طالوت
1
ایم اے راحت
Ikram Raja

آغازیہ

"طالوت" پاکستان کے سب سے بڑے ڈائجسٹ "سسپنس ڈائجسٹ" میں بہت سال دھوم مچانے والی سدا بہار داستان آج بھی روزِ اوّل کی طرح مقبول ہے۔ اس کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہوئے اور بک گئے۔ لیکن ہمارے وطن میں ایک دکھ بھری روایت ہے کہ تخلیق کار کو ایک کلرک سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کی عرق ریزی کا مختصر معاوضہ دے کر اجارہ داری قائم کر لی جاتی ہے اور اسے کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے معاوضہ تو درکنار اسے اطلاع تک نہیں دی جاتی۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر نئے ایڈیشن کی اشاعت پر اُسے اس کی دو کاپیاں تک نہیں دی جاتیں۔ جبکہ مروّجہ قانون کے تحت ہر ایڈیشن کی رائلٹی رائٹر کا حق ہوتی ہے۔ ہاں، اس سلسلے میں وطن کے ایک پروقار جریدے "اخبار جہاں" نے ہمیشہ اپنے کہانی کاروں کو ان کا بھرپور حق دیا۔ میرے ایک ناول "کالا جادو" کے انہوں نے جتنے ایڈیشن شائع کئے، ہر ایک کی رائلٹی اور ہر نئے ایڈیشن کی پانچ کاپیاں مجھے دیں۔ طالوت کی اشاعت کو پچیس سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور اب اسے پہلی بار نئی کتابی صورت میں خوبصورت انداز میں ملک کے سب سے خوبصورت ناول شائع کرنے والا ادارہ "القریش پبلی کیشنز" شائع کر رہا ہے۔ میں اس کی خوبصورت اشاعت پر بھائی محمد علی قریشی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور انہیں مبارکباد اور دن دُگنی رات چوگنی ترقی کی دعا دیتا ہوں۔

ایم۔اے راحت

دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے ٹن ٹن کر کے آٹھ بجائے، لیکن اُس کی سوئیاں ساڑھے نو کے ہندسے بتا رہی تھیں۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں نے کھا جانے والی نگاہوں سے کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کم بخت کو بھی اسی وقت مذاق سوجھا تھا۔ حالانکہ ٹھیک آٹھ بجے میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تھا اور ساڑھے نو بجے اللہ رکھا ریسٹورنٹ کا بیرہ میرے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے میں نے اپنے ایک بینڈ کے ریڈیو سے رات کی خبریں سنی تھیں۔ تقریباً بارہ بجے میں بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اور ایک گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد بھی نیند نہ آنے پر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر تک میں نے زرینہ کو ایک نفرت بھرا خط لکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پیڈ کا آخری کاغذ بھی پھاڑنے کے باوجود خط نہ لکھ سکا تھا۔ تب خط لکھنے کا ارادہ ملتوی کر کے میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک مسلسل سوچ رہا تھا۔ ہائی لائٹ کے نئے پیکٹ میں آخری سگریٹ رہ گئی۔ گویا میں نے سوچ بچار میں پوری اُنیس سگریٹیں پھونک ڈالی تھیں، اور اتنی سگریٹیں پینے میں کم از کم دو گھنٹے ضرور لگے ہوں گے۔ لیکن کم بخت کلاک آٹھ بجا رہا تھا اور اُس کی سوئیاں ساڑھے نو کے ہندسے پر تھیں!

لیکن کلاک بھی کیا کرتا۔ وہ اپنی عمر کی آخری منازل میں تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ اس بڑھاپے میں بھی وہ حسبِ توفیق اپنا فرض ادا کر دیتا تھا۔ اس کی کیفیت ایک فرض شناس، لیکن افیونی پہریدار کی سی تھی، جو دن کے بارہ بجے بھی افیون کی پینک میں چونک کر "جاگتے رہو" کا نعرہ لگا دیتا ہے۔ تمام تر غلطی اسی کی نہ تھی۔ میں نے کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ کبھی اس کا فریم خوش نما اور چمک دار تھا۔ گھنٹے کے اوپری شیشے پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے، لیکن اب سرے سے شیشہ ہی غائب تھا۔ گرد اور میل کچیل سے پیتل کے چمک دار گھنٹے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اندرونی حصوں میں "مکڑی نگر" آباد ہو گیا تھا اور مکڑیوں کے بہت سے خاندان اس میں سکون و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ البتہ جب کبھی اس کا گھنٹہ بج اُٹھتا تو چھوٹے چھوٹے، ہلکے پھلکے بچے خوف زدہ ہو کر باہر نکل آتے اور دیوار پر اِدھر اُدھر دوڑنے لگتے۔ لیکن پھر اُن کے والدین اُنہیں سمجھا بجھا کر واپس گھر لے جاتے اور بہادر بننے کی تلقین کرتے۔ سیاہ اور چمک دار سوئیاں ڈھیلی ہو کر بے جان ہو گئی تھیں۔ وہ اس شریر گھنٹے کا ساتھ نہ دے پاتی تھیں۔ اور جب وہ دن کے بارہ بجا رہا ہوتا تو سوئیاں بلندی سے پستی میں آ پہنچتیں اور ساڑھے چھ بج جاتے۔ چنانچہ کلاک کو بے قصور قرار دے کر میں پھر غور و خوض میں مصروف ہو گیا۔

کیا کرنا چاہیئے؟ ...... مردود اختر بیگ نے مجھے شکست فاش دی تھی۔ اور بے وفا زرینہ نے مجھے

تین سال تک احمق بنایا تھا۔ اس سے بہتر تو انجیلا تھی۔ اگر اُس کی دونوں آنکھیں بیک وقت مختلف سمتوں میں نہ دیکھتی ہوتیں اور ٹھوڑی پر جلے ہوئے کا نشان نہ ہوتا تو وہ زرینہ سے کہیں خوب صورت تھی۔ اُس کا قد زرینہ سے کہیں اچھا تھا۔ اور جو مجھ سے، زرینہ سے زیادہ محبت کرتی تھی۔

لیکن نہ جانے موٹا حشمت کہاں سے اس کوتاہ قد لڑکی کو لے آیا، جس نے مجھے انجیلا سے دُور کر دیا۔ زرینہ نے چند ہی دنوں میں مجھے خود پر عاشق کر لیا اور انجیلا سوگوار ہوگئی۔ زرینہ، مجھ سے محبت کی پینگیں بڑھاتی رہی اور میں، انجیلا کو بھولتا گیا۔ خدا مجھے معاف کرے، میں نے انجیلا کی بھینگی آنکھوں کا مذاق بھی اُڑایا، جس کی محرک زرینہ تھی۔ پھر انجیلا اتنی بد دِل ہوگئی کہ اُس نے ادھیڑ عمر کے جیکب سے شادی کر لی۔ انجیلا کی شادی میں، میں اور زرینہ اسی طرح شریک ہوئے تھے جیسے میاں بیوی ہوں۔ اس طرح خوشی کے موقع پر بھی میں اُس کے دل پر چرکے لگانے سے باز نہ آیا۔

مجھے انجیلا کی وہ کرب ناک مسکراہٹ یاد آگئی، جو مجھ سے شادی کی مبارک باد وصول کرتے وقت اُس کے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا........سب کچھ زرینہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ اور........اب زرینہ، اختر بیگ سے شادی کر رہی تھی۔ صرف اس لئے کہ اختر بیگ، اکاؤنٹنٹ تھا۔ اُس کی تنخواہ گیارہ سو تھی۔ اور میں کلرک تھا۔ میری تنخواہ ساڑھے تین سو تھی۔

مگر اب میں کیا کروں؟........زرینہ کی شادی کا کارڈ سامنے میز پر پڑا منہ چڑا رہا تھا اور میں غصہ سے کھول رہا تھا۔

ہم سب موٹے سیٹھ حشمت علی کی امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم ''حشمت برادرز'' میں کام کرتے تھے۔ سیٹھ حشمت خالص سیٹھ تھے۔ نہ جانے کون سے خاندان سے اُن کا تعلق تھا۔ لیکن اب باعزت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بڑے بڑے لوگوں سے رسوخ تھے۔ بڑے بڑے لائسنس مل جاتے تھے اور کاروبار خوب چل رہا تھا۔ لیکن حشمت سیٹھ حد درجہ کنجوس تھے۔ لنڈا بازار کے سوٹ پہنتے تھے۔ سڑی بُسی آسٹن کار میں سفر کرتے تھے، جس میں ہارن کے سوا ہر چیز بولتی تھی۔ جس طرف سے گزرتے، راہ گیر دُور دُور ہٹ جاتے کہ کہیں گاڑی کا بونٹ اُچھل کر اُن پر نہ آ پڑے۔ دفتر کی بھی یہی حالت تھی۔ پورے چھ سال سے میں اس میں کام کر رہا تھا لیکن ایک بار بھی کبھی دفتر میں رنگ و روغن نہیں کرایا گیا تھا۔ دیواروں پر البتہ جگہ جگہ پان کی پیک سے گل کاری ہو رہی تھی۔ دفتر کے بہت سے لوگ پان کے شوقین تھے اور کام کے اوقات میں کہیں اور جا کر پیک تھوکنے کی تکلیف نہیں کرتے تھے۔ حشمت سیٹھ کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ملازموں کی مستعدی اور وفاداری کا ثبوت تھا۔ فرنیچر بھی سیٹھ حشمت کی ''کفایت شعاری'' کا آئینہ دار تھا۔ رحیم الدین کباڑی سے فرنیچر کی سپلائی کا معاہدہ تھا اور رحیم الدین نے ''نایاب'' فرنیچر حشمت برادرز میں جمع کر دیا تھا۔ رحیم الدین بھی ماہر فن تھا۔ ٹوٹی پھوٹی میز کرسیوں کو تیار کر دینا اُس کے ''دائیں ہاتھ'' کا کام تھا۔ کیونکہ اُس کا بایاں ہاتھ شانے کے قریب سے غائب تھا۔ شاید ضرورت پڑنے پر اُس نے کسی کرسی کے پائے کی جگہ لگا دیا تھا۔ کسی بھی میز کے چاروں پائے یکساں نہیں تھے۔ ایک میز مختلف میزوں کا مجموعہ تھی۔ یہی کیفیت کرسیوں کی تھی۔ کوئی بھی کرسی بید سے بُنی ہوئی نہیں تھی بلکہ تختے جوڑ کر بار بار پیسے خرچ کرنے کا جھگڑا ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ دفتر کا دوسرا سامان بھی نوادرات میں سے تھا۔ مثلاً ریک، ٹائپ رائٹر اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ ٹائپ رائٹر کے حروف، زیڈ کو اُردو کے ''سات''

کا ہندسہ بنا دیتے تھے۔ یو کو جے اور ایل کو آئی۔ لیکن انجیلا کو تنخواہ کس بات کی ملتی تھی۔ ضروری خطوط ٹائپ کرنے کے بعد وہ تمام ہندسے بال پوائنٹ سے درست کر دیتی تھی اور اس کام میں ماہر ہو گئی تھی۔

دفتر کا اسٹاف چودہ افراد پر مشتمل تھا، جن میں دو خواتین اور باقی حضرات تھے۔ کسی بھی فرم کی شان بڑھانے کے لئے لیڈی ٹائپسٹ اور لیڈی ریسپشنسٹ کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ حشمت سیٹھ اس ضرورت سے بہ خوبی واقف تھے۔ لیکن دو سو روپے ماہوار پر بھینگی آنکھوں والی انجیلا ہی مل سکتی تھی، جس کی ٹائپ کی اسپیڈ بہر حال بائیس الفاظ فی منٹ تو تھی ہی، اور اس نایاب ٹائپ رائٹر پر، جس کے حروف ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، پندرہ سولہ الفاظ فی منٹ نکل ہی آتی تھی۔

دوسری خاتون وقت کی ستائی ہوئی محترمہ زیب النساء تھیں، جو ریسپشنسٹ کا کام کرتی تھیں۔ لیکن ان کی عمر خاصی تھی اس لئے دفتر کا کوئی آدمی ان سے عشق نہ کر سکا اور جب وہ کسی کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو بد دل ہو کر ملازمت ہی چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس طرح دفتر میں اب بھینگی آنکھوں والی انجیلا کا ہی راج تھا۔ وہی چپراسی سے لے کر اکاؤنٹنٹ تک کی آنکھوں کا تارا تھی۔ یہ انجیلا کی آنکھوں کا کمال تھا کہ وہ ہر شخص کو مطمئن کر دیتی تھیں اور ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ مس انجیلا ہر وقت اس کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ لیکن اس باذوق عیسائی لڑکی نے اس ناچیز کو پسند کیا تھا۔ جس کا اظہار ایک دن کرسمس کے موقع پر اُس نے کر دیا۔ وہ اس طرح کہ دفتر کے پورے اسٹاف میں اُس نے صرف اس خادم کو اپنے ہاں بلایا تھا۔

میری باچھیں کھل گئیں۔ ویسے ایک بات عرض کر دوں کہ لوگ مجھے قبول صورت، بلکہ خوب صورت کہتے ہیں۔ یوں بھی پوری دنیا میں تنہا ہونے کی وجہ سے اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا عادی رہا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے عمدہ لباس پہن کر کبھی دفتر نہیں جاتا کیونکہ ان کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بہر حال، مس انجیلا نے مجھ سے اظہارِ عشق کر دیا تھا اور میرے دل کے کنول کھل گئے۔ ہمارا عشق پورے دو سال تک بغیر کسی حادثے کے چلتا رہا۔ اس دوران انجیلا نے کئی بار عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور میں نے عیسائی ہونے کا۔ لیکن ہم اس کے لئے وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ........ حشمت سیٹھ، نئی ریسپشنسٹ کو لے آئے۔ یہ زرینہ تھی۔ بوٹے سے قد کی، گھنگھریالے بالوں والی حسینہ۔ خوش مزاج، ہنس مکھ۔ اور اس کے آتے ہی انجیلا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لیکن میں، آپ کو پورے خلوص سے بتاتا ہوں کہ میرے دل میں اس وقت تک کوئی منافقت پیدا نہیں ہوئی، جب تک زرینہ نے خود میری طرف قدم نہ بڑھائے۔ دفتر کے بیشتر لوگ زرینہ کی توجہ حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ لیکن زرینہ کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی۔ پھر ایک شام، جب ہم دفتر سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچے تو زرینہ میرے قریب آ گئی۔

''مصروف ہیں، مسٹر عارف؟'' اُس نے ایک ادا سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ حکم دیں۔''

''دراصل، پکچر دیکھنے کا موڈ تھا۔ لیکن تنہا جاتے ہوئے جھجکتی ہوں۔ دو ٹکٹ بک کرائے تھے۔ اگر آپ پسند کریں۔'' اس نے کہا۔

میں بھلا کیوں نہ پسند کرتا؟ ہم نے پکچر دیکھی۔ میں نے اُسے ڈنر کی دعوت دی جو اُس نے قبول کر

لی۔ ڈنر کے دوران ہم نے ایک دوسرے کے حالات زندگی جانے، ایک دوسرے سے واقف ہوئے۔ اور پھر زرینہ نے روزانہ مجھے مسکرا کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ دفتر میں کھلبلی مچ گئی۔ انجیلا اُداس ہو گئی۔ لیکن ان باتوں کا ہمارے اوپر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ میں نے انجیلا کی نیو ایئر ڈے والی دعوت پر بھی معذرت کر لی تو انجیلا کو یقین ہو گیا کہ اُس کا دور ختم ہو گیا۔ چنانچہ وہ مظلوم لڑکی خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ دوسرے لوگوں کو بھی احساس ہو گیا کہ یہ دوسری لڑکی بھی میرے جال میں پھنس گئی ہے اور اب ان کی دال گلنا مشکل ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی عشق کرنے کے اوزار سمیٹ کر دل کے تھیلے میں بند کر لئے اور ہمارے بارے میں کانا پھوسی کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔

یوں زرینہ سے میری محبت پروان چڑھنے لگی۔ ہم ہر جگہ ساتھ آتے جاتے۔ دفتر میں بھی زرینہ دو تین بار میرے پاس آتی اور میں دو تین بار اُس کے پاس جاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اطلاع دیئے بغیر بھی غیر حاضر نہ ہوتے۔ دوپہر کو ساتھ کھانا کھاتے۔ شام کو میں زرینہ کو اُس کے مکان پر چھوڑنے جاتا۔ وہ مجھے ایک پیالی چائے پلاتی۔ اُس کی بوڑھی ماں مجھے بیٹا اور چھوٹا بھائی، انکل کہتے۔ اس طرح پورے تین سال گزر گئے۔ ان تین سالوں میں، میں اور زرینہ اتنے قریب آ گئے کہ دُوری کا تصور بھی دُور ہو گیا۔ انجیلا کے دل کی سیٹ خالی ہو گئی تھی۔ چنانچہ دفتر کے دوسرے لوگوں نے الیکشن لڑا، لیکن کسی کو کوئی ووٹ نہ مل سکا۔ تب ادھیڑ عمر کے جیکب نے انجیلا کو مذہب اور ملّت کا واسطہ دے کر اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا۔ اُس نے شاید اُسے یہی بتایا ہو گا کہ یہ مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آخر میں نے اپنے مذہب کی لڑکی کو اُس پر ترجیح دی تھی چنانچہ کیوں نہ وہ بھی اپنے مذہب کے آدمی کا خیال کرے۔ تب ایک دن جیکب نے مجھے اپنی شادی کا کارڈ دیا۔ یہ شادی، مس انجیلا کے ساتھ ہو رہی تھی۔

میں اور زرینہ اس کارڈ کو دیکھ کر خوب ہنسے تھے۔ پھر ہم نے اُن کی شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دفتر کے دوسرے لوگ بھی پہنچے تھے۔ لیکن میں اور زرینہ ساتھ ساتھ، انجیلا کی شادی میں گئے۔ میں نے زرینہ کو اپنی پوری تنخواہ خرچ کر کے ایک ساڑھی خرید کر دی تھی۔ اور اس ماہ میرے اوپر جو کچھ بیتی، اس کا ذکر کیا کروں۔ ہاں، تو ہم اس شادی میں شریک ہوئے اور اس کامیابی سے شریک ہوئے کہ لطف آ گیا۔ دفتر کے دوسرے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بات حد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ انجیلا نے افسردہ مسکراہٹ سے ہماری مبارک باد وصول کی، ہم دونوں کا مشترکہ تحفہ وصول کیا اور یوں اس شادی کی یاد بہت دنوں تک ہمارے لئے دلچسپ موضوع گفتگو بنی رہی۔

پھر میری قسمت کے تاریک دور نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں اُسے بھول چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اہمیت کا احساس دلانا ضروری سمجھا اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک شام دورانِ گفتگو زرینہ نے تذکرہ کیا کہ اگلے ماہ کی پانچ تاریخ کو وہ پورے بیس سال کی ہو جائے گی۔ میں، جو اُس کی خوشنودی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا، بول پڑا۔

”تب اس ماہ تمہاری سالگرہ باقاعدگی سے منائی جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ زرینہ نے چونک کر کہا تھا۔

”تمہارے گھر پر ایک چھوٹی سی تقریب ہو گی، جس میں ہمارے دفتر کے تمام لوگ شریک ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ اور زرینہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ لیکن پھر اُس نے اُداس ہو کر کہا۔

''میں نے اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ اور اس بار بھی کیسے منا سکتی ہوں؟ خاصے اخراجات ہو جائیں گے۔''

''تو ہونے دو، ڈارلنگ!''

''نہیں عارف! تمہارے اوپر یوں ہی کافی بار ہے۔ تمہاری آدھی تنخواہ تو میرے اوپر خرچ ہو جاتی ہے۔ بلاوجہ اس بوجھ کی کیا ضرورت ہے؟''

''تمہارے لئے تو میں ساری دنیا کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکتا ہوں، ڈارلنگ!''

پھر ہم سالگرہ کا پروگرام ترتیب دینے لگے۔

جوشِ محبت میں، میں زرینہ کی سالگرہ کا پروگرام تو بنا چکا تھا لیکن اُس کے گھر سے نکلنے کے بعد مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ یہ میں کیا کر بیٹھا تھا۔ میں سالگرہ کے انتظامات کہاں سے کروں گا؟ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ساڑھے تین سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ تنہا انسان تھا، بہ خوبی گزارہ ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے زرینہ سے محبت کی تھی، آدھی تنخواہ اُس کی ماں، بھائی اور خود زرینہ کی کچھ ضروریات پر خرچ ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنے اخراجات کم کر دیئے تھے۔ مثلاً پہلے میں ہمیشہ دیر سے دفتر کے لئے نکلتا تھا اور رکشہ یا ٹیکسی سے دفتر جاتا تھا۔ لیکن اب میں نے باقاعدگی سے بس کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ علی الصبح گھر سے نکل آتا تھا۔ پہلے ناشتے میں انڈے، مکھن اور دوسری چیزیں ہوتی تھیں، اب صرف چائے اور سلائس پر گزارہ کرتا تھا۔ پہلے میں کیپسٹن کے چار پیکٹ پیتا تھا اور اب ہائی لائٹ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح کی دوسری کفایت شعاریوں سے میں نے ان اخراجات پر قابو پا لیا تھا، جو زرینہ پر ہوتے تھے۔ لیکن اب سالگرہ کے لئے کافی رقم درکار تھی۔ میں غور و خوض کرتا رہا۔ لے دے کے گھر کے سامان پر ہی نگاہ گئی۔ گھر کے قیمتی سامان میں ایک ٹیپ ریکارڈر تھا، جسے میں نے بڑی چاہت سے خریدا تھا اور یہ میرے تنہائی کے وقت کا ساتھی تھا۔ قیمتی ٹیپ ریکارڈر صرف تین سو روپے میں فروخت کر دیا۔ کلائی کی گھڑی ایک سو پانچ روپے میں بکی۔ تین عمدہ سوٹ سلائی کی قیمت میں بک گئے۔ دیوار کے اس کلاک کے ایک کباڑی نے صرف بارہ روپے لگائے تھے اس لئے یہ بدبخت بچ گیا۔ بہرحال، میں سات آٹھ سو روپے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن زرینہ کی خوشی کے لئے یہ قربانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے ایک سوخوب صورت دعوتی کارڈ چھپوائے اور جب کارڈ تیار ہو گئے تو زرینہ کے سامنے رکھ دیئے۔ کس قدر خوش ہوئی تھی وہ ان کارڈوں کو دیکھ کر۔ اُس دن اُس نے میری سچی محبت کا اقرار کیا تھا۔ میرے ساتھ دائمی زندگی نبھانے کا وعدہ کیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ زرینہ کا دل جیتنے کے لئے میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ بہت بڑی دانش مندی تھی۔ بہرحال دعوت نامے تقسیم کر دیئے گئے۔ اس تقسیم میں، میں پیش پیش تھا، لیکن خوف زدہ بھی تھا کہ کہیں میری مہیا کی ہوئی رقم کم نہ پڑ جائے۔ تاہم میں نے سخت احتیاط سے کام لیا۔ زرینہ کو احساس بھی نہ ہونے دیا اور تمام کام بخیر و خوبی نمٹ گئے۔ سالگرہ پارٹی میں، میں نے اپنا آخری خوب صورت سوٹ زیب تن کیا تھا۔ زرینہ نے میری دی ہوئی ساڑھی پہنی اور ہم مہمانوں کا استقبال کرنے لگے۔

مہمانوں میں شیطان کا خالہ زاد بھائی، اختر بیگ بھی تھا۔ اختر بیگ، ہمارے ہاں اکاؤنٹنٹ تھا۔

خاصے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی سی شکل تھی، لیکن جوان آدمی تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ گیارہ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ دوسرے مہمانوں نے حسب توفیق زرینہ کو تحائف پیش کئے اور پھر اختر بیگ نے بھی اپنا تحفہ زرینہ کو دیا۔ یہ سنہری مخمل کا ایک بکس تھا۔

"یہ میری طرف سے حقیر نذرانہ۔" اُس نے ایک ادا سے جھک کر کہا۔ تمام مہمانوں کے تحفے کھلے ہوئے تھے، ہم اُن کی مالیت کا اندازہ بہ خوبی لگا سکتے تھے۔ لیکن اس بند ڈبے میں نہ جانے کیا تھا۔ زرینہ اس ڈبے سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی اور اُس کے دل میں اسے کھول کر دیکھنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ یہ خواہش میرے دل میں تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی خود پر قابو پائے رہے اور سالگرہ کی دعوت بہ خیر و خوبی اختتام کو پہنچ گئی۔

مہمانوں کے جاتے ہی ہم دونوں سنہری ڈبے کی طرف لپکے۔ ہم نے بڑے تجسس سے اسے کھولا۔ اور ڈبہ کھلتے ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ڈبے میں جڑاؤ زیورات کا ایک خوب صورت سیٹ جگمگا رہا تھا۔ زرینہ کا چہرہ اُس سیٹ کو دیکھ کر گلنار بن گیا۔ اور میرے جبڑے لٹک گئے۔ اتنا قیمتی تحفہ! تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے، امی ٹیشن ہے۔" میں نے کہا۔

"سونے کا معلوم ہوتا ہے۔" زرینہ نے کہا۔ پھر اُس کی ماں نے بھی تصدیق کر دی کہ زیورات خالص سونے کے ہیں۔

"کم از کم ڈیڑھ ہزار کے ہوں گے۔" زرینہ نے کہا۔

"اونہہ......... سونا بہت سستا ہے آج کل۔ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو کے ہوں گے۔ نگینے زیادہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں ان چیزوں کی کیا تمیز؟" زرینہ نے ناک سکوڑ کر کہا اور پھر اسی وقت اُس نے آئینے کے سامنے جا کر زیورات پہن لئے اور ان زیورات کو زیب کرنے کے بعد وہ درحقیقت بہت خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔

"یہ اختر بیگ اس قدر مخلص نکلے گا، مجھے خیال بھی نہ تھا۔" زرینہ نے کہا۔

"مجھے اجازت دو، زرینہ!" میں نے کہا۔

"اچھا......... خدا حافظ!" وہ بے خیالی میں اپنے بُندوں کے نگ درست کرتے ہوئے بولی اور میں ہونّق سا رہ گیا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی بے نیازی سے مجھے جانے کی اجازت دے دے گی۔ میں دل برداشتہ سا چلا آیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرے سے جاگ اُٹھے تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اختر بیگ پر غصہ آ رہا تھا۔ خود پر غصہ آ رہا تھا۔ بلاوجہ یہ سالگرہ کا کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ لیکن پھر میں نے دل کو تسلی دی۔ عورت کی فطرت کے متولے یاد کئے۔ عورت تو زیورات پر مرتی ہے۔ لیکن زرینہ کو بہت جلد میری دل شکنی کا احساس ہو جائے گا۔ وہ مجھ سے معافی مانگ لے گی۔ البتہ میں اُس سے دو تین دن تک ناراضی کا اظہار کروں گا۔ اُسے احساس دلاؤں گا کہ اُس نے سونے کی چمک سے مرعوب ہو کر میری دل شکنی کی تھی۔ اُس رات، اُس وقت تک، جب تک نیند نہ آ گئی، میں غم و غصہ کا شکار رہا۔

دوسرے دن جب معمول میں دفتر پہنچ گیا۔ زرینہ بھی آ چکی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

روزانہ وہ مسکرا کر میرا استقبال کرتی تھی۔ اُس روز بھی اُس نے استقبالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ لیکن آج اُس کی مسکراہٹ میں وہ زندگی نہیں تھی۔ یا یہ صرف میرا احساس تھا۔ بہرحال، مجھے اُس سے ناراضگی کا اظہار کرنا تھا۔ سو میں دن بھر کرتا رہا۔ میں نے لنچ میں بھی زرینہ کو مخاطب نہیں کیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوئی۔ اور یہی چھٹی کے وقت ہوا۔ وہ چھٹی کے بعد بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی ایک بس میں سوار ہوتے اور میں اُسے اُس کے گھر چھوڑ کر اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آتا۔ لیکن آج جب میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو زرینہ موجود نہیں تھی۔ میں اور جل گیا اور اُس کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر واپس آ گیا۔

میری انا جاگ اُٹھی تھی۔ میں نے زرینہ کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس نے ذرا سی دیر میں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس وقت تک زرینہ سے بات نہیں کروں گا جب تک وہ میری خوشامد نہ کرے۔ اور دفتر میں دوسرے دن میں نے اپنا موڈ سخت خراب رکھا۔ میں نے ایک بار بھی زرینہ کی طرف نہیں دیکھا۔ تیسرے دن بھی یہی کیفیت رہی۔ ویسے تیسرے دن میں نے چور نظروں سے زرینہ کی شکل دیکھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی اضطراب نہیں تھا۔ اُس کے انداز میں ذرا بھی افسردگی نہیں تھی۔ وہ حسب معمول اپنا کام انجام دے رہی تھی۔ چوتھا دن بھی یونہی گزرا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ البتہ اُس روز میں، زرینہ سے گفتگو کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں اُس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مستقبل کے جو پروگرام ہم نے بنائے تھے، ان کا کیا ہو گا۔ اس خیال کے تحت میں ذرا جلدی دفتر سے نکل آیا اور بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ حالانکہ روزانہ زرینہ پہلے نکل جاتی تھی۔ بس اسٹاپ پر میں ایک طرف آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ تاکہ زرینہ کی نگاہ براہِ راست میرے اوپر نہ پڑے۔ میں دفتر کے دروازے کی طرف نگراں تھا۔ اور پھر میں نے زرینہ کو بس اسٹاپ کی طرف آتے دیکھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر اختر بیگ، اس سے بے خبر اسی طرف آ رہا تھا۔ شاید وہ بھی بس میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

زرینہ، بس اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ اور پھر اُس نے مسکرا کر اختر بیگ کو سلام کیا۔ اختر بیگ نے بھی اسی طرح مسکرا کر اسے جواب دیا تھا اور زرینہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ میں ان دونوں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن دونوں میں سے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے زرینہ کی آواز سنی۔

''مصروف ہیں، اختر صاحب؟''

''اوہ........نہیں، مس زرینہ! حکم دیں؟'' اختر نے کہا۔

''وہ، دراصل پکچر دیکھنے کا موڈ تھا۔ لیکن تنہا جاتے ہوئے جھجکتی ہوں۔ دو ٹکٹ بک کرائے تھے۔ اگر آپ پسند کریں۔''

اور میرا دماغ سن ہو گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ میں نے نہیں سنا کہ اختر بیگ کیا کہہ رہا ہے۔ زرینہ نے مزید اس سے کیا کہا۔ البتہ میری آنکھوں نے اختر بیگ کو ٹیکسی روکتے دیکھا۔ اور پھر وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ کئی بسیں نکل گئیں۔ پھر جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں ایک بس میں بیٹھ کر گھر چلا آیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زرینہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ زیورات کے ڈبے میں بند ہو گئی۔ سونے کی چمک

نے میری محبت کو ماند کر دیا۔ میں نے فلمی عاشقوں کے سے انداز میں درد بھرے گانے گنگنانے شروع کر دیئے۔ شیو بنانا بند کر دیا، بال سنوارنے چھوڑ دیئے۔ مجھے اپنی گھڑی، ٹیپ ریکارڈر اور سوٹوں کا بھی غم تھا۔ اور اس سے زیادہ غم زرینہ کی بے وفائی کا تھا۔

کئی بار میرے ذہن میں خطرناک خیالات بھی آئے۔ دل نے کہا، اختر بیگ کی مرمت کر دوں یا زرینہ کو اغوا کر لوں، گھوڑا لے کر جاؤں، اُسے اُٹھا کر گھوڑے پر ڈالوں اور پستول سے فضا میں فائرنگ کرتا ہوا بھاگ نکلوں۔ لیکن پھر عقل نے ٹہوکا دیا۔ لالہ سدھیر یا سلطان راہی تو ایسے کام کر سکتے ہیں، میرے بس کی بات نہیں۔ اگر گھوڑے سے گر پڑا تو ایک آدھ ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اور مجھے دونوں ٹانگیں عزیز تھیں۔ پھر کیا کروں؟......... بے شمار خیالات میرے ذہن میں جنم لینے لگے۔ کم ہمت نہیں ہوں۔ دنیا میں تنہا ہونے کی وجہ سے موت اور زندگی کا بھی غم نہیں ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے کیا فائدہ ہوگا؟ زرینہ بے وفا ہے، بے وفا رہے گی۔ لیکن اُس کی بے وفائی کی وجہ دولت ہے۔

یوں تو قدم قدم پر دولت کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ لیکن اس واقعے کے بعد سے دولت کی طاقت کا میں دل سے قائل ہو گیا۔ انسان کے پاس دولت نہیں ہے تو زندگی بے کار ہے۔

روز و شب گزرتے رہے۔ دفتر کے لوگ اب مضحکہ خیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے تھے۔ زرینہ بھول گئی تھی کہ کبھی اُس کے مجھ سے بھی تعلقات تھے۔ اب وہ کھلم کھلا اکاؤنٹنٹ سے عشق کر رہی تھی اور بہرحال اختر بیگ کی تنخواہ گیارہ سو تھی۔ میرے لئے اگر اُس کی آنکھوں میں رحم کے تاثرات تھے تو وہ انجیلا یا مسز جوزف تھی۔ لیکن آنکھوں کا زاویہ درست نہ ہونے کی وجہ سے یہ تاثرات ٹھیک طور سے نظر نہیں آتے تھے۔

اور ابھی اس کامیاب عشق کو پورا ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ آج شام کو اختر بیگ مردود نے میرے ہاتھ میں یہ کارڈ تھما دیا تھا۔ سب سے پہلا کارڈ مجھے ملا تھا۔ بعد میں یقیناً دوسروں کو بھی ملے ہوں گے۔ لیکن اختر بیگ تو صرف میرا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔ آج زرینہ بھی دفتر نہیں آئی تھی۔ اور درحقیقت میں تماشا بن گیا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا لیکن یہ آدھا گھنٹہ بھی مجھ سے نہ گزارا گیا۔ میں دفتر سے نکل آیا۔ اور پھر نہ جانے کہاں کہاں آوارہ گردی کرتا پھرا۔ نہ جانے میرے دل میں کیسے کیسے طوفان آ کر گزر گئے۔ دولت کی فتح ہوئی تھی۔ مردود اختر بیگ نے زرینہ کو جیت کر مجھے شکست فاش دی تھی اور زرینہ نے زیورات کے سیٹ پر اپنی محبت قربان کر دی تھی۔

اور اس وقت اندازے کے مطابق رات کے تین بج رہے تھے۔ اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔ ورنہ ابھی تھوڑی دیر قبل کلاک نے آٹھ بجائے تھے اور اُس کی سوئیاں ساڑھے نو پر اٹکی ہوئی تھیں۔ کلائی کی گھڑی سے وقت کا پتہ چل سکتا تھا۔ لیکن اس کو میں نے زرینہ کی سالگرہ کی نذر کر دیا تھا۔ میرے دل میں دھواں سا اٹھنے لگا اور میں بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں اب آخری سگریٹ رہ گیا تھا اور اس آخری سگریٹ کے دوران میری سوچ کو تسکین ملنا ضروری ہے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ دل چاہ رہا تھا کہ آخری سگریٹ بھی جلا لوں۔ لیکن اگر اس دوران بھی سکون کی منزل نہ مل سکی تو؟ بہرحال، اب نہیں برداشت کر سکتا۔ میں نے ہائی لائٹ کے پیکٹ سے آخری سگریٹ نکال لی، سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر فوری فیصلے کرنے لگا۔ زرینہ کا خیال دل سے نکالنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ

نہیں ہے۔ غصہ کے عالم میں کوئی انتقامی قدم پوری زندگی کا پچھتاوا بن سکتا ہے۔ گناہ بے لذت والی بات ہوگی۔ زبردستی کسی کی توجہ نہیں حاصل کی جاسکتی۔ خواہ زرینہ ہو یا کوئی اور......... دولت کے ذریعے دلوں پر ڈاکے ڈالے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ پہلا قدم دولت کا حصول ہے۔ دولت ہو تو دنیا بھر کی توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ دولت نہ ہونے کی وجہ سے ہی آج یہ کیفیت ہوئی ہے۔ ورنہ زرینہ کی شادی کے دعوت نامے پر آج خود میرا نام ہوتا۔ پھر، دولت حاصل کرنے کی کیا ترکیب ہے؟ سگریٹ کے ایک چوتھائی حصے کے جلتے جلتے میں نے دولت کے حصول کی ترکیب سوچ لی۔ زرینہ کو اغواء کیا جاسکتا ہے۔ با آسانی۔ اسے قابو بھی رکھا جاسکتا ہے، خواہ کتنے ہی خطرات کیوں نہ مول لینے پڑیں۔ لیکن اس طرح زرینہ کی محبت تو نہیں حاصل کی جاسکتی۔ پوری زندگی کا عذاب۔ زرینہ نہ سہی، کوئی اور سہی جو بھرپور محبت دے سکے۔ دولت کے عوض۔ گویا دولت کا حصول اوّلین شرط ہے۔ خواہ جائز طور سے حاصل ہو یا ناجائز طور سے۔

اور ناجائز طور سے دولت کے حصول کے لئے اس سے عمدہ اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی تھی، جو سگریٹ کے آدھے ہونے تک میرے ذہن میں آئی تھی اور اس ترکیب پر میں دل ہی دل میں اچھل پڑا۔ ایک تیر سے دو شکار۔ اختر بیگ کی شادی ضرور کھٹائی میں پڑ جائے گی، اور زرینہ کے حواس درست ہو جائیں گے۔ رہا خود میرا سوال .... تو نو رسک، نو گیم۔ خطرہ مول لئے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ یوں بھی ان صدمے اور بے عزتی کی وجہ سے میں اب اس دفتر میں کام نہیں کرسکوں گا۔ زرینہ جب مسز اختر بیگ بن کر دفتر میں آئے گی تو میرے دل پر کیا بیتے گی۔ اس طرح اگر میں کوئی جنونی قدم اُٹھا گیا تو ویسے بھی مصیبت مول لینا پڑے گی۔ اس لئے دوسری مصیبت کیوں نہ مول لی جائے۔ سگریٹ ختم ہونے تک میں اپنے فیصلے کو یقین کی شکل دے چکا تھا۔ میں مجرمانہ طور پر دولت حاصل کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ سگریٹ ختم ہوگئی۔ لیکن اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرا ذہن ایک راہ سوچ رہا تھا۔ میں نے وہ مڑے تڑے پیڈ کے کاغذ اُٹھائے، جن پر میں زرینہ کو ایک عتاب نامہ لکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اُن میں سے چند کاغذوں کو سیدھا کرکے اُن کی شکنیں نکالیں اور پھر پین لے کر اپنے پروگرام کا نقشہ ترتیب دینے لگا۔ میں اپنے پروگرام کے ایک ایک نکتے پر غور کر رہا تھا۔ اور پھر بہت سے کاغذوں پر مشتمل پروگرام کو ذہن نشین کرنے کے بعد میں نے اپنی فطرت کا جائزہ لیا۔

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں میری شخصیت، میری فطرت کی کوئی کمزوری تو آڑے نہیں آئے گی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور پوری دلجمعی سے اپنا کام انجام دے سکتا ہوں۔ اور پھر میں نے ان تمام کاغذوں کو ایک جگہ جمع کرکے ان کو ماچس دکھا دی۔ ایک ایک ٹکڑے کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کے بعد میں نے احتیاط سے وہ راکھ اُٹھائی اور اسے منتشر کر دیا۔ کاغذوں کے باقی ٹکڑوں کو میں نے سمیٹنا ضروری نہیں سمجھا۔ ان پر چند سطور لکھی ہوئی تھیں، جن میں مختلف انداز میں زرینہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ میں چشم تصور میں اپنے مکان میں پولیس کو دیکھ رہا تھا۔ پولیس کا افسرِ اعلیٰ ان کاغذات سے میرے پروگرام کے بارے میں کیا اندازہ لگا سکتا ہے؟ ہاں......... وہ زرینہ کے گھر ضرور پہنچے گا اور اُسے خوب پریشان کرے گا۔ وہ اُس سے پوچھے گا کہ میں اُسے کیا لکھنا چاہتا تھا۔ اس سے میرے کیسے تعلقات تھے۔ اور جب دفتر والوں کی زبانی اور خود زرینہ کی زبانی میرے عشق کی داستان

اُچھلے گی تو اختر بیگ کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ سوچے گا کہ زرینہ وہ ہے جو عاشق سے عشق کرتی تھی۔
خوب........ان کاغذوں کا یہاں پڑا رہنا ہی درست ہے۔ ممکن ہے، پولیس زرینہ کو بھی اس سازش میں شریک سمجھے اور اس سے پوچھے کہ میں کہاں ہوں۔
واہ........لطف آ جائے گا۔ کاغذ کے یہ ٹکڑے تو بڑے کام کی چیز ثابت ہوں گے۔ چنانچہ میں اطمینان سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسی وقت گھنٹے نے گیارہ بجائے اور ٹھک ٹھک کی آواز سے نو کے ہندسے پر اٹکی ہوئی چھوٹی سُوئی سات پر کھسک آئی۔ بڑی سُوئی اطمینان سے وہیں تھی۔ گویا اب ساڑھے سات بجے تھے۔ میں نے کلاک کی شرارت کو پسند کیا۔ اور بوڑھی مکڑی کو پہلو بدلتے ہوئے دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

دوسرے دن ساڑھے دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ آج دفتر کی چھٹی ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے میرے پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں نے اطمینان سے منہ ہاتھ دھویا، لباس تبدیل کیا اور ناشتہ کرنے کے لئے نیچے اُتر گیا۔ اللہ رکھا ریسٹورنٹ سے میرا حساب چلتا تھا۔ چنانچہ ریسٹورنٹ کی بینچ پر بیٹھ کر میں نے ناشتہ کیا اور پھر شیو بنوانے چلا گیا۔ ہفتوں کی شیو تھی، بے ترتیب داڑھی کی شکل میں۔ نائی نے کئی بار منہ بنایا تھا۔ لیکن بہرحال، میں پرانا گاہک تھا۔ اُس نے ناراضگی کا اظہار نہ کیا اور میں بل ادا کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے میں نے ہلکا سا کھانا کھایا اور پھر دفتر چل پڑا۔ میں آدھے دن کی ڈیوٹی جوائن کرنا چاہتا تھا۔ سب لوگ لنچ پر تھے۔ سب سے پہلے میری ملاقات جوزف سے ہوئی اور اُس پُرخلوص عیسائی نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا۔
"کہاں رہ گئے تھے، عارف بابو؟" اُس نے کہا۔
"بس، ایسے ہی، مسٹر جوزف! رات کو طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"
"اوہ۔ انجیلا بھی پریشان تھی۔ تم کبھی چھٹی جو نہیں کرتے۔" اس نے کہا اور میں خوامخواہ ہنس دیا۔
جوزف کے بعد دوسرے لوگ بھی آ گئے اور مجھے اپنی سیٹ پر کام کرتا دیکھ کر اور میرے بدلے ہوئے حلیے کو دیکھ کر مسکرائے اور آپس میں اشارے کرنے لگے۔ میں سب کچھ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجھے ان باتوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ میں تو وہ کچھ کرنے والا تھا، جو اُن میں سے ایک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمت ہی نہیں پڑ سکتی تھی، سالوں کی۔ بزدل کہیں کے! میں حقارت سے مسکرا دیا۔
اُس دن شام کو زرینہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ زرینہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ لیکن میں اُس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اور پھر ایک بس میں بیٹھ کر چل پڑا۔ مجھے زرینہ کی آنکھوں کی حیرت پر لطف آ رہا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں اُس سے کیسا دلچسپ انتقام لینے والا ہوں۔
ایک ایک گھڑی گن گن کر بالآخر تین تاریخ آ گئی۔ یہ وہ دن تھا، جب میں اپنا کام انجام دینے والا تھا۔ اس دن میں علی الصبح اُٹھ گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر اپنا سوٹ پہنا اور پھر وہ عینک لگائی، جس سے میری شخصیت بدل جاتی تھی۔ آج میں نے اللہ رکھا ریسٹورنٹ میں ناشتہ کرنے کی بجائے اسٹیشن کے قریب ایک خوب صورت سے ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ میری جیب میں ایک سو دس روپے تھے، جو میں نے اپنی ایڈوانس تنخواہ میں سے لئے تھے۔ ڈیڑھ سو روپے میں نے دو دن پہلے ہی اختر بیگ سے لے لئے

تھے، جن میں سے چالیس روپے مختلف خریداری میں خرچ ہو گئے تھے اور ایک سو دس روپے بچے تھے۔ دس روپے میں نے ناشتے کا بل ادا کیا۔ اب میں کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھا۔ اور اگر قسمت ساتھ دے گئی تو لکھ پتی بننے والا تھا۔ بہر حال، وقت ہو گیا تھا۔ میں ریلوے بکنگ پر پہنچا اور میں نے اٹھاسی روپے کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ یہ ٹکٹ ایک چھوٹے سے اسٹیشن کا تھا، جہاں سے مجھے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔ ایک ہی ٹرین سے منزل پر پہنچ کر میں پولیس کے لئے منزل کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹکٹ بک کراتے ہوئے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بہر حال، اسٹیشن سے نکلتے ہوئے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اور پھر ایک ٹیکسی روک کر دفتر کی طرف چل پڑا۔

آفس کے انچارج، مسٹر شکیل نے ٹوٹی ہوئی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھا اور میں اُن کے قریب پہنچ گیا۔

''معاف کیجئے گا، جناب! دراصل آج مجھے کچھ ضروری کام کرنے تھے۔ آپ میرے آدھے دن کی چھٹی کاؤنٹ کر لیں۔'' میں نے لجاجت سے کہا اور مسٹر شکیل کی عینک ناک پر آ رہی۔ اس سے قبل میں نے ایسی سعادت مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ چنانچہ اُن کا پیک زدہ منہ پھیل گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ بس، آج تین تاریخ ہے۔ اور آپ کو علم ہے.........''

''آپ فکر نہ کریں، میں کام ختم کر لوں گا۔'' میں نے کہا اور شکیل صاحب نے گردن ہلا دی۔ میں اپنی میز پر پہنچ گیا۔ اور پھر میں نے آج کا کام شروع کر دیا۔ میں نے جان بوجھ کر بہت سے فائل ایک ساتھ کھول لئے اور اُن پر کام کرنے لگا۔ میڈم انجیلا کو میں نے کئی خطوط ٹائپ کرنے کو دیئے۔ چار مرتبہ مسٹر اختر کے پاس گیا، اُنہیں کچھ واؤچر دکھانے تھے۔ لیکن درحقیقت یہ اندازہ کرنا تھا کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اور اختر بیگ کی میز پر نوٹوں کے بڑے بڑے بنڈل دیکھ کر دل کو تسکین دی۔ بہت کم وقت ہے۔ یہ سب نوٹ میرے ہوں گے۔ سب میرے ہوں گے! میں، چور نظروں سے اختر بیگ کو کام کرتے دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک بجنے تک میرا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ سگریٹ پھونکے تھے۔ پھر ایک بج گیا۔ لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر باہر جانے لگے۔ سب ہی نے میری طرف دیکھا لیکن میں سر جھکائے کام میں مصروف تھا۔ میرے سامنے فائل پھیلے ہوئے تھے، جنہیں سمیٹنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میری تو بس ایک دعا تھی۔ وہ یہ کہ اختر بیگ پروگرام کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔

جونہی دفتر کا آخری آدمی باہر نکلا، میں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ اس وقت جس قدر پھرتی کی جاتی، اتنا ہی کام آسان ہو جاتا۔ میں برق کی طرح اختر بیگ کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ کیبن کیا تھا، بس لکڑی کی تین تین فٹ کی چہار دیواری تھی، جس میں دروازے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اُسے پھلانگ کر بھی داخل ہوا جا سکتا تھا۔ لیکن بہر حال، باقاعدگی کی وجہ سے دروازہ بھی موجود تھا۔ میں نے دروازے کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی اور کیبن میں پہنچ گیا۔ دوسرے لمحے میں نے پھرتی سے اختر بیگ کی میز کی عقبی دراز کھولی۔ سیف کی چابی اسی دراز میں ہوتی تھی۔ چابی ایک کونے میں پڑی مل گئی اور میں جھکا جھکا سیف کے قریب پہنچ گیا۔ سیف میں چابی لگائی اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن......... یہ کیا......... چابی تو گھوم ہی نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کم بخت کو کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر کافی قوت صرف کی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ چابی تو یہی تھی، لیکن نہ جانے کیا ہو

گیا تھا۔ میں نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دوبارہ چابی کو گھمانے لگا۔ دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ چابی دوسری طرف گھوم رہی ہے۔ چنانچہ میں نے خود پر لعنت بھیجی اور دوسری طرف چابی گھمانے لگا، جو با آسانی گھوم گئی۔ لیکن اب جو سیف کا ہینڈل پکڑ کر اُسے کھولنے کی کوشش کی تو سیف ہی نہیں کھل رہا تھا۔

لاحول ولا قوۃ۔ کیا مصیبت پیش آ گئی! میں نے تاریک ہوتے ہوئے ذہن پر قابو پایا۔ کشیدہ اعصاب کو درست کیا اور پھر سیف پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ لیکن نتیجہ صفر......! ایک بار پھر میں نے چابی کو دوسری طرف گھمایا تو چابی گھوم گئی۔ اور اب جو میں نے ہینڈل پر زور لگایا تو سیف کھل گیا۔ ''لعنت ہے مجھ پر۔'' ایک بار پھر میں نے اپنی بدحواسی پر لعنت بھیجی۔ سیف تو پہلے ہی کھلا ہوا تھا اور میں نے پہلے کھلے ہوئے سیف پر قوت آزمائی کی تھی۔ پھر اسے بند کر کے اس کے ہینڈل پر زور لگا تا رہا تھا۔ کتنا وقت ضائع ہو گیا تھا، چابی نکالنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ غریب اختر بیگ نے تو مجھے تمام سہولتیں بہم پہنچا دی تھیں۔ وہ تو سیف بھی کھلا چھوڑ گیا تھا تاکہ مجھے سیف کھولنے میں دقت نہ پیش آئے۔

بہرحال...... میں نے سیف کھولا۔ اندر نوٹوں کی گڈیاں چنی ہوئی تھیں۔ میں نے پھرتی سے اختر بیگ کا بریف کیس اُٹھایا، جس میں وہ شام کو تمام نوٹ بھر کر بینک میں جمع کرانے جاتا تھا۔ اور پھر میرے ہاتھ برق رفتاری سے سیف کی گڈیاں نکال کر بریف کیس میں جمانے لگے۔ میری نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ کہیں چوکیدار مراد بخش لمبی لمبی ڈکاریں لیتا ہوا اندر نہ داخل ہو جائے۔ میں نے سیف کی آخری گڈی بریف کیس میں رکھی۔ اُسے بند کیا اور پھر پھرتی سے کیبن کی دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے دوسری سمت کی آہٹ لی۔ کوئی چاپ نہیں تھی۔ تمام لوگ لنچ میں مصروف تھے۔ میں دروازے سے نکل آیا۔ اس بڑے ہال کا ایک دروازہ مین گیٹ کی طرف جاتا تھا، جہاں سے عمارت میں داخلے کا عام راستہ تھا۔ بائیں ہاتھ ایک پتلی سی گلی تھی، جو عمارت کے عقبی حصے میں جاتی تھی۔ عقبی حصے میں جوتے بنانے کا کارخانہ تھا، جس میں کام کرنے والوں کے لئے حشمت سیٹھ نے عقب میں ایک دروازہ کھلوا دیا تھا۔ اور اس وقت میرے یہاں سے باہر جانے کے لئے یہ عقبی دروازہ ہی مناسب تھا۔ چنانچہ میں تیزی سے گلی پار کر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے میں زنجیر لگی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاط سے اُسے کھولا اور باہر نکل گیا۔ اب میں عمارت کی عقبی گلی میں تھا۔ اس گلی کے دونوں راستے چوڑی سڑکوں کی طرف جاتے تھے۔ ایک راستہ وہ تھا، جو عمارت کے سامنے سے گزرتا تھا۔ دوسرا راستہ ایک اور سڑک پر نکلتا تھا۔ میرے لئے یہ دوسرا راستہ موزوں تھا۔ چنانچہ میں تیز تیز قدموں سے گلی پار کرنے لگا۔

اب میری دلی آرزو تھی کہ مجھے فوراً ٹیکسی مل جائے۔ اندازاً ڈیڑھ بج گیا ہو گیا۔ دو بج کر بارہ منٹ پر وہ ٹرین جاتی تھی، جس سے میں نے ٹکٹ بک کرایا تھا۔ مجھے کہیں اور نہیں جانا تھا، بلکہ یہاں سے سیدھا اسٹیشن جانا تھا لیکن کم از کم دو ٹیکسیاں بدل کر۔ چنانچہ میں سڑک پر نکل آیا اور میری نگاہیں دور دور تک ٹیکسی تلاش کرنے لگیں۔ خوش قسمتی تھی کہ ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ لیکن ڈرائیور صاحب پان کے شوقین تھے، اس لئے وہ پان والے کی دُکان کے سامنے ٹیکسی روک کر اُتر گئے۔ میں ضرورت مند تھا، اس لئے دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اُنہوں نے شہزادی والا پان کھایا اور پھر نخوت سے میری طرف دیکھا۔

''کدھر جانا ہے؟''

''پیلس سینما۔'' میں نے کہا۔

''اَم اُدر نئیں جائیں گا۔'' وہ ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور میں کسی فقیر کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے لپکا۔

''بڑا ضروری کام ہے، خان صاحب! میٹر سے ایک روپیہ زیادہ لے لینا۔''

''او، صاب! تم لوگ بہت پریشان کرتا ہے۔'' وہ نیم راضی ہو گئے اور میں اُن کی رضا پا کر جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی نے مجھے پیلس سینما چھوڑ دیا اور میں ڈرائیور صاحب کو بل ادا کر کے (معہ ایک زائد روپے کے) تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ جب ٹیکسی دور نکل گئی تو میں رکا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور کسی ایسے آدمی کو نہ پا کر، جس نے مجھے ٹیکسی سے اُترتے دیکھا ہو، ایک دوسری ٹیکسی کو اشارہ کیا جو ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ ڈرائیور بہت شریف تھا، فوراً آ گیا اور میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

''اسٹیشن......!'' میں نے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ پیلس سینما سے اسٹیشن کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ٹیکسی چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی اور میں نیچے اُتر گیا۔ میں نے اُس شریف ڈرائیور کو بھی ایک روپیہ زیادہ دیا اور بریف کیس لئے ہوئے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر لگی ہوئی گھڑی میں، میں نے وقت دیکھا، دو بجے تھے۔ گویا ابھی ٹرین کی روانگی میں بارہ منٹ تھے۔ میں نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ بارہ منٹ بہت طویل محسوس ہو رہے تھے۔ ویسے اس دوران مجھے کھلے عام نہیں رہنا چاہئے۔ ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ کے جاننے والے ٹکرا جاتے ہیں۔ چنانچہ میں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں، میں نے ایک اخبار خرید لیا پڑھنے کے لئے نہیں، صرف چہرہ ڈھکنے کے لئے۔ اور پھر میں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ ریف کیس میں نے کمر کے پیچھے رکھ لیا تھا اور اخبار کھول کر چہرے کے سامنے کر لیا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن اگر میں خود کو نہ سنبھال سکا تو ہمیشہ کے لئے ڈوب جاؤں گا۔ اس احساس کے تحت میں نے خود کو سنبھالا۔ لیکن اس وقت میں اپنے جسم کی لرزش پر قابو نہ پا سکا جب میں نے ایک پولیس آفیسر کو چند آدمیوں کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا یہ پولیس آفیسر مجھے بتلے شاہی دور کا جلاّ دیا فرشتۂ موت معلوم ہوا جو میری رُوح قبض کرنے آیا تھا۔ اخبار میرے ہاتھوں میں لرزنے لگا اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''ابھی نکل کر کہاں جائے گا، سالا۔ چاروں طرف پولیس لگی ہوئی ہے۔'' افسر کی بھاری آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''اپن تو مر گئیلا، داروغہ جی! اگر وہ نہ پکڑا گیا تو اپن تو کھود کسی کر لینگا۔'' ایک منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آپ فکر نہ کریں، سیٹھ صاحب! پولیس مستعد ہے۔''

پولیس مستعد ہے......! میرے ذہن میں چھناکے ہونے لگے۔ میں اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ اخبار چہرے سے ہٹا کر اُنہیں دیکھ سکوں۔ دل تھا کہ سینے کا

پنجرہ توڑ کر باہر نکل جانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ کیا کروں اب۔ کیا کروں۔ کیا بیگ چھوڑ کر بھاگ نکلوں؟ یا پھر پولیس افسر کے پیروں پر گر پڑوں کہ ایک بار غلطی ہو گئی۔ اب ایسا نہ ہو گا۔ اور یہ سب کچھ اسی مردود اختر بیگ اور زرینہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ کاش، میں انجیلا سے ہی عشق جاری رکھتا۔ میرے خیالات لرزاں تھے کہ ذہن کے کسی گوشے میں ایک خیال اُبھرا۔ اتنی جلدی پولیس کا یہاں پہنچ جانا ممکن نہیں ہے۔ اور پھر وہ منمناتی ہوئی آواز بھی حشمت سیٹھ کی نہیں تھی۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں خوامخواہ خوف زدہ ہو رہا ہوں۔ اگر میری خوف زدگی کو پولیس نے نوٹ کر لیا تو میں اُس کی نظروں میں مشکوک ہو جاؤں گا۔ اس طرح میں خود اپنی موت کو آواز دے رہا تھا۔

ایک بار پھر میں نے زبردست کوشش کر کے خود کو سنبھالا۔ اپنے جسم کی لرزش پر قابو پایا۔ اسی وقت سیٹیوں کا زبردست شور سنائی دیا اور پولیس افسر چونک پڑا۔

''آیئے، دیکھیں۔'' اُس نے جلدی سے کہا اور وہ سب تقریباً دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں نے خدا کی اس بروقت مدد پر اس کا شکر ادا کیا اور خود بھی بریف کیس اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ پلیٹ فارم کی گھڑی میں اب دو بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ ٹرین بھی پلیٹ فارم پر لگ گئی تھی۔ اس وقت میرے لئے عافیت کی جگہ ٹرین کا کمپارٹمنٹ تھا۔ میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران میں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے میں پولیس والوں کی بھاگ دوڑ دیکھی تھی۔ اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کی ایک سیٹ پر بیٹھ کر میں نے اس ذلیل دل پر قابو پانے کی کوشش کی، جو اپنی تمام دھڑکنیں آج ہی پوری کر لینا چاہتا تھا۔ مجھے احساس نہ تھا کہ میں اس قدر بزدل ہوں۔ یا پھر ممکن ہے کہ پہلا جرم کرنے کے بعد ہر انسان کی ایسی ہی حالت ہوتی ہو۔ ورنہ پولیس کا کام مشکل ہو جائے۔ شکر تھا کہ اس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ لیکن میری یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ ایک موٹے، بھدے سے صاحب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے ایک ایک کر کے تین چار بچوں کو اوپر چڑھایا۔ اس کے بعد عورتوں کی باری آئی۔ چشمہ لگائے، شال اوڑھے ایک بڑی بی اندر داخل ہوئیں۔ پھر ایک درمیانی عمر کی عورت، اور پھر دو تین خوب صورت اور نوجوان لڑکیاں، ان کے چہروں سے شرارت ٹپک رہی تھی، اور پھر وہی موٹے صاحب۔ اندر داخل ہو کر ان سب نے باری باری مجھے گھورا، جیسے کسی عجوبے کو دیکھ رہے ہوں۔ اور پھر موٹے صاحب نے نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر سامنے کی سیٹیں سنبھال لیں۔ قلیوں نے اُن کا مختصر سامان اندر پہنچا دیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر جب مجھے گاڑی کھسکنے کا احساس ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ دل اس طرح صاف نکل آنے کی خوشی بھی برداشت نہ کر پا رہا تھا۔ اور میرا پورا جسم بے جان ہو گیا تھا۔

ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ اور میں اسی طرح خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ میرے ذہن میں بے شمار خیالات آ رہے تھے۔ میں کسی طرح اس نامراد دل پر قابو پانے میں کوشاں تھا کہ میرے کانوں میں چشمے والی بڑی بی کی آواز گونجی۔

''تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے، بیٹے؟'' شاید مجھے ہی مخاطب کیا گیا تھا۔ میں اس تخاطب پر

چونک پڑا۔لیکن میں نے آنکھیں نہیں کھولیں اور بڑی بی میرے جواب کا انتظار کرتی رہیں۔ پھر کسی سے بولیں۔

''افضل میاں! دیکھو تو اس بے چارے کو۔ مجھے تو بیمار معلوم ہوتا ہے۔''

''اونہہ، ہوگا خالہ! آپ تو خوانخواہ ہر ایک سے ہمدردی جتانے بیٹھ جاتی ہیں۔'' یہ موٹے صاحب کی آواز تھی۔

'اُلّو کا پٹھا........!' میں نے دل ہی دل میں کہا۔لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ بہرحال ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میرے خیالات بٹ گئے تھے۔

''بھئی، انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے، راشدہ! تم دیکھو، بیٹی!''

''جی امی!'' ایک نوجوان لڑکی نے کہا اور میرا دل اُچھل پڑا۔ ایک نوجوان لڑکی مجھے دیکھنے آ رہی تھی۔ کیسے دیکھے گی؟........ میں سوچ رہا تھا۔ بہرحال، میں نے اپنی حالت بہتر ہوتی محسوس کی۔ خیالات بٹ گئے تھے۔لڑکی میرے پاس پہنچ گئی اور میں نے آنکھیں بند کیے کیے فیصلہ کر لیا کہ ان سے کیا گفتگو کروں گا۔تب لڑکی کی آواز میرے کانوں کے قریب گونجی۔

''کیا آپ سو رہے ہیں، جناب؟''

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات تھے۔ میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔''پانی........اگر ایک گلاس پانی پلا دیں تو........!''

''ابھی........ایک منٹ!'' لڑکی نے جلدی سے کہا اور پھر اُس نے پلاسٹک کے جدید ساخت کے ایک تھرماس سے پانی گلاس میں اُنڈیلا اور لے کر میرے پاس آ گئی۔ میں درحقیقت پانی کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ یہ چند لمحات ایسے گزرے کہ بس ....میں خود بھی خود کو برسوں کا مریض سمجھنے لگا تھا۔ میں نے پانی پیا اور جان میں جان آئی۔ گاڑی کی تیز رفتار مجھے سکون بخش رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

لڑکی گلاس لے کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ سب ہی میری طرف متوجہ تھی۔ بڑی بی کی آواز پھر اُبھری۔''کیا تم بیمار ہو، بیٹے؟''

''جی!'' میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔''میں دل کا مریض ہوں۔ٹرین میں بیٹھتے وقت طبیعت ٹھیک تھی، لیکن پھر حالت بگڑنے لگی۔اب ٹھیک ہوں۔'' میں نے پروگرام کے تحت کہا۔تاکہ یہ لوگ میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

''آہ........اس مرض نے نوجوانوں کو بھی نہیں بخشا ہے۔ میں بھی دل کی مریضہ ہوں، بیٹے!''

''یہ مرض تو ہے ہی نوجوانوں کا، امی!'' ایک لڑکی نے آہستہ سے کہا اور بڑی بی اُسے گھورنے لگیں۔ درمیانی عمر کی عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ البتہ اُس سانڈ نما انسان یا انسان نما سانڈ کا چہرہ سپاٹ رہا، جیسے وہ بہرہ ہو۔

''کس کا علاج کر رہے ہو، بیٹے؟'' بڑی بی نے پھر مجھ سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے کہا

''اے ہے........علاج کرو، بیٹے! ابھی جوان ہو۔ اللہ شفا دے۔ ابھی سے جوانی کو روگ لگ

جائے گا۔"

"جوانی خود ایک روگ ہے۔" اُسی لڑکی نے پھر کہا اور میں نے چونک کر اُس بذلہ سنج لڑکی کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"تُو اپنی کترنی بند نہیں رکھے گی؟" بڑی بی اُس پر اُلٹ پڑیں۔ دوسری لڑکیاں رُخ پھیر کر مسکرا رہی تھیں۔ اُس لڑکی نے جلدی سے ایک کتاب اُٹھا کر آنکھوں کے سامنے کر لی۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ویسے میں سوائے اس موٹے کے، اس پورے خاندان کا شکر گزار تھا جس نے میرا ذہن بانٹ دیا تھا اور وہ خوف جو میرے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہا تھا، وقتی طور پر دُور ہو گیا تھا۔

"تم خیال نہ کرنا، بیٹے! ان کم بختوں کی زبان بے قابو ہے۔ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔ وقت دیکھتی ہیں نہ موقع۔" بڑی بی نے کہا۔ پھر بولیں۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"راشد۔" میں نے شرارتاً اور مصلحتاً کہا۔ شرارتاً اس لئے کہ ان میں سے ایک کا نام راشدہ تھا۔ اور مصلحتاً اس لئے کہ اپنا نام بتانا درست نہیں تھا۔

"اوہو......... میری ایک بچی کا نام بھی راشدہ ہے۔ کہاں جا رہے ہو، راشد میاں؟"

اور میں نے ایک دور دراز اسٹیشن کا نام لے دیا۔

"وہاں تمہارے عزیز ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں تنہا ہوں۔ ایک کاروباری سلسلے میں جا رہا ہوں۔"

"ماں باپ، بیوی بچے کوئی نہیں ہے؟" بڑی بی حد سے زیادہ باتونی معلوم ہوتی تھیں۔

"جی کوئی نہیں ہے۔"

"چچ، ہائے ہائے۔ کاروبار کرتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اللہ تندرستی دے۔ ہم لوگ رسول پور رہتے ہیں۔ یہ میری بڑی بیٹی ہے۔ یہیں رہتی ہے۔ اور یہ اس کے بچے ہیں۔" بڑی بی نے چھوٹے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میری تینوں چھوٹی لڑکیاں ہیں اور یہ میرا دیور۔" انہوں نے موٹے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا کاروبار بھی یہیں ہے۔ مگر ہم رسول پور رہتے ہیں۔ میں اپنے دیور کے ساتھ اپنی لڑکی کو لینے آئی تھی۔ یہ تینوں پہلے سے اُس کے ہاں تھیں۔" بڑی بی نے مجھے بھی اپنی ہم عمر عورت سمجھ لیا تھا۔ اس لئے وہ مکمل تعارف کراتی رہیں۔ اپنے داماد کے کاروبار کے بارے میں بتایا، خاندان کے افراد گنائے۔ دیور کے نکھٹے پن کی داستانیں سنائیں۔ اور تینوں لڑکیاں میری حالت دیکھ دیکھ کر ہنستی رہیں۔ خود میں بھی بوکھلا گیا تھا۔ اب میں ان بڑی بی کو اُن کی باتوں کے جواب میں کون سی داستان سناتا؟ یوں بھی اُن کی بکواس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن بڑی بی تھیں کہ اپنے پورے خاندان کا شجرہ، ان لوگوں کی عادتوں اور گھریلو قصوں کی پوری داستان مجھے سنا دینا چاہتی تھیں۔

بہر حال، ایک فائدہ مجھے ضرور ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اب میرا ذہن پورے طور سے بٹ گیا تھا اور میری وحشت ختم ہو گئی تھی۔ اس خاندان کے ساتھ میں خود کو بھی کوئی خاندانی آدمی سمجھنے لگا تھا۔ بڑی بی سادہ دل اور نیک خاتون تھیں۔ اُن کے ساتھ بہترین وقت کٹ رہا تھا۔ اور پھر درمیان میں لڑکیاں بھی کوئی

شرارت کر بیٹھتی تھیں، جس پر بڑی بی جھلا جاتیں۔
پانچ بجے چائے پی گئی جس میں، میں شریک تھا۔ اور رات کے کھانے پر بھی بڑی بی نے مجھے زبردستی شریک کیا۔ پھر شاید اُن کی زبان تھک گئی۔ انہوں نے ہولڈال کھلوا کر ایک کمبل نکال کر مجھے دیا اور اس بات کی تلقین بھی کی کہ سردیوں میں سفر کرتے ہوئے کوئی گرم چیز ضرور رکھا کروں۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ خیال رکھوں گا۔
اس دوران سب لوگ اپنے طور پر بڑی بی کی اور میری گفتگو سے محظوظ ہوتے رہے تھے، سوائے موٹے بھائی کے۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھے اُٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیں۔ لڑکیاں اُنہیں بھی چھیڑتی رہیں۔
ساڑھے دس بجے بڑی بی نے آنکھیں بند کر لیں اور خراٹے لینے لگیں۔ اُن کا اسٹیشن بارہ بجے آنا تھا۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند رکھنا چاہتی تھیں۔ جب بڑی بی کے خراٹے عروج پر پہنچ گئے تو اُس شریر لڑکی نے جس کا نام نفیس تھا، مجھ سے کہا۔
"کہئے راشد صاحب! آپ کے دماغ کے تمام پُرزے اپنی جگہ درست ہیں؟"
"جی......" میں چونک کر بولا۔ "میں نہیں سمجھ سکا۔"
"ماشاء اللہ، ہماری امی دماغ کھانے کی بڑی شوقین ہیں۔ لیکن آپ بھی خوب ہیں۔ امی کو احساس ہی نہ ہوا کہ آپ اُن کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔"
"ان خاتون کا خلوص تمام تکالیف پر بھاری ہے۔ اور پھر میں نے تو ایسی باتیں کبھی نہیں سنیں۔ کیونکہ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔"
"مجھے دُکھ ہے۔ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اُس نے بے تکلفی سے کہا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بچا کھچا جو کچھ ہے، وہ تم چاٹ لو۔" درمیانی عمر کی عورت نے جوان کی بڑی بہن تھی، کہا۔ اور تینوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔
"جاگتے رہنا بھی ضروری ہے، باجی! اسٹیشن آنے والا ہے۔" نفیس نے کہا۔
"تو اس بے چارے کو کیوں جگا رہی ہو؟"
"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی، باجی! اور اب تو آپ لوگ رخصت ہو جائیں گی۔ چنانچہ مجھے اس تھوڑی دیر کی گفتگو سے محروم نہ رکھیں۔" میں نے کہا۔
"کبھی فرصت ملے تو ہمارے ہاں آؤ، راشد میاں! تعلقات ایسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارا پتہ لکھ لو۔" درمیانی عمر کی عورت نے کہا اور ایک لڑکی جلدی سے ڈائری نکال کر پتہ لکھنے لگی۔ پھر کاغذ کا پُرزہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔ اس دوران موٹے بھائی بھی لڑھک گئے تھے اور اُن کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں، جیسے منہ میں مرچیں لگ گئی ہوں۔
بارہ بجے تک یہ دلچسپ خاندان میرے ساتھ رہا اور پھر ٹرین رُک جانے پر وہ سب ہڑبڑا کر اُٹھ گئے۔ بڑی بی، موٹے صاحب کو سامان سنبھال کر اُتارنے کی ہدایت کر رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں بھی دیتی جا رہی تھیں۔ پھر تینوں لڑکیوں نے مجھے سلام کیا اور نیچے اُتر گئیں۔ نہ جانے کیوں، مجھے اُن کے بچھڑ جانے کا افسوس ہوا۔ لڑکیوں نے پلٹ کر کئی بار میری طرف

دیکھا تھا۔

اور ٹرین پھر چل پڑی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اب میں اپنے کمپارٹمنٹ میں تنہا تھا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اب بھی میرے پاس موجود تھا بڑی بی نے تو مجھے کمبل رکھ لینے کی پیشکش کی تھی" لیکن میں نے اسے گوارہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اب ہلکی سی سردی بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ گو، ٹرین کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ کمپارٹمنٹ کو گرم رکھنے کی کوشش بھی کی گئی تھی جو نا کافی تھی۔ اور سردی مختلف راستوں سے کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ رہی تھی۔

بہر حال، اب تک کا وقت تو افراتفری میں گزرا تھا۔ میں ایک مرحلے سے نکل گیا تھا، لیکن اب مجھے دوسرے معاملات پر سوچنا تھا۔ نیند کسے آتی؟ نیا نیا دولت مند بنا تھا، بلکہ ابھی بنا بھی نہ تھا۔ ابھی تو اس دولت کو ہضم کرنے کا مسئلہ تھا، جو نہایت ہوشیاری سے حل کرنا تھا۔ ظاہر ہے، پولیس پورے ملک میں مجھے تلاش کرے گی۔ میرے پاس ایک پروگرام تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی چھوٹے سے قصبے یا دیہات میں چلا جاؤں اور تقریباً ایک سال خاموشی سے گزار دوں۔ اس ایک سال تک اپنی دولت صرف ضرورتاً استعمال کروں اور کسی پر ظاہر نہ کروں کہ میں کوئی صاحب حیثیت انسان ہوں۔ اس کے بعد جب میرے حلیے میں تبدیلی آ جائے تو پھر شہر آؤں اور کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کر دوں۔ نام تو میں نے بدل ہی لیا تھا۔ اس کے بعد عملی زندگی شروع کروں۔ میرا خیال ہے، انسان کے پاس دولت ہونا ہی کافی ہے۔ خواہ اسے خرچ نہ کیا جائے۔ دل کو بڑا سکون رہتا ہے۔ میں اس پروگرام پر نظر ثانی کرنے لگا۔

اب تک میری جو حالت رہی تھی، وہ تسلی بخش نہیں تھی۔ اس طرح اگر بزدلی کا مظاہرہ کرتا رہا تو کسی دن پولیس کے ہاتھ لگ جاؤں گا۔ اور سب پروگرام دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ چنانچہ سکون اور بہادری سے کام لینا تھا۔

لیکن یہ رقم ہے کتنی؟ ذرا اندازہ تو کروں؟ میں نے سوچا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ دروازے، کھڑکیاں پہلے ہی مضبوطی سے بند تھے۔ ایک بار پھر انہیں چیک کیا اور پھر اپنی سیٹ پر آ گیا۔ بریف کیس کھول کر گھٹنوں پر رکھ لیا اور اس میں رکھی ہوئی گڈیوں کو نکالنے لگا۔ سو سو کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں تھیں جن پر قلم سے دس دس ہزار لکھا ہوا تھا۔ پچاس کے نوٹوں کی چار گڈیاں تھیں، جن پر پانچ پانچ ہزار لکھا ہوا تھا۔ دس دس کے نوٹوں کی دس گڈیاں تھیں جو ہزار ہزار کی تھیں۔ گویا ہوئے اسّی ہزار۔ باقی گڈیاں پانچ کے نوٹوں اور ایک روپے کے نوٹوں کی تھیں۔ یہ بھی مجموعی طور پر تقریباً چھ ہزار تھے۔ گویا کل چھیاسی ہزار روپے تھے۔ چھیاسی ہزار...... ایک لاکھ سے تھوڑے سے کم...... بہت تھے۔ میں نے اتنی دولت کا تصور زندگی بھر نہیں کیا تھا۔ لیکن بہر حال، اب یہ میری تھی بشرطیکہ میں اپنے پروگرام پر کامیابی سے عمل کر سکا۔

اور میرے دل میں خوشی کی بے پناہ لہر اُٹھی۔ اب درجنوں زرینائیں میری جیب میں ہوں گی۔ ایک ایک گڈی سے میں ایک ایک زرینہ خرید سکتا ہوں۔ کیوں نہ عملی زندگی میں آ کر میں اس خاندان سے رابطہ قائم کروں، جو مجھے ٹرین میں ملا تھا۔ ان لوگوں کو میں نے اپنے بارے میں غلط سلط بتایا تھا اور انہوں نے یقین کر لیا تھا۔ وہ مجھے کوئی با حیثیت آدمی سمجھ رہے تھے۔ لیکن میں واقعی با حیثیت بن کر اُن کے سامنے جاؤں گا۔ اور ان میں سے کسی ایک لڑکی سے...... مگر کس سے......؟ میرا ذہن اُن لڑکیوں

کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک بہت شوخ تھی۔ خوب صورت تھی، لیکن حد سے زیادہ شریر۔ دوسری، وہ کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ تیسری وہ تھی جو مجھے کمبل اوڑھانے آئی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا........ ہاں، راشدہ........ راشدہ ہی تھا اُس کا نام۔ 'راشدہ' میں نے دل ہی دل میں دوہرایا۔ یہ لڑکی مجھے پسند تھی۔ زرینہ کی صورت پر لعنت۔ وہی ٹھیک تھی۔ لیکن........ اور میں خود ہی اپنی حماقت پر ہنس پڑا۔ ابھی تو دِلی دور ہے۔ ابھی تو میں خود غیر یقینی حالات سے گزر رہا ہوں۔ زندگی بچانا اور دولت ہضم کرنا ہی مشکل ہے۔ ابھی سے مستقبل کے پروگرام ترتیب دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

عارف صاحب! ہوش کے ناخن لو۔ جس خطرے سے تم دوچار ہو، وہ معمولی نہیں ہے۔ تمہاری ذرا سی لغزش تمہاری موت بن سکتی ہے۔ پولیس ملک کے چپے چپے میں تلاش کرے گی۔ چھیاسی ہزار کی رقم ہے اور وہ بھی حشمت جیسے کنجوس انسان کی۔ آسانی سے ہضم نہیں ہو گی۔ لیکن ٹھہرو........ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور پریشانی تو صلاحیتوں کی قاتل ہوتی ہے۔ ہوش و حواس قائم رکھو۔ ذہانت سے کام لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لوگ پوری پوری سلطنتیں ہضم کر جاتے ہیں۔ چھیاسی ہزار کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن حواس قائم رکھو۔ تم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ جدید ماحول سے واقف ہو۔ خود پر کنٹرول کرو۔ ابھی سے کسی دوسری زرینہ کی تلاش مت کرو۔ ایک زرینہ نے تمہیں ڈاکو بنا دیا ہے، دوسری تمہیں پولیس کے حوالے کر دے گی۔ اس دولت کو ہضم کر جاؤ۔ درجنوں زرینائیں تمہارے اردگرد چکر لگائیں گی۔

میرے ضمیر نے اندر سے نصیحت کی اور اس کا ایک ایک لفظ مجھے حقیقی معلوم ہوا۔ اس وقت ذہن کو رومان کی وادیوں میں دھکیلنے کی بجائے اپنے بچاؤ کی کوشش میں صرف کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں سنبھل گیا۔ میں نے اپنے پروگرام پر نظرِ ثانی کی اور مطمئن ہو گیا۔ ٹھیک ہے........ یہی مناسب ہے۔ ایک سال پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ بس، ذرا سی ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔ اور اس کے بعد!........ میرے دل میں پُرمسرت کی لہریں جاگ اُٹھیں۔ میں نے نرم گدے دار سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور مستقبل کے حسین خواب بند آنکھوں میں رینگ آئے۔

ایک خوب صورت سا مکان........ جس کے دروازے پر سفید رنگ کی لمبی کار کھڑی تھی۔ سفید وردی میں ملبوس ڈرائیور کار سے ٹیک لگائے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا........ اور پھر ایک نفیس تراش کے سوٹ میں ملبوس، سنہری فریم کی عینک لگائے میں باہر نکلا اور ڈرائیور اٹینشن ہو گیا۔ اسی وقت ایک سرخ رنگ کی کار میرے برابر آ کر رکی اور اس سے ایک خوب صورت لڑکی پرس ہلاتی نیچے اُتری۔

"ہیلو، عارف!"

"ہیلو........!" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"کہیں جا رہے ہو، ڈارلنگ؟" اُس نے میری سرد مہری کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کہاں؟" اُس نے ادائے محبوبانہ سے پوچھا۔ لیکن میں اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر کار میں بیٹھ گیا اور میرے اشارے پر ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور سرخ کار سے اُترنے والی لڑکی منہ دیکھتی رہ گئی۔ لیکن مجھے اُس کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ میری کار حسین سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ اور ایک

خوب صورت عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر رُک گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور میں نیچے اُتر کر ایک خوب صورت گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

ایک بڑے سے ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب کھڑے ہو گئے۔ اُن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ لیکن میں کسی کی طرف توجہ دیئے بغیر اندر پہنچ گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ دفتر کی لمبی میز کے پیچھے ریوالونگ کرسی پر بیٹھ کر میں نے گھنٹی بجائی اور میرا اردلی اندر آ گیا۔

''مس زرینہ کو بھیج دو۔'' میں نے کہا اور چند منٹ کے بعد سہمی سہمی زرینہ اندر آ گئی۔ میں نے نفرت وحقارت سے بھرپور نگاہ اُس پر ڈالی۔ اُسے بیٹھنے تک کے لئے نہ کہا۔

''آپ نے وہ کاغذات ٹائپ کر لئے، مس زرینہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! چند کاغذات رہ گئے ہیں۔''

''مس زرینہ! اگر آپ نے حواس درست نہ کئے تو مجھے مجبوراً آپ کو ڈس مس کرنا پڑے گا۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا اور زرینہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اُس کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

''عارف! کیا تم مجھے کبھی معاف نہ کرو گے؟''

ایک لمحے کے لئے میرا دل پسیجا لیکن دوسرے لمحے میں غصہ سے کھول اُٹھا۔

''تمہیں اس بے تکلفی سے بولنے کی اجازت کس نے دی، مس زرینہ؟ نکل جاؤ میرے آفس سے۔ گیٹ آؤٹ۔'' میں حلق پھاڑ کر دہاڑا۔

''میں نہیں جاؤں گی، عارف! آج تمہیں مجھے معاف کرنا ہو گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' اُس نے لپک کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور میں حقارت سے مسکرانے لگا۔

''تُو میرے دل سے اُتر چکی ہے، لالچی لڑکی! میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ شدید نفرت۔'' میں نے کہا اور زرینہ میرے پاؤں پکڑے روتی رہی۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور اچانک کچھ پولیس والے میرے آفس میں گھس آئے۔ آگے ایک افسر تھا اور اُس کے پیچھے چند کانسٹیبل۔ میں انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ پولیس افسر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس پر میری تصویر لگی صاف نظر آ رہی تھی۔

''مسٹر عارف! براہِ کرم خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ مسٹر حشمت کی رپورٹ پر آپ کو حراست میں لیا جاتا ہے۔''

''کیا بکواس ہے؟......... کون حشمت؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

''یہ تو آپ کو پولیس اسٹیشن چل کر ہی معلوم ہو گا۔'' پولیس افسر نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی اور پھر چند کانسٹیبلوں نے مجھے میز کے پیچھے سے گھسیٹ لیا۔ زرینہ میرے پاؤں چھوڑ کر ہٹ گئی اور اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''چپ ہو جاؤ......... خاموش ہو جاؤ، سوّر کی بچی!'' میں غصے سے دہاڑا اور خود کو پولیس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور اسی کوشش میں میری آنکھ کھل گئی۔ ریل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ ہل رہا تھا۔ لیکن......... پولیس والوں کی گرفت میرے بازوؤں پر سخت تھی۔ میرا دل لرز

اٹھا۔ یہ کیا تھا؟ خواب یا حقیقت؟........ بہت سے لوگ میرے سامنے کھڑے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں پھیلی روشنی میں اُن کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔

وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ میں گرفتار کر لیا گیا تھا!........ میری گھگھی بندھ گئی۔ وہ سب عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ لیکن چند ساعت کے بعد مجھے احساس ہوا، اُن کے جسموں پر پولیس کی وردی تو نہیں ہے۔ پولیس والے ایسے لمبے لمبے چغے تو نہیں پہنے ہوتے۔ اُن کی ایسی داڑھیاں تو نہیں ہوتیں۔ یہ لوگ دراز قامت اور چہروں سے کافی خطرناک معلوم ہوتے تھے۔

'ڈاکو........!'

میرے ذہن نے نعرہ لگایا۔ اگر وہ ڈاکو تھے اور چلتی ٹرین میں گھس آئے تھے، تب بھی میں برباد ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں میں تاریکی چھا گئی اور میں نے اُن کی گرفت میں خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"ہم مجبور ہیں، شہزادہ عبران!........ عالم پناہ کا یہی حکم ہے کہ تم جہاں بھی ہو، جس حال میں ہو، تمہیں گرفتار کر کے لایا جائے۔ ہم اس گستاخی کے لئے معافی کے طلب گار ہیں۔ لیکن آپ ہماری مجبوریاں سمجھتے ہیں۔" ایک بھاری آواز سنائی دی، جس کے الفاظ میں نے صاف سنے۔ اور میری کھوپڑی پر چپتیں سی پڑتی محسوس ہوئیں۔

"کیا مطلب........؟" میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"میں تمہارا اتالیق بھی ہوں، شہزادے! مجھے اتنا حق دو کہ میں تمہیں کچھ نصیحتیں کروں۔ جوانی منہ زور گھوڑے کی طرح ہوتی ہے، جو ناہموار راستوں پر بھی سرپٹ دوڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ بالآخر ٹھوکر کھا کر لہولہان ہو جاتا ہے۔ جوانی میں شیطان زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ اسے سینے سے لگا لے یا اس کے چنگل سے نکل کر نیکیوں کی راہ چل پڑے۔ اور جوانی کی نیکیاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ آپ نے جس دنیا کو دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے، وہاں رنگین آنچل، رنگین جسم ضرور لہراتے ہیں، لیکن ان آنچلوں کے نیچے، ان حسین جسموں کے اندر حشرات الارض چھپے ہوتے ہیں جن کا زہر انسانیت کا کوڑھ بن جاتا ہے۔ خود آپ کے پاس کیا نہیں ہے۔ آپ کے ایک اشارے پر سینکڑوں پری زادیاں اپنی زندگی نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ آپ اشارہ کر دیں، آپ کا محل، حسیناؤں سے بھر دیا جائے گا۔ پھر یہ ضد کیوں؟ والدین کا دل دُکھانا گناہِ عظیم ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ عالم پناہ آپ کے غم سے نڈھال ہیں۔ والدین بچھڑ کر دوبارہ نہیں ملتے۔ ان کی دعائیں زندگی بھر ساتھ دیتی ہیں۔ ہم، آپ کو واپس لے جانے آئے ہیں۔"

میں نے اُس بوڑھے اتالیق کو دیکھا۔ کیا یہ لوگ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں؟ اگر یہ ڈاکو تھے تو مسخرے معلوم ہوتے تھے۔ اور پولیس والوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

"سنو!" میں نے اُن میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ بڑے ادب سے میرے سامنے جھک گیا۔

"آدھے آدھے کر لو!" میں نے بجھے دل سے کہا اور وہ میری بات نہ سمجھ کر کھوپڑی ہلانے لگا۔ پھر اُس نے احمقانہ انداز میں دوسروں کی طرف دیکھا۔ اور بوڑھا اتالیق میرے قریب جھک آیا۔

"کیا فرما رہے ہیں، شہزادۂ عالم؟"

"مذاق مت اُڑاؤ یار! کام کی بات کرو۔ میں خوشی سے آدھے دینے کو تیار ہوں۔ مان جاؤ،

دوست! اب کچھ خوشیاں نصیب ہونے والی تھیں۔ لیکن قسمت ہی کھوٹی ہے۔ بہرحال، تینتالیس ہزار بھی کم نہیں ہوتے۔ کیا میرا بیگ تمہارے قبضے میں ہے؟'' میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور بوڑھا پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگا، پھر ہنس پڑا۔

''شہزادۂ عالم کی شرارتیں تو مشہور ہیں، لیکن یہ بوڑھا اتالیق بھی ان کا شکار بنے گا، سوچا بھی نہ تھا۔''

''بس کرو، بڑے میاں! کیا نوٹ گن لئے ہیں؟'' میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''نوٹ؟'' بوڑھے نے پھر حیرت سے کہا اور اب مجھے غصہ آنے لگا۔ میں ہونٹ بھینچے اُنہیں گھورتا رہا، پھر عاجزی سے بولا۔

''سیدھی طرح بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''

''شہزادۂ عالم کو واپس لانا چاہتے ہیں۔''

''کہاں........ اس موٹے حشمت کے پاس؟'' میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

''کون حشمت؟'' اس بار بوڑھے نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی! پھر تم کون ہو؟''

''شہزادۂ عالم ہمیں نہیں پہچانتے؟''

''کیا تمہارا تعلق میری سسرال سے ہے؟'' میں نے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور ان میں سے کچھ مسکرانے لگے۔ لیکن بوڑھے کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ پھر اُس نے افسردگی سے کہا۔

''میں، غلام ہوں، آقا!........ حضور چاہیں تو گالیاں بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو ہر حال میں واپس لے آؤں۔ لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر ناراض ہونے کی بجائے واپس چلیں۔''

''کہاں چلوں؟'' میں نے پوچھا۔

''محل........!'' اُس نے جواب دیا۔ تب میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میں چونک کر اُن لوگوں کی شکلیں دیکھنے لگا۔ اُن کے لباس عجیب تھے۔ کم از کم میں نے اس دور میں ایسے لباس نہیں دیکھے تھے۔ کیا درحقیقت ان کا تعلق کسی ریاست سے ہے؟ اور یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کی بناء پر تو نہیں ہو رہا ہے؟........ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔ یہ غلط لوگ نہ ہوں۔

''سنو!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''تم کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہو؟''

''کیسی غلط فہمی، شہزادۂ عالم؟''

''میرا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف عبران۔''

''خوب۔ اچھا دوستو! اگر تم مذاق کر رہے ہو تو براہِ کرم اسے ختم کر دو۔ اور اگر کسی غلط فہمی کے شکار ہو تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا نام یوسف عبران نہیں، بلکہ عارف ہے۔ عارف۔''

''ہم خادم ہیں۔ اس لئے اس مذاق سے محظوظ بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ چلنے کے لئے تیار ہو جائیے۔''

''بخدا، میں مذاق نہیں کر رہا۔ موٹے حشمت کی امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم حشمت برادرز میں کام کرتا تھا۔ اب وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔ تم اگر واقعی مذاق نہیں کر رہے ہو تو اُسے تلاش کرو، جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ مجھے لے جا کر تمہیں شرمندگی ہی ہوگی۔''

''بہت وقت ضائع ہو چکا ہے، رحمت! زنجیر کھینچو۔'' بوڑھے نے اس بار قدرے درشت لہجے میں کہا اور ان میں سے ایک نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دی۔

''ارے، ارے...... کیا کر رہے ہو؟...... سنو تو...... سنو تو...... یہاں، اس ویرانے میں ٹرین کیوں رُکوالی......؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔ لیکن ان میں سے کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ٹرین کے پہیوں سے بریکوں کی زبردست رگڑ کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ٹرین کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ مضبوطی سے مجھے پکڑے ہوئے دروازے پر آ گئے۔

''ارے بدبختو! میرا بیگ تو لے لو...... اس میں...... اس میں میری زندگی چھپی ہے۔'' میں نے روہانسے لہجے میں کہا اور اُن میں سے ایک نے میرا بریف کیس اُٹھا لیا۔ اور جونہی ٹرین رُکی، وہ مجھے لے کر نیچے کود پڑے۔ اُنہوں نے میرا پورا وزن سنبھال رکھا تھا، اس لئے میرے پیروں کو تکلیف نہ ہوئی۔ وہ مجھے لٹکائے ہوئے تاریک جنگل کی طرف لے جا رہے تھے اور میرے پیچھے ٹرین کے عملے کے لوگ لالٹین لئے ہوئے گاڑی کے اُس ڈبے کی طرف بڑھ رہے تھے، جس کی زنجیر کھینچی گئی تھی۔ لیکن مجھے اغواء کرنے والے بہت تیز چل رہے تھے اس لئے آن کی آن میں وہ جنگلوں کے سلسلے کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس طرح میں، ٹرین والوں کی نگاہ سے روپوش ہو گیا۔

درختوں کے درمیان وہ رکے۔ اور پھر بوڑھے اتالیق نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ ''رحمان کو آواز دو۔'' اور اُس کے ساتھی نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ درختوں کے سلسلے میں داخل ہو گیا اور وہ لوگ وہیں کھڑے انتظار کرنے لگے۔ میرا ذہن انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کیا چاہتے ہیں۔ اگر ڈاکو ہیں تو انہیں مال سے غرض ہونی چاہئے۔ میرا کیا کریں گے۔ مجھے درختوں میں لے جا کر قتل کرنے سے بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی دولت واپس لینے کی کون سی جدوجہد کی تھی؟ اور پھر اگر ڈاکو نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟...... کیا جو کچھ بکواس کر رہے ہیں، وہی ہیں؟ اُن کا کوئی شہزادہ بھاگ گیا ہے؟ لیکن اس سے میرا کیا تعلق؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دیکھوں تو، تقدیر میرے لئے کیا راستہ متعین کرتی ہے۔ یوں بھی میں تو ایک مجرم تھا۔ مجھے پناہ کی ضرورت تھی۔ کچھ روز ان کے ساتھ ہی سہی!

میں نے اب ہر قسم کی جدوجہد ترک کر دی اور خاموشی سے کھڑا رہا۔ چند منٹ کے بعد مجھے عجیب سی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی اور بوڑھے اتالیق نے آہستہ سے کہا۔

''رحمان آ گیا...... آؤ!''

اور میرے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ، میرے بازو پکڑ کر آگے بڑھ گئے۔ اب میں شرافت سے اُن کے ساتھ چل رہا تھا۔ درختوں کے سلسلے سے نکلتے ہی مجھے روشنیاں نظر آئیں۔ یہ رنگین روشنیاں کسی گھوڑا گاڑی میں نصب تھیں۔ روشنیوں کے سائے میں مجھے سفید رنگ کے گھوڑے نظر آ رہے تھے۔ قریب پہنچنے پر میرا خیال درست ثابت ہوا۔ وہ ایک خوب صورت گاڑی تھی، جس میں چار گھوڑے جتے ہوئے تھے

جن پر بہترین ساز سجا ہوا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھولا گیا اور ایک سنہری چوکی نکال کر نیچے رکھ دی گئی۔

"تشریف لے چلیں، شہزادۂ عالم!"

"بہت بہتر۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور چوکی پر چڑھ کر گاڑی میں داخل ہو گیا۔ گاڑی کی سیٹ پر بیٹھتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے پروں کے ڈھیر میں دھنس گیا ہوں۔ نہایت ملائم اور آرام دہ سیٹیں تھیں۔ میرے سامنے کی سیٹ پر بوڑھا اتالیق بیٹھ گیا اور اُس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ گویا اب باہر کا منظر نہیں نظر آ سکتا تھا۔ یوں بھی اس تاریکی میں درختوں کے ہیولوں کے علاوہ اور کیا نظر آتا۔ دوسرے سب لوگ باہر ہی رہ گئے تھے۔ گاڑی کو جنبش ہوئی اور گھوڑوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی مترنم آواز گونجنے لگی۔

میں خاموشی سے اتالیق کو گھور رہا تھا۔ پھر میں نے چونک کر کہا۔

"میرا بریف کیس کہاں ہے؟"

"محفوظ ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"بتا دو، بڑے میاں! کیا پھڈا ہے؟ میں بہت پریشان ہوں۔" کچھ دیر کے بعد میں نے خاموشی سے اُکتا کر کہا۔ اور بوڑھا چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"مجھ بوڑھے کا دل نہ دُکھائیں، شہزادۂ عالم! کیا میں نے زندگی میں ایسی ہی غلطیاں کی ہیں کہ آپ، مجھ سے اس قدر متنفر ہو جائیں؟ لِلّٰہ، میرے القاب تو برقرار رہنے دیں۔ مجھے اس سے سکون ملتا ہے۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اس عمر میں یہ اداکاری قیامت ہے۔ تمہیں تو کسی فلم کمپنی میں ہونا چاہئے تھا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کچھ نہ بولوں گا اور خاموشی سے ان لوگوں کی حرکتیں دیکھتا رہوں گا، جو مجھے پاگل بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔

گاڑی دوڑتی رہی۔ مجھے حیرت تھی، نہ جانے وہ کیسے راستے پر سفر کر رہی تھی کہ اس کو ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ ہمارے سفر کی ابتداء گھنے جنگلات اور کچے راستے سے ہوئی تھی۔ لیکن اب میں اس منحوس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور نہ جانے کب میری آنکھیں غنودہ ہو گئیں اور اس شدید ذہنی انتشار کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

پھر جب ہاتھوں کو میں نے اپنے جسم پر محسوس کیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ گاڑی رُک گئی تھی۔

"اُتریئے، شہزادۂ عالم!........" مجھے بوڑھے کی مکروہ آواز سنائی دی اور میں نے کھا جانے والی نگاہوں سے اُسے دیکھا، پھر نیچے اُتر آیا۔ اس چوکی پر پاؤں رکھ کر میں نے زمین پر قدم رکھا۔ سبز گھاس تھی۔ رات کا وقت تھا، لیکن یہاں رنگین روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ روشنیاں بجلی کی نہ تھیں بلکہ رنگین مشعلیں روشن تھیں۔ اور میں نے اس سے قبل رنگین مشعلیں نہیں دیکھی تھیں۔ مشعلوں سے اُٹھتے ہوئے رنگین شعلے بڑا خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔

پھر میری نگاہیں اُس عظیم الشان عمارت کی طرف اُٹھ گئیں، جو پرانے طرز کی تھی۔ اس میں بے شمار گنبد تھے جو چمک رہے تھے۔ شاید ان میں ریڈیم شامل تھا کیونکہ ہلکی سبز روشنی ہو رہی تھی۔ بوڑھے

اتالیق نے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور میں حیرت سے منہ پھاڑے اندر چل پڑا۔
میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سچ مچ کسی محل میں پہنچ جاؤں گا۔ ویسے محلوں کی میں نے کہانیاں تو سنی تھیں، اُن کی کوئی حقیقت ہوگی، میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔ لیکن اس وقت میں عالمِ ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔
میں سنگِ مرمر سے بنے ہوئے دروازے کی ابتدائی سیڑھیاں طے کرنے لگا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا اتالیق میرے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک لمبی راہداری تھی، جس میں موٹا قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں میں بڑے بڑے روشن پتھر نصب تھے، جن سے راہداری جگمگا رہی تھی۔ میں مرعوب ہو چکا تھا۔ اور اب میں بوڑھے اتالیق سے بھی کوئی اُلٹی سیدھی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ ابھی تو وہ غلط فہمی کا شکار ہے، لیکن جب اُسے حقیقت پتہ چل جائے گی تو وہ میری کھال بھی کھنچوا دے گا۔
راہداری کا اختتام ایک دروازے پر ہوا۔ ہم اس دروازے سے بھی گزر گئے۔ دروازے کے دوسری طرف ایک عظیم الشان ہال تھا، جس میں بے شمار ستون لگے ہوئے تھے اور یہ ستون بھی مختلف رنگوں میں روشن تھے۔ ہال کے چاروں طرف دروازے بنے ہوئے تھے۔ اتالیق ایک اور دروازے سے اندر داخل ہو کر ایک خوب صورت کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی چھت میں ایک فانوس لٹک رہا تھا، جس میں نیلے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے اور ہر شیشے میں شمع روشن تھی۔
نیلی روشنی نے ماحول کو خواب ناک بنا دیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اتالیق رُک گیا۔
''گو، عالم پناہ، آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ لیکن میری مجال نہیں کہ اُنہیں خواب سے بیدار کروں۔ اس لئے آپ صبح تک یہاں آرام فرمائیے، شہزادۂ عالم! صبح میں آپ کی واپسی کی اطلاع عالم پناہ اور ملکہ عالیہ کو دوں گا۔''
''دیکھو بھائی! میری کوئی خطا نہیں ہے۔'' میں نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''میں، وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھ رہے ہو۔''
''میرے شریر شہزادے! براہِ کرم، آرام کرو۔ سب کچھ صبح کو دیکھا جائے گا۔'' اتالیق نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر دروازے کے قریب رُک کر بولا۔ ''میری درخواست ہے کہ رات کو باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ میں پوری رات دروازے پر پہرہ دوں گا۔ خدا حافظ!''
وہ باہر نکل گیا۔ اور میں سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ہی رنگین آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں نے آئینے کے قریب جا کر اپنی شکل دیکھی، منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے، لباس گرد سے اٹا ہوا تھا۔ 'اے شہزادۂ عالم!' مجھے ہنسی آ گئی۔ 'بوڑھے کی شامت آئی ہے۔ نہ جانے کس کے دھوکے میں پکڑ لایا ہے۔ اب جب صبح کو حقیقت پتہ چلے گی تو پھر لطف آئے گا۔'
فرش پر بیٹھ کر میں نے جوتے اُتارے۔ لیکن ابھی فیتے بھی نہ کھولنے پایا تھا کہ کمرے میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک چوڑے شیشے نے اپنی جگہ چھوڑ دی، اور اس کے پیچھے سے دو قتالائیں نکل آئیں۔ کافی خوب صورت تھیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔
میں منہ پھاڑے اُنہیں گھورنے لگا۔ وہ آگے بڑھیں اور پھر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ اُن کے بیٹھنے کا انداز بھی ہیجان خیز تھا

پھر اُن میں سے ایک نے میرے جوتوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور میں اُچھل پڑا۔
''ارے، ارے........ کیوں شرمندہ کر رہی ہیں؟ میں خود کھول لوں گا۔'' میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''شہزادے حضور! براہِ کرم۔'' اُن میں سے ایک نے التجا کی اور مجھے اُس کے ہونٹ سکوڑنے کا انداز بہت پسند آیا۔ دوسری نے میرے جوتے کے فیتے کھولنا شروع کر دیئے۔
''سنو! اگر تم شہزادہ سمجھ کر میرا کام کر رہی ہو تو بعد میں تمہیں مایوسی ہوگی۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہاں، اگر میری ذاتی حیثیت تمہیں پسند آئے تو میں حاضر ہوں۔''
وہ دونوں مسکرانے لگیں۔ پھر اُنہوں نے میرے جوتے اُتار دیئے اور اُن میں سے ایک اُٹھ کر چلی گئی۔ دوسری میرے بال سنوارنے لگی تھی اور اُس کی نرم اُنگلیوں کا لمس مجھے بے حد خوشگوار معلوم ہوا۔
میں نہ جانے کن بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی بے خود تھی۔ ہم دونوں اس وقت چونکے جب دوسری لڑکی واپس آ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک خوب صورت ٹرے تھی، جس میں ایک رنگین لباس رکھا ہوا تھا۔
''لباس تبدیل کر لیں، شہزادۂ عالم!'' اُس نے کہا۔
''میرا نام عارف ہے۔ کیا تم مجھے میرے نام سے پکار سکتی ہو؟'' میں نے کہا۔ اور دوسری لڑکی پھیکے انداز میں مسکرا دی۔
''اگر شہزادے کی یہ خواہش ہے تو جو حکم۔ لباس تبدیل کر لیں۔'' وہ میرے قریب پہنچ کر میرے کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ میں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن جب اُس نے میری پتلون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں اُچھل پڑا۔
''تت........ تم لوگ ذرا باہر چلی جاؤ تو میں لباس بدل لوں۔''
''لونڈی کو اتنا حق بھی نہ دیں گے، شہزادۂ عالم؟'' اُس نے اسی افسردگی سے کہا۔
ارے، تت........ تو کیا........ پپ........ پتلون بھی تم ہی اُتارو گی؟'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔
''جو حکم۔'' وہ بولی اور مڑ کر چل دی۔ لیکن دوسری وہیں کھڑی رہی۔
''تم بھی جاؤ۔ میں، لباس تبدیل کر لوں تو واپس آ جانا۔'' میں نے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

میں نے جلدی سے کپڑے اُتار کر دوسرا لباس پہن لیا۔ رات کے سونے کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا، لیکن بے حد قیمتی کپڑے کا۔ لباس پہن کر عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ اور پھر میری توجہ ان دونوں لڑکیوں کی طرف ہو گئی۔ وہ غالباً اس شہزادے کی خادمائیں ہوں گی۔ ممکن ہے، میری صورت شہزادے سے ملتی ہو۔ کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ سب دھوکا کیسے کھاتے؟
اور اسی وقت ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ کیوں نہ میں اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھاؤں۔ جہنم میں گئے چھیاسی ہزار روپے۔ یہاں جو عیش و عشرت ملے گی، چھیاسی ہزار میں اس کا حصول مشکل تھا۔ اور پھر پولیس کا خطرہ الگ۔ لیکن اگر شہزادہ واپس آ گیا تو؟........ اس ریاست میں نہ جانے دھوکہ

اس کی کیا سزا ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نہیں، یہ غلط ہے۔ حقیقت میں رہو۔ اس کے بعد بھی یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہوگا؟

''خادمہ کو اندر آنے کی اجازت ہے؟'' اُسی خادمہ کی شیریں آواز سنائی دی، جس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔

''آؤ۔'' میں نے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹ خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی اور میرے سامنے جھک کر بولی۔

''خادمہ کے لئے اور کیا حکم ہے؟''

''کیا تم مجھ سے کچھ دیر گفتگو کر سکتی ہو؟''

''پوری رات، شہزادۂ عالم!'' اُس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بستر پر لے چلی۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ہونٹ خشک ہو گئے۔ زرینہ اور انجیلا کا طویل ساتھ رہا تھا لیکن بات صرف باتوں اور آنکھوں تک ہی رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس حسین لڑکی کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے اور میں بھی زاہد نہ تھا۔ لیکن اس کا انجام........!

اور پھر انجام کا تصور ذہن سے جھٹک کر میں بستر پر پہنچ گیا۔ وہ میری مسہری کے نیچے فرش پر بیٹھنے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اوپر بیٹھنے کے لئے کہا۔

''کنیز کو بہت عزت بخش دی ہے آپ نے، شہزادۂ عالم!........ نارمہ جل گئی ہے۔ آپ نے اُس کے چہرے کو دیکھا ہوگا۔''

اور پھر اُس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لٹا دیا۔

''نارمہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی، جو لباس لائی تھی۔ لیکن شہزادے حضور! آپ ہم سے اجنبیت کا اظہار کیوں کر رہے ہیں؟''

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں شہزادہ نہیں ہوں۔ تم مانو نہ مانو۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

''کیا باہر کی دُنیا اتنی حسین ہے کہ آپ، ہم سب کو چھوڑ کر چل دیئے؟''

''اجی لعنت بھیجو اس دنیا پر........ اگر مجھے یہاں رہنے کی اجازت مل جائے تو اور کچھ نہیں چاہئے۔'' میں نے جواب دیا۔

✿

اور وہ رات، میری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ اس رات نے زرینہ کی بے وفائی کے تمام گھاؤ بھر دیئے۔ اس رات میں، انجیلا کے ساتھ ضائع ہونے والے لمحات پر مسکرا دیا۔ میری تقدیر میں تو شہنا تھی۔ سنگِ مرمر سے بنی ہوئی شہنا، جس نے تمام لطافتیں مجھ پر نچھاور کر دی تھیں۔

اور وہ رخصت ہو گئی۔ میں اُس کی خوشبو فضاؤں میں سونگھتا رہا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا تھا۔ اپنی نادانی پر ہنسی آ رہی تھی کہ میں نے پہلی لڑکی کو ہی کس خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ حالانکہ مشرق و مغرب اُس کی نگاہوں میں ایک تھے۔ اور پھر زرینہ......... کاش! زرینہ، شہنا کو دیکھ سکتی۔ جل کر کباب ہو جاتی۔ اور اختر بیگ کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔

اختر بیگ کے تصور کے ساتھ حشمت سیٹھ کا خیال آیا۔ حشمت سیٹھ کے تصور کے ساتھ نوٹوں کا بیگ یاد آیا اور نوٹوں کے بیگ کے ساتھ ہتھکڑیوں کا جوڑا نگاہوں میں گھومنے لگا اور اس دلکش تصور میں یہ بدنما خیالات سخت ناگوار گزرے۔ لیکن حقیقت کون جھٹلا سکتا ہے۔ مجھے اپنی اصلیت یاد آ گئی۔ یہ لوگ کسی یوسف عبران کے دھوکے میں پکڑ لائے ہیں، اور جب اُنہیں اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گا تو مجھے اس جنت سے نکال دیا جائے گا اور یہاں سے جانے کے تصور سے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ شہنا بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ یہ یوسف عبران کون گدھا ہے، جو اس جنت کو چھوڑ بھاگا ہے؟......... کوئی بھی ہو، خدا کرے کبھی واپس نہ آئے۔ اور پھر کیوں نہ میں خود کو یوسف عبران تسلیم کر لوں۔ اس طرح یہ جنت ہاتھ سے نہ جائے گی۔ لیکن پھر عقل نے ٹہوکا دیا۔ نہ جانے یہ لوگ کون ہیں۔ خاصے پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔ اگر حقیقت کھل گئی تو بوٹیوں کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ اس خیال سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ حقیقت سے منہ نہ موڑوں گا اور اگر اس کے باوجود وہ میری بات تسلیم نہیں کریں گے تو چپ سادھ لوں گا۔ جب تک بھی چل جائے۔

انہی خیالات میں صبح ہو گئی۔ سورج کی چند کرنوں نے کمرے میں داخل ہو کر صبح کی خبر سنائی اور اسی وقت دروازہ کھول کر چند پری زادیاں اندر داخل ہو گئیں۔ میں اچھل پڑا۔ شہنا کے جانے کے بعد میں نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ میں نے جلدی سے ریشمی رضائی جسم پر لے لی اور منہ پھاڑے اُنہیں دیکھنے لگا۔ لڑکیاں مسکراتی ہوئی میری مسہری کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔

''ہم سے اتنا پردہ کیوں حضور؟ شہنا کی خمار آلود آنکھوں نے رات کی کہانی سنا دی ہے۔ آیئے، حمام تیار ہے۔ غسل فرما لیں۔'' ایک دلربا نے کہا۔

''ارے، مم........مگر........'' میں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔
''ہم شہنا کی طرح خوش نصیب تو نہیں ہیں، لیکن دل والے ضرور ہیں۔ ہمیں اس خدمت سے محروم نہ رکھیں۔'' ایک شوخ سی لڑکی نے، جس کے گال کشمیر کی وادیوں کی یاد دلاتے تھے، مسکراتے ہوئے کہا اور اچانک میرے جسم سے رضائی کھینچ لی۔
''ارے، ارے........ یہ کیا وحشت ہے؟'' میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں مسہری سے چھلانگ اگا دی۔ لیکن شریر لڑکیوں نے مجھے چاروں طرف سے گرفت میں لے لیا۔ مجھے اتنی لڑکیوں کے درمیان سخت شرم آ رہی تھی۔ لیکن میں اُن سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتا تھا۔ وہ سب مجھے لٹکائے ہوئے حمام میں داخل ہو گئیں۔ سنگِ مرمر کے ٹائل جڑے ہوئے حمام میں۔
نیم گرم خوشگوار پانی سے انہوں نے میرے بدن کو نرم اسفنج سے رگڑ رگڑ کر دھویا۔ اس دوران بھی وہ طرح طرح کی شرارتیں کرتی رہیں۔ میں نے مجبوراً خود کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔
غسل کے بعد انہوں نے مجھے ایک خوب صورت لباس پہنایا، میرے بالوں کو خشک کیا، اور پھر ان میں مانگ نکالی۔ میں خاموشی سے اپنی درگت بنتے دیکھتا رہا۔ بنا سنوار کر وہ مجھے حمام سے نکال لائیں۔ اور پھر ایک معمر خاتون میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر میرے قریب موجود تمام لڑکیاں مؤدب ہو گئیں۔
''شہزادہ عبران!'' معمر خاتون نے پُر جلال آواز میں کہا۔ ''شاہ محترم نے حکم دیا ہے کہ آپ ناشتہ اُن کے ساتھ ہی کریں گے۔ چنانچہ اب سے کچھ دیر کے بعد آپ ناشتے کے کمرے میں پہنچ جائیں۔''
معمر خاتون نے یہ الفاظ کہے اور واپس مڑ کر دروازے سے نکل گئیں۔
''سنو!'' میں نے ایک لڑکی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون تھیں؟''
''ارے، آپ انہیں بھول گئے؟ یہ آپ کی دایہ ہیں۔ انہوں نے تو بچپن سے آپ کو پالا ہے۔''
''اوہ........!'' میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا ہماری امی حضور زندہ نہیں ہیں؟''
''توبہ، توبہ........ کیا ہو گیا ہے، آپ کو شہزادے حضور؟'' وہ دونوں گال پیٹ کر بولی اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''گویا امی حضور بھی موجود ہیں۔ خیر!'' میں نے گردن ہلائی۔
''آخر آپ اس قدر اجنبیت کا اظہار کیوں کر رہے ہیں، شہزادہ عبران؟ بتائیے تو سہی، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''
''مجھے........'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے حشمت برادرز ہو گیا ہے۔ چھیاسی ہزار ہو گیا ہے۔'' میں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے ناشتے کی میز پر ابا حضور اور امی حضور کے روبرو پیش ہونا پڑے گا۔ میں اُن سے کیا گفتگو کروں گا؟ کیا کہوں گا، اپنے بارے میں؟ دوسروں کو شدید غلط فہمی ہوئی تھی، لیکن والدین اولاد میں کوئی فرق ضرور محسوس کر لیں گے۔ اور اس کے بعد........! میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شہنا کی محبت میرے دل میں در آئی تھی۔ اگر مجھے یہاں سے نکال دیا گیا؟........ بہرحال، جو قسمت میں لکھا ہو گا، پورا ہو گا۔ میں نے دل ہی دل میں پچاس موٹی موٹی گالیاں بک کر اُنہیں سو سے ضرب دیا اور ان کا ثواب زرینہ کو بخش دیا۔ اُسی کم بخت کی وجہ سے مجھے یہ

خواری نصیب ہوئی تھی۔ ورنہ ساڑھے تین سو مجھے ملتے تھے اور دو سو روپے ماہوار اُسے۔ ساڑھے پانچ سو میں زندگی کی گاڑی خوب چل سکتی تھی۔ مگر وہ اختر بیگ کی تنخواہ پر مرمٹی۔ سونے کے زیورات پر مرمٹی اور مجھے برباد کر دیا۔

میں زرینہ کو کوس رہا تھا اور شوخ حسینائیں مجھ سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھی۔ یہ سب مجھ سے محبت کر سکتی تھیں۔ لیکن مجھے اپنی حقیقت معلوم تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر شہنا کو بھی میری حقیقت کا علم ہو جائے تو وہ بھی مجھے گھاس نہ ڈالے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اسی وقت ایک خادمہ کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

''شاہ محترم اور ملکہ عالیہ، ناشتے کے کمرے میں شہزادہ حضور کے منتظر ہیں۔''

''چلو!'' میں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ہونٹ خشک تھے، آنکھوں کے سامنے گنجان دائرے رقص کر رہے تھے۔

بہرحال، میں ناشتے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسے کمرہ کہنا درست نہ ہوگا۔ وہ تو ایک عظیم الشان ہال تھا۔ جس میں کئی انچ موٹا سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک لمبی میز لگی ہوئی تھی، جس پر انواع واقسام کے ظروف سجے ہوئے تھے اور ان کے اندر سے لذیذ کھانوں کی مہک اُٹھ رہی تھی۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ آنے والی، کمرے کے دروازے پر ہی رُک گئی تھی۔ میں میز کے قریب پہنچ گیا۔ ایک طرف با ادب کھڑے ہوئے خادم نے میرے لئے کرسی سرکا دی تھی۔ لیکن ان دونوں کو میں کرسی پر بیٹھنے کے بعد ہی دیکھ سکا، جو میرے عین سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک پُر جلال خاتون اور ایک باریش بزرگ تھے، جو غصیلی نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

''تم اس قدر گستاخ ہو گئے ہو، عبران! ہمیں گمان بھی نہیں تھا۔ تمہاری امی حضور تمہارے سامنے ہیں اور تم نے انہیں سلام بھی نہیں کیا۔ تمہیں معلوم ہے، وہ تمہاری جدائی سے کس قدر ملول ہیں؟'' بزرگ کی رعب دار آواز اُبھری اور میں جلدی سے کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے جھک کر ان دونوں کو سلام کیا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟ صحت بھی کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ کہاں کہاں آوارہ گردی کر آئے؟'' بزرگ نے پھر پوچھا۔

''شاہِ محترم! اجازت ہو تو پہلے ناشتہ کر لوں۔ مجھے یقین ہے کہ تفصیل بتانے کے بعد ناشتہ نہ نصیب ہو سکے گا۔'' میں نے لجاجت سے کہا اور بزرگ کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھر آئے۔ لیکن خاتون تعجب سے بولیں۔

''تمہاری آواز حیرت انگیز طور پر بدل گئی ہے۔''

''ناشتہ کریں، بیگم!'' بزرگ نے کہا اور اُن کے ناشتہ شروع کرنے پر میں نے بھی جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔ نہ جانے کیا حالات ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں آواز کی تبدیلی محسوس کر لی گئی ہے۔ آگے آگے دیکھئے۔ چنانچہ میں اپنا کوٹہ پورا کرنے لگا۔ اور پھر قہوے کی تین پیالیاں پینے کے بعد میں سیر شکم ہو گیا۔ اب میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار تھا۔

وہ دونوں بھی ناشتہ کر چکے تو خادموں نے بچا ہوا سامان اُٹھانا شروع کر دیا۔

"یوسف عبران! میرا حکم ہے کہ اپنے حواس درست کرو۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں بیٹے! جس دنیا کو تم دیکھنا چاہتے ہو، اس کی تفصیل ہم سے سن لو۔ وہ غاصبوں، مکاروں کی دنیا ہے۔ وہاں سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ سب ایک دوسرے کو لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ وہ سب آپس میں دست و گریباں ہیں۔ کسی کو کسی سے ہمدردی نہیں ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہیں، لیکن جانوروں سے بدتر۔ تم اس دنیا کو دیکھ کر کیا کرو گے؟ تمہاری دنیا اس سے زیادہ پُرسکون ہے۔ یہاں محبت کا وجود ہے۔ سب ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، امن و سکون ہے۔ یہ چند دن جو تم نے ان لوگوں کے درمیان گزارے، سچ بتاؤ، کیسے پائے؟" بزرگ نے کہا۔

میری گردن جھکی ہوئی تھی۔ بزرگ نے ایک ایک لفظ درست کہا تھا۔ مجھے اُن سے اتفاق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں تو اسی دنیا کا ایک فرد تھا۔ بہرحال، اب میں جواب دینے کے لئے تیار تھا۔

"محترم بزرگ! میں، آپ کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ بلاشبہ میری دنیا ایسی ہی ہے، جیسی آپ نے بیان فرمائی۔ لیکن میں، آپ سب حضرات کی ایک غلط فہمی دُور کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری آواز کو کیا ہو گیا بیٹے؟" خاتون نے جلدی سے پوچھا۔

"یہی میری اصل آواز ہے، معزز خاتون! میں وہ نہیں ہوں، جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں، یوسف عبران نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے سامنے بدتمیزی کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ میرے غصے کو آواز نہ دو۔ رات کو تمہارے اتالیق نے بھی یہی بتایا تھا کہ تم خود کو عبران نہیں تسلیم کر رہے۔ لیکن مجھے گمان بھی نہ تھا کہ تم اپنے والدین کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کرو گے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے آواز بدل لینے سے تمہاری شکل و صورت بھی بدل جائے گی؟" بزرگ نے کہا۔

"محترم بزرگ! صرف اتنا عرض کروں گا، آپ کی یہ دنیا بے حد دل کش ہے۔ اس پُرخار دنیا میں جانے کی بجائے میں اسی دنیا کے کسی گوشے میں تمام زندگی گزارنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کی کسی غلط فہمی پر میں، سزا کا مستحق نہیں ہوں گا۔ آپ، مجھے یوسف عبران کہیں، یا کچھ اور۔ بس میں یہ عرض کر دوں کہ میں، یوسف عبران نہیں ہوں۔ میرا نام عارف ہے۔ اس کے باوجود آپ مجھے یوسف عبران تسلیم کرنے پر بضد ہیں تو میں اب خاموشی اختیار کر لوں گا۔"

بزرگ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگے۔ معمر خاتون بھی تعجب سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور اب ان دونوں کی آنکھوں میں شکوک نظر آ رہے تھے۔

"تب پھر تم کون ہو؟"

"میرا نام عارف ہے۔ زمانے کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں۔ ایک جرم کر کے فرار ہو رہا تھا کہ راستے میں آپ کے آدمیوں نے پکڑ لیا اور زبردستی مجھے یوسف عبران بنا دیا۔ انہوں نے میرے بیگ پر بھی قبضہ کر لیا جس میں پورے چھیاسی ہزار روپے ہیں۔"

"واللہ! ہمیں یقین نہیں آتا۔ اگر تم یوسف عبران نہیں ہو تو تمہاری اُس سے مشابہت حیرت انگیز ہے۔ لیکن اگر یہ تمہاری شرارت ہے تو تم ہمارے عتاب سے نہ بچ سکو گے۔" معمر بزرگ کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے تالی بجائی اور ایک خادم اندر داخل ہو گیا۔

''سفینہ کو بلاؤ۔'' معمر بزرگ نے کہا اور خادم واپس چلا گیا۔ چند لمحات کے بعد وہی دوسری معمر عورت اندر داخل ہوگئی جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میری دایہ ہے۔

''سفینہ! اسے غور سے دیکھو۔ کیا تم اس میں اور عبران میں کوئی تبدیلی پاتی ہو؟''

معمر بزرگ نے کہا اور بوڑھی عورت مجھے قریب آ کر دیکھنے لگی۔ پھر وہ چونک پڑی۔ وہ بالکل قریب سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پھر اُس نے جلدی سے میرا گریبان کھول دیا اور میرے سینے پر دیکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کے چہرے پر اضطراب تھا۔

معمر خاتون اور بزرگ اُسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

''حضور!........ حضور!'' دایہ بولی۔ ''یہ، یوسف عبران نہیں ہیں۔ یہ شہزادہ حضور نہیں ہیں۔ میں قسم کھاتی ہوں، یہ شہزادہ حضور نہیں ہیں۔''

اور معمر خاتون اور بزرگ چونک پڑے۔ ''تم نے یہ یقین کس طرح کیا دایہ! جبکہ تم نے ان کی آواز بھی نہیں سنی؟'' بزرگ نے اضطراب سے پوچھا۔

''میں نے بچپن سے شہزادہ حضور کو پالا ہے۔ ان کی آنکھوں کی بائیں پتلی میں ایک نیلا تل ہے اور سینے پر ایک سورج کی شکل کا سرخ نشان۔ بلاشبہ، یہ نوجوان ہوبہو شہزادے کا ہم شکل ہے، لیکن شہزادہ نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے پاس موجود نہیں ہیں۔'' دایہ نے کہا اور معمر خاتون نے جلدی سے چہرے پر نقاب کھینچ لی۔

معمر بزرگ، خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ لیکن پھر اُن کے خدوخال نرم پڑ گئے اور ان سے اُداسی ٹپکنے لگی۔

''اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اسے مہمان خانے میں پہنچا دو۔'' بزرگ نے کہا۔

''شاہ محترم!'' میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں نے اپنی اصلیت نہیں چھپائی ہے۔ براہِ کرم، مجھے کوئی کونہ عنایت فرما دیا جائے۔ میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''اور........ دانیال کو ہمارے پاس بھیج دو۔'' بزرگ نے میری بات سُنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''اس بے وقوف نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' انہوں نے کہا اور معمر خاتون کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں دایہ اور میں رہ گئے تھے۔

''آؤ!'' دایہ نے خشک لہجے میں کہا۔

''آپ ہی میرے اوپر رحم کھائیں، محترم خاتون! آپ جانتی ہیں، میں بے قصور ہوں۔'' میں نے دایہ سے کہا۔

''خاموش رہو، بے وقوف لڑکے! اگر شاہ کو معلوم ہوگیا کہ تم محل کی کنیزوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہے ہو تو تم ضرور سزا پاؤ گے۔ آؤ، خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی اور چار و ناچار میں بھی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ لیکن اس بار ہمارا رُخ ایک دوسرے راستے پر تھا۔ میری آنکھوں میں پھر تاریکی پھیل رہی تھی۔ یہ حسین ماحول مجھ سے جدا ہو رہا تھا۔ شہنا........ آہ، شہنا بھی مجھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں ڈبڈبائی آنکھوں سے راستہ طے کرتا رہا۔ تب

مجھے ایک اور عمارت کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا، جہاں آسائش کے تمام سامان موجود تھے۔
میں ایک مسہری پر بیٹھ کر اپنے مستقبل پر غور کرنے لگا اور دایہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔
اب کیا ہوگا؟ اب مجھے یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ پھر میں کہاں جاؤں گا؟........کاش، میں یہاں رہ سکتا۔ کاش........! میرے گالوں پر آنسو لڑھک آئے۔
کئی گھنٹے گزر گئے۔ کوئی میرے پاس نہ آیا۔ پھر شاید دوپہر کا وقت ہو گیا۔ میں نے کمرے کے دروازے پر قدموں کی چاپ سنی اور چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن........وہ دو سیاہ فام غلام تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اُٹھائی ہوئی تھی۔ ہر چند کہ کھانے کی اشتہا نہ تھی، لیکن خوان سے اُٹھتی ہوئی خوشبو نے مجھے کھانے پر آمادہ کر لیا۔ دونوں غلام کھانا رکھ کر اسی خاموشی سے واپس چلے گئے اور میں بے دلی سے کھانے کی میز پر آ گیا۔
بڑا لذیذ کھانا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنے غم پرے سرکا دیئے اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ لذیذ کھانے سے پوری طرح انصاف کر کے فارغ ہوا تھا کہ وہی ملازم قہوے کے برتن لئے ہوئے آ گئے اور کھانے کے خالی برتن اُٹھا کر لے گئے۔ گرم گرم قہوہ پی کر میں نے گہری گہری سانسیں لیں اور پھر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ دل چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر محل میں گھس جاؤں، شہنا کے پاس پہنچ جاؤں، یا اُسے بلا لوں۔ اس سے کہوں کہ میں اسے چاہتا ہوں۔ وہ شاہ سے مجھے مانگ لے۔ لیکن اب شہنا کا بھی کیا بھروسہ۔ وہ مجھے شہزادہ سمجھ کر مجھ پر اپنا سب کچھ نثار کر چکی تھی، حقیقت معلوم ہونے پر نہ جانے میرے ساتھ کیسا سلوک کرے۔
تھک کر میں مسہری پر آ بیٹھا۔ اور پھر نہ جانے کیوں میرے دماغ میں ہلکا سا چکر آ گیا۔ رات بھر نہ سونے کی وجہ ہو سکتی تھی۔ کیوں نہ تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور ریشمی چادر بدن پر کھینچ لی۔ نہ جانے کیوں مسہری پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ نیند بھی ایسی طویل تھی کہ گھوڑے بیچ کر سویا۔ نہ جانے کتنی دیر تک اس آرام دہ مسہری پر سوتا رہا۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ باہر سے کہیں روشنی کی رمق اندر آ رہی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے ماحول میں کچھ گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ظاہر ہے، اب یہاں میری کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی، ایک بوجھ تھا ان لوگوں پر......زبردستی کا مہمان......پھر میری فکر کیوں کی جاتی......!
میں نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم کے نیچے مسہری نہیں ہے۔ ارے........مسہری کہاں گئی؟ میں نے ٹٹول کر دیکھا اور بری طرح چونک پڑا۔ یہ تو صاف زمین تھی۔ میرے نیچے کچھ نہ تھا۔ تب میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ تو وہ مہمان خانہ نہیں تھا، جہاں میں سویا تھا........!
پھر یہ کون سی جگہ ہے........؟ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے سخت سردی کا احساس ہوا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے سر کے نیچے تکیہ ضرور تھا۔ میں نے اس تکیے کو ٹٹول کر دیکھا اور ایک بار پھر میرا دل دھڑک اٹھا۔ یہ تکیہ نہیں تھا بلکہ وہ بریف کیس تھا، جس میں، حشمت برادرز سے چرائے ہوئے نوٹ تھے۔ میں نے تاریکی میں جلدی سے بریف کیس کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال کر نوٹ ٹٹولنے لگا۔ نوٹ بدستور بھرے ہوئے تھے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے اس دنیا سے نکال دیا گیا ہے۔ یقیناً اب میں وہاں نہیں ہوں۔ لیکن ان شریف لوگوں نے یہی احسان کیا کم کیا ہے کہ میرے نوٹ مجھے واپس کر دیئے۔ میرے دل میں ایک ہوک اُٹھی۔ نوٹ میرے پاس موجود تھے، لیکن شہنا، خادمہ اور دوسری لڑکیاں........ میں چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ سب کچھ ایک خواب نہیں تھا۔ مجھے وہ ماحول پوری طرح یاد تھا، جواب مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ لیکن دولت میرے پاس موجود تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی دنیا میں رکھنا پسند نہیں کیا تھا۔ اونہہ۔ نہ کریں۔ یہ دنیا ہی کیا بری ہے؟ اپنی چیز اپنی ہی ہوتی ہے۔ چھیاسی ہزار ہیں پورے۔ کم نہیں ہوتے۔ ان سے ایک بہترین زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ بس ذرا پولیس سے چھٹکارا مل جائے اور میں کوئی مناسب جگہ پانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ نہ جانے کم بختوں نے مجھے کہاں لا پھینکا ہے۔ بڑے بے اخلاق تھے۔ میں خود تو ان کے ہاں نہیں گیا تھا۔ کچھ دن تو مہمان نوازی کرتے۔ بہر حال، دیکھا جائے گا یہ کون سی جگہ ہے........ میں اُٹھ گیا۔ سرہانے سے بریف کیس اُٹھایا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر قدم رکھ کر میں نے اپنا لباس دیکھا۔ میرا اپنا لباس تھا۔ وہی، جسے پہن کر میں فرار ہوا تھا۔

نہ جانے میری نیند کیسی تھی۔ انہوں نے میرا لباس تبدیل کیا، مجھے یہاں تک لائے اور مجھے پتہ بھی نہ چل سکا۔ ضرور اس قہوے میں کوئی گڑبڑ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ اور پھر میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ یہ تو ریلوے اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دور اسٹیشن ماسٹر کا آفس اور بکنگ آفس نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں چائے کا ایک گندا سا اسٹال کھلا ہوا تھا۔ ایک کیتلی سے پانی کی بھاپ نکل رہی تھی۔ اور بدہیئت ادھیڑ عمر آدمی گردن شانوں میں گھسائے اونگھ رہا تھا۔ ریل کی پٹریاں چمک رہی تھیں اور بہت دور ایک روشنی کے نیچے ''شاہ پور جنکشن'' کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔

''شاہ پور جنکشن........!'' میں نے زیرِ لب کہا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں۔ چند چھوٹے نوٹ جیب میں موجود تھے، جو میں نے بریف کیس سے نکالے تھے۔ میں چائے کے اسٹال کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں ایک گندی سی پیالی میں چائے پی رہا تھا۔

''کیا بجا ہو گا؟'' میں نے چائے والے سے پوچھا۔

''سوا بارہ بجے ہیں، صاحب!''

''اس وقت کون سی ٹرین آئے گی؟''

''میل ٹرین گزرے گی، صاحب! بس وہ آخری ٹرین ہے۔ اس کے بعد صبح نو بجے سے گاڑیاں آنا شروع ہوں گی۔'' چائے والے نے بتایا۔

''میل کہاں جائے گی؟'' میں نے پوچھا اور اس نے شہر کا نام بتایا جسے سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اس ٹرین سے روانہ ہو سکتا تھا۔ میں نے چائے کے پیسے ادا کیے اور پھر بکنگ آفس کی طرف چل پڑا۔ بکنگ کلرک موٹے اوورکوٹ میں لپٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس سردی اور رات میں مجھ جیسے آدمی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت اور پھر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ پھر اُس نے اوورکوٹ سے دوسرا ہاتھ نکالا اور قلم پکڑ لیا۔

میں نے اس سے اپنی مطلوبہ جگہ کا ٹکٹ طلب کیا اور فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کے بارے میں سن کر وہ مؤدب ہو گیا۔ میں نے رقم پوچھی، ادا کی، ٹکٹ لیا اور چل پڑا۔ ایک بار پھر میں چائے والے کے پاس پہنچ گیا۔

''ایک کپ چائے اور دو، دوست!'' میں نے اس سے کہا اور پھر پوچھا۔ ''سگریٹ ہو گی؟''

''سگریٹ تو نہیں ہے صاحب! اگر بیڑی پئیں تو'' اُس نے اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالتے ہوئے کہا اور میں نے شکریہ کے ساتھ ایک بیڑی قبول کر لی۔ بہت عرصہ کے بعد تمباکو نوشی کی تھی۔ اس گھٹیا سی بیڑی نے بھی بہت لطف دیا۔ میں ٹرین کا انتظار کرتا رہا۔ چائے پیتا رہا اور چائے والے سے بیڑی مانگ مانگ کر پیتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹرین آ گئی اور میں اپنا کمپارٹمنٹ تلاش کر کے اس میں داخل ہو گیا۔ کمپارٹمنٹ میں بہت سے لوگ تھے۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھ گیا۔ تقریباً سب ہی سو رہے تھے۔ ٹرین یہاں چند منٹ رکی اور پھر روانہ ہو گئی۔

اسٹیشن چھوڑ دینے کے بعد میں نے گہرے گہرے سانس لئے۔ آپ مجھ جیسے کسی آدمی کے بارے میں غور کر سکتے ہیں کہ میں کیسا وقت گزار رہا تھا۔ چرکے پر چرکے لگ رہے تھے۔ ایک عجیب بے یقینی کی زندگی تھی، لیکن بہرحال یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ اور میں برداشت کر رہا تھا۔ میں نے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا اور دیکھنے لگا کہ ان میں کوئی ایسا آدمی تو نہیں ہے، جو میرے لئے خطرناک ہو۔

مختلف قسم کے لوگ تھے۔ سب کے سب تعلیم یافتہ۔ کچھ خواتین بھی تھیں۔ میرے بائیں سمت سامنے کی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی سو رہی تھی۔ اُس کے برابر ایک موٹی سی بڑی بی اونگھ رہی تھیں۔ میں اس جوان لڑکی کو دیکھنے لگا جو گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔

یہ تمام لڑکیوں کے جسم گلابی کیوں ہوتے ہیں؟ ہر نوجوان لڑکی حسین کیوں ہوتی ہے؟ ان کے خدوخال بعض اوقات اچھے نہیں ہوتے لیکن جسم دیکھ کر خدوخال بھول جانے کو دل چاہتا ہے۔ پھر مجھے شہنا یاد آ گئی اور میرے ہاتھوں کی مٹھیاں کس گئیں۔ میرا دل چاہا کہ یہ نوجوان لڑکی اُٹھے، میرا ہاتھ پکڑے اور ٹرین سے اُتر جائے۔ پھر وہ خود کو میرے سپرد کر دے اور کہے۔ شہزادۂ عالم! میں تو آپ کی کنیز ہوں۔ میرا رواں رواں آپ کا ہے۔ صرف آپ کا۔

میں نے لڑکی کے ہونٹ دیکھے۔ گلابی ہونٹ، جو خشک ہو رہے تھے۔ اور اسی وقت لڑکی کے سرہانے بیٹھے ہوئے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی۔ موٹی خاتون نے میری چوری پکڑ لی تھی، چنانچہ انہوں نے لڑکی کے بدن سے کھسک جانے والی شال اس کے اوپر کھینچ کر چہرے تک ڈھک دی اور مجھے گھورنے لگیں۔ میں جلدی سے سنبھل گیا اور ٹرین کی کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن بڑی بی کی خونخوار نگاہیں اب بھی میری پیشانی میں چبھ رہی تھیں۔

میں دل ہی دل میں ان بڑی بی پر لعنت بھیجتا رہا۔ کیا میں کھائے جا رہا تھا، اُن کی صاحبزادی کو؟ تنگ دل کہیں کی۔ خود جوانی میں عیش کئے ہوں گے، سینکڑوں نگاہوں کا مرکز رہی ہوں گی، بہت سوں کو تڑپایا ہو گا، اور اب....... میں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ اب بھی میری طرف نگراں تھیں۔ میں نے ان سے نگاہیں چار کیں۔ پہلے تو مجھے جھرجھری آ گئی، پھر غصہ۔ اور پھر انتقاماً میں بھی انہیں گھورنے لگا۔ میرے ذہن میں شرارت اُبھر آئی۔ چنانچہ میں نے نگاہوں کا غصہ دور کیا اور میٹھی نظروں سے بڑی بی

کو گھورنے لگا۔ وہ اب بھی مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ لیکن پھر ان کے چہرے کے تاثرات بدلے اور ان میں حیرت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن میں اُنہیں مسلسل گھور رہا تھا۔ نہ صرف انہیں، بلکہ میری نگاہیں ان کے موٹے اور تھلتھلے جسم پر بھی پھسل رہی تھیں۔ اور بڑی بی کے چہرے پر شرم کے تاثرات پھیل گئے۔ انہوں نے جلدی سے لڑکی کے جسم کی شال کھینچ کر اپنے جسم پر ڈال لی اور پھر برابر میں اونگھتے ہوئے بڑے میاں کے جسم کو ٹہوکے دینے لگیں۔

''کیا بات ہے؟........ کیا بات ہے؟'' بڑے میاں نیند سے چونک کر بولے اور اُلوؤں کی طرح آنکھیں پھاڑنے لگے۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن میرے کان انہی کی طرف تھے۔ بڑی بی نے منہ سے کچھ نہ کہا، لیکن میں نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا کہ وہ بڑے میاں کو ٹہوکے دے کر میری طرف اشارے کر رہی تھیں۔ بڑے میاں نے کڑی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بڑی بی کی طرف۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اب بڑی بی کو لڑکی کی بجائے اپنی فکر تھی۔ میں نے پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اور گٹھڑی بن گئی تھی لیکن اُس کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔

کافی دیر تک میں ان لوگوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان بڑے میاں اور بڑی بی کی نیند اُڑ گئی تھی۔ بڑے میاں نے ایک کمبل سے لڑکی کو خوب ڈھک دیا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اب میری توجہ ان لوگوں کی طرف سے ہٹ گئی تھی اور ایک بار پھر شہنا میرے خیالوں میں رینگ آئی۔

'اونہہ........ ایک خواب تھا، ایک فریب تھا۔ مجھے سب کچھ بھول جانا چاہئے۔ میں جو قدم اُٹھا بیٹھا ہوں، اس پر غور کرنا چاہئے۔ دل چاہا، دوسری گاڑی سے واپس اپنے شہر پہنچ جاؤں اور بریف کیس حشمت سیٹھ کے قدموں میں رکھ کر اپنے گناہ کی معافی مانگ لوں۔ یقیناً حشمت سیٹھ اپنی رقم پا کر پھولا نہ سمائے گا۔ ممکن ہے وہ مجھے معاف بھی کر دے۔

لیکن اس خیال پر میں نے خود کو لعنت ملامت کی۔ قسمت نے ایک موقع دیا ہے۔ اسے اس طرح نہیں گنواؤں گا۔ دنیا بہت وسیع ہے۔ کیا وہ ایک انسان کو روپوش نہ رکھ سکے گی؟ آخر مجھے بھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ جس طرح زرینہ کو اختر بیگ سے شادی کرنے کا حق ہے۔ اور ان تمام خیالات سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ میں سونے کی کوشش کروں۔

چنانچہ میں سونے کی کوشش کرنے لگا اور نہ جانے کب میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

اس وقت دن کا نہ جانے کیا بجا تھا، جب میری آنکھ کھل گئی۔ کمپارٹمنٹ کے تمام مسافر جاگ اُٹھے تھے۔ کچھ ناشتہ کر رہے تھے، کچھ اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ ٹرین شاید منزل پر پہنچنے والی تھی۔ بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی، کیونکہ میں نے صرف گزشتہ دن دوپہر کو کھانا کھایا تھا، یا پھر اسٹیشن پر کئی کپ چائے پی تھی۔

میں لاپروائی سے اُٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ بریف کیس کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی جیسے اس میں کوئی خاص چیز نہ ہو۔ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے میں نے بڑے میاں، بڑی بی اور اُن کی خوب صورت لڑکی کو بھی دیکھا۔ لڑکی واقعی خوب صورت تھی۔ اُس کے چہرے سے الہڑ پن جھلکتا تھا۔ اُس نے بھی مجھے دیکھا اور میں لاشعوری طور پر مسکرا دیا۔ لیکن اس مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

باتھ روم سے واپس آ کر میں پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کیا وقت ہوا ہے محترم؟'' میں نے بڑے میاں سے پوچھا۔
''ساڑھے نو۔'' اُنہوں نے گالی دینے والے انداز میں جواب دیا۔
''ٹرین کہاں پہنچ چکی ہے؟'' میں نے اُن کی دشمنی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
''بس، آخری منزل کے قریب ہے۔'' انہوں نے یہ الفاظ بھی اسی انداز میں ادا کیے، جیسے کہہ رہے ہوں ''جہنم میں۔'' اُن کے لہجے پر اُن کی لڑکی نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف، جیسے وہ میرے ساتھ اس سلوک کی وجہ جاننا چاہتی ہو۔ بہرحال، میں خاموش ہو گیا۔ لیکن نہ جانے صرف میرا احساس تھا، خوش فہمی تھی یا حقیقت، کئی بار لڑکی نے معذرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

لیکن فی الحال میں کسی نئے عشق میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ کھڑکی سے باہر کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ پھر لڑکی اُٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی اور میں اس کی خوب صورت چال کا نظارہ کرتا رہا۔ میں نے بڑے میاں اور بڑی بی کی کڑی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی باہر نکل آئی۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔ اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا اور میرا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسٹیشن سے باہر نکل کر اس کا تعاقب کروں۔ لیکن پھر عقل نے سمجھایا، کسی کو دشمن بنانے سے کیا فائدہ؟ سیدھی طرح اپنے مستقبل کی فکر کروں۔ اور پھر میں سنبھل گیا۔

باہر ملوں کی دھواں اُگلتی چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اِکا دُکا مکانات بھی نظر آنے لگے تھے۔ پھر گاڑی شہر میں داخل ہو گئی اور بڑے میاں اپنا سامان درست کرنے لگے۔ دوسرے لوگ بھی منزل پر پہنچنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ بالآخر ٹرین رک گئی اور مسافر کھڑے ہو گئے۔ بہت سے قلی اندر گھس آئے اور بڑے میاں انہیں سامان بتانے لگے۔ میں نے بھی اپنا بریف کیس اُٹھایا۔ اسی وقت اتفاق سے لڑکی میرے بالکل قریب آ گئی۔ لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ وہ اتفاق نہیں تھا۔ لڑکی جان بوجھ کر میرے پاس آئی تھی۔ بڑی بی اور بڑے میاں سامان کی طرف متوجہ تھے کہ لڑکی نے سفید کاغذ کا ایک پُرزہ میری طرف بڑھا دیا اور میں دھک سے رہ گیا۔ اُس نے پھرتی سے پُرزہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

یا خدا!........ یہ لڑکیاں میرا پیچھا بھی چھوڑیں گی یا نہیں؟........ مجھ سے عشق کریں گی اور کسی دوسرے سے شادی کر لیں گی۔ کیا میں بالکل گدھا ہوں؟ بہرحال، میں پُرزہ مٹھی میں دبائے باہر نکل آیا۔ میں نے اس خاندان کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پلیٹ فارم کے باہر تانگے، ٹیکسیاں، رکشائیں کھڑی تھیں۔ کئی تانگے والے میری طرف لپکے اور میں نے بالآخر تانگے سے ہی سفر کرنا مناسب خیال کیا۔ میں اس شہر سے واقف نہیں تھا۔
''کسی ہوٹل میں چلو۔''
میں نے تانگے والے سے کہا اور وہ چل پڑا۔ تانگے میں بیٹھ کر میں نے مٹھی میں پکڑا ہوا پرچہ کھولا۔ اس پر ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا اور نیچے لکھا تھا۔
''شام چار بجے۔ نائلہ۔''
فون نمبر........ شام چار بجے........ نائلہ........ میں سب کچھ سمجھ گیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پھیل گئی۔ تانگہ ٹخ ٹخ کرتا دوڑتا رہا اور میں حسین خیالوں میں کھو گیا۔ لڑکی یہ بھی بری نہیں تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری دسترس سے دور نہیں تھی۔ اب وہ کسی اور سے شادی نہیں رچا سکے گی۔ کیونکہ میرے پاس دولت ہے۔ میں سوچتا رہا اور پھر تانگے والے نے ایک عمدہ سے ہوٹل کے سامنے تانگہ روک دیا۔

''یہ اچھا ہوٹل ہے، صاحب!'' اس نے بتایا۔ درحقیقت ہوٹل کی عمارت باہر سے کافی خوب صورت تھی۔ حالانکہ یہ میرے پروگرام کے خلاف تھا، لیکن اب تک کون سا کام میری مرضی کے مطابق ہوا تھا۔ چنانچہ میں ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ایسے ہوٹل میں کبھی قیام نہیں کیا تھا لیکن اُن کے آداب سے واقف تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک کمرہ طلب کیا۔ اپنا نام فضل الٰہی لکھا اور پیشہ تجارت۔ مقصد بھی تجارت لکھا اور پھر ایک پورٹر کے ساتھ کمرے میں پہنچ گیا۔

بڑا نفیس اور آرام دہ کمرہ تھا۔ گو، عبران کے محل کی طرح تو نہیں تھا، لیکن برا نہیں تھا۔ میں نے بریف کیس ایک الماری میں رکھا اور سب سے پہلے گھنٹی بجا کر بیرے سے ناشتہ طلب کیا۔ عمدہ ناشتہ تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچنے لگا۔ ذہن مختلف حصوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ مستقبل کا خیال، شہنا، زرینہ اور نہ جانے کیا کیا۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ پہلے گمنامی کی زندگی بسر کروں گا، کسی غریب آدمی کی طرح۔ اس کے بعد حلیہ بدلوں گا اور پھر نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔ لیکن اس ہوٹل میں آنے کے بعد میں نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ جب دولت ہے تو پھر عسرت کی زندگی کیوں بسر کی جائے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ چند روز تو عیش کر لیا جائے۔

لیکن ایک دقت تھی۔ میرے پاس صرف یہی ایک لباس تھا اور یہ لباس بھی اب مسل چکا تھا۔ اونہہ..... پرواہ کس بات کی ہے۔ ریڈی میڈ ملبوسات کی دکانیں کہاں نہیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد نکلوں گا، کچھ لباس اور ضرورت کی دوسری چیزیں خریدوں گا اور پھر شام کو چار بجے۔ تانگے کے خیال سے میرا دل دھڑکنے لگا! قسمت تو بُری نہیں ہے، لیکن نہ جانے گھپلا کیوں ہو جاتا ہے۔ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی، جو میرے تیرِ نظر کا شکار نہ ہوئی ہو۔ پھر یہ تیرِ نظر دردِ جگر کیوں ہو جاتا ہے۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ لباس اُتارا اور جسم سے مہک آنے لگی۔ یہ مہک، شہنا کی یاد دلا رہی تھی۔ محل کی شوخ و شنگ لڑکیوں نے مجھے شہزادوں کی طرح غسل کرایا تھا۔ وہ میرے جسم کو پھولوں سے رگڑتی رہی تھیں۔ اس دلفریب منظر کو یاد کر کے میرا دل کڑھنے لگا۔ میں بھی احمق ہوں۔ جب زندگی ہی داؤ پر لگا دی ہے تو ایک فریب وہ بھی سہی۔ میں خود کو یوسف عبران ہی ظاہر کرتا۔ جب اصلیت پتہ چلتی، اس وقت دیکھا جاتا۔ چند روز تو عیش سے گزر جاتے۔ شہنا کے ساتھ گزاری ہوئی حسین رات اتنی مختصر تو نہ ہوتی۔ اور بھی بہت سی راتیں، جن میں کبھی شہنا، کبھی نارمہ اور کبھی کوئی دوسری لڑکی ہوتی۔ وہاں تو سب ہی مجھ پر جان چھڑک رہی تھیں۔

غسل کے دوران میں یہی کچھ سوچتا رہا۔ اس خواب کے منظر کو یاد کر کے میرے دل میں ہوک اُٹھنے لگتی تھی۔ کاش، میں درحقیقت یوسف عبران ہوتا۔ لیکن یہ یوسف عبران ہے کون بے وقوف، جو اس جنت سے جان بوجھ کر نکل آیا۔ وہاں تو زندگی کی آخری سانس تک گزاری جا سکتی تھی۔ وہاں کا تو ہر لمحہ جاوداں تھا۔ آہ، شہنا....... شاید وہ مجھے میری اصلیت میں بھی قبول کر لیتی۔ نہ جانے قبول کرتی بھی یا

نہیں۔ وہ تو مجھے یوسف عبران سمجھ کر اپنی اُلفت کا اظہار کر رہی تھی۔ اور مجھے اُس یوسف عبران پر غصہ آنے لگا۔

پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ یہ سب حماقت کی باتیں تھیں، ان تمام باتوں کے سوچنے سے صرف ذہن پراگندہ ہوتا، اس کے علاوہ اور کیا ملتا۔ وہ ماحول مجھے دوبارہ نہیں ملتا۔ اب میری اس ماحول میں گنجائش نہیں تھی۔ پھر اس کے لئے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ میں نے ذہن جھٹک دیا اور نائلہ کے بارے میں سوچنے لگا جس نے چار بجے مجھے ٹیلی فون کرنے کی دعوت دی تھی، نائلہ........ مجھے رات کا منظر یاد آ گیا۔

بلاشبہ سوتے میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی، لیکن وہ بوڑھا جوڑا۔ یقیناً، وہ اُس کے والدین تھے۔ خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر میں ان بڑی بی کے ساتھ بھی شرارت کر چکا تھا۔ اگر معاملات آگے بڑھ جاتے ہیں تو وہ مجھے قبول بھی کریں گے یا نہیں۔ اونہہ، میں بھی گدھا ہوں، انتہائی احمق۔ پہلے اپنے بچاؤ کی فکر تو کروں، اس رقم کے بچنے کا کوئی انتظام کروں، اس کے بعد ان باتوں کے بارے میں سوچوں۔ خود اپنی عافیت خطرے میں ہے اور میں رومان کی جھیل میں غوطے لگا رہا ہوں۔ ہر لڑکی سے شادی کے خواب دیکھنے لگتا ہوں۔

غسل سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آیا۔ جسم خشک کرنے کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کے عقبی حصے کو استعمال کیا۔ پھر ذہن میں ضروریات کی ایک فہرست تیار کی۔ بریف کیس سے ایک مناسب رقم نکالی اور بازار کے لئے نکل آیا۔ بریف کیس میں نے لاپروائی سے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ اسی طرح اس کی حفاظت ہو سکتی تھی کہ اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

بازار سے حسب ضرورت سامان خرید کر میں ہوٹل واپس آیا۔ اس دوران کچھ اور کام بھی کئے تھے۔ مثلاً کچھ بینکوں سے ڈیپازٹ فارم حاصل کئے تھے۔ میرا پروگرام تھا کہ تھوڑی تھوڑی رقم بہت سے بینکوں میں جمع کرا دوں۔ ضمانت کی ضرورت تھی۔ لیکن دولت بذاتِ خود بہت بڑی ضمانت ہوتی ہے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا اور تھکن کی وجہ سے نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو چار بج چکے تھے۔ ذہن میں فوراً نائلہ کا خیال آیا اور میں نے مسہری سے چھلانگ لگا دی۔ نائلہ سے گفتگو کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ چٹ پر لکھے ہوئے نمبر پر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

''میں، مس نائلہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں، نائلہ بول رہی ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟''

''صرف ٹرین کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ ویسے میرا نام، عا......'' میں اپنا اصل نام بتاتے بتاتے رُک گیا۔ یہ مناسب نہ تھا۔ چنانچہ دوسرے لمحے میں سنبھل کر بولا۔ ''میرا نام، عامر ہے۔''

''آپ، نام بتاتے بتاتے رُک کیوں گئے تھے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔'' میں نے برجستہ جواب دیا اور وہ مطمئن ہو گئی۔

''کہاں قیام ہے آپ کا، عامر صاحب؟'' اُس نے پوچھا۔

''ایک ہوٹل میں۔''

”نام نہیں بتائیں گے؟“
”کوہ نور۔“
”اوہ........!“ اُس نے دلکش آواز میں کہا۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر بولی۔ ”کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“
”بس، آوارہ گرد ہوں۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں۔ شاہ پور سے سوار ہوا تھا۔“
”عامر صاحب! آپ نے میرے بارے میں کیا اندازہ لگایا؟“
”میں نہیں سمجھا؟“ میں نے اس عجیب سوال پر چکرا کر پوچھا۔
”میں نے آپ کو ٹیلی فون کرنے کے لئے کیوں کہا تھا؟“
”کیا عرض کرسکتا ہوں؟“ میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔
”دراصل مجھے احساس ہوا کہ امی جان اور ابو کا روّیہ آپ کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ قدامت پسند لوگ ہیں، اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتے اور اپنی سادگی میں اخلاقی قدروں کو بھی فراموش کر جاتے ہیں۔ میں ان کے رویے کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“
”اوہ........ لیکن اگر آپ معافی مانگنا ضروری سمجھتی ہیں تو پھر میرے معاف کرنے کا حق محفوظ ہے۔“
”کیا مطلب؟........ میں سمجھی نہیں؟“
”میں اتنی دُور سے معاف نہیں کروں گا۔“
”پھر........؟“
”میرے سامنے آکر معافی مانگیں۔“ میں نے کہا اور وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ کئی سیکنڈ خاموش رہی، پھر بولی۔
”یہ ایک مشکل کام ہے........ تاہم میں کوشش کروں گی۔ حالانکہ کل کالج جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ لیکن آپ کی وجہ سے جانا پڑے گا۔ آپ ایک تکلیف کریں، کل گیارہ بجے نکل روڈ پہنچ جائیں۔ نکل روڈ کے ٹیکسی اسٹینڈ پر میں پہنچ جاؤں گی۔ میرا کالج وہیں ہے۔“
”بہت بہتر۔ میں چشم براہ رہوں گا۔“ میں نے کہا۔
”اب آپ سے معافی مانگنا بھی ضروری ہے۔“
”بہت بہت شکریہ!“ میں نے مسرت دباتے ہوئے کہا اور پھر تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔ وقتی طور پر میں، شہنا کو بھول گیا اور نائلہ میرے حواس پر چھا گئی۔ کیسی حسین آواز ہے۔ اس کے دلکش خدوخال میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور میں مستقبل کے پروگرام بنانے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ نائلہ کو بتاؤں گا کہ میں بھری دنیا میں تنہا ہوں۔ کھاتا پیتا آدمی ہوں، ابھی تک لا اُبالی زندگی گزار رہا ہوں۔ اُس کے خاندان میں مجھے سہارا مل جائے تو مقصدِ حیات مل جائے۔ بلاشبہ نائلہ کا شریف خاندان ہے۔ اس کے ساتھ حسین زندگی گزرے گی۔
وہ رات بھی میں نے نائلہ کے خوابوں میں گزاری۔ شہنا کی جھلکیاں ذہن سے محو نہ ہوسکی تھیں۔ لیکن وہ تو اب ایک بھولا ہوا خواب تھی۔ اُسے دہرانے سے کیا فائدہ؟ حقیقتوں کو اپنایا جائے۔ خوابوں کے

پیچھے بھاگنا حماقت ہے۔

دوسری صبح خاصی خوش گوار تھی۔ نائلہ سے ملاقات کا تصور دل کو گدگدا رہا تھا۔ نو بجے سے ہی تیاری شروع کر دی اور پونے دس بجے ہوٹل سے نکل آیا۔ ٹیکسی لی، آوارہ گردی کرتا رہا، پروگرام بناتا رہا اور پھر گیارہ بجے نکل روڈ پہنچ گیا۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر ٹیکسی رُکوالی اور اسی میں بیٹھ کر انتظار کرتا رہا۔ تب دور سے نائلہ آتی نظر آئی اور میں ٹیکسی سے اُتر آیا۔ چند قدم اُس کی طرف بڑھا اور پھر ٹھٹک کر رُک گیا۔ سفید سادہ لباس میں ملبوس وہ حوروں کی طرح مقدس اور پاکیزہ نظر آ رہی تھی۔ اُس کا دُھلا دُھلا چہرہ بے حد حسین معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں اور بالوں کی چند شریر لٹیں آوارہ گردی کر رہی تھیں۔ میں مبہوت اُسے دیکھتا رہا۔

اُس نے مجھے سلام کیا اور میں نے نہ جانے کس طرح جواب دیا۔ پھر میں ٹیکسی کی طرف مڑا اور وہ بھی خاموشی سے میرے نزدیک آ بیٹھی۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے واپس ہوٹل چلنے کے لئے کہا اور ٹیکسی سڑک پر دوڑنے لگی۔ راستے بھر ہم دونوں خاموش رہے۔ میں نے کئی بار اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی، کوہ نور پہنچ گئی۔ میں نے ڈرائیور کو بل ادا کیا اور وہ نیچے اُتر آئی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اُسے مخاطب کیا۔

”نائلہ صاحبہ!“

”جی........!“ وہ آہستہ سے بولی۔

”آپ بے حد خاموش ہیں؟“

”جی........جی نہیں تو۔“

”آپ کے چہرے پر گھبراہٹ ہے؟“

”نن........نہیں........تو۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”نائلہ صاحبہ!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے میرے اوپر جو اعتماد کیا ہے، میں اسے ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔“

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر بحالی آ گئی ہے۔ میں اُسے لئے ہوئے اپنے کمرے کے سامنے پہنچ گیا اور اس کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے گھوم پھر کر میرا کمرہ دیکھا۔ میں نے جان بوجھ کر دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے اُسے بیٹھنے کی پیشکش کی اور وہ قدرے تکلف سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کیا پسند کریں گی؟“

”کوئی تکلف نہیں ہونا چاہئے۔“ اُس نے کہا۔

”قطعی نہیں ہوگا۔ آپ بھی بے تکلفی سے فرما دیجئے۔“

”تان، چائے پر ہی ٹوٹتی ہے۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہتر........!“ میں نے گھنٹی بجا کر بیرے کو بلایا اور اُسے چائے وغیرہ لانے کے لئے کہہ دیا۔ وہ اب کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ پھر اُس نے مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''اب تو آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ اب معاف کر دیں۔''

''شرمندہ نہ کریں، نائلہ صاحبہ! وہ میرے بزرگ تھے اور درحقیقت شرارت میری تھی۔ اُن کی ناراضگی بجا تھی۔ ٹرین میں یونہی میری نگاہیں آپ پر پڑ گئیں۔ آپ سوتے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھیں اس لئے دوبارہ دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ اور اس بات کو والدہ صاحبہ نے محسوس کر لیا۔ بعد میں مجھے اپنی گستاخ نگاہی کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔

''اوہ......'' وہ قدرے شرماتی ہوئی بولی۔ ''وہ قدیم خیالات کے مالک ہیں۔ اکثر اُنہیں مجھ سے اور بھائی جان سے گلہ رہتا ہے کہ ہم لوگ بہت بے باک ہیں۔ وہ ہمیں سرزنش بھی کرتے رہتے ہیں۔''

''بزرگ ہیں۔ اُن کے حکم کی تعمیل سر آنکھوں پر۔'' میں نے کہا۔

''تو آپ نے معاف کر دیا؟''

''بار بار یہ الفاظ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ معافی تو مجھے اُن سے مانگنی چاہئے۔ میں نے اُنہیں تکلیف پہنچائی تھی۔''

''تو پھر معافی مانگنے آ جائیے، ہمارے گھر۔'' اُس نے شوخی سے کہا۔

''سر کے بل حاضر ہوں گا۔ لیکن خوف محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے، وہ میرے لئے گنجائش نہ نکال سکیں۔'' میں نے کہا اور اس بات پر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ چند لمحات ذہن کریدتی رہی، پھر اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

''تب پھر آپ، بھائی جان سے ملاقات کریں۔ ایسا کریں کہ کل شام پانچ بجے آپ، ہمارے ہاں آ جائیں۔ میں، بھائی جان سے آپ کا تذکرہ کر دوں گی۔ وہ آپ کو اپنے دوست کی حیثیت سے ریسیو کریں گے۔''

''آپ کے بھائی جان ہیں؟'' میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ہاں......دنیا کے تمام بھائیوں سے اچھے۔ بے حد ہنس مکھ، بے حد پیارے۔ میں اُن سے پانچ سال چھوٹی ہوں، لیکن میری اور ان کی دوستی ہے۔ نہ وہ کوئی بات مجھ سے چھپاتے ہیں اور نہ میں۔ یہاں تک کہ انہوں نے نفیس سے پہلی ملاقات کی تفصیل بھی مجھے بتا دی تھی۔''

''یہ نفیس کون محترمہ ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی جان اُسے پسند کرتے ہیں۔ بہت پیاری لڑکی ہے، اور اب بہت جلد وہ ہماری بھابی بننے والی ہے۔''

''خوب......اور آپ، میرے بارے میں اُنہیں کیا بتائیں گی؟'' میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کے بارے میں؟'' وہ ایک لمحے کے لئے بھونچکی ہو گئی، پھر اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر شرم سے دوہری ہو گئی۔

میرے رگ و پے میں مسرت کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ نائلہ نے صاف اظہارِ محبت کر دیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے سب کچھ مل گیا تھا۔ وہ سب کچھ، جو پیشہ ور عشاق مہینوں میں نہیں حاصل کر پاتے۔ وہ میرے تیرِ نظر کی گھائل ہو گئی تھی۔ اور میں......میں تو ہر اُس لڑکی کے لئے دیوانہ ہوں، جو مجھ سے پیار

کرے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''شکریہ، نائلہ صاحبہ!.......آپ کا جواب مجھے مل گیا ہے۔''

''عامر صاحب.......!'' وہ جذبات سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولی اور صوفے سے اُٹھ گئی۔

''گستاخی پر شرمندہ ہوں۔ چائے پیئے بغیر نہ جانے دوں گا۔'' میں نے بھی جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''عامر صاحب.......!'' وہ اسی طرح گردن جھکائے جھکائے بولی اور پھر شرمائی شرمائی سی بیٹھ گئی۔

''یہ غلط ہے، نائلہ صاحبہ! چلیئے، ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کریں۔'' میں نے کہا۔ اسی وقت ویٹر چائے اور دوسرے لوازمات لے کر آ گیا اور میں چائے بنانے کے لئے اٹھ گیا۔

''میں بناؤں گی۔'' وہ مجھے اُٹھتے دیکھ کر خود چائے کی طرف بڑھ گئی۔

''بہت بہتر۔ شکریہ!'' میں نے بے تکلفی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چائے کی ایک پیالی میرے سامنے رکھی اور میں اصرار کر کے اُسے دوسری چیزیں کھلانے لگا۔ وہ قدرے سنبھل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سوال کیا۔

''آپ کا مستقل قیام کہاں ہے؟''

''میں نے آپ سے عرض کیا تھا، ایک آوارہ گرد ہوں۔ پوری دنیا میں تنہا۔ کوئی نہیں ہے میرا۔ والد صاحب چند سال قبل انتقال کر گئے۔ زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ والد صاحب کا تھوڑا سا سرمایہ لے کر یہاں آیا ہوں۔ ماضی کی یادیں بہت تلخ ہیں۔ اپنی شخصیت بدل دینا چاہتا ہوں، اور یہیں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ.......'' اُس کے چہرے پر تاسف اور خوشی کے ملے جلے جذبات پیدا ہو گئے۔ ''آپ کے دُکھ سے مجھے دُکھ ہے۔ ہم سب کوشش کریں گے کہ ماضی کی یادیں آپ کے ذہن سے محو ہو جائیں۔''

''شکریہ، نائلہ صاحبہ!....... آپ کا احسان ہو گا۔ زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔'' میں نے درحقیقت رنجیدہ لہجے میں کہا۔ کیونکہ میری باتوں میں کسی قدر حقیقت بھی تھی۔ وہ خاموش رہی۔ چند منٹ کے بعد میں نے ہی موضوع بدل دیا۔ ''چھوڑیئے ان باتوں کو....... آپ کے بھائی صاحب کا کیا نام ہے؟''

''آصف۔ بہت ہی پیارے بھائی ہیں، وہ۔ آپ اُن سے ملیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔''

''کل کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔ پھر اُس نے اجازت طلب کر لی۔

''دل تو نہیں چاہتا، لیکن آپ کو روکنے کا حق بھی تو نہیں ہے۔ بہر حال، کل سہی۔'' میں نے کہا۔ وہ مجھ سے دوسرے دن ضرور آنے کا وعدہ لے کر اور اپنا تفصیلی پتہ دے کر چلی گئی، اور میں دل میں میٹھی یادیں لئے اُسے ٹیکسی میں سوار کرا کے واپس آ گیا۔ ایک خوش گوار مستقبل میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں اپنی نئی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کاش یہ زندگی مجھے راس آئے۔ کاش، میرا گناہ سر چڑھ کر نہ بولے۔

وہ رات عجیب سحر کے عالم میں گزری۔ میں نے انجیلا کو یاد کیا۔ ہونہہ، ٹیڑھی آنکھوں والی۔ ظاہر ہے، وہ مجھ جیسے گلفام کے قابل کہاں تھی۔ اور زرینہ....... وہ مطلب پرست عورت....... خدانخواستہ اگر میری زندگی اس سے وابستہ ہو گئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ وہ زندگی کے کسی لمحے میں دھوکا دے سکتی تھی۔ اور اس

وقت میری کیفیت اب سے مختلف ہوتی۔ میں نے دل ہی دل میں زرینہ کو بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر مجھے راشدہ یاد آ گئی۔ ایک خوب صورت سی، ہمدرد لڑکی۔ لیکن وہ میرے لئے نہیں تھی۔ قدرت انسان کے لئے جو فیصلے کرتی ہے، وہی صحیح ہوتے ہیں۔ میں بلاوجہ شہنا کی یاد میں تڑپتا رہا۔ حالانکہ شہنا وہ عورت تھی، جس نے مجھے صحیح معنوں میں عورت سے روشناس کرایا تھا۔

لیکن .... دل اُس کا بھی صاف نہیں تھا۔ وہ مجھے شہزادہ یوسف عبران سمجھ رہی تھی۔ اور شاید خود میرے دل میں جگہ پا کر ہونے والی ملکہ بننا چاہتی تھی۔ ممکن ہے، اُسے میری حقیقت معلوم ہو جاتی تو وہ مجھے ٹھوکر لگانا بھی پسند نہ کرتی۔ اونہہ........ میں خود ٹھوکر مارتا ہوں ایسی لڑکیوں کو، جو مرد کے صرف ایک اشارے پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتی ہیں۔ اور پھر نہ جانے وہ سب کون تھے؟ کچھ عجیب سی بادشاہت تھی۔ ایسے عجیب لوگوں میں میرا گزر کہا ہوتا؟ میری یہ دنیا کیسی بھی ہے، میری تو ہے!

اُس رات میں شہنا کے لئے نہ تڑپا۔ میں نے صرف نائلہ کے خواب دیکھے۔ نائلہ........ جو، راشدہ سے زیادہ خوب صورت تو نہ تھی، لیکن اُس کے پہلو میں محبت کرنے والا خوب صورت دل تھا۔ اُس نے پہلی ہی نگاہ میں مجھے پسند کر لیا تھا اور اب میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں بھی اسے اپنی بھرپور محبت دوں گا۔ میں اپنا سب کچھ اُس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

انہی خیالات میں، میں سو گیا۔ اُس رات صرف نائلہ میرے خوابوں میں تھی۔ میں پہاڑوں میں، جھرنوں میں، سرسبز میدانوں میں اُس کے ساتھ کلیلیں کر رہا تھا۔ اپنے پسندیدہ فلمی نغمے گا رہا تھا۔ اُچھل رہا تھا، کود رہا تھا۔ وہ بھی قدم قدم پر نئے نئے لباسوں میں میرے سامنے آ رہی تھی۔ کبھی قبائلی لباس میں، کبھی کسی دوسرے علاقے کے لباس میں، کبھی جدید شہری لباس میں........ پھر میں نے اُس کے لئے دشمنوں سے زبردست جنگ کی، ظالم سماج کو بھرپور شکست دی، اور پھر ہماری شادی کی خوشی میں آتش بازی چلنے لگی اور میری آنکھ کھل گئی!........ صبح ہو چکی تھی۔ کاش، صبح نہ ہوتی۔

میں اس فلمی خواب پر ہنس پڑا۔ پھر اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ آج کا دن، مسرتوں کا دن تھا۔ شام کے پانچ بجانا مشکل ہو گئے۔ دن بھر کاہلوں کے انداز میں بستر توڑتا رہا۔ حالانکہ کئی کام کرنے تھے، لیکن کچھ نہ کر سکا۔ دل نے کئی بار سوچا کہ نائلہ کو فون کروں، لیکن بے احتیاطی اچھی نہیں تھی پھر اُن خوف ناک والدین کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ مجھے معاف بھی کریں گے یا نہیں؟........ اُس کے بھائی کے بارے میں سوچنے لگا، جس کا نام آصف تھا۔ وہ بہن کی ہر بات قبول کر سکتا ہے، لیکن کیا اُس کا عشق بھی قبول کر سکتا ہے؟........ دل خوف سے دھڑکا۔ لیکن میں نے خود کو تسلی دی۔ جدید دور ہے، لوگوں کے ذہن بدل گئے ہیں۔ ماڈرن گھرانوں میں ان باتوں کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اور پھر اس کی بہن اس کی رازدار بھی تو تھی۔ اُس نے بھائی کی محبت کامیاب کرائی تھی، اُسے اس کا بدلہ ضرور دینا چاہئے۔

ساڑھے چار بجے میرے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ نائلہ کے علاوہ اور کون فون کر سکتا ہے؟ میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون کا ریسیور اُٹھایا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''ہیلو!''

''عامر صاحب؟'' دوسری طرف سے نائلہ کی آواز سنائی دی اور میں نے سکون کی سانس لی۔

''میں ہی بول رہا ہوں۔''
''آپ ابھی چلے نہیں ہوٹل سے؟''
''بس، چلنے والا تھا۔ لیکن...... کیا...... مس نائلہ! آپ نے...... اپنے بھائی صاحب سے......؟''
''اس کی فکر آپ کو کیوں ہے؟ آیئے۔ ہم آپ کے منتظر ہیں۔'' نائلہ کی چہکتی ہوئی آواز اُبھری اور میری روح تک خوش ہوگئی۔ اس کا مطلب ہے، نائلہ نے معاملات ہموار کر لئے ہیں۔
''میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور نائلہ نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، بال ایک خاص انداز سے سنوارے اور نوک پلک سے درست ہو کر ہوٹل سے نیچے اتر آیا۔ بے شک، آپ مجھے ایک دیدہ دلیر چور کہہ سکتے ہیں۔ میں ڈاکہ مارنے کے بعد شادی رچانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور عشق میں مبتلا ہو کر موت کو بھول گیا تھا۔
ٹیکسی میں بیٹھ کر میں، نائلہ کے بتائے ہوئے پتے پر چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی ایک خوب صورت بنگلے کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے بنگلے کی شان دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ گویا میری سسرال والے بھی معمولی حیثیت کے لوگ نہیں تھے۔ بہر حال، وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کوئی لکھ پتی داماد ملا ہے۔ ٹیکسی کا بل ادا کر کے میں گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔
مین گیٹ پر میں نے نائلہ کو منتظر پایا اور اُس کی محبت کا دل سے قائل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اُس نے اندر رُخ کر کے کسی کو آواز دی اور ایک دراز قامت، خوب صورت نوجوان اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بے حد اسمارٹ تھا اور اُس کے خدوخال نائلہ سے ملتے جلتے تھے۔ اُس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور آگے بڑھ کر گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔
''میرا نام آصف ہے۔ اور آپ، میرے پرانے دوست ہیں۔'' اُس نے کہا۔
''شکریہ، آصف صاحب!'' میں نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔ نائلہ نے بھی مجھے سلام کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا، آصف مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے، کیوں نہ دیکھتا۔ جہاندیدہ انسان ہے، ہونے والے بہنوئی کی شخصیت سے پوری طرح واقف ہونا چاہتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا اور چہرے پر مسکنت طاری کر لی۔ دونوں مجھے لئے ہوئے ایک خوب صورت ڈرائنگ رُوم میں داخل ہو گئے اور پھر آصف نے مجھ سے بیٹھنے کی استدعا کی۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔
''میں، امی اور ابو کو اطلاع کرتی ہوں۔'' نائلہ نے کہا اور ڈرائنگ رُوم سے باہر نکل گئی۔
''نائلہ نے بڑی تعریفیں کی ہیں، آپ کی، عامر صاحب!'' آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''مس نائلہ خود پُرنور دل کی مالک ہیں۔'' میں نے کہا۔
''اور سنایئے، کیا مشاغل ہیں، آپ کے؟''
''زندگی کی راہوں کا کوئی تعین نہیں کر سکا ہوں۔ آوارہ گرد ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری دنیا میں تنہا ہوں۔ والد صاحب تجارت کرتے تھے، لیکن پرانی بات ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد زندگی کے راستے متعین نہیں کر سکا اور اُن کی چھوڑی ہوئی دولت پر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کچھ ہمدردوں کا طالب ہوں، جو میرے لئے راستے منتخب کر دیں۔'' میں نے الفاظ چن چن کر کہا۔

''اوہ........دُکھ ہوا۔ ہم لوگ جس قابل ہیں، حاضر ہیں۔'' آصف نے کہا۔
''ہمدردی کے الفاظ سن کر دل رو پڑتا ہے۔ محبتوں کی تلاش ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور وہ پھر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ چند منٹ خاموشی رہی، پھر اُس نے کہا۔
''ویسے آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''
''چند ہفتوں سے شہر کی گہما گہمی سے اُکتا کر ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم تھا۔ اُس قصبے کا نام شاہ پور ہے۔ یہاں، شاہ پور سے آیا ہوں۔''
''خوب........!'' آصف نے گردن ہلاتے ہوئے کہا، لیکن نہ جانے کیوں، اُس کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک لہر رقصاں تھی۔ اسی وقت ڈرائنگ روم کے دروازے میں نائلہ کا چہرہ نظر آیا۔ اُس کے پیچھے معمر خاتون اور وہی بزرگ تھے۔ دونوں ہی مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ میں نے بھی چونکنے کی اداکاری کی تھی۔ بہرحال، میں نے کھڑے ہو کر اُنہیں سلام کیا۔
بڑی بی اور بڑے میاں اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور میرے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ وہ دونوں ہی مجھے گھور رہے تھے۔
''آپ، انہیں پہچان گئیں، امی؟ یہ میرے پرانے دوست عامر ہیں۔ بڑے شریر اور زندہ دل انسان ہیں۔'' آصف نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''پرانے دوست؟'' بڑے میاں چونک کر بولے۔
''ہاں تو........ہم اسکول کے زمانے کے ساتھی ہیں۔'' آصف نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا یہ صاحبزادے حال ہی میں کہیں سے آئے ہیں؟'' بڑے میاں نے آنکھیں مل مل کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''شاہ پور سے آیا ہوں، محترم! اور اُسی کمپارٹمنٹ میں، جس میں آپ حضرات تشریف لا رہے تھے۔'' میں نے خود ہی کہا۔
''ہوں۔'' بڑے میاں نے ایک گہری سانس لی۔
''برا مت ماننا، آصف میاں! تمہارے دوست کوئی شریف انسان نہیں۔'' بڑی بی نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔
''کیوں امی! کیا ہوا؟'' آصف نے حیرت سے پوچھا۔
''کمپارٹمنٹ میں انہوں نے شرافت کا ثبوت نہیں دیا تھا۔''
''امی! میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے ضرور کوئی شرارت کی ہو گی۔ ایک منٹ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ مگر ہوا کیا تھا؟'' آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیا ہوا تھا........بتاؤ جی!'' بڑی بی نے بڑے میاں کے کہنی مارتے ہوئے کہا۔
''ایں........کیا ہوا تھا؟ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' بڑے میاں چونک کر بولے۔
''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی، امی جان! میں سخت پیاسا تھا۔ آپ جاگ رہی تھیں۔ میرا دل چاہا کہ آپ سے پوچھوں کہ پانی ہے یا نہیں۔ اس لئے بار بار میں، آپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن پانی مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔''

''ایں.......!'' سادہ لوح بڑی بی بھی چونک پڑیں۔
''ہوا کیا تھا، امی؟''
''ارے کچھ نہیں۔ بس میری ہی عقل ماری گئی تھی۔ دراصل رات کا وقت تھا۔ میں ڈر گئی تھی۔'' بڑی بی نے کہا۔ اور میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ حقیقت وہ بے چارے کیا بتا سکتے تھے؟ میں نے کوئی ایسی حرکت تو نہیں کی تھی، جو الفاظ میں لائی جا سکے! آصف پھر ہنس پڑا تھا۔ بڑے میاں اور بڑی بی کے دل صاف ہو گئے تھے۔ میری خوب خاطر مدارات ہوئی۔ آصف درحقیقت گریٹ تھا۔ ایسے محبت کرنے والے بہن بھائی میں نے کم ہی دیکھے تھے۔ لیکن آصف کا بار بار مجھے گھورنا، میرے دل میں چبھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی ایسی ہی بات تھی، جو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بہرحال، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں تو نائلہ کی دبی دبی، پُرمسرت مسکراہٹ میں کھویا ہوا تھا۔ نائلہ کے چہرے پر حیا کی سرخی لہرا رہی تھی۔ اور میری آنکھوں میں انجانے خواب!

آصف، اُس کی والدہ اور والد مجھ سے گفتگو کرتے رہے اور میں کمزور پہلو بچا بچا کر ان کے جوابات دیتا رہا۔ اس روز میں نے بے پناہ جھوٹ بولا، بہترین اداکاری کی، اور مجھے یقین ہے کہ جب رات کے کھانے کے بعد میں، اُن سے رخصت ہوا تو ان پر بڑے اچھے تاثرات چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے رخصت کرتے وقت آصف نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کل دن میں گیارہ بجے تک میں، آپ سے ملاقات کروں گا، عامر صاحب! میرا انتظار کریں۔''
''سر آنکھوں پر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دل میں حسین چٹکیاں لئے، نائلہ کی الوداعی مسکراہٹ سمیٹے میں واپس چل پڑا۔ ٹیکسی نے مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

رات بھر میں مستقبل کے سہانے خواب میں کھویا رہا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تیس چالیس ہزار کا ایک خوب صورت سا مکان خرید لوں گا۔ دس بارہ ہزار کی ایک درمیانے درجے کی کار۔ باقی رقم سے کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لوں گا اور اس طرح نائلہ کے ساتھ زندگی بسر کروں گا۔ رات بھر میرے خوابوں میں اپنا گھر گھومتا رہا، جہاں نائلہ کے قدموں کی چاپ مسرتیں بکھیر رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے چھوٹے سے بنگلے کے لان پر اپنے خوب صورت بچوں کو کلکلیں کرتے دیکھا۔ سب میرے اور نائلہ کے ہم شکل تھے۔ میں نے اُن کے نام بھی تجویز کر لئے تھے۔

دوسری صبح حسب معمول خوش گوار تھی۔ میرا دل انجانی مسرتوں سے لبریز تھا۔ کافی دیر سے جاگا تھا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور پھر گھنٹی بجا کر بیرے کو ناشتہ کا آرڈر دے دیا۔ ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں نے ناشتے کی میز سے ٹیلی فون کی طرف چھلانگ لگا دی۔

''ہیلو!'' میں نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔
''سلام عرض کرتی ہوں۔'' دوسری طرف سے نائلہ کی آواز سنائی دی۔
''جیتی رہو.......ہمیشہ خوش رہو۔'' میں نے جواب دیا اور نائلہ کی ہنسی سنائی دی۔
''خوب، خوب.......یہ بزرگی کب سے آگئی؟'' اُس نے پوچھا۔
''رات کا خواب دیکھنے کے بعد۔''
''اوہ.......تو آپ خواب بھی دیکھتے ہیں۔''

''ہاں........اب دیکھنے لگا ہوں۔ حسین خواب........زندگی سے آراستہ!''
''لیکن خواب دیکھنے سے بزرگی کیوں آ گئی؟''
''رات کو میری عمر ستّر برس ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا خوب صورت مکان دیکھا۔ اس مکان میں زندگی مسکراتے دیکھی۔ جو میری شریکِ حیات کے قدموں سے جگمگا رہی تھی۔ ہاں، ایک حسین صورت محبت بھری نگاہوں سے میری منتظر تھی۔ میں نے اُسے دل میں بٹھا لیا۔ وہ قدم قدم پر میرے ساتھ تھی۔ پھر ہمارے بچے مکان کے صحن میں کھیلنے لگے۔ ایک، دو، تین، چار۔ اب آپ جانتی ہیں کہ بال بچوں والے آدمی میں تھوڑی بہت سنجیدگی تو ہونی ہی چاہیئے۔''
نائلہ شرمیلی ہنسی ہنس رہی تھی۔ پھر اُس کی شرگیں آواز سنائی دی۔ ''تب تو میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔''
''شکریہ........اور آپ بھی۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔
''عامر صاحب!'' اُس نے شرمایا ہوا سا احتجاج کیا۔
''کیوں........آپ کو میرے بچے پسند نہیں آئے؟'' میں نے بدستور شوخی سے کہا۔
''بڑے شریر ہیں، آپ۔''
''اگر خوشیوں کا اظہار شرارت ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ دوسری طرف خاموشی رہی تو میں نے اُسے آواز دی۔ ''مس نائلہ!''
''جی........!'' وہ آہستہ سے بولی۔
''برا مان گئیں آپ؟''
''نہیں۔''
''کب ملاقات ہو رہی ہے؟''
''شام چار بجے۔''
''آپ تشریف لائیں گی؟''
''نہیں۔ پارک ہال گیٹ پر ملوں گی۔ گھر سے بہانہ کر کے آؤں گی۔''
''شکریہ۔ میں انتظار کروں گا۔'' میں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔
''خدا حافظ!'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا اور میں کئی منٹ ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا۔ یہ مسرت آگیں لمحات میرے لئے جاوداں تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سرور میں گم رہا۔
ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کئی منٹ کے بعد مجھے اس کا خیال آیا اور میں ریسیور رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے یونہی اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور بیرے کو بلا کر برتن اُٹھانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ساڑھے دس بجے تھے کہ میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی اور میں چونک پڑا۔ ممکن ہے، آصف ہو۔ حالانکہ اس نے گیارہ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آصف ہی تھا۔ لیکن جس انداز میں تھا، اُسے دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ دل اُچھل کر حلق میں آ گیا اور میں اندھوں کی طرح اُسے گھورتا رہا۔

''اندر آسکتا ہوں؟'' آصف نے مسکراتے ہوئے کہا اور نہ جانے کیسے میں نے خود کو سنبھالا۔ میں راستے سے ہٹ گیا اور آصف اندر آ گیا۔ وہ پولیس انسپکٹر کی وردی میں بھی خوب جچ رہا تھا۔

''آپ کو میرے اس لباس پر حیرت ہوئی ہے، شاید......؟''

''ہاں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ......نائلہ نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ یہاں مقامی پولیس انسپکٹر ہوں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ میں نے کس طرح خود کو سنبھالا تھا۔

''اتفاق ہے!'' آصف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور میں بھی مرے مرے قدموں سے ایک صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

''ڈیوٹی پر تھا۔ دفتر سے سیدھا آ رہا ہوں۔ آپ سے وعدہ کیا تھا نا۔'' وہ لاپروائی سے بولا اور میں گردن ہلانے لگا۔ ''آپ مجھے دیکھ کر کچھ خوف زدہ ہو گئے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بچپن ہی سے پولیس والوں سے ڈرتا ہوں۔'' میں نے نہ جانے کہاں سے کھینچ کھانچ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کی۔

''ہر شریف آدمی کو ڈرنا چاہئے۔ اور پھر آپ تو ذاتِ شریف ہیں۔'' اس نے کہا اور میں خوامخواہ ہنسنے لگا۔

''اور سنائیے، رات کیسی گزری؟'' اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انداز پولیس والوں کا سا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں خوامخواہ ہی ڈر گیا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھی۔ اس شہر کی راتیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔''

''ہاں......اور دن بڑے منحوس۔'' اُس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور میں پھر چونک کر اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ ''کافی پیوں گا۔'' اُس نے صوفے کی پشت سے گردن ٹکا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں۔ لاحول ولا قوۃ! میں، آپ کی پولیس کی وردی دیکھ کر بری طرح بدحواس ہو گیا ہوں۔'' میں نے جلدی سے گھنٹی کے بٹن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور وہ مسکراتا رہا۔ بیرے کے آنے پر میں نے کافی کا آرڈر دیا اور اس کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں لانے کے لئے بھی کہا۔ کمبخت دل کو لاکھ سنبھال رہا تھا، لیکن وہ تھا کہ ڈوبا ہی جا رہا تھا۔ ویسے میں اس منحوس اتفاق کو کوس رہا تھا کہ نائلہ نے مجھے اپنے بھائی کے بارے میں تفصیل نہیں بتائی تھی، ورنہ اس عشق پر لعنت بھیجتا۔ ایک مجرم کو پولیس والے کی بہن سے کبھی عشق نہیں کرنا چاہئے!

میں دوبارہ اُس کے سامنے آ بیٹھا۔ وہ عجیب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ممکن ہے، اُس کے مسکرانے کا انداز یہی ہو۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ اب مجھے اُس کے سامنے خوف زدہ ہو کر اُسے شبہ کا موقع نہیں دینا چاہئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ویٹر کافی لے آیا۔ اور میں نے کافی بنا کر اُس کے سامنے سرو کر دی۔ دوسری چیزیں بھی میں نے اُس کے سامنے رکھ دیں اور وہ ہر چیز کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ میں بھی اُس کے ساتھ شریک تھا۔ لیکن اُس کی بے تکلفی دیکھ کر مجھے چکر آ رہے تھے۔ دل اندر سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ کافی کی دو پیالیاں پینے کے بعد اُس نے لمبی ڈکار لی۔ اس کے سامنے کے تمام برتن صاف ہو گئے تھے۔ پھر اُس

نے گھڑی دیکھی اور بولا۔
''بہت وقت ہو گیا ہے۔اب کچھ کام کی باتیں ہو جانی چاہئیں۔''
''کام کی باتیں؟'' میرا دل پھر لرز اٹھا۔لیکن میں نے ایک بار پھر اپنی بزدلی پر لعنت بھیجی۔ممکن ہے، وہ میری اور نائلہ کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہو۔آخر ایک جوان بہن کا بے تکلف بھائی ہے۔
''ضرور!'' میں نے پھر سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔
''نائلہ سے آپ کی ملاقات ٹرین میں ہی ہوئی تھی؟''
''ہاں!''
''بہت مختصر وقت میں آپ نے اُسے اس قدر متاثر کر دیا۔''
''مس نائلہ بے حد نیک دل خاتون ہیں۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔وہ بے حد معصوم ہے۔اور........آپ اسی قدر ذلیل۔'' اُس کا لہجہ بدل گیا اور میں بلاشبہ صوفے سے ایک فٹ اونچا اچھل پڑا۔میں منہ پھاڑے اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔
''میں، کل ہی آپ کی شکل دیکھ کر چونکا تھا، مسٹر عارف! لیکن میں تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔آج میں نے اس شہر سے آئی ہوئی رپورٹ کا فائل نکلوایا، اس میں آپ کی تصویر دیکھی اور پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد یہاں آیا ہوں۔''
میرے پورے بدن کا لہو خشک ہو گیا تھا۔
''آپ اپنی فرم سے چھیاسی ہزار روپے کا کیش اُڑا کر فرار ہوئے ہیں۔پورے ملک میں آپ کی تلاش جاری ہے۔ہر شہر میں آپ کی تصویر اور رپورٹ بھیج دی گئی ہے۔آپ کی فائل میرے پاس موجود ہے۔کیا پیش کروں؟'' اُس نے سوال کیا۔میں بھلا کیا جواب دیتا۔میرا دل چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔لیکن بدن میں اتنی سکت نہ تھی کہ ہل بھی سکتا۔بھاگنا تو درکنار۔
''مجھے افسوس ہے کہ بے وقوف نائلہ آپ سے متاثر ہو گئی۔مجھے دُکھ ہے کہ اس کا نازک دل ٹوٹ جائے گا۔لیکن آپ کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد وہ بھی آپ پر نفرت سے تھوک دے گی۔کمینے مجرم! تم میری بہن کو ورغلا کر اپنے جال میں پھانس رہے تھے۔میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔'' اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور میں صوفے پر لیٹ گیا۔میرے دل کی دھڑکنیں بند ہوا چاہتی تھیں۔پورا کمرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔میں اُس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔
''رقم کہاں ہے؟'' اُس نے کڑک کر پوچھا۔
''بب........بریف کیس میں........بریف کیس میں۔'' میں نے کانپتے ہوئے کہا۔
''کہاں ہے، بریف کیس؟'' وہ کھڑا ہو گیا۔
''پپ........پلنگ کے نیچے!'' میں ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔اُس نے اپنا سروس پستول نکالا اور اُس کا رُخ میری طرف کر دیا۔
''اگر ہلنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔'' وہ گرجدار آواز میں بولا اور پھر پستول سے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''کھڑے ہو جاؤ!'' اور میں صوفے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔اگر اُس کے ہاتھ میں پستول نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے، میں کبھی کھڑا نہ ہو سکتا۔''چلو........بریف کیس نکالو!'' اُس نے پستول

سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ میں نے بریف کیس اُس کے سامنے سرکا دیا، لیکن خود میرا دل پلنگ کے نیچے سے نکلنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''باہر آؤ۔'' وہ پھر اسی انداز میں بولا اور چاروناچار مجھے یہ کمزور پناہ گاہ چھوڑنی پڑی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ لیکن میرے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اُس نے بریف کیس اُٹھا لیا اور پستول کا رُخ میری طرف کئے ہوئے اسے کھول کر دیکھا، پھر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے اسے بند کر دیا۔'' کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''چلو!'' اُس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے پستول ہولسٹر میں رکھ لیا تھا، یہی اُس کی عنایت تھی۔ ورنہ اگر وہ ہتھکڑیاں لگا کر لے جاتا تو میں کیا کرتا۔ نیچے چند اور پولیس والے موجود تھے، جو یقیناً اُس کے ساتھ آئے تھے اور وہ اُنہیں نیچے چھوڑ آیا تھا۔ یقیناً پولیس والوں نے ہوٹل کے عملے کو تفصیل بتا دی تھی۔ ان لوگوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور آصف مجھے لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ باہر پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔

پولیس والوں نے مجھے جیپ میں بٹھایا۔ آصف آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا اور جیپ چل پڑی۔ میرا ذہن تاریک تھا، دل بیٹھ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کوئی خیال ذہن میں نہیں تھا۔ مناظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ لیکن میں ان سے بے بہرہ تھا! یہاں تک کہ جیپ، پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ پولیس والوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اُتارا اور اندر لے چلے۔ چند منٹ کے بعد میں آصف کے دفتر میں ایک کرسی پر سمٹا ہوا بیٹھا تھا اور آصف میری فائل پڑھ رہا تھا۔ پھر اُس نے گھنٹی بجا کر ہیڈ محرر کو بلایا۔

''ہیڈ آفس کو اطلاع دو کہ ڈکیتی کا مجرم عارف پکڑا گیا ہے۔ سیٹھ حشمت اور وہاں کی پولیس کو تار دے دیا جائے۔''

''یس سر!'' ہیڈ محرر نے کہا اور گردن جھکا کر باہر چلا گیا۔ آصف نے ایک سگریٹ سلگائی اور اُس کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے بولا۔

''کیا یہ تمہارا پہلا جرم ہے؟''

اور میری آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔ میں اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

''جواب دو۔ اور کہاں کہاں کیس کئے ہیں؟ کبھی پکڑے گئے ہو یا نہیں؟''

''میں مجرم نہیں ہوں، انسپکٹر صاحب!...... میں مجرم نہیں ہوں۔'' میں رو پڑا۔ ''مجرم زرینہ ہے جس نے مجھے ٹھکرا کر اختر بیگ سے شادی کر لی۔ صرف اس لئے کہ مجھے ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور اُسے گیارہ سو! میں نے یہ رقم صرف اس لئے حاصل کی تھی کہ کسی پُرسکون گوشے میں پُرسکون زندگی گزار سکوں۔'' میں نے روتے ہوئے بتایا۔

''کیا نام لیا...... اختر بیگ...... یہ کون ہے؟'' اُس نے فائل کے اوراق اُلٹتے ہوئے کہا۔

''حشمت برادرز کا اکاؤنٹنٹ'' میں نے جواب دیا اور اُس نے گردن ہلائی۔

''ہاں...... تمہاری جگہ وہی تھانے میں بند ہے۔'' اُس نے کہا اور اس افتاد میں پہلی بار میرے دل

میں خوشی کی ایک لہر بیدار ہوگئی۔ اختر بیگ، تھانے میں بند ہے........اُس کی شادی کی تاریخ نکل گئی۔ مجھے اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔

''اصل مجرم وہی دونوں ہیں، انسپکٹر صاحب! اُنہوں نے ہی مجھے اس کام کے لئے مجبور کیا تھا۔''

''ہوں........تو تم کسی زرینہ سے بھی عشق لڑا چکے ہو۔ اور میری بہن کو بھی دھوکا دے رہے تھے۔ مجھے بے وقوف نائلہ پر بھی غصہ ہے۔ اُس کے دل نے تمہیں کیسے قبول کیا؟ اگر یہ اُس شہر کی پولیس کا معاملہ نہ ہوتا، مردود! تو میں تجھے جہنم میں دھکیل دیتا۔ کم از کم دس سال کی سزا کراتا۔'' انسپکٹر آصف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس پر میری اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس پر میری داستانِ غم کا کوئی ردِعمل نہ ہوا تھا۔ اُس کے روّیے میں کوئی لچک نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک سب انسپکٹر اندر آ گیا۔ اُس نے سلیوٹ مارا اور بولا۔ ''مجرم کو ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا ہے، جناب!''

''لے چلو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔'' انسپکٹر آصف نے کہا اور سب انسپکٹر نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے اٹھا لیا۔ اس بار مجھے پولیس کی ایک وین میں بٹھایا گیا تھا۔ ویسے اب میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ جو تقدیر میں لکھا ہے، پورا ضرور ہوگا۔ میں ہونی کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ پولیس مجھے میرے شہر پہنچا دے گی، مقدمہ چلے گا، سزا ہو جائے گی۔ بس! انجام یہی تھا۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وین، پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوگئی۔ مجھے نیچے اُتار کر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے ایس پی صاحب کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ ایس پی صاحب اس وقت موجود نہیں تھے، اس لئے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ ایک بینچ پر بیٹھے بیٹھے مجھے کئی گھنٹے گزر گئے، پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور دو سپاہی مجھے ایس پی صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ ایس پی کی بارعب شکل دیکھ کر میرا دل لرزنے لگا۔ آصف بھی وہیں موجود تھا۔

''کیا تمہارا نام، عارف جمال ہے؟''

''جی!'' میں نے گردن ہلائی۔

''تعلیم کتنی ہے، تمہاری؟''

''گریجویٹ ہوں۔''

''تم نے حشمت برادرز کے کیش سے رقم نکالی ہے؟''

''جی ہاں!''

''فرار ہونے کے بعد تم نے باقی وقت کہاں گزارا؟''

اور میں سوچ میں گم ہوگیا۔ میں اس وقت کے بارے میں ان لوگوں کو کیا بتاتا۔ کوئی یقین نہ کرتا۔ بتانا بے سود تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''شاہ پور!''

''وہاں تمہارا کوئی معاون ہے؟''

''جی نہیں........میں پوری دنیا میں تنہا ہوں۔''

''شاہ پور میں تم نے کہاں قیام کیا تھا؟''
''ایسے ہی آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔
''اس دوران تم نے کتنی رقم خرچ کی؟''
''تقریباً دو سو روپے۔''
''ہوں......ٹھیک ہے، انسپکٹر! اسے لاک اپ کر دو۔ ہمارا کیس نہیں ہے۔ بقیہ معلومات خود وہ حاصل کریں گے۔'' ایس پی نے کہا اور انسپکٹر نے گردن ہلا دی۔ ایک بار پھر مجھے اس کمرے سے نکال لایا گیا۔ وہ لوگ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہاں میری انگلیوں وغیرہ کے نشانات لئے گئے اور پھر مجھے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ میرا دماغ سن تھا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں سرسرا رہے تھے۔ اختر بیگ بھی لاک اپ میں ہے۔ یہ بہر حال، بڑی خوشی کی بات ہے۔
لاک اپ میں دوسرے کچھ لوگ بھی تھے۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔
''چوری کے الزام میں آئے ہو، بابو جی؟''
''لونڈیا کو چھیڑا ہے؟''
''کسی کے گھر میں اُتر گئے تھے کیا؟''
''کوئی لڑکی نکال لی تھی کیا؟''
ایسے ہی دوسرے سوالات۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانا دیا گیا۔ لیکن یہاں تو سانس لینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، کھانا کون کھاتا۔ پھر قیدی سونے کا بندوبست کرنے لگے۔ مجھے بھی ایک بدبودار کمبل دے دیا گیا اور میں آدھا کمبل بچھا کر اور آدھے میں منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ نیند کوسوں دُور تھی۔ کس حال کو پہنچ گیا تھا۔ بہر حال، بھگتنا تھا۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن رونے پیٹنے سے کیا فائدہ؟
رات گزرتی رہی۔ لاک اپ کا پیلا بلب سلگتا رہا، پھر میرے برابر لیٹے ہوئے قیدی نے میری کمر میں اُنگلی چبھوئی اور میں اُچھل پڑا۔ میں نے کمبل سے منہ نکال کر اُسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن یہ کیا؟......مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ........ وہ تو میرا ہی ہم شکل تھا۔ ہاں، سو فیصدی میرا ہم شکل۔ حالانکہ دن میں یہ قیدی لاک اپ میں نہیں تھا۔ اس وقت کہاں سے آ گیا۔ میں اُسے گھورتا رہا۔
''کیا سوچ رہے ہو، دوست؟'' اُس نے کہا۔
''تت......تم کون ہو؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔
''طالوت......!'' اُس نے جواب دیا۔

میں خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔ وہ ہو بہو میرا ہم شکل تھا۔ بس، یوں سمجھ لیں، جیسے آئینہ سامنے رکھا ہو۔

''نیند آ رہی ہے؟'' اُس نے بدستور اسی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے بادل ناخواستہ نفی میں سر ہلایا۔

''تب پھر اُٹھ کر بیٹھو، یار! باتیں کریں گے۔'' اُس نے بے تکلفی سے کہا اور کمبل اُتار کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے میرا کمبل بھی کھینچ کر اُتار دیا۔ میں گھبرائے ہوئے انداز میں اُٹھ بیٹھا۔ دوسرے قیدی مزے سے سو رہے تھے اور باہر گارڈ کے بھاری قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے بھی اُسی کے انداز میں دیوار سے پشت لگائی اور کمبل پیروں پر کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے۔

''تمہارا نام، عارف جمال ہے؟'' اُس نے کہا۔

''ہاں۔ مگر تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا اور وہ پھر اسی انداز میں مسکرانے لگا۔

''یوں تو دنیا میں بہت سے رشتے ہوتے ہیں۔ بہن، بھائی، دوست، والدین........ لیکن ہمارے تمہارے درمیان ایک عجیب رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ ہم شکل ہونے کا رشتہ۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ ہم دونوں کی شکلوں میں سرمو فرق نہیں ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری حیرت بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب میں اُس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ''ہاں، یہ تو درست ہے۔ ہم کہیں بھی ہوتے، ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ مشابہت اس حد تک ہے کہ خود میرے والدین تمہارے بارے میں دھوکا کھا گئے۔'' اور اُس کے ان الفاظ پر میں تعجب سے اُچھل پڑا۔ میرے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ اور میں نئے سرے سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔ کہیں یہ وہ تو نہیں ہے، جس کے دھوکے میں مجھے ٹرین سے اغواء کیا گیا تھا؟ میں تعجب خیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اور وہ شاید میرے دل کی بات سمجھ گیا۔

''تمہارا خیال درست ہے، میرے دوست! مجھے اسی دن اطلاع مل گئی تھی، جب تمہیں میرے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔''

''اوہ........ مگر........ مگر........!'' میں نے شدید حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''سب کچھ بتا دوں گا، یار!'' اُس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا، اور پھر سوچنے لگا۔ میں خاموشی سے اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اُس نے اپنا نام طالوت بتایا تھا، جبکہ وہاں اُسے

یوسف عبران کے نام سے یاد کیا گیا تھا۔ گو، طالوت بھی بذاتِ خود عجیب نام تھا، لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت ایسی ہی ہو رہی تھی کہ اس نام کے عجیب ہونے پر غور نہ کر سکا۔

''یوں سمجھ لو۔'' اُس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کہ میں وہاں کے حالات سے بے خبر نہیں رہتا۔ بات یہ نہیں ہے کہ مجھے اپنے والدین سے محبت نہیں۔ صرف ضد کی بات ہے۔ بھلا اُنہیں میری تفریحات پر اعتراض کیوں ہے؟ تم خود غور کرو، تم ایک جوان آدمی ہو۔ خود مختار ہو۔ اب چند پرانے خیالات کے بزرگ تمہارے اوپر پابندیاں لگانے لگیں تو تم کیسے برداشت کر سکو گے؟ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموشی سے وہاں سے نکل آؤں۔ اور یہی کیا۔ اب وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ پریشان نہیں ہیں۔ اگر وہ پریشان ہوتے تو مجھے والدین کی محبت کی وجہ سے واپس جانا پڑتا۔ لیکن وہاں میرے آدمی موجود ہیں۔ اور انہوں نے ہی مجھے تمہارے بارے میں اطلاع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شاہ کے ہرکارے کسی ایسے آدمی کو پکڑ لائے ہیں، جو میرا ہم شکل ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بہر حال، میں خوش تھا کہ اُنہیں میرا نعم البدل مل گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سر پھرے ہو۔ ارے یار! عیش کرتے، میری جگہ رہتے۔ بہر حال، وہ دنیا تمہارے لئے عجیب ہوگی۔''

''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے شہنا یاد آ گئی تھی۔

''بہر صورت، میرے دوست مجھے پل پل کی اطلاع دیتے رہے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ تم بے حد نیک انسان ہو اور تم نے صاف کہہ دیا کہ تم وہ نہیں ہو، جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ تمہیں وہاں سے نکال دیا گیا ہے۔ تب مجھے دکھ ہوا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے تمہارے بارے میں معلوم کیا اور وہ تمہیں تلاش کرنے لگے۔ پھر آج مجھے اطلاع ملی کہ تم یہاں ہو، تو میں، تم سے ملاقات کرنے چلا آیا۔ ظاہر ہے، مجھے تم سے دلچسپی ہے۔ کیونکہ تم میرے ہم شکل ہو۔''

میں اب بھی متعجب نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

''مگر دوست! وہاں تو تمہارا نام یوسف عبران لیا گیا تھا۔''

''ہاں...... اُن لوگوں نے میرا نام یہی رکھا ہے۔ لیکن مجھے اس نام سے نفرت ہو گئی ہے۔ جیسا ثقیل نام، ویسی ہی ثقیل زندگی۔ پابندیوں میں گھری ہوئی۔ اب میں نے اپنا نام طالوت رکھا ہے۔ یہ نام مجھے بچپن سے پسند ہے۔ طالوت میرا دوست تھا، جس کا میرے بچپن میں انتقال ہو گیا۔'' اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

میرے ذہن سے حیرت کی دُھند چھٹتی جا رہی تھی۔ اب میں سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان میں دلچسپی لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے دل سے پریشانیاں دور ہو گئی تھیں۔ وہ پراسرار دنیا میرے حواس پر ابھر آئی تھی، جس میں، میں نے بڑے رنگین، بڑے عجیب لمحات گزارے تھے۔ میں اس دنیا کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

''اس عجیب ماحول اور عجیب جگہ پر تم سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی، میرے دوست! میں ایک عام سا انسان ہوں۔ تمہاری دنیا نے حیرت کے چند نقوش میرے ذہن پر چھوڑے ہیں۔ میں تمہاری دنیا کے بارے میں کچھ جاننے کا خواہش مند ہوں۔ کیا تم میری یہ خواہش پوری کر دو گے؟''

''جب ہم دوست بن ہی گئے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہمیں ایک دوسرے کے اس قدر قریب لے آیا

ہے تو پھر ایک دوسرے کی خواہشات کی تکمیل ہم پر فرض ہو جاتی ہے۔ کیا خیال ہے؟''
''بے شک!'' میں نے گردن ہلائی۔ ''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا، تا کہ ہمارا تعارف مکمل ہو جائے اور پھر میں بھی تم سے تمہارے اور تمہاری دنیا کے بارے میں سوالات کروں گا۔''
''مجھے تمہارے سوالات کے جواب دے کر خوشی ہوگی۔ ہاں، تو تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''
''کیا تم شہزادے ہو؟''
''ہاں......اپنی ریاست کے حکمران کا بیٹا ہوں۔''
''تمہاری ریاست کا نام کیا ہے؟''
''اسے ساستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔''
''ساستان......؟'' میں نے اس عجیب نام کو دُہراتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔''
''مگر یہ نام میرے لئے اجنبی ہے۔ شاید نقشے پر بھی اس کا وجود نہیں ہے۔''
''ہاں۔ کیونکہ اس کا تعلق دنیا کے نقشے سے نہیں ہے...... ہماری ریاستوں کے نقشے تمہاری دنیا سے الگ ہیں۔''
''کیوں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔
''کیونکہ ہمارا تعلق تمہاری دنیا سے نہیں ہے۔''
''پھر کہاں سے ہے؟''
''بڑے بھولے ہو، یار! ہم تم سے جدا ہیں۔ یوں سمجھ لو، تمہارا خمیر مٹی سے اُٹھا ہے اور ہم آگ سے بنے ہوئے ہیں۔''
''جن......!'' میں نے خوف سے اُچھلتے ہوئے کہا۔
''ہاں، ہاں۔ جن۔ مگر حواس قائم رکھو۔ ہم آدم خور نہیں ہوتے، تمہاری طرح کی مخلوق ہیں۔ تم سے قدرے مختلف۔ اور بس۔'' اُس نے جواب دیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔
''منہ بند کرلو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا'' اُس نے جھلاّئے ہوئے انداز میں کہا اور میں نے جلدی سے اپنا حیرت سے کھلا ہوا منہ بند کرلیا۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ اور دوست صرف دوست ہوتے ہیں۔ ان پر شک کرنا دوستی کی توہین ہے۔''
''تو......تو شہنا، پری زاد تھی؟'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور وہ چونک پڑا۔
''شہنا......اوہ......'' اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیسی تھی؟ سچ سچ بتانا۔ جھوٹ نہیں چلے گا۔''
''بہت دلکش۔ بے حد حسین۔''
''بات بن چکی ہے؟'' اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
''ناراض تو نہ ہوگے؟''
''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یار! اور پھر وہ لونڈیا تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چلو اچھا ہوا۔ میں نہ سہی، میرا ہم شکل سہی۔ اُس کی آرزو تو پوری ہوگئی۔ مگر سچ بتانا، کیا وہ تمہاری دنیا کی لڑکیوں کے مقابلے کی

تھی؟"

"ان سے کہیں زیادہ حسین۔ کہیں زیادہ دلکش۔"

"بکواس........ میں نہیں مانتا۔" اُس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تمام واقعات میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ میں اسے اپنی دنیا کی کوئی ریاست سمجھا تھا، مگر وہ جنوں کی گڑھی تھی۔ جہاں میں نے وہ دلکش لمحات گزارے تھے، وہاں کا پورا ماحول پُراسرار تھا۔ لیکن اس وقت میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں کن لوگوں میں ہوں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ مجھے وہاں سے نکال دیا گیا۔ ورنہ حقیقت معلوم ہونے پر میرا تو ہارٹ فیل ہی ہو جاتا۔

"اصل میں بات یہ ہے، دوست! میرا نام یوسف عبران ہے۔ اپنی ریاست کے حکمران کا بیٹا ہوں۔ ہونے والا حکمران۔ مگر مجھے اپنی دنیا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ میں نے تمہاری دنیا کے دل کش نظارے دیکھے۔ یہ گہما گہمی سے بھرپور ہے۔ یہاں زندگی رقص کرتی ہے، ہنگامے ہوتے ہیں۔ اور مجھے ہنگامے بہت پسند ہیں۔ اس کے برعکس میری دنیا میں، جہاں اطاعت ہی اطاعت ہے، نیکیاں ہی نیکیاں ہیں۔ ایک جمود طاری ہے، اس دنیا پر۔ ایک لگی بندھی زندگی ہے۔ ہنگامے نہیں ہیں۔ ہر چیز کا حصول آسان ہے۔ ایک نگاہ اُٹھا دو، ہر چیز حاضر۔ نہ کوئی تگ و دو، نہ جدوجہد۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی ہے؟ میں، تمہاری دل کش دنیا کا ہمیشہ سے دلدادہ تھا۔ کئی بار میں نے اس دنیا میں آنے کی اجازت مانگی، لیکن نہ ملی۔ تب میں ایک رات خاموشی سے فرار ہو گیا۔ میں تمہاری دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ یہاں انوکھا پن ہے، نت نئے لوگ ہیں۔ سرکش، باغی، خونخوار، مقابلے پر آنے والے۔ ان لوگوں کے درمیان زندگی بہت حسین ہے۔ مجھے اپنی دنیا سے آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے ہیں۔ میں یہاں سے ناواقف ہوں۔ ابھی تک میں نے صرف خود کو پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کی ہے۔ اب میں اس دنیا کو دیکھنا چاہتا ہو۔ مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے۔ ایک قابلِ اعتماد دوست........ جو میرے ساتھ رہے۔ مجھے اپنی دنیا سے پوری طرح روشناس کرائے۔ اور، ہی ہی ہی۔" وہ شرمائے ہوئے انداز میں ہنسا۔ "میں، یہاں کی لڑکیوں سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہے میری زندگی کی تفصیل۔ بس، اس کے بارے میں مزید سوالات نہیں کرو گے، کیونکہ وہ سب فضول ہوں گے۔"

"کافی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اصل میں دوست! یہ فطرت کی بے چینی ہے۔ تبدیلی کی خواہش انسانی فطرت کا جزو ہے۔ زندگی تحریک کا نام ہے۔ میں تم سے متفق ہوں۔ مجھے تمہاری دنیا پسند آئی تھی۔ میرے لئے یہ دنیا دُکھ کی گھڑی ہے، جو تمہارے لئے دلکش ہے۔ بہرحال، مجھے خوشی ہے کہ مجھے تم جیسا دوست مل گیا۔"

"میں بھی خوش ہوں۔ اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" اس نے کہا۔

"تم میرے نام سے واقف ہو۔ پوری دنیا میں تنہا ہوں۔ اس دنیا کی عورت کی بے وفائی کا شکار ہوں۔" میں نے زرینہ، انجلا، حشمت سیٹھ اور اپنی اب تک کی زندگی کے مختصر واقعات اُسے سنائے۔ وہ پوری دلچسپی سے میری کہانی سن رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک رقصاں تھی۔ میں اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔

"بے حد دلکش........ بے حد حسین........ زندگی سے بھرپور۔" وہ میرے خاموش ہونے کے بعد

ایک گہری سانس لے کر بولا اور میں اُسے تعجب سے دیکھنے لگا۔ وہ ایسی بے تکی زندگی کو حسین کہہ رہا تھا، جس میں پریشانیوں اور دُکھوں کے سوا کچھ نہ تھا!

’’تم اس زندگی کے حُسن سے ناواقف ہو، میرے دوست! جبکہ مجھے تمہاری اس زندگی کے تصور سے ہی لطف محسوس ہو رہا ہے۔‘‘ اُس نے پھر کہا اور میں جل گیا۔

’’ہاں۔ کل جب یہ پولیس والے میری رگوں سے خون نچوڑیں گے، تب مجھے معلوم ہو گا۔ وہ منظر بھی تمہارے لئے دل کش اور زندگی سے بھرپور ہو گا۔‘‘

’’مجال ہے کسی کی۔‘‘ اُس نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ’’تم میرے دوست ہو۔ کس کی ہمت ہے کہ میرے دوست کو کوئی تکلیف دے سکے۔ رقم پولیس کو مل گئی، اب اسے کیا چاہئے؟‘‘

’اگر تمہاری ریاست کا یہی قانون ہے تو کاش میں اسی ریاست میں پیدا ہوتا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’جانے دو یار! یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میرا وعدہ ہے۔ ہاں، یہ بتاؤ کہ کیا تم بھی میری دوستی قبول کر لو گے؟ کیا تم مجھے اپنی دنیا کی سیر کراؤ گے؟‘‘

’’میں جیل کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔ وہاں سے اگر زندہ بچ سکا تو پھر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ جہاں کہو گے، چلوں گا۔‘‘

’’اور اگر تم سرے سے جیل میں نہ جاؤ، تو؟‘‘

’’یہ اب ممکن نہیں ہے۔ میں رقم کے ساتھ پکڑا گیا ہوں۔‘‘

’’پھر وہی۔‘‘ وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ’’کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں گرفتار کرنے والوں کو تمہارے سامنے لا کر مرغا بنا دوں؟‘‘

’’اگر تم یہ کر سکتے ہو تو یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب ہی کرو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کمال ہے...... میرے لئے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں جس طرح یہاں آیا ہوں، نکل بھی سکتا ہوں۔‘‘

اور میں چونک پڑا۔ ہاں، یہ تو درست ہی ہے۔ میں نے سوچا۔ دن میں وہ نہیں تھا، لیکن اب رات میں پراسرار طور پر یہاں موجود ہے۔ میرے چہرے پر سرخی آ گئی۔

’’تو کیا تم، مجھے یہاں سے نکال سکتے ہو؟‘‘

’’کیوں نہیں۔ ابھی، اسی وقت۔ مگر یہاں سے کہاں چلو گے؟ اب تو رات ہو چکی ہے۔‘‘

’’کسی ہوٹل میں۔ کسی بھی عمدہ سی جگہ۔‘‘ میں نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

’’ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ویسے یہ جگہ بھی بری نہیں ہے۔ یہاں نیا پن ہے۔ کچھ انوکھی سی جگہ ہے یہ۔‘‘

’’فضول باتیں مت کرو، یار! میری جان پر بنی ہے اور تم......‘‘

’’اچھا، اچھا...... ناراض مت ہو۔ اُٹھو!‘‘ اُس نے کہا۔

’’تالا لگا ہوا ہے، بھائی!‘‘ میں نے لاک اپ کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ’’ممکن ہے، تم ان سلاخوں سے گزر سکو، لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔‘‘

’’سب کچھ ممکن ہو جائے گا۔‘‘ اُس نے کہا۔

اور پھر اُس نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے اور سانس اندر کھینچنے لگا۔ میں حیرت

سے اُس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود گارڈ کو سلاخوں کی طرف آتے دیکھا، لیکن اُس کے آنے کا انداز...... ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ تیز آندھی کے جھکڑوں کے ساتھ کھنچا چلا آ رہا ہو۔ وہ عجیب سے انداز میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر وہ سلاخوں اور دروازے سے ٹکرایا اور طالوت نے سلاخ سے ہاتھ باہر نکال کر اُس کی گردن پکڑ لی۔ گارڈ کے منہ سے ایک آواز نکل گئی لیکن طالوت نے دوسرے ہاتھ سے اُس کا منہ بھینچ لیا۔ پھر اُس نے سپاہی کی گردن چھوڑی اور اُس کے لباس میں تالے کی چابی ٹٹولنے لگا۔ چابی نکال کر اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اُس کا ہاتھ کافی لمبا ہو گیا جس سے اُس نے اطمینان سے تالا کھول لیا۔ اور پھر چابی دوبارہ گارڈ کے لباس میں رکھ کر اُس نے دروازہ کھولا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے دانت پیس کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور پھر میری گردن پکڑ کر مجھے باہر دھکیل دیا۔ میں گرتے گرتے بچا اور سنبھل کر خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرے خیال میں یہاں دوسرے گارڈ بھی موجود ہوں گے اور لاک اپ سے فرار ہونے والے کو گولی بھی ماری جا سکتی ہے۔

لیکن یہ کیا......؟ میں، پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں تو نہ تھا۔ نہ جانے یہ کون سی جگہ تھی۔ سامنے ہی ایک چوڑی سڑک نظر آ رہی تھی، جس پر دو رویہ لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے۔ دُور دُور تک سناٹے کا راج تھا۔ اور طالوت میرے برابر موجود تھا۔

"میں نے تمہیں، اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس لئے بات بات پر حیرت سے آنکھیں مت نکالا کرو۔ تمہارے کھلے ہوئے منہ کو دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔" اُس نے کہا۔

"مم...... مگر یہ کون سی جگہ ہے؟"

"وہاں سے تقریباً ایک میل دُور ہے، جہاں تم بند تھے۔" اُس نے جواب دیا۔

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ ایک میل کا سفر صرف اس دوران طے ہوا تھا، جب اُس نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا اور میں چند قدم لڑکھڑایا تھا۔ چند لمحات تو میں حیران اور خوف زدہ رہا، پھر میرے دل کے تاریک گوشوں میں مسرت کی ایک لہر اُٹھی۔ میں ایک ایسی ہستی کا دوست بن گیا تھا، جو مافوق الفطرت تھی اور سب کچھ کر سکتی تھی۔ مجھے ایک بہت بڑا سہارا مل گیا تھا، چنانچہ اب میرے چہرے پر حقیقی خوشی اُبھر آئی۔

"تم...... تم بے حد عظیم ہو، میرے دوست! مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔" میں نے کہا۔

"تب پھر وعدہ کرو کہ میری ہر بات پر حیرت کا اظہار نہیں کرو گے۔"

"وعدہ!" میں نے اُس کے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھامتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

"اب یہ بتاؤ، رات کہاں گزاری جائے؟ تمہاری دنیا کے آداب بھی تو مجھے معلوم نہیں ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں، ہاں...... پوچھو!"

"کیا تم دولت بھی مہیا کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ کیا چاہیے؟" اُس نے پوچھا۔

''تھوڑی سی کرنسی، کچھ سامان۔''

''سامان کی فہرست بتاؤ۔''

''بھئی، ایک دو سوٹ کیس، ہم دونوں کے کچھ لباس۔ جدید دنیا کے مطابق۔''

''راسم........!'' اُس نے اپنے بائیں سمت رُخ کر کے کسی کو آواز دی اور میں چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اور پھر تاریکی سے ایک دُبلا پتلا آدمی نمودار ہوا۔ اُس نے ایک ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا۔ ''دو سوٹ کیس۔ جن میں ہم دونوں کے ناپ کے لباس موجود ہوں اور کرنسی........ جلدی۔'' اُس نے آرڈر دیا اور راسم نے گردن جھکا دی۔ پھر وہ اسی طرف چلا گیا، جس طرف سے آیا تھا۔

''یہ کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ، راسم۔ یہ میرا غلام ہے۔ بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ بے پناہ محبت کرتا ہے، مجھ سے۔ اور ایک راز کی بات بتاؤں، یہی میرے لئے میری ریاست کی مخبری کرتا ہے۔ اسی نے تو مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔''

''اوہ........'' میں نے گردن ہلائی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ میرے جسم میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ کیسا انوکھا دوست ملا تھا۔ کیسی دلچسپ زندگی گزرے گی اس کے ساتھ۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے میری زندگی کے تمام دُکھوں کا ازالہ ہو گیا ہو۔ جیسے اب مجھے کوئی فکر نہ ہو۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے کچھ فیصلے کئے۔ زندگی کی گھما گھمیوں میں پوری طرح دلچسپی لی جائے۔ ہر قسم کے ماحول سے لطف اندوز ہوا جائے۔ اسی طرح طالوت سے دوستی قائم رہ سکتی ہے۔

ہم چلتے رہے۔ چکنی اور چمک دار سڑک دُور تک بچھی ہوئی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ دفعتہً ہمیں اپنی پشت پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

راسم تھا۔ جس کے دونوں ہاتھوں میں وزنی سوٹ کیس لٹکے ہوئے تھے۔ میں، تھوک نگل کر رہ گیا۔

''چلے آؤ۔'' طالوت نے کہا اور پھر میری طرف رُخ کر کے بولا۔ ''کتنی دُور چلنا ہے؟''

''کسی عمدہ سے ہوٹل چلیں گے۔ میرا خیال ہے، رینبو عمدہ ہوٹل ہے۔''

''رین........ بو........!'' طالوت نے عجیب لہجے میں کہا اور مجھے ایک دم ٹھوکر سی لگی۔ میں سنبھلنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ طالوت نے مجھے سہارا دیا اور میں سنبھل گیا۔ لیکن اتنی دیر میں منظر بدل چکا تھا۔ سامنے ہی رینبو کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ میں بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ راسم بھی غائب تھا اور سوٹ کیس ہمارے قریب رکھے ہوئے تھے۔ میں نے حسب وعدہ حیرت کا اظہار نہیں کیا اور طالوت مجھ سے بولا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''تم یہاں رُکو۔ میں اندر جا کر کمرہ بک کراتا ہوں اور پورٹر کو لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اُس نے گردن ہلائی۔

''وہ، رقم........ کمرے کا کرایہ ایڈوانس دینا پڑے گا۔''

''اوہ........ رقم تمہاری جیب میں موجود ہے۔ جاؤ۔ جاؤ!'' اور میں نے تعجب سے جیبیں ٹٹولیں۔ پھر جیب میں رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں باہر نکالیں۔ سو سو کے نوٹوں کی چار گڈیاں تھیں۔

''چالیس ہزار۔'' میں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔
''کم ہوں تو سوٹ کیس سے نکال دوں؟'' طالوت نے پوچھا۔
''ایں........نن نہیں........ بہت ہیں........ بہت ہیں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ میں چھیاسی ہزار کی رقم گنوا بیٹھا تھا، گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن میرا دوست ایک اشارے پر چالیس ہزار روپے منگوا سکتا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ کم ہوں تو اور دوں۔ میری خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا۔ میرے قدم زمین پر نہیں ٹِک رہے تھے۔ اب میں محفوظ تھا۔ میرے ساتھ ایک طاقت ور دوست تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کاؤنٹر منیجر نے مجھے سرسری نظروں سے دیکھا۔
''ڈبل رُوم۔'' میں نے کہا اور اُس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔
''کہیں باہر سے تشریف لائے ہیں؟''
''ہاں۔'' میں نے کہا۔
''ہمارے ہاں کمرے بہت مہنگے ہوتے ہیں۔''
''بدتمیزی مت کرو، منیجر! رُوم بُک کرو اور کرایہ ایڈوانس لو۔'' میرا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ اور پھر اُس نے مجھے گھورتے ہوئے ایک رجسٹر اُٹھا لیا۔ اس میں اندراجات کئے اور پھر بولا۔
''دو سو ساٹھ روپے۔ کل شام تک کے لئے۔''
''ہم زیادہ دن رہیں گے۔'' میں نے کہا اور جیب سے ایک گڈی نکال کر اُس میں سے دس نوٹ کھینچے اور منیجر کی طرف بڑھا دیئے۔ منیجر گڈی دیکھ کر ہی اُچھل پڑا۔ ''ختم ہو جائیں تو اور منگوا لینا........اور یہ تمہارا ٹپ۔'' میں نے ایک نوٹ مزید کھینچ کر اُس کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔
''پورٹر!........ پورٹر!'' منیجر بدحواس ہو کر چیخا اور پھر جلدی سے اپنے کیبن سے باہر کے دروازے کی طرف لپکا۔ ''ہری اپ۔ صاحب کا سامان اُٹھا کر لاؤ۔ جلدی کرو!'' اور پھر وہ ایک چابی اُٹھا کر میرے ساتھ نکل آیا۔ ''تشریف لایئے، جنابِ والا! آیئے۔ بہت خوب صورت کمرہ پیش کروں گا۔ آپ کے شایانِ شان ہوگا۔'' وہ جھک کر بولا اور میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔
''ٹھہرو، میں اپنا سامان اُٹھوا لوں۔'' میں نے کہا اور وہ میرے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل آیا۔ طالوت دونوں سوٹ کیسوں کے قریب کھڑا تھا۔ پورٹر اُس کے نزدیک پہنچ گیا تھا اور گردن اُٹھا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔
''یہی سامان ہے، جناب؟''
''ہاں۔ اُٹھاؤ!'' میں نے کہا اور اُس نے جھک کر دونوں سوٹ کیس اُٹھائے۔ ''آؤ دوست!'' میں نے طالوت کی طرف رُخ کر کے کہا اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ منیجر ہم دونوں کے پیچھے مؤدب چل رہا تھا۔ اس طرح ہم رینبو ہوٹل کے رُوم نمبر گیارہ میں پہنچ گئے۔ کمرہ واقعی خوب صورت تھا۔ منیجر نے پورٹر کو ہدایت کی کہ ہمارا سامان درست کر دے۔ پھر اُس نے بڑے ادب سے پوچھا۔
''کسی چیز کی ضرورت ہے، جناب؟''
''ہاں........ اگر مل سکے تو کافی اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھجوا دو۔''

''ابھی پیش کرتا ہوں۔ دوسرے صاحب ابھی تشریف نہیں لائے؟''
''کیا مطلب؟'' میں نے تعجب سے دیکھا اور اسی وقت طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔
''مم........ میرا مطلب تھا کہ........ وہ دوسرے صاحب؟'' منیجر نے کہا۔
''یہ مجھے نہیں دیکھ سکتا۔'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی اور میں چونک پڑا۔ پھر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلائی۔
''وہ ابھی آتے ہوں گے۔ تم دو آدمیوں کے لئے کافی بھیجو۔''
''بہت بہتر۔'' منیجر نے گردن ہلائی اور ایک بار پھر پورٹر کو ہدایات دے کر باہر چلا گیا۔
''ٹھیک ہے، دوست! سامان وغیرہ دن میں رکھ دیا جائے گا۔ بس، اب تم جاؤ۔'' میں نے پورٹر کو بھی سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس سے چھوٹے نوٹ میرے پاس نہیں تھے۔ پورٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر وہ مجھے جھک جھک کر سلام کرتا ہوا باہر نکل گیا اور میں نے گہری سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا۔
''تو وہ لوگ، تمہیں نہیں دیکھ سکتے؟''
''کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا، سوائے اس کے، جسے میں چاہوں۔ اور میرا خیال ہے، دیکھنا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ ہم دونوں ہم شکل ہیں۔ خوامخواہ لوگوں کی نگاہوں کا نشانہ بنیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
طالوت، سوٹ کیسوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر اُس نے دونوں سوٹ کیس کھول دیئے۔ ان میں بے شمار سوٹ، قمیص اور ٹائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ سوٹ تھا، ایک سے ایک نفیس ٹائی تھی۔ طالوت نے ایک سوٹ نکال لیا۔
''اسے پہننے میں میری مدد کرو........ میں نے ایسا لباس کبھی نہیں پہنا۔''
''ضرور........ لیکن یہ دن میں پہنیں گے۔ اس وقت تو رات کا لباس پہنو۔''
''کون سا ہے؟ مجھے بتاؤ۔''
اس نے کہا اور میں نے اسے ایک سلیپنگ سوٹ نکال کر دے دیا۔ سلیپنگ سوٹ اُس نے اطمینان سے پہن لیا اور پھر آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔ میرا اور اُس کا جسم یکساں تھا، اس لئے کوئی بھی لباس کوئی بھی پہن سکتا تھا۔ میں نے بھی سلیپنگ سوٹ پہنا اور پھر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''کیسا لگ رہا ہے، عارف؟'' اُس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''میں، ابھی تک سحر زدہ ہوں۔ خود کو خوابوں کی کیفیت میں محسوس کر رہا ہوں۔''
''خوابوں سے نکل آؤ، میرے دوست! میں حقیقت ہوں۔ اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ ایک نئی زندگی سے روشناس کرانے میں میری معاونت کرو۔ ہم دونوں مل کر زندگی کی تمام خوشیاں سمیٹ لیں گے۔''
''کاش میں تمہارے معیار پر پورا اُتروں۔ اور تم مجھے کبھی نہ چھوڑو۔'' میں نے کہا۔
''اوہ........ ہماری دوستی کچی نہیں ہے۔ ہمارے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہے۔ اس لئے وسوسے

دل سے نکال دو۔ تمہاری ہر تکلیف میری ہوگی۔ راحتوں میں ہم شانہ بشانہ ہوں گے۔"
"مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔" میں نے کہا اور طالوت چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا، جہاں قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ پھر ویٹر نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔
"آ جاؤ!" میں نے کہا اور ویٹر ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ ٹرالی پر رکھی کیتلی سے کافی کی اشتہا انگیز سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ طالوت زور زور سے سانس کھینچنے لگا۔
"اچھی خوشبو ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا اور میں چونک کر ویٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ویٹر نے طالوت کی آواز پر توجہ نہیں دی تھی۔
"وہ میری آواز بھی نہیں سن سکتا۔" طالوت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اور پھر ویٹر گردن جھکا کر واپس جانے لگا۔
"سنو! تم اسے کچھ نہ دو گے؟ میرا خیال ہے، اسے بھی ایک نوٹ دو۔" اور میں نے ویٹر کو آواز دی۔ گڈی سے ایک نوٹ کھینچ کر اُس کے حوالے کر دیا اور ویٹر کا منہ پھیل گیا۔ وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔
"کوئی اور چیز، حضور؟"
"نہیں، بس...... شکریہ۔" میں نے کہا اور اُس نے پھر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔
"کاغذ کے یہ ٹکڑے ان کی آنکھوں میں کیسی چمک پیدا کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ چمک بہت پسند ہے۔ ان کے چہروں پر ایک انوکھی خوشی بکھر جاتی ہے۔ ان ٹکڑوں کا اس خوشی سے کیسا عجیب تعلق ہے۔"
"ہاں، میرے دوست! کاغذ کے یہ حقیر ٹکڑے زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں۔ ان کے ذریعے ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ زندگی، خوشیاں، اُمنگیں، محبت۔ ہر چیز ان ٹکڑوں کے سامنے حقیر ہے۔"
"کیسی انوکھی بات ہے؟"
"یہ دنیا بھی عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ تمہاری دنیا کے عجائبات اس سے مختلف ہوں گے۔ اس سے انوکھے نہ ہوں گے۔"
"میں ہر عجوبہ دیکھوں گا۔ اور تم میرا ساتھ دو گے۔"
"میں اس وقت تک تمہارا ساتھ دوں گا، جب تک تم پسند کرو گے۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا اور اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک ایک چیز چکھنے لگا۔ بلاشبہ چیزیں اُسے بہت پسند آئی تھیں۔ میں بھی اُس کے ساتھ کھا رہا تھا۔ پھر میں نے اُسے کافی بنا کر دی اور اُس نے کافی کی کئی پیالیاں پی ڈالیں۔
"بہت عمدہ چیز ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔" اُس نے کہا۔ اُسے یہ تمام چیزیں عجیب لگ رہی تھیں۔ رات کے تین پہر گزر چکے تھے۔ اور پھر ہم نے کئی کپ کافی پی لی تھی، اس لئے نیند بھاگ گئی تھی۔ تاہم، ہم اپنے بستروں پر پہنچ گئے۔ وہ فوم کے نرم بستر پر لیٹ گیا۔
"نیند تو نہیں آ رہی؟" اُس نے پوچھا۔
"ان ہوش ربا واقعات کے بعد نیند کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم سے ملاقات کی خوشی اس آسانی سے برداشت نہیں ہوگی۔ اور پھر ہم نے جو چیز پی ہے، وہ نیند بھگانے میں اکسیر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

''اوہ.........!'' وہ ہنسنے لگا۔ پھر میری طرف رُخ کر کے بولا۔ ''کل کا کیا پروگرام ہے؟ سیر کرنے چلو گے؟''

''جہاں تم کہو گے، چلوں گا۔ تمہاری ہر خوشی مجھے عزیز ہے۔'' میں نے محبت سے کہا۔

''سنو! تم نے کئی محبوباؤں کی کہانی سنا ڈالی ہے۔ مجھے ہر ایک کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ تم اُن میں سے کسی سے مجھے نہ ملاؤ گے؟'' اُس نے اچانک کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ درست تھا کہ طالوت جیسے دوست کے مل جانے سے میں کسی قدر نڈر ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کام کسی حد تک ٹیڑھا تھا۔ ابھی میرے دل سے خوف دُور نہیں ہوا تھا۔

''یہاں، اس شہر میں صرف نائلہ ہے۔ یہ لڑکی مجھ سے کافی حد تک متاثر ہو گئی تھی، لیکن اب میری حقیقت جاننے کے بعد نہ جانے اس کے کیا خیالات ہوں گے۔'' میں نے کہا اور طالوت، کہنی مسہری پر لگا کر تھوڑا سا اٹھ گیا۔

''سنو، عارف! زندگی جذبات میں کھو کر تباہ کر لینا عقل مندی نہیں ہے۔ ہر شخص سے اچھے اور برے سلوک کی توقع رکھو، تاکہ جب تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے تو وہ تمہارے لئے غیر متوقع نہ ہو۔ اور برے سلوک سے بھی تمہارے اوپر کوئی اثر نہ پڑے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری دنیا میں انوکھے تجربے کروں۔ میرے وطن میں ایسی چیز کا فقدان ہے۔ خاص طور سے میرے ساتھ۔ میری ہر بات کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ جو کچھ میں کہوں، کروں، سب پر آمنا و صدقنا کہا جاتا ہے۔ یہی چیز مجھے ناپسند ہے۔ میں چاہتا ہوں، میرے دوست! کہ تم بھی صرف حقیقت پسند بن جاؤ۔ ہر فرد کو کھلونا سمجھو۔ جس کی جیسی فطرت ہوگی، ویسا ہی وہ کرے گا۔ ہم اُسے اُس کی فطرت کے خلاف کیسے مجبور کر سکتے ہیں؟ ہم تو صرف تماشائی ہوں گے۔ زندگی اپنا لو یار! جذباتیت کا ڈھونگ رچانا چھوڑ دو۔ میرے اوپر اعتماد کرو۔ میں، تمہارا بہترین دوست ثابت ہوں گا۔ بس، میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ایک ایک لمحہ تفریح میں گزاریں۔ ہر شخص سے لطف لیں، نت نئے ہنگامے کریں، انوکھا ماحول پیدا کریں۔ اور پھر اس ماحول کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوں۔ اگر تم اس بات پر تیار ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں، تم سے مایوس ہو جاؤں گا۔''

''نہیں، نہیں میرے دوست! تم جیسے دوست کو کھو کر اب میری زندگی بھی محال ہو جائے گی۔ میں، تمہارے مشورے پر غور کر رہا ہوں اور فیصلہ کر رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے!''

''ضرور کرو.......ضرور کرو۔'' وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور میرے ذہن میں خیالات گردش کرنے لگے۔ طالوت درست ہی کہہ رہا ہے۔ میری زندگی میں اب کیا رہ گیا ہے، سوائے اس کے کہ پولیس سے چھپتا پھروں، ویرانے اپنا لوں۔ دولت بھی چھن گئی، محبوباؤں نے بھی دھوکا دیا۔ گویا میری شخصیت مسخ کر دی گئی۔ دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو خودکشی کر لوں اور سکون کی نیند سو جاؤں، یا پھر دنیا کی تمام اقدار بھول کر خود کو ماحول میں ضم کر دوں۔ وہ کروں، جس میں مسرت و شادمانی ہو۔ خواہ اس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہو۔ اور پھر طالوت بھی برا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔ وہ صرف ایک کھلنڈرا نوجوان ہے، جو مافوق الفطرت ہے۔ اس کی مدد سے تو میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہوں۔ چنانچہ اسے خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ کیا نائلہ، کیا زرینہ.......میری نگاہ میں تو اب کسی لڑکی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اور میرے دل میں ایک زبردست بھونچال پیدا ہو گیا۔ محبت و ایثار کے تمام سوتے پھوٹ پڑے۔ لاوا نکل کر بہہ گیا۔ اور اب ایک سادہ سا غار تھا، جہاں نئی کونپلوں کو جنم لینا تھا!...... میں نے اپنی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ درحقیقت، میرے خیالات نے مجھے نیا انسان بنا دیا تھا۔ اور اب یہ انسان اچھا تھا یا برا، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی!

''سو گئے......؟'' کئی منٹ کے بعد طالوت کی آواز اُبھری۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سوچ رہے ہو؟''

''سوچ کیسی؟''

''خوب......!'' طالوت اُچھل کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ ''کیا سوچا؟''

''عیش کریں گے، ہنگامے کریں گے اور اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ بس، یہی زندگی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہُرا......!'' وہ خوشی سے چیخا اور اپنی مسہری سے کود کر میری مسہری پر آ گیا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں، یار! اور پھر تجھ جیسے دوست کے ساتھ مل کر تو میرے تمام مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی ہے، والدین کو دھوکا دے کر نکلا ہوں۔ اگر تُو مجھے مایوس کر دیتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔'' طالوت بے تکلفی میں مجھے تُو سے مخاطب کرنے لگا تھا۔ بہرحال، مجھے اُس کی یہ بے تکلفی پسند آئی۔ اور پھر ہم دوسرے دن کا پروگرام بناتے رہے۔ بہ مشکل تمام مجھے طالوت نے سونے کی اجازت دی تھی۔

دوسری صبح باتھ روم وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم نے نئے لباس تبدیل کئے۔ طالوت درحقیقت، زندہ دل نوجوان تھا۔ بچوں کی طرح شریر اور ہر چیز میں دلچسپی لینے والا۔ اس نے سوٹ پہنا اور مجھ سے ٹائی بندھوائی۔ پھر وہ پندرہ بیس منٹ تک ٹائی کھول کھول کر باندھتا رہا۔ اور جب تک خود صحیح ناٹ نہ لگا لی، سکون سے نہ بیٹھا۔

میں نے ویٹر کو بلا کر دو آدمیوں کا ناشتہ لانے کے لئے کہا۔

ہوٹل والے شاید مجھے خبطی سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ میں تنہا تھا، لیکن میں نے ڈبل رُوم حاصل کیا تھا۔ دو آدمیوں کے لئے کافی منگوائی تھی۔ اور اب دو آدمیوں کا ناشتہ طلب کر رہا تھا۔ بہرحال، میں نے جس انداز میں ٹپ دیا تھا، اس کے بعد اگر میں اُنہیں پتھر بھی مارتا، تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ برداشت کر لیتے۔

ناشتہ آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ویٹر اخبار بھی لایا تھا اور میں اخبار دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا، اور دوسرے لمحے اس خیال کی تائید ہو گئی۔ میرے فرار کی خبر اخبار میں موجود تھی۔ اخبار والوں نے حسبِ توفیق اسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی تھی۔ پولیس میری تلاش میں تھی اور اس نے اُمید ظاہر کی تھی کہ مجھے بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔

میں نے وہ خبر، طالوت کو دکھائی اور طالوت حقارت سے مسکرا دیا۔ پھر وہ ناشتہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن اب پولیس تمہیں کیوں گرفتار کرنا چاہتی ہے؟ اسے رقم تو واپس مل گئی۔''

"یہ میرے ملک کا قانون ہے، میرے دوست! جب تک وہ مجھے سزا نہ دے لیں گے، سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔"

"اُن کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی۔" طالوت نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ناشتہ سے فارغ ہو گئے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سگریٹ سلگا لی اور طالوت نے بھی مجھ سے ایک سگریٹ مانگی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے ایک سگریٹ دے دی اور وہ اسے میری طرح سلگا کر پینے لگا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ کم از کم چھ ماہ تک مسلسل پینے کے بعد معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال، اچھا لگتا ہے۔" اس نے کہا اور میرے انداز میں سگریٹ پینے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اُس لڑکی کے یہاں کس وقت چلو گے؟"

"وہ ایک کالج میں پڑھتی ہے۔ میرا خیال ہے، ہم اُسے کالج سے آتے ہوئے پکڑیں۔"

"جیسا مناسب سمجھو۔" اس نے کہا۔

"چھٹی کے بعد ہی مناسب رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اس دوران ہم شہر میں آوارہ گردی کریں گے۔"

"ضرور۔" اس نے کہا۔

"مگر طالوت!" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ "پولیس میری تلاش میں ہے۔ میرا شہر میں نکلنا سخت خطرناک ہوگا۔"

"ہوں........" وہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں بندوبست کرلوں گا۔ آؤ!"

میں نے شانے ہلائے اور اس کے ساتھ اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دل کی بات بتا رہا ہوں، میں خوف زدہ تھا۔ پوری طرح طالوت پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی کچے ذہن کا کھلنڈرا نوجوان تھا۔ ٹھیک ہے، اُس کی پوشیدہ قوتیں میرے کام آ سکتی تھیں، لیکن بہرحال کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ تاہم میں نے اس کا اظہار نہ کیا اور دل ہی دل میں اپنی خیریت کی دعائیں مانگتا رہا۔

"مجھے اپنی دنیا سے آئے ہوئے کافی دن ہو چکے ہیں، لیکن یقین کرو، عارف! ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ ایک دوست کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی، جو اس دنیا کا باشندہ ہو۔ اور حقیقت ہے کہ اگر چند روز اور اسی انداز میں گزرتے تو شاید میں مایوس ہو کر واپسی کا فیصلہ کر لیتا۔ یہ ماحول میرے لئے اجنبی ہے، لیکن اب تمہاری موجودگی میں........"

"فکر مت کرو۔ بس، مجھے اتنا سا افسوس ہے کہ میری پوزیشن خراب ہے۔ اگر صاف ستھرے حالات میں تم مجھے ملے ہوتے تو۔"

"اوہ........ میں کہہ چکا ہوں، اس کی فکر مت کرو۔" طالوت نے لاپرواہی سے کہا۔

اور پھر شام تک ہم آوارہ گردی کرتے رہے۔ دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھایا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ کوئی خاص طور سے میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔

شام پانچ بجے ہم نکل روڈ کے ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچ گئے۔ نائلہ کا کالج سامنے ہی تھا۔ کالج

سے لڑکیاں نکلنا شروع ہوگئی تھی۔ میں اُن میں نائلہ کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن آنکھیں پتھرا گئیں، ایک ایک لڑکی نکل گئی۔ اُن میں نائلہ نہیں تھی۔ آخری لڑکی کے نکلنے کے بعد میں مایوس ہوگیا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی۔

''ممکن ہے، کالج ہی نہ آئی ہو۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔''

''تمہیں اُس کا گھر تو معلوم ہے؟''

''ہاں۔''

''تب پھر، گھر چلیں گے۔''

''مگر.......''

''بس، طے ہے۔ رات کو اُس کے گھر چلیں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' طالوت نے کہا۔

بہر حال، اُس کی خواہش پوری کرنی تھی۔ رات کو پونے گیارہ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکلے۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور اُسے نائلہ کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں ٹیکسی نے نائلہ کے مکان کے نزدیک چھوڑ دیا۔

''اندر کس طرح داخل ہوں گے؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر طالوت سے کہا۔

''اس طرح۔'' طالوت نے اچانک میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گھبرا کر اُس کی کلائی پکڑی اور اُس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا دیا۔ اور پھر میں اُچھل پڑا۔ ہم نائلہ کے مکان کی اندرونی راہداری میں کھڑے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ حیرت کی کیا بات تھی؟ طالوت سے واقف ہونے کے بعد کسی قسم کی حیرت بے کار تھی۔ میں نڈر ہوگیا۔ میرا دوست، میری توقعات سے زیادہ طاقت ور ہے۔ بلاوجہ خوف زدہ ہوکر خود کو اُس کی نظروں سے نہیں گرانا چاہئے۔ میں نے اپنی بزدلی پر لعنت بھیجی اور پھر نائلہ کی خواب گاہ تلاش کرنے لگا۔ کئی کمروں میں جھانکنے کے بعد بالآخر مجھے نائلہ نظر آ گئی۔

وہ اپنی خوب صورت اور سادہ انداز میں سجی ہوئی خواب گاہ کی ایک کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی۔

''خوب.......خوب.......تو اندر چلو نا، یار!'' اُس نے بے چینی سے کہا اور میں نے دروازے پر ہاتھ ڈالا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون.......؟'' نائلہ کی مترنم آواز سنائی دی۔ لیکن میں نے کوئی جواب نہ دے کر دوبارہ دستک دی۔ ساتھ ہی ساتھ شیشے سے اندر بھی جھانکتا جا رہا تھا۔ نائلہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ سفید شب خوابی کے لباس میں وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔

''بہت حسین ہے۔'' طالوت نے میرا شانہ دباتے ہوئے کہا۔ لیکن میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے میرے ساتھ نائلہ کا رد عمل کیسا ہو۔

بہر حال، دروازہ کھل گیا اور نائلہ نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑیں۔ وہ میری شکل نہ دیکھ سکی تھی۔ میں جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔ طالوت بھی میرے پیچھے ہی تھا۔ اور پھر مجھے دیکھ کر نائلہ کے منہ سے

ایک ہلکی سی آواز نکل گئی۔ اُس کے چہرے پر خوف اور پھر غصے کے آثار نظر آئے۔
میں کمرے کے درمیان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ہونٹ بھینچے مجھے گھورے جارہی تھی۔ پھر اُس نے سخت آواز میں کہا۔
"کیوں آئے ہیں؟........ کیا چاہتے ہیں؟"
آواز اس قدر پُر رعب تھی کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میں نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے طالوت کی طرف دیکھا۔ وہ اس دلچسپ پچویشن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا!
"اگر کسی بری نیت سے آئے ہیں، تو صرف اتنا عرض کر دوں، مجھے اپنی عزت، اپنی زندگی سے زیادہ پیاری ہے۔"
"بری نیت سے تمہاری کیا مراد ہے، نائلہ؟" میں نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"آپ ایک جرائم پیشہ انسان ہیں۔ انسانی زندگی اور عورت کی عزت وعصمت کی آپ کی نگاہوں میں کیا وقعت ہوگی؟ اور پھر اس طرح کسی نوجوان لڑکی کی خواب گاہ........"
"بس، بس نائلہ!........ اس سے زیادہ کچھ نہ کہو۔ میں تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"
"عامر صاحب!........ اوہ........ میں بھول گئی، آپ نے تو اپنا نام بھی غلط بتایا تھا۔ شاید عارف صاحب! ہاں، تو میں عرض کر رہی تھی کہ مجھے اپنی عزت اور وقار کا سودا کسی قیمت پر نہیں کرنا۔ براہِ کرم آپ یہاں سے نکل جائیے۔"
"تم سے گفتگو کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"
"کیا کہنا چاہتے ہیں؟" اس نے میرے لہجے کی مضبوطی سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔
"میرے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟"
"بہت کچھ........ مجھے علم ہے کہ آپ ایک جرائم پیشہ انسان ہیں۔ آپ نے اپنی فرم میں ڈاکہ ڈالا اور فرار ہو گئے۔ اور پھر آپ یہاں پکڑے گئے۔ آج صبح کے اخبار سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ آپ ایک خطرناک انسان ہیں اور حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ بس، مجھے ایک بات کا دکھ ہے، عارف صاحب! میں زندگی میں پہلی بار کسی سے متاثر ہوئی تھی۔ لیکن وہ میرا غلط فیصلہ تھا، جس کے لئے میں، بھائی جان سے ہمیشہ شرمندہ رہوں گی۔ میں آئندہ خود اپنی قسمت کے بارے میں کبھی نہ سوچوں گی۔ یہ فیصلہ میرے والدین کریں گے۔"
"میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"
"کہہ دیں........ میں، سننے کے لئے مجبور ہوں۔ کاش، آپ مجھے باہر جانے کا موقع دیں تو میں، بھائی جان کو جگا کر آپ کو گرفتار کرا دوں۔"
"یہ موقع میں خود مسٹر آصف کو دوں گا۔ تم اس بارے میں فکر نہ کرو۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں، جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ اگر میں برا ہی ہوتا تو ہوٹل کی تنہائی تمہارے لئے بہت بھیانک ہوتی۔ اور پھر اِس وقت کون تمہاری مدد کو آ سکتا ہے؟ بھولی لڑکی! اپنی کہانی سنانا فضول ہے۔ صرف اتنا کہہ کر واپس جا رہا ہوں کہ اگر ہو سکے تو اپنے دل سے یہ خیال نکال دینا۔ حالات نے مجھے جو کچھ بنا دیا ہے، میں وہ نہیں ہوں........ خدا حافظ! زندگی کی آخری سانس تک کے لئے۔"

میں دروازے کی طرف مڑ گیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ طالوت کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات تھے۔ وہ ہونٹ سکوڑے میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر اُس نے چلتے چلتے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اب ہم اس مکان سے کافی دور کھڑے تھے۔

''یہ تو کچھ نہ ہوا۔'' طالوت نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے سوچا تھا کہ حُسن و عشق کے دلکش مناظر ہوں گے، جذبات کا اظہار ہو گا۔ اور...... اور...... ہی، ہی، ہی......!'' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس پڑا۔

''دانت بند کر و یار! وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جانے دو۔ جانے دو۔ وسیع دنیا پڑی ہے۔ ہاں، تمہاری ایک بات سے مجھے اتفاق ہے۔''

''کون سی؟''

''تم نے کہا تھا کہ تم اس کے بھائی کو ایک موقع فراہم کرو گے۔ میں اس کے حق میں ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک پڑا۔

''تم اس سے ضرور ملو...... بلکہ کل اس کے دفتر میں ملو۔ ہم تھوڑی سی تفریح کریں گے اور پھر یہاں سے نکل چلیں گے۔''

''دھر لئے گئے تو اس بار نکلنا مشکل ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''میری توہین مت کرو۔ بس تماشا دیکھو۔ آج رات آرام کریں گے اور کل اس کے دفتر چلیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن میرے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ نہ جانے، طالوت کے اس تماشے میں میرا کیا حال بنے۔

ہم دونوں ہوٹل واپس آ گئے۔ رات کا کھانا کھا ہی چکے تھے۔ اپنے بستروں پر پہنچ گئے۔ طالوت کچھ سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اُسے مسکراتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی باتوں میں شکایت کا عنصر موجود تھا۔ وہ تم سے بدظن ضرور ہو گئی تھی، لیکن اس کے باوجود اُس کے انداز میں محبت کی جھلک ملتی تھی!''

''لیکن اب بھی اُس کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہو گا۔''

''ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا ہمارے لئے صاف دل والوں کی کمی ہے؟...... تم دیکھتے رہو، دوست! میں کیسے چکر چلاتا ہوں۔ دنیا بھر کی دلچسپیاں ہمارے قدموں میں ہوں گی۔ بس، تم میری کسی بات سے انحراف مت کرو۔ جو کہوں، کرتے رہو۔''

''ٹھیک ہے، بھائی! اس کے سوا اب چارہ بھی کیا ہے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا اور پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ نائلہ کے سخت الفاظ، سخت چہرہ یاد آ رہا تھا اور دل لٹ رہا تھا۔

پھر میں نے سوچا، میری حیثیت اب بدل گئی ہے۔ حُسن و عشق کی چاشنی اب میرے لئے نہیں ہے۔

یہ تو شریف لوگوں کا کام ہے۔ آئندہ مجھے کسی لڑکی سے اس قدر متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ گدھا بن جاؤں۔ بس، وقتی تفریح۔ اور طالوت بھی یہی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ میری زندگی تو اب داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ کچھ بھی کرلوں....... اگر طالوت کے کہنے پر بھی عمل نہ کروں، تب بھی راہِ مفر نہیں ہے۔ پکڑا جاؤں گا اور زندگی جیل میں گزر جائے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اُس کی ہدایات پر عمل کرتا رہوں۔ اور اگر قسمت خراب ہو اور پھنس جاؤں تو اسے اپنا مقدر سمجھوں۔ اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔

آخری بار میں نے دل کو مضبوط کیا اور سختی سے اپنے مؤقف پر جمے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب کسی لڑکی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری پسند صرف شہنا تھی۔ اور اب وہ لڑکی میری منظورِ نگاہ ہوگی، جو میری راتوں کو دلکشی بخش دے۔ باقی سب بکواس ہے۔ محبت، وفا، سب حماقت کی باتیں ہیں۔ کسی سے دل نہ لگاؤ، گدھے بن جاؤ گے۔ اگر طالوت نہ ملتا تو اس عشق کا نتیجہ بہت خراب ہوتا....... دولت تو گئی تھی، جیل بھی ہوتی اور جیل سے نکلنے کے بعد ٹھوکریں ہی ٹھوکریں۔

'ٹھیک ہے، بیٹے طالوت! اب تم مجھے اپنی مرضی کے مطابق ہی پاؤ گے....... اب میں ایک مفرور مجرم ہوں اور مجھے اس کا احساس ہے۔'

اور اس آخری فیصلے کے بعد میں اطمینان سے سو گیا تھا۔

⊛⊛⊛

دوسری صبح، درحقیقت میں بدلا ہوا تھا۔ میرا دل سخت ہو گیا تھا۔ اور مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ طالوت نے بھی میری اس بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کیا اور مسکرانے لگا۔ بہرحال، اُس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔ اور پھر غسل سے فارغ ہو کر ہم لوگ ناشتہ کرنے لگے۔ طالوت نے اپنی فرمائش کی چند چیزیں منگوائیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر طالوت نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا پروگرام ہے؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آصف کے ہاں چلیں گے۔''

''تب پھر تیاری کرو۔''

اور ہم تیار ہونے لگے۔ میں نے سوٹ کیس میں سے سب سے عمدہ لباس نکالا۔ طالوت نے بھی ایک خوب صورت سوٹ نکال لیا۔ اس نے سوٹ پہنا، ٹائی باندھی، بال بھی میرے ہی انداز میں بنائے اور پھر ہم دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گئے۔ راستے میں طالوت آہستہ آہستہ مجھے اپنا پروگرام بتانے لگا، جسے سن کر میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُس کے پروگرام کو پسند کیا تھا۔ درحقیقت ہم ایک عمدہ تفریح کرنے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ میں نے نیچے اُتر کر بل ادا کیا اور پھر میں اور طالوت، آصف کے دفتر کی طرف چل پڑے۔ آصف کی کار باہر کھڑی ہوئی تھی، جس سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اندر موجود تھا۔

چنانچہ اُس نے مجھے باہر رُکنے کا اشارہ کیا اور میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا، جہاں سے اندر کا نظارہ کر سکتا تھا اور ان دونوں کی گفتگو بھی سن سکتا تھا۔

آصف اپنی خوب صورت میز کے پیچھے بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' طالوت کی آواز سنائی دی اور آصف چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اس طرح اُچھلا، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''تم........؟'' اُس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''میں، آپ کی خدمت میں ایک رپورٹ درج کرانے حاضر ہوا ہوں۔'' طالوت نے کہا۔ آصف اس وقت اُسے دیکھ رہا تھا۔ یعنی طالوت پوشیدہ کیفیت میں نہیں تھا۔

''رپورٹ کے بچے! اب دیکھتا ہوں، تُو کیسے نکل کر جاتا ہے؟'' آصف کرسی کھسکاتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' طالوت نے حیرت سے کہا۔ لیکن آصف نے جھک کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ پھر اس نے شاید گھنٹی کا بٹن بھی دبا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی کمرے میں داخل ہو گیا۔

''سب انسپکٹر نفیس کو بلاؤ۔ دو کانسٹیبل ساتھ لائے۔'' آصف نے اسے حکم دیا اور اردلی کمرے سے نکل گیا۔ میں سٹپٹا گیا تھا۔

''مم........ میں اپنی کار چوری ہونے کی رپورٹ لکھوانے آیا ہوں، جناب! آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں ایک باعزت شہری ہوں۔ آپ کو اس سلوک کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔''

''جواب دہی کے بچے!........ کیا تُو عارف جمال نہیں ہے؟ کیا تُو حوالات سے فرار نہیں ہوا ہے؟'' آصف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر آصف! تمھیں میرے ساتھ بدسلوکی کی بھاری قیمت اد کرنی پڑے گی۔ میرا نام عارف جمال نہیں، اختر سلطان ہے۔ سیٹھ اختر سلطان۔ فولاد کا بہت بڑا تاجر ہوں۔ میری کار چوری ہو گئی ہے۔'' طالوت نے کہا اور آصف چونک پڑا۔

''کیا تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو؟'' آصف نے سخت لہجے میں کہا۔

''اب مجھے کوئی رپورٹ نہیں کرنی۔ چلو، ایس پی کے پاس چلو۔ تمھیں ایس پی کے پاس چلنا ہو گا۔ میں اس سے اپنی بات کی تصدیق کراؤں گا اور تمھاری شکایت بھی کروں گا۔'' طالوت کھڑا ہو گیا۔

''اگر مجھے غلط فہمی بھی ہوئی ہے، تب بھی تمھیں اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں اگر ایس پی صاحب تمھیں پہچانتے ہیں تو پھر میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔'' آصف نے کہا۔

اسی وقت ایک سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

''چلو۔'' سب انسپکٹر نے طالوت سے کہا اور طالوت اکڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ ایس پی کا دفتر عمارت کے ایک دور دراز حصے میں تھا۔ میں پروگرام کے مطابق ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اور پھر جونہی آصف ایک طرف گھوما، طالوت نے راہداری کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

''لینا........ پکڑنا........!'' آصف چیخا اور سب انسپکٹر اور سپاہی، طالوت کے پیچھے دوڑے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ چھلاوہ اب کہاں ہاتھ آتا ہے۔ انسپکٹر آصف شور مچا رہا تھا کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''انسپکٹر!........ انسپکٹر پلیز!........ ایک ضروری بات۔'' میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ انسپکٹر کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ لیکن اچانک ہی اس کی نگاہ میرے لباس پر پڑی۔ میں گہرے نیلے رنگ کا نفیس تراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، جبکہ طالوت کے

جسم پر کریم کلر کا دھاریوں والا سوٹ تھا اور انسپکٹر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں میرا گریبان چھوڑ دیا لیکن اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بھی متعجب رہ جانے کی اداکاری کر رہا تھا اور اپنی ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا، جو انسپکٹر آصف کے ہاتھ سے خراب ہو گئی تھی۔

"آپ.......آپ......." اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میرا نام اختر سلطان ہے۔ ایک بدمعاش جعلساز میری کار لے بھاگا ہے۔ وہ میرا ہم شکل ہے اور کئی آدمیوں کو میرے نام سے دھوکا دے چکا ہے۔ میں فولاد کا ایک صنعت کار ہوں۔ اور......."

انسپکٹر کی جو حالت ہوئی ہو گی، اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ سب انسپکٹر اور کانسٹیبل کافی دور ایک کمرے میں طالوت کو تلاش کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے وہ ان کی نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔

"آپ......آپ میرے ساتھ اندر آیئے۔" بالآخر انسپکٹر آصف نے کہا اور واپس چل پڑا۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ "تشریف رکھئے۔" وہ بولا اور میں تھکے تھکے انداز میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں کیسے اندازہ کروں کہ آپ میں جعلساز کون ہے.....اور اصل اختر سلطان کون؟" اس نے کہا۔

"دونوں میں.......تو کیا آپ اسے دیکھ چکے ہیں؟" میں نے اُچھل کر پوچھا۔

"ہاں.......وہ بدمعاش بھی یہی کہانی لے کر آ چکا ہے۔ اور جب میں اسے ایس پی کے سامنے لے گیا تو وہ بھاگ نکلا۔"

"اوہ میرے خدا.......! اس نے کیا کہا تھا؟"

"اس نے اپنا نام اختر سلطان بتایا تھا اور اپنی کار چوری ہونے کی اطلاع دی تھی۔"

"خدا اسے غارت کرے۔" میں نے کہا۔

"میں سخت اُلجھن میں ہوں مسٹر!......اصل میں وہ ایک مفرور قیدی ہے اور آپ اس کے ہم شکل۔"

"آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، انسپکٹر! اگر وہ سچا ہوتا تو بھاگ کیوں جاتا؟ براہِ کرم اس بدمعاش سے میری کار برآمد کریں۔"

"وہ گرفتار ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" آصف کو میری اس دلیل پر کسی قدر یقین ہو گیا تھا۔ ویسے وہ اب بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب انسپکٹر اور سپاہی پریشان واپس آ گئے۔

"ہم نے اسے خود گارڈ روم میں داخل ہوتے دیکھا تھا جناب! لیکن نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ آپ یقین کریں، پورے ہوش و حواس سے.......!"

"کیا بکواس ہے؟.......وہ پولیس ہیڈ آفس سے فرار ہو گیا؟"

"سچ.......خدا کی قسم جناب! گارڈ روم میں آپ کو معلوم ہے کوئی دروازہ بھی نہیں ہے۔ اور وہ اسی میں داخل ہو گیا تھا۔"

"تب وہ مکھی بن کر نکل گیا ہو گا۔ اسے تلاش کرو، سب انسپکٹر! ورنہ اچھا نہ ہو گا۔" آصف نے پیچ ا

اب کھاتے ہوئے کہا اور سب انسپکٹر پریشان سا باہر نکل گیا۔

"بہت بڑا بدمعاش ہے۔" آصف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور انسپکٹر آصف نے ریسیور اٹھالیا۔ پروگرام کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ آصف فون پر ہی مؤدب ہوگیا۔

"جناب...... جناب! ابھی حاضر ہوا...... جی ہاں...... فوراً۔" اُس نے فون رکھ دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ تشریف رکھئے اختر صاحب! میں ذرا ایس پی کے پاس جارہا ہوں، ابھی واپس آتا ہوں، پھر آپ کی رپورٹ لکھوں گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ اور جونہی انسپکٹر آصف، کمرے سے نکلا، میں نے اس کے سامنے رکھا پیڈ اٹھالیا اور اس پر اسی کے قلم سے لکھنے لگا۔

"میں جعلساز نہیں ہوں، آصف صاحب! زمانے کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں۔ پچھلی رات نائلہ سے ملا تھا لیکن آپ نے اسے خوب رنگ چڑھا دیا ہے۔ بہرحال اب جب کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تو آپ سے مروّت کیسی۔ آپ نے بالآخر مجھے مجرم بنا ہی دیا۔ یہ میری طرف سے ایک چھوٹی سی سزا ہے، قبول کریں۔"

عارف جمال

اس پرچے کو موڑ کر میں نے پیپر ویٹ کے نیچے دبایا اور تیزی سے انسپکٹر کے دفتر سے نکل آیا۔ اُدھر طرف طالوت اپنا کام کر رہا تھا۔ یہ ہم دونوں کا مشترکہ پروگرام تھا۔ بعد کو اس کارنامے کی تفصیل طالوت نے بتائی۔ اس نے بتایا کہ سب انسپکٹر اور کانسٹیبلوں کو ڈاج دے کر وہ گارڈ روم میں گھس گیا اور وہاں سے ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو کر واپس نکل آیا۔ پھر وہ بڑے کرّ وفر سے ایس پی کے کمرے میں پہنچا اور اس سے انسپکٹر آصف کی شکایت کی، جس نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ طالوت نے ایس پی سے کہا کہ وہ وزیرِ تجارت کو کال کر کے اختر سلطان کے بارے میں معلوم کریں، لیکن ایس پی نے اس پر اعتبار کرلیا تھا، چنانچہ ایس پی نے آصف کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ آصف نے ایس پی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پستول نکال لیا تھا۔

"ہوش میں آیئے، مسٹر آصف! کیا آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟" ایس پی نے کہا تھا۔

"جناب!...... جناب! یہ بہت بڑا جعلساز ہے۔ لاک اپ سے فرار ہے۔ غالباً آپ سے اس نے اختر سلطان کی حیثیت سے تعارف کرایا ہوگا۔" آصف نے کہا تھا۔

"براہِ کرم اپنے حواس درست کریں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بغیر کسی ثبوت کے آپ نے ان کے ساتھ بدسلوکی کیوں کی؟"

"ان کی بدقسمتی سے ثبوت موجود ہے جناب!"

"وہ کیا......؟" ایس پی نے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا۔

"اصلی اختر سلطان صاحب تشریف لے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"جی ہاں...... یہ بدمعاش ہمیں اختر سلطان بن کر دھوکا دے رہا ہے۔"

”کیا بکواس ہے؟ کہاں ہیں اختر سلطان؟“

”میرے آفس میں موجود ہیں۔“

”بلایئے۔“ ایس پی نے کہا اور آصف نے ایک اردلی کو اپنے آفس کی طرف روانہ کر دیا۔ اس نے ایک دوسرے سب انسپکٹر کے ہاتھوں مجھے بلایا تھا، لیکن سب انسپکٹر ہاتھ میں میرا پرچہ لے کر پہنچا۔ اس نے میرے نہ ہونے کی اطلاع دی اور پرچہ آصف کے ہاتھ میں تھما دیا۔ آصف نے پرچہ پڑھا اور اس کا منہ اُتر گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ایس پی نے پوچھا اور آصف پرچہ نہ چھپا سکا۔ ایس پی پرچہ پڑھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اور پھر طالوت سے کافی معذرت کی تھی۔ اور پھر طالوت ایک اُلٹا سیدھا پتہ نوٹ کرا کر وہاں سے میرے پاس واپس آ گیا تھا۔

طالوت کی کہانی سن کر میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ بلاشبہ ہم نے بہترین تفریح کی تھی اور یہ سزا اس کا جواب تھی، جو آصف نے مجھے گرفتار کرنے کے سلسلے میں میرے ساتھ کیا تھا۔ لیکن بہرحال آصف، نائلہ کا بھائی تھا اور نائلہ ایک شریف لڑکی تھی۔ اس لئے میں آصف کو اس سے زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے طالوت سے اس کا آئندہ پروگرام پوچھا۔

”جو تمہاری رائے ہو۔ اگر محبوبہ کے بھائی کے لئے یہ سزا کافی ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اور پریشان کیا جا سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے، کافی ہے........ اب یہاں سے چلیں؟“

”کہاں چلو گے؟“

”جہاں تم چاہو۔ اس شہر سے نکل چلنا ہے۔“

”تب پھر ہم تمہاری محبوباؤں کے پاس چلیں گے، انہیں بھی دیکھ لوں۔ یہ میری خواہش ہے۔“

زرینہ........ میرے دل میں دھواں سا اٹھا، میری بربادیوں کی ذمہ دار........ اس سے انتقام کا اس سے اچھا موقع اور نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ میں تیار ہو گیا۔

”میرا خیال ہے ہم باقاعدگی سے سفر کریں۔ سیاہ رنگ کی لمبی ریل گاڑی کا سفر مجھے بہت پسند ہے۔ صرف ایک بار میں تھوڑی دیر کے لئے اس میں بیٹھا ہوں۔ تمہارے ساتھ لطف آئے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ اور پھر ہم نے ٹیلی فون پر فرسٹ کلاس کی دو سیٹیں بک کرائیں اور وقتِ مقررہ پر اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

”میرا خیال ہے، اس بار تم صحیح شکل میں سفر کرو۔ زیادہ لطف اسی طرح آئے گا۔ مگر ایک خطرہ ہے، ہم دونوں کا ہم شکل ہونا، لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ ہم خاص طور سے نگاہوں میں آ جائیں گے۔“

”یہ کوئی تردّد کی بات نہیں ہے۔ یہ لو۔“ طالوت نے کہا اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ پھر جب اس کے ہاتھ ہٹے تو اس کی شکل بدلی ہوئی تھی۔ بھوری فرنچ کٹ داڑھی اور لمبی اسٹائکش مونچھوں میں وہ کافی اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''شاندار!'' میں نے جواب دیا اور وہ ہنسنے لگا۔
وقت مقررہ پر ہم دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے کے چند منٹ کے بعد ٹرین آ گئی اور ہم اس میں سوار ہو کر چل پڑے۔ فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں صرف چند افراد تھے، جن میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اس بات پر میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا، ورنہ خوامخواہ کسی نئے عشق کی داغ بیل پڑ جاتی۔
طالوت درحقیقت پورے سفر سے خوب لطف اندوز ہوا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ بعض اوقات اس کی کیفیت کسی بچے کی طرح ہوتی، جو نت نئی چیزیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ دوران سفر بھی وہ ایسے ہی خوش ہوتا رہا تھا۔ اور پھر...... ایک طویل عرصہ کے بعد، میں نے دوبارہ اسی شہر کے اسٹیشن پر قدم رکھا، جہاں میں ایک طویل اور پھیکی زندگی گزار چکا تھا۔ جہاں سے میں مجرم بن کر فرار ہوا تھا اور جہاں کی پولیس کو آج بھی میری تلاش تھی۔ لیکن اب مجھے پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اب میں نے دل سے خوف نکال دیا تھا اور ایک نڈر انسان بن گیا تھا!
اسٹیشن سے ہم نے ٹیکسی لی اور میں نے ڈرائیور کو ایک عمدہ سے ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ طالوت کی دی ہوئی رقم میں سے ابھی کچھ خرچ نہیں ہوا تھا۔ میرے پاس کافی دولت تھی، اپنے پسندیدہ ہوٹل کا ہم نے ایک ڈبل روم حاصل کیا اور اس میں مقیم ہو گئے۔ طالوت نئی شکل میں سب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مجھ پر ہر لمحہ اس کی قوتوں کے پراسرار انکشافات ہو رہے تھے۔ بہر حال یہ میرے اندازے کی غلطی تھی، ورنہ طالوت کے بارے میں جاننے کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ آتشی مخلوق میں سے ہے۔
ہوٹل میں ہم نے کافی دیر آرام کیا اور ٹرین کے سفر کی تکان اُتارتے رہے۔ شام کو چار بجے ہم اُٹھ گئے، غسل کر کے لباس تبدیل کیا، چائے پی اور پھر طالوت نے مجھ سے اپنا مدعا دوہرایا۔
''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ میرا خیال ہے پہلے میں تمہیں اپنی اُس بھینگی محبوبہ سے ملاؤں، جس پر میں نے ظلم کیا تھا۔ بہر حال وہ کم از کم وفا شعار تو تھی۔ زرینہ کی طرح سنگ دل تو نہیں تھی۔''
''بالکل ٹھیک...... چلو، پہلے اس کے ہاں چلتے ہیں۔ لیکن سنو۔ میں اس کے سامنے نہیں آؤں گا۔ ظاہر ہے وہ میری موجودگی میں تم سے کھل کر گفتگو نہیں کر سکے گی۔ میں اسے تم سے بات چیت کا پورا پورا موقع دوں گا۔ پھر جب تم مجھے بلاؤ گے، تب میں آ جاؤں گا۔''
''جیسا مناسب سمجھو۔'' میں نے جواب دیا اور ہم دونوں ہوٹل سے نکل آئے، ٹیکسی میں بیٹھے اور میں نے ڈرائیور کو انجیلا کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ ٹیکسی سڑکوں پر دوڑتی رہی اور طالوت دلچسپی سے سڑک پر چلنے والی رنگین تتلیوں کو دیکھتا رہا۔
''مجھے تمہارے ہاں کی یہی رواں دواں زندگی پسند ہے۔ حسین چہرے، اُمنگوں اور جذبات میں لپٹے ہوئے احساسِ حُسن لئے ہوئے، بچتے بچتے سے...... دادِ حُسن کے طلب گار...... کیسا متضاد مزاج ہے۔ حُسنِ بے پروا، دعوتِ گناہ، لیکن محتاط محتاط سا۔ بڑے حسین مناظر ہوتے ہیں۔'' وہ راستے میں کہنے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انجیلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی اس کے مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ وہی جانا پہچانا مکان، جہاں کبھی میں اور انجیلا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتے تھے۔ مکان کے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل پر اُنگلی رکھتے ہوئے میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات تھے۔ چند ساعت کے بعد دروازہ کھلا۔ انجیلا تھی لیکن اس

کے چہرے پر بشاشت نہیں تھی۔ پہلے سے کمزور بھی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بے قابو آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے۔

میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں طالوت کی طرف دیکھا، طالوت موجود نہیں تھا۔ تب میں نے ایک گہری سانس لی۔ انجیلا سے مجھے اس بے ساختگی کی اُمید نہیں تھی۔ بہر حال، اب وہ شادی شدہ تھی۔ تب انجیلا نے مجھے اندر گھسیٹ لیا اور پھر میرے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

یہ پورا ڈرامہ آؤٹ آف پروگرام تھا۔ نہ جانے بدمعاش طالوت کہاں ہو۔ ممکن ہے، وہ چھپ کر ہم دونوں کو دیکھ رہا ہو۔ تاہم میں انجیلا کو سینے سے لگائے ہوئے کمرے میں آ گیا۔ اور پھر میں بمشکل اس کی سسکیاں رکوانے میں کامیاب ہو سکا۔

''جوزف کہاں ہے؟'' میں نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''ہسپتال میں۔''

''اوہ........ کیوں؟''

''وہ بیمار ہے۔''

''مجھے دکھ ہوا۔'' میں نے کہا اور انجیلا نے گردن جھکا لی۔ پھر میں نے بھاری آواز میں کہا۔ ''مجھے احساس ہے انجیلا! کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، لیکن میں بے غیرت زرینہ کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ مجھے تمہارے ساتھ ناانصافی کی سزا ملی۔ بہر حال اب تم جوزف کی بیوی ہو........ اس کے ساتھ انصاف کرو۔''

''میں نے کبھی اسے اپنے دکھ کا احساس نہیں ہونے دیا۔'' انجیلا نے کہا۔

''بلاشبہ تم ایک شریف لڑکی ہو۔''

''تم یہاں کب آئے، عارف؟ کیا پولیس کو تمہاری تلاش نہ ہو گی؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''پولیس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ تم سناؤ، یہاں کے حالات کیا رہے؟ کیسے کیسے ہنگامے ہوئے؟ اور تم میرے بارے میں کہاں تک واقف ہو؟''

''تمام معلومات میرے دفتر کو ملتی رہتی ہیں۔ حشمت سیٹھ کو تمہارے گرفتار ہونے کی اطلاع ملی۔ پھر تمہارے فرار کی اطلاع بھی ہم لوگوں کو مل گئی۔ حشمت سیٹھ کی رقم واپس مل گئی، اب اسے تمہاری گرفتاری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''وہ واپس آ گیا........؟''

''ہاں........ کل ہی آیا ہے۔''

''اختر بیگ اور زرینہ کا کیا حال ہے؟''

''اختر بیگ گرفتار ہو گیا تھا، ضمانت پر رہا ہو گیا۔ بہر حال، ان کی شادی کا پروگرام فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔ لیکن دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، بلکہ اب تو اختر بیگ، زرینہ کے مکان میں ہی اس کے ساتھ رہتا ہے۔''

''بہت خوب!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال میں اپنی زیادتی پر ایک بار پھر تم سے

معذرت خواہ ہوں انجیلا! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو۔"

"جوزف کی بیماری نے ہمارے معمولات پر بہت اثر ڈالا ہے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا ہے، جس پر دو ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ دوسرے اخراجات بھی ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ حشمت سیٹھ ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دینے کا روادار نہیں ہے۔"

"اوہ......! اس سلسلے میں فکر نہ کرو انجیلا! میں بہرحال تمہارا دوست ہوں۔ جوزف کی ملازمت تو بحال ہے؟"

"ہاں۔ حشمت سیٹھ نے اسے دو ماہ کی رخصت دے دی ہے۔"

"اس کنجوس کے لئے یہی کافی ہے۔" میں نے کہا اور پھر میں نے جیب سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکالیں اور انجیلا کے سامنے ڈال دیں۔ "بیس ہزار ہیں......میرا خیال ہے، تمہارا کام چل جائے گا۔"

"کک......کیا مطلب؟" انجیلا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"ایک دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کرلو، انجیلا! اور ہاں، فکر مت کرو، چوری کے نہیں ہیں۔ حشمت سیٹھ کو اس کی دولت واپس مل گئی ہے۔"

"مم......مگر......بب......بیس ہزار......"

"تمہارے کام آئیں گے، انجیلا! براہِ کرم اب اس موضوع پر گفتگو نہ کرو اور مجھے اجازت دو۔"

"کیوں؟"

"کسی بھی جگہ میرا زیادہ رُکنا خطرناک ہے۔ تم میری دوست ہو، میں تمہارے اوپر کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہتا۔"

"چائے تو پی لو، عارف!" انجیلا نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ اس کی بھینگی آنکھیں اس وقت براہِ راست میری طرف دیکھ رہی تھیں، اس کا مطلب تھا کہ اس کی نگاہ نوٹوں پر ہے۔

"شکریہ انجیلا! پھر کبھی سہی۔" میں اُٹھ گیا۔

"تم تو ایک خواب کی طرح آئے......دل کی پیاس بجھی بھی نہیں تھی کہ واپس جا رہے ہو۔"

"مجھے خواب میں رہنے دو، انجیلا! تم اب جوزف کی امانت ہو۔" میں نے کہا اور انجیلا کے مکان سے نکل آیا۔ میری نگاہیں طالوت کو تلاش کر رہی تھیں۔ دفعتہً مجھے بائیں سمت سے تالیوں کی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ طالوت مسکراتے ہوئے تالیاں بجا رہا تھا۔

"مزہ آ گیا......خدا کی قسم، مزہ آ گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت عمدہ منظر تھا۔ جذباتی اور تاثر انگیز......آنکھوں کو چھوڑو دوست، اُس کی محبت پر غور کرو۔"

"آؤ۔" میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ "تو تم میرے نزدیک موجود تھے۔"

"بات چونکہ آگے بڑھنے والی نہیں تھی، اس لئے میں نے وہاں رہنا مناسب سمجھا۔ ہاں اگر مناظر قابلِ اعتراض ہو جاتے تو میں نکل آتا۔" طالوت شرارت سے بولا اور میں ہنس پڑا۔

"میں نے اسے بیس ہزار روپے دے دیئے۔"

"بس یہی بات پسند نہیں آئی۔ تمہیں جیبیں خالی کر دینی چاہئیں۔ ہمارا کیا ہے۔ اس کا کچھ اور کام بن جاتا۔" طالوت نے کہا۔

''اس کے لئے یہی کافی تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ انہیں برداشت کر سکے گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ جیسا تم پسند کرو۔'' طالوت نے شانے ہلاتے ہوئے کہا اور ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل واپس چل پڑے۔ انجیلا کے پُر جوش استقبال سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ لڑکی اب بھی مجھ سے محبت کرتی تھی، لیکن بہرحال میں اس کی محبت کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اب میرے ذہن میں زرینہ تھی۔ اختر بیگ سے اس کے تعلقات کا ذکر سن کر میں اور کھول گیا تھا۔ ویسے ان کی شادی میں رخنہ پڑ جانے پر مجھے خوشی بھی تھی، لیکن میں اسے اس طرح معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اختر بیگ کا اس کے یہاں رہنے کا کیا مقصد تھا؟........ کیا زرینہ نے خود کو اختر بیگ کے حوالے کر دیا ہے؟........ اگر ایسا ہے تو پھر میں اس سے کیوں محروم رہوں؟

ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچ کر میں اسی بارے میں سوچنے لگا۔ طالوت بھی میرے سامنے کرسی پر دراز تھا۔

''میں جانتا ہوں، تم اپنی محبوبہ کے بارے میں سوچ رہے ہو۔''

''ہاں........ لیکن اس بے وفا محبوبہ کے بارے میں۔''

''اوہ ہاں........ اس سے ملاقات کرنے کب چلو گے؟''

''کل۔ لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں، طالوت!'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا اور میں نے اسے انجیلا کی فراہم کی ہوئی معلومات بہم پہنچا دیں۔ طالوت بھی کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذہن میں انتقام کی ایک بہترین ترکیب آئی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔ اور طالوت رازداری سے مجھے اپنا پروگرام بتانے لگا۔ بہرحال میں نے اس کے پروگرام کو پسند کیا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عمدہ پروگرام تھا۔

دوسرے دن گیارہ بجے میں نے حشمت برادرز فون کیا۔ زرینہ نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

''مس زرینہ! میں آپ کا ایک پرانا شناسا ہوں۔ براہِ کرم کسی طور چھٹی لے کر اپنے گھر واپس پہنچ جایئے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کسی قدر آواز بدل کر کہا۔

''لیکن میں آپ کو نہیں پہچانتی۔ آپ کا نام........؟''

''سب کچھ آپ کے گھر پر معلوم ہو جائے گا۔ میری آپ سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ میں آپ کے گھر پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ طالوت مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے اپنے بائیں سمت رخ کر کے اپنے غلام کو آواز دی اور پراسرار شکل والا نوجوان اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا پیکٹ تھا۔

''ٹھیک ہے، جاؤ۔'' طالوت نے اس سے کہا اور وہ غائب ہو گیا۔ طالوت نے میرے سامنے پیکٹ کھول دیا تھا۔ سبز، سرخ، پیلے، مخملیں ڈبوں میں قیمتی زیورات جگمگا رہے تھے۔ میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ طالوت نے تمام ڈبے میری طرف کھسکا دیئے اور پھر ہم نے انہیں ایک چرمی بریف کیس میں رکھ دیا۔

''چلیں........؟'' طالوت نے پوچھا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ٹیکسی

میں بیٹھے جا رہے تھے۔ زرینہ کی بوڑھی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھیں کمزور تھیں، اس لئے وہ مجھے نہیں پہچان سکی۔

”میں مس زرینہ کا دوست ہوں....... انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ وہ خود بھی آفس سے واپس پہنچ رہی ہیں۔“ میں نے کہا اور بوڑھی نے مجھے راستہ دے دیا۔ میں طالوت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا اور تھوڑی دیر کے بعد جب دروازے پر دستک سنائی دی تو طالوت اُٹھ کھڑا ہوا۔

”فکر کی بات نہیں ہے دوست! تمہاری اداکاری عمدہ ہونی چاہئے۔“ اس نے کہا اور ایک طرف رخ کر کے غائب ہو گیا۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔

اور چند لمحات کے بعد وہ دروازے میں نظر آئی۔ وہی بوٹا سا قد، وہی گدرایا ہوا جسم، وہی سحر خیز آنکھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ میرے دل میں نفرت کا طوفان اٹھا۔ لیکن میں نے ایک لمحے میں خود پر قابو پا لیا اور مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری حیرت بجا ہے زرینہ! مجھے خود احساس تھا، لیکن اس سرکش دل پر قابو نہیں پا سکا۔“

”تم....... تم عارف....... م....... مگر.......“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”لاکھ کوشش کی، زرینہ! لیکن دل سے تمہاری محبت نہیں نکال سکا۔ اختر بیگ سے تمہاری شادی کا دعوت نامہ پانے کے بعد پاگل ہو گیا تھا، اور اسی دیوانگی میں نہ جانے کیا کیا کر بیٹھا۔ لیکن شکر ہے، حشمت سیٹھ کی دولت اسے واپس مل گئی، اور کوئی ایسا حادثہ نہ ہو سکا، جس پر میں پشیمان رہتا۔“

”مگر....... پولیس....... پولیس تو تمہیں ہی تلاش کر رہی ہے عارف!“ زرینہ نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

”رسمی طور پر....... ورنہ اسے مجھ سے پرخاش نہیں ہے۔ دیکھ لو....... آزادی سے گھوم رہا ہوں۔ دولت منہ پر تالا لگانے کے لئے کافی ہے۔ اور پھر اعلیٰ حکام کو میری حیثیت بھی معلوم ہو گئی ہے۔“

”حیثیت.......؟“ زرینہ نے پھر آنکھیں پھاڑ دیں۔

”ہاں زرینہ! میں نے ایک طویل مجاہدہ کیا ہے۔ میں نے اپنوں سے دور ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ صرف ذرا سے اختلاف پر۔ میں وہ نہیں ہوں، جو تم آج تک سمجھتی رہی ہو۔ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے نواب کا بیٹا ہوں، جو گھر سے ناراض ہو کر نکل آیا تھا اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔“

”کک....... کیا کہہ رہے ہو عارف؟“

”درست کہہ رہا ہوں، میری روح!....... میرے والدین نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ میری ان سے ناراضگی دور ہو گئی ہے۔ چنانچہ کسی نواب زادے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔ میرے والد حشمت سیٹھ جیسے پچاس سیٹھوں کو کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔“

زرینہ کی حیرت قابلِ دید تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”چھوڑو ان باتوں کو زرینہ!....... میں تمہاری خدمت میں اپنی محبت کے کچھ تحفے پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور زیورات کے بکس کی طرف بڑھ گیا۔ پھر میں نے زیورات کھول کھول کر اسے پہنانے شروع کر دیئے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے، زرینہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی، نیم پاگل ضرور ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دمک اٹھا تھا اور وہ دیوانوں کے سے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔

قیمتی زیورات پہن کر وہ سج گئی اور میں نے اسے آئینے کے سامنے کر دیا۔ زرینہ نے آئینہ دیکھا اور پھر دوسرے لمحے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”عارف!....... میرے اپنے عارف!....... آہ، تمہیں کیا معلوم، تمہاری جدائی کے یہ لمحات میں نے کس طرح گزارے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد کیسی کیسی پشیمان ہوئی ہوں۔“ وہ میرے سینے سے لگ کر سسکنے لگی اور میں حیرانی سے اس مکار عورت کی شکل دیکھنے لگا، جو کتنی خوبی سے آنسو بہا رہی تھی۔ لیکن بہرحال اس کامیاب اداکاری کا جواب مجھے بھی کامیابی سے دینا تھا۔

”مجھے یقین تھا، زرینہ!....... مجھے اپنی محبت پر اعتماد تھا اور اسی اعتماد کے سہارے میں واپس چلا آیا۔ اب میں تم سے کبھی جدا نہ ہوں گا، میری روح!“

زرینہ مجھ سے زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”اختر بیگ کا کیا حال ہے؟“ میں نے اسے پہلو میں لے کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس ٹھیک ہے....... سر پڑ گیا ہے، کمبخت۔ حالانکہ تمہارے چلے جانے کے بعد میری بری حالت ہو گئی تھی۔ ایک شام میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں عارف کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن وہ رونے، گڑگڑانے لگا اور بولا کہ عارف کے صدقے میں اسے نہ ٹھکرایا جائے۔“

”شادی کے پروگرام کا کیا ہوا؟“

”تمہاری جدائی نے میری آنکھیں کھول دی تھیں، عارف! یقین کرو، میں نے ایک بھی سکون کی رات نہیں گزاری۔“

”مجھے یقین ہے۔“ میں اسے بازوؤں میں کھینچتے ہوئے بولا۔ مزاحمت کا شائبہ بھی نہ تھا، لیکن مجھے بدمعاش طالوت کا بھی خیال تھا، ضرور کسی کونے میں چھپا ہو گا۔ چنانچہ میں نے احتیاط برتی۔

وہ مجھے دل میں بٹھا لینا چاہتی تھی۔

”اختر بیگ یہاں روز آتا ہے؟“

”ہاں....... روز ہی آمرتا ہے۔ لیکن میں آج اس سے معذرت کروں گی اور کہوں گی کہ میرے چند عزیز آ گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور زرینہ ایک دم چونک پڑی۔

”ارے....... میں بھی کیسی بے وقوف ہوں، تمہارے لئے چائے تو بنا لوں۔ ابھی آئی، میری جان!“ اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ زرینہ کمرے سے نکل گئی اور میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے آواز دی۔

”طالوت.......!“

”بیٹھا ہوں بھائی!....... تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“ طالوت کی آواز سنائی دی۔ ایسی مضحکہ خیز آواز تھی کہ میں ہنسی نہ روک سکا۔

”یہ غلط بات ہے....... نازک قسم کے مناظر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”فکر مت کرو، دوست! میں احتیاط رکھوں گا۔ مگر کیا بات ہے اس عورت کی۔ رنگ بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ تمہاری اداکاری بھی بے مثال ہے۔ یقین کرو عارف! زندگی کا لطف آ رہا ہے۔ میرے

یہاں یہ پُر لطف مناظر کہاں؟........ یہ فریب کاری کہاں؟........وہ تو ایک سیدھی سادی دنیا ہے، جہاں دوستی اور دشمنی کھل کر کی جاتی ہے۔ بہرحال ڈرامہ اسی انداز سے آگے بڑھے۔ کوئی جھول نہ آئے۔"
"فکر مت کرو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اور اور پھر ہم دونوں کئی منٹ تک گفتگو کرتے رہے اور پھر قدموں کی چاپ سن کر خاموش ہو گئے۔ زرینہ ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ ٹرالی پر چائے کے برتن اور بسکٹ وغیرہ سجے ہوئے تھے۔ زرینہ اصرار کر کے مجھے کھلاتی رہی اور میں اس کی نگاہ بچا کر بسکٹ دوسرے صوفے پر اچھالتا رہا، جو صوفے پر گرتے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ پھر چائے پینے سے قبل میں نے زرینہ سے پانی منگوایا اور جونہی وہ باہر نکلی، ایک کپ چائے بنا کر طالوت کو دے دی۔
"شکریہ!" طالوت نے کہا۔ "تمہاری محبوبہ کے ہاتھوں کی چائے نہ پی کر مجھے افسوس رہتا۔ ویسے میری فکر نہ کرنا، میں کھانا وغیرہ باہر کھا لوں گا۔" طالوت نے جلدی سے مجھے پیالی واپس کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں دوسری پیالی میں چائے بنا چکا تھا۔ اور پھر اپنی پیالی میں بھی میں نے چائے بنا لی اور پانی پینے کے بعد ہم چائے پینے لگے۔
وہ ایسے ایسے اظہارِ محبت کر رہی تھی کہ طالوت کی موجودگی کے تصور سے شرم محسوس کرنے لگا تھا۔
شام کو پانچ بجے اختر بیگ آیا اور زرینہ دروازے پر پہنچ گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ میں وہ واپس آئی اور ناک چڑھا کر بولی۔ "بے غیرت کہیں کا۔ میں ایسے خشک انداز میں پیش آئی، لیکن ٹل ہی نہیں رہا تھا۔ بمشکل ٹالا ہے۔"
"دو تین روز ٹالو گی تو خود سنبھل جائے گا۔" میں نے کہا۔
"دیکھنا، کیسا ذلیل کرتی ہوں کمبخت کو۔" اس نے کہا اور پھر مجھ سے بولی۔ "اسی نے مجھے تمہاری طرف سے ورغلایا تھا۔ میں بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے لگی۔"
رات کے کھانے کے بعد میں نے زرینہ سے اجازت مانگی۔ "اب اجازت دو، زرینہ! کل آؤں گا۔"
"کہاں جاؤ گے؟" وہ تعجب سے بولی۔
"ہوٹل۔"
"میرے ہوتے ہوئے ہوٹل۔ کیا مجھے دُکھ نہ ہو گا؟"
"تمہیں تکلیف ہو گی، زرینہ!"
"کیسی غیروں کی سی باتیں کرتے ہو، عارف! تم سے اب ایک لمحہ دور رہنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا اور میں شرمندہ ہو گیا۔ "میں نے سونے کا انتظام کر لیا ہے۔ بس اب تم یہیں رہو گے۔" زرینہ نے تحکمانہ انداز میں کہا اور میں تیار ہو گیا۔ تب زرینہ مجھے لے کر اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ خواب گاہ میں ایک مسہری بچھی ہوئی تھی اور اس پر دو تکیے موجود تھے۔
"میں لباس تبدیل کر آؤں، جانم!" زرینہ نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر جونہی وہ باہر نکلی، میں نے دبی آواز میں طالوت کو آواز دی لیکن جواب نہ ملا۔ دو تین بار میں نے طالوت کو آواز دے کر ایک گہری سانس لی۔ آدمی بات کا پکا ہے، خواب گاہ میں آنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ میں نے سوچا اور پھر آنے والے وقت کے تصور سے میرے جسم میں انگڑائیاں ٹوٹنے

لگیں۔

چند لمحات کے بعد زرینہ اندر آ گئی اور اسے دیکھ کر میرے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ چند لمحات کے لئے میں اپنے انتقام کو بھول گیا۔ میں مسہری پر اُٹھ بیٹھا اور میرے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور زرینہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھی۔

میرے حواس معطل ہو گئے تھے۔ زرینہ کبھی زرینہ نظر آتی، کبھی شہنا۔ شہنا، جو زرینہ سے کہیں زیادہ حسین تھی، اور جس نے خود کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد شہنا پھر میرے حواس پر چھا گئی اور مجھے وہ دلکش رات یاد آ گئی........ کسی بھولے ہوئے خواب کے مانند!

زرینہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری حقیقت کچھ اور ہے۔ میں نے اسے جو کہانی سنائی تھی، اس پر وہ مکمل طور سے یقین کر بیٹھی تھی۔ میرے دیئے ہوئے قیمتی زیورات میری کہانی کا ثبوت تھے اور شاید وہ دل ہی دل میں اپنی غلطی پر بہت نادم تھی۔ کہاں ایک نواب زادہ اور کہاں ایک اکاؤنٹنٹ۔ اختر بیگ میں اور مجھ میں اچانک بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ زرینہ کو اپنا مستقبل درخشاں نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے دل سے اپنی بے وفائی کا ایک ایک نقش دھو ڈالنا چاہتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ عورت کی لطافتیں، مرد کی کدورتیں دھونے میں اکسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلاشبہ وہ میرے لئے شہنا سے کم نہیں ثابت ہوئی۔ اور یہ میری زندگی کی دوسری عورت تھی۔

لیکن جذبات کا بھوت اُترنے پر میں نے شہنا اور زرینہ کا فرق واضح طور پر محسوس کیا۔ زرینہ میری دنیا کی ایک فریبی عورت تھی، جس کی بے وفائی نے میری پوری زندگی کو تباہی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ اگر قسمت یاوری نہ کرتی تو میں اب تک جیل کی تاریک کوٹھری میں پہنچ چکا ہوتا۔ اور نہ جانے عمر کا کتنا حصہ اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں گزر جاتا۔ زرینہ، جس نے اختر بیگ کے دیئے ہوئے معمولی تحائف کی وجہ سے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور اب وہ ان سے زیادہ قیمتی تحائف دیکھ کر دوبارہ میری طرف آ گئی تھی۔

شہنا کی بات دوسری تھی۔ وہ طالوت کی پجاری تھی اور مجھے طالوت سمجھ کر اس نے خود کو میرے قریب کیا تھا۔ بہرحال وہ زرینہ سے بلند تھی۔ اس کی دنیا کی اقدار مختلف تھیں۔ وہ یوسف عبران عرف طالوت کی لونڈی تھی، اس پر جان دیتی تھی اور کون جانتا ہے کہ میری حقیقت معلوم ہونے پر اس پر کیا گزری ہو گی۔

بہرحال زرینہ کے حسین سحر نے میرے اوپر وہ کیفیت طاری نہیں کی، جو شہنا نے کی تھی۔ میں نے اس کے بعد زرینہ کے ساتھ زندگی گزارنے کی آرزو بھی نہیں کی۔ لیکن میں اپنے انتقام کو ادھورا چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں بے وفا زرینہ سے پورا پورا انتقام لینا چاہتا تھا، جس نے مجھ جیسے سیدھے سادے انسان کی زندگی کو بدی کی راہوں پر ڈال دیا تھا۔

ساری رات زرینہ سوتی رہی۔ سکون کی نیند۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی یہ والہیت مصنوعی ہے، وہ صرف دولت کی پجارن ہے۔

دوسری صبح زرینہ بے حد خوش تھی۔ وہ مجھ سے بے پناہ اُلفت کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ افسوس کر رہی تھی کہ اس نے بدبخت اختر بیگ کو کیوں قریب آنے دیا۔ اس نے بہترین ناشتہ تیار کیا، خود بھی میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور میں طالوت کو یاد کرنے لگا۔ نہ جانے میرا دوست کہاں ہے؟

’’فکر مت کرو، میں تمہارے پاس موجود ہوں۔‘‘ میرے کان میں اس کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر زرینہ کی شکل دیکھنے لگا۔ لیکن زرینہ کے کچھ سننے کا سوال ہی نہیں تھا۔

’’کیا پروگرام ہے اب؟‘‘ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے زرینہ سے پوچھا۔

’’کچھ نہیں۔ آفس ٹیلی فون کردوں گی کہ آج میں نہیں آسکوں گی۔‘‘

’’اوہ نہیں۔ میرا خیال ہے، تم آفس جاؤ۔ شام کو واپسی کے بعد تفریح کریں گے۔ مجھے بھی کچھ کام دیکھنے ہوں گے۔‘‘

’’کہیں جانا ہے؟‘‘

’’ہاں۔ ابا حضور نے ریاست کے چند کام سپرد کیے ہیں، انہیں انجام دینا ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’تب ٹھیک ہے........ تم جاؤ۔ میرا آج دفتر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گی۔ دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھانا۔‘‘

’’جیسی تمہاری مرضی۔‘‘ میں نے کہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں باہر نکل آیا۔ زرینہ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والی عورت کا کردار ادا کر رہی تھی۔

تھوڑی دُور نکلتے ہی میں نے طالوت کو آواز دی۔

’’بس چپ رہو........ دل ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔‘‘ طالوت کی آواز مجھے سنائی اور اس کے انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔

’’میرے سامنے تو آؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’چلو........ کسی ایسے ہوٹل میں چلو، جہاں ہمیں دیکھا نہ جا سکے۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔‘‘ طالوت نے کہا اور مجھے احساس ہو گیا کہ اس غریب نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گیا۔ طالوت کے جسم کو میں نے قریب محسوس کیا تھا۔

’’پیکسی ریستوران۔‘‘ میں نے ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ پیکسی کے ایئر کنڈیشنڈ ہال کے ایک خوب صورت کیبن میں بیٹھ کر میں نے ویٹر کو لمبے چوڑے ناشتے کا حکم دیا اور پردہ کھینچ دیا۔ پھر جب ویٹر ناشتہ میز پر لگا کر چلا گیا تو طالوت میرے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس نے بھی نیا سوٹ پہن لیا تھا اور پورے سلیقے سے۔ میں اسے مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

’’مسکرا رہے ہو........؟‘‘ طالوت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

’’کیوں........ کیا بات ہے؟‘‘ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

’’مجھے بھی ایسی ہی کوئی محبوبہ فراہم کردو۔‘‘ اس نے کہا۔

’’پہلے یہ بتاؤ........ رات تم کہاں تھے؟‘‘

’’جھوٹ بولوں یا سچ؟‘‘ طالوت نے سنجیدگی سے کہا۔

’’سچ بولو۔‘‘ میں نے چونک کر کہا۔

’’دروازے سے جھانک کر دیکھا ہی تھا کہ خود کو باز نہ رکھ سکا اور سوراخ سے اندر داخل ہو گیا۔ بس یار! اب برا مانو یا بھلا، غلطی ہو گئی۔‘‘ طالوت نے اس طرح گردن لٹکاتے ہوئے کہا کہ شرمندگی کے

باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔

''بہت بے شرم ہو........اور تم نے وعدہ خلافی بھی کی ہے۔''

''ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔'' اُس نے اسی طرح گردن لٹکاتے ہوئے کہا۔

''ناشتہ تو کرو۔'' میں نے کہا اور وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ میں اُس کی شکل دیکھتا رہا اور ایک بار پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ ''ارے تو چہرے پر یہ سوگ کیوں طاری کر لیا ہے؟'' میں نے چند منٹ کے بعد کہا۔

''بس یار! مجھے احساس ہے کہ غلطی ہو گئی........بہر حال تم میرے دوست ہو۔ تمہارا احترام بھی واجب ہے۔''

''اب جب تم بدمعاشی کر ہی چکے ہو تو........ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔''

''واقعی........؟'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''یعنی تم نے مجھے معاف کر دیا؟''

''کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''اور آئندہ بھی کرتے رہو گے؟''

''طالوت!'' میں نے اسے گھورا۔

''مان جا میرے یار!'' اس نے میرا بازو پکڑ کر لجاجت سے کہا۔ ''اس دنیا کو قریب سے دیکھنے کی خوشی میں سب کچھ چھوڑ آیا ہوں اور یہاں پر تیرے علاوہ میرا کوئی دوست بھی نہیں ہے۔ تجھ سے اور کوئی خواہش ظاہر نہیں کروں گا، بس میری یہ خوشی پوری کر دے۔''

''بہت خطرناک ہو تم۔'' میں نے کہا اور طالوت میرے ان الفاظ کو میری رضامندی سمجھا۔ اس کے چہرے پر مسرت بکھر گئی اور وہ جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا۔ مجھے اس کی خوشی دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے مخاطب کیا۔

''سنو!........میں نے تمہاری شہنا کے ساتھ ایک دلکش وقت گزارا ہے۔ زرینہ سے میرا کوئی جذباتی رشتہ نہیں ہے، بلکہ وہ میرے انتقام کی شکار ہے۔ اگر تم چاہو تو........میری جگہ لے سکتے ہو۔''

''واقعی........؟'' مارے حیرت کے طالوت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں........اگر زرینہ کی جگہ نائلہ یا انجیلا ہوتی تو میں تمہیں یہ اجازت نہ دیتا۔''

''ارے واہ میرے دوست!........تمہاری دوستی پر قربان۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ بوٹے سے قد کی حسینہ بہت پسند آئی ہے یار!........تمہاری دنیا کی یہ لڑکی میری زندگی میں پہلی لڑکی ہو گی۔ ارے جیتے رہو۔'' وہ اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا اور میں ہنسنے لگا۔ یوں بھی میں طالوت کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے مجھے یہ طاقت دی تھی کہ میں آزادانہ گھوم رہا تھا۔ ورنہ میری کیا مجال تھی۔ سچ پوچھئے تو اس نے مجھے نئی زندگی دے دی تھی ورنہ اب میری زندگی میں جیل کی تاریک کوٹھری کے سوا اور کیا رہ گیا تھا۔ طالوت اگر مجھ سے علیحدہ ہو جاتا تو میری کیا حیثیت رہ جاتی؟ میں اس کے بغیر خاک کا ایک ذرّہ تھا۔

چنانچہ میں اسے ہر طرح خوش رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُس کی سادگی اور محبت تھی کہ خود سب کچھ ہونے کے باوجود زرینہ کے سلسلے میں میری اجازت کا طالب تھا بلکہ دل کی بات کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ ورنہ وہ قدرت رکھتا تھا کہ مجھے بے ہوش کر کے غسل خانے میں بند کر دیتا اور میری شکل میں زرینہ کے پاس پہنچ

جاتا۔ چنانچہ آئندہ بھی مجھے یہی طرزِ عمل رکھنا تھا۔ اس کی دوستی اپنی جگہ اور اس کی برتری بھی اپنی جگہ۔ بہرحال ہر طرح اس کا خیال رکھنا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے ایک زوردار ڈکار لی۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی نظر آ رہی تھی۔

''بڑی خوب صورت عورت تھی۔'' اس نے چٹخارے کی آواز نکال کر کہا۔

''ہاں، بہت۔ مگر ساتھ ہی بدکردار بھی۔'' میں نے کہا۔

''تو اُسے سزا تو دے رہے ہو۔ اور کیا چاہئے؟'' اس نے کہا۔

''اسے سزا دے کر میں گناہ تو نہیں کر رہا۔ وہ اسی قابل ہے۔''

''کیسا چولا بدلا ہے، اُس نے...... بس مزہ ہی آ گیا۔ سنو! تمہاری دنیا میں اس سنہری چمکتی دھات کی اس قدر اہمیت کیوں ہے؟...... لوگ اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینے کو تیار رہتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

''بس یوں سمجھ لو، میری دنیا تمہاری دنیا سے اسی قدر مختلف ہے۔ تم جس دنیا کو اتنی دلچسپی سے دیکھتے آئے ہو، اسی دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو زندگی کا بوجھ بمشکل تمام گھسیٹ رہے ہیں اور اس دنیا کو جلد از جلد چھوڑ دینے کے خواہش مند ہیں۔''

''ہم ایسے لوگوں کی مدد کریں گے...... انہیں زندہ رہنے کے سامان فراہم کریں گے۔''

''کس کس کے لئے کرو گے دوست! یہاں تو ہر دوسرا آدمی دکھی ہے۔ بہرحال چھوڑو اس ذکر کو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اس دنیا کے روشن پہلو ہی دکھاؤں۔ تاریکیوں میں تمہارا دم گھٹ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... لیکن روشنی میں اگر کبھی تاریک دھبے بھی نظر آ گئے تو ہم انہیں صاف کرتے چلیں گے اور تم مجھے اس سے نہ روکو گے۔'' طالوت نے کہا۔

''تمہاری مرضی۔'' میں نے گردن ہلائی اور پھر بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی اور طالوت سے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے، اب یہاں سے اُٹھیں؟''

''ہاں...... آؤ، سیر کریں۔'' طالوت نے کہا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

بیرے سے بل منگوا کر میں نے اس کی ادائیگی کی اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ طالوت اب صرف میری نگاہوں کے سامنے تھا، دوسرے لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ راستے میں وہ کہنے لگا۔

''اپنی مملکت سے فرار ہوئے مجھے بہت سے دن گزر چکے ہیں...... یہ دن میں نے یہیں، اسی ماحول میں گزارے تھے۔ لیکن میں سب سے اجنبی تھا، ہر ایک سے خوف زدہ تھا، نہ جانے کیا ہو۔ اور میرے دوست! جب سے تم ملے ہو، لطف ہی آ گیا ہے۔ بلاشبہ یہ میری زندگی کے حسین ترین دن گزرے ہیں، اور تمہاری معیت میں آنے والے لمحات کا تصور میرے دل میں گدگدی پیدا کرتا رہتا ہے۔''

''میری خوش قسمتی ہے طالوت! کہ میں تمہارے کسی کام آ سکا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ مسکراتا رہا۔

بازاروں میں رونق بڑھتی جارہی تھی۔ راستے میں مجھے کبھی پولیس کی وردی نظر آجاتی تو میں ہول جاتا اور وہ راستہ کاٹ دیتا، جہاں پولیس والوں سے مڈبھیڑ ہونے کا اندیشہ ہوتا۔ پولیس کی نگاہوں میں، میں اچھا خاصا مجرم بن گیا تھا۔ میری گرفتاری پر کسی بھی پولیس والے کی ترقی ہوسکتی تھی۔ یہ پہلو میرے لئے پریشان کُن تھا، جسے تھوڑی دُور چل کر طالوت نے بھی محسوس کرلیا۔

''میں نے غور کیا ہے کہ تم پولیس والوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہو۔'' تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

''پریشان نہ ہوؤں تو کیا خوشی سے قہقہے لگاؤں؟ تم سمجھتے کیوں نہیں، میری حیثیت ایک مجرم کی ہے۔ میں اس طرح آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتا۔''

''اچھا، تم اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ کیا کرے گی؟''

''جیل میں ٹھونس دینے کے علاوہ کچھ نہ کرے گی۔''

''بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا وہ تمہاری محبوبہ کو مجرم نہیں گردانے گی، جس نے تمہیں اس جرم پر مجبور کردیا تھا؟''

''قطعی نہیں۔ وہ صرف جرم کرنے والے کو دیکھتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں کے قانون میں ان لوگوں کے لئے بھی سزا مقرر ہو جائے جو جرم پر اُکساتے ہیں تو شاید جرائم میں کمی ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں جرم کے محرکات کو نہیں دیکھا جاتا۔ حکومت ان کا سدِّ باب کرے تو جرائم کی روک تھام میں بڑی کمی ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن میرے دوست! حکومت کوئی ادارۂ عشق تو نہیں کھول سکتی۔ دوسرے محرکات کو تو روکا جاسکتا ہے، لیکن ناکام عاشقوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ کسی کو جبراً عشق کرنے پر تو مجبور نہیں کرسکتی۔'' طالوت نے کہا۔

''ہاں...... یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔'' میں نے لاجواب ہو کر کہا۔

''بہرحال...... اخلاقی طور پر تمہاری محبوبہ ضرور مجرم ہے۔ اس کا محاسبہ ضرور ہونا چاہئے تھا۔ لیکن خیر...... حکومت کو دوسرے کام کرنے دو۔ ہم خود اس کا محاسبہ کر رہے ہیں۔ رہا تمہارا سوال...... تو تم اس کے حقدار کو پہنچ چکی ہے اور زندگی بچانا اور آزاد رہنا ہر ایک کا حق ہے۔ اس سلسلے میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو ناقابلِ معافی ہو۔ اس لئے تم میرے ضمیر پر بھی بوجھ نہیں ہو۔ فکر مت کرو...... پولیس اگر تمہیں پچاس مرتبہ بھی گرفتار کرلے تو چند گھنٹوں سے زیادہ جیل میں نہ رکھ سکے گا۔ اوّل تو ایسے واقعات پیش ہی نہیں آئیں گے اور اگر پیش آ بھی جائیں تو تم فکرمند نہ ہونا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور طالوت میرے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''چھوڑو ان باتوں کو...... آؤ، کچھ تفریح کریں۔''

''کیسی تفریح؟...... میں سمجھا نہیں۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''ارے بھئی تفریح کا مطلب تم نہیں سمجھے؟...... ہی ہی ہی......'' طالوت اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ وہ ان فیشن ایبل لڑکیوں کی طرف تھا، جو مشتعل کردینے والے کپڑے پہنے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی جارہی تھیں۔

''ہوں........!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کوئی شرارت کرنا چاہتے ہو؟''
''نہیں، نہیں........ مجھے یہ کھلے ہوئے پھول بہت پسند ہیں۔ ان میں زندگی ہے، بے حجابی ہے۔ ہمارا میری مملکت میں عورتوں پر بڑی پابندی ہے۔ ان کے لئے درجے مخصوص ہیں، لباس مخصوص ہیں، کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔''
''کبھی تم جیسے طور طریقے ہمارے ہاں بھی رائج تھے۔ ہماری دنیا بڑی پُرسکون تھی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اب یہاں انتشار اور خلفشار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''
''اونہہ........ بوڑھی باتیں مت کرو........ دیکھو، وہ کہاں داخل ہو رہی ہیں۔'' طالوت نے کہا اور میں نے لڑکیوں کو ایک بڑے اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا۔
''آؤ یار!'' طالوت نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا اور میں مجبوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ بہر حال اس کی خوشی پوری کرنے کے لئے میں کسی حد تک مجبور تھا۔
ہم دونوں بھی جنرل اسٹور میں داخل ہو گئے۔ بہت بڑا اسٹور تھا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بہت سے سیلز مین گاہکوں کو اٹینڈ کر رہے تھے۔ لڑکیاں تعداد میں پانچ تھیں۔ شوخ، چنچل، الٹرا ماڈرن اور تیز طرار۔ ایک سے ایک حسین۔ انہوں نے جدید طرز کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ میں ان سے ذرا دور کھڑا ہو گیا اور ایک شوکیس میں سجے ہوئے لائٹر دیکھنے لگا۔ طالوت لڑکیوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ انہیں قریب سے دیکھ رہا تھا اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں خود کو مصروف رکھنے کے لئے الٹی سیدھی چیزیں خریدنے لگا۔
تقریباً دس منٹ کے بعد لڑکیاں ڈریسنگ روم سے نکلیں۔ ان کے پیچھے پیچھے طالوت بھی گردن لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا، اپنی خریدی ہوئی اشیاء کا بل ادا کیا اور باہر نکلنے لگا۔
''ایک منٹ ٹھہر جاؤ........ صرف ایک منٹ۔'' اس نے التجا کی۔
''کیا پٹنے کا ارادہ ہے؟........ چلو بھائی! خدا کے لئے چلو۔ اپنے ساتھ تم مجھے بھی پٹواؤ گے۔'' میں نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔
''میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی، حالانکہ........ سنو تو، ان بے چاریوں کی کچھ مدد کر دوں۔'' طالوت مجھ سے ہاتھ چھڑا کر پھر کاؤنٹر کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکیاں سیلز مین سے سودا طے کر رہی تھیں۔ میں نے ان کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے اور پھر لڑکیوں نے طرح طرح کی درجنوں چیزیں خرید ڈالیں اور اسٹور سے باہر نکل آئیں۔
''آؤ........!'' طالوت نے کہا۔
''فضول جھگڑوں میں مت پڑو........ ہم ان کا تعاقب نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔
''کون بے وقوف کہہ رہا ہے یار! مگر لطف آ گیا........ ہائے!''
''تم نے ان کی مدد کیا کی؟'' میں نے پوچھا۔
''سیلز مین چیزوں کی جو قیمت بتانا چاہتا تھا، میری وجہ سے ان کی قیمت چوتھائی سے بھی کم بتائی۔ تم نے دیکھا، لڑکیوں نے کتنی خریداری کر لی۔''

"اوہ!........تم نے غریب سیلز مین کو مروا دیا۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ بری طرح مارا گیا۔"
"کیسے مارا گیا؟........کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"ارے بھئی! اب اس کی ساری تنخواہ کٹ جائے گی........ بے چارہ۔ اُس کا پورا مہینہ پتہ نہیں، کیسے کٹے گا۔"
"ارے میں ناانصاف نہیں ہوں........اس کی جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی ڈال آیا ہوں۔" طالوت نے کہا۔ اور مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ عجیب شخص تھا یہ بھی۔ طالوت ڈریسنگ روم کے اندر کے حالات یاد کر کے چٹخارے لیتا رہا، لیکن میں سنبھل گیا۔ کیونکہ سامنے سے دو پولیس سارجنٹ آ رہے تھے۔ پولیس سارجنٹ آگے نکل گیا تو میں نے ایک گہری سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ طالوت ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہم بہت سی عمارتوں میں داخل ہوئے لیکن میں نے طالوت کو مزید کوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں دی اور پھر شام تک آوارہ گردی کرنے کے بعد ہم واپس زرینہ کے گھر چل پڑے۔ زرینہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ اُس نے ہزاروں سنگھار کر رکھے تھے اور میرے قتل کا مکمل سامان کئے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے پچھلی رات یاد آ گئی۔ اُس کی لطافتیں یاد آ گئیں۔ بے شک وہ ایک دلکش عورت تھی، لیکن آبرو باختہ۔ دولت کی ہوس نے اس سے نسوانیت چھین لی تھی۔

زرینہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی، لیکن میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس ہوس پرست لڑکی نے اگر میری محبت قبول کر لی ہوتی یا پھر قبول ہی نہ کی ہوتی تو آج حالات دوسرے ہوتے۔ لیکن اس نے مجھے خود اپنی طرف متوجہ کیا۔ غریب اور محبت کرنے والی انجیلا کا حق چھینا، مجھ سے اس کی دل شکنی کرائی اور پھر اختر بیگ کے گیارہ سو پر مر گئی۔ بات شاید اس حد تک نہ ہوتی، جہاں اب پہنچ گئی تھی۔

لیکن اب وہ ایک شریف عورت نہیں تھی۔ اس نے زیورات دیکھ کر خود کو میرے سپرد کر دیا۔ اور میں جانتا تھا کہ طالوت کسی گھناؤنے بوڑھے کی شکل اختیار کر کے اگر اس کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیتا تو وہ سب کچھ بھول کر طالوت کی آغوش میں پہنچ جاتی۔ ایسی عورت کے ساتھ اچھا سلوک کیوں کیا جائے۔

میں سوچتا رہا۔ پھر زرینہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
"کیا سوچ رہے ہو، عارف؟"
"تمہارے بارے میں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔
"کیا........؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آ گیا تھا۔
"یہی.... کہ تم مجھ سے دُور کیوں چلی گئی تھیں؟" میں نے اس کی حالت سے مسرور ہوتے ہوئے کہا۔
"یہ صرف تمہارا خیال تھا، عارف!........ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ میں تم سے دور کیسے ہو جاتی؟" اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"پھر اختر بیگ سے اتنی یگانگت اور مجھ سے بے اعتنائی........اس بارے میں تم کیا کہتی ہو؟"
"وہ صرف تمہارا احساس تھا۔ میں تمہاری محبت آزمانا چاہتی تھی لیکن میری اس تفریح کا جو نتیجہ نکلا،

اس نے مجھے لرزا دیا عارف! کاش تم اس قدر جلد بازی سے کام نہ لیتے۔" اس نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آزمائش تمہیں مجھ سے اس قدر متنفر کر دے گی۔"

"اوہ........ تو تم میری محبت کو آزما رہی تھیں؟........ یعنی اختر بیگ سے اتنی یگانگت مصنوعی تھی؟"

"ہاں........ مگر افسوس کہ تمہیں اس مصنوعیت کا احساس نہ ہو سکا۔ اختر بیگ تمہارے جوتوں کی خاک بھی نہیں ہے۔ میں اس مردود سے کیا دل لگاتی؟ میں تو تمہاری ہو چکی تھی۔ اور جب تم میری نگاہوں سے دور ہو گئے، تم پر ایک سنگین الزام لگ گیا تو میں خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ عارف! اگر تم مجھے نہ مل جاتے تو میں خودکشی کر لیتی۔" زرینہ نے کوشش کر کے آنسو نکال لئے۔ اس کی اداکاری اس وقت قابلِ دید تھی۔ میں اس کی کیفیت سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"ارے نہیں جانِ من!........ میں تمہارے بغیر زندہ کیسے رہ سکتا تھا؟"

"تم یہاں سے چلے کیوں گئے تھے عارف؟" زرینہ نے مجھ سے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بس، میں نے سوچا کہ تم بے وفا ہو........ دولت نے تمہاری محبت مجھ سے چھین لی ہے۔ حالانکہ دولت کی میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ میں تمہیں اپنی حقیقت بتا چکا ہوں۔ لیکن بہرحال، میں والدین سے ناراض تھا۔ میں نے حشمت سیٹھ کی دولت اسی لئے حاصل کی تھی کہ اس کے ذریعے میں کسی طور زرینہ کو خرید لوں گا۔ لیکن تمہارے بغیر میرا دل نہ لگا، گرفتار ہوا اور حشمت سیٹھ کو اس کی رقم واپس مل گئی۔ لیکن اس دوران میرا اپنوں سے رابطہ قائم ہو گیا اور پھر میں بہت سی دولت لے کر تمہارے پاس آ گیا۔ اب تم جو چاہو گی ملے گا۔ جس چیز کی خواہش کرو گی، حاضر کر دی جائے گی۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہئے عارف! بس مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے اپنے ساتھ اپنی ریاست لے چلو۔ میں پوری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دوں گی۔" زرینہ نے میرے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔ اپنے اس مطالبے کو پورا کرانے کے لئے وہ مجھے اپنے آپ کا احساس دلا رہی تھی۔ مجھے بتا رہی تھی کہ یہ سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ میں جس طرح اور جب بھی دل چاہے، اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

ایک بار پھر میں بہکنے لگا۔

لیکن میں جلد ہی سنبھل گیا۔ ممکن ہے، طالوت میرے پاس ہی موجود ہو اور میری وعدہ خلافی پر برے برے منہ بنا رہا ہو۔ میں کسی صورت میں اس کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں زرینہ کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں چلا گیا۔ اس رات زرینہ کی لطافتیں میری شریانوں میں آگ بہانے لگیں۔ لیکن مجھے صبر سے کام لینا تھا۔ میں نے زرینہ کو بستر پر لٹا دیا اور اس کے ہاتھ آگے بڑھنے لگے۔

"ایک منٹ زرینہ!" میں نے کہا اور مسہری سے اُٹھ گیا۔

"کیوں........ کیا بات ہے جانِ من؟" زرینہ مخمور لہجے میں بولی۔

"بس، ابھی آیا۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے سے تھوڑی دور طالوت زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔

"کیوں بھائی! یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''طے کر چکا تھا کہ اگر تم اپنا وعدہ بھول گئے تو صبح تک اسی طرح بیٹھا رہوں گا۔'' اس نے منہ پھلائے پھلائے کہا۔ ''اور تمہیں کوستا رہوں گا۔''

''بھلا میں اپنا وعدہ کیسے بھول سکتا ہوں؟ تم میرے لئے زرینہ سے زیادہ محترم ہو۔ وہ تو فاحشہ ہے۔ کوئی بھی مرد اس کے لئے اختر بیگ یا عارف بن سکتا ہے۔''

''اچھا تو پھر مجھے اجازت ہے؟'' وہ کھڑے ہو کر بولا۔

''ہاں، ہاں........ کیوں نہیں؟ میں اس دوسرے کمرے میں آرام کروں گا۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر میں طالوت کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

رات کو نہ جانے کب تک میں جاگتا رہا۔ میری آنکھوں میں کئی ایک شکلیں گھوم رہی تھیں۔ انجیلا، زرینہ، راشدہ، نائلہ اور شہنا........ تھوڑے دنوں میں میری زندگی میں کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ میں کیا سے کیا بن گیا تھا........ حالات نے مجھے کچل کر رکھ دیا تھا۔ میری شخصیت بدل دی تھی۔ میں جو ایک سیدھا سادا نوجوان تھا، جس کی زندگی اپنے بوسیدہ فلیٹ اور دفتر تک محدود تھی، جس نے اپنے مستقبل کا تعین اسی حد تک کیا تھا کہ کسی بھی لڑکی سے شادی کر لوں گا، محنت سے کام کروں گا تو میری تنخواہ بڑھ جائے گی۔ بچے ہوں گے اور میں بھی ایک عام آدمی کی طرح بوڑھا ہو کر مر جاؤں گا۔ اس سے زیادہ میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ میرے دل میں ترقی کرنے کی لگن نہیں تھی۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کو سُکھی رکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میں تعلیم یافتہ تھا، لیکن میرے دل میں دنیا کی سیر کرنے کا خبط نہیں سمایا تھا۔ میں نے خود کو ایک حد تک محدود کر لیا تھا۔

لیکن اچانک حالات بدل گئے تھے۔ انجیلا اور پھر زرینہ میری زندگی میں آئیں۔ زرینہ نے میرے مستقبل کا دھارا بدلنے میں ایک خاص کردار انجام دیا۔ اور اب، میں ایک مفرور مجرم تھا۔ طالوت کے رحم و کرم پر تھا۔ زرینہ کے خلاف میرے دل میں نفرت کا شدید جذبہ تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس بے وفا عورت کو سسکا سسکا اور تڑپا تڑپا کر مار دوں۔ لیکن پھر میرے خیالات کا رخ بدل گیا۔ زندگی تو چار دن کی چاندنی ہے، اس کے باوجود انسان طویل پروگرام بناتا ہے۔ حالانکہ وہ موت کے ہاتھوں بے بس ہے، صرف چند لمحوں میں موت گردن دبوچ سکتی ہے۔ پھر اس زندگی پر بھروسہ کیوں کیا جائے۔ موت نے جتنی مہلت دی ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ زندگی کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ نت نئی تفریحات اور ہنگاموں کو کیوں نہ جنم دیا جائے۔ ہر پریشان کن خیال کو دل سے نکال دیا جائے اور طالوت کی پُراسرار قوتوں کو زندگی کی دلچسپیوں سے لطف اُٹھانے کے لئے کیوں نہ استعمال کیا جائے........!

یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ گیا۔ زرینہ کے ہاں مہمان رہنے سے اُکتاہٹ ہونے لگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بس ایک آدھ دن میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اور اس خیال سے مطمئن ہونے کے بعد میں سو گیا۔

کافی دیر سے سویا تھا۔ گہری نیند آئی۔ لیکن صبح پوری طرح نہ ہونے پائی تھی کہ کسی نے میرے اوپر چھلانگ لگائی اور دبوچ لیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے اوپر سوار بلا کو دیکھا۔ وہ طالوت تھا۔ اُس نے جھک کر میرے کئی بوسے لے ڈالے اور میں بمشکل اسے خود پر سے دھکیل سکا۔

''کیا بدتمیزی ہے؟........ کیوں بدحواس ہو رہے ہو؟''

''مانگ لے میرے یار!........ جو دل چاہے مانگ لے........ میں سب کچھ بخشنے کو تیار ہوں۔'' طالوت نے مسرور لہجے میں کہا۔

''کیوں چیخ رہے ہو طالوت؟........ یہ کیا وحشت ہے؟ ہوش میں آؤ۔''

''ہوش کہاں میری جان؟........ آہ........ یہ رات، یہ رات........ اس رات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کاش وہ ہرجائی نہ ہوتی تو ہم اُسے اپنے ساتھ شامل کر لیتے۔''

''اچھا، اچھا........ بکواس بند کرو........ اسے تمہارے اوپر شبہ تو نہیں ہوا؟''

''بالکل نہیں........ لیکن مجھے شبہ ہونے لگا تھا۔'' طالوت نے میرے قریب دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا شبہ ہونے لگا تھا؟''

''یہی کہ وہ عورت نما مرد ہے اور میں مرد نما عورت۔ یقین کرو، بڑی جذباتی اور بے حیا عورت ہے۔ ہر بات میں پہل کرتی ہے........ افوہ........!'' طالوت نے آنکھیں بند کر لیں۔

''سو رہی ہے کیا؟'' میں نے مسکرا کر سوچا۔

''بڑی مشکل سے اُسے سُلانے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' طالوت نے کہا۔ ''اس کے لئے مجھے اپنی پُراسرار قوت سے کام لینا پڑا۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ زرینہ کو شبہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

میں نے اس کے کمرے سے ملحقہ غسل خانے میں غسل کیا۔ جب میں غسل خانے سے باہر آیا تو وہ جاگ چکی تھی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیر لی۔

''کیا دیکھ رہی ہو، سویٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''رات کو تم کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ پتہ نہیں، مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ تم وہ نہیں ہو، جو پہلے تھے۔''

''تمہاری آنکھوں کا قصور ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا اور وہ دلکش انداز میں مسکرانے لگی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا، خوب کس کس کر اس کے منہ پر طمانچے ماروں لیکن میں نے بمشکل خود پر قابو پا لیا۔

''عارف!'' وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔

''ہوں........؟''

''ابھی کیوں جاگ گئے؟ صبح اتنی جلدی کیوں ہو گئی؟'' وہ بہکی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کاش یہ رات کبھی ختم نہ ہوتی۔''

''اُٹھو!........ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رات کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ چھوڑو، رات گئی، بات گئی۔''

''مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر ناشتہ کرو۔''

''نہیں۔''

''کیوں........؟''

''میں تمہارا ناشتہ کروں گی۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔

''اُٹھو!........شاید کوئی آیا ہے۔''

''برابر والے فلیٹ میں کوئی آیا ہے........ ہمارے یہاں کون اتنی صبح آ سکتا ہے؟'' اس نے مخمور لہجے میں کہا اور اُٹھ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ ''یہاں آ جاؤ، ڈارلنگ!'' اس نے کہا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ میں ایک لمحے کے لئے بے بس ہو گیا۔ میں روشنی کی اس کرن کو بھی نہیں دیکھ سکا جو بند دروازے سے رینگ آئی تھی۔

اور پھر میری نگاہ دروازے پر پڑی تو میں چونک اُٹھا!

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور کوئی دروازے میں کھڑا تھا۔ میں دروازے میں موجود شخص کو دیکھنے لگا!

اور پھر اُسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ اختر بیگ تھا........!

ایک لمحے کے لئے میں بوکھلا گیا۔ تب زرینہ کی نگاہ بھی اختر بیگ پر پڑی۔ خود اُس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گئی۔ اور غصیلی نگاہوں سے اختر بیگ کو دیکھنے لگی۔ مجھ پر اپنی محبت کا سکہ بٹھانے کا ایک موقع اُسے مل گیا تھا۔

لیکن اب اختر بیگ بھی مجھے پہچان گیا تھا۔ چنانچہ اس کا تمام غصہ حیرت میں بدل گیا تھا۔

''تم........تم عارف!'' اس کے منہ سے نکلا اور میرے اندر ایک عجیب جرأت اُبھر آئی۔ میں نے حواس مجتمع کیے اور مسکرانے لگا۔

''ہاں........یہ میں ہی ہوں، اختر بیگ! کیوں، تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟........کیا میں زرینہ سے اظہارِ التفات نہیں کر سکتا؟''

''میں کہتی ہوں تم بلا اجازت اندر کیسے آئے؟.....دروازہ کس نے کھولا؟'' معاً زرینہ کان پھاڑ آواز میں چیخ اُٹھی۔

''ٹھہرو زرینہ! اختر بیگ میرا پرانا دوست ہے۔ مجھے اس سے مل تو لینے دو۔'' میں نے اسے روکا۔

''تو تم یہاں چھپے ہوئے ہو؟'' اختر بیگ نے کہا۔

''ہاں میری جان! کیا تمہیں اعتراض ہے؟........کیا تم میرے اور زرینہ کے درمیان قائم تعلقات سے واقف نہیں تھے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''لیکن اس نے تم سے نگاہیں پھیر لی تھیں۔ شاید تم بھی اس بات سے واقف ہو۔'' اختر بیگ نے کہا۔

''ہاں! زرینہ نے کامیابی سے تمہیں بے وقوف بنایا، اختر بیگ! ہم دونوں نے مل کر تمہارے ساتھ ایک دلچسپ مذاق کیا تھا۔ زرینہ صرف میری ہے، ہمیشہ سے میری ہے۔ وہ صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، زرینہ........؟''

''بالکل نہیں، ڈارلنگ! تم سولہ آنے صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ اختر بیگ گدھا ہے۔'' زرینہ نے نفرت سے کہا اور میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

''یہ ہمارا مشترکہ پروگرام تھا، اختر بیگ! زرینہ تمہیں بے وقوف بناتی رہی اور تم نے اسی گدھے پن میں شادی کے کارڈ چھپوا لئے۔ پھر تمہاری اس حماقت سے خوش اسلوبی سے نمٹنے کے لئے میں نے رقم غائب کرنے کا ڈرامہ کیا۔ حالانکہ مجھے اس رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی، میں کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ معاف کرنا اختر بیگ! ہماری تفریحات اسی قسم کی ہوتی ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اختر بیگ کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

''تو...... تو اس سؤر کی بچی نے مجھے اتنا زبردست دھوکا دیا ہے...... میں اسے جان سے مار دوں گا۔'' اختر بیگ، زرینہ کی طرف جھپٹا لیکن درمیان میں ہی میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''کس کی مجال ہے کہ میری موجودگی میں میری محبوبہ کو ہاتھ لگا سکے؟''

''چھوڑو...... چھوڑو مجھے۔'' اختر بیگ نے مجھ سے گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن میرے ایک زوردار تھپڑ نے اس کے حواس درست کر دیئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہیں میری محبت پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آئی تھی، اختر بیگ؟ جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ میں زرینہ سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اس پر ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں...... میں اپنی کمائی اس پر لٹاتا رہا ہوں، چنانچہ یہ کسی صورت میں تمہاری نہیں ہو سکتی۔''

''یہ تمہاری حماقت تھی، زرینہ کی نہیں۔ زرینہ! اس کے تمام تحائف واپس کر دو۔'' میں نے کہا۔

''میں اس کے پھٹیچر تحفوں کو جوتے کی نوک پر مارتی ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔ اور پھر اس نے ایک الماری سے زیورات کے ڈبے، ساڑھیاں اور دوسرے کپڑے نکال کر پھینکنا شروع کر دیئے۔

''اُٹھاؤ...... انہیں اُٹھاؤ، اختر بیگ! اور یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ تم بلا اجازت ہماری خلوت میں داخل ہوئے ہو۔ مجھے غصہ آ گیا تو تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔''

میرا تن و توش اختر بیگ کے مقابلے میں بہت اچھا تھا۔ اور پھر میرے زوردار تھپڑ نے بھی اختر بیگ کے حواس درست کر دیئے تھے۔ اس لئے اختر بیگ نے سامان اٹھا کر فرار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ زرینہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلی اور پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ''ملعون نے تمام موڈ چوپٹ کر دیا۔ مگر دروازہ کس نے کھولا؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''ممکن ہے، تم رات کو بند کرنا بھول گئی ہو۔'' میں نے کہا۔ لیکن میرے ذہن میں طالوت گھوم رہا تھا۔ نہ جانے وہ بدمعاش کہاں ہے۔ دروازہ اس کے علاوہ کون کھول سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے، میں نے بند کر دیا تھا۔ بہرحال، اچھا ہوا، اس موذی سے جان چھوٹ گئی۔ لیکن تم نے بات بھی خوب بنائی۔ کیسا منہ پھاڑ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھ رہا تھا، ذلیل کہیں کا۔''

''یہ صبح صبح آ کیسے گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، پرسوں میں نے ٹال دیا تھا۔ کل آفس نہیں گئی تو آج آ دھمکا۔'' زرینہ نے کہا۔

''اب تم اس نوکری پر لعنت بھیج دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں نوکری

کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"اب تو ویسے بھی وہاں نوکری کرنا مشکل ہے۔ حشمت سیٹھ، اختر بیگ کو بہت مانتا ہے۔ اور پھر تمہارا کہنا بھی درست ہے، اب مجھے ملازمت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" اس نے میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... مگر اب ناشتے کا بندوبست تو کر دو...... بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

"جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔" زرینہ نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "میں غسل کر سکتی ہوں؟"

"کرلو...... میں دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور پھر جب وہ باتھ روم میں چلی گئی تو میں جلدی سے باہر نکل آیا۔

"طالوت!" میں نے دانت بھینچ کر آواز دی۔

"جانِ طالوت۔" میرے کان کے نزدیک ہی آواز سنائی دی اور طالوت نمودار ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"تو میرا خیال درست تھا؟" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کون سا خیال؟" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"کال بیل بجنے پر دروازہ تم نے ہی کھولا تھا؟"

"ہاں...... مہمان کو اندر آنے سے روکنا بداخلاقی جو ہے۔ اور پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ اختر بیگ ہے تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں تم دونوں کے ٹکراؤ کا دلچسپ تماشہ دیکھوں۔"

"اس کا نتیجہ جانتے ہو؟"

"دیکھ تو لیا۔"

"ابھی کہاں؟...... ابھی تو دیکھو گے۔ وہ بدبخت پولیس لے کر آ گیا تو؟"

"تو کیا ہوگا؟" طالوت نے لاپروائی سے شانے اچکا دیئے۔

"اوہ...... تم نہیں سمجھتے، طالوت! ہمیں ان جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے ہتھیلی پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں ان تمام تفریحات سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ تم اس قسم کے معاملات مجھ پر چھوڑ دیا کرو۔" طالوت نے کہا اور میں نے غصے سے آنکھیں بند کر لیں۔

"چھوڑو ان باتوں کو، میری جان! آؤ، کمرے میں چلیں۔" طالوت نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میں نے ایک کرسی پر گر کر آنکھیں بند کر لیں اور طالوت گراموفون کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ریکارڈر کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"فضولیات۔" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا اور طالوت، گراموفون میں اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے اسے آن کر لیا اور ریکارڈ سے ایک نغمہ پھوٹ پڑا۔ میں نے طالوت کو اُچھل کر ایک طرف پلٹتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اس کا ہونق چہرہ دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی۔

''اچھی چیز ہے۔'' اس نے چند منٹ کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ بجاتا رہا اور میں کرسی پر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد زرینہ کی آواز سنائی دی۔

''عارف!........آ جاؤ، ڈارلنگ! ناشتہ تیار ہے۔''

''بس بند کرو'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔''

''تم جاؤ۔ ناشتہ میرے لئے تھوڑی تیار ہوا ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''بس، ہم آج ہی یہاں سے چل دیں گے۔ میں اب زیادہ فضولیات برداشت نہیں کرسکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، میں تمہارے ساتھ ناشتہ بھی نہیں کرسکتا۔''

''جاؤ، جاؤ........ بلا رہی ہے۔'' طالوت نے میری گردن پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیل دیا اور پھر خود گراموفون بند کرنے لگا۔ زرینہ اسی طرف آ رہی تھی۔ غسل کرنے کے بعد وہ نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر قبل کے واقعات کا کوئی اثر اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ میں نے اس بدذات عورت کی شکل دیکھی۔ اپنی محبت کے دھارے تبدیل کر دینا اس عورت کے لئے کس قدر آسان ہے۔ غریب اختر بیگ لٹ گیا، اس کی دنیا برباد ہو گئی، لیکن اس کے اوپر کوئی اثر نہیں ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے، جب میں بھی اس کی وجہ سے سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ میرا دل چاہا کہ زرینہ کا چہرہ بگاڑ دوں۔ لیکن بہرحال، مجھے کیا پڑی تھی۔ کچھ عرصہ بعد خود ہی اس کا طلسم ٹوٹ جانے والا تھا!

میں اس کے ساتھ ناشتے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ میری خاطر مدارات کرنے لگی۔ لیکن میں زندگی کے کسی حصے میں اس مکار عورت کی طرف سے دل صاف نہیں کرسکتا تھا۔

بہرحال، ہم ناشتہ کرتے رہے........ اور ابھی ناشتہ سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر زوردار دھڑ دھڑاہٹ سنائی دی۔

میرے ساتھ زرینہ بھی چونک پڑی تھی۔

''کون بدتمیز ہے؟'' وہ بولی اور ناشتے کی میز سے اُٹھ گئی۔ میرا رنگ اُڑ گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔ پولیس!........ اور میرا یہ خیال سو فیصدی درست تھا۔

چند لمحے بعد ایک پولیس افسر پستول تانے ہوئے ناشتے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو کانسٹیبل زرینہ کے بازو پکڑے ہوئے تھے اور زرینہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پولیس کو دیکھ کر میرا بھی بدن کانپنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں طالوت کی تسلیاں بھول گیا۔ میں نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن میری ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔

''ہتھکڑیاں ڈال دو، اس بدمعاش کو۔'' خرانٹ پولیس آفیسر نے کہا اور پھر زرینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اور کون ہے یہاں؟''

''کوئی نہیں۔ میری بوڑھی ماں تھی، جو ایک رشتہ دار کے یہاں چلی گئی ہے۔'' زرینہ نے جواب دیا۔

''ہاں........ تاکہ تم خوب رنگ رلیاں منا سکو۔ تم نے ایک خطرناک مجرم کو پناہ دی ہے........ تمہارے لئے یہی کافی ہے۔ اب جیل جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''خود مجھے جرم پر اُکسانے والی یہی عورت ہے، انسپکٹر!'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"دونوں کو دیکھ لیا جائے گا۔" انسپکٹر نے کہا اور زرینہ کی خوف و حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اپنے گرفتار ہونے کا خوف میرے دل سے جاتا رہا۔ میں زرینہ کی زندگی برباد کر چکا تھا۔ میرا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ یہ میری زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔

"یہ....... یہ ایک بہت بڑے نواب کا بیٹا ہے، انسپکٹر! تم........ تم......." زرینہ کے منہ سے نکلا۔

"اور تم اس نواب کی بہو بیگم ہو۔ کیوں؟" انسپکٹر نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

اتنی دیر میں سپاہی میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال چکے تھے۔ پھر وہ مجھے لئے ہوئے باہر نکل آئے۔ یہاں میں نے اختر بیگ کو دیکھا، جس کی آنکھوں سے انتقام کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، اختر بیگ! میں اس تھپڑ کی بھی معافی چاہتا ہوں، جو میں نے تمہارے گال پر لگایا تھا۔ اصل میں، میں تمہیں اس عورت کی اصلیت دکھانا چاہتا تھا، جس نے میری زندگی برباد کی ہے۔" میں نے اختر بیگ سے کہا۔

"لے چلو اس عورت کو۔" انسپکٹر نے کہا اور سپاہی زرینہ کو گھسیٹنے لگے۔ جو میرے الفاظ پر نیم مُردہ سی ہو گئی تھی۔ پھر ہم دونوں کو پولیس کی بند گاڑی میں بٹھایا گیا۔ زرینہ کے تمام پڑوسی جمع ہو گئے تھے اور اس کے بارے میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

"آوارہ تھی، اُلّو کی پٹھی....... ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا....... اپنے آشنا کے ساتھ پکڑی گئی۔"

بہت سی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

زرینہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی اور بار بار پھٹی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس سے اتنا زبردست انتقام لیا ہے۔ اب وہ کہیں کی نہیں رہی تھی۔ شاید ملازمت سے بھی نکال دی جائے گی۔ پولیس کے شکنجے سے تو خیر با آسانی نکل سکتی تھی، کیونکہ اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا تھا۔ لیکن فلیٹ کے قرب و جوار کے لوگ اب اسے اس فلیٹ میں نہ رہنے دیں گے۔ اور اختر بیگ....... وہ تو شاید اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہ کرے۔

"ٹھیک ہے....... ہے بھی اسی قابل!" میں نے نفرت سے سوچا۔ "کمینی، ذلیل، بدذات کہیں کی۔"

گاڑی پولیس اسٹیشن کی عمارت میں پہنچ کر رک گئی اور ہم دونوں کو نیچے اُتارا گیا۔ پھر زرینہ کو تو کہیں اور لے جایا گیا اور مجھے ڈی ایس پی کے آفس میں پہنچا دیا گیا۔ انسپکٹر نے ڈی ایس پی کو میرے بارے میں رپورٹ پیش کی۔

"خوب....... تو یہ حضرت پکڑے ہی گئے۔ سنا ہے کہ انہوں نے اس شہر میں تو بڑے کارنامے دکھائے تھے، جہاں انہیں رقم سمیت پکڑا گیا تھا، اب یہی اس آدمی کے بارے میں بھی بتا سکیں گے، جس نے پولیس کے سامنے خود کو ایک تاجر ظاہر کیا تھا اور جوان کا ہم شکل تھا۔" ڈی ایس پی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر انسپکٹر کی طرف رُخ کر کے بولا۔ "فی الحال اسے لاک اپ میں بند کر کے خصوصی گارڈ لگا دو۔ اس کے بعد مزید کارروائی کی جائے گی۔"

اور مجھے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ یہ بے عزتی میرے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ اور نہ ہی اب مجھے اس کی پروا تھی۔ البتہ زرینہ کی شکل رہ رہ کر یاد آ رہی تھی، متضاد کیفیات تھیں میرے دل میں۔ کبھی

اس کی بے بسی پر رحم کے جذبات بھی اُبھرنے لگتے تھے، کبھی اس پر غصہ آنے لگتا تھا۔ لیکن میں نے رحم کے جذبات کو سختی سے دبا دیا۔ وہ بے وفا اسی قابل تھی۔ وہ صرف ایک زر پرست عورت ہے، جس کی نگاہ میں عزت و عصمت کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی بھی نوجوان اس کے لئے اختر بیگ یا عارف ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی جیبیں بھری ہوئی ہوں۔

پورا دن لاک اپ میں گزر گیا۔ شام کو پانچ بجے ڈی ایس پی کے دفتر لے جایا گیا، جہاں بہت سے پولیس افسر موجود تھے۔ ڈی ایس پی نے میرے ساتھ بڑا نرم سلوک کیا۔ مجھے چائے منگوا کر پلائی اور پھر مجھ سے پوچھا۔

''کیا تمہارا تعلق کسی باقاعدہ گروہ سے ہے؟''

مجھے ہنسی آنے لگی۔ لیکن پولیس والوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس ہنسی پر میں اپنے دانتوں سے بھی محروم ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور صاف لہجے میں کہا۔

''میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں ہے جناب! صرف اس عورت کی بے وفائی کا شکار ہو کر یہ جرم کر بیٹھا ہوں، جسے میرے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔''

''بے وفائی؟........ لیکن اس کے دوست اختر بیگ نے تو تمہیں اس کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔''

''ہاں........ وہ زر پرست عورت ہے۔ میں نے اس کا منہ دولت سے بھر دیا تو وہ میری ہو گئی۔''

''ہوں........ لیکن مسٹر عارف! تم نے سیٹھ حشمت کی فرم سے جو رقم حاصل کی تھی، وہ تو دستیاب ہو گئی۔ مزید دولت حاصل کرنے کے لئے تم نے کیا، کیا تھا؟ اتنی دولت تمہیں کہاں سے مل گئی کہ زرینہ، اختر بیگ کو چھوڑ کر تمہاری ہو گئی؟''

بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ طالوت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ لیکن اس سوال کا جواب بھی دینا تھا۔ چنانچہ میں نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے بتایا تھا کہ میں ایک نواب زادہ ہوں۔ اس سلسلے میں اسے یقین دلانے کے لئے مجھے اداکاری کرنا پڑی تھی۔ میں نے اسے اپنی ریاست میں لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد اس نے پولیس کو بتایا تھا کہ میں ایک نواب زادہ ہوں۔''

ڈی ایس پی نے گردن ہلائی۔ شاید زرینہ نے بھی اسے یہی بتایا تھا۔

''وہ شخص کون تھا، جو تمہارا ہم شکل تھا؟''

''میں اسے نہیں جانتا۔''

''بہرحال، مسٹر عارف! حشمت سیٹھ کی فرم سے تم نے جو رقم چرائی تھی، وہ تو مل گئی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی تم نے ایک جرم کیا ہے۔ یعنی تم ایک مرتبہ لاک اپ سے فرار ہوئے اور دوسری دفعہ پولیس کو دھوکا دیا۔ اس سلسلے میں جلد ہی تمہارا بیان قلم بند کیا جائے گا۔ اس عورت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ اس کی بے وفائی سے بد دل ہو کر میں نے جرم کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اختر بیگ سے اس کی شادی نہ ہو۔''

''گویا حشمت سیٹھ کی فرم سے رقم چرانے کی ترغیب تمہیں اس نے نہیں دی؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے انسپکٹر! اسے بند کر دو۔'' ڈی ایس پی نے حکم دیا اور ایک بار پھر مجھے لاک اپ میں بند کر دیا۔ لاک اپ میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

شام کے کھانے کے بعد میں دیوار سے ٹِک کر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن صاف تھا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، ٹھیک کیا تھا۔ کم از کم اب میں خود کو چغد تو نہیں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بھی زرینہ کا لطف اُٹھا لیا تھا اور اسے بے عزت کر دیا تھا۔ اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ پولیس سے بچ بھی جائے تو اب زندگی کس طرح گزارے گی۔

اور اتنی دیر کے بعد پہلی بار مجھے طالوت کا خیال آیا اور میں چونک پڑا۔ اوہ! میرے نکلنے کا تو راستہ موجود ہے۔ میرا پُراسرار دوست ضرور میری مدد کرے گا........ یقیناً........ اور میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بے اختیار میں نے پکارا۔

''طالوت........!''

''طالوت حاضر ہے، میرے دوست!'' میرے کان کے نزدیک آواز سنائی دی۔ اور میں نے چونک کر اپنی بائیں طرف دیکھا۔ طالوت بھی میرے جیسے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ طالوت بھی مسکرا رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

''ارے، ارے........ کافی گر جائے گی۔'' طالوت نے جلدی سے تھرماس ایک طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''کافی........؟''

''ہاں........ میں تو کھانے پینے کا سامان بھی لایا تھا۔ مگر تم نے انتظار بھی نہیں کیا۔''

''اوہ........ ونڈرفل میرے دوست!........ ونڈرفل۔'' میں اسے بھینچتے ہوئے بولا۔ ''تم اس دوران کہاں تھے؟''

''تمہارے ساتھ ہی تھا۔ یہ بے چارے بھی کیا یاد کریں گے کہ تمہیں کئی گھنٹے بند رکھا۔ لو، کافی پیو۔ پھر یہاں سے چلتے ہیں۔'' اس نے تھرماس کھول کر کافی انڈیلتے ہوئے کہا اور میں نے کافی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''تم نے زرینہ کو دیکھا؟''

''ہاں یار!........ ترس آرہا تھا اس پر۔ لیکن بہرحال تمہاری دشمنی ہے، اس لئے میری بھی دشمنی ہے۔ یہ لو۔'' اس نے ایک پوٹلی میری گود میں ڈال دی۔

''یہ کیا ہے........؟'' میں نے چونک کر پوٹلی کو ٹٹولا۔

''وہ زیورات جو تم نے اسے دیئے تھے۔ اگر یہ اس کے پاس رہ جاتے تو بہرحال سودا اسے مہنگا نہ پڑتا۔ ہزاروں روپے کے زیورات ہیں۔ وہ سوچتی کہ ان دو راتوں کی قیمت اور اختر بیگ سے لڑائی اسے مہنگی نہ پڑی۔'' طالوت نے کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"بلاشبہ........تم بھی بڑے شیطان ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"برا تو نہیں کیا میں نے؟ تم کہو تو واپس کر آؤں؟"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر ہمارا انتقام کیسے پورا ہوگا۔ لیکن اب یہاں سے نکلنے کا مسئلہ ہے۔"
"پھر وہی؟" طالوت نے غصیلے انداز میں کہا اور میں ہنسنے لگا۔ بلاشبہ میں نے اس تمام عرصے میں طالوت کو نظرانداز کر دیا تھا۔ میرے دوست کے لئے تو یہ لاک اپ وغیرہ کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ ہاں یہ دوسری بات تھی کہ میرا جرم اور سنگین ہو جاتا۔ لیکن اب اس کی کیا پروا کی جاسکتی تھی۔ کافی ختم کرنے کے بعد میں نے تھرماس کا گلاس طالوت کو واپس کر دیا اور اس نے تھرماس ایک طرف ڈال دیا۔
"چلیں........؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں........چلو" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ اس آسانی سے وہاں سے نکل جانا مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ طالوت کھڑا ہو گیا۔ زیورات کی پوٹلی زمین پر پڑی تھی۔
"اسے بھی اٹھا لو۔ کسی ضرورت مند کو دے دیں گے۔" اس نے کہا اور میں پوٹلی اُٹھانے کے لئے جھکا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ طالوت میرے سامنے کھڑا تھا۔
"آؤ........" میں نے کہا۔ اور طالوت مسکرانے لگا۔
"کہاں چلیں؟"
"پہلے یہاں سے باہر........" جملہ میرے ہونٹوں پر ادھورا رہ گیا۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ یہ لاک اپ نہیں ہے۔ کھلی ہوا جسم کو لگ رہی تھی۔
"ارے........" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے شدید حیرت سے کہا۔ "کک........کیا ہم نکل آئے؟"
"اور کوئی حکم میرے دوست!" طالوت نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔
"مم........مگر مجھے تو احساس ہی نہ ہو سکا۔"
"اگر تمہیں احساس ہو جاتا تو پھر میری پُراسرار قوتیں خاک میں مل جاتیں۔ بہرحال چھوڑو ان کو۔ شاید یہ کوئی پارک ہے اور یہ ہواؤں کے ساتھ آنے والی خوشبوئیں۔ آؤ، ہم پھولوں کے کسی کنج میں بیٹھ کر ان معطر ہواؤں سے لطف اندوز ہوں۔"
اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور پارک کی طرف چل پڑا۔ میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ زرینہ کو سخت سزا مل گئی تھی اور میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ طالوت میرا دوست، میرے تصورات سے زیادہ پُراسرار ہے۔ لیکن کیا وہ پوری زندگی میرے ساتھ رہے گا؟ کیا اس کا ساتھ چھوٹنے کے بعد میری زندگی کا کوئی مصرف رہے گا؟"
"ارے بھائی! کیا سوچ رہے ہو؟" طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا اور میں نے خلوصِ دل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار طالوت سے کر دیا۔ طالوت غصیلے انداز میں میری شکل دیکھنے لگا تھا۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔
"تم اپنی دنیا کے انسانوں کے انداز میں سوچ رہے ہو، دوست! ہم تم سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ ہماری دوستی اور دشمنی پائیدار ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں دوست بنایا ہے۔ پوری زندگی تمہارے

ساتھ رہوں گا۔ مرنے لگوں گا تو اپنی قوم کے کسی فرد کو وصیت کر جاؤں گا کہ وہ تمہاری زندگی میں تمہارا خیال رکھے۔ تمہارے ساتھ میرے لمحات دلکش گزر رہے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری دوستی کو زندگی کے کسی حصے میں فراموش نہیں کروں گا۔ لیکن میرے اس وعدے کے ساتھ تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا......؟" میں نے خوشی سے پوچھا۔

"گو میں آتشی ہوں، اس کے باوجود غلطیوں سے مبرّا نہیں ہوں۔ مجھ سے تمہاری دل شکنی بھی ہوسکتی ہے۔ ایسے موقعوں پر تم ایک مہربان دوست کی طرح میری غلطی کو نظر انداز کر دو گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی کروں گا۔"

"تمہیں ایک اور وعدہ بھی کرنا پڑے گا۔"

"وہ کیا......؟"

"اس وقت کے بعد ذہن سے ہر تشویش، ہر خوف نکال دو گے۔ میں تمہیں کبھی اُداس نہ دیکھوں۔"

"ٹھیک ہے، یہ بھی منظور۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خوش رہو......اور زندگی کا ہر لطف انسانیت کے دائرے میں رہ کر حاصل کرو۔ تاکہ جب موت آئے تو خوشی سے جان دے دو۔"

"ٹھیک ہے طالوت! آج کے بعد سے تردّد ختم۔" میں نے کہا اور طالوت نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب آئندہ پروگرام پر غور کرو۔"

"اس دیس کی فضائیں مجھے راس نہیں آئیں گی، طالوت!...... یہاں سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ اس ملک سے میرا جی بھر گیا ہے...... کیوں نہ......"

"یہاں سے کہیں اور چلا جائے۔" طالوت نے میرا فقرہ اچک لیا۔

"ہاں...... میں یہی کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"ضرور پوچھو میری جان......!" اس نے مسرت سے جھومتے ہوئے کہا۔ کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔

"جس طرح تم چشم زدن میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہو، جس طرح تم مجھے لاک اپ سے یہاں نکال لائے ہو، اسی طرح کیا ہم دوسرے ممالک میں بھی پہنچ سکتے ہیں؟"

"یقیناً...... ہمارے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، لیکن اس طرح مزہ نہیں آئے گا۔ میں اس سفر کی تفصیلات نہیں جان سکوں گا، جو تم دوسرے ملکوں کے لئے کیا کرتے ہو۔"

"تب پھر میری ایک تجویز ہے۔"

"بتاؤ، بتاؤ...... جلدی بتاؤ۔"

"کیوں نہ تم بھی کوئی انسانی شکل اختیار کرلو......اور ایک انسان کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو۔"

''ہاں۔کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''
''تمہاری اپنی حیثیت تو برقرار رہے گی؟''
''ظاہر ہے۔''
''تب ٹھیک ہے۔اسی وقت یہ کام کرو۔''
''چہرہ تم سے مختلف ہوگا؟''
''بالکل۔''
''تب دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے؟'' طالوت نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر ہٹایا اور ایک عجیب سی شکل کا نوجوان میرے سامنے آ گیا۔
''نہیں.......تمہاری ناک بہت لمبی ہے۔'' میں نے کہا۔
''تب پھر ناک بدل لیتا ہوں۔'' اس نے چٹکی سے ناک اُکھاڑ لی اور جیب سے دوسری ناک نکال کر لگا لی۔
''نہیں...... بات نہیں بنی۔'' میں نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار کئے بغیر کہا۔ مافوق الفطرت طالوت کی باتوں پر حیرت کا اظہار کرنا میں نے چھوڑ دیا تھا۔
''ٹھیک ہے۔تب یہ چہرہ کیسا ہے؟'' اس نے دوبارہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر ہٹائے۔
''یہ بھی ٹھیک نہیں۔'' میں نے کہا۔
''تب پھر تم اپنی پسند بتاؤ۔''
''سنہرے بال، گھنگھریالے۔'' میں نے کہا اور اس نے اپنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا۔اس کے بال سنہرے اور دلکش ہو گئے تھے۔''دودھ کی طرح سفید رنگ۔'' میں نے پھر اسے ہدایت دی اور اس نے ہاتھ چہرے پر رکھ کر ہٹا لئے تھے۔اب بغیر خدوخال کا ایک سپاٹ چہرہ میرے سامنے تھا، جس پر سنہرے گھنگھریالے بال لہرا رہے تھے۔
''آگے بولو۔'' طالوت کی آواز سنائی دی۔
''روشن آنکھیں بڑی بڑی بادامی ڈیزائن کی، جن کی پتلیوں میں نیلاہٹ ہو۔اور سپاٹ چہرے پر دو حسین آنکھیں جگمگانے لگیں۔''ستواں ناک..... خوب صورت ہونٹ...... بیضوی ٹھوڑی...... بھرے بھرے گال۔'' میں بولتا گیا اور چند لمحات کے بعد ایک وجیہہ نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا۔ایک خوب صورت آئیڈیل....... میں اُسے مکمل ہو جانے کے بعد دیکھتا رہ گیا۔اور پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''بالکل ٹھیک........اب تم جچ رہے ہو۔''
''اب کیا کروں؟''
''کسی دوسرے ملک جانے کے لئے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ فراہم کردو۔''
''مثلاً؟'' اس نے پوچھا۔
''پاسپورٹ، ویزا اور کچھ سامان۔''
''راسم کو سمجھا دو...... وہ ان معاملات میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر

گردن ٹیڑھی کر کے آواز دی۔ ''راسم!''

''حاضر ہوں، شہزادہ حضور!''

''میرا دوست جو کچھ کہے، وہ مہیا کرنا ہے۔'' اس نے کہا اور میں اُس پُراسرار غلام کو تمام چیزوں کے بارے میں بتانے لگا۔ راسم کے چہرے پر بھی اُلجھن کے آثار تھے۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ بولا۔

''میں یہ تمام چیزیں مہیا کر دوں گا، آقا! لیکن میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ چنانچہ میں اُنہیں، انہی لوگوں سے حاصل کروں گا جو یہ سب تخلیق کرتے ہیں۔ کیا مجھے کل تک کی مہلت مل سکے گی؟''

''ہاں، ہاں........کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کل میں یہ تمام چیزیں پیش کر دوں گا۔'' راسم نے کہا اور پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ طالوت میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے چمک دار سفید دانتوں سے روشنی پھوٹ رہی تھیں اور میں اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''غیر ملکی لڑکیوں کا تو بیڑہ غرق ہو گیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولا۔

''ارے تم اس قدر وجیہہ و شکیل ہو کہ جو لڑکی دیکھے گی، دل تھام کر رہ جائے گی۔''

''یہ وجاہت بھی تمہاری دی ہوئی ہے، تم ہی ذمہ دار ہو گے۔'' طالوت بھی مسکراتے ہوئے بولا پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''کیوں نہ رات کسی بند کمرے کے بجائے کھلے آسمان کے نیچے گزاری جائے؟''

''ہاں........یوں بھی بہت کم وقت باقی رہ گیا ہے۔ اب کہاں جائیں گے۔ لیکن کل پورے شہر میں پولیس مجھے تلاش کرے گی۔''

''اس کی فکر مت کرو........راسم ضرورت کی چیزیں لے آئے تو ہم یہ ملک چھوڑ دیں گے۔''

''سفر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''ہوائی جہاز تم نے فضا میں اُڑتے دیکھے ہوں گے۔ دوسرے سمندری جہاز بھی ہوتے ہیں، جو سمندر کے سینے پر سفر کرتے ہیں۔ ان سے سفر طویل ہوتا ہے، لیکن خاصا پُر لطف۔ جبکہ ہوائی سفر مختصر ہوتا ہے۔''

''تب پھر سمندری سفر عمدہ رہے گا۔ ہواؤں کے دوش پر تو میں نے بہت وقت گزارا ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔ پھر پوری رات ہم نے باتوں میں گزار دی۔ طالوت سمندری سفر کی تفصیلات مجھ سے معلوم کر رہا تھا۔ اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اب ایک انسان کی حیثیت سے اس کی بھی وہی شخصیت ہو گی اور وہ انسانوں کے سے انداز اپنائے گا۔

صبح ہونے پر ہم پارک سے نکل آئے اور سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ گو رات جاگ کر گزاری تھی، لیکن ایک تو خوشگوار و خوش آئند خیالات، اوپر سے ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے ذہن کو ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہم چلتے رہے، اور پھر ایک ریستوران کے قریب سے گزرتے ہوئے بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو ناک سے ٹکرائی تو معاً بھوک کا احساس ہوا۔ ہم

دونوں کے قدم ایک ساتھ رُک گئے۔

"کیا خیال ہے؟...... ناشتہ کرلیا جائے؟" طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

ہم ریستوران میں داخل ہو گئے۔ واش بیسن پر جا کر ہم نے منہ دھوئے اور پھر چہرے تولیہ سے خشک کر کے میز پر آ بیٹھے۔ ریستوران کے سب سے پہلے گاہک ہم ہی تھے۔ بھنے ہوئے مرغ اور تندوری پراٹھے سامنے آ گئے اور کھانے کا لطف ہی آ گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد طالوت نے بل ادا کیا اور پھر ہم باہر نکل آئے۔ اب صرف راسم کا انتظار تھا۔ لیکن نہ جانے اسے کتنی دیر لگے۔ نہ جانے راسم پاسپورٹ وغیرہ کس انداز سے حاصل کرے گا۔ میں سوچ رہا تھا۔ بہرحال یہ بات طالوت سے پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

"کیوں نہ بندرگاہ کی سیر کی جائے۔ یہ بھی معلوم کرلیں گے کہ کون سا جہاز کب اور کہاں جا رہا ہے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"تو اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" طالوت نے جواب دیا اور میں ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکنے لگا۔ ٹیکسی ہمارے قریب پہنچ گئی اور میں نے ڈرائیور سے بندرگاہ چلنے کے لئے کہا۔

"شاید تمہارے پاس کرنسی ختم ہو گئی ہے۔" ٹیکسی میں طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں...... لاک اپ میں داخل کرتے وقت پولیس نے میری تلاشی لی تھی اور سب کچھ دھروا لیا تھا۔"

"تب یہ رکھ لو۔" اس نے چھوٹے نوٹوں کی دو گڈیاں میری جیب میں ٹھونس دیں اور میں ایک گہری سانس لے کر سڑک پر دیکھنے لگا۔ روزمرہ کے کام شروع ہو چکے تھے۔ ہر شخص اپنی دھن میں مگن تھا۔ ہم بندرگاہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اور پھر ٹیکسی کو بل ادا کر کے اندر داخل ہو گئے۔

میں طالوت کو لے کر اس علاقے کی طرف چل دیا، جہاں سے جہازوں کا نظارہ کیا جاتا تھا۔ طالوت بڑی دلچسپی سے دیوپیکر جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری دنیا میں زندگی گزارنا سخت مشکل ہے۔ یہاں زندگی گزارنے کے لئے سخت محنت کرنی پڑے گی اور میں سمجھتا ہوں، یہ زندگی کو خراج ہے۔ محنت میں عظمت ہے اور تم لوگ واقعی بہت محنت کرتے ہو۔ جدوجہد انسان کو مصروف رکھتی ہے اور دن کے لمحات آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے مسائل محدود ہیں۔ ہمیں سب کچھ آسانی سے مہیا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں کی زندگی پر جمود طاری ہے۔"

"درست ہے۔ لیکن انسان کسی طور خوش نہیں ہے۔"

"خوش ہونا چاہئے۔ اسے بہت کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سمندر کے سینے پر چلنے والے یہ جہاز، اگر انسان کو سمندر پر چلنے کی قوت حاصل ہوتی تو وہ جہاز کیوں بناتا؟ لیکن دیکھو، کیسے خوب صورت جہاز بنائے گئے ہیں۔ آؤ...... ان میں سے کسی جہاز کو اندر سے دیکھیں۔"

"اس طرح اجازت نہیں ملے گی۔"

"اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے؟" طالوت نے کہا اور میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر جب اس کا ہاتھ ہٹا تو ہم ایک خوب صورت جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر طالوت کے ساتھ جہاز کی سیر کرنے لگا۔ اس وقت ہم لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے باز پرس کر لی تو کیا جواب دیا جائے گا۔ لیکن خوش قسمتی ہی تھی کہ کسی نے خاص طور سے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ جہاز کے خلاصی اپنے کاموں میں مصروف تھے، انہوں نے سوچا کہ ہم کوئی حیثیت ہی رکھتے ہوں گے جو جہاز پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے جہاز کے آرام دہ کیبن دیکھے اور طالوت نے اس پورے ماحول کو بے حد پسند کیا۔

''ہم اسی جہاز سے سفر کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''تب آؤ........ شیڈول میں دیکھتے ہیں کہ یہ جہاز کب روانہ ہوگا۔''

''کہاں؟........ واپس خشکی پر چلیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔''

''بس، تو پھر آنکھیں بند کرو۔'' وہ بولا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں، جسم کو ذرا سے جھٹکے یا ٹانگوں کو ہلکی سی جنبش کا احساس بھی نہیں ہوا اور آنکھیں کھولیں تو اسی جگہ تھے، جہاں سے جہاز پر گئے تھے۔ بہر حال مجھے اب اس بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ میرا دوست انوکھی قوتوں کا شہنشاہ تھا۔ اس کے لئے سب کچھ ممکن تھا۔ ہم اس علاقے کی طرف بڑھ گئے، جہاں چارٹ میں جہازوں کی آمد اور روانگی کی تفصیلات درج تھیں۔ جس جہاز پر ہم گئے تھے، اس کا نام ''ایس بی۔ پیسا'' تھا۔ فرانسیسی تجارتی کمپنی کا جہاز تھا۔ میری نگاہوں میں فرانس کی کہانیاں گھوم گئیں۔ حسین اور زندہ دل لوگوں کا حسین ملک۔ جسے میں نے انگریزی فلموں میں دیکھا تھا یا اس کے بارے میں کتابوں میں پڑھا تھا۔ خود میری کبھی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اس ملک کی سیر کے بارے میں سوچ بھی سکوں۔

لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا، جیسے اس جہاز سے سفر میرے لئے ناممکن نہ ہو۔ پیرس کی حسین سڑکیں میرے قدموں سے دور نہ ہوں۔ میں نے طالوت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہم فرانس چلیں گے، طالوت!''

''کیا مطلب........؟'' طالوت نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس جہاز سے سفر نہیں کرو گے؟''

''اسی سے کریں گے۔ یہ فرانس جا رہا ہے۔''

''اوہ........ کسی شہر کا نام ہے؟''

''نہیں، ملک کا۔''

''کیا بہت خوب صورت ملک ہے؟''

''دیکھنے کے قابل۔''

''تو پھر چلو نا۔''

''ایسے نہیں میرے معصوم دوست! پاسپورٹ آ جانے دو۔ کل کا دن بھی ہمیں یہیں گزارنا ہے۔ یہ جہاز پرسوں جائے گا اور اس دوران فرانس کا ویزا وغیرہ بھی حاصل کرنا ہوگا۔''

''راسم سب کام کر لے گا۔ لیکن کیا ہم اس جہاز کو آج جانے پر مجبور نہیں کر سکتے؟'' طالوت نے کہا۔

''دو دن انتظار کر لو۔ اس کے بعد ہم اس دلچسپ سفر کا آغاز کریں گے۔''

''تب پھر یہ دو دن کہاں گزارو گے؟''

''کسی خوب صورت سے ہوٹل میں۔'' میں نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے......'' طالوت نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ٹیکسی لے کر واپس چل پڑے۔ اس بار بھی ہم نے ایک خوب صورت سے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ ہوٹل میں ہم شہنشاہوں کے سے انداز میں داخل ہوئے۔ گو ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا، لیکن بیروں اور اسٹیورڈوں کو ہم نے اتنا ٹپ دیا کہ ہم بے تاج شہنشاہ مانے جانے لگے۔ بیرے ہماری خدمت میں مصروف ہوگئے۔ میں نے اپنے کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں غسل کیا اور پھر آرام دہ مسہری پر آبیٹھا۔ طالوت غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ مسہری پر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی اور میں دوپہر کے دو بجے تک سوتا رہا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو طالوت ایک کرسی پر نیم دراز کچھ سوچ رہا تھا۔''
''تم نہیں سوئے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ مگر بھوک شدت سے لگ رہی ہے۔''
''اوہ......تم نے کھانا کھالیا ہوتا۔'' میں نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ گھنٹی بجا کر بیرے کو بلایا، کھانے کا آرڈر دیا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ پھر جب واپس آیا تو طالوت کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ راسم کاغذات وغیرہ دے گیا ہے۔
''کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا اور اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ کھانے کے بعد میں نے کاغذات دیکھے اور حیرت سے اچھل پڑا۔
''ارے......اس میں تو بین الاقوامی ویزا بھی موجود ہے۔''
''میں نے بعد میں راسم کو ہدایت کر دی تھی۔''
''کوئی ایسا کام بھی ہے طالوت! جو تم نہ کرا سکو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''بہت سے ایسے کام ہیں جو میرے بس سے باہر ہیں۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا اور میں کچھ سوچنے لگا۔
''بس تو آج اس جہاز کے ٹکٹ حاصل کر لئے جائیں۔''
''ٹکٹ کیا ہوتے ہیں؟''
''رقم ادا کر کے کیبن بک کرائے جاتے ہیں، جیسے ہم نے ہوٹل میں کمرہ لیا ہے۔''
''تب پھر تیاری کرو......ایسا نہ ہو کہ یہ کام رہ جائے۔'' طالوت نے کہا اور میں بال وغیرہ درست کرنے لگا۔ پھر ہم نیچے اُتر آئے۔ ایک ٹیکسی کر کے ہم شپنگ کمپنی کے دفتر روانہ ہوگئے۔ میں نے دفتر میں بکنگ منیجر سے ملاقات کی اور ہمیں فرسٹ کلاس کیبن بک کرانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ دولت سے کیا نہیں ہوسکتا۔
شام ہو چکی تھی......ہم بازار میں نکل آئے......سفر کے لئے زوردار خریداری کرنی تھی۔ اور پھر ایک بھرے بازار کے فٹ پاتھ پر شام کے اخبارات میں، میں نے اپنی تصویر دیکھی، جو پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔
''طالوت!'' میں نے طالوت کا شانہ دبایا۔
''ہوں؟'' وہ چونک پڑا۔

''ادھر دیکھو۔'' میں نے فٹ پاتھ پر اخباروں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور وہ چونک کر میری تصویر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اخبار اٹھالیا اور ہاکر کو پیسے دے کر میرے قریب آ گیا۔

''کیا لکھا ہے؟........ پڑھو۔''

''خطرناک مجرم ایک بار پھر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لاک اپ سے فرار ہو گیا۔

بڑی سرخی تھی۔ اس کے نیچے عارف جمال کی تفصیلی خبر تھی، پولیس افسروں کے بیانات تھے۔ عارف جمال کو ایک خطرناک مجرم قرار دیا گیا تھا، جو انتہائی چالاک اور پُر اسرار تھا۔ پولیس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بہت جلد مجرم کو دوبارہ گرفتار کر لے گی اور اس بار وہ پولیس کو جل نہیں دے سکے گا۔

طالوت یہ خبر سن کر مسکرانے لگا تھا۔

''مسکرا رہے ہو؟........ میری جان پر بنی ہوئی ہے........ کاش! جہاز آج رات ہی روانہ ہو سکتا۔''

''حماقت........ بے وقوفی۔ تم نے پھر بزدلی کا مظاہرہ کیا۔'' طالوت نے آنکھیں نکالیں۔

''انہوں نے چیلنج کیا ہے کہ اس بار وہ پولیس کو جل دے کر نہیں نکل سکے گا۔ ممکن ہے وہ میری ٹانگیں ہی توڑ ڈالیں۔''

''تب پھر ہم یہاں سے سیدھے پولیس ہیڈ کوارٹر چلیں گے۔ دیکھتا ہوں، وہ تمہاری ٹانگیں کیسے توڑیں گے۔''

''ارے نہیں میرے بھائی!........ خدا کے لئے، کوئی احمقانہ ضدمت کرنا۔ بس جلدی سے نکل چلو۔ اب تو ہوٹل میں بھی خطرہ ہے۔ سارے اخبارات نے میری تصویریں شائع کی ہیں، میرے لئے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔'' میں نے بدحواسی سے کہا۔

''خریداری کریں گے، بازار کی ایک ایک دکان گھومیں گے۔'' طالوت نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتا ہوں، پولیس کیسے روکتی ہے۔''

''لالوت!........ میرے دوست!'' میں نے کہنا چاہا، لیکن طالوت نے میرے چہرے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔ طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''بس، بس..... جانے دو۔ میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ ذرا کسی آئینے میں اپنی شکل دیکھ لو۔'' اس نے کہا اور میں چونک پڑا۔ سامنے ہی ایک پان کی دکان تھی۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پھر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ میں ایک بوڑھے کی شکل میں تھا اور خود اپنی صورت نہیں پہچان سکتا تھا۔

''اب تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں......!'' میں ایک گہری سانس لے کر بولا اور پھر میں طالوت کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن اخبار کی خبر اب بھی میرے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔ ہم نے زبردست خریداری کی اور پھر ہوٹل واپس چل پڑے۔

''میری نئی شکل دیکھ کر ہوٹل والے ضرور چونکیں گے۔''

''اگر کسی نے پوچھا تو میں بہانہ کر دوں گا۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''بہر حال، جب تک میں یہاں رہوں گا، مجھے خطرہ درپیش رہے گا۔ نہ جانے جہاز کی روانگی میں

اافت کیوں ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت ہونٹ سکوڑ کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل
اؤں پہنچ گئے۔ بیروں نے سامان اوپر لے جانے میں میری مدد کی۔ طالوت کے کہنے کے باوجود میں
ڈائننگ ہال کا رخ نہیں کیا۔ طالوت بھی نہیں گیا تھا۔

دوسری صبح میں نے تمام اخبارات منگوائے۔ ہر اخبار میں میری تصویر نمایاں تھی۔ پولیس نے
شہریوں سے مدد کی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ مجھے جہاں بھی دیکھا جائے، پولیس کو اطلاع دی
جائے۔ اس کے علاوہ شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ بڑے خطرناک انتظامات تھے۔ طالوت نے
اردتی مجھ سے تمام خبریں سنیں اور مسکراتا رہا۔

''مسکرا لو........ میری طرح مصیبت میں گرفتار ہوتے تو پتہ چلتا۔'' میں نے بلبلا کر کہا۔

''تمہاری ہر مصیبت میری ہے دوست!........ بہرحال فکر مت کرو۔ اب تو ہم ان دلچسپ لوگوں کو
ہاد کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

اُس روز میں دن بھر ہوٹل ہی میں گھسا رہا۔ طالوت بھی میری وجہ سے کہیں نہیں گیا تھا۔ لیکن
ر شام ہی وہ مجھ سے تقاضا کرنے لگا کہ کوئی تفریح کی جائے۔

''مناسب نہیں ہوگا، طالوت!'' میں نے کہا۔

''آخر کیوں مناسب نہیں ہوگا؟ اب تو تمہاری شکل بھی بدلی ہوئی ہے۔''

''ارے پولیس والے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ چال ڈھال سے انسان کو پہچان لیتے ہیں۔ تم
ان کی کارکردگی سے واقف نہیں ہو۔''

''اور وہ میری کارکردگی سے واقف نہیں ہیں۔ پھر میرے دوست! تم نے ایسا کوئی بھیانک جرم نہیں
کیا، جس کی بنا پر وہ تمہیں قتل کر دیں۔ بزدلی نہ دکھاؤ۔ آؤ، کوئی انوکھی تفریح کریں گے، دل بہلائیں گے،
اس کے بعد تو جہاز تک ہی محدود رہیں گے۔'' اور پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا۔ ناچار میں نے لباس تبدیل
کیا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گو میری صورت بدلی ہوئی تھی، لیکن کسی بھی پولیس والے کو دیکھ کر میری
روح فنا ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دور چل کر ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ٹیکسی نے
ایک پُررونق بازار میں ہمیں اتار دیا۔ اس بازار کے عقب میں بازارِ حُسن تھا لیکن میں نے زندگی میں کبھی
اس بازار کا رُخ نہیں کیا تھا۔

ہم دکانیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک آدمی کندھے پر رومال
االے ہمارے نزدیک سے گزرا۔

''چاہئے صاحب؟'' اس نے طالوت کی طرف جھک کر کہا۔

''کیا......؟'' طالوت چونک کر رک گیا۔

''گھر کی پلی ہوئی ہے۔'' دلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی، سنو یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' طالوت نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

''آگے بڑھو، آگے بڑھو۔'' میں نے اسے شانے سے دھکیلتے ہوئے کہا اور دلال مایوس ہو کر آگے
بڑھ گیا۔

''کیا معاملہ تھا؟ مجھے بتاؤ۔''

''ارے چھوڑو........ تمہارے مطلب کی بات نہیں تھی۔'' میں نے کہا۔

''مگر وہ گھر کی پلی ہوئی کس چیز کی بات کر رہا تھا؟'' طالوت ضد کرنے لگا۔ مجبوراً مجھے اسے طوائفوں کے کاروبار کے بارے میں بتانا پڑا۔ میں نے اسے بتایا کہ بہت سی طوائفیں صرف گانے بجانے کا کاروبار کرتی ہیں اور بہت سی عصمت فروشی کا!

''تب پھر تم مجھے اس سے لاعلم کیوں رکھ رہے تھے؟'' طالوت نے شکایت کی۔

''اسی لئے کہ تم ضد نہ کرنے لگو۔''

''ضد تو میں اب بھی کروں گا۔ سنو، ہم عصمت فروش عورتوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ لیکن گانا سننے میں کیا حرج ہے؟''

''ارے وہ جگہ شریفوں کے قابل نہیں ہے۔''

''میں خود کو شریف نہیں سمجھتا، سمجھے؟........ میں ضرور وہاں چلوں گا'' طالوت بری طرح اڑ گیا۔ پھر جب اس نے کہا۔ ''یار! تم کیسے آدمی ہو؟ میں تمہاری دنیا دیکھنے آیا ہوں۔ مجھے اس انوکھی دنیا کے ایک ایک پہلو سے روشناس کرا دو۔ پھر جب تم میری دنیا میں جاؤ گے تو میں بلا تکلف تمہیں وہاں کے تمام عجائبات دکھا دوں گا۔'' طالوت نے اس انداز میں یہ بات کہی تھی کہ میں پھر انکار نہ کر سکا اور مجبوراً مجھے اس بازار کا رخ کرنا پڑا جہاں میں کبھی نہیں گیا تھا۔

ہر بالا خانے سے ہارمونیم، ڈھول اور گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی۔ طالوت بے حد خوش نظر آنے لگا۔ اور پھر جس پہلے زینے کی طرف ہمارے قدم اُٹھے، ہم اس پر چڑھ گئے۔ میں سخت اُلجھن میں تھا لیکن طالوت کے لئے مجھے سب کچھ کرنا تھا۔ وہ بے حد شوقین مزاج تھا اور اسے اچھے برے کسی ماحول کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ہم اوپر پہنچ گئے۔ بہت بڑے ہال نما کمرے میں براق چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سازندے بیٹھے ساز بجا رہے تھے۔ ایک طرف نائکہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس کے برابر دو حسین لڑکیاں دو زانو بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے تین طرف تماشبین بیٹھے ہوئے تھے، ایک سے ایک بے ہودہ شکل، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، گالوں میں گلوریاں دبائے جھوم رہے تھے۔ اور درمیان میں ایک قتالۂ عالم محوِ رقص تھی۔

طالوت کی آنکھوں سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی میں جھینپا جھینپا سا تھا۔ بہرحال ہم بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ نائکہ کی نگاہیں ہماری طرف اُٹھیں، اور وہ تجربے کار عورت بھانپ گئی کہ ہم نئے پنچھی ہیں۔ طالوت بڑی دلچسپی سے رقص دیکھ رہا تھا، پھر اس نے میری طرف جھک کر کہا۔

''ہمارے ہاں بھی رقص و سرود کی محفلیں ہوتی ہیں، لیکن کبھی کبھی۔ کسی جشن کے موقع پر۔ اور ان کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔''

''یہاں صرف دولت لٹائی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' طالوت نے پوچھا۔

''دیکھو........ اس عقل کے اندھے کو دیکھو، جو نوٹ ہلا رہا ہے۔'' میں نے طالوت کو ایک تماشبین کی طرف متوجہ کیا اور طالوت دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ رقص کرتی طوائف آہستہ آہستہ تماش بین کے سامنے پہنچ گئی اور پھر وہ دو زانو بیٹھ گئی اس نے اس گیت کے کچھ بول تماشبین کو مخاطب کر کے گائے اور

نوٹ وصول کر کے آگے بڑھ گئی۔

''میں بھی دوں؟'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''آئے ہو تو دینا ہی ہوں گے۔ مگر ابھی رکو۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اسی وقت نائیکہ کے نزدیک بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پانوں کی ایک تھالی ہاتھ میں لئے ہماری طرف آئی۔ یہ لڑکی بھی کافی حسین تھی، وہ ادب سے ہمارے سامنے بیٹھ گئی اور پہلے طالوت کے سامنے پان پیش کیا۔

''کیا کروں؟'' طالوت نے میرے کہنی ماری۔

''کھالو........ جب یہاں آئے ہو تو ہر چیز سے لطف اندوز ہولو۔''

اور طالوت نے تھالی سے تمام پان اٹھا لئے۔ اس سے قبل کہ میں اسے روکوں، اس نے تمام پان موڑ کر منہ میں ٹھونس لئے۔ لڑکی ہنس پڑی۔ طالوت کا منہ بری طرح بھر گیا تھا۔

''آپ کے لئے اور لاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''رُکو........ میں نہیں کھاؤں گا۔'' میں نے کہا اور جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر تھالی میں ڈال دیا۔ طوائف پر اس نوٹ کا بڑا اثر پڑا تھا۔

''اور کچھ شوق کریں گے حضور؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ........ نہیں نہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ طالوت پانوں کی مصیبت میں گرفتار تھا ورنہ وہ اس شوق کے بارے میں ضرور پوچھتا۔

''چھالی نہیں کھائیں گے حضور؟'' وہ مسکرا کر طالوت سے بولی۔

''تم دیکھ رہی ہو........ اب چھالیوں کی گنجائش کہاں ہے؟'' میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میں اُگالدان لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اُٹھ گئی۔ طالوت گال پھلائے بیٹھا تھا۔ پان کی سرخ پیک اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے نکل آئی تھی اور اس کے دودھیا چہرے پر بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ رقص کرتی ہوئی رقاصہ کی نگاہیں بار بار اس کے حسین چہرے پر آ جاتی تھیں۔ اور پھر گیت کا ایک مصرعہ گاتی ہوئی وہ طالوت کے سامنے آ گئی۔

❀

طالوت کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ اس کے گال پھولے ہوئے تھے، ورنہ وہ مسکرانے کی کوشش بھی کرتا۔

رقاصہ اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نے وہی مصرع طالوت کے سامنے پھر دوہرایا، جسے وہ گا رہی تھی۔ اس مصرعے میں محبوب کے حُسن کا ذکر تھا۔ طالوت گال پھُلائے گردن ہلا رہا تھا۔ میں نے اس کے کہنی ماری اور طالوت چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ تب میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر طالوت کے گال پر رکھ دیا۔ رقاصہ نے نوٹ لیا اور زور سے طالوت کا گال نوچ لیا۔

طالوت کے رخساروں میں کوئی دباؤ برداشت کرنے کی گنجائش کہاں تھی؟ چنانچہ پان کی پچکاری رقاصہ کے لباس پر پڑی اور رقاصہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ کسی اور کی حرکت ہوتی تو شاید وہ ناک بھوں سکوڑتی، لیکن ایک تو طالوت کی شخصیت، پھر سو کا نوٹ........ وہ ہنس پڑی۔ اور طالوت جو بدحواس ہو گیا تھا، خوف زدہ نگاہوں سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ رقاصہ خاموش ہو کر اپنا لباس صاف کرنے لگی تھی، مجھے بھی اس حادثے کا احساس تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے ایک اور نوٹ نکال کر رقاصہ کی گود میں ڈال دیا۔ اتنی دیر میں دوسری لڑکی اگالدان لئے آ گئی تھی۔ طالوت چونک کر اگالدان دیکھنے لگا اور میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ پانوں کی مصیبت سے نجات حاصل کر لے۔ بات طالوت کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنا منہ اگالدان میں خالی کر دیا۔

رقاصہ نے اپنا لباس صاف کیا۔ لیکن شاید طالوت کے سامنے سے اُٹھنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرا مصرع شروع کر دیا اور طالوت مسکرانے لگا۔

”یہ توہین ہے، نواب صاحب!“ اچانک ایک طرف سے آواز اُبھری۔ ”گویا ہم لوگوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔“ آواز کافی زوردار تھی۔ میں نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا۔ چمک دار شیروانی میں ترچھی ٹوپی لگائے، بڑی بڑی مونچھوں والے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ شکل سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ کئی صاحب ان کے گرد موجود تھے اور انہی میں سے ایک نے یہ بات کہی تھی۔

نواب صاحب کا جگالی کرتا ہوا منہ رک گیا، ان کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ انہوں نے فوراً سو روپے کا ایک نوٹ انگلیوں میں تھاما اور گرج دار آواز میں بولے۔

”اِدھر آ جاؤ، لڑکی!“

رقاصہ نے پیار بھری نگاہ طالوت پر ڈالی اور پھر وہی مصرع گاتی ہوئی اُٹھ گئی۔ اب وہ نواب صاحب کے سامنے جا بیٹھی۔

"یہ کیا ہوا؟" طالوت نے پوچھا۔
"یہ عورتیں دولت کی غلام ہوتی ہیں۔ جہاں نوٹ دیکھے، لپک پڑیں۔ آؤ، اُٹھیں یہاں سے۔"
"ارے واہ!.......دیکھنے دو یار! اچھی لگ رہی ہے۔" طالوت نے کہا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکال لیا۔ لڑکی نے نواب صاحب سے نوٹ لے لیا تھا۔
"اب واپس آ جاؤ!" طالوت نے بھی زور سے آواز لگائی اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ طالوت اس رقص وسرود میں پوری طرح کھو گیا تھا اس لئے اب اسے یہاں سے اٹھا لے جانا مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش ترک کر دی۔ لیکن رقاصہ وہاں سے نہ اُٹھی کیونکہ نواب صاحب نے دوسرا نوٹ نکال لیا تھا۔ رقاصہ نے مسکراتی نگاہوں سے طالوت کی طرف دیکھا اور پھر نواب صاحب کی طرف رخ کر کے گانے لگی۔ میں نے طالوت کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ طالوت کو غصہ آ رہا تھا۔
دوسرے لمحے طالوت نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے رکھ لی۔
"اِدھر آ جاؤ، رقاصہ!" اس نے کہا اور رقاصہ نے اس طرف دیکھا۔ نائیکہ کی آنکھوں میں نوٹوں کی گڈی دیکھ کر چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدلنے لگی۔ پھر اس نے اس لڑکی کو اشارہ کیا، جو اگالدان لے کر طالوت کے پاس آئی تھی اور لڑکی مسکراتی ہوئی طالوت کے سامنے آ بیٹھی۔
"میں کوئی خدمت کروں، نواب صاحب؟" اس نے طالوت کو مخاطب کر کے کہا۔
"اسے بلاؤ۔" طالوت نے سخت لہجے میں کہا اور ایک اور گڈی نکال کر سامنے رکھ لی۔
"ریشم! دیکھو، نواب صاحب بلا رہے ہیں۔" نائیکہ دوسری گڈی دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھی۔ گاتی ہوئی رقاصہ نے پھر طالوت کی طرف دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی لیکن مونچھوں والے نواب صاحب نے بھی ایک موٹی سی گڈی جیب سے نکال کر سامنے رکھ لی۔ طالوت اسی طرف دیکھ رہا تھا اور میں بدحواس تھا کہ اب نہ جانے کیا ہو۔ طالوت کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر وہ نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کر ڈھیر کرنے لگا۔ اتنی گڈیاں اس نے سامنے سجا لیں جو اس کی اور میری دونوں کی جیبوں میں ملا کر بھی نہیں آ سکتی تھیں۔
میں نے ایک سازندے کو، جو طبلہ بجا رہا تھا، پیچھے اُلٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ بے چارہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے ساز رک گئے۔ تمام سازندے منہ پھاڑے نوٹوں کی گڈیوں کو دیکھ رہے تھے۔ تماش بینوں کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ مونچھوں والے نواب صاحب کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن دوسرے لمحے نواب صاحب نے اس کی کلائی پکڑ لی۔
"کیا بدتمیزی ہے، نواب صاحب؟.......آدابِ محفل سیکھیں۔" نائیکہ اب پوری طرح طالوت کی طرف دار ہو چکی تھی۔
"بکواس مت کرو، بائی جی! اس کل کے چھوکرے کی یہ مجال کہ نواب چھٹن کے منہ کو آئے۔ یاد رکھو، ہمارے ٹکڑوں پر پل رہی ہو۔ اس نودولتیئے کے سامنے پرانے گاہکوں کی توہین کر رہی ہو۔" نواب صاحب کے ایک مصاحب نے بگڑتے ہوئے کہا۔ اتنے دیر میں ناچنے والی، نواب صاحب سے کلائی چھڑا چکی تھی۔ چنانچہ وہ پلٹ کر طالوت کے پاس پہنچ گئی
"محفل خراب نہ کریں، نواب صاحب! حواس میں بیٹھیں۔" نائیکہ نے پھر کہا اور پھر سازندوں کو

اشارہ کیا۔ ساز پھر بجنے لگے لیکن سازندوں کی نگاہ نوٹوں کے ڈھیر پر تھی۔ بائی جی طبلچی کی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار مار کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ایک غزل پیش کروں، نواب صاحب؟'' ریشم نے طالوت کے لباس کے دامن سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''ضرور، ضرور........تم بہت اچھا گاتی ہو۔'' طالوت نے ترنگ میں کہا اور لڑکی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لیکن نواب چھٹن اپنے مصاحبوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔

''بتّے! دلّن! اُٹھا کر باہر پھینک دو ان دونوں کو۔'' نواب چھٹن کی چنگھاڑ سنائی دی اور ان کے چمچے ہماری طرف بڑھے۔ صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر میں جلدی سے اُٹھ گیا۔

''سنیے........ سنیے تو سہی نواب صاحب!'' میں نے دونوں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا۔ لیکن نواب چھٹن کے ایک بدمعاش نے میرا گریبان پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور میں بائی جی پر قلابازی کھا گیا۔

''آئے ہائے........نوابو، صندلو، چلیو ذرا۔ ان موئے بدمعاشوں کی بدمعاشی نکال دو۔ اے بلاؤ، رمضانی دادا کو........ یہ بدمعاشی یہاں نہیں چلے گی، نواب چھٹن!'' بائی جی میرے نیچے دبی ہوئی چیخیں اور پھر مجھے خود پر سے دھکیلتے ہوئے بولیں۔ ''اے ذرا جان پکڑو میاں! ایک دھکے میں قلابازی کھا گئے۔''

لیکن نواب چھٹن کے چار رفٹے چمچے نے مجھے جان نہ پکڑنے دی، اس نے میرا گریبان پکڑا اور پھر ایک ہاتھ جھاڑ دیا۔ میں اتنا بدحواس تھا کہ پھر گر پڑا۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا، میں مدافعت ہی میں لگا ہوا تھا اور بدمعاش طالوت، ریشم سے گفتگو کر رہا تھا۔ ریشم بھی بدحواس تھی، لیکن وہ طالوت کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

محفل بگڑ چکی تھی، تماشبین کوٹھے سے فرار ہو رہے تھے۔ نواب چھٹن اور ان کے آدمی رہ گئے تھے۔ نائکہ کے نوابو اور صندلو بھی نواب صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ وہ شاید نواب صاحب سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو سکا تھا کہ نواب صاحب دراصل نواب کے بجائے بہت بڑے غنڈے تھے۔

بہرحال، مصیبت میری آئی ہوئی تھی۔ صرف میں تھا جو نواب صاحب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھا ہوا تھا اور دو تین آدمی میری خوب مرمت کر رہے تھے۔ پھر بھلا ہو نواب چھٹن کا، وہ آگے بڑھے اور انہوں نے ریشم کو بازو سے پکڑ کر طالوت کے سامنے سے اٹھا لیا۔ تب طالوت چونکا، اس نے غصیلی نگاہوں سے نواب صاحب کو دیکھا اور پُراسرار لہجے میں بولا۔

''چھوڑ دو اسے۔''

''ابے جا........نواب چھٹن سے واقف نہیں ہے کیا؟ مار مار کر بھوسہ بھر دوں گا۔'' نواب صاحب نے کہا اور ان کے دو آدمی جلدی سے ان کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن اچانک ان کی چیخیں سنائی دی تھیں۔ نواب صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر ان کا منہ بھی حیرت سے پھیل گیا۔ ان کے دونوں آدمیوں کے ہاتھ فضا میں چل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے ان کی گردنیں پکڑ لی ہوں۔

اور پھر وہ دھماکوں کے ساتھ نیچے گرے۔ طالوت نے میری طرف دیکھا، اس وقت دو آدمیوں نے میری انگلیں اور ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے جھلا کر دُور پھینکنا چاہتے تھے، لیکن اسی وقت ان دونوں کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور میں پٹ سے زمین پر گر پڑا۔ دونوں دھوبی پاٹ کے ذریعے نیچے گرے تھے۔ پھر کسی نادیدہ ہاتھ نے نواب صاحب کی ٹوپی اُچک لی۔ کھوپڑی نواب صاحب کی بھی گنجی تھی۔ درمیان میں چندیا چمک رہی تھی۔ نواب صاحب پاگلوں کی طرح پلٹے، لیکن چٹاخ کی آواز دُور تک پھیلی تھی۔ نواب صاحب کا بھیجہ ہل گیا ہوگا۔ وہ چکرا کر گرے اور زمین پر اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے، جیسے پانی میں تیر رہے ہوں۔ دوسری طرف ان کے آدمیوں کی بری حالت تھی۔ وہ کھڑے ہونے کی کوشش کرتے، لیکن ان کی ٹانگیں اس انداز میں پھیل جاتیں کہ وہ گر پڑتے۔ اور اب ان کے حلق سے ڈری ڈری چیخیں نکل رہی تھیں۔

نواب چھٹن کو کسی بڑے جنجال کا احساس ہوگیا تھا، اس لئے فی الوقت اس نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ دوسرے لمحے وہ اُٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے تین بار بری طرح اوندھے منہ گرا جیسے کسی نے عقب سے لات رسید کی ہو۔ طالوت معصومانہ انداز میں ریشم کا بازو لئے کھڑا تھا۔

نواب صاحب کے فرار کے بعد بھلا ان کے غنڈوں کی کیا مجال تھی کہ رُک جاتے۔ وہ بھی گرتے پڑتے بھاگ نکلے۔ نائیکہ، سازندے کونوں میں سمٹے کھڑے تھے۔ میں احمقوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر نائیکہ کو ہی ہوش آیا۔ طالوت کے رکھے ہوئے نوٹ چاروں طرف بکھر گئے تھے اور نائیکہ کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

''ارے دیکھتے کیا ہو، کم بختو! فرش کی صفائی کرو۔ حضور، نواب صاحب کی توہین ہے یہ۔ جلدی کرو۔ ریشم! نواب صاحب کو اندر لے جاؤ، ان کی خاطر مدارات کرو۔ کمبخت غنڈوں نے نواب صاحب کا مزاج کو پراگندہ کر دیا ہوگا۔ اری مردار! جاتی کیوں نہیں؟'' نائیکہ، ریشم پر بگڑ گئی اور ریشم نے مسکراتے ہوئے طالوت کا بازو پکڑ لیا۔ پھر اس نے جھک کر طالوت کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ بدمعاش طالوت نے میری طرف رخ کر کے آنکھ دبائی اور مسکراتا ہوا ریشم کے ساتھ چل پڑا۔

میں البتہ وہیں کھڑا تھا۔ فرش کی صفائی صرف نوٹوں کو چننے کی حد تک تھی۔ نائیکہ پوری طرح نگاہ رکھے ہوئے تھی کہ نوٹ چننے والے سازندے کوئی نوٹ اپنی جیب میں نہ کھسکا لیں۔ پھر اسے میرا خیال آیا اور وہ مسکراتی ہوئی میرے قریب پہنچ گئی۔

''تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ان مسٹنڈوں نے۔ چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے میرے بازو سے رخسار رگڑتے ہوئے کہا، اور اس پلپلی بڑھیا کی اس حرکت پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے نفرت سے اپنا بازو اس سے چھڑا لیا۔

''آئے واہ مولوی صاحب! جوانی میں کیا کیا نہ کھیل کھیلے ہوں گے، اب اس طرح بازو چھڑا رہے ہو۔ انسان بوڑھا ہو جائے مگر دل زندہ رہنا چاہئے۔ نوکر ہو نواب صاحب کے؟'' خمیرے آٹے کی طرح پھولی ہوئی نائیکہ نے چندھی آنکھوں سے تیر برسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ مجھے یاد آ گیا کہ اس وقت میرا چہرہ ایک بوڑھے کا ہے، جس کے ایک عدد داڑھی بھی موجود

ہے۔
''آؤ........ کمرے میں چل کر باتیں کریں گے۔'' بڑھیا نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے آنکھ سے لڑکیوں کو اشارہ کر دیا تھا کہ سازندوں پر نظر رکھیں۔ دراصل نائیکہ نہیں چاہتی تھی کہ اس زبردست دولت کا کوئی حصہ واپس ہماری جیبوں میں چلا جائے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی نائیکہ کے ساتھ کھنچا چلا گیا اور وہ میرا بازو پکڑے ایک سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئی۔
''میری تو عقل دنگ ہے۔ کم بخت نواب چھٹن بڑا بدمعاش ہے، اس کے غنڈے سڑکوں پر چاقو لئے پھرتے ہیں۔ مگر یہاں سے کیسے بھاگے، خود بخود چیخ رہے تھے۔ میاں! یہ کہاں کے نواب ہیں؟''
''وہی بتا سکیں گے، بائی جی!'' میں نے بیزاری سے کہا۔
''تم ان کے نوکر ہو نا؟''
''جی نہیں........ ان کا چچا ہوں۔'' میں نے بلبلاتے ہوئے کہا۔
''اے سبحان اللہ! بڑے زندہ دل چچا بھتیجے ہیں، اللہ رکھے چاندی صورت پائی ہے، نواب صاحب نے۔ اور تم بھی کسی زمانے میں کم نہ ہو گے۔ سچ بتاؤ، کتنیوں نے آہیں بھری ہوں گی؟''
''ہوش میں آؤ، بائی جی!........ میں شریف آدمی ہوں۔'' میں نے کہا۔
''ہائے ری شرافت۔ ہم اس پر کون سا قبضہ کر رہے ہیں۔'' بائی جی نے میری داڑھی کو نوچتے ہوئے کہا اور میں غصے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔
''بس ہم چلیں گے، بائی جی! اُسے آواز دو۔''
''ارے میاں! ہمارے بھی دل ہے، اب ایسی بھی کیا بے رُخی؟ اور پھر نواب صاحب کی تو نوجوانی ہے، لڑکی بھی ان پر مرمٹی ہے۔ ایسے تو نہ چھوڑے گی۔'' بائی جی نے مٹکتے ہوئے کہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس بڑھیا کا سر دیوار سے دے ماروں۔ نہ جانے کہاں سے اس منحوس علاقے میں آ پھنسا تھا اور طالوت، وہ بے وقوف تو اس وقت چغد بن گیا تھا۔ جانے بوجھے بغیر ہر چیز میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ بائی مجھے بور کرتی رہیں اور میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بائی جی کی کوشش تھی کہ ہمارے بارے میں پوری تفصیل معلوم کر لیں، لیکن مجھے تو ان کی اداؤں سے ہی نفرت ہو رہی تھی۔
دفعتہً باہر شور کی آواز سنائی دی اور بائی جی چونک گئیں۔ میں بھی شور کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''ٹھہرو!........ میں دیکھوں، کیا ہے۔ اُس کمبخت نواب چھٹن سے خطرہ ہے۔ بہت بڑا غنڈہ ہے۔'' بائی جی کے لہجے میں کسی قدر بدحواسی ٹپک رہی تھی۔ وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میرے کمرے میں رہنے کی کوئی تک نہیں تھی، چنانچہ میں بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طالوت کو آواز دوں اور یہاں سے نکل چلوں۔
لیکن میری نگاہ ایک جھروکے پر پڑی، جہاں سے بائی جی باہر کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔
''نیچے بھیجو اُس نواب کے بچے کو........ روشن بائی! اگر زندگی چاہتی ہو تو نواب کو نیچے اتار دو۔''
میں نے بائی جی کی پشت پر جا کر جھروکے کے باہر جھانکا۔
نواب چھٹن بیس پچیس غنڈوں کے ساتھ کھڑا چیخ رہا تھا۔ اس کے آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلے

ہوئے چاقو، ہاکی اسٹکیں اور ایسے ہی دوسرے ہتھیار تھے۔ بائی جی نے میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر بھی پسینہ آ گیا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟........ نواب صاحب خطرے میں ہیں۔ خدا غارت کرے اس نواب چھٹن کو۔''

''ارے نکالو تو سہی اس نواب کے بچے کو........ ہے کہاں؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''آؤ........ نواب صاحب کو اطلاع دینا ضروری ہے۔'' بائی جی نے کہا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ تب بائی جی ایک کمرے کے سامنے پہنچیں۔

''ریشم! دروازہ کھول........ وہ نواب چھٹن کا بچہ آ گیا ہے........ ارے جلدی کر........ نواب صاحب کو پچھلے دروازے سے نکال دے۔ اگر وہ اندر گھس آیا تو........''

دروازہ کھلا اور طالوت مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ........ نواب چھٹن........ بہت سے لوگوں کو لے کر آ گیا ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔''

''اچھا ریشم!........ پھر آؤں گا........ انتظار کرنا۔''

''ضرور تشریف لائیے، نواب صاحب!........ اب آپ کے بغیر تو زندگی بے کار ہے۔'' ریشم نے اُداس سی شکل بناتے ہوئے کہا اور پھر نائیکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نواب چھٹن کو ٹھنڈا کر دو، اماں! میں نواب صاحب کو پچھلے دروازے سے لے جاتی ہوں۔''

''ہم چور نہیں ہیں، ریشم! سامنے سے ہی جائیں گے۔ ہاں، اگر تم چاہو تو جھروکوں سے نواب چھٹن کا حشر دیکھ لو۔'' طالوت نے بڑے موڈ میں کہا اور میں دانت پیسنے لگا۔

''آؤ۔'' طالوت نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''پچھلے دروازے سے نکل چلو، بھائی! کیوں موت کو آواز دے رہے ہو؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور جواب میں طالوت نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میری گردن جھک گئی۔

''آؤ۔'' اس نے پھر کہا اور میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں بہت کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور بہر حال مجھے علم تھا کہ طالوت کون ہے........ ہم باہر نکل آئے۔ نواب چھٹن اور اس کے آدمی دروازے کے سامنے ہی موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی نواب چھٹن چیخا۔

''یہی دونوں ہیں۔ پکڑ لو۔ لاشیں گرا دو، سالوں کی۔ دیکھ لوں گا۔''

اور طالوت نے بائیں سمت رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ سکے تھے، لیکن میں سمجھ گیا، اس نے اپنے نادیدہ خادم کو آواز دی تھی۔ نواب چھٹن کے آدمی ہم پر جھپٹے۔ لیکن پھر اس طرح ٹھٹک گئے جیسے کسی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا گئے ہوں۔ ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔

''اے نامردو! کھڑے کیوں ہو گئے؟........ پکڑ کر چمڑی ادھیڑ دو، سالوں کی۔'' نواب چھٹن پھر چیخا۔ اور پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اچانک نواب چھٹن کے جسم سے لباس غائب ہو گیا تھا۔ وہ مادر زاد برہنہ کھڑا چیخ رہا تھا۔ ہاں، سر پر ٹوپی موجود تھی۔ نواب چھٹن کے آدمیوں نے اسے دیکھا

اور منہ پھاڑ کر رہ گئے۔ خود نواب چھٹن کو ابھی تک لباس غائب ہونے کا احساس نہیں ہوا تھا۔
''استاد!........استاد! تمہارے کپڑے۔'' بالآخر اس کے ایک ساتھی نے کہا اور نواب چھٹن چونک پڑا۔ اس نے اپنا جسم دیکھا اور اس کا منہ تعجب سے کھل گیا۔ راہ گیر جمع ہو گئے تھے اور اب وہ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ نواب چھٹن اُچھل کر بھاگا لیکن اُچھلنے سے اس کے قدم زمین سے اُٹھے تو پھر زمین نہ چھو سکے۔ اب وہ فضا میں کئی فٹ اوپر اٹھا ہوا تھا اور بھاگنے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن قدم زمین پر پڑتے تو وہ آگے بھاگتا۔ ایک ہی جگہ ٹکا سائیکل چلانے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے تمام ساتھی اس کی طرف لپکے۔ پھر کسی نے بھوت کا نعرہ لگایا اور نواب چھٹن کے جانباز ساتھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ راہ گیر حیرت زدہ بھی تھے اور قہقہے بھی لگا رہے تھے اور نواب چھٹن پوری قوت صرف کر کے سائیکل چلا رہے تھے۔
''آؤ........!'' طالوت نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں لوگوں کے مجمع سے اطمینان سے گزرتے چلے گئے۔ کافی دور آ کر ہم نے ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ہم ہوٹل چل پڑے میں خاموش تھا۔ طالوت بھی خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ بل ادا کر کے ٹیکسی سے اُترے اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ کمرے میں پہنچ کر طالوت نے گہری سانس لی اور ایک آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔
''کیا بات ہے میری جان؟'' اس نے آنکھ مار کر کہا۔
''فضول بکواس مت کرو۔ تم خود رنگ رلیوں میں مست تھے اور چھٹن کے آدمی میری مرمت کر رہے تھے۔'' میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاں یار!..... معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت میں واقعی تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ بہر حال، کیسی رہی؟''
''لعنت ہے۔ تمہاری ضد مجھے لے ڈوبے گی۔''
''انہی ہنگاموں کی وجہ سے تو اپنی معنوی دنیا چھوڑی ہے، پیارے! جی لینے دو کچھ دن۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا کہ میرا غصہ کافور ہو گیا۔
''تم تو اپنی پُراسرار قوتوں کی وجہ سے محفوظ رہتے ہو۔ لیکن میرے سینے میں کسی دن کوئی چاقو یا گولی اُتار دے گا۔ اور پھر وہ منحوس بڑھیا مجھے اپنے بوڑھے عاشقوں میں شمار کر رہی تھی۔''
طالوت نے قہقہہ لگایا اور دلچسپی سے بولا۔ ''اماں سچ کہنا۔ کیا وہ تم سے عشق جھاڑ رہی تھی؟''
''رہنے دو بس۔ تم نے شکل ہی ایسی بنا دی ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت قہقہے لگاتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سنجیدہ ہو کر بولا۔
''اگر تم وہاں نہ لے جاتے تو زندگی ادھوری رہ جاتی........ ہائے ریشم!'' اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔
''کیا بکواس ہے؟ صاحبزادے! تم ان لوگوں سے ناواقف ہو۔ بس یہ اسی حد تک ٹھیک ہیں۔ اس سے آگے کچھ تلاش کرو گے تو تمام قوتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔'' میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" طالوت نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
"کیا تم ریشم سے متاثر ہوئے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تم متاثر ہونے کی بات کرتے ہو، میں تو اس کے بغیر زندگی ادھوری سمجھتا ہوں۔ کیا بتاؤں عارف! کیسی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ بس ایک دم عاشق ہو گئی اور اپنا سب کچھ میرے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ کہہ رہی تھی، میرے بغیر نہ جی سکے گی۔ نہ جانے میں نے ان چند لمحات میں کیا جادو کر دیا ہے۔ یار! قسم لے لو، جو میں نے کچھ بھی کیا ہو۔ بس یہ اس کی محبت ہے۔" طالوت نے مسرور ہوتے ہوئے کہا۔
"طالوت!......طالوت! ہوش میں آؤ۔ تم ایک طوائف سے متاثر ہو رہے ہو، جو ہمارے یہاں سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو، عارف!......وہ خوب صورت لڑکی......"
"خوب صورت ناگن کہو۔"
"کیوں......آخر کیوں؟"
"اوہ، میرے بھولے دوست! وہ طوائف ہے۔ دولت کی رسیا۔ اس کی نگاہ میں صرف دولت سب کچھ ہے۔ جتنی زیادہ جیب میں دولت ہوگی، اتنی ہی اس کی محبت حاصل ہوگی۔ وہ دولت کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کرتی۔"
"میں اس کا مکان سونے چاندی سے بھر دوں گا۔ نوٹوں کے انبار لگا دوں گا، اس کے سامنے۔" طالوت نے کہا۔
"پھر اس سے کیا ہوگا؟ وہ طوائف ہے، طوائف رہے گی۔ طوائف اپنی فطرت کو کبھی بدل نہیں سکتی۔"
"تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ طوائف ہے، طوائف رہے گی۔ تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ مجھ سے محبت تو کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔"
"دیکھو طالوت! تم اس دنیا سے ناواقف ہو اور تم نے یہ کام میرے سپرد کر دیا ہے کہ میں تمہیں اپنی دنیا سے روشناس کراؤں۔ چنانچہ تمہیں میری باتوں پر اعتبار بھی کرنا چاہئے۔ اس دنیا کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"
"اوہ......تم تو سنجیدہ ہو گئے، میرے دوست!......لیکن اصل میں تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔" طالوت نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
"تم نے زرینہ کو دیکھا تھا، وہ بھی عورت تھی۔ لیکن محبت کے بجائے دولت کی بھوکی۔ وہ فطرتاً طوائف تھی، جس کی وجہ سے مجھے جو تکالیف اٹھانی پڑیں، وہ تمہارے علم میں آ چکی ہیں زرینہ جیسی عورتیں ان طوائفوں سے زیادہ خطرناک یوں ہوتی ہیں کہ ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے اور دھوکا کھا جاتے ہیں۔ لیکن ان بالا خانوں پر ملنے والی طوائفوں کی کہانیاں بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ بھی صرف دولت سے پیار کرتی ہیں۔ ہر وہ شخص ان کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے، جس کی جیب میں دولت ہو۔ اور پھر جب اس کی جیب خالی ہو جاتی ہے تو پھر یہ اس سے اس طرح نگاہیں پھیر لیتی ہیں جیسے کبھی شناسائی نہ رہی ہو۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" طالوت نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو مجھ سے بے پناہ اُلفت کا اظہار کر رہی تھی۔"

"عملی تجربہ کرنے کا وقت نہیں ہے میرے دوست! ہم دوسرے ملک جا رہے ہیں۔ ورنہ میں تمہیں ان کی حقیقت دکھا دیتا۔" میں نے کہا اور طالوت گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر چند منٹ کے بعد اس نے کہا۔

"عورت کا یہ روپ میرے لئے اجنبی ہے عارف! لیکن اس کی دلکشی سے میں انحراف نہیں کر سکتا۔ سنو! ہم اپنی فوری روانگی ملتوی کئے دیتے ہیں۔ میں اس عورت کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک بات سمجھو میرے دوست! مجھے دنیا کی عمارتیں، جگہیں دیکھنے کا اتنا شوق نہیں ہے، جتنا یہاں کے لوگوں سے واقفیت اور ان کے طور طریق سے دلچسپی ہے۔ دنیا دیکھنے کے لئے تو میرے پاس بہت سے ذرائع ہیں، اپنے محل میں بیٹھ کر ایک سفید گولے میں، میں پوری دنیا کو دیکھ سکتا ہوں۔ یا پھر کسی ہوائی تخت پر اس کی سیر کر سکتا ہوں۔ لیکن میری خواہش تو کچھ اور ہے۔ میں ہر چیز کی گہرائی کی تلاش میں ہوں۔ ہم ابھی دوسرے ملکوں میں نہیں جائیں گے، بلکہ اسی ملک کو دیکھیں گے۔ ابھی تو یہاں لاکھوں انوکھے کردار پڑے ہوں گے۔ تم مجھے ان کرداروں سے روشناس کراؤ۔ ان کی حقیقت دکھاؤ۔ جب بھی یہاں سے دل اُکتا جائے گا تو پھر کہیں اور چلیں گے۔"

میں منہ پھاڑے طالوت کی شکل دیکھنے لگا۔ میرا نادان دوست، مجھے اُلجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ میری پریشانی بھول گیا تھا۔ چنانچہ میری گردن جھک گئی۔ ایک حد تک میری اس سے بے تکلفی درست تھی۔ لیکن اگر وہ کسی بات کی خواہش کرے تو پھر میں کیا حقیقت رکھتا تھا کہ اسے روک سکوں۔ میں تو خود اس کے رحم و کرم پر تھا۔

طالوت اُٹھ کر میرے قریب پہنچ گیا اور محبت سے میرا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ "عارف! میرے دوست! اگر تم چاہو تو میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ میں درحقیقت اس دنیا کے عجائبات دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہر اس چیز سے دلچسپی ہے، جس کا وجود میری دنیا میں نہ ہو۔ سنو...... میں اس عورت کی حقیقت سے واقف ہونا چاہتا ہوں، جس نے میرے لئے بڑی بے قراری کا اظہار کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، طالوت! جیسا تم پسند کرو گے، ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"سنو عارف! تم نے میرے لئے ایک چہرہ پسند کیا، میں نے اپنا لیا۔ اب میں تمہارے لئے ایک چہرہ پسند کروں گا، تاکہ بوڑھی نائیکہ تمہیں اپنا ہم عمر سمجھ کر تم سے عشق نہ شروع کر دے۔"

"شکر ہے، تمہیں میرا خیال تو آیا۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس مصنوعی بڑھاپے سے بیزار ہو گیا تھا۔ ویسے نئی شکل میں میرے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیوں نہ طالوت کو ہی خوش رکھ کر زندگی کے مزے لوٹے جائیں۔ چنانچہ میں نے خود کو تیار کر لیا۔ طالوت نے اپنی جیب سے ایک رومال نکال لیا اور اس کے دو کونے پکڑ کر اسے میرے منہ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ میرے چہرے پر جمائے اور پھر رومال ہٹا لیا۔ رومال ہٹانے کے بعد اس نے میری شکل دیکھی اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔

"کون ہے ظالم جو تجھے دیکھ کر بے اختیار نہ ہو جائے؟"
اس نے عاشقانہ انداز میں کہا اور میرا دل دھڑک اٹھا۔ کیا درحقیقت طالوت درست کہہ رہا ہے؟ میں ایک طرف رکھی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا اور پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر میں بھی محوِ حیرت رہ گیا۔ درحقیقت طالوت نے مجھے گلفام بنا دیا تھا۔ میرے دل میں مسرت کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ یہ حسین چہرہ میرے خوابوں میں بھی نہیں تھا۔ گو طالوت کو میں نے اپنی نگاہ میں ایک خوب صورت چہرہ دیا تھا۔ لیکن طالوت کا بخشا ہوا چہرہ اس سے کچھ آگے ہی تھا۔ نئی شکل مل جانے کے بعد میں نے اپنے اندر خاص تبدیلیاں پائیں۔ میرا دل لڑکیوں سے عشق کرنے کو چاہنے لگا۔
"کیا خیال ہے؟" طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"کہیں یہ بہروپ ہمارے لئے مصیبت نہ بن جائے۔"
"وہ کس طرح؟"
"بس، یہ دنیا نرالی ہے۔ یہاں ایسے ایسے ہنگامے جنم لیتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔"
"بہر حال، ہمیں تو مصیبتوں کی تلاش ہے۔ ہاں، میں تمہیں ایک چیز اور دینا چاہتا ہوں۔" طالوت نے کہا۔
"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔
"راسم۔" طالوت نے بائیں سمت رخ کر کے آواز دی اور طالوت کا غلام سر جھکائے اس کے سامنے پہنچ گیا۔ "ایک پیالہ آبِ آہن۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے بیرے کو چائے کا آرڈر دے رہا ہو۔ راسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
"یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"حکیم فلفلاس کا پوری زندگی کا نچوڑ ہے۔ خوب چیز بنائی ہے۔ صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص ہے۔"
"مگر اس کا فائدہ کیا ہے؟"
"ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔
"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"سوچ رہا ہوں، ریشم تمہاری طرف مائل نہ ہو جائے۔ وہ تم سے اظہارِ محبت نہ شروع کر دے۔"
"ریشم ایسا نہیں کر سکتی، میرے دوست! کیونکہ اس نے نوٹوں کی گڈیاں تمہاری جیب سے برآمد ہوتے دیکھی تھیں۔ ہاں، اگر اس سے زیادہ دولت میں اسے پیش کر دوں تو دوسری بات ہے۔"
"اوہ........ گڈ! بات بن گئی۔" دفعتہً طالوت چٹکی بجا کر اُچھل پڑا اور میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ "سنو عارف! تم بے پناہ دولت مند بن کر ریشم کے گھر جاؤ گے۔ اس وقت میں غائب پوزیشن میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ تم سے بھی بند کمرے میں اظہارِ اُلفت کرتی ہے یا نہیں۔"
"مسئلہ دو منٹ میں حل ہو جائے گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم دیکھو گے کہ وہ مجھ سے لوٹ کر محبت کا اظہار کرے گی۔"

''مجھے بہت حیرت ہو گی، عارف!........ وہ مجسم خلوص بنی ہوئی تھی اور سچ جانو، اس کی بے پناہ اُلفت سے میں بھی متاثر ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ میرے محل کی کنیزوں سے زیادہ حسین نہیں ہے۔'' طالوت نے گہری سانس لے کر کہا۔

اسی وقت راسم حاضر ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک وزنی پیالہ پکڑا ہوا تھا، جس میں گہرے سرخ رنگ کا ایک سیال موجود تھا۔ طالوت نے وہ پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور مجھے پیش کرتے ہوئے بولا۔

''پوری خوراک ہے۔ پی جاؤ۔''

''مگر یہ کس کام آتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا اندازہ تمہیں خود بخود ہو جائے گا۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے پیالہ اس سے لے لیا۔ سیال کسی کام بھی آتا ہو، لیکن وہ بہت ہی خوش ذائقہ تھا۔ میں ایک ایک قطرہ پی گیا۔ سیال کے حلق سے اُترتے ہی میں نے بڑی بشاشت محسوس کی۔ مجھے اپنے جسم میں ایک انوکھی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے طالوت کی طرف دیکھا، طالوت مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور ایک طرف بڑھ گیا۔ ایک میز سے اس نے ایک آہنی مجسمہ اُٹھایا۔ ڈیکوریشن پیس تھا، ٹھوس فولاد سے بنا ہوا تقریباً ایک سیر وزنی۔ اس نے ڈیکوریشن پیس میرے ہاتھ میں دے دیا۔

''کیا تم اسے مٹھی میں دبا کر پچکا سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو طالوت؟........ میں لکڑی کے ایک ٹکڑے کو ہاتھ سے نہیں توڑ سکتا، یہ تو پھر لوہے کا بنا ہوا ہے۔'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔

''کوشش کرو۔ میرے کہنے سے۔'' طالوت نے کہا اور میں اسے تعجب سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے ہرکولیس سمجھ رہا تھا۔ لیکن بات طالوت کی تھی، جس کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں تھی۔ میں نے تفریحاً مجسمے پر قوت صرف کی اور پھر خود چونک پڑا۔ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ فولادی مجسمہ انسانی ہاتھ کی گرفت میں پچک سکتا ہے۔ لیکن حقیقت سے انکار بھی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مجسمہ موم کے مجسمے کی طرح پچک رہا تھا۔ وہ درمیان سے پتلا ہو گیا اور اس کے دونوں سرے پھول گئے۔ مجسمے کی ہیئت بگڑ گئی تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں اس کے وزن کا اندازہ کرنے لگا۔

''دراصل میں نے اپنی ایک ذمہ داری اور ختم کر دی ہے۔ نواب چھٹن کے غنڈے تمہارے قابو میں نہیں آتے تھے اور انہوں نے تمہارے ساتھ خاصی بدتمیزی بھی کی تھی۔ اب صورتِ حال دوسری ہے۔ اب تمہارے جسم میں بے پناہ طاقت ہے، جسے تم محسوس نہیں کر سکتے۔ ہاں کبھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئی تو وہ سب کچھ ہو جائے گا، جو تم چاہو گے۔''

''طالوت!........ طالوت میرے دوست! تم مجھے کیا سے کیا بنا دو گے؟'' میں نے مسرت سے جھوم کر کہا۔

''بس تفریح کرنی ہے۔ اس لئے ضروریات کے لوازمات سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔ چائے منگواؤ۔ پھر پروگرام بنائیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا اور میں نے مجسمے کو دوبارہ

ہاتھ میں اٹھالیا۔ پھر میں نے گھنٹی بجا کر بیرے کو بلایا اور اسے چائے کے لئے کہہ کر دوبارہ مجسمے پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ فولادی مجسمہ درحقیقت میری قوت کے آگے موم تھا۔ میں اپنی قوت کو دوسرے طور پر بھی آزمانا چاہتا تھا لیکن ذرا بچکانہ بات تھی۔ اس لئے میں نے خود کو باز رکھا۔ اس دوران چائے آگئی اور میں نے دو پیالیاں بنا کر ایک طالوت کو پیش کر دی اور دوسری اپنے سامنے لے کر بیٹھ گیا۔

''ہاں........اب بتاؤ، کیا کرنا ہے؟'' طالوت نے ایک چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''گویا فرانس کا سفر ملتوی ہو گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''طویل زندگی پڑی ہے........ بہت کچھ دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو اس دلکش ماحول کو پوری طرح دیکھ لیں۔''

''ایک بات بتاؤ، طالوت! ریشم نے تمہارے دل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر وہ اتفاق سے ٹھیک ثابت ہوتی تو تم کیا کرتے؟''

''فی الوقت میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''سنو طالوت!........ ہماری تفریحات کے دوران بہت سے لوگ ملیں گے، جو ہمارے ذہنوں کے قریب پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہمیں ان کے چکر میں پڑ کر چغد نہیں بننا چاہئے۔ اس طرح ہم الجھنوں میں پھنس جائیں گے۔ ممکن ہے، تم میرے بارے میں غلط انداز میں سوچنے لگو اور میں تمہارے بارے میں۔ چنانچہ ہمیں ایک معاہدہ کر لینا چاہئے۔ کوئی عورت ہماری منزل نہیں ہوگی۔ ہم ہر معاملے میں ایک دوسرے کے مشورے کا خیال رکھیں گے۔''

''بالکل ٹھیک ہے........ لیکن اگر ہم اس کی گہرائی تک پہنچنے میں کچھ وقت صرف کر دیں تو کیا حرج ہے؟ میرا مطلب ہے، جیسے ریشم کا معاملہ........ ہاں، ایک بات کا وعدہ کرتا ہوں۔ اگر یہ لڑکی ریشم تمہارے کہنے کے مطابق نکلی تو پھر کسی لڑکی پر اعتماد نہیں کروں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے........ اس کے بعد ہم اپنے آئندہ اقدامات کا فیصلہ کریں گے۔'' میں نے کہا اور طالوت نے تسلیم کر لیا۔ اور اس کے بعد ہم دوسرے دن کا پروگرام بنانے لگے۔ دوسری شام میں نے ایک خوب صورت لباس زیب تن کیا اور خود کو آئینے میں دیکھا۔ بس، کیا عرض کروں........ کوہ قاف کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ پہلے ہوٹل والوں نے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ ٹیکسی اسٹینڈ تک لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ اور پھر ٹیکسی ہمیں لے کر بازارِ حُسن چل پڑی۔ طالوت میرے برابر بیٹھا تھا۔ لیکن خود مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس میں اس کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔

بازارِ حُسن پہنچ کر میں ٹیکسی سے اُتر گیا۔ بل ادا کر کے میں نے سیدھے ریشم کے مکان کا رخ کیا۔ محفل ابھی سجی نہیں تھی لیکن راستے بھر دلّال میرے پیچھے دوڑتے رہے اور پھر دروازے پر ریشم کے ایک ملازم نے مجھے خوش آمدید کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

دوسری لڑکیوں نے میری پذیرائی کی اور مجھے بڑے احترام سے اندر لے گئیں۔ ایک خوب صورت اور سجے سجائے کمرے میں مجھے بٹھایا گیا۔ طوائفیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

''گانے کی محفل میں ابھی دیر ہے........ حضور کچھ شغل کریں گے؟'' ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، انتظار کریں گے........ بائی جی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی بلا کر لاتی ہوں۔'' ایک لڑکی نے کہا۔ دوسری بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ جس جگہ میں بیٹھا تھا، وہاں بائیں سمت لکڑی کا پارٹیشن تھا، جس کے دوسری طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اتفاقیہ طور پر میں اس پارٹیشن کے دوسری طرف سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آوازیں واضح تھیں۔
''غصہ نہ کرو، نواب چھٹن! یہ طوائف کا کوٹھا ہے........ کسی شریف عورت کا گھر نہیں ہے۔ یہاں کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ دولت پھینکو، تماشہ دیکھو۔ ہم تو تمہیں اپنا آدمی سمجھتے تھے، لیکن تم........ تم آستین میں چھری رکھتے ہو؟''
''اُس مردود نے میری بے عزتی کی ہے۔ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گا۔ ورنہ کان کھول کر سن لو بائی جی! خون خرابہ ہو گا۔ دو چار لاشیں گریں گی۔''
''ہماری زندگی میں یہ نئی بات نہیں ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خان آتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ خون کرو تم اس نواب کا، ہمارا کیا قصور ہے؟ ہاں، ہم تم سے ایک درخواست ضرور کریں گے۔ جب تک اس کی جیب میں دولت ہے، تم اپنے آپ پر قابو رکھو۔ میں تمہارے لئے ریشم سے اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اس کی جیبیں جلدی سے خالی کرا لے۔ پھر میں تمہارے ہاتھوں اُسے اُٹھوا کر باہر پھنکوا دوں گی اور پھر ریشم تمہارے علاوہ کسی کی نہ ہو گی۔ ہماری روزی خراب مت کرو، نواب چھٹن! اگر زیادہ رقم مل گئی تو اس میں سے تمہیں بھی حصہ مل جائے گا۔''
''طالوت!'' میں نے آواز بھینچ کر کہا۔ میں چاہتا تھا کہ طالوت بھی یہ الفاظ سن لے۔
''سن رہا ہوں۔'' طالوت کی سرگوشی سنائی دی۔ ''لیکن اس بوڑھی کی باتوں کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ اصل بات تو ریشم کی ہے۔''
''ہوں....... فکر مت کرو، میرے دوست! ریشم کی باتیں بھی جلد سن لو گے۔'' میں نے کہا اور پھر دوسری طرف کی آوازیں سننے لگا۔ لڑکیاں شاید بائی جی کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ بائی جی کے آخری الفاظ سنائی دیئے۔
''ٹھنڈے دل سے غور کر لینا، نواب چھٹن! ممکن ہے وہ آج پھر آئے۔ کل جو کچھ ہوا تھا، وہ تمہیں یاد ہو گا۔ ممکن ہے، اس کے سر پر ولیوں کا سایہ ہو۔ ہم اس کی عزت کرنے پر مجبور ہیں۔ میں چلتی ہوں۔'' اور پھر قدموں کی آواز پر میں سنبھل گیا۔ چند منٹ کے بعد نائیکہ اِٹھلاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اس نے بڑی محبت سے میری خیریت پوچھی اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔
''ہم نے زندگی میں پہلی بار یہاں قدم رکھا ہے، بائی جی!'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔
''بڑا اچھا کیا، میاں! یہ سکون کی جگہ ہے۔ یہاں انسان کے ذہنی غسل کا معقول انتظام ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد محفلِ ساز منعقد ہو گی۔ آپ اس محفل میں ضرور شریک ہوں۔ یقیناً آپ محظوظ ہوں گے۔''
''ہم چاہتے ہیں، اس محفل میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔'' میں نے کہا اور بائی جی بہت غور سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر گردن جھکا کر بولیں۔
''اس کے لئے ہم مجبور ہوتے ہیں میاں! پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے آپ جیسے شرفاء کے علاوہ غلط

لوگ بھی آتے ہیں، انہی سے ہماری روزی چلتی ہے۔"
"آج کی محفل ہماری ہے بائی جی! ہم آپ کو اس کی منہ مانگی قیمت دیں گے۔ دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ۔"
"ارے سب کچھ آپ پر صدقے۔ آپ کی صورت تو ایسی موہنی ہے کہ مجھ بڑھیا کے دل میں بھی جوانی جاگ اٹھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں میاں! کس کی مجال ہے جو آپ کے سامنے یہاں قدم رکھ سکے۔ ویسے حضور کا تعلق کہاں سے ہے؟"
"ہم ایک پہاڑی ریاست کے ولی عہد ہیں۔ یہاں کافی عرصہ قیام کریں گے۔"
"زہے نصیب........ زہے نصیب۔" نائیکہ کا منہ پھیل گیا۔ "سچ پوچھو تو میاں! یہ محفلیں شہزادوں ہی کی ہیں۔ بس حالات نے انہیں خراب کر دیا۔ ہاں تو میں سازندوں سے کہوں کہ انتظام کریں۔ بس ان کم بختوں کی جیبیں گرم ہو جائیں تو........"
"ہاں، ہاں..... یہ رقم آپ رکھیں۔ ہم ان کو خوش کر دیں گے۔" میں نے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر بائی جی کے سامنے ڈال دیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ ہی تھے۔ بائی جی کانپتے ہاتھوں سے انہیں سمیٹنے لگیں۔ ان کی تو قسمت کھل گئی تھی۔ خواب میں بھی اتنی رقم یکمشت انہوں نے نہیں دیکھی ہو گی۔ یہ دو دن ان کی زندگی کے بہت خوش قسمت دن تھے۔ وہ نوٹ سمیٹ کر پلو میں رکھتے ہوئے اٹھیں اور باہر نکل گئیں۔
"کہاں ہیں آپ، حضرت؟" میں نے آہستہ سے کہا۔
"موجود ہوں۔ یہ بڑھیا گرگٹ کی نسل سے ہے شاید۔"
"یہاں سب گرگٹ ہیں، میرے بھائی! دیکھتے رہو۔" میں نے کہا اور پھر دروازے پر قدموں کی چاپ سن کر خاموش ہو گیا۔ دو خوب صورت لڑکیاں اندر آ گئی تھیں۔ انہوں نے جھک کر مجھے سلام کیا اور پھر میرے قدموں میں آ بیٹھیں۔
"ارے، ارے........ یہاں بیٹھیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"ہماری جگہ یہی ہے حضور! ہمیں کوئی خدمت بتائیں؟" ایک لڑکی نے میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر کہا۔
"اوہ، شکریہ........ شکریہ........" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ دوسری لڑکی خود ہی اٹھ کر میرے برابر بیٹھ گئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ طالوت مجھے دیکھ کر جل رہا ہو گا۔ لڑکیوں نے اپنے بدن ڈھیلے چھوڑ دیئے۔
"ہم نے زندگی میں شہزادے نہیں دیکھے تھے، صرف ان کی کہانیاں سنتے آئے تھے۔ آج ہماری قسمت بھی کھل گئی۔ دل کی دھڑکنیں دیکھئے شہزادے! ہر دھڑکن آپ کو پکار رہی ہے۔"
میں چونک پڑا۔ میں اس حد تک جانے کے موڈ میں نہیں تھا، لیکن لڑکی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا اور اسے دبا رہی تھی۔
"دل چاہتا ہے، آنکھیں چوم لوں۔ ہائے........ کیسی کنول جیسی آنکھیں ہیں۔" اور اس نے دل کی حسرت پوری کر لی۔

اب میرے اوپر بوکھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں طالوت کی موجودگی سے شرمندہ تھا۔ لیکن پھر نائیکہ کی آمد سے میری گلو خلاصی ہوئی۔ وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

''کیا شرارت کر رہی ہو، لڑکیو؟........شہزادہ صاحب کو باہر لے چلو۔ سازندے تیار ہو گئے ہیں۔''

اور لڑکیوں نے میرے بازو پکڑ کر اٹھایا۔ میں ان کے ساتھ اسی ہال میں آ گیا، جہاں کل ایک بوڑھے کی شکل میں بیٹھا تھا۔ بڑے اہتمام سے مجھے ایک قالین پر بیٹھایا گیا۔ ایک لڑکی پان بنا رہی تھی۔ میرے ساتھ آنے والی دونوں لڑکیاں ادب سے سازندوں کے پاس جا بیٹھیں۔ سازندوں نے ساز چھیڑے اور پھر ایک دروازے سے سجی بنی ریشم برآمد ہوئی اور درحقیقت وہ ان لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس کے آنے سے سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ لڑکیوں نے ایک غزل چھیڑ دی اور ریشم ناچنے لگی۔

''استاد!'' میں نے طالوت کو پکارا۔

''میں نے ابھی ہار نہیں مانی ہے۔'' طالوت کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

''دیکھتے رہو........کیا یاد کرو گے۔'' میں نے کہا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ریشم جان توڑ کر ناچ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں وہی کیفیت تھی، جو کل طالوت کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک مصرع گاتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خوب صورت ڈبہ نکال لیا۔ اس ڈبے میں ایک خوب صورت ہار موجود تھا، جس میں نفیس ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ڈبہ کھول کر میں نے ہار نکالا اور ریشم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے مصرع مکمل کر کے گردن جھکا دی اور میں نے ہار اس کی گردن میں ڈال دیا۔

وہ پھر کھڑے ہو کر رقص کرنے لگی۔ اس بار میں نے دوسری جیب سے انگوٹھی کی ڈبیہ نکال لی تھی۔ یہ تمام چیزیں طالوت مجھے فراہم کرتا جا رہا تھا۔ وہ میرے کانوں میں سرگوشی کر دیتا تھا۔ ریشم کے ریشمی ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر میں نے نوٹوں کی ایک گڈی کھولی اور سو سو کے نوٹ اس پر سے نچھاور کر دیئے۔

کئی غزلیں سنیں۔ ریشم ناچتے ناچتے تھک گئی۔ میں بھی انگڑائیاں لینے لگا۔ تب ریشم میرے پاس آ بیٹھی۔

''حضور کو میرا رقص پسند آیا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بے حد۔ کیا تم مجھے تنہائی دے سکو گی؟''

'لونڈی ہوں حضور کی۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے، دل بے قابو ہے........اللہ!........کہاں سے لائے ہیں یہ حُسن آپ؟''

''استاد کا کرم ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ تب ریشم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اس کے ساتھ اُٹھ گیا۔ نائیکہ اور سازندوں نے جھک کر مجھے سلام کیا اور میں نے نوٹوں کی گڈیاں ان کی طرف اچھال دیں۔ ریشم مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑے اسی کمرے کی طرف جا رہی تھی، جس میں کل طالوت گیا تھا۔ باقی لڑکیاں حسرت سے مجھے تک رہی تھیں۔

''یہ جگہ آپ کے قابل تو نہیں ہے، لیکن میں نے ایک خوب صورت محل میں آپ کا بندوبست کر دیا

جانتے ہیں وہ محل کہاں ہے؟"

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں........" اس نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"ہم اس تحفے کی قدر کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن........"

"لیکن کیا حضور؟" ریشم نے مجھے نرم مسہری پر بٹھا دیا اور میری ٹائی سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"ہمارے ایک ادنیٰ خادم کا کہنا ہے کہ تم اسے پسند کرتی ہو۔"

"کون ہے وہ احمق؟" ریشم نے تڑپ کر پوچھا۔

"کل اسی نے تمہاری تعریف کی تھی۔ سنا ہے وہ کل یہاں کچھ ہنگامہ بھی کر کے گیا تھا تمہارے لئے۔"

"اوہ........ وہ آپ کا خادم تھا؟"

"ہاں........ ہماری ریاست کے وزیر کا بیٹا۔ ہمارے ساتھ ہی ریاست سے آیا ہے۔"

"حضور! کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگو تیلی۔ میرے دل نے تو اسے ایک آنکھ قبول نہیں کیا تھا۔ بس ماں کے کہنے سے میں نے اس کی دلجوئی کی تھی۔ ہم ایک ایسے پیشے سے منسلک ہیں سرکار! کہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی ہر ایک کی محبت کا دم بھرنا پڑتا ہے۔" ریشم نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا خیال غلط تھا کہ تم اس پر مرمٹی ہو؟"

"یہاں آنے والے ہر انسان کا یہی خیال ہوتا ہے حضور! مگر ہمارا دل جسے چاہتا ہے، ہم اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔"

"تب تم نے ضرور اسے پسند کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں حضور؟ آپ کے سامنے اس کی کیا حیثیت ہے؟ ہم تو آپ کے دیوانے ہیں۔ ہماری قسمت۔ اب آپ سے جدا ہو کر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے آپ نے ہم پر۔"

"سچ کہہ رہی ہو، ریشم!"

"آپ کی قسم حضور! اب آپ کے بنا ہمارا دل نہیں لگے گا۔"

"ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر دوسری طرف رخ کر کے کہا۔ "استاد!"

"سر پھوڑ دوں گا، تم دونوں کا۔" طالوت کی جھلائی ہوئی آواز ابھری اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"حضور کب تک یہاں رہیں گے؟" ریشم نے پوچھا۔

"بس اب جا رہے ہیں ریشم!" میں نے کہا۔ "ریاست میں بہت سے کام ہماری عدم موجودگی کی بنا پر رکے ہوئے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور؟" ریشم حیرت سے اچھل پڑی۔

"ہاں........ ہمارا جانا بے حد ضروری ہے۔"

"آخر کیوں؟ کیا آپ میرے لئے بھی نہیں رک سکتے؟"

"ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔" میں نے اس کے سر کو گود سے ہٹاتے ہوئے کہا اور ریشم چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا بات ہے، سرکار؟ کچھ غلطی ہوگئی مجھ سے؟'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
''نہیں .... تمہارا دل تو بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ میرا نادان دوست بھٹک گیا تھا۔''
''کون سا دوست؟ میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔'' ریشم نے حیران ہوکر پوچھا۔
''ملاقات کروگی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''شاید حضور کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی ہے۔'' ریشم کو میری باتیں بہکی بہکی لگ رہی تھیں۔
''نہیں، نہیں .... میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ میرے دوست کا موڈ خراب ہوگیا ہے۔ وہ نادان میری بات پر یقین نہیں کر رہا تھا اور تمہاری محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے، تمہاری نگاہوں میں انسان کی دولت اس کا حسن ہوتی ہے۔ لیکن وہ تمہیں کیا جانے؟ اس کا تم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔''
''سرکار! .... سرکار! کیا ہوگیا آپ کو؟'' ریشم مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔
''مجھے نہیں، میرے دوست کو کچھ ہوگیا ہے۔ بھئی طالوت! اس معصوم لڑکی کو بتاؤ کیا ہوگیا ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت کی گہری سانس سنائی دی۔ پھر ہمارے سامنے دھوئیں کا ایک ہیولا نمودار ہونے لگا اور ریشم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹ گئی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس دھوئیں کو دیکھنے لگی، جو انسانی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ لیکن اس سے جو شکل برآمد ہوئی، اسے دیکھ کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شکل ایسی ہی بھیانک تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سوکھے سوکھے تھے، جسم پر لمبے لمبے بال تھے، چہرہ کسی مٹکے کے برابر تھا۔ دانت لمبے اور نوکیلے تھے اور تقریباً آٹھ انچ لمبی سرخ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھیں سفید تھیں اور پتلیوں کی جگہ دو کھڑی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ بدنما ہاتھوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ انچ لمبے ناخن نکلے ہوئے تھے۔

پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور ریشم کی بھیانک چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ دوسرے لمحے اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ بے تحاشہ چیختی ہوئی دوڑ رہی تھی۔
''کیسی رہی ....؟'' بھیانک شکل نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بھی بہت خطرناک تھی، لیکن آواز طالوت کی تھی۔
''میرے خدا .... یہ تم ہی ہو؟''
'آؤ .... ذرا بائی جی سے بھی ملاقات کریں۔'' طالوت نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سچی بات ہے کہ طالوت کی یہ بھیانک شکل دیکھ کر میری بھی سٹی گم ہوگئی تھی۔ لیکن بہرحال میں اپنے دوست کی پراسرار قوتوں سے واقف تھا۔ میں بادل نخواستہ اس کے پیچھے نکل آیا۔
ریشم کی چیخیں سن کر نائیکہ، دوسری لڑکیاں اور سازندے دوڑ پڑے تھے لیکن جوں ہی طالوت ان کے سامنے آیا، لڑکیاں چیختی ہوئی پلٹ کر بھاگیں۔ نائیکہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کے منہ سے خوف کی وجہ سے چیخ بھی نہیں نکل سکی تھی۔ سازندے ایک دوسرے سے چمٹ گئے تھے۔ تب طالوت نائیکہ کے پاس پہنچ گیا۔
''اب تو میں تمہیں پسند کرتا ہوں، موٹی بھینس!'' اس نے نائیکہ کے دونوں شانے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مر گئی....... ہائے مر گئی....... بچاؤ!....... بچاؤ!'' نائیکہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ طالوت کا موڈ بہت خراب ہے، وہ نائیکہ سے انتقام لئے بغیر نہیں رہے گا۔''

''منہ بند کر لو۔ ورنہ گردن دبا دوں گا۔'' طالوت غرّایا۔ اس خوفناک شکل پر یہ غرّاہٹ۔ نائیکہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئی۔

''ارے بچاؤ....... اُستاد جی!....... چھٹن خان!....... آگے آؤ۔ ارے میری جان بچاؤ۔''

''ہو ہو ہو....... بائی جی....... ہائے بائی جی۔'' استاد اپنی جگہ کھڑے چیخے۔

''چلو....... ہال میں چلو....... سب دروازے بند کر دو....... کسی نے چیخنے یا بھاگنے کی کوشش کی تو گردن دبا کر مار ڈالوں گا۔'' طالوت نے پھر کہا اور بائی جی کو ہال کی طرف دھکیلنے لگا۔

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کسی کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ریشم دوسری لڑکیوں سے لپٹی کھڑی تھی۔ سب کا برا حال تھا۔ طالوت سب کو ہانکتا ہوا ہال میں لے آیا اور پھر وہ اسی خوف ناک شکل میں گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

''چلو، ساز سنبھالو'' اس نے سازندوں سے کہا۔ لیکن سازندے اپنی جگہ کھڑے کانپ رہے تھے۔ تب طالوت نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور پتلا ہاتھ لمبا ہوتا گیا۔ اس نے ایک استاد جی کی گردن پکڑ کر ساز کے قریب بٹھا دیا جو ترچھی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا اور مونچھیں بڑی نوکیلی تھیں۔ استاد جی دہشت سے گھگیا رہے تھے۔ ان کی ترچھی ٹوپی پیشانی پر جھک آئی تھی۔

''تم لوگ بھی ساز سنبھالتے ہو یا.......'' طالوت گرجا اور تمام سازندوں نے سازوں کی طرف دوڑ لگائی۔ ان کے پورے جسم کانپ رہے تھے۔ ''چلو بائی جی!....... شروع ہو جاؤ'' سازندوں کے ساز سنبھالتے ہی طالوت نے کہا۔

''مم....... میں مر جاؤں گی۔'' بائی جی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''مر جانا....... ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' طالوت نے کہا۔

''اری ریشم....... زمرد....... پکھراج....... غزل سناؤ۔ ناچو۔''

''ناچو گی تو تم بائی جی!....... جلدی کرو....... ورنہ.......'' طالوت نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا اور بائی جی بری طرح چیخنے لگیں۔ لیکن اب طالوت کا دوسرا ہاتھ بھی لمبا ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے بائی جی کا منہ دبایا اور دوسرے سے ان کی چوٹی گھسیٹتا ہوا فرش کے درمیان لے آیا۔

''ناچو بائی جی....... ورنہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چلو بے....... ساز بجاؤ'' اس نے سازندوں کی طرف رخ کر کے کہا اور طبلچی طبلہ پیٹنے لگا۔ ہارمونیم والا جلدی جلدی دھونکنی دھونکنے لگا۔ ہر ساز اپنی اپنی راگنی الاپ رہا تھا۔ کوئی نغمہ نہیں تھا، کوئی سُر نہیں تھا۔ سب دہشت زدہ انداز میں ساز بجا رہے تھے۔

اور پھر موٹی بھینس نما بائی جی ان سازوں پر تھرکنے لگیں۔ اپنے ہاتھی جیسے بے ڈول جسم کو وہ بے تکے انداز میں اُچھال رہی تھیں۔ بار بار پلٹ کر طالوت کی طرف دیکھتیں اور پھر خوف سے آنکھیں بھینچ کر ناچنے لگتیں۔ ان کے پورے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا، منہ کتے کی طرح کھلا ہوا تھا، سینہ پھول اور

پچک رہا تھا۔ اور پھر ناچتے ناچتے ان کا پاؤں ساڑھی میں پھنسا اور وہ بینگن کی طرح لڑھک گئیں۔ لڑکیاں اگر خوف زدہ نہ ہوتیں تو ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتیں۔ خود میری بری حالت تھی۔ لیکن طالوت کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی خوف ناک گردن ہلا رہا تھا۔

اور پھر اچانک وہ اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔ وہی شکل، جو میں نے اس کے لئے منتخب کی تھی۔ ابھی تک کسی کی نگاہ اس کی بدلی ہوئی شکل پر نہیں پڑی تھی۔ سب کے سب اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ بائی جی اس طرح چت پڑی تھیں جیسے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو۔ لیکن پھر ان کی نگاہ طالوت پر پڑ گئی۔

بجتے ہوئے ساز رک گئے اور طالوت کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا بائی جی! خدا حافظ۔'' اس نے کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''چلو بھئی، واپس چلیں۔ یہ لوگ اب بھی گھاٹے میں نہیں ہیں۔ انہیں اتنا مل گیا ہے، جتنا یہ پچاس آدمیوں کو بھی بے وقوف بنا کر نہیں حاصل کر سکتی تھیں۔''

کسی نے کچھ نہ کہا اور طالوت میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

اس نے سیڑھیوں پر زور سے میرا ہاتھ کھینچا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن طالوت نے مجھے سنبھال لیا تھا اور جب میں نے ماحول پر نگاہ ڈالی تو سمجھ گیا کہ طالوت نے مجھے کیوں جھٹکا دیا تھا۔ ہم ہوٹل میں اپنے کمرے میں کھڑے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

''آج تو تم نے شرارت کی انتہا کر دی، طالوت!''

''فضول باتیں مت کرو، یار! یہ لوگ تو واقعی بہت خراب ہوتے ہیں۔ کمبخت نہ جانے کتنوں کی جیبیں اس طرح خالی کراتی ہوں گی۔ آدمی کو جب پیٹ بھر کر مل جائے تو پھر وہ سچ تو بولے۔''

''یہ جھوٹ کی حقیقی شکل ہیں طالوت! تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ تمہاری دنیا ان عناصر سے پاک ہے میرے دوست! یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ چہرے پہچاننے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوتی ہو گی۔ اس کے برعکس ہم لوگ قدم قدم پر ہراساں رہتے ہیں۔ نہ جانے کون کیا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ کیوں ہمیں زک دینے کی فکر میں ہے۔ یہ طوائفیں ہیں، دولت کمانے کے لئے جھوٹی محبت کے کاروبار کھولے بیٹھی ہیں۔ کم از کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ دولت کی پیاسی ہوتی ہیں، جان بوجھ کر بے وقوف بننے والے کو کون روک سکتا ہے۔ لیکن زرینہ کے بارے میں تم کیا کہو گے؟ اس کی تو اصلیت بھی پوشیدہ تھی۔ تم نے ریشم کی محبت دیکھی، اس کی باتیں سنیں...... اور اس کی محبت پر ناواقفیت کی بنا پر یقین کر بیٹھے۔ جبکہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں صرف تفریح کی حد تک آتا۔ لیکن زرینہ کو دیکھو...... جس کے ساتھ میں زندگی گزارنے پر آمادہ تھا۔ اس نے جب مجھے دھوکا دیا ہو گا تو میرے دل پر کیا بیتی ہو گی؟''

طالوت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے انگلی اٹھا کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بے شک، ٹھیک کہتے ہو تم...... بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ بہر حال، اسے سزا بھی اچھی مل گئی۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم ریشم کے ساتھ رہو گے۔ میرا مطلب ہے......'' طالوت ہنسنے لگا۔

''نہیں دوست! میں اس نیت سے وہاں قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ تو صرف تمہارے سر سے

بھوت اُتارنا تھا۔"

"ہاں....... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بے وقوف بن گیا تھا۔ بہر حال، آئندہ تمہاری بات مانا کروں گا۔"

"پھر.......اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"ابھی وقت ہے.......ہم روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"اوہ.......ابھی نہیں دوست! ابھی میں اس ملک میں اور کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم بار بار یہاں سے جانے کی رٹ نہ لگاؤ۔ چلیں گے فرصت سے۔ ویسے میں نے وہ سب کچھ ختم کر دیا ہے، جس کی تمہیں ضرورت تھی۔"

"کیا.......؟"

"وہی جو سفر کے لئے حاصل کیا تھا۔ ٹکٹ وغیرہ بھی پھاڑ دیئے ہیں۔ جب چاہو گے، مل جائیں گے۔ اب یہ بتاؤ کہ کہاں سے ابتدا کریں؟ کسی ایسی جگہ لے چلو، جہاں زندگی کے نئے نئے تجربے ہوں۔"

"ہوں......." میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسی بات ہے طالوت! تو پھر ایک پروگرام بناتے ہیں۔"

"کیا.......؟"

"اس پورے معاشرے کا جائزہ لیں گے۔ انسانوں کی فطرت دیکھیں گے، غور کریں گے کہ کون کس انداز میں سوچتا ہے۔ میرا خیال ہے، ہر طبقے کے انسانوں کا تجزیہ ایک بہترین مشغلہ ہے۔"

"بے شک۔ مجھے تمہارے خیال سے اتفاق ہے۔ اس طرح ہم بہت کچھ دیکھ سکیں گے۔ لیکن یار! ان چیزوں سے کچھ اُلجھن ہونے لگی ہے۔ کیوں نہ حقیقی شکل میں آ جائیں۔"

"کیوں میری موت کے خواہاں ہو؟ اگر پولیس نے دیکھ لیا تو اس بار گولی ہی ماردی جائے گی۔"

"پھر وہی فضول باتیں۔ میرے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔"

"ایسے ہی رہنے دو، پیارے بھائی! اس طرح کم از کم تردّد تو نہ رہے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔ پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ تم اس شکل سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتے ہو؟"

"تمہاری مرضی ہے۔ پھر بوڑھا بنا دو۔ تاکہ بوڑھیاں مجھ سے اظہارِ عشق کرنے میں تکلف نہ محسوس کریں۔" میں نے کہا اور طالوت قہقہے لگانے لگا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"سچ کہنا، تمہیں اس موٹی محبوبہ کا رقص پسند نہیں آیا تھا؟"

"مجھے تو خطرہ تھا کہ کہیں اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"مر بھی جاتی تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔ نہ جانے کتنوں کو جال میں پھانس کر تباہ کیا ہوگا۔"

طالوت ہونٹ سکوڑ کر بولا اور پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ریشم کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

دوسرے دن صبح ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پروگرام بنانے لگے۔
''ابتدا کہاں سے کی جائے؟'' طالوت نے سوال کیا۔
''اس کا تعین ابھی نہیں کرتے۔ سرِ راہ جو بھی نظر آ جائے۔ ہم کسی کردار کا انتخاب کر لیں گے اور جو ہمیں دلچسپ معلوم ہوا، بس اسی سے ابتدا کر دیں گے۔''
''یہ ٹھیک ہے...... پھر کب چلو گے؟''
''بس تھوڑی دیر کے بعد۔'' میں نے کہا اور پھر ہم تیار ہونے لگے۔ لباس وغیرہ پہن کر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہوٹل سے باہر آ کر ہم نے ٹیکسی بھی نہیں پکڑی اور پیدل سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ چیونٹیوں کی طرح روزی کی تلاش میں سرگراں انسان، چہروں پر ایک دوسرے سے مختلف تاثرات لئے ہوئے بے اطمینانی کے شکار، گھبرائے گھبرائے سے، افسردہ، خوشحال، بے حال، دولت کے نشے میں سرشار، غربت کا شکار، ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں، ٹیکسیوں میں، بسوں کے فٹ پاتھوں سے لٹکے ہوئے، رکشاؤں میں، پیدل، ننگے پاؤں، بوسیدہ لباس، عشرت کے شاہکار۔ سینکڑوں چہرے نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے اور طالوت کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔
''بڑی انوکھی ہے تمہاری دنیا۔ سڑک کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر کیسی متضاد کیفیات بکھری ہوئی ہیں۔ اس بدنما کینوس پر مصور نے کس چابک دستی سے مختلف رنگ پھیلائے ہیں۔ یہ تمام کردار کتنی مختصر جگہ میں سمو دیئے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔
''یہ کینوس تا حد نگاہ پھیلا ہوا ہے، طالوت! اپنے جذبات پر قابو پا لو، ورنہ دل غم سے بھر جائے گا اور تم اپنی دنیا میں لوٹ جانے کی خواہش کرو گے۔'' میں نے غم زدہ انداز میں کہا۔
''نہیں عارف! میں حالات سے اس قدر جلد گھبرانے کا عادی نہیں ہوں۔ تم فکر مت کرو۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
فاصلہ طے ہوتا رہا۔ ہم کافی دور نکل آئے۔ اس وقت ہم بچوں کے ایک اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ننھے ننھے، خوب صورت بچے اسکول کے احاطے کے باہر اِدھر سے اُدھر کلیلیں کر رہے تھے۔ شاید ان کا ہاف ٹائم ہوا تھا۔ بچوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے آوازیں لگا رہے تھے اور بچے جمگھٹے بنائے یہ چیزیں خرید رہے تھے۔
''آؤ...... انہیں قریب سے دیکھیں۔'' طالوت نے کہا اور میں اسی طرف بڑھ گیا۔
''مجھے یہ ننھے پھول بہت پسند ہیں۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... یہ ہر دور میں حقیقت ہوتے ہیں۔ اگر کبھی سچائی کی تلاش ہو تو ان بچوں میں گم ہو جاؤ۔''
''اس بچے کو دیکھو...... اس کے چہرے پر کیسی متانت ہے۔ وہ سب سے الگ تھلگ کھڑا ہے۔'' طالوت نے کہا پھر بولا۔ ''ذرا آؤ، اس سے گفتگو کریں۔'' اور میں طالوت کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ طالوت، بچے کے پاس پہنچ گیا۔
''ہیلو......!'' اس نے کہا اور بچہ چونک کر ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی۔
''آپ ان سب سے الگ کیوں کھڑے ہیں بیٹے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے جناب! بس ایسے ہی۔ وہ کھا پی رہے تھے۔ اگر میں ان کے پاس جاؤں گا تو وہ سمجھیں گے کہ میں ان کی چیزوں میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔'' بچے نے جواب دیا۔

''آپ نے کوئی چیز نہیں خریدی؟''

''میں یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں جناب! کھانے پینے کے لئے نہیں۔''

''اوہ......لیکن اس وقت تو چھٹی ہے۔''

''ہاں......لیکن میں چودہ کا پہاڑہ یاد کر رہا ہوں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''کیا آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

''ہیں...... مجھے ایک آنہ روز ملتا ہے۔ میری امی بڑی محنت سے پیسے کماتی ہیں۔ میں یہ ایک آنہ کھٹی میٹھی گولیوں یا سڑے ہوئے پھلوں میں کیوں ضائع کروں؟ میں اسے رکھ لیتا ہوں۔ امی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ کبھی مجھے پنسل کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی کاپی کی۔ میں خرید لیتا ہوں۔ ایک بار ابو کی دوا کے لئے پیسے نہیں تھے، میں نے پورے چودہ آنے امی کو دیئے تھے۔ ان کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔''

میں نے طالوت کے جسم میں لرزش دیکھی۔ خود میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''آپ کے ابو بیمار ہیں؟''

''ہاں......'' بچے نے افسردگی سے کہا۔

''کام نہیں کرتے؟''

''بیمار ہیں تو کام کیسے کریں گے؟'' بچے نے معصومیت سے کہا۔

''امی کیا کرتی ہیں؟''

''باجی اور امی کپڑے سیتی ہیں۔ میں اسکول سے واپس جا کر کپڑے گھروں میں دے آتا ہوں۔''

''آپ رہتے کہاں ہیں؟''

''نئے محلے میں۔'' بچے نے جواب دیا۔

''بیٹے! اگر ہم آپ سے دوستی کریں تو آپ ہمارے دوست بن جائیں گے؟'' طالوت نے پوچھا اور بچہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ تو اتنے بڑے ہیں۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ دوستی اپنی جگہ۔''

''تو بن جائیے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور طالوت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ بچے نے اپنا ننھا منا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور طالوت نے اسے گود میں لے لیا۔

''بھئی ہم خالی خالی دوستی نہیں کریں گے، آپ کو ہمیں اپنے گھر لے جا کر چائے وغیرہ پلانی پڑے گی۔''

''تو پھر شام کو آپ ہمارے گھر چائے پئیں۔'' بچے نے دعوت دی۔

''ضرور......آپ اپنے گھر کا پتہ بتائیے۔'' طالوت نے کہا اور بچے نے پتہ نوٹ کرا دیا۔ طالوت نے اسے گود سے اتارا اور پھر جیب سے ایک نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہماری دوستی کا تحفہ۔''

''دوستی تحفوں کی محتاج نہیں ہوتی جناب! یہ میرے ابو نے ایک بار کہا تھا۔ چھٹی ختم ہو گئی ہے، میں

آپ کا انتظار کروں گا۔" وہ اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ طالوت منہ پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔
پھر جب بچہ گیٹ سے اندر چلا گیا تو اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔
"تمہاری دنیا بالکل ہی مفلس نہیں ہے عارف! اس میں عظمت کے مینار موجود ہیں۔ اس معصوم مجاہد کی گفتگو پر غور کرو، سب کچھ اس کے سامنے ہیچ ہو جاتا ہے اور یہ دنیا فرشتوں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔"
"بڑا ہونہار بچہ ہے...... خدا اس کی عمر دراز کرے اور...... اسے دنیا کی ٹھوکروں سے بچائے۔" میرے منہ سے نکلا۔
"ہم شام کو اس کے گھر ضرور چلیں گے۔ دیکھیں گے ان لوگوں کو، جنہوں نے اس کی تربیت کی ہے۔" طالوت نے کہا اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔
دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی۔ میری طبیعت کچھ بے کیف سی تھی۔ میں نے فرانس جانے کے پروگرام بنائے تھے۔ خود کو وہاں کی جگمگاتی فضاؤں میں دیکھا تھا۔ لیکن طالوت کی ضد کے آگے میری ضد کیسے چل سکتی تھی۔ بہر حال وہ مجھ پر حاوی تھا اور مجھے اس کی مرضی پر چلنا تھا۔
جب ہم آوارہ گردی کرتے کرتے تھک گئے تو ایک ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل کا بورڈ نظر آیا۔
"آؤ...... کچھ کھا پی لیں۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔" میں نے طالوت سے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ ہم دونوں ہوٹل کی طرف بڑھ گئے۔ بے فکروں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ گرمی تھی، اس لئے ہوٹل کا ہال کافی حد تک آباد تھا۔ ہم دونوں نے ایک کیبن کا انتخاب کیا تھا۔ کیبن میں بیٹھ کر ہم نے پردہ کھینچ دیا اور پھر ویٹر کے آنے پر میں نے اسے کچھ چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے ابھی آرڈر سرو بھی نہیں کیا تھا کہ کیبن کا پردہ سرکا کر کسی نے اندر جھانکا۔ ایک خوب صورت سا چہرہ تھا۔ درمیانی عمر لیکن شگفتہ شگفتہ۔
"اوہ...... معاف کیجئے گا۔ کیا آپ میں سے کوئی شوکت صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا اور پردہ سرکا کر اندر آ گئی۔
"نہیں...... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔
"معافی چاہتی ہوں۔ لیکن انہوں نے کیبن نمبر سات کے لئے ہی کہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو انتظار کر لوں؟"
"ضرور، ضرور......" میرے بجائے طالوت بول پڑا اور وہ اندر آ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خوب صورت پرس میز پر رکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہلکے پیازی رنگ کی ساڑھی میں گندھا ہوا گداز جسم جس سے بھینی بھینی، موسم کے لحاظ سے خوشبو اُٹھ رہی تھی۔
میں اور طالوت چور نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔
"آپ شوکت صاحب کو پہچانتی نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"جی نہیں...... صرف فون پر بات ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔ اس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔
"بہر حال، آپ انتظار کر لیں اور اگر پسند کریں تو لنچ ہمارے ساتھ کھائیں۔" طالوت نے پیشکش کر دی۔"
"اوہ......" وہ ہنس پڑی۔ "بہر حال میں بن بلائی مہمان ہوں۔"
"آپ کی میزبانی کر کے ہمیں خوشی ہو گی۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ بھی مسکرا دی۔

طالوت نے مینیو اس کی طرف بڑھا دیا۔
"میزبان کی مرضی سے۔" اس نے جواب دیا اور کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔ اس دوران ایک ویٹر ایک بڑی ٹرالی گھسیٹتا ہوا لے آیا اور اس نے پلیٹیں ہماری میز پر سجانا شروع کر دیں۔ طالوت نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے ویٹر کو کچھ اور آرڈر دے دیئے۔ ویسے میں اس عورت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ میں اسی دنیا کا باسی تھا، لیکن ممکن ہے شوکت صاحب کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور یہ صرف تعارف حاصل کرنے کا طریقہ ہو۔ لیکن چہرہ....... عورت کے چہرے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی، جو اس کے بارے میں برے خیالات سے روک رہی تھی۔"
ویٹر نے ہمارا دوسرا آرڈر بھی سرو کر دیا اور ہم تینوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ عورت کبھی کبھی نگاہیں اٹھا کر مسکراتی نگاہوں سے ہمیں دیکھ لیتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ بہت حسین تھی۔ کھانے کے دوران اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر ایک مشروب کا دور ہوا اور طالوت نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔
"کیسی دلچسپ بات ہے۔ ہم خاصے دوست ہو گئے، لیکن ایک دوسرے کے نام سے ناواقف ہیں۔"
"اوہ ہاں....... بات واقعی دلچسپ ہے۔ میرا نام ثریا ہے۔"
"یہ عارف ہے اور میں عمران ہوں۔" طالوت نے کہا۔
"آپ دونوں بھائی ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں....... گہرے دوست۔"
"ماشاءاللہ! دونوں ایک دوسرے سے زیادہ حسین ہیں۔ خدا آپ کو بری نگاہوں سے بچائے۔"
"شکریہ!"
"شادی شدہ ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں....... دونوں بھٹک رہے ہیں۔" طالوت جلدی سے بولا۔
"عارضی منزل کی تلاش میں؟" وہ پُراسرار انداز میں بولی۔
"یہی سمجھ لیں۔" طالوت جلدی سے بول پڑا۔
"تب پھر میرے ساتھ چلیئے۔ میں آپ کو سکون کے کچھ لمحات مہیا کر دوں گی۔" اس نے دعوت دے ڈالی اور میرا دل دھک سے ہو گیا۔ تمام خاکے بگڑ گئے۔ اُس کے چہرے کی پاکیزگی ڈھل گئی۔ اُس کے لہجے کا خلوص مٹ گیا، جو اس کے دعائیں دیتے وقت ہم نے محسوس کیا تھا۔ کشمکش کا عالم ختم ہو گیا۔ سفلی خیال کو تقویت مل گئی۔ طالوت نے میری طرف دیکھا۔
"چلیں.......؟" اس نے پوچھا۔
"چلو!" میں نے بادلِ نخواستہ جواب دیا اور طالوت نے بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ بیرے کو بل ادا کر کے ہم ہوٹل سے نکل آئے۔ ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی روکی اور وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔
"کیو روڈ۔" اس نے کہا اور ڈرائیور نے گردن ہلا دی۔ کیو روڈ کی چار منزلہ عمارت کے سامنے ٹیکسی رکی۔ میں نے بل ادا کیا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے عمارت میں داخل ہو گئے۔ پہلی منزل کے ایک مکان پر

اس نے دستک دی اور ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے بوڑھی عورت کا دُھندلایا ہوا چہرہ دیکھا۔ پرانے طرز کی عورت تھی، چہرے پر ایک دل دہلا دینے والی سنجیدگی طاری تھی۔ دروازہ کھول کر سفید دوپٹے سے چہرہ چھپائے ہوئے واپس مڑ گئی۔

وہ ہماری طرف رخ کر کے مسکرائی۔ ''آیئے۔'' اس نے گردن کو ہلکے سے جھٹکا اور ہم اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ ہم دونوں کو لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں معمولی فرنیچر تھا۔ ایک مسہری پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ چھت میں ایک پرانا پنکھا لگا ہوا تھا، دیواروں پر سفیدی تھی۔ حالانکہ عورت کے جسم پر ساڑھی قیمتی تھی، لیکن اس کے مقابلے میں مکان عسرت زدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پنکھا کھول دیا اور ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کی پیشکش کر دی۔

''اجازت ہو تو لباس تبدیل کر آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں......ضرور!'' طالوت نے کہا اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد طالوت نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھنے لگا۔

''تم بہت خاموش ہو عارف؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس میں اس عورت کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا ہوں۔''

''میں بھی اُلجھن میں ہوں......ایک منٹ رکو۔ میں ذرا مکان کا جائزہ لے لوں۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ طالوت پھرتی سے کرسی سے اُٹھ گیا اور باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ باہر نکلتے ہی وہ دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا ہو گا۔ بہرحال، اس کے جانے کے بعد میں پھر اس عورت میں اُلجھ گیا۔ تین چار منٹ گزر گئے۔ پھر میں نے طالوت کو اندر آتے دیکھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں چونک پڑا۔ نہ جانے کیوں، طالوت کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

''وہ واپس آ رہی ہے۔'' اس نے کہا اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اُس کے اُترے ہوئے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا، لیکن چونکہ اس سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں تھا، اس لئے میں خاموش ہی رہا۔ باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ اندر آ گئی۔ اس نے گلابی رنگ کا ایک ڈھیلا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ بال ایک مخصوص انداز میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی ہماری طرف بڑھی اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''معاف کیجئے......لباس تبدیل کرنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ آپ لوگ اُلجھ تو نہیں رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ طالوت خاموش تھا، اس کے چہرے کی غم انگیز کیفیت برقرار تھی۔

''آپ کے ساتھی شاید بور ہو گئے۔ میرا خیال ہے آپ لوگ اطمینان سے نہیں بیٹھے۔'' وہ اُٹھی اور میری طرف بڑھ آئی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑا اور بولی۔ ''آیئے، مسہری پر لیٹ جایئے۔ لایئے، میں آپ کے جوتوں کے تسمے کھول دوں۔ باہر دھوپ بہت ہے، اب شام کو ہی جایئے۔''

میں اُٹھ گیا اور اس نے مجھے مسہری پر بٹھا دیا۔ پھر وہ طالوت کو بھی اسی انداز میں اٹھا کر لے آئی اور اسے مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بٹھا کر خود درمیان میں بیٹھ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم ابتدا کریں۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں فضا کچھ اور نشہ آور ہو گئی تھی۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور پھر

میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے کسی دوسرے کمرے میں پہنچا دیں۔ میرے ساتھی کا دل بہلائیں۔ نہ جانے کیوں یہ اُداس ہو گیا ہے۔''

''بہت بہتر۔'' اُس نے کہا۔ لیکن طالوت بھی میرے ساتھ ہی اُٹھ گیا۔ اس نے مجھے دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا اور پھر خود بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تکلف برطرف محترمہ! ہمیں آپ کو کیا پیش کرنا ہوگا؟''

عورت نے ایک دم نظریں جھکا لیں، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے لمحے وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''میری خدمت سے خوش ہو کر جو دل چاہے، دے جائیں۔ میں سودا نہیں کرتی۔''

''پھر بھی۔'' طالوت نے اصرار کیا۔

''عرض کیا نا....... میں سودا نہیں کرتی۔'' عورت کی آواز سے لرزش عیاں تھی۔

''خدمت کا تعین آپ کس طرح کریں گی؟'' طالوت نے عجیب سا سوال کیا اور وہ پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔'' اس نے کہا۔

''تب پھر ہم دونوں یہاں بیٹھیں گے اور آپ ہم سے گفتگو کریں گی۔ ہم لوگوں کو حق ہے کہ آپ سے جس قسم کے چاہیں سوالات کریں، آپ ان کے جواب دیں گی۔''

''دلکشی....... شاید....... شاید میں آپ کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔'' وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے بولی۔

''ہاں....... کیونکہ آپ کو اپنے حُسن میں دلکشی پیدا کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ دیکھئے، آپ کی بائیں چھاتی سے دودھ ٹپک رہا ہے اور آپ کے خوب صورت گاؤن پر اس دودھ کا دھبہ نمایاں ہے۔'' طالوت نے اذیت ناک لہجے میں کہا اور وہ چونک پڑی۔ میری نگاہ بھی اُٹھ گئی اور میں نے اُس کے اُبھرے ہوئے سینے پر بائیں سمت ایک نشان دیکھا۔

اُس کا چہرہ فق ہو گیا۔ آنکھوں میں شدید ہیجان کے آثار نظر آئے تھے۔ ''س....... سوری....... میں ابھی آئی۔'' وہ جلدی سے اُٹھ گئی۔

''بیٹھ جاؤ!'' طالوت کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ لرزنے لگی اور پھر جیسے اس کے قدم بے جان ہو گئے ہوں۔ وہ مسہری پر بیٹھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔ میں بری طرح اُلجھ رہا تھا۔

''آپ کو ہماری خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔'' طالوت نے نرم لہجے میں کہا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

''آپ شادی شدہ ہیں؟'' طالوت نے پوچھا اور اس نے گردن جھکا لی۔ ''اگر ہماری یہاں موجودگی آپ کو پسند نہ ہو تو.......''

''نہیں، نہیں.......'' وہ جلدی سے بولی۔

''تب پھر میرے سوالات کے جواب دیں۔''

''ہاں.......'' اس نے خشک سی آواز میں کہا۔

''آپ کے شوہر کہاں ہیں؟'' طالوت نے دوسرا سوال کیا۔ میں حیران تھا، آخر طالوت کو یہ کیا سوجھی؟ اس وقت وہ عجیب سی گفتگو کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پہلی بار لڑکی کی آنکھوں میں تلخی کے اثرات دیکھے۔ اس کی آنکھیں ایک دم بدل گئی تھیں، چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے طالوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''سینی ٹوریم میں........ وہ ٹی بی کے مریض ہیں۔''

''بوڑھی عورت کون ہے؟''

''میرے شوہر کی ماں۔''

''بچہ........؟''

اس سوال پر وہ چونک پڑی۔ پھر اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''میرا ہے۔''

''اس کی عمر کتنی ہے؟''

''ایک سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''ایک ہی بچہ ہے؟''

''ہاں........ اور شاید تم میری دلکشی سے اسی لئے متنفر ہو گئے ہو کہ میں ایک بچے کی ماں ہوں۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''لیکن تمہارا خیال غلط ہے۔ میں مکمل عورت ہوں۔ دیکھو........ ان دودھ ٹپکاتی ہوئی چھاتیوں کو بھول جاؤ۔ تم نے بہت سی عورتوں کو دیکھا ہو گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں اُٹھی۔ اُس نے اپنے گاؤن کی ڈوری ایک جھٹکے سے کھول دی اور اسے نوچ کر دور پھینک دیا...... بے شک وہ دلکش تھی۔ نسوانیت کا حسین پیکر۔

نہ جانے کیوں میری آنکھیں جھک گئیں۔ طالوت بھی پریشان ہو گیا تھا۔ پھر وہ اُٹھا اور اُس نے زمین پر پڑا ہوا گاؤن اُٹھا لیا۔

''اسے پہن لو، میری بہن!........ بہنیں بھائیوں کے سامنے عریاں نہیں ہوتیں۔'' اس نے گاؤن عورت کی طرف بڑھایا لیکن وہ اسی بپھرے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔

''بکواس مت کرو........ اداکاری مت کرو........ مجھے بھائیوں کی نہیں، عاشقوں کی ضرورت ہے۔ میں بہن نہیں، عورت ہوں، سمجھے........ میں عورت ہوں۔ مجسم دلکشی۔ میں تمہیں سکون کی انتہائی منزلیں دے سکتی ہوں۔ ہمیشہ یاد رکھو گے مجھے۔ آؤ........ بے وقوفی مت کرو۔''

''آؤ........'' اس نے طالوت کا گریبان پکڑ لیا لیکن طالوت کے مضبوط پنجے نے اس سے گریبان چھڑا لیا تھا۔

''بہنیں، بھائیوں کے سامنے عریاں نہیں ہوتیں۔ لباس پہن لے........ بے شرم، بے غیرت۔'' اس نے عورت کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور وہ نیچے گر پڑی۔ طالوت پھر جھکا، اس نے عورت کے بال پکڑے اور کھڑا کر دیا۔ ''لباس پہنو........ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ اُٹھاؤ لباس۔'' اس نے ایک اور زوردار تھپڑ عورت کے منہ پر رسید کر دیا۔ نہ جانے کیوں وہ بھی دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ پھیلے، لیکن زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔

طالوت نے گاؤن اٹھا کر پھر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ عورت کی جدوجہد ختم ہو گئی تھی۔ تھپڑوں نے اس کے حواس درست کر دیئے تھے۔ طالوت کی آنکھوں میں خون لہرا رہا تھا۔

''بے غیرت تم ہو........ بے شرم تم ہو........ اگر غیرت مند ہو تو جاؤ، اسے قتل کر دو، جسے میں نے بھائی کہہ کر روٹی مانگی تھی، لیکن اس نے مجھے بہن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے صاف کہا کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی جوان آدمی، جوان عورت کا بھائی نہیں ہے۔ اگر میں عورت بن جاؤں تو وہ مجھے روٹی دے گا۔ بتاؤ، تین دن کا فاقہ کسی عورت کو بہن بنائے زندہ رکھ سکتا ہے؟........ میری چھاتیوں کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ میرا بچہ بھوک سے بلک رہا تھا۔ بوڑھی ساس پلنگ پر پڑی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ کیا اس کے بعد بھی میں عورت نہ بنتی؟........ بہن بننے میں مجھے کیا ملا تھا؟........ بولو........ جواب دو۔'' وہ گاؤن کی آستین چڑھاتے ہوئے بولی۔

''میں اسے ضرور قتل کروں گا۔ میں اس سے تمہارا انتقام ضرور لوں گا، میری بہن! جاؤ........ لباس پہن کر میرے پاس آؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔ جاؤ، مجھے شرمندہ نہ کرو۔ جاؤ!'' اس نے عورت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور عورت کی آنکھوں کے سوتے کھل گئے۔

''میں........ اب........ بہن نہیں بن سکتی۔ میں کسی کی بہن نہیں بن سکتی۔ میں بہن بننے کے قابل نہیں ہوں۔ سنو!........ مجھے مجبور مت کرو۔ مجھے عورت رہنے دو۔ اگر میں بہن بن گئی تو میرا شوہر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ بہن بننے کے بعد میں عورت نہ بن سکوں گی۔ مان لو میری بات۔''

''کچھ نہیں ہو گا........ کچھ نہیں ہو گا۔ لباس پہن آؤ۔ تمہارے عریاں جسم کو دیکھ کر میری گردن شرم سے جھک گئی ہے۔'' طالوت نے آنسوؤں بھرے لہجے میں کہا اور وہ گاؤن سنبھالے لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گئی۔ طالوت کے خوب صورت رخساروں پر دو آنسو لڑھک آئے تھے۔

''بڑی ذلیل ہے تمہاری دنیا، عارف!........ بڑی بدکار ہے۔ بڑی قابلِ نفرت ہے۔ کیسے زندہ ہو تم اس دنیا میں؟'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''تم نے کیا دیکھا تھا، طالوت؟........ مجھے بتاؤ تو سہی۔'' میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ دیکھا، عارف! وہ قابلِ بیان نہیں ہے۔ وہ یہاں سے دوسرے کمرے میں گئی۔ اس کے پرس میں ایک روٹی تھی، جو یقیناً اس نے ہماری آنکھ بچا کر ہوٹل ہی میں، پرس میں رکھ لی ہو گی۔ اس نے وہ روٹی نکال کر بوڑھی عورت کو دی، جو ایک بلکتے ہوئے ننھے سے بچے کو کندھے سے لگائے ہلا رہی تھی اور بولی کہ وہ یہ روٹی پانی سے کھا لے۔ شام کو وہ اس کے لئے کھانے کا بندوبست کر سکے گی۔ بڑھیا روٹی کھانے لگی اور اس نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اس نے اسے جلدی جلدی تھوڑا سا دودھ پلایا اور پھر اسے روٹی کھاتی ہوئی بڑھیا کی گود میں دیتے ہوئے بولی۔ تم اسے سنبھالو ماں! گاہک انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ وہ دل میں نہ جانے کیا سوچیں گے۔ بچے کا پیٹ نہیں بھرا تھا، وہ پھر رونے لگا۔ تب اس نے کہا۔ ''ماں کی مدد کرو بیٹے! تھوڑی دیر اور صبر کر لو۔ تھوڑی دیر۔'' اور پھر وہ کمرے سے نکل آئی۔ اب نے اپنی ساڑھی اتار کر ایک خالی صندوق میں احتیاط سے رکھ دی۔ اس صندوق میں اس ساڑھی کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا، صرف دیوار پر ایک پرانی شلوار اور قمیض لٹکی ہوئی تھی۔ ایک طرف یہ گاؤن لٹکا ہوا تھا، جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ پھر اس نے گاؤن پہن لیا۔'' طالوت نے

بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا اور میں سکتے میں رہ گیا۔ کمرے کا ماحول بے حد ویران ہو گیا تھا۔ میرا دل بھی ویران ہو گیا تھا۔ ہم دونوں گردن جھکائے سوچتے رہے۔ پھر یکایک طالوت چونکا، اس نے بائیں سمت رخ کر کے کہا۔

''راسم......!'' اور راسم اس کے سامنے پہنچ گیا۔ ''ایک خوراک پیک کرا لاؤ اور بچے کے لئے دودھ کی شیشی اور دودھ۔ بہت جلد۔''

راسم گردن جھکا کر پلٹا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ اور دوسرے لمحے دونوں چیزیں موجود تھیں۔ اسی وقت وہ دروازے پر نظر آئی۔ میلی کچیلی شلوار اور قمیض، پیلے سے رنگ کا دوپٹہ، جس میں سوراخ تھے، آنکھوں کا کاجل پونچھ دیا گیا تھا، ہونٹوں کی سرخی صاف کر دی گئی تھی۔ دُھلا دُھلا چہرہ پُروقار لگ رہا تھا۔

''یہ کھانا بوڑھی ماں کو پہنچا دو، ثریا! اور بچے کو دودھ۔ یہ دیکھو، یہ شیشی ٹھیک ہے نا؟'' طالوت نے کہا اور وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''یہ اتنی جلدی؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''پہنچا دو......پھر گفتگو کریں گے۔'' طالوت نے کہا اور عورت تمام سامان لے کر نکل گئی۔ طالوت ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے میری طرف رخ کر کے کہا۔ ''کیسی متضاد کیفیات کی حامل ہے، تمہاری دنیا عارف! اگر میں نے ایسے دو چار ویرانے اور دیکھ لئے تو شاید میں کان پکڑ کر اپنی دنیا میں واپس چلا جاؤں۔''

''تم جا سکتے ہو طالوت! کیونکہ تمہاری دنیا موجود ہے۔ لیکن مجھے اسی ماحول میں زندگی گزارنی ہے۔ یہ دنیا اسی طرح بلکتی رہے گی۔ اسے تبدیل کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تم تو اب زندگی کے ساتھی ہو عارف! تمہیں اب کہاں چھوڑ سکتا ہوں؟'' اس نے کہا اور ہم دونوں پھر دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ واپس آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرے سکون کے آثار تھے۔ وہ گردن جھکائے ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔

''میں تمہارے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتا، ثریا! لیکن تمہاری داستان سننے کا بھی خواہش مند ہوں۔ کیا تم میری یہ خواہش پوری کرنا پسند کرو گی؟'' طالوت نے کہا اور اس نے چہرہ اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھا۔ دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''کوئی انوکھی کہانی نہیں ہے، میری۔ ان لاکھوں انسانوں میں سے ایک، جو اس پورے معاشرے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میری جیسی کسی بھی شکل کی عورت کو روک کر اس سے اس کی داستان پوچھ لینا، میری داستان سے مختلف نہیں ہو گی۔ بھیڑیوں کی بستی میں بے کس و مجبور عورتیں میری طرح عصمت فروشی کر کے ہی زندگی گزار سکتی ہیں۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ کی نقاب ہو گی اور اس نقاب کے پیچھے پاکیزگی سسک رہی ہو گی، مجبوریاں تڑپ رہی ہوں گی۔ ہاں...... مجھے ان کی خوش بختی پر رشک آتا ہے، جو تنہا ہیں۔ جن کے ساتھ بیمار شوہر، اس کی نشانی مُنا سا بچہ اور ایک بوڑھی ساس نہیں ہے۔ ایسی لڑکیوں کو اگر معاشرے کے مقابلے پر آنا پڑے تو ان کے پاس خودکشی کا راستہ رہتا ہے۔ وہ خودکشی کر کے اس بے غیرت معاشرے کو شکست دے سکتی ہیں۔ مجھ جیسی بدنصیب ایسا نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کے سر پر بہت سے بوجھ ہوتے ہیں۔ وہ معصوم مسکراہٹ کو پامال نہیں کر سکتیں۔ وہ بوڑھی آنکھوں کے ٹمٹماتے

ارمانوں کو قتل نہیں کر سکتیں۔ وہ محبت کرنے والے بے بس شوہر کو موت سے ہمکنار نہیں کر سکتیں۔
جاوید ایک دفتر میں کلرک تھا۔ سیدھا سادا، خوش مزاج نوجوان۔ جس نے اپنی ہی حیثیت کی لڑکی سے شادی کی۔ میری بیوہ ماں بیمار رہتی تھی۔ میں نے زندگی کی ابتدا ہی دُکھوں سے کی ہے۔ جاوید نے ہمیں سہارا دیا۔ سادہ اور شریفانہ انداز میں میری اس سے شادی ہو گی۔ قلیل تنخواہ تھی، لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور محبت بھری مسکراہٹیں، غمِ روزگار کو بھی دُور کر دیتی ہیں۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور جاوید نے میرا غم دُور کرنے کے لئے دن رات ایک کر دیئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا، میرے لئے دنیا جہان کی خوشیاں فراہم کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے جاوید کے لئے ماں کا غم بھلا دیا۔ اس کی ماں بھی تو میری ماں تھی۔ اور پھر جب اس کی محبت کی کونپل میرے بطن میں پھوٹی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے اپنی محبت کا خراج ادا کرنے کے لئے اپنی محنت اور شدید کر دی۔ بچے کی آمد کی خوشی میں وہ اپنی شخصیت بھول گیا۔ وہ ننھے مہمان کا پُرجوش استقبال کرنا چاہتا تھا، لیکن شدید محنت رنگ لائی۔ جاوید کا موروثی تحفہ اُبھر آیا۔ اُس کے باپ کو بھی ٹی بی تھی اور شاید اس کے جراثیم جاوید کے جسم میں بھی موجود تھے۔ مرض نے اسے دبوچ لیا اور وہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ اُسے بہت دکھ تھا۔ اُسے بہت غم تھا کہ وہ مہمان کی پذیرائی نہ کر سکا۔ شروع میں احساس نہ ہوا، لیکن پھر تفکرات منہ پھاڑے سامنے آ گئے۔ جو کچھ جمع کیا تھا، وہ بیماری اور روزمرہ کے اخراجات میں ختم ہو گیا۔ اور پھر خاموشی سے بچہ پیدا ہو گیا۔ کوئی دھوم نہ تھی۔ کوئی اہتمام نہ تھا۔ لیکن اُمید ضرور تھی۔ اب نہ سہی، آئندہ سہی۔ لیکن پھر ایک دن جاوید نے بہت سا خون اُگلا تو یہ اُمید بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے فوری طور پر سینی ٹوریم بھجوا دیا جائے ورنہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ اور...... ہم نے گھر کا بہت سا سامان بیچ کر جاوید کو سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا۔ لیکن اس کے بعد بھی بہت سے مسائل تھے، جن کا احساس رفتہ رفتہ ہو رہا تھا۔ سینی ٹوریم میں جاوید کو دوائیں مل رہی ہیں، لیکن گھر کے حالات کی فکر اسے صحت مند نہیں ہونے دے رہی۔ اسے دواؤں کی ضرورت ہے، پھلوں کی ضرورت ہے۔ اب یہ چیزیں اسے باقاعدگی سے مہیا ہو رہی ہیں۔ لیکن...... جب وہ صحت مند ہو کر واپس آئے گا اور اسے حقیقت معلوم ہو گی...... تو مجھے یقین ہے، وہ پہلے سے زیادہ خون اُگلے گا۔ اور اس کے بعد زندگی اس سے بہت دُور چلی جائے گی۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں...... اب صرف جاوید نہیں ہے، ایک اور ذمہ داری ہے، جس کا نام انور ہے۔ یہ معصوم ذمہ داری جاوید کی محبت سے بڑھ کر ہے۔ میں نے محنت مزدوری کرنے کی کوشش کی، بہت کچھ کرنا چاہا، لیکن کچھ نہیں کر سکی اور میرے عزائم خاک میں ملتے گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں جاوید کو زندہ رکھنے کے لئے تن من کی بازی لگا دوں گی۔ محنت کر کے جاوید کو زندہ رکھوں گی، اس کی نشانی کو پروان چڑھاؤں گی۔ لیکن دنیا نے میری محنت قبول نہیں کی۔ اس کا فلسفہ دوسرا تھا۔ وہ جسم کے عوض، سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ محنت مزدوری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے حالات سے جنگ کی، زمانے سے لڑنے کی کوشش کی، لیکن کس کس سے لڑتی؟ کوئی میرے دُکھ کو جاننے کے لئے تیار نہ تھا۔ سب کی نگاہیں میرے جسم کے نشیب و فراز ٹٹولتی تھیں۔ آہستہ آہستہ احساسِ شکست شدید ہوتا گیا اور جب میرے انور کی حالت خراب ہو گئی تو...... میں نے اپنی انا کو مار دیا۔ میں نے اپنے جسم کو راکھ کا ڈھیر تصور کر لیا اور خاک کے اس ڈھیر نے انور کو بچا لیا۔ جاوید کے

لئے دوائیں مہیا کر دیں۔ بوڑھی ساس کو فاقوں کی موت مرنے سے بچا لیا۔ اور اب........اب میں راکھ کی بیوپاری ہوں۔ جھوٹی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر راکھ خریدنے والوں کی تلاش میں نکل جاتی ہوں۔ کوئی مل جاتا ہے تو اسے لے آتی ہوں، راکھ کی قیمت وصول کرتی ہوں اور اس وقت تک خاموش بیٹھ جاتی ہوں، جب تک فاقے دوبارہ نہ شروع ہو جائیں۔ جب فاقے شروع ہو جاتے ہیں تو میں اس غلیظ راکھ کو سجا کر پھر بازار میں نکل جاتی ہوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طالوت خاموشی سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ میرے دل پر گہرا اثر تھا۔ تب طالوت نے بڑی حقیر نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میری گردن شرم سے جھک گئی۔ لیکن طالوت کے چہرے کے تاثرات فوراً بدل گئے۔ وہ بھی جانتا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ اس دنیا نے کسی کو نہیں چھوڑا تھا۔ طالوت کو میری کہانی معلوم تھی۔

کئی منٹ تک غم انگیز خاموشی چھائی رہی۔ صرف ثریا کی سسکیاں ماحول کو زندگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ تب طالوت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رونے کی ضرورت نہیں ہے ثریا! میری بات غور سے سنو۔ تم اس دنیا میں پیدا ہوئی ہو، اسی میں زندہ رہو گی۔ تمہیں علم ہے کہ تمہاری دنیا فریبی ہے۔ یہ اوپر سے کچھ، اندر سے کچھ ہے۔ یہ ہونٹوں پر نیکی اور پاکیزگی کے افسانے سجائے ہوئے ہے، لیکن سینے کی گہرائیوں میں غلاظت اور درندگی لئے ہوئے ہے۔ تم نے اپنے پیاروں کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ دنیا نے تمہیں کچھ نہ دیا۔ ہاں، اس نے تمہارے جسم کی قیمت ضرور چکا دی۔ ٹھیک ہے، اسے جس چیز کی ضرورت تھی، تم نے اسے دے کر زندگی کے لوازمات پورے کئے۔ پاکیزگی اور گندگی کے معیار اسی دنیا نے تو قائم کئے ہیں........تم اس پر افسردہ کیوں ہو؟ تم اسے اپنے افسانے کیوں سناتی ہو؟ تم یہ سب کچھ کر کے بھی سربلند ہو۔ کیونکہ تمہارے سامنے ایک مقصد تھا۔ ان کی بات کرو، جو صرف ذاتی تسکین کے لئے تمہیں خریدتے رہے ہیں۔ تم ان سے نفرت کرو، ان کے درمیان خود کو برتر محسوس کرو۔ ان لوگوں سے گھن کھاؤ، جو جنسی تسکین کے لئے تمہارے سامنے کتے کی طرح دُم ہلاتے ہیں۔ اور اب اگر تمہاری ضرورت جسم فروشی کے بغیر پوری ہو سکتی ہے تو پوری کرو۔ یہ تو وقت کی بات ہے۔ جاوید کو بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ تم نے زندگی گزارنے کے لئے کیا کیا فروخت کیا۔ یہی کافی ہے کہ تم دیانت داری سے اس کے بچے اور اس کی ماں کی پرورش کر رہی ہو۔ تم اپنے حالات بدل لو، یہ مکان چھوڑ دو، نئے مکان میں رہو۔ باعزت اور سربلند ہو کر رہو۔ فریبی دنیا کے سامنے ایک نیا جھوٹ پیش کرو۔ سنو ثریا! تم جب زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اپنا جسم فروخت کرنے پر تُل گئیں تو پھر تم یہ سب کچھ بھی کر سکتی ہو، جو میں کہہ رہا ہوں۔ کیا تم مجھ سے متفق نہیں ہو، عارف؟" طالوت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں تم سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ ہم سب غلاظت کی تخلیق ہیں۔ صرف ہمارے ضمیر ہماری حیثیت متعین کرتے ہیں۔ ثریا ایک پاک دل کی مالک ہے، اس لئے قابلِ عزت و احترام ہے۔ اس کے کردار کی عظمت سب سے پوشیدہ ہے۔ اگر دنیا کی اندھی آنکھیں اس کی عظمت تک نہ پہنچ سکیں تو اسے کیا ضرورت ہے، دنیا کو اپنے بارے میں بتانے کی۔ وہ اپنے طور پر اس دنیا کی حیثیت متعین کر سکتی ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس کی شخصیت کو چیلنج کر سکے۔"

ثریا کی سسکیاں رک گئیں۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ تب طالوت نے اس سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے ثریا! کیا تم ایک نئی زندگی اپنانا پسند کرو گی؟ تمہارا بچہ، آیاؤں کی گود میں پرورش پائے گا۔ تمہاری ساس ایک بزرگ اور معزز خاتون کی حیثیت سے رہیں گی اور تم...... تم ایک عظیم خاتون بن جاؤ گی۔ جاوید کا خیراتی ہسپتال میں نہیں، کسی بہت بڑے ہسپتال کے خصوصی وارڈ میں علاج ہوگا۔ اور پھر ایک دن وہ تمہارے پاس واپس آ جائے گا۔ تب تم اسے غم دوراں سے نجات دلا دو گی اور اسے کبھی ٹی بی نہ ہوگی۔ تم سوچ لینا کہ زندگی میں کچھ بھیانک راتیں آئی تھیں، پھر صبح ہو گئی۔"

"تمہاری یہ گفتگو بڑی سحر انگیز ہے۔ لیکن میں وہ صبح کہاں سے لاؤں گی؟ میری زندگی میں صبح کہاں ہے؟ وہاں تو صرف شام ہے۔ درد انگیز شام۔ جس کے خوف ناک سائے میری روح کو دہلاتے رہتے ہیں۔" وہ کرب ناک آواز میں بولی۔

"وہ صبح ہم مہیا کریں گے۔ کیا تم ہماری طرف سے صبح کا تحفہ قبول کرو گی؟"

"اگر دنیا مجھے بھیک دینے پر تیار ہو جاتی تو میں اسے عصمت فروشی پر ترجیح دیتی۔ آپ نے جس صبح کا ذکر کیا ہے، وہ میرے نزدیک خوابوں کی صبح ہے۔ اگر اس صبح کی ایک کرن بھی مجھے مل جائے تو میں اسے سینے سے لگا لوں گی۔"

"بھائی، بہنوں کو بھیک نہیں، تحفے دیتے ہیں۔ تم نے ایک بار بھی ہمیں بھائی نہیں کہا۔"

"کس زبان سے کہوں؟...... اس زبان سے، جس سے تمہیں اپنے آبرو باختہ ہونے کی داستان سنا چکی ہوں؟ اگر تم اس غلیظ زبان سے یہ لفظ سن کر خوش ہو سکتے ہو، تو میں تمہیں اپنی ناپاک زبان کی جسارت دکھا سکتی ہوں۔"

"تمہارے ضمیر سے اُٹھنے والی خوشبو، غلاظتوں پر حاوی ہے، ثریا! آج سے اندھیرے چھٹ گئے۔ زندگی کے بوجھ کو اسی طرح سنبھالنا جس طرح آج تک پامردی سے اس کا مقابلہ کرتی رہی ہو۔ آج کی شب اور گزار لو...... کل کی صبح تمہاری نئی زندگی کی پیغامبر ہوگی۔" طالوت نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"راسم......!" اس نے دائیں سمت رُخ کر کے آواز دی اور راسم نمودار ہو گیا۔ ثریا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں!

"ان کے سامنے دولت کے انبار لگا دو...... وہ سب کچھ انہیں دے دو، جس کی انہیں ضرورت ہے۔"

راسم نے گردن جھکائی اور غائب ہو گیا۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے؟...... وہ کون تھا؟" ثریا کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ہمارے بارے میں کسی سے تذکرہ مت کرنا۔ پوری ذمہ داری اور ہوشیاری سے سب کچھ سنبھالنا۔ جو کچھ تمہیں ملے گا، وہ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ تم اس سے خوف زدہ نہیں ہوگی۔" طالوت نے کہا۔ اسی وقت راسم نمودار ہوا۔ اس کے سر پر ایک عظیم الشان صندوق لدا ہوا تھا، جسے اس نے اتار کر نیچے رکھ دیا۔ طالوت نے جھک کر صندوق کا ڈھکن کھول دیا اور ثریا کی چیخ نکل گئی۔ صندوق میں اوپر تک نوٹوں کے انبار تھے...... نہ جانے کتنی دولت تھی۔ میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"تم اس طرف سے پوری طرح مطمئن رہو گی۔ ہاں، اس دنیا کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا، ورنہ طرح

طرح سے تمہیں پریشان کرے گی۔ ہمیں اجازت دے دو۔" طالوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ثریا پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے صندوق کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم دونوں باہر نکل آئے۔

ثریا کے مکان سے کافی دور نکل آنے کے بعد طالوت نے کہا۔ "کسی پُرسکون جگہ چلو۔ چائے وغیرہ پئیں گے۔"

"آؤ۔" میں نے کہا اور ہم ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور کو ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل کے ایک پُرسکون گوشے میں بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چائے کے برتن لگے ہوئے تھے۔

"میں ان واقعات پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔" طالوت نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "البتہ ایک گزارش ضرور کروں گا۔ تصویر کا یہ رخ میری برداشت سے باہر ہے۔ اب ہم ایسے رُخ تلاش نہیں کریں گے۔ یہ تاریک پہلو تو میرا ذہن چھلنی کر دیں گے۔ میں تو لطافتوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے، طالوت! لطافتیں محدود ہیں۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ کہاں کہاں سے چشم پوشی کرو گے؟ اس دنیا کی اسّی فیصد آبادی مصائب میں گرفتار ہے۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں، ہر روشن چہرے کے عقب میں تمہیں تاریکی نظر آئے گی۔ اگر تم اس تاریکی کو نہیں دیکھ سکتے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ واپس لوٹ جاؤ۔ میری دنیا یہی ہے۔" میرا لہجہ نہ جانے کیوں سخت ہو گیا۔ طالوت پیالی رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر وہ بڑے دُکھ سے بولا۔

"پھر میں تمہاری دنیا کو کیسے بدل دوں؟ میری طاقت تو محدود ہے۔ میری زندگی بھی محدود ہے۔"

"اور میری دنیا ناقابلِ اصلاح۔ چنانچہ تاریک پہلوؤں سے خود چشم پوشی کرو۔ سطح دیکھو۔ گہرائیاں جھانکو گے تو تاریکیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔"

"میں گہرائیوں میں نہیں جھانکوں گا۔" طالوت نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا اور میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر مجھے طالوت پر رحم آنے لگا۔ بے چارہ کہاں آ پھنسا ہے۔ کئی منٹ تک ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پانچ بجے اپنے ننھے دوست کے ہاں نہیں چلو گے؟"

"نہیں عارف!...... ہمت نہیں ہے۔ خدا کے واسطے میرے ذہن کا تکدر دُور کر دو...... اُس خاندان میں بھی کوئی دردناک داستان جنم لے رہی ہے۔ میں راسم کو وہاں بھیج دیتا ہوں۔ وہ معذرت کا ایک خط دے گا اور ہماری طرف سے کچھ تحفے بھی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"آؤ، واپس ہوٹل چلیں۔ طبیعت مکدر ہو گئی ہے۔" اس نے کہا اور میں نے ویٹر کو بلا کر بل طلب کر لیا۔ پھر ہم وہاں سے ہوٹل روانہ ہو گئے۔

ہوٹل میں بھی طالوت خاموش خاموش سا تھا۔ مجھے یہ ماحول پسند نہیں آیا تھا چنانچہ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچتا رہا کہ کس طرح طالوت کا موڈ درست کروں۔ سامنے ہی اخبارات پڑے تھے۔ میری نگاہ اتفاقیہ طور پر ایک اشتہار پر جا پڑی۔ کسی نائٹ کلب کا اشتہار تھا اور میں چونک پڑا۔ میں نے اخبار اٹھا کر اشتہار دیکھا۔ اچھا خاصا پروگرام تھا۔ تب میں نے طالوت کو آواز دی۔

''سو رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''یار! کوشش کے باوجود ثریا کی کہانی ذہن سے نہیں نکال پا رہا۔''

''وہ مضبوط عورت ہے۔ حیرت کے سمندر سے نکلنے کے بعد وہ خود کو تمہاری دولت کے سہارے سنبھال لے گی۔ اس کی کہانی بھول جاؤ۔ رات کے لئے ایک پروگرام ہے۔''

''کیا پروگرام ہے؟''

''گولڈ اسٹار نائٹ کلب چل رہے ہیں۔ بہت اچھا پروگرام ہے۔''

''وہاں کیا ہوتا ہے؟''

''ناچ رنگ.......وہ جدید دنیا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ۔''

''کیا وہاں بھی ریشم سے ملاقات ہوگی؟''

''ریشم جیسی لڑکیاں تو ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن تم اس ماحول کو بدلا ہوا پاؤ گے۔ اس پوری کائنات پر دولت کی حکومت ہے، طالوت! جہاں دولت نہیں ہے، وہاں المیے ہیں۔ جہاں دولت ہے، وہ سب کچھ بھول گئے ہیں۔ ان چکروں میں نہ پڑو۔ بس میں کہہ چکا ہوں، ہر چیز کو سطحی نگاہ سے دیکھو، مطمئن رہو گے۔ جہاں گہرائیوں میں گئے، ڈوب جاؤ گے۔''

''تب پھر اُٹھو.......جلدی چلیں۔ اس کوفت سے تو نجات ملے۔''

''ابھی نہیں....ابھی نہیں....ابھی تو کافی دیر ہے۔ وہاں راتیں جاگتی ہیں۔ یہ تو سونے کا وقت ہے۔''

''تب میں بھی رات کے انتظار میں سو جاتا ہوں۔'' طالوت نے کہا۔

''یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے جواب دیا اور ہم دونوں مسہریوں پر جا لیٹے۔ تقریباً سات بجے آنکھ کھلی۔ طالوت بے خبر سو رہا تھا۔ میں اپنی مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں طالوت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ معصوم بچوں کے سے انداز میں سوتا ہوا یہ شخص، کیسی پُراسرار قوتوں کا حامل تھا۔ وہ ہم میں

سے نہیں تھا۔ دولت اور اس قسم کی چیزوں کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ وہ جو چاہتا، کر سکتا تھا۔ کیسا انوکھا تھا وہ........ ایک میں تھا........ صرف اس کا دست نگر........ میری آزادی اُس کی مرہونِ منت تھی۔ میں بذاتِ خود کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ نہ جانے ذہن میں یہ خیالات کیوں آجاتے تھے۔ میری زندگی اب غیر یقینی سی ہوگئی تھی۔ ہمیشہ سوچتا تھا کہ اب خود کو صرف حالات کے رخ پر چھوڑ دوں۔ جو ہو رہا ہے، ہونے دوں۔ لیکن نہ جانے کیوں اپنی فطرت میں یہ لاپروائی پیدا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، ایسے خیالات مجھے پریشان کرنے لگتے تھے۔ پھر میں گردن جھٹک کر اُٹھ گیا۔ غسل خانے میں جا کر غسل کیا۔ طبیعت بشاش ہوگئی۔ باہر نکلا تو طالوت بھی جاگ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں کافی پی رہے تھے۔

پھر میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں گولڈ اسٹار کے نمبر تلاش کئے اور فون کر کے رات کے پروگرام کے لئے دو نشستیں بُک کرالیں۔

"کیا خیال ہے؟ باہر نکلا جائے؟" طالوت نے پوچھا۔

"ہاں........ آوارہ گردی کریں گے۔ یہاں اتنا وقت گزارنا مشکل ہوگا۔" میں نے کہا اور ہم دونوں لباس وغیرہ سے درست ہو کر باہر نکل آئے۔ ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔

"ساحل........!" میں نے ڈرائیور سے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ ٹیکسی دوڑتی رہی۔ طالوت راستے بھر خاموش رہا تھا۔ پھر ہم ساحلِ سمندر پر اُتر گئے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بل ادا کیا اور پھر ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گئے۔

"کیا سوچ رہے ہو، طالوت؟" تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں........ تھوڑی سی تفریح ہونی چاہئے، ورنہ طبیعت کا یہ تکدّر دُور نہ ہوگا۔" اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"آؤ........ ساحل کے ساتھ گشت کریں۔" میں نے پیشکش کی اور وہ میرے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"سچ مچ بڑی انوکھی دنیا ہے تمہاری عارف!........ ان لوگوں کو دیکھو........ رنگین لباسوں میں کیسے خوش نظر آرہے ہیں، جیسے انہیں کوئی غم نہ ہو۔ اب تک جو دیکھا ہے، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی یہ خوشی عجیب لگتی ہے۔"

"ہاں طالوت!........ بس یہی خوبی ہے میری دنیا کے لوگوں میں۔ ہر غم کو دُور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ خوبی بھی ان میں نہ ہوتی تو شاید اب تک دنیا ختم ہوگئی ہوتی۔"

"اوہو........ ان صاحب کو دیکھو........ شاید یہ زندگی میں پہلی بار گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں۔" طالوت نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک تندرست و توانا نوجوان تھا، جو سیاہ بنیان، چست پتلون پہنے، سر پر فلیٹ، جس پر سرخ پَر لگے ہوئے تھے، ساحل پر سیر کرنے والے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے کی پشت پر سوار اکڑا ہوا جا رہا تھا۔

"یہ ٹیڑھے کیوں ہوگئے ہیں؟" طالوت نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

''وجہ اس سفید رنگ کی کار کے قریب موجود ہے۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کیا اور طالوت ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً نصف درجن نوجوان لڑکیاں اور تین چار نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ سفید رنگ کی خوب صورت کار کے عقب میں ایک ویگن بھی کھڑی ہوئی تھی۔ شاید پوری پارٹی ساحل کی سیر کو آئی تھی۔ سب لوگوں کی نگاہیں ان صاحب کی طرف تھیں، جو گھوڑے پر جا رہے تھے۔

''اوہ......!'' طالوت نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آؤ!''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''آؤ تفریح کریں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ طالوت اسی سفید رنگ کی کار کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرنے کے موڈ میں تھا۔ ویسے اس کے ہونٹوں کی شرارت آمیز مسکراہٹ کسی خاص پروگرام کا پتہ دے رہی تھی۔ ہم دونوں اس طرح سیدھے ان کی طرف بڑھے تھے کہ وہ سب ہمیں دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ لڑکیوں نے پہلے ہمیں اجنبی، پھر دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھا۔ نوجوانوں کے چہروں پر خشک سے تاثرات اُبھر آئے۔ انہوں نے ہمیں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔

''فرمائیے؟'' ان میں سے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''کیا میں آپ سے ان صاحب کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں، جو گھوڑے پر بیٹھ کر ٹیڑھے ہو گئے ہیں؟'' طالوت نے کہا۔

''کیوں........آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' اس شخص نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔

''بس انہیں دیکھ کر مجھے بڑی شرم آ رہی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''میرا خیال ہے، آپ یہاں سے دفعان ہو جائیں۔ ورنہ ان لڑکیوں کے سامنے مار کھا کر آپ کو اور شرم آئے گی۔'' اس نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں..... گفتگو انتہائی پُر امن ماحول میں ہو گی۔ میں آپ لوگوں کو ایک مشورہ دینے آیا ہوں۔'' طالوت نے جلدی سے دونوں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''مشورے کی ایسی تیسی.......آپ یہاں سے جاتے ہیں یا نہیں؟'' ایک اور نوجوان بھی آگے بڑھ آیا۔

''نفیس! جھگڑا مت کرو۔'' ایک لڑکی گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

''آپ ہی انہیں سمجھائیے محترمہ! میں صرف ان صاحب کی بھلائی چاہتا ہوں، جو بے چارے گھوڑے پر جا بیٹھے ہیں۔ آج کل کے گھوڑے بے حد شریر ہو گئے ہیں۔ ابھی یہ گھوڑا ریورس گیئر میں چلے گا۔ ایسی صورت میں وہ مٹی کا شیر گر بھی سکتا ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''مار کھائے بغیر نہیں جاؤ گے؟'' نوجوان غرّایا۔

''آپ کی مرضی۔'' طالوت نے شانے اچکائے اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس سے دُور ہٹ گیا۔ صرف چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر اُس نے دُور نگاہ دوڑائی اور پھر اُس کے ہونٹ گول ہو گئے۔ اُس نے زور سے سانس اندر کھینچی اور میں چونک کر گھوڑے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا، وہی ہو گا جو طالوت نے کہا ہے۔

اچانک گھوڑا دوڑتا ہوا رُک گیا اور پھر وہ اُلٹا دوڑنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے گھوڑا قدم جما کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن کوئی نادیدہ قوت اُسے کھینچ رہی ہو۔ اُس کے قدم ریت پر پھسل رہے تھے۔ اُس پر بیٹھا ہوا ہیرو اُسے چابک پر چابک رسید کر رہا تھا۔ لیکن گھوڑا پلٹ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اب اور تیزی سے پیچھے آ رہا تھا۔ اور اب اس پر بیٹھا ہوا سوار بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپک گیا تھا۔ میں نے گردن گھما کر سفید کار کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں حیرت زدہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

لیکن پھر وہ سب تتر بتر ہو گئیں کیونکہ گھوڑا کار کی سیدھ میں آ رہا تھا۔ اور پھر وہ خاصی زوردار آواز میں کار سے ٹکرایا اور سوار نیچے آ رہا۔ دوسرے لمحے گھوڑا سرپٹ ایک طرف دوڑ پڑا۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر سوار کو اُٹھا رہے تھے اور وہ احمقانہ انداز میں ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر ہماری طرف اشارے ہوئے اور اس کے بعد پورا غول ہماری طرف بڑھا۔ نوجوان شہسوار سب سے آگے تھا۔ قریب آ کر اس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور کھڑا ہو کر ہمیں گھورنے لگا۔ پھر نوجوان کی سخت آواز سنائی دی۔

''گھوڑے کو کیا ہو گیا تھا؟''

''خاندانی گھوڑا تھا، غلط سوار کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی دیکھ کر میں نے پیش گوئی کی تھی۔'' طالوت نے معصومیت سے جواب دیا۔

''مجھے نہیں جانتے، میں کون ہوں۔ دماغ درست کر دوں گا۔'' نوجوان نے گرج دار آواز میں کہا۔

''میرا کیا قصور ہے بھائی؟...... غصہ گھوڑے پر اُتارو، جو تم جیسے گھٹیا آدمی کو برداشت نہیں کر سکا۔'' طالوت اسی لہجے میں بولا۔

''رفعت!...... شمسی!...... مارو سالوں کو...... دیکھ لوں گا۔'' نوجوان نے دوسرے لوگوں سے کہا اور وہ آگے بڑھ آئے۔ طالوت اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ لڑکیاں اپنے ساتھیوں کو روک رہی تھیں۔ اچانک گھوڑے والے نوجوان کا ہیٹ فضا میں بلند ہو گیا۔ اس نے لپک کر ہیٹ پکڑنے کی کوشش کی، لیکن ہیٹ ایک دوسرے نوجوان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہیٹ اُتارنے کی کوشش کی تو وہ تیسرے نوجوان کے سر پر جا ٹکا۔ آگے بڑھنے والے نوجوان رک گئے۔ وہ تعجب سے ہیٹ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ہیٹ کو بھول کر میری طرف لپکے۔ لیکن ہم سے کچھ دُور اُن کے قدم رک گئے۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے پوری قوت لگا رہے تھے، لیکن ان کے قدم ہی نہ اُٹھ رہے تھے۔ تب اچانک ہیٹ والے نوجوان نے جیب سے پستول نکال لیا۔ طالوت نے پستول کی طرف دیکھا اور وزنی پستول نوجوان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ بھی ہیٹ کی طرح فضا میں معلق ہو گیا اور ہیٹ والا نوجوان اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنے لگا۔ لیکن پستول اُس سے مذاق کر رہا تھا۔ وہ کھٹ سے نوجوان کی کھوپڑی پر گرتا اور پھر بلند ہو جاتا۔ عجیب مضحکہ خیز پچویشن تھی۔ چاروں نوجوان آگے بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہیٹ والا نوجوان، پستول پکڑنے کے لئے مینڈک کی طرح پھدک رہا تھا۔ لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوف زدہ ہوں یا قہقہے لگائیں۔ کچھ ہنس رہی تھیں، کچھ خوف سے منہ پھیرے کھڑی تھیں۔ پستول کا مذاق جاری تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ پستول فضا میں معلق رہا اور نوجوان بھی کسی اسٹیچو کی طرح ساکت ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پستول کو لپک لینے کے لئے اُٹھے ہوئے تھے۔

اور........اچانک سفید کار اسٹارٹ ہوگئی۔ گھر گھرر کی آواز پر لڑکیوں نے خوف زدہ ہوکر کار کی طرف دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ کار ریورس گیئر میں چلنے لگی۔ وہ پیچھے جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وین بھی اسٹارٹ ہوکر کار کے انداز میں پیچھے دوڑنے لگی۔ دونوں گاڑیاں پاگل گھوڑوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ اور ساحل پر تفریح کرنے والے لوگ دہشت زدہ ہوکر ان کی زد سے بچنے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔

''بس کرو، طالوت! کوئی بے گناہ گاڑیوں کی زد میں نہ آجائے۔'' میں نے طالوت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ گاڑیاں رُک گئیں۔ ویسے ان سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سائیکل چلانے والے نوجوان بھی ٹھیک ہوگئے تھے۔ لیکن اب وہ بدحواس نظر آرہے تھے۔ نوجوان کا پستول بھی زمین پر آگرا تھا۔ تب طالوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھ آیا۔

لڑکیوں اور نوجوانوں کے گرد مجمع جمع ہوگیا تھا۔ ساحل پر تفریح کرنے والے بدحواس لوگ گاڑیوں کو گھیرے کھڑے تھے۔ خاصا ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ لیکن طالوت ہونٹ سکوڑے آگے بڑھ رہا تھا۔

''کچھ مزہ نہیں آیا۔'' اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کون سے موڈ میں ہو؟''

''تکدر دُور کررہا ہوں یار! وہ سامنے کیا ہوٹل ہے؟''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا اور طالوت میرا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے شرارتی موڈ پر حیران تھا لیکن میں نے اور کچھ نہ کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ ہوٹل کے وسیع ہال میں کافی رونق تھی۔ چاروں طرف رنگ برنگے لباس نظر آرہے تھے۔ طالوت اس رونق کو دیکھ کر مسکرایا۔ پھر ہم ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔ کرسی پر بیٹھ کر طالوت نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر مسکرانے لگا۔

''ہاں........ یہاں زندگی ہے........ اندر جھانکنے سے کیا فائدہ؟ ان سرخ وسفید چہروں کو دیکھ کر آنکھوں میں تازگی آتی ہے کچھ کھلاؤ، بھوک لگ رہی ہے۔''

میں نے ویٹر کو اشارہ کیا اور ویٹر ہمارے قریب پہنچ کر ادب سے جھک گیا۔ میں نے اسے کچھ آرڈر نوٹ کرائے اور وہ ادب سے واپس چلا گیا۔

''کتنی متضاد زندگی ہے........ کیسی عجیب........ حاکم ومحکوم ایک جگہ جمع ہیں، دونوں کا فرق محسوس کرنے کے لئے غور کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ لیکن تمہارے اوپر جمی ہوئی برف مجھے کوفت میں مبتلا کررہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اس قدر خاموش کیوں ہو؟'' طالوت نے منہ بنا کر کہا اور پھر خود ہی بولا۔ ''میں سمجھا........ شاید ساحل پر تمہیں میری تفریح پسند نہیں آئی۔ مگر میں نے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔ بس وہ گھوڑے سوار مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ اچھی خاصی شخصیت تھی، لیکن خود کو نمایاں کرنے کے لئے وہ گھوڑے کی سواری کررہا تھا اور اس طرح اکڑا ہوا بیٹھا تھا، جیسے دنیا کا سب سے بڑا شہسوار ہو اور کوئی ملک فتح کرنے جارہا ہو۔''

طالوت نے یہ سب کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ ''بہر حال، اب تو خوش ہو؟........ اس شہسوار کے سر پر بہت سے سر نمودار ہو گئے ہوں گے۔ پستول خاصا وزنی ہوتا ہے۔''

''تمہاری دنیا میں اتنی اتنی سی بات پر زندگی چھین لینے کی اجازت کس نے دی ہے؟ پستول سے نکلنے والی گولی زندگی چھین لیتی ہے نا؟''

''تم بار بار اسے میری دنیا کہہ کر طنز کیوں کر رہے ہو، طالوت؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور وہ چونک کر میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر معذرت کے آثار پھیل گئے۔

''ہاں........ یہ غلطی مجھ سے ہوتی رہی ہے۔ لیکن تم نے اسے طنز کیوں سمجھ لیا؟ تم نے اس بارے میں پہلے کچھ کیوں نہیں کہا؟ یقین کرو، میرے دوست! میں اپنے ان الفاظ پر شرمندہ ہوں۔'' طالوت نے کہا۔

''بس بس........ زیادہ بکواس مت کرو۔ ان خاتون کو دیکھو۔ خاص طور سے تمہیں دیکھ رہی ہیں۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''سب سے پہلے مجھے معاف کر دو۔ اس کے بعد دوسری بات ہو گی۔''

''اچھا بھائی! معاف کر دیا۔''

''شکریہ........ اس کے بعد ایک بات سن لو۔ ہم دونوں دوست ہیں۔ اگر ایک دوسرے سے تکلف روا رکھا تو دوستی زیادہ دن نہیں چل سکے گی۔ تمہیں حق ہے کہ میری ہر غلط بات پر مجھے ٹوک دو۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب اس طرف تو دیکھو۔'' میں نے کہا اور طالوت میرے اشارے پر دیکھنے لگا۔ ایک جوان العمر گڑیا سی لڑکی تھی۔ لیکن اس کا ساتھی سیاہ رنگ کا گینڈا تھا۔ گرے کلر کے سوٹ میں وہ گینڈا ہی نظر آ رہا تھا۔ پھیلا ہوا دہانہ، گھنگھریالے بال، فٹ بال سے بڑی کھوپڑی، شانوں پر رکھی ہوئی گردن۔ عمر بھی لڑکی سے کہیں زیادہ تھی۔ ایسی شکل میں لڑکی ہماری طرف نہ دیکھتی تو کیا کرتی؟ یہ حقیقت تھی، اس نے دو تین بار اس طرف دیکھا تھا۔

''یہ اس کی کون ہو سکتی ہے؟'' طالوت نے زیر لب کہا۔

''پوچھ لو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پوچھ لیتا ہوں۔'' طالوت ایک دم کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ طالوت آج حد سے زیادہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ اس سے قبل کہ میں اسے روکوں، وہ ان دونوں کی میز کے قریب پہنچ گیا۔ میں بدحواس نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور میری چھٹی حس نے پھر کسی ہنگامے کا اعلان کر دیا تھا۔ میں نے طالوت کو ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے دیکھا۔ لڑکی اور گینڈے نما آدمی، دونوں چونک پڑے تھے۔ طالوت مسکراتے ہوئے ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جواب میں، میں نے گینڈے نما آدمی کی شکل بگڑتے دیکھی۔ وہ آنکھیں نکال کر طالوت کو گھور رہا تھا۔ طالوت اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ پھر اس نے گینڈے نما آدمی سے کچھ کہا اور اچانک گینڈے نما آدمی نے اپنا فولادی ہاتھ گھما دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ خلا میں جھول گیا تھا۔ تب طالوت نے کرسی کھسکائی اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھر کچھ کہا اور گینڈے نما آدمی نے بھی کرسی کھسکا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی توند میز کے نیچے پھنسی ہوئی تھی........ میز اُلٹ

گی۔اوراس پر رکھے ہوئے برتن نیچے گر پڑے۔
کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی اُچھل کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ''مار ڈالوں گا، کتے........ کمینے........ ذلیل!'' گینڈا حلق پھاڑ کر دھاڑا اور لوگ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ گینڈا پھر طالوت پر جھپٹا تھا لیکن طالوت اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور شاید اس نے گینڈے کے پاؤں بھی اڑا دیا تھا۔ نتیجے میں گینڈا قریب ہی ایک اور میز پر اوندھ گیا، جس پر مرد اور دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے خوف ناک وزن سے میز کی جو حالت ہوئی ہوگی، ظاہر ہے میز پر بیٹھے ہوئے چاروں افراد اُچھل کر کھڑے ہوگئے۔
''جان سے مار ڈالوں گا........ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' گینڈا بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی پلیٹ آگئی، جو اس نے اٹھا کر پوری قوت سے طالوت پر اُچھال دی۔ لیکن میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک معزز آدمی کے منہ پر لگی اور اس کی طویل چیخ پورے ہال میں گونج اُٹھی۔ گینڈے نے دوسری پلیٹ اٹھالی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اسے کسی پر کھینچ مارے، اچانک دو تین آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے گینڈے کی مرمت شروع کردی۔ دوسرے لوگ بھی اس پاگل آدمی سے نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔
طالوت بڑے وقار سے چلتا ہوا میرے قریب آگیا۔ ''چلو، یہاں سے چلیں۔ گھٹیا جگہ ہے۔'' اس نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ لیکن ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ لڑکے اور لڑکیوں کا وہ گروہ بھرا ہوا ہوٹل کی طرف آتا نظر آیا، جسے ہم نے ساحل پر پریشان کیا تھا۔ ان کے ساتھ مزید چار پانچ افراد تھے۔ سب سے آگے بے ملک کے شہزادے ہاتھ میں پستول لئے تنتناتے چلے آرہے تھے۔
میں نے ایک دم طالوت کا بازو پکڑلیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''بلاوجہ ایک اور بے گناہ مارا جائے گا، دو چار زخمی ہوجائیں گے۔ کسی ترکیب سے ان سے اُلجھے بغیر نکل چلو۔''
''چلنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ لو۔'' طالوت نے میرے چہرے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر جب اس نے ہاتھ ہٹایا تو مجھے اس کی شکل بدلی ہوئی نظر آئی۔ وہ اصلی شکل میں تھا۔ یقیناً میری شکل بھی تبدیل ہوگئی ہوگی۔ میں نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میری اصلی شکل تو میرے لئے اور خطرناک تھی۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ بدمعاش طالوت میرے خوف سے نفرت کرتا تھا، چنانچہ میں نے اس موضوع پر کچھ نہ کہا۔
آنے والوں نے یہاں کا ماحول دیکھا۔ گینڈا اب بھی پاگلوں کی طرح خوں خوں کر رہا تھا۔ اُس کی ساتھی لڑکی اُس سے دُور کھڑی ہوئی تھی۔ اُسے شاید گینڈے کی پٹائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہوٹل کے ملازمین ایک جگہ جمع ہوگئے۔ اور پھر گینڈے کی شکایت پر ہماری تلاش شروع ہوگئی۔
اس افراتفری پر کسی نے ہم دونوں کی یکساں شکل پر توجہ نہیں دی تھی۔ شہزادۂ عالم بھی ہر کونے کھدرے میں ہمیں تلاش کر کے مایوس ہوگئے۔ بمشکل تمام ہنگامہ فرو ہوسکا۔ اس دوران طالوت میزوں سے اپنی پسند کی چیزیں اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا تھا۔ لوگ ہوٹل سے نکلنا شروع ہوگئے۔ بے چارے ہوٹل والے کا اچھا خاصا نقصان ہوگیا تھا۔

بہر حال، منتظمین نے مہمانوں سے درخواست کی کہ وہ اس وقت ان کی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور جب دوسرے لوگ نکلے تو ہم بھی باہر نکل آئے۔ طالوت اطمینان سے ٹہلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''ڈر لگ رہا ہوگا۔''

''کیسا ڈر......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اپنی اصلی شکل سے۔''

''اب نہیں لگتا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بہر حال، ذہنی تکدر دُور ہو گیا۔ آج کا دن بھی عجیب و غریب گزرا ہے۔ اتنے بہت سارے واقعات ایک دم ہو گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے نائٹ کلب میں کیا ہوتا ہے۔''

''ضرور دیکھنا......لیکن آخر اس گینڈے سے تم نے کیا کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار!......بس ان کا رشتہ دریافت کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ بڑے میاں! یہ آپ کی پوتی ہیں یا نواسی؟......بس وہ مجھے گھورنے لگا۔ تب میں نے کہا۔ اگر ان دونوں کے علاوہ آپ میں کوئی اور رشتہ ہے تو براہِ کرم اس خوب صورت لڑکی کو میرے حوالے کر دیں۔ آپ کے ساتھ اس کی شخصیت خراب ہو رہی ہے۔ بس وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا تو میں نے اس سے کہا کہ لڑکی کے سامنے نوجوان بننے کی کوشش مت کرو، ورنہ جوتے مار مار کر گنجا کر دوں گا۔ اور اس کے بعد سب کچھ ہو گیا۔'' طالوت نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''مجھے آج تمہارے موڈ پر حیرت ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بس یار!......اس دنیا میں اسی طرح گزارہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے خلاف کیا تو بہت سے ذہنی امراض لے کر واپس جانا پڑے گا۔ اور پھر شاید میں کبھی اِدھر کا رُخ کرنے کی ہمت نہ کر سکوں۔ چنانچہ میرے دوست! میرے ساتھ تفریحات میں بھرپور حصہ لو۔ لطف آ رہا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق کسی غریب انسان کو میں کبھی پریشان نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......عیش کرو۔ میرا کیا جاتا ہے۔''

''ٹیکسی روکوں، نائٹ کلب کا وقت ہو گیا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔ پھر ایک دم کہنے لگا۔ ''یار! یہ ٹیکسی کی مصیبت کیوں پالی جائے؟ کیوں نہ راسم سے کہہ کر کار منگوالیں۔ تم اسے چلانا جانتے ہو؟''

''ہاں، جانتا تو ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تب ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ ہم ہوٹل بھی چھوڑ دیں گے اور اپنے لئے کوئی خوب صورت سا مکان پسند کر لیں گے۔ راسم!'' اس نے آواز دی اور راسم حاضر ہو گیا۔ ''تم جانتے ہو، ہمیں کیا چاہئے؟'' طالوت نے کہا۔

''تشریف لائیے!'' راسم نے کہا اور طالوت مجھے اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ راسم نے ہماری رہنمائی ایک قیمتی کار تک کر دی۔ انتہائی اعلیٰ درجے کی کار تھی۔ میں نے کبھی ایسی کار میں بیٹھنے کے خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اب کسی چیز کے لئے مجھے خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ

میرے قبضہ قدرت میں تھا۔ نہ جانے کس کس کو ہم نے لکھ پتی، کروڑ پتی بنا دیا تھا۔ طالوت کے اشارے پر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پوری طرح ایکسپرٹ نہیں تھا۔ کسی زمانے میں دوستوں کی گاڑیاں چلاتے چلاتے ڈرائیونگ سیکھ گیا تھا۔ بہر حال، کام چلا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کار اسٹارٹ کر دی اور طالوت میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

''ہوٹل سے ہمارا سامان مکان میں پہنچا دینا۔'' طالوت نے راسم سے کہا اور راسم نے گردن جھکائی اور غائب ہو گیا۔ میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ عجیب خواب کی سی کیفیت میں، میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک نشہ سا میرے حواس پر طاری تھا۔ طالوت مجھے کار چلاتے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے بھی سکھا دینا۔ بڑی دلچسپ چیز ہے۔'' اس نے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ کار سست روی سے سڑکیں طے کر رہی تھی۔ ہم لوگ کافی دیر تک آوارہ گردی کرتے رہے اور پھر میں نے گولڈ اسٹار کی طرف رخ کر لیا۔ بہت مہنگا کلب تھا۔ چھوٹے موٹے سرمایہ دار بھی ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ بلاشبہ یہاں ٹیکسی سے آتے ہوئے بے حد شرم آتی۔ کلب کے کمپاؤنڈ میں اعلیٰ درجے کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک سے ایک شاندار۔ اور ہماری کار بھی ان شاندار کاروں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ فوراً ایک پورٹر نے ہمیں ریسیو کیا۔ میں نے اسے ریزرویشن کا نمبر بتایا اور پورٹر مجھے لے چلا۔ اس نے ہمیں ہماری سیٹوں پر بٹھا دیا اور پھر ٹکٹ بنوا کر ہمیں پیش کر دیئے۔ میں نے ٹکٹ کی رقم کے علاوہ بڑی ٹپ بھی اسے دی اور پورٹر شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

کلب کی مدھم روشنیوں میں حسین اور چمک دار چہرے جگمگا رہے تھے۔ پیشہ ور تتلیاں فضا میں چکرا رہی تھیں۔ وہ ہر متوجہ ہونے والے پھول پر بیٹھتیں، اس کی جیبیں خالی کراتیں اور پھر دوسرے پھول پر جا بیٹھتیں۔ مختلف حصوں میں مختلف گیم ہو رہے تھے۔ رقص کے پروگرام میں ابھی دیر تھی۔ جام کھنک رہے تھے، قہقہے اُبل رہے تھے۔ ہم نے کافی طلب کر لی۔ کافی کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں بھی منگوائی تھیں۔

طالوت دلچسپ نگاہوں سے اس پورے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے میری طرف جھک کر کہا۔

''یہ ماحول اب تک دیکھی ہوئی تمام جگہوں سے مختلف ہے۔''

''ہاں...... جس قدر دولت مند طبقے کی طرف بڑھتے جاؤ گے، ماحول بدلتا جائے گا۔ یہ دولت مندوں کے کھیل ہیں، جن پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''خوب...... تو دولت نے یہاں خوب ہنگامے کر رکھے ہیں۔ بہر حال ایک بات کا اعتراف تو کرنا پڑے گا، وہ یہ کہ دولت نے یہاں زندگی کو بے حد تیز کر دیا ہے۔ ہر جگہ نیا پن ہے۔ یہ لڑکیاں یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ایک خوب صورت سی لڑکی کو اشارہ کر دیا۔ لڑکی مسکراتی ہوئی ہمارے سامنے آ بیٹھی۔

''ہیلو!'' اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے دونوں ہونٹ سکوڑ لئے۔ ''مائی گڈنس۔ آپ دونوں شاید جڑواں بھائی ہیں۔''

''نہیں...... ہم الگ الگ پیدا ہوئے تھے۔'' طالوت نے جلدی سے جواب دیا اور لڑکی ہنس پڑی۔

''کیا پیو گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''شمپئین۔'' لڑکی نے بے تکلفی سے جواب دیا اور بے تکلفی سے آگے جھک آئی۔ لیکن میں نے طالوت کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''اوہ.......وہ شاید بڑا بھائی ہے۔'' لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔
بیرے نے شمپئین رکھ دی۔ وہ تین گلاس لایا تھا۔ لڑکی بوتل سے تین گلاس بنانے لگی۔ پھر اس نے ایک گلاس اٹھا کر میرے سامنے رکھا، دوسرا طالوت کے سامنے اور پھر اُنگلی سے ہونٹوں پر شراب لگا کر میری طرف بڑھی۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے طالوت کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ لیکن طالوت نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے بھی لڑکی سے اپنے آپ کو بچالیا تھا۔
''یہ کیا مصیبت آ گئی......اسے بھگاؤ عارف!'' طالوت بھرّائی ہوئی آواز میں بولا اور میں ہنس پڑا۔
''میرا دوست ذرا نروس قسم کا آدمی ہے۔ تم بوتل لے جاؤ اور کہیں اور بیٹھ کر پی لو'' میں نے کہا۔
''اوہ.......آئی سی.......'' لڑکی نے ہونٹ سکوڑ کر طالوت کی طرف دیکھا اور پھر کرسی کھسکا کر اُٹھ گئی۔ اس نے تینوں گلاسوں کی شراب اپنے حلق میں انڈیل لی اور چلتے چلتے طالوت کے ساتھ ایک ایسی حرکت کی کہ طالوت اُچھل پڑا۔ لڑکی ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میرا بھی ہنسی کے مارے برا حال تھا۔
''یہ سچ مچ لڑکی تھی.......؟'' طالوت نے بھرّائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''تمہیں شک ہے؟''
''اصلی تھی.......مم.......میرا مطلب ہے، بالکل اصلی.......؟''
''بلاؤں.......اُسی سے پوچھ لو۔'' میں نے کہا اور طالوت نے جلدی سے میرا منہ بھینچ لیا۔ وہ حیرانی سے دُور جاتی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔
یہ سب لڑکیاں ایسی ہی ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔
''ہاں، ہاں.......میں بتا چکا ہوں کہ سب کی سب پیشہ ور ہیں۔''
''مگر.......مگر یہ کہاں پیدا ہوتی ہیں؟.......میرا مطلب ہے، یہ کہاں سے آتی ہیں؟ کیا ان کی پیداوار کسی خاص طریقے سے ہوتی ہے؟ عام لڑکیاں.......یہ عام لڑکیاں تو نہیں ہیں۔''
''ہاں میرے دوست! ان کے اندر یہ حس ایک خاص انداز میں جنم لیتی ہے۔''
''آؤ، دوسرے حصے دیکھیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم نے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں۔ ہم وہاں سے ٹہلتے ہوئے گیمز روم میں چلے گئے، جہاں اعلیٰ پیمانے پر جوا ہو رہا تھا۔ کھیلنے والوں میں مرد، عورتیں سب ہی شامل تھے۔ طالوت یہ سب کچھ بھی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اس کی نگاہ ایک طرف اُٹھ گئی۔ گہرے نیلے رنگ کی ساڑھی میں لپٹا ہوا حسین جسم.......گھنگھریالے بال.......حُسنِ بے پناہ تھا۔ طالوت اُسے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے کئی لحات کے بعد اس کی محویت محسوس کی تھی۔ تب میری نگاہ بھی اس کے تعاقب میں اُٹھ گئی۔
درحقیقت دنیا کا منتخب حُسن تھا۔ میری کیفیت بھی طالوت سے مختلف نہ تھی۔ اس کے ساتھ دو بارعب آدمی تھے۔ لیکن ان کا رویہ غلاموں کا سا تھا۔ وہ اس کی بات پر گردن جھکا کر جواب دے رہے تھے۔

''دیکھا؟'' طالوت نے گہری سانس لے کر کہا۔
''ہاں........'' میں نے جواب دیا۔
''ایسی ایسی حسین لڑکیاں بھی یہاں اس قدر سستی ہیں۔''
''اوہ........نہیں طالوت!........وہ ان میں سے نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟'' طالوت چونک کر بولا۔
''ہاں........وہ تماشبین ہے۔''
''اوہ........تب تو........تب تو........پھر کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کی لڑکی تو نہیں ہو گی۔''
''کیا وہ تمہیں پسند آ گئی ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''پسند سے بھی کچھ زیادہ۔ لیکن میرا مطلب ہے، وہ معاملہ نہیں جو ریشم کے ساتھ تھا۔ یقین کرو، میں اپنے وعدے پر پابند ہوں۔''
''اگر تمہارا شرارت کا موڈ نہیں ہے تو آؤ، کوشش کریں۔''
''آؤ........'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ لڑکی ایک ٹرالر کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ جواء ہو رہا تھا اور وہ بڑی بڑی رقمیں لگا رہی تھی۔ ہم اس کے سامنے کھڑے ہو کر بظاہر کھیل، لیکن دراصل اسے دیکھنے لگے۔ سرخ وسفید گولیاں گھوم رہی تھیں اور کوپن منتقل ہو رہے تھے۔
''اسے کیسے مخاطب کیا جائے؟'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
''سرخ رنگ کی گولی اس کے نمبر پر رُکنی چاہیے۔'' میں نے طالوت کو دیکھا۔
''بال برابر اِدھر اُدھر نہ ہو گی۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''تب پھر آؤ!'' میں کھسک کر لڑکی کی پشت پر پہنچ گیا۔ لڑکی پھر بہت سے کوپن ہار گئی تھی۔
''براہِ کرم، اس بار تین نمبر پر لگایئے۔ جتنی رقم چاہے لگا دیں۔'' میں نے لڑکی کے کان کے قریب سرگوشی کی اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے دونوں ساتھی مجھے اس قدر قریب دیکھ کر کڑی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔
''کیوں........؟'' لڑکی نے پوچھا۔
''آپ جیت جائیں گی۔''
''اور اگر ہار گئی؟''
''اس سے دوگنی رقم پیش کر دوں گا۔'' میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ پھر اس نے تین نمبر پر چار سرخ کوپن رکھ دیئے۔ ہر کوپن دس ہزار روپے کی مالیت کا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والوں نے تھوک نگلے۔ اس بار سب ہی نے بڑی بڑی رقمیں لگائیں اور گولیاں نمبروں پر گردش کرنے لگیں۔ طالوت سرخ گولی پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اور پھر گولی تین نمبر پر کیوں نہ رُکتی۔
لڑکی کی خوشی سے چیخ نکل گئی تھی اور اس کے دونوں ساتھی کوپن سمیٹنے لگے۔
''اس بار کون سا نمبر لگاؤں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''جو دل چاہے لگا دیں۔ جب تک ہم یہاں ہیں، آپ کے علاوہ کوئی نہ جیت سکے گا۔''

تب لڑکی نے بہت سے کوپن ایک اور نمبر پر رکھ دیئے اور اس بار بھی گولی اس کے نمبروں پر رُکی تھی۔

''ونڈر فُل!........مگر یہ سب کیسے ہوتا ہے، مسٹر؟........اب کون سا نمبر لگاؤں؟''

''میں نے کہا نا، جو دل چاہے لگا دیں۔ کس کی مجال ہے جو جیت سکے۔''

''آپ حیرت انگیز ہیں۔'' لڑکی نے کہا اور اس نے پھر ایک نمبر لگا دیا۔ طالوت اپنا کام کر رہا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھیوں کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی کوپن سمیٹ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں کھیلنے والے قلاش ہو گئے۔ لڑکی خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اور پھر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ مشین کے پاس سے ہٹ کر لڑکی نے ہمیں شراب پینے کی دعوت دے ڈالی۔ طالوت پر ابھی اس کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔

''شکریہ........میرے بھائی بھی میرے ساتھ ہیں۔''

''کہاں ہیں؟ انہیں بھی بلائیے۔ میں آپ سے اس کی تکنیک معلوم کروں گی۔ یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں یہاں لاکھوں ہار کر گئی ہوں۔''

''طارق!'' میں نے طالوت کو آواز دی اور وہ قریب آ گیا۔ لڑکی اسے دیکھ کر اُچھل پڑی۔ وہ کبھی طالوت کی شکل دیکھ رہی تھی، کبھی میری۔

''میرے خدا! آپ دونوں میں سر مو فرق نہیں ہے۔ آپ جڑواں ہیں شاید۔''

''ہاں........میرے بھائی مجھ سے صرف بارہ منٹ بڑے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بارہ منٹ........'' لڑکی ہنس پڑی۔ پھر اس نے طالوت سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرا نام پوچھا۔

''طارق بٹا دو کہہ لیجئے۔ اور اگر اس میں دقت ہو تو پھر شارق۔'' میں نے جواب دیا اور وہ ہنس پڑی۔

''آپ بڑے حیرت انگیز ہیں۔ بے حد پُر مذاق۔ آیئے۔''

''آپ کے نام سے محروم رہیں گے؟''

''اوہ، سوری........جیتنے کی خوشی میں دیوانی ہو رہی ہوں۔ میرا نام نرگس رحمانی ہے۔ میرے والد اسٹیل کنگ ہیں۔ شاید آپ داؤد رحمانی کے نام سے واقف ہوں۔''

''بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر، مس رحمانی!'' میں نے کہا اور ہم دونوں اس کے ساتھ میز پر آ بیٹھے۔ اس نے ہماری پسند کے مشروب کا آرڈر دیا۔ اور پھر وہ ہم سے اس کھیل کے بارے میں معلوم کرنے لگی۔

''صرف ستارہ شناسی۔ میرے بھائی بہت بڑے نجومی ہیں۔ تین نمبر کے بعد آپ کا ستارہ بلندی پر آ گیا۔ اس کے بعد ہر نمبر آپ کا تھا۔ ہاں، اگر آپ پہلے تین نمبر نہ لگاتیں تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ ہر نمبر پر ہارتی رہتیں۔''

''ونڈر فل........ونڈر فل!'' وہ تعجب سے بولی، پھر کہنے لگی۔ ''بہر حال، میں آدھی رقم آپ کو پیش کر سکتی ہوں۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ آج میں جیت کر جاؤں گی۔''

''رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آپ کی ہے۔ ہمارے لئے آپ کی دوستی کافی ہے۔ طارق آپ

ہے بے حد متاثر ہیں۔''

''میں بھی بہت تھوڑے سے وقت میں آپ دونوں کو بے حد پسند کرنے لگی ہوں۔ کیا آپ میرے مستقل دوستوں میں شامل ہونا پسند کریں گی؟''

''ہم میں سے ایک۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دونوں آپ کے لئے پریشان کن ہوں گے۔''

''میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ آپ دونوں میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔''

''تب آپ میرے بھائی کی دوست بن جائیں۔''

''آپ دونوں ہی میرے دوست ہیں۔ اس میں ہرج بھی کیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ایک معاہدے کے تحت ہمارے دوست مشترک نہیں ہو سکتے۔''

''تب پھر آپ میرے دوست بن جائیں۔'' اس نے کہا اور میں نے عجیب سی نگاہوں سے طالوت کو دیکھا۔ لیکن طالوت مسکرا رہا تھا۔

''فیصلہ ہو گیا......اب تم کچھ نہ کہو گے۔''

''یہ صرف شارق صاحب کی ضد ہے۔ ورنہ میں آپ دونوں سے متاثر ہوں۔ کل شام کی چائے آپ میرے گھر پر میرے ساتھ پئیں گے۔'' اس نے اپنے خوب صورت پرس سے ایک ننھا سا کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔

''صرف شارق۔ میں اپنی ایک اور دوست سے وعدہ کر چکا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور میں اُلجھی ہوئی نگاہوں سے طالوت کو دیکھنے لگا۔ لیکن طالوت کی پیشانی بے شکن تھی۔ ہم کافی دیر تک نرگس سے گفتگو کرتے رہے۔ مائیک پر رقص شروع ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

''کیا آپ رقص نہیں دیکھیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں......اس کی اجازت نہیں ہے۔ بس اب میں واپس جاؤں گی۔ کل پانچ بجے آپ کا انتظار کروں گی۔''

''اوکے!'' میں نے کہا اور وہ اُٹھ گئی۔ میں طالوت کے ساتھ اُٹھ کر رقص کے ہال میں واپس آ گیا۔

''یہ کیا حماقت تھی؟'' میں نے طالوت سے کہا۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''اگر وہ ہم دونوں کی دوست بن جاتی تو کیا حرج تھا؟''

''اس نے تمہیں پسند کیا تھا۔''

''بس......کل میں نہیں جاؤں گا۔ اور اس سے کوئی دوستی نہیں رکھوں گا۔''

''میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو چھوڑنا حماقت ہے۔ میں اس پر عاشق نہیں ہوں۔ تم معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔'' طالوت نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''مگر میرے دوست! تم بھی تو اسے پسند کرتے ہو؟''

''تمہارا دماغ خراب ہے...... ہاں، میرے لئے کوئی اور محبوبہ تلاش کرو۔ یہ تمہارا فرض ہے۔

بہر حال وہ تمہاری ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر رقص شروع ہو گیا اور طالوت پوری دلچسپی سے ناچنے والی رقاصاؤں کو دیکھنے لگا۔

''یہ کون سا رقص ہے؟'' تھوڑی دیر کے بعد طالوت نے پوچھا۔

''دولت کا رقص۔'' دولت کی قوت کا اعتراف۔ جو انسان کو برہنہ کر دیتی ہے۔ چند کاغذ کے نوٹوں کے عوض نسوانیت ننگی ہو جاتی ہے۔ شرافت کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ یا پھر یہ جنسی بھوکوں کے مذاق کا رقص ہے۔ وہ صرف برہنگی دیکھنے آتے ہیں اور رقاصائیں ان کے آگے ہڈی ڈال کر چلی جاتی ہیں۔ ان چکروں میں نہ پڑو، طالوت!'' میں نے کہا۔

''اور تم بھی بات بات پر ناصح نہ بن جاؤ۔ دیکھو........ یہ بھی خوب صورت ہے۔'' اس نے اسٹیج پر تھرکنے والی رقاصہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ عورت نہیں ہے۔ اگر تم اسے عورت سمجھنے پر تیار ہو، جو شراب کی ایک بوتل پر تمہارے پر ٹوٹ پڑی تھی تو ٹھیک ہے۔ یہ تو تمہارے لئے بہت سہل الحصول ہے۔''

''ارے باپ رے........ نہیں بھائی! یہ نہیں چاہئے۔ کچھ اور تلاش کر لوں گا۔'' طالوت نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کے بعد ہم خاموشی سے ہیجان خیز رقص دیکھتے رہے۔ طالوت کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی رات گئے رقص ختم ہوا اور تماشائی اُٹھنے لگے۔ تب ایک بڑی بڑی مونچھوں اور خطرناک چہرے والا آدمی میرے قریب پہنچ گیا۔

''مسٹر حیات!'' اس نے گردن قدرے خم کر کے ہماری طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''یہ آپ کے لئے ہے........؟'' اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔

''شاید نشے میں تھا۔'' طالوت نے کہا۔ اور پھر میرے بازو کو پکڑے آگے بڑھ گیا۔ نہ جانے کس خیال سے میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے حسب معمول کار اسٹارٹ کی اور ہم گولڈ اسٹار کے کمپاؤنڈ سے نکل آئے۔

''اب تو اپنی رہائش گاہ پر ہی چلیں گے؟'' طالوت نے کہا۔

''لیکن........''

''راسم........!'' طالوت نے میرا جملہ پورا ہونے سے قبل آواز دی۔

''خادم حاضر ہے، آقا!'' راسم کی آواز کار کی پچھلی نشست سے سنائی دی۔

''راہنمائی کرو۔''

''ہم ٹھیک چل رہے ہیں۔ میں نے وہ کوٹھی، سر ناصر حیات کے نام سے حاصل کر لی ہے۔''

''حیات........؟'' میں چونک پڑا۔ اس مونچھوں والے نے مجھے حیات کے نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ لیکن وہ کون تھا؟........ میں نے جیب میں لفافہ ٹٹولا۔ لفافہ موجود تھا۔ بہر حال میں نے کچھ نہ کہا اور کار ڈرائیو کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک خوب صورت کوٹھی میں داخل ہو گئے۔

''کوٹھی کا معائنہ صبح کریں گے۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر راسم کی طرف مڑ

ر بولا۔ ’’خواب گاہ کس طرف ہے؟‘‘
’’سامنے ہی موجود ہے آقا!‘‘ راسم نے جواب دیا اور طالوت اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ ہوٹل کی بات اور تھی، لیکن یہاں ہمارے لئے دو الگ الگ خواب گاہیں موجود تھیں۔ اس وقت طالوت نیند کے لئے میں چُور تھا۔ اس لئے اس سے کوئی بات کرنا فضول تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ یہاں آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ میں جانتا تھا کہ راسم کے لئے یہ سب مشکل نہیں تھا۔ اُس نے پلک جھپکنے میں یہ سب کچھ کرلیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ اس دنیا کا انسان نہیں تھا۔

میں نے ایک الماری سے ایک خوب صورت سلیپنگ سوٹ نکالا، جو بالکل میرے ناپ کا تھا۔ اسے پہن کر میں مسہری پر دراز ہو گیا۔ بہت عجیب دن گزرا تھا، آج کا۔ بے شمار واقعات سے پُر۔ اتنے واقعات کسی ایک دن میں کسی کو پیش نہ آئے ہوں گے۔ میں صبح سے اب تک کے واقعات پر نگاہیں دوڑاتا رہا اور پھر میری نگاہوں میں گہرے نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک سفید چہرہ آ گیا۔ نرگس۔ بلاشبہ وہ حسین تھی۔ انتہائی خوب صورت، ماڈرن۔ میری پچھلی زندگی میں تو اس جیسی لڑکیوں کا تصور ایک خواب تھا۔ میں ان کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی میں نرگس کا حصول مشکل نہیں تھا۔ اُس کا باپ اسٹیل کنگ کہلاتا تھا لیکن میں اگر چاہتا تو طالوت میرے لئے دولت کے انبار لگا دیتا اور میں اس جیسے کئی اسٹیل کنگز کو خرید سکتا تھا۔ ایسی صورت میں نرگس آسانی سے میرے قبضے میں آ سکتی تھی۔ لیکن اس میں صرف ایک قباحت تھی، نرگس سے شادی کر کے میں گھریلو زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ طالوت میرا دوست تھا۔ ہم دونوں نے دنیا دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے بہرحال طالوت کا ساتھ دینا تھا۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے میری زندگی بنی تھی۔ اس کے علاوہ ہم ایک معاہدہ بھی کر چکے تھے کہ کسی لڑکی کے مستقل چکر میں نہیں پڑیں گے۔ یہ تو وعدہ خلافی ہو گی۔ نہیں، نرگس کے ساتھ گھریلو زندگی ممکن نہیں ہو گی۔ ہاں، طالوت کی اجازت سے میں اس سے عشق کر سکتا تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر کر سکتا تھا۔ طالوت اس کے لئے مجھے ہر آسانی مہیا کر دیتا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ مجھے اپنا ذہن بدلنا ہو گا۔ اب عام انسانوں کی سی زندگی گزارنا میرے لئے ناممکن ہے۔ بہرحال! نرگس سے جب تک دوستی چل سکے، مجھے طالوت کے ایثار کا خیال آیا۔ اُس نے خوش دلی سے نرگس کو میرے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا بندوبست ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بندوبست مجھے ہی کرنا ہے۔

’’اچھا بیٹا طالوت! تم بھی کیا یاد کرو گے۔‘‘ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ ایک عمدہ ترکیب میرے ذہن میں آ گئی تھی۔ نرگس میری بیوی نہیں تھی، نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی پروگرام تھا۔ اس لئے وہ ہم دونوں کی مشترکہ محبوبہ ہو گی۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ طالوت بھی جب اس سے ملے گا تو میری حیثیت سے ملے گا۔ میں اسے اس کے لئے مجبور کر دوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔ تب میں نے سونے کے لئے کروٹ بدلی۔ اور کروٹ بدلتے ہی میرے ذہن میں وہ لفافہ گھس آیا، جسے میں تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ گیا۔ اپنے کوٹ کی جیب سے میں نے لفافہ نکال لیا اور اسے چاک کرنے پر ایک پرچہ برآمد ہوا۔ پرچے پر صرف چند الفاظ لکھے تھے۔

''مسٹر حیات! کل رات کو آٹھ بجے ہمارے فون کا انتظار کریں۔ ہمیں آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ (ایکس۔ وائی۔ زیڈ)''

''کیا بات ہوئی؟'' میں نے سوچا۔ کون ہے؟...... کیا چاہتا ہے؟...... ویسے حیات کہہ کر مخاطب کرنا حماقت تھی۔ شاید انہوں نے اس کوٹھی کے باہر لگی نیم پلیٹ سے ہمارے نام کا تعین کیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ صورت سے اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آخر کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟...... لفافہ بند کر کے رکھنے کے بعد میں پھر مسہری پر آ گیا۔ میرے ذہن میں خلجان تھا اور نہ جانے کب تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر نیند نے مجھے اس خلجان سے نجات دلا دی۔

دوسری صبح بڑی پُرسکون تھی۔ میں نے اپنے کمرے کے ملحقہ باتھ رُوم میں غسل کیا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ طالوت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی۔

''ارے آ جاؤ نا، میری جان! یہاں میری خلوت میں کون ہے جو تم اجازت لے رہے ہو؟'' طالوت کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی اور میں ایک گہری سانس لے کر اندر داخل ہو گیا۔ طالوت ایک خوب صورت سلیپنگ گاؤن میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کا چہرہ نکھرا نکھرا تھا۔ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

''کہو...... رات کیسی گزری؟''

''کافی دیر تک پریشان کُن۔ اس کے بعد پُرسکون۔'' میں نے جواب دیا۔

''خوب...... خوب! جلدی سے وضاحت کرو۔ اور ہاں، چائے منگواؤں؟''

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا اور طالوت نے ایک طرف لگا ہوا سوئچ دبا دیا۔

''ایک بات بتاؤ، یہاں ملازم وغیرہ مقامی ہیں یا سب تمہارے غلام؟''

''سب تمہارے ہی غلام ہیں میری جان! فکر مت کرو۔ ہاں، انہیں یہاں کے اصول سکھانے پڑیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا اور پھر ایک آدمی کے اندر آنے پر اس نے چائے کے لئے کہہ دیا۔

''میں منتظر ہوں۔''

''اسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''ضرور سوچ رہے ہو گے۔ کافی خوب صورت تھی۔''

''اس کی خوب صورتی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا، بلکہ صرف یہ خیال تھا کہ وہ تمہیں بھی پسند ہے۔''

''میرا خیال ہے، اس بات پر جھگڑا ہو جائے گا۔'' طالوت نے منہ پھُلا کر کہا۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ہی اب میں کسی پر عاشق ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تمہیں بھی کسی پر عاشق نہیں ہونے دوں گا۔ بس تفریح کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔''

''تم نے میرے مطمئن ہونے کی وجہ نہیں پوچھی۔'' میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

''وہ بھی بتا دو۔''

''دیکھو دوست! اگر وہ لڑکی تفریح پسند نکلی اور عشق و محبت کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوئی تو پھر وہ ہم دونوں کی ملکیت ہو گی۔ یعنی کبھی تم شارق ہو گے اور کبھی میں۔''

''نہیں ہو سکتا...... ہرگز نہیں ہو سکتا۔'' طالوت نے ہتھیلی پر گھونسہ مار کر کہا۔

''آخر کیوں؟........ہم دونوں سمجھوتہ کر چکے ہیں۔'' میں نے بھی زوردار آواز میں کہا۔

''بہر حال، دیکھا جائے گا۔'' طالوت نے دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر کہا۔ اور پھر ملازم چائے لے کر اندر آ گیا۔ اس نے سلیقے سے چائے کی ٹرالی ہمارے سامنے کر دی اور میں آگے بڑھ کر چائے بنانے لگا۔ اسی وقت مجھے لفافہ یاد آ گیا اور میں نے اس کے بارے میں طالوت کو بتایا۔

''اوہ........!'' طالوت نے ہونٹ سکوڑ لئے۔ ''کون ہو سکتا ہے؟''

''میں بھی نہیں سمجھ سکا۔''

''خیر....آٹھ بجنے میں ابھی پورے بارہ گھنٹے باقی ہیں۔ ابھی سے ذہن کو اُلجھانے سے کیا فائدہ؟'' طالوت نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا کر چسکیاں لیتے ہوئے کہا اور میں بھی چائے پینے لگا۔ چائے پیتے پیتے طالوت مسکرا کر بولا۔

''ویسے تفریح کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ خاص طور سے یہ لفافہ........اور اس کی تحریر نہ جانے کیوں مجھے بڑی دلچسپ محسوس ہو رہی ہے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ آج کا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس........تیار ہو کر نکلیں گے۔ سیر و تفریح کریں گے۔ ویسے میں کل کے سے دن کا کوئی تجربہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔'' طالوت نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے ناشتہ کیا اور پھر یہ عمارت دیکھنے نکل آئے۔ میرے لئے یہ خوابوں کی عمارت تھی۔ میں نے کبھی ایسے مکان میں رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور اب اس خیال سے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی کہ یہ میری ملکیت ہے۔ میں اس میں مالکوں کی طرح رہ سکتا ہوں۔ لیکن...... بہر حال اب تو سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نرگس سے عشق کرنے کے قابل بھی تو نہیں تھا!......عمارت ہمیں بہت پسند آئی۔ اسے دیکھنے کے بعد ہم پھر واپس آ گئے اور پھر ایک کمرے میں بیٹھ کر پروگرام طے کرنے لگے۔ طے یہ ہوا کہ بازار کی سیر کریں گے، دوپہر کا کھانا گھر واپس آ کر کھائیں گے، اس کے بعد آرام کریں گے، پھر پانچ بجے نرگس کے یہاں چائے پی جائے گی۔

اس پروگرام پر اسی طرح عمل ہوا۔ بازار سے ہم نے کچھ اُلٹی سیدھی چیزیں خریدیں۔ طالوت نے حسب عادت چند لوگوں سے مذاق کیا، لیکن آج کا کوئی بھی مذاق کسی سنگین نوعیت کا حامل نہیں تھا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔ کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ میں اس شاندار زندگی پر طالوت کا ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے مجھ جیسے انسان کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

شام کو تقریباً ساڑھے چار بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے جلدی سے گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر باتھ روم میں جا گھسا۔ غسل کرنے کے بعد میں نے ایک خوب صورت سوٹ پہنا اور تیار ہو گیا۔ تب میں نے باہر نکل کر طالوت کو آواز دی۔ لیکن طالوت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک نوکر اندر کی صفائی کر رہا تھا۔

''صاحب کسی کام سے چلے گئے ہیں۔ یہ پرچہ آپ کے لئے دے گئے ہیں۔'' اس نے کہا اور میں چونک پڑا۔ میں نے جلدی سے پرچہ لے کر کھولا۔

''تمہاری ضد کی وجہ سے گھبرا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ جاؤ، اسے

ٹٹولو۔ اگر دونوں کے کام کی ہو تب بھی ٹھیک ہے اور اگر تنہا تمہارے لئے ہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ میں بھی رات کسی نہ کسی کو تلاش کرلوں گا۔"

میں دل ہی دل میں دانت پیس کر رہ گیا۔ بہت بدمعاش تھا۔ صبح سے اس قسم کی بات نہیں کی تھی۔ بہرحال، وقت کم رہ گیا تھا، اس لئے میں باہر نکل آیا۔ طالوت کے بغیر کہیں جاتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ پانچ بجنے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی، میں نے باہر آکر کار کا دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور کار چکنی سڑک پر پھسلنے لگی۔

تنہائی ملی تو اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ملا۔ ہاں، یہ میں ہی تھا...... عارف جمال...... جو ایک معمولی کلرک تھا اور جس نے پوری زندگی بس میں لٹک کر سفر کیا تھا۔ چمچماتی کاروں کو دیکھ کر جس نے کبھی حسرت سے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسی ہی ایک کار میرے پاس بھی ہو۔ میں بھی ایک خوب صورت کوٹھی کا مالک ہو جاؤں...... میں جانتا تھا کہ یہ حسرت حماقت ہے۔ یہ طلب بے وقوفی ہے۔ ساڑھے تین سو روپے پانے والے کلرک کی زندگی میں یہ چیزیں کبھی نہیں آسکتیں۔ لیکن...... آج سب کچھ موجود تھا۔ اور بعض اوقات میرے اوپر غیر یقینی کیفیت طاری ہو جاتی تھی!

نرگس کے بتائے ہوئے پتے کو تلاش کرتا میں داؤد رحمانی کی عالیشان کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ ایک مہذب چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا اور میں کار پورٹیکو میں لے گیا۔ صدر گیٹ میں نرگس دو لڑکیوں اور ایک درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ میرے استقبال کے لئے موجود تھی۔ میں کار سے اُتر گیا اور نرگس چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگی۔ میں مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھ گیا۔

"اوہ...... میں نہیں جانتی، آپ طارق صاحب ہیں یا شارق صاحب۔ بہرحال، دونوں میں سے کوئی بھی ہوں آپ۔ دوسرے صاحب کہاں ہیں؟"

"میں شارق ہوں، نرگس صاحبہ!...... بھائی جان کو کچھ کام تھا۔ انہوں نے معذرت کی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تاثل ہے۔ میں نے اپنی ان دونوں سہیلیوں کو خاص طور سے آپ دونوں سے ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ میری بات پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ دونوں میں ایسا فرق ضرور ہوگا، جس سے آپ میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔" نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ پھر کبھی سہی۔" میں نے مسکراتے ہوئے معذرت کی۔

"تشریف لایئے۔ ویسے آپ ان لوگوں کو بتایئے کہ کیا آپ دونوں میں کوئی نمایاں فرق ہے؟"

"آواز تک میں نہیں۔ کوئی نمایاں یا غیر نمایاں فرق نہیں ہے۔ آپ امتیاز نہیں کرسکتیں۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھتے، تب بتاتے۔" ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شارق صاحب! یہ میری آنٹی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے پرورش کیا ہے۔ میری ماں بچپن میں نتقال کر گئی تھیں۔ یہ میری دونوں سہیلیاں عظمٰی اور صفیہ ہیں۔ بے حد شریر...... ڈیڈی آج صبح جرمنی چلے گئے۔ پھر کسی دن آپ کو ان سے ملواؤں گی۔"

میں نے بوڑھی عورت کو آداب کیا۔ وہ شاید ملازمہ تھی، لیکن اسے احتراماً آنٹی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ

ہم تینوں کو ایک خوب صورت ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، شارق صاحب! آپ نے اس منہ زور گھوڑے، بلکہ گھوڑی کو کیسے رام کر لیا؟ یہ تو کسی سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جس طرح اس نے آپ کے گُن گائے ہیں، ہمیں بڑی تشویش ہوگئی ہے۔'' صفیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کہہ چکی ہوں، شارق صاحب! شیطان سے براہِ راست ان کی عزیزداری ہوتی ہے۔ اس لئے آپ انہیں نسلِ شیطانی سمجھ کر معاف کر دیں۔'' نرگس جلدی سے بولی۔

''یہ اپنا راز کُھل جانے سے پریشان ہے، اس لئے باتیں بنا رہی ہے۔ لیکن بہرحال ہمیں اس کے مستقبل کا خیال ہے۔ اس لئے ہم معلومات ضرور کریں گے۔'' عظمیٰ نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا۔

''ارے مستقبل کی خالاؤ...... کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو؟ تمیز سے گفتگو کرو۔'' نرگس نے جھلا کر کہا۔

''کیوں شارق صاحب!...... آپ کو یہ گفتگو پسند نہیں ہے؟'' صفیہ نے پوچھا۔

''کیوں نہیں...... میں نے پوری زندگی ایسی محفلوں سے دُور گزاری ہے۔ یہ ماحول میرے لئے بہت پُرکشش ہے۔''

''آپ کے گھر میں دوسرے لوگ نہیں ہیں؟'' نرگس نے پوچھا۔

''بس، طارق بھائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''اوہ......!'' نرگس نے ہمدردی سے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جانتی ہو، طارق صاحب ان سے کتنے بڑے ہیں؟''

''ابھی تو ہم کچھ نہیں جانتے۔'' عظمیٰ یہاں بھی چوٹ کرنے سے باز نہ آئی۔

''صرف بارہ منٹ۔''

''ماشاء اللہ!...... ماشاء اللہ! پھر تو وہ بوڑھے ہوں گے۔'' صفیہ نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ بڑی شریر لڑکیاں تھیں۔ بڑا دلچسپ ماحول تھا۔ کاش یہ ماحول میرا اپنا ہو جاتا۔ لیکن اب یہ سب کچھ سوچنا فضول تھا۔

کافی دیر تک یونہی چونچیں چلتی رہیں۔ پھر ایک ملازمہ نے آ کر چائے لگ جانے کی اطلاع دی اور ہم چاروں اُٹھ گئے۔ چائے انتہائی پُرتکلف تھی۔ چائے کی میز پر ہی کل رات کے واقعے پر گفتگو چل نکلی۔

''میں اس پُراسرار واقعے پر ابھی تک حیرت زدہ ہوں۔ اس طرح تو آپ بہت سے جوئے خانوں کو قلاش کر سکتے ہیں۔'' نرگس نے پھر کہا۔

''لیکن ان کی خوش قسمتی سے ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی دولت ہے کہ مزید کی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور میری اس بات سے تینوں لڑکیاں کافی مرعوب ہوگئیں۔ پھر صفیہ نے مجھ سے میری رہائش گاہ کے بارے میں پوچھا اور میں نے اسے اپنی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔

''اگر ہم کبھی حاضر ہوں تو ناگوار تو نہ ہوگا؟'' صفیہ نے پوچھا۔

''میری خوش قسمتی ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تب ٹھیک ہے۔ بچی کے لئے آنا ہی ہوگا۔ آخراس کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔'' عظمٰی نے پھر اسی انداز میں کہا۔

''عظمٰی! بدتمیزی کی حدود میں داخل نہ ہو۔'' نرگس نے سرزنش کی۔ میں خاموش تھا۔ لیکن میرے دل میں عجیب سے خیالات بیدار ہونے لگے۔ کاش یہ سب کچھ اسی انداز میں ہوسکتا۔ کاش! یہ حقیقی زندگی ہوتی۔ اس سے مجھے اپنی فطرت کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ لوگوں کی نادانیوں نے مجھے غلط راستوں پر ضرور ڈال دیا تھا، لیکن فطرتاً میں گھریلو ماحول کا آدمی تھا۔ مجھے ایک پُرسکون اور ٹھہری ہوئی زندگی پسند تھی۔ نرگس کی آنکھوں میں ایک حیا آلود پیغام تھا۔ وہ ماڈرن سوسائٹی کی ایک فرد ضرور تھی، لیکن کردار خراب نہیں تھا۔ وہ نائٹ کلب میں جوا کھیل سکتی تھی کیونکہ اس کی اونچی سوسائٹی میں یہ معیوب نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس میں عورت چھپی ہوئی تھی!

اور میری عجیب کیفیت تھی۔ یہ عورت مجھے پسند تھی۔ لیکن....... میرے لئے بیکار....... میں تو اب کسی عورت کو نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ تفریح کی دلدادہ کوئی فیشن ایبل لڑکی ہوتی تو ٹھیک تھی۔ اس کے عورت پن سے مجھے کیا لینا تھا....... میرے دل میں متضاد خیالات بیدار ہو رہے تھے۔

کافی دیر تک اسی طرح ہنسی مذاق ہوتا رہا، پھر میں نے واپسی کی اجازت طلب کی۔

''کب ملاقات ہوگی، مسٹر شارق؟''

''اگر آپ میرے مکان کو عزت بخشیں تو خوش نصیبی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ضرور بخشیں گی۔ میری پیش گوئی نوٹ کرلیں۔ ضرور عزت بخشیں گی۔ ان کے تیوروں سے معلوم ہوتا ہے۔'' صفیہ نے کہا اور نرگس نے اُس کی پیٹھ پر دھول جمادی۔

''تب پھر کل کی چائے آپ کے ساتھ۔'' نرگس نے کہا۔

''ضرور.......!'' میں نے جواب دیا اور باہر نکل آیا۔ لڑکیاں میرے ساتھ باہر تک آئیں اور میں اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔ ذہن پر ایک سرور سا طاری تھا۔ اندھیرے، اُجالے۔ نرگس بہت خوب صورت تھی۔ بے شک وہ مجھے پسند آئی تھی۔ اس کا حصول بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن میں اب بیوی پالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

کار سڑک پر دوڑ رہی تھی اور میرے ذہن میں بے شمار خیالات تھے۔ تب اچانک میرے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

''کیا سوچ رہے ہو، مادھو لال؟''

اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ بہک گئے اور میں نے جلدی سے بریک لگا دیئے۔ پھر پلٹ کر دیکھا۔ طالوت پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

''یہ کیا حرکت تھی؟'' میں نے منہ بنا کر پوچھا۔

''معافی چاہتا ہوں....... میں صرف اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔''

''تو تم وہاں موجود تھے؟''

''کیوں نہیں....... ویسے اپنے حصے کی ہر چیز کھا چکا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہیں بھی میرے کھانے پینے کی چیزیں غائب ہونے کا احساس نہیں ہوا۔''

''بہت بڑے بدمعاش ہوتم۔''
''اس دنیا میں آپ ہی پیر ومرشد ہیں، سرکار!........ میں کس قابل ہوں؟ ویسے لونڈیا نے گھائل کر دیا۔''
''تمہیں........؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''اجی ہم کس گنتی میں ہیں؟........ حضور کی بات کر رہا ہوں۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''چھوڑو ان باتوں کو۔ اس قسم کی لڑکیوں سے اب ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔''
''کیوں؟''
''ارے کیا مجھے اس سے شادی کر کے موت بلانی ہے؟ بس اب تو ایسی لڑکیاں چاہئیں جن کے ساتھ تفریح کی جائے۔''
''ہاں........ یہ تو درست ہے۔ بہر حال کل اس بے چاری کو چائے تو ضرور پلا دینا۔ میں خود بھی تمہیں اس سے عشق کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ عشق وغیرہ کو تو ہم اپنی لغت سے خارج کر چکے ہیں۔''
''ہاں........!'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور پھر گھڑی دیکھنے لگا۔ پونے آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے لفافے کا خیال آ گیا اور میں نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ آٹھ بجے کا وقت دیا گیا تھا، فون کے لئے۔ اور پھر جس وقت ہم دونوں اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ طالوت بھی میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔
''ہیلو!'' میں نے کہا۔
''مسٹر حیات سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''
''فرمائیے'' میں نے کہا۔
''آپ کو لفافہ مل گیا تھا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
''ہاں۔''
''ہم نے آپ کا نام حیات صرف اس لئے تصور کر لیا ہے کہ آپ کی کوٹھی پر نیم پلیٹ اسی نام کی ہے۔ بہر حال، آپ کا نام کچھ بھی ہو، ہم آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ براہِ کرم کیا آپ اس کا موقع دیں گے؟''
''کیا بات ہے، کہو؟''
''فون پر مشکل ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی تکلیف کریں۔ بہر حال جو گفتگو ہم آپ سے کریں گے، وہ آپ کے لئے فائدہ مند ہے۔ اگر آپ اسے اپنے حق میں تصور کریں تو ٹھیک ہے، ورنہ آپ کی مرضی ہو گی۔'' میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور اس نے گردن ہلا دی۔ تب میں نے کہا۔
''مجھے کہاں ملاقات کرنا ہو گی؟''
''ربر اسکوائر کے بنگلہ نمبر ایک سو بارہ میں۔ ہم آپ کے منتظر ہیں۔''
''میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''بہت بہت شکریہ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور فون بند ہو گیا۔ تب میں نے ایک گہری سانس لی اور طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔

''معاملہ دلچسپ ہی ہے۔ چلو چلیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن طالوت نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے راسم کی جھلک دیکھی۔ طالوت کا یہ غلام صرف طالوت کے کہنے سے ہی نمودار ہوتا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے خود بخود آتے دیکھا تھا۔ طالوت بھی چونک پڑا۔

''کیا بات ہے، راسم؟''

''آقا! تنہائی دے سکیں گے؟'' راسم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور طالوت حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

''تم کار میں چلو عارف! میں ابھی آتا ہوں۔'' اور میں حیران سا آگے بڑھ گیا۔ نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ کار میں بیٹھا میں طالوت کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کئی منٹ تک وہ واپس نہیں آیا۔ پھر مجھے کان کے قریب سرگوشی سنائی دی۔

''تم چلو عارف! میں تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔''

''مگر بات کیا ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''فرصت سے بتاؤں گا۔ تم چلو۔'' طالوت نے کہا اور میں تعجب سے گردن ہلانے لگا۔ نہ جانے طالوت سرگوشی میں کیوں بول رہا تھا۔

''تم وہاں پہنچ جاؤ گے؟ کوئی دقت تو نہیں ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔ لیکن مجھے طالوت کی آواز سنائی نہیں دی۔ ''طالوت!'' میں نے پھر اسے آواز دی، لیکن جواب نہ ملا۔ تب میں نے ایک گہری سانس لی۔ نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ کہاں چلا گیا تھا وہ۔ راسم نے اسے کیا اطلاع دی تھی۔

اب تو تفصیل اس کی واپسی پر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔ میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میرے ذہن میں پھر لفافہ آ گھسا۔ فون پر ہونے والی گفتگو بھی پُراسرار تھی۔ وہ لوگ کون تھے؟ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے اس قدر پُراسرار انداز کیوں اختیار کیا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں گردن جھٹک دی۔ جو ہوگا، سامنے آ جائے گا۔ فکرمند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ فون پر دیئے ہوئے پتے کے مطابق میں ربر اسکوائر کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں زیادہ تر ایک منزلہ خوش نما بنگلے تھے۔

بنگلہ نمبر ایک سو بارہ کو تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ پیتل کی پلیٹ پر ایک سو بارہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے کار بنگلے کی طرف موڑ دی۔ گیٹ پر دو قوی ہیکل چوکیدار کھڑے تھے۔ انہوں نے گیٹ کھول کر مجھے سلام کیا اور میں کار لے کر اندر داخل ہو گیا۔ ایک خوب صورت پورٹیکو میں، میں نے کار روکی۔ وہاں دو کاریں اور کھڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے ایک بات پر حیرت ہوئی۔ دونوں میں سے کسی کار پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ چھوٹے قد کے ایک خوش شکل ادھیڑ عمر آدمی نے میرا استقبال کیا۔

''مسٹر حیات......؟'' اس نے گردن جھکائے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''کہہ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے میرا نام شارق ہے۔''

''تشریف لایئے۔'' اس نے ادب سے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک سادہ سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ''تشریف رکھئے۔'' اس نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ پستہ قد آدمی باہر نکل گیا اور میں نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ قابلِ ذکر کوئی بات نہیں تھی۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ

سنائی دی اور میری نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں۔ خوب صورت پردہ سرکا اور ایک بھاری جسامت کا آدمی اندر داخل ہو گیا۔ اس کے عقب میں تقریباً پینتیس سال کی عمر کی ایک عورت تھی، جس کے خدخال تو حسین تھے لیکن ان میں بے پناہ بے با کی تھی۔ آنکھیں بادام کی طرح اور پتلیاں بھوری تھیں۔ ہونٹوں کا اُبھار بے حد دلکش تھا۔ اس نے فیروزی رنگ کی چست پتلون اور عنابی شرٹ پہنا ہوا تھا۔ بھاری جسامت کے آدمی کی آنکھیں بہت چھوٹی اور ایک لکیر کے مانند تھیں۔ سر گنجا تھا، جسمانی اعضاء سے سستی کا اظہار ہوتا تھا۔ رنگ بہت صاف تھا اور بادی النظر میں وہ مغربی باشندہ معلوم ہوتا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ آواز وہ نہیں تھی، جو میں نے فون پر سنی تھی۔

''ہیلو!'' میں نے اخلاقاً کہا۔ وہ دونوں بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''سب سے پہلے تو آپ اپنا صحیح نام بتائیے۔''

''میرا نام شارق ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''مسٹر حیات کون ہیں؟''

''میرے چچا تھے۔ انتقال کر گئے۔'' میں نے برجستہ جھوٹ بولا۔

''خوب.......آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی، مسٹر شارق! مجھے آپ شیکر کہہ سکتے ہیں۔ یہ فلمینا ہے۔ ہم دونوں مقامی عیسائی ہیں۔''

میں نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''سب سے پہلے میں آپ کی مالی حالت جاننا چاہتا ہوں، مسٹر شارق!'' شیکر نے کہا۔

''اپنے بارے میں کچھ بتانے سے قبل میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''قدرتی بات ہے۔'' شیکر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر فلمینا سے بولا۔ ''فلمینا! کیا تم مہمان کی تواضع نہیں کرو گی؟''

''سوری.......!'' عورت نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ ایک الماری کی طرف بڑھ گئی۔ الماری سے اس نے اعلیٰ درجے کی شراب اور تین گلاس نکالے اور پھر اس نے گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ایک خوب صورت ٹرے میں رکھ کر ہمارے سامنے آگئی۔

''شکریہ.......میں نہیں پیتا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.......مسٹر شارق! شاید آپ نے اس دوستانہ ماحول کو پسند نہیں کیا ہے۔ ہم آپ کے دوست ہیں، مسٹر شارق! آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔'' شیکر نے کہا۔

''درست ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں نہیں پیتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تعجب ہے۔ گولڈ اسٹار میں نظر آنے والے شراب نہ پیتے ہوں۔ بہرحال، آپ کیا پینا پسند کریں گے؟''

''مسٹر شیکر!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ دونوں کے نام معلوم ہو گئے ہیں، ان کا شکریہ۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس طرح میرے ذہن میں جو خلش ہو گی، اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اور جب تک یہ خلش رفع نہ ہو، میں آپ کی دعوت کیسے قبول کر سکتا

ہوں؟''

شیکر نے اپنا گلاس اٹھالیا۔ اس میں سے دو تین چسکیاں لینے کے بعد اس نے ہونٹ صاف کئے اور پھر بولا۔ ''داؤد رحمانی کی لڑکی نرگس رحمانی کے بارے میں آپ سے کچھ گفتگو کرنی ہے۔''

''اوہ.......!'' میں نے چونک کر کہا۔ ''مثلاً؟''

''مکمل تعارف یوں ہے مسٹر شارق! کہ ہمیں اس لڑکی کی ضرورت ہے۔ دراصل ہمارا یہی کام ہے۔ اس پورے ملک میں ہمارے اسٹیشن ہیں۔ ہم معزز لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔ ہمارے پاس غیر ممالک سے بھی آرڈر آتے رہتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق ہم معقول قیمت پر لڑکیاں باہر بھی بھیج دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی ہمارا کافی کاروبار ہے۔ اپنے طور پر ہم کبھی کبھی ایسی لڑکیوں کو حاصل کرتے ہیں، جن کی بھرپور قیمت مل جائے۔ انہی میں نرگس رحمانی ہے۔ داؤد رحمانی اسٹیل کنگ کہلاتا ہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ اگر وہ اپنی دولت کا ایک حصہ ہمیں دے دے تو اس پر کیا آفت آ جائے گی۔ مثلاً دس کروڑ اس کے لئے بہت بڑی رقم نہیں ہے۔ اس کا پچیس فیصد حصہ تمہیں مل جائے گا۔ میرے خیال میں اس کے بعد تمہیں پوری زندگی دولت کے حصول کے لئے جدوجہد نہیں کرنی ہوگی۔''

میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں خطرناک مجرموں کے نرغے میں آ گھسا ہوں۔ چند لمحات کے لئے میرا ذہن تاریک ہو گیا۔ لیکن پھر مجھے طالوت کا خیال آیا اور میں سنبھل گیا۔ میرے پاس ایک ایسی قوت تھی، جو ان لوگوں پر بھاری تھی۔ چنانچہ مجھے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

''گویا تم بردہ فروش ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''پرانا اور گھٹیا نام ہے۔ تم ہمیں انٹرنیشنل ٹریڈرز کہہ سکتے ہو۔ بردہ فروشی تو ایک محدود اندازہ ہے۔ ہم اسمگلنگ کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے دولت حاصل ہو سکے۔ بہت سے ممالک میں ہمارے نمائندے ہیں، بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ہم نے انہیں اور بڑا کر دیا ہے۔ مجال ہے کسی کی جو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ جائے۔ عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔ ممکن ہے تم بھی اچھی مالی حیثیت رکھتے ہو۔ لیکن دس بیس لاکھ سے زیادہ نہیں۔ اور یہاں پہلے ہی کام کے لئے تمہیں ڈھائی کروڑ مل رہے ہیں۔ بولو، کیا تم انہیں ٹھکرا دو گے؟'' شیکر نے سوال کیا۔

''اگر میں ٹھکرا دوں تو آپ کا کیا رویہ ہوگا، مسٹر شیکر؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ایک بزرگ کی حیثیت سے تمہیں سمجھاؤں گا۔ اس دنیا کے بارے میں بتاؤں گا، جہاں صرف دولت سے عزت ہے۔ جتنی دولت ہو گی، اتنی ہی عزت ہو گی۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔'' شیکر نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

''لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟ نرگس رحمانی سے میرا کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔

''تعلق کا ہمیں علم ہے۔ اس کا کئی روز سے تعاقب کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باڈی گارڈز کافی چوکس ہیں۔ کل وہ تم سے بہت متاثر معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ پبلک مقامات پر وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ اس کے متاثر ہونے کا اندازہ اس سے لگا کہ آج تم اس کے ہاں چائے پر مدعو تھے۔

''خوب...... خاصی معلومات ہیں تمہاری بہرحال، میری اس سے دوسری ملاقات تھی۔ ایسی شکل میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''معمولی سا کام ہے۔ اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس لو۔ خوب صورت آدمی ہو، وہ نکل نہ سکے گی۔ اور پھر اسے پھسلا کر یہاں لے آؤ۔ بس تمہارا کام ختم۔ اور میرا خیال ہے کہ دنیا میں کسی کو اتنے مختصر کام کا اتنا بڑا معاوضہ نہ ملا ہوگا۔''

''فرض کرو اگر داؤد رحمانی اس کی اتنی بڑی رقم نہ دے سکے؟''

''تمہارے ڈھائی کروڑ پھر بھی پکے۔ ہم اسے کسی ریاست کے شوقین حکمران کو سپلائی کر دیں گے۔ اتنی رقم ضرور مل جائے گی۔''

''ہوں...... اور اگر میں اس سے محبت کرتا ہوں تو؟''

''تو اس احمقانہ خیال کو دل سے نکال دو۔ وہ یہاں آئے گی اور اس دوران جب تک اس کے باپ سے گفت و شنید ہو، تم اپنی محبت کا خراج وصول کر لینا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' شیکر نے جواب دیا۔

''میں پھر وہی سوال کروں گا۔ اگر میں تمہاری پیشکش ٹھکرا کر یہاں سے جانا چاہوں تو؟'' میں نے کہا۔

''زندہ نہ جا سکو گے۔'' شیکر نے ہونٹ سکوڑ کر جواب دیا۔

''اوہ......'' میں نے ہونٹ سکوڑے۔ فلمینا اطمینان سے شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں بہت سے فیصلے کر چکا تھا۔ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک ہیں۔ اس وقت تک کچھ نہ ہو سکے گا، جب تک طالوت نہ آ جائے۔ مجھے ہوشیاری سے کام لینا چاہئے۔ اگر کسی حماقت میں پڑا تو ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھوں گا۔

میں گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر میں نے کہا۔ ''مجھے سوچنے کا موقع دو گے، مسٹر شیکر؟''

''کتنا وقت درکار ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کل صبح جواب دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ کیا تم کھانا کھا چکے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''فلمینا! کھانے کا بندوبست کرو۔ معزز مہمان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔'' شیکر نے کہا اور اپنے گلاس میں بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ''ایک بار پھر ایک بزرگ کی حیثیت سے مشورہ دے رہا ہوں، مسٹر شارق! میری پیشکش پر جذبات سے ہٹ کر سوچنا۔ تم خوب صورت آدمی ہو۔ بات صرف ڈھائی کروڑ تک نہیں رہے گی، ممکن ہے اس کے بعد بھی ہم تم سے کام لیں۔ ہمیشہ پچیس فیصد تمہارا۔ ہم اپنے آدمیوں کو بھرپور معاوضہ دیتے ہیں تاکہ انہیں احساس ہو کہ جو کچھ انہوں نے کیا اس سے انہیں کیا ملا۔'' اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر فلمینا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی۔

''مسٹر شیکر نے غلط نہیں کہا ہے، مسٹر شارق! کسی ایک لڑکی کے لئے اعلیٰ مستقبل برباد کر دینا بہت بڑی حماقت ہے۔ جبکہ دولت حاصل کرنے کے بعد ایک سے ایک حسین لڑکی تمہارے قدموں میں ہوگی۔ آؤ، کھانے کے کمرے میں چلیں۔'' اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

''ایک بات اور بتا دوں۔'' اس نے راستہ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''یہاں قدم قدم پر بہترین نشانہ باز موجود ہیں۔ جو دن رات پوری طرح ہوشیار رہتے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی کوشش نقصان دہ ہوگی۔'' اس نے رک کر میری شکل دیکھی اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میری بات کا یقین اس طرح کرو۔'' اس نے میرا فلیٹ ہیٹ لے کر فضا میں اچھال دیا۔ ڈز ڈز کر کے کئی دھماکے ہوئے اور ہیٹ میں نصف درجن سوراخ ہو گئے۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ گولیاں کہاں سے آئی ہیں۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر دل ہی دل میں اس لڑکی کا شکریہ ادا کیا، جس نے مجھے اس بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میں اس انداز میں بھی سوچتا۔

لڑکی مسکراتی ہوئی میرے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ اور پھر ہم دونوں ایک ڈائننگ روم میں داخل ہو گئے۔ لڑکی نے میرے لئے ایک کرسی کھینچی اور خود بھی دوسری کرسی کھسکا کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور چند منٹ کے بعد کئی ملازم قسم کے آدمی ٹرالیوں میں کھانا رکھے اندر آ گئے۔

میں نے بے تکلفی سے کھانا کھایا۔ اب تکلف بے کار تھا۔ اس وقت تک کے لئے تو پھنسا ہی ہوا تھا، جب تک طالوت نہیں آ جاتا، یا پھر ممکن ہے طالوت مجھ سے زیادہ دور نہ ہو۔ بہر حال، تنہائی ضروری تھی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور پھر ہم ڈائننگ روم سے نکل آئے۔

''آؤ........ میں تمہیں تمہاری خواب گاہ دکھا دوں۔'' اس نے کہا اور پھر مجھے بنگلے کے آخری حصے میں ایک خوب صورت کمرے میں لے گئی۔ بڑا حسین ماحول تھا۔ آرام دہ مسہری بچھی ہوئی تھی، آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک دیوار پر ایک ہیجان خیز پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ فلمینا اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''لباس تبدیل کر لو، ڈارلنگ!........ میں بھی لباس بدل کر آتی ہوں۔ میں تمہارے دل سے نرگس رحمانی کا خیال مٹا دوں گی۔''

میں احمقوں کی طرح اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

۞

فلمینا کے چلے جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ عرصہ قبل کی پُرسکون زندگی بار بار میرے دل میں ایک خلش پیدا کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی فرم میں کام کرنے والا لاابالی لڑکا، جو عام انسانوں کی طرح حالات کی گود میں پروان چڑھا، جس کی آرزوئیں ایک بیوی، ایک مکان اور چند بچوں تک محدود تھیں۔ جوانی کے تقاضوں نے جسے حالات کے بھنور میں پھنسا دیا، کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ خود کو یہاں تک لانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میرا مستقبل تماشوں سے وابستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ تماشے ہو رہے تھے اور میں خود ان تماشوں میں ایک تماشائی بن گیا تھا۔ میں تو صرف ایک کٹھ پتلی تھا، جسے وقت نچا رہا تھا۔ اور وقت طاقت ور ہے۔ وہی ہو گا، جو وقت چاہے گا۔ اپنی خاموش اور سیدھی سادی دنیا میں لوٹنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ پھر ٹھیک ہے، نچانے والا جس انداز سے نچائے۔ مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری حیثیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ دریا میں بہنے والا ایک تنکا ہوں، دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہوں گا۔

مجھ میں یہ خصوصیت تھی کہ میں خود اپنا تجزیہ کر کے اپنے ذہن کو مطمئن کر لیتا تھا۔ میرے بس میں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ پھر فضول اور پریشان کن خیالات کا شکار کیوں رہوں۔ سو میں فلمینا کا انتظار کرنے لگا۔ جو تجویز انہوں نے پیش کی تھی، وہ صرف میری ذات تک محدود نہیں تھی۔ نرگس رحمانی نئے زمانے کی ایک شوخ، لیکن معصوم لڑکی تھی۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اسے ان درندوں کی بھینٹ چڑھا دوں۔ اس سے بڑی کمینگی اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں کسی قیمت پر یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ٹھیک ہے، ان کا جو دل چاہے کریں۔ مجھے مار ڈالیں، ہاتھ پاؤں توڑ دیں، آنکھیں پھوڑ دیں، جو دل چاہے کریں، میں اسے اپنی تقدیر سمجھ لوں گا۔

چنانچہ میں اور زیادہ بے چینی سے فلمینا کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا دعویٰ کہ وہ نرگس رحمانی کا خیال میرے دل سے مٹا دے گی، ضرور متاثر کرے۔ یہی تو میں چاہتا تھا۔ اس سادہ سی لڑکی کا خیال صرف اس کے دلکش چہرے تک محدود تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور فلمینا اندر آ گئی۔ کمرے کی رنگین فضا میں سرخ طوفان آ گیا۔ گہرے سرخ لبادے سے اس کا گلابی مرمریں بدن اس طرح چمک رہا تھا، جیسے کسی ماہرِ فن مصور نے شوخ رنگوں سے خوب صورت زاویے کھینچ دیئے ہوں۔ اس کے آہستہ آہستہ چلنے سے یہ زاویے بدل رہے تھے۔ میں جلتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کو

تھپک تھپک کر سلا دیا تھا اور اب میری کائنات اس کمرے تک محدود ہو گئی تھی، جہاں شوخ وشنگ فلمینا کی رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پھر ایک الماری کی طرف بڑھ گئی۔ VATE 69 کی بوتل اس کے ہاتھوں میں جگمگانے لگی۔ دو بلوریں جام لئے وہ میرے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ان دیکھے خواب مچل رہے تھے۔ شراب کی بوتل شرما رہی تھی ان آنکھوں سے۔ اس نے دونوں پیمانوں میں شراب انڈیلی اور ایک پیمانہ میرے منہ سے لگا دیا۔

پورے کمرے میں مجھے فلمینا کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میرے دل کو بہت بھائی تھی۔ میں اسے نہ ٹھکرانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور پھر میں اس میں جذب ہو کر رہ گیا میرے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں صرف خواب دیکھ رہا تھا۔ شراب کے کئی جام اُس نے میرے حلق میں انڈیل دیئے اور میری آنکھوں میں دھندلاہٹ آ گئی۔ پھر میں نے اپنا جسم ہلکا ہوتا محسوس کیا۔

مجھے ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن پھر یہ ٹھنڈک ایک گرم لحاف سے ڈھک گئی۔ عجیب لحاف تھا۔ اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آ رہا تھا، تاکہ میں اسے سر تک اوڑھ لوں۔ اس لحاف میں گرمی تھی، اس نے میرے جسم سے سردی سمیٹ لی۔ میرا جسم تپنے لگا۔ اس تپش میں درد نہیں تھا، ہلکا ہلکا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ دنیا کی اچھی سے اچھی شراب پینے سے اس طرح کا سرور نہیں مل سکتا تھا۔ اور پھر مجھے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا۔ میرے جسم کی تپش ختم ہو چکی تھی، چنانچہ میں سکون کی نیند سو گیا۔

صبح سویرے میں بیدار ہوا تو میرے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو رہا تھا۔ طبیعت بھاری بھاری تھی، سر چکرا رہا تھا۔ کافی دیر تک میں آنکھیں کھولے پڑا چھت کو تکتا رہا۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ سنی تو چونک پڑا۔ میں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک عورت اندر آ رہی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر وہ مسکرائی۔

''اٹھو گے نہیں؟'' اس نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے مسہری سے اٹھا لیا۔

''وہ سامنے باتھ روم ہے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور میں تیزی سے باتھ روم کی طرف لپکا اور اندر داخل ہو گیا۔

''لباس یہاں موجود ہے۔'' عورت کی آواز سنائی دی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ رات کے واقعات میرے ذہن کے پردے پر دوڑنے لگے۔ ایک انوکھا سرور محسوس ہونے لگا اور میں نے شاور کھول دیا۔ ٹھنڈے پانی کی پھواروں نے میرے جسم پر دوڑتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور میں غسل کرتے ہوئے فلمینا کے بارے میں سوچتا رہا۔

حسین عورت تھی۔ حسین رات تھی۔ بس شراب کی کڑواہٹ نے حواس چھین لئے تھے۔ ورنہ...... ورنہ...... مجھے ایک اور گناہ کا احساس ہوا۔ مجھے شراب نہیں پینی چاہئے تھی۔ ٹھنڈا پانی میرے سر پر گرتا رہا اور سینکڑوں خیالات میرے ذہن سے ٹکراتے رہے اور پھر تان نرگس رحمانی پر آ کر ٹوٹی۔ اس لڑکی کے بارے میں، میں فیصلہ کر چکا تھا۔ خواہ یہ لوگ مجھے کچھ بھی دے دیں، کتنے ہی احسان میرے اوپر لاد دیں، ان کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

دفعتہً مجھے طالوت کا خیال آیا۔ اوہ...... رات کو طالوت کہاں تھا؟...... کیا وہ اس وقت میرے پاس تھا، جب میں فلمینا کے جسم میں چھپا ہوا تھا؟...... بدمعاش طالوت کی شریر نگاہیں یاد آ گئیں اور میں جھینپ گیا۔ تب میں نے جلدی جلدی غسل کیا، لباس پہنا اور باہر نکل آیا۔ کمرہ خالی تھا، عورت جا چکی تھی۔

''طالوت!'' میں نے آواز دی، لیکن جواب ندارد۔ ''طالوت!'' میں نے پھر اسے پکارا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا، ان لوگوں کے مطالبے کے بارے میں اسے بتانا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے، طالوت ہی مجھے معقول مشورہ دے سکتا تھا۔ میں اسی کے مشورے کی روشنی میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ لیکن وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔

''ممکن ہے، رات کو آیا ہو اور مجھے مصروف دیکھ کر خاموشی سے واپس چلا گیا ہو۔ ہلکی سی پریشانی میرے ذہن میں رینگ آئی۔ میں طالوت سے بات کئے بغیر ان لوگوں سے کیسے گفتگو کر سکتا تھا۔ کئی آوازوں پر بھی طالوت نہ آیا تو مجھے یقین آ گیا کہ وہ آس پاس موجود نہیں ہے۔ اسی وقت دو آدمی میرے کمرے میں داخل ہو گئے۔

''مسٹر شیکر ناشتے کے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''چلو!'' میں نے ایک گہری سانس لی اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ کئی راہداریوں سے گزر کر وہ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

''اندر تشریف لے جائیے۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور میں دروازہ کھول کر بے جھجک اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک خوب صورت ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی، اس کے پیچھے صرف شیکر بیٹھا ہوا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گڈ مارننگ، مسٹر شیکر!''

''مارننگ! کہیے مسٹر شارق! رات کیسی رہی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور میں مسکرا کر رہ گیا۔ ''تشریف رکھئے...... ویسے میرا خیال ہے، آپ نے فلمینا کو مس رحمانی سے کم تر نہ پایا ہوگا۔''

میں نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ظاہر ہے، اس بے غیرت بردہ فروش کو اس بات کی اہمیت کا کیا احساس ہو سکتا تھا۔

''تشریف رکھئے۔'' اس نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ناشتہ بالکل خاموشی سے کیا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر شیکر نے ایک اعلیٰ درجے کا غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر مجھے پیش کر دیا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ سگریٹ لے لیا۔ اس نے اپنے خوب صورت لائٹر سے میرا سگریٹ سلگایا، پھر اپنا سگریٹ سلگا کر اس نے دو تین گہرے گہرے کش لئے اور بولا۔

''فلمینا کی کوئی حیثیت نہیں ہے، مسٹر شارق! نہ جانے آپ جیسے انسان اپنے ذہن میں پاکیزگی، گناہ اور ثواب کا روگ کیوں پال لیتے ہیں۔ زندگی تو شراب کی بوتل کے کاک کی طرح ہے۔ اسے محدود کرنا زندگی کی توہین ہے۔ ہر رات نئی لڑکی۔ ایک سے ایک حسین اور صبح کو اس کے جسم و صورت کا ہر نقش مٹا دو۔ دوسری رات کے انتظار میں۔ صرف اسے یاد رکھو، جو تمہارے سامنے ہے۔ دولت، اس کی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ عزت، شہرت، شرافت سب کچھ اس سے خرید کر اپنا لو۔ جتنا بڑا دولت مند، اتنا

ہی شریف انسان۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور بولا۔

"مختلف لوگ مختلف کاروبار کرتے ہیں۔ اسٹیل کنگ سستا لوہا خریدتا ہے، مہنگا بیچتا ہے۔ اس کے پاس جو دولت ہے، اس کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہم کسی ایسے آدمی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، جو بذاتِ خود تنگ دست ہو۔ تم داؤد رحمانی کے پاس چلے جاؤ۔ اس سے کہو کہ تم ایک ضرورت مند انسان ہو۔ اگر تمہیں دس ہزار روپے نہ ملے تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ تمہیں مضحکہ اُڑانے والے انداز میں دیکھے گا، ہونٹ سکوڑے گا اور پھر اپنے چپراسی کو بلائے گا، اس سے کہے گا کہ اس بے وقوف نوجوان کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔ حالانکہ دس ہزار روپے اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن اسے تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ بھلا وہ اپنی دولت سے تمہاری زندگی بچانے کی کوشش کیوں کرے؟ ہاں، اپنی لڑکی کے لئے وہ دس کروڑ روپے ضرور خرچ کر سکتا ہے، آزمائش شرط ہے۔ پھر تمہیں ایک ایسے انسان سے ہمدردی کیوں ہو، جسے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میری بات کا جواب دو۔" وہ بڑے غور سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

"آپ کے دلائل خاصے وزنی ہیں، مسٹر شیکر! لیکن میں نرگس رحمان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"پھر وہی حماقت کی بات۔ ارے تم اسے دھوکا کہاں دے رہے ہو؟ بے شک اپنی محبت اس کے لئے وقف کر دو۔ ہمیں تو اس کے باپ کی جیب سے دس کروڑ روپے چاہئیں۔"

"افسوس! کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

"کوئی دلیل ہے تمہارے پاس؟ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرو۔" شیکر نے کہا۔ "کہ تم یہ کام کس بنا پر کرنا نہیں چاہتے؟"

"بس....... میں اپنی ذات کو اس فریب میں ملوث نہیں کر سکتا۔ میں دھوکے باز اور فریبی نہیں ہوں۔"

"یہ ہٹ دھرمی اور ضد کی بات ہے۔" شیکر نے کہا۔

"جو دل چاہے، سمجھ لو۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں میرے ہیرو! ابھی میں کچھ نہیں سمجھوں گا۔ تم ساڑھے سات کروڑ روپے کی مالیت رکھتے ہو اور میں انہیں حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں شیکر کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ خاموشی سے بنگلے کے ایک حصے کی طرف چل پڑا اور پھر ایک کمرے کے سامنے ہم دونوں رک گئے۔

"مجھے صرف دلائل کی زبان پسند ہے۔ جب میرے دلائل کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکتے تو پھر میری بات مان لو۔"

"مسٹر شیکر! مجھے آپ کے گھناؤنے کاروبار سے نفرت ہے۔ معصوم لڑکیوں کی خرید و فروخت میں، میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اصل میں، میں دوستی کی فضا کو اس وقت تک ختم نہیں کرتا، جب تک دشمنی ناگزیر نہ ہو جائے، مسٹر

شارق! تم ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہو۔ ہم ہر قیمت پر چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لئے کام کرنے پر تیار ہو جاؤ۔ تم اگر چاہو تو نرگس رحمانی کے بعد اپنا حصہ لے کر ہمیں چھوڑ سکتے ہو، لیکن اس سے قبل ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے'' اس نے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میں اس کے پیچھے اندر پہنچ گیا۔ عجیب سا کمرہ تھا۔ اس میں صرف دو دروازے تھے۔ فرش بھی ننگا تھا، دیواریں بھی ننگی۔ کمرے میں ان دروازوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''دراصل، انسان نے مختلف لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ ایک چہرے پر کئی چہرے چڑھا رکھے ہیں۔ ہر ضرورت ضرورت ہے۔ جس طرح میرے لئے تم ایک ضرورت ہو۔ میں نے تم سے انتہائی دوستانہ ماحول میں گفتگو کی، فرائض میزبانی بھی ادا کرنے کی کوشش کی اور کرتا رہوں گا۔ لیکن اپنی ضرورت کو میں کسی طرح نہیں ٹال سکتا، اس کے لئے میرے نزدیک چند ذرائع ہیں۔ جس طرح دولت حاصل کرنے کے لئے میں داؤد رحمانی کی لڑکی کو اغواء کرنا چاہتا ہوں، اسی طرح یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کا ذریعہ تم بنو۔ گویا تم میری ضرورت ہو۔ اور تمہاری ضرورت اگر وہ دولت نہیں تو زندگی ضرور ہوگی۔ اگر تمہیں اپنی زندگی کا احساس ہو جائے تو میری ضرورت پوری کرنے پر آمادہ ہو جانا...... ڈیوڈ!'' اس نے دوسرے کمرے کی طرف رخ کر کے آواز دی اور دوسرے ہی لمحے ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی باہر نکل آیا۔ اس کے جسم پر چست نیلی پتلون اور سفید بنیان تھی۔

''یس باس!'' اس نے گردن جھکا کر کہا۔

''مسٹر شارق میری ضرورت پوری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تم انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کرو۔''

''یس باس!'' اس نے اسی انداز میں کہا۔

''او کے مسٹر شارق! آپ کی آمادگی کے بعد ہی ملاقات ہوگی۔'' شیکر نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈیوڈ کی شکل دیکھ کر ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میرے جسم میں سرد لہریں دوڑنے لگی۔ پھر میں نے سوچا، میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک مفرور مجرم، جس کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزر سکتی ہے۔ کیا حیثیت ہے اس زندگی کی؟ کب تک میں طالوت کے سہارے چلوں گا؟...... اگر نرگس رحمانی بچ جائے تو یہ احساس تو رہے گا کہ میں نے کچھ کیا۔ نہ جانے کمبخت طالوت کہاں ہے۔ طالوت!'' میں نے پھر اُسے آواز دی لیکن وہ بدبخت کہیں دور ہی نکل گیا تھا۔

''سائرے!...... روبن!...... کم اِن۔'' دیو قامت ڈیوڈ نے کسی کو آواز دی اور اسی وقت دوسرے دروازے سے دو اور آدمی نکل آئے۔ یہ بھی صورت سے بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے رنگین لباسوں کے ساتھ فٹ بال بوٹ پہن رکھے تھے، جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئے۔

''کوٹ اُتار دیجئے، مسٹر!'' ڈیوڈ نے بڑی شرافت سے کہا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے سرد آواز میں پوچھا۔

''میں کسی سوال کا عادی نہیں ہوں...... کوٹ اُتار دو۔'' ڈیوڈ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ کسی شکاری کتے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کوٹ اتار دیا، جسے اس نے میرے ہاتھ سے لے کر احتیاط سے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ تب دونوں خطرناک آدمی میرے دو طرف کھڑے ہو گئے۔ انہوں

نے مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنا جسم تولنے لگے۔ عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے وہ دونوں۔ لیکن دوسرے لمحے ان میں سے ایک فضا میں اُچھلا اور اس کے بوٹ کی ٹھوکر میرے گھٹنے پر پڑی۔ میرے منہ سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ ابھی میں اس چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ دوسرے آدمی نے میری ٹانگ کے جوڑ کو ٹھوکر ماری اور میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ دوسرے لمحے میں زمین پر پڑا تھا۔ گھٹنے کی چوٹ سے میں بلبلا گیا تھا اور وہ دونوں لڑاکا مرغے کی طرح گردن جھکائے میرے گرد چکر کاٹ رہے تھے، جیسے میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں تاہم اس طرح پڑے رہنا بھی مردانگی کے خلاف تھا۔ اب میں اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ مداخلت کے لئے ہاتھ بھی نہ اٹھا سکوں۔ میں گھٹنے کی چوٹ بھول کر پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ دونوں بدمعاش اپنے کام میں ماہر تھے۔ کھٹا کھٹ دو ٹھوکریں میری پنڈلی اور کمر پر پڑیں اور میں سنبھلنے کی کوشش میں دیوار سے جا ٹکرایا اور مجھے نہ گرتے دیکھ کر ان دونوں کو غصہ آ گیا....... اب لگا تار ٹھوکریں مرے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ ہر ٹھوکر پر میرے منہ سے کراہ نکل جاتی۔ میں فٹ بال ہی کی طرح لڑھکتا پھر رہا تھا اور ڈیوڈ کونے میں میرا کوٹ سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر اچانک اس نے ہاتھ اٹھایا اور وہ دونوں رک گئے۔ ”ہاں جوان! کیا خیال ہے؟ باس کا مرضی پورا ہوگا؟“

”بکومت....... کتے....... ذلیل!“ اس بار میں کوشش کر کے ڈیوڈ پر ہی چڑھ دوڑا۔ لیکن دونوں میں سے ایک نے راستے میں ہی مجھے سنبھال لیا۔ اس کی ٹھوکر میری کمر پر پڑی اور میں ڈیوڈ کے قدموں میں جا گرا۔ ڈیوڈ نے بھی پھرتی سے ایک ٹھوکر رسید کر کے اپنی ٹانگوں کو میرے ہاتھوں کی گرفت سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن یہ ٹھوکر فیصلہ کُن تھی، کیونکہ میرے سر پر پڑی تھی۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش نہ آتا تو اچھا تھا۔ کیونکہ جسم میں سخت تکلیف تھی۔ جگہ جگہ اُبھار تھے۔ کانوں میں سیٹیاں گونج رہی تھیں۔

”اُٹھو....... یہ پی لو....... تکلیف رفع ہو جائے گی۔“ ایک نسوانی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میں چونک پڑا۔ تکلیف کے باوجود میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ایک سرخ و سفید چہرہ میرے بالکل قریب تھا۔ اس کے بال جدید فیشن کے مطابق کٹے ہوئے تھے۔ جسم سے خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ دلکش نقش و نگار، سیاہ آنکھیں، بھرے ہوئے ہونٹ....... میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

”اُٹھو.......!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے سفید دانتوں کی چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس پر نگاہ ڈالی، پیلے رنگ کا سیال تھا۔ نہ جانے کیا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی اور وہ مجھے سہارا دینے کے لئے جھک آئی۔ میں نے اپنے شانے پر اس کے گداز جسم کا بوجھ محسوس کیا۔ اس تکلیف دہ حالت کے باوجود میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بہر حال میں اس کے سہارے سے اُٹھ گیا اس نے باقاعدہ میرے جسم کا بوجھ سنبھال لیا تھا۔ تب میں نے سیال کا گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا اور گلاس خالی کر کے اسے واپس کر دیا۔

”شکریہ.......!“ میں نے اس سے کہا اور وہ مجھے لٹا کر اُٹھ گئی۔ میں نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے اس کے گداز جسم کو دیکھا۔ اس کا قد پانچ فٹ سے کم تھا۔ کمر بے حد پتلی۔ عمر بھی سترہ اٹھارہ سے زیادہ نہ

ہو گی۔ اس کے چہرے سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ گلاس رکھ کر وہ پلٹی۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ بوٹے سے قد کی نوخیز لڑکی حسین ترین کہی جاسکتی تھی۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ کافی دلکش اور موزوں تھی۔

لیکن ان تمام باتوں کو سوچنے سے پہلے مجھے اس کے بارے میں جاننا چاہئے تھا کہ وہ کون تھی؟ اور میں نے اس سے یہ سوال کر دیا۔

''تم کون ہو؟''

''جینی۔'' اس نے جواب دیا۔ جیسے میں اس نام سے اچھی طرح واقف ہوں۔

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تب میں نے اچانک محسوس کیا، جیسے میرے جسم کا درد رفع ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے کیا جادو اثر دوا تھی اور تھوڑی دیر کے بعد میں بالکل تروتازہ تھا۔ میں نے کہنیوں کے سہارے سے اُٹھنے کی کوشش کی اور جینی نے مجھے پھر سہارا دیا۔

''میں کتنی دیر بے ہوش رہا، جینی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ کیا تم بھوک نہیں محسوس کر رہے؟''

''سخت۔'' میں نے کہا۔ واقعی مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔

''تب میں کھانا لے آؤں۔'' اس نے کہا اور مسہری سے اُٹھ کر دروازے کی طرف چل دی۔ میری نگاہیں اس کے حسین سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ میں بدستور شکیر کی قید میں تھا۔ وہ ذلیل انسان مجھے پاگل کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ لیکن یہ کمبخت طالوت کہاں مر گیا؟......کیا وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گیا؟......کیا وہ مجھ سے اُکتا گیا؟

''طالوت......!'' میں نے بھنچے ہوئے لہجے میں آواز دی۔ لیکن وہی سناٹا......وہی خاموشی۔

میرے ہاتھ پاؤں سرد پڑنے لگے۔ بھیانک مستقبل میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اگر طالوت چلا گیا ہے تو اب میں کیا کروں گا؟......میری اپنی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔

میرے ذہن میں پریشانیاں کروٹیں بدلتی رہیں۔ اور پھر وہ کھانا لے کر آ گئی۔ ایک خوب صورت ٹرالی میں بہت سی پلیٹیں چنی ہوئی تھیں۔ اس نے ٹرالی میرے سامنے رکھ دی۔

میں مسہری سے اُتر آیا۔ باتھ روم میں جا کر کلّی کی، دانت صاف کئے اور پھر کھانے کے سامنے آ گیا۔ ''آؤ......تم بھی کھالو۔'' میں نے اسے مدعو کیا۔

''شکریہ......میں کھا چکی ہوں۔'' اس نے کہا اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ پھر مجھے کوئی خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

''فلمینا کہاں ہے، جینی؟''

''آج میری ڈیوٹی ہے۔ وہ چھٹی پر ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے کہا۔ اگر یہ ڈیوٹی وہی ہے، جو فلمینا نے انجام دی تھی، تو بہت خوب ہے۔ کم از کم اس معاملے میں شکیر کا شکریہ ادا کرنا بداخلاقی اور ناسپاسی ہے۔ میں نے دل میں سوچا اور کھانا کھاتا رہا۔ کھانے کے بعد جینی میرے لئے کافی اور سگریٹ لے آئی۔ زوداثر دوا نے میرے جسم سے تکلیف رفع کر دی تھی۔ کافی اور سگریٹ سے ذہنی تھکن رفع ہو گئی۔ میں نے جینی کو دیکھا اور وہ مسکرا دی۔ پھر وہ اُٹھی اور ایک الماری سے شراب کی بوتل نکال لائی۔

پچھلی رات کی کہانی دوہرائی جا رہی تھی۔ میں اپنے ذہن کو ان بے شمار پریشان کن خیالات سے چھٹکارا دلانا چاہتا تھا، اس لئے میں نے گناہ وثواب کی کہانی بھلا دی اور جینی کے ہاتھ سے جام لے لیا۔ کئی پیگ پینے کے بعد میرا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔ اب مجھے جینی کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔

''جینی......!'' میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ بیٹھی۔

''جینی......!'' میں نے اس کے ایک ایک نقش کو ذہن میں اُتار لیا اور پھر میں گہری نیند سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی تو جینی ایک خواب کی طرح ذہن پر مسلط تھی۔ اس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو اب میرے جسم سے آ رہی تھی۔ میں بھاری دماغ لئے باتھ روم میں چلا گیا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کل کی چوٹیں رات کی شراب سے وقتی طور پر دب گئی تھیں اور اب ان میں پھر سے درد شروع ہو گیا تھا۔

غسل کر کے باہر نکلا، بال وغیرہ ترتیب دیئے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر جینی کے بارے میں سوچنے لگا۔ جینی بھی فلمینا کی طرح رات کے کسی حصے میں غائب ہو گئی تھی۔ ویسے اس سلوک کے بعد رات کو جینی کی آمد ہی میرے لئے حیرت انگیز تھی۔ سوچتے ہوئے چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی اور پھر ایک آدمی اندر آ گیا۔

''باس ناشتے کی میز پر آپ کا منتظر ہے۔''

میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ ذلیل فطرت شیکر اپنے عجیب وغریب رویے سے مجھے ذہنی ہیجان میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تھا۔ بہر حال، ممکن ہے وہ مجھ سے کچھ اور گفتگو کرنا چاہتا ہو۔ لیکن اس کی درندگی کو شکست دینے کے لئے میرے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔ وہ یہ کہ اس کی بات نہ مانوں!

مجھے بلانے کے لئے آنے والا میرا منتظر تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر میں اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا، جہاں پہلے روز میں نے شیکر کے ساتھ ناشتہ کیا تھا۔ شیکر نے حسب معمول میرا استقبال کیا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ ناشتہ کرتا رہا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے مجھے سگریٹ پیش کی، جسے میں نے بلا تردّد لے لیا۔ اس دوران میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر دروازے پر چاپ سنائی دی اور میری گردن اس طرف گھوم گئی۔ ایک بار پھر میرے جسم میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔

مردود ڈیوڈ دروازے میں کھڑا تھا۔ ''کیا آپ ناشتے سے فارغ ہو چکے، مسٹر شارق؟'' اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''ہاں......ہم فارغ ہو چکے ہیں، ڈیوڈ!'' شیکر نے جواب دیا۔

''تب براہ کرم میرے ساتھ تشریف لایئے۔'' ڈیوڈ نے مجھے مخاطب کر کے کہا اور شیکر کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

''اوکے مسٹر شارق! کل ملاقات ہو گی، اگر آپ زندہ رہے تو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''آیئے مسٹر شارق!'' ڈیوڈ کی آواز پھر اُبھری۔

''کک......کہاں؟......کیا کرنا چاہتے ہو تم؟'' میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کل کا کھیل میرے ساتھیوں کے لئے کافی دلچسپ تھا۔ آج انہوں نے کچھ اور تبدیلیاں کی ہیں۔ بڑے جدت پسند ہیں وہ لوگ۔" ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلئے۔ وہ بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں بادل نخواستہ اُٹھ گیا۔ دل ہی دل میں طالوت کو کوس رہا تھا۔ کس برے موقع پر اس نے میرا ساتھ چھوڑا ہے۔ آخر مر کہاں گیا، کمبخت؟ مستقل غائب ہے۔

"طالوت......!" میں نے پھر آہستہ سے سرگوشی کی۔ لیکن وہ منحوس ہوتا تو جواب ملتا۔ وہ تو مجھے پھنسوا کر غائب ہو گیا تھا۔

آنکھوں میں تاریکیاں لئے میں ڈیوڈ کے ساتھ چلتا ہوا اسی کمرے میں پہنچ گیا، جہاں کل میری دُرگت بنی تھی۔ اندر ان دونوں کے علاوہ درمیانی عمر کی دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر میرا دل دھڑک اُٹھا۔ میں تھوک نگلتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا۔ ڈیوڈ نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"انتظار نہ کریں، مادام!...... شروع ہو جائیں۔" ڈیوڈ نے کہا اور دونوں عورتیں آگے بڑھ آئیں۔ انہوں نے میری قمیض کے بٹن کھولے۔ میرے ہاتھ مدافعت کے لئے بڑھے لیکن اوّل تو عورتیں ہی کافی مضبوط تھیں، اس کے علاوہ دونوں آدمیوں نے میرے بازو پکڑ لئے۔ میری قمیض اُتار دی گئی۔ اور پھر عورتوں کے ہاتھ میرے زیریں لباس کی طرف بڑھے۔

"کیا کر رہی ہو، سؤر کی بچیو!" میں چیخا اور ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر میرے بال پکڑ لئے۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی پتلون سے ایک لمبا چاقو نکال لیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ چاقو کھل گیا اور ڈیوڈ اسے میرے نرخرے پر رکھ کر سفاک لہجے میں بولا۔

"مدافعت کی تو بکرے کی طرح ذبح کر دوں گا۔ باس کی طرف سے آرڈر مل چکا ہے۔"

بالوں کی تکلیف سے میرے منہ سے کراہ نکل گئی اور عورتوں نے میرا زیریں لباس بھی اُتار دیا۔

"سنو...... سنو تو سہی۔" میں نے سخت ذہنی ہیجان کے عالم میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں...... میں تمہارے باس سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا وقت گزر گیا۔ اب صرف تمہیں وہ کرنے کے لئے تیار ہونے کا اقرار کرنا ہے، جو باس نے کہا ہے۔"

"میرا لباس کیوں اتارا گیا ہے؟" میں نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"تماشا دیکھتے رہو۔" ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم خود دیکھ لو گے کہ تمہارا لباس کیوں اتارا گیا ہے۔"

میری حالت کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ تین مردوں اور دو عورتوں کے درمیان میں برہنہ کھڑا تھا۔ بے بس تھا۔ اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کرنے والے تھے، اس کا صحیح اندازہ تو نہیں کر سکا تھا، لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کریں گے، اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔ اب دو ہی راستے تھے...... یا تو نرگس رحمانی کی بربادی کا اقرار کر لوں یا پھر ڈیوڈ سے بھڑ کر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔

زندگی بڑی عزیز شے ہے۔ انسان کسی بھی حالت میں مرنا نہیں چاہتا۔ نرگس رحمانی کا معصوم چہرہ

میری نگاہوں میں گھوم گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''سنو ڈیوڈ!'' میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''تھینک یو، مسٹر شارق!'' ڈیوڈ نے میرے بال چھوڑ دیئے۔ وہ ایک دم بے حد مؤدب نظر آنے لگا۔ اور پھر اس نے ان سب سے کہا۔ ''چلو، باہر جاؤ۔''

دونوں عورتیں اور مرد جلدی سے دوسرے دروازے سے باہر چلے گئے۔ اور ڈیوڈ دوسری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

''براہِ کرم لباس پہن لیں، مسٹر شارق!'' اس نے کہا اور میں نے جلدی سے اپنی پتلون اُٹھالی۔

لباس پہننے کے بعد میں نے گہری گہری سانسیں لیں اور پھر بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مسٹر شیکر کہاں ہیں؟''

''اب تو کل ہی باس سے ملاقات ہوگی۔ وہ جا چکا ہے۔ آیئے...... اپنے کمرے میں آرام کیجئے۔'' اور میں ڈیوڈ کے ساتھ نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں مسہری پر گر پڑا۔ ذہن تھا کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سب سے زیادہ رنج طالوت کے چلے جانے کا تھا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ کیوں چلا گیا؟...... اور اب میں کیا کروں۔ طالوت کی غیر موجودگی میں میری جو حیثیت تھی، وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ نہ جانے کتنی دیر میں ذہن کو پُرسکون کر سکا۔ یہ بھی ایک زبردست کوشش تھی، ورنہ اس وقت سکون کا نام کہاں؟

میں نے اپنی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایک مفرور مجرم، جس کے اوپر بہت سے کیس بن چکے تھے، کسی بھی وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا سکتا تھا۔ طالوت چلا گیا تھا اور اب مجھے زندگی کی گاڑی خود دھکیلنا تھی۔ طالوت سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اتنی جلد ساتھ چھوڑ دینے کی توقع نہیں تھی۔ بہرحال اس پر میرا حق بھی کیا تھا۔ مجھ میں اور اس میں بہت فرق تھا۔ میں نے جھنجلا کر طالوت کا خیال دل سے نکال دیا۔ دوسروں کے سہارے کب تک زندہ رہوں گا خود کیا کرنا ہے، یہ سوچنا تھا۔ ان لوگوں سے نرگس رحمانی کو برباد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا، جانتا تھا کہ وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ ہوں گے۔ صرف میرے وعدے پر مطمئن نہ ہو جائیں گے۔ ہاں، ایک بات کا اندازہ تھا۔ وہ میری اصل شخصیت سے ناواقف ہیں۔ انہیں میری عارف والی حیثیت معلوم نہیں ہے۔ پھر اب جبکہ میں ایک مجرم بھی بن چکا ہوں تو اپنی صلاحیتوں کو کیوں نہ استعمال کروں؟...... ٹھیک ہے، مجرم ہی سہی۔ اسی طرح زندگی گزاروں گا۔ جہاں ضمیر مطمئن نہ ہوگا، وہاں اپنی مردانگی سے کام لوں گا۔ نرگس کی زندگی کم از کم میرے ہاتھوں برباد نہ ہو گی۔ کوشش کروں گا کہ اسے محفوظ رکھوں۔ زیادہ سے زیادہ اس کوشش میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے۔ زندگی تو جانی ہی ہے......!

''ٹھیک ہے...... قسمت میں اگر یہی لکھا ہے تو یہی سہی۔'' میں مسہری سے اُٹھ گیا۔ باتھ روم میں گیا، غسل کیا۔ حالانکہ صبح کو غسل کر چکا تھا، لیکن اس بار گویا میں نے اپنی ذہنی اُلجھنیں دھو دیں اور پھر سب کچھ بھول کر میں شراب کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ شراب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا، جو بوتل سب سے خوب صورت نظر آئی، نکال لی، گلاس میں اُنڈیلی اور پینے لگا۔

سینے پر جلتی ہوئی لکیریں اُترتی رہیں۔ اور پھر سرور آنے لگا۔ پیتا رہا اور جب ہاتھ بوتل اُٹھا کر انڈیلنے کے قابل نہ رہے تو اوندھا گر پڑا۔ کچھ ہوش نہ رہا۔ یہ بے ہوشی ہی مناسب تھی، ورنہ پریشان کن خیالات میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ پھر جب ہوش آیا تو سخت نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ آنتیں بھوک سے قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ اندازہ ہوا کہ یہاں والے مجھ سے بے خبر نہ تھے۔ کرسی پر مدہوش ہوا تھا، مسہری پر موجود تھا۔ بوتل اور گلاس ہٹ چکے تھے۔ آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ نقاہت آواز نکالنے میں بھی مانع تھی۔ نہ جانے کیوں یہ حالت ہو گئی تھی۔ پھر جب دروازے پر آہٹ سنائی دی تو سنبھلا۔ نیا چہرہ تھا۔ حسین، دلکش........ مسکراتی ہوئی وہ میرے قریب آئی اور مسہری پر بیٹھ کر بڑے پیار سے میری پیشانی پر اُنگلیاں پھیرنے لگی۔

"اب اٹھ جاؤ........" بڑے گھریلو انداز میں کہا گیا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ "میرا نام شکیلہ ہے۔" اس نے کہا اور میرے کچھ اور قریب کھسک آئی۔ اس کے قرب سے میں سرور محسوس کرنے لگا اور میرے جسم میں توانائی آ گئی۔ ہاتھ اُٹھے اور اس کی طرف بڑھ گئے۔

"سخت بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"صبح کا ناشتہ کئے ہوئے ہو۔ نشہ اتارنے کی کئی چیزیں استعمال کی جا چکی ہیں۔ ایک انجکشن بھی دیا گیا ہے۔ ورنہ صبح تک ہوش میں نہ آتے۔ اتنی کیوں پی لی تھی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خود کو بھول جانے کے لئے۔" میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔

"خود کو یاد رکھو........ ورنہ دنیا میں اپنا مقام کھو بیٹھو گے۔"

"کھانا منگواؤ۔" میں نے اس کی بات سنی اَن سنی کر کے کہا۔

"ابھی لائی۔" اس نے کہا اور جھپاک سے مسہری سے اُٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں اُس کے جملے پر غور کرتا ہوا باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ "ہونہہ........ ناسمجھ، احمق........ کیا دیکھا ہے ابھی دنیا میں۔" اس کے الفاظ کو یاد کر کے میں نے تلخ انداز میں سوچا۔ باہر آہٹ سنائی دی تو باتھ روم سے نکل آیا۔ گرم کھانے سے اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ مربھکوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ نہ جانے پیٹ میں اتنی گنجائش کہاں سے آ گئی۔ ڈٹ کر کھایا۔ گرم کافی پی اور پھر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ احساس ہوا کہ زندگی بس یہیں تک محدود ہے!

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گیارہ بجنے والے ہیں۔"

"اوہ........ کافی رات ہو گئی ہے۔" میں نے دھوئیں کے مرغولوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ گئی اور ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ واپس آئے گی اور مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں شکیر کی اس عنایت کا دل سے شکر گزار تھا۔ اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا، جو کچھ وہ چاہتا تھا، وہ اپنی جگہ........ لیکن اس نے یہ جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کی مثال مشکل تھی۔ فلمینا اور جینی کی طرح یہ لڑکی بھی بھرپور تھی۔ اور میں آنے والے وقت کے تصور سے خوش تھا۔

پھر وہ آ گئی........ وہی خود سپردگی لئے ہوئے........ وہی انداز، وہی ناز و ادا........ تیسری رات کی تیسری لڑکی بھی اپنی لطافتیں مجھے سونپ کر سورج کی کرنوں میں گھل گئی........ ایک پُراسرار خواب کے

مانند......اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے بھلا دیا۔

پھر شیکر کا بلاوا آ گیا اور میں چل پڑا۔ لیکن آج اس کمرے تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میں نے دل میں اپنے عزائم تازہ کئے تھے۔ اپنی صلاحیتوں کو پکارا تھا۔ اور جب میں کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو کسی حد تک پُرسکون ہو چکا تھا۔ شیکر نے حسب معمول میرا استقبال کیا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے مجھے ڈیوڈ کے حوالے کرنے کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا ہو۔ میں نے اطمینان سے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔ ملازموں نے ناشتہ لگا دیا اور ہم دونوں خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے......پھر ناشتہ ختم ہو گیا اور شیکر نے مجھے سگریٹ پیش کی، جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

''ڈیوڈ نے مجھ سے کہا ہے کہ تم نے......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں......بحالتِ مجبوری میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔'' میں نے ہونٹ سکوڑ کر جواب دیا۔

''تمہارے آدمی درندگی کی انتہائی منزلوں پر پہنچ رہے تھے۔''

''اوہ......گویا دل سے تم اس کام کے لئے تیار نہیں ہو......؟''

''قطعی نہیں......اگر مجھے تیار ہونا ہوتا تو اسی دن ہو جاتا۔ تم نے جس رقم کا لالچ دیا تھا، وہ اتنی ہے کہ مجھے پہلی ہی پیش کش میں تیار ہو جانا چاہئے تھا۔''

''گویا تم نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے ڈیوڈ سے اقرار کر لیا تھا؟'' شیکر نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''بات کچھ یونہی ہے، شیکر!'' میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ ''لیکن جو اقرار میں نے کیا ہے، اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''گویا تم......'' شیکر نے حیرت سے کہا۔ ''یعنی واقعی تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں......اُس معصوم لڑکی کی بربادی میرے ہی ہاتھوں میں لکھی ہے تو میں مجبور ہوں......میری زندگی بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر اس کا باپ اس کی زندگی بچانا چاہتا ہے تو تمہاری مانگ پوری کر دے۔''

''گڈ......یہی بات سمجھانے کی میں نے کوشش کی تھی۔ دیر سے تمہاری سمجھ میں آئی۔ لیکن شارق! اپنے خلوص کا یقین کس طرح دلاؤ گے؟''

''کوئی ذریعہ نہیں ہے......سب کچھ تمہیں کرنا ہو گا۔ ہاں، میری کچھ شرطیں ہیں۔''

''بیان کرو۔''

''مجھے تمہاری ڈھائی کروڑ کی پیشکش نامنظور ہے۔ میں اس ذلیل پیسے میں سے کچھ نہ لوں گا۔''

''اوہ......ٹھیک ہے۔ اور کیا چاہتے ہو؟''

''اس کے عوض تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔''

''وہ کیا؟'' شیکر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نرگس رحمانی کو یہاں لانے کے بعد تم اسے بتاؤ گے کہ تم نے مجھے کس طرح مجبور کیا تھا۔ میں اپنی رضی سے اس کام پر تیار نہیں ہوا تھا۔''

''اوہ......چلو، منظور ہے۔'' شیکر نے کہا۔ ''اور کوئی حکم؟''

"یہاں اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوگا۔ کوئی اس سے گری ہوئی بات نہیں کرے گا۔ ہاں، اگر اس کا باپ روپے کی ادائیگی سے انکار کر دے، تب پھر جو دل چاہے کرنا۔"

"یہ بھی منظور۔ اور بتاؤ؟"

"تیسری اور آخری شرط یہ ہے کہ معاوضے کے طور پر تم مجھے یہاں سے نکال دو گے۔ میں اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"گویا آئندہ ہمارے لئے کام نہیں کرو گے؟" شیکر نے پوچھا۔

"نہیں شیکر! مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔" میں نے کہا۔ "میں بڑی مشکل سے اس کام کے لئے آمادہ ہوا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تمہیں اس کی آزادی ہے۔ لیکن میری کچھ باتیں بھی سن لو۔" اس نے کہا اور میں سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ "تم نے کسی بھی قسم کی وعدہ خلافی کی کوشش کی تو تمہیں اور نرگس، دونوں کو گولی ماردی جائے گی۔ تم جانتے ہو، یہ کام ہمارے لئے مشکل نہیں ہے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میرے دل میں طالوت کا خیال آ گیا تھا۔ کاش وہ ہوتا، تب میں دیکھتا کہ شیکر کے لئے کون سا کام آسان ہے اور کون سا مشکل۔ لیکن اب تو میں طالوت کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا تھا۔ کیوں اور کہاں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

"کام کرنے کا انداز کیا ہوگا؟" شیکر نے پوچھا۔

"یہ سب فیصلے تم کرو گے، شیکر!........ میں وہی کروں گا، جو تم کہو گے۔" میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو پھر غور سے سن لو شارق! ہم تو خطرات مول لینے کے عادی ہیں۔ ہم تمہارے اوپر بھروسہ کریں گے۔ تمہاری اور نرگس کی زندگی بندوق کی نال پر ہوگی۔ جس وقت کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی، تمہیں ختم کر دیا جائے گا۔ تم نرگس کے پاس جاؤ گے، اس سے ملو گے اور اسی انداز میں ملو گے، جیسے ملے تھے۔ اسے اپنے عشق کے جال میں پھانسو گے اور پھر کسی وقت اسے لے کر باہر نکل آؤ گے۔ باقی کام ہمارا ہے۔ تم سے رابطہ قائم رہے گا۔ ہم تمہیں ہدایات دیتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"یہ رات تم یہاں گزارو گے۔ اس وقت تک، جب تک ہمارا کام نہ ہو جائے۔"

"تمہارے ہاں کی راتیں بے حد حسین ہوتی ہیں شیکر!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں کہہ چکا ہوں، تمہارے دل سے نرگس کا عشق ہوا ہو جائے گا۔ ایک سے ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ اور پھر اس شکل میں جب نرگس کا باپ رقم دینے پر راضی نہ ہو، تم ایسی ہی ایک رات نرگس کے ساتھ بھی گزار سکتے ہو۔ میری طرف سے پیش کش ہے۔"

"دراصل شیکر! وہ لڑکی اس طرح میرے حواس پر چھائی ہے کہ میں اس کے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہیں کر سکتا۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ تمہاری مرضی ہے۔" شیکر نے کہا۔ اس دوران اس کی آنکھیں میرا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ لیکن

میں اس وقت اداکاری کے فن کی بلندیوں پر تھا۔ میں نے اپنی کیفیت اس طرح کی بنالی تھی، جیسے بحالتِ مجبوری میں یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔ چنانچہ شیکر کو یقین آ گیا اور اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''تب شیکر کی دوستی قبول کرو۔ وہ بھول جاؤ جو ہو چکا ہے۔ تمہارے لئے مکمل انتظام کر لیا جائے گا۔ جوں ہی کام مکمل ہوا، ہم تمہیں لندن پہنچا دیں گے۔ باقی سب کچھ تمہاری مرضی پر ہو گا۔''
میں نے بجھے ہوئے انداز میں شیکر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور شیکر نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ میرے ساتھ ہی کمرے سے نکل آیا۔ ایک اور کمرے کے قریب پہنچ کر اس نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی فلمینا تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی۔ اس رات کے بعد وہ مجھے آج نظر آئی تھی۔
''فلی......! مسٹر شارق کے ساتھ رہ کر ان کا دل بہلاؤ۔ اب یہ دوستوں میں شامل ہو گئے ہیں۔''
''اوہ!...... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آیئے شارق صاحب!'' فلمینا نے آگے بڑھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور شیکر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فلمینا مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ بڑا خوب صورت کمرہ تھا، جو فلمینا کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ خوب صورت مجسمے، حسین پینٹنگز۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔
''اُداس کیوں ہو، ڈارلنگ؟'' اس نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس پر میرا دل خوش نہیں ہے فلمینا!'' میں نے کہا۔
''دل کے چکر میں مت پڑا کرو شارق! یہ ہمیں اُلٹے مشورے دیتا ہے۔ اس پاگل کو کیا معلوم کہ زندگی گزارنے کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کہو اپنا کام کرے اور ہمیں اپنا کام کرنے دے۔''
''تمہارے جذبات کتنے عرصے میں مُردہ ہوئے فلمینا؟'' میں نے پوچھا۔
''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولی۔
''ضمیر کو مُردہ کرنے میں تمہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں؟ مجھے بتاؤ۔ میں انہی مراحل سے گزر رہا ہوں۔'' میں نے کرب ناک آواز میں کہا۔ میری نگاہیں فلمینا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے اس کے چہرے میں تغیر دیکھا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے۔ دوسرے لمحہ وہ پُرسکون تھی۔ البتہ اس کے لہجے میں ایک عجیب سی گمبھیرتا آ گئی تھی۔
''ہاں...... ابتدا میں ضمیر نے مجھے بڑے کچوکے لگائے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ میں اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلانے میں کامیاب ہو گئی۔ زندگی گزارنے کے لئے اور بھی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ضرورت ضمیر کی لعنت و ملامت سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے میں نے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔
''کیا اب تمہارا ضمیر تمہیں لعنت و ملامت نہیں کرتا؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں...... اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
''تم مجھے ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتی ہو۔''
''کیسی باتیں کر رہے ہو، شارق! کیا تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحات جذبات سے خالی تھے؟''

''ہاں!'' میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''اس رات کے بعد تم روپوش ہو گئی تھیں۔ تم نے صرف اپنا فرض پورا کیا تھا جو تم نہ جانے کس کس طرح پورا کرتی ہو گی۔'' میں نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی اُبھر آئی۔ ''اُس رات کے بعد تم نے مجھے یاد کیا؟........ بتاؤ مجھے، کیا اس رات کے بعد تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی؟''

''نہیں........'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''یہ باتیں احمقانہ ہیں۔ کوئی اور بات کرو۔''

''ابھی زندہ ہو........ تڑپ رہی ہو........ مرنے کی کوشش کر رہی ہو، مری نہیں ہو........ مر جاؤ گی۔ یقیناً مر جاؤ گی۔ تم تک پہنچنے کے لئے ابھی مجھے بہت سے مراحل سے گزرنا ہو گا۔ میں یہ مراحل طے کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور جب میں بھی مر گیا، فلمینا! تو موت کے بعد تمہارے پاس ضرور آؤں گا! پھر ہم دونوں مل کر زندگی پر قہقہے لگائیں گے۔ زندگی ایک بیکار شے اور فریب، ایک دھوکا!'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

''موت کے وقت ایسی ہی چیخیں بلند ہوتی ہیں نا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے ایک طرف بڑھ گئی۔ ایک الماری سے اس نے دو گلاس اور ایک بوتل نکالی، ناپ کر شراب گلاسوں میں ڈالی اور میرے قریب آ گئی۔

''اسے پی لو........ تڑپ ختم ہو جائے گی۔ پی لو........ ہم دن کو رات بنا لیں گے۔ آؤ........ میرا جسم تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میں تمہارے ضمیر کی چیخوں کو سمیٹ لوں گی۔ اس کی آواز تمہارے کانوں تک نہ پہنچ سکے گی۔ آؤ........!'' اس نے کہا اور پھر میز سے شراب کا گلاس اٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

دن کو فلمینا........ رات کو سدھا، ایک ہندو لڑکی........ شرمائی شرمائی تھی، لیکن اپنے فن میں طاق۔ یہ چوتھی لڑکی بھی خوب تھی۔ میں نے شراب پی کر شیکر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ طالوت مُردہ باد کے نعرے لگائے اور پھر سدھا کے لمبے بالوں کو سینے پر پھیلا کر سو گیا۔ اور حسب معمول صبح ہو گئی۔ خالی خالی صبح........ جس کی روشنی میں ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہونے والا تھا۔

۞

لمبی سرخ اسپورٹس کار میں، میں داؤد رحمانی کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ سیاہ ڈاج اور پیلے رنگ کی ڈاٹسن آگے بڑھ گئی تھیں۔ ان دونوں کاروں نے میرا تعاقب کیا تھا۔ میرے جسم پر نفیس ترین سوٹ تھا۔ اور اس وقت میں انتہائی اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ پورٹیکو میں دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک تو نرگس کی کار تھی، جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دوسری کار ایک نیلے رنگ کی سیڈان تھی۔ میں نے ان دونوں کاروں کے قریب اپنی کار روک دی اور نیچے اُتر گیا۔ میرے لباس میں ایک ٹرانسمیٹر چھپا ہوا تھا، جس کے بارے میں مجھے بتا دیا گیا تھا۔ ٹرانسمیٹر آن تھا اور اس پر میری آواز سنی جا سکتی تھی۔

''فرمائیے جناب؟'' ایک ملازم نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''مِس نرگس کو میرا اسلام کہہ دو۔''

''آپ کا نام؟'' اُس نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

''شارق۔'' میں نے ایک شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

''تشریف لائیے۔'' ملازم نے کہا اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود نرگس کو اطلاع دینے اندر چلا گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے جو کام کرنا تھا، وہ سخت مشکل تھا۔ تاہم میں اسے کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں نگاہیں دوڑائیں، وہاں ایک ڈرائنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ میں پھرتی سے اُٹھا اور ڈرائنگ ٹیبل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے میں نے ایک سادہ کاغذ اٹھایا، اسے بے آواز تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ایک بال پوائنٹ بھی مجھے مل گیا تھا۔ دونوں چیزیں احتیاط سے جیب میں رکھنے کے بعد میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ نرگس آ گئی۔

''ہیلو مسٹر شارق!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہیلو مس نرگس! سب سے پہلے یہ بتائیے، آپ میرے ہاں گئی تھیں؟''

''ہاں گئی تو تھی۔ ظاہر ہے، آپ نے بلایا تھا۔ بس صفیہ اور عظمٰی کا مذاق مجھے ناگوار گزرا۔ انہوں نے واپسی پر میرا خوب مذاق بنایا تھا۔'' اس نے کسی قدر اُداس لہجے میں کہا۔

''میں بے حد شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت خواہ بھی۔ بدقسمت ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں آپ کے دل پر غلط تاثر قائم کر گیا۔ لیکن کچھ ایسی ہی مجبوری تھی کہ........''

''طارق صاحب بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ پوری کوٹھی سنسان پڑی تھی۔''

''بھائی جان ایک ضروری کام سے کینیڈا چلے گئے۔ ملازم ذلیل ہوتے ہیں۔ کم بختوں نے موقع

ایلو کریش کئے ہوں گے۔ اصل میں مجھے ایک اتنا ضروری کام پڑ گیا کہ اسی رات جانا پڑا۔ خیال تھا کہ صبح کو واپسی ہو جائے گی، لیکن آج آ سکا ہوں۔ بہر حال، مجھ سے جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا میں ازالہ نہیں کر سکتا...... ہاں! آپ جو سزا بھی تجویز کریں گی، میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"بس، میں تو آپ سے ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن آپ...... آپ اگر واقعی اتنے زیادہ مصروف ہو گئے تھے تو خیر......" نرگس کی مسکراہٹ واپس لوٹ آئی تھی۔

"آپ کی سہیلیاں کہاں ہیں؟"

"آج غائب ہیں۔ ڈیڈی بھی تھوڑی دیر قبل غیر ممالک کے دورے سے واپس آئے ہیں۔ چلئے، ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ آپ کے بھائی جان کب تک واپس آئیں گے؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے جواب دیا اور نرگس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"اور اگر آپ کے ڈیڈی ابھی واپس آئے ہیں تو پھر میں بڑا ناوقت آیا ہوں۔ وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔"

"ارے نہیں...... ڈیڈی آپ سے مل کر ناخوش نہیں ہوں گے۔ وہ بڑے دلچسپ انسان ہیں۔ تھکن وغیرہ کا خیال نہیں کرتے۔" نرگس نے کہا اور پھر وہ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رک گئی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں، ڈیڈی؟"

"آؤ بیٹے!...... کم اِن۔" اندر سے ایک نرم لیکن بھاری آواز سنائی دی۔ اور نرگس مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

"ہیلو......!" دوہرے جسم کے سنجیدہ شکل آدمی نے خوش اخلاقی سے میرا استقبال کیا۔

"یہی ہیں شارق صاحب، ڈیڈی! اس حیرت انگیز جیت کے محرک۔" نرگس نے تعارف کرایا اور داؤد رحمانی مسکرانے لگے۔ انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔

"کلب سے واپسی پر نرگس نے آپ کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کئے تھے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی، اس لئے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جس دن آپ تشریف لانے والے تھے، اسی دن جرمنی جانا پڑ گیا۔"

"جی...... مجھے معلوم ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، شارق صاحب! پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں...... عرصہ ہوا، تعلیم کو خیرباد کہہ چکا ہوں۔ بس، کچھ کاروبار ہے، جسے بھائی جان سنبھالے ہوئے ہیں۔ میں تو آزاد پھرتا ہوں۔"

"خوب، خوب...... ماشاء اللہ!...... اس دن کیا تماشہ تھا؟ یہ نرگس کلب والوں کو قلاش کر آئی تھی۔"

"جی ہاں۔ بس قوتِ ارادی کا ایک کرشمہ تھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تب تو پھر آپ حیرت انگیز قوتِ ارادی کے مالک ہیں مسٹر شارق! یعنی بے جان چیزوں کو بھی مطیع کر سکتے ہیں تو جانداروں کا کیا ٹھکانہ؟" داؤد رحمانی مسکراتے ہوئے بولے۔ میں بھی مسکرا کر رہ گیا۔

"بہر حال، بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ کیا آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی؟"

”جی ہاں، ضرور۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نرگس! اپنے مہمان کی خاطر مدارات کرو۔“ وہ بولے اور نرگس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
”آیئے شارق صاحب! میں آپ کو کوٹھی دکھاؤں۔“
”چلئے۔“ میں تیار ہو گیا۔
نرگس مجھے کوٹھی کے خوب صورت حصے دکھاتی رہی اور میرے ذہن میں کھچڑی پکتی رہی۔ پچھلی چار راتیں، چار لڑکیوں کے ساتھ گزر چکی تھیں۔ چاروں ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھیں، انہوں نے اپنی محبت، اپنی چاہت، اپنی وارفتگی، اپنی نسائیت مکمل طور سے میرے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے مجھے زندگی کی تمام لذتیں بخشی تھیں۔ ایسی شکل میں مجھے نرگس کی پروا تو نہ ہونی چاہئے تھی۔ لیکن نہ جانے فطرت انسانی کیا ہے، اسے پوشیدہ رازوں کا تجسس کیوں ہے۔ نرگس کی کشش اب بھی برقرار تھی۔ اس کی محبت میں ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہو رہا تھا اور دل میں اس کے لئے وہی جذبۂ ہمدردی و محبت موجود تھا۔
”آیئے شارق صاحب! چائے تیار ہو چکی ہو گی۔“ کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔
”میں ذرا باتھ روم تک جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”اوہ.......آیئے!“ اس نے کہا اور پھر وہ مجھے ایک کمرے کے باتھ روم کے دروازے پر چھوڑ گئی۔
میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور پھر پھرتی سے کاغذ اور بال پوائنٹ نکال لیا۔ کاغذ کو ایک شیشے کے کارنس پر رکھ کر میں نے اس پر لکھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر میں واش بیسن کا نل کھول رہا تھا، تاکہ پانی کی آواز ٹرانسمیٹر کے ذریعہ پہنچتی رہے۔ میں نے داؤد رحمانی کے نام رقعہ لکھا۔

”محترم رحمانی صاحب!
میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ مس نرگس سے ملاقات اتفاقیہ تھی۔ لیکن اس ملاقات کے بعد چند لوگوں نے مجھے اغواء کر لیا۔ انہوں نے مجھے شدید اذیتیں دیں، جن کے نشانات میرے بدن پر موجود ہیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں نرگس رحمانی کو اپنی محبت کے جال میں پھانس کر کسی ایسی جگہ لے جاؤں، جہاں سے وہ انہیں اغوا کر سکیں۔ اس کے لئے آپ سے دس کروڑ کا مطالبہ کیا جائے گا اور اگر آپ نے وہ رقم ادا نہ کی تو نرگس رحمانی کو مڈل ایسٹ میں فروخت کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مجھے ڈھائی کروڑ روپے کی پیشکش بھی کی ہے۔ براہِ کرم میری بات کو کسی قسم کا فراڈ نہ سمجھیں۔ وہ لوگ بے حد چالاک اور خطرناک ہیں۔ اپنی بچی کی حفاظت کریں۔ میرے لباس میں ایک ٹرانسمیٹر موجود ہے، جس پر وہ لوگ ایک ایک بات سن رہے ہیں۔ داؤد صاحب! میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ زندگی میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ آپ کی بچی کے لئے زندگی کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ میری قربانی رائیگاں جائے۔ کل میں پھر نرگس سے ملاقات کرنے آؤں گا۔ اس دوران آپ نے جو حل سوچا ہو، ایک پرچے پر لکھ کر مجھے دکھا دیں۔ اس بات کو یاد رکھیں کہ اگر یہ کام میرے ذریعہ انجام نہ پا سکا تو وہ کوئی اور ذریعہ اپنائیں گے۔ بس انہیں موقع نہیں مل سکا ہے........خادم........شارق۔“

پرچہ لکھ کر میں نے اس پر ایک نگاہ دوڑائی اور پھر اسے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد تل بند کر کے میں باہر نکل آیا۔ نرگس میری منتظر تھی۔ ہم دونوں ایک کمرے میں پہنچ گئے، جہاں چائے کا پُرتکلف انتظام کیا گیا تھا، جس میں داؤد صاحب نہیں تھے۔

چائے کے دوران نرگس سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، پھر اس کی سہیلیوں کی بات نکل آئی۔

''شیطان صفت لڑکیاں ہیں....... آج موجود نہیں ہیں، ورنہ ناک میں دم کر دیتیں۔ اس دن ہی آپ نے دیکھا تھا۔''

''ہاں.......!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ ''کلب گئی تھیں آپ؟''

''باقاعدہ نہیں جاتی۔ کبھی کبھی جاتی ہوں۔''

''کل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آپ ساتھ ہوں تو کیا حرج ہے؟....... چلئے، کل پھر لوگوں کی جیبیں خالی کرائی جائیں۔''

''ضرور!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ نرگس کے انداز سے اظہار ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے متاثر ہے۔ پھر میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی۔

''تو پھر کل کا پروگرام طے؟''

''یقیناً۔''

''آپ کو پھر کوئی ضروری کام تو یاد نہیں آجائے گا؟''

''آپ کو شرمندہ کرنے کا حق ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں....... میں نے مذاق کیا تھا۔ محسوس نہ کریں۔''

''آیئے....... آپ کے ڈیڈی سے اجازت لے لوں۔'' میں نے کہا اور پھر میں اس کے ساتھ لائبریری میں پہنچ گیا۔ جہاں مسٹر داؤد رحمانی ایک آرام کرسی پر نیم دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے کتاب میں نشانی رکھی اور مسکراتے ہوئے ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔

''اجازت دیجئے انکل!....... پھر حاضر ہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا بھئی، خدا حافظ!....... آتے رہا کرو۔''

''ڈیڈی! کل میں شارق صاحب کے ساتھ کلب جاؤں گی۔''

''ضرور بیٹے!....... اچھا شارق صاحب!'' داؤد رحمانی نے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس دوران میں نے صفائی سے پرچہ نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور پھر مصافحے کے ساتھ ہی میں نے پرچہ رحمانی صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نرگس میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ داؤد رحمانی نے حیرت سے میری شکل دیکھی اور میں نے آنکھ دبا دی۔ پھر تیزی سے مڑا۔

''خدا حافظ!....... آیئے نرگس صاحبہ!'' اور میں نرگس کو لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ نرگس مجھے میری اسپورٹس تک چھوڑنے آئی اور میں اسے بھی خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔ وہاں سے میں سیدھا ربراسکوائر آیا اور اسپورٹس اسی عمارت میں داخل ہوگئی۔

عمارت کے برآمدے میں ہی شیکر نے میرا استقبال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

''ویری گڈ، مسٹر شارق!........ بہرحال تم ایک بااصول انسان ہو۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور شیکر میرے ساتھ اندر تک آیا۔ پھر اس نے مجھے ایک کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔

''بیٹھو!'' اس نے کہا اور میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے خوشی ہے، مسٹر شارق! تم نے حسب وعدہ کام کیا ہے۔ اس سے فارغ ہو جاؤ، اس کے بعد بات کریں گے۔ تم یقیناً ایک شریف نوجوان ہو، لیکن میرے دوست! شرافت آج کل کی دنیا میں ایک بے کار شے سمجھی جاتی ہے۔ کوئی اس کی قدر نہیں کرتا۔ پھر اس بے کار شے کو کیوں اپنایا جائے؟ بہرحال! کام کے بعد بھی تم اگر چاہو تو ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔ آئندہ زندگی پر غور کر سکتے ہو۔ ویسے اندازہ ہوا کہ تم بھی خاصے دولت مند انسان ہو........ کیا کاروبار ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے بھائی لیدر کا کام کرتے ہیں۔ ہم ملکی چمڑا ایکسپورٹ کرتے ہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''بہرحال........ کوئی بھی کاروبار اس کاروبار سے زیادہ منافع بخش نہ ہوگا۔ لیکن خیر........ یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ ہاں، کل کا کیا پروگرام رہے گا؟''

''میں نے اسے کلب چلنے پر آمادہ کر لیا ہے۔''

''تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا گیا ہے۔'' شیکر نے جواب دیا۔

''بس........ پروگرام تم طے کرو۔'' میں نے کہا۔

''طے کیا جا چکا ہے۔'' شیکر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم کلب جاؤ گے۔ وہاں کی تفریحات میں مصروف رہو گے۔ ہمارے آدمی نگرانی کرتے رہیں گے۔ ظاہر ہے، وہ تمہاری کار میں ہو گی۔ واپسی پر تم ہی اسے چھوڑنے جاؤ گے۔ راستے میں ہمارے آدمی تمہیں روکیں گے اور تم کار روک لو گے۔ بس، اسے اغوا کر لیا جائے گا۔ کوئی ترمیم........؟'' اس نے پوچھا۔

''تم نے مناسب ہی سوچا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''بس........ آرام کرو۔ لی کا تمہاری منتظر ہو گی۔ آج ایک غیر ملکی لڑکی تمہاری خدمت کرے گی۔ اس بات پر غور کر لو، اگر تم ہمارے ساتھ پندرہ برس تک کام کرتے رہے، تب بھی ہر رات نئی لڑکی........ پوری دنیا کا منتخب حُسن........ یہ شیکر کا وعدہ ہے۔''

اور درحقیقت لی کا میری خواب گاہ میں موجود تھی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب میں خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہ میری مسہری پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ پھول دار گاؤن میں ملبوس........ چھوٹے سے قد کی جاپانی حسینہ.... جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے حد پُرکشش تھیں۔ جس کے چہرے کی سانولاہٹ انتہائی دلکش تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے گردن جھکاتے ہوئے جاپانی زبان میں مجھ سے کچھ کہا۔

''انگلش سمجھتی ہو؟'' میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

"تھوڑا تھوڑا......." اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ لیکن اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ ایک رات کی مہمان تھی اور اپنا فرض ادا کرنے میں اسے کسی زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسری صبح حسب معمول تھی۔ لیکا کا کوئی وجود نہیں تھا۔ البتہ اس کی مسکراہٹیں کمرے کے مختلف کونوں میں جگمگا رہی تھیں۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ بڑی دلکش زندگی تھی۔ تفکرات سے عاری۔ لیکن میں بُرا آدمی نہیں ہوں....... مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ ہاں، مجھے یہ زندگی پسند نہیں تھی۔ میں کسی ایک مسکراہٹ کو اپنانا چاہتا تھا۔ آخر میرے سینے میں دل تھا۔ اس میں محبت کا جذبہ تھا۔ میں کس سے محبت کروں؟....... کسے چاہوں؟

باتھ روم میں بھی میں یہی سوچتا رہا۔ ناشتے کی میز پر بھی یہی۔ اور پورا دن اسی خیال میں گزرا۔ پانچ راتیں....... پانچ لڑکیاں۔ ہر ایک لڑکی محبت سے پیش آنے والی....... یادیں چھوڑ جانے والی۔ کس کس کو یاد رکھوں؟....... وہ تو ایک خواب کی طرح آتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ خواب بڑے پُرکشش ہوتے ہیں۔ لیکن صبح کیسی ویران ہوتی ہے!

پھر نرگس کے پاس جانے کا وقت نزدیک آنے لگا۔ فلمینا میرے پاس آئی۔ وہ میرے لئے نیا سوٹ لائی تھی۔ میں نے شیو کر کے لباس تبدیل کیا۔ فلمینا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس وقت فلمینا کی آنکھوں سے چھپی ہوئی عورت نے جھانکا تھا۔ انسان کچھ بھی بن جائے، زندگی میں چند لمحات ایسے ضرور آتے ہیں، جب وہ صرف حقیقت ہوتا ہے۔

بہرحال، ممکن ہے فلمینا سے معذرت کا موقع ہی نہ ملے۔ ممکن ہے، آج کی رات میں کسی آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوں۔ ڈاکٹر میرے جسم سے گولیاں نکال رہے ہوں....... یا پھر میرا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں۔ میں نرگس کے لئے زندگی دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور میرے ارادوں میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر داؤد رحمانی، نرگس کی حفاظت میں ناکام رہا تو پھر میں کھل جاؤں گا۔ میں وہ سب کروں گا، جو میرے اختیار میں ہوگا۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس حالات کے تحت کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا!

باہر نکلا تو شیکر سے ملاقات ہو گئی۔ "اوکے مسٹر شارق! وقت ہو گیا ہے۔ سخت ہوشیاری سے۔"

"بے فکر رہو....... میں اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے کروں گا۔" میں نے کہا اور میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی، جسے شیکر نے محسوس نہیں کیا تھا۔ اور پھر میں سرخ اسپورٹس میں چل پڑا۔ راستے بھر میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آتے رہے۔ ان میں طالوت کا خیال بھی تھا۔

طالوت میرا دوست....... جس سے مجھے اُنسیت بھی ہو گئی تھی اور جس کی اس طرح گمشدگی نے میرا دل توڑ دیا تھا اور جواب میرا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ شاید اپنی دنیا میں....... نہ جانے کیوں.......؟

یہاں تک کہ داؤد رحمانی کی کوٹھی آ گئی۔ ملازموں نے مجھے دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور میری کار پورٹیکو میں داخل ہو گئی۔ شاید کار کی آواز سن کر ہی نرگس رحمانی اور داؤد رحمانی باہر نکل آئے تھے۔ نرگس نے تو حسب معمول مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ داؤد رحمانی نے بھی استقبالیہ کلمات کہے۔ ویسے ان

کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
"آؤ بھئی .... یہ نرگس تو بڑی بے چینی سے تمہاری منتظر تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ تم آ جاؤ تو مجھے بھی چائے ملے۔" داؤد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
دلچسپ باتوں کے دوران ہم چائے کی میز پر پہنچ گئے۔ چائے کے دوران داؤد صاحب مجھ سے میرے خاندانی حالات پوچھتے رہے اور میں انہیں اُلٹی سیدھی باتیں بتانے لگا۔ پھر چائے کے بعد انہوں نے کہا۔ "آؤ، شارق میاں! ہم دونوں گفتگو کریں۔ جب تک نرگس لباس وغیرہ تبدیل کرلے گی۔ کیوں نرگس؟"

"ہاں ڈیڈی! بس تھوڑی دیر کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔" نرگس نے کہا اور داؤد صاحب مجھے لئے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔
"بیٹھو!" انہوں نے کہا اور میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ داؤد صاحب نے ایک پیڈ اور قلم میری طرف بڑھا دیا اور دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا، پھر وہ بولے۔
"شارق میاں! میں تم سے نرگس کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے پیڈ پر لکھا۔
"میں نے تمہارا کل کا خط پڑھ لیا ہے۔ تمہاری شرافت کا ممنون ہوں، بیٹے! کیا آج پروگرام ہے؟....... اگر ہے تو کیا ہے؟" اور انہوں نے پیڈ میری طرف بڑھا دیا۔
"فرمایئے....... میں حاضر ہوں۔" میں نے کہا اور جواب میں پیڈ پر لکھا۔
"اُن کا قیام ربر اسکوائر کی عمارت نمبر ایک سو بارہ میں ہے۔ یہاں تک میرا تعاقب کیا گیا ہے۔ ان کے بہت سے لوگ ہمارے پیچھے ہوں گے۔ سخت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"
"دراصل......." داؤد صاحب ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "نرگس کی ماں نہیں ہے....... اسے میری ایک عزیز عورت نے پالا ہے۔ بڑی حساس اور نازک طبع لڑکی ہے۔ میں اُس کے کردار سے مطمئن ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے پیڈ پر لکھا۔
"بے فکر رہو....... میں نے انتظامات کر لئے ہیں۔ تمہارے کلب روانہ ہوتے ہی خفیہ پولیس کے لوگ تمہاری نگرانی کریں گے۔ کیا اغوا کا پروگرام کلب سے واپسی پر ہے؟"
"میں کیا عرض کرسکتا ہوں؟" میں نے خجل انداز میں کہا اور پیڈ پر لکھ دیا۔
"جی ہاں.......!"
"بہرحال، میں نے یہی محسوس کیا ہے۔ میں فراخ دل انسان ہوں اور کسی پاک جذبے پر پابندیاں لگانے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو میں تمہیں یکجا کرسکتا ہوں۔ اس کے لئے تمہیں وہی سب کچھ کرنا ہوگا، جو رائج زمانہ ہے۔" انہوں نے کہا اور پیڈ پر لکھا۔
"جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔ جس وقت تم لوگ عمارت میں داخل ہو جاؤ گے، اس وقت پولیس ریڈ کرے گی، تاکہ تمام مجرموں کو پکڑا جاسکے۔ میں نے ڈی آئی جی سے بات کی ہے، وہ بذاتِ خود اس ریڈ کی نگرانی کریں گے۔ تمہارے روانہ ہوتے ہی میں پولیس کو اس عمارت سے آگاہ کردوں گا اور جب

تک تم کلب میں رہو گے، پولیس وہاں اپنا کام مکمل کر لے گی۔ ہاں، نرگس کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ اس عمارت میں تم اس کی حفاظت کرو گے، جس کے لئے میں تمہیں اپنا پستول دوں گا۔"

"بھائی جان کی واپسی پر میں انہیں آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔ وہ میرے بڑے ہیں۔ میں آپ سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ نرگس کو میری ذات سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔" میں نے کہا اور پیڈ پر لکھا۔

"آپ اطمینان رکھیں، بس نرگس پر میری موت کے بعد ہی آنچ آسکتی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے....... مجھے تم دونوں کے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تمہارے بھائی کی آمد کا انتظار کروں گا۔" داؤد صاحب نے کہا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لکھا۔

"ٹھیک ہے....... میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

اور پھر وہ بولے۔ "آؤ....... میرا خیال ہے، وہ لباس بدل چکی ہوگی۔"

میں نے کرسی کھسکائی اور کھڑا ہو گیا۔ تب داؤد صاحب نے ایک الماری سے ایک آٹومیٹک پستول اور چند راؤنڈ مجھے دیئے، جنہیں میں نے احتیاط سے لباس میں چھپا لیا اور ہم دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ نرگس ہمیں دروازے سے چند قدم دُور ملی۔ داؤد رحمانی نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم باہر نکل آئے۔

میں نے کار اسٹارٹ کی، نرگس میرے برابر آبیٹھی اور ہم باہر نکل آئے۔

"ڈیڈی سے کیا گفتگو رہی؟" راستے میں اس نے پوچھا۔

"آپ کے ڈیڈی بے حد نیک، نفیس انسان ہیں، نرگس صاحبہ! میرا خیال ہے، وہ آپ سے بھی گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد ہی ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی گفتگو بتائیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رحمانی صاحب کی ہوشیاری کی وجہ سے مجھے کافی ڈھارس ہو گئی تھی اور اب میں اتنا پریشان نہیں تھا۔

نرگس خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم کلب پہنچ گئے۔ کلب کی تفریحات حسب معمول تھیں۔ ویسے اس دوران میں نے شکیر کے بہت سے ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ چند افراد کلب میں بھی موجود تھے، جو سب کے سب میرے صورت آشنا تھے۔ لیکن وہ مجھ سے بے تعلق اپنی تفریحات میں گم تھے۔ بظاہر کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی، لیکن میں جانتا تھا، نہ جانے کتنی آنکھیں میری نگرانی کر رہی ہوں گی۔ تاہم جس انداز میں بھی وقت گزرے، مجھے گیارہ بجانے تھے۔

"اوہ....... گیارہ بج گئے۔ میرا خیال ہے، اب واپسی مناسب ہے۔"

"ہاں....... وقت کا تو پتہ ہی نہیں چلا۔" نرگس نے میری تائید کی۔

"آؤ چلیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں کلب سے نکل آئے۔ میں نے اپنی نگرانی کرنے والوں کو سمٹتے دیکھا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اگر رات کا وقت نہ ہوتا تو کوئی بھی میری اس وقت کی کیفیت سے مشکوک ہو سکتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ نرگس خاموش تھی لیکن یہ خاموشی طویل ہو گئی تو اس نے کہا۔

"کس سوچ میں گم ہیں، شارق صاحب؟"

"ہیں......." میں چونک پڑا۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر بات بنائی۔ "کچھ نہیں، نرگس صاحبہ! میں اپنے اور آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور نرگس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ میری اس سوچ کی

کرید کرے۔ بات ہی ایسی تھی۔ ہاں، وہ میری طرف سے کچھ بولنے کی منتظر تھی۔
''کب ملاقات ہوگی؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔
''ملاقات.......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کون جانے، کب اور کہاں؟''
''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولی۔
''تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے بات کی ہے، نرگس! وہ تمہیں اور مجھے یکجا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں انہوں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا ہے؟''
نرگس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ وہ کوشش کے باوجود اس سوال کا جواب نہ دے سکی اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر وہ مجھ سے محبت کا اقرار کر لیتی تو نہ جانے بعد میں میرے دل پر کیا بیتتی۔ میں نے بھی اس سوال کے جواب کے لئے اصرار نہ کیا۔ اور پھر ایک سنسان سڑک سے گزرتے ہوئے دھندلائی ہوئی روشنی میں دو آدمی ہاتھ اُٹھائے کھڑے نظر آئے۔
میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کار کی رفتار سست کر دی۔
''کیا بات ہے؟'' نرگس نے سڑک پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سچ سچ میرے دل کی حالت عجیب ہوگئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ کار آہستہ آہستہ ان لوگوں کے قریب پہنچ کر رک گئی۔
''ہماری گاڑی کا پٹرول ختم ہوگیا ہے، جناب!....... ازراہِ کرم کیا آپ ہمیں تھوڑا سا پٹرول دے دیں گے؟ بس اتنا کہ ہماری گاڑی کسی پٹرول پمپ تک پہنچ سکے۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور پھر دوسرے لمحے اس نے پستول کی نال میری کنپٹی پر رکھ دی۔
حالانکہ پورا پروگرام مجھے معلوم تھا، لیکن پھر بھی میں چونک پڑا۔ دوسرا آدمی اُچھل کر میری گاڑی میں سوار ہوگیا تھا۔ اس نے نرگس کو بھینچ کر اس کا منہ بند کر لیا۔
''چیخنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دیا جائے گا۔'' وہ سفاک لہجے میں بولا اور نرگس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
''چلو.......کار آگے بڑھاؤ۔'' دوسرا بھی کود کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میری نگاہیں کسی دوسری کار کی روشنیاں تلاش کر رہی تھیں۔ دوسری کار جو پولیس کی ہو....... نہ معلوم پولیس کامیابی سے ہمارے اوپر نگاہ رکھے ہوئے تھی یا ناکام ہوگئی تھی۔ مجھے دُور دُور تک کوئی تحریک نہ محسوس ہوئی۔ بہر حال، سخت ذہنی انتشار کے عالم میں، میں ربر اسکوائر میں داخل ہوگیا اور پھر بنگلہ نمبر ایک سو بارہ کے پورٹیکو میں، میں نے کار روک دی۔
یہاں شیکر دوسرے کچھ لوگوں کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے نرگس کو کار سے اتارا اور شیکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''تھینک یو، مسٹر شارق! آپ نے ہمارے دیرینہ خواب کی تکمیل کر دی۔ اب یہ سونے کی چڑیا، سونے کے انڈے دے گی۔'' اس نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھی نرگس کو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں نے نرگس کی آنکھوں میں شدید حیرت کے آثار دیکھے۔ اور یہ حیرت میرے دل پر نقش ہوگئی۔ ذلیل شیکر کو نرگس کے سامنے یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔

دونوں آدمی نرگس کو لئے ہو ونہ جانے کہاں چلے گئے۔ شیکر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اس تعاون کے لئے میں شکر گزار ہوں۔ میں نے تم سے جو وعدے کئے ہیں، وہ ضرور پورے کروں گا۔"
"میرا خیال ہے، تم نے اس کے سامنے میرا شکریہ ادا کر کے اچھا نہیں کیا ہے۔" میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔
"کیوں......اس میں کیا حرج تھا؟" اس نے پوچھا۔
"بس......میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے مجبور سمجھتی اور سوچتی کہ میں بھی تم لوگوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ اور یہی حقیقت بھی ہے۔"
"مجھے حیرت ہے......اتنی حسین لڑکیاں تمہارے دل سے اس لڑکی کا خیال ختم نہیں کر سکیں۔ آخر اس میں ایسی کیا خصوصیت ہے؟"
"تم نہ سمجھ سکو گے، شیکر! بہر حال میں نے تمہارے سامنے کچھ شرائط رکھی تھیں۔"
"دوہراؤ۔" شیکر نے کہا۔
"اسے یہاں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس وقت تک، جب تک اس کے باپ سے فیصلہ کن گفتگو نہ ہو جائے۔"
"مجھے یاد ہے۔" شیکر نے کہا۔
"میں اس کی نگرانی کروں گا۔ مجھے اس کی اجازت دی جائے۔"
"چلو منظور......میں تمہیں بد دل نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔ تم نے میری مدد کی ہے، میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا۔" شیکر نے کہا اور پھر مجھے ساتھ لئے ہوئے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جہاں نرگس کو رکھا گیا تھا۔ نرگس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، سکتے کے عالم میں اور شیکر کے دونوں ساتھی اس سے تھوڑی دُور کھڑے تھے۔
"ہیلو مس رحمانی! ہم آپ کو اس غریب خانے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔" شیکر نے کہا۔ "فکر مند نہ ہوں۔ آپ کے دوست مسٹر شارق یہاں آپ کی نگرانی کریں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اگر آپ کے ڈیڈی نے ہماری مطلوبہ رقم ادا کر دی تو ہم آپ کو باعزت واپس پہنچا دیں گے۔ ہاں، دوسری شکل میں کچھ اور فیصلے ہوں گے۔ بہر حال فی الحال آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، مسٹر شارق! آپ ان کی نگرانی کریں اور ان کی ضروریات پوری کرتے رہیں۔ آؤ......" شیکر نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا اور پھر وہ تینوں باہر نکل گئے۔
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور نرگس کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کی بے جان مورتی کی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔
"نرگس......!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی اور اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ آہ!......بڑا غم تھا، ان آنکھوں میں۔ میں اس کیفیت کو الفاظ میں نہیں ڈھال سکتا۔ ہاں، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ کئی منٹ تک میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا، پھر ہمت کر کے بولا۔ "فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے نرگس!......میری زندگی میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔"

اُس نے جلتی ہوئی نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان نگاہوں میں نفرت کے آثار تھے۔ پھر اُس کے منہ سے حقارت آمیز آواز نکلی۔

''اب...... اب اور بے وقوف بناؤ گے؟...... کیا...... کیا تم بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہو؟''

''ہاں نرگس!...... حالات نے مجھے ان کا ساتھی بنا دیا ہے۔ لیکن میرا دل تمہارے ساتھ ہے۔ میرا دل......'' میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور شیکر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔

''تو تم نے غداری کی ہے، شارق!'' وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے سنبھل کر پوچھا۔

''پولیس نے چاروں طرف سے بنگلہ گھیر لیا ہے۔ اب وہ اندر داخل ہو رہی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پہ وارننگ دی گئی ہے کہ ہم خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے شیکر!...... میری ایک ایک حرکت تمہارے علم میں ہے۔ اس میں غداری کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم بہت چالاک ہو۔ کوئی ترکیب کر گئے...... ورنہ...... اتنی جلدی، اس منظم انداز میں پولیس یہاں کیسے پہنچ سکتی تھی؟ بہرحال اب ایک ہی ذریعہ ہے۔ اس لڑکی کو ڈھال بنا کر نکل جایا جائے۔ چلو...... اس طرف آؤ۔'' شیکر نے نرگس سے کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا، شیکر!...... تم نے وعدہ کیا ہے کہ اسے......''

''بکواس مت کرو، وعدے کے بچے!...... ہماری زندگی خطرے میں ہے۔'' شیکر آگے بڑھا اور دوسرے لمحے میں نے پستول نکال لیا۔

''آج کارڈ میرے ہاتھ میں ہے، شیکر! باہر نکل جاؤ۔ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ دوسرے لمحے شیکر کے ایک ساتھی نے پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن میرے پستول کی گولی نے اس کے سر کے چیتھڑے اُڑا دیئے۔ اُس کی دلخراش چیخ گونجی اور شیکر منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''چلو...... باہر نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارا حشر بھی اس سے مختلف نہ ہوگا۔'' میں نے پستول سے شیکر کا نشانہ لیتے ہوئے کہا اور شیکر اور اس کے ساتھی نے ہاتھ بلند کر دیئے۔ پھر وہ دروازے کی طرف مڑا اور دروازے سے نکل گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی میں نے جھپٹ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر نرگس کو لے کر دیوار کی آڑ میں ہو گیا تاکہ شیکر اور اس کے ساتھی پستول سے گولیاں چلائیں تو ہم نشانہ نہ بن سکیں۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ دھائیں دھائیں کی آواز کے ساتھ ہی دروازے میں کئی سوراخ ہو گئے تھے۔ لیکن ہم لوگ محفوظ تھے۔ نرگس پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے میں پڑی ہوئی لاش دیکھ رہی تھی اور میں ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ باہر اب باقاعدہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ اس فائرنگ کے دوران کبھی کبھی چیخیں بھی لہرا جاتی تھیں۔ لیکن اب ہماری طرف کسی نے رُخ نہیں کیا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک سخت مقابلہ ہوتا رہا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ باہر بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بھاری جوتوں کی آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ پولیس والے ہو سکتے ہیں۔

”اگر کوئی ہے تو ہاتھ اُٹھائے سامنے آ جائے......ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔“ ایک آواز گونجی۔اور پھر ایک آواز سنائی دی۔

”نرگس!......نرگس بیٹی!“ یہ داؤد صاحب کی آواز تھی۔نرگس اُچھل پڑی۔

”آؤ نرگس....!“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔کئی پولیس والے میرے سامنے تھے۔ان میں سے ایک نے مجھے دیکھتے ہی للکارا۔

”خبردار!...... ہاتھ بلند کر دو......ورنہ......“

”نہیں، نہیں...... وہ شارق ہے۔نرگس میری بچی!“ داؤد صاحب کی آواز اُبھری اور پھر بہت سے لوگ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ڈی آئی جی صاحب نے بنفسِ نفیس اس ریڈ کو کمان کیا تھا۔وہ بھی موجود تھے۔داؤد صاحب کے ساتھ وہ بھی میرے نزدیک آ گئے۔

”یہی ہیں شارق؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں...... یہی ہے وہ دلیر انسان، جس نے میری بچی کی زندگی بچائی ہے۔“ داؤد صاحب نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں ڈیڈی! یہ...... یہ ان کا ساتھی ہے۔“ نرگس، داؤد صاحب سے چمٹ کر بولی۔

”ایسا نہ کہو بیٹے! یہ ہم سب کا محسن ہے۔اس نے ہمارے اور ملک کے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔“ داؤد صاحب جلدی سے بولے اور نرگس کی آنکھوں میں حیرانی اُمڈ آئی۔

زندہ گرفتار ہونے والوں کو ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔لاشیں جمع کی جا رہی تھیں۔باہر ایمبولینسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔پھر مجرموں کو گاڑیوں میں بھر کر پولیس ہیڈ آفس لے جایا گیا۔ڈی آئی جی نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔میرا بیان لیا جانے والا تھا۔نرگس کو اس کے ڈیڈی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

پولیس ہیڈ آفس میں ڈی آئی جی میرے ساتھ خصوصی مہربانی سے پیش آ رہے تھے۔میرا مکمل بیان لکھا گیا اور پھر مجھ سے مجرموں کی شناخت کرائی گئی۔لیکن زندہ لوگوں میں شیکر موجود نہ تھا۔تب ہم لاشوں کو دیکھنے گئے اور شیکر ان لاشوں میں بھی نہیں تھا۔

”وہ نہیں ہے۔“

”اوہ.....لیکن.....بنگلے میں تو اور کوئی لاش بھی نہیں رہ گئی۔ایک ایک کمرے کو چھان مارا گیا ہے۔“

”تب وہ نکل گیا۔“

”حیرت ہے۔بہرحال، بچ کر کہاں جائے گا؟ ہم اسے قبر سے بھی کھود نکالیں گے۔بس تعجب ہے، آخر وہ کس طرف سے نکل گیا۔“ ڈی آئی جی نے کہا اور پھر ایک ایس پی کو بلا کر ہدایت کی کہ شیکر کو تلاش کیا جائے۔پتہ لگایا جائے کہ وہ کہاں سے نکل گیا۔پھر ڈی آئی جی مجھ سے بولے۔

”آپ کو بے حد تکلیف اُٹھانی پڑی ہے، مسٹر شارق! بہرحال ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔اب آپ آرام کریں۔مسٹر ہارون! آپ مسٹر شارق کو داؤد صاحب کے مکان پر پہنچا دیں۔“

”وہاں جا کر کیا کروں گا؟...... میں اپنے گھر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”اوہ...... میرا خیال ہے، آپ داؤد صاحب کے پاس جائیں۔وہ کہہ گئے تھے کہ آپ کو یہاں

سے فارغ کر کے ان کی کوٹھی پر پہنچا دیا جائے۔'' ڈی آئی جی نے کہا اور میں نے شانے ہلا دیئے۔ پھر میں ڈی آئی جی کے کمرے سے نکل آیا۔ انسپکٹر ہارون میرے ساتھ تھے۔ باہر میری بہت سی تصاویر کھینچی گئیں اور پھر انسپکٹر ہارون مجھے ایک جیپ میں لے کر چل پڑے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم داؤد صاحب کی کوٹھی پر تھے۔ داؤد صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی میں جیپ سے اُترا، انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے مجھے اندر لے گئے۔

''نرگس کو میں نے خواب آور انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔ اس کے ذہن پر گہرا اثر تھا۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر وہ مجھے لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

''شارق بیٹے!........ تم نے ہم دونوں باپ بیٹی پر جو احسان کیا ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمہیں اس کا صلہ دینے کی کوشش کروں گا۔''

''میں نے کسی صلے کے لئے یہ سب کچھ نہیں کیا ہے جناب!'' میں نے جواب دیا اور داؤد صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر گھڑی دیکھ کر بولے۔

''اوہ........ پونے چار بج رہے ہیں........ رات تو خراب ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ آؤ........ میں تمہیں کمرے میں پہنچا دوں۔'' اور میں ان کے ساتھ اُٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں کمرے میں تھا اور وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

میرا جسم و ذہن تھکن سے چور تھا۔ نیند کا غلبہ بھی تھا۔ بمشکل تمام صرف جوتے اُتارے اور پھر مسہری پر دراز ہو گیا۔ ذہن تھا کہ پھٹا جا رہا تھا، آنکھیں جل رہی تھیں، لیکن نیند غائب تھی۔ پولیس ہیڈ آفس میں، میں نے فلمینا، جینی، لی کا اور دوسری لڑکیوں کو قیدیوں کے ساتھ گردن جھکائے بیٹھے دیکھا۔ اُن کے بارے میں، میں فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ اُن سے ہمدردی کروں، اُن کی گرفتاری پر افسوس کروں یا انہیں نظر انداز کر دوں؟........ اور اب........ اب جبکہ یہ ڈرامہ ختم ہو چکا ہے، خود میرا کیا بنے گا؟........ زندگی کس انداز میں گزرے گی۔ اب تو میں تنہا ہوں........ طالوت بھی موجود نہیں ہے۔

طالوت!........ کہاں چلے گئے میرے دوست؟........ اس طرح منجدھار میں چھوڑ دینا تھا تو میری زندگی میں آئے کیوں تھے؟........ تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، طالوت!........ اور میرا دل طالوت کے لئے تڑپتا رہا۔ پھر میں اسے بھول کر نرگس میں کھو گیا۔ نرگس کی غلط فہمی یقیناً دُور ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس کا کیا رویہ ہو گا........؟

کیا درحقیقت اس کے ساتھ ایک انوکھی زندگی گزاری جا سکتی ہے؟........ لیکن اچانک ایک اور خوف ناک سوال سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں وہ نہیں ہوں، جو وہ سمجھتے ہیں۔ میں نے ان سے اپنے بارے میں جھوٹ بولا ہے۔ کیا میری اصلیت سے واقف ہو کر بھی وہ میرے اوپر اس قدر مہربان رہ سکتے ہیں؟ سب کچھ غلط ہے۔ نرگس جس حیثیت سے مجھ سے متاثر ہوئی تھی، اب وہ حیثیت بھی باقی نہیں رہی۔ اب تو میں صرف عارف تھا۔ صرف عارف۔ ایک مفرور قیدی۔ نہ جانے کون کون سے جھگڑے تھے، ان کا فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ پھٹتے ہوئے دماغ کو فوری سکون دینے کی صرف ایک صورت تھی، سونے کی کوشش کروں۔ اور پھر اس کوشش میں کامیابی نصیب ہو گئی۔ نیند نے ایک مہربان ماں کی

طرح مجھے اپنی آغوش میں لے کر تمام تفکرات سمیٹ لئے اور ماں کی گود میں سکون ہوتا ہے۔

دوسرے دن گیارہ بجے آنکھ کھلی تھی۔ جسم بھاری ہو رہا تھا۔ ملحقہ باتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی کے نیچے خوب نہایا۔ نہانے سے طبیعت ہلکی ہو گئی۔ رات کا لباس مسل گیا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ اسی کو پہن کر باہر نکل آیا۔ ایک ملازمہ سامنے سے گزر رہی تھی، مجھے دیکھ کر چونکی اور پھر جلدی سے ایک طرف دوڑ گئی۔ اور پھر وہ نرگس کے ساتھ واپس آئی۔ نرگس آسمانی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی، مسکراتی میری طرف آ رہی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے نازک ہونٹوں سے شیریں نغمہ پھوٹا۔

”نیند بھر گئی، حضور کی؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اس وقت تو میں اور ڈیڈی، خدا کے حضور صرف ایک دعا مانگ رہے تھے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا......؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”یہی کہ آپ کی آنکھ کھل جائے، تاکہ ہمیں ناشتہ مل سکے۔“

”کیا......؟“ میں چونک پڑا۔ ”مم......مگر گیارہ بج رہے ہیں۔ کیا آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟“

”مہمان کے بغیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟“ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلئے، ڈیڈی کو آپ کے جاگنے کی خوشخبری سنائی جائے۔ اور سوسن بوا!......آپ جلدی سے ناشتہ لگوا دیں۔“ نرگس نے ملازمہ سے کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ پھر داؤد صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچ کر ہی اس نے میرا ہاتھ چھوڑا تھا۔ سارے راستے میں جاں بخش حرارت محسوس کر رہا تھا۔

”آؤ شارق میاں!......آؤ۔“ داؤد صاحب نے کھڑے ہو کر میرا خیر مقدم کیا۔

”میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ لوگوں نے میری وجہ سے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ مجھے کیا معلوم...“

چھوڑو بیٹے! تکلف کی باتیں مت کرو اب تم غیر تھوڑی ہو؟ ہمارے اپنوں سے بڑھ کر ہو۔ اور پھر تم اتنی رات گئے سوئے تھے۔ کل سے تمہیں اتنی دیر تک سونے کی اجازت تھوڑی ملے گی۔ ہاں تو نرگس بیٹے! چلیں ناشتے کے کمرے میں؟“

”چلئے ڈیڈی!“ نرگس نے کہا اور ہم تینوں ناشتے کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ ناشتے کی میز پر لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے۔ نرگس میرے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ آسمانی ساڑھی میں وہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ آج اس کا حُسن ہمیشہ سے زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر میری خاطر کرنے لگی۔ زبردستی اپنی پسندیدہ چیزیں میری پلیٹ میں ڈالنے لگی۔

”میں جانتا ہوں، یہ خوشامد کیوں ہو رہی ہے۔“ داؤد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور نرگس کے ہاتھ میں لرزش پیدا ہو گئی۔ پھر داؤد صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ ”نرگس بہت شرمندہ ہے، شارق میاں! جب میں نے اسے تفصیل بتائی تو یہ سکتے میں رہ گئی۔ تمہارا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ تب میں نے کہا کہ تم یقیناً فراخ دلی سے اسے معاف کر دو گے......کیا میں اس دعوے میں حق بجانب تھا؟“

"میری تو دلی خواہش تھی کہ نرگس کی حفاظت میں اپنی زندگی قربان کر دوں۔ یہی میری زندگی کا صحیح مصرف تھا۔"

"خدا نہ کرے........ خدا تمہیں سلامت رکھے، بیٹے! تم میرے اپنے بچے ہو۔ اور ہاں، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تمہارے بھائی صاحب ہالینڈ سے واپس نہ آ جائیں، اس وقت تک تم یہیں رہو گے۔"

میں نے ایک نگاہ نرگس پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں شرمگیں مسکراہٹ تھی۔ میرا دل اُلٹنے لگا۔ دل چاہا کہ اسی وقت سب کچھ صاف صاف بتا دوں، اپنی اصلیت کھول کر ان کے سامنے رکھ دوں۔ لیکن اس کے بعد........ اس کے بعد بھی کیا یہ فضا برقرار رہے گی؟ یہ سب کچھ میرے مقدر میں نہیں ہے نرگس کی آنکھوں کا پیار، اس کی اپنائیت، یہ شرمگیں مسکراہٹ سراب ہے۔ یہ سب میرے لئے نہیں ہے۔ یہ مجھے نہ مل سکے گا! اس لئے سرور کے جس قدر لمحات گزر جائیں، اس کے بعد تو بھیانک تاریکیاں میرا مقدر ہیں۔

چنانچہ میں خاموش رہ گیا۔ ناشتہ ختم ہو گیا اور ہم سب داؤد صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ کمرے میں پہنچ کر داؤد صاحب نے کہا۔

"ڈی آئی جی صاحب کا فون آیا تھا۔ نرگس کا بیان لینے کے لئے وہ کسی ایس پی کو بھیجیں گے۔ میرا خیال ہے، اسے آ جانا چاہئے۔ ہاں، شکیر کا پتہ نہیں چل سکا۔ ڈی آئی جی کا خیال ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس گروہ کے یہاں اور بھی ٹھکانے ہوں گے۔ بہرحال، جلد یا بدیر وہ سب مردود ضرور گرفتار ہوں گے........ ان کے ہاں جو لڑکیاں ملی ہیں، وہ سب بھی مظلوم ہیں۔ انہیں اغوا کیا گیا تھا اور........ وہ ان کے اشاروں پر چلتی تھیں۔

ایک بار پھر مجھے فلمینا، جینی، شکیلہ اور لی کا وغیرہ یاد آ گئیں اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے اطلاع دی۔

"ایس پی غفور صاحب آئے ہیں۔"

"اوہ........ بھیج دو۔ یہیں پہنچا دو۔" داؤد صاحب نے کہا اور ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایس پی صاحب ایک فائل بغل میں دبائے اندر داخل ہو گئے۔ داؤد صاحب نے ان سے مصافحہ کیا تھا۔ ایس پی صاحب نے مجھے بہت غور سے دیکھا تھا اور میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی، ان کی تیز نگاہوں نے میرے لباس کا خاص طور سے جائزہ لیا تھا۔

"تشریف رکھئے، غفور صاحب!........ فرمائیے، شکیر کی تلاش کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے، اب وہ مشکل نہ رہے گی۔" ایس پی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ........ کوئی اشارہ ملا ہے کیا؟"

"ہاں........ ایک اہم انکشاف ہوا ہے۔" ایس پی بدستور اسی انداز میں بولے۔ ایس پی کے لہجے سے مجھے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

"خوب........!" داؤد صاحب مسکراتے ہوئے بولے، پھر کہنے لگے۔ "کیا آپ تنہا آئے ہیں؟ میرا خیال ہے، بے بی کا بیان لے لیں۔ یہ اب بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں اس وقت بے بی کا بیان لینے نہیں آیا۔" ایس پی نے کہا اور پھر اچانک انہوں نے پستول

نکال کر اس کا رخ میری طرف کر دیا۔

"براہِ کرم ہاتھ بلند کر دیں، عارف صاحب!" اور میرا پورا بدن لرز کر رہ گیا۔ "آ جاؤ!" ایس پی نے دروازے کی طرف رخ کر کے کہا اور ایک انسپکٹر، دو سب انسپکٹروں کے ساتھ اندر آ گیا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے۔

"تلاشی لو۔" ایس پی نے کہا اور انسپکٹر میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میرا کالر پکڑ کر مجھے کھڑا کیا اور پھر میری جیبوں سے سب کچھ نکال لیا۔ داؤد صاحب کا پستول میں رات کو ہی واپس کر چکا تھا۔

داؤد صاحب اور نرگس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھے پھر بٹھا دیا گیا اور انسپکٹر نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔

"یہ....... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟........ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی غلط فہمی ہے شاید....... ضرور کوئی...."

"ہاں....... بہت بڑی غلط فہمی ہوئی تھی، داؤد صاحب!........ لیکن شکر ہے، بہت جلد دُور ہو گئی اور خدا نے آپ کو کسی بہت بڑے نقصان سے بچا لیا۔"

"کیا مطلب؟" داؤد صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ بہت خطرناک جعلساز عارف ہے، داؤد صاحب!....... عرصہ دراز سے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ اس نے پولیس کو ایسے ایسے چکر دیئے ہیں کہ بس کیا بتایا جائے۔ دراصل اس کا ایک ہم شکل اور ہے....... یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ شاید دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ بہرحال، اب اس کی مدد سے ہم اسے بھی گرفتار کر لیں گے۔"

ہم شکل کے نام پر نرگس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اسی وقت داؤد صاحب بولے۔

"مگر....... مگر آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے، ایس پی صاحب؟ اس نے جو کچھ کیا ہے......."

"اس کی تہہ میں بھی کوئی گہری سازش ہے، جس کا انکشاف یہ خود کرے گا۔ آپ یوں سمجھ لیں، جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، جس طرح ایک ملک میں دو شہنشاہ نہیں رہ سکتے، اسی طرح اس نے بھی شکیر کی یہاں موجودگی پسند نہیں کی اور ایک زبردست سازش کر کے ہم سب کو اور شکیر کو بے وقوف بنایا اور بہرحال، یہ ذہنی طور پر شکیر سے طاقتور نکلا اور اس نے شکیر کو ڈبو دیا۔ مجھے یقین ہے کہ شکیر کے دوسرے ٹھکانے اسے ضرور معلوم ہوں گے اور اب یہی ان کی نشاندہی کرے گا۔" ایس پی نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میری ذہنی حالت جو ہو گی، اس کا شاید آپ خود ہی اندازہ کر سکیں۔ بہرحال، میں نے کچھ نہ کہا۔

"کیا یہ درست ہے شارق؟....... کیا یہ درست ہے کہ تمہارا نام شارق نہیں، عارف ہے؟"

"ہاں....... یہ درست ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تم وہی عارف جمال ہو، جس نے حشمت برادرز سے چوراسی ہزار روپے اُڑا لئے تھے؟ اور اس کے بعد سے چار بار جیل توڑ چکے ہو؟" ایس پی نے سوال کیا۔

"ہاں....... میں وہی ہوں۔" میں نے کہا اور داؤد صاحب نے اس طرح نرگس کو چمٹا لیا، جیسے ان کی بچی اچانک کنوئیں میں گرتے گرتے بچی ہو۔ نرگس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اب کون سی گنجائش تھی؟

اب کسی غلط فہمی کا کیا امکان تھا؟........خود داؤد صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں!

''یہ اتفاق ہے کہ پولیس فوٹوگرافروں میں سے ایک اس وقت موجود تھا جب مسٹر عارف کی تصاویر لی جا رہی تھیں۔ اسی فوٹوگرافر نے پہلے بھی مسٹر عارف کی تصویر لی تھی، جس کے نگیٹو اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے فوراً ان کے پرنٹ نکالے اور نئی تصویر کے ساتھ پولیس کو پیش کر دیئے۔ تب ہم نے مسٹر عارف کی فائل نکلوائی۔ دیکھئے، یہ میرے پاس موجود ہے۔ ایس پی نے فائل داؤد صاحب کے سامنے رکھ دی اور داؤد صاحب جھلک کر اسے دیکھنے لگے۔ کئی منٹ تک وہ فائل کی ورق گردانی کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا خیال ہے، داؤد صاحب؟'' ایس پی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں........میں کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔'' داؤد صاحب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شخص یہاں کسی گہری سازش کے تحت گھسا ہے۔ نہ جانے یہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال، پولیس سب کچھ معلوم کر لے گی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ چلو، کھڑے ہو جاؤ۔'' ایس پی نے طنزیہ انداز میں مجھ سے کہا اور میں نے صرف ایک حسرت آمیز نگاہ نرگس پر ڈالی۔ وہ پاگلوں کے سے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر میں گردن جھکا کر ایس پی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے نرگس کی چیخ سنی تھی۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ نرگس کی ذہنی کیفیت کا مجھے پورا پورا احساس تھا لیکن........میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس وقت حقیقت بتانا خود کو ذلیل کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ باہر لا کر مجھے پولیس جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ ایس پی صاحب فاتحانہ انداز میں آگے بیٹھ گئے اور پھر وہ مجھے لے کر چل پڑے۔

انجام یہی ہونا تھا۔ اچھا ہے، جلد ہو گیا........میں نے سوچا اور اپنے ذہن کو خالی چھوڑ دیا۔ اب کچھ سوچنا بیکار تھا، صرف حالات کا انتظار کرنا تھا۔ مقدر جو فیصلہ کرے۔ اب طالوت نہیں تھا کہ جیل کی سلاخیں میرے لئے نرم ہو جاتیں۔ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لایا گیا۔ ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کئی مسلح کانسٹیبل میری نگرانی کر رہے تھے۔ ان سب کو میری سخت نگرانی کی ہدایت کی گئی تھی۔ دوپہر کو ایس پی صاحب کی ہدایت پر میرے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔

میں نے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ شام کو مجھے چائے پیش کی گئی، جس کے ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ پولیس پوری تندہی سے میرے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے ایس پی صاحب دوسرے کچھ لوگوں کے ساتھ میرے پاس آئے اور انہوں نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مسٹر عارف! آپ کے بارے میں تمام رپورٹیں جمع کی جا رہی ہیں.....کام مکمل ہو گیا ہے...... آپ کے اس ساتھی کو تلاش کیا جا رہا ہے، جو آپ کا ہم شکل ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں بتا سکیں گے؟''

''کیا بتاؤں؟'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''مختلف آدمی میرے میک اپ میں میرے لئے کام کرتے رہے ہیں، کوئی ایک نہیں ہے۔ وہ سب

کرائے کے آدمی تھے۔“

”اوہ........ونڈر فل!“ ایس پی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا، پھر بولا۔ ”مسٹر حیات کون ہیں، جن کے نام سے آپ نے کوٹھی خریدی ہے؟“

”ایک فرضی نام ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”خوب........خوب!“ ایس پی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ ”مسٹر عارف! ظاہر ہے، حشمت سیٹھ کی رقم اسے مل گئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے کیا، کیا؟........کیا آپ اس کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟ اس سے ہمارے کام میں مدد ملے گی۔“

”سنو! تم میرے اوپر جو بھی جرم عائد کرو گے، میں اسے تسلیم کرلوں گا۔ تم جرم لگاؤ، میرے لئے سزا کی اپیل کرو........یہ سزا سزائے موت بھی ہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور ایس پی حیرت سے میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہمیں تم سے ذاتی دشمنی نہیں ہے عارف! تم نے جو کچھ کیا ہے، صرف اس کی سزا ملے گی۔ لیکن بعض معاملات میں تمہاری مدد ضروری ہے۔“

”میری درخواست ہے کہ مجھ سے کچھ نہ پوچھا جائے۔“

”شیکر کے بارے میں بھی نہیں؟“

”جو کچھ کہوں گا، یقین کرو گے؟“ میں نے ایس پی کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں........کوشش کریں گے۔“

”تب سنو۔ میں شیکر سے اجنبی تھا۔ شیکر میری طرف صرف اس لئے متوجہ ہوا تھا کہ نرگس رحمانی سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے اغوا کرلیا اور پھر نرگس رحمانی کے اغوا میں میری مدد کے لئے مجھ پر تشدد کیا۔ تم اس کے نشان میرے جسم پر دیکھ سکتے ہو۔ نرگس جیسی معصوم لڑکی کے لئے میں پُرخلوص تھا۔ میں نے پورے خلوص سے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر نرگس کی زندگی اور داؤد رحمانی کی عزت بچائی ہے۔ میں ان شریف انسانوں کو کوئی دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔“

”ہوں........“ ایس پی گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میرا تجربہ ہے کہ بعض خطرناک مجرم اعلیٰ ظرف کے مالک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے، تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ اگر یہ بات ہے دوست! تو ان لوگوں کے ذہن تمہاری طرف سے خراب نہیں رکھے جائیں گے۔ شیکر کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟“

”تقریباً سب کچھ بتا چکا ہوں۔ وہ کسی بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتا ہے، لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے، اغوا کر کے رقمیں وصول کرتا ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔“

”کیا تمہارا ابھی کوئی گروہ بن چکا ہے؟“

”نہیں........“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”میرے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔“

”کیا تمہارا اکاؤنٹ وغیرہ ہے؟“

”بالکل نہیں........تم تحقیقات کرسکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے........بس تمہاری باتوں پر بھروسہ کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم کہاں تک

سچ بول رہے ہو۔ کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ اور کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''نہیں، شکریہ! ہاں ہو سکے تو ایک کام ضرور کر دینا۔''

''کیا؟''

''داؤد رحمانی اور نرگس رحمانی کو یہ یقین دلا دینا کہ میں ان کے لئے دل میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرے ان الفاظ کو حالات کی ترازو میں تول لیا جائے، واقعات کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ اور اگر اس میں کوئی کھوٹ ہو تو مجھے اس سے ضرور آگاہ کر دیا جائے۔''

''اطمینان رکھو! کل تمہاری یہ خواہش پوری کر دی جائے گی۔'' ایس پی نے کہا اور پھر بولا۔''یہاں سے فرار ہونے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ بس اب آرام کرو۔'' وہ اُٹھ گیا۔ مجھے لاک اپ کے ایک خصوصی کمرے میں لایا گیا۔ مجھ جیسے خطرناک مجرم کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے تھے، لیکن ان کے باوجود میرے پیروں سے بیڑیاں نہیں کھولی گئی تھیں۔ وہ بہرحال میری طرف سے محتاط رہنا چاہتے تھے۔

میں بستر پر لیٹ گیا جو مجھے خصوصی طور پر فراہم کیا گیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''طالوت......!'' میرے دل سے ایک آہ نکل گئی۔''یقیناً تجھے میرے ان حالات کی خبر نہ ہو گی۔'' میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔ تمام جھگڑوں سے آزاد ہو کر میں سو جانا چاہتا تھا، لیکن بیڑیاں اس طرح پیروں کو چھیل رہی تھیں کہ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

خاصی رات گزر گئی۔ اور جب کسی طور نیند نہ آئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹخنے زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے اَ ۔ زخمی ٹخنے کو بیڑی سے آزاد کرانے کی ایک احمقانہ کوشش کی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے بیڑی کے جوڑ لو ڈھیلا کرنے کے لئے زور لگایا اور بیڑی کا جوڑ اس طرح کھل گیا، جیسے وہ موم کی ہو۔

کیا مطلب......؟ میں نے حیرت سے کھلے ہوئے جوڑ کو دیکھا اور پھر میں نے بیڑی پاؤں سے نکال دی۔ اس کے اوپری جوڑ کو بھی میں نے اسی آسانی سے کھول لیا تھا۔ میں نے فولادی بیڑی کو حیرت سے دیکھا اور پھر دوسرے پاؤں کی بیڑی بھی اسی طرح کھول لی۔

یہ میری طاقت کا کرشمہ تھا، یا......اور طاقت کے تصور سے ہی مجھے شربتِ فولاد یاد آ گیا۔ ہاں...... مجھے وہ وقت یاد آ گیا، جب طالوت نے کہا تھا کہ میں وہ شربت پی لوں۔ اس کے بعد مجھے اس کی مدد کی ضرورت نہ رہے گی اور میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا۔ اوہ!......تو میرے بدن میں کوئی پُراسرار قوت پوشیدہ ہے......ایسی قوت، جسے اب تک میں نے عدم واقفیت کی بنا پر استعمال ہی نہیں کیا تھا مجھے اس کے بارے میں یاد ہی نہیں آیا تھا۔ اور اس نئے واقعے کے سبب میرے ذہن میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ میرے دماغ میں کچھ اجنبی خانے روشن ہو گئے۔ کچھ انوکھے خیالات میرے حواس پر چھا گئے۔ گویا......گویا میں اتنا بے بس نہیں ہوں، جتنا خود کو سمجھ رہا ہوں۔

طالوت کا ایک تحفہ میرے پاس موجود ہے۔ افوہ!........ میں اسے بالکل بھول گیا تھا۔ کیسی حماقت ہوئی۔ اگر مجھے یاد آ جاتا تو شکیر کے ہاتھوں اس قدر تکالیف نہ برداشت کرنا پڑتیں۔ میں ان لوگوں کے دماغ درست کر دیتا، جو مجھے بے عزت کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد حالات کا رُخ یہ نہ ہوتا، جواب تھا۔ مجھے وہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی، جو میں نے کیا تھا۔ بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی تھی مجھ سے۔ لیکن بہرحال، جو کچھ ہو چکا تھا، اب اسے لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ اب آئندہ کے لئے سوچنا تھا۔ ابھی زندگی کے کچھ لمحات باقی ہیں، کچھ کرنے کی سکت موجود ہے۔ طالوت نہیں ہے، لیکن اُس کا دیا ہوا تحفہ موجود ہے، جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

طالوت کی اس یادگار سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں؟ کیوں ان سلاخوں کے پیچھے محبوس رہوں؟ اور میرا ذہن نئے انداز سے سوچنے لگا۔ دنیا اسی انداز سے زندگی گزار رہی ہے۔ کچھ نے اخلاقیات کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں اور ان کی اصلی شکل ان لبادوں میں پوشیدہ ہے اور کوئی انہیں نہیں پہچان سکتا، کچھ عریاں ہیں۔ جو عریاں ہیں، لوگ صرف انہیں پہچانتے ہیں، انہیں برا کہتے ہیں، برا سمجھتے ہیں۔ ان کے دشمن ہیں۔ ملمع سازی اس ماحول کے لئے ضروری ہے۔ مجھے ان سلاخوں کے پیچھے سے نکل جانا چاہئے۔ کسی بھی طرح........ آخر میں ہی سب کے مظالم کا نشانہ کیوں بنوں؟........ میں نے ایک عفت مآب لڑکی کو مصیبت سے بچانے کے لئے زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ میں نے اس کے لئے سخت تکالیف برداشت کی تھیں، مگر میری تمام خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک غلطی جو جذبات میں آ کر سرزد ہو گئی تھی، آج تک یاد رکھی گئی تھی۔ دنیا اسے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ مجھے خطرناک جعلساز قرار دے دیا گیا تھا۔ میری نیکی کو بھی کسی گہری سازش سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو مجھ سے میرا احوال پوچھتے، میری ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرتے اور پھر میرے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرتے۔ میری حماقتوں کو معاف کر کے مجھے بھی ایک اچھے شہری کی زندگی گزارنے کی اجازت دے دیتے۔ اور اگر داؤد رحمانی چاہتے تو اس مصیبت سے مجھے نجات دلا سکتے تھے۔ نرگس رحمانی یہ سوچتی کہ میں نے اس کی زندگی بچانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ یہ تمام باتیں مجھے بچا سکتی تھیں........ لیکن سب نے میرے بارے میں اس انداز میں سوچنا چھوڑ دیا تھا........ انہوں نے میری پیشانی پر مجرم کی مُہر لگا دی تھی اور اب یہ مُہر کسی طور نہیں مٹ سکتی تھی۔ جب یہ لوگ مجھ سے تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر میں ان سے کیوں رعایت کروں؟ میں اپنی زندگی کی قدر خود کیوں نہ کروں؟........ میں طاقت ور ہوں، یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں اور بہت کچھ کر سکتا ہوں۔

میں نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لئے۔ میرا ذہن سب کچھ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ جیل کی سلاخوں کے نزدیک آیا۔ باہر جھانکا۔ تقریباً بیس گز دور، دو مسلح گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے جوتوں کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید انہیں میری طرف سے پوری طرح ہوشیار کر دیا گیا تھا۔ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ میری سخت نگرانی کی جائے اور ذرا بھی غفلت نہ برتی جائے۔ میرے ساتھ قطعی کوئی رعایت نہ کی جائے۔

یہ تھی میری حیثیت اس دنیا کی نگاہوں میں۔ یہ تھا میری نیک دلی اور شرافت کا صلہ........ ٹھیک ہے، اے دنیا والو! جو کچھ میں بن رہا ہوں، اس میں صرف تمہاری کوششوں، تمہارے غلط اندازِ فکر کو دخل ہے۔ پھر مجھے دوش نہ دینا۔ تم میری ایک معمولی سی خطا کو درگزر نہیں کر سکتے۔ پھر میں کیوں تمہارے ساتھ رعایت برتوں؟“

میں نے جیل کے دروازے کی موٹی سلاخوں کو آزمایا، ان پر طاقت صرف کی اور آہنی سلاخیں میرے مضبوط پنجوں کی گرفت میں بے بس ہوگئیں۔ میں نے انہیں سمیٹا اور وہ سمٹتی چلی گئیں۔ اتنا بڑا خلا بن گیا کہ میں اس میں سے با آسانی نکل سکتا تھا۔ کوئی آواز نہ ہوئی، کوئی شور نہ ہوا۔ میں جیل کی کال کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ اب میں آزاد تھا۔ بیس گز کے فاصلے پر مسلح سپاہیوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے نکلنے کا وہی راستہ تھا۔ ان لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر نکلنا مشکل تھا، اس لئے ان سے بھڑنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے قبل بھی کئی بار جیل سے نکلا تھا۔ لیکن اس طرح کہ خود مجھے بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ کیا ہو گیا۔ لیکن آج میں جیل سے باقاعدہ فرار ہو رہا تھا اور یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

مستعد اور چوکنا سپاہیوں نے شاید میرے قدموں کی آہٹ سن لی۔ وہ حیران ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ لیکن اتنے کم فاصلے پر بندوقیں صرف لاٹھی کے طور پر ہی استعمال کی جا سکتی تھیں، جبکہ آن کی آن میں، میں اُن کے سر پر پہنچ گیا۔ ان دونوں کے چہروں سے شدید حیرت عیاں تھی۔ لیکن دوسرے لمحے انہوں نے بیک وقت مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے ان میں سے ایک کی گردن پکڑ لی اور دوسرے کی پیشانی پر ایک زوردار مُکا رسید کر دیا........ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا، جیسے اس کے سر کی ہڈی ملائم ربر کی ہو۔ اس کی پیشانی اندر گھس گئی اور خون سے رنگین ہو گئی۔ جس کی گردن میری گرفت میں تھی، وہ گردن چھڑانے کی سخت جدوجہد کر رہا تھا لیکن میں اسے بھول کر دوسرے سپاہی کو دیکھ رہا تھا، جو اب زمین پر گر کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ پھر میں نے اس سپاہی کی گرفت بھی سست محسوس کی، جس کی میں نے گردن پکڑی ہوئی تھی۔ تب میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی زبان باہر نکل پڑی تھی اور وہ دم توڑ رہا تھا۔

میں بدحواس ہو گیا...... یہ کیا ہو گیا؟........ میرے ہاتھ دو بے گناہوں کے خون سے رنگ گئے تھے۔ آہ! یہ کیا ہو گیا؟........ میں طالوت کی بخشی ہوئی منحوس طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ آہ!...... اس طاقت نے دو گھر اُجاڑ دیئے۔ ان کے مرنے سے پتہ نہیں، کتنے افراد بے سہارا ہو جائیں۔ میرا دل رنج والم میں ڈوب گیا۔ میرا ضمیر چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ یہ بہت برا ہوا........ میں یہ نہ چاہتا تھا۔ یہ سب نادانستگی میں ہوا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں بت کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اور پھر میں اس وقت چونکا، جب دور سے سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

میں سنبھل گیا۔ اس سیٹی کے جواب میں بھی سیٹیاں بجنی چاہئے تھیں، لیکن اب وہ سیٹیاں خون میں اوبی پڑی تھیں۔ انہیں بجانے والے دنیا چھوڑ چکے تھے۔ میں جعلساز سے قاتل بن گیا تھا۔ دو بے گناہوں کا قاتل...... جو پیٹ بھرنے کے لئے اپنا فرض انجام دے رہے تھے۔ اُف میرے خدا! میں کیا کروں؟...... خودکشی کرلوں؟...... یا...... یا......!

لیکن پھر دل میں کچھ اُمید کے چراغ روشن ہوئے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے۔ مجھے اس کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ میں قصوروار نہیں ہوں...... میں قصوروار نہیں تھا۔ اگر میں خود کو دوبارہ گرفتاری کے لئے پیش کردوں...... اگر میں یہاں کھڑا ان دو بے گناہوں کا ماتم کرتا رہوں، جو نادانستگی میں میرے ہاتھوں مارے گئے تھے، تب بھی بیکار ہے۔ کوئی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ کوئی میرے درد کا درماں نہیں کرے گا۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اسے لوٹانا میرے بس میں نہیں ہے...... موت تو یقینی ہے...... اس طرح نہیں مرنا چاہئے۔ مجھے فرار ہو جانا چاہئے۔

اور میں اُچھل پڑا...... سیٹیوں کی دو تین آوازیں اور سنائی دے چکی تھیں...... اور اب دُور سے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سپاہی جواب نہ ملنے پر پریشان ہو کر اس طرف آ رہے تھے۔ صرف چند لمحے...... اگر ان چند لمحوں میں، میں ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوا تو سپاہی مجھے گولیوں کا نشانہ بنالیں گے...... یا پھر پھانسی کے تختے پر جانا پڑے گا۔ نہیں، نہیں...... فرار ضروری ہے۔ میرے جسم میں بجلیاں بھر گئی۔ میں تڑپ کر ایک طرف دوڑنے لگا۔ میرا رخ جیل کی آخری دیوار کی طرف تھا۔ لیکن ابھی میں دیوار کے قریب پہنچا بھی نہیں تھا کہ زوردار آواز سے گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سپاہیوں کے قتل اور میرے فرار کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ سیٹیاں اور گھنٹیاں خوف ناک انداز میں بج رہی تھیں۔ سرچ ٹاوروں میں روشنیاں ہونے لگی تھیں۔ اوپر سے بھی سیٹیوں کا جواب مل رہا تھا۔ جیل کا پورا عملہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ چاروں طرف کی ناکہ بندی کی جا رہی تھی۔ میں جس دیوار کے ساتھ کھڑا تھا، وہ سپاٹ تھی۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا...... اب کیا کروں؟...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فرار کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اب میں کسی اور سپاہی کی جان لینا نہیں چاہتا تھا، کسی اور بے گناہ کا خون اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتا تھا۔

دفعتہً مجھے خیال آیا...... فولاد کے اس مجسّے کا، جو میری انگلیوں کی گرفت میں پچک گیا تھا۔ میں نے ایک احمقانہ کوشش کی، میں نے دیوار کے پتھروں پر ہاتھ رکھے اور ان پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ اور پھر میرا دل دھک سے ہو گیا۔ پتھر کھسک رہے تھے۔ میں نے کچھ اور طاقت صرف کی اور مضبوطی سے جڑے ہوئے پتھروں نے جگہ چھوڑ دی۔ وہ باہر جا گرے تھے۔ لیکن اندر اتنا شور ہو رہا تھا کہ پتھر گرنے کی آوازیں اس میں دب گئیں۔ میں نے جلدی جلدی دوسرے پتھر گرائے اور اتنا راستہ بنا لیا کہ باہر نکل سکوں۔ تب میں دیوار کے اس سوراخ سے باہر نکل گیا۔

سرچ ٹاوروں کی روشنیوں نے اب باہر کا رخ بھی کر لیا تھا۔ لیکن مزید احتیاط حماقت تھی۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں انتہائی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا اور یہاں بھی مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ میرے دوڑنے کی رفتار غیر معمولی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا اور پھر سرچ ٹاوروں سے گولیاں برسیں۔ مٹی اُڑی، لیکن کوئی گولی میرے لگ نہ سکی۔ میں گولیوں سے بچنے کی کوشش

کئے بغیر دوڑتا رہا۔ بندوقیں گرجتی رہیں، لیکن شاید اپنی برق رفتاری کی وجہ سے میں ان کی رینج سے ہی نکل گیا تھا۔

تب جیل کے پھاٹک سے کئی جیپیں نکل کر میری طرف دوڑیں، لیکن میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ میرے حواس بحال تھے۔ میں پتلی گلیاں تلاش کر رہا تھا۔ اور پھر ایک پتلی سی گلی میں گھس کر میں دوسری طرف نکل گیا۔ جیپوں کو اس دوسری سڑک پر آنے کے لئے ایک طویل راستہ طے کرنا تھا۔ میں بے تکان بھاگ رہا تھا۔ میں بھاگتا رہا۔ انتہائی برق رفتاری سے۔ اور پھر ایک گلی مل گئی۔ یہ گلیاں میری معاون تھیں۔ لیکن .... پولیس والے بھی بے وقوف نہیں تھے۔ وہ چاروں طرف سے مجھے گھیر رہے تھے۔ جیپیں سڑک کے دوسری سمت سے بھی آ رہی تھیں۔ ان کی تیز روشنیوں نے سڑک کو منور کر دیا تھا۔ تب میری نگاہ ایک پتلے اور اونچے درخت پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا .... کیوں نہ درخت پر چڑھ جاؤں ....؟

فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ میں تیزی سے درخت پر چڑھنے لگا اور چند لمحات کے بعد میں درخت کی سب سے اونچی شاخ پر تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے گہری گہری سانسیں لیں اور اردگرد کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ درخت سے چند گز کے فاصلے پر ایک خوب صورت کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ درخت کی شاخیں اس کوٹھی کی چھت تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال نے جنم لیا۔ کیوں نہ رات اس کوٹھی میں گزاری جائے .... میں اندازہ لگا رہا تھا، پولیس نے چاروں طرف کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ بظاہر میرے نکلنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی .... اب یہاں سے فرار کی کوشش خطرناک تھی۔ وہ ضرور گولیاں چلائیں گے اور مجھے ہلاک کر دیں گے۔ اس طرح مرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ درخت پر بھی پوری رات نہیں گزار سکتا تھا۔ اس لئے کوٹھی کی چھت پر اُتر جانے کا خیال پختہ ہو گیا۔

پولیس زبردست کارروائیوں میں مصروف تھی۔ میں اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے گاڑیاں آ رہی تھیں۔ شاید جیل والوں نے باہر سے بھی مدد طلب کر لی تھی۔ یہ سب انتہائی پھرتی سے ہوا تھا۔ پولیس کے چند جوان اس درخت کے قریب بھی پہنچ گئے اور وہاں کھڑے ہو کر گفتگو کرنے لگے۔ شاید وہاں ان کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ گویا پولیس کو یقین ہو گیا ہے کہ میں اس علاقے سے باہر نہیں نکل سکا ہوں۔ بہرحال، سپاہیوں کی موجودگی میں تو میں درخت سے بھی نہیں اُتر سکتا تھا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ لیکن شکر ہے، سپاہی زیادہ دیر وہاں نہیں رُکے۔ وہ تھوڑی دیر کھڑے گفتگو کرتے رہے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں آہستہ آہستہ نیچے اُترا اور اس شاخ تک پہنچ گیا، جو کوٹھی کی چھت تک گئی تھی۔ شاخ پر آگے بڑھتا رہا اور بالآخر خوب صورت کوٹھی کی چھت پر اُتر گیا۔

عمارت کسی صاحبِ ذوق کی تھی اور انتہائی خوب صورتی سے تعمیر کی گئی تھی۔ میں نے چھت پر رُکنا مناسب نہیں سمجھا اور نیچے جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس اس علاقے کی ناکہ بندی کئے رہے گی اور پھر دن کی روشنی میں عمارتوں کی تلاشی لے گی۔ دو سپاہیوں کے قاتل اور ایک خطرناک مفرور کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ دن کا اُجالا پھیلنے سے قبل مجھے کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہئے تھی، جہاں میں ایک آدھ دن تک پولیس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکوں۔

میں کوٹھی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا۔ چند خواب گاہوں میں مجھے روشنی نظر آئی .... نیلی روشنی،

جو مکینوں کے وجود کا پتہ دیتی تھی۔ میں نے ان خواب گاہوں کا رخ نہیں کیا اور چھپنے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ پھر میں نے کوٹھی کے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ لیکن چند لمحات کے بعد میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس میں پرانا فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ شاید بیکار اور ناقابلِ استعمال۔ ممکن ہے یہ میرے کام آ سکے۔ میں نے ایک ایک چیز کو ٹٹولا اور پھر ایک بڑی الماری کے عقبی حصے کو میں نے چھپنے کے لئے پسند کر لیا۔

بلاشبہ یہ ایسی جگہ نہیں تھی، جہاں عام حالات میں آدمی آئے۔ کسی خاص ہی ضرورت پر کوئی یہاں آ سکتا تھا۔ میں نے اس جگہ کو ہاتھ سے ٹٹولا، نیچے ٹائل کا فرش تھا اور یہاں صفائی بھی تھی۔ تن بہ تقدیر ہو کر میں نے اسی جگہ چھپنے کا یقینی فیصلہ کر لیا اور پھر الماری کے پیچھے لیٹ گیا۔

تھکن......خوف...... پریشانی، دماغ پر حملہ آور تھیں۔ عجیب عجیب سے پریشان کن خیالات ذہن میں چکرا رہے تھے۔ باہر پولیس موجود تھی۔ مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اور پھر میرے دل میں خوف در آیا......آخر میں بھی انسان تھا۔ ایک معمولی انسان......ایک دفتر کا سیدھا سادا کلرک......محبت کا پرستار......حالات نے مجھے جو کچھ بنا دیا تھا، وہ میری شخصیت نہ تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو سکون دینے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن سکون کہاں تھا؟ کبھی گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ دیکھتا، کبھی خود کو بجلی کی کرسی پر بیٹھے دیکھتا، کبھی جسم میں درجنوں گولیاں پیوست دیکھتا جن کے سوراخوں سے خون اُبل رہا تھا۔ ذہنی کیفیت عجیب تھی!

لیکن......اس بے سرو سامانی کے عالم میں بھی......اس خوف و دہشت کے ماحول میں بھی...... دشمنوں کے پھیلے ہوئے سمندر میں بھی میرا ایک دوست تھا، جس نے بروقت مجھے سہارا دیا تھا......اور یہ دوست نیند تھی......گہری نیند!......جس نے مجھے تمام فکروں سے آزاد کر دیا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ کوئی بات مجھے یاد نہ رہی۔ اور نہ جانے کب تک میں سوتا رہا۔

پھر کچھ آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ میں چند لمحات ماحول سے بے خبر رہا۔ لیکن پھر ذہن نے پوری حقیقت سمجھا دی اور میں سنبھل گیا۔ میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ یہ آوازیں کیسی ہیں؟

"کانپ کیوں رہی ہو؟......آؤ دیکھیں، کون ہے۔" ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ نہ جانے کیوں، یہ آواز کانوں کو مانوس سی لگی۔

"بی بی جی!......لل......لاش......" ایک سہمی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"پیروں سے تو لاش نہیں معلوم ہوتی۔ آؤ، ڈر کیوں رہی ہو؟" اسی مانوس آواز نے کہا اور میں نے چونک کر اپنے پیروں پر نگاہ ڈالی۔ آہ......میرے پاؤں سونے کے دوران الماری سے دوسری طرف نکل گئے تھے۔ مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ میرا دل لرزنے لگا۔ لیکن پھر میں نے ہمت کی اور پاؤں سکوڑ لئے۔

"تم جو کوئی بھی ہو، باہر نکل آؤ!" مانوس آواز نے کہا۔ لیکن ذہن اس قدر منتشر تھا کہ میں اس آواز کو پہچان نہ سکا۔ بہر حال، میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ضمانت دیتی ہوں کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ باہر نکل آؤ!" دوبارہ کہا گیا اور بالآخر میں ایک گہری سانس لے کر باہر نکل آیا اور پھر میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ میں حیرت و مسرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ......وہ ثریا تھی۔ ہاں! وہ یقیناً ثریا ہی تھی۔ مظلوم ثریا، جو اپنے بیمار شوہر

کے علاج کے لئے، اپنی بوڑھی ساس کی خوراک کے لئے اور اپنے بچے کی پرورش کے لئے جسم فروشی کرتی تھی۔ صرف کچھ عرصے قبل کی بات تھی، لیکن اُس وقت کی اور اب کی ثریا میں بہت فرق تھا...... طالوت نے ثریا کی قسمت بدل دی تھی، اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ یقیناً یہ کوٹھی اسی کی تھی۔

میرا دل مسرت سے سرشار ہو گیا۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔

''ثریا!...... تم......؟'' میں نے والہانہ انداز میں کہا اور وہ اُچھل پڑی۔

''تم...... تم کون ہو؟'' اس نے متحیرانہ انداز میں کہا اور میرے دل کو ایک دھچکا لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور تلخ حقیقت میرے ذہن میں عریاں ہو گئی۔ اس وقت، جب میں طالوت کے ساتھ ثریا سے ملا تھا، میری شکل یہ نہیں تھی جواب تھی۔ اس وقت میں طالوت کی بخشی ہوئی شکل میں تھا۔

''بتاؤ...... تم کون ہو؟'' ثریا نے پوچھا۔

''کوئی نہیں ثریا!...... کوئی بھی نہیں۔'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے کس طرح جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم...... مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' میں نے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ ثریا غور سے میری شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں ایک نوکرانی قسم کی عورت کھڑی تھی۔

''باہر جاؤ...... کسی سے ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جانتی ہو، تمہیں سختی سے میری بات پر عمل کرنا ہے۔'' ثریا نے سخت آواز میں ملازمہ سے کہا۔

''جی، بی بی جی!'' ملازمہ نے گردن جھکا کر کہا اور باہر نکل گئی۔

''آؤ......!'' ثریا بڑے اعتماد سے بولی۔ حالانکہ میرا حلیہ بہت خطرناک تھا، لیکن وہ مجھ سے ذرہ برابر خوف زدہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا اور وہ مجھے لئے ہوئے کوٹھی کے ایک انتہائی اندرونی کمرے میں پہنچ گئی۔

''بیٹھو!'' اس نے کہا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''میرا انتظار کرو۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں جانتا تھا، ثریا مجھے نہیں پہچانے گی...... اس کی عقل میں یہ بات نہیں آئے گی کہ شکلیں اس قدر کیسے بدل سکتی ہیں۔ اسے کچھ بتانا بھی فضول تھا۔ لیکن وہ کہاں گئی ہے؟...... کیا پولیس کو مطلع کرنے؟...... میرا دل پھڑ پھڑانے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکل جاؤں...... بھاگ جاؤں...... پولیس کے آنے سے قبل یہاں سے دُور نکل جاؤں...... لیکن کہاں؟...... باہر پولیس موجود ہو گی...... اندر بھی خطرہ ہے اور باہر بھی۔ پھر کہاں جاؤں؟...... کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

لیکن جب دروازہ کھلا تو میں اُچھل پڑا۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا...... ثریا تھی...... اُس کے ہاتھوں میں کوئی چیز تھی۔ لیکن میں اس کے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ کیا پولیس اس کے پیچھے موجود ہے؟...... پھر جب اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ ثریا کے ہاتھوں میں ایک قمیض اور ایک پتلون تھی۔ اس کے پاس شیو کا مکمل سامان موجود تھا۔ اُس نے شیو کا

سامان اور کپڑے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"وہ سامنے باتھ روم ہے...... شیو کر کے غسل کرو۔ لباس تبدیل کر لو۔ ممکن ہے، یہ تمہارے جسم پر چھوٹا، یا بڑا رہے۔ لیکن بہر حال، کام چل جائے گا۔"
اس کے انداز میں عجیب سا وقار تھا۔ بہر حال میں اس کا حکم نہ ٹال سکا اور لباس اور شیو کا سامان لیا، پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ شیو بنایا، غسل کیا اور لباس پہن کر باہر نکل آیا۔ اس دوران بھی میرے کان باہر ہی لگے رہے تھے۔ چند آوازیں سنائی دیں...... دروازہ کھلنے کی آواز...... بند ہونے کی آواز ...... کچھ سرگوشیاں، جن کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ دیکھئے، باتھ روم سے نکلنے کے بعد کیا صورتِ حال پیش آتی ہے!
بہر حال، میرا حلیہ بدل گیا تھا۔ شریف آدمیوں کی سی شکل نکل آئی تھی۔ ثریا اب بھی کمرے میں تنہا تھی۔ البتہ دو تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ نمبر ایک، میز پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی، جس پر بہترین قسم کا ناشتہ موجود تھا...... دوسرے ایک کونے میں بنے ہوئے آتش دان میں آگ روشن تھی۔ حالانکہ یہ آتش دان کے استعمال کے دن نہیں تھے۔ نہ جانے ثریا نے آگ کیوں جلائی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عجیب سا سکون تھا اس کے چہرے پر۔
"ناشتہ کر لو......!" اس نے اسی تحکمانہ انداز میں کہا اور مجھے پہلی بار شدید بھوک کا احساس ہوا۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں صوفے پر آبیٹھا اور ناشتہ شروع کر دیا۔ ثریا خاموشی سے اُٹھی، باتھ روم میں گئی اور پھر میرے قیدیوں والے کپڑے ہاتھوں میں لٹکائے باہر آئی۔ اس نے وہ کپڑے آتش دان میں ڈال دیئے...... اور مارے حیرت کے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ ثریا کیا کر رہی ہے؟...... کیا یہ مجھے پہچان گئی ہے؟ میں نے ناشتہ کرتے ہوئے سوچا۔ ثریا اس وقت تک آتش دان کے قریب کھڑی رہی، جب تک میرے کپڑے جل کر راکھ نہ بن گئے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر واپس آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک کپ چائے اپنے لئے بنائی اور پیالی اپنے سامنے رکھ کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔
"پولیس تمہاری تلاش میں آئی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور مجھے چائے کا پھندا لگتے لگتے رہ گیا۔
"کیا پولیس اندر آئی تھی؟" میں نے حلق صاف کر کے پوچھا۔
"ہاں...... اور اس نے عمارت کی تلاشی بھی لی تھی...... اور پھر مجھے ہوشیار کر کے کسی بھی شبے پر ہیڈ آفس فون کرنے کی ہدایت کر کے واپس چلی گئی۔ شکر ہے، اس نے اسٹور کا رُخ نہیں کیا تھا۔ بعد میں میری ملازمہ نے الماری کے پیچھے سے نکلے ہوئے تمہارے پاؤں دیکھے اور مجھے اطلاع دی۔"
"ہوں......!" میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنے لئے دوسرا کپ بنانے لگا۔
"مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا، تم اتنے خطرناک نہیں نظر آتے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ عادی مجرم تمہاری طرح نہیں ہوتے۔ شاید تم نے زندگی میں پہلی بار جرم کیا ہے۔" اس نے کہا۔
میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ وہ خاموشی سے میری شکل دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سرد آواز میں کہا۔ "اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ مجھے کیسے جانتے ہو؟"
"نہیں ثریا!...... ایک بے فائدہ، بے مقصد بات ہے۔" میں نے ایک سرد آہ لے کر کہا۔

''سنو!'' وہ چند لمحوں کے بعد بولی۔ ''اگر میرے جسم کے گاہک بن چکے ہو تو مجھے اپنے کسی گاہک کی شکل یاد نہیں۔ اگر ہو سکے تو تم بھی بھول جاؤ۔ ہو سکے تو اپنے ذہن و دل سے وہ لمحات کھرچ دو وہ میں نہیں تھی، ایک بے جان لاش تھی...... ایک مجبوری تھی...... اگر یہ تصور بھی کسی کے پاس رہ گیا تو میں تڑپتی رہوں گی۔ لوٹا دو میری عزت مجھے۔ میں بے گناہ ہوں۔ مجھ سے اس کا صلہ لے لو۔ وہ قیمت لے لو، جو تم نے مجھے ادا کی تھی۔ کھرچ دو اپنے ذہن سے وہ لمحات۔ میں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔''

''نہیں ثریا!...... خدا گواہ ہے، میں تمہارے جسم کا راز دار نہیں ہوں۔ خدا گواہ ہے، تم میرے لئے ایک مقدس بہن کی حیثیت رکھتی ہو۔'' میں نے کہا اور ثریا کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''لیکن...... پھر تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

''میں یہ نہ بتا سکوں گا...... خدا کے لئے مجھ سے یہ نہ پوچھو۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' میں نے کرب سے کہا۔

''میں مستقل بے چین رہوں گی۔ بہر حال، تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گی۔ تم جیل سے فرار ہوئے ہو؟''

''ہاں!''

''تمہارا نام عارف جمال ہے؟''

''ہاں۔''

''پولیس نے یہی نام لیا تھا۔ کیا تم قاتل بھی ہو؟''

''ہاں ثریا! میں نے دو بے گناہ انسانوں کو قتل کر دیا ہے۔'' میرے دل میں دُکھن ہونے لگی۔

''یہ تم نے بہت برا کیا۔'' وہ کرب سے بولی۔ ''آج کا انسان تو خود ہی لاش ہے۔ زندگی خود ہی دُکھ ہے۔ اسے لینے سے کیا فائدہ۔''

''جو کچھ ہوا، نادانستہ ہوا ثریا!...... میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

''کس اپنائیت، کس بھروسے سے میرا نام لیتے ہو۔ کاش! میں تمہارے بارے میں جان سکتی۔'' اس نے سرد سانس لے کر کہا۔

''تم نے مجھے پناہ کیوں دی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے انسان کی مجبوریوں کا احساس ہے۔ کیونکہ خود میں بھی مجبور رہ چکی ہوں۔ میں جانتی ہوں، انسان پیدائشی گناہگار نہیں ہوتا، اس کی فطرت برائی کی طرف راغب نہیں ہوتی، حالات اسے گناہوں کے گڑھوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ اتنا مجبور ہوتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جرم کرتا ہے، جو اس کے ضمیر کو کچوکے دیتا رہتا ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں طوائف بھی رہ چکی ہوں۔ لیکن جن حالات میں، میں نے ایسا کیا، وہ ناگزیر تھے۔ ان سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں تھی...... میں نے سوچا، ممکن ہے تم بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہوئے ہو۔ جو دُکھ جھیل چکا ہوتا ہے، وہ دُکھوں سے واقف ہوتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم باقاعدہ مجرم نہیں ہو...... تفریحاً جرم نہیں کرتے۔ میں تمہاری ہر قسم کی مدد کر سکتی ہوں۔ تمہیں جس قدر رقم کی ضرورت ہو، مجھ سے لے لو اور اس ملک سے باہر نکل جاؤ۔ نیکیوں کو اپنا لو اور

پوری زندگی اس جرم کا کفارہ نیکیاں کر کے ادا کرتے رہو۔"
"عظیم عورت........ میری بہن! قدرت کسی کی قسمت بلاوجہ نہیں بدلتی۔ تمہاری قسمت کسی خاص مقصد کے تحت ہی بدلی گئی ہے۔" میرے منہ سے جذباتی انداز میں نکلا اور وہ چونک پڑی۔
"تمہیں میری قسمت کے بارے میں کیا معلوم ہے؟"
"مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔ اور پھر میں تمہارے حالات دیکھ رہا ہوں...... اگر میں کچھ اور پوچھوں گا تو تم پریشان ہو جاؤ گی۔"
"نہیں........ خدا کے واسطے مجھ سے گفتگو کرو۔ مجھ سے ہر قسم کے سوالات کرو۔" میں نے کہا۔
"تمہارے منہ سے بار بار لفظ بہن نکلتا ہے اور یہ لفظ میرے دل سے سیاہیاں دھو دیتا ہے۔ ایک انوکھی فرحت محسوس ہوتی ہے مجھے۔"
"تمہارا بچہ کیسا ہے؟" میں نے پوچھا اور وہ پھر اُچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت اُبھر آئی لیکن وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔
"جاوید کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اور تمہاری ساس؟ اُس کا کیا حال ہے؟"
ثریا نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ خاموش بیٹھی رہی، سوچتی رہی، پھر سر اُٹھا کر بولی۔ "جاوید خدا کا شکر ہے ٹھیک ہے۔ میری ساس بھی ٹھیک ہیں اور جاوید کے پاس ہسپتال میں موجود ہیں۔ جلد ہی جاوید کو چھٹی مل جائے گی۔ بچہ آیا کے پاس ہے۔ کیا میں اسے لے آؤں؟"
"کیا کرو گی اس معصوم کو مجھ بدقسمت کی شکل دکھا کر۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
"نہیں........ میں اسے لے کر آتی ہوں۔" ثریا نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ میں سخت کشمکش میں گرفتار تھا، ثریا کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟ کیا یہ سب کچھ اس کے لئے قابلِ یقین ہو گا؟ کیا اس سے مدد طلب کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ مناسب رہے گا؟ لیکن اس بھری دنیا میں میرا اتھا بھی کون؟........ اگر اس باظرف عورت کا سہارا لے کر اس ملک سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا حرج ہے۔ بقیہ زندگی اس کے کہنے کے مطابق گزارنے کی کوشش کروں گا۔
میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ثریا، بچے کو لئے اندر آ گئی۔ بچے کی بھی شکل بدل گئی تھی۔ لاغر بچہ اب گول مٹول ہو گیا تھا۔ ثریا نے اسے میری گود میں بڑی اپنائیت سے ڈال دیا۔ اور مجھے بڑا اچھا لگا۔ کسی ننھے سے بچے کو میں نے زندگی میں پہلی بار گود میں لیا تھا۔ کیسا انوکھا سرور ہوتا ہے، اس ننھی مخلوق کے لمس میں۔ ہر لمس سے زیادہ فرحت بخش۔ میں اسے سینے سے چمٹائے رہا اور آنسو میری آنکھوں میں مچلنے لگے۔ سینکڑوں حسرتیں بیدار ہو گئیں، جن کا عکس میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔
"عارف صاحب!" ثریا کی لرزتی آواز اُبھری۔
"ہاں۔" میں نے اُسے دیکھا۔
"یہ بچہ آپ کو پسند آیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔
"یہ سوال تم نے کیوں کیا ہے ثریا!" میں نے ثریا کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"میں آپ کو اس بچے کی زندگی کی قسم دیتی ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں ایک ایک لفظ سچ سچ بتا دیجئے۔ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میرے پاس آپ کی زبان کھلوانے کی اس کے علاوہ اور کوئی

ترکیب نہیں تھی۔" ثریا نے اچانک کہا اور میرے دماغ میں بم پھٹ گیا۔ مجھے ثریا سے اس اچانک اقدام کی توقع نہیں تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ ثریا میری شکل دیکھ رہی تھی۔ میں نے بچے کو سینے سے بھینچ لیا اور ننھے ننھے کومل ہونٹ مسکرا اُٹھے۔

تب میں نے کہا۔

"میرا نام عارف جمال ہے۔ بچپن میں والدین مجھ سے جدا ہو گئے اور کٹھن زندگی سے گزر کر جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا۔ معمولی کلرک تھا، حسین زندگی کا خواہش مند۔ عام نوجوانوں کی طرح محبت کی۔ لیکن محبوبہ بے وفا نکلی۔ اور اس کی بے وفائی نے مجھے جرم کے راستے پر ڈال دیا...... جرم کیا اور پھر پُراسرار حالات کا شکار ہو گیا۔ ایک پُراسرار شخصیت میری زندگی سے وابستہ ہو گئی۔ وہ میرا ہم شکل تھا۔ میں اس کا تابع ہو گیا اور پھر انوکھے حالات پیش آئے اور ایک دن تم مل گئیں ثریا! لیکن اُس وقت میری یہ شکل نہ تھی۔ ہم دونوں تمہارے گاہک بن کر تمہارے ساتھ گئے، لیکن وہاں تم اس معصوم کو دودھ پلا رہی تھیں...... اور اسی معصومیت نے ہمارے خیالات بدل دیئے۔ طالوت نے تمہیں بہن بنا لیا اور اپنی پُراسرار قوتوں سے تمہیں مالا مال کر کے چلا آیا۔ لیکن پھر وہ مجھ سے بھی جدا ہو گیا اور میں بدترین حالات کا شکار ہو گیا۔ ان حالات کا، جنہوں نے مجھے جیل اور پھر یہاں پہنچا دیا۔"

میں نے ثریا کو اپنی مختصر کہانی سنا دی۔ ثریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی...... نہ جانے کتنی دیر۔ اور پھر وہ اُٹھ کر مجھ سے چمٹ گئی۔

"آہ...... میرے محسن!...... میرے محسن!...... خدا کا شکر ہے...... خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارے ساتھ اس انداز میں پیش آئی۔ اگر مجھ سے کوئی بھول ہو جاتی تو...... تو میں شاید زندگی بھر خود کو معاف نہ کرتی۔ آہ...... مجھے خیال کیوں نہ آیا کہ میرے بچے، میرے شوہر اور میری ساس کے بارے میں تمہارے علاوہ اور کون جانتا ہے۔ میں نے کسی کو اپنی کہانی نہیں سنائی تھی۔ یہ تم ہو میرے بھائی! جس نے ایک لاوارث بچے، ایک پریشان بیوی اور ایک غمزدہ ماں کو سہارا دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا...... یہ تم ہو...... مجھے بتاؤ، میں تمہیں دل کے کون سے خانے میں بٹھاؤں؟ میں اپنی آنکھیں نکال کر تمہارے قدموں تلے کیوں نہ رکھ دوں۔"

"گمان بھی نہ تھا ثریا! کہ زندگی اس حال میں تمہارے سامنے لے آئے گی۔ لیکن مجبوریاں...... انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

"میرا مقدر...... میری خوش بختی...... میں تمہارے کسی کام آ سکی۔ ورنہ تو تمہارا احسان اتنا ہے کہ میں مر کر بھی ادا نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں اپنی آخری سانسوں تک فراموش نہ کر سکوں گی۔"

"بھائی، بہن پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ میں نے تو تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔" میں نے ثریا کو خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا تم نے میری تمام باتوں کا یقین کر لیا؟"

"اپنے بچے کی قسم، میں نے ایک ایک لفظ سچ سمجھا ہے۔ کتنی درد بھری کہانی ہے تمہاری...... میں نے زندگی میں خود کو سب سے زیادہ مظلوم سمجھا تھا۔ لیکن...... لیکن میری مظلومیت تمہارا آگے کچھ بھی نہیں۔" وہ فرطِ جذبات سے خاموش ہو گئی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپاٹپ گر رہے تھے۔ ثریا نے اپنے آنچل سے میرے آنسو خشک کئے اور پھر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ انسان بھی کس قدر عجیب مخلوق

ہے۔ کتنی انوکھی اقدار ہیں اس کی، کتنا معمولی فاصلہ ہے اس کے خیالات میں......... ذہن و زبان سے اصولِ فطرت بدل جاتے ہیں۔ یہ لڑکی، جس کے جسم کی دلکشی نے ہمیں اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور میں، جو عورت پرست بن چکا تھا......... بہت سی عورتیں، بہت مختصر عرصہ میں میرے قریب آ چکی تھیں اور میں ان کی جسمانی دلکشی کا دلدادہ تھا۔ یہ عورت بھی جوان تھی۔ میرا، اُس کا تعلق طویل نہیں تھا، لیکن اس کے سینے کے لمس میں اور دوسری عورتوں کے لمس میں کتنا فرق تھا۔ ان دوسری عورتوں کے لمس نے میرے جسم میں ہیجان پیدا کر دیا تھا اور اس عورت کے لمس میں سمندر کا سا سکون تھا۔ ایک عجیب احساس تھا، جیسے وجود کی تمام اُلجھنیں جذب کر لی گئی ہوں۔ ہلکا پھلکا ذہن......... لطیف احساس.........! میں کئی منٹ تک اس سکون سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر میں اس کے سینے سے الگ ہو گیا۔

''تم بالکل بے فکر ہو جاؤ بھیا! میں عورت ضرور ہوں، لیکن میرے حالات و واقعات نے میرے جسم میں دس مردوں کی قوت پیدا کر دی ہے۔ تم آرام سے یہاں قیام کرو۔ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو گا۔ میں تمہارے لئے پاسپورٹ بنواؤں گی......... خواہ کچھ بھی کرنا پڑے۔ اور پھر میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گی۔''

''نہیں، نہیں ثریا! میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ میری پوزیشن بہت خطرناک ہے۔ میری مدد کرنے والوں کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ بس تمہاری اتنی ہی مہربانی کافی ہے۔''

''مجھے اس چھوٹی سی خوشی سے محروم نہ کرو بھیا! تمہارے لئے کچھ کر کے میرے دل کو بے پناہ سکون ملے گا بس تم میری یہ بات مان لو۔''

کافی دیر تک ثریا میں اور مجھ میں ردوقدح ہوتی رہی۔ لیکن ثریا نے شکست نہیں مانی۔ شکست میں نے بھی نہیں مانی تھی۔ میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میری زندگی حباب کے مانند تھی۔ پھر اس بے کار اور بے مصرف زندگی کے لئے کسی معصوم ہستی کو کیوں مصیبت میں گرفتار کروں۔ ثریا کے اوپر بہت سے لوگوں کی ذمہ داری تھی، اسے خوشیاں ملنے والی تھیں......... اس کا شوہر صحت یاب ہو کر واپس آ رہا تھا۔ اُس کے بچے کو اُس کے سائے کی ضرورت تھی۔ میں جانتا تھا، یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔ پولیس جس شدت سے مجھے تلاش کر رہی ہو گی، اس کے اندر ثریا کی ذرا سی کوشش اسے عذاب میں مبتلا کر سکتی تھی۔

بہر حال......... میں خاموش ضرور ہو گیا......... لیکن دل میں، میں نے کچھ اور فیصلے کئے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا اور اپنے بچاؤ کی خاطر ثریا جیسی معصوم عورت کو پریشان نہیں کر سکتا تھا۔ ثریا میرے لئے دیدہ دل فرشِ راہ کئے ہوئے تھی۔ ہر طرح میری خاطر مدارات کر رہی تھی۔ پولیس کا خطرہ بھی فی الحال ٹل گیا تھا۔ اس کے دوبارہ یہاں آنے کے امکانات نہیں تھے۔ میں اپنے کمرے میں اپنے پروگرام کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اب میرا دوسرا قدم کیا ہو؟

وہ رات اور پھر دوسرا دن میں نے ثریا کے گھر پر گزارا۔ اس دوران اخبارات میں، میں نے اپنے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ پولیس نے میرے لئے معقول انتظامات کئے تھے۔ اب میں قاتل بھی بن گیا تھا۔ مجھے خطرناک اشتہاری ملزم قرار دے دیا گیا تھا اور پولیس میری زندہ یا مُردہ گرفتاری پر کچھ انعامات رکھنے پر بھی غور کر رہی تھی۔ میں بھی اُلجھن میں گرفتار تھا۔ کبھی کبھی تو سوچتا کہ خود کو پولیس کے حوالے کر

کے اس ذلیل زندگی سے نجات حاصل کرلوں۔ لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ دل کو کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ خدا جانے کیوں، ذہن میں نرگس رحمانی کا خیال آ گیا۔ یہ خیال اس قدر شدید ہو گیا کہ میں نے اس دوسری رات کو نرگس رحمانی سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تجربہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ لیکن بہر حال، اُلجھے ہوئے ذہن کو شاید کچھ سکون مل جائے۔ اور رات کو جب سب سو گئے تو میں خاموشی سے اٹھا، کپڑے پہنے، بال سنوارے اور پھر چپکے سے باہر نکل آیا۔ عمارت کے عقبی حصے کی دیوار پھاند کر میں باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں تاریک گلیوں کا سہارا لیتا ہوا چل دیا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ صرف میرے احساسات تھے۔ میرا وجود ایک تنہا، اُجاڑ درخت کے مانند تھا، جس کے قرب و جوار میں کوئی جھاڑی تک نہ ہو۔ نہ تاحدِ نگاہ روشنی کی رمق۔

مجھے روشنیوں میں رہنے کی خواہش تھی۔ مجھے روشنیاں پسند تھیں۔ لیکن دنیا نے میرے راستے کے تمام چراغ گل کر دیئے تھے۔ میں روشنی کی تلاش میں سرگرداں تھا، لیکن اس طرح جیسے عالمِ خواب میں ہوں۔ میں چل رہا تھا، ماحول سے ڈرا ڈرا، سہا سہا سا۔ ہر آہٹ پر دل پھڑ پھڑانے لگتا۔ تاریک سائے اپنی طرف بڑھتے محسوس ہوتے اور جب آہٹ معدوم ہو جاتی تو مجھے شدید پیاس محسوس ہونے لگتی۔

نرگس رحمانی....... حسین، معصوم لڑکی، جس کے لئے میں نے اذیتیں برداشت کی تھیں۔ جسے میں جان دے کر بھی شکیر کی درندگی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچ رہی ہو گی۔ میں جانتا تھا، وہ بھی اسی دنیا کی پروردہ ہے۔ شک و شبہ اس کے دل میں بھی ہو گا، اس نے بھی میرے پنجے سے بچ جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہو گا۔ نہ جانے ایس پی نے ان لوگوں کو میرے بارے میں بتایا ہو گا یا نہیں۔ نہ جانے اب اس کے دل میں میرے لئے کیسے جذبات ہوں، اس کے ذہن میں میرے لئے کیسے خیالات ہوں.......!

لیکن آخر میں اس کے پاس جا ہی کیوں رہا ہوں؟ وہ بھی ایک عام لڑکی ہے۔ ان لڑکیوں کی طرح جو میری مرضی کے بغیر میری زندگی میں آتی رہی ہیں، ان لڑکیوں کے لئے میرے دل میں کوئی تڑپ نہیں ہے، پھر نرگس رحمانی ہی کیوں؟....... لیکن دل کے گوشے سے آواز اُبھری۔ ”نہیں....... وہ مختلف ہے۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح سستی اور چھچھوری نہیں ہے۔ وہ سہل الحصول نہیں ہے۔ اس کے حصول کا تصور ایک ٹھنڈک ہے جبکہ دوسری لڑکیاں جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتی ہیں، جسم میں آگ سلگا دیتی ہیں اور بس دل چاہتا ہے کہ انہیں مسل کر جوتے تلے روند دیا جائے۔ بس یہی فرق ہے اس میں اور دوسری لڑکیوں میں.......اور یہی کشش مجھے وہاں لے جا رہی ہے۔

یہ پورا سفر میں نے پیدل ہی طے کیا۔ اور نہ جانے کتنی دیر میں طے کیا۔ راستے میں مجھے گشتی پولیس کے آدمی نظر آئے تھے، لیکن میں نہایت ہوشیاری سے ان کی نگاہوں سے بچتا ہوا، بالآخر نرگس رحمانی کی کوٹھی پر آ پہنچا۔ اور اب نرگس رحمانی کی شاندار کوٹھی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں ایک تاریک گوشے میں کھڑا حسرت بھری نگاہوں سے اس کوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا، جب مجھے عزت و احترام سے یہاں لایا گیا تھا۔ نرگس کی حسین آنکھوں میں محبت کے پیغام تھے۔ حقیقت جاننے کے بعد وہ کس قدر مسرور نظر آنے لگی تھی۔ اور....... اور داؤد رحمانی صاحب کی آنکھوں میں بھی پدرانہ شفقت تھی۔ وہ شفقت جس سے میں ہمیشہ نابلد رہا تھا، لیکن جس کی مجھے کس قدر طلب تھی۔ کتنا خواہش مند تھا میں ان

تمام جذبوں کا۔ لیکن پھر مجھے وہ وقت بھی یاد آیا، جب ایس پی کے انکشاف پر داؤد صاحب نے نرگس کو سینے سے بھینچ لیا تھا، جیسے وہ کسی بڑی مصیبت سے بچ گئی ہو۔ اور وہ مصیبت میں تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ داؤد صاحب کی کوٹھی کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ آخر یہاں آ کر میں کیا چاہتا تھا۔ میں نرگس سے کیا لینا چاہتا تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا لیکن کوئی جواب نہیں تھا میرے پاس۔ اس قدر اُلجھا ہونے کے باوجود میں نے اتنی عقل مندی سے کام لیا تھا کہ سامنے کی طرف سے کوٹھی کی دیوار پر نہیں چڑھا۔ بلکہ اس کے لئے میں نے بائیں سمت کی دیوار استعمال کی۔ اس دیوار کو پھلانگ کر میں کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ دو بار اس کوٹھی کو دیکھ چکا تھا۔ نرگس رحمانی کی خواب گاہ بھی معلوم تھی۔ دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں خواب گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے کواڑوں کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تھی۔ کوٹھی بہر حال محفوظ تھی۔ خواب گاہ میں زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ ایک مسہری پر شب خوابی کے خوب صورت لباس میں ملبوس نرگس رحمانی گہری نیند سو رہی تھی۔

ہونٹوں پر ایک مسکان لئے وہ بال بکھرائے سو رہی تھی۔ اس مست شباب کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے میں سب کچھ بھول گیا...... مجھے اپنی شخصیت تک یاد نہ رہی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں خمار اُمڈ آیا اور میرے قدم بے اختیار اس کی طرف بڑھ گئے۔ اب میں اس کے بالکل قریب تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ بھول جاؤں۔

بمشکل تمام میں نے خود پر قابو پایا۔ اور اگر میں نے اس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کر دی تو پھر شیکر میں اور مجھ میں بہت معمولی سا فرق رہ جائے گا۔ انتہائی معمولی فرق...... اس کے ناموس کی حفاظت کے لئے تو میری یہ حالت ہوئی ہے۔ اگر شیکر کی بات مان لیتا تو کتنی بڑی دولت حاصل کر سکتا تھا۔

اور اگر داؤد رحمانی وہ عظیم رقم دینے پر تیار نہ ہوتے تو...... تو پھر یہ جسم بھی ایک رات کے لئے مجھے مل جاتا، شیکر نے وعدہ کیا تھا۔ اگر یہی کرنا تھا تو پھر شیکر کی بات ہی کیوں نہ مان لی جاتی۔ نہیں، نہیں...... میں درندہ نہیں، انسان ہوں۔

میں اس کے قریب مسہری کے برابر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے ریشمی بالوں میں اُلجھ گیا۔ الہڑ اور جوان ہونے کے باوجود وہ گہری نیند کی عادی نہیں تھی۔ میرے ہاتھ کے پہلے لمس پر ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ میرا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف اور پھر ہیجان دیکھا۔ اور پھر اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے ایک زوردار چیخ ماری لیکن میں اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کا منہ بھینچ لیا اور سرد آواز میں کہا۔

”ہوش میں آؤ، نرگس! میں کوئی عفریت نہیں ہوں اور نہ میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔ میں کسی بُرے ارادے سے نہیں آیا۔ بس ضمیر کے سکون کے لئے تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔ باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔ خود کو سنبھالو...... چیخنے کی کوشش مت کرو...... اگر تم نہ چیخنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارا منہ چھوڑ دوں؟؟“

اس نے جلدی سے خوف زدہ انداز میں گردن ہلا دی اور میرا دل خون ہو کر رہ گیا۔ اس کے سہمے ہوئے انداز میں اپنائیت نہیں، صرف خوف تھا۔ وہ صرف اپنی زندگی بچانا چاہتی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی

سانس لے کر ہاتھ ہٹالیا...... وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم اب تک کانپ رہا تھا۔ چہرے کے نقوش خوف سے بگڑ گئے تھے۔

''کیا ان ملاقاتوں میں تم نے مجھے ایسا ہی خوف ناک پایا تھا، نرگس! جو اس وقت تم اس طرح کانپ رہی ہو؟''

''تم...... تم کیوں...... یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

''تم سے ایک سوال کرنے۔'' میں نے کہا۔

''کون سا سوال؟...... خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''نرگس!...... نرگس! تمہیں خدا کا واسطہ...... دل سے خوف نکال دو۔ ذہن کی گہرائیوں کو ٹٹول کر میرے سوالات کا جواب دو۔'' میں نے عاجزی سے کہا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

''کیا تم نے ابتدا سے...... پہلی ملاقات سے اس وقت تک، جب تمہارے ڈیڈی نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا، میرے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

نرگس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی کیفیت ایسی ہی تھی، جیسے کوئی چڑیا باز کے پنجے میں ہو۔ اور اس کے دل میں ایک آرزو ہو کہ کسی طرح وہ باز کے شکنجے سے نکل جائے۔ جب اس نے کئی سیکنڈ تک میری بات کا جواب نہیں دیا تو میں نے خود ہی کہا۔

''میں جانتا ہوں نرگس! میری کوئی کوشش تمہارے ذہن سے میری نفرت، میرا خوف نہیں نکال سکتی۔ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا ہے کہ تم میرے کسی سوال کا جواب نہیں دو گی۔ لیکن خیر...... کوئی بات نہیں ہے میں دل کا بوجھ اُتارنے آیا ہوں، اسے اُتارنے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکے تو میری بات سن کر مجھے اپنے تاثرات سے آگاہ کر دینا۔ اور یہ بھی نہ کر سکو، تب بھی...... بہرحال! تم اپنی مرضی کی مختار ہو۔ میں کوئی لمبی تقریر نہیں کروں گا، مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کروں گا۔ سنو! میں ایک غریب کلرک تھا۔ حادثات نے مجھے غلط راہوں پر ڈال دیا۔ جذبات میں بھر کر ایک جرم کر بیٹھا...... دولت حاصل کرنے کا جرم...... اس تصور کے ساتھ کہ شاید دولت سے سچی اُلفت مل جائے۔ لیکن اس جذباتی حرکت نے مجھے نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔ اور پھر میں ایک لاوارث کشتی کی طرح وقت کی لہروں پر ڈولتا رہا۔ دوسرے میرے لئے سمتیں متعین کرتے رہے۔ میں کوئی جدوجہد نہ کر سکا۔ حالات نے مجھے جو کچھ بنایا، بن گیا۔ پھر تم ملیں۔ تمہاری پاکیزگی مجھے پسند آئی۔ میں تمہاری عزت کرنے لگا۔ بردہ فروش تمہیں میرے ذریعے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں تمہارے سفید آنچل پر کوئی داغ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے وہ تمام داغ اپنے اوپر سمیٹ لئے، جنہیں میں ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔''

میں نے بے حد جذباتی انداز میں قمیض اُتار دی۔ اپنی پنڈلیاں اُسے دکھائیں اور درحقیقت میں نے نرگس کی آنکھوں میں نمایاں تغیر محسوس کیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تمہارے والد کو حقیقت بتا دی، صف اس لئے کہ اگر میں اپنی جان بھی دے دوں گا، تب بھی شیکر تمہیں کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کر لے گا۔ اس لئے تمہارے والد کو خبردار کرنا ضروری تھا۔ بہرحال! مجھے مسرت ہے کہ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا۔ تمہاری عزت محفوظ رہ گئی۔ شیکر کا گروہ ٹھکانے لگ گیا۔ خدا گواہ ہے، نرگس! اس کے بعد میرا ارادہ تمہارے پاس آنے کا نہیں تھا، میں تو خود کو

کسی کے قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن تمہارے ڈیڈی کا بلاوا مجھے ملا اور مجھے یہاں پہنچا دیا گیا۔ اور پھر........ میں تمہارے بارے میں رنگین اور سہانے سپنے دیکھنے لگا۔ میں کچھ دیر کے لئے خود کو بھول گیا۔ لیکن یہ وقفہ بہت کم رہا، دنیا مجھے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں نے ایک نیکی کی، دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر۔ اسے بھی دوسرا رنگ دے دیا گیا اور میرا سکون لٹ گیا۔ تمہاری آنکھوں کا یہ خوف، یہ اجنبیت میرے لئے سوہانِ روح ہے نرگس!........ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا........ کچھ نہیں چاہتا........ یہ دنیا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ خواہ زندگی بھر دوسروں کے لئے جان کی بازی لگاتا رہوں۔ لیکن نرگس!........ اپنی آنکھوں کا یہ خوف دُور کر کے مجھے اپنائیت کی نگاہ سے دیکھ لو........ میں سکون سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مجھے زندہ رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔ کہہ دو نرگس! تم اس غریب کلرک کو جعلساز اور خوف ناک مجرم نہیں سمجھتی ہو........ اپنے یقین کا اظہار کرو کہ میں نے تمہاری عفت بچانے کے لئے قربانی دی ہے۔ بس مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے، نرگس!........ اور کچھ نہیں چاہئے۔"

نرگس عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زوردار آواز سے دروازہ کھلا اور بہت سے لوگ اندر گھس آئے۔ سب سے آگے ایک پولیس افسر تھا، جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"خبردار........ کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو چیتھڑے اُڑا دیئے جائیں گے۔ گرفتار کر لو اس قاتل کو۔" افسر نے کہا اور دو آدمی آگے بڑھے۔

"رک جاؤ........ صرف ایک منٹ کے لئے رک جاؤ۔ میں........ میں صرف ایک منٹ کی تنہائی چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بے شک تم مجھے گولی مار دینا۔" میں نے دونوں ہاتھ سامنے کر کے کہا۔

"بکواس مت کرو........ اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تم نے فرار کے دوران دو سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ تمہیں گولی مار دینے کا حکم ہے۔"

"میں نرگس سے اپنی بات کا جواب لئے بغیر خود کو گرفتار کرانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو تو دو منٹ کے لئے باہر نکل جاؤ۔"

"نرگس!........ نرگس! میری بچی! تُو ٹھیک تو ہے نا؟........ گرفتار کر لو اس مردود کو۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ پھانسی دے دو کمبخت کو........ یہ........ یہ نہ جانے میری بچی کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا تھا۔" داؤد رحمانی نے آگے بڑھ کر نرگس کو سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک منٹ........ صرف ایک منٹ........ مجھے دل کی خلش دُور کر لینے دو ظالمو!........ میں مجرم نہیں ہوں، بنایا گیا ہوں........ صرف ایک منٹ دے دو........ خدا کے لئے صرف ایک منٹ!" میں ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے والے میرے قریب پہنچ گئے اور پھر انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ میں نے پوری قوت سے ان میں سے ایک کو دبوچا اور اُٹھا کر افسر پر دے مارا۔ افسر کے ہاتھ سے پستول نکل کر دور جا گرا۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے تھے۔ فوراً ہی دوسرے لوگوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ لیکن اب میرے سامنے کون ٹِک سکتا تھا۔ میرے خوف ناک ہاتھ جس پر پڑے، اس کے حلق سے صرف کراہ نکل سکی۔ دوبارہ اُٹھنے کی ہمت اس میں کہاں تھی۔ میں دروازے سے نکل گیا۔

پولیس افسر نے پستول دوبارہ اُٹھایا اور گولی چلا دی۔ لیکن نشانہ چوک گیا تھا۔ افسر سیٹیاں بجا رہا تھا اور میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ لیکن پولیس کی تعداد کافی تھی۔ پولیس والے چاروں طرف سے دوڑ رہے تھے۔ شاید ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ میں ایک بار یہاں ضرور آؤں گا۔ شاید اس لئے کہ میں نے ایس پی سے درخواست کی تھی کہ وہ داؤد رحمانی کا دل میری طرف سے صاف کر دے...... اس لئے یہاں پولیس پوشیدہ تھی۔ باہر موجود پولیس والوں کے پاس رائفلیں بھی تھیں...... اب انہیں میری زندگی کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے وہ بے دریغ گولیاں چلا رہے تھے۔ میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

لیکن میں ان گولیوں سے بچتا ہوا سڑک پر نکل آیا...... میں نے ایک سے زیادہ گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنیں اور گاڑیاں میرے پیچھے دوڑنے لگیں۔ لیکن میں کسی قیمت پر خود کو ان کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نکل جانا چاہتا تھا اور میں نے ایک حیرت انگیز بات محسوس کی۔

میں سیدھی سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ اپنے پیچھے جیپوں کی روشنیاں محسوس کر رہا تھا۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ لیکن پولیس کی جیپیں مجھ تک نہ پہنچ پا رہی تھیں۔ البتہ گولیاں میرے دائیں بائیں سے نکل جاتی تھیں۔ ظاہر ہے، جیپوں کی رفتار سست نہ ہوگی۔ وہ میرے قریب پہنچنے کے خواہش مند ہوں گے۔ لیکن شاید میری رفتار اتنی تیز تھی کہ گاڑیاں مجھے پکڑ نہیں پا رہی تھیں۔ اور یہ بھی شربتِ فولاد کا ہی کارنامہ تھا!

کافی دُور بھاگنے کے بعد مجھے ایک موڑ ملا اور میں تیزی سے گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلیاں تھیں، چنانچہ میں ان گلیوں میں دوڑنے لگا۔ جیپیں گلیوں میں داخل ہو گئی تھیں، لیکن اب ان کی رفتار تیز نہیں تھی۔ زیادہ تر پولیس والے جیپوں سے اُتر کر گلیوں میں دوڑنے لگے تھے۔ میں بھی دوڑ رہا تھا۔

پھر ایک جگہ راستہ بند ہو گیا۔ میں نے رک کر دیکھا، ایک چھوٹا سا ایک منزلہ بنگلہ تھا، جس کا پھاٹک کھلا ہوا تھا...... میں جلدی سے بنگلے میں داخل ہو گیا اور پھاٹک بند کر دیا۔ لیکن یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بنگلے کے ایک کمرے میں، میں نے روشنی ہوتے دیکھی تھی۔ پولیس کی بھاگ دوڑ سے بنگلے کے مکین جاگ اُٹھے تھے۔ لیکن میں عمارت میں داخل ہو گیا۔ اور پھر چھپنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ چند کمرے تھے، جن میں سے صرف ایک کمرہ روشن تھا۔ باقی تاریک پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک تاریک کمرے کے دروازے کو دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کی تاریکی میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ اور پھر میرے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے۔ مسہری تھی۔ میں جلدی سے زمین پر بیٹھ کر مسہری کے نیچے رینگ گیا۔

میرا دل اُچھل رہا تھا۔ اتنی تیز دوڑنے سے سانس پھول گیا تھا۔ میں تنگ جگہ میں چت لیٹا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، درست ہوا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے مقابلے پر آنا ہی پڑے گا، جنہوں نے میری زندگی میں زہر گھولا ہے۔ ٹھیک ہے۔

اب میں دنیا سے اپنا حق چھینوں گا۔ آخری دم تک زندگی کی جدوجہد کروں گا۔ اس کا حق مجھے بھی ہے۔ جب لوگ میری زندگی کے درپے ہیں تو میں بھی انہیں کھلونا سمجھوں گا۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ اے دنیا والو! ہوشیار ہو جاؤ...... تم نے ایک انسان کو عفریت بنا دیا ہے۔ تم نے ایک زہریلا درخت اُگایا ہے، اب اس کے پھل سمیٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ دنیا نے کبھی میری بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ کبھی میری چیخیں سننے کی

کوشش نہیں کی۔ پھر میں کیوں چیخوں؟ اس دنیا کو چیخنے پر مجبور کیوں نہ کر دوں؟ میرا دل چاہا، زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ وحشت سے ناچنے لگوں۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور ذہن کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت میں نے قدموں کی چاپ سنی اور دوسرے لمحے میں نے سانس روک لیا۔

''شاید پولیس کسی کو تلاش کر رہی ہے۔'' ایک آواز اُبھری۔

''کوئی اُچکا ہوگا۔ آپ آرام کریں۔'' یہ نسوانی آواز تھی۔

''اچھا......!'' مردانہ آواز اُبھری۔ اور پھر کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کوئی اندر آ گیا۔ بتی جل اُٹھی۔ اور پھر دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں بدستور دم سادھے پڑا تھا۔ میں نے دو خوب صورت پنڈلیاں دیکھیں، جو ایک الماری کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اوہ! اس کا مطلب ہے، مرد چلا گیا۔

وہ پنڈلیاں الماری کے نزدیک پہنچ گئیں۔ الماری کے شیشے کا عکس ناچنے لگا۔ شاید اسے کھولا گیا۔ پھر کچھ رنگین کپڑے نظر آئے۔ الماری بند کر دی گئی۔ لیکن اب اس کا شیشہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اور اس شیشے میں اندر آنے والی کا عکس......!

ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے۔ خوب صورت انداز میں بال باندھے ہوئے۔ رنگ ضرورت سے زیادہ حسین تھا۔ گلابی گلابی۔ شاید میک اپ ہو...... یا......!

اپنی ذہنی کیفیت کا میں صحیح تجزیہ نہیں کر سکا تھا۔ تاہم آئینے سے میں اپنی نگاہ نہیں ہٹا سکا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر اُس نے ایک باریک گاؤن جسم پر ڈالا اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرسی کے پاس ایک شیلف سے اس نے کوئی کتاب اُٹھائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اُس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

میں جس پوزیشن میں تھا، اس کے تحت تو مجھے خاموشی سے وہاں چھپے رہنا چاہئے تھا۔ لیکن میرے ذہن میں زبردست بغاوت اُبھر آئی تھی۔ اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں تھا۔ چنانچہ میں مسہری کے نیچے سے کھسکا اور باہر نکل آیا۔ لڑکی نے میری چاپ سن لی۔ دوسرے لمحے اس نے چونک کر کتاب بند کر دی اور کسی قدر خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مقامی نہیں تھی۔ بیس بائیس سے زیادہ کی نہ ہوگی۔ چہرہ بے حد پُرکشش تھا۔

ابتدا میں اس کے چہرے پر خوف کی جھلکیاں نظر آتی رہیں۔ پھر وہ پُرسکون ہو گئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے شیریں آواز میں کہا۔

''ہیلو......!''

اور اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہیں دیکھ کر چیخی کیوں نہیں۔ خوف سے کانپنے کیوں نہیں لگی۔ کیوں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب اس نے خود ہی کہا۔ ''اس کا جواب یہ ہے کہ آخر تم انسان ہی ہو...... کوئی خوف ناک درندے یا زہریلے جانور تو نہیں ہو...... تمہاری کوئی ضرورت ہی تمہیں یہاں لائی ہوگی۔ اگر ایک انسان کی حیثیت میں، میں تمہاری ضرورت پوری کر دوں تو کیا حرج ہے۔ اوہ...... مگر ٹھہرو...... یہ ابھی کچھ دیر قبل پولیس کی بھاگ دوڑ تمہارے لئے ہی تو نہیں تھی؟...... میں سمجھی، تم یہاں صرف جان بچانے کے لئے آئے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''زیادہ نڈر بننے کی کوشش مت کرو۔ نقصان اُٹھا سکتی ہو۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''اونہہ...... اپنی برتری چاہتے ہو...... چاہتے ہو میں تمہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاؤں۔ چلو، تمہاری برتری تسلیم۔ آئینہ دیکھو...... اتنے برے بھی نہیں ہو کہ کوئی تمہیں دیکھ کر ڈر جائے۔'' اس نے ایک ادا سے کہا۔ میں مسلسل اسے گھور رہا تھا۔

''آدم خور ہو کیا؟...... کھانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے کہا اور ایک نازک سا قہقہہ لگایا۔ ''بیٹھ بھی جاؤ...... پہلے میری چند باتیں سن لو...... میں تم سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں...... اگر یہاں کی کسی چیز کی ضرورت ہے تو لے جا سکتے ہو۔ اگر پولیس سے بچنا چاہتے ہو تو یہاں آرام کرو۔ پولیس یہاں نہ پہنچ سکے گی۔ اور اگر پہنچ بھی جائے تو تمہیں نہ پا سکے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ بیٹھ جاؤ پلیز!''

لڑکی ضرورت سے زیادہ نڈر تھی۔ میں نے بھی اپنے رویّے میں تبدیلی کر لی اور بیٹھ گیا۔

''شکریہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔ ''کوئی فراڈ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کسی کو مدد کے لئے نہیں بلانے جا رہی۔ اگر کہو تو چائے یا کافی تیار کر کے لاؤں؟''

''نہیں...... شکریہ!'' میں نے خشک انداز میں کہا۔

''آئے ہو تو دوستوں کی طرح باتیں کرو۔ یہ خشک انداز مجھے پسند نہیں آئے گا۔ اور بلاوجہ دل تم سے متنفر ہو جائے گا۔ پھر برداشت تو کروں گی، لیکن بے دلی سے۔''

''یہ جاننے کے بعد بھی کہ پولیس میرے پیچھے ہے، تم مجھ سے دوستانہ انداز میں بات کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں...... یہ میرا گھر ہے...... اور تم ایک ضرورت مند ہو۔ پولیس اگر اس گھر سے باہر تمہیں تلاش کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن یہاں بہرحال تم ایک آزاد انسان ہو۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کرسٹینا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس عمارت میں کتنے افراد رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف میں اور غلام بابا۔'' اس نے جواب دیا۔

''غلام بابا کون ہیں؟''

''میرے مربی۔ میرے نگران۔ اب اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں۔ یقین نہ ہو تو باہر جاؤ اور اطمینان کر لو۔''

''میں رات کو یہاں قیام کر سکتا ہوں؟''

''بڑے سکون و اطمینان سے۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''تب میں یہاں...... تمہارے کمرے میں رات گزاروں گا۔'' میں نے کہا۔

''میرے بستر پر...... میرے ساتھ نہیں۔'' اس نے زوردار انداز میں کہا اور میں اس کے چہرے پر کوئی خاص بات تلاش کرنے لگا۔ لیکن کچھ نہ پا سکا۔ اس کا سوال بے حد بے باک تھا۔ مجھ سے اس کا کوئی جواب نہ بن سکا۔

''میں خود بھی بیزار تھی...... نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجبوراً ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی تھی اور کتاب کے

لمحات نے مجھے اور پریشان کر دیا تھا۔ لیکن اب تنہائی نہیں رہی۔ مجھ پر بھروسہ کرو......اطمینان سے رات گزارو۔ صبح جہاں دل چاہے، چلے جانا۔" وہ کرسی سے اُٹھ گئی۔

مسہری پر بیٹھ کر اس نے جوتے اُتارے اور انہیں دوسری طرف اُچھال دیا اور پھر مسہری پر لیٹ کر ریشمی چادر جسم پر سرکالی۔

کھلی دعوت تھی۔ میں کیسے رَد کر سکتا تھا۔ اور پھر اس سے میرے باغیانہ جذبے کو بھی تسکین ملتی تھی۔ میں نے اس کے انداز پر غور کرنا چھوڑ دیا۔ رات بہر حال گزارنی تھی، خواہ اس رات کی صبح کیسی ہی ہو۔ چنانچہ میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ میں نے مسہری پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکراتی ہوئی چمک دار آنکھیں جو میرے حواس پر مسلط ہو گئیں اور میں ان آنکھوں میں ڈوب کر گہری نیند سو گیا۔

صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو وہ مست نیند سو رہی تھی۔

"خوب......!" میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ "بن مانگے موتی ملیں، مانگے ملے نہ بھیک۔" میرے ذہن میں ایک فقرہ اُبھرا۔ میں نے اس کے ریشمی بالوں کو اپنے چہرے سے لگایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر اس کے ہونٹ مسکرا اُٹھے۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"کیسے بے درد ہو؟......اپنا نام تک نہیں بتایا۔"

"عارف!" میں نے نہ جانے کیوں سچ بول دیا۔

"چھوٹا سا، خوب صورت نام ہے۔ کیا تمہارے دل میں اب بھی میری طرف سے وسوسے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے غیر اختیاری طور پر کہا۔

"تب مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ.... پولیس تمہاری تلاش میں کیوں تھی؟ رات کو کیا واردات کی تھی؟"

"تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے یہ سوالات بیکار ہیں۔"

"غلام بابا بہت رحم دل انسان ہیں......ممکن ہے، وہ تمہاری مدد پر آمادہ ہو جائیں۔"

"بے وقوفی کی بات ہے۔ لوگ مجھے مجرم تو سمجھ سکتے ہیں، جرم کی وجہ جاننے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ میرے اوپر رحم کھانے والا اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"ہم ہیں......یقین کرو، ہم ہیں۔ کیونکہ ہم بھی زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں غلام بابا سے ملاؤں گی۔"

"مناسب نہ ہوگا، کرسٹینا!......وہ مجھے کیسے برداشت کریں گے؟ کیا تم انہیں بتاؤ گی کہ......کہ میں پوری رات تمہارے کمرے میں رہا ہوں؟"

"میں غلام بابا سے کوئی بات نہیں چھپاتی......تم چلے جاؤ گے، تب بھی بتا دوں گی۔ ان کی طرف سے مجھے پوری آزادی ہے۔ جس طرح چاہوں، زندگی گزاروں۔" کرسٹینا نے کہا اور میں حیران رہ گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

بہر حال بہت سی باتیں انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

"اب میں اُٹھوں......ناشتہ تیار کرنا ہے۔" اس نے کہا اور چادر سرکا کر کھڑی ہو گئی۔

اطمینان سے چلتی ہوئی الماری تک پہنچی۔ اس نے نیا لباس نکالا اور مسکراتی ہوئی باتھ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی، جو کمرے سے منسلک تھا۔ میری نگاہوں نے مسلسل اس کا تعاقب کیا تھا۔ اچھی لڑکی تھی۔ جسمانی زندگی سے بھرپور........لیکن اب میں کسی سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آوازیں آتی رہیں اور میں آئندہ اقدامات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے بہت سے فیصلے کئے۔ اور پھر وہ باتھ روم سے نکل آئی۔ نکھری نکھری سی........ڈھلی ڈھلی سی۔

''تم غسل کر لو، ڈارلنگ!........میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ پھر ہم تینوں ناشتہ کریں گے۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔

جو کچھ بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ میں نے سوچا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ کافی دیر تک غسل کیا۔ پانی بڑا سکون بخش رہا تھا۔ اور جب ضرورت سے زیادہ وقت گزر گیا تو پھر میں اپنا لباس پہن کر باہر نکل آیا۔ ابھی تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی، لیکن میں ہر خطرناک واقعے کے لئے تیار تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ہتھیاروں کی سخت ضرورت ہے تاکہ پولیس سے مقابلے میں انہیں بھی استعمال کر سکوں۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، باقاعدگی سے کرنا تھا۔ چنانچہ میں ہتھیار حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

کافی وقت گزر گیا۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کرسٹینا نے اندر جھانکا اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''غلام بابا ناشتے کی میز پر تمہارے منتظر ہیں، ڈارلنگ!....آؤ۔'' اور میں اُٹھ گیا۔ خود کو پوری طرح سنبھال کر میں کرسٹینا کے ساتھ قدم ملاتا ہوا ناشتے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے میز کے پیچھے کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ متناسب قد و قامت، گھنی داڑھی اور مونچھیں۔ مقامی لباس پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی چبھن کا احساس ہوا........ یہ مسکراہٹ اجنبی نہیں تھی۔ لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود اسے نہیں پہچان سکا۔

''یہ عارف ہیں بابا!'' کرسٹینا نے کہا۔ ''اور یہ میرے غلام بابا ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔'' غلام بابا نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہم تینوں نے انتہائی خاموشی سے ناشتہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد ناشتے سے فارغ ہو گئے۔ تب بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صبح کے اخبار میں تمہاری تصویر پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ تمہارے بارے میں تفصیل پڑھ لی تھی۔ جب کہ کرسٹینا نے بتایا کہ تم یہاں موجود ہو۔ اور یہ رات تم نے اس کے کمرے میں گزاری ہے تو بڑی خوشی ہوئی کہ تم کسی غلط جگہ نہیں پہنچے۔''

میں بوڑھے کی آواز پر غور کر رہا تھا۔ یہ آواز میرے کسی شناسا کی نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود میری چھٹی حس میرے ذہن پر ٹھوکے لگا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں!

''میں تمہاری ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم یہاں آرام سے وقت گزارو۔ کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ کرسٹینا تمہارے ساتھ ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔'' بوڑھا کھڑا ہو گیا۔

''کب تک واپسی ہو گی بابا؟'' کرسٹینا نے کہا۔
''دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا۔'' بوڑھے نے کہا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اب کمرے میں، میں اور کرسٹینا ہی رہ گئے تھے۔ کرسٹینا خاموشی سے میری شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔
''بابا نے غلط نہیں کہا ہے۔ تم یہاں بے فکری سے وقت گزار سکتے ہو۔''
''تمہارے بابا پولیس سے خوف زدہ نہیں ہیں؟''
''پولیس ان کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اور پھر ہم یہاں شریف لوگوں کی طرح رہتے ہیں۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا کہ تم یہاں موجود ہو........ اس کے علاوہ یہاں تہہ خانے بھی ہیں، جہاں پولیس نہیں پہنچ سکتی۔ میں نے کہا نا کہ بابا بہت بارسوخ ہیں، ان کے زیر سایہ تم تکلیف میں نہ رہو گے۔''
''ہوں.......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ گویا یہ لوگ بھی شریف آدمی نہیں ہیں۔ بوڑھے غلام کی مسکراہٹ مجھے ابھی تک بے چین کر رہی تھی۔
''ایک بات پوچھوں؟'' تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔
''پوچھو۔''
''تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟''
وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ چند منٹ اُلجھے اُلجھے انداز میں مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ لیکن براہِ کرم مجھ سے کوئی ایسی بات مت پوچھو، جس کا میں جواب نہ دے سکوں۔ بابا تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ صرف اتنا کہوں گی کہ انہیں تم جیسے لوگ پسند ہیں۔''
میں گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے اس سے اخبار طلب کیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اخبار کی خبریں بہت گرم تھیں۔ میرے بارے میں چار کالمی سرخی جمائی گئی تھی، جس میں میری تصویر بھی تھی۔ رات کو بھی چند پولیس والے میرے ہاتھوں زخمی ہو گئے تھے۔ عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔ یہاں تک لکھ دیا گیا تھا کہ میں کچھ پُراسرار اور سائنسی قوتوں سے لیس ہوں اور بے پناہ طاقتور بھی، وغیرہ وغیرہ!...... میں خبریں پڑھتا رہا اور کرسٹینا مسکراتی رہی۔
پھر میں نے گردن اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں....... مسکرا کیوں رہی ہو؟''
''پولیس نے تمہارے بارے میں کیسی بھی قیاس آرائیاں کی ہوں، میں نے ایک بات ضرور محسوس کی ہے۔''
''کیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''تم....... تم بے حد دلکش ہو۔ صنفِ نازک کو پوری طرح قابو میں کر لینے والے۔''
اس نے مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''اُٹھو!''
''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔
''کمرے میں چلیں.......!'' اس نے ٹھنکتے ہوئے کہا اور میں نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ ایک انوکھا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ میرے مقدر میں جس طرح اُلجھنیں لکھی گئی تھیں، اسی طرح شاید لڑکیاں بھی۔ جو ہر حالت میں کہیں نہ کہیں زبردستی مجھے مل جاتی تھیں۔ میں نے اُن میں سے کسی کو تلاش نہیں کیا تھا، بلکہ ابتدا میں جب عشق کی ضرورت بھی پیش آئی تھی تو بھینگی آنکھوں والی انجیلا پر ہی اکتفا کیا۔ پھر زرینہ مل گئی! میری نگاہ میں تو وہ ملکہ حُسن تھی اور اسی ملکہ حُسن کی بے وفائی پر میں نے زندگی تباہ کر لی۔ اور اس کے بعد سے لڑکیوں کی جو بھر مار ہوئی تھی، تو صحیح معنوں میں مجھے اُن کے نام بھی یاد نہیں رہ گئے تھے۔

''کرسٹینا.......!''

''ہوں؟''

''تمہیں اندازہ ہے کہ ہمارا یہ ساتھ کتنی دیر کا ہے؟''

''کوئی اندازہ نہیں۔''

''پھر تم نے مجھے اپنے دل میں جگہ کیوں دے دی؟''

''دنیا اتنی تیز جا رہی ہے، مسٹر عارف! کہ انسان کے پاس سوچنے کے لئے بہت کم وقت ہے۔ سوچنے میں دیر لگ جاتی ہے اور وقت آگے بڑھ جاتا ہے۔ جو ذہن میں آئے، کر ڈالنا چاہئے۔ اس کے بعد اگر سوچنے کے لئے وقت مل جائے تو سوچ لو۔'' کرسٹینا نے کہا اور میں اس کی منطق پر غور کرنے لگا۔ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک ہم اسی طرح لیٹے رہے، پھر وہ اُٹھ گئی۔

''دوپہر کے لئے کھانا تیار کر لوں۔'' اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ اُٹھ کر باہر نکل گئی اور میں باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر باہر نکلا اور ایک صوفے پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ خیالات کی مشین چل پڑی۔ نرگس رحمانی یاد آئی۔ اس کے رات کے رویے پر غور کرنے لگا۔ کیا انداز تھا اس کا....... کیا سوچ رہی تھی وہ اس وقت....... کیا اس کے رویّے میں لچک تھی؟....... یا وہ بھی اپنے باپ اور پولیس والوں سے متفق تھی؟

اگر وہ بھی انہی لوگوں سے متفق ہے تو پھر شرافت کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ اس کے لئے کی گئی محنت کی قیمت وصول کر لی جائے۔ کم از کم حماقت کا احساس تو نہ رہے گا۔ یہ تو نہ سوچوں گا کہ بلاوجہ ڈھائی کروڑ کی رقم ضائع کی۔ جب برا ہوں تو برا سہی....... دماغ کھولتا رہا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ پھر تصور کرسٹینا کی طرف منتقل ہو گیا، اس کے الفاظ یاد آئے۔ ہاں، میں ان الفاظ سے متفق تھا۔ اس کی سوچ مناسب تھی۔ میں اسے پسند کر آیا۔ اس نے مجھے حاصل کر لیا۔ لیکن....... کیا بوڑھے غلام بابا کو اس بات کا علم ہو گا کہ کرسٹینا مجھے اپنا سب کچھ سونپ چکی ہے؟ کیا اسے اس بات پر اعتراض نہیں ہو گا؟ آخر ان دونوں کا رشتہ کیا ہے؟ غلام بابا مقامی معلوم ہوتا ہے اور وہ کرسچین ہے....... وہ کہتی ہے کہ بوڑھا اس کا مربی ہے۔ بڑے پُراسرار تھے یہ دونوں۔ بوڑھے نے کرسٹینا سے یہ سوال ضرور کیا ہو گا کہ رات کو وہ کہاں رہا ہو گا۔ کیا کرسٹینا نے رات کی تفصیل بتا دی ہو گی؟....... اور تفصیل جاننے کے باوجود بوڑھے نے اسے کچھ نہ کہا ہو گا۔ اُس کا رویّہ بہت اچھا تھا....... پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ معلوم کرنے کے باوجود کہ میں قاتل ہوں، اس نے مجھے پناہ دی ہے اور میری اعانت کرنے کے لئے تیار ہے۔ آخر

کیوں؟........اور........اور اب وہ کہاں گیا ہے؟ کیا پولیس کو اطلاع کرنے؟........لیکن پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ کرسٹینا میرے لئے چائے لائی۔ چائے پینے کے دوران میں نے اس سے پوچھا۔

''تم لوگوں کی مالی حالت بری نہیں ہے کرسٹینا! پھر یہاں کوئی ملازم کیوں نہیں ہے؟''

''بہت سوچتے ہو ڈارلنگ!........میں کہتی ہوں، اس فضول سوچ میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ اگر ہمارے بارے میں تفصیل معلوم ہو گئی تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے کرسٹینا! بس ایسے ہی خیال آ گیا تھا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

حسب وعدہ دوپہر کے کھانے تک بوڑھا غلام پہنچ گیا۔ کھانے کے کمرے میں اس نے اسی مخصوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا تھا اور میں پھر اس کی مسکراہٹ پر غور کرنے لگا۔

''مجھے یقین ہے، کرسٹینا کے ساتھ تمہارا وقت برا نہ گزرا ہوگا۔ یہ بڑی دلچسپ اور مہمان نواز لڑکی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرا دیا۔ پھر ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کھانے سے فارغ ہو گئے۔

کھانے سے فرصت پا کر بوڑھے غلام بابا نے مجھے اور کرسٹینا کو اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا اور ہم دونوں اس کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ بوڑھے نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

اور........میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دروازہ بند کرنے کا یہ انداز کوئی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا۔ صرف چند کرسیاں، جو ایک طرف پڑی تھیں۔ اس میں دوسرا دروازہ بھی تھا، جس پر پردہ لٹکا ہوا تھا!

''عارف........!'' بوڑھے نے بھاری آواز میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ کرسٹینا ایک کرسی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ''میں تمہیں شارق کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ بلکہ میں تمہیں شارق کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ تمہاری یہ نئی حیثیت میرے لئے حیران کن ہے۔ بلاشبہ میں تمہارے بارے میں سخت اُلجھن میں ہوں۔ صبح کے اخبار میں، میں نے تمہاری تصویر دیکھی تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ تفصیل پڑھی تو اندازہ ہوا کہ جو کچھ اخبار میں درج ہے، وہی درست ہے۔ بلاشبہ تم پُراسرار شخصیت کے حامل ہو۔ میں نے آج کا پورا دن تمہارے بارے میں معلومات اکٹھا کرتے ہوئے گزارا ہے، اور میری معلومات نے اخبارات کی خبروں کی تصدیق کر دی ہے۔ یعنی تمہارے جرائم کی ابتدا حشمت سیٹھ کی فرم سے رقم لے کر فرار ہونے سے ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد تم نے جو کچھ کیا ہے، درحقیقت قابلِ ستائش ہے۔ ایک سیدھا سچا کلرک اس قدر شاندار مجرم بن جائے........یقین کرو، عارف! کہ تمہارے کارناموں کی تفصیل معلوم کر کے میں اپنے عظیم نقصان کو بھی فراموش کر چکا ہوں۔''

وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں پریشان نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

''پہلے میں تمہاری اُلجھنوں کو دور کر دوں، اس کے بعد ہم بات کریں گے۔'' بوڑھے غلام بابا نے کہا۔ اور پھر اس نے اپنے چہرے سے ایک وِگ اُتار دی۔ وِگ کے نیچے جو شکل برآمد ہوئی، اسے دیکھ کر

میں حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ شکیر تھا۔

میرے دماغ میں اتنا زوردار دھما کا ہوا تھا کہ میرے حواس گم ہو گئے تھے اور اب مجھے اس مسکراہٹ سے مانوسیت کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تب شکیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں واقعی اتنی ہی حیرت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں میرے دوست! کہ میں صرف چند افراد کا گروہ بنا کر یہ کام نہیں کر رہا، میری حیثیت بین الاقوامی ہے۔ پوری دنیا میں میرے ساتھی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چند ساتھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے، تو میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرا نیا گروہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگا۔ اس کا انتظام بہت جلد ہو جائے گا۔ کرسٹینا بھی میرے گروہ کی ایک فرد ہے۔ شہر میں دوسرے بہت سے افراد ہیں جو اسی انداز میں غیر متعلق رہتے ہیں اور بس ضرورت پر کام آتے ہیں۔ بہرحال ان باتوں کو چھوڑو، تم نے بحیثیت شارق میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس وقت میں تمہیں ایک شریف آدمی سمجھتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر تم اسی حیثیت میں میرے سامنے آتے تو میں پہلا کام یہی کرتا کہ تمہیں گولی مار دیتا۔ لیکن عارف جمال والی حیثیت میرے لئے پُرکشش ہے۔ اس حیثیت میں جو کارنامے تم سے منسوب ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں۔ بلاشبہ اگر تم ایسے ہی آدمی ہو تو میں پچھلی رنجشیں بھول کر تمہیں کچھ نئی پیشکش کروں گا۔ میں نہیں کہتا عارف! تمہارے کیا حالات ہوں گے، کون سے راستوں سے گزر کر تم یہاں تک پہنچے۔ لیکن ایک بات کی تلقین میں نے پہلے بھی تمہیں کی تھی، وہ یہ کہ اس دنیا میں جینے کے لئے ہر قسم کے اخلاقی اصول بھلا دو۔ وقت جو کہے وہ کرو۔ اگر تم پوری زندگی نیکیاں کرتے رہو گے تب بھی یہ دنیا تمہیں کچھ نہ دے گی۔ تم نے داؤد رحمانی کی لڑکی کی حفاظت کے لئے خطرات مول لئے لیکن تمہیں داؤد رحمانی کی کوٹھی سے ہی گرفتار کیا گیا۔ اور اب بھی اگر تم اس کے سامنے گڑگڑاؤ، اسے اپنے احسان کا واسطہ دو، تب بھی وہ تمہاری طرف نہیں پسیجے گا۔ جب تم صرف ایک جعلساز تھے، عارف! اب قاتل بھی بن چکے ہو۔ یاد رکھو، اگر تم پوری زندگی نیکیاں کرتے رہے، تب بھی دنیا تمہارے اس جرم کو معاف نہیں کرے گی۔ پھر بلاوجہ کیوں احمقانہ زندگی گزار رہے ہو؟ دنیا کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

شکیر کی گفتگو میرے ذہن کے دریچے وا کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیا درحقیقت شکیر کی بات مان لوں؟ یا...... یا...... اور اس سے آگے میرا ذہن نہ سوچ سکا۔

''میں تمہارے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر دوں گا۔ تمہیں ایک لانچ کے ذریعے یہاں سے مڈل ایسٹ بھجوا دوں گا۔ اور پھر وہاں سے تم کہیں بھی نکل سکتے ہو۔ میں تمہاری بھرپور مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

میری حالت اب قدرے پُرسکون ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے شکیر کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''اس کے عوض مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''وہی پرانا کام۔'' شکیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یعنی......؟'' میں تعجب سے اچھل پڑا۔

''نرگس رحمانی۔'' اس نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ''وہ دس کروڑ کا چیک ہے۔''

''لیکن شیکر!........اب یہ کیسے ممکن ہے؟''
''ناممکن کو ممکن بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' شیکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں تمہیں ترکیب بھی بتا سکتا ہوں۔ تم نے میرا چہرہ دیکھا ہوگا اور میری آواز سنی ہوگی۔ میں تمہارے چہرے پر میک اپ کر کے تمہیں گلفام بنا دوں گا۔ میرا دعویٰ ہے کہ نرگس رحمانی تمہیں پسند کرتی ہے۔ تم کسی طرح اس کے قریب جاؤ گے اور راہ و رسم بڑھاؤ گے۔ اور پھر موقع ملتے ہی اس پر اپنی اصلیت ظاہر کر دو گے۔ یقیناً وہ تمہیں اپنے قریب دیکھ کر گھبرائے گی۔ لیکن بہر حالی، اسے راہِ راست پر لانا تمہارا کام ہوگا۔ پھر تم اسے ہمارے شکنجے میں دے دو اور آرام سے یہاں سے نکل جاؤ۔''
''لیکن وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔''
''اگر واقعی ایسا ہے تو........ تم دوسری شکل میں اسے ٹٹولو۔ مطلب صرف کام نکالنے سے ہے۔''
''میں سمجھ نہیں سکا شیکر! تمہارے اتنے زبردست وسائل ہیں۔ پھر تم یہ کام مجھ سے ہی کیوں لینا چاہتے ہو؟'' میں نے پریشانی سے کہا۔
''اسے میری کمزوری سمجھ لو دوست! میں بچپن سے ضدی ہوں۔'' شیکر نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔
''کیا تم اس لڑکی کو بخش نہیں سکتے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''ناممکن........ یہ کام ضرور ہوگا۔''
''لیکن شیکر! میں اب بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔''
''تب میں نے تمہارے لئے دوسرا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔''
''وہ کیا؟''
''میں تمہیں رسّی سے باندھ کر یہاں ڈال دوں گا اور پولیس کو فون کر دوں گا کہ تم یہاں موجود ہو۔ ہم یہ مکان خالی کر کے چلے جائیں گے اور پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔''
''کیا تم اس کام کو اتنا ہی آسان سمجھتے ہو شیکر؟'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
''ہاں۔ تم آخری فیصلہ مجھے سنا دو۔''
''تب پھر میرا جواب نفی میں ہے۔ میں تمہارے لئے یہ کام نہیں کر سکتا شیکر!''
''آخری فیصلہ؟'' شیکر نے سنجیدگی سے کہا۔
''بالکل آخری۔''
''میری ضد اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ تم مصیبت مول لینا چاہتے ہو تو لے سکتے ہو۔''
''میں کہہ چکا ہوں شیکر!........ یہ میرا قطعی آخری فیصلہ ہے۔ نرگس رحمانی کو میری وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو سکے گی۔''
''جوزف........!'' شیکر نے آواز دی اور کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رسّی تھی۔
''میں تمہیں خود بھی قتل کر سکتا ہوں عارف! لیکن میں بتا چکا ہوں کہ میں ضدی آدمی ہوں۔ پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔ ممکن ہے تم دوبارہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ۔ میں کہیں نہ کہیں تم سے رابطہ قائم کر لوں گا اور پھر وہی آفر کروں گا، سمجھے۔ میری پیشکش برقرار رہے گی۔''

''تب شیکر! میں نے ایک اور فیصلہ بھی کیا ہے۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
''وہ کیا؟''
''میں نے دو قتل نادانستگی میں کئے ہیں۔ بے کار، بے مصرف، صرف اپنی زندگی بچانے کے لئے۔ حالانکہ مجھے اپنی زندگی سے اس قدر لگاؤ نہیں ہے، جتنا نرگس کی زندگی سے۔ چنانچہ نرگس کی زندگی کے لئے میں ایک قتل اور کروں گا۔ اور وہ قتل تمہارا ہوگا۔ تمہاری موت سے بہت سے بے گناہوں کو فائدہ پہنچے گا۔'' میں نے کہا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔
''باندھ لو۔'' شیکر نے غضب ناک ہو کر کہا اور اس کے دونوں آدمی آگے بڑھے۔ لیکن میں بھی تیار تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ شیکر کے پاس پستول نہ ہو۔ اس لئے میں ان دونوں کے ساتھ شیکر کو بھی سنبھالنا چاہتا تھا۔ کرسٹینا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ لیکن ظاہر ہے وہ شیکر کی غلام تھی۔ کر بھی کیا سکتی تھی۔ چنانچہ جونہی شیکر کے دونوں آدمی میرے نزدیک پہنچے میں نے انہیں جھکائی دے کر شیکر پر چھلانگ لگا دی۔
یہ بات شیکر کے لئے غیر متوقع تھی۔ قاعدے سے مجھے پہلے ان دونوں سے نمٹنا چاہئے تھا۔ شیکر میری گرفت میں آ گیا اور میں نے سب سے پہلے اس کا پستول تلاش کیا۔ وہ پہلے میری پٹائی دیکھ چکا تھا۔ اطمینان تھا کہ اس کے یہ دونوں نئے آدمی جنہیں وہ شاید پروگرام کے تحت ساتھ لایا تھا، باآسانی مجھ پر قابو پالیں گے۔ اس لئے اس نے پستول نکالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے اس کے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال لیا اور اچھل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
اس کے آدمیوں نے پستول نکالنے کی کوشش کی اور میں نے بے دریغ ان دونوں پر فائر جھونک دیئے۔ دونوں گولیاں نشانے پر لگی تھیں۔ کرسٹینا چیخ مار کر ایک کرسی کی آڑ میں چھپ گئی۔ وہ دونوں نیچے گر کر تڑپنے لگے اور میں شیکر کی طرف مڑا، جو منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ میں نے پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کیا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔
''سنو شیکر! تمہاری موت سے نہ صرف نرگس رحمانی محفوظ ہو جائے گی، بلکہ نہ جانے کتنی لڑکیاں برباد ہونے سے بچ جائیں گی۔ چنانچہ میں ایک نیک کام سمجھ کر تمہیں قتل کر رہا ہوں۔'' اپنے الفاظ کے خاتمے کے ساتھ ہی میں نے گولی چلا دی۔ گولی نے شیکر کی پیشانی کے چیتھڑے اُڑا دیئے تھے۔ کرسٹینا نے پھر ایک بھیانک چیخ ماری تھی۔
تب میں کرسٹینا کی طرف مڑا۔ ''کھڑی ہو جاؤ کرسٹینا!'' میں نے کہا۔
''میں........ میں بے گناہ ہوں........ میں نے کچھ نہیں کیا........ میں مظلوم ہوں۔''
''میں جانتا ہوں کرسٹینا! لیکن میں خود حالات کا شکار ہوں۔ کاش، میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا بہرحال ان لمحوں کا شکریہ جو تم نے مجھے دیئے ہیں........ اپنے بارے میں جیسا مناسب سمجھو کرو۔ میں چلتا ہوں۔''
کرسٹینا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔
''تم اگر چاہو تو بے تکلفی سے میرے بارے میں پولیس کو بتا سکتی ہو۔ کہہ سکتی ہو یہ قتل میں نے کئے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، بلکہ پولیس کے سہارے سے تمہاری زندگی بھی محفوظ ہو جائے گی۔'' میں

نے کرسٹینا سے الوداعی الفاظ کہے اور باہر کی طرف مڑ گیا۔ بنگلے کے لان میں شیکر کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے اسی کار کا استعمال مناسب سمجھا اور اس میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کر کے میں باہر آیا۔ بہر حال اب میرے پاس پستول موجود تھا۔

میں نے سنسان راستے اختیار کئے۔ میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا، میں نے کوئی راہ متعین نہیں کی تھی۔ اخبارات میں میری تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ ہر شخص مجھے پہچان سکتا تھا، اس لئے کوئی راستہ نہ تھا، جہاں سے میں نکل جاؤں۔ پانچ قتل کرنے کے بعد میں نڈر ہو گیا تھا۔ میرے دل میں حیرت انگیز توانائی آ گئی تھی۔ اب میں زندگی سے نہ تو بیزاری محسوس کر رہا تھا اور نہ مجھے کوئی خوف تھا۔ بلکہ اب میری ذہانت عود کر آئی تھی۔ میں اپنے پروگرام بنا رہا تھا اور اردگرد سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ کار خود بخود نواحی راستے پر چل پڑی تھی اور کافی دور نکل آنے کے بعد میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ کوئی گمنام گوشہ اپنا لوں۔ لیکن کہاں.......؟

ایک نواحی بستی کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے شیکر کے الفاظ یاد آئے۔

"میں تمہارے چہرے پر میک اپ کر کے تمہیں گلفام بنا دوں گا اور پھر کام ہونے کے بعد تمہیں لانچ کے ذریعے اسمگل کرا دوں گا۔"

اخبارات کی بہت سی خبریں میری نگاہوں میں گھوم گئیں۔ انسانوں کو اسمگل کرنے کا کاروبار باقاعدہ ہوتا ہے۔ ان میں بہت سے لوگ پکا کام کرتے ہیں۔ بس دولت خرچ ہوتی ہے۔ دولت.......دولت ....اور میرے ذہن میں ڈھائی کروڑ روپے آ گئے۔ ڈھائی کروڑ.......اگر میں شیکر کا کام کر دیتا تو مجھے اتنی دولت مل جاتی.......تو.......پھر میں یہ دولت داؤد رحمانی سے کیوں نہ طلب کروں؟ میں نے اس کی لڑکی کو ہمیشہ کے لئے بچا دیا ہے۔ کیا مجھے اس کا اتنا صلہ بھی نہیں ملے گا؟

حالانکہ داؤد رحمانی کی کوٹھی پر کل جو کچھ میرے ساتھ بیت چکی تھی، وہ پھر بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میں خوف زدہ نہیں تھا۔ آخری بار نرگس رحمانی سے بھی مل لینا چاہتا تھا۔ ان پر اپنا احسان کھلے لفظوں میں جتانا چاہتا تھا اور داؤد رحمانی سے اتنی دولت طلب کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے اسمگل ہو کر باہر جا سکوں۔ کیا مجھے اس احسان کے عوض اتنا حق بھی نہیں پہنچتا؟

یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ نہ جانے میں اس گدھی سے اتنا متاثر کیوں ہو گیا تھا۔ جبکہ اس سے کہیں زیادہ خوب صورت لڑکیاں مجھے حاصل ہو چکی تھیں۔

میں نے ایک گزرگاہ پر بنے ہوٹل کے سامنے کار روک دی اور اُتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ چٹائی اور بانسوں سے بنے ہوئے ہوٹل میں بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ باسی بسکٹ اور گھٹیا چائے موجود تھی۔ میں نے وہی طلب کر لیا۔ ثریا کی مہربانی سے میری جیب میں کچھ رقم موجود تھی، چنانچہ مجھے فکر نہیں تھی۔ اطمینان سے چائے بسکٹ کھاتا رہا۔ شاید میں اس ہوٹل کا پہلا اور آخری گاہک تھا۔ کیونکہ دوپہر اور پھر شام گزرنے پر بھی کوئی دوسرا گاہک نہیں آیا۔ ہوٹل کا سیدھا سادا مالک دیہاتی زبان میں مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس بے چارے کو اخبار پڑھنا ہی نہیں آتا تھا، جو وہ میرے بارے میں جان سکتا۔

شام کو میں نے اسے کچھ نوٹ دیئے۔ اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر چل پڑا۔ راستے میں ایک پٹرول پمپ پر رک کر میں نے کار میں پٹرول بھروایا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

رات ہو چکی تھی۔ سڑکیں تاریک تھیں۔ میں اپنے پروگرام میں مست تھا۔ داؤد رحمانی سے رقم لے کر میں سب سے پہلے اپنا حلیہ بدل لوں گا۔ داڑھی چھوڑ دیتا ہوں۔ آج سے شیو کرنا بند۔ شلوار قمیض استعمال کروں گا۔ سفید چشمہ بھی خرید لوں گا۔ بندرگاہ کے کسی گھٹیا سے ہوٹل میں قیام کروں گا اور وہیں سے ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا، جو انسانوں کو اسمگل کرتے ہیں۔ مناسب پروگرام تھا۔ لیکن........بس پہلا مرحلہ کامیاب ہو جائے!

دولت مجھے ثریا سے بھی مل سکتی تھی۔ لیکن اب میں ادھر کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس معصوم عورت کی پُرسکون زندگی کو روگ لگانے سے کیاں فائدہ؟ ہاں.......نرگس رحمانی۔ میرا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ تقریباً نو بجے تھے۔ میں نے شیکر کی کار نرگس رحمانی کی کوٹھی سے کافی دور کھڑی کر دی۔ اور پھر اسی مخصوص راستے سے کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ پولیس کے بارے میں مجھے آج بھی کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ ویسے میں نے سوچا تھا کہ چونکہ اب انہیں میرے اس طرف رخ کرنے کا گمان بھی نہیں ہوگا، اس لئے پولیس یہاں نہ ہوگی۔

بہر حال میں کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ میرا رخ نرگس رحمانی کی خواب گاہ کی طرف تھا۔ لیکن وہ خواب گاہ میں موجود نہیں تھی۔ تب میں نے دوسری جگہوں پر اسے تلاش کیا۔

اور پھر ڈائننگ روم میں، مجھے نرگس رحمانی اور داؤد رحمانی نظر آ گئے۔ دو ملازم ان کے سامنے کھانا سرو کر رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ داؤد رحمانی اور نرگس رحمانی نے بیک وقت مجھے دیکھا تھا۔ دونوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ملازم بھی اچھل پڑے اور میں نے پستول نکال لیا۔ وہ سب سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔

''مسٹر داؤد رحمانی! ہر چند کہ آپ لوگوں نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ یہ پستول صرف اپنی حفاظت کے لئے ہے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ ایسے وقت میں مخل ہوا ہوں۔ لیکن میرے دل میں جو آگ سلگ رہی ہے، اسے سرد کئے بغیر میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔

داؤد رحمانی بھی اس دوران سنبھل گیا تھا۔ نرگس آنکھیں پھاڑے، سکتے کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان ہو گیا تھا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' داؤد رحمانی نے آواز پر حیرت انگیز طور پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''صرف آپ سے گفتگو کرنا۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب میں اس قابل نہیں ہوں کہ شریفوں میں بیٹھ سکوں۔ جعلسازی کا ٹائٹل تو تھا، آپ کی مہربانیوں نے قاتل بھی بنا دیا۔ میرا خیال ہے، آپ بے خبر نہ ہوں گے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہو چکا ہے۔'' داؤد رحمانی نے کہا اور پھر ملازموں کو اشارہ کرتے ہوئے بولے ''تم باہر جاؤ۔''

''میرے لئے مناسب نہ ہوگا۔'' میں نے پستول کا رخ بدلتے ہوئے کہا اور ملازم چیخ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ''چلو، تم اس کونے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے پستول کا اشارہ کرتے ہوئے

کہا اور سہمے ہوئے ملازم اس طرح دوڑ کر کونے میں پہنچ گئے، جیسے گولیاں ان کا تعاقب کر رہی ہوں۔ پھر وہ دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے فرش پر بیٹھ گئے۔ داؤد رحمانی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ نرگس رحمانی اسی طرح پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔

"داؤد صاحب! میری مکمل ہسٹری آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ اس لئے مزید کچھ کہنا فضول ہے۔ ہاں، کچھ قسمیں کھانے آیا ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں سماج کا مجرم ہوں۔ میں جو کچھ کر چکا ہوں، اب قابلِ معافی نہیں ہے۔ لیکن آپ کے لئے میں نے جو کچھ کیا، خلوصِ نیت سے کیا تھا۔ مس رحمانی مجھ سے ملیں تو شیکر نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ اور پھر اس نے اپنا پروگرام مجھے بتایا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جان دے دوں گا لیکن مس رحمانی پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ اور داؤد صاحب! اگر مجھے خاموشی سے جان دینے پر اطمینان ہو جاتا کہ مس رحمانی کی زندگی اور عزت بچ جائے گی تو میں خاموشی سے جان دے دیتا اور آپ کے سامنے نہ آتا۔ لیکن میری موت کے بعد بھی انہیں خطرہ درپیش تھا، چنانچہ میں آپ تک آیا۔ داؤد رحمانی صاحب! مجھے نرگس اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ میرا ایک ایک رواں اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ میں اس کے لئے پوری دنیا کو تباہ و برباد کرنے کو تیار ہوں اور اس کے عوض مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں نرگس کے سائے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ اور موجودہ حالت میں تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میری دلی خواہش تھی داؤد صاحب! کہ یہ ایک بار میری بے گناہی کا یقین کر لیں۔ بہر حال، یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ میں یہاں پھر آیا ہوں۔ اس بار کچھ اور خبریں لایا ہوں۔ یہاں سے فرار ہو کر میں بھاگتا رہا اور پھر میں نے ایک مکان میں پناہ لے لی۔ اس مکان کا پتہ نوٹ کر لیجئے۔ اگر آپ چاہیں تو پولیس کو وہاں بھیج سکتے ہیں۔ اس مکان میں شیکر موجود تھا۔ خود شیکر بھی مجھے عارف والی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ لیکن اخبارات میں اس نے سب کچھ پڑھ لیا۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ وہ پچھلی رنجش بھول جائے گا، بشرطیکہ میں وہی کام انجام دینے پر رضامند ہو جاؤں۔ اس نے کہا کہ چونکہ میں خود کوئی شریف آدمی نہیں ہوں، اس لئے نرگس ہی کے معاملے میں کیوں شرافت کی لکیر پیٹ رہا ہوں۔ ہاں! اور اس نے اس کے معاوضے میں مجھے یہاں سے نکال دینے کی پیشکش بھی کی۔ زندگی مجھے بھی عزیز ہے داؤد صاحب! اس کے باوجود کہ میں قاتل بن گیا ہوں، لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ پوری دنیا میں مجھ سے زیادہ نرگس سے کوئی محبت نہ کرتا ہوگا۔ میں نے نہ صرف شیکر کی پیشکش ٹھکرا دی بلکہ نرگس کی طرف اٹھنے والی ناپاک آنکھوں کو میں نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اس دماغ کے چیتھڑے اُڑا دیئے، جس میں نرگس کو تکلیف پہنچانے کا سودا بھرا ہوا تھا۔ میں نے شیکر اور اس کے دو ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ ان تینوں کی لاشیں اس مکان میں موجود ہیں، جس کا میں نے پتہ بتایا تھا۔ اور میرے خیال سے میرا فرض پورا ہو چکا ہے۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ دل پر بہت سے داغ ہیں داؤد صاحب! میں اس نفرت کی سرزمین کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس بے غیرت انسان کو اس کی خدمت کا کچھ صلہ دے دیجئے۔"

داؤد رحمانی عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بہت سے رنگ آ رہے تھے۔ اور نرگس اسی طرح پتھرائی ہوئی تھی۔ پھر داؤد رحمانی نے کہا۔

"تو تم نے شیکر کو بھی قتل کر دیا۔"

"میرے جانے کے بعد اس کی تصدیق کرلیں۔"

"یہاں سے کہاں جاؤ گے؟"

"اس وسیع دنیا کے کسی گمنام گوشے میں پناہ لینے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر قسمت ساتھ نہ دے سکی تو موت کی وادیوں میں پناہ ضرور مل جائے گی۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تھوڑی سی رقم کی ضرورت ہے۔ جو یہاں سے نکالنے میں معاون ہو سکے۔"

"کتنی؟"

"پچاس ہزار۔ میرا خیال ہے، میری خدمات کا یہ صلہ زیادہ نہیں ہے۔"

"ہوں۔" داؤد رحمانی مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ "میں یہ رقم دینے کو تیار ہوں۔ کب ضرورت ہے؟"

"ابھی اور اسی وقت۔"

"انتظار کرو۔" وہ اٹھ گئے۔ اور میں کشمکش میں پھنس گیا۔ نہ جانے داؤد رحمانی کے دل میں کیا ہے۔ لیکن وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئے اور میں انہیں روکنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور نرگس کی طرف دیکھنے لگا۔ نرگس کے چہرے پر اب کچھ تغیرات نمودار ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں پہلے نمی آئی اور پھر آنسو امڈ آئے۔

"کتنی سنگدل ہو تم نرگس!........ کتنی کنجوس ہو۔ اپنے چند الفاظ سے بھی کسی کو زندگی نہیں بخش سکتیں۔ بہر حال میں نے محبت کا قرض اتار دیا ہے۔ اس کے عوض میں نے تم سے کچھ نہیں لیا نرگس! اس کی گواہ تم ہو۔ ایک چھوٹی سی چیز مانگی تھی، لیکن تم وہ بھی نہ دے سکیں۔ بہر حال ٹھیک ہے۔ زندہ رہا تو تمہارے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہوں گا۔ اپنی فطرت کا تجزیہ کروں گا کہ میں نے تمہیں اس قدر کیوں چاہا۔ یہ گناہ کیوں کیا۔"

نرگس کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ملازم بغلوں سے سر نکال نکال کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے پستول کا رخ ان کی طرف کیا تو وہ سہم کر اس طرح پلٹے کہ ان کے سر زمین سے ٹکرا گئے اور دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر میں داؤد صاحب واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس تھا، جسے انہوں نے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

"گن لو........ پورے پچاس ہزار ہیں۔"

"یقیناً پورے ہوں گے۔" میں نے کہا اور بریف کیس بند کر کے تھام لیا۔

"بیٹھو عارف! اگر پسند کرو تو کھانا کھا لو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں منتظر ہوں داؤد صاحب! لیکن میں بتا چکا ہوں کہ میں آپ کے نزدیک بیٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ یوں بھی میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہوں۔ ایک دفتر کا کلرک۔"

"تم جو کوئی بھی ہو عارف! میں تمہارا احسان مند ہوں بیٹے! کہ تم نے میری بیٹی کی عزت بچانے کے لئے عظیم قربانی دی ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہارے بارے میں اچھے انداز میں سوچا تھا۔ اس وقت

اب تم نے مجھے خفیہ تحریر دی تھی، میں نے تمہاری عظمت کا اعتراف کیا تھا۔ اور عارف! میں نے تمہارے بارے میں کچھ فیصلے کئے تھے۔ انہی فیصلوں کے تحت۔'' داؤد صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کی یہ خاموشی کئی منٹ تک رہی، پھر وہ بولے۔ ''انہی فیصلوں کے تحت میں نے ایس پی سے کہا تھا کہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے۔ میں اپنی اکلوتی بیٹی نرگس کو تم جیسے بہادر اور باغیرت نوجوان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے بچے! تمہارے بارے میں جو انکشافات ہوئے، کیا انہیں سننے کے بعد بھی کوئی باپ اپنی بیٹی کا مستقبل ایسے ہاتھوں میں دے سکتا ہے؟ کیا تمہیں میری مجبوری کا اندازہ نہیں ہے؟''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے گردن جھکا کر کہا۔

''میرے خیال میں تم انتہائی جذباتی نوجوان ہو۔ تم نے جذبات میں ہمیشہ غلط اقدامات کئے۔ اور ان سے کبھی سبق نہ لیا۔ تم جعلساز تھے، تمہارے اوپر مقدمہ چلا، زیادہ سے زیادہ تمہیں چند سال کی سزا ہو جاتی۔ لیکن تم نے پھر جذبات کا سہارا لیا۔ تم نے دو بے گناہ فرض شناس سپاہیوں کو قتل کیا۔ دو خاندان برباد کر دیئے اور اب تم ہمیشہ کے لئے برباد ہو گئے۔ کیا تمہیں اس کا اعتراف نہیں ہے؟''

''میں انہیں قتل کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ نادانستگی میں مارے گئے۔ وہ میری انجانی طاقت کا شکار ہو گئے۔ میں ان کے لئے پشیمان ہوں۔''

''ان کی زندگیاں واپس نہ ملیں گی۔ خواہ تم قیامت تک پشیمان رہو۔ بہر حال وہ تمہارا فعل تھا، جس پر کوئی شریف شہری تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ میں بھی نہیں۔'' داؤد صاحب نے آخری الفاظ سخت لہجے میں کہے اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''شکیر کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے تم نے اسے قتل کر کے میرے اوپر زبردست احسان کیا ہے۔ اگر تمہارے اوپر مقدمہ چلا تو میں تمہیں بچانے کے لئے بے دریغ اپنی ساری دولت خرچ کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ تم مزید جذباتی قدم اٹھانے سے باز رہے۔ اور اگر خدا نے تمہیں نئی زندگی دے دی اور تم نے خود کو ایک بہتر انسان بنا لیا تو میں نرگس کو تمہارے حوالے کر کے فخر محسوس کروں گا۔ لیکن عارف! میں ان بے گناہوں کے خون کو نظر انداز کر کے بے حسی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ میں یہاں سے رقم لینے گیا تھا لیکن پہلے میں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ پولیس کے جوان باہر تاریکی میں موجود ہیں اور اب میں ان کے قدموں کی چاپ دروازے پر سن رہا ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ داؤد رحمانی کیا کہہ رہا ہے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ کوئی عضو حرکت نہیں کر رہا تھا۔ لیکن پھر میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ دروازے سے پولیس کا پورا دستہ اندر گھس آیا تھا۔ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ پولیس افسروں نے میرے ہاتھ سے پستول چھین لیا تھا۔ لیکن اب میرے اندر جدوجہد کی ہمت کہاں تھی۔ میں تو اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہ ہو سکا تھا۔

تب میرے کانوں میں نرگس کی چیخ سنائی دی۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟........ یہ آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔'' رحمانی صاحب کی آواز ابھری۔ یہاں تک کہ میرا منہ بھی ایک کپڑے سے جکڑ دیا گیا اور پھر وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے چلے۔ میں بالکل بے بس تھا۔

پولیس افسران کو ہدایت مل گئی تھی کہ اگر وہ مجھ پر قابو نہ پا سکیں تو مجھے بے دریغ قتل کر دیں۔ وہ

میرے ساتھ اسی انداز میں پیش آرہے تھے۔ جس انداز سے مجھے جکڑا گیا تھا، اگر میں غیر معمولی قوت کا حامل نہ ہوتا تو رسیوں کی بندش سے ہی میرا دم نکل جاتا۔ اس وقت ایک موٹا رسّا میری گردن میں بندھا ہوا تھا۔ ایک کمر میں۔ دونوں طرف سے بازو بھی رسوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ بالکل یہی کیفیت تھی جیسے ایک بپھرے ہوئے سانڈ کو قابو میں کیا گیا ہو۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ بھی کرتے، تب بھی میں اب کوئی جدوجہد نہیں کرتا۔ صدمے سے میرے قویٰ مفلوج ہو گئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی تھی۔

پولیس والے مجھے باہر لائے۔ یہاں ایک بند ٹرک موجود تھا، مجھے اٹھا کر ٹرک میں پھینک دیا گیا۔ کافی زور سے گرا تھا، چوٹ بھی آئی تھی لیکن اس وقت کوئی احساس نہیں تھا۔ میں سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ پولیس کا پورا دستہ ٹرک میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے جوتوں تلے دبا لیا تھا۔ رسہ پکڑنے والے بھی مضبوطی سے رسہ پکڑے ہوئے تھے۔ رسے کی گرہ میرے نرخرے پر تھی۔ گویا اگر رسے کو ایک زوردار جھٹکا دے کر کھینچا جاتا تو مجھے اسی ٹرک میں پھانسی مل جاتی۔ ایسی حالت میں جنبش کا تصور بھی محال تھا۔ میں ایک ایسے جانور کی طرح پڑا تھا، جسے مذبح خانے لے جایا جا رہا ہو۔

ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور میرے ذہن میں نرگس کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ آپ نے کیا کیا؟...... یہ آپ نے کیا کیا؟...... ان الفاظ میں سکون تھا۔ ان الفاظ سے دل کو ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ کافی ہے۔ اگر نرگس کو میرے ایثار کا احساس ہو گیا ہے تو اب مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ زندگی سے یونہی کون سی دلچسپی رہ گئی تھی۔ رہے، رہے نہ رہے...... میں جو چاہتا تھا، وہ ہو گیا تھا۔ محبت بھی کیا بری شے ہے۔ انسان کی خواہشات کس قدر احمقانہ ہیں۔ میں نے نرگس کو پسند کیا تھا۔ وہ بھی ایک لڑکی تھی، نرم و گداز جسم کی مالک۔ لیکن ان لڑکیوں کے جسم بھی نرگس سے کم گداز و حسین نہیں تھے، جو میری زندگی میں آ چکی تھیں۔ ان کے لئے دل نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ جب وہ جدا ہو گئیں تو ان کی جدائی کا کوئی احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب میں نے ان جیسی ہی ایک لڑکی کے لئے زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ آخر کیوں؟...... اس میں کیا خصوصیت تھی؟ میں اگر شیکر کی بات مان لیتا تو وہ بھی ایک رات کے لئے میرے بستر کی زینت بن جاتی۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز سے مجھے آگاہی ہو جاتی اور بس۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہئے تھا۔ لیکن فطرت...... کیا کوئی بھی انسان فطرت کی تفسیر بن سکتا ہے؟ اپنی خواہشات کا تجزیہ کر سکتا ہے؟ ممکن ہے کوئی اس کا دعویٰ کرتا ہو۔ لیکن میں یقین نہیں کرتا۔ دنیا میں کچھ ایسی خواہشوں کا بھی وجود ہے جن سے ہم خود ناواقف ہیں۔ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیوں دل میں آتی ہیں۔ لیکن انسان ان میں کامیاب ہو کر ہی سکون محسوس کرتا ہے۔ جیسے داؤد رحمانی...... وہ اپنی بیٹی کی عزت کے لئے تو اپنی جان دے سکتے تھے لیکن انہوں نے اس شخص کو موت کے حوالے کر دیا جو ان کی بیٹی کی عزت کا محافظ تھا۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتے تو مجھے میری کاوشوں کا صلہ دے سکتے تھے۔ ویسے میرے خیال سے وہ قصوروار بھی نہیں تھے۔ ان کے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ ایک قاتل کو نکل جانے میں مدد دیں۔

ایک پولیس افسر نے اپنا جوتا میرے منہ پر رکھ دیا اور میں خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس سے جوتا ہٹانے کی فرمائش کی تو یہی جوتا پوری قوت سے میرے منہ پر پڑے گا اور اس کے بعد نہ جانے میرے چہرے کا زاویہ کیا بن جائے گا۔

جوتے کے تلے میں لگی ہوئی مٹی میری آنکھوں میں پڑی تو میں نے پھر سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت بے بس گائے کی طرح پڑے رہنا ہی اچھا تھا۔ ذرا بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو شاید ٹرک سے لاش ہی اُتاری جاسکے گی۔ وہ اتنے ہی غضب ناک اور جھنجلائے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔

تکلیف کا سفر بھی طویل ہوتا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے ٹرک ایک شہر سے دوسرے شہر جارہا ہو۔ نہ جانے کتنی دیر ٹرک چلتا رہا، پھر وہ پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ اسے رکتا محسوس کر کے میں نے ایک گہری سانس لی۔ ویسے گردن پر بندھی ہوئی رسّی کی وجہ سے اب سانس لینے میں بھی دقت ہورہی تھی۔ پولیس والے نیچے اُترنے لگے۔ اس کے بعد میری رسیوں کو جنبش دی گئی۔ میں جلدی سے نیچے کود گیا۔ اگر گردن کی رسّی کھینچ لی جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ لیکن مجھے فوراً ہی اپنی اس کوشش پر ہنسی آگئی۔ مرنے کے لئے تیار ہوں۔ نہ بھی تیار ہوں تو مار دیا جاؤں گا۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن گردن کی بندش سے خوف زدہ ہو کر جان بچانے کی کوشش کررہا تھا۔

جس جگہ مجھے اتارا گیا تھا، وہاں سے تھوڑے فاصلے پر کچھ بڑے پولیس افسر بھی کھڑے تھے۔ سپاہیوں کا ایک گروہ ان سے کچھ دُور مؤدب کھڑا تھا۔ ایک بھاری بھرکم پولیس آفیسر نے مجھے دیکھ کر اپنے قریب کھڑے ہوئے دوسرے ماتحت افسر کو کوئی حکم دیا اور ماتحت افسر تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس نے مجھے لانے والوں سے کچھ کہا۔ مجھے لانے والے جلدی جلدی میری گردن اور کمر کی رسیاں کھولنے لگے۔ پھر انہوں نے میرے بازوؤں اور پاؤں کی رسیاں بھی کھول دیں۔ لیکن تھوڑی دور کھڑے ہوئے پولیس والوں نے میرے اوپر رائفلیں تان لی تھیں۔ پھر میرے ہاتھوں میں خاص قسم کی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ پیروں میں بھی چمکتی ہوئی بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ چند سیکنڈ میں میری سمجھ میں آگیا کہ میرے ساتھ یہ عنایت کیوں کی گئی تھی۔ بہت سے اخباری رپورٹر اندر گھس آئے اور میری تصویریں بنانے لگے۔ چند رپورٹروں نے پولیس آفیسروں کے نزدیک آنے کی کوشش بھی کی لیکن انہیں روک دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ابھی اس سلسلے میں کوئی بیان نہیں دیا جائے گا۔

اخباری رپورٹر جب تصویروں سے فارغ ہوگئے تو مجھے اندر لے جایا گیا۔ شاید یہ پولیس ہیڈ آفس کا جدید ترین ہال تھا، جہاں مجھے لایا گیا۔ مضبوط فولادی دروازے اور خاص قسم کی دیواریں۔ وہ مجھ سے بہت خوف زدہ تھے۔ ہال میں تقریباً دو انچ موٹی سلاخوں کا ایک پنجرہ بنا ہوا تھا۔ مجھے اس میں دھکیل کر دروازہ بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ پولیس افسروں کی پوری جماعت ہال میں گھس آئی تھی۔ پستول بردار محافظ ہال کے کونوں پر جم گئے اور چار مسلح محافظ میرے کٹہرے کے گرد کھڑے ہو گئے۔ یہ خوف ناک انتظامات دیکھ کر مجھے دہشت بھی محسوس ہورہی تھی اور ہنسی بھی آرہی تھی۔

خوب بیٹے عارف جمال! عشق میں خوار ہو کر کیا شہرت پائی ہے۔ سینکڑوں افسانے اور درجنوں مقولے مجھے یاد آنے لگے۔ اس عورت نے دنیا میں نہ جانے کون کون سی کہانیاں ترتیب دی ہیں۔

پولیس افسروں کی جماعت ایک چمک دار میز کے گرد بیٹھ گئی۔ خاموش ہال ایک عجیب منظر پیش کررہا تھا۔ بڑے بڑے افسر گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نئے نئے لوگ آرہے تھے اور کرسیاں بھرتی جارہی تھیں۔ پھر چند سادہ پوش لوگ آئے۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے کرسیاں چھوڑ کر ان کا استقبال کیا۔

آنے والوں میں سے ہر ایک مجھے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بالکل چڑیا گھر کی سی کیفیت تھی۔ میں بھی خاموشی سے آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ہال کے دروازے بند ہو گئے۔ میز پر کچھ فائل نظر آئے اور ایک پولیس آفیسر نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔

''میں محترم ہوم سیکرٹری کی توجہ اس خطرناک شخص کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا نام عارف جمال ہے۔ یہ شخص چند سال قبل ایک معمولی حیثیت کا کلرک تھا اور ایک معمولی سے فلیٹ میں شریفوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن واقعات کے مطابق اسے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اور جب یہ اسے حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تو جس فرم میں یہ کام کرتا تھا، وہاں سے ایک بڑی رقم لے کر فرار ہو گیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس وقت کچھ غیر معمولی قوتیں رکھنے والی اس کی صلاحیت سامنے آئی۔ اس نے پولیس کے ساتھ بار بار فراڈ کیا اور کئی بار اس کے نرغے سے نکل گیا۔ اس دوران اس کے ایک ہم شکل کو بھی دیکھا گیا۔ لیکن اس کے کہنے کے مطابق وہ اس کا کرائے کا آدمی تھا، جس کے چہرے پر میک اپ کر دیا گیا تھا۔ دوسری بار اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تو اس نے جیل کی سلاخوں کو توڑ کر دو سپاہیوں کو قتل کر دیا اور پھر دیوار توڑ کر نکل بھاگا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کی اطلاع ہے کہ یہ کسی غیر معمولی سائنسی قوت کا حامل ہے یا پھر ممکن ہے اسے کوئی اور قوت حاصل ہو۔ پولیس سے ٹکراؤ پر اس نے حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جس پر عقل حیران ہے۔ ان میں سے چند موٹی موٹی باتوں کی تفصیل اس فائل میں موجود ہے۔'' پولیس افسر نے ایک فائل ہوم سیکرٹری کے سامنے رکھ دی۔ وہ فائل مختلف لوگوں میں گھومتی رہی۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اس پولیس افسر کی آواز پھر ابھری۔

''ہم نہیں جانتے جنابِ عالی! کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو اس شخص میں پوشیدہ ہیں۔ نہ ہی ہم اس کا کوئی تجزیہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس خوف ناک شخص کو زندہ رہنے کا موقع دے کر ہم شہریوں کے لئے ایک خطرہ مول لے لیں۔ نہ جانے یہ بھیانک انسان کن راستوں پر چل پڑے۔ ہر شہری کی زندگی قیمتی ہے۔ اگر صرف اخلاقی قدروں کو نگاہ میں رکھ کر ہم اس کے خلاف کوئی باقاعدگی اختیار کریں، تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوران کیا ہو جائے۔ اگر ہمیں باقاعدگی کے لئے مجبور کیا جائے گا تو ہم شہریوں کی زندگی کے زیاں کے لئے جواب دہ نہیں ہوں گے جو اس کے ہاتھوں ضائع ہو گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر کیا کر بیٹھے۔ ہم اب تک اسے قید رکھنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ اس لئے عزت مآب جناب وزیر داخلہ سے درخواست کی گئی تھی کہ اس کی فوری موت کے احکامات صادر کریں تاکہ معصوم شہریوں کو ایک خوف ناک شخص سے نجات دلائی جائے۔''

اس پولیس افسر کی پوری تقریر میں نے سنی اور پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔ میرے حلق میں ایک گولہ سا اٹک گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جھلکنے لگی۔ تو یہ تھا میری زندگی کا اختتام ...... کیسا انوکھا اختتام ہے یہ۔ پیدا ہوا ہوں گا تو نہ جانے والدین نے کتنی خوشیاں منائی ہوں گی۔ لیکن اب ان کے دل قبر میں کیسے تڑپ رہے ہوں گے کہ ان کے دل کے ٹکڑے کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کیا میں اسی قابل تھا؟ جو کچھ ہوا تھا، اس میں میرا قصور کس حد تک تھا؟ آپ خود تجزیہ کر سکتے ہیں۔

ہاں، دو بے گناہ سپاہی جو میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے، واقعی مظلوم تھے۔ انہیں قتل کر کے میں شرمندہ تھا۔ لیکن میری شرمندگی پر کون دھیان دیتا ہے؟ کون میرے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے؟

رہی شیکر اور اس کے ساتھیوں کی بات........ تو میرے خیال میں، میں نے انہیں قتل کر کے خود پر سے گناہوں کا بوجھ کم کر دیا تھا۔ ان وحشی درندوں کو قتل کرنا ہر انسان کا فرض تھا، اس پر میں ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔

پھر پولیس آفیسرز اور نئے آنے والے دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ یقیناً میرے سلسلے میں ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر ایک آدمی اٹھ کر باہر نکل گیا اور چند منٹ کے بعد ایک ٹائپسٹ کے ساتھ اندر آ گیا۔ ٹائپسٹ ٹائپ مشین اٹھائے ہوئے تھا۔ پھر مشین پر کچھ ٹائپ کیا جانے لگا۔

میں خالی خالی نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری موت کے سامان ہو رہے تھے۔ کیا آپ ایسے کسی آدمی کی حالت کا تجزیہ کر سکتے ہیں؟ میں نے ہمیشہ زندگی سے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ میں ہر وقت موت کو گلے لگانے کا خواہشمند تھا۔ لیکن........ اب جب موت میرے قریب آ رہی تھی تو میرا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اب میں یہ پنجرہ توڑ کر نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ اب میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، لیکن بے بس تھا۔ چند لوگ، چند انسان، ایک انسان کی جان کے لاگو تھے۔ وہ اس سے اُس کی زندگی چھین رہے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا کیا تھا میں نے ان کا؟........ میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے اُبھر رہے تھے۔ میں اس کاغذ کو مختلف لوگوں کے سامنے دیکھ رہا تھا جو ٹائپ کیا گیا تھا، اس پر دستخط ہو رہے تھے۔

پھر وہ لوگ اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ ایک کاغذ میرے سامنے لایا گیا۔ ایک پولیس آفیسر نے قلم کھول کر میرے سامنے کر دیا۔

"عارف جمال! یہ تمہارے جرائم کی تفصیل ہے۔ اس میں تم نے اب تک کے جرائم کا اقرار کیا ہے۔ اس پر دستخط کر دو۔" آفیسر نے بھاری آواز میں کہا اور میں انکار نہیں کر سکا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قلم لے کر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ میری قوتِ ارادی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں موت کے خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ دنیا تاریک ہو گئی تھی اور اب چاروں طرف موت کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تب پولیس آفیسر نے کہا۔

"مجرم عارف جمال! تمہارے بھیانک جرائم کی فہرست طویل ہے۔ تم جانتے ہو، تم نے امن پسند شہریوں کے ساتھ اور قانون کے محافظوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ قانون کی مجبوریاں قانون کے آڑے آتی ہیں۔ قانون کے تحت تم پر مقدمہ چلایا جانا چاہئے تھا۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ تم اپنی پُراسرار قوتوں کا سہارا لے کر ہمیشہ پولیس کی قید سے نکل جاتے ہو۔ پچھلی بار تم نے قانون کے دو محافظوں کو بھی قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ وزارتِ داخلہ سے تمہاری موت کے لئے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر لیا گیا ہے اور طے کیا گیا ہے کہ تمہیں فوری طور پر گولی مار دی جائے۔ اجازت نامہ مل چکا ہے۔ اب سے دس منٹ بعد تمہیں گولی مار دی جائے گی۔"

پولیس آفیسر خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش تھا۔ بولتا بھی کیا۔ گویائی سلب ہو گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں مفلوج ہو گئے تھے۔ کانوں میں عجیب سی آوازیں گونج رہی تھیں۔ چند منٹ میں موت کا تماشا ہونے والا تھا۔ پولیس افسروں کی جماعت باہر چلی گئی لیکن اسی وقت چند افسروں کے ساتھ پولیس کا ایک مسلح دستہ

اندر آ گیا۔ مجھے پنجرے سے نکالا گیا۔ ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں، اس لئے پولیس والوں نے میری بغلوں میں ہاتھ دے دیئے اور مجھے ہال سے باہر نکال لائے۔

ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے ایک سنسان گوشے میں مجھے لے جایا گیا اور ایک دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا۔ اس وقت میرے ذہن سے ہر خیال مٹ گیا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، مناظر نگاہوں کے سامنے تھے لیکن ذہن انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ذہن میں کلمے کا خیال آیا۔ آخر میں مسلمان ہوں....... آخری بار کلمہ تو پڑھ لوں۔ ساتھ ہی ذہن میں مقدس الفاظ گونجنے لگے۔ زبان تو تالو سے چپکی ہوئی تھی۔ لمحہ لمحہ گزر رہا تھا۔ چند بڑے پولیس افسر بھی مقتل گاہ میں آ گئے تھے۔ ان کے اشارے پر دو رائفل برداروں نے رائفلیں سیدھی کر لیں اور رائفلوں کی گول سیاہ نالیں میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ابھی ان سے سنسناتی ہوئی گولیاں نکلیں گی اور پہلو میں پیوست ہو جائیں گی۔ آہ، موت کی اذیت کیسی ہو گی۔ جان کس طرح نکلتی ہے۔ تب مجھے ایسا لگا، جیسے جان نکل رہی ہو۔ دل پھڑ پھڑا رہا ہو.......!

وقت ہو گیا۔ سپاہیوں نے گھوڑے چڑھائے۔ پولیس افسر کا ہاتھ اٹھا اور دو دھماکے ہوئے۔ تکلیف کا احساس کیسا، مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں شاید مرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ پھر کچھ آوازیں کانوں میں گونجیں، جن میں پولیس افسر کی کڑک بھی شامل تھی۔

"صحیح نشانہ لو گدھو! یہ کیا حماقت ہے؟"

بدحواس پولیس والوں نے دوبارہ رائفلیں سیدھی کر لیں۔ وہ پہلے نشانے کے خطا ہونے پر شرمندہ تھے۔ انہوں نے نشانہ تو صحیح لیا تھا لیکن دونوں کی چلائی ہوئی گولیاں دیوار میں لگی تھیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔

"جلدی کرو۔" پولیس آفیسر نے حکم دیا۔ دو دھماکے پھر ہوئے۔ لیکن اس بار گولیاں پہلے سے بھی زیادہ فاصلے پر لگیں۔ اسی وقت مجھے نتھنوں میں ایک جانی پہچانی سی خوشبو کا احساس ہوا۔ یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ خوشبو کہاں سونگھی تھی۔ حواس واپس آ رہے تھے۔ پولیس والوں کی بدحواسی دیکھنے کے قابل تھی!

"گدھے ہو تم دونوں۔ خیبر خان! دلدار!....... آؤ اور جلدی کرو احمقو!"

دو سپاہی آگے بڑھ آئے اور انہوں نے پھرتی سے رائفلیں سیدھی کر لیں۔ لیکن اچانک وہ دونوں زمین سے اوپر اٹھنا شروع ہو گئے۔ ایک فٹ، دو فٹ، تین فٹ۔ ان کے حلق سے ڈری ڈری چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر ان دونوں کے ہاتھ سے رائفلیں چھوٹ کر نیچے گر پڑیں اور وہ دونوں زمین پر اترنے کے لئے اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے جیسے سائیکل چلا رہے ہوں۔ خود پولیس افسروں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ دوسرے کچھ پولیس والے فضا میں بلند ہونے والوں کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہاں ان کی پتلونیں ضرور اُتر آئی تھیں۔

"یہ سب اسی بدمعاش کی کارروائی ہے۔" ایک پولیس افسر چیخا اور اس نے پھرتی سے اپنے ہولسٹر سے پستول کھینچ لیا۔ لیکن اچانک اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہو گیا۔ ابھی وہ اوپر اٹھے ہوئے پستول کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے بائیں سمت ایک چیخ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، ایک پولیس کانسٹیبل کی پتلون غائب تھی۔ وہ صرف قمیض پہنے اپنی برہنگی کو چھپانے کی کوشش کر رہا

تھا۔ پھر وہ دونوں پولیس والے دھڑام سے نیچے گر پڑے، جو فضا میں بلند تھے۔ اور ان کے قریب کھڑے دو اور پولیس والے بلند ہو گئے۔ پھر وہ بھی نیچے گرے اور ان کی جگہ دو اور پولیس والے بلند ہو گئے۔ پھر تو ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔ پولیس کے دو دو کانسٹیبل فضا میں بلند ہو کر نیچے گر رہے تھے۔ اچانک ایک افسر کو اپنے جسم پر ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اس نے چیخ مار کر باہر چھلانگ لگا دی۔ جب افسر ہی بھاگ جائے تو پولیس کانسٹیبل کہاں ٹھہر سکتے تھے؟ ذرا سی دیر میں بھگدڑ مچ گئی۔ باقی تمام آفیسر بھی بھاگ گئے۔ ان نادیدہ قوتوں کے خلاف وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

اور میں سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اب وہ نادیدہ خوشبو بھی مجھے یاد آ گئی تھی۔ یہ طالوت کی خوشبو تھی۔ ہاں، یہ اسی کی خوشبو تھی جسے میں بھول چکا تھا۔

پھر طالوت میرے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میری ہتھکڑیاں توڑ دیں اور میرے پاؤں سے بیڑیاں بھی نکال دیں۔

''آؤ عارف!'' اس نے کہا اور نہ جانے کیوں میرا ذہن غصے سے کھول اٹھا۔

''نہیں...... میں نہیں جاؤں گا۔ تم جا سکتے ہو۔ مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''آؤ میرے دوست!...... آؤ بھی۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں کہتا ہوں چلے جاؤ تم یہاں سے۔ مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے کچے سہاروں کے ساتھ میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں؟ مجھے مرنے دو...... میں مرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گرج کر کہا۔

''اس وقت ضد مت کرو عارف! بعد میں برا بھلا کہہ لینا۔'' طالوت عاجزی سے بولا۔

''میں نہیں جاؤں گا طالوت! میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ براہِ کرم تم چلے جاؤ۔''

''چلتے کیوں نہیں؟'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا اور میری کلائی پکڑ لی۔

''میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔'' میں نے کلائی چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں اس نے میرے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر خود کو گرنے سے روکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ کسی قالین پر ٹک گئے ہیں۔ سرخ رنگ کے خوبصورت قالین پر۔

کہاں وہ کھردری زمین جو میرا مقتل تھی اور کہاں نرم و گداز قالین۔ میں احمقوں کی طرح اس قالین کو گھورنے لگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ نظریں اٹھائیں۔ طالوت کی ٹانگیں میرے سامنے تھیں۔ وہ ایک نفیس پتلون پہنے ہوئے تھا۔ آہستہ آہستہ میری نگاہیں اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خجالت اور شرمندگی کے تاثرات تھے۔

''میں یہاں نہیں رہنا چاہتا طالوت! خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں کسی کا طفیلی بن کر زندہ نہیں رہوں گا۔ میں موت قبول کر چکا ہوں۔ مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ براہِ کرم یہاں سے چلے جاؤ اور انہیں اپنا کام کرنے دو۔''

طالوت جھکا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور کھڑا کر دیا۔ تب مجھے بدلے ہوئے ماحول کا احساس ہوا۔

لیکن میرے حواس تو اس طرح معطل تھے کہ قالین کو نظر انداز کر کے میں خود کو اسی جگہ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، یہ نامانوس جگہ تھی۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا طالوت! تم نے مجھے وہاں سے لا کر اچھا نہیں کیا۔ موت میرا مقدر ہے۔ صرف موت ہی میرا انجام ہے۔ پھر زندگی کے تعاقب میں بھاگنے سے کیا فائدہ؟''

''بیٹھ جاؤ عارف! کیا تم اپنے دوست کی کوئی بات نہیں سنو گے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''دوست........ پوری دنیا میں کون میرا دوست ہے؟ مجھ مجہول انسان سے دوستی کر کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا طالوت! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تقدیر میرے لئے جو کچھ متعین کر چکی ہے اسے ہونے دو۔ آج نہیں تو کل ایسا ہوگا۔ پھر آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

''میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے عارف! میری کوتاہی پر مجھے معاف کر دو۔ یقین کرو، میں ایک ایسی اُلجھن میں پھنس گیا تھا کہ نکل ہی نہ سکا، ورنہ تمہیں یہ تکلیف نہ ہوتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر آئندہ ایسے خطرناک حالات پیش آئے، تب بھی میں ساتھ رہوں گا۔ میں اس وقت تو بدحواس ہو گیا تھا، ورنہ........ ایک بار مجھے معاف کر دو میرے دوست! صرف ایک بار معاف کر دو.... ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر میں خاموشی سے اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں گا۔ ایک غمزدہ احساس لئے کہ میں دنیا میں کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکا'' طالوت نے ایسے لہجے میں کہا کہ میرا دل پسیج گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے طالوت! لیکن تم یہ تو سوچو، میری زندگی اب میری نہیں ہے۔ مجھ سے ایسے ایسے جرائم سرزد ہو گئے ہیں کہ اب یہ دنیا کسی قیمت پر مجھے معاف نہیں کرے گی۔ آخر کب تک تم میری مدد کرتے رہو گے؟........ جب مرنا ہی ہے تو مر جانے دو۔''

''میں کہہ چکا ہوں، میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر سچ پوچھو عارف! تو تمہاری یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے۔ تم نے ایک معمولی سا جرم کیا تھا۔ چند ماہ کی سزا کاٹ کر تم آزاد ہو جاتے اور پھر امن کی زندگی بسر کرتے۔ لیکن میں نے تمہیں غلط راستوں پر لا ڈالا۔ اس کا ایک ذمہ دار میں ہوں۔ میں تمہاری طرف سے دی ہوئی ہر سزا قبول کرنے کو تیار ہوں۔ مگر میری مختصر سی داستان تو سن لو۔''

میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا اور طالوت ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''اُس روز جب تم نرگس رحمانی سے ملاقات کے لئے جانے والے تھے، تم نے دیکھا ہوگا کہ راسم میرے پاس آیا تھا اور اس نے مجھے کوئی اطلاع دی تھی، جس پر میں نے کہا تھا کہ تم نرگس رحمانی کے پاس جاؤ، میں پہنچ جاؤں گا۔ راسم نے مجھے بتایا تھا کہ ایک پورا گروہ میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ابا حضور خود اس کی سرکردگی کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ پُراسرار قوتیں ہیں۔ راسم نے مجھے بتایا تھا کہ شہر کے کونے کونے میں میری تلاش جاری ہے اور وہ اِدھر کا رخ بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ میں اس گھر سے فرار ہو گیا۔ جہاں بھی میں نے روپوش ہونے کی کوشش کی، وہ پُراسرار قوتیں مجھے تلاش کرتی ہوئی اسی جگہ پہنچ جائیں۔ کیا بتاؤں عارف! کیسے کیسے چکر دینے پڑے ہیں انہیں۔ پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ میں نے ان پُراسرار قوتوں کو دھوکا دیا ہے۔ بہر حال پھر میں اس شہر سے نکل کر بھاگا اور میں نے ویران علاقوں کا رخ کیا۔ ویرانوں میں، پہاڑوں میں، سرنگوں میں اور نہ جانے میں کہاں کہاں چھپتا پھرا ہوں۔ اس

دوران ایسے ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ تم سنو گے تو ہنس ہنس کر پاگل ہو جاؤ گے۔ نہ جانے مجھے کون کون سے روپ دھارنے پڑے ہیں، تب کہیں جا کر میں ان لوگوں سے جان بچا سکا ہوں۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا میرے دوست! تو یقین کرو تم سے ایک لمحے بھی جدا نہ رہتا۔ بہر حال مجھ سے ایک غلطی ہو گئی، جس کا مجھے اعتراف ہے۔ اگر میں تمہیں بھی ساتھ لے لیتا تو تمہیں یہ پریشانی اٹھانا نہ پڑتی۔ لیکن آئندہ وعدہ ہے، اگر مجھے موت بھی آئی تو مرنے سے قبل تمہیں بھی ختم کر دوں گا اور ہم دونوں ایک ساتھ ایک قبر میں دفن ہوں گے۔ یہ طالوت کا قول ہے اور طالوت کا قول سچا ہے۔ بس پہلی اور آخری بار مجھے دل سے معاف کر دو، آئندہ کبھی اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

طالوت کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ میرا دل پگھل گیا۔ میں نے اس کی مجبوری پر غور کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ درحقیقت وہ مجبور تھا۔ ورنہ ایسا نہ کرتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے صبح ہو گئی ہے۔ میری پریشانیوں کے دن ختم ہو گئے ہیں اور یہ ویران دنیا پھر سے آباد ہو گئی ہے۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور طالوت نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں اٹھا اور طالوت سے لپٹ گیا اور طالوت میری پیٹھ تھپکنے لگا۔

"تجھے جتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں میرے یار! میں ان سب کا ازالہ کر دوں گا۔ ایک ایک کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ بھی کیا یاد رکھیں گے۔ چن چن کر ان لوگوں سے بدلے لوں گا، جنہوں نے تجھ سے دشمنی کی ہے۔"

"نہیں طالوت! ان میں سے کوئی مجرم نہیں ہے۔ کوئی قابلِ سزا نہیں ہے۔ بس میں ہی خود غرض ہو گیا تھا۔ میں نے دو بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مجھے ان غریب سپاہیوں کی موت کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ نہ جانے ان کے بیوی بچوں پر کیا گزری ہوگی۔"

"ہم انہیں پوری زندگی کے لئے فکرِ معاش سے آزاد کر دیں گے۔ ہم انہیں اتنی دولت دیں گے کہ زندگی بھر انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟ تم مجھے پوری کہانی تو سناؤ۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک ہوٹل کا کمرہ ہے۔ میں نے کرائے پر حاصل کیا ہے۔ اب تو مجھے بھی اس دنیا میں رہنا آ گیا ہے۔"

"تب کھانے کے لئے کچھ منگواؤ۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ........ ابھی لو۔" طالوت نے کہا اور پھر اس نے بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی اور بیرے کے آنے پر اسے بہت سی چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آرڈر کی تعمیل ہو گئی اور میں مربھکوں کی طرح پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ طالوت بھی میرا ساتھ دے رہا تھا اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر کافی پیتے ہوئے میں نے اپنی داستان اس وقت سے شروع کی جب میں نرگس رحمانی کے یہاں سے واپسی کے بعد ٹیلی فون پر بات کرنے والے سے ملاقات کرنے کے لئے گیا تھا۔ شیکر کی پوری داستان سنانے کے بعد میں نے بعد کی داستان سنائی، جس میں نرگس رحمانی کا تذکرہ، داؤد رحمانی کی فرض شناسی، پولیس کانسٹیبلوں کے قتل، ثریا سے ملاقات، شیکر اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے پولیس ہیڈ آفس تک کے واقعات شامل تھے۔ طالوت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

میرے خاموش ہونے پر وہ کئی منٹ تک خاموش رہا۔ کبھی اس کے چہرے پر غصے کی سرخی نظر آتی اور کبھی غم کے تاثرات۔ پھر اس نے سرد آواز میں کہا۔ ”بردہ فروش تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔ کاش مجھے اس سے انتقام لینے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ان لوگوں کو میں نہیں چھوڑوں گا، جنھوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔“

”نہیں طالوت!“ میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ ”ان میں سے ایک بھی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ سب نے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ پولیس والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہی افسوس ناک ہے۔ سب نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ میری نگاہوں میں ان میں سے ایک بھی مجرم نہیں ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو کچھ نہیں کہیں گے۔“

”اور داؤد رحمانی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ طالوت نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

”داؤد رحمانی کا کردار بھی میری نگاہوں میں برا نہیں ہے۔ اس نے بڑے خلوص سے کہا تھا کہ اگر میرے اوپر مقدمہ چلا اور مجھے بچانے میں اس کی پوری دولت بھی صرف ہوئی تو وہ اس سے دریغ نہیں کرے گا۔ نہیں طالوت! ان میں کوئی بھی قابلِ سزا نہیں ہے۔ جو قابلِ سزا تھا، اسے میں کیفرِ کردار تک پہنچا چکا ہوں۔“

”ہوں۔“ طالوت مجھے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”تو اب کیا ارادے ہیں؟“

”تمہارے اوپر سے خطرہ ٹل گیا؟“

”ہاں۔ وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔“

”لیکن تم انہیں دھوکا دینے میں کس طرح کامیاب ہوئے؟ ظاہر ہے، وہ بھی تمہاری طرح پُراسرار قوتوں کے مالک ہوں گے۔“

”یہ نہ پوچھو یار!...... کیا کیا جتن کرنے پڑے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ ایک رات مجھے گدھے کے روپ میں ایک دھوبی کے تھان پر بندھا رہنا پڑا۔“ طالوت نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا اور میرے حلق سے ایک زوردار قہقہہ اُبل پڑا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کبھی فرصت میں پوری داستان سناؤں گا۔“ طالوت نے کہا اور میرے حلق سے قہقہے اُبل رہے تھے اور طالوت بری سی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ بہت دن کے بعد یوں کھل کر ہنسا تھا، طبیعت کو ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ دفعتہً طالوت نے کہا۔

”سنو، تمہارے ہاں بھی تو شہنشاہی نظام ہے۔ میرا مطلب ہے، شہنشاہ ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں جن کے احکامات چلتے ہیں۔“

”تھا کبھی۔ اب یہ ختم ہو چکا ہے۔“

”لیکن میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”کہاں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”پہاڑوں کے درمیان۔ جہاں ہر طرف برف بکھری پڑی ہے۔“

”اوہ...... شاید تم علاقہ غیر کی آزاد ریاستوں کی طرف نکل گئے ہو گے۔“

”جو کچھ بھی ہو، مجھے وہ خطہ بہت پسند آیا۔ اگر تم ساتھ ہوتے اور میں سنگین حالات سے دوچار نہ

ہوتا تو کچھ وقت وہاں گزار کر ضرور لطف اندوز ہوتا۔"
"ہاں........لیکن میں نے وہ علاقے نہیں دیکھے ہیں۔ صرف ان کے بارے میں سنا ہے۔" میں نے کہا۔
"تو پھر کیا خیال ہے؟"
"کیا مطلب؟"
"چلیں اُدھر؟ دلچسپیاں رہیں گی۔" طالوت نے بچوں کے سے انداز میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے نیم رضامندی سے کہا۔ خود میں بھی اس ماحول سے اُکتا گیا تھا اور تھوڑی سی تبدیلی چاہتا تھا۔
"تب ٹھیک ہے۔ ہم وہاں چلیں گے۔ لیکن میرے دوست! تم مجھے تھوڑی سی اجازت ضرور دو گے۔ اگر تم نے اس کے لئے منع کیا تو میری طبیعت پر اضمحلال رہے گا۔"
"کیسی اجازت؟"
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ لیکن جن لوگوں نے تمہیں تر نوالہ سمجھا تھا، بس ان کے ساتھ تھوڑی سی تفریح کر کے ان پر تمہاری اہمیت واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم داؤد رحمانی سے بھی ملیں گے اور اس کا شکریہ ادا کریں گے۔"
"ان باتوں سے اب کوئی فائدہ نہیں ہے طالوت!"
"ہے........تم نہیں سمجھتے۔ پھر تم نرگس سے بھی بات کر لینا۔ ویسے کیا واقعی تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟" طالوت نے مجھے گھورا۔
"محبت........وہ مجھے پسند ہے۔ اگر میں چاہتا تو اسے با آسانی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن پھر وہ میرے لئے ایک عام عورت سے زیادہ نہ رہ جاتی۔ لیکن وہ ایک سادہ دل لڑکی ہے۔ میں اسے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔"
"تب پھر تمہارے کہنے کے مطابق آخری وقت میں وہ تمہاری سچائی پر یقین کر بیٹھی تھی اور اب اس کی نہ جانے کیا حالت ہوگی۔ تم اسے سمجھا تو سکتے ہو۔"
طالوت کے ان جملوں نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ سچ بتاؤں، میرے دل میں بھی یہ خواہش مچل اٹھی کہ کم از کم نرگس پر ان واقعات کے بعد کا ردِعمل تو دیکھوں۔ طالوت میری شکل دیکھ رہا تھا۔ مجھے نرم پا کر وہ بولا۔
"بس........اب سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے ضرور ملیں گے۔" اور میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اب میں اپنے حالات پر غور کر رہا تھا۔ کچھ دیر قبل میرے دل میں کتنی مایوسیاں تھیں، کیسا اندھیرا تھا۔ اور اب......اب......میں نے طالوت کو دیکھا۔ وہ کسی خیال میں غرق تھا!
"کیا سوچ رہے ہو طالوت؟" میں نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ صرف چند دلچسپ پروگرام بنا رہا ہوں۔ اب تم دیکھو گے کیسی کیسی تفریحات ہوتی ہیں۔ یقین کرو، پچھلے دن میرے لئے بھی سخت کوفت کا باعث رہے ہیں۔ تھوڑی سی تفریح کر لوں گا تو موڈ درست ہو جائے گا۔ ویسے تم تھکن تو نہیں محسوس کر رہے؟"

"نہیں۔تمہارے آجانے کے بعد اب تھکن کیسی؟"

"پھر بھی........آج رات آرام کرو۔ہم کل نرگس رحمانی کے یہاں ناشتہ کریں گے۔" اور میں نے گردن ہلا دی۔

رات کو ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میں ان خوفناک لمحات کو بھلا نہیں پا رہا تھا۔نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال، کافی دیر تک جاگنے کے بعد نیند آ ہی گئی۔ جب صبح اٹھا تو تازہ دم تھا۔

غسل کرنے کے بعد بیرے سے اخبارات منگوائے گئے۔ اخبارات کی حاشیہ آرائی دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے ایک خوف ناک خطرہ قرار دیا گیا تھا۔ ہنگامی پیمانے پر مجھ سے نمٹنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اخبارات نے نمایاں طور پر میری تصاویر شائع کی تھیں۔کہیں مجھے ایک ماڈرن جادوگر کہا گیا تھا اور کہیں کوئی خبیث روح۔کل کا پورا واقعہ تفصیل سے درج تھا۔ طالوت ایک ایک خبر کو پڑھ کر ہنس رہا تھا۔

"تم ہنس رہے ہو۔میری جان نکلی جا رہی ہے۔اگر کسی بیرے وغیرہ نے ہمیں پہچان لیا تو؟"

"تم فکر مت کرو۔بس دیکھتے جاؤ۔"

"نہیں طالوت! شکلیں بدل لو۔ہم کوئی نیا ہنگامہ نہیں کریں گے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں نکلوں گا جب تک شکل نہ بدل لی جائے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔لیکن داؤد رحمانی کے سامنے ہم اصلی شکل میں ہی جائیں گے۔"

"وہاں کی دوسری بات ہے۔لیکن اس بات پر غور کر لینا کہ وہاں پولیس ضرور ہو گی۔ انہیں خیال ہو گا کہ میں ایک بار وہاں ضرور جاؤں گا۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔بس تیار ہو جاؤ۔ناشتہ داؤد رحمانی کے ہاں ہی کریں گے۔"

"ناشتہ کر کے چلو۔ہمیں دیکھنے کے بعد وہاں ناشتے کا کسے ہوش رہے گا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔" طالوت نے مجھ سے اتفاق کیا۔ناشتے کے بعد ہم نے لباس پہنے اور تیار ہو گئے۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے بھی میرے قدم کانپ رہے تھے اور میں خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔لیکن بدمعاش طالوت مطمئن تھا۔ پھر ہوٹل سے باہر قدم رکھ کر اس نے میرے چہرے پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنے چہرے پر۔ طالوت کی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر میں نے بھی سمجھ لیا کہ میری شکل بدل گئی ہو گی۔اور میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔

طالوت نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم دونوں اطمینان سے اس میں بیٹھ گئے۔

"ذرا شہر کی حالت دیکھتے چلیں گے۔" طالوت نے ٹیکسی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔لیکن طالوت نے ٹیکسی ڈرائیور کی کوئی پروا نہیں کی اور بولا۔ "ایک طرح سے اگر دیکھا جائے تو چند ناگوار باتوں کے علاوہ تم نے بہت عمدہ وقت گزارا ہے۔ کاش مجھے ایسا کوئی مہربان اور سرپرست مل جائے، جو روزانہ نئی نئی لڑکیاں فراہم کرے۔ مجھے تو تمہاری قسمت پر رشک آتا ہے۔"

میں نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں گزرے ہوئے لمحات کی تصویریں میرے ذہن

میں ضرور رینگ آئی تھیں۔ راتوں کو خواب کی طرح نظر آنے والے چہرے اور دکتے ہوئے مومی اجسام، جو دن کی روشنی میں تحلیل ہو جاتے تھے، دوبارہ نظر نہ آنے کے لئے۔ کیسی انوکھی راتیں تھیں وہ۔ اگر ان کے ساتھ شیکر کی شرط نہ ہوتی، اس کا وہ ذلیل رویّہ نہ ہوتا تو شاید ان راتوں کو میں کبھی فراموش نہ کرتا۔ میں سوچ رہا تھا اور طالوت میری شکل دیکھ رہا تھا۔

پھر میری ذہنی رو طالوت کی طرف بھٹک گئی۔ اس شخص کو حالات کا رخ بدل دینے پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔ وہ نہیں آیا تھا تو میرے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ اور جب وہ آیا تو سب کچھ ایک بھیانک خواب بن گیا...... ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پریشانی قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا۔ اور اب اس خواب سے آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور طالوت کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا دیا۔ ’اس وقت ظاہر ہے طالوت یاد آیا ہوگا۔‘‘ اس نے کہا۔

’’نہیں طالوت! میں نے تو تمہیں ہر موقع پر یاد کیا تھا۔ تم میرے لئے ایک خواب بن گئے تھے۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم واپس آؤ گے۔ تم پہنچے بھی تو کیسے حیرت انگیز وقت پر۔ تمہیں میری پریشانی کا اندازہ کیسے ہوا؟‘‘

’’سخت پریشانیوں کے باوجود مجھے تمہارا خیال تھا۔ جوں ہی حالات درست ہوئے میں وہاں واپس آ گیا۔ اور پھر اس شہر میں تمہاری بُو سونگھنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تمہارے جسم کی خوشبو کے سہارے تم تک پہنچ گیا۔‘‘

’’اگر تم تھوڑی دیر اور نہ آتے طالوت! تو پھر شاید......‘‘

اور طالوت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چند ساعت وہ غصے سے کھولتا رہا۔ پھر اس نے غرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’پھر طالوت اپنی دنیا میں واپس چلا جاتا لیکن جانے سے پہلے وہ اپنے دوست کی موت کا انتقام ضرور لیتا۔ اور یہ انتقام کیسا ہوتا، اس کے بارے میں اب کچھ کہنا بیکار ہے۔ جب تک میرا دل ٹھنڈا نہ ہوتا، میں انتقام لیتا رہتا۔ بہرحال، اب اس ذکر کو جانے دو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔ اور تم ان لوگوں کے خلاف کچھ کرنے کو منع کر چکے ہو۔‘‘

’’ہاں۔ اب اس ذکر کو جانے دو۔ یہ گزری باتیں ہیں۔ بھولے ہوئے افسانے ہیں۔ انہیں ذہن سے نکال دینا ہی بہتر ہے۔‘‘ میں نے کہا اور طالوت خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی داؤد رحمانی کی خوب صورت کوٹھی کے سامنے پہنچ گئی اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ طالوت نے بل ادا کیا اور ہم چاروں طرف نظریں ڈالتے ہوئے گیٹ پر پہنچ گئے۔ بظاہر پولیس والوں کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا، اس نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’سیٹھ صاحب موجود ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں۔ لیکن وہ کسی سے مل نہیں سکتے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔‘‘ چوکیدار نے کہا۔

’’اور نرگس رحمانی؟‘‘

’’بی بی بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ بھی کسی سے نہیں ملیں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ اگر وہ ہم سے نہیں ملیں گی تو ہم ان سے مل لیں گے۔‘‘ طالوت نے کہا اور آگے

بڑھنے لگا۔

''میں بول چکا ہوں صاب! آپ لوگ اندر نہیں جا سکتے۔ سیٹھ نے بول دیا ہے، کوئی بھی ہو، وہ نہیں ملیں گے۔'' چوکیدار راستہ روکنے کے انداز میں بولا اور طالوت چونک کر اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے ہونٹ سکوڑ کر چوکیدار کے سینے پر پھونک ماری اور چوکیدار کسی تنکے کی طرح اُڑ کر دُور جا گرا۔ طالوت نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ طالوت اطمینان سے چلتا ہوا اندر جا رہا تھا اور چوکیدار اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ بہرحال پھر اس نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی اور ہم اطمینان سے اندر داخل ہو گئے۔ طالوت نے ایک گزرتی ہوئی ملازمہ کو روکا اور اس سے مسٹر داؤد رحمانی کے بارے میں پوچھا۔

''صاحب اپنے بیڈروم میں ہیں۔''

''اور مس نرگس؟''

''وہ اپنے بیڈروم میں ہیں۔'' ملازمہ نے کہا اور طالوت شکریہ ادا کر کے آگے چل پڑا۔ پھر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اب بتاؤ، تم کس کے بیڈروم میں جانا پسند کرو گے؟ لیکن ایک شرط ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کوئی رومانی ڈرامہ نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے، حد سے تجاوز کرنے والی بات۔ اگر ایسی کوئی بات ہونی ہے تو پھر میں باہر ہی رہ جاؤں، ورنہ ذرا میں......'' طالوت شرارت سے گردن کھجاتے ہوئے بولا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ تم باہر ہی رہو گے۔'' میں نے کہا اور طالوت ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''بہتر ہے۔ اس دوران میں ذرا سیٹھ صاحب سے ملاقات کر لوں گا۔'' میں نے گردن ہلا دی۔ پھر ہم دونوں نرگس رحمانی کی خواب گاہ پر پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو نرگس کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' لیکن میں نے اس آواز کا جواب نہیں دیا اور تیسری بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت نے اپنا ہاتھ میرے چہرے کے سامنے کر دیا اور ہم دونوں اپنی اصلی شکل وصورت میں آ گئے۔

''کون ہے؟........ بولتے کیوں نہیں؟........ بھاگ جاؤ۔'' اندر سے نرگس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ لیکن میں نے پھر چوتھی بار دستک دی۔ تب اندر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں نے ملتجی نگاہوں سے طالوت کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے طالوت میری نگاہوں سے غائب ہو گیا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ نرگس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں متورم تھیں۔ اس وقت چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا لیکن میری شکل دیکھتے ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لئے دروازے کا سہارا لیا اور پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگی۔

عجیب کیفیت تھی اس کی آنکھوں کی۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''کیا........ کیا تم کوئی تصور ہو؟

کیا تم کوئی خواب ہو؟"

"نرگس! میں عارف جمال ہوں۔ ایک حقیقت۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"حقیقت........اوہ........ حقیقت........ عارف!........ عارف! تم........تم؟" وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "عارف! تم زندہ ہو؟ ہاں، تم زندہ ہی ہو........ عارف........" وہ پاگلوں کی طرح مجھے ٹٹولنے لگی۔ میں اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر لے گیا۔ میں نے پلٹ کر دروازہ بھی بند کر لیا اور پھر میں اسے لے کر ایک صوفے پر پہنچ گیا۔

اب نرگس جذبات کے بھنور سے نکل آئی تھی۔ وہ قدرے سنبھل گئی تھی۔ "آپ........آپ........ عارف صاحب!........ میں نے اخبارات میں پڑھ لیا تھا۔ اُف........ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں خودکشی کر لیتی، عارف صاحب!........ مجھے قیامت تک یہ ملال رہتا کہ ڈیڈی آپ کے احسانات کا جواب نہ دے سکے۔" اس نے کہا۔

"تفصیل آپ کو معلوم ہو گئی ہو گی نرگس صاحبہ!" میں نے کہا۔

"ہاں........ اور تفصیل معلوم ہونے کے بعد ہی میں نے ڈیڈی کو معاف کر دیا تھا۔

"نہیں نرگس صاحبہ! آپ کے ڈیڈی قصور وار نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک مہذب انسان اور ایک محب وطن شہری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ بہر حال نادانستگی میں ہی سہی، میں مجرم ضرور ہوں۔"

"یہ دنیا اتنی سطحی کیوں ہے؟ یہ گہرائیوں میں کیوں نہیں جھانکتی؟ قانون اتنا ہلکا کیوں ہے؟ جرم کی وجہ کیوں نہیں معلوم کی جاتی؟ اس کا تدارک کیوں نہیں کیا جاتا؟ کیا یہ لوگ صرف سزائیں دینے والے ہیں؟ پھر انصاف کرنے والے کہاں گئے؟" نرگس نے درد بھرے لہجے میں کہا اور میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"پوری دنیا سے میرا گلہ ختم ہو گیا، مس نرگس! میرے دل کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ آپ کی زبان سے یہ الفاظ سن لوں۔ میں نے آپ کے لئے کبھی برا نہیں سوچا مس نرگس! درحقیقت آپ کے لئے میں نے یہ سب تکالیف اٹھائی ہیں۔ آپ میرے دل کو بھا گئی ہیں۔ اور دل کی صرف اتنی سی خواہش تھی کہ آپ میرے سامنے میری بے گناہی کا اقرار کر لیں۔ اس کی وجہ سے جو کچھ ہوا ہے، آپ کے علم میں ہے۔"

"میں آپ کی دل سے قدر کرتی ہوں عارف صاحب! کاش میں آپ کی اس محبت کا کوئی بدلہ دے سکتی۔"

"بدلہ تو مجھے مل گیا۔ اب مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک نرگس چونک پڑی۔

"پولیس اب بھی آپ کی تلاش میں ہو گی عارف صاحب!........ اور........"

"آپ پولیس کی فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا اخبارات کی خبریں درست تھیں عارف صاحب؟ کیا درحقیقت پولیس کے ساتھ وہی سب کچھ ہوا، جو اخبارات نے لکھا ہے؟"

"ہاں۔ وہ خبریں درست تھیں۔"

''لیکن یہ سب کیا تھا؟ اخبارات نے عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی ہیں۔''
''وہی سب کچھ، جو تم پہلی ملاقات میں دیکھ چکی تھیں۔'' میں نے جواب دیا اور نرگس تعجب سے میری شکل دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کچھ اور پوچھنا چاہا۔ لیکن اسی وقت باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسی وقت دروازے پر ایک دستک سنائی دی۔ دوسری دستک پر نرگس نے سخت لہجے میں پوچھا۔
''کون ہے؟........ کیا بات ہے؟''
''میں شبراتن ہوں بی بی جی! کوئی آپ سے ملنے تو نہیں آیا؟''
''بکواس مت کرو........ بھاگ جاؤ۔'' نرگس نے کہا اور پھر خوف زدہ نگاہوں سے میری شکل دیکھنے لگی۔ قدموں کی آہٹیں دروازے سے دور ہوتی گئیں۔
''کیا پولیس اس وقت بھی یہاں موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''پتہ نہیں۔ لیکن کل میری موجودگی میں ہی ڈیڈی کو آپ کے فرار کی اطلاع دی گئی تھی۔''
''اوہ........ سیٹھ صاحب پر کیا ردِعمل رہا؟''
''یقین کریں گے؟'' نرگس نے مجھے دیکھا۔
''کیوں نہیں؟ تمہاری ہر بات پر مجھے یقین ہے۔''
''ڈیڈی شاید آپ کو گرفتار کرانے کے بعد سکون کا ایک لمحہ بھی نہ گزار سکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھے۔ آپ کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ پھر انہوں نے مجھے فون کیا اور عجیب سے انداز میں بولے۔ کیا میں نے غلط کیا ہے نرگس؟ کیا میں ایک شریف شہری نہیں ہوں؟ کیا بے گناہ انسانوں کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی؟........ انہوں نے کئی بار مجھے فون کیا اور عجیب اُلٹی سیدھی باتیں کرتے رہے۔''
''ہوں........ مجھے داؤد صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انہوں نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ بہرحال اب ان باتوں کو جانے دو۔ میں سیٹھ داؤد سے بھی مل لوں گا۔ تمہاری طرف سے مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔''
''لیکن........ اب آپ کیا کریں گے؟ کیا پولیس آپ کی تلاش میں نہیں ہو گی؟''
''یہ تو زندگی بھر کی آنکھ مچولی ہے نرگس! بس اب مجھے اجازت دو۔ میں جس کام کے لئے بار بار تمہارے پاس آتا رہا تھا۔ وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب شاید کبھی ہماری ملاقات نہ ہو۔''
نرگس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔
''اگر حالات میرے ساتھ یہ مذاق نہ کرتے نرگس! اور میری تم سے ملاقات ہو جاتی........ اور اگر تم مجھے کوئی حیثیت دیتیں تو میں تمہیں اپنا کر زندگی بھر فخر محسوس کرتا۔ لیکن اب تو میں ایک سایہ ہوں۔ ایک خواب ہوں جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔ اگر تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں کبھی میرا تصور آئے تو اسے نکال پھینکنا۔ خدا حافظ!'' میں نے افسردگی سے کہا اور نرگس کو سسکتا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ میرا دل بھی اُداس ہو گیا تھا۔ لیکن نرگس سے اپنی بے گناہی کا اقرار سن کر مجھے ایک سکون کا سا احساس بھی ہو گیا تھا۔

باہر نکلتے ہی طالوت نظر آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ طالوت کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟....... کیا تم داؤد رحمانی سے ملے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس دلکش منظر کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا؟'' طالوت نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور میں جھینپ گیا بدمعاش طالوت نے میری اور نرگس کی باتیں چھپ کر سنی تھیں۔ بہرحال یہ اچھا ہوا تھا کہ زیادہ حماقت کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

''پھر اب کیا خیال ہے؟....... آؤ، داؤد صاحب سے بھی مل لیا جائے۔'' طالوت نے کہا۔ میں نے مضمحل انداز میں گردن ہلا دی۔ طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ میں اس کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ بہرحال وہ میرے ساتھ قدم ملاتا ہوا چل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے داؤد رحمانی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے ایک بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''آ جاؤ۔''

میں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ داؤد رحمانی ایک آرام کرسی پر دراز تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور اچھل پڑے۔ ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور پھر ایک عجیب سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

''آؤ عارف! میں تمہارا منتظر تھا۔'' انہوں نے کہا۔ میں خاموشی سے کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ ''انتقام لینے آئے ہو؟'' ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''انتقام.......!'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''میں تمہیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے، میں نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ لیکن میں اپنے اس فعل میں حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ بہرحال میں قانون کا احترام کرتا ہوں۔''

''میں آپ سے متفق ہوں داؤد صاحب! اور آپ کے اس اقدام پر مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور داؤد صاحب یکبارگی چونک کر گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''میں نہیں سمجھا۔'' انہوں نے کمزور آواز میں کہا۔

''اگر آپ نے ایک شریف شہری ہونے کا ثبوت دیا تھا تو میں برا ماننے والا کون ہوں؟ میں صرف آپ سے آخری ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں۔''

''آخری ملاقات؟''

''جی ہاں....... میں یہ شہر چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے داؤد صاحب! کہ آپ جیسے نیک انسان سے ملاقات بہت مختصر رہی۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ایک بدکردار انسان کی حیثیت سے آپ کے سامنے آیا

کاش ہم اچھے لوگوں کی طرح ملتے۔ بہرحال قسمت۔ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کو اب بھی میرے اس خلوص کا یقین نہیں ہے؟''

رحمانی صاحب منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر انہوں نے گردن جھکا لی اور آہستہ سے بولے۔

"تمہارے اس احسان سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہے گی بیٹے! قانون اگر کبھی تمہیں معاف کر دے تو ایک بار میرے پاس ضرور آنا" انہوں نے دوسری طرف رخ کرلیا۔

"خدا حافظ رحمانی صاحب! آپ نے میری کاوشوں کا صلہ دے دیا ہے۔ بس مجھے کچھ اور نہیں چاہئے۔ خدا حافظ" میں نے دوبارہ کہا اور داؤد رحمانی کے کمرے سے نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی طالوت مجھے ملا۔ اس نے برا سا منہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

"کیوں، کیا بات ہے؟ تمہارا منہ چڑھا ہوا ہے۔"

"چھوڑو یار! بور کر دیا۔" طالوت شانے جھٹک کر بولا۔

"کیوں؟"

"کیا بس اسی لئے آئے تھے؟"

"تم نہیں سمجھتے طالوت! اس وقت میرا ذہن کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔"

"مگر وہ لڑکی بڑی کنجوس ہے۔ جب وہ تم سے لپٹی تھی تو میں نے سمجھا تھا کہ......کہ......مگر یار! اس احسان کے بدلے میں وہ ایک بوسہ ہی دے دیتی۔"

"نہیں طالوت! مجھے کھلے الفاظ میں اس کے جسم کی پیشکش کی گئی تھی۔ اتنی بہت سی لڑکیاں میری زندگی میں آئی ہیں لیکن میرے ذہن میں ان کا خیال بھی نہیں رہ گیا ہے۔ میں تو اس کے تقدس پر مرمٹا تھا۔ اگر میں اس کا بوسہ لینا چاہتا تو وہ انکار نہ کرتی۔ تم نے اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکا تھا طالوت! اس کے جسم کا رواں رواں مجھے بوسے دے رہا تھا۔ میں ان ہی بوسوں سے اپنی روح کو منور کر کے یہاں سے جا رہا ہوں۔ آؤ میرے دوست! تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے؟"

"بس، بس......سمجھ لیا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب تم مجھے کچھ کرنے کی اجازت دو۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس سلسلے میں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" طالوت نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جب ہم کوٹھی سے کچھ دور نکل آئے تو میں نے گھبرا کر کہا۔

"اب شکلیں تو بدل لو۔"

"ہوں۔" طالوت نے ہلکی سی غرّاہٹ سے کہا اور اپنے ہاتھ کو میرے چہرے کے سامنے کر دیا۔ پھر اس نے اپنی شکل بھی تبدیل کی اور میں نے سکون کی سانس لی۔ میرا ذہن طالوت میں اُلجھ گیا تھا۔ درحقیقت اگر اس وقت طالوت میرے ساتھ نہ ہوتا تو نہ جانے نرگس سے جدا ہونے کا خیال کتنی دیر تک پریشان کرتا۔ لیکن اب میں طالوت کی اس حرکت کے بارے میں سوچ رہا تھا، جو وہ کرنے والا تھا۔

ہم کوٹھی سے کافی دور نکل آئے۔ کئی ٹیکسیاں خالی گزر گئیں لیکن طالوت نے مجھے ٹیکسی نہیں روکنے دی اور پیدل ہی چلتا رہا۔ پھر ہم سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک نوجوان آدمی کے قریب سے گزرے، جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔ اچانک طالوت نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے کے سامنے کر دیا اور نوجوان ٹھٹک گیا۔ اس نے رک کر ناگوار نگاہوں سے طالوت کو دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''اوہ......اوہ......کوئی بات نہیں نوجوان! مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔'' طالوت نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔لیکن طالوت کی غلط فہمی دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔وہ نوجوان میرا ہم شکل بن گیا تھا۔ ہو بہو میری طرح۔اور اس بے چارے کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔وہ طالوت کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''طالوت......!'' میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے؟'' طالوت نے تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''وہ......وہ بے موت مارا جائے گا۔سنو، نہ جانے کون ہے؟ تمہیں اس بے چارے سے کیا دشمنی ہے؟''

''چلتے رہو۔تم وعدہ کر چکے ہو کہ میرے معاملات میں دخل نہ دو گے۔'' طالوت نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔لیکن اسی وقت طالوت ایک اور آدمی کے سامنے رکا۔اس نے اپنا ہاتھ اس شخص کے چہرے کے سامنے کر دیا اور اس شخص نے گھبرائے ہوئے انداز میں چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔طالوت نے مسکرا کر گردن خم کی اور اسی انداز میں آگے بڑھ گیا۔اس دوسرے شخص کی شکل بھی تبدیل ہو گئی تھی۔

پھر اچانک میرے ذہن میں طالوت کی شرارت کی وجہ آ گئی تھی اور میں طالوت کی اس شرارت پر دنگ رہ گیا۔شہر میں اگر ایک ہی شکل کے پچیس پچاس نوجوان گھوم رہے ہوں گے تو پولیس کس کو شناخت کرے گی؟ کتنوں کو گرفتار کرے گی؟ ان کے بارے میں کیا اندازہ قائم کرے گی؟ یقیناً پولیس چکر میں پڑ جائے گی۔اور اس کے بعد......اس کے بعد تو اگر میں بھی چاہوں تو اپنی اصلی شکل میں آزادانہ گھوم سکتا ہوں۔اگر کبھی پکڑا بھی جاؤں تو اپنے شریف آدمی ہونے کا یقین دلا کر با آسانی نکل آؤں۔

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا ایک شخص ٹھٹک گیا۔

''اوہ......کوئی بات نہیں ہے بھائی صاحب! میرا دوست تھوڑا سا پاگل ہے۔ طالوت نے اس شخص کے چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ شریف آدمی گردن ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔اس بات سے بے خبر کہ اب اس کے بیوی بچے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔

''طالوت! تمہاری یہ حرکت بے حد دلچسپ،لیکن بہت سے لوگوں کے لئے سخت پریشان کن ہے۔''

''بہت سے لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' طالوت نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''تم خود سوچو۔پولیس ان بے چاروں کو گرفتار کرلے گی اور تین دن تک تھانے میں رکھ کر ان کے بارے میں چھان بین کرے گی۔ان کے بال بچے پریشان ہوں گے اور پھر وہ انہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔غور تو کرو۔''

''دیکھئے جناب! ان سب کے چہرے چار دن کے اندر اصل حالت پر آ جائیں گے۔مجھے ان سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔میں صرف ان لوگوں کو تنگ کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میرے دوست کو پریشان کیا ہے۔اور میرے نزدیک انہیں پریشان کرنے کا یہ سب سے شریفانہ طریقہ ہے۔'' طالوت نے ایک اور شریف آدمی کے چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بدتمیزی ہے؟'' اس شخص نے طالوت کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' طالوت رُک کر اسے گھورنے لگا۔

''میں کہتا ہوں، تم نے میرے چہرے پر ہاتھ کیوں رکھا؟''
''اب ایسے گلفام بھی نہیں ہو کہ میرے ہاتھ رکھنے سے چہرہ میلا ہو گیا ہو گا۔'' طالوت نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔
''گلفام کے بچے! میں تیرا دماغ درست کر دوں گا۔''
''ابے، میں خود تیرا دماغ درست کر دوں گا۔'' طالوت نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔
''ہائیں، ہائیں...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میں نے ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانا چاہا۔ لیکن طالوت نے اس شخص کے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا اور تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے دو کانسٹیبل دوڑے چلے آئے۔
''ارے کیا بات ہے؟'' ان میں سے ایک نے کڑک کر پوچھا۔
''دیکھئے تو سہی حوالدار جی! غنڈہ گردی کر رہا ہے۔ کہتا ہے میں بہت خطرناک ہوں۔ ابھی آنتیں نکال دوں گا۔'' طالوت نے جلدی سے کہا۔
پولیس کانسٹیبلوں نے اس شخص کو گھورا اور دوسرے لمحے ان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ دونوں ہی اس شخص پر لپکے۔ انہوں نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کانسٹیبل دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں اس شخص کو رسیوں سے باندھ لیا گیا۔ وہ بے چارہ ایک لفظ بھی تو نہیں بول سکا اور پولیس والوں کے چہروں پر ایسے خوشی کے آثار پھیل گئے جیسے انہیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔
''آؤ۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ ''دیکھ رہے ہو پولیس کی اعلیٰ کارکردگی۔ ایک ایک پولیس مین کو تمہارا حلیہ یاد کرا دیا گیا ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے طالوت! لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو سلوک ہو گا، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔''
''دو چار گرفتار ہو کر وہاں پہنچ جائیں گے تو پھر کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں ہو گا۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا اور ایک شخص کے چہرے کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔
داؤد رحمانی کی کوٹھی سے ہوٹل تک کا فاصلہ طالوت نے پیدل ہی طے کیا اور اس پورے راستے میں وہ یہی حرکت کرتا چلا آیا۔ تقریباً پینتالیس نوجوان میرے ہم شکل بن گئے تھے۔ پھر ہم ہوٹل میں داخل ہوئے۔ یہاں پر طالوت نے اپنی اور میری شکل بھی درست کر لی تھی۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب کل کے اخبارات دیکھنے کے قابل ہوں گے۔''

اور درحقیقت دوسرے دن کے اخبارات دیکھنے کے قابل ہی تھے۔ خوف ناک قاتل عرف ماڈرن جادوگر کے کارناموں سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ ہر اخبار کا موضوع عارف جمال تھا۔ وہ انوکھا جادوگر جس نے اپنے درجنوں ہم شکل بنا دیئے تھے۔ اخبارات میں بڑی دلچسپ تفصیل تھی۔ پولیس کا پورا محکمہ سخت مصروف تھا۔ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ اس کے ہم شکل فرضی ہیں۔ پولیس اب بھی ان ہم شکلوں کو اس امید پر گرفتار کر رہی تھی کہ ممکن ہے ان میں سے کوئی اصلی ہو۔ پکڑے جانے والوں کے بارے میں دلچسپ خبریں تھیں۔ ان کے اعزہ نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔

طالوت ایک ایک خبر سن کر ہنس رہا تھا۔ بے شمار تصویریں چھپی تھیں جو میرے ہم شکلوں کی تھیں۔ ان میں جسامت کے فرق کے علاوہ سر مو فرق نہیں تھا۔ پھر طالوت نے کہا۔

''اب ہوٹل والے بھی ہمیں پہچان لیں گے۔ اس لئے جتنی دیر ہوٹل میں قیام کریں گے، شکل بدل کر رہیں گے۔ بلکہ میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔

''میں اپنی اصلی شکل میں گرفتار ہو جاؤں گا اور پولیس کے ہاتھ لگ کر ان لوگوں سے تھوڑی سی تفریح کروں گا۔''

''بس بہت ہو گیا طالوت! اب میں مزید کوئی گڑبڑ پسند نہیں کروں گا۔ لیکن تم کہاں چلنے کی بات کر رہے تھے؟''

''کیا مطلب؟''

''تم کسی جگہ کی تعریف کر رہے تھے کہ وہاں کا علاقہ بہت خوب صورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ، ہاں........ پھر؟''

''میرا خیال ہے ہمیں چل دینا چاہئے۔''

''یار!........ دل تو ٹھنڈا نہیں ہوا۔ یہاں ابھی کچھ اور تفریح کرنے کی خواہش ہے۔ لیکن تم اگر چاہتے ہو تو یہی سہی۔ تو پھر تیاریاں کروں؟''

''ہاں طالوت! بس یہاں سے نکل چلنے کو دل چاہ رہا ہے۔ یہاں سے بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں رہا تو نرگس سے ملنے کو بھی دل چاہے گا۔ ایک جگہ رہتے ہوئے اور آسانی ہوتے ہوئے اس سے دور رہنا مشکل ہے، لیکن میں اس معصوم لڑکی کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے آزردہ لہجے میں کہا اور طالوت میری شکل دیکھنے لگا۔

''تم نے تو مجھے انتباہ کیا تھا کہ اس گندے ماحول کی کسی لڑکی سے دل لگانے کی کوشش نہ کروں اور خود دیوداس بن گئے۔ سنو مسٹر عارف! یہ آہیں اور سوگ اب نہیں چل سکے گا۔ زندگی کو پوری طرح دلچسپیوں میں گم کر دو، ورنہ مزہ خراب ہو جائے گا۔''

''کچھ دن کی مہلت دے دو طالوت! پچھلے دن جس طرح گزرے ہیں وہ اتنی آسانی سے فراموش نہیں ہوں گے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت نہ ہو۔''

''اوہ........ تو پھر اس ماحول میں یہی مناسب ہے کہ فوری طور پر یہاں سے نکل چلا جائے۔''

طالوت نے کہا اور پھر اپنے دائیں طرف رخ کر کے بولا۔

''راسم........!'' اور راسم آ موجود ہوا۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل جناب!'' راسم نے جواب دیا۔

''سفر کی ضرورتوں کا بندوبست کرو۔ تم بہتر سمجھتے ہو کہ ہم کس انداز میں سفر کریں گے۔''

اور راسم نے گردن جھکا دی۔ دوسرے لمحے وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

دوسرے دن ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اخبارات دیکھ رہے تھے۔ آج کے اخبارات میں بھی ہمارے بارے میں بہت سی خبریں تھیں۔ پولیس سخت پریشان تھی۔ اس عجیب صورتِ حال میں اصلی

عارف جمال کی تلاش بہت مشکل تھی۔ پولیس کے اعلان چھپے تھے، جن میں پولیس نے لوگوں کو اس خطرناک آدمی سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ ہر طرف سنسنی پھیل گئی تھی۔ تمام اخبارات پڑھنے کے بعد طالوت نے گہری سانس لی اور پھر بولا۔

''چلو بھئی۔ ان بے چاروں کو اب معاف کر دیا جائے۔ کیا خیال ہے، روانگی کی تیاریاں کریں؟''

''انتظامات ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''راسم نے صبح ہی اطلاع دی تھی۔''

''کیا پروگرام ہے؟ روانگی کا کیا بندوبست ہوگا؟''

''یہاں سے بذریعہ ٹرین چلیں گے۔ اور پھر جب ضرورت ہوگی، دوسرے انتظامات کر لیں گے۔ راسم نے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''بس تو پھر جوتے وغیرہ پہن لو، ہوٹل کا بل ادا کر دیں۔ ویسے بیرے وغیرہ ہماری تبدیل شدہ شکلوں پر حیران سے ہیں۔ لیکن میں نے اتنی معمولی سی تبدیلی کی ہے کہ وہ شک نہیں کر سکتے۔'' طالوت نے کہا اور پھر ہم تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم نیچے اُتر آئے۔ ہوٹل کا بل وغیرہ ادا کیا اور اس کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن چل پڑے۔ طالوت چاہتا تو اپنے مخصوص انداز میں بھی سفر کر سکتا تھا۔ لیکن وہ مکمل دلچسپیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ٹرین کا سفر پسند کیا تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں اسٹیشن پہنچا دیا۔ راسم ایک عام سے ملازم کی حیثیت سے ہمیں پلیٹ فارم پر مل گیا۔

''سامان وغیرہ کمپارٹمنٹ میں رکھوا دیا گیا ہے جناب! ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''

''شکریہ راسم! ٹکٹ کہاں ہیں؟'' طالوت نے پوچھا اور راسم نے ٹرین کے ٹکٹ ہمارے حوالے کر دیئے۔ ٹرین کی روانگی میں تھوڑا وقت باقی تھا، اس لئے ہم دونوں کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے۔

فرسٹ کلاس کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ڈبہ خالی دیکھ کر طالوت نے ہونٹ سکوڑ لئے۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھ نہیں رہے، یہاں تو اُلو بول رہے ہیں۔'' طالوت منہ بسور کر بولا۔

''ہمارے یہاں کے بہت کم لوگ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ اور پھر یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم تنہا ہیں۔ آزادی رہے گی۔''

''اونہہ...... پھر وہی لغو باتیں۔ میں تمہاری دنیا کی گہما گہمیوں میں رہنا چاہتا ہوں اور تم تنہائی پسند کرتے ہو؟'' طالوت نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ لیکن اسی وقت کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک سیاہ سوٹ کیس اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے قلیوں کی پوری فوج چڑھ آئی۔ آدھ درجن سوٹ کیس، باسکٹ اور دوسری چیزیں اندر آئیں۔ طالوت منہ پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر پرانے طرز کی سفید بالوں والی ایک بڑی بی نظر آئیں، جن کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ طالوت نے برا سا منہ بنا کر آنکھیں بھینچ لیں۔ مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔

''اُٹھو۔'' طالوت آنکھیں بند کئے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''کیوں......کیوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''ابے تو کیا یہاں بیٹھو گے؟ لعنت ہے ان بڑی بی پر۔'' طالوت آنکھیں ہی نہیں کھول رہا تھا۔ بڑی بی کے پیچھے ایک رنگین لباس نظر آیا اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ جدید طرز کے چست پائجامے پر خوب صورت فراک پہنے اور دوپٹہ گلے میں ڈالے ایک رشکِ حور اندر داخل ہوئی۔ سادہ سا سفید چہرہ، ڈھلی ڈھلی آنکھیں جن سے بے پناہ شوخی ٹپک رہی تھی، انتہائی متناسب جسم، دراز قد......پھر بات ایک تک محدود نہیں رہی، اس کے پیچھے دو اور حسینائیں اندر داخل ہوئیں۔ گو یہ دونوں حُسن میں پہلی لڑکی کے مقابل نہیں تھیں تاہم وہ بھی انتہائی حسین کہی جاسکتی تھیں۔
''آنکھیں تو کھولو۔'' میں نے طالوت کے کان میں سرگوشی کی۔
''بکواس بند کرو عارف! سامان پر لعنت بھیجو اور خاموشی سے نیچے اُتر چلو۔'' طالوت نے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے میرا بازو پکڑ کر مجھے بھی کھڑا کر دیا۔
''تمہاری مرضی۔ ویسے بڑی بی تنہا نہیں ہیں۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
''کیا مطلب ہے؟'' طالوت نے بدستور اسی انداز میں کہا۔
''آنکھیں کھولو تو پتہ چلے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور طالوت نے خوف زدہ انداز میں آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہی لڑکی تھی۔ طالوت نے اسے دیکھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ میری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔
''ابے تم بیٹھو نا۔ کھڑے کیوں ہو گئے؟'' اور خود بھی وہ دھم سے بیٹھ گیا۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ لڑکیاں اور بڑی بی ابھی تک ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئی تھیں۔ دو تین آدمی ان کا عظیم الشان سامان سجانے میں لگے ہوئے تھے۔ اور پھر جب سامان لگ گیا تو انہوں نے گہری سانسیں لیں۔
''ٹھیک ہے سردار علی! بس تم لوگ جاؤ۔'' بڑی بی نے کمر سیدھی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''خدا حافظ مہرانہ بٹیا! خدا حافظ رشیدہ بوا!'' سردار علی نے کہا اور گاڑی سے اُتر گئے۔ لڑکیاں اپنی سیٹوں پر آگئیں۔ تب ان کی نگاہ ہم دونوں کی طرف اٹھ گئی اور وہ بیٹھتے بیٹھتے چونک پڑیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اب تک کسی نے ہمیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ لڑکیوں نے پلٹ کر بڑی بی سے کچھ کہا اور بڑی بی چونک پڑیں۔ انہوں نے پورا وجود گھما کر ہمیں دیکھا۔ اس بڑھاپے میں بھی بڑی خطرناک آنکھیں تھیں ان کی۔ اور پھر وہ طوفانی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''خدا خیر کرے۔'' طالوت نے بڑی بی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ بڑی بی ہمارے قریب پہنچ گئیں۔
''کون ہو جی تم؟'' انہوں نے کڑک دار آواز میں پوچھا اور سچ مچ میرے علاوہ طالوت کا بھی حلیہ بگڑ گیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا اور میں جلدی سے بول پڑا۔
''آدمی ہیں جی۔ بالکل آدمی۔''
''آدمی کے بچو! اس کمپارٹمنٹ میں کیوں گھس آئے؟ ہم نے پورا ڈبہ ریزرو کرایا ہے۔ سردار علی! ارے او سردار علی......!'' بڑی بی چیخیں لیکن سردار علی واپس جاچکے تھے۔ ''چلو اُترو......نکلو یہاں سے۔''

بڑی بی پھر ہماری طرف رخ کر کے چیخیں۔

ہماری خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ جتنا ان چہروں کو دیکھ کر خوشی ہوئی تھی، اتنی ہی بڑی بی کی بکواس پر کوفت ہونے لگی۔ اس کے علاوہ میں اس بات پر بھی غور کر رہا تھا کہ درحقیقت ہم غلط کمپارٹمنٹ میں تو نہیں آ گئے؟ بڑی بی پورے کمپارٹمنٹ کو ریزرو کرانے کی بات کر رہی تھیں۔

''ارے تم اٹھتے ہو یا نہیں؟'' بڑی بی پھر دہاڑیں۔

''بیٹھا رہنے دو، رشیدہ بوا! بے چارے صورت سے شریف لوگ معلوم ہوتے ہیں۔'' ایک لڑکی نے کہا۔

''جی ہاں......جی ہاں۔ ہم بالکل شریف ہیں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''ارے تمہاری شرافت میں آگ لگا دوں۔ اُترتے ہو یا بلاؤں ٹی ٹی کو؟'' بڑی بی کلکلا کر بولیں۔

''عارف!......عارف! کیا میں اس بڑھیا کا دماغ درست کر دوں؟'' طالوت کو اب غصہ آنے لگا تھا۔ لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر جلدی سے اپنے ٹکٹ نکال لئے۔ ٹکٹوں پر اسی کمپارٹمنٹ کا نمبر موجود تھا۔ سیٹیں بھی یہی تھیں، جن پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ تب میں نے ہونٹ بھینچ کر بڑی بی کو دیکھا۔

''پڑھنا جانتی ہو؟''

''آئے تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہوں۔ پانچ سیپارے پڑھے ہیں پورے۔ تم بس اُتر جاؤ۔''

''بڑی بی! پورا کمپارٹمنٹ ریزرو نہیں ہے۔ ہمارے ٹکٹ بھی اسی کمپارٹمنٹ کے ہیں۔ آپ لوگ دیکھئے۔'' میں نے ٹکٹ لڑکیوں کی طرف بڑھا دیئے۔

''رشیدہ بوا! بیٹھ جاؤ۔ ممکن ہے، پورا کمپارٹمنٹ نہ مل سکا ہو۔ بیٹھا رہنے دو انہیں۔ کیا حرج ہے؟'' اس بار حسین لڑکی نے کہا۔

''اے یہ موا سردار علی بھی سٹھیا گیا ہے۔ بھلا لڑکیوں کو اکیلے غیر مردوں کے ساتھ سفر کراؤں گی؟ ہائے......مجھے تو یہ سفر حرام ہو جائے گا۔'' بڑی بی ہار ماننے والے انداز میں بولیں اور پھر واپس لوٹ کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھیں۔

''ٹھیک ہے بڑھیا! تجھے تو ایسا درست کروں گا کہ کیا یاد کرے گی۔'' طالوت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ خوب صورت لڑکی اپنے پرس سے ٹکٹ نکال کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے بوڑھی عورت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''خوامخواہ ان بے چاروں سے بدتمیزی کر رہی تھیں تم بوا! سردار علی نے صرف چار ٹکٹ لئے ہیں۔''

''ارے ستیاناس جائے اس سردار علی کا۔ دیکھو میاں سے شکایت کروں گی۔'' بڑی بی نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے گا آپ لوگ، بوا کی بے وقوفی کو۔ دراصل ہم نے پورا کمپارٹمنٹ ریزرو کروانے کے لئے کہا لیکن ملازم کی غلطی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ یا ممکن ہے کمپارٹمنٹ نہ مل سکا ہو۔''

''آپ اس ایٹم بم کو اٹھا کہاں سے لائیں؟'' طالوت نے ناک سکوڑ کر کہا۔

''اے کیا بک رہا ہے لونڈے!...... زبان سنبھال لیجیو۔ اللہ قسم، بڑے بڑوں کے دماغ سیدھے کر دیئے ہیں میں نے۔'' بڑی بی آنکھیں نکال کر بولیں۔

”بوا! خاموش نہیں بیٹھ سکتیں تم؟“ لڑکی سخت لہجے میں بولی۔
”اے تو اسے کچھ نہیں کہوگی بٹیا! مجھے ایٹم بم کہہ رہا ہے۔“ بڑی بی نے احتجاج کیا۔
”شادی ہوگئی ہے ان کی؟“ طالوت نے پھر پوچھا۔ اشارہ بڑی بی کی طرف ہی تھا۔ لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ لیکن بڑی بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
”اے شادی ہو تیرے ہوتے سوتوں کی۔ دیکھ لو بٹیا! منع کرلو ان کو...... میرا نام بھی......“
”اوہو، معاف کیجئے بوا! شاید آپ کے ہاں شادی بیاہ نہیں ہوتے۔“ طالوت بھی اب بڑی بی میں پوری دلچسپی لینے لگا تھا۔ مجھے بھی بڑی بی پر ہنسی آرہی تھی اور لڑکیاں بھی ہنس رہی تھیں۔
”اے میں کہتی ہوں تُو زبان بند کرے گا یا نہیں؟“ بڑی بی غصے سے کھڑی ہوگئیں۔ لیکن اسی وقت ٹرین کو ایک جھٹکا لگا اور بڑی بی لڑکیوں پر گر پڑیں۔ ٹرین چل پڑی تھی۔ لڑکیاں خود پر سے بڑی بی کو دھکیل رہی تھیں۔
”توبہ ہے بوا! تم نے تو میری پنڈلیاں توڑ دیں۔“ خوب صورت لڑکی نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔
”اے ستیاناس جائے ان ریل والوں کا۔ ایسا جھٹکا دے کر چلاتے ہیں۔ اور پھر ان کم بختوں نے اور دماغ خراب کردیا ہے۔“ بڑی بی اُٹھتے ہوئے بولیں اور لڑکیوں نے بازو پکڑ کر انہیں سیٹ پر بٹھا دیا۔
”زور سے تو نہیں لگ گئی بٹیا؟“ بڑی بی خوب صورت لڑکی کی پنڈلیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوئی بولیں اور لڑکی نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ پنڈلیاں سکوڑ لیں۔
”ٹھیک ہوں...... ٹھیک ہوں بوا!“ وہ جلدی سے بولی اور بوا سیٹ کی پشت سے ٹک گئیں۔
خوب صورت لڑکی کی ساتھی لڑکیاں بھی مسکراتی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگیں۔ طالوت اب خاموش ہوگیا تھا۔ میں بھی لڑکیوں کی طرف سے بے توجہ ہوگیا تھا۔ ویسے وہ لڑکی بہت حسین تھی، لیکن اب حسین لڑکیوں سے مجھے زیادہ رغبت نہیں رہ گئی تھی۔ اور خاص طور سے کسی شریف لڑکی سے۔ ظاہر ہے میرے اندر بھی اتنی حمیت باقی تھی کہ شریف اور معصوم لڑکیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ رہی عشق و محبت کی بات، سو وہ بھی بے کار تھی۔ میری زندگی بارود کا ڈھیر تھی، جس وقت کوئی چنگاری آپڑی، راکھ ہو جائے گی۔ پھر ان باتوں کا کیا فائدہ؟ چنانچہ میں نے اس حسین لڑکی کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ طالوت البتہ بہت خوش تھا۔ بڑی بی نے ہم لوگوں سے کافی بدکلامی کی تھی اور طالوت بھی ان سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو طالوت، بڑی بی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ لیکن وہ بھی شاید تفریح کے موڈ میں تھا۔
”عارف!“ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔
”ہوں......؟“ میں چونک پڑا۔
”کیا خیال ہے؟...... میرا مطلب ہے، ان لوگوں کے بارے میں؟“
”میں نہیں سمجھا۔“ میں نے تعجب سے کہا۔
”یار! لڑکی واقعی حسین ہے۔ میں کچھ وقت برباد کرنے کے موڈ میں ہوں۔“ طالوت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
”ضرور کرو۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''زندہ باد!..... میں سمجھا تھا کہ تم مجھے اخلاقیات پر کوئی لیکچر دینا شروع کر دو گے۔ لیکن اس اجازت سے طبیعت خوش ہو گئی۔ لیکن شرط یہ ہے یار! کہ تم بھی ان معاملات میں پوری پوری دلچسپی لو گے۔''

''ہاں، ہاں....... کیوں نہیں۔'' میں نے ذہن پر طاری جمود کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس سوگواری سے کیا فائدہ؟ نہ جانے کیوں میں ابھی تک خود کو حالات میں ضم نہیں کر سکا تھا۔ چور تھا، ڈاکو تھا، مفرور تھا، قاتل تھا۔ لیکن ابھی تک خود کو شریف انسان سمجھنے پر ڈٹا ہوا تھا۔ کیا یہ خود فریبی نہیں تھی؟ اور اس اداکاری سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ دنیا کے ایک بھی انسان کو اپنی نیک طبیعت کا یقین نہیں دل سکتا تھا۔ چنانچہ بلاوجہ زندگی خراب کر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ زندگی میں پوری طرح دلچسپی لی جائے اور اگر حالات ساتھ نہ دے سکیں تو پھر ہنستے ہوئے سینے پر گولی کھالی جائے۔ اس طرح میں نے خود کو تسلی دی اور پھر پوری طرح طالوت کے کارناموں میں دلچسپی لینے لگا۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ فی الحال ہم ان کے ساتھ رہیں گے۔ ویسے اس خبیث بڑھیا کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟ میں اسے سزا دینا چاہتا ہوں۔'' طالوت نے کہا۔

''ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ سوچ لیں گے اس بارے میں بھی۔ ویسے بڑھیا درحقیقت زہر کی پُڑیا ہے۔ خیر.......''

''ہوں۔'' طالوت نے ایک غرّاہٹ سے کہا۔ لڑکیاں آپس میں کچھ گفتگو کر رہی تھیں۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور اب وہ شہر کے نواحی علاقوں سے نکل کر جنگل میں دوڑ رہی تھی۔ خوب صورت لڑکی آرام سے سیٹ پر پشت ٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں لڑکیاں بھی اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک لڑکی نے بڑی بی سے کہا۔

''بوا! تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ بیٹھے بیٹھے تمہاری کمر دُکھ جائے گی۔''

''اے کیسے لیٹ جاؤں بٹیا! اس موئے سردار علی نے تو سفر حرام کر دیا ہے۔ پورا ڈبہ لینا چاہئے تھا۔ ان دونوں کی موجودگی میں مجھے چین کہاں؟'' بڑی بی نے کراہتے ہوئے کہا۔

''بوا! وہ آدم خور تو نہیں ہیں۔ تم بلاوجہ ان بے چاروں کی بے عزتی کئے جا رہی ہو۔'' خوب صورت لڑکی نے کہا۔

''بس بس بٹیا! تم کیا جانوں ان مردوؤں کو۔ بڑے کمبخت ہوئیں ہیں مٹے مارے۔'' بڑی بی نے بیزاری سے کہا۔ آواز اتنی تھی کہ ہم بخوبی سن رہے تھے۔ لڑکیوں نے پھر ہماری طرف دیکھا۔

''بڑی تجربے کار معلوم ہوتی ہیں بڑی بی مردوں کے معاملے میں۔'' طالوت نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ لیکن آواز اتنی اونچی تھی کہ ان لوگوں نے بخوبی سن لیا۔ بڑی بی چونک کر سنبھل گئیں۔ لیکن ہم ان کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

''شوہر جان چھڑا کر بھاگ گیا ہو گا دو ہی دن میں۔'' میں نے کہا۔

''ارے اس صورت حرام سے شادی ہی کس نے کی ہو گی؟'' طالوت نے کہا۔

''نہیں نہیں... جوانی میں تو اچھی خاصی ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ بڑی بی ہمارا ایک ایک لفظ سن رہی تھیں۔ لڑکیوں نے ہنسی روکنے کے لئے منہ بند کر لئے تھے اور بڑی بی کا آتش فشاں اُگلنے ہی والا تھا۔

''ایں....... ہاں.......'' طالوت نے بڑی بی کی طرف دیکھا۔ ''ویسے شکل وصورت تو اب بھی بری

نہیں ہے۔ کیا خیال ہے، اپنے راسم کے لئے رشتے کی بات چیت کرلیں؟"

"اے میں کہتی ہوں میرے منہ مت لگو کمبخت مارو! تمہارا ستیاناس جائے۔ مجھ بڑھیا کا مذاق اُڑاتے ہو بے شرمو!" بڑی بی آگ بگولا ہو کر بولیں اور میں اور طالوت چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"اب کیا ہو گیا محترمہ؟" طالوت نے شرارت سے پوچھا۔

"آنے دو دوسرا اسٹیشن۔ بتاؤں گی تمہیں کیا ہو گیا۔ ارے کیڑے پڑیں سردار علی مردار میں، کہاں پھنسا دیا، کمبخت نے۔"

"انہیں کیا ہو گیا ہے خاتون! کچھ بیمار ہیں؟" طالوت نے براہِ راست لڑکی سے پوچھا اور لڑکی ہنس پڑی۔

"براہِ کرم آپ ہی لوگ صبر کرلیں۔ بوا بہت پرانے خیالات کی ہیں۔ میں ان کی بدتمیزی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

"اے لو۔ بدتمیزی میں نے ہی کی ہے۔ اور تم کیسی پٹر پٹر غیر مردوں سے باتیں کر رہی ہو۔ ارے خاموش رہو۔ میں میاں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟" بڑی بی سخت پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"بوا! خاموش رہو........اب تمہاری زبان سے ایک بھی لفظ نہ نکلے۔" لڑکی نے سخت لہجے میں کہا اور بڑی بی اس کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔ بہر حال اس کے بعد ان کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن ان کی خوفناک آنکھیں۔ وہ ہم دونوں کو اس انداز میں گھور رہی تھیں، جیسے کچا ہی کھا جائیں گی۔

"آپ لوگ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں؟" طالوت نے پوچھا اور بڑی بی، بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔ لڑکیاں کسی قدر سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ پھر خوب صورت لڑکی نے خشک لہجے میں کہا۔

"بوا اب کچھ نہیں بولیں گی۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمارے درمیان اجنبیت برقرار رہنا چاہئے۔ آپ لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" طالوت نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "سب ایک جیسے ہیں۔" پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "بہت بہتر خاتون! اب اس اجنبیت کو آپ ہی ختم کریں گی۔" پھر وہ دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ بڑی بی کے چہرے پر کسی قدر سکون کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ٹرین برق رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔

"عارف!" طالوت نے میری طرف رخ کر کے سرگوشی کی۔

"ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی ترکیب سوچو عارف! میں ان مغرور لڑکیوں کو نیچا دکھانا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے مجھ سے بہتر تم خود سوچ سکتے ہو۔"

"میں......؟" طالوت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ "میں جو کچھ سوچوں گا، اس پر تمہیں اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"شرافت کے دائرے میں رہ کر۔ بہر حال وہ کمزور لڑکیاں ہیں۔" میں نے کہا اور طالوت پُر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کافی وقت خاموشی سے گزر گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے طالوت سو گیا ہے۔ لڑکیاں بھی شاید ماحول کی خاموشی کو محسوس کرنے لگی تھیں۔ دفعتہً بڑی بی اپنی جگہ

سے اٹھیں اور باتھ روم کی طرف جانے لگیں۔ میں نے اچانک طالوت کو سنبھلتے ہوئے دیکھا، اس نے نیم باز آنکھوں سے بڑی بی کو دیکھا، پھر دائیں سمت گردن جھکا کر آہستہ سے بڑبڑایا۔

''راسم.......!''

میں نے اس کے لباس کی سرسراہٹ سنی۔ پھر راسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ''آقا!''

''ذرا دیکھنا۔'' طالوت آہستہ سے بولا۔ اس کے جواب میں کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بڑی بی کی شامت آئی ہے۔ بڑی بی باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ لیکن دوسرے لمحے ان کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ انہوں نے باتھ روم کے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ بری طرح گریں اور لڑکیاں اچھل پڑیں۔

''ارے، ارے، ارے.......'' بڑی بی ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ لڑکیاں جھپٹ کر ان کے قریب پہنچ گئیں۔

''کیا ہوا؟........کیا ہوا بوا!'' وہ انہیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھنے لگیں۔

''ارے بچ گئی.......ارے بال بال بچ گئی۔'' بڑی بی گردن پٹختے ہوئے بولیں۔

''ہوا کیا؟'' خوب صورت لڑکی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''فرش....... ہائے اگر میں اندر قدم رکھ دیتی تو کیا ہوتا؟ وہاں تو فرش ہی نہیں ہے۔ دوڑتی ہوئی زمین نظر آرہی ہے۔''

''باتھ روم میں؟'' لڑکی چونک کر بولی۔

''ہاں.......اگر گر پڑتی تو قیمہ بن جاتا۔'' بڑی بی کے پورے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟.......نصرت! دیکھو تو۔'' خوب صورت لڑکی نے ایک لڑکی سے کہا اور لڑکی نے باتھ روم کے قریب پہنچ کر اس کا دروازہ کھولا، پھر پلٹ کر بولی۔

''بوا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔''

''کیا.......؟'' بڑی بی اُچھل پڑیں۔ انہوں نے خوف زدہ انداز میں باتھ روم کی طرف دیکھا۔ دوسری لڑکی بھی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

''بوا کی آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے۔'' اور بڑی بی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ خوب صورت لڑکی خود بھی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''آپ واقعی پاگل ہو گئی ہیں بوا! خوامخواہ اپنا مذاق بنوا رہی ہیں۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اے میں سچ کہہ رہی ہوں بٹیا!.......اللہ کی پناہ....... یہ میری آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا؟....... ہائے.......'' بڑی بی نے گہری گہری سانسیں لیں۔ ''چکر آ گیا ہو گا....... معاف کرنا بٹیا! تم لوگوں کو تکلیف دی۔''

''نہیں.......آپ خوب تماشا بنالیں ہمیں۔'' لڑکی نے برا سا منہ بنا کر کہا اور بڑی بی باتھ روم میں داخل ہو گئیں۔ لڑکیاں اپنی سیٹوں پر آبیٹھیں۔ دوسری دونوں لڑکیاں برابر ہنسے جا رہی تھیں۔ بڑی بی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ خوب صورت لڑکی برا سا منہ بنائے بیٹھی تھی۔ میں نے طالوت کی طرف

دیکھا، وہ لاپروائی سے پشت گاہ سے گردن ٹکائے بیٹھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ طالوت اتنی ہی بات پر مطمئن نہیں ہو گیا ہوگا۔ اسے لڑکیوں کا یہ اجتناب بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی میری بات کی تصدیق ہو گئی۔ باتھ روم سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اب کیا ہو گیا؟'' لڑکی دانت پیس کر بولی۔

''اے کھولو بٹیا!......دروازہ بند کیوں کر دیا؟......کھولو......جلدی کھولو۔'' باتھ روم سے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔

''دیکھو بھئی رومی! انہوں نے تو آج ناک میں دم کر دیا۔'' خوب صورت لڑکی نے دوسری لڑکی سے کہا اور وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''ایک کا نام رومی، دوسری کا نصرت۔ لیکن خود ان محترمہ کا نام کیا ہے؟'' طالوت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ لیکن میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ میں تو رومی کو باتھ روم کے دروازے پر قوت آزمائی کرتے دیکھ رہا تھا۔

''بوا! دروازہ اندر سے بند ہے؟'' رومی نے کہا۔

''کھلا ہوا ہے بٹیا!......اللہ قسم......تم باہر سے کھولو۔''

''باہر سے بھی کھلا ہوا ہے۔'' رومی نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

''اے میرے مولا! پھر یہ کھل کیوں نہیں رہا ہے؟ ارے میرا دم گھٹ جائے گا......ارے میں مر جاؤں گی۔ کھولو......خدا کے لئے دروازہ کھولو۔'' رومی پھر دروازے کو اندر دھکیلنے لگی۔ لیکن دروازہ کیسے کھلتا۔ میں جانتا تھا، وہ طالوت کی مدد کے بغیر نہیں کھل سکتا۔ دوسری دونوں لڑکیاں بھی اٹھ کر دروازے پر آ گئیں اور سب مشترکہ کوشش کرنے لگیں لیکن دروازے کو کھلنا تھا نہ کھلا۔ بڑی بی اندر سے مسلسل چیخے جا رہی تھیں اور طالوت اطمینان سے آنکھیں بند کئے سیٹ سے ٹکا ہوا تھا۔ اس دوران لڑکیوں نے کئی بار ملتجی انداز سے ہماری طرف بھی دیکھا لیکن ہمارے اُٹھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ پھر نصرت ہماری طرف بڑھی۔

''دیکھئے۔ باتھ وم کا دروازہ نہ جانے کس طرح بند ہو گیا ہے۔ براہِ کرم ہماری مدد کریں۔''

''ہمارے درمیان اجنبیت برقرار رہنی چاہئے محترمہ!'' طالوت نے خشک لہجے میں کہا اور لڑکی بے بسی سے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگی، جنہوں نے اس کا جواب سن لیا تھا۔

''ارے میں مری......ہائے میرا دم چلا۔''

''مر جاؤ۔ ہم کیا کریں؟'' خوب صورت لڑکی جھنجلا کر بولی اور پھر دوسری لڑکی سے کہا۔ ''زنجیر کھینچ دو۔ یہ ٹرین ہے یا بوچڑ خانہ؟''

اور نصرت زنجیر کی طرف بڑھی۔ طالوت نے زنجیر کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ نصرت نے زنجیر کا ہینڈل کھینچا اور ہینڈل اُکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا اور نصرت گرتے گرتے بچی۔

''ارے میں مر گئی لڑکیو!......ارے میں مر گئی۔'' اندر سے بوا کی آواز آئی۔

''ثمینہ باجی!......زنجیر۔'' نصرت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا لیکن کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکیاں بھی زنجیر کا حشر دیکھ چکی تھیں۔

''سیمیں۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔ ''واقعی، بڑا مناسب نام ہے۔''
تینوں لڑکیاں پھر ہماری طرف دیکھنے لگیں۔ مجھے کچھ بے چینی ہو رہی تھی، لیکن جانتا تھا کہ میں بھی ان کے لئے کچھ نہیں کرسکوں گا۔ اور پھر طالوت اس معاملے میں میری مداخلت پسند نہیں کرے گا۔''
اچانک خوب صورت لڑکی پاؤں پٹختی ہوئی ہمارے نزدیک آگئی اور ہمیں گھورنے لگی۔
''سنیئے!'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔
''فرمایئے۔'' طالوت آنکھیں بند کیے ہوئے بولا۔
''کیا ہم مدد کے مستحق نہیں ہیں؟''
''کیا آپ کے رویّے سے ہم ذلیل نہیں ہوگئے ہیں؟'' طالوت نے برجستہ کہا۔
''تو آپ انتقام لے رہے ہیں؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔
''انسانی فطرت ہے۔'' طالوت نے جواب دیا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔ تینوں پھر دروازے پر زور آزمائی کرنے لگیں۔ اب وہ سچ مچ پریشان ہوگئی تھیں۔ بڑی بی کی آواز آنا بھی بند ہو گئی تھی۔
کافی دیر تک وہ سر مارتی رہیں۔ پھر وہی لڑکی طالوت کے سامنے آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
''میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ براہِ کرم ہماری مدد کریں۔'' اس نے آہستہ لہجے میں کہا اور طالوت اچھل کر کھڑا ہوگیا اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔
''ارے تم خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ جاؤ، جلدی سے دروازہ کھولو۔ نہ جانے بے چاری بوا کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جلدی اُٹھو بھئی۔''
پھر ہم دونوں دروازے پر پہنچ گئے۔ طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہم دونوں نے دروازے کو دھکیلا۔ اب نہ کھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ دروازہ کھل گیا۔ بڑی بی باتھ روم کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ لڑکیاں غڑاپ سے اندر گھس گئیں۔
''بے ہوش ہیں۔ ہٹیئے آپ لوگ۔'' طالوت نے کہا اور پھر بڑی بی کو اٹھا کر باہر لے آیا اور انہیں سیٹ پر لٹا دیا۔ لڑکیاں انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ چند منٹ کے بعد بڑی بی ہوش میں آ گئیں لیکن ان کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔
''آج آپ نے جس قدر پریشان کیا ہے بوا!'' سیمیں دانت پیس کر بولی۔ ''آئندہ آپ کو کبھی ساتھ نہیں لاؤں گی۔''
''اے میرے مولا......!'' بڑی بی گہری سانس لے کر بولیں اور پھر ان کی نگاہ ہم دونوں پر پڑی اور ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔
''چلئے، آپ اوپر کی برتھ پر جا کر لیٹ جائیں فوراً۔'' سیمیں نے بڑی بی کے کچھ کہنے سے پہلے کہا اور زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں برتھ پر چڑھا دیا۔
''زندگی اجیرن کر دی۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ دوسری لڑکیاں بھی بیٹھ گئی تھیں۔ طالوت اور میں بھی اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے۔
''نصرت! کافی پلاؤ۔'' سیمیں نے کہا۔ نصرت باسکٹ سے کافی کا بڑا تھرماس نکالنے لگی۔ پھر اس

نے خوب صورت مگ اس میں سے نکالے اور ان میں کافی اُنڈیلنے لگی۔ سیمیں نے ہماری طرف اشارہ کر دیا اور نصرت ایک ٹرے میں کافی کے دو گلاس لے کر ہمارے قریب آ گئی۔ طالوت نے اطمینان سے ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا اور دوسرا خود لے لیا۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ لڑکیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بوا!'' نصرت نے آواز دی۔ ''کافی پئیں گی؟''

''نہیں بٹیا! میری حالت اچھی نہیں ہے۔ مگر تم ان مردوؤں کو منہ مت لگاؤ'' بڑی بی نے کہا۔

''اگر یہ مردوئے نہ ہوتے بوا! تو آپ اسی باتھ روم میں پڑے پڑے مرگئی ہوتیں۔'' سیمیں نے کہا اور بوا خاموش ہو گئیں۔

''آخر انہیں ہم دونوں سے کیا بیر ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''انہیں تمام مردوں سے بیر ہے، صرف آپ سے نہیں۔ بہرحال، آپ انہیں ملازمہ سمجھ کر معاف کر دیں۔ ویسے آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' سیمیں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ سوال آپ پر اُدھار ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''ہم جلال آباد جا رہے ہیں۔''

''اتفاق ہے۔'' طالوت نے کہا۔ ''ہم سفر ہونے کے ساتھ ساتھ، ہم لوگ ایک ہی جگہ جا رہے ہیں۔ ہم بھی جلال آباد اُتریں گے۔''

''کیا آپ وہیں رہتے ہیں؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''اے خاموش نہیں بیٹھے گی لڑکی؟'' اوپر سے بوا چیخیں۔

''نصرت! اگر بوا آئندہ بولیں تو انہیں اٹھا کر دوبارہ باتھ روم میں بند کر دینا۔'' سیمیں دانت پیس کر بولی اور بوا گھبرا کر خاموش ہو گئیں۔

''نہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔ ''ہم وہاں بغرض تفریح جا رہے ہیں۔ کیا آپ کا قیام وہیں ہے؟''

''جی ہاں۔''

''یہ بوا آپ کی کون ہیں؟''

''بس سرپرست ہیں۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ آخری امتحان دے کر واپس جا رہی ہوں۔ یہ میری سہیلیاں ہیں جو مجھے لینے آئی تھیں۔''

''اوہ.......تو کیا بوا آپ کے ساتھ شہر میں رہتی تھیں؟''

''جی ہاں۔''

''زندگی اجیرن کر دی ہوگی آپ کی۔'' طالوت نے کہا اور لڑکی مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ ''آپ نے ہم لوگوں کا نام نہیں پوچھا۔''

''بتا دو.......بتا دو خود۔ نہیں پوچھا تو۔'' بوا نے طنزیہ انداز میں کہا اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''چلیے، بوا کہہ رہی ہیں تو بتا دیجیے۔'' روحی نے کہا۔

''اے مجھے کیا ضرورت پڑی ہے غیر مردوں کا نام پوچھنے کی؟ تمہیں ہی مبارک ہو۔'' بوا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''چلئے، بوانہیں چاہتیں تو جانے دیجئے۔ ویسے خاصی دلچسپ شخصیت ہیں۔ کیا واقعی انہوں نے شادی نہیں کی؟''

''میں کہتی ہوں تُو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے آخر؟'' بوا برتھ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ وہ خونخوار نگاہوں سے طالوت کو گھور رہی تھیں، لیکن طالوت نے بوا کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔

''اگر ان کی شادی نہیں ہوئی، مس سیمیں! تو پھر میں آپ کو کچھ تکلیف دوں گا۔''

''کیسی تکلیف؟'' یاسمین نے بھی اب دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''بس، ان کے سامنے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' طالوت نے گردن جھکاتے ہوئے پوچھا اور لڑکیاں قہقہے لگانے لگیں۔

''مر جاؤ۔ خدا کرے، مر جاؤں دونوں۔ آنکھیں پھوٹیں۔'' بوا جلدی سے برتھ پر لیٹ گئیں۔

''بس، اب بوا کو معاف کر دیجئے۔ بہت زچ ہو گئی ہیں بے چاری۔'' سیمیں نے سفارش کی۔

''ہائے، یہ دل کے معاملے ہیں۔ کیا عرض کروں؟''

''اے، تمہارے دل کو آگ لگے، کیڑے پڑ جائیں کمبخت میں۔'' بوا کلکلائیں۔ لڑکیاں بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ مجھے بھی ہنسی آ رہی تھی۔ طالوت انتہا پسندی کے موڈ میں تھا۔

''آپ لوگ بھی طالب علم ہیں؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''میں تو بس طالب بوا ہوں۔ مگر کیا کروں، اس ظالم کا دل پگھلتا ہی نہیں۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔ اور بوا پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ طالوت کو کچا چبا جائیں۔

''اللہ!........اب تو ہنسا بھی نہیں جاتا۔ بس خدا کے لئے خاموش ہو جایئے۔'' روحی نے کہا۔

''نہیں، نہیں۔ ہنسو۔ خوب ہنسو۔ مر جاؤ ہنستے ہنستے۔'' بوا نے کہا اور برتھ سے نیچے اُتر آئیں۔ ''اب اگر کچھ! لا لڑکے! تو بس جوتیاں مار مار کر تیرا سر گنجا کر دوں گی۔ بول کے دیکھ۔ کیا سمجھ رکھا ہے آخر؟''

''ہے، ہے........لذتِ پاپوشِ جاناں، حلوۂ بادام ہے۔'' طالوت گنگنانے لگا اور بوا سچ مچ جوتی اُتار کر طالوت پر پلٹیں۔

''ارے، ارے........ بوا!'' دونوں لڑکیوں نے بڑی بی کو پکڑ لیا۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ بوا سے جوتی چھین لی گئی اور لڑکیوں نے انہیں زبردستی پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اللہ........اب خاموش ہو جایئے۔'' سیمیں نے کہا۔ وہ بھی بے تحاشہ ہنس رہی تھی اور طالوت شرارت آمیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

✿

جلال آباد کا بارہ گھنٹے کا سفر انتہائی دلچسپ گزرا۔ بوا کئی بار غصے سے دیوانی ہوئیں، پھر تھک ہار کر برتھ پر سو گئیں۔ طالوت بھی بہترین موڈ میں تھا۔ اس نے بوا کو اور کوئی سزا نہیں دی تھی۔ لیکن جب تک وہ سو نہیں گئیں، وقفے وقفے سے وہ اُن کے حُسن کی تعریف کرتا رہا اور بوا چراغ پا ہوتی رہیں۔ اس دوران لڑکیاں بھی کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ کھانا بھی ایک ساتھ کھایا گیا۔ طالوت نے انہیں اپنا نام عادل اور میرا صائم بتایا۔ اس نے مجھے اپنا بھائی بتایا تھا۔

جب جلال آباد قریب آ گیا تو سیمیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ سفر طویل عرصہ تک یاد رہے گا، عادل صاحب! خاص طور سے بوا کو۔ بہرحال، ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔''

''کیا جلال آباد میں آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی، مس سیمیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''میں یہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہوں عادل صاحب! کہ ہمارا خاندان انتہائی قدامت پسند ہے۔ میرے والد اور والدہ بھی اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ والد صاحب اجنبیوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ خاص طور سے کم حیثیت لوگوں سے۔ اس خاندان کی ایک جھلک آپ بوا میں دیکھ چکے ہیں۔ میرے گھر میں آپ کو سب بوا جیسے ملیں گے۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں۔''

''اوہ........ لیکن ہم آپ کے گھر ضرور آئیں گے مس سیمیں! اور کچھ نہیں تو بوا کا رشتہ لے کر ہی۔''

''میرا خیال ہے، بوا اس وقت تک والد صاحب کو آپ کے خلاف کافی بھر چکی ہوں گی۔ میری درخواست ہے کہ جلال آباد میں آپ گمنام ہی رہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ والد صاحب ناراض ہو کر آپ کو تلاش کریں۔''

''ہم ایک بار ضرور آئیں گے، مس سیمیں!'' طالوت نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سیمیں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ''کیا آپ ہمیں جلال آباد میں اپنا پتہ نہیں بتائیں گی؟''

''نواب جلال الدین کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ لیں۔''

''تو........ تو کیا........؟''

''وہاں جلال آباد میں ہماری جاگیر ہے۔'' سیمیں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا اور طالوت گردن کھجانے لگا۔ میں بھی تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹرین جلال آباد کے خوب صورت اسٹیشن پر رک گئی اور باوردی ملازموں کی پوری فوج اس کمپارٹمنٹ کے سامنے آ گئی، جس میں ہم لوگ تھے۔

سیمیں کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ملازم سامان اُتارنے لگے۔ بوا بھی نیچے اُتر گئیں۔ ہم لوگوں کی

طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ طالوت اور میں خاموشی سے یہ ہنگامہ دیکھتے رہے۔ پھر طالوت نے ایک گہری سانس لی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''آؤ......ذرا میں بھی دیکھوں کہ نواب جلال الدین کیا حیثیت رکھتے ہیں۔'' اور میں گھبرائی ہوئی نگاہوں سے طالوت کو دیکھنے لگا۔

طالوت میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کمپارٹمنٹ کے دروازے سے نیچے اُتر گیا۔ لیکن سیمیں کو ریسیو کرنے والے اب بھی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی شان دیکھ کر میں دنگ تھا۔ بڑے کرّ و فر کے لوگ تھے۔ سیمیں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ بہت سے ہار اس کی گردن میں ڈالے گئے تھے۔ نوچھاوریں ہو رہی تھیں۔ اسٹیشن ایک تماشہ بنا ہوا تھا۔ ٹرین میں بیٹھے دوسرے مسافر بھی گردنیں نکال کر دیکھ رہے تھے۔ طالوت میرا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ آیا۔ سیمیں کو بھی کشاں کشاں باہر لایا جا رہا تھا۔

کاروں کا ایک قافلہ تھا۔ ایک قیمتی رولس کھڑی ہوئی تھی، جس کی کھڑکیوں اور بیک ویو پر قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ سیمیں پردہ نشین نہیں تھی۔ بہر حال وہ چاروں رولس میں جا بیٹھیں۔ دوسرے لوگ بھی اپنی کاروں میں بیٹھ گئے اور یہ عظیم الشان قافلہ چل پڑا۔ ہم دونوں کاروں کی لمبی قطار کو آگے بڑھتے دیکھ رہے تھے۔

''ہوں۔'' طالوت کے ہونٹوں سے ایک غرّاہٹ سی نکلی اور میں چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''یہاں بلا وجہ اُتر گئے طالوت!......ہمیں تو آگے چلنا تھا۔''

''یار!......یہ لڑکی واقعی پسند آ گئی ہے۔'' طالوت نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اونہہ......میرا مطلب ہے، وقتی طور پر۔ اور تم بہر حال اس سے عشق کی اجازت دے چکے ہو۔ تھوڑے دن تفریح کریں گے اور اس کے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اور پھر یوں بھی ہمیں کون سا کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے۔ جہاں تفریح کے مواقع ہاتھ آئیں گے، رک جائیں گے۔ اور جہاں سے اُکتا جائیں گے، آگے بڑھ جائیں گے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کیا تم اس سے متاثر نہیں ہوئے؟''

''تم ہو چکے تھے، اس لئے میری گنجائش نہیں تھی۔ ویسے اس قسم کی لڑکیاں دکھ دینے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہیں؟ ہم ان معصوم لڑکیوں سے دھوکا بھی تو نہیں کر سکتے اور نہ ہی انہیں اپنا سکتے ہیں۔''

''یہ تو درست ہے عارف!......سمجھ میں نہیں آتا یار! میرے اپنے علاقے کی لڑکیاں، میری آغوش میں آنے کے لئے بے چین رہتی تھیں۔ لیکن مجھے ان سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ تمہارے یہاں کی لڑکیاں اتنی پُرکشش کیوں ہیں؟''

''اللہ جانے......بہر حال، اب یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے بڑھو۔''

''ہاں، آگے بڑھو......آؤ۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہاں کیا حیثیت اختیار کی جائے۔ یہ تو طے ہے کہ ان نواب جلال الدین سے دو دو ہاتھ ضرور ہوں گے۔ تم نے اس لڑکی کے الفاظ سنے تھے؟''

''کون سے الفاظ؟''

’’کہہ رہی تھی، والد صاحب اجنبیوں سے ملنا پسند نہیں کرتے، خاص طور سے کم حیثیت لوگوں سے........ ہونہہ........ میں دیکھوں گا، نواب صاحب کی کیا حیثیت ہے۔‘‘

’’طے کر چکے ہو کہ یہاں قیام کرو گے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میں اور کیسے بتاؤں؟........ اور یہ جو تم خود پر ہر وقت سوگ طاری کئے رہتے ہو، یہ مجھے پسند نہیں۔ تفریحات کی دنیا میں آؤ۔ زندگی میں پوری پوری دلچسپی لو۔ اب یہ تمہاری دنیا ہے۔ تم یہاں کے اصولوں سے واقف ہو۔ مجھے مشورے دو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن تم ہو کہ بس۔‘‘

’’کیا بتاؤں یار!...... ہر لحہ خود کو سمجھاتا رہتا ہوں۔ زبردستی دل میں اُمنگ پیدا کرتا ہوں، لیکن خون میں وقتی جوش آجاتا ہے اور پھر وہی اُداسی گھیر لیتی ہے۔ بہر حال، پروا مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ جلال آباد کی تفریحات میں حصہ لینے کو تیار ہوں۔‘‘

’’یہ ہوئی نا بات۔‘‘ طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم پیدل ہی چل پڑے۔ ’’ہاں، اب بتاؤ۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟‘‘

’’فی الحال تو کسی جگہ کا بندوبست۔‘‘

’’ہوٹل؟‘‘ طالوت نے سوالیہ انداز میں کہا۔

’’تلاش کرنا پڑے گا۔ میں پہلے کبھی یہاں نہیں آیا۔‘‘ میں نے کہا اور پھر ہم نے ہاتھ کے اشارے سے ایک گزرتے ہوئے تانگے کو روکا اور اس میں بیٹھ گئے۔

’’یہاں کے سب سے عمدہ ہوٹل لے چلو۔‘‘ میں نے کہا اور تانگے والے نے گردن ہلا دی۔ جلال آباد کوئی پسماندہ شہر نہیں ثابت ہوا۔ خوب صورت عمارتیں، بازار۔ کئی ہوٹلوں کی عمارتیں بھی نظر آئیں۔ لیکن تانگے والا ہمیں سب سے عمدہ ہوٹل لے جا رہا تھا۔ اور جس ہوٹل کے سامنے اس نے ہمیں اتارا، اس کا نام ’’ارم‘‘ تھا۔ درحقیقت اپنے وقوع کے لحاظ سے ارم ہی تھا۔ سرسبز علاقے میں چاروں طرف میدان پھیلے ہوئے تھے۔ بہت دُور سے ایک پہاڑی جھرنا نظر آتا تھا، ایک سمت ریس کورس کا طویل میدان تھا۔ مجھے اور طالوت کو یہ جگہ پسند آئی ہم نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور پھر اندر داخل ہو گئے۔ ایک ڈبل روم تیسری منزل پر حاصل کیا۔ انتہائی کشادہ اور اعلیٰ درجے کا کمرہ تھا۔

ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے کافی طلب کی اور آبشار کی سمت کی کھڑکیوں کو کھول کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

’’بلاشبہ خوب صورت جگہ ہے۔ لیکن سیمیں اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔‘‘

’’سیمیں........ ہاں........ کافی خوب صورت لڑکی تھی۔ بہر حال اس تک پہنچنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے نواب جلال الدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوگی۔‘‘

’’کس قسم کی معلومات؟‘‘ طالوت نے پوچھا۔

’’دیکھو طالوت! تمہیں سیمیں تک پہنچنا ہے۔ نواب جلال الدین سے دشمنی کا انداز مناسب نہ ہوگا۔ اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں، کس ٹائپ کا آدمی ہے۔ کیا مشاغل رکھتا ہے۔ کس قسم کے لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہے۔ اس کے بعد اس سے ملا جائے۔‘‘

’’خوب........ مناسب خیال ہے۔ میں تم سے متفق ہوں۔ لیکن اس کے لئے ہمیں کوشش کرنے کی

کیا ضرورت ہے؟ راسم کس کام آئے گا؟“

”اوہ......کیا وہ یہ کام بھی کر سکتا ہے؟“

”ارے وہ کیا کام نہیں کر سکتا؟......راسم!“ طالوت نے آواز دی اور راسم سامنے آگیا۔

”آقا......!“

”دیکھو، نواب جلال الدین کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہیں۔ کیسا آدمی ہے، کون کون سی چیزوں سے شوق رکھتا ہے۔ اور اس سے ملاقات کا بہترین ذریعہ کیا ہے۔“

”جو حکم آقا!“

”بس جاؤ، ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“ طالوت نے کہا۔ راسم نے گردن جھکائی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارے والدین کو تمہاری بھنک کہاں سے ملی؟“

”میری تلاش مستقلاً جاری ہے۔ ابا حضور ظاہر ہے، اس طرح نہ چھوڑ دیں گے۔ ان کے ہرکارے قریہ قریہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ بہر حال، میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں کو بھٹکانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب کوئی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”انہیں یقین ہو گیا ہے کہ میں یہاں نہیں ہوں۔ اس کے لئے میں نے ایک خاص تکنیک استعمال کی تھی۔“

”وہ کیا؟“

”بتا تو چکا ہوں یار!......ایک رات ایک گدھی کے ساتھ کھونٹے سے بندھا رہا ہوں۔ کئی راتیں درختوں پر بندروں کی شکل میں گزاری ہیں۔ دراصل میں نے انسانوں کا روپ ہی نہیں دھارا۔ ورنہ وہ لوگ مجھے ضرور تلاش کر لیتے۔ جانوروں کی طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں دی اور وہ بھی ایسے جانور جن سے مجھے نفرت ہے۔“

”اوہ......تو تم یہ قوت بھی رکھتے ہو؟“

”فضول باتیں مت کرو۔ کیا خیال ہے، ہوٹل کی سیر کریں؟“ طالوت نے پوچھا۔

”جیسی مرضی۔ ویسے ابھی رونق کا وقت نہیں ہوا ہے۔ تاہم آؤ، چلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ طالوت بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ہمارے جسموں پر قیمتی سوٹ تھے۔ حلیے بھی باحیثیت لوگوں کے تھے۔ بہر حال، ہم نیچے ڈائننگ ہال میں آگئے۔ لیکن ڈائننگ ہال آباد نہیں تھا۔ طالوت نے اس کی ویرانی دیکھ کر ہونٹ سکوڑے اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں چلے گا......آؤ۔“ اور ہم ڈائننگ ہال سے بھی نکل آئے۔ ہوٹل سے زیادہ سڑکیں بارونق تھیں۔ ہم ٹہلنے کے سے انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ طالوت چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم نے جن علاقوں کا ذکر کیا تھا، وہ کون سے تھے؟“

”یہی راستہ جاتا ہے۔ پہاڑوں کے اس طرف۔ شاید آزاد علاقہ کہلاتا ہے۔ میں نے صرف ایک ریاست دیکھی۔ زنگانہ نام تھا۔“

''اوہ......تو تم زنگانہ جانکلے تھے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔
''ہاں......کیوں؟ تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟''
''زنگانہ ایک پُراسرار ریاست ہے۔ انتہائی طاقتور۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ لوگ بیرونی دنیا کے کسی انسان کو اندر نہیں داخل ہونے دیتے، سخت نفرت کرتے ہیں باہر کے لوگوں سے۔ بیرونی دنیا کے لوگوں سے ان کا رابطہ ضرور رہتا ہے لیکن اس کے لئے انہوں نے ایک علیحدہ جگہ بنائی ہے، جو اُن کی ریاست سے دُور ہے۔ بس وہ حد ہے۔ اس سے آگے شاید کبھی کوئی بیرونی انسان نہیں گیا۔''
''میں گیا ہوں۔ لیکن درختوں کے ذریعے......بندر کی شکل میں۔''
''کیا ماحول ہے وہاں کا؟ کیسی ہے وہ پُراسرار بستی؟''
''بس، عام انسانوں جیسی......میں بتا چکا ہوں کہ میں اپنی اُلجھن میں گرفتار تھا۔ کسی چیز کے تجزیے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہاں، وہ علاقے مجھے دلکش معلوم ہوئے تھے، اس لئے میں نے تم سے ان کا تذکرہ کیا تھا۔
''بہرحال، وہاں تمہارا داخلہ مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن میں......؟''
''ارے، طالوت اور تم الگ الگ تو نہیں ہو۔ جس طرح طالوت وہاں داخل ہوگا، اسی طرح تم۔'' طالوت نے کہا اور پھر بائیں سمت دیکھنے لگا، جہاں راسم کھڑا تھا۔
''کام ہوگیا راسم؟''
''آقا!'' راسم نے جواب دیا۔
''خوب۔ کیا پوزیشن ہے؟''
''وہ ایک مغرور اور خودسر انسان ہے۔ کم حیثیت لوگوں کے سائے سے بھی بچتا ہے۔ اپنے برابر کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس کی کوٹھی بے حد شاندار ہے۔ آپ کے لئے کام کی جو بات ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ریس کا جنونی ہے۔ دیوانگی کی حد تک ریس کا شوقین ہے۔ اس کا اپنا اصطبل ہے، جہاں ریس میں دوڑنے والے بیس گھوڑے پلتے ہیں۔ ہفتے میں دو بار یہاں ریس ہوتی ہے، جس میں ملک کے بڑے بڑے لوگ شرکت کرتے ہیں، لاکھوں روپے کا جوا ہوتا ہے۔ لیکن ریکارڈ ہے کہ کسی ریس میں جلال الدین کے گھوڑے نہیں ہارے۔ وہ جہاں بھی گئے ہیں، جیت کر آئے ہیں اور جلال الدین ان پر فخر کرتا ہے۔ بیس گھوڑوں پر ساٹھ ملازم ہیں۔ باداموں کی بوریوں سے اسٹور بھرے پڑے ہیں۔ گھوڑے بادام کھاتے ہیں وغیرہ۔''
''یقیناً کام کی بات ہے راسم!'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ ریس کب ہے؟''
''پرسوں۔ آپ جلال الدین کی کوٹھی کے عقب میں دیکھیں، خیموں کا شہر آباد ہے۔ ریس کے کھلاڑی اور وہ، جن کے گھوڑے ہیں، یہاں مستقل آباد رہتے ہیں اور ان کے گھوڑے ریس میں دوڑتے ہیں۔''
''عارف! کام بن گیا'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں......میں بھی سمجھ رہا ہوں......کام بن گیا'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ میں جانتا تھا کہ کام کس طرح بن گیا۔

"راسم! ہمیں تین گھوڑوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اسی میدان میں ہمارا خیمہ بھی ہوگا۔ کیا سمجھے؟"

"جو حکم آقا!" راسم نے کہا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ طالوت بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔
"اب تم تماشہ دیکھو۔ ہم سے زیادہ نواب جلال الدین کا دوست اور کون ہو سکتا ہے؟ ہمارے تمام گھوڑے ریس میں اوّل آئیں گے۔ آؤ، ہوٹل واپس چلیں۔ راسم انتظام کرے تو ہم خیموں میں منتقل ہو جائیں گے۔"

یہ دن ہم دونوں نے ہوٹل میں گزارا۔ راسم نے دوسرے دن صبح خیمے نصب ہونے کی اطلاع دی تھی۔

"نواب عادل، نواب صائم آف ریاست شادیا، جو آزاد علاقے میں کوہِ عبورا کے دامن میں آباد ہے۔" راسم نے بتایا۔
"خوب....... بہت خوب۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھ کر آنکھ دبا دی۔
"لیکن ہمارے یہاں سے جانے کے کیا انتظامات ہوئے ہیں راسم؟"
"نیچے ریاست کی گاڑی موجود ہے۔ جس پر ریاست کا نشان ہے۔"
"گھوڑے؟"
"پہنچ چکے ہیں۔ دو سیاہ، ایک سفید۔"
"انتہائی مناسب۔ ملازم وغیرہ؟"
"آقا کی شان کے مطابق۔"
"ارے تو پھر چلتے کیوں نہیں؟" طالوت نے میرا بازو پکڑ کر کہا اور ہم دونوں راسم کے ساتھ باہر نکل آئے۔ ہوٹل کا بل ادا کیا گیا۔ لیکن ہوٹل والوں کو ابھی ہماری حیثیت معلوم نہیں تھی۔ البتہ باہر بہت سے لوگوں کی نگاہیں سیاہ رنگ کی اس ایئر کنڈیشنڈ کار پر پڑ رہی تھیں، جو تقریباً پندرہ فٹ لمبی تھی۔ اس کے عقب میں دو موٹر سائیکل سوار تیار کھڑے تھے۔ ان کا رنگ براؤن تھا۔ افریقہ کے کسی حصے سے تعلق رکھتے تھے۔ انتہائی جسیم اور طاقتور تھے۔
طالوت نے سنجیدگی سے گردن ہلائی اور راسم سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جا سکتے ہو۔"
راسم نے گردن جھکائی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

باوردی ڈرائیور نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا اور ہم اندر بیٹھ گئے۔ ہمارا سامان ڈگی میں رکھ دیا گیا تھا اور پھر طالوت کے اشارے پر کار آگے بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے موٹر سائیکلیں بھی اسٹارٹ ہو گئی تھیں اور ہم بڑی شان سے گزرنے لگے۔ سڑکوں پر لوگ رُک رُک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔
اسٹیشن پر کیمپ کا جو استقبال ہوا تھا، اسے دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ میں نواب جلال الدین کے نام سے ہی مرعوب ہو گیا تھا۔ حالانکہ میرے علم میں تھا کہ طالوت نے لاکھوں روپے اجنبی لوگوں کو بخش کر ان کی قسمت بنا دی ہے۔ لیکن یہ شان....... میرا خیال تھا، یہ شان الگ ہی ہے۔ لیکن اب ہم جس انداز میں سفر کر رہے تھے، اسے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔
"جلال الدین کی ایسی کی تیسی۔ طالوت زندہ باد۔" لیکن کیسی حیرت انگیز بات تھی۔ ابھی کسی کو معلوم ہو

جائے کہ موٹر سائیکل پر سوار افراد، کار ڈرائیونگ کرنے والا اور میرے نزدیک قیمتی سوٹ میں ملبوس شخص انسان نہیں ہے تو یہ بازار ویران ہو جائیں۔ ان لوگوں کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کون لوگ تھے۔ وردی خوب صورت تھی اور کسی ماہر درزی کے ہاتھوں کی سلی ہوئی تھی۔ کار کا میکر اجنبی تھا لیکن بہر حال وطالوت کی دنیا میں نہیں بنی ہوگی۔ خدا جانے کیا چکر ہے۔ کہاں سے یہ سب کچھ فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ چکر تو پہلے بھی تھا۔ یعنی وہ کرنسی جو میرے ملک کی تھی، وہ کرنسی راسم نے تیار تو نہ کی ہوگی۔ اگر وہ جعلی ہوتی تو اب تک کسی نہ کسی کا کباڑا ہو گیا ہوتا۔

لیکن میرے لئے یہی کافی تھا کہ طالوت انسان نہیں ہے۔ وہ جس قدر حیرت انگیز اور پُر اسرار ہے، اگر اس کے بارے میں غور کیا جائے تو انسان با آسانی پاگل ہو سکتا ہے۔"

طالوت نے بھی راستے میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کی۔ یہاں تک کہ ہم اس میدان میں پہنچ گئے، جہاں میلہ سا لگا ہوا تھا۔ متعدد اشیاء فروخت کرنے والے ٹھیلے لگائے کھڑے تھے۔ خیمے قطار سے لگے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے کے حصے میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے کھانے کا سامان بھی وہیں فروخت ہو رہا تھا۔ بہر حال، ماحول اچھا نہ تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بڑے گھٹیا ٹیسٹ کے لوگ ہیں۔" طالوت نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ کار ست روی سے آگے بڑھ رہی تھی اور لوگ چونک کر ادھر دیکھ رہے تھے۔ پھر دور ایک بلند ٹیلے پر ایک خیمہ نظر آیا۔ خیمہ کیا، پوری عمارت تھی۔ انتہائی خوب صورت، کئی حصوں میں بنا ہوا۔ اور طالوت اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"یہ راسم واقعی ذہین ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ٹیلے کے چاروں طرف لوگ جمع تھے، جو اس خیمے کو دیکھ رہے تھے۔ خیمے کے چاروں طرف وردی پوش ایستادہ تھے۔ اور پھر اس عالیشان کار کو دیکھ کر لوگ اور مرعوب ہو گئے۔ جبکہ موٹر سائیکل سوار گارڈ تھے۔

کار ٹیلے پر پہنچ گئی اور خیمے کے سامنے رک گئی۔ وردی پوش محافظوں نے ایڑیاں بجا کر سلامی دی تھی۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ طالوت کار سے اترا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

"بڑا زبردست انتظام ہوا ہے طالوت!" میں نے اندر داخل ہو کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! اس نواب کے بچے کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔"

"لیکن راسم یہ سب کیسے سمجھ گیا؟"

"راسم ہر بات سمجھتا ہے۔ وہ صرف الفاظ سے بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس قسم کے انتظامات اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر تم اس سے کہتے تو راتوں رات یہاں ایک عالیشان محل تعمیر ہو جاتا۔ لیکن ایسے محل کو دیکھ کر لوگ بدحواس ہو جاتے۔ اس لئے اس نے احتیاط کی۔ خیمے کی بات اور ہے۔"

"ہوں......!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ طالوت ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پھر طالوت نے میرے ساتھ چل کر گھوڑے دیکھے۔ گھوڑے تھے؟ دیکھ کر روح خوش ہو جاتی تھی۔ بلند و بالا قد، چیتوں کی سی کمر، صاف شفاف! مگر اس میں حیرت کی کیا بات تھی۔

حیرت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی، جب نواب جلال الدین کے ایک ملازم نے آ کر جلال الدین کا

پیغام دیا۔ پیغام کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا طالوت تک پہنچا تھا۔ طالوت خیمے کے اندرونی حصے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سفید رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں آیا اور وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

''محترم! آپ سے تعارف کا متمنی ہوں۔ کیا آپ رات کا کھانا نواب جلال الدین کے ساتھ کھانا پسند کریں گے؟ براہِ کرم ملازم کو جواب دے دیں۔''

طالوت نے پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے پڑھ کر ایک گہری سانس لی۔

''کیا خیال ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم کہو کہ تم نہ آسکو گے۔ سفر کی تھکان ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ ارے وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ پوری جاگیر کھڑے کھڑے خرید لوں گا۔'' طالوت نے کہا اور پھر اپنے آدمی سے یہی کہہ دیا کہ نواب صاحب سے معذرت کر لی جائے۔ آج ملاقات نہیں ہوسکتی۔

''اور سنو!'' طالوت نے اپنے آدمی سے کہا۔ ''اگر نواب بذاتِ خود بھی آئے تو اسے واپس کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ پرنس آج صرف آرام کریں گے۔''

''جو حکم آقا!'' ملازم نے جواب دیا اور طالوت ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر مسکرانے لگا۔

''چڑ نہ جائے۔'' میں نے کہا۔

''جھکنا پڑے گا۔ میں کل ریس کے میدان میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔'' طالوت نے جواب دیا۔

رات ہو گئی۔ لیکن نواب جلال الدین نہیں آیا۔ وہ بھی سچ مچ کا نواب تھا۔ نہ جانے طالوت کے انکار سے اس کی کیا کیفیت ہوئی ہو۔ بہر حال، طالوت نے جو چکر چلایا تھا، وہ اتنا ہی زوردار تھا کہ نواب جلال الدین کوشش کے باوجود اس سے اجتناب نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال دوسرے روز ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ریس کورس جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کُل دس ریسیں تھیں۔ ریس کورس سے ملحق پہاڑی پر نواب صاحب کا خیمہ تھا۔ طالوت کو کسی پہاڑی پر تو جگہ نہیں ملی تھی، لیکن نیچے اس کا خیمہ بھی بہت شاندار تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی خیمے لگائے ہوئے تھے لیکن وہ معمولی قسم کے تھے۔ پہاڑی پر نواب جلال الدین کے گھوڑے نظر آ رہے تھے، جنہیں سبز لباس والے ملازم ٹہلا رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اور طالوت بھی اپنے خیمے میں پہنچ گئے۔ ہماری کار خیمے کے سامنے رک گئی اور پھر تین جاکی ہمارے تینوں گھوڑے لے کر آ گئے۔ ہلکے پھلکے جاکی بھی طالوت کے آدمی تھے۔ میں ان لوگوں کی قسمت کے بارے میں سوچنے لگا، جو آج کی ریس میں شریک تھے۔ بھلا ان جناتی گھوڑوں سے کون جیت سکتا تھا۔ اگر جاکی خود ٹریک پر دوڑنا شروع کریں تو شاید ریس میں موجود کوئی گھوڑا انہیں نہ پکڑ سکے۔

ویسے وہاں تھے بڑے شاندار گھوڑے۔ نواب جلال الدین کے گھوڑے بھی شان میں بے مثال تھے۔ تندرست، توانا اور خوب صورت۔ ایک آدمی ضروری کارروائی کرنے چلا گیا، جو ریس کے قانون کے مطابق تھی۔ عجیب گہما گہمی تھی۔ اور یہ سب اس شخص کی وجہ سے تھا، جس کا نام طالوت تھا۔ کتنے

اختیارات کا مالک ہے یہ۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور پھر ذہن جھٹک دیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آئے تھے۔ شائقین گھوڑوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کرنسیوں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ نہ جانے یہاں ریس کھیلنے کا طریقہ کیا تھا۔ نہ یہ ریس ایسی تھی جو شہروں میں ہوتی ہے۔ نہ جوا کھیلنے کا انداز وہ تھا۔ بس انوکھا سا طریقہ تھا، جو میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ طالوت کے آدمی نے بقیہ انتظام کرلیا۔ اس کے گھوڑوں کے نام بھی ریس میں درج ہو گئے تھے اور اب ہمارے جاکی گھوڑوں کو خیمے سے نکال کر ٹریک پر لے جا رہے تھے۔ تینوں گھوڑوں کو تین الگ ریسوں میں رکھا گیا تھا۔ پہلا گھوڑا پہلی ریس میں شامل تھا۔ اس ریس میں کل پندرہ گھوڑوں کو دوڑنا تھا۔ اور ان پندرہ گھوڑوں میں تین شاندار گھوڑے نواب جلال الدین کے تھے۔ طالوت کا سفید گھوڑا اس ریس میں حصہ لے رہا تھا۔ اس کا جاکی، گھوڑے کو ٹریک پر گشت کرا رہا تھا اور لوگ اس گھوڑے پر بھی رقمیں لگا رہے تھے۔

میں نے نواب جلال الدین کو دیکھا، جو اپنے خیمے سے چل کر ریس کے میدان کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دس بارہ آدمی تھے۔ لوگ کائی کی طرح پھٹ کر نواب جلال الدین کو راستہ دے رہے تھے۔ دراز قد ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چہرے سے واقعی جلال ٹپکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ریس کے میدان میں اپنے لئے مخصوص جگہ پر پہنچ گیا اور گھوڑوں کا گشت دیکھنے لگا۔

پہلی ریس کا وقت ہو گیا۔ گھوڑے اسٹارٹ پوائنٹ پر جانے لگے۔ اور درحقیقت طالوت کے سفید گھوڑے کے سامنے دوسرے گھوڑے ٹٹو معلوم ہو رہے تھے۔ خود نواب جلال الدین کے گھوڑے دب گئے تھے جس کا احساس نواب جلال الدین کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ بہرصورت، گھوڑے اسٹارٹ پوائنٹ پر پہنچ گئے۔ ضروری امور طے ہو گئے تھے۔ نواب صاحب نے دوربین آنکھوں سے لگا لی تھی اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو دوربین کا مرکز سفید گھوڑا ہی تھا۔

ریس شروع ہوئی اور گھوڑوں کے درمیان سے سفید گھوڑا تیر کی طرح نکلا۔ اس کے بال کھڑے ہوئے تھے، دُم اُٹھی ہوئی تھی۔ ابتدا میں ہی وہ دوسرے گھوڑوں سے تقریباً پندرہ گز آگے نکل آیا۔ اور پھر یہ فاصلہ بڑھتا گیا۔ پہلا موڑ گھومتے وقت اس کا فاصلہ دوسرے گھوڑوں سے تقریباً پچاس گز تھا۔ پھر جب اس نے دوسرا موڑ گھوما تو دوسرے گھوڑے اس سے آدھے فرلانگ پیچھے تھے۔ اور پھر جب سفید گھوڑا رننگ پوائنٹ سے آگے نکل گیا تو بعض گھوڑے دوسرے موڑ سے ہی مڑ رہے تھے۔ چیخنے والوں کے گلے خشک ہو گئے تھے۔ خود نواب صاحب بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ویسے یہ بھی حقیقت تھی کہ نواب صاحب کے تینوں گھوڑے سیکنڈ، تھرڈ اور فورتھ تھے اور انہوں نے دوسرے گھوڑوں کو کافی فاصلے سے چھوڑا تھا۔ جن لوگوں نے سفید گھوڑے پر رقم لگائی تھی، وہ خوشی سے ناچ رہے تھے اور جنہوں نے دوسرے گھوڑے کھیلے تھے، وہ منہ لٹکائے گھوم رہے تھے۔ طالوت البتہ صرف نواب صاحب کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے چہرے سے کوئی تاثر نہیں ٹپک رہا تھا۔

دوسری تین ریسیں ہوئیں۔ پانچویں ریس بڑی تھی۔ اس میں سترہ گھوڑے دوڑے۔ جن میں چار نواب صاحب کے گھوڑے تھے۔ درمیانی ریسوں میں بھی نواب صاحب کے گھوڑے دوڑے تھے اور انہوں نے ریس جیتی تھی، لیکن اس ریس میں نواب صاحب نے اپنے سب سے شاندار گھوڑے بھیجے تھے۔

یہ چاروں گھوڑے بے حد شاندار تھے لیکن اس وقت تک جب تک طالوت کا سیاہ گھوڑا میدان میں نہیں پہنچا۔ اس گھوڑے کی شان ہی نرالی تھی۔ اور اس بار لوگوں نے سوچنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی، بے دھڑک اس گھوڑے پر دولت لگائی۔ اور سیاہ گھوڑے نے بھی مایوس نہیں کیا۔ اس نے سفید گھوڑے ہی کی شان سے ریس جیتی تھی۔ اور اس دوسری ریس کے بعد ہی نواب صاحب واپس چل پڑے۔ شاید وہ بد دل ہو گئے تھے۔ جو گھوڑے اس بار ریس میں دوڑے تھے، وہ نواب صاحب کا وقار تھے۔ ان کے ہار جانے کے بعد کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، اس لئے نواب صاحب واپس چل پڑے۔

''چلو یار! اب کیا رکھا ہے؟ ہم بھی چلیں۔'' طالوت نے کہا۔

''اور وہ تیسرا گھوڑا؟'' میں نے پوچھا۔

''دوڑے گا اور جیت جائے گا۔ لیکن اب اس ہنگامے میں رہنے سے کیا فائدہ؟ چل کر اس نواب کے بچے سے مل بیٹھنے کی سوچیں گے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ہم لوگ بھی اپنے خیمے میں واپس آ گئے اور اس کے بعد نواب صاحب سے ملنے کے بارے میں مشورے کرنے لگے۔ فیصلہ کیا گیا کہ آج کا دن نکال لیا جائے۔ اگر نواب صاحب سے کوئی تحریک ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ کل خود اس سے ملنے کی کوشش کی جائے گی۔ ویسے آج ملازموں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر نواب کا ملازم آئے تو اسے احترام سے ریسیو کیا جائے۔

شام کے پانچ بجے تھے جب طالوت کے دو ملازم دوڑے آئے اور انہوں نے اطلاع دی۔

''نواب جلال الدین آئے ہیں۔''

''اوہ......'' طالوت جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''اب......اب کیا کریں؟''

''بلاؤ......خیمے کے باہر ہم ان کا استقبال کریں گے۔'' میں نے کہا اور طالوت نے ملازم سے کہا کہ وہ نواب صاحب کو ادھر ہی لے آئے۔

ملازم باہر چلا گیا۔ میں اور طالوت تیار ہو گئے۔ اور پھر ہم نے دوسرے ملازموں کو چائے کے لئے ہدایت دی اور پھر خیمے سے باہر نکل آئے۔ نواب جلال الدین ایک اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس، پُروقار انداز میں چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے تین آدمی تھے، جو ان سے ایک قدم پیچھے چل رہے تھے۔

طالوت اور میں کئی قدم آگے بڑھے اور پھر میں نے آگے بڑھ کر نواب صاحب کا خیر مقدم کیا۔

''عزت مآب نواب جلال الدین کو شہزادہ صائم اور شہزادہ عادل خوش آمدید کہتے ہیں۔'' میں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''ہم نے سوچا کہ ہم خود دونوں شہزادوں کی قدم بوسی کریں۔ شاید شہزادگان نے ملازموں کے ہاتھوں ہماری دعوت کو پسند نہ کیا ہو۔'' نواب جلال الدین نے پُر رعب آواز میں کہا۔

''آپ کی بزرگی ہمیں شرمندہ کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ سفر کی تھکان تھی، ورنہ ضرور حاضر ہوتے۔'' طالوت آگے بڑھ کر بولا۔

''یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ میں صائم کون ہے اور عادل کون ہے۔''

''خادم عادل ہے۔ صائم سے آپ پہلے ہم کلام ہو چکے ہیں۔ تشریف لائیے۔ آپ کی آمد نے

ہماری عزت افزائی کی ہے۔" طالوت نے گردن خم کرتے ہوئے کہا اور نواب جلال الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر آ گئے۔ اور اندر داخل ہو کر میں حیران رہ گیا۔ ملازموں نے خیمے میں عجیب تبدیلی کر دی تھی، جو کسی طرح ممکن نہیں تھی۔ خیمہ حیرت انگیز طور پر کشادہ ہو گیا تھا۔ نفیس ترین فرنیچر کمرے میں آ گیا تھا۔ خوبصورت زرنگار مجسّمے جگہ جگہ ایستادہ تھے۔ ایک عجیب پُراسرار ماحول تھا، جس کی طرز یقیناً اس دنیا کی نہ تھی۔ ہاں اس وقت میں نے اس انداز کی سجاوٹ دیکھی تھی، جب مجھے طالوت کے دھوکے میں ایک پُراسرار دنیا میں لے جایا گیا تھا۔

میں نے نواب جلال الدین کے چہرے میں نمایاں تغیر دیکھا۔ طالوت البتہ اسی طرح پُرسکون تھا۔ اس نے نواب صاحب کو بیٹھنے کی پیشکش کی اور نواب صاحب اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھ گئے۔

"آپ جیسے صاحبِ وقار شہزادوں سے مل کر بے پناہ مسرت ہوئی۔" نواب صاحب نے کہا۔

"ہم بھی جلال الدین اور جلال آباد سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔" طالوت نے کہا۔

"یقیناً جلال آباد کی شان ریاست شادیا جیسی نہ ہوگی لیکن عبورا کے دامن کی یہ ریاست عام فہم نہیں ہے۔"

"ریاست اپنی چھوٹی سی آبادی کی خودکفیل ہے۔ ہمیں بیرونی دنیا سے کچھ منگوانے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ صرف چند یورپی ممالک سے ہمارا رابطہ ہے، جہاں ہم ریاست کی زمینوں سے برآمد ہونے والے ہیرے بھیجتے ہیں اور ضروریات کی کچھ چیزیں منگواتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے ہیرے پوری دنیا میں نایاب ہوتے ہیں۔" طالوت نے جواب دیا۔

"اوہ......." نواب صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور طالوت نے تالی بجائی۔ فوراً ایک ملازم آ کر ادب سے جھک گیا۔

"ریاست کے ہیروں کے چند نمونے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔" اور ملازم گردن جھکا کر چلا گیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بلاشبہ طالوت کے لئے ایسے ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ چند لمحات کے بعد ملازم ایک سونے کی پلیٹ میں جگمگاتے بیش قیمت ہیروں کے تقریباً پندرہ دانے لے آیا اور اس نے وہ دانے نواب صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ نواب صاحب کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے بدحواسی نظر آئی۔ بیش قیمت ہیرے لاکھوں روپے کی مالیت کے تھے۔ ان کی چمک سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ نواب صاحب ایک ایک دانے کو اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بے شک، یہ بے مثال ہیں۔ ایسے نادر ہیرے شاذ ہی نظر آتے ہیں۔"

"بندہ پروری۔" طالوت نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو جلال آباد کے بارے میں کیسے معلوم ہوا شہزادہ صاحب؟"

"بس، گھوڑے کی دوڑ سے ہمیں بھی بے حد دلچسپی ہے۔ ہمارے اصطبل میں ایک ہزار نایاب گھوڑے ہیں۔ گھوڑوں کی دوڑ ہمارے قومی کھیل میں شامل ہے۔ چنانچہ ہمیں کچھ لوگوں سے معلوم ہوا کہ جلال آباد میں اس کھیل سے شوق رکھا جاتا ہے۔ ہم یہاں آ گئے۔ یہاں کے بارے میں ہم نے معلومات کیں اور پھر اپنی ریاست سے تین گھوڑے منگوا لئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ ہمارے ہاں کے

تیسری کلاس کے گھوڑے تھے۔ پہلی اور دوسری کلاس کے گھوڑے ریاست سے باہر نہیں جاتے۔"

"وہ تیسری کلاس کے گھوڑے تھے؟" نواب صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جی........!"

"لیکن بے حد شاندار۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ واپسی میں، میں انہیں قریب سے دیکھوں گا۔ آپ سے ملاقات کر کے دلی مسرت ہوئی ہے مسٹر صائم اور مسٹر عادل!"

"ہم بھی مسرور ہیں۔" طالوت نے کہا اور اسی وقت ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

"چائے تیار ہے۔"

"آیئے نواب صاحب! چائے تیار ہے۔"

"جلال آباد میں آپ مہمان ہیں۔ یہ فرض میرا ہے، لیکن بدقسمتی کہ میری دعوت قبولیت نہ حاصل کر سکی۔ تاہم میں اس دعوت کو ٹھکرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" نواب صاحب نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف کل کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ جب بھی حکم فرمائیں، ہم لوگ حاضر ہو جائیں گے۔" طالوت نے کہا اور پھر نواب صاحب کو لے کر ہم دنوں خیمے کے دوسرے حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک خوب صورت لمبی میز لگی ہوئی تھی۔ اس میز کی تفصیل الفاظ میں کیا بیان ہوتی۔ سونے چاندی کے برتن تھے، جن میں حسین نگینے جگمگا رہے تھے۔ درجنوں قسم کے پھل اور خشک میوے تھے، چائے تھی۔ نواب صاحب کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ ساری نوابی رکھی رہ گئی تھی اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ طالوت بہرحال طالوت ہے۔ میری دنیا کے نواب اس کا کیا مقابلہ کر سکیں گے۔

پُر تکلف چائے پی گئی۔ اس کے بعد نواب صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ اور پھر نواب صاحب نے اجازت طلب کی۔

"اگر گستاخی نہ تصور کریں تو دونوں حضرات کل خادم کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں۔"

"شرمندہ کر رہے ہیں محترم!........ آپ کی محبت بھری شخصیت سے کون متاثر نہ ہوگا؟ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔" طالوت نے کہا اور نواب صاحب اسی وقت بول پڑے۔

"ہاں، وہ آپ کے گھوڑے نہ دیکھ سکے۔"

"تشریف لایئے۔" طالوت نے ہی کہا اور ہم دونوں مع نواب صاحب اور ان کے مشیروں کے چل پڑے۔ عارضی اصطبل میں تینوں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھوڑے دیکھے اور ان کی آنکھوں میں تحسین کے آثار اُبھر آئے۔

"واللہ........ اس سے حسین اور شاندار گھوڑے ہماری نگاہوں سے نہیں گزرے۔ کیا شان ہے۔"

"آپ کو پسند آئے نواب صاحب؟" طالوت نے پوچھا۔

"بے پناہ۔ ہم گھوڑوں کے عاشق ہیں۔"

"تب یہ تینوں آپ کی نذر۔" طالوت نے کہا اور نواب صاحب اچھل پڑے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے تعجب خیز نگاہوں سے طالوت کی طرف دیکھا، اس کے الفاظ پر غور کیا۔

"سائیس! گھوڑے کھول کر نواب صاحب کے مکان پر پہنچا دیئے جائیں۔"

''واللہ، شہزادہ عادل! آپ........آپ........''

''کیوں........کیا خادم کا یہ تحفہ آپ کو پسند نہیں ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''اوہ........اوہ، شہزادہ عادل! آپ نے ہمیں بڑی قیمتی چیز بخش دی ہے۔'' نواب صاحب گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولے۔

''اگر آپ قبول کرلیں تو میری عزت افزائی ہوگی۔'' بدمعاش طالوت نے مکاری سے کہا اور اسی وقت دو خادم ہاتھوں میں خوب صورت مخملیں بکس لے آئے۔ ایک بڑا بکس تھا، جو کھلا ہوا تھا اور اس میں انتہائی نفاست سے جمائے ہوئے وہ پندرہ ہیرے جگمگا رہے تھے، جو طالوت نے نواب صاحب کو دکھائے تھے۔ طالوت نے وہ بکس نواب صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ریاست شادیا کی طرف سے یہ حقیر تحفہ۔''

نواب صاحب کی حالت واقعی بگڑ گئی تھی۔ ان کا منہ کھل گیا تھا، آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی حیرت پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔

''حضور......شہزادہ صاحب! یہ بہت ہے، میری حیثیت سے زیادہ۔ میں ان تحفوں کا بار برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

''آپ کی اعلیٰ شخصیت کے لئے یہ حقیر تحفے مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ تاہم پھر آؤں گا تو آپ کے لئے شادیا کی چند نایاب چیزیں لاؤں گا۔ فی الحال انہیں قبول فرما کر مجھے عزت بخشیں۔'' طالوت نے کہا اور نواب صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے ہیروں کا بکس تھام لیا۔ اور پھر ایک ایک بکس ان تینوں آدمیوں کو بھی پیش کیا گیا، جو نواب صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں پانچ پانچ ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی بھی حالت خراب ہوگئی۔ کبھی مسکراتے، کبھی خوف زدہ ہو جاتے۔ ویسے ان ہیروں کے مالک بن کر وہ بھی چھوٹے موٹے نواب بن گئے تھے۔ ہونہہ، کیا ضرورت ہے ان سڑے ہوئے نواب صاحب کے یہاں نوکری کی۔ بڑے نواب جلال الدین بنتے ہیں، آج تک تنخواہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہ دے سکے۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر۔ غالباً ان میں سے ہر ایک نے یہی سوچا ہوگا۔

بہرحال تینوں گھوڑے اور قیمتی ہیرے لے کر نواب صاحب ہانپتے کانپتے رخصت ہوگئے۔

ان کے دور چلے جانے کے بعد طالوت میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''کیسی رہی؟''

''میرا خیال ہے، ایسے دو چار تحفے تم اور دے دیتے تو پھر یہاں سے نواب صاحب کی لاش اُٹھوانے کا انتظام ہی کیا جاتا۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے کل کی دعوت کے بارے میں؟''

''دیکھنا ہے کہ یہ دعوت کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔''

''ویری گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی وہی کچھ سوچ رہے ہو، جو میں سوچ رہا ہوں۔ ابھی تو کل تک کچھ اور طومار باندھیں گے تاکہ نواب صاحب بالکل ہی آؤٹ ہو جائیں۔''

''لیکن اس نواب کو اتنی دولت دے کر تم کیا کرو گے؟''

''دولت۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔ ''یار! تمہارے ہاں جس چیز کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے، میری نگاہوں میں وہ ایک بے حقیقت شے ہے۔ اس سے قیمتی بے شمار چیزیں ہیں جن کے خرچ میں

ہم بخل سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اخلاق، محبت، نیکی وغیرہ۔ اور پھر وہ لڑکی واقعی خوب صورت تھی۔ یقیناً نواب کے یہاں کا ماحول بہت دلکش ہوگا۔ ہم تھوڑی سی تفریح کریں گے اور بس۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری چند باتیں گرہ میں باندھ لی ہیں۔ وعدہ کر لیا تھا کہ اب کسی بھی لڑکی سے اس حد تک متاثر نہیں ہوں گا کہ وہ ہمارے مشاغل میں حارج ہو۔ یہ لڑکی بھی بس تھوڑی سی تفریح کے لئے ٹھیک ہے۔"

"گڈ!........کام کے آدمی بن گئے ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور طالوت بھی ہنسنے لگا۔

دوسرے دن ہم نے نواب صاحب کے محل روانگی کا بندوبست کیا۔ طالوت نے راسم سے کچھ اور فرمائشات کی تھیں اور راسم نے ان کی تعمیل کر دی تھی۔ چنانچہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہراول دستہ روانہ ہو گیا۔ پرانے طرز کے خوان تھے جو ان لوگوں کے شانوں پر لدے ہوئے تھے، جو یہاں موجود تھے۔ سب کے سب وردی پہنے ہوئے تھے۔ یہ خوان، سرپوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان میں وہ کچھ تھا، جو نواب صاحب نے خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اعلیٰ درجے کے کپڑے کے تھان، خشک پھل، نفیس ترین ڈیکوریشن پیس اور نہ جانے کیا کیا۔ اور یہ سب کچھ ظاہر ہے، اس دنیا کی طرز پر نہیں تھا۔

پھر ایک بجے ہماری کار نواب وِلا میں داخل ہوئی تو گویا پورا محل استقبال کو اُنڈ آیا تھا۔ نواب صاحب نے بھی شاید کل شام واپسی کے بعد سے ہی انتظامات شروع کر دیئے تھے۔ ان کا شاندار محل اور خوبصورت بن گیا تھا۔ تمام ملازم نئی پوشاکیں پہنے ہوئے تھے۔

روانگی کے لئے طالوت نے بھی خوب تیاریاں کی تھیں، انتہائی اعلیٰ درجے کے جدید تراش کے سوٹ ہم دونوں نے پہنے ہوئے تھے اور خوب بج رہے تھے۔ طالوت کی تو چال بھی شہزادوں کی سی تھی۔ کیونکہ وہ درحقیقت شہزادہ تھا۔ لیکن حشمت برادرز کا یہ دوکوڑی کا کلرک بھی اسی کے انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب جیسا بھی لگ رہا تھا، اس کا اندازہ اس خادم کو نہیں ہے۔ محل کی خوبصورت کنیزیں پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ پورٹیکو میں ہمارے باوردی ڈرائیور نے کار روک دی۔ نواب صاحب اور ان کے اہلِ خاندان ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ طالوت نے آہستہ سے میرا شانہ دبایا۔

"ہوں؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"وہ رہی........ ہو ہو........موجود ہے۔" وہ احمقوں کے سے انداز میں اشارہ کرتے ہوئے بولا اور میں بھی اس کے اشارے پر اس طرف دیکھنے لگا۔ سیمیں ان لڑکیوں کے ساتھ ایک خوبصورت لباس میں ملبوس کھڑی تھی لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور اس پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ دونوں شریر لڑکیاں بھی سنجیدہ ہی کھڑی تھیں۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔ پہلے طالوت اور پھر میں نیچے اُترا اور نواب صاحب دونوں ہاتھ پھیلا کر ہماری طرف لپکے۔ ان کا چہرہ مسرت سے سرخ تھا۔ انہوں نے باری باری ہم سے معانقہ کیا۔ سفید شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں وہ خوب بج رہے تھے۔

"میری خوش نصیبی کی انتہا ہے........آج اس کوٹھی کی رونق بڑھ گئی ہے۔" انہوں نے کہا۔ کیونکہ ہم ان کی طرف متوجہ تھے، اس لئے سیمیں اور نصرت وغیرہ کے چہروں کا جائزہ لینے کا موقع نہیں مل سکا۔

بہر حال........اس کی نوبت بھی آ گئی۔ لڑکیوں کے ایک پورے گروپ سے ہمارا تعارف کرایا گیا، جن میں سیمیں وغیرہ بھی تھیں۔ میں نے سیمیں، نصرت اور روحی کی شکل بھی دیکھی۔ ان کی آنکھیں حیرت

سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"یہ میری بچی مہرانہ بیگمیں ہیں۔ یہ نصرت اور یہ روحی۔"

"اوہ، ان خاتون سے تو ایک اتفاق کے تحت ملاقات ہو چکی ہے۔" طالوت پھٹ سے بول پڑا۔

"ارے کہاں؟" نواب صاحب حیرت سے بولے۔

"ٹرین میں....... ہم لوگ خاموشی سے جلال آباد آ رہے تھے۔ یہاں ہمارے آدمی موجود تھے۔ بہر حال، ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں یہ خاتون چند اور خواتین کے ساتھ موجود تھیں۔ سفر کا ساتھ رہا۔"

"ارے بیگمیں بیٹے! آپ نے ہم سے تذکرہ بھی نہیں کیا۔"

لیکن بیگمیں کے حواس ہی درست نہیں تھے۔ بہر حال ہم نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

نواب صاحب نے ہماری مدارات کے سلسلے میں اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کر ڈالی تھیں، ان کا تذکرہ طویل اور بے مقصد ہے۔ یوں سمجھ لیا جائے کہ وہ ان تمام چیزوں کا جواب دینے میں کوشاں تھے جو ہم نے انہیں تحفتاً پیش کی تھیں۔ لیکن طالوت موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے چائے کے وقت مل گیا۔

"ہم ریاست سے ایک طویل سیر کا پروگرام لے کر نکلے تھے۔ بہت سے شہر گھومے، لیکن جلال آباد آ کر ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم نے کوئی جگہ دیکھی۔ گو ابھی ہم نے جلال آباد میں کچھ نہیں دیکھا، لیکن آپ جیسے محبت کرنے والے بزرگ کو دیکھ کر اور کچھ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی ہے۔"

"یہ آپ کی محبت ہے بیٹے! کچھ روز اگر یہاں قیام کریں تو میری سب سے بڑی آرزو پوری ہو جائے گی۔" نواب صاحب نے کہا۔

"ہمارا دل خود یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا۔ لیکن ملازموں وغیرہ کو ہمیں واپس بھیجنا پڑے گا۔ ہم اس بھیڑ کو ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اس کے لئے ہمیں ہوٹلوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیا کیا یہاں کوئی اعلیٰ ہوٹل موجود ہے؟"

"ہوٹل......." نواب صاحب شرمندہ سے لہجے میں بولے۔ "یہ کوٹھی شاید حضور شہزادہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔"

"ارے نہیں، یہ کیا فرما رہے ہیں آپ نواب صاحب؟" طالوت جلدی سے بول پڑا۔

"مجھے قلبی مسرت ہوتی، اگر آپ یہاں کچھ روز قیام فرماتے۔"

"ہمیں صرف آپ کی تکلیف کا احساس ہے، ورنہ آپ کی معیت سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟"

"آپ کے قیام سے میری عزت بڑھ جائے گی۔ سعادت تو مجھے ملے گی، کیا شہزادہ عادل میری یہ دعوت بھی قبول کر لیں گے؟"

"بسر و چشم۔ جب تک آپ حکم دیں گے۔ بلاشبہ ہمیں جلال آباد بہت پسند آیا ہے۔" طالوت نے کہا اور نواب صاحب خوش ہو گئے۔ طالوت یہاں آ گیا تھا۔ واپسی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ بات تو پروگرام میں شامل تھی۔ چنانچہ ہم نواب صاحب کے یہاں قیام پذیر ہونے کو تیار ہو گئے۔

چائے کے بعد نواب صاحب نے اہلِ خاندان میں سے کچھ حضرات کو ہمارے اوپر متعین کیا اور خود

انتظامات کرنے چلے گئے۔ وہ اپنی نگرانی میں ہمارے قیام کا انتظام کرنا چاہتے تھے تاکہ کوئی کسر نہ رہ جائے۔نواب صاحب قدامت پسند تھے،لیکن ہر شخص ضرورت کے مطابق لچک رکھتا ہے۔نواب صاحب نے بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی قدامت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔سیمیں تو یوں بھی بے پردہ تھی لیکن ان کے خاندان کی دوسری خواتین بھی طالوت کے اور میرے سامنے آگئی تھیں۔

بلاشبہ طالوت نے ایسے ایسے تحائف ان لوگوں کو دیئے تھے کہ اب کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ نواب صاحب کے اہلِ خاندان جن میں کچھ بوڑھی عورتیں اور کچھ نوجوان تھے، طالوت کا دماغ چاٹتے رہے۔ وہ طالوت کی ریاست، شادیا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے اور طالوت بھی ایسی اونچی اونچی چھوڑ رہا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ وہ مجھ سے بھی اپنی باتوں کی تصدیق کرا رہا تھا۔

”شہزادہ صائم آپ کے بڑے بھائی ہیں یا چھوٹے؟“ ایک صاحب نے سوال کیا۔

”ہم دونوں میں صرف بیس دن کا فرق ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ کون بیس دن چھوٹا ہے، کون بڑا۔“

”بیس دن؟“ ایک خاتون اس ”ٹیکنیکل خامی“ پر گرفت کرتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

”جی۔“ طالوت نے جواب دیا۔

”لیکن........“

”دراصل والد صاحب کی ایک سو اکیس بیویاں ہیں۔ ان سب کے لئے الگ الگ محل ہیں۔ سب کے الگ الگ مشاغل ہیں۔ اس طرح صائم کی اور میری والدہ الگ الگ ہیں۔“

”ایک سو اکیس؟“ بڑی بی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی حیرت سے بولے۔

”جی ہاں۔ جب ہم وہاں سے چلے تو ایک سو اکیس ہی تھیں، اب کچھ زیادہ ہوں تو ہمیں معلوم نہیں ہے۔“ طالوت نے نہایت سادگی سے کہا۔ ہنسنے کی بدتمیزی کون کرسکتا تھا۔ ہاں، حیرت زدہ سب تھے۔ اس کے بعد کافی دیر تک لوگ ان ایک سو اکیس بیویوں میں اُلجھے رہے اور تھوڑی دیر کے لئے سوالات سے نجات مل گئی۔

پھر نواب صاحب آگئے اور لجاجت سے بولے۔ ”آپ کی رہائش کے انتظامات ہو گئے ہیں شہزادہ صائم اور عادل! گو آپ کے قابل تو نہیں ہیں، لیکن بہرحال....... چنانچہ آپ پسند فرمائیں تو اپنے آدمیوں کو واپسی کی اجازت دے دیں۔“

”بہتر ہے.......نوازش۔“ طالوت نے کہا اور ڈرائیور کو بلانے کی فرمائش کی۔ ڈرائیور سے اس نے کہا کہ باقی لوگوں کو واپس کر دیا جائے۔ صرف کار رہنے دی جائے۔ وہ خود بھی جا سکتا ہے۔ اور ڈرائیور گردن جھکا کر چلا گیا۔

رات گئے نواب صاحب سے جان چھوٹی۔ رات کے کھانے پر سیمیں سے ملاقات ہوئی لیکن وہ گردن جھکائے کھاتی رہی۔ ایک دو بار اس نے عجیب سی نگاہوں سے طالوت کو دیکھا تھا لیکن ان نگاہوں کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ بہرحال پھر طالوت نے آرام کی خواہش ظاہر کی اور نواب صاحب ہمیں ہماری خواب گاہ تک چھوڑنے آئے۔

خواب گاہ کیا تھی، بس بے نظیر تھی۔ طالوت نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے ایک کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔

''شہزادہ صائم!'' اس نے مجھے آواز دی۔
''جی شہنشاہ عادل!'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا اور طالوت بے تحاشا ہنس پڑا۔
''یار! ایمانداری سے بتاؤ، مزہ آ رہا ہے یا نہیں؟''
''اتنی دولت خرچ کر کے بھی مزہ نہیں آئے گا؟''
''دولت کی بات چھوڑو پیارے! یہ بتاؤ، کیسا جا رہا ہوں؟''
''کیا بات ہے تمہاری۔''
''مگر یار! اس نواب کے بچے نے تھکا دیا۔ کمبل کی طرح چمٹ گیا ہے۔ اس سے جان چھڑاؤ کسی طرح۔''
''سوچو۔'' میں نے کہا۔
''تم غور کرو، اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی اجنبیوں کے سے انداز میں۔ یہ اجنبیت دور ہونی چاہئے۔''
''وہ سخت حیرت زدہ ہے۔''
''ہونا چاہئے۔ بہر حال، اس سے ملاقات کی تدبیر کرو۔ بات تنہائی میں ہی بن سکے گی۔''
''ہاں....... یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے استاد! تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا۔''
''کیا؟''
''تم بھی کسی کو پسند کر لو۔ وقتی طور پر سہی۔ تاکہ تفریح برابر رہے۔ ورنہ مجھے کوفت رہے گی۔''
''تم بے فکری سے اپنا کام کرو۔ میری پروا مت کرو۔''
''یہ بکواس ہے۔ اگر تم نے کل تک کسی کو پسند نہیں کر لیا تو ہم یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔''
''واہ، یہ خوب زبردستی ہے۔''
''میری خاطر، میری جان! پلیز۔'' طالوت نے ایسے انداز میں کہا کہ میری ہنسی نہ رک سکی۔
''بس، تو تم ہی انتخاب کر دینا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں....... یہ میری ذمہ داری رہی۔ پھر لطف آئے گا۔ ویسے ابھی چند منٹ کے بعد میں ایک کام ضرور کروں گا۔''
''وہ کیا؟''
''ذرا باہر جاؤں گا اور یہ پتہ لگاؤں گا کہ اس کی رہائش گاہ کہاں ہے۔ یعنی وہ ہم سے کتنی دور ہے۔''
''ضرور لگاؤ۔ لیکن احتیاط سے۔ کوئی گڑبڑ مت کر ڈالنا۔''
''ارے فکر مت کرو میری جان!....... اور ہاں، ذرا مجھے دو چار عشقیہ مکالمے ضرور یاد کرا دینا۔ آج تک کسی سے اظہارِ عشق نہیں کیا ہے۔ ذرا دو چار موقعے کے اشعار اور کچھ ایسی ہی دوسری باتیں۔ میں ذرا سلیقے سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔''
''ضرور، ضرور۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور طالوت اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اب کسی کے کمرے میں آنے کے امکانات نہیں تھے چنانچہ مجھے طالوت کے چلے جانے سے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں آرام

وہ مسہری پر لیٹ گیا۔ انوکھے خیالات پھر میرے ذہن میں داخل ہونے لگے۔ لیکن میں نے زور سے گردن جھٹک دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن طالوت کے ساتھ گزرنے والا ہر دن اپنے جلو میں سینکڑوں ہنگامے لئے ہوتا تھا۔ کیسی عجیب و غریب شخصیت کا مالک ہے وہ شخص۔ میں اس کی حرکتوں پر مسکراتا ہوا سو گیا۔ مجھے نہیں معلوم، طالوت کس وقت واپس آیا۔ بہرحال صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو وہ اپنی مسہری پر بے خبر سو رہا تھا۔ میں کسلمندی سے کروٹیں بدلتا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باتھ روم سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آیا۔ غسل کرنے سے طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی۔ لباس تبدیل کیا اور ایک آرام کرسی میں دراز ہو کر طالوت کا جائزہ لینے لگا۔ پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اٹھا اور خواب گاہ کی بغلی سمت کی کھڑکی کھول دی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت خوب صورت موسم تھا۔

میں نے کھڑکی کے دوسری طرف نگاہ دوڑائی۔ انتہائی حسین باغ لگا ہوا تھا۔ پھولوں کے تختے بکھرے ہوئے تھے، جن پر رنگ برنگے پھول لگے تھے۔ ہواؤں میں ان پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔

رنگین آنچلوں کی ایک ٹولی۔ چار پانچ لڑکیاں محوِ گشت تھیں اور ان میں سیمیں، نصرت اور روحی بھی تھیں۔ سیمیں ایک ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال اُلجھے تھے۔ عجیب حُسن تھا۔ بے شک وہ بے حد پیاری تھی۔ لیکن میں نے کھڑکی بند کر دی۔ طالوت اگر جاگ گیا اور اس نے مجھے اس طرح کھڑے دیکھ لیا تو ممکن ہے وہ کچھ غلط سوچ لے۔ وہ سیمیں کو پسند کرتا تھا اس لئے اس پر میرا کوئی حق نہیں تھا۔

چند منٹ کے بعد طالوت جاگ گیا۔ اس نے انگڑائیاں لیں اور پھر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”جب میں واپس آیا تھا تو تم سو چکے تھے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں....... میں رات کی رپورٹ کے لئے بے چین ہوں۔“

”بڑی دلچسپ رپورٹ ہے۔“

”حلیہ درست کر آؤ۔ اس کے بعد ہی بات چیت کریں گے۔“ میں نے کہا اور طالوت گردن ہلا کر اٹھ گیا۔ پھر وہ غسل خانے میں گنگناتا رہا اور میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد طالوت واپس آ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”پہلی خوشخبری۔ محترمہ سیمیں اس کمرے کی بائیں سمت والی عمارت میں مقیم ہیں، جس کا ایک دروازہ اس حسین باغ میں کھلتا ہے، جسے تم یہ کھڑکی کھول کر دیکھ سکتے ہو۔“

”خوب۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا، جہاں مجلسِ مشاورت جمع تھی۔“

”یعنی.......؟“

”آٹھ دس لڑکیاں تھیں۔ اس عمارت میں لڑکیوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ لڑکے کم ہی نظر آتے ہیں۔ جو بھی ہیں، بڑے برخوردار قسم کے۔ انہیں لڑکیوں کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور بوا

جیسی کئی عورتیں، لڑکیوں کی نگرانی پر مامور ہیں۔"

"خوب۔ بوا سے ملاقات ہوئی؟"

"خدانخواستہ۔" طالوت جلدی سے بولا۔ "ابھی تک تو ان کی شکل نظر نہیں آئی۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"اس کے علاوہ؟" میں نے پوچھا۔

"پوری کوٹھی کی سیر کی ہے۔ ہر طرف ہمارا ہی چرچہ ہے، خاص طور سے ان تحائف کا۔ اس کے بعد میں نے نواب جلال الدین کی خواب گاہ کی بھی سیر کی۔"

"خوب۔"

"بیگم صاحبہ بھی خاصی حسین ہیں۔ لیکن انتہائی پردہ نشین۔ استقبال میں بھی وہ شریک نہیں تھیں۔ بہر حال، نواب صاحب سے بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔"

"کیا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بڑی اُلجھن میں پڑ گئے ہیں بے چارے۔ ابھی کل یا پرسوں تک نواب شمشیر الدولہ آنے والے ہیں۔"

"یہ کون بزرگ ہیں؟"

"سیمیں کے طلب گار۔ پہلے سے معاملہ طے ہے۔ اب چونکہ سیمیں تعلیم ختم کر چکی ہے، اس لئے شمشیر الدولہ چند روز کے لئے یہاں آ رہے ہیں۔ اس دوران نواب صاحب ان کی عادات و اطوار کا جائزہ لے کر آخری فیصلہ کریں گے۔ کسی اور ریاست کے نواب کے صاحبزادے ہیں۔"

"اُلجھن کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دونوں۔ نواب صاحب نے دبی زبان میں اظہار کیا تھا کہ ہماری....... میرا مطلب ہے، میری اور تمہاری بات ہی کیا ہے۔ نواب اور شہزادوں میں بہر حال فرق ہوتا ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی سیمیں سے منسوب ہو سکتا تو نواب صاحب کی قسمت کھل جاتی۔ اس پر بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ نواب صاحب نے ان کے منہ کی بات چھین لی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ شمشیر الدولہ کا انتخاب کیا جا چکا ہے اور اگر شمشیر الدولہ کو نظر انداز بھی کیا جائے تو کس بل بوتے پر۔ شہزادوں کے لئے ایک سے ایک حسین لڑکی ہوگی۔ کیا ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی سیمیں کو پسند کر لے؟"

"اوہ۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہے نا دلچسپ رپورٹ؟" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہے تو۔ لیکن اُلجھن میں، میں بھی پڑ گیا ہوں طالوت!"

"کیوں؟"

"ایک بات بتاؤ طالوت! کیا ہم برے لوگ ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ ہمارے جیسے نیک لوگ تو اب تک نہیں پیدا ہوئے اور نہ آئندہ پیدا ہوں گے۔" طالوت نے بڑے خلوص سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"مسخرہ پن مت کرو۔ ہمارے تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے۔"

"وہ کیا؟"

''کسی شریف لڑکی کو کسی قیمت پر پریشان نہیں کیا جائے گا۔''
''میں اس پر کاربند ہوں۔'' طالوت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''میرے سلسلے میں بھی تم دیکھ چکے ہو۔ داؤد رحمانی کی لڑکی کے لئے خاصی تکلیفیں اٹھائیں لیکن اس کی عفت پر حرف نہ آنے دیا۔''
''قدر کرتا ہوں یار! اس بات کی۔'' طالوت نے کہا۔
''اگر سیمیں، شمشیر سے منسوب ہے اور اگر دونوں خوش ہیں تو ہمیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے، اسے شمشیر سے جدا کر کے ہم اسے کوئی سہارا تو نہیں دے سکتے۔ پھر ان کا معاملہ خراب کیوں کیا جائے؟''
''ہوں۔'' طالوت کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کہتے تو ٹھیک ہو۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے۔''
''کیا؟''
''ان شمشیر الدولہ بہادر کا جائزہ لیا جائے گا۔ سیمیں کو بھی ٹٹولا جائے گا۔ اگر شمشیر الدولہ، سیمیں جیسی حسین لڑکی کے لائق ہوئے اور سیمیں نے بھی انہیں پسند کیا تو ہم خاموشی سے یہاں سے بستر گول کر جائیں گے۔ اور اگر ایسی بات نہ ہوئی تو پھر جملہ حقوق محفوظ ہیں۔''
''چلو منظور۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور یہ بات طے ہوگئی کہ فوری طور پر طالوت، سیمیں سے عشق نہیں شروع کرے گا۔
تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے دھکا دیا گیا اور کسی نے اندر جھانکا۔ کوئی ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کے سامنے آگئی تھی اس لئے اس نے سہمے ہوئے انداز میں کئی سلام کر ڈالے۔
''کیسے آئیں خاتون؟'' میں نے شرافت سے پوچھا۔
''نواب میاں نے بھیجا تھا کہ دیکھ آؤں، آپ جاگ گئے یا نہیں۔'' ملازمہ نے خشک ہونٹ تر کرتے ہوئے بتایا۔
''اندر آجاؤ۔'' طالوت نے کہا اور وہ اندر آ گئی۔ پوری جان سے کانپ رہی تھی بے چاری۔
''یہاں سب کس وقت جاگ جاتے ہیں خاتون؟''
''میاں سات بجے تک۔ بچے آٹھ بجے تک۔''
''ٹھیک ہے۔ ناشتہ کس وقت ہوتا ہے؟''
''نو بجے۔''
''بس تو ہمارے جاگ جانے کی اطلاع دو۔'' طالوت نے کہا اور ملازمہ واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب خود آ پہنچے۔
''صبح بخیر بچو! رات کو ایک بڑی غلطی ہوگئی۔''
''کیا نواب صاحب؟'' طالوت نے کہا۔ ہم دونوں نے انہیں سلام کر کے مصافحہ کیا تھا۔
''بھئی پوچھنا بھول گیا کہ تم لوگ بیڈ ٹی وغیرہ لیتے ہو یا نہیں؟''

''نہیں نواب صاحب! خدا کے فضل سے ہم بھی مسلمان ہیں۔''

''بڑی مسرت کی بات ہے۔ تیار ہو تو آؤ، تھوڑی دیر چمن کی سیر رہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔ چمن کی سیر کرتے ہوئے نواب صاحب ہم سے گفتگو کرتے رہے۔ بہت سی باتیں کیں انہوں نے۔ تب طالوت نے ایک بات کہی۔

''میرے ذہن میں ایک خیال اُلجھ رہا ہے نواب صاحب!''

''وہ کیا شہزادے عادل؟''

''ہم لوگ سیر و تفریح کرنے نکلے ہیں اور تمام تکلفات سے بے نیازی چاہتے ہیں۔ اس کا معمولی سا اندازہ آپ نے اس بات سے لگا لیا ہوگا کہ ہم دونوں تنہا ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔''

''اوہ ہاں...... مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔

''یہاں اس محل میں آپ نے جس اپنائیت سے ہمیں مدعو کیا ہے اور یہاں کے مکین جس محبت سے ہم سے پیش آئے ہیں، وہ احساس دلاتی ہے کہ ہم اپنے ہی گھر میں ہیں۔''

''بے شک۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ آپ لوگ اسے اپنا گھر تصور کرتے ہیں۔''

''تب پھر نواب صاحب! آپ جس طرح اپنے روزمرہ کے معاملات میں مصروف رہتے ہیں، مصروف رہیں۔ ہمیں گھر کے دوسرے لوگوں کے سپرد کر دیں۔ اور صرف فرصت کے اوقات میں ہماری ملاقات ہو۔ ہم یہاں تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ تکلفات جاری رہے تو زیادہ عرصے نہ رہ سکیں گے۔''

نواب صاحب، طالوت کی اس بات سے بہت متاثر ہوئے اور بولے۔ ''تم لوگ واقعی نیک فطرت اور سادہ دل ہو بیٹے! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم میرے اپنے بچے ہو۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو میں اس پر عمل کروں گا۔ یہ کوٹھی تمہاری ہے۔ سب لوگ تمہارا احترام کرتے ہیں۔ جہاں دل چاہے جاؤ۔ سب سے ملو۔ تم اپنے بچے ہو۔ جلال آباد کی سیر کے لئے جسے چاہو ساتھ لے لینا۔''

''شکریہ...... یہ آپ نے اپنائیت کی بات کی ہے۔'' طالوت نے کہا۔ میں طالوت کی شرارت سمجھ گیا تھا۔ بہر حال نو بجے ہم ناشتے کے لئے چل پڑے۔ ناشتے کی میز پر گنے چنے افراد تھے۔ یعنی گھر کے خاص خاص لوگ۔ بیگم صاحبہ بھی تھیں، جنہیں خاص طور سے ہمارے سامنے لایا گیا تھا اور وہ نئی نویلی دلہن کی طرح شرمائی بیٹھی تھیں۔

سیمیں اور دوسری لڑکیوں کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ مسکرا کر بیگم صاحبہ کو دیکھ رہی تھیں۔ نواب صاحب بھی ناشتے کے دوران لطیفے سنا رہے تھے۔ بہر حال، اگر وہ مغرور بھی تھے تو یقین نہیں آتا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ بہت خوش مزاج معلوم ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے طالوت کی فرمائش بتائی اور خاص طور سے سیمیں سے مخاطب ہو کر بولے۔

''سیمیں بیٹے! تم جدید طور پر تعلیم یافتہ ہو۔ اس لئے معزز مہمانوں کی مدارات کی ذمہ داری تم پر خاص طور سے عائد ہوتی ہے۔ انہیں جلال آباد کے نواح کی سیر ضرور کرانا۔''

''جی......!'' سیمیں نے سادگی سے کہا۔ میں نے اس وقت اس کے لہجے میں کوئی خاص بات نہیں محسوس کی تھی۔ اور نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید شمشیر بہادر کا پلّہ بھاری ہے۔

ناشتہ ختم ہوگیا۔ نواب صاحب نے ملازم کو بلا کر ہدایت کی کہ اکبر پور کا دورہ جو ملتوی کر دیا گیا تھا، آج ہی ہوگا۔ کیونکہ مہمانوں نے اجازت دے دی ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ انہیں ایک ضروری کام سے اپنی جاگیر اکبر پور جانا تھا، جس کے لئے منع کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب ان لوگوں کی اجازت سے وہ وہاں جا رہے ہیں۔

''آپ بڑے اطمینان سے جایئے اور تمام کام کر کے واپس آیئے۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔

''تو آخر تم نے اپنا کام کر ہی لیا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یار! مگر یہ لڑکی کچھ ٹھس معلوم ہوتی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''اس کی وجہ شمشیر تو نہیں ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔ دیکھ لیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' طالوت نے خشک لہجے میں کہا اور میں مسکرانے لگا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟...... میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' طالوت گرم ہوتے ہوئے بولا اور میں زور سے ہنس پڑا۔

''تو بگڑ کیوں رہے ہو؟ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔ تم نے حسب وعدہ میرے لئے بھی تو کوئی تلاش نہیں کی۔''

''ایں...... ہاں...... روحی کیسی ہے؟''

''زیادہ خوبصورت تو نہیں۔''

''نصرت سے اچھی ہے۔ بہرحال، آج دن میں جائزہ لیں گے۔ تفریح کریں گے یار! نہ سہی عشق۔ لیکن ان شمشیر الدولہ کو دیکھے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''ضرور، ضرور...... لیکن رقابت میں......'' میں جملہ بھی پورا نہ کر پایا تھا کہ باہر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور نصرت کی شکل نظر آئی۔ پھر روحی اور سب سے آخر میں سیمیں جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ تینوں لڑکیاں سنجیدہ تھیں۔ میں نے اور طالوت نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور پھر طالوت گردن اٹھا اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ نہیں آئیں؟'' اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی......!'' سیمیں بھی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کون؟''

''بوا...... جن کے لئے یہاں آنا پڑا۔'' طالوت نے اسی انداز میں کہا اور لڑکیوں کی سنجیدگی رخصت ہو گئی۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''بوا یاد ہیں آپ کو؟'' سیمیں نے کہا۔

''ارے انہی کی کوشش تو یہاں لائی ہے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا نا کہ میں ایک بار آپ کے یہاں ضرور آؤں گا، بوا کا رشتہ لے کر۔'' طالوت نے کہا۔

''تو آپ بوا کا رشتہ لے کر آئے ہیں؟'' نصرت ہنستے ہوئے بولی۔

''بلاشبہ۔ شاید انہیں پتہ چل گیا ہے۔ جبھی وہ میرے سامنے نہیں آئیں۔ اگر آپ نے انہیں بتا دیا

ہے تو ظلم کیا ہے مس سیمیں! میری آنکھیں انہیں دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
سیمیں ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔ ''میرا خیال تھا، اس حیثیت میں آپ سنجیدہ ہوں گے۔ لیکن........''
''ارے کیسی حیثیت؟ کہاں کی حیثیت؟........ بوا کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا کر یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ ہائے بوا!'' طالوت نے اس انداز میں کہا کہ نصرت اور روحی بے تحاشا ہنسنے لگیں۔
''آپ اب ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے شہزادہ عادل!'' سیمیں نے کہا۔
''بے وقوف؟........ میں نے ایسی جسارت کب کی تھی محترمہ؟''
''ٹرین میں آپ نے کب بتایا تھا کہ آپ شہزادے........ ایسے اعلیٰ انسان ہیں۔''
''بوا میری سات پشتوں کو گالیاں دیتیں۔ کہتیں، شکل تو دیکھ آئینے میں کمبخت۔ صورت پر پھٹکار برس رہی ہے۔ شہزادے تجھ جیسی منحوس شکل رکھتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
''بوا نے آپ سے کافی گستاخی کی تھی، جس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔'' سیمیں نے کہا۔
''اب آپ میرا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ میرا دل ان کے لئے تڑپ رہا ہے اور آپ ان کی گستاخی کی معافی مانگ رہی ہیں۔'' طالوت نے منہ پھُلاتے ہوئے کہا۔
''روحی! ذرا بوا کو بلا لاؤ۔'' سیمیں نے ہنستے ہوئے کہا اور روحی جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ باہر نکل گئی۔ سنجیدہ ترین سیمیں بے ساختہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے کئی بار میری طرف بھی دیکھا تھا۔
''یہ حقیقت ہے صائم صاحب! کہ ہم لوگ ٹرین میں آپ کی حیثیت نہیں جان سکے تھے۔ ہمیں وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ دو شہزادے ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔''
''آپ نے ہمیں اپنے گھر آنے کے لئے منع کیا تھا، سیمیں صاحبہ! کیا آپ کی نگاہ میں عام انسان، انسان نہیں ہیں؟'' میں نے کہا۔
''میں نے اپنی نگاہ کی بات نہیں کی تھی، صرف والد اور والدہ کی بات کی تھی۔ آپ نے یہاں کا ماحول دیکھ لیا۔ اس کے بعد بھی اگر آپ مجھے مجرم قرار دیں تو میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔''
''بس تو پھر آپ ہمیں شہزادہ نہ کہیں، صرف عادل اور صائم کہیں۔ شہزادگی کا دُم چھلاّ صرف آپ کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے لئے ہے۔'' طالوت نے کہا۔
اتنی دیر میں بوا ہانپتی کانپتی اندر آئیں۔ ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، بدن کانپ رہا تھا۔ اندر گھستے ہی وہ چیختی ہوئی طالوت کے پیروں کے پاس بیٹھ گئیں۔ ''معاف کر دو حضور! بس ایک بار معاف کر دو۔ اللہ قسم، آئندہ ایسی حرکت نہیں ہوگی۔ بس ایک بار، اللہ کے واسطے بس ایک بار۔''
''ارے، ارے........ کیا بات ہے بوا؟........ روحی! کیا کہہ دیا تم نے بوا سے؟'' طالوت جلدی سے بولا۔
''میں نے تو کچھ نہیں کہا، شہزادہ حضور!'' روحی بولی۔
''پھر یہ بوا کو کیا ہو گیا؟''
''کل جب سے آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے، اپنے کمرے میں چھپ کر بیٹھ گئی ہیں۔ اس وقت بھی بڑی مشکل سے نکلی ہیں۔ راستے بھر درود شرف پڑھتی ہوئی آئی ہیں۔'' روحی نے کہا اور طالوت

ہنس پڑا۔

”اُٹھ جاؤ بوا! کانپ کیوں رہی ہو؟“

”معاف کر دو...... پہلے معاف کر دو........ بڑی غلطی ہوئی ہے مجھ سے۔ اللہ کے واسطے۔“

”بوا!........ بوا! اُٹھو۔ میں تمہاری شادی کی بات پکی کرنے آیا ہوں۔ اُٹھو تو سہی۔“

”ایں.......“ بوا جلدی سے اُٹھ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے قہر آلود نگاہوں سے طالوت کو دیکھا اور پھر جلدی سے بولیں۔ ”جو دل چاہے کرا دو بھیا! مگر معاف کر دو۔“

”تو کیا تم شادی کرو گی بوا؟“ سیمیں چیخ پڑی۔

”مجبوی ہے بیٹا!....... ہائے.......اس بڑھاپے میں غلطی ہو گئی۔ نہ کروں تو شہزادے میاں گردن اُتروا دیں گے۔“

”عادل!“ میں نے طالوت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”کیوں سیدھی سادی بوا کو پریشان کر رہے ہو؟ خبردار، اب تمہاری زبان سے بدتمیزی کا ایک لفظ بھی نہ نکلے۔“

”بوا بہت نیک ہیں........ بے حد سادہ دل اور معصوم۔ میں خود آپ سے بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں بوا!“ طالوت نے کہا۔

”ایں.......؟“ بوا کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ ”مجھے اور گناہ گار مت کرو میاں! اتنے بڑے آدمی ہو کر معافی مانگتے ہو۔ اللہ تمہاری عمریں دراز کرے۔“

”اور وہ شادی کی بات کیا ہوئی بوا؟ ہمیں تو آپ کے تیار ہو جانے سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔“ نصرت نے کہا۔

”تُو خاموش رہ بے شرم! اس بڑھاپے میں میرا مذاق اُڑاتی ہے۔ ارے میں جانتی ہوں، تُو صدا سے میری دشمن ہے۔“ بوا اُلٹ پڑیں۔

”مگر تم نے ابھی اقرار کیا ہے بوا!“ روحی بولی۔

”ارے جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر۔ کٹے تمہاری زبان.......“ بوا کچھ اور کہنا چاہتی تھیں لیکن پھر ان کی نگاہ ہم دونوں پر پڑی اور وہ جلدی سے خاموش ہو گئیں۔ ”تو میں جاؤں میاں؟ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ خوش رکھے خدا تمہیں۔“ بوا دروازے کی طرف کھسکنے لگیں اور پھر وہ باہر نکل کر جو بھاگیں تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سیمیں، نصرت اور روحی بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ طالوت چور نگاہوں سے سیمیں کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو کچھ نہ ہوا۔“ طالوت نے شانے ہلا کر ایک گہری سانس لی تھی۔

”آپ کیا چاہتے تھے؟“

”بس، بوا سے نوک جھونک ہوتی۔ کچھ گالیاں سننے کو ملتیں۔ ٹرین میں تو جوتی تک لے کر دوڑی تھیں۔“

”جب سے آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے، اوسان خراب ہیں۔“

”اور جناب کی کیا کیفیت ہے؟“ طالوت نے براہِ راست سیمیں سے کہا۔

”شہزادے بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ سیمیں نے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ طالوت نے ایک گہری سانس لی۔

"ویسے آپ نے اس گھر کی کایا پلٹ دی ہے۔ ابو جان نے مجھے اجازت دی ہے کہ آپ کو جلال آباد کے نواح کی سیر کراؤں۔" سیمیں نے خوبصورتی سے کہا۔

"لیکن میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ اگر آپ اسے پسند نہ کریں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"نہیں، نہیں....... پسند نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ یوں بھی آپ صرف شہزادے ہی نہیں ایک دلچسپ انسان بھی ہیں۔ اگر خاندانی روایات سے مجبور نہ ہوتی تو پہلے ہی، میرا مطلب ہے ٹرین میں آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتی۔"

"شکریہ مس سیمیں! اگر یہ بات ہے تو پھر سیر کو ضرور چلیں گے۔" طالوت نے کہا۔

"صائم بھائی، آپ کے برعکس ہیں، عادل صاحب! بہت کم گو اور متین۔"

"چھپے رستم ہیں۔ خاموشی سے کام کر جاتے ہیں۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں مانتی۔" سیمیں ہنستے ہوئے بولی۔ پھر کہنے لگی۔ "بہرحال، آپ تیار ہو جائیے۔ ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔"

"بہتر ہے۔" طالوت نے کہا اور وہ تینوں مسکراتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ طالوت شرارت آمیز انداز میں میری طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

"کیوں، بہت خوش ہو۔"

"صائم بھائی....... عادل صاحب....... کیا سمجھے؟"

"اوہ......." میں بھی ہنس پڑا۔ اور پھر ہم تیاریاں کرنے لگے۔ تینوں لڑکیاں بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ دو لڑکے بھی تھے، جو صورت ہی سے احمق معلوم ہوتے تھے۔

"یہ کون ہیں؟" طالوت نے پوچھا۔

"عالم صاحب....... میرے پھوپھی زاد بھائی۔" سیمیں نے ایک لڑکے کا تعارف کرایا اور وہ کوٹ کا کالر درست کرنے لگا۔ "اور یہ شہزاد صاحب ہیں۔ میرے ماموں زاد بھائی۔ چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں۔"

"ہمارے ساتھ چل رہے ہیں؟"

"جی ہاں....... انہوں نے اجازت لے لی ہے امی جان سے۔" سیمیں کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا۔

"پروا نہ کریں۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور میں نے ہمدردی سے ان دونوں بے وقوفوں کو دیکھا۔ شامت آ گئی تھی بے چاروں کی۔ بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ طالوت کی شاندار کار ہی میں سفر کی ٹھہری۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور طالوت میرے برابر بیٹھ گیا۔ اس کے نزدیک عالم صاحب بیٹھ گئے تھے۔ عقبی سیٹ پر تینوں لڑکیاں اور شہزاد صاحب تھے، جو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مسرت ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ طالوت نے ان کی کیفیات نوٹ کی تھیں۔ لیکن وہ پُراسرار انداز میں مسکراتا رہا تھا۔

"دائیں طرف موڑ لیں صائم بھائی!" راستے میں سیمیں نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ہم زوبی فال چلیں گے۔ روجی! میرا خیال ہے، تم آگے چلی جاؤ اور صائم بھائی کو گائیڈ کرو۔ آپ یہاں آ جائیے عادل صاحب!"

طالوت آنکھیں بند کر کے مسکرایا اور میں نے کار روک دی۔ تب عالم صاحب اُتر کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ پیچھے سیمیں کے برابر چلے جائیں، لیکن سیمیں نے نام لے کر طالوت کو پیچھے بلایا تھا، اس لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

طالوت سیمیں کے برابر بیٹھ گیا۔ روحی میرے پاس آ گئی اور عالم صاحب کھڑکی کے نزدیک بیٹھ گئے۔ میں نے کار پھر آگے بڑھا دی۔ عالم صاحب کا منہ بن گیا تھا۔ شہزادمیاں بھی خوش نہیں تھے۔ روحی مجھے سمتیں بتا رہی تھی۔ اور پھر اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔

''اللہ......سرک کر بیٹھئے عالم بھائی! آپ کے جسم سے سرکے کی سی بدبو آ رہی ہے۔ آپ سال میں کتنی مرتبہ نہاتے ہیں؟''

''جی......؟'' عالم صاحب بوکھلا گئے۔

''میں کہتی ہوں، سرک کر بیٹھئے۔ گرے پڑ رہے ہیں۔'' روحی نے ڈانٹ کر کہا اور عالم صاحب سہم گئے۔ باقی سب لوگ خاموش تھے۔ سفر بہت طویل نہیں تھا، زوبی فال وہی تھا جو ہمیں ہمارے ہوٹل سے نظر آیا تھا۔ بہرحال خوب صورت علاقہ تھا۔ موسم بھی بے حد حسین تھا۔ کار ایک جگہ کھڑی کر دی گئی اور سب نیچے اتر گئے۔

''جلال آباد قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ لیکن ابھی یہاں ایسی تفریح گاہیں نہیں ہیں، جہاں خاص طور سے وقت گزارا جا سکے۔ تاہم یہ خوب صورت جگہ ہے۔ آپ کی اسٹیٹ کیسی ہے عادل صاحب؟'' سیمیں نے طالوت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''آسمان کو چھوتے ہوئے پہاڑ، برف سے ڈھکے ہوئے اور سفید برف کے پگھلنے کے بعد زمین پر نظر آنے والی سبز گھاس کے طویل اور ہموار میدان۔ برف کی سفیدی سبز زمین پر چمکتی ہوئی اور ان کے درمیان آباد ایک چھوٹی سی دنیا۔ خوشحال و مطمئن۔ محنت کش لوگ۔ سرخ اور سفید۔ آسودگی کی سانس لیتے ہوئے۔ ہماری دنیا محدود ہے، ہم اپنے آپ میں خوش ہیں۔'' طالوت نے منظر کشی کرتے ہوئے کہا اور سیمیں کی آنکھیں خوابوں میں کھو گئیں۔

''آپ کو دیکھ کر اس دنیا کا احساس ہوتا ہے۔'' سیمیں نے کہا۔

''لیکن میں نے اپنی دنیا میں ہمیشہ ایک کمی محسوس کی ہے......صرف اپنے لئے۔'' طالوت نے کہا۔

''کیسی کمی؟''

''بس......الفاظ نہیں دے سکتا اس احساس کو۔ نہ ان دنوں وہ احساس باقی رہا ہے۔ اس وقت سے، جب ایک ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں سفر کیا تھا۔ افسوس، ہم بوا کو نہ لے آئے۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا اور سیمیں جو طالوت کی باتوں سے کسی قدر سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اچانک ہنس پڑی۔

''بوا کی تو جان پر بن آئی تھی۔ اگر آپ ذرا سی برہمی کا اظہار کرتے تو ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔''

''آخر کیوں؟......بوا کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟ کیا ان پر ڈانٹ پڑی تھی؟''

''نہیں۔ ڈانٹ وغیرہ تو نہیں پڑی۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہے کہ انہوں نے ٹرین میں آپ سے کیا بدتمیزی کی تھی۔ بس انہیں جونہی معلوم ہوا کہ آپ اتنے بڑے شہزادے ہیں اور ابو حضور آپ کی اس قدر عزت کرتے ہیں تو ان پر خوف کے دورے پڑنے لگے۔ انہیں خطرہ تھا کہ آپ ابو حضور سے ان کی

شکایت نہ کر دیں۔"
"آپ کی کیا کیفیت ہوئی ہمارے بارے میں معلوم کر کے؟" طالوت نے کہا اور سیمیں چونک کر عقب میں دیکھنے لگی۔ میں جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا۔ روحی اور نصرت میرے ساتھ تھیں۔ البتہ عالم اور شہزاد، سیمیں وغیرہ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ سیمیں کے مڑ کر دیکھنے پر طالوت نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ عالم اور شہزاد کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور بولا۔
"آیئے، ان پتھروں پر بیٹھیں سیمیں صاحبہ! بڑا خوب صورت منظر ہے۔" اس نے ندی کنارے پڑے ہوئے پتھروں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں بھی نزدیک پہنچ گیا۔ پتھر دُور دُور بکھرے ہوئے تھے۔ سیمیں اور طالوت نزدیک نزدیک کے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ ان سے صرف چند گز کے فاصلے پر عالم اور شہزاد بیٹھ گئے۔ میں نصرت اور روحی کے ساتھ دوسری طرف مڑ گیا۔
سیمیں نے طالوت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ طالوت بھی خاموش بیٹھا رہا اور کئی منٹ گزر گئے۔ "وہ اس طرف ڈھلان میں کیا ہے؟" طالوت نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ بس سبزہ ہے۔ نیچے چیڑ کے درخت ہیں۔"
"آیئے دیکھیں۔" طالوت اٹھ کھڑا ہوا۔ سیمیں بھی اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی عالم اور شہزاد نے بھی اُٹھنے کی کوشش کی اور میں نے ان کے چہروں پر بدحواسی دیکھی۔ وہ اُٹھنے کے لئے زور لگا رہے تھے، لیکن پتھروں نے جیسے انہیں دانتوں میں دبا لیا تھا۔ طالوت اطمینان سے سیمیں کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گیا اور دونوں بے وقوف بوکھلائے ہوئے انداز میں زور لگاتے رہ گئے۔ وہ شرم کی وجہ سے کچھ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ البتہ کئی بار ان کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل گئی تھیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ طالوت کام کر گیا تھا۔ لیکن میں نے نصرت اور روحی کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور انہیں لے کر دوسری سمت چل پڑا۔ دور جاتے ہوئے میں نے دو تین بار پلٹ کر دیکھا۔ دونوں جوان پتھروں سے جان چھڑانے میں مصروف تھے لیکن ان کی ٹیڑھی ٹانگیں سیدھی ہی نہیں ہو رہی تھیں۔
میں دل ہی دل میں ہنستا ہوا آگے بڑھتا رہا اور جھرنے کے دوسری سمت آ گیا۔
"عادل صاحب کے مقابلے میں آپ سنجیدہ ہیں صائم صاحب! کیا بات ہے؟" نصرت نے کہا۔
"میں خود کو اس کا بزرگ سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"گویا بیس دن بڑے آپ ہیں؟"
"یہی سمجھ لیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"لیکن کیا درحقیقت نواب آف شادیا کی ایک سو بیس بیویاں ہیں؟"
"ایک سو اکیس۔"
"بڑی عجیب بات ہے۔"
"دادا جان قبلہ کی دو سو گیارہ بیویاں تھیں۔ ہمارے خاندان میں یہی رواج ہے۔"
"تو یہ شادیاں کتنی عمر سے شروع ہو جاتی ہیں صائم صاحب؟"
"پہلی شادی تقریباً بائیس سے چھبیس سال کی عمر تک۔ اس کے بعد انسان خود مختار ہوتا ہے۔ بعض اوقات چار چار شادیاں ایک ہی دن میں ہوتی ہیں۔ یعنی ایک نکاح سے فارغ ہو کر دوسرے نکاح کو چلے

جاتے ہیں اور پھر چار دلہنیں رخصت ہو کر آتی ہیں۔" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

"اتنی ساری بیویوں کی موجودگی میں خود نواب صاحب کا کیا حشر ہوتا ہے صائم صاحب؟"

"کیوں؟........خوش وخرم رہتے ہیں۔"

"آپ بھی اتنی ہی شادیاں کریں گے؟"

"میں؟........کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا اور لڑکیاں میرے اس ذومعنی جملے پر بوکھلا گئیں۔

"ہمارا مطلب ہے، آپ بھی تو........"

"اوہ........دراصل آپ ہمارے ہاں کی روایات سے واقف نہیں ہیں۔ اتنی شادیاں صرف وہ کرتا ہے، جو مستقبل کا حکمراں ہوتا ہے۔ میں اور عادل حکمراں نہیں ہیں۔ ریاست کی حکومت ہمارے بڑے بھائی کو ملے گی۔"

"اوہ........" روحی نے کہا۔ کافی دیر تک دونوں لڑکیاں مجھ سے دلچسپ گفتگو کرتی رہیں اور میں انہیں گھستا رہا۔ پھر طالوت کو واپس آتے دیکھ کر میں ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ طالوت میرے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس سپاٹ سا چہرہ تھا۔

"کیا خیال ہے صائم! واپس چلیں؟"

"چلو۔" میں نے کہا اور طالوت گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"ارے وہ شہزادہ صاحب اور عالم صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ بیٹھے ہوئے ہیں۔" روحی نے اشارے سے بتایا۔

"آؤ۔" اور ہم سب ان دونوں کی طرف چل پڑے۔ وہ پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے چہرے پیتل کی طرح زرد تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے جسم اچکانے لگتے اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے۔ لیکن دونوں بڑے صابر تھے۔ ابھی تک ان کے حواس قائم تھے اور انہوں نے چیخنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"چلئے، واپس چلیں۔" سیمیں نے کہا اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر عالم بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"نہ جانے کیا ہوا........نہ جانے کیوں، ہم سے اُٹھا نہیں جا رہا۔"

"جی۔" طالوت نے تعجب کا مظاہرہ کیا۔

"جی ہاں........جی ہاں۔ جب سے........جب سے........"

"کیا قصہ ہے سیمیں صاحبہ؟"

"پتہ نہیں۔" سیمیں بیزاری سے بولی۔ پھر ان کی طرف رخ کر کے کہنے لگی۔ "بہتر ہے۔ آپ تشریف رکھئے۔ ہم چلے۔"

"مگر........مگر سنیئے تو مس سیمیں!........خدارا ہمیں اس مصیبت میں چھوڑ کر نہ جایئے۔"

"تو پھر چلئے۔" سیمیں تنک کر بولی۔ اور وہ دونوں پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگے اور اس بار آسانی سے اٹھ گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ وہ دونوں بوکھلائے ہوئے انداز میں جھک جھک کر پتھروں کو جھانک رہے تھے۔

"نہ جانے کیا ہوا تھا۔" عالم نے شہزاد سے کہا۔

"آیئے عادل صاحب!" سیمیں نے بیزاری سے کہا اور پھر واپسی کا سفر ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں، واپسی میں سب خاموش خاموش سے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم سب نے منہ ہاتھ دھوئے اور کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہماری خاطر مدارات میں آج بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ مجھے اب تک طالوت سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

بہر حال کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں آ گئے اور میں نے پھرتی سے دروازہ بند کر کے طالوت کی گردن تھام لی۔ "ہاں محترم! اب بتاؤ، کیا رہا؟"

"یار عارف! کچھ بھی نہیں رہا۔ یقین کرو۔" وہ اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"لڑکی بے پناہ اُلجھی ہوئی ہے۔ اس نے کھل کر بات ہی نہیں کی۔ مجھے جتنا تجربہ ہے، میں نے سب استعمال کر ڈالا۔ بعض اوقات صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ لیکن وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے، اس نے کسی جملے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس کان کے پاس سے نکال دیتی تھی اور چہرہ سپاٹ رہتا تھا۔"

"اوہ........ پھر تم نے کیا اندازہ لگایا؟"

"صرف ایک........ شمشیر الدولہ کا رنگ پکا ہے اور چونکہ اس کا باپ مجھے اس کے حوالے کر گیا ہے اس لئے وہ میرے ساتھ بداخلاقی سے بھی نہیں پیش آنا چاہتی تھی۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟ چلیں یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"چلنا تو ہے۔ لیکن ذرا ان شمشیر الدولہ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ آخر ہیں کیا بلا۔" طالوت نے کہا۔

"تمہاری مرضی۔"

"تم سناؤ۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دو تھیں۔ کسی سے بھی اظہارِ عشق نہ کر سکا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر........ وقت برباد کیا ہے تو ڈراپ سین بھی دیکھتے چلیں۔ نواب شمشیر الدولہ سے ملاقات کرتے ہی یہاں سے واپس چلیں گے۔" طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

شام کو پانچ بجے نواب جلال الدین واپس آ گئے۔ آتے ہی وہ ہم دونوں سے ملے۔ بے حد معذرت کی۔ دن کے بارے میں پوچھا کہ کیسا گزرا۔ میں نے اور طالوت نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔ نواب صاحب ہم سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر صرف غسل کرنے گئے۔ اس کے بعد رات کے کھانے تک وہ ہمارے ساتھ رہے۔ پھر جب ہم سونے کے لئے تیار ہوئے، تب وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ طالوت کچھ بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب یہاں زیادہ نہیں رکے گا۔ مجھے بھی کوئی خاص لطف نہیں آ رہا تھا۔ بڑا پُر تکلف ماحول تھا۔

"اگر شمشیر الدولہ مناسب آدمی ہوا تو؟" میں نے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ سیمیں سے شادی کر کے عیش کرے۔" طالوت نے جواب دیا۔

"اور اگر مناسب نہ ہوا، تب؟"

"تب ہم اس خوب صورت لڑکی کو اس کے بدصورت ذوق کا احساس دلا کر یہاں سے نکل چلیں گے۔ بہرحال، ہمیں اس سے کیا لینا ہے؟ ویسے کم از کم ایک صنف کا اور تجربہ ہوا۔ یعنی یہ بے ذوق لڑکیاں........ہونہہ........ پہلے ہی سے عشق زدہ ہیں۔" طالوت نے منہ بناتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ کافی دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ طالوت آئندہ کے پروگرام بنا رہا تھا۔ پھر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔

دوسرا دن حسب معمول تھا۔ لیکن ناشتے کی میز پر نواب جلال الدین نے ہمیں بتایا کہ ریاست الوری کے نواب زادے شمشیرالدولہ آج دن کے گیارہ بجے آ رہے ہیں۔ "وہ آپ کی طرح شہزادے تو نہیں ہیں عادل میاں! لیکن خاندانی لوگ ہیں۔ نواب اصغرالدولہ۔ یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ بڑا دلچسپ انسان۔ انتہائی نفیس شخصیت کا مالک۔ دراصل میری لڑکی سیمیں بچپن سے اس کے بیٹے سے منسوب ہے۔ آپ کو یہ سب باتیں عجیب لگتی ہوں گی، بس ہمارے ہاں کے ایسے ہی دستور ہیں۔"

"بڑی مسرت ہوئی یہ سن کر۔ ہم بھی ان کا استقبال کریں گے۔" عادل نے فراخ دلی سے کہا۔

"شمشیر کی پوری عمر یورپ میں گزری ہے۔ نہ جانے کیا بن گیا ہوگا۔ میں نے جس وقت دیکھا تھا، صرف بارہ سال کا تھا۔ چودہ سال کے بعد وطن واپس آ رہا ہے۔"

"اوہ......." طالوت نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور پھر نواب صاحب سے بولا۔ "تو کیا یورپ سے واپسی کے بعد وہ پہلی بار یہاں آ رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی۔ یہاں کچھ دن قیام کرے گا۔ ہم میں سے کوئی اس سے ملنے بھی نہ جا سکا۔ اور پھر اسے واپس آئے ہوئے صرف بیس روز ہوئے ہیں۔"

"خوب۔" طالوت نے گردن ہلائی۔ ناشتے کے بعد جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو طالوت نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"صاحبزادی بھی چودہ سال کے بعد اسے دیکھیں گی۔ گویا کسی نزدیکی عشق کا امکان ختم ہو گیا۔"

"ہماری دنیا عجیب ہے طالوت! اور پھر مشرقی لڑکیاں ایک ذرا سے لگاؤ پر زندگی وار دیتی ہیں۔"

"عجیب بات ہے۔ تاہم ذرا میری سمجھ سے باہر ہے۔" طالوت نے کہا۔

ٹھیک گیارہ بجے محل کے دروازے سے نواب صاحب کی کار داخل ہوئی۔ یہ کار سٹیشن گئی تھی۔ کار کے پیچھے نواب صاحب کی پوری فوج تھی۔ خود نواب صاحب ہمارے پاس دعوت دینے آئے تھے اور ہم بھی ان کے ساتھ شمشیر بہادر کے استقبال کو پہنچ گئے۔ کار پورچ میں رکی اور ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔

تب کار سے بھاری بدن اور پستہ قد کا ایک لنگور برآمد ہوا۔ شانوں تک بکھرے بال، ٹھوڑی تک قلمیں اور قلموں میں نیچے جھکی ہوئی مونچھیں شامل تھیں۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک لگائے ایک نہایت قیمتی اور نفیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے پیچھے تین بدمعاش ٹائپ کے لوگ اُترے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر زخموں کے گہرے نشانات تھے۔ سوٹ ان کے بھی اعلیٰ درجے کے تھے، لیکن مانگے کے معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے نواب جلال الدین کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی زیادہ خوشگوار تاثرات نہیں

تھے۔لنگور نما آدمی نے دانت کھول دیئے۔بھیڑیوں جیسے دانت جو قطار میں جمے ہوئے تھے۔
''ہیلو انکل!........ہیلو آنٹ!'' وہ ایک ہاتھ بڑھاتا ہوا ان کی طرف لپکا اور نواب صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔''اوہ.....اوہ.....اوہ!'' اس نے ہاتھ پیچھے کرلیا اور نواب صاحب سے لپٹ گیا۔
''بالکل اپنے باپ کی طرح........موٹا تازہ........کیوں بیگم!'' نواب صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا اور لنگور نے انہیں چھوڑ دیا۔اس نے گھور کر بیگم صاحبہ کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کی طرف جھپٹا۔
''اوہ........'' اس نے بیگم صاحبہ کو دونوں بازوؤں میں بھرلیا اور بیگم صاحبہ کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔''شیمی کہاں ہے آنٹ؟ ان میں سے کون سی شیمی ہے؟'' اس نے لڑکیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔میں نے دیکھا،سیمیں کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔وہ نصرت اور روحی کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔
''آؤ۔'' نواب صاحب شاید اس کی نیت بھانپ گئے تھے،اس لئے انہوں نے مضبوطی سے شمشیر کا بازو پکڑ لیا۔
''اوہ انکل!شیمی میرے ریسیپشن کو نہیں آئی۔'' لنگور،نواب صاحب کے ساتھ گھسٹتے ہوئے بولا۔
''ان سے ملو۔تمہیں ایک بہت بڑی شخصیت سے ملاؤں۔'' نواب صاحب اسے طالوت کے سامنے لاتے ہوئے بولے۔
''بڑی شخصیت........یہ کون ہے؟'' شمشیر نے کہا۔
''شہزادہ عادل،شہزادہ صائم۔ایک بہت بڑی ریاست کے شہزادے۔'' نواب صاحب نے تعارف کرایا۔
''ہماری ریاست سے بھی بڑے؟'' شمشیر نے کہا۔
''ہاں۔اتنے بڑے کہ شاید تمہاری پوری ریاست کی قیمت یہیں کھڑے کھڑے ادا کر دیں۔'' نواب صاحب نے جواب دیا۔
''ہیلو!'' طالوت نے آگے بڑھ کر کہا اور شمشیر نے سیاہ چشمہ اتار کر اسے دیکھا،پھر چشمہ آنکھوں سے جما کر دانت نکالتے ہوئے بولا۔
''ہیلو!'' اور اس نے طالوت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔کسی گینڈے کی طرح طاقتور تھا وہ۔لیکن اچانک اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔اور پھر وہ ایک طرف جھک گیا۔تب طالوت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
''ہیلو!'' اس نے میری طرف دیکھا لیکن ہاتھ ملانے کی جرأت نہیں کی۔اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔میں نے بھی خوش اخلاقی سے سر خم کیا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔
''اوہ،انکل!میرے فرینڈز سے ملئے۔یہ نائیڈے ہے۔یہ پیڈرو دی نائٹ اور یہ ایڈگر ہے۔بہترین دوست ہیں میرے۔ہم لوگ ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔''
''ہوں۔'' نواب صاحب نے گردن ہلائی۔''لیکن یہ سب تو مقامی باشندے معلوم ہوتے ہیں۔''
''اوہ........'' لنگور نے کہا۔''ہم نے یورپ میں ایک دوسرے کے نام بدل دیئے تھے۔وہاں ہم انہی ناموں سے پہچانے جاتے تھے انکل!جانتے ہیں،ان لوگوں نے میرا کیا نام رکھا تھا؟''

''مکلارنس۔'' نائیڈے نے پیار سے دوہرایا۔

''لیکن اب تو تم وطن واپس آچکے ہو۔'' نواب صاحب نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

''اوہ، ڈیئر انکل! یہاں کی فضا میں کیسی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ میں آگیا ہوں انکل! لیکن یہاں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ جی چاہتا ہے، گولی ماردوں ان سب گدھوں کو۔ نہ جانے یہاں کس طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ کیوں ڈیئر پیڈرو!''

''آف کورس....... آف کورس۔'' پیڈرو نے کوٹ کے اوپر اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب کچھ نہ بولے لیکن ان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ مجھے ہنسی آرہی تھی اور طالوت بھی دلچسپ نگاہوں سے اس پورے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال سب اندر پہنچ گئے۔ محل کا ایک حصہ شمشیرالدولہ کے لئے سجایا گیا تھا۔ انہیں وہیں لے جایا گیا۔ نواب صاحب کے اشارے پر بیگمیں وغیرہ زنان خانے کی طرف چلی گئی تھیں۔ ہم دونوں البتہ شمشیرالدولہ کے ساتھ ان کی رہائش گاہ تک آئے تھے۔

نواب صاحب کے چہرے پر سخت بے چینی نظر آرہی تھی۔ لیکن وہ برداشت کیئے ہوئے تھے۔

''آپ کی کوٹھی بہت خوب صورت ہے انکل! لیکن اس کے کچھ حصوں سے قدامت پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ لوگ اپنا مائنڈ کیوں نہیں بدلتے انکل؟ اگر آپ نے یہ کوٹھی مجھے دے دی..... میرا مطلب ہے، شمی کو دے دی تو میں اس کا ڈیزائن بدل دوں گا۔ اس کو ایک دم تبدیل کردوں گا۔ کیوں ایڈگر!''

''آف کورس باس۔ میں اس کا ڈیزائن پیرس کے آرکیٹکٹ سے بنوادوں گا۔ ہی اِز مائی فرینڈ۔''

''اچھا....... اب تم آرام کرو۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔ آیئے عادل میاں! آؤ صائم میاں!'' انہوں نے کہا۔

''اوہ...... آپ لوگوں سے پھر ملاقات رہے گی۔ ویسے آپ لوگ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟''

''تفصیلی ملاقات پر بتاؤں گا۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور گردن ہلاتا ہوا واپس پلٹ پڑا۔ نواب صاحب نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور ہم اس حصے سے نکل آئے۔

''مجھے افسوس ہے صائم میاں! آپ لوگوں کو یقیناً کوفت ہوئی ہوگی۔'' راستے میں نواب صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ....... نہیں نواب صاحب! بہرحال وہ آپ کے مہمان ہیں۔ جس طرح آپ کے لئے، اسی طرح ہمارے لئے۔ اگر ہمارے یہاں قیام سے آپ کو کوئی تکلیف ہو تو تکلف نہ کریں۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔'' طالوت نے کہا۔

''مجھے شرمندہ نہ کرو بیٹے!'' نواب صاحب نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ طالوت انہیں جاتا دیکھتا رہا اور پھر معنی خیز انداز میں گردن ہلاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پھر اس نے میری شکل دیکھی اور ہنس پڑا۔

''ہیلو مسٹر ایرف!....... ہاؤ آر یو؟'' اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا اور مجھے بھی ہنسی آگئی۔

''ایک بات بتاؤ۔'' میں نے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور طالوت سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''تم نے اس سے مصافحہ کیا تھا؟''

''ہاں۔'' طالوت ہنس پڑا۔

''اس کے بعد اس نے مجھ سے مصافحہ نہیں کیا۔''
''سمجھ دار آدمی ہے۔ ویسے دوپہر کے کھانے پر دیکھنا۔ مصافحے کا اثر تو اب ظاہر ہوگا۔ ویسے اس نے اپنے ہاتھ کی کلائی کی مضبوطی کا اظہار تو کیا تھا، لیکن زندگی بھر پچھتائے گا۔''
''میں نے محسوس کیا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا اور ہم دونوں ہنستے ہوئے اندر آ گئے۔
''کیا خیال ہے عارف! کیا بیزاری دور نہیں ہوگئی؟''
''میں نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔
''سچ مانو تو میں بھی کچھ اُکتاہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اس ولایتی بندر کے آ جانے سے اچانک دلچسپیاں پیدا ہوگئی ہیں۔''
''عجیب آدمی ہے۔ ویسے تم نے ایک بات محسوس کی؟''
''کیا؟'' طالوت نے دلچسپی سے پوچھا۔
''خود نواب صاحب کے بھی ہوش اُڑ گئے ہیں۔''
''ظاہر ہے......اوہ عارف! بس انتظار کرو۔ یہ خشک سی جگہ تو اچانک لالہ زار بن گئی ہے۔ ابھی تو یہاں دلچسپ کہانیاں جنم لیں گی۔ ذرا ان شیمی صاحبہ کا بھی رنگ دیکھنا ہے جو اچانک سیمیں سے شیمی بن گئی ہیں۔'' طالوت نے ہنستے ہوئے کہا اور میں بھی ہنسنے لگا۔

❁❁❁

ہم لوگ واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ طالوت کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے کپکپا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ہنس پڑا۔
''کیوں؟'' میں نے اس کی شکل دیکھی۔
''یار! خود اس جگہ کیسے کیسے لوگ ہوتے ہوں گے، جہاں یہ دیسی بندر تربیت پاتے ہیں؟''
''نسل وہ بھی بگڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس حد تک نہیں۔ دراصل یہ تیتر اور بٹیر والی بات ہے۔ یہ لوگ جس معاشرے سے نکل کر جاتے ہیں، وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں جا کر یہ سدھ بدھ کھو بیٹھتے ہیں۔ ان لوگوں کے چمکدار ماحول کو اپنانے کی کوشش میں یہ اپنا رنگ بھی کھو بیٹھتے ہیں اور پھر واپسی پر ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا اور طالوت ہنس پڑا۔
''تب تو ایک بار ان ملکوں کی سیر ضرور کریں گے۔''
''ضرور۔ تم نے خود فرانس جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ ورنہ اب تک ہم وہیں ہوتے۔''
''ہاں۔ اس وقت تمہارا نام ایرف اور میرا ٹولیٹ ہوتا۔'' طالوت نے ایسے انداز میں کہا کہ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ طالوت کسی خیال کے تحت سنجیدہ ہو گیا۔
''کیوں......کیا سوچنے لگے؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''سیمیں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا وہ شیمی بننا پسند کرے گی؟ باتوں سے تو سلیقے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ خود اپنا بھی کوئی ذوق رکھتی ہوگی۔''
''مشرقی لڑکیاں عجیب ہوتی ہیں طالوت! اگر اس کے والدین نے اسے شیمی بنانا پسند کیا تو وہ انکار نہ کر سکے گی۔''

''یعنی اتنے بڑے نواب کی بیٹی، اتنی تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی۔''

''ہاں...... یہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ والدین نے اقدار کے نام پر اولاد کی زبان میں تالے ڈال دیئے ہیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کے لئے ماحول بہت سنگین ہے۔ والدین انہیں پیدا کرنے اور پرورش کرنے کے احسان کا پورا پورا بدلہ وصول کرتے ہیں اور اگر ان سے بغاوت کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر نئی نسل کو گالیاں پڑتی ہیں۔ اسے بے غیرت و بے حیا کہا جاتا ہے اور طرح طرح سے اسے تکلیفیں پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر وہ ڈرامائی لہجے میں کہنے لگا۔ ''نہیں، نہیں۔ میں اس بے زبان حسینہ پر ایسا ظلم کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ میں پورے زمانے سے ٹکرا جاؤں گا۔ میں اسے اس کا حق دلواؤں گا۔ سنبھل اے ولایت پلٹ بندر! کہ تُو نے ہماری غیرت کو للکارا ہے۔ ہم تجھے ولایت کے سمندر میں غرق کیے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے۔ اور بے فکر ہو جا اے بے زبان حسینہ! کہ ہماری زندگی میں اس لنگور سے تیرا جوڑ نہیں لگایا جا سکتا۔''

''بس بس......'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر فلم کمپنی والوں نے تمہارے ڈائیلاگ سن لئے تو تمہیں فلم ''بکرے دا پتر'' کے لئے ولن منتخب کر لیا جائے گا۔''

''فلم کمپنی کیا ہوتی ہے؟'' طالوت نے تعجب سے پوچھا۔

''بس ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ یہاں آ کر تم نے کوئی فلم نہیں دیکھی ورنہ پہلے میرا سر پیٹ ڈالتے اور پھر اپنا۔ اور اب تک ہماری کہانی ختم ہو گئی ہوتی۔''

''یار عارف! اگر یہ بات ہے تو پھر تمہاری زیادتی ہے۔'' طالوت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''کیوں؟ اس میں زیادتی کی کیا بات ہے؟''

''اگر ایسی کوئی دلچسپ جگہ ہے تو تم نے مجھے آج تک کیوں نہیں دکھائی؟''

''اوہ...... بس کبھی اس کا ذکر نہیں آیا۔ ویسے جلال آباد میں بھی کوئی سینما ضرور ہو گا۔ پہلے تو میں تمہیں فلم دکھاؤں گا۔ اس کے بعد فلم کمپنی دیکھنے کا فیصلہ کرنا۔''

''وعدہ......؟'' طالوت نے پوچھا۔

''پکا وعدہ۔''

''لیکن کب؟''

''بہت جلد یار! پہلے ان معاملات سے بھی تو نمٹ لو۔ ویسے فلم کے واقعات ان واقعات سے مختلف نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ہیرو ہوتا ہے، ہیروئن ہوتی ہے، ولن ہوتا ہے، ویمپ ہوتی ہے۔ ظالم آسمان ہوتا ہے، بیدار باپ ہوتا ہے، ہمدرد بھائی ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور واقعات یونہی جنم لیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو جاتی ہے۔ یا پھر ان میں سے ایک مر جاتا ہے یا دونوں مر جاتے ہیں اور تماشائی آہیں بھرتے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''آہیں بھرتے ہوئے کیوں؟''

''انہیں اپنے پیسے ضائع ہونے کا افسوس ہوتا ہے۔''

''نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ویسے ایک بات کہہ دوں، اپنی دنیا کے کسی بھی دلچسپ شعبے سے مجھے محروم مت رکھو۔ یہی سب کچھ دیکھنے کے لئے تو میں نے اپنی دنیا چھوڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے....... ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے اس کہانی کو تو مکمل کر لو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ کہانی مکمل کرنی ہے۔'' طالوت بولا اور پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

دوپہر کے کھانے کی اطلاع ملنے پر ہم دونوں تیار ہو کر باہر نکل آئے۔ ملازمہ ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ ہم کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شمشیر الدولہ مع اپنی بٹالین کے موجود تھا۔ نواب صاحب بھی موجود تھے۔ لیکن خواتین میں کوئی نہیں تھا۔ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''شروع کریں۔'' نواب صاحب نے اپنے سامنے کی پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ....... انکل! لڑکیاں کہاں ہیں؟'' شمشیر الدولہ نے حیرانی سے کہا۔

''وہ دوسری خواتین کے ساتھ کھالیں گی۔''

''نو....... نو انکل! میں نہیں کھاؤں گا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ میں اتنے عرصے کے بعد وطن واپس آیا ہوں، آپ سب لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے۔ ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ اور پھر دیکھئے نا، میں شیمی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ آئی مین....... دیکھئے نا....... ہمیں ایک دوسرے کے عادات و اطوار سے واقف ہونا چاہئے۔ ہی ہی۔'' شمشیر الدولہ شرمائے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا۔ نواب صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ برداشت کر گئے۔

''تم نے یورپ میں کتنا عرصہ گزارا ہے شمشیر؟'' انہوں نے حلیمی سے پوچھا۔

''طویل عرصہ انکل!....... چودہ پندرہ سال۔''

''اس دوران تم وطن کو بالکل بھول گئے؟''

''اوہ....... نہیں انکل! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے آپ سب لوگ اچھی طرح یاد تھے۔ میں اپنے دوستوں سے آپ کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ اور شیمی کا بھی۔''

''تم سیمیں کا نام بھول گئے۔ اس کا نام سیمیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے شیمی ہی سویٹ لگتا ہے۔ ہاؤ بیوٹی فل۔ اور پھر میں نے اپنے دوستوں کے نام بھی بدل دیئے ہیں۔ آپ نائیڈے کو دیکھئے، اس کا نام عبدالجلیل ہے، مگر نائیڈے کتنا ہینڈسم ہے۔ پیڈرو....... اوہ ڈیئر پیڈرو!....... تمہارا نام کیا تھا؟''

''اوہ....... ایمی، نٹ، کان۔'' پیڈرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یس یس....... تو انکل! اس کا نام امانت خان تھا۔ اور اپنا ایڈگر....... ایڈگر دی باکسر....... اس کا نام فضل دین تھا۔ مگر میں نے اس کو کتنا خوب صورت نام دیا ہے۔ مجھے شیمی پسند ہے انکل! پلیز آپ انٹرفیئر نہ کریں۔''

''تم یہ بھی بھول گئے شمشیر الدولہ! کہ ہمارے ہاں خواتین غیروں کے سامنے نہیں آتیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں۔'' جلال الدین ہونٹ بھینچ کر بولے۔

''پرانا بات ہے انکل! ٹائم بدل گیا ہے۔ یورپ میں لوگ ہوائی جہاز....... آئی مین ایروپلین میں

اُڑتا ہے۔'' شمشیر الدولہ نے نواب صاحب کی بے وقوفی پر ہنستے ہوئے کہا۔
''لیکن یہ یورپ نہیں ہے۔ جلال آباد ہے۔ تم نے الوری میں بھی تبدیلیاں کی ہوں گی؟''
''ایک دم........ ایک دم انکل! میں نے ڈیڈی کو نوٹس دیا، ان کو بولا پورا ماحول ایک دم بدل دیں۔ ورنہ میں واپس یورپ چلا جاؤں گا۔''
''ہوں........ تو تم نے اصغر الدولہ کو ابا حضور کے بجائے ڈیڈی کہنا شروع کر دیا ہے؟'' نواب صاحب بولے۔
''ابا حضور........'' شمشیر الدولہ ایک دم ہنس پڑا۔ ''جب ہم چھوٹا تھا، تب بولتا تھا۔ اب ہم ان کو ڈیڈ بولتا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے، خود اصغر الدولہ بھی کافی مشکل میں ہے۔'' نواب صاحب بڑبڑائے۔ اور ہم دونوں ہنسی نہ روک سکے۔ نواب صاحب نے چونک کر ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ان کی پیشانی پر ندامت کے قطرے جگمگانے لگے۔ شمشیر الدولہ کی سمجھ میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ بھی ہنسنے لگا۔ تب نواب صاحب نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔
''اچھا، کھانا شروع کرو۔ وہ لوگ شرماتی ہیں۔ تمہاری بات اور ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے وہ اجنبی ہیں۔''
''اوہ........ یہ میرے جگری دوست ہیں انکل! گہرے دوست۔ میں نے ان لوگوں سے آپ کا بہت تعریف کیا ہے۔ آپ ٹھہریں، میں خود آنٹ کو بلا کر لاتا ہوں۔'' شمشیر الدولہ نے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔
''نہیں، نہیں۔ تم بیٹھو........ رتن! جاؤ، بیگم اور لڑکیوں کو بلا لاؤ۔'' نواب صاحب نے ایک ملازم سے کہا اور ملازم گردن جھکا کر چلا گیا۔ نواب صاحب کے چہرے سے ان کی دلی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن وہ بے بس تھے۔ شاید اصغر الدولہ ان کا ایسا ہی دوست تھا کہ وہ شمشیر کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ یا پھر نہ جانے کیا بات تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد تینوں لڑکیاں اور بیگم نواب کھانے کے کمرے میں آ گئیں۔
نواب صاحب نے خاموشی سے کھانے کا اشارہ کیا اور کھانا شروع ہو گیا۔ شمشیر الدولہ تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر کھانوں پر تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ خود کو ان کھانوں سے اجنبی ظاہر کر رہا تھا۔ یورپ کے کھانوں کی کیا بات تھی۔ ایک سے ایک شاندار، ایک سے ایک عمدہ........ نواب صاحب خاموشی سے برداشت کر رہے تھے۔ میں اور طالوت کافی محظوظ ہو رہے تھے۔ اور طالوت بار بار سیمیں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ لیکن سیمیں کا چہرہ سپاٹ تھا، اس سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ جبکہ دونوں لڑکیوں کو کئی بار ہنسی روکنے کی کوشش میں خاصی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بہر حال، نواب صاحب نے کھانا کچھ جلد ہی ختم کر لیا۔ لڑکیاں اور بیگم نواب بھی اٹھ گئیں۔ اور پھر وہ باہر ہی نکل گئی تھیں۔
''آپ لوگ بھی آرام کریں، شہزادہ عادل اور صائم! شام کی چائے پر آپ سے ملاقات ہوگی۔''
''چائے کے بعد ہم آؤٹنگ کریں گے انکل! آپ لوگ بھی ہمارا ساتھ دیں گے نا؟'' شمشیر الدولہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں مصروف ہوں۔'' نواب صاحب نے خشک سے انداز میں کہا اور پھر مڑ کر ایک طرف چل پڑے۔

''آیئے نواب شمشیر الدولہ! تھوڑی دیر گفتگو رہے۔'' طالوت نے شمشیر الدولہ کو دعوت دی اور وہ پھر چونک کر طالوت کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کسی خیال کے تحت یہ دعوت منظور کر لی اور اپنے دوستوں کے ساتھ ہمارے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں نے طالوت کی شکل دیکھ کر گہری سانس لی تھی۔ یقیناً وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ ہم کمرے میں آ گئے۔

''تشریف رکھئے۔'' طالوت نے کہا اور وہ بیٹھ گئے۔ شمشیر الدولہ کے دوستوں نے سگریٹ سلگا لئے تھے۔

''آپ کے بارے میں ہمیں اب تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔'' شمشیر نے کہا۔

''کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ نواب صاحب؟''

''آپ کی ریاست کہاں ہے؟''

''اوہ۔ وہ ایک چھوٹی سی ناقابلِ ذکر ریاست ہے۔ کہاں آپ لوگ، کہاں ہم۔'' طالوت نے کہا۔

''لیکن انکل پر آپ نے اچھا خاصا رعب جما رکھا ہے۔'' شمشیر الدولہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ وہ بے حد شریف اور نیک انسان ہیں۔''

''یہاں آپ کس سلسلے میں آئے ہوئے ہیں؟''

''بس ہمارا، آپ کا ایک ہی سلسلہ ہے۔'' طالوت نے کہا اور شمشیر الدولہ چونک پڑا۔

''کیا مطلب؟...... کیا آپ سیمیں......؟''

''ارے توبہ، توبہ۔ میرا مطلب تھا کہ میں بھی نواب صاحب کا مہمان ہوں۔ سیمیں تو آپ کی بچپن کی منگیتر ہے نواب صاحب!''

''ہاں...... نہ صرف منگیتر بلکہ وہ میرے اوپر جان بھی دیتی ہے۔ یورپ کے پندرہ سال میں نے اسی کی یاد کے سہارے گزارے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ایڈگر؟''

''قطعی نہیں۔ آپ ہر وقت ان کے لئے آہیں بھرتے تھے۔''

''سرد آہیں؟'' طالوت نے چونک کر پوچھا۔

''انتہائی سرد۔'' ایڈگر جلدی سے بولا۔

''تب تو آپ کو اپنے کمرے ایئر کنڈیشنڈ نہیں کرانے پڑتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے گرمیوں میں۔''

''کیا آپ ہمارا مذاق اُڑانا چاہتے ہیں؟'' شمشیر نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔

''ارے نہیں شمشیر الدولہ! ہماری یہ مجال؟'' طالوت نے جلدی سے کہا۔

''میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں، لیکن میرے ساتھی۔ یہ میرے بارے میں ایک بھی غلط لفظ سننا نہیں پسند کرتے۔''

''میں شرمندہ ہوں نواب صاحب! آپ کو میرے مذاق سے تکلیف پہنچی۔ دراصل ہم لوگ ہم عمر بھی تو ہیں۔ اس لئے تھوڑی سی بے تکلفی۔''

''میں اجنبیوں سے بے تکلفی کا قائل بھی نہیں ہوں۔'' شمشیر الدولہ نے کہا۔
''ہمارے درمیان اب اجنبیت کہاں ہے نواب صاحب!'' طالوت نے بڑی نرمی سے کہا۔
''لیکن یہ تعارف بھی زبردستی کا ہے۔ بہرحال آپ انکل جلال کے مہمان ہیں، اس لئے مجبوری ہے۔لیکن یہاں میری دوسری حیثیت ہے۔''
''میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ درحقیقت سیمیں کو آپ جیسا ہی شوہر ملنا چاہئے۔ باوقار شخصیت کا مالک۔''
''شکریہ۔لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اپنے بارے میں تفصیل چالاکی سے گول کر گئے ہیں۔''
''فرصت سے بتادوں گا نواب صاحب! بہت جلد سمجھ لیں گے۔'' طالوت نے معنی خیز لہجے میں کہا اور شمشیر اٹھ گیا۔
''ٹھیک ہے۔ میں بھی بے چین نہیں ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنے دوستوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد طالوت میری طرف دیکھ کر گردن ہلانے لگا۔
''گھامڑ نہیں ہے عارف صاحب!''
''اچھا ہے ٹل گیا۔ ذرا نواب صاحب کے خیالات تو معلوم ہونے چاہئیں۔'' میں نے کہا۔
''اوہ، ہاں.......کھانے کی میز پر خاصی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا ردِعمل معلوم ہونا چاہئے۔ کیا میں جاؤں؟''
''جاؤ بھئی۔تمہارے اختیارات وسیع ہیں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔
''کیا مطلب؟'' طالوت چونک پڑا۔
''میں خود تمہاری طرح نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ ورنہ میں بھی اس دلچسپ تفریح میں حصہ لیتا۔''
''ارے تم خواہش تو کرو میری جان! دقت تو یہ ہے کہ تم ابھی تک تکلف کرتے ہو۔تمہاری جو خواہش ہو، بیان کر دیا کرو۔ میں اگر پوری کرسکوں گا تو کردوں گا، ورنہ اس کا کوئی دوسرا حل سوچیں گے۔''
''کیا مطلب؟'' اس بار میں نے کہا۔
''تم بھی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہونا چاہتے ہونا؟''
''فرض کرو، چاہتا ہوں۔''
''تو پھر ہو جاؤ'' طالوت نے کہا اور بائیں طرف رخ کر کے آواز دی۔''راسم!''
''شہزادہ عبران۔'' راسم نمودار ہو کر بولا۔
''ذرا شاہ دانا کی اجرک لا دو۔مگر جلدی۔''
راسم نے گردن جھکائی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ چند ساعت کے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا اور اس نے ایک خوبصورت دوشالہ طالوت کی خدمت میں پیش کر دیا۔
''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے کہا اور راسم چلا گیا۔تب اس نے دوشالہ کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔
''اسے کندھوں پر ڈال لو۔ جب لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہو تو اسے سر پر اوڑھ لینا۔''
''کیا.......کیا واقعی؟'' میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔
''جھوٹ بولا ہے کبھی میری جان؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے دوشالہ اوڑھ لیا۔

''خوب۔ اب میرے علاوہ اور کوئی تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔''

میں حیرت سے طالوت کی شکل دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوں۔ لیکن طالوت کے لئے سب کچھ ممکن تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم دونوں نواب صاحب کی خواب گاہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں طالوت کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ ملازم ہمارے قریب سے گزر رہے تھے لیکن کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ حالانکہ عام حالات میں ان کے سانس پھول جاتے تھے۔

بہر حال مجھے یقین ہو گیا۔ طالوت کے اس تحفے سے میں بہت خوش تھا۔ طالوت پہلے بھی یہاں کی سیر کر چکا تھا، اس لئے وہ سیدھا نواب صاحب کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن ابھی ہم دروازے پر ہی تھے کہ اچانک عقب سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ نواب بیگم آ رہی تھیں۔ ہم جلدی سے ایک طرف ہٹ گئے۔ نواب بیگم نے خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور جونہی وہ اندر داخل ہوئی، طالوت نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم بڑی صفائی سے بیگم صاحبہ کے پیچھے داخل ہو گئے تھے اور یہ مناسب ہی ہوا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔

''یار!'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''کوئی غلط منظر نہ شروع ہو جائے۔''

''آنکھیں بند کر لیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ لیکن نواب صاحب کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی، اسی لئے سب خیریت رہی۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا نواب صاحب؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''جی۔'' نواب صاحب نے جواب دیا۔

''خیریت؟''

''کیا آپ خیریت سمجھتی ہیں؟'' نواب صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں نہیں سمجھی۔''

''یا سمجھنا نہیں چاہتیں؟''

''براہ کرم مجھے بتائیے۔ آپ خاصے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے خود بھی پریشانی سے کہا۔

''اگر آپ مضطرب نہیں ہیں بیگم! تو ہمیں حیرت ہے۔ کیا شمشیر کو دیکھنے کے بعد ہمارا سکون برقرار رہ سکتا ہے؟''

''شمشیر......'' بیگم صاحبہ نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یورپ میں پورے چودہ سال گزارے ہیں۔ چودہ سال کم نہیں ہوتے۔ فرنگیوں کی عادتیں اپنا لی ہیں۔ اپنے ماحول میں رہے گا تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے تو وہ پاگل معلوم ہوتا ہے اور یہ آپ کہہ رہی ہیں بیگم! جسے اس نے سب کے سامنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ کیا ہمارے ہاں اس سے قبل بھی ایسی کوئی واردات ہوئی ہے؟''

''میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی یہ اس کی محبت تھی۔ آخر وہ ہمارا بھی تو بچہ ہے۔''

''سوچنا پڑے گا بیگم! اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ...... کہ اپنی روایات کا جنازہ نکال

کر اس مردود کو اپنالیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں بیگم! آپ کو نہیں معلوم، تھوڑی دیر قبل کھانے کے کمرے میں اس نے کیسی فضول گفتگو کی تھی۔ افوہ! ہمارا وقار ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ دونوں........وہ دونوں دل ہی دل میں ہم پر کس قدر ہنس رہے ہوں گے۔ ہمیں خدشہ ہے بیگم! کہ نامعقول شمشیر ان دونوں سے بھی فضول گفتگو نہ شروع کر دے۔"

"ارے، آپ تو شمشیر سے سخت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

"قدرت ہم سے کوئی امتحان لے رہی ہے بیگم! اس شخص نے ہمارا سکون چھین لیا ہے۔ اب بتائیے، ہم اس کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ کیسے دیں جس نے اس کا نام تک بگاڑ دیا ہے؟ اس کی کوئی بات بھی تو سلیقے کی نہیں ہے۔ نہ معلوم اصغر الدولہ کا کیا حال ہوگا۔"

"اصغر الدولہ بیٹے پر جان دیتا ہے۔ اس نے اس کی شخصیت کو ضرور قبول کر لیا ہوگا۔" بیگم پریشانی سے بولیں۔

"اور سیمیں؟ کیا وہ اس نامعقول کو پسند کر لے گی؟"

"سیمیں بے زبان ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود میری بچی ہے۔ اسے آپ جس کے سپرد کر دیں گے، اسے قبول کر لے گی اور پوری زندگی گزار دے گی۔"

"لیکن کیا وہ زندگی ہوگی بیگم؟ افسوس ہم اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے اپنی بیٹی کے دشمن بن گئے۔"

"خدا نہ کرے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" بیگم روہانسی آواز میں بولیں اور نواب صاحب نے کہا۔

"ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے بیگم! اصغر الدولہ ہمارا جگری دوست ہے۔ ہم اس کی فطرت سے واقف ہیں۔ اگر ہم شمشیر کو ٹھکرا دیں تو وہ........وہ دوستی کو بالائے طاق رکھ دے گا۔ اور تم جانتی ہو، جلال آباد اس کے ہاتھ رہن ہے۔ اب تو اگر ہم خود کو بیچ دیں، تب بھی اس کی رقم واپس نہیں کر سکتے۔" بیگم نے گردن جھکا لی۔ طالوت نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"کچھ سوچئے بیگم!........کچھ سوچئے۔"

"میں کیا سوچوں؟ آپ کی پریشانی دیکھ کر تو میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالئے۔ اسے قبول کر لیجئے اور پھر سب کچھ اس کے حوالے کر کے گوشہ نشین ہو جائیے۔"

"لیکن اس شخص کو ہم کون سے دل سے قبول کریں بیگم؟ اس سے بہتر ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو بھی زہر دے دیں اور خود بھی زہر کھا کر ہمیشہ کے لئے ان جھگڑوں سے نجات حاصل کر لیں۔"

"سنیے تو سہی۔ خدارا اس طرح نہ سوچئے۔ ممکن ہے، سیمیں کو اس کی حرکتیں ناگوار نہ ہوں۔ ممکن ہے، شمشیر اسے پسند ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"کیا یہ ممکن ہے بیگم؟" نواب صاحب امید و بیم کی کیفیت میں بولے۔

"اس کا اندازہ لگا لیا جائے گا۔"

''وہ کس طرح؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔
''یہ آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ میں کسی نہ کسی طور سیمیں کی رائے معلوم کر لوں گی۔''
''ہمیں امید نہیں ہے کہ سیمیں اتنی بد ذوق ثابت ہو گی۔ تاہم ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ شمشیر الدولہ کو پسند کر لے۔ تا کہ ہمیں کسی مصیبت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔'' نواب جلال الدین تھکے تھکے انداز میں بولے۔
''خدارا آپ بھی خود پر قابو رکھیں۔ اس کی احمقانہ حرکتوں کو نظر انداز کر دیں۔ اسے بددل نہ کریں۔ مصلحت کا یہی تقاضا ہے۔''
''ٹھیک ہے بیگم! ہم خیال رکھیں گے۔ ظاہر ہے، نواب جلال الدین اب نواب کہاں، بیٹی کا سوداگر ہے۔ اپنی حرکتوں کے نتیجے میں بیٹی کو فروخت کر دیا ہے۔''
''خدا کے لئے........ خدا کے لئے۔'' بیگم صاحبہ، نواب صاحب سے لپٹ گئیں اور طالوت نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔
''نکل چلو یار! ماحول واقعی بگڑ گیا ہے۔ آؤ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے دروازے پر آہٹ پیدا کی اور بیگم صاحبہ جلدی سے نواب صاحب سے علیحدہ ہو گئیں۔ نواب صاحب خود اٹھ کر دروازے پر آئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ہم دونوں تیزی سے باہر نکل آئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اپنے کمرے میں تھے۔ طالوت کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ وہ احمقانہ انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔
''کیوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''کیا ہے یار!........ یہ سب کیا ہے؟''
''ڈھول کا پول۔'' میں نے جواب دیا۔
''بڑی عجیب بات ہے۔''
''کیوں؟........ عجیب کیوں؟''
''یہ تزک و احتشام، یہ نوکروں کی فوج، یہ ریس کے گھوڑے اور پھر یہ قرض........''
''نواب ہیں بھائی! ہمارے ہاں کے نواب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ریس کا شوق نواب صاحب کو لے ڈوبا ہے اور اب صرف کھال رہ گئی ہے۔''
''ایک بات ضرور کہوں گا۔'' طالوت نے متاثر لہجے میں کہا۔
''کیا؟''
''ہے شریف آدمی۔ طبیعتاً نیک ہے۔''
''ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''ابے تو کیا ہم شریف نواز نہیں ہیں؟'' طالوت بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔
''بالکل ہو بھائی! میں نے کب منع کیا ہے؟'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''تو کیا اب ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ اس نواب کا اتنا معمولی سا قرض نہیں ادا کر سکتے؟''
''بالکل نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم نواب کا قرض ادا کریں گے اور فوراً ادا کریں گے۔''
''صرف تھوڑی سی ترمیم قبول کرلو۔''
''پیش کرو۔'' طالوت نے مسخرے پن سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔
''یہ فوراً کا لفظ اُڑا دو۔ ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔''
''تیل......تیل کی دھار......اسے دیکھنے سے کیا ہوگا؟''
''اونہہ......محاورہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ابھی حالات کا جائزہ لو۔ ذرا ان سیمیں صاحبہ کا عندیہ لو، یہ کیا فرماتی ہیں۔ نئے دور کی انوکھی نسل ہے۔ ممکن ہے، موصوفہ اس چمپینزی کو دل و جان سے چاہنے لگیں۔ ایسی صورت میں ہم احمقوں کو سر پیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہ کرنا پڑے گا۔''
''ایں...... ہاں...... یہ تو درست ہے۔ خیر، حالات کا جائزہ لیتے ہیں، اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔'' طالوت نے میری بات مان لی۔

شام کی چائے پر ہی حالات بدلے ہوئے تھے۔ چائے لان پر ہی لگائی گئی تھی اور رنگ برنگی کرسیوں پر نواب صاحب، بیگم صاحبہ، سیمیں، نصرت، روحی کے علاوہ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ سیمیں نے ایک خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا اور اس میں بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ اسی طرح سپاٹ تھا۔ کوئی تاثر نہیں پایا جاتا تھا اس کے چہرے پر۔

ہم لوگ جونہی لان پر پہنچے، دوسری طرف سے شمشیر الدولہ اپنے جانبازوں کے ساتھ آتا نظر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔ لیکن بہرحال ہم ساتھ ہی لان پر پہنچے تھے۔ نواب صاحب نے کھڑے ہو کر ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔
''ہیلو عادل میاں!......ہیلو صائم!......آؤ شمشیر!'' انہوں نے کہا اور شمشیر کے لئے خاص طور سے اپنے نزدیک کی کرسی کھسکائی۔
''تھینک یُو انکل۔'' شمشیر نے اس اعزاز کو محسوس کر لیا اور گردن اکڑا کر بیٹھ گیا۔ ''ہیلو شیمی! کیسی ہو؟'' اس نے باقی سب کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔
''شکریہ......ٹھیک ہوں۔'' سیمیں نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔ کچھ گڑبڑ ہو چکی تھی۔ شاید سیمیں کی والدہ نے اسے حالات سے آگاہ کر دیا تھا، ورنہ سیمیں سے جواب نہ ملتا۔
چائے سرو ہونے لگی۔ اور چائے کے دوران شمشیر نے کہا۔ ''کیا آپ ہمیں آؤٹنگ کی اجازت دیں گے انکل؟''

''ہاں، ہاں۔ سیمیں اور نصرت وغیرہ تمہیں گرد و نواح کی سیر کرا دیں گی۔ شہزادہ عادل اور شہزادہ صائم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔'' نواب صاحب نے جلدی سے کہا۔
''اوہ......ضرور، ضرور۔'' شمشیر نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ ''آپ دونوں حضرات کب تک یہاں قیام کریں گے؟'' شمشیر نے براہِ راست ہم سے سوال کیا اور نواب صاحب کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس سے قبل کہ نواب صاحب بات برابر کرنے کی کوشش کرتے، طالوت جلدی سے بول پڑا۔
''آپ کے آنے سے قبل ہم یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ لیکن آپ کے آنے سے ماحول ہی بدل گیا ہے۔ اس رونق کو چھوڑ کر ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں؟ چنانچہ آپ فکر نہ کریں،

نواب شمشیر الدولہ! جب تک آپ کا قیام ہے، ہم بھی یہاں رہیں گے تاکہ آپ کو کسی بوریت کا احساس نہ ہو۔ آپ جیسی نایاب شے........ میرا مطلب ہے دلچسپ شخصیت کو چھوڑ کر واپس جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

طالوت کی گفتگو کے دوران میں سیمیں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ شمشیر کے بے تکے سوال پر سیمیں کے چہرے میں بھی تھوڑی سی تبدیلی ہوئی تھی لیکن طالوت کے جواب پر اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسری طرف نواب صاحب نے بھی اس جواب پر سکون کی سانس لی اور جلدی سے بولے۔

"ہاں، ہاں میاں!..... یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہوگی، اگر آپ یہاں قیام کریں۔"

شمشیر الدولہ خاموش ہو گئے۔ اب ان کے بولنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بہرحال چائے کے بعد نواب صاحب نے سیمیں سے کہا۔ "سیمیں بیٹے! مہمانوں کی خاطر مدارات کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہی ڈال دی گئی ہے۔ انہیں تکلیف نہ ہونے پائے۔"

سیمیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شمشیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تیار ہو جائیے۔"

"اوہ......صرف چند منٹ کی اجازت۔" شمشیر جلدی سے بولا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے واپس چل پڑا۔

"آپ لوگ بھی۔" سیمیں ہماری طرف رخ کر کے بولی۔

"جو حکم۔" طالوت نے کہا اور ہم دونوں بھی سیمیں کے رویّے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ "میں ان لوگوں کی فوراً گلوخلاصی کر دیتا۔ یعنی یہاں سے دال۔ فے۔ عین ہو جاتا۔ لیکن ان لوگوں کو بے سہارا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ انہیں ہماری ضرورت ہے اور یہ........ یہ لڑکی........ میرا مطلب ہے سیمیں۔ میرا خیال ہے وہ قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی ماں نے اس سے گفتگو کر لی ہے۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے کہا۔

"اجی اس لنگور کی کیا مجال جو اس حور کا بال بھی بیکا کر سکے۔" طالوت نے خیالی مونچھوں پر تاؤ پھیرتے ہوئے کہا۔

"محاورہ........ویری گڈ۔"

"اب تو ایسا ہی ہوگا۔" طالوت نے کہا اور پھر ہم اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

"راسم!" طالوت نے آواز دی۔

"آقا!" راسم حاضر ہو گیا۔

"دو انتہائی عمدہ قسم کے سوٹ درکار ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ ان کا جواب نہ ہو۔ ہم مقابلہ حُسن میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔"

راسم گیا اور واپس آ گیا۔ جدید تراش کے دو اعلیٰ درجے کے سوٹ موجود تھے۔ طالوت نے تیاری پر خاصا وقت صرف کیا اور پھر مجھے بھی بہت سی ہدایات دیں۔

پھر بوا ہی ہمارے کمرے میں آئیں۔ "سلام شہزادے بھیا! چھوٹی بی بی بلا رہی ہیں۔ باہر گاڑی

میں۔"

"ارے بوا! کہاں غائب رہتی ہیں آپ؟........ میری آنکھیں تو ہر وقت آپ کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔" طالوت نے کہا۔ بوا نے دانت پیس کر ہماری طرف دیکھا، پھر جلدی سے سنبھل گئیں۔

"جلدی چلو بھیا!........ بی بی جی........" اور پھر وہ جھپاک سے باہر نکل گئیں۔ ہم دونوں بھی ہنستے ہوئے باہر آ گئے۔ آج نواب صاحب کی کار بھی ہمارے استعمال میں تھی۔ ہماری کار بھی پورچ میں موجود تھی۔ اور شمشیر کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سیمیں کے نزدیک نصرت، روحی اور دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ شمشیر الدولہ کے تینوں بہادر بھی موجود تھے اور انہوں نے امریکن کاؤ بوائے لباس پہن رکھے تھے۔ خود شمشیر الدولہ بھی ایسے ہی لباس میں تھا۔ وہ خود میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف ہولسٹر لٹک رہے تھے، جن میں پستول کے دستے نظر آ رہے تھے۔ کندھے سے ایک نفیس رائفل بھی لٹک رہی تھی۔

"اوہ........ کیا شکار کا پروگرام ہے؟" طالوت نے پوچھا۔

"ہاں یقیناً۔ کیا آپ کی ریاست میں شکار نہیں کھیلا جاتا؟" شمشیر نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن دن میں۔" طالوت نے جواب دیا۔

"ابھی کون سی رات ہو گئی؟" شمشیر جلدی سے بولا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔ "آؤ سیمی!........ بیٹھو لڑکیو! اور ہاں، تم لوگ ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔" اس نے ہماری گاڑی کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

اور ایک لمحے کے لئے سیمیں نے رحم طلب نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھا۔ طالوت جلدی سے ان لوگوں سے بولا۔ "تشریف لائیے حضرات!" تینوں لڑاکے ہماری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ سیمیں، شمشیر کے برابر بیٹھ گئی اور باقی لڑکیاں عقبی سیٹ پر۔ شمشیر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ دوسری طرف ہماری گاڑی کا اسٹیئرنگ خصوصی طور پر طالوت نے سنبھالا تھا۔

"تم ڈرائیو کرو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں........ کیوں؟ اب میں اتنا گھامڑ بھی نہیں ہوں۔" طالوت نے جواب دیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اور پھر دونوں گاڑیاں نواب محل سے باہر نکل آئیں۔ شمشیر نے وہی حرکت کی تھی، جس کی توقع تھی۔ اس کی گاڑی بندوق کی گولی کی طرح باہر نکلی اور برق رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ہماری کار پُر وقار انداز سے آگے بڑھ رہی تھی۔

"اوہ........ مسٹر عادل! کیا آپ تیز ڈرائیونگ نہیں کر سکتے؟ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ یورپ میں تو لڑکیاں بھی اس سے تیز گاڑیاں دوڑاتی ہیں۔" ایڈگر بولا۔

"اوہ........ شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مسٹر ایڈگر!" طالوت نے کہا۔ اچانک اس نے گاڑی کو ریس دی اور پھر بریک لگائے۔ تینوں جیالے ہماری گردنوں پر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن کار کے دوسرے جھٹکے نے انہیں سیٹوں پر پھینک دیا۔ اور پھر تو طالوت نے وہ قیامت مچائی کی توبہ ہی بھلی۔ وہ جھٹکوں سے گاڑی چلا رہا تھا اور پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کا برا حال تھا۔ انہوں نے کئی بار اپنے ہیٹ اٹھا کر سروں پر جمائے تھے۔ ان کے حلیے بگڑ گئے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی دقت ہو رہی تھی، مگر ان سے کم۔

"مم........ مسٹر عادل!........ یہ کک........ کیا........ کیا........؟" نائیڈے جھٹکوں کے دوران کہہ

رہا تھا۔
"ہماری ریاست میں گاڑی چلانے کا یہی انداز ہے، مسٹر نائیڈے!" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شمشیر کی کار اب نظر آنے لگی تھی۔ وہ گدھا رفتار بڑھائے جا رہا تھا۔ لیکن طالوت نے بھی خاصی رفتار رکھی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جھٹکے بھی جاری تھے اور تینوں بہادروں کا کچومر بن رہا تھا۔ وہ گدھوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ آج بھی زوبی فال ہی کا رخ کیا گیا تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے ہم زوبی فال پہنچ گئے۔ شمشیر نے گاڑی روک دی تھی۔ طالوت نے بھی اپنی کار ان کے قریب روک دی۔ شمشیر مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے طالوت کی طرف رخ کر کے کہا۔
"میرا خیال ہے شہزادہ عادل! آپ کو کار دوڑانے کی زیادہ مشق نہیں ہے۔"
"ہاں....... ہمارے ہاں کاروں کا استعمال کم ہی ہے۔ ہم مردانہ سواری زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے گھوڑے۔"
"اوہ....... رائیڈنگ کا مجھے بھی شوق ہے۔ فرینکفرٹ رائیڈنگ کلب سے تین سال تک رائیڈنگ کا اعلیٰ اعزاز حاصل کرتا رہا ہوں۔"
"چوتھے سال کیا ہوا شمشیر صاحب؟" طالوت نے پوچھا۔
"چوتھے سال ہم نے فرینکفرٹ چھوڑ دیا تھا۔" شمشیر جلدی سے بولا پھر کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے کل آپ سے مقابلہ ہو جائے۔"
"آپ انکل جلال الدین کے مہمان ہیں، آپ کے لئے تفریحات مہیا کرنا ہمارا فرض ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیوں سیمیں صاحبہ؟" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
سیمیں صرف مسکرا کر رہ گئی۔ تیز رفتاری سے لڑکیاں بھی بدحواس تھیں لیکن پُر لطف کیفیت ان جانبازوں کی تھی جو کراہتے ہوئے کار سے اتر رہے تھے۔
"ارے تم لوگوں کو کیا ہوا؟" شمشیر الدولہ نے چونک ان سے پوچھا۔
"شہزادہ عادل ڈرائیورنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں معلوم ہوتے۔" پیڈرو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"مجھے اعتراف ہے۔ پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں۔" طالوت نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔
"مگر ہوا کیا؟" شمشیر نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔
"تمام راستے شدید جھٹکے لگتے رہے اور اب ہماری ریڑھ کی ہڈیاں جواب دے چکی ہیں۔" نائیڈے غرّایا۔
"اب ایسا بھی نہیں۔ ہم دونوں تو ٹھیک ہیں۔" طالوت پھر بولا۔ میں نے سیمیں کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ دیکھی تھی جسے وہ پی گئی۔ شمشیر برا سا منہ بنائے پلٹ پڑا تھا۔ پھر اس نے اپنا موڈ بحال کیا اور چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔
"کتنا حسین منظر ہے۔ آیئے شیمی! ہم سیر کریں۔" اس نے سیمیں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن سیمیں جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ شمشیر بھی اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔
"آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟" طالوت نے نائیڈے وغیرہ سے پوچھا۔

''آپ نے کسی قابل ہی کہاں چھوڑا ہے۔ ہم آرام کریں گے۔'' نائیڈے نے جواب دیا۔
''تھوڑی دیر سو جائیے، تھکن دور ہو جائے گی۔ آؤ نصرت! آؤ'' طالوت لڑکیوں سے بولا۔ سیمیں کی اس انوکھی بد اخلاقی پر وہ بھی حیران تھیں۔ بہر حال وہ بلا چوں و چرا ہمارے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ ان تینوں وحشیوں سے وہ بھی خوف زدہ معلوم ہوتی تھیں۔ نصرت اور روحی ہمارے برابر چل رہی تھیں۔
''ایک بات پوچھوں؟'' روحی نے اچانک طالوت سے پوچھا۔
''ضرور مس روحی!''
''ان تینوں کا حلیہ آپ نے کس طرح بگاڑا؟''
''ارے بس، خود بخود بگڑ گیا۔ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' طالوت نے معصومیت سے جواب دیا۔
''ناممکن۔ آپ لوگوں کی شرارت ہے۔ معاف کیجئے گا اس بے تکلفی کے لئے۔''
''احساس بھی نہ دلایئے۔ ورنہ ان کے پاس چھ پستول ہیں۔'' طالوت نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا اور روحی ہنسنے لگی۔ نصرت میرے ساتھ چل رہی تھی۔ بقیہ لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔
''صائم صاحب!'' اچانک نصرت نے آہستہ سے کہا اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''آپ لوگ عرصہ تک نہ بھلائے جا سکیں گے۔ آپ بہت بڑے لوگ ہیں۔ ممکن ہے، آپ ہمیں آسانی سے فراموش کر دیں۔''
''آسانی سے نہ کہیں نصرت صاحبہ! ہمیں بھی خاصی مشکلات پیش آئیں گی۔''
''اجنبیوں سے اتنی اُنسیت کیوں ہو جاتی ہے صائم صاحب؟'' نصرت عجیب سے انداز میں بولی۔
''دل کا کام بغاوت ہے۔ اس پر قابو رکھنا ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اس لڑکی کو بہکانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے چند الفاظ اسے بھٹکا سکتے تھے اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔
''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ بہر حال آپ دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ میں شاید زندگی کے کسی دور میں آپ کو نہ بھول سکوں۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولی اور پھر جلدی سے کہنے لگی۔ ''شمشیر صاحب کے آ جانے سے ماحول کسی قدر مکدر ہو گیا ہے۔ لیکن میں آپ لوگوں کی بڑائی کی قائل ہوں۔ آپ نے جس طرح بوا کو نظر انداز کیا تھا، اسی طرح انہیں بھی کر رہے ہیں۔''
''اوہ، وہ کچھ نہیں۔ ہاں اگر آپ پسند کریں تو چند راز کی باتیں مجھے بتا دیں۔'' میں نے کہا۔
''ضرور پوچھئے۔'' وہ مستعدی سے بولی۔
''کیا سیمیں، شمشیر کو پسند کرتی ہیں؟''
میرے اس سوال پر نصرت نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولی۔ ''اس سوال کا جواب آپ ہی دے دیں صائم صاحب! کیا کوئی مشرقی لڑکی شمشیر کو پسند کر سکتی ہے؟''
''میرے لئے ٹیڑھا سوال ہے۔''
''ازراہِ تکلف کچھ نہ کہیں۔ بہر حال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ سیمیں بچپن سے شمشیر سے منسوب ہے۔ ہمارے خاندانی اقدار اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم والدین سے بغاوت کریں۔''
''کیا آپ کو سیمیں کے دل کا حال معلوم ہے؟''
''میں اور روحی اس کی گہری دوست ہیں۔''

''لیکن شمشیر کے ساتھ اس کا رویہ؟''
''وہ اپنے والدین کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی۔ براہِ کرم اس بارے میں اور کوئی سوال نہ کریں۔''
نصرت نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔ یوں بھی مجھے یقین تھا کہ سیمیں کے رویئے میں تبدیلی کسی خاص ہی بنا پر ہے۔ بہر حال، طالوت ان لوگوں کا مسئلہ حل کرنے پر تیار تھا اور یہ بے حد مسرت کی بات تھی۔
میں نے رک کر دُور تک نگاہ ڈالی۔ نہ جانے شمشیر، سیمیں کو لے کر کہاں نکل گیا تھا۔ وہ بدفطرت انسان سیمیں کے ساتھ کوئی بدسلوکی بھی کر سکتا تھا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور طالوت رک گیا۔ وہ میرے نزدیک آ گیا تھا۔
''جنگل ہے عادل! کہیں سیمیں خاتون کسی دشواری میں نہ گرفتار ہو جائیں۔''
''اوہ ہاں...... آیئے، انہیں تلاش کریں۔'' طالوت بولا اور ہم نے رخ بدل دیا اور پھر ہم تیزی سے اس طرف چل پڑے جدھر شمشیر وغیرہ گئے تھے۔ دور سے وہ ہمیں پتھروں پر بیٹھے نظر آ گئے۔ سیمیں سر جھکائے بیٹھی تھی اور شمشیر اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا غالباً اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم سب ان کے نزدیک بیٹھ گئے۔
''بھئی آج کی سیر میں لطف نہیں آ رہا۔ کیوں شمشیر صاحب! کیا اس حسین ندی میں نہ نہانا گناہ نہیں ہے؟'' طالوت نے کہا۔
''اس وقت؟...... اور پھر پانی ٹھنڈا ہے۔''
''ارے ہاں...... آپ کو زکام ہو جائے گا۔ آؤ صائم! ہم لوگ نہائیں۔''
''ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' شمشیر نے کہا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا اور پھر وہ سیمیں کی طرف رخ کر کے بولا۔ ''آپ کی اجازت سے۔''
میں اور طالوت اس طرح ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چلے گئے تھے، جیسے لباس اتار رہے ہوں۔ میں طالوت کی چال نہیں سمجھ سکا تھا، اس لئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔
''کیا کر رہے ہو؟ برف کا پگھلا ہوا پانی ہے۔ ایک غوطہ بھی لگا لیا تو اوسان خطا ہو جائیں گے۔''
''تو پھر؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''شیر دل شمشیر الدولہ کو نہانے دو۔'' طالوت نے کہا اور میں بے تحاشہ ہنس پڑا۔ ہم چند ساعت انتظار کرتے رہے۔ طالوت دوسری طرف جھانکتا رہا۔ پھر اس نے شمشیر کو پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' وہ بولا اور میرا ہاتھ پکڑے چٹان کی اوٹ سے نکل آیا۔ لڑکیاں ہماری منتظر تھیں۔ لیکن ہمیں لباس پہنے دیکھ کر وہ چونک پڑیں اور اچانک سیمیں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔
''کیوں......؟'' وہ بولی۔
''ہم نے پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ پانی واقعی ٹھنڈا ہے۔'' طالوت نے سوکھے منہ سے کہا اور لڑکیاں پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگیں۔ دوسری طرف شمشیر بہادر کا برا حال تھا۔ دانت بھنچ گئے تھے۔ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ جھونک میں، پانی میں کودتے ہی وہ دور نکل گیا تھا اور اب شاید اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔
''پانی ٹھنڈا تو نہیں ہے شمشیر صاحب؟'' طالوت نے ہانک لگائی۔ لیکن شمشیر صاحب کے منہ سے

آواز نہیں نکل سکی۔ البتہ وہ بدحواسی کے عالم میں کنارے کی طرف واپس آ رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ اوپر آئے۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ پورے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے اور وہ بری طرح کانپ رہے تھے۔

''دیکھا، میں نہ کہتا تھا، پانی ٹھنڈا ہوگا۔'' میں نے طالوت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک ہی کہتے تھے صائم بھائی!'' طالوت نے سعادت مندی سے کہا۔

''مم........ میرے........ سس........ سس........ ساتھیوں کو........ بب........ بلاؤ۔'' شمشیر بری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔

''ارے کیا بہت سردی لگ رہی ہے شمشیر بھائی؟'' طالوت نے تعجب سے پوچھا۔

''مم........ میرا........ لل........ لباس........'' شمشیر جانکنی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے نصرت کو اشارہ کیا اور نصرت اس چٹان کی طرف لپکی۔ دوسری طرف طالوت نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

''راسم! لباس۔'' اس کے الفاظ میں ہی سن سکا تھا اور میں نے واقعی شمشیر پر فاتحہ پڑھ لی۔ نصرت پریشان سی واپس آئی۔

''وہاں تو نہیں ہے۔''

''ہیں........ کہاں گیا؟ دیکھو تم لوگ۔'' میں نے شمشیر کی حالت سے پریشان ہوتے ہوئے کہا اور دوسری لڑکیوں نے وہاں سے کھسکنا ہی مناسب سمجھا۔ ہنسی روکنے سے ان کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ شمشیر اکڑوں بیٹھ گیا تھا اور سردی کھائے ہوئے کتے کے پلّے کی طرح کانپ رہا تھا۔

''کہاں مر گئیں کمبخت؟'' میں خود اس طرف بڑھ گیا، جہاں شمشیر بہادر نے لباس اتارا تھا۔ لیکن لباس ہوتا تو ملتا۔ طالوت بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ پھر سیمیں لڑکیوں کے ساتھ واپس آئی۔ وہ پریشان بھی تھی۔ لیکن چٹان کے دوسری طرف جا کر وہ بھی شاید خوب ہنسی تھی۔

''نہ جانے کہاں گیا۔'' وہ پریشانی سے بولی۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''اللہ........ صائم بھائی! ا ب ہی اپنا کوٹ دے دیجئے۔''

''اوہ........ ضرور۔'' میں نے جلدی سے کوٹ اتار کر سیمیں کو دے دیا۔

''سردی شاید زادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ لوگ اپنے دوپٹے بھی اوڑھا دیں۔''

''مم........ میرے........ سس........ ساتھیوں کو........'' شمشیر نے بمشکل کہا۔

''اچھا، اچھا۔ میں بلاتا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور تیزی سے ان لوگوں کی طرف بڑھ گیا جو ابھی تک اپنے جوڑ درست کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر شمشیر کو عجیب حالت میں کار تک لے جایا گیا۔ وہ میرا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی گردن میں بہت سے رنگین دوپٹے جھول رہے تھے۔

''آپ لوگ نواب شمشیر کو لے کر چلئے، ہم دوسری گاڑی میں آ رہے ہیں۔'' طالوت نے شمشیر کے ساتھیوں سے کہا۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔'' سیمیں نے کہا اور طالوت چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ سیمین ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی اور تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب کی کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی۔

طالوت نے ایک گہری سانس لی۔
"کہیں یہ بندہ راستے میں فوت نہ ہو جائے۔" روحی نے کہا۔
"نہیں روحی! ایسا مت کہو۔ وہ ہماری نسیمیں کا منگیتر ہے۔" نصرت نے سنجیدگی سے فہمائش کی اور روحی خاموش ہوگئی۔ ہم سب لوگ بھی طالوت کی کار کی طرف بڑھ گئے تھے۔
"مگر کپڑوں کا تعجب ہے۔ کپڑے کہاں گئے؟"
"یہ کسی کی شرارت بھی نہیں تھی۔ کوئی اس طرف نہیں گیا۔" ایک اور لڑکی سنجیدگی سے بولی۔
"لیکن اس نے پانی میں چھلانگ ہی کیوں لگائی؟' روحی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور طالوت میرے برابر بیٹھ گیا۔ نصرت نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ نہ جانے کیوں؟ اس کی ہنسی کے ساتھ ہی لڑکیوں کی ہنسی بھی اسٹارٹ ہوگئی۔
"آپ لوگ بھی تو چٹان کے پیچھے لباس تبدیل کرنے گئے تھے۔ پھر آپ نے ارادہ کیوں ملتوی کر دیا؟"
"صائم بھائی کہنے لگے کہ شمشیر الدولہ طاقت ور ہے۔ اس کے مقابلے میں تیرنا شرمندگی اٹھانا ہو گا۔ پھر پانی کے ٹھنڈے ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ اور میں بہرحال اپنے بیس دن بڑے بھائی کی بات کا احترام کرتا ہوں۔" طالوت نے جواب دیا۔
"افسوس، یہ مشورہ کسی نے شمشیر صاحب کو نہیں دیا۔"
جس وقت محل پہنچے تو وہاں کافی لے دے ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر دوڑ رہے تھے۔ شمشیر بہادر سخت بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ہم دونوں بھی انہیں دیکھنے گئے۔ نواب صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ بہرحال، شمشیر کے تینوں دوست اس کے گرد جمع تھے۔ ہم نے کچھ افسوس کے الفاظ کہے اور اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔
"بڑے انتہا پسند ہو یار!" میں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔
'ارے تو کیا میں نے اسے پانی میں دھکیل دیا تھا؟" طالوت لڑاکا بوڑھیوں کے سے انداز میں بولا اور میں ہنسنے لگا۔ طالوت بھی ہنسنے لگا تھا۔ "بہرحال، وہ دوپٹوں میں ملبوس بہت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔" طالوت نے ہنستے ہوئے کہا۔
"لباس غائب ہو جانا مشکوک ہے۔" میں نے کہا۔
"ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں رکھ سکتا۔" طالوت بولا۔ اور پھر عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔ "مگر اس لڑکی کا رویہ بے حد پُراسرار ہے۔"
"بالکل نہیں طالوت!" میں نے کہا۔
"کیوں، وہ کتنی بداخلاقی سے ہمیں چھوڑ کر چلی آئی تھی۔"
"اس کی مجبوریوں کو نظر انداز مت کرو۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے کہنے سے معاف کر دیا۔" طالوت نے لباس اتارتے ہوئے کہا۔
"کہیں مر ہی نہ جائے کمبخت۔" میں نے کہا۔
"اتنا باغیرت نہیں ہے۔ فکر مت کرو۔" ہم نے لباس تبدیل کیا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رات ہوگئی

تھی۔ باہر کی کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ پھر ہم اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ دروازے سے سیمیں کی شکل نظر آئی۔ وہ اندر آ گئی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

''خیریت مس سیمیں؟........اب کیسی حالت ہے؟'' طالوت نے چونک کر کہا۔ سیمیں کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''خیریت تو ہے سیمیں؟ کیا شمشیر........؟''

''نہیں، وہ ٹھیک ہیں۔'' سیمیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ ان کے لئے پریشان ہیں مس سیمیں؟'' طالوت نے پوچھا۔ لیکن سیمیں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے زمین پر ٹپک پڑے۔ طالوت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اضطرابی انداز میں سیمیں کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی شرارت پر سخت شرمندہ ہوں، مس سیمیں!........ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو دکھ پہنچا۔ بے فکر رہیں، شمشیر ٹھیک ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے۔''

''عادل صاحب! میں........ میں سخت شرمندہ ہوں۔'' سیمیں کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

''آپ........ کیوں؟'' طالوت نے تعجب سے پوچھا۔ لیکن سیمیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ طالوت پریشانی سے میری شکل دیکھنے لگا لیکن خود میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سیمیں کس بات کی معافی مانگ رہی ہے۔

''مس سیمیں!........ مس سیمیں!........ براہِ کرم........ براہِ کرم۔'' طالوت بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''دیکھئے، آنسو نہ بہایئے۔ مجھے دکھ ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔'' سیمیں نے سسکی کے سے انداز میں کہا۔ ''مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ شاید آپ مجھے سخت بداخلاق سمجھ رہے ہوں گے۔ میں ایسی نہیں ہوں عادل صاحب! میں ایسی نہیں ہوں صائم صاحب!........ ہماری کچھ گھریلو پریشانیاں ہیں، ہماری کچھ گھریلو مجبوریاں ہیں۔ میں........ میں ان کی وجہ سے مجبور ہوں۔ خدارا میرے بارے میں اپنے خیالات تبدیل نہ کریں۔ میں آپ لوگوں سے بہت متاثر ہوں۔ یہ ماحول آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھر دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ طالوت ہکا بکا رہ گیا تھا۔ پھر اس نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ میں خود سیمیں کی گفتگو پر غور کر رہا تھا اور اب یہ گفتگو میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے عارف؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہے طالوت!........ پوشیدہ راز کھل رہے ہیں اور بس۔''

''تفصیل سے بتاؤ یار! ورنہ پھر یہاں سے بھاگ چلو۔'' طالوت نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم نے اس مظلوم خاندان کو بھنور سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا، طالوت!''

''ارے تو مجھے کب انکار ہے؟........ لیکن کچھ سمجھ میں تو آئے۔ یہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ کیا سمجھانا چاہتی تھی؟''

''کار میں شمشیر کے ساتھ سفر، واپسی پر اس کے ساتھ آ جانا سب کو چھوڑ کر۔ وہ اس پر نادم ہے۔

لیکن شاید اس کے کانوں تک ماں باپ کی مجبوریاں پہنچ چکی ہیں اور اس نے خود کو ان کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

"اوہ........اس کا مطلب ہے کہ وہ اس ریچھ کو پسند نہیں کرتی۔"

"بہ الفاظِ دیگر........اس سے نفرت کرتی ہے۔ لیکن اپنے والدین کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے پوری زندگی اس کے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ یہ مشرقی لڑکیاں ایسی ہی سرپھری ہوتی ہیں۔"

"یہی تو ان کا حُسن ہے عارف! ایثار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن بہرحال ہم اسے اس ریچھ کے قبضے میں نہیں جانے دیں گے۔ آج تو رہنے دو، کل نواب صاحب سے کھل کر بات کرنا ہوگی۔"

"ریچھ کی حالت واقعی خراب ہوگئی ہے۔ کہیں مر نہ جائے۔"

"نہیں مرے گا۔ مجھے یقین ہے۔" طالوت نے وثوق سے کہا۔ "بہرحال، رات کو گشت کریں گے اور ہر جگہ کا جائزہ لیں گے۔ دیکھیں گے کہاں، کیا گفتگو ہو رہی ہے۔"

رات کے کھانے پر پورا خاندان ہی موجود تھا۔ لیکن بڑی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب لوگ جیسے کوئی فرض پورا کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد نواب صاحب ٹہلتے ہوئے ہم لوگوں کے ساتھ باہر آئے۔

"میں محسوس کر رہا ہوں شہزادہ صائم! کہ ہم آپ لوگوں کی مدارات نہیں کر پا رہے۔ آپ لوگوں کو یقیناً کوفت ہو رہی ہوگی۔"

"ہم تو یہاں پُرسکون ہیں نواب صاحب! بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔ لیکن بلا تکلف، اگر آپ لوگ ہماری وجہ سے کچھ اُلجھن محسوس کر رہے ہوں تو بلا تردّد فرما دیں۔ ہمیں کوئی احساس نہ ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

"شہزادہ صائم! آپ لوگوں کی آمد میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ میں بدنصیب ہی آپ کے قابل نہیں ثابت ہوا۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ مزید کچھ وقت گزار دیں۔"

"آپ کی محبت میں اپنائیت ہے۔ ہماری طرف سے بے فکر رہیں۔ جب یہاں سے اُکتاہٹ محسوس کریں گے، آپ سے اجازت لے لیں گے۔"

"میں شکر گزار ہوں، آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔" نواب جلال الدین بولے۔ وہ ہمارے ساتھ کمرے تک آئے اور پھر ریس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ کافی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد وہ چلے گئے اور طالوت نے ایک گہری سانس لی۔

"میرا خیال ہے عارف! مکمل کوائف ہمارے علم میں آ چکے ہیں۔ اب کسی قسم کی چھان بین کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کھل کر نواب صاحب سے گفتگو ہو جائے گی۔ ہم انہیں مجبور کریں گے کہ اس ریچھ سے پیچھا چھڑائیں۔"

"اوکے........پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"گشت کا پروگرام بہرحال اپنی جگہ........آؤ، تیار ہو جاؤ۔ آج ابتدا سیمیں کے کمرے سے کریں گے۔"

"میں بھی؟" میں نے کہا۔

''''داناشاہ کا دوشالہ کیا اپنے کفن میں استعمال کرو گے؟'' طالوت نے کہا اور میں پھیکی ہنسی ہنس پڑا۔ بے شک اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، پھر بھی مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔
مزید کچھ دیر ہم نے انتظار کیا اور پھر جب رات خوب بھیگ گئی تو میں نے دوشالہ سر پر ڈالا اور طالوت نے خود کو نگاہوں سے گم کیا۔ تب ہم دونوں بہ آہستگی دروازہ کھول کر نکل آئے۔ محل کی چاردیواریاں سنسان پڑی تھیں۔ ایک عجیب سوگواری کیفیت طاری تھی۔ راستے میں طالوت نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔
''آؤ، اس لنگور کے منہ میں دوائے صحت اُنڈیلتے چلیں۔ اگر یہاں مر گیا تو نواب صاحب کو پریشانی ہوگی۔''
''دوائے صحت؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔
''راسم سے منگوائی تھی۔ اسی کے بھروسے پر میں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ نہیں مر سکے گا۔''
ہم لوگ اس طرف چل پڑے جہاں شمشیرالدولہ بستر مرگ پر محو استراحت تھے۔ کمرے میں اس وقت تینوں غلام تین کونوں میں سو رہے تھے۔ درمیان میں شمشیر کی مسہری تھی۔ ہم نے جھک کر شمشیر کی طرف دیکھا۔ واقعی بری حالت تھی۔ ڈبل نمونہ ہوا تھا کمبخت کو۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ طالوت نے جیب سے ایک چمک دار گولی نکالی، شمشیر کا منہ کھولا اور اس کے حلق میں ڈال دیا۔ شمشیر نے چند کراہیں لیں اور پھر بے خبر ہو گیا۔ طالوت گردن ہلا رہا تھا۔
''آؤ۔ اب سب ٹھیک ہے۔ اس نے کہا اور ہم واپس چل پڑے اور اب ہمارا رخ سیمیں کی خواب گاہ کی طرف تھا۔ ہم خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے اور پھر وہاں پہنچ گئے۔ سیمیں کی خواب گاہ کے سامنے ہم ٹھٹکے۔ اندر روشنی تھی۔ شاید سیمیں تیز روشنی گل کرنا بھول گئی تھی۔
طالوت نے میری طرف دیکھا۔ ''یار! اندر جھانکنا بری بات تو نہیں ہے؟ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔''
''جھانکنا تو پڑے گا۔'' میں نے کہا اور ایک کھڑکی کے شیشے سے آنکھ لگالی۔ سیمیں ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما ہوا تھا۔ میں نے طالوت کو اشارہ کیا اور وہ بھی جھانکنے لگا۔
''پریشان ہے بے چاری۔'' اس نے افسوس سے کہا۔
''اسے کس طرح تسلی دی جائے؟'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔
''اوہ......وہ اٹھ گئی۔'' طالوت بولا اور میں بھی اندر جھانکنے لگا۔ سیمیں نے سیاہ رنگ کی ایک چادر اٹھائی اور اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹنے لگی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
''ارے......یہ کہاں چل پڑی؟'' طالوت تعجب سے بولا اور ہم دونوں دروازے کے ایک طرف ہو گئے۔ سیمیں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس نے پیروں میں اسفنج کے خوب صورت چپل پہنے ہوئے تھے جس سے اس کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ یوں بھی وہ بڑی محتاط محتاط سی تھی۔
''اس وقت یہ کہاں جا رہی ہے؟''
''شاید شمشیر کو دیکھنے۔'' طالوت نے کہا۔
''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اس سے پہلے عورت کسی کی سمجھ میں آئی ہے؟'' طالوت تھکے تھکے سے انداز میں بولا۔
''آؤ، دیکھیں تو سہی۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ہم دونوں ایک مخصوص فاصلے سے اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ لان میں آ گئی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کا رخ ملازموں کے کوارٹروں کی طرف ہو گیا۔ میں اور طالوت دونوں حیران رہ گئے۔ بہرحال ہم اس کے پیچھے چلتے رہے۔ سیمیں بڑی احتیاط سے چل رہی تھی۔ پھر وہ ایک کوارٹر کے سامنے پہنچ گئی۔ تب اس نے ایک اور حرکت کی۔ وہ کوارٹر کے کواڑوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ درحقیقت بڑی حیرت انگیز بات تھی۔
لیکن اسی وقت ہم نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی اور چونک کر اس طرف دیکھا۔ ایک شخص اس طرف آ رہا تھا۔ سیمیں نے بھی چاپ سن لی اور اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ آنے والا، سیمیں کے قریب آ گیا۔ ہم نے بھی نزدیک سے اسے دیکھا۔ اُلجھے اُلجھے بالوں والا ایک حسین نوجوان تھا۔ چہرہ بے حد خوب صورت لیکن تفکرات کا شکار۔ معمولی سے لباس میں تھا۔
''کیا آپ مجھے تلاش کر رہی تھیں، مس سیمیں؟'' اس نے اُداس سی آواز میں پوچھا۔
''تم کہاں تھے احسان! اتنی رات گئے؟''
''برگد کا مہربان درخت ہر شام سورج چھپتے ہی میرا انتظار کرنے لگتا ہے۔ وہ ایک باپ کی طرح مجھے آغوشِ شفقت میں جگہ دے دیتا ہے اور پھر سکون سے، خاموشی سے میری کہانیاں سنتا رہتا ہے۔ بڑا مہربان درخت ہے وہ۔ اگر وہ نہ ہوتا مس سیمیں! تو میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔''
سیمیں خاموش کھڑی رہی۔ وہ کئی منٹ تک کچھ نہ بول سکی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔
''تم......تم نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا احسان! تمہیں یہاں کیا ملے گا؟''
''جتنی محرومیاں میرے مقدر میں ہیں، ضرور ملیں گی۔ انہیں حاصل کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔''
''مجھے اس مہربان درخت سے ملاؤ احسان! میں بھی اس کی زیارت کروں گی، جو دُکھے ہوؤں کو پناہ دیتا ہے۔'' سیمیں نے جذباتی انداز میں کہا۔
''آپ......آپ......مس سیمیں! آیئے! آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ وہ......وہ درحقیقت سکون کا درخت ہے۔'' نوجوان نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا اور سیمیں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
ہم دونوں حیرانی سے سر کھجا رہے تھے۔ اس نوجوان کا جغرافیہ سمجھ میں نہیں آیا تھا، یہ کون تھا؟ بہرحال ہم بھی ان دونوں کے پیچھے چل پڑے۔
''آؤ بھئی۔ ہم بھی ذرا اس سکون کے درخت کی زیارت کر لیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم برگد کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا اور اس کی شاخیں خاصی پھیلی ہوئی تھیں۔
''یہ میرا محسن، میرا بزرگ، میرا رازداں ہے۔'' نوجوان نے کہا۔
''سکون کے درخت!'' سیمیں نے ایک لٹکی ہوئی شاخ تھام کر ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں بھی سکون چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں انگارے سلگ رہے ہیں۔ میرا وجود تپتی ہوئی بھٹی بن گیا ہے۔ میری ہنستی کھیلتی زندگی ایک انقلاب سے دوچار ہو گئی ہے۔ مجھے بھی تھوڑا سا سکون دیدے..... مجھے بھی....''
سیمیں کی آواز رندھ گئی۔

''سیمیں !........مس سیمیں !........خدارا........میں خودکشی کرلوں گا۔ خدا کی قسم، کل صبح اس برگد کے پہلو میں میری لاش پڑی ہوگی۔ میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا مس سیمیں !........ورنہ........ورنہ مجھے بتا دیجئے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ میں آپ کی تکلیف دور کرنے کے لئے خوشی سے جان دے دوں گا۔'' نوجوان سخت اضطراب کے عالم میں بولا۔

سیمیں سسکیاں لیتی رہی اور نوجوان دور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے سخت غم کا اظہار ہورہا تھا۔ تب سیمیں کی آواز اُبھری۔ ''احسان!''

''مس سیمیں۔'' احسان ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو احسان؟........احسان! تم مجھے کیوں چاہتے ہو؟''

''کاش، آپ کو نہ چاہنا میرے بس میں ہوتا مس سیمیں !''

''کیا تمہاری چاہت کا صلہ، میرا جسم ہوسکتا ہے احسان؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''جسم؟'' احسان کے منہ سے غم زدہ آواز نکلی۔

''ہاں احسان!........میں تمہارے طویل مجاہدے کا صلہ دینا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں وہ سب کچھ دینے آئی ہوں، جو تمہاری طلب ہے۔ کیونکہ میری قیمت اچانک بہت گرگئی ہے۔ میں بے مول ہوگئی ہوں۔ زروجواہر کے ایک حقیر سے انبار کے عوض مجھے فروخت کردیا گیا ہے۔ میں جو خود کو بہت بلند سمجھتی تھی، میں جو اپنی قیمت کا تعین نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن اچانک مجھے اپنی حیثیت معلوم ہوگئی ہے........مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں کس قدر حقیر ہوں۔ زروجواہر کے جو ڈھیر میری قیمت کی حیثیت سے دیئے گئے ہیں، وہ تمہاری محبت کے سامنے بے حقیقت ہیں احسان! تب مجھے احساس ہوا کہ غرور میں، میں اپنے آپ کو بہت قیمتی شے سمجھتی رہی۔ میں نے خود کو تمہاری محبت سے بلند سمجھا تھا، اسی لئے میں تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب میرے دل میں اچانک یہ احساس پیدا ہوا کہ میری قیمت ناکافی لگائی جارہی ہے۔ اور جب میرے سوداگر مجھے اس معمولی قیمت پر فروخت کرنے کو تیار ہوگئے ہیں تو میں نے سوچا کہ میں اپنی وہ قیمت کیوں نہ وصول کروں جو اس سے کہیں عظیم ہے۔ میں تمہاری محبت قبول کرنے آئی ہوں احسان!........میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔ ہاں احسان!........میں تمہیں بے پناہ چاہتی ہوں۔ بس میں خواہش مند تھی کہ تم مجھے میری صحیح قیمت دے سکو۔ لیکن میری جو قیمت لگائی گئی ہے، وہ تمہاری محبت کے سامنے بے حقیقت ہے۔ چنانچہ میں تمہاری محبت کی قیمت پر خود کو فروخت کرنے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری محبت کا سودا منظور ہے۔ بولو، اپنی محبت کے عوض مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میرا جسم آج کی رات تمہارا ہے۔ میری روح ہمیشہ کے لئے تمہاری ہے۔ آؤ، اپنی محبت کا صلہ وصول کرلو۔'' سادہ لوح سیمیں جذبات میں دیوانی ہورہی تھی۔

تب احسان آگے بڑھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے لرزتے ہوئے قدم آگے بڑھے۔

''میری محبت کا صلہ تو میری چاہت سے کہیں زیادہ مل گیا سیمیں !........جسم بے حقیقت شے ہے۔ انسان کا وجود تو روح سے ہے۔ تم بتاؤ، جب روح مل جائے تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے؟ کیا بے روح جسم کی کوئی حقیقت ہے؟ میری پسند مجھے مل چکی ہے سیمیں ! اب یہ بچا کھچا جسم کسی کو دے دو۔ مجھے ذرہ برابر تردد نہ ہوگا۔''

"احسان........!" سیمیں اس سے لپٹ گئی اور طالوت گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
"ربّ کا شکر ادا کر بھائی! جس نے ہماری بہنیں بنائیں۔"
مجھے ہنسی آ گئی لیکن بہر حال میں نے خود کو سنبھالا۔
یہ سب کچھ انتہائی غیر متوقع اور عجیب تھا۔
"ابے، اب الگ بھی ہو گے؟" طالوت دانت پیس کر بولا۔ لیکن ان دونوں نے اس کی سرگوشی نہیں سنی تھی۔ میں ہنستا رہا۔ وہ کئی منٹ تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے، پھر احسان نے سیمیں کو سنبھالا اور اسے لئے ہوئے برگد کی آغوش میں بیٹھ گیا۔
"میری سیمیں! کیا مجھے حقیقت نہ بتاؤ گی؟....... مجھے بتا تو دو سیمیں! کہ اچانک مجھے یہ سب کچھ کیسے مل گیا؟"
"زندگی میں پہلی اور آخری بار تمہارے پاس آئی ہوں احسان! سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں بچپن سے الوری کے نواب اصغر الدولہ کے بیٹے شمشیر الدولہ سے منسوب ہوں۔ نواب جلال الدین ریس کے بے پناہ شوقین ہیں۔ اصغر الدولہ ان کے بچپن کے دوست ہیں اور صرف انہیں نواب جلال الدین کی حقیقت معلوم ہے۔ نواب صاحب نے نہ صرف جلال آباد بلکہ خود اپنے بیوی بچوں کو بھی اصغر الدولہ کے ہاتھوں رہن رکھ دیا ہے۔ یہ تمام دولت ریس کی نذر ہوئی ہے۔ یوں سمجھو احسان! کہ ہماری یہ جاہ و حشمت نواب اصغر الدولہ کی رہین منت ہے۔ مجھے معلوم تھا احسان! کہ میں شمشیر سے منسوب ہوں۔ اس لئے میں نے تمہیں چاہتے ہوئے بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کیا کیونکہ یہ سب کچھ بے مقصد تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک دن مجھے شمشیر الدولہ کے ساتھ چلے جانا ہے۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ شمشیر الدولہ ایک نواب کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس قدر گھٹیا انسان ہو گا۔ یقین کرو احسان! اسے انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ میں نے اسے دیکھا اور لرز گئی۔ مجھے اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید میرے والدین اسے ٹھکرا دیں گے، خود کو فروخت کر دیں گے اور مجھے اس سے بچا لیں گے۔ لیکن پھر مجھے ہدایت دی گئی کہ میں اس کا خیال رکھوں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میرے والدین مجبور ہیں۔ ان کی عزت خطرے میں ہے۔ اور مجھ سے توقع کی گئی کہ میں خاندان کی عزت کی لاج رکھوں گی۔
میں جانتی ہوں احسان! کہ میں ایسا ہی کروں گی، جیسا کہ مجھ سے کہا گیا ہے۔ مجھے اسی بدنما انسان کے ساتھ زندگی گزارنا ہو گی۔ تب میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میں نے سوچا، قدرت کی طرف سے مجھے یہ سزا کیوں ملی ہے۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے تمہاری محبت کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔ تم....... جس نے میرے لئے اپنے مستقبل کو تاریک کر لیا تھا....... اور پھر سکونِ دل تلاش کرنے تمہارے پاس آ گئی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں احسان! میں تمہیں چاہتی ہوں۔ زندگی کے آخری سانس تک چاہتی رہوں گی۔ میرے دل کے تار تمہارے دل کے تاروں سے منسلک رہیں گے۔ میں جہاں بھی رہوں گی، تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔ بس اس کے بعد میں تمہیں کچھ اور نہ دے سکوں گی۔"
"اس کے بعد مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے سیمیں! میں تو....... میں تو سب کچھ پا چکا ہوں۔ تمہاری محبت ہی تو میری زندگی ہے۔ اُٹھو سیمیں! میں اپنی چاہت کو حقیر نہیں سمجھتا۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا کی نگاہیں تم تک پہنچیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی ذہن میں تمہارے بارے میں کوئی برا خیال

آ ئے۔ سنو سیمیں! میں زندہ رہوں گا۔ میں تمہاری محبت کو دل کے ان گوشوں میں پوشیدہ رکھوں گا جہاں تصور تک نہ پہنچ سکے۔ میں اپنی زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ تلاش کرلوں گا۔ میں خودکشی نہیں کروں گا کہ لوگ اس خودکشی کے اسباب پر غور کریں۔ بس تم خاموشی سے واپس چلی جاؤ۔ تمہاری امانت زندگی بھر میرے پاس رہے گی۔ اور میں خوشی سے زندگی گزار سکوں گا۔ اُٹھو سیمیں!........اُٹھ جاؤ۔ میں برگد سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ ہمارے راز کو قیامت تک راز رکھے۔ بس اب جاؤ۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ سیمیں!........وقت نہ برباد کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانے کی آنکھ کھل جائے۔"

اس نے سیمیں کو کھڑا کر دیا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اٹھا کر چوم لئے۔ "سیمیں! خدا حافظ۔ خود کو سنبھالے رکھنا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ۔"

اور سیمیں واپس مڑ گئی۔ طالوت کے قدم جم گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سیمیں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ متعجب نگاہوں سے احسان کو دیکھ رہا تھا۔ احسان خاموش کھڑا تھا۔ کسی ستون کے مانند۔

اور سیمیں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ احسان اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ ہم دونوں برگد کے نیچے کھڑے رہ گئے۔

"یار! تیری اس دنیا میں کیا کیا ہے؟........یہاں اگر بدمعاش ہیں تو پیٹ بھر کر۔ اور شریف ہیں تو وہ بھی انتہا کو پہنچے ہوئے۔ اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" طالوت گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ "اس کا مطلب ہے کہ سیمیں صاحبہ ہم دونوں میں سے کسی سے بھی متاثر نہیں تھیں۔ یعنی صرف خوش اخلاقی برت رہی تھیں۔"

"بہرحال، وہ نیک لڑکی ہے۔" میں نے کہا۔

"ابے تو ہم کون سے برے ہیں؟........مگر یار! ان خان صاحب کا راز معلوم کرنا ضروری ہے۔ آخر یہ احسان خان ہیں کیا شے۔"

"بڑا کٹھن ہوگا، طالوت! وہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"ہاں۔ مجھے احساس ہے۔ اور یقین کرو، زندگی میں پہلی بار کسی کام میں بے بسی محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی زبان کھلوانے کی ترکیب سوچو۔ میرا خیال ہے، یہ کام جلد از جلد ہونا چاہئے۔" طالوت نے کہا۔

"ہوں!" میں نے گردن ہلائی۔ ترکیب تو میری سمجھ میں بھی کوئی نہیں آ رہی تھی۔ جب کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئے تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ سب کچھ سچ سچ بیان کر کے اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی فیصلہ کیا گیا۔ میں نے دوشالہ اتار لیا اور طالوت سے بھی سامنے آ جانے کی درخواست کی۔

"کچھ سوچا؟" طالوت بولا۔

"ہاں........آؤ، ایک ترپ لگاتے ہیں۔ ممکن ہے، کامیاب ہو جائے۔" میں نے کہا اور پھر میں اور طالوت خاموشی سے اس کے کوارٹر کی طرف چل پڑے۔

طالوت نے آہستہ سے دستک دی اور اندر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ شاید احسان یہی سمجھا تھا کہ کسی خاص بات کو یاد کر کے سیمیں واپس آ گئی ہے۔

لیکن ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ ظاہر ہے، وہ بھی محل میں کسی ملازم کی حیثیت سے تھا اور ہمیں پہچانتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ........آپ........''

میں اور طالوت اندر داخل ہو گئے۔ طالوت نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ احسان اسی طرح کھڑا تھا۔ طالوت اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ واقعی بے حد پُرکشش نوجوان تھا۔

''بیٹھنے کو بھی نہ کہو گے احسان؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آ........آپ شہزادے صاحب! یہاں........غریب خانے پر؟''

''دیکھو یار! ہم ذرا کمیونسٹ ٹائپ کے شہزادے ہیں، اس لئے تکلف کو دروازے کے باہر پھینک دو۔ اور ہاں، اگر ہماری خاطر مدارات کرنا چاہتے ہو تو ذرا چائے وغیرہ پلاؤ۔'' میں نے بے تکلفی سے کمرے کے اکلوتے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ احسان اب بھی اسی طرح کھڑا پاگلوں کی طرح ہمیں گھور رہا تھا۔

''کیوں، کیا پتی ختم ہو گئی ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''مم........مگر........'' احسان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کی چائے آپ کے شایانِ شان ہو گی؟''

''پہلے ایک بات بتاؤ'' طالوت بولا۔ ''ہماری تمہاری کوئی دشمنی ہے؟'' احسان نے سادگی سے گردن نفی میں ہلا دی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔

''دشمنی نہیں ہے تو پھر یقیناً دوستی ہے۔ اور نہیں بھی ہے تو اس کے ہونے کے امکانات ہیں۔''

''لیکن میں........میں شہزادے صاحب! آپ کی دوستی کے قابل کہاں ہوں؟''

''گویا ہمیں گدھا کہنا چاہتے ہو۔ یعنی ہمیں دوست بنانے کی تمیز بھی نہیں۔ کیوں؟''

''مم........میں شرمندہ ہوں۔'' احسان جلدی سے بولا۔

''بس تو پھر چائے پلا دو۔ دودھ نہ ہو تو بغیر دودھ کی۔ شکر موجود نہ ہو تو نمک کی بھی چل سکتی ہے۔ کیوں صائم؟''

''یقیناً'' میں نے گردن ہلا دی۔ احسان احمقوں کی طرح گردن ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اور پھر اس نے نہایت پھرتی سے چائے بنالی اور پیالوں میں انڈیل کر لے آیا۔

''جب آپ مجھے عزت بخشنے پر تلے ہوئے ہیں تو میں کوئی تکلف نہیں کروں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے، پیالے ہمیں پیش کر دیئے۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔ پھر بھی حیرت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

''تھوڑی سی تصحیح کر لو۔ عزت نہیں، دوستی بخشنے پر تلے ہوئے ہیں۔ قبول کر لو گے؟''

''میں شکر گزار ہوں۔''

''تب پھر لاؤ ہاتھ۔'' طالوت نے ایک ہاتھ سے پیالہ تھاما اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ احسان نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔

''کبھی پہلے بھی دوستی کی ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جی......؟'' احسان چونک پڑا۔

''میرا مطلب ہے، ہاتھ ملا کر دوستی نبھانا بھی جانتے ہو؟''

''کوشش کروں گا کہ اس دوستی پر زندگی نثار کر دوں۔'' احسان نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''تب سنو دوست! ہمیں تمہاری دوستی درکار ہے، زندگی نہیں۔ اور یہ بھی سنو، دوستی میں خلوص پہلی شرط ہے۔ ایک دوسرے کی نیت پر شک کرنا گناہِ عظیم ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟''

''بالکل درست ہے۔''

''پھر ٹٹول لو دل کو۔ زبردستی کے دوستوں کو دل سے قبول کر سکتے ہو یا نہیں؟''

''عادل صاحب! پوری دنیا میں ایک بے سہارا انسان ہوں۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔ اگر کچھ ہمدرد مل جائیں تو میرے لئے سرمایۂ حیات ہوں گے۔''

''تو سمجھ لو، ہم مل گئے۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ دوستوں کے مل جانے کے بعد انسان نہ تو بے سہارا ہوتا ہے نہ تنہا۔ آج سے یہ لفظ اپنی لغت سے خارج کر دو گے۔''

''شاید خدا کو میری کوئی بات پسند آ گئی ہے، جو مجھے آپ جیسے لوگوں کا سہارا مل گیا۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں، کون سی بات پسند آ گئی ہے۔ بتاؤں؟'' میں نے کہا۔

''بتا دو...... بتا دو۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''شاید یہ احسان کہ ایک مایوس لڑکی ذہنی خلجان اور شدید مایوسی کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کرنے آئی تھی۔ لیکن تم نے اس کی روح کو قبول کر کے، اس کے جسم کی حفاظت کی۔ اس کی عفت کی حفاظت کر کے تم نے اس دور میں بھی فرشتوں کے وجود کو ثابت کر دکھایا۔'' میں نے براہِ راست کہا۔

میرے ان جملوں سے طالوت بھی چونک پڑا تھا۔ احسان کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ گرم چائے نے اس کے پیروں کو جھلسا دیا۔ لیکن اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ سخت ذہنی ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا وہ۔ پھر اس نے پھٹی پھٹی، عجیب سی آواز میں کہا۔

''تمہیں...... یہ سب کچھ...... کیسے معلوم ہوا؟'' عجیب سخت آواز تھی۔ بالکل بدلی ہوئی۔

''اتفاق سے۔ ہم لوگ رات کو چہل قدمی کرنے کے عادی ہیں۔ اتفاق سے اس طرف آ نکلے۔ یہ

وہ وقت تھا، جب تم سیمیں کے ساتھ برگد کے درخت کے نیچے آئے ہوئے تھے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن........لیکن کسی اور کو ہمارے راز سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی اور شخص کو زندہ نہ رہنا چاہیے جو اس راز سے واقف ہو۔ میں......میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔ میں........میں........'' وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ چہرے پر ایک خوفناک وحشت برسنے لگی تھی۔
''کیا تم دوستوں سے زندگی چھین لیتے ہو احسان؟ کیا تم دوستی کا اقرار کر کے دوستوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟''
''تب........تب پھر تم مجھے قتل کر دو۔ میں اس خوف کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا کہ میری سیمیں کا راز کسی کو معلوم ہے۔'' اس نے اچانک دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''میں نے یہ راز اپنے سینے میں دفن کر لیا تھا۔ افسوس........افسوس!'' وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔
میں اٹھا اور میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''احسان! میرے دوست! ایک راز تمہارے سینے میں دفن ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوستوں سے کوئی خوف ہے تو اب ہم تم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں قتل کر دو۔ ہاں، یہیں قتل کر دو۔ یا پھر ہم سے کہو کہ ہم دوستی کے نام پر خودکشی کر لیں۔ اور اگر ہماری زندگی چاہتے ہو تو پھر اعتبار کر لو کہ جس طرح یہ راز تمہارے سینے میں دفن ہے، اسی طرح ہمارے سینوں میں بھی رہے گا۔''
احسان نے گردن اٹھا کر دیکھا اور پھر آنسو خشک کرتے ہوئے بولا۔ ''میری خوش قسمتی ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہیں آتا کہ آپ جیسے لوگ میرے دوست ہیں۔''
''جب اعتبار کر لو تو ہمیں بتا دینا۔'' طالوت نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔
''میں اللہ کے بھروسے پر، آپ دونوں پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب میری زندگی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔''
''تب پھر دوستی کے نام پر چائے پیو۔ ایک خالی پیالہ لے آؤ۔ چائے کے دوران بات کریں گے۔'' طالوت نے کہا اور احسان باہر چلا گیا۔ طالوت نے تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ بہر حال میں نے ایک بڑا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ احسان اپنی چائے لے کر اندر آ گیا اور پھر وہ بیٹھ کر چائے پینے لگا۔
''ہاں تو مسٹر احسان! ہم تمہارا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''میں حاضر ہوں۔''
''پورا نام؟''
''احسان الحق۔''
''حالاتِ زندگی دہراؤ۔''
''والدین بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ دور کی ایک خالہ نے پرورش کی۔ کیونکہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ ابتداً ٹھیک رہی، لیکن جب خدا نے انہیں اولاد سے نواز دیا تو میری حیثیت ختم ہو گئی۔ اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی۔ زندگی مشکلات سے دوچار ہو گئی۔ فاقوں میں گزر بسر ہونے لگی۔ پندرہ سال کی عمر تک گزارہ کیا، پھر نکال دیا گیا۔ کیونکہ خالہ زاد بہن بھائی مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ تب سے محنت مزدوری کرتا رہا۔ ایم۔ اے کر لیا اسی طرح۔ سیمیں کلاس فیلو تھی۔ دل نے سب کچھ نظر انداز کر کے اسے

چاہنا شروع کر دیا۔ سیمیں بہت عظیم تھی۔ وہ خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ لیکن اس نے میری محبت کی کبھی پذیرائی نہیں کی۔ میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی لیکن سیمیں کا دیدار ہو جاتا تھا۔ پھر جب سیمیں کی تعلیم ختم ہوگئی تو وہ مجھ سے ملی۔ اس نے بتایا کہ اب وہ مستقلاً جلال آباد چلی جائے گی۔ اور میں نے اس سے صرف ایک درخواست کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے قریب رہنے کی اجازت دیدے۔ میں صرف اسے دور سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ خاموش ہوگئی تو میں اس سے پہلے جلال آباد چلا آیا اور سخت کوشش کر کے یہاں ملازم ہو گیا۔ میں نواب صاحب کے گھوڑوں کا نگراں ہوں۔ صرف اتنی سی کہانی ہے۔"

ہم غور سے اس شخص کی کہانی سن رہے تھے، جسے سیمیں بھی چاہتی تھی۔ دفعتہً طالوت نے پوچھا۔

"تمہیں یہاں آئے کتنا عرصہ گزر گیا احسان؟"

"زیادہ نہیں، صرف ڈیڑھ ماہ یا اس سے کچھ زیادہ۔"

"ہوں۔" طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اب ایک دوسری بات بتاؤ احسان!"

"پوچھیے۔" احسان نے چائے کا خالی پیالہ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم سیمیں کو شمشیر کے حوالے کرنے کو تیار ہو؟"

"میں......" احسان کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ کئی منٹ تک اس کی حالت خراب رہی، پھر وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں جس قدر بے حقیقت انسان ہوں، آپ کو معلوم ہے۔"

"دوستوں پر بھروسہ تو کر سکتے ہو۔ فرض کرو، ہم یہ نہ چاہیں کہ سیمیں تم سے جدا ہو تو کیا تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرو گے؟"

"آپ......آپ......لیکن آپ......آپ سیمیں کی مکمل گفتگو سن چکے ہیں۔ اس کے خاندان کے راز بھی آپ کو معلوم ہو چکے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی میری یا اس کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ اور پھر میری غیرت یہ مدد قبول بھی نہیں کر سکتی کہ......کہ......"

"ہوں۔ گویا دل سے تم نے ابھی ہمیں دوست تسلیم نہیں کیا۔ ٹھیک ہے، یہی سہی احسان! لیکن کیا تم یہ پسند کرو گے کہ سیمیں جیسی نفیس طبیعت لڑکی، شمشیر جیسے بھینسے کے ساتھ پوری زندگی کے لئے منسلک ہو جائے، سلگتی رہے، تڑپتی رہے اور ایک دن اسی طرح ختم ہو جائے؟"

"خدا نہ کرے......خدا نہ کرے۔" احسان تڑپ کر بولا۔

"تب تم کیسے عاشق ہو احسان! اپنی محبوبہ کو جہنم میں جھونک رہے ہو، اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"میں کیا کروں؟......میں کیا کروں؟" احسان پھر رو پڑا۔

"دوستوں پر بھروسہ......صرف دوستوں پر بھروسہ۔ یاروں کے کام یاروں سے نکلتے ہیں۔ دل سے ہمیں دوست تسلیم کر لو اور وہ کرتے رہو، جو ہم کہیں۔ وعدہ ہے کہ ایک دن سیمیں تمہاری ہوگی۔ اور یہ ہماری دوستی کا ایک حقیر سا نذرانہ ہوگا۔"

"نواب صاحب! شہزادہ عادل! شہزادہ صائم! آپ بے حد عظیم ہیں۔ آپ......آپ بے حد عظیم ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑا کام ہے۔ اتنا بڑا، جس کا میں اہل نہیں ہوں۔ نواب اصغر الدولہ نے پورا جلال آباد

رہن رکھا ہوا ہے۔ وہ دولت معمولی نہیں ہوگی۔ خدا نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن میں آپ کو اس کا بدل کیا دے سکوں گا، سوائے اپنی غلامی کے۔ اور میں اس قدر قیمتی نہیں ہوں۔''

''تمہارے پاس ایک قیمتی چیز ہے، جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ اور وہ ہے دوستی۔ اگر وہ دے سکتے ہو تو دے دو۔ ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔ اور اگر وہ نہیں دے سکتے تو پھر کسی اور چیز کی طلب نہ ہوگی۔''
طالوت نے کہا اور احسان دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا اور طالوت اس کی کمر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

اس رات تقریباً چار بجے تک میں اور طالوت، احسان کے پاس رہے۔ طالوت اس دوران اسے ہدایات دیتا رہا۔ اور پھر چلتے وقت اس نے تاکید کی۔

''تمہاری اداکاری میں ذرا بھی لچک ہوئی تو کام خراب ہو جائے گا احسان! اور ہاں، سیمیں کو اس کی ہوا نہ لگنے پائے۔''

''آپ نے جس طرح کہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔'' احسان نے جواب دیا اور ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔

''کیا خیال ہے؟'' طالوت نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''انتہائی مناسب۔''

''مگر یار! یہ لونڈیا بہت گہری نکلی۔ سب معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا۔ اور ہم اس چکر میں رہے کہ ہم میں سے کسی کی دال گل جائے گی۔''

''چلو، ہمیں دال کی ضرورت بھی تو نہیں تھی۔ تم بے حد عظیم ہو طالوت! تم نے میری دنیا کے لوگوں کے لئے جو کچھ کیا ہے، اس کا میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔''

''مسائل سے گھری ہوئی یہ دنیا بے حد دلکش ہے عارف! ہم کسی کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ قدرت نے کچھ عطیات مجھے دیئے ہیں۔ اگر میں ان سے کام لے کر اس کے بندوں کی کچھ خدمت کر دیتا ہوں تو کون سی بڑی بات ہے؟ یہ سوچو، اگر مجھے یہ عطیات نہ بخشے گئے ہوتے تو میں بھی ان مصائب زدہ انسانوں میں سے کوئی ایک ہوتا۔ بہر حال، میں بہت خوش ہوں اور ان لوگوں کے لئے کچھ کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ کل سے ہمارا کام شروع۔''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔

اور دوسرے دن ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ صبح ناشتے کی میز پر سب موجود تھے۔ گھوڑوں کی بات چل نکلی جو طالوت نے ہی شروع کی تھی۔ اور نواب صاحب پوری دلچسپی لینے لگے۔ تب اچانک طالوت نے کہا۔

''آپ نے ابھی تک اپنا اصطبل نہیں دکھایا نواب صاحب!''

''بس، احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا ہوں عادل میاں! جرأت نہیں ہوئی۔''

''آج ضرور دیکھیں گے۔ ابھی ناشتے کے بعد۔''

''ضرور۔ جو کچھ بھی ہے، حاضر ہے۔'' نواب صاحب نے کہا اور پھر ایک ملازم سے بولے۔ ''اصطبل کے انچارج سے کہو کہ شہزادہ صائم اور شہزادہ عادل، اصطبل دیکھنے آ رہے ہیں۔ انتظام کر لیا

جائے۔" اور ملازم سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ نواب صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ شمشیر کی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس پر ہم دونوں نے نواب صاحب کو مبارک باد دی تھی۔
"بس، کیا بتاؤں؟ بچپن کے دوست کی اولاد ہے۔ حالانکہ یورپ نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔" نواب صاحب نے کہا۔
ناشتے کے بعد ہم اٹھ گئے۔ نواب صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ ہم باہر نکل آئے۔ اور پھر نواب صاحب ہمیں لے کر اصطبل کی طرف چل پڑے۔ ہم دونوں پُرسکون تھے۔ ابھی ہمیں ایک ڈرامہ کرنا تھا، جس کے صرف تین کردار تھے۔ ہم دونوں تو مطمئن تھے، بس احسان کی فکر تھی۔ نہ جانے وہ اپنے رول میں کس حد تک کامیاب رہے۔ یہاں تک کہ ہم اصطبل کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تب نواب صاحب نے ایک ملازم سے پوچھا۔
"انچارج کہاں ہے؟"
"اندر موجود ہے جناب!"
"اسے اطلاع دو۔" نواب صاحب بولے اور ملازم اندر چلا گیا۔
چند ساعت کے بعد احسان باہر نکل آیا۔ جوں ہی وہ سامنے آیا، اچانک طالوت چیخ پڑا۔ "حسام!" میں بھی اچھل پڑا تھا۔ ویسے تالوت کی اداکاری غضب کی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے احسان کو دیکھ رہا تھا اور نواب صاحب حیرت سے منہ پھاڑے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔
"حسام! میرے بھائی!........ میرے بھائی!" میں اچانک دوڑا اور احسان سے لپٹ گیا۔ "تم مل گئے حسام!........ تم مل گئے۔ آہ........ ہم نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہ کیا؟ تم مل گئے حسام!" طالوت بھی حسام سے لپٹا ہوا تھا اور نواب صاحب بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔
"تو تم یہاں ہو........ اور ہم پر قیامتیں بیت گئی ہیں۔ ہم نے تمہاری تلاش میں آدھی دنیا چھان ماری حسام! تمہارا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"
"میں تم لوگوں کو نہیں جانتا۔" احسان نے سخت لہجے میں کہا۔
"آہ........ حسام! ہماری کیا غلطی ہے؟ ہم تو بے قصور ہیں حسام! ہم نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"
"تم مجھے لینے آئے ہو۔ یقیناً تم مجھے لینے آئے ہو........ لیکن میں خودکشی کر لوں گا، شادیانہیں جاؤں گا۔"
"تم مل گئے حسام! یہی کیا کم ہے؟ وہی ہوگا، جو تم چاہو گے۔ تم پوری زندگی یہاں گزار سکتے ہو۔ ہمارے لئے یہی کیا کم ہے کہ ہم دوبارہ تمہیں دیکھ سکے۔" طالوت نے کہا۔
"تمہیں قسم کھانی ہوگی عادل! کہ تم کسی سے میرا تذکرہ نہیں کرو گے۔"
"وہی ہوگا حسام! جو تم چاہتے ہو، بالکل وہی ہوگا۔ ہم قسم کھاتے ہیں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور احسان نے ہم دونوں کو لپٹا لیا۔ نہ جانے کس طرح اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ نواب صاحب اب بھی پاگلوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ پھر انہوں نے ہمت کی اور آگے بڑھ آئے۔
"آہ، نواب جلال الدین! ہم کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کریں؟ آپ نے ہمارا بچھڑا ہوا بھائی ہم سے ملا دیا ہے۔ آہ! جدائی کا یہ طویل عرصہ ہمارے اوپر کتنا شاق تھا، کیا بتائیں ہم آپ کو؟ حسام کے

روٹھ کر چلے آنے سے شادیا کی رونقیں گم ہو گئی تھیں۔ ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں نواب صاحب!''
''مم........ مگر........ یہ سب کیا ہے؟........ یہ تو........ یہ تو اصطبل کے انچارج ہیں۔'' نواب صاحب کے منہ سے بھرّائی ہوئی آواز نکلی۔
''اصطبل انچارج؟'' طالوت نے چونک کر کہا اور ایک بار پھر وہ احسان سے لپٹ گیا۔
''ہائے میرے پیارے بھائی! تم نے یہ کیا حالت بنالی؟ تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟........ ہائے، تمہارے لئے تو دس دس ملازم رکھے گئے تھے، جو تمہارے ایک اشارے پر دوڑ جاتے تھے اور اب تم گھوڑوں کی نگرانی کرتے ہو۔'' طالوت بوڑھی عورتوں کی طرح بین کر رہا تھا اور میرے پیٹ میں قہقہے اُبل رہے تھے۔ سچ مچ حیرت انگیز تھا یہ بدمعاش بھی۔ خود احسان اپنا ڈرامہ بھولے جا رہا تھا۔
''شہزادہ عادل!........ شہزادہ عادل!........ خدا کے لئے خود کو سنبھالیے۔ افسوس، کوئی اور خفت میرے مقدر میں لکھی ہوئی ہے۔ میرے اس منحوس گھر میں صرف المیے ہی ہوتے رہیں گے۔'' نواب صاحب آگے بڑھ کر طالوت کو شانوں سے پکڑتے ہوئے بولے۔
''المیہ........ آپ اسے المیہ کہیں گے نواب صاحب؟ ایک طویل عرصے کے بعد میرا بچھڑا ہوا بھائی ملا ہے۔ ارے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے ہمارے لئے؟ ہم آپ کے محل کو موتیوں سے کیوں نہ بھر دیں۔ ہماری طویل جدوجہد بارآور ہوئی ہے۔''
''اوہو... تب تو.... تب تو یہ بے حد مسرت کی بات ہے۔'' نواب صاحب احمقانہ انداز میں بولے۔
''یقیناً۔'' میں نے نواب صاحب کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''شہزادہ حسام طویل عرصے سے شادیا چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ وہ گھر والوں سے ناراض ہو گئے تھے۔ اب تو ان کی موت کا یقین کرلیا گیا تھا۔ آپ غور کریں، ایک ایسے بھائی کا مل جانا، جو ہمارے نزدیک مُردہ تھا، کتنی خوشی کی بات ہے۔''
''اوہ........!'' نواب صاحب نے ایک گہری سانس لے کر احسان کو دیکھا اور پھر جلدی سے گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''یقیناً........ یقیناً۔ لیکن میری بدقسمتی دیکھئے کہ میں ایک عالی مرتبت شہزادے کی حقیقت نہ پہچان سکا۔ میں از حد شرمندہ ہوں شہزادہ حسام! یہاں آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہ ہوا ہو گا۔''
احسان احمقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ طالوت نے سب کی نظریں بچا کر اس کے ایک زوردار چٹکی لی اور وہ اچھل پڑا۔ اور پھر اس نے مشینی انداز میں بولنا شروع کر دیا۔
''نہیں نواب صاحب! میری حیثیت کچھ بھی ہو، آپ کو اس کا علم ہی کیا تھا۔ لیکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ یہاں مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔''
''یقیناً...... یقیناً۔ نواب جلال الدین جیسے عالی ظرف شخص کے ہاں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ بہرحال، نواب صاحب! آپ کا یہ احسان ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہمارے بھائی کو پناہ دی تھی۔''
''مجھے اور شرمندہ نہ کریں شہزادہ عادل! میں از حد شرمندہ ہوں۔''
''یہ آپ کی نیک دلی ہے۔ ورنہ اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ ویسے آپ یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھئے، ہمارے بھائی کی کشش ہمیں یہاں کھینچ لائی تھی۔''

''یقیناً۔ خون کی پکار بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بہر حال، شہزادہ حسام! یہاں آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہو تو اسے معاف کر دیں۔ میں آپ لوگوں کی خوشی میں برابر کا شریک ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ نواب صاحب!...... کیا ہم اپنے بھائی کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں شہزادہ حسام کے لئے ایک کمرہ آپ کے برابر درست کرائے دیتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔'' نواب صاحب ایک دم پلٹے اور باہر نکل گئے۔ احسان نے ایک گہری سانس لے کر ہم دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

''میں اس نیک انسان کو دھوکا دے کر خوش نہیں ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''بس اب زیادہ بکواس مت کرو حسام! ایک تو گھر سے بھاگ آئے، اس پر سے شرافت بگھارنے بیٹھ گئے ہو۔ صائم! تم انہیں لے کر آؤ۔ میں ان کے لئے ڈھنگ کے لباس کا بندوبست کرتا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور باہر نکل گیا۔

''صائم بھائی! آپ لوگوں کے خلوص اور عنایت کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھئے، سیمیں میری حیثیت سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ مجھے اس ڈرامے میں شریک دیکھے گی اور میری زبان سے جھوٹ سنے گی تو بدظن ہو جائے گی۔ کیا آپ لوگ یہ اجازت بھی نہیں دیں گے کہ میں اس سے بات کرلوں؟''

''اس سے کیا بات کرو گے؟''

''میں اسے پوری حقیقت بتا کر مشورہ طلب کروں گا۔ اگر اس نے مجھے اس حیثیت میں قبول کرلیا تو پھر میں آپ کے تمام احسانات قبول کرلوں گا۔ اور اگر اس نے یہ سب کچھ پسند نہ کیا تو آپ جانتے ہیں میرے لئے یہ سب بے کار ہو گا۔''

''ہوں۔'' میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ بات معقول تھی، اس لئے میں اس کی تردید نہ کر سکا اور ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن سیمیں سے ملاقات کا کیا ذریعہ نکالو گے؟''

''آپ کسی طرح نواب صاحب کو اس بات پر تیار کرلیں کہ ابھی وہ میری اس حیثیت کا اعلان نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے...... اس کے بعد؟''

''میں سیمیں سے ملاقات کی کوئی سبیل نکال لوں گا۔''

''چلو، یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ جب تم اسے حقیقت بتاؤ گے تو ہمارے بارے میں بھی بتانا ہی پڑے گا۔''

''ہاں۔'' احسان نے کہا۔

''اور کچھ؟'' میں نے پوچھا۔ اسی وقت طالوت وہاں آ گیا۔ بعد میں اسے احسان سے ہونے والی

گفتگو بتانے لگا۔ طالوت نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر ہم دونوں احسان کو لے کر چل پڑے اور اپنے کمرے میں آ گئے۔ یہیں پر نواب صاحب سے ملاقات ہو گئی، جنہوں نے ہمارے برابر ہی کا ایک کمرہ احسان کے لئے درست کرا دیا تھا۔

''اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو نواب صاحب! تو ابھی میرے بھائی کی حیثیت سے دوسروں کو متعارف نہ کرائیں۔ ہمیں سخت شرمندگی ہو گی، اس طرح انہیں پیش کر کے۔ تھوڑے سے انتظامات کرنے کی مہلت دے دیں۔''

''جیسا آپ پسند کریں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بیان فرمائیں۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''ہم تو یونہی آپ کے لئے کافی تکلیف دہ بن گئے ہیں۔ بہرحال اگر کوئی ضرورت ہوئی تو ضرور تکلیف دیں گے۔ ہاں شمشیر صاحب کی کیا کیفیت ہے؟''

''کافی حد تک ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چہل قدمی بھی کی ہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''ان سے بھی مزاج پرسی کرنی ہے۔ بہت دلچسپ انسان ہیں۔'' میں نے کہا اور نواب صاحب نے گردن جھکا لی۔ شمشیر کے تذکرے پر وہ شرمندہ ہو جاتے تھے۔ پھر انہوں نے اجازت چاہی۔

''ایک بار پھر اپنے بھائی سے اس طرح ملاقات ہونے پر میری طرف سے پُرخلوص مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں ذرا چلوں۔''

''بہت بہتر۔'' میں نے کہا اور نواب صاحب لوٹ گئے۔ تب ہم دونوں احسان کی طرف متوجہ ہوئے۔ احسان کے چہرے پر عجیب سی کشمکش نظر آ رہی تھی۔

''اے میرے پیارے بھائی! اب تُو کہاں کھو گیا ہے؟'' طالوت نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' احسان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک دلچسپ اتفاق پر غور کر رہا تھا۔''

''اللہ...... ہمیں بھی بتا دو نا۔'' طالوت نے زنانہ انداز میں کہا اور احسان ہنس پڑا۔

''میں سوچ رہا تھا، شہزادہ عادل! کہ میرا نام احسان ہے۔ کیا ذو معنی نام ہے۔ احسان کیا جاتا ہے، لیا جاتا ہے۔ میں نے پیدا ہو کر دنیا پر کیا احسان کیا ہے؟ سوائے اس پر بوجھ بننے کے۔ چنانچہ دنیا نے مجھے خود پر سوار کر کے خود میرے اوپر احسان کیا ہے، گویا میرا نام احسان ہے...... احسان لینے والا۔ محبت کی کامیابی کے لئے بھی میں کچھ نہیں کر سکا۔ اس کے لئے آپ کا احسان مجھ پر ہو گا بشرطیکہ یہ بیل منڈھے چڑھ گئی۔ آپ کا نام عادل ہے اور آپ اسم با مسمیٰ بھی ہیں۔ یہ ناموں کا اُلٹ پھیر بھی کیسا عجیب ہے۔''

''ہاتھوں کے اُلٹ پھیر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' طالوت نے ہونٹ بھینچ کر پوچھا۔

''میں نہیں سمجھا۔'' احسان نے اسے دیکھا۔

''دیکھ بھائی! ہم ذرا بے تکلف قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں سے ہم تمہیں یاری دوستی کے لئے تیار کر رہے ہیں لیکن ابھی تک تم ذہنی طور پر ہمیں قبول نہیں کر سکے ہو۔ اور یہ تو تمہیں احساس ہے کہ تم ہمارے چھوٹے بھائی ہو۔ اور شادیا سے فرار بھی ہوئے ہو۔ چنانچہ اگر ہم دونوں، ہاتھوں کے الٹ پھیر پر آمادہ ہو گئے تو ایک تو تمہاری یہ حسین شکل بگڑ جائے گی، دوسرے دیکھنے والے ہنسیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ بڑے بھائی ناراض ہو کر چھوٹے بھائی کے کل پرزے درست کر رہے ہیں۔ چنانچہ

بہتر یہ ہے کہ کسی احسان وغیرہ کو قریب نہ پھٹکنے دو۔ یار رہو۔ یاری بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ بات صرف تمہاری ہی نہیں ہے، اس معصوم اور خوب صورت لڑکی کی بھی ہے جس سے ہم تم سے پہلے واقف ہوئے تھے۔ وہ نیک فطرت اور سادہ دل بھی ہے۔ اور یار! کسی حسین لڑکی کو ایک باؤلے ریچھ کے چنگل میں پھنستے دیکھ کر کون اس کی مدد کو نہ دوڑ پڑے گا۔ چنانچہ اگر تم اسے احسان ہی سمجھتے ہو تو اپنے اوپر نہ سمجھو۔ یا پھر آدھا آدھا بانٹ لو۔ اور پھر تمہارا نام احسان نہیں، حسام ہے۔ کیا سمجھے؟'' یہ آخری الفاظ طالوت نے ڈپٹ کر کہے تھے۔

احسان نے ہنستے ہوئے گردن جھکا دی۔ ''میں ہاتھوں کے الٹ پھیر کے لئے حاضر ہوں۔''

''کیا واقعی اتنے ہی سعادت مند ہو؟'' طالوت نے اسے گھورا۔

''آزمالیں عادل بھائی!'' احسان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''تو سنو۔ میرا حکم ہے، ایک دوست ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے کہ آئندہ ہمارا تعارف کسی احسان وحسان سے مت کرانا۔ دوست ہو۔ بھائی ہو۔ ہمارے اوپر اپنا پورا حق سمجھو۔ دل میں کسی ایسے تصور کو جگہ مت دو جو ہمارے خلوص کی توہین ہو۔ کھلے دل سے قہقہے لگاؤ، ہنسو اور اپنی محبت کو کامیاب بناؤ۔ تمہاری طرف سے ہمارے خلوص کا یہی صلہ ہوگا۔''

احسان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ اس نے جذباتی انداز میں طالوت کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''آؤ.... تمہارے کمرے میں چلیں۔ دیکھیں، نواب صاحب نے کیا کیا ہے؟'' ہم تینوں دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور پھر طالوت، احسان کو اور مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیوں گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا، اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک سوٹ کیس لٹک رہا تھا۔

''لو بھئی، اس میں تمہارے نئے لباس اور ضرورت کا دوسرا سامان ہے۔ اب تم غسل کرو اور لباس تبدیل کرلو۔ لنچ پر تمہاری ملاقات دوسرے لوگوں سے ہوگی۔''

''آپ بھول گئے عادل بھائی!''

''کیا؟'' طالوت نے چونک کر پوچھا۔

''وہ........ سیمیں۔''

''اوہ آں........ تب پھر آج تم پورا دن قیدی کی حیثیت سے گزارو۔ اور صائم بھائی! احسان کے سلسلے میں نواب صاحب کو مطمئن کرنا آپ کا کام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ میرے اوپر چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا اور پھر ہم دونوں احسان کے کمرے سے نکل آئے اور اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ طالوت میری شکل دیکھ رہا تھا۔

''کیسا؟'' اس نے عجیب سا منہ بنا کر پوچھا۔

''بہت عمدہ۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہماری دال کہیں نہیں گلے گی یار! اس لحاظ سے یہ ماحول بہت بور ہے۔''

''بوا کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''بوا........ ہائے بوا........ ارے انہیں ہی بلا دو۔ اس پوری کوٹھی میں دل کے بہلانے کے لئے ایک وہی ہیں۔ بلا دو........ اللہ، بلا دو'' طالوت نے کہا اور میرے ذہن میں بھی شرارت کلبلانے لگی۔

''بہتر ہے۔ میں ابھی انہیں لے کر آتا ہوں۔''

''لے آؤ۔ خدا کی قسم، لے آؤ۔ آج میں اپنا دل کھول کر ان کے قدموں میں رکھ دوں گا۔'' اور میں سچ مچ اٹھ گیا۔ طالوت نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں بوا کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں مجھے نصرت، روحی اور سیمیں نظر آ گئیں۔ وہ تینوں کچھ گفتگو کر رہی تھیں اور سیمیں کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ پر ان کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور وہ چونک پڑیں۔ سیمیں نے اپنے چہرے کے تاثرات بحال کر لئے اور میری طرف متوجہ ہو گئی۔

''آیئے صائم بھائی! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''وہ میرے بھائی پر عشق کا دورہ پڑا ہے۔ بوا، بوا چلاّ رہا ہے اور سینہ پیٹ رہا ہے۔ بہت بری حالت ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور تینوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''پھر آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' نصرت نے پوچھا۔

''بوا کو اطلاع دینے اور انتباہ کرنے کہ میرے بھائی کی موت کی ذمہ دار وہی ہوں گی۔''

''میں بوا کو لاؤں صائم صاحب؟'' نصرت نے پوچھا۔

''بعد میں بوا آپ کو کھا جائیں گی۔ کیونکہ عادل سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔''

لڑکیاں ہنس پڑیں۔ پھر روحی بولی۔ ''تب ٹھیک ہے۔ لیکن ایک شرط ہے صائم بھائی! ہمیں بھی ان دونوں کے........ مم، میرا مطلب ہے ہمیں بھی دیکھنے کی اجازت ہو گی۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ آپ لوگ بھی ضرور دیکھئے۔ ایسے عبرت ناک مناظر کبھی کبھی ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ویسے بوا اس وقت کہاں ملیں گی؟''

''ابھی ابھی اپنے کوارٹر میں گئی ہیں۔ میں نے دیکھا تھا۔'' سیمیں نے کہا۔ اس کی غم زدہ آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے مسکرا اُٹھی تھیں۔

''آہ........ تب میں اسی طرف جاتا ہوں۔ بوا کو تیار کرنا بھی ایک مسئلہ ہو گا۔ لیکن عادل کے لئے سب کچھ کرنا ہو گا۔'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ لیکن میں ان کے قہقہے کی پروا کئے بغیر بوا کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ لڑکیاں شاید کوارٹر کی عقبی سمت دوڑ رہی تھیں۔

میں نے بوا کے کوارٹر پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے بوا کی کراری آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ بوا نے شاید میری آواز نہیں پہچانی تھی، چنانچہ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ لیکن میری شکل دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئیں۔

''ارے آپ........ شش........ شہزادہ صاحب!........ مم........ میرے غریب خانے پر۔''

''آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے بوا!........ براہِ کرم اندر چلئے۔'' میں نے بدحواس لہجے میں کہا اور بوا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ میں نے پلٹ کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

''آئے ہائے........ در........ دروازہ کیوں بند کر رہے ہو؟'' بوا گھبرا کر بولیں۔

''بوا!..... بوا! خدا کے لئے بچا لیجئے..... بچا لیجئے۔'' میں نے بوا کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''آئے خبر دار...... خبر دار...... ہاتھ چھوڑ...... میں شور مچا دوں گی۔'' بوا نے ایک جھٹکے سے مجھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔
''بچا لیجئے بوا!...... خدا کے لئے بچا لیجئے۔'' میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔
''اے اللہ مارے! ہوا کیا؟ کس کو مار کر بھاگے ہو؟..... مم..... میرا مطلب ہے، شہزادے صاحب! ہوا کیا؟'' بوا کو ایک دم ہماری اہمیت کا احساس ہو گیا۔
''نہیں بوا!...... میں کسے ماروں گا؟ لیکن میرا بھائی مر رہا ہے بوا! اگر آپ نے اسے تسلی نہیں دی تو وہ ضرور مر جائے گا۔''
''بھائی مر رہا ہے۔'' بوا ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔ ''کک..... کیوں مر رہا ہے شہزادے صاحب؟''
''تمہارے عشق میں بوا!...... رات بھر پاگلوں کی طرح چیختا رہا ہے۔ صبح سے حالت خراب ہے۔ بالکل وحشی بنا ہوا ہے۔ کہتا ہے، بوا نہ ملیں تو خودکشی کر لوں گا۔''
''اے لعنت ہے اس کمبخت مارے پر۔ لو...... اس بڑھاپے میں مجھے بدنام کرنے چلا ہے۔ اللہ کی مار اس موئے کی صوت پر۔ کان کھول کر سن لو میاں! ہم غریب بھی عزت رکھتے ہیں۔ بس بہت ہو چکی، ہاں۔'' بوا آنکھیں نکال کر بولیں۔
''بوا!...... بوا! خدا کے لئے مان جاؤ۔ میرے بھائی کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر وہ مر گیا تو میں تمہارے بھی ٹکڑے کر دوں گا۔''
''ارے ارے...... مم...... مگر میں نے کیا کیا ہے شہزادے حضور!...... ہائے میرے مولا۔'' بوا لرزتے ہوئے بولیں۔
''اسے تسلی دے دو۔ بس اسے یقین دلا دو کہ تم بھی اس سے عشق کرتی ہو۔ میں اسے سمجھا بجھا کر یہاں سے لے جاؤں گا۔''
''مم...... مگر میں...... میں......''
''خدا کے لئے بوا! میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرے بھائی کی زندگی بچا لو۔ اگر تم نہیں مانتیں تو میں نواب جلال الدین کے پاس جاتا ہوں، ان سے کہتا ہوں کہ تمہاری ان بوا نے پہلے تو میرے بھائی کو اپنی محبت کے جال میں پھانسا اور اب اس کی زندگی کی دشمن بن گئی ہیں۔''
''ہائے...... ارے نہیں...... خدا کے لئے ان کے پاس مت جانا۔ میں...... میں چلتی ہوں۔ اے اللہ!...... اے اللہ! میری عزت کی حفاظت کریو۔ چلو...... مگر تم جاؤ، میں آ رہی ہوں۔ ہائے اس موئے سے کیا بات کروں گی؟ میری جان ہلکان ہو رہی ہے۔''
''بس ذرا پیار محبت کی باتیں کر لینا بوا!...... بچہ ہے، خوش ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔
''دس جھاڑو پھرے اس موئے بچے کی صورت پر۔ پرائی بہو بیٹیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔'' بوا دانت پیس کر بولیں۔ اور پھر میری شکل دیکھ کر جلدی سے سنبھل گئیں۔ ''میں ابھی آ رہی ہوں شہزادے صاحب! بس ابھی آئی۔''
''اچھا بوا!'' میں مسمسی سی شکل بنائے باہر نکل گیا۔

باہر نکلا ہی تھا کہ نصرت کی سرگوشی سنائی دی۔ ''صائم صاحب!........صائم صاحب!'' اور میں نے چونک کر کوارٹروں کی عقبی سمت دیکھا، نصرت اشارے سے بلا رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ روحی اور سیمیں نے دوپٹہ حلق میں ٹھونسا ہوا تھا۔ وہ شاید عقبی کھڑکی سے بوا کے کمرے کا منظر دیکھ رہی تھیں اور ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ تینوں لڑکیوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں پیچھے ہٹیں اور پھر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگیں۔

''اللہ، صائم بھائی! ہمیں بھی عقبی کھڑکی سے عادل صاحب کے کمرے کا منظر دیکھنے کی اجازت دے دیں۔'' سیمیں کی سنجیدگی اس وقت رخصت ہو گئی تھی۔

''ایک شرط پر۔'' میں نے انگلی اٹھا کر کہا۔

''ہمیں ہر شرط منظور ہے۔'' سیمیں کے بجائے روحی جلدی سے بولی اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''بتائیے کیا شرط ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''آپ کو مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔'' میں نے کہا اور روحی منہ پھاڑ کر رہ گئی۔

''وہ تو ہر شرط منظور کر چکی ہے صائم بھائی!'' سیمیں نے کہا۔ روحی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مجھے بھی اپنی بے باکی کا احساس ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے جلدی سے کہا۔

''خیر........اگر یہ شرط سخت ہے تو کم از کم آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ آپ اتنی زور سے نہیں ہنسیں گی کہ آواز کمرے تک پہنچ جائے۔''

''وعدہ........وعدہ۔'' نصرت اور سیمیں نے جلدی سے کہا۔ البتہ روحی کی آواز بند ہو گئی تھی۔

''تب آئیے۔ ابتدائی مناظر کے لئے ہمیں پہلے سے پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی تک پہنچ جانا چاہئے۔ اس انداز میں کہ عادل کو بھی پتہ نہ چلے۔''

''آئیے۔'' نصرت نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ سیمیں روحی کو دھکے دے رہی تھی اور روحی شرمائی ہوئی سی آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھے ایک گونہ کوفت ہوئی۔ بے چاری لڑکی کو میں نے مذاق ہی مذاق میں پریشان کر دیا تھا۔

''ارے روحی صاحبہ!........آپ کو کیا ہو گیا؟........چلئے، میں نے اپنی شرط واپس لے لی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' سیمیں اور نصرت ہنسنے لگیں۔ لیکن روحی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے ایک عجیب بات کہہ ڈالی۔

''نہیں نہیں........شرط واپس کیوں لے رہے ہیں؟ یہ شرط تو میری زندگی ہے۔ یہ الفاظ تو سرمایۂ حیات ہیں۔ اتنی بے دردی سے میری چاہت کا مذاق نہ اُڑاؤ۔''

مجھے دکھ ہوا کہ میں نے بے چاری لڑکی کو خوامخواہ غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ بہرحال، اس وقت شرارت ذہن پر سوار تھی۔ ہم لوگ تیزی سے فاصلہ طے کر کے طالوت کے کمرے کی عقبی کھڑکی پر پہنچ گئے۔

طالوت اندر موجود تھا اور ڈرامے کے لئے پوری طرح تیار۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی، لباس بھی مسلا ہوا تھا اور وہ آرام سے کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

''یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے عادل صاحب نے؟'' سیمیں نے حیرت سے کہا۔

''عاشق ہے، گھسیارہ نہیں ہے۔'' میں نے فخر سے کہا اور لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔
''اس وقت سے خوف محسوس ہوتا ہے صائم بھائی! جب آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔'' سیمیں نے عجیب سے انداز میں کہا۔
''کیوں؟'' میں نے اسے دیکھا۔
''آپ لوگوں کی آمد نے اس کوٹھی کو وہ حق بخشا ہے جو شاید زندگی بھر نہ بھلایا جا سکے۔''
''فکر نہ کریں۔ ہم یہاں ایسے نقوش چھوڑ جائیں گے، جو زندگی بھر ہماری یاد تازہ رکھیں گے۔'' میں نے کہا۔ روحی نے پھر ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔
''کیا آپ یہاں جلال آباد میں ہی نہیں رہ سکتے صائم بھائی؟'' سیمیں نے پوچھا۔
''نہیں سیمیں! یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم دور کے مسافر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قدر متاثر نہ ہو کہ بعد میں کوئی تکلیف ہو۔ چند دنوں کا ساتھ ہے۔''
''اللہ، سیمیں باجی! اس حسین اور دلچسپ وقت کو ان باتوں سے مکدر نہ کریں۔'' نصرت نے درخواست کی۔
''بوا ابھی آئی نہیں۔'' سیمیں جلدی سے بولی۔ اور اسی وقت طالوت کے کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دی۔
''کون ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
''دروازہ کھولو۔'' بوا کی آواز سنائی دی اور طالوت دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول دیا تاکہ اندر کی آوازیں بھی صاف سنائی دے سکیں۔ طالوت نے دروازہ کھول دیا تھا اور پھر وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اس کی گمبھیر آواز اُبھری۔
''آہ....... تم آ گئیں....... تم آ گئیں....... کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟''
''خواب دیکھنے لگو۔ باؤلے تو ہو ہی۔'' بوا ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں۔
''خدارا، میرا مذاق نہ اُڑاؤ....... میرا مذاق نہ اُڑاؤ۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔'' طالوت نے کہا۔
''ہاں، ہاں....... چاہو....... ضرور چاہو۔ تمہارے باوا کی جاگیر ہوں۔ جو دل چاہے کرو۔''
''میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔''
''جھاڑو پھرے تمہاری زندگی پر۔ ایک میں ہی رہ گئی ہوں؟ دیکھو شہزادے میاں! اللہ کے واسطے، میری جان بخش دو۔ کیوں میری عزت دو کوڑی کی کرنے پر تلے ہو؟''
''میں تمہاری عزت پر اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، میں تمہارے لئے کیا کروں؟''
''اپنی یہ منحوس صورت لے کر یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ بس۔'' بوا نے منہ پھیر کر کہا۔
''اچھی بات ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نواب صاحب سے کہہ دوں گا کہ آپ کی کوٹھی میں میرے اوپر ظلم ہوا ہے۔ مجھے لوٹ لیا گیا ہے۔''
''ہے، اللہ مارے!....... اللہ کے واسطے، میاں سے کچھ نہ کہنا۔ یا اللہ!....... میری حفاظت کر۔'' بڑی بی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔

''اب تم میری ایک خوشی پوری کر دو۔ میں تم سے کچھ نہ کہوں گا۔''

''اے بے غیرت! ....اے منحوس! میں بڑھیا ہوں۔'' بوا نے نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ انہوں نے شرم سے منہ پر ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ دوسری طرف لڑکیاں بری طرح شرما گئی تھیں۔ انہوں نے دانتوں میں دوپٹے دبائے تھے لیکن پلٹنے کو کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''دوسری صورت میں، میں نواب صاحب کے پاس جاؤں گا۔''

''پہنچ جا۔ جان دے دوں گی، عزت نہ دوں گی۔ پوری زندگی اللہ اللہ کر کے گزار دی، اب بڑھاپے میں منہ کالا کروں گی؟''

''مان جاؤ........خدا کے لئے مان جاؤ۔'' طالوت نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بوا نے ہاتھ چھڑا کر دو ہتھڑ اس کے سینے پر مارا۔ طالوت پٹ سے زمین پر گر پڑا تھا۔ دو تین دفعہ اس نے پاؤں رگڑے اور پھر ساکت ہو گیا۔ بوا کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ انہوں نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر لپک کر دروازہ بند کر دیا۔

''اے میرے مولا! میں کیا کروں؟........ ہائے، مر گیا کیا؟........ ارے اب کیا ہو گا؟'' بوا، طالوت کے پاس بیٹھ گئیں۔ ''یا اللہ! اسے ٹھیک کر دے۔ ہائے، مر گیا تو کیا ہو گا؟........ ارے اُٹھ کمبخت۔ اُٹھ جا، تیرا ستیاناس ہو جائے۔'' بڑی بی، طالوت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجوڑ کر بولیں اور طالوت نے آنکھیں کھول دیں۔

''تو........تو........تم میری خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہو؟''

''ارے اُٹھ بھی جا۔ اللہ کو یہی منظور ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟'' بڑی بی نے پریشانی سے کہا اور طالوت جلدی سے اٹھ گیا۔ بڑی بی کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

طالوت ایک طرف بڑھا۔ اس نے ایک الماری سے ایک خوب صورت لباس نکالا اور زیورات کا ایک ڈبہ بھی نکال لیا۔ ''وہ سامنے باتھ روم ہے۔ لباس تبدیل کر لو اور زیورات پہن لو۔''

''اب یہ چونچلے بھی کرائے گا؟'' بڑی بی کراہ کر بولیں۔

''جاؤ، جاؤ........جلدی کرو۔''

''مٹی میں مل گئی۔ دو کوڑی کی ہو گئی۔ پوری زندگی برباد ہو گئی۔ ہائے، ہائے........'' بڑی بی کراہتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ اور جب وہ باتھ روم سے برآمد ہوئیں تو لڑکیاں ہنسی سے دیوانی ہو گئیں۔ وہ پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ سرخ غرارہ، جمپر اور اوپر سے زیورات۔ نہ جانے کیسی لگ رہی تھیں بوا۔

''براہِ کرم........ براہِ کرم آداب ملحوظ رکھیں۔ دیکھیں، اندر کا منظر دیکھیں۔'' میں نے جلدی سے کہا مگر لڑکیاں شرما رہی تھیں۔

''اُٹھیے تو سہی۔ آپ نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں۔'' میں نے کہا اور نصرت نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ تب دوسری لڑکیاں بھی کھڑکی سے آ لگیں۔ بڑی بی کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر شرم کے آثار تھے اور طالوت ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے، آنکھیں پھاڑے، ایک ہاتھ سینے پر رکھے انہیں گھور رہا تھا۔

''بس، بس........ میری یہی خواہش تھی........ یہی میری خواہش تھی........ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''
اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''ایں........'' بڑی بی چونک پڑیں۔

''مجھے سب کچھ مل گیا........ بس اور کچھ نہیں چاہئے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' بڑی بی جلدی سے بولیں۔ ''تو میں جاؤں؟''

''ہاں۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ کپڑے اتار دوں؟''

''نہیں، نہیں........ یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ یہ سب تمہارے لئے ہے۔ میری محبت کا حقیر تحفہ۔''

''اللہ قسم........'' بڑی بی کے دانت نکل پڑے۔ ''مگر بھیا! میں یہ پہن کر تو نہ جاؤں گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ مذاق نہ اُڑائیں گے میرا۔''

''تو پھر انہیں اُتار کر اپنا لباس پہن لو۔ جاؤ۔'' طالوت نے کہا۔

''اے، اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جبھی تو میں کہوں، اتنا شریف بچہ........ اتنا نیک لونڈا مجھ بڑھیا کے منہ پر کالک لگا کر کیا کرے گا؟'' بڑی بی جلدی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ کپڑوں اور زیورات کی پوٹلی بنائے ہوئے وہ جلد ہی برآمد ہوئیں اور اس انداز میں طالوت کی طرف دیکھتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگیں جیسے ابھی اٹھ کر وہ ان سے پوٹلی چھین لے گا۔ پھر جو وہ دروازہ کھول کر بھاگیں تو پلٹ کر نہ دیکھا۔

لڑکیاں اب بھی بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ان کی آواز اندر پہنچ گئی۔ طالوت ایک دم چونک پڑا۔

''یہ........ یہ کیا حرکت ہے؟'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''حرکت تو ہم آپ سے پوچھیں گے عادل صاحب!'' سیمیں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر ہم سب گھوم کر کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ طالوت سر پکڑے بیٹھا تھا۔

''کیوں، کیا ہوا عادل بھائی؟''

''میں بوا کی عزت کو ڈر رہا ہوں۔ حسن و عشق کا یہ منظر آپ نے بھی دیکھ لیا ہوگا اور اب بوا کو بدنام کرتی پھریں گی۔'' طالوت نے مصنوعی پریشانی سے کہا اور لڑکیاں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

''آپ لوگ........ آپ لوگ انتہا پسند ہیں۔ واقعی انتہا پسند ہیں۔'' سیمیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مسخرے ہیں سرکار۔ آپ لوگوں کو ہنسا کر زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہی ہماری عبادت ہے اور یہی ہمارا مشن۔'' طالوت نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔

''بوا کے تو عیش ہو گئے۔ آپ نے وہ زیورات انہیں کیوں دے دیئے؟'' نصرت نے کہا۔

''آپ کو بھی پیش کر سکتا ہوں۔ آپ بوا سے حسد کیوں کر رہی ہیں؟'' طالوت نے کہا۔

''نہیں، نہیں۔ شکریہ۔'' نصرت شرماتے ہوئے بولی۔

''اری لے لے نا۔ سرخ جوڑا پہنائے گا۔ دو چار ڈرامائی ڈائیلاگ سننے پڑیں گے اور بس۔'' روحی نے کہا۔

''سوری روحی صاحبہ! آپ کے حقوق صائم بھائی کے نام محفوظ ہیں۔ اس لئے میں آپ کی شان میں کوئی گستاخ نہیں کر سکتا۔'' اور اب روحی کے شرمانے کی باری تھی۔

''آپ بھی کچھ بولیے سیمیں صاحبہ!''

''نہیں........ بس شکریہ۔ میں کیا بولوں؟'' سیمیں نے جان بچاتے ہوئے کہا۔

''مسٹر مکلارنس رو بہ صحت ہیں۔ لیکن آپ انہیں روکیے، وہ میرے ساتھ گھوڑے کی ریس لگانے کو تیار ہیں۔ بعد میں آپ ناراض نہ ہوں۔'' طالوت نے کہا اور سیمیں اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ پھر وہ مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

''اوہ........ سیمیں باجی فیل کر گئیں۔'' روحی بولی۔ اور پھر دونوں لڑکیاں بھی چلی گئیں۔ طالوت ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگا، پھر منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''ویل مسٹر عارف!........ پروگرام کیسا رہا؟''

''ٹھیک ہی رہا یار! مگر تم کچھ گڑبڑا گئے۔''

''کیا؟''

''میرا خیال تھا کہ سیمیں کی ملاقات ابھی احسان سے کرا دی جاتی۔''

''اوہ، مناسب نہ تھا عارف! اور پھر وہ دونوں بلائیں بھی تو اس کے ساتھ تھیں۔''

''خیر........ رات کو سہی........ لیکن یار! ان میں سے ایک بلا غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے۔''

''واللہ........ کون؟''

''روحی۔''

''ہائے، مارے گئے نا ہاتھ۔ یار! بڑے استاد ہو۔ یہاں وہ ستّر سالہ بڑھیا اتنے نخرے دکھا رہی ہے۔ قسمت ہی خراب ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

''ویسے بوا کے معاملے میں تم اوور ہو گئے تھے۔ بعض باتیں ناجائز تھیں۔''

''جائز و ناجائز کی ایسی تیسی۔ بڑی بی نے کسی حد تک مجھے قبول کر لیا ہے۔ میں اب باقاعدہ ان سے عشق شروع کر دوں گا۔'' طالوت نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا اور میں ہنستا رہا۔ اسی وقت ایک ملازم کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا اور بولا۔

''نواب صاحب نے نئے مہمان کے لئے کھانا بھجوایا ہے اور کہا ہے کہ اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو انہیں بھی ساتھ لے آئیں۔''

''اوہ........ نہیں۔ ابھی وہ بیمار ہیں۔ ٹھیک ہے، تم چلو۔ ہم آ رہے ہیں۔''

''بہت بہتر۔'' ملازم نے کہا اور پھر میں نے کھانے کی ٹرالی احسان کے کمرے میں پہنچا دی۔ احسان مسہری پر دراز تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ گیا اور مسکرانے لگا۔

''ابھی آپ کے کمرے سے سیمیں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔''

''فکر نہ کرو۔ تھوڑے دن کے بعد تمہارے کمرے سے بھی آنے لگیں گی۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا........ اب اچھے بچوں کی مانند ہاتھ منہ دھوؤ، کھانا کھاؤ۔ کل سے تمہارا پردہ ختم ہو جائے گا۔ ہم بھی کھانا کھانے جا رہے ہیں۔'' احسان ہنسنے لگا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے

بعد ہم دونوں کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ سب ہی موجود تھے۔ بیگم نواب نے بڑے خلوص سے ہمارے سلام کا جواب دیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ نواب شمشیر الدولہ بھی اپنے دلیر لڑاکوں کے ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھے اور ان کے سامنے صرف سُوپ رکھا ہوا تھا۔

لڑکیاں مسکرا پڑی تھیں۔ کھانا شروع ہو گیا۔

''شادیا بر فیلی حکومت ہے، نواب صاحب!........سال میں بارہ مہینے وہاں برف کی تہیں جمی رہتی ہیں۔'' طالوت کھانے کے دوران بولا۔ ''ہم لوگ سخت سردی کے عادی ہیں۔''

''بڑا خوب صورت علاقہ ہوگا۔ اگر کبھی آپ نے مدعو کیا تو ضرور حاضر ہوں گے۔'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یقیناً مدعو کریں گے نواب صاحب! ہاں، شمشیر صاحب کو ضرور ساتھ لائیں۔ لیکن وہاں سردی زیادہ ہے۔''

''میں جانتا ہوں، آپ لوگ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ لیکن میرے ساتھی خاموش رہیں گے۔ کیونکہ ہماری توہین کی ذمہ داری انکل پر عائد ہوتی ہے۔''

''ارے نہیں........اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟''

''عادل صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ مجھ میں سردی برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے۔ حالانکہ میری بیماری محض اتفاق ہے۔ میں نے برف کے جمے ہوئے سمندروں پر اسکیٹنگ کی ہے اور مہینوں وہاں گزارے ہیں۔ کیوں ایڈگر! میں نے غلط تو نہیں کہا؟''

''مجھے یاد ہے ڈیئر مکلارنس!........تم نے وہاں ایک سفید ریچھ کا شکار بھی کیا تھا۔''

''برف کے سمندر میں امانت بھائی؟'' طالوت نے کہا اور روحی بھی ہنس پڑی اور اس امانت بھائی پر نصرت کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہاں، ہاں۔ برف کے سمندر پر۔ سمندر جما رہتا ہے۔'' شمشیر نے طالوت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''اوہ........ریچھ بھی وہاں اسکیٹنگ کرنے آیا ہوگا۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا اور روحی بھی ہنس پڑیں۔ سیمیں البتہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لیکن طالوت کہاں خاموش رہنے والا تھا۔

''آئندہ ریس کب ہو رہی ہے نواب صاحب؟''

''اوہ........بہت جلد۔ شاید چودہ تاریخ کو۔''

''ویسے شمشیر صاحب نے مجھے گھوڑے کی سواری کے لئے چیلنج کیا ہے۔''

''خوف زدہ ہو تو معاف کر سکتا ہوں۔'' شمشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا بار بار بگڑنا اس کی شخصیت کو ہلکا کرتا ہے۔

''نہیں نہیں........خوف زدہ تو نہیں ہوں۔ مگر آپ سے مقابلے میں ڈر لگتا ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''کیوں؟'' شمشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک دفعہ کافی شرمندگی اٹھانی پڑی ہے۔ خدا کا شکر ہے، آپ ٹھیک ہو گئے۔ ورنہ میں نواب صاحب کو کیا منہ دکھاتا۔''

''لیکن آپ نے تو پانی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔''

''صائم بھائی نے منع کر دیا، ورنہ شاید میرا بستر بھی آپ کے قریب ہوتا۔''
''بہرحال، رائیڈنگ کے لئے میری پیشکش برقرار رہے گی۔ جب چاہو، سامنے آ جاؤ۔''
''بہتر ہے۔'' طالوت نے گردن جھکاتے ہوئے سعادت مندی سے کہا۔ نواب صاحب بھی کسی قدر پُرسکون ہو گئے تھے۔ البتہ شمشیر کے لڑاکے کینہ توز نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔
کھانا ختم ہو گیا اور ہم سب گفتگو کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے سیمیں نے مجھے کوئی اشارہ کیا تھا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ہم نواب صاحب سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ کمرے میں پہنچ کر میں طالوت سے سیمیں کے اشارے کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا لیکن چند منٹ کے بعد سیمیں عقبی کھڑکی میں نظر آئی۔ اس نے شیشہ بجایا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ سیمیں سنجیدہ ہی تھی۔
''صائم بھائی! آپ لوگوں سے کچھ گفتگو کرنی ہے۔''
''تو اندر آ جاؤ۔''
''نہیں، یہیں۔ صرف چند الفاظ۔'' سیمیں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
''کہو۔ کیا بات ہے؟''
''میری ایک درخواست قبول کر لیں؟''
''ضرور........ لیکن ایک شرط بھی ہے۔''
''کیا........؟''
''جواباً تمہیں بھی ہماری ایک درخواست قبول کرنا ہو گی۔''
''میں آپ کا حکم مان کر فخر محسوس کروں گی۔'' سیمیں نے خلوص سے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ درخواست پیش کرو۔''
''خدا کے واسطے، میرے لئے آپ لوگ شمشیرالدولہ کے منہ نہ لگا کریں۔ وہ مذاق کو سمجھنے کی حِس نہیں رکھتے۔ وہ ذہنی طور پر........ نہ جانے کیا ہیں۔ لیکن آپ اُن سے نہ اُلجھیں۔ ورنہ........ ورنہ وہ ہمارے خاندان کے لئے ایک مصیبت بن جائیں گے۔''
''ٹھیک ہے........ سیمیں! لیکن وہ ہماری درخواست؟''
''آپ نے میری درخواست منظور کر لی؟''
''سو فیصدی۔''
''اگر وہ ریس کے لئے کہیں، تب آپ تیار نہ ہوں۔''
''اس کی وجہ بھی بتا دو۔''
''ان کے پاس صرف تین باتیں ہیں۔ اگر انہیں نقصان پہنچ گیا تو........ تو........ ہم ذلیل ہو جائیں گے۔ ان کی کیفیت آپ دیکھ بھی چکے ہیں۔ میں تو ان کی بیماری سے لرز رہی تھی۔''
''تو سنو سیمیں! اگر انہوں نے ریس کا چیلنج دیا تو ضرور قبول کیا جائے گا۔ لیکن فکر مت کرو، ریس نہ ہو گی۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔''
''بہت بہت شکریہ۔ یہی کافی ہے۔''

''اور وہ ہماری درخواست؟''

''درخواست کہہ کر شرمندہ نہ کریں، حکم دیں۔'' سیمیں نے کہا۔

''آج رات کو........ ڈنر کے بعد جب سب لوگ سونے کے لئے کمروں میں چلے جائیں، تم تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس آؤ گی۔'' میں نے کہا۔ سیمیں ایک لمحے کے لئے تو بھونچکی رہ گئی، پھر اس کے چہرے سے شرمندگی کے آثار نظر آئے اور پھر وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''میں حاضر ہو جاؤں گی۔''

''شکریہ سیمیں! ہم انتظار کریں گے۔'' طالوت نے کہا اور سیمیں مڑ کر واپس چلی گئی۔

''یار طالوت! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان لوگوں میں بلا کی اپنائیت ہے اور انہوں نے ہمارے ذہنوں کو بری طرح جکڑ لیا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''جب میں نے سیمیں سے رات کو آنے کے لئے کہا تھا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تھے؟''

''ہاں........ مگر انہیں پڑھ نہیں سکا۔''

''پہلے تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ کیونکہ الفاظ بھی ایسے تھے۔ اس کے ذہن میں کچھ غلط خیالات آئے ہوں گے۔ لیکن پھر وہ ان خیالات پر شرمندہ ہوئی اور پھر اس نے بڑے اعتماد سے وعدہ کر لیا، جیسے اسے ہم لوگوں پر مکمل بھروسہ ہو۔''

''ارے تو کون سے برے ہیں ہم لوگ؟'' طالوت نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں ہنسنے لگا۔

رات کا کھانا حسب معمول نواب صاحب کے ساتھ کھایا۔ احسان کے لئے وہیں کھانا آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ طالوت نے سیمیں سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا تھا۔ حالانکہ شمشیر الدلہ نے کچھ چبھتے ہوئے فقرے پھینکے تھے۔ لیکن طالوت بڑے صبر سے انہیں پی گیا۔ اس لئے شمشیر الدولہ کا موڈ بحال رہا۔ کافی وغیرہ پینے کے بعد سب اٹھ گئے۔ شمشیر الدولہ حسب عادت بیہودگیاں کرتا رہا۔ آج تو اسے بولنے کا بہت زیادہ موقع مل گیا۔ کیونکہ میں اور طالوت خاموش تھے۔ ہاں، نواب صاحب سے جب کوئی بات برداشت نہ ہوتی تو بول ہی پڑتے۔

بہرحال اٹھتے ہوئے سیمیں نے ہمیں شکر گزار نگاہوں سے دیکھا تھا اور میں نے اسے معنی خیز نگاہوں سے۔ پھر ہم لوگ اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ کمرے میں آ کر ہم نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر احسان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ احسان جاگ رہا تھا اور ہم لوگوں کا منتظر تھا۔

''میری عجیب پوزیشن ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''غالباً چوروں جیسی۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔'' احسان نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے غالباً ذہنی طور پر ہماری پیشکش قبول کر لی تھی۔

''بس اب تیار ہو جاؤ۔ محترمہ تشریف لاتی ہوں گی۔''

''اوہ........ آپ نے انہیں کیا بتایا ہے؟''

''ابھی تک کچھ نہیں........ ارے ہمارا بھی اس پر حق ہے۔ بھابی ہے ہونے والی۔ کیا وہ ہماری اتنی

بات بھی نہیں مانے گی؟ لیکن استاد کمال دیکھنا ہے تمہارا۔ اسے ہر قیمت پر تیار کرنا ہے۔"
"ایک شرط پر۔" احسان نے کہا۔
"وہ کیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔
"آپ لوگ وعدہ کریں کہ اپنے کمرے میں بھی نہیں رہیں گے۔" احسان نے شرماتے ہوئے کہا۔
"ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ اپنے کمرے میں نہیں رہیں گے۔" طالوت نے قسم کھالی اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس بدمعاش سے مجھ سے زیادہ اور کون واقف ہوسکتا تھا؟
احسان کو سمجھا بجھا کر ہم اپنے کمرے میں آ گئے اور سیمیں کا انتظار کرنے لگے۔ خیریت ہی ہوئی، کیونکہ ہمارے کمرے میں داخل ہونے کے دو منٹ کے بعد ہی سیمیں نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
"آ جاؤ۔" میں نے کہا اور طالوت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سیمیں نے سفید لباس پر سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر استعجاب نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں سنجیدہ ہو گئے۔ طالوت نے تمام گفتگو میرے اوپر چھوڑ دی تھی۔
"دروازہ بند کر دو سیمیں!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور سیمیں نے صرف ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ تب میں اس کی طرف بڑھا اور پھر میں نے سیمیں کے مقابل کھڑے ہو کر کہا۔ "سیمیں! اگر میں تم سے کہوں کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں، تو؟"
سیمیں نے گھبرا کر میری شکل دیکھی اور پھر طالوت کی۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔
"تت.......تو میں اسے مذاق سمجھوں گی۔"
"لیکن اگر یہ مذاق نہ ہو تو؟.......تھوڑی سی پیچھے لوٹ جاؤ سیمیں! ہم نے تمہیں ٹرین میں دیکھا، پسند کیا اور پھر تمہارے پیچھے یہاں تک دوڑے چلے آئے۔ ہم دونوں تمہارے خواہش مند تھے اور موقع کی تلاش میں تھے۔ اور پھر جب ہم نے تمہیں اعتماد میں لے لیا تو موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچی اور آج دھوکے سے تمہیں یہاں بلا لیا۔ غور کرو، تمہاری پوزیشن کس قدر نازک ہے۔ تم خود چوروں کی طرح یہاں آئی ہو۔ ایسے میں اگر کوئی تمہاری مدد کو آ بھی جائے تو ہماری پوزیشن اس قدر خطرناک نہ ہو گی، جس قدر تمہاری......."
سیمیں نے گردن جھکا کر کچھ سوچا اور پھر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر بڑے پُر وقار لہجے میں بولی۔ "اگر یہ سب کچھ اسی انداز میں ہو جائے صائم صاحب! جس طرح آپ فرما رہے ہیں، تب بھی اسے میں آپ کا قصور نہیں سمجھوں گی۔ میں سوچوں گی، صائم صاحب! کہ قدرت نے مجھے کسی بہت بڑے گناہ کی سزا دی ہے اور اس سزا کو مزید اذیت ناک بنانے کے لئے اس نے آپ لوگوں کا انتخاب کیا ہے، کیونکہ آپ پر مجھے بے پناہ اعتماد ہے۔"
"سیمیں!.......تمہارے یہ الفاظ اس قدر خلوص سے کہیں زیادہ ہیں جو تمہارے لئے ہمارے دل میں ہے۔ لیکن کیا اس اعتماد کو نباہ سکتی ہو؟ کیا وہ خلوص قبول کر سکتی ہو جو ان الفاظ کی بے پناہ کیفیت سے ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے؟"
"میں نہیں سمجھی صائم صاحب!"

''سیمیں! ان الفاظ کی قیمت کے طور پر اگر میں اور عادل تمہیں بہن کہیں تو خدا کے حضور جوابدہ ہوتے ہوئے تم یہ رشتہ قبول کر لوگی؟'' میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

''صائم بھائی!'' سیمیں چکرا کر رہ گئی۔ ''میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکی۔''

''تم ابتدا سے مجھے بھائی کہتی آئی ہو۔ صرف احتراماً یا دل سے بھی کبھی یہ محسوس کیا ہے؟''

''میں خدائے بزرگ و برتر کو سامنے رکھ کر کہتی ہوں، صائم بھائی! کہ ابتدا میں ٹرین میں ہی آپ دونوں مجھے بے حد پسند آئے تھے۔ اس کے بعد آپ ہمارے قریب آ گئے۔ ہمارا ساتھ رہا، آپ کی دلچسپ شرارتوں، شگفتہ طبیعت نے میرے دل میں ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ میں اس جذبے کو عشق کا نام نہیں دے سکتی، کیونکہ یہ آپ دونوں سے یکساں تھا۔ ہاں ایک تصور ضرور تھا، ایک خواہش ضرور تھی، کاش پوری عمر آپ دونوں کے ساتھ ہی بسر ہو سکتی۔ آپ کی حسین شخصیتیں دل کے گوشوں میں پنہاں تھیں۔ اگر آپ کی ذرا سی توہین ہوتی ہے تو دل اندر سے کٹتا ہے۔ مجبوریاں بھی ہیں اس لئے اظہار کا ذریعہ نہیں ملتا۔ اور جب یہ طلب، یہ خواہش کسی نفسانی جذبے کا اظہار نہیں کرتی تو اسے روحانی حیثیت ہی دی جا سکتی ہے۔ اور روح کے رشتے کے لئے کوئی بھی لفظ اختیار کر لیا جائے۔ بھائی، باپ.......اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''گویا روح کا رشتہ طے ہو گیا۔''

''یقیناً۔'' سیمیں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''درمیان میں کوئی اجنبیت بھی نہیں رہی۔''

''قطعی نہیں۔'' سیمیں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''لہجے کی یہ مضبوطی برقرار رہے گی؟''

''تا زندگی۔''

''تب صرف اتنا سمجھ لو، سب کے لئے فرائض منتخب کئے گئے ہیں۔ اگر تمہارے دو بھائی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہیں تو اسے رد کرنا، روح کی دھجیاں اُڑانے کے مترادف ہے۔ عشق خدا کی طرف سے ودیعت ہے، جذبے سچے، پاک اور صادق ہوں تو انسان ولی اللہ کہلاتا ہے۔ آؤ.......میں تمہارا امتحان چاہتا ہوں۔''

''میں حاضر ہوں۔'' سیمیں نے کہا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر میں دروازے سے نکل گیا۔ سیمیں حیرت زدہ نظر آ رہی تھی۔ میں احسان کے دروازے پر پہنچ گیا۔

''جاؤ.......اس دروازے سے اندر چلی جاؤ۔ مقدس رشتے نبھانے کا امتحان کٹھن ہے۔ لیکن جو قول خدا کو سامنے رکھ کر کیا جائے، اس سے انحراف خدا کو بھی ناراض کر دیتا ہے۔'' میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ اسی وقت طالوت بدمعاش نے میرے اوپر شاہ دانا کا دوشالہ ڈال دیا اور پیچھے سے اندر کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ خود بھی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اس طرح ہم دونوں بھی احسان اور سیمیں کے درمیان پہنچ گئے۔

سیمیں، احسان کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ احسان بھی زرد چہرہ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''دروازہ بند کر دو سیمیں!'' احسان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ سیمیں نے اس کی کیفیت دیکھی اور

پھر پلٹ کر درواہ بند کر دیا۔
''تم......تم یہاں کیسے احسان؟'' بالآخر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
''سیمیں!......میں......میں جھوٹا نہیں ہوں۔ میں جو کہوں گا، اس پر اعتماد کر لینا۔''
''ہاں......میں جانتی ہوں، تم جھوٹے نہیں ہو احسان! اس قدر پریشان کیوں ہو؟ بیٹھو۔'' سیمیں اب خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔
احسان بیٹھ گیا۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ سیمیں کی حیرانی بھی عروج پر تھی، لیکن احسان کی اس کیفیت سے وہ پریشان تھی۔
''احسان!......احسان! مجھے تمہارے اوپر مکمل بھروسہ ہے۔ مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟........ میری طرف سے کسی بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو۔ میں تمہارے ایک ایک لفظ پر بھروسہ کروں گی۔''
''یار! بڑی عظیم عورت ہے۔ میں دل سے قائل ہو گیا۔'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
''خاموش رہو۔ وہ آواز سن لے گی۔''
''بے فکر رہو۔ نگاہوں سے غائب ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری آواز بھی گم ہو جاتی ہے۔ اس لئے بے دھڑک تبصرہ کرتے رہو۔''
''کمال ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ دوسری طرف احسان کہہ رہا تھا۔
''میں تمہید میں وقت ضائع نہیں کروں گا سیمیں!......کل رات کو جب تم میرے پاس آئی تھیں اور ہم دونوں گفتگو کر رہے تھے تو تمہاری اور میری گفتگو کا ایک ایک لفظ ان دونوں نے بھی سن لیا تھا۔ میری مراد شہزادہ عادل اور شہزادہ صائم سے ہے۔ زمین کے یہ فرشتے نہ جانے کس طرح وہاں پہنچ گئے تھے۔ پھر جب تم چلی گئیں تو وہ میرے پاس آئے۔ میرا لہو خشک ہو گیا۔ سیمیں! ان کی باتیں سن کر انہیں قتل کر دینے پر تل گیا۔ لیکن پھر ان کی گفتگو نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان پر اعتماد کروں۔'' احسان نے ایک ایک لفظ سیمیں کو سنایا اور پھر بولا۔
''بالآخر انہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کے ساتھ ایک ڈرامے میں شریک ہو جاؤں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا سیمیں! کہ یہ صرف میرے لئے نہیں، بلکہ سیمیں کے لئے بھی ہے۔ کیونکہ وہ اس کی بے پناہ عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا، وہ جو کچھ کریں گے، وہ کسی پر احسان نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہ اپنے جذبات کو تسکین دیں گے۔ پھر آج صبح انہوں نے وہ ڈرامہ شروع کر دیا۔'' احسان نے اصطبل والے ڈرامے کی تفصیل بتائی اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے نواب صاحب سے مہلت لے لی ہے۔
''کل وہ مجھے اپنے بھائی کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ میں نے ان کی اجازت سے تمہارے گوش گزار کر دیا ہے سیمیں!......خدا کی قسم، اگر تم یہ سب کچھ پسند نہ کرو تو میں انہیں مجبور کر دوں گا کہ وہ یہ سب کچھ نہ کریں۔''
احسان خاموش ہو گیا۔ سیمیں پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ویران ہو گیا تھا۔ نہ جانے اُس کے ذہن میں کون کون سے خیالات آ رہے تھے۔
خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا۔ پھر سیمیں واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون پھیل گیا۔ اور پھر وہ سرد آواز میں بولی۔

''انہیں ابو جان کے قرضے کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا ہے احسان!''

''ہاں۔''

''اس کا وہ کیا کریں گے؟''

''شاید وہ اسے ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا ابو جان اسے قبول کر لیں گے؟''

''اس کے بارے میں وہی بات کریں گے۔ بہرحال وہ چالاک ہیں۔''

''اگر قدرت ہمارے دلوں کے پھول کھلانا چاہتی ہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے احسان! ہم نے تو پہلے بھی اس کی رضا کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔ اب وہ اپنا کھیل بدلنا چاہتی ہے تو میں یا تم اسے روکنے کی قوت نہیں رکھتے۔ اگر وہ ابو جان کو تیار کر سکے تو ہم ان کے کاموں میں مداخلت نہ کریں گے۔ سنو احسان! شمشیر کے ساتھ زندگی گزارنے پر میں ہزار بار مرنے کو ترجیح دیتی۔ لیکن ابو جان کا وقار مجھے ہزار زندگیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اپنے دوستوں، ان فرشتوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اللہ کی جانب سے آئے ہیں تو ہم ان کے کام میں مداخلت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔''

''سیمیں! میری زندگی......!'' احسان نے روتے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے اور سیمیں اٹھ کر اس کے بازوؤں میں آ گئی۔

''اے بھائی صاحب!.......اے اواللہ کے نیک بندو! دوازہ تو کھول دو۔ تاکہ یہ دو بے وقوف باہر چلے جائیں۔ ہائے پوری کائنات گلے مل رہی ہے۔ صرف دو باقی ہیں۔'' طالوت بین کرنے لگا۔ اور میرا رنگ فق ہو گیا۔ میں گھبرا کر سیمیں اور احسان کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن ......دونوں ہماری آواز سے بے خبر تھے۔ ان دونوں کی سسکیاں اُبھر رہی تھیں۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے، پھر سیمیں نے کہا۔

''میں اجازت چاہتی ہوں احسان! براہِ کرم تم ان سے مل لو۔ اس وقت میں ان کا سامنا نہیں کر سکتی۔''

''ٹھیک ہے......تم سیدھی نکل جاؤ۔'' دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اور ہم کھلے ہوئے دروازے سے ان کے دور نکل جانے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر جونہی وہ دور ہٹے، میں اور طالوت باہر نکل آئے۔ طالوت میرا ہاتھ پکڑ کر دور نکل گیا تھا۔ تب میں نے شاہ دانا کا دوشالہ اتار دیا اور طالوت بھی انسانی ہیئت میں آ گیا۔ ہم دونوں رخ بدل کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ احسان پریشانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ہماری شکلیں دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

''کہاں ہے؟'' میں نے اشارے سے پوچھا۔

''چلی گئی۔'' احسان نے جواب دیا اور ہمارے قریب آ گیا۔ چند ساعت ہماری طرف دیکھتا رہا، پھر دونوں بازو پھیلا کر ہم سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

''پگلے! وقتی طور پر سہی، تُو ہمارا بھائی ہے۔ کیا رہا؟''

''سیمیں نے آپ کا حکم مان لیا ہے۔''

''مبارک ہو احسان!'' ہم دونوں نے اسے پُر خلوص مبارکباد دی۔

''لیکن اس نے کہا ہے کہ اگر اس کے ابو آپ سے وہ سب کچھ لینے پر تیار ہو گئے جو اصغر الدولہ کو ادا

کرنا ہے، تب یہ کام ہو سکے گا۔''
''ارے تم جیسے منہ زور گھوڑوں کو رام کر لیا تو وہ بڑے میاں کیا چیز ہیں۔ اور اب دیکھوں گا ان نواب شمشیر الدولہ کو۔ واپس ولایت نہ پہنچا دوں تو...... یو...... مم، میرا مطلب ہے، عادل نام نہیں۔''
احسان ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''سنا ہے، آپ نے اسے بے وقوف بنا کر ٹھنڈے پانی کے چشمے میں چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔''
''اب تو ریس بھی ہو گی۔ محترمہ نے اس چمار کی سفارش کی تھی۔ میرا خیال ہے، اب اس سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔''
''ریس کا کیا قصہ ہے؟'' احسان نے دلچسپی سے پوچھا اور میں نے اسے ریس کے بارے میں بتایا۔ احسان ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ رات گئے تک وہ ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ وہ اپنی زندگی بھر کی محرومی کے قصے سنا رہا تھا۔
دوسرے دن علی الصبح نواب صاحب ہمارے پاس آئے۔ ''میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آج کا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے، شہزادہ حسام کی ڈرامائی آمد کا اعلان کیا جائے گا یا نہیں؟''
''یقیناً نواب صاحب! یقیناً۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بڑی دلچسپی رہے گی۔ ویسے آپ لوگ بے حد فیاض اور فراخ دل ہیں شہزادہ عادل و صائم! لیکن ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ شمشیر کی کسی بدتمیزی سے دل میلا نہ کریں۔''
''اوہ، آپ بالکل بے فکر رہیں نواب صاحب! ویسے ایک خاص مسئلے پر آپ سے گفتگو کرنی ہے۔''
''کیا مسئلہ ہے؟''
''اس کے بارے میں آپ سے رات کو گفتگو ہو گی، نواب صاحب!''
''کیوں...... ابھی کیوں نہیں؟''
''طویل گفتگو ہو گی۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ براہِ کرم رات تک انتظار کر لیں۔''
''ضرور، ضرور۔ ویسے دن بھر اُلجھن میں رہوں گا۔ لیکن کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں، تو آپ شہزادہ حسام کو بھی تیار کر کے ساتھ لیتے آئیں۔''
''بہت بہتر۔'' طالوت نے گردن جھکا کر جواب دیا اور پھر وہ واپس چلے گئے۔
''ابے او جن!...... یہ کیا، کیا؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
''بس، بس اے آدم زاد! تُو اپنی عقل کو سب سے زیادہ کیوں سمجھتا ہے؟ ارے بھائی! ہماری کھوپڑی میں ناریل کا گودا نہیں ہے۔ ہم بھی کچھ سوچ سکتے ہیں۔''
''مگر سوچا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔'' طالوت نے اکڑتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔
''چلو آؤ، شہزادۂ عالم کو تیار کرا لیں۔'' اور ہم دونوں احسان کے کمرے میں گئے۔
''خوب۔ گویا آپ نے سوٹ کیس کھولا بھی نہیں ہے۔'' طالوت نے اس سوٹ کیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو شاید اس نے راسم سے منگوایا تھا۔ اور پھر اس نے سوٹ کیس کھول کر شیونگ مشین نکالی۔
''چلو، شیو کر کے منہ دھو لو۔ غسل تو تم نے کر لیا ہو گا۔''

''ہاں۔'' احسان نے جواب دیا اور شیونگ مشین کا پلگ ساکٹ میں لگا کر شیو کرنے لگا۔ پھر اس نے منہ دھویا۔ اس دوران طالوت اس کے لئے ایک اعلیٰ درجے کا سوٹ منتخب کر چکا تھا۔ ہلکے کلر کے سوٹ، بے داغ کالر اور حسین ٹائی، عمدہ چمک دار شوز نے احسان کی شخصیت ہی بدل دی تھی۔ طالوت نے اس کی انگلیوں میں قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں ڈال دیں۔ ہیرے کا ٹائی پن لگا دیا۔ شکل وصورت سے احسان یوں بھی شہزادہ معلوم ہوتا تھا، اس لئے اس وقت اسے شہزادہ تسلیم نہ کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ یوں ہم احسان کو لے کر بَر دکھاوے کو چل پڑے اور شاید نواب صاحب نے کوئی باقاعدہ تقریر کر دی تھی، سب لوگ حیران تھے اور دروازے کی طرف منتظر۔

پھر جب ہم تینوں اندر داخل ہوئے تو سب جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ ارادتاً اور کچھ غیر فطری طور پر۔ حتیٰ کہ شمشیر الدولہ بھی کھڑے ہونے والوں میں شامل تھا۔ پھر جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی سب لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

''شہزادہ صائم! میں نے ان لوگوں کو بتا دیا ہے کہ آج ناشتے پر ہمارے ساتھ ایک انتہائی پُراسرار شخصیت مدعو ہے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ گویا آج کی صبح ایک دلکش انکشاف سے شروع ہوئی ہے۔''

لڑکیاں اور دوسرے لوگ حیرت سے احسان کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی پہلے بولنے والا پہلا بے وقوف، شمشیر ہی تھا۔

''میرا خیال ہے انکل! میں نے اس شخص کو اصطبل میں دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے......''

''کوئی حرج نہیں ہے شمشیر! تم جیسا انسان ایسے ہی الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ بہرحال، تمہارا خیال درست بھی ہے۔ کافی عرصے تک شہزادہ حسام ہمیں بے وقوف بناتے رہے۔''

''شہزادہ حسام؟'' بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

''ہاں...... شادیا کے تیسرے شہزادے، شہزادہ حسام۔ جو تفریحاً ہمارے اصطبل میں گھوڑوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ لیکن کون جانتا تھا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ شادیا سے ناراض ہو کر طویل عرصہ قبل چلے آئے تھے اور ان کے دونوں بھائی عادل اور صائم انہیں تلاش کر رہے تھے۔ مجھے مسرت ہے کہ یہ دلچسپ ملاپ میرے غریب خانے پر ہوا۔''

''ارے......'' دوسروں کے منہ سے نکلا۔ ملازم بھی حیران تھے۔ کیونکہ احسان ان کے ساتھ کوارٹروں میں ہی رہتا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''خوب......!'' یہ شمشیر کی آواز تھی۔ ''ویسے انکل! آپ کا شوق دلچسپ ہے۔ لوگ کبوتر پالتے ہیں، بٹیر پالتے ہیں، گھوڑے پالتے ہیں۔ آپ آج کل شہزادے پال رہے ہیں۔''

نواب صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ انہوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں ہماری طرف دیکھا، لیکن طالوت فوراً بول پڑا۔ ''ہاں شمشیر الدولہ! نواب جلال الدین کے شوق واقعی دلچسپ ہیں۔ اپنے وطن میں بندروں کی کیا کمی تھی کہ انکل نے ولایت سے دیسی بندر امپورٹ کئے ہیں۔''

''وہاٹ......؟'' اچانک شمشیر کا ایک ساتھی کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خونی نگاہوں سے طالوت کو گھور رہا تھا۔ طالوت نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور اچانک خونخوار آدمی کے چہرے پر بوکھلاہٹ

کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ سوڈے کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔

''بھئی یہ تو مذاق کی گفتگو ہے۔ اس میں برا ماننے کی کیا ضرورت ہے شمشیر؟'' نواب صاحب نے بات برابر کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے برا نہیں مانا انکل! میرا ساتھی بے وقوف ہے۔'' شمشیر زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ نواب صاحب نے چند لمحات ماحول درست ہونے کا انتظار کیا اور پھر وہ حسام کے بارے میں دوسرے لوگوں کو بتانے لگے۔ سیمیں بھی گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ حسب معمول تاثرات سے عاری تھا۔ بہرحال احسان سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ناشتہ جاری رہا، لیکن شمشیر اور اس کے ساتھیوں کے منہ بنے ہوئے تھے۔ اچانک شمشیر نے کہا۔

''بات مذاق کی ہی ہے انکل! لیکن میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکوں گا کہ یہ اجتماع شہزادگان کس لئے ہے؟''

''اوہ.... ممکن ہے، الوری کے اصغر الدولہ نے تمہارے آنے کے بعد اپنے اصول بدل دیئے ہوں۔ ورنہ نوابوں کے مہمان خانے کبھی خالی نہیں رہتے۔'' جلال الدین نے کہا۔

''نہیں، میری وجہ سے اصول نہیں بدلے گئے۔ ہاں، کچھ پرانے اصولوں کی پابندیاں ضرور کی جاتی ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم تصدیق شدہ اعلیٰ نسب کے لوگوں کو مہمان بناتے ہیں۔ آپ حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔'' اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی شخص خود کو شہزادہ کہہ کر ہم میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہماری حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ آپ شادیا کے بارے میں ہی غور کر لیں۔ بقول شہزادوں کے، وہ کوئی پہاڑی ریاست ہے۔ پہاڑوں کی ریاست کیا ہوگی۔ ممکن ہے، تھوڑے سے رقبے میں چند لوگوں کو جمع کر کے جرگہ بنا لیا گیا ہو اور اسے ریاست کا نام دے دیا گیا ہو۔ معاف کیجئے گا انکل! اس سے ہماری توہین ہوتی ہے۔ مجھے جواب دیں۔ کیا شادیا......''

''ہاں...... میں شادیا کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان لوگوں کی نیکی اور شرافت، شادیا کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور اس کے علاوہ شمشیر! تم یہاں صرف ایک مہمان کی حیثیت سے ہو۔ میرا خیال ہے، مہمانوں کے لئے بھی کچھ اصول مقرر ہوتے ہیں۔'' نواب صاحب مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

''نہیں انکل! میں صرف مہمان نہیں ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میں صرف...... مہمان...... نہیں ہوں۔'' شمشیر الدولہ نے ایک ایک لفظ رک رک کر اور نواب صاحب کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''اس لئے مجھے حق ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں آپ سے سوالات کروں ...... اور ...... ان سے میں سوالات کروں۔ کیا آپ مجھے بتا سکیں گے، شہزادہ عادل! کہ شادیا کی مالی حالت کیا ہے؟''

''بڑی معمولی سی، شمشیر الدولہ۔ ہم لوگ تفریحی سفر پر نکلے ہیں۔ کچھ زادِ راہ ساتھ ہے، جسے خرچ کرنے پر ہم حسب ضرورت اور منگوا سکتے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہے کہ اگر آپ الوری جیسی دو چار ریاستیں مع اس کے محل اور اس میں رہنے والوں کو فروخت کرنا چاہیں تو ہم اس کی فوری ادائیگی کر سکتے ہیں۔ ریاست کے نوابوں کو اپنا غلام بنا کر، انہیں ہی اپنی ریاست کی نگرانی سونپ کر ان کی تنخواہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اگر آپ الوری کو فروخت کر کے پھر سے مکلا رنس بننا چاہتے ہوں تو اپنے والد سے بات کر لیں اور

کاغذات منگوالیں۔ یہیں نواب جلال الدین کے محل میں ریاست کی قیمت ادا کی جائے گی۔" طالوت نے لاپروائی سے کہا۔

بڑا بھرپور جواب تھا۔ شمشیر برداشت نہ کر سکا۔ وہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اور اس کے ساتھی بھی۔ نواب صاحب نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سب ناشتے کے کمرے سے نکل گئے اور نواب صاحب گھبرائے ہوئے انداز میں انہیں دیکھنے لگے۔ تب طالوت نے سرو کرنے والے ملازم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بھئی کافی اور دو........آپ بھی لیں نواب صاحب!"

ہم لوگوں کی اس اپنائیت اور بے تکلفی پر نواب صاحب کی آنکھوں میں نمی آ گئی جسے وہ پی گئے۔ شمشیر کی ذلالت پر ان کا خون کھول رہا تھا۔

واپسی میں احسان بھی ساتھ ہی تھا۔ اسے الگ کمرہ اسی لئے دلوایا گیا تھا کہ آپس کی گفتگو میں دقت نہ ہو، اور ہم اپنا کام انجام دیتے رہیں۔

"یہ شمشیر الدولہ سخت بدتمیز انسان ہے۔ واقعی نواب زادے کے بجائے کسی سرکس کا مسخرہ معلوم ہوتا ہے۔" احسان نے کہا۔

"میرا خیال ہے صائم بھائی! اب کچھ کام کی باتیں ہونی چاہئیں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"آج شمشیر الدولہ سے ہی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ طے نہیں کیا ہے۔ لیکن تفریح کرنی چاہئے۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ بے چارے نواب صاحب کی حالت واقعی خراب ہے۔ شمشیر بھی یہاں سے ٹلنے والا نہیں معلوم ہوتا۔ اور ظاہر ہے، ہم تو اپنے حسام بھیا کے سہرے کے پھول دیکھے بغیر یہاں سے جائیں گے نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب میں نواب صاحب کے پاس جا کر دیکھتا ہوں۔"

"کیا بات کرو گے؟" میں نے کہا۔ لیکن اسی وقت ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دروازے پر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور پھر دروازہ کھلا اور شمشیر کی شکل نظر آئی۔ اس کے پیچھے اس کے مسلح لڑاکے بھی تھے۔ شمشیر خونی نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ پھر وہ اندر آ گیا۔

"یہ نواب جلال الدین کا محل ہے، اس لئے میں یہاں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا۔ لیکن تم نے الوری کی توہین کی ہے۔ میرے ساتھی بضد ہیں کہ تمہیں اس کی سخت سزا دی جائے۔ چنانچہ شادیا میں اگر مردانگی پائی جاتی ہے تو میں تمہیں کسی کھلی جگہ مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔"

"زوبی فال کیسا رہے گا شمشیر بہادر؟" طالوت نے دلچسپی سے کہا۔

"نواب محل کے علاوہ کوئی بھی جگہ مناسب ہے۔"

"تب آپ تیاریاں کریں شمشیر بہادر! الوری سے آپ کی فوج کب تک پہنچ جائے گی؟" طالوت نے پوچھا۔

"فوج؟........تم تینوں کو ایڈگر با آسانی قتل کر دے گا۔" شمشیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔آپ کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔'' طالوت نے شانے ہلائے۔ احسان بوکھلائے ہوئے انداز میں ہم سب کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

''سس........ سنیئے تو شہزادہ عادل!'' اس نے درمیان میں مداخلت کی۔

''ہوں، ہوں........ خاموش رہو حسام! شمشیر بہادر اور ان کے تین بندروں کی ہڈیاں کڑکڑا رہی ہیں۔ انہیں درست کرنے کے بعد بات کریں گے۔ ہاں تو شمشیر بہادر! اگر آپ نواب صاحب کی مدد لینا چاہیں تو لے لیں، ورنہ پھر ایسا کرتے ہیں کہ شام کو پکنک کا پروگرام بنا کر چلتے ہیں۔ وہاں ہمارا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' شمشیر نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا اور پھر گردن اکڑاتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

''ٹھیک ہے شمشیر بہادر! تم نے یہ فضا خود ہی پیدا کی ہے۔ بہرحال، تفریح رہے گی۔'' طالوت بڑبڑایا اور میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نصیحت کے علاوہ اور سب کچھ۔'' طالوت غرایا۔

''تم یہ تو سوچو، نواب صاحب اُلجھن میں پھنس جائیں گے۔ جبکہ ابھی تم نے ان سے بات بھی نہیں کی ہے۔''

''یار! مجھے غصہ آ گیا ہے۔ جو کچھ کرنا چاہتے ہو، ابھی کرلو۔ تا کہ شام کو خالی الذہن ہوں۔'' طالوت نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر ہمیں دروازے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ نواب جلال الدین نے دروازے سے اندر آنے کی اجازت طلب کی تھی۔

''اوہ، تشریف لایئے نواب صاحب!'' ہم تینوں کھڑے ہو گئے۔ نواب صاحب کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

''بیٹھیے۔ آپ لوگ بیٹھیے۔ شہزادہ صائم! میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں........ ضرور۔ آپ لوگ دوسرے کمرے میں آ جایئے۔'' میں نے طالوت اور احسان سے کہا اور طالوت نے مجھے آنکھ ماردی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ دونوں اندر چلے گئے تو نواب صاحب گردن جھکا کر بیٹھ گئے۔ میں ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر نواب صاحب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''شہزادہ صائم! آپ کی جس قدر توہین اس گھر میں ہوئی ہے، اس کے لئے میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔ میرا دل ہمیشہ روتا رہے گا۔''

''قطع کلامی کی اجازت دیجئے نواب صاحب! میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔'' میں نے درمیان میں ٹوکا اور نواب صاحب سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ ''اگر آپ کی مراد شمشیر الدولہ کی گفتگو ہے، تو سب سے پہلے میں عرض کر دوں کہ براہِ کرم ان کی اور ہماری جو گفتگو ہوئی ہے، اس سے اپنا تعلق نہ قائم کریں۔ مجھے علم ہے کہ شمشیر الدولہ آپ کے بچپن کے دوست کے صاحبزادے ہیں۔ لیکن آپ ہر بار بھول جاتے ہیں کہ آپ نے ہم اجنبی لوگوں کو اپنے سلوک سے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم اجنبی نہیں، بلکہ اپنے گھر میں ہیں۔ اس لئے اگر آپ شمشیر الدولہ کے بارے میں معذرت کرتے ہیں تو ہمیں دکھ ہوگا۔''

''میرے بچے!........ میرے عظیم بچو! میں صرف اتنا کہوں گا کہ تمہاری رگوں میں ایک شریف خون ہے۔'' نواب صاحب لرزتی آواز میں بولے اور ان کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔

''اگر آپ یہ اعتراف کرتے ہیں نواب صاحب! اگر آپ ہمیں پسند کرتے ہیں تو کیوں اپنوں میں جگہ نہیں دے دیتے؟'' میں نے کہا۔

''میں اپنے خدا کو جواب دہ ہوں کہ میں تمہیں غیر نہیں سمجھتا۔'' نواب صاحب کی رُندھی ہوئی آواز اُبھری۔

''تب آپ نادانستگی میں ہمیں غیریت کا احساس دلا رہے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' نواب صاحب حیرت سے بولے۔

''سنیئے نواب صاحب! اس گفتگو سے ناراض ہو کر آپ چاہیں تو بے تکلفی سے ہمیں گھر سے نکال دیں۔ اور اگر ہمیں اس کا جواب نہ ملا تو ہم بددل ہو کر خود ہی یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ آج فیصلہ ہو جائے گا۔ شمشیر کی حیثیت ہمارے علم میں ہے۔ لیکن کیا آپ یہ بتائیں گے نواب صاحب! کہ اس کی دوسری حیثیت کیا ہے؟''

''دوسری حیثیت؟'' نواب صاحب پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔

''ہاں......کیا اس کی دوسری حیثیت سیمیں کے منگیتر کی نہیں ہے؟''

''ہاں......وہ سیمیں کا منگیتر ہے۔''

''نواب صاحب! ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔ اگر آپ ہمیں شریف النسل سمجھتے ہیں تو کیا ہم آپ سے درخواست کر سکتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنے بیٹوں کی حیثیت دیں۔ آپ اس درخواست کو قبول کریں گے؟''

''میرے بیٹے!......میرے بیٹے! خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں اپنا لختِ جگر سمجھتا ہوں۔''

''اس حیثیت سے سیمیں ہماری بہن ہوئی؟''

''یقیناً۔''

''تو نواب صاحب! میں اپنی بہن کے لئے شمشیر الدولہ جیسے انسان کو ناپسند کرتا ہوں۔ آسمان اور ذرّے کی بات ہے۔ میری بہن شائستہ اور اعلیٰ معیار کی ہے اور وہ ایک مصنوعی انسان ہے، جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے۔ وہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہے۔ وہ ذہنی طور پر کمتر ہے۔ بدسلیقہ اور غیر شائستہ ہے۔ نواب صاحب! کیا ایک بھائی اپنی بہن کو جہنم میں جھونک سکتا ہے؟ کیا آپ ذمہ داری لیتے ہیں کہ میری بہن کے ساتھ بدسلوکی نہ ہوگی؟ کیا وہ کم ظرف آدمی قدم قدم پر اس کی توہین نہیں کرے گا؟''

''مجھے احساس ہے بیٹے!'' نواب صاحب روتے ہوئے بولے۔

''کیا بیٹیاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں نواب صاحب! کہ انہیں جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے؟''

''نہیں۔''

''تو سنئیں۔ سیمیں اس سے نفرت کرتی ہے۔ شدید نفرت۔ میں دعویٰ کرتا ہوں۔''

''لیکن میں......میں مجبور ہوں بیٹے!''

''کیوں؟......جواب دیں۔'' میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا اور اچانک ان کی سسکیاں رک گئیں۔

''اپنی غلط کاریوں کی بنا پر۔ سنو، جلال آباد رہن ہے۔ میرا وقار فروخت ہو چکا ہے۔ میں

اصغر الدولہ کا مقروض ہوں۔ میں جھوٹی شان پر بیٹی کی قربانی دے رہا ہوں۔"

"مجھے علم ہے۔ اور اگر اس محل میں ہماری توہین ہوئی ہے تو صرف یہی کہ ہم اپنائیت کی بھیک مانگتے رہے ہیں اور ہمیں وہ بھیک نہیں ملی۔ دولت دنیا کی سب سے بے حقیقت شے ہے نواب صاحب! وہ انسان کا وقار نہیں خرید سکتی۔ جو لوگ دولت سے وقار کی تجارت کر سکتے ہیں، وہ انسان نہیں کہلاتے اور جانور اور انسان، رحم کے رشتے میں تو منسلک ہو سکتے ہیں، کسی اور رشتے میں نہیں۔ ہمارے دلوں نے آپ کے ماحول کو قبول کر لیا ہے، ہم نے آپ سے محبت طلب کی، آپ نے صرف ہمارا احترام کیا، ہماری ضرورت پوری نہیں کی۔ آپ شمشیر کی بدتمیزیوں کی معافی مانگنے چلے آئے، اپنے بیٹوں سے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ آخر کیوں نواب صاحب! کیا یہی اپنائیت ہے؟"

"میں مجرم ہوں بیٹے! مجھے جو چاہو سزا دے لو۔" نواب صاحب گردن جھکاتے ہوئے بولے۔

"اولاد والدین کو، چھوٹے بزرگوں کو، سزا نہیں دیتے۔ ہاں اپنی خواہشات کے لئے ضد ضرور کرتے ہیں۔ سنیئے نواب صاحب! میں آپ سے اپنا حق طلب کرتا ہوں۔ میں آپ کا اعتماد چاہتا ہوں۔ میں آپ کی اپنائیت، آپ کی محبت چاہتا ہوں۔"

"بولو......کس طرح یقین کرو گے؟" نواب صاحب پُر اعتماد لہجے میں بولے۔

"میں اپنی بہن کے لئے، اس کا پسندیدہ مستقبل چاہتا ہوں۔"

"میری مجبوریاں تمہارے علم میں ہیں۔"

"جوان بیٹے، والدین کی مجبوریاں سمیٹ لیتے ہیں۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ عادل اور صائم۔ نواب صاحب! ہم دونوں کی خواہش ہے کہ ہم اصغر الدولہ کا قرض اس کے منہ پر مار دیں۔ اور نواب صاحب! ہماری خواہش ہے کہ ہم حسام کو اور سیمیں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیں۔ حسام اب کہیں نہیں جائے گا۔ سنیئے نواب صاحب! حالانکہ یہ بات میرے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ میں کئی زندگیوں کو داؤ پر لگا رہا ہوں۔ لیکن اب میں ہر انجام کے لئے تیار ہوں۔ میرا ایمان ہے، سچ میں جو قوت ہوتی ہے، وہ جھوٹ میں نہیں۔ جھوٹ بعض اوقات بہت سے معاملوں کی ملمع پوشی کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے انسان کے ضمیر پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں اور وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔ حسام میرا بھائی نہیں ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ وہ سیمیں کو چاہتا ہے۔ بھری دنیا میں تنہا ہے۔ سیمیں کا کالج کا ساتھی ہے۔ سیمیں کی وجہ سے یہاں ملازم ہوا تھا۔ اور جب سیمیں کو شمشیر کی تصویر نظر آئی تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس نے خود کو بے حقیقت شے سمجھا اور وہ جذبات میں دیوانی ہو گئی۔ لیکن حسام نے......جس کا نام احسان ہے، اسے سنبھالا۔ اسے خاندانی وقار پر قربان ہونے کے لئے تیار کر لیا۔ اور اتفاق سے پوری بات ہمیں معلوم ہو گئی۔ نواب صاحب! اس راز کے چوتھے شریک آپ ہیں۔ ہم احسان کی شرافت سے متاثر ہوئے۔ سیمیں کے لئے احسان سے بہتر شوہر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کی شادی صرف احسان سے ہو گی۔ خواہ ہمیں اس کے لئے ریاست الوری تباہ کرنا پڑے۔ وہ ہماری بہن ہے۔ بہر حال ہم نے احسان کو مجبور کر دیا کہ وہ ہمارے کہنے پر عمل کریں۔ اگر اس وقت جذبات میں آ کر میں سچ بولنے پر آمادہ نہ ہوتا تو حسام کی حیثیت سے احسان کی شادی سیمیں سے ہوتی۔ یہی ہونا ہے جو ہم نے سوچا ہے اور یہی ہو گا۔ سیمیں جیسی نیک لڑکی جہنم میں نہیں جائے گی۔ سنیئے، ریاست الوری کا جتنا قرض آپ پر ہے، آپ اسے اس

کے منہ پر مار دیں اور شمشیر سے تعلقات منقطع کر لیں۔ ہم احسان کی شادی سیمیں سے کرنے کے بعد یہاں سے جائیں گے۔"

میری آواز میں غراہٹ تھی اور چہرے پر عزم۔ نواب صاحب پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر تک ان پر سکتہ رہا۔ پھر وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

"سیمیں بھی اسے پسند کرتی ہے؟"

"بے پناہ۔ اس طرح کہ اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے تو وہ بے جان انسانوں کے مانند زندہ رہیں گے۔"

"لیکن اصغرالدولہ چھچھورا آدمی ہے۔ گو وہ........"

"اسے صرف اپنی رقم چاہئے نا؟"

"ہاں۔ اس کے پاس کاغذات ہیں۔ ایسے کاغذات........"

"تمام کاغذات آج ہی رات آپ کو مل جائیں گے، رقم ادا کئے بغیر۔" میں نے پھر نواب صاحب کی بات درمیان سے کاٹ دی۔ "لیکن اس کے باوجود آپ اسے رقم ادا کر دیں۔"

"اب میں کچھ نہیں بول سکتا۔ ٹھیک ہے، میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ میں تمہارے احسان کا تذکرہ بھی نہیں کروں گا۔ سب کچھ فضول ہے۔ لو، میرا وقار اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" نواب صاحب نے اپنی ٹوپی اتار کر میرے سامنے اچھال دی۔ لیکن میں نے اسے زمین پر نہ گرنے دیا اور اٹھا کر سر پر رکھ دی۔

"آج آپ نے ہمیں دنیا کی سب سے قیمتی شے دے دی ہے نواب صاحب! جائیے، آرام کیجئے۔ اس خاندان کی عزت اب آپ کے دونوں بیٹے سنبھالیں گے۔"

"میں اپنے بیٹوں کی قوت کا معترف ہوں۔" نواب صاحب پوری طرح اطمنان سے بولے اور پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں کمرے سے نکلا اور احسان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ طالوت موجود نہ تھا، صرف احسان تھا جو اُداس سی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ طالوت کہاں ہوگا۔ بہر حال وہ میرے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"تو تم نے میری اور نواب صاحب کی گفتگو سن لی؟" میں نے کہا۔

"اچھی طرح۔"

"کہیں کوئی جھول؟"

"ذرہ برابر نہیں۔"

"کاغذات کا کیا کرو گے؟"

"آدمی روانہ کر دیا ہے۔"

"کوئی دقت تو نہیں ہوگی؟"

"ذرہ برابر نہیں۔ بلکہ تم کہو تو الوری کو دیوالیہ کر دوں؟"

"نہیں۔ ہمیں صرف شمشیرالدولہ سے پرخاش ہے۔ اور اب یہاں اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ چنانچہ آج شمشیرالدولہ کی دعوت ہوگی۔ اور ہاں، اپنے اس یار کا منہ تو میٹھا کرو۔ اس کی شادی کی بات پکی ہوگئی

ہے۔ سمجھے احسان!........نواب صاحب، سیمیں کی شادی تمہارے ساتھ کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔"

احسان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس کی آنکھوں سے صرف آنسو بہتے رہے۔ طالوت نے جلدی سے جیب سے ایک پڑیا نکالی اور اسے کھولنے لگا۔ پھر اس نے پڑیا میں سے شکر کی ایک چٹکی بھری اور احسان کا منہ کھول کر اس میں ڈال دی۔

"ناشتے کی میز سے چرائی تھی، اسی موقع کے لئے۔ لو، تم بھی منہ میٹھا کرو۔" اس نے تھوڑی سی شکر اپنے اور تھوڑی سی میرے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اور شدید سنجیدگی کے باوجود احسان بھی ہنس پڑا۔

❁

پکنک کی تیاریوں کے لئے کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ البتہ شمشیر الدولہ کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑے پسند کئے تھے۔ لڑکیاں آج سب ہماری کار میں تھیں۔ دوسری کار بھی لے لی گئی تھی۔ بہر حال کسی کو بتایا نہیں گیا تھا کہ آج شمشیر کی شامت آ گئی ہے۔ شمشیر نے سیمیں کو بھی گھوڑے پر چلنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن سیمیں نے معذرت کر لی تھی۔ تاہم شمشیر نے اپنا گھوڑا خاص طور سے سیمیں کی کار کے پیچھے لگایا۔ لیکن اس کار کا اسٹیئرنگ طالوت کے ہاتھوں میں تھا۔

گھوڑوں کی جان تو راستے میں ہی نکل گئی تھی، کیونکہ تیز رفتار کار کا ساتھ دینے کے سلسلے میں مار کھا کھا کر ان کا برا حال ہو گیا تھا۔ بہر حال، ہم اب زوبی فال کے نزدیکی میدان میں پہنچ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد چاروں سوار بھی پہنچ گئے۔

''سیمیں!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''جی صائم بھائی؟''

''تمہارے ایکس منگیتر نے آج ہمیں چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ تم سے معذرت کے ساتھ۔''

''ایکس منگیتر۔'' سیمیں ہنس پڑی۔ لیکن وہ سوالیہ انداز میں میری شکل بھی دیکھ رہی تھی۔

''یہ خوشخبری تمہیں یہیں لا کر سنانا چاہتا تھا۔ عادل کی جیب میں شکر کی پڑیا ہے، جو اس نے ناشتے کی میز سے چرائی تھی اور جس سے ایک ایک چٹکی بھر کر اس نے احسان اور میرا منہ میٹھا کرایا تھا۔ ابھی چپکے سے وہ پڑیا مانگ کر میں تمہیں بھی ایک چٹکی کھلاؤں گا۔''

سیمیں عجیب سے انداز میں ہنس رہی تھی۔

''ارے بھئی صاف صاف کیوں نہیں پوچھتیں؟ ہاں ہاں، میں نے نواب صاحب سے بات کر لی ہے اور وہ میرے بھائی حسام سے نہیں بلکہ تمہارے کالج فیلو احسان سے تمہاری شادی کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اور خدا کی قسم، اس میں جھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور سیمیں سکتے میں رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پھر وہ آگے بڑھی اور اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی، جس سے اس کے ذہنی ہیجان کا اندازہ ہوتا تھا۔

''خود کو سنبھالو سیمیں! تم جتنی پیاری لڑکی ہو، ہم تمہیں شمشیر جیسے گیدڑ کے حوالے کیسے کر سکتے تھے؟''

سیمیں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکی تھی۔

لیکن شمشیر نے دور سے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ سیمیں ابھی تک میرا بازو پکڑے ہوئے تھی۔ اگر تنہائی ہوتی تو وہ یقیناً مجھ سے لپٹ جاتی۔ دوسرے لمحے شمشیر کا گھوڑا ہماری طرف دوڑا۔ وہ منہ سے شوں شوں

کرتا ہوا ہمارے نزدیک پہنچ گیا اور پھر مجھے گھورتے ہوئے سیمیں سے بولا۔

”کیا بات ہے سیمیں؟........ یا تمہارے ساتھ بدتمیزی کی گئی ہے؟“

”بدتمیزی تو اب تمہارے ساتھ کی جائے گی میری جان! فکر مند نہ ہو۔“

”میں تمہارے بدن کی پوری کھال اتار دوں گا صائم! تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔“ شمشیر گرجا اور دوسرے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ طالوت جلدی سے میری طرف بڑھا تھا۔

”سیمیں! اس کا ہاتھ چھوڑ دو۔ مجھے یہ بے تکلفی پسند نہیں ہے۔“

”ولدیت میں تو تم لوگ اپنی مائیں اور بہنیں دوسروں کی آغوش میں دے دیتے ہو، یہاں یہ اعتراض کیوں؟ اور پھر سیمیں سے تو تمہارا کوئی بھی رشتہ نہیں ہے۔“ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔

شمشیر کا پارہ عروج پر پہنچ گیا۔ دوسرے لمحے اس نے دانت پیس کر گھوڑے کو ایڑ دی۔ وہ شاید دیوانگی میں گھوڑا ہی ہمارے اوپر چڑھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک ایک دلچسپ تماشا شروع ہو گیا۔ گھوڑا آگے بڑھنے کے لئے زور لگا رہا تھا، لیکن کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کی دُم پکڑ رکھی تھی اور وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔

تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ گھوڑا ایک بار اچھلا اور دوسرے لمحے اس نے الف ہو کر شمشیر کو نیچے گرا دیا۔ شمشیر منہ کے بل گرا تھا۔ اس سے اس کا چہرہ خراب ہو گیا لیکن دوسرے لمحے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔

لڑکیاں سہم کر چیخنے لگیں۔ شمشیر کے لڑاکوں نے پستول نکال لئے تھے۔

”شمشیر بہادر اپنے لڑاکوں کی مدد سے لڑکیوں کی بے عزتی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کسی کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ موجود ہیں۔“ طالوت نے ہونٹ بھینچ کر کہا اور لڑکیاں زور سے چیخنے لگی۔

”یہاں سے تمہاری لاشیں ہی واپس جائیں گی۔“ شمشیر گرجا۔

”سن لیا تم لوگوں نے؟........ نواب صاحب کے سامنے گواہی دینا ہو گی۔“ طالوت پھر لڑکیوں سے بولا اور پھر شمشیر سے بولا۔ ”میں حکم دیتا ہوں، شمشیر! کہ اپنے آدمیوں کو پستول پھینکنے کا حکم دو۔“

”پکڑو اسے۔ گرا کر ذبح کر ڈالو۔“ شمشیر نے تینوں لڑاکوں سے کہا اور انہوں نے جلدی سے پستول ہولسٹروں میں رکھ کر چاقو نکال لئے۔ میں اور احسان آگے بڑھے تو طالوت نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

”نہیں نہیں صائم بھیا! یہ ہماری توہین ہے۔ کیا میں ان تینوں سے بھی نہیں نمٹ سکوں گا؟ تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”یہ دیوانگی ہے۔“ احسان گرجا۔

”رک جاؤ حسام! ٹھیک ہے۔ عادل انہیں درست کر دے گا۔“ میں نے کہا اور احسان چونک کر میری شکل دیکھنے لگا۔

شمشیر کے چہرے سے آگ برس رہی تھی۔ وہ اس وقت سب کچھ کرنے پر تُل گیا تھا۔ لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں۔ سیمیں پاگلوں کی طرح کبھی میری اور احسان کی شکل دیکھتی اور کبھی عادل اور لڑاکوں کی۔ شمشیر کے لڑاکے چاقو کھولے طالوت پر حملہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان کے چہروں سے وحشت برس رہی

تھی۔ عجیب ماحول تھا۔ دوسرے لوگ لرز رہے تھے، لیکن طالوت کی حقیقت سے صرف میں واقف تھا۔
''معزز شمشیر الدولہ! میں تمہارے لڑاکوں کی پٹائی نہیں کروں گا، صرف ان کے لباس اُتار لوں گا، انہیں زوبی فال کے دریا میں تین تین غوطے دوں گا۔ اور میرے خیال میں یہی سزا ان کے لئے کافی ہو گی۔ اس کے بعد تمہارے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔''
''ذبح کر دو۔'' شمشیر حلق پھاڑ کر چیخا اور تینوں لڑاکوں نے خوف ناک انداز میں طالوت پر حملہ کر دیا۔ طالوت نے انہیں جھکائی دی اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ بمشکل تمام وہ تینوں خود کو زخمی ہونے سے بچا سکے تھے۔ میں سمجھ گیا، طالوت اگر چاہتا تو اس کے ایک اشارے پر وہ تینوں برہنہ ہو سکتے تھے۔ ان کے چاقو، ان کے ہاتھوں سے نکل کر ایک دوسرے کے جسم میں پیوست ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ انسانوں کے سے انداز میں لڑنا چاہتا تھا تا کہ کوئی اس کی شخصیت پر شک نہ کر سکے۔
لڑاکے سنبھلے اور اس بار انہوں نے بڑی مہارت سے حملہ کیا تھا۔ لیکن اس بار طالوت نے انہیں جھکائی نہیں دی بلکہ اس نے ان تینوں کو دبوچ لیا۔ وہ تینوں اس کے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ گئے اور بری طرح زور لگانے لگے۔ افراتفری کا عالم تھا، اس لئے کسی نے طالوت کے اچانک لمبے ہو جانے والے ہاتھوں پر توجہ نہیں دی تھی ورنہ تین آدمیوں کو بیک وقت جکڑ لینا ممکن نہیں تھا۔ طالوت کے ہاتھ غیر معمولی طور پر لمبے ہو گئے تھے اور ان کی گرفت میں بھنچے ہوئے لڑاکوں کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اور ان کے انداز سے بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔
''اپنے اپنے چاقو پھینک دو، ورنہ تمہاری پسلیاں چُور چُور ہو جائیں گی۔'' طالوت نے غرّاتے ہوئے کہا اور لڑاکے سہمی ہوئی نگاہوں سے شمشیر کو دیکھنے لگے۔
''ٹکڑے کر دو۔ پلٹ کر ہاتھ مارو۔'' شمشیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اور پھر اس نے اپنا پستول نکال کر اس کا رخ طالوت کی طرف کر دیا۔ لیکن اس وقت میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے پھرتی سے شمشیر کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر میرا گھونسہ شمشیر کے جبڑے پر پڑا۔ شمشیر کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ لیکن مجھے اپنی یادداشت پر ہمیشہ شرمندگی ہوتی تھی۔ مجھے اس وقت بھی یاد نہیں تھا کہ میری رگوں میں طالوت کا مہیا کیا ہوا شربتِ فولاد دوڑ رہا ہے۔ وہ تو جب میرے گھونسے نے عجیب تماشہ دکھایا، تب مجھے یاد آیا۔ شمشیر کا جبڑا اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا اور وہ کروٹ کے بل نیچے گرا تھا۔ میں نے اس کا پستول اٹھایا اور پوری قوت سے پانی کی طرف اچھال دیا۔
شمشیر کے حواس گم تھے۔ ممکن ہے، دو چار دانت ٹوٹ گئے ہوں۔ اس ایک گھونسے نے ہی اسے خراب پوزیشن کا احساس دلا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اُٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری طرف عادل نے تینوں لڑاکوں کو ادھ موا کر دیا تھا۔ ان کے چاقو ان کے ہاتھوں سے نکل کر نیچے گر پڑے تھے اور اب ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔
''چھوڑ دو........ ٹخ........ خدا کے لئے چھوڑ دو۔'' ایڈگر نے بمشکل کہا۔
''ایک شرط پر۔'' طالوت نے جواب دیا۔ ''تم لوگ اپنے کپڑے اُتار کر پانی میں تین تین غوطے لگاؤ گے۔''
''ہم لگائیں گے۔'' وہ تینوں بیک وقت بولے اور طالوت نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھر اس نے ان

تینوں کی طرف دیکھا۔ وہ جھوم رہے تھے اور گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ شمشیر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔

"ہیلو ڈیئر مکلارنس! آؤ۔" عادل نے اسے چیلنج کیا اور شمشیر دانت پیس کر رہ گیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہوش خراب کئے ہوئے تھا اور اس میں کوئی نیا خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں تھی۔

"کم آن ڈیئر مکلارنس! ولایتی چوہے کی چٹنی خواتین کو بے حد پسند ہو گی۔ آؤ، ہمت کرو۔" طالوت پھر بولا اور شمشیر خاموشی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے گھوڑے کی رکاب پر پاؤں رکھا اور وزن ڈال کر اس پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک رکاب ٹوٹ گئی اور ایک بار پھر اسے زمین چاٹنا پڑی۔ گھوڑا الف ہو کر دُور ہٹ گیا تھا۔

"ایسے نہیں بھاگ سکو گے پیارے بندر!" طالوت نے پھر کہا اور اس بار شمشیر کسی ارنے بھینسے کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اس نے سر سے ٹکر مارنی چاہی تھی، لیکن طالوت کسی ماہر بل فائیر کی طرح سامنے سے ہٹ گیا اور شمشیر دور تک دوڑتا چلا گیا۔ پھر اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے طالوت پر پھینک مارا۔ لیکن یہاں بھی طالوت نے ستم ظریفی سے کام لیا۔ پتھر چند فٹ پر گر پڑا تھا۔

"ہائے.......اس بھینسے جیسے بدن کی یہ نزاکت۔ بہت تھک گئے پیارے!" طالوت بولا اور پھر ایک دم چیخا۔ "اے، تم کہاں بھاگ رہے ہو؟.......رک جاؤ۔" اور شمشیر کے تینوں لڑاکے جو موقع ملتے ہی فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، اس طرح رک گئے جیسے کسی نے ان کی کمر پکڑ لی ہو۔

"شرط پوری کئے بغیر تم نہیں بھاگ سکو گے۔" طالوت مسکراتے ہوئے بولا اور وہ تینوں گڑگڑانے لگے۔

"معاف کر دو۔ بس ایک احسان کرو۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ مر جائیں گے۔"

لڑکیوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ انہیں شاید ان سانڈوں سے اس بزدلی کی توقع نہیں تھی۔ ان کے پاس پستول موجود تھے لیکن اب شاید وہ پستول نکالنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے۔

"تب پھر دوسری شرط پوری کرنا ہو گی۔" طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"معاف کر دو شہزادے صاحب! بس ایک بار معاف کر دو۔" وہ گڑگڑائے۔

"معاف کر دوں گا۔ لیکن دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے اپنے پاؤں سے جوتے اتار کر شمشیر الدولہ کی کھوپڑی پر پانچ پانچ رسید کر دو۔ جلدی کرو، ورنہ میں تمہیں اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گا۔" طالوت ان کی طرف بڑھا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ جھکے اور اپنے اپنے جوتے اتارنے لگے۔

"کمینو!.......ذلیلو!.......کتو!.......تم میرے جوتے لگاؤ گے؟" شمشیر الدولہ دھاڑا۔

"مجبوری ہے باس! پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ ہم مرنا نہیں چاہتے۔" ایڈگر نے کہا۔

"نمک حرامو! میں آج ہی سے تمہیں اپنی ملازمت سے خارج کرتا ہوں۔"

"ہم محنت مزدوری کر لیں گے باس! مگر پانی بہت ٹھنڈا ہے۔" وہ ایک ایک جوتا پکڑے آگے بڑھے اور پھر شمشیر دیوانہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد ایک دلچسپ ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شمشیر اب طالوت سے یا مجھ سے تو بھڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے آدمیوں پر گھونسے برسا رہا تھا اور وہ لوگ اس کے جوتے لگانے میں کوشاں تھے۔ طالوت نے صرف پانچ پانچ جوتوں کے لئے کہا تھا، لیکن اب بات بگڑ گئی

تھی۔ شمشیر ان پر گھونسے برسا رہا تھا اور وہ جوتے۔ ایسی حالت میں گنتی کسے یاد رہتی ہے۔
طالوت ہاتھ جھاڑتا ہوا سیمیں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے سیمیں؟''
''بہت عمدہ عادل بھائی! اس کمبخت نے مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔'' سیمیں نفرت سے بولی اور دوسری لڑکیاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ لڑائی زور و شور سے جاری تھی۔ تب طالوت نے سیمیں سے کہا۔
''کیا خیال ہے سیمیں! ان لوگوں کو لڑنے دیں۔ ہم واپس چلیں۔''
''چلئے۔'' سیمیں بھی بہت زیادہ موڈ میں تھی۔ چنانچہ ہم واپس اپنی گاڑی کی طرف چل پڑے۔ سیمیں کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ احسان کی موجودگی سے اس پر ایک انبساط کی کیفیت طاری تھی۔ اسے اب شمشیر یا اس کے ساتھیوں کی کوئی پروا نہیں رہ گئی تھی۔ راستے میں قہقہے اُبلتے رہے۔ سب لوگ اس دلچسپ جنگ پر تبصرہ کر رہے تھے۔
''اللہ، عادل صاحب! جب ان کم بختوں نے آپ پر چاقوؤں سے حملہ کیا تو میرا تو دم رُکتے رُکتے رہ گیا۔ لیکن آپ پتہ نہیں، آدمی ہیں یا جن۔ آپ نے انہیں چوہوں کی طرح دبوچ لیا تھا۔'' روحی نے کہا۔
''اور صائم صاحب کے ایک ہاتھ کے بعد شمشیر بہادر نے دور ہی دور رہنے میں عافیت سمجھی۔ اس کے بعد وہ کسی قیمت پر قریب آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔''
''میں ہی رہ گیا۔ یارو! تم لوگ اسے پکڑ لیتے تو ایک آدھ ہاتھ میں بھی جھاڑ دیتا۔ ویسے تو میرے اندر ہمت نہیں تھی۔'' احسان نے کہا اور سب ہنس پڑے۔
''آپ بھی چھپے رستم ہوں گے حسام بھائی! آخر بھائی تو ان دونوں کے ہی ہیں۔'' نصرت بولی۔
''بھائی ضرور ہوں، رستم نہیں۔ اعتراف کرتا ہوں۔''
''لیکن اب ہوگا کیا؟ .... انکل کو کیا جواب دیں گے؟'' روحی نے پریشانی سے کہا۔
''سیدھی سی بات ہے۔ ابو سے شمشیر کی شکایت کریں گے۔ اس نے اپنے لڑاکوں کی مدد سے ہم لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا تم لوگ اس کی گواہی نہیں دو گی؟''
''یقیناً دیں گے۔'' دونوں لڑکیاں بیک وقت بولیں۔
''پھر مجبوری تھی۔ صائم بھائی اور عادل بھائی .... اور .... حسام صاحب کو بولنا پڑا۔ کیا یہ لوگ ہماری بے عزتی برداشت کر لیتے؟''
''ہرگز نہیں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔ اور پھر ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔ گاڑیاں محل کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ محل میں ہم لوگ گاڑیوں سے اُترے۔ ہم نے ملازموں سے نواب صاحب کے بارے میں پوچھا اور پتہ چلا کہ نواب صاحب اندر موجود ہیں۔
''ہم لوگ تو اپنے کمروں میں جا رہے ہیں، تم اپنا کام شروع کر دو۔'' طالوت نے کہا اور لڑکیوں نے گردن ہلا دی۔ اور پھر ہم اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ ہم نے لباس تبدیل کئے۔ احسان کسی قدر پریشان نظر آ رہا تھا۔
''کیوں، آپ کو کیا ہوا؟'' طالوت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''یہ شمشیر کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دے۔ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔'' احسان نے کہا۔
''آپ لحاف اوڑھ کر مسہری پر لیٹ جایئے۔ کوئی آئے تو منہ ڈھک لیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے

گا۔" طالوت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"یہ بات نہیں ہے۔ میں بس یہ نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے نواب صاحب کسی زحمت میں پڑیں۔"
"داماد ہو تو ایسا ہونہار۔ ٹھیک ہے بھائی! تم اپنے سسر کے لئے فکرمند ہو۔ لیکن ہم غریب بھی تو کسی کام آسکتے ہیں۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ شمشیر الدولہ اس کوٹھی میں تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ ممکن ہے آج ہی اس کی چھٹی ہو جائے۔ آئندہ وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ رہے باقی معاملات......تو نواب صاحب بھی اس سے دبے نہیں رہیں گے۔ پھر فکر کس بات کی ہے؟" طالوت نے کہا اور احسان خاموش ہو گیا۔
زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نواب جلال الدین ہانپتے کانپتے ہمارے پاس آئے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔
"یہ......یہ سب کیا قصہ ہے شہزادہ صائم؟"
"غلطی اسی کی تھی نواب صاحب!......یقین فرمایئے۔ آپ نے دیکھا، ہم تو اس کی ہر بات ٹالتے تھے لیکن خواتین سے اس کی بدتمیزی ہم سے برداشت نہ ہو سکی۔ بہت لفنگا آدمی ہے۔"
"میں تمہارا شکر گزار ہوں بیٹے!......اگر......اگر اصغر الدولہ کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیتا۔ تم لوگوں کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"
"نہیں نواب صاحب! وہ ولایتی چوہے ہمارا کیا بگاڑ سکتے تھے؟" طالوت نے کہا۔
"ظاہر ہے، تم پہاڑی شہزادے ہو اور وہ...... بہرحال تم نے ٹھیک کیا۔ ایک بار پھر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" نواب صاحب نے کہا۔ "مگر وہ کہاں گیا؟"
"شاید آتے ہوں۔" طالوت نے معصومیت سے کہا۔
"آیئے، کھانا تیار ہے۔ آؤ احسان میاں!"
"چلو۔" طالوت نے احسان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور احسان لڑکیوں کی طرح شرما گیا۔
حسب معمول کھانے کے کمرے میں سب موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی لڑکیاں مسکرا پڑیں۔ ابھی ہم کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھے بھی نہ تھے کہ ایک ملازم دوڑا آیا اور جلال الدین چونک کر اسے دیکھنے لگے۔
"کیا بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"حضور! وہ شمشیر الدولہ......نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔"
"کہاں ہے وہ مردود؟" نواب صاحب غصے سے کھڑے ہو گئے۔
"بری حالت ہے سرکار! کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ سے خون نکل رہا ہے۔ منہ سوجا ہوا ہے۔ پہچانا نہیں جا رہا۔"
"ہے کہاں؟" نواب صاحب نے پوچھا۔
"اسی طرف آرہے ہیں۔"
"تم لوگ یہاں رکو، میں اس سے بات کروں گا۔" نواب صاحب کرسی سے اٹھ گئے۔
"الٰہی! خیر۔" نواب بیگم نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن ہم لوگوں کے یہاں بیٹھے رہنے کی تک نہیں تھی چنانچہ ہم بھی جلدی سے اٹھ گئے۔ ہمارے دیکھتے ہوئے لڑکیاں اور بیگم نواب بھی کھانے کے کمرے سے نکل آئیں۔ نواب صاحب اور شمشیر الدولہ زیادہ دور نہیں تھے۔ بلاشبہ شمشیر الدولہ کی

حالت درست نہیں تھی۔ شاید اس کی اس کے ساتھیوں سے کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ ہم نے بغور ان دونوں کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔

"مجھے یقین ہے، ان لوگوں نے واپس آ کر آپ کو بہت کچھ سنایا ہوگا لیکن مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اور آج الوری اور جلال آباد کی پُر اتحاد دوستی ختم ہوگئی۔ اب ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں نواب جلال الدین! اور تم جانتے ہو، الوری کی دشمنی تمہیں کس قدر مہنگی پڑے گی۔ میں جلال آباد کو نیلام کراؤں گا۔ کوڑیوں کے مول نیلام کروں گا اس کو......اور پھر میں جلال آباد کے محل میں رہنے والوں کی قیمت لگاؤں گا۔ آپ کے وقار کا جنازہ جلال آباد کی سڑکوں پر نکلے گا۔"

طالوت سے اس کی بکواس برداشت نہ ہو سکی۔ وہ آگے بڑھا اور بولا۔ "اگر آپ اجازت دیں نواب صاحب! تو میں اس کے کپڑے اتار لوں، اس کا منہ کالا کروں اور ایک گدھے پر بٹھا کر الوری کی طرف ہانک دوں۔"

نواب صاحب غصے کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ شمشیر کی دیوانوں جیسی کیفیت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ طالوت کی بات سن کر وہ اس پر جھپٹ پڑے گا۔ اپنی جان دینے اور اس کی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس ولایتی دیوانے کو اتنا ہوش ضرور تھا کہ اس نے خود کو قابو میں رکھا۔ اسے طالوت وغیرہ کی قوت کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے طالوت کو صرف خونی نگاہوں سے گھورنے پر اکتفا کی۔

"شمشیر!.......اصغر الدولہ کے ناخلف!.......تُو جلال آباد میں مہمان ہے۔ اگر تُو مہمان نہ ہوتا تو.......تو شاید میں سب سے پہلے تیری زبان گدّی سے نکلوا لیتا.......اور پھر.......اور پھر......." غصے کی شدت سے نواب صاحب کے منہ سے الفاظ نہ نکل سکے۔

"بہتر یہی ہے شمشیر! کہ تم اپنی منحوس صورت لے کر دس منٹ کے اندر محل اور تھوڑی دیر کے اندر جلال آباد چھوڑ دو۔ ہم نے تمہارا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ اور ہاں....... ہماری وہ پیش کش برقرار ہے۔ جلال آباد کو نیلام کرانے کے خواب کسی پاگل خانے میں جا کر ضرور پورے کر لینا۔ ہاں، الوری کا خریدار میں موجود ہوں۔ میں الوری کو معہ اس کے محل کے مکینوں کے خریدنے کو تیار ہوں۔ اور اگر تم بھی ان میں شامل ہوئے شمشیر! تو میں تمہیں گھوڑوں کی مالش کرنے پر ملازم رکھوں گا۔ بلاشک تمہاری حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اب میں نے وقت کی گنتی شروع کر دی ہے اور پچاس سیکنڈ گزر چکے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ....... جاؤ۔" اچانک طالوت دہاڑا اور شمشیر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر وہ ایک دم پلٹ پڑا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ طالوت نے وہاں کھڑے ہوئے ملازموں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کھانے کے کمرے میں ہمیں اس کے چلے جانے کی اطلاع دو۔ آیئے نواب صاحب!" اس نے نواب صاحب کا بازو پکڑ لیا اور نواب صاحب نے اس کے ساتھ اندر آنے میں کوئی تعرض نہیں کیا۔

"کھانا شروع کریں اور اسے ذہن سے نکال دیں۔ طویل زندگی ہے۔ ہمیں ہر قسم کے اچھے برے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس کی حیثیت کا احساس دلا دیا گیا ہے۔"

نواب صاحب نے خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔ ان کی کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی۔ بہرحال، کھانے کے دوران کوئی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے کھانا ختم ہوگیا۔ کھانے کے بعد سب لوگ اٹھ گئے اور کھانے کے کمرے سے نکل آئے۔ نواب صاحب نے ان لوگوں سے اجازت مانگی۔

''میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔''
''کیا میں ایک گھنٹے کے بعد آپ کے پاس حاضر ہو سکتا ہوں نواب صاحب؟'' طالوت نے پوچھا۔
''اوہ......'' نواب صاحب نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''انتہائی ضروری گفتگو کرنی ہے۔''
''میں انتظار کروں گا۔'' نواب صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور ایک طرف چل پڑے۔
میں، احسان اور طالوت اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں، میں نے ایک ملازم سے پوچھا۔
''شمشیر الدولہ چلا گیا؟''
''جی شہزادے صاحب!''
''اس کے ساتھی تو نہیں آئے؟''
''جی نہیں۔'' ملازموں نے جواب دیا اور ہم گردن ہلا کر آگے بڑھ گئے۔
''معلوم ہوتا ہے، شمشیر الدولہ کے تینوں جانبازوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ظاہر ہے، ساتھ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال اب زیادہ وقت برباد کرنا مناسب نہیں ہے۔ نواب صاحب ذہنی طور پر سخت پریشان ہیں۔''
''ہاں......ان کی کیفیت عجیب سی ہے۔'' احسان نے کہا۔
''پروا مت کرو۔ ایک گھنٹے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''کیا کریں گے عادل بھائی؟'' احسان نے پوچھا۔
''دیکھا صائم! کیسا بے حیا بھائی ہے۔ سسرال والوں کے تذکرے سے ذرا بھی نہیں شرماتا۔ چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔ ورنہ منہ پر پھٹکار برسنے لگے گی۔'' طالوت نے کہا اور احسان ہنستا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم دونوں اپنے کمرے میں واپس آ گئے تھے۔ طالوت نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔
''کیا خیال ہے؟'' اس نے متفکرانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔
''کیا مطلب؟''
''نواب کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ شمشیر سے معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اب نواب کو اپنی عزت کی پڑ گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذہنی انتشار میں وہ کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے۔ ہم نے بھی صرف وعدہ ہی کیا ہے۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔''
''بہرحال، میں نے اس سے ایک گھنٹے کی مہلت تو لے ہی لی ہے۔ میرا خیال ہے، اب وقت برباد کرنا بے سود ہے۔ اس کا کام ختم کر لیا جائے۔'' طالوت نے کہا اور پھر بائیں سمت رخ کر کے آواز دی۔
''راسم......!'' اور پُراسرار غلام حاضر ہو گیا۔
''کاغذات لے آیئے۔''
''حاضر ہیں شہزادہ حضور!'' راسم نے ایک صندلی بکس، طالوت کے سامنے رکھ دیا۔
''تمہیں یقین ہے کہ یہ کاغذات مکمل ہیں؟ ان کے علاوہ تو کچھ اور نہیں رہ گیا؟ کوئی بھی ایسا نشان جس سے اندازہ ہو کہ نواب جلال الدین کسی بھی طرح الوری کے مقروض ہیں؟''

''بالکل نہیں آقا! اب الوری میں کچھ نہیں رہ گیا ہے۔'' راسم نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے راسم! اب ہمیں اس رقم کی ضرورت ہے جو نواب جلال الدین پر نکلتی ہے۔ اسے کرنسی کی شکل میں یہاں ڈھیر کر دو۔''
''جو حکم شہزادہ حضور!'' راسم نے گردن جھکائی اور پھر وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ طالوت مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں دم بخود تھا۔ مجھے طالوت پر رشک آ رہا تھا۔ کیسا صاحب اختیار ہے یہ شخص۔ دنیا کی ضرورتیں اس کے لئے کس قدر آسان ہیں۔ کاش میری دنیا کے لوگ بھی اسی طرح مطمئن ہوتے۔ کاش! یہ زندگی ان کے لئے اس قدر کٹھن نہ ہوتی۔ تب یہ دنیا ایک خوب صورت پھول کی مانند ہوتی۔ ایک مہکتا ہوا پھول۔ ہر چہرے پر دمک ہوتی۔ غربت ذہن پراگندہ کرتی ہے۔ حادثات ہوتے ہیں، جرائم ہوتے ہیں، نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی ضروریات پوری ہونے لگیں تو نفسانفسی کی یہ زندگی محبت کے پھول بکھیر سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر انسان کو ایک طالوت مل جائے یا ہر انسان راسم کی طرح سب کچھ حاصل کر سکے۔ انسانی جدوجہد باقی رہے۔ لوگ محنت کریں اور اپنی ضروریات پوری کر لیں، بس۔ کوئی زندگی گزارنے کے لئے پریشان نہ رہے۔ کاش......کاش.......
''تو قبلہ وکعبہ بھائی صاحب! میرا مطلب ہے، شہزادہ صائم! ہم نواب صاحب کے پاس چلیں؟''
''چلو۔ لیکن کیا ہم یہ کاغذات دیکھیں؟''
''نہ دیکھنا بہتر ہے۔ کسی کے رازوں سے واقف ہونے سے کیا فائدہ؟''
''ٹھیک ہے۔ چلو'' میں نے کہا۔ طالوت نے کاغذات کا مقفل صندوق بغل میں دبایا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم دونوں نواب صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑے اور تھوڑی دیر بعد ہم ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ بیگم نواب نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں نمایاں تھیں جنہیں شاید انہوں نے جلدی میں پونچھا تھا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ جھجکیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے خلوص پر پورا بھروسہ کر لیا تھا اور ہم پر اپنوں ہی کی طرح بھروسہ کرتے تھے۔ بیگم نواب صرف ایک لمحے اُلجھیں، پھر رو پڑیں اور سسکتے ہوئے بولیں۔
''آؤ میرے بچو! ان کی حالت بہت خراب ہے۔ تم بھی ہمارا تماشہ دیکھ لو'' وہ دروازے کے قریب سے ہٹ گئیں اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔
''دروازہ بند کر دیں امی حضور!'' طالوت نے کہا اور بیگم صاحبہ نے دروازہ بند کر دیا۔ نواب صاحب ایک مسہری پر بے حال پڑے تھے۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ہم دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔ طالوت نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ میری قوتِ تقریر سے آگاہ تھا۔ چنانچہ میں نواب صاحب کی مسہری کی پٹی پر بیٹھ گیا۔
''تو آپ کو ابھی تک ہمارے اوپر یقین نہیں آیا نواب صاحب!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ نواب صاحب نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''یہ بات نہیں ہے بیٹے!........ یہ بات نہیں ہے۔'' انہوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
''میں آپ سے کوئی معذرت نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ یقیناً

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اب شمشیر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ الوری جا کر اصغر الدولہ کو پوری تفصیل بتائے گا۔ اصغر الدولہ آپ کے کتنے ہی دوست سہی، لیکن وہ بیٹے کے طرف دار ہوں گے اور اس کا انتقام لینے کے لئے آپ کو پریشان کریں گے۔"

"یہی بات ہے....... یہی بات ہے۔" نواب صاحب نے گہری گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے....... براہِ کرم اُٹھ کر بیٹھیے۔ امی حضور! آپ بھی تشریف رکھئے۔ اتفاق سے آپ یہاں موجود ہیں اور آپ اسی قدر پریشان ہوں گی، جس قدر نواب صاحب۔ آپ ہم سے جدا نہیں ہیں۔ نواب صاحب! کیا امی حضور بھی ہماری پیشکش سے واقف ہیں؟"

"ہاں۔ یہ میری پریشانی میں برابر کی شریک ہیں۔" نواب صاحب نے کہا اور سہارا لے کر اٹھ گئے۔

"تو نواب صاحب! یہ وہ صندوقچہ ہے جس میں آپ کے وہ کاغذات موجود ہیں، جن میں آپ پر قرض کی تفصیل ہے۔"

"ہیں......" نواب صاحب اُچھل پڑے۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملا؟" انہوں نے جھپٹ کر صندوقچہ اپنے قبضے میں کر لیا۔

"منگوایا گیا ہے۔ براہِ کرم اس کی تفصیل نہ معلوم کریں۔ کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

"بخوبی....... اصغر الدولہ نے اس میں ہی میرے کاغذات رکھے تھے۔"

"تب براہِ کرم آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔" طالوت نے کہا اور پھر اس نے چٹکی سے صندوقچے کا تالا کھول دیا۔ نواب جلال الدین نے بے صبری سے صندوقچہ کھولا اور اس میں سے ایک ایک دستاویز نکال کر دیکھنے لگے۔ ان کی حالت پاگلوں کے مانند تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور وہ آنکھیں مل مل کر کاغذوں کو پوری مضبوطی سے پکڑ پکڑ کر یقین کر رہے تھے کہ یہ انہی کے کاغذات ہیں۔ خود بیگم نواب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کاغذات کو دیکھ رہی تھیں۔

نواب صاحب کی حالت اعتدال پر آتی جا رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنی حیثیت بھول گئے تھے اور بچوں کی طرح خوش نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔ اور پھر نواب صاحب نے آخری کاغذ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"یہ کہاں سے آ گیا؟....... خدا کے لئے مجھے بتاؤ تو سہی، یہ کاغذات کہاں سے آ گئے؟"

"ان کے علاوہ اور کچھ بھی ہے اصغر الدولہ کے پاس؟" طالوت نے ان کی بات کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں....... اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میری حیثیت انہی کاغذات میں پوشیدہ تھی۔"

"اگر اصغر الدولہ کبھی آپ پر حرف زنی کرتا تو انہی کاغذات کے ذریعے نا؟"

"ہاں....... اب تو اس کے پاس میرے خلاف کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تب براہِ کرم انہیں مجھے دے دیجئے۔" طالوت نے کہا اور نواب صاحب نے صندوقچہ طالوت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ طالوت اسے لئے آتش دان کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر اس نے پورا صندوقچہ آتش دان میں ڈال دیا۔ نواب صاحب کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ ان کی آنکھیں سچے موتیوں کے مانند چمکنے

لگیں۔ وہ وفورِ مسرت سے ہاتھ مل رہے تھے۔ جب صندوقچہ اور کاغذات جل کر راکھ ہو گیا تو انہوں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

”خدا کے لئے، اب تو بتا دو، یہ کہاں سے آیا؟“

”یہ ہماری اپنی کوشش تھی نواب صاحب!........ اصغرالدولہ کے خزانے سے یہ صندوقچہ ہم نے چالاکی سے منگوا لیا۔ اب وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یعنی قانونی طور پر یہ بات ختم ہو چکی ہے کہ جلال آباد پر الوری کا قرض ہے۔ لیکن آپ کے تعلقات بھی ہیں، دوستی بھی ہیں۔ شمشیر اس قابل نہیں تھا کہ آپ سیمیں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے۔ چنانچہ آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ آپ اسے برداشت نہیں کر سکے اب اصغرالدولہ، بیٹے کی بے عزتی سے کتنے ہی سیخ پا ہوں، آپ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یعنی وہ کسی سے یہ کہنے کے قابل نہیں ہیں کہ آپ پر کچھ ہے۔“

”یقیناً........ یقیناً۔“ نواب صاحب خوشی سے بولے۔

”تاہم آپ ایک نیک انسان ہیں۔ اگر اصغرالدولہ کو عقل آ جاتی ہے اور وہ صرف شریفانہ طور سے آپ سے اپنی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں تو آپ انہیں شریفانہ طور پر ان کی رقم واپس کر دیں۔ اس کا انتظام بھی ہو چکا ہے۔ براہِ کرم میرے ساتھ کمرے تک چلیے۔“

اور نواب صاحب جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

’بے بس انسان........ تمام نوابی بھول گیا ہے۔‘ میں نے دل میں سوچا۔ ورنہ کیا کرّ وفر تھے۔ اور اس کی قیمت سیمیں تھیں۔ ایک حسین، نیک اور معصوم لڑکی۔ نواب صاحب اور بیگم نواب ہمارے کمرے میں آ گئے۔ احسان حسب معمول کمرے میں تھا اور کمرے میں لکڑی کے دو صندوقوں کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ گویا راسم اپنا کام کر چکا تھا۔

”آپ یہ رقم کس شکل میں ادا کرنا پسند کریں گے نواب صاحب؟“ طالوت نے پوچھا۔

”کسی بھی شکل میں۔ میرا خیال ہے، کرنسی مناسب رہے گی۔“

”پوری رقم کس قدر بنتی ہے؟“

”غالباً نو کروڑ۔“ نواب صاحب کی آواز میں لرزش تھی۔ طالوت نے آگے بڑھ کر صندوقوں کے ڈھکنے اٹھا دیے۔ کرنسی نوٹ صندوقوں میں چنے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ بیگم نواب نے بھی دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”تو نواب صاحب! آپ یہ رقم اصغرالدولہ کو دے دیں۔ تفریحاً ان کے کاغذات بھی طلب کریں اور اگر وہ شرمندہ ہوں تو کہہ دیں کہ بہر حال وہ آپ کے دوست ہیں۔ کاغذات وہ خود ضائع کر دیں۔ یہ ان کے رویے پر ہے۔ براہِ کرم ان صندوقوں کو اپنے خزانے میں پہنچا دیں۔“

”مم........ مگر میرے بچو!........ میں تمہیں........ اس عنایت کا بدل کیسے دے سکتا ہوں؟........ میں تمہارے لئے کیا کروں گا؟“

”آپ ہم سے ایک وعدہ کر چکے ہیں نواب صاحب!“

”آہ........ وہ وعدہ اپنی جگہ۔ تمہارے کہنے سے میں سیمیں کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں بھی دے سکتا تھا۔ حسام........ مم........ میرا مطلب ہے، احسان تو چیز ہی دوسری ہے لیکن اس کے باوجود........“

"میں اس وعدے کی بات نہیں کر رہا نواب صاحب!........سیمیں جیسی پیاری بہن کے لئے تو کائنات کی ساری دولت بھی کم ہے۔ میں اس وعدے کی بات کر رہا ہوں جو آپ نے ہمیں بیٹا سمجھنے کا کیا تھا۔"

"میرے خدا!........میرے خدا!........اگر تُو نے آسمان سے یہ فرشتے بھیجے ہیں تو میں تیری ثنا کیسے کروں؟" نواب صاحب کی آواز رُندھ گئی تھی اور وہ زار و قطار رونے لگے۔ بیگم نواب نے بھی دوپٹہ آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ طالوت پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ان دونوں کو خاموش کروں۔ تب نواب صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہمیں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"خدا خدا کر کے نواب صاحب اور بیگم نواب اعتدال پر آئے۔ انتہائی خفیہ طریقے سے صندوق خزانے میں پہنچا دیئے گئے۔ اُس روز شام کی چائے پر مزہ آ گیا۔ دلوں پر سے بوجھ ہٹ گئے تھے۔ نواب صاحب چہک رہے تھے اور تو اور بیگم نواب بھی بات بات پر ہنس رہی تھیں۔ ان دونوں کو خوش دیکھ کر سیمیں بھی خوش تھی۔ البتہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگتی تھی۔ نصرت اور روحی، احسان کو چھیڑ رہی تھیں، جو باقاعدہ شرمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھئی بیگم!" نواب صاحب نے بیگم نواب کو مخاطب کیا۔

"جی........!"

"بہت دنوں سے اس گھر میں کوئی تقریب نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے، اب کچھ ہو جانا چاہئے۔"

"سیمیں کی سالگرہ بھی قریب ہے، چچا نواب!" نصرت بول پڑی۔

"ایں........ہاں........ارے کتنے دن باقی ہیں؟"

"صرف ایک ہفتہ۔"

"کمال ہے........اور ہمارے علم میں بھی یہ بات نہیں لائی گئی۔" نواب صاحب بولے۔

"جس طرح یہ سالگرہ ہوتی ہے، وہ انتظامات تو ہو رہے ہیں۔" بیگم نواب نے کہا۔

"نہیں بھئی، یہ بات اچھی بات ہوئی۔ اس بار ہم اس سالگرہ کو ایک یادگار حیثیت دیں گے۔ ہمیں اس میں کچھ اور بھی اعلانات کرنے ہیں۔"

"وہ کیا چچا نواب؟" اس بار روحی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔ ہاں، ان میں سے ایک تو یہ سمجھ لو کہ اس ولایتی ریچھ کے فرار کا اعلان بھی کیا جائے گا، اور بتا دیا جائے گا کہ اس کی اصل جگہ چڑیا گھر تھی، وہ غلطی سے یہاں گھس آیا تھا۔ میری مراد شمشیر سے ہے۔" روحی، نصرت اور سیمیں تینوں منہ پھاڑ کر رہ گئی تھیں۔ "بس........باقی پروگرام صیغۂ راز میں ہیں۔" نواب صاحب خوشی کے عالم میں بولے۔ بیگم نواب بھی مسکرا رہی تھیں۔ ان کی پیار بھری نظریں بار بار احسان پر پڑ رہی تھیں اور احسان اسے محسوس کر کے بے وقوفوں کی طرح شرما رہا تھا۔

چنانچہ یہ دلچسپ شام قہقہوں میں گزر گئی۔ پھر رات آئی اور کھانے پر قہقہے اُبلتے رہے۔ کھانے ہی کی میز پر طالوت نے ایک اور چکر چلا دیا۔ اس نے نواب صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شہزادہ حسام کو جلال آباد کچھ اس قدر پسند آیا ہے نواب صاحب! کہ ہماری لاکھ کوششوں کے

باوجود یہ اسے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہیں۔ ان کا خیال یہاں مستقل آباد ہونے کا ہے۔ بہرحال، بھائی کی ضد ہے، اس لئے پوری کرنی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی مدد بھی درکار ہے۔“

”اوہ........ ہاں کہو........ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ نواب صاحب نے کہا۔

”جلال آباد کے کسی خوب صورت علاقے میں اتنی زمین درکار ہے، جہاں حسام کا جھونپڑا بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ شادیا سے مزدور بلا کر جلد از جلد یہ مکان تعمیر کر دیا جائے۔ میں اسے شادیا کی طرز پر ہی تعمیر کرانا چاہتا ہوں، تاکہ یہ ہماری یادگار رہے۔ تو آپ مجھے یہ زمین عنایت فرمادیں۔“

”پورے جلال آباد کو چاروں طرف سے دیکھ لو۔ جو جگہ پسند آئے، وہاں تعمیر شروع کرادو۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”بس اجازت لینا تھی۔“ طالوت نے کہا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ طالوت سنجیدہ تھا اور ظاہر ہے، یہ اس کے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک محفل میں قہقہے گونجتے رہے۔ آج کا رنگ ہی نرالا تھا۔ سیمیں بھی بول رہی تھی۔ بیگم صاحبہ بھی خوش تھیں اور نواب جلال الدین........ انہیں تو گویا نئی زندگی ملی تھی۔

پھر سب اپنے کمروں میں آ گئے۔ احسان بھی ہمارے ساتھ ہی تھا چنانچہ طالوت نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ میاں جاؤ........ ہم تمہاری شادی کی بات کریں گے۔ بزرگوں کے درمیان نہیں بیٹھتے۔“

”آپ نے مکان کا کیا چکر چلایا ہے، عادل بھائی؟“

”وہ بھی تمہاری شادی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لئے اس پر بولنے کی اجازت نہیں ہے۔“ طالوت نے کہا اور احسان ہنسنے لگا۔

”اب میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں........ کسی بھی بات پر تکلف کے الفاظ کہنے پر شرم آتی ہے۔“

”پھر جاؤ........ اپنے کمرے میں جا کر شرماؤ۔“ طالوت نے کہا اور احسان ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد طالوت نے دروازہ بند کر لیا اور پھر کسی فکرمند ماں کی طرح میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”احسان کا ایک مکان ضرور ہونا چاہئے عارف!“ اس نے کہا۔

”ہاں........ وہ بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے؟“

”ہو جائے کیا........ ہونا ضروری ہے۔“

”پھر فکرمند کیوں ہو؟“

”یار! اس قضیئے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔ مکان تو ایک رات میں بھی تیار ہو سکتا ہے، لیکن پھر ان لوگوں پر ہماری قلعی کھل جائے گی۔ یہ لوگ کسی طور اس قدر جلد تعمیر کو تسلیم نہیں کریں گے۔“

”یہ بھی درست ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”پہلے یہ بتاؤ، اس کے لئے کون سی جگہ منتخب کی ہے؟“

”زوبی فال کا علاقہ۔ بے حد خوب صورت جگہ ہے۔“

”مکان بھی اپنی مرضی کے مطابق بنواؤ گے؟“

”ظاہر ہے۔“

"تب پھر کل نواب صاحب سے کہہ دو کہ شادیا اطلاع کرا دی ہے۔ مزدور پہنچنے والے ہوں گے۔ اب یہ خطرہ تھوڑا بہت تو مول لینا ہوگا۔ کئی باتیں ایسی ہو چکی ہیں۔"

"مثلاً......؟"

"بھئی الوری کے خزانے سے نکل آنے والے کاغذات، اتنی دولت کا ایک دم آ جانا۔ جبکہ شادیا کے دوسرے لوگوں کو واپس کیا جا چکا ہے۔ نواب صاحب نے خوشی کی زیادتی کی وجہ سے یہ سب کچھ نہیں سوچا ہے جس وقت سوچیں گے، انہیں شدید حیرت ہوگی۔"

"ہاں...... ہونی تو چاہئے۔ لیکن نہ ہو تو بہتر ہے۔ بہرحال ٹھیک ہے یار! ہمیں کون سی زندگی گزارنی ہے؟ ہمارے جانے کے بعد وہ جو کچھ سوچیں، ہمیں کیا۔ کل سے کام شروع کرا دیا جائے۔ اور تم جانتے ہو کہ نواب صاحب سالگرہ میں کیا چکر چلا رہے ہیں۔"

"کیا......؟"

"میرا خیال ہے، احسان اور سیمیں کے رشتے کا اعلان کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، ہو جائے تو اچھا ہے۔ یہاں سے جلد از جلد فرصت ملے۔ واقعی یہاں بہت دن ہو گئے ہیں۔ اور اب تو وہ ابوالہول بھی فرار ہو گیا ہے۔"

"دیکھنا یہ ہے کہ کیا گل کھلاتا ہے۔" طالوت نے کہا اور اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

"کیوں پریشان کر رہے ہو احسان؟ ہم ابھی تک تمہاری شادی کی بات چیت کر رہے ہیں۔" میں نے کہا اور باہر خاموشی چھا گئی۔ پھر سیمیں کی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولیے صائم بھائی!...... میں سیمیں ہوں۔"

"اوہ......" طالوت نے گردن ہلائی اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"تشریف لائیے۔" میں ایک گہری سانس لے کر بولا اور سیمیں ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔

"کیا گفتگو ہو رہی ہے؟" وہ بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے شرمانے والی۔" طالوت نے کہا۔

"آپ مجھے بھگانا چاہتے ہیں عادل بھائی؟" سیمیں نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ فرمایئے، کیسے تشریف لائیں؟" طالوت بولا۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ آج اچانک ہمارے گھر میں زندگی کیسے لوٹ آئی؟" سیمیں نے کہا۔

"زندگی سے معلوم کیجئے۔" طالوت نے کہا۔

"وہ بھی خاموشی سے مسکرائے جا رہی ہے۔ کچھ بتاتی نہیں۔" سیمیں نے کہا۔

"کان پکڑ کر دو تھپڑ لگا دیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"پلیز صائم بھائی! آپ نہیں جانتے کہ آج مجھے کیا مل گیا ہے۔ ابو کے چہرے کی اس مسکراہٹ پر میں سو بار مرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے اس کی وجہ معلوم ہو جائے تو بڑی شکر گزار ہوں گی۔" سیمیں نے لجاجت سے کہا۔

"تو سنیے سیمیں صاحبہ! آج سے آپ ہمیشہ کے لئے شمشیر کے چنگل سے آزاد ہو گئی ہیں۔ نواب صاحب کی جس قدر اُلجھنیں تھیں، دُور ہو گئی ہیں اور اب سالگرہ کی تقریب میں آپ کی شادی احسان کے

ساتھ ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اور ہم آپ کی سسرال کے لئے زوبی فال کا انتخاب کر رہے ہیں وہاں آپ کے لئے ایک عالیشان مکان کی تعمیر کل سے شروع ہو جائے گی۔ اور کچھ؟''

''اللہ...... عادل بھائی!'' سیمیں سچ مچ شرما گئی۔ لیکن وہ اُٹھ کر گئی نہیں تھی۔ کئی منٹ کے بعد اس نے گردن اٹھائی۔

''ہاں، ہاں...... اب تم شکریہ کے الفاظ کہہ کر مجھے بے وقوف بناؤ۔ میں کہتا ہوں، اپنی شادی کی خبر سن کر تو بھاگ جاؤ۔ دوپٹہ بھی منہ میں دبانا چاہیے۔ مگر تم......''

''عادل بھائی!'' سیمیں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''ارے میرا تمہارا سسرال کا رشتہ بھی تو ہے۔ ٹھہرو...... احسان کو بلاتا ہوں۔'' طالوت نے اُٹھتے ہوئے کہا اور سیمیں جلدی سے اُٹھ کر ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ طالوت نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر وہ دروازے سے ٹِک کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ مجھے اس کی اداکاری پر ہنسی آ رہی تھی۔

دوسری صبح حسب توقع تھی۔ سب خوش و خرم تھے۔ سیمیں ہم دونوں کی طرف دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ نواب صاحب بھی خواب کی سی کیفیت میں تھے۔ ناشتے پر ہی طالوت نے نواب صاحب سے اجازت مانگی۔

''میں حسام میاں کے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں ضروری انتظامات کرنا چاہتا ہوں نواب صاحب! اس لئے آج کے دن مجھے اجازت درکار ہے۔''

''اوہ...... جگہ کا انتخاب کرنا ہے؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔

''جگہ کا انتخاب تو کر لیا۔ زوبی فال کا علاقہ آج سے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ میں شادیا کے محکمہ تعمیر کو اطلاع بھجوا رہا ہوں۔ ضروری سامان بھی وہیں سے آئے گا اور مزدور وغیرہ بھی۔ شادیا کی تعمیرات کے بارے میں سن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ ہمارے تیز رفتار معمار ہفتوں میں مکان تیار کر دیتے ہیں اور وہ ہر طرح مکمل ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، یہاں بھی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''خوب... جس قدر حیرت انگیز تم لوگ ہو، میرا خیال ہے شادیا کے تمام لوگ ویسے ہی ہوں گے۔''

''آپ کا خیال تقریباً درست ہے۔''

''بہتر ہے شہزادہ عادل! میں بھی سالگرہ کی تیاریاں کرتا ہوں۔ اس بار بہت سی خوشیاں اکٹھا ہو گئی ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا اور پھر ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب سے رخصت ہونے لگے۔

''تم تینوں جاؤ گے...... کم از کم حسام کو تو مجھے دے دو...... میں ان سے کچھ کام لے لوں۔''

''یہ آپ کے حوالے۔'' طالوت نے احسان کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور نواب صاحب ہنس پڑے۔

''شکریہ، شکریہ۔'' وہ بولے۔ اور پھر ہم تیار ہو کر وہاں سے نکل آئے۔ طالوت نے کار سنبھالی اور ہم زوبی فال کی طرف چل پڑے۔ زوبی فال کے نزدیک پہنچ کر طالوت نے گاڑی روک دی۔ اور پھر وہ مجھے مکان کی تفصیل بتانے لگا، جو نقشہ اس نے پیش کیا تھا اس کے بارے میں غور کر کے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کیسا خوب صورت مکان ہو گا۔ پھر اس نے راسم کو آواز دی اور راسم گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''تم سمجھتے ہو راسم! میں کیا چاہتا ہوں؟''

''غلام سمجھ گیا ہے آقا!'' راسم نے جواب دیا۔

''بس تو سب سے پہلے اس علاقے کے گرد دیواریں کھڑی کرا دو۔ تاکہ کسی کو اندر کا حال نہ معلوم ہو سکے۔ اس کے بعد کام درست کر دو۔''

''جو حکم آقا!'' راسم نے بدستور گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اور کوئی خاص بات؟''

''کوئی خاص بات نہیں آقا! آپ کی تلاش بدستور جاری ہے۔ ویسے اعلیٰ حضرت کا خیال ہے کہ اب آپ کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ آپ دنیا دیکھ لیں اور آپ کا دل بھر جائے تو خود ہی واپس آجائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے، یہ عقل مندانہ فیصلہ ہے۔ بہرحال، دیکھا جائے گا۔'' طالوت نے کہا اور پھر اس کے اشارے پر راسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

راسم نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ہر کام قاعدے سے ہو رہا تھا۔ شاید اس گفتگو کے تیسرے دن سے ہی زوبی فال کے ایک عظیم الشان علاقے میں بلند و بالا دیواریں نظر آنے لگی تھیں، جن کے دوسری طرف کا حال کسی کو معلوم نہیں تھا۔ خود نواب صاحب کو بھی ان کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ انہوں نے شادیا کے مزدوروں کو اور ان کے طریقۂ تعمیر کو دیکھنا چاہا تھا۔ لیکن طالوت نے معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ ان کا قومی راز ہے، جسے افشا کرنے کی سرکاری طور پر اجازت نہیں ہے۔ بہرحال، نواب صاحب، طالوت کو کیا مجبور کر سکتے تھے۔

روزمرہ کی دلچسپیاں جاری تھیں۔ لیکن پانچویں دن ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ نواب اصغرالدولہ اچانک الوری سے جلال آباد پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ دس بارہ افراد تھے۔ ادھیڑ عمر کا یہ مخص چہرے سے ہی مکار معلوم ہوتا تھا۔ وہ جلال الدین سے اسی طرح گلے ملا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ محل کے دوسرے افراد سے بھی وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھ سے، طالوت سے اور احسان سے بھی گرمجوشی سے مصافحہ کیا تھا اور کہا تھا۔

''گو میں ریاست شادیا سے واقف نہیں ہوں، لیکن بہرحال کسی ریاست کے نمائندے اس کے لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ آپ کے چہروں سے آپ کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔''

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ رات کو ان دونوں، یعنی نواب صاحب اور اصغرالدولہ میں غیر رسمی گفتگو ہوئی اور بھلا اس گفتگو میں ہم دونوں شریک کیوں نہ ہوتے۔ طالوت کو اس سے پوری پوری دلچسپی تھی۔ حالانکہ اس گفتگو میں بیگم نواب تک کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی تھی لیکن طالوت نظر نہ آنے والی حالت میں تھا اور میں بھی شاہ دانا کے دوشالے میں چھپا ہوا تھا۔ ہم دونوں چالاکی سے اس کمرے میں گھس آئے تھے اور ایک گوشے میں خاموش بیٹھے تھے۔

کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اصغرالدولہ ایک آرام کرسی میں دراز، نواب جلال الدین کو دیکھ رہا تھا۔

''جلال......!'' اصغرالدولہ نے نواب جلال الدین کو مخاطب کیا۔ ''مجھے علم ہو چکا ہے کہ شمشیر نے یہاں آکر تم لوگوں کے سامنے بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دراصل جب وہ ولایت سے واپس آیا اور میں نے اس کی حالت دیکھی تو میرے دوست! میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے ہماری روایات کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ میں اسے یہاں بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن عورت انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کی ماں کو اس میں کوئی خامی نہیں نظر آئی اور اس نے اسے یہاں روانہ کر دیا۔ یقین کرو

میرے دوست! میں خوف زدہ تھا۔ اور وہی ہوا۔ وہ واپس پہنچ گیا۔ اور جس حال میں پہنچا ہے، اس سے بہر حال ایک باپ کو تکلیف ہونا فطری امر ہے۔"

"میں شرمندہ ہوں اصغر الدولہ! لیکن اس کی اس حالت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" نواب جلال الدین نے کہا۔

"مجھے یقین ہے۔ مجھے اعتماد ہے۔ لیکن جلال الدین! پہلے میں تم سے ایک سوال کروں گا۔ کیا اس کی بدتمیزی کی وجہ سے تم نے اپنے بچپن کے دوست اصغر کو بھی دل سے نکال دیا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اصغر الدولہ!" جلال الدین بولے۔

"مجھے یقین تھا میرے دوست! اور اسی لئے میں سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔ جلال الدین! تم جانتے ہو، میری ایک ہی اولاد ہے۔ شمشیر سے میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ وہ ولایت کے ماحول میں ضرور رنگ گیا ہے لیکن قصور اس کا بھی نہیں ہے۔ ہم نے ہی اسے وہ ماحول دیا تھا۔ اور ہاں، اس کی تربیت کا کوئی بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔ ہمیں چاہئے تھا کہ ہم ایسے چند لوگوں کو اس کے ساتھ رکھتے جو اسے ہمارے اقتدار کا احساس دلائے رکھتے اور اسے الوری یاد رہتا۔ لیکن تم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے جلال الدین! کہ شمشیر ہمیشہ کا خراب نہیں ہے۔ ماحول کے اس وقتی اثر نے اسے بے وقوف بنا دیا ہے۔ اب اسے ہماری شفقت کی ضرورت ہے۔ ہم اسے سنبھال سکتے ہیں جلال الدین! اور یہ ذمہ داری صرف میرے اوپر عائد نہیں ہوتی، تم بھی اس کے پابند ہو۔"

جلال الدین تیکھی نگاہوں سے اصغر الدولہ کو دیکھنے لگے۔ لیکن اصغر الدولہ کے چہرے کی مکاری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"کیونکہ تمہاری بیٹی کا مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر وہ یہاں سے بھی بد دل ہو گیا تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔" اصغر الدولہ کاروباری گفتگو پر آیا۔

"پیچیدگیوں سے آپ کی کیا مراد ہے اصغر الدولہ؟" نواب صاحب کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"تم انہیں سمجھتے ہو جلال الدین! مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتے ہو؟ ہمارے تمہارے مابین ایک سمجھوتہ ہوا تھا، جب تمہارے اوپر مالی مشکلات کا دباؤ پڑ گیا تو میں نے تمہاری مدد کی تھی۔ لیکن یہ امداد مشروط تھی۔ یعنی تم جلال آباد کی تمام تر حیثیت، اپنی بیٹی سیمیں کو دے دو گے۔ بظاہر وہ جہیز ہو گا۔ لیکن دراصل ہماری دوستی بھی ہے، اس لئے میں ایسا کوئی لفظ نہیں کہنا چاہتا جو اس دوستی میں رخنہ انداز ہوئے۔"

"تم بکواس کرتے ہو اصغر الدولہ! میں نے ایسی کوئی شرط نہیں مانی تھی۔" نواب صاحب بگڑ گئے۔

"الفاظ دوسرے تھے، لیکن مفہوم....... کیا تم اس سے انکار کرو گے؟" اصغر الدولہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اصغر الدولہ! شمشیر اب اس معیار سے انتہائی درجے گر گیا ہے، جو میں اپنی بیٹی کے شوہر کے لئے متعین کر چکا ہوں۔ میں اور میری بیٹی اسے کسی طور قبول نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، جلال الدین! یہ تو خوشی کے سودے ہیں۔ شمشیر اب خود اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ لیکن......."

"میں سمجھتا ہوں، اصغر الدولہ! تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے قرض کی ادائیگی کے لئے تیار

ہوں۔" جلال الدین نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور اصغرالدولہ اچھل پڑا۔

"کیا مطلب؟........یعنی کہ کیا مطلب؟"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا وہی مطلب ہے اصغرالدولہ! کیا قرض کے کاغذات تم اپنے ساتھ لائے ہو؟"

"کک........کاغذات........مگر ان کی کیا ضرورت تھی؟" اصغرالدولہ کسی قدر بوکھلا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے سخت رویئے سے جلال الدین اس کے قدموں میں آ گرے گا۔ لیکن جلال الدین کے تو تیور ہی دوسرے تھے۔ رہی کاغذات کی بات تو ناممکن تھا کہ اصغرالدولہ جیسے چھچھورے آدمی نے بغیر کاغذات کا جائزہ لئے یہاں آنے کی کوشش کی ہو۔ اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ کاغذات اب اس کے قبضے میں نہیں ہیں۔

"کیوں........اگر میں شمشیرالدولہ سے سیمیں کی شادی نہ کروں تو کیا تم اپنا قرض وصول نہیں کرو گے؟" نواب صاحب بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔

"قرض ایک الگ حیثیت رکھتا ہے جلال الدین! ہماری دوستی بھی تو ہے۔"

"سوچ لو اصغرالدولہ! کیا کہہ رہے ہو۔ پہلی بات درست تھی یا اب جو کہہ رہے ہو وہ درست ہے؟ ابھی چندمنٹ قبل ہی تم شرط کا تذکرہ کر چکے ہو۔" اور اصغرالدولہ کو پسینے چھوٹ گئے۔ وہ ہونقوں کی طرح جلال الدین کی شکل دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر وہ جلد ہی سنبھل گیا اور نئے پینترے بدلنے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"تم میری ایک بات کا جواب دو جلال الدین!........خوب سوچ سمجھ کر۔"

"میں حاضر ہوں اصغرالدولہ!"

"کیا تم کسی بھی حیثیت میں شمشیر کو داماد نہیں بنا سکتے؟"

"اس چھچھورے اور ذلیل لڑکے کو اب جلال آباد میں قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ آپ داماد بنانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"اس کے انجام سے واقف ہو؟" اصغرالدولہ نے کہا۔

"واقف ہونا چاہتا ہوں۔" جلال الدین زہریلے لہجے میں بولے۔

"میں تم سے اپنی رقم کا مطالبہ کروں گا اور اس کا تخمینہ نو کروڑ تک پہنچتا ہے۔"

"مجھے علم ہے۔"

"کیا تم ادا کر سکو گے؟"

"تم مطالبہ کرو۔ اس کے بعد سوچوں گا۔" جلال الدین نے کہا۔

"کک........کیا مطلب؟" اصغرالدولہ کے اعصاب پھر جواب دینے لگے۔

"میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں اصغرالدولہ! کیا تم قرض کے کاغذات ساتھ لائے ہو؟ اگر لائے ہو تو حساب کرو اور اپنی رقم لے لو۔ شمشیر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ اب ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ اگر کاغذات نہیں لائے ہو تو منگوا لو۔ یا وہاں جا کر بھیج دو۔"

اصغرالدولہ کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔ پھر اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

”جلال الدین! کاغذات کہیں گم........ ہو گئے ہیں۔ وہ اب میرے پاس نہیں رہے ہیں۔“

”کاغذات کی غیر موجودگی میں، میں تمہارا قرض کیسے ادا کر سکتا ہوں اصغرالدولہ؟“ نواب جلال الدین بولے۔

”میں برباد ہو جاؤں گا، جلال الدین!........ میں خودکشی کر لوں گا۔ خودالوری کی مالی حالت زیادہ درست نہیں ہے۔ میں نے جلال آباد کے بھروسے پر بہت سے قرضے لے رکھے ہیں۔ الوری بک جائے گا۔“ اصغرالدولہ نے کانپتے ہوئے کہا۔

”ایسی صورت میں تم میری دوستی آزما سکتے ہو اصغرالدولہ!........ شمشیر اگر فطرتاً ٹھیک ہوتا تو میں خوشی سے سیمیں کو اس کے حوالے کر دیتا۔ لیکن وہ راستے سے بھٹک چکا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ صحیح راستے پر آ جائے اور تمہارے دل کی ٹھنڈک بنے۔ رہی اس قرض کی بات جو میں نے تم سے لے لیا ہے تو کاغذات کی غیر موجودگی میں بھی اسے ادا کرنے کو تیار ہوں۔ تم اسے لے کر جا سکتے ہو۔“

اصغرالدولہ نے گردن جھکا دی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

اور دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد اصغرالدولہ روانہ ہو گیا۔ نوٹوں سے بھرے ہوئے بکس وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ نواب جلال الدین گویا پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے کی چند جھریاں بالکل غائب ہو گئی تھیں، یہاں تک کہ وہ دن آ گیا، جب سیمیں کی سالگرہ تھی۔

سالگرہ کا اہتمام شاندار کیا گیا تھا۔ پورے محل کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ پورا جلال آباد مدعو تھا۔ ہم لوگ بھی اچھی طرح سجے بنے ہوئے تھے۔ سالگرہ کی تقریبات شروع ہو گئی تھیں اور انتہائی شاندار پیمانے پر انجام پا گئیں۔ شہر بھر کی دعوت کا بندوبست کیا گیا تھا یہاں تک کہ عام مہمان رخصت ہو گئے۔ چند مخصوص دوستوں کو نواب جلال الدین نے روک لیا تھا۔ ان کی بیگمات بھی موجود تھیں۔ تب جلال الدین نے کھڑے ہو کر کہا۔

”معزز دوستو! اس تقریب سعید میں........ ایک اور اہم تقریب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ گو یہ تقریب بے حد اہم ہے، لیکن اس کا انتظام نہایت سادگی سے کیا گیا ہے۔ شہزادہ صائم، شہزادہ عادل سے آپ لوگ واقف ہیں، یہ ان کے دوست احسان ہیں۔ ان دونوں شہزادگان کی درخواست پر میں نے احسان میاں کے ساتھ سیمیں کا رشتہ منظور کر لیا ہے۔ چنانچہ میری طرف سے احسان میاں کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی جائے گی۔ نصرت! منگنی کی رسم ادا کرو۔“ نواب صاحب نے کہا اور میں نے چونک کر طالوت کی طرف دیکھا۔

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ طالوت آہستہ سے بولا۔

”لیکن........“

”فکر مت کرو۔ انگوٹھی میری جیب میں موجود ہے۔“ طالوت نے جواب دیا۔ نصرت نے احسان کو انگوٹھی پہنا دی۔ سیمیں کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا اور احسان کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔ مہمانوں کی جانب سے مبارکباد کی آوازیں اُبھریں۔ تب نواب صاحب پھر بولے۔

”اور یہ دوسری انگوٹھی، خود شہزادہ عادل، احسان میاں کی طرف سے اپنی ہونے والی بھاوج کو

پہنائیں گے۔'' نواب صاحب نے دوسری انگوٹھی سونے کی طشتری میں رکھ کر طالوت کو پیش کی اور طالوت اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے پہلے نواب صاحب کی دی ہوئی انگوٹھی سیمیں کو پہنائی، پھر اپنی جیب سے ایک عجیب وغریب پتھر کی انگوٹھی نکال کر اسے بھی سیمیں کی انگلی میں ڈال دیا۔ اس پتھر سے ہفت رنگ شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ اور عجیب کیفیت تھی اس روشنی کی۔ اسے دیکھ کر ذہن سونے لگتا تھا۔ نواب صاحب نے جھک کر اس دوسری انگوٹھی کو دیکھا اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ بہر حال، منگنی کی رسم بھی انجام پا گئی اور مہمان رخصت ہونے لگے۔ عادل، میں اور احسان، نواب صاحب کے ساتھ مل کر مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے۔ آخر میں صرف گھر کے لوگ رہ گئے۔ نواب صاحب نے میرے اور عادل کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور ایک طرف لے گئے۔

''ایک بات کا مجھے احساس ہو رہا ہے عادل میاں!'' انہوں نے کہا۔

''کیا نواب صاحب......؟'' عادل نے پوچھا۔

''دراصل، منگنی کا خیال میں نے صرف اپنے ذہن تک محدود رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اچانک اعلان کر کے سب کو چونکا دوں گا۔ اسی خیال کے تحت میں نے دونوں طرف کی انگوٹھیاں خود مہیا کر لی تھیں۔ تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوا؟''

''نہیں نواب صاحب! اعتراض کیسا؟ میں اگر خود فوری طور پر مہیا نہ کر سکتا تو آپ سے کہتا۔'' عادل نے کہا۔

''پھر تم نے وہ دوسری انگوٹھی......؟''

''وہ......وہ دراصل میں نے اس کا فیصلہ اپنے دل میں کیا تھا۔ وہ میری خوشی تھی، نواب صاحب! آپ اسے کسی ردِعمل کا نتیجہ نہ سمجھیں۔''

''میں مطمئن ہو گیا۔'' نواب صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر بولے۔ ''مگر بھئی عجیب پتھر ہے۔ اسے دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے، جیسے نیند آ رہی ہو۔''

''نایاب ہے۔ سنگِ خفتہ کہلاتا ہے۔ بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ بہر حال، سیمیں بہن کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔'' عادل نے سیمیں کے قریب آنے پر کہا۔ سیمیں شرمائی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس رات دیر تک نشست رہی۔ سیمیں اور لڑکیاں تھوڑی دیر تک اس محفل میں شریک رہیں پھر لڑکیوں کو نیند آنے لگی تو وہ چلی گئیں۔ نواب صاحب، طالوت، میں اور بیگم نواب بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ احسان بھی سونے چلا گیا تھا۔

''مکان کی تعمیر بہت جلد مکمل ہو جائے گی، نواب صاحب! ہم لوگوں کو بھی شادیا سے نکلے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے ہماری خواہش ہے کہ سیمیں اور احسان کی شادی کی تاریخ طے کر لی جائے اور تیاریاں شروع کر دی جائیں۔'' میں نے کہا۔

''مکان کب تک تعمیر ہو جائے گا؟ تم نے وہاں ہم سب کا داخلہ ہی بند کر دیا ہے۔'' نواب صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

''بس، اس کا طرزِ تعمیر انوکھا ہے۔ شادیا کے مزدور کسی اور کے لئے کام بھی نہیں کرتے۔ مکان تعمیر ہو جائے، وہاں ضروری سامان مہیا ہو جائے، تب آپ اسے دیکھ سکیں گے۔ مزدور خاموشی سے واپس چلے

جائیں گے۔"

"ارے........ یہ کیوں؟"

"بس نواب صاحب! شادیا کے کچھ اصول انوکھے ہیں۔ جنہیں ہم بھی نہیں بدل سکتے۔ حالانکہ بظاہر وہ بے معنی ہیں۔"

"ہوں۔" نواب صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "بھئی، مجھے کیا سوچنا۔ تم لڑکی اور لڑکے دونوں کے وارث ہو۔ جو مناسب سمجھو، کرو۔ ویسے مکان کب تک مکمل ہو جائے گا۔"

"ایک ہفتے کے اندر اندر۔"

"ارے........" نواب صاحب کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"جو مزدور اسے تعمیر کر رہے ہیں، ان کی تعداد آپ کے تصور سے باہر ہے۔ اور یہ سن کر آپ کو مزید حیرت ہو گی کہ اب صرف اس کا رنگ و روغن اور نقش و نگار باقی ہیں۔"

"بات کسی طرح ذہن میں نہیں آ رہی۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اتنے دن میں تو ایک معمولی مکان بھی، خواہ وہ کتنے ہی مزدور تعمیر کریں، مشکل سے تیار ہوتا ہے۔"

"مکان تو وہ بھی معمولی ہی ہے۔ بہرصورت، مکمل ہو جائے تو آپ خود دیکھ لیں۔ یوں بھی شادیا حیرتوں کی سرزمین ہے۔" طالوت نے جواب دیا اور نواب صاحب خاموش ہو گئے۔

"بہرصورت، ہماری خواہش ہے نواب صاحب! کہ پندرہ دن کے اندر اندر ہم اپنے کاموں سے فارغ ہو جائیں۔"

"بھئی میں تمہارے کسی معاملے میں دخل انداز نہیں ہوں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد کیا ہو گا؟ تم تو ہماری زندگی کا ایک جزو بن گئے ہو۔"

"ہم احسان کو اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ جائیں گے، نواب صاحب!........ اور بہرحال پھر ملاقات ہوتی رہے گی۔" طالوت نے کہا۔ کافی دیر کی نشست کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی۔

درمیان کے دن بہت دلچسپ رہے۔ طالوت کا الٹی میٹم ان لوگوں کو مل گیا تھا، چنانچہ شادی کی زبردست تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ پورے محل میں جگمگاہٹیں رقصاں تھیں۔ دعوت نامے دُور دُور تک جاری کر دیئے گئے تھے۔ ایک تاریخ کا تعین بھی ہو گیا تھا۔ طالوت کی شرارتیں عروج پر تھیں۔ کبھی بوا سے چھیڑ چھاڑ رہتی تو کبھی لڑکیوں میں جا گھستا۔ اس کے لئے یہ گہما گہمی انوکھی تھی۔ کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا۔

"یار عارف! تمہاری دنیا میں اور کچھ ہو نہ ہو، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ گوناگوں ہنگاموں کا مرقع ہے، یہاں کا ہر لمحہ ایک نئی کیفیت سے روشناس کراتا ہے۔ ان کیفیات میں بڑی رومانیت ہوتی ہے۔ غم اور خوشی کے امتزاج سے نمود پانے والی یہ دنیا مجھے بہت پسند ہے۔ اس کے برعکس میری دنیا میں جمود ہے، یکسانیت ہے، ٹھہراؤ ہے۔ انسان اپنے معمولات سے آشنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی زندگی کس انداز سے گزرے گی۔ اس میں طلب نہیں ہے، خواہش نہیں ہے، امید و بیم کی کیفیت نہیں ہے، جدوجہد نہیں ہے۔ چنانچہ اس دنیا کے سامنے میں اسے دنیا تسلیم کرنے سے ہی انکار کرتا ہوں۔ دنیا تو ہنگاموں کا نام ہے۔ خواہش، ناامیدی، سہارے، روشنی، اندھیرے۔ یہی سب زندگی کا جزو ہیں۔ جدوجہد سالوں میں روانی پیدا کرتی ہے اور ہر نیا دن ایک لگے بندھے اصول کے تحت نہیں آتا بلکہ اپنے

ساتھ آس کی روشنی، عمل کی دعوت لاتا ہے۔ تمہاری یہ دنیا بہت خوب صورت ہے عارف! میں تسلیم کرتا ہوں، تمہاری یہ دنیا بہت خوب صورت ہے۔"

زوبی فال کے گرد تعمیر ہونے والی دیوار ایک دن اچانک غائب ہو گئی۔ اس دن طالوت تنہا مجھے لے کر وہاں گیا اور حسین آبشار کے بائیں سمت ایک چمک دار عمارت دیکھ کر میرا حلق خشک ہو گیا۔

چاندی کی طرح چمکتی ہوئی یہ عمارت، قدیم و جدید طرزِ تعمیر کا ایک ایسا نمونہ تھا، جس کی مثال روئے زمین پر خال ہی ہو گی۔ اسے دیکھ کر ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہماری کار عمارت کے دروازے پر رک گئی۔ پوری عمارت خالی تھی۔ ایک بھی متنفس موجود نہیں تھا۔ لیکن خود کار دروازہ نہ جانے کون سے میکنزم کے تحت کھل گیا اور کار اندر داخل ہو گئی۔ دو رویہ سبزہ لگا ہوا تھا۔ طالوت نے عقل سے کام لیا تھا، ورنہ یہاں تو درخت بھی نظر آ سکتے تھے جو پھلوں سے لدے ہوتے اور پھول بھی کھلے ہوتے۔ لیکن پھر انسانی عقل اسے حقیقت تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی۔ اور شاید لوگ خوف سے ادھر کا رخ بھی نہ کرتے۔ اس لئے اس نے صرف پودے لگوانے پر ہی اکتفا کی تھی۔

پورٹیکو کے بعد حسین ٹائیلوں کا ایک بہت بڑا چبوترا تھا، جس کے بعد صدر دروازہ شروع ہوتا تھا۔ اور یہاں بھی وہی خود کار میکنزم تھا۔ اور پھر صدر دروازے کے بعد پرانے طرز کا ایک ہال، جہاں سونے کے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ اعلیٰ پائے کے قالین سے فرش ڈھکا ہوا تھا۔ دروازوں میں سونے چاندی کی خوب صورت کیلیں لگی ہوئی تھیں۔

پوری عمارت دیکھنے کے لئے تو پورا دن درکار تھا۔ جو کچھ دیکھا تھا، اسے دیکھ کر ہی عقل دنگ رہ گئی تھی۔ میں...... ایک کلرک، اس محل کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ میں اس کا دوست تھا۔ ایسا دوست، جس کے مشورے پر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے قدرت نے کیوں میرے دل کو بھی ایک صبر دے دیا تھا۔ مجھے سیر چشمی عطا کر دی گئی تھی۔ میں نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ کاش یہ سب کچھ میرے لئے ہوتا۔

"کیا خیال ہے عارف!...... کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟" طالوت نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے، اسے کچھ دولت بھی دے دیں گے۔ تاکہ وہ پُرسکون زندگی گزار سکے۔ یار! وہ بہت عظیم انسان ہے۔ مایوسی کے عالم میں بھی اس نے لڑکی سے فائدہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور وہ لڑکی...... والدین کے وقار کے لئے اس نے اسے زندگی بھر کے لئے قبول کر لیا، جس کے سائے سے بھی اسے نفرت تھی۔ میں ان دونوں سے ہی بے حد متاثر ہوں۔"

"ہوں۔" میں نے کہا۔

"بس، آج نواب صاحب کو بھی محل دکھا دیں گے۔ یہاں کے لئے بہت سے ملازموں کی ضرورت ہو گی۔ نواب صاحب ہی ملازم مہیا کریں گے۔ میرے خیال میں دو ایک دن میں اس کا بندوبست ہو جانا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔ اور پھر ہم دونوں وہاں سے چلے آئے۔ اسی شام نواب صاحب نے بھی طالوت کی دعوت پر محل دیکھا اور ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ احسان بھی ساتھ

تھا۔ ان دونوں کی جو حالت ہوئی، اس کی تفصیل طویل ہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ ذہنی توازن نہ کھو بیٹھیں۔ خود نواب صاحب کا عالی شان محل، اس کے سامنے ایک جھونپڑا معلوم ہوتا تھا۔

''کیا شادیا کے مزدور واپس جا چکے ہیں؟'' نواب صاحب نے پاگلوں کی طرح پوچھا۔

''آخری آدمی بھی روانہ ہو گیا۔''

''مجھے یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ ایک خواب کی طرح۔ نہ جانے یہ خواب ہے یا حقیقت۔''

''ہمیں یہاں کے لئے ملازموں کی ضرورت ہے نواب صاحب! اس کا بندوبست آپ ہی کریں گے۔ میں آپ کو ملازموں کی فہرست دے دوں گا۔ براہِ کرم اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔'' طالوت نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں کر دوں گا۔''

''فی الحال کم از کم دربانی کے لئے محل سے ہی کچھ لوگوں کو بھیج دیں۔''

''یہی ٹھیک ہے۔'' نواب صاحب گردن ہلاتے ہوئے بولے اور پھر وہاں سے واپس چل پڑے۔

احسان نے اس رات بھی کافی گڑبڑ کی تھی۔ اس نے رو رو کر طالوت کے اور میرے پاؤں پکڑ لئے تھے اور کہا تھا کہ وہ ان تمام چیزوں کے قابل نہیں ہے۔ ہم نے اس معمولی سے انسان پر وہ احسانات کئے ہیں کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک ہمارے احسانوں کا بوجھ اتارنے کا تصور بھی نہیں کر سکے گا۔ بمشکل تمام ہم نے اسے سمجھا بجھا کر خاموش کرایا تھا۔

الغرض دن رات بڑی تیزی سے گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آ گیا۔ اس دن کے لئے طالوت نے راسم کو خاص لباس لانے کی ہدایت کی تھی۔ اس کے علاوہ دلہن کے لئے ملبوسات اور زیورات وغیرہ کی ذمہ داری بھی راسم پر ڈال دی گئی تھی اور راسم کی پسند بہرحال انتہائی مطمئن کن تھی۔ شادی ہوئی اور ایسی ہوئی کہ اہلِ جلال آباد انگشت بدنداں رہ گئے۔ ہر رسم اسی انداز میں ہوئی، جیسی رائج تھی۔ طالوت نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دُلہن رخصت ہو کر محل میں آ گئی۔ سب پر سحر کی سی کیفیت طاری تھی۔ اور پھر دُولہا دُلہن جس وقت خلوت میں گئے تو طالوت نے میرے کہنی مار کر کہا۔

''کیا خیال ہے عارف؟''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں، یہ لوگ کس انداز میں گفتگو کرتے ہیں؟''

''لاحول ولا قوۃ........ انتہائی لغو جن ہو تم بھی۔ سیمیں کو بہن کہا ہے اور ان کے حجلۂ عروسی میں گھسو گے؟''

''ارے نہیں۔ مم........ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ بس دیکھنا تھا کہ ان تمام چیزوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔'' طالوت نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں بھی تھکے ہوئے تھے، اس لئے ایک کمرے میں آرام کرنے لیٹ گئے۔ طالوت اپنی مسہری پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند مجھے بھی نہیں آ رہی تھی۔

''طالوت!'' میں نے اسے آواز دی۔

''ہوں۔''

''کیا بات ہے؟ سوتے کیوں نہیں؟''

''نیند نہیں آ رہی یار!''
''وجہ؟''
''وجہ کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے عارف! اب ہم جلد از جلد یہاں سے دوڑ لیں۔''
''کیوں؟........اس جلدی کی وجہ؟''
''بس یار! یہاں اپنا کوئی کام نہیں بنا۔''
''بن سکتا ہے۔ روحی اور نصرت بھی تو باقی ہیں۔''
''یار! وہ شریف لڑکیاں ہیں، انہیں جانے دو۔ اور پھر یہاں اچھی خاصی مثال قائم کی ہے، کوئی گڑبڑ نہ ہو تو بہتر ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''کہتے تو ٹھیک ہو۔ بہر حال، ہم جانا چاہیں تو کون روک سکتا ہے؟''
''ہاں........کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ لیکن ان لوگوں سے باقاعدہ اجازت لے کر نہیں چلیں گے۔''
''ہوں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا خیال ہے؟''
''مجھ سے بہتر تم ہی سوچ سکتے ہو۔'' طالوت نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا اور میں درحقیقت کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ طالوت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر اعلان کر کے یہاں سے جایا جائے تو بڑی لے دے ہو گی۔ اچانک اور خاموشی سے نکل جانا بہتر ہو گا۔''
''ایک بات بتاؤ۔'' میں نے اچانک پوچھا۔
''کیا؟''
''چلنا کب ہے؟''
''میرا خیال ہے، دو تین روز تو رکنا ہی پڑے گا۔ ان لوگوں کو تازہ تازہ خوشیاں ملی ہیں، ہمارے جانے سے غم ضرور ہو گا۔ اس لئے فوری غم مناسب نہیں ہے۔ ذرا خوش ہو لینے دو۔ آہستہ آہستہ ان کے کانوں میں جانے کی بات بھی ڈالیں گے اور پھر خاموشی سے غائب ہو جائیں گے۔''
''ہاں........میں تم سے متفق ہوں۔ لیکن جاتے وقت انہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا ہے۔''
''مناسب ہی ہو گا۔ ورنہ شاد یا تلاش کریں گے اور اپنا وقت ضائع کریں گے۔''
''ٹھیک ہے۔ پھر میں ایک لائحہ عمل مقرر کر لوں گا۔'' میں نے کہا اور طالوت ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
دوسرے دن ناشتے پر نواب صاحب، بیگم نواب اور محل کے دوسرے لوگ مدعو تھے۔ سیمیں اور احسان کے چہروں کی دمک محبت کی کہانیاں سنا رہی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ نواب صاحب ہمارے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ناشتے کے بعد نواب صاحب ہمارے ساتھ محل کے دوسرے حصے میں چل پڑے۔ وہ بھی اب اس حسین محل کی تعریف کر رہے تھے۔
''اب ہمیں کب اجازت ملے گی نواب صاحب؟'' میں نے کہا اور نواب صاحب چونک کر رک گئے۔
''کچھ اور نہیں ٹھہریں گے صائم میاں؟'' نواب صاحب گلوگیر لہجے میں بولے۔
''آپ جانتے ہیں نواب صاحب! طویل عرصہ گزر چکا ہے۔''

''خوشیاں ماند پڑ جائیں گی، تمہارے جانے سے۔ زندگی میں ایک خلا ہو جائے گا۔''
''جانا تو ہے نواب صاحب!''
''ہاں..... جانا تو ہے۔'' نواب صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ بہر حال، چند روز اور۔''
''بہت دن سے ریس کا پروگرام نہیں بنا ہے نواب صاحب!''
''اوہ....... میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آج سے چوتھے روز ریس ہے۔ سال میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا ان حالات میں۔ لیکن بہرحال میرے اوپر کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ ریس کے عملے کے لوگ اپنے انتظامات میں مصروف ہیں۔''

چنانچہ یوں بات ٹل گئی۔ احسان اور سیمیں بہت خوش تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار اُبھر آتے تھے۔ لیکن ہماری ناراضگی کے خیال سے انہوں نے اس سلسلے میں کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اور طالوت نے مل کر ایک پروگرام بنا لیا تھا اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ وہ دن آ گیا جس کے دوسرے دن ریس تھی۔ اس روز ہمارے دلوں کی بھی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ درحقیقت یہاں کے پُرمحبت ماحول سے کچھ اُنسیت ہو گئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے، زندگی یہاں محدود تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ ابھی تو ایک عظیم دنیا پڑی تھی، جس میں نہ جانے کیا کیا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر سب لوگ موجود تھے۔ اسی وقت میں نے پروگرام کے مطابق اعلان کیا۔
''حضرات! سیمیں اور احسان کو یہ شادی مبارک ہو۔ نواب صاحب اور بیگم نواب کو اپنے بچوں کی پُرمسرت زندگی کی مبارکباد...... کل ریس ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کی روانگی ضروری ہے۔ ہمارے بھی بہت سے کام اُلجھے پڑے ہوں گے، اس لئے اب ہم اجازت طلب کریں گے۔''

لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے، ورنہ اس اعلان کے بعد شاید کسی سے کھانا نہ کھایا جاتا۔ سیمیں مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ روحی اور نصرت کے چہرے بھی اُتر گئے تھے۔ احسان کا چہرہ فق ہو گیا تھا اور نواب صاحب اور بیگم نواب بھی ششدر رہ گئے تھے۔
''ا۔ ا...... مم...... میرا مطلب ہے......'' نواب صاحب بوکھلا گئے۔
''ابھی تو نہیں۔ بہرحال آپ لوگوں کی اجازت ضروری ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
بہرحال، وہی اُلجھنیں پیش آئیں جو متوقع تھیں۔ بمشکل تمام ماحول کی اُداسی دُور ہو سکی۔ لیکن احسان اور سیمیں نے تھوڑی دیر کے بعد ہی ہمیں آ لیا۔
''عادل بھائی!...... خدا کے لئے، ابھی ایسا کوئی دکھ نہ دیں۔ ہمارا دل تو بھر جانے دیں۔'' سیمیں نے کہا۔
''ارے میں نے اپنا بھائی تمہیں دے دیا سیمیں! اور کیا چاہئے؟'' طالوت نے آنکھیں نکال کر کہا اور احسان رو پڑا۔
''میں...... میں آپ کے بغیر نہ رہ سکوں گا عادل اور صائم بھائی!...... مجھے ابھی آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔''
''ہائیں، ہائیں...... سیمیں! اسے سمجھاؤ۔ یہ کیا لڑکیوں کی طرح رونے لگتا ہے؟''
لیکن سیمیں خود رو رہی تھی اور اس دن کے ماحول سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں سے باقاعد

رخصت ہونا ناممکن ہے۔ لیکن دوسرے دن کے لئے پروگرام مکمل تھا۔ رات کو راسم نے دو مخصوص گھوڑوں کا انتظام کرلیا تھا۔ اسی رات میں نے نواب صاحب کے نام ایک خط لکھا، جس کی تحریر یوں تھی:

"محترم نواب صاحب!

ہماری روانگی آپ کے لئے حیران کن ضرور ہوگی، لیکن باقاعدہ رخصت ہونا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم جارہے ہیں۔ یہ سن کر شاید آپ کو دکھ ہو کہ ریاست شادیا کا روئے زمین پر کوئی وجود نہیں ہے۔ ہم کیا ہیں، اسے صیغۂ راز میں ہی رہنا چاہئے۔ آپ دنیا کے ایک ایک گوشے کو چھان ماریں گے، تب بھی آپ کو ہمارا سراغ نہ لگے گا، لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی نہ اخذ کرلیں کہ ہم فرشتے تھے۔ ہم اسی جہاں کے گنہگار ہیں۔ آپ جیسے پُرمحبت لوگوں کے خلوص کے عوض ہم نے جو کچھ کیا، وہ آپ کی محبت کا بدل نہیں ہے۔ خلوص و محبت کی قیمت تو سارے جہان کے خزانے بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بات بھول جائیں کہ ہم نے آپ کو کچھ دیا۔ احسان ایک نیک انسان ہے۔ اس کا خیال رکھیں۔ سیمیں ایک پیاری بہن ہے، اس کی محبت کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ روحی اور نصرت کو آداب کہہ دیں اور بتا دیں کہ ہم کسی قابل نہیں تھے۔ بیگم صاحبہ، ماں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہیں بھی تسلی دے دیں۔ آداب!"

آپ کے خادم۔ صائم و عادل

طالوت نے یہ خط سن کر گردن ہلا دی تھی۔ ویسے وہ بھی کسی قدر مغموم تھا۔ میں نے خط بند کر کے ایک لفافے میں رکھ دیا اور پھر ہم سو گئے۔

دوسرے دن ریس کی تیاریاں تھیں۔ نواب صاحب، اصطبل کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارے نئے گھوڑوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑے تھے۔ بہرحال میں نے انہیں بتایا کہ یہ گھوڑے بھی ریس میں دوڑیں گے اور میں اور عادل ان پر سواری کریں گے۔ نواب صاحب پسندیدگی کی نگاہوں سے گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے۔

دن کو دس بجے میں نے بوا کو بلایا اور لفافہ انہیں دیتے ہوئے کہا۔ "بوا!...... ممکن ہے، ہمیں واپسی پر یاد نہ رہے۔ یہ لفافہ شام کو تم نواب صاحب کو دے دینا۔" اور معصوم بوا نے گردن ہلا کر لفافہ رکھ لیا۔

ریس کورس میں جلال آباد کی پوری خلقت سمٹ آئی تھی۔ احسان اور سیمیں بھی تھے۔ نواب صاحب اور دوسرے لوگ بھی۔ ہم دونوں پوری طرح تیار تھے۔ تین ریسیں ہوگئیں۔ گھوڑے اوّل دوئم اور سوئم آتے رہے۔ چوتھی ریس پر ہمارے گھوڑے شامل تھے۔ ہم دونوں جاکی کے لباس میں ٹریک پر آگئے اور ریس شروع ہوگئی۔ ہم گھوڑے لے کر چل پڑے۔ لیکن جب اسٹارٹ پوائنٹ سے گھوڑے چھوٹے تو ہمارے گھوڑوں کا رخ بدل گیا۔ ہم مخالف سمت چل پڑے۔ نواب صاحب اور دوسرے لوگ دُور بین سے ہمارے گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے۔

لیکن...... اب ہم انہیں بھول چکے تھے۔ ہمارے طوفانی گھوڑے جلال آباد سے باہر جانے والے راستے پر دوڑ رہے تھے اور ہمارے ذہن ساکت تھے۔

✿

گھوڑے دوڑتے رہے۔ ان کی رفتار نہ جانے کیا تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلال آباد کے آثار نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ نواب صاحب ہماری تلاش کرائیں گے۔ چنانچہ ہم رُکنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ پھر ہم اتنی دُور نکل آئے کہ دوسرے گھوڑے ایک دن میں بھی وہ فاصلہ طے نہ کر سکیں۔ پہاڑی علاقہ تھا۔ چاروں طرف بھوری چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک اونچی چٹان، جو سائبان کی طرح پھیلی ہوئی تھی، کے نیچے ہم نے گھوڑے روک دیئے اور طالوت گھوڑے سے اُتر آیا۔ اس کے چہرے پر مضمحل سی مسکراہٹ تھی۔

''کیسی رہی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔

''بہت عمدہ۔''

''ہاں یار! کب تک ان لوگوں پر مسلط رہتے۔ بوا اُنہیں خط دے دیں گی۔ چند روز وہ پریشان رہیں گے، پھر بھول جائیں گے۔ اور ہمیں بھی دل سے یہ سب کچھ نکال دینا چاہئے۔ ابھی تو دنیا بہت وسیع ہے۔ نہ جانے کتنے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا، جو دل کے قریب آئیں گے۔''

''درست کہتے ہو۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''بیٹھو........ بھوک لگ رہی ہے؟'' طالوت چٹان سے کمر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''نہیں........ بھوک تو نہیں لگ رہی ہے۔''

''بہت اُداس ہو؟'' طالوت مسکرایا۔

''قدرتی بات ہے۔''

''اونہہ، چھوڑو۔ وہ لوگ مطمئن ہیں۔ ہم بھی مطمئن ہو جائیں گے۔ اب یہ سوچو، آئندہ کیا پروگرام ہے؟''

''تمہارے دو پروگرام تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ایک تو وہ آزاد ریاستوں کی طرف جانے کا، اور دوسرا وہ جس کے بارے میں تم نے کہا تھا۔ کیا نام لیا تھا تم نے اس کا؟''

''فلم انڈسٹری۔''

''ہاں یار! مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

''تفصیل تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس ایک مصنوعی دنیا ہے، جہاں کی ہر بات انوکھی ہے۔ غم، خوشی، محبت، سب کچھ مصنوعی۔ اسے آرٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ اجنبی اس کی چمک دمک سے بہت متاثر ہوتے

ہیں۔ جدید نسل کے نوجوان دل اس کی آرزو میں دھڑکتے ہیں۔ بڑے انوکھے کردار ملتے ہیں وہاں۔"

"ارے تو پھر دیر کس بات کی ہے عارف! ہاں ایک بات اور ہے۔"

"وہ بھی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"یار! یہاں نواب جلال الدین کے محل میں تو ہر چیز تبرک ہو کر رہ گئی تھی۔ نصرت اور روحی دل دونوں ہاتھوں میں لئے پھر رہی تھیں، مگر ہمارے لئے وہ شجرِ ممنوعہ تھیں۔"

"ہاں طالوت! اس جہاں میں لاکھوں کردار بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے لوگ با آسانی مل جاتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کے دل کیوں دُکھائے جائیں جو غم نا آشنا ہوں۔"

"ٹھیک ہے....... مجھے تم سے اتفاق ہے۔" طالوت نے جواب دیا۔ اور ہم دونوں کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ "پھر....... اب کیا پروگرام ہے؟"

"چلیں گے....... وہیں چلیں گے۔"

"لیکن کب؟....... کس طرح؟"

"میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے، جہاں چاہو چل سکتے ہیں۔ لیکن بس....... صورتِ حال یہ ہے کہ......." ابھی ہم بات پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ دُور سے کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی اور ہم چونک پڑے۔

"اوہ....... کوئی آ رہا ہے۔"

"ہاں۔ کار کی آواز ہے۔" طالوت نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا اور پھر ایک دم بول پڑا۔ "اوہ، عارف! میرا خیال ہے، ٹھن گئی ہے۔ دو گھوڑے سوار آپس میں اُلجھ گئے ہیں۔"

میں بھی چٹان پر چڑھ گیا۔ لیکن دوسری طرف دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ابھی ہم لوگ فلم انڈسٹری کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے اور وہی ہمارے سامنے آ گئی۔

یقیناً یہ کوئی فلم یونٹ ہی تھا، جو شوٹنگ پر آیا ہوا تھا۔ ایک بڑی جیپ پر کیمرہ نصب تھا اور سامنے پہاڑیوں کے درمیان دو گھوڑے سوار تلوار بازی کر رہے تھے۔ ان میں ایک سیاہ رنگ کے چست لباس میں تھا اور دوسرا پولیس کی وردی میں۔

"طالوت!" میں چیخ پڑا۔

"چلیں؟ لیکن یہ کار پر جو لوگ ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں؟ دونوں میں بیچ بچاؤ کیوں نہیں کراتے؟"

"ارے، یہ شوٹنگ ہو رہی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟....... وہ تو تلوار بازی کر رہے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے، فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"یعنی وہی، جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے تھے؟"

"ہاں۔"

"لیکن یہ فلم انڈسٹری یہاں کیسے آ گئی؟"

"اوہ....... طالوت! اگر تم فلم دیکھ لیتے تو یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جاتی۔ دراصل فلم میں ایک کہانی

ہوتی ہے، جس میں مختلف کردار ہوتے ہیں۔ مختلف واقعات ہوتے ہیں۔ اسکرین پر پیش کرنے سے پہلے ان کی شوٹنگ ہوتی ہے، تب اسے مکمل کر کے پردۂ سیمیں پر پیش کیا جاتا ہے۔''

''بات اپنی کھوپڑی سے باہر ہے۔ کیا ان لوگوں پر تمہارے دیس کا قانون لاگو نہیں ہوتا؟ اگر ان میں سے کوئی مر جائے؟''

''کوئی نہیں مرتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا

''ارے کیوں بکواس کرتے ہو؟........ دیکھو، اُس کا کام ہو گیا۔'' طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور مجھے زوردار ہنسی آ گئی۔ ایک کردار گھوڑے سے گر پڑا تھا اور اس شارٹ کے ساتھ ہی کیمرہ شاید بند ہو گیا تھا۔ جیپ سے چند لوگ نیچے اُتر آئے اور پھر وہ فیتے سے زمین ناپنے لگے۔ لڑنے والے ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

''لاحول ولا قوۃ۔ نہ جانے کیا تماشا ہو رہا ہے۔''

''آؤ، اس تماشے کو قریب سے دیکھیں۔'' میں نے کہا لیکن اسی وقت طالوت نے میرا شانہ دبایا اور میں چونک پڑا۔

''وہ دیکھو!'' وہ آہستہ سے بولا۔ اور میں نے دیکھا، جیپ سے ایک لڑکی نیچے اُتر آئی تھی۔ وہ بھی کاسٹیوم پہنے ہوئے تھی۔ گھوڑے سے گرنے والا پھر اسی طرح گر پڑا اور سیاہ لباس والا گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ جیپ تیار ہو گئی۔ کیمرہ اسٹارٹ ہو گیا۔ لڑکی درمیان میں آ گئی تھی۔ کلیپ دیا گیا اور گھوڑے سوار نے گھوڑا دوڑایا۔ اور پھر اس نے بھاگتے ہوئے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا۔ گھوڑا دوڑنے لگا۔ لڑکی چیخ رہی تھی۔ ''بچاؤ........ بچاؤ........ آہ، بچاؤ!''

''اوہ........ گڑبڑ ہو گئی۔ اُس کی ایسی تیسی۔ میری موجودگی میں لے کر نکل جائے۔'' اور اس سے قبل کہ میں طالوت سے کچھ کہتا، اس نے چٹان سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر تھا اور تیسرے لمحے گھوڑا طوفانی رفتار سے سیاہ لباس والے کی طرف دوڑنے لگا۔ جیپ بدستور دوڑ رہی تھی اور کیمرہ اپنا کام کر رہا تھا۔

میں بھی جلدی سے چٹان سے نیچے آیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر طالوت کے پیچھے دوڑ پڑا۔ مروا دیا تھا اس بے وقوف نے۔

طالوت، گھوڑے سوار کے برابر پہنچ چکا تھا۔ اور پھر اس نے گھوڑے سوار کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ اور پھر گھوڑے سوار کو گھوڑے سے نیچے پھینک دیا گیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ اگر اس کی ایک آدھ ہڈی اپنی جگہ سے کھسک گئی ہو گی تو کباڑا ہی ہو جائے گا۔ لڑکی اب طالوت کے گھوڑے پر تھی اور اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری طرف جیپ پر شور ہونے لگا تھا۔ اور پھر جیپ تیز رفتاری سے طالوت کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے اپنا گھوڑا روک لیا تھا۔ میں بھی قریب پہنچ رہا تھا۔ بڑی مشکل آ پڑی تھی۔ یقیناً ان لوگوں سے اُلجھنا پڑے گا۔ لڑکی طالوت کی گرفت سے نکل کر نیچے اُتر گئی۔ وہ خوف زدہ انداز میں چیخ رہی تھی اور طالوت ہونقوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ جیپ پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اُتر پڑے تھے۔

''پکڑ لو........ جانے نہ پائے........ مارو........'' ایک پھٹی ہوئی آواز اُبھری اور تین

چار آدمی طالوت کی طرف دوڑے۔
"رُک جاؤ......کیا بدتمیزی ہے؟" میں دہاڑا اور وہ اب میری طرف دیکھنے لگے۔
"کون ہو تم لوگ؟......یہ کیا گڑبڑ تھی؟ یاد رکھو، ہمارے پاس پستول ہیں۔" نیچے اُترنے والوں میں سے ایک نے کہا اور سچ مچ اس نے پستول نکال لیا۔ میں بھی گھوڑے سے اُتر پڑا تھا۔ اور پھر میں نے طالوت کو اشارہ کیا۔ اس وقت اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ اس کے خیال میں ان سب کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ اُلٹے اُس پر بگڑ رہے تھے۔
"سب کچھ غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے دوستو!......کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ ہوش و حواس قائم رکھو۔ ورنہ اگر رانا صاحب کو غصہ آگیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" میں نے کہا۔
"مگر یہ مس روشیلا کو لے کر بھاگ رہے تھے۔" ایک آدمی نے احتجاج کیا۔
"بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ اپنی دانست میں انہوں نے اُن کی جان بچائی تھی۔ دراصل رانا صاحب کو اگر غصہ آگیا تو تمہارا سامان الگ چھین لیا جائے گا اور بند الگ کر دیئے جاؤ گے۔ اس لئے تسلی سے بات سنو اور سمجھ لو کہ معاملہ کیا تھا؟"
"کیا معاملہ تھا؟......رانا صاحب کون ہیں؟" بوڑھے آدمی نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے کہا۔
"رانا عزیز الدین......یہ پورا علاقہ انہی کی ملکیت ہے۔ ارب پتی ہیں، ارب پتی۔ میں ان کا سیکرٹری ہوں۔"
"اوہ۔" دوسرے لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گردن ہلانے لگے۔ "مگر قصہ کیا تھا صاحب؟"
"رانا صاحب کی پرورش ایک پہاڑی علاقے میں ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی فلم نہیں دیکھی، اس لئے وہ فلم کی شوٹنگ سے بھی ناواقف ہیں۔ ہم لوگ ادھر سے گزر رہے تھے کہ رانا صاحب نے آپ کی ہیروئن کی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ چنانچہ وہ سمجھے کہ کوئی بدمعاش، لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ پھر آپ سوچئے، وہ کیسے رُک سکتے تھے؟" میں نے کہا اور مس روشیلا ہنس پڑیں۔ مس روشیلا ہنسیں تو دوسرے لوگ کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ چنانچہ چاروں طرف قہقہے گونج اُٹھے۔
"ارے، اُس بہادر کو تو دیکھو۔ اُس کی کمر کی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔" روشیلا نے کہا اور سب لوگ اس سیاہ پوش کی طرف متوجہ ہو گئے جو ابھی تک زمین پر چت پڑا تھا اور اس کا گھوڑا قریب ہی گھاس تلاش کر رہا تھا۔ دو آدمی اس کی طرف دوڑ پڑے۔
"سارا ٹائم کھوٹی کر دیا۔ ارے دیکھو، بابو خان کو چوٹ تو نہیں آیا؟ شارٹ رہ جائے گا یار!" بوڑھے آدمی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے، تمہاری شامت ہی آگئی ہے۔ ارے رانا صاحب بگڑ گئے تو اچھا نہ ہوگا۔ پہلے تو یہ کہ تم نے ان کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں شوٹنگ ہی کیوں کی؟ رانا صاحب تمہارے یونٹ کو سامان سمیت خرید سکتے ہیں۔ اگر انہیں غصہ آگیا تو دس بیس فلمیں بنا ڈالیں گے۔ دو چار کروڑ خرچ کر لینا ان کے لئے مشکل نہیں ہے۔"
"ارے تم کائے کو بوم مارتا سیٹھ روئی والا! بس اب باقی شوٹنگ کل ہوئیں گا۔ اُٹھاؤ ٹام ٹبارہ۔" ایک درمیانی عمر کے آدمی نے دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا اور پھر ہماری طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

"معاف کر دو صاب! سیٹھ کا مگج کھراب ہے۔ آیئے رانا صاحب! ہمارے کیمپ تک چلئے۔ ہم آپ کو پھلم (فلم) کے بارے میں بتائینگا۔ ہم اس پھلم کا ڈائریکٹر ہے۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ کام کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ طالوت بھی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"آیئے رانا صاحب! واقعی بڑا دلچسپ حادثہ ہوا ہے۔ آیئے۔" مس روشیلا نے طالوت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ میری بکواس کام کر گئی تھی۔ وہ لوگ طالوت سے مرعوب ہو گئے تھے اور ایسے لوگوں کو ہمیشہ موٹی مرغی کی تلاش رہتی ہے۔ پھر ہمارے شاندار گھوڑے ہمارے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ اسی وقت وہ دونوں آدمی واپس آ گئے، جو شیر دل سیاہ پوش کو دیکھنے گئے تھے۔

"بابو خان بے ہوش ہو گیا ہے سیٹھ!"

"ارے اسے اٹھا کر جیپ میں ڈال دو۔ وہ ہے بھی نازک مزاج۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ اور پھر ہم لوگوں کی طرف رخ کر کے بولا۔ "آپ لوگ آیئے، ہم کیمپ چلتے ہیں۔"

"میں بھی گھوڑے پر ہی چلوں گی، رانا صاحب! کیا آپ کا گھوڑا میرا وزن سنبھال سکتا ہے؟" روشیلا نے مسکراتے ہوئے طالوت کو دیکھا۔ اس وقت اُس کی حیثیت ایک بے وقوف مالدار کی سی ہو گئی تھی، لیکن اب طالوت بھی فارم میں آ گیا تھا۔ وہ لپک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور روشیلا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ روشیلا، طالوت کے سینے سے پشت لگا کر بیٹھ گئی اور میں نے بھی ڈائریکٹر کو اپنے گھوڑے پر سوار کرا لیا۔

"کیمپ میں آ جاؤ سیٹھ!........ آج شوٹنگ ختم۔" ڈائریکٹر نے کہا اور سیٹھ برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ لیکن جب مس روشیلا ہی کام کرنے پر رضامند نہیں تھیں تو پھر اور کون کام کر سکتا تھا۔ ہمارے گھوڑے کیمپ کی طرف دوڑنے لگے۔ طالوت کے مزے آ گئے تھے۔ اور اب یقینی طور پر نئے اور دلچسپ ہنگامے جنم لینے والے تھے۔

❀❀❀

بھانت بھانت کے جانور موجود تھے۔ ہر ایک علیحدہ علیحدہ خصوصیت کا حامل۔ لیکن روشیلا جس کی طرف مائل ہو، اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور پھر فلم ڈائریکٹر کو معلوم ہو چکا تھا کہ نواب رانا عزیز الدین ارب پتی ہیں، اور اگر انہیں غصہ آ گیا تو دس بیس فلمیں بنا ڈالیں گے۔

دس بیس فلموں کا نام سن کر ڈائریکٹر کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اس سے عمدہ پارٹی کون سی مل سکتی تھی۔ بس کسی طرح فلم بنانے پر راضی ہو جائے، لطف آ جائے گا۔ اور اس کے لئے اس نے روشیلا کو پھانسنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ رانا عزیز الدین، روشیلا کی طرف متوجہ نظر آ رہے تھے۔

بہر حال، خوب چکر چلا تھا۔ ہم دونوں مس روشیلا اور فلم ڈائریکٹر عبدل بھائی کو لے کر کیمپ میں آ گئے تھے۔ شوٹنگ کرنے والے دوسرے لوگ بھی ہمارے پیچھے چل پڑے تھے۔ خیموں کی چھوٹی سی آبادی میں پہنچ کر گھوڑے روک لئے گئے اور طالوت گھوڑے سے کود پڑا۔ مس روشیلا نے بھی اپنے نازک بازو پھیلا دیئے تھے۔ وہ طالوت کے سہارے سے اُترنا چاہتی تھیں۔ طالوت نے گردن کھجاتے ہوئے میری طرف

دیکھا اور میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ کوئی حرج کی بات نہیں تھی، چنانچہ طالوت نے روشیلا کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں نیچے اُتارا اور مس روشیلا نے اپنے پورے جسم کا وزن طالوت پر ڈال کر گھوڑے کی پشت سے زمین تک کا سفر طے کیا۔ وہ چند لمحات میں اپنا مستقبل تابناک بنا لینا چاہتی تھیں۔

دوسری طرف ڈائریکٹر صاحب بھی گھوڑے سے اُتر آئے تھے۔ ”آؤ رانا عجیج الدین صاب! خدا کسم، آج تو آپ نے کمال کر ڈالا۔ کیسا مجے (مزے) کا بات تھا۔ آپ اور یجنل ہیرو لگتا پڑا تھا۔ بابو خان کو آپ نے ایسا پٹکنی دیا کہ سالا چت ہو گیا۔ ہاہا...... کیا یاد کرے گا، سالا کہ کبھی ولن بنا تھا۔“

”یہ سب کیا ہوتا ہے؟ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا۔“ طالوت نے کہا۔

”ارے جرور بتائیں گا۔ کائے کو نہیں بتائیں گا...... آپ دیکھو جرا۔ خدا کسم پھلم نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا۔“

”آیئے رانا صاحب! آرام کریں تھوڑی دیر۔ صبح سے کئی شارٹ ہو گئے۔ میں تھک گئی ہوں۔“

”ہاں، ہاں...... جرور آرام کرو رانا صاحب! تھوڑا دیر آرام کرو۔“

”سیکرٹری!“ رانا صاحب نے مجھے آواز دی۔

”رانا صاحب!“ میں نے طالوت کے سامنے گردن جھکا دی۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ رانا صاحب نے حکم دیا اور مس روشیلا نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ بہر حال میں رانا صاحب کے حکم کو کیسے ٹال سکتا تھا چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ ہی مس روشیلا کے خوب صورت خیمے میں داخل ہو گیا۔ مس روشیلا نے تھوڑی دیر کے لئے اپنے پروگرام میں تبدیلی کر لی تھی۔

اندر ایک کریہہ صورت بڑی بی، جن کی ٹھوڑی منہ چلاتے ہوئے ناک کی پھنگ سے جا لگتی تھی، ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے دراز تھیں۔ ان کے سامنے ہی پٹاری سی رکھی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑیں اور پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”یہ میری نانی ہیں۔“ مس روشیلا نے تعارف کرایا۔ بڑی بی کڑک نظروں سے ہم دونوں کو گھور رہی تھیں۔ ”اور نانی! یہ نواب رانا عزیز الدین ہیں۔ اس علاقے کے سب سے بڑے نواب۔“

”ارے، تُو شوٹنگ کرنے گئی تھی کہ نواب صاحب کو بلانے؟ یہ کہاں سے مل گئے؟“ بڑی بی نے پوپلی آواز میں کہا۔

”نانی! یہ بہت بڑے نواب ہیں۔ ارب پتی ہیں۔ دس بیس فلمیں بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ مس روشیلا نے کہا۔ ارب پتی والی بات نانی کی سمجھ میں آتی نہ آتی، لیکن دس بیس فلموں کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا، دس بیس لاکھ روپے۔ چنانچہ نانی کے ہونٹوں پر پھسپھساہٹ پھیل گئی۔ مسکراہٹ تو حسین چیز ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے ہونٹوں کے کھل جانے کو پھسپھساہٹ ہی کہنا مناسب ہے۔ ان کا منہ اندر سے لال تھا۔

”اے جم جم آؤ نواب صاحب! اللہ کاروبار میں برکت دے۔“ نانی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور روشیلا نے اطمینان کی سانس لی۔

”آپ ذرا باہر جا کر خود چائے وغیرہ کا انتظام کرائیں۔ نواب صاحب ہمارے مہمان ہیں۔“

”ضرور، ضرور......“ نانی صاحبہ نے کہا اور پھدکتی ہوئی خیمے سے باہر نکل گئیں۔ ان کی چال بے حد

مضحکہ خیز تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اوپری بدن بہت لمبا تھا اور ٹانگیں چھوٹی۔
"تشریف رکھیے، نواب صاحب! آپ تو بہت ہی بھولے ہیں۔ بھلا اس دور میں کون ہوگا جس نے فلم نہ دیکھی ہو۔"
"میرے سیکرٹری بتا چکے ہیں کہ میں نے پوری زندگی پہاڑوں میں گزاری ہے۔ بیرونی امور کے نگراں میرے سیکرٹری ہیں۔ لیکن ہمیں یہ سب کچھ بہت عجیب معلوم ہوا۔"
"بڑی دلچسپ بات ہے۔ میں آپ کو فلم دکھاؤں گی۔ اس فلم کے کچھ پرنٹ اور پروجیکٹر یہاں موجود ہے۔ آج رات کو انتظام کریں گے۔ آپ بہت بڑے نواب ہیں، ورنہ میں آپ سے کہتی کہ فلم کے ہیرو آپ بنیں۔ اچھے اچھوں کے رنگ پھیکے پڑ جائیں گے۔"
"ہیرو کیا ہوتا ہے؟" طالوت نے پوچھا۔
"بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ آپ کو فلم دیکھ کر ہی پتہ چل سکتا ہے، نواب رانا عزیز الدین صاحب!" میں نے جلدی سے بات لپک لی۔ روشیلا نے پھر میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ مجھے رانا صاحب کی نانی سمجھ رہی ہو۔ اور اس وقت خیمے میں نانیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ کیوں نہ طالوت کو تفریح کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اس سے اجازت طلب کی۔
"اگر آپ اجازت دیں رانا صاحب! تو میں باہر کے علاقے کی سیر کرلوں؟"
"چائے نہیں پیو گے سیکرٹری؟" طالوت نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔
"ان کی چائے باہر چلی جائے گی۔ ویسے بھی آقا اور نوکر ایک ساتھ چائے پیتے بھلے نہیں معلوم ہوتے۔ ٹھیک ہے، تم باہر کی سیر کرو۔" روشیلا نے کہا اور میں سعادت مندی سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔
نواب جلال الدین کے جلال آباد میں بڑے ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں زندگی بسر کی تھی، خاصا وقت وہاں گزارا تھا۔ اس کے بعد یہ تبدیلی کافی دلکش تھی۔ اور پھر طالوت ایک اور انوکھے ماحول سے روشناس ہونے جا رہا تھا، اس لئے میں نے اسے پورا پورا موقع دیا اور اسے اور روشیلا کو خیمے میں تنہا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے، طالوت کو فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور پھر اسے خطرہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔
باہر فلم ڈائریکٹر میری تاک میں تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً میری طرف چھلانگ لگائی۔ "ہو، ہو........ آؤ جی سیکرٹری صاحب!..... خدا کسم، ہمارے ساتھ چائے پیو تو ہمارے کو بہت کھسی (خوشی) ہوئینگا۔"
"سیٹھ روئی والا واپس آ گیا؟" میں نے اس کے ساتھ اس کے خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"ارے آ گیا سالا۔ کھالی پیلی بوم مارتا۔ ارے جب مس روسیلا ہی سوٹنگ (شوٹنگ) کو تیار نہیں ہوئینگا تو پھر وہ کیا کرلیں گا۔ ایں، تم بولو بھائی! کیا ہمارے کو دوپٹہ اوڑھا کر اغوا کرائینگا؟ ہی ہی ہی۔" ڈائریکٹر ہنستے ہوئے بولا۔
"بالکل، بالکل۔" میں نے گردن ہلائی اور سامنے دیکھنے لگا، جہاں سیٹھ روئی والا کچھ لوگوں پر بگڑ رہا تھا۔ اس کا موڈ بہت خراب معلوم ہو رہا تھا۔
"آؤ یار! میں چائے بولتا ہوں۔ آؤ......!" ڈائریکٹر مجھے اپنے خیمے میں لے گیا اور پھر مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اب مجھے اپنا ماضی یاد نہیں آتا تھا۔ حالانکہ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، لیکن طالوت کی ہنگامہ خیزیوں میں، میں سب کچھ بھول گیا۔ اور کوئی بات یاد رکھنا

حماقت تھی۔ خاصی دلچسپ زندگی گزر رہی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس نئے ماحول میں کون کون سی دلچسپیاں پوشیدہ ہیں۔

ڈائریکٹر اندر واپس آ گیا اور میرے سامنے فولڈنگ اسٹول کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اپن کو عبدل بھائی بولتا۔ سیکرٹری صاب! تمہارا نام کیا ہے؟''

''گولر بھائی۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ایں......کیا بولا؟'' ڈائریکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن میرے چہرے پر سنجیدگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ پہلے مسکرایا، پھر سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے میرا نام تسلیم کر لیا تھا۔ چند ساعت خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔

''اے گولر بھائی! تمہارا سیٹھ......میں بولا، رانا صاحب بہت گریٹ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شکل صورت سے تو تم دونوں خدا کسم ہیرو لگتا ہے۔ ایک دم فس کلاس والا ہیرو۔ تم بہت شاندار لوگ ہیں۔ ہمارے کو تم سے مل کر بہت کھسی ہوا۔''

''شکریہ عبدل بھائی!''

''ارے سکریہ وکریہ کا کیا بات ہے۔ ہم تو تمہارا مکھلس (مخلص) ہے۔ پن تمہارا سیٹھ کیا کرتا پڑا اے؟''

''کیوں......کیا ہو گیا؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ایں......کچھ نہیں ہوا۔ میں بولتا، صاب کیا کاروبار کرتا ہے؟''

''اسے کاروبار کی ضرورت کیا ہے عبدل بھائی؟ .....اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ کسی معمولی سی تفریح پر دس بیس لاکھ خرچ کر دینا اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''ہو ہو ہو......'' عبدل بھائی کے منہ سے کپکپاتی ہوئی ہنسی نکل گئی اور پھر وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ارے تو یار!......اپنا سیٹھ، میرا مطلب ہے رانا صاحب کو بولو پھلم بنائے۔ خدا کسم بڑا آمدنی ہوتا ہے۔ اور سہرت الگ۔ ہمارے ساتھ چلو اور رانا آرٹس پیلس کے نام سے پھلم کمپنی کھول دو۔ ہمارا کھدمت (خدمت) حاجر (حاضر) ہے۔ ہم نے پورا ڈزن پھلم ڈائریکٹ کیا۔ سب کا سب ہٹ گیا۔ خدا کسم تمہارا دعا سے ہمارا بہت نام ہے۔''

''میں رانا صاحب سے بات کروں گا، بشرطیکہ انہیں تمہارا ماحول پسند آ جائے۔ روشیلا سے کہو، رانا صاحب کو مائل کرے۔ بس کام بن جائے گا۔''

''سب کا کام بنے گا یار! بس تم دیکھتا رہو۔ پن تمہارے کو ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔''

''میں تیار ہوں۔ مگر تمہارا سیٹھ گڑبڑ نہ کر دے۔ وہ رانا صاحب سے خار کھا رہا ہے۔ اگر اس نے رانا صاحب کو ناراض کر دیا تو بات بگڑ جائے گی۔''

''ارے صرف کل کا بات اور ہے۔ اپن سیٹھ کا ڈبیل نہیں ہے۔ کل سارا سوٹنگ کر لے گا اور پھر ادھر سے چلے گا۔ ویسے ہم سیٹھ کو سمجھا دے گا، تم پھکر مت کرو۔'' عبدل بھائی نے کہا اور اسی وقت ڈبل ڈبل چائے آ گئی۔ ایک تو مس شیلا نے بھجوائی تھی اور دوسری عبدل بھائی نے منگوائی تھی۔ چنانچہ ہم نے ڈبل ڈبل چائے پی اور چائے کے ساتھ عبدل بھائی میرا بھیجا تناول فرماتے رہے۔ انہوں نے مجھے فلم بنانے

کے لئے تیار کر کے ہی چھوڑا تھا۔

کافی دیر کے بعد میں عبدل بھائی سے جان چھڑا سکا اور مس روشیلا کے خیمے کی طرف چل پڑا۔ روشیلا اور طالوت اندر موجود تھے۔

''میں آسکتا ہوں؟'' میں نے دروازے پر رک کر اجازت طلب کی۔

''آجاؤ سیکرٹری!........ اندر آجاؤ'' طالوت نے جلدی سے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ طالوت کے چہرے پر جھینپے جھینپے تاثرات تھے۔ اس کی وجہ مجھے فوراً معلوم ہو گئی۔

''ہوں۔'' میں نے گہری سانس لی۔ گویا روشیلا، طالوت کو فلم بنانے پر راضی کر چکی ہے۔ ''کیا پروگرام ہے باس؟'' میں نے طالوت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مس روشیلا بہت اچھی دوست ہیں سیکرٹری! ہم کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''خادم کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ البتہ شاید سیٹھ رُوئی والا اسے پسند نہ کرے۔''

''وہ کون ہوتا ہے، پسند یا ناپسند کرنے والا۔ اُس کی کیا مجال ہے؟........ رانا صاحب میرے مہمان ہیں۔'' روشیلا نے دخل دیا۔

''تب ٹھیک ہے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''سیکرٹری میرے بچپن کے دوست بھی ہیں، مس روشیلا! اس لئے میں ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔''

''اوہ........ یہ تو بہت اچھی بات ہے سیکرٹری صاحب!'' روشیلا کا لہجہ بدل گیا۔ ''ویسے آپ کے رانا صاحب بہت عمدہ انسان ہیں۔ میں انہیں دل سے پسند کرنے لگی ہوں۔''

''دل سے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں........ دل سے۔'' روشیلا نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں گڑبڑ آدمی ہوں اور مجھے سنبھالنا ضروری ہے۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ بہرحال، اس مسئلے پر رانا صاحب سے گفتگو کرنا بھی ضروری تھا۔ ویسے یہ بات تو ہمارے پروگرام میں شامل تھی کہ اس ماحول کو بھی اندر سے دیکھا جائے۔

رانا عزیز الدین، روشیلا کے منظورِ نظر تھے اور روشیلا کی نظر سب کو منظور تھی، اس لئے سیٹھ روئی والا بھی نرم ہو گئے اور فوری طور پر ہمارے لئے ایک خیمہ خالی کرا دیا گیا۔ خیمے کے مکینوں کو دوسروں کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ بہرحال ہم اس پورے یونٹ کی نگاہ میں تھے اور ہمارے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ ابھی تک مس روشیلا نے طالوت کو نہیں چھوڑا تھا اس لئے مجھے اس سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن مغرب سے کچھ پہلے مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔ اُس وقت مس روشیلا اپنی نانی سے کسی مسئلے پر گفتگو کرنے چلی گئی تھیں۔ میں اور طالوت اپنے خیمے میں آگئے۔

اندر آتے ہی طالوت ہنس پڑا۔ ''یار عارف! بڑی عمدہ جگہ ہے........ مزہ آگیا۔''

''ہاں بھائی!........ تیری قسمت میں مزے ہیں۔ مزے کر۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''مزے تو تم بھی کر سکتے ہو۔ دوسری لڑکیاں بھی موجود ہیں۔''

''وہ لڑکیاں ہیں؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''خیر، لڑکی تو یہ روشیلا بھی نہیں ہے۔ لیکن اس ویرانے میں غنیمت ہے۔ یار! کیوں نہ ہم باقاعدگی سے اس ماحول کا پوری طرح جائزہ لیں۔ مجھے تو ان کی زندگی بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔''
''طالوت........!'' میں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''میری ہدایت یاد ہے؟''
''یاد ہے........ایمان سے یاد ہے۔ تم فکر مت کرو۔ اب میں کسی کے پھندے میں نہیں پھنسوں گا۔ وقتی تفریح میں کیا حرج ہے؟''
''ہاں........وقتی تفریح میں کوئی حرج نہیں ہے۔''
''وہ مارا........گویا تمہاری طرف سے تھوڑے عرصے کے لئے اس ماحول میں رہنے کی اجازت ہے؟'' طالوت نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''ہاں، ہاں........یہ تو ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔''
''زندہ باد!'' طالوت خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا۔
''اس نے کیا گفتگو کی؟''
''یار! چکر میں لانے کا فن بخوبی جانتی ہے۔ ایسے ایسے جال ڈالے ہیں کہ اگر تمہاری ہدایات اور اپنا تجربہ شامل نہ ہوتا تو میں خود کو زندگی بھر کے لئے اس کی غلامی میں پیش کر دیتا۔''
''کیا کہہ رہی تھی؟''
''بس وہ تین چار ہزار جان سے میرے اوپر عاشق ہو گئی ہے۔ اس سے قبل اپنی زندگی میں گڑھا محسوس کرتی رہی تھی، جس میں اچانک مٹی بھر گئی ہے۔ اور اب وہ میرے بغیر زندگی گزارنے کو مر جانے پر ترجیح دے گی۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں اسے قتل کر دوں یا پھر اپنی صورت اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ کروں۔''
''خوب، خوب........یہ باتیں تو اسے زبانی یاد ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر فلم میں دوہرائی جاتی ہیں۔'' اور کچھ بتاؤ؟''
''اور کچھ سے کیا مراد ہے؟''
''کوئی عملی ثبوت بھی پیش کیا؟''
''عملی........میرا مطلب ہے عملی........؟'' طالوت گھبرا کر بولا۔
''خیر، پریشان مت ہو۔ میں خود بتا دوں گا۔ اس سے کہو، کس پروف لپ اسٹک استعمال کیا کرے، ورنہ مقابل کے رخساروں اور ہونٹوں کے نشان اس کا راز طشت ازبام کر دیتے ہیں۔''
''ارے توبہ توبہ........'' طالوت نے منہ پیٹتے ہوئے کہا۔
''نہیں طالوت! یہ مقام توبہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی زندگی یہی ہے۔'' میں نے کہا۔ اسی وقت باہر سے عبدل بھائی کی آواز سنائی دی۔
''اے گولر بھائی!........کیا تم اندر ہوتا پڑا ہے........ارے میں اندر آ سکتا ہوں؟''
''گولر بھائی؟'' طالوت نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
''ہاں۔ عبدل بھائی کو گولر بھائی سے مل کر بہت خوشی ہوا تھا۔ اس لئے میں گولر بھائی بن گیا ہوں۔

خیال رکھنا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور طالوت بھی ہنس پڑا۔
"دیکھیں، اس پر کیا پتا پڑی ہے۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔
"ہے گولر بھائی! ہم سالا تمہارے کو سارے میں تلاش کرتا پڑا۔" عبدل بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے عبدل بھائی؟"
"وہ، مس روسیلا تمہارے کو بلاتا۔ پھلم کے پرنٹ دکھانے کو ہیں۔ اس نے روئی والا کو تیار کرلیا ہے۔"
"کہاں ہیں؟"
"روئی والا کے کھیمے کے پاس اسکرین لگایا ہے اور پروجیکٹر بھی اُدھر سیٹ ہو گیا ہے۔"
"ٹھیک ہے عبدل بھائی! تم چلو، میں رانا صاحب کو لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور عبدل بھائی چلا گیا۔
"کیا کہہ رہا تھا؟" طالوت نے پوچھا۔
"آؤ........ فلم دیکھیں۔" میں نے کہا اور طالوت دلچسپی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خلاف توقع اس وقت روئی والا نے بھی ہمارا بہترین استقبال کیا تھا۔ روشیلا نے نشیلی آنکھیں بنا کر طالوت کو دیکھا اور پھر اس کے بازوؤں میں بازو ڈال کر رسیوں کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی طالوت کے برابر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے برابر عبدل بھائی، روئی والا اور دوسرے لوگ بیٹھ گئے۔ باقی لوگ پچھلی صف میں تھے۔
پروجیکٹر آن ہو گیا اور فلم چلنے لگی۔ یہ ریلیں مکمل تھیں۔ پہلے منظر میں ہیرو جاوید کو نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے دکھایا گیا تھا۔ پھر اس کی ملاقات سیٹھ صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ روشیلا تھی، جس نے جاوید کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔
پھر دوسری ریل لگائی تھی، اس میں ہیرو اور ہیروئن کا رومان تھا۔ ایک خوبصورت باغ کا منظر تھا، جہاں دونوں چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے۔ ہیرو حلق پھاڑ پھاڑ کر ایک گانا گا رہا تھا۔ انتہائی درجے کی اچھل کود کے باوجود اس کا سانس نہیں پھولا تھا اور آواز میں لرزش نہیں تھی۔ روشیلا رقص کے دوران اپنے پورے جسم کا ناپ بتا رہی تھی۔ وہ کبھی گھاس پر قلابازیاں کھاتی، کبھی پانی میں اچھل کود مچاتی۔ یہاں تک کہ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں پہنچ گئے۔ تب جاوید صاحب کی آواز اُبھری۔
"نیلم!........ نیلم! تم نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے نیلم!........ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ نیلم! مجھے اس خواب سے بیدار تو نہ ہونا پڑے گا؟" اس نے روشیلا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
"یہ خواب تو ہماری زندگی ہیں جاوید! دعا کرو کہ ہمیں انہی خوابوں میں موت آجائے۔ ہماری آنکھ کبھی نہ کھلے۔ تم میری روح ہو جاوید! روح بنا زندگی ناممکن ہے۔ مجھے چھوڑ تو نہ دو گے جاوید؟"
"عارف!" طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
"ہوں۔" میں چونک پڑا۔
"یہ سسری بھی فراڈ ہے۔ سو فیصدی فراڈ۔"
"کیوں........ کیا ہوا؟"
"بالکل اسی انداز میں مجھ سے بکواس کر رہی تھی۔ ذرا بھی فرق نہیں ہے۔"

”میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ لیکن فکر مت کرو۔ جس طرح جاوید نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا، اسی طرح تم بھی مت کرو۔“

”کیا مطلب؟“

”ارے بھئی یہ فلم ہے۔ اور جاوید جانتا تھا کہ یہ بکواس کر رہی ہے۔ اس لئے وہ صاف بچ گیا۔ ورنہ آج یہ اس کی بیوی ہوتی۔“

”تجربے کار آدمی ہوگا۔“ طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ رومانی منظر اب بھی چل رہا تھا اور روشیلا کا سر جاوید کے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔ اچانک روشیلا نے طالوت کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”میری اداکاری کیسی ہے ڈارلنگ؟“

”بہت عمدہ۔ بے مثال۔“ طالوت نے زہریلے لہجے میں کہا۔ لیکن روشیلا اس کے لہجے کے طنز کو نہ سمجھی اور اس نے پیار سے طالوت کی کلائی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

فلم کی چند بے ربط ریلیں تھیں، جو ختم ہو گئیں۔ زیادہ تر رومانی مناظر تھے۔ ریلیں ختم ہونے کے بعد چائے کا دور چلا، جو روئی والا کی طرف سے تھا اور میں روئی والا کی خاطر مدارات کا مطلب بھی تھوڑی دیر کے بعد سمجھ گیا تھا۔ بات روئی والا کے سیکرٹری نے شروع کی تھی۔

”کیا آپ کو ہماری فلم کے مناظر پسند آئے رانا صاحب؟“

”ہاں....... بہت عمدہ تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار فلم دیکھی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ ایک ہی شخصیت، میرے پاس بھی موجود تھی اور میرے سامنے بھی۔“

”اس دور میں یہ حیرت انگیز بات ہے کہ کسی نے فلم نہ دیکھی ہو۔ بہرحال آپ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ لیکن رانا صاحب! ہماری ایک درخواست ہے۔“

”کیا؟“ طالوت نے پوچھا۔

”سیٹھ روئی والا نے دس کے قریب فلمیں بنائی ہیں۔ ہماری ساری فلمیں باکس آفس پر ہٹ ہوئی ہیں، یعنی بہت پسند کی گئی ہیں۔ اس فلم کا نام چنڈال چوکڑی ہے۔ کافی پبلسٹی ہو چکی ہے۔ بہت سے ڈسٹری بیوٹر اسے خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ جانتے ہیں، بزنس مین کے پاس روپیہ رولنگ میں رہتا ہے، اگر ہم فلم ابھی سے بیچ دیں تو ہمیں منہ مانگی قیمت نہ مل سکے گی، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اسے مکمل کرنے کے بعد ہی مارکیٹ میں لائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ طالوت نے کہا اور میں نے بمشکل ہنسی روکی۔

”دراصل......“ سیکرٹری نے کہا۔ ”روئی والا مالی طور پر کمزور ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ رانا صاحب! آپ ان کے پارٹنر بن جائیں۔“

”بن جائیں گے۔“ طالوت نے موج میں آ کر کہا۔

”واللہ، لطف آ جائے گا، اگر ایسا ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ کھڑکی توڑ فلم ہوگی۔“ سیکرٹری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی! مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

''فوری طور پر آپ کو صرف پانچ لاکھ روپے خرچ کرنا ہوں گے اور اس کے بعد آپ ذرا لطف دیکھیں۔''

''ارے ماں کسم......مجا آ جائے گا۔ ہو ہو ہو۔'' روئی والا نے بھی خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے روئی والا! میں اپنے سیکرٹری سے مشورہ کر کے صبح کو جواب دوں گا۔''

''جرور جی جرور...... ہو ہو ہو۔'' روئی والا نے کہا اور پھر یہ محفل برخاست ہو گئی۔ روشیلا نے طالوت کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''کیا آپ بھی آرام کریں گے رانا صاحب؟''

''کیوں......آپ حکم دیں روشیلا!''

''میں تو صرف التجا کر سکتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد چاند نکل آئے گا اور چاندنی میں قرب و جوار کی پہاڑیاں بے حد حسین ہوتی ہیں۔ کیا آپ میرے ساتھ اس حسن کا نظارہ نہیں کریں گے؟''

''ضرور کریں گے۔'' طالوت نے ترنگ میں آ کر کہا اور میں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

''مم......میرا مطلب ہے، مجھے تھوڑی دیر کی اجازت تو ضرور دیں گی مس روشیلا! اتنی دیر میں چاند بھی نکل آئے گا۔''

''میں آپ کا انتظار کروں گی رانا صاحب!''

''میں ضرور آؤں گا ڈارلنگ!'' رانا صاحب نے جاوید کی نقل کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ میرے ساتھ خیمے میں آ گئے۔

''بلاوجہ تکلیف کی رانا صاحب! ابھی تھوڑی دیر میں چاند نکل آئے گا۔ نہ بھی نکلے تو کیا حرج ہے۔ تاریکی میں بھی یہ پہاڑیاں بڑی رومان انگیز ہوتی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یار گھپلا مت کرو عارف بھائی! اُس مولویانہ ماحول سے نکل آئے ہیں، تھوڑی سی تفریح کی اجازت دے دو۔''

''ٹھیک ہے......میں کب انکار کر رہا ہوں؟''

''خوشی سے اجازت دے دو پیارے بھائی!'' طالوت نے خوشامد کی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''

''یہاں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ تم بھی ٹرائی کرو نا۔''

''ابھی تک کوئی سامنے ہی نہیں آئی ہے۔''

''ایک مشورہ دوں؟''

''ضرور دو۔''

''شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ کر ان خیموں کی سیر کرو۔ کہیں نہ کہیں دال گل جائے گی۔ میرا خیال ہے، ایسا کرو۔''

''دیکھا جائے گا۔'' میں نے بظاہر لاپروائی سے کہا۔ درحقیقت یہ عمدہ تجویز مجھے پسند آئی تھی۔

''تو میں جاؤں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''خدا حافظ۔''

''شکریہ..... شکریہ۔'' طالوت جھکتے ہوئے بولا اور پھر باہر نکل گیا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ اب وہ آسانی سے کسی جال میں نہیں پھنسے گا۔ اسے اس دنیا کا بھی کافی تجربہ ہو چکا ہے اور یہ طالوت اس طالوت سے مختلف ہے جو پہلے ہر چیز پر لٹو ہو جاتا تھا۔ ویسے میں نے طالوت کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ کر میں بھی طالوت کی طرح پوشیدہ انداز میں گھوم پھر سکتا تھا۔

بہر حال، طالوت کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک تو میں اپنے خیمے میں بیٹھا اس دلچسپ ماحول کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے شاہ دانہ کا دوشالہ نکالا اور اسے اوڑھ کر باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے ڈائریکٹر عبدل بھائی کا خیمہ نظر آیا۔ میں نے اس کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور عبدل بھائی کو خراٹے لیتے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ بدمعاش طالوت ہی کو دیکھوں۔ دیکھوں تو سہی کیا کر رہا ہے؟ اور میں طالوت کی تلاش میں چل پڑا۔ چاندنی نکل آئی تھی، قرب و جوار کی چٹانوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے میں آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک جگہ وہ دونوں مجھے نظر آ گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں دبے قدموں ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ روشیلا طالوت پر جھکی ہوئی تھی۔

''آہ..... رانا صاحب! میں سوچتی ہوں کہ کیا ان پہاڑوں میں، میں لٹنے آئی تھی؟'' روشیلا نے کہا۔

''کیا مطلب؟........ کیا کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟''

''ہاں........ عقل و خرد۔ دین و دنیا۔ ہوش و حواس، سب کچھ تو گم ہو گیا ہے۔ اب میرے پاس بچا کیا ہے۔''

''بہت افسوس ہوا۔'' طالوت نے ہمدردی سے کہا۔

''لیکن میں بہت خوش ہوں۔''

''اوہ........''

''مجھے آپ مل گئے، رانا صاحب! ہاں، مجھے اپنی محرومی کا احساس اس وقت ہوگا، جب آپ مجھ سے دور چلے جائیں گے۔'' اس بات کا طالوت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''آپ مجھ سے دور تو نہیں جائیں گے رانا صاحب؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تب آپ یہاں سے ہمارے ساتھ ہی چلیں۔''

''میں چلوں گا۔''

''سیٹھ روئی والا کے ساتھ بزنس میں شرکت کر لیں۔ اس طرح آپ کو تجربہ بھی ہو جائے گا اور ہم دونوں مل کر الگ کمپنی کھول لیں گے اور اپنی فلمیں بنایا کریں گے۔''

''کر لوں گا۔''

''اپنی فلموں میں، میں صرف آپ کے ساتھ کام کروں گی۔ میرے مقابل اور کوئی ہیرو نہیں آئے گا۔''

''نہیں آئے گا۔'' طالوت احمقانہ انداز میں بولا۔

''تب پھر صبح ہی آپ اپنے سیکرٹری کو روانہ کر دیں اور روپیہ منگوا لیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دس بیس لاکھ تو ہمیشہ پڑے رہتے ہیں۔ میں صبح کو نقد روپیہ دے دوں گا۔''

''دس بیس لاکھ؟'' روشیلا اچھل پڑی۔

''ہاں۔'' طالوت نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''اور آپ اتنی دولت لئے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''جنگل میں ڈاکو بھی مل سکتے ہیں۔''

''اوّل تو میں ان سے نمٹنا جانتا ہوں، دوسرے اگر اتنی رقم چلی بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے، ان کے کام آ جائے گی۔ میرے پاس کیا کمی ہے؟'' اور روشیلا اس عظیم انسان پر مزید کچھ جانوں سے فدا ہو گئی، جو دس بیس لاکھ کو کچھ گردانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے ارادے بہت بھیانک ہو گئے۔ اور جب طالوت نے بھی اس کی پذیرائی کی تو پھر میں نے وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ چاندنی رات کا کھیل میرا دماغ بھی خراب کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے چل پڑا اور اب میں نے دوسرے خیموں میں جھانکنے کا پروگرام بنایا۔

واپسی میں جو سب سے پہلے خیمہ نظر آیا، میں اسی کی طرف چل پڑا۔ اس خیمے کے مکین سو نہیں رہے تھے۔ اندر سے گفتگو کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بہ آہستگی خیمے کے دروازے کو ہٹایا۔ لیکن اندر کا ناٹک کچھ اور ہی تھا۔ ایک سہمی ہوئی لڑکی ایک طرف کھڑی تھی اور ایک آدمی بستر پر بیٹھا تھا۔

''تمہیں کمپنی سے نکلوانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے نوری! تم جانتی ہو کہ تمہیں یہاں تک لانے والا بھی میں ہی ہوں۔'' مرد نے بھاری آواز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بابو خان!...... مگر تم سوچو، غور کرو۔ تمہاری ابرو کے اشارے پر بے شمار لڑکیاں تمہاری آغوش میں آ گریں گی۔ پھر ایک غریب کی عزت لے کر تمہیں کیا مل جائے گا؟'' لڑکی نے دلگداز آواز میں کہا۔

''ہونہہ...... عزت، عزت، عزت۔ نہ جانے ہر لڑکی نے دلوں کے کھیل کو عزت کیوں بنا لیا ہے۔ تُو میری پسند ہے نوری! میں تجھ سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان بھی پتہ نہیں چلے گا۔ کوئی اس کا راز دار نہیں ہو گا اور تیری زندگی بن جائے گی۔ ضد نہ کر..... باہر کا موسم بہت خوبصورت ہے۔''

''بابو خان! کچھ بھی ہو جائے، میں اپنی عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔ مجھ پر ترس کھاؤ بابو خان!'' لڑکی کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

''میں نے تمہارے اوپر ترس کھا کر ہی تمہیں یہ نوکری دلائی تھی۔ لیکن یاد رکھو! اگر تم نے میری خواہش پوری نہ کی تو تمہیں نوکری سے فارغ بھی کروا سکتا ہوں۔'' بابو خان کے لہجے کی رعونت بڑھتی جا رہی تھی۔

''اللہ مالک ہے بابو خان! میں تمہارے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بنوں گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔'' لڑکی پُرعزم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس کا نتیجہ تمہیں صبح ہوتے ہی مل جائے گا۔'' بابو خان نے غصے سے کہا اور خیمے سے نکل کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

❀

(اس سے آگے کے واقعات جاننے کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں)

طالوت
2
ایم اے راحت

میں نے خونی نگاہوں سے بابو خان کو دیکھا۔ حقیقی زندگی میں بھی وہ وِلن تھا۔ ہاں، یہ وہی ولن تھا، جسے طالوت نے گھوڑے سے گرا دیا تھا...... تُو نے اپنی شامت کو آواز دے لی ہے بابو خان!...... تُو شمشیر بن گیا ہے۔ لیکن فکر مت کر...... تیرا حشر بھی شمشیر سے مختلف نہیں ہوگا۔

اس کے بعد کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنے خیمے میں جا کر لیٹ گیا۔ دل میں عجیب سا درد ہو رہا تھا۔ خدایا!...... پوری دنیا کا درد کیسے بانٹ لوں؟...... یہاں نہ جانے کون کون مظلوم ہے۔ میرا بس چلے تو پوری دنیا کے دُکھ دُور کر دوں۔

نہ جانے کتنا وقت انہی خیالات میں گزر گیا۔ نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خیمے کے دروازے پر طالوت کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر وہ دروازہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے چند ساعت میری طرف دیکھا اور پھر شاید مجھے سوتا ہوا سمجھ کر اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ میں خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر اسی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

"عارف!" اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی۔

"میں جاگ رہا ہوں طالوت!"

"ارے تو پھر بات کیوں نہیں کی تھی؟...... کیا سوچ رہے تھے؟...... کیا ناراض ہو گئے ہو؟"

"نہیں طالوت!...... اپنی اس گندی دنیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہاں انسانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انسانی پیکر میں درندے قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ آخر اس دنیا میں درندوں کا تسلط کیوں ہو گیا ہے؟"

"کسی خاص بات نے تمہیں متاثر کیا ہے عارف؟" طالوت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہاں تو ہر قدم پر کوئی نہ کوئی خاص بات موجود ہے۔ کہیں بھی گہری نگاہ سے دیکھو، کوئی نہ کوئی ایسیہ نظر آ جائے گا۔"

"مجھے بتاؤ میرے دوست! کیا ہوا؟...... کیا دیکھا؟ میں اُس کو جڑ سے مٹا دوں گا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے، ہم پوری دنیا کو درست نہیں کر سکتے۔ لیکن جو ہمارے سامنے آ جائے، اس کی مدد ہمارا فرض ہے۔ دنیا کو بھول جاؤ، کیونکہ تم تنہا ہو۔ اور جو کوئی تمہارے سامنے آئے اسے دنیا پر تقسیم کر دو۔"

"ٹھیک ہی کہتے ہو۔" میں نے مضمحل انداز میں کہا۔

"عارف! میرے دوست! میں یہ انداز برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے خوشیاں پسند ہیں۔ ہنستے رہو.....

ہر حال میں ہنستے رہو۔ یہی زندگی ہے۔ بتاؤ تو، ہوا کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہاں ایک لڑکی نوری ہے۔ زمانے کی ستائی ہوئی۔ تمہارے کہنے پر شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ کر نکلا تھا۔ پہلے ہی مرحلے پر حوصلے پست ہو گئے۔ نوری کی کہانی کچھ یوں ہے کہ اس کا باپ شاید ٹرک ویلڈر تھا۔ بدقسمتی سے کسی حادثے میں اس کی آنکھیں چلی گئیں۔ تب نوری گھر کی کفالت کے لئے گھر کا باورچی خانہ چھوڑ کر نکل آئی۔ اس نے ملازمت تلاش کی۔ شاید کوشش کے باوجود ملازمت نہ ملی ہو گی۔ تب وہ فلم انڈسٹری کی طرف آ گئی اور نہ جانے کیسے، بابو خان اسے مل گیا، جس نے اسے ایکسٹرا لڑکیوں میں ملازم کرا دیا۔ نوری کے جذبات مر چکے ہیں، لیکن ضمیر زندہ ہے۔ وہ ملازمت برقرار رکھنے کے لئے منت سماجت کر سکتی ہے، پاگلوں کے انداز میں روزی کی بھیک مانگ سکتی ہے، لیکن روپیوں کے عوض اپنی عصمت نہیں دے سکتی۔"

"اوہ........ وہ کہاں ہے عارف؟"

"یہیں........ اسی کیمپ میں۔" میں نے کہا اور پھر نوری اور بابو خان کی کہانی سنا دی۔ طالوت خاموشی سے سنتا رہا، سوچتا رہا۔ اور پھر میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"تو اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو یہ مسرت ہے کہ تمام کہانی ہمارے علم میں آ گئی۔ چنانچہ اب نوری کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ البتہ بابو خان کو سزا ضرور ملے گی۔ اور کس کی مجال ہے کہ اب نوری کو کوئی تکلیف پہنچا سکے۔ خوش ہو جاؤ۔ مجھے آنسوؤں سے بہت خوف آتا ہے۔"

"ہاں طالوت! ہم اس کی بھرپور مدد کریں گے۔ اس کا ضمیر زندہ ہے۔ انسان مر جائے، اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن ضمیر کی موت برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب اس موضوع کو ختم کر دو۔"

"ہاں........ اب تم اپنا موضوع شروع کرو۔ سناؤ، کیا گفتگو ہوئی ہے اس سے؟"

"وہ ہر لمحہ اپنی چاہت کی ڈگریاں بڑھا رہی ہے۔ چاہت کے شدید بخار میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔ اسے یقین آ گیا ہے کہ میں اب زندگی بھر اس سے جدا نہ ہوں گا۔ اس نے اپنی اور میری زندگی کے مشترکہ پروگرام ترتیب دے دیئے ہیں۔ آئندہ وہ صرف میرے مقابل کام کرے گی، اور اُس نے پُرزور سفارش کی ہے کہ میں روئی والا کی مدد کروں اور اسے پانچ لاکھ روپیہ ادا کر دوں تاکہ اس کی فلم مکمل ہو جائے۔"

"خوب، خوب........ خود تمہاری کیا پوزیشن ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں دل سے استاد مان لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کے جال اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ بس........ ایسی ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں کہ انسان گدھے کی بولی بولنے لگے۔ کسی طور ان کی ریاکاری پر یقین کرنے کو دل نہ چاہے........ لیکن یار استاد! تیرا نام لے کر اب میں ہر عورت کا تیار کیا ہوا جال توڑ سکتا ہوں۔"

"ویری گڈ!...... یار تمام اُداسی ڈھل گئی۔ بہرحال اس کے بعد کچھ اور نہیں پوچھوں گا، کیونکہ........" میں خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔

"کیونکہ کیا؟" طالوت نے چیخ کر پوچھا۔ "کچھ نہیں۔ ذرا شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ کر پہاڑیوں کی طرف نکل گیا تھا۔"

''بدمعاشی ہے یہ۔کوئی شرافت کی بات نہیں ہے۔'' طالوت نے بھناتے ہوئے کہا۔
''پوری بات تو سن لو۔تم لوگوں کو دیکھ کر میں فوراً واپس چل دیا تھا۔
''قسم کھاتے ہو؟''
''ہاں یار!......تم خود غور کرو۔اس بھیانک ماحول میں، میں کیسے زندہ رہ سکتا تھا؟ چنانچہ سرپٹ دوڑ لگادی۔''
طالوت جھینپ رہا تھا۔''یار! بہت استاد عورت تھی۔''
''نقصان میں ہی رہی۔تمہارا کیا لے لیا؟''
''اگر اجازت دو تو تھوڑے دن تفریح جاری رکھوں۔لیکن استاد کی اجازت سے۔اگر استاد انکار کر دیں تو ابھی واپسی کے لئے تیار ہوں۔''
''عیش کرو بچّو!رام بھلی کرے گا۔'' میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور طالوت میرے بستر میں ہی آ گھسا۔
''کیا خیال ہے......ہمیں اسی ماحول کے بارے میں جاننا ہے۔اس کے بجائے کہ ہم فلم انڈسٹری میں اجنبی ہوتے، کیوں نہ ان لوگوں کے ساتھ ہی فلم لائن تک چلا جائے۔ ہماری حیثیت بھی ہوگی۔باقی رہا دولت کا سوال،تو یہ سوال ہی کیا ہے۔کیا خیال ہے؟''
''ٹھیک ہے۔دس بیس لاکھ تو ہر وقت تمہارے پاس پڑے رہتے ہیں۔صبح کو پانچ لاکھ روپے ادا کر دو۔''
''استادِ اعظم،زندہ باد۔'' طالوت نے نعرہ لگا کر مجھے بھینچ لیا۔وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔
دوسری صبح شوٹنگ کی تیاریوں کے بجائے ہمارے لئے ناشتے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ہم دونوں نے لباس وغیرہ تبدیل کئے اور پھر باہر نکل آئے۔طالوت نے راسم سے رقم طلب کر لی تھی اور اس وقت ہم دونوں کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے پُر تھیں۔سیٹھ روئی والا، عبدل بھائی، روشیلا اور دوسرے لوگوں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔روشیلا کی نانی اس کے خیمے میں ہی تھی۔اور یوں بھی روشیلا تو عشق کرنے کی ماہر تھی، اس لئے وہ سب کے سامنے بھی طالوت سے اظہارِ عشق کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔لیکن طالوت سنجیدہ تھا۔
ناشتہ بہت پُر تکلّف تھا۔اس دوران عبدل بھائی اور روئی والا، لطیفے سناتے رہے تھے۔وہ خود کو بہت زیادہ شائستہ اور با اخلاق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔پھر عبدل بھائی نے گفتگو کی ابتدا کر دی۔
''خدا کسم، آپ لوگوں کی آمد سے ہمارے کو بہت کھُشی ہوا ہے۔اور اگر آپ لوگ سیٹھ روئی والا کا پارٹنر بن گیا تو بس مجا ہی آجائے گا۔''
''او ماں کسم......ایسا پھلم بنائے گا، ایسا پھلم بنائے گا کہ بس پبلک پاگل ہو جائے۔'' روئی والا نے ٹکڑا لگایا۔
''کیا فیصلہ کیا تم نے ڈیئر؟'' روشیلا نے طالوت کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
''کس بارے میں؟''
''کیا تم روئی والا کے پارٹنر بننے کو تیار ہو؟''

''ارے پانچ لاکھ کی بات ہی کیا ہے........اس کے بارے میں صرف سیکرٹری سے معلونات کرنا تھی۔سیکرٹری نے منظوری دے دی۔بس ٹھیک ہے۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔

''منجوری دے دیا؟'' سیٹھ اچھل پڑا۔

''سیکرٹری! رقم دے دو۔'' طالوت نے کہا اور میں نے جیب سے گڈیاں نکالنا شروع کر دیں۔نوٹ دیکھ کر سب کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔عبدل بھائی کی تو سانس کی آمدورفت ہی بند ہو گئی تھی۔روشیلا کے چہرے پر ایسے آثار نظر آ رہے تھے، جیسے وہ پرانے قبض میں مبتلا ہو۔سیٹھ روئی والا کی گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی۔نوٹوں کی ہر گڈی کے ساتھ اس کی گردن ہل رہی تھی۔بڑا سکوت چھایا ہوا تھا۔

''گن لو، روئی والا!........ پورے پانچ لاکھ ہیں۔''

''پھوں........'' روئی والا نے رُکی ہوئی سانس ایک دم چھوڑ دی اور اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکل گئی۔''گگ........گننے کی کیا جرورت ہے مائی باپ! ٹھیک ہوں گے۔ابھی سیکرٹری کو بولتا ہوں، رسید بنائے۔ایگریمنٹ تیار کرے۔اب پھلم بنے گا، ایک دم پھس کلاس والا۔آپ دیکھو رانا صاحب! ماں کسم........ہو ہو ہو۔''

''رسید یا ایگریمنٹ کی ضرورت نہیں ہے روئی والا۔پیسے سنبھالو، اپنا کام کرو۔اور جتنی ضرورت ہو، لے لینا۔'' طالوت نے کہا۔

''ڈار........لنگ........ڈارلنگ........!'' روشیلا کو بخار چڑھ آیا۔وہ طالوت سے چمٹ گئی۔

''حواس قائم رکھیے، مس روشیلا! آپ کو کیا ہو گیا؟'' طالوت نے پُروقار انداز میں کہا اور روشیلا اس کے خشک انداز پر سنبھل گئی۔مجھے طالوت کی یہ بات بہت پسند آئی تھی۔اور دوسرے لوگوں پر بھی اس کا بہتر اثر پڑا تھا۔روشیلا جھینپ گئی تھی۔

''آج شوٹنگ ہو رہی ہے سیٹھ؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہو جی، جیسا آپ کا حکم۔''

''آپ بے تکلفی سے اپنا کام کریں۔ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔اور ہاں........ یہاں آپ کا اسٹاف کتنا ہے؟........میرا مطلب ہے، کُل کتنے افراد یہاں آئے ہوئے ہیں؟''

''جی........تقریباً چالیس آدمی ہیں۔آٹھ لڑکیاں، باقی مرد۔''

''لڑکیوں کا کیا کام ہے؟''

''ہم نے ایک آؤٹ ڈور کورس شوٹ کیا ہے۔اب لڑکیوں کا کوئی کام نہیں ہے۔'' سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔

''ہوں........ٹھیک ہے۔آپ شوٹنگ کا انتظام کریں۔ہم بھی دیکھیں گے۔'' طالوت نے کہا اور سیٹھ صاحب نے عبدل بھائی کو حکم دیا۔عبدل بھائی دوسروں کو حکم دینے لگے۔اور ذرا سی دیر میں شوٹنگ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔کل ہی کا سین فلمایا جانے والا تھا۔

میں نے بابو خان کو دیکھا۔چہرے سے ہی ولن معلوم ہوتا تھا۔بابو خان نے لباس پہن لیا تھا۔البتہ مس روشیلا ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔تب بابو خان نے سیٹھ کے قریب آ کر کچھ کہا۔وہ بہت سنجیدگی سے کچھ کہہ رہا تھا۔میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا، تاکہ ان کی گفتگو سن سکوں۔

''ارے بابا! اس ٹیم کیا لفڑا ہے؟ واپس چل کر بات ہو جائیں گا۔''

''نہیں سیٹھ!........ بات ابھی ہو گا۔ میں صفِ اوّل کا آرٹسٹ ہوں۔ ایک ایکسٹرا لڑکی کی یہ مجال کہ وہ میرے منہ آئے۔''

''اے بابو کھاں........ کیا بولتا ہے یار؟ تم نے ہی تو اسے رکھوایا تھا۔''

''تو میں ہی بولتا ہوں سیٹھ! کہ اس کی چھٹی کر دو۔ آج........ اسی وقت۔ میں اس کے بعد ہی شوٹنگ پر جاؤں گا۔''

''ارے یار! تم لوگ بہت پریشان کرتا ہے۔ جاؤ بابا! تم کُھد اس کو بول دو۔ میرے کو اس کا چٹنی بنانے کو نہیں مانگتا۔ جاؤ، بول دو بابا!''

''یہ بات تم ہی اس کو بولو گے سیٹھ!........ ابھی اور اسی وقت........ ورنہ شارٹ فلمبند نہیں ہو گا۔''

''اے رسید (رشید)........ اِدھر آؤ بابا!'' سیٹھ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''جی سیٹھ؟'' ایک آدمی اس کے قریب پہنچ گیا۔

''اے جاؤ، نوری کو بلا لاؤ........ بولو، سیٹھ بلاتا ہے۔'' روئی والا نے کہا اور ملازم دوڑ گیا۔ تب میں نے دن کی روشنی میں نوری کو دیکھا۔ حُسنِ مظلوم، سادگی کا پیکر........ زرد چہرہ لئے، کانپتا ہوا آ رہا تھا۔ پتلے پتلے نقش و نگار، معصوم سی شکل، جسے اپنے ضمیر کے خلاف مسکرانا بھی پڑتا ہو گا۔ رقص کر کے چھچھوری ادائیں بھی دکھانا پڑتی ہوں گی۔ دُبلا پتلا جسم۔ سادہ سے کپڑوں میں رشید کے ساتھ آ رہی تھی۔

''ارے تیرے کو کیا ہوا لڑکی؟........ اپنا بابو کھان تیرے کو ناراج ہوتا۔ اس کو کُھس نہیں رکھے گا تو کھائے گا کیا؟ اپن تیرے کو ڈس مس کرتا ہے بابا!........ ابھی اور اسی وقت ڈس مس کرتا ہے۔ واپس چل کر اپنا حساب کر لینا۔ کیوں بابو خان! اب تو کُھس؟''

''تھینک یو سیٹھ! بابو خان بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔'' بابو خان نے موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ نوری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی کانپ رہی تھی۔ تب میں ایک دم آگے بڑھا اور ان لوگوں کے قریب پہنچ گیا۔

''یہ لڑکی کون ہے سیٹھ؟'' میں نے پوچھا۔

''نوری ہے سیکرٹری صاحب!........ ایکسٹرا لڑکی ہے۔''

''کیا یہ تمہاری ملازم ہے؟''

''تھی........ ابھی میں نے بابو کھاں کی شکایت پر اسے نکال دیا ہے۔ یہ لوگ آرٹسٹ کو کُھس نہیں رکھیں گا تو ترقی کیسے کریں گا۔ یہ نہیں سوچتا بابا۔''

''نوری! اِدھر آؤ۔'' میں نے اُسے پکارا۔ اور اس نے لرزتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلا رہی تھیں۔ ''اِدھر آؤ'' میں خود اس کے قریب پہنچ گیا۔ اور پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی وقت مس روشیلا تیار ہو کر آ گئیں اور چلنے کا شور مچ گیا۔ کیمرہ مین اور دوسرے لوگ گاڑیوں پر چڑھ گئے۔ سیٹھ نے ایک گاڑی ہمارے لئے مخصوص کر دی تھی۔ لیکن روشیلا کی فرمائش پر طالوت کو اس کے ساتھ ہی جیپ میں سوار ہونا پڑا تھا۔

''میں آ رہا ہوں رانا صاحب!........ ذرا نوری سے بات کر لوں۔''

''آؤ... میں انتظار کر رہا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور میں نوری کا ہاتھ پکڑ کر جیپ کی طرف بڑھ گیا۔
''بیٹھو نوری! ہم شوٹنگ دیکھنے چلیں گے۔''
''آپ.......آپ.......'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
''میں تم سے بات کروں گا نوری!.......بیٹھو تو سہی۔'' میں نے کہا اور وہ جیپ میں بیٹھ گئی۔ میں بھی اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میں سست روی سے چل رہا تھا۔
''کیا تمہیں اس کا احساس نہیں ہے نوری! کہ اگر ایک در بند ہوتا ہے تو ستر در کھل جاتے ہیں؟''
نوری کی ڈبڈبائی آنکھوں میں حیرت کے نقوش اُبھر آئے۔
''میں ذرا جذباتی سا آدمی ہوں نوری!.......میں تجھ سے فریب کی گفتگو نہیں کروں گا۔ کل رات میں نے بابو خاں کے خیمے سے گزرتے ہوئے تیری اور بابو خاں کی گفتگو سن لی تھی۔ میں تیری عظمت کا احترام کرتا ہوں۔ میں دل سے تیری عزت کرتا ہوں۔ سن نوری! قدرت نے تجھے دولت سے نہیں نوازا۔ لیکن خدا اپنے خاص بندوں کو کچھ خاص صفتیں دیتا ہے۔ اس نے تجھے ضمیر کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ تُو نے شدید ترین مصیبت میں بھی اپنے ضمیر کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ ٹھیک ہے، دنیا کی نگاہ سینے کے اندر نہیں جاتی۔ لیکن دل کی دولت چہرے سے جھلکتی ہے۔ تیرا شمار دنیا کی عظیم عورتوں میں ہے۔ میں تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔''
''سیٹھ صاحب!.......سیٹھ صاحب! میں ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہوں۔ میں ایک مظلوم لڑکی ہوں سیٹھ صاحب!.......میں.......میں.......'' وہ زار و قطار رو پڑی اور میں نے جیپ کی رفتار اور سست کر دی۔
''سیٹھ میں نہیں ہوں نوری!.......مجھے گالی مت دے۔ میں نے تجھے گالی نہیں دی ہے۔ سیٹھ وہ ہے، جو ہوس کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ جس نے ایک بدفطرت انسان کے کہنے سے تیری روزی چھین لی۔ صرف اس لئے کہ وہ اس فلم کا ایک اہم کردار ہے۔ لیکن تُو فکر مت کر نوری! سزا بابو خان کو ملے گی۔ اور تُو ابھی دیکھ لے گی۔ تُو نے کہا کہ تُو غریب ہے، بے سہارا ہے۔ کیا بھائیوں کی موجودگی میں بہنیں بے سہارا ہوتی ہیں؟.......کیا تُو اپنے بھائی کو مُردہ سمجھ چکی ہے؟''
''بھائی.......'' نوری درد بھرے لہجے میں بولی۔ ''میرا کوئی بھائی نہیں ہے سیٹھ صاحب! کاش میرا ایک ہی بھائی ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی بہن کو بے غیرتی سے نہ ناچنے دیتا۔ پھر نوری اس قدر بے سہارا نہ ہوتی۔ میرا بھائی، بابو خان جیسے کمینے انسان کا منہ توڑ دیتا۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا۔ میرا کوئی بھائی نہیں ہے سیٹھ صاحب!''
''کاش! میں تیرا بھائی بننے کے قابل ہوتا۔ کاش میں تیری زبان سے بھیا کا لفظ سن سکتا نوری!'' میں نے جذباتی انداز سے کہا۔ میری آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے تھے۔ آپ جانتے ہیں، میں خود بھی ایک مظلوم انسان ہوں۔ میں خود بھی دنیا کی محبتوں سے ناآشنا رہا ہوں۔ طالوت کی موجودگی نے میری شخصیت بدل دی تھی، لیکن میری فطرت کون بدل سکتا تھا؟
لیکن میرے الفاظ سے نوری کو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاگلوں کے سے انداز میں کہا۔ ''نہیں، نہیں.......اتنا بڑا دعویٰ نہ کرو سیٹھ!.......بابو خان سے

میرے ابا نے کہا تھا، بابو خان! میرے بیٹے! میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ بھائی، بہنوں کے محافظ ہوتے ہیں، میرے بچے!........ مجبوری میری نوری کو بازار میں بھیج رہی ہے۔ خدا کے بعد تُو ہی اس کا محافظ ہے۔ اور بابو خاں نے کہا تھا۔ تم فکر مت کرو، ابا! تمہاری نوری کو کوئی بری آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ بابو خان نے میری حفاظت کی، اس نے اپنا قول نبھایا۔ کوئی میری طرف بری آنکھ سے نہ دیکھ سکا۔ لیکن خود بابو خان نے اپنے لئے وعدہ نہیں کیا تھا۔“

میں خاموش رہا۔ ستم رسیدہ لڑکی کو کسی بات کا فوری یقین دلانا مشکل تھا۔ اب صرف عمل کی ضرورت تھی اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس سے خود پر یقین کرنے کی درخواست نہیں کروں گا، تاوقتیکہ وہ خود مجھے بھیا نہ کہے۔ چنانچہ میں نے جیپ کی رفتار تیز کر دی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں بابو خان کل کے سین کو دہرانے کے لئے تیار تھا۔ اسے روشیلا کو اغوا کرنا تھا۔ روشیلا نے بھی طالوت کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ طالوت اس جیپ سے اُتر کر میری جیپ میں آ گیا۔

”یہ نوری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں........ یہ نوری ہے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”کیا سیٹھ نے اسے نوکری سے جواب دے دیا؟“

”ہاں۔“

”خوب........ پھر اب تم نے اس سے اس کا ارادہ معلوم کیا؟“

”اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اب ہم سیٹھ سے اسے رکھ لینے کی سفارش نہیں کریں گے۔“

”اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہمیں خود بھی تو اپنا دفتر قائم کرنا ہے۔ نوری! تمہاری تعلیم کیا ہے؟“

”نویں کلاس پاس ہوں سیٹھ صاحب!“ نوری نے جواب دیا۔

”سیٹھ صاحب؟“ طالوت نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں رانا صاحب! نوری ہمیں سیٹھ کے علاوہ کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ بہرحال، یہی سہی۔ ہم اسے اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کریں گے۔“

”اوہ........ بہرحال، نوری! کیا تم ہمارے پاس کام کرنا منظور کرو گی؟........ سنو، ہمیں اپنا دفتر قائم کرنا ہے۔ تم اس کی دیکھ بھال کرو گی۔ میرا خیال ہے، تم اس کام کے لئے موزوں ہو۔“

”دعائیں دوں گی سیٹھ صاحب! پوری محنت سے کام کروں گی۔“ نوری نے شکر گزار نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس ٹھیک ہے۔ آج سے تم ہماری ساتھی بن گئیں۔ فکر مت کرو، تمہیں مناسب تنخواہ ملے گی۔ دفتر کا کام جب سے شروع ہو، تمہاری تنخواہ وغیرہ آج سے ہی شروع ہو گئی ہے۔“

نوری کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ مجھے اس مظلوم لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا۔

”بابو خان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ طالوت نے پوچھا۔

”اس کی سزا لازمی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”او کے۔“ طالوت نے گردن ہلائی۔ پھر نوری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اس نے تمہاری بے عزتی کی تھی نوری!........ کس کی مجال ہے جو ہمارے کسی ساتھی کی بے عزتی کر جائے۔ بس تماشا دیکھو۔ لیکن

ہماری پہلی ہدایت ہے کہ ہماری تمام باتیں راز میں رہیں گی۔"
"میں اس ہدایت کو یاد رکھوں گی سیٹھ صاحب!"
"دوسری ہدایت یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کو سیٹھ نہ کہو۔ یہ گولر بھائی ہیں اور میں رانا عزیزالدین۔ تم مجھے رانا اور انہیں گولر کہو گی۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"گولر بھائی۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔
"ہاں، ہاں....... صورتِ حال چونکہ سنگین ہے، اس لئے گولر بھائی ہی سہی۔" طالوت ہنستے ہوئے بولا۔ میں نے خود ہی اپنی مٹی پلید کی تھی، اس لئے خاموش رہنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ ویسے طالوت کا خیال تھا کہ شاید لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے۔ لیکن اب اسے صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔
دوسری طرف بابو خاں، گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ کیمرہ تیار تھا۔ کلیپر بوائے کلیپ دے رہا تھا۔ اور پھر کیمرہ اسٹارٹ ہو گیا۔ بابو خان نے گھوڑے کو دوڑایا۔ لیکن نہ جانے کس طرح، گھوڑا نہ دوڑ سکا۔ اُس کی دُم کھڑی ہو گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے کسی نے مضبوطی سے اُس کی دُم پکڑ رکھی ہو۔ بابو خان نے اسے دو تین ہاتھ مارے۔ گھوڑا بدحواس ہو گیا تھا۔
"کٹ....... کٹ......." عبدل بھائی چیخا۔ "اے بابو خان! کیا کرتا پڑا ہے؟ گھوڑا دوڑاؤ۔"
"نہیں دوڑ رہا عبدل بھائی!....... سالا اڑی کر رہا ہے۔"
"ارے تمہارے باپ نے بھی کبھی گھوڑا دوڑایا ہے؟ سالا پھلم کھراب کرتا پڑا ہے۔ ہوسیاری سے کام کرو یار!....... کائے کو ہمارا کباڑا کرتا پڑا ہے؟" روئی والا نے غصیلے انداز میں کہا۔
"اس بار ٹھیک ہو گا سیٹھ!" بابو خان نے کہا اور گھوڑے کو دو تین چکر دیئے۔ گھوڑا فارم میں آ گیا تھا۔ اور پھر اسے مناسب اور منتخب جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ کلیپ دیا گیا اور کیمرہ اسٹارٹ ہو گیا۔ بابو خان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس بار گھوڑا بری طرح اُچھل کر بھاگا۔ بابو خان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گھوڑا اس طرح بدک جائے گا۔ وہ گھوڑے کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ گھوڑا سیدھا روشیلا کی طرف لپکا تھا۔ لیکن روشیلا سمجھ گئی تھی کہ وہ بابو خان کے کنٹرول سے باہر ہے، اس لئے وہ چیخ کر ایک طرف بھاگ اٹھی اور گھوڑا اُچھلتا کودتا آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور بابو خان اس کی پشت سے پھسل پڑا۔ لیکن وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ اور سیٹھ روئی والا بری طرح دانت پیس رہا تھا۔
"اس میں میرا کیا قصور ہے سیٹھ؟ گھوڑا اڑی کر رہا ہے۔" بابو خان نے بے چارگی سے کہا۔
"کائے کو بوم مارتا ہے یار!....... تیرے کو گھوڑے کا سواری نہیں آتا۔ ماں کسم، ہمارا مگج پھر گیلا تھا، جو ہم نے تیرے کو کاسٹ کیا۔" روئی والا نے کہا۔
"اے بابو خان! کیا کرتا ہے یار؟....... تُو تو بالکل اناڑی ہو گیا۔" عبدل بھائی نے کہا۔ غرض چاروں طرف سے بابو خان پر ملامت ہونے لگی۔ پھر بابو خان کی درخواست پر گھوڑا بدل دیا گیا۔ ہمارے تنومند گھوڑوں کے بارے میں کچھ کہنے کی وہ ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خود بابو خان ان گھوڑوں پر سوار ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔
دوسرے گھوڑے کو کافی دور تک دوڑا کر چیک کر لیا گیا۔ یہ بالکل فارم میں تھا۔ ایک بار پھر بابو خان نے ہمت کی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ آخری چیکنگ کے بعد گھوڑے کو پھر دوڑایا گیا۔ لیکن جونہی بابو خان

نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا الف ہو گیا۔ بابو خان اس بار بری طرح گرا تھا۔
''او بابو کھاں......او بابو کھاں!......او گدھے کی اولاد! تُو یہ سارٹ نہیں کرا سکتا۔ تیرے بس کا ہات نہیں ہے۔ عبدل بھائی! یار کیا سکھری ہوتا پڑا ہے۔''
''بابو کھاں کو تم نے کاسٹ کیا تھا سیٹھ! میرا مرجی نہیں تھا۔''
''ارے، تو مارے کو کیا معلوم تھا یار! کہ یہ سالا ہیجڑے کی اولاد ہے۔''
''پن اب کیا کرے گا سیٹھ؟'' عبدل نے پریشانی سے کہا۔
''سین چینج کرنا پڑے گا۔''
''ارے مگر کائی خراب ہو جائیں گا۔'' عبدل بھائی نے کہا۔ وہ لوگ بکواس کر رہے تھے۔ تب طالوت نے نوری کے کان میں کہا۔
''اگر یہ تم سے معافی مانگ لے تو سین ہو سکتا ہے۔''
نوری نے حیرت سے اسے دیکھا، لیکن کچھ بولی نہیں۔ تب طالوت نے کہا۔ ''اجازت دو عارف! تو میں یہ سین فلما دوں؟''
''ہاں، اس بابو خان کو اس فلم سے نکلنا چاہئے۔''
''ابھی لو۔'' طالوت نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ ''کیسے گھٹیا آدمی سے کام لے رہے ہو سیٹھ؟ یہ کیسے چل سکے گا؟ اس طرح تو فلم خراب ہو جائے گا۔''
''میں بھی ایسا ہی بولتا، رانا صاحب!......اے عبدل بھائی! اس سالے بابو کھاں کا ایگریمنٹ کینسل کرو یار! یہ اپنے پاس نہیں چلے گا۔ نکالو یار اسے۔ ابھی اس کا تھوڑا کام ہوا ہے، اگر جیادہ ہوتا تو ہم پھنس جاتا۔''
''ایسی بات نہیں ہے سیٹھ صاحب! تمہارے گھوڑے ہی خراب ہیں۔'' بابو خان نے کہا۔
''میرا گھوڑا لے لو، بابو خان!'' طالوت بولا۔
''وہ بہت اونچا ہے۔'' بابو خان نے گھبرا کر کہا۔
''آئے ہائے......ایک اونچا ہے، ایک نیچا ہے۔ اے میں بولتا، تمہارا کھود اونچا نیچا ہے۔ نہیں چلے گا، بابو کھاں! تم اس پھلم میں نہیں چلے گا۔ تمہارے لئے ہم اپنا پھلم کو ڈبے میں نہیں بند کرے گا۔ عبدل بھائی! میں بولا تم اس کا ایگریمنٹ کینسل کرو۔''
''ٹھیک ہے سیٹھ! مگر اس سین کا کیا ہوگا؟......بڑا نقصان ہوئیں گا۔''
''اسے برداشت کرے گا بھائی! پھر کیا بولے؟'' سیٹھ نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
''میں یہ شارٹ دے سکتا ہوں سیٹھ!'' طالوت نے کہا۔
''آپ......آپ دیں گا، رانا صاحب؟'' سیٹھ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
''بائی گاڈ......بائی گاڈ......ایسا ہو جائے تو پھلم ایک دم آسمان پر اُڑ جائیں گا۔'' عبدل بھائی جوش سے بولا۔
''ٹھیک ہے، تیاری کرو۔ میرا چہرہ کیمرے کے سامنے مت لانا۔'' طالوت نے کہا اور اس بار نئے جوش و خروش سے کیمرہ تیار ہونے لگا۔ پھر طالوت نے بابو خان کا اُتارا ہوا لباس پہنا، جو اس کے جسم پر

کافی حد تک ٹھیک تھا۔ روشیلا بھی خوش ہو گئی تھی۔ طالوت کا بلند و بالا گھوڑا لایا گیا اور طالوت بڑی شان سے اس پر سوار ہو گیا۔ کلیپ دیا گیا۔ عبدل بھائی نے طالوت کو ہدایات دیں اور پھر کیمرہ چل پڑا۔ طالوت نے گھوڑا دوڑایا۔ بلاشبہ وہ بے حد شاندار لگ رہا تھا۔ کیمرہ صرف گھوڑے اور اس کے جسم کو ایکسپوز کر رہا تھا۔ دوسرے لمحے وہ جھکا اور اس نے روشیلا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا۔ کئی گز دور جانے کے بعد اس نے روشیلا کو گھوڑے پر بٹھایا تھا۔

چاروں طرف سے تالیاں بج اُٹھیں۔ ایک تو سین بہت عمدہ ہوا تھا، اوپر سے رانا صاحب کی حیثیت........ چاروں طرف سے واہ واہ ہو رہی تھی۔ صرف بابو خان تھا، جو خوب ذلیل ہوا تھا۔

سین ہو گیا تھا۔ اس لئے وہاں سے واپسی ہو گئی اور پھر فوری طور پر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نوری بدستور ہمارے ساتھ تھی۔ بابو خان یا سیٹھ نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بابو خان کی پوزیشن تو خراب ہو ہی چکی تھی، اب وہ کیا بولتا۔ خود اس کی حیثیت خطرے میں تھی۔

دوسری بات یہ کہ سیٹھ اور دوسرے لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نوری کو ہم نے خاص طور پر لفٹ دی ہے، اس لئے اب وہ نوری کی طرف آنکھ بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ البتہ نوری بالکل خاموش تھی۔ وہ ہم لوگوں میں اپنی صحیح حیثیت جاننا چاہتی تھی۔ اس علاقے کی شوٹنگ مکمل ہو چکی تھی، اس لئے سیٹھ نے ہم سے واپسی کے بارے میں مشورہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تو سیر کو نکلے ہیں۔ تمہارے ساتھ ہی چلیں گے سیٹھ!''

''ماں کسم! میرے کو بہت کھسی ہوگا، رانا صاحب!'' سیٹھ نے کہا۔

''رانا صاحب کا خیال ہے سیٹھ! کہ خود اپنی فلم کمپنی قائم کی جائے۔ سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوگا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ ہم ہیلپ کروں گا۔'' روئی والا نے کہا۔ اور پھر واپسی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور ہم فلم مرکز کی طرف چل پڑے۔

سفر طویل تھا، لیکن دلچسپ رہا۔ بابو خان کو ابھی تک کسی نے منہ نہیں لگایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کلس رہا تھا، لیکن مجبور تھا۔ بالآخر دن اور رات کا طویل سفر کر کے ہم لوگ فلم مرکز پہنچ گئے۔ اس سے قبل بھی ایک بار اس شہر میں آنے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس وقت حیثیت کچھ اور تھی۔ اور آج اس شہر میں داخلہ بڑے کرّ وفر سے ہوا تھا۔ سیٹھ روئی والا نے ہمیں اپنی شاندار کوٹھی میں ٹھہرایا اور پوری طرح ہماری خاطر مدارات میں مصروف ہو گیا۔ نوری ابھی تک ہمارے ساتھ تھی۔

''ہمارے لئے کسی عمدہ سی کوٹھی کا بندوبست کر دو سیٹھ! ابھی ہم کچھ دن یہاں قیام کریں گے۔''

''میری کئی کوٹھیاں ہیں رانا صاحب! جو آپ پسند کریں گا، ہم اس میں بھیج دیں گا۔''

''لیکن ہم کوٹھی خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ان میں سے کوئی فروخت کرنا چاہیں تو ہمیں دے دیں۔''

''جیسا آپ کا حکم رانا صاحب!'' سیٹھ نے کہا۔ ''آج آپ ہمارا مہمان بنیں۔ کل ہم آپ کو کوٹھی دکھا دیں گے۔''

اور ہم نے منظور کر لیا۔ نوری خاموش بیٹھی رہی تھی۔ پھر سیٹھ ہم سے اجازت لے کر چلا گیا۔ تب طالوت، نوری کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں تو نوری خانم! اب آپ بتائیے، آپ کا کیا حکم ہے؟''

''میں کیا حکم دے سکتی ہوں رانا صاحب؟''

''شکر ہے، تم نے سیٹھ سے رانا تو کہا۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ویسے جب تم نے اتنی لفٹ دی ہے تو ہماری ہمت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ کیا ہم ایک فرمائش کر سکتے ہیں؟''

''حکم دیں، رانا صاحب!''

''تب پھر آج رات کا کھانا تمہارے ہاں، تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں گے۔'' طالوت نے کہا اور نوری چونک پڑی۔ وہ ہماری طرف دیکھتی رہی، پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''میں حاضر ہوں رانا صاحب!........ آپ نوری کی حیثیت کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آپ چونکہ فلم لائن سے واقف نہیں ہیں۔ ایکسٹرا لڑکی، فلم انڈسٹری کی سب سے گھٹیا صنف ہوتی ہے۔ بہر حال، میں حاضر ہوں۔ آپ کو میری حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی، تب آپ اپنے فیصلے، اپنی ہمدردی پر نظر ثانی کریں۔''

''ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''تب مجھے اجازت دیں۔ تاکہ میں جا کر کچھ تیاریاں کر لوں۔''

''جاؤ نوری!'' طالوت نے کہا اور نوری نے اٹھ کر میری طرف دیکھا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں سیکرٹری صاحب؟''

''ہاں۔'' میں نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

''کاش، میں آپ کو خوش کر سکتی۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا اور سر جھکائے باہر نکل گئی۔ میں اور طالوت ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ لیکن اسی وقت ہمیں باہر سے سیٹھ کی آواز سنائی دی۔

''اے نوری! تم کِدر جاتا پڑا؟''

''گھر جا رہی ہوں، سیٹھ صاحب!'' نوری کی آواز اُبھری۔

''سیٹھ لوگ نے چھوڑ دیا؟''

''ہاں۔''

''اے میں تو سمجھا کہ وہ لوگ نے تم کو پسند کر لیا۔ کوشش کرو نوری! کہ ان لوگ کو پھانس لو۔ تمہارا مکدر کھل جائے گا۔''

''کوشش کروں گی، سیٹھ صاحب!........ ایک درخواست ہے۔''

''درکھاس ورکھاس اس وکت نہیں چلیں گا بابا! کل تم دفتر سے اپنا حساب لے لینا۔ ہم تو کھُس ہے؟ ہمارا جان چھوٹا۔ ورنہ ایکسٹرا لوگ کون ملازم رکھتا ہے؟ کام کرو، پیسہ لو۔ سالا بابو کھان تمہارا سفارش بولا۔ اب وہ منع کرتا۔ ٹھیک ہے۔''

''مجھے دس روپے دے دیں، سیٹھ صاحب! کل حساب میں کاٹ لیں۔''

''ارے دمڑی نہیں ہے بابا! تم لوگ کا تو عادت کھراب ہوتا ہے۔ لو، یہ دو روپے رکھ لو۔ باقی کل حساب کر لینا۔''

''شکریہ سیٹھ صاحب!'' نوری کی آواز سنائی دی اور پھر قدموں کی چاپ۔ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ سیٹھ ہمارے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''چائے مائے تیار ہے رانا صاب! ہمیں کھدمت کا موقع دو، آؤ۔'' اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چائے کے دوران طالوت نے سیٹھ صاحب سے روشیلا کے بارے میں پوچھا۔

''اوہ........ مس روسیلا تو چلا گیا۔ جاتے وکت وہ ہم سے بولا تھا، سیٹھ صاب! رانا صاب کا کھیال رکھنا۔ ہم ٹیلی پھون کریں گا۔ پن ابھی اس کا پھون نہیں ملا۔''

''اور یہ نوری کہاں رہتی ہے سیٹھ صاحب؟''

''ارے وہ ایکسٹرا ہے بابا!........ یہ ایکسٹرا لوگ ایک دم پھڈے باج ہوتا پڑا۔ ان لوگ کو جیادہ منہ مت لگاؤ۔ ہم تمہارے کو مسورہ بولتا آں۔''

''وہ کہاں رہتی ہے روئی والا؟'' طالوت نے کہا۔

''ارے، مارے کو نہیں معلوم۔ عبدل بھائی جانتا پڑا۔''

''عبدل بھائی کہاں ہے؟''

''وہ بھی چلا گیا۔ پن آپ بولے گا تو ہم اسے پھون کر کے بلا لیں گا۔ آپ ہمارا مسورہ مانو۔''

''میں نے آپ کے بہت سے مشورے مان لئے ہیں، سیٹھ صاحب! روپے پیسے کی پروا نہ کریں۔ دو چار کروڑ بھی لگانے پڑے تو ہم لگا دیں گے۔ آپ اپنا فلم تیار کریں اور ہمیں مشورے دیتے رہیں۔''

''گلام ہوں جی........ ہو ہو ہو........'' سیٹھ صاحب خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

''عبدل بھائی کو ٹیلی فون کر کے بلا دیں۔''

''اچھا جی........ چائے کے بعد بلا دیں گا۔''

اور چائے کے بعد عبدل بھائی کو فون کر کے بلایا گیا۔ ہم اسے لے کر ایک کمرے میں آ گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ عبدل بھائی بڑی اُمید بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''عبدل بھائی! آپ تو فلم لائن سے پوری طرح واقف ہیں۔''

''پوری عمر گجری ہے صاب!........ بہت سی ہٹ پھلمیں بنائی ہیں۔''

''یہ سیٹھ کس قسم کا آدمی ہے؟'' طالوت نے پوچھا اور عبدل بھائی سر کھجانے لگا۔ پھر کنکھیوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''برا آدمی نہیں ہے جی۔ بس جرا لالچی ہے۔ پیسے پر جان دیتا ہے۔ آپ اس سے لکھت پڑھت جرور کر لو۔ یہ دوستانہ مسورہ ہے۔ ورنہ لفڑا بھی ہو سکتا ہے۔ میری مانو رانا صاحب! اب تو اپنا پھلم کمپنی الگ بناؤ۔ عبدل بھائی کا جان حاجر ہے۔ نام پیدا کر دوں گا، خدا کسم۔''

''تم واقعی اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو، عبدل بھائی! ہم تمہارا مشورہ مانیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں کوٹھی کا بندوبست کرنا ہے، پھر ایک عمدہ سا آفس بنانا ہے۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟''

''کیا نہیں کر سکتا تمہارا عبدل بھائی، رانا صاب!...... خدا کسم، ایسا آفس، ایسا کوٹھی دلائیں گا، خلاص ہو جائیں گا۔ ہمارا کئی جاننے والا بروکر ہے۔ ہم کل ہی ان سے بات کر کے آپ کے واسطے دونوں چیزیں تلاس کرائیں گا۔''

''ٹھیک ہے عبدل بھائی! تم یہ دس ہزار روپے رکھ لو اور ہمارے لئے کام کرو۔ ایسا کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے ہم تمہیں منیجر مقرر کر دیں گے۔ تم ہی ہمارے لئے کام کرو۔'' طالوت نے جیب سے نوٹوں کی

ایک گڈی نکال کر عبدل بھائی کو دیتے ہوئے کہا اور عبدل بھائی کے ہاتھ کانپنے لگے۔ بہرحال انہوں نے گڈی جیب میں رکھ لی۔

''یہ نوری کہاں رہتی ہے، عبدل بھائی؟'' بالآخر طالوت مطلب کی بات پر آ گیا۔

''نوری جی........نوری........وہ ایکسٹرا؟''

''ہاں........وہ ایکسٹرا۔''

''ساپور کالونی کے ایک مکان میں رہتی ہے۔''

''تم وہ مکان جانتے ہو؟''

''ہاں جی۔ ہم اکثر اُدر جاتا پڑا۔ اسے بابو کھان لایا تھا۔ وِلن بننے سے پہلے وہ ایکسٹرا سپلائر تھا۔''

''ٹھیک ہے عبدل بھائی! اب چونکہ تم ہمارے منیجر بھی بن گئے ہو، اس لئے ہم تم سے کام بھی لے سکتے ہیں۔ شام کو ہمیں شاپور کالونی میں نوری کے مکان پر پہنچا دینا۔''

''جیسا آپ بولیں گا سیٹھ!'' عبدل بھائی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر آنکھ دبا کر بولا۔ ''پن اگر آپ ہمیں بولیں گا سیٹھ! تو ایک سے ایک فس کلاس چھوکری اِدر آ کر ناک رگڑیں گا، نوری کا کیا بات ہے۔''

''ہمیں نوری پسند ہے۔ بس، اب تم جا سکتے ہو۔''

''شام کو چھ بجے ہم پہنچ جائیں گا۔'' عبدل بھائی نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد طالوت نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''بلاشبہ یہ ایک عمدہ عجائب گھر ہے۔ جہاں بڑی بڑی نادر روزگار چیزیں موجود ہیں۔ سیٹھ روئی والا، جس کی کئی کوٹھیاں ہیں لیکن وہ اپنی فلم نہیں مکمل کر سکتا۔ عبدل بھائی فلم ڈائریکٹر۔ لیکن وہ لڑکیاں تک سپلائی کر سکتا ہے۔ بابو خان وِلن، مس روشیلا اور ان کی نانی۔''

''یہ تو نمونہ ہے طالوت! یہاں تمہیں بڑے بڑے عجوبے ملیں گے۔ ابھی ذرا آفس قائم ہو جانے دو، پھر دیکھو۔''

''دلچسپ ماحول ہے۔ مجھے یقین ہے، یہاں بہت عمدہ وقت گزرے گا۔''

''یقیناً۔ فی الحال مس روسیلا کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ حیرت انگیز طور پر غائب ہو گئی ہے۔ لیکن اب مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ وقتی طور پر متاثر ہو گیا تھا۔''

''خوب۔ تمہاری یہ بات پسند آئی۔ ویسے اس لائن میں نوری جیسی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ میں اس لڑکی کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نوری جیسی لڑکی کے لئے جان بھی حاضر ہے میرے دوست! ہماری دلچسپ تفریحات میں اگر کچھ لوگوں کی پریشانیاں دُور ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ بلاشبہ یہ دور میری زندگی کا یادگار دور ہے۔ میں تمہاری اس دنیا سے بہت متاثر ہوں عارف!........ یہاں دکھ اور خوشیاں ملی جلی نظر آتی ہیں۔ لیکن زندگی کے لئے بے شمار ہنگامے مہیا ہیں۔ کم از کم یہاں سے انسان اُکتا نہیں سکتا۔ میں یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔''

''ہاں طالوت! اگر غور کرو تو قدرت نے اس دنیا کو یکسانیت نہ بخش کر اس میں زندگی رواں دواں کر

دی ہے۔ ورنہ سکوت ہوتا۔ لوگ مُردہ دل ہوتے۔ اور پھر یہاں زندگی گزارنا بے حد مشکل ہو جاتا۔"

"یقیناً........ میں متفق ہوں۔ بہرصورت، اس اجنبی دنیا میں بہت سے کام ہماری، خاص طور سے میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میری سمجھ میں اوّل تو یہ بات ہی نہیں آئی کہ یہاں انسانی تصویریں متحرک کیسے ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہرحال، ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ تم نے اسے سائنس کا نام دیا، میں نے تسلیم کرلیا۔ ویسے معاملہ مشترک ہی ہے۔ قدرت نے ہم لوگوں کو جو قوتیں دی ہیں، وہ صرف ہماری مرضی کے تابع ہیں۔ تم انہیں سائنس کہتے ہو۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ سیٹھ روئی والا کا ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ "صاب جی! مس روسیلا کا پھون آیا ہے۔"

"کیا بولتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رانا صاحب سے بات کریں گا۔" ملازم نے جواب دیا اور میں نے مسکراتے ہوئے طالوت کو اشارہ کیا۔

"آؤ یار! تم بھی آؤ۔" طالوت نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا اور میں بھی ہنستا ہوا اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ راستے میں، میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک ہی رات میں بور ہو گئے؟"

"وہ اسی ٹائپ کی عورت ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر میرے عشق اور اپنی معصومیت کی قسمیں کھائی ہیں۔"

"بہرحال، اس نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا ہے، کچھ تو قدر کرو۔"

"یار! سیدھی سادی بات کرو تو ٹھیک ہے۔ رہی سب کچھ کی بات تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ بہتوں کے حوالے کر چکی ہوگی۔" طالوت نے کہا اور مجھے ہنسی آگئی۔ میں اس کے ساتھ اس کمرے میں پہنچ گیا، جہاں فون کا ریسیور میز پر رکھا ہوا تھا۔ طالوت نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو!" اس نے کہا۔ اب وہ اس دنیا کے حالات بخوبی سمجھ گیا تھا۔

"آہ........ حالانکہ چند گھنٹوں کے بعد تمہاری آواز سنی ہے، لیکن ایسا لگ رہا ہے، جیسے برسوں سے کان اس آواز کو ترس رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے ڈارلنگ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"آہ........ کتنے بھولے ہو تم........ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں۔ خیر تو ڈارلنگ! تم نے بھی میری غیر موجودگی میں کیا محسوس کیا؟"

"میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، وہ اپنے سیکرٹری کو بتا دیا ہے۔ آپ ان سے بات کرلیں۔" طالوت نے کہا اور ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ریسیور پکڑ لیا۔ طالوت نے اچانک یہ بدمعاشی کی تھی۔ بھلا میں کیا کہہ سکتا تھا۔ لیکن اچانک میری رگِ شرارت پھڑک اُٹھی۔

"ہیلو!" میں نے ریسیور میں کہا۔

"ہیلو گولر بھائی! خیریت ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے جی۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"کولر بھائی! یہ آپ کے رانا صاحب کس قسم کے آدمی ہیں؟"
"قسم اوّل جی۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ آپ کو کیا بتاؤں؟"
"بہت شرمیلے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ میری جدائی میں آپ پر کیا گزری تو کہنے لگے کہ میرے سیکرٹری سے معلوم کرلیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کولر بھائی؟"
"ہاں جی، بہت بری گزری ہے۔ کمر میں درد ہے۔ کراہ کراُٹھ بیٹھ رہے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریوں کی شکایت کر رہے ہیں۔ کچھ ڈرے ڈرے سے ہیں، مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کسی عورت کا فون آئے تو فوراً منع کر دوں۔"
"اللہ....... بڑے شریر ہیں آپ کولر بھائی!" روشیلا نے شرماتے ہوئے کہا۔
"اجی میں تو ان کی باتیں دوہرا رہا ہوں۔"
"خیر....... آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ دامن نہ چھڑا سکیں گے۔ میں نے یہ چند لمحات کی جدائی صرف اس لئے برداشت کی تھی کہ گھر واپس آ کر ان کے شایانِ شان انتظام کرلوں۔"
"اوہ....... تو کیا آپ نے انتظام کرلیا؟"
"ہاں....... میں تھوڑی دیر کے بعد پہنچ رہی ہوں، آپ لوگوں کو لینے۔ آپ میرے یہاں قیام کریں گے۔ اور ہاں، آپ سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی تھیں۔"
"گویا اب تک کی باتیں غیر ضروری تھیں؟"
"نہیں۔ وہ بھی ضروری تھیں، لیکن خاص بات یہ ہے کہ آپ سیٹھ روئی والا کے جھانسے میں نہ آئیں۔ وہ بڑا افرادی آدمی ہے۔ مجھے تو ان پانچ لاکھ کا ہی افسوس ہے، جو رانا صاحب نے ادا کئے اور ان کی رسید بھی نہیں لی۔"
"اوہ....... لیکن رانا صاحب کا تو خیال ہے کہ آپ نے بھی روئی والا کی سفارش کی تھی؟"
"لیکن اس وقت یہ خیال تھوڑا ہی تھا کہ رانا صاحب اتنی رقم ساتھ لئے پھرتے ہوں گے اور فوراً ادا کر دیں گے۔ لیکن رانا صاحب تو درحقیقت بہت بڑے انسان نکلے۔ اتنی بڑی رقم انہوں نے چٹکیاں بجاتے ادا کر دی۔"
"بہرحال، یہ باتیں آپ رانا صاحب سے ہی کریں۔ آپ کے آنے کی خبر سن کر ان کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ برسوں کے مریض معلوم ہونے لگے ہیں۔ اب آپ ہی آ کر انہیں سنبھالیں۔"
"میں ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچ رہی ہوں۔"
"بہت بہتر۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ طالوت جھینپے ہوئے انداز میں ہنس رہا تھا۔ "آ رہی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"فوراً نکل چلو۔" طالوت اٹھتے ہوئے بولا۔
"ارے، ارے....... وہ زبردستی تھوڑی کرے گی؟ آ جانے دو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"بکواس مت کرو یار!....... نوری کے ہاں نہ جا سکیں گے۔ اگر وہ آ گئی تو؟"

''میں ہو آتا ہوں، تم رک جاؤ۔''
''عارف! خدا کے لئے چلو۔ میں واقعی اس عورت سے خوف زدہ ہوں۔''
''اتنی آسانی سے جان نہ بچا سکو گے طالوت! ویسے فکر مت کرو۔ میں کسی فٹ پاتھی حکیم سے تمہارے لئے نقرئی گولیاں خرید لاؤں گا۔'' اور پھر طالوت کو جھلائے ہوئے انداز میں کھڑے ہوتے دیکھ کر میں بھی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''چلو، چل تو رہا ہوں۔ مگر عبدل بھائی.......''
''ہم خود نوری کا پتہ لگا لیں گے۔'' طالوت نے کہا۔
''دقت ہو گی۔ میرے ذہن میں ایک اور ترکیب ہے۔''
''کیا؟........ جلدی بتاؤ۔''
''اسے آنے دو۔ ہم اس کی نگاہوں سے غائب ہو جائیں گے۔ جب عبدل بھائی آئیں گے، تب تک وہ چلی جائے گی۔''
''اوہ........'' طالوت میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ مجھے بے تحاشا ہنسی آ رہی تھی۔
''میں کوشش کروں گا کہ اپنا عشق تمہاری طرف منتقل کر دوں۔'' طالوت نے جھلائے ہوئے انداز میں دانت پیستے ہوئے کہا۔
''بات کیا ہے میری جان؟........ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''
''یار! بڑی بھیانک عورت ہے۔ میرے تو فرشتوں کی بھی ہمت نہیں پڑتی۔ بھلا میں اس حد تک جا سکتا ہوں؟ اس نے خود ہی گڑبڑ کر ڈالی تھی۔ اور پھر موقع محل بھی نہیں دیکھتی۔ میرا خیال ہے، وہ تمہارے عبدل بھائی اور روئی والا کے سامنے بھی اظہارِ عشق کے بھونڈے طریقے اختیار کرے گی۔''
''ہاں........ یہ تو خطرناک بات ہے۔''
''ابھی تو بہت سی ایسی ملیں گی، میری جان! ذرا کسی فلم فنانسر کی حیثیت سے خود کو متعارف تو ہو جانے دو۔'' میں نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔
''تب تو جلدی بھاگ جانا پڑے گا۔'' طالوت نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ کافی دیر تک ہم اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے۔ پھر میں نے طالوت کو اشارہ کیا۔ میں نے شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھا اور طالوت خود نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ اس انداز میں ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہم نے کوٹھی کے لان کا رخ کیا تھا۔ اور بالکل ٹھیک وقت پر باہر پہنچے۔ ایک خوب صورت سی کار سے روشیلا اُتر رہی تھی۔ کار میں باوردی ڈرائیور موجود تھا اور روشیلا نے بھی قیامت ڈھائی تھی۔ ایک انتہائی نفیس ساڑھی میں ملبوس تھی اور چہرے پر اتنا حسین میک اپ کر رکھا تھا کہ بس دیکھتے رہو۔
''عمدہ ہے۔'' میں نے طالوت کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔
''ہاں........ لیکن عورت کے معیار سے گری ہوئی ہے۔''
''اسے تو برداشت کرنا پڑے گا پیارے! معیاری عورت اس طرف نہیں آئے گی۔''
''یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم بولا۔ ''اوہ........ وہ دیکھو، سیٹھ صاحب اس کی پذیرائی کو کس طرح لپک رہے ہیں۔''

''آؤ، قریب سے دیکھیں۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ مس روشیلا بڑے ناز سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اور سیٹھ صاحب اپنی عمر کو نظر انداز کر کے ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ لیکن مس روشیلا کی نگاہیں شاید ہم دونوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا تھیں۔

''ہے، ہے...... جے نصیب...... ماں کسم، کیامت کا کرب ہے۔ آفت ہے آفت...... آؤ، آؤ۔''

''وہ دونوں کہاں ہیں سیٹھ صاحب؟''

''ہو ہو...... رانا صاحب کو بولتا ہے...... اندر ہیں، اندر...... آؤ۔ ماں کسم، رانا صاحب تو سہید ہو گیا...... ایک دم کھلاس ہو گیا۔''

''میں انہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں، سیٹھ صاحب!''

''ایں...... کیا بولتا پڑا، شیلا بائی؟...... وہ تو ہمارا مہمان ہے۔ ابھی تو اس سے رات کے کھانے پر جرا کاروباری بات کرنے کو مانگتا۔ ارے تم دیکھتی ہو، سیلا بائی!...... رانا صاب کا دولت اور ہمارا محنت۔ ماں کسم، تھوڑے روج کے بعد ہم ہی ہم ہوئیں گا۔''

''وہ پانچ لاکھ میں سے میرے ایک لاکھ میرے ڈرائیور کو ادا کر دیں۔''

''ایں...... ایک لاکھ؟...... کیا بولتا، روسیلا بائی؟...... ماں کسم، ایک لاکھ کا بات کب ہوا؟ ہم تو ٹین پرسنٹ بولا۔''

''ٹونٹی پرسنٹ، روئی والا! اس سے کم پر بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔''

''ارے کیا کرتا ہے، مس روسیلا؟...... ابھی ہمارے کو حساب بھی تو دینا پڑے گا۔''

''سیٹھ صاحب! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کیسا حساب دیں گے۔ پہلے ہی مرحلے پر گڑبڑ نہ کریں۔ ابھی تو بات بہت آگے بڑھنی ہے۔''

''اچھا، اچھا...... ٹھیک ہے بابا!...... آؤ!'' سیٹھ صاحب نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ پھر وہی ہوا، ہمیں پوری کوٹھی میں تلاش کیا گیا۔ ایک ایک ملازم سے پوچھا گیا۔ دونوں کافی حد تک پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں گئے۔

''عارف!'' طالوت نے میرا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔''

''گویا ان پانچ لاکھ میں بیس فیصدی روشیلا کا ہے؟''

''یقیناً۔ اب بیس فیصد تو ہونا ہی چاہئے۔ بقول اس کے، اس نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا ہے۔''

''گویا ہم اتنے ہی بے وقوف ہیں؟''

''بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

''لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے تو کیا ہم ایک معمولی سی تجوری بھی نہیں توڑ سکتے؟ کیا سیٹھ نے اتنی جلدی روپیہ بینک میں رکھوا دیا ہوگا؟''

''اوہ........اُس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا، طالوت!''

''گندا ہارٹ ہے۔ فیل ہو جانے دو۔ یہ روپیہ نوری کے کام آئے گا۔'' طالوت نے کہا اور میں ا
کی شکل دیکھنے لگا۔ طالوت اپنے ارادے میں پختہ نظر آ رہا تھا۔

''آؤ........جب تک وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں، ہم اس کی تجوری تلاش کریں۔'' طالوت نے ک
اور ہم تجوری کی تلاش میں چل پڑے۔

سیٹھ روئی والا کی تجوری ایسی جگہ نہیں ہو سکتی تھی، جہاں عام نگاہیں پہنچ جائیں۔ لیکن اس کی بدقسمتی ک
کھوجی بھی معمولی نہیں تھے۔ طالوت جب تجوری کی تلاش میں ناکام رہا تو اس نے راسم کو آواز دی اور حکم
کا غلام حاضر ہو گیا۔

''روئی والا کی تجوری کی تلاش ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''تشریف لائیے۔'' راسم نے گردن جھکا کر کہا اور ہم اس کے ساتھ چل پڑے۔ راسم ہمیں ایک
اندرونی کمرے میں لے گیا، اور پھر اس نے ایک خوب صورت مجسمے کی آنکھ دبائی اور مجسمے کی پشت پر ہلکی
سی کٹ کٹ کی آواز کے ساتھ ہی ایک چوکور خلا نمودار ہو گیا۔

''دائیں آنکھ دبائیں گے تو تجوری بند ہو جائے گی۔'' راسم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے گردن جھٹکی اور راسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ طالوت نے مسکراتے
ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر تجوری کے قریب پہنچ گیا۔ تجوری میں بہت سے کاغذات، کچھ زیورات،
جن کے ساتھ کاغذ کی چٹیں بندھی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ پانچ لاکھ کے نوٹوں کی گڈیاں اور بہت سی
چیک بکیں اور پاس بکیں رکھی ہوئی تھیں۔

''ظاہر ہے، سیٹھ صاحب کی اصل دولت تو بینکوں میں ہو گی۔ یہ پانچ لاکھ ابھی بینک تک پہنچانے کی
مہلت نہیں ملی ہو گی۔ ورنہ یہ بھی بینک میں ہوتے۔'' میں نے کہا۔

''ذرا دیکھو تو سہی عارف! اس سیٹھ کے بچے نے کیا کیا دھندے شروع کر رکھے ہیں۔'' طالوت نے
کہا اور پھر زیورات کی ایک پوٹلی اور چٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی کاغذات بھی
تھے۔ میں نے کاغذات دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔

''کیوں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''روئی والا مکمل سیٹھ ہے۔ کمبخت سُود پر رقم بھی دیتا ہے اور مجبوروں کی عزت گروی رکھ لیتا ہے۔ ان
پوٹلیوں میں ضرورت مندوں کے زیورات ہیں، جن کے عوض سیٹھ نے انہیں رقم دی ہے۔ اب یہ زیورات
ان کے پاس واپس کہاں جائیں گے طالوت! سیٹھ انہیں سود میں ہی ہضم کر لے گا۔ اور اصل باقی کا باقی رہ
جائے گا۔''

''کیسے ہضم کر لے گا؟ ہم انہیں واپس کر دیں گے۔'' طالوت نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا اور
میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کس کس کی عزت بچاؤ گے طالوت!........کس کس پر احسان کرو گے؟........یہ دنیا تو ایسے المیوں
سے بھری پڑی ہے۔''

''تم نے پھر فضول گفتگو شروع کر دی عارف! ہم طے کر چکے ہیں کہ جو بھی نگاہوں کے سامنے آ گیا

اور ہم اس کے لئے کچھ کر سکے، کریں گے۔ یہ سوچ کر کہ ہم پوری دنیا کی مدد نہیں کر سکتے، انہیں کیوں نظر انداز کر دیں، جو ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن اس سلسلے میں کیا کرو گے؟"

"کیا ہمیں روزی کمانے کی ضرورت ہے عارف؟"

"ایں........ نہیں........ یہ تو نہیں ہے۔"

"تو پھر بس، تفریح کریں گے، جس انداز میں بھی کر سکے۔ اور ہر اس شخص کی مدد کریں گے، جو مدد کا مستحق ہوگا۔ سیٹھ کی تجوری صاف، یہ زیورات اور کاغذات ان تک پہنچ جائیں گے، جن کے ہیں۔ چنانچہ سیٹھ روئی والا مُردہ باد۔" طالوت نے دونوں ہاتھ تجوری پر پھیلائے۔ اور دوسرے لمحے تجوری میں کچھ نہ تھا۔ تب طالوت نے اطمینان سے مجسمے کی دوسری آنکھ دبائی اور تجوری کا خانہ بند ہو گیا۔

"آؤ دیکھیں، وہ دونوں کس مرحلے میں ہیں۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور ہم دونوں تجوری والے کمرے سے باہر نکل آئے۔ بہت سے کمروں میں جھانکتے ہوئے ہم دونوں سیٹھ روئی والا کی خواب گاہ پر پہنچ گئے۔ کمرے سے مس روشیلا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ بند نہیں تھا، اس لئے ہم اندر داخل ہو گئے۔ روشیلا اور سیٹھ صاحب ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ روشیلا کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے، لیکن سیٹھ صاحب قربان ہو جانے والے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"سمجھ میں نہیں آتا، آخر وہ دونوں کہاں چلے گئے۔ کسی ملازم نے بھی باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا، اور پھر بغیر اطلاع دیئے ہوئے۔" روشیلا پُر خیال انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ارے مارے کو کھود حیرت ہے۔ پن جہاں کہیں بھی ہوئیں گا، واپس آ جائیں گا۔ تم کائے کو پریسان ہوتا، روسیلا بائی؟" سیٹھ صاحب کسی قدر جھنجلائے ہوئے انداز میں بولے اور روشیلا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم پریشان تو نہیں ہو، روئی والا؟"

"ارے ہم کائے کو پریسان ہوئیں گا؟........ ہمارے کو کیا گھاٹا ہے........ ہو ہو، پورے پانچ لاکھ وصول کیا۔ ماری طرف سے دونوں کھڈے میں جائیں۔"

"بس تمہاری اوقات یہی ہے، سیٹھ صاحب!........ لیکن یاد رکھو، اگر وہ ہمارے ہاتھ میں رہے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ نواب رانا عزیز الدین خاں کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ جو شخص دس بیس لاکھ جیب میں ڈال کر گھومے اور چار پانچ لاکھ معمولی سے انداز میں دیدے، وہ معمولی نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے بابا! پن اب اسے کِدر سے پیدا کرے؟ سارا مجا کرکری ہوتا پڑا۔" سیٹھ صاحب نے بیزاری سے کہا۔

"مزہ........؟" روشیلا نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"ارے اور کیا؟........ فس کلاس والا موسم ہے، ہم ہے، تم ہے۔ یہ........ یہ کیا بولتا سالا........ تنہائی ہے۔ ہو ہو ہو........ ہیرو کا مافک........ اور پیار محبت کا باتیں کرنے کو مانگتا ہے۔ پن تم ان دونوں کی پھکر میں پڑا ہے۔"

"اوہ سیٹھ صاحب!........ آپ کا پیار محبت کا موڈ ہے؟"

''تو اور کیا بابا!........ہم سالا انسان نہیں ہے کیا؟''
''آپ کو پیار کرنا آتا ہے سیٹھ صاحب؟'' روشیلا نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''ہو ہو........ کائے کو نہیں آتا۔ ایسا سالا فس کلاس والا کرتا۔ جرا اِدر آؤ۔'' سیٹھ صاحب چونچ بنا کر روشیلا کی طرف کھسکے۔ لیکن روشیلا نے جلدی سے انہیں سینے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔
''ہاں، ہاں سیٹھ صاحب!........آپ کاروباری آدمی ہیں۔ پہلے کاروبار کی باتیں تو کرلیں۔''
''ارے کاروبار کیسا؟........ ہم سالا پیار کرنے کو مانگتا ہے۔'' سیٹھ صاحب پھر مرغ کے مانند پَر پھڑپھڑانے لگے۔
''وہ سیٹھ صاحب! پہلے تو میرے کمیشن کے ایک لاکھ۔'' روشیلا صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ارے تو بولا نا، بابا!........ دیں گا۔ اِدر تم پیچھا کب چھوڑیں گا۔ میں وعدہ کیا، جرور دیں گا۔ بس تم بیٹھو تو۔''
''اگر آپ اُن میں سے دو لاکھ نکال دیں سیٹھ صاحب! تو کیا فرق پڑے گا؟ آپ پھر بھی تین لاکھ کے فائدے میں رہیں گے۔'' روشیلا معنی خیز انداز میں بولی۔
''دو........ دو لاکھ........؟'' سیٹھ صاحب جلدی سے بیٹھ گئے۔ ''دو لاکھ کائے کو بابا؟''
''ایک لاکھ میرا کمیشن........ اور ایک لاکھ پیار محبت کے۔ پھر آپ بالکل ہیرو بن جائیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
''ارے........ اوہ........ وہ ہو ہو........ ہم سالا اس بڑھاپے میں کائے کو ہیرو بنیں گا؟ ہم تو ایسے ہی مسکھری کرتا پڑا۔ تم بیٹھو روسیلا بائی! کچھ چائے پانی منگواتا۔''
''نہیں........ میں چلوں گی۔ رانا صاحب واپس آجائیں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں ان سے سخت ناراض ہوں۔ وہ مجھے منانے میرے گھر آسکتے ہیں۔'' روشیلا بولی۔
''بول دیں گا، بابا! مگر ہم بڑا بدنصیب ہے۔'' سیٹھ صاحب نے افسردگی سے کہا۔
''کیوں، کیوں؟'' روشیلا مسکرائی۔
''اے دیکھو نا، روسیلا بائی!........ ہم تمہارے کو کتنا محبت کرتا پڑا۔ اپنی پھلم میں تمہارے کو کاسٹ کیا۔ تمہارے پر اتنا محنت کرتا پڑا۔ پن تم پیار کا ایک بات بھی نہیں کرتا۔''
''آپ پیار کر کے کیا کریں گے سیٹھ صاحب؟'' روشیلا نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔
''اے بس..!...ایک کھواہس (خواہش) تھا۔ پن تم پورا نہیں کرتا پڑا۔ تو کیا بنیں گا؟'' سیٹھ صاحب مایوسی سے بولے۔
''تو اپنی خواہش پوری کرلیں سیٹھ صاحب! میں تو بازار میں سجی ہوئی ہوں۔ آپ لوگوں سے بنا کر نہ رکھوں تو کیسے کام چلے گا؟''
''اے ٹھیک بولتا پڑا۔ بالکل ٹھیک بولتا پڑا'' سیٹھ صاحب، روشیلا پر جھک گئے۔ طالوت سے برداشت نہ ہوسکا تھا۔
اس سے قبل کہ میں اسے روکوں، اس نے سیٹھ صاحب کے سر سے پگڑی اُٹھائی اور وہ زوردار ہاتھ رسید کیا کہ سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ وہ اوندھے ہو گئے۔ روشیلا ان کے وزن سے

بچنے کے لئے جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی تھی۔
''کیا ہوا سیٹھ صاحب؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''ایں.......'' سیٹھ صاحب نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر غصیلے انداز میں روشیلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بابا! تم کھود بولا، پھر مارتا کائے کو ہے؟''
''کیا مطلب؟'' روشیلا نے تعجب سے کہا۔
''پن تمہارے دونوں ہاتھ تو مارے سامنے تھے۔'' سیٹھ صاحب کو خود بھی حیرت تھی۔
''ہوا کیا؟'' روشیلا نے تنگ کر پوچھا۔
''ارے ہم کھود نئیں جانتا، کیا ہوا'' سیٹھ صاحب نے پہلے اوپر اور پھر نیچے اس خیال سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اوپر سے کوئی چیز تو ان کے سر پر نہیں گری تھی۔ لیکن ایسی کوئی چیز انہیں نظر نہیں آئی تھی۔
''بس، اب میں چلوں گی سیٹھ صاحب! وہ پیسے مجھے دے دیں۔'' روشیلا نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ سیٹھ صاحب میں اب اس قدر ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کوشش کرتے۔ ان کا سر اب بھی چکرا رہا تھا اور کان سنسنا رہے تھے۔
''دیتا ہے بابا! دیتا ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولے اور پھر لرزتے قدموں سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔
''آؤ دیکھیں۔'' طالوت نے سرگوشی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر سیٹھ صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ پھر ہم دونوں سیٹھ صاحب کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ سیٹھ صاحب نے مجسّمے کی آنکھ دبائی اور تجوری کھل گئی۔ پھر انہوں نے اندر جھانکا اور ایک دم ایسا لگا، جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔
''ہائیں.....ارے.....ارے یہ کیا؟'' ان کے منہ سے بھرّائی ہوئی آواز نکلی اور وہ دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''ارے.....ارے ڈاکہ پڑ گیو..... ہائے بپا.....ارے چلو جلدی.... پولیس، پولیس.....''
وہ بوکھلاہٹ میں ناچتے ہوئے چیخے اور پھر سرپٹ باہر کی طرف دوڑے۔ انہوں نے وہ شور مچایا کہ خدا کی پناہ!
ذرا سی دیر میں گھر کے سارے ملازم روشیلا سمیت ان کے گرد جمع تھے اور سیٹھ صاحب بوڑھی عورتوں کی طرح بین کر رہے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ وہ لٹ گئے...... پانچ لاکھ نقد.....لاکھوں کے زیورات..... اور نہ جانے کیا کیا چلا گیا۔ ''سب کچھ چوپٹ ہو گیو..... ماں کسم..... ہمارا پاٹیا ہو گیو۔'' اور پھر اچانک وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ اور پھر انہوں نے روشیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''مس روسیلا!''
''کیا بات ہے سیٹھ صاحب؟'' روشیلا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ لیکن سیٹھ صاحب کو اس وقت اس کے لہجے پر توجہ دینے کی فرصت کہاں تھی۔
''مس روسیلا!...... گھپلا ہو گیا...... ماں کسم، بہت بڑا گھپلا ہو گیا۔''
''گھپلا تو ہو رہا ہے سیٹھ صاحب! میں خود دیکھ رہی ہوں۔''
''وہ رانا کا بچہ......اور اس کا ساتھی ڈاکو تھے...... بہت بڑے ڈاکو...... وہ پانچ لاکھ دے کر سب لے گئے...... ہائے، مار دیو...... سب لے گئے...... پانچ لاکھ بھی لے گئے...... جیور (زیور)

بھی لے گئے........سب کچھ لے گئے........ ہائے!'' رُوئی والا بار بار سینہ پیٹ رہا تھا۔

''سیٹھ صاحب! سوچ سمجھ کر بات کریں۔ آپ بغیر ثبوت کے الزام لگا رہے ہیں۔'' روشیلا نے تیز لہجے میں کہا۔

''ارے اب ثبوت کا کیا جرورت ہے؟ بھاگ گئے۔ ہائے بپا!'' سیٹھ نے رونے والے انداز میں کہا اور روشیلا ان کے قریب پہنچ کر جھک گئی۔

''سیٹھ صاحب! آپ کتنی ہی اداکاری کریں، میں آپ سے ایک لاکھ روپیہ ضرور وصول کروں گی۔ اگر آپ شرافت سے نہیں دیں گے تو میں بھی اُنگلیاں ٹیڑھی کرنا جانتی ہوں۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

''آں........ارے ایک لاکھ........ارے ایک لاکھ........اب ایک لاکھ اور دیں گا........ارے کیا کرتا پڑا مس روسیلا! اب ایک لاکھ کدر سے دیں گا؟ ارے ہم تو ایسے ہی مری گیا۔''

''دیکھ لو سیٹھ صاحب!'' روشیلا کو سیٹھ کی بکواس پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

''ابھی تو آپ بھی باقی ہیں مس روشیلا!'' طالوت نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پھانس کر ایک لاکھ کی حقدار وہ بھی تھیں۔ اور پھر روئی والا........ گویا اُس کی نگاہوں میں میری اور روئی والا کی ایک ہی حیثیت ہے۔ کیا اس توہین کا انتقام نہیں لیا جائے گا؟''

''ایک لاکھ کی بات دوسری ہے طالوت! باقی معاملات کے لئے اسے معاف کر دو۔ اُس کی لائن ہی ایسی ہے۔''

''بہر حال، ایک لاکھ سہی۔ اس گدھے کے لئے یہی سزا کافی ہے یا کچھ اور؟ اس نے ہمارے اوپر ڈاکہ زنی کا بھی شبہ کیا ہے۔ کیا اس کے لئے اسے علیحدہ سے سبق دیا جائے؟''

''بس، بس۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ہارٹ فیل ہو جائے گا، بے چارے کا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن حیرت ہے عارف! یہ اتنا معمولی آدمی تو نہیں ہے کہ اتنی سی رقم کے لئے اُس کی بری حالت ہو جائے۔ اس کی جائیداد ہی کافی ہے۔''

''اس دنیا کے کارخانے کو سمجھنے کے لئے ابھی وقت درکار ہے طالوت! بس دیکھتے رہو اور لطف اندوز ہوتے رہو۔ آؤ، اپنے کمرے میں چلیں۔ یہ تو اسی طرح بین کرتا رہے گا۔''

اور میں اور طالوت واپس چل پڑے۔ ٹھیک چھ بجے عبدل بھائی آ گیا۔ اس نے ہمارے بارے میں پوچھا ہو گا تو ظاہر ہے اسے عجیب سی باتیں سننے کو ملی ہوں گی۔ تاہم وہ ہمارے کمرے کی طرف نکل ہی آیا اور ہم نے اس کا استقبال کیا۔

''ارے کیا بولتا ہے گولر بھائی!........ کیا باہر سب لوگ کا مغج چل گیا ہے؟'' عبدل بھائی ہمیں دیکھ کر اُچھل پڑا۔

''کیا ہوا عبدل بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بابا! اِدھر تو پاگل خانہ معلوم ہاتا پڑا۔ جرا آؤ، وری دیکھو۔ اِدھر سب لوگ کھلاس ہو گیا۔'' عبدل بھائی کھوپڑی سہلاتا ہوا بولا۔

"کیا ہو گیا آخر؟" میں نے کہا اور پھر طالوت کی طرف مڑ کر بولا۔ "آیئے دیکھیں رانا صاحب!"

"چلو!" طالوت نے کہا اور ہم تینوں سیٹھ کے کمرے کی طرف چل پڑے، جہاں تعزیتی میٹنگ ہو رہی تھی۔ کچھ دوسرے لوگ بھی باہر سے آئے ہوئے تھے۔ سیٹھ ان کے درمیان بیٹھا اپنے لٹ جانے کی داستان سنا رہا تھا۔ سب سے پہلے عبدل بھائی، اس کے پیچھے میں اور پھر طالوت اندر داخل ہوئے۔

سیٹھ نے یونہی سرسری نگاہ ہمارے اوپر ڈالی اور اچانک وہ کسی فٹ بال کی طرح اچھل پڑا۔ اور پھر اس نے اپنے جثے سے کہیں زیادہ پھرتی سے ہمارے اوپر چھلانگ لگائی۔ دوسرے لوگ گھبرا کر کرسیوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ سیٹ نے جھک کر میری کمر میں دونوں بازو ڈال کر مجھے پکڑ لیا اور پھر اس کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"ماں کسم...... ہاہاہا...... مار دیو...... ہو ہو...... پکڑ لیو۔" اُس کا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔ اور ہنسی روکنے کی کوشش میں میری اور طالوت کی بری حالت ہو گئی۔

"کیا ہو گیا سیٹھ صاحب کو؟" میں نے حیرت سے عبدل بھائی سے کہا۔ سیٹھ بدستور میری کمر سے لپٹا کانپ رہا تھا۔

"اے روئی والا!...... اے روئی والا! کیا کرتا ہے، کھدا قسم۔ اے تیرا مگج پھر گیا ہے کیا؟ اے سنبھل کے بولو...... سیٹھ!" عبدل بھائی، سیٹھ سے میری کمر چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ دوسرے لوگ پاگلوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے۔

"نہیں چھوڑیں گا...... ماں کسم نہیں چھوڑیں گا...... اے پولیس بلاؤ...... جلدی کرو...... مری گیو...... پکڑ لیو۔"

"پولیس......" طالوت آگے بڑھ آیا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے روئی والا؟" اس نے روئی والا کی گردن پکڑ کر اسے زور سے دھکیل دیا اور روئی والا چاروں شانے چت گرا۔ لیکن اس نے اُٹھنے میں بہت پھرتی دکھائی۔ وہ پھر کسی بے سینگ کے مینڈھے کی طرح گردن جھکائے آگے بڑھا اور اس بار اس نے طالوت کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن طالوت کے تھپڑ کی آواز کافی دیر تک گونجتی رہی تھی۔ اور اس تھپڑ نے روئی والا کے بھی حواس درست کر دیئے تھے۔

"اب اس بدتمیزی کی وجہ بتاؤ، روئی والا!" طالوت آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کی پُروقار شخصیت سے سب ہی مرعوب ہو گئے تھے۔ کسی نے اس معاملے میں مداخلت کی کوشش ابھی تک نہیں کی تھی۔ طالوت نے روئی والا کا گریبان پکڑ لیا۔

"ارے مارتا کائے کو ہے بھائی!...... ارے مارتا بھی ہے...... لُوٹ لیا ارر...... ارر......" روئی والا گریبان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

"عبدل بھائی! اس سے معلوم کرو، اسے کیا ہو گیا؟" طالوت نے پھر اسے دھکا دے دیا اور وہ اطمینان سے نیچے گر گیا۔ لیکن اس بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی طرح پڑا ایک ایک کو گھورنے لگا، جو چپ سادھے پڑے ہوئے تھے۔

"وہ رانا صاب!...... اپن کے سالے سیٹھ کا مگج پھر گیا ہے۔ وہ بولتا پڑا ہے، آپ لوگ ڈاکو ہے۔ آپ نے اس کی تجوری صاف کر کے پانچ لاکھ روپے اور بہت سے زیورات نکال لئے ہیں۔" عبدل

بھائی نے کہا۔

"اوہ........!" طالوت نے ہونٹ بھینچ کر روئی والا کو گھورا۔"تو گھر بلا کر، مہمان بنا کر تم مہمان کی یہ عزت کرتے ہو روئی والا؟........ہم ڈاکو ہیں........کیوں؟" طالوت آگے بڑھا۔

"ارے مار یو مت بھائی!........ماں کسم بڑے جور کا ہاتھ پڑتا ہے........ہم کیا بولے؟........ارے اور کس نے ہمارا تجوری صاف کر دیا؟"

"روئی والا! تمہاری جتنی جائیداد ہے، کھڑے کھڑے خرید لوں گا۔ بتاؤ، اس کی قیمت کیا ہے؟ اسی وقت ادائیگی ہو گی، سمجھے؟" طالوت نے گونج دار آواز میں کہا۔

"اے تو پھر بھائی! ہم کیا بولے؟ ہائے، ہم تو لُٹ گیو۔"

"بکواس مت کرو۔ میرے دیئے ہوئے پانچ لاکھ واپس کر دو، ورنہ تمہارے اوپر دھوکا دہی کا مقدمہ کروں گا اور تمہیں قید میں ڈلوا دوں گا۔"

"ارے پانچ لاکھ اور........اور ایک لاکھ روسیلا کا........پورے چھ لاکھ۔ اور پھر لاکھوں کا نقصان۔ ہائے........ہم تو لُٹ گیو۔" سیٹھ گانے کے انداز میں رونے لگا۔

"آؤ عبدل بھائی! سیٹھ کو رات میں دیکھیں گے۔" طالوت نے کہا۔ عبدل بھائی اب ہمارا چمچہ تھا، اس لئے وہ گردن اکڑائے ہمارے ساتھ نکل آیا۔ کس کی مجال تھی کہ ہمیں روکتا۔ ہم لوگ باہر نکل آئے۔

"سیٹھ بہت کمینہ ہے، عبدل بھائی! مہمانوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے۔" طالوت نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ارے خدا کسم........کمینوں کا کمینہ ہے۔ بہت ذلیل ہے........پن آپ نے کھوب جور کا جھانپڑ لگایا، رانا صاحب! خدا قسم، مجا آ گیا۔ اب وہ پانچ لاکھ ہجم (ہضم) کرنے کو مانگتا ہے۔"

"ہم اس کے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر نکال لیں گے۔ تم فکر مت کرو۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم تینوں سیٹھ کی کوٹھی سے نکل آئے۔

"کیا بولتا صاب! نوری کے گھر چلیں گا؟"

"ہاں........ہاں........بالکل۔ تم ٹیکسی روکو۔" طالوت نے کہا۔ اور عبدل بھائی ایک ٹیکسی کو آوازیں دینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھے شاہ پور کالونی جا رہے تھے۔ راستے میں طالوت نے کہا۔

"اب ہم واپس سیٹھ کی کوٹھی پر نہیں جائیں گے۔ ہمیں کسی عمدہ سے ہوٹل میں قیام کرنا ہو گا۔ عبدل بھائی! تم نے کوٹھی کے لئے کسی سے بات کی؟"

"ارے آپ کے پاس سے جانے کے بعد ہم چاروں طرف گھومتا پڑا۔ ایک بہت عالیشان کوٹھی کے لئے بروکر سے بات کی۔ کل کوٹھی دکھائیں گا سیٹھ، بوا فس کلاس کوٹھی ہے۔ ایک دم فٹ فاٹ۔"

"خوب........کل ایک کار بھی خریدنی ہے۔ ضرورت تو ہو گی۔"

"ٹھیک بولا، رانا صاحب........ٹھیک بولا۔" عبدل بھائی خوشی سے دانت نکال کر بولے۔ بڑی موٹی آسامی ہاتھ لگی تھی۔ وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اور کیا چاہئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی شاہ پور کالونی پہنچ گئی اور پھر عبدل بھائی نے اسے رُکوا لیا۔ عبدل بھائی نے کرایہ بھی اپنی جیب سے ہی ادا کیا تھا۔ آخر کو اس کمپنی کا منیجر تھا، جو ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

چند منٹ کے بعد ہم ایک افلاس زدہ مکان کے سامنے رک گئے، جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ پردے کی موجودگی کم از کم مکین کی ذہنیت کی عکاسی کرتی تھی، خواہ وہ ٹاٹ ہی کا تھا۔ عبدل بھائی نے دروازے پر دستک دی اور چند لمحات کے بعد ایک گول مٹول سا بچہ باہر نکل آیا۔ دُھلے ہوئے معمولی لیکن صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر نوری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

''اے نوری کو ملنے کا مانگتا بابا! نوری کو بولو، رانا صاب آیا ہے۔''

''جی.......تشریف لائیے۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔'' بچے نے کہا اور بڑے سلیقے سے پردہ ہٹا دیا۔ پہلے عبدل بھائی اونٹ کی طرح منہ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ وہ اس گھر میں آنا جانتے تھے۔ ان کے پیچھے ہم دونوں بھی جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹے سے مکان کا ایک کمرہ تھا۔ سامنے چھوٹا سا دالان تھا اور دالان ہی کو سٹنگ روم بنایا گیا تھا۔ سرکنڈوں کے دو مونڈھے، ایک گول میز اور ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ چارپائی پر سفید چادر تھی۔ دالان کے سرے پر ایک سادہ سے لباس میں ملبوس بوڑھا، جو آنکھوں سے اندھا تھا، کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ٹٹول کر احتیاط سے آگے بڑھا۔

''آیئے، آیئے.......نور النساء بیٹی!.......نور النساء بیٹی! مہمان آ گئے۔''

''آئی ابا میاں!'' نوری کی آواز سنائی دی اور وہ مسکراتی ہوئی دالان میں آ گئی۔ بالکل سادہ، کسی آرائش سے ناآشنا، آنکھیں شاید باورچی خانے کے دھوئیں سے سرخ ہو گئی تھیں۔ چہرے پر ایک آدھ جگہ کالک بھی لگ گئی تھی۔ اس نے ہم سب کو سلام کیا تھا۔ اور پھر وہ ہمارے قریب آئی اور سب سے پہلے میرا ہاتھ پکڑ کر بوڑھے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

''ابا میاں! یہ گولر بھائی ہیں۔'' شاید 'گولر' پر وہ جھجکی تھی۔ طالوت مسکراہٹ نہ روک سکا اور اس وقت میری شرارت مجھ پر ہی اُلٹ گئی۔ بوڑھے نے میرا ہاتھ ٹٹولا۔ شاید وہ اس ہاتھ سے کوئی اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر میاں!''

''اور یہ نواب عزیز الدین ہیں۔'' اس بار نوری نے طالوت کا ہاتھ پکڑ کر بوڑھے کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اللہ تعالیٰ مرتبہ بلند کرے۔'' بوڑھے نے کہا۔

''اپنے عبدل بھائی بھی ساتھ ہیں۔'' نوری بولی۔

''اوہ.......عبدل بھائی۔ بڑا کرم کیا میاں....... بیٹھیے، بیٹھیے۔ آپ سب لوگ بیٹھیے۔''

''اے لو، کرم سرم کائے کا سالا۔ رانا صاب بولا، ہم انہیں اِدھر لے آیا۔'' عبدل بھائی نے بھی اپنے طور پر انکساری برتی۔ ہم دونوں مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ نوری کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔ نہ جانے وہ ہمارے چہروں سے کیا اندازہ لگا رہی تھی۔ شاید جاننا چاہتی ہو کہ ہمیں یہاں آ کر کوئی مایوسی ہوئی ہے۔ بوڑھا بھی عبدل بھائی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا اور پھر بولا۔

''میاں! میرے دو بچے ہیں۔ نور النساء اور صفدر۔ صفدر کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں بھی ایک حادثے میں چلی گئیں۔ اور جب میں کسی قابل نہ رہا تو نور النساء نے مرد بن کر اس گھر کی ذمہ داری

سنبھال لی۔ خدا اسے خوش رکھے۔"

میں نے محسوس کیا، بوڑھا اپنی بیٹی کا نام بڑے احترام سے لیتا ہے۔ ہم دونوں اس ماحول سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

"ہاں چاچا! ایکسٹرا لوگوں کو کام کِدھر ملتا ہے۔ صاحب لوگ کا مرجی (مرضی) کا بات ہے۔ اور اپنا روئی والا۔ یہ تو سالا ایک دم حرامی ہے۔ ابھی نوری کو نوکری سے نکال دیا۔ پن یہ سالا بابو کھان کا حرامی پن ہے۔ وہ سیٹھ کو بولا۔ نئیں تو سیٹھ نوری کو نئیں نکالتا۔" عبدل بھائی نے کہا۔

"ایں......تت......تو......نور النساء بیٹے!......مم......میرا مطلب ہے......" بوڑھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر خاموش ہو گیا۔ نوری کا چہرہ بھی زرد ہو گیا تھا۔ شاید اس نے بھی یہ خبر گھر میں نہیں سنائی تھی۔ "ارے دیکھو......چائے وغیرہ تیار ہو گئی ہو گی۔" بوڑھے نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور نوری کی مشکل کسی حد تک حل ہو گئی۔ وہ چائے لینے چلی گئی۔

"بابو خان کو بھی تو نکال دیا گیا۔" میں نے اس موضوع کو آگے بڑھایا۔

"ارے ہاں۔ وہ بھی کھلاس ہو گیا۔" عبدل بھائی ہنس پڑا۔

"بابو خان کا نور النساء سے جھگڑا ہو گیا تھا؟" بوڑھے کے چہرے پر تجسس اُبھر آیا۔

"پتہ نہیں۔" عبدل بھائی کے بجائے میں جلدی سے بول پڑا۔

"خیر......اللہ رازق ہے۔" بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے رانا عزیز الدین سے ان کے بارے میں پوچھا تھا۔ پھر نوری چائے لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی پھل اور بسکٹ بھی تھے، اس نے گھریلو لڑکیوں کے مانند چائے بنا کر ہمیں دی اور پھلوں وغیرہ کی پلیٹیں پیش کیں۔ بوڑھا بھی شریک تھا۔ صفدر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ شریف لوگ، حالات کا شکار۔ میں نے دل میں سوچا۔ نوری نے سیٹھ سے دس روپے اُدھار مانگے تھے، سیٹھ نے اسے دو روپے دیئے۔ نہ جانے بے چاری نے یہ سب کچھ کہاں سے کیا ہو گا؟ ویسے اس وقت عبدل بھائی کی بات بات میں مداخلت کھل رہی تھی۔ اس لئے میں نے اسے بھگانے کا فیصلہ کر لیا۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے عبدل بھائی سے کہا۔ "عبدل بھائی! آپ کے سپرد ایک کام کیا گیا ہے۔"

"ہو ہو......بولو گولر بھائی!......حکم کرو۔" عبدل بھائی مستعدی سے بولے۔

"کمرہ بُک کرا لیں۔ پہلے سے انتظام ضروری ہے۔ اور ہاں......رات کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آپ ہمیں لینے آ جائیں۔ بس اب آپ چلے جائیں۔"

"اچھا جی......اپن چلے۔" عبدل بھائی فوراً کھڑے ہو گئے اور پھر وہ سلام کر کے نکل گئے۔ عبدل بھائی کے نکل جانے کے بعد بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میاں! اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور محترم!" میں نے کہا۔

"یہ سیکرٹری صاحب کا نام سمجھ میں نہیں آیا......گولر بھائی......کیا آپ......؟"

"بڑا اچھا سوال کر کے آپ نے میری ایک مشکل حل کر دی ہے محترم بزرگ!......رانا عزیز الدین

دراصل میرے دوست ہیں۔ میں ان کا سیکرٹری قطعی نہیں ہوں۔ ہم دونوں یونہی سیر کو نکلے تھے کہ یہ عجیب وغریب لوگ ٹکرا گئے اور میں تفریحاً کولر بھائی بن گیا۔ میرا نام سلیم احمد ہے۔ رانا صاحب کو یہ انوکھے لوگ دلچسپ معلوم ہوئے، کیونکہ انہوں نے زندگی پہاڑوں میں گزاری ہے، اس لئے ہم ان میں شامل ہو گئے۔"

"اوہ......" بڑے میاں ہنس پڑے۔ نوری بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ چند منٹ سب مسکراتے رہے۔ پھر بڑے میاں بولے۔ "مجھے بھی ان لوگوں سے اُلجھن ہوتی ہے۔ لیکن بس...... جب نورالنساء، نوری بن گئی تو ان لوگوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔" آخر میں بوڑھے کی آواز لرز گئی۔

"نورالنساء نے اس لائن کا انتخاب کیوں کیا ہے محترم؟" طالوت نے پوچھا۔

"بیٹے! انسان سے کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں ان کے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ میرا خیال ہے، مجھ سے بھی کوئی گناہ ہی ہوا تھا۔ لیکن مجھے اپنے معبود سے یہ شکوہ ہے کہ اس نے میرے گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں نہ دی؟ میرے بچے کیوں میرے گناہ کا شکار ہو گئے؟ میرا کوئی وسیلہ نہیں تھا میاں! صرف آنکھوں سے معذور ہونا تو کوئی بات نہیں تھی۔ مزید بیماریاں بھی حملہ آور ہو گئیں۔ نورالنساء نے گھر کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ باہر کی دنیا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ میں نے کوئی گناہ کیا، اس کی سزا مجھے یہ ملی کہ نورالنساء کو میری مرضی کے خلاف راستے اختیار کرنا پڑے۔ لیکن مجھے یقین ہے میرے بیٹے! کہ میں نے کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں کیا، جس کی پاداش میں نورالنساء کے ذریعے میری پیشانی داغدار ہو جائے۔ اس لئے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے آزادی دے دی۔"

نوری کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، جن کا اسے جونہی احساس ہوا، اس نے انہیں خشک کر لیا۔

"جس لائن میں نوری نے قدم رکھا ہے محترم! اس میں غلط لوگوں کی بہتات ہے۔ نوری ایک شریف لڑکی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ماحول اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک درخواست کروں گا میاں! اگر مان لو تو بڑا احسان ہو گا۔"

"فرمائیے، فرمائیے۔" طالوت جلدی سے بولا۔

"نورالنساء کو نوری صرف وہ لوگ کہتے ہیں، جن کا انسانیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جو جذبات سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ جب لوگ نورالنساء کو حقارت سے نوری کہتے ہیں تو میرے دل پر گھونسہ لگتا ہے۔ آپ لوگ گفتگو سے نیک اور شریف معلوم ہوتے ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ اسے نوری نہ کہیں۔"

"ہم آپ کی خواہش کا احترام کریں گے محترم! کیا ہم انہیں نور کہہ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس نام میں اپنائیت ہے۔"

"شکریہ۔ لیکن آپ کو یہ احساس کیونکر ہوا کہ ہم لوگ شریف ہیں؟"

"اس کے جواب کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہاں، میں خدا سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ میری نورالنساء کو برے لوگ نہ ٹکرائیں اور نہ جانے کیوں بعض اوقات مجھے اپنی دعاؤں پر اعتماد سا محسوس ہوتا ہے۔"

"مجھے چند لمحات کی اجازت دیں۔" نورالنساء نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ بڑے میاں کے چہرے پر چند سوال اُبھر آئے۔ لیکن وہ انہیں آخر تک زبان پر نہ لا سکے۔ نوری بھی

باورچی خانے میں جاتی اور کبھی ہمارے پاس آبیٹھتی۔ صفدر بھی آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے اور ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتا ہے۔ اور جب نورالنساء باجی گھر پر ہوتی ہیں تو خوب محنت سے اسے پڑھاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ اسے کھلونے بالکل پسند نہیں ہیں۔ ہاں، کہانیوں کی کتابیں وہ شوق سے پڑھتا ہے، جو کبھی کبھی نورالنساء باجی لا دیتی ہیں۔

یہ کسی طور ایک ایکسٹرا گرل کا گھرانہ نہیں تھا۔ نہایت شریفانہ ماحول اور اوپر سے بابو خان کی ذلالت۔ نوری کی لجاجت۔ کیسی متضاد باتیں تھیں۔ پھر ہم نے کھانا کھایا۔ خاصے لوازمات تھے۔ نہ جانے نوری نے یہ سب کچھ کہاں سے کیا تھا؟ تاہم اس کا گھر تھا، اس لئے اس سے کچھ نہ پوچھ سکے۔ پھر عبدل بھائی آ گیا۔ نوری نے اسے بھی کھانے کی پیشکش کی اور عبدل بھائی بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اس نے بتایا کہ ''دلشاد'' میں ہمارے لئے کمروں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس نے کمروں کے نمبر وغیرہ بھی بتائے تھے۔

چلتے ہوئے میں نے سو روپے کا ایک نوٹ صفدر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''صفدر میاں! یہ تمہاری مٹھائی کے لئے۔ اور کہانیوں کی کتابیں اُدھار۔''

''سلیم بھائی!'' نوری نے آہستہ سے کہا۔ ''اس بچے نے اتنا بڑا نوٹ کبھی نہیں دیکھا۔ دینا چاہتے ہیں تو اس کی حیثیت کے مطابق دیں۔''

''نورا!'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میرا اس فلمی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی میری شخصیت پر گندگی کی اتنی تہہ نہیں چڑھی کہ میں مخلص اور نیک لوگوں کو ان کی قیمت ادا کر سکوں۔ ہاں، دل کی کوئی خواہش پوری کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے۔ اگر ضروری سمجھو تو صفدر کو یہ پیسے رکھ لینے دو۔ ہاں، اگر مجھے کوئی مقام نہیں دینا چاہتیں تو میں مجبور بھی نہیں کروں گا۔''

نوری مجھے دیکھتی رہی۔ پھر نظریں جھکا لیں۔

''اب اجازت دیں محترم! جب تک اس شہر میں ہیں، حاضر ہوتے رہیں گے۔ اگر آپ کی اجازت ہو؟''

''میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کون سی ہو سکتی ہے بیٹے! میں تو یوں بھی اندھا آدمی ہوں، کہیں جا نہیں سکتا۔ بس گھر میں پڑا رہتا ہوں۔ اگر کوئی آ جائے تو میرا دل بھی خوش ہو جاتا ہے۔''

''تب تو ہم روز حاضر ہوں گے۔'' طالوت نے کہا۔

''بڑی خوشی سے۔ یہ جھونپڑا تمہیں خلوص سے مالا مال ملے گا۔'' بڑے میاں نے کہا۔

''نورا!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''جی!'' وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی، اس لئے سرگوشی میں بولی۔

''اگر اس قابل سمجھو تو کل دن کو دس بجے دلشاد میں آ جاؤ۔ تمہارے شہر میں اجنبی ہیں، اس لئے بعض معاملات میں تم سے کچھ مشورے کرنے ہیں۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گی۔''

''وعدہ؟''

''جی!'' اس نے جواب دیا۔ اور پھر ہم بزرگ سے مصافحہ کر کے اور صفدر کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل آئے۔ عبدل بھائی ایک ٹیکسی پکڑ لایا اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر دلشاد چل پڑے۔ راستے بھر ہم خاموش

رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی ایک خوبصورت ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ عبدل بھائی نے کرایہ ادا کیا اور پھر ہم اندر داخل ہو گئے۔

ہوٹل درحقیقت عالیشان تھا۔ کشادہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے رہائش کے لئے بہت عمدہ تھے۔ ہم نے انہیں پسند کیا۔ اور پھر طالوت نے مزید پانچ ہزار روپے نکال کر عبدل بھائی کو دیئے۔

''آپ اپنی جیب سے ہمارے اخراجات نہ کریں عبدل بھائی! یہ رکھ لیں۔ اور جب ختم ہو جائیں تو بے تکلفی سے مانگ لیں۔''

''ہو جی...... آپ نے دس ہجار جو دیئے تھے؟'' عبدل بھائی نروس ہو کر بولے۔

''وہ آپ کے تھے عبدل بھائی! ہمارے دوسرے اخراجات ہمارے ذمے۔ آپ کا ان سے کیا تعلق؟''

''کھادم (خادم) ہوں سرکار! خدا قسم! ہمیشہ وفادار پائیں گے۔'' عبدل بھائی لرزتے ہوئے بولے۔

''اور عبدل بھائی!'' دفعتہً طالوت بولا۔

''جی سرکار!''

''روشیلا کا فون نمبر کیا ہے؟'' طالوت نے اچانک پوچھا۔ اور میں چونک کر طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔ طالوت کو اسی کا خطرہ تھا، اس لئے اس نے میری طرف نہیں دیکھا، بلکہ عبدل بھائی کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کرنے لگا۔ ''ٹھیک ہے عبدل بھائی! اب آپ آرام کریں۔ کل کا کیا پروگرام ہے؟''

''جیسا حکم کریں رانا صاحب!'' عبدل بھائی سراپا نیاز تھے۔

''کل آپ سارے کام کر کے آئیں۔ کوئی عمدہ گاڑی، کوٹھی اور دفتر۔ دفتر کا فوری طور پر بندوبست نہ بھی ہو سکے تو ایک آدھ دن دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ دونوں چیزیں....... ہم ہوٹل سے اس وقت تک کہیں نہیں جائیں گے جب تک آپ کا فون نہ آئے۔ سودا ہو جائے تو موٹر کمپنی کے ملازم کو ساتھ لیتے آنا۔ ادائیگی کر دی جائے گی۔ کسی ڈرائیور کا بھی انتظام کر لینا۔''

''میں خود بھی کار چلا سکتا ہوں جی۔ خدا قسم! ایک دم فس کلاس والا۔''

''خیر، پھر بھی ڈرائیور کی ضرورت تو ہوگی۔''

''تلاس کر لیں گے سرکار!'' عبدل بھائی نے کہا اور پھر وہ سلام کر کے چلا گیا۔ تب طالوت مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں...... اب سناؤ...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کہنے کو تو بہت کچھ ہے۔ لیکن پہلے حضور سے ایک سوال کروں گا۔''

''اس کا جواب نہیں ملے گا۔'' طالوت نے کہا۔

''آخر کیوں؟''

''ہاں، انسان ہوں۔ بس، بہر حال وہ اس مصرف کے لئے کیا بری ہے؟ اور پھر اس بے چاری کو روئی والا سے کچھ نہیں ملا۔''

''اوہو...... ابھی تھوڑی دیر قبل تو اس کے بارے میں تم دوسرے انداز سے سوچ رہے تھے۔ اس بات پر تاؤ کھا رہے تھے کہ اس نے سیٹھ کے ساتھ مل کر تمہیں پھانسنے کی کوشش کی۔''

''دراصل عارف! میں نے اس کے ایک جملے پر غور کیا، جس نے میرے اندر لچک پیدا کر دی۔''

''یعنی؟''

''اس نے کیسے انوکھے انداز میں کہا تھا کہ میں تو بازار میں بجی ہوں۔ آپ لوگوں سے بنا کے نہ رکھوں تو کیسے گزارا ہو گا؟''

''ہاں........ مجھے یاد ہے۔''

''نوری کو تھرکتے دیکھ کر ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کا دوسرا رخ ایسا عجیب ہو گا۔ میرا خیال ہے، وہاں دوسری ایکسٹرا لڑکیاں بھی تھیں۔ ہم نے کس کی طرف توجہ دی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اسی طرح ممکن ہے، روشیلا کی بھی کوئی کہانی ہو۔ نہیں بھی ہے تو یہاں اس ہوٹل میں اسے مدعو کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں ہے طالوت! ہاں روشیلا اور نوری کا فرق میں تمہارے سامنے واضح کر دوں۔ روشیلا کے ساتھ اگر حادثات بھی ہوئے تو اس نے ان حادثات کو قبول کر کے خود کو فروخت کر دیا۔ نوری بھی حالات سے لڑ رہی ہے۔ ممکن ہے، اس کی زندگی میں بھی کوئی ایسا اسٹیج آ جاتا، جب وہ روشیلا بن جاتی۔''

''ہاں........ یہ نمایاں فرق ہے۔ لیکن ہم اسے روشیلا نہیں بننے دیں گے۔''

''پوری کوشش کریں گے۔ مگر یار! کیسی انوکھی بات ہے، ہمیں ایسے ہی لوگ ٹکراتے ہیں۔ خوددار اور معزز قسم کے۔ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے ان کے ساتھ۔''

''لطف بھی اسی میں آتا ہے۔ اب ان نورالنساء عرف نوری عرف نور خاتون کو شیشے میں اتارنے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟'' طالوت نے کہا۔

''کل دس بجے بلایا ہے۔ اس کے بعد اس کے سامنے ڈرامہ بولنا پڑے گا۔ امید ہے، کامیابی ہو جائے گی۔ بہر حال، اب یہاں کچھ عرصہ قیام کا فیصلہ کیا ہے تو پھر کیا حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تمہارے اندر ایک بڑی خرابی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم محبوباؤں کے بجائے بہنیں دریافت کرنے کے عادی ہو۔ یار! میں چاہتا ہوں، تم بھی ایک محبوبہ پال لو۔ تاکہ میرے پروگراموں میں رخنہ اندازی نہ ہو۔'' طالوت نے کہا۔

''خیر........ اس لائن میں رہے تو میرا کام بھی کہیں نہ کہیں بن جائے گا۔ لیکن فی الحال میں تمہارے کسی پروگرام میں رخنہ اندازی تو نہیں کر رہا؟''

''کر تو رہے ہو۔ اب اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو میں ذرا ٹیلی فون پر روشیلا سے پیار محبت کی دو چار باتیں کر لوں۔''

''چلا جاؤں گا دوست! لیکن ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ کم از کم فون پر تم اس سے گفتگو میرے سامنے ہی کرو۔''

طالوت مجھے گھورتا رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن تم شاہ دانہ کا دوشالہ میرے پاس رکھ کر جاؤ گے۔''

''کیوں؟''

''تم خود سمجھ سکتے ہو۔ پہاڑیوں پر تم نے بدمعاشی کا ثبوت دیا تھا۔''
''نہیں میرے دوست! ہمارے اور تمہارے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ بھی ہے۔ کبھی کسی کی قابلِ اعتراض خلوت میں داخل نہ ہوں گے۔''
''وعدہ؟'' طالوت نے میرے لفظ ''قابلِ اعتراض'' پر غور نہیں کیا تھا۔
''پکا وعدہ۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ میں اس الفاظی چکر سے فائدہ اُٹھانے کے چکر میں تھا۔ ظاہر ہے، بات صرف ''قابلِ اعتراض'' مناظر کی تھی، اس سے پہلے کا تو میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔
''تو پھر کروں فون؟''
''بسم اللہ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور طالوت نے ریسیور اُٹھالیا۔ پھر اس نے روشیلا کے نمبر ڈائل کئے اور دوسری طرف سے ایک زنانی آواز سنائی دی۔
''ہیلو!''
''مس روشیلا موجود ہیں؟''
''کون صاحب بول رہے ہیں؟''
''رانا عزیز الدین۔''
''میں معلوم کرتی ہوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور چند ہی لمحات کے بعد روشیلا کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔
''رانا صاحب........؟''
''رانا عزیز الدین ہی بول رہا ہوں۔''
''میں آپ سے ناراض ہوں رانا صاحب!'' روشیلا نے روٹھی ہوئی آواز میں کہا۔
''اسے اپنی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں؟'' طالوت نے جواب دیا۔
''بدقسمت تو میں ہوں، جو آپ کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ لیکن آپ میرا پیغام ملنے کے بعد بھی مجھ سے نہ ملے۔''
''میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں سب لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ کیا سوتے میں انسانی جسم بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں؟''
''کیا مطلب؟'' روشیلا تعجب سے بولی۔
''دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ ہم روئی والا کی کوٹھی میں، اپنی خواب گاہ میں موجود نہیں تھے۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ ناوقت نیند آ گئی تھی اور بس۔''
''ارے۔ لیکن میں نے خود آپ کی خواب گاہ میں جھانکا تھا۔ اور پھر پوری کوٹھی میں آپ کو تلاش کرتی پھری تھی۔''
''میں اس سلسلے میں اور کچھ نہیں کہوں گا، سوائے اس کے کہ ہمارے ساتھ مناسب سلوک نہیں ہوا۔'' طالوت نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔
''اوہ........ تو کیا روئی والا نے آپ سے بھی کوئی بدتمیزی کی ہے؟''
''نہیں مس روشیلا! مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ممکن ہے، میں بہت جلد آپ کا شہر چھوڑ دوں۔''

''رانا صاحب!........ رانا صاحب!........ سنیئے تو سہی رانا صاحب! میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں، ابھی اور اسی وقت........ براہِ کرم آپ اب روئی والا کی کوٹھی سے نکل آیئے۔''

''میں روئی والا کی کوٹھی سے نکل آیا ہوں۔''

''اوہ........ کیا مطلب؟........ کہاں سے فون کر رہے ہیں؟''

''دلشاد........ روم نمبر ایک سو آٹھ۔''

''مائی گڈنس۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔ میرا انتظار کریں۔'' روشیلا نے کہا اور فون بند کر دیا۔ طالوت نے بھی ایک گہری سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔

''آ رہی ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''مبارک........!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار! تم ناراض تو نہیں ہو گئے؟ میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے......'' طالوت کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں اور دفعان ہو رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔ میں کمرے سے باہر نکل گیا، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ طالوت اور روشیلا کی ابتدائی گفتگو ضرور سنوں گا۔ چنانچہ میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں بظاہر لباس وغیرہ تبدیل کر کے لیٹ گیا تھا لیکن میرے کان باہر ہونے والی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرے کی چابی کے سوراخ سے کوئی اندر جھانک رہا ہے۔ نائٹ بلب روشن تھا۔ طالوت کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ بدمعاش اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ میں سو گیا، یا جاگ رہا ہوں۔ بہر حال، میں سوتا بنا رہا۔ اور پھر ہلکی سی قدموں کی چاپ دُور ہو گئی۔ تب میں خاموشی سے اٹھا، شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھا اور بہ آہستگی باہر نکل آیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ لیکن میرا اندازہ درست تھا۔ میں ٹھیک وقت پر باہر نکلا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لفٹ سے روشیلا باہر نکل آئی۔ ایک پورٹر نے کمرہ نمبر ایک سو آٹھ کی طرف اس کی رہنمائی کر دی تھی۔

دستک پر طالوت نے دروازہ کھولا۔ تب مجھے شاہ دانہ کے دوشالے کی ایک اور خاصیت معلوم ہوئی، اس میں محفوظ ہونے کے لئے ضروری نہیں تھا کہ میں اتنی ہی جگہ سے اندر داخل ہو سکوں، جتنی میری جسامت ہے۔ میں طالوت کی ٹانگوں کے درمیان سے بھی آسانی سے نکل گیا تھا۔ گویا دوشالہ اوڑھنے کے بعد جسامت کی قید نہیں رہتی تھی۔

روشیلا اندر داخل ہو گئی اور طالوت نے دروازہ بند کر دیا۔ روشیلا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ ایک جگہ کھڑی طالوت کو گھور رہی تھی۔

''کیا بات ہے مس روشیلا! آیئے........ اندر آیئے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پہلے مجھے یہ بتایئے رانا صاحب! کہ آپ نے مجھے اس قابل کیوں نہیں سمجھا کہ روئی والا کے مکان سے نکلنے سے قبل مجھے فون کر لیتے۔''

''دراصل مس روشیلا! روئی والا کی کمینگی کے بعد میری جرأت نہ ہوئی کہ کسی اور سے رابطہ قائم کروں۔''

''کیا کمینگی کی اُس نے؟'' روشیلا چونک کر بولی۔

''کچھ نہیں۔ صرف ہمارے اوپر ڈاکہ زنی کا الزام لگایا ہے۔ پانچ لاکھ روپے نقد اور کچھ زیورات وغیرہ۔''

''اوہ......وہ کمینہ......وہ کمینہ.....'' روشیلا دانت پیس کر بولی۔

''جانے دو، روشی! اسے اس کی کمینگی کی سزا ضرور ملے گی۔ میں ان لوگوں کو معاف نہیں کروں گا، جنہوں نے میرے خلاف سازش میں حصہ لیا ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''روئی والا بے حد کمینہ ہے۔ لیکن تم سب کو ایک ہی خانے میں نہ تولو، ڈارلنگ! میں تو تمہاری دیوانی ہوں۔ میں نے تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ میں تمہارے لئے مناسب انتظام کرلوں۔ بس اتنی سی دیر میں سب کچھ ہو گیا۔''

''اوہ......تم نے میرے لئے کیا انتظام کیا ہے؟''

''وہ نانی...... کمبخت نہ جانے کیوں زندہ ہے ابھی تک۔ بس وہ سب کی طرف سے مشکوک ہے۔ پیسے کی لالچی ہے۔ میں نے اسے موٹی رقم دی، تب جا کر تیار ہوئی۔''

''میں تمہیں اس کے بدلے میں دس گنا رقم دوں گا، روشی! دولت کی فکر مت کرو۔''

''مجھے تو بس تمہاری فکر ہے۔ اور کس بات کی فکر ہوسکتی ہے مجھے؟'' روشیلا نے طالوت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے گرا دیا۔

اسی وقت میرے کان میں ایک سرگوشی سنائی دی۔

''اس کے بعد یہاں رُکنا مناسب نہیں ہے محترم عارف صاحب!''

اور میں بری طرح چونک پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، راسم میرے نزدیک کھڑا تھا۔

''اوہ.....تم؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تشریف لائیے۔'' راسم نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ دوسرے لمحے میں اپنے کمرے میں تھا۔ یقیناً یہ طالوت کی بدمعاشی تھی۔ اس نے راسم کو ہدایات دے دی ہوں گی اور راسم میری چوکیداری کر رہا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں خود بھی وہاں نہیں رُکنا چاہتا تھا۔ اس لئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ لیکن دوسری صبح روشیلا ناشتے میں ہمارے ساتھ تھی۔

''اوہ......مس روشیلا! آپ کب تشریف لائیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس صبح ہی صبح۔ پتہ معلوم کر کے آ گئی۔'' طالوت نے مجھے آنکھ مار کر ایک مخصوص اشارہ کیا اور بولا۔

''مس روشیلا بضد ہیں سیکرٹری! کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں اور ہم ان کے ساتھ ہی قیام کریں۔''

میں طالوت کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ طالوت نے ایک بار پھر ہونٹ سکوڑ لئے۔ گویا روشیلا سے بیزاری کا اظہار کر رہا تھا۔ اور میں اس کی بات بخوبی سمجھ گیا۔ اور میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

''سیٹھ روئی والا کے روّیے کے بعد بھی آپ اس بات پر غور کریں گے، رانا صاحب؟'' میں نے لشک سے انداز میں کہا۔

''سیٹھ روئی والا میں اور مجھ میں فرق ہے گولر بھائی!'' روشیلا نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

''جی ہاں......وہ فرق مجھے معلوم ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟......کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" روشیلا تنک کر بولی۔
"بس......میری زبان نہ کھلوایئے مس روشیلا!......میں آپ دونوں کے فرق کو بخوبی جانتا ہوں
آپ میں اور روئی والا میں ایک لاکھ اور چار لاکھ کا فرق ہے۔ آپ کی حیثیت صرف ٹوکٹی پرسنٹ ہے۔"
ایک لمحے کے لئے روشیلا کا چہرہ فق ہو گیا۔ لیکن اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اچانک اس کی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ طالوت کے کندھے پر سر رکھ کر روتی ہوئی بولی۔
"ڈارلنگ! تم میری توہین برداشت کر رہے ہو۔ تمہارا سیکرٹری کیا کہہ رہا ہے؟"
"سیکرٹری! کیا کہہ رہے ہو آخر؟ کھل کر کیوں نہیں کہتے؟" طالوت نے کڑک کر کہا۔
"حضور رانا صاحب! جو کچھ عرض کر رہا ہوں، درست ہی ہے۔ خود سیٹھ روئی والا نے مجھے بتایا تھا۔
اس نے دس پرسنٹ کی آفر مجھے بھی دی ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے مس روشیلا کے ذریعے آپ کو پھانسا
ہے۔ پانچ لاکھ میں سے ایک لاکھ روشیلا کا ہے اور حضور رانا صاحب! میں نے ان دونوں کی گفتگو بھی سنی
ہے۔ کہیے تو لفظ بہ لفظ دہراؤں؟ کیوں مس روشیلا! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ سیٹھ روئی والا نے اس وقت
ڈاکہ زنی کی اداکاری نہیں کی، جب آپ نے چلتے وقت ان سے ایک لاکھ کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ کو معلوم
نہیں، میں رانا صاحب کا دوست بھی ہوں۔ میں ان کے سارے مفادات کی نگرانی کرتا ہوں۔ چنانچہ میں
نے آپ کی اور ان کی گفتگو ٹیپ بھی کر لی ہے۔"
"یہ......یہ جھوٹ ہے رانا صاحب! آپ کا سکرٹری جھوٹ بول رہا ہے۔" روشیلا نے گھبرائے ہوئے
انداز میں کہا۔
"سیکرٹری میں یہی ایک خوبی ہے مس روشیلا! وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں تو آپ پر کروڑوں خرچ
کرنے کو آمادہ تھا، لیکن آپ نے اپنی قیمت بہت کم لگائی۔ میرا خیال ہے، آپ ناشتہ کر کے فوراً یہاں سے
نکل جائیے۔ ورنہ میں آپ کی آوازوں کا ٹیپ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"
روشیلا جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ناشتہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔
اب اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ کہتی بھی تو کیا۔ ساری پول کھل گئی تھی۔ طالوت نے ایک قہقہہ
لگایا اور میری پشت تھپکتے ہوئے بولا۔ "یار! بڑی خوبیوں کے مالک ہو۔"
"بندہ پروری ہے حضور نواب صاحب! لیکن خادم سے کیا عقل مندی سرزد ہوئی ہے؟" میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔
"موقع شناسی......فوراً میرا مقصد سمجھ گئے۔ درحقیقت مجھے اس عورت سے کوفت ہونے لگی تھی اور
میں اسے بلا کر اپنی حماقت پر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔
"کیوں......خیریت؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"یار! عورت پن نام کو نہیں ہے۔ انتہائی لچر انداز ہے۔ اس کی موجودگی میں خود مجھے اپنی مردانگی پر
شک ہونے لگتا ہے۔ مجھے ایسی عورتوں سے نفرت ہے۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ کوئی ایسی
کوشش کی جائے کہ اب وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ میرا خیال ہے، ہم کامیاب ہو چکے ہیں۔" طالوت نے
جواب دیا۔
میں ہنستا رہا۔ "بہرحال، معلوم ہوتا ہے رات سخت گزری ہے۔"

''بس یار! یاد نہ دلاؤ...... نہ جانے کس طرح برداشت کیا ہے۔ یوں سمجھو، اپنی حماقت کی سزا بھگتتا رہا ہوں۔''

''خیر...... خیر فی الحال وہ نہیں آئے گی۔ لیکن اسے لکھ لو، پیچھا بھی نہیں چھوڑے گی آسانی سے۔''

''نہیں، اب میں خود پیچھا چھڑا لوں گا۔ کم از کم ایک بات تو سامنے آ گئی ہے۔ اب وہ کس منہ سے اظہارِ اُلفت کرے گی؟''

''اسی منہ سے، جس سے وہ سب کے سامنے فلمی ہیرو سے کرتی ہے۔''

''اونہہ...... میں ہیرو نہیں، ولن ہوں۔ چلو ناشتہ کرو۔ اس کی موجودگی میں، میں نے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ اور سچ پوچھو عارف! تو یہ بھی میں نے اس سے انتقام لیا ہے۔ اُلّو کی پٹھی نے ایک لاکھ کی حیثیت مجھ سے زیادہ سمجھی تھی اور اپنی دانست میں مجھ کو بے وقوف بنایا تھا۔''

''بہرحال، مجھے خوشی ہے کہ اب تم زمانہ ساز ہوتے جا رہے ہو۔'' میں نے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔

ٹھیک دس بجے کسی نے طالوت کے دروازے پر دستک دی اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ نوری ہی تھی۔

''ہیلو نورا!'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ نوری نے ہم دونوں کو سلام کیا اور جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

''ہم بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔'' طالوت نے اسے بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

''تعجب ہے۔'' نوری بڑبڑائی۔

''کیوں؟...... اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ نوری نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ ہم دونوں اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''تم نے جواب نہیں دیا نورا!'' طالوت نے کہا۔

''میں...... میں...... اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ صاف صاف گفتگو کر لوں؟''

''اجازت ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ ناشتہ کر چکی ہو یا نہیں؟''

''کر چکی ہوں۔''

''چائے پیئو گی یا کوئی ٹھنڈی چیز؟''

''کسی شے کی حاجت نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ظاہر ہے۔ حاجت مند تو ہم تھے، جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے تمہارے گھر کھانے پہنچ گئے۔'' طالوت نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ نوری نے اس کی شکل دیکھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں اپنی اس خوش قسمتی کو یاد کر کے، تھوڑی دیر کے لئے خوشی حاصل کر سکتی ہوں۔ اسے برقرار رہنے دیجئے۔''

''خیر...... کچھ نہ کچھ کھاؤ پیئو۔ اب وہ صاف صاف گفتگو شروع کر دو۔'' طالوت نے کہا۔

''رانا صاحب! سلیم صاحب!...... خدا نے زمین پر انسانوں کی پیدائش کی جس مصلحت سے کی، وہ کُلی طور پر ہماری یا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آ سکتی، اس لئے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ اس میں مصلحت ضرور پنہاں ہو گی۔ اس نے انسانوں کو ایک انداز میں، ایک جیسا پیدا کرنے کے بعد ان کی حیثیت میں تخفیف کی۔ اس پر بھی

ذہن تردّد کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن انسانی ذہن کو اتنا ہی کچھ دیا گیا ہے، جتنی ضرورت سمجھی گئی۔ اس لئے اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو اسے بھی مصلحت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ہاں، عام سی باتیں ذہن میں ضرور آ سکتی ہیں اور ان سے انکار ایک احمقانہ کوشش ہے، جس کا سر پاؤں نہیں۔"

نوری چند لمحات کے لئے رکی۔ ہم اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"قدرت نے یقیناً تمام کارخانے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ انسانوں کو یوں تو بہت سے درجے دیئے گئے ہیں، لیکن ان میں خالص دنیاوی دو درجے ہیں۔ امیر اور غریب۔ فلاسفروں اور دوسرے لوگوں نے یوں کہہ کر دل کی تسلی کر لی ہے کہ انسان اپنی ذات، اپنی فطرت سے بڑا ہوتا ہے، دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ خیال کی عظمت ہے، خوب صورت الفاظ ہیں۔ لیکن ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی شخص صرف ذات کی عصمت سے اعلیٰ حیثیت نہیں حاصل کر سکتا۔ وہ لوگ جو فطرتاً بھی عظیم ہیں اور دولت مند بھی، وہ یقیناً عام انسانوں سے ارفع ہیں۔ رانا صاحب! میں نے دکھوں اور تنگدستی میں آنکھ کھولی ہے۔ زندگی کے کسی دور میں ہم نے خود کو مکمل عیش و عشرت میں نہیں پایا۔ تاہم چند لمحات سکون کے ضرور میسر ہوئے ہیں۔ میری ذہنی پرورش اسی ماحول میں ہوئی ہے، جس میں، میں آج تک ہوں۔ اس لئے جب مجھے کوئی ٹھکراتا ہے، دھتکارتا ہے یا کسی اور طریقے سے پریشان کرتا ہے تو مجھے قطعی حیرت نہیں ہوتی۔ میں جانتی ہوں کہ قدرتی طور پر میری یہی حیثیت متعین کی گئی ہے اور مجھے یہ حیثیت قبول کرنی چاہئے۔ بابو خان سے پہلے بھی بہت سی بری نگاہوں نے مجھے چھوا ہے۔ میں مدافعت کرتی رہی ہوں۔ اور میرا حق ہے۔ لیکن کہیں بھی، کسی بھی حالت میں میری مدافعت شکست بھی کھا سکتی ہے۔ میں اس شکست کو بھی اپنی حیثیت سمجھ کر قبول کر لوں گی۔ اور چند روز کے دکھ کے بعد مجھے کوئی احساس نہیں رہے گا۔ تو رانا صاحب! آپ صاحبِ ثروت ہیں۔ میری جو حیثیت ہے، کچھ میں نے اس وقت بتائی ہے، کچھ کا اندازہ آپ نے میرے گھر سے لگا لیا ہوگا۔ کل کے کھانے کی آپ نے مناسب قیمت ادا کر دی تھی۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ میں نے کچھ روپے بمشکل تمام قرض حاصل کر کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے سو روپے کے نوٹ سے سب کے قرض ادا کر دیئے۔ میرے پاس کچھ روپے بچ گئے ہیں، جنہیں اگر آپ چاہیں تو بخشش کے طور پر مجھے دے دیں۔ واپس لینا چاہیں تو پیشِ خدمت ہیں۔ میرے لئے یہ منافع کافی ہے کہ آپ جیسے عظیم لوگوں نے مجھ سے کوئی کام لے کر مجھے عزت بخشی۔ ہاں، اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اس توجہ کی وجہ بتا دیں، جو آپ مجھ پر دیتے رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ سیکرٹری صاحب نے بھرے منہ سے مجھے بہن کہا ہے، ان کی حیثیت پر تو ابھی تک مجھے شبہ نہیں۔ حالانکہ بہت سی زبانوں سے میرے لئے یہ لفظ نکلا ہے۔ خود بابو خان نے بھی ایک بار ابا میاں کے سامنے مجھے بہن کہا تھا، لیکن بہرحال! ہر لفظ ایک حاجت ہوتا ہے۔ رانا صاحب! اگر میں آپ کو پسند آ گئی ہوں، اگر آپ مجھے کھلونا بنانے کے خواہش مند ہیں تو کیا مجھے ایک درخواست کرنے کا حق دیں گے؟" اس نے خاموش ہو کر ڈبڈبائی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور جب ہم کچھ نہ بولے تو کہنے لگی۔

"ابھی میں زندگی سے جدوجہد کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ عورت ہوں۔ عورت مرد کے لئے ہے اسے ایک نہ ایک دن مرد کے بستر کی زینت بننا ہے۔ خواہ اپنی مجبوری یا ضرورت کے تحت...... یا

پھر...... اگر خوش بخت ہو تو عزت واحترام اور مذہب کے اجازت کے ساتھ۔ رانا صاحب! ضمیر میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے، ابھی کچھ آرزوئیں سسک رہی ہیں، انہوں نے دم نہیں توڑا۔ جب یہ آرزوئیں آخری سانس لے کر دم توڑ دیں گی تو خود کو دنیا کے حوالے کر دوں گی۔ اور اس وقت کسی کو اپنے قریب آنے سے نہیں روکوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں رانا صاحب! کہ جب مجھے آرزوؤں کی لاش نظر آ جائے گی تو سب سے پہلے اپنے آپ کو...... آپ کے ہی حوالے کروں گی۔ میرا وعدہ ہے رانا صاحب!"

اس دوران میں نے طالوت کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھ لیتا تو یقیناً مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو جاتا۔ میں تو اس وقت چونکا، جب طالوت نے غرّاتے ہوئے اچانک جھپٹ کر نوری کے بال پکڑ لئے۔

"تجھے کس نے یہ حق دیا ذلیل! کہ تُو انسانوں کو اس قدر نیچ سمجھے...... بول، ہم نے تیرے ساتھ کون سا برا سلوک کیا ہے؟ تیری سوچ اس قدر ذلیل ہے، گمان بھی نہیں تھا۔" طالوت نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا اور نوری قالین پر جا پڑی۔

"طالوت......!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ اس نے انسانیت کی اس قدر گھناؤنی تصویر دکھائی ہے کہ....." طالوت پھر اس کی طرف بڑھا۔ لیکن میں اس کے راستے میں آ گیا۔ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔

"یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ ہماری دنیا کی باتیں ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور جو باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، ان کے بارے میں تم کوئی اقدام نہیں کرو گے۔"

"اس نے ہمیں کتنی گالیاں دی ہیں، تمہیں ان کا احساس نہیں ہے؟" طالوت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس کے خیالات درست ہیں۔ کاش تم اس کا وہ لہجہ سنتے، جب بابو خان اس کی عصمت کے درپے تھا اور یہ اس سے اپنی ملازمت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کا یہی حاصل ہے طالوت! ہمارے ہاں عورت ایسی ہی مظلوم ہے۔"

"مگر ہم نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ ہم نے تو اس سے کچھ بھی نہیں چاہا۔ ہم نے تو اس کی نسائیت کی کوئی توہین نہیں کی۔" طالوت کراہا۔

"ہمارے جیسے دوسرے انسانوں نے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے، یہ ہماری اندرونی کیفیت سے کب واقف ہے؟" میں نے کہا اور طالوت اعتدال پر آ گیا۔

"تو کیا...... تو کیا مجھ سے غلطی ہوئی ہے؟" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہیں۔ یہ بے چاری اگر اس کی عادی بھی نہ ہوئی ہو گی تو اب ہو جائے گی۔" میں نے کہا اور طالوت کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ گیا اور اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر نوری کے پاؤں پکڑ لئے۔

"مجھے معاف کر دے میری بہن! میری نوری! مجھے معاف کر دے۔ میں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے معاف کر دے۔"

نوری نے جلدی سے پاؤں سکوڑ لئے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار تھے۔ وہ پھٹی پھٹی

نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر بے پناہ خوشی اُبھر آئی۔ اس کا چہرہ ایک انوکھے رنگ میں چمکنے لگا۔ اور پھر اس نے طالوت کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میرے منہ پر اتنے تھپڑ مارو بھیا! کہ میری شکل بگڑ جائے۔ مجھے مار مار کر لہولہان کر دو۔ لیکن اللہ کے واسطے، مجھے یہ بالکل سچ سچ بتا دو کہ کیا نوری تمہاری بہن بننے کے لائق ہے؟...... کیا میں اس قابل ہوں کہ کوئی میری طرف توجہ دے؟...... مجھے بتاؤ، میں کیوں اس قابل ہوں۔ میں نے خود کو زندگی بھر سڑک پر پڑا ہوا ایک پتھر سمجھا ہے۔ اچانک میری حیثیت کیوں بدل گئی؟ میرے اندر کون سی تبدیلی ہوئی ہے؟'' نوری طالوت کو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

''نوری!...... نوری! آؤ بیٹھو...... آؤ نوری! ہم دونوں، ہم تینوں ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتائیں۔ ہم لوگ اپنی تسلی کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن نوری! مجھے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ برا سلوک کروں۔ اس کے لئے مجھے معاف کر دو نوری!''

''تمہارے اس تھپڑ نے ہی تو مجھے تمہارے خلوص کا یقین دلایا ہے بھیا! تمہارے تھپڑ نے ہی تو میری ڈھارس بندھائی ہے۔ اب میں تمہارے سامنے بے شرمی کی باتیں کبھی نہ کروں گی۔ اب میں ایک بے سہارا، آوارہ قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔ اب میں ایکسٹرا گرل نہیں ہوں، جسے اسٹوڈیو کے چپراسی سے لے کر مالک تک لوٹ کا مال سمجھتے ہیں۔ اب میں ایک باحیثیت عورت ہوں۔ بھیا! تم مجھے چاہے جتنے تھپڑ مار لو، لیکن میرے اس تصور کو نہ توڑنا کہ اچانک میں بڑی بن گئی ہوں۔'' نوری نے لجاجت سے کہا اور طالوت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ ہم انسان جذبات سے کسی طور خالی نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنی کیفیات بدل لی ہیں۔ ہم سخت بے حس ہو گئے ہیں۔ ہم نے جدید بننے کی کوششوں میں خود پر نہ جانے کتنے لبادے ڈال لئے ہیں۔ لیکن ایک وقت ہوتا ہے، جب ہماری اصلیت اُبھر آتی ہے۔ اور اس وقت ہم معمولی انسان ہوتے ہیں۔ حقیقی انسان ہوتے ہیں۔

''میں پھر بھی تم سے معذرت خواہ ہوں نوری! لیکن ہمارے خلوص، ہماری محبت پر بھروسہ کرو۔ ہم تم سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے رہے۔ بس انہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ انہوں نے اس وقت تمہاری اور بابو خان کی گفتگو سنی تھی، جب بدمعاش بابو خان، شراب کے نشے میں انسانیت کے رشتے بھول گیا تھا اور تم اس سے اپنی عزت کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ اپنی نوکری کا تحفظ مانگ رہی تھیں۔ نوری! انہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا اور ہم نے تمہیں بہن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری آج تک کی توجہ صرف اسی لئے تھی۔ یقین کرو، اس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔''

''میں بھی بے قصور ہوں بھیا! میں نے دنیا کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے۔ حرص و ہوس سے لبریز۔ کوئی بے مقصد کسی سے بات نہیں کرتا۔ کہیں جنس کی طلب ہے، کہیں دولت کی۔ تم کہاں سے آئے ہو بھیا! مجھے نہیں معلوم، میں تو اس نیکی کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، جس کے عوض تم مجھے ملے ہو۔''

میں خاموش تھا۔ جب وہ دونوں جذبات میں ڈوب کر خاموش ہو گئے تو میں نے نوری سے کہا۔

''نور! وعدہ کرو کہ اب ہمیں جھوٹا نہیں سمجھو گی۔''
''نہیں سلیم بھیا!...... کبھی نہیں۔ خدا کی قسم، کبھی نہیں۔'' نوری نے خلوص سے کہا۔
''اور خود بھی کسی معاملے میں جھوٹ نہیں بولو گی۔''
''وعدہ بھیا! آپ نوری کو جھوٹا نہیں پائیں گے۔''
''ناشتہ کر کے آئی ہو؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔
''نہیں۔'' اس نے شرمائے ہوئے انداز میں گردن ہلا دی۔
''ہوں۔'' طالوت کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھنٹی بجا کر ویٹر کو بلایا اور اسے ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ نوری کی گردن شرم سے جھکی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ صرف چند منٹ قبل اس کے چہرے پر عجیب سی خشکی اور بے نوری تھی، لیکن اب ایک عجیب سی جاذبیت اور ملاحت پیدا ہو گئی تھی جیسے اسے اچانک سکون مل گیا ہو۔ جیسے منزل سے مایوس مسافر کو غیر متوقع طور پر نشانِ منزل مل گیا ہو۔ یہ اس لڑکی کی سادگی تھی، اس نے ان اجنبیوں پر بھروسہ کر لیا تھا۔
اس کے بعد اس وقت تک خاموشی رہی، جب تک ویٹر ناشتہ لے کر نہ آ گیا۔
''شروع کرو نور!'' میں نے کہا اور ہم دونوں بھی اس کے سامنے کھسک آئے۔
''آپ بھی لیں بھیا!'' نوری نے شرمائی ہوئی آواز میں کہا۔
''ہم دونوں ناشتہ کر چکے ہیں۔ تم ہمارے لئے چائے بنا دو۔'' میں نے کہا اور نوری نے بڑی نفاست سے ہمارے سامنے چائے بنا کر پیش کر دی۔ نوری خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔ اور پھر وہ ناشتے سے فارغ ہو گئی۔ اور پھر برتن ایک طرف سرکا دیئے گئے۔
''نور!'' طالوت نے چند منٹ کے بعد اسے مخاطب کیا۔
''جی بھیا!''
''میرا خیال ہے، اب تمہارے ذہن میں ہماری توجہ نہیں کھٹک رہی ہو گی۔ اس لئے ہم اس سے آگے کی گفتگو شروع کر دیں؟''
''جی بھیا!'' نوری نے اسی معصومیت سے کہا۔
''یہ طے ہو چکا کہ اب تم صرف ننھے سے صفدر کی بہن نہیں ہو، بلکہ ایک چھوٹے اور دو بڑے بھائیوں کی بہن ہو۔ اور جب بڑے بھائی موجود ہوتے ہیں تو بہنوں پر کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی۔ اس لئے آج سے تم گھر سے باہر کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو۔''
''بھیا......!'' نوری نے بڑے جذباتی انداز میں کہا اور اس کی گردن کچھ اور جھک گئی۔
''ہم جو کچھ کریں گے، ہمارا فرض ہو گا۔ اس میں تمہیں مداخلت کی اجازت نہیں ہو گی۔ بس آج تم سے یہی گفتگو کرنی تھی۔ گھر کیا کہہ کر آئی ہو؟''
''ابا میاں کو بتا کر آئی ہوں کہ آپ لوگوں کے پاس جا رہی ہوں۔''
''پوچھا ہو گا، کیوں؟''
''ہاں...... آپ لوگوں کے چلے آنے کے بعد گفتگو ہوئی تھی۔ عبدل بھائی نے بتا دیا تھا کہ روئی والا نے مجھے بابو خان کی وجہ سے نوکری سے نکال دیا ہے۔ ابا میاں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے بتا

دی۔ ابا میاں ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ رات بھر نہیں سو سکے۔ شاید روئے بھی تھے۔ لیکن صبح کو انہوں نے مجھے دلاسے دیئے۔ ہاں، جب میں نے ان سے آپ کے پاس آنے کے لئے کہا تو انہوں نے سختی سے منع کیا۔ میں نے ان سے بحث کی اور کہا کہ بہرحال مجھے ملازمت کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے، ان بڑے آدمیوں نے مجھے کسی ملازمت کے لئے منتخب کیا ہو۔ ابا میاں مخالفت کرتے رہے، پھر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اگر میری عزت کو خطرہ درپیش ہو تو جان دے دوں، لیکن عزت نہ جانے دوں۔ یہ دنیا بے مطلب کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ آج......آج بھیا! صفدر بھی اسکول نہیں گیا ہے۔ وہ معصوم کہہ رہا تھا کہ اب وہ نہیں پڑھے گا اور کوئی چیز فروخت کر کے گھر کا خرچ چلائے گا۔ اس نے بھی معصومیت سے کہا تھا کہ باجی! جب ابا رو رہے ہیں تو تم نوکری کی تلاش میں کیوں جا رہی ہو؟'' نوری کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

''ہاں نور!...... وہ ایک غیرت مند باپ ہیں۔ حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کا اضطراب بجا ہے۔''

''ابا میاں کہہ رہے تھے کہ جب بابو خان، جس کو انہوں نے اپنی عزت کا محافظ سمجھا تھا، جسے انہوں نے بڑے بڑے واسطے دیئے تھے، اتنا گندا نکل سکتا ہے......اب تو......اب تو صفدر پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔'' نوری نے روتے ہوئے بتایا۔

''بے شک نوری! ان کے احساسات درست تھے۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ غریب کو عزت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ وہ بہن، بیٹیوں کی زندگی کی نزاکت جانتا ہے۔ غریب کسی حد تک بھروسے کے قابل ہوتا ہے، جب اس سے ہی بھروسہ اُٹھ جائے تو پھر دولت مندوں کا کیا ٹھکانہ، وہ تو کچھ بھی کر لیں، ان کی عزت محفوظ ہوتی ہے۔''

''بس کرو نور!......بس کرو۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں ہے۔ جاؤ نور بہن!......اپنے محترم باپ کو سمجھاؤ۔ ان سے کہو، دولت انسانیت کی کسوٹی نہیں ہے۔ انسان ہر حال میں انسان ہے، بشرطیکہ وہ انسانیت کا احساس رکھتا ہو۔ بس اب تم جاؤ نوری بہن! شام کو ہم گھر آئیں گے۔ اور ہاں......رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم ہمارے لئے کیا پکاتی ہو؟''

''میں انتظار کروں گی بھیا!'' نوری اُٹھتے ہوئے بولی۔

''گھر کے خرچ کے لئے کچھ پیسے رکھ لو نوری! اس کے بعد تمہیں یہ زحمت نہیں اُٹھانی پڑے گی۔ ہم خود گھر کا نظام سنبھالیں گے۔ لو، یہ رکھ لو۔''

میں نے سو سو کے دو نوٹ نوری کے پرس میں رکھ دیئے۔

''پیسے تو میرے پاس تھے بھیا!'' نوری نے کہا۔

''رکھ لو۔ کسی بھی معاملے میں مداخلت مت کرو۔''

''بہت اچھا بھیا!'' نوری نے کہا اور پھر وہ ہم دونوں کو سلام کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد طالوت کافی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔

''کیا سوچ رہے ہو طالوت؟'' میں نے پوچھا۔

"یار! بعض اوقات تو تمہاری دنیا سے بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ بڑی بھیانک جگہ ہے۔ انسان کو یہاں کیسے کیسے روپ دے دیئے گئے ہیں، کیسی کیسی مجبوریاں اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہیں۔ میں نے اس مظلوم لڑکی کے ساتھ زیادتی کی، اس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں نے تمہارے جذبات کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے عارف! میں اس کے لئے بھی شرمندہ ہوں۔"

"نہیں طالوت! ابھی تم میری دنیا کے بہت سے پہلوؤں سے اجنبی ہوں۔ میں نے بھی تمہارے ساتھ گستاخی کی ہے، جس کے لئے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"ارے نہیں میرے دوست! میری طرف سے کھلی اجازت ہے، میری کسی غلطی پر تم مجھے سرزنش کر سکتے ہو۔" طالوت نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری فطرت سے بخوبی واقف ہو گیا ہوں، طالوت! جو کچھ تم کہہ چکے ہو، اس کے بعد بار بار تم سے کہلوانا حماقت ہی ہے۔ بہرحال ابھی بہت سے ایسے دور آئیں گے، جب ہمیں عجیب وغریب حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ اور میری درخواست ہے کہ میری غلطی پر مجھ سے بددل مت ہو جانا۔ بلکہ میری اصلاح کر دینا۔"

"میری تو اب پوری زندگی تم سے وابستہ ہے طالوت! میں تم سے کس طرح بددل ہو سکتا ہوں؟ بہرحال، کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے کچھ غلط لمحات بھی آ جائیں تو ہم خوش اسلوبی سے انہیں ٹال دیں گے۔"

"یقیناً..... اس سے جو روحانی خوشی نصیب ہوتی ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔"

"روشیلا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ تمام مدارج سے گزری ہوئی عورت ہے۔ ہم صرف ان لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں، جن کے ضمیر میں تھوڑی بہت بھی زندگی باقی ہے۔ جس کے پہلو میں ضمیر نام کی کوئی شے ہی نہ ہو، اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ روشیلا کے لئے اتنا ہی کافی ہے، اب وہ کسی حیثیت سے ہمیں قبول نہیں ہے۔ آئندہ اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا جائے گا۔"

"سیٹھ روئی والا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اس گدھے کے لئے بھی یہی سزا کافی ہے۔ ویسے اس سے بھی ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔ میرے خیال میں اس کے حواس درست کرنے کے لئے پانچ لاکھ کی دھمکی کافی ہوا کرے گی۔ ہاں، عارف! ایک کام اور کرنا ہے۔"

"کیا؟"

"جن لوگوں کے زیورات اور کاغذات ہمارے پاس ہیں، انہیں وہ واپس پہنچانے ہیں۔ اُن کے لئے کیا کیا جائے؟ کیا ایک ایک کے گھر چلو گے؟"

"یہ تو مناسب نہ ہوگا۔ ایسا کرتے ہیں کہ ایک مناسب مضمون کے خطوط ٹائپ کراتے ہیں، جن میں انہیں اطلاع دیں گے کہ ان کی جان سیٹھ روئی والا سے چھڑا دی گئی ہے۔ اور وہ اس کے چکر سے نکل چکے ہیں، چنانچہ ان کے رہن کے کاغذات اور زیورات وغیرہ حاضر ہیں۔ اب وہ خود کو روئی والا سے آزاد

سمجھیں۔ اگر وہ کسی قسم کی دھمکی دے تو اسے خاطر میں نہ لائیں۔ اس کے ساتھ ہی جس کا جو سامان ہے، اس کے پیکٹ بنا کر احتیاط سے ان لوگوں کو پارسل کر دیں۔"

"بہترین۔ بہت عمدہ خیال ہے۔" طالوت نے میری رائے پسند کی اور اس بات کا بھی فیصلہ ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ عبدل بھائی تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ چند اور لوگ بھی تھے۔ عبدل بھائی نے سلام کیا۔ اور پھر ایک خوش لباس نوجوان سے تعارف کراتے ہوئے بولے۔

"یہ ڈی لکس موٹر کے سیل آپھیسر (آفیسر) جمور کھاں (ظہور خاں) ہیں رانا صاحب! میں نے انہیں ایک ہجار بیعانہ دے دیا ہے۔ موٹر اور اس کے کاگجات (کاغذات) لے آئے ہیں۔ باقی مال میں نے بولا کیس مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، کتنی رقم ادا کرنی ہے؟" طالوت نے پوچھا۔

"ایک لاکھ دس ہزار جناب!" نوجوان نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کو ابھی کیش کی ادائیگی کر دی جائے گی۔"

"میرا نام جی۔ بی چوپڑہ ہے سیٹھ! عبدل بھائی میری کوٹھی خریدنے کو بولا۔ میں نے عبدل بھائی کو کوٹھی دکھا دیا۔ یہ پسند کیا تو آپ بھی پسند کر لو جی، تا کہ سودا ہو جائے۔"

"عبدل بھائی!" طالوت نے عبدل بھائی کو پکارا۔

"جی رانا صاحب!"

"آپ نے کوٹھی دیکھ لی؟"

"جی۔"

"پسند آئی آپ کو۔"

"اے کلاس کوٹھی ہے جی۔ سمندر کے پاس۔ ایک دم فس کلاس ویو ہے۔ میرے کو بوہت پسند آیا صاحب! آپ کو بھی جرور پسند آئے گا۔"

"کیا قیمت مانگتے ہیں چوپڑہ صاحب؟"

"اٹھارہ لاکھ جی۔ ابھی نئی بنائی ہے۔ ویل فرنسڈ ہے جی۔ کسی چیج کا جرورت نہیں پڑیں گا آپ کو۔"

"آپ کو بھی کیش ادائیگی کرنی ہوگی؟"

"جیسا حکم کرو سیٹھ!" چوپڑہ صاحب نیاز مندی سے بولے۔

"اور آپ......؟" طالوت نے تیسرے آدمی کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس دلنشیں روڈ پر ایک خوبصورت دفتر ہے جناب! عبدل بھائی نے اس کے بارے میں بات چیت کی ہے۔ میں نے اس کے ڈیڑھ لاکھ طلب کئے ہیں۔ آپ دیکھ لیں، آپ کے شایانِ شان جگہ ہے۔ چاروں طرف فلم اسٹوڈیو بکھرے پڑے ہیں۔"

"فرنیچر؟" طالوت نے پوچھا۔

"موجود ہے جناب! چند کمرے آپ کو ڈیکوریٹ کرنے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ عبدل بھائی کو دفتر پسند ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ ٹھہریئے، میں آپ لوگوں کو ادائیگی کئے

دیتا ہوں۔" طالوت نے کہا اور وہ سب حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ اتنی بڑی بڑی رقموں کی اس طرح ادائیگی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن طالوت باہر نکل گیا۔ اور پھر چند منٹ کے بعد وہ ایک وزنی سوٹ کیس لٹکائے اندر آیا، جس میں اوپر تک نوٹوں کی گڈیاں چنی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلے دونوں چھوٹی ادائیگیاں کیں، اس کے بعد چوپڑہ صاحب کو بھی رقم ادا کر دی، جسے وصول کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے کسی کو فون کر کے اپنی مدد کے لئے بلایا۔ یہ ان کا اکاؤنٹنٹ تھا۔

"کوٹھی کی ڈلیوری ابھی لے لی جائے عبدل بھائی! باقی کاغذات وغیرہ آپ کل مکمل کرالیں۔ کل ہی دفتر بھی دیکھ لیا جائے گا۔"

"جو حکم رانا صاب!" عبدل بھائی کانپتے ہوئے بولے۔ ان کی شکل حیرت سے بگڑی ہوئی تھی۔ طالوت نے کسی چیز کو دیکھے بغیر اس کی قیمت ادا کر دی تھی، لیکن کسی کو کیا معلوم، وہ کون تھا۔ اور اس کاغذی دولت کی اس کی نگاہوں میں کیا وقعت ہے۔

باقی لوگ چلے گئے۔ اب صرف عبدل بھائی رہ گئے تھے، جنہیں کوٹھی کی ڈلیوری لینے جانا تھا۔

"شکریہ عبدل بھائی! اب آپ بھی جائیں اور شام تک ہمیں کوٹھی میں منتقل کرنے کا بندوبست کر دیں۔ ہاں، آپ کو رقم کی ضرورت ہوگی۔ کوٹھی مکمل ہونی چاہئے۔"

عبدل بھائی کچھ نہ بولے۔ اور طالوت نے انہیں بھی کاغذ کی کچھ گڈیاں سرکا دیں۔ وہ سلام کر کے چلے گئے۔ تب میں نے مسکراتے ہوئے طالوت سے کہا۔

"جناب نواب عزیز الدین صاحب! ذرا احتیاط سے خرچ کریں۔ ورنہ انسان چیل کوؤں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے۔"

"یار! ضرورت مندوں کا کام اگر ان بیکار کاغذات سے چل جاتا ہے تو میرا کیا نقصان ہے؟" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ بیکار کاغذات حکومت کے خزانے پر بار ڈالتے ہیں۔ ان کی قیمت سونا ہونا ضروری ہے۔"

"وہ بھی پورا کرلیں گے۔" طالوت نے لاپروائی سے کہا۔ "اب بتاؤ، کیا پروگرام ہے؟"

"بس، کام مکمل ہو چکا ہے۔ اب فلم کمپنی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کھلے گی اور ضرور کھلے گی۔ میں نے اس کا نام بھی تجویز کر لیا ہے۔"

"یعنی......؟"

"نور آرٹس پروڈکشن۔" طالوت نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ! تم تو اچھے خاصے بزنس مین ہوتے جا رہے ہو۔"

"بس، محترم عارف صاحب کی کرم نوازی ہے۔" طالوت ہنستے ہوئے بولا اور پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "آؤ، ذرا کار تو دیکھ لیں۔ عبدل بھائی کی پسند کیسی ہے۔"

ہوٹل کی پارکنگ میں ہماری خوب صورت کار کھڑی تھی، جس پر ابھی کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ بلا شبہ یہ ایک حسین کار تھی۔ میں نے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور پھر ہم نے کافی دور تک اس کی ٹرائی لی۔ اور کار ہمیں کافی پسند آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل واپس آ گئے۔

شام کو حسبِ پروگرام ہم اپنی نئی کار میں شاہ پور کالونی پہنچ گئے۔ صفدر میاں دروازے پر ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں کار سے اُترتے دیکھ کر وہ بڑے حیران ہوئے۔ بہرحال انہوں نے ادب سے سلام کیا تھا۔

''تشریف لائیے۔ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' انہوں نے بڑے بالغانہ انداز میں کہا اور طالوت کو ہنسی آ گئی۔ صفدر میاں نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی۔ ''باجی! مہمان آ گئے ہیں......اور بڑی خوبصورت کار میں آئے ہیں۔''

نوری کے والد اُٹھے اور ٹٹولتے ہوئے ہم دونوں کی طرف بڑھے۔ ''آیئے، آیئے نواب صاحب! تشریف لائیے......نورالنساء...... بیٹی نورالنساء!'' انہوں نے آواز دی اور نوری سفید کپڑوں میں ملبوس باورچی خانے سے نکل آئی۔ اس کے چہرے پر ایک انوکھی دمک تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔

''نور! ابا میاں مجھے نواب صاحب کے نام سے پکار رہے ہیں۔ کیا آپ نے انہیں میری حیثیت نہیں بتائی؟''

''بتا دی ہے بھائی جان! لیکن ابا میاں ہر بات پر دیر سے یقین کرنے کے عادی ہیں۔''

بوڑھے کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ پھر وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''آنکھوں سے اندھا ہوں بیٹے! زمانے نے اتنا تجربہ دیا تھا کہ شکلیں دیکھ کر انسان کی کیفیات کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔ لیکن آنکھوں نے وہ تجربہ بھی چھین لیا۔ اب خوف زدہ رہتا ہوں کہ کسی کی حیثیت کے خلاف کوئی بات منہ سے نہ نکل جائے۔ نہ جانے کیسی شکل ہو گی......اس غلیظ منہ سے کسی کو اس کے مرتبے کے لحاظ سے مخاطب نہ کر کے نقصان بھی اٹھا سکتا ہوں۔ نہ جانے ایسی حالت ہے بھی یا نہیں۔''

''آپ ہماری بہن نوری کے والد ہیں، اس لئے ہمارے بھی ہوئے۔ اگر دل چاہے تو یہ اعزاز دے دیں، ورنہ مجبور نہ کر سکیں گے۔'' طالوت نے سنجیدگی سے کہا۔

''اعزاز تو تم نے اس کسمپرسی میں گھرے ہوئے گھرانے کو دیا ہے بیٹے! برا نہ مانو تو یہ کہوں کہ شاید خدا نے میری کوئی دعا قبول کر لی ہے۔ ورنہ تم لوگ ہم بیکار لوگوں پر اس قدر مہربان نہ ہوتے۔''

''جس خدا پر آپ کو اتنا بھروسہ ہے محترم بزرگ! ہم اسی کی ذات کو درمیان میں رکھ کر کہتے ہیں کہ نور بہن ہمیں اپنی سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔ ہمارے خلوص اور محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ آپ اپنے خدا سے سوال کریں کہ آپ کا دل ہمیں کیا تسلیم کرے؟ اگر سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے، ہمارا سچ ثابت ہو جائے گا۔ اور اگر تردّد باقی رہے تو ہمیں آئندہ نہ آنے کے لئے صاف صاف کہہ دیں۔ ہم آپ کو کبھی تکلیف نہیں دیں گے۔'' طالوت نے کہا۔

اور بوڑھا ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس کی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ اور پھر اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اے خدا!......اے خدا! میں نے تیری ذات پر بھروسہ کیا ہے۔ اے خدا!......اے خدا!''

نوری، میں، صفدر اور طالوت خاموش کھڑے تھے۔ اچانک بوڑھے کے چہرے پر شگفتگی اُبھر آئی۔ ''اُس کی ذات کو درمیان میں رکھ کر ہی کہہ رہا ہوں بیٹے! کہ اس اندھے نے تم دونوں پر اعتبار کر لیا۔ اور اب میرے دل میں تمہاری طرف سے کوئی شکوک و شبہات نہیں آئیں گے۔ اگر میں شکوک و شبہات میں

بھی مبتلا رہتا تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا بیٹے! لیکن وہ تمہارے خلوص کا جواب نہ ہوتا۔ مجھ ناچیز کے پاس اعتماد کے تحفے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اسے قبول کرو۔"

طالوت نے گرمجوشی سے بوڑھے کا ہاتھ دبایا۔ اور پھر مونڈھوں پر ہم دونوں بیٹھ گئے اور بڑے میاں چارپائی پر۔

"آپ نے ہمیں اپنا بیٹا سمجھ لیا ہے، ابا میاں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... اب اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میرے سینے پر سے ذمہ داری کی سِل ہٹ گئی ہے۔ کاش! میں تمہیں یہ سکون دکھا سکتا، میرے بچو! جو تمہاری وجہ سے مجھے ملا ہے۔" بوڑھے نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔ میری نور النساء اب بے سہارا لڑکی نہیں ہے، جس کی عزت ہر وقت خطرے میں ہو۔"

"آپ کے بیٹے آپ سے فرمائش کریں گے تو آپ اسے ردّ تو نہیں کریں گے؟"

"ارے میرے پاس کیا ہے میرے بچو! جان لے لو، چُوں کر جاؤں تو وہاب علی نام نہیں۔"

"شکریہ ابا میاں!...... اے نوری بیگم! آپ کھڑی شکل کیا دیکھ رہی ہیں؟ ذرا گرما گرم سی چائے ہو جائے۔" طالوت نے کہا اور نوری خوامخواہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"لائی بھائی جان!" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"بھائی جان! آپ کو کریم والے بسکٹ پسند ہیں؟" صفدر میاں بولے تو طالوت نے اسے گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بے حد۔"

"تب اگر اجازت دیں تو میں باجی سے ان کے لئے بھی کہہ آؤں۔ ممکن ہے انہیں یاد نہ رہیں۔"

"اوہ ہاں...... ضرور صفدر میاں! ذرا جلدی۔ کہیں وہ چائے لے کر نہ چل پڑیں۔" طالوت اُسے اتارتے ہوئے بولا۔ اور وہاب صاحب مسکرانے لگے۔

چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کریم بسکٹوں کی پلیٹ بھی تھی اور پانچ کپ تھے۔ نوری خود بھی ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو گئی۔ صفدر میاں موقع سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے اور کریم بسکٹ ان کے معدے میں اُترتے جا رہے تھے۔

"بڑا شریر ہے۔" نوری مسکرا کر بولی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔ اور پھر طالوت نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے بڑے میاں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ابا میاں! کل ہمیں اپنے نئے مکان میں شفٹ ہونا ہے۔ آپ نور بہن کو حکم دیں کہ سامان وغیرہ باندھ لیں۔"

"نیا مکان؟" بوڑھے نے لرزتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... کیا آپ پسند کریں گے کہ ہم ہوٹل میں پڑے رہیں؟ اور پھر نوری بہن کے ہاتھ کے کھانے کھانے کے بعد تو ہوٹل کے کھانوں سے چڑ ہو گئی ہے۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے، ورنہ ہم لوگ بھی یہیں گھس رہتے۔"

بوڑھا کئی منٹ تک خاموش رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہمارے اوپر اتنا کرم کرو بیٹے! جو ہماری حیثیت کے مطابق ہو۔''

''آپ اپنی حیثیت خود مقرر نہ کریں تو بہتر ہے ابا میاں! کیونکہ اس سے خود ہماری حیثیت متاثر ہوتی ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر نوری کی طرف رخ کر کے بولا۔ ''یہ مکان کل چھوڑ دینا ہے نوری! ضروری تیاریاں تم خود کر لینا۔'' اس نے نوری کو اشارہ کیا اور نوری نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ پھر وہ ہمیں باہر تک چھوڑنے آئی اور ہم کار میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔

دوسرے دن ہم اپنی خوبصورت کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ نوری اس کوٹھی کو دیکھ کر سحر زدہ تھی۔ درحقیقت عبدل بھائی نے بہترین انتخاب کیا تھا۔ کوٹھی کا جائے وقوع بہترین تھا۔ اس کی پشت پر سمندر تھا اور چاروں طرف خوبصورت سبزہ اور ان کے درمیان حسین سڑکیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوٹھی کی دوسری تیاریاں بھی مکمل ہو گئی تھیں۔ ویسے عبدل بھائی، نوری اور اس کے گھر والوں کو دیکھ کر حیران تھے لیکن ابھی تک انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

تاہم دوپہر کے کھانے پر وہ پوچھ ہی بیٹھے۔ ''اے کولر بھائی! یہ نوری اور اس کا باپ اِدر کیوں آتا پڑا؟''

''ارے تمہیں نہیں معلوم عبدل بھائی؟''

''اے کیا مالوم (معلوم) کولر بھائی!...... پن یہ نوری لوگ تو کوٹھی کو ایسا دیکھتا پڑا، جیسے سالا اس کے باپ کا گھر ہو۔''

''باپ کا گھر نہیں، لیکن بھائی کا گھر ضرور ہے عبدل بھائی! اس بات کو نوٹ کر لیں۔ اور کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دیں، جس سے رانا صاحب ناراض ہو جائیں۔''

''بھائی کا گھر...... یہ بھائی سالا کِدر سے نکل پڑا؟''

''اوہ...... عبدل بھائی! رانا صاحب کو پتہ چل گیا ہے کہ نوری اُن کی خالہ زاد بہن ہے۔ رانا صاحب کی خالہ ناراض ہو کر اسٹیٹ سے چلی آئی تھیں، اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چل سکا، جبکہ اسٹیٹ کے لوگ انہیں چاروں طرف تلاش کرتے رہے تھے۔ اب رانا صاحب کو پتہ لگا کہ نوری کے والد وہاب علی، رانا صاحب کے خالو ہیں اور نوری ان کی خالہ زاد بہن۔ بے چاروں کے حالات خراب تھے، اس لئے ایسی زندگی گزار رہے تھے۔

''کھالہ جاد بہین۔'' عبدل بھائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور اس کے بعد تو وہ بالکل سکتے میں رہ گئے تھے۔

⊛⊛⊛

طالوت فلمی دنیا کے ہنگاموں سے پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ اسے اس دنیا کے ہنگامے بہت پسند آئے تھے اور اس نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ یہاں کافی وقت گزارے گا۔ بہرحال ہماری زندگی تو ہمیشہ سے نئے ہنگاموں سے دوچار رہتی تھی۔ خود میری زندگی کا بھی یہی راستہ تھا، چنانچہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

فلم کمپنی کا دفتر قائم کیا گیا، جو اپنی مثال آپ تھا۔ بلاشبہ پورے شہر میں کسی فلم کمپنی کا اتنا خوبصورت

دفتر نہیں تھا۔ دفتر کی عمارت کے باہر انتہائی حسین نیون سائن میں نور آرٹس پروڈکشن کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ خود نوری کو ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ ہاں، صرف اسے اتنا معلوم تھا کہ فلم کمپنی کھولی جا رہی ہے۔

نوری اب خالص گھریلو عورتوں کی طرح رہتی تھی۔ اس پر بے جا ذمہ داریاں یا پابندیاں نہیں لگائی گئی تھیں۔ کوٹھی کے کام ہی ایسے تھے، جن سے اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ صفدر میاں کو شہر کے اعلیٰ درجے کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ اور طالوت نے وہاب صاحب کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔

بہر حال! دفتر کے افتتاح کا پروگرام بنایا گیا۔ اور پوری فلم انڈسٹری کو دعوت نامے بھجوا دیئے گئے۔ ان میں روشیلا اور سیٹھ روئی والا بھی شامل تھے۔ طالوت کا خیال تھا کہ یہ دونوں اس افتتاح میں شرکت نہیں کریں گے۔ لیکن افتتاح کے موقع پر روشیلا اور روئی والا کو ایک ہی کار سے اُترتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''عارف...... مہمانِ خصوصی!'' اس نے سرگوشی کی۔

''یہ فلم انڈسٹری ہے میری جان! یہاں کی رنجشیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ روئی والا تمہارے تھپڑ کو بھول گئے ہوں گے۔ روشیلا بھی نئے جال لے کر آئے گی، ہوشیار رہنا۔''

''ارے اُس کی ایسی تیسی۔'' طالوت اکڑ کر بولا۔ ''ابھی تک نوری نہیں آئی۔ پتہ نہیں، عبدل بھائی پہنچا یا نہیں۔''

''اوہ...... آ رہی ہے...... وہ دیکھو۔'' میں نے دُور سے اپنی کار آتے دیکھ کر کہا۔ اتنی دیر میں روئی والا اور روشیلا ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ روئی والا مسکراتے ہوئے کار سے اُترے تھے۔

''اے رانا صاحب! خدا قسم! تم تو کمال کیا بابا! ایک دم آفس بنا ڈالا۔ مارے کو مالوم بھی نہیں ہوا۔ ہماری طرف سے مبارکباد کبول کرو۔'' روئی والا نے کہا۔

''شکریہ سیٹھ روئی والا! آخر آپ کے پانچ لاکھ روپے اور لاکھوں کے زیورات تو کہیں نہ کہیں خرچ کرنا تھے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے بجائے کہ روئی والا شرمندہ ہوتا، اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''اے کائے کو مجاک کرتا پڑتا، رانا صاب! مارے کو بھوت شرمندگی ہوا۔ مارے کو ماپھ کر دو۔''

''معاف کر دیا سیٹھ روئی والا! لیکن مس روشیلا نے بھی آپ کو معاف کر دیا یا رقم دینی پڑی؟''

''اے وہ کِدر چھوڑتا پڑا یار! مارے کو کھلاس کر دیا۔ پورا ایک لاکھ لے کر جان چھوڑا۔''

''اب تو گزری داستانیں نہ دہرایئے رانا صاحب! ہم آپ کے مہمان ہیں۔'' روشیلا نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ پھر بولی۔ ''میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ مگر یہ نور آرٹ پروڈکشن...... یہ نور صاحب کون ہیں؟''

نوری کی کار قریب آ گئی۔ ایک خوب صورت ساڑھی میں ملبوس وہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ دولت اور سکون، انسان کی شکل بدل دیتا ہے۔ اس کی مثال معمولی سی ہے۔ اُمراء کے بچے عموماً خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور غریبوں کے بچے بدشکل۔ نوری کے قریبی جاننے والے بھی اُس کی شکل نہیں پہچان سکتے تھے۔

اس کے ساتھ صفدر، وہاب صاحب اور عبدل بھائی تھے۔ صفدر بھی ایک گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں بے حد خوبصورت، اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ وہاب علی اعلیٰ کپڑے کی شیروانی میں ملبوس تھے اور آنکھیں نہ ہونے کے باوجود بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''آپ نے بتایا نہیں، رانا صاحب! یہ نور صاحب کون ہیں؟'' روشیلا نے پھر اصرار کیا۔

''سوری مس رشیلا! نور آرٹس پروڈکشن کے مالکان تشریف لے آئے ہیں۔ آؤ، ہم ان کا استقبال کریں۔ تمہیں ان سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔'' طالوت کے بجائے میں نے کہا اور روشیلا گردن گھما کر دیکھنے لگی۔ میں اور طالوت آگے بڑھ گئے تھے۔

''ہیلو نور!'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک ملازم کے ہاتھوں سے پھولوں کا خوبصورت ہار لے کر نوری کی گردن میں ڈال دیا۔ دوسرے ہار اس نے اور میں نے وہاب علی صاحب اور صفدر کے گلے میں ڈالے تھے۔ نوری دفتر کے دروازے پر جگمگاتے نیون سائن کو دیکھ کر ہی سراسیمہ ہوگئی تھی۔

''آیئے خاتون نور النساء! ہماری طرف سے اس عالیشان پروڈکشن قائم کرنے کی مبارکباد قبول فرمایئے۔'' طالوت نے قدرے جھک کر کہا اور نوری تھوک نگل کر رہ گئی۔

بہت سے لوگوں کے چہرے حیرت کا آئینہ بن کر رہ گئے تھے۔ روشیلا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ روئی والا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ نوری کو دوسری فلم کمپنیوں والے بھی ایک ایکسٹرا گرل کی حیثیت سے جانتے تھے۔ بابو خان ٹائپ کے لوگ بن بلائے ہی پہنچ گئے تھے۔ غرض نوری کی آمد اور اس کی موجودہ حیثیت نے بڑا دلچسپ ماحول پیدا کر دیا تھا۔

''مہمانانِ گرامی!'' طالوت نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''خاتون نور النساء، نور آرٹس پروڈکشن کی مالک، محترم وہاب علی نور النساء کے والد اور ننھے صفدر علی۔ ہم سب خاتون نور النساء کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔'' طالوت نے تالیاں بجائیں اور تمام احمق تالیاں بجانے لگے۔ لیکن ان کے چہرے ہاتھوں سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

''اس دفتر کا افتتاح محترم وہاب علی اپنے مبارک ہاتھوں سے کریں گے۔'' طالوت نے دوسرا اعلان کیا اور تالیاں پھر گونجنے لگیں۔ وہاب علی سراسیمہ انداز میں اپنی چھڑی کو اِدھر اُدھر گھمانے لگے تھے۔ تب طالوت ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے وہاب علی کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور وہاب علی نے اس کا شانہ دبوچ لیا۔

''ابا میاں! آپ کا بیٹا عزیز الدین ہے۔ گھبرایئے نہیں۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا اور وہاب علی کے دانت بھنچ گئے۔ انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ البتہ صفدر نے نوری کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ونڈر فل باجی! آپ تو بہت بڑی عورت بن گئیں۔ کیا خیال ہے؟''

لیکن نوری ابھی تک سحر زدہ تھی۔ میں نے نوری کی آنکھوں میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ تب نوری سنبھل گئی۔

''آیئے۔'' میں نے کہا اور طالوت، وہاب علی کو لے کر آگے بڑھا۔ ایک باوردی ملازم نے پلیٹ میں رکھی ہوئی قینچی وہاب صاحب کے ہاتھ میں تھمائی اور وہاب صاحب نے افتتاحی فیتہ تلاش کر کے کاٹ

دیا۔ اخباری رپورٹروں نے تصویریں لیں اور ایک رپورٹر نے مائیک ان کے منہ کے قریب کر کے کہا۔

''محترم وہاب صاحب! آپ کے تاثرات؟''

وہاب صاحب سنبھلے۔ اور پھر انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''صاحبو! میں آنکھوں سے معذور انسان ہوں، لیکن دل کی روشنی میں، میں ان چمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ رہا ہوں، جن کے دم سے انسانیت کا وجود باقی ہے۔ کون کہتا ہے کہ انسان مفلس ہے۔ وہ آج بھی انسانیت کی دولت سے مالا مال ہے۔ ہاں، غلط سوچ، غلط خیالات، غلط رجحانات نے انسانیت کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ زخم اس طرح مندمل ہوتے ہیں کہ ان کے نشانات تک باقی نہیں رہتے۔ میری دعا ہے کہ خدا انسانیت کو زندہ رکھنے والوں کو زندہ رکھے تاکہ ان کے دم سے بجھے چراغ جلتے رہیں اور انسانیت پر مکمل تاریکی نہ چھائے۔ میری ساری دعائیں اس پروڈکشن کے ساتھ ہیں۔''

لوگوں نے پھر تالیاں بجائی تھیں۔ اس کے بعد مہمان دفتر کی عظیم الشان عمارت دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور سمجھنے والوں نے اس کی حیثیت کو خوب سمجھ لیا تھا۔

مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام ہال میں کیا گیا تھا، جہاں ان کی تواضع کی جانے لگی۔ لیکن ابھی تک ذہن صاف نہیں ہوئے تھے۔ نوری کے جاننے والے ابھی تک انگشت بدنداں تھے۔ وہ اس بات پر کیسے یقین کر لیتے کہ ایک ایکسٹرا گرل اچانک ایک بہت بڑی فلم کمپنی کی مالک بن گئی۔

نوری بھی اب سنبھل گئی تھی۔ وہ اب ان دونوں سے پوری طرح واقف ہو گئی تھی، جو اس کے لئے آسمان سے اُترے تھے۔ لوگوں نے کھانے کے دوران نوری سے کچھ بولنے کی فرمائش کی۔

''ہاں ہاں نور! اپنے مقاصد کے بارے میں مہمانوں کو بتاؤ۔''

میں نے کہا اور نوری تیار ہو گئی۔

''میری کمپنی......'' اس نے جھجکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''معاشرے کی سچی تصویریں پیش کرے گی۔ ہم ایسی فلمیں بنائیں گے جو فلاحی مقاصد رکھیں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ فلم تھکے ہوئے ذہنوں کو اُلجھنوں سے نکالنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لوگ محنت و مشقت کرنے کے بعد ذہنی شگفتگی چاہتے ہیں، اسی لئے وہ سینما ہال میں آتے ہیں۔ ہم ان کے ذہنوں پر جنس اور رومان کا بوجھ نہیں لادیں گے۔ گو رومان اور جنس کا زندگی سے گہرا تعلق ہے، لیکن سڑکوں اور گلیوں کے رومان ہمارے معاشرے سے بہت دُور کی چیزیں ہیں۔ ہمارا پاکیزہ ماحول ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم ان امثال کو فلم کا موضوع کیوں نہ بنائیں۔ میں نہیں کہتی کہ فلم میں رومان نہ ہو۔ لیکن وہ رومان جو زندگی سے قریب ہو۔ ہماری لڑکیاں سڑکوں پر پرس ہلاتی ہوئی عاشقوں کی تلاش میں نہیں نکلتیں۔ ہاں، کچے ذہن ان فلموں کو دیکھ کر اس انداز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ اور ہماری کوئی غلطی اگر ایک بھی ذہن کو بھٹکانے کا ذریعہ بن جائے تو ہم معاشرے کے بہت بڑے مجرم ہیں۔ رومان پیش کیا جائے، لیکن اسی انداز میں جو ہمارے ماحول کا خاصا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے بے پناہ مسائل ہیں۔ اگر ہم ستھرے انداز میں وہ مسائل اور ان کا حل پیش کریں تو لوگوں کو سوچنے اور عمل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس طرح اپنی تفریح کے اوقات میں وہ ذہنی شگفتگی اور اپنے کسی مسئلے کا حل پالیں تو میرا خیال ہے، فلم انڈسٹری بھی معاشرے کے

خدمت گار کی حیثیت سے اُبھر سکتی ہے۔ مزاح انسانی فطرت کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاف ستھرا مزاح پیش کر کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں جگائی جا سکتی ہیں۔ یہ ہماری فلموں کی اہم ضرورت ہے۔ ذاتی طور پر میں صاف ستھرا مزاح پیش کرنے والوں کی پرستش کرتی ہوں، کیونکہ وہ ذہنوں کو الجھنوں کی دلدل سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد کر دیتے ہیں۔ میں کوشش کروں گی، جو کچھ کہا ہے، وہی کروں۔ سستی قسم کی رومانی فلمیں بنا کر معاشرے کی مجرم نہ بنوں۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرنی پڑے۔''

اس صاف ستھری تقریر پر درحقیقت خلوصِ دل سے تالیاں بجانے کو دل چاہا۔ اور تالیوں کی آوازیں بہت زوردار تھیں۔ نوری نے سر جھکا کر لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد مہمانوں کو آزادی مل گئی۔ سب ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ اخباری رپورٹروں نے نوری سے سوالات شروع کر دیئے۔

''کیا آپ نے فلم کے لئے کوئی کہانی حاصل کر لی ہے مس نوری؟''

''میرا نام نورالنساء ہے۔'' نوری نے تصحیح کی۔

''سوری۔''

''جی نہیں۔ ابھی نہیں۔ لیکن ظاہر ہے، اب ہمیں کہانی کی تلاش ہوگی۔''

''کیا کوئی کہانی آپ کے ذہن میں ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''کہانیوں کی کمی نہیں ہے۔ کسی بھی ایسے گھر میں جھانک لیں، جہاں چراغ میں تیل نہ ہو، ایک کہانی مل جائے گی۔'' نوری نے جواب دیا۔

''کیا آپ کمیونزم کا پرچار کریں گی؟''

''میں صرف انسان ازم کی قائل ہوں۔ آپ اسے کوئی نام دے لیں۔''

''تھوڑا سا وقت ہمیں بھی دے دو نوری!'' روشیلا نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ اور نوری اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میں اور طالوت ان دونوں سے زیادہ دُور نہیں تھے۔

''میں بھی ایک سوال کروں؟'' روشیلا نے کہا۔

''ضرور۔'' نوری مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں اس کایا پلٹ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''میں نہیں سمجھی۔'' نوری کا چہرہ خشک ہو گیا۔

''کیا رانا صاحب نے تمہیں پسند کر لیا ہے؟''

''ہاں۔'' نوری نے سخت لہجے میں کہا۔

''سیکرٹری بھی تم سے بہت بے تکلف ہے۔''

''ہاں۔'' نوری پھر اسی انداز میں بولی۔

''گویا دونوں کی منظورِ نظر ہو؟''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' نوری کا سانس پھولنے لگا تھا۔

''گمان بھی نہیں تھا نوری! کہ تم اتنی تیز نکلو گی۔ کون سا طریقہ استعمال کیا تھا میری جان! کہ دونوں

بیک وقت لٹو ہو گئے؟"

"تم طریقے کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟"

"ہاں..... ہمیں بھی تو بتاؤ۔ عورت تو ہم بھی ہیں۔ اور تم سے کسی طرح کم بھی نہیں۔" روشیلا تحش انداز میں بولی۔

"یہ طریقہ تھا۔" نوری نے ایک زوردار تھپڑ روشیلا کے گال پر رسید کر دیا۔ کافی زوردار آواز تھی۔ لوگ اس طرف گھوم گئے۔ روشیلا کا گال سرخ ہو گیا تھا۔

اور اسی وقت طالوت نے زور سے تالیاں بجائیں۔ لوگ بے اختیار تالیاں بجانے لگے اور میں اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔ لیکن لوگوں کو جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور تالیاں رُک گئیں۔ روشیلا خونخوار نظروں سے نوری کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ نوری پر جھپٹنے والی ہے تو میں فوراً ان دونوں کے درمیان آ گیا۔

"صاحبان!..... میرا خیال ہے، مس نور اپنی پہلی فلم کا نام..... "تھپڑ" رکھنا چاہتی ہیں۔" طالوت نے ہانک لگائی۔ "غالباً انہوں نے اس کا اعلان کیا ہے۔"

"کمینی!..... کتیا!..... ایکسٹرا!..... میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" روشیلا، نوری پر جھپٹی۔ لیکن طالوت نے اس کے دونوں شانے پکڑ لئے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ بولا۔

"لیکن مس روشیلا بضد ہیں کہ اس کا نام "ایک لاکھ" رکھا جائے۔ کیا میں لوگوں کو فلم ایک لاکھ کی کہانی سنا دوں، مس روشیلا؟"

"اے، تم کیسا لوگ ہے؟ مہمان کو بلا کر بے عجتی کرتا ہے..... دیکھ لو بھائیو! یہ ہم لوگوں کا عجت ہوتا پڑا ہے۔"

"سیٹھ روئی والا نے بھی ایک نام پیش کیا ہے..... پانچ لاکھ..... اب یہ فیصلہ ابھی مشکل ہے کہ فلم کا نام مس روشیلا کے کہنے سے ایک لاکھ رکھا جائے یا روئی والا کے حکم پر پانچ لاکھ۔ ویسے ان دونوں کی کہانیاں دلچسپ ہیں۔ کیوں روئی والا! کیا میں معزز مہمانوں کو سنا دوں؟"

روئی والا اور روشیلا دونوں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ روشیلا نے خونی نگاہوں سے ہم لوگوں کو دیکھا اور پھر تیزی سے ایک طرف مڑ گئی۔

"اے میرے کو کاہے کو چھوڑتا پڑا ہے؟ میں تیرے ساتھ چلنے کو مانگتا، مس روسیلا!" سیٹھ صاحب، روشیلا کے پیچھے لپکے اور طالوت نے پھر تالیاں بجا دیں۔ عبدل بھائی، میں اور صفدر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسرے لوگ حیران تھے۔ بہر حال تقریب اختتام پر ہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے۔

"کیا..... میں نے..... میں نے غلط کیا؟" نوری نے لرزتی آواز میں کہا۔

"بالکل غلط۔ میں تم سے ناراض ہوں۔" طالوت نے کہا۔

"اوہ....." نوری کی گردن جھک گئی۔

"ایسے لوگوں کی سزا صرف ایک تھپڑ نہیں ہونی چاہئے۔ اب روشیلا کے ایک سائیڈ تھوڑا نکل آئے گا اور اُس کی ساری اسکرین بیوٹی ختم ہو جائے گی۔ تمہیں چاہئے تھا کہ دوسری طرف بھی فوراً ہی تھپڑ مار دیتیں

تا کہ اس کے پچکے ہوئے گال اُبھر آتے۔ کسی کی روزی کا خیال رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔" طالوت نے کہا
اور نوری چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"تم نے روشیلا کے گال پر تھپڑ لگا کر ہماری ساری محنت وصول کر دی ہے نور!...... لطف آ گیا۔"
طالوت نے کہا اور نوری مسکرا دی۔

نور آرٹس پروڈکشن نے کام شروع کر دیا۔ کہانیوں کے لئے اخبارات میں اشتہار دے دئے گئے تھے۔ کچھ اور لوگوں کو بھی ملازم رکھا گیا تھا، جو دفتری کاموں کے لئے تھے، اور ہم لوگ حسبِ معمول تفریحات میں مشغول ہو گئے تھے۔ عبدل بھائی ہمارے منیجر تھے۔ مجموعی طور سے وہ برا آدمی نہیں تھا۔ معقول تنخواہ ملی تو وہ پوری طرح وفادار بن گیا تھا۔

وہاب صاحب ایک عمدہ ہسپتال میں آنکھوں کے آپریشن کے لئے داخل کر دیئے گئے تھے۔ صفدر کو ایک اعلیٰ درجے کے اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ نوری کے لئے گھر کے کاموں کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں تھا، لیکن گھر کے کاموں کے لئے بہت سے ملازم موجود تھے۔ اس لئے وہ عموماً بیکار رہتی۔ اس سلسلے میں ایک دن طالوت نے اس سے بات کی۔

''محترمہ نور صاحبہ! خادموں کے عہدے کا تعین نہیں کیا گیا۔''

''میں نہیں سمجھی بھیا!''

''کیا ہم خود کو ملازم سمجھیں؟''

''کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے۔'' نوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''منہ دھو رکھیں۔ ہم کوئی ملازمت قبول بھی نہیں کریں گے۔ چنانچہ اب اپنی کمپنی آپ خود سنبھالیں۔ روزانہ دفتر جایا کریں۔ کہانیوں کے بارے میں چند خطوط آئے ہیں، کل سے ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔''

''اوہ...... لیکن بھیا! آپ کی موجودگی میں یہ مناسب ہوگا۔''

''ہم ہمیشہ موجود نہیں رہیں گے۔ اگر تمہیں یہ کاروبار پسند ہے تو سنبھالو، ورنہ کوئی اور کاروبار کر لو۔''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں بھیا! مجھے حکم دیں، میں کیا کروں؟''

''کل سے باقاعدہ دفتر جائیں۔ آپ کی کرسی پر آج تک ہم لوگوں نے بیٹھنے کی جرأت نہیں کی۔ فلم شروع کریں۔ جلدی سے کہانی کا انتخاب کریں۔ عبدل بھائی اپنی پروڈکشن کے جوہر دکھانے کے لئے بے چین ہیں۔''

''ٹھیک ہے بھیا! جو حکم۔ کل سے میں دفتر جاؤں گی۔''

''ہاں...... پروپرائیٹر صاحب کے لئے کار کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔ اور عبدل بھائی سے کہہ دیا گیا ہے کہ ایک ڈرائیور کے لئے اشتہار دے دیں۔''

''جی......!'' نوری نے آہستہ سے کہا۔

بہرحال، دوسرے دن سے نوری نے دفتر آنا جانا شروع کر دیا۔ ہماری تفریح کے لئے دفتر ہی کافی تھا۔ دن بھر بھانت بھانت کے لوگ چکر لگاتے رہتے تھے۔ اور طالوت ان سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔ اسے اس لائن میں بہت مزہ آرہا تھا اور اکثر وہ کہتا تھا۔

''یار! باقی تو سب ٹھیک ہے، لیکن ابھی تک کوئی قاعدے کی لڑکی نہیں ملی۔''

''مل جائے گی......مل جائے گی۔ تھوڑا سا صبر کرو۔''

اور پھر ایک دن ہم نے کہانی کے سلیکشن کا پروگرام بنالیا۔ چند لوگوں کو جواب بھی دیئے گئے تھے۔ باہر بورڈ لگا دیا گیا تھا کہ جن لوگوں کو بلایا جائے، وہی آئیں۔ باقی حضرات تکلیف نہ کریں۔ چنانچہ آج مصنفین کا دن تھا۔ اور آنے والے، فلم انڈسٹری کے جانے پہچانے مصنف ہی تھے۔ ہم چاروں یعنی میں، طالوت، نوری اور عبدل بھائی انٹرویو لینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ باہر کے کمرے میں مصنفین حضرات تشریف رکھتے تھے۔ اور ان کے ناموں کی فہرست ہمارے سامنے تھی۔

''عبدل بھائی!'' میں نے عبدل بھائی کو مخاطب کیا۔

''ہا......کولر بھائی! کیا بولتا اے؟ بولو بھائی۔''

''جن لوگوں کے نام کی یہ فہرست ہے، ان میں سے کسی نے اس سے پہلے بھی کوئی فلمی کہانی لکھی ہے؟''

''اے کیا بولتا کولر بھائی! ہم نے فالتو سب لوگ چھانٹ کیا۔ ایسا لوگ، جس نے پہلے بھی کوئی پھلمی (فلمی) کہانی نہیں لکھا، ایک بھی نہیں رہنے دیا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو ایک دم ہٹ اسٹوری لکھتا پڑا۔ سب کا سب ایک دم نام والا لوگ ہے۔ انہی لوگ کا اسٹوری پر پھلم بنتا پڑا ہے۔''

میں نے چونک کر عبدل بھائی کی شکل دیکھی۔ طالوت کی پیشانی بھی شکن آلود ہوگئی تھی۔ تب میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''عبدل بھائی! ایک بات غور سے سن لو۔ وہ لوگ جو فلمیں بنا رہے ہیں، فلمیں لکھ رہے ہیں، ان میں اداکاری کررہے ہیں، ان میں سے ایک بھی ہمارے معیار کا نہیں ہے۔ جیسی فلمیں وہ لوگ بنا رہے ہیں، ہمیں ان سے نفرت ہے۔ اور پھر ان لوگوں نے اس صنعت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نئے ذہن، نئے چہرے صرف اس لئے پیچھے جا پڑے ہیں کہ آپ جیسے لوگ انہیں سامنے نہیں آنے دیتے۔ آپ جانتے ہیں عبدل بھائی! فلم بنا کر ہم صرف دولت نہیں سمیٹنا چاہتے، ہمارا مقصد کچھ اور ہے۔ چنانچہ آپ آئندہ خیال رکھیں۔ یہاں آنے والوں کے ساتھ عام فلم کمپنیوں کا سا سلوک نہیں ہونا چاہئے۔ جو بھی آئے، اسے ہمارے پاس ضرور بھیجا جائے۔ اگر زیادہ لوگ آ گئے اور وقت کا معاملہ ہوا تو ہم انہیں پھر آنے کا وقت دیں گے۔''

''کھیال رکھیں گا جی۔'' عبدل بھائی سر جھکا کر بولے۔

''نہیں عبدل بھائی! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اپنا مقصد آپ کو بتا دیا ہے۔ بس آپ آئندہ اس پر عمل کریں۔ ویسے آپ چاہیں تو ان لوگوں کو بھی طلب کر سکتے ہیں۔''

''شکریہ کولر بھائی! بہت بہت شکریہ۔ ہمیں تو ہم سالا شرمندہ ہوتا۔'' عبدل بھائی نے فہرست کی ایک کاپی جو اُن کے سامنے رکھی ہوئی تھی، میں نام دیکھ کر گھنٹی بجائی۔ باہر کھڑا ہوا اردلی اندر آ گیا تھا۔

''گھونچان گھونچی کو بلاؤ۔'' اور اردلی سر جھکا کر چلا گیا۔
''یہ کون سی زبان کا رائٹر ہے عبدل بھائی؟'' طالوت نے حیرت سے پوچھا۔
''او جی، ہماری جبان کا ہے۔ اس کا کئی پھلم ہٹ ہوا ہے۔ آپ نے کھٹم کھٹولا نہیں دیکھی تھی، ورنہ آپ بیہ بات نہ پوچھتے۔'' عبدل بھائی نے کہا۔
''کھٹم کھٹولا......؟'' طالوت میری طرف دیکھ کر گردن ہلانے لگا۔ ''یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔''
''بہت بڑا ادیب معلوم ہوتا ہے رانا صاحب! گھونچان گھونچی، کھٹم کھٹولا نہیں لکھے گا تو اور کیا لکھے گا؟ اگر اس کا نام، اس کا کام عوام کی سمجھ میں آ جائے تو پھر اس میں کیا خوبی رہ جائے گی۔ تجریدی ادیب معلوم ہوتا ہے۔''

چند لمحات کے بعد گھونچان گھونچی اندر آ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے گھونچان کہا جائے یا گھونچی۔ ساڑھے چار فٹ کا قد، گھٹنوں تک لمبی شرٹ پہنے، جس پر راک ہڈسن اور سینڈرا ڈی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، کالے رنگ کی پتلون پہنے، پیروں میں اسفنج کی چپل۔ جسامت کے لحاظ سے پھیلاؤ کچھ زیادہ، بھرے خدوخال، پیشانی ندارد، آنکھوں کے اوپر بے بی اسٹائل کے کترے ہوئے بال پڑے تھے اور سر پر ایک پورا بیابان نظر آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے ہاتھ میں روبن سکاچ کی چھوٹی بوتل پکڑے اندر تشریف لائے تھے۔ آتے ہی نوری کے سامنے کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ پہلے بریف کیس میز پر رکھا، پھر بوتل اور پھر میز کی سطح سے سینہ لگا کر نوری کی طرف جھکے، اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ اور پھر ایک دم پیچھے ہٹے اور اسکاچ کی بوتل کھول کر دو گھونٹ حلق میں انڈیل لئے، پھر بوتل کا کارک لگا کر کلائی سے ہونٹ صاف کئے۔

مجھے اور طالوت کو انہوں نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ عبدل بھائی کو وہ کسی قابل نہیں سمجھ رہے تھے جو ان کی طرف متوجہ ہوتے۔ لے دے کے ایک نوری رہ گئی تھی، جسے وہ گھورے جا رہے تھے۔ نوری گھبرا کر ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

''پیشانی کی چمک......'' گھونچان گھونچی کی آواز اُبھری۔ ''ابرو کا خم، ہونٹوں کی مسکان، اندازِ نشست، تیرے وقار، تیرے عزّ و جلال کی خبر دے رہا ہے اے حسینہ!......ہم اہلِ خرد، مستقبل کے دریچوں میں جھانک لیتے ہیں۔ اور گھونچان پیشگوئی کرتا ہے کہ نور آرٹس، فلستان کی پیشانی کا نور بن جائے گا۔ لیکن اسے گھونچان کا پسینہ درکار ہے۔ تو حاضر ہے تیرے لئے۔ اور سمجھ لے کہ گھونچان ایک ایسی کہانی تشکیل کرے گا، جو آفاقی ہوگی۔ لوگوں پر سحر طاری کر دے گی۔ میں اس سے بڑا اخراج تیرے حُسن کو نہیں پیش کر سکتا۔''

انہوں نے اسکاچ کی بوتل اٹھائی اور اس کا کارک کھولا۔ لیکن اچانک بوتل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ گھونچان اسے لپکنے کے لئے بری طرح اٹھا تھا، لیکن بوتل اس کے سر پر معلق ہو کر اوندھی ہو گئی اور شراب گھونچان کے گھونسلے کو تر کرنے لگی۔ گھونچان اُچھل اُچھل کر اسے پکڑ رہا تھا، لیکن بوتل باقاعدہ اس سے مذاق کر رہی تھی۔ اور پھر وہ اس وقت تک اس کے ہاتھ میں نہ آئی، جب تک خالی نہ ہو گئی۔
نوری اور عبدل بھائی پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ طالوت برداشت نہیں کر سکا ہے، اس نے گفتگو کرنے کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن لے لیا ہے۔

"یہ...... یہ کک...... کیا...... یہ کک...... کیا......" گھونچان گھونچی ساری طراری بھول گئے تھے۔ اچانک ان کا بریف کیس میز سے اُچھل کر دروازے کی سمت بھاگا۔

"گیا...... یہ بھی گیا۔" گھونچان اس کی طرف لپکے۔ لیکن خودکار دروازہ خودبخود کھل گیا اور بریف کیس منہ زور گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ گھونچان گھونچی بھی اس کے ساتھ ہی نکل گئے تھے۔

"عبدل بھائی!" طالوت نے آواز دی۔ "دوسرے کو بلاؤ۔"

لیکن عبدل بھائی منہ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ کبھی دروازے کی طرف دیکھتے، کبھی ہم لوگوں کی طرف۔ ان کی شکل دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔

"یہ...... یہ سب کیا تماشا تھا؟" بالآخر نوری نے کہا۔

"کہانی نگار سے زیادہ وہ کوئی شعبدے باز معلوم ہوتا ہے...... ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کر کے چلا گیا ہے۔"

"لیکن حلیہ تو اس کا ہی خراب ہو گیا تھا۔ عجیب شعبدہ تھا۔" نوری آہستہ سے بولی۔

"پھر آئے گا، داد وصول کرنے۔ شکل ہی سے کمبخت جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ عبدل بھائی! کوئی اور ہے؟"

"خدا قسم...... خدا قسم...... ہمارے کو معلوم نہیں تھا...... ہمارے کو معلوم نہیں تھا کہ اپنا گھونچان بھائی اتنا پہنچا ہوا بجرگ (بزرگ) ہے۔ ہمارے کو آج تک نہیں معلوم تھا۔"

"اب تم اس کے مرید بن جانا۔ یہ بتاؤ، باہر اور کون ہے؟" طالوت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور عبدل بھائی نے پھر گھنٹی بجا دی۔ اردلی آیا تو وہ فہرست کا دوسرا نام پڑھ کر بولے۔

"اے منسی پھرستہ کو بھیج دو۔"

"منشی فرشتہ۔" طالوت گردن ہلاتے ہوئے بولا اور منشی فرشتہ اندر آ گئے۔ نام فرشتہ تھا، شکل سے شیطان نظر آ رہے تھے۔ پورا منہ اُگالدان بنا ہوا تھا۔ دانتوں کو چھالیہ سمجھ کر نگل چکے تھے۔ صرف ان کے نشانات باقی رہ گئے تھے، جو کتھے کی کتری ہوئی ڈلیاں معلوم ہوتے تھے۔ قدیم طرز کی شیروانی اور علی گڑھ کٹ پائجامے میں ملبوس تھے۔ بغل میں فائل دبی ہوئی تھی اور چال میں بڑی نزاکت اور لچک تھی۔ شرماتے ہوئے اندر آئے اور جھک کر کئی سلام کر ڈالے۔

"اللہ اکبر......!" طالوت نے خاصی زوردار آواز میں کہا۔

"وعلیکم السلام...... وعلیکم السلام، حضور رانا صاحب! وعلیکم السلام۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر مصافحے کے لئے لپکے اور فائل بغل سے نکل کر نیچے گر پڑی۔ مصافحہ بھول کر فائل اُٹھانے جھپٹے اور اسے سمیٹنے لگے۔ لیکن شیروانی کی جیب سے فاؤنٹین پین نکل کر نیچے گر پڑا تھا۔ سماعت بھی کمزور تھی، اس لئے اللہ اکبر کو السلام علیکم سمجھے تھے، اسی لئے جواب دے کر مصافحے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔ بھلا ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، جو سلام میں پہل کریں اور پھر نہ جانے کس طرح وہ رانا صاحب سے واقف بھی ہو گئے تھے۔

بہرحال، بمشکل تمام وہ اپنا سامان سمیٹنے میں کامیاب ہوئے، اس دوران مصافحہ بھول چکے تھے۔ فائل سمیٹ کر وہ میز کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

''تشریف رکھیے!'' طالوت نے کہا۔
''الحمدللہ۔ دعائیں ہیں آپ کی۔'' منشی جی نیاز مندی سے بولے۔
''سبحان اللہ۔ میں نے کہا، تشریف رکھیے۔'' اس بار طالوت نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ نوری بے ساختہ مسکرا پڑی تھی۔
''اوہ...... نوازش۔ نوازش۔'' منشی فرشتہ کرسی پر بیٹھ گئے۔
''منسی پھرستہ جرا اونچا سنتے ہیں، رانا جی۔'' عبدل بھائی بولے۔
''فرمائیے منشی جی! کیا لائے ہیں؟'' اس بار میں نے اونچی آواز میں کہا۔
''بندہ پروری ہے حضور کی...... ورنہ خادم کس لائق ہے۔''
''کیا مصیبت ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے عبدل بھائی کی طرف دیکھا اور عبدل بھائی اپنی کرسی کے پیچھے سے نکل آئے۔ وہ منشی جی کے قریب جھک کر بولے۔
''اے منسی جی! کیا مکج پھر گیلا ہے تمہارا؟ اے وہ تمہارا سننے والا آلا کِدر ہے؟ اِدر کیسے بات کرے گا تم؟'' منشی جی سوالیہ انداز میں عبدل بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ طالوت کی طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں بولے۔
''کیا کہہ رہے ہیں عبدل بھائی؟''
اور نوری قہقہہ ہضم نہ کرسکی۔ وہ بری طرح ہنس پڑی۔ میں اور طالوت بھی ہنسی نہ روک سکے تھے۔
''آلہ سماعت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔
''محبت....'' منشی جی مسکرا کر بولے۔ ''محبت کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ میری کہانی میں محبت کا سمندر موجزن ہے۔ ایک پاکیزہ رومان...... آہ!...... وہ کپڑے دھوتی تھی۔ اس نے دنیا کو بہت نیچے رہ کر دیکھا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا، گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار، لاکھوں روپے کی جائیداد کا مالک...... سب کچھ اس کے قدموں پر قربان کر دے گا۔ لیکن معاشرہ اس دھوبن کو کیسے قبول کرسکتا تھا؟ درجات کی پابندیوں نے دلوں کے اصول کو کب تسلیم کیا ہے۔ اندھے سماج کو کیا معلوم کہ دھڑکنیں کیوں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ ان کی نگاہیں دلوں کے اندر کب پہنچتی ہیں۔''
''اے منسی جی!...... اے منسی جی! کائے کو مسکھری کرتا ہے؟'' عبدل بھائی دانت پیس کر چیخے۔
''حسین واقعات پر مشتمل پاکیزہ کہانی ہے۔ محبت کے جذبات سے مزین۔''
''دری تم اُٹھو اِدر سے...... چلو۔'' عبدل بھائی، منشی جی کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ اور منشی جی نے تعجب سے انہیں دیکھا۔
''چند ٹکڑے اور ہیں۔ انہیں سنا دوں۔''
''ارے اُٹھو بابا!...... خدا قسم، تم اور پریسان کی تو ہم تمہارے ٹکڑے کر دیں گا۔'' عبدل بھائی، منشی جی کو کھینچ کر اٹھاتے ہوئے بولے اور منشی جی کھڑے ہوگئے۔
''تو حضور! خیال رکھیے گا۔ خدا حافظ!'' منشی جی پھر مصافحہ کرنے لپکے لیکن عبدل بھائی نے ان کی کمر پکڑ لی تھی۔ اب منشی جی، مصافحہ کرنے کے لئے زور لگا رہے تھے اور عبدل بھائی انہیں باہر نکالنے کے لئے پیچھے سے کھینچ رہے تھے۔ جب دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوا تو منشی جی نے عبدل بھائی کی

طرف دیکھا۔

''بڑے ظریف الطبع ہیں اپنے عبدل بھائی۔'' وہ شرمائے ہوئے انداز میں بولے۔

''اے جریف کا بچہ! کائے کو ہماری عجت کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ باہر جاؤ۔ خدا کے واسطے باہر جاؤ۔'' بالآخر عبدل بھائی، منشی فرشتہ کو باہر کھینچ کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ انہیں دروازے کے باہر تک چھوڑ کر آئے تھے۔ نوری ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔ میں اور طالوت بھی بے تحاشا ہنس رہے تھے۔

لیکن عبدل بھائی باقاعدہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ باہر کھینچ تان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید منشی جی کو اپنی توہین کا احساس ہو گیا تھا۔ پھر بڑے زور سے دروازہ کھلا اور ایک نئی شکل نظر آئی۔ لیکن دوسرے لمحے اسے کسی نے باہر کھینچ لیا۔ اس کے بعد عبدل بھائی نے اندر گھسنے کی کوشش کی لیکن انہیں بھی باہر کھینچ لیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد پھر وہی شکل اندر گھس آئی۔ اس کے پیچھے عبدل بھائی اور چپڑاسی اندر دوڑے آئے تھے۔ انہوں نے دونوں طرف سے اس نئے آدمی کو پکڑ لیا۔

''میں تیرے کو بولا، ابی اِدھر نہیں آنے دیں گا۔ جبردستی کائے کو کرتا پڑا؟'' عبدل بھائی ہانپتے ہوئے بولے۔

''کیا بات ہے عبدل بھائی؟'' طالوت نے پوچھا۔

''حضور! میں ایک انقلابی ادیب ہوں۔ انقلابی کہانیاں لکھتا ہوں اور خود بھی انقلابات کا شکار ہوں۔ یہ سماج کے ٹھیکیدار، یہ ظالم سرمایہ دار کسی غریب کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ میرا داخلہ بند کیا جا رہا ہے۔ جبکہ میں بھی اپنی کہانی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اے تو تیرے کو منع کدر کیا؟ پن اپنا باری آنے دے بھائی!'' عبدل بھائی بولے۔

''حق چھیننے سے ملتا ہے، مانگنے سے نہیں۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ انسان صدیوں سے انتظار کر رہا ہے اور صدیوں تک انتظار کرتا رہے گا۔ لیکن انتظار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میری نئی کہانی کا نام انتظار ہی ہے۔''

''چھوڑ دو عبدل بھائی!......اسے چھوڑ دو۔'' طالوت نے کہا۔

''شکریہ جناب! غور فرمایئے۔ کیا انوکھا خیال ہے۔ انقلابی حیثیت کا حامل۔ لوگ محلوں اور کوٹھیوں کی باتیں کرتے ہیں، لاکھوں میں کھیلتے ہیں، مِلوں اور فرموں کی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ایک نانبائی کے مسائل پیش کئے ہیں۔ جی ہاں، وہ چھبیس سال کا ایک بانکا نوجوان تھا۔ تندور پر روٹیاں پکاتا تھا۔ گرمی میں، سردی میں، برسات میں۔ بھری دنیا میں تنہا تھا۔ تب اُس کی زندگی میں جھمیا آئی۔ چیتھڑوں میں ملبوس ایک شرمیلی بھکارن۔ اس نے ہاتھ پھیلایا اور نوجوان نے اپنا دل نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ بے سُدھ ہو گیا۔ اسے دنیا کی خبر نہ رہی اور وہ بھکارن کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب کر بیگانہ ہو گیا۔''

''کیسا مارا ہے، خداقسم!......ارے بابا! تندور میں جو روٹیاں جلا ہوگا، اس کا پیسہ کون دے گا؟'' عبدل بھائی طنزیہ انداز میں بولے۔

''عشق دیوانہ کسی نقصان کی پروا کب کرتا ہے عبدل بھائی؟......آگے سنو......''

''ایک منٹ.....ایک منٹ.....'' طالوت ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا محترم!''

''خادم کو مجنوں پہلوان غمزدہ کہتے ہیں۔ ہاں تو......نوجوان نانبائی......''
''اے بھائی! نانبائی نہیں چلے گا۔'' عبدل بھائی نے دخل دیا۔
''کیسے نہیں چلے گا۔ تم لوگ پیشے کے اعتبار سے انسان کی فطرت پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ عشق ایک انقلابی حقیقت ہے اور انقلاب دبائے نہیں جا سکتے۔ چھیما اُس کی زندگی بن گئی۔ بھکاران......بھوکی تھی۔ وہ پیٹ بھرنا چاہتی تھی، اور عشق سے پیٹ نہیں بھرتا۔''
''آبجکشن......خدا قسم آبجکشن......یہ بات غلط ہے۔ ہم جب کریم بھائی کی ماں سے سالا عشق کیا تو ہمارے کو کھانے پینے کا کوئی پروا نہیں تھا۔'' عبدل بھائی نے دخل دیا۔
''بکواس......پیٹ ایک انقلابی حقیقت ہے۔ بھوک ہر جذبے کو فنا کر دیتی ہے۔'' مجنوں پہلوان غمزدہ زوردار لہجے میں بولا۔ ''اور جب بھکارن نے اسے اپنا پیٹ کھول کر دکھایا......تو......نانبائی کا دل لرز کر رہ گیا......آہ......اس کی محبوبہ بھوکی تھی......!''
''کٹ، کٹ......یہ سین سنسر اُڑا دے گا۔ سیکس مارتا پڑا ہے یار! پھلم ڈبے میں بند کرائے گا۔'' عبدل بھائی چیخے۔
''نہیں کاٹ سکے گا۔ تم کب تک بھوک چھپاتے رہو گے؟......ایک دن یہ اس زور سے اُبھرے گی کہ انسان، انسان کو کھانا شروع کر دے گا......بھوک کی آگ گولیوں سے بجھ نہ پائے گی۔ جیل بھیج دو گے، جیل کو جلائے گی۔'' مجنوں پہلوان مُکا ہلاتے ہوئے بولے۔
''معاف کیجئے گا مجنوں پہلوان! کیا آپ ناشتہ کر چکے ہیں؟''
''جی؟'' مجنوں پہلوان ایک دم چپ ہو گئے، پھر شرمائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کر لوں گا جی۔''
''عبدل بھائی!'' طالوت نے عبدل بھائی کو مخاطب کیا۔
''جی سرکار!'' عبدل بھائی جلدی سے بولے۔
''آپ ایسا کریں، سامنے والے ریستوران میں لے جا کر مجنوں صاحب کو ناشتہ کرا دیں اور باقی لوگوں سے معذرت کر لیں۔ ہم ذرا آپس میں تبادلہ خیال کریں گے۔'' طالوت نے کہا۔
''بہت اچھا حجور!'' عبدل بھائی نے کہا اور مجنوں پہلوان نیاز مندی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''خدا کی پناہ!'' نوری نے ہنستے ہوئے سر پکڑ لیا۔ میں اور طالوت ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔
''تم تو اس ماحول سے واقف ہو گی نور؟'' طالوت نے کہا۔
''اس حد تک نہیں تھی۔ میں نے ان لوگوں کو قریب سے نہیں دیکھا۔''
''پتہ نہیں، باقی لوگ جانے پر تیار ہیں یا نہیں۔''
''نہ گئے تو بہت بری طرح پیش آؤں گا۔'' طالوت آنکھیں نکال کر بولا۔
''دیکھ تو لو۔'' میں نے کہا اور طالوت کرسی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ باہر کا ہال خالی تھا۔ شاید مصنفین نے عبدل بھائی کی اپیل مان لی تھی۔
''اللہ کا شکر ہے۔'' طالوت ایک گہری سانس لے کر واپس آ گیا۔ اور پھر جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔

"مگر اب کہانی کا کیا ہوگا؟"

"میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں سلیم بھائی!" نوری نے کہا۔

"کون سی بات؟"

"ہم کسی غیر معروف ادیب سے کہانی لیں گے، جو کم از کم ہوش مند تو ہو۔"

"قصور ان لوگوں کا نہیں ہے نوری! بہر حال یہ اہلِ قلم ہیں۔ لیکن دولت خرچ کرنے والے دنیا کے سب سے بڑے عقل مند ہوتے ہیں۔ وہی مناسب اور موزوں ہوتا ہے جو وہ سوچتے ہیں۔ ان کے قلم پر انہی کی سوچ مسلط ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ خود سوچنے لگتے ہیں کہ ان کا علم، ان کا ادب بیکار شے ہے۔ کارآمد وہی ہے جو سیٹھ گولی والا بولتا ہے۔ بہر حال، کہانی مل جائے گی۔ اصل مقصد تو اس لائن کے لوگوں سے ملاقات تھی۔ درحقیقت بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ ابھی تو اور بھی شعبے باقی ہیں۔ ان میں بھی نایاب انسانوں سے ملاقات ہوگی۔" طالوت نے کہا۔

اور اس کا یہ خیال درست تھا۔ کہانی کی تلاش جاری رہی اور اخبارات میں اشتہار بھی نکلتے رہے۔ اور تھوڑے دن کے بعد ہمیں تسلیم کر لینا پڑا کہ ان لوگوں سے نمٹنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہر شخص اپنے فن میں یکتا، ہیرو، ہیروئنیں، ولن اور نہ جانے کون کون حضرات آ رہے تھے۔ دفتر میں اداکاری کے مظاہرے ہوتے اور روز نیا تماشا دیکھنے میں آتا۔ ایک خاتون تو طالوت پر مر ہی مٹیں۔ ان کا نام جبیں تھا۔ اچھا راستہ اختیار کیا تھا۔ فلم میں کام کرنے آئی تھیں، لیکن طالوت پر جال پھینکنا شروع کر دیا تھا۔

"سنبھلو طالوت! میرا خیال ہے اس لائن کے کسی فرد کے چکر میں آئے تو خاصی اُلجھنیں پیش آئیں گی۔" ایک دن میں نے کہا۔

"بہر حال، ہمیں ہیروئن کی ضرورت تو ہے۔"

"تو کیا جبیں......؟"

"کیا حرج ہے؟...... خوبصورت لڑکی ہے۔"

"اللہ کو پیارے ہو جاؤ گے۔"

"میں نے حدود مقرر کر دی ہیں۔" طالوت نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے...... تمہاری مرضی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

پھر ایک اور دلچسپ دن آیا۔

آج ہیرو کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ ہم سب تیار بیٹھے تھے۔ ہیرو حضرات باہر ہال میں انٹرویو کے لئے بیٹھے تھے۔ فلم انڈسٹری کے نامور ہیرو تو خیر اس طرح انٹرویو میں آنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کی دال روٹی بحمد اللہ خوب چل رہی تھی۔ ہاں وہ لوگ جو ہیرو بننے کے آرزو مند تھے، آ گئے تھے۔ عبدل بھائی ہم سے پورا پورا تعاون کر رہے تھے۔ وہ ہم سے متفق ہو گئے تھے کہ بالکل نئے لوگوں کی ٹیم بنا کر کام شروع کیا جائے۔ چنانچہ اس وقت وہ بھی تیار بیٹھے تھے۔ چپراسی ہماری آواز کا منتظر تھا۔

عبدل بھائی نے گھنٹی بجائی اور دروازے سے ایک بانکے چھبیلے پیا اندر آ گئے۔ بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ سینہ چھبیس انچ، کمر اٹھارہ انچ، قد ساڑھے پانچ فٹ، گال پچکے ہوئے، دانت پیلے، سرخ

رنگ کی شرٹ اور نیلی پتلون۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جوانی کا خمار بھرے ہوئے، لچکتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

''خادم کو فرہاد راہی کہتے ہیں۔'' انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

''اس سے قبل کسی فلم میں کام کیا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''کون سا رول ادا کرتے رہے ہو؟''

''جی...... وہ...... بس پہلی فلم میں باہر والا بنا ہوں اور اس کے بعد......''

''اس کے بعد کیا؟'' طالوت اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''پھر چانس نہیں ملا۔ لیکن یہ میرے پاس تصویریں ہیں۔ دیکھئے، میں نے ان میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔''

انہوں نے جیب سے ایک پیکٹ نکال کر ہمارے سامنے پٹخ دیا اور تصویریں بکھر گئیں۔ کسی تصویر میں موصوف بوتل ہاتھ میں لئے ناچتے نظر آ رہے تھے، کسی میں عشقیہ پوز بنائے ہوئے تھے، کسی میں اپنے جیسے دو چار لوگوں سے نبرد آزما تھے۔

''اٹھایئے انہیں۔'' طالوت کڑک کر بولا۔

''جی وہ...... ایک دفعہ چانس دیجئے اور پھر دیکھئے۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولے۔

''تصویریں اٹھاؤ۔''

طالوت گرجا اور انہوں نے جلدی جلدی تصویریں سمیٹنا شروع کر دیں۔ پھر انہیں پیکٹ میں بھرنے کے بعد بولے۔

''تو پھر کیا فیصلہ کیا حضور نے؟''

''فیصلہ یہ کیا ہے کہ اگر تم دو منٹ کے اندر اندر اس عمارت سے نہ نکل گئے تو اٹھا کر باہر پھنکوا دیئے جاؤ گے۔'' طالوت کرسی کھسکاتے ہوئے بولا۔

''اوہ...... آپ بہت زندہ دل ہیں۔ مذاق فرما رہے ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن طالوت کرسی سے کھڑا ہو کر ان کی طرف بڑھا تھا۔

''اے جاؤ نا بابا! پہلے اپنا کمر سیدھا کر کے آؤ۔ ٹانگیں ٹیڑھا ہوتا پڑا اور ہیرو بننے آیا ہے۔ جاؤ نا یار!'' عبدل بھائی کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ لیکن فرہاد راہی موقعے کی نزاکت سے واقف ہو گئے تھے، اس لئے تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔ ''دیکھئے، اگر کوئی چانس ہو تو......''

''ابے جاتا ہے کہ نہیں؟'' طالوت اس کی طرف جھپٹا اور فرہاد راہی جلدی سے باہر نکل گیا۔ ''کیا سب ایسے ہی ہیں عبدل بھائی؟'' طالوت نے مایوسی سے پوچھا۔

''نہیں رانا صاحب! بہت سے فس کلاس چھوکرے ہیں۔''

''تو پھر براہِ کرم آپ باہر جا کر چند لوگوں کا انتخاب کریں اور صرف انہیں میرے پاس بھیجیں۔''

''جو حکم حجور!'' عبدل بھائی نے کہا اور باہر نکل گئے۔ ان کے ساتھ آنے والا ایک معقول شکل و صورت کا آدمی تھا۔ لیکن لباس اس کا بھی نامعقول تھا۔

"جاوید سعید رونی۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔
"ہائے، اس جانِ ناتواں پر تین تین ناموں کا بوجھ۔ کیا آپ ایک نام سے کام نہیں چلا سکتے بھائی صاحب؟" طالوت نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
"جاوید میرا نام ہے جناب! سعید والد صاحب کا نام اور رونی میرا تخلص۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اداکاری کون سے نام سے کریں گے؟"
"میرے دوست مجھے مستانہ کہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو یہ نام اختیار کر سکتا ہوں۔"
"خوب...... اداکاری آتی ہے آپ کو؟" اور اس سوال کے ساتھ ہی مستانہ صاحب کی مشینری خراب ہوگئی۔ ایک جھٹکے سے انہوں نے گھٹنا زمین پر ٹکایا، ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور نوری کی طرف دیکھ کر بولے۔
"چمپا!...... آہ چمپا!...... مجھے ان آنکھوں سے نہ دیکھ...... ہاں، میں نے جرمِ محبت کیا ہے۔ ہاں، میں نے پیار کیا ہے...... اگر تو میرے پیار کو پیار سمجھ لے تو مجھے پیار کی ہر سزا قبول ہے...... چمپا!...... تجھے کیا معلوم دیوانی! میری راتوں کا سکون برباد ہوگیا ہے۔ ہر وقت تُو نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ چمپا! میں مر جاؤں گا...... میں مر جاؤں گا چمپا!...... میں مر جاؤں گا۔" انہوں نے چیخ مار کر کہا اور نوری کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اور پھر انہوں نے اس کا ہاتھ بھی پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرے لمحے نوری نے سامنے رکھا قلم دان ان کے سر پر دے مارا۔ جاوید سعید رونی عرف مستانہ صاحب سنبھل گئے۔ قلمدان کی سیاہی نے اُن کے رُخِ پُرنور کو داغدار کر دیا تھا۔
"آئی...... آئی ایم سوری...... مم...... میڈم!...... یہ...... یہ اداکاری تھی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولے۔
"گیٹ آؤٹ۔" طالوت چیخا۔
"مم...... میرا خیال ہے......" مستانہ صاحب ہکلائے۔
"گیٹ آؤٹ۔" طالوت حلق پھاڑ کر چیخا۔
"اوہ...... آپ...... آپ لوگ آرٹسٹ کی قدر نہیں کر سکے۔ بہت خسارے میں رہیں گے آپ...... ایک دن...... ایک دن میں آسمانِ فلم پر ستارہ بن کر جگمگاؤں گا...... اور وہ وقت...... وہ وقت دور نہیں ہے۔" وہ شرافت سے باہر نکل گیا۔
"عبدل بھائی......!" طالوت نے تھکے تھکے انداز میں پکارا۔
"حجور...... سرکار......!"
"اس سے بھی معقول آدمی کوئی اور ہے؟"
"دو آدمی اور بیٹھے ہیں حضور!"
"دونوں کو ایک ساتھ بلا لو۔" طالوت نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور عبدل بھائی پھر باہر نکل گئے۔
اور پھر وہ باہر بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کو ساتھ لے کر اندر آ گئے۔
ان میں ایک زنانی شکل، لیکن اچھے تن و توش کا آدمی تھا۔ دوسرا دراز قد، چھریرے بدن کا ایک خوبصورت سا نوجوان تھا اور اسے دیکھ کر طالوت چونک پڑا۔ پہلی بار ایک معقول شکل نظر آئی تھی۔ اس کا

لباس بھی سادہ تھا۔ سفید معمولی پتلون، سفید قمیض، چہرے پر بھی سادگی۔ عمر اٹھائیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

''تشریف رکھئے۔'' طالوت نے دونوں کو اشارہ کیا اور پھر زنانی شکل والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ کا نام؟''

''دلاور۔'' اس نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

''اس سے پہلے کسی فلم میں کام کیا ہے؟''

''اونئیں جی۔ پر اپن فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اداکاری بھی جانتے ہیں۔ مار کائی کی فلموں کے لئے بہت فٹ ہیں۔ جوڈو بھی جانتے ہیں۔''

''خوب......!'' طالوت مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہماری فلم مار کٹائی والی نہیں ہے۔ وہ سوشل فلم ہے۔''

''اپن رونے پیٹنے میں بھی ایکسپرٹ ہے۔ اگر آپ بولو تو اداکاری کے جوہر دکھائیں۔'' اس نے کہا۔

''دکھایئے۔''

طالوت نے کہا اور وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے زاویے بدلنے لگے۔ منہ ٹیڑھا ہو گیا اور وہ ہیجڑوں کے انداز میں بولا۔

''اگر...... اگر یونہی ٹھکرانا تھا...... تو میری زندگی میں کیوں آئی تھیں؟...... بولو، جواب دو...... میں زندگی کا بوجھ لئے کہاں کہاں پھروں؟...... خدا کے لئے...... اپنے ہاتھوں سے مجھے زہر دے دو۔ میں مرنا چاہتا ہوں...... مرنا چاہتا ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نوری پھر ہنس پڑی تھی۔

''دوسرا ایکشن۔'' اس نے اکڑ کر کہا۔ ''چیونٹی کے پَر نکل آئے ہیں۔ جا چلا جا جوان!...... دلاور کے سامنے آنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ پھنس جائے گا، تو یہ لے...... ہا...... ہا...... آ...... ہے...... اے......'' اس نے جوڈو کے داؤ دکھانے شروع کر دیئے۔ ''ای...... ہا...... آ...... آ......'' اس نے لپک کر کرسی پر بیٹھے ہوئے دوسرے نوجوان کی گردن پکڑ لی اور وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جوڈو ماسٹر نے اس کے بازو پکڑ کر پھینکنے کی کوشش کی لیکن دوسرے نوجوان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک زوردار دھکا دیا۔ اور جوڈو ماسٹر چاروں شانے چت جا گرا۔ دوسرے لمحے وہ کھڑا ہو گیا۔ ''سوری ماسٹر!...... اپن بڑک بھی لگا سکتا ہے، صاحب!...... یا آ آ......'' وہ مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔

''خوب، خوب...... ٹھیک ہے...... کافی ہے۔ بس اب باہر جاؤ۔ اگر تمہارا سلیکشن ہو گیا تو اطلاع دے دی جائے گی۔'' طالوت نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''او کے، تھینک یو۔ بس ذرا خیال رکھیں۔'' اس نے نہایت شرافت سے کہا اور کپڑے جھاڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ تب انہوں نے آخری ہیرو کی جانب دیکھا۔

''آپ کا نام......؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جی...... مجھے محمود کہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اداکاری کا شوق کب سے ہے آپ کو؟'' طالوت نے پوچھا۔

''پیدائش کے فوراً بعد سے۔ بھوکا تھا۔ ماں سے دودھ مانگنے کے لئے رونے کی اداکاری کی اور کامیاب رہا۔ اس کے بعد جوں جوں زندگی کی منازل طے کرتا رہا، حقیقت پر لبادے پڑتے گئے اور اداکاری آتی گئی۔ کیونکہ اس کے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو؟''

''جی ہاں...... بی۔اے تک پڑھا ہے۔''

''خوب...... کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ایک کامیاب اداکار بن سکیں گے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''کامیاب اداکار ہوتا تو اب تک ملازمت مل گئی ہوتی۔ میں لوگوں کو اپنی پریشانی، اپنی ضرورت، اپنی قابلیت کا یقین دلانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔''

''خوب...... پھر فلمی دنیا میں آپ کو کامیابی کا یقین کیوں ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''مجھے یقین نہیں ہے۔ لیکن کوشش کرنے میں حرج نہیں سمجھتا۔ پولیس نے مجھے باقاعدہ ڈرائیونگ لائسنس دیا ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے میں نے ایک پیسہ بھی رشوت نہیں دی۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی ٹرائی دے سکتا ہوں۔ ایمانداری سے کام کروں گا۔ پٹرول چرانے کی عادت قطعی نہیں۔ جو بھی تنخواہ ملے گی، اس پر اعتراض نہیں کروں گا۔ اگر اس معیار پر پورا نہ اُتروں تو آپ مجھے الگ کر سکتے ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''کیا مطلب...... کیا مطلب ہوا اس بات کا؟'' طالوت حیرت سے بولا۔

''حالات سے آپ کی غلط فہمی کا اندازہ ہو گیا ہے۔ لیکن میں یاد دلا دوں کہ آپ نے ڈرائیور کے لئے بھی اشتہار دیا ہے۔ اگر کوئی خوش نصیب منتخب ہو چکا ہے تو وقت خراب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔''

''ارے......'' ہم سب کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ درحقیقت ہم نے ڈرائیور کی ضرورت کا بھی اشتہار دیا تھا اور ابھی تک کوئی ڈرائیور بھی نہیں رکھا تھا۔

''تو...... تو آپ ہیرو بننے نہیں آئے؟'' طالوت بولا۔

''قدم قدم پر زندگی سے ہارنے والے ہیرو نہیں ہوتے۔ میں تو ڈرائیور ہوں۔''

''سوری محمود صاحب!...... آپ نے دیکھا کہ یہاں بے شمار ہیرو آئے تھے۔''

''جی ہاں...... اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ جوڈو ماسٹر میری قمیض نہ پھاڑ دے۔'' محمود ہنستے ہوئے بولا۔ اور نوری بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔

''ٹھیک ہے محمود صاحب! آپ اپنا لائسنس دکھائیں گے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' محمود نے اپنے کاغذات طالوت کے سامنے پیش کر دیئے۔

''کیا تنخواہ قبول کریں گے آپ؟''

''کم بھی ہوگی تو لے لوں گا۔ آپ کی پسند مقدم ہوگی۔ کیونکہ سخت ضرورت مند ہوں۔'' اس نے کہا۔

''آپ کے والدین حیات ہیں کیا؟''

"خدا کے فضل سے والدین موجود ہیں اور ایک چھوٹی بہن بھی۔"
"کہاں قیام ہے؟"
"ایک معمولی سی بستی میں۔ لیکن وقت کی پابندی کا خیال رکھوں گا۔" محمود نے جواب دیا۔
"جو تنخواہ ہم دیں گے، اس پر اعتراض تو نہیں کریں گے؟"
"قطعی نہیں۔"
"وعدہ......؟"
"جی ہاں......وعدہ۔" محمود نے جواب دیا۔
"تب آپ کی ملازمت کل سے شروع۔ نورالنساء خاتون کی اجازت سے آپ کی تنخواہ فی الحال ایک ہزار روپے ماہوار مقرر کی گئی ہے۔ آپ کے گھر کے دوسرے اخراجات بذمہ کمپنی۔ وعدے کی پابندی شرط ہے۔ کمپنی آپ کے لباس اور دوسرے اخراجات کی ذمہ دار ہوگی۔ ہاں، ایک رعایت آپ سے طلب کی جا سکتی ہے۔"
"حکم......" محمود حیرت سے بولا۔ ایک ہزار اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھے۔
"اگر ضرورت پڑی تو آپ سے دفتر کا کچھ کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ہزار الگ سے۔ اور ہم اپنے اصول کے مطابق ملازموں کو دو ماہ کی تنخواہ بطور ڈیپازٹ یا بطور ایڈوانس ادا کر دیا کرتے ہیں۔ تاکہ ملازمت پکی سمجھی جائے۔"
محمود کی زبان بند ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس انداز میں ہم لوگوں کو دیکھنے لگا تھا، جیسے سمجھ رہا ہو کہ ہم اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اور اس نے بمشکل تمام یہ سوال کر ہی دیا۔
"کیا......کیا آپ مذاق کر رہے ہیں جناب؟"
"کیوں......آپ کو اس میں مذاق کی کون سی بات نظر آئی؟" میں نے سوال کیا۔
"ڈرائیور کی تنخواہ......ایک ہزار......اور......اور......"
"منیجر صاحب!" طالوت زور سے چیخا۔ "ان صاحب کا ایگریمنٹ تیار کرا کر دے دو۔ ہم ان سے پانچ سال کا ایگریمنٹ کرنے کو تیار ہیں۔"
"جو حکم رانا صاحب!" عبدل بھائی سیٹ سے اُٹھتے ہوئے بولے۔
"لیکن جناب!......مم......میرا مطلب ہے......"
"اگر آپ کو ایک ہزار روپے زیادہ لگ رہے ہیں تو معاف کیجئے مسٹر محمود! اس سے کم تنخواہ پر ہم آپ کو رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آپ کو پورے دو ہزار روپے ماہوار لینے ہوں گے۔ باقی اخراجات بھی ہماری مرضی کے مطابق ہوں گے۔ دراصل یہ رانا صاحب کی پرسٹیج کا سوال ہے۔ ہمارے ہاں کام کرنے والوں کو بھی معمولی نہیں ہونا چاہئے۔"
"بہتر جناب! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" بالآخر محمود نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"تب پھر ہماری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے محمود صاحب!" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑے ہو کر محمود سے مصافحہ کیا۔ پھر اس کے لئے کافی وغیرہ منگوائی گئی۔ اس کے ساتھ کچھ دوسرے

لوازمات بھی تھے۔نوری کافی بنانے کے لئے اٹھی تھی۔لیکن محمود جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے اجازت دیجئے جناب! کافی میں بنا دوں۔''

''بری عادت ہے مسٹر محمود! یہ لڑکیوں کا شوق چھوڑ دیجئے۔''

طالوت نے کہا اور محمود جھینپ گیا۔

''مم...... میرا مطلب ہے...... باس کہاں تکلیف کریں گی؟''

''ان کا نام باس نہیں، نور ہے۔آپ ازراہ احترام مس نور کہہ سکتے ہیں۔ ویسے کافی بنانا لڑکیوں کا کام ہے اور یہاں ان کے علاوہ اور کوئی لڑکی نہیں، اس لئے یہ کام یہی کریں گی۔ کیوں نور؟''

''یقیناً۔'' نوری نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اس نے کافی بنا کر سب سے پہلے بڑے احترام سے محمود کو پیش کی، پھر دوسرے لوگوں کو اور پھر ایک کپ وہ خود لے کر بیٹھ گئی۔

محمود کسی حد تک سنبھل گیا تھا۔وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے بار بار ان لوگوں کی شکلیں دیکھنے لگتا تھا۔ اس کے ہونٹ اس انداز میں کھلتے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔پھر بند ہو جاتے تھے۔

''کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں مسٹر محمود؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جی۔''اس نے گہری سانس لی۔

''تو کہیے۔''

''کیا مجھے،آپ کے بارے میں کچھ کہنے کی اجازت ہے؟''

''توصیفی کلمات ہیں؟''

''جی ہاں۔'' محمود مسکراتے ہوئے بولا۔

''تب پھر ان کی تنخواہ آپ کو الگ سے قبول کرنی پڑے گی۔'' طالوت دھمکی دینے والے انداز میں بولا اور محمود ہنس پڑا۔اس کے انداز میں بے بسی، خوشی اور حیرت شامل تھی۔

''مسٹر محمود! آپ کو ڈرائیوروں جیسی کوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں۔مثلاً آپ نور کے لئے کار کا دروازہ کبھی نہیں کھولیں گے۔ کیونکہ ان کے بھی ہاتھ موجود ہیں۔ نہ ہم لوگوں کے لئے کوئی کام کرنے دوڑیں گے۔ہم سب اپنا اپنا کام انجام دینے کے قائل ہیں۔''

''جی......'' محمود کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ جسے دوسرے لوگوں نے محسوس کر لیا تھا۔

اتنی دیر میں عبدل بھائی آ گئے۔ انہوں نے اگریمنٹ اور دو ہزار روپے محمود کے ہاتھ میں پکڑا دیئے تھے۔تب طالوت نے کوٹھی کا پتہ دیتے ہوئے کہا۔

''کل صبح نو بجے اس پتے پر پہنچ جائیں۔آپ صرف نور کو لے کر آفس آئیں گے اور اس کے بعد آفس میں بیٹھیں گے۔''

''بہت بہتر۔'' محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب آپ اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور محمود کھڑا ہو گیا۔اس نے سلام کیا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

''مسٹر محمود!'' طالوت اچانک بولا۔

''جناب!''

''بداخلاقی کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو ہم سے مصافحہ کر کے رخصت ہونا چاہیے۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور محمود نے جھینپے ہوئے انداز میں مجھ سے، طالوت سے اور عبدل بھائی سے مصافحہ کیا۔ نوری کو سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی، پھر طالوت نے میری طرف دیکھا۔

''کیا خیال ہے سلیم؟''

''بالکل فٹ......'' میں نے مستعدی سے کہا۔ نوری اور عبدل بھائی ہمارے ان کوڈ ورڈز کو نہیں سمجھ سکے تھے۔

۞

فلمی دنیا کے ہنگاموں میں خوب گزر رہی تھی۔طرح طرح کے جال میری اور طالوت کی طرف آ رہے تھے۔سب جانتے تھے کہ ہم ہی اس کمپنی کے روحِ رواں ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے ہمیں سنہرے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جال حسین لڑکیوں پر مشتمل تھے۔لیکن اب نہ تو طالوت ہی کچے ذہن کا مالک تھا اور میری تو بات ہی دوسری تھی۔ میں کب کسی کے فریب میں آنے والا تھا۔ چنانچہ بعض اوقات ہم نے لوگوں کی پیشکشوں سے فائدہ بھی اٹھالیا۔لیکن نوری کا خیال ہم دونوں رکھتے تھے۔ اس کی نگاہ میں اپنا کردار خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اپنے محمود صاحب بھی خوب تھے۔نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ابتدا میں حیرت کا شکار رہا، بھلا ہم کروڑ پتی لوگوں سے کیسے بے تکلف ہو سکتا تھا۔لیکن کہاں تک۔ یہاں تو کسی میں دولت کی خوبو ہی نہیں تھی۔نوری تھی تو نہایت سادہ مزاج، رہ گئے میں اور طالوت۔تو ہمارے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ چنانچہ محمود صاحب کو کھلنا ہی پڑا۔اب وہ دبے الفاظ اور مہذب انداز میں مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔

ویسے درحقیقت شریف اور مستعد آدمی تھا۔اپنی ڈیوٹی سے اس نے آج تک ذرا بھی غفلت نہیں برتی تھی۔صبح نو بجے گھر پہنچ جاتا تھا۔ہم لوگ اس وقت تیاریاں کر رہے ہوتے تھے۔وہ انتظار کرتا رہتا اور پھر ہمیں لے کر دفتر آ جاتا۔اس نے اپنے لئے ایک دفتر بنا لیا تھا، جہاں وہ کمپنی کے دوسرے کام کرتا رہتا۔ اور جب کہیں جانے کی ضرورت ہوتی تو ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا۔ یہ کیفیت ایک ہفتہ رہی۔ہم اسے ناشتے میں شریک کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ناشتہ کر کے آتا تھا۔ چنانچہ ایک دن جب وہ پہنچا تو ہم سب بستروں پر پڑے تھے۔

''ہم نے بھوک ہڑتال کر دی ہے۔ اگر کل سے تم نے ہمارے ساتھ ناشتے کا وعدہ نہ کیا تو ہڑتال جاری رہے گی۔''

''ایمان سے محمود صاحب! میں نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا، طبیعت پر کچھ گرانی تھی۔ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔اگر آپ نے جلد وعدہ نہ کیا تو میں جاں بحق ہو جاؤں گی۔'' نوری نے کہا۔

''آپ مجھے حکم دیں مس نور! میں بھلا انکار کر سکتا ہوں؟ لیکن خدارا مجھے اپنی حیثیت یاد رہنے دیں۔ اگر میں خود کو بھول گیا تو میرے والدین کا سہارا چھن جائے گا۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

''ان الفاظ کا ترجمہ کرو۔'' طالوت اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''بھائی جان! اس وقت، جب میں دنیا میں بالکل بے سہارا بھٹک رہا تھا، میں نے اپنی شخصیت ختم کر

دی تھی۔ آپ نے میرا ہاتھ تھام لیا، آپ نے مجھے وہ کچھ دے دیا، جس کا میں اپنی دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں بہت خوش ہوں۔ آپ مجھے احکامات دیتے رہیں۔ ایسے راستے پر نہ ڈالیں کہ میں ایک بار پھر اپنی شخصیت کو بھول جاؤں۔"

"تمہیں احساس ہے کہ تم نے مجھے کس نام سے مخاطب کیا ہے؟" طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"م...... معافی چاہتا ہوں۔ شدت جذبات میں کہہ گیا تھا۔"

"گویا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم ہوش و حواس میں مجھے بھائی جان کہہ سکو۔ کیوں؟" طالوت اسی انداز میں بولا۔ محمود بے بسی سے ہنسنے لگا۔

"محمود عالی! تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ تم مجھے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرو گے۔ اور اے نورالنساء خاتون! اب آپ کسی دوسرے ڈرائیور کا انتظام کر لیں...... غضب خدا کا...... نواب رانا عزیز الدین کا بھائی...... اور آپ کا ڈرائیور۔" طالوت بولا۔

"بہتر ہے بھیا!"

"سن لیا آپ نے محمود صاحب! کل سے ناشتہ ہمارے ساتھ ہی کریں گے۔"

"جو حکم۔ لیکن میرا خیال ہے، میرے معمولات میں تبدیلی نہ کی جائے۔" محمود دبی زبان میں بولا اور طالوت چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اور پھر وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"بہت بہتر...... بہت بہتر...... بڑی خوشی کی بات ہے، آپ اپنے معمولات جاری رکھئے۔"

بہرحال، طالوت کی باتوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور محمود نے اپنا کام جاری رکھا۔ ہاں، اب وہ ہم سب سے کسی قدر بے تکلف ہو گیا تھا۔ چونکہ ملازمت دیتے وقت اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اس کے لباس وغیرہ کی ذمہ داری کمپنی پر ہو گی، اس لئے طالوت کی ایما پر اس کے لئے بہترین لباس تیار کرائے گئے تھے، جن میں ڈرائیور کا ایک لباس بھی نہیں تھا۔

محمود نے اس پر بھی دبا دبا احتجاج کیا تھا۔

پھر پہلی تاریخ کو محمود کو تنخواہ ملی تو طالوت نے نادر شاہی انداز میں کہا۔ "چونکہ آپ کو پہلی تنخواہ ملی ہے مسٹر محمود! اس لئے آپ پر ایک ڈنر ڈیو ہو گیا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کب ہماری دعوت کرتے ہیں۔"

"آج ہی بھائی جان!"

"اتنی جلدی تیاریاں کر لو گے؟"

"م...... میرا مطلب ہے...... میرا مکان تو اس قابل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہوٹل......"

"اونہہ...... ہوٹل میں بھلا ڈنر کا کیا مزہ آئے گا۔ ویسے اگر دعوت کا وعدہ پکا ہو تو کمپنی آپ کے لئے مکان کا بندوبست کر سکتی ہے مسٹر محمود!"

"اوہ، نہیں...... اگر آپ کا حکم ہے تو پھر گھر پر ہی پروگرام بنا لیتا ہوں، لیکن کل کا۔"

"منظور......" طالوت نے کہا اور دوسرے دن رات کو ہم سب محمود کے مکان پر پہنچ گئے۔ معمولی سی بستی میں ایک معمولی سا مکان...... سادہ سادہ سے لوگ...... محمود کی بہن بھی محمود کے مانند نیک اور سادہ تھی۔ مخلص اور محبت کرنے والے لوگ۔ کھانے میں بھی سادگی تھی۔ اس سے محمود کی فطرت کا اندازہ ہوا

تھا، وہ نمائش پسند نہیں تھا۔ محمود کے ہاں سے ڈنر کر کے ہم واپس آ گئے۔ نوری نے بھی محمود کے گھر والوں کی بہت تعریف کی تھی۔

فلم کی کہانی پر بھرپور کام ہو رہا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہم نے ایک کاپی نویس رکھ لیا تھا اور ہم سب مل کر کہانی لکھ رہے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ کہانی نویس بھی کوئی مناسب شخص مل جائے۔ لیکن مناسب لوگ فلم انڈسٹری سے اتنے بددل تھے کہ وہ اس انداز میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ گھٹیا قسم کی رومان انگیز داستانیں لکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہرحال ہماری تلاش جاری تھی اور کہانی بھی لکھی جا رہی تھی۔ دوسرے بہت سے معاملات باقی تھے اور ہم ان کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ خیال یہ تھا کہ جب کہانی مکمل ہو جائے گی، تب اس میں شامل ہونے والوں کی فہرست بنائیں گے۔

اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ سیٹھ دولہا بھائی نوشہ بھائی کے سنگ سنگ آرٹس پروڈکشن کی نئی فلم ''آسمانی سوار'' کی مہورت تھی۔ سیٹھ نوشہ بھائی دولہا بھائی ہمیشہ جادوئی فلمیں بنایا کرتے تھے۔ اور آسمانی سوار بھی ایسی ہی فلم تھی۔ جادو کے مناظر اور مار کٹائی سے بھرپور...... انہوں نے مہورت بھی انوکھے انداز میں کی تھی۔ یعنی شہر سے باہر ایک پُرفضا مقام پر انہوں نے مہورت کا انتظام کیا تھا۔ اور سب کو وہاں دعوت دی تھی۔

''کیا خیال ہے نور؟''

''لطف آئے گا۔'' نوری مسکراتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، چلیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ضرور چلیں گے...... ضرور چلیں گے۔ میرا خیال ہے، دعوت نامے میں کوئی قید تو نہیں ہے۔ ہم پانچوں چلیں۔''

''پانچوں کون؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بھئی ہم تینوں، عبدل بھائی اور محمود۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلا کر تائید کر دی۔ اور ہم بے چینی سے دعوت کی تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ دن آ گیا اور ہماری کاریں ''ترنا'' چل پڑیں۔ ترنا شہر سے باہر ایک پُرفضا مقام تھا۔ سرسبز پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا۔ وہاں ایک خوبصورت جھرنا بھی تھا۔ اس جھرنے کا نام ترنا رکھ دیا گیا تھا۔ اکثر فلموں کی شوٹنگ یہاں ہوتی تھی۔

سیٹھ نوشہ بھائی دولہا بھائی سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ نایاب چیزیں تھیں۔ چار چار فٹ کے قد اور چار فٹ ہی پھیلاؤ...... بس ایسا لگتا تھا جیسے دو بہت بڑی گیندیں ہوں، جو ساتھ ساتھ رکھی ہوں۔ دونوں بھائی تھے اور ہم شکل بھی تھے۔ تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ استقبال کر رہے تھے۔

عبدل بھائی نے ہمارا تعارف کرایا اور دونوں نے خوش اخلاقی سے دانت نکال دیئے۔ ''بڑی خوشی ہوئی جی۔ بڑے نام ہیں آپ کے بھی ہو ہو ہو..... فلم کب اسٹارٹ کر رہے ہیں؟'' نوشہ بھائی نے گڑبڑاتی آواز میں کہا جو بمشکل حلق کو چیرتی پھاڑتی باہر نکل رہی تھی۔

''بس نوشہ بھائی! بہت جلد آپ لوگوں کو تکلیف دیں گے۔''

''کیوں جی، ہمیں کیوں تکلیف دیں گے؟'' دولہا بھائی، طالوت کو گھورتے ہوئے بولے۔

''مطلب یہ ہے دولہا بھائی! کہ آپ کو مہورت میں آنے کی تکلیف دیں گے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہا ہا ہا ہا......'' دونوں نے بھیانک قہقہے لگائے اور تمام مہمان چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ ہم لوگ آگے بڑھ گئے چونکہ دوسرے مہمان بھی آ رہے تھے۔

''انتظام عمدہ ہے۔'' طالوت نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ خوبصورت شامیانے چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک بڑے شامیانے میں مہمانوں کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ یونٹ کیمپ الگ تھا۔ رنگین لباس میں حسین چہرے چاروں طرف نظر آ رہے تھے۔

''آداب عرض کرتا ہوں، نورالنساء خاتون!'' ایک طرف سے آواز آئی اور ہم چونک پڑے۔ گھوم کر دیکھا تو بابو خان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ نوری کے چہرے پر گھبراہٹ اُبھر آئی۔ بابو خان سے اس کا خوف فطری تھا۔

''کیا بات ہے بابو خان؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کہیں کام وغیرہ ملا یا یونہی گھوم رہے ہو؟'' بابو خان کے طنزیہ انداز کے جواب میں میری طرف سے یہ بھرپور جملہ تھا۔ بابو خان تلملا کر رہ گیا اور طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ تاہم وہ سنبھل کر بولا۔

''سیٹھ روئی والا جیسے چھچھورے انسانوں کے ساتھ تو میں خود بھی کام کرنا پسند نہیں کرتا سیکرٹری صاحب! ورنہ میرے لئے کام کی کیا کمی ہے؟ اور ابھی آپ کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اس لائن میں آئے ہوئے۔ ابھی کوئی فلم بنائیے۔ لوگوں کی قیمت تو آپ کو اس وقت معلوم ہوگی۔''

''مگر یار! تم جیسے کسی فرد کو ہم اپنی فلم میں لیں گے نہیں، جسے گھوڑے کی سواری بھی نہ آتی ہو۔'' طالوت نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔

''فلم شروع تو کریں رانا صاحب! حقیقت معلوم ہو جائے گی۔'' بابو خان نے کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ طالوت نے مسکرا کر نوری کی طرف دیکھا۔ نوری کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ بابو خان کے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔ پھر ہم مہمانوں کے پنڈال میں پہنچ گئے۔

یہاں عبدل بھائی نے بہت سے لوگوں سے ہماری ملاقات کرائی۔ کچھ لوگ ہمارے واقف بھی تھے، جنہوں نے بڑے اخلاق سے ہمارا استقبال کیا اور بڑی دلچسپ گفتگو ہونے لگی۔ کئی ہیروئنیں ہمارے گرد چکرا رہی تھیں۔ صرف ہماری توجہ کی دیر تھی، وہ جاں نثاری کرنے لگتیں۔

دفعتہً طالوت نے کہنی سے اشارہ کیا اور میں نے اس طرف دیکھا۔ روشیلا تھی، جو حسبِ معمول بنی ٹھنی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا اور ہماری طرف بڑھ آئی۔

''بڑے جگرے کی عورت ہے۔ ادھر ہی آ رہی ہے۔'' طالوت نے نیچی آواز میں کہا۔ روشیلا ہمارے قریب پہنچ گئی۔

''ہیلو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہیلو روشیلا!'' طالوت بولا۔

''کیسے ہیں رانا صاحب؟''

''بس، جی رہے ہیں مس روشیلا!'' طالوت نے جواب دیا۔

''کیوں......خدا نے آپ کو زندگی کی ساری آسائشیں مہیا کر دی ہیں، پھر یہ مایوسانہ انداز کیوں؟''
''آپ کے بغیر سب کچھ پھیکا پھیکا ہے۔'' طالوت شرارت سے بولا۔
''میں آپ کو کھو چکی ہوں رانا صاحب! ایک چھوٹی سی غلطی، مجھے اچھے لوگوں سے دور کر دینے کا باعث بن گئی ہے۔ انسان ایک غلطی کرتا ہے، لیکن اس کی سزا کتنی طویل، کتنی بھیانک ہوتی ہے۔'' روشیلا نے اُداسی سے کہا اور گردن جھکا لی۔ طالوت چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اسے آنکھ مار دی۔
کچھ اور لوگ ہمارے قریب آ گئے اور ان میں سے ایک نے روشیلا کو اپنی طرف مخاطب کر لیا۔
''یار! یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' طالوت اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔
''پرانے شکاری، نیا جال لائے ہیں۔ ہوشیار رہو رانا عزیز الدین!..... کیوں نوری! کیا خیال ہے؟''
''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' نوری نے جواب دیا۔
''اور یہ آپ احترام الدین کیوں بنے ہوئے ہیں محمود صاحب! آپ بھی کچھ بولیے، لوگوں سے گھلیے ملیے۔ آپ کو اس لائن میں کام کرنا ہے۔'' طالوت، محمود کی طرف دیکھ کر بولا اور محمود مسکرا دیا۔
''میں مطمئن ہوں رانا صاحب!''
''عبدل بھائی کو دیکھئے، یہ شاید ان کی محبوبہ ہیں۔'' طالوت نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم سب نے عبدل بھائی کو دیکھا، جو ایک ادھیڑ عمر کی خاتون پر نثار ہو رہے تھے۔ انہیں اپنے لہجے کا بھی احساس نہیں تھا۔ خاصی اونچی آواز میں بول رہے تھے اور ان کی آواز ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔
''خدا قسم بلبل بائی! اپن کو وہ ٹائم یاد ہے، جب اپن نے پہلی بار تمہارے کو دیکھا تھا..... ہائے، کیا بر (نظر) تھی...... کیا مسکراہٹ تھی۔'' عبدل بھائی دانت کٹکٹانے لگے۔
ہٹیے بھی عبدل بھائی! کیوں پرانی باتیں یاد دلا کر دل دُکھاتے ہیں۔'' بلبل بائی لچک کر بولیں۔ لیکن عبدل بھائی کا منہ بگڑ گیا تھا۔
''اے، پھر عبدل بھائی بولا۔ میں تیرے کو کتنی بار بولا، بلبل بائی! اے کچھ کھیال کرو...... کھالی عبدل بولا کرو، آں۔'' عبدل بھائی نے اسے سمجھایا۔
''ملاحظہ کیا آپ نے؟'' طالوت نے محمود کو اشارہ کیا اور محمود جھینپے ہوئے انداز میں ہنس پڑا۔ نوری بھی منہ پھیر کر مسکرا رہی تھی۔
تقریباً سارے مہمان جمع ہو گئے تھے چنانچہ نوشہ بھائی اور دولہا بھائی بھی پنڈال میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی نئی فلم کے بارے میں بتایا۔ اس کے یونٹ سے متعارف کرایا۔ ہیروئن مس شمشاد بہت خوب صورت تھیں۔ ہیرو دیونندا بھی بہت خوب صورت آدمی تھا۔ دوسرے لوگوں میں بابو خان بھی تھا جو ولن کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس وقت بابو خان پرانے دور کی نقلی داڑھی لگائے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر زرق برق لباس تھا اور کمر سے تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ شاید وہ بھی میک اپ کر کے آیا تھا۔
''فلم کا پہلا شارٹ آؤٹ ڈور رکھا گیا ہے۔ ولن بابو خان، جادوگر شم شم ہے۔ وہ ایک اونچی پہاڑی میں رہتا ہے اور اپنے اُڑنے والے گھوڑے پر آتا ہے۔'' نوشہ بھائی نے جو اس فلم کے ڈائریکٹر بھی تھے، بتایا۔ ''اور اب آپ لوگوں سے درکھاست ہے کہ مہورت میں شریک ہوں۔''

کیمرے وغیرہ اپنی جگہ سیٹ ہو چکے تھے۔ پورا یونٹ تیار تھا۔ بابو خان کے اُڑتے ہوئے گھوڑے کا شاٹ لینا تھا۔ چنانچہ مہمان ایک قطار میں کھڑے تھے۔

''عارف......!'' طالوت آہستہ سے بولا۔

''ہوں۔'' میں نے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا۔

''بابو خان۔'' طالوت بولا۔

''کیا مطلب؟''

''پھر گھوڑا۔'' طالوت نے ہونٹ بھینچ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ......'' میں طالوت کو دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ ''جانے دو طالوت! ہماری نوشہ بھائی، دولہا بھائی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''بابو خان سے تو ہے۔''

''نوشہ بھائی، دولہا بھائی کی وجہ سے اسے معاف کر دو۔''

''مشکل ہے عارف! ابھی بابو خان نے پھر بکواس کی تھی۔''

''تو پھر؟''

''ہم نوشہ بھائی، دولہا بھائی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، لیکن بابو خان......اسے معاف کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟''

''دیکھتے رہو۔'' طالوت بولا۔ اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

بابو خان سفید رنگ کے ایک گھوڑے پر بڑی شان سے سوار ہو گیا۔ آج اسے خود پر پورا پورا اعتماد تھا۔ خاص طور سے وہ روئی والا کو ذلیل کرنا چاہتا تھا، جس نے اسے اپنی فلم سے نکال دیا تھا۔ سیٹھ روئی والا بھی شریک تھا۔ لیکن وہ آج دور دور ہی رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ہمارے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مصنوعی بادل پیدا کرنے کے لئے مشینوں سے سفید دھواں چھوڑا جانے لگا۔ بابو خان کو اس دھوئیں سے اپنا گھوڑا گزارنا تھا، تاکہ وہ پرواز کرتا ہوا معلوم ہو۔

''کیمرہ اسٹارٹ......!'' ڈائریکٹر کی آواز اُبھری اور کیمرے اسٹارٹ ہو گئے۔ ''کلیپ۔'' دوسری آواز سنائی دی اور کلیپر بوائے نے کلیپ دیا اور بابو خان نے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ اس کے ساتھ ہی طالوت کی آواز اُبھری۔

''راسم......!''

''آقا......!'' راسم کی سرگوشی میں نے بھی سنی تھی، لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

''گھوڑے کو اُڑنا چاہیے......خاصی بلندی تک۔ لیکن بابو خان گرنے نہ پائے۔''

''ایسا ہی ہوگا آقا!'' راسم نے کہا اور میرے ہوش اُڑ گئے۔ فلم کی تاریخ کا حیرت ناک واقع ظہور ہونے والا تھا۔ بابو خان گھوڑا دوڑاتا ہوا دھوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

جوں ہی اس نے دھوئیں میں قدم رکھا، اس کے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے۔ اب وہ فضا میں بلند ہو کیمرے چل رہے تھے۔ خود کیمرہ مینوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، اس لئے وہ غیر اختیاری طور پر

کیمروں کے رخ بدل رہے تھے۔ خود بابو خان کو بھی ابھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ گھوڑا بلند کس طرح ہو رہا ہے۔ لیکن پھر سارے مہمانوں کے منہ سے حیرت زدہ چیخیں نکل گئیں۔ گھوڑا دھوئیں سے کافی اوپر بلند ہو گیا تھا اور آسمان کی سمت پرواز کر رہا تھا۔ خود گھوڑے کو قدموں کے نیچے خلا ہونے کا احساس نہیں تھا، ورنہ وہ بھی گڑبڑ کرتا۔ البتہ بابو خان کے حواس خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اور اب اس کی چیخیں صاف سنی جا سکتی تھیں۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

''ارے بچاؤ...... بچاؤ...... آ...... آ آ......'' بابو خان خوف سے گھگھیا رہا تھا۔ لیکن لطف کی بات تھی کہ کیمرے چل رہے تھے اور حقیقی منظر سلولائیڈ پر منتقل ہو رہا تھا۔ بابو خان دہشت سے چیخ چلا رہا تھا۔ اب اس کی بری حالت تھی۔ لیکن گھوڑا اطمینان سے خلاء کا سفر کر رہا تھا۔ اب وہ کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا اور بابو خان کی چیخیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ لوگ حیرت سے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ خود دولہا بھائی اور نوشہ بھائی پتھر کے بُت کے مانند کھڑے تھے۔ یوں سمجھ لیا جائے کہ میرے اور طالوت کے علاوہ سب پاگلوں کے مانند اُڑتے ہوئے گھوڑے کو دیکھ رہے تھے، جن میں نوری اور محمود بھی تھے۔

تب گھوڑے نے نیچے کا رخ کیا اور بتدریج نیچے اُترنے لگا۔ کیمرہ مین بھی بس نہ جانے کس طرح اپنا کام کر رہے تھے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ نیچے پہنچ گیا اور پھر وہ زمین پر اُتر گیا۔

اور پھر بابو خان کسی مُردہ چھپکلی کے مانند پٹ سے نیچے گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ لوگ بابو خان اور گھوڑے کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ قریب پہنچنے والے کبھی بابو خان کو دیکھ رہے تھے اور کبھی گھوڑے کو۔ پھر بابو خان کو اٹھا کر ایک خیمے میں لے جایا گیا۔

دونوں سیٹھ اب بھی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ ہاں، لوگوں نے جب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو وہ چونکے۔

''ونڈرفل نوشہ بھائی!...... کیا سین ہوا ہے۔ لیکن یہ جادوئی گھوڑا آپ کو کہاں سے ملا؟''

''کیا یہ کل کا گھوڑا ہے؟''

''یہ سب کیا ہے دولہا بھائی؟''

''یہ گھوڑا آپ ہی کا ہے؟''

''آپ نے اسے کہاں سے حاصل کیا؟''

''میرا خیال ہے، جادو کی فلموں میں یہ سب سے انوکھی فلم ہو گی۔''

''یہ فلم مارکیٹ کا ریکارڈ توڑ دے گی۔ ایسی پبلسٹی لاکھوں خرچ کر کے بھی نہیں ملے گی۔''

بے شمار آوازیں، بے شمار سوالات۔ چند فوٹو گرافرز بھی تھے، جنہوں نے گھوڑے کی بے شمار تصویریں لی تھیں۔ وہ گھوڑے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی مشینی معاملہ تو نہیں ہے۔ لیکن گھوڑا نارمل تھا۔

تب نوشہ بھائی، دولہا بھائی کے کاروباری ذہن جاگ اُٹھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا، اشارے کئے اور مسکرانے لگے۔

''شارٹ پسند آیا جی؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''بے حد۔ میرا خیال ہے، یہ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز گھوڑا ہے۔''

''لاکھوں روپے میں خریدا ہے جی۔ یہ بہت قیمتی فلم ہے۔ ابھی تو آپ آگے دیکھئے۔''

''لیکن یہ آپ نے کہاں سے خریدا؟''
''بزنس کی بات ہے۔ بتائی نہیں جا سکتی۔'' دولہا بھائی نے جواب دیا۔
بہر حال، دھوم مچ گئی تھی اور لوگ ان دونوں سیٹھ صاحبان کا پیچھا چھوڑتے نہیں نظر آ رہے تھے، جنہیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ گھوڑے نے پرواز کیسے کی۔ لیکن بہر صورت وہ اپنا کارنامہ بتا رہے تھے۔
''مگر یہ بابو خان کیوں چیخ رہا تھا؟'' کسی نے سوال کیا۔
''اسے حقیقت نہیں معلوم تھی۔'' نوشہ بھائی نے بتایا۔ ''ورنہ وہ اتنا اوریجنل سین نہیں دے سکتا تھا۔''
''خوب......لیکن اس کے چہرے کے تاثرات؟''
''دور سے پتہ نہیں چلیں گے۔'' دولہا بھائی نے بتایا۔
مہورت ختم ہو گئی۔ بے ہوش بابو خان کو فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر ہم بھی واپس آ گئے۔ لیکن راستے میں نوری کان کھاتی رہی۔ وہ بھی عام لوگوں کے انداز میں اس حیرت انگیز گھوڑے پر تبصرہ کر رہی تھی۔ میں اور طالوت خاموش تھے۔ گھر پہنچنے کے بعد محمود اور عبدل بھائی بھی اس تبصرے میں شامل ہو گئے اور ہم نے بمشکل ان سے جان چھڑائی۔

❀❀❀

کہانی تیار ہو چکی تھی۔ اور اب اس پر کام شروع کرنا تھا۔ عبدل بھائی کے مشورے سے کچھ فلم انڈسٹری کے اور کچھ باہر کے لوگوں کا انتخاب کیا گیا اور اس کے بعد افتتاح کا اعلان کر دیا گیا۔
طالوت نے اپنی عالیشان کوٹھی میں ہی فلم کا افتتاح کیا تھا۔ اس نے پورا ساز و سامان خریدا تھا۔ ٹیکنیشن ملازم رکھے تھے۔ ایک خوبصورت سے منظر کی فلمبندی سے فلم کا آغاز ہوا۔ اور نہایت کامیاب منظر فلمبند کیا گیا۔ اس کے بعد ایک عمدہ سی پارٹی دی گئی۔ لوگوں نے اور اخباری نمائندوں نے فلم کے بارے میں نوری سے بہت سے سوالات کئے، جن کا جواب اس نے نہایت مناسب دیا۔
''آپ نے اس فلم کے ہیرو اور ہیروئن کا نام اناؤنس نہیں کیا؟'' ایک رپورٹر نے پوچھا۔
''جی ہاں......دراصل ہم نے ابھی تک ان کا انتخاب ہی نہیں کیا۔''
''اس کی وجہ؟''
''ہم اس میں نئے چہرے لانا چاہتے ہیں۔ ان کی تلاش جاری ہے۔'' نوری نے جواب دیا۔
افتتاح نہایت کامیاب رہا۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد طالوت مجھے علیحدہ لے گیا اور اس نے بڑی رازداری سے کہا۔
''عارف! محمود کو دیکھ رہے ہو؟''
''ہاں......کیوں؟''
''گرے کلر سوٹ میں ظالم کیا جچ رہا ہے۔''
''وہ خوب صورت اور جامہ زیب ہے۔'' میں نے کہا۔
''اور اپنی نوری؟'' طالوت نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں چونک پڑا۔
''کسی سے کم ہے کیا؟......ہماری فلم کے لئے یہ جوڑی کیسی رہے گی؟''

''اوہ، طالوت! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میرا خیال ہے، ان دونوں کو یکجا کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ ورنہ یہ شریف عشق و عاشقی سے واقف نہیں معلوم ہوتے۔ تم نے نوری یا محمود کے کرداروں میں کوئی لچک دیکھی ہے؟''

''قطعی نہیں۔ ہم ان دونوں کا رومان لڑوانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔''

''تب پھر بسم اللہ۔''

''بسم اللہ!'' اور پھر ہم نے نوری اور محمود کو اپنی میٹنگ میں شریک کر لیا۔

''ایک خاص مسئلے پر گفتگو کرنا ہے محمود!''

''جی فرمائیے۔'' محمود ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''فلم کی باقاعدہ پبلسٹی کے لئے ضروری ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کا نام بھی اس میں شامل کیا جائے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا جناب!''

''پھر کوئی فیصلہ کرو۔ یہ فیصلہ بہت جلد ہونا چاہئے۔'' طالوت نے کہا اور محمود سوچ میں گم ہو گیا۔

''کہانی تمہارے معیار کی ہے نور؟'' وہ نوری سے مخاطب ہوا۔

''یقیناً۔''

''اس میں ہیرو یا ہیروئن کا کردار کیسا ہے؟''

''نہایت پاکیزہ اور مناسب۔ میرے خیال سے مشرقی رومان کا یہی انداز ہے۔''

''جو لوگ ان دونوں کا کردار ادا کریں گے، کیا وہ اس میں جھجک سکتے ہیں؟''

''قطعی نہیں۔'' نوری نے وثوق سے کہا۔

''کیوں محمود! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے، یہ ایک پاکیزہ ترین فلم ہو گی۔'' محمود نے جواب دیا۔

''تو پھر دوستو! کسی چکر کے بغیر عرض ہے کہ میں نے اور سلیم نے ان کرداروں کے لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔'' طالوت نے کہا اور یہ خبر ان دونوں کے لئے دھاکے سے کم نہ تھی۔ وہ ہماری شکل دیکھتے رہ گئے اور پھر جھینپے جھینپے نظر آنے لگے۔

''کسے اعتراض ہے؟'' طالوت نے دونوں کی طرف دیکھا۔ لیکن کوئی جواب نہ دے سکا۔ ''مجھے جواب کی ضرورت ہے۔''

''مجھے اس لائن کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔'' محمود نے دبی زبان سے جواب دیا۔

''ہو جائے گا۔'' طالوت سکون سے بولا۔ ''کرداروں کی پاکیزگی کا تم دونوں اعتراف کر چکے ہو۔'' نوری بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''اگر تم دونوں نے ایک منٹ کے اندر اندر ہاں یا نہیں کا اعلان کر دیا تو پھر یہ بات فائنل ہو جائے گی۔'' طالوت نے وارننگ دی۔ لیکن دونوں خاموش رہے۔ تھے۔ طالوت گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اور جونہی سیکنڈ کی سوئی نے منٹ پورا کیا، طالوت نے کھڑے ہو کر مجھے مبارکباد دی اور نوری اور محمود بے بسی سے ہنس پڑے۔

❀❀❀

''بزرگوار!'' طالوت نے محمود کے والد کو مخاطب کر کے کہا۔ ''نورالنساء ایک شریف لڑکی ہے۔

صاحبِ حیثیت ہے۔ اور محمود ہمارا دوست۔ میری زمینوں کو میری ضرورت ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ ان دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔"

محمود کے والد حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ پھر انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا میرا بیٹا اس قابل ہے؟"

"وہ جس قابل ہے، ہمیں معلوم ہے۔ آپ اپنا جواب مرحمت فرمائیں۔"

"میرے لئے شادیٔ مرگ کی بات ہے۔" بڑے میاں بولے۔

"تب پھر ہماری خواہش ہے کہ آپ باقاعدہ ہمارے گھر آئیں۔ لیکن ابھی محمود کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔"

"کیا وہ اس شادی پر تیار ہے؟"

"یقیناً۔ ورنہ ہم آپ سے درخواست نہ کرتے۔" طالوت نے جواب دیا۔ اور بڑے میاں نے خوشی سے اقرار کر لیا۔ اور پھر محمود اور نوری کے والد کی ایک خفیہ ملاقات ہوئی، جس میں دونوں نے ضروری امور طے کر لئے۔

پھر ایک شام فلم کے دوسرے منظر کی فلمبندی کا پروگرام بنایا گیا۔ یہ ٹکڑا باقاعدہ کہانی میں شامل تھا۔ البتہ سیٹ پر مہمانوں کی ترتیب حقیقی رکھی گئی تھی۔ وہاب علی، صفدر محمود کے والد، اس کی بہن اور دوسرے لوگ سیٹ پر موجود تھے۔

عبدل بھائی کی ہدایت میں سین شروع ہوا۔ محمود، نوری کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے والا تھا۔ دونوں شرمائے ہوئے تھے اور اس حقیقی شرم نے منظر میں زندگی ڈال دی تھی۔ محمود نے ہیرے کی چمکتی ہوئی انگوٹھی نوری کی انگلی میں پہنا دی اور تمام مہمانوں نے تالیاں بجائیں۔

سین او کے ہو گیا تھا......!

تب طالوت نے اخباری رپورٹروں کو مخاطب کر کے کہا۔ "صاحبو! اس منظر کی ایک حقیقت میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہماری فلم کا ایک منظر ہے۔ لیکن کیسی انوکھی بات ہے کہ اس منظر میں کوئی مصنوعیت نہیں ہے۔ خاتون نورالنساء اور مسٹر محمود کے بزرگوں نے یہ منگنی حقیقی طور پر طے کی ہے اور آج سے باقاعدہ طور پر خاتون نورالنساء، محمود کی منگیتر ہیں۔ یہ منظر زندہ جاوید رہے گا۔"

نوری اور محمود نے گھبرا کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔

"میرے الفاظ کی تصدیق دونوں بزرگ کریں گے۔" طالوت نے اشارہ کیا اور دونوں بزرگوں نے کھڑے ہو کر منگنی کی تصدیق کر دی۔ نوری اور محمود شدتِ حیرت سے گنگ کھڑے ایک ایک کی شکل دیکھ رہے تھے۔

مہمانوں نے ایک بار پھر تالیاں بجائی تھیں۔ لوگ بھی اس دلچسپ پروگرام سے مسرور نظر آ رہے تھے۔ پھر لوگوں نے اُٹھ اُٹھ کر نوری اور محمود کو مبارکباد دی۔

"اس فلم کے معیاری ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، جس کے مناظر اس قدر حقیقی اور جاندار ہوں۔"

"بلاشبہ آپ کی فلم کامیاب ترین فلم ہو گی۔" لوگ نوری اور محمود سے کہہ رہے تھے۔ لیکن ان دونوں کی حالت خراب تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک کو دیکھ رہے تھے، جیسے متوقع ہوں کہ اب ہم یہ مذاق ختم

رہیں گے۔

لیکن ظاہر ہے، یہ مذاق نہیں تھا۔ منگنی کا باقاعدہ اعلان ہوا تھا۔ انگوٹھی پہنائی گئی تھی، پھر شک وشبہ کی گنجائش تھی۔ اور پھر مہمانوں میں انتہائی نفیس قسم کی مٹھائی تقسیم کی گئی جو منگنی کی خوشی میں تھی اور اس کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے۔ پھر جب وہ دونوں سنبھلے تو محمود نے طالوت کا بازو پکڑا۔

''میری بات سنیں گے بھائی جان؟''

''سلیم! ...... سلیم! دیکھو ذرا...... اس محمود کے انداز میں جارحیت ہے۔ ذرا میری مدد کو آؤ، کہیں یہ مجھے مارنا نہ شروع کر دے۔'' طالوت نے مسخرے پن سے کہا اور میں ہنستا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

''ذرا دوسرے کمرے میں آیئے۔'' محمود نے کہا۔

''آؤ......'' طالوت مُردہ سے لہجے میں بولا۔ اور ہم تینوں دوسرے کمرے کی طرف چل پڑے۔ محمود کے چہرے پر سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے بھائی جان؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے تو کیا فلم کی کہانی میں یہ منظر میں نے رکھا تھا؟'' طالوت کلکلا کر بولا۔

''پلیز! مذاق نہ کریں۔ مجھے سنجیدگی سے بتائیں، یہ سب کیا ہے؟''

''منگنی ہے۔ اور کیا ہے؟'' طالوت ہی بولا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

''فلمی یا حقیقی؟''

''فلمی بھی...... حقیقی بھی۔''

''بھائی جان......!'' محمود نے دوسری طرف رخ کر لیا۔ ''بھائی جان! یہ اچھا نہیں ہوا۔''

''کیوں محمود! کیا نوری میں کوئی خرابی ہے؟''

''یہ اچھا نہیں ہوا بھائی جان!'' محمود نے کہا۔

''اوہ...... شاید تمہیں اس کے ماضی سے اختلاف ہے۔ لیکن محمود! یقین کرو، نوری ایکسٹرا گرل ضرور رہی ہے، لیکن اس نے اپنی خودی، اپنی شرافت کی حفاظت کی ہے۔''

''محترمہ نورالنساء کی پاکبازی پر شک کا مجرم بنا کر مجھے ذلیل نہ کریں بھائی جان! خدا شاہد ہے کہ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''بھائی جان! میں ایک کم مایہ انسان ہوں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے، جو پورے نہیں ہو سکے۔ میں نے اپنی کوششوں میں کوتاہی نہیں کی تھی، بس مقدر نے ساتھ نہیں دیا۔ پھر میں نے ڈرائیوری کرنے کی ٹھان لی۔ آپ کے اشتہار کو دیکھ کر آپ کے یہاں آیا اور ملازمت مل گئی۔ آپ نے میری جو تنخواہ لگائی، پہلے اسے مذاق سمجھا، پھر بڑے آدمیوں کا کھیل۔ بہر حال یہ کھیل میرے لئے منافع بخش تھا۔ میں نے کبھی اپنے فرض سے بد دیانتی نہیں کی۔ میں ہمیشہ آپ کا مخلص اور وفادار رہا۔ محترمہ نوری ایک نیک اور پُرکشش خاتون ہیں، میری نگاہوں نے اگر کبھی بھٹکنے کی کوشش کی تو میرے ضمیر نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے ہمیشہ اپنی حیثیت یاد رکھی۔ بھائی جان! مس نور ایک بلند پایہ خاتون ہیں۔ اس تصور کے ساتھ وہ بھی خوش نہ رہ سکیں گی کہ...... کہ ان کا شوہر، اُن کا ملازم...... اُن کا

ڈرائیور رہ چکا ہے۔" محمود نے گردن جھکا لی۔

"اور کچھ......؟" طالوت نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں......کچھ اور بھائی جان!" محمود نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"وہ بھی کہہ دو۔"

"حالات نے مجھے بعض معاملات میں شکست دی ہے بھائی جان! لیکن وہ میری خودی کو شکست نہیں دے سکے۔ میں ابھی تک خوددار ہوں، میں زندگی بھر اس اذیت سے تڑپتا رہوں گا کہ میں اپنی بیوی کی وجہ سے دولت مند بنا ہوں۔"

"اور کچھ؟" طالوت اسی انداز سے بولا۔

"بس، اور کچھ نہیں۔"

"گویا......گویا تم نورالنساء سے شادی پر تیار نہیں ہو؟"

"جی......جی ہاں......میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔" محمود نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہمیں افسوس ہے محمود! ہم تمہارے دل تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارا خلوص، ہماری محبت ہمارے کام نہیں آ سکی۔ ہم نے تمہیں اپنوں میں سے سمجھ لیا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ تم ہمارے دوست، ہمارے بھائی ہو۔ اور ہم اسی انداز میں اپنے لئے کچھ حقوق متعین کر بیٹھے تھے۔ لیکن تم نے اجنبیت، غیریت کی دیوار گرانا پسند نہیں کی۔ خیر، تمہاری مرضی۔ ہم ان دونوں بزرگوں سے بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ ہم غلطی کر بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے ان کے وقار کو ٹھیس لگے گی۔ ہم ان سے معافی مانگنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟......بہت بہتر محمود صاحب! آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی خودی پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"بھائی جان......!" محمود گھبرا کر بولا۔

"میرا نام رانا عزیز الدین ہے۔ رانا صاحب کہو ڈرائیور! کسی ایسے نام سے مخاطب مت کرو، جو مجھے میری حماقت کا احساس دلائے۔" طالوت نے کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

محمود چند قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ پھر وہ میری طرف پلٹ کر بولا۔

"س......سلیم بھائی......بھائی جان ناراض ہو گئے۔"

"اپنی بے وقوفی پر نادم ہوئے ہیں محمود! اسے ناراضگی نہ کہو۔" میں نے بھی تلخ لہجے میں کہا اور میں بھی طالوت کے سے انداز میں باہر نکل گیا۔

محمود کمرے میں کھڑا رہ گیا تھا۔ میں تیزی سے طالوت کے پاس پہنچ گیا۔

"طالوت......!" میں نے اسے آواز دی۔

"چھوڑو یار!......موڈ خراب ہو گیا۔" طالوت نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"سب کے سب یکساں۔ جیسے ہمارے اوپر احسان کر رہے ہوں۔"

"اوہ......طالوت! یہ بات نہیں۔ کاغذ کے چند ٹکڑے لے کر کسی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ لوگ انہیں حاصل کرنے کے لئے ہر امکانی کوشش کریں گے۔ روشیلا اور روئی والا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس

ے علاوہ بھی بہت سے لوگ تمہارے علم میں آ چکے ہیں۔ دراصل ہم نے ہمیشہ کیچڑ میں پڑے ہوئے ہیرے تلاش کئے ہیں۔ ہم نے انسانیت کے پیکر تلاش کیے ہیں، جن کی نگاہوں میں انسانیت کا تقدس ہوتا ہے، دولت نہیں۔ ہیرے کہیں بھی ہوں، ان کی چمک کیسے ختم کی جا سکتی ہے؟ انہیں کیچڑ سے اٹھا کر، صاف ستھرا کر کے شوکیس میں رکھنے کے لئے بہر حال، جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ نہ دیکھو انہیں...... نہ تلاش کرو۔ تمہیں تمہاری مرضی کے لوگ بھی ملتے رہیں گے۔ تم جو کچھ انہیں دو گے، قبول کر لیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اب اس کیچڑ کے ہیرے کا کیا کیا جائے؟"

"کچھ سوچتے ہیں...... اس کی ایسی کی تیسی۔"

"اوہ...... یہ مس نورالنساء اس کمرے میں کیوں جا رہی ہیں؟" طالوت نے کہا۔

"ونڈرفل...... رومانس...... سسپنس۔ ارے میرا دوشالہ۔" میں اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ طالوت ہنسنے لگا۔ شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ کر میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ اور پھر ہم دونوں تیزی سے کمرے کی طرف لپکے۔ نوری کمرے میں داخل ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے ہی ہم دونوں اندر جا گھسے۔ لیکن نوری کو ہماری آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ سامنے ہی ایک کرسی پر محمود سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"محمود صاحب......!" نوری کی لرزتی آواز ابھری اور محمود اچھل پڑا۔ پھر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"مس نور......!"

"جی......!"

"مس نور! آپ...... آپ جانتی ہیں کہ...... آپ جانتی ہیں مس نور! کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" محمود نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو...... کیا آپ کے خیال میں قصور میں نے کیا ہے؟" نوری مسکراتے ہوئے بولی۔

"مس نور!...... آپ یقین کریں...... میں نے...... میں نے......"

"نہ جانے آپ پر اتنی بوکھلاہٹ کیوں طاری ہے مسٹر محمود! آپ نے ان فرشتوں کو ناراض کر دیا ہے۔ مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے۔"

"مس نور!...... وہ...... مس نور......"

"ایک بات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ وہ یہ کہ میں عقبی کھڑکی سے آپ حضرات کی گفتگو سن رہی تھی اور میں نے آپ کے اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔"

"مس نور!...... مجھے بتائیے...... مجھے بتائیے میں کیا کروں؟ میں نے تو اپنے کردار میں کبھی جھول نہیں پیدا ہونے دیا۔ میری تو کوئی خطا نہیں ہے۔"

"مسٹر محمود! خدا کا شکر ہے کہ میں نے بھی انتہائی نامساعد حالات میں اپنے کردار کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ میں آپ کی ذہنی کیفیت سمجھتی ہوں۔ کیونکہ یہی کیفیت مجھ پر بیت چکی ہے۔ اگر میں اس سے واقف نہ ہوتی تو اس وقت آپ کے پاس بھی نہ آتی۔ لیکن چونکہ مجھے احساس ہے، اس لئے مجھے آپ سے ہمدردی محسوس ہوئی اور میں یہاں چلی آئی۔"

"میں نہیں سمجھا مس نور؟" محمود نے کہا۔

"میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔ تشریف رکھئے۔" نوری نے کہا اور پھر خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ

گئی۔ محمود اس کے دوبارہ کہنے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
”مسٹر محمود! اگر میں آپ کی اور ان دونوں کی گفتگو نہ سنتی تو میری نسائیت مجھے کبھی اجازت نہ دیتی کہ میں آپ سے اس قسم کی گفتگو کروں۔ یوں سمجھ لیں کہ میں یہ گفتگو اپنے بھائیوں کی وجہ سے کر رہی ہوں۔“
”جی......“ محمود نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
”میں آپ سے چند سوالات کروں گی۔ سنیئے مسٹر محمود! آپ ایک خوددار انسان ہیں۔ اور خوددار انسان اپنی عزت، اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لئے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں آپ کی خودداری کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔ دیکھنا چاہتی ہوں کہ آپ کہاں تک صاف گو اور سچ بولنے والے ہیں۔“
محمود متحیرانہ انداز میں نوری کی شکل دیکھ رہا تھا۔
”کیا آپ جوابات دینا پسند کریں گے؟“
”ضرور۔“
”ان میں بہت سے سوالات ایسے ہیں جو ایک لڑکی کی زبان سے معیوب ہیں، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ان سوالات سے میری نسائیت کس حد تک مجروح ہوتی ہے۔ آپ کچھ بھی سمجھیں۔“
”جی۔“ محمود سنبھل کر بیٹھ گیا۔
”اگر میں ایک معمولی لڑکی ہوتی اور حالات ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لے آتے تو کیا آپ مجھے اپنانا پسند کرتے؟“
”آپ نے مجھے صاف گوئی کی اجازت دی ہے مس نور؟“
”ہاں......آپ کھل کر اظہارِ حقیقت کر سکتے ہیں۔ آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“
”تو مس نور! میں آپ سے اظہارِ محبت کی جرأت کرتا ہوں۔ ہاں مس نور! میں آپ کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ میں دل ہی دل میں آپ کی پرستش کرتا ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں مس نور!......میں آپ کو اس وقت سے چاہتا ہوں، جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔ میری زندگی میں وہ لمحات جاوداں ہوتے ہیں، جب آپ میرے نزدیک ہوتی ہیں۔“ محمود نے کہا اور نوری کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی۔
”شکریہ مسٹر محمود! گویا یہ بات طے ہو گئی کہ میں بحیثیت عورت آپ کے لئے قابلِ قبول ہوں؟“
”جی......“ محمود نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
”تو مسٹر محمود! اب میری حیثیت کے بارے میں جان لیجئے۔ دراصل آپ اس قدر نیک اور شریف انسان ہیں کہ ان لوگوں سے آپ کی ملاقات بھی نہیں ہوئی، جو میری حیثیت سے واقف ہیں۔ ورنہ یہ اُلجھن ہی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے مسٹر محمود! میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں، جو آنکھوں سے اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے باپ اور بھائی کی پرورش کے لئے ملازمت تلاش کی، لیکن کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ تب میں نے ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے متعدد فلموں میں کام کیا۔ میں سرسری انداز میں کہوں گی کہ خدا نے میری عزت محفوظ رکھی۔ اور جب بات عزت پر بنی تو اس نے دو فرشتے زمین پر اُتار دیئے۔ ابتداء میں، میں انہیں سمجھ نہ سکی، میں نے انہیں بھی اپنے حُسن کا گاہک جانا......لیکن بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ میں کسی دوسری دنیا کے لوگوں کے ساتھ ہوں۔ انہوں نے مجھے بہن کہا اور میرے حالات بدل دیئے۔ خدا

کی قسم! اگر وہ اس قدر مخلص نہ ہوتے تو میں کبھی ان کی دی ہوئی عزت قبول نہ کرتی۔ لیکن ان کی نیت پر شک کرنا گناہِ عظیم ہے۔ اور محمود صاحب! آپ کا انتخاب بھی انہوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ خدا ہماری تقدیریں بدلنے پر آمادہ ہے محمود صاحب! تو آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں؟ وہ انسان ہی کو ذریعہ بناتا ہے۔ آپ جان گئے ہیں کہ میری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ہم دونوں اس جاہ و حشمت کو خدا کا عطیہ سمجھ کر قبول کر لیں تو کیا حرج ہے؟"

اور اچانک محمود کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کی سانس تیز چلنے لگی۔ تب اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"تو......تو مس نور!......مس نور!......آپ کو......اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" نوری نے بڑے وقار سے کہا۔

"صرف ان دونوں......ان دونوں کی وجہ سے؟"

"ہاں......ان دونوں کی وجہ سے بھی۔ کیونکہ ان کے فیصلے میرا ایمان ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری نگاہ میں تم بھی ایک نیک سیرت اور شریف انسان ہو۔"

"مجھے کم مایہ سمجھ کر، مجھے خود سے کمتر تو نہ سمجھو گی نور؟"

"اس وقت تم مجھے ایک ایکسٹرا گرل کہہ دیا کرنا، جو چند روپوں کے عوض ناچتی تھی۔"

"نوری میں تمہیں اپنا کر فخر محسوس کروں گا۔ نور!...... میں تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم نور! میں تمہاری پرستش کرتا ہوں۔" محمود تیزی سے اٹھا۔ اس نے نوری کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

"آؤ......!" میں نے طالوت کے کان میں کہا۔

"ایک منٹ یار!......ایک منٹ۔"

"آؤ۔" میں نے اس کا لباس پکڑ کر کھینچا۔

"صرف ایک منٹ......صرف ایک منٹ۔"

"اسے بہن کہا ہے۔" میں نے دانت کچکچا کر کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" طالوت برا سا منہ بنا کر واپس پلٹ پڑا۔ اور پھر دروازے سے باہر نکل کر بولا۔

"کان کھول کر سن لو عارف! آئندہ میں کسی کو بہن نہیں کہوں گا، ہاں۔"

ہم دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں نے دوشالہ اتار دیا۔ طالوت بھی ایک کرسی پر دراز ہو گیا تھا۔ اس کا موڈ بدستور بگڑا ہوا تھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جیسی مرضی سرکار!"

"بس چلیں گے یہاں سے۔"

"ضرور......لیکن کب؟"

"جلد از جلد۔"

"اور کہاں چلیں گے؟"

"جدھر منہ اٹھ جائے۔"

''ان پہاڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا؟''
''اسی طرف چلیں گے۔''
''کب؟''
''یہ تم بتاؤ۔''
''میرا خیال ہے، جلد از جلد بچوں کی شادی کر کے اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ تاکہ سکون سے آوارہ گردی ہو سکے۔'' میں نے فکرمند بوڑھوں کے سے انداز میں کہا اور طالوت کو ہنسی آ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ہم دونوں خاموش ہو گئے۔
''میں اندر آ سکتا ہوں بھائی جان؟'' دروازے سے محمود کی آواز سنائی دی تھی۔
''آ جاؤ۔'' میں نے بھاری آواز میں کہا اور محمود شرمندہ سا اندر آ گیا۔ طالوت نے پھر چہرہ بگاڑ لیا تھا۔
''میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں بھائی جان!'' محمود نے کہا۔
''اپنے الفاظ کی تصحیح کریں مسٹر محمود! بھائی جان نہیں، رانا صاحب۔'' طالوت نے کہا۔
''نہیں...... بھائی جان، بھائی جان، بھائی جان۔'' محمود نے شرمندہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیوں؟...... یہ رشتہ تو تمہیں قبول نہیں تھا۔''
''غلطی ہو گئی تھی۔ سخت شرمندہ ہوں۔ ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔'' محمود نے کہا۔
''غور کر لو محمود! اپنے دل کو ٹٹول لو۔''
''ٹٹول لیا بھائی جان!''
''لیکن میں تمہیں سزا دیئے بغیر نہ رہوں گا۔''
''مجھے ہر سزا قبول ہے۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہوں...... ٹھیک ہے۔ تو پہلی سزا تو یہ ہے کہ اس ہفتے کے آخر میں تمہاری شادی نورالنساء کے ساتھ کر دی جائے گی۔ دوسری سزا کل سنائی جائے گی۔''
محمود نے گردن جھکا دی۔
چنانچہ دوسرے دن کوٹھی پر ہی ایک چھوٹی سی نشست ہوئی، جس میں بزرگ بھی شامل تھے۔ تب طالوت نے کہا۔
''معزز بزرگوں کی اجازت سے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''
''کہو بیٹے!'' عبدالوہاب صاحب محبت سے بولے۔
''محترم! آپ کے علم میں ہے کہ میں صرف چند روز کے لئے اپنی جاگیر سے نکلا تھا۔ لیکن حالات کچھ اس انداز سے پیش آئے کہ مجھے کافی وقت آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ آپ جیسے پُرمحبت لوگوں کے درمیان سے جانے کو دل تو نہیں چاہتا، لیکن میری مجبوریوں کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے مجھے اجازت دیں۔ مجھے اب جانا ہی ہوگا۔''
''اوہ......!'' سب کے منہ سے بیک وقت نکلا۔
''لیکن بھیا......!''

''لیکن بھائی جان!'' نوری اور محمود کے منہ سے بیک وقت نکلا۔
''ہاں نورا!...... ہاں محمود! تم خود غور کرو۔ میرے سارے معاملات بکھرے پڑے ہیں۔ ہمیں انہیں سمیٹنا ہے۔ ہماری روانگی ضروری ہے۔ تو بزرگو! میری خواہش ہے کہ روانگی سے قبل نوری اور محمود کی شادی کردی جائے۔ کیا آپ اس ہفتے کا آخری دن اس کام کے لئے قبول کریں گے؟''
''خوشی کے ساتھ غم بھی دے دیا عزیز الدین!...... کاش...... کاش تم ہمیشہ ہم میں رہتے۔ لیکن تمہیں ہ کتنا خودغرضی ہے۔''
''ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے بھیا!'' نوری روتے ہوئے بولی۔
''آہ...... بھائی جان! یہ تصور بھی نہیں تھا کہ آپ سے جدا ہونا پڑے گا۔'' محمود آزردگی سے بولا۔
''پھر ملیں گے محمود! میں تم لوگوں کو اپنی جاگیر پر بلاؤں گا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں کچھ اور روز آپ کی صحبت میں گزارتا۔''
''جس طرح تم پسند کرو بیٹے!'' عبدالوہاب صاحب بولے۔
''دوسری ایک بات اور...... محمود! سزا نمبر دو سن لو، جسے تم قبول کر چکے ہو۔'' طالوت نے کہا۔
''نورالنساء میری بہن ہے عبدالوہاب صاحب! تو محمود میرا بھائی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرا بھائی کسی حیثیت میں میری بہن سے کمتر رہے۔ چنانچہ میرا بھائی محمود، پچاس لاکھ روپے نقد کا مالک ہے۔ میں نے رقم عبدل بھائی کے ذریعے بینک میں جمع کرادی ہے...... بینک کا منیجر ابھی آنے والا ہوگا۔'' وہ کاغذات خود لا رہا ہے۔''
''بھائی جان......!'' محمود اٹھ کر طالوت کے قدموں میں گر گیا۔
''نور آرٹس پروڈکشن...... نورالنساء کی ملکیت ہے۔ اور اس کے نام سے بھی پچاس لاکھ کا اکاؤنٹ موجود ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ دونوں مل کر اس کمپنی کو چلائیں اور بامقصد اور معیاری فلمیں تیار کریں۔ اور آج کی نشست ان الفاظ پر ختم۔''
اس کے بعد پورے ہفتے ہنگامے رہے۔ نوری نے روتے روتے آنکھیں سرخ کرلی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''یہ کیسی خوشی دی ہے آپ نے بھیا! جو آپ کی جدائی کے غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔''
''بہنیں تو یوں بھی پرائی ہوتی ہیں پگلی!''
''مگر آپ ہمیں کب بلائیں گے؟''
''یہ سوچنے کے بجائے اپنے شوہر کے ساتھ دلچسپیوں میں گم ہو جانا۔ میرے حالات جب اجازت دیں گے، تمہیں بلانے آجاؤں گا۔'' طالوت نے کہا۔
ایک ہفتے کے بعد نوری اور محمود کی شادی ہوگئی۔ اور اسی رات طالوت نے اپنے کمرے میں آکر کہا۔
''کیا خیال ہے عارف بھائی؟''
''بس...... چلیں گے۔''
''آج ہی رات کو...... باقاعدگی سے رخصت ہونا مجھے پسند نہیں ہے۔''
''ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ ورنہ یہ لوگ بہت بور کریں گے۔''
''پھر......؟''

''بس رات گہری ہوتے ہی نکل چلیں گے۔''
''پروگرام کس طرح رہے گا؟''
''تم ایسا کرو، فون پر کسی ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرالو۔ رات وہاں گزاریں گے اور پھر وہاں سے مناسب پروگرام بنائیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے طالوت کی اس تجویز کو پسند کیا۔ یہاں رہ کر پروگرام بنانے میں دقت ہو گی۔ ہوٹل کا کمرہ ہی مناسب تھا۔ چنانچہ میں نے فون کر کے پیلس ہوٹل میں ایک ڈبل روم بک کرالیا۔''
''ایک اور خیال ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''وہ کیا؟''
''ہمیں اپنی شکلیں بدل کر وہاں چلنا ہوگا۔ کیونکہ بہت سے لوگ ہمیں جان گئے ہیں۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے طالوت سے اتفاق کیا اور پھر ہم کافی دیر تک یونہی سی گفتگو کرتے رہے۔ اور جب رات گہری ہو گئی تو ہم نے چلنے کی تیاری کر لی۔
''کیا ان لوگوں کو اطلاع دی جائے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''اخلاقی طور پر ضروری ہے۔''
''تب ایک پرچہ لکھ دو۔'' طالوت نے کہا۔ اور میں نے لکھنے کی میز پر پہنچ کر ایک تحریر گھسیٹ کر نمایاں جگہ رکھ دی۔ اس میں، میں نے لکھ دیا تھا کہ چونکہ باقاعدہ روانگی رقت آمیز ہوتی، اس لئے ہم جا رہے ہیں۔ حالات نے ساتھ دیا تو پھر ملیں گے۔ اور یہ پرچہ لکھنے کے بعد ہم باہر نکل آئے۔
گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کوٹھی سے باہر نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر طالوت نے کہا۔ ''کیا پیدل چلنا پڑے گا؟...... کار نہیں لے چلو گے؟...... اس وقت تو ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔''
''اوہ...... کار نہیں لے چلیں گے۔ اور پھر ہمیں تو پیلس ہوٹل تک چلنا ہے۔''
''تو پیلس ہوٹل کون سا قریب ہے۔ اور میرے اس سوٹ کیس کا وزن پندرہ بیس سیر سے کم نہیں ہے۔''
''چھوڑو یار! کیوں مذاق کرتے ہو؟'' طالوت نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں سوٹ کیس کا سہارا لے کر سنبھلا تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میں نے طالوت کو گھورا۔ لیکن دوسرے لمحے خاموش ہو جانا پڑا۔ بہرحال یہ بدتمیزی بری نہیں تھی کیونکہ ہم ہوٹل پیلس کے لان میں کھڑے تھے۔ فوراً ہی دو پورٹر ہمارے پاس آ گئے اور ان میں سے ایک نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ ہم نے انہیں روم نمبر بتائے، جن کی اطلاع ہمیں فون پر مل گئی تھی۔ اور پھر ہم ہوٹل کے ہال کی طرف بڑھ گئے۔ پورٹر نے چابی لے لی اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں مسہریوں پر دراز تھے۔
''یہ دور بھی اچھا خاصا رہا۔ لیکن یار عارف! یہاں بھی پیاس باقی رہی۔ جلال آباد کے ماحول میں تو پاکیزگی آ گھسی تھی۔ یہاں بھی وہی کیفیت رہی۔''
''کیوں؟...... روشیلا نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا ہے۔''
''بور مت کرو۔ وہ عورت کی قسم سوئم تھی۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ پاکباز عورتیں اس طرح سامنے

نہیں آتیں۔ کام ایسے ہی لوگوں سے چلانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ تو ضرورت سے زیادہ ہی گڑبڑ تھی۔"
"پھر بھی...... اس کے بارے میں تو تم نے بہت بعد میں سوچا۔"
"جبیں کو تو تم نے ہاتھ نہیں لگنے دیا۔"
"میں نے کب منع کیا تھا؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔
"بہرحال چھوڑو ان باتوں کو۔ کچھ بوریت ہونے لگی ہے۔ کوئی بات بنی چاہئے۔"
"چلیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"کہاں؟"
"بازارِ حُسن۔" میں نے جواب دیا۔
"اوہ...... وہاں جہاں رقص ہوتا ہے؟"
"ہاں۔"
"بازارِ حُسن کہہ کر حُسن کی توہین کیوں کر رہے ہو؟ وہ تو بازارِ ہوس ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔"
"پھر......؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"بس اب ایسا بھی نہیں۔ ویسے ان لوگوں کو چھوڑ کر بھی دکھ ہو رہا ہوے۔ لیکن کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے، ہم پوری زندگی تو ان کے درمیان نہیں گزار سکتے۔"
"کسی کے ساتھ نہیں گزار سکتے۔ بہرحال، ان باتوں کو چھوڑو۔ آئندہ کے لئے پروگرام بتاؤ۔"
"بس، وہیں چلیں گے۔"
"اور کل ہی یہاں سے چلیں گے۔"
"ہاں، کل ہی چلیں گے۔ مگر عارف! کیوں نہ اس بار تمہارے اُڑن کھٹولے سے سفر کیا جائے؟"
"اُڑن کھٹولا؟"
"ہاں...... جسے تم نے ہوائی جہاز کا نام دے دیا ہے۔"
"اوہ...... ٹھیک ہے۔ اگر تم فرغالہ قبائل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہو تو اس کے لئے ہمیں بذریعہ جہاز، روشن آباد تک جانا پڑے گا۔ وہاں سے بسوں کا سفر ہے۔"
"کوئی دقت ہوگی؟"
"بالکل نہیں۔ اور پھر تمہارے لئے کیا دقت؟"
"اونہہ...... میری بات چھوڑو۔ میں تو تمہاری دنیا دیکھنے آیا ہوں۔ میرے لئے جو آسانیاں ہیں، وہ تو بس ایسے مواقع کے لئے رہنے دو، جہاں ان کی خاص ضرورت ہے۔"
"ٹھیک ہے...... کل میں روشن پور کے دو ٹکٹ مہیا کر لوں گا۔"
"ٹھیک...... اور ہم دونوں اصلی شکل میں سفر کریں گے۔"
"کیا مطلب؟"
"ہنگامہ رہے گا یار!" طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔
"لیکن میرا خون خشک ہوتا رہے گا۔"
"اونہہ...... پھر وہی حماقت کی باتیں...... اب تو شاہ دانہ کا دوشالہ بھی تمہارے پاس موجود ہے۔

بس یار! تفریح کریں گے، خالص۔ فی الحال رفاہ عامہ کے کام بند۔"
"او کے چیف!......اب سو جاؤ۔ ورنہ صبح کو منہ پر پھٹکار برسے گی۔" میں نے کروٹ بدل کر لائٹ آف کر دی۔ طالوت نے بھی سونے کا پروگرام بنا لیا تھا۔
دوسری صبح جاگنے کے بعد جب میں باتھ روم میں داخل ہوا تو آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر چونک پڑا۔ بہت دن کے بعد عارف میرے سامنے آیا تھا۔ گویا طالوت نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیر دیا تھا۔ باہر نکل کر طالوت کو دیکھا تو وہ بھی اصلی شکل میں تھا۔ ہم دونوں میں سرمو فرق نہیں تھا۔
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر ویٹر کو بلا کر ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر ناشتہ لایا تو ہم آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ویٹر کی حیرانی قابلِ دید تھی۔ وہ دروازے تک پلٹ پلٹ کر ہم دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔ طالوت نے مجھے آنکھ ماری اور ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے۔
ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ "او کے طالوت! میں ٹکٹوں کا بندوبست کرتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے......اب نکل ہی چلنا چاہیے۔" طالوت نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔ ایک ٹیکسی کر کے میں ایئرپورٹ چل پڑا۔ روشن آباد جانے والی فلائٹ کے ٹکٹ حاصل کرنا مشکل نہ ہوا۔ بہت کم مسافر سفر کرتے تھے اس طرف۔ بہرحال دوپہر تک میں واپس آ گیا۔ چار بجے فلائٹ جاتی تھی۔
طالوت ہوٹل ہی میں میرا منتظر تھا۔
"کہیں باہر نہیں گئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"کہیں نہیں۔ اسی خیال سے کہ پھر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے جس کی وجہ سے رکنا پڑے۔ تم سناؤ، کیسا رہا؟"
"ہم چار بجے چل رہے ہیں۔"
"ٹھیک ہے......کسی چیز کی ضرورت؟"
"نہیں۔ فی الحال صرف کھانا منگواؤ۔" میں نے کہا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور پھر تیاریاں کرنے لگے۔ ساڑھے تین بجے ہم دونوں تیار ہو کر نیچے اترے۔ ہمارے جسموں پر ایک ہی رنگ، ایک ہی تراش کے سوٹ تھے۔ ہم دونوں نے ایک ہی انداز میں بال بنائے تھے، اور اب ہم دونوں پوری طرح حالات سے دلچسپی لینے کے موڈ میں تھے۔
ہوٹل کے کاؤنٹر پر ہم دونوں پہنچے۔ کاؤنٹر پر ایک درمیانی عمر کی عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد بیٹھے ہوئے تھے۔
"میں کمرہ چھوڑ رہا ہوں۔ میرا بل؟" پروگرام کے مطابق ہم دونوں نے بیک وقت کہا اور دونوں چونک پڑے۔ اور پھر ان دونوں کے چہروں کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔
"آپ دونوں......آپ دونوں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے؟" مرد نے پوچھا۔
"...دونوں؟" ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بیک وقت کہا۔
"ہم..... میرا مطلب ہے، آپ دونوں حضرات؟" ادھیڑ عمر شخص کی حیرت قابلِ دید تھی۔
"آپ نشے میں ہیں محترم! ایک کے دو دو نظر آ رہے ہیں آپ کو۔ براہ کرم میرا بل۔" ہم نے اسی انداز میں کہا اور ادھیڑ عمر آدمی کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ پھر اس نے عورت کی طرف جھک کر کہا۔
"کیا میں نشے میں ہوں جولیا؟"

''روم نمبر پلیز......؟'' عورت مرد سے چالاک تھی۔ اور ہم نے اپنا روم نمبر دوہرایا۔ عورت نے بل بنا کر پیش کر دیا۔ اور یہاں بھی ہم نے دلچسپی برقرار رکھی۔ ہم دونوں نے ہی بل کی رقم نکال کر دے دی تھی۔ ظاہر ہے، رقم دوگنی تھی۔

''شکریہ جناب! ویسے آپ لوگوں کی شکلیں حیرت انگیز ہیں۔ لیکن بعض جگہوں پر یہ ایکیوٹی مہنگی پڑے گی، جیسے یہاں۔ بہرحال شکریہ!'' اس نے پورٹر کو بلا کر ہمارا سوٹ کیس اٹھانے کے لئے کہا اور ہم واپس پلٹ پڑے۔

''کیا تم بھی نشے میں ہو جولیا؟'' پیچھے سے مرد کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

باہر آ کر ہم نے ٹیکسی کی اور ایئر پورٹ پر چل پڑے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھا تھا اور پھر ایئر پورٹ پر بھی ہم تماشہ بن گئے۔ دور دور تک ہمارے بارے میں چرچے پھیل گئے۔ جہاز کی روانگی میں بہت کم وقت تھا۔ ہمارا سوٹ کیس جہاز پر پہنچ گیا اور پھر ہم دونوں بھی رن وے کی طرف چل پڑے۔

سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوئے کسٹم آفیسر نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی تھی۔ ''غالباً آپ دونوں جڑواں بھائی ہیں؟''

''دونوں......؟'' ہم نے بیک وقت کہا۔ اس اداکاری میں پوری کوشش یہ تھی کہ ہماری آوازیں، ہمارے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں۔

''جی......مم......میرا مطلب ہے......''

''نہ جانے پورے شہر کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے ہر شخص دو کہہ رہا ہے۔'' طالوت نے کہا۔ میں نے صرف ہونٹ ہلا کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب اتنی مہارت بھی نہیں تھی کہ برجستہ الفاظ ادا کئے جا سکیں۔

''اوہ......آپ کے ٹکٹ......؟''

''یہ لیجئے۔'' ہم دونوں نے ٹکٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیئے۔

''تب ٹھیک ہے۔ بہرحال حیرت انگیز مشابہت ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ دونوں زندہ سلامت رہیں۔'' کسٹم آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

اوپر ایک خوب صورت سی ایئر ہوسٹس کھڑی مسافروں کو مسکراتے ہوئے ریسیو کر رہی تھی۔ اس کی نگاہ ہم دونوں پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے خندہ پیشانی سے ہم دونوں کو دیکھا۔ ''خوش آمدید!'' اس نے مسکراتے ہوئے گردن خم کی۔

''تھینک یو مس۔'' ہم دونوں نے ایک ہی انداز میں گردن خم کر کے جواب دیا۔

''تشریف رکھئے۔'' وہ بولی۔ اندر ایک دوسری ہوسٹس ٹکٹ لے کر سیٹیں دے رہی تھی۔ یہ بھی خاصی حسین تھی اور اس نے پُراخلاق انداز میں گردن خم کی۔

''ماشاء اللہ!'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''غالباً آپ دونوں جڑواں بھائی ہیں۔''

''کمال ہے خاتون! آپ بھی مجھے دو سمجھ رہی ہیں؟ نیچے کسٹم آفیسر نے بھی یہی کہا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ہنس کر بولی۔

''کیا میں آپ کو دو نظر آتا ہوں؟''
''آپ تو ایک ہی ہیں۔ لیکن انہیں ملا کر......'' اس نے جواب دیا۔
''اُف......آپ لوگ دماغ خراب کر دیں گے۔ آپ سب نشے میں معلوم ہوتے ہیں۔'' طالوت اور میں نے بیک وقت کہا۔ اور ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ہوسٹس اتنی حیران ہوئی کہ دوسرے مسافروں کو ریسیو کرنا بھی بھول گئی تھی۔ پھر جب ایک مسافر نے ہی اسے مخاطب کیا تو وہ چونکی۔
لیکن اب ہم خاصے مقبول ہو گئے تھے۔ جہاز کے مسافر بھی گردن گھما گھما کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ تمام مسافر آ گئے اور اس کے بعد بیلٹ کس لینے کی درخواست کی گئی۔
''ہم دونوں نے سنجیدگی سے حفاظتی بیلٹس کس لیں اور طیارے کے انجن اسٹارٹ ہو گے۔ بڑی سنجیدگی سے تفریح کرنی تھی۔ اب مجھے بھی لطف آ رہا تھا۔ طیارہ جب فضا میں سیدھا ہو گیا، تب مسافروں میں پھر ہمارے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دوسرے لوگوں کو تو خیر تفصیل معلوم ہی نہیں تھی، ہاں ہوسٹسیں ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ پھر وہ ہوسٹس ہماری طرف بڑھی، جس نے سیڑھیوں پر ہمیں ریسیو کیا تھا۔
''ہوشیار!'' طالوت نے کہا اور میں سنبھل گیا۔ ہوسٹس ہمارے پاس پہنچ گئی۔
''کسی چیز کی ضرورت جناب؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''نہیں۔'' ہم دونوں نے بیک وقت گردن ہلا کر کہا۔
''آپ لوگ روشن آباد کے باشندے ہیں۔''
''آپ میرا مذاق اُڑانے پر کیوں تلی ہوئی ہیں خاتون؟'' طالوت نے کہا۔ میں نے طالوت کے ہونٹوں کا ساتھ دیا تھا۔
''کیوں......مذاق کیوں؟''
''لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' طالوت بولا۔
''گویا آپ ایک ہیں؟''
''اور آپ کو دو نظر آ رہے ہیں......کیوں؟'' ہم نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔
''حیرت انگیز ہیں خدا کی قسم آپ۔ بے حد حیرت انگیز......اور بے حد پُرکشش۔'' ہوسٹس بولی۔
''براہِ کرم میرا مذاق نہ اُڑائیں۔''
''اچھا، تو یہ بتا دیں کہ آپ دو سیٹوں پر کیوں بیٹھے ہیں؟''
''دو سیٹیں؟'' طالوت نے حیرت سے کہا۔ اور پھر ہم دونوں نے گردن گھما کر ایک دوسرے کی سیٹیں دیکھیں۔
''خیر......خیر آپ سے جیتنا بہت مشکل ہے۔ ہاں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ روشن آباد کے باشندے ہیں؟''
''نہیں۔''
''سیر کی غرض سے جا رہے ہیں؟''
''ہاں۔''

''کون سے ہوٹل میں قیام کریں گے؟''

''پہلی بار جارہا ہوں۔''

''تب آپ ''گل رخ'' میں قیام کریں۔ یہ بہت خوبصورت ہوٹل ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔ میں بھی دو روز گل رخ میں رکوں گی۔ آپ سے ملاقات رہے گی۔''

''بہت بہتر۔'' طالوت نے گردن ہلائی۔ میں بدستور اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہوسٹس آگے بڑھ گئی۔ غالباً وہ اپنی ساتھیوں کو ہمارے بارے میں بتارہی تھی۔

اتفاقیہ طور پر بہت عمدہ تفریح ہاتھ آگئی تھی۔ میں بھی اس سے پوری طرح محظوظ ہورہا تھا۔ راستے بھر ہم لوگوں کی تفریح کا ذریعہ بنے رہے۔ خاص طور سے ہوسٹسیں ہمارے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

روشن آباد ایئرپورٹ پر اُترے تو وہی ہوسٹس ہمارے قریب آگئی۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟''

''طاؤس۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''اوہ......اور آپ کا؟'' وہ بے ساختہ میری طرف مڑی۔

''طاؤس۔ میں بتا چکا ہوں۔'' میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

''اچھا خیر۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''میرا نام فریدہ ہے۔ گل رخ میں آپ کو تلاش کرلوں گی۔''

''بہتر۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور ہم کسٹم وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے باہر نکل آئے۔ ہم دونوں ابھی تک سنجیدہ تھے۔ ٹیکسی میں بھی سنجیدہ رہے۔ طالوت نے ٹیکسی ڈرائیور سے گل رخ چلنے کے لئے کہا تھا۔

گل رخ جیسے ہوٹل کی روشن آباد جیسی درمیانی قسم کی جگہ پر ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ انتہائی جدید ہوٹل تھا۔ دنیا بھر کی سہولتوں سے آراستہ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دو بیڈ کے ایک آراستہ کمرے میں پہنچ گئے، جس کی عقبی کھڑکی سے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں اور حسین میدان نظر آتے تھے۔ پورٹر کے واپس جانے کے بعد طالوت نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔

''خیریت...... خیریت؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت سے قہقہے میرے پیٹ میں جمع ہو گئے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ تفریح پہلے ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟''

''اب سہی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایمانداری سے بتاؤ، کیسی رہی؟ اچھے اچھوں کو متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ۔''

''لیکن قباحت ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہمارے چہروں کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں اور پھر الفاظ۔ بعض جگہوں پر اندازہ نہیں ہوتا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔''

''ہاں...... میں نے محسوس کیا ہے۔ اس لئے ہمیں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہئے۔''

''مثلاً؟''

''ففٹی ففٹی۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''طاؤس! ایک بٹا دو...... یعنی آدھا میں، آدھا تم...... یہ بات اس لئے ذہن میں آئی کہ اگر ہم نے محبوبائیں پالیں تو یکجا نہیں رہ سکتے۔''

''ہوں۔'' میں نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔

''اس کے علاوہ ایک اور کام ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم دونوں دو مختلف جگہوں پر ہوں تو ایک دوسرے کے الفاظ کا اندازہ کیسے لگا سکیں گے؟''

''ہاں...... متضاد گفتگو ہماری شخصیتیں الگ کر دے گی۔''

''میرے پاس اس کی ترکیب موجود ہے۔''

''کیا ہے، بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ اور طالوت نے اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی اتار کر مجھے دے دی۔
''اسے پہن لو۔ دونوں کے خیالات، الفاظ ایک دوسرے کو ملتے رہیں گے۔ تم کمرے سے باہر یا باتھ روم میں جا کر اس کا تجربہ کرلو۔''
''کمال ہے...... اچھا میں جاتا ہوں۔'' اور میں باتھ روم میں چلا گیا۔ انگوٹھی میں نے انگلی میں پہن لی اور میرے ذہن میں طالوت کی آواز گونجی۔
''کیا خیال ہے؟ میری آواز تمہارے کانوں میں آرہی ہے؟''
''ارے ہاں...... مگر...... مگر کیا یہ آواز کوئی دوسرا نہیں سن سکتا؟''
''نہیں۔ یہ صرف ذہن میں رہے گی۔''
''حیرت انگیز..... خدا کی قسم حیرت انگیز۔ بالکل ایسے لگ رہا ہے جیسے ٹیلی فون پر گفتگو ہو رہی ہے۔''
''ہاں...... ٹیلی فون تمہاری ایجاد ہے اور سنگونا ہماری۔''
سنگونا؟''
''ہاں...... اس انگوٹھی کا نام سنگونا ہے۔ اب باہر نکل آؤ۔'' طالوت نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔
''کمال کی چیز ہے۔ لیکن اس سے کتنے فاصلے پر سنا جا سکتا ہے؟''
''دنیا کے کسی بھی حصے سے کسی بھی حصے تک۔ بہر حال یہ کام ہو گیا۔ اب لڑکیوں کی باتیں کریں۔ مگر زکو۔ اس سے پہلے کافی منگوالو۔ کافی کے دوران گفتگو کریں گے۔''
میں نے بیرے کو بلا کر کافی کا آرڈر دے دیا اور تھوڑی دیر کے بعد آرڈر سرو ہو گیا۔ بہت عمدہ سروس تھی۔ طالوت نے کافی بنائی اور پھر دلچسپ انداز میں بولا۔
''اُڑن کھٹولے والی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''والیاں کہو۔'' میں نے کہا۔
''ہاں۔ کئی تھیں۔ مگر متوجہ ایک ہی ہوئی تھی۔''
''کیا نام بتایا تھا اس نے؟''
''فریدہ۔''
''اوہ، ہاں...... یہاں آئے گی ضرور۔ اندازہ یہی ہوتا تھا۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے۔''
''پھر......؟''
''پھر کیا؟''
''میری یا تمہاری؟...... یار! اس انداز میں یہ معاملہ بہت ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ ویسے ہم اسے گھستے ہی ایں گے۔ کیا خیال ہے؟''
''جیسے حالات ہوں۔''
''فیصلہ نہیں ہو سکا۔''
''تم کیا چاہتے ہو؟''
''ہاں..... عمدہ ہے۔ مجھے دے دو۔ پسند آگئی ہے۔ تمہیں اللہ اور دے گا۔'' طالوت نے گھگھیائے

ہوئے انداز میں کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔
''جلدی بتاؤ۔'' طالوت میرا بازو پکڑ کر بولا۔
''ٹھیک ہے، تم لے لو۔ لیکن میں اپنے لئے جو تلاش کروں گا، وہ صرف میری ہو گی۔ یہ نہیں کہ اس کے بعد تم ادھر پھسل پڑو۔''
''حرام ہو گی میرے اوپر۔ وعدہ۔'' طالوت نے جلدی سے کہا۔
''تب ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلا دی اور طالوت خوش ہو گیا۔ ہم دونوں کافی پیتے رہے۔ طالوت بڑی بے چینی سے فریدہ کا منتظر تھا۔ ویسے ہم اپنی اس اداکاری کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ہم بہت سے پروگرام بناتے رہے۔ رات ہو گئی تھی، لیکن ابھی تک فریدہ کا پتہ نہیں تھا۔ طالوت کو کچھ مایوسی ہونے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔
''کیا خیال ہے...... وہ آئے گی یا نہیں؟''
''ظاہر ہے، میں بھی اس سے اتنا ہی ناواقف ہوں جتنا تم۔''
''یار! آئے گی ضرور۔ میرا یہی اندازہ ہے۔ لیکن آؤ، باہر کی فضا بھی دیکھیں۔''
''چلو۔'' میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اور ہم دونوں تیار ہونے لگے۔ نوک پلک سے درست ہو کر ہم نے کمرہ چھوڑ دیا۔ اس وقت بھی ہم دونوں کے لباس اور انداز میں سرمو فرق نہیں تھا۔ ہم ایک ہی انداز میں لفٹ کے ذریعہ اُترے اور پھر ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔ ڈائننگ ہال پوری طرح آباد تھا۔ چاروں طرف قہقہے اُبل رہے تھے۔ ماحول بھی بے حد رنگین تھا۔ شاید روشن آباد کے سارے امراء اور معزز لوگ گل رخ کو ہی واحد تفریح گاہ سمجھتے تھے اور یہاں آنا فرض خیال کرتے تھے۔ ہال میں بے شمار حسین چہرے موجود تھے۔ بعض میزوں پر قوی ہیکل قبائلی بھی نظر آئے تھے۔ لیکن وہ بہرحال مہذب اور ہوٹلوں کے آداب کو سمجھنے والے معلوم ہوتے تھے۔ لباس کی بات دوسری ہے۔ ظاہر ہے، یہ علاقہ ہی قبائلی علاقے سے ملا ہوا تھا۔
ہم لوگوں کے داخلے سے ماحول پر ایک اثر پڑا۔ جن لوگوں نے ہمیں دیکھا، نظر انداز نہ کر سکے۔ اور بہت سی میزوں پر ہمارے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔
ایک پورٹر لپک کر ہمارے پاس پہنچا تھا۔
''روم نمبر ایٹی ون کی ٹیبل اس طرف ہے جناب! تشریف لائیے۔'' اور ہم دونوں اس طرف چل پڑے۔ بہت سی نگاہوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ میز پر بیٹھ کر طالوت نے ہال پر نگاہ دوڑائی۔ میری گردن بھی اس کی گردن کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ حتیٰ الامکان یہی کوشش تھی کہ ہمارا انداز ایک ہی رہے۔
اور بہت جلد ہم پورے ہال کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ ویٹر نے ادب سے مینیو ہمارے سامنے رکھ دیئے تھے۔ ہم نے ایک ہی انداز میں مینیو کی ورق گردانی کی اور پھر ایک ہی قسم کا آرڈر نوٹ کرایا۔ آرڈر لینے والے نے بھی یہ یکسانیت نوٹ کی تھی۔ بہرحال وہ چلا گیا تو نزدیک ہی کی میز سے ایک درمیانی عمر کا آدمی اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ شکل وصورت سے مہذب معلوم ہوتا تھا۔
''چند لمحات کے لئے سمع خراشی کر سکتا ہوں؟'' اس نے مہذب انداز میں کہا۔

"تشریف رکھیے۔" ہم نے بیک وقت کہا۔
"آپ دونوں کی حیرت انگیز مشابہت مجھے کھینچ لائی ہے۔ میرا نام رانا تفضل ہے۔ روشن آباد کے
اراح میں میری جاگیر ہے۔ میں نے شباہت تو دیکھی ہے، لیکن ایسی حیرت انگیز نہیں۔ آپ کے انداز بھی
اماں ہیں۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ہم دونوں نے ایک گہری سانس لی۔
"یقیناً آپ دونوں آپس میں بھائی ہیں۔"
"میرا مقدر ہی خراب ہے محترم!" طالوت نے کہا اور اس وقت اس نے صرف ہونٹ ہلائے تھے۔
یہ حیرت انگیز بات تھی کہ طالوت جو جملے کہنے والا تھا، وہی میرے ذہن میں گونجے تھے۔ بہرحال
لونا کا حیرت انگیز کمال ظاہر ہو گیا تھا اور اب میں اعتماد سے کام کر سکتا تھا۔
"میں نہیں سمجھا۔" آنے والے نے حیرت سے کہا۔
"دنیا والے مجھے ڈبل کیوں سمجھتے ہیں؟ میں تنہا ہوں، اکیلا ہوں...... لیکن......" اس بار میں نے
ے اطمینان کے ساتھ طالوت سے آواز ملائی تھی اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
"اور یہ صاحب......" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے گہری سانس لی تھی۔
"یہ معمہ کبھی حل نہ ہو سکے گا۔" ہم نے کہا۔
"آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں؟"
"براہِ کرم کوئی نئی بات کریں۔ جو بھی ملتا ہے مجھ سے، اسی قسم کی گفتگو کرتا ہے۔ آخر میں دنیا والوں کو
ہرا کیوں نظر آتا ہوں؟ ایک آدھ شخص کی بات ہو تو اسے مخبوط الحواس بھی سمجھا جائے۔"
"تو کیا...... تو کیا...... م...... میرا مطلب ہے، آپ دونوں اپنے وجود کو الگ الگ نہیں سمجھتے؟"
"اگر آپ کو ایک کے دو نظر آتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" ہم دونوں نے خشک لہجے میں کہا۔
"لیکن...... لیکن......"
"براہِ کرم، مجھے افسوس ہے کہ میں بداخلاقی کا ثبوت دے رہا ہوں۔ آپ یہاں سے تشریف لے
جائیں۔ یہ بات اب میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔" ہم نے غصیلے لہجے میں کہا۔
"کمال ہے۔ خدا کی قسم کمال ہے۔ آپ کی آوازیں بھی یکساں ہیں۔ ایک ہی لفظ بیک وقت آپ
کے منہ سے نکلتا ہے۔ آپ کے تاثرات بھی یکساں ہوتے ہیں۔"
"ویٹر!" ہم نے ویٹر کو آواز دی اور وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ ویٹر ہمارے پاس آ گیا تھا۔ "پانی لاؤ۔"
ہم نے کہا اور ویٹر چلا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے طالوت ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔
"ارے ستیاناس!"
"کیوں؟" میں نے گردن جھکائے جھکائے کہا۔
"ذرا دیکھو تو، وہ کہاں گیا ہے؟"
"کون؟"
"وہی جو ہمارے پاس بیٹھا تھا۔" طالوت نے کہا اور ہم نے ایک ساتھ جھکی ہوئی گردنیں اُٹھائیں۔
والی جس میز پر گیا تھا، وہاں تین خوب صورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔
"چوٹ ہو گئی پیارے طالوت!" میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں...... چوٹ ہوگئی۔ لیکن ہم اسے اٹھتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بہرحال، کوئی حر
نہیں ہے۔ اس سے اپنی بداخلاقی کی معذرت کرلیں گے۔''

''کرنا ہی پڑے گی۔ لڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔''

ویٹر نے دو گلاس پانی لاکر رکھ دیا اور ہم نے بیک وقت گلاس اٹھا لئے اور پھر پانی پی کر ایک سات
گلاس رکھے۔

''طالوت!'' میں آہستہ سے بولا۔

''ہوں؟''

''ایک دقت اور پیش آسکتی ہے۔''

''کیا؟''

''اگر کسی نے ہمارا امتحان لینے کے لئے ہمارے سامنے ایک چیز سرو کی، جیسے یہ پانی کا گلاس۔ تب
کیا ہوگا؟''

''ہوں...... سوال عمدہ ہے۔ اچھا ہوا جو پہلے سے سوچ لیا۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''کیا بندوبست ہوگا؟''

''راسم زندہ باد...... اس سے آگے جب کوئی واقعہ پیش آئے تو دیکھ لینا۔'' طالوت نے کہا اور میں
طالوت کی بات پر غور کرنے لگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ طالوت کے لئے کوئی اُلجھن، اُلجھن نہیں ہے۔ ہماری
نگاہ پھر ان لڑکیوں پر جا پڑی جو اس شخص کے ساتھ تھیں، جسے ہم نے بے وقوف بنا کر روانہ کر دیا تھا۔

ابھی ہم اس کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک طالوت چونک پڑا۔ ''عارف......!'' اس
نے آہستہ سے کہا۔

''ہوں......'' میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''فریدہ۔''

''اوہ......'' میں نے گردن اٹھائی۔ ہال کے دروازے سے فریدہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے
چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور ہم پر نگاہ پڑتے ہی تیزی سے ہماری طرف آئی۔ اس وقت وہ یونیفارم میں
نہیں تھی۔ بلکہ ہلکے کلر کی ساڑھی میں خاصی خوبصورت نظر آرہی تھی۔

''ہیلو......!'' وہ قریب آکر بے تکلفی سے بولی۔

''ہیلو۔'' ہم دونوں نے بیک وقت کہا اور وہ ہنستی ہوئی، کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے گردن گھما
کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اسی انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔

''تو میرا اندازہ درست تھا۔ آپ لوگوں نے پورے ہوٹل کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے،
اس وقت ہر نگاہ آپ پر ہے۔''

''محترمہ فریدہ! کیا آپ اس وقت بھی میری دل آزاری سے باز نہیں آئیں گی؟'' ہم نے بیک وقت
کہا۔ اور فریدہ سنجیدہ ہو کر غور سے ہمیں دیکھنے لگی۔

''ایک بات عرض کروں؟'' اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''فرمائیے۔'' ہم نے کہا۔

''ملازمت پیشہ ہوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ڈیوٹی ہی کے حساب سے صرف دو دن یہاں قیام کرنا ہے۔ اس کے بعد چلی جاؤں گی۔ اور پھر کون جانے زندگی کے کسی حصے میں ملاقات ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ چنانچہ اگر ممکن ہو تو تھوڑی دیر کے لئے خود میں، اپنی دوستی میں شریک کر لیں۔ کیا حرج ہے؟ وقت اچھا گزر جائے گا۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' ہم نے اسی انداز میں کہا۔

''تو سنیئے۔ میرا قیام بھی گل رخ میں ہے۔ روم نمبر ایک سو آٹھ۔ اگر اپنا فیصلہ بدل لیں اور مجھے دوستوں میں شامل کر سکیں تو مجھے پکار لیں۔'' وہ کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

''ارے، ارے...... تشریف تو رکھیے مس فریدہ!...... بیٹھیئے۔ آخر اس ناراضگی کی وجہ؟'' اس بار بھی میں نے طالوت کا مکمل ساتھ دیا تھا۔

وہ رک گئی اور پھر اس نے میز پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''سنیے حضرات! نہ یہ دیو مالائی دور ہے، نہ میں پاگل۔ ہاں اس فن کی داد ضرور دوں گی۔ آپ لوگوں کے چہرے، قد و قامت، انداز، یہاں تک کہ آواز اور چہرے کے تاثرات اس قدر یکساں ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور پھر آپ لوگوں نے الفاظ کے سلسلے میں جو تعاون کیا ہے، جس طرح آپ ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ لیتے ہیں، یہ دنیا کا سب سے حیرت انگیز فن ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ کو ایک نہیں سمجھ سکتی، کیونکہ میری دونوں آنکھوں کی بینائی درست ہے۔''

''آپ تشریف تو رکھیے۔'' طالوت نے اور میں نے بیک وقت کہا۔

''اس وقت تک نہیں، جب تک آپ میں سے ایک مجھے بیٹھنے کے لئے نہ کہے۔''

''ہاتھ سے جا رہی ہے بیٹا!'' طالوت کے خیالات میرے ذہن میں گونجے۔

''پھر؟'' میں نے بھی خیالات کی زبان میں کہا۔

''مجھے پسند ہے۔ ممکن ہے، کام بن جائے۔''

''روکو پھر۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں...... کیا حرج ہے؟'' طالوت نے کہا اور اس بار صرف اس نے ہی فریدہ کو مخاطب کیا۔

''تشریف رکھیے محترمہ!'' میں خاموش رہا تھا۔

فریدہ نے میری طرف دیکھا، پھر مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''اپنی کامیابی پر نہیں، خوش بختی پر مسرور ہوں۔ آپ لوگوں کی دوستی میرے لئے بہت قیمتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''طاؤس بٹا دو۔'' طالوت نے مجھے پکارا۔

''کیا بات ہے طاؤس بٹا ایک؟'' میں نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

''خاتون فریدہ کے لئے کچھ منگواؤ۔''

''یہاں نہیں...... اپنے کمرے میں۔'' میں نے کہا۔

''ایں، ہاں...... یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' فریدہ نے کہا اور ہم تینوں اٹھ گئے۔ میں نے حسرت بھری

نگاہوں سے بوڑھے کی ساتھی لڑکیوں کو دیکھا تھا، جواب بھی ہماری طرف دیکھ ہی تھیں۔ کافی خوبصورت لڑکیاں تھیں، لیکن کام بگڑ گیا تھا۔ طالوت کی خودغرضی پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا۔ کمبخت ایک دم پھسل گیا اور سارے پروگرام رکھے رہ گئے تھے۔

بہرحال، ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ اور یہاں ہم نے ویٹر کو بلا کر کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دیا۔ فریدہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، کمرے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''ویسے یہ حقیقت ہے کہ آپ کا دلچسپ اور متحیر کن انداز لوگوں کو پاگل پن کی حد تک حیران کر دیتا ہے۔ میری ساتھی ہوسٹس سخت حیران تھیں بلکہ گل تو مرمٹی تھی آپ پر۔ کہہ رہی تھی، کاش اس کا اسٹیشن روشن آباد میں ہوتا۔''

''گل......؟''

''ہاں...... سلونی گل۔ وہ، جس نے سیٹوں کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی۔''

''اوہ......''

''آپ لوگ بے حد پُرکشش اور بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں اور پھر...... لیکن اب مکمل تعارف ہو جانا چاہئے۔ کیا آپ دونوں بھائی ہیں؟''

''نہیں۔'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''صرف دوست۔''

''کیا دوسرا میک اپ میں ہے؟''

''قطعی نہیں۔ ہماری دوستی ہم شکل ہونے کی بنا پر ہوئی ہے۔''

''آپ لوگوں کے نام کیا ہیں؟''

''طاؤس بٹا ایک۔ طاؤس بٹا دو۔''

''پھر شرارت؟'' وہ پیار بھری نگاہوں سے طالوت کو دیکھتے ہوئے بولی اور طالوت کے خیالات سنگوں کے ذریعے میرے ذہن میں گونجے۔

''معاف کر دے عارف!...... بس ایک بار معاف کر دے۔ اب نہیں کروں گا۔ قسم لے لے، اب نہیں کروں گا۔'' اور مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر طالوت نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

''یقین نہیں کرتیں تو پھر آپ جس نام سے چاہیں پکار لیں۔''

''چلئے، میرا کیا ہے۔ جو آپ پسند کریں۔'' فریدہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہم تو آپ کو پسند کرتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''اس کے لئے شکرگزار ہوں۔ لیکن نمبر ایک یا نمبر دو؟'' اس نے کہا۔

''میں نمبر ایک ہوں۔''

''تو پھر میں کہئے نا۔'' اس بار فریدہ نے میری طرف دیکھا اور میں نے چہرہ سپاٹ کر لیا۔ ویٹر ہمارے آرڈر کا سامان لے آیا تھا۔ چنانچہ کھانے پینے کا دور شروع ہو گیا۔ فریدہ خاصی باذوق اور بذلہ سنج تھی۔ اس نے پتہ بھی بتایا اور کہا کہ اگر کبھی اس کے یہاں آئیں تو اسے مسرت ہو گی۔

ہم گفتگو کرتے رہے اور فریدہ بے تکلف ہوتی گئی۔ ہم اسے ٹٹول رہے تھے اور اندازہ ہوا کہ وہ زندگی میں ہر تفریح کی قائل ہے۔

"میں تو آوارہ گرد ہوں..... آج یہاں، کل وہاں۔ پُرخطر زندگی گزارتی ہوں۔ اس لئے زندگی کو تمام قیود سے آزاد کردیا ہے۔ بس، جہاں خوشی ملی، اپنالی۔" اس نے دورانِ گفتگو کہا اور طالوت نے گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"طاؤس بٹا دو کو اجازت دیں مس فریدہ!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... کہاں؟"

"بس رات کو بارہ بجے کے بعد میں آوارہ گردی کرتا ہوں۔"

"میں اپنے کمرے میں ہی سوؤں گی۔ وہ بھی ڈبل روم ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔" اس نے طالوت کو دعوت دی۔

"اس طرح میری مشکل آسان ہو جائے گی۔" میں نے جلدی سے کہا اور طالوت نے شکر گزار نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"تب اجازت...... وقت بھی کافی ہو گیا ہے۔" وہ کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھ کر بولی۔

"او کے، طاؤس بٹا ایک۔" میں نے طالوت سے کہا اور طالوت کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور میں تنہا رہ گیا۔ ٹھیک ہے، لڑکی نے خود دعوت دی ہے تو میں ان کی راہ میں روڑا کیوں بنوں؟ لیکن یہ رات...... میری یہ رات تنہا کیوں رہے؟...... پھر...... پھر کیا کرنا چاہئے؟ ان لوگوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک میں یہی سوچتا رہا لیکن کوئی بات ذہن میں نہیں آئی۔

پھر یہی فیصلہ کیا کہ سونے کی کوشش کروں۔ اور میں لباس تبدیل کر کے سونے لیٹ گیا۔ آج پھر پرانے خیالات ذہن کے پردے پر اُبھر آئے تھے۔ بہت کچھ یاد آیا۔ انجیلا، روزینہ، شہنا، نرگس، رحمانی، نیمی، نوری اور پھر وہ لڑکیاں جو شیکھر نے مجھے پیش کی تھیں۔ کیسے متضاد کردار تھے، کیسی انوکھی فطرت کے مالک تھے یہ سب۔

زندگی کا ہر پہلو دیکھ چکا تھا۔ کسے پسند کروں، کسے ناپسند۔ کبھی کبھی پاکیزگی پوری قوت سے اُبھر آتی تھی اور کہیں خود کو غلاظت کے ڈھیر میں ملفوف سمجھتا۔ زندگی کیا ہے؟ خواہشات کے کتنے مدفن میرے سامنے آئے؟ جو پالے، وہ اپنا ہے۔ جو کھو دے، وہ خیال ہے۔ نیکیاں، پاکیزگی سب حالات کے تحت ہیں۔ انسان نیک بننا چاہتا ہے، نہیں بن سکتا۔ پاکیزگی اپنانا چاہتا ہے، نہیں اپنا سکتا۔ حالات اس کے لئے کچھ اور راستے متعین کرتے ہیں۔ اپنانے پڑتے ہیں وہ راستے۔ ورنہ راہیں ناہموار ہو جاتی ہیں۔ کبھی بلندیاں، کبھی پستیاں.... اعتماد کھو جاتا ہے۔ ہر قدم خوف کا قدم ہوتا ہے۔ ہاں، وقت جو کہے، وہی ہوتا ہے۔

طالوت، میری قسمت کا راہبر۔ اس نے میرے لئے منزلیں متعین کیں...... ورنہ میری قسمت جیل کوٹھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ اگر حقیقت پر نگاہ دوڑائی جائے تو میں کیا تھا؟ کچھ نہیں صرف طالوت کا دستِ نگر۔ اسی نے قدم قدم پر میری زندگی بچائی تھی۔

ذہن انہی اوٹ پٹانگ خیالات میں غنودہ ہو گیا۔ اور پھر نیند آ گئی۔ گہری نیند۔ لیکن نہ جانے کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کسی نے جھنجوڑ دیا۔

"عارف!...... عارف!" طالوت کی آواز اُبھری اور ذہن بیدار ہو گیا۔

''خیریت؟'' میں نے پوچھا۔

''سب خیریت ہے...... اٹھو یار!'' طالوت نے کہا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی کافی رات باقی تھی، نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم واپس کیوں چلے آئے؟''

''معاہدے کے تحت۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''بہت عرصے کی بات ہے۔ لیکن ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔''

''مجھے یاد نہیں آرہا۔''

''ہم نے طے کیا تھا کہ اگر کوئی لڑکی پاکباز نہ ہو...... میرا مطلب ہے، ایک عام سی لڑکی ہو، جسے شخصیتیں بدل جانے پر کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم دونوں کے لئے جائز ہے۔ اور تم نے زرینہ کے سلسلے میں اس وعدے کا ایفا بھی کیا تھا۔''

''اوہ ہاں...... پھر؟''

''فریدہ بھی زرینہ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے شراب طلب کی تھی۔''

''اوہ......!''

''اور اب نشے سے نڈھال پڑی ہے۔''

''اوہ......'' میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔

''اس کے بعد میں اس کی عزت کیسے کروں؟''

''میں نہیں سمجھا طالوت!'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''طاؤس بٹا دو! بقیہ رات تم اس کے ساتھ گزارو گے۔''

''اوہ......'' میں اچھل پڑا۔

''اب وہ اتنی ذہین بھی نہیں ہے کہ طاؤس بٹا ایک اور طاؤس بٹا دو میں تمیز کر سکے۔ صبح تم طاؤس بٹا ایک کہلاؤ گے۔'' طالوت نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

''خوب...... طاؤس بٹا ایک کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''قطعی نہیں۔ ہم تو کردار کے پرستار ہیں۔ اگر وہ فطری طور پر ٹھیک ہوتی تو...... تم جانتے ہو۔''

''اوکے ڈیئر! میں تمہاری اس پیشکش سے انکار نہیں کروں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُٹھ گیا۔ طالوت نے مجھے فریدہ کے کمرے کا پتہ بتایا اور تھوڑی دیر کے بعد میں فریدہ کے کمرے کے دروازے پر تھا۔ طالوت دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ فریدہ بے سدھ مسہری پر پڑی تھی۔ نزدیک کی میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ لیکن صرف ایک گلاس کے پیندے میں شراب کا نشان تھا۔

میرے ذہن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ درحقیقت زندگی پر اتنے واقعات چھا گئے تھے کہ فطرت

بھول بھلیّوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ عورت کی اتنی شکلیں سامنے آئی تھیں کہ اس کی اصلیت ذہن سے محو ہو گئی تھی۔

نوری اور سیمیں یاد آئیں۔ دوسری لڑکیاں بھی یاد آئیں۔ کون نوری ہے اور کون زرینہ، تمیز مشکل ہو جاتی تھی۔ لیک یہ تو زرینہ بھی نہیں ہے۔ زرینہ دولت کی خواہش مند تھی۔ اور یہ...... یہ صرف تفریح پسند۔ یہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہ تیسری شخصیت کی حامل ہے، لیکن جوان ہے۔ خوب صورت ہے اور...... اور...... میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

عورت کے حسین نقوش تیز آندھی کی طرح ذہن پر چھا گئے۔ میں سب کچھ بھول گیا اور صرف ایک عام انسان رہ گیا...... ایک معمولی آدمی...... جو صرف ہوس کا غلام ہوتا ہے۔

دوسری صبح طبیعت پر عجیب سا بار تھا۔ ذہن اس ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ انفرادیت تو نہیں رکھتا۔ آدمی کی ضرورت تو بہت کچھ ہے۔ بعض ضرورتوں کے لئے اسے معیار سے گرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ضرورت ٹالی بھی جا سکتی ہے۔ اس بار طالوت کی وجہ سے گڑبڑ ہوئی تھی۔ وہ فریدہ پر اس طرح مرمٹا تھا کہ اس نے پورا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔ ورنہ طاؤس بنا ایک اور طاؤس بنا دو...... انتہائی دلچسپ حیثیت رکھتے تھے۔

''ڈارلنگ!'' فریدہ نے بال خشک کرتے ہوئے کہا۔ وہ غسل کر کے نکلی تھی۔

''ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم بھی غسل کر لو۔ پکھیرو انتظار کر رہا ہو گا۔''

فریدہ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ راتوں رات کیا ہو چکا۔ بہرحال خاموشی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ نہانے کے بعد بھی خوشی نہ ہوئی۔ اور یہ کیفیت طالوت کے سامنے بھی برقرار رہی۔ فریدہ میرے ساتھ ہی طالوت کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''ہیلو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!'' فریدہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ لیکن طالوت میرا چہرہ دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

''ناشتہ منگوایا جائے؟'' طالوت بولا۔

''ہاں...... میں سخت بھوکی ہوں۔'' فریدہ نے جلدی سے جواب دیا اور طالوت نے بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ بیرے کو ناشتے کا آرڈر دے کر ہم سب آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ فریدہ کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ہشاش بشاش تھی۔

''آج کیا پروگرام رہے گا؟'' ناشتہ کرتے ہوئے فریدہ نے پوچھا۔

''جو تم پسند کرو۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کے لئے معذرت چاہوں گی، کچھ کام ہے۔ ہاں، شام ساتھ گزرے گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''کیا تم میرے ساتھ شاپنگ کرنے نہیں چلو گے ڈارلنگ؟'' فریدہ نے بے حجابی سے کہا۔

''ہم دونوں ہی چلیں گے۔'' طالوت جلدی سے بول پڑا اور فریدہ ہنسنے لگی۔
''کیوں؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''آپ دونوں پر ہنس رہی ہوں...... آج رات اور یہاں رہ گئی تو آپ لوگوں کے نام بھی پوچھ لوں گی۔''
''اوہ......'' طالوت مسکرانے لگا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ غالباً فریدہ کے جملوں نے اسے بھی اپنے ہلکے پن کا احساس دلا دیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم لوگ تھوڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے پھر باہر جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ فریدہ تیار ہو کر آئی تھی۔ ہم چل پڑے۔ ایک ٹیکسی کر کے ہم بازار پہنچے۔ اور پھر طالوت نے فریدہ کی پسند کی ہر چیز خریدی تھی۔ خاصی لمبی شاپنگ ہوئی تھی، جو فریدہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔
شاپنگ کرنے کے بعد طالوت نے فریدہ سے کہا۔ ''اب کیا پروگرام ہے مس فریدہ؟''
''بس، یہاں سے ہوٹل چلیں گے۔ پھر میں ذرا کام سے جاؤں گی۔''
''ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیں یہیں اجازت دے دیں اور اس کے بعد ہم لوگ اس وقت ملاقات کریں، جب آپ واپس آ چکی ہوں۔ دراصل ہمیں بھی کچھ کام ہے۔''
''ہاں، ہاں...... کیا حرج ہے؟ میں ٹیکسی کر کے چلی جاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر وہ ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں چار بجے تک واپس پہنچ جاؤں گی ڈارلنگ!''
اور ہم دونوں نے بادل نخواستہ گردن ہلا دی۔ جب اس کی ٹیکسی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو طالوت نے چاروں طرف دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک ریستوران کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔
''ہم ریستوران میں بیٹھیں گے عارف!'' طالوت نے کہا اور میں خاموشی کے ساتھ ریستوران کی طرف بڑھ گیا۔ ریستوران کے ایک الگ تھلگ کیبن میں بیٹھ کر طالوت نے ایک مشروب کا آرڈر دیا اور پھر دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔
''سنگوانا اُتار دو عارف! اس وقت ہم اس کے بغیر گفتگو کریں گے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے خاموشی سے انگوٹھی اتار دی۔ انگوٹھی میز پر رکھ کر میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔
''تم غیر معمولی طور پر خاموش ہو۔'' وہ آہستہ سے بولا۔
''ہاں طالوت! اس وقت صاف گفتگو پسند کروں گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔
''مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟''
''ہاں۔''
''تو پہلے معاف کر دو۔ اس کے بعد بات کریں گے۔'' طالوت نے بڑے خلوص سے کہا۔
''میں تمہاری پُر خلوص دوستی پر ناز کرتا ہوں طالوت! اس لئے اس وقت اپنی حیثیت نظر انداز کر کے ایک دوست کی حیثیت سے تم سے گفتگو کروں گا۔'' میں نے کہا۔
''تمہیں یہی کرنا چاہئے عارف!''
''کیا اچانک ہمارے ضمیر پر کوئی زخم نہیں لگا ہے طالوت؟''
''کہتے رہو...... میں سن رہا ہوں۔''

''میری پوری زندگی تمہارے سامنے ہے طالوت! میں پارسا نہیں ہوں۔ بلکہ ایک عورت کی وجہ سے میں اپنی پوری زندگی تباہ کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد بھی اس عورت سے دور نہ رہا۔ تمہیں تفصیل بتانے سے کیا فائدہ؟ کون سا پہلو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے؟''

''یقیناً...... لیکن جو کچھ کہنا چاہتے ہو، جلدی کہہ ڈالو'' طالوت نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''جب ہم اس کے سامنے ایک انوکھی حیثیت میں آئے تھے تو خود کس قدر مسرور تھے اور وہ سب کتنی حیرت زدہ تھیں۔ لیکن...... اس کی وجہ سے...... ایک عورت کی وجہ سے ہماری کوئی انفرادیت نہیں رہی۔ نہ اپنی نگاہ میں، نہ اُس کی نگاہ میں۔''

''ہاں...... مجھے اس کا احساس ہے۔''

''اس کے ساتھ ہی ہمارے، میرے ضمیر پر ایک بوجھ سا ہے۔ کیا ہم وہی ہیں، جس نے سیمیں اور نوری کو بہن بنایا تھا؟...... دراصل، میں نے روشیلا کے بارے میں تم سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ایک انتقامی کیفیت بھی تھی۔ لیکن فریدہ کے ساتھ گزری ہوئی رات مجھے پسند نہیں آئی۔ اور پھر فریدہ کا انداز...... اُس کے الفاظ......!''

''ہاں یار! پسند تو مجھے بھی نہیں آئے۔'' طالوت نے سر جھکا کر کہا۔ ''ہم دوسری رات اس کے ساتھ نہیں گزاریں گے طالوت!''

''بس، نہیں گزاریں گے۔''

''اور ہم ایسی رات کہیں بھی نہیں گزاریں گے، جہاں ضمیر پر ایسا بوجھ آ گرے۔ یوں ہم انسان ہیں۔ اور ہر انسان ہر ضرورت کا غلام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ بس، اس کے بعد اور کچھ نہ کہو۔ بتاؤ، کیا پروگرام ہے؟''

''شکریہ میرے دوست!''

''فضول.... بکواس...... میں نے حماقت کی ہے، مجھے احساس ہے۔ بس اب جانے دو۔ میری رائے ہے کہ ہم روشن آباد چھوڑ دیں۔''

''میری بھی یہی رائے ہے۔''

''تب پھر بیرے کو دیکھ کر بل ادا کرو۔''

''لیکن اس طرح کیسے ممکن ہے؟ کچھ انتظامات بھی تو کرنے ہیں۔''

''مثلاً؟''

''پہاڑوں کے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ پیدل تو نہیں چلیں گے۔''

''راسم انتظامات کر دے گا۔ روشن آباد کا گناہ مجھے شدید محسوس ہو رہا ہے۔''

''تمہاری مرضی...... اور ہوٹل کا سامان وغیرہ؟''

''ابے تو سامان کی کوئی کمی ہے؟'' طالوت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور میں ہنسنے لگا۔ پھر میں نے بیرے کو بلا کر بل ادا کیا اور ہم یہاں سے نکل آئے۔

''آگے کے نقشوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم ان علاقوں کو پہچان لوگے، جہاں تم پہلے بھی ہو آئے ہو؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس تم روشن آباد چھوڑ دو۔'' طالوت کے سر پر

دھن سوار ہوگئی تھی۔

''تب پھر آؤ۔ اور آواز دو راسم کو۔''

''کیا تم ہماری ضرورتیں سمجھ چکے ہو راسم؟'' طالوت نے دائیں طرف رُخ کر کے کہا۔

''آقا......!'' راسم کی آواز سنائی دی اور میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ اس وقت راسم نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ہمیں تمام چیزیں کسی مناسب جگہ درکار ہیں۔''

''روشن آباد کی آبادی کا آخری سرا، ڈریسا کہلاتا ہے۔'' راسم نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔'' طالوت نے جواب دیا اور راسم خاموش ہوگیا۔ میں حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ طالوت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''آؤ، ٹیکسی تلاش کریں۔''

''تمہارا ہر کام محیر العقول ہوتا ہے۔''

''بس، روشن آباد ابھی چھوڑ دیں گے۔ واقعی یہاں بڑی بے وقوفی ہوئی ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ میں دل سے اس شخص کا قدردان تھا۔ ورنہ وہ صاحبِ اختیار تھا۔ خشک انداز میں مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھوں۔ اس کے معاملات میں دخل نہ دوں۔ لیکن طالوت......وہ ایک قابل قدر ہستی تھا۔

ہم نے تھوڑی دُور آ کر ایک ٹیکسی پکڑی اور اس میں بیٹھ گئے۔

''ڈریسا......!'' طالوت نے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے گردن موڑ کر ہم دونوں کو دیکھا۔ بہرحال، اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔

خوبصورت وادیوں اور حسین مناظر کا شہر، روشن آباد ہمیں راس نہیں آیا تھا۔ اور اسے چھوڑنے کا فیصلہ بروقت تھا۔ ٹیکسی دوڑتی رہی۔ ڈریسا بہت دُور تھا۔ ڈرائیور بھی وہاں جانے سے خوش نہیں تھا۔ لیکن بہرحال، اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ اور درحقیقت وہ آبادی کا آخری سرا ثابت ہوا۔ یہاں کچی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ سامنے ہی ایک قہوہ خانہ نظر آ رہا تھا، جو چھپر کے سائبان کے نیچے تھا۔

طالوت نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈرائیور کو کچھ رقم دی اور ڈرائیور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم یہاں سے خالی جاؤ گے دوست! رکھ لو۔'' طالوت نے کہا اور اس نے نیچے اُتر کر ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔

''آؤ......'' طالوت نے کہا اور ہم قہوہ خانے کی طرف بڑھ گئے۔ قہوہ خانے میں بہت سے قبائلی، بنچوں اور چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان ہی کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ لیکن ہمارے لباس دوسروں سے مختلف تھے، اس لئے سب کے سب حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ہم نے قہوہ طلب کیا اور قہوہ خانے کا بوڑھا لیکن تندرست و توانا مالک صاف ستھرے برتنوں میں قہوہ لے کر خود ہمارے پاس آ گیا۔

''شہر کا لوگ ہے، صاب؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، خان بابا!''

"ہمارا مہمان ہے..... پیو...... اچھا والا قہوہ بنایا تم لوگوں کے واسطے۔" سرخ وسفید بوڑھے نے کہا۔
"شکریہ۔ آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں تو لطف آ جائے گا۔"
"چہ، زرّین خان.....!" بوڑھے خان نے لڑکے کو آواز دی۔ "ایک پیالی اور لاؤ۔" اور قہوہ خانے کا بوڑھا مالک ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔
"ادھر سیر کرنے کو آیا صاب؟" اس نے قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں، خان! ہم ان پہاڑوں کے دوسری طرف جائیں گے۔"
"پہاڑوں کے دوسری طرف......؟" اچانک بوڑھا، قہوے کی پیالی منہ تک لے جاتے رک گیا۔"
"ہاں...... کیوں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"اُدھر مت جاؤ، صاب!...... وہ سیر کا جگہ نہیں ہے۔ یہ بوڑھے خان کا مشورہ ہے۔"
"کیوں خان بابا! اُدھر کیا بات ہے؟"
"وہ غیر علاقہ ہے۔ اُدھر کا لوگ، اِدھر کے لوگ کو پسند نہیں کرتا۔"
"ہم ان کے مہمان بن کے جائیں گے۔" میں نے کہا۔
"وہ لوگ اجنبی لوگوں کو مہمان بنانا پسند نہیں کرتا...... اُدھر انسان کا زندگی کچھ نہیں۔" بوڑھے خان نے کہا۔
"کیا اُدھر کے لوگ بہت خونخوار ہیں، خان بابا؟" طالوت نے پوچھا۔
"غیرت مند لوگ ہے۔ اپنے بارے میں کسی کو نہیں جاننے دیتا۔"
"اگر وہ غیرت مند ہیں خان بابا! تو ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ غیرت مند اپنے مہمان کو نہیں مارتے۔"
"او بابا! خدا کا قسم، باز آ جاؤ۔ ہمارا جوان بیٹا اُدھر موت کا شکار ہو گیا اور ہم بوڑھا آدمی اکیلا رہ گیا۔ ہمارے بازو کا قوت ختم ہو گیا، ورنہ ہم بھی ایک بار اُدھر ضرور جاتا اور اپنے بیٹے کا انتقام لیتا۔"
"ارے......" طالوت کے منہ سے نکلا۔ اُس نے بوڑھے کے سرخ وسفید چہرے کو دیکھا، جس پر غم کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور بوڑھے سے بولا۔
"تمہارا اور کوئی بیٹا نہیں ہے، خان بابا؟"
"اوئے خدائی خوار...... اور بیٹا ہوتا تو ہم اُدھر جائے بیٹھتا؟ ...... چہ، خدا کا قسم، بندوق لے کر اُدھر جاتا اور اپنے بیٹے کے قاتل کا خانہ خراب کرتا۔" خان نے پُرجوش آواز میں کہا۔ میں نے گھبرا کر طالوت کی شکل دیکھی۔ طالوت کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔
"خان صاحب! اگر خدا آپ کو دو بیٹے دے دے، تو کیا آپ اپنے بیٹوں کا انتقام لیں گے؟"
"چہ، خانہ خراب۔ کیا بات کرتا؟ ابھی ہم بوڑھا ہو گیا۔ ہمارا بی بی بھی بوڑھا ہو گیا۔ اب بیٹا کدھر سے آئیں گا؟"
"ہمیں اپنا بیٹا بنالیں خان صاحب! ہم آپ کے بیٹے ہیں۔" طالوت نے کہا اور بوڑھا خان چونک کر ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"چہ، خداتم لوگ کوخوش رکھے۔ تم بابولوگ ہے۔ ہم غریب آدمی تمہارا کیا خدمت کرے گا؟"
"آپ ہماری نہیں، ہم آپ کی خدمت کریں گے خان بابا!"
"بس، تم امارا بات مان لو صاب! اُدھر مت جاؤ۔ اُدھر کا زمین اچھا نہیں ہے۔" بوڑھے خان
قہوے کا آخری گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے کہا۔
"تو آپ ہمیں بیٹا نہیں بنائیں گے؟"
"خدا آپ کو خوش رکھے۔ غریب خان آپ کا کوئی خدمت نہیں کرسکتا۔ آپ ہمارے کو عزت دو،
آپ کو عزت دے گا۔" خان نے متاثر لہجے میں کہا۔
"تو پھر سن لو خان بابا! اگر تم نے ہمیں بیٹا نہ بھی بنایا تو بھی ہم پہاڑوں کے اس طرف جائیں گے
اپنے بھائیوں کا انتقام لیں گے۔" طالوت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور مجھے چکر آ گیا۔ کیونکہ طالوت
انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ اس نے کیا چکر شروع کر دیا ہے۔
خان ہنسنے لگا۔ اس نے غور سے ہم دونوں کی شکل دیکھی، پھر بولا۔ "آپ دونوں بھائی ہے؟"
"ہاں۔" میرے بولنے سے قبل طالوت بول پڑا۔
"چہ، آپ کے بدن میں شریف خون ہے۔ آپ دوسرے کے غم کو سمجھتا ہے۔ رب العالمین سے ہ
دعا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو سلامت رکھے۔ بوڑھے خان نے دنیا سے جھگڑا ختم کر لیا۔ اس نے اپنا حسا
کتاب خدا کو دے دیا ہے۔ اب ہمارا بدلہ وہ لے گا۔"
"لیکن خان! ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم تمہارے بیٹے کے قاتلوں سے بدلہ ضرور لیں گے۔ ہمی
اس سے کوئی نہیں روک سکتا۔" طالوت نے ہاتھ پر مُکا مارتے ہوئے کہا۔
"خو، بکواس مت کرو...... تم کون ہوتا ہے، ہمارے بیٹے کا بدلہ لینے والا؟ تم اُدھر نہیں جائے گا۔ اگ
تم نے غیر علاقہ میں قدم رکھا تو ہم تمہیں گولی مار دے گا۔" اچانک خان بگڑ گیا۔ اس کا سرخ چہرہ غصے سے
سرخ ہو گیا۔
لیکن طالوت کسی سے کب کم تھا۔ وہ چائے کی پیالی پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کے
تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ پھر اس نے جیب سے کچھ رقم نکال کر رکھ دی۔
"یہ تمہاری چائے کی قیمت ہے خان!" اس نے سرد آواز میں کہا۔
"نہیں لے گا۔ ہم نے تمہیں مہمان بولا تھا۔" خان نے کہا۔
"یہ پرانی بات ہے۔" طالوت نے جواب دیا اور پھر میرا بازو پکڑ کر قہوہ خانے کے دروازے کی
طرف بڑھ گیا۔
"او خدائی خوار! اپنا پیسہ اُٹھا لو...... ورنہ...... ورنہ......" خان چیخا۔ اور پھر ہماری طرف لپکا بھی،
لیکن ہم دونوں تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہم نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ کافی دُور آنے کے
بعد میں نے طالوت سے کہا۔
"یہ کیا لغویت تھی؟"
"کیا مطلب؟" طالوت نے تیکھے انداز میں مجھے دیکھا۔
"تمہیں اس سرپھرے کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

''کیا ہم آج تک سرپھروں کے چکر میں نہیں رہے؟'' طالوت نے سوال کیا۔
''مگر......''
''کیا سیمیں سرپھری نہیں تھی، جس نے شمشیر الدولہ جیسے امیر کبیر شخص کو چھوڑ کر احسان سے شادی کر لی؟...... کیا نوری سرپھری نہیں تھی، اس نے انتہائی ناساعد حالات میں بھی اپنی عزت محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا؟...... اُس نے بھوکا مرنا گوارا کر لیا تھا۔ بہت مشکل ہے عارف!...... زندگی کو داؤ پر لگا کر اپنی انا، اپنی غیرت برقرار رکھنا بہت مشکل ہے..... انہی سرپھروں کے دم سے وجودِ انسانیت باقی ہے۔ ورنہ انسانیت کا نام ونشان مٹ جاتا۔ اور پھر ساری دنیا حیوانوں سے بھری ہوتی۔''
''لیکن طالوت! بوڑھے خان کا معاملہ مختلف ہے۔'' میں نے طالوت کو سمجھانے کی کوشش کی۔
''صرف تمہاری نگاہ کی خرابی ہے۔ صرف تمہاری سوچ کی حماقت ہے۔ حالانکہ بے بسی یہاں بھی موجود ہے۔ کاش تم اس وقت بوڑھے خان کے لہجے پر غور کرتے، جب اس نے کہا تھا کہ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ورنہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے ضرور جاتا۔ اس کا بڑھاپا اُس کی بے بسی بن گیا۔ اور عارف! ہمیں روکنے میں بھی اس کا خلوص شامل ہے۔ اس کی نگاہوں میں محبت تھی۔ اس کی دعاؤں میں شفقت تھی۔ اس نے برہمی کا اظہار صرف ہمیں روکنے کے لئے کیا تھا۔
''ہوں...... اور تم نے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں نے صرف اس لئے کیا کہ وہ ہمیں روکنے سے باز رہے اور سوچے کہ دونوں جہنم میں جائیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''تمہارا بھی جواب نہیں ہے طالوت!'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
''یار! یوں کیوں نہیں سوچتے؟ ہمیں بہرحال، اس علاقے میں جانا ہے، اب اس کے لئے کوئی جواز بھی ہو جائے گا۔''
''لیکن کیا سچ مچ بوڑھے کے بیٹے کے قاتلوں کو تلاش کرو گے؟''
''ہاں..... کیا حرج ہے؟''
''حالانکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے کیوں قتل کیا گیا، کس نے قتل کیا۔ بوڑھے کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ اس کا نام تک تو معلوم نہیں کیا تم نے۔''
''یہ کون سا مشکل کام ہے؟ معلوم کر لیں گے۔''
''کس طرح؟ کیا اس سے ملو گے؟''
''راسم معلوم کر لیگا۔''
''اوہ...... تو پھر تم اس کے ذریعے بوڑھے کے قاتلوں کو بھی تلاش کر سکتے ہو۔''
''اور ہم کیا مکھیاں ماریں گے وہاں؟ نہیں...... ہم اس سلسلے میں راسم سے مدد نہیں لیں گے۔'' طالوت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''پھر اب کیا پروگرام ہے؟''
''آؤ...... بستی کی سیر کریں...... رات کو یہاں سے نکل چلیں گے۔''
''رات کو کیوں؟..... انجانے راستے میں ہم دن کی روشنی میں چلیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کل علی الصبح سہی۔ لیکن بستی سے ہم خرید و فروخت بھی کریں گے۔''
''چلو......!'' میں نے کہا۔ اور پھر ہم دونوں بستی کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ہمیں بستی کے تندرست و توانا لوگ نظر آئے، جو اپنے لباسوں میں بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ طالوت تعریفی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''یہاں کے لوگ بے حد وجیہہ اور ترو تازہ ہیں۔''
''ہاں...... یہ سرحدوں کی جان ہیں۔ بڑے جنگجو اور بہادر لوگ ہوتے ہیں۔ اور پھر اس علاقے کی آب و ہوا بھی مثالی ہے۔''
''کیوں نہ ہم بھی ان ہی کی سی وضع قطع اختیار کر لیں۔ مجھے ان کا لباس بھی پسند آیا ہے۔''
''ضرور، ضرور۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔
''تم بڑے کام چور اور نکمے انسان ہو عارف! ہر معاملے کی مخالفت ضرور کرتے ہو۔ غور کرو، ان پہاڑوں میں، ان پُراسرار وادیوں میں چند خطرناک لوگوں کی تلاش کس قدر دلچسپ کام ہوگا۔ اور پھر ان سے مڈبھیڑ ہوگئی تو مزا ہی آ جائے گا۔''
''جی ہاں...... ابھی آپ کو ان وادیوں کی تفصیل نہیں معلوم۔ کسی طرف سے ایک گولی آئے گی اور کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔''
''میں اس سوراخ کو باآسانی بند کر دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' طالوت نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ضدی آدمی کسی طور نہیں مانے گا۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بستی کے بازار میں پہنچ گئے، یہاں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ تازہ اور خوبصورت پھل، خشک میوے، چمڑے کی بنی ہوئی پوستینیں اور دوسرے مقامی لباس، پستول، بندوقیں، غرض ہر چیز موجود تھی۔
''آؤ، خریداری کریں۔'' طالوت نے کہا۔
''بہتر۔'' میں نے جواب دیا اور ہم بازار پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے عمدہ لباس خریدے گئے۔ پوستینیں خریدی گئیں۔ چمڑے کے بڑے تھیلے خریدے گئے۔ خشک میووں کی زبردست خریداری کی گئی اور پھر دو شاندار رائفلیں، بے شمار کارتوس، دو پستولیں خریدی گئیں جن کی پیٹی کمر سے باندھ کر طالوت بہت خوش ہوا تھا۔
''اب یہ دو گدھوں کا بوجھ کون لادے لادے پھرے گا؟'' میں نے اس حاتم طائی کو روکتے ہوئے کہا۔
''دو گدھے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے ایک تھیلا میرے کندھے پر لاد دیا اور دوسرا اپنے کندھے پر۔ میں دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ تھیلا بے حد وزنی تھا۔ مجھے تو خاصی مشکل پیش آ رہی تھی اور ذہن پر جھنجلاہٹ بھی سوار ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر ایک جگہ میں نے تھیلا پٹخ دیا اور طالوت چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر وہ مسکرا کر ایک آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا، اس سے کچھ گفتگو کرتا رہا اور پھر میری طرف پلٹ آیا۔
''تھوڑی دُور اور چلیں شہزادۂ نازک اندام! آگے مویشیوں کی منڈی ہے۔ ہم وہاں سے دو خچر خرید لیں گے۔''
''کیوں پریشان کر رہے ہو یار؟ واقعی بہت وزنی ہے۔ کیا منڈی تھوڑی سی قریب نہیں آ سکتی؟''

میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔
''واہ رے ہم شکل! کاش تُو لڑکی ہی ہوتا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اس صورت میں بھی لوگ ہمیں بہن بھائی ہی سمجھتے۔'' میں نے کہا اور طالوت گردن ہلانے لگا۔
بہرحال، تھوڑی دیر کے بعد ہم نے پھر تھیلے اُٹھائے اور اس طرف چلنے لگے، جہاں مویشیوں کی منڈی تھی۔ منڈی دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ انتہائی شاندار، قد آور گھوڑے، مضبوط خچر اور دوسرے جانور موجود تھے۔ کمزور جانور بھی موجود تھے اور زیادہ تر انہی کی خریداری ہو رہی تھی۔ تندرست جانور منڈی میں لانے والے شوقین قبائلی تھے، جو صرف اپنے جانوروں کی نمائش کر رہے تھے۔ اور اگر کوئی ان سے ان کی قیمت پوچھ لیتا تو وہ اتنے دام بتاتے کہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔
''میں اور طالوت ایک جگہ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے۔ ایک جگہ کچھ زیادہ لوگ نظر آرہے تھے اور ان کے سروں سے اونچے دو سیاہ گھوڑے نظر آرہے تھے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی قد و قامت کے یہ بلند و بالا گھوڑے بے حد خوبصورت اور شاندار تھے۔ طالوت نے مجھے اُن کی طرف متوجہ کیا اور بے ساختہ میرے منہ سے تعریف نکل گئی۔
''واہ...... کیا شاندار گھوڑے ہیں۔''
''آؤ......!'' طالوت نے کہا اور ہم تھیلے ایک جگہ رکھ کر ان گھوڑوں کی طرف بڑھ گئے۔ قبائلی گھوڑوں کے ساتھ ہمیں بھی دیکھنے لگے تھے۔ ان قد آور اور تندرست و توانا لوگوں میں ہم شہری جھینگے عجیب لگ رہے تھے۔ بہرحال، انہوں نے ہمیں آگے آنے کا راستہ دے دیا تھا۔
''کیا یہ گھوڑے برائے فروخت ہیں؟'' طالوت نے پوچھا اور ایک بڑی بڑی مونچھوں والے بلڈوزر نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا اور ہمیں دیکھتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''ظاہر ہے، منڈی میں آئے ہیں۔ فروخت کے لئے ہی ہوں گے۔ خریدو گے کیا؟'' اُس نے کہا۔
''ظاہر ہے، منڈی میں آئے ہیں۔ خریدنے کے لئے ہی آئے ہوں گے۔ کیا قیمت ہے ان کی؟'' طالوت نے اسی کے انداز میں کہا۔
''مگر تم ان کا کیا کرو گے بابو؟ تم لوگ تو مشینوں پر سواری کرو۔'' قبائلی نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''تمہیں ان باتوں سے کیا سروکار؟ گھوڑے بیچو۔'' طالوت نے بھی حقارت سے جواب دیا۔
''یہ گھوڑے اعلیٰ نسل کے ہیں۔ کم نسل کے لوگوں کو اپنی پیٹھ پر نہیں بیٹھنے دیتے، بابو!''
''اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ تم نے آج تک ان کی پشت پر سواری نہیں کی۔''
''میرے علاوہ کون ہے جو ان کی پیٹھ پر بیٹھ سکے؟ سنو بابو! ان کی قیمت بیس بیس ہزار روپے ہے۔ مگر تم ان میں سے کسی پر سواری کر سکے تو میں تمہیں یہ گھوڑے مفت دے دوں گا۔''
''مارے جاؤ گے خان! تمہارے قبیلے میں ہمارے جیسا سوار ایک بھی نہ نکلے گا۔''
''تو آجاؤ۔ خان کی زبان ہے۔ زورک خان اعلیٰ نسل سے ہے۔ اگر تم نے ان کی سواری کر لی تو یہ دونوں گھوڑے تمہیں مفت دے دوں گا۔ یہ پٹھان کا وعدہ ہے۔'' زورک خان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے خان!'' طالوت نے کوٹ اُتار کر میری طرف بڑھا دیا اور پھر آستینیں چڑھانے لگا۔
لیکن اسی وقت زورک خان سینہ تانے ہوئے اس کے سامنے آگیا۔

''لیکن سنو! اگر تم گھوڑے کی سواری نہ کر سکے اور گر پڑے، تو تم دونوں کو سارے کپڑے اُتار کر بستی سے نکلنا پڑے گا۔ تاکہ اس کے بعد تم کسی پٹھان کے گھوڑے خریدنے کی بات نہ کرو۔ تمہاری ہر چیز زورک خان کی ملکیت ہوگی۔''

''منظور ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''سن لیا تم لوگوں نے۔ زورک خان پھر کسی کی بات نہیں مانے گا، شرط ہو چکی ہے۔ آؤ!'' زورک خان نے ایک گھوڑے کی لگام پکڑی اور پھر اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے لگام طالوت کے ہاتھ میں دے دی۔ یہاں اس قسم کے تماشے شاید عام ہوتے تھے، اس لئے لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے اور انہوں نے میدان چھوڑ دیا۔

گھوڑے کے تیور بہت خراب تھے۔ اس کی آنکھیں وحشت سے سرخ ہو گئی تھیں۔ شاید زورک خان نے ابھی تک ان کی پشت استعمال ہی نہیں کی تھی اور صورتِ حال یہ تھی کہ اگر ان کی پشت پر ہاتھ بھی رکھا جاتا تو وہ بھڑک اُٹھتے تھے۔ لیکن میں پُرسکون نگاہوں سے طالوت کو دیکھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

طالوت نے گھوڑے کی لگامیں پکڑ لی تھیں۔ گھوڑا چوکنا تھا اور پینترے بدل رہا تھا۔ اگر اس کی پشت پر مکھی بھی بیٹھ جاتی تو وہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر اگلے پاؤں خلا میں چلا کر طالوت کو مارنا ہی چاہتا تھا، لیکن طالوت نے ابھی تک اس کی پشت کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زورک خان فخریہ انداز میں گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

اور یہ بات صرف میں نے ہی محسوس کی تھی کہ لگاموں کے سرے کے بل طالوت کے ہاتھ پر لپٹتے جا رہے تھے۔ اس طرح وہ اپنا ہاتھ گھوڑے کے چہرے تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ دلچسپی سے بقول ان کے اس شہری جھینگے کی اُچھل کود دیکھ رہے تھے، جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ کپڑے اُتروا کر ہی جائے گا۔

لیکن...... اچانک بجلی سی چمک گئی۔ طالوت کا ہاتھ جو اب گھوڑے کے چہرے تک پہنچ چکا تھا، اچانک مُڑا اور گھوڑے کی گردن ٹیڑھی ہو گئی۔ گھوڑے نے گردن سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن اس لاہوتی قوت کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس کی گردن اس حد تک مُڑ گئی کہ اچانک وہ ایک سمت لڑھک گیا اور کافی زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی طالوت نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑے نے سنبھل کر اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اب وہ گرے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔
اور جب گھوڑے نے پھرتی سے کروٹ لی اور پاؤں ٹکا کر اُٹھا تو طالوت اُس کی پشت پر تھا۔

تماشائیوں کے منہ سے صرف ایک آواز نکلی اور وہ خاموش ہو گئے۔ گھوڑا بلا کی اُچھل کود مچا رہا تھا۔ لیکن طالوت اُس کی پشت پر اس طرح سوار تھا، جیسے اس کی پشت ہی کا ایک حصہ ہو۔ اور پھر بالآخر گھوڑے نے ہار مان لی۔ اُس کی اُچھل کود سست پڑ گئی تھی۔ طالوت اس کے کس بل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور میدان کے چکر لگانے لگا۔

دوسرے لمحے چاروں طرف سے تالیاں گونج اُٹھیں۔ لوگ نعرہ ہائے تحسین بلند کر رہے تھے اور زورک خان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ طالوت اس کے سامنے گھوڑا لے آیا اور پھر اس کی پشت سے نیچے اُتر آیا۔

لیکن زورک خان ہماری توقع کے برخلاف بہت اعلیٰ ظرف نکلا۔ اس نے طالوت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''خوش رہو جوان! خان کی طرف سے شرط جیتنے پر مبارک باد قبول کرو۔'' اور ہم حیران رہ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ غصہ ور انسان گڑبڑ ضرور کرے گا۔ ممکن ہے، حالات بگڑ جائیں اور جھگڑا مول لینا پڑے۔ لیکن وہ باظرف انسان تھا۔ اس نے فن کی داد دی تھی۔ طالوت گھوڑے سے اُتر کر آیا اور پیار سے زورک خان کو دیکھ رہا تھا۔

زورک خان نے دوسرے گھوڑے کی لگام بھی طالوت کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''شکریہ خان زورک! یہ تو مذاق کی بات تھی، ویسے میں تمہارے گھوڑے خریدنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بہت پسند ہیں، ان کی قیمت لے لو۔''

''چہ، خدا کا کسم، کیا بولتا ہے یار! ہم شرط ہار گیا۔ گھوڑا اب تمہارا ہے، بیچنے کا کیا سوال؟'' خان نے کہا۔

''نہیں خان! ہم گھوڑوں کی قیمت ادا کریں گے۔''

''خان اس قیمت پر پیشاب کر دے گا جو اس کا زبان خراب کرے گا۔ گھوڑا اب تمہارا ہے۔'' خان آنکھیں نکال کر بولا۔ بہرحال، طالوت نے بہت کوشش کی، لیکن خان نے گھوڑوں کی قیمت ایک پیسہ بھی وصول نہیں کی۔ مجبور ہو کر ہم گھوڑے لے کر چل پڑے۔

''عجیب ہے تیری دنیا یار! یہاں کس شکل میں کون ہے، پتہ نہیں چلتا۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ گھوڑوں کے دماغ درست ہو گئے تھے۔ ہم نے ان پر سامان کے تھیلے مضبوطی سے کسے اور اب ہم سفر کے لئے تیار تھے۔ لیکن طے یہ کیا گیا تھا کہ ہم علی الصبح سفر کریں گے، اس لئے رات کے قیام کا بندوبست کرنا تھا۔

اس کے لئے ہم نے ایک کھلی جگہ منتخب کی اور وہیں بستر لگا دیا۔ بستر کے لئے ہم نے نرم کھالیں خرید لی تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور طالوت کافی دیر تک زورک خان اور قہوہ خانے کے مالک کے بارے میں گفتگو کرتا رہا وہ اس دلکش علاقے کے بارے میں بھی باتیں کر رہا تھا۔

اور پھر ہمیں نیند آ گئی۔ صبح کو پہلے طالوت ہی جاگا تھا۔ ابھی اُجالا پوری طرح نہیں پھوٹا تھا۔ بہت خوب صورت منظر تھا۔ میں بھی جاگ گیا۔

''اُٹھو...... تیاریاں کریں...... روشنی ہونے سے قبل ہمیں یہ سرحد پار کر لینی ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں اُٹھ گیا۔ ہم ضروریات سے فارغ ہو گئے۔ ناشتے کے بارے میں طے کیا گیا کہ راستے میں کریں گے۔ چنانچہ ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑے۔ قد آور گھوڑے اب بالکل رام ہو گئے تھے اور ذرا بھی شرارت نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے سست روی سے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور پہاڑوں کے درمیان سفر کرنے لگے۔

ناہموار پتھروں پر گھوڑے زیادہ تیز نہیں چل سکتے تھے۔ ہمیں بھی کسی مخصوص جگہ پہنچنے کی جلدی نہیں تھی، اس لئے ہم اطمینان سے آگے بڑھتے رہے۔ ناہموار پتھروں سے ڈھکا ہوا ٹکڑا زیادہ طویل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہموار لیکن چٹیل راستہ آ گیا۔ ہمارے دونوں سمت بلند و بالا پہاڑ تھے اور ہم ان کے درمیان چل رہے تھے۔ یہ راستہ آگے چل کر پتلا ہوتا گیا تھا۔ یہاں تک کہ آگے چل کر دونوں پہاڑ مل گئے

تھے اور راستے نے ان کے نیچے ایک سرنگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ سرنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ دوسری طرف روشنی نظر آ رہی تھی۔

لیکن ہم نے جونہی سرنگ سے سر نکالا، اچانک ایک فائر کی آواز پہاڑوں میں گونج اُٹھی۔

''بسم اللہ......'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم دونوں نے پھرتی سے اپنے اپنے پستول نکال لئے۔ ہم نے گھوڑے آڑ میں کر لئے تھے اور تیز نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

اور پھر سامنے کی پہاڑی سے ہم نے ایک سفید رنگ کے گھوڑے کو نیچے اُترتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پشت پر کوئی سوار تھا۔ لیکن جب وہ ہمارے سامنے آیا تو ہم چونک پڑے اور حیرانی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ یہ قہوہ خانے کا بوڑھا مالک تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ چند ساعت کے بعد وہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی رائفل ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔

''تو تم نے میری بات نہیں مانی۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہم نے اسی وقت کہہ دیا تھا خان!'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔

''مگر......مگر......اس طرف موت ہے۔'' بوڑھے نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہم موت کا شکار کرتے ہیں۔ ہم موت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔''

''جوانی منہ زور ہوتی ہے۔ لیکن میرے بوڑھے تجربے سے فائدہ اُٹھاؤ لڑکو! اس طرف نہ جاؤ۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔''

''ہم عہد کر چکے ہیں خان! کہ تمہارے بیٹے کے قاتلوں سے بدلہ ضرور لیں گے اور عہد، توڑنے کے لئے نہیں ہوتے۔''

''لیکن تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ تم میرے لئے اجنبی ہو۔''

''انسانیت کا رشتہ سب سے بڑا ہوتا ہے خان! تم نے بے بسی سے کہا تھا کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو اور اپنے بیٹے کا انتقام نہیں لے سکتے۔ ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہم تمہارے بیٹوں کی جگہ ہیں اور ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے۔ بس، اس کے بعد تم کچھ بھی کہتے، ہم اپنا عہد ضرور پورا کریں گے۔''

''تم کیسے بیٹے ہو؟ ...... بوڑھے بابا کی بات نہیں مانتے۔'' خان نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ وہ بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

''اس کے علاوہ ہم تمہاری ہر بات مان لیں گے خان! ہمیں ہمارا عہد پورا کرنے دو۔''

''دشمن بہت خونخوار ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔''

''دشمن اگر خونخوار نہ ہو تو اس سے مقابلہ کرنے میں کیا لطف آئے گا خان!'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور بوڑھا خان بے بسی سے ہمیں گھورنے لگا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اور پھر اچانک بوڑھے کے چہرے سے خون اُبلنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور پھر اس نے رائفل بلند کی اور پاگلوں کی طرح دھاڑا۔

''میں آ رہا ہوں، سرتاج خان! میں آ رہا ہوں۔ بوڑھے شہباز کی رگوں کا خون پھر سے جوان ہو گیا ہے۔ ہوشیار سرتاج خان! ہوشیار...... مظلوم رحمان کا خون آج پھر جاگ اُٹھا ہے۔ میں اپنی بہو کو لے کر آؤں گا۔ درزانہ میری عزت ہے...... درزانہ میری عزت ہے...... میری عزت میرے گھر میں ہی

کملا رہے گی۔"
اور بلاشبہ ہم نے بوڑھے خان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ توانائی دیکھی۔ اس کے اندر ایک عجیب
ا ہوش پیدا ہو گیا تھا۔ پھر وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔
"آؤ میرے بچو!...... آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم نے شہباز کو پھر سے جوان کر دیا ہے......
اا، میرا چوڑا سینہ بیٹے کے سر کا لمس بھول چکا ہے۔ آؤ، میرے سینے پر سر رکھ دو، تا کہ رحمان کی یاد کے زخم
A سے ہرے ہو جائیں۔ اور میں اپنے دشمنوں کے لئے زیادہ خطرناک ہو جاؤں۔ آؤ میرے بچو!"
اور ہم دونوں گھوڑوں سے اُتر آئے۔ بوڑھے خان نے ہم دونوں کو سینے سے بھینچ لیا اور پھر کوشش
لے باوجود وہ اپنی سسکیاں نہ روک سکا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ بمشکل تمام ہم نے اُسے سہارا
ا،ا اور ایک چٹان کے پاس لے آئے۔ ہم نے اپنے گھوڑے یونہی چھوڑ دیئے تھے۔ چٹان کے پاس بیٹھ
ر بھی بوڑھا روتا رہا۔
"پورے آٹھ سال گزر گئے صاب! ہمارے بیٹے کی موت کو۔ رحمان خان ہمارا اکیلا بیٹا تھا...... اس
لے بعد ہم...... اولاد کو ترس گیا۔ ہم آج آخری بار رویا ہے۔ خدا کسم، اس کے بعد ہماری آنکھوں سے
السو نہیں، آگ نکلے گا، آگ۔ اور اس آگ میں سرتاج خان کی پوری بستی جل جائے گی۔ تم دیکھنا، یہ
شہباز خان کا عہد ہے۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔
"ہم تمہارے ساتھ ہیں شہباز خان!"
"خدا تم لوگوں کو زندگی دے۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"تم ادھر کیسے نکل آئے تھے خان بابا؟" طالوت نے پوچھا۔
"چہ، تم لوگوں کو بھول جاتا۔ تم نے ایسا بات بولا تھا کہ ہمارے دل پر زخم لگ گیا تھا ہم نے اسی
الت دکان چھوڑ دیا اور پھر تمہارا پیچھا کرتا رہا۔ ہم اس وقت بھی تمہیں دیکھ رہا تھا، جب تم نے زورک خان
لے گھوڑے کو قابو میں کیا۔ خدا کا قسم، ہم تم سے دُور تھا۔ مگر ہم نے خوب زور زور سے تالیاں بجایا تھا۔ تم
لوگ جو تیاریاں کر رہا تھا، اس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ تم غیر علاقے میں ضرور جائے گا۔ مگر ہم سوچتا تھا
کہ تم شہر کا لوگ کمزور ہوتا ہے۔ تم ادھر آزاد نہیں رہ سکے گا۔ پھر جب تم نے گھوڑے کو گرا لیا تو خدا کا قسم،
ہم منہ کھول کر رہ گیا۔ اور پھر ہم نے سوچا، تم معمولی لوگ نہیں ہے۔ پھر ہم اپنا بی بی کے پاس آیا اور اس کو
ب بات بولا تو اس نیک بخت نے ہم کو غیرت دلایا۔ وہ بولا، تم لوگ رحمان خان کا بدلہ لینے جا رہے ہو
اور ہم گھر میں بیٹھا ہے۔ تب ہم نے طے کیا کہ اگر تم ادھر جائے گا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔ ہم نے
جلدی جلدی سارا انتظام کیا اور پھر ہم ادھر پہنچ کر تمہارا انتظار کرنے لگا۔
"ہوں......" طالوت نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "خان شہباز کا ساتھ
ہمارے لئے اور دلچسپ ہوگا۔ کیا خیال ہے؟"
"یقیناً" میں نے بادل نخواستہ کہا۔
"تم نے ناشتہ کر لیا خان؟"
"ابھی نہیں۔" شہباز نے سادگی سے جواب دیا۔
"تو آؤ ناشتہ کریں۔" طالوت بولا۔ خان جلدی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس وقت

کا ناشتہ ہم نے خان کے ساتھ لائے سامان میں سے کیا۔ وہ پنیر اور روٹی لایا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے سفر کی تیاریاں کیں اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی۔ ہم اطمینان سے چل رہے تھے۔

''آپ لوگ نے اپنے نام نہیں بتائے؟''

''آپ جو نام لیں شہباز خان!'' طالوت نے کہا۔

''چہ اگر تم خان کے لباس میں ہوتا تو ہم تمہیں دلیر خان اور اور اس کو دلاور خان بولتا۔'' شہباز خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بات ہے خان! تو ابھی لو۔'' طالوت نے کہا اور گھوڑے سے اُتر پڑا۔ شہباز خان نے بھی گھوڑا روک لیا تھا۔ طالوت نے تھیلے سے مقامی لباس نکالا اور مجھے بھی اشارہ کیا۔ بدمعاش طالوت سرحدی لباس پہننے کے بعد بالکل پٹھان نظر آ رہا تھا۔ خود میں نے بھی یہی لباس پہن لیا۔

خان ہمیں اپنے لباس میں دیکھ کر کھل اٹھا۔ ''چہ، خدایا! تم لوگ بالکل پٹھان لگ رہا ہے۔'' اس لے مسرور انداز میں کہا۔

''اب میرا نام دلیر خان...... اور ان کا نام دلاور خان ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم یہی نام لے گا۔'' خان شہباز نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پورا دن ہم نے گھوڑوں کی پشت پر گزارا۔ راستے میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ راستے کے مناظر بدلتے رہے تھے۔ کبھی خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑیاں نظر آتیں، کبھی سبزے سے لدے ہوئے میدان اور کبھی برف پوش علاقے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اس وقت ہم ایک بلند و بالا برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کے دامن میں تھے۔ وہیں ایک مناسب جگہ تلاش کر کے رات کے قیام کا بندوبست کیا گیا اور پھر رات کے کھانے کا بندوبست کیا جانے لگا۔ کھانے کے بعد ایک تھرماس سے شہباز خان نے قہوہ نکالا اور قہوہ پیتے ہوئے طالوت نے شہباز خان سے پوچھا۔

''کیا تم ہمیں رحمان خان کی موت کی تفصیل نہیں بتاؤ گے شہباز خان؟''

''ہاں، ضرور بتاؤں گا۔ اور سمجھ لو میرے بچو! بوڑھا خان جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ جو کچھ کہے گا، سچ کہے گا۔''

''یقیناً...... ہمیں اعتماد ہے۔''

''رحمان خان کا عمر بائیس سال تھا۔ پہلے ہم لوگ بھی تاسیہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ یہ خوبصورت بستی اسی راستے پر ہے، جدھر ہم جا رہے ہیں۔ تاسیہ سے آگے چھ بستیاں اور پڑتی ہیں جو آزاد علاقے میں ہیں۔ آخری بستی کے دوسری طرف زورات ہے۔ خان زورات ایک نیک دل انسان ہے۔ گو یہ علاقہ اس کی ملکیت نہیں ہے، نہ ہی کبھی اس نے اس پر بری نگاہ ڈالی۔ اس کے باوجود وہ اس علاقے کے مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ کبھی یہ بستیاں قحط سالی کا شکار ہو جاتی ہیں یا زلزلے سے تباہ کاری ہوتی ہے تو خان زورات ہماری پوری پوری مدد کرتا ہے۔ اب کی بات نہیں معلوم۔ پہلے یہی ہوتا تھا۔ تاسیہ میں میری تھوڑی سی زمین تھی، جس پر کاشت کر کے میں اپنی بیوی اور بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ میرے دو بھائی بھی تھے، وہ بھی اسی بستی میں رہتے تھے۔ لیکن پھر تباہی نے ہمارے گھر میں جھانکا۔ تاسیہ ہی کے علاقے کا ایک بڑا آدمی دولت خان تھا۔ بڑا کینہ پرور اور خطرناک آدمی۔ اس کے پاس بہت بڑی زمین تھی اور اس کے

مویشی پورے علاقے میں سب سے زیادہ تھے۔اس کی چراگاہ بھی سب سے بڑی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ چور بھی تھا۔رات کی تاریکی میں اُس کے آدمی غلّہ چرانے آجاتے تھے۔

اور ایک رات اس کے دو آدمی میرے بھائی گلدار خان کے گھر چوری کرنے آئے۔گلدار خان کو معلوم نہیں تھا کہ ان چوروں میں دولت خان کا سگا بھائی بھی ہے۔گلدار خان کی رائفل نے دونوں چوروں کو موت کی نیند سلا دیا۔اور پھر دن کی روشنی میں پتہ چلا کہ دولت خان کا بھائی بھی چوروں میں شامل تھا۔

دولت خان اپنے آدمیوں کو لے کر گلدار خان پر چڑھ آیا۔لیکن جرگے نے فیصلہ دیا کہ چونکہ گلدار خان نے انہیں چوری کرتے ہوئے ہلاک کیا تھا، اس لئے گلدار خان بے قصور ہے۔دولت خان چلا گیا، لیکن اس کے دل میں بدلے کا خیال تھا۔ چنانچہ ایک شام جب گلدار خان اپنے مویشیوں کو لا رہا تھا، دولت خان کے آدمیوں نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔جرگے نے اسے طلب کیا، لیکن وہ صاف مُکر گیا کہ اس کے آدمیوں نے قتل نہیں کیا۔

جرگہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا، لیکن میرا چھوٹا بھائی، زمرد خان جانتا تھا کہ گلدار کو دولت خان کے آدمیوں نے مارا ہے اور وہ دولت خان کی تاک میں رہا۔آخر ایک دن اس نے دولت خان کو اس کی چراگاہ میں للکارا۔لیکن بدقسمت انسان، دولت خان کو ہلاک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔دولت خان نے اُس کی لاش بھجوا دی تھی اور بتایا تھا کہ وہ کس طرح مارا گیا۔

میں شروع سے امن پسند آدمی تھا، لیکن دوسرے بھائی کی موت پر میرا خون کھول اُٹھا۔میں نے دولت خان سے کہا کہ میں اس سے اپنے بھائیوں کا انتقام لوں گا، لیکن دولت خان نے مقدمہ جرگے کے سامنے رکھ دیا۔اس نے کہا کہ اسے مجھ سے خطرہ ہے، اس لئے اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔اور جرگے کے بوڑھے ارکان نے فیصلہ کیا کہ مجھے بستی سے نکال دیا جائے۔انہوں نے میری منت کی کہ امن کی خاطر میں بستی چھوڑ دوں اور مجھے بستی چھوڑنی پڑی اور میں یہاں چلا آیا۔رحمان خان اس وقت آٹھ سال کا تھا اور بہت سمجھ دار تھا۔پورے دس سال تک ہم نے تاسیہ کا رُخ نہیں کیا۔لیکن رحمان خان اپنی بستی اور اس کے بچوں کو نہیں بھولا تھا۔جب وہ اٹھارہ سال کا تھا تو اس نے تاسیہ جانے کی اجازت مانگی۔میں نے اسے بہت منع کیا، لیکن ضدی لڑکا ایک دن چھپ کر ادھر نکل گیا۔وہ تاسیہ پہنچا اور وہاں اپنے رشتے داروں سے ملا۔

دشمنی ختم ہو چکی تھی، کیونکہ میرے بھائیوں کے بچوں میں کوئی لڑکا نہیں تھا، جو انتقام لیتا۔وہ آرام سے رہ رہے تھے۔لیکن بدقسمت رحمان خان، تاسیہ کی ایک لڑکی سے دل لگا بیٹھا۔اور پھر وہ چھپ چھپ کر تاسیہ جانے لگا۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی دولت خان کی تھی۔اور وہ بھی رحمان خان سے محبت کرتی تھی۔لیکن دولت خان کے بیٹے کو یہ بات معلوم ہو گئی۔اس کا نام سرتاج خان تھا۔اور ایک دن اس نے رحمان خان کو گولی مار دی۔

دولت خان نے میری آخری پونجی بھی چھین لی۔میرے رشتے داروں نے رحمان خان کے خون آلود کپڑے میرے پاس بھجوا دیئے اور میں پاگل ہو گیا۔مجھ بوڑھے کے بدن میں اب اتنی قوت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے بچے کا بدلہ لیتا۔اور اس کے بعد میں نے صبر کر لیا۔" بوڑھے شہباز خان کی آنکھوں سے آنسو

بہنے لگے۔ طالوت اور میں بہت متاثر تھے۔ پھر کافی دیر کے بعد طالوت نے پوچھا۔
''کیا تم اپنے بیٹے کی قبر پر بھی نہیں گئے؟''
''میری بی بی نے نہیں جانے دیا۔ وہ بہت ڈرتی تھی۔''
''تمہارے پاس رحمان کی لاش کیوں نہیں آئی؟''
''میرے رشتے داروں نے بتایا تھا کہ رحمان خان کی لاش بالکل خراب ہو چکی تھی۔ وہ ایک ویرانے میں پڑا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ اس کی لاش میرے پاس لائی جاتی۔ چنانچہ انہوں نے اسے دفن کر دیا اور میرے پاس صرف کپڑے بھیج دیئے۔''
''غم نہ کرو خان بابا! ہم ان سب کا انتقام لیں گے۔'' طالوت نے کہا۔
''میں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا میرے بچو! مگر آج میں اُٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں امن پسند تھا۔ لیکن آج......اب......اب میں ایک ایک کا انتقام لوں گا۔''
''ہم تمہارے ساتھ ہیں بابا!''
''تم میرے محسن ہو۔ میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ اگر تم مجھے نہ جگاتے تو......تو شاید میں اپنے بیٹے کے بدلے کی حسرت لے کر قبر میں جاتا۔ لیکن......لیکن اب......اگر میں بھی دولت خان کے ہاتھوں مارا گیا تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔ میں اپنی کوشش میں جان دوں گا۔''
''دولت خان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا شہباز خان! تم اکیلے نہیں ہو۔'' طالوت نے کہا۔ میں عموماً خاموش ہی رہتا تھا۔ بہر حال میں اس پروگرام سے بھی ناخوش نہیں تھا۔ زندگی کو ہنگاموں کی ضرورت ہوتی ہے اور طالوت کی معیت ہنگاموں سے پُر تھی۔
''دولت خان کا علاقہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟''
''ابھی لمبا سفر ہے۔ لیکن پروا نہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے کہا۔ اور پھر ہم سونے لیٹ گئے۔ اس ویران علاقے میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سردی بھی خاصی تھی، لیکن سردی سے بچاؤ کے انتظامات بھی پورے تھے، اس لئے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔۔ میں نے دیکھا، طالوت مزے سے سو رہا ہے۔ البتہ شہباز خان جاگ رہا تھا۔
''شہباز بابا!'' میں نے اسے آواز دی۔
''جاگ رہے ہو دلاور؟''
''ہاں بابا! نیند نہیں آ رہی۔''
''آؤ، باتیں کریں۔'' بوڑھے نے کہا اور میں اُٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ ''وہ تمہارا بھائی ہے؟''
''سگا بھائی نہیں۔ لیکن بھائیوں سے زیادہ ہے۔''
''چچا کا لڑکا ہے؟''
''نہیں۔''
''مگر اس کا شکل......وہ بالکل تمہارے جیسا ہے۔''
''یہی چیز ہماری دوستی کا باعث بنی ہے۔''
''اوہ......!'' بوڑھے نے گردن ہلائی، پھر بولا۔ ''بہر حال تمہارے بدن میں دلیر ماں کا خون ہے۔

مگر سنو، تم نے بندوق ادھر سے خریدا ہے؟''

''ہاں!''

''اس سے پہلے تمہارے پاس ہتھیار نہیں تھے؟''

''نہیں۔''

''کیا تم لوگوں کا نشانہ اچھا ہے؟''

''بس ٹھیک ہے۔''

''نہیں میرے بچے! پہاڑوں میں زندگی گزارنے والے بندوق کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ ہمارے علاقے کا بچہ بچہ سچے نشانے لگاتا ہے۔ اگر تمہارا نشانہ اچھا نہیں ہے تو تمہیں اس کی مشق کرنی چاہئے۔''

''مشق کر لیں گے بابا!''

''کل صبح، پہلا کام یہی ہوگا۔''

''آپ کا نشانہ تو بہت اچھا ہوگا، بابا؟''

''ہاں...... میں بھی اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔'' بوڑھا ہنسنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم آپ سے کچھ سیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا اور بوڑھا پُرتفکر انداز میں گردن ہلانے لگا، پھر بولا۔

''یہاں سے دس بارہ میل دُور لالہ زار ہے۔ یہ شیکو خان کی بستی ہے۔ شیکو خان، دولت خان کا آدمی ہے۔ ہمیں اس بستی سے ہٹ کر گزرنا ہوگا۔ ہم پہاڑوں کے پیچھے کا راستہ اختیار کریں گے، تاکہ دولت خان پر اچانک جا پڑیں۔''

''ٹھیک ہے بابا!'' اور پھر کافی دیر تک ہم لوگ گفتگو کرتے رہے۔ پھر مجھے نیند آنے لگی اور میں اُٹھ کر اپنی جگہ آ لیٹا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح آنکھ کھل گئی۔ شہباز خان جاگ اُٹھا تھا۔ طالوت ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا، شہباز خان محبت بھری نظروں سے طالوت کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا، پھر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''تمہارا دوست بے حد نڈر ہے۔ ان اجنبی پہاڑوں میں اتنے آرام کی نیند سونا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ہاں...... وہ بے حد نڈر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ہم لوگ ضروریات سے فارغ ہونے لگے۔ پھر طالوت بھی اُٹھ گیا اور پھر ہم تینوں نے ناشتہ کیا، پھر ایک فکرمند بزرگ کی طرح شہباز خان نے کہا۔

''میں نے تمہارے دوست سے رات کو تمہارے نشانے کی بات کی تھی۔ کیا تم لوگ مجھے اپنا نشانہ دکھاؤ گے؟''

''ضرور خان بابا!'' طالوت نے کہا اور ہم اپنی رائفلیں لے کر ایک مناسب جگہ چل پڑے۔

''پہلے ہم آپ کا نشانہ دیکھیں گے، خان بابا!'' طالوت نے کہا۔

''ہاں، ہاں...... ضرور۔ مگر اب ہم بوڑھا ہو چکا ہے۔''

پھر بہت دُور ایک اونچی جگہ کچھ نشان بنائے گئے اور بوڑھے خان نے ان پر کامیاب نشانے لگائے۔ بلاشبہ اس عمر میں بھی اس کا نشانہ قابلِ داد تھا۔ میں نے اور طالوت نے دل کھول کر تعریف کی۔

تب طالوت کے اشارے پر میں نے رائفل سنبھال لی۔
بلاشبہ نشانے بازی کے بارے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور اس نے آنکھ مار دی۔ پھر اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ یکے بعد دیگرے چھوٹے پتھر فضا میں اُچھالے اور مختلف سمتوں میں اُچھالے اور بوڑھا ہنسنے لگا۔ میرے حواس گم ہو رہے تھے۔ لیکن صاحب! طالوت، طالوت ہے۔ بوڑھے خان نے مختلف سمتوں میں پتھر اُچھالے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حشمت برادرز کے کلرک کے خاندان میں کسی نے بندوقیں نہیں چلائی تھیں۔ بخدا ان نشانوں سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس کو میں کیا کرتا کہ میری تکے بازی نے تینوں پتھروں کے پرخچے اُڑا دیئے تھے اور بوڑھا خان منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری بھی ہمت بڑھ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کسی طرف بھی گولی چلا دوں، لگے گی نشانے پر ہی۔ اور وہی ہوا۔ بوڑھا حیرت سے گنگ ہو گیا تھا۔ اور پھر جب میں نے رائفل رکھی تو اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

”خدا کا قسم......ایسا نشانہ اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ ہمارا تو مغز خراب ہو گیا......سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ یہ نشانہ بازی کیسا ہے۔“

بہر حال، اس کے بعد طالوت نے اپنی نشانہ بازی دکھائی اور اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ طالوت کی نشانہ بازی تھی۔ بوڑھے خان کا دماغ خراب ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ......تم لوگ اس دنیا کے انسان نہیں معلوم ہوتے۔ اور تمہارے ساتھ آنے کے بعد....... اب ہمیں بھی یقین ہونے لگا ہے کہ ہم اپنا پرانا آرزو پورا کر سکے گا۔“

ہم دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”آؤ چلیں، ہماری دوسری منزل کچی سرائے ہوگی، جہاں سے ہمارے دشمنوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ کچی سرائے اگر گلباغ خان ہی کی ملکیت ہے تو پھر دولت خان کو ہمارے آنے کی خبر مل جائے گی۔“ شہباز خان نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا اور ہم دونوں نے بھی اپنے گھوڑے سنبھال لئے۔

اور پھر ایک سمت کا تعین کر کے ہم چل پڑے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان تین آدمیوں کا یہ سفر بہت دلچسپ لگ رہا تھا اور پھر آنے والے لمحات کا تصور......نہ جانے کون کون سے ہنگاموں سے نمٹنا پڑے۔

”تم نے کہا تھا، خان بابا! کہ آزاد علاقے میں زبردست خطرہ ہے۔ ابھی تک تو ایک بھی فرد سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ راستے میں طالوت نے کہا۔

”اس دھوکے میں مت رہو برادر! جس علاقے سے ہم گزر رہے ہیں، اس علاقے کے جرگے کے سردار کو ہمارے بارے میں اطلاع ضرور مل گئی ہوگی۔“ خان نے کہا۔

”ارے......وہ کیسے؟“

”پہاڑوں میں چھپی ہوئی بہت سی آنکھوں نے ہمیں دیکھا ہوگا اور جرگے کو اطلاع دی ہوگی۔“

”لیکن ہمیں تو کوئی نہیں نظر آیا۔“

”خاموشی سے گزرنے کی اجازت دے دی گئی ہوگی۔ ورنہ اتنی آسانی نہیں ہوتی۔“ بوڑھے خان نے بتایا اور ہم خاموش ہو گئے۔ ممکن ہے، بوڑھے خان کا بیان درست ہو۔ ممکن ہے، ان پہاڑی راستوں

کی ایسی ہی نگرانی ہوتی ہو۔

بہر حال، طویل سفر طے ہوتا رہا۔ موسم بھی بے حد خوشگوار تھا۔ گرمی کا نام ونشان نہیں تھا۔ تیز رفتار گھوڑے بھی خوش وخرم تھے اور آسانی سے سفر کر رہے تھے۔ بعض جگہ دشوار راستے آجاتے، لیکن گھوڑے بھی مقامی تھے اور ان راستوں کے عادی۔ اس لئے انہیں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اچانک سورج ہمارے سروں سے غائب ہو گیا اور بادلوں کی دُھند چھا گئی۔ موسم اور رنگین ہو گیا تھا، لیکن بوڑھے خان نے کئی بار گردن اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ بادل گھیرے ہوتے جا رہے تھے۔

''کیا ان پہاڑوں کی بارش خطرناک ہوتی ہے خان بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''بارش نہیں، برف باری کہو۔'' شہباز خان نے کہا۔

''اوہ......تو کیا برف باری کے آثار ہیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہاں......ان علاقوں میں اچانک اور غیر متوقع طور پر برف باری شروع ہو جاتی ہے اور پھر کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے۔ نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ تم جن راستوں سے گزر کر دوسری جگہوں پر جاتے ہو، واپسی پر ان کا نام ونشان نہیں ہوتا۔''

''خوب۔'' طالوت نے پسندیدگی کے انداز میں گردن ہلائی۔ ''بہت خوب صورت علاقہ ہے۔''

درحقیقت ہم ایک حسین خطے میں سفر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کا حُسن نکھرا ہوا تھا۔ بادلوں کی بجلاہٹ میں ماحول بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ بادل گھیرے ہوتے گئے۔ شہباز خان کے اشارے پر گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی گئی تھی۔

پھر ایک ایسی پہاڑی آئی جس کے اوپری حصے پر ایک گول دائرے نما چٹان نظر آ رہی تھی، اس کے درمیان صاف کٹا ہوا سوراخ تھا۔ شاید یہ کسی قسم کا نشان تھا۔ گو کٹاؤ قدرتی ہی معلوم ہوتا تھا۔

تب بوڑھے شہباز خان نے کہا۔ ''اس پہاڑی کے دوسری طرف کچی سرائے ہے۔''

''کوئی بستی ہے؟''

''ہاں، چھوٹی سی بستی ہے، جسے زغن خان نے آباد کیا تھا اور پھر زغن خان کے بعد اس کا بیٹا اس کا مالک بن گیا۔ پھر اس کا پوتا گلباغ خان۔ جو مکار بھی ہے اور بے غیرت بھی۔ اس نے اپنی پھوپھی دولت خان کو دے دی اور دولت خان نے اس پر عنایات کی بارش کر دی۔ اور گلباغ خان خود بھی اس علاقے کا دا کہلانے لگا۔ کیونکہ اسے دولت خان کی مدد حاصل تھی۔''

''خوب۔ تو گلباغ خان ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟''

''یہ تو وقت بتائے گا۔'' شہباز نے کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔

دائرے والی پہاڑی کی لمبائی کافی تھی۔ ہم گھوم کر ہی اس کے دوسری طرف پہنچ سکے۔

دوسری طرف کا منظر ادھر سے بھی زیادہ خوشگوار تھا۔ یہاں لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے اور کھیتوں کے دوسری طرف کچے پکے مکان خوبصورت کھلونوں کے مانند بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد دو سو کے قریب ہو گی۔ بعض مکانات کی چمنیوں سے لرزتا ہوا سا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہم نے گھوڑے روک لئے۔ شہباز خان عجیب سی نگاہوں سے بستی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو خان بابا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر قسمت یہاں لے آئی ہے۔ لیکن سوچ رہا ہوں کہ اب میں کس قدر قلاش ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں رہا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی اولاد ہوتی ہے، جس کے پاس یہ دولت بھی نہ رہے، اسے زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ خدا نے مجھے ایک بیٹا دیا تھا۔ میں نے خود کو مطمئن کرنے کے لئے سوچا تھا کہ شیر کا بیٹا شیر ببر ہوتا ہے۔ لیکن لوگوں نے میرا شیر مجھ سے چھین لیا۔ اب میرے پاس انتقام کے سوا اور کیا رہ گیا ہے۔" بوڑھے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ تب طالوت نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور شہباز خان کے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہاری دنیا میں یہی خوبی ہے شہباز خان! کہ ہر ایک کا مسئلہ نیا ہوتا ہے۔ تم لوگ اسی لئے زندہ ہو کہ تمہارے درمیان یکسانیت نہیں ہے۔ ہر دل ایک نئے درد سے آشنا ہے۔ ہر آنکھ میں نئے آنسو ہیں۔ عجیب ہے تمہاری دنیا۔ عجیب ہے۔"

اور میں چونک پڑا۔ یہ یوسف عمران بول رہا تھا۔ طالوت اپنی شخصیت کے لبادے سے جھانک رہا تھا۔ شاید وہ جذباتی ہو گیا تھا، چنانچہ میں جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

اور وہ مجھے دیکھ کر سنبھل گیا۔ تب اس نے بوڑھے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "انتقام کی پیاسی آنکھوں میں آنسو نہیں، آگ ہوتی ہے خان بابا! تم کبھی بھی ہمیں اپنی اولاد نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن ہم نے تمہیں بابا کہا ہے۔ ہم قول نبھائیں گے۔"

"یہ میری آنکھوں کے آخری آنسو تھے میرے بچو! میں نے انہیں بھی گرا دیا۔ اب تم صرف ان آنکھوں کو شعلے برساتے ہوئے دیکھو گے، صرف شعلے۔ آؤ!" بوڑھے نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اور ہم نے بھی اپنے گھوڑے اس کے پیچھے دوڑا دیئے۔ شہباز خان نے کھیتوں کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ اس نے اپنا گھوڑا کھیتوں میں ڈال دیا اور ہم نے بھی مجبوراً اس کی تقلید کی۔ حالانکہ لہلہاتے ہوئے کھیت روندنے سے کوفت ہو رہی تھی۔

اور پھر اسی وقت برف باری شروع ہو گئی۔ برف کے ذرّات تیزی سے گرنے لگے۔ اس موسم نے طالوت کو بے حد متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اس نے گھوڑے کی رفتار سست کر دی۔ بوڑھا خان ہم سے بہت آگے نکل گیا تھا۔

"طالوت!" میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے آواز دی اور وہ میرے قریب آ گیا۔

"آؤ...... شہباز خان آگے نکل چکا ہے۔"

"یار! موسم بہت خوب صورت ہے۔" طالوت نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... لیکن حالات خوب صورت نہیں ہیں۔ ہم موسم سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔"

"خیر...... پھر سہی۔" طالوت نے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور ہم نے رفتار تیز کر دی۔ چند ساعت کے بعد ہم نے بوڑھے شہباز کو جا لیا۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔ برف باری شروع ہونے کی وجہ سے بستی کے لوگ گھروں میں جا گھسے تھے۔ صرف اِکا دُکا آدمی جلدی جلدی گھروں کی طرف جاتے نظر آ جاتے تھے۔

شہباز کا رُخ اس بڑی سی عمارت کی طرف تھا، جس پر ''قہوہ خانہ کچی سرائے'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سرائے کے باہر ایک چوڑا سائبان موجود تھا، جس میں گھوڑے باندھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اپنے گھوڑے اس سائبان کے نیچے لے گئے اور پھر شہباز خان گھوڑے سے نیچے اُتر گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو باندھا، ہم لوگ اس کی تقلید کر رہے تھے۔ بوڑھے خان نے اپنے کلاہ کے صافے سے داڑھی کو لپیٹ لیا۔ اس سے اس کا چہرہ کافی حد تک ڈھک گیا تھا۔

پھر اس نے زین کے ہولسٹر سے رائفل کھینچی۔ پستول کی پیٹی اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی رائفلیں بھی ساتھ لے لیں اور اس کے بعد ہم سرائے کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

ایک بہت بڑا ہال تھا، جس میں لکڑی کی بے ہنگم کرسیاں اور میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے گرد بے شمار خوش فکرے بیٹھے ہوئے قہوے سے شغل کر رہے تھے۔ تندرست و توانا۔ خوبصورت اور خطرناک چہرے والے۔ قہقہے اُبل رہے تھے۔ سب ایک دوسرے سے بے نیاز تھے۔ کھڑکیاں چاروں طرف سے کھول دی گئی تھیں اور ان سے باہر کی فضا صاف نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کے کسی شریر جھونکے کے ساتھ برف کی پھوار اندر بھی آ جاتی اور چہرے پر ننھی ننھی کنکریوں کی بارش ہو جاتی۔ اندر کا موسم بھی کافی خنک تھا اور اس کی خنکی میں قہوے کی خوشبو شامل ہو کر عجیب لطف دے رہی تھی۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی ایک دم خاموشی چھا گئی۔ لوگ ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے، لیکن شہباز خان سب سے بے نیاز کوئی خالی میز تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک میز منتخب کی اور اس کی طرف چل پڑا۔ ہم بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور پھر ایک کھڑکی کے نزدیک خالی میز پر ہم بیٹھ گئے۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد ہم نے چاروں سمت نگاہیں دوڑائیں۔ خاموشی ابھی تک طاری تھی۔

ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ ہی مسلح تھے۔ تقریباً سب ہی کی کمر سے پستول کی پیٹی لٹک رہی تھی۔ اور ان میں مختلف سائز کے پستول تھے۔ بہت سے لوگوں کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ گویا ہتھیار یہاں عام تھے۔ ہم نے اپنی رائفلیں اپنے قریب رکھ لیں۔ اسی وقت میں نے طالوت کی ہلکی سی آواز سنی۔ ''راسم......!'' اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن طالوت نے اتنے دھیمے لہجے میں کوئی بات کی کہ میں سن نہ سکا۔ بوڑھا شہباز خان ہال میں نگاہیں دوڑا رہا تھا اور ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اور پھر طالوت خاموش ہو گیا۔

میں نے اس سے اشارے سے پوچھا کہ وہ راسم کو کیا ہدایات دے رہا تھا۔ اور اُس نے لاپروائی سے گردن ہلا دی۔ بہر حال، میں مشکوک ہو گیا تھا۔ نہ جانے، طالوت نے راسم کو کیا ہدایات دی تھیں۔

''کیا بات ہے خان بابا! خاموش کیوں ہو؟'' چند منٹ کے بعد طالوت نے پوچھا اور بوڑھا چونک کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں دولت خان کے آدمیوں کو تلاش کر رہا ہوں۔''

''اوہ......ان میں کوئی ہے؟''

''نہ جانے کتنے ہوں گے۔ لیکن اس خنزیر، توریز کو میں پہچان رہا ہوں جو بوڑھا ہو چکا ہے لیکن آج بھی جوانوں کے سے انداز میں بیٹھا ہے۔'' شہباز خان نے کینہ توز نگاہوں سے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سا ہے؟''

''وہ، جس نے اپنی کلاہ کا طرّہ ایک فٹ اونچا کر رکھا ہے۔'' اور ہم نے ایک تندرست و توانا بوڑھے کو دیکھا، جس کے چوڑے چہرے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ بوڑھا شکل اور آنکھوں سے کافی خونخوار معلوم ہوتا تھا۔

''خوب.....تو پہلے اُسے مارو خان بابا!'' طالوت نے کہا۔

''نہیں......میں اس چھچھورے پر اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا جب تک وہ میرے مقابل نہ آئے۔ میں تو گلباغ خان سے معلوم کروں گا کہ میرے بیٹے کو کس طرح قتل کیا گیا۔''

''تو کیا وہ اس کے بارے میں جانتا ہوگا؟''

''اس کے علاوہ اور کون جانے گا؟'' شہباز خان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کیا وہ بھی ان لوگوں میں موجود ہے؟''

''نہیں......چور اندر ہوگا۔''

''ہوں......'' طالوت نے گردن ہلائی اور اسی وقت ایک بوڑھا بیرا ہمارے پاس آ گیا۔

''قہوہ پیتا ہے خان؟''

''لاؤ'' شہباز خان نے بھاری آواز میں کہا۔

''کون سی بستی سے آئے ہو؟ تمہاری شکلیں ہمارے لئے اجنبی ہیں۔'' بیرے نے کہا اور شہباز خان بھنویں اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا قہوے کے پیسوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے؟'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''اجنبی لوگوں کے بارے میں ہم ضرور معلوم کرتے ہیں۔'' بیرے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیوں......وہ چور دولت خان کسی سے خوف زدہ ہے کیا؟'' شہباز خان نے کہا اور بیرا چونک کر اسے گھورنے لگا۔ ''ہاں......ہاں میں جانتا ہوں، تم دولت خان کے کتے ہو۔ اُسی کے اشارے پر دُم ہلاتے ہو۔'' شہباز خان نے حقارت سے کہا۔

''یہ گلباغ خان کا حکم ہے۔''

''وہ بے غیرت بھی اب حکم دینے کے قابل ہو گیا۔ کیوں نہ ہو، اس نے دولت خان کو لڑکی پیش کی ہے۔''

بیرا آگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے مُڑا اور واپس چلا گیا۔ شہباز خان تیکھی نگاہوں سے اُسے گھور رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ''اب وہ چوہا بِل سے نکل آئے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور اپنے پستول کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ باہر برف اور زور سے پڑنے لگی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اب یہ سفید برف خون سے رنگین ہو جائے گی، ہنگامہ ضرور ہوگا۔

اور میرا خیال غلط نہ تھا۔ ہال کے ایک دروازے سے، جس میں بیرا داخل ہوا تھا، ایک میلے رنگ کا خوف ناک شکل والا آدمی باہر آیا۔ اس کے پیچھے دو مسلح جوان تھے اور بیرا اُس کے ساتھ تھا۔ باہر نکل کر اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور بیرے نے اُنگلی سے ہماری طرف اشارہ کیا۔

''عارف!'' طالوت نے مجھے پکارا۔

''ہوں۔''

''سنبھل جاؤ۔ کسی قسم کا خوف مت محسوس کرو۔'' میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ شہباز خان اسی طرح گردن اکڑائے بیٹھا تھا۔ پھر اس کے منہ سے غرّاہٹ نکلی۔

''آؤ چور......آؤ بے غیرت!''

گلباغ خان اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمارے سامنے پہنچ گیا۔ وہ خونخوار نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ ''کھڑے ہو جاؤ۔''

''او بے غیرت! تیری گردن آج بھی نہیں جھکی۔ آج بھی تجھے احساس نہیں ہوا کہ تُو نے اپنی پھوپھی دولت خان کو پیش کر کے اپنے باپ دادا کی غیرت مٹا دی ہے۔'' شہباز خان نے زور سے کہا۔

''کھڑے ہو جاؤ۔'' گلباغ خان گرجا۔ اس وقت ہال کے سارے لوگ ہماری طرف متوجہ تھے۔

''میں ایک بے غیرت کی بات نہیں مانتا۔'' شہباز خان نے کہا۔ اور دوسرے لمحے گلباغ خان نے پستول نکال لیا۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کی طرف رُخ کر کے بولا۔

''اسے کھڑا کرو۔''

''رک جاؤ......رک جاؤ۔'' طالوت نے ایک ہاتھ اُٹھا کر دونوں آدمیوں کو روکا جو بڑے وحشیانہ انداز میں آگے بڑھے تھے اور وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے اور یہ بات صرف میں نے محسوس کی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں رکے تھے، کوئی غیر مرئی قوت اُن پر مسلط ہو گئی تھی۔

''اسے کھڑا کرو۔'' گلباغ خان دونوں کی طرف دیکھ کر دھاڑا۔

''ہم ایسا نہیں کر سکتے خان!'' وہ دونوں بیک وقت بولے، اور ان کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ یہ جملے ان کی مرضی سے ان کے منہ سے نہیں نکلے۔

''کیوں؟'' گلباغ خان گرجا۔

''کیونکہ......کیونکہ......تم سچ مچ بے غیرت ہو۔'' وہ پھر اسی انداز میں بولے۔

''او خنزیر کے بچو!......او نمک حرامو!......تمہاری یہ جرأت۔ تم سے بعد میں نمٹوں گا۔ دیکھ لوں گا تمہیں بھی۔'' گلباغ خان نے ان میں سے ایک کے لات ماری اور وہ لڑھک گیا۔ دوسرے کے منہ پر اس نے پستول والا ہاتھ مارا تھا، اور اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔ وہ بھی گر پڑا تھا اور ان دونوں نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

تب شہباز خان کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجمع کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ''کچی سرائے کے جوانو! کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ گلباغ خان نے دولت خان کی محبت کیسے حاصل کی؟ اس نے اپنے باپ کی بہن دولت خان کو پیش کی تھی۔ کم عمر لڑکی بغیر نکاح کے دولت خان کے حرم میں داخل ہوئی تھی اور گلباغ خان اسی کی بدولت عزت دار بنا۔''

''او کتے!......کتے! میں تجھے فنا کر دوں گا۔'' گلباغ خان نے پستول کا رخ شہباز کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ شہباز خان پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ لیکن گلباغ کے پستول سے گولی ہی کہاں نکلی

تھی۔ نہ کوئی دھما کا ہوا تھا۔ شاید پستول خالی تھا۔
"تیرا پستول خالی ہو چکا ہے گلباغ! ایسے کھلونے غیرت داروں کے ہاتھوں میں اچھے لگتے ہیں۔ اب میں تجھے بتاؤں گا، میں کون ہوں۔" شہباز خان نے اپنا چہرہ کھول دیا۔
ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے تھے اور ہم نے اپنے پستول نکال لئے تھے۔ ہماری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ خاص طور سے ہم بوڑھے توریز پر نگاہ رکھ رہے تھے۔
"گلباغ خان تعجب سے شہباز کو دیکھنے لگا۔ اور پھر وہ اسے پہچان گیا اور اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ "شہباز خان!...... یہ تم ہو شہباز خان؟"
"ہاں...... یہ میں ہوں۔ تُو نے مجھے پہچان لیا۔"
"یہاں کیوں آئے ہو شہباز خان؟" گلباغ سنبھل کر بولا۔ ویسے وہ کسی حد تک نروس نظر آ رہا تھا۔ اوّل تو اس کے جوانوں نے جواب دے دیا تھا، اور اب بھی چوہوں کی طرح کونے میں کھڑے تھے۔ دوسرے اس کا پستول خالی تھا۔ نہ جانے کس طرح؟
"رحمان خان کے خون کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے گلباغ خان! میں اس کے قاتلوں سے انتقام لینے آیا ہوں۔"
"آٹھ سال بعد۔" گلباغ مسکرا کر بولا۔
"ہاں...... یہ آٹھ سال میں نے تیاریوں میں گزارے ہیں۔ اور اب وقت آیا ہے کہ میں دولت خان اور اس کے خاندان کو قبر میں پہنچا دوں۔"
"کیا پوری فوج ساتھ لائے ہو شہباز خان؟"
"بیٹے کا انتقام لینے آیا ہوں۔ میں خود پوری فوج ہوں۔"
"سن لو بھئی...... یہ شیروں کے شیر دولت خان، شیر ببر سرتاج خان سے بدلہ لینے آیا ہے۔ پورے آٹھ سال کے بعد شہباز خان کی رگوں میں خون نے جوش مارا ہے۔" گلباغ خان نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔
"لیکن اس بے وقوف سے پوچھو کہ یہ دولت خان کے پاس پہنچے گا کس طرح؟" اس بار دوسری آواز سنائی دی۔ اور یہ توریز کی آواز تھی۔ اس نے اپنی رائفل اٹھالی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔
"میں تجھے بھی پہچان گیا ہوں توریز کتے!...... فکر مت کر۔ میں تیرا بھی دماغ ٹھیک کروں گا۔ دولت خان کا ایک ایک آدمی میرے قہر کا نشانہ بنے گا۔"
"میں دولت خان کا غلام ہوں۔ پہلے تُو اُس کے غلاموں سے نمٹ لے، بوڑھے شہباز خان! اس کے بعد دولت خان کی بات کرنا۔" توریز آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھی اشارہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ پانچوں بھی آگے بڑھ آئے۔ اور پھر وہ ہمارے نزدیک پہنچ گئے۔
"پستول نیچے پھینک دے توریز! ورنہ میں تیری پیشانی میں سوراخ کر دوں گا۔" شہباز خان نے کہا اور توریز نے دانت کچکچا کر فائر کر دیا۔ لیکن اس کے پستول سے بھی ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی۔
اور میری سمجھ میں راسم کو آواز دینے کی وجہ آ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس وقت قہوہ خانے میں موجود

کسی بھی شخص کے پستول یا رائفل میں کارتوس نہ ہوں گے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تب توریز نے پستول پھینک دی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اس نے رائفل تان لی۔

''اس کے ہاتھ سے پستول چھین لو۔'' اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ اور اس کے بعد ایک دلچسپ منظر نظر آیا۔ توریز کے آدمیوں کے قدم اٹھے، لیکن پھر وہ ایک دائرے میں گھوم گئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹھمکنا شروع کر دیا۔ وہ رقص کرنے لگے تھے۔ توریز منہ پھاڑے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''اس کا پستول چھین لو، خنزیر کے بچو!'' وہ دھاڑا اور اس کے آدمیوں کے رقص کرنے کی رفتار تیز ہو گئی۔

''کچی سرائے کے جیالے اب پستول نہیں چلاتے، رقص کرتے ہیں۔'' شہباز خان نے کہا۔ ''تُو بھی رائفل پھینک دے توریز! اور ان میں شامل ہو جا۔ اب ان کا مصرف یہی ہے۔'' شہباز خان نے کہا۔

اور دوسرے لمحے توریز، رائفل لے کر شہباز خان پر ٹوٹ پڑا۔ رائفل کا پہلا وار میز پر پڑا اور رائفل ٹوٹ گئی۔ دوسرے لمحے شہباز خان کے پستول سے گولی نکلی اور توریز کی پیشانی میں داخل ہو گئی۔ گلباغ نے دوسری طرف چھلانگ لگائی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور گلباغ کی گردن پیچھے سے پکڑ لی۔ گلباغ نے پلٹ کر مجھ سے نمٹنے کی کوشش کی، لیکن میرے فولادی گھونسے نے اسے زمین چٹا دی اور میں نے گرے ہوئے گلباغ کی پشت پر پاؤں رکھ دیا۔

یہ سب کچھ بڑی پھرتی سے ہو گیا تھا۔ توریز کے ساتھی اب بھی ٹھمک ٹھمک رقص کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور آنکھیں فرطِ حیرت سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔

ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے تھے۔ ویسے وہ لوگ شاید اس جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے کیونکہ غیر متعلق تھے۔ ممکن ہے وہ گلباغ سے خوش بھی نہ ہوں۔

''تُو نے میری فوج دیکھ لی ہے گلباغ!...... اُٹھ، باہر نکل۔ مجھے تجھ سے بہت سے حساب چکانے ہیں۔'' شہباز خان نے کہا اور پھر اس نے ہال میں ایک رسّی تلاش کی اور گلباغ خان کی گردن میں پھندا بنا کر ڈال دیا۔

''کچی سرائے کے لوگو! اگر دولت خان اس کی تلاش میں آئے تو اسے بتا دینا کہ شہباز خان آیا تھا اور اسے رسّی سے باندھ کر لے گیا۔ اس سے کہہ دینا کہ وہ بہت جلد اس سے بھی ملے گا اور رحمان خان کے خون کا حساب چکائے گا۔ تیاریاں کر لے۔''

''لیکن رحمان خان کا کیا قصہ ہے خان! ہمیں نہیں معلوم۔'' ایک شخص نے کہا۔

''ابھی...... چند روز کے بعد کچی سرائے اور اس علاقے کے گرد و نواح میں دولت خان کی موت کے چرچے ہوں گے۔ سرتاج خان کی جواں مرگی کی داستانیں عام ہوں گی، تب تم لوگوں کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔'' شہباز خان نے پُرجوش آواز میں کہا اور پھر اس نے گلباغ خان کی گردن میں بندھی ہوئی رسّی کو ایک جھٹکا دیا اور گلباغ خان گر پڑا۔

''اُٹھ......!'' شہباز نے اس کے ایک ٹھوکر رسید کی اور گلباغ دانت پیستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''کچی سرائے کے لوگو! میری مدد کرو۔ انہیں ہلاک کر دو۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی تو...... تو دولت

خان کے قہر کا شکار ہو گے۔ وہ تمہارے گھروں کو آگ لگا دے گا۔ وہ......وہ......" گلباغ نے تماشا دیکھنے والوں سے کہا اور وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر حقارت کے آثار پھیل گئے۔ پھر ان میں سے ایک بوڑھا آگے بڑھا۔

"خوب جانتے ہیں ہم گلباغ خان!......اور خوب جانتے ہیں تیرے دولت خان کو۔ یہ تیرا آپس کا معاملہ ہے، خود ہی نمٹ۔ اور آواز دے اپنے دولت خان کو۔ رہا ہمارا معاملہ تو ہمارے بھی ہاتھ پاؤں ہیں۔ دولت خان جب ہم سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو ہم بھی اسے دیکھ لیں گے۔"

"تمہارا......تمہارا بہت برا حشر ہو گا۔" گلباغ خان نے کہا۔ لیکن پھر شہباز خان نے اسے ایک جھٹکا دیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ شہباز خان اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ برف باری شدت اختیار کر گئی تھی۔ ماحول نیم تاریک سا ہو گیا تھا۔ لیکن شہباز، گلباغ خان کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اور پھر وہ اپنا گھوڑا کھولنے لگا۔ ہم دونوں خاموشی سے اس کی تقلید کر رہے تھے۔ طالوت نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"بوڑھا شدید غصے میں ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے خود بھی اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ بوڑھے نے گلباغ خان کی گردن میں پھنسی ہوئی رسّی گھوڑے کی زین سے باندھ لی تھی۔

اور پھر اس نے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ گھوڑے کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ لیکن گلباغ کو گرنے سے بچنے کے لئے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ برف باری کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے دُھند چھائی ہوئی تھی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچی سرائے کے لوگ گھروں میں گھسے ہوئے تھے، لیکن کوئی اس وقت اس کی مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔ اور پھر چیخنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ گردن کا پھندا کافی تنگ تھا۔ اگر چیخنے کی وجہ سے شہباز خان نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی تو زندگی محال ہو گی۔

اور پھر، ان لوگوں نے ہی ساتھ کہاں دیا، جو اس کا کھاتے تھے۔ گلباغ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی حصے میں ایسی تکلیف، ایسی ذلت اُٹھانی پڑے گی۔ اُس کی ذہنی کیفیت خراب ہو رہی تھی۔ کبھی اسے شدت سے اپنے ساتھیوں پر تاؤ آتا، جنہوں نے شہباز کی شکل دیکھتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں بدل لی تھیں۔ ورنہ شہباز خان پر حملہ کرنے کے بجائے رقص کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اور کبھی بوڑھے شہباز خان پر۔ شہباز خان آٹھ سال کے بعد اتنا شہ زور کیسے ہو گیا کہ دولت خان سے ٹکرانے آ جائے۔

لیکن جو کچھ تھا، نگاہوں کے سامنے تھا۔ بلکہ خود پر بیت رہی تھی۔ ان راستوں سے واقفیت تھی، ورنہ نہ جانے کہاں جاتا۔ شہباز اسے بستی سے باہر لے جا رہا تھا۔ ابھی تک گلباغ گرا نہیں تھا۔ زمین پر برف کی اچھی خاصی تہہ جم گئی تھی، جس کی وجہ سے پاؤں اندر دھنسنے لگے تھے۔ بہرحال، سفر طے ہو گیا۔ اب وہ پہاڑی کے دامن میں تھے۔ اس پہاڑی میں چھوٹے چھوٹے غار موجود تھے اور غالباً شہباز خان نے انہی غاروں کو منتخب کیا تھا۔ ایک غار کے دہانے پر شہباز خان نے گھوڑا روک لیا اور ہم دونوں بھی اس کے ساتھ رُک گئے۔

"میں......میں اسے اندر لے جاؤں گا۔" شہباز خان نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔

’’ضرور لے جاؤ شہباز خان! کیا ہم باہر پہرہ دیں؟‘‘
’’کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون اس کتے کی مدد کو آئے گا۔ آؤ..... اندر آؤ۔‘‘ شہباز خان نے کہا اور پھر وہ گلباغ کو گھسیٹتا ہوا غار میں لے گیا۔
میں نے گھوڑے ایک چٹانی سائبان کے نیچے کھڑے کر کے ان کی لگامیں ایک نوک دار پتھر میں باندھ دیں اور پھر ہم دونوں بھی شہباز خان کے پیچھے غار میں داخل ہو گئے۔ گلباغ خان غار کی سنگلاخ زمین پر بیٹھا ہوا قہر آلود نگاہوں سے شہباز خان کو دیکھ رہا تھا اور شہباز خان کے ہونٹوں پر درندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔
’’ہاں گلباغ خان! اب تم زبان کھول دو۔‘‘ شہباز خان نے اپنا شکاری چاقو ایک تیز کڑکڑاہٹ کے ساتھ کھولتے ہوئے کہا۔
’’زبان کھول دوں؟‘‘ گلباغ خان غرایا۔ ’’تو سن شہباز خان! تیری موت تجھے یہاں لائی ہے۔ تُو نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، کیا تُو سمجھتا ہے کہ دولت خان اسے معاف کر دے گا۔ دولت خان تیرے جسم کی ایک ایک بوٹی کر دے گا۔ یہی نہیں، وہ سرحد کے پار جائے گا اور تیری عورت کو پکڑ لائے گا، اور پھر ہر خاص و عام کو دعوت دے گا۔ تیرا وہ حشر ہوگا شہباز خان! جس کا تُو تصور بھی نہیں کر سکتا۔‘‘
’میں تیری زبان باہر نکال لوں گا گلباغ خان! تیرے ساتھ وہ سلوک کروں گا، جو تیرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو تجھے بتانا ہے کہ میرے بیٹے کی موت کس طرح ہوئی۔‘‘
’’اس طرح، جیسے کوئی خارش زدہ کتا مارا جاتا ہے۔ سرتاج خان نے اس سے کہا کہ وہ زندگی بچانا چاہتا ہے تو دوڑے اور اس کے پستول کی رینج سے باہر نکل جائے۔ سرتاج خان کے ہاتھ میں ایک بڑا سیب تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سیب کھائے گا اور جونہی سیب ختم ہوگا، اسی وقت وہ گولی چلا دے گا۔ چنانچہ شہباز خان! تیرا بیٹا پشت دکھا کر بھاگا اور سرتاج خان مزے سے سیب کھاتا رہا۔ پھر جونہی سیب ختم ہوا، اس نے گولی چلا دی۔ اور تیرا بیٹا بڑا ہی اناڑی تھا۔ وہ رینج سے نہ نکل سکا، اور ڈھیر ہو گیا۔‘‘
’’غلط..... بالکل غلط..... جھوٹ بول رہا ہے تُو کتے!..... رحمان خان نے پشت نہیں دکھائی ہوگی۔ اگر وہ پشت دکھا کر مارا گیا تو..... تو پھر میں دولت خان سے کوئی بدلہ نہیں لوں گا۔ بزدل بیٹے کی موت پر مجھے خوشی ہوگی۔ سچ بول گلباغ خان!..... سچ بول۔ کیا وہ اسی طرح مارا گیا؟‘‘ شہباز خان نے تڑپتے ہوئے لہجے میں کہا۔
’’دوسری طرح۔‘‘ گلباغ خان مسکرایا۔ ’’میں تجھے سینکڑوں کہانیاں سناؤں گا۔ اصل بات کبھی نہیں بتاؤں گا۔‘‘
’’اوہ..... اوہ..... کمینے!..... خدا کا شکر ہے۔ اگر تُو نے سچ کہا ہوتا تو یہ زخم مجھے جانبر نہ ہونے دیتا۔ اچھا ہوا، تُو کھل گیا۔ لیکن اب میں صرف حقیقت سنوں گا، گلباغ خان! صرف حقیقت۔‘‘ شہباز خان، گلباغ کے نزدیک آ گیا۔ گلباغ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ شہباز نے لات مار کر اسے نیچے گرا دیا اور پھر اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔
’’حقیقت بتا، گلباغ!..... سچ بول۔‘‘ اس نے گلباغ کی پیشانی پر چاقو کی دھار سے لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

''کبھی نہیں بتاؤں گا۔ میں بھی گلباغ خان ہوں۔ کبھی نہیں بتاؤں گا۔'' گلباغ نے ہذیانی انداز میں کہا۔ پیشانی کی لکیروں سے خون کی دھاریں پھوٹ کر آنکھوں پر آ رہی تھیں۔

گلباغ خان نے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی لیکن شہباز نے اس کی کلائی میں چاقو اُتار دیا۔ اور گلباغ کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکل گئی۔

''رحمان خان کے قاتلوں میں تُو بھی شریک تھا، بول؟''

''شریک......؟'' گلباغ نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔ ''میں نے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا تھا۔''

''او کُتے!......او کُتے!......تُو میرے بیٹے کا قاتل ہے۔'' شہباز خان نے دیوانوں کی طرح اس پر چاقو کے کئی وار کر دیئے اور گلباغ پوری قوت سے چیخنے لگا۔ اس کے جسم کے ہر سوراخ سے خون اُبل رہا تھا۔

''طالوت!'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''ہوں!'' طالوت سکون سے بولا۔

''یہ تو ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔''

''اب ہو گیا ہے......تم دیکھ چکے ہو......گلباغ بہرحال ظالم ہے۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو وہ شہباز کے اور خود ہمارے ساتھ اس سے برا سلوک کرتا۔'' طالوت نے اسی سکون سے جواب دیا۔

میں خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے، طالوت سے میں بھی متفق تھا۔ لیکن یہ سب کچھ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں خود بھی مجرموں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ میرے ہاتھوں سے بھی قتل ہوا تھا۔ لیکن عجیب و غریب حالات میں۔ میں بہرحال قتل کا عادی نہیں ہوا تھا۔

گلباغ کے جسم سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ لیکن وہ کافی جاندار تھا۔ پھر اس نے دم توڑتے ہوئے کہا۔

''میں مر رہا ہوں شہباز! لیکن سن لے، دولت خان کو، سرتاج خان کو پتہ ضرور چل جائے گا کہ میرا قاتل تُو ہے۔ اور پھر وہ ہو گا، جو تیرے لئے بہت اذیت ناک ہو گا۔ سن، میں تجھے ایک خوشخبری سنا سکتا......آ......آ......آ......'' گلباغ کا دم اُکھڑنے لگا تھا۔ لیکن حواس اب بھی قائم تھے۔ ''میں......تجھے ایک خوشخبری سنا سکتا تھا۔ لیکن......اب......نہیں......اب نہیں۔'' اُسے خون کی ایک بڑی قے ہوئی اور پھر اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

''میرے لئے اس سے بڑی خوشخبری اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے بیٹے کے قاتلوں کے نشان مل جائیں۔ میں ان میں سے ایک ایک کو تلاش کر لوں گا۔ آؤ میرے بچو! ہم آگے بڑھیں گے۔ آؤ۔'' شہباز خان نے گلباغ کے مُردہ جسم کو اُٹھایا اور اسے برف پر ڈال دیا۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔

ہم دونوں اس کے ساتھ تھے۔ شہباز خان بے حد مسرور نظر آ رہا تھا۔ برف اب بھی اسی رفتار سے پڑ رہی تھی۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر شہباز نے گھوڑا روک دیا۔

''اب آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔''

''لیکن......اس کھلی جگہ؟'' میں نے کہا۔

''نہیں دلاور خان! میں ان علاقوں کا کیڑا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ یہاں اتنے کشادہ غار ہیں کہ ان میں فوج سما جائے۔ آؤ۔'' شہباز خان گھوڑے سے اُتر آیا۔ برف اور تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن شہباز کی آنکھیں جیسے رات میں بھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ چند ساعت کے بعد برف

ہمارے سروں سے غائب ہوگئی گھوڑوں نے بھی برف اپنے جسم سے جھاڑنے کے لئے پھریری لی تھی۔ گویا ہم اس غار کے عظیم الشان دہانے میں داخل ہو گئے تھے۔
شہباز خان گھوڑے کو لئے آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر اس نے کہا۔ ''میرے گھوڑے کی لگام پکڑو۔ میں روشنی کرتا ہوں۔''
''روشنی؟'' میں نے چونک کر کہا۔
''ہاں.....!'' شہباز خان ہنسنے لگا۔ تم نے سفر کے لئے بہت سامان خریدا تھا، لیکن ابھی تم ان پہاڑوں کے لئے اجنبی ہو۔ بتاؤ، کیا تمہارے سامان میں روشنی ہے؟''
''نہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''میرے پاس ہے۔'' بوڑھا اپنے گھوڑے پر لدے ہوئے تھیلے میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے کسی عجیب سی چربی کی بنی ہوئی موٹی شمع نکالی اور کشادہ غار میں روشنی پھیل گئی۔
روشنی ہونے کے بعد ہم نے گھوڑوں کی پشت سے زین اور تھیلے اُتارے، اپنے ہتھیار قرینے سے رکھے اور پھر ایک صاف جگہ دیکھ کر بستر بچھائے۔ پھر کھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس دوران ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی تھی، لیکن کھانے کے دوران شہباز خان نے اچانک ہاتھ روک کر کہا۔ ''کیا بات ہے؟ تم لوگ خاموش کیوں ہو؟''
''کوئی بات نہیں خان بابا!''
''کیا میں نے غلط کیا؟''
''نہیں......تم نے جو کچھ کیا ہے، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''اطمینان رکھو۔ میرے ہاتھ سے کوئی بے گناہ نہیں مارا جائے گا۔ گلباغ خنزیر تھا۔ اس نے اپنی غیرت دولت خان کے حوالے کر دی تھی۔ اور پھر دولت خان کی مدد حاصل ہو جانے کے بعد اس نے کمزوروں پر ظلم کرنے شروع کر دیئے۔ نہ جانے اس بے غیرت نے کتنوں کی عزت، دولت خان کے حوالے کی ہوگی۔ تم نے دیکھا، بستی کے لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ کوئی بھی گلباغ سے خوش نہیں تھا۔ ورنہ بستی کے ہر آدمی کے لئے وہ لوگ خون بہا دیتے۔''
''ٹھیک ہے خان بابا! مگر اس کی موت سے کوئی پتہ تو نہ چل سکا۔''
''نہ چلے...... پتہ بھی چل جائے گا۔ موذی کو مارنا ثواب ہے۔ مگر......آج قسمت عجیب طور پر ساتھ دے رہی ہے۔''
''کیوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''تم نے کچھ عجیب باتیں نہیں دیکھیں؟''
''کیا؟''
''خالی پستول ہمارے لئے بہت بڑا گالی ہے۔ پٹھان لوگ کبھی پستول خالی نہیں رکھتے۔ لیکن توریز کا پستول بھی خالی تھا اور گلباغ کا بھی۔ اور پھر توریز کے آدمی ہمارے اوپر حملہ کرنے کے بجائے ناچنے لگے اور گلباغ کے دونوں آدمیوں نے بھی اس کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا تھا۔''
''ہاں۔ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے خان بابا!'' میں نے مسکراتے ہوئے طالوت کی طرف دیکھا۔

''اگر قسمت اسی طرح ساتھ دیتی رہی تو مجھے یقین ہے کہ رحمان خان کے قاتلوں کو فنا کر کے ہی
واپس جاؤں گا۔''

''تم فکر مت کرو شہباز خان! قسمت اسی طرح ساتھ دیتی رہے گی۔''

''اِن شاء اللہ!'' شہباز نے بڑے خلوص سے کہا اور پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

''اب ہم کہاں چلیں گے خان بابا؟''

''تاسیہ۔'' شہباز خان نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم
آرام کرنے لیٹ گئے۔ اور آج مجھے بھی نیند آ گئی۔ طالوت کے خراٹے تو میں نے پہلے ہی سن لئے تھے۔

❀

رات گزر گئی۔

دوسری صبح بڑی صاف و شفاف تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ برف نہ جانے کب تک گرتی رہی تھی۔ بہر حال ہوا چلنے کی وجہ سے کافی سردی ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے پوستینیں اور بڑے بالوں والی ٹوپیاں پہن لیں۔ بوڑھے خان نے بھی چمڑے کا لباس پہن لیا تھا۔ ناشتہ وغیرہ کیا گیا۔ گھوڑوں کو بھی شہباز خان نے اپنے ہاتھ سے کھلایا پلایا اور پھر پوری طرح چاق و چوبند ہونے کے بعد ہم نے ہتھیار چیک کئے اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑے۔

تا حدِ نگاہ سفید سفید برف نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ سورج نکلا ہوا تھا لیکن دھوپ میں ذرا بھی حدت نہیں تھی۔ سردی شدید تھی۔ کبھی کبھی بادلوں کے ٹکڑے سورج پر آ جاتے تو سردی کا احساس شدید ہو جاتا۔

طالوت کا گھوڑا میرے گھوڑے کے برابر دوڑ رہا تھا۔ طالوت نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”عارف......!“

”ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ اُلجھے اُلجھے ہو؟“

”نہیں...... تمہارا خیال ہے۔“

”کیا یہ تبدیلی تمہیں پسند نہیں آئی؟“

”آئی ہے۔“ میں نے مختصراً جواب دیا۔

”نہیں۔ تم سنجیدہ ہو۔ مجھے تو یہ مناظر بے حد پسند ہیں۔ برف پوش پہاڑ، خوب صورت اور خطرناک راستے۔ شہروں کی بہ نسبت کتنے پُرسکون ہیں؟“

”ہاں...... لیکن ہم جس مسئلے میں اُلجھ گئے ہیں، میرا خیال ہے طویل نہ ہوگا۔ بڑے میاں کا کام ہو جائے تو انہیں چھٹی دے دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ان کا کام آسان نہیں ہوگا۔“

”ہم لوگ آسان کاموں کے عادی بھی نہیں ہیں۔ بڑے میاں بھی کیا یاد کریں گے۔“ طالوت نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ ایک درّے سے گزر کر ہم بلندی کی طرف چل پڑے۔ بوڑھے شہباز خان کی نگاہیں دُور دُور تک جائزہ لے رہی تھیں۔ چاروں طرف سنسان پہاڑیاں خاموش کھڑی تھیں۔ ہم بلندی طے کرتے رہے۔

لیکن جونہی ہم سرے پر پہنچے، اچانک تینوں اُچھل پڑے۔ تقریباً پچیس تیس کے قریب گھوڑے سوار بالکل سامنے سے آ رہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے اور ان کی قیادت ایک دیو پیکر انسان کر رہا تھا۔ اس نے بڑے بالوں والے ریچھ کی کھال کا چست کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے کندھے سے رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کا اس طرح آمنا سامنا ہوا تھا کہ ہم ٹھٹک کر رہ گئے۔

شہباز خان نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور پھر اس کے منہ سے غرّاہٹ نکلی۔

''دولت خان۔''

''کون سا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''مگر نہیں...... دولت خان ابھی تک اتنا جوان نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً سرتاج خان ہے۔ باپ کا ہم شکل۔'' دوسری طرف بھی گھوڑے رک گئے تھے۔

دیو پیکر انسان کا ہاتھ پٹی کے ریوالور پر پہنچ گیا اور پھر اُس کی بھاری آواز اُبھری۔

''کیا یہ تم ہو شہباز خان؟''

''ہاں...... میں شہباز خان ہوں۔ کیا تُو دولت خان کا لڑکا ہے؟''

''ہاں...... میرا نام سرتاج خان ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت جلد تُو میرے سامنے آ گیا، سرتاج خان!'' شہباز خان نے بھی پستول پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ لیکن میری نگاہیں سرتاج خان کے پیچھے موجود لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ سب نے رائفلیں اُتار لی تھیں اور پوری طرح تیار تھے۔

''توریز خان کو تُو نے قتل کیا ہے، شہباز خان؟'' سرتاج خان نے پوچھا۔

''ہاں...... اور گلباغ بھی میرے ہی ہاتھوں کتے کی موت مارا گیا ہے۔'' شہباز خان نے فخریہ انداز میں کہا۔

''اوہ...... تو...... تُو نے گلباغ کو بھی قتل کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ میرے آدمی کی اطلاع درست تھی۔'' سرتاج خان، بھیڑیے کی طرح غرّایا۔

''بالکل درست۔'' شہباز خان نے کہا۔

''تُو نے ان دونوں کو کیوں قتل کیا شہباز خان؟'' سرتاج نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''اس لئے کہ یہ تیرے ساتھی تھے۔ دولت خان سے میری پرانی دشمنی ہے اور اب میں بدلہ لینے آیا ہوں۔''

''اتنے طویل عرصے تک تیرا خون کیوں سرد رہا، شہباز خان؟'' سرتاج نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''وقت کا انتظار تھا۔''

''اب وقت آ گیا ہے۔''

''اس کا ثبوت دونوں لاشیں ہیں، جو دولت خان کے پاس پہنچ جائیں گی۔ لیکن تیسری لاش دیکھ کر دولت خان کو سب سے زیادہ خوشی ہو گی۔ کیونکہ وہ لاش اس کے بیٹے سرتاج خان کی ہو گی۔ اتنی ہی خوشی، جتنی مجھے رحمان خان کے خون آلود کپڑے دیکھ کر ہوئی تھی۔''

''خوب...... خوب......'' سرتاج خان وحشیانہ انداز میں بولا۔ پھر وہ ہم دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ کون ہیں شہباز خان؟......ان غریبوں کو تُو کہاں سے پکڑ لایا ہے؟''
''میرے ساتھی......میرے مددگار۔''
''کرائے کے ہیں؟'' سرتاج خان مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔
''جیسے بھی ہیں، تیرے اور تیرے ساتھیوں کے لئے کافی ہیں۔''
''کیا بیٹے کی موت نے تیرا دماغ بھی خراب کر دیا ہے، بوڑھے شہباز؟......سن! میں تیرے ساتھ کچھ رعایت کرنا چاہتا ہوں۔ سرتاج خان بزدل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں، تم صرف تین ہو اور میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ خود کو میرے حوالے کر دے۔ میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو قتل نہیں کروں گا بلکہ تجھے اپنے باپ کے حوالے کر دوں گا۔ مجھے تیرے بڑھاپے پر رحم آتا ہے۔ ہاں، میرا باپ تیرے ساتھ جو سلوک کرے، اس میں، میں دخل نہیں دوں گا۔''
''واقعی، یہ بے حد شریف آدمی ہے شہباز خان! تم سے جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کیا یہ مجھ سے جنگ کرنا پسند کرے گا؟'' اچانک طالوت نے کہا۔
سرتاج خان چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس سے قبل کہ شہباز خان کچھ بولے، سرتاج خان، گھوڑے سے اُترتے ہوئے بولا۔ ''اگر تُو مکاری سے کام نہ لے شہباز خان! تو میں تجھے پٹھانوں کی ایک رسم یاد دلانا چاہتا ہوں۔''
''کیسی رسم؟'' شہباز خان نے بے ساختہ پوچھا۔
''اگر کوئی کسی ایک فرد کو للکارے اور دوسرا اسے قبول کر لے تو صرف دو آدمیوں میں جنگ ہوتی ہے۔ اس جھینگے نے مجھے للکارا ہے۔ کیا تُو مجھے اس سے جنگ کرنے کی اجازت دے گا؟''
''شہباز خان ضرور اجازت دے گا۔'' طالوت نے بھی گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تُو اپنے آدمیوں سے بھی کہہ دے کہ وہ بدعہدی نہ کریں۔''
''پٹھان بدعہد نہیں ہوتے۔'' سرتاج خان نے کہا۔ اور پھر وہ اپنے آدمیوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ''اگر شہباز خان کی طرف سے مکاری نہ کی جائے تو تم لوگ خاموش رہو گے۔''
میں نے شہباز خان کے چہرے پر کسی قدر بوکھلاہٹ دیکھی۔ اسے احساس تھا کہ سرتاج خان اور طالوت کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ سرتاج خان فیل پیکر تھا اور طالوت اس کے سامنے مچھر۔
''تیرا جھگڑا مجھ سے ہے، اس سے نہیں۔ میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔'' شہباز خان نے کہا۔
''تُو بوڑھا آدمی ہے شہباز! اور پھر میں تجھے قتل کرنے کے بجائے زندہ گرفتار کر کے اپنے باپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کروں گا۔ میں تجھ سے جنگ نہیں کروں گا۔''
''اسے لڑنے دو شہباز خان!'' میں نے شہباز خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور شہباز خان خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے سخت ہیجان اور اضطراب عیاں تھا۔
''ہاں جوان! کیا تُو اپنی بات پر قائم ہے؟'' سرتاج خان نے مسکراتے ہوئے طالوت کو دیکھا۔
''بالکل......لیکن اس جنگ کا نتیجہ کیا ہو گا؟''
''ہم دونوں میں سے ایک کی موت۔''
''اس کے بعد؟'' طالوت نے پوچھا۔

''اس کے بعد میں ان دونوں کو گرفتار کر کے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں گا۔''

''اور اگر تم مارے جاؤ سرتاج خان؟''

''تب......'' سرتاج خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تب پھر میرے آدمی یہاں سے پانچ سو گز دُور ہٹ جائیں گے۔ اس کے بعد تم لوگ مقابلہ کرنا اور اس کا جو بھی نتیجہ ظاہر ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔'' طالوت نے کہا اور سرتاج خان نے گھوڑے کی لگام ایک آدمی کے حوالے کر دی۔ پھر اس نے ان سے پیچھے ہٹ جانے کو کہا اور بولا۔

''کیسے جنگ کرے گا؟......پستول سے؟''

''مزہ نہیں آئے گا، سرتاج خان!'' طالوت نے جواب دیا۔

''مگر تیرے پاس تلوار نہیں ہے۔''

''تیرے پاس ہے؟''

''ہاں۔'' سرتاج خان نے گھوڑے کی زین سے تلوار کھینچ لی۔

''بس کافی ہے۔ میں تیری تلوار چھین کر تجھے موقع دوں گا کہ تُو دوسری تلوار حاصل کر لے۔'' طالوت نے کہا۔

''میں تجھے تلوار مہیا کر سکتا ہوں۔''

''شکریہ......میں دشمن سے تلوار مانگ کر جنگ نہیں کروں گا، بلکہ چھین لوں گا۔''

''کیا تُو صحیح الدماغ ہے؟'' سرتاج خان نے کہا۔

''ابھی پتہ چل جائے گا۔'' طالوت نے کہا۔ ان دونوں کی گفتگو سے شہباز خان بہت مضطرب تھا۔ ہم لوگ بھی پیچھے ہٹ آئے تھے۔ تب شہباز خان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ......وہ غلطی کر رہا ہے......وہ حماقت کر رہا ہے۔''

''وہ اس کا عادی ہے۔ تم فکر مت کرو۔'' میں نے سکون سے کہا۔ میرے دل میں اضطراب کا تصور بھی نہیں تھا۔ طالوت کے لئے بھلا سرتاج خان کیا حیثیت رکھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ طالوت تفریح کر رہا ہے۔ ورنہ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔

دونوں آمنے سامنے آ گئے۔ سرتاج خان نے تلوار سیدھی کر لی تھی۔ اس کے فولادی بازو کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ وہ شاید اس فکر میں تھا کہ صرف ایک وار کرے اور دشمن کی گردن اُڑا دے۔ یہی اس کے شایانِ شان تھا۔ ورنہ ایک نہتا اور اس کے سامنے بے حیثیت انسان اگر اس کا وار بچا گیا تو خاصی سکی ہو گی۔ چنانچہ تلوار تولتے ہوئے پینترے بدلتا رہا۔ اور پھر ایک بار اس نے کاوادے کر ایک بھرپور وار کیا۔ لیکن اچانک سر پر سے پرواز کر جانے والی ٹوپی نے اس کا ذہن بانٹ دیا۔ اور طالوت کو ہلنے کی ضرورت بھی نہ پیش آئی۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ٹوپی دیکھی اور سر ٹٹولنے لگا۔ ٹوپی کافی بلند ہو کر دوبارہ اس کے سر پر آ پڑی تھی۔

میری ہنسی نکل گئی۔ جبکہ دوسرے لوگ دم بخود تھے۔ بہرحال سرتاج خان نے اسے اتفاق ہی سمجھا تھا۔ البتہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اگر مقابل کے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو وہ باآسانی اس وقت اس کے سینے میں بھونک سکتا تھا۔ جب اس نے ٹوپی کے لئے اوپر دیکھا تھا، اس بات کو وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

اور اس بار وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے گھوم کر تلوار کا دوسرا وار کیا اور اچانک اس کے زیر جامے کا بند ٹوٹ گیا۔ زیر جامہ ڈھیلا ہو کر نیچے کھسک گیا اور سرتاج خان نے جلدی سے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ طالوت حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مسخرے انداز سے پوچھا۔

''کیا ہوا سرتاج خان! کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟''

سچویشن ہی ایسی تھی۔ سرتاج خان کیا کہتا۔ ظاہر ہے، یہ اس کے دشمن کا کارنامہ تو نہیں تھا۔ نہ جانے کس طرح...... نہ جانے کیسے یہ ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ پیچھے پلٹا۔ اور پھر اپنے آدمیوں کے پیچھے چلا گیا۔

شہباز خان نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''کیا بات ہے سرتاج خان! کیا تم نے میدان چھوڑ دیا؟''

''ابھی...... ابھی واپس آتا ہوں۔''

''ضروریات سے فارغ ہونے گئے ہو؟...... ابھی تو اس نے ایک بھی وار نہیں کیا۔'' شہباز خان ہنستے ہوئے بولا۔ خود میرے پیٹ میں قہقہے اُبل رہے تھے۔ طالوت معصوم سی شکل بنائے کھڑا تھا۔

چند منٹ کے بعد سرتاج خان پھر واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر جھلاہٹ اور دیوانگی طاری تھی۔ آتے ہی اس نے تلوار کے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ تالوت اُچھل اُچھل کر اُس کے وار خالی دے رہا تھا۔ اور پھر اچانک سرتاج خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اُچھلنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے بدحواسی میں ''ارے...... ارے'' نکل رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے تلوار پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا لباس نوچنے لگا۔ اس نے اوپر کا کوٹ اُتار کر پھینک دیا اور پھر چمڑے کی واسکٹ بھی اتار دی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُچھلتا بھی جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس کے لباس میں چھپکلیاں گھس گئی ہوں۔ لیکن اوپری لباس پر ہی بس نہیں ہوئی تھی، زیریں لباس میں بھی گڑبڑ تھی!

وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں دوسری طرف بھاگ گیا۔ اس بار اُس نے ایک چٹان کے پیچھے پناہ لی تھی۔

''کیا یہ مقامی طریقۂ جنگ ہے شہباز خان؟'' طالوت نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔ ''یہ بار بار بھاگ کیوں جاتا ہے؟'' اور شہباز خان نے زوردار قہقہہ لگایا۔ خود سرتاج خان کے آدمی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

''اب میں کس سے لڑوں، خان بابا؟'' طالوت نے فریادی لہجے میں کہا اور شہباز خان نے دوسرا قہقہہ لگایا۔ وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہا تھا۔ لیکن طالوت نے اسی پر بس نہیں کی۔ وہ سرتاج خان کے آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اچانک ان لوگوں کے گھوڑوں نے اُلٹا چلنا شروع کر دیا۔ ان کے منہ آگے تھے، لیکن وہ پیچھے کی سمت دوڑ رہے تھے۔ بہت سے سوار بوکھلا کر ان سے کُود پڑے اور بہت سے انہیں پیٹ پیٹ کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ایک بھی گھوڑا نہ رُکا۔ کُودنے والوں نے دوڑ کر اپنے گھوڑے پکڑ لئے تھے۔ لیکن گھوڑے تھے کہ کسی طور نہیں رک رہے تھے۔ وہ خود بھی رُکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں اُچھل رہے تھے، گر رہے تھے، کھڑے ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی افراتفری پھیل گئی۔ گھوڑے سوار بری طرح بدحواس تھے۔

اور طالوت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

''یہ سب کیا ہے خان بابا؟ کیا یہ لوگ کوئی مزاحیہ ناٹک پیش کر رہے ہیں؟'' لیکن خان کی ہنسی تھی کہ

رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں بھی ہنس رہا تھا۔ تب اچانک چٹان کے پیچھے سے سرتاج خان نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اُچھل کر اس پر بیٹھ گیا۔ لیکن اسے دیکھ کر اور بھی بم پھٹ پڑا۔ سرتاج خان برہنہ تھا۔ اس نے صرف ایک چھوٹی سی کھال بدن پر باندھ رکھی تھی، جسے برابر رکھنے کے لئے وہ بار بار گھوڑے کی لگام چھوڑ کر اسے سنبھالنے لگتا تھا۔

''لینا......! سرتاج خان نکل گیا۔'' شہباز خان چیخا۔

''رُک جاؤ خان بابا!......وہ کپڑے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور میں ننگے آدمیوں سے بالکل نہیں لڑ سکتا۔ انہیں دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

اور پھر اچانک شہباز خان کی ہنسی میں بریک لگ گیا۔ اس نے حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مگر...... یہ سب ہوا کیا؟''

''یہ تو آپ ہی بتائیں گے، خان بابا!'' طالوت جلدی سے بولا۔

''میں...... میں کیا بتاؤں؟''

''پہلے اس نے پیٹ پکڑ لیا اور بھاگ گیا۔ دوبارہ کپڑے اُتار پھینکے اور پھر کپڑے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور اس کے ساتھی اُلٹے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فرار ہو گئے۔ آخر کیوں؟''

''مم...... مجھے کیا معلوم؟''

''کیوں؟...... آپ بھی تو انہی علاقوں کے رہنے والے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور میری پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

''ان باتوں کا علاقے سے کیا تعلق؟ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔'' شہباز خان نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کمال ہے...... پھر اب ہم کیا کریں؟''

''سرتاج خان بچ کر نکل گیا۔ مگر...... مگر...... وہ...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آؤ، آگے بڑھیں۔''

''سرتاج خان کے کپڑے اُٹھالیں؟'' طالوت نے معصومیت سے پوچھا۔

''اوہ...... ہاں...... یہ کپڑے دولت خان اور تاسیہ والوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ دولت خان کا نام اونچا ہو گا۔''

اور پھر درحقیقت چٹان کے عقب سے سرتاج خان کے کپڑے مل گئے، جنہیں شہباز خان نے احتیاط سے لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ سرتاج خان اور اس کے ساتھیوں کا اب دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔

رہ گیا شہباز خان، تو وہ بھی کبھی کبھی ہمیں گھورنے لگتا تھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر سامنے متوجہ ہو جاتا تھا۔ یوں ہم سفر کرتے رہے۔ لیکن بہر حال، اب ہماری آمد کی خبر سب کو مل گئی ہو گی، لیکن کون کسے کیا بتائے گا۔ ایک بار شہباز خان آگے نکل گیا تو میں نے طالوت سے کہا۔

''درحقیقت تم پورے شیطان ہو۔''

''غلط...... ہم دونوں مل کر پورے ہوتے ہیں۔''

''مگر...... اس کے لباس میں کیا تھا؟''

”کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اسے وہم تھا۔ راسم اپنے کمالات دکھا رہا تھا۔“
”بے موت مارے گئے بے چارے۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک شیطان ان کے علاقے میں گھس آیا ہے۔“
”دراصل میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔“
”کیوں؟“
”بس، تم تو اپنا دماغ نہ جانے کہاں چھوڑ دیتے ہو۔“
”تمہارے ساتھ رہ کر میں نے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔“
”کیوں؟“
”کوئی بات دماغ میں آئے تو اس کے بارے میں سوچوں۔ نہ جانے تم کیا کیا چکر چلاتے رہتے ہو۔“
”گلباغ کی ایک بات یاد کرو۔ مرتے وقت اس نے کیا کہا تھا؟“
”گلباغ نے......؟“ میں ذہن پر زور دینے لگا۔ ”اس نے تو بہت سی باتیں کی تھیں۔“
”اس نے کہا تھا کہ وہ بوڑھے شہباز کو ایک خوشخبری سنا سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے خوش نہیں ہونے دے گا۔“
”ایں...... ہاں، کہا تھا۔ مگر تم نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟“
”کچھ بھی نہیں۔“ طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور پھر میں انتظار کرتا رہا، لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ ہم برابر منزلیں طے کر رہے تھے۔ سرتاج اور اس کے آدمیوں کا دور دور تک نشان نہیں ملا تھا۔ وہ بری طرح بھاگے تھے اور اب بھی طالوت کی شرارت پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی۔ طالوت معصومیت سے سفر کر رہا تھا۔
کافی دیر گزر گئی۔ بوڑھا خان اب ہمارے برابر چل رہا تھا۔ وہ بھی گردن جھکائے سوچ میں غرق تھا۔ پھر اچانک اس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کچھ بھی نہیں آتا۔“
”کیا بات ہے خان بابا؟“
”کیا تم لوگ فرشتے ہو، جو آسمان سے میری مدد کو آئے ہو؟“
”نہیں بابا! ہم گناہ گار انسان ہیں۔“
”پھر یہ سب کیا تھا؟“
”غیبی مدد کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟؟ تم غور کرو بابا! میرا اور اس کا کیا مقابلہ تھا؟ ڈر کے مارے میری بری حالت تھی۔“
”جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے تمہارا چہرہ دیکھا تھا۔ میرے تجربے کو چیلنج مت کرو۔ میں نے تمہارے چہرے پر اتنا ہی سکون دیکھا تھا، جیسے تمہیں یقین ہو کہ تم اسے آسانی سے مار لو گے۔“
”وہ موت کا سکون تھا، خان بابا! میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔“
”نہیں۔ تم اتنے بزدل نہیں ہو۔ تم نے خود اسے للکارا تھا۔“
”تو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ تیار ہی ہو جائے گا۔“ طالوت نے رو دینے والے انداز میں کہا۔
”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ شہباز خان نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس درّے میں داخل ہونے کے بعد ہم تاسیہ میں داخل ہو جائیں گے۔''

''کیا اس درّے کا اختتام تاسیہ پر ہوگا؟''

''نہیں۔ اس کے بعد کوہ تامند آئے گا کوہ تامند کے اندر سے ایک سرنگ تاسیہ میں جا کر کھلتی ہے۔ بہت خوبصورت جگہ ہے، تمہیں بہت پسند آئے گی۔ تاسیہ کے کاریگروں نے ایک بڑا کارنامہ دکھایا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''کوہ تامند سے گرنے والے آبشار کو کاٹ کر سرنگ کے ذریعے اندر لے گئے ہیں اور پھر وہ پانی تاسیہ کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔''

''خوب۔ واقعی عمدہ جگہ ہوگی۔'' میں نے شہباز خان کی باتوں پر غور کرتے ہوئے کہا۔ لیکن طالوت کے کان کھڑے تھے۔ وہ کچھ اور ہی سن رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ لیکن میرا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ بہت سے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں اور گولیوں نے ہمارے اردگرد پتھر اُڑانے شروع کر دیئے۔ ہم درّے کے اندر داخل ہو چکے تھے اور یہ گولیاں یقیناً درّے کے دونوں طرف سے آ رہی تھیں۔

''بھاگو..... خطرناک جگہ ہے۔'' بوڑھا شہباز چیخا اور اس نے اپنا گھوڑا دوڑانا شروع کر دیا۔ ہم دونوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔ طالوت نہ جانے پہلے سے باخبر ہوا تھا یا نہیں، لیکن اس خطرناک سچویشن میں بوکھلا گیا تھا۔ بلاشبہ دونوں طرف سے آنے والی گولیاں باآسانی ہمیں چاٹ سکتی تھیں۔

لیکن آگے دوڑنے یا پیچھے ہٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں طرف کی کیفیت یکساں تھی۔ چنانچہ آگے دوڑنا ہی بہتر تھا۔ گولیاں چلانے والے اناڑی نہیں تھے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ بہت سی گولیاں ہمارے لباس کو چھوتی ہوئی نکلی تھیں۔ لیکن ہم صرف چند سوت کے فاصلے پر محفوظ تھے۔

شہباز کا گھوڑا سب سے آگے تھا اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر ہمیں دیکھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم درّے سے نکل گئے۔ گولیاں چلانے والے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ درّے سے نکل کر ہم کھلی فضا میں آ گئے۔ سامنے ہی کوہ تامند تھا۔ شہباز نے رائفل اتار لی تھی اور اب دانت پیستے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتا تھا، بزدل سرتاج خان کوئی چال چلے گا۔ اس نے چالاکی اسی لئے کی تھی۔'' شہباز خان دانت پیستا ہوا بولا۔

''چلو چھٹی ہوئی۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا مطلب؟''

''بڑے میاں کا شبہ رفع ہو گیا۔ ورنہ وہ اُلٹی سیدھی سوچنے لگے تھے۔''

''یہ تو شبہ رفع ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم صرف تین تھے اور وہ بیس پچیس۔ اگر ہم دس بارہ کو مار لیتے، تب بھی بقیہ لوگ ہمیں بھون ڈالتے۔ اگر بڑے میاں یہ سوچ رہے ہیں تو......''

''ابے، تو سب تیری طرح فلاسفر نہیں ہیں۔ خاموش بھی رہ۔'' طالوت نے کہا۔ ہم دونوں نے بھی شہباز خان کی دیکھا دیکھی رائفلیں اُتار لی تھیں۔ لیکن درحقیقت اب سرتاج خان کے آدمی ہمارے سامنے

آنے سے کترا رہے تھے۔ ہمیں درّے کی بلندیوں پر کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

''وہ چور سامنے نہیں آئے گا۔ آؤ! اب تاسیہ میں ہی اس سے ملاقات ہو گی..... آؤ!'' شہباز خان نے ایک چوڑی سرنگ کے دہانے کی طرف گھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ تامند سے نکلنے والا آبشار صاف نظر آ رہا تھا۔ ویسے درحقیقت یہ علاقہ بے حد خوبصورت اور سرسبز تھا۔ آبشار کے چاروں طرف اور پہاڑی کے دامن میں سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ آبشار کافی بلندی سے ایک پھیلی ہوئی چٹان پر گر رہا تھا اور شاید چٹان کے رُخ کو اندر موڑ دیا گیا تھا۔ کیونکہ آبشار کا پانی چٹان سے نیچے نہیں گر رہا تھا اور پہاڑ ہی میں غائب ہو جاتا تھا۔

نہایت عمدہ ترکیب تھی۔ آبشار کو سرنگ کے ذریعے موڑنا آسان بات نہیں تھی۔ لیکن ان جفاکش لوگوں کو دیکھنے کے بعد حیرت میں کمی ہو جاتی تھی۔ مجھے اور طالوت کو یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ لیکن افسوس! ہم یہاں سیر و تفریح کرنے نہیں، کشت و خون کرنے آئے تھے، جس کی ابتدا شہباز خان نے کر دی تھی۔ گو سرتاج خان سے طالوت کا طریقۂ جنگ مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ یہ جنگ بھی تھی اور تفریح بھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ تفریح عارضی ہے۔ اس علاقے میں تو قدم قدم پر گولیاں چلتی ہیں۔ کہاں تک تفریحات کا سہارا لیا جائے گا۔ اور پھر شہباز خان کے تیور تو بہت خراب تھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دے گا، جس کے بارے میں شبہ ہو گا کہ اس کا سرتاج خان اور دولت خان سے کوئی تعلق ہے۔ وہ تو آیا ہی اسی لئے تھا۔ اور طالوت پورے طور سے اس کا مددگار تھا۔ بہرحال، ان ہنگاموں میں میری کیا چلتی۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

''کیا تاسیہ میں ہمارا داخلہ علی الاعلان ہو گا؟'' میں نے سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہم چوروں کی طرح نہیں داخل ہوں گے۔'' شہباز خان سینہ تان کر بولا۔

''لیکن سرتاج خان ہمارے پیچھے ہے۔''

''وہ جس قدر بزدل ہے، تم دیکھ چکے ہو۔ اب وہ پیچھے سے ہی پٹاخے چلاتا رہے گا۔ ویسے یہ بات اسے بدحواس کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم اس کے شہر میں داخل ہو رہے ہیں اور اس کی بزدلی کا راز ہمارے سینے میں ہے۔''

''اس کے آدمیوں کو بھی معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایک بھی آدمی پر اسے شبہ ہوا کہ وہ یہ راز کسی اور کو بتا دے گا تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔'' دولت خان کے ہم شکل نے طبیعت بھی دولت خان کی سی پائی ہو گی۔'' شہباز خان نے کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ طالوت ہماری باتوں سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اسے اس گفتگو سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ میں نے اس کی شکل دیکھی اور مجھے غصہ آنے لگا۔ اسے کسی بھی قسم کے حالات کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ وہ محفوظ ہے۔ ہاں، اگر کسی وقت وہ ہماری طرف سے غافل ہو جائے تو شامت تو ہم دونوں کی ہی آئے گی۔

لیکن میں یہ بات طالوت سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بوڑھا شہباز تو آیا ہی موت سے کھیلنے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس عظیم الشان سرنگ کے دہانے کے پاس کھڑے تھے، جو شہر تاسیہ میں داخل ہونے کا دروازہ تھی۔ آبشار کا پانی اس کے اوپر سے گزر کر اندر کسی سمت جا رہا تھا۔ اس کی آواز کی گرج ضرور محسوس ہو رہی

تھی، لیکن وہ کہیں سے نظر نہیں آتا تھا۔
''بے حد شاندار جگہ ہے۔ بالکل جادوئی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔'' طالوت نے تعریفی انداز میں کہا۔
''ان پہاڑوں میں بڑے بڑے جفاکش موجود ہیں۔ وہ بہت بڑے دماغ رکھتے ہیں۔ افسوس، ان لوگوں کو اچھے راہبر نہیں ملتے، اس لئے وہ اپنی صلاحیتیں لئے ہوئے قبروں میں جا سوتے ہیں۔'' شہباز خان نے کہا۔
''یا پھر آپس کی دشمنیوں میں زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔'' طالوت بولا۔
''یہ بھی درست ہے میرے بچے!'' شہباز خان نے ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گیا۔ سرتاج خان کے آدمیوں کی نقل و حرکت اب دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم انتظار کرتے رہے اور پھر مایوس ہو گئے۔
''یہ بھی ہو سکتا ہے، خان بابا! کہ سرتاج خان سرنگ کے دوسرے دہانے پر اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا ہو۔ اور جوں ہی ہم سرے پر پہنچیں، وہ ہمیں گولیوں پر رکھ لے۔'' میں نے کہا اور شہباز خان چونک پڑا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔
''ہاں، وہ لومڑی کی اولاد یہ حرکت کر سکتا ہے۔''
''ہم اسے اس کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔ اس لئے فکر مت کرو۔'' طالوت کی آواز سنائی دی اور میں دانت پیس کر رہ گیا۔
''ہاں...... دلیر خان ٹھیک کہتا ہے۔ ہم تاسیہ ضرور چلیں گے۔ آؤ!'' شہباز خان نے کہا۔ اور ہم نے سرنگ میں گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ سروں پر روشنی تھی، لیکن ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، سرنگ تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑے بھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ وہ کسی قدر خوف زدہ تھے۔ غالباً اس سے قبل وہ اس علاقے میں نہیں آئے تھے۔
تاہم، ہم پامردی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے سروں پر ایک عجیب سی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔ بڑا سنسنی خیز سفر تھا۔ عقب سے بھی خطرہ تھا اور سامنے سے بھی۔ جگہ بھی ایسی تھی کہ ہم کسی طرف سے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ بہر حال، آگے بڑھتے رہے۔
''یہ سرسراہٹ......!'' میں نے کہا۔
''پانی ہمارے سروں سے گزر رہا ہے۔'' شہباز خان نے جواب دیا۔
''اوہ...... پتھروں کی موٹائی کافی ہو گی۔ کیا پانی انہیں کاٹ سکتا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''اس کا انتظام کر لیا گیا ہے۔''
''کیا؟''
''وہ چٹان، جس پر گرنے کے بعد آبشار کا رُخ مُڑتا ہے، قدرتی طور پر وہاں نہیں جمی ہوئی، اسے ضرورت کے تحت موڑا بھی جا سکتا ہے۔ اس طرح آبشار نیچے گرنے لگتا ہے اور اس سرنگ کی صفائی اور مرمت کر لی جاتی ہے، جس سے پانی گزرتا ہے۔''
''بہت عمدہ۔'' طالوت نے تعریفی انداز میں کہا۔
''لیکن کیا کسی ذریعے سے اوپر کی سرنگ کا پانی اس سرنگ میں نہیں آ سکتا؟'' میں نے سوال کیا اور

اچانک شہباز خان رک گیا۔ تاریکی میں اس کی شکل تو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد سے رُکا ہے۔

''کیا بات ہے خان بابا؟'' طالوت نے سوال کیا اور شہباز خان اُچھل پڑا۔

''جلدی کرو......آؤ......جلدی سے سرنگ سے نکل جاؤ۔ کہیں یہ خیال اس مردود کے دماغ میں نہ آ جائے۔'' شہباز خان گھوڑے کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''گویا......اس کا خطرہ ہے؟''

''سو فیصدی......جلدی آؤ......ہم آدھی......''

لیکن الفاظ شہباز خان کے حلق ہی میں اٹک گئے۔ جس جگہ ہم تھے، وہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر اچانک روشنی ہوئی اور پھر ایک خوفناک آواز کے ساتھ آبشار کا پانی اندر گھس آیا۔

''بھاگو......واپس بھاگو۔'' شہباز خان چیخا۔ لیکن ہمارے عقب میں بھی ویسا ہی دروازہ کھل گیا۔ پانی کے طوفانی شور میں اس بار شہباز خان کی آواز بھی نہ سنائی دی۔ جس طرف سے ہم آ رہے تھے، وہ بلندی پر تھی اور ہم بتدریج ڈھلان میں جا رہے تھے۔ اس لئے عقب سے آنے والے پانی کے ریلے نے گھوڑوں کے قدم اُکھاڑ دیئے۔ گھوڑے بھیانک آوازوں میں چیخے، انہوں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، لیکن یخ پانی کا خوفناک ریلا بے پناہ طاقتور تھا۔ اس نے گھوڑوں کو اُچھال کر چھت سے ٹکرایا۔ صرف ایک لمحے میں میرے جسم کے نیچے سے گھوڑا نکل گیا اور میں سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے ہاتھ خلا میں جھول گئے۔ کسی موہوم سے سہارے کی اُمید فضول تھی۔ پانی کا ریلا مجھے اُڑا کر آگے لے چلا۔

برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی نے ایک لمحے میں ذہن سُن کر دیا۔ ہاتھ پاؤں مفلوج کر دیئے۔ کوئی خیال ذہن میں نہیں تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ میرا پورا بدن اینٹھ گیا۔ سرنگ پانی سے بھر گئی تھی۔ پانی چھت تک پہنچ گیا تھا کیونکہ اس کی مقدار بھی زبردست تھی۔

اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہوش کے کتنے لمحات گزرے تھے۔ پہلے دماغ میں ٹھنڈک ہوئی۔ پھر دم گھٹنے لگا۔ جان کنی کے عالم کا بھی احساس تھا۔ لیکن اس کے بعد سارے احساسات سے عاری ہو گیا کچھ ہوش نہ رہا۔

لیکن عالم بے ہوشی کا بھی وقت نہیں متعین کر سکا۔ ہوش آ گیا۔ ہاں، کیسی حیرت انگیز بات ہے۔ ہوش آ گیا تھا۔ لیکن دماغ بدستور ماؤف تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سوئی ہوئی تھیں۔ بہرحال کافی دیر تک یہی کیفیت رہی، پھر حواس واپس آنے لگے۔ احساسات جاگے تو محسوس کیا کہ چاروں طرف پتھریلی دیواریں ہیں، اوپر چھت ہے۔

یہ ناہموار دیواریں، کوئی غار ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن......لیکن یہ غار۔ ذہن میں تحریک ہوئی اور موت کی سرنگ یاد آ گئی۔ ایک بار پھر حواس جواب دینے لگے۔ وہ تصور ہی اس قدر بھیانک تھا۔ خدا کی پناہ، دونوں طرف سے بند سرنگ اور طاقتور سفید پانی۔ اُف......کتنا ٹھنڈا، کیسا یخ۔ لیکن اس کے بعد زندگی......! زندگی کا کیا سوال ہے؟......تو......تو کیا یہ قبر ہے؟ لیکن ایسی کشادہ قبر؟ میں نے قبریں تو دیکھی

تھیں۔ اتنی کشادہ تو نہیں ہوتیں۔ پھر بزرگوں کی بات یاد آ گئی۔ نیک اعمال والے کی قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔

نیک اعمال......اس تصور پر ہی ہنسی آتی تھی۔ میرے......اور نیک اعمال......ایک بھی بات ایسی یاد نہ آسکی، جسے نیک اعمال میں شامل کیا جا سکے۔ لیکن نہیں......قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ میں نے نرگس رحمانی کی زندگی بچانے کے لئے بری طرح مار کھائی تھی۔ طالوت کا ساتھ مل جانے پر میں نے بے بس انسانوں پر ترس کھایا تھا۔ بخشے جانے کے لئے تو ایک ہی نکتہ کافی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میں واقعی مر چکا ہوں؟......کیا موت کے بعد بھی آدمی خود سے اسی طرح لاعلم رہتا ہے؟......روح کی قوت تو برتر ہوتی ہے۔ میں اپنی زندگی اور موت کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ کرنا چاہئے۔ احمقانہ اندازے قائم کرنے سے کیا فائدہ؟......میں نے زمین کا سہارا لے کر اُٹھنے کی کوشش کی۔ جسم میں بڑی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیچے گھاس تھی۔ گویا پتھریلی زمین پر میرا بستر تھا۔ دیواروں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے، ان سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ نیم تاریک سی جگہ تھی۔

کچھ اور ہمت کی اور کھڑا ہو گیا۔ دیواروں کو ٹٹولا تو ایک چٹانی دروازہ نظر آیا۔ حواس واپس آ چکے تھے۔ یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوئی کہ بقیدِ حیات ہوں اور کسی غار میں بند ہوں۔ پچھلے حالات سب یاد آ چکے تھے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس خونی سرنگ سے بچ کر میں غار میں کیسے پہنچ گیا۔ ویسے غار میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

چٹانی دروازے کو ٹٹولا۔ یوں تو میں اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن دروازہ کسی میکنزم کے تحت گھومتا تھا۔ ایک طرف سے دبانے پر وہ گھوم گیا اور غار روشن ہو گیا۔

باہر روشنی تھی۔ میں نے باہر جھانکا اور پھر دروازے سے نکل آیا۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا لیکن سامنے ہی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ان سلاخوں سے باہر جانا ممکن نہیں تھا۔

''دلاور خان!'' اچانک بائیں طرف سے مجھے شہباز خان کی آواز سنائی دی اور میں اُچھل پڑا۔ میں نے بائیں سمت دیکھا۔ ادھر بھی ایسا ہی برآمدہ تھا اور سلاخوں کے پیچھے شہباز خان کھڑا نظر آ رہا تھا۔ میں حیرت زدہ سا شہباز خان کی طرف بڑھ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں خان بابا! مگر......''

''اوئے خدائی خوار! ہم لوگ دولت خان کی قید میں ہیں۔'' شہباز خان نے بتایا۔ لیکن اس کے لہجے سے کسی قسم کے خوف یا تردّد کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''اوہ......!'' میں نے ہونٹ سکوڑے اور پھر میری زبان سے بے اختیار طالوت کا نام نکلتے نکلتے رہ گیا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ''اور......دلیر خان کہاں ہے؟''

''اس شیر کے بچے کا پتہ نہیں چل سکا۔''

''مگر ہم زندہ کیسے بچ گئے، خان بابا؟''

''چہ، یار! زندگی ہوتا ہے تو مارنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یخ پانی نے تمہیں بے ہوش کر دیا تھا۔ لیکن

شہباز خان نے پانی کا سفر ہوش وحواس میں کیا تھا۔ مگر یہ پانی بہت طاقتور ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں کچھ نہیں کرنے دیا۔"

"تو کیا ہم پانی کے ساتھ ہی سرنگ سے باہر نکلے تھے؟"

"ہاں...... بزدل سرتاج خان نے دو سوراخ کھول دیئے تھے، جو سرنگ کی صفائی کے کام آتے تھے۔ سال میں ایک دفعہ سرنگ کو پانی سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہ سوراخ اسی کے لئے بنے تھے۔ پانی نے ہمیں باہر پھینک دیا اور اس طرف سے دولت خان کے آدمیوں نے ہمیں پکڑ لیا۔"

"آپ ہوش میں تھے، خان بابا؟"

"چہ، بولتا تو ہے یار! مگر ہمارے ہاتھ پاؤں بیکار ہو گئے۔ غم کا بات ہے کہ اس سے لڑائی نہیں کر سکا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ طالوت کے بارے میں سوچ رہا تھا، کہاں گیا؟ کیا گل کھلا رہا ہے؟ ویسے میرا خیال تھا کہ پانی کا خطرہ اسے درپیش نہ ہوگا۔ پھر وہ ہمارے قریب کیوں موجود نہیں ہے؟

"طالوت!" میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔

"کیا بات ہے دلاور خان؟" شہباز خان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں خان بابا!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کیا کہتا طالوت کے بارے میں۔

"ہمارے کو یقین ہے دلاور خان کہ دلیر خان زندہ ہے۔ وہ لوگ سرنگ میں اس کا لاش تلاش کر رہے تھے پر انہیں لاش نہیں ملا۔ ایک آدمی مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتا تھا؟"

"وہ اس طرح نہیں مر سکتا، خان بابا! اس کی طرف سے بے فکر رہو۔"

"اوہ...... ہم فکر نہیں کرتا۔ مردوں کی طرح موت کو گلے لگانے کو تیار ہے۔ بس ہمیں ایک افسوس رہے گا۔ مرنے سے پہلے ہم نے سرتاج خان اور دولت خان کا لاش نہیں دیکھا۔"

میں خاموش رہا۔ ویسے ہی ذہن پر جھلاہٹ سوار تھی۔ میں اتنا بہادر نہیں تھا کہ مرنے سے پہلے کسی کی لاش دیکھنا پسند کرتا اور پھر خاموشی سے مر جاتا۔ میں جانتا تھا، طالوت ہر قسم کے حالات بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ لیکن وہ چلا کہاں گیا؟ کیا پھر کسی اُلجھن میں پڑ گیا؟ اگر اس بار بھی وہ کسی اُلجھن میں پڑ گیا ہے تو پھر خدا ہی حافظ ہے اس بار شکر جیسے کسی بدمعاش سے واسطہ نہیں بلکہ خونخوار قبائلی مقابل ہیں جن کے لئے گولی چلا کر کسی کو مار دینا ہنسی کھیل ہوتا ہے۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے خان بابا؟" میں نے پوچھا اور شہباز خان ہنس پڑا۔

"کھانے اور سونے کے علاوہ اور کیا کام ہو سکتا ہے دلاور خان! آرام کرو یار! جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

"مجھے اپنے دوست کی فکر ہے۔"

"زندگی ہے تو آ ملے گا۔ ورنہ مرنے کے بعد اسے تلاش کر لیں گے۔ فکر مت کرو۔" اور میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ ٹھیک کہتا ہے شہباز خان۔ بوڑھا مجھے واقعی دلاور خان سمجھتا ہے۔ لیکن میں اسے کیسے بتاؤں کہ بھائی! میں ہر طرح سے ایک معمولی انسان ہوں۔ میری دلیری کا راز ایک جن کی مٹھی میں ہے۔ ورنہ حشمت برادرز کے ایک کلرک کا مہمات سے کیا تعلق۔

دفعتہً ہم چونک پڑے۔

چھ سات دراز قد قبائلی ہماری طرف آ رہے تھے۔ وہ حسب معمول مسلح تھے۔ اور ان کے چہرے خشمگیں نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میرے کٹہرے کا تالا کھولا۔ اور پھر دوسرے کو اشارہ کیا۔ دو آدمی اندر گھس آئے۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ سامنے کر کے ان میں زنجیریں ڈال دیں اور پھر مجھے باہر نکال لیا گیا۔ یہی سلوک شہباز خان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے ہم دونوں کو آگے دھکیلتے ہوئے چلنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے۔

''کہاں لے چل رہے ہو خاناں؟'' شہباز خان نے پوچھا۔

''دولت خان کے پاس۔''

''تم دولت خان کے آدمی ہو؟''

''ہاں۔''

''مجھے ایک بات بتا دو۔''

''کیا بات؟''

''میرے بیٹے رحمان خان کو کس نے قتل کیا تھا؟''

''یہ بات تمہیں دولت خان ہی بتائے گا۔''

''کیا یہ قید خانہ دولت خان ہی کا ہے؟''

''ہاں۔''

''تو اس چور نے بہت پاؤں نکال لئے ہیں۔ کیا اس علاقے کا جرگہ ختم ہو گیا؟''

''دولت خان، جرگے کا سردار ہے۔''

''اوہ...... پھر یہاں انصاف کون کرتا ہے؟'' شہباز خان نے مایوسی سے کہا۔

''دولت خان۔''

''میں جانتا ہوں، دولت خان کیسا انصاف کرتا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے، تاسیہ کے لوگ سخت مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔ افسوس...... افسوس! کیا خان زورات کو تاسیہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟''

''آدھے سے زیادہ تاسیہ، دولت خان کی ملکیت ہے۔ خان زورات اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

''ہاں...... ظالم کی رسّی دراز ہوتی ہے۔'' شہباز خان نے ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ قید خانے سے نکل کر ہم ایک پتھریلے راستے پر چل پڑے۔ میں سخت پریشان تھا۔ طالوت کی اتنی دیر تک گمشدگی کا مطلب تھا کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اور اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے، خود ہی کرنا ہے۔

لیکن میں خود کیا کر سکتا تھا، یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ رہ گیا شہباز خان تو ہم نے اس پر اپنی دلیری کا اس قدر سکہ بٹھا دیا تھا کہ وہ میرے خوف زدہ ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

چھوٹے چھوٹے مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ہاں، ہم کسی بلند جگہ پہنچتے تو ہمیں بہت دُور تک بکھری ہوئی بستی نظر آتی۔ لیکن یہ جگہ بستی سے کافی دُور معلوم ہوتی تھی۔ دولت خان کی اپنی ملکیت...... عام بستی والوں کو شاید ابھی تک ہمارے بارے میں نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ پھر پتھروں سے بنے ہوئے ایک بہت بڑے مکان کے دروازے پر ہم رک گئے۔

ہمارے ساتھ آنے والوں نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک بہت بڑا صحن تھا، جس کے ایک سرے پر کرسیاں پڑی تھیں۔ ان کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کھڑا سرتاج خان مجھے نظر آ گیا تھا۔ اس کے سامنے والی کرسی پر ایک خونخوار شکل کا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ اور یقیناً یہی بوڑھا، دولت خان ہو سکتا تھا۔ سرتاج خان سے اس کی شکل بہت ملتی جلتی تھی۔ وہ مضحکہ خیز نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہمیں لانے والوں نے ہمیں ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بوڑھے دولت خان کی صحت قابل رشک تھی۔ اس عمر میں بھی وہ دیو معلوم ہوتا تھا۔ سرخ چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

''اوہ...... شہباز خان! میرے دیرینہ شناسا! تم خیریت سے تو ہو؟'' اس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں دولت خان! میں اسی لئے خیریت سے ہوں کہ ایک دن تیری گردن مروڑ دوں۔'' شہباز خان نے غرّاتے ہوئے کہا۔

''ارے، ارے...... شاید تم پاگل ہو چکے ہو۔ کیوں نوجوان! کیا اس بوڑھے کا دماغ خراب ہو چکا ہے؟'' اس بار اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''ہاں۔ اور آج کل یہ اپنے دشمنوں کا حساب چکاتا پھر رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''خوب...... خوب......'' دولت خان نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ بھی خوب بولتا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

''یہ سب تیرے بے غیرت مصاحب معلوم ہوتے ہیں دولت خان!'' شہباز خان نے کہا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی ہنسی رُک گئی۔ اُن کے چہروں پر برہمی کے آثار نظر آنے لگے۔

''جانے دو بھئی۔ موت کو دیکھ کر آدمی بدحواس ہو ہی جاتا ہے۔ یہ میرا دیرینہ شناسا ہے، اس لئے اسے معاف کر دو۔''

''دیرینہ دشمن کیوں نہیں کہتے، دولت خان! کیا میری دشمنی سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہے؟''

''دشمن......!'' دولت خان پھر ہنس پڑا۔ ''دشمن وہ ہوتے ہیں، شہباز خان! جن کی کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ میں جب چاہتا، تمہیں مسل سکتا تھا۔''

''اسی لئے جرگے کے سامنے فریاد لے کر گئے تھے دولت خان! اسی لئے مجھے بستی سے نکلوایا تھا؟''

''میں نے جرگے سے کوئی فریاد نہیں کی تھی۔ بستی سے تمہارا نکلنا تمہارے ہی حق میں بہتر تھا شہباز خان! میں نے سوچا، تمہارے دو بھائی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اگر تم یہاں رہے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔ اس لئے میں نے تمہارے اوپر رحم کیا۔ اور دیکھ لو! تمہارے جانے کے بعد تمہارا خاندان امن کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ میں نے کسی کو پریشان نہیں کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری عورتوں نے میرے خوف سے نُر جننا ہی چھوڑ دیئے۔''

''اور میرے نُر سے خوف زدہ ہو کر تم نے اپنے کتوں سے اسے مروا دیا۔ کیوں؟''

''رحمان خان کی بات کر رہے ہو؟ وہ اسی قابل تھا۔ اس نے ہماری عزت کی طرف نگاہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ کیا میں اسے شہر سے بلانے گیا تھا؟ میں نے تو تمہارے خاندان کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دشمنی

اُن سے کی جاتی ہے، جن کی کوئی حیثیت ہوتی ہے۔تمہاری دشمنی میرے لئے کیا حقیقت رکھتی ہے۔"
"میں گرفتار ہو چکا ہوں دولت خان! میرے ہاتھوں میں زنجیریں ہیں، ورنہ میں تمہیں بتاتا میری دشمنی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے جانباز سے پوچھ لو۔" شہباز خان نے سرتاج خان کی طرف اشارہ کیا اور سرتاج خان کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار پھیل گئے۔
"کیا مطلب؟" دولت خان نے سرتاج خان کی طرف دیکھا۔
"میرا سامان میرے حوالے کر دو تو بتاؤں۔" شہباز خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تمہارے سامان میں کیا ہے؟"
"تمہارے دلیر بیٹے کے کپڑے، جنہیں چھوڑ کر یہ بھاگ آیا تھا۔"
"کیا کہہ رہا ہے یہ سرتاج خان؟" دولت خان نے سرتاج خان سے پوچھا۔
"میرے خیال میں یہ بالکل پاگل ہو گیا ہے بابا!" سرتاج خان نے سنبھل کر حقارت سے کہا۔
"اوہ......تو اس کا مطلب ہے، سرتاج خان! کہ تمہارے کپڑے تمہارے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ مگر مجھے بتاؤ تو سہی، میرے جانباز! تم نے وہ حرکت کیوں کی تھی؟" شہباز خان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
"مجھے اجازت دو بابا! کہ میں اس کی زبان کاٹ دوں۔" سرتاج خان غصے سے چیخا۔
"مگر یہ بکواس کیا کر رہا ہے؟" دولت خان نے پوچھا۔
"مجھے نہیں معلوم۔"
"مجھ سے سنو دولت خان! تمہارے دلیر بیٹے کی کہانی میں تمہیں سناؤں گا۔ اس کی تصدیق ان لوگوں سے کرو، جو اس کے ساتھ گئے تھے۔ جس وقت یہ ہمارے سامنے پہنچا تو اس نے ہم سے جنگ کی اجازت طلب کی، جسے دلیر خان نے قبول کر لیا۔ ہاں، وہ جیالا نہتا تھا اور تمہارے بیٹے کے ہاتھ میں شمشیر براں تھی۔ لیکن تمہارا دلیر جانباز کبھی اپنے ساتھیوں کے پیچھے جا چھپتا، کبھی کسی چٹان کے عقب میں۔ یہاں تک کہ تمہارے سارے جوان اسے چھوڑ کر بھاگ نکلے اور وہ لباس چھوڑ کر چلا آیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، سرتاج خان؟"
"کیا بکتا ہے ذلیل بوڑھے؟......کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"
"جس باپ کی تُو اولاد ہے، اسے دیکھ کر تجھے جھوٹ بولتے دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوتی۔" شہباز خان نے حقارت سے کہا۔
"سچ مچ تو پاگل ہی ہو گیا ہے، شہباز خان! میری سمجھ میں نہیں آتا، میں تجھے کیا سزا دوں۔"
"اس دیوانے نے گلباغ خان اور نوریز کو قتل کر دیا ہے بابا!" سرتاج خان نے بتایا۔
"کیا......؟" بوڑھا اُچھل پڑا۔
"ہاں......نوریز کے ایک آدمی نے یہ اطلاع مجھے دی تھی، اسی لئے میں اس کی سرکوبی کو گیا تھا۔"
"یہ قبول رہا ہے، دولت خان!" شہباز خان مسکرایا۔
"کیا......کیا یہ حقیقت ہے کہ......کہ تُو نے ان دونوں کو قتل کر دیا ہے؟"
"ہاں......میں نے تیرے دونوں کتے ہلاک کر دیئے ہیں۔"
"اوہ......اوہ......یہ بات مجھ تک کیوں نہیں پہنچی؟" دولت خان غرّایا۔

''اس میں کچھ دوسری باتیں بھی شامل تھیں دولت خان! سرتاج خان تجھے یہ کیوں بتاتا؟''
''شہباز خان کی گفتگو کی کیا حقیقت ہے سرتاج خان! جواب دو۔ میں تحقیقات کرلوں گا۔ اور میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ میرا بیٹا مجھ سے بھی جھوٹ بولے۔''
''مجھے اسے قتل کرنے کی اجازت دی جائے بابا! اس نے ہمارے دو آدمی مار دیئے ہیں۔''
''پہلے میں اس کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔'' دولت خان غرّایا۔
''میں نہیں جانتا، کیا ہوا تھا۔ لیکن میں نے بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔'' سرتاج خان سرد لہجے میں بولا۔
''کیا تُو نے اس کے ساتھی سے جنگ کی تھی؟''
''ہاں...... اس نے مجھے جنگ کے لئے للکارا تھا۔''
''پھر...... اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوا؟''
''میں نہیں بتا سکتا، بابا! ممکن ہے تُو میری بات کو جھوٹ سمجھے۔''
''تُو میرے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت کرسکتا ہے؟'' دولت خان غرّایا۔
''نہیں...... ہرگز نہیں۔ لیکن نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ پہلے میری ٹوپی ہوا میں بلند ہو گئی۔ پھر میرا زیرجامہ کھل گیا۔ اور...... اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا، جیسے میرے بدن پر چھپکلیاں رینگ رہی ہوں۔ ایسی حالت میں، میں کیا جنگ کرسکتا تھا؟ میں نے ایک چٹان کے عقب میں جاکر لباس اُتار کر دیکھا۔ لیکن اسی وقت میرے ساتھی مجھے چھوڑ کر بھاگ پڑے اور میں لباس بھی نہیں پہن سکا۔''
''تُو بھی وہاں سے فرار ہو گیا؟''
''ہاں بابا!'' سرتاج خان نے گردن جھکا کر کہا۔
''اس کے بعد کی باتیں بھی معلوم کرو، دولت خان!'' شہباز خان چہک کر بولا۔
''بابا!...... بابا! کیا میں اسے قتل کردوں؟ مجھے اجازت دو۔ ورنہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''
''اس کے بعد کیا ہوا، سرتاج خان؟'' دولت خان سرد لہجے میں بولا۔
''ہم نے درّے سے اس پر گولیاں چلائیں۔ لیکن یہ تینوں وہاں سے بھی بچ نکلے۔ تب ہم نے اُنہیں تاسیہ آنے والی سرنگ میں داخل ہوتے دیکھا اور ہم نے ان پر پانی کھول دیا۔''
''گویا انہیں گرفتار کرنے کے لئے تیرے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا؟'' دولت خان غرّایا۔
''میں تمہیں حقیقت بتا چکا ہوں۔''
''اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ کیا تُو اس حقیر شخص کو مافوق البشر کہنا چاہتا ہے؟''
''میں کہہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' سرتاج خان نے کہا اور پھر وہ تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ دولت خان خونخوار نگاہوں سے مجھے اور شہباز خان کو دیکھنے لگا۔
''تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟'' اس نے سانپ کے مانند پھنکارتے ہوئے پوچھا۔
''تاسیہ آنے والی سرنگ میں ہمارے ساتھ چلو۔ پانی کھول دو۔ اور اس کے بعد تم اپنا نام بتا سکو تو ہم تمہیں اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں ضرور بتا دیں گے، دولت خان!'' شہباز خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سرتاج خان نے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے، شہباز خان! لیکن وہ ابھی بچہ ہے۔ میں تیرے تیسرے ساتھی کو تلاش کراؤں گا اور سرتاج خان کو اس سے میرے سامنے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سے قبل تم لوگوں کو قتل نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے تیسرے ساتھی نے سرتاج خان کو قتل کر دیا تو یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو آزاد کر دوں گا۔ میں کسی بزدل بیٹے کا باپ بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''اگر ہمارا تیسرا ساتھی نہ مل سکا، تو؟''

''تو پھر اس دوسرے آدمی کو سرتاج خان سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔'' بوڑھے شہباز نے کہا اور میری جان نکل گئی۔ تیرا ستیاناس بوڑھے! مجھے کیوں پھنسا دیا؟...... میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ تب بوڑھے خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔

''لے جاؤ...... ان دونوں کو بند کر دو۔ اور ان کے تیسرے ساتھی کو تلاش کرو۔ اس کے بعد ہی ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔'' اور دولت خان کے آدمی ہمیں لے کر واپس چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں اسی قید خانے میں بند کر دیا گیا

''تم فکر مت کرو دلاور خان! اس نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں جنگ کرنے کا موقع دے گا۔ میں صرف دولت خان کے سینے پر ویسا ہی داغ لگانا چاہتا ہوں، جیسا میرے سینے پر موجود ہے۔ جنگ کے میدان میں، میں تمہاری مدد کروں گا۔''

''کیا دولت خان اتنا ہی بے وقوف ہے؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ تمہیں اس کا موقع دے دے گا؟''

''اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ دلیر خان بڑا کھلنڈرا تھا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر وہ چاہتا تو باآسانی سرتاج خان کو قتل کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے تو تلوار بھی نہیں لی تھی۔ تم اس کی بہ نسبت سنجیدہ ہو۔ تم تلوار قبول کر لینا۔ مجھے تمہارے بازو کی قوت پر بھروسہ ہے۔''

'مروا دیا بڑے میاں!' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ 'ارے میرے بازو بہت ناتواں ہیں۔ میں اس پہاڑ سے کیا مقابلہ کروں گا؟ طالوت کی دوسری بات تھی۔ واہ طالوت!...... خیر، تمہارے ساتھ رہ کر ایک نہ ایک دن تو یہی حشر ہونا تھا...... لیکن آخر وہ گیا کہاں؟...... کس چکر میں پھنس گیا؟'

یہ بات تو سوچنا بے کار ہی تھی کہ وہ پانی کی سرنگ کا شکار ہو گیا۔ طالوت اس طرح شکار ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ بہرحال، دیکھنا یہ ہے کہ قسمت میں کیا لکھا ہے!

قبائلیوں کی روایتی مہمان نوازی کا مجھے ان غاروں میں قائل ہونا پڑا۔ گو ہم قیدی تھے...... دولت خان ایک بدفطرت انسان تھا...... لیکن کھانے پینے کی ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وقت پر کھانا ملتا اور نہایت عمدہ۔ پورے تین روز اس قید میں گزر گئے۔ اور اب میں اُکتا گیا تھا۔ اچھا ہے، جلدی سے یہاں سے نکلا جائے...... جنگ ہو...... اور فیصلہ ہو جائے۔ اِس پار یا اُس پار۔ یوں بھی زندگی میں کیا رکھا ہے۔ طالوت نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ آ بھی جائے تو بے کار ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسی طرح مارے جانا ہے۔

نہ جانے کیا کیا اُلٹے سیدھے خیالات ذہن میں آتے رہتے تھے۔ طبیعت پر سخت بیزاری طاری تھی۔ گزرے ہوئے واقعات ذہن کے پردے پر چکراتے رہتے۔ دل چاہتا کسی بارے میں نہ سوچوں لیکن ان خیالات سے پیچھا چھڑانا مشکل ہی ہو جاتا۔

آج چوتھا دن تھا۔ صبح کے عمدہ ناشتے سے فارغ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ موت کا پروانہ آ گیا۔ بہت سے مسلح آدمی قید خانے میں آ گئے تھے۔

''دولت خان نے تمہیں طلب کیا ہے شہباز خان!''

''کیا بات ہے؟''

''اس نے کہا ہے کہ تمہارا تیسرا ساتھی نہیں مل سکا۔ اس لئے تمہارے دوسرے ساتھی کو سرتاج خان سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔''

''اوہ...... ٹھیک ہے۔ ہم تیار ہیں۔'' شہباز خان نے سینہ نکال کر کہا اور میرا دل چاہا کہ بوڑھے کے سینے میں خنجر بھونک دوں۔ کس دلیری سے میرے قتل کا سامان کر رہا ہے۔ لیکن غلطی اس کی نہیں تھی۔ طالوت نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔

بہرحال، ہم چل پڑے اور اسی صحن میں پہنچ گئے، جسے میدانِ جنگ بنا دیا گیا تھا۔ آج یہاں کافی لوگ موجود تھے۔ دولت خان بھی تھا...... سرتاج خان بھی...... اور دوسرے بے شمار لوگ۔

دولت خان ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ ''تمہارے ساتھی کا حال پتلا تو نہیں ہے شہباز خان؟''

''شیروں کی دوستی شیروں سے ہوتی ہے، گیدڑوں سے نہیں۔'' شہباز خان نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔

''خود تمہارے خون میں بھی گرمی پائی جاتی ہے شہباز خان! یا اب صرف دوسروں کے بل پر اکڑتے ہو؟'' دولت خان نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

''تم جیسے بزدل چوہوں سے اب بھی نمٹ سکتا ہوں دولت خان! آ جاؤ، ہمارے تمہارے درمیان ہی فیصلہ ہو جائے۔''

''میں لڑنا بھڑنا چھوڑ چکا ہوں شہباز خان!..... ہاں، تمہاری خواہش پوری کی جا سکتی ہے۔ کیا تم جنگ کرو گے؟''

''مقابل کے بارے میں پتہ چل جائے تو۔'' شہباز خان نے کہا۔

''وہ...... جس نے تمہارے بیٹے رحمان کو قتل کیا ہے۔''

''آہ..... آہ...... کہاں ہے وہ؟...... دولت خان! اسے میرے سامنے لے آ...... میں تیرے سارے گناہ معاف کر دوں گا۔ میں تجھے زندگی بخش دوں گا۔'' شہباز خان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''لیکن تم اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے۔''

''کیا مطلب؟...... کیوں؟''

''بس...... یہ میری شرط ہے۔ تمہاری اور اس کی دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ تم دونوں کے منہ میں ربر کے ٹکڑے دے دیئے جائیں گے۔ تم ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر سکو گے۔''

''یہ انوکھی شرط ہے۔'' شہباز خان حیرت سے بولا۔

''میں نے جنگ کے دلچسپ طریقے ایجاد کئے ہیں۔ بولو! اپنے بیٹے کے قاتل سے مقابلہ کرو گے؟''

''میں تیار ہوں...... میں تیار ہوں۔'' شہباز خان نے غرّاتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ انوکھی شرط میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ آخر دولت خان اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور پھر کیا یہ جنگ خطرناک نہ ہوگی؟...... اگر شہباز خان بھی مارا گیا تو پھر میں تنہا رہ جاؤں گا۔ لیکن شہباز خان اس داؤ پر چت ہو گیا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ اس کے بیٹے کا قاتل وہی ہو، جس سے دولت خان اسے لڑا رہا ہے۔ لیکن اب شہباز خان کو روکنا بھی مشکل تھا۔ وہ بیٹے کے قاتل سے جنگ کرنے کے نشے سے سرشار تھا۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے مقابلے کی تیاریاں کی جائیں۔'' دولت خان نے کہا۔ ''تم دونوں خنجروں سے مقابلہ کرو گے تا کہ ایک دوسرے سے قریب آسکو۔''

اور پھر شہباز خان کو اس کی پسند کا خنجر دے دیا گیا۔ ایک سیاہ رنگ کی پٹی اس کی آنکھوں سے باندھ دی گئی اور پھر اس کے چہرے پر ایک ایسا تھیلا چڑھا دیا گیا، جس سے وہ سانس وغیرہ لے سکے۔ خنجر اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔

میں تھوک نگلتے ہوئے اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، جس سے قاتل کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ آہ...... طالوت کہاں مر گیا؟ ساری سچویشن دولت خان کے ہاتھ میں ہے۔ ہم بے بس ہیں اور ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیکن میرے کانوں میں کوئی آواز نہ گونجی۔ اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا!

اور پھر ایک دروازے سے ایک نوجوان قیدی کو اندر لایا گیا۔ اس کے چہرے پر بھی تھیلا بندھا ہوا تھا۔ لیکن وہ تندرست و توانا اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔

گئے بڑے میاں......! میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دونوں کے منہ میں ربر کے ٹکڑے دبا دیئے گئے۔ بظاہر یہ اس لئے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی آواز پر حملہ نہ کر سکیں۔ اور پھر ایک آدمی ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ یہ ان دونوں کو لڑانے والا تھا۔

''تم دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو۔ تمہارے درمیان صرف چار فٹ کا فاصلہ ہے۔ مقابلے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' تیسرے آدمی نے کہا اور دونوں خنجر تولنے لگے۔ لڑنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے دولت خان کی طرف دیکھا۔ دولت خان ایک سرخ رومال اٹھائے ہوئے تھا۔ پھر اس کا ہاتھ ہلا اور اس کے ساتھ ہی لڑانے والے نے کہا۔

''شاباش...... حملہ کرو۔''

شہباز خان نے اپنی طرف سے کہیں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا خنجر صرف چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا تھا۔ ورنہ قیدی کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ قیدی نے بھی اپنا لمبا ہاتھ گھمایا۔ اس کا وار بھی بے حد خطرناک تھا۔ شہباز خان کے بازو کی آستین پھٹ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شہباز خان نے دوسرا حملہ کر دیا تھا۔ قیدی صرف اندازے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بھی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

میں سانس روکے اس سنسنی خیز مقابلے کو دیکھ رہا تھا۔

لڑانے والے کی آواز اُبھری۔ ''اب تم لوگ پھر ایک دوسرے سے فاصلے پر چلے گئے ہو۔ نوجوان قیدی! تمہارا دشمن تمہارے بائیں طرف ہے اور بوڑھے! تمہیں دائیں طرف حملہ کرنا ہے۔''

دونوں پھر تیار ہو گئے۔ اور اس بار مجھے خطرہ ہوا کہ دونوں میں سے ایک گیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں

ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ لڑانے والا خود بھی اُچھل اُچھل کر انہیں پوزیشن بتا رہا تھا۔
لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ خود دولت خان بھی ہنس رہا تھا۔ البتہ سرتاج خان خاموش تھا۔ وہ شاید مجھ سے بھی خائف تھا۔ کیونکہ اس کا پہلا تجربہ اچھا نہیں تھا۔
اس بار پھر شہباز خان نے خوفناک حملہ کیا اور اچانک میں اُچھل پڑا۔ لڑانے والا شخص اس طرح اُچھل کر شہباز خان کی طرف آیا تھا جیسے کسی نے اس کی کمر پر لات رسید کر دی ہو۔ شہباز خان کو آہٹ مل گئی تھی، چنانچہ دوسرے لمحے اس کا خنجر لڑانے والے کے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ خود لڑانے والے کی چیخ بڑی دراز تھی۔ شہباز خان نے سمجھا کہ اس نے اپنے دشمن کا کام کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ دشمن کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے قبل کہ لوگ شہباز خان کو روکیں، اس نے پے در پے لڑانے والے پر کئی وار کر ڈالے اور وہ زمین پر گر پڑا۔
دولت خان اس عجیب وغریب سانحے پر پریشانی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے دانت پیس کر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ”قیدی کو لے جاؤ۔“
اور دو تین آدمیوں نے قیدی کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔
”اوہ...... شہباز خان!...... اوہ، شہباز خان! یہ تُو نے کیا کِیا؟“ دولت خان غرّایا اور شہباز خان کے منہ سے ربر نکال کر پھینک دیا۔ اس نے خون آلود خنجر لہراتے ہوئے کہا۔
”میں نے دشمن کا کام تمام کر دیا ہے۔ میری آنکھوں کی پٹی کھولو۔“
”او بے وقوف...... گدھے!...... تُو نے...... تُو نے دوسرے آدمی کو قتل کر دیا ہے۔“
”کیا مطلب؟“ شہباز خان حیرت سے بولا۔
”اوہ...... اس کی آنکھیں کھول دو۔“ دولت خان نے کہا اور کچھ لوگوں نے شہباز خان کی آنکھیں کھول دیں۔ حقیقت معلوم ہونے پر شہباز خان بھی ششدر رہ گیا تھا۔
لیکن میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کیا لڑانے والا اتفاق سے اُچھل کر شہباز خان کے خنجر کی زد پر آ گیا تھا؟...... یا...... یا پھر......
”طالوت......!“ میں نے کسی موہوم سی اُمید پر آواز دی۔
”معاف کر دے یار عارف!...... صرف ایک بار معاف کر دے۔“ مجھے اپنے کان کے قریب ہی طالوت کی سرگوشی سنائی دی۔ اور میرا دل چاہا کہ خوشی سے پاگلوں کی طرح چیخنے لگوں۔ میری زبان گنگ ہو گئی۔ ”خدا کی قسم!...... زندگی بھر سامنے نہیں آؤں گا، اگر تُو نے صدقِ دل سے مجھے معاف نہ کر دیا۔“ طالوت کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔
”تم خیریت سے تو ہو نا؟“
”بالکل...... بالکل...... اور یقین کرو کہ راسم تمہاری خبر گیری کر رہا تھا۔ اگر تم ایک بار بھی اسے آواز دیتے تو وہ تمہیں تسلی دے دیتا۔“
”خیر...... تم سے گفتگو پھر کروں گا۔ موجودہ پچویشن سے واقف ہو؟“
”اچھی طرح۔ ورنہ ان دونوں کو لڑانے والا خود مار کیسے کھا جاتا؟“
”ہوں...... مجھے شبہ تھا۔ اب کیا کرنا ہے؟ سرتاج خان سے مجھے جنگ کرنی ہے۔“

''تو کرو۔اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟''
''میرا تو ہارٹ فیل ہوا جا رہا تھا۔اور تم کہہ رہے ہو گھبرانے کی کیا بات ہے۔''
''جنگ نہیں کرنا چاہتے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''لعنت ہے۔'' میں دانت پیستے ہوئے بولا۔
''ٹھیک ہے۔ وہ تم سے نہیں لڑے گا۔ اور اگر میں اس وقت یہاں نہ بھی آتا، تب بھی راسم تمہاری مدد کو موجود تھا۔ بہر حال، غائب تو رہا ہوں لیکن ایسی دُور کی لایا ہوں کہ سارے گناہ معاف کر دو گے۔''
''فی الحال تو اپنی پڑی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہوتا ہے۔'' میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ شہباز خان احمقوں کی طرح اس لاش کو دیکھ رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے شکار ہوا تھا۔
''اس میں میرا کیا قصور ہے دولت خان! یہ خود سامنے آ گیا تھا۔'' شہباز خان نے کہا۔
''اب تیرا کیا خیال ہے شہباز خان؟''
''میں نہیں جانتا، تُو نے اپنے لڑاکے کو بھگا کیوں دیا۔ میں اب بھی اس سے جنگ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تیرا تماشا زیادہ دلچسپ نہیں رہا۔ ہم دونوں کو کھلی آنکھوں سے لڑنے دے۔ اصل تماشا اس وقت ہو گا۔''
''تیرا ساتھی کیا کہتا ہے؟ کیا تُو اپنے وعدے کو پورا کرے گا؟''
''دلاور خان شیر ہے، گیدڑ نہیں۔ وہ تیار ہے۔'' شہباز خان نے کہا۔ اور میں نے کلکلا کر بوڑھے کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کمبخت میری جان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اگر طالوت اس وقت بھی نہ آتا تو اس بوڑھے نے مروا دیا تھا۔
''تو ٹھیک ہے۔ میرا شیر بھی میدان میں آنے کو تیار ہے۔ سرتاج خان!''
''بابا......!'' سرتاج خان نے خطرناک تیور سے کہا۔ شاید اس کی رگوں میں بھی خون نے جوش مارا تھا۔
''سامنے آؤ اور اپنا شکار حاصل کر لو۔''
''میں تیار ہوں بابا!'' سرتاج خان نے چوڑی اور وزنی تلوار سونتتے ہوئے کہا۔
''طالوت......!'' میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں طالوت کو پکارا اور طالوت کی ہنسی میرے کانوں میں گونج اُٹھی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تلوار طلب کرو۔''
''دل بھر گیا ہے مجھ سے؟''
''نہیں میری جان! تم سے تو ایسا دل لگا ہے کہ کبھی بھر ہی نہیں سکتا۔ جو میں کہہ رہا ہوں، کرتے رہو۔''
''اچھا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور پھر میں بھی آگے بڑھ آیا۔ ''کیا مجھے تلوار نہیں ملے گی؟'' میں نے زوردار آواز میں کہا۔
''اسے اس کی پسند کی تلوار دو۔'' دولت خان نے گرج کے کہا۔ اور بہت سی تلواریں میرے سامنے لائی گئیں۔ میں نے ان میں سے ایک تلوار اٹھا لی۔ بھلا مجھے اس دھار دار ہتھیار سے کیا دلچسپی تھی؟ صحیح

معنوں میں مجھے یہ ہتھیار سنبھالنا بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن بہرحال مجھے تلوار لے کر سرتاج خان کے مقابل آنا پڑا۔ سرتاج خان کے چہرے پر بظاہر جوش کے آثار تھے لیکن آنکھوں سے دبے دبے خوف کی پرچھائیاں بھی جھلک اُٹھتی تھیں۔ پہلا تجربہ اسے یاد تھا۔

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں کیسے مسکرایا تھا۔ ابھی تک طالوت کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں خود پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

دولت خان نے پھر سرخ رومال اُٹھا لیا تھا اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ دیکھنے والوں کے چہروں سے بھی جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور پھر دولت خان نے جھٹکے سے رومال نیچے کر دیا۔

سرتاج خان نے پینترا بدلا۔ اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن...... اچانک سرتاج خان نے ایک پاؤں اٹھا کر گھٹنے پر رکھ لیا۔ تلوار کی نوک کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھ لیا اور رقص کے ایک دلفریب پوز میں آ گیا۔

''ہا، طالوت......'' میں نے دل ہی دل میں ہانک لگائی۔

سرتاج خان یہ پوز بنا کے مسکراتا رہا۔ اس نے بڑی ادا سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا اور گردن ناز سے مٹکا رہا تھا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کسی فاحشہ عورت کے انداز میں دولت خان کو آنکھ ماردی اور دولت خان کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ دوسرے لوگ بھی احمقوں کے انداز میں دیوہیکل سرتاج خان کو دیکھ رہے تھے جو جنگ کرنے کے بجائے رقص کرنے کے موڈ میں نظر آتا تھا۔

میں آگے بڑھا اور میں نے تلوار کی نوک سرتاج خان کی کمر میں چبھو دی۔ وہ شرمائے ہوئے انداز میں لچک کر رہ گیا اور پھر زنانی آواز بنا کر بولا۔ ''اُوئی اللہ...... مان جاؤ!''

''سرتاج خان......!'' دولت خان کی دہاڑ زبردست تھی۔ ''تو اپنے باپ کے سامنے ہے۔''

''ہائے...... میں مر جاؤں......'' سرتاج خان نے تلوار پھینک کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

''قتل کر دو، دلاور خان!...... اسے قتل کر دو۔ تمہارا دشمن تمہاری تلوار کی زد پر ہے۔'' دولت خان حلق پھاڑ کر دہاڑا۔

''یا اللہ...... رحم کر...... مجھے میرے ظالم باپ سے بچا۔'' سرتاج خان نے دونوں ہاتھ کلیجے پر رکھ لئے۔ وہ کسی وحشت زدہ حسینہ کی طرح اکڑوں بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

''مبارک ہو دولت خان! تیرے بیٹے کی اصلیت سامنے آ گئی۔''

''قتل کر دو...... اسے قتل کر دو۔'' دولت خان پاگلوں کی طرح چیخا۔

''اے اللہ...... اے اللہ......'' سرتاج خان کانپتی آواز میں بولا۔ ''بچا لے میرے مولا!...... میری عزت بچا لے۔'' اور دولت خان اس پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے ہاتھ سے تلوار چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن اس دوران سرتاج خان ریس کر گیا تھا۔ وہ دونوں ٹانگیں چوڑی کر کے عجیب بے تکے انداز میں بھاگ رہا تھا۔

اور اب لوگوں کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ اور دولت خان کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ پھر وہ مجھ پر اُلٹ پڑا۔

''تم...... تم نے اسے قتل کیوں نہیں کر دیا؟...... جواب دو۔ کیا اس جرم کے بدلے میں تمہیں قتل نہ

کر دوں؟"

"ہم ہمیشہ مردِ میدان پر ہاتھ اُٹھاتے ہیں دولت خان! بزدلوں کو قتل کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔" شہباز خان نے کہا۔

"لے جاؤ، بند کر دو انہیں۔ لے جاؤ۔" دولت خان پاگلوں کے انداز میں دہاڑا اور بہت سے لوگوں نے ہمیں پھر جکڑ لیا۔ ایک بار پھر ہمیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بوڑھا شہباز خان راستے بھر ہنستا رہا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگتا۔

"واہ رے دولت خان! کیا شاندار جوان پیدا کیا ہے۔" وہ کہتا اور ہنسنے لگتا۔ لیکن جب ہم غار میں داخل ہوئے تو چونک پڑے۔ خاص طور سے بوڑھے شہباز خان کا منہ حیرت سے پھیلا رہ گیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ فرش پر طالوت گھٹنوں میں منہ دیئے سو رہا تھا۔ شہباز خان پہلے تو حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا رہا۔ ہمیں لانے والوں نے ہمیں باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر اچانک شہباز خان مسرت سے بھرپور آواز میں چیخا۔

"اوئے دلیر خان!......اوئے دلیر خاناں!"

اور پھر وہ سوئے ہوئے طالوت سے لپٹ گیا۔ "تُو آ گیا دلیر خاناں! تُو زندہ ہے میرے بیٹے؟...... تُو زندہ ہے؟" وہ انتہائی محبت سے طالوت کو بھینچ بھینچ کر کہہ رہا تھا اور طالوت احمقوں کی طرح خاموش تھا۔

"تُو کہاں سے پکڑا گیا ہے میرے بچے؟...... بول، تُو کہاں سے پکڑا گیا؟"

"افریقہ کے جنگلات سے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرا دل تیرے لئے روتا تھا دلیر خان! میں نے یہی سمجھا تھا کہ تُو سرنگ میں کہیں پھنس کر مر گیا۔ آج مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے میرا رحمان خان مجھے واپس مل گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں دلیر خان! مگر تُو چلا کہاں گیا تھا؟"

"بس ایسے ہی.....ان لوگوں کی نگاہوں سے چھپتا پھر رہا تھا، خان بابا!"

"اوئے تُو نے آج کا تماشا نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم، دولت خان کا اس سے بڑا بے عزتی اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا بیٹا نہ مرد ہے نہ عورت۔" شہباز خان نے ایک گرج دار قہقہہ لگایا۔ "مگر پانی کی سرنگ میں تیرے ساتھ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بابا! بس جو تم لوگوں کے ساتھ پیش آئی، وہی میرے ساتھ ہوا۔"

"مگر تجھے زندہ دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ دولت خان انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔"

"لیکن ہم یہاں قید ہونے تو نہیں آئے شہباز خان!"

"لیکن سرنگ میں پھنس کر ہم بند ہو گئے۔ میں تیری وجہ سے اُداس تھا دلیر خان! اب ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

"کل ہم یہاں سے نکل چلیں گے بابا! تم بے فکر رہو۔"

"اب مجھے فکر نہیں ہے۔ میں نے دولت خان کو خوب ذلیل کر دیا ہے۔ مگر اس کا بے عزت بیٹا۔ مجھے تعجب ہے، سرحد کے دلیر ایسی اولاد نہیں پیدا کرتے۔ یہ سرتاج خان کو کیا ہو گیا ہے؟"

اور یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ بے چارے سرتاج خان کو کیا ہوا ہے۔ میرے علاوہ اور کون جان سکتا تھا۔ سرحد کے ان دلیروں کو بڑے بڑے سورماؤں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ لیکن ایسے سورما کہیں نہ ملے ہوں گے۔

رات کو جب بوڑھا شہباز خان سو گیا تو میں نے طالوت کی گردن ناپی۔ ''ہاں اب بتاؤ..... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''باہر چلو گے؟'' طالوت نے میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''آؤ.....!'' طالوت نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر جب میں اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ یہ ان کی مخصوص حرکت تھی، اس کے باوجود میں گڑبڑا جاتا تھا۔ میں نے گرتے گرتے بچنے کے لئے سہارا لیا تو ایک چٹان میرے ہاتھ آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے جھونکے میرے بدن سے ٹکرائے تھے۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہم ایک سنسان علاقے میں کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر تاسیہ کے چراغ روشن نظر آ رہے تھے۔ پوری آبادی خاموش تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر طالوت کی جانب دیکھا۔

''میں بالکل مجبور ہو گیا تھا عارف!'' طالوت نے کہا۔

''میں تمہاری مجبوری کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''بس ایک خاندانی روایت..... ایک انوکھی دعا۔''

''کیا مطلب؟''

''ایک بار میں چاہِ زیمان میں گر پڑا تھا۔ تب والد صاحب قبلہ نے پانی کے قیدی ازعود کو آزاد کیا اور اس نے اس تاریک کنوئیں سے مجھے نکالا۔ اس کنوئیں میں اس کے سوا کوئی نہیں اُتر سکتا تھا۔ والد صاحب نے اس کی خطائیں معاف کر دیں اور اسے مکمل طور سے آزاد کر دیا۔ ہاں، اس کے سپرد ایک کام کر دیا گیا۔ وہ یہ کہ پانی کے ڈوبنے والوں کو وہ بچائے گا۔ تو سرنگ میں اچانک پانی آیا تھا۔ میں بھی ایک لمحے کے لئے گھبرا گیا اور اسی وقت ازعود نے مجھے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

ازعود کو نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔ جب خشکی میں لا کر اس نے میری شکل دیکھی تو اُچھل پڑا۔ کیونکہ اسے بھی میرے فرار کے بارے میں معلوم تھا۔ اس نے میری منت سماجت شروع کر دی کہ میں واپس چلوں۔ میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس علاقے کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ مجبوراً مجھے اسے چکر دینے پڑے۔ میں اسے صحرائے آلام میں لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہاں میرے چند دوست میرے منتظر ہیں، ان سے اجازت لے لوں تو اس کے ساتھ چلوں گا۔ اس دوران میں نے راسم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمہارا خیال رکھے۔ صحرائے آلام کے ایک خوفناک کنوئیں کے نزدیک میں نے چالاکی سے کچھ لباس رکھ دیئے اور پریشانی سے ازعود سے کہا کہ شاید میرے خاکی دوست اس کنوئیں میں پھنس گئے ہیں۔ میں نے ازعود سے عہد لیا کہ جب تک وہ انہیں تلاش نہ کر لے گا، باہر نہیں نکلے گا۔ اور اس نے عہد کر لیا۔ چنانچہ وہ کنوئیں میں داخل ہو گیا اور میں وہاں سے فرار ہو کر یہاں پہنچ گیا۔

آہ...... بے چارہ ازعود۔ اپنے عہد سے مجبور ہو کر اب اس کنوئیں میں میرے خیالی ساتھیوں کو تلاش کرتا رہے گا۔" طالوت نے غم آلود لہجے میں کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"اگر وہ نہ ملے تب بھی وہ باہر نہیں آئے گا؟"

"نہیں۔ اس نے عہد کیا ہے۔"

"تم کسی کو نہیں چھوڑتے طالوت!"

"تمہارے سوا سب کو چھوڑنے کو تیار ہوں...... بس۔"

"یہی بات تھی، جس کی بنا پر تم کہہ رہے تھے کہ میں تمہاری زیادتی معاف کر دوں گا؟"

"نہیں۔"

"پھر......؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" طالوت نے کہا۔ اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔ طویل فاصلہ طے کر کے طالوت ایک دور دراز پہاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس پہاڑی کے ایک غار کے سامنے آگ روشن تھی۔ دیواروں میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں اور بہت سے مسلح قبائلی نظر آ رہے تھے۔ تب طالوت نے راسم کو آواز دی اور راسم سامنے آ گیا۔

"ہمارا سامان۔" طالوت نے اس سے کہا اور راسم نے پلک جھپکتے ہمارا ضروری سامان ہمارے سامنے رکھ دیا۔

"گھوڑوں کا کیا ہوا طالوت؟" میں نے پوچھا۔

"افسوس، گھوڑے نہ بچ سکے۔ تم نے شاید اُن کی لاشیں نہیں دیکھیں۔ پہاڑوں کے دوسری طرف اس جگہ پڑی ہیں جہاں یہ لوگ مُردہ جانور ڈال دیتے ہیں۔" طالوت نے جواب دیا۔

"افسوس۔ عمدہ گھوڑے تھے۔"

"اپنا دوشالہ نکال لو۔" طالوت نے کہا۔

"اوہ......!" میں نے اس کی شکل دیکھی اور پھر اپنے سامان سے شاہ دانا کا دوشالہ نکال لیا۔ راسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے دوشالہ اوڑھ لیا۔ پھر طالوت نے بھی نگاہوں سے اوجھل ہونے کا عمل کیا اور اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر اس غار کی طرف چل پڑا جہاں مسلح پہریدار کھڑے تھے۔ چند پہرے دار غار کے دہانے پر جمے ہوئے تھے۔ ان کی رائفلیں ان کے نزدیک رکھی ہوئی تھیں۔

طالوت نے ہونٹ سکوڑے اور رائفلوں کی طرف پھونکنے لگا۔ رائفلیں اپنی جگہ سے ہلیں اور پھر دُور جا پڑیں۔ پہرے دار چونک پڑے تھے۔ وہ بدحواسی میں رائفلیں اُٹھانے دوڑے۔ اور طالوت نے دوبارہ پھونک مار دی۔ رائفلیں اور دُور جا پڑی تھیں۔ اور غار کا دروازہ خالی ہو گیا۔ تب طالوت میرا ہاتھ پکڑ کر اطمینان سے غار کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹی سرنگ دُور تک گئی تھی۔ اور اس کے اختتام پر ایک اور چھوٹا سا غار تھا۔ لیکن اس غار کے دہانے پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخوں کے پیچھے پتھر کی سِل پر کوئی گھٹنوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

"آؤ......!" طالوت نے کہا اور ہم سلاخوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ "اندر آ جاؤ۔" طالوت نے کہا اور سلاخوں کی درمیانی جگہ سے اندر داخل ہو گیا۔ سلاخوں کی درمیانی جگہ چھ انچ سے زیادہ نہیں تھی۔ طالوت

کا داخلہ ہی حیرت انگیز تھا۔ میں نے بھی اسی کے انداز میں اس چھوٹی سی جگہ سے گزرنے کی کوشش کی اور بلاشبہ یہ تجربہ میرے لئے کافی دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ گویا دوشالہ اوڑھنے کے بعد میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ میں اطمینان سے اندر داخل ہو گیا۔

سونے والا ایک قوی ہیکل جوان تھا۔ لیکن اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، سر کے بال منتشر تھے۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ طالوت اس کے سرہانے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''یہ کون ہے؟'' بالآخر میں نے طالوت سے پوچھا۔

''وہ قیدی۔ جس نے آج شہباز خان سے مقابلہ کیا تھا۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''اوہ...... لیکن اس سے ہمیں کیا سروکار ہے؟''

''زبردست۔'' طالوت پہیلیاں بجھوا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''غور سے اس کی شکل دیکھو۔'' طالوت نے کہا اور میں جھک کر قیدی کو غور سے دیکھنے لگا۔ لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں سیدھا ہو کر سوالیہ انداز میں طالوت کو دیکھنے لگا۔

''کوئی اندازہ؟''

''نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''یہ رحمان خان ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''کون رحمان خان؟'' میں نے کہا۔

''شاید تمہارا ذہن سو رہا ہے۔ کیا تمہیں اس کے چہرے میں شہباز خان کی جھلکیاں نظر نہیں آتیں؟ کیا شہباز خان کے بیٹے کا نام رحمان..... '' طالوت اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں شدت حیرت سے اُچھل پڑا۔

''یہ...... یہ...... لیکن یہ......''

''ہاں...... یہ، یہ...... لیکن یہ...... زندہ ہے...... یہ شہباز خان کا بیٹا رحمان خان ہی ہے اور زندہ ہے۔ اس کی موت کا افسانہ جھوٹا ہے اور کمینہ صفت دولت خان نے آج ان دونوں باپ بیٹوں کو لڑایا تھا۔ غور کرو طالوت! کسی کے ہاتھوں کوئی مارا جاتا...... کیسا دلدوز المیہ ہوتا۔ بوڑھا باپ جو بیٹے کے غم میں سلگ رہا تھا، اگر وہ قیدی کو ہلاک کر دیتا تو دولت خان باپ کو بیٹے کی شکل دکھا دیتا اور کہتا کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خود شہباز خان نے اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ اور اگر رحمان خان، شہباز خان کو قتل کر دیتا تو درندہ صفت دولت خان، بیٹے کا مذاق اُڑاتا کہ اس نے بوڑھے باپ کو قتل کر دیا۔'' طالوت کی آواز اُبھری۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

''میں ان دونوں کے ہاتھوں سے دولت خان یا اس کے بیٹے سرتاج خان کو بھی قتل کرا سکتا تھا۔ لیکن ابھی انہیں کچھ اور سزائیں ملنی چاہئیں، اس لئے انہیں زندہ چھوڑ دیا ہے۔''

''اوہ...... طالوت...... درحقیقت تم نے دنیا کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ بڑے بروقت پہنچے طالوت! اگر ان دونوں کو لڑانے والا ان کے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو دولت خان یہ تماشا جاری رکھتا۔ اور اس کے بعد...... لیکن میرے خدا...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، تم اس بات تک کیسے پہنچے؟''

''میں جس وقت وہاں پہنچا تو دونوں لڑاکے مقابل تھے۔ مجھے ان کے ڈھکے ہوئے چہروں پر حیرت ہوئی۔ تب میں نے ان تھیلوں کے اندر جھانکا اور مجھے اس قیدی میں شہباز خان کی شباہت محسوس ہوئی۔ میں حیران تو ہوا لیکن فوری طور پر کچھ کرنا ضروری تھا۔ میں نے راسم کو ہدایات دیں اور اس نے حالات بدل دیئے۔ بعد میں، میں نے راسم کے ذریعے ہی تحقیقات کرائی اور راسم نے مجھے رپورٹ دے دی۔

''ہاں، تمہارے لئے یہ کیا مشکل تھا؟ لیکن راسم کی رپورٹ کیا ہے؟''

''بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ آؤ....... باہر چل کر سناؤں گا۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں اسی انداز سے قید خانے سے باہر نکل آئے۔

باہر رائفلوں کا ہنگامہ جاری تھا۔ سارے مسلح پہرے دار ایک جگہ جمع ہو کر رائفلیں اُڑ جانے کے حیرت انگیز واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہم اُن سے دُور ایک پتھر پر آ بیٹھے اور طالوت نے کہا۔

''راسم کی رپورٹ کے مطابق جس وقت دولت خان اور سرتاج خان نے رحمان خان کو پکڑا، اس وقت عشق زدہ جوڑا ایک دوسرے میں گم تھا۔ دولت خان کی بیٹی گلفشاں، رحمان خان پر بری طرح مرتی ہے۔ رحمان خان نے سرتاج خان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن گلفشاں درمیان میں آ گئی۔ اس نے کہا، مجرم وہ ہے۔ سزا اسے سنائی جائے۔ وہ دولت خان کی بہت چہیتی ہے۔ دولت خان نے اسے دھمکیاں دیں اور غیرت دلائی کہ وہ اس کے دشمن کے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔

تب گلفشاں نے کہا کہ اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس نے باپ کی منت ساجت کی کہ اس دشمنی کو ختم کر دیا جائے۔ دولت خان نیم راضی تھا لیکن سرتاج خان راضی نہ ہوا۔ وہ ہر قیمت پر رحمان خان کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ تب گلفشاں نے کہا کہ ٹھیک ہے، وہ رحمان خان کو قتل کر دے۔ لیکن گلفشاں پورے تاسیہ میں گھومے گی اور ایک ایک سے کہے گی کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے پیٹ میں رحمان خان کا بچہ ہے۔ شہباز خان کے بیٹے رحمان خان کا۔ چنانچہ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو رحمان خان کے ساتھ اسے بھی قتل کر دیا جائے یا ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے۔ سرتاج خان غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا، لیکن دولت خان کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ دولت خان نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ رحمان خان کی موت کی خبر مشہور کر دی جائے اور اسے خاموشی سے قید کر لیا جائے۔ رحمان خان کی زندگی بچ جانے سے گلفشاں نیم راضی ہو گئی۔ دولت خان نے سرتاج خان کو سمجھایا کہ کسی مناسب موقع پر رحمان خان کو قتل کر دیا جائے گا اور اس وقت تک گلفشاں بھی راہِ راست پر آ جائے گی۔ بمشکل سرتاج خان راضی ہو گیا۔ لیکن گلفشاں بھی بہت سخت نکلی۔ وہ ہر ماہ رحمان خان کی خبر گیری کرنے آتی ہے۔ اور یہ لوگ رحمان خان کو زندہ رکھنے پر مجبور ہیں۔ گلفشاں نے شادی کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ویسے حاملہ ہونے والی بات غلط تھی۔ وہ دونوں پاک ہیں۔''

''لیکن وہ لاش.......؟''

''دولت خان کے ایک اور دشمن کی تھی، جسے مسخ کر کے رحمان خان کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اور پھر چونکہ لاش شہباز خان کے پاس نہیں گئی، اس لئے یہ راز، راز رہا۔

''خدا کی پناہ..... لیکن کیسی مسرت افزا خبر ہے۔''

"ویسے آج کل تمہاری کھوپڑی ناکارہ ہوتی جارہی ہے عارف!"
"کیوں؟"
"مجھے رحمان خان کی موت پر پہلے ہی شبہ تھا۔"
"وہ کس طرح؟"
"اس وقت سے، جب شہباز خان نے گلباغ کو قتل کیا تھا اور گلباغ نے مرتے مرتے کہا تھا کہ وہ شہباز خان کو ایک خوشخبری سنا سکتا ہے، لیکن نہیں سنائے گا۔ بھلا غور کرو، غم زدہ باپ کو بیٹے کی موت کے بعد کیا خوشخبری سنائی جاسکتی تھی سوائے اس کے کہ اسے اس کے بیٹے کی زندگی کی اطلاع دی جاتی۔"
"اوہ....... ہاں......تم نے اس بارے میں کچھ کہا بھی تھا۔"
"ہاں۔ اور تم نے توجہ نہیں دی تھی۔"
"مجھے اعتراف ہے طالوت!......تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ چلو، ہم بوڑھے شہباز خان کو خوشخبری سنادیں۔"
"ہاں....... ہاں......کیا کہہ رہے ہو؟ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"
"کیا مطلب؟"
"ابھی صبر کرو۔ ابھی اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔ ورنہ بوڑھے کی نہ جانے کیا کیفیت ہو۔ ابھی تو دولت خان اور سرتاج خان سے نمٹنا ہے۔"
"اوہ......پھر کیا پروگرام ہے؟"
"بس دیکھتے رہو.......اس بار تم خاموش رہو۔ کیونکہ کام میری پسند کا ہے، مجھے کرنے دو۔"
"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔ آؤ، اب ہم قید خانے چلیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں قید خانے کی طرف چل پڑے۔ بوڑھا شہباز اسی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔
ہم دونوں بھی لیٹ گئے۔ تب میں نے طالوت سے کہا۔ "ایک بات بتاؤ۔"
"ہوں۔"
"تم تو خاموشی سے ہی قید خانے میں آئے ہو۔"
"ہاں۔"
"پہرے دار تمہیں دیکھ کر حیران نہ ہوں گے؟"
"ہونے دو۔" طالوت نے لاپروائی سے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے، اس شخص کو کیا فکر ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔
مجھے کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ بوڑھا شہباز خان اور طالوت گہری نیند سو رہے تھے۔ درحقیقت رحمان خان کی زندگی کی مجھے بہت خوشی تھی۔ بوڑھا شہباز خان سنے گا تو کس قدر خوش ہوگا۔
باقی رہے یہ لوگ......یعنی دولت خان اور سرتاج خان وغیرہ۔ تو اب طالوت آ گیا تھا۔ اور بقول اس کے، اپنے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ بہرحال میں صرف اتنا جانتا تھا کہ دولت خان کی شامت آ گئی تھی۔ طالوت نہ جانے ان کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا۔ دولت خان کی یوں بھی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔

دوسری صبح سب سے پہلے میں جاگا تھا۔ ناشتہ لانے والے ناشتہ دے کر چلے گئے تھے۔ طالوت چونکہ میرا ہم شکل تھا، اس لئے انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد طالوت نے شہباز خان سے کہا۔

"کیا خیال ہے خان بابا! کیا ہم دولت خان کے قیدی بننے آئے ہیں؟"

"ایں...... نہیں...... مگر......" بوڑھے شہباز نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"تو چلو پھر، باہر کی فضا میں سانس لیں گے۔ دولت خان کی کیا مجال جو ہمیں بند کر سکے۔"

"اوہ...... اوہ...... میرے شیر!...... مگر باہر محافظ موجود ہیں۔"

"سب اپنے غلام ہیں، خان بابا! آؤ، اُٹھو۔" طالوت نے کہا اور پھر وہ قید خانے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ "اے...... دروازہ کھولو۔" اس نے پتھر کے ایک ٹکڑے سے دستک دی اور ایک محافظ نے دروازہ کھولا۔

"صبح ہو گئی ہے بھائی صاحب!" طالوت بڑی محبت سے بولا۔

"تو پھر......؟" محافظ نے غصیلے انداز میں کہا۔

طالوت اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے لجاجت سے کہا۔ "تو دروازہ کھول دو۔"

اور محافظ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

"آیئے خان بابا!" طالوت نے گردن جھکا کر کہا اور ہم تینوں قید خانے سے باہر نکل آئے۔

پھر ہم دوسرے ہال سے بھی باہر نکلے جہاں بہت سے محافظ موجود تھے۔ وہ سب ہمیں دیکھ کر اُچھل پڑے۔ ان میں سے بہت سوں نے پستول نکال لئے تھے۔

"ارے ارے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ہم تمہارے لئے غیر ہیں؟" طالوت نے عجیب لہجے میں کہا اور میں نے ان سب کے چہرے ڈھیلے پڑتے دیکھے۔

"نہیں...... ہرگز نہیں!" سب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

"تو پستول رکھ لو۔" طالوت انہیں چمکارتے ہوئے بولا اور انہوں نے پستول ہولسٹروں میں واپس رکھ لئے۔ "اب اجازت دو۔" طالوت نے کہا۔

"خدا حافظ!" سب اسی انداز میں بولے اور شہباز خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ طالوت اطمینان سے انہیں الوداع کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

"اوئے دلاور خان!...... اوئے دلاور خان! رُک جا۔ پہلے مجھے اس کے بارے میں بتا۔" شہباز خان میرا شانہ جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"میں کیا بتاؤں خان بابا؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"کیا یہ جادوگر ہے؟"

"نہیں...... صرف ہمارا دوست ہے۔"

"مگر...... وہ لوگ اس کی بات کیوں مان گئے؟"

"میں نے انہیں بھاری رشوت دی ہے خان بابا! نہ صرف وہ بلکہ تاسیہ کے دوسرے لوگ بھی اب میری بات مانیں گے۔"

''اوئے...... مگر بابا! تم نے کب ان کو رشوت دیا؟''

''رات کو۔ آپ فکر نہ کریں بابا!...... آئیں، اب ہم کوئی قیام گاہ تلاش کر لیں، اس کے بعد دولت خان کو چیلنج کریں گے۔ دیکھتے ہیں، یہاں اُس کے آدمی زیادہ ہیں یا ہمارے۔''

بوڑھے خان نے پریشانی سے گردن ہلا دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دشمنوں کے اس علاقے میں ان کے آدمی کہاں سے آ گئے۔ لیکن شعبدہ گر طالوت کی انوکھی طاقتوں سے کون انکار کر سکتا تھا؟ دولت خان کی سچ مچ ہی مصیبت آ گئی تھی۔ ہم بہت دُور نکل آئے۔ پہاڑیوں کے سلسلے کے پاس پہنچ کر طالوت رکا اور پھر بولا۔

''یہاں بے شمار غار ہیں۔ کوئی بھی غار ہماری قیام گاہ بن سکتا ہے۔ کیوں؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

اور ہم کوئی مناسب غار تلاش کرنے لگے۔ ویسے مجھے طالوت کا یہ چکر پسند نہیں آیا تھا۔ بوڑھے شہباز خان سے اُس کے بیٹے کی زندگی کی خبر چھپائے رکھنا مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔

طالوت نے ایک عمدہ سا غار تلاش کر لیا اور ہم اس میں فروکش ہو گئے۔ تب طالوت نے بوڑھے شہباز خان سے کہا۔ ''ہم یہاں رحمان خان کی موت کا انتقام لینے آئے ہیں خان بابا! کسی خیر سگالی کے مشن پر نہیں آئے۔ میرے خیال میں ہمیں تھوڑے سے انتظامات کرنے کے بعد اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔''

''لیکن ہم کیا انتظامات کر سکتے ہیں؟ ہمارا سامان بھی تو ان کے قبضے میں چلا گیا۔''

''میں وہ سامان ان کے قبضے سے نکالے لاتا ہوں۔ اُن کے گھوڑے بھی چرا لیں گے اور پھر ان پر حملہ کریں گے۔''

''اوہ...... تب چلو۔ ہم تینوں چلتے ہیں۔''

''نہیں خان بابا! تم یہ کام میرے اوپر چھوڑ دو۔ کیا خیال ہے دلاور خان؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''تو مجھے اجازت دو خان بابا!...... اور ہاں، دلاور خان! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' طالوت غار سے باہر نکل آیا۔ بوڑھا خان منہ کھول کر رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے عارف! تم بیزار سے نظر آ رہے ہو۔''

''ہاں، تمہارا خیال درست ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''مجھے ان ہنگاموں میں کچھ لطف نہیں آ رہا طالوت! رحمان خان زندہ ہے۔ اگر واقعی اس کی موت کا انتقام لینا ہوتا تو پھر ٹھیک تھا۔ اب فضول باتوں سے کیا فائدہ؟ یوں بھی یہ زیادہ دلچسپ جگہ نہیں ہے۔''

''اوہ......'' طالوت نے ہونٹ سکوڑ لئے۔ ''پھر تم بتاؤ، کیا کرنا چاہئے؟''

''رحمان خان کو ان کے قبضے سے نکال لاؤ۔ بوڑھے کے حوالے کرو اور پھر یہ جگہ چھوڑ دو۔''

''میرا خیال تھا اس چور سرتاج خان کو کچھ اور سزا دوں۔''

''کافی سزا مل گئی ہے۔ اور ٹھوک پیٹ لو۔ اور پھر یہاں سے چلو۔''

''ہوں......!'' طالوت نے ایک گہری سانس لی، پھر شانے ہلا کر بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ تمہاری وجہ سے ان بدمعاش باپ بیٹوں کو معاف کئے دیتا ہوں۔ تب پھر آؤ، ذرا ان سے ملاقات تو کریں۔''

''ہاں چلو۔ میں ذرا بوڑھے خان سے کہہ آؤں۔'' میں نے کہا اور غار میں واپس جا کر بوڑھے سے کہہ آیا کہ میں بھی دلیر خان کے ساتھ جا رہا ہوں۔

''جیسا تمہاری مرضی بابا! ہم کیا بولے۔'' بوڑھے نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''آپ یہاں پوشیدہ رہیں گے بابا! باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، جیسا تم بولو گے ویسا ہی کریں گے۔'' بوڑھے نے گہری سانس لی۔ میں چاہتا تھا کہ اس بوڑھے کے جسم میں نیا خون دوڑا دوں۔ لیکن بہر حال کچھ دیر اور انتظار سہی۔ بہر حال میں طالوت کے پاس پہنچ گیا۔

''دوشالہ۔'' طالوت نے کہا اور میں نے شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ لیا۔ ''آنکھیں بند کرو۔ ہم وقت ضائع کیوں کریں؟'' طالوت پھر بولا اور میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔

تب اس نے آہستہ سے میرا بازو دبایا اور میرے کانوں میں دولت خان کی آواز گونجی۔ ''میرے سامنے اُس خنزیر کا نام مت لو...... میں اُس کی شکل سے نفرت کرتا ہوں۔''

''لیکن اُس سے مل تو لو۔ سن تو لو، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔'' ایک نسوانی آواز تھی۔

''پھر میرے پاس آ کر کوئی جھوٹ بولے گا۔ سرتاج خان کی ماں! دولت خان نے گردن اُٹھا کر زندگی گزاری ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے، میرے گناہوں کی اس سے بڑی سزا اس دنیا میں کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی کہ میرا بیٹا بزدل نکل جائے۔ میرا دل چاہتا ہے، سرتاج خان کو گولی مار دوں۔'' دولت خان دانت پیس کر بولا۔

''میرے کہنے سے...... میرے کہنے سے ایک بار اُس کی سن لو۔'' دولت خان کی بیوی نے اصرار کیا۔ اور دولت خان اسے گھورنے لگا۔ پھر اُس نے گرج دار آواز میں کہا۔

''بلاؤ اُسے...... بلاؤ۔''

اور دولت خان کی بیوی اس کمرے سے باہر نکل گئی، جہاں ہم موجود تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت مجھے سیدھا دولت خان کے مکان میں لے آیا تھا۔

''کیا خیال ہے عارف! یہ دولت خان تو کچھ سیدھا ہوتا جا رہا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا اور ہم انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے میں سرتاج خان نظر آیا۔ اس کے پیچھے اس کی ماں بھی تھی۔ سرتاج خان کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا، لیکن اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

دولت خان نے اُسے نفرت سے دیکھا۔ ''اب کیا کہنے آیا ہے؟'' وہ دہاڑا۔

''تمہارا غصہ بجا ہے بابا!...... لیکن میری سن لو۔''

''سنا...... ضرور سنا۔''

''وہ سب کچھ میرے بس میں نہیں تھا بابا! میں کسی پُراسرار طاقت کے کہنے سے یہ سب کر رہا تھا۔ میرا جسم میرے بس میں نہیں رہا تھا۔'' سرتاج خان نے کہا۔

''خوب......خوب......تُو کہنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ انسان نہیں، جن ہیں؟''

''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، سوائے ایک بات کے۔''

''بول، بول......وہ کون سی بات ہے؟''

''بوڑھے شہباز خان کو رہنے دو۔ اس دلاور خان کو ایک بار اور میرے حوالے کر دو۔ میں اُس کا سر کاٹ لوں، اس کے بعد تم جو کہو گے، وہ کروں گا۔''

''اوہ......نامرد! تُو اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر اس ایک آدمی کی زندگی لے گا؟ اور اگر تیرے خیال میں وہ جن ہے تو پھر تُو اس کا کیا بگاڑ سکے گا؟ نہیں سرتاج خان! یہ بھی تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ تُو نے میری زندگی بھر کے کارناموں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔ میں اس پر عمل کروں گا۔''

''کیا فیصلہ ہے بابا؟''

''سرتاج خان! میں نے پوری زندگی جو کچھ کیا ہے، اس پر نادم ہوں۔ اب سے کچھ وقت پہلے میرے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن پٹھان کی آن ہی اس کا سب کچھ ہوتی ہے۔ میری آن ٹوٹ گئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے کون سے گناہ کی سزا ہے؟ تو مجھے گناہوں کے سوا کچھ یاد نہیں آیا۔ تب میں نے سوچا کہ پوری زندگی میں ثواب کا ایک ہی کام کرلوں......اور وہ کام یہ ہو کہ شہباز خان کو اس کا بیٹا واپس کر دوں۔''

''یہ نہیں ہوسکتا بابا!...... یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' سرتاج خان غرّایا۔

''تیری یہ غرّاہٹ اصلی ہوتی تو بے شک یہ نہیں ہوتا۔ لیکن تُو میدان میں کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں سے ہے۔'' دولت خان نے حقارت سے کہا۔

''یہ نہیں ہوسکتا خان!...... یہ بالکل نہیں ہوسکتا۔ تیری آن ایک بار اور ٹوٹ چکی ہے۔ اس وقت تُو نے کچھ نہیں کیا۔'' سرتاج خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تیرا اشارہ کس طرف ہے؟'' دولت خان غرّایا۔

''جب تیری بیٹی، تیرے دشمن کے بیٹے سے عشق کر رہی تھی، تیرا دشمن تیری عزت سے کھیل رہا تھا اور تُو بیٹی کے ہاتھوں اتنا بے بس ہوا کہ تُو نے اپنے دشمن کو قتل بھی نہ کرایا۔ تیری بیٹی آج بھی اُس سے محبت کرتی ہے۔''

''سرتاج خان......!'' بوڑھا وحشیانہ انداز میں چیخا۔

''تُو اپنی زندگی کے دن گزار چکا ہے خان!......اب میرا وقت ہے۔ شہباز خان کا بیٹا کبھی رہا نہیں ہوسکتا۔ میں تو اُس کی زندگی کے ہی خلاف ہوں۔ اور خان! آج سے تیرے معاملات میں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ میں نے کافی سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تُو میرا ہم آواز ہوگا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں تجھے گرفتار کرلوں گا۔''

''سرتاج خان......!'' بوڑھے دولت خان نے خنجر نکال لیا۔

''آ جاؤ......اندر آ جاؤ۔'' سرتاج خان نے کہا اور بہت سے مسلح آدمی دھڑ دھڑاتے اندر آ گئے۔

''گرفتار کرلو دولت خان کو۔''

''تم......تم لوگ......'' دولت خان گرجا۔ لیکن آنے والوں نے دولت خان کو چاروں طرف سے جکڑ لیا۔
طالوت نے مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
''اے بھائی عارف! ڈراپ سین ہو گیا'' وہ آہستہ سے بولا۔ بدلتے ہوئے یہ رنگ میرے لئے بھی دلچسپ تھے۔
''لے جاؤ۔ اسے قید خانے میں بند کر دو۔ مجھے بہت سے اہم فیصلے کرنے ہیں۔'' سرتاج خان نے کہا اور مسلح لوگ، دولت خان کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے چلے۔
''گل چمن!......گل چمن! تُو بھی بیٹے کے ساتھ شریک ہے۔'' دولت خان اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوا دہاڑا۔
''ہاں دولت خان!...... میں بیٹے کے ساتھ ہوں۔'' اُس نے کہا اور دولت خان خاموش ہو گیا۔
سرتاج خان مسکراتی نگاہوں سے دولت خان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دو مصاحب اور اس کی ماں اب بھی اس کے قریب کھڑے تھے۔ پھر اُس کے آدمی دولت خان کو باہر لے گئے۔ سرتاج خان نے دونوں ہاتھ جھاڑے تھے۔ پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔
''تم لوگ جاؤ۔ اور شہباز خان اور اُس کے ساتھی کو لے آؤ۔ ان کا قصہ بھی آج ہی پاک ہو جانا چاہیے۔''
''جو حکم سرتاج خان!'' دونوں نے گردن ہلائی اور باہر نکل گئے۔
''اب تُو کیا کرے گا سرتاج خان؟'' سرتاج خان کی ماں نے اس سے پوچھا۔
''پہلے شہباز خان، اس کے بیٹے اور اس کے ساتھی کو ختم کرنا ہو گا ماں! اس کے بعد ہمیں گلفشاں کی شادی کرنی ہے۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہی میں بابا کو آزاد کر سکتا ہوں۔''
''انہیں قید خانے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی؟''
''بالکل نہیں۔ تم فکر مت کرو۔'' سرتاج خان نے مسکراتے ہوئے کہا اور بوڑھی عورت کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔
''آؤ......!'' طالوت نے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلتے ہوئے کہا اور میں باہر نکل آیا۔
''اب کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ایک اور کردار رہ گیا ہے۔ اس سے بھی ملاقات کر لیں۔''
''کون......؟''
''گلفشاں۔''
''لیکن وہ سیدھی سادی لڑکی کیا ہم لوگوں کو دیکھ کر پریشان نہیں ہو گی؟''
''دیکھے لیتے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم گلفشاں کی تلاش میں نکل گئے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ہم اس کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اندازے سے گلفشاں کو پہچانا تھا۔ خاصی حسین اور معصوم سی لڑکی تھی۔
''میرا خیال ہے، میں اس سے گفتگو کروں۔'' طالوت بولا۔
''ٹھیک ہے۔''

''تب تم یہاں رُکو۔ میں باقاعدہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ ورنہ بات نہ بن سکے گی۔''
میں نے گردن ہلا دی اور طالوت باہر نکل گیا۔ پھر اُس نے باہر سے دستک دی اور گلفشاں نے سادہ سی آواز میں کہا۔ ''آ جاؤ۔''
اور طالوت اندر داخل ہو گیا۔ گلفشاں نے اُسے دیکھا اور اُچھل پڑی۔ اُس نے دوپٹہ سر پر برابر کر لیا۔ ''کون ہو؟......تم کون ہو؟''
''میرا نام دلیر خان ہے۔ شاید تم نے اپنے گھر میں میرا تذکرہ سنا ہو۔ میں شہباز خان کے ساتھ آیا ہوں۔''
''اوہ......اوہ...... یہاں کیوں آئے ہو؟''
''تم سے گفتگو کرنے۔''
''مجھ سے...... مجھ سے کیا گفتگو کرو گے؟''
''حالات ایک دم بدل گئے ہیں گلفشاں! تمہارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ تمہارے بھائی نے تمہارے باپ کو قید کر لیا ہے۔''
''بابا...... بابا کو......؟ نہیں...... یہ کیسے ممکن ہے؟''
''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کے بارے میں باہر نکل کر معلوم کر لینا۔ مجھے تم سے کچھ اور باتیں کرنی ہیں۔''
''ٹھہرو، پہلے میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔''
''مجھے معلوم ہے، تم مجھے رحمان خان کی زندگی کی اطلاع دو گی۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔
''اوہ......اوہ......تو کیا......؟''
''ہاں۔ ہمیں سارے حالات معلوم ہیں گلفشاں! سرتاج خان نے تمہارے بابا کو اس لئے قید کر دیا ہے کہ اب انہیں عقل آ گئی ہے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے شہباز خان اور اس کے بیٹے پر ظلم کیا ہے۔ لیکن سرتاج خان اس بات پر تیار نہیں ہے کہ رحمان خان کو آزاد کر دیا جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو روانہ کیا ہے کہ وہ شہباز خان، اس کے ساتھی اور رحمان خان کو لے آئیں تاکہ وہ اُنہیں قتل کر دے۔''
''نہیں، نہیں...... سرتاج خان ایسا نہیں کر سکتا۔ اُسے...... اُسے مجھے بھی قتل کرنا ہو گا۔'' گلفشاں چیخ پڑی۔
''تمہاری ماں بھی اس سازش میں شریک ہے گلفشاں! میں تمہارے پاس صرف اس لئے آیا ہوں کہ تم سے تمہارے خیالات معلوم کروں۔''
گلفشاں سسکیاں لے رہی تھی۔
''میں...... میں بے بس ہوں...... لیکن میں سرتاج خان کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ بابا نے مجھے زبان دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ رحمان خان قیدی رہے گا، اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ میں خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن...... لیکن اب......''
''کیا تم ہمارا ساتھ دو گی گلفشاں؟''
''مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟''

''ہم نے حالات سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ فی الحال تم صرف خاموش رہو۔ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ کوئی جذباتی قدم اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں...... میں وہی کروں گی، جو تم کہو گے۔ لیکن...... میرے بابا...... رحمان خان......'' گلفشاں روتے ہوئے بولی۔

''ان دونوں کی طرف سے بے فکر رہو۔'' طالوت نے اُسے تسلی دی۔ اور پھر وہ مجھے ایک مخصوص اشارہ کر کے باہر نکل آیا۔ میں بھی باہر آ گیا تھا۔

''کیسی رہی؟''

''بہت عمدہ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آؤ، اب سرتاج خان کو دیکھیں۔'' طالوت بولا اور ہم واپس سرتاج خان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سرتاج خان پورے کمرے میں ناچ رہا تھا۔ قید خانے کے محافظ اور اُس کے ساتھی پریشان کھڑے تھے۔

''بکواس کرتے ہو۔ میں تم لوگوں کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے۔ آخر وہ کیسے نکل گئے؟''

''ہماری آنکھوں کے سامنے سرتاج خان! تم مانو یا نہ مانو...... وہ جادوگر تھے۔ ہم پاگل ہو گئے تھے۔

''ان جادوگروں کی ایسی تیسی...... گلدار خان! جاؤ، جتنے آدمی چاہو ساتھ لے لو۔ انہیں چپے چپے پر تلاش کرو۔ جہاں نظر آئیں، گولی مار دو۔ جاؤ۔'' سرتاج خان دہاڑا اور اُس کے ساتھی باہر نکل گئے۔

سرتاج خان ہاتھ مل رہا تھا۔ پھر اُس نے بوڑھی گل چمن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ بہت برا ہوا ماں!...... یہ بہت برا ہوا۔''

''سب کچھ ہی برا ہو رہا ہے سرتاج خان!...... افسوس، تیرے کہنے سے میں بھی بہک گئی۔ میں نے بڑھاپے میں دولت خان سے غداری کی ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے سرتاج!''

''بے کار باتیں مت سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں...... میں......'' سرتاج خان جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کے پاس آگے کچھ کہنے کے لئے الفاظ ہی نہ تھے۔

''آؤ...... اب یہ بے چارہ کیا کہے گا۔'' طالوت بولا اور میں احمقوں کی طرح اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ''آؤ اب رحمان خان کو نکال لیں۔ اُس کی رہائی کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن سنو! کیوں نہ بوڑھے دولت خان کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ اُس بے چارے کو اب معاف کر دینا چاہئے۔ کیونکہ وہ راہِ راست پر آ گیا ہے۔''

''یہ سارا مسئلہ تمہیں ہی طے کرنا ہے۔ میں دخل نہ دوں گا۔'' میں نے کہا اور طالوت مسکرانے لگا۔

''ٹھیک ہے میری جان!...... تم آؤ تو سہی۔ لو، یہ سنبھالو۔'' طالوت نے لکڑی کا ایک موٹا ڈنڈا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ویسا ہی ایک ڈنڈا اُسکے ہاتھ میں تھا۔

''ارے...... اس کا کیا کریں گے؟''

''ہمارے ہتھیار ہیں۔ تلوار وغیرہ سے کوئی مارا جائے گا۔ مزاحمت کرنے والوں کے لئے یہ ڈنڈے ہی کافی ہیں۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

''راسم!'' طالوت نے راسم کو آواز دی۔

''آقا!'' راسم ظاہر ہو گیا۔

''قید خانے کی طرف راہنمائی کرو، جہاں دولت خان قید ہے۔'' اور راسم نے گردن جھکا دی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس قید خانے کے سامنے کھڑے تھے، جہاں دولت خان سلاخوں کے پیچھے موجود تھا۔

''دوشالہ اُتار دو عارف!'' طالوت نے کہا اور خود بھی ظاہر ہو گیا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اب ہم محافظوں کے سامنے تھے۔ اور دوسرے لمحے ہمیں دیکھ لیا گیا۔
محافظ اُچھل پڑے۔ اور پھر وہ خنجر اور تلواریں کھینچ کر ہماری طرف دوڑے۔ دولت خان پاگلوں کی طرح ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے محافظوں کے وار اپنے ڈنڈوں پر روکے۔ ڈنڈے تو ایک بہانہ تھے، جس کے پڑے وہ دوبارہ نہ اُٹھ سکے۔ حالانکہ محافظوں کی تعداد دس بارہ کے قریب تھی، لیکن اُنہیں لمبا کرنے میں دومنٹ سے زیادہ نہ لگے۔
دولت خان سلاخیں پکڑے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ جب سارے محافظ لمبے ہو گئے تو طالوت قید خانے کی طرف بڑھا۔ اُس نے قید خانے کے موٹے تالے کو ڈنڈے کی ایک ہی ضرب سے توڑ دیا۔ اور پھر سلاخوں والے دروازے کو کھولتے ہوئے وہ بولا۔
''آؤ دولت خان!...... باہر آ جاؤ۔''
لیکن دولت خان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اُس نے روتے ہوئے کہا۔
''مجھے بھی ہلاک کر دو۔ خدا کے لئے، مجھے بھی ہلاک کر دو۔ تاکہ میری سزا دنیا میں ہی پوری ہو جائے۔ آہ...... اس سے بڑے غم کی بات اور کیا ہوگی، میرے دشمن میرے اوپر رحم کھا رہے ہیں۔''
''تمہاری دشمنی شہباز خان سے تھی دولت خان! وہ مظلوم تھا، اس لئے ہم اس کی مدد پر آمادہ ہوئے تھے...... لیکن...... اب تم بھی مظلوم ہو۔ خدا سے اپنے گناہوں کی توبہ کرنا دولت خان!...... آؤ، کچھ کرنے کا موقع ملا ہے۔ پیچھے نہ ہٹو۔ باہر آ جاؤ۔''
''لیکن اب زندگی میں کیا رکھا ہے؟ جی کر کیا کروں گا؟ اب تو...... اب تو کوئی بھی اپنا نہیں رہ گیا۔''
''تمہاری بیٹی...... تمہاری ہے۔ سرتاج خان اُس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔''
''ایں......'' دولت خان اُچھل پڑا۔ ''ہاں...... آہ...... میری گلفشاں...... میری گلفشاں......'' وہ درد سے کراہا۔
''اس کے علاوہ شہباز خان تمہارا دشمن ضرور ہے۔ لیکن تم اگر چاہو تو اُس سے معافی مانگ سکتے ہو۔ وہ فراخ دل ہے، ضرور معاف کر دے گا۔ ہم تمہیں اُس کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دے سکتے ہیں۔''
''وہ...... وہ کس طرح؟''
''اس کے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے اس کی خدمت میں پیش کر دو۔ میرا خیال ہے، بیٹے کو پانے کے بعد وہ سب رنجشیں بھول جائے گا۔'' طالوت نے کہا اور دولت خان کی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی۔
''کیا...... کیا یہ ممکن ہے؟...... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''
''آؤ...... باہر آ جاؤ۔'' طالوت نے کہا اور دولت خان باہر نکل آیا۔ اُس کی آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بار بار خدا سے توبہ کر رہا تھا۔

''میرے معبود!...... میرے معبود! میں اس قابل نہیں ہوں کہ تیرے حضور بخشش کے لئے ہاتھ پھیلا سکوں۔ لیکن...... لیکن شرمسار، تیرے حضور کھڑا ہوں۔ میرے معبود!...... میرے معبود!'' ہولے ہولے اُس کی آواز اُبھر رہی تھی اور ہم اسے سن رہے تھے۔

طالوت بے حد متاثر ہو گیا۔ اور پھر اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہی ہوا۔ جو کچھ ہوا، ٹھیک ہوا۔ ایسے آدمی کو ہم کیا سزا دیتے؟''

تھوڑی دیر کے بعد ہم اس قید خانے میں پہنچ گئے جہاں رحمان خان قید تھا۔ چار آدمی اسے باہر لا رہے تھے۔ یہ سرتاج خان کے ساتھی تھے۔ ہم لوگ ان کے سامنے پہنچ گئے۔ دولت خان ہمارے ساتھ تھا۔

سرتاج خان کے آدمی ہمیں دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

''کہاں لے جا رہے ہو اسے؟'' دولت خان نے گرج کر پوچھا۔

''سرتاج خان نے طلب کیا ہے۔''

''چھوڑ دو...... میں حکم دیتا ہوں، اسے چھوڑ دو۔''

''ہم سرتاج خان کی حکم عدولی نہیں کر سکتے خان!''

''تب میں تمہارے سر قلم کر دوں گا۔'' دولت خان دہاڑا اور ان کی طرف بڑھا۔ لیکن ہم دونوں نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔

''ہم موجود ہیں خان بابا! رُک جاؤ۔'' اور پھر ہمارے ڈنڈے چل پڑے۔ خوب چلے۔ اور چند منٹ کے بعد محافظ زخمی پڑے تھے۔ رحمان خان ششدر رہ گیا تھا۔

''آؤ رحمان خان!'' دولت خان نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آؤ...... دولت خان کا غرور خاک میں مل گیا ہے۔ آؤ میرے بچے! میں تم سے اپنے مظالم کی معافی بھی مانگنے کے قابل نہیں ہوں۔ آؤ...... میری سمجھ میں نہیں آتا، کون کون سے گناہ کا ازالہ کر سکوں گا۔ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوں...... آؤ۔''

''کہاں چل رہے ہو دولت خان؟'' رحمان خان کی آواز میں گرج اب بھی باقی تھی۔

''آہ...... مجھ سے سوال مت کرو میرے بیٹے!...... تمہیں خدا کا واسطہ، مجھ سے کوئی سوال مت کرو۔ میرے پاس جواب نہیں ہے۔''

رحمان خان کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے گردن ہلا کر کہا۔

''چلو دولت خان! میں نہیں سمجھتا اب تم کون سی چال چل رہے ہو۔ اور یہ ضرورت تمہیں کیوں پیش آئی۔'' رحمان خان بہرحال کشادہ دل شہباز خان کا بیٹا تھا۔ اور پھر وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔

اب اس سلسلے کا سب سے اہم سین باقی تھا۔ راستے میں دولت خان نے مجھ سے درخواست کی۔

''میری ایک بات مان لو گے میرے بچو؟''

''کیا خان بابا؟''

''مجھے تنہا شہباز خان کے سامنے جانے دینا۔ جو کچھ بھی ہو، میرے حال پر چھوڑ دینا۔''

''یہ خطرناک ہوگا دولت خان! شہباز خان، بیٹے کا زخم خوردہ ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کوئی خطرناک سلوک نہ کر بیٹھے۔''

"مجھے میری قسمت پر چھوڑ دینا میرے بچو! یہ میری درخواست ہے۔"

"یہ سب کیا ہے؟ کیا تم لوگ مجھے نہ بتاؤ گے، کون سے شہباز خان کی بات ہو رہی ہے؟ میں بھی انسان ہوں۔ خدا کے واسطے، مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ مجھے بتاؤ تو سہی دولت خان! تمہارے روّیے میں یہ اچانک کیسی تبدیلی آ گئی ہے؟" رحمان خان نے پریشانی سے پوچھا۔

"میں شکست کھا چکا ہوں رحمان خان! تمہارا باپ خدائی قوتوں کے ساتھ میرے اوپر حملہ آور ہوا اور اُس نے مجھے بدترین شکست دے دی۔ اور اب شکست خوردہ دولت خان، شہباز خان کو اس کی امانت لوٹا کر جان کی امان حاصل کرنے جا رہا ہے۔" دولت خان نے کہا اور رحمان خان گنگ رہ گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ غار سامنے آ گئے تھے جہاں ہمارا قیام تھا۔ تب طالوت نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"میں رحمان خان کے ساتھ رہوں گا۔ تم دوشالہ اوڑھ کر اندر چلے جانا۔ اگر شہباز خان کسی خطرناک حرکت پر آمادہ ہو جائے تو اسے روکنا۔"

اور میں نے گردن ہلا دی۔ بالآخر دولت خان، شہباز خان کے سامنے پہنچ گیا۔

شہباز خان قدموں کی آہٹ سن کر چونک پڑا تھا۔ دولت خان کو دیکھ کر وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

"تو تم یہاں تک پہنچ گئے دولت خان!" اُس نے ایک خوفناک غراہٹ سے کہا۔

"ہاں۔" دولت خان سکون سے بولا۔

"کتنے آدمی لائے ہو؟...... تنہا کیوں داخل ہوئے ہو یہاں؟" شہباز خان نے کہا اور پھر اچانک دولت خان پر آ پڑا۔ "اگر میں صرف تمہیں ختم کر سکا دولت خان! تو میں سمجھوں گا، میں نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا۔"

اس نے دولت خان کی گردن دبوچ لی۔ لیکن دولت خان نے مدافعت نہیں کی تھی۔ شہباز خان نے اسے بری طرح رگڑ دیا۔ یوں بھی شہباز خان، دولت خان سے زیادہ طاقتور تھا۔

شہباز خان، دولت خان کو بری طرح مار رہا تھا۔ لیکن دولت خان کی طرف سے کوئی مدافعت نہ پا کر وہ رُک گیا۔

"تیرے ہاتھ پاؤں کیوں مفلوج ہو گئے گیدڑ! مجھ سے مقابلہ کر۔ اپنے آدمیوں کو آواز کیوں نہیں دیتا؟ کیا تُو اپنی بزدلی سے میرا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے؟"

"مجھے اور مارو شہباز خان! ابھی میرے جسم کے بہت سے حصے گنہگار ہیں۔ میں چاہتا ہوں، میرے جسم کے ایک ایک مسام سے خون اُبل پڑے تاکہ کوئی حصہ غلیظ نہ رہے۔"

"کیا بکواس کرتا ہے بزدل کتے!...... اُٹھ، مقابلہ کر۔ پٹھان گرے ہوؤں کو نہیں مارتے۔" شہباز خان گرجا۔

"میں بہت بے غیرت انسان ہوں شہباز خان!...... مجھے مارو۔"

دولت خان، شہباز خان کے قدموں سے منہ رگڑنے لگا۔ اور شہباز خان حیران رہ گیا۔ وہ پریشانی سے دولت خان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے دولت خان کا گریبان پکڑ کر اُسے اٹھایا۔

''کیا...... کیا تُو بھی پاگل ہو گیا ہے؟'' وہ تعجب سے بولا۔

''تمہارا بزدل دشمن، تمہارے بیٹے کو لایا ہے شہباز خان! اگر رحمان کو کلیجے سے لگا کر تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو مجھے معاف کر دینا۔'' دولت خان نے کہا اور پھر باہر کی طرف رخ کر کے بولا۔''رحمان خان! اندر آ جاؤ...... اندر آ جاؤ رحمان خان!'' اور رحمان خان اندر داخل ہو گیا۔

شہباز خان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پھر اُس کے حلق سے ایک دلدوز آواز نکلی۔

''رحمانے......!''

اور وہ دوڑ کر رحمان خان سے لپٹ گیا۔ میں باہر نکل گیا۔ اور چند ساعت کے بعد طالوت اور میں اندر داخل ہو گئے۔ شہباز خان پاگلوں کی طرح رحمان خان کو چوم رہا تھا۔ اور دولت خان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شہباز خان کی کیفیت پاگلوں جیسی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دہاڑا۔''دلیر خان!...... دلاور خان!...... دیکھو، رحمانے زندہ ہے۔ یہ زندہ ہے میرے بچو!...... یہ دیکھو، یہ زندہ ہے۔''

اور پھر جب شہباز خان کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو ہم نے اسے پوری کہانی سنائی۔ شہباز خان غور سے سن رہا تھا اور دولت خان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تب شہباز خان اپنی جگہ سے اُٹھا، اُس نے دولت خان کا بازو پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''اوئے دولت خاناں! خدا اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے تو ہم کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ میں نے تجھے معاف کر دیا میرے یار!...... تُو نے میری آنکھوں کی روشنی لوٹا دی ہے۔ میرے اوپر احسان کیا ہے دولت خاناں! خدا کا قسم...... ہم نے تجھے معاف کر دیا۔ دل سے معاف کر دیا۔ رحمان خان اب تیرا بھی بیٹا ہے۔''

اور دولت خان، شہباز خان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

بدمعاشِ اعظم اب معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اشارہ کیا اور میں باہر نکل آیا۔''جناب!'' اُس نے میری طرف دیکھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''سرتاج خان کے بارے میں کیا حکم ہے؟''

''بہر حال، وہ دولت خان کا بیٹا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ ہاں...... شاید تمہارا ہی خیال درست ہے اسی سے اس کے بارے میں گفتگو کی جائے۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر تک تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہم واپس اندر پہنچ گئے۔ رحمان خان ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔

''کیسی مزے کی بات ہے میرے بھائیو! تم لوگوں نے ہمارے اوپر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن نہ تو میرے باپ کو اور نہ مجھے ابھی تک تمہارے بارے میں کچھ معلوم ہے۔'' رحمان خان نے کہا۔

''کیا معلوم کرنا چاہتے ہو رحمان خان؟''

''یہی کہ تمہارا تعلق کون سے علاقے سے ہے؟ گھر بار کہاں ہے؟ اور کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے یا اب ہمارے بھائی ہوں گے؟''

''ہم لوگ آوارہ گرد ہیں رحمان خان!...... جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ہماری دوستی ہم شکل ہونے کی

وجہ سے ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہماری راہیں بھی ایک ہو گئیں۔ دلیر خان کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اس کے خیال میں دلیر خان کی عادات خراب ہو گئی تھیں۔ میرا باپ میری حرکتوں سے پریشان ہو کر میرے بچپن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بس ہم دونوں یونہی آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر.......اب میں تمہارا باپ ہوں.......اور میں تمہیں آوارہ گردی نہیں کرنے دوں گا۔'' شہباز خان نے کہا اور ہم دونوں مسکرانے لگے۔ پھر میں نے دولت خان سے پوچھا۔

''سرتاج خان کے بارے میں اب تمہارا کیا خیال ہے دولت خان؟''

''وہ.......وہ میری اولاد ہے۔ مجھ جیسے گنہگار باپ کی ایسی ہی اولاد ہونی چاہئے۔ مجھے اس سے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ ہو سکے تو میری بیٹی کو وہاں سے نکال لاؤ۔ میں اس کا ہاتھ رحمان خان کے ہاتھ میں دے کر کوئی ویرانہ اپنا لوں گا اور باقی زندگی عبادت کروں گا۔ اب مجھے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر ہے۔''

''اوہ......'' طالوت نے میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر ہم مشورہ کرنے باہر آ گئے۔

''ٹھیک ہی ہے عارف! ہم سرتاج خان پر کیوں وقت برباد کریں۔ جیسا دولت خان کہتا ہے، ویسا ہی کیا جائے۔'' طالوت نے کہا۔ اور پھر چونک پڑا۔ اس نے میرا شانہ دبایا اور میں نے بھی اس کے اشارے کی طرف دیکھا۔ بے شمار گھوڑے طوفانی رفتار سے دوڑتے اسی طرف آ رہے تھے۔ اور ان کی قیادت منہ سے جھاگ اُڑاتا ہوا سرتاج خان کر رہا تھا۔ اُن کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔

طالوت نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھا۔

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تب دولت خان کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ وہ سرتاج خان کی طرف دیکھتا رہا، جس نے ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اور پھر اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔

''مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے میرے معبود! لیکن تُو تو معاف کر دیتا ہے۔ مجھے کتنی بار شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میری غیرت، میرا وقار اب کوئی نام نہیں رکھتا۔ پھر اس بے جان بدن پر بے غیرتی کے اور کتنے نشان بنیں گے؟ میری روح نکل چکی ہے۔ اب مجھے صرف موت درکار ہے......صرف موت! صرف موت۔''

دولت خان کی رگیں پھول گئیں۔ اس کا چہرہ انگارے کی مانند دہکنے لگا اور وہ سینہ تان کر آگے بڑھ آیا۔ سرتاج خان کے بے شمار ساتھی ہمارے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اور خود سرتاج خان اپنا گھوڑا سامنے لے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ دولت خان آہستہ آہستہ اُس کے سامنے آ گیا۔

''کیوں آیا ہے سرتاج خان؟'' اس نے قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ دیکھنے دولت خان! کہ تیرے جیسے بزدل انسان نے کہاں پناہ لی ہے۔ کیا پٹھانوں کی یہی رِیت ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے پناہ کی بھیک مانگتے ہیں؟'' سرتاج خان نے کہا۔

''میں نہیں جانتا سرتاج خان! کہ کیا میرا باپ بھی اتنا ہی بے غیرت تھا، جتنا میں ہوں۔ افسوس، مجھے اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ یقیناً وہ بھی میری طرح ظالم اور بے

غیرت ہو گا۔ ورنہ اس کے نطفے سے دولت خان کیوں جنم لیتا۔ دولت خان کو اعتراف ہے سرتاج خان! کہ اس جیسا ذلیل، کمینہ فطرت انسان اس بستی میں دوسرا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ نا قابل معافی ہے۔ لیکن میرے نطفے سے تجھ جیسے انسان نے جنم لے کر میرے گناہوں کی سزا پوری کر دی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور سزا ایجاد نہ ہوئی ہو گی۔ اور اس کے بعد اگر مجھے کوئی سزا دی گئی تو میرا دل قبول نہیں کرے گا۔"

"میں اگر تیرے گناہوں کی سزا ہوں دولت خان! تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ لیکن بعض اوقات کسی ایک انسان کے گناہ کی سزا دوسروں کو بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو یہ بات سمجھا دے۔" سرتاج خان نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا چاہتا ہے؟ کیوں لے کر آیا ہے ان بزدلوں کو؟" دولت خان غرّایا۔

"میں تجھ سے رشتے ختم کر چکا ہوں دولت خان! اور تجھے معلوم ہے کہ تُو نے میری راہ میں آنے کی کوشش کی ہے۔ اب تیرا شمار میرے دشمنوں میں ہے۔ تُو نے میرے بدترین دشمن رحمان خان کو آزاد کیا ہے۔ اس کے بعد میرا فرض ہو گیا ہے کہ تجھے اور تیرے ساتھیوں کو قتل کر دوں۔" سرتاج خان نے وحشیانہ انداز میں کہا۔

"کیا تُو پٹھانوں کی کسی رسم کا قائل نہیں رہا سرتاج خان؟"

"کیا مطلب؟"

"اگر تُو خود کو پٹھان کہتا ہے تو پھر پٹھانوں کی ایک رسم پوری کر۔ ہمارے قبیلے میں غالازی رائج ہے۔ کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے زیادہ کشت و خون کی بجائے صرف دو دشمن آپس میں جنگ کر لیتے ہیں۔ میں تجھے غالازی کی دعوت دیتا ہوں۔"

"تُو بوڑھا ہو گیا ہے دولت خان! اس کے علاوہ میرا دشمن صرف تُو نہیں ہے۔ یہ سب میرے دشمن ہیں۔ میں ان سب کو قتل کرنے کا خواہش مند ہوں۔ اس کے لئے میں کیا کروں؟"

اور دولت خان دانت پیس کر رہ گیا۔ بلاشبہ اس کے لئے کوئی رسم نہیں تھی۔

"کیا تمہارے ہاں ہارے ہوئے دشمن کے لئے کوئی سزا نہیں ہے سرتاج خان؟ تم بار بار میدان چھوڑ کر بھاگ چکے ہو۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ اب بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک ہو سکتا ہے، جو اب تک ہوتا رہا ہے؟" اس بار طالوت نے پوچھا۔

"آج میں تم سب کی موت بن کر آیا ہوں۔" سرتاج خان غرّایا اور طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے بتاؤ دولت خان! میں اس سرپھرے کے ساتھ کیا سلوک کروں؟" اس نے دولت خان سے پوچھا۔

"خدا اس کے ساتھ برا سلوک کرے۔ اب میرا اس سے کیا تعلق؟" دولت خان نے مایوسی سے کہا۔

"آؤ سرتاج خان! بولو، کیا چاہتے ہو؟......آؤ، ہمیں گرفتار کر لو۔ ہمیں گولی مار دو۔" طالوت نے کہا۔

"ان سب کو گرفتار کر لو اور ایک چٹان کے ساتھ کھڑا کر کے گولی مار دو۔" سرتاج خان نے کہا اور اس

کے ساتھی گھوڑوں سے اُتر پڑے۔ خود سرتاج خان بھی گھوڑوں سے اُتر آیا تھا۔
لیکن جونہی وہ گھوڑوں سے اُترے، نہ جانے گھوڑوں کو کیا ہو گیا۔ وہ بری طرح ہنہنانے لگے۔ تمام گھوڑے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور پھر وہ پلٹ کر بری طرح بھاگ نکلے۔ بدحواسی کی بات تھی۔ سرتاج خان کے سارے ساتھی بے اختیار گھوڑوں کو پکڑنے کے لئے لپکے۔ خود سرتاج خان کئی قدم دوڑ گیا تھا۔ لیکن پھر وہ رُک گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔
پھر وہ جھلاّئے ہوئے انداز میں پلٹا اور اس نے طالوت کی طرف شست باندھ کر فائر کیا۔ لیکن رائفل خالی تھی۔ طالوت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اُس نے سرتاج خان کی رائفل پکڑ لی۔
''ایک بار تو مردوں کی طرح لڑ لو سرتاج خان! حسرت ہی رہے گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سرتاج خان نے رائفل چھوڑ دی۔ وہ پاگلوں کے سے انداز میں طالوت پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے طالوت کی کمر پکڑ لی تھی اور پھر وہ طالوت کے پاؤں زمین سے اُکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ طالوت نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔
لیکن سرتاج خان کا واسطہ تو کسی پتھریلے ستون سے پڑا تھا وہ پوری قوت سے اس ستون کو ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ستون کہیں ہلتے ہیں؟ سرتاج خان کا جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ لیکن وہ انتہائی کوشش کے باوجود طالوت کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ تب اس نے طالوت کے بدن پر گھونسے برسانا شروع کر دیئے۔ اور اس سے بھی کچھ نہ بگڑا تو اُس نے گردن جھکا کر کسی ارنے بھینسے کی طرح اس کے سینے پر ٹکر ماری۔
لیکن سرتاج خان کے منہ سے نکلنے والی دہاڑ بہت تیز تھی۔ اُس کی پگڑی خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ لیکن خون کافی مقدار میں نکل گیا تھا اور مسلسل بہہ رہا تھا۔ چنانچہ وہ لمبا ہو گیا۔
دولت خان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن شہباز خان آگے بڑھ کر طالوت کے بدن کو ٹٹولنے لگا تھا۔ رحمان خان بھی آگے بڑھ آیا تھا۔ طالوت مسخرے انداز میں اُچھلنے لگا۔
''ارے، ارے......'' وہ اُچھل اُچھل کر کہہ رہا تھا۔ ''تم میرے گدگدی کیوں کر رہے ہو؟''
''اوئے دلیر خان! تُو آخر کس دھات سے بنا ہوا ہے؟'' شہباز خان متحیرانہ لہجے میں بولا۔
''تت......تو......تو گدگدی کیوں کر رہے ہو؟'' طالوت اسی بے تکے انداز میں اُچھلتے ہوئے بولا۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔
''کیا یہ مر گیا؟'' دولت خان کی آواز اُبھری اور ہم سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''آؤ چلیں۔ گلفشاں کو نکال لائیں۔'' وہ ایک طرف مڑ گیا۔
ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ راستے میں سرتاج خان کا ایک بھی ساتھی نظر نہیں آیا۔ شاید انہوں نے گھوڑوں کے پیچھے ہی پیچھے بھاگ جانے میں عافیت سمجھی تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ بستی کے لوگ شاید حقیقت سے ناواقف تھے۔ گھر میں گلفشاں تنہا تھی۔ دولت خان کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی۔
''آؤ گلفشاں!......آؤ۔ یہ بستی اب ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہ گئی۔ آؤ...... ورنہ لوگ تجھے

اس لئے حقارت سے دیکھتے رہیں گے کہ تُو بے غیرت دولت خان کی اولاد ہے۔ چل گلفشاں! ہمارا قافلہ لٹ چکا ہے۔ عزت، دولت، غیرت، حمیت اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ چل گلفشاں! اس سے قبل کہ لوگوں کو ہمارے لٹنے کا احساس ہو جائے، ہم یہاں سے نکل چلیں۔‘‘

اور گلفشاں اُس کے ساتھ چل پڑی۔

تب اُس کی نگاہ رحمان خان پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی۔

’’آ جا گلفشاں! شکست کے بہت سے نشان تجھے نظر آئیں گے۔ ان نشانوں پر نہ ٹھٹک۔ یہ تو اب زندگی کے سارے راستوں پر بکھرے پڑے ہیں۔ ہم ان سے قدم نہیں بچا سکتے۔‘‘

دولت خان اُس کا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہم سب اُس کے ساتھ تھے۔

’’دوستو! اس ہارے ہوئے جواری کے بارے میں تم نے اب کیا فیصلہ کیا ہے؟‘‘ بستی سے کافی دور نکل کر دولت خان نے پوچھا۔

’’میری تجھ سے دشمنی ختم ہو گئی ہے دولت خان! اب تُو میرا بھائی ہے۔ چل، یہاں سے جا کر میں نے اپنی ایک چھوٹی سی کٹیا بنالی تھی، جو رحمان خان کی موت کے بعد بے چراغ ہو گئی تھی۔ آؤ ہم سب مل کر اسے روشن کریں گے۔ آؤ دولت خان!‘‘ شہباز خان نے دولت خان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے گلفشاں کے سر کی اوڑھنی برابر کر دی تھی۔ دولت خان شرمندگی سے سر جھکائے آگے بڑھتا رہا۔ تب ہم نے غاروں کے قریب سے گزرتے ہوئے کچھ آوارہ گھوڑے دیکھے اور طالوت ایک دم رُک گیا۔

’’گھوڑے۔‘‘ وہ آہستہ سے بولا۔

’’ہاں، گھوڑے۔‘‘ میں نے بھی بے ساختہ کہا۔

’’ہمیں گھوڑوں کی ضرورت ہے۔‘‘

’’ارے...... یہ...... یہ شاید سرتاج خان کے ساتھیوں کے گھوڑے ہیں، جنہیں وہ پکڑ نہیں سکے ہوں گے۔‘‘ شہباز خان بے اختیار بولا۔

’’مگر یہ اسی طرف آ رہے ہیں۔‘‘ رحمان خان نے کہا۔

’’پکڑو...... انہیں پکڑو۔‘‘ شہباز خان خود بھی گھوڑوں کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔

گھوڑے پکڑ لئے گئے۔ اور سب سے پہلے گلفشاں کو ایک گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ پھر سب لوگ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور گھوڑے چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اِدھر سے گزرے، جہاں سرتاج خان زخمی ہوا تھا۔ دولت خان نے اس طرف سے منہ پھیر لیا۔

لیکن سرتاج خان اب اس جگہ موجود نہیں تھا، جہاں اسے چھوڑا تھا۔ البتہ زمین پر خون کے دھبے موجود تھے۔ اور اچانک پہاڑوں میں ایک آواز گونجی۔

’’بابا!...... بابا!‘‘

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دولت خان ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا، لیکن پھر اُس نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

’’بابا!...... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے بابا! میں زخمی ہوں...... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے بابا!‘‘ سرتاج خان حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

شہباز خان نے گھوڑا روک لیا۔
''دولت خان!'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔
''کیا بات ہے شہباز خان؟''
''سرتاج زخمی ہے۔''
''اُسے مرنے دو شہباز خان!......اسے مرنے دو۔''
''نہیں میرے دوست! وہ تمہاری اولاد ہے۔ اُسے معاف کر دو۔ بچہ ہے، زخمی ہے۔ آؤ، ہمیں اُس کی مدد کرنی چاہئے۔''
''نہیں شہباز خان! میرے زخموں کو اور نہ کریدو۔''
''وہ ہماری اولاد ہے دولت خان! جانے بھی دے یار! بچوں سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ میرا سینہ اولاد کے غم سے آشنا ہے، دولت خان! چل میرے یار! ہم اسے لے آئیں۔''
''بابا...... بابا...... بھیا......!'' گلفشاں دردبھرے انداز میں رو پڑی۔
''آؤ دولت خان! ہم اسے لے آئیں۔'' شہباز خان نے کہا اور دولت خان کا بازو پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ دولت خان گردن جھکائے اُس کے ساتھ چل پڑا۔
''کہاں ہو سرتاج خان؟'' شہباز خان چیخا۔
''میں...... میں ادھر ہوں...... میں......'' اور پھر ایک چٹانی دوشاخے کے نزدیک سرتاج کا بدن آہستہ آہستہ اُبھرا۔ اُس کا پورا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ بمشکل تمام سہارا لے کر وہ چٹانی دوشاخے میں کھڑا ہو سکا۔ لیکن اُس کی حالت غیر معلوم ہوتی تھی۔
''ہم آرہے ہیں سرتاج خان!......ہم آرہے ہیں۔'' شہباز خان، دولت خان کا بازو پکڑ کر دوڑنے لگا۔

اور اچانک میں نے بجلی سی کوندتی دیکھی۔ سرتاج خان جس طرح نڈھال ہونے کی اداکاری کر رہا تھا، درحقیقت وہ اس قدر نڈھال نہ تھا۔ شیطان نئی کارگزاری کے لئے تیار تھا۔ رائفل شاید اس نے اس انداز سے چٹان سے ٹکائی تھی کہ اسے آسانی سے اُٹھا سکے۔ اُس نے نہایت پھرتی سے رائفل اُٹھائی اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فائر کر دیا۔
گولی دولت خان کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی گدّی سے نکل گئی تھی۔
دولت خان کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور پھر وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ شہباز خان ہکا بکا رہ گیا تھا۔
''بچو شہباز خان!'' طالوت چیخا لیکن سرتاج دوسرا فائر کر چکا تھا۔ شہباز خان کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی اور وہ بھی زمین پر آرہا تھا۔
''بابا......!'' گلفشاں چیخی۔ اُس نے دوڑنے کی کوشش کی لیکن رحمان خان نے اسے دبوچ لیا۔ اور وہ اسے ایک طرف دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔
''او بزدل......او کتے!......او خنزیر کی اولاد......میں آرہا ہوں۔ میں......میں تجھے کچا چبا لوں گا۔''
''آؤ......آؤ بزدل چوہے! تمہیں بھی تمہارے باپ کے پاس روانہ کر دوں۔'' سرتاج خان نے

قہقہہ لگا کر کہا۔ اور دوسرے لمحے گولی رحمان خان کے قریب سے نکل گئی۔ لیکن اسی وقت طالوت نے چھلانگ لگائی اور رحمٰن خان کو لئے ہوئے نیچے گر پڑا۔ سرتاج خان کا یہ فائر بھی خالی گیا تھا۔

''رحمان خان! تم یہاں رکو۔ میں اس مردود کو دیکھتا ہوں۔''

''نہیں۔'' رحمٰن خان نے طالوت کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کی۔ ''اس نے میرے باپ کو قتل کردیا ہے...... میں اس سے انتقام لوں گا۔''

''وہ میرا بھی باپ تھا۔ رُک جاؤ رحمان خان! میری راہ میں مشکلات پیدا مت کرو۔'' طالوت نے کہا۔

''نہیں...... نہیں۔'' رحمان خان پاگلوں کی طرح چیخا۔

'' بکومت۔'' طالوت کی غرّاہٹ بہت خوف ناک تھی۔ اُس نے خونخوار نگاہوں سے رحمان خان کو گھورا اور رحمان خان کسی خوف زدہ چوہے کی طرح ٹھٹک گیا۔

تب طالوت اُسے چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اور سرتاج خان نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ گولی طالوت کے سینے سے ٹکرائی تھی۔ لیکن طالوت کے قدموں میں کوئی لغزش نہ ہوئی۔

وہ آگے بڑھا۔ اور سرتاج خان بدحواسی میں گولیاں چلاتا رہا۔ پھر میں نے اُسے چٹان کے عقب سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔

طالوت اب بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت مجھے طالوت بے حد پُراسرار معلوم ہوا۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی تھی۔ سرتاج خان پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ اب وہ نیچے ایک وادی میں داخل ہو رہا تھا۔ شاید وہاں سے وہ غاروں میں نکل جانا چاہتا تھا۔ تب طالوت رک گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ بلند کیا اور سرتاج خان رک گیا۔

نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیوں وہ رُک کر طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ اور پھر وہ واپس آنے لگا۔ طالوت کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور سرتاج خان مشینی انداز میں اُس کی طرف واپس آ رہا تھا۔

دوسری طرف اچانک شہباز خان کے بدن میں حرکت ہوئی۔ رحمان خان اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں بھی اس کی طرف دوڑا اور گلفشاں میرے پیچھے۔

''خان بابا!'' رحمان خان نے شہباز خان کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے رحمانے! گولی میرے بازو کے گوشت سے نکل گئی ہے۔'' شہباز خان اس کے سہارے سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ گلفشاں، دولت خان کی لاش سے لپٹی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔

تب شہباز خان نے رحمانے سے کہا۔ ''اسے سنبھالو بیٹے! بدنصیب لڑکی۔''

دوسری طرف سرتاج خان واپس طالوت کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ طالوت نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیٹی سے پستول نکال لیا۔ اور پھر وہ اس کے چیمبر چیک کرنے لگا۔ پستول میں کارتوس موجود تھے۔

''سرتاج خان!'' طالوت کی آواز اُبھری اور پھر اُس نے پستول سرتاج خان کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''اس کی نال کنپٹی پر رکھ کر خودکشی کر لو۔ تم اتنے ذلیل ہو کہ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں قتل بھی نہیں کروں گا۔''

سرتاج خان نے پستول کی نال اپنی کنپٹی پر رکھی اور پھر اُس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ اُس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ ہاں پستول کی آواز پر چونک کر سب نے اس کی طرف دیکھا۔

سرتاج خان کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گر رہا تھا۔ اور طالوت واپس پہنچ گیا۔

''سنو......!'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے طالوت؟'' میں اس المیے پر رنجیدہ ہو گیا تھا۔

''دولت خان کی قبر کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرو۔ ہم اسے قبر میں اُتارنے کے بعد جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔''

اور پھر اُس نے گلفشاں کو دیکھا جو روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی۔

''رحمان خان!'' اس نے رحمان خان کو مخاطب کیا۔

''جی دلیر خان!'' رحمان خان جلدی سے آگے بڑھ آیا۔

''اسے سنبھالو۔ میں خان بابا کا زخم دیکھتا ہوں۔'' طالوت نے شہباز خان کا ہاتھ پکڑا اور ایک چٹان کی طرف بڑھ گیا۔

''اوئے دلیر خان! اب میں اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوں کہ اتنے اتنے سے زخموں سے گھبراؤں گا۔ لیکن دولت خان کی موت کا مجھے افسوس ہے۔''

''اُسے اُس کے گناہ کی سزا ملی ہے۔''

''پھر بھی...... پھر بھی اُسے ایسے نہیں مرنا چاہئے تھا۔''

''تم تو اُس کے دشمن تھے شہباز خان!''

''اوئے دشمنی تو ختم ہو گئی تھی۔ برا ہوا...... ظلم ہوا۔'' شہباز خان غم زدہ لہجے میں بڑبڑاتا رہا۔

دولت خان کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر ہم وہاں سے چل پڑے۔ شہباز خان کی اجازت سے رحمان خان نے گلفشاں کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا تھا۔ اس عجیب المیے سے ذہن پر بوجھ تھا۔ بڑی خاموشی سے سفر ہو رہا تھا۔

شام ڈھل گئی تھی۔ اور ایک جگہ قیام کی ٹھہری۔ رات کے کھانے وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ کسی سے کھایا نہیں گیا تھا۔ گلفشاں رہ رہ کر رونے لگتی تھی۔ لیکن رحمان خان کی موجودگی سے اُسے تقویت تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور طالوت چل پڑے۔

''جی......'' طالوت نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''یار! اب رحمان خان کے گھر جا کر کچھ اور رقت انگیز مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''اُس کی ماں..... ظاہر ہے، ماں کو اُس کا وہ بیٹا ملے گا، جس کی موت پر وہ آنسو بہا کر صبر کر بیٹھی تھی۔''

''اوہ...... ہاں، یہ تو ہے۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''فرار......!''

''کس طرح؟''

''میرا خیال ہے، شہباز خان سے بات کر لی جائے۔''

''کیا بات کرو گے؟''

''آؤ......اب تو مجھے بھی بات کرنی آ گئی ہے۔'' طالوت نے کہا اور مجھے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ شاہ دانہ کا دوشالہ اس نے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ نہ جانے اُس کے کیا ارادے تھے۔

شہباز خان، رحمان خان اور گلفشاں سے کافی دُور بیٹھا زمین کرید رہا تھا۔ وہ کسی خیال میں گم تھا۔

''شہباز خان!'' طالوت نے سنجیدگی سے اسے آواز دی۔

''اوہ......آؤ میرے بچو!'' اس نے بڑی محبت سے کہا اور ہم دونوں اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ ''کیا بات ہے؟'' اُس نے ہم دونوں کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ سے اجازت طلب کرنے آئے تھے۔'' طالوت بولا۔

''کیا مطلب؟''

''ہم اب جانا چاہتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''شہباز خان! ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں اسی وقت تک کے لئے بھیجا گیا تھا۔''

''بھیجا گیا تھا؟......کس نے بھیجا تھا؟''

''شہباز خان! تم دانا انسان ہو۔ کیا تمہیں ہمارے اندر کچھ عجیب باتیں محسوس نہیں ہوئیں؟''

''کیا مطلب؟'' شہباز خان چونک پڑا۔

''ابتدا ان دونوں گھوڑوں کے حصول سے ہوئی۔ بے شک ان گھوڑوں پر سواری آسان نہیں تھی۔ پھر سرتاج خان اور اس کے ساتھیوں کے اُلٹے دوڑنے والے گھوڑے......اس کے بعد کی دوسری ناقابلِ یقین باتیں۔ کیا یہ سب تمہیں عجیب نہیں محسوس ہوئیں؟''

''ہاں۔ لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شہباز خان کی آواز میں عجیب سا تاثر تھا۔

''یہی کہ ہمارا مشن پورا ہو گیا ہے۔ ہمیں حکم ملا تھا کہ تمہاری مدد کریں۔ رحمان خان کو تم سے ملا دیں اور اس کے بعد واپس آ جائیں۔''

''مم......مگر آخر تم کون ہو؟'' شہباز خان کی آواز میں لرزش تھی۔

''رحمان خان کی شادی گلفشاں سے کر دینا۔ اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور دیکھو، میں کون ہوں۔''

طالوت نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا اور دوسرے لمحے وہ نگاہوں سے غائب تھا۔

''ارے......ارے......'' شہباز خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اور پھر اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ طالوت کی حرکت میں سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ لیا۔ اور ظاہر ہے، میں بھی شہباز خان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا ہوں گا۔ لیکن اب ہم دونوں اسے بخوبی دیکھ رہے تھے۔

شہباز خان پاگلوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ اور پھر وہ چیختا ہوا رحمان خان کی طرف دوڑا۔

''رحمان خان!......رحمانے......رحمانے......!''

''آؤ دیکھیں، کیا ردِ عمل ہے۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں بھی اسی طرف چل پڑے۔ شہباز خان شاید رحمان خان کو تفصیل بتا رہا تھا۔ رحمان اور گلفشاں بھی سخت حیران تھے۔

''میں گناہگار انسان ہوں میرے معبود!......تُو نے میری کون سی بات پسند کر لی......میرے پاک

بے نیاز رب! میں تو ایک گنہگار انسان ہوں۔'' شہباز خان کہہ رہا تھا۔
پھر اُس نے جائے نماز بچھائی اور سجدہ ریز ہو گیا۔
''آؤ...... بات بن گئی۔'' طالوت نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''لیکن ہم تو گناہگار ہو گئے طالوت!...... اُس نے ہمیں فرشتہ سمجھا۔''
''خدا ہمارا گناہ معاف کر دے گا۔ ہم مجبور تھے۔''
''مگر اب کیا، کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔
''ابے یہاں سے تو نکلو۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ کیا، کیا جائے۔''
''گھوڑے؟'' میں نے کہا۔
''جہنم میں جائیں۔'' طالوت نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا اور میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ شخص جس جگہ سے بیزار ہوتا ہے، اسی طرح ہوتا ہے۔

⊛

ہم شہباز خان وغیرہ سے کافی دور نکل آئے۔ اور پھر ایک بڑی چٹان کے عقب میں ہم دونوں رک گئے۔

''آؤ......اوپر بیٹھیں گے۔'' طالوت نے کہا اور ایک مناسب راستے سے چڑھ کر ہم مسطح چٹان پر پہنچ گئے۔ صاف ستھری چٹان پر بیٹھ کر میں نے منہ اٹھا کر تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھری اور پھر اسی چٹان پر دراز ہو گیا۔

طالوت گھٹنے سکوڑے بیٹھا تھا۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ تب میں نے ایک گہری سانس لے کر طالوت کو مخاطب کیا اور طالوت میری جانب دیکھنے لگا۔

''بہت گہری سوچ میں ہو۔ کیا بات ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔ آئندہ پروگرام پر غور کر رہا ہوں۔''

''ایک بات بتاؤ طالوت!''

''پوچھو۔''

''کیا ہماری قسمت میں زندگی بھر صحرا گردی لکھی ہے؟ کسی مقام پر قیام ہوگا یا نہیں؟''

''تم اُکتا گئے ہو عارف؟'' طالوت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے احساس ہے میرے دوست! اپنی تفریح طبع کی خاطر میں نے تمہیں بھی در بدر کر دیا ہے۔ دراصل میری طبیعت تمہاری طبیعت سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ تم میری شخصیت کا ایک جزو بن گئے ہو۔ لیکن عارف! برا مت ماننا۔ میں تو ابھی اپنی دنیا میں واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میری دنیا پر جمود طاری ہے۔ اور مجھے اس قبرستان سے وحشت ہوتی ہے۔ میں تو ابھی تمہاری دنیا دیکھوں گا۔ لیکن میرے دوست! اگر تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو میں تمہیں خدا حافظ کہہ سکتا ہوں۔ میں تمہارے اعلیٰ مستقبل کا انتظام کر دوں گا۔ پوری زندگی عیش و عشرت میں گزار سکو گے۔''

''اس بکواس کا کیا مطلب؟'' میں نے بھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

''برا مت مانو۔ میں نے ایک بات کہی ہے، تمہارے سوال کے جواب میں۔ تمہیں حق ہے کہ اپنی دنیا کے ماحول کے مطابق زندگی گزارو۔ تمہیں بھی بیوی بچوں کی......''

''بیوی بچوں کی اور تمہاری ایسی کی تیسی۔ فضول بکواس مت کرو۔'' میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں

کہا۔

”بھئی میں نے تو......“

”کیوں ذلیل کر رہے ہو طالوت! ایک درخواست ہے۔ جب تمہارا اس دنیا سے دل بھر جائے اور تم واپس جانا چاہو تو براہِ کرم میرا ایک کام ضرور کرتے جانا۔“

”اوہ......کیا کام؟“

”راسم سے کہہ کر کوئی ایسا سریع الاثر زہر میرے لئے مہیا کرا دینا، جسے کھانے کے بعد تکلیف کا کوئی احساس نہ ہو اور انسان کچھ سوچے سمجھے بغیر مر جائے۔ میں تم سے علیحدگی کے تصور کے چند لمحات بھی نہیں گزار سکتا۔“

”مجھے تیری دوستی پر ناز ہے عارف! میں خود تجھ سے جدا نہیں رہ سکتا۔ لیکن بس کبھی کبھی تیرا خیال آ جاتا ہے، کہیں تُو صرف مروّت میں میرا ساتھ نہ دے رہا ہو۔“

”نہیں طالوت، میرے دوست! میں ایک بے سہارا انسان ہوں۔ میری دنیا میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے، تُو جانتا ہے۔ تیری معیت میری زندگی کا ستون ہے۔ تُو چلا گیا تو یہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔“

”عارف......!“ طالوت چونک کر بولا۔

”کیوں......کیا ہوا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”کیا ہم دونوں پاگل ہو گئے ہیں؟“

”کیوں؟“

”پھر یہ بکواس کیا حیثیت رکھتی ہے؟ ظاہر ہے، نہ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں اور نہ تُو مجھے۔ پھر ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے یہ سوچنا چاہئے کہ اب ہمارا دوسرا قدم کیا ہو گا؟“

”دوسرے قدم کے بارے میں اس سے پہلے ہم نے کیا سوچا ہے، جواب سوچیں گے۔ جدھر منہ اُٹھا، چل پڑیں گے۔“

”گویا رات کو آرام کیا جائے۔“

”بے شک!“

”ٹھیک ہے۔ آرام کرو۔“ طالوت نے کہا اور پھر اُس نے سنجیدگی سے سونے کی ٹھان لی۔ اور شاید تھوڑی دیر کے بعد سو بھی گیا۔ لیکن مجھے کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ چاند نکل آیا۔ اور میں چاند پر نگاہیں جمائے خیالات میں اُلجھا رہا۔ لیکن یہ بھی بے خوابی کا ایک مجرب علاج ہے۔ نہ جانے کب چاند کی سنہری ٹھنڈک میری آنکھوں میں نیند لے آئی۔

اور دوسری صبح جب میں جاگا تو سورج ناگواری سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر طالوت کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ چٹان کے عقب میں نیچے کی سمت دو گھوڑے کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

”اُٹھو......کافی دیر تک سو لئے۔“

”ہاں۔“ میں ایک انگڑائی لے کر اُٹھ گیا۔ چٹان کے آخری کونے پر پانی کے برتن وغیرہ رکھے ہوئے

تھے۔ طالوت نے اس طرف اشارہ کیا اور میں ضروریات سے فارغ ہونے لگا۔ منہ ہاتھ دھو کر جب میں طالوت کے پاس پہنچا تو وہ دستر خوان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور دستر خوان پر عمدہ قسم کا ناشتہ موجود تھا۔

''اوہ......'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

''آج کی ضیافت راسم کی طرف سے ہے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' میں نے طویل سانس لی۔ اور پھر ہم دونوں نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ ''یہ گھوڑے؟''

''یقیناً سرتاج خان کے بھگوڑے سپاہیوں کے ہوں گے۔ خود بخود آ گئے تھے بے چارے۔ میں نے پُرتپاک خیر مقدم کیا۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''خوب!'' میں ہنسنے لگا۔

ناشتہ کرنے کے بعد کافی دیر تک ہم لوگ اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہے۔ بہت سے لوگ زیر گفتگو آئے۔ اور پھر طالوت نے دُور...... بہت دُور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اُن پہاڑیوں کے دوسری طرف کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''کیوں نہ اُدھر کا رُخ کیا جائے؟''

''جیسا پسند کرو۔'' میں نے جواب دیا۔

''ادھر ہی چلیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے۔''

''سر تسلیم خم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ اور طالوت دُور سے دھوئیں کی مانند نظر آنے والی پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ اُٹھ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم گھوڑوں پر سوار خراماں خراماں اس طرف جا رہے تھے۔ چاروں طرف بے آب و گیاہ پہاڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ بڑا خشک سفر تھا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ اس کا باقاعدہ سفر کرنے کا ارادہ تھا۔ ورنہ اُس کے لئے کیا مشکل تھا کہ پلک جھپکے اور ہم پہاڑوں کے نزدیک ہوں۔ لیکن موڈی جن تھا۔ اس نے صرف گھوڑوں پر قناعت کی تھی۔ چنانچہ پورا دن سخت تکلیف میں گزرا۔ جب شام کی ہوائیں اندھیرے کو کھینچ کر لانے لگیں تو ہم ایک سبزہ زار میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں سبز گھاس کے میدان تھے۔ دُور ایک ندی گنگناتی ہوئی گزر رہی تھی۔

پیاسے گھوڑے اس طرف دوڑنے لگے۔ ہم نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھوڑوں نے پانی میں منہ ڈال دیا اور ہم نے ان کی پشت چھوڑ دی۔

طالوت چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کہیں کہیں خود رو درخت اُگے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی چٹانیں دُور دُور تک بکھری پڑی تھیں۔ عجیب سا علاقہ تھا۔ پُراسرار اور خوب صورت۔

''عمدہ جگہ ہے۔'' اس نے کہا اور ہم نے قیام کے لئے ایک جگہ منتخب کر لی۔ وہ پہاڑ زیادہ دور نہ تھے، جنہیں ہم نے صبح کو دیکھا تھا۔ بڑے خوب صورت پہاڑ تھے۔ اُن کی چوٹیوں پر سفید سفید برف کی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں۔ برف پگھل چکی تھی، ورنہ یہ سارے پہاڑ ہی برف پوش ہوتے۔ موسم بھی نہایت عمدہ تھا۔ طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔

ایک عمدہ سی جگہ بیٹھ کر ہم نے پاؤں پھیلا دیئے اور رات کی چادر ماحول پر آ پڑی۔ سورج غائب ہو گیا۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑے سر جوڑنے لگے۔

''بارش۔'' طالوت نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرا خیال ہے بارش نہیں، برف باری۔''

''بڑا حسین منظر ہوتا ہے۔''

''ہاں...... مجھے بھی پسند ہے۔ لیکن میرے عزیز! اگر یہ برف باری ہو ہی گئی تو کیا رات برف کے ذرّات سے ہم آغوش ہو کر گزاری جائے گی؟''

''یہاں بہت سی چٹانوں کے سائبان موجود ہیں۔ کہیں بھی پناہ لے لیں گے۔''

''ہاں۔'' میں نے ایک طویل سانس لی۔ ''بھوک لگ رہی ہے۔''

''راسم......!'' طالوت نے دائیں طرف رُخ کر کے کہا۔

''آقا......!'' راسم نگاہوں کے سامنے تھا۔

''کھانے کا وقت ہے۔''

''کیا پیش کروں؟'' راسم نے کسی ویٹر کے سے انداز میں پوچھا۔

''اپنا آرڈر نوٹ کرا دو۔'' طالوت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''راسم مجھ سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔'' میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''جاؤ یار!...... لے آؤ، جو دل چاہے۔'' طالوت نے کہا۔ اور راسم نے گردن جھکا دی اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد راسم نے تازہ گرم اور لذیذ کھانوں کے ڈھیر لگا دیئے اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

ابھی کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ برف باری شروع ہو گئی۔ ننھے ننھے سفید ذرّات آسمان سے ہماری طرف لپکے اور ہم مسرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

''قدرت نے انسان کی دل بستگی کے لئے کیا کیا سامان مہیا کئے ہیں۔'' طالوت آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور پھر اُس نے جلدی سے گردن جھکا لی۔ برف کے ذرّات آنکھوں میں آ پڑے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ایک چٹان پر جا چڑھے۔ چٹان پر برف بکھری ہوئی تھی۔ ایک ہلکی سی تہہ۔ ہم اس پر بیٹھ گئے اور نیچے کی برف ہمارے جسموں کی حرارت سے پگھلنے لگی۔ ہمارے شانوں پر، سر پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر برف کے ذرّات جم رہے تھے۔ اور جب ہم انہیں جھاڑتے تو سفید برادہ سا بکھر جاتا۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن دونوں ہی اس حسین موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کافی دیر گزر گئی۔ برف برابر گر رہی تھی۔ تب دُور...... کافی دُور اچانک ایک روشنی سی نظر آئی اور ہم تعجب سے اسے دیکھنے لگے۔

''عارف!'' طالوت نے مجھے مخاطب کیا۔

''ہاں۔''

''روشنی دیکھی؟''

''ہاں۔''

''کیا ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

''اوہ......وہ دیکھو، اس چٹان کے عقب سے روشنی اُبھر رہی ہے۔'' طالوت نے کہا۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک کر کے بہت سی مشعلیں روشن کی جا رہی ہوں۔ اور پھر روشنی کا ایک دائرہ سا بن گیا۔

''اُٹھو......!'' طالوت نے کہا اور میں بھی غیر اختیاری طور پر اُٹھ گیا۔ ہم دونوں روشنی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ان چٹانوں کے نزدیک پہنچ گئے جو عجیب ساخت کی تھیں۔ کئی چٹانوں نے مل کر ایک پیالہ سا بنا لیا تھا۔ ان کے رخنوں سے گزر کر اندر جایا جا سکتا تھا۔ ہاں اگر کوئی اوپر سے اُترنے کی کوشش کرتا تو مشکل پیش آتی۔ کیونکہ ان کے اندرونی سرے ڈھلوان تھے۔ پھر ہم نے چٹانوں کے اوپر کچھ انسانی سائے اُبھرتے دیکھے اور ہم جلدی سے آڑ میں ہو گئے۔

''کوئی دلچسپ معاملہ ہے۔'' طالوت نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔

''یقیناً۔''

''چٹانوں کی بلندی سے یہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ آؤ......ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر چلیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے تائید کی اور چند منٹ کے بعد ہم پوشیدہ حالت میں چٹان کے ایک رخنے کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر تقریباً بیس آدمی موجود تھے۔ یہ لوگ جانوروں کی کھالوں کی جیکٹوں اور چست پائجاموں میں ملبوس تھے۔ سروں پر بڑے بالوں والی گول ٹوپیاں تھیں اور پیروں میں پنڈلیوں تک جوتے۔ سب کے سب رائفلوں اور پستولوں سے مسلح تھے، بلکہ چٹانوں پر چڑھے آدمیوں کے پاس اسٹین گنیں بھی موجود تھیں۔ قوی ہیکل اور خطرناک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اُن کے چہرے سیاہ کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

طالوت نے شانے ہلا کر میری طرف دیکھا اور ہم ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ پیالہ نما چٹانوں کے رخنوں میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں۔ مخصوص ساخت کی مشعلیں تھیں لیکن ان کے اوپر سائبان بھی تھے۔ گویا مشعلیں لگانے کی یہ جگہ انسانی ہاتھوں سے تراشی ہوئی تھی۔ اتنے آدمی موجود تھے، لیکن ایسی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے وہاں انسانوں کا وجود ہی نہ ہو۔ اور یہ خاموشی کافی دیر تک طاری رہی۔ پھر چٹانوں میں کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اُبھری اور مختلف جگہوں پر کھڑے ہوئے لوگوں میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بے چینی سے چٹانوں کے اوپر دیکھنے لگے۔ اور پھر اُدھر سے ایک آواز سنائی دی۔

''وہ آ گیا ہے۔''

نیچے موجود لوگوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم لوگ چٹانوں کے رخنوں پر نگاہ دوڑا رہے تھے۔ تب ایک قوی ہیکل شخص اسی لباس میں ایک رخنے سے اندر داخل ہو گیا اور اندر موجود لوگوں نے مختلف جملوں میں اس کا استقبال کیا۔ وہ سب اس انداز سے مؤدب ہو گئے تھے، جیسے آنے والا کوئی بہت بڑی حیثیت کا حامل ہو۔

طالوت اور میں بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''کیا چکر ہے؟'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''میرا خیال ہے، چند لمحات میں پتہ چل جائے گا۔'' میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔ خاموشی اب تک برقرار تھی۔ آنے والا دیو ہیکل انسان تھا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے، سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو گھور رہا

تھا۔ پھر اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"دوستو! میرے پاس تمہارے لئے خوشخبری ہے۔ آنے والے آ گئے ہیں۔ میں نے اُنہیں پوائنٹ بارہ میں ٹھہرا دیا ہے۔ وہیں پر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اور اب بہت جلد میں آپ لوگوں کے سپرد کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہم سب مستعد ہیں۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"شہر کی کیا رپورٹ ہے؟"

"ہمارے آدمی خوش اسلوبی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے چہ میگوئیاں نہیں سنیں؟"

"ہاں...... میں مطمئن ہوں۔ لیکن ایک اور بات بھی میرے علم میں آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے محسوس کیا ہے کہ ایک خفیہ تحریک ہمارے خلاف مصروف ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کو علم ہے کہ ہمارے نمائندے ملکہ کے واقعے کو اُچھال رہے ہیں۔ لیکن اب کچھ لوگ اُس کی تردید کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔"

"کیا وہ لوگ تمہاری نگاہوں میں آئے؟"

"نہیں۔ لیکن ہم اُن کی تلاش میں ہیں۔"

"اونہہ...... مجھے ان لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ میرا کام اتنا کمزور نہیں ہے کہ معمولی قسم کے لوگ اس میں رخنہ انداز ہو سکیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم بھی ان کے لئے فکر مند نہیں ہیں۔"

"بس، آج کی گفتگو یہیں تک محدود تھی۔ بہت جلد تم لوگوں کو تمہارے ٹھکانے پر کام سے مطلع کر دیا جائے گا۔ بس اب تم جا سکتے ہو۔" قوی ہیکل قبائلی دونوں ہاتھ ہلا کر چٹان کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگے۔

"کیا چکر ہے؟" میں نے طالوت کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"یہ تو معلوم کرنے سے ہی پتہ چلے گا۔"

"کس سے معلوم کرو گے؟"

"کوئی بھی ذریعہ نکال لیں گے۔ تم بتاؤ، کیا تمہیں ان معاملات میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہاں...... پُراسرار لوگ ہیں۔ ملکہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔"

"یہ ملکہ کون ہو سکتی ہے؟"

"کسی قبائلی ریاست کی ملکہ۔ یہاں سرحد پر بہت سی ریاستیں پھیلی ہوئی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یار عارف! معاملات دلچسپ رُخ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔"

"یقیناً۔"

"تو پھر بسم اللہ۔"

"آؤ چلیں...... وہ سب نکل چکے ہیں۔"

''اوہ......اُن کی فکر مت کرو۔ راسم اُن کے بارے میں بتا سکتا ہے۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔ اور پھر ہم بھی چٹان کے رخنے سے باہر نکل آئے۔ تھوڑے فاصلے پر ہمارے گھوڑے خاموش کھڑے تھے۔ سمجھ دار جانوروں نے آواز نہ نکال کر ہمارے ساتھ تعاون کیا تھا۔ ہم اپنے گھوڑوں کے نزدیک آ گئے۔ طالوت اپنی اصلی شکل میں آ گیا اور میں نے بھی شاہ دانہ کا دوشالہ اُتار دیا۔

اور پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ اچانک چٹان کے اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔

''خبر دار......تم دو پستولوں کی زد پر ہو اور میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔''

ہم دونوں ہی بری طرح اُچھل پڑے تھے۔

''ہاتھ بلند کر دو......ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' آواز پھر آئی۔ آواز کی نسوانیت چھپی نہ رہ سکی تھی۔ لیکن اس میں سفاکی تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے بولنے والی جو کہہ رہی ہے، وہی کر گزرے گی۔

طالوت نے مجھے اشارہ کیا۔ اور پھر خود بھی ہاتھ بلند کر دیئے۔

''اے تم......'' آواز نے شاید مجھے مخاطب کیا تھا۔ کیونکہ اب ہم اسے دیکھ بھی سکتے تھے۔ اُس نے پستول سے میری طرف اشارہ کیا تھا۔ ''یہ رسّی لو۔ اپنے ساتھی کے ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دو۔'' اس نے ایک رسّی میری طرف اُچھال دی۔ اور پھر طالوت سے بولی۔ ''چلو، تم دونوں ہاتھ پشت پر کر کے گھوم جاؤ۔''

طالوت نے دونوں ہاتھ پشت پر کیئے اور گھوم گیا۔

''سنو......میرے پورے بدن پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مفت میں جان کھو دو گے۔''

''کیا ہم ان آنکھوں کو ٹٹول سکتے ہیں؟'' طالوت نے پوچھا اور ٹرچ کی آواز کے ساتھ طالوت کے پاؤں کے قریب پتھر کی کرچیاں اُڑ گئیں۔ اُس نے بے آواز پستول سے فائر کیا تھا۔

''بکواس سے پرہیز کرو۔ مجھے تم میں سے صرف ایک کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر میرا کام ہو جائے تو ممکن ہے میں تم دونوں ہی کو زندہ چھوڑ دوں۔''

''ہم میں سے کون سا پسند ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''اگر اس کے بعد تم نے بکواس کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' آواز حد درجہ سرد تھی۔

''کمال ہے۔'' طالوت ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ میں نے طالوت کے ہاتھ اُس کی پشت پر باندھ دیئے تھے اور چند ساعت کے بعد میں اس کام سے فارغ ہو گیا۔

''اب اس کا اسلحہ نکال کر نیچے ڈال دو۔'' پستول والی نے پھر کہا۔ وہ اطمینان سے چٹان پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے جسم پر بھی ویسا ہی لباس تھا، جیسا ہم نے ان مردوں کے جسم پر دیکھا تھا۔ بڑے بالوں والی ٹوپی نے اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ ممکن ہے اس کے چہرے پر بھی سیاہ نقاب ہو۔ تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور پھر برف کا ہلکا سا دھواں ہمارے اور اس کے درمیان حائل تھا۔

''ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ جو کہا جا رہا ہے، کرو۔ چلو جلدی کرو۔''

''مجھے شرم آتی ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت ہنس پڑا۔ پھر جلدی سے بولا۔

"اس کی باتوں میں مت آنا۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرے پاس پستول موجود ہے۔ اور اس نے میرے ہاتھ بھی ڈھیلے باندھے ہیں۔ یہ دیکھو۔" طالوت نے رسّی کھول کر دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے۔

"ہوں...... شکریہ......" عورت نے غرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ چلو، اب تم کس کر اس کے ہاتھ باندھ دو۔"

میں بدمعاش طالوت کی اس حرکت پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ شرارت کے موڈ میں تھا کمبخت۔ اُس نے کس کر میرے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔

"کیا اس کے پاس پستول موجود ہے۔"

"دو...... دو......!" طالوت جلدی سے بولا۔ حالانکہ درحقیقت میرے پاس پستول نہیں تھا۔ لیکن وہ طالوت ہی کیا، جو میرے لباس سے دو پستول نہ نکال لیتا۔ طالوت نے دو پستول نکال کر عورت کے سامنے ڈال دیئے۔

"تمہارے پاس بھی پستول ہے؟"

"ہے۔" طالوت نے سادگی سے کہا۔

"تم بھی اپنا پستول نکال کر ڈال دو۔" اور طالوت نے نہایت سعادت مندی سے ایک اور پستول نکال کر چٹان کے سامنے پھینک دیا۔ "اپنے ہاتھ بلند رکھو۔"

"اب بھی اس کی ضرورت ہے؟"

"ہاں۔ میں خود بھی تمہارے لباس کی تلاشی لوں گی۔ ممکن ہے، تمہارے پاس دوسرا پستول موجود ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سمجھیں؟" طالوت نے غصیلے انداز میں کہا۔

"چلو...... میں اپنی تسلی ہی کر لوں۔" عورت چٹان سے کود آئی۔ اور پھر اُس نے طالوت کے لباس کی تلاشی لی تھی۔ پھر عورت ایک گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ قریب سے ہم نے اس کا بخوبی جائزہ لیا تھا۔ خاصے حسین جسم کی مالک تھی، لیکن کافی محتاط نظر آتی تھی۔

"کیا نام ہے تم دونوں کا؟"

"یہ خربوز خان ہے...... اور میں تربوز خان۔" طالوت نے جواب دیا۔

"مسخرہ پن مت کرو۔ نام بتاؤ۔"

"کک...... کیا مطلب؟" طالوت حیرت سے بولا۔

"کیا تم دونوں کے یہی نام ہیں؟"

"ہاں...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"جہنم میں جاؤ۔ مجھے تمہارے ناموں سے غرض نہیں ہے۔ میں تو تم سے تمہارے سربراہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"سربراہ کیا ہوتا ہے بھائی خربوز؟" طالوت نے میری طرف رُخ کر کے کہا۔

"تم زیادہ نڈر بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ اس کے بعد تم میں سے ایک کو ختم کر دیا جائے گا۔"

"تم ہماری جوڑی برباد کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟ بلاوجہ ختم کر دو گی؟" طالوت نے اسی مسخرے

پن سے کہا۔
''اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو......تو یہ لو۔'' لڑکی نے پسول سیدھا کرلیا۔
''خدا حافظ بھائی خربوز! موت جس وقت بھی آ جائے۔ اسی وقت لکھی تھی۔ روزِ محشر آواز دے لینا۔''
طالوت روہانسی آواز میں بولی اور عورت ہنس پڑی۔
''میں تمہاری دلیری کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن اب میں وقت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ براہِ کرم میرے سوال کا جواب دو۔''
''مگر تمہارا سوال ہی ٹیڑھا ہے۔'' طالوت بولا۔
''کیا ابھی تم چٹانوں کے درمیان نہیں تھے؟''
''تھے۔''
''تب پھر کیا تم اُس گفتگو میں شریک نہیں تھے جو وہاں ہو رہی تھی؟''
''تھے۔'' طالوت اطمینان سے بولا۔
''میں سربراہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''
''یہی تو غلط ہے۔ سربراہ کون سا تھا، ہمیں بھی نہیں معلوم۔''
''وہی، جس نے تم لوگوں کو کسی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔''
''ہم لوگوں کو کیوں دیتا؟ ہم تو خود چھپے ہوئے تھے۔''
''کیا مطلب؟''
''ہم نے اتفاقیہ طور پر ہی اُنہیں دیکھا تھا۔''
''بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم ان کے ساتھیوں میں سے نہیں ہو؟''
''لعنت ہے۔ ہم تو غریب الوطن ہیں۔ سیر کرتے کرتے اس طرف آ نکلے تھے۔''
''میں کہتی ہوں، جھوٹ بولنے سے باز آ جاؤ۔'' عورت دانت کچکچا کر بولی۔
''اگر تیسری بار تم نے مجھے جھوٹا کہا تو......تو......'' طالوت غصیلے لہجے میں بولا۔
''تو تم کیا کرو گے؟''
''خ......خودکشی کرلوں گا۔'' طالوت نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا اور عورت پھر ہنس پڑی۔
''کاش تم غدارِ قوم نہ ہوتے، کاش تم ملت فروش نہ ہوتے۔ تمہاری یہ دلیری کیسے غلط راستوں پر جا رہی ہے۔''
''بھائی خربوز! کیا یہ درست ہے؟'' طالوت نے پھر میری طرف دیکھا۔
''مسخرہ پن چھوڑ دو۔ یہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیں ان کی غلط فہمی دور کرنی چاہئے۔'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''اچھا......تو تم ہی غلط فہمی دُور کر دو۔''
''خاتون! یہ حقیقت ہے......ہم دُور سے آ رہے ہیں۔ ہم نے رات گزارنے کے لئے ان چٹانوں میں پناہ لی تھی۔ برف باری شروع ہونے کے کچھ منٹ بعد ہمیں روشنی نظر آئی اور ہم تجسس میں ڈوب کر ادھر آ نکلے۔ تب ہم نے اندر کے مناظر دیکھے۔ اور جب سب چلے گئے تو ہم واپس آئے تھے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمارے گھوڑے ان سب سے الگ بندھے ہوئے تھے۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم سچ بول رہے ہو؟"

"فی الحال ایک ثبوت کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے لباس ان سے الگ ہیں۔ جبکہ وہ یکساں لباس میں تھے اور وہ لباس تمہارے جیسا تھا۔

عورت سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تب تم جہنم میں جاؤ۔ بلاوجہ میں نے وقت برباد کیا۔ لیکن سنو! زورات میں داخل ہونے کی کوشش مت کرنا۔ وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ ہر اجنبی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض اوقات اگر ان کے بارے میں مناسب معلومات مہیا نہیں ہوتیں تو انہیں گولی ماردی جاتی ہے۔"

"سنو خانم! اگر مناسب سمجھو تو ہمیں زورات کے حالات سے آگاہ کرو۔"

"فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور اس کے منہ سے تیز سیٹی کی آواز نکلی۔ اسی لمحے سفید رنگ کا ایک گھوڑا دوڑتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ عورت نہایت پھرتی سے اس پر سوار ہو گئی۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا ہو گئی۔

"عمدہ عورت ہے۔" طالوت تعریفی لہجے میں بولا۔

"افسوس، اس کی شکل نہیں دیکھی جا سکی۔"

"دیکھ لیں گے۔ ضرور دیکھ لیں گے۔ پروا کیوں کرتے ہو؟" طالوت تسلی آمیز انداز میں بولا۔ اور اس کے لہجے پر مجھے ہنسی آ گئی۔ "کیا خیال ہے، ہو گئی نا کہانی تیار۔"

"شاید۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"اب تو پھر جلدی کرو۔ کیا ہم اس کا تعاقب نہیں کریں گے؟" طالوت نے گھوڑوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔ اور پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر اسی راستے پر چل پڑے، جس پر پہلے وہ لوگ اور بعد میں عورت گئی تھی۔ لیکن ہمارے گھوڑوں کی رفتار بہت ست تھی اور ہم بڑے اطمینان سے چل رہے تھے۔ رات کی تاریکی اور اور برف باری کی وجہ سے گھوڑے بھی سہمے سہمے چل رہے تھے، اسی لئے ہم نے رفتار تیز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ طالوت کسی سوچ میں گم تھا۔

کئی منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "کیا تم نے حالات پر کچھ غور کیا ہے عارف؟"

"کس قسم کے حالات پر؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی وہ لوگ، اُن کی گفتگو اور پھر عورت کی باتیں۔ کوئی نتیجہ اخذ ہو سکا؟"

"میرا ذہن اس قابل نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹوپی پر سے برف جھاڑتے رہو۔ کیا تمہیں زورات کا نام یاد نہیں ہے؟ خان زورات کی شہباز خان بھی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔"

"یاد ہے۔ بالکل یاد ہے۔"

"گویا نیک دل خان قابل تعریف ہے۔ اور اسی کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کے الفاظ کے مطابق، ملکہ کے بارے میں کیا پروپیگنڈہ کرایا جا رہا ہے۔ اور پھر آنے والے جو پوائنٹ نمبر بارہ پہ تیاریاں کر رہے ہیں...... کیسی تیاریاں؟...... شاید انقلاب لانے کی۔ گویا خان زورات کی زندگی کو

خطرہ ہے۔ لیکن ایک پارٹی...... اُس شخص کے الفاظ یاد کرو۔ اُس نے کہا تھا کہ ایک پارٹی اُن کے خلاف میدان میں اُتر آئی ہے۔ کیا یہ لڑکی اُس دوسری پارٹی کی فرد نہیں ہو سکتی، جو ان لوگوں کے تعاقب میں یہاں آئی تھی۔ اور ہمیں ان کا آدمی سمجھ کر ہم سے معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی؟‘‘

’’خوب...... کیا تمہارے ہاں بھی جاسوسی ناول نگار ہوتے ہیں؟‘‘ میں نے حیرت زدہ انداز میں طالوت کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’کیوں...... کیا میرے اندازے غلط ہیں؟‘‘ طالوت نے جھلّا کر پوچھا تھا۔

’’یہ بات نہیں۔ لیکن تمہاری نکتہ دانی بہت خوب ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم زورات ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ غلط یا صحیح رُخ کا اندازہ کس طرح ہو؟‘‘

’’بکواس مت کرو۔ بس چلتے رہو۔ تم نے میری زندگی کا مذاق اُڑایا ہے، اسے یاد رکھنا۔‘‘ طالوت نے کہا۔

’’ارے، ارے...... کیا تم ناراض ہو گئے؟‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’نہیں۔ لیکن میری بات پر غور کرو۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور کہانی تیار کر کے بتا دو۔‘‘ طالوت نے کہا۔

’’حقیقت بہت جلد سامنے آ جائے گی طالوت! لیکن پروگرام کیا ہے؟‘‘

’’کیا پہلے سے پروگرام بنانے کی خاص ضرورت ہے؟ دیکھیں گے، حالات کو جانچیں گے۔ اور پھر جو بھی مظلوم ہو، اُس کی مدد کریں گے۔ کیا خیال ہے؟‘‘

’’بالکل...... بالکل کریں گے۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ نہ جانے کون سے ہنگامے جنم لینے والے تھے۔

ہم ان آخری پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ اور پھر ایک چھوٹے سے درّے سے گزرنے کے بعد جب ہم دوسری طرف پہنچے تو حیران رہ گئے۔ ان زرد زرد پہاڑیوں کے اس طرف، اس ویران میدان سے پرے ایک ایسی خوب صورت دنیا آباد ہو گی، گمان بھی نہ تھا۔ ریاست زورات کا شہر زورات، زمرد کی پلیٹ میں رکھے ہوئے سفید ہیرے کی طرح تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سبزہ چڑھا ہوا تھا، جس میں اب تھوڑی دیر کی برف باری سے سفید ذرات اٹک گئے تھے اور اس زمردیں مخمل میں کہیں کہیں سفیدی جمع ہو گئی تھی۔ اونچے نیچے خوب صورت مکانات، لکڑی کے، پتھر کے، جن کی بعض کھڑکیوں سے روشنی چمک رہی تھی۔

سویا سویا شہر، خاموش خاموش سا۔

ہم نے گھوڑے روک لئے۔ طالوت اور میں بھی خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ البتہ ہمارے گھوڑے منہ سے کھر کھر کی آواز نکال کر اپنے بدن کو جھٹک کر برف گرا دیتے تھے۔

’’یہ زورات ہے۔‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔

’’خاصا بڑا شہر ہے۔‘‘

’’ہاں...... میں بھی اسے دیکھ کر حیران ہوا ہوں۔ مجھے اتنی اُمید نہیں تھی۔‘‘

’’آؤ عارف! رات کی خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر ہم اس شہر میں پناہ حاصل کر لیں۔ ممکن ہے، دن کی

رائنی زورات کے شہریوں کو ہماری اجنبیت کا احساس دلا دے۔''
طالوت نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اور میں بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔
''کہاں پناہ حاصل کرو گے طالوت؟''
''دیکھتے ہیں۔'' طالوت نے لاپروائی سے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔
گھوڑے سست رفتاری سے چلتے ہوئے زورات کے بازاروں میں داخل ہو گئے۔ بازار سنسان پڑے ہوئے تھے۔ لوگ گہری نیند میں مست تھے۔ بلاشبہ زورات کو ایک جدید شکل دے دی گئی تھی۔ بہت کافی رقبے میں آباد تھا یہ شہر۔ طالوت ایک سڑک سے دوسری سڑک پر، ایک گلی سے دوسری گلی میں داخل ہوتا رہا۔ پھر وہ ایک بڑے مکان کے احاطے کے سامنے رک گیا، جہاں شہر کا واحد فرد جاگ رہا تھا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا، جس کے ہاتھ میں حقہ تھا اور کبھی کبھی حقے کی گڑگڑاہٹ بھی گونج اُٹھتی اور اس کے دھوئیں کی سوندھی بُو پھیل جاتی۔
''آؤ۔'' طالوت نے کہا اور گھوڑے سے اُتر گیا۔ گھوڑوں کی باگ پکڑے ہوئے ہم دونوں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اور بوڑھا ٹاپوں کی آواز سن کر اُچھل پڑا۔
''آ گئے۔'' وہ خاموشی سے بولا اور حقہ رکھ کر ہماری طرف لپکا۔ ''آہا..... آ گئے..... آؤ..... مجھے یقین تھا، تم ضرور آؤ گے۔ دیکھا، میں جاگ کر تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' بوڑھا بچوں جیسی خوشی کے ساتھ بولا۔
طالوت نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔
''اغمانہ سو گئی ہے۔ جاؤ..... اندر جاؤ۔ اُسے جگا لینا۔ ذرا گہری نیند سوتی ہے۔ خوب جھنجوڑ لینا۔ مگر رات بیت گئی ہے، کہیں گلاب خان بھی نہ سو گیا ہو۔ مگر خیر..... میں اسے جگا لوں گا۔ لاؤ، سلفے کے لئے پیسے دو۔ میرا نشہ بڑی دیر سے اُکھڑا ہوا ہے۔ اے دیکھتے کیا ہو؟ پیسے نکالو۔''
''نشے کے ساتھ ساتھ میں تمہاری گردن بھی اُکھاڑ دوں گا۔ ورنہ ہوش و حواس میں رہ کر گفتگو کرو۔''
طالوت نے پلٹ کر بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا اور بوڑھے کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔
''گگ..... گردن اُکھاڑ لو گے؟'' اُس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔
''ہاں۔''
''لل..... لیکن کیوں؟''
''تم کون ہو؟'' طالوت نے پوچھا۔
''پوگا..... پوگا جان۔'' بوڑھے نے پھدک کر کہا۔
''یہ کیا ہوتا ہے؟'' طالوت نے پوچھا اور مجھے ہنسی آ گئی۔
''میں ہوتا ہوں۔ بالکل میں ہوتا ہوں۔'' اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔
''طالوت!'' میں نے حالات کسی حد تک سمجھ کر طالوت کو آواز دی اور وہ میری طرف دیکھنے لگا۔
''اسے کچھ رقم دے کر دفع کر دو۔ اتفاق سے ہم نے بہترین جائے پناہ تلاش کی ہے۔''
''کیا مطلب؟'' طالوت نے حیرت سے کہا۔ اس دوران میں نے کچھ کرنسی بوڑھے کی طرف بڑھا دی تھی، جسے دیکھ کر بوڑھا خوشی سے اُچھل پڑا۔
''ارے واہ..... اس سے تو میں اپنا سارا قرض بے باق کر دوں گا۔ جیتے رہو..... جیتے رہو..... اب

تم اندر جاؤ، اغمانہ کو جگا لو۔ وہ بے حد خوش اخلاق ہے۔ ذرا بھی برا نہیں مانے گی۔''
بوڑھے نے ایک زقند بھری اور دوڑتا ہوا احاطے سے نکل گیا۔ طالوت نے شانے اچکا کر میری طرف دیکھا۔
''آؤ۔'' میں نے کہا۔ اور پھر ہم نے گھوڑے احاطے میں باندھ دیئے۔
''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے۔'' طالوت نے میرا شانہ بھینچ کر غرّاتے ہوئے کہا۔
''یار! ہم ویسی ہی ایک جگہ آ گئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کاروباری جگہ...... میرا خیال ہے، یہاں لڑکیاں ملتی ہیں۔''
''ارے......؟''
''ہاں میرے دوست! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ غلاظت اور گندگی ہر جگہ ہوتی ہے۔ بوڑھا نشے کا عادی ہے۔ ممکن ہے وہ اس کی بیٹی ہی ہو۔''
''تو پھر؟''
''ہمیں اس سے کیا غرض۔ ہمیں تو راتوں رات کسی جائے پناہ کی ضرورت تھی نا۔ اور میرا خیال ہے، اس سے عمدہ جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہاں کوئی ہمیں حیرت سے نہیں دیکھے گا۔''
بات طالوت کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔ چنانچہ ہم دونوں خاموشی سے بڑے مکان میں داخل ہو گئے۔ اس میں چھ سات کمرے تھے۔ بعض میں روشنیاں تھیں، بعض بے چراغ پڑے تھے۔
''کسی اغمانہ کو جگانے کی کیا ضرورت ہے؟ بس ایک کمرہ تلاش کر لو۔'' طالوت نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ لیکن آؤ، اس مکان کا جائزہ تو لے لیں۔'' میں نے طالوت سے کہا اور طالوت تیار ہو گیا۔ مکان میں کل چار افراد تھے۔ دو نوجوان لڑکیاں، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا جو چلا گیا تھا۔
''خوب...... اچھی پوزیشن ہے۔ میرا خیال ہے، وہ آخری سرے والا کمرہ درست ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''آؤ پھر، آرام کریں۔'' میں نے کہا اور ہم اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے کی عقبی کھڑکی کھول دینے سے باہر کا منظر نظر آنے لگا۔ برف اب بھی پڑ رہی تھی اور اندر اچھی خاصی خنکی تھی۔ ہم کھردری زمین پر لیٹ گئے۔
''کیا خیال ہے عارف! زبردستی کے مہمان کیسے رہے؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے میری طرف کروٹ بدل لی۔
''تمہارا موڈ ہے طالوت! ورنہ میں جانتا ہوں، تم خان زورات کے محل میں بھی قیام کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔
''اونہہ...... ہر ماحول کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ کھردری زمین پر بھی انسان سوتے ہیں۔ بہت سے لوگ تمہاری دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کے سر پر سائبان بھی نہیں ہے۔''
''ہاں۔ میری دنیا کی بات نہ کرو۔ نہ جانے میری دنیا میں کیا کیا ہے۔'' میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔
''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے، اب سونے کی کوشش کرو۔ تاکہ صبح کو شکل پر پھٹکار نہ برسے۔'' طالوت

نے کروٹ لیتے ہوئے کہا اور میں نے بھی کروٹ بدل لی اور اس کھردری زمین پر بھی مجھے نیند آ گئی۔
پھر صبح کو اس وقت ہی آنکھ کھلی، جب چند آوازیں نزدیک سنائی دیں۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ رات کا بوڑھا، بوڑھی عورت اور دو خوب صورت لڑکیاں ہمارے گرد کھڑی تھیں۔
''ایسے کام نہیں چلے گا اغمانہ! تُو امیر زورات کی بیٹی نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں، اتنی گہری نیند سوئی کیوں؟ مہمان کیا سوچیں گے؟''
''میں گہری نیند نہیں سو رہی تھی۔ مجھے جگانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔'' ایک لڑکی نے جواب دیا۔
''ابھی اُٹھ جانے دے۔ اگر مہمانوں نے شکایت کی، تب تیری خبر لوں گی۔ رنجشے سے کہوں گی کہ اب یہاں مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک ہونے لگا ہے۔''
''خدا کے لئے...... خدا کے لئے، رنجشے سے کچھ مت کہنا۔ میں مہمانوں سے معافی مانگ لوں گی۔''
''بھائی خربوز خان! یہ سب کیا ہے؟'' طالوت کی آواز سنائی دی تھی۔
''ابے اُٹھ تربوز کے بچے!'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور طالوت اُچھل کر بیٹھ گیا۔ ہمارے اس طرح جاگ جانے سے ہمارے گرد کھڑے ہوئے سارے لوگ چونک پڑے تھے۔
پھر بوڑھی نے اپنے چہرے پر ملائمت کے آثار پیدا کئے اور کریہہ انداز میں مسکراتی ہوئی بولی۔
''اُٹھو بچو!...... ہائے کیسا شرمندہ کیا ہے۔ تم یہاں آ کر کیوں سو گئے تھے؟ مجھے جگا لیا ہوتا۔''
''ہم یہاں بہت آرام سے سوئے تھے بڑی بی! ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔''
''تم ہمارے مہمان تھے۔ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک تو کہیں نہیں ہوتا۔''
''کوئی فرق نہیں پڑا۔ تم بے فکر رہو، ہم بہت خوش ہیں۔''
''تم نے اغمانہ کو جگایا تھا؟'' بڑی بی نے پوچھا۔
''نہیں...... ہم تو سیدھے اسی کمرے میں آئے تھے۔ اور چونکہ سخت نیند آ رہی تھی، اس لئے اطمینان سے سو گئے۔''
''چلو پھر کوئی بات نہیں۔ اب تم نہا لو۔ میں ناشتہ تیار کراتی ہوں۔ چل دلشاد! ناشتہ تیار کر۔ اور اغمانہ! تُو ان لوگوں کے نہانے کا انتظام کر۔ اور پوگے! تُو باہر بیٹھ۔''
''جاتا ہوں...... جاتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا اور باہر نکل گیا۔ بوڑھی عورت جو چہرے سے کافی خطرناک معلوم ہوتی تھی، دوسری لڑکی کو لے کر باہر نکل گئی۔ اب کمرے میں اغمانہ ہمارے ساتھ رہ گئی تھی۔
''میں تم لوگوں سے معافی چاہتی ہوں، یہاں تمہیں تکلیف ہوئی۔'' اُس نے گمبھیر آواز میں کہا۔
''خربوز بھائی! اس لڑکی سے کہو، ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' طالوت نے کہا۔
''تم ہمیں غسل خانہ دکھا دو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' میں نے کہا۔
''اوہ...... آؤ......'' وہ جلدی سے بولی اور پھر غسل خانے کے دروازے پر رُک کر اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ ''سنو، ممکن ہے، اس کے بعد مجھے دوبارہ موقع نہ مل سکے۔ ممکن ہے، میں تم سے نہ کہہ سکوں۔ خدا کے لئے، میرے بارے میں ناراضگی کا اظہار مت کرنا۔ ورنہ رنجشے میری کھال اُدھیڑ دے گا۔''
''یہ رنجشے کون ہے؟'' طالوت نے سوال کیا۔
''اس کے بارے میں پھر بتاؤں گی۔ اس وقت موقع نہیں ہے۔ اب میں جاؤں؟''

''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور لڑکی واپس مڑ گئی۔
''عارف!'' طالوت ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا۔
''بھائی تربوز!'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں گردن ہلائی۔
''رخشے......!''
''ہاں، رخشے۔''
''لڑکیوں کی کھال اُدھیڑ دیتا ہے۔''
''ہم اُس کی کھال اُدھیڑ دیں گے۔''
''اُس کی کھال میں بُھس بھی بھریں گے۔''
''ایں، ہاں......مگر بُھس کہاں سے دستیاب ہوگا؟''
''فی الحال اس کے بارے میں مت سوچو۔ بلکہ یہ سوچو کہ غسل خانہ ایک آدمی کے لئے ہے یا دونوں بیک وقت اس میں غسل کر سکتے ہیں۔ اگر صرف ایک کے لئے ہے تو پہلے میں جاؤں، یا......''
''تم ہی چلے جاؤ۔ مگر واپس آ جانا۔''
''آ جاؤں گا۔ اللہ مالک ہے۔'' ہم دونوں اسی طرح مسخرے پن کی باتیں کرتے رہے۔ پھر طالوت غسل خانے میں داخل ہو گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم غسل سے فارغ ہو گئے تھے۔ ہمیں ناشتے کے لئے لے جانے والی دوسری خوب صورت لڑکی تھی، جس کا نام دلشاد لیا گیا تھا۔ اُس کی عمر اغمانہ سے کم تھی اور وہ کسی قدر شوخ بھی نظر آتی تھی۔
''آپ کا نام دلشاد ہے خاتون؟'' طالوت نے بھینگی آنکھیں بنا کر پوچھا۔
''ہاں ہے......پھر؟'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔
''اللہ اکبر......کیا آپ ہری مرچوں کا شوق رکھتی ہیں؟''
''کیا مطلب ہوا اس بات کا؟'' اُس نے تیکھے انداز میں طالوت کو گھورا۔
''خدا اپناہ میں رکھے۔ کیا آپ نے ناشتہ نہیں کیا ہے؟''
''کیا تم پاگل ہو؟'' لڑکی کلکلا کر بولی۔
''ابھی تک تو نہیں ہوں۔ لیکن انشاء اللہ......''
''تم نے میرے ناشتے کے بارے میں پوچھا تھا۔''
''میں نے سوچا کہ......اگر کوئی اور بات میرے منہ سے نکل گئی تو ممکن ہے، ناشتے میں آپ مجھے ہی کھا جائیں گے۔''
''دیکھو جی، میں پتھر مار کر سر پھاڑ دیا کرتی ہوں۔ میرے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں مت کرنا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔''
''رخشے سے بھی نہیں؟'' طالوت نے یونہی اندھیرے میں تیر پھینکا۔
''رر......رخ......شے......'' وہ کسی قدر گھبرا گئی۔ ''ہاں......اس سے بھی نہیں۔'' اُس نے کھوکھلے لہجے میں کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بہر حال، اس کے بعد ہم خاموش ہو گئے اور پھر ناشتے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ناشتے کے کمرے میں اغمانہ موجود تھی۔ دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اس پر دودھ کی مصنوعات، پنیر، کچھ پھل رکھے ہوئے تھے۔

اغمانہ نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ لیکن یہ مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے ہم سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا اور ہم بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ ناشتہ بہت عمدہ تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت؟" اغمانہ نے پوچھا۔

"نہیں، شکریہ۔ تم سے کچھ باتیں کریں گے۔"

"آپ......آپ......دونوں......؟" اُس نے ہکلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔"

"ایک ساتھ؟" وہ کسی قدر پریشانی سے بولی۔

"ہاں......کیا حرج ہے؟" طالوت نے جواب دیا اور وہ گھبرا کر دلشار کو دیکھنے لگی۔

"تُو جا......تُو یہاں کیوں کھڑی ہے؟" اُس نے کسی قدر ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ اور دلشاد ہمیں گھورتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور پھر اغمانہ سراسیمہ سی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"م......میرا مطلب ہے آپ دونوں......؟" وہ پھر بولی۔

"تم اس قدر پریشان کیوں ہو اغمانہ؟" طالوت نے کہا۔

"نہیں......آؤ......" اُس نے بے چارگی سے کہا اور پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ہم اُس کے ساتھ تھے۔ لیکن راستے میں بوڑھی اور کریہہ صورت عورت ہمارے سامنے آ گئی۔ اُس نے اپنے پیلے اور بدنما دانت نکال دیئے تھے۔

"جا رہے ہو......مگر پیسے......؟" اُس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اور طالوت نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ بوڑھی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بعد اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور ہم اس طرف بڑھ گئے جہاں اغمانہ دروازہ کھولے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

ہمارے قریب پہنچنے پر وہ راستے سے ہٹ گئی اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ لیکن اغمانہ کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے۔

"تم لوگ برا مت ماننا۔ میں کبھی دو آدمیوں کے ساتھ نہیں رہی۔ میں......میں......"

"اندر چلو بے وقوف لڑکی!" طالوت نے اُس کے شانے پکڑ کر اُسے اندر دھکیلتے ہوئے کہا اور وہ بے بسی سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ طالوت نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

لڑکی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

"کیوں......گرمی لگ رہی ہے کیا؟" طالوت نے پوچھا۔

"جی......وہ......نہیں......" وہ بے تکے انداز میں بولی۔

"پتہ نہیں، کیا بک رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔" طالوت نے اُسے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ پریشان پریشان سی بیٹھ گئی۔

''تم پریشان کیوں ہو؟''

''نہیں...... پریشان نہیں ہوں۔ بس میں دو آدمیوں کے ساتھ......''

''ہم آدمی ہیں، درندے نہیں۔ تمہیں چیر پھاڑ کر نہیں کھا جائیں گے۔ بیٹھو، باتیں کرو۔ ہم تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی......؟'' اُس نے حیرانی سے ہماری طرف دیکھا۔

''ہاں......اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''اور کچھ نہیں......؟''

''نہیں......تمہاری سوچ غلط ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''اوہ......اوہ.....'' اُس نے ایک گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر کسی قدر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر اُس نے متفکرانہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور بولی۔

''تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟''

''ناراضگی کی کیا بات ہے؟''

''درحقیقت رات کو میں گہری نیند سوئی تھی۔ تم نے مجھے جگانے کی کوشش کی تھی؟''

''جی نہیں۔ ہمیں آپ سے ایسا کوئی کام نہیں تھا محترمہ! جس کی وجہ سے آپ کو رات کو جگایا جاتا۔''

''یا تو تم بہت ہی شریف آدمی ہو یا پھر ضرورت سے زیادہ بے وقوف۔ بوڑھی ماں نے تمہیں ایسے ہی میرے ساتھ نہ بھیج دیا ہوگا۔ اُس نے پیسے ضرور لئے ہوں گے۔''

''اغمانہ! فضول باتیں مت کرو۔ تمہاری بوڑھی ماں نے اور تم نے جو کچھ بھی سوچا ہو، تم جو بھی کرتی ہو، ہمیں اس سے غرض نہیں ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں، ہمیں تم سے گفتگو کرنی ہے۔''

''میں تیار ہوں۔'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

''رنشے کون ہے؟'' طالوت نے پوچھا اور اغمانہ کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ ''جواب دو اغمانہ!......رنشے کون ہے؟''

''میرا ماموں ہے۔'' اغمانہ نے جواب دیا۔

''اوہ......بوڑھی عورت تمہاری ماں ہے؟''

''نہیں......میری خالہ ہے۔''

''اور بوڑھا؟''

''وہ......میرا خالو ہے۔''

''تمہارے ماں باپ کہاں گئے؟''

''مر گئے۔'' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اوہ......تو کیا تمہارے ماموں اور خالہ نے تمہاری پرورش کی ہے؟''

''ہاں۔'' اُس نے جواب دیا۔

پوری صورتِ حال ہماری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مظلوم اغمانہ خالہ اور ماموں کا ذریعۂ معاش بنی ہوئی تھی۔ بہرحال مظلوم لڑکیوں کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل کر لیا گیا۔ کئی منٹ تک ہم گردن جھکائے

اُس کے بارے میں سوچتے رہے، پھر طالوت نے پوچھا۔
''کیا تمہاری چھوٹی بہن بھی اسی لائن پر چل رہی ہے؟''
''خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے۔'' وہ تڑپ کر بولی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''میں نے رنشے سے کہہ دیا ہے، وہ جتنا چاہے مجھ سے کما لے، جس قدر چاہے مجھے لوٹ لے، لیکن دلشاد کی طرف بری نگاہ نہ ڈالے۔ خود دلشاد بہت تیز ہے، رنشے اُس سے ڈرتا ہے۔ ابھی تک تو خدا نے اُس کی حفاظت کی ہے۔ آگے بھی وہی نگہبان ہے۔''
''اوہ...... فکر مت کرو اغمانہ!...... فکر مت کرو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں رنشے کے چنگل سے نکال لیں گے۔ اور تمہیں ایک عمدہ زندگی گزارنے کا موقع دیں گے۔''
اور اغمانہ نے گردن جھکا لی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے تھے۔ صاف ظاہر تھا، اس نے ہماری باتوں کو روا روی میں سنا ہے۔ ممکن ہے، دوسروں نے بھی اسے یہ پیشکش کی ہو اور بے وقوف بنا کر چلے گئے ہوں۔
بہر حال، اس کے بعد طالوت نے یہ موضوع ختم کر دیا۔ کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر اغمانہ نے کہا۔ ''تم نے بوڑھی خالہ کو پیسے دیئے ہوں گے۔''
''ہاں...... کیوں؟''
''بس...... میں...... میں...... میں ہر طرح تیار ہوں۔'' وہ ہکلا کر بولی۔
''بیٹھی رہو اغمانہ! ہم صرف تم سے گفتگو کریں گے تاکہ تمہیں ان لوگوں میں اور ہم میں فرق کا احساس ہو جائے، جنہوں نے شاید ہماری طرح تمہیں تسلیاں دی ہوں گی۔''
''اوہ......'' وہ چونک پڑی۔ اُس نے حیرت سے ہم دونوں کی شکل دیکھی تھی، جیسے اُسے حیرت ہوئی ہو کہ ہم نے اُس کے دل کی بات کیسے جان لی۔ اور پھر اُس نے گردن جھکا لی۔
''بلکہ اگر ہو سکے تو ایک ایک کپ چائے پلوا دو۔ طبیعت سیر نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا اور اغمانہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔
''ابھی لائی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔
طالوت نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ ''خیریت، یہ چائے کی ضرورت کس طرح پیش آ گئی؟'' اُس نے پوچھا۔
''میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ کس اُلجھن میں پڑ گئے۔ ہمیں دوسرا کام کرنا ہے۔ یہاں پھنس کر......''
''اوہ...... دوسرے کام ضرور کریں گے عارف! لیکن کیا ان مظلوم لڑکیوں کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟''
''ٹھیک ہے۔ لیکن میرا خیال ہے، پہلے اس اُلجھن کو دیکھ لیا جائے۔''
''میں نے سوچا ہے کہ اس مکان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا جائے۔ یہاں رہنے میں کوئی دقت بھی نہیں ہے۔ یہیں سے زورات کے حالات معلوم کئے جائیں۔ اور پھر فیصلہ کیا جائے۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔''
''بوڑھی عورت سے معاملے کی بات کر لیں گے۔ اور اس وقت تک اُسے بے وقوف بنائیں گے،

جب تک یہاں کے معاملات سے واقف نہیں ہو جاتے۔"
"بالکل ٹھیک۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اور اسی وقت اغمانہ واپس آ گئی۔
"میں نے دلشاد سے کہہ دیا ہے۔ ابھی تیار کر کے لاتی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ بیٹھو!"
"دروازہ کھلا رہنے دوں؟"
"یقیناً۔" طالوت نے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ کئی منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ پھر طالوت نے بڑی چالاکی سے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔
"خان زورات کے بارے میں سنا ہے کہ بے حد رحم دل اور خدا ترس انسان ہے۔ کیا تم لوگوں نے رنشے کی شکایات اس کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کبھی نہیں کی؟" اس نے پوچھا۔
اغمانہ نے چند سیکنڈ تک گردن جھکا کر کچھ سوچا، پھر آہستہ سے بولی۔ "خان زورات تک رسائی بہت مشکل تھی۔ اور پھر صرف ایک بار میں نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو دو ماہ تک بستر پر پڑی رہی تھی۔" اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔
"مارا تھا تمہیں رنشے نے؟"
"ہاں...... اس کے بعد میری ہمت نہیں پڑی۔ لیکن دلاد بہت تیز ہے۔ اس نے کوشش کی تو رنشے نے اُسے دھمکی دی کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔ تب مجبوراً دلشاد بھی خاموش ہو گئی۔"
"بڑی افسوس ناک ہے تمہاری کہانی۔ لیکن خان زورات کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ وہ بہت باخبر انسان ہے۔ تعجب ہے، خود اُس کے زیر سایہ ایسے مظالم ہو رہے ہیں۔"
"خان بابا کو کچھ نہ کہو۔ وہ درحقیقت رحم دل انسان ہے۔ یہ اُس کی رحم دلی ہی ہے کہ نہ جانے آج وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ نہ جانے وہ کہاں گیا۔"
"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ایں......!" اغمانہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔
"خان زورات کہاں ہے؟"
"اوہ...... تمہیں نہیں معلوم؟"
"نہیں۔" میں نے گردن ہلائی۔
"کیوں؟...... کیا تمہارا تعلق زورات سے نہیں ہے؟"
"نہیں۔ ہم تاسیہ بستی کے باشندے ہیں۔ وہیں سے آئے ہیں۔"
"تعجب ہے۔ ہاں، ارے میں نے تمہارے لباس پر غور ہی نہیں کیا۔ تم دونوں بھائی ہو؟"
"ہاں۔"
"تمہاری شکلیں کیسی ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔"
"تم نے اب غور کیا ہے؟"
"نہیں، پہلے بھی غور کیا ہے۔ لیکن سچ پوچھو، مجھے اپنے پاس آنے والوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ سخت نفرت۔ میں ان سے ان کی ذات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتی۔ تمہاری دوسری بات ہے۔"

''کیوں، ان میں کیا لعل جڑے ہوئے ہیں؟'' دروازے سے دلشاد کی آواز سنائی دی، جو چائے کی ٹرے لئے اندر آ رہی تھی۔

''اوہ......دلشاد! یہ بہت نیک لوگ ہیں۔'' اغمانہ جلدی سے بولی۔

''یہاں کون سی نیکیاں کرنے آئے ہیں؟'' وہ چائے رکھتے ہوئے ناک سکوڑ کر بولی۔

''دلشاد!'' اغمانہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

''فکر مت کرو اغمانہ! اس نک چڑی کی باتیں مجھے پسند ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''لعنت ہے تمہاری پسند پر۔ میں تمہاری پسند پر تھوکتی بھی نہیں۔''

''دلشاد! خدا کے لئے، زبان قابو میں رکھ۔ پھر کوئی ہنگامہ کھڑا کرائے گی؟''

''میں ہنگاموں سے نہیں ڈرتی۔ سمجھیں؟'' دلشاد کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے......لیکن......'' اغمانہ کبھی ہماری شکل دیکھتی کبھی دلشاد کی۔

''بیٹھ جاؤ دلشاد!'' طالوت نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں بیٹھ جاؤں؟ غلام ہوں تمہاری؟'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''افوہ......دلشاد! تم ان لوگوں کو نہیں سمجھیں۔ یہ وہ نہیں ہیں جو یہاں آتے ہیں۔ دلشاد! یہ ان میں سے نہیں ہیں جو میرے طلب گار ہوتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' دلشاد کسی قدر نرم پڑ گئی۔

''ہاں دلشاد! یہ اجنبی ہیں۔ زورات کے رہنے والے بھی نہیں ہیں۔''

''لیکن انہوں نے خالہ کو موٹی رقم دی ہے۔''

''میں بھی تو تم سے کہہ رہی ہوں۔''

''پھر یہ کون ہیں؟''

''صرف مہمان۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں جانتی۔''

دلشاد حیرت سے ہمیں گھورنے لگی۔ اور طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم چند روز تمہارے یہاں قیام کریں گے، زورات کی سیر کریں گے اور پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''سیر کرنے کے لئے تم نے برے وقت کا انتخاب کیا ہے۔ زورات کے حالات تو بہت خراب ہیں۔'' دلشاد نے کہا۔

''اگر تم غصہ تھوک کر میزبانوں کی طرح بیٹھو تو تم سے بات کی جائے۔'' طالوت نے کہا۔

''اگر تم باجی کے گاہک نہیں، صرف انسان ہو تو میں تم سے شرمندہ ہوں۔ ویسے انسانوں کو دیکھے ہوئے عرصہ بیت گیا۔ یہاں تو صرف بھیڑیے آتے ہیں۔ خون کے پیاسے، جو نوچتے بھنبھوڑتے ہیں اور سیر ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔'' دلشاد نے کہا۔

ہم دونوں اس تلخ لڑکی کو غور سے دیکھ رہے تھے اور اُس سے متاثر تھے۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی، پھر بولی۔ ''تو تمہیں زورات کے حالات معلوم نہیں ہیں۔''

''نہیں۔''

''زورات سخت بحران سے گزر رہا ہے۔ کل نہ جانے کیا حالات ہوں۔''
''اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بتاؤ۔''
''خان زورات کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اور اس اغوا میں خانم کا ہاتھ ظاہر کیا جا رہا ہے۔''
''خانم......؟''
''ہاں۔ زورات کی ملکہ۔ خان زورات کی نوجوان بیوی۔''
''اوہ...... یہ کب کی بات ہے؟''
''دو ہفتے گزر گئے۔''
''خان کا پتہ نہیں چل سکا؟''
''بالکل نہیں۔ سخت کوشش ہو رہی ہے۔''
''ملکہ پر شبہ ظاہر کرنے والے کون لوگ ہیں؟''
''امیر گلبار۔ لیکن اُن کی نیک نامی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔''
''ان کی کیا حیثیت ہے؟''
''سب سے بڑا خاندان ہے زورات کا۔ شاہی خاندان سے بھی بڑا۔ ہمیشہ کا نیک نام ہے۔ اس خاندان کے افراد بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔''
''خوب۔'' طالوت نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔ مجھے بھی اس گفتگو میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ ''کیا امیر گلبار کی زورات کی خانم سے کچھ دشمنی تھی؟''
''نہیں...... لیکن اگر اُن کا شبہ درست ہے تو پھر ہر سنجیدہ آدمی کو خانم پر نگاہ رکھنی ہوگی۔''
''کیا مطلب؟'' طالوت نے پوچھا۔
''شکیل یوں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔''
''یہ کون ہے؟''
''خان زورات کا بھتیجا۔''
''تو شکیل کا ان معاملات سے کیا تعلق؟''
''ہو یا نہ ہو، لیکن کہا جاتا ہے کہ زورات کی خانم کا شکیل سے ضرور تعلق ہے۔'' دلشاد نے کہا۔
''دلشاد! اپنے الفاظ پر قابو رکھو۔'' اغمانہ نے سرسراتی آواز میں کہا۔
''اونہہ...... کیوں قابو رکھوں؟ ڈرتی ہوں کسی سے؟''
''بڑی اُلجھی ہوئی کہانی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔'' طالوت نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
''بس، میں کچھ اور نہیں سمجھاؤں گی۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔'' دلشاد اچانک کھڑی ہوگئی۔ عجیب متلون مزاج لڑکی تھی۔ اغمانہ اُسے روکتی رہ گئی۔ لیکن وہ باہر نکل گئی تھی۔
''اس کے بعد کے حالات تم بتاؤ گی اغمانہ!'' طالوت نے کہا۔
''میں کیا بتا سکتی ہوں؟ میرے حالات نے مجھے کسی اور معاملے میں مداخلت کا موقع ہی نہیں دیا۔''
''ہوں۔'' طالوت خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اُس نے گردن ہلائی اور ہم چائے پینے لگے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد طالوت نے اغمانہ سے کہا۔ ''اغمانہ! اپنی خالہ کو بھیج دو۔ میں اُن

سے گفتگو کروں گا۔"

"اچھا۔" اُس نے سادگی سے کہا اور اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

"معاملات ہماری توقع سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ کیا تم بھی ان میں دلچسپی لے رہے ہو عارف؟"

"بالکل۔" میں نے بھرپور لہجے میں کہا۔

"گویا خانم ایک فریق ہے۔ خان زورات کے اغوا میں اُس کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ اور دوسرے فریق وہ ہیں، جنہیں ہم نے پہاڑوں میں دیکھا تھا۔ اور یہ بات بھی کسی حد تک ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ دوسرا فریق چالباز ہے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا تھا۔"

"بے شک۔"

"تو پھر تیسرے فریق ہم کیوں نہ بن جائیں۔ جو صرف اصلیت سامنے لانے والوں میں سے ہوں۔"

"نقاب پوش نے کسی پروپیگنڈہ پارٹی کا ذکر بھی کیا تھا۔"

"اسے بھی دیکھ لیں گے۔"

"اور وہ پُراسرار حسینہ؟"

"ارے سب کی قلعی کھل جائے گی۔ تم فکر مت کرو۔ بس یہ بتاؤ کہ کیا اس سلسلے میں کام کرنے کو تیار ہو؟"

"بخوشی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو لطف آ جائے گا۔ حالات کچھ ایسے ہی معلوم ہو رہے ہیں۔"

چند منٹ کے بعد خالہ آ گئی، منحوس چہرے پر مکاری کی مسکراہٹ سجائے۔ اس منحوس بڑھیا سے سخت نفرت محسوس ہوتی تھی۔ تاہم طالوت نے اُس سے گفتگو شروع کی۔

"چھوٹی لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے بڑی بی؟"

"نہیں...... ابھی وہ تیار نہیں ہے۔"

"میں منہ مانگی رقم دوں گا۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بیٹے! مگر...... تم اُسے تیار کر لو تو دوسری بات ہے...... وہ بڑی سخت مزاج ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب تم دوسری بات بتاؤ۔ اگر میں ایک آدھ ہفتے تمہارے پاس رہنا چاہوں تو؟"

"سر آنکھوں پر۔"

"لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"جب تک میں یہاں رہوں گا، کوئی دوسرا نہیں آنے پائے گا۔"

"اگر تم ایک ہفتے کی ادائگی کر دو گے تو دوسرا کیسے آئے گا یہاں؟"

"بولو...... کیا مانگتی ہو؟"

"جو خوشی سے ـــــ دو۔" بوڑھی نے بے غیرتی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور طالوت نے نوٹوں کی

ایک گڈی نکال کر بوڑھی کی گود میں ڈال دی۔ یہ رقم بوڑھی اس چھوٹی سی ریاست میں ایک سال میں بھی نہ کماتی ہوگی۔ گڈی دیکھ کر اُس کا سانس پھول گیا۔

''ہمارے کھانے، پینے، سونے کا معقول انتظام ہونا چاہئے۔ اور اگر ہماری مرضی کے خلاف کوئی گڑبڑ ہوئی تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔''

''تم بالکل فکرمت کرو یہاں۔'' بوڑھی نے بمشکل تمام خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''دونوں لڑکیوں کو ہماری خدمت میں رہنا چاہئے۔ چھوٹی سے اگر بات بن گئی تو اس کی رقم تمہیں الگ سے ملے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم بالکل فکرمت کرو۔'' بوڑھی نے زورزور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بس، جاسکتی ہو۔'' طالوت نے رعب سے کہا اور بوڑھی جلدی سے اُٹھ کر باہر لپکی۔ انداز ایسا تھا جیسے خطرہ ہو کہ نوٹ اُس سے چھین لئے جائیں گے۔

اس کے باہر نکلتے ہی طالوت اُسے گالیاں دینے لگا۔

''تجھے تو ایسا درست کروں گا بوڑھی! کہ یاد کرے گی۔''

''اور رشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''رشتے......؟'' طالوت دانت پیسنے لگا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''باہر نکلیں گے۔ حالات دیکھیں گے۔ بہت سے معاملات ہیں۔ ایک ایک کر کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔''

''کب چلو گے؟''

''بس تھوڑی دیر کے بعد۔

''میرا خیال ہے، راسم کو تکلیف دینا پڑے گی۔''

''کیوں؟''

''مقامی لباس۔ ہمیں مقامی لباسوں کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ اجنبی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔''

''منگوا لئے جائیں گے۔'' طالوت نے پُرخیال انداز میں کہا۔ اس کے بعد ہم دیر تک بیٹھے اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ بوڑھی پلٹ کر نہیں آئی اور اُمید تھی کہ نہیں آئے گی۔ ہم لوگوں نے تیاریاں کیں اور راسم نے ہماری مرضی کے مطابق لباس مہیا کر دیئے۔

باہر نکل رہے تھے کہ دلشاد نظر آ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک دم ٹھٹک گئی۔ اُس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔ اور پھر نہ جانے کیوں، وہ بچوں کے سے انداز میں مسکرا دی۔

''کیوں......کیا بات ہے؟''

''تم دونوں......تم دونوں ایک دوسرے کا آئینہ معلوم ہوتے ہو۔ بہت ہی اچھے لگ رہے ہو تم دونوں۔ کوئی تمہیں دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہے گا۔''

''اچھا......!'' طالوت ہنس پڑا۔

''کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟''

''زورات کی سیر کرنے۔''
''اوہ......شام کو واپس آ جاؤ گے؟''
''ہاں۔''
''تب ٹھیک ہے۔ خالہ کہہ رہی تھی کہ تم لوگ کافی دن تک یہاں رہو گے۔ اور جب تک تم رہو گے، اور کوئی نہیں آئے گا۔''
''ٹھیک کہہ رہی ہے۔''
''کیا تم نے خالہ کو بہت سے پیسے دیئے ہیں؟''
''اس بارے میں بھی کچھ کہہ رہی تھی تمہاری خالہ؟''
''ہاں۔ کہہ رہی تھی کہ تم لوگ بہت مالدار معلوم ہوتے ہو۔''
''اس سے تمہارے اوپر کیا فرق پڑتا ہے؟''
''میرے اوپر کیا فرق پڑے گا؟ میں تو دولت پر تھوکتی ہوں۔'' اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔
''جیتی رہو.....جی خوش کر دیا۔ بس، اب بھاگ جاؤ۔'' طالوت نے کہا اور میرا شانہ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دن کی روشنی میں ہم مکان سے نکل آئے۔ تب زورات کی بستی دیکھی۔ بلاشبہ ایک عمدہ شہر کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہم گھوڑوں پر بیٹھے بستی کی سیر کرتے رہے۔ اونچے نیچے مکانات دیکھے، گلیاں بازار دیکھے۔ یہاں اسکول اور کالج وغیرہ بھی تھے۔

پہاڑوں سے گھری اس بستی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا رکھوالا اس کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے۔ اس نے اپنی بستی کے عوام کی خوشحالی کا کس طرح خیال رکھا ہے۔ خان زورات......نہ جانے بے چارے کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ نہ جانے اُسے کس نے اغوا کیا ہے۔ بازاروں میں گھومنے پھرنے والوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ظاہر ہے، اتنے بڑے شہر میں دو آدمیوں کی موجودگی کیا حیثیت رکھتی تھی۔ ویسے یہاں ہوٹل وغیرہ نہیں تھے۔ ہاں، قہوہ خانے بکثرت تھے۔

گھوڑوں کی پشت پر ہم نے آدھے شہر کا چکر لگایا۔ اور پھر ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ ایک ملازم نے قہوے کے برتن ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ بلاشبہ ماحول میں ایک پُراسراری خاموشی گھلی ہوئی تھی۔ ہر شخص کسی سوچ میں گم نظر آتا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ایک عجیب سا احساس۔

دفعتہً دو آدمی ہماری طرف بڑھے۔ یہ شکل وصورت سے خطرناک نظر آتے تھے۔ جسامت بھی کافی تھی۔ جس وقت وہ ہمارے سروں پر پہنچ گئے، تب ہمیں احساس ہوا۔ طالوت نے قہوے کا پیالہ آہستہ سے رکھ دیا۔ اُس کے تیور خراب نظر آ رہے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اُن میں سے ایک نے سخت لہجے میں پوچھا۔
قرب وجوار میں بیٹھے ہوئے لوگ چونک چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

طالوت نے میری طرف دیکھا اور میں نے قہوے کا پیالہ اطمینان سے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر اُچھال دیا۔ قہوہ کافی گرم تھا۔ اُس کا چہرہ جھلس گیا۔ طالوت نے کھڑے ہو کر میز اُلٹ دی تھی۔ اور دوسرا آدمی میز کی لپیٹ میں آ کر ڈھیر ہو گیا۔ قہوے سے جلنے والا دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے

دہاڑ رہا تھا۔
طالوت نے جیب سے قہوے کی قیمت نکالی اور تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اتنی دیر میں میز کی ٹکر سے گرنے والا کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے پیٹی سے پستول نکالا اور طالوت کی طرف تان لیا۔ لیکن دوسرے لمحے طالوت نے اس کے پستول والے ہاتھ پر لات ماری اور پستول اُچھل گیا۔ طالوت نے اسے اطمینان سے لپک لیا تھا۔
جلنے والے کی ہمت ہی نہ رہی تھی کہ کوئی دوسری حرکت کر سکے۔
''اب بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''
''خنزیر...... خنزیر کے بچے!'' پستول والا طالوت کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کو نظر انداز کر کے اس پر جھپٹا۔ لیکن طالوت نے پستول کا دستہ اس قوت سے اُس کی کھوپڑی پر رسید کیا کہ اُسے تارے ہی نظر آ گئے ہوں گے۔
''آؤ!'' طالوت نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں اطمینان سے قہوہ خانے سے نکل آئے۔ کسی اور نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
''مگر یہ تھے کون؟ اور کیا چاہتے تھے؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔
''پتہ نہیں۔'' طالوت نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔
''معلوم تو کیا ہوتا۔''
''کیا ضرورت ہے عارف! اب سوچو، کرنا کیا ہے؟ میں ان معاملات میں مداخلت چاہتا ہوں، فوری طور پر۔ یہاں کے لوگ سسپنس کا شکار ہیں۔ ہمیں بھی حالات سے واقف ہونا چاہئے۔''
''تو پھر کام شروع کر دو۔ تمہارے لئے کیا مشکل ہے؟''
''ابتدا کہاں سے کی جائے؟''
''زورات کے محل سے۔'' میں نے جواب دیا۔
''تو آؤ۔'' طالوت نے میری ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی اور میں گرتے گرتے بچا۔ گو میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا، لیکن بعض اوقات اس بدمعاش کی حرکتیں عقل سے باہر ہوتی تھیں۔ گرنے سے سنبھلا تو زورات کے محل کے پائیں باغ میں تھا۔
''یہ...... یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''خان آف زورات کا محل۔''
''اوہ...... اب؟''
''آؤ...... خانم سے ملیں گے۔'' طالوت نے کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑا۔
''تو گویا براہِ راست کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟''
''بالکل۔'' طالوت نے جواب دیا۔ اُس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہنگامی طور پر کام کرنے کے موڈ میں ہے۔ محل کے صدر دروازے پر پہرے دار موجود تھے۔
''دوشالہ اوڑھ لو۔'' طالوت آہستہ سے بولا اور میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ طالوت خود بھی نگاہوں سے روپوش ہو گیا تھا۔ اور ہم اطمینان سے پہریداروں کے درمیان سے نکل کر اندر داخل ہو گئے۔

''تھوڑی دیر کے بعد ہم خانم آف زورات کے خوبصورت کمرے کے دروازے پر تھے۔ طالوت نے دروازے پر طاقت صرف کی، لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔

''بند ہے۔'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''ترکیب نمبر دس۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے گردن ہلا دی۔ اور پھر اُس کی زوردار لات کمرے کے دروازے پر پڑی اور ہم دونوں تیار ہو گئے۔ اندازے کے مطابق چند لمحات کے اندر ہی دروازہ کھلا اور دو قوی ہیکل نوجوان باہر نکل آئے۔ جونہی وہ باہر نکلے، ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر خانم کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ درمیانی عمر کی خوب صورت اور پُروقار عورت۔ چہرے پر پریشانی کی لکیریں۔ دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

دونوں نوجوان اندر آ گئے۔ ''کوئی بھی نہیں ہے خانم!'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''پھر یہ آواز کیسی تھی؟''

''پتہ نہیں۔''

خانم چند ساعت خاموشی سے ان دونوں کی شکلیں دیکھتی رہی، پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''میں جانتی ہوں، زورات کے در و دیوار میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ لیکن خیر، دروازہ بند کر دو۔''

ایک نوجوان نے دروازہ بند کر دیا۔ اور وہ دونوں کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''ہاں، کیا بتا رہے تھے تم؟'' خانم نے پوچھا۔

''امیر گلبار کے محل میں ہمارا آدمی پہنچ چکا ہے۔ بے حد چالاک آدمی ہے۔ بہت جلد رپورٹ دے گا۔''

''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ خان کہاں ہیں۔ اگر وہی مجھے مل جائیں تو میں ساری ذمہ داریاں اُن کے سپرد کر کے خودکشی کر لوں۔ اُن کے بنا تو میں مر بھی نہیں سکتی۔''

''آپ ہمت نہ ہاریں خانم! حالات کا مقابلہ کرنے میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم جیسے چند انسانوں کے سہارے سے تو میں زندہ ہوں۔ خدا کی قسم، حقیقت سامنے آ جائے، اس کے بعد میں زندگی بھی خوشی سے دے دوں گی۔ بدنامی کا کوئی داغ لے کر میں مر بھی نہیں سکتی۔ میرے والدین، میرے خاندان کی بھی عزت ہے۔'' خانم کی آواز میں سسکیاں شامل تھیں۔

''آپ ہمارے سروں پر قائم رہیں خانم! ہم آپ کے لئے جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔''

''مگر اب کیا کیا جائے؟''

''ممکن ہے امیر گلبار کے محل سے کوئی پتہ چل سکے۔''

''اندھیرے کے تیر ہیں۔ نشانوں کا کیا بھروسہ؟''

''پھر بھی، ہمیں اپنی کوششوں میں ناکام ہونے دیں خانم! اس کے بعد پہلے ہم خودکشی کریں گے، پھر آپ۔'' نوجوان نے کہا۔

خانم کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر اُس نے گہری سانس لی اور بولی۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گی۔'' اور وہ دونوں نوجوان اُٹھ گئے۔

''آؤ!'' طالوت نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی اور ہم دونوں بھی ان نوجوانوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ نوجوان آگے بڑھ گئے تھے۔ جب وہ دُور نکل گئے تو طالوت نے خود کو ظاہر کر دیا۔ میں نے بھی شاہ دانہ کا دوشالہ اُتار دیا۔ اور پھر طالوت نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟...... اندر آ جاؤ۔'' خانم کی آواز اُبھری اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ خانم نے ہماری طرف دیکھا اور اُچھل پڑی۔ وہ متوحش انداز میں کھڑی ہو گئی تھی۔

''تم کون ہو؟'' اُس نے سوال کیا۔ اور پھر باری باری ہماری شکلیں، ہمارا جسم اور ہمارا لباس دیکھنے لگی۔

''خانم کے دوست۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''لیکن تمہاری شکلیں میرے لئے اجنبی ہیں میں نے پہلے کبھی تمہیں نہیں دیکھا۔ میں نے کبھی تمہارے چرچے نہیں سنے۔''

''ہم زورات میں اجنبی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ...... اوہ...... بیٹھ جاؤ۔ خدا کے واسطے مجھے اپنے بارے میں صاف صاف بتاؤ۔ اگر دشمن بھی ہو، تب بھی مجھے دشمنی کی وجہ بتاؤ۔ میں وہی کرنے کو تیار ہوں جو تم چاہتے ہو۔ لیکن مجھے وجہ بتا دو۔''

''ہم سو فیصد دوست ہیں خانم! اور یہ جذبہ لے کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ کی مدد کریں۔'' طالوت نے کہا۔

''جب تم زورات میں اجنبی ہو تو تمہیں زورات کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟...... تمہاری یہاں تک رسائی کیسے ممکن ہوئی؟''

''یہ ہماری خوبی ہے خانم! ہم ناممکن کو ممکن بنانے کے ماہر ہیں۔ رہا زورات کا مسئلہ تو یہاں کے گلی کوچے بتاتے ہیں کہ زورات اُلجھن میں گرفتار ہے۔''

'اجنبی دوستو! اگر تم دوست ہو تب، اگر مذاق اُڑانے آئے ہو، تب میں تم سے درخواست کروں گی کہ ایک بےبس عورت کی مدد کرو، جو کمزور ہے۔ جو وہ کچھ برداشت کر رہی ہے، جو اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ سنو...... میری آخری منزل موت ہے۔ میں خوشی سے مر جانے کو تیار ہوں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے کردار پر جو داغ لگے ہیں، وہ دُھل جائیں۔''

''کیا آپ ہمارے اوپر بھروسہ کر سکتی ہیں خانم؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں اس وقت ہر ستون کا سہارا لے سکتی ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ کوئی بھی ستون میرا مقبرہ بن سکتا ہے۔''

''تب پھر خانم! الف سے لے کر یے تک پوری داستان سنا دیں۔ کوئی لفظ درمیان سے حذف نہ کریں۔ وہ بھی بتا دیں جو دوسروں کے علم میں نہیں ہے۔ یہ بھروسے کی کسوٹی ہے اور یہی ہمارے جذبات کو تحریک دے گی۔''

''مجھے اعتراض نہیں ہے۔'' بےبس عورت نے کہا اور پھر پُرخیال انداز میں بولی۔ ''تم نے کہا ہے کہ تم زورات میں اجنبی ہو۔ سنو، شاید تمہیں یہاں کے مفصل حالات بھی معلوم نہ ہوں۔ خان زورات ایک نیک دل انسان ہے، زورات کی ملکہ کے انتقال کے بعد اس نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔ میرا

انتخاب ہوا۔ گو عمر میں تضاد تھا، لیکن میرے والدین نے یہ بات پسند کی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں یہاں آ گئی۔ حالانکہ عرشیلا میری ہم عمر تھی۔ بہرحال میں نے اس موضوع پر کچھ نہیں سوچا اور اپنے فرائض انجام دینے لگی۔ یہاں مجھے ناپسند کرنے والوں میں صرف عرشیلا تھی۔ میری بیٹی...... میری سوتیلی بیٹی۔ میں اس پر کوئی الزام نہیں لگاؤں گی۔ کیونکہ وہ معصوم ہے۔ وہ مجھ سے نفرت ضرور کرتی ہے، میرے خلاف سازش نہیں کر سکتی۔ دوسرا انسان شکیل ہے۔ لوگ اُسے برا سمجھتے ہیں۔ وہ اوباش انسانوں میں بیٹھتا ہے۔ لیکن خود برا نہیں ہے۔ میرے سامنے وہ ہمیشہ احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے اس کی سازش سے خان زورات کو اغوا کرایا ہے۔ یہ غلط ہے۔ میں نے اپنے شوہر کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ سازش کرنے والے دوسرے ہیں۔ میں بے تکلفی سے امیر گلبار کا نام لے سکتی ہوں۔ وہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں اور ہمیشہ ہمارے خلاف صف آرا رہے ہیں۔ میں ریاست کی باگ ڈور، جو پسند کرے اُس کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرے اوپر سے تمام الزامات واپس لئے جائیں۔"

"آپ کا مطالبہ جائز ہے خانم!" طالوت نے کہا۔

"کیا تم خلوصِ دل سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں...... ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

"مجھے اس وقت ہمدردوں کی ضرورت ہے۔ میرے محافظوں نے میرے عوام کو میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ میرے ہمدردوں کی تعداد بہت کم ہے۔"

"ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔"

"تم میرے لئے کیا کرو گے؟"

"وہ کریں گے، جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں خانم!" طالوت نے جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ناموں میں کیا رکھا ہے خانم! آپ مجھے پانسہ پلٹ خان نمبر ایک اور انہیں پانسہ پلٹ خان نمبر دو کہہ سکتی ہیں۔"

خانم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "خوش مزاج ہو تم لوگ۔ مجھے بھی ہنسنے ہنسانے والے لوگ پسند ہیں۔ لیکن بدقسمتی نے میری مسکراہٹ چھین لی ہے۔"

"ہم بدقسمتی سے آپ کی مسکراہٹ واپس لے کر آپ کے ہونٹوں پر چپکا دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں اجازت دیں۔"

"خدا حافظ...... کاش! کوئی میرے لئے کچھ کر سکے۔" خانم ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ طالوت سنجیدہ تھا۔ ہم اطمینان سے محل کے بیرونی حصے کی طرف چل پڑے۔ طالوت کی خاموشی بے حد پُراسرار لگ رہی تھی۔ دفعتہً وہ رُک گیا۔

"کیوں......؟" میں نے اسے دیکھا۔

"کام شروع کرنا ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

''تو پھر ابھی کیوں نہ شروع کر دیا جائے۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔''
''تو بھائی پانسہ پلٹ خان نمبر دو!......پھر شروع کرو۔''
''کیا ارادہ ہے؟''
''اس سلسلے میں جتنے کردار ملوث ہیں، ایک ایک کر کے انہیں ٹٹولتے ہیں۔''
''مثلاً؟''
''شکیل، عرشیلا، امیر گلبار۔ فی الحال یہ تین نام فہرست میں ہیں۔ میرا خیال ہے، ابتدا کسی حسین چہرے سے کی جائے۔ یوں بھی حسین چہروں سے شروع ہونے والے کام خوش اسلوبی سے طے پا جاتے ہیں۔''
''گویا عرشیلا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''سمجھ دار آدمی ہو۔ مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ایک گزرتے ہوئے ملازم کو روک کر بولا۔''اے، خانم عرشیلا کہاں ہیں؟''
''خانم اپنی خواب گاہ میں ہیں اور خان زادی بیلا باغ میں۔''
''اور یہ بیلا باغ کہاں ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''اس عمارت کے پیچھے۔ مگر تم کون ہو؟'' ملازم نے پوچھا۔
''دوسری طرف گھوم جاؤ۔'' طالوت بولا۔ اور ملازم حیرت سے اُسے گھورنے لگا۔ پھر اُس کی گردن خود بخود دوسری طرف گھوم گئی۔ طالوت نے ہونٹ سکوڑ کر پھونک ماری اور ملازم بدحواس سا آگے دوڑتا چلا گیا۔
''آؤ......!'' طالوت نے کہا اور میں ہنستا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ عمارت کے پیچھے درحقیقت ایک خوبصورت باغ تھا، جس کے درمیان ایک ننھا سا کاٹج بنا ہوا تھا۔ طالوت نے پسندیدگی کی نگاہوں سے اس حسین علاقے کو دیکھا۔''عمدہ جگہ ہے......آؤ۔'' اور ہم کاٹج کی طرف بڑھ گئے۔
کاٹج کے دروازے پر کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔ ہم لوگ اطمینان سے اندر داخل ہو گئے۔ ایک لمبی راہداری سے گزر کر ایک کمرے کے دروازے پر رُکے۔ طالوت نے دروازے کو دھکیل کر کھولا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے اطمینان سے دروازہ کھول دیا۔
بہت ہی خوبصورت کمرہ تھا۔ موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس پر اعلیٰ درجے کا فرنیچر موجود تھا۔ ایک آرام کرسی پر ہم دونوں کی طرف پشت کئے کوئی بیٹھا تھا۔ لمبے لمبے بال کرسی سے نیچے لٹک رہے تھے۔
آہٹ سن کر وہ اس پھرتی سے پلٹی کہ ہم حیران رہ گئے۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا اور آنکھوں میں کسی بھوکی بلی کی سی کیفیت تھی۔ اس نے چمک دار نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھا اور پھر چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔
''آؤ......آؤ....... مجھے تم سے مل کر کافی خوشی ہوگی۔''
''آؤ۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
''طالوت!'' میں آہستہ سے بولا۔

''ہوں۔''
''اس کی آواز پر غور کرو۔''
''کر چکا ہوں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''کیا خیال ہے؟''
''بہت خوب صورت آواز ہے۔''
''مذاق مت کرو۔ میرا مطلب ہے......''
''سمجھ رہا ہوں یار! تمہارا مطلب۔ تھوڑی دیر خاموش رہو۔'' طالوت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''کیا مشورے کر رہے ہو؟..... غالباً تمہارے پاس پستول تو ہوں گے ہی۔'' حسین لڑکی بہت مضبوط اعصاب کی مالک معلوم ہوتی تھی۔
''اونہہ...... ہم پستول نہیں رکھتے۔ آنکھ مار کر قتل کر دیتے ہیں۔''
''اوہ...... تمہاری شکلیں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ آؤ بیٹھو، میرے پاس کس کام سے آئے ہو؟'' لڑکی نے پورے سکون سے کہا۔ ویسے مجھے اس کے انداز پر زیادہ حیرت نہیں تھی۔ میں اُس کی آواز سے اُسے پہچان گیا تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ وہی عورت تھی، جو پچھلی رات ہمیں پہاڑوں میں ملی تھی۔
طالوت اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی اطمینان سے کرسی پر بیٹھی تھی لیکن پستول کا انداز ایسا تھا کہ ہماری ذرا سی بھی غلط جنبش پر اس کے استعمال میں وقت نہ ہو۔
''ہاں، اب بتاؤ...... کون ہو؟ غالباً تم دونوں جڑواں بھائی ہو۔''
''کون سے سوال کا جواب پہلے درکار ہے؟''
''تمہاری ذات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔'' اس نے صاف لہجے میں کہا۔
''تمہارا نام عرشیلا ہے؟''
''ہاں ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔
''کچھ معلومات درکار ہیں تم سے۔'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔
''مگر تم ہو کون؟'' اُس نے خونخوار لہجے میں کہا۔
''ہماری ملاقات پہلی نہیں ہے۔'' اس بار میں نے اُن کی گفتگو میں مداخلت کی۔
''کیا مطلب؟'' وہ چونک پڑی۔
''پچھلی رات، پہاڑوں میں ہم نے تم سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ اس وقت، جب کچھ پُراسرار لوگ ایک میٹنگ کر رہے تھے۔'' میں نے جواب دیا اور عرشیلا کا چہرہ ایک لمحے کے لئے ست پڑ گیا۔ لیکن بڑے آہنی اعصاب کی مالک تھی۔ فوراً خود پر قابو پالیا اور غصیلے انداز میں بولی۔
''میرا خیال ہے، تم دونوں پاگل ہو۔ لیکن مخل کی اب یہ حالت رہ گئی ہے کہ تم جیسے لوگ بلا روک ٹوک اندر آ جاتے ہیں۔ میرے پاس کیوں آئے ہو، اس کا مقصد بتاؤ۔ ورنہ میں تمہارے اوپر گولی بھی چلا

سکتی ہوں اور اپنی حفاظت کے سلسلے میں تم دونوں کو ختم بھی کر سکتی ہوں۔"

"خاتون عرشیلا! ہم اس وقت بھی آپ کو بتا چکے ہیں کہ آپ کے زورات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، اور آج بھی یہی کہتے ہیں۔ زورات کے اجنبیوں کی خواہش ہے کہ آپ لوگوں کی مدد کی جائے۔ خاتون! ہم آپ کی مدد کے لئے آئے ہیں۔"

"تم دونوں مجھے پاگل معلوم ہوتے ہو۔ مجھے کسی کی مدد درکار نہیں ہے۔ نہ ہی تمہاری پہاڑوں والی بات درست ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ ہم سے تعاون نہیں کر رہیں، نہ کریں۔ لیکن سن لیں، آج ہی سے زورات میں نت نئے ہنگامے ہوں گے۔ خان زورات کے دشمنوں کو چوہے کے بل سے نکال لیا جائے گا اور انہیں سڑکوں پر کتے کی موت مار دیا جائے گا۔"

"اور یہ تم کرو گے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"ہاں خاتون عرشیلا!" طالوت نے بھاری آواز میں کہا۔

"تو پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"اس خیال سے آئے تھے کہ آپ سے بھی ملاقات کر لی جائے۔ ممکن ہے، آپ بھی زورات سے کچھ دلچسپی رکھتی ہوں۔" طالوت نے کہا اور عرشیلا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ خطرناک ہو گئیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور درحقیقت اس شکل میں وہ کافی خطرناک نظر آ رہی تھی۔

"سنو......!" اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں، تم بابا کے دشمنوں کی کوئی نئی چال ہو، جو تیسرے راستے سے کام کرنا چاہتے ہو۔ لیکن کوشش کر لو۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔ عرشیلا کسی کی محتاج نہیں ہے۔"

"ہم جا رہے ہیں مس عرشیلا!" طالوت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں نہ جانے دوں۔ لیکن یہ زورات کا محل ہے۔" وہ غرّائی۔

"ہمیں یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔" طالوت بولا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"اگر آپ کا دل چاہ رہا ہے کہ ہمیں یہاں سے نہ جانے دیں تو آپ کو کوئی خاص دقت نہ ہو گی۔ بشرطیکہ آپ ہماری لاشیں ٹھکانے لگانے کا بھی معقول بندوبست کر سکیں۔"

"فوراً یہاں سے چلے جاؤ...... جاؤ...... فوراً نکل جاؤ۔"

"ارے بس...... ہمت جواب دے گئی؟" طالوت نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں چلے جاؤ...... ورنہ...... ورنہ......" عرشیلا دانت پیس کر کھڑی ہو گئی۔ پستول پر اُس کی گرفت سخت تھی۔ چند ساعت وہ ہم دونوں کو گھورتی رہی اور پھر اُس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

"ممکن ہے، تمہارا مشن ہی یہ ہو...... ممکن ہے تم صرف قربانی کے بکرے ہو...... جاؤ...... چلے جاؤ۔ تمہیں یہاں سے کچھ نہ ملے گا۔"

"ایک کپ چائے بھی نہیں؟"

"مجھے افسوس ہے، میں تمہارے ساتھ دوستانہ سلوک نہیں کر سکتی۔"

''خیر...... یہ تو بتا دو کہ شکیل سے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟''
''کیوں؟'' وہ پھر چونک پڑی۔
''بس ایسے ہی...... پرانی شناسائی ہے۔ یہاں آئے ہیں تو ملتے چلے جائیں گے۔''
''اور اس کے باوجود تم خود کو شریف انسان کہہ رہے ہو۔ جاؤ، کسی ملازم سے پوچھ لو۔ وہ تمہیں اس کے پاس پہنچا دے گا۔'' اس نے نفرت زدہ انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔
''پانسہ پلٹ نمبر دو!'' طالوت نے میری طرف دیکھا۔
''کیا بات ہے بھائی نمبر ایک!''
''چلیں؟''
''چلو......!'' میں نے بھی اسی مضحکہ خیز انداز میں جواب دیا اور ہم دونوں بیلا باغ کے خوب صورت کالج سے نکل آئے۔ ہم اس طرح اس عمارت میں گھوم رہے تھے، جیسے یہ ہماری ننھیال ہو۔
طالوت پر پھر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ ہم بیلا باغ سے نکل کر پھر دوسری عمارت میں آ گئے۔
''بہر حال، عرشیلا بھی ان معاملات میں خصوصی طور سے ملوث ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ایک سوال ہے۔''
''کیا؟''
''وہ تنہا ہے یا اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟''
''معلوم کرنا پڑے گا۔''
''ویسے تمہیں اُس کے رات کے الفاظ یاد ہیں؟''
''ہاں...... کم از کم اُس کا تعلق ان لوگوں سے نہیں ہے جو پہاڑوں میں موجود تھے۔ گویا وہ خان زورات یا خانم کے دشمنوں میں سے نہیں ہے۔''
''لیکن خانم کے الفاظ بھی یاد رکھنا۔''
''کیا مطلب؟''
''خان زورات نہ سہی، وہ خانم کے دشمنوں میں سے ضرور ہو سکتی ہے...... اے!'' طالوت نے ایک گزرتے ہوئے ملازم کو روکا اور وہ ان کے قریب آ گیا۔
''خان زادہ شکیل کہاں ہے؟''
''اپنے کمرے میں...... مگر تم کون ہو؟''
''شکیل کے دوست۔ تم ہمیں اس کے کمرے تک پہنچا دو۔''
''آؤ......!'' ملازم نے کہا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ اُس نے ایک اونچے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''یہ ہے شکیل خان کی حرم...... اگر دوست ہو تو اندر چلے جاؤ۔ ساری ذمہ داری تمہاری ہے۔''
''پروا نہ کرو...... ہم دونوں لنگوٹیئے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور مجھے اشارہ کیا۔ ہم نے دروازے کو دھکیلا اور دروازہ کھل گیا۔ جسے کمرہ کہا گیا تھا، وہ کمرہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان ہال تھا، جس کی بناوٹ عمدہ ترین تھی۔ عقبی حصہ کھلا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف بھی دو دروازے نظر آ رہے تھے، جو کھلے ہوئے

تھے۔ ہم نے خالی ہال کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف۔
''دروازے۔'' طالوت نے کہا۔
''آؤ۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں کھلے ہوئے دروازوں کی طرف بڑھ گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سے دروازے سے داخل ہوا جائے۔ چنانچہ ایک دروازے سے میں اور دوسرے سے طالوت اندر داخل ہو گیا۔
لیکن دونوں دروازے ایک دوسرے بڑے ہال کے تھے۔ اور یہ ہال خالی نہیں تھا۔ تین چار قوی ہیکل لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اور کرسی پر بڑی مونچھوں والے لیکن دبلے پتلے بدن کا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اچھی شکل وصورت کا تھا، لیکن چہرے پر شرافت نہیں تھی۔ آنکھیں سرخ اور ڈراؤنی تھیں۔ اس کے سامنے میز پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ وہ تنہا ہی پی رہا تھا۔ دوسرے لوگ اس کے سامنے کسی حد تک مؤدب نظر آ رہے تھے۔
نوجوان کا رُخ سامنے ہی کی طرف تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کے انداز پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی احساس ہوا اور ان کی گردنیں بھی گھوم گئیں۔
نوجوان خونخوار آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا۔
''سب ہی نمونے ہیں۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔
''آگے آؤ۔'' نوجوان کی بھاری آواز سنائی دی اور طالوت خوف زدہ انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اُس نے میری آستین بھی پکڑ لی تھی۔ اس طرح ہم دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔''
''کون ہو تم لوگ؟'' نوجوان دہاڑا۔
''تت...... تربوز...... خ...... خربوز......'' پہلے طالوت اور پھر میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔
''کیا بکواس ہے؟'' نوجوان دہاڑا۔
''نن...... نام ہیں ہمارے۔''
''تمہیں اندر کیوں آنے دیا گیا؟''
''ہم شکیل خان سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''کیوں؟''
''پپ...... پرانی دوستی ہے۔'' طالوت نے اسی انداز میں ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔
''کس سے...... شکیل سے؟'' شکیل خان نے پوچھا۔
''ہاں......!''
''میرا نام شکیل ہے۔'' شکیل کی مونچھوں کے نیچے ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
''اچھا......'' طالوت نے خوش ہو کر کہا اور پھر دوڑ کر شکیل سے بغل گیر ہو گیا۔ شکیل ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اُس کے ساتھی اُچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ پستول پر پہنچ گئے تھے۔
بمشکل تمام شکیل نے اُسے دور دھکیلا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ''دیکھو ان مسخروں کو۔ پوچھو ان سے، یہ کون ہیں؟ کس نے انہیں بھیجا ہے؟...... رکو، پہلے ان کے لباس کی تلاشی لو۔'' شکیل نے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے پستول نکال لئے۔ پھر اُن کے رُخ ہماری طرف کر کے

ہوئے بولے۔
''اپنے ہاتھ بلند کر لو۔''
اور ہم دونوں نے نہایت شرافت سے ہاتھ اوپر کر دیئے۔
''ان میں سے ایک آدمی نے ہم لوگوں کی جامہ تلاشی لی، لیکن ہمارے پاس معمولی سا چاقو بھی نہیں تھا۔ اُس نے شکیل کی طرف رُخ کر کے گردن ہلا دی اور ہم نے ہاتھ گرا دیئے۔
''ہاں.....اب بتاؤ......تم کون ہو؟......کس نے بھیجا ہے اور کیا چاہتے ہو؟''
''خان زورات کے بارے میں معلومات کرنے آئے ہیں۔''
''کیا؟'' شکیل نے پوچھا۔
''کہاں چھپایا ہے تم نے اسے؟'' طالوت نے کہا اور شکیل کی آنکھیں کچھ اور بھیانک ہو گئیں۔ وہ خوف ناک نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔
''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟'' اس نے کہا۔
''ہم خود آئے ہیں۔''
''تمہیں خان زورات سے کیا دلچسپی ہے؟''
''ان سے بھی ہماری پرانی دوستی ہے۔'' طالوت نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
''ہوں......معلوم کرو ان دونوں سے......کس نے بھیجا ہے انہیں؟'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور ان چاروں نے پستول ہولسٹروں میں رکھ لئے۔
''خان زورات کہاں ہے شکیل؟ اگر ان کے اغوا میں تمہارا ہاتھ ہے تو صاف صاف بتا دو۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ دوسری صورت میں ہم تمہیں سزا دینے کے حق دار ہوں گے۔'' طالوت نے سخت لہجے میں کہا۔
''کھال کھینچ دو ان کی......ٹکڑے کر دو......میں ذمہ دار ہوں۔'' شکیل نے غضب ناک لہجے میں کہا اور وہ سب ہم پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن طالوت ہی بے خبر تھا، نہ میں۔ میرا خوف ناک گھونسہ اُن میں سے ایک کے جبڑے پر پڑا اور شاید اُس کا منہ ہمیشہ کے لئے ٹیڑھا ہو گیا۔ طالوت نے ان میں سے ایک کو سر سے بلند کر کے باقی دو پر دے مارا تھا۔ اور پھر اُس کی ٹھوکروں نے اُنہیں اُٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔ شکیل نے اپنا پستول نکالنا چاہا، لیکن پستول اس کے ہولسٹر میں ایسا پھنسا کہ کسی طور نہ نکل سکا۔
شکیل پستول نکالنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ اور ہم دونوں گرے ہوئے آدمیوں کو ناکارہ کر رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ان میں کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی۔ تب طالوت ہاتھ جھاڑتا ہوا شکیل کی طرف بڑھا۔ اس نے شکیل کا ہاتھ پکڑ کر ہولسٹر سے ہٹا دیا۔ اور پھر اس کا پستول نکال کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
شکیل احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھ رہا تھا، اور طالوت اس کی نگاہوں میں جھانک رہا تھا۔ پھر شکیل نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔
''کیا......کیا یہ مر گئے؟''
''نہیں......صرف بے ہوش ہیں۔''
''اوہ......مگر......مگر......''

''کیا تم بھی مار کھانا چاہتے ہو شکیل؟'' طالوت نے پوچھا۔
''تم......تم میری توہین کر رہے ہو۔ جانتے نہیں، میں کون ہوں؟''
''مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے شکیل! میں جو کچھ جاننا چاہتا ہوں، وہ تم مجھے بتاؤ گے۔''
''تم زبردست نقصان اٹھاؤ گے......سمجھے؟'' شکیل بے بسی سے بولا۔ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر اس کی بہادری دکھانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔
''میرے نفع نقصان کی تم کوئی فکر مت کرو۔ بولو، میری بات کا جواب دو گے؟''
''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔
''خان زورات کہاں ہے؟''
''کیا تمہیں خانم نے بھیجا ہے؟'' شکیل نے پوچھا۔
''شکیل! صرف میرے سوال کا جواب دو۔''
''اگر تمہیں اُس نے بھیجا ہے تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں دیکھوں گا، وہ کتیا مجھے کتنا بدنام کر سکتی ہے۔'' شکیل نے کہا اور طالوت نے اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔
شکیل لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لیکن طالوت کا ہاتھ اور رنگ نہ لاتا۔ اُس کے ہونٹ سے خون ٹپکنے لگا۔ اُس کی خونخوار آنکھوں میں بھی خون ہی خون نظر آنے لگا۔
دوسرے لمحے وہ طالوت پر جھپٹ پڑا۔
''مار ڈالوں گا...... مار ڈالوں گا۔'' وہ کسی جانور کی طرح غرّایا تھا۔ اور اس نے طالوت کی کمر پکڑ لی تھی۔ لیکن نہ جانے طالوت نے کیا کیا، اُس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ نکلی اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ طالوت آگے بڑھا اور اس نے شکیل کا ایک بازو پکڑ کر مروڑ دیا۔ شکیل دوہرا ہو گیا تھا۔
''خان زورات کہاں ہے؟''
''چھوڑ دے......چھوڑ دے مجھے..... پاگل!.....کتے! چھوڑ دے۔'' شکیل طاقت صرف کرنے لگا، لیکن طالوت کی گرفت سے آزاد ہونا آسان کام نہیں تھا۔ البتہ اُس کے بازو کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔
''خان زورات کہاں ہے؟'' طالوت کا لہجہ بہت خونخوار تھا۔
''وہ......وہ میرا چچا ہے اور......میرا خون خراب نہیں ہے۔'' شکیل نے کراہتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب ہوا اس بات کا؟''
''اگر مجھے خان زورات کے بارے میں معلوم ہوتا تو میں خود بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا رہتا۔ شکیل نے کہا۔
''تمہارے خیال میں خان زورات کو کس نے اغوا کیا ہے؟''
''ہاتھ تو چھوڑ دو......آہ......ہاتھ......''
''پہلے جواب۔''
''امیر گلبار نے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''
''ہوں۔'' طالوت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شکیل اب بھی درد سے کراہ رہا تھا۔
''کہاں رکھا ہے امیر گلبار نے خان زورات کو؟''

”مجھے نہیں معلوم۔“

”پھر بھکے۔“ طالوت غرّایا۔

”سچ کہہ رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو میں اسے چھڑانے کی کوشش ضرور کرتا۔ میرا اس سے اسی بات پر اختلاف ہوگیا ہے۔“

”تم مجھے پوری کہانی سناؤ گے؟“ طالوت نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا...... کیا یہ مر گئے؟“ اس نے پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ایک بھی نہیں مرا۔ فکر مت کرو، بیٹھ جاؤ۔“

اور شکیل بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تکلیف کے آثار ہویدا تھے۔ ”ایک گلاس...... ایک پیگ لے لوں؟“ اُس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”لو میری جان! ایک میری طرف سے بھی۔“ طالوت چہکا۔ اور شکیل نے گلاس میں شراب انڈیلی۔ پھر اسے چند ہی لمحوں میں معدے میں اُتار لیا۔ اور پھر ہونٹ چوستا ہوا طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں دروازے کی طرف بھی اُٹھ جاتی تھیں۔

”تمہاری مدد کو اگر پوری فوج بھی آ جائے، تب بھی تمہیں ہمارے چنگل سے نہ چھڑا سکے گی۔ کیا سمجھے؟“ طالوت نے کہا۔

”مگر تم ہو کیا بلا؟“ شکیل جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”اصلی نام خربوز، تربوز۔ عرفیت پانسہ پلٹ نمبر ایک اور دو۔ ویسے تم خدائی فوجدار بھی کہہ سکتے ہو۔ ویسے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کام کی باتیں کرو۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”خوب...... ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا۔ کیا پھر اُٹھنا پڑے گا؟“

”ذلیل مت کرو۔ گولی مار دو۔“ شکیل خان غرّایا۔

”ذلیل کرنا مقصود نہیں ہے دوست! لیکن تم بھی تو تعاون کرو۔“

”خان زورات کے اغوا میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔“

”تم نے امیر گلبار کا نام لیا تھا۔“

”ہاں...... مجھے شبہ ہے، اسی نے خان کو اغوا کیا ہے۔“

”کیسے شبہ ہے؟“

”پہلے وہ یہ کام میرے ذریعے چاہتا تھا۔“

”یعنی؟“

”وہ خانم کے خلاف سازش کرنا چاہتا تھا۔ خانم کے خاندان سے اُس کی پرانی دشمنی ہے۔ میں بھی اُس کے فریب میں آ گیا تھا اور...... اور اُس کے فریب میں آ کر میں نے ایک گھناؤنا کام کیا۔“

”وہ کیا کام تھا؟“

”میں نے کسی کو نہیں بتایا۔“ شکیل غرّایا۔

”مجھے بتا دو میری جان! کسی سے کہنے تھوڑی جا رہا ہوں۔“

''میں نے اپنی ماں کو بدنام کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں نے امیر گلبار کی پھیلائی ہوئی افواہ کی تردید بھی نہیں کی۔''

''گول مول گفتگو مت کرو۔ صاف کہو۔''

''خانم میری ماں ہے۔ میں نے کبھی اسے بری آنکھ سے نہیں دیکھا۔ لیکن امیر گلبار...... مکار انسان نے میرے اور اُس کے تعلقات کی افواہ پھیلائی اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔''

شکیل نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

''امیر گلبار کا مقصد کیا تھا؟''

''براہِ کرم...... براہِ کرم اور کچھ مت پوچھو۔''

''ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں شکیل! تم نے ہماری دشمنی دیکھی ہے، دوستی بھی آزماؤ۔ لیکن اس کے لئے تمہیں ایک ایک لفظ صاف صاف بتانا پڑے گا۔'' طالوت نے کہا۔

شکیل کئی منٹ تک منہ چھپائے رہا، پھر اُس نے آہستہ آہستہ ہاتھ نیچے گرا دیئے۔

''طویل کہانی نہیں ہے۔ بہت کچھ تمہیں بتا چکا ہوں۔ حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کون ہو۔''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ ہم جو کوئی بھی ہیں، نہ تمہارے دشمن ہیں نہ خانم کے، نہ زورات کے۔ ہم تم سب کی مدد کرنا چاہتے ہیں، بلاواسطہ۔ اس لئے تمہیں تردّد نہیں ہونا چاہئے۔''

''جو کوئی بھی ہو، طاقتور ہو۔ اور طاقتور بذاتِ خود بہت کچھ ہوتا ہے۔ سنو، جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس میں ایک لفظ غلط نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر تم میرے بدن کی بوٹی بوٹی کاٹ دو گے، تب بھی کچھ اور نہیں معلوم کر سکو گے۔''

''ہم تمہارے اوپر اعتبار کریں گے شکیل خان!''

''خان زورات میرا مہربان چچا ہے۔ اس کی ذات سے نہ صرف مجھے بلکہ کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن میں امیر گلبار کی لڑکی زرینہ سے محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ ایک بار امیر گلبار اور اس کے بیٹے زبر خان نے ہم دونوں کو یکجا دیکھ لیا۔

زبر خان نے تلوار نکال لی۔ لیکن امیر گلبار نے اسے روک دیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر پہنچ گیا۔ امیر گلبار سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''زرینہ سے تمہارے کب سے تعلقات ہیں؟''

''تین سال سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں تک پہنچ چکے ہو؟''

''پاکیزگی کی حدود کے اندر۔ محبت کی انتہائی منزل تک۔'' میں نے کہا۔

''سچ کہتے ہو؟''

''بالکل سچ۔ جھوٹ کی ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔''

''زرینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔''
''کیا کرسکو گے اس کے لئے؟''
''جو مجھ سے کہا جائے گا۔''
''تمہاری حیثیت کیا ہے، سوائے اس کے کہ خان زورات کے بھتیجے ہو۔ کیا تم کبھی زورات کے حکمران بن سکتے ہو؟''
''شاید کبھی نہیں۔''
''لیکن میں زرینہ کی شادی والئ زورات سے کرنا چاہتا ہوں۔''
''میرے لئے کیسے ممکن ہے؟''
''ہمت کرو تو ہر ناممکن، ممکن بن سکتا ہے۔''
''وہ کس طرح؟''
''پہلے تمہیں حلف اُٹھانا پڑے گا جو کچھ کہوں گا، اسے راز رکھو گے، اس پر اسی طرح عمل کرو گے، جس طرح میں کہوں گا۔ حلف اُٹھائے بغیر کچھ ممکن نہیں۔''
میں زرینہ کی محبت میں اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے حلف اٹھا لیا۔ تب امیر گلبار نے مجھ سے کہا۔
''اگر تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو نہ صرف زرینہ سے ہاتھ دھوؤ گے، بلکہ تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''
''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ تب اُس نے باقی گفتگو دوسری نشست میں کرنے کے لئے کہا اور زرینہ سے مجھے ملنے کی اجازت دے دی۔ تم جانتے ہو، میں اُس کا کس قدر ممنون ہوا ہوں گا۔
اور پھر دوسری ملاقات میں اُس نے دل کا حال کھول دیا۔ اس نے کہا، وہ زورات کی حکومت حاصل کرنے میں میری مدد کرسکتا ہے۔ اور پھر اس نے پورا پروگرام بتایا۔ پروگرام کے تحت ہمیں سب سے پہلے خانم آف زورات کا پتہ کاٹنا تھا۔ اسی سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اس کا خاندان بہت با اثر تھا۔ خان زورات کی موت کے بعد خانم کا خاندان برسرِ اقتدار آسکتا تھا۔ رہی خان زورات کی لڑکی عرشیلا، تو اس کی کوئی آواز نہیں تھی۔ خانم، خان زورات سے اپنے خاندان کے لئے کوئی وصیت لکھوا سکتی تھی۔
زورات کی حکومت بہت دلکش تھی دوستو! اور پھر میری محبت بھی مجھے مل رہی تھی۔ میں تیار ہو گیا۔ اور میں نے اس پروپیگنڈے کی کوئی تردید نہیں کی جو میرے اور خانم کے بارے میں شروع ہوا۔ یوں میں نے اپنی ماں کو بدنام کیا۔ لیکن خان زورات کے اغوا کا پروگرام مجھ سے بھی پوشیدہ رکھا گیا۔ میں نے امیر گلبار سے رابطہ قائم کیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ خان کے اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے اس سے سخت الفاظ میں کہا کہ خان زورات، یعنی میرے چچا کو فوراً برآمد ہونا چاہئے۔ تو اس بات پر میری اس سے تکرار ہوگئی ہے۔ یہ ہے کُل داستان۔ اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔''
''ہوں۔'' طالوت نے گردن ہلائی۔ ''خانم کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کس نے شروع کی ہے؟''
''میں نہیں جانتا۔'' شکیل نے کہا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" طالوت نے پوچھا۔
"میں سخت اُلجھن میں ہوں۔ ایک طرف چچا ہے، دوسری طرف محبت۔"
"خان زورات کے اغوا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"
"میرا شبہ امیر گلبار کی طرف ہے۔"
"کیا وہ افرادی قوت بھی رکھتا ہے؟"
"وہ بے پناہ دولت مند ہے۔ اور دولت ہر طاقت مہیا کر دیتی ہے۔"
"ہوں...... تو شکیل! میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کرو۔ خان زورات کو ہم برآمد کریں گے۔ ممکن ہے تمہاری ضرورت بھی پیش آئے۔"
"میں تیار ہوں۔ لیکن کیا میرے ذہن کے لئے یہ اُلجھن کم ہے کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"
"ہم خدائی فوجدار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق زورات سے نہیں ہے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہاں، عرشیلا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"
"خونخوار بلی...... بے حد چالاک ہے۔ خانم سے خار کھاتی ہے اور بس۔"
"ٹھیک ہے...... اجازت دو...... بہت جلد تم سے ملاقات کریں گے۔" طالوت نے کہا اور پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر واپسی کا اشارہ کیا اور پھر ہم دونوں محل ہی سے نکل آئے۔
"کیا خیال ہے عارف؟"
"انوکھی داستان ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔
"بے حد...... لیکن میرا خیال ہے، شکیل وہ آدمی نہیں ہے۔"
"کون سا؟"
"جورات پہاڑوں میں تھا۔ اُس کی آواز......"
"ہاں، وہ آواز شکیل کی نہیں تھی۔"
"پھر......؟"
"ابھی ایک مہرہ اور ہے؟"
"امیر گلبار......؟"
"ہاں۔"
"اسے بھی دیکھ لیں گے۔ آخری مہرہ ہے، اطمینان سے دیکھیں گے۔ آؤ...... آج کا کام ختم۔ واپس چلیں۔" اور ہم واپس اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ دروازے پر پہنچے تو اندر سے ہنگامے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم دونوں ٹھٹک گئے۔
"رخشے......؟" طالوت آہستہ سے بولا۔
"ممکن ہے۔"
"دوشالہ اوڑھ لو۔" طالوت آہستہ سے بولا اور خود بھی نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ میں نے بھی دوشالہ اوڑھ لیا اور ہم مکان کے اندر داخل ہو گئے۔

ہمارا اندازہ درست تھا مکان کے اندرونی حصے میں ہنگامہ برپا تھا۔ رنشے ایک کریہہ شکل اور قوی ہیکل آدمی تھا۔ وہ چمڑے کا چابک لئے کمرے کے درمیان کھڑا تھا۔ ایک کونے میں اغمانہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ کمرے کے درمیان دلشاد شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی۔

''میں تیری صورت داغ دار کردوں گا۔'' رنشے دہاڑا۔

''میری دلی خواہش ہے، تُو ایسا ہی کر۔ تاکہ لوگ میری شکل سے گھن کھا کر اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل نہ کرسکیں۔''

''میں تیری کھال اُدھیڑ دوں گا۔''

''تُو بزدل ہے۔ کچھ بھی نہ کرسکے گا۔ کان کھول کر سن لے رنشے! میں اغمانہ نہیں ہوں۔'' دلشاد غضب ناک آواز میں بولی۔

''دلشاد...... دلشاد...... کتیا کی بچی!...... میں تجھے ٹھیک کردوں گا۔''

''وہ یقیناً کتیا ہی ہوگی، جو میری ماں اور تیری بہن تھی۔''

رنشے نے چابک والا ہاتھ اٹھایا لیکن دلشاد کے چہرے پر کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ وہ تنی کھڑی رہی۔

''رُک جاؤ رنشے!...... یہ لڑکی پاگل ہوگئی ہے۔ میں اُسے سمجھالوں گی۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''ابھی اور اسی وقت سمجھالے۔ ورنہ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔'' رنشے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''یہ بے غیرت مجھے کیا سمجھائے گی؟ تجھے جو کچھ کرنا ہے، ابھی کرلے۔'' دلشاد دیوانگی سے بولی۔

''اگر کام نہ کرے گی تو کھائے گی کیا؟'' بوڑھی بولی۔

''میں تیری روٹی پر لعنت بھیجتی ہوں۔''

''وہ لوگ بہت امیر ہیں دلشاد! اگر تُو ان میں سے دوسرے کو پھانس لے تو وارے نیارے ہوجائیں گے۔''

''خاموش، ذلیل...... کتیا! ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

''طالوت!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہوں۔ طالوت کی آواز بہت سنجیدہ تھی۔

''یہ ہمارا ہی ذکرِ خیر ہے۔''

''میرا خیال ہے ان لڑکیوں کو ان دونوں خبیثوں سے نجات دلا دی جائے۔'' طالوت آہستہ سے بولا۔ اور پھر ہم دونوں رنشے کی طرف متوجہ ہوگئے، جو بھیانک انداز میں دلشاد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے دلشاد کے نزدیک پہنچ کر چابک اُٹھایا۔ اور اسی وقت طالوت نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ کافی لمبا ہوگیا تھا۔ چابک اُس نے پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور رنشے اوندھے منہ گر پڑا۔ وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ خونخوار انداز میں اُٹھا۔

''تُو نے...... تُو نے چابک پکڑا تھا۔ میں...... میں تجھے......'' اُس نے وحشیانہ انداز میں چابک گھمایا۔ لیکن اس بار چابک دلشاد کے بجائے بوڑھی کے بدن پر پڑا۔

بوڑھی کی چیخ کان پھاڑ دینے والی تھی۔ ''اے میرے مولا! بچانا۔'' وہ دروازے کی طرف لپکی۔ لیکن رنشے کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ اس نے لپک کر پھر بوڑھی پر وار کیا تھا اور بوڑھی پھر چیخی۔ پھر تو رنشے کا چابک تھا اور بوڑھی کا بدن۔ رنشے پاگلوں کے سے انداز میں اسے ادھیڑ رہا تھا۔ دلشاد اب منہ پھاڑے اغمانہ کے نزدیک جا کھڑی ہوئی تھی۔ اور بڑھیا کی چیخیں چھت اُڑائے دے رہی تھیں۔

لیکن رنشے اندھا ہو گیا تھا۔ وہ عقل وخرد سے عاری ہو گیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ دلشاد کو مار رہا تھا۔ لیکن مصیبت بوڑھی کی آئی ہوئی تھی۔ بارہ زبانوں کا خوفناک چابک ......اور رنشے کا قوی ہیکل جسم...... بوڑھی کے بدن سے محاورتاً نہیں، حقیقتاً کھال اُتر رہی تھی۔ وہ لہولہان ہو گئی تھی۔ اب اُس کی کراہیں بھی مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔

اور پھر اُس نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ تب رنشے کا جنون سرد ہوا۔

''میرے احکامات سے منحرف تھی، کمینی کہیں کی۔'' وہ بولا۔ اور پھر اس نے اغمانہ اور دلشاد کی طرف دیکھا اور اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''ہیں......'' وہ پاگلوں کے سے انداز میں بولا۔ ''تُو......تُو زندہ ہے۔'' اُس کا تخاطب دلشاد سے تھا۔ پھر اُس نے اسی انداز سے بوڑھی کی طرف دیکھا۔

''ارے......ارے...... یہ کیا ہوا؟......ارے......ارے......'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بوڑھی کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''یہ...... یہ کیا ہوا؟......ارے یہ میں نے کیا کِیا؟......میں نے......اپنی بہن کو قتل کر دیا......ارے، میں نے......میں نے......'' اور پھر وہ زور سے چیخا۔ ''میں نے اپنی بہن کو قتل کر دیا۔''

اور اس کے بعد وہ یہی الفاظ دوہراتا ہوا، چیختا ہوا باہر نکل گیا۔

''فی الحال یہی کافی ہے۔ اگر اس کا انجام مناسب نہ ہوا تو پھر ہم خود اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیں گے۔'' طالوت نے کہا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آؤ......اب یہاں رُکنا بیکار ہے عارف! بہت سے بوجھ خود پر لادنا مناسب نہ ہوگا۔ امیر گلبار سے بھی آج ہی بات کر لی جائے۔''

''جیسا مناسب سمجھو۔'' میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور پھر طالوت کے ساتھ باہر نکل آیا۔

باہر مجمع جمع ہو رہا تھا۔ رنشے کو لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔

''آجاؤ......کام حسبِ مرضی ہوا ہے۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں وہاں سے کافی دُور نکل آئے۔

''کچھ تھکن محسوس کر رہے ہو؟'' تھوڑی دیر کے بعد طالوت نے پوچھا۔

''ہاں یار!'' میں نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تب آؤ۔ پہاڑیوں میں کسی جگہ آرام کریں گے۔ امیر گلبار کو صبح ہی دیکھ لیں گے۔''

''چلو......!'' میں نے کہا۔ اور پھر ویران پہاڑیوں میں ایک مناسب جگہ ہم نے قیام کا فیصلہ کیا اور آرام کرنے لیٹ گئے۔ میرے ذہن میں عجیب سا خلفشار تھا۔ رات گئے تک میں اور طالوت انہی حالات پر تبصرہ کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

دوسری صبح گوشت کی سوندھی بُو سے میری آنکھ کھلی۔ پشت کے نیچے کھردری زمین تھی۔ لیکن اس کے باوجود نیند بہت عمدہ آئی تھی۔ گردن گھما کر دیکھا......سامنے ہی دسترخوان چنا ہوا تھا، جس پر بے شمار برتن رکھے ہوئے تھے۔

کہاں کی نیند، کیسی کسل۔ جلدی سے اُٹھا۔ طالوت میرے سرہانے ہی کھڑا تھا۔
''منہ ہاتھ دھولو۔''
''ٹھنڈا...... ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' میں نے بدحواسی میں ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔
''نہیں ہوگا۔ یہ تو صرف نمونہ ہے۔ تمہیں جگانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔''
''اور پھر ناشتہ کیا ہوگا؟'' میں نے دستر خوان کی طرف دیکھا اور دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں، جس جگہ اب سے چند ساعت پیشتر دستر خوان بچھا ہوا تھا، وہاں اب ہری ہری گھاس نظر آ رہی تھی۔
''کیا بے ہودہ مذاق ہے۔'' میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔
''جاؤ۔ ضروریات سے فارغ ہولو۔ ناشتہ آ جائے گا۔'' اور میں گردن جھکا کر ایک طرف چل پڑا۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم سچ مچ کے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور دستر خوان اعلیٰ لوازمات سے پُر تھا۔ خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اور پھر راسم کسی بیرے کے انداز میں برتن سمیٹ لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم تیار ہو گئے۔ طالوت میری شکل دیکھ رہا تھا۔
''کیا پروگرام ہے طالوت؟''
''میرا خیال ہے، آج بہت سے کام نمٹا لئے جائیں۔''
''ہاں...... یہ پہاڑ زیادہ پسند نہیں آئے۔ جلد ہی مہذب دنیا میں چلیں گے۔''
''بالکل...... بالکل......تو اب امیر گلبار کو دیکھ لیا جائے؟''
''یقیناً۔''
''تب پھر آؤ۔'' طالوت نے کہا اور میں اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ طالوت میرے برابر چل رہا تھا۔ اچانک اُس نے میرے شانے کو زور سے دھکا دیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ لیکن اُس کی حرکت میری سمجھ میں آ گئی تھی۔
''کیا اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہے؟'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
''افسوس، نہیں۔''
''اور اگر کسی وقت میرا منہ ٹوٹ جائے؟''
''دوسرا لگایا جا سکتا ہے۔'' طالوت نے اطمینان سے کہا۔ اسی وقت ہمیں عقب سے بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور اس سے قبل کہ ہم گھومتے، چھ رائفلیں ہماری طرف تن گئیں۔
''خبردار...... ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' ایک کڑک دار آواز نے کہا۔ ہم نے خاموشی سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ تب ہم نے انہیں دیکھا۔ وردی پہنے ہوئے چھ محافظ تھے۔
''کون ہو تم؟...... یہاں کیا کر رہے ہو؟''
''مسافر ہیں۔ رفع حاجت کے لئے آئے تھے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''کیا بکواس ہے؟...... جانتے ہو، یہ کون سی جگہ ہے؟''
''ب...... بیت الخلا نہیں ہے؟'' طالوت احمقانہ انداز میں بولا۔
''اُچکے معلوم ہوتے ہیں، زور شاہ!'' کسی نے کہا۔

''گرفتار کر لو انہیں۔ داروغہ کے پاس لے چلو۔'' کڑک دار آواز والے نے کہا اور باقی آدمی رائفلیں سیدھی کر کے ہماری طرف بڑھے۔

''ارے بھائیو!......رر......رر......رفع حاجت......'' طالوت نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''بکواس مت کرو۔'' کڑک دار آواز والے نے کہا اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ طالوت کی یہی مرضی تھی۔ ورنہ اُن کی کیا ہمت تھی کہ ہمیں گرفتار کرتے۔

''دیکھو......دیکھو یہ ساری ذمہ داری تمہارے اوپر ہوگی۔'' طالوت عجیب سے انداز میں بولا اور ان میں سے کچھ لوگ ہنس پڑے۔

''لے چلو......دھکے دیتے ہوئے لے چلو۔'' کڑک دار آواز والے نے دوسروں کو ڈانٹ دیا اور وہ لوگ ہمیں دھکے دینے لگے۔

''ارے خدا کے بندو!......ارے خدا کے بندو! دھکے تو نہ دو......ویسے ہی حالت.....خراب ہے۔'' طالوت کی بدمعاشی پر مجھے بھی ہنسی آ رہی تھی۔

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ہم داروغہ کے سامنے کھڑے تھے۔ داروغہ بھی ایک خونخوار آدمی تھا۔ اُس نے سوالیہ انداز میں ہماری طرف دیکھا۔

''یہ دونوں اندرونی محل میں کھڑے تھے خان! فضول بکواس کر رہے تھے۔''

''اندرونی محل میں....اور دربان کہاں مر گئے تھے؟'' داروغہ نے پوچھا۔

''انہیں چکمہ دے کر اندر داخل ہوئے ہوں گے۔''

''کیا بکواس ہے؟ وہ ان کے چکمے میں آ گئے۔''

''ہم کیا کہہ سکتے ہیں جناب؟''

'سب کو میرے سامنے حاضر کرو۔''

''رفع حاجت کرنا چاہتے ہیں۔'' طالوت نے فقیروں کے سے انداز میں کہا۔

''کیا......؟'' داروغہ جھلا گیا۔

''بہت بری حالت ہے خان!'' طالوت گھگھیایا۔

''کیا بک رہے ہیں یہ؟''

''یہی بکواس وہاں کر رہے تھے خان!''

''ڈنڈے مار مار کر درست کر دو۔ اسلحہ تو نہیں ہے ان کے پاس؟''

''بہت سا اسلحہ ہے خان! مگر رفع حاجت......''

''اوہ گدھو......انہیں بیت الخلا لے جاؤ۔ خود ان کے سر پر کھڑے رہو۔''

''شرم آئے گی خان!'' طالوت مسخرے پن سے بولا اور لوگ پھر ہنس پڑے۔

''لے جاؤ۔'' داروغہ دہاڑا۔ اور وہ بادل نخواستہ ہمیں پھر دھکے دینے لگے۔

''دوشالہ۔'' طالوت نے آہستہ سے مجھ سے کہا اور آنکھ مار دی۔ بہر حال ہمیں الگ الگ دو بیت الخلا میں پہنچا دیا گیا اور اندر داخل ہو کر میں نے دوشالہ اوڑھ لیا۔

طالوت بھی باہر نکل آیا تھا اور ہمارے نگران اپنی دانست میں بڑے چوکنے کھڑے تھے۔ طالوت

نے مجھے اشارہ کیا اور ہم خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ''اس شرارت کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے کہا۔
''لطف نہیں آیا؟'' طالوت نے بچوں کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ بیت الخلا کی نگرانی کرتے رہیں گے۔''
میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔ کیا کہہ سکتا تھا، اس خطرناک معصوم کے بارے میں۔ محل کے اندرونی حصے میں داخل ہو کر ہم امیر گلبار کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔
''یار!...... یہ محل بھی خان زورات کے محل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔''
''ہاں...... امیر گلبار معمولی حیثیت کا انسان نہیں معلوم ہوتا۔''
''ہے کہاں کمبخت؟ اے......'' طالوت نے ایک ملازم کو آواز دے لی اور ملازم اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''امیر کہاں ہیں؟''
''اپنی نشست گاہ میں۔ مگر تم کون ہو؟''
''تم سب جاسوس ہو کیا؟ ہر ایک یہی سوال کرتا ہے۔''
''کیا امیر نے تم سے ملنے کی خواہش کی ہے؟''
''نہیں تو کیا ہم تمہاری شادی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟'' طالوت نے کہا اور ملازم جھینپ گیا۔ پھر وہ ہمیں ساتھ لے چلا اور ایک خوبصورت دروازے پر رُک گیا۔
''امیر اندر ہیں۔'' اس نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ ہم نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی صرف تین آدمی تھے۔ امیر گلبار اور دو اور آدمی۔ جو مقامی ہی معلوم ہوتے تھے۔ امیر گلبار حقہ پی رہا تھا۔ خاصا بارعب آدمی تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تینوں چونک پڑے۔ امیر خاموشی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔
امیر نے اس پر بھی کچھ نہ کہا۔ البتہ اس کے دونوں ساتھیوں نے پستول نکال لئے تھے۔ امیر نے انہیں اشارے سے روکا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں نہیں جانتا۔''
''امیر گلبار آپ ہی ہیں؟'' طالوت نے مسکینیت سے پوچھا۔
''ہاں۔''
''ہم آپ کو قتل کرنے آئے ہیں۔'' طالوت اسی سادگی سے بولا۔
''کیا؟'' امیر گلبار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
''ہاں...... ہمیں باہر سے بلایا گیا ہے۔ اور معقول معاوضے پر آپ کے قتل کا کام سونپا گیا ہے۔''
امیر گلبار کے دونوں ساتھی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پستول ہماری گردنوں پر رکھ دیئے اور پھر حسبِ معمول ہمارے لباس کی تلاشی لی گئی۔ لیکن اس سے کچھ ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔
''کیا کیفیت ہے؟'' امیر گلبار نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔
''خالی ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔
''پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہاں داخل کیسے ہو گئے؟'' امیر گلبار نے کہا۔
''پتہ نہیں خان! پہرے داروں کو سزا ملنی چاہئے۔''

''ٹھہرو، ان سے گفتگو تو کر لی جائے۔'' امیر گلبار نے کہا۔ اور پھر ہماری طرف رُخ کر کے بولا۔
''کس نے تمہیں میرے قتل پر مامور کیا ہے؟''

''خانم آف زورات نے۔'' طالوت نے جواب دیا۔ مجھے چکر آ رہے تھے۔ بدمعاش طالوت نے پھر چکر چلا دیا تھا۔ کسی جگہ اپنی شرارت سے باز نہیں آتا۔

''اوہ...... کیا خانم پاگل ہو گئی ہے؟''

''آپ اُن کی بے عزتی نہیں کر سکتے خان! انہوں نے ہمیں پانچ ہزار روپے دیئے ہیں۔'' طالوت نے برا ماننے والے انداز میں کہا اور پھر وہ امیر گلبار کے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اے، تم بھی خاموش کھڑے ہو۔ حالانکہ ہماری مدد کے لئے تمہیں بھی بھاری رقم دی گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ دونوں چونک پڑے۔

''یہ بھی ہمارے ساتھی اور خانم کے مددگار ہیں امیر! ہمیں ان کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے؟'' امیر گلبار چونک پڑا۔ وہ حقہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور امیر گلبار کے دونوں آدمی بوکھلاہٹ میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''کیا تم انہیں جانتے ہو دلاور خان؟'' امیر گلبار نے پوچھا۔

''مسخرے ہیں خان! ضرور کسی سازش کے تحت آئے ہیں۔''

''ہم تمہاری طرح چور نہیں ہیں۔ دیکھو، ہم نے صاف صاف کہہ دیا۔ تم کیوں چھپا رہے ہو؟'' طالوت نے کہا۔

''میں تجھے گولی مار دوں گا۔'' دلاور خان نے پستول تان لیا۔

''ٹھہرو دلاور خان!...... اے، تم بتاؤ...... خانم نے ان کے بارے میں تم سے کیا کہا تھا؟''

''ارے ہم ان دونوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ خانم کے محل میں ہمیں ملے تھے۔ اب دیکھ لو، انہوں نے ہماری تلاشی لے کر تم سے کہہ دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس بہت سا اسلحہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' خان چونک پڑا۔

''یہ دیکھو'' طالوت نے اپنے لباس سے ایک پستول نکال کر امیر گلبار کے سامنے ڈال دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے ایک اور پستول نکال لیا اور اس کے بعد اس نے دو دستی بم نکال کر خان کے سامنے پھینک دیئے اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب تم بھی اپنا اسلحہ نکال کر دکھاؤ۔''

مروا دیا تھا طالوت نے ان دونوں بے چاروں کو۔ بہرحال میرے لباس سے اسلحہ کیوں نہ برآمد ہوتا۔

ان دونوں کے چہرے ہونق ہو کر رہ گئے تھے۔

''کیوں...... اب کیا خیال ہے؟'' طالوت نے ان سے پوچھا لیکن امیر گلبار حرکت کر چکا تھا۔ دوسرے لمحے چار آدمی اندر گھس آئے۔ وہ بھی مسلح تھے۔

''دلدار خان اور گلدار کو حراست میں لے لو اور سخت نگرانی میں رکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ہمارا اسلحہ اپنے قابو میں کر لیا تھا۔

''تم دونوں بیٹھ جاؤ۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا اور طالوت اطمینان سے بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے زدیک بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں بے چارے اپنی گرفتاری پر احتجاج بھی نہ کر سکے تھے۔

''جب تم مجھے قتل کرنے آئے تھے، تو تم نے اپنا کام کیوں نہیں کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم نے اس سے پہلے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''تمہیں دیکھنے کے بعد قتل کرنے کو دل نہیں چاہا۔ نہ جانے خانم تمہیں کیوں قتل کرانا چاہتی ہے۔''

''نیک لوگ ہو تم...... تم نے نادانستگی میں میری مدد کی ہے۔ کہاں سے آئے ہو تم؟''

''سولی بستی سے ہمیں بلوایا گیا ہے۔''

''خانم نے اس کام کے لئے تمہیں پانچ ہزار روپے دیئے تھے؟''

''ہاں۔''

''اسلحہ بھی اس نے دیا ہوگا۔''

''ہاں۔''

''میں تمہیں دس دس ہزار دوں گا۔''

''دس دس ہزار۔'' طالوت نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں...... پورے دس دس ہزار...... نقد!'' امیر گلبار مسکرایا۔

''مگر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟...... کیا خانم کو قتل کرنا ہے؟''

''نہیں دوست! وہ تو خود قتل ہو جائے گی۔ تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے گی۔''

''ہم حاضر ہیں امیر گلبار! کیا ہم خانم کے پانچ پانچ ہزار روپے واپس کر دیں؟''

''کیا ضرورت ہے؟ انہیں بھی رکھو۔''

''اوہ...... بہت بہت شکریہ خان!...... ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

''فی الحال اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم محل گلبار میں معزز مہمانوں کی طرح رہو گے۔ یہاں تمہیں ہر سہولت حاصل ہوگی، سوائے اس کے کہ تم اس وقت تک باہر نہ جا سکو گے، جب تک میں نہ چاہوں۔''

''ہمیں منظور ہے خان!'' طالوت نے جواب دیا اور امیر گلبار نے ملازموں کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ ملازموں کے آنے پر اس نے انہیں ہمارے بارے میں خصوصی ہدایات دیں اور ملازم ہمیں لے کر چل پڑے۔ محل کے ایک عمدہ حصے میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن بہرحال، پہرے کی پابندیاں سخت تھیں۔

ملازموں کے جانے کے بعد میں نے دانت پیستے ہوئے طالوت کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا چکر چلا دیا ہے تم نے؟''

''غلط ہے کیا؟''

''صحیح بھی کیا ہے؟'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''امیر گلبار کے مہمان ہیں۔ اور کیا چاہتے ہو؟''

''یہاں کیا جھک مارو گے؟''

''یار! احمق ہی ہو۔ ہم شہ رگ تک پہنچ گئے ہیں۔ اب باقی کام مشکل نہ ہوگا۔''

''یعنی......''

''اب میرا دماغ نہ چاٹو۔ اس بار میرا کمال دیکھو اور دیکھتے رہو۔''

''بہتر ہے۔ مجھے سونے کی اجازت دو۔ اس نرم و آرام دہ مسہری پر نیند بہت عمدہ آئے گی۔''

''اجازت ہے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں درحقیقت مسہری پر لیٹ گیا۔ بس ذہن ایک عجیب سی جھلاہٹ طاری ہو گئی تھی اور اسی جھلاہٹ میں نیند آ گئی۔

نہ جانے کب تک سویا۔ آنکھ کھلی تو طالوت موجود نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا کمرے دروازہ اندر سے بند تھا۔ باتھ روم میں جھانکا۔ دوسری جگہوں پر دیکھا۔ اور پھر بدن میں ایک ٹھنڈی لہر د گئی۔ اگر وہ واپس نہ آیا تو یہاں امیر گلبار کے محل میں اچھی خاصی درگت بن جائے گی۔ واہ رے طالوت تیری معیت میں راحت بھی ہے اور مصیبتوں کے پلندے بھی۔''

پریشان سا بیٹھا تھا کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی اور پھر کسی نے دستک دی۔ یا شامت، میں دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ دو ملازم تھے۔ اسلحہ تو یہاں سب کے پاس تھا۔

''چائے پیش کر دی جائے جناب؟'' ایک ملازم نے پوچھا۔

''ہاں لے آؤ...... لے آؤ۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا اور ملازم لوٹ گئے۔ شکر ہے، اندر آئے۔ ورنہ طالوت کو نہ پا کر شبہ میں مبتلا بھی ہو سکتے تھے۔

چائے کی ٹرالی آ گئی۔ میں نے دروازے سے ہی لے لی تھی۔ عجیب مضحکہ خیز پوزیشن میں تھا۔ دل کی کیفیت کچھ درست نہ تھی اور سوچ رہا تھا کہ نئی مصیبت سے کیسے نمٹا جائے۔

چائے بنائی اور پیالی کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ عقب سے ایک ہاتھ آیا اور میری پیالی اُٹھا گئی۔ میں اُچھل پڑا تھا۔

''کیا بد اخلاقی ہے؟ میرے لئے چائے نہیں بنائی۔'' طالوت کی آواز اُبھری اور میں نے طویل سانس لی۔

''تو تم آ گئے؟''

''کیوں...... خطرہ تھا؟''

''اب تو لفظ خطرہ بھی میرے لئے بے بنیاد ہو گیا ہے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''چائے لا یار! فضول بکواس مت کر۔'' طالوت نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا اور میں نے چائے کی پیالی اُسے پیش کر دی۔ میں نے اور طالوت نے چائے وغیرہ پی اور پھر ہم آرام سے بیٹھ گئے۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم سو گئے تھے۔ میں نے سوچا، کچھ کام ہی کر ڈالوں۔''

''اوہ...... تو کچھ کیا؟''

''بہت کچھ۔''

''خوب۔'' میں نے دلچسپی سے کہا اور طالوت نے کرسی کی پشت سے ٹِک کر آنکھیں بند کر لیں میں سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں نے خان زورات کا پتہ لگا لیا ہے۔''

''اوہ......کہاں ہے وہ؟''
''گلبار کی شکار گاہ کے ایک خفیہ قید خانے میں۔''
''گویا امیر گلبار......؟''
''سو فیصدی ثبوت مل گیا۔''
''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کس حالت میں ہے؟''
''امیر گلبار اس سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہے، اس لئے اس نے خان کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی۔''
''تمہاری اس سے ملاقات ہوئی؟''
''ہاں۔''
''گویا بہت کچھ کر آئے ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ یونہی سمجھ لو۔''
''خان کو علم ہے کہ امیر گلبار نے ہی اسے اغوا کیا ہے؟''
''یقیناً۔ اسے سب کچھ علم ہے۔ لیکن وہ واقعی نیک انسان ہے۔ بالکل بے بس ہے۔ سازشی ذہن نہیں رکھتا۔''
''امیر گلبار کا مقصد؟''
''یہ خان زورات کو بھی نہیں معلوم۔''
''تم نے معلوم کیا؟''
''ہاں۔'' طالوت مختصراً بولا۔
''تو پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''وہی اقتدار، یار!.......اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟'' طالوت نے بھی برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہیں تمہاری دنیا کے انسان۔ ہر شخص دولت اور اقتدار کے لئے جی رہا ہے۔''
''تو مجھ سے کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیا کروں؟'' میں نے چڑ کر کہا۔
طالوت میری شکل دیکھتا رہا، پھر ہنس پڑا۔ ''ناراض ہو گئے میری جان!'' اس نے کہا۔
''تم مجھے میری دنیا کا طعنہ نہ دیا کرو۔''
''ناراض ہو گئے تو معافی چاہتا ہوں۔ لیکن ان لوگوں پر بڑا غصہ آتا ہے۔ انسانی زندگی، اخلاق، محبت، کسی چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ امیر گلبار صرف اقتدار کے لئے کتنا برا کھیل، کھیل رہا ہے۔ چھی.....''
''کھیل کیا ہے؟''
''اس کی تفصیل ابھی پردۂ راز میں ہے۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ بہت جلد سارے راز کھل جائیں گے۔ بہت جلد سارے برائی سے پاک ہو جائیں گے۔'' طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔
''پروگرام کیا ہے اب؟''
''میرا خیال ہے، کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے ہم یہاں قیدی بھی نہیں ہیں۔ محل میں گھوم

پھر سکتے ہیں۔ آؤ، باہر کی سیر کریں۔''

اور میں تیار ہو گیا۔ ہم دونوں مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر باغ میں پہنچ گئے۔ اور اتفاقیہ طور پر ہی ان محافظوں سے مڈبھیڑ ہو گئی، جنہیں ہم باغ میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر اُچھل پڑے۔

''پکڑنا...... لینا...... پھر آ گئے......'' وہ چیخے اور ہماری طرف دوڑے۔ دونوں نے ہمیں پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے؟'' طالوت سخت لہجے میں بولا۔

''اب کے نہیں بھاگ سکو گے بیٹا!'' ایک محافظ بولا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ چھوڑو ہاتھ۔'' طالوت نے جھٹکا دیا اور محافظ اوندھے منہ جا پڑا۔ لیکن گرتے گرتے بھی وہ چیخا تھا۔

''بھاگنے...... بھاگنے نہ پائے۔''

بہت سے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ ان میں وہ بھی تھے، جنہیں امیر گلبار نے ہماری خدمت کا حکم دیا تھا۔ ہمیں ضرورت نہ پڑی۔ وہ خود ہی ان سے بھڑ گئے۔

''کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ یہ امیر کے مہمان ہیں۔''

''امیر کے مہمان؟'' وہ دونوں سہم گئے۔

''ہاں...... قابلِ احترام مہمان۔''

''لل...... لیکن یہ تو وہی ہیں جو...... بیت الخلا سے بھاگ گئے تھے۔''

''پاگل ہو تم دونوں۔ دونوں معافی مانگو ان سے۔'' اور وہ ہمارے سامنے گڑگڑانے لگے۔ طالوت مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

''کوئی نہ کوئی حرکت ایسی ہی کر دیتے ہو کہ بس۔''

''انہی حرکتوں میں تو زندگی ہے۔'' طالوت نے کہا اور ہم باغ کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔

طالوت پر نہ جانے کیا بھوت سوار تھا، ساری دنیا سے لاپروا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں محل تک محدود تھے۔ کھا رہے تھے، پی رہے تھے، عیش کر رہے تھے۔ کوئی کام نہ ہوتا۔ طالوت نت نئی حرکتیں کرتا رہتا۔ محل کے محافظ اس سے خوف زدہ رہنے لگے تھے۔ تین دن گزر گئے تھے۔ اس دوران ایک مختصر سی ملاقات امیر گلبار کے لڑکے محراب خان سے ہوئی تھی۔ ایک دفعہ لڑکی کو دُور سے دیکھا تھا۔ دونوں خوب صورت تھے۔ ان سے گھلنے ملنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔

تیسری رات، امیر گلبار کے ہاں بڑی چہل پہل تھی۔ بہت سے لوگ نظر آئے تھے۔ بڑی پُراسراری کیفیات تھیں۔ رات کو امیر گلبار نے ہمیں بھی بلا بھیجا۔

جس ہال میں ہم پہنچے، وہاں اجنبی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر گلبار بھی موجود تھا۔

''میرے نئے دوست۔'' امیر گلبار نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ''انہیں خانم نے میرے قتل کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن اب یہ میرے دوست ہیں۔''

''کیا یہ جلسۂ عام میں گواہی دیں گے؟''

''یہ سوال ہم ابھی ان سے کریں گے۔'' امیر گلبار نے کہا اور پھر میری طرف رُخ کر کے بولا۔

''دوستو! میں نے تم سے جس مدد کی درخواست کی تھی، اس کا وقت آ گیا ہے۔ کل شہر کے سب سے بڑے چوک میں، میں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا ہے۔ یہاں سارے زورات کے عوام پہنچیں گے۔ کل کا دن فیصلے کا ہو گا۔ عوام فیصلہ کر لیں گے کہ زورات کی حکمران خانم رہے گی یا کوئی اور ہو گا۔ چنانچہ خانم کے خلاف ہم نے بے شمار ثبوت اکٹھے کئے ہیں، ان میں تمہاری گواہی بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔''

''ہم ضرور گواہی دیں گے امیر!'' طالوت نے پُر جوش انداز میں کہا۔

''میں نے جلسۂ عام میں خانم، شکیل اور عرشیلا کو بھی طلب کیا ہے۔ یوں سمجھو، یہ ایک عوامی عدالت ہے۔ اور ان لوگوں کو اس میں شریک ہونا پڑے گا۔ کل دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

''ہم تمہارے ساتھ ہیں امیر گلبار!''

''شکریہ دوستو! میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تم سب کو اس تعاون کا صلہ دوں گا۔'' امیر گلبار نے کہا اور پھر کافی دیر تک وہ سب کل کے جلسے کی تیاریوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ خاصی رات گئے یہ نشست برخاست ہوئی تھی۔ میں اور طالوت اپنی رہائش گاہ پر چل پڑے۔

میرے ذہن میں سخت بے چینی تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے طالوت کی ٹانگ پکڑی۔

''یہ سب کیا ہے طالوت؟ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اس بار تم عجیب حرکتیں کر رہے ہو۔''

''امیر گلبار نے کہا تھا، دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تو میری جان! دودھ، دودھ رہے گا اور پانی، پانی۔''

''مگر تم نے طے کیا کیا ہے؟''

''اس بار خاموش ہو کر تماشا دیکھو تو بہتر ہے۔'' طالوت نے کہا اور میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر میں نے جھلّائے ہوئے انداز میں گردن ہلائی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تماشا ہی دیکھوں گا۔''

دوسرے دن ہم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ تا حدِ نگاہ ایک عظیم الشان میدان پھیلا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ سارا زورات اُمڈ آیا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی، سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ہم نے اس عظیم مجمع کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ میں طالوت سے ابھی تک ناراض تھا اور میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ہم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اس عظیم الشان اسٹیج کے عقب میں پہنچ گئے، جہاں امیر گلبار نے خانم کے خلاف دوسرے گواہوں کو بٹھایا تھا۔ بڑا زبردست انتظام تھا۔ خود امیر گلبار کے اپنے محافظ بھی موجود تھے۔

ایک لمبی گھوڑا گاڑی میں خانم آئی۔ دوسری میں عرشیلا اور شکیل ساتھ آئے تھے۔ چونکہ یہاں کے اصول کے مطابق یہ عوامی عدالت تھی، اس لئے سب کو بلا چون و چرا آنا پڑا تھا۔

اور پھر تمام لوگ جمع ہو گئے۔ خانم کے چہرے پر سیاہ رنگ کی باریک نقاب تھی۔ جس میں وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ عرشیلا بے نقاب تھی، شکیل کا چہرہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی خوفناک نظر آ رہا تھا۔ یہ سب اسٹیج کے اوپر پہنچ گئے۔ تب امیر گلبار بھی وہاں پہنچ گیا امیر گلبار نے ایک اناؤنسر کو اشارہ کیا اور وہ اسٹیج پر آ گیا۔

''سرحد کے اصول کے مطابق وطن کا کوئی معزز شخص، موجودہ حکومت کے سلسلے میں یا کسی بڑے عوامی مسئلے پر، عوامی عدالت طلب کر سکتا ہے۔ امیر گلبار نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے آج عوامی عدالت طلب کی ہے۔ میرے دوستو! زورات میں جو کچھ ہو رہا ہے، کون ہے جو اس سے واقف نہیں ہے۔ ہمارا وطن سازشوں کی سرزمین نہیں بننا چاہئے۔ حکومت ناکارہ ہے تو اسے بدل دو۔ سازشیوں کو کچل دو۔ اسی فیصلے کے لئے آج آپ کو جمع کیا گیا ہے۔''

''ہم ہنگاموں کو ختم کر دیں گے۔ ہم سازشیوں کو کچل دیں گے۔'' عوام کی آواز اُبھری اور اناؤنسر بیٹھ گیا۔ تب امیر گلبار اُٹھا اور عوام کے سامنے آ گیا۔

''بھائیو! تمہیں معلوم ہے کہ گلبار ہمیشہ سے زورات کی عظمت کا نشان رہا ہے۔ ہم نے حکومت نہیں کی۔ ہم نے حکومت نہیں چاہی۔ لیکن زورات کو جب بھی ہماری ضرورت پڑی، ہم پیش پیش رہے۔ ہم نے ہمیشہ اپنا فرض پورا کیا۔ آج جب زورات ایک بار پھر بحران کا شکار ہے تو ہم اپنا فرض پورا کرنے نکل آئے ہیں۔ میرے دوستو! حالات کافی حد تک آپ کے سامنے ہیں۔ سازشیوں کے چہرے ممکن ہے، آپ میں سے کچھ کی نگاہ میں ہوں۔ لیکن عوامی عدالت میں ہمیشہ سچ بولا جاتا ہے۔ خواہ وہ بادشاہِ وقت کے خلاف ہی کیوں نہ جاتا ہو۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' عوام کی آواز سنائی دی۔

''شکریہ میرے بھائیو!'' امیر گلبار کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ طالوت، خانم کے پاس پہنچ گیا تھا، جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے طالوت کی شکل دیکھی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

''پانسہ پلٹ نمبر ایک آپ سے مخاطب ہے۔'' طالوت بولا۔

''میرا...... میرا مذاق اُڑانے آ گئے ہو؟'' خانم کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''نہیں خانم!...... پانسہ پلٹنے۔ ابھی آپ تماشا دیکھیں گی۔'' طالوت نے کہا اور مسکراتا ہوا اپنی جگہ آ بیٹھا۔ میری سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا تھا کہ طالوت نے کون سی ترکیب سوچی تھی۔ ہاں، اس بات کو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بہرحال پانسہ پلٹ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک داؤ مارے گا اور سب چت ہو جائیں گے۔ لیکن وہ داؤ کیا ہو گا؟ یہ ابھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''تو میرے دوستو! میں کھلے دل سے ان معاملات کی ذمہ داری خانم آف زورات پر ڈالتا ہوں۔ بوڑھے خان زورات کی نوجوان بیوی، جو ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ جو ہماری ملکہ ضرور ہے۔ لیکن عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے۔ ایک نوجوان عورت، جو بوڑھے خاوند کو پسند نہیں کرتی۔ میں نے اتنا بڑا الزام بغیر ثبوت کے نہیں لگایا۔ میں آپ کے سامنے ثبوت پیش کر دوں گا، خانم نے خان زورات کو اغوا کرا لیا۔ تاکہ خان زورات کے بھتیجے شکیل کے ساتھ عیش کر سکے۔ میں شکیل کو طلب کرتا ہوں۔ وہ میرے بیان کی تصدیق کرے۔''

شکیل کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

لیکن شکیل سے قبل طالوت اُٹھ کر امیر گلبار کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے جھک کر امیر گلبار کے کان میں کچھ کہا اور امیر گلبار مسکرانے لگا۔ طالوت اُس کے سامنے ہی کھڑا ہو گیا۔

امیر گلبار مجمع کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پھر اُس نے اس انداز میں قہقہہ لگایا، جیسے کوئی بہت ہی مزے

کی بات ہوئی ہو۔ اس کے بعد اُس نے دوبارہ مجمع کو مخاطب کیا۔
''میرے دوستو! میرے ایک عزیز ترین دوست نے فرمائش کی ہے کہ اب میں جو کچھ کہوں، سچ کہوں۔ بلکہ جو کچھ جھوٹ بول چکا ہوں، اس کی خود ہی تردید کر دوں۔ تو میرے عزیز بھائیو! اب میں سچ بول رہا ہوں۔ اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ جو کہوں گا، سچ کہوں گا۔ بات یہ ہے کہ خانم آف زورات کا تعلق اس خاندان سے ہے، جس سے ہماری پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ خان زورات نے جس وقت دوسری شادی کا فیصلہ کیا، اور اس خاندان کو منتخب کیا، میں اسی وقت اس کا مخالف تھا۔ میرے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔
لیکن مجبوری تھی دوستو! میرے ہاں کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی، جس کی شادی میں خان زورات سے کر دیتا۔ میں مجبور تھا۔ لیکن میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میرے دل میں سب سے بڑی جلن یہ تھی کہ اب اس خاندان کی اولاد زورات کی حکمراں ہو گی۔ اور میں اسی وقت سے سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ خانم کو خان زورات کی نگاہوں سے گرا دوں۔ لیکن بدقسمتی سے کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن کب تک؟...... میں مسلسل کوشش میں مصروف تھا۔
اور بالآخر ایک موقع ہاتھ آ ہی گیا۔ خان زورات کا بھتیجا میری لڑکی سے عشق کرنے لگا۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ میرا بیٹا اُسے قتل کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میں نے اس کی جان بچائی اور اسے پیشکش کی کہ وہ خانم آف زورات کو بدنام کرنے میں میرا ساتھ دے۔ میں کوشش کر کے اُسے والیٔ زورات بنا دوں گا اور اس کی شادی اپنی بیٹی سے کر دوں گا۔ شکیل تیار ہو گیا اور ہم نے خانم کو بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم کو زوردار بنانے کے لئے میں نے شکیل کی لاعلمی میں خان زورات کو اغوا کر لیا اور اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ شکیل اس بات سے ناراض ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے خان زورات کے اغوا کی خبر اس سے بھی چھپائے رکھی۔ اور میرے دوستو! پھر میں نے کرائے پر کچھ ایسے لوگ بلوائے جو زورات میں ہنگامے کریں۔ اُن کے سپرد شکیل کا قتل بھی تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اصل سکیم کچھ اور تھی۔ میں شکیل کو بھی دھوکے میں رکھ کر قتل کرا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میری اصل مددگار، خان زورات کی لڑکی عرشیلا تھی، جو میری دستِ راست تھی۔ عرشیلا، خانم سے بے پناہ نفرت کرتی ہے۔ اور اسی نفرت کے تحت وہ میرے لئے کام کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ میرا پروگرام تھا کہ شکیل، خان زورات اور خانم کی موت کے بعد عرشیلا ہی اس خاندان کی واحد حکمراں بنے۔ چنانچہ میں محراب خان سے اس کی شادی کر دوں گا اور اس طرح حکومت میرے خاندان میں آ جائے گی۔ یہ جامع پروگرام میرے ذہن کی پیداوار ہے۔ اور یوں سمجھو کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے دوست کی خواہش ہے کہ میں سچ بولوں۔ سو میں نے حقیقت تمہارے سامنے پیش کر دی۔'' امیر گلبار خاموش ہو گیا۔
عوام پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی اور میں سحر زدہ انداز میں طالوت کو دیکھ رہا تھا۔ تو یہ تھا طالوت کا پروگرام۔ خانم، شکیل، عرشیلا ہر ایک سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور امیر گلبار فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔
''اس کا مقصد ہے امیر گلبار! سازش تم نے کی ہے؟'' ایک سرحدی سردار کھڑے ہو کر بولا۔

"ہاں۔ تمہارا خیال درست ہے۔" امیر گلبار نے گردن جھکا کر کہا۔
"تم نے زورات کے خلاف سازش کی ہے؟"
"بالکل۔"
"تم نے خان زورات کو اغوا کیا ہے؟"
"ہاں، میرے ساتھیوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"
"خان زورات زندہ ہے؟"
"ہاں...... میں نے اُسے اس وقت تک کے لئے زندہ رکھا ہے، جب تک میرا بیٹا مکمل طور پر حکمران نہ بن جائے۔ کچھ ضروری باتوں میں اُس کی ضرورت پڑے گی، اس کے بعد میں اُسے قتل کرا دوں گا۔"
"ہمارے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے؟...... خان زورات کہاں ہے؟"
"میرے خصوصی قید خانے میں۔"
"تم نے زورات میں ہنگامے کرائے ہیں۔ تم نے ہماری خانم کو بدنام کیا ہے۔ تمہارا قتل واجب ہے۔" سردار طیش میں آ کر بولا۔
"امیر گلبار کو قتل کر دو...... سازشیوں کو قتل کر دو۔" عوام میں غلغلہ اُٹھا۔ اور پھر ایک خوفناک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بے شمار گولیاں امیر گلبار کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ عرشیلا نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن شکیل، عرشیلا دونوں میں سے کوئی نہ بچ سکا۔ گولیوں نے اُنہیں چھلنی کر دیا تھا۔ عوام بگڑ گئے تھے۔ ایک بہت بڑے گروہ نے خانم کو گھیر لیا تھا۔
خانم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ تب طالوت، خانم کے پاس پہنچ گیا۔
"آپ کی خواہش پوری ہو گئی ہے خانم آف زورات! خان زورات سے ملیے۔" طالوت نے کہا اور خانم چونک پڑی۔
اُس کے عقب میں خان زورات کھڑے تھے اور اس طرح حیرت ناک انداز میں چاروں طرف دیکھ رہے تھے، جیسے اپنی یہاں موجودگی پر سخت حیران ہوں۔ خانم نے محبت بھرے انداز میں ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی خان زورات کو دیکھ لیا تھا۔ اور خان زورات کے نام کے نعرے لگنے لگے۔ طالوت واپسی پر میرے پاس پہنچ گیا۔
"بھائی خربوز......!" اُس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ "اب ہمارا یہاں کیا کام ہے؟"
"کک...... کیا مطلب؟"
"چلیں۔"
"کہاں؟" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔
"ابے یہاں سے نکلو۔ کوئی گولی بھٹک کر ادھر آ گئی تو خوامخواہ سوراخ ہو جائے گا۔" وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے بولا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس مجمع سے نکل آئے۔ طالوت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔
"جا کہاں رہے ہو؟" میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

''یہاں کا کام ختم۔اب یہاں کیا رکھا ہے۔''

''مگر چل کہاں رہے ہو؟''

''ان پہاڑوں سے نکل چلو۔آبادی میں چلو۔ یہاں سے طبیعت اُکتا گئی ہے۔''

''میں خود بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔''

''مگر چلیں کہاں؟''

''واپس تو نہیں چلیں گے۔آؤ، پہاڑوں کے اس پار چلیں۔ دیکھیں،اس سمت کی دنیا کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' طالوت نے مجھ سے اتفاق کیا اور پھر دائیں طرف دیکھ کر بولا۔''راسم......!''

''آقا!'' راسم سامنے آگیا۔

''گھوڑوں کی ضرورت ہے۔''

''حاضر کرتا ہوں آقا!''

اور یہ کام راسم کے لئے کیا مشکل تھا۔تھوڑی دیر کے بعد ہم گھوڑوں پر سفر کر رہے تھے۔ ہمارا رخ پہاڑوں کی طرف تھا۔

سفر خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ گھوڑے ظاہر ہے، عام نہ تھے۔ پہاڑوں پر چڑھنے میں اُنہیں کوئی دقت نہ ہوئی اور ہم دوسری طرف اُتر گئے۔ پہاڑوں کے دوسری طرف ہم نے بے شمار فوجیوں کو دیکھا۔ یہ شاید سرحد کے نگراں تھے۔

''غالباً ہم پڑوسی ملک کی سرحد پر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر......؟''

''یہ لوگ آسانی سے ہمیں دوسری طرف نہ جانے دیں گے۔''

''مشکل سے چلیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''مگر سنوتو...... سنوتو........ کیوں نہ ہم چھپ کر چلیں۔''

''چور ہیں کیا؟....... کیوں چھپ کر چلیں؟ .... چلتے رہو۔'' طالوت نے بدستور ضدی انداز میں کہا۔ گھوڑے تیر کی طرح فوجیوں کی طرف جا رہے تھے۔ فوجیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اور پھر وہ ہمیں ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کرنے لگے۔

لیکن گھوڑوں کی رفتار سست نہیں ہوئی اور وہ فوجیوں کے سروں پر پہنچ گئے۔ تب فوجیوں نے بندوقیں تان لیں اور گھوڑوں کے راستے میں بہت سے فوجی آگئے۔ مجبوراً گھوڑوں کو رُکنا پڑا تھا۔

فوجیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ ہمیں خونخوار نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

''نیچے اُتر آؤ۔ ورنہ گولی ماردی جائے گی۔'' ایک فوجی گرج کر بولا۔

''اُترو بھئی۔ ورنہ گولی ماردی جائے گی۔'' طالوت نے میری طرف دیکھا اور میں جلدی سے نیچے اُتر آیا۔ اس جن کی کیا بات تھی۔ میں تو بہر حال انسان تھا۔ طالوت بھی نیچے اُتر آیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے فوجیوں سے پوچھا۔

''کہاں منہ اُٹھائے چلے آرہے ہو؟ روکنے سے کیوں نہیں رُکے؟..... تمہیں پتہ نہیں کہ یہ دوسرے ملک کی سرحد ہے۔'' ایک فوجی نے سامنے آکر کہا۔

''ہم درویش لوگ ہیں بابا! ہمارے لئے کوئی سرحد متعین نہیں ہوتی۔ ہمیں جانے دو۔''

''تم درویش ہو؟'' فوجی مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''ہاں۔ ماڈرن درویش۔'' طالوت آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے بولا۔

''تب فکر مت کرو۔ ہم تمہیں انتہائی ماڈرن قید خانے میں ڈال دیں گے۔ نہایت ماڈرن طریقے سے

تمہاری مرمت کریں گے۔ ''چلو...... لے چلو انہیں۔'' ایک افسر نے کہا۔
''کیوں اپنی گردن پر عذاب لیتا ہے بچہ! درویشوں کو تنگ مت کرو، ہمیں جانے دو۔ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' طالوت نے کہا۔
''لے چلو۔ یہ دوسرے ملک کے جاسوس معلوم ہوتے ہیں۔''
''ٹھہر جا۔ تیری اس حکومت کا کیا نام ہے؟''
''یہ گووند اس کپور کی راجدھانی ہے۔ گووند اس کپور۔ شیروں کا شیر۔ جس کی ہیبت سے دُور دُور کی ریاستیں کانپتی ہیں۔''
''ہم اس شیروں کے شیر کو گیدڑوں کا گیدڑ بنا دیں گے۔ ہم درویش ہیں۔''
''لے چلو۔ یہ مہاراج کا اپمان کر رہا ہے۔ مسلمان معلوم ہوتا ہے۔''
''سائیں خربوز!'' طالوت نے مجھے مخاطب کیا۔
''سائیں تربوز!'' میں نے جواب دیا۔
''کرامات دیکھے بغیر باز نہ آئیں گے۔''
''ایسا ہی لگتا ہے؟''
''پھر دکھاؤ کرامات۔''
''تم خود دکھا دو سائیں تربوز!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''چلو میں ہی دکھا دیتا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور پھر اس نے ایک اُنگلی اُٹھائی اور فوجی افسر زمین سے اُٹھتا چلا گیا۔ وہ خلا میں چار پانچ فٹ اوپر معلق ہو گیا۔ اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ خلا میں وہ زور زور سے اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ تب طالوت نے دوسرے فوجی کی طرف انگلی اٹھائی اور اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اور اس کے بعد تو فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔
دس بارہ فوجی خلا میں معلق تھے۔
''ہمیں نیچے اُتارو۔ ہمیں نیچے اُتارو۔'' فوجی چیخ رہے تھے۔
''یہ کام میرا بھائی سائیں خربوز کرتا ہے۔'' طالوت میری طرف اشارہ کر کے بولا۔
''بھگوان کے لئے ہمیں نیچے اُتار دو۔''
''سائیں خربوز!''
''کیا خیال ہے بھائی تربوز؟''
''لٹکا رہنے دو۔ آؤ چلیں۔'' طالوت نے کہا اور لٹکے ہوئے آدمی چیخنے لگے۔
''اُتار دو...... بھگوان کے لئے اُتار دو۔ ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔'' فوجی گڑگڑانے لگے۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی اور طالوت نے تمسخرانہ انداز میں انہیں دیکھا۔
''سائیں خربوز!'' اُس نے مجھے پکارا۔
''ابھی نہیں...... ابھی نہیں۔ یہاں سے دُور نکل جانے کے بعد ان کی رسیاں کاٹ دیں گے۔'' میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے، آؤ۔'' طالوت آگے بڑھ گیا۔ لٹکتے ہوئے فوجی دیکھتے رہ گئے تھے۔ ''کیا خیال ہے،

اس گووندااس کپورشیروں کے شیر کی راجدھانی کے بارے میں؟"
"دیکھے لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے؟"
"نام کیسا ہے؟"
"ہندوریاست معلوم ہوتی ہے۔" میں نے کہا اور طالوت گردن ہلانے لگا۔ ہمیں کافی فاصلہ طے کرنا پڑا تھا، تب کہیں جا کر کسی بستی کے نشانات نظر آئے۔ دُور کہیں گھنٹہ بج رہا تھا۔ ناقوس کی صدائیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ طالوت غور سے یہ آوازیں سن رہا تھا۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"یہ مختلف المذاہب لوگ ہوتے ہیں نا؟"
"ہاں۔"
"گڑبڑ ہوتے ہیں کچھ۔"
"کافی......لیکن یہاں بھی تخصیص ہے۔"
"آؤ......آؤ دیکھ لیں گے۔ میں ان کی عبادت گاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"یہ آوازیں وہیں سے آ رہی ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔
"خوب......خوب......تو آؤ جلدی۔" طالوت نے کہا اور ہم تیز رفتاری سے ان آوازوں کی سمت بڑھنے لگے۔ تھوڑی دُور ہمیں ایک مندر کا عکس نظر آیا اور میں نے طالوت کو اشارہ کیا۔ طالوت گردن ہلانے لگا تھا۔
"ایک منٹ طالوت!" میں نے کہا۔
"کیوں؟"
"لباس۔ ہم مخصوص لباسوں کے بغیر ان کی عبادت گاہ میں نہیں داخل ہو سکیں گے۔"
"کون روکے گا؟" طالوت نے اکڑ کر کہا۔
"چھپ کر چلو تو دوسری بات ہے۔"
"آؤ......چھپ کر ہی چلتے ہیں۔" طالوت نے کہا۔ پھر میں نے شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھا اور طالوت نے نگاہوں سے غائب ہو جانے کا عمل کیا اور ہم دونوں مندر کے دروازوں کی طرف چل پڑے۔ مندر کے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک ہیبت ناک بت پر نگاہ پڑی اور طالوت ٹھٹک گیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"ان لوگوں کا کوئی دیوتا۔"
"پتھر کا ہے نا؟"
"ہاں۔ میں نے جواب دیا اور طالوت پُر خیال انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچتی دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچ گئے، جہاں پوجا ہو رہی تھی۔ طالوت دلچسپی سے منہ پھاڑے پنڈتوں کو دیکھ رہا تھا، جو موٹے تازے اور ننگ دھڑنگ تھے۔ اُن کے سر گھٹے ہوئے تھے اور درمیان میں لمبی لمبی چوٹیاں لٹک رہی تھیں۔
"عارف......!" طالوت شرارت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔
"ہوں۔"

''یہ کیا شے ہیں؟''
''پنڈت کہلاتے ہیں۔ مندروں کے پجاری ہوتے ہیں۔ بڑے عیش ہیں ان لوگوں کے۔''
''خوب...... بڑی عمدہ چیزیں ہیں یہ تو۔ ہم انہیں اور عیش کرائیں گے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'آ گئی بے چاروں کی شامت' میں نے دل میں سوچا۔ بہر حال، طالوت کی اس بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ''یہ بتوں کو پوجتے ہیں نا؟''
''ہاں۔''
''ان بتوں کے بارے میں ان کے بڑے بڑے عقیدے ہوں گے۔''
''یقیناً۔''
''بہت ہی خوب۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا غالباً اُس کے شریر ذہن میں کوئی خاص منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔ ''تو پھر آج کا دن انہی کے ساتھ گزارا جائے، پھر کہیں چلیں گے۔''
''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ظاہر ہے، مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا وہی تھا جو طالوت چاہتا تھا۔ چنانچہ ہم دیر تک ان کی پوجا دیکھتے رہے۔ لوگ مٹھائیاں، پھل اور نہ جانے کیا کیا لا رہے تھے اور دیوی، دیوتاؤں کے چرنوں پر نچھاور کر رہے تھے۔ پنڈت اُن کی پیشانیوں پر چندن اور صندل لگا رہے تھے۔ بخور دانوں میں عجیب عجیب قسم کے دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔
''بڑی انوکھی مخلوق ہے۔ کسی کا وزن دو ڈھائی من سے کم نہیں ہے۔''
''مٹھائیوں کے ڈھیر دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔
''ظاہر ہے۔ یہ سب دیوتاؤں کے پجاریوں کے لئے ہوں گے۔''
''تو اور کس کام آئیں گے؟''
''آج میں ان سب کو خوب مٹھائی کھلاؤں گا۔ تم مجھے ان کے عقیدوں کے بارے میں بتاؤ۔'' اور مجھے جس قدر معلوم تھا، میں نے طالوت کو بتا دیا۔
''پوجا دونوں وقت ہوتی ہے؟''
''ہاں۔''
''تب پھر آؤ...... شام کی پوجا میں شریک ہوں گے۔ اس وقت تک یہاں کے دوسرے لوازمات بھی دیکھ لیں گے۔'' طالوت نے کہا اور ہم ہال کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں ایک راہداری میں چھوٹے چھوٹے کمروں کے دروازے تھے۔ ان کمروں میں پنڈے رہتے تھے۔ پنڈے ننگ دھڑنگ چھوٹی سی دھوتی باندھے جنیئو ڈالے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ہم انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر مندر کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ ایک بڑے ہال کے دروازے سے گزرتے ہی ہم ٹھٹک گئے۔ بے حد حسین وجمیل عورتوں کا جمگھٹ تھا، جو ایک دوسرے سے چہلیں کر رہی تھیں۔
''عارف!'' طالوت ہونقوں کے سے انداز میں بولا۔
''ہوں۔'' میں بھی دنیا کے اس منتخب حُسن کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔
''اتنی ساری...... مگر یہ کون ہیں؟''
''پجارنیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہائے...... یہ کس کام آتی ہیں؟''
''بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں ان مندروں میں۔ یہ دیوکنیائیں ہیں، دیوی دیوتاؤں کے سامنے رقص کرتی ہیں۔اور......اور......''
''اور کیا؟......جلدی بتاؤ۔''
''یہ تو بڑے پجاری ہی بتا سکتے ہیں۔''
''بڑے پجاری بھی ہوتے ہیں؟'' طالوت کراہ کر بولا۔
''بہت بڑے ہوتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔
''دل تڑپ اُٹھا ہے خدا کی قسم......ان سے ملاقات ضرور کریں گے۔اور عارف! یہ تو...... یہ تو جائز ہیں نا؟''
''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا بھائی!''
''دیکھیں گے۔ پہلے یہاں کے رنگ دیکھیں گے۔ کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم بھی چند روز کے لئے پنڈت بن جائیں......مگر یار! یہ حلیہ......خود کو مسخرے معلوم ہوں گے۔''
''ہاں.....سادھو بننے کے لئے سب کچھ کرنا ہوگا طالوت!''
''دیکھیں گے یار! خول چڑھالیں گے سروں پر۔ اللہ مالک ہے۔افوہ......اس لڑکی کو دیکھو، کیسی اُداس بیٹھی ہے۔'' طالوت نے ایک انتہائی حسین اور نوخیز لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور میں اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔
کنول سا چہرہ.....انتہائی پُرکشش آنکھیں.... چہرے پر اُداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوسری لڑکیاں اُسے چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آرہی تھی۔
''بہت حسین ہے۔'' میں نے سحر زدہ سے انداز میں کہا۔
''واقعی بہت حسین ہے۔'' طالوت بھی بولا۔
''آؤ......دوسری جگہیں دیکھیں۔'' میں نے کہا اور ہم اس ہال سے بھی نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے اندر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مندر کے عقب میں ایک خوب صورت اور کافی بڑا تالاب تھا۔ اس کے کنارے ہی بڑے پجاری کی عالیشان رہائش گاہ تھی۔
''اب اپنا ٹھکانہ بتاؤ'' طالوت نے کہا۔
''یہاں کا ماحول تو بہت گھٹا گھٹا ہے۔''
''پھر...... یہاں کے حالات جانے بغیر تو یہاں سے جانا بھی مناسب نہیں ہے۔''
''آؤ......چھت پر چلیں۔'' میں نے کہا اور ہم اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گئے، جنہیں ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ چھت صاف ستھری تھی۔ خوب کھلی اور عمدہ جگہ تھی۔ طالوت کو بھی اور مجھے بھی وہ جگہ بہت پسند آئی اور ہم نے وہیں قیام کا فیصلہ کرلیا۔ طالوت ایک جگہ بیٹھ کر مسکرانے لگا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں شرارت مرتب ہورہی ہے۔
کافی دیر ہم نے وہاں گزاری۔ اور پھر طالوت بولا۔ ''کیا پوجا ختم ہوگئی ہوگی؟''
''شاید۔''

''تو پھر اب پجاری مٹھائی تقسیم کر رہے ہوں گے۔''
''دیکھیں۔'' میں نے کہا۔
''آؤ......'' طالوت کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں نیچے اُتر کر اُس بڑے ہال کی طرف چل پڑے۔ بالکل ٹھیک وقت پر آئے تھے۔ چار پنڈے، دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں رکھے ہوئے مٹھائیوں کے دونے ایک جگہ جمع کر رہے تھے۔ اور مٹھائی اور پھلوں کا ایک بڑا انبار لگا ہوا تھا۔
طالوت نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر اس نے ایک آنکھ دبائی اور ایک بہت بڑے بت کے پیچھے چلا گیا۔ پنڈے مٹھائی جمع کر چکے تھے اور اب تقسیم شروع ہونے والی تھی۔
تقسیم کی غرض سے پنڈے ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ چار پنڈے مٹھائی کے خالی دونے ان میں تقسیم کرنے لگے۔ اور پھر اس کے بعد وہ مٹھائی کی طرف بڑھے۔ لیکن جونہی پنڈوں نے مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا، اچانک ایک خوفناک پھنکار سنائی دی اور ایک انتہائی چوڑے پھن والے سیاہ ناگ نے مٹھائی کے دونوں سے سر نکال لیا۔
''ہا...... ہا......'' پنڈوں کی دہاڑیں سنائی دیں اور وہ اُچھل کر بھاگے۔ پھنکار دوسرے پنڈوں نے بھی سن لی تھی۔
''ہرے رام...... ہرے رام...... ناگ...... ناگ دیوتا......'' وہ بھی چیختے ہوئے بھاگے اور اس بری طرح بھاگے کہ مجھے بھی ان سے بچنا مشکل ہو گیا۔ میں بری طرح دیوار سے چپک گیا تھا۔
بہرحال ایک ایک پنڈا باہر بھاگ گیا۔ تب سیاہ ناگ مٹھائی کے دونوں کے درمیان سے نکلا اور بڑے بت کے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے لمحے طالوت باہر نکل آیا اور میرے نزدیک پہنچ گیا۔
''آؤ......اپنا حصہ وصول کر لیں۔ چھت پر چلیں گے۔ میرا خیال ہے، یہ پنڈے اب مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔'' میں ہنسنے لگا۔ اور پھر ہم نے عمدہ قسم کی مٹھائی اُٹھائی اور واپس چھت پر پہنچ گئے۔
نیچے پنڈا رے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اُس ہال میں جانے کی ہمت کسی میں نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن ہمیں کس کی پروا ہو سکتی تھی۔ ہم نے مزے سے مٹھائی کھائی اور پھر آرام کرنے لیٹ گئے۔
جس جگہ ہم لیٹے تھے، بڑی ہوا دار تھی۔ مٹھائی کھائی تھی، پیٹ وزنی ہو گیا تھا۔ نیند آ گئی۔ اور پھر اس وقت جاگے، جب خاصی رات ہو گئی تھی۔ کانوں میں ایک عجیب سی آواز آ رہی تھی۔ سازوں کی آواز۔
''عارف!'' طالوت نے میرا کندھا ہلایا۔
''جاگ رہا ہوں یار!''
''یہ آوازیں کیسی ہیں؟''
''دیکھنا پڑے گا۔''
''آؤ یار! بڑی گہری نیند سوئے۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں بیکار لوگ اُٹھ گئے۔ اور پھر نیچے اُتر آئے۔ سازوں کی آواز پوجا کے ہال سے آ رہی تھی۔ بڑی دلکش آواز تھی۔ ہم اُس کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ اور پھر ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال کا منظر دیکھ کر ہم ساکت رہ گئے۔ بڑا پُرسحر منظر تھا۔ تھالیوں میں دیے روشن تھے۔ دیوکنیائیں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ انہوں نے بڑا حسین میک اپ کیا ہوا تھا۔ رنگین مخصوص ساخت کے لباسوں میں وہ بہت ہی حسین نظر آ رہی تھیں۔ چہروں پر جگمگاتے ہوئے ستارے

ایک عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ سازوں کی دُھن پر اُن کے پاؤں تھرک رہے تھے اور ہال کی فضا بڑی مست کُن تھی۔

طالوت نے دلچسپ نگاہوں سے یہ منظر دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہیں پنڈوں اور پجاریوں پر پڑیں، جو ڈھول کی تھاپ پر مست ہو رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ شاید وہ چرس پیئے ہوئے تھے۔ ویسے ہال کی فضا پاک صاف تھی۔ طالوت گردن ہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اُبھر رہی تھی۔ تب بڑا پجاری ہال میں داخل ہو گیا اور دیو کنیائیں جھک گئیں۔ ننگ دھڑنگ پجاری کئی من کی لاش تھا۔ فٹ بال کی طرح گول اور گھٹا ہوا سر، منڈی ہوئی مونچھیں، سر کے درمیان ایک لمبی سی چوٹی جھول رہی تھی۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ پھر وہ ایک سنگھاسن پر بیٹھ گیا اور سازوں کی دُھن تیز ہو گئی۔ تب دیو کنیائیں آگے آئیں اور انہوں نے رقص شروع کر دیا۔ سازوں کی لے سے اُن کے قدم ہم آہنگ ہو گئے اور پنڈے جھومنے لگے۔ بڑا پجاری پتھر کی طرح ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اُس کی خونی آنکھیں دیو کنیاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ اور پھر ایک پنڈے نے اس کے سامنے گھٹی ہوئی بھنگ کا پیالہ رکھ دیا۔ اُس نے پیالہ اُٹھایا اور اسے حلق کے راستے اپنی مٹکے نما توند میں انڈیل لیا۔ اس کے بعد اُس نے پیالہ رکھ دیا اور پھر دیو کنیاؤں کا رقص دیکھنے لگا۔

اچانک طالوت اپنی جگہ سے کھسکا۔ میں نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں دیو کنیاؤں کے پُرسحر رقص میں اسی طرح کھویا ہوا تھا۔ میں تو اس وقت چونکا، جب میں نے بڑے پجاری کے عقب میں طالوت کا چہرہ اُبھرتے دیکھا۔ پھر طالوت کے ہاتھ اُٹھے اور بڑے پجاری کی چوٹی اُس کی گرفت میں آ گئی۔

بڑے پجاری کی خوف ناک چنگھاڑ سازوں پر بھی بھاری تھی۔ وہ دونوں ہاتھ خلا میں مار رہا تھا۔ لیکن طالوت اُسے ایسی جھکائیاں دے رہا تھا کہ پجاری اُس کے بدن کو چھو نہ سکے۔

ساز بند ہو گئے۔ رقص رُک گیا۔ دیو کنیائیں اور پنڈت منہ پھاڑے اب بڑے پجاری کا رقص دیکھ رہے تھے، جو تکلیف سے کراہتا ہوا اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

"کیا ہو گیا؟...... کیا ہو گیا مہاراج؟" چند پجاری اُس کے گرد جمع ہو گئے۔

"چھوڑ دے...... ابے چھوڑ دے...... مر جاؤں گا...... ابے...... ہائے...... ہائے......" بڑا پجاری دہاڑ رہا تھا اور دوسرے لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا چھوڑ دے مہاراج؟" ایک پنڈے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ہائے...... ابے...... چھوڑ دے...... ہائے......" بڑے پجاری کے منہ سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل رہا تھا۔

"ہے رام۔ کیا ہو گیا پجاری جی کو؟" کسی نے کہا۔ لیکن ان کے قریب پہنچنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو لی تھی۔ تب طالوت نے زور سے پجاری کو ایک دھکا دیا اور اوندھے منہ گر پڑا۔

پنڈے اُچھل کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ پجاری جی خود اتنے وزنی تھے کہ گرنے کے بعد اُٹھنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ پنڈے اُن پر چھا گئے اور انہوں نے بڑی مشکل سے بڑے پجاری جی کو اُٹھایا۔ بڑے پجاری کے حواس قائم نہیں تھے۔ چوٹی کے نیچے کا سر کافی زور سے دُکھ رہا تھا۔ پنڈوں نے اُنہیں پھر سے سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ پجاری جی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔

دیوکنیائیں اب بھی حیران کھڑی تھیں اور بڑے پجاری کو دیکھ رہی تھیں۔ اور طالوت میرے پاس واپس پہنچ گیا۔

"کیا رنگ میں بھنگ ڈال دی یار! کتنا عمدہ رقص ہو رہا تھا۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یار! نہ جانے کیوں اُس کی مرغی کی دُم کی مانند اُٹھی ہوئی چوٹی دیکھ کر میرے ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی تھی۔ بس دل چاہا۔" طالوت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب پجاری جی اس قابل نہیں رہے کہ رقص و سرود سے لطف اندوز ہوں۔"

"ظاہر ہے۔"

"تو پھر یہاں رُکنے سے فائدہ؟"

"ارے ٹھہرو۔ ذرا تماشا دیکھیں۔" طالوت نے کسی کھلنڈرے لڑکے کے سے انداز میں کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ بہرحال، ہم وہاں کھڑے رہے۔ بڑے پجاری کے حواس کافی دیر تک درست نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر جب سر کی دُکھن کم ہوئی، دماغ قابو میں آیا تو وہ کسی ارنے بھینسے کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"کون تھا؟...... یہ کون تھا؟" وہ غرایا۔

"کہاں مہاراج؟...... کیا ہو گیا مہاراج؟...... کیسی طبیعت ہے؟" پنڈوں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"جلا دوں گا...... بھسم کر دوں گا ایک ایک کو۔ بتاؤ، کون تھا؟ کس نے میری چوٹی پکڑی تھی؟" بڑے پجاری غصے سے بے حال ہو رہے تھے۔

"چوٹی پکڑی تھی؟" ایک پجاری نے حیرت سے کہا۔ وہی بڑے پجاری کے زیادہ قریب تھا۔ چنانچہ بڑے پجاری نے اُس کی گردن پکڑ لی اور پنڈا تھر تھر کانپنے لگا۔

"شما...... شما کر دیں مہاراج!...... ہے بھگوان...... کیا ہو گیا مہاراج کو؟"

"مہاراج کے بچے!...... بتا، میری چوٹی کس نے پکڑی تھی؟"

"کسی نے نہیں مہاراج! ہم نے تو نہیں دیکھا۔" پنڈے نے کہا۔

"نہیں دیکھا۔" بڑے پجاری نے پنڈے کے گھٹے ہوئے سر پر ایک ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا اور پنڈا ہائے رام کہہ کر زمین پر گر پڑا۔ عجیب ہنگامہ ہو گیا تھا۔ دیوکنیائیں دروازے سے باہر نکل گئیں۔ اب صرف پنڈے رہ گئے تھے اور مہاراج، جو پنڈوں سے باز پرس کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، کسی نے کچھ دیکھا ہوتا تو بتاتا۔

"آؤ...... اب یہاں کا ماحول غیر دلکش ہو گیا ہے۔" طالوت نے کہا اور ہم دروازے سے باہر نکل آئے۔ "یار عارف!" طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔

"ہوں۔"

"وہ خوب صورت لڑکی ان لڑکیوں میں نظر نہیں آئی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"نہ جانے کیوں...... اس کی شکل بار بار نگاہوں میں اُبھر آتی ہے۔"

"بہت حسین ہے وہ؟"

"یہ بے تکے، بے ڈول پنڈے اور پنڈت اس کے ساتھ بھی نازیبا حرکتیں کرتے ہوں گے۔"

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہندو دھرم سے تعلق رکھتی ہے۔ ممکن ہے، وہ خود ان پجاریوں کی اتنی عقیدت مند ہو کہ ان کے قرب کو نجات کا ذریعہ سمجھتی ہو۔''

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔''

''کیوں؟''

''میرا مطلب ہے، اتنی خوب صورت لڑکی۔''

''دھرم کی بات ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''میرا دل نہیں مانتا۔ وہ بہت اُداس تھی۔ کیا خیال ہے...... آؤ، اُسے تلاش کریں۔''

''کیا کرو گے؟''

''بس دیکھیں گے۔ اُس کے بارے میں میرے ذہن میں تجسس بیدار ہو گیا ہے۔ ہم اُس کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اور ہم دیو کنیاؤں کی رہائش گاہ پر چل پڑے۔ لیکن اندر کے مناظر دیکھ کر ہمیں ایک دوسرے کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہو جانا پڑا۔ دنیا کا منتخب حُسن ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے کوئی پاکباز زندگی نہیں گزاری تھی۔ وقت نے ایک زمانے میں میرے لئے ایسا ماحول مہیا کیا تھا، جس کا تصور آج بھی ذہن میں ہلچل مچا دیتا تھا۔ طالوت کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔

''عارف!'' اُس نے مسخرے انداز میں کہا۔

''کیا ہے بھائی تربوز؟''

''اب کیا کریں؟''

''صبر کرو بھیا!''

''نکل چلو۔''

''کہاں جا سکیں گے اب؟''

''ہاں یار! میری ٹانگیں تو بے جان ہو رہی ہیں۔ بیٹھ جاؤں؟'' طالوت نے کہا اور میں ہنسی نہ روک سکا۔ لیکن طالوت دھم سے بیٹھ گیا تھا۔

بڑا بھیانک منظر تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے چہلیں کر رہی تھیں۔ وہ خود اپنے حسین جسموں سے بے نیاز تھیں۔ ٹھیک ہے، جنسِ مخالف اُن کے خیال میں یہاں اس ہال میں موجود نہیں تھی۔ لیکن شاید ایک دوسرے سے شرم بھی ان کے دھرم میں موجود نہیں تھی۔ بہرحال، یہ خوفناک منظر کافی دیر تک جاری رہا۔

اور پھر میں نے طالوت کو مخاطب کیا۔ ''بھائی تربوز!''

''خربوزِ اعظم......!'' طالوت نے جواب دیا۔

''اب اُٹھ جاؤ۔''

''کیسے اُٹھوں؟''

''مسخرہ پن مت کرو۔ آؤ، اُسے تلاش نہیں کرو گے؟''

''ایں...... ہاں...... اسے تو بھول ہی گئے۔ مگر کہاں تلاش کریں؟''

''ان لوگوں میں تو موجود نہیں ہے۔''

''تم مانو یا نہ مانو عارف! اُس لڑکی میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔''

''اگر ہے تو پتہ چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ اور پھر ہم اس ہال سے نکل آئے۔ کیونکہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ ہم دوسرے کمروں میں اُسے تلاش کرتے رہے۔ اور پھر بڑے پجاری کی رہائش گاہ کی طرف نکل آئے۔

چھ پنڈے بڑے پجاری جی کے ساتھ آرہے تھے۔ بڑے پجاری اب بھی نڈھال سے تھے۔ لڑکی تو چونکہ نظر نہیں آئی تھی، اس لئے ہم اُن کے پیچھے ہی چل پڑے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ پجاری جی کی رہائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ بڑے پجاری جی ایک سنگھاسن پر بیٹھ گئے اور پنڈت اُن کے گرد کھڑے ہو گئے۔

تب بڑے پجاری نے گردن اُٹھا کر سرخ نگاہوں سے اُنہیں دیکھا۔ ''تم میرے متر ہو۔ تم میرے ساتھی ہو۔ کیا تم بھی وہی کہتے ہو جو دوسرے؟''

''مان لیں مہاراج!...... ہم کسی کو یہ حرکت کرتے دیکھتے اور خاموش رہتے؟ ہم اُس کی تکا بوٹی کر ڈالتے، جو مہاراج کا اپمان کرتا۔'' ایک پنڈت نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ پنڈتوں میں میرے مخالف موجود ہیں۔ خاص طور سے جوگندر لال کے ساتھی میرے دشمن ہیں۔ مگر کیا جوگندر لال ایسا مہان ہو گیا کہ وہ جادو سے کام لے سکے؟''

''ارے اس بھانڈ کے پاس یہ شکتی کہاں ہے مہاراج؟ بھبھوت مل کر، آنکھیں لال کر کے کوئی سادھو تھوڑا ہی بنتے ہیں؟ اس کی مجال ہے کہ ہمارے مہاراج پر وار کر سکے؟''

''پھر...... وشواش کرو بھوپندر جی!...... کسی نے میری چوٹی اس زور سے پکڑی تھی کہ آنکھوں میں تارے ناچ گئے تھے۔ میں بے بس ہو گیا تھا۔

''مہاراج! صبح سے مندر میں دو واقعے ہو چکے ہیں۔ صبح کو مٹھائی میں ناگ دیوتا پھنکار رہے تھے۔ اور شام کو...... یہ...... یہ واقعہ ہوا۔ کہیں ناگ دیوتا تو ناراض نہیں ہو گئے؟'' ایک دوسرے پنڈت نے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔'' بڑے پجاری نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''کل ہمیں ناگ دیوتا کی کیرتن کرانی ہو گی۔ تم لوگ تیاریاں شروع کر دو۔''

''اوش مہاراج! ہم کل تیاریاں کر لیں گے۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''میں بھی نہیں جانتا۔'' میں نے کہا اور طالوت گردن ہلانے لگا۔ پھر بڑے پجاری نے ان لوگوں سے چلے جانے کے لئے کہا اور خود ایک مرگ چھالہ پر لیٹ گئے۔ پنڈت ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے۔

اب کمرے میں بڑے پجاری اور ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تب پجاری جی اُٹھے اور انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور ایک اندرونی دروازہ کھل گیا، جس پر پہلے ہم دونوں کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہونے والی دو خوب صورت لڑکیاں تھیں۔

''آج تمہاری باری ہے؟'' پجاری جی نے پوچھا۔

''ہاں مہاراج!'' دونوں لڑکیوں نے بیک وقت کہا۔

''تیرا کیا نام ہے؟''

''دسونتی۔''

''اور تیرا؟'' مہاراج نے دوسری لڑکی کو مخاطب کیا۔

''شکنتلا۔''

''تم لوگ دھرمان مندر سے آئی ہو نا؟''

''ہاں مہاراج!''

''خیر...... ٹھیک ہے۔ ہمیں دارو پلاؤ۔ آج ہمارا من پریشان ہے۔''

''جو آگیا مہاراج!'' دسونتی نے کہا اور لڑکیاں واپس چل پڑیں۔

''شکنتلا!'' مہاراج نے دوسری لڑکی کو آواز دی۔

''مہاراج!'' وہ رُک گئی۔

''تُو کہاں جا رہی ہے؟...... اِدھر آ، ہمارے پاس۔'' اور شکنتلا عقیدت سے مہاراج کے پاس آ گئی۔ ''تُو جا دسونتی! دارو لے آ۔'' اور دسونتی دروازے سے نکل گئی۔

تب مہاراج نے شکنتلا کو نزدیک بٹھایا اور اپنا پاؤں اُس کی نازک گود میں رکھ دیا۔ شکنتلا مطلب سمجھ گئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے پجاری جی کا بھدا اور کسی ستون کی طرح موٹا پاؤں دبانے لگی۔ مہاراج کسی ارنے بھینسے کی طرح دراز تھے۔ لیکن وہ بار بار اپنی کھوپڑی پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ بدمعاش طالوت نے اُن کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ پھر وہ میرے کان کے پاس منہ کر کے بولا۔

''عارف!''

''فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''کیا خیال ہے استاد؟''

''کس بارے میں جہاں پناہ؟''

''جانتے ہو، اس کے بعد کے کیا مناظر ہوں گے؟''

''اندازہ تو ہو رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے، ہر جگہ اخلاقیات کا چرخہ نہیں چلنا چاہئے۔ ہم یہاں رُکیں گے۔ یار! کتنی خوب صورت لڑکیاں ہیں اور یہ ارنا بھینسا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے؟'' میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''ابھی اور خراب ہوگا، جب یہ گنبدان سے عشق کرے گا۔'' طالوت نے غرّاتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''ابے اجارہ داری ہے تمہاری۔ خود انہیں دیکھو، کیسی اطاعت کر رہی ہیں اس کی۔''

''پتہ نہیں کیا مجبوری ہے بے چاریوں کے ساتھ۔''

''طالوت! یہاں بہت سی بے چاریاں ہیں۔ ایک ایک کی مجبوری معلوم کرتے رہو گے تو پوری عمر اسی مندر میں گزر جائے گی۔''

''اس کا ایک بہتر نعم البدل ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اس گنبد کی ہی ایسی تیسی کیے دیتے ہیں۔''
''بے کار بات ہے۔ یہ ہندو ریاست ہے۔ نہ جانے کتنے مندر ہوں گے اور نہ جانے ان مندروں میں کون کون سے کھیل کھیلے جاتے ہوں گے۔''
''نہیں جاؤں گا۔ خدا کی قسم، نہیں جاؤں گا۔ بس کہہ دیا۔'' طالوت جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا اور میں نے گہری سانس لی۔ بے چارے پنڈت کی شامت ہی آ گئی تھی۔ کون روک سکتا تھا؟
چند ساعت کے بعد دسونتی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں خوب صورت دھات کی صراحی اور دو چھوٹے چھوٹے جام تھے۔ شکنتلا بدستور مہاراج کے پاؤں دبا رہی تھی۔ دسونتی نے لچکتے ہوئے تھال رکھ دیا، جس میں شراب کے برتن سجے ہوئے تھے۔ اور پھر اس نے ایک جام بھرا اور اسے مہاراج کے ہونٹوں تک لے گئی۔ مہاراج نے منہ کھول دیا اور شراب اُن کے بھاڑ جیسے منہ سے اندر داخل ہو گئی۔
دو تین جام پینے کے بعد مہاراج اُٹھ گئے۔ ''سندریو!'' اُنہوں نے کہا۔
''مہاراج!'' دونوں لڑکیوں نے بیک وقت جواب دیا۔
''تمہیں یہاں کی ریت معلوم نہیں ہے؟''
''ہم پہلی بار آپ کی سیوا میں آئے ہیں مہاراج!''
''دوسری لڑکیوں نے تمہیں نہیں بتایا؟''
''کچھ باتیں بتائی ہیں مہاراج!''
''وہ کیا؟''
''یہی کہ مہاراج جس طرح چاہیں، ان کی سیوا کی جائے۔ ان کی کوئی بات ٹالنے کے لئے نہیں ہوتی۔''
مہاراج ایک دوسرے سنگھاسن پر نیم دراز ہو گئے۔ شکنتلا اُن کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کر حسبِ معمول اُن کے پاؤں دبانے لگی اور دسونتی انہیں جام پر جام بھر کر دینے لگی۔ مہاراج شراب پینے کے دوران لڑکیوں سے مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔
طالوت نہ جانے کیوں ابھی تک برداشت کئے ہوئے تھا۔ ویسے پنڈت جی مہاراج نے ابھی تک ساری حدیں عبور کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی ابھی ایسے آثار نظر آ رہے تھے۔ ویسے اس ساری شگفتگی کے دوران بھی مہاراج سر کی تکلیف کو فراموش نہ کر سکے تھے اور بار بار اُن کا ہاتھ سر پر پہنچ جاتا تھا۔ چوٹی پر ہاتھ پڑتے ہی اُس کے منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔
پھر مہاراج اُٹھ کر بیٹھ گئے۔
''سندری!'' اُنہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
''مہاراج۔'' دسونتی جلدی سے بولی۔
''دارو کے دو چار جام میرے سر پر اُلٹ دو۔''
''مہاراج!'' دسونتی حیرت سے بولی۔
''جو کہہ رہا ہوں، کرو۔'' مہاراج نے کہا۔ ''میرے سر میں تکلیف ہے۔''
''جو آ گیا مہاراج!'' دسونتی نے کہا۔ اور پھر اُس نے شراب کا ایک جام بھرا۔ اسی وقت میں نے طالوت کو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے دیکھا، اُس کی ایک اُنگلی لمبی ہو گئی۔ اُنگلی کا سرا جام کی طرف بڑھا اور پھر

طالوت نے جام میں اُنگلی کا سرا ڈبو دیا۔
''مارا گیا پنڈت۔'' میرے منہ سے نکلا اور میں طالوت کی کارکردگی کے ردِعمل کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ اُنگلی کچھ نہ کچھ کر کے آئی ہو گی۔
دسونتی نے شراب کا جام مہاراج کے سر پر اُنڈیل دیا۔ مہاراج نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دسونتی دوسرا جام بھرنے لگی تھی۔ لیکن اچانک مہاراج کے حلق سے ایک دہاڑ نکلی تھی۔
''ہے رام...... ہے پربھو...... ہے رام...... ہے پربھو!'' وہ چیخ رہے تھے اور اپنے گھٹے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے بری طرح کھجا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑی ہو گئیں۔
''مہاراج!'' شکنتلا کے منہ سے نکلا۔
''مر گیا...... ہائے...... ہائے...... کیا...... کیا......'' مہاراج نے کھجا کھجا کر کھوپڑی لہولہان کر لی تھی۔ وہ پورے کمرے میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ یقیناً اُس کی دہاڑیں دُور تک سنی جاتی رہی ہوں گی۔ لڑکیوں نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔
اور وہی ہوا...... باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔
''مہاراج!...... دروازہ کھولئے...... مہاراج!''
''مر گیا...... ہائے مر گیا۔''
''دروازہ کھولئے مہاراج!''
''جاؤ...... جاؤ...... تم جاؤ۔'' نہ جانے مہاراج کو کیسے خیال آ گیا اور لڑکیاں اندرونی دروازے کی طرف بھاگیں۔ لیکن مہاراج نے لپک کر ان میں سے ایک کی کمر پکڑ لی۔
''ارے، ارے...... مر گیا...... مر گیا...... ہائے، یہ...... یہ...... یہ تو لیتی جاؤ، بیسواؤ!'' انہوں نے شراب کی تھال کی طرف اشارہ کیا اور شکنتلا نے پلٹ کر تھال اُٹھا لیا۔ اندرونی دروازے کی طرف بھاگی تو پیتل کی صراحی گر پڑی۔ زوردار آواز ہوئی تھی۔
''مر گیا...... ہائے رام......'' پنڈت چلایا۔
''دروازہ کھولئے مہاراج!...... دروازہ کھولئے۔'' باہر سے دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ شکنتلا نے صراحی اُٹھائی اور بمشکل تمام لڑکیاں دروازے سے نکل کر بھاگ سکیں۔
تب مہاراج نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور بھرّا مار کر بہت سے پنڈے اندر گھس آئے۔
''کیا ہو گیا مہاراج...... کیا ہو گیا مہاراج؟'' بہت سی آوازیں اُبھریں۔
''پانی...... پانی......'' مہاراج دونوں ہاتھوں سے کھوپڑی رگڑتے ہوئے بولے۔
''ہوا کیا مہاراج؟''
''ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... ناگ دیوتا...... ناگ دیوتا۔''
اور پنڈے بے اختیار چیخ پڑے۔ بہت سے واپس نکل بھاگے۔ بہت سے اونچی جگہوں پر چڑھ گئے۔ لیکن مہاراج بدستور کھوپڑی کھجا رہے تھے۔
''پانی...... ارے پانی......''
اور پھر نہ جانے کتنے ہنگاموں کے بعد پانی آیا۔ اور مہاراج کے اشارے پر اُن کی کھوپڑی پر اُنڈیلا

جانے لگا۔ مہاراج کے لمبے ناخنوں نے اُن کی کھوپڑی چھیل دی تھی۔
''آؤ...... میرا خیال ہے، رات بھر کے لئے کافی ہے۔'' طالوت نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی ہنستا ہوا اُس کے پیچھے چل پڑا تھا۔
''بھلے آدمی! ہوا کیا تھا؟''
''کہاں؟'' طالوت نے معصوم بن کر پوچھا۔
''پنڈت جی کی کھوپڑی پر۔''
''اوہ......کوئی خاص بات نہیں...... صرف کھجلی...... جو رات بھر جاری رہے گی۔'' طالوت نے کہا اور میں ہنس پڑا۔
''کیوں بے چارے کی جان کے گاہک ہو گئے ہو؟''
''اور اُس ڈنبے کو نہیں دیکھا تھا؟ کس مزے سے ان خوب صورت ہاتھوں سے پاؤں دبوا رہا تھا۔''
''تم کس کس کو روکتے پھرو گے؟''
''جسے جسے دیکھوں گا۔'' طالوت آنکھیں نکال کر بولا۔ ہم دونوں چھت پر پہنچ گئے۔ اور پھر اپنی جگہ لیٹ گئے۔ طالوت خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔
''یار!......وہ نہیں ملی۔''
''کیا کرو گے طالوت! اُس سے مل کر؟ وہ بھی ان دوسری ہندو لڑکیوں کی طرح دیوداسی ہے۔''
''یار! نہ جانے کیوں، دل کہہ رہا ہے کہ...... کہ وہ اُن کی طرح نہیں ہے۔''
''میں بتاؤں؟''
''کیا......؟''
''یہی کہ تمہارا دل یہ بکواس کیوں کر رہا ہے؟''
''بتا دے بھائی!''
''اس لئے کہ وہ بہت حسین ہے۔''
''قسم لے لو...... حسین وہ ضرور ہے۔ لیکن صرف یہی بات نہیں ہے۔ اُس کے چہرے کی اُداسی کچھ اور افسانے سنا رہی ہے۔'' طالوت پُر خیال انداز میں بولا۔
''میرے کان وہ افسانے نہیں سن سکے۔ ویسے تم چاہو تو ہم اُسے تلاش کر لیں گے۔''
''ضرور کریں گے۔ کم از کم پتہ تو چلے۔'' طالوت نے کہا اور ہم اپنی منتخب کردہ جگہ پر آرام کرنے لیٹ گئے۔ طالوت کسی سوچ میں گم تھا۔ پھر اُس نے اچانک کہا۔
''تم نے اُن لڑکیوں کی گفتگو سنی تھی؟''
''وہ کیا نام تھا، دسونتی اور شکنتلا کی؟''
''ہاں۔''
''ہاں...... وہ کسی اور مندر سے آئی تھیں۔''
''ویسے یار! اس ڈنبے کے عیش ہیں۔ میرا خیال ہے، کوئی دیوداسی اُس کی ہوس سے نہیں بچی ہوگی۔''
''ان حالات میں تو یہی کہا جا سکتا ہے۔''

''یہ لڑکیاں کون ہوتی ہیں؟''
''اچھے گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ مندروں کو دان کر دی جاتی ہیں۔ اور پھر یہ ان پجاریوں کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں تبرک سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ کسی حد تک تم بھی دیکھ چکے ہو۔''
''سارے مندروں میں یہی ہوتا ہے؟''
''پوجا اور رقص تو ان کے مذہب میں شامل ہے۔ لیکن باقی معاملات کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے ہاں بھی بڑے بڑے رشی منی ہوتے ہیں۔ ان میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں۔ سب کے بارے میں ایک ہی بات نہیں کہی جا سکتی۔''
''ہوں......'' طالوت نے پُرخیال انداز میں کہا اور پھر اچانک وہ ہنس پڑا۔
''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ نہیں...... میں سوچ رہا ہوں، وہ بڑے پجاری مہاراج رات بھر کھوپڑی کھجاتے رہیں گے۔ صبح کو ممکن ہے، کھوپڑی ہی ان کے شانوں پر موجود نہ ہو۔''
''سخت اذیت دی ہے تم نے اُسے۔''
''اور اس نے مجھے اذیت نہیں دی۔ اتنی حسین لڑکیاں اور اس تو ندو کے قبضے میں۔ ابھی تو دیکھنا، اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ اور ہاں، یہ پنڈے بھی تو عیش کرتے ہوں گے۔''
''رہنے دے یار!...... بس رہنے دے۔ سو جا آرام سے۔''
''نمٹ لوں گا کل ان بدمعاشوں سے بھی۔'' طالوت نے غراتے ہوئے کہا۔
اور پھر کافی دیر تک اُس کی آواز نہ سنائی دی۔ میں نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ وہ کروٹ لے کر سو گیا تھا۔
میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا طالوت کا خیال درست ہے؟...... وہ حسین، اُداس چہرہ...... کیا وہ اُداسی کوئی خاص حیثیت رکھتی تھی؟...... مگر وہ گئی کہاں؟...... کسی دوسرے مندر میں؟...... اونہہ...... ہو گا۔ میں نے آسمان پر نگاہ دوڑائی اور آسمان مجھے انوکھی کہانیاں سنانے لگا۔
انہی کہانیوں کے دوران نہ جانے کہاں سے نیند چپکے سے پلکوں کے دروازے سے داخل ہوئی اور پھر سورج کی پہلی کرن نے ہی جگایا تھا۔ سورج کی ان چھوئی کنواری کرن چپکے سے آسمان سے اُتر آئی تھی۔ کسی سے پوچھے بغیر، کسی سے کہے بغیر...... نرم نرم سی...... سہمی سہمی سی...... زمانے کو دیکھنے کی شوقین۔ میں نے اس کے کنوارے لمس کو محسوس کیا۔ کشش انگیز لمس۔ اور میرے کانوں میں رسیلے قہقہے گھل گئے۔
لیکن یہ قہقہے اس نوخیز کرن کے تو نہ تھے۔ اور پھر یہ تو تنہا تھی۔ اس کے ساتھ ہنسنے والا کون تھا؟ ذہن جاگا اور میں احمقوں کی جنت سے نکل آیا۔ رسیلے قہقہوں کی آوازیں نیچے سے آ رہی تھیں۔ ذہن میں تجسس جاگا اور میں چھت کے کنارے پہنچ گیا۔ لیکن دوسری طرف کا منظر......!
حسین صبح کا حسین تحفہ۔ اخلاق اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہاں رُکوں۔ لیکن ذہن و دل میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اور پھر میں کون سا عابد و زاہد تھا۔ شیطان کا پیروکار۔ اور میں وہاں سے نہ ہٹ سکا۔ اس جگہ سے مندر کا عقبی تالاب نظر آ رہا تھا۔ اور تالاب میں جل پریاں رقص کر رہی تھیں۔
دیوکنیاؤں کا جھرمٹ...... وہ تالاب میں نہا رہی تھیں۔
ہندو مندروں کے بارے میں کچھ میں نے بھی سنا تھا۔ تیرتھ یاتراؤں کی تفصیل سنی تھی۔ گنگا اور جمنا

کے کنارے اشنان کرنے والوں کی کچھ کہانیاں میرے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ لیکن یہ کہانیاں اتنی پرانی تھیں کہ اب صرف کہانیاں ہی معلوم ہوتی تھیں۔ حقیقت ایسے مناظر کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن...... وہ کہانیاں زندہ ہو گئی تھیں۔ وہ قصے عملی روپ دھار چکے تھے۔

اور پھر مجھے تنہائی کا احساس ہوا۔ اوہ...... میرا دوست اس حسین صبح کی قیامتوں سے نا آشنا ہے۔ سورج اُبھرے گا تو یہ مناظر گم ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں طالوت کی طرف دوڑا۔

''طالوت!...... طالوت!'' میں نے اُسے جھنجوڑ ڈالا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''کیا قیامت آ گئی؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''اوہ......'' وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ ''لیکن سورج ابھی سوا نیزے پر نہیں آیا ہے۔''

''ماہتاب زمین پر اُتر آئے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''جلدی آؤ!'' اور وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ میرے ساتھ چلا آیا۔ اور پھر تالاب کا منظر دیکھ کر اُس نے چھت کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے سے اُس کی کمر پکڑ لی۔

''کیا بدتمیزی ہے؟'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''صبر سے بیٹھو۔''

''جانے دو۔ قریب سے دیکھوں گا۔'' طالوت نے کہا۔

''طالوت! ہوش میں آؤ۔''

''نہیں آ سکتا۔ صبح ہی صبح...... آنکھ کھولتے ہی...... نہیں برداشت کر سکتا۔ نہیں برداشت کر سکتا۔''

اس نے دوبارہ چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور میں نے پھر اُسے پکڑ لیا۔

''بور مت کرو یار!...... اس سے تو میں تمہیں نہ جگاتا تو بہتر تھا۔''

''اوہ......'' طالوت نے میری شکل دیکھی اور پھر سنبھل گیا۔ پھر وہ دوبارہ تالاب کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ بتاؤ، آخر یہ کیا طلسم خانہ ہے؟ یہاں کیا کیا ہوتا ہے؟''

''سورج نکلنے سے قبل یہ لوگ دریاؤں اور تالابوں میں غسل کرتے ہیں۔ عورتیں الگ، مرد الگ۔ بڑے بڑے دریاؤں پر ان کے الگ الگ گھاٹ ہوتے ہیں۔''

''پوری ریاست میں ایسا ہی ہوتا ہے؟''

''ہاں...... یہ بھی ان کی مذہبی رسوم میں شامل ہے۔''

''تب پھر ہم باقی زندگی یہیں گزاریں گے۔'' طالوت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طالوت دلچسپ نگاہوں سے اس حُسنِ آوارہ کو دیکھتا رہا۔ اور پھر اُس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''عارف!''

''ہوں۔'' میرا دل وہاں سے نگاہیں ہٹانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''وہ یہاں بھی نہیں ہے۔''
''میرا خیال ہے، چلی گئی یہاں سے۔''
''لیکن کہاں؟''
''ممکن ہے کسی دوسرے مندر میں۔''
''تب ہم یہاں ایک ایک مندر کی خاک چھانیں گے۔ ہم اسے ضرور تلاش کریں گے عارف!''
''تمہارے لئے کیا مشکل ہے؟''
''نہیں یار! تم نہیں سمجھتے۔ راہم سے ایسے کاموں میں مدد لینا مناسب نہیں ہے۔ اس ماحول سے واقفیت بھی ضروری ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔''
سورج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اور تالاب کی جل پریاں باہر نکل رہی تھیں۔
''ارے، ارے!'' اچانک طالوت چونک پڑا۔
''خیریت، کیا ہوا؟''
''ان درختوں کی طرف دیکھو عارف!''
''کون سے درخت؟''
''ابے وہ تالاب کے کنارے۔'' اور میں طالوت کے اشارے پر ان درختوں میں جھانکنے لگا۔ کئی منٹ کی کوشش کے بعد مجھے وہ پنڈے نظر آئے، جو درختوں کے پتوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ بندر کی طرح موٹی شاخوں سے لپٹے ہوئے تھے۔
''ارے۔'' میں چونک پڑا۔
''چھپے ہوئے ہیں بدمعاش۔'' طالوت کے لہجے میں شرارت تھی۔
''ہاں۔''
''اُن کی ایسی تیسی۔ روزانہ یہی حرکت کرتے ہوں گے۔''
''یقیناً، ان لڑکیوں کو نہیں معلوم۔''
''بالکل...... اور یقیناً ان کا یہاں آنا منع ہے۔ ورنہ وہ چھپے ہوئے کیوں ہوتے؟''
''بے شک!''
''ابے تو پھر آؤ نا۔'' طالوت کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔
''کیا مطلب؟''
''ان کی یہ حرکت قابل معافی نہیں ہے۔''
''ہم بھی تو دیکھ رہے ہیں طالوت!'' میں نے کہا۔
''ہماری اور بات ہے۔'' طالوت نے میری گردن پکڑ کر مجھے زور سے دھکا دیا اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں چھت کے کنارے تھا اور بہر حال چھت اتنی اونچی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی سلامتی مشکل تھی۔ لیکن اپنی حماقت کو کیا کہوں۔ بار بار بھول جاتا کہ وہ طالوت ہے۔ دہلتے ہوئے دل کو سنبھالا تو معلوم ہوا کہ ایک درخت پر ہوں۔

”تم انہیں دھکا دے سکتے ہو۔لیکن پھرتی سے۔کسی کے ساتھ لپٹے ہوئے درخت سے نیچے مت آ گرنا۔میں دوسرا ڈرامہ کرتا ہوں۔“ طالوت کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

لیکن وہ میرے پاس موجود نہ تھا۔ہاں، دو پنڈے ضرور مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر درختوں سے چمٹے ہوئے تھے۔میں آگے بڑھا۔ایک دوشاخے کو پکڑا۔پتے ہلنے کی آواز پر پنڈوں نے پلٹ کر دیکھا۔لیکن ظاہر ہے، انہیں نظر کون آتا؟ دوسرے لمحے میں نے دوشاخے کو مضبوطی سے پکڑ کر ایک پنڈے کی کمر پر زوردار لات رسید کی کہ گو درخت تالاب سے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا،لیکن پنڈا تالاب میں ہی گرا تھا۔اُس کی گھگھیائی چیخ بہت بلند تھی۔اس سے قبل کہ دوسرا پنڈا سنبھلے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کرے، میری لات نے اُسے بھی اُچھال دیا۔اور وہ بےچارا زمین پر ہی گرا تھا۔

اور تالاب سے سریلی چیخیں بلند ہونے لگیں۔کنارے پر لباس تبدیل کرتی ہوئی دیو کنیائیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔اور پھر ان چیخوں میں دوسرے درخت پر چھپے ہوئے پنڈوں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔وہ ان عورتوں سے زیادہ زور سے چیخ رہے تھے۔اور میں نے ان چیخوں کا راز بھی پا لیا۔

جس درخت پر پنڈے چیخ رہے تھے،اس پر سیاہ رنگ کا ایک اژدھا نما سانپ رینگ رہا تھا۔تین پنڈے پکے ہوئے پھلوں کی طرح اس درخت سے بھی ٹپکے اور دیو کنیاؤں کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔پنڈے بری طرح اُٹھ کر بھاگے۔پانی میں گرا ہوا آدمی بدحواسی میں نکل نہیں پایا تھا۔وہ ہر بار کنارے سے پھسل جاتا تھا۔

اور ذرا سی دیر میں مندر کے دوسرے حصے سے پنڈوں کی پوری فوج نکل آئی۔کچھ عورتیں خود کو چھپانے کے لئے درختوں کی آڑ لے رہی تھیں۔لیکن جونہی ان کی نگاہ درخت پر پہنچتی، وہ چیخ مار کر دوڑ پڑتیں۔کیونکہ اس درخت پر بھی پنڈے چھپے ہوتے۔بہرحال، عجیب ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔

پنڈوں کی فوج نے پورے تالاب اور اس کے کنارے کے درختوں کو گھیر لیا۔اور پھر چھپے ہوئے پنڈوں کو نیچے اُتارا جانے لگا۔

شاید یہ جرم اچھا خاصا تھا۔کیونکہ آنے والوں نے چھپے ہوئے ایک ایک پنڈے کو پکڑ لیا تھا۔میں نے ایک طویل سانس لے کر گردن جھٹکی اور اس درخت پر سانپ تلاش کرنے لگا۔لیکن سانپ غائب تھا۔

تب مجھے اپنے کانوں کے قریب طالوت کی ہنسی سنائی دی۔”کیسی رہی؟“

”یار! تجھے شیطان کہنا، شیطان کو بہت بڑا درجہ دینا ہے۔“

”محبت ہے تیری۔ورنہ میں کس قابل ہوں۔“ طالوت نے انکساری سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

چھپے ہوئے پنڈوں کی خوب درگت بن رہی تھی۔عورتیں سب بھاگ گئی تھیں۔اور پھر پنڈوں کو بھی اندر لے جایا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد تالاب خالی ہو گیا۔

”آؤ......اب ہم کب تک درخت پر لٹکے رہیں۔“ طالوت نے کہا اور ہم دونوں بھی درخت سے نیچے اُتر آئے۔”بہرحال، اس دن کی ابتدا بہت دلچسپ رہی ہے۔میں چاہتا ہوں، انتہا بھی اتنی ہی دلچسپ ہو۔“

”ہو گی......ضرور ہو گی۔ان بدبختوں کی شامت ہی آ گئی تھی اس وقت جب ہم یہاں داخل ہوئے تھے اور وہ گھنٹے بجا رہے تھے۔“

''چھوڑو......اب کیا پروگرام ہے؟'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔
''ناشتہ۔''
''ایں، ہاں......ناشتہ......آؤ پھر پوجا ہال میں چلیں۔''
''چلو۔'' میں نے کہا اور ہم مندر کے اندرونی حصے کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم پوجا کے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ پوجا کرنے والے عقیدت مند ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ پنڈت، بتوں کے سامنے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ دھونیاں جلا رہے تھے اور لوگوں کے تلک وغیرہ لگا رہے تھے۔ عقیدت مندوں کے ہاتھوں میں ہار اور مٹھائیاں تھیں اور پنڈے حسبِ معمول انہیں ایک جگہ جمع کر رہے تھے۔

طالوت کی نگاہ ایک موٹے تازے بنیئے پر پڑی، جو ہاتھوں میں عمدہ قسم کی مٹھائیوں کا ایک دونا لئے اندر آ رہا تھا۔ طالوت نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مجھے ٹہوکا دیا۔
''عارف! کیا خیال ہے؟......کافی رہے گی؟''
''ہاں......ناشتے کے لئے کافی ہے۔''
''لاتا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور بنیئے کی طرف بڑھ گیا۔ بنیا بڑے اہتمام سے اندر آ رہا تھا۔ طالوت نے اطمینان سے دونا اس کے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور بنیا اُچھل پڑا۔ اُس نے اُچھل کر دونے کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن طالوت پیچھے ہٹ گیا اور بنیا گرتے گرتے بچا۔
''ہے رام......'' بنیئے کے منہ سے نکلا اور وہ بدحواسی میں پھر دونے کی طرف لپکا۔ لیکن طالوت نے اُسے جھکائی دی اور اس بار وہ ایک پنڈے سے ٹکرا گیا۔
''پپ......پنڈت جی!'' وہ چیخا۔ لیکن پنڈت جی تو خود منہ پھاڑے اس پرواز کرنے والے دونے کو دیکھ رہے تھے۔ بنیا پھر دونے کی طرف لپکا۔ اور اس بار وہ ایک دوسرے پنڈے کو لپیٹ میں لئے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ دونوں کی چیخیں اُبھری تھیں۔ لیکن چیخیں تو دوسرے لوگوں کے حلق سے بھی نکل رہی تھی۔
طالوت نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سب لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن طالوت چونکہ ناشتے کے موڈ میں تھا اس لئے وہ زیادہ دیر تک نہ رُکا اور دونا لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی تھی کہ دونے کا تعاقب کرے۔ ہاں چیخ دہاڑ پھر شروع ہو گئی تھی۔
مگر ہمیں اس سے کیا۔ ہم تو واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے تھے۔ اور مزے سے مٹھائی کھا رہے تھے۔ خوب اچھی طرح ناشتہ کرنے کے بعد ہم اُترے، ایک کنوئیں سے نکال کر تازہ پانی پیا اور تازہ دم ہو گئے۔
''اب اس مندر سے باہر نکلو گے یا نہیں؟''
''نکلیں گے یار! کیا یہاں مزہ نہیں آ رہا؟''
''بخش دو ان بے چاروں کو۔ بھوکے مر جائیں گے۔ تم دیکھ لینا، یہاں حاضری بہت کم ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''پوجا کرنے والے یہاں کے حالات سے خوف زدہ ہو کر دوسرے مندروں کا رخ کریں گے اور

ان بے چارے پنڈوں کو بھوکا مرنا پڑے گا۔"
"اچھا ہے۔کوئی بھی تین من سے کم وزن کا نہیں ہے۔ کچھ وزن ہی کم ہو جائے گا۔" طالوت نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ کسی طوران لوگوں کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔
پورے مندر میں سخت ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ سارے پنڈے جگہ جگہ جمع ہو کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ وہ ان آفات کو دیوتاؤں کی ناراضگی سے تعبیر کر رہے تھے۔ آج ناگ پوجا ہونے والی تھی۔ اس کے بعد شاید ناگ دیوتا راضی ہو جائیں۔ درختوں پر چڑھ کر غسل کرنے والیوں کا نظارہ کرنے والے مجرم پنڈوں کے لئے نہ جانے کیا سزا تجویز ہوئی تھی۔
بہر حال، ناشتے کے بعد ہم نے پورے مندر کے ایک ایک کونے کی سیر کی اور پھر بڑے پجاری جی کی سیوا میں پہنچ گئے۔ بڑے پجاری کا واقعی حلیہ بگڑ گیا تھا۔ سر میں جگہ جگہ اپنے ہی ناخنوں سے لگائے ہوئے زخم موجود تھے جن پر کسی درخت کے پتے کوٹ کر رکھے گئے تھے۔ وہ شدید بخار میں مبتلا تھے اور کراہ رہے تھے۔ بہت سے پنڈے ان کے گرد موجود تھے۔
"عارف!" طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
"ہوں۔"
"کیا خیال ہے، ان پنڈت جی سے ہی کیوں نہ اس لڑکی کے بارے میں معلوم کیا جائے۔"
"ارے۔" میں چونک کر طالوت کی شکل دیکھنے لگا۔
"کیوں......کیا حرج ہے؟"
"گویا اس کی اور دُرگت بناؤ گے؟"
"یار! نہ جانے کیوں تمہیں اس ریچھ پر رحم آ رہا ہے۔ سچ جانو تو مجھے تو ان لوگوں سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، میں اس لڑکی کے بارے میں معلوم کروں۔"
"کر لو بھائی! تمہیں کون روک سکتا ہے؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
"اب ان پنڈوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔"
"ضرور......حکم دیں۔"
"میں ہی بندوبست کرتا ہوں۔" طالوت نے کہا اور ایک طرف کھسک گیا۔ نہ جانے کس طرح وہ میری نگاہوں سے بھی غائب ہو گیا تھا۔ اور پھر چند ہی ساعت کے بعد اس کمرے کے ایک کونے سے ایک سانپ کی پھنکار سنائی دی اور پنڈے چونک پڑے۔ پھنکار پھر سنائی دی۔ اور اس بار سانپ کے منہ سے شعلے بھی نکلے تھے۔
اور پنڈے گھگھیاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "پپ...... پنڈت جی مہاراج! نن......ناگ......دیوتا......ہے۔" وہ سب دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ کیونکہ سانپ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔
بڑے پجاری جو سخت نقاہت کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے، اس پھرتی سے اُٹھے کہ میں دنگ رہ گیا۔ انہوں نے بھی دوسرے پنڈوں کے ساتھ مل کر دروازے سے باہر چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن میں نے پھرتی سے ان کی کمر پکڑ لی اور واپس کمرے میں دھکیل دیا۔
"ہائے...... ہائے...... ہائے مرگیو، رام!......ارے مرگیو...... ہائے مرگیو۔" پجاری بدحال ہو

گیا۔ پنڈے سب باہر نکل گئے تھے۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔
پجاری جہاں گرا تھا، اب اوندھا ہو گیا تھا اور سجدے کی سی کیفیت میں پڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ساتھ ہی اُس کے منہ سے کچھ الفاظ نکل رہے تھے۔
''شما...... شما کر دو مہاراج!...... ہائے شما کر دو۔''
''پجاری!'' طالوت کی گرج دار آواز اُبھری۔
''نن...... ناگ...... ناگ دیوتا...... مہاراج!'' پجاری کانپتا ہوا بولا۔
''بھگوان کے گھر میں یہ اندھیر...... تُو دیوکنیاؤں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔''
''شما...... شما کر دو مہاراج!...... شارے مندروں میں یہی ہوتا ہے...... شارے مندروں میں یہی ہوتا ہے۔''
''ہم سب کو ٹھیک کر دیں گے۔'' طالوت نے اکڑ کر کہا۔
''ہو ہو ہو...... ہو ہو ہو...... شب کے شاتھ ہی مجھے بھی ٹھیک کر دینا مہاراج! اش بار شما کر دو۔'' پجاری جی کانپتے ہوئے بولے۔
''ایک شرط پر ہم تمہیں شما کر سکتے ہیں۔''
''مجھے شاری شرطیں منظور ہیں مہاراج! بھگوان کے واسطے ایک بار شما کر دو۔ میری کھوپڑی پر بچھو ڈنک مار رہے ہیں۔''
''ہمیشہ مارتے رہیں گے۔ تم مجھے اس سندر ناری کے بارے میں بتاؤ جو پرسوں رات یہاں موجود تھی۔''
''یہاں تو بہت شی شندر ناریاں آتی جاتی رہتی ہیں مہاراج! آپ کون شی ناری کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟'' پجاری اسی طرح سجدے میں پڑا پھٹی پھٹی آواز میں کہہ رہا تھا۔
''وہ دُبلی پتلی سی...... خوب صورت سی۔''
''کوئی دیوکنیا ہو گی مہاراج!...... وشواش کریں...... میں نہیں جانتا۔''
میری نگاہیں بڑے پجاری پر جمی ہوئی تھیں، اس لئے میں نہ دیکھ سکا کہ سانپ کب کھسکا۔ میں تو اس وقت اُچھل پڑا، جب طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟'' اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بھی کوئی دیوکنیا ہو گی۔''
''ہوں۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پھیکے سے انداز میں بولا۔ ''تب پھر یہاں سے چلو یار! اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ بس، طبیعت اُکھڑ گئی۔''
''زخمی ہو گئے ہو پیارے!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ابے نہیں..... اب ایسے زخم بھی مناسب نہیں۔ ان آبرو باختاؤں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔''
''تب پھر آؤ۔''
''آؤ......'' طالوت نے کہا اور ہم اوندھے پڑے پجاری کو چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ تین دن کے بعد ہم نے مندر کے دروازے سے باہر قدم نکالا تھا۔ بہر حال، مندر کی تفریحات خوب رہی تھیں۔ طالوت کسی

سوچ میں اُلجھا ہوا تھا۔
''پریشان ہو طالوت؟'' میں نے سوال کیا۔
''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا پریشانی کا۔ بس اس لڑکی کے چہرے کی اُداسی مجھے یاد آ جاتی ہے، جو بات نہیں تھی۔''
''تب پھر میری جان! ہم اُسے تلاش کریں گے۔''
''چھوڑو...... جب وہ صرف دیوکنیا تھی تو پھر ہمیں اس سے کیا؟''
''ممکن ہے وہ مظلوم ہو۔ ہمیں دھرم و مذہب کو نظر انداز کر کے انسانیت کی مدد کرنی چاہئے۔''
''اب جب میرا ذہن صاف ہوا تو تم فضول باتیں لے بیٹھے۔'' طالوت نے غصے سے کہا۔
''تمہارا خیال ہے، مجھے مظلوموں کی مدد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟'' میں نے طالوت کو گھورا۔
''پھر ذہن کیوں بھٹکا دیتے ہو؟''
''تمہارا خیال ہے......ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
''تب پھر ہم پہلے مندروں میں اُسے تلاش کریں گے۔''
''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور پھر ہم خاموشی سے چل پڑے۔ میں گہری نگاہوں سے بستی کا جائزہ لے رہا تھا۔ خاصا بڑا شہر تھا، پرانے طرز پر آباد۔ عجیب لگ رہا تھا۔ ہم جدید شہروں کے باسی۔ ہمارے لئے تو اس قسم کے شہر ایک کلاسیکل حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن بہرحال ابھی ایسی ریاستیں باقی تھیں، جو عہدِ قدیم کے مناظر پیش کرتی تھیں۔
ایک دوسرے چھوٹے سے مندر کے اندر داخل ہو کر ہم نے دیکھا۔ لیکن یہ مندر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اور پھر ہم نے بے شمار مندر دیکھ ڈالے۔ بڑے بڑے مندروں کے اندر دیوداسیاں وغیرہ تھیں۔ لیکن ان میں وہ کامنی نظر نہ آئی۔ پورے تین دن اور گزر گئے اور اب ہم مایوس ہو گئے تھے۔
''آخر تم راسم سے کام کیوں نہیں لیتے؟'' میں نے عاجز آ کر کہا۔
''فضول باتیں نہیں۔ کچھ کام اپنے آپ بھی کرنے چاہئیں۔'' طالوت نے جواب دیا اور پھر وہ خیال انداز میں بولا۔ ''عارف! تم نے ایک بات پر غور کیا؟''
''کیا؟''
''اس پورے شہر میں مسجد ایک بھی نہیں ہے۔''
''ہاں۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے یہاں مسلمان ہی نہ ہوں۔''
''یہ ممکن ہے؟''
''ہاں......ہوسکتا ہے۔''
''وجہ؟''
''بھئی مذہبی تعصب۔ یہ ہندوؤں کی ریاست ہے۔ ممکن ہے راجہ گووند اس کپور مسلمانوں کو پسند نہ کرتا ہو۔ اور اس نے یہاں سے مسلمانوں کو نکال دیا ہو۔''
''اُس کی ایسی تیسی۔ اس کی کیا مجال کہ وہ خدا کی زمین پر اُس کے نام لیواؤں کے ساتھ ایسا سلوک کرے۔'' طالوت غضب ناک انداز میں بولا اور میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو طالوت!"
"کیوں؟" طالوت غرّایا۔
"خدا کے کون سے نام لیواؤں کی بات کر رہے ہو؟ خدا کا نام تو سبھی لیتے ہیں۔"
"میں مسلمان کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"
"تم مسلمانوں کی سرزمین سے ہی آئے ہو۔"
"تو پھر؟"
"کیا خدا کا نام لینے والے، خود ہی خدا کے نام لینے والوں پر مظالم نہیں توڑ رہے؟ کیا اپنے بھائی اپنے بھائیوں کی گردنیں ہی نہیں کاٹ رہے؟ کیا وہ رشتۂ مذہب، رشتۂ انسانیت کا احساس کرتے ہیں؟ کیا وہ خدا کے رشتے سے محبت کرتے ہیں؟ مذہب و ملت کو صرف ایک روایت نہیں بنا لیا گیا؟...... ہاں، مذہب و ملت ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ جب خدا کا نام لینے والے کسی اُلجھن میں پھنس جاتے ہیں تو دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے وہ مذہب کا سہارا لیتے ہیں۔ اخوت کے واسطے دیتے ہیں۔ کیسی دُکھ کی بات ہے طالوت! ہم اپنی مصیبتوں کا حل خدا کے نام میں پاتے ہیں۔ اور اس کے سہارے مصیبتوں سے نکل آتے ہیں۔ لیکن مصیبت سے نکل آنے کے بعد ہم اس مضبوط سہارے کو کس آسانی سے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے طالوت! کہ جب ہماری پریشانیوں اور آفات کا حل ان رشتوں، اس نام میں پوشیدہ ہے تو ہم اسے ہی کیوں نہ اپنائیں۔ ان اصولوں کو اپنی زندگی میں کیوں نہ شامل کر لیں جو ہماری پریشانیوں کا حل ہیں۔"
"ہاں......انوکھی بات ہے عارف! ہم ایک مضبوط سہارے کو چھوڑ کر عارضی سہاروں کی پناہ حاصل کرتے ہیں۔"
"ان غیر مذہبیوں کی تو بات ہی کیا ہے۔"
"ٹھیک ہی کہتے ہو یار!" طالوت نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور ہم ایک مناسب جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔ طبیعت کسی قدر مکدر ہو گئی تھی دونوں کافی دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر طالوت نے ہی گردن اُٹھائی۔
"کس سوچ میں ڈوب گئے عارف؟"
"بس......کوئی خاص بات نہیں۔"
"بوریت ہو رہی ہے یار!"
"کچھ سوچو۔"
"سوچ لیا۔"
"اچھا......کیا؟" میں نے سوال کیا۔
"شہ رگ۔" طالوت مسکرایا۔
"یعنی؟"
"ارے بھئی راجہ گونداس کپور کا محل۔ کیا اس محل کو ہمارے قدموں کی برکت کی ضرورت نہیں ہے؟"
"یقیناً ہے۔"

''ارے تو اُٹھونا۔'' طالوت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''ایسے ہی جاؤ گے؟'' میں نے سوال کیا۔
''تو پھر......؟''
''کچھ مزہ نہیں آتا طالوت! کیوں نہ ہم ایک با قاعدہ حیثیت سے وہاں چلیں۔''
''کوئی حرج نہیں ہے۔''
''مگر حیثیت کیا ہو؟''
''یہ بھی تم ہی سوچو۔''
''ہوں......'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ''طالوت! پورا ہندو مذہب توہمات اور کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کی دیو مالائیں بڑی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہم کسی دیو مالائی حیثیت سے وہاں چلیں یا پھر کسی بڑے سادھو کی حیثیت سے تو لطف آ جائے گا...... میرا خیال ہے، ہمارا بڑا عمدہ استقبال ہوگا۔ اور تم با آسانی اس رول کو نبھا سکتے ہو۔''
''درست کہا خربوز جی مہاراج!'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بس تو تربوز جی مہاراج!...... تیاریاں کرو۔''
''تیاریاں کیسی خربوز مہاراج؟''
''سادھوؤں کا لباس اوّل ضرورت۔ شکل وصورت بھی تبدیل کرنا پڑے گی۔''
''میرا خیال ہے، رہیں گے ہم شکل۔''
''ہاں...... ذرا دلچسپی رہے گی۔''
''شکل وصورت کے بارے میں کیا کرنا ہوگا؟''
''لمبے لمبے بال، لمبی داڑھیاں وغیرہ۔'' میں نے کہا۔
''مثلاً ایسے؟''
طالوت نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن شانوں سے نیچے لٹکتے گھرے سیاہ بال اور ٹھوڑی کے اچانک وزن نے مجھے بوکھلا دیا۔ میری سیاہ داڑھی سینے پر آ رہی تھی اور سر کے بال اچانک بے حد لمبے ہو گئے تھے۔
''اپنی شکل دکھاؤ تربوز جی مہاراج!'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا اور دوسرے لمحے طالوت بھی میرا ہم شکل ہو گیا۔ میں شدت حیرت سے گنگ ہو گیا تھا۔
''ہمارے چہرے یونہی سرخ وسفید تھے۔ اس پر سے گھنے سیاہ بال اور سیاہ داڑھی۔ طالوت بے حد خوب صورت اور پُروقار لگ رہا تھا۔ یقیناً یہی شکل میری ہوگی۔ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔
''اب لباس کی کسر رہ گئی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''وہ بھی پوری ہو جائے گی۔'' طالوت نے جواب دیا اور اس بار اُس نے راسم کو آواز دی اور راسم حاضر ہو گیا۔
''اُتار لا یار! دو عدد سادھوؤں کے لباس۔ لیکن گندے نہ ہوں۔''
''حاضر کرتا ہوں آقا!'' راسم نے کہا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس جن زادے کے لئے کیا

مشکل تھا۔ سادھوؤں کے سارے لوازمات کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔

پیتل کے کمنڈل، مڑی ہوئی بھیانک شکل کی لکڑیاں اور سادھوؤں کے سفید لباس راسم نے ہمارے سامنے پیش کر دیئے اور ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لئے۔ شکلیں بدل ہی چکی تھیں۔ لباس بدلے اور حلیے بدل گئے۔

''وہ ماتھے پر نقش ونگار بھی تو بنانے ہوتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''ضروری نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہاں، کچھ کرامات کی ضرورت ہوگی۔''

''ارے، ایسی ایسی کرامات دکھاؤں گا کہ طبیعت خوش ہو جائے گی مہارا گووند اس کپور کی۔'' طالوت نے کہا اور ہم گووند اس کپور کے محل کی طرف چل پڑے۔

۞

تھوڑی دیر کے بعد ہم محل کے سامنے تھے۔
کیا شان تھی۔ باوردی پہرے دار چاروں جانب پھیلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ دربار عام کی طرف جاتا تھا۔ اس پر جانے والوں کو روک ٹوک نہیں تھی۔ دوسرا راستہ محل کے اندرونی حصے کی طرف جاتا تھا، جہاں بغیر اجازت پرندہ پر نہیں مارتا تھا۔ شاید دربار لگا ہوا تھا۔ لوگ اس طرف سے آ جا رہے تھے۔
ہم دونوں اسی راستے پر چل پڑے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دربار عام کے دروازے پر تھے۔
دروازے پر کھڑے ہوئے پہریداروں نے ہماری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔
"سکھی رہو بچہ!" میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اور پہرے دار سامنے سے ہٹ گئے۔
"بہت خوب۔" طالوت نے کہا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک عظیم الشان ہال تھا، جس میں آخری سرے پر تخت لگا ہوا تھا۔ تخت کے دونوں طرف زرنگار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کرسی پر ایک دراز قامت شخص، چوڑا چہرہ، انتہائی حد تک بڑی اور چڑھی ہوئی مونچھیں، چھوٹی سرخ آنکھیں، چوڑی دار پائجامے اور ایک قیمتی کپڑے کی شیروانی پہنے ہوئے ایک خوب صورت چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے بڑے ٹھسّے سے براجمان تھا۔ دوسری کرسی پر ایک بوڑھا سادھو بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بھی تندرست آدمی تھا۔
البتہ تخت خالی تھا۔
"آدمی شاندار ہے۔" طالوت نے کہا۔
"ہاں......لیکن راجہ نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"یہ راجہ نہیں معلوم ہوتا۔"
"کیوں؟"
"راجہ تو تخت پر ہوتا۔"
"اوہ......پھر کون ہے؟"
"وزیر..... یا پھر کوئی اور بہت بڑا عہدیدار۔"
"ہوں۔" طالوت نے گردن ہلائی۔ چار سیڑھیاں اُتر کر نیچے دوسرے درباریوں کی کرسیاں تھیں۔ ایک طرف مسائل لانے والوں کا کٹہرہ بنا ہوا تھا، جہاں چند لوگ کھڑے ہوئے تھے اور ایسے ہی دوسرے لوگ جو راج دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم دونوں کو سب نے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا۔

بڑی مونچھوں والے نے بھی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھا تھا دربار کے کچھ آداب ضرور ہوں گے، لیکن ہمیں ان آداب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

''آجاؤ'' طالوت نے رُکے بغیر کہا اور ہم سب کو نظرانداز کر کے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اور پھر ہم نے پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ دو چوبدار جن کے ہاتھوں میں بلّم تھے، ہمارے پاس پہنچ گئے۔

''یہیں رُکیں مہاراج!'' ان میں سے ایک نے کہا اور طالوت نے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرے کی طرف۔ اور دونوں اس طرح پیچھے ہٹے، جیسے اُنہیں کرنٹ لگا ہو۔

تب طالوت نے اشارہ کیا اور ہم سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔

چوڑے چہرے والا گہری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دوسری طرف بیٹھا ہوا سادھو بھی ہماری طرف ہی متوجہ تھا۔ تب بڑی مونچھوں والے نے گرج دار آواز میں کہا۔

''کیا بات ہے مہاراج؟''

''گوونداس کپور کہاں ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''مہاراج دربار میں نہیں آتے۔ تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟''

''وہاں سے، جہاں تیری نگاہیں، تیرا تصور نہیں پہنچ سکتا۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''مطلب کی بات کرو مہاراج! میرا تصور بہت دُور پہنچ جاتا ہے۔'' گھنی مونچھوں کے نیچے معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کون ہے تُو؟'' طالوت نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم دیوان ہرچرن لال کے سامنے ہو سنت!'' اس بار سادھو کی آواز اُبھری۔

''راجہ گوونداس کپور کو بلاؤ۔ ہم اُس کے سوا کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔'' طالوت نے پُررعب لہجے میں کہا۔

''آپ اپنے بارے میں بتایئے گیان مہاراج! کہاں سے آئے ہیں اور کیوں مہاراج سے ملنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ بہت بڑے گیانی ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مہاراج کسی سے نہیں ملتے۔''

''خربوزجی مہاراج!'' طالوت نے مجھے پکارا۔

''مہاراج تربوز۔''

''ان آنکھ کے اندھوں کو بتاؤ کہ ہم کتنے بڑے گیانی ہیں۔''

''آپ ہی بتا دیں مہاراج!'' میں نے کہا۔

''کیا مسخرہ پن لگا رکھا ہے تم لوگوں نے۔ یہ دربار ہے۔ دربار کا احترام کرو۔''

''سادھوؤں کے لئے کوئی دربار قابل احترام نہیں۔ ہم تو اس دربار کے باسی ہیں، جہاں بڑے بڑے راجہ بھکاری ہوتے ہیں۔''

''آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے مہاراج! بتائیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''

''کیوں......اتنے بڑے محل میں ہماری کوئی جگہ نہیں ہے؟''

''اوہ......تو یوں کہئے۔ آپ یہاں رہ کر روٹیاں توڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے تو بہت سے

مندر اور دھرم شالہ موجود ہیں مہاراج!'' دیوان نے کہا۔
''روٹیاں صرف توڑنا ہی نہیں، کھانا بھی چاہتے ہیں۔''
''نکال دو ان بدمعاشوں کو۔ خوامخواہ پریشان کرنے آگئے ہیں۔'' دیوان نے سخت لہجے میں کہا اور کئی چوبدار ہماری طرف بڑھے۔
''خبردار...... رُک جاؤ۔ اگر تربوز جی مہاراج کو جلال آ گیا تو تم سب بھسم ہو جاؤ گے۔'' میں چیخ کر بولا۔
''پنڈت نانکی داس!'' دیوان جی نے اس بار سادھو مہاراج کو مخاطب کیا۔
''دیوان جی۔''
''ذرا ان سادھوؤں کو دیکھئے۔ یہ بھی مفت خورے ہیں یا کچھ رکھتے بھی ہیں؟''
''میں دیکھ رہا ہوں دیوان جی! مجھے تو یہ مسخرے معلوم ہوتے ہیں۔''
''خربوز جی مہاراج! مجھے جلال آ گیا ہے۔'' طالوت بولا۔
''آنے دیں مہاراج! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔'' میں نے کہا۔
''تو یہ لے۔'' طالوت نے ایک ہاتھ اٹھایا اور سادھو مہاراج یعنی نانکی داس کی کرسی اُلٹی ہو گئی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ نانکی داس اس پر بیٹھے ہوئے بھی تھے، لیکن نیچے نہیں گر رہے تھے اور کرسی اُلٹی خلاء میں لٹکی ہوئی تھی۔
''اگر سنتوں، سادھوؤں کا ایسے ہی اپمان ہوتا رہا اس محل میں، تو ایک دن ہم اس محل کو بھی اسی طرح اُلٹا کر دیں گے۔ آؤ خربوز جی مہاراج!'' طالوت نے میرا شانہ پکڑ لیا اور واپسی کے لئے مڑا۔
لیکن دیوان ہرچرن لال جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلاء میں اُلٹی لٹکی ہوئی کرسی کو دیکھ رہا تھا۔ درباریوں کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ سب کے منہ پھٹے ہوئے تھے۔
''مہاراج!...... مہاراج!...... رُک جایئے مہاراج!'' دیوان ہرچرن لال ہاتھ اُٹھا کر چیخا۔
''اب نہیں رُکیں گے...... اب نہیں رُکیں گے۔ ہم روٹیاں توڑنے آئے تھے۔ نہیں توڑیں گے تیری روٹیاں...... اُتار لے اب اپنے نانکی داس کو۔ ہم بھی تو دیکھیں، کیسے اُتارتا ہے۔'' طالوت اینٹھتے ہوئے بولا۔
نانکی داس بڑی خاموشی سے لٹکے ہوئے تھے۔ بھلے آدمی نے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔
''مہاراج!...... مہاراج!...... رُک جایئے مہاراج!'' دیوان جی نے کہا۔ بہت سے لوگ ہمارے راستے میں آ گئے تھے۔ اور پھر دیوان جی بھی سیڑھیاں اُتر کر ہمارے پاس پہنچ گئے۔
''رُک جایئے مہاراج!...... رُک جایئے۔''
''کیوں رُک جائیں؟...... نہیں رُکیں گے۔''
''آپ مہان ہیں مہاراج! ہماری آنکھیں آپ کو نہیں پہچان سکی تھیں۔''
''مسخرے ہیں ہم تو۔''
''نہیں مہاراج! بھول ہو گئی تھی۔ شما کر دیں۔''
''دیوان ہرچرن لال۔'' طالوت نے کہا۔

"مہاراج!" دیوان عاجزی سے بولا۔
"ہم تم سے کہہ چکے ہیں کہ ہم گووند اس کپور سے ملنا چاہتے ہیں۔"
"ان سے بھی ملادوں گا مہاراج! مجھے بھی سیوا کا موقع دیں۔"
"تب محل میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کرو۔"
"سب کچھ ہو جائے گا مہاراج! سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ پدھاریئے تو سہی۔"
"خربوز جی مہاراج!" طالوت نے مجھے پکارا۔
"مہاراج تربوز۔"
"کیسے پدھاریں؟" طالوت مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ پدھارنے کا لفظ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
"جہاں دل چاہے بیٹھ جائیں مہاراج!"
"اوہ......اچھا، اچھا۔" طالوت نے کہا۔ اور پھر وہ خطرناک شخص، مہاراجہ گووند اس کپور کے تخت پر بیٹھ گیا۔ سارے درباری کھڑے ہو گئے تھے۔ گو وہ لٹکے ہوئے مہاراج کو دیکھ کر ششدر تھے لیکن گووند اس کپور کے تخت پر کسی اور کو بیٹھے دیکھ کر وہ غصے میں بھر گئے تھے۔
"مہاراج!......مہاراج!......شما کریں مہاراج! وہاں نہ بیٹھیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"
"کیوں؟......کیوں نہ بیٹھیں؟"
"یہ مہاراج کا سنگھاسن ہے۔ یہاں اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"
"سادھو بیٹھ سکتے ہیں۔" طالوت نے اور جم کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کسی سے اُٹھایا جائے تو اُٹھا دو۔"
"یہ کتنا ہی بڑا سادھو ہو، اسے تخت سے اُٹھا دو۔" راجدھانی کی فوجوں کا سپہ سالار بولا۔
"تو آؤ......اُٹھا دو۔" اور اس سے قبل کہ دیوان جی کچھ کہتے، سالار چند لوگوں کو اشارہ کر کے طالوت پر پل پڑا۔ اس نے طالوت سے ہاتھا پائی نہیں کی تھی۔ لیکن وہ سب مل کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پانچ چھ آدمی مل کر طالوت کو ہلا بھی نہ سکے۔
اور پھر وہ بری طرح ہانپنے لگے۔ سالار پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔
"برخاست......دربار برخاست۔" دیوان ہرچرن لال چیخا اور درباری کھڑے ہو گئے۔ بہر حال، یہاں بھی خوب دھما چوکڑی مچ گئی تھی۔ طالوت اب بھی تخت پر جما بیٹھا تھا۔ معمولی بات نہیں تھی۔ بہت برا شگون تھا کہ راجہ کی زندگی میں اس کے تخت پر کوئی بیٹھ جائے۔
"اُٹھ جائیے مہاراج!......بھگوان کے لئے اُٹھ جائیے۔ ورنہ میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔"
"بڑے چھوٹے دل کے ہو تم لوگ۔ کیا ہو گیا، اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس تخت پر بیٹھ گئے۔" طالوت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"اس کی سزا موت ہے مہاراج! مگر آپ سنت سادھو ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں؟" ہرچرن لال نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے خونخوار چہرے پر بے بسی نظر آ رہی تھی۔
عام لوگ دربار سے چلے گئے تھے۔ ہرچرن اور دوسرے خاص لوگ موجود تھے۔
"نانگی داس کی مشکل حل کر دیں مہاراج!" ہرچرن لال نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
"نانگی داس! نیچے اُتر آؤ۔" طالوت نے کہا اور نانگی داس کی کرسی سیدھی ہو گئی۔ پھر وہ نیچے اُتر آئی۔

نانکی داس اب بھی کسی بت کی مانند ساکت تھا۔ اُس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔

"ہم آپ کی کیا سیوا کریں مہاراج؟" ہرچرن لال نے کہا۔

"بس کچھ روز تمہارے ساتھ گزاریں گے۔ گوونداس کپور سے ملیں گے اور پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"مگر مہاراج تو کسی سے ملتے نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس...... آج کل اُن کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ دربار میں بھی نہیں آتے ہیں۔"

"ہم ان کی صحت ٹھیک کر دیں گے۔"

"وہ کسی سے ملیں، جب نا۔"

"پھر دربار کے کام کون چلاتا ہے؟"

"ان کا داس۔" ہرچرن لال نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے دیوان جی! مگر کیسی ہے تمہاری حکومت؟ یہاں دو سادھوؤں کے لئے بھی جگہ نہیں ہے۔"

"پوری ریاست درگاپور میں جگہ جگہ دھرم شالے اور مندر موجود ہیں مہاراج! اور پھر آپ جیسے رشی منی کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ آپ چنتا کیوں کرتے ہیں؟"

"چنتا اس بات کی ہے کہ ہم تمہارے محل میں ٹھہریں گے۔ ہم عام سادھو نہیں ہیں۔"

"اگر آپ آگیا دیں تو راج مندر میں آپ کا بندوبست کر دیا جائے۔"

"راج مندر...... یہ کہاں ہے؟"

"محل کے اندر...... بہت بڑا مندر ہے۔ اس کے دوار ہفتے میں صرف ایک روز عام لوگوں کے لئے کھلتے ہیں۔"

"چلو منظور ہے۔ وہیں سہی۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"نانکی داس جی!" ہرچرن لال دہاڑا۔

"ہیں..... ہیں...... ہے بھگوان!...... ہری کرشن...... ہری شنکر......" نانکی داس حواس میں آتے ہوئے بولے۔ اور پھر وہ تھر تھر کانپنے لگے۔

"کیا آپ مر رہے ہیں؟" ہرچرن لال دانت پیستے ہوئے بولا۔

"نہیں دیوان جی!...... نہیں منتری جی!...... نہیں سنت جی مہاراج!" اس نے ہم دونوں کی طرف ہاتھ جوڑ لئے۔

"مہان سادھوؤں کو راج مندر لے جایئے۔"

"جو آگیا مہاراج!...... جو حکم مہاراج!" نانکی داس کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ کئی منٹ تک اُلٹے لٹکے رہنے کے بعد اُن کی عقل معدے سے کھوپڑی میں آگئی تھی۔ "چلئے مہاراج!"

"پورن مہاراج سے کہہ کر ان کے رہنے کا عمدہ بندوبست کرا دیں۔"

"جو آگیا مہاراج!" نانکی داس نے بدستور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور ہرچرن لال ہماری طرف

دیکھ کر مسکرایا۔
"آپ کو کوئی کٹھنا نہ ہوگی مہاراج!"
"اسی میں تمہاری مکتی ہے ہرچرن لال!" میں نے کہا اور ہرچرن لال بدستور مسکراتا رہا۔ نانکی داس اب ہمارے سامنے بچھا جارہا تھا۔ راستے میں اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔
"مجھے شما کردیں مہاراج!...... بھگوان کے لئے مجھے شما کردیں۔ میں آپ کا داس ہوں۔ آپ کو نہ سمجھ سکا تھا۔"
"جاؤ، معاف کیا بچہ! سادھوؤں کے بارے میں جانے بغیر اب ایسی کوئی بات منہ سے مت نکالنا۔" طالوت نے کہا اور ہم محل کا راستہ طے کرتے رہے۔ راج مندر، راج محل کی رہائشی عمارت کے عقب میں تھا۔ نہایت عالیشان مندر تھا۔ وسیع وعریض رقبے میں پھیلا ہوا۔ مندر کے صحن میں ایک بہت بڑا ہنومان کا مجسمہ نصب تھا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا دالان تھا۔ دالان سے گزر کر پوجا کا ایسا عظیم الشان ہال تھا، جہاں سینکڑوں آدمی ایک وقت میں آجائیں۔
یہاں سونے چاندی کے بے شمار بت رکھے ہوئے تھے۔ درجنوں پنڈت اور پنڈے پوجا میں مشغول تھے۔ نانکی داس کی معیت میں ہم ان کے درمیان سے گزرتے چلے گئے۔
"کیا خیال ہے عارف! یہاں دیوداسیاں بھی ہوں گی؟"
"راج مندر ہے۔ دیوداسیاں زیادہ ہی ہوں گی۔"
"اور تالاب......" طالوت نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔
"دیکھ لیں گے یار!"
"ویسے عمدہ جگہ ہے۔"
"اس میں کیا شک ہے؟"
"سونے کے ان بتوں کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ مال دار ریاست ہے۔"
"یقیناً۔" میں نے کہا اور پھر نانکی داس ایک دروازے کے پاس پہنچ گیا۔
"جوتیاں اُتار دیں مہاراج!" نانکی داس نے کہا۔
"کیوں...... یہ کون سی جگہ ہے؟"
"آپ ایک بہت بڑے رشی منی کی سیوا میں حاضر ہورہے ہیں۔"
"یہ کون ہیں؟"
"مہاراج پورن لال جی۔ ان سے مل کر آپ کی طبیعت خوش ہوجائے گی۔"
"آپ کی راج دربار میں کیا حیثیت ہے نانکی داس جی؟"
"بس..... داس ہوں، مہاراج گوونداس کپور کا۔ دھرم کے کاموں میں دیوان جی کی مدد کرتا ہوں۔"
"اوہ......" طالوت نے گردن ہلائی۔ اور پھر ہم نے مخصوص ساخت کی سادھوؤں کی کھڑاؤں دروازے پر اُتار دیں اور اندر داخل ہوگئے۔ بڑا سا کمرہ تھا۔ اندر کا ماحول بڑا پُراسرار تھا۔ سیاہ رنگ کا ایک ہیبت ناک مجسمہ کمرے کے درمیان میں رکھا ہوا تھا اور اس کے قدموں میں ایک سڈول جسم کا شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے بدن پر بھی سادھوؤں کا لباس تھا۔ لیکن عام سادھوؤں کی مانند اس کا سر گھٹا

ہوا نہیں تھا۔ بلکہ لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''ہری اوم۔'' نانکی داس نے آہستہ سے کہا۔ لیکن سادھو متوجہ نہیں ہوا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اور کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ہم لوگ بور ہونے لگے تھے۔ اور طالوت کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔

''اُٹھاؤں اسے؟'' طالوت نے غرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ...... رُکو...... دیکھتے رہو۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ تب سادھو نے گردن اُٹھائی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ خاصے لمبے قد کا مالک تھا۔ عام سادھوؤں کی طرح مجرب نہیں تھا۔ بلکہ سڈول بدن رکھتا تھا۔ چہرے سے تیز اور خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہم تینوں کو دیکھا اور پھر بڑے نرم لہجے میں بولا۔

''کیا بات ہے نانکی داس! کون لوگ ہیں یہ؟''

''بڑے گیانی ہیں مہاراج! بہت بڑے سادھو ہیں۔'' نانکی داس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''خوب...... جے رام جی کی مہاراج!'' سادھو نے نرم لہجے میں کہا اور ہم دونوں نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میرے پاس کیسے آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''دیوان ہرچرن لال جی نے بھیجا ہے۔ ان کی اِچھا ہے کہ آپ ان کے لئے مندر میں رہنے کا بندوبست کر دیں۔''

''ہوں۔'' سادھو نے کہا اور ایک بار پھر ہماری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بہت گہری اور ذہن میں اُتر جانے والی تھیں۔ ''مہامنتری کی آگیا کا پالن ہوگا۔ نانکی داس! تم جاؤ۔''

''مہاراج ہرچرن لال جی کی اِچھا ہے کہ ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے۔''

''یہ بھگوان کا گھر ہے نانکی داس! یہاں کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں ہوتا۔'' سادھو پورن لال نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ لیکن یہ بات ہم دونوں نے ہی محسوس کی تھی کہ اس نرم آواز میں بھیڑیے کی سی غراہٹ ہے۔

''مجھے آگیا ہے مہاراج؟''

''ہاں جاؤ۔ چنتا نہ کرو۔ اُن کے ساتھ برا سلوک نہ ہوگا۔''

اور نانکی داس، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر کے چلا گیا۔

''بیٹھو مہاراج!...... مگر ٹھہرو...... تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئے گی۔ آؤ!'' پورن لال نے کہا اور پھر وہ ہمارے ساتھ دروازے سے نکل آیا۔ عظیم الشان مندر کے ایک اور خوب صورت کمرے میں پہنچ کر ہم زمین پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئے۔

پورن لال نے ایک طرف لٹکا ہوا گھنٹہ بجا دیا تھا۔ ایک قوی ہیکل پنڈا اندر آ گیا۔

''سادھو مہاراج آئے ہیں۔ ان کے لئے جل پانی لاؤ۔''

''مہاراج!'' پنڈے نے سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔ تب پورن لال نے روشنی میں ہماری آنکھوں میں جھانکا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کے دانت بھی کسی بھیڑیئے کی مانند تھے اور اُس کی مسکراہٹ بظاہر نرم، لیکن اندر سے بڑی خوف ناک لگتی تھی۔

''آپ کے درشن کر کے بڑی خوشی ہوئی مہاراج! میرا نام پورن لال ہے۔ آپ کا شبھ نام؟''
''تربوز لال..... خربوز لال۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''اوہ......'' پورن لال آہستہ سے بولا۔ اُس نے اس نام پر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں، اُس کی آنکھیں ہمیں ٹٹول رہی تھیں۔ ''آپ دونوں بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں۔'' اس نے کہا۔
''ہاں..... ہم دونوں بھائی ہیں۔''
''کہاں سے آئے ہیں؟''
''پہاڑوں سے۔'' طالوت نے جواب دیا۔ ویسے وہ بھی اب اس ماحول سے واقف ہو گیا تھا اور کافی حد تک فٹ جا رہا تھا۔
''خوب..... تعلق کہاں سے ہے؟''
''پہاڑوں سے۔''
''اوہ...... میں سمجھا..... آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ سچ ہے، سادھو سنتوں کا اس سنسار سے کیا تعلق؟ یہ سنسار ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہر حال، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔''
''یہ بات نہیں ہے پورن مہاراج! سچی بات یہ ہے کہ ہم نے جیون میں پہلی بار اس سنسار کو دیکھا ہے۔ ہم نے پہاڑوں پر آنکھ کھولی، وہیں عمر بتائی۔ اور پھر ہمیں حکم ملا کہ اس سنار کو قریب سے دیکھیں۔ سو ہم چلے آئے۔'' میں نے کہا۔
''بھگوان کی لیلا ہے۔'' پورن لال نے کہا۔ بڑا پکا اور گہرا آدمی تھا۔ اتنی دیر میں پنڈا، تھال اُٹھائے آ گیا۔ اُس کے پیچھے ایک اور پنڈا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کسی خوش رنگ مشروب کے گلاس تھے۔ پہلے پنڈے کے ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھال میں پھل اور مٹھائیاں تھے۔ انہوں نے یہ سب سامان ہمارے سامنے رکھ دیا۔
''شروع کریں مہاراج!'' پورن لال نے کہا اور پنڈوں سے مخاطب ہو کر بولا۔
''ایک کوٹھری مہاراج کے لئے ٹھیک کر دو۔ سنت یہاں آرام کریں گے۔''
''جو آ گیا مہاراج!'' دونوں پنڈے ادب سے بولے اور باہر نکل گئے۔ میں نے کسی قدر تکلف سے کام لیا تھا۔ لیکن طالوت کسی سلسلے میں تکلف کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ دھڑلے سے شروع ہو گیا اور پھلوں اور مٹھائیوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس نے ایک بار بھی پورن لال کو اپنے ساتھ شامل ہونے کے لئے نہیں کہا تھا۔ پورن لال مسکراتی نگاہوں سے ہمیں دیکھتا رہا۔
اور پھر شربت کے کئی گلاس پینے کے بعد طالوت نے ایک ڈکار لی اور اس طرح مجھے اور پورن لال کو گھورنے لگا، جیسے اس سے قبل ہماری موجودگی کو ہی بھول گیا ہو۔
''پوجا شام کو چھ بجے ہوگی مہاراج! اس سمے تک آرام کریں۔'' پورن لال نے پھر گھنٹہ بجایا اور پنڈے آ گئے۔ ''کوٹھری ٹھیک کر دی؟''
''ہاں مہاراج!''
''جاؤ...... انہیں لے جاؤ۔'' پورن لال نے حکم دیا اور ہم باہر نکل آئے۔ کوٹھری تک کا سفر خاموشی

سے طے ہوا۔ جسے کوٹھری کہا گیا تھا، وہ ایک عمدہ اور کشادہ کمرہ تھا۔ روشن اور ہوادار۔ وہاں آرام و آسائش کا سارا سامان موجود تھا۔ طالوت اطمینان سے ایک نرم مرگ چھالہ پر دراز ہو گیا۔

''ایسا لگتا ہے، جیسے سسرال آئے ہو۔'' اُس نے کروٹ بدل کر کہا۔

''لیکن طالوت! میں خود کو بہت سے انجانے خطرات میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔''

''خطرات کی ایسی تیسی۔''

''تم نے کچھ غور کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اب کریں گے۔ مگر کس سلسلے میں؟''

''دیوان ہرچرن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''چالاک اور خطرناک آدمی ہے۔'' طالوت نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ صورت ہی سے خوف ناک معلوم ہوتا ہے، تم لاپروائی سے ٹال رہے ہو۔ حالانکہ میرا خیال ہے، اس نے ہمیں بحالتِ مجبوری برداشت کیا ہے۔''

''جیسے بھی برداشت کرے۔ بہت سے لوگوں نے ہمیں بحالتِ مجبوری برداشت کیا ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''اور پھر یہ پورن لال؟''

''صحیح معنوں میں تو میرے خیال میں پورن لال، ہرچرن لال سے زیادہ ہی خطرناک ہے۔''

''فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں میں کون زیادہ خطرناک ہے۔''

''فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے یار! ہم دونوں کی ناک کاٹ لیں گے۔ تاکہ ناک غائب ہو جائے اور صرف 'خطر' رہ جائیں۔''

''تمہارے لئے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی طالوت! لیکن مجھے غور کرنا پڑے گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہرچرن لال ہمیں نظر انداز کر دے گا۔''

''جب تک زندہ ہوں، تمہارے لئے بھی کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی، سمجھے؟'' طالوت نے کہا۔ اور پھر جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''چھوڑو یار! کیا فضول باتیں لے بیٹھے۔ کچھ رنگین، کچھ دلکش باتیں کرو۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ راج محل ہے۔ رنگینیوں اور دلکشی سے بھرپور ہو گا۔ ہمیں مہم پر نکلنا پڑے گا۔''

''مندر کی سیر کریں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''رات ہونے دو۔ ویسے پوجا ہال میں چلیں گے۔ دیکھیں گے، وہاں کیا پوزیشن ہے۔''

''تب پھر آرام کرو۔'' طالوت نے کہا اور مزے سے لیٹ گیا۔ لیکن میں ان دونوں شخصیتوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ ہرچرن لال اور پورن لال۔ ہرچرن صاحبِ اقتدار۔ گویا گووند اس کپور کی غیر موجودگی میں وہ دربار بھی لگا سکتا ہے۔ اور تنہا حکومت کے کاموں کو نمٹا سکتا ہے۔ اس سے اس کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ گووند اس کپور اس پر بے حد اعتماد کرتا ہے۔

اور...... شاید پورن لال، ہرچرن لال کے خاص آدمیوں میں شامل ہے۔ لیکن یہ شخص بھی ہرچرن لال سے کم خطرناک نہیں ہے۔ خاص طور سے ایسے لوگ بے حد خوفناک ہوتے ہیں، جو بھیڑیے ہونے

کے باوجود بھیڑوں کے انداز میں گفتگو کریں۔ بہرحال، یہ تجربہ بھی دلچسپ رہے گا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

شام کو چھ بجے ہم تیار ہوئے اور پوجا کے ہال میں چل پڑے۔ اندر سے مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے اندر قدم رکھا تو آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

جس مندر میں ہم نے تین روز گزارے تھے، اس کی تو حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ عام مندر تھا اور یہ راج مندر۔ محل کی داسیاں اور رانیاں سبھی موجود تھیں۔ صحیح معنوں میں مردوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ صرف چند مرد اور درجنوں عورتیں۔ یا پھر پنڈے تھے، جو حسبِ معمول پوجا کے کاموں میں مشغول تھے۔ بہت سے پنڈت تھے۔ لیکن پورن لال موجود نہیں تھا۔

''یار! بڑا حُسن بکھرا ہوا ہے۔''

''راجہ کا محل ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ویسے یہ ہندو عورتیں بے حد حسین ہوتی ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے؟''

''ان میں گووند اس کپور کی رانیاں بھی ضرور ہوں گی؟''

''ہاں۔ میرا خیال ہے، داسیاں جن حسیناؤں کو جھرمٹ میں لئے ہوئے ہیں، وہ رانیاں ہی ہوں گی۔''

''اس عورت کو دیکھو۔ میرا خیال ہے، یہ زیادہ عمر کی نہیں ہے۔'' طالوت نے ایک خوب صورت عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا اور میں اس رانی کو دیکھنے لگا۔ بلاشبہ انتہائی پُرکشش خدوخال کی مالک تھی۔ چاند کی مانند دمکتا ہوا چہرہ، زیورات سے لدی ہوئی تھی، اس لئے اور حسین نظر آ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ درمیانہ قد، انتہائی حسین جسم، جو سرخ رنگ کی ساڑھی میں بے حد پُرکشش نظر آ رہا تھا۔

''کیا حسین چہرہ ہے طالوت!'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''پسند ہے تمہیں؟'' طالوت نے کہا۔

''کیا بات ہے اس کی۔''

''تب جاؤ...... تمہیں دی۔'' طالوت نے فراخ دلی سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''ابے، ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تم اُس سے عشق کرنے کے لئے آزاد ہو۔'' طالوت نے مصنوعی انداز میں بگڑتے ہوئے کہا اور میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ ویسے یہ حقیقت تھی۔ وہ کوئی بھی ہو، مجھے پسند آئی تھی اور میں اُس کے لئے دل میں کافی کشش محسوس کر رہا تھا۔

''پوجا جاری رہی۔ پنڈت اشلوک پڑھتے رہے۔ اور پھر پوجا کے خاتمے پر ایک دیوکنیا نے تھوڑی دیر رقص کیا۔ تب پوجا ختم ہو گئی۔ داسیاں، رانیاں مندر سے نکلنے لگیں۔

میں صرف اسی رانی کو دیکھ رہا تھا۔ بڑی نزاکت تھی اُس کی چال میں۔ بے حد پُرکشش عورت تھی، دل چھین لینے والی۔ ہم لوگ بھی پوجا ہال سے باہر نکل آئے۔ اور باہر قدم رکھتے ہی طالوت چونک پڑا۔

''عارف!'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ہوں......''

''ہرچرن لال۔'' طالوت نے کہا اور میں بھی اُس کے اشارے پر ہرچرن لال کی طرف دیکھنے لگا، جو شاید پجاری پورن لال کی طرف جا رہا تھا۔ ''دو خطرناک ملنے والے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں ان سے دُور نہیں رہنا چاہئے۔''

''تب پھر آؤ۔'' ہم اپنے کمرے کی طرف چل پڑے اور پھر انتہائی پھرتی سے تیار ہو کر ہم دونوں پورن لال کی رہائش گاہ کی طرف دوڑے۔ لیکن اس وقت ہم دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔

پورن لال کی رہائش گاہ کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ پنڈے باہر نکل رہے تھے۔ شاید انہیں باہر جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ بہرحال، ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ہرچرن لال ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور پجاری اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا جاتے ہوئے پنڈوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جب آخری پنڈا نکل گیا تو پورن لال نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

اور پھر وہ مسکراتا ہوا ہرچرن لال کی طرف مڑا۔ وہی بھیڑیوں جیسی مسکراہٹ۔

''کیسے ہو پورن لال؟'' ہرچرن نے پوچھا۔

''جی رہا ہوں، مہاراج کی کرپا سے۔''

''خوب گزر رہی ہے؟'' ہرچرن مسکرایا۔

''خوب۔''

''دیومتی رام ہوئی؟''

''ہو جائے گی مہاراج!...... بچ کر کہاں جائے گی؟'' پورن لال نے خوفناک انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... تم سے بچ کر کوئی جا سکا ہے آج تک؟'' ہرچرن لال بولا اور طالوت ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگا۔

پورن لال بدستور ہنس رہا تھا اور ہرچرن گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔

''میں نے دو سادھوؤں کو تمہارے پاس بھیجا تھا پورن لال!''

''پہنچ گئے ہیں مہاراج! اور میں نے آپ کی آگیا کے مطابق انہیں آرام سے ٹھہرا دیا ہے۔''

''میں نے صرف اس لئے انہیں تمہارے پاس بھیجا تھا پورن لال؟''

''میں یہ بھی جانتا ہوں مہاراج! پر آپ سے بات کئے بنا میں کیا کر سکتا تھا؟ اب مجھے ان کے بارے میں بتائیے۔''

''خود تم نے ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا؟''

''معمولی سا۔''

''کیا؟''

''بہت گہرے، بہت چالاک ہیں۔ بس، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔''

''اچانک دربار میں آ گئے۔ ایسے ایسے حیرت انگیز کارنامے دکھائے کہ سارے درباری حیران رہ گئے۔ ان میں سے ایک پاپی تو راج سنگھاسن پر بھی بیٹھ گیا۔ سیناپتی بہت بگڑا۔ اُس نے اسے اُٹھانے کی

کوشش کی، لیکن بہت سے لوگ بھی مل کر اُسے نہ اُٹھا سکے۔"

"طاقت کا کمال ہوگا۔ اُن کے بدن بھی مضبوط معلوم ہوتے ہیں۔"

"ارے نہیں پورن لال! نانکی داس سے پوچھو، جن کی کرسی اُلٹی لٹکی ہوئی تھی اور وہ اس پر بیٹھے تھے۔"

"ہوں۔" پورن لال کی آنکھیں بھی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کئی منٹ تک خاموشی رہی، پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "صورت سے تو ایسے گیانی نہیں معلوم ہوتے۔ اور اگر ہیں تو راج محل میں ان کا کیا کام؟ انہوں نے اپنے آنے کا کارن نہیں بتایا؟"

"مہاراج گووندداس کپور سے ملنے کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"مقصد؟"

"کون پوچھ سکتا تھا؟"

"تو پھر کیا آ گیا ہے ہرچرن لال جی؟"

"میں نے اُنہیں تمہارے حوالے کر دیا ہے پورن لال! میں محل میں کسی خطرناک آدمی کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ حالات ویسے ہی اچھے نہیں ہیں۔"

"ہوں۔" پورن لال کی ہوں بہت طویل تھی۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ہرچرن لال جی! آپ کا داس سب کچھ ٹھیک کر لے گا۔ بڑے بڑے گیانیوں سے اس کا واسطہ پڑا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو پورن لال! ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔"

"بس، آپ چنتا نہ کریں۔ ہاں، وہ مادھوری کی کیا رہی؟" پورن لال مسکرایا۔

"ابھی کیا جلدی ہے پورن لال! وہ کام بھی ہو جائے گا۔ ابھی تو دیومتی کو سنبھالو۔"

"اُسے محل میں آ جانا چاہئے مہاراج! آپ اُسے مجھے دے چکے ہیں۔ باقی کام بھی آپ خود کریں گے۔"

"آ جائے گی...... آ جائے گی۔" ہرچرن لال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ اُٹھ گیا۔ پورن لال اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا اور ہرچرن لال باہر نکل گیا۔

"دو خطرناک انسان۔" میں نے آہستہ سے کہا اور طالوت چونک پڑا۔

"ہاں...... ایک طالوت...... اور دوسرا عارف۔" اُس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"نہیں...... ایک ہرچرن لال اور دوسرا پورن لال۔"

"بکواس ہے۔ دونوں سازشی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا کیا بگاڑیں گے۔"

"پروگرام تو بنا ہے۔"

"دیکھ لیں گے۔" طالوت اکڑ کر بولا اور پھر مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آؤ چلیں۔"

اور پھر ہم دونوں کمرے سے نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنی کوٹھری میں تھے۔

"یہ دیومتی کون ہے؟" طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔

"اور مادھوری۔" میں نے کہا۔

"پورن لال کافی عیاش معلوم ہوتا ہے۔"

"اور ان دونوں کی ملی بھگت ہے۔"

''مگر وہ شیروں کا شیر کہاں روپوش ہے؟''

''گووند اس کپور؟''

''ہاں۔''

''یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی عیاش فطرت انسان ہوگا۔ عورتوں میں گھسا رہتا ہوگا۔ ویسے یار! اس راج مندر میں ابھی تک کوئی تفریح نہیں ہوئی۔''

''صبر کرو۔ یہاں کے حالات معلوم کرو۔ تفریح کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔''

''یار عارف! نہ جانے کیوں، رہ رہ کر مجھے وہ لڑکی یاد آجاتی ہے۔''

''اعتراف کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اُس کے حُسن، اُس کی خوب صورتی، اُس کی پُرکشش آنکھوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد سب فضول بکواس ہے۔ تم نے مجھے اس قدر پکا کر دیا ہے کہ اب ان چکروں میں نہیں پڑتا۔ وہ بھی کسی موٹی توند والے سادھو کے پاؤں دبا کر مکتی حاصل کرنے کے چکر میں ہوگی۔ حسین ضرور تھی، لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ ہمارے مطلب کی بھی ہو۔''

''لیکن ہم تو اُسے تلاش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''یہاں کے ماحول کو دیکھ کر طبیعت مکدر ہو گئی ہے۔ خاص طور سے تلاش نہیں کریں گے۔ ہاں، اگر اس دوران نظر آ گئی تو اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''جو تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

''محل کی سیر نہیں کرو گے؟''

''کر لیں گے۔ میرا خیال ہے، رات کا بھوجن ہو جانے دو۔ اور پھر ممکن ہے، پورن لال جی آج ہی ہم سے ملاقات کی کوشش کریں۔''

''انتظار کریں اس کا؟''

''میری تو یہی رائے ہے۔'' میں نے جواب دیا اور طالوت نے ایک مرگ چھالہ پر لیٹ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ میں بھی خیالات میں گم ہو گیا تھا۔

رات کا کھانا آ گیا۔ ڈھاک کے دونے ایک تھال میں سجے ہوئے تھے۔ مٹھائی، پوریاں، ترکاری اور بہت سی چیزیں۔ دو تھال ہمارے سامنے رکھ دیئے گئے۔ اور پھر کھانا لانے والے چلے گئے تو میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھہر جا یار! بے صبری مت کر۔'' طالوت نے کہا اور میں رُک گیا۔ طالوت نے کھانے پر ہاتھ گھمایا اور نہ جانے کیا کرنے لگا۔ پھر اُس نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پورن لال جی کی نوازشوں کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''زہر وغیرہ؟''

''سب کچھ ہوسکتا ہے۔'' طالوت نے جواب دیا اور ہم کھانے پر پل پڑے۔ ویسے میں طالوت کی بات سے متفق تھا۔ بہرحال، اُس رات پورن لال جی ہم سے ملاقات کرنے نہیں آئے۔ رات کو کافی دیر تک ہم نے اُن کا انتظار کیا اور پھر سو گئے۔

صبح مندر کے گھنٹوں اور ناقوس کی آوازوں سے آنکھ کھلی تھی۔

''لعنت ہے......سونے بھی نہیں دیتے سالے۔'' طالوت نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اُٹھ جائیے خربوز جی مہاراج! پوجا کرنے بھی چلنا ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت اُٹھتے ہوئے بولا۔

''کل سے بجا جائیں یہ کچھ بھی۔ میرا ذمہ۔''

اور پھر ضروری تیاریوں کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ پورن لال جی پوجا کے ہال میں موجود تھے۔ اس وقت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ پنڈے نظر آرہے تھے۔ کچھ عورتیں بھی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ راج محل میں شام کی پوجا زیادہ زوردار ہوتی ہے۔

بہرحال، ہم ان لوگوں کی حرکتیں دیکھتے رہے۔ اور پھر پوجا ختم ہوگئی۔ پورن لال جی مڑے اور ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور ہم نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ لوگوں کو؟''

''سادھو سنتوں کو تکلیف اور آرام کی کوئی چنتا نہیں ہوتی۔'' میں نے جواب دیا۔

''میری اِچھا ہے کہ کچھ سمے آپ کے ساتھ گزاروں۔''

''گزارو۔'' طالوت نے کہا۔

''تب آیئے، صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کریں۔'' پورن لال نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔ پورن لال ہمیں مندر کے ایک دُور دراز حصے میں لے گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ مندر کا یہ حصہ سارے حصوں سے زیادہ خوب صورت تھا۔ سجے سجائے بڑے سے کمرے میں پرانے طرز کا عمدہ فرنیچر موجود تھا۔ پورن لال نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم بیٹھ گئے۔ پورن لال ہمارے سامنے ایک کارنس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کارنس پر کہنی ٹکائے وہ ہمیں گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں مہاراج؟'' اُس نے سوال کیا۔

''سنسار سدھارنے۔'' میں نے جواب دیا۔

''سنسار ٹھیک ہے مہاراج! اور پھر سنسار، راج مندر میں محدود نہیں ہے۔''

''ابتدا یہاں سے کریں گے۔''

''یہاں پورن لال کی حکومت ہے۔''

''ایں......تو یہ گووندا اس کپور کی راجدھانی نہیں ہے؟'' طالوت نے حیرت سے کہا۔

''میں راج مندر کی بات کر رہا ہوں۔''

''کیا راج مندر اس راجدھانی سے الگ ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''نہیں۔لیکن یہاں کے اصول اور ہیں۔ یہاں پورن لال کی مرضی چلتی ہے۔''
''کیا کہنا چاہتا ہے بچہ!......صاف صاف کہہ۔'' طالوت بولا۔
''سب سے پہلے میں تمہاری حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔تم نے اپنے نام غلط بتائے ہیں۔تربوز لال، خربوز لال نام نہیں ہوتے۔''
''تربوز جی مہاراج!'' طالوت جلال سے بولا۔
''مہاراج خربوز!''
''اس پاگل کو سمجھاؤ......اسے بتاؤ کہ ہمارے پتا گوبھی چند نے ہمارا یہی نام رکھا تھا۔اب یہ کہے گا کہ گوبھی چند بھی نام نہیں ہوتا تو ہم اپنے دادا، لالہ بینگن رائے کا نام لیں گے۔اس سے پوچھو، اسے ہمارے ناموں پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟''
''جواب دو پورن لال؟'' میں نے کڑک کر کہا۔
''مجھے کوئی ادھیکار نہیں ہے مہاراج! آپ نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔'' پورن لال نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ چونک کر بولا۔''ارے ہاں مہاراج!...... میں بھوجن کا بندوبست کروں۔''
اور پھر وہ باہر نکل گیا۔تب چالاک طالوت میری طرف متوجہ ہوا۔
''بھائی تربوز!''
''خربوز جی مہاراج!'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
''اس وقت کے بھوجن میں ضرور گڑبڑ ہوگی۔''
''ہونی چاہئے۔میرے خیال میں پورن لال اس وقت ہم سے معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا، لیکن مایوس ہو گیا۔''
''راسم......!'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔
''آقا!'' راسم کی آواز سنائی دی۔
''کھانا بدل جانا چاہئے۔''
''تعمیل ہوگی آقا!'' راسم کی آواز آئی اور طالوت اطمینان سے بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد پورن لال واپس آ گیا۔اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
''میں بھوجن کے لئے کہہ آیا ہوں۔ابھی آتا ہوگا۔اور کیا سماچار ہیں مہاراج!''
''درگا پور میں بڑے پاپ ہو رہے ہیں پورن لال! ہمارا خیال ہے، ہم درگا پور والوں کو ٹھیک کر دیں۔مندر بھگوان کا گھر ہوتا ہے۔تم جیسے لوگوں نے اسے بھی خراب کر دیا ہے۔''
''آپ ہم سب کو ٹھیک کر دیں مہاراج!'' پورن لال مسکراتے ہوئے بولا۔
''اوش......اِوش...... چنتا نہ کرو۔''
''آپ کو مندر کے کاموں سے دلچسپی نہیں ہے مہاراج؟''
''پوجا پاٹ کسے پسند نہیں ہوتی؟ پرنتو اس کے علاوہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھگوان کے ساتھ ٹھٹھول ہے۔بھگوان ڈھیل دیتا رہتا ہے۔مگر جب وہ رسّی کھینچتا ہے تو بڑی موٹی موٹی گردنیں اس میں پھنسی رہ جاتی ہیں پورن لال!''

''جب تک وہ ڈھیل دے رہا ہے مہاراج! چنتا کیسی۔ جب وہ رسّی کھینچے گا، تب دیکھی جائے گی۔''
پورن لال نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔
اتنی دیر میں دو پنڈے تھال لے آئے۔ تین تھال تھے۔ دو تھال ہم لوگوں کے سامنے رکھ دیئے گئے
اور ایک پورن لال کے سامنے۔
''شروع کریں مہاراج!'' پورن لال نے کہا اور ہم شروع ہو گئے۔ پورن لال دلچسپ نگاہوں سے
ہمیں دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نے کھانا ختم کر لیا۔
''اور کیا سیوا کروں مہاراج؟''
''جو کچھ کر چکے ہو، وہ کافی نہیں ہے پورن لال؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھا نہیں مہاراج! کسی چیز کی کمی رہ گئی؟'' پورن لال نے کہا۔
''ہاں۔''
''وہ کیا مہاراج؟''
''تمہارے اندر عقل کی۔ تم نے یہ نہیں سوچا پورن لال! کہ سادھو سنتوں پر ایسی چیزیں اثر نہیں
کرتیں۔'' طالوت نے کہا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''چلیں بھائی تربوز لال؟''
''چلیئے مہاراج!'' میں نے کہا اور ہم دونوں اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ پورن لال خوف ناک نگاہوں
سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم اپنی کوٹھری میں آ گئے۔
''تو طے ہو گیا عارف! کہ ہمارا پہلا شکار پورن لال ہی ہے۔''
''اب تو ہے ہی۔ پہلا وار اس نے کیا ہے۔''
''دوسرا ہم کریں گے۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور خاموشی سے مرگ چھالہ پر بیٹھ گیا۔
میں بھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگا تھا۔ اچانک طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔
''عارف!''
''ہوں۔'' میں چونک پڑا۔
''کیوں نہ ہم مر جائیں۔''
''کیا مطلب؟''
''تھوڑی دیر کے لئے پورن لال کو خوش کر دیں۔''
''اس سے کیا فائدہ ہو گا؟''
''تفریح...... یوں بھی دن گزارنا ہے...... رات کو کچھ کارروائی کریں گے۔''
''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ تب طالوت نے دو گولیاں نکالیں۔ ایک
اپنے منہ میں ڈالی اور دوسری مجھے دے دی۔
''اسے چبا لو۔'' طالوت اپنی گولی چباتے ہوئے بولا۔ اور گولی چبانے سے ہمارے منہ سے فیروزی
رنگ کا پانی بہنے لگا۔ ''بس لیٹ جاؤ۔ اس انداز سے، جیسے بڑی اذیت سے دم نکلا ہو۔''
''بلاشبہ، طالوت کا خیال غلط نہیں تھا۔ پورن لال کو یقین نہیں تھا کہ زہر آلود کھانا کھانے کے بعد بھی
ہم بچ گئے ہوں گے۔ ہماری کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک پنڈا اندر گھس آیا۔

''مہاراج!.......مہاراج!'' اُس نے زور زور سے آوازیں دیں۔ لیکن ہم دم سادھے پڑے رہے۔
''مہاراج! سورہے ہیں کیا؟'' اُس نے گھگھیاتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر دو تین بار ہمیں جھنجھوڑنے کے بعد باہر بھاگا۔
''بھائی تربوز!'' طالوت اسی انداز میں پڑے پڑے بولا۔
''ہوں۔''
''ہوشیار.......اطلاع جارہی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور طالوت خاموش ہو گیا۔ ہمیں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد باہر سے کئی آوازیں سنائی دیں اور پھر بہت سے لوگ اندر گھس آئے۔ آگے آگے ہرچرن لال اور پورن لال تھے۔ اُن کے چہرے جوش سے سرخ ہو رہے تھے۔ دونوں ہی جھک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے مسرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
''آپ نے انہیں بہت بڑا مان لیا تھا ہرچرن مہاراج! پورن لال کی بات اور ہے۔'' پورن لال نے فخر سے کہا۔
''تم نے دربار میں نانکی داس کی درگت دیکھی ہوتی پورن لال! تو تم بھی حیران رہ جاتے۔ بہر حال، تمہاری کامیابی، بھگوان کی کرپا ہے۔ یہ تو تم بھی نہ معلوم کر سکے کہ یہ تھے کون؟''
''سر پھرے تھے سسرے۔ اس کے علاوہ کیا۔ راج مندر میں رہ کر مفت کی روٹیاں توڑنا چاہتے تھے۔''
''لیکن.......لیکن.......بہر حال.......اب کیا کیا جائے پورن لال؟'' ہرچرن لال نے پوچھا۔
''کچھ نہیں مہاراج! پنڈے انہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔ مہمان لوگ تھے، آکاش پر چلے گئے۔''
''مہاراج تربوز!'' طالوت نے آواز لگائی اور ہرچرن لال اور پورن لال اس طرح اُچھل پڑے، جیسے پیروں کے نیچے سانپ آ گیا ہو۔ اُن کے منہ سے گھگھیائی ہوئی آوازیں بھی نکل گئی تھیں۔
''ہے رام.......ہے بھگوان.......ہے رام.......ہے بھگوان۔'' پنڈے دیوار سے ٹک گئے۔ مجھے ہنسی آرہی تھی۔
''ابے سو رہے ہو کیا؟'' طالوت زور سے بولا۔
''صبح ہو گئی بھائی خربوز؟'' میں نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے، دوپہر بھی ہو گئی۔'' طالوت اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
ہرچرن لال پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پورن لال کا سینہ بھی زور زور سے پھول پچک رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔
''ارے.......ارے.......کیا ہوا پورن لال جی؟.......کیا ہو گیا؟.......تم لوگ.......تم لوگ.......سب.......بھائی تربوز!''
''کیا تکلیف ہے ان لوگوں کو؟'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
''کچھ نہیں مہاراج! مہامنتری ہرچرن لال آپ کے درشن کو آئے تھے۔'' پورن لال سنبھل کر بولا۔
''اچھا، اچھا.......بھائی تربوز!.......تربوز جی مہاراج!''
''مہاراج خربوز۔''

"درشن کرادو۔"
"کرادوں؟" میں نے کہا۔
"بالکل...... بالکل۔" طالوت نے کہا۔
"چلیں مہاراج! آپ کی منوکامنا پوری ہو گئی۔" پورن لال نے ہرچرن لال کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا اور ہرچرن لال جلدی سے مُڑ گیا۔ دونوں بڑی بدحواسی سے دروازے سے نکلے تھے۔

طالوت نے مجھے آنکھ ماری اور ان کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھ لیا۔ طالوت بھی عام نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے ہم دونوں باہر نکل آئے۔ پنڈے پہلے ہی رفوچکر ہو گئے تھے۔ ہرچرن لال اور پورن لال اسی حصے کی طرف جا رہے تھے، جہاں پورن لال نے ہم سے ملاقات کی تھی۔ ہم اُن کے دونوں طرف چلنے لگے۔ اور پھر وہ اسی کمرے میں داخل ہو گئے۔
"یہ کیا ہوا پورن لال؟" ہرچرن لال نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔
"میں کیا بتاؤں مہاراج!" پورن لال جھینپے ہوئے سے لہجے میں بولا۔
"تم نے انہیں ہوشیار کر دیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ تم انہیں جس قدر معمولی سمجھ رہے ہو، وہ نہیں ہیں۔"
"مجھے بہت حیرت ہیں مہاراج! وِش میں نے ہی کھانے میں ملایا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک بات کہی تھی۔"
"کیا؟"
"انہوں نے کہا تھا کہ سادھوسنتوں پر یہ چیزیں اثر نہیں کرتیں۔"
"اس کے بعد بھی تم نے انہیں مُردہ سمجھ لیا؟"
"ان کے منہ سے نیلا پانی نکل رہا تھا مہاراج! آپ نے خود بھی دیکھا ہو گا۔"
"بہت برا ہوا پورن لال!...... بہت برا ہوا۔ انہوں نے ہماری باتیں بھی سن لی ہوں گی۔"
"اب کیا کیا جائے ہرچرن لال جی؟"
"متلکا مہاراج کے چرنوں میں جانا ہو گا۔ ان بھوتوں کو وہی ٹھیک کریں گے۔"
"وہ تیار نہ ہوں گے مہاراج!"
"انہیں تیار کرنا ہی ہو گا۔ اس سمے وہ ہماری سہائتا نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ ہمیں اُن کی ضرورت ہے۔"
"آپ جائیں مہاراج!"
"ہاں...... میں آج ہی رات کو جاؤں گا۔ آپ سمجھ نہیں رہے پورن لال! ان دونوں سادھوؤں کی یہاں موجودگی ہمارے لئے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا کام بھی رُک سکتا ہے۔"
"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" پورن لال پُرخیال انداز میں بولا۔ اور اس کے بعد وہ دونوں خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ طالوت معنی خیز انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔
پھر ہرچرن لال اُٹھ گیا اور پورن لال سے کچھ کہے بغیر دروازے سے نکل گیا۔ پورن لال اب بھی

گردن جھکائے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ اُٹھا، اپنے بدن سے بھبھوت ملی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد وہ ایک بت کے قدموں میں جا بیٹھا۔

طالوت نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنی کوٹھری میں تھے۔ ''اس کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کوئی سازش۔''

''یار! یہاں سازشوں کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے؟''

''بہت کچھ ہوتا ہے طالوت! چھوڑو ان باتوں کو۔ اب بتاؤ، کیا پروگرام ہے؟''

''موجودہ پروگرام بھی خاصا دلچسپ ہے۔ رات کو کچھ ہنگامے کریں گے۔ اب آرام کریں۔''

طالوت لیٹ گیا۔ میں بھی اس کے نزدیک ہی لیٹ گیا تھا۔

''یہ تلکا کیا ہوتا ہے؟'' تھوڑی دیر کے بعد طالوت نے پوچھا۔

''اللہ ہی بہتر جانے۔''

''ہوگا کچھ۔ اُسے بھی دیکھ لیں گے۔ لیکن اس پورن لال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا سلوک کیا جائے اس کے ساتھ؟''

''بات تفریح سے آگے نہیں بڑھنی چاہئے۔ ویسے ان لوگوں کو خوب زچ کرو۔ نہ جانے کیا چکر چلا رکھے ہیں سالوں نے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوکے چیف!...... جیسا آپ کہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔'' طالوت نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔ یقیناً اُس کا شیطانی دماغ شرارتیں ترتیب دے رہا ہوگا۔ میں بھی خاموش رہا تھا۔

دوپہر کو بھی ہمارے لئے عمدہ کھانا آیا۔ اب ایسی کوئی حرکت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے ہم نے اطمینان سے کھانا کھایا اور پھر باہر نکل آئے۔ طالوت اور میں پورے مندر کا گشت کرتے پھرے۔ پنڈے ہمیں دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتے تھے لیکن کوئی ہم سے مخاطب نہ ہوا اور ہم مٹر گشت کرتے رہے۔ اور پھر دیوداسیوں والے حصے میں جا نکلے۔

عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھیں۔ لیکن انہوں نے ہمیں دیکھ کر کام چھوڑ دیئے اور ہمارے گرد جمع ہوگئیں۔

''سنا ہے آپ دونوں بڑے گیانی ہیں مہاراج!'' ایک شریر سی لڑکی نے کہا۔

''کیا چاہتی ہو؟'' طالوت نے کہا۔

''آپ کی عمر کیا ہے؟'' لڑکی تڑ سے بولی۔

''ایک ہزار سال۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''دوسرے مہاراج کی بھی اتنی ہی ہوگی؟''

''نہیں...... ہم دونوں میں ایک گھنٹے کا فرق ہے۔''

''ایک گھنٹہ؟'' لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''کیا آپ دونوں جڑواں ہیں مہاراج؟''

''ہم تمہیں جڑے ہوئے نظر آرہے ہیں؟'' طالوت آنکھیں نکال کر بولا۔

''ہم آپ کی کیا سیوا کریں؟...... کچھ جل پانی؟''

''پانی ہم ہفتے میں ایک بار پیتے ہیں۔ آرام کرو تم لوگ۔'' طالوت نے کہا اور پھر چونک کر ایک لڑکی کو اشارہ کیا۔ ''تیرا کیا نام ہے سندری؟''

''نروپا مہاراج!''

''ہوں۔ میں تیرے ماتھے پر باگیشوری کا استھان دیکھ رہا ہوں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا تربوز جی مہاراج؟''

''بالکل ٹھیک۔ روگ باگیشوری سات لڑیوں کی مالا لئے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کیا تُو گاتی ہے لڑکی؟'' میں نے کہا۔

''بھجن مہاراج!...... مہاراج پورن لال کو میری آواز بہت پسند ہے۔'' لڑکی جھانسے میں آگئی۔

''ٹھیک ہے۔ جس کے ماتھے پر باگیشوری جگمگائے، اس کے کیا کہنے۔ ہم نے یہ مالا ایک اور لڑکی کے ماتھے پر بھی دیکھی تھی۔''

''کون تھی وہ مہاراج؟''

''ہم اُس کا نام نہیں جانتے...... حلیہ بتا سکتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''وہی بتائیں۔''

اور طالوت نے یادداشت کے سہارے اُس پُراسرار لڑکی کا حلیہ بیان کر دیا، جو ایک بار نظر آنے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ اور میں طالوت کی چال سمجھ گیا۔ گویا وہ لڑکی ابھی تک طالوت کے ذہن سے چپکی ہوئی ہے۔ بڑا گہرا ہے یہ شخص...... لیکن نہ جانے کیوں طالوت اُس کی تلاش میں اپنی پُراسرار قوتوں سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اُسے لڑکی کی تلاش میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ اُس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اور میں خود بھی اُسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''وہ دیوداسی تھی مہاراج؟'' نروپا نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''درگا پور، دیوداسیوں سے بھرا پڑا ہے۔ نہ جانے کون ہوگی اور کہاں ہوگی۔'' لڑکی نے جواب دیا اور طالوت خاموش ہوگیا۔ پھر ہم یہاں سے بھی چلے آئے۔ شام کی پوجا میں ہم حسبِ معمول شریک تھے۔ شام بڑی حسین ہوتی تھی۔ پورا راج مندر اندر کا اکھاڑا بن جاتا تھا۔ سارے محل کی حسین عورتیں یہاں جمع ہو جاتی تھیں۔

لیکن آج وہ من موہنی نظر نہ آئی، جسے دیکھ کر میں کل بہت متاثر ہوا تھا۔

''سمجھ گیا۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تیری نگاہیں کسے تلاش کر رہی ہیں؟...... بھیجوں راسم کو؟''

''فضول بکواس۔ میں کسی کو تلاش نہیں کر رہا۔'' میں نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔

پوجا کے بعد پورن لال ہمارے پاس آیا۔ اُس کے چہرے سے خجالت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''تھوڑا سا سمے مجھے دیں گے مہاراج؟'' اُس نے خجالت سے کہا۔

"ضرور دیں گے پورن جی۔ فرمایئے؟" طالوت نے کہا۔
"میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
"کچھ جل پانی بھی ضرور ہوگا۔"
"ضرور مہاراج!....... میرے بھاگ۔"
"اب کے اس میں کیا ملاؤ گے؟" طالوت ہنس کر بولا۔
"داس کو سبق مل چکا ہے مہاراج! داس آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔"
"آؤ تربوز لال جی!" طالوت نے میرا شانہ پکڑتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر ہم پورن لال کے ساتھ چل پڑے۔ پورن لال ہمیں اپنی اسی نشست گاہ میں لے گیا تھا۔ اُس نے بڑی عاجزی سے ہم سے بیٹھنے کے لئے کہا اور ہم بیٹھ گئے۔
"مہاراج!" اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "میں بڑا پاپی ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا۔ لیکن قصور میرا نہیں ہے مہاراج! آپ جانتے ہیں، آپ کو ہرچرن لال نے بھیجا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔ لیکن ہرچرن لال بلاوجہ ہمارا دشمن کیوں ہوگیا؟" طالوت نے پوچھا۔
"وہ ڈرتا ہے مہاراج!"
"کیوں؟"
"آپ جانتے ہیں، راج محلوں میں نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ ہرچرن لال جی منتری ہیں مگر ان کی ہوس بڑھی ہوئی ہے۔ وہ مہاراج گووند اس کپور کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ اگر آپ معمولی منش ہوتے تو انہیں پروا نہ ہوتی۔ مگر آپ کا گیان، آپ کا منتر دیکھ کر وہ ڈر گئے کہ کہیں آپ ان کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔"
"سادھوؤں کو راج محل سے کیا لینا ہے بالک! ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کا بھانڈا پھوڑتے پھریں؟ ہم تو سنسار سدھارنے کے لئے آئے تھے۔ یہی ہمارا کام ہے۔" میں نے کہا۔
"آپ مہان ہیں مہاراج! اس داس کو شما کر دیں۔ داس کو آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بس ہرچرن لال کے کہنے میں آ کر میں نے آپ سے دھوکا کیا تھا۔ مجھے شما کر دیں مہاراج! میں تو آپ سے گیان لینا چاہتا ہوں۔"
"تلکا کون ہے پورن لال جی؟" میں نے کہا۔ اور میری بات کا وہی ردِعمل ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ پورن لال کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھتا رہ گیا۔ پھر اُس نے تھوک نگلا اور اُس کے منہ سے نکلا۔
"ہے بھگوان!....... ہے بھگوان!"
"تلکا کون ہے پورن لال؟ ہمیں معلوم ہے، اب ہرچرن لال اُس کے پاس جائے گا۔"
"آپ....... آپ مہان ہیں مہاراج!...... تلکا پنڈت، درگا پور کے سب سے بڑے پجاری ہیں۔ انہیں سینکڑوں منتر آتے ہیں۔ پورے سنسار میں ان جیسا گیانی کوئی نہ ہوگا۔"
"ہوں...... ٹھیک ہے۔ انہیں بھی دیکھ لیں گے۔" اس بار طالوت نے کہا۔
"مہاراج!....... مہاراج! میری بڑی مٹی خراب ہوئی ہے۔"

''کیوں...... تمہیں کیا ہو گیا؟''

''میں ہرچرن لال کے ہاتھوں میں کھلونا ہوں۔ اُس کی بات نہ مانوں تو وہ میرے پران لے لے گا۔ وہ بڑا خطرناک ہے مہاراج!...... میری بڑی مصیبت آ گئی۔ آپ جیسے مہان سادھوؤں سے دھوکا کرتے ہوئے بھی جان جاتی ہے اور دوسری طرف...... ہے بھگوان! میں کیا کروں؟''

''تُو چنتا نہ کر پورن لال! ہرچرن جو کرتا ہے، کرنے دے۔ سادھوؤں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''میری رائے ہے مہاراج! تلکا جی کے آنے سے پہلے آپ یہاں سے چلے جائیں۔ بڑی کرپا ہو گی مہاراج! میرا جیون بھی بچ جائے گا۔''

''یہ ناممکن ہے پورن لال! ہم اُس سے ڈر کر چلے جائیں؟''

''میری مان لیں مہاراج!''

''ناممکن۔'' طالوت گرج کر بولا۔

''آپ تلکا ناتھ جی کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ فیصلہ کر لیں۔''

''ٹھیک ہے، اُسے آنے دو۔''

''برابر والی کوٹھری میں چھپ کر آپ اُن کی باتیں سن لیں۔ میں چپ چاپ آپ کو وہاں چھپا دوں گا۔ پر مجھے شما کر دیں مہاراج! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو باہر نکلنے کا چور راستہ بھی بتا دوں۔ آپ وہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''چور راستہ کون سا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''آیئے۔'' پورن لال نے کہا اور طالوت کھڑا ہو گیا۔ مجھے بھی مندر کے اس چور راستے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ پورن لال ایک دیوار کے پاس پہنچا۔ اُس نے دیوار کی کوئی کل دبائی اور دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ایک دروازہ بن گیا اور میں اور طالوت، پورن لال کے اشارے پر اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف تاریکی تھی۔ صرف چھت سے روشنی آ رہی تھی۔ لیکن وہ ایک مختصر سے حصے کو روشن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر رہی تھی۔ ہم دونوں اندر پہنچ گئے۔

لیکن اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ہم چونک پڑے تھے۔

''پورن لال......!'' طالوت نے پکارا۔

''دھوکا کر گیا یار!'' میرے منہ سے نکلا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی سوائے اس ننھے سوراخ کے جو چھت میں تھا اور کافی بلندی پر تھا۔ طالوت دانت پیس رہا تھا۔

''میرا خیال ہے، اُس نے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی ہے۔'' طالوت غراتے ہوئے بولا۔ ''گویا اتنی دیر تک وہ اپنی باتوں سے ہمیں احمق بناتا رہا تھا۔''

''یقیناً۔ اور یہ اُس کی آخری کوشش تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''ہوشیار ہو جاؤ طالوت! اس نے ہمیں صرف قید کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہو گی۔''

''پروا مت کرو یار! ہاں، یہ سوچو کہ اُس نے جو گفتگو کی تھی، جھوٹ تھی؟''

''ان حالات میں اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔''

"تو ان پورن لال جی کا کریا کرم جلد ہو جانا چاہئے۔ اچھا پورن لال جی! آپ بھی کیا یاد کریں گے۔" طالوت گردن ہلانے لگا۔ اور پھر اُس نے چھت کے سوراخ کو دیکھا۔

اور اچانک ہمیں تاریک کمرے کے دائیں کونے سے کھٹکے کی ایک آواز سنائی دی، اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک پھنکار۔

"سانپ۔" میرے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی اور طالوت بھی چونک پڑا۔ سانپ تھا کہ مصیبت، اتنی تیزی سے حملہ آور ہوا کہ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ ہم نے دوسرے کونے میں چھلانگ لگائی اور سانپ بھی خوف ناک انداز میں پلٹ پڑا۔ شاید وہ بہت زیادہ بھوکا تھا، یا مخصوص طریقے سے ستایا ہوا تھا، اسی لئے غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

طالوت نے صورتِ حال بھانپ لی۔ دوسرے لمحے اُس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ایک طرف کھینچا۔ اور اُس کی یہ حرکت میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ دوسرے لمحے روشنی کا احساس ہوا۔ اور اردگرد کا ماحول دیکھا تو ہم اپنی کوٹھڑی میں تھے۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

طالوت البتہ خاموش تھا۔

اور یہ خاموشی ...... میں اسے اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کئی منٹ کے بعد میرے حواس بحال ہوئے اور میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ "بری طرح پھنس گئے تھے یار!"

"اُس کی ایسی تیسی۔ چلو تیار ہو جاؤ۔"

"تیار ہوں برادر!" میں نے گہری سانس لے کر کہا اور طالوت نے نگاہوں کے سامنے سے غائب ہونے کا عمل کیا۔ میں نے بھی دوشالہ اوڑھا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ طالوت خاموشی سے اس طرف بڑھ رہا تھا، جہاں تھوڑی دیر قبل ہم دونوں تھے۔ پورن لال اب بھی اسی کمرے میں موجود تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

ہمیں اندر داخل ہوئے چند لمحات ہی گزرے تھے کہ دو پنڈے آ گئے اور پورن لال اُنہیں دیکھنے لگا۔

"رانی جی آ گئیں مہاراج!"

"آ گئیں؟" پورن لال اُچھل پڑا۔

"ہاں مہاراج!......وہ استھان پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"اوہ...... بالدیو...... غلطی ہو گئی۔ میں تمہیں منع کرنا بھول گیا۔ آج میرا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ آج میں بہت پریشان ہوں۔ خیر سنو، تم دونوں یہاں رُکو۔ اس دروازے پر نگاہ رکھو۔ اور ہاں، دھارے اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ کوئی نکلنے کی کوشش کرے تو خیال کئے بنا ہی گردنیں اُڑا دینا۔ میں ذمے دار ہوں۔"

"جو آ گیا مہاراج!" پنڈے مرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا کہا ہے تم نے رانی دیومتی سے؟"

"وہی مہاراج! جو آپ نے آگیا دی تھی۔"

"ہوں۔" پورن لال نے کہا اور پھر وہ اس کمرے سے نکل آیا اور اس سے ملحق ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اُس نے لباس تبدیل کیا، آنکھوں میں کاجل لگایا، بدن سے خوشبو ملی اور پوری طرح تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ اب وہ راج مندر کے ایک مخصوص حصے کی طرف جا رہا تھا اور ہم دونوں

خاموشی سے اُس کے پیچھے چل رہے تھے۔ تالاب والے راستے سے گزر کر وہ مندر کے سب سے دُور دراز حصے میں پہنچ گیا، جو کافی ویران تھا۔ اس طرف پنڈے وغیرہ بھی نہیں تھے۔ پورن لال ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

ایک چوڑا صحن تھا، جس میں پیپل کا ایک درخت پھیلا ہوا تھا۔ دالان میں کئی مجسمے موجود تھے اور پھر ایک دروازہ تھا۔ پورن لال اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اندر روشنی تھی اور اس روشنی میں چودھویں رات کا چاند جگمگا رہا تھا۔ لمبے لمبے بال کمر سے گزر کر زمین تک پہنچ رہے تھے۔ دودھ جیسا سفید اور چمک دار چہرہ، اُلجھنوں کی تصویر بنا ہوا تھا۔

یہ وہ حسین عورت تھی، جسے میں نے پوجا کے دوران راج محل کے مندر میں دیکھا تھا اور کافی متاثر ہوا تھا۔

''اے عارف!'' طالوت نے میرا شانہ دبایا۔

''ہوں۔''

''تیرے والی۔''

''وہی ہے۔''

''مگر رانی دیومتی؟''

''ممکن ہے، رانی ہی ہو۔''

''مگر بڑی کمسن ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ راجے مہاراجے بڑے عیاش ہوتے ہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''پورن لال کی نمسکار سویکار ہو مہارانی!'' پورن لال نے اندر داخل ہو کر بڑے میٹھے لہجے میں کہا اور رانی چونک پڑی۔

''نمسکار مہاراج!'' خوب صورت عورت جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

''پدھاریئے مہارانی!...... پدھاریئے۔ داس اس قابل نہیں ہے کہ آپ اسے اتنا بڑا رُتبہ دیں۔''

''آپ مہان ہیں مہاراج! آپ کے من میں بھگوان کی دی ہوئی جوتی ہے۔''

''ہری رام...... ہری شنکر...... بس دیا ہے مرلی منوہر کی۔'' پورن لال اُس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا مہاراج؟''

''ہاں مہارانی! سنسار کی تکلیفیں ہماری نگاہوں سے چھپی نہیں رہتیں۔ ہمارے کانوں میں دُکھی من کی پکار سرگوشیاں کرتی رہتی ہے۔ مہارانی اُداس تھیں، ہم نے اپنی قوتوں کو آواز دی اور انہوں نے ہمارے کان میں بہت سی باتیں کہیں۔ تب ہم چپ نہ رہ سکے۔''

''آپ مہان ہیں مہاراج!''

''ارے ہم کیا اور ہماری ذات کیا۔ بس گرو کی دیا ہے۔ کیا آپ ہمیں من کی بات نہ بتائیں گی مہارانی؟...... ہم آپ کی زبان سے آپ کے من کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔''

''اپنے من کی جوت سے کام لیں مہاراج! میری جیب نہ کھل سکے گی۔''

''سادھوسنت دنیا تیاگ چکے ہوتے ہیں رانی دیومتی! ان سے شرم بیکار ہے۔ وہ تو سنسار کو دُکھوں سے نکالنے کا کام کرنے کے لئے زندہ رہتے ہیں اور بس۔ آپ کھل کر من کی بات کہہ دیں۔''

دیومتی نے سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرے پر شرم کے آثار تھے اور پورن لال ہوس ناک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش کھڑے اس بھیڑیے کے شکار کرنے کا انداز دیکھ رہے تھے۔

''بولئے رانی دیومتی!'' بالآخر پورن لال نے کہا۔

''ہم کیسے بولیں پورن جی!...... جیب نہیں کھلتی۔''

''میں کہہ چکا ہوں رانی! سادھوسنتوں سے شرم اچھی نہیں ہوتی۔''

''مہاراج...... مہاراج کو جانے کیا ہو گیا ہے۔''

''کیا بات ہے؟ مجھے بتائیں۔''

''عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ میرے تو پاس ہی نہیں آتے۔ میں...... میں وِواہ ہونے کے بعد سے اب تک...... اب تک کنواری ہوں۔'' دیومتی نے آنچل منہ میں ٹھونس لیا اور پورن لال کی آنکھوں میں شیطان اُتر آیا۔

''اتنی رانیاں ہیں...... مگر آپ کی ٹکر کی ایک بھی نہیں۔ کیا مہاراج اندھے ہو گئے ہیں؟'' پورن لال نے کہا۔

''میں کیا جانوں؟'' دیومتی مسکراتی ہوئی بولی۔

''حالانکہ مہاراج نے بڑے چاہ سے آپ کو بیاہا تھا۔''

''آپ...... آپ نہیں سمجھتے پورن لال جی!''

''میں سب سمجھتا ہوں رانی دیومتی! دھن واد ہے آپ کو کہ اس کے باوجود آپ نے اتنا سے گزار لیا اور زبان سے اُف تک نہ کی۔''

''اُف تو ہم نے کبھی نہیں کی پورن جی!'' دیومتی اُداس لہجے میں بولی۔

''ہم نہیں سمجھے مہارانی؟''

''یہ وِواہ ہماری مرضی سے تو نہیں ہوا مہاراج! ہمیں تو جیتے جی نرکھ میں جھونکا گیا ہے۔''

''ہم اب بھی نہیں سمجھے مہارانی!'' پورن لال نے کریدتے ہوئے کہا۔

''ہم سادھنا کے زمیندار کی پتری ہیں مہاراج گوونداس کپور شکار کھیلنے گئے تھے، جب انہوں نے ہمیں دیکھا۔ پھر کون ہمیں ان سے بچا سکتا تھا؟ ہمارے پتا کو حکم دیا گیا کہ ہمارے وِواہ کی تیاریاں کی جائیں۔ پتا جی کیسے انکار کر سکتے تھے۔ کولہو میں نہ پلوا دیا جاتا۔ بے چارہ ست پرکاش۔'' رانی نے ایک سسکی لی۔

''ست پرکاش کون ہے مہارانی؟'' پورن لال دلچسپی سے بولا۔

''ہمارے بچپن کا ساتھی...... ہمارا پریمی...... ہم ساون بھادوں کی طرح پریم کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ پرنتو...... پھر ساون بھادوں ہی ہو کر رہ گئے ایک دوسرے کے لئے...... ہم بچھڑ گئے، کبھی نہ ملنے کے لئے۔''

''وہ کہاں ہے رانی دیومتی؟''

''نہ جانے کہاں ہوگا؟......نہ جانے جیتا بھی ہوگا یا مر گیا۔'' دیومتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''سچ مچ بڑا انیائے ہوا ہے تمہارے ساتھ...... مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے رانی دیومتی۔ مگر گووند اس کپور کو کیا ہوا؟ کیا مہاراج کی آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا ہے؟''
''ہماری حیثیت ایک داسی کی سی ہے مہاراج! کھا لیتے ہیں، پی لیتے ہیں، سو جاتے ہیں اور بس۔''
''بڑا انیائے ہوا ہے آپ کے ساتھ۔ ہم نے جھوٹ تو نہ کہا تھا۔ مگر رانی! آپ ہمت سے کام کیوں نہیں لیتیں؟''
''کیا کریں؟......بتاؤ، ہم کیا کریں؟''
''گووند اس مہاراج نے آپ کی کومل جوانی خاک میں ملائی ہے، آپ اس کی قیمت کیوں نہیں وصول کر لیتیں؟''
''ہم کیا کریں؟......کیسے کریں؟''
''آپ کا بالک درگا پور کا راجہ ہونا چاہئے۔ آپ کا بالک درگا پور کا راجکمار ہونا چاہئے۔ آپ ایسی کوششیں کیوں نہیں کرتیں؟''
''ہمارا بالک......کیسی باتیں کرتے ہیں پورن مہاراج!...... بالک آسمان سے گرے گا؟'' دیومتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''سادھو کے پاس سارے علاج موجود ہیں دیومتی!'' پورن لال اصلیت پر آ گیا۔
''ہم نہیں سمجھے مہاراج!''
''بھگوان آپ کو بالک دے گا۔ میں آپ کی سہائتا کروں گا۔ مگر آپ کو بھی کچھ کرنا ہوگا۔''
''کیا پورن مہاراج؟''
''کسی بھی طرح مہاراج کو دارو پلا کر...... یا کوئی بھی نشے کی چیز پلا کر اپنے ساتھ سلانا ہوگا۔'' پورن لال نے کہا۔
''اس سے کیا ہوگا؟''
''سنت کی آنکھوں سے کوئی بات نہیں چھپی۔ آپ چنتا نہ کریں۔ آپ کا جیون کشٹ ہوا ہے...... آپ بھی بدلہ لیں۔ دل کھول کر بدلہ لیں۔'' پورن لال نے کہا۔
''مگر کیسے پورن لال؟'' دیومتی نے پریشانی سے کہا۔
''میرا من آپ کے لئے بہت اُداس ہے مہارانی! میں آپ کی سہائتا کروں گا۔ میں آپ کو بالک دوں گا۔ آپ کے پیٹ میں میرا بچہ پروان چڑھے گا۔ میں آپ کے لئے...... میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''
پورن لال نے اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر دیومتی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور دیومتی ہکا بکا رہ گئی۔
''مہاراج!......مہاراج! کیا آپ نشے میں ہیں؟'' وہ گرجی۔
''میں تیری سہائتا کرنا چاہتا ہوں دیوی!......تُو کلیوں کی طرح نازک، کرن کی طرح خوب صورت ہے۔ اور تیری جوانی یوں نظر انداز کی جا رہی ہے...... میں یہ انیائے برداشت نہیں کر سکتا۔ تیرا بالک...... تیرا بالک......''

''آپ پاگل ہو گئے ہیں مہاراج!......کیا آپ بھول گئے کہ میں سب کچھ ہونے کے ساتھ ایک ہندو استری بھی ہوں۔ میرے ساتھ کچھ بھی ہوا، پر میں اپنی عزت کسی کو نہ دوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہے دیومتی!......تیرا پریمی تجھ سے چھینا گیا۔ تیرے سہاگ نے تجھے ٹھکرا دیا اور تُو دھرم کی لکیر پیٹ رہی ہے۔'' پورن لال نے اپنے مضبوط پنجوں سے اس کے شانے دبوچ لئے۔

''تم تو دھرم سیوک ہو پورن لال مہاراج! دھرم کی باتیں ہم سے زیادہ جانتے ہو۔ کیا میں اپنے پتی کو دھوکا دوں؟ تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا کر پاپ کروں؟ اور پھر پاپ کی پوٹ لے کر گردن اُونچی کروں؟......کیا میری گردن اُونچی ہو سکے گی مہاراج؟''

''تُو انسان بھی ہے۔ تیرے ساتھ انیائے ہوا ہے دیومتی!''

''اس کا انصاف کرنے والا بھگوان ہے۔ تم کون ہو؟'' دیومتی غضب ناک لہجے میں بولی۔

''میں بھگوان کا داس ہوں۔ مجھے یہی حکم ملا ہے۔''

''غلط......تم شیطان کے چیلے ہو۔ بھولی بھالی ناریوں کو بہکا کر نرکھ میں جھونک دیتے ہو۔ بڑے مہان بنتے تھے مہاراج! شیطان کے جال میں آ گئے نا۔ ہٹ جاؤ میرے پاس سے۔ میں جیون اسی طرح گزار دوں گی، مگر پاپ نہ کروں گی۔''

''تُو بھول گئی دیومتی! راج محل میں میری بھی چلتی ہے۔ دیوان ہر چرن میری مٹھی میں ہے۔''

''تو پھر......اس سے کیا ہوا؟''

''تجھے میری بات ماننی ہوگی۔''

''پران لے لو گے نا میرے۔ عزت نہ لے سکو گے مہاراج! کر لو جو چاہو۔ دیکھوں گی میں بھی۔''

''دیومتی! میرے غصے کو نہ جگا۔''

''تیرے پاس جاگنے والی کوئی چیز نہیں ہے رنگے سیار۔ جاگ سکتا تو تیرا ہردے جاگتا۔ تُو ہندو دھرم کو بدنام کر رہا ہے۔ دھرم کوئی خراب نہیں ہوتا، پاپی! اس کو ماننے والوں میں راکھشش نکل آتے ہیں۔ وہی دھرم بدنام کرتے ہیں۔ بول، ہندو دھرم میں تجھ جیسے پاپیوں کی گنجائش ہے؟......ارے دھرم نیکیاں سکھاتے ہیں۔ تُو نے یہ بدی کہاں سے پائی؟''

''بے کار باتیں نہ کرو دیومتی! میں تیرا جیون بنانا چاہتا ہوں۔''

''بنانے بگاڑنے والا بھگوان ہوتا ہے۔ میں تجھے اپنے شریر کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں گا۔ سن ذلیل سادھو! میں جذبات کے ہاتھوں بہک کر اپنے پریمی کے پاس گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جیون کی پیاس بجھا لے، میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے اپنا شریر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس نے کہا، ہم اپنے دھرم پر کالک نہیں لگائیں گے دیومتی! یہ بدن ہمارے اپنے ہیں۔ لیکن دھرم پورے سنسار کا ہے، اس پر ہمارا ادھیکار نہیں ہے۔ ایک وہ تھا......اور ایک تُو ہے......جو دھرم بانٹتا ہے اور خود کنگال ہے۔''

''دیومتی!......دیومتی! میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ کس کی مجال ہے جو تجھے میرے پنجے سے نکال لے۔ میں......میں جو چاہوں گا، کروں گا۔ اور پھر......اور پھر تجھے یہاں سے دھکے دے کر نکال دوں گا۔ کون تیری بات سنے گا؟ یہاں میری راجدھانی ہے۔ عزت اسی میں ہے، میری بات مان لے۔ خود بھی عیش کر۔ تیرا درجہ بہت اونچا ہوگا۔''

"پاگل ہے تُو........ مجھے جانے دے........ بس ہٹ جا........ میں جاؤں گی۔"
"دُور دُور تک آدم زاد نہیں ہے۔ تُو اب اس وقت تک کہیں نہیں جائے گی، جب تک میری بات نہ مان لے۔" پورن لال خوف ناک انداز میں بولا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ دیومتی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔
تب طالوت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"تربوز بھائی!" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔
"ہوں۔" میں چونک پڑا۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ سارے مذہب نیکیاں سکھاتے ہیں اور نیکی انسان کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اور جب کسی کو انسان تسلیم کر لو تو اسے انسان ہی سمجھو۔ دھرم بعد میں آتا ہے۔"
"یقیناً۔"
"آدم زاد تم ہو، پری زاد میں ہوں۔ کیا ہم دونوں مل کر اُس گدھے کو مرغا نہیں بنا سکتے؟"
"تو انتظار کس بات کا ہے؟" میں نے جواب دیا۔
"دوشالہ اُتار دو۔" طالوت نے کہا اور ہم دونوں دروازے کے قریب آ گئے۔ دوسری طرف پورن لال نے دیومتی کے نازک بدن کو دبوچ لیا تھا۔ دیومتی شدید مزاحمت کر رہی تھی۔ لیکن پورن لال نے اُسے اُٹھا کر زور سے بستر پر پٹخ دیا۔
اور اسی وقت طالوت نے اندر سے ہی دروازے پر لات ماری اور اس کے ساتھ ہی مجھے پورن لال پر دھکا دے دیا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ لیکن طالوت کی تو ساری حرکتیں ہی حیران کُن تھیں۔
"بچاؤ..... بچاؤ مجھے پورن لال جی!..... خربوز جی مہاراج مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ بچاؤ پورن مہاراج!" اور پورن لال اُچھل پڑا۔ اُس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اُس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دیومتی اُچھل کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ بھی ہمیں متعجب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر پورن لال کو ہوش آ گیا۔ اُس نے ہماری طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔
"تو..... تو تم زندہ ہو.......؟" اُس نے دانت پیس کر کہا۔
"اب غلطی تمہاری ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟" طالوت جھلّائے ہوئے انداز میں بولا۔ "سالا سانپ بھیجا تو ایسا مریل۔ اُس سے رینگا بھی نہیں جا رہا تھا۔"
"چلے جاؤ تم دونوں...... نکل جاؤ یہاں سے....... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"
"اس بار اژدھا بھیجو گے کیا؟" طالوت خوف زدہ انداز میں بولا۔
"میں..... میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ خون کر دوں گا تمہارا۔" پورن لال نے مجھے دبوچ لیا۔ کیونکہ میں ہی اُس کے قریب تھا۔ بڑی خوفناک گرفت تھی، کمبخت کی۔
"خربوز لال!..... خربوز لال!" میں چیخا۔
"اچھا ہے۔ پہلے تم مر جاؤ۔ پھر میں تمہارے غم میں رو رو کر جان دے دوں گا۔" طالوت نے بوڑھی عورتوں کے سے انداز میں کہا۔
"نہیں پیارے بھائی! ہمارا تمہارا جھگڑا الگ۔ اس وقت ہم دشمن کے سامنے ہیں۔" میں نے مظلوم

انداز میں کہا۔

''اچھا......؟'' طالوت جیسے سوتے سے جاگ اُٹھا۔

''ہاں...... ہاں...... بالکل۔'' پورن لال کے بازوؤں میں میری ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں اور میری آواز بھنچ رہی تھی۔ پورن لال کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ چہرہ انگارہ ہو گیا تھا۔

''ابے تو اپنا داہنا ہاتھ اس کی کھوپڑی پر کیوں نہیں مارتے؟'' طالوت نے کہا۔ سچ مچ میرا داہنا ہاتھ آزاد تھا اور اس وقت اس کی قوت میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ میں نے فوراً اس پر عمل کیا اور میرا فولادی ہاتھ، پورن لال کی پیشانی پر پڑا۔ ہتھوڑے کی سی ضرب ہو گی۔ پورن لال کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔

پورن لال نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ پھر اُس نے گردن جھٹکی اور آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھا۔ لیکن میری زوردار لات، پورن لال کی کمر پر پڑی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ لیکن طالوت نے اسے سنبھال لیا۔ اس نے پورن لال کے دونوں شانے پکڑ لئے اور پورن لال نے پھر دونوں ہاتھوں سے طالوت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

لیکن مقابل طالوت تھا۔ پورن لال کے دونوں ہاتھ خلا میں جھول گئے تھے۔ اور طالوت کے زوردار گھونسے نے اُسے پھر راؤنڈ کر دیا۔ یہاں میں پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے ایک زوردار ٹکر ماری اور اس بار پورن لال زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

تب طالوت نے اسے گھورا اور اس وقت طالوت کی آنکھوں میں پُراسرار چمک لہرائی۔ میں نے پہلی بار طالوت کی آنکھوں میں یہ انوکھی چمک دیکھی تھی۔

''پورن لال!'' اس نے بڑے پیار سے پکارا اور پورن لال اُسے دیکھنے لگا۔ ''گھوڑا بن جاؤ میری جان!'' اور پورن لال دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ ''ہنہناؤ!'' طالوت نے کہا اور پورن لال نے منہ سے کھر کھر کی آوازیں نکالیں اور پھر زور سے ہنہنایا۔ آواز بالکل گھوڑوں کی سی تھی۔

''شاباش!......شاباش!'' طالوت مسرور لہجے میں بولا۔ ''دیکھا، کتنا سعادت مند گھوڑا ہے۔ پورن بیٹے! دولتی جھاڑو۔'' طالوت پھر بولا اور پورن دونوں ٹانگیں اُچھالنے لگا۔ اور اس کوشش میں اوندھے منہ گر پڑا۔

دیومتی اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

''تربوز لال!'' طالوت نے مجھے آواز دی۔

''کیا ہے خربوز لال؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''گھوڑا کیسا ہے؟''

''بالکل بکواس۔''

''کیوں؟''

''اسے دولتی جھاڑنا بھی نہیں آتی......اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''اس کا ڈزگنیشن بدل دو۔''

''کیا بنایا جائے؟''

''مرغی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ابے نہیں۔ اسے انڈے دینے میں مشکل ہوگی۔'' طالوت نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہونے دو۔''

''نہیں، گھوڑا ٹھیک ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ مرغی ٹھیک ہے۔''

''گھوڑا۔''

''مرغی۔'' میں نے بھی آنکھیں نکال کر کہا۔

''اچھا۔'' طالوت نے مُردہ سی آواز میں کہا اور پھر وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجبوری ہے پیارے پورن لال!...... میرا ساتھی نہیں مانتا۔ تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ لیکن مرغی بھی کیا بری ہے۔ اور ہاں، تم انڈے دینے کے لئے مجبور نہیں ہو۔ کسی مرغے سے یاری ہو جائے تو مجبوری ہے، ورنہ انڈے دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

اور پورن لال سکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے مرغی کی مانند ہی کٹکٹانا شروع کر دیا تھا۔

اچانک دیومتی نے ایک چیخ ماری۔ اور پھر وہ دروازے کی طرف لپکی۔ ہم دونوں میں سے کسی نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ پورن لال اب اطمینان سے ہاتھوں اور پیروں کے بل زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا خیال ہے؟'' طالوت نے مجھ سے پوچھا۔

''کافی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آؤ......'' طالوت بولا۔ اور ہم دونوں باہر چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنی کوٹھری میں تھے۔ مرگ چھالہ پر بیٹھ کر طالوت نے کہا۔ ''آج کا کام ختم۔ چلو آرام کریں۔''

''پنڈت تلکا کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آ تو جانے دو۔ پہلے سے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں آرام کرنے کے موڈ میں ہوں۔ سونے دو۔'' طالوت نے کہا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ سو بھی گیا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر تک میں جاگتا رہا اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

راج مندر کا ماحول پُرسکون تھا۔ کوئی خاص بات نہیں نظر آتی تھی۔ چنانچہ میں راج مندر سے نکل آیا۔ دوشالہ اوڑھنے کی ابھی میں نے ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک کسی نے مجھے نہیں ٹوکا تھا۔ میرے ذہن میں خیال تھا کہ میں آج راج محل کی سیر کروں۔ گو مجھے یہاں کے راستے وغیرہ معلوم نہیں تھے۔

بہرحا، میں طالوت کی طرح دلیر اور بے فکر نہیں تھا، اس لئے میں نے تھوڑی دُور چل کر دوشالہ اوڑھ لیا اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب میرے انداز میں زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں

آزادی سے گھومنے لگا۔ اور اسے اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ ہرچرن لال مجھے نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

میں سنبھل گیا...... مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہرچرن لال، تلکا کے پاس گیا تھا۔ تو کیا تلکا یہی ہے؟ میں ان لوگوں کے قریب پہنچ گیا اور پھر بوڑھے خبیث کی شکل دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ چھوارے کی طرح سکڑا ہوا تھا۔ پورے بدن، یہاں تک کہ گھٹے ہوئے سر پر بھی جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے درمیان ایک باریک سی چوٹی کسی چوہے کی دُم کی مانند کھڑی ہوئی تھی۔ بدن ننگا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی دھوتی تماشابنی ہوئی تھی۔ گلے میں جنیئو پڑا تھا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں تھیں، جن کی آواز سناٹے میں دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ بوڑھا تلکا شکل سے ہی شیطان نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

اور اچانک تلکا چلتے چلتے رُک گیا۔

''کیا بات ہے پنڈت جی مہاراج؟'' ہرچرن نے چونک کر پوچھا۔

''ہرچرنا!'' تلکا کی باریک سی آواز اُبھری۔

''کیا بات ہے مہاراج!''

''ہمارے پاس کوئی اور ہے۔''

''کہاں؟'' ہرچرن لال نے چاروں طرف دیکھا۔

''قریب...... بہت قریب...... میری ناک اسے سونگھ رہی ہے۔''

''پرنتو یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے مہاراج!'' ہرچرن نے حیرانی سے کہا۔

''کوئی ہے...... ضرور ہے ہرچرنا! اسے تلاش کرو۔ میری ناک دھوکا نہیں دے سکتی۔''

''میں کیسے تلاش کروں تلکا مہاراج؟'' ہرچرن بے بسی سے بولا۔

''مگر ہو کون سکتا ہے؟...... ہے پربھو!...... ہے جگن کشوری...... ہے جگ ناتھ...... ہے کالی دیوی...... اُسے میرے سامنے ننگا کر دے۔'' اور سادھو زور زور سے کوئی منتر پڑھنے لگا۔

''خوب!'' میں دل ہی دل میں اس کی ناک کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

سادھو نے زور زور سے منتر پڑھنے کے بعد آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیا اور جیسے کوئی شے مٹھی میں لے لی۔ پھر اس نے مٹھی پر پھونک ماری اور پھر اسے اوپر کر کے کھول دیا۔ تیز روشنی ہوئی اور نیلے رنگ کی ننھی ننھی چنگاریاں فضا میں اُڑنے لگیں۔ پھر یہ چنگاریاں میری طرف بڑھیں اور انہوں نے میرے گرد حصار کر لیا۔

میں اُچھل پڑا تھا۔ اور پھر میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ یہ منظر میرے لئے سخت بدحواس کر دینے والا تھا۔ چنگاریاں میرے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ اور ہرچرن بھی بدحواسی میں میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ پھر بہت سے پہرے دار بھی ہرچرن کے ساتھ ہو گئے۔

''دوڑو...... پکڑو...... جانے نہ پائے...... پکڑ لو...... گرفتار کر لو۔'' ہرچرن چیخ رہا تھا اور پہرے داروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسے پکڑیں۔ میں راج مندر کی طرف بھاگ رہا تھا۔

اور پھر میں راج مندر میں گھس گیا۔ دوڑو، پکڑو کا شور میرے پیچھے آ رہا تھا۔ لیکن میں اتنی تیز دوڑا تھا کہ وہ لوگ کافی پیچھے رہ گئے۔ شور کی آوازیں مندر میں بھی سن لی گئیں۔ چنانچہ سوئے ہوئے پنڈے جاگ

اُٹھے تھے اور صورت حال معلوم کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اندر گھسا تو بہت سے پنڈے میرے راستے میں تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دھکیلا اور پنڈے بدحواسی میں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ اور پھر انہوں نے بھی اُڑتی ہوئی چنگاریاں دیکھی تھیں، جو ظاہر ہے ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہوں گی۔ دوسرے لمحے وہ گھگھیانے لگے۔ اور یہ بے چارے پنڈے ہی تھے، جنہوں نے اندر داخل ہونے والوں کو روکا۔ چونکہ وہ دروازے میں کھڑے گھگھیا رہے تھے۔ آنے والے ان سے ٹکرائے اور ان کے ساتھ ہی ڈھیر ہو گئے۔ اس طرح مجھے اپنی کوٹھری میں پہنچنے کا موقع مل گیا۔

طالوت بدستور خراٹے لے رہا تھا۔

''طالوت!...... طالوت!'' میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا ہوا؟...... کیا ہوا؟...... ارے!'' طالوت نے میرے گرد بکھری ہوئی چنگاریاں دیکھیں اور بوکھلاہٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ''یہ...... یہ کیا ہے عارف؟''

''مصیبت...... تلکا کی مصیبت۔'' میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جلدی کرو۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔''

طالوت نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس نے منہ کھول دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے تیز ہوا مجھے ایک طرف کھینچ رہی ہو اور میں پوری قوت صرف کر کے خود کو روکنے لگا، لیکن نہ رُک سکا اور طالوت کے قریب پہنچ گیا۔ طالوت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ لیکن میرے گرد بکھری ہوئی چنگاریاں طالوت کے حلق میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے ننھے منے جگنو کسی غار میں گھس رہے ہوں۔ اور پھر ساری چنگاریاں غائب ہو گئیں تو میں نے جلدی سے شاہ دانہ کا دوشالہ اُتار دیا۔

شوراب مندر میں آ گیا تھا۔ ہرچرن لال ہماری ہی کوٹھری کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اور پھر کوٹھری کے دروازے پر قدموں کی آواز رُک گئی۔

''دروازہ کھولو۔'' ہرچرن کی آواز اُبھری۔

''قصہ کیا ہے؟'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''ان کے ساتھ تلکا ہے۔ خطرناک آدمی ہے۔ ہوشیار...... باقی باتیں پھر بتا دوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ فکر مت کرو۔'' طالوت نے کہا۔

''دروازہ کھولو...... کھولو دروازہ۔'' باہر سے زور زور سے دروازہ بجایا جانے لگا اور طالوت دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں بھی اپنی کیفیت درست کر کے اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا تھا۔

ہرچرن لال بڑی کینہ توز نگاہوں سے ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔

''کیا بات ہے مہامنتری جی!'' طالوت نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

''اندر اور کون ہے؟'' ہرچرن لال نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔

''تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟'' طالوت نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

''وہ کون ہے جو باہر سے آیا ہے؟''

"کیا سے ہوا ہے ہرچرن لال؟" طالوت نے پوچھا۔
"ہم اندر تلاشی لیں گے۔" ہرچرن بولا۔ اب تلکا بھی اُس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔
"میں پوچھتا ہوں، سے کیا ہوا ہے؟" طالوت گرجا۔
"مجھے نہیں معلوم۔"
"یہ سمے کسی کو جگانے کا ہے؟ ہماری نیند کیوں خراب کی گئی ہے؟"
"جاؤ...... اندر دیکھو...... اندر کون ہے؟" ہرچرن لال نے پنڈوں سے کہا اور پنڈے اندر گھس گئے۔ کوٹھری کون سی بڑی تھی، جو کسی کے چھپنے کا احتمال ہوتا۔ چنانچہ پنڈوں نے گردن ہلا دی۔
"ان دونوں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے۔" تلکا کی کریہہ آواز اُبھری۔ اُس کی پوری شخصیت کراہت آمیز تھی۔ اُس کے ایک ایک عضو سے نفرت ہوتی تھی۔
"یہ کون ہے ہرچرن لال؟" طالوت نے پوچھا۔
"ارے..... ارے، مہاراج تلکا پنڈت۔ تم ان کا نام کس طرح لے رہے ہو؟" ہرچرن بوکھلا کر بولا۔
"انہیں نانکی داس سے ملا دو، ہرچرن لال! اور تم بھی اب یہاں سے بھاگ جاؤ۔ رات کافی بیت گئی ہے۔"
"ہوش میں رہو مہاراج! میرا نام ہرچرن لال ہے۔ میں تمہیں یہاں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا اور سُولی پر چڑھا دوں گا۔"
"تربوز مہاراج!" طالوت نے مجھے پکارا۔
"مہان خربوز جی!"
"کیا ہرچرن لال جی کی بدھی ٹھیک کر دی جائے؟"
"زبانی مہاراج..... زبانی...... ممکن ہے، یہ شریف آدمی باز آ جائے۔"
"کیا خیال ہے ہرچرن!..... جاتے ہو یا......" طالوت نے اسے گھورا اور ہرچرن نے بوکھلا کر آنکھیں پھیر لیں۔ پھر وہ پنڈوں کی طرف رخ کر کے بولا۔
"جاؤ تم...... دیکھو، راج مندر میں ایک ایسا آدمی گھس آیا ہے جس کے گرد اگن ناچ رہی ہے۔"
پنڈوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن انہوں نے وہاں سے بھاگ جانے میں عافیت سمجھی تھی۔
پھر ہرچرن لال نے امداد طلب نگاہوں سے تلکا کی طرف دیکھا۔ تلکا گہری نگاہوں سے ہم دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں مہاراج!"
"ابے جاتا ہے یہاں سے کہ دوں کھوپڑی پر ایک ہاتھ۔ سالا سوکھے کا مریض۔ ابے پہلے ایک درجن انڈے چڑھا، اس کے بعد آنا۔" طالوت نے کہا اور ہرچرن لال بری طرح بپھر گیا۔
"مار ڈالوں گا...... مار ڈالوں گا...... چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ مہاراج کا یہ اپمان۔" اور وہ ہماری طرف بڑھا۔ لیکن تلکا نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ اس نے ہرچرن کو پکڑتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔
"نہیں نہیں ہرچرن!...... سادھو سنتوں کی بات کا برا نہیں مانتے۔ نہ جانے کون سی بات میں کیا چمتکار ہو۔ رہنے دے، اشُ شبھے۔ صبح کو ہم مہاراج سے بات کر لیں گے۔" اور ہرچرن رک گیا۔ "آرام کریں مہاراج! صبح کو آپ کی شیوا میں حاضر ہوں گے۔ آؤ ہرچرن!" تلکا نے ہرچرن کا بازو پکڑا اور

ایک طرف چل پڑا۔ طالوت نے مجھے آنکھ ماری تھی اور پھر وہ بھی ان کے پیچھے نکلنے کو تیار ہو گیا۔
"رُک جاؤ طالوت! کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"ان کے پیچھے۔ پہلے ان کی باتیں سن لیں، اس کے بعد ہم آپس میں باتیں کریں گے۔"
"رُک جاؤ یار!...... وہ بڑا خبیث ہے...... ہواؤں میں انسانوں کی بُو سونگھ لیتا ہے۔" میں نے کہا۔
"میری بُو نہ سونگھ سکے گا۔ میں انسان کہاں ہوں؟ ویسے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔ اب تم بیٹھ جاؤ۔ اور اس آدمی رات کے ہنگامے کے بارے میں بتاؤ۔"
"یار! عمدہ چیز آئی ہے۔ میرا خیال ہے، اس سے تمہیں مقابلہ کرنے میں بھی لطف آئے گا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"اب تفصیل بھی بتا دو یار!" طالوت نے بیزاری سے کہا۔
"بس، نیند نہیں آ رہی تھی۔ دوشالہ اوڑھ کر باہر نکل گیا۔ وہاں یہ دونوں نظر آ گئے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ بوڑھے خبیث نے رُک کر کہا کہ اس کی ناک، انسان کی بُو سونگھ رہی ہے۔"
"خوب...... پھر......؟" طالوت دلچسپی سے بولا۔
"اس نے مٹھی بند کر کے کوئی منتر پڑھا، ایک روشنی ہوئی۔ اس نے کہا تھا، جو کوئی ہے اسے ننگا کر دے۔ سو چنگاریاں میرے گرد پھیل گئیں اور میں بدحواسی میں دوڑ پڑا۔"
"عمدہ۔" طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔
"اب سوچو برخوردار!...... آدمی خطرناک ہے۔"
"عارف دی گدھے...... غصہ مت دلاؤ...... ورنہ اُس کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کا تیل نکال کر تمہارے پورے بدن پر مل دوں گا۔" طالوت غصیلے انداز میں بولا۔
"گویا اس کے بعد بھی تم اس کی پروا نہیں کرتے۔"
"ابے اتنے عرصے سے اپنے ابا جان کو دھوکا دیتا پھر رہا ہوں۔ یہ سالا سوکھا بانس میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"
"پھر بھی، ہوشیاری کی ضرورت ہے طالوت! یہ ہندو جوگی بڑے منتر جانتے ہیں۔"
"ایک بات بتاؤں؟" طالوت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"ضرور میرے بھائی! ضرور بتاؤ۔"
"وہ گندے علم کا ماہر ہے۔ تم نے اس کی شخصیت سے گھن نہیں محسوس کی؟"
"خدا کی قسم! محسوس کی تھی۔" میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔
"گندا علم خطرناک ضرور ہوتا ہے۔ لیکن چنتا نہ کر بچہ!...... ایسے چکر دوں گا مہاتما جی کو کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ ٹھہرو، یہاں رہ کر ان کی گفتگو سنتے ہیں۔"
"یہاں رہ کر؟" میں تعجب سے بولا۔
"راسم......!" طالوت نے آواز دی اور راسم کو آنے میں دیر کیا لگتی۔ "اُن دونوں کی گفتگو یہاں سننا چاہتا ہوں۔" طالوت نے کہا اور راسم نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا دی۔ اُس نے ایک ہاتھ خلا میں نچایا اور ہرچرن لال کی آواز اُبھری۔

''آپ نے دونوں کو دیکھ لیا مہاراج؟''
''ارے......'' میں اُچھل پڑا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟''
''خاموشی سے سنو یار!'' طالوت نے کہا۔ لیکن میں حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی بھی چیز نہیں تھی اور دوسری طرف سے آواز صاف آ رہی تھی۔ وہی دونوں تھے۔
''ہاں مہاراج!''
''گہرے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''
''ہیں کون مہاراج! میں تو سخت پریشان ہوں۔''
''چنتا مت کرو ہرچرن لال! میں تمہارا کام کر دوں گا۔ لیکن تم نے میرے کام کے بارے میں کیا سوچا ہرچرن لال!''
''آپ کا کام؟...... میں سمجھا نہیں مہاراج!''
''راج ہنس۔'' بوڑھے خبیث کی آواز اُبھری۔
''اوہ......'' ہرچرن کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ وہ کئی منٹ خاموش رہا تھا، پھر اس نے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا مہاراج! کہ آپ اس کا خیال چھوڑ دیں۔''
''حالات نہیں دیکھ رہے ہمارے...... اُس کے پریم نے ہمیں سکھا دیا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔
''انا للہ..... بھائی عاشق ہیں۔'' طالوت نے کہا۔ لیکن میں تو اس آواز پر غور کر رہا تھا۔ آخر یہ آ کہاں سے رہی تھی۔
''لیکن وہ بڑی بس کی پڑیا ہے مہاراج!...... پورن لال الگ اس پر دانت رکھتا ہے۔ وہ تو گووندا اس کپور مہاراج نے اسے نہیں دیکھا۔ ورنہ پھر وہ ہم میں سے کسی کی نہیں رہتی۔''
''ہمارے سامنے کس کی مجال ہے کہ اس پر نگاہ رکھے۔''
''لیکن مہاراج!...... کرپا کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اُس کے بنا نہیں جی سکتا۔''
''بکو مت ہرچرن لال! ہم تمہارا کام اسی شرط پر کریں گے کہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔'' تلکا پنڈت نے کہا۔
''مہاراج!...... مہاراج!''
''ہم جا رہے ہیں۔'' تلکا شاید اُٹھ گیا تھا۔
''سنیئے تو سہی مہاراج!...... بیٹھ جائیے...... سنیئے...... اُس نے آج تک مجھے بھی پریم کی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ اگر وہ آپ کو پسند کر لے تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا اس پر حق ہے۔''
''وچن دیتے ہو، ہرچرن لال؟''
''ہاں مہاراج! لیکن شرط یہی ہے کہ اگر اُس نے من سے آپ کو پسند کر لیا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔''
''منظور ہے۔ تم دیکھو گے۔ وہ من سے ہمیں سویکار کرے گی۔''
''آپ شکتی رکھتے ہیں مہاراج!..... بدنصیب تو میں ہی ہوں۔'' ہرچرن لال نے کہا۔ ''خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ ان دونوں کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''بھور ہونے دو۔ وہ دونوں تمہارے سامنے اپنے بارے میں بتائیں گے۔ اور پھر تم ان کے لئے جو بھی سزا طے کرو گے، وہ خاموشی سے سزا قبول کریں گے۔''

''کیا...... کیا ایسا ہو سکے گا مہاراج؟''

''اوش...... کیا تم تلکا کو نوٹنکیا سمجھتے ہو؟'' تلکا کی آواز میں بڑا مان تھا۔

''ٹھیک ہے مہاراج!...... مجھے آپ پر وشواش ہے۔ مگر یہ پورن لال کہاں گیا؟...... سو گیا ہوگا پاکھنڈی۔ آپ بھی سو جائیں مہاراج! صبح کو ان دونوں کا فیصلہ کریں گے۔''

''ہمارا استھان کہاں ہے؟''

''یہی کمرہ ٹھیک ہے مہاراج!''

''ہاں..... ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' تلکا نے کہا اور پھر شاید ہر چرن لال کمرے سے نکل گیا۔ آوازیں بند ہو گئیں اور طالوت میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''طالوت! مجھے بتاؤ، یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''کمال ہے یار! اتنی دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی، تم نے اس پر تو غور نہیں کیا۔ آوازوں کے لئے اتنے پریشان ہو۔''

''یار! حیرانی کی بات ہے۔''

''میرے خیال میں بالکل حیرانی کی بات نہیں ہے۔ تم لوگ کالے رنگ کے پلاسٹک کے آلے میں سمندر پار کی گفتگو سن سکتے ہو۔ ہزاروں میل دور کے حالات دیکھ لیتے ہو۔ ہماری سائنس اتنی بھی نہ ہوگی؟''

''مگر یار! ہماری سائنس تو نظر آتی ہے۔'' میں نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

''سائنس سائنس میں فرق بھی تو ہوتا ہے عارف!...... اس بات کو جانے دو۔ یہ تلکا مہاراج تو اب مجھے بھی مزے کے نظر آنے لگے ہیں۔ کیا تم نے توجہ سے ساری گفتگو سنی؟''

''ہاں۔''

''کوئی خاص بات نوٹ کی؟''

''راج ہنس۔'' میں نے طالوت کی آنکھوں میں جھانکا۔

''شکر ہے...... بالکل ہی غیر حاضر نہیں تھے۔''

''ظاہر ہے...... میں گفتگو سن رہا تھا۔''

''مگر یہ ہے کیا بلا؟''

''ظاہر ہے، لڑکی ہوگی۔''

ہاں...... عشق و عاشقی کی بات بھی ہو رہی تھی۔'' طالوت نے کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اچانک میں کسی خیال کے تحت چونک پڑا۔

''طالوت!''

''ہاں...... ہاں...... کہو، جلدی کہو۔''

''کہیں وہی لڑکی......؟''

''میرے دماغ میں بھی یہی بات آ رہی تھی۔''

''اوہ......تب تو......تب تو لڑکی واقعی پُراسرار شخصیت کی مالک ہے۔ ریاست درگا پور کے اتنے بڑے بڑے لوگ اُس کے چکر میں ہیں۔''

''مہاراج گووندا اس کپور کی بات بھی آئی تھی۔''

''راجہ بھی کافی عیاش معلوم ہوتا ہے۔''

''شاید وہ عیاشی کی وجہ سے ہی دربار میں بھی نہیں آتا۔ اور ہرچرن لال پورے درگا پور پر راج کر رہا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔''

''خیر، راجہ کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے ان لوگوں کو درست کر لیا جائے۔''

''نہ جانے کیوں یہ آدمی مجھے خوف ناک لگ رہا ہے۔ دراصل طالوت! میں اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ اب تک ہمارا واسطہ صرف ایسے لوگوں سے پڑتا رہا ہے جو صرف عام لوگ تھے۔ میرا مطلب ہے، جادو وغیرہ سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ لیکن ہندو جادوگر بہت مشہور ہوتے ہیں۔ تمہیں ان کے بارے میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''اب ہو جائے گا میری جان!......بس اب سونے کی کوشش کرو۔ صبح کو بہت سے معرکے سر کرنے ہیں۔'' طالوت نے حسبِ عادت لاپروائی سے کہا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

لیٹ میں بھی گیا تھا......لیکن نہ جانے کب تک نیند نہیں آئی تھی۔ طالوت مست نیند کے خراٹے لے رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ پھر میری آنکھوں میں بھی چپکے سے نیند گھس آئی۔

اور پھر صبح ناقوس کی صداؤں سے ہی آنکھ کھلی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سویا تھا۔ طالوت بھی جاگ گیا تھا اور دانت پیس رہا تھا۔

پھر اُس نے راسم کو آواز دی۔ ''راسم......!''

''صبح بخیر آقا......!'' راسم نے فوراً جواب دیا۔

''ابھی نہیں......ہم بہت دیر سے سوئے تھے۔ کچھ دیر اور سوئیں گے۔''

میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''ایک بھی گھنٹہ نہیں بجنا چاہئے۔ ایک بھی آواز بلند نہ ہو۔'' طالوت نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا آقا!'' راسم نے کہا اور نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ اور چند ساعت کے بعد واقعی ساری آوازیں معدوم ہوگئیں۔ حالانکہ مندر کی صبح ایسی پُرشور ہوتی تھی کہ کان پھٹ جاتے تھے۔ اور ابھی چند ساعت قبل ایسی ہی کیفیت تھی۔ لیکن اب بالکل خاموشی چھا گئی تھی......لیکن پھر یہ خاموشی ٹوٹ گئی۔

اب یہ انسانوں کا شور تھا۔ نہ جانے کیسی بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ طالوت تو کروٹ بدل کر گہری نیند سو رہا تھا، لیکن میری نیند اُچٹ گئی تھی۔ طبیعت بھاری ہو رہی تھی۔ لیکن صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے نکل آیا۔ میں جانتا تھا، یہ دن مندر میں بڑا ہنگامی ہوگا۔ اور اس صبح کی ابتدا بھی ایسی ہوئی ہے۔

میں باہر نکل آیا۔ بہت سے پنڈے جگہ جگہ جمع تھے۔ کچھ پنڈے مندر کی دیواروں پر کھڑے سمندری گھونگھوں سے بنائے ہوئے ناقوسوں میں پھونکیں مار رہے تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہوگئے تھے۔ وہ بار بار ناقوس جھاڑنے لگتے اور پھر بجانے کی کوشش کرتے۔ لیکن آواز نکلنی تھی، نہ نکلی۔

یہی کیفیت بڑے بڑے پیتل کے گھنٹوں کی تھی۔ بے شمار لوگ گھنٹے ہلا رہے تھے۔ لیکن بیکار...... ایسا لگتا تھا، جیسے ان میں بجانے والی ہتھوڑیاں ہی نہ ہوں۔ توہمات کے بندے بڑے دہشت زدہ تھے۔ وہ اس انوکھی بات کو بڑی بدشگونی قرار دے رہے تھے۔ پورے مندر میں ہنگامہ تھا۔ پنڈے جھانک جھانک کر پیتل کے گھنٹوں میں دیکھ رہے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ نہ جانے کیوں میرے دل کو تقویت سی ہوگئی۔ تلکا خطرناک شخصیت ضرور ہے، لیکن اُس کا واسطہ جس شخص سے پڑنے والا ہے، وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ وہ صرف کچھ دیر سونے کے لئے اتنا بڑا ہنگامہ برپا کرا سکتا ہے۔ میں وہاں سے پلٹا اور واپس طالوت کے پاس پہنچ گیا۔

طالوت بھی اب آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ اُس کے انداز میں کسلمندی تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے باہر؟'' اس

نے پوچھا۔

''ہنگامہ۔'' میں نے جواب دیا۔

''پورن لال برآمد ہو گیا؟''

''میرا خیال ہے ابھی نہیں۔ ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔

''چلو...... باہر چلیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم دونوں تالاب پر آ گئے۔ وہاں منہ ہاتھ دھویا، دانت وغیرہ صاف کئے اور پھر اندر واپس آ گئے۔ پنڈے اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے تھے۔ چنانچہ گھنٹے بجانے کی کوشش ترک کر دی گئی تھی۔ پوجا کرنے والے یونہی آ گئے تھے۔ اور پھر پورن لال کی تلاش شروع ہو گئی۔

''مہاراج پورن لال کہاں ہیں؟'' کسی نے کہا۔

''ارے ہاں...... مہاراج صبح سے نظر نہیں آئے۔''

''کہاں گئے؟'' بہت سی آوازیں آئیں۔ سب کو پورن لال کا خیال آ گیا تھا۔

''دیکھو...... مہاراج کو تلاش کرو۔''

اور پنڈے، پورن لال کی تلاش میں چاروں طرف دوڑنے لگے۔ بڑی افراتفری پھیل گئی۔ تلکا پنڈت کی آمد کی شاید ابھی یہاں کسی کو خبر نہیں تھی۔ لیکن پھر تلکا بھی برآمد ہو گیا اور سارے پنڈے عقیدت سے اُس کے سامنے جھک گئے۔ بدہیئت تلکا، پوجا کے ہال میں آ گیا تھا۔

''بڑی عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں تلکا مہاراج!''

''کیا بات ہے؟''

''آج مندر کے سارے گھنٹے بند ہو گئے۔ سنکھ کی آوازیں بھی بند ہو گئیں...... اور مہاراج پورن غائب ہیں۔''

''پورن لال غائب ہے؟'' تلکا چونک پڑا۔

''ہاں مہاراج!''

''کب سے؟''

''رات کو انہیں دیکھا گیا تھا۔ پوجا میں تھے۔ صبح سے ان کا پتہ نہیں ہے۔''

''مہاراج پورن لال، تالاب کے اس پار کے مکان میں موجود ہیں۔'' ایک پنڈا چیختا ہوا آیا۔ ''وہ وہاں موجود ہیں۔''

''کیا کر رہے ہیں؟'' تلکا نے پوچھا۔

''انڈوں پر بیٹھے ہیں۔'' پنڈا بدحواسی میں بولا اور سب اُسے گھورنے لگے۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں مہاراج!...... وہ کئی انڈے نیچے دبائے بیٹھے ہیں اور ان پر سے اُٹھ نہیں رہے۔''

''کیا بکواس ہے؟'' تلکا غرّایا۔

''آپ...... آپ خود دیکھ لیں تلکا مہاراج! بھگوان کی سوگند، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' پنڈا رو دینے والی آواز میں بولا۔ اور اب ہنگامہ دوسری طرف منتقل ہو گیا۔ بہت سے لوگ مندر کے دوسرے حصے کی طرف دوڑے۔ تلکا بھی اپنی سوکھی ٹانگیں اُٹھاتا ہوا اسی طرف جا رہا تھا۔ ویسے پنڈے اُس کے زبردست

عقیدت مند تھے۔ بہت سے پنڈے اُس کے پیچھے ادب سے چل رہے تھے۔

''رُک جاؤ۔ اُن سے کہو، کوئی اندر نہ داخل ہو۔'' تلکا نے کہا اور پنڈے چیخ چیخ کر اُنہیں تلکا پنڈت کا حکم سنانے لگے۔ چنانچہ وہ بھی رُک گئے، جو پرانے مندر کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ سب نے تلکا مہاراج کو راستہ دے دیا۔

اور اچانک تلکا کو جیسے کوئی خیال آ گیا۔ اُس نے سارس کی طرح گردن اُٹھائی اور اُچک اُچک کر دیکھنے لگا۔ تب اُس کی نگاہ ہم دونوں پر پڑی اور اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پیچھے ہٹا اور ہمارے قریب پہنچ گیا۔

''جے رام جی کی مہاراج!'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں اور طالوت مسکرا کر رہ گئے تھے۔

''داس سے کچھ ناراضگی ہے مہاراج؟'' تلکا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تلکا جی؟'' طالوت نے زہریلے انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں شوامی!......رات بھر چندر گیتی کا پاٹھ کیا، پرنت تمہارا مکھ نہ تلاش کر سکا۔ بڑی بات ہے۔ مگر مقابلہ سخت رہے گا مہاراج! ہی ہی ہی......'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔

''ہاں تلکا جی! تمہارے لئے بڑی مصیبت پڑ جائے گی۔''

''دیکھیں گے مہاراج! آیئے، اندر آئیں۔ یہ پورن لال کو کیا ہو گیا ہے؟''

''آپ دیکھیں تلکا مہاراج! ہم یہیں ٹھیک ہیں۔''

''آیئے بھی......اب ایسی بھی کیا......ہم دونوں گیان کی جنگ لڑیں گے۔ آپس میں من بگاڑنے سے کیا ملے گا؟''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن ہرچرن لال کو آپ نے اطلاع نہیں کرائی؟''

''ارے ہاں......خوب یاد دلایا۔ ارے سنو بھگوان داس! مہاراج ہرچرن لال کو تو اطلاع دو۔ پورن لال ان کا بھی متر ہے۔ دیکھیں تو آ کر، اسے کیا ہو گیا ہے؟'' اور بہت سے پنڈے دوڑ گئے۔

بہر حال ہم تلکا اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ پورن لال، دالان کے دوسری طرف اسی کمرے میں موجود تھا۔ اور اسی جگہ بیٹھا تھا، جہاں ہم چھوڑ گئے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ مرغی کی طرح کڑکڑایا......اور کڑکڑاتا ہی رہا۔ اُس نے سنبھل سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اور ایک سفید انڈا اُس کے نیچے سے سرک آیا تھا۔

''پورن لال!......اُٹھو پورن لال!'' تلکا نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا اور پورن لال زور سے کڑکڑایا۔

''منش کی زبان میں بات کر پورن!......یہ تلکا کا حکم ہے۔ منش کی زبان میں بات کر۔''

''ابے بھاگ یہاں سے......دیکھتا نہیں ہے، میں بچے نکال رہی ہوں۔'' پورن لال نے جواب دیا اور تلکا اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پورن لال کے چہرے پر بیزاری تھی۔

''کیسے بچے، پورن لال؟'' بالآخر اُس نے پوچھا۔

''سفید سفید......چھوٹے چھوٹے......بڑے ہی سندر......بڑے ہی سندر۔''

''کیا بک رہا ہے پورن لال!......تُو منش ہے۔ مرغی نہیں ہے۔''

''ہے بھگوان! اس بوڑھے کی آنکھیں ٹھیک کر دے۔ میں اسے منش نظر آ رہی ہوں۔ ارے کلنک! بھاگ جا یہاں سے...... کیوں مجھے ستا رہا ہے؟...... میں تیرا کیا بگاڑ رہی ہوں؟'' پورن لال نے مظلوم انداز میں کہا اور تلکا اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے زور کی ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن طالوت بڑی سنجیدگی سے پورن لال کو دیکھ رہا تھا۔

''کچھ آپ ہی بتائیں مہاراج!...... کیا ہوا پورن لال کو؟'' کریہہ شکل بوڑھا ہماری طرف مڑا۔

''جو تمہیں ہونے والا ہے تلکا مہاراج!''

''ہی ہی ہی...... مجھے تو مرغا ہی بنانا مہاراج!...... میں انڈوں پر نہ بیٹھ سکوں گا۔ اور ہاں، مندر کے گھنٹے کیسے بند ہو گئے تھے؟'' لومڑی کی شکل والے تلکا نے کہا۔

''تم تو بڑے گیانی ہو تلکا پنڈت! معلوم کر لو۔''

''سب کچھ معلوم ہو جائے گا...... چنتا مت کرو...... سمے آنے دو۔ اوش اوش...... ویسے ایک بات بتا دوں۔''

''ضرور۔''

''چندر گپتی تمہارے بارے میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس کا ایک مطلب ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیا مہاراج؟''

''ہو سکتا ہے، ہندو دھرم سے تمہارا کوئی سمبندھ نہ ہو۔'' تلکا نے ہماری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ سچ بات ہے، میرے چہرے کا رنگ تو اڑ گیا تھا۔ لیکن طالوت نے قہقہہ لگایا تھا۔

''ہاں ہاں...... ہمارا دھرم آکاش سے اُترا ہے مہاراج!...... آپ چنتا نہ کریں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں میرے پیارے بالکو!...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر تم ہندو نہیں ہو تو ملیچھ ضرور ہو گے۔ اور پنڈوں اور پجاریوں کو جب یہ بات معلوم ہو گی تو وہ آرام سے تمہارا کریا کرم کر دیں گے۔ بہت جلد میں ان کے سامنے یہ بات رکھ دوں گا۔''

''تم جو کچھ کرو گے تلکا مہاراج! وہ تمہارا کام ہو گا۔ اور ہم جو کچھ کریں گے، وہ ہمارا۔'' طالوت نے جواب دیا۔ اسی وقت دیوان ہرچرن لال آ گئے۔ اُن کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے تلکا مہاراج؟'' ہرچرن لال نے آتے ہی پوچھا اور پھر ہمیں دیکھ کر سنبھل گیا۔

''ان بالکوں سے پوچھو، جن کی بدھی خراب ہو گئی ہے۔ تلکا سے ٹکر لینے آئے ہیں۔''

''ارے تم سب یہاں کیوں آ مرے ہو؟...... باہر جاؤ...... مجھے انڈے سینے دو۔ میرے انڈے ٹوٹ جائیں گے۔'' پورن لال نے پریشانی سے کہا اور ہرچرن چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے پورن لال!...... اُٹھو...... چلو اندر چلو۔'' ہرچرن لال نے پورن لال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور پورن لال کسی مظلوم مرغی کی طرح زور زور سے چیختا رہا۔ ''چلو...... اسے اُٹھا کر مندر میں لے چلو۔'' ہرچرن لال نے پنڈوں کو حکم دیا اور پورن لال کو پکڑ لیا۔ پورن لال دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ بین کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ انیائے ہوا ہے۔ اسے اپنے بچوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔

''آؤ یار!...... آج کھانے پینے کی بات بھی نہ ہو سکے گی۔ خود ہی بندوبست کریں۔'' طالوت نے

مجھ سے کہا اور ہم بھی وہاں سے چل پڑے۔ غرض خوب ہنگامہ ہو رہا تھا۔ مندر کے سارے پنڈے جمع ہو گئے تھے، اور پورن لال کی حالت پر ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ ہم لوگ مندر میں واپس آ گئے۔ اور پھر کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔

کھانا موجود تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پروسا نہیں گیا تھا۔ بہرحال، ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق نکال لیا اور اطمینان سے ایک کونے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔

''یار طالوت!'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے طالوت کو مخاطب کیا۔

''پیرو مرشد!''

''اس پورن لال کے بچے کے نیچے انڈے کہاں سے آ گئے؟''

''راسم نے اس کی خواہش پوری کر دی تھی۔ وہ بے چارہ انڈے کہاں سے دیتا؟''

''واقعی، تم بہت بڑے شیطان ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ابے یہ بتاؤ، لطف آ رہا ہے یا نہیں؟''

''میں تو خوف زدہ ہوں یار!''

''اس بوڑھے تلکا سے۔''

''ہاں۔''

''اس کے بعد اگر تم نے یہ بات زبان سے نکالی تو تمہیں مرغا بنا کر پورن لال سے تمہارا جوڑا لگوا دوں گا۔ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔'' طالوت نے غرّاتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھو، اس نے ہمارے بارے میں کتنا درست اندازہ لگایا ہے۔''

''ارے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ مقابلے پر تو آئے۔'' طالوت نے کہا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ طالوت بھی کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم تلکا پنڈت کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں..... اُس کی جاں بخشی کی جا سکتی ہے۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر وہ راج ہنس ہمیں دے دے۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''ہوں۔ یہ راج ہنس کوئی بڑی مصیبت بن کر رہے گی۔ میری پیش گوئی ہے۔''

''بنا کرے..... اندازہ لگاؤ۔ کیا یہ وہی لڑکی ہو سکتی ہے؟''

''ہو بھی سکتی ہے طالوت!''

''کس بنا پر کہہ رہے ہو؟''

''وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔''

''ہاں یار!...... قسم لے لو، جو ذہن میں ایسی ویسی کوئی بات ہو۔ لیکن وہ لڑکی ذہن سے بری طرح چپک گئی ہے۔''

''لیکن طالوت! تم اسے اپنے طور پر کیوں نہیں تلاش کر لیتے؟''

"پہلے بھی کہہ چکا ہوں میری جان! کہ میرے اوپر بھی بعض اخلاقی پابندیاں ہیں، جنہیں تم پر ظاہر کرنے سے معذور ہوں۔ بعض معاملات میں میری پوزیشن یوں سمجھ لو کہ کر سکتا ہوں..... لیکن نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ تم نے کہا تھا۔" میں نے گردن ہلائی۔

"البتہ تمہارے والی کے لئے مدد کر سکتا ہوں۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیومتی؟"

"ہاں...... کیوں؟" طالوت نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم اُس کی مدد ضرور کریں گے طالوت! لیکن اب میں اسے اپنی نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"ارے تم اُس کی پورن لال سے گفتگو سن چکے ہو۔ وہ کسی ست پرکاش سے پریم کرتی ہے۔"

"اوہ...... تب کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم اُسے ست پرکاش دلا دیں گے۔ مگر یار! یہ راجہ گووند اس کپور تو ایسا لگتا ہے جیسے صرف ایک نام ہو۔ اس سے کب ملاقات کرو گے؟"

"تم یہاں کے ہنگامے نمٹا لو تو پھر دیکھیں گے۔"

"تو آؤ...... آج تمہاری دیومتی سے مل لیں۔"

"ابھی نہیں طالوت! میری رائے ہے، پہلے تلکا کا قصہ نمٹا دو۔"

"ہوں......" طالوت نے ہونٹ بھینچ کر میری طرف دیکھا۔

"بالکل۔"

"آؤ استاد! اُس بوڑھے سے بھی نمٹ لیں۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور نہ جانے کیوں میرا دل بھڑک اُٹھا۔ لیکن اب کسی خوف کا اظہار طالوت کے غصے کو دعوت دینا تھا۔ اور یہ انتہا پسند محض تفریحاً بھی اپنی کسی بات کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ ہم دونوں اس کمرے سے نکل آئے، جہاں کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔

پنڈے اب بھی حیران پریشان، ٹولیوں میں بٹے کھڑے تھے۔ وہ پورن لال اور گھنٹے بند ہو جانے والے واقعات پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ہم ان کی باتیں سنتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں پورن لال رہتا تھا۔ اور پھر ہم اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ طالوت نے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ مہاراج!" اندر سے تلکا کی آواز سنائی دی اور ہم اندر پہنچ گئے۔ پورن لال بدستور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اُس کے نیچے انڈے رکھوا دیئے گئے تھے۔ کیونکہ اُس نے رو رو کر دیواروں سے سر مارنا شروع کر دیا تھا۔ اُسے اپنے نکلنے والے چوزوں کا غم تھا۔ ایک سرے پر ہرچرن لال بیٹھا خونی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن تلکا کے منحوس چہرے پر وہی تاثرات تھے۔

"پدھاریئے مہاراج!...... پدھاریئے۔" اُس نے ہم دونوں سے کہا اور ہم بیٹھ گئے۔ "کیوں نہ ہمارے درمیان صاف صاف بات چیت ہو جائے مہاراج!" تلکا نے کہا۔

"ہم تیار ہیں۔ کیوں ہرچرن لال جی!" طالوت نے ہرچرن لال سے کہا۔

"آپ نے جس طرح یہاں آ کر لوگوں کو پریشان کیا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ من کی بات کہیں۔ کیا چاہتے ہیں آخر آپ؟" ہرچرن لال نے غصیلے انداز میں کہا۔

''کوئی پوچھے بھی تو من کی بات، ہرچرن لال!'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بجائے آپ نے تو ہمارے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اور اس بندر کو بلا کر تو آپ نے ہمیں اور غصہ دلا دیا ہے۔ ہم اس بندر کے بغیر بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔'' طالوت نے تلکا کی طرف اشارہ کیا۔

اور ہرچرن لال شدید غصے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تلکا کی توہین پر چراغ پا ہو گیا تھا۔ لیکن مکار تلکا بدستور مسکرا رہا تھا۔

''مکار سادھو!...... میں...... میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔ تم تلکا مہاراج کا اپمان نہیں کر سکتے۔ مہاراج!...... مہاراج! آپ مجھے آگیا دیں۔ میں اپنے خنجر سے ان کے ٹکڑے کر دوں۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' ہرچرن لال اپنی پیٹی سے خنجر کھینچتے ہوئے بولا۔ لیکن تلکا نے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔

''رہنے دے ہرچرنا!...... منش کے کہنے سے کچھ نہیں ہو جاتا۔ پدھاریئے مہاراج! آپ ہرچرنا سے ہی بات کر لیں۔ میں خاموش رہوں گا۔'' وہ اپنی منحوس آواز میں بولا۔

''ہرگز نہیں سوکھے بندر! تم اسے ہمارے ٹکڑے کرنے کی اجازت دے دو۔'' طالوت نے زہریلے لہجے میں کہا اور ہرچرن لال سچ مچ خنجر سیدھا کر کے طالوت کی طرف دوڑ پڑا۔ طالوت نے اس وقت کوئی پُراسرار چال چلنے کے بجائے سیدھا سیدھا ہرچرن لال کے خنجر پر ہاتھ ڈال دیا۔ اور پھر اُس کا زوردار تھپڑ ہرچرن لال کے گال پر پڑا۔ کیا ہی زوردار آواز تھی، جیسے پٹاخہ چھوٹا ہو۔ ہرچرن لال کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔

پھر وہ خنجر کو اُلٹا سیدھا ہوا میں لہراتا ہوا چیخا۔ ''مار ڈالوں گا۔'' لیکن اسی وقت، تلکا کی آواز سنائی دی۔

''ہرچرن لال! کیا تُو خود تلکا کا اپمان نہیں کر رہا؟...... کیا تُو اس کی بات مان رہا ہے؟'' اور ہرچرن لال رک گیا۔

''تلکا مہاراج!...... تلکا مہاراج!...... نشٹ کر دو انہیں...... مار ڈالو ان پاپیوں کو...... بھسم کر دو۔ میں انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اب درگاپور میں یہ رہیں گے یا میں...... مجھے اپنے اپمان کی چنتا نہیں ہے۔ میں...... میں......''

''دھیرج رکھ ہرچرنا!...... تُو مجھے محل میں کیوں لایا ہے؟ میں ان لوگوں کو ٹھیک کر دوں گا۔ تم نے ہرچرن لال کا اپمان کر کے بہت برا کیا ہے بالکو! اب تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔''

''بڈھے، بے وقوف! تیری شامت آئی ہے۔ ہم تیار ہیں۔ جب چاہے، سامنے آجا۔ جس طرح چاہے، آجا۔ دیکھیں گے، تُو کتنا بڑا سادھو ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''ایسے نہیں مہاراج!'' تلکا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ راج محل ہے۔ لڑنا ہے تو کسی سنسان جگہ چل کر لڑیں۔ اس لڑائی میں مزہ آئے گا۔''

''ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، یہیں کر لے۔ آؤ تربوز مہاراج!'' طالوت نے کہا اور میں بھی اُٹھ گیا۔ ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ ہرچرن لال دیوانگی کے عالم میں ہونٹ چبا رہا تھا۔ لیکن بے بس انسان کیا کر سکتا تھا۔ تلکا بھی کچھ نہ بولا اور ہم باہر نکل آئے۔

میں خاموش تھا، لیکن طالوت کے ہونٹوں پر وہی لاپروا مسکراہٹ تھی۔ ہم واپس اپنی کوٹھری میں آ گئے۔ اور پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔

''جی..... خربوز جی مہاراج؟'' میں نے اسے دیکھا۔
''کیوں؟'' طالوت نے میری طرف مسکراتے ہوئے کہا۔
''اب کیا خیال ہے؟''
''کچھ نہیں...... عیش کرو۔ کوئی تفریحی پروگرام بناؤ۔''
''تلکا کے بارے میں کچھ نہیں سوچو گے؟''
''میری سمجھ میں نہیں آتا عارف! تلکا تمہارے ذہن پر اس قدر کیوں سوار ہے؟'' طالوت نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''کیا تمہارے خیال میں اب اس کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رعایت کرے؟''
''اور ہمیں رعایت کی ضرورت ہے...... کیوں؟''
''میرا خیال ہے، ہمارا کھانا بھی بند کر دیا جائے گا۔''
''اور ہم بھوکے مر جائیں گے۔''
''افوہ...... بھئی تم غلط کیوں سوچ رہے ہو؟ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''
''اچھا...... یہ مطلب نہیں ہے۔ میں واقعی غلط سوچ رہا تھا۔'' طالوت دانت نکال کر بولا اور میں ہنس پڑا۔ ''عارف! میں چاہوں تو ابھی تلکا کو ناچ نچا سکتا ہوں۔ لیکن تم نے دیکھا، پہلا وار پورن نے کیا اور اب وہ انڈے سی رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تلکا بھی کوشش کرے۔''
''جیسی تمہاری مرضی یار!'' میں نے بیزاری سے کہا۔
''آؤ...... ہنگامہ کریں۔'' طالوت نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں اُچھل پڑا۔
''ہنگامہ...... صرف ہنگامہ۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''ہنگامہ......'' طالوت ہنس پڑا اور میں احمقوں کی طرح اسے گھورتا رہ گیا۔ طالوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ لیکن تلکا ہم سے پہلے ہی ہنگامہ شروع کر چکا تھا۔
بے شمار پنڈے ہمارے کمرے کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر خطرناک تاثرات تھے۔ میں انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا اور طالوت نے ہونٹ بھینچ لئے۔
تب دو قوی ہیکل پنڈے آگے بڑھ آئے۔ ''کیا تم ملیچھ ہو؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔
''کیا بات ہے مہاراج؟'' طالوت نے نرم لہجے میں کہا۔
''تلکا مہاراج کہتے ہیں، تم ملیچھ ہو...... اور چالاکی سے یہاں گھس آئے ہو۔''
''کیا ہم صورت سے تمہیں ملیچھ نظر آتے ہیں؟'' طالوت نے پوچھا۔
''مسلمان بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی صورتیں بنا لیتے ہیں۔''
''اور صورتیں بگاڑ بھی دیتے ہیں مہاراج!'' طالوت نے کہا۔
''تمہیں بتانا پڑے گا۔'' پنڈا بولا۔
''نہ بتائیں مہاراج...... تو......؟'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہم زبردستی تمہارے کپڑے اُتار لیں گے۔''
''ایک شرط پر مہاراج!'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔
''کیا شرط ہے؟'' پنڈا بولا۔
''تم جانتے ہو پنڈت جی! کہ تلکا مہاراج گندے علم کا ماہر ہے۔''
''مہاراج کا اپمان مت کرو۔ ورنہ ہم تمہاری زبان کھینچ لیں گے۔''
''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں پنڈت جی مہاراج! کہ خود تلکا، رنگا سیار ہے۔ اصل میں وہ ملیچھ ہے۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے یہ الزام لگایا ہے۔ وہ تمہاری توجہ ہماری طرف مبذول کر کے خود چھپنا چاہتا ہے۔''
''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' پنڈا اچیخا۔
''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، بالکو!...... جاؤ، پہلے تلکا کو دیکھ آؤ۔ اس کے بعد ہمارے پاس آجانا۔'' طالوت نے کہا۔
''اور اتنی دیر میں تم بھاگ گئے مہاراج!......تو؟''
''آدھے آدمی ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔''
''ارے ان کی باتوں میں مت آنا۔ تلکا مہاراج جیسے مہان پُرش کہیں ملیچھ ہو سکتے ہیں؟'' کسی نے کہا۔
''جو میں کہہ رہا ہوں، کرو۔ میں اس کے بعد بات کروں گا۔ اور اگر اس کے خلاف کسی نے کچھ کیا تو اس کا بہت برا حشر کروں گا۔'' طالوت نے کہا اور میں اُس کے لہجے کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔
''چلو درسدیو!...... مہاراج سے بات کریں۔'' ایک پنڈے نے کہا۔ ''آؤ....'' اور دس بارہ پنڈے چل پڑے۔ باقی لوگ ہمارے سامنے ہی کھڑے رہے تھے۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید تلکا نے اُنہیں خوب بھرا تھا۔
''مہاراج خربوز جی!'' میں نے سرگوشی کی۔
''سب ٹھیک ہے یار!...... تفریح شروع ہو چکی ہے۔'' طالوت نے بھی اسی سرگوشی کے انداز میں جواب دیا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔
تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ پھر دوسری طرف سے شور کی آوازیں اُبھریں اور سب چونک پڑے۔ چار پانچ پنڈے، تلکا کو اُٹھائے ہوئے آرہے تھے۔ ہمارے نزدیک کھڑے ہوئے پنڈوں نے اُسے دیکھا۔ اور سب گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ اب کسی کو کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔
''تو یہ بدمعاش مسلمان آج تک ہمیں تلکا پنڈت بن کر دھوکا دیتا رہا ہے۔''
''یہ ہمارا دھرم نشٹ کرتا رہا ہے۔''
''یہ ہم سب کو بے وقوف بناتا رہا ہے۔''
''مارو...... مارو...... اسے مارو۔'' اور پنڈوں نے تلکا پر یلغار کر دی۔ مارا گیا غریب...... میں نے سوچا۔ اُس کی سوکھی ہڈیوں میں جان ہی کتنی تھی۔ قوی ہیکل پنڈے ایک ایک ہاتھ بھی مارتے تو وہ گیا تھا۔ پنڈوں نے اپنی دانست میں تلکا کو اَدھ مرا ہی کر دیا تھا۔

اور تلکا اس طرح پڑا تھا، جیسے مر گیا ہو۔
''جاؤ...... مہاراج ہرچرن لال کو خبر دو...... تلکا ملیچھ ہے۔'' کسی پنڈے نے کہا اور پھر سارے پنڈے اسے چھوڑ کر ہٹ گئے۔
''مروا دیا نا۔'' میں نے طالوت سے کہا۔ لیکن طالوت غور سے تلکا کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈوں نے اُسے اتنا مارا تھا، لیکن تلکا کے بدن کے کسی حصے سے خون نہیں نکلا تھا۔
پنڈے اب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔ تلکا کے مسلمان ثابت ہو جانے پر وہ سخت حیران تھے اور اس کے بعد شاید ان کی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہم سے اپنا مطالبہ دوہراتے۔
دفعتہً تلکا نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ پھر دوسری آنکھ کھولی اور اس کے ہونٹوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے کسی انداز سے تکلیف کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ تب وہ اُٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔
''ارے..... طالوت!'' میں حیرت سے بولا۔ طالوت بھی تلکا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ تلکا نے ہماری طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔
''وار کر گئے مہاراج!...... مگر اب ہوشیار رہیں۔ اگلا وار تلکا کا ہوگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''چنتا نہ کریں مہاراج! سارے وار آپ پر اُلٹتے رہیں گے۔'' طالوت نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
''دیکھیں گے..... دیکھیں گے۔'' تلکا کھڑا ہو گیا۔ اور پھر وہ ایک طرف بڑھا تو پنڈے اُس کی طرف دوڑ پڑے۔
''جا کہاں رہا ہے بدمعاش!...... مہامنتری جی ہی تیرے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ تُو یہاں سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔'' پنڈوں نے اسے پکڑ لیا۔ تب تلکا نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا۔
''بس، بس...... چھوڑ دو...... بہت ہو گئی۔ دونوں نے تم اتنے ساروں کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ تمہاری بدھی نشٹ ہو گئی ہے۔ ارے پاگلو! یہ جادوگر ہیں۔ ملیچھ جادوگر۔ بہت جلدی تمہیں پتہ چل جائے گا۔''
''جانے نہ پائے...... کتنی ہی چالاکی کرے۔'' طالوت نے آواز لگائی اور پنڈوں نے تلکا کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب تلکا نے ان لوگوں کو گھورا اور پھر اس نے دونوں پاؤں اُٹھائے۔ اب اُس کا بدن نیچے سے پتلا ہوتا جا رہا تھا...... پتلا اور پتلا...... اور پتلا...... یہاں تک کہ اچانک پنڈوں کے منہ سے دہشت زدہ چیخیں اُبھریں۔ تلکا کے بازو بھی غائب ہو گئے تھے اور اب پنڈوں کے ہاتھوں میں پیلے رنگ کا ایک بدہیئت سانپ لٹک رہا تھا۔
پنڈوں نے بھیانک چیخوں کے ساتھ سانپ چھوڑ دیا اور سانپ اس تیزی سے ایک طرف بھاگا کہ صرف اُس کی دُم دیکھی جا سکی۔ اور پھر وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ پنڈے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ پھر وہ ہماری طرف مڑے۔
''شما کر دیں دھرماتما!...... شما کر دیں مہاراج!...... تلکا ملیچھ ہے، ہمیں معلوم نہیں تھا۔'' اور پھر اچانک وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہرچرن لال آ رہا تھا۔
''کہاں ہیں تلکا مہاراج؟'' اُس نے غراتے ہوئے پوچھا۔
''وہ ملیچھ تھا، مہامنتری جی!..... ہم نے خود دیکھا تھا۔'' ایک پنڈے نے کہا۔
''کون...... تلکا مہاراج؟''

''ہاں۔''

''کیا بکتا ہے، پاگل!...... گدھے!...... کمینے!'' ہرچرن لال، پنڈے پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے کئی ہاتھ پنڈے کے رسید کر دیئے۔ ''بول، کہاں ہیں تلکا مہاراج؟''

''بب...... بھاگ گئے۔''

''کہاں بھاگ گئے؟''

''سانپ بن کر بھاگ گئے۔'' پنڈوں نے بتایا۔

''او عقل کے اندھو! اس کے بعد بھی تم اُنہیں ملیچھ کہتے ہو؟...... تمہارا ستیاناس۔'' ہرچرن لال دہاڑا۔ اور پھر وہ ہم لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ...... بھگوان کے لئے مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

''کبھی من سے تو پوچھو مہاراج! تم تو ہمیشہ دشمنوں کی طرح پیش آتے ہو۔ ارے تلکا کیا اور اس کی حیثیت کیا۔ ہم تو ایسے دھرماتما ہیں کہ تمہیں راجاؤں کا راجہ بنا دیں گے۔ پر کبھی من سے تو بات کرو، ہرچرن!'' طالوت نے محبت آمیز انداز میں کہا اور ہرچرن چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے ذہن پر طالوت کی بات نے اثر کیا ہو اور اب وہ نئے انداز میں سوچ رہا ہو۔

پھر اُس کے چہرے پر نرمی پھیل گئی۔ ''تو تلکا مہاراج چلے گئے؟''

''نہ جاتے تو اپنی چٹنی بنواتے۔''

''میرے ساتھ آیئے مہاراج!'' ہرچرن لال نے نرم لہجے میں کہا اور طالوت میرا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہرچرن لال ہمارے ساتھ آ رہا تھا۔ اور پھر وہ ہماری کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ ہم لوگ اس کی طرف سے لاپروا ہو گئے تھے۔

''آپ نے ایک انوکھی بات کہی ہے مہاراج! میں اس کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔''

''آرام سے جا کر سوچو ہرچرن! اس طرح نہ سوچنا، جس طرح پورن لال نے سوچا تھا۔ اور جس کے نتیجے میں وہ انڈے سی رہا ہے۔''

ہرچرن بری طرح چونک پڑا۔ ''تو...... تو مہاراج پورن لال......؟''

''ہم جیسے مہان سادھوؤں کا اپمان کرو گے تو مرغی کیا، کتیا بھی بن سکتے ہو۔''

''اب تو سوچنا پڑے گا مہاراج!...... یوں سمجھ لو، اس وقت سے ہماری آپ کی لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا مان کریں گے۔''

''پھلو پھولو گے بچہ!'' طالوت ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

''میرے لئے کوئی سیوا ہو تو بتایئے۔'' ہرچرن لال نے کہا۔

''بتائیں گے...... بتائیں گے۔ پر اس وقت، جب تم اپنے من میں فیصلہ کر لو گے کہ جو کچھ کہہ رہے ہو، وہی کرو گے یا کچھ اور۔''

''میں فیصلہ کر چکا ہوں مہاراج!'' ہرچرن مسکراتا ہوا بولا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تمہارے مکھ سے کرودھ ٹپک رہا ہے۔''

''نہیں مہاراج!...... بھگوان کی سوگند، اب میں آپ کا داس ہوں۔''

"اور تلکا؟"
"تلکا مہاراج کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر وہ گئے کہاں؟"
"جان بچا کر بھاگ گئے۔" طالوت مسکرا کر بولا۔ ہرچرن لال سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر وہ گردن ہلاتا ہوا بولا۔
"بڑی عجیب بات ہے۔ بھگوان ہی بہتر جانے۔"
"ہاں...... بھگوان ہی بہتر جانے۔" طالوت نے جواب دیا۔
"رات کو میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں گا مہاراج!" ہرچرن لال واپس مڑتا ہوا بولا۔
"ضرور...... ضرور......" طالوت نے بڑے خلوص سے گردن ہلائی تھی۔ ہرچرن لال باہر نکل گیا اور طالوت میری طرف دیکھنے لگا۔
"کیا کہتے ہیں تربوز جی مہاراج؟"
"خدا ہی بہتر جانے۔"
"ٹھیک ہے، ہرچرن لال جی بلکہ مہامنتری جی اگر ہمارے راستے میں نہیں آئے تو ہم ان سے دشمنی نہیں کریں گے۔"
تلکا مہاراج کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ پورا راج مندر سرگوشیوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ پنڈے اب ہمارے لئے اپنے دلوں میں عقیدت پا رہے تھے۔ اس کا اظہار اُن کے رویے سے ہوا تھا۔ بہرحال مجھے یا طالوت کو ان باتوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ ہم تو بقول شخصے اُنہی کا کھا رہے تھے اور اُنہی کے سینوں پر مونگ دل رہے تھے۔
خاصی رات گئے ہرچرن لال جی کی آمد کی اطلاع ملی۔ ہم نے مسکراتے ہوئے اُن کا سواگت کیا تھا۔ ہرچرن لال کے چہرے پر غور و فکر کے آثار تھے۔
"کیسے مہامنتری جی! کیا حال ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"کرپا ہے مہاراج کی...... مگر میں بہت پریشان ہوں۔"
"کیوں؟"
"تلکا مہاراج کے پاس گیا تھا۔"
"جانا ہی چاہئے تھا۔" طالوت آہستہ سے بولا۔
"ملے......؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں، اپنی گپھا میں موجود تھے۔"
"کیا کر رہے تھے؟"
"تیاریاں۔"
"کیسی؟"
"آپ سے مقابلے کی۔"
"خوب...... تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ہرچرن جی؟"
"میں بڑی کٹھنا میں پڑ گیا ہوں مہاراج!...... آپ بھی مہان ہیں اور تلکا مہاراج بھی بہت بڑے

گیانی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کس پر بھروسہ کروں؟"
"بھروسہ کس سلسلے میں ہرچرن لال؟"
"آپ نہیں سمجھتے مہاراج؟"
"ہم سب سمجھتے ہیں۔ سادھوؤں سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے؟"
"جاننا چاہتے ہو ہرچرن؟" میں نے کہا۔
"ہاں مہاراج! بتا ہی دیں۔"
"تو پھر سنو! تمہارے راستے کا بڑا کانٹا پورن لال تھا، جسے تم صاف نہیں کر سکتے تھے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ پورن لال بہت بڑا سازشی ہے۔ تمہاری ساری باتیں اس کے علم میں تھیں۔ تم اس سے بنائے رکھنے کے لئے مجبور تھے۔ تمہارے راستے کا وہ کانٹا ہم نے ہی صاف کیا۔ اور اس کے بعد بھی ہم ہی تمہاری سہائتا کریں گے۔"
"اوش مہاراج!.......اوش......تب تو میں نے بہت بڑی غلطی کی۔" ہرچرن لال بولا۔
"غلطی منش ہی کرتے ہیں ہرچرن لال!"
"مگر اب تلکا مہاراج کا کیا کریں گے؟"
"پھلکا بنا کر لٹا دیں گے۔ چنتا مت کرو۔" طالوت نے لاپروائی سے کہا اور ہرچرن لال کے چہرے پر گہرے غور وفکر کے تاثرات نظر آتے رہے۔ پھر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔
"پورن لال اب ٹھیک تو نہیں ہوگا، مہاراج؟"
"تم چاہو گے تو نہیں ہوگا۔"
"وہ میرے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اُسے ٹھیک نہیں ہونا چاہئے۔" ہرچرن بولا۔
"نہیں ہوگا، ہرچرن لال! مگر اس کے بدلے تم ہمیں کیا دو گے؟"
"میرا کام ہو گیا......تو میں آپ کو وہ دوں گا مہاراج! جو آپ چاہیں گے۔" ہرچرن لال پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔
"وچن دیتے ہو؟"
"ہاں......وچن دیتا ہوں۔"
"ایک بات سن لو ہرچرن! یہ بات تمہارے علم میں بھی ہے کہ پورن لال نے ایک بار ہمیں وش دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ دوسری بار اُس نے ہمیں بند کر کے سانپ سے ڈسوانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا......تمہارے سامنے ہے۔ تم بھی اچھی طرح سن لو! تلکا کی کوششوں کو جاری رہنے دو۔ وہ ہمارے دشمنوں میں سے ہے۔ لیکن......اگر تم نے ہم سے کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو ناکام تو رہو گے مگر......اس کے بعد تم ہمارے متر نہ رہو گے۔"
"میں وچن دے چکا ہوں مہاراج! آج سے ہماری آپ کی صرف دوستی ہے۔ لڑائی ختم ہو چکی ہے۔"
"کیا محل کی باتیں ہم سے چھپاؤ گے؟"
"نہیں چھپاؤں گا مہاراج!"
"پورا پورا بھروسہ کرو گے؟"

''ہاں۔''
''اسی میں کلیان ہے۔ ہاں تو پہلی بات بتاؤ۔''
''پوچھیں مہاراج!''
''راج ہنس کہاں ہے؟'' طالوت نے تیر پھینکا اور ہرچرن لال کا چہرہ ایک دم اُتر گیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی کشمکش نظر آنے لگی۔ ہم دونوں اُس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ پھر اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔
''آپ اس کا کیا کریں گے مہاراج؟''
''چٹنی بنا کر روٹی کے ساتھ کھائیں گے۔ یہ کیوں پوچھتے ہو؟''
''آپ کے اس سوال سے میرے من میں پھر شبہ جاگ اُٹھا ہے۔'' ہرچرن آہستہ سے بولا۔
''کیسا شبہ؟''
''مجھے شما کریں مہاراج!...... یہی کہ آپ ملیچھوں کے جاسوس ہیں۔''
''یعنی مسلمانوں کے......؟'' طالوت نے پوچھا۔ میرے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔
''ہاں......''
''اگر ہیں بھی تو تم ہمارا کیا بگاڑ لو گے ہرچرن لال؟'' طالوت نے کہا۔
''میں اپنے پران دے دوں گا، مہاراج! مگر آپ کو اپنا راز دار نہیں بناؤں گا۔'' ہرچرن لال نے ذہنی ہیجان کے درمیان کہا۔
''تب پھر بھگوان کی سوگند کھا کر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے جاسوس نہیں ہیں۔ اور اس کے بعد ہم کچھ نہ کہیں گے۔''
''میں مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا ہوں مہاراج! مجھے ان سے بہت نفرت ہے۔ آپ دیکھ لیں، ایک دن پورے درگا پور کو ان سے صاف کر دوں گا۔''
''ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں ہے ہرچرن لال!'' میں نے کہا۔
''تب پھر آپ نے راج ہنس کے بارے میں کیوں پوچھا؟''
''کیوں...... اس سے مسلمانوں کا کیا تعلق؟'' طالوت نے بے ساختہ پوچھا اور ہرچرن لال گہری نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''اگر آپ کو یہ تعلق نہیں معلوم مہاراج! تو پھر مجھے اطمینان ہے۔'' اُس نے سکون سے مسکراتے ہوئے پوچھا اور ہم دونوں احمقانہ انداز میں اُس کی شکل دیکھتے رہے۔ لیکن یہ انوکھا انکشاف ہمارے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ بہرحال ہم دونوں بھی سنبھل گئے اور طالوت نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
''تم نے راج ہنس کے بارے میں نہیں بتایا؟''
''آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''
''اسی کے لئے تو ہم راج محل آئے ہیں مورکھ!'' طالوت نے کہا۔
''راج ہنس کے لئے؟''
''ہاں۔''

”کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے مہاراج؟“
”ہاں۔“
”کہاں؟“
”جب ہم دُرگا پور آئے تھے تو ایک رات ہم نے بستی کے سب سے پہلے مندر میں استھان کیا تھ
یہ کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ وہیں ہم نے راج ہنس کو دیکھا اور ہماری ساری تپسیا نشٹ ہوگئی۔ ہمارا خیا
تھا کہ وہ اسی مندر میں رہتی ہوگی۔ لیکن اس سمے کے بعد سے وہ ہمیں نظر نہیں آئی۔“
”اوہ، ہاں...... ایک رات وہ رام نرائن مندر میں تھی۔“ ہرچرن لال جلدی سے بولا۔
”ہم اُسی رات کی بات کر رہے ہیں۔“
”عجیب بات ہے مہاراج!“ ہرچرن گردن ہلا کر بولا۔
”کیوں...... کیا بات ہے؟“
”اس لڑکی کو جو ایک نگاہ دیکھتا ہے، اُس پر مر مٹتا ہے۔ کیا رشی، کیا منی۔“
”ہم اپنے علاوہ اس کے ایک بھی عاشق کو زندہ نہ رہنے دیں گے۔“ طالوت جلدی سے بولا۔
”ہاں مہاراج!...... طاقتور کی لاٹھی سب سے بڑی۔ پورن لال بھی اُسے چاہتا تھا۔ میں بھی اُس
سے بہت پریم کرتا ہوں اور تلکا مہاراج تو کہتے ہیں کہ وہ اُس کے پریم میں سوکھ گئے۔“
”اور کتنے پریمی ہیں اُس کے؟“ طالوت نے بھاری لہجے میں پوچھا۔
”مہاراج گووند اس کپور کے کانوں میں اُس کی آواز نہیں پہنچی ہے، ورنہ پھر کسی کی ہمت کہاں تھی ک
وہ اس سے پریم کر سکے۔“ ہرچرن لال نے بتایا۔
”کیا درگا پور میں عشق کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا؟“
”کام کرنے والے الگ ہوتے ہیں مہاراج! پریمیوں کو پریم کرنے سے ہی کہاں فرصت ہوتی ہے۔“
”جیسے مہاراج گووند اس؟“
”مہاراج...... ہاں......“ ہرچرن لال ہنس پڑا۔
”وہ درگا پور کا سب سے بڑا پریمی معلوم ہوتا ہے۔“
”آپ نے ٹھیک کہا مہاراج!“ ہرچرن لال بولا۔
”تو پھر ہمارے پریم کا کیا ہوگا ہرچرن لال؟“
”ہرچرن لال کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے مہاراج! کہ وہ آپ کی پریمیکا کو لے جائے۔“
”دھن واد ہرچرن! دھن واد...... متر ہو تو تمہارے جیسا۔“ طالوت نے جھومتے ہوئے کہا۔
”پر میری بھی ایک منوکامنا ہے مہاراج!“
”ہاں ہاں، کہو۔“ طالوت آنکھیں بند کر کے بولا۔
”آپ بھی من سے میرے میت بن جائیں۔“
”خود کو اس قابل ثابت کرو ہرچرن لال!“
”میں کوشش کروں گا مہاراج! مگر مجھ سے بڑی بھول ہو چکی ہے۔“
”وہ کیا؟“

''میں آپ کے خلاف تلکا مہاراج کو کھڑا کر چکا ہوں۔''
''کتنی دیر کھڑا رہے گا۔ اُس کی ٹانگوں میں جان نہیں ہے۔ خود گر پڑے گا۔''
''یہ مہاراج کی بھول ہے۔''
''کیوں؟''
''تلکا جیسا گیانی سادھو دوسرا نہیں ہے مہاراج!.....وہ......وہ بڑی طاقت رکھتا ہے۔ اُس کے سوکھے شریر میں سینکڑوں شیطان چھپے ہوئے ہیں۔''
''اسی لئے وہ یہاں سے بھاگ گیا ہے۔''
''وہ بہت چالاک ہے مہاراج! اب میں آپ کا متر ہوں۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ وہ آپ کو کامیاب کرے۔ لیکن تلکا مہاراج سے ہوشیار رہیں۔''
''ٹھیک ہے ہرچرن لال! تم راج ہنس کی بات کرو۔ تلکا اور اُس جیسے دوسرے لوگوں کو ہمارے اوپر چھوڑ دو۔''
''راج ہنس آپ کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی ہے مہاراج! پرنتو، میرے کام کے بعد۔''
''ہوں.....تمہارا کیا کام ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''کچھ باتیں میرے لئے بھی رہنے دیں مہاراج! آپ پہلے تلکا مہاراج سے نمٹ لیں۔ اس کے بعد میں اپنا کام بتاؤں گا۔''
''اور راج ہنس کا کیا ہوگا؟''
''میں کہہ چکا ہوں مہاراج!''
''نہیں بالک! تیرا من صاف نہیں ہے۔ تُو سوچ رہا ہے کہ اگر ہم تیرا کام نہ کر سکے تو تُو ہماری بات نہیں مانے گا۔ تُو سوچ رہا ہے کہ پتہ نہیں، ہم تلکا کو نیچا دکھا سکے یا نہیں؟''
''ہاں مہاراج!.....تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں انکار نہ کروں گا۔ لیکن میرے لئے یہ بہت ضروری ہے۔''
''تو اس سمے تک ہم راج ہنس کے لئے تڑپتے رہیں گے؟''
''مجبوری ہے مہاراج!''
''نہیں ہرچرن لال! ہم کسی کام کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ ہم جب چاہیں، اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ تُو یا کوئی اور ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔''
''میں جانتا ہوں مہاراج! پرنت میرے پاس کوئی اُپائے نہیں ہے۔ آگے آپ کی مرضی۔ آپ مجھے متر کہہ چکے ہیں۔'' ہرچرن لال نے کہا۔
''تربوز جی مہاراج؟'' طالوت نے مجھے پکارا۔
''جی مہاراج خربوز!''
''کیا خیال ہے؟''
''جو آپ کا خیال ہے مہاراج!......عاشق آپ ہیں، میں نہیں۔ اگر میں راج ہنس کا عاشق ہوتا تو ہرچرن لال سے کہتا کہ اسے ایک بار مجھ سے ملا دیا جائے۔ بس تھوڑی سی بات چیت کر لوں۔ اس کے

بعد ہرچرن کا کام شروع کر دیتا۔"

"تو ہم بھی یہی کہہ دیتے ہیں۔" طالوت بولا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو گا مہاراج!" ہرچرن لال بولا۔

"اس کے علاوہ اور کچھ ٹھیک نہیں ہو گا ہرچرن!"

"مگر مہاراج! تلکا کے خطرے کو آپ کیوں بھول رہے ہیں؟ جس طرح وہ سانپ بن کر بھاگ سکتا ہے، اس طرح کیا وہ راج ہنس کو نہیں لے جا سکتا؟"

"کس کی مجال ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے ہماری پریمیکا کو لے جائے۔ مگر ہرچرن لال! تلکا اب بھی تو یہی کام کر سکتا ہے۔ تجھے زیادہ بہتر معلوم ہے کہ وہ کتنا چالاک ہے۔"

اور ہرچرن لال گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار پھیل گئے تھے۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "ہاں مہاراج! جب کی بات اور تھی، اب کی بات اور ہے۔ تم ٹھیک ہی کہتے ہو، تلکا کو جب یہ معلوم ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تو...... تو وہ سب سے پہلے راج ہنس کو ہتھیائے گا۔"

"تب پھر جلدی کرو۔ پہلے راج ہنس کو نکالو۔ اس کے بعد دوسرا کام کریں گے۔ کیا تلکا کو معلوم ہے کہ وہ راج ہنس کہاں ہے؟"

"نہیں...... یہ کسی کو نہیں معلوم۔ مگر وہ اسے ضرور تلاش کرے گا۔"

"تو پھر چلو نا ہرچرن جی!"

"مگر...... اسے میں کہاں لے جاؤں گا مہاراج؟..... تلکا ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔" ہرچرن فکرمندی سے بولا۔

"تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔ اس کے بعد تلکا اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔"

"پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا مہاراج!" ہرچرن لال پریشانی سے بولا۔

"تب تیری بدھی خراب ہو گئی ہے ہرچرن!...... سن، اگر تلکا اس کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے تو کیا ہم نہیں کر سکتے؟ ہم تجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔" طالوت نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

طالوت نے پہلے یہ کوشش نہیں کی تھی۔ پھر اب کیوں؟

"مہاراج!...... مہاراج!...... میرے کام کی بات بھی تو کریں۔ ٹھیک ہے، میں راج ہنس کو آپ کے حوالے کر دوں گا، لیکن پھر میرے کام کا کیا ہو گا؟"

"ہرچرن لال! اگر یہ بات ہے تو آج ہی اپنا کام بتا دے۔ ہم نے کب منع کیا ہے؟" طالوت نے نرم آواز میں کہا اور ہرچرن گردن جھکا کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ چالاک مہامنتری شاید کچھ اور اہم فیصلے کر رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج! ابھی میں آپ کو اپنے کام کے بارے میں تو نہیں بتاؤں گا، لیکن میرے خیال میں راج ہنس کی رکھشا آپ سے اچھی کوئی نہیں کر سکے گا۔ میں راج ہنس کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو ایک وچن بھی دینا پڑے گا۔"

"کیسا وچن؟"

''آپ میرا کام ضرور کریں گے۔ اور اگر تلکا مہاراج آپ پر چھا گئے تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں سمجھیں گے۔''
''ہمیں منظور ہے ہرچرن لال!''
''تب آیئے مہاراج! میں آج ضروری فیصلے کر ہی ڈالوں۔ خطرہ مول لئے بنا کون سا کام چلتا ہے۔'' ہرچرن لال نے کہا اور ہم دونوں تیار ہو گئے۔
''راج ہنس کو لے کر راج مندر میں ہی آ جائیں گے مہاراج! یا آپ خود اس کے ساتھ وہیں رہیں گے؟ میرے خیال میں ابھی اس کو سامنے لانا ٹھیک نہیں ہوگا۔''
''جیسا تم ٹھیک سمجھو، ہرچرن لال!'' طالوت نے جواب دیا۔
''آپ کو راج محل سے کیا لینا؟ جس جگہ راج ہنس موجود ہے، رہائش کے لحاظ سے وہ بری نہیں ہے۔ آپ وہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔ کسی چیز کی تکلیف آپ کو نہیں ہوگی۔''
''ٹھیک ہے۔ وہاں ہی رہیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
میں حسب معمول خاموش تھا اور طالوت کے آئندہ پروگرام پر غور کر رہا تھا۔ بہرحال، ہرچرن لال ہمیں اپنے خاص محل میں لے گیا۔ اور پھر وہ محل کے پائیں باغ میں ایک درخت کے نزدیک پہنچ گیا، جہاں سے ان تہہ خانوں میں جانے کا راستہ تھا، جو محل کے نیچے تھے۔ اور جہاں راج ہنس قید تھی۔
درخت کے کھوکھلے تنے سے نیچے جانے والی سیڑھیوں سے گزرتے ہوئے ہم تہہ خانوں میں پہنچ گئے۔ اندر جگہ جگہ خوب صورت شمع دان رکھے ہوئے تھے، جن میں لگی ہوئی شمعوں کی روشنی میں تہہ خانوں کا ماحول بے حد پُراسرار لگ رہا تھا۔ ہم بڑی دلچسپی سے اس زیرزمین دنیا کو دیکھ رہے تھے۔ کئی کمروں سے گزر کر ہرچرن لال ایک دروازے پر پہنچ گیا۔ اور پھر اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔
''راج ہنس!...... دروازہ کھولو!''
لیکن اندر سے کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ چند ساعت انتظار کے بعد ہرچرن لال نے دوبارہ پکارا۔
''راج ہنس! دروازہ کھولو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر دباؤ بھی ڈالا تھا۔ اور ذرا سے دباؤ پر دروازہ کھل گیا۔
''ارے......'' ہرچرن لال کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی اور وہ جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی اندر گھس گئے۔ اعلیٰ درجے کی ایک رہائش گاہ تھی، لیکن قیمتی سامانِ آرائش سے آراستہ بڑا کمرہ بالکل خالی تھا۔ البتہ ایک کارنس پر شمع دان کے نزدیک ایک بھیانک چیز نظر آ رہی تھی۔
یہ ایک مُردہ اُلو تھا۔ جو شمع دان کے نزدیک ایک ڈیکوریشن پیس میں پھنسا ہوا تھا۔
''تلکا......!'' ہرچرن لال کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔
طالوت اور میں گہری نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے ہرچرن لال کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس وقت شاید ہرچرن لال ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا۔
''کیا ہوا ہرچرن لال؟'' طالوت نے پُرسکون آواز میں پوچھا۔
''تلکا...... تلکا یہاں پہنچ گیا مہاراج!...... بات بگڑ گئی۔ بھگوان کی سوگند، بات بگڑ گئی۔''
''ہوں...... تمہاری طرف سے راج ہنس کو ہمیں اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہے؟'' طالوت نے

پوچھا۔
''میں کہہ چکا تھا مہاراج! مگر اب بات بہت بگڑ گئی۔''
''تم چنتا مت کرو ہرچرن لال! بگڑی ہوئی بات کو اب ہم خود ہی ٹھیک کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہے۔''
''مگر میرا کام.....'' ہرچرن لال نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے مہاراج! داس ہر سیوا کے لئے حاضر ہے۔ داس کی جب بھی ضرورت ہو، اسے آواز دے لیں۔''
''تمہارے خیال میں ہرچرن لال! تلکا، راج ہنس کو لے کر کہاں گیا ہوگا؟'' طالوت نے پوچھا اور اچانک ہی ہم سب چونک پڑے۔
کارنس پر لٹکا ہوا مُردہ اُلّو پھڑ پھڑایا تھا۔ اور پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کی خوفناک آنکھیں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اُس کی چونچ کھلی اور اُس کے منہ سے تلکا کی باریک اور مکروہ آواز سنائی دی۔
''راج ہنس تالاب میں پہنچ گیا۔ بالکو! اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ چنتا مت کر...... کوّے ماس کھا گئے اور اب ہڈیاں چنو اور چتا میں جھونک دو۔''
ہرچرن لال کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ خود میرے بدن کے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ اس جدید دور میں اس قسم کے جادو کیسے انوکھے تھے۔ لیکن...... مجھے اتنی شدید حیرت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ میرے ماڈرن جن کے کارنامے کیا کم تھے۔
تب میں نے طالوت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ طالوت کوئی حرکت کرنے کے لئے تیار تھا۔ تب اُس نے ہاتھ اُٹھایا اور اُلّو کے پَر پھڑ پھڑانے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے تیز ہوائیں اُسے طالوت کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ اور پھر وہ کسی کاغذ کی طرح اُڑتا ہوا طالوت کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور طالوت نے اُسے مٹھی میں جکڑ لیا۔
''ہری اوم...... ہری کرشن...... ہری اوم...... ہری کرشن!'' ہرچرن لال کی حالت خراب تھی۔ یہ سارے عجیب و غریب واقعات کسی کا بھی دماغ خراب کرنے کے لئے کافی تھے۔ میں نے طالوت کی کامیابی دیکھ لی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے طالوت کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ اُلّو کو چہرے کے قریب لا کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُلّو کی گردن پھر لٹک گئی تھی۔ گویا وہ دوبارہ مر گیا تھا۔
''مم..... مر گیا..... مر گیا.....!'' ہرچرن لال کے منہ سے نکلا۔ لیکن طالوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُلّو کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے اسے پھینک دیا۔
''مہاراج!..... مہاراج!..... کیا یہ...... مر گیا؟''
''ہاں، یہ پھر مر گیا۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔
''آپ نے..... آپ نے تلکا کو مار ڈالا؟'' ہرچرن لال مسرت سے چیخا۔
''نہیں۔''
''مم..... مگر یہ..... یہ تو..... تلکا تھا۔''
''نہیں ہرچرن لال! یہ صرف ایک پرندہ ہے۔ تلکا چند ساعت کے لئے اس کے منہ سے بولا تھا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ وہ بہت جلد مر جائے گا۔''
''اوہ..... اب تو..... اب تو وہ میرا بھی دشمن بن گیا ہوگا۔''

''تو تم خوف سے مر جاؤ۔'' طالوت نے غصیلے انداز میں کہا۔
''نہیں مہاراج!...... نہیں۔ آپ شکتی مان ہیں۔ آپ اس سے نہیں ڈر سکتے۔ مگر میں...... میں تلکا کی خوف ناک شکتی کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟''
''تو پھر سنو ہرچرن لال! تم نے تلکا کے کہنے میں آ کر ہمارے ساتھ کوئی چال نہیں چلی تو اطمینان رکھو۔ تلکا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سمجھے؟...... اب ہمیں آ گیا دو۔''
''کہاں مہاراج؟'' ہرچرن لال چونک پڑا۔
''اب پہلے تلکا سے ہی دو دو ہاتھ ہو جائیں...... اس کے بعد تم سے ملاقات ہو گی، ہرچرن لال!''
''میں اکیلا رہ جاؤں گا مہاراج!...... میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔'' ہرچرن رو دینے والے انداز میں بولا۔
''اپنی رکھشا خود کرو ہرچرن لال!...... آؤ۔'' طالوت نے مجھ سے کہا اور یوں اُس کے ساتھ تہہ خانوں سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔
''مہاراج!...... مہاراج!'' ہرچرن ہماری طرف دوڑا۔ لیکن طالوت نے اچانک مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ اور اُس کی اس حرکت کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ ماحول ایک دم بدل جائے۔ اور ہرچرن سے جان چھوٹ جائے۔ لیکن جس اجنبی جگہ ہم پہنچے تھے، وہ بھی کوئی مندر ہی تھا۔
میں غور سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ اور پھر مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ یہ وہی مندر ہے، جہاں ہم نے درگاپور میں داخل ہونے کے بعد پہلا قیام کیا تھا۔ ہم اسی چھت پر تھے، جہاں سے دریا کا پاٹ نظر آتا تھا۔
میں نے ایک گہری سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔ اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔
''ہیلو......!'' میں نے طالوت کو مخاطب کیا اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔
''فرمایئے؟''
''آپ ہی فرما دیں تو مناسب ہے۔''
''کیا بات ہے؟''
''یہاں تشریف لانے کی وجہ، جہاں پناہ؟''
''محل چھوڑنا تھا۔ اور یہی جگہ علم میں تھی۔''
''محل چھوڑنے کی وجہ سرکارِ عالی؟''
''تلکا سے باقاعدہ مقابلہ''
''خوب..... لیکن مقصد؟''
''راج ہنس کا حصول۔''
''کیا یہ اعترافِ محبت ہے؟''
''تمہارے دماغ میں خرابی ہے۔'' طالوت منہ بنا کر بولا۔

"پھر اس قدر شدت؟"
"ارے اس سوکھے کے مریض کی یہ مجال کہ ہمارے ساتھ چالیں چلے۔" طالوت چمک کر بولا۔
"گویا یہ صرف انا کی بات ہے؟"
"انا کی بات آجائے تو "صرف" کیا معنی رکھتی ہے؟" طالوت مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔لیکن اس لڑکی کے سلسلے میں حضور پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد تھیں۔"
"مجھے روکنا چاہتے ہو؟"
"ہرگز نہیں۔صرف ایک سوال ہے۔ جواب مل جائے تو ٹھیک ہے۔اور اگر یہ سوال، جواب کے قابل نہ ہو تو بھی کوئی بات نہیں ہے۔"
"یار عارف! بور مت کرو۔" طالوت ایک دیوار سے ٹکتے ہوئے بولا۔
"بہتر ہے۔تعمیل ارشاد میں خاموش ہو جاتا ہوں۔"
"باز نہیں آؤ گے تم۔"
"میں کیا...... اور میری بساط کیا۔"
"فضول آدمی!...... معاملہ اب میرا نہیں رہا ہے؟"
"چھوٹا دماغ ہے حضور!...... تشریح کر دیں۔"
"اس وقت...... عارف! جب ہم اس کے بارے میں سوچ رہے تھے، اُس کے حصول کا محرک صرف ہماری طلب تھی۔اب صورتِ حال دوسری ہے۔"
"اب بھی نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔
"سب کچھ سمجھ رہے ہو۔کمینہ پن کر رہے ہو۔" طالوت نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ارے نہیں حضور! یہ تاب، یہ مجال کہاں سے لا سکتا ہوں؟"
"کیوں پریشان کر رہا ہے یار!" طالوت زچ ہو کر بولا۔
"بس تشریح کر دیں۔اور کچھ نہیں چاہتا۔"
"عارف! اب صورتِ حال دوسری ہے۔ ممکن ہے، اُسے ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ انسانی رشتے ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ہم یہ بات نظر انداز کر سکتے ہیں کہ اس کا تعلق ہمارے مذہب سے نہیں ہے۔ دیومتی ہی کون سی ہمارے مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔لیکن کیا وہ امداد کی مستحق نہیں تھی؟"
"ٹھیک ہے طالوت!...... لیکن راج ہنس کو کون سی امداد کی ضرورت ہے؟"
"وہ لوٹ کا مال بنی ہوئی ہے۔کیا یہ ٹھیک ہے؟"
"بالکل نہیں۔"
"کیا اُس کی مدد کے لئے یہ جواز کافی نہیں؟"
"ہاں...... میرا خیال ہے، ہے تو سہی۔"
"اور پھر تلکا...... کیا اس مریل بوڑھے سے ہار ماننی ہے؟"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن خبیث جادوگر ہے۔ بہت خطرناک۔"

''بات صرف اپنی ذات تک محدود ہے عارف! ورنہ اگر کسی سے مدد طلب کر لوں، تو پورے درگاپور کو اُلٹا کر دوں۔ تلکا کیا حیثیت رکھتا ہے۔''

''یہ بات دل سے تسلیم۔ لیکن ایک اور سوال مہاراج!'' میں نے کہا۔

''فرمائیے...... فرمائیے۔'' طالوت طنزیہ انداز میں بولا۔

''اگر راج ہنس وہ لڑکی نہ ہوئی، جو ہمارے ذہن میں ہے، تب؟''

''عارف! کیا ہم اتنے ہی خودغرض ہیں کہ کسی کے سلسلے میں اپنی پسند کا خیال رکھیں۔ خدا کی قسم! وہ کوئی بھی ہو، مظلوم ہے تو ہم اُس کی مدد کریں گے۔''

''معاف کرنا طالوت! یہ بات صرف مذاق تھی۔''

''شکریہ میرے دوست!''

''مگر اب پروگرام کیا ہے؟''

''سوکھے کی تلاش۔''

''کہاں تلاش کرو گے؟''

''مشکل نہیں ہے۔ راسم سے اس کا پتہ معلوم کریں گے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ معاملہ شروع ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ اب کام ہو جائے گا۔

''تو پھر دیر کس بات کی؟''

''راسم!'' طالوت نے داہنی طرف رُخ کر کے کہا اور راسم جاتا ہی کہاں تھا، جو آتا۔ دوسرے لمحے نمودار ہو گیا۔

''آقا!'' اُس نے گردن جھکا دی۔

''اس بار صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔'' طالوت بولا۔

''میں جانتا ہوں آقا!'' راسم نے جواب دیا۔

''تھوڑی سی احتیاط کرنا پڑے گی۔ معلوم کرو، وہ کہاں ہے؟''

''ابھی حاضر ہوا آقا!'' راسم نے کہا اور نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ طالوت نے آسودہ انداز میں گردن ہلائی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ راسم کو ان کاموں میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آ گیا۔

''زیادہ دُور نہیں ہے آقا! اپنے دوستوں کی محفل لگائے بیٹھا ہے۔''

''دوستوں کی محفل؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہاں آقا!..... سب گندی روحیں ہیں۔ جہاں ان کا اجتماع ہے، وہاں ناک بدبو سے پھٹ جاتی ہے۔ تلکا نے اُن کی ضیافت کا بندوبست کیا ہے۔''

''اوہو...... عارف! کیا خیال ہے بھئی۔ کیوں نہ اس ضیافت میں ہم بھی شرکت کریں؟''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے بادل ناخواستہ کہا۔ حالانکہ میرے دل میں بہت سے وسوسے جاگ اُٹھے تھے۔ اور پھر جونہی طالوت نے میرا ہاتھ پکڑا، میں نے اُسے روکا۔

''سنو تو طالوت!''

''ہوں۔'' وہ رُک گیا۔
''تمہیں وہ رات یاد ہے، جب تلکا نے میرے گرد چنگاریاں بکھیر دی تھیں۔''
''ہاں...... یاد ہے۔''
''میرا مطلب ہے، اس نے میرے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا۔''
''اور اس وقت وہ ہمارے بدن سے شعلے لپیٹ دے گا۔ کیوں؟'' طالوت بولا۔
''نہیں۔ میں نے صرف تمہیں یاد دلایا ہے۔ میں اُس سے خوف زدہ نہیں ہوں۔''
''آ جا یار!..... مجھے سب کچھ یاد ہے۔'' طالوت نے مجھے کھینچتے ہوئے کہا اور میں نے خود ہی آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے لمحے ہم ایک اجنبی جگہ کھڑے تھے۔

پہاڑی مقام تھا۔ ایک خاصی بلند پہاڑی کے دامن میں ایک بھیانک غار منہ کھولے کھڑا تھا۔ اور ہم اسی غار کے سامنے تھے۔ درحقیقت غار کے دہانے سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

میں نے چٹکی سے ناک دبالی۔ طالوت کی خود بھی بری حالت تھی۔
''کچھ بھی ہو، ہمیں اندر داخل ہونا ہے۔'' اُس نے کہا۔
''مر جائیں گے طالوت!''
''ابے ناک دبائے رکھو۔ دیکھیں تو سہی۔'' طالوت بولا اور میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ ناچار میں اُس کے ساتھ غار میں داخل ہو گیا۔ خدا کی پناہ...... بڑا بھیانک منظر تھا۔ ہمارے بزرگ بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سناتے تھے۔ بڑی عجیب عجیب شکلیں بتاتے تھے وہ ان کی۔ اس وقت یہ ساری باتیں افسانے معلوم ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے پتے والے چڑیلوں سے خوف زدہ نظر آتے تھے۔ نئی نسل کے لوگ جوان چیزوں سے واقف بھی نہیں ہیں، ان کی معلومات صرف خوف ناک قصوں تک ہی محدود ہیں۔ اگر اس خوفناک اجتماع کو دیکھ لیں تو ان کے دل کی دھڑکنیں ہی بند ہو جائیں۔

عجیب عجیب شکلیں تھیں۔ ایک شکل آدمی کی تھی۔ لیکن سارس جیسے پیروں پر صرف گردن رکھی ہوئی تھی۔ چہرے پر عجیب لمبے لمبے بال اُگے ہوئے تھے۔ ہونٹوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ ہاتھ میں سڑی ہوئی کلیجی کی بوٹیاں تھیں، اس کے قریب ہی ایک اور شکل بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے مٹکے جیسے پیٹ سے ایک بچہ چپکا ہوا تھا۔ لمبی لمبی چھاتیاں زمین پر رکھی تھیں۔ یہ شاید عورت تھی۔ ایک جوڑا انتہائی چھوٹے قد کا سیاہ فام تھا۔ سب کے سب کچھ نہ کچھ کھا رہے تھے۔ اور یہ تعفن ان اشیاء سے ہی اُٹھ رہا تھا، جو وہ کھا رہے تھے۔ کھاتے کھاتے وہ بھیانک آواز میں ہنس پڑتے اور پھر کھانے لگتے تھے۔

سر چکرا رہا تھا اس خوف ناک ماحول کو دیکھ کر۔ طالوت کے انداز میں دلچسپی تھی۔ وہ متعجبانہ انداز میں ان کی شکلیں اور حرکات دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
''تلکا نہیں ہے۔''
''ہاں، وہ نظر نہیں آ رہا۔ لیکن طالوت!''
''ہوں؟''
''کیسے بھیانک ہیں یہ سب؟''
''اور یہ کھا کیا رہے ہیں؟''

''طالوت! اگر تلکا نے ہمارے بارے میں اندازہ لگالیا تو؟''

''کچھ نہیں ہوگا میری جان! کچھ نہیں ہوگا۔ ارے وہ دیکھو۔'' طالوت نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں نے بھی اس سیاہ شے پر نگاہیں جمادیں۔

تب میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ میں نے دیکھا ایک انتہائی جسیم چمگادڑ ایک دروازے سے نکل کر آ رہا ہے، لیکن پورے بدن سے چمگادڑ ہونے کے باوجود اُس کا سر انسان کا تھا۔ اور یہ شکل تلکا کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔

ضیافت میں شریک مہمان ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے اور پھر وہ مخصوص انداز میں ہنس پڑے۔

''کھاؤ......کھاؤ میرے دوستو!......خوب کھاؤ۔''

''ہمارے پیٹ بھر گئے تلکا!'' ننھے سے جوڑے نے کہا۔

''کیا سب کے پیٹ بھر گئے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر کھڑے ہو جاؤ۔'' تلکا نے کہا۔ طالوت نے مضبوطی سے مجھے تھاما ہوا تھا، ورنہ میں تو گر ہی پڑتا۔ ''اب تمہیں میرا کام کرنا ہے۔''

''ہم تیار ہیں۔'' سب نے بیک وقت جواب دیا۔

''رنگا!'' تلکا نے آواز دی۔

''تلکا مہاراج!'' سارس کی ٹانگوں والا آگے بڑھ آیا۔ عجیب شکل تھی۔ صرف ٹانگوں کے اوپر رکھا ہوا سر بے حد خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

''اپنے جیون میں تُو بہت بڑا جیوتشی تھا؟''

''اب بھی ہوں مہاراج!'' رنگا کی منمناہٹ سنائی دی۔

''تو بتا، میرے دشمن اس سمے کہاں ہیں؟'' اور تلکا کے ان الفاظ پر میرا سانس پھولنے لگا۔ میں خوف زدہ نگاہوں سے رنگا کو دیکھنے لگا۔

رنگا نے اپنے پتلے پتلے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ اُٹھایا، اُس کی انگلی کو خلا میں نچانے لگا۔ اُس کی اُنگلی کی جنبش کے ساتھ خلا میں چمک دار لکیریں بن رہی تھیں۔ اور کئی منٹ تک رنگا یہی عمل کرتا رہا۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کون سے دشمن مہاراج؟''

''تُو ہمارے دشمنوں کو نہیں جانتا؟'' تلکا گرجا۔

''سنسار میں ان کی کوئی شکل نہیں ہے مہاراج! اگر ان کا کوئی مکھ ہے تو چھپا ہوا ہے۔ مجھے وہ کہیں نہیں ملتے۔''

''وہ بڑے چالاک ہیں۔ تُو اُن کا پتہ نہ لگا سکے گا۔'' تلکا مایوسی سے بولا۔ اور پھر اس نے ننھے سے جوڑے میں چڑیل کی شکل کو گھورتے ہوئے کہا۔

''گملوکی!''

''مہاراج۔''

''کیا تُو یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ وہ کون ہیں؟''
''کیوں نہیں مہاراج!''
''تو دیکھ..... بتا..... رنگا کی جیوتش کی طرح تیری آنکھیں بھی بند ہیں کیا؟''
''میں ابھی بتاتی ہوں مہاراج!'' ننھی سی برہنہ عورت نے کہا۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند ساعت کھڑی جھومتی رہی۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔
''ان میں سے ایک منش کا پتہ لگتا ہے مہاراج! مگر وہ پاپی ملیچھ ہے۔''
''اور دوسرا؟''
''دوسرے کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔''
''ایک کون ہے؟''
''عارف..... اُس کا نام عارف ہے..... وہ ملیچھ ہے۔''
''تو میرا اوچار ٹھیک ہے..... مگر..... مگر دوسرا؟..... تم میں سے کوئی اُس کے بارے میں بتا سکتا ہے؟'' اور سب گردن ہلانے لگے۔
''گملوکی!'' تلکا نے پھر عورت کو آواز دی۔
''مہاراج۔''
''تُو ہی بتا، اس سمے ان دونوں میں سے ایک کہاں ہے؟''
''اوش مہاراج!'' ننھی عورت نے کہا اور پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی وقت میں نے طالوت کا ایک ہاتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ طالوت اسی جگہ کھڑا تھا، لیکن اُس کا ایک ہاتھ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ ننھی سی عورت کی گردن تک پہنچ گیا۔ دوسرے لمحے ننھی سی عورت کی گردن، طالوت کی لمبی اُنگلیوں کی گرفت میں تھی۔
گملوکی نے ہاتھ پاؤں مارے اور اُس کی بھنچی بھنچی چیخیں اُبھرنے لگیں۔ تلکا اُچھل پڑا تھا۔ طالوت نے گملوکی کو اس کی جگہ سے اُٹھا لیا۔ اور پھر اُس نے اُس کی گردن دبا کر نیچے پھینک دیا۔
لیکن گملوکی اُٹھ کر پھر چیخنے لگی تھی۔
''ہائے رام..... ہائے رام..... مر گئی..... ہائے لپا.....''
''ارے جل کوٹی..... ارے جل کوٹی.....'' موٹی عورت، جس کی چھاتیاں کھڑے ہونے سے زمین تک لٹک گئی تھیں، اپنے بچے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ کر ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ پتلی ٹانگوں والا رنگا پھدک کر ایک کونے میں ہاتھ لہرانے لگا۔ سب کے سب بھیانک آواز میں چیخ رہے تھے اور تلکا پَر ہلا رہا تھا۔
تب طالوت آگے بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا تھا۔
''تم باہر رُکو عارف! لیکن خبردار، راستے میں نہیں۔ تاکہ جب یہ لوگ باہر بھاگیں تو ان کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔''
''اوہ..... لیکن.....''
''پلیز عارف!..... جیسا کہہ رہا ہوں، کرو۔''

''او کے۔'' میں نے کہا اور پھر میں باہر سے ہی اندر کے مناظر دیکھنے لگا۔
طالوت اندر جا کر سب پر ظاہر ہو گیا تھا۔ اور ساری آوازیں ایک دم رُک گئیں۔ تلکا زہریلی نگاہوں سے طالوت کو گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''تو تم آ ہی گئے سوامی!''
''ہاں تلکا!'' طالوت نے جواب دیا۔
''دوسرا کہاں ہے؟''
''فی الحال میں ہی تمہارے لئے کافی ہوں۔''
''کرپا کی مہاراج! ہم تمہیں کہاں تلاش کرتے پھرتے؟ پرنت وہ دوسرا..... کیا تمہارا نام عارف ہے؟''
''عارف جس کا نام ہے، وہ بہت بڑی شکتی رکھتا ہے۔ میں تو اُس کا داس ہوں۔''
''چلو، پہلے داس کو ختم کر لیا جائے۔ پھر اُس مہان شکتی والے کو بھی دیکھ لیں گے۔''
''یہ ٹھیک ہے۔'' طالوت مسکراتا ہوا بولا۔
''میں نے جھوٹ تو نہ کہا تھا، تم ملیچھ ہو۔''
''ملیچھ تم ہو تلکا! گندے، پلید کہیں کے۔'' طالوت نے کہا۔
''گھورے کے باسیو! کیا تم اسے کھاؤ گے؟'' تلکا نے اپنے مہمانوں سے پوچھا۔
''اوش مہاراج!..... آپ کی آ گیا ہو تو۔''
''میں اس کا کلیجہ چباؤں گی۔'' موٹی عورت نے کہا۔
''دل گردے میرے ہوں گے مہاراج!''
''اور میں اس کا خون پیؤں گا۔ میں بہت کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔'' سارس نما رنگا نے کہا۔
''ارے تو پھر دیر کس بات کی..... بانٹ لو۔ چلو جلدی کرو۔'' تلکا نے کہا اور چاروں طرف سے بدروحیں، طالوت پر لپکیں۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ لیکن طالوت نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے اور اس کی انگلیوں سے آگ کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ لمبے لمبے شعلے، بدروحوں کو چاٹنے لگے اور کان پھاڑ دینے والی چیخوں سے ماحول گونج اُٹھا۔
''ہائے میرے جل گوٹی.....!''
''اری انگولی..... ہائے، ہائے..... ہائے مر گئی..... مر گیا..... ہو ہو..... ہا ہا.....'' اُن سب کے بدن سلگ رہے تھے۔ شعلے اُن کے جسموں سے لپٹ گئے تھے۔
اور اچانک تلکا نے پَر پھیلائے۔ پھر وہ پھدکا اور دوسرے لمحے دروازے سے نکل بھاگا۔ طالوت کی نگاہ بھی اُس پر پڑ گئی تھی۔ تب میں نے اُسے ایک چمک دار ہیولے میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ اور دوسرے لمحے وہ بھی فضا میں پرواز کرتا ہوا تلکا کے پیچھے لپکا۔ میں ہونقوں کی طرح دونوں کو تلاش کرتا رہ گیا۔
لیکن تاریکی میں آتے ہی دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اندر سے رونے پیٹنے اور سسکنے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں اور خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ اور پھر اس قسم کی کراہیں سنائی دینے لگیں جیسے زخمیوں نے دم توڑ دیا ہو۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مکمل سناٹا چھا گیا۔

میں نے اندر جھانکا۔ زمین پر سیاہ کوئلے پڑے ہوئے تھے۔ اب کوئی آواز، کوئی تحریک نہیں تھی۔ گویا سب ختم ہو گئے تھے۔

لیکن میری اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں باہر رُک کر طالوت کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ہندو یوگیوں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن ان کی شیطانی قوتیں اس قدر بڑھ جاتی ہوں گی، اس کا مجھے گمان بھی نہیں تھا۔ لیکن طالوت نے بہرحال، شاندار طریقے سے ان پر قابو پا لیا تھا۔

طالوت بہرحال طالوت ہے...... میں نے دل میں سوچا۔ لیکن میں کیا کروں؟...... اور اچانک میرے ذہن میں ایک روح فرسا خیال آیا۔ طالوت اگر دیر تک واپس نہ آیا تو میں اس خوف ناک ویرانے میں...... ارے باپ رے...... ارے باپ رے!

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے...... تو پھر میں کیا کروں؟

میں اس پُراسرار غار سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ویران پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے یہ جگہ درگا پور سے کتنی دُور ہے۔ ہم باقاعدہ تو یہاں آئے نہیں تھے، جو راستے کا تعین ہوتا۔ واقعی خطرناک بات ہے۔

اور اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میری کیفیت بڑی شرم ناک ہے۔ میں اُنگلی پکڑ کر چلنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ درحقیقت میری اپنی شخصیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ میں ہر وقت طالوت کا سہارا تلاش کرتا ہوں۔ یہ تو مناسب بات نہیں ہے۔ مجھے خود بھی اپنی فطرت اپنی شخصیت کو آواز دینی چاہئے۔ آخر میں بھی تو اتنا کند ذہن نہیں ہوں۔ میں خود بھی تو ہاتھ پاؤں رکھتا ہوں...... یہ خیال اتنی شدت سے مجھ پر حاوی ہوا کہ میرے بدن میں آگ سی سُلگنے لگی۔ بلاشبہ میں نے اپنی شخصیت کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں بھی گوشت پوست کا انسان ہوں۔ مجھے اپنے طور پر بھی کچھ سوچنا چاہئے۔

اور ان خیالات نے ماحول کا وہ خوف میرے ذہن سے نکال دیا، جو ابھی تک میرے بدن پر طاری تھا۔ میں نے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچا۔ طالوت کا انتظار زیادہ دیر تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو......!

وقت گزرتا رہا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں کبھی کبھی ماحول کا سکوت توڑ دیتی تھیں، ورنہ ہُو کا عالم...... خاموشی...... اور کافی دیر گزر گئی۔ میں جانتا تھا کہ میں طالوت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، خواہ اُسے کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑے۔ خواہ کیسے ہی حالات سے گزرے وہ۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

چنانچہ وہاں قیام سے ہی کیا فائدہ؟ لیکن اب کون سی راہ اختیار کی جائے؟ درگا پور کا راستہ بھی تو نہیں معلوم تھا۔ پھر بھی، کچھ بھی ہو، چلنا چاہئے۔ یہاں رُکنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ ایک سمت کا رُخ کر کے میں چل پڑا۔ کچھ بھی ہو، کہیں بھی پہنچوں...... طالوت کے لئے فکرمند ہونا حماقت تھی۔ میں جانتا تھا، وہ آسانی سے تلکا کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ویسے میں نے ان غاروں میں راج ہنس کی موجودگی کے امکانات پر بھی غور کیا تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان بھیانک غاروں میں داخل ہونے کی ہمت میرے اندر نہیں تھی۔ کئی بار رقدم رکے...... ہمت کو آواز دی لیکن پھر آگے بڑھنا ہی مناسب خیال کیا۔ اور میں آگے بڑھتا رہا۔

دفعتہً ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ کسی بلند جگہ پر چڑھ کر روشنیاں تلاش کروں۔ ممکن ہے، شہر کی صحیح سمت کا اندازہ ہو سکے۔

کافی دور ایک ٹیلے کو منتخب کیا۔ اس پر چڑھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ اور قسمت نامہربان نہیں تھی۔ ٹیلے پر چڑھتے ہی مجھے روشنیاں نظر آ گئیں۔ اسی سمت تھیں جدھر میں چل رہا تھا۔ چنانچہ ٹیلے پر سے اُتر کر اسی طرف کی راہ لی۔ اور رات کا دوسرا پہر تھا، جب میں بستی میں داخل ہوا۔

ہُو کا عالم تھا...... کہیں آنے جانے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ محل ہی کا رُخ کیا۔ سوچا، محل کا جائزہ ہی لے لیا جائے۔ پہرے دار مستعد تھے۔ لیکن جو نظر ہی نہ آئے، اسے کون روک سکتا ہے؟ چنانچہ میں اُن کے جسموں سے بچتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ راج مندر کا رُخ معلوم تھا۔ لیکن راج مندر جانا ضروری تو نہیں تھا۔ کہیں بھی چل پڑا جائے، کیا فرق پڑتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایسی سمت کا رُخ کیا، جہاں پہلے نہیں گیا تھا۔

محل کافی خوبصورت تھا۔ میں اس کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ اور پھر محل کی پشت پر پہنچ گیا۔ یہاں خوب صورت دروازے بنے ہوئے تھے۔ میں ان دروازوں کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں سسکیوں کی آواز اُبھری اور میرے قدم رک گئے۔

یہ آواز...... میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگایا اور پھر اسی اندازے کے تحت دروازے کی عقبی سمت کا رُخ کیا..... اور اس طرف کا منظر مجھے بہت پسند آیا۔ چھوٹا سا خوب صورت باغ تھا، جس میں ننھے ننھے فوارے بنے ہوئے تھے۔ فواروں میں پانی اُچھل رہا تھا۔

پچھلی راتوں کا چاند نکل آیا تھا۔ ورنہ یہ منظر اتنا حسین نہ ہوتا۔ اور اسی چاند کی روشنی میں، میں نے رونے والے کو دیکھا۔

سفید لبادے میں ملبوس وہ ایک فوارے کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔ جھکی ہوئی گردن، لمبی چوٹی۔ گو چہرہ جھکا ہونے کی وجہ سے صاف نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں، دیومتی کا گمان ہوا۔ اور میں دل ہی دل میں اُچھل پڑا۔ اگر یہ دیومتی ہے تو آج اس سے کچھ باتیں ہو جائیں۔ بہر حال اس کی گفتگو سننے کے بعد میرے دل سے پسندیدگی کا وہ جذبہ تو نکل گیا تھا، جو پیدا ہوا تھا۔

تاہم، اس سے ہمدردی برقرار تھی۔ چنانچہ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ اور پھر میں نے آہستہ سے نادیدہ دوشالہ اُتار دیا اور چاندنی نے میرا سایہ دراز کر دیا۔

دیومتی نے جھکی ہوئی آنکھوں سے سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ بری طرح سہم گئی۔ اس نے گردن اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''ہائے رام......!'' دوسرے لمحے وہ خوف زدہ انداز میں کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری شکل دیکھ رہی تھی۔ دوسرے لمحے میں بولا۔

''ڈر گئیں دیومتی۔''

''ہائے رام...... ہائے رام......'' دیومتی قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی۔

''مجھے پہچانو دیوی!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم نے تمہیں پرانے مندر میں دیکھا تھا۔ اُس سمے، جب بدمعاش پورن لال تمہاری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔''

''ایں......!'' دیومتی چونک پڑی۔

''غور سے دیکھو دیومتی!...... پہچاننے کی کوشش کرو۔ میں دوست ہوں، دشمن نہیں۔''
''آپ...... آپ مہاراج!...... ہاں...... آپ وہی تو ہیں...... مگر دوجے؟''
''میرا ساتھی تھا۔ اِس سے نہیں ہے۔''
''مہاراج!...... مہاراج! میں ڈر گئی تھی۔ میں پہچان نہیں سکی تھی۔ اُس سے بھی میری بری حالت تھی، جب آپ نے میری رکھشا کی تھی۔''
''ہاں، تم چلی آئی تھیں۔''
''میں پاگل ہو رہی تھی مہاراج!...... میں...... میں......''
''کوئی بات نہیں تھی دیوی!...... ادھر سے گزر رہا تھا کہ تمہاری سسکیوں کی آواز کانوں میں پڑی اور میں اِدھر نکل آیا۔
''آپ کی دیا مہاراج!...... آپ تو میرے بہت بڑے متر ہیں۔ آپ نے تو میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے مہاراج! پر میں ایسی ڈری ہوئی تھی کہ آپ کا شکریہ ادا نہ کر سکی۔ مجھے شما کر دیں مہاراج!''
''کوئی بات نہیں ہے دیوی! ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔''
''آپ نے میرا جیون بچا لیا مہاراج! اس سے بڑا کام اور کیا ہوتا؟''
''وہ ہمارا فرض تھا۔''
''پدھاریئے مہاراج!...... پدھاریئے۔ اس جگہ، میں آپ کی کیا سیوا کروں؟ آپ اندر چلیں...... کچھ جل پانی......؟''
''نہیں دیوی! آسمان کے نیچے چاند کی روشنی میں۔ ہاں، تمہیں کسی کا ڈر تو نہیں ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو آرام کرو۔''
''نہیں مہاراج! مجھ اپاگن کے پاس کون آئے گا؟''
''تو پھر بیٹھو دیوی جی!...... یہیں بیٹھو۔'' میں فوارے کے کنارے بیٹھ گیا اور دیومتی میرے پیروں کے پاس بیٹھنے لگی۔ ''اوہ...... یہ کیا کرتی ہو دیومتی؟''
''میری جگہ آپ کے چرنوں میں ہی ہونی چاہئے مہاراج!''
''نہیں دیومتی!...... تم آرام سے بیٹھو۔ تم کہو تو ہم تم سے دُور بیٹھ جاتے ہیں۔''
''نہیں مہاراج! آپ تو عزت کی رکھشا کرتے ہیں۔ آپ کے بارے میں یہ سوچنا بھی حماقت ہے۔''
''ہاں...... تمہارا خیال ٹھیک ہے دیومتی!''
''میں جانتی ہوں مہاراج! بھگوان آپ کو سکھی رکھیں۔ آپ نے مجھ اُجڑی ہوئی کی عزت بچائی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟''
''بار بار احسان کا ذکر مت کرو دیومتی! وہ میرا فرض تھا۔ اور میں تمہارا متر ہوں۔ تم نے دیکھا، پورن لال کو کتنی بڑی سزا ملی ہے؟''
''ہاں مہاراج!...... سنا ہے پاگل ہو گیا ہے، ابھنارا۔'' دیومتی نے کہا۔
''ہاں۔''
''بھگوان کرے کبھی ٹھیک نہ ہو۔ بڑا اندھیر مچا رکھا ہے اُس نے۔''

''چنتامت کرو دیومتی! اب وہ ٹھیک نہ ہوگا۔''
''اینٹیں مارتا ہوا مارا جائے، پاپی کہیں کا۔ متر مہاراج! آپ بڑے مہان ہیں۔ کیا حالت ہوگئی تھی آپ کے سامنے اس کی۔''
''مہان میں نہیں ہوں، میرا بھائی ہے۔ میں تو ایک عام انسان ہوں دیوی!''
''میں آپ کی کیا سیوا کروں مہاراج؟''
''تجھ سے کچھ باتیں کرنے کو من چاہ رہا تھا۔ اگر تُو پسند کرے۔''
''میرے بھاگ۔'' دیومتی بولی۔
''تُو پریشان تو نہیں ہوگی؟''
''نیلے آکاش کے نیچے بالکل اکیلی ہوں مہاراج! کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہے، پریشان کیا ہوں گی؟''
''دیومتی!...... تُو نے ہمیں متر سمجھا ہے۔ کیا ہمیں اپنا رازدار بنا سکتی ہے؟''
''رازدار؟'' دیومتی حیرت سے بولی۔
''تُو دُکھی ہے دیومتی۔ اور دُکھیا پریم پیاسی ہوتی ہے۔ ہم تجھے ایک دوست کا پریم دیں گے۔ کیا تُو اسے سویکار کرلے گی؟''
''مہاراج!...... آپ...... آپ......''
''تیری مرضی ہے دیومتی!...... ہم تجھے مجبور نہیں کریں گے۔''
''یہ بات نہیں ہے مہاراج! مگر میرا راز ہی کیا ہے؟''
''بہت سے۔ لیکن اگر تُو بتانا چاہے تو بتانا۔ ورنہ رشی سے کون سی بات چھپی ہے۔''
''میرا کوئی راز نہیں ہے مہاراج!'' دیومتی نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ متر زبردستی نہیں بنائے جاتے۔ ہمیں شما کردیوی! ہم نے تجھے پریشان کیا۔'' میں اُٹھ گیا۔ اور پھر میں پلٹا ہی تھا کہ دیومتی نے جلدی سے کہا۔
''رُکیے مہاراج!''
''یہ من کے سودے ہیں دیومتی!...... زبردستی نہیں ہوتے۔'' میں آگے بڑھا۔
''سنیے تو مہاراج!'' دیومتی نے جلدی سے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اب مجھے رک جانا پڑا۔ ''شما کر دیں مہاراج! میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ میرا تو کوئی میت نہیں ہے۔''
''ناراض نہیں، ناراش کہو دیوی!...... ہم ناراض نہیں ہیں۔''
''مگر مہاراج!...... بیٹھیے تو...... بیٹھیے تو مہاراج!'' اور میں پھر بیٹھ گیا ''آپ کون سے راز کی بات کررہے ہیں؟''
''جو تمہارے من میں چھپا ہوا ہے دیوی! گیانیوں سے کیا پردہ ہوتا ہے؟ کیا میں ست پرکاش کا نام لوں؟'' اور دیومتی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔
پھر اچانک وہ اُٹھی اور اُس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کردیا۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اور نہ جانے کیوں میرا ہاتھ اُس کے سر پر پہنچ گیا۔

حالانکہ مندر میں، میں اُس کی شکل وصورت دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔ مجھے اُس کی بھولی، من موہنی صورت پسند آئی تھی۔ لیکن جب سے میں نے پورن لال کے سامنے اُس کی باتیں سنی تھیں، میرے دل میں اُس کے لئے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ میرے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا اور اب اسے دیکھ کر میرے دل میں کوئی بدی نہیں اُبھر رہی تھی۔

ہم انسان ہیں...... بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں، بے بسی سے مر جاتے ہیں۔ بس اتنی سی کہانی ہے انسان کی۔ دنیا میں آنے کے بعد جسم کی، ذہن کی نشوونما ہوتی ہے، جس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خالقِ کائنات کے اشارے پر سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں اور نظام کائنات چلتا ہے۔ لیکن...... ایک چھوٹے سے حقیر ذرّے کو جب وسعت ملتی ہے تو اس کا ذہن اُسے نہ جانے کہاں کہاں لے جاتا ہے۔ کہیں وہ نمرود بن جاتا ہے، کہیں شداد۔ کہیں چنگیز خاں بن جاتا ہے، کہیں ہٹلر...... کبھی بم بناتا ہے، کبھی تسخیرِ کائنات کے خواب دیکھتا ہے۔ لیکن خالقِ حقیقی کا ایک اشارہ اُس سے اُس کی ساری خدائی چھین لیتا ہے۔ اور وہ پھر بے بس ہو جاتا ہے۔ کون ہے جو اس کو چیلنج کر سکا ہے، جو اس کا تشکیل کنندہ ہے۔ صرف سوچنے کی بات ہے۔ رنگ، نسل، مذہب وملت، سب ہماری تخلیق ہے۔ بے رنگ، ناپائیدار...... اُلجھی ہوئی۔ ہم ایک بھی کام تو سلجھا ہوا نہیں کر سکے۔ اس پر ہم خود کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اس نے صرف ایک رنگ پیدا کیا ہے۔ اُس نے ایک نسل پیدا کی ہے۔ اُس نے ایک ملّت پیدا کی ہے۔ اُس نے ایک مذہب پیدا کیا ہے۔ ہم انسان ہیں، انسانیت ہمارا مذہب ہے۔ ہمیں کچھ ہدایات دی گئی ہیں، مذہب کی شکل میں۔ کوئی مذہب برا نہیں ہے۔ سب نے درسِ انسانیت دیا ہے۔ خدا کے بندو! خدا تمہارا محتاج نہیں ہے۔ اس کی عبادت کرو گے، تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس کے احکامات کی تعمیل کرو گے، تمہاری بہبود ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ اُسے تم سے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ اُس نے تو انسان کو انسان کے ساتھ سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن اُس نے تمہیں پوری کائنات بخش دی ہے۔ اُس نے تمہیں ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور تم اُسی کا کھانے کے بعد اُسی کی بخشی ہوئی سانسوں کے ساتھ اُسی کی نافرمانی کرتے ہو۔ کیسی عجیب بات ہے۔ کیسی مضحکہ خیز بات ہے۔ وہ قادر تھا، قادر ہے، قادر رہے گا۔ تو جب انسان ایک ہی نسل، ایک ہی ملّت سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر مذاہب کی تخصیص پر انسانیت کا رشتہ کیوں توڑ دیا جائے۔ ہوس، خواہشِ انسانی مخالف صنف کی کشش، سب کچھ انسانی کمزوریاں ہیں۔ لیکن جب بینائی ظاہر ہو جائے تو سارے برے جذبے فنا ہو جاتے ہیں۔

اور دیومتی کے آنسوؤں نے میرے دل میں انسانیت جگا دی تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار ہو کر دستِ محبت کے بجائے دستِ شفقت بن گیا تھا۔ دیومتی کو شاید یہ لمس پہلے میسر نہیں ہوا تھا۔ وہ سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی، جو نہ جانے کب کے اس کے سینے میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ بلک بلک کر روتی رہی اور میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ جب دیومتی کا دل پوری طرح ہلکا ہوا تو اُس نے میرے کندھے سے سر اُٹھایا اور پھر آنسو بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''آپ..... آپ اسے کیا جانیں مہاراج؟'' اس نے سسکی لے کر کہا۔

''سنسار کی بہت سی باتیں ہمیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔ دیوی! اس بارے میں تیرا کچھ پوچھنا

بیکار ہے۔"

"آپ بہت بڑے گیانی ہیں مہاراج! یہ سچ ہے کہ اگر اس دن آپ نہ آتے تو میری عزت نہیں بچتی۔ اور پھر مجھے آتما ہتھیا ہی کرنا پڑتی۔"

"ایک بات تو بتاؤ دیومتی!"

"جی مہاراج؟"

"تم نے پورن لال کی شکایت مہاراج گوونداس کپور سے نہیں کی؟"

"نہیں مہاراج!" دیومتی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیوں؟"

"ہم آپ کو کیا بتائیں سوامی مہاراج!...... ویسے آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

"جو من چاہے کہہ لو دیوی! ویسے لوگ ہمیں تربوز لال کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی......؟" دیومتی حیرت سے بولی۔

"ہاں۔ یہ بڑی عجیب کہانی ہے۔"

"کیا مہاراج!"

"لوگوں کا خیال ہے کہ ہم دونوں بھائی تربوز اور خربوزوں کی بیل میں آ گئے تھے۔ ہمارے ماتا پتا کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بس ایک دن ہم بیل میں اُلجھے ہوئے تھے کہ لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ انہوں نے ہمیں توڑ لیا اور ہماری پرورش کی گئی...... بس۔"

"ہائے رام!...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جیسے بھی ہوا ہو دیوی! اسے جانے دو۔ گوونداس کپور کی باتیں کرو۔"

"مہاراج! کپور سے جب سے میری شادی ہوئی ہے وہ ایک بار بھی میرے پاس نہیں آئے۔ وہ...... وہ ہر وقت اندرونی کمروں میں رہتے ہیں۔ بہت سی عورتیں اُن کے پاس رہتی ہیں۔ نہ جانے انہوں نے میری تقدیر کیوں پھوڑی تھی۔ نہ جانے انہوا نے...... نہ جانے انہوں نے......"

"اوہ...... تم سے ملاقات بھی نہیں ہوئی؟"

"دو چار بار دیکھا ہے اور بس۔ انہوں نے میری طرف توجہ بھی نہیں دی۔"

"کمال ہے...... راج پاٹ کے کسی کام میں بھی دلچسپی نہیں لیتے؟"

"کبھی نہیں۔ دیوالی پر ہر سال راج دربار لگتا ہے۔ جس میں سارے لوگ بدھائی دینے آتے ہیں۔ لیکن اس سال مہاراج جھروکوں میں بھی نہیں آئے تھے۔"

"پھر راج پاٹ کے کام کیسے چلتے ہیں؟"

"راجہ تو اب صرف منتری ہرچرن لال ہیں۔ انہی کی حکومت چل رہی ہے درگا پور پر۔"

"ہوں...... راجہ گوونداس کپور کو اس پر اعتماد ہے؟"

"پورا پورا۔"

"کیا راجہ بہت عیاش ہے؟"

"کیا کہہ سکتی ہوں مہاراج! میں تو کبھی ایک گھنٹہ بھی ان کے پاس نہیں بیٹھی۔"

''اوہ.....خیر چھوڑو راجہ کی بات......اب ست پرکاش کی بات کرو۔''
''مہاراج!'' دیومتی تڑپ گئی۔
''کیوں دیومتی؟''
''اُس کی بات اب نہ کریں مہاراج!''
''کیوں؟''
''میں بنتی کرتی ہوں مہاراج!'' دیومتی پھر رونے لگی۔
''تُو ہمیں اپنا متر کہہ چکی ہے دیومتی! دوستوں سے کوئی بات چھپانا اچھا نہیں ہوتا۔''
''میں کچھ بھی ہوں مہاراج! مگر ایک پتی ورتا استری بھی ہوں۔''
''تُو استری نہیں ہے دیومتی!''
''کیوں مہاراج؟''
''تُو یہ بھی نہیں جانتی کہ پتی کیسا ہوتا ہے۔''
''پھر بھی مہاراج!''
''مجھے بتا دیومتی! یہ کیسے پتی پتنی ہیں جو ایک دوسرے سے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ملے؟''
''پھر بھی، میرے اُن کے ساتھ پھیرے ہوئے ہیں۔''
''پھیرے سب کچھ نہیں ہوتے۔''
''میں اب ست پرکاش کے لئے کچھ کر بھی تو نہیں سکتی مہاراج! پھر گھاؤ کریدنے سے کیا حاصل؟''
''ہم تو کر سکتے ہیں دیومتی!''
''نہیں مہاراج!......اب کچھ نہیں ہو سکتا......اب کچھ نہیں.....''
''ہو نہ ہو دیومتی!...... یہ ہماری خوشی ہے کہ تُو ہمیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔'' میں نے کہا اور دیومتی میری شکل دیکھنے لگی۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولی۔
''جو آ گیا مہاراج!''
''تجھے ہمارے اوپر وشواش ہے تو چنتا نہ کر دیوی! ہم کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو تیری رُسوائی بن جائے۔ ہم کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھائیں گے جس سے تمہیں تکلیف ہو دیوی!''
''ٹھیک ہے مہاراج! آپ اُس کا نام جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ.....''
''تُو اُس سے پریم کرتی ہے۔''
''ہاں مہاراج!'' دیومتی نے ایک سسکی لے کر کہا۔ ہم دونوں بچپن کے میت تھے۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر نہیں سوچا۔ بچپن بیتا، جوانی آئی اور ہماری آنکھوں میں جوانی کے رنگین سپنے بس گئے۔ مگر پھر آندھی چلی......کالی آندھی، اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ مہاراج گووند نے مجھے دیکھا۔ میرے پتا کی کیا مجال تھی جو مہاراج کی بات نہ مانتے۔ میں روتی ہوئی ڈولی میں بیٹھی اور راج محل پہنچا دی گئی۔
''تمہارا گھر کہاں ہے؟''
''جوالا پور میں...... یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔''
''پتا کا کیا نام ہے؟''

''بدری پرشاد۔''

''ست پرکاش کہاں رہتا ہے؟''

''مہاراج! اُس دُکھیارے کا کیا پوچھنا۔''

''مجھے بتاؤ۔''

''وہیں رہتا تھا اب نہ جانے کہاں ہوگا۔''

''ہوں..... دیومتی! کیا تم مجھے ادھیکار دیتی ہو، اگر میں تمہاری بہتری کے لئے کچھ کروں؟''

''میرے لئے صرف ایک کام کردیں مہاراج!'' دیومتی روتے ہوئے بولی۔

''کیا دیومتی؟''

''مجھے کہیں سے وش لا دیں۔ میرے لئے کوئی ایسا جاپ کردیں کہ میں تکلیف کے بنا مر جاؤں۔ میں بہت ڈرپوک ہوں مہاراج!..... میں آتما ہتھیا نہیں کرسکتی، جو مجھے کرلینی چاہئے تھی۔ میرے لئے.....''

''خاموش ہو جاؤ دیومتی!..... خاموش ہو جاؤ۔''

''میرا بس یہ کام کردیں مہاراج!''

''نراش ہونا پاپ ہے دیومتی!''

''مگر اب آس بھی کیا رہ گئی ہے مہاراج!''

''مجھے وچن دو دیومتی! کہ اس سمے تک، جب تک میں تمہارے لئے کچھ نہ کروں، تم کوئی اُلٹا سیدھا کام نہیں کرو گی۔ میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے جیون میں اب کچھ نہیں رہا ہے مہاراج!'' دیومتی زاروقطار رونے لگی۔

''تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے دیومتی؟''

''نہیں۔'' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''دیومتی! اگر میں کہوں کہ تم مجھے اپنا بھائی بنالو؟'' میں نے خلوص دل سے کہا اور دیومتی چونک پڑی۔ اُس نے حیرانی سے میری شکل دیکھی اور دیکھتی رہ گئی۔

''جواب دو دیومتی!''

''کیا یہ ممکن ہے مہاراج؟''

''کیوں..... ممکن کیوں نہیں ہے؟''

''تو میرے لئے اس سے بڑے بھاگ کیا ہوں گے؟''

''تو دیومتی!..... یوں سمجھ لو، آج سے تم میری بہن ہو۔ اور چھوٹی بہنیں ہمیشہ بڑے بھائیوں کی بات مانتی ہیں۔ بڑا مان ہوتا ہے بھائیوں کو اپنی بہنوں پر۔ تم اس مان کو تو نہ توڑو گی؟''

''بھیا.....!'' دیومتی بے اختیار ہوکر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور پھر وہ اتنا روئی، اتنا روئی کہ میں گھبرا گیا۔ بمشکل میں اسے خاموش کرانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ''بھیا! میرا کلیجہ پھٹ جائے گا بھیا!..... میرا کلیجہ پھٹ جائے گا میرے ویر!..... جیون میں پہلی بار مجھے سچا پیار ملا ہے۔ جیون میں پہلی بار کسی نے مجھے خلوص سے پریم کیا ہے۔ میں کیسے برداشت کروں؟''

''ست پرکاش کے پریم پر تمہیں بھروسہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"اس کی بات اور ہے بھیا!"
"میں اس غرض سے نہیں پوچھ رہا۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ بڑا سیدھا ہے بھیا! وہ دھوکا نہیں کر سکتا۔"
"ہوں، دیومتی! تو پھر تمہارا وعدہ؟"
"جیسا تم کہو گے بھیا!" دیومتی نے گردن جھکا دی۔
"بس دیومتی!...... تُو خاموش بیٹھی رہ۔ میں ضرورت کے سمے تجھ سے ملتا رہوں گا۔ لیکن اپنا وچن یاد رکھنا۔"
"پر تم کرو گے کیا بھیا؟"
"تیرا سکھ، تیرا چین تجھے واپس دلاؤں گا دیومتی! اس کے لئے جو کچھ بھی کر سکا۔ تُو یہ سمجھ لے کہ تیری بدنامی اب میری بدنامی ہے۔"
"ہے بھگوان!...... نہ جانے میرے کون سے پن کا تُو نے جواب دیا ہے۔ ہے بھگوان...... ہے بھگوان......" دیومتی نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں متاثر کن نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
پھر دیومتی نے آنکھیں کھولیں۔ چند الفاظ نے اُس پر جادو کر دیا تھا۔ اُس کا چہرہ کنول کی طرح کھل اُٹھا تھا۔ اور پھر اُس نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ایک بات پوچھوں بھیا؟"
"پوچھو دیومتی!"
"تم نے مجھے اپنا نام کیوں نہیں بتایا؟...... تم نے اپنے آپ کو مجھ سے کیوں چھپایا؟"
"میری حقیقت جان کر تُو مجھے اپنا پریم نہ دے سکے گی۔"
"بہن پر بھروسہ نہیں بھیا؟"
"شاید اس کے بعد تُو مجھے اپنا بھیا ماننے سے بھی انکار کر دے۔ مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور نہ کر دیومتی! جانے دے میرے نام کو۔" میں نے کہا اور دیومتی میری شکل دیکھنے لگی۔
اُس کی آنکھوں میں عجیب تاثرات تھے۔ اور پھر ان میں ہلکی سی اُداسی اُبھر آئی۔ "جیب کا ناطہ، سنسار کے سارے ناطوں سے مضبوط ہوتا ہے بھیا! مگر شرط یہی ہے کہ من کی آواز جیب پر آئی ہو۔"
"میں نہیں سمجھا دیومتی!" میں نے اُس کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں نے زبان سے تمہیں بھیا کہا ہے۔ بڑا مان کیا ہے میں نے تم پر۔ کنیا کے من کو نہ توڑو میرے بیرا! بہن بنایا ہے تو اس کے سارے مان پورے کر دو۔ پھر باقی باتیں بہن پر چھوڑ دو۔"
"بات بگڑ جائے گی دیومتی!"
"نہیں بگڑے گی بھیا!...... ایک بہن کے امتحان کی بات ہے۔"
"ہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ بہت بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اگر دیومتی میری حقیقت سے واقف ہو جاتی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے مذہب کی وجہ سے مجھ سے اجتناب برتتی۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔
"تو سن دیومتی!...... میں مسلمان ہوں...... میں سادھو نہیں ہوں، نہ ہی میری اصلی شکل یہ ہے۔"

''ملیچھ......!'' دیومتی اُچھل پڑی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں خوف اُبھرا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ پُرسکون ہو گئی۔ اور پھر اُس کی آنکھوں میں محبت سمٹ آئی۔

''بس......اتنی سی بات بھیا؟''

''کیا تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟''

''ہے۔''

''پھر؟''

''تم نے یہ نہیں پوچھا بھیا! کہ کیا اہمیت ہے۔'' دیومتی مسکراتی ہوئی بولی۔

''بتا دو دیومتی!''

''سنسار میں اچھے برے سبھی منش ہوتے ہیں۔ اگر تم سادھو ہوتے تو میرے من میں بال رہتا۔ کیونکہ ایک سادھو نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم مسلمان ہو۔ سو اب میں مسلمانوں کے بارے میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا سارے مسلمان تمہارے جیسے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ ہونے والے انیائے پر تڑپ اُٹھتے ہیں؟ کسی ابلا کی عزت بچاتے سے یہ نہیں سوچتے کہ وہ ہندو جاتی ہے یا مسلمان؟......اس سے تو میرے من میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی ہے بھیا!''

''دیومتی!'' میں جذباتی ہو گیا۔

''ہاں بھیا!......میرے بیر!......میرے پیارے بیرا......!'' دیومتی شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''ہاں میرے بیر!......اگر تم مسلمان ہو تو آج سے میں سارے مسلمانوں کی عزت کروں گی۔ مجھے تمہارے اوپر پورا پورا وشواش ہے میرے بیر!......ایک ہندو دھرم کے سادھو نے میری بے عزتی کرنے کی کوشش کی تھی اور مسلمان نے میری عزت بچائی۔''

''تم عورت ہو دیومتی!......کمزور ہستی۔ اور مسلمان ہمیشہ کمزور کی حمایت کرتا ہے۔''

''مجھے وشواش ہے بھیا!......مجھے وشواش ہے۔ آؤ......میرے ساتھ آؤ......آ جاؤ۔'' اور میں دیومتی کے ساتھ اُس کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ دیومتی نے مجھے بڑے احترام سے بٹھایا تھا۔

''کیا تم مادھو پورہ میں رہتے ہو بھیا؟''

''مادھو پورہ کیا دیومتی؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مادھو پورا میں نہیں رہتے؟''

''میں تو درگا پور ہی پہلی بار آیا ہوں۔''

''ارے......کہیں اور سے آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''کہاں سے بھیا؟''

''نہ جانے کہاں کہاں سے دیومتی!......میں اور میرا ساتھی آوارہ گرد ہیں۔ بس گھومتے پھرتے ہیں۔ اور اسی طرح گھومتے پھرتے ہم درگا پور آ نکلے۔''

''تم نے کہا تھا بھیا! یہ تمہاری اصلی شکل نہیں ہے۔ کیا تم مجھے اپنی اصلی شکل نہ دکھاؤ گے بھیا؟''

''دکھا دوں گا دیومتی! لیکن ابھی مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو۔ ایک بھائی ہونے کی حیثیت سے میں

تمہارے اوپر بھروسہ کرتا ہوں۔ اس لئے میری کسی بات سے انکار پر دل پر میل مت لانا۔ تھوڑا وقت گزر جانے دو، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے بھیا! میں تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔" دیومتی نے کہا۔

"مجھے اپنے دوست کا انتظار ہے۔ لیکن ہرچرن لال میرا دشمن ہو گیا ہے۔ اُس نے ایک خبیث روح سے مدد لی ہے۔ میں ذرا اُس سے نمٹ لوں۔"

"ہائے رام...... ہرچرن لال تمہارا دشمن ہے؟" دیومتی پریشانی سے بولی۔

"ہاں...... سب سے بڑا دشمن۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ تو ہم خود نہیں جانتے۔ حالانکہ اب وہ ہماری دوستی کا دم بھر رہا ہے۔ لیکن مجھے اس کے اوپر پورا بھروسہ نہیں ہے۔"

"ارے وہ تو بڑا پاپی ہے۔"

"اُس نے منحوس تلکا سے مدد لی ہے۔ لیکن اُس کا مقابلہ بھی بہت سخت ہو گا۔ کیا یاد کرے گا وہ بھی۔"

"تت...... تلکا مہاراج سے؟"

"جانتی ہو اُس خبیث کو؟"

"ارے تلکا مہاراج کو کون نہ جانے گا؟ اتنا مہان سادھو تو پورے ہندوستان میں کوئی نہ ہو گا۔"

"لیکن وہ کالے جادو کا ماہر ہے۔"

"وہ اپنی گپھاؤں سے کیوں نکل آئے؟ اگر تلکا مہاراج تمہارے بیری ہو گئے ہیں تو پھر بھیا! تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ بھگوان نہ کرے تمہاری جان کو کچھ ہو۔"

"فکر مت کرو دیومتی! بس حالات دیکھتی رہو۔ اچھا...... اب میں چلتا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے بھیا؟"

"راج محل میں ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ حالانکہ راج محل میرے لئے اب رہنے کی جگہ نہیں رہا۔"

"بہن کو اتنا کنگال سمجھتے ہو کہ تمہیں رہنے کی جگہ بھی نہ دے سکے؟"

"لیکن......"

"تم یہیں آرام کرو بھیا!...... بہن کی عزت کا بھائی سے بڑا رکھشا کرنے والا کون ہو گا؟"

"ہوں۔" میں گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ٹھیک ہی تھا۔ کوئی حرج نہیں تھا۔ طالوت کے لئے مجھے تلاش کر لینا مشکل کام نہیں تھا۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، وہ میرے پاس پہنچ جائے گا۔

"لیکن دیومتی! مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر تمہارے اوپر کوئی حرف تو نہیں آئے گا؟"

"تم اس کی چنتا نہ کرو بھیا! میں تمہیں کسی کو دیکھنے کاہے کو دوں گی؟ اور پھر حرف لانے والا کون ہے؟ محل کی مہارانیاں سب کچھ کرتی ہیں۔ اُن کے من میلے ہیں۔ پر تم تو میرے بھیا ہو۔"

"اوہ...... محل کی یہ حالت کیوں ہے دیومتی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی بھیا!...... سچی جانو تو مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے۔ مہاراج تو پوری دنیا کو تیاگے بیٹھے ہیں۔ وہ تو باہر بھی نہیں نکلتے جو ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہو سکے۔"

''کیا کرتے رہتے ہیں محل میں؟''

''بس، خراب عورتوں میں گھرے رہتے ہیں۔ ہرچرن لال کا پورے محل کیا، پوری راجدھانی پر قبضہ ہے۔ وہی راج پاٹ کے کام چلاتا ہے۔ وہی سارے سیاہ وسفید کا مالک ہے۔''

''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔ لیکن دیومتی! اس طرح تو ہرچرن گووند اس کے خلاف کوئی سازش بھی کر سکتا ہے۔ دُرگا پور کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''راج پاٹ کے کام، راج کرنے والے جانیں بھیا! میں تو اس بارے میں کچھ نہیں سوچتی۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک بات اور بتا دو دیومتی!''

''پوچھو بھیا!''

''تم نے مسلمانوں کے سلسلے میں مادھو پورہ کا نام لیا تھا؟''

''ہاں...... درگا پور میں سارے مسلمانوں کی ایک ہی بستی ہے۔ اس کا نام مادھو پورا ہے۔ دوسری جگہوں پر مسلمانوں کو رہنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اوہ...... مادھو پورا کہاں ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''درگا پور کے آخری کونے میں۔ پہلے اس کا نام سلطان آباد تھا۔ لیکن ہرچرن لال نے ہر اُس آدمی کی گردن ماردی جو اسے سلطان آباد کہتا تھا۔ اس نے اس کا نام مادھو پورا رکھا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے تعجب سے گردن ہلائی۔ یہ نیا انکشاف میرے لئے بہت سنسنی خیز تھا۔ طالوت بھی اسے سنے گا تو شاید ہرچرن لال کو معاف نہیں کرے گا۔ گویا یہاں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک ہوتا ہے۔ اور نہ جانے کیوں میرا دل تڑپ اُٹھا۔ میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوگئی کہ میں مسلمانوں کی بستی سلطان آباد یا مادھو پورا دیکھوں۔

لیکن...... تنہا کیا مزہ آتا؟...... طالوت کا ایسا عادی ہوگیا تھا کہ اب کسی کام میں اکیلے لطف ہی نہیں آتا تھا۔

بہرحال، وہ ساری رات دیومتی کی خواب گاہ میں گزاری۔ رات گئے تک دیومتی باتیں کرتی رہی۔ پھر اُس نے مجھے ایک پوشیدہ جگہ سلا دیا۔ تنہائی میں لیٹ کر طالوت کا خیال آیا اور دل میں شدید بے چینی پیدا ہوگئی۔ وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟...... کیا تلکا سے لمبی ٹھن گئی؟...... ویسے پہلے مرحلے پر اُس نے تلکا کو جس طرح ناکام کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تلکا، طالوت کے لئے بہت بڑی حیثیت نہیں رکھتا۔ طالوت جلد یا بدیر اُس سے نمٹ لے گا۔

لیکن آخر وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟...... اتنی دیر...... بالآخر بے چینی کے باوجود نیند آگئی۔ اور پھر دوسری صبح کافی دن چڑھ گیا تھا، جب آنکھ کھلی۔

بڑی آرام کی نیند آئی تھی۔ ماحول کا احساس بھی نہ رہا کہ کون سی جگہ ہے۔ بہرحال، چند ساعت کے بعد ذہن جاگا تو میں اُچھل پڑا۔ اوہ...... یہ تو دیومتی کی خواب گاہ تھی۔ جلدی سے باہر جھانکا۔ خوب صورت کمرے میں دیومتی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ خوب صورت لباس میں ملبوس اُداس بیٹھی تھی۔

پہلی بار میں نے اس خوب صورت عورت کو مندر میں دیکھا تھا اور بلاشبہ وہ ایسی پُرکشش تھی کہ دل بے اختیار اُس کی جانب کھنچتا تھا۔ اگر میری زندگی کا کوئی محور ہوتا، اگر زندگی کا کوئی مقصد ہوتا، اگر میں

سکون سے کسی جگہ قیام کرسکتا تو شاید دیومتی میرے دل میں گھر کر جاتی اور نہ جانے میں اس کے لئے کیا کیا سوچتا۔ نہ جانے میں اس کے لئے کیا کیا چالیں چلتا۔ لیکن خود میری زندگی مانندِ حباب تھی۔ ایسی باتوں کی حدود اب پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب تو اگر کوئی خوب صورت عورت پسند بھی آ جاتی تھی تو اس کے بارے میں دوسرے انداز میں ہی سوچنا پڑتا تھا۔

لیکن طبیعت میں اس قدر لچک پیدا ہوگئی تھی کہ اگر کہیں ذرا بھی مظلومیت کے سائے نظر آتے تھے تو مزاج کا رنگ بدل جاتا تھا۔ دیومتی کے بارے میں بھی یہی ہوا تھا۔ جس انداز وہ اس وقت بیٹھی تھی، وہ دل کو تڑپا دینے والا تھا۔ ایسی خوب صورت، ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ بس دیکھے جانے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن یہاں نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر سے نگاہیں ہٹالیں اور پھر آہستہ قدموں سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

دیومتی میرے قدموں کی آہٹ سن کر اُچھل پڑی۔ اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جاگ گئے بھیا؟''

''ہاں دیومتی!''

''اشنان کرو گے؟''

''کہاں؟''

''پچھلے تالاب میں۔''

''نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صرف منہ ہاتھ دھولوں گا۔''

''تو ادھر آ جاؤ۔'' دیومتی نے کہا۔

ضروری امور سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ کیا۔ دیومتی کے خلوص کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ اس نے میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔

''تمہارا دھرم تو مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی اجازت نہیں دیتا دیومتی؟'' میں نے کہا۔

''من تو اجازت دیتا ہے بھیا!..... اور دھرم من سے ہی ہوتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان بہن اور بھائی کا دھرم ہے اور یہ دھرم سب سے بڑا ہے۔'' دیومتی نے کہا۔

میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ لیکن اب میں طالوت کے لئے کچھ اور پریشان ہوگیا تھا۔ وہ ساری رات واپس نہیں آیا تھا۔ حالات شاہد تھے کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ وہ دو دو روز غائب ہوا تھا اور پھر آ گیا تھا۔ لیکن اُس کی غیر موجودگی میں، میں جن مشکلات میں پھنس جاتا تھا، وہ میرے لئے کافی پریشان کن ہوتی تھیں۔ لیکن بہرحال..... اس بار میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اگر طالوت کو کچھ دیر بھی ہوئی تو اس بار میں اس کے سہارے تلاش نہیں کروں گا۔

رات کی سیاہی تو بہت سے راز چھپا لیتی ہے۔ لیکن دن کی روشنی...... دن کی روشنی اپنے اندر یہ صفت نہیں رکھتی۔ دیومتی کا دل میری طرف سے صاف تھا۔ میں اب دیومتی کے لئے دل میں کوئی کھوٹ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن دوسرے لوگ...... لاکھ مہاراج گووند اس کپور، دیومتی کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ وہ اس سے بیاہ کر کے بھول گئے تھے۔ لیکن بہرحال دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دیومتی رانی ہے۔ محل کی عزت ہے اور محل کی عزت اگر پورن لال جیسے لوگ دھوکے سے لوٹ لیں، تب تو کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن دیومتی

اپنی مرضی سے کسی کو اپنے کمرے میں جگہ دے دیتی تو پورے محل میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔
یہ بات میں نے بھی سوچی تھی اور یقیناً دیومتی نے بھی سوچی ہو گی۔ لیکن دیومتی کسی طور مجھ سے نہ کہہ سکتی تھی۔ یہ تو میرے سوچنے کی بات تھی۔ چنانچہ ناشتے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

''اب مجھے اجازت دو گی دیومتی؟''

''کہاں جاؤ گے بھیا؟'' دیومتی نے پوچھا۔

''کہیں بھی...... درگا پور کی سیر کروں گا۔ یہاں کی حالات دیکھوں گا۔ ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں دیومتی!''

''لیکن بھیا!''

''ہاں، ہاں...... کہو۔''

''رات کو واپس آ جاؤ گے نا؟''

''ہاں، آ جاؤں گا۔ اگر نہ آؤں تو سمجھ لینا، کسی کام میں پھنس گیا ہوں۔''

''نہیں...... رات کو ضرور آ جانا۔ میں انتظار کروں گی۔''

''میں پوری پوری کوشش کروں گا۔''

''رات کا بھوجن بھی میں تمہارے ساتھ ہی کروں گی بھیا!''

''اتنی محبت نہ کرو دیومتی!...... بہرحال، ہمیں ایک دن جدا ہونا پڑے گا۔''

''تم جانتے ہو بھیا! میں تو سدا کی پریم پیاسی ہوں۔ تم نے پریم سے بہن کہا ہے۔ اکیلے دل کو سہارا سا ہو گیا ہے۔ اگر تم نہیں نبھاؤ گے تو پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔ کر بھی کیا سکتی ہوں؟''

''نہیں دیومتی!...... میں نے اوپری دل سے تمہیں بہن نہیں کہا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنا قول نبھا دوں۔ بہرحال، کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے بھیا! سنسار کی کسی چیز کی منوکامنا نہیں ہے۔ بس محبت بھرے دو بول میرے جیون کے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔'' دیومتی کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے ذہن میں اس کے لئے ایک پروگرام تھا۔ لیکن ابھی اسے زبان پر لانا حماقت تھی۔ بھلا میری حیثیت کیا تھی؟...... ہاں، طالوت، تلکا کے چکر سے نکل آئے۔ وہ اُسے ختم کر دے، راج ہنس کا مسئلہ حل ہو جائے تب دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اس کے بارے میں دیومتی سے کچھ کہنا سب سے بڑی حماقت ہے۔

بہرحال، میں نے پیار سے اُس کا شانہ تھپتھپایا اور پھر اُسے تسلی دے کر باہر نکل آیا۔

❁

دیومتی کے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے تھوڑی سی احتیاط کی تھی۔ پھر تو ایک ستون کی آڑ مل ہی گئی تھی اور میں نے جلدی سے شاہ دانہ کا دوشالہ اپنے سر پر ڈال لیا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے آگے بڑھ گیا۔ محل کے مختلف حصوں سے ہوتا ہوا بالآخر میں باہر نکل آیا اور پھر یونہی بے مقصد ایک طرف چل پڑا۔ لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ۔ لیکن اب میرے ذہن میں طالوت شدت سے اُبھر آیا تھا۔ طالوت کہاں ہے؟

گھنٹے دو گھنٹے کی گمشدگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اتنی طویل گمشدگی...... اتنی لمبی غیر حاضری بہت سے خدشات کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس سے قبل کے واقعات شاہد تھے۔ طالوت پہلے بھی غائب ہو چکا تھا اور میری شامت آ گئی تھی۔ خیر، وہ اتفاقات تھے کہ میں ایسے حالات میں گھر گیا تھا۔ ورنہ میں بھی انسان ہی ہوں۔ اپنے طور پر بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن طالوت کی غیر موجودگی درحقیقت ہاتھوں پیروں کی جان نکال دیتی ہے۔ اور اس بار...... اس بار صورتِ حال کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھی۔

طالوت جن حالات میں گیا تھا، وہ بے حد خوف ناک تھے۔ خبیث روح تلکا کم خوف ناک نہیں تھا۔ میں نے گزرے ہوئے واقعات یاد کئے اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ درحقیقت طالوت کی موجودگی کی وجہ سے اور اُس کی طویل معیت میں محیر العقول واقعات سے دوچار ہوتے رہنے کی وجہ سے میں رات کے ماحول کو برداشت کر گیا تھا۔ ورنہ نہ جانے میری کیا حالت ہو جاتی۔ تلکا کے مہمان جس قدر خوفناک تھے، اس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اور پھر تلکا کے پیچھے طالوت گیا تھا۔

وہ ایک نڈر نوجوان تھا۔ بلاشبہ اس کے پاس بے شمار پُر اسرار قوتیں تھیں، لیکن پھر بھی نوجوانی کی عمر تھی اور مقابلہ تلکا جیسے چالاک انسان سے تھا۔ ابھی تک نہ جانے کیوں وہ واپس نہیں آیا تھا۔

بہرصورت، یہاں بھی صورتِ حال پُرسکون نہیں تھی۔

گو ہرچرن لال بظاہر ہمارے دوستوں میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں اس انداز میں تنہا رہ گیا ہوں اور تلکا ہمارے قابو میں نہیں آیا تو وہ کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ظاہر ہے، وہ صرف ہماری وجہ سے مصیبت میں پھنسا تھا۔ ورنہ اس کا کام تو کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا۔ پورن لال اور وہ مل کر نہ جانے کیا سازش کر رہے تھے اور نہ جانے کس حد تک اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اُن کے حلق کی ہڈی تو ہم لوگ بنے تھے اور ہماری وجہ سے ان کے سارے پروگرام چوپٹ ہو گئے تھے۔ تب مجبوراً ہرچرن لال نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ اور بہرحال، تلکا کی مصیبت میں وہ

بھی گرفتار ہو گیا تھا۔
لیکن اب......؟ راستہ چلتے ہوئے میں نے حالات پر غور کیا۔ طالوت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا حماقت ہے۔ اپنے آپ کو متحرک رکھا جائے۔ طالوت کی اتنی دیر کی غیر حاضری بتاتی ہے کہ وہ کسی لمبے چکر میں پڑ گیا ہے۔ ممکن ہے، طویل عرصے تک وہ واپس نہ آ سکے۔ لیکن میں کروں کیا؟
کیا دیومتی کے ست پرکاش کو تلاش کروں؟......راج ہنس کے سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟ اور اچانک دیومتی کے کچھ الفاظ یاد آ گئے۔
مادھو پورا......سلطان آباد......مسلمانوں کی بستی......کیوں نہ مادھو پورہ تلاش کروں۔ وہاں مسلمان موجود ہیں۔ دیکھا تو جائے، وہ کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن مادھو پورہ تلاش کیسے کیا جائے؟ کوئی مسلمان صورت نظر آئے۔
میں درگا پور کے بازاروں کی طرف چل پڑا۔ اب میں نے خاص نگاہوں سے یہاں کی معیشت اور رہن سہن کو دیکھا تھا۔ چاروں طرف ہندو دھرم کے نشان نظر آ رہے تھے۔ ایک بھی جگہ ایسی نظر نہیں آئی، جہاں کسی دوسرے مذہب کا نشان ملے۔
چنانچہ ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر میں نے شاہ دانہ کا دوشالہ اُتار لیا اور ظاہر ہو گیا۔ لباس اور انداز سادھوؤں کا سا تھا، اسی لئے کسی نے توجہ نہ دی۔ اِکا دُکا لوگ نظر آ رہے تھے، جو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تب ایک چھوٹی سی دھرم شالہ کے نزدیک میں رکا۔ سامنے ہی پانی پلانے کی سبیل لگی ہوئی تھی، جسے یہ لوگ "پیاؤ" کہتے ہیں۔ اندر ایک پنڈت بیٹھا لوٹے سے پانی پلا رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے پہنچ گیا اور پنڈت نے لوٹا سامنے کر دیا۔
"نہیں بچہ!......ہم پانی نہیں پئیں گے۔" میں نے کہا۔
"پھر کیا سیوا کروں مہاراج؟" پنڈت نے پوچھا۔
"بھکشو کو کسی سیوا کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں پیاس ضرور لگ رہی ہے، مگر تیرے جل کمنڈل کو کسی ملیچھ کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں، اس لئے ہم اس سے جل نہیں پئیں گے۔"
"ملیچھ کے ہاتھ؟" پانی پلانے والا بولا۔
"ہاں، ہاں......ملیچھ کے ہاتھ۔"
"مگر مہاراج! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ہو چکا ہے مورکھ!......تُو خود سوچ یہ کیسے ہوا۔"
"مہاراج! میرے خیال میں کوئی ملیچھ ادھر نہیں آتا۔"
"کیوں نہیں آتا؟ تجھے کیسے معلوم؟"
"وہ یہاں آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"
"کیا درگا پور میں ملیچھ ہیں ہی نہیں؟"
"ہیں......مگر صرف مادھو پورا میں۔ وہ ہمارے شہر میں نہیں آتے۔"
"مادھو پورہ کہاں ہے؟"

''کافی دُور ہے مہاراج!......آپ کا خیال غلط ہے......ایک بھی ملیچھ اِدھر نہیں آتا۔''
''ہم تجھے بتائیں گے کہ کسی ملیچھ نے تیرے جل کمنڈل کو ہاتھ ضرور لگایا ہے۔ تُو ہمیں بتا، مادھو پورا یہاں سے کس اور ہے؟''
''مادھو پورہ ...... اس سڑک سے آگے بڑھ کر ایک سڑک کھبے ہاتھ گھوم جاتی ہے۔ جب وہ لمبی سڑک ختم ہوتی ہے تو کچا راستہ آتا ہے۔ اور جب کچا راستہ ختم ہو جاتا ہے، تب مادھو پورا آتا ہے۔''
''بہت جلد ہم تجھے بتائیں گے کہ ہماری بات جھوٹ نہیں تھی۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پانی پلانے والا سر کھجاتے ہوئے میری طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

بہر حال مجھے صرف راستہ معلوم کرنا تھا۔ اب میرا رُخ مادھو پورا کی طرف تھا۔ بس یونہی ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی، ورنہ مادھو پورہ جا کر ہی میں کیا کر لیتا۔ طالوت کا انتظار تھا، جس سے میں خود کو لاپروا ظاہر کر کے خود ہی کو دھوکا دینے میں مصروف تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ دل بس اسی میں اٹکا ہوا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ آ کر میری مدد کرے یا میرے لئے عمدہ ماحول اور آسانیاں فراہم کر دے۔ بلکہ اس لئے کہ اب مجھے اس سے محبت بھی تھی۔ آخر وہ میرا دوست تھا۔ اور ہم دونوں ساتھی تھے۔

مادھو پورا جانے والی میلوں لمبی سڑک کی لمبائی کا احساس خیالات نے نہ ہونے دیا۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف گھوم کر میں کچے علاقے کی طرف مڑ گیا۔

یہاں ترکاریوں کے کھیت جگہ جگہ موجود تھے، جن میں عمدہ ترکاریاں موجود تھیں۔ میں کھیتوں کے درمیان کی پگڈنڈیوں سے گزرتا رہا۔ اور پھر مادھو پورا آ گیا۔

کچے پکے مکانوں پر مشتمل ایک الگ تھلگ بستی، جو درگاپور کی سب سے پسماندہ بستی تھی۔ کسی صفائی کا انتظام نہیں تھا۔ کوئی سرکاری آسائش یہاں موجود نہیں تھی۔ دُور ہی سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا پتہ چل جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں میری توجہ بٹ گئی۔ میرے دل میں اس چھوٹی سی بستی کے بارے میں جاننے کی شدید جستجو بیدار ہو گئی اور میں نے تیزی سے قدم آگے بڑھائے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں مادھو پورا میں داخل ہو گیا میرا حلیہ اس وقت بھی سادھوؤں کا سا تھا۔ بستی کے سب سے پہلے مکان کے سامنے مجھے ایک بزرگ صورت لیکن زبوں حال مسلمان نظر آیا۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اور میں نے اُس کی نگاہوں میں صاف نفرت دیکھی۔

''پرنام میاں جی!'' میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بزرگ صورت نے گردن ہلا دی۔ ''سادھو ہوں میاں جی!......آپ کا مہمان ہوں۔ کیا آپ کی بستی میں کچھ سمے بتا سکتا ہوں؟''
''کہیں باہر سے آئے ہو؟'' بزرگ نے پوچھا۔
''ہاں...... بہت دُور سے۔''
''درگاپور کے بارے میں نہیں جانتے؟''
''بس تھوڑا تھوڑا۔''
''تم مہمان ہو۔ ہم تمہاری عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمان ہیں، ہمارے ہاں کا کھانا پینا اور رہائش تمہیں پسند نہ ہو گی۔''
''سادھو سنتوں کو دھرم کی صحیح باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی دھرم برا تو نہیں ہے۔ ہمارے دھرم

انسانوں کے ہی ہیں۔"

"ہاں...... انسانوں کے تو ہیں۔" بزرگ نے تلخی سے کہا۔

"تو پھر......؟"

"لیکن درگا پور میں مسلمانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔"

"پھر کیا سمجھا جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جانوروں سے بھی بدتر کوئی نسل۔" بزرگ نے جواب دیا۔

"چھی چھی...... کوئی مذہب انسانوں کو جانور سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ درگا پور کے لوگ کیسے ہیں؟ کچھ بھی ہو میاں جی! میں کچھ روز تمہارے در پر مہمان رہنا چاہتا ہوں۔"

"تم درگا پور میں آ گئے ہو سادھو! ہم تمہیں مادھو پورہ سے نکالنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے تم جو چاہو کرو۔ جیسا کہ درگا پور کے لوگوں کی ریت ہے۔ جہاں سے جو دل چاہے، لوٹو۔ جو دل چاہے، چھینو۔ کھاؤ، پیو۔ کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔ کیونکہ روکنے والوں کا حشر بہت برا ہوتا ہے۔ ہاں، اگر مہمان بننے کے خواہش مند ہو تو میں دوسروں سے پوچھے بغیر تمہیں مہمان نہیں بنا سکتا۔"

"مگر یہ تو مسلمانوں کے اصول کے خلاف ہے۔ وہ تو مہمانوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔"

"اس کی بھی وجہ ہے، سادھو جی!...... اگر تم ایک ڈاکو ہو تو سب تم سے ہوشیار رہیں گے۔ کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں گے، جس سے ہمارے اوپر کوئی مصیبت آئے۔ اور اگر مہمان بنے تو ہم تمہیں ساری اپنائیت دے دیں گے۔ معاف کرنا سادھو جی! اگر درگا پور سے تمہارا تھوڑا سا واسطہ بھی ہوتا تو ان باتوں پر تمہیں حیرت نہ ہوتی۔"

بزرگ کی باتوں میں بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن سے کیا کہوں۔ ایک دل چاہ رہا تھا کہ اپنی اصلیت ظاہر کر دوں۔ لیکن فوری طور پر یہ بھی مشکل تھا۔ اس کے بعد میری حیثیت کیا ہو گی۔ لیکن میں نے ابھی اپنے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا اور شانے ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہم دُرگا پور بھی جا سکتے ہیں شریمان جی!...... مگر اب تو ہماری آرزو ہے کہ ہم چند روز یہیں بتائیں۔ تم جس سے چاہو پوچھ لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تب آئیے سادھو جی! اس وقت تک کے لئے میری ڈیوڑھی حاضر ہے۔" بزرگ نے کہا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔

بوسیدہ سا کچا مکان، عسرت اور زبوں حالی کی تصویر۔ ڈیوڑھی میں بان کی بنی ہوئی ایک چارپائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ بزرگ نے مجھ سے وہاں بیٹھنے کو کہا اور میں بیٹھ گیا۔ تب ان بزرگ نے کہا۔

"میں آپ کی کیا خاطر کروں سادھو جی؟ یہاں کسی ہندو کی دکان بھی نہیں ہے جہاں سے آپ کے لئے کچھ لے آؤں۔"

"کیا یہاں مسلمانوں کی دکانیں بھی نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مسلمانوں کی تو ہیں۔"

"ٹھیک ہے میاں جی!...... درگا پور کے، بلکہ میرا خیال ہے، سارے علاقوں کے ہندو ایسے ہی تنگ

نگاہ ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھوئی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے۔ لیکن میرے لئے گھر میں جو کچھ ہو، منگوا دیں۔ مجھے پہلے مسلمانوں سے پیار ہے، پھر دھرم سے۔ اور دھرم بھی یہی سبق دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔

بزرگ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

''آپ نے اپنا شبھ نام نہیں بتایا شریمان جی!''

''اللہ بخش ہے جی میرا نام۔''

''ٹھیک ہے چاچا اللہ بخش!...... آپ لوگوں سے میرے بارے میں اجازت لے لیں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور بزرگ حیرت سے مجھے گھورنے لگے۔

''باہر سے آئے ہو نا۔ کاش درگا پور کے ہندو بھی تمہاری طرح زبان کے میٹھے اور دل کے نرم ہوتے۔'' چاچا اللہ بخش نے کہا اور پھر وہ باہر نکل گئے۔

اس کا مطلب ہے کہ مادھو پورہ کے رہنے والے، درگا پور کے ہندوؤں سے عاجز ہیں۔ بزرگ نے بتایا تھا کہ ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خود رانی دیومتی نے بھی کچھ تفصیلات بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا، مادھو پورہ کا پہلا نام سلطان آباد تھا۔ بعد میں اسے مادھو پورہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ خود اس تنگ و تاریک بستی کی زبوں حالی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے باشندے خاصی تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا دل تو بہت کڑھا۔ لیکن میں کسی اسلامی مملکت کا شہنشاہ تو نہیں تھا کہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر درگا پور پر چڑھائی کر دیتا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔

تھوڑی دیر کے بعد مکان کے اندر سے ایک چھوٹی سی بچی ہاتھ میں تھالی لئے، سر پر دوپٹہ اوڑھے اندر آئی۔ تھالی میں مکئی کی دو روٹیاں، جن پر گھی ملا ہوا تھا اور لسی کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا، جسے گڑ سے میٹھا کیا گیا تھا۔ ''سلام سادھو جی!'' اس نے کہا۔

''سلام بیٹی!...... آؤ......'' میں نے اس چھوٹی سی میلی کچیلی بچی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس وقت یہی تھا سادھو جی!'' بچی نے کہا۔

''بہت کچھ ہے بیٹے!...... کیا نام ہے تمہارا؟''

''صغرا۔''

''بڑا پیارا نام ہے۔ اللہ بخش چاچا کی بیٹی ہو؟''

''وہ میرے دادا ہیں۔''

''خوب...... تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟''

''مولا بخش۔'' بچی نے جواب دیا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ بہرحال ٹھیک تھا۔ باپ بیٹوں میں قربت تھی۔ بچی نے تھالی میرے سامنے رکھ دی اور میں نے ضرورت نہ محسوس کرتے ہوئے بھی ایک روٹی میٹھے چھاچھ کے ساتھ کھا لی۔ بچی پانی لے آئی تھی۔ ویسے وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی حیرت محسوس کر لی اور اس کی وجہ بھی پوچھ ڈالی۔

"کیا بات ہے صغرا! تم اتنی حیران کیوں ہو؟"
"کک...... کوئی بات نہیں سادھو جی!...... کوئی بات نہیں۔" صغرا گڑبڑا کر بولی۔
"پھر بھی۔" میں نے محبت سے اصرار کیا۔
"آپ...... آپ کیسے سادھو ہیں؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔
"کیوں؟"
"دوسرے تو ایسے نہیں ہوتے۔"
"کیسے ہوتے ہیں دوسرے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"بس، وہ روٹی بھی لیتے ہیں تو اتنے نیچے ہاتھ کر کے کہ ہاتھ نہ چھو جائے۔ وہ اس طرح مسکراتے بھی نہیں۔ وہ اتنے اچھے بھی نہیں ہوتے، جتنے آپ ہیں۔"
"اوہ......" میں ہنسنے لگا۔
"آپ ناراض تو نہیں ہوئے سادھو جی؟"
"نہیں بیٹے! تم ہماری بیٹی نہیں ہو؟"
"خدا کا شکر ہے۔" صغرا نے ٹھنڈی سانس بھری اور مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر ڈیوڑھی کے دروازے پر آوازیں سنائی دیں اور اللہ بخش چاچا نے اندر جھانکا۔
"ہم آ جائیں سادھو مہاراج؟"
"آیئے، آیئے چاچا اللہ بخش!...... آیئے۔" میں نے کہا۔ چاچا اللہ بخش کے ساتھ سات آٹھ آدمی اور تھے۔ سب کے سب قوی ہیکل جوان۔ پیشانی پر سیاہ نشان جو نماز کے تھے۔ یہ حقیقت ہے، ایمان جب کفر میں گھر جاتا ہے تو جوہر دکھاتا ہے۔ ان سب کی نگاہوں میں جلال تھا۔ میں نے انہیں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔
اور پھر اللہ بخش چاچا نے سب سے میرا تعارف کرایا۔
"میرا نام عبدالکریم ہے سادھو جی!" ایک درمیانی عمر کے تندرست انسان نے کہا۔
"مجھے معلوم ہو گیا ہے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"یہ برتن کیسے ہیں؟" عبدالکریم نے اللہ بخش سے پوچھا۔
"صغرا بیٹی نے مجھے چھاچھ سے مکئی کی روٹی کھلائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"آپ کیسے سادھو ہیں مہاراج! کیا آپ کا دھرم بھرشٹ نہیں ہوا مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا کھا کر؟" عبدالکریم نے کہا۔
"ارے پاگل!.... اناج تو آسمان والے نے ہی پیدا کیا ہے۔ کیا ہم لوگ بھی اسی کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟ دھرم خود بھی تو سب سے پہلے انسانی محبت کا سبق دیتا ہے۔"
"یہ بات دوسرے سادھو کیوں نہیں جانتے؟" عبدالکریم نے کہا۔
"بھگوان جانے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔
"آپ ہمارے مہمان بننا کیوں چاہتے ہیں؟" عبدالکریم نے کہا۔
"روٹیاں توڑنا نہیں چاہتا بھائیو! بس دل چاہا تھا کہ تھوڑا وقت اس بستی میں گزار کر یہاں کے لوگوں

کو بھی دیکھوں۔ نہیں برداشت کر سکتے تو چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔
اور میرے سامنے والے تڑپ گئے۔ سب کے چہرے شرمندگی کی تصویر نظر آنے لگے۔
"نہیں، نہیں سادھو مہاراج!...... گو ہم بہت دُکھے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب میں مہمان کی دل شکنی نہیں کی جاتی۔ آپ کوئی بھی ہوں، بعد میں ہمیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائیں، بہر حال اس وقت آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اور ہم اپنے مہمان کو کوئی شکایت نہ ہونے دیں گے۔" عبدالکریم نے جلدی سے کہا۔
"میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔" میں ایک آوارہ گرد سادھو ہوں۔ میں تمہارے وہ حالات جاننے کی کوشش نہیں کروں گا جو اندرونی ہیں۔ لیکن مجھے بتاؤ، درگا پور میں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟"
"آپ درگا پور کب آئے ہیں سادھو جی؟"
"بس، صرف چند روز ہوئے۔"
تبھی آپ یہاں کے بارے میں نہیں جانتے۔ درگا پور پر راجہ گوونداس کی حکومت ہے۔ ایک متعصب راجہ...... جو مسلمانوں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے قبل اس کا باپ کرشن داس کپور حکمران تھا۔ اس وقت ہمیں پوری پوری آزادی تھی۔ ہم بھی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ہمارا ان سے لین دین تھا۔ ہم اپنے طور پر زندگی گزارتے تھے اور ہندو اپنے طور پر۔ معمولی معمولی جھگڑے بھی ہوتے تھے لیکن وہ بڑا فساد کبھی نہ بنتے۔ کیونکہ کرشن داس کپور نہیں چاہتے تھے۔ پھر اُن کا انتقال ہوا تو عیاش راجہ گوونداس کپور گدی پر آیا۔ اس سے قبل ہم اس کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے تھے۔ ہم نے اس کی بہادری کی داستانیں سنی تھیں اور اسے دعائیں دیتے تھے۔ بہر حال وہ ہمارا راجہ تھا۔
لیکن راج گدی سنبھالتے ہی اُس نے ہمارے اوپر زندگی تلخ کر دی۔ وہ ...... اور اُس کا ذلیل ساتھی ہرچرن لال...... بڑے ہی بدفطرت انسان ہیں، اس نے ہرچرن لال کو وزیر بنا لیا ہے۔ ملک کا سارا انظام ہرچرن لال سنبھالے ہوئے ہے...... سیاہ وسفید کا مالک...... اس نے مسلمانوں پر وہ مظالم توڑے ہیں کہ بس..... کیا کہا جائے۔
ابتدا فسادات سے ہوئی۔ ہندو اور مسلمان ہمیشہ بھائیوں کی طرح ساتھ رہے۔ لیکن ہندوؤں کے دلوں میں نفرت کا بیج بویا گیا۔ طرح طرح سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو بھڑکایا گیا۔ خود کسی ہندو دوشیزہ کو اغوا کر کے گوونداس کپور کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا اور نام مسلمانوں کا لگا دیا گیا۔ چنانچہ ہنگامے شروع ہوئے۔ ہماری تعداد یہاں بہت مختصر ہے لیکن ہم بے گناہ تھے، اس لئے بہادر تھے۔ ہم نے پہلے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانے تو پھر ہم نے بھی دوسری زبان استعمال کی۔ مارا، مارے گئے۔ لیکن ہندوؤں کو حکومت کی حمایت حاصل تھی اور پھر مٹھی بھر مسلمان ان سب کا کیا بگاڑ لیتے؟ ہمیں شہر سے نکال دیا۔ شہر میں ہماری آمد و رفت بند کر دی گئی۔ ہم سے تجارت کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور ہمیں بے سروسامانی کی حالت میں سلطان آباد میں دھکیل دیا گیا۔ ایک بھی مسلمان اب شہر میں نہیں ملے گا۔ سب یہاں آباد ہیں اور سلطان آباد کو بھی مادھو پورہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔ کیا کر سکتے ہیں ہم ان کا۔" عبدالکریم کی آواز بھرّا گئی۔

اور میرے دل میں ایک عجیب سی دُکھن پیدا ہو گئی۔ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ پوری زندگی گناہوں میں بسر کی ہے۔ لیکن انسانیت کی تڑپ بھی تو مذہب سے منسلک ہے۔ اسے مذہبی درد ہی کیوں نہ کہا جائے۔ میرے دل میں گووند اس کپور کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ ہر چرن لال کو ہم ویسے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اُس کے اس نئے روپ کے بارے میں سن کر اُس کی شکل سے گھن آنے لگی۔

کئی منٹ خاموشی رہی۔ پھر عبدالکریم نے ہی زبان کھولی۔

''ہمارا مذہب ہم سے چھینا جا رہا ہے۔ اس بستی میں اسکول کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ اسکول کھولا گیا تو ہر چرن لال کے سپاہی آ گئے۔ استاد کو ہلاک کر دیا گیا اور اسکول کی کچی عمارت ڈھا دی گئی۔ ہاں، ہمارے بچوں کو بستی کے اسکولوں میں ہندی تعلیم مل سکتی ہے۔ وہاں اُنہیں شدھی کرنے کے معقول انتظامات ہیں۔''

''تمہاری کوئی عبادت گاہ بھی نہیں ہے؟''

''مسجد اور مدرسہ بنانا منع ہے، ہر چرن لال کے حکم سے۔ چوری چھپے کسی نہ کسی گھر میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔'' عبدالکریم نے بتایا اور میرا سر چکرانے لگا۔

آہ...... ہم فضول معاملات میں اُلجھے رہے۔ تالوت بلا وجہ تلکا کے چکر میں پڑ گیا۔ کاش اس سے قبل ہم اس بستی میں آ نکلتے۔ ہماری زندگی کا مشن ہی دوسرا ہوتا۔ یہ تو بات ہی انوکھی نکلی۔ یہ تو معاملہ ہی عجیب نکلا۔ اور اب تو طالوت کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کاش وہ آ جائے تو ہم ان مظلوم انسانوں کے بارے میں سوچیں، ان کے لئے کچھ کریں۔

''تو یہ وجوہات تھیں سادھو جی! جن کی وجہ سے ہمارے روّیے میں خشکی تھی۔ خدا کی قسم ہم آج بھی اپنا حق حاصل کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ہم آج بھی وہی فضا پیدا کر سکتے ہیں، جو تھی۔ لیکن بالآخر ہم انسان ہی ہیں۔ جب راجہ ہی پرجا کے خلاف ہو تو پھر بھائی چارہ کہاں سے پیدا کیا جائے؟''

''تم نے ٹھیک کہا عبدالکریم!..... صبر کرو...... ہاں، ایک پیش گوئی میں کئے دیتا ہوں۔ سنو اور غور سے سنو! بہت جلد، اتنی جلد کہ تمہیں حیرت ہو گی، ظالم گووند اس کپور اور ہر چرن لال کے چراغ بجھنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد جو راج آئے گا، وہ تم لوگوں کو پوری پوری آزادی دے گا۔''

''یہ صرف ایک خواب ہے سادھو جی!''

''نہیں بچو! یہ خواب نہیں ہے۔ لیکن تم اسے گھر گھر گاتے رہے، ایک ایک کو جا کر بتاتے رہے تو گووند اس کپور اور ہر چرن لال ہوشیار ہو جائیں گے اور پھر تم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے سادھو جی! مگر آپ...... آپ اُن کے خلاف کیوں ہو گئے ہیں؟''

''میں صرف ظلم کے خلاف ہوں میرے بچو!...... میں صرف ظلم کے خلاف ہوں میرے دوستو!...... ظالم کوئی بھی ہو، کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اُسے بد دُعا ہی دی جا سکتی ہے۔''

''ان لوگوں کے مظالم کی تو کوئی انتہا نہیں ہے سادھو جی!...... یہ ہماری لڑکیاں اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی مسلمان لڑکیاں ان کے قبضے میں ہیں۔''

''اوہ...... ان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا؟''

"آج تک نہیں......کون پتہ چلائے گا؟......کہاں سے پتہ چلے گا؟" عبدالکریم نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے یہ حالات سن کر سخت افسوس ہوا ہے۔" میں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"صرف یہی وجہ تھی سادھو جی! جو آپ نے مسلمانوں میں مہمانوں کے لئے گرمجوشی نہیں پائی۔ ورنہ ہمیں اپنے مذہب کی روایات یاد ہیں۔" عبدالکریم نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو عبدالکریم! لیکن میں نے جو بات کہی ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے گرہ میں باندھ لینا۔ ان لوگوں کی موت قریب ہے اور اس کے بعد تمہیں ایک نئی زندگی ملے گی۔ کیا تم میری اس پیش گوئی پر یقین کرو گے؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے سادھو جی!"

"ہاں!......خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے کہا اور پھر میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس پوری بستی کی تصویر اسی جگہ میرے سامنے آ گئی تھی۔ اب یہاں رُکنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ یہاں سے چلنا ہی بہتر ہے۔ دل کسی جگہ رُک ہی نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ تو تلاش کرنے کی ضرورت ہی تھی۔

طالوت......اور طالوت......جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، مجھے مایوسی ہوتی جا رہی تھی۔ طالوت پھر کسی اُلجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن کون سی اُلجھن؟......کیا چالاک تلکا نے اُسے پھانس لیا تھا؟ حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ بھلا تلکا کی یہ مجال......طالوت کے پہلے ہی وار نے اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اللہ بخش اور دوسرے لوگ اب بھی میرے گرد جمع تھے۔ میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا سمجھے بھائیو!......خدا کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ تمہاری مشکلات کا دور ختم ہونے والا ہے۔ میں تمہارے درمیان اسی مختصر وقت کے لئے آیا تھا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

"ارے نہیں سادھو جی!......آپ یہاں آرام کریں۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ آپ عام ہندوؤں سے مختلف ہیں۔"

"ہاں......میں عام ہندوؤں سے مختلف ہوں۔ کیونکہ......کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن تم لوگ میری بات یاد رکھنا۔ اس بات کا چرچا نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے حق میں ہی اچھا نہیں ہوگا۔"

"مسلمان ہو؟"

"الحمد للہ!" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر تمہارا حلیہ......؟" وہ سب حیرانی سے بولے۔

"بس یہ ضرورت کے تحت تھا۔" اور سب میری شکل دیکھتے رہ گئے۔ ان سادہ دل آنکھوں میں شدید حیرت کے نقوش تھے۔

"خدا حافظ بھائیو!......آخری بار کہہ رہا ہوں۔ میری بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا اور شاہ دانہ کا دوشالہ سر پر ڈال لیا۔ دوسرے لمحے ظاہر ہے، میں ان کی نگاہوں سے غائب تھا۔

اُن سب کے منہ سے حیرت کی آوازیں نکل گئی تھیں۔ "ارے......کک......کہاں گیا؟......ارے کہاں گیا؟" سب چیخ پڑے۔ اور پھر ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ وہ سب مجھے کوئی فرشتہ، کوئی ولی،

کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھنے لگے، جو اُنہیں بشارت یا خوشخبری دینے آیا تھا۔
اور ان کے سینے عقیدت سے پھولے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ خدا میری مدد کرے۔ میں نے دل میں سوچا۔ میں نے انہیں خوشخبری تو دی ہے لیکن خدا توفیق دے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، اسے پورا کرنے میں ان کی مدد کر سکوں۔ بہر حال ان سب کی حیرت کی انتہا نہیں تھی۔ اور جب وہ سب باہر نکلے تو میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے نکل آیا۔
اب میں واپس جا رہا تھا۔ لیکن کیفیت وہی تھی۔ کھویا کھویا سا...... پریشان...... کیا کروں؟...... میں تو جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کروں تو کیا کروں؟...... محل جاؤں..... لیکن وہاں جا کر کیا کروں؟...... صرف دیومتی کی دلجوئی۔ لیکن یہ کوئی کام تو نہیں۔ بیکار وقت ضائع کرنا۔ بالکل فضول۔
طبیعت پر سخت جھنجلاہٹ سوار تھی۔ کہاں مر گیا آخر یہ شخص۔ اس کے ساتھ نباہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے تو مجھے کھلونا بنا رکھا ہے۔ صرف مصاحب بنا رکھا ہے...... ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے...... اور جب جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ کیا ساری زندگی اسی طرح جینا ہے؟...... لعنت ہے ایسی زندگی پر، جو دوسروں کے رحم و کرم پر ہو۔ موت ایک دفعہ ہی آتی ہے۔ کیوں نہ کسی دوسرے کے تسلط سے آزاد ہو کر جیا جائے۔ رہا دوسرے مسائل کا معاملہ، تو اگر کبھی گرفتار ہو جاؤں تو ٹھیک ہے۔ ہر چیز کی بہر حال انتہا ہوتی ہے۔
ذہنی انتشار کے عالم میں عجیب اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔ اور پھر جب حواس جاگے تو محل کے سامنے تھا۔ نہ جانے قدم اس طرف کیوں اُٹھ گئے تھے۔ بہر حال اب یہاں آ ہی گیا تھا تو پھر اندر داخل ہونے میں کیا حرج ہے۔
شاہ دانہ کا دوشالہ کاندھوں پر ہی تھا۔ اندر داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور میں محل کے مختلف حصوں سے ہوتا ہوا دیومتی کے محل میں داخل ہو گیا۔
دیومتی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ کہیں چلی گئی تھی۔ میں نے سوچا اور بے تکلفی سے اُس کے بستر پر لیٹ گیا۔ حالانکہ کوئی طویل سفر نہیں کیا تھا، لیکن عجیب سی تھکن ذہن پر سوار تھی۔ مسلمانوں کی زبوں حالی سے بھی دل کٹ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ ان کے لئے کچھ کروں۔ لیکن اپنی بے بسی کا بھی احساس تھا۔ ہاں، اگر وہ ہوتا تو......
ایک بار پھر جھلاہٹ کی لہر ذہن کی طرف دوڑی، لیکن میں نے اسے کنٹرول کیا، خود پر قابو پایا اور سوچنے لگا، طالوت جب بھی غائب ہوا ہے کسی اُلجھن میں پھنسا ہے۔ اور اس بار...... اس بار تو اس کے لئے دعا کرنا ہی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ ایک خبیث روح کے تعاقب میں گیا تھا۔
بہر حال اس کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی مناسب نہیں ہے۔ طالوت کے پاس پُراسرار قوتیں ہیں۔ لیکن بہر حال انسان تو میں بھی ہوں اور میرے پاس بھی ایک قوت موجود ہے۔ اور وہ ہے عقل کی قوت۔ میں نے اس قوت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ مجھے اس سے کام لینا چاہئے۔ طالوت جب بھی آئے، اس کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا فضول ہے۔ کچھ کیا جائے۔

اور درحقیقت اس بار میرا عزم بہت مضبوط تھا۔ میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہتا تھا اور میں دیوتی کے بستر پر لیٹا لیٹا گہرے خیالات میں گم ہو گیا۔

میرے ذہن میں ہانڈی پکتی رہی۔ ہرچرن لال...... دیوان...... گووند اس کپور...... مسلمانوں کے دشمن...... پھر ان کے ساتھ رعایت کیسی؟ کچھ کرنا چاہیئے...... اور اس کے بعد فیصلہ حالات پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اس سلسلے میں، میں نے جو سب سے پہلا مہرہ تلاش کیا، وہ گووند اس کپور تھا۔ ابھی تک مہاراج گووند اس کپور کے درشن ہی نہیں ہوئے تھے۔ دیکھا تو جائے اس پردہ نشین مہاراج کو۔

اور میں بستر سے اُتر آیا۔ اب میں اپنے کیئے ہوئے فیصلوں پر اٹل تھا۔ دروازے سے نکلا تو سامنے ہی دیوتی نظر آئی۔ اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے، مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں بھی اب اس کے پاس رک کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا تھا، چنانچہ میں اس سے بچ کر آگے نکل گیا۔

مہاراج گووند اس کپور کو تلاش کرنا مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے یہاں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو ہی گئی تھیں۔ چنانچہ میں خاص محل کی طرف چل پڑا۔

بلاشبہ محل کے راستے پر خاص ہی پہرے دار تھے۔ عام لوگ ادھر کا رُخ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سپاہی پوری طرح چوکس اور مستعد تھے۔ ویسے یہ حصہ تھا بھی خوب صورت۔ پورے محل سے زیادہ شاندار۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سپاہیوں کی چوکیاں تھیں اور وہ سب کے سب مستعد تھے۔ عجیب بات ہے...... میں نے دل میں سوچا۔ آخر یہ مہاراج ہیں کیا بلا؟...... اور ان تک پہنچنا اس قدر مشکل کیوں ہے؟

میں پہرے داروں کے نزدیک سے گزرتے ہوئے آہٹ بھی نہیں پیدا ہونے دیتا تھا۔ بہر حال، اسی طرح عجائبات سے گزرتا ہوا میں گووند اس کپور جی کے محلِ خاص کے بڑے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ پھاٹک بہت مضبوط تھا۔ اس میں سونے کی خوب صورت کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہاں بڑی مشکل پیش آ گئی۔ اب اس پھاٹک کے دوسری طرف کیسے جایا جائے؟...... چالاکی سے کام لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے پھاٹک زور زور سے بجایا اور تھوڑے فاصلے پر موجود پہرے دار چونک پڑے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور پھاٹک کی طرف بڑھ گئے۔ دوسری طرف اندر موجود پہرے داروں نے بھی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھولی۔ دو آدمی تھے، جنہوں نے منہ نکال کر باہر جھانکا اور میں نے پھرتی سے ان دونوں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں اندر دھکیل دیا اور دوسرے لمحے میں غڑاپ سے ذیلی کھڑکی سے دوسری طرف تھا۔

پہرے دار میرے دھکے سے گر پڑے تھے۔ لیکن ان کی حالت عجیب تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ اسی وقت باہر کے پہرے دار ان کے پاس پہنچ گئے۔

''تم......؟'' گرنے والے پھنکارے۔

''کیا ہوا گردھاری؟''

''یہ کیا حرکت تھی؟'' اندر والے اُٹھتے ہوئے بولے۔

''کون سی حرکت؟''

''دھکا کیوں دیا؟'' گردھاری مرنے مارنے پر آمادہ تھا۔

''ارے، ارے...... دماغ پھر گیا ہے کیا؟'' باہر والا پہرے دار پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارا خون کر دوں گا۔''

''اسے کیا ہو گیا بانکے لال!...... سنبھالو اسے۔'' باہر والے نے بھی ناخوشگوار لہجے میں کہا اور میں اطمینان سے ایک طرف کھڑا ان لوگوں کی بات رفع دفع ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

بہر حال بمشکل تمام وہ خاموش ہوئے۔ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں تھی۔ دونوں حیران تھے بیچارے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دھکا کس نے دیا؟ پھاٹک کس نے بجایا؟...... بہر حال طالوت کا ایک تحفہ میرے پاس موجود تھا، جس سے میں اس کی یاد تازہ کر سکتا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ سامنے بہت بڑا گھاس کا قطعہ تھا، جس کے درمیان ایک انتہائی حسین فوارہ بنا ہوا تھا۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ فوارے سے دوسری طرف تھوڑے فاصلے پر ایک اور دروازہ تھا لیکن وہاں پہرے دار نہیں تھے۔ گویا پہرے داروں کی حدود صرف اس بڑے پھاٹک تک تھیں۔ میں نے یہ دروازہ بھی کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

لیکن پھر مجھے ایک دم ٹھٹک جانا پڑا۔ دوسری طرف حسین عورتوں کا ایک غول موجود تھا۔ شاید کنیزیں تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ سب کی سب خوب صورت تھیں اور شرارت میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوشاں تھیں۔ میں ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''مہاراج نے تو حد کر دی ہے۔ اب تو ہنسی روکنا بھی مشکل ہے۔ اب بتاؤ، وہ کتھا کلی کیسے ناچیں گے؟'' ایک کومل سی لڑکی کہہ رہی تھی۔ دوسری تمام لڑکیاں ہنس پڑیں اور پھر ان میں سے دوسری بولی۔

''وہ مہاراج ہیں۔ جو چاہیں، کر سکتے ہیں۔''

''اری کیوں بکواس کر رہی ہو؟...... خاموش ہو جاؤ۔ کسی نے سن لیا تو گونڈی ہو جائے گی۔''

''ہائے رام۔'' لڑکیاں ''گونڈی'' کا نام سن کر ایک دم خاموش ہو گئیں۔ میری سمجھ میں ان کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ بہر حال، میں آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک خوب صورت جھالر دار پردہ لٹک رہا تھا۔ اس کے دوسری طرف ایک ہال تھا جس میں ایک جڑاؤ دروازہ تھا۔ اور دروازے کے دوسری طرف مہاراج تھے۔

دھڑکتے دل سے میں نے دروازہ کھولا اور میری آنکھیں جھپک گئیں۔ بہت ہی بڑا ہال تھا چاروں طرف قیمتی فانوس لٹکے ہوئے تھے، جن میں رنگین شمعیں روشن تھیں۔ بڑا حسین ماحول تھا اور اس ماحول میں ان نازنینوں کے سیمیں جسموں نے شفق کھول دی تھی۔ وہ شہد کی مکھیوں کے چھتے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی کی نقرئی ہنسی گونج اٹھتی۔ میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ ایسے ایسے حسین اجسام اور اس انداز میں...... بہر حال میں بھی انسان تھا۔ یہ ہلکی سی نیم پوشی، عریانیت سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

قہقہے جاری تھے۔ لیکن مہاراج گووند اس کپور کہاں ہیں؟...... میں گووند اس کپور کے بارے میں

مشہور داستانوں پر غور کرنے لگا۔ شیروں کا شکاری....... بہادروں کا بہادر، گوونداس کپور گوشہ نشینی اختیار کر کے ان عورتوں کے درمیان زندگی کیسے گزار رہا ہے؟...... مگر وہ ہے کہاں؟ میں نے آنکھیں کھول دیں۔
اسی وقت میرے کانوں میں ایک کڑک دار، رعب دار آواز گونجی۔
''بس، ہٹ جاؤ...... کافی ہے۔'' اور میں چونک پڑا۔ یہ آواز گوونداس کپور کی ہی ہو سکتی تھی۔ اور یقیناً وہ عورتوں کے جھرمٹ میں ہی ہے۔
عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں اور پھر وہ کافی دُور ہٹ گئیں۔ ایک خوب صورت سنگھاسن تھا اور اس پر ایک درمیانے قد کی فربہ اندام عورت بیٹھی تھی۔ اس کے پورے بدن پر قیمتی زیورات سجے ہوئے تھے۔ دُلہن بنی ہوئی تھی پوری۔ اُس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔
وہ عورت...... وہ عورت...... خالص عورت تو نہیں معلوم ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچوں، اچانک عورت اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے رقص کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کئی بار اس نے گھوم کر اپنے آپ کو دیکھا، پھر شرمائے ہوئے انداز میں بولی۔
''کیسا لگ رہا ہوں اس لباس میں؟'' اور میرا منہ تعجب سے کھل گیا۔ مرد کی آواز تھی۔ گویا میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔
''لگ رہی ہوں کہیئے مہاراج!...... ورنہ سارا سواد جاتا رہے گا۔'' ایک خوب صورت لڑکی بولی۔
''ہائے رام!...... کیسی لگ رہی ہوں؟'' عورت نما مرد یا مرد نما عورت لچک کر بولی۔
''بڑی سندر۔ بھگوان کی سوگند، بڑی سندر۔'' ساری لڑکیوں نے بیک آواز کہا اور ہیجڑا دانتوں میں اُنگلی دبا کر مسکرانے لگا۔
میری آنکھیں حیرت سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک خیال آ رہا تھا۔ کیا یہی شخص مہاراج گوونداس کپور ہے؟...... کیا یہی؟...... ورنہ پھر اس کا یہاں کیا کام؟...... اور لڑکیاں اس قدر چونچلے [illegible] کر رہی ہیں؟
لیکن گوونداس کپور، شیروں کا شیر، زمین سے شیروں کا شکار کرنے والا، کیا یہی ہے؟...... اگر یہ شوق ہے تو عجیب ہے۔ اور پھر یہ انداز...... تب ہیجڑا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے لڑکیوں سے رقص کے انداز میں آنے کے لئے کہا۔ اور پھر ہال کے کونوں سے سازوں کی آواز پھوٹ پڑی۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا جو ساز بجا رہی تھیں۔ اب تک میری نگاہ ان پر نہیں پڑی تھی۔ ان کے ہونٹ دبے ہوئے تھے، جیسے انہوں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی ہو۔
تب وہ رقص کے پوز میں آ گیا۔ لڑکیاں تتلیوں کی طرح اس کے چاروں طرف بکھر گئیں اور ہیجڑا رقص کرنے لگا۔ حالانکہ اس ماحول نے مجھے حیرت سے گنگ کر دیا تھا۔ لیکن ہیجڑے کی بے تکی اُچھل کود دیکھ کر میری بھی ہنسی نہ رُک سکی۔
اس کے ساتھ رقص کرنے والی لڑکیوں کی بری حالت تھی۔ رقص بھی کر رہی تھیں، پیٹ بھی دبا رہی تھیں۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔
ہیجڑے کا رقص جاری رہا۔ وہ لہرے پر لہرے لے رہا تھا، لچک رہا تھا، مٹک رہا تھا۔ اور پھر وہ تھک

گیا اور لڑکیوں کی جان میں جان آئی۔ وہ نخریلی رقاصاؤں کے انداز میں فرش پر بیٹھ گیا۔
لڑکیاں پھر اس پر پل پڑیں۔ وہ اسے چاروں طرف سے ٹٹول رہی تھیں۔
''کیسا رہا؟'' ہیجڑے نے ہانپتے ہوئے کہا۔
''بھگوان کی سوگند مہاراج!...... آپ نے تو کمال کر دیا۔ بڑے بڑوں کے کان کاٹ لئے۔'' ایک لڑکی ہیجڑے کے دونوں گالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی اور مہاراج شرمائے ہوئے انداز میں ہنس پڑے۔
میں اب بھی پریشان تھا۔ یہ ماجرا کیا ہے؟...... اگر یہ راجہ گوونداس کپور ہے تو اس کے بارے میں مشہور داستانیں کیا تھیں؟ اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر اس کے محل میں اس ہیجڑے کا کیا کام؟
''اب کیا آگیا ہے مہاراج؟'' ایک خوب صورت سی لڑکی نے پوچھا۔
''ائے بس...... اب کیا ہے؟...... چلو، اندر چلو۔'' ہیجڑا لچک کر بولا اور پھر وہ لڑکیوں کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکیوں نے پھر اسے جھرمٹ میں لے لیا اور آگے بڑھ گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ اس بار وہ اسے لئے ہوئے ایک اور کمرے میں پہنچیں، جو دوسرے کمروں کی طرح طویل و عریض تھا۔ لیکن وہ خواب گاہ کی شکل رکھتا تھا۔
لیکن یہ انوکھی خواب گاہ تھی...... میں نے ایسا حیرت انگیز کمرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پورے کمرے میں انتہائی شرم ناک مناظر بکھرے پڑے تھے۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر، چاروں طرف رکھے ہوئے جوڑوں کے مجسمے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ گوونداس کپور ہی ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ سب آخر کیا تھا؟ کیا درگاپور کا راجہ، ہیجڑا ہے؟...... یہ کیا مسخرہ پن تھا؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا تھا۔
''بلاؤ اب اس وسونتی کو...... دیکھے ہمارا ناچ...... کہتی تھی، ہم ناچ ہی نہیں سکتے۔ کیسا ناچا تھا؟''
''بہت ہی سندر...... بہت ہی سندر مہاراج!...... اور یہ وسونتی...... اس کی تو گونڈی ہونی چاہئے۔ اپنے آپ کو بہت بڑی ناچنے والی سمجھتی ہے۔''
''گونڈی...... ہاں ضرور ہوگی۔ ارے ہاں، وسونتی کی گونڈی تو ضرور ہوگی۔''
''بلاؤں اسے مہاراج؟'' ایک شریری لڑکی نے پوچھا۔
''ضرور بلاؤ۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟'' مہاراج نے کہا اور لڑکی باہر نکل گئی۔ دوسری لڑکیاں اب بھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ میں ایک جگہ تھکا تھکا سا بیٹھ گیا۔ اب تو حیران ہونے کی ہمت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ دنیا بھر کی حیرت انگیز باتیں میرے حصے میں ہی آگئی تھیں۔ بتائیے، اس راجہ کو کیسے برداشت کر لیتا جس کی بہادری کے گیت گائے جاتے تھے اور وہی راجہ، سولہ سنگھار کئے، عورتوں کے لباس میں میرے سامنے بیٹھا تھا اور لڑکیوں کے مذاق پر شرما شرما کر دوہرا ہو رہا تھا۔
بہرحال حیرانی ختم ہو جانے کے بعد بات دلچسپ تھی۔ معاً میری نگاہیں تصاویر کے درمیان ایک تصویر پر پڑی۔ لمبی لمبی مونچھوں والا ایک شاندار جوان تھا، جس کے چہرے سے درحقیقت رعب ٹپکتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے اُس کے نقوش اُس ہیجڑے سے ملتے ہوئے دیکھے۔
گوونداس کپور کے باپ دادا میں سے کوئی ہوگا۔ میں نے سوچا اور خاموشی سے ان سب کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی واپس آگئی۔ اُس کے عقب میں ایک گداز بدن اور حسین چہرے والی

اٹھائیس تیس سال کے درمیان کی عورت تھی۔ اندر آکر اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور جھک کر پرنام کیا۔
''آؤ، آؤ.......اندر سبھا کی اپسرا!.......اب کہو۔'' ہیجڑے نے کہا۔
''اندر سبھا، مہاراج گووندا س کپور کی سبھا سے اچھی کیا ہوگی؟ میں تو گووندا س سبھا کی اپسرا ہوں۔''
آنے والی نے دلکش لہجے میں کہا۔
''اوہو......اوہو......کیا یہ ٹھیک کہتی ہے سندریو؟'' مہاراج نے دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔
''بنا رہی ہے مہاراج!.......وسنتی کا چرتر تو مشہور ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ اب گونڈی ہونے والی ہے۔''
شریر لڑکیوں نے ہنستے ہوئے کہا اور آنے والی نے خونخوار نگاہوں سے اُنہیں گھورا۔
ایں، ہاں......گونڈی تو ہوگی......ضرور ہوگی۔'' مہاراج جلدی سے بولے۔
''مگر میرا دوش مہاراج؟'' وسنتی نے پوچھا۔
''ارے تُو نے کہا تھا کہ کتھا کلی ہمارے بس کا روگ ہی نہیں۔ اب دیکھ لے، ہم نے کتھا کلی سیکھ لیا ہے۔''
''سچ مہاراج.......؟'' وسنتی خوشی سے بولی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جان بچانے کے لئے بکواس کر رہی ہے۔
''تو جھوٹ بول رہے ہیں ہم؟'' ہیجڑے مہاراج بولے۔
''ارے نہیں، نہیں......مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔'' وسنتی نے کہا۔
''کچھ بھی ہو۔ گونڈی ضرور ہوگی۔''
''مہاراج کو ادھیکار ہے۔ مگر ایک بات ضرور کہوں گی۔''
''کیا؟......کہو، کہو۔'' مہاراج جلدی سے بولے۔
''مہاراج اَن داتا ہیں۔ لیکن بات فن کی ہے۔ اگر مہاراج کتھا کلی کرنے لگے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اور اگر کلا کی اندھیوں نے ایسے ہی آپ سے کہہ دیا ہے تو دوسری بات ہے۔'' وسنتی نے کہا۔
''سمجھ گئے ہم......سمجھ گئے......بولو، کیا چاہتی ہو؟''
''ہو جائے ایک مقابلہ مہاراج؟''
''اوہ......منظور......مگر اس کے بعد گونڈی......کیا سمجھیں؟''
''ہار گئی تو مہاراج!'' وسنتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بڑا مان ہے تجھے......آجا، اسی وقت......اسی سمے۔''
''نہیں مہاراج!......رات ڈھل جانے دو۔ وہ سمے اچھا ہوتا ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' شیروں کے شکاری غرّائے اور وسنتی مسکرانے لگی۔
میں نے ایک گہری سانس لی۔ حیرت کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اب دلچسپی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا، طالوت کی موجودگی میں ہم ادھر کیوں نہیں آئے۔ بڑی تفریح رہتی ان مہاراج کے ساتھ تو۔ واقعی یہ تو بڑی دلچسپ چیز تھے۔
بہر حال، طویل وقت میں نے وہیں گزارا۔ اور اب مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ یہی مہاراج گووندا س کپور ہیں۔ لیکن جو کچھ نظر آرہے ہیں، اس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

دوسرا مسئلہ گونڈی کا تھا۔ نہ جانے یہ گونڈی کیا بلا ہے۔ شاید کسی قسم کی سزا ہو گی۔ بہرحال، وسونتی نے یہ سزا قبول کر لی تھی۔ کیوں نہ وسونتی سے دوستی کی جائے۔ کچھ خودسری لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ شاید کام آ جائے اس سے مہاراج گووند اس کپور کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو سکتی تھیں۔

چنانچہ میں اس لڑکی کی تلاش میں نکل پڑا۔ یوں بھی محل کے اس حصے کی سیر مقصود تھی، اس لئے ایک ایک کمرے میں جھانکتا ہوا بالآخر وسونتی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وسونتی بال بال موتی پرو رہی تھی۔ ہندو لڑکیاں یوں بھی کافی خوب صورت ہوتی ہیں۔ وسونتی سنگھار کے بعد بہت ہی حسین نظر آنے لگی تھی۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ عقب سے ایک اور لڑکی آتی نظر آئی۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو کر رک گئی تھی۔

''ارے، ارے...... آؤ ہنسو! ...... رُک کیوں گئیں؟'' وسونتی نے کہا۔ میں پہچان گیا۔ میں نے اس لڑکی کو بھی گووند اس کپور کے پاس دیکھا تھا۔ ہنسو خاموش کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے ری؟ چپ کیوں ہے؟'' وسونتی نے سنگھار کرنا بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کر رہی ہے وسونتی؟'' ہنسو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کتھا کلی کی تیاریاں۔'' وسونتی مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا تیرا بھی دماغ خراب ہی ہو گیا ہے؟''

''کیوں؟'' وسونتی نے تعجب سے بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ دیں۔

''وسونتی! تجھے میں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی۔''

''اری مگر ہوا کیا؟ ...... کچھ بتا تو سہی۔''

''کیا تُو مرنا چاہتی ہے؟''

''نن...... نہیں...... نہیں تو۔'' وسونتی کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

''پھر اس پاگل راجہ سے مقابلہ کرنے کیوں جا رہی ہے؟''

''اری...... مگر اُس سے ناچا کب جائے گا؟''

''میں جانتی ہوں۔''

''تو پھر؟'' وسونتی حیرت سے بولی۔

''بڑی بھولی، بڑی ہی بے وقوف ہے تُو...... اگر وہ ہار گیا تو کیا تجھے زندہ چھوڑ دے گا؟ کیا وہ نہ کہے گا کہ تُو نے اس کا اپمان کیا ہے۔ کیا تیرا دماغ ٹھیک ہے جو تُو اُس کی باتوں میں آ گئی؟''

''مگر...... مگر......'' وسونتی پریشانی سے بولی۔

''تُو نے پاگل پن کی بات کی ہے وسونتی!''

''ارے تو اب...... اب کیا کروں؟'' وسونتی نے سخت پریشان لہجے میں کہا۔

''دیوانی ہے نری۔ اب کیا کروں کی بچی۔ بس سنگھار کر، مہاراج کے ساتھ ناچ اور ہار جا۔ اُس کی بڑائی مان لے۔'' ہنسو نے کہا۔

''اور پھر گونڈی؟''

''مر تو نہیں جائے گی۔ جیون جانے سے تو ٹھیک ہے۔''

''بڑی بے عزتی کی بات ہے ہنسو!''
''تو پھر مر جا۔ ویسے بھی کس کی عزت ہے؟ کتنی ہیں جن کی گونڈی نہیں ہو چکی۔ اور پھر ضروری تو نہیں ہے کہ کسی قصور پر ہی گونڈی ہو۔ مہاراج کی مرضی۔''
''ہوں.....'' وسونتی نے ایک طویل سانس لی۔ ''تُو ٹھیک ہی کہتی ہے ہنسو!.....تُو ٹھیک ہی کہتی ہے۔''
''تیری سکھی ہوں، اس لئے کہہ رہی ہوں۔ ورنہ یہاں کس کا جیون سُکھی ہے؟...... کس کی عزت اور جان بچی ہوئی ہے؟ کون جانے، کب مہاراج کے من میں کیا آ جائے؟''
''ہاں۔'' وسونتی بجھ گئی تھی۔
''چل اب......اُٹھ جا۔''
''کہاں؟''
''بلایا ہے مہاراج نے۔''
''ارے......ابھی سے؟'' وسونتی چونک پڑی۔
''ہاں......اُن سے صبر نہیں ہو رہا۔''
''ہائے رام......میری بھی مصیبت آ ہی گئی۔''
''اری چل......مر نہیں جائے گی۔ میری نہیں ہو چکی؟''
''اری میری تو کمر ٹوٹ جائے گی۔ اور پھر کیسی......''
''چل، چل...... جو کچھ ہے، برداشت کرنا ہی پڑے گا۔'' ہنسو نے کہا اور وسونتی تیار ہو گئی۔ پھر وہ دونوں باہر نکلیں۔ میں بھلا پیچھے رہنے والا کہاں تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ہنسو راستے بھر وسونتی کو سمجھاتی آئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ مہاراج کے رقص کی خوب تعریف کرے تا کہ اُن کا من ڈھل جائے۔ ورنہ نقصان اُٹھائے گی۔
''ٹھیک ہے ہنسو!...... میں ایسا ہی کروں گی۔''
''کرنا پڑے گا، وسونتی!......وہی مثل ہے کہ

ڈوم کہے سن ڈومنی، تو ہے گام میں رہنا
اور اُونٹ بلّیا لے گئی، سو ہانجو ہانجو کیتو''

''ٹھیک ہے ہنسو!'' وسونتی آزردگی سے بولی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس بڑے ہال کے دروازے پر پہنچ گئیں، جہاں میں پہلے بھی شیروں کے شکاری، مہاراج گوونداس کپور کی کتھا کلی دیکھ چکا تھا۔
اندر کی فضا کسی عیاش راجہ کے اندرونِ خانہ کی بہترین نمائندگی کر رہی تھی۔ چاروں طرف حسین لڑکیاں، نہ ہونے کے برابر لباسوں میں بکھری پڑی تھیں۔ ساز بج رہے تھے اور گوونداس کپور، جو شاید عورتوں کے لباس میں رہنے کے شائق تھے، ایک حسین لباس میں ملبوس، سنگھاسن پر بیٹھے تھے۔ اِن کے چہرے پر بدلی بکھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کٹیلا سرمہ لگا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی تھی۔ عجیب پھٹکار بھری شکل نظر آ رہی تھی۔
وسونتی کی شکل دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''آؤ، آؤ مہان کتھا کلی!......بھگوان نے دھرتی پر ایک ہی ناچنے والی اُتاری ہے اور وہ تم ہو۔ مگر

آج تمہارا مان ٹوٹ جائے گا۔'' اُس نے لچکتے ہوئے کہا۔
وسونتی بھی مسکرانے لگی۔ حالانکہ اس کے دل میں خوف تھا، لیکن جان بچانے کے لئے بھی طریقے سے کام لینا تھا۔ مہاراج گووند اس کپور نے اپنی ساری مداحوں کی طرف دیکھا اور بولے۔
''کیا خیال ہے...... شروع کیا جائے؟''
''ہاں مہاراج!...... فیصلہ ہو ہی جائے۔'' لڑکیاں بولیں۔
''تیار ہو، وسونتی؟'' مہاراج نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے وسونتی کو دیکھا اور وسونتی نے گردن جھکا دی۔ تب مہاراج نے پیروں میں گھنگھرو باندھے اور بڑے ناز سے کھڑے ہو گئے۔
سازندوں نے ساز سنبھال لئے۔ وسونتی بھی کمر کس کر سامنے آ گئی۔ اور پھر کتھا کلی بول شروع ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی دونوں کا رقص۔ بے تکے مہاراج گردن مٹکا رہے تھے، اُن کی آنکھیں بھی مٹک رہی تھیں۔ نہ جانے کیا کر رہے تھے وہ...... میری کیا، کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا ہوگا۔ دوسری طرف وسونتی بھی ناچ رہی تھی۔
بلاشبہ وہ فنکارہ تھی۔ لیکن بہت جلد جان کا خوف اُس کے ذہن پر طاری ہو گیا اور وہ فن بھول گئی۔ جبکہ مہاراج ٹانگ ٹوٹے بکرے کی طرح بری طرح اُچھل رہے تھے۔ سازوں کی دُھنیں تیز تر ہوتی گئی تھیں۔ وسونتی کی شاید ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ مہاراج اب بھی پاؤں پھینک رہے تھے۔ اور جب لڑکیوں نے خوشی کے نعرے لگائے، تب انہیں پتہ چلا کہ انہوں نے معرکہ سر کر لیا ہے۔
بالآخر وہ رک گئے۔ اُن کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ گو اس اُچھل کود سے بری طرح ہانپ گئے تھے، لیکن دانت نکلے پڑ رہے تھے۔
''ہرے...... ہرے کیا ہوا مہان کتھا کلی؟'' انہوں نے طنز کیا۔
''مجھے...... مجھے نہیں معلوم تھا، مہاراج!...... آپ...... آپ اتنے بڑے کلاکار بن چکے ہیں۔''
غریب وسونتی نے نہ جانے کس دل سے کہا اور مہاراج ہنس پڑے۔
''تو معلوم کر لیا ہوتا۔ اب کونڈی کس کی ہو گی؟'' مہاراج ہنستے ہوئے بولے۔ دوسری لڑکیاں بھی قہقہے لگانے لگی تھیں۔ ''بس وسونتی! تم ہار گئیں۔'' مہاراج پھر بولے۔
''ہاں مہاراج! میں ہار گئی۔''
''کونڈی......!'' مہاراج دہاڑے اور وسونتی کے ہونٹوں کی مصنوعی مسکراہٹ بھی سکڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دہشت اُبھر آئی۔ لیکن پھر وہ پُرسکون ہو گئی۔
مہاراج دوبارہ سنگھاسن پر جا بیٹھے تھے اور داسیاں اُن کے پیروں کے گھنگھرو کھولنے لگیں۔ مہاراج کی آنکھوں میں مسرت نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف وسونتی، پتھر کے بت کی مانند ساکت کھڑی تھی۔
''ارے کونڈی......'' مہاراج ران پر ہاتھ مار کر چیخے۔ وسونتی اس مضحکہ خیز رسم سے واقف تھی۔ خود اُس کے سامنے کئی لڑکیاں بے عزت ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ جھکی اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔
مہاراج قہقہے لگا رہے تھے۔ اُن کے پیروں کے گھنگھرو کھل چکے تھے۔ پھر وہ سنگھاسن سے اُترے

اور وسنتی کی پشت پر جا بیٹھے۔ خاصے وزنی تھے۔ لیکن انہوں نے ہاتھ پیچھے کر کے وسنتی کو زور سے ہاتھ مارا اور گھوڑے کو ہانکنے والے انداز میں زبان سے ٹخ ٹخ کرنے لگے۔ وسنتی کا چہرہ سُت گیا تھا۔ لیکن بہر حال، وہ بمشکل تمام مہاراج کے بوجھ کو لے کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل آگے بڑھنے لگی۔

لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں۔

وسنتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس نے پورے ہال کے دو چکر لگائے۔ مہاراج بے حد خوش تھے۔ دوسری لڑکیاں بھی قہقہے لگا رہی تھیں اور اس عجیب وغریب کھیل کو میں دیکھ رہا تھا۔ اس میں سوائے جنس کے کچھ نہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے، لڑکیاں خوشی سے اس گدھے کے بوجھ کو اٹھانا تو پسند نہ کرتی ہوں گی۔ اور پھر بہر حال کوئی بھی اس طرح پسند نہ کرے گی۔

لیکن اس سے میرے ذہن میں کچھ اور خیالات بھی آئے تھے۔ راجہ کی فطرت کسی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

تیسرے چکر میں وسنتی تھک کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ راجہ گوونداس کپور اس پر سے اُتر آئے تھے۔ اور پھر وہ فخریہ انداز میں بولے۔ ''ہونہہ...... ہمارے مقابلے پر ناچے گی۔ نرتکی کہیں کی۔''

چند لڑکیاں وسنتی کو اُٹھا کر لے گئیں۔ مہاراج نے اُس کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی طوفانِ بدتمیزی اُبھر آیا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں، میں نے ایک خاص بات شدت سے محسوس کی۔ مہاراج کو ان عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف ان کے درمیان خود کو نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف رہے تھے۔

رات گزرتی رہی۔ وہاں کے مناظر کو تعجب خیز ضرور تھے، لیکن دلچسپ بھی تھے۔ چنانچہ اُکتاہٹ نہ طاری ہوئی۔ اور پھر شاید مہاراج تھک گئے۔

''بس سندریو!...... اب تم جاؤ۔ ہم سوئیں گے۔'' انہوں نے کہا اور لڑکیاں ایک ایک کر کے باہر نکل گئیں۔ مہاراج نے لباس بدلا اور پھر وہ سونے کے لئے ایک خوب صورت بستر کی طرف بڑھ گئے۔

اس دوران میں اپنے ذہن میں کچھ فیصلے کر چکا تھا۔

جب مہاراج بستر پر لیٹ گئے تو میں خاموشی سے خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھا اور میں نے دروازہ بند کر دیا۔ مہاراج کو آہٹ نہیں سنائی دی تھی۔ بہر حال میں ان کے بستر کے نزدیک پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

اور پھر میں نے بڑی ڈراؤنی آواز بنا کر اُس پکارا۔ ''گوونداس...!''

اور مہاراج کی حالت میری توقع کے مطابق ہی ہوئی۔ وہ بری طرح بستر سے اُچھل پڑے تھے۔

''کک...... کون ہے؟...... کون ہے؟'' وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولے۔ اُن کی گردن چاروں طرف گھوم رہی تھی۔

''تُو مجھے نہیں دیکھ سکے گا، گووندا!...... مگر میرے ہاتھ آسانی سے تیری گردن داب سکتے ہیں۔'' میں نے بدستور خوفناک آواز میں کہا۔

''ارے ارے...... مری گیو...... ہائے دیا...... دھنی...... دھنی رام......!'' مہاراج بھنچی بھنچی آواز میں چیخے۔

"اس سے کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا، گووندا!...... ہم نے سب کے کان بند کر دیئے ہیں۔ اور سن! اگر تُو نے چیخنے کی کوشش کی تو ہم تیری گردن دبا دیں گے۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھائے اور گووند اس کپور کی گردن پکڑ لی۔

گووند اس کپور کا منہ بند ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں دہشت زدہ انداز میں پھیلی ہوئی تھیں۔

"پرنت...... ہم تجھے نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں۔ ہم تو تیری مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

"کک...... کون ہو مہاراج...... بھگوان کے لئے، میری گردن چھوڑ دو...... ہائے، میں مر جاؤں گی...... ہائے میں مر جاؤں گا۔"

اور میں نے اُس کی گردن چھوڑ دی۔ گووند اس کپور جلدی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس کی روح قبض ہوئی جا رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔

"تُو نے سن لیا گووندا!...... ہم تیری سہائتا کرنے آئے ہیں۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

"مگر...... تم...... تم کون ہو مہاراج؟"

"پاتال کے اندھیروں سے آئے ہیں۔ کوئی آنکھ ہمیں دیکھ نہیں سکتی۔"

"ہے بھگوان...... ہے بھگوان...... میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"کہہ چکے ہیں، کہ تیری سہائتا کرنے۔"

"مم...... مگر...... مم...... میں تو ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بڑا بھولا ہے پگلے!...... بڑا ہی سیدھا ہے۔ تُو کہتا ہے کہ تُو ٹھیک ہے۔ حالانکہ تُو چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ تیرے بیری، تیری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اوئی، میں مر جاؤں...... میرے بیری......؟" مہاراج لچک کر بولے۔

"ہاں، تیرے بیری۔ جنہوں نے تیرا یہ حال کیا ہے۔ اور ابھی نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

"مم...... مہاراج!...... مہاراج! بھگوان کے لئے مجھے بچا لو...... مجھے بچا لو مہاراج!...... میں مرنا نہیں چاہتی...... مم...... میں مرنا نہیں چاہتا۔" گووند اس کپور جلدی سے بولا۔ اُس کا سینہ خوف سے پھول پچک رہا تھا۔

"ہم اسی لئے آئے ہیں گووندا! کیا تُو ہمارے اوپر وشواش کرے گا؟"

"ضرور کروں گا مہاراج!...... ضرور کروں گا۔"

"وچن دے...... جو کچھ ہم تجھ سے پوچھیں گے، سچ سچ بتائے گا۔"

"بتاؤں گی مہاراج!"

"ہوں...... تُو چنتا نہ کر...... آرام سے بیٹھ جا۔ تجھے نیند تو نہیں آ رہی؟"

"ن...... نہیں۔"

"گووندے!...... پہلے ہم تجھے یہ بتا دیں کہ تیرے بیری کیا چاہتے ہیں۔"

"بتائیں مہاراج!...... مگر آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

"بھدر نامکنڈ...... عرف پاتال بھیرویں۔" اور گووند اس کپور احمقوں کے سے انداز میں گردن ہلانے لگا۔ چند سیکنڈ خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تو گووندے! تیرے بیری تجھے جان سے مار کر تیری

راج گدی چھیننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔"

"اوئی...... میں مر گئی۔" گوونداس کپور اُچھل پڑا۔ مجھے اُس گدھے کی حرکتوں پر ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن بہرحال میں خود کو روکے ہوئے تھا۔

"ہاں گووندے! تجھے میری بات پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ تُو جانتا ہے، تیرے بیری کون ہیں؟"

"نہیں مہاراج! میں کسی کو نہیں جانتی۔" گووند اس کپور نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"خیر...... میں تجھے یہ بھی بتا دوں گا۔ پہلے تُو مجھے کچھ باتیں بتا۔"

"پوچھیں مہاراج!"

"تُو عورت ہے یا مرد؟" میں نے سوال کیا۔

"ایں......؟" گووند اس کپور اس بات پر حیران رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کافی اُلجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اور پھر میں نے اُس کے چہرے پر اُداسی دیکھی۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"پہلے مرد ہی تھا مہاراج! مگر اب...... اب......"

"کیوں...... اب کیا ہوا؟"

"اب میں نہ مرد ہوں، نہ عورت۔" اُس نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا اور گووند اس کپور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ہائے، اب تو میں نہ عورت ہوں نہ مرد...... میرا جیون نشٹ ہو گیا۔ ہائے......" وہ بری طرح بین کرنے لگا اور میں گھبرا گیا۔ میں نے جلدی سے اُس کا منہ بھینچ لیا۔ باہر بھی آواز جا سکتی تھی۔

میرے نادیدہ ہاتھوں کے لمس سے اُس کی آواز رُک گئی۔ بہرحال وہ خوف زدہ بھی تھا۔

"رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا گووند اس کپور!...... پہلے مجھے ساری باتیں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں مہاراج؟"

"تمہاری یہ حالت کب سے ہوئی؟"

"سے یاد نہیں ہے مہاراج!...... بس کافی دن سے...... میرے من میں خیال اُٹھتا ہے کہ میں...... مرد نہیں ہوں...... اور...... اور ساری رانیاں بھی یہی کہتی ہیں۔ میرا من چاہتا ہے کہ میں عورتوں کے کپڑے پہنوں، عورتوں کی طرح باتیں کروں، عورتوں کی طرح رہوں۔ بس مہاراج! یہی حالت ہے۔ سارے کام عورتوں کی طرح کرنے کو من چاہتا ہے۔"

"ہوں...... کیا یہ خود بخود ہو گیا گووند اس؟"

"میں نہیں جانتی...... جانتا مہاراج!"

"یہ تمہارے بیروں کا کام ہے۔"

"اُوئی، میں مر گئی...... ہائے میں مر گیا...... کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟"

"تلکا کو جانتے ہو؟"

"تلکا مہاراج...... وہ تو بڑے گیانی ہیں۔"

"تمہارا منتری ہرچرن لال بے حد چالاک انسان ہے۔ وہ اور بڑا پجاری پورن لال مل کر تم سے

تمہاری راج گدی چھیننا چاہتے تھے۔ پورن لال کو تو میں نے ٹھیک کر دیا ہے...... مگر...... ابھی ہر چرن لال باقی ہے۔"

"ہیں..... اُس کمینے کی یہ مجال...... ارے اُس پاپی نے میرا برا چاہا ہے۔" گووند اس کپور پھر رونے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے جلدی سے اُس کا منہ بھینچ لیا۔

"رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے مہاراج! کوئی اپائے کریں۔ یہ لوگ آپ سے راجدھانی چھین لیں گے۔"

"ارے، میں کیا کروں؟...... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا...... ہائے رام...... ہائے رام۔"

گووند اس کپور عورتوں ہی کی طرح کراہنے لگا۔

"میں کہہ چکا ہوں، چنتا نہ کرو مہاراج! سوچ سمجھ کر سارے کام کرنا ہیں۔ بس تم یوں کرو...... جیسا میں کہوں، کرتے جاؤ۔ بولو، اس کے لئے تیار ہو؟"

"تیار ہوں...... بھگوان کی سوگند بالکل تیار ہوں۔"

"ہوں......" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ ویسے میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ دلچسپ مہرہ ہاتھ آیا ہے۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی مثال تھی۔ مہاراج بہادر کی بہادری کی جتنی داستانیں سنی تھیں، سب کی سب بکواس ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ تو چیز ہی عجیب تھے۔ لیکن آخر قصہ کیا تھا؟...... کیا مہاراج بہادر ہمیشہ سے ایسے تھے؟ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں سوال کر ڈالا۔

"آپ کی یہ حالت کب سے ہے مہاراج؟"

"مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے۔ مگر اس وقت سے میں نے دربار چھوڑ دیا ہے۔"

"ہوں...... کیا آپ کو ہر چرن لال پر پورا اعتبار ہے؟"

"پہلے تھا۔ اب نہیں ہے۔"

"ہر چرن لال اور پورن لال آپ کے لئے عورتیں لاتے تھے؟"

"ہاں...... عام طور سے ملیچھ لڑکیاں...... بڑی کٹھور ہوتی تھیں۔ اب تو بہت عرصے سے کسی ملیچھ لڑکی کو نہیں دیکھا۔ مگر ان کی زبان بڑی کالی ہوتی ہے۔" مہاراج بدستور لچک لچک کر بولے۔

"کیا مطلب؟"

"پورن لال کہیں سے ایک ملیچھ لڑکی کو پکڑ لایا تھا۔ بڑی چنڈال تھی۔ بڑی کوشش کی میں نے، مگر ہاتھ نہ رکھنے دیا اس نے۔ آخر میں کھڑکی سے کود کر جان دے دی۔ کہنے لگی، تُو اس قابل ہی نہ رہے کہ کسی لڑکی کو پریشان کرے۔ بس اسی دن سے......"

"اوہ....." میں نے ہونٹ بھینچ لئے۔ یہ تو تیرے ساتھ بہتر ہی ہوا کتے!..... میں نے دل میں سوچا۔ لیکن بہرحال مجھے اس سے کام لینا تھا اور اس وقت ایک عمدہ چیز ہاتھ آ گئی تھی۔ خود کو پُرسکون کرنے کے بعد میں نے اُس سے کہا۔ "ہاں...... ویسے تمہاری تو بہت سی رانیاں ہیں۔"

"ہوں گی...... مجھے اب ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"خواہ وہ دوسروں کو تکتی پھریں؟"

"نرکھ میں جائیں نرکھنیں۔ مجھے کیا۔" مہاراج اُنگلیاں چٹخاتے ہوئے بولے۔

"ان لڑکیوں کے ساتھ آپ کیا کرتے ہیں مہاراج! جنہیں آپ نے اپنے گرد جمع کر رکھا ہے؟"
میں نے پوچھا اور مہاراج سوچ میں ڈوب گئے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔
"کچھ بھی نہیں۔ بس اُن کے ساتھ رہ کر مجھے شانتی ملتی ہے۔ میں سوچتی ہوں...... ہائے، سوچتا ہوں......بس نہ جانے کیا سوچتا ہوں۔" مہاراج گووندااس کپور اُلجھے ہوئے انداز میں بولے۔
میں پُر خیال انداز میں اس عجوبے کو دیکھتا رہا۔ بہت سی باتیں ذہن میں آ رہی تھیں، لیکن بہت سے سوالات تشنہ تھے۔ تب اچانک وہ بول پڑا۔
"مگر آپ کی کوئی شکل تو ہوگی مہاراج؟"
"ہاں......کیوں نہیں۔" میں نے بے خیالی میں جواب دیا۔
"بھگوان کے لئے مجھے دکھا دو، پاتال کے اوتار!......میری سہائتا کرو۔" گووندااس کپور نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور میں نے کسی خیال کے تحت پوشیدہ رہنے کا پروگرام بدل دیا۔ چنانچہ میں نے خاموشی سے دوشالہ اُتار دیا اور اس پر ظاہر ہو گیا۔
گووندااس کپور نے میری شکل دیکھی اور دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ اور پھر اُس کی آنکھوں میں نمی اُبھر آئی۔ "ہائے......یہ کیا ہو گیا مہاراج!......یہ کیا ہو گیا؟"
"کیا ہوا گووندے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"پریم......بھگوان کی سوگند، پریم......مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے مہاراج!.....ہائے، میں مر جاؤں، کیسے سندر ہو۔ بالکل دیوتاؤں کی طرح۔" گووندااس کپور ایک ادا سے بولا۔
'لاحول ولاقوۃ' میں نے جھلا کر کہا لیکن بہرحال دل ہی دل میں۔ میں متحیر ضرور تھا۔ کیا درحقیقت اس کی جنس بدل گئی ہے؟ یا پھر ہرچرن لال اور پورن لال نے مل کر اس کا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔
"اب تو......اب تو تمہارے بنا جیون بِتانا مشکل ہوگا مہاراج!" گووندااس کپور اُٹھ کر میرے پاس پہنچ گیا۔
"ہوش میں آؤ گووندے! سادھو سنتوں سے مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"
"بھگوان کی سوگند! میرے پریم کو مذاق نہ سمجھو۔ میں رو رو کر مر جاؤں گی۔" گووندااس کپور نے کسی برہا کی ماری کے سے انداز میں کہا۔
"اگر تم خاموش نہ بیٹھے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
"ہائے......میں تمہیں جانے نہ دوں گی مہاراج!......مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔" گووندااس کپور نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور پھر وہ میرے بازو سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔
طبیعت پر جھلاہٹ بھی طاری تھی اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ لعنت ہے اس اُلّو کے پٹھے پر......خوامخواہ بور کر رہا ہے۔ لیکن بہرحال، اس عجوبے سے نمٹنا ہی تھا۔
میں بے بس کھڑا اُس کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر کے بعد اُس کی سسکیاں رُکیں اور وہ ناک سے شوں شوں کرنے لگا۔ بڑی مضحکہ خیز شکل ہو گئی تھی اس کی۔
"گووندااس کپور! میں چاہتا ہوں، تم خود کو بدلو۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرو۔ میں تمہاری

مدد کروں گا۔"

"ہاں...... میں تو اب کچھ نہیں کر سکتی۔" گووند اس کپور لچک کر بولا۔

"تمہیں کرنا پڑے گا گووند اس! ابھی عوام کو تمہاری اس کیفیت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ تمہیں ایک آدھ بار منظرِ عام پر ضرور آنا پڑے گا۔"

"تم کہتے ہو تو آ جاؤں گی۔" گووند اس کپور نے شرماتے ہوئے کہا۔ اور بہر حال میں نے اس کڑوی گولی کو بھی نگلنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"تم سچ مچ مجھ سے پریم کرتے ہو گووند اس کپور؟"

"ہاں...... بھگوان کی سوگند...... میں تو تمہارے پریم میں دیوانی ہو رہی ہوں۔"

"تو پھر......" میں نے صبر کرتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا اور درگا پور چھوڑ دوں گا۔"

"ہائے، میں مر جاؤں...... ایسا نہ کرنا، ناتھ!...... میں بے موت مر جاؤں گی۔ اب تو تمہارے بنا ایک ایک پل بیا کل گزرے گا۔ ایسا نہ کرنا مہاراج!" اُس نے مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی اور میں چالاکی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"تم جس طرح سے گزار رہے ہو، اسی طرح گزارتے رہو۔ میں تم سے وقتاً فوقتاً ملتا رہوں گا۔ جو کچھ تم سے کہوں، وہی کرتے رہنا۔ تاکہ میں تمہارے دشمنوں کا صفایا کر دوں۔ اس کے بعد......"

"اس کے بعد کیا؟" گووند اس کپور نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اس کے بعد میں تم سے پریم کروں گا۔" میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا اور گووند اس کپور کی آنکھوں میں خمار اُمڈ آیا۔

میں نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے دھکیل دیا اور پھر جلدی سے دوشالہ اوڑھ لیا اور اُس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

گووند اس کپور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ "چلے گئے...... ہائے چلے گئے...... موہے چھوڑ گئے سانوریا......!" وہ درد بھرے لہجے میں بولا اور میرا دل چاہا کہ جوتا اُتار کر اُس کے سر پر اتنے ماروں کہ شکل بدل جائے...... سانوریا کا پٹھا...... لاحول ولاقوۃ۔

میں باہر نکل آیا۔ بے تحاشا ہنسی بھی آ رہی تھی اور حیران بھی تھا۔ یہ ہے درگا پور کا مہاراج...... یہ ہے شیروں کا شیر گووند اس کپور۔ ممکن ہے کسی زمانے میں کچھ ہو۔ سازشوں کے چکر میں پھنس کر...... لیکن خود گووند اس کپور نے بھی تو ایک مسلمان لڑکی کی بددعا کے بارے میں بتایا تھا۔

بہر حال، کچھ بھی ہو۔ مجھے بہت سے کام کرنے تھے۔ طالوت کے بارے میں اب میرا دل سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے تیسری بار یہ حرکت کی تھی۔ حالانکہ اُسے علم تھا کہ اُس کے بغیر میں مصیبت میں پھنس جاتا ہوں۔ لیکن بہر حال...... اس بار میں پھنسنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُس کی فکر چھوڑ کر دیکھوں گا، میں کیا کر سکتا ہوں۔

ہاں، دل میں ہوک اُٹھتی تھی تو صرف اتنی سی کہ وہ تلکا کے پیچھے گیا تھا...... اور تلکا بہر حال ایک

خبیث روح ہے۔ کہیں طالوت اس بوڑھے سانپ سے دھوکا نہ کھا جائے۔ گو اس کے امکانات کم ہی تھے۔ نہ بھی ہوتے تو میں کیا بگاڑ سکتا تھا؟ دفعتہً میرے ذہن میں راسم کا خیال آیا اور میں چونک پڑا۔ کیوں نہ راسم سے ملاقات کی جائے۔ اگر وہ مل جائے تو طالوت کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک جگہ رک کر اُسے آواز دی۔ ''راسم......!'' لیکن پھر خود ہی شرمندہ ہونا پڑا۔ اب راسم میرا غلام تو تھا نہیں جو میری آواز پر بھی حاضر ہو جاتا۔ میں مایوس ہو گیا۔

رات میں نے یونہی ایک معمولی سی جگہ گزاری۔ دیومتی کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ کیا فائدہ اُس کے سر پر مسلط ہونے سے؟...... ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اگر مجھے دیومتی کے کمرے میں دیکھ بھی لیا جاتا تو پوچھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ جب مہاراج ہی اللہ کی امانت بن چکے تھے تو پھر پوچھنے والا کون ہوتا۔

بہر حال، رات کو دیر تک میں آسمان کو گھورتے ہوئے آئندہ پروگرام بنانے لگا۔ گووندا اس کپور ایک لحاظ سے میرے لئے عمدہ چیز تھا۔ اگر میں اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکا تو لطف آ جائے گا۔ کافی رات گئے میں سو سکا تھا۔ دوسرے دن اُٹھ کر دیومتی کے پاس چل پڑا۔ ناشتے کی ضرورت تو بہر حال تھی۔

دیومتی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ''رات کہاں رہ گئے تھے بھیا جی مہاراج؟'' اُس نے محبت سے کہا۔

''بس دیومتی! یونہی آوارہ گردی کو نکل گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''خاص طور سے مادھو پورہ۔''

''اوہ...... مسلمانوں سے ملنے؟''

''ہاں...... یونہی سمجھ لو۔''

''سنا ہے بڑی خراب حالت ہے بے چاروں کی۔'' دیومتی نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ہاں دیومتی!...... جانوروں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ تم بتاؤ دیومتی! کیا مذہب کا فرق اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسانوں کی زندگی کو جہنم بنا دو۔''

''ہرگز نہیں بھیا!...... سارے انسان ایک جیسے ہیں۔ سب بھگوان کو مانتے ہیں۔ صرف بھگوان کی شکلیں مختلف سمجھنے کی وجہ سے اتنی بڑی دشمنی اچھی تو نہیں ہوتی۔'' دیومتی نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو دیومتی!...... وہ بے چارے بہت سخت زندگی گزار رہے ہیں۔''

''کاش اُن کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

''دیومتی! اگر مہاراج ہوتے اور تم اس ریاست کی اکیلی رانی ہوتیں تو تم ان مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتیں؟''

''انہیں برابر کا درجہ دیتی۔ انہیں ان کے مذہب کی پوری پوری آزادی دیتی۔'' دیومتی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

''لوگوں کے کہنے سننے سے تم تعصب کا شکار نہ ہوتیں؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اچھا......اگر اب ایسا ہو جائے؟''

''میں ان کے ساتھ ہونے والی ساری نا انصافیوں کی تلافی کروں گی۔'' دیومتی نے کہا اور پھر پھیکے انداز میں مسکرا دی۔ ''مگر اس کا کیا سوال ہے بھیا؟''

''ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا تھا۔ ویسے دیومتی! اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''کہاں بھیا؟''

''جوالا پور۔''

''جوالا پور......کیوں؟''

''کچھ کام کرنے ہیں۔''

''کیا بھیا؟''

''یہ ابھی نہ بتا سکوں گا۔''

''کیا کام کرو گے بھیا!......مجھ ابھاگن کے لئے تو کچھ نہیں کر رہے؟''

''ابھی تو میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر رہا دیومتی!'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ہاں......میرے پتا سے ملو گے؟'' دیومتی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ضرور ملوں گا۔''

''میرے بارے میں کچھ مت بتانا بھیا!......میری طرف سے کہہ دینا، میں بہت خوش ہوں۔ جو ہوا، وہ تو ہوا۔ اب اُنہیں دکھی کرنے سے کیا فائدہ؟''

''تم بے فکر رہو دیومتی!''

''کب جا رہے ہو؟'' دیومتی کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔

''شاید آج ہی چلا جاؤں۔''

''ہوں۔'' دیومتی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''ست پرکاش کو بھی تلاش کروں گا۔'' میں نے کہا اور دیومتی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر بولی۔

''اس سے مل کر کیا کرو گے بھیا؟''

''جو کچھ کروں گا، وہ میرا کام ہوگا۔ تم بس تماشا دیکھتی رہو۔'' میں نے کہا اور دیومتی عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر چونک کر بولی۔ ''تم نے صبح کا بھوجن تو نہیں کیا ہوگا؟''

''بالکل نہیں۔''

''میں منگواتی ہوں۔'' وہ اُٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ناشتہ کر رہے تھے۔ دیومتی اب مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ ہم نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اس دوران دونوں خاموش رہے تھے۔ پھر ناشتہ ختم ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک میں دیومتی کے پاس رہا، اور پھر میں نے اس سے اجازت مانگی۔ ''اب میں چلتا ہوں دیومتی! ممکن ہے کافی دنوں تک تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ بہر حال، میرا انتظار کرنا۔ میں آؤں گا

ضرور۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ بھگوان تمہیں ہر بلا سے بچائے۔" دیومتی کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا اور پھر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب میرے ذہن کی نئی گرہیں کھل رہی تھیں۔ کارکردگی کا یہ جذبہ بھی ایک قسم کی جھنجلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ بہرحال، یہاں میری شخصیت بہت مضبوط تھی۔ اس سے قبل تو میں ایک مفرور ملزم تھا اور پولیس سے چھپا چھپا پھر رہا تھا۔ وہاں بھی میں نے زندگی بچانے کے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ وہ تو طالوت کے ساتھ رہ کر عادات بگڑ گئی تھیں، ورنہ عارف بذاتِ خود بھی تو کچھ تھا۔ سو اب مجھے پھر اسی عارف کو آواز دینا تھی۔

محل سے باہر دوشالہ اوڑھ کر ہی نکلا۔ طالوت کی یہ سوغات میرے لئے بے حد قیمتی تھی۔ اس دوشالے کے سہارے سے بھی میں بہت بڑے اقدامات کر سکتا تھا۔

بہرحال میں چلتا رہا۔ جوالا پور جانے کے لئے سواری کے بارے میں معلومات کرنا تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے مقامی سکوں کی بھی ضرورت تھی۔ اب طالوت تو تھا نہیں کہ ہر کام خود بخود ہوتا رہے۔ خود ہی سب کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے کرنسی کی ضرورت پوری کرنے کے بارے میں سوچا اور اس کے لئے کسی مقامی شخص ہی کو تلاش کرنا تھا۔

بازار سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جوہری کی دکان تاڑی۔ موٹی توند والے لالہ جی گدی پر بیٹھے ہوئے نوٹ گن رہے تھے۔ ان کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا۔ بہرحال، یہ پیشکش میرے لئے ہی تھی۔ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ لالہ جی مجھے دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے ان کے سامنے رکھی ہوئی نوٹوں کی دو گڈیاں اٹھالیں اور لالہ جی اُچھل پڑے۔

"ہے، ہے..... ہے، ہے..... ارے..... کا بھیو..... ہے، ہے....." وہ گڈیوں کی طرف لپکے۔ بہرحال اُنہیں گڈیاں تو نظر آرہی تھیں۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور لالہ جی سامنے رکھے ہوئے ڈیسک پر ڈھیر ہو گئے۔

"ہرے..... ہرے..... گھنشو..... گھنشو....." وہ اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چلائے۔ لیکن دھوتی پاؤں میں اُلجھ گئی اور وہ پھر ڈھیر ہو گئے۔

"ہے لالہ جی!" ایک دُبلے پتلے ملازم نے قریب آکر کہا۔

"ابے پکڑ..... جلدی پکڑ..... اُڑ گئیں..... ہے رام، اُڑ گئیں..... ابے پکڑ۔" لالہ جی پھر چلائے اور ملازم نے جلدی سے لالہ جی کو پکڑ لیا۔ "ابے پکڑ..... بھاگ کر پکڑ..... ہائے، مر گیو۔"

ملازم حیران و پریشان لالہ جی کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ گڈیوں کی طرف اُس کی نگاہ بھی نہیں گئی تھی۔ بہرحال رش جمع ہونے سے پہلے میں دکان سے نکل آیا۔ گڈیاں میں نے اپنے لباس میں پوشیدہ کر لی تھیں۔

پھر میں دکان سے دُور ہو گیا۔ لالہ جی کی واویلا کی آوازیں دُور تک آرہی تھیں۔ اور میری توقع کے مطابق وہاں مجمع لگ رہا تھا۔ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ کافی دُور جا کر میں نے سر سے دوشالہ اُتار دیا۔ حلیہ بدستور سادھوؤں کا تھا، اس لئے پروا کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں اطمینان سے آگے بڑھتا رہا۔ ایک سنسان سی جگہ جا کر میں نے نوٹوں کی ایک گڈی کھولی اور کچھ نوٹ نکال کر پھر گڈیاں چھپالیں۔

اس کے بعد میں نے بازار سے ایک کمبل، ایک کمنڈل اور ایک موٹا بید خریدا۔ اور اب میں اپنے کام سے فارغ تھا۔ میں نے ایک نوجوان ہندو کو روک کر پوچھا۔

''جوالا پور کے لئے کیا سواری ملتی ہے بچہ؟''

''لاری مہاراج۔''

''کہاں سے ملتی ہے؟''

''یکے میں بیٹھ کر اڈے پر چلے جاؤ۔ وہاں مل جائے گی۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ غرض میں جوالا پور جانے والی لاری میں بیٹھ گیا اور لاری چل پڑی۔

بہت سے دوسرے مسافر بھی تھے۔ ان میں سے کسی کے مسلمان ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کو انسانی حقوق دینے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ میری بہت عزت کی جارہی تھی۔ لیکن میں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ رہ رہ کر ذہن میں طالوت کا خیال آجاتا تھا۔

اس کے بارے میں بس ایک ہی تشویش تھی۔ نہ جانے تلکا کے ساتھ اُس کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلا۔ باقی رہا اُس کا میرے پاس آنے کا سوال، تو یہ تو اُس کی مرضی تھی۔ میں جانتا تھا، اُسے مجھے تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ میں کہیں بھی ہوں گا، وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔

بہر حال، اب تو اس کے بارے میں کچھ سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں جوالا پور کے پروگرام کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں آئندہ کا لائحہ عمل بنانے لگا اور وقت گزرتا رہا۔

جوالا پور کا سفر طویل نہیں تھا۔ یہ ریاست بھی چھوٹی سی تھی۔ چنانچہ ایک گھنٹے کے بعد لاری جوالا پور پہنچ گئی۔ درگا پور کی بہ نسبت یہ جگہ بہت چھوٹی تھی۔ معمولی سے مکانات تھے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین بازار تھے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی اڈے پر اُتر گیا۔ تب میرے ساتھ لاری میں سفر کرنے والا ایک ہندو میری طرف بڑھا۔

''جے رام جی کی مہاراج!'' اس نے کہا اور میں نے اس کی جانب دیکھا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ ہی درگا پور سے لاری میں سوار ہوا تھا۔''

''ہوں...... کیا بات ہے بچہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں آپ کا استھان کہاں ہوگا؟''

''سادھو کا استھان کہیں نہیں ہوتا بچہ! کیا یہاں کوئی دھرم شالہ نہیں ہے؟''

''ہے مہاراج!...... پرنت دھرم شالہ میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟ داس کا گھر موجود ہے۔''

''نہ، نہ...... ہم کسی کو کشٹ دینا پسند نہیں کرتے بچہ!''

''آپ کی سیوا کرنے میں کشٹ نہیں ہوگا مہاراج!...... میں بھی برہمن ہوں۔ رام نرائن نام ہے میرا۔ اگر آپ میرے ہاں پدھاریں تو میرے بڑے بھاگ۔''

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ یہاں مجھے کام کرنا تھا۔ بہر حال یہ جگہ میرے لئے اجنبی تھی۔ چنانچہ اگر تھوڑی دیر یہاں رک کر رام نرائن سے معلومات ہی حاصل کی جائیں تو کیا حرج ہے۔

''جیسی تیری مرضی بالک۔'' میں نے اس بوڑھے بچے سے کہا اور وہ خوش ہوگیا۔ اس کا مکان کو بستی کے دوسرے مکانوں کی طرح سیدھا سادا تھا لیکن کافی وسیع تھا۔ ڈیوڑھی میں میرے لئے بندوبست

کر دیا گیا۔ ایک عمدہ چارپائی ڈال دی گئی، جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ اور پھر دوپہر کا کھانا برہمن نے میرے ساتھ کھایا۔

''بڑی کرپا ہے مہاراج کی۔ آپ کے مکھ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مہان ہیں۔'' رام نرائن نے کہا۔

''کیا کام کرتے ہو رام نرائن؟'' میں نے پوچھا۔

''کپڑے کا کاروبار تھا مہاراج!...... اب تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا۔'' رام نرائن نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟''

''بس مہاراج! بھگوان کی لیلا ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا، باپ کی کمر کی ہڈی ہوتا ہے۔ جب یہ ٹوٹ جائے تو انسان سیدھا کیسے رہ سکتا ہے؟''

''تو کیا؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''نہیں مہاراج!...... نہیں۔ بھگوان اُس کے جیون کی رکھشا کرے۔ بس من کو روگ لگا بیٹھا ہے پاپی۔ پڑھا لکھا ہے، دماغ والا ہے، مگر من کے روگ نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔''

''ہم سمجھے نہیں رام نرائن؟''

''مہاراج! اُس کا جیون کالا ہو گیا ہے۔ دوش اُس کا بھی نہیں ہے۔ کسی کے من کا میت چھن جائے، کسی کے بچپن کا پریم لٹ جائے تو اُس کی حالت خراب ہونی ہی چاہئے۔''

اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''کیا نام ہے تیرے بالک کا؟''

''ست پرکاش مہاراج!''

''اوہ......'' میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ حیرت بھی تھی اور خوشی بھی ہوئی تھی۔ تو یہ ست پرکاش کا مکان تھا۔ کتنی آسانی سے میں یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ میں گردن جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا رام نرائن بھی خاموش تھا۔ پھر کئی منٹ کے بعد اس نے کہا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے مہاراج؟''

''ست پرکاش کے بھاگ پر غور کر رہے ہیں، رام نرائن! نردوئی نے من بھی لگایا تو ایسی جگہ، جہاں پہلے ہی سانپ بیٹھے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کیا جانو؟...... تم تو...... تم تو باہر سے آئے ہو۔'' رام نرائن چونک کر بولا۔

''سنسار کی بہت سی باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں رام نرائن! اس جھگڑے میں مت پڑو۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''نہیں مہاراج!...... بھگوان کے لئے مجھے بتائیں۔'' رام نرائن پیچھے پڑ گیا۔

''کیا بتائیں رام نرائن؟''

''یہی کہ...... یہی کہ......'' رام نرائن ہچکچایا۔

''سیدھی بات کرو رام نرائن! ہمارے گیان کا امتحان چاہتے ہو تو سنو! تم دیومتی کی بات کر رہے ہو نا، جس سے تمہارا بیٹا پریم کرتا تھا اور جسے گووندا اس کپور بیاہ کر لے گیا۔''

میرے الفاظ نے رام نرائن پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری شکل دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔

''بعض دفعہ انسان کے روپ میں اوتار بھی مل جاتے ہیں مہاراج! مجھ ابھاگی کے بھاگ میں ایسے اوتار کہاں تھے؟ پرنت بھگوان کے گھر سے مایوسی نہیں ہوتی۔ میرا من کہہ رہا ہے، میرے بھاگ جاگنے والے ہیں۔ میرے بھاگ جگا دو مہاراج!...... میرے بھاگ جگا دو۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، اُس پر اوس پڑ گئی ہے مہاراج!...... وہ دنیا کو بھول گیا ہے۔ میں آدھا مر گیا ہوں مہاراج!...... میرے بھاگ جگا دو۔'' رام نرائن میرے پاؤں جھنجوڑ جھنجوڑ کر رونے لگا۔

تب میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ''اٹھو رام نرائن!...... یہ شکتی بھگوان نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ میں کوشش کروں گا۔ تمہارے بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اُٹھو...... اُٹھ جاؤ۔''

اور رام نرائن روتا ہوا اُٹھ گیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں رام نرائن! ست پرکاش ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ہے کہاں؟''

''شاید گھر ہی میں ہو۔ بس من موجی ہے۔ کبھی ہفتوں گھر میں نہیں گھستا کبھی مہینوں گھر سے نہیں نکلتا۔ من چاہا، کھا لیا۔ ورنہ بھوکا رہا۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ ہنستا ہے۔'' رام نرائن نے بتایا۔

''میں اُس سے ملوں گا رام نرائن جی!''

''کرپا ہے مہاراج کی۔'' رام نرائن ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

''ایک بات اور بتاؤ رام نرائن!''

''جی مہاراج؟''

''دیومتی کا باپ بدری پرشاد کہاں رہتا ہے؟''

''راجہ محلے میں۔''

''کتنی دُور ہے؟''

''زیادہ دُور نہیں ہے مہاراج!...... کیا آپ اُس سے ملیں گے؟''

''ہاں.... اُس سے بھی ملیں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ست پرکاش سے ملاقات کرنی ہے۔ معلوم کرو، وہ کہاں ہے؟''

''ابھی معلوم کرتا ہوں مہاراج!'' رام نرائن خوشی خوشی گھر کے اندر چلا گیا۔ میں اُس دلچسپ انسان پر غور کرتا رہا۔ چلو اچھا ہوا، یہاں داخل ہوتے ہی اس سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ اُسے تلاش کرنا پڑتا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد رام نرائن منہ لٹکائے واپس آیا۔ ''ست پرکاش تو ہے نہیں مہاراج!'' اُس نے اُداسی سے کہا۔

''پتہ بھی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے؟''

''صبح سے گیا ہوا ہے۔ پرنت میں اُسے تلاش کر لوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اُسے تلاش کرو۔'' میں نے کہا۔

''آپ آرام کریں مہاراج!''

''نہیں۔ جب تک میں بدری پرشاد سے مل لیتا ہوں۔ تم اُسے تلاش کر کے گھر لے آؤ۔''
''جو آ گیا۔'' رام نرائن نے کہا اور میں اُس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔''
''تم مجھے دُور سے بدری پرشاد کا مکان بتاتے جانا؟''
''بہت اچھا مہاراج!'' رام نرائن نے سعادت مندی سے کہا اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ دُور سے بدری پرشاد کا مکان دکھا کر وہ چلا گیا۔ میں مکان کی طرف بڑھ گیا۔ پیتل کی کیلوں جڑے چوبی دروازے پر میں نے دستک دی اور تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ بھاری بدن کی ایک خوب صورت اور عمر رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا تھا۔ اُس کا چہرہ دیومتی کے چہرے سے ملتا جلتا تھا۔
میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور عورت نے بھی مجھے دیکھ کر پرنام کیا۔ ''لالہ بدری پرشاد موجود ہیں دیوی؟''
''ہاں مہاراج!...... اندر آ جایئے۔'' عورت دروازے سے ہٹ گئی۔
چونکہ میں سادھو کے روپ میں تھا، اس لئے سب ہی میری عزت کر رہے تھے۔ میں اندر چلا گیا۔
عورت نے مجھے ایک بیٹھک میں بٹھا دیا۔
''آپ شاید بدری پرشاد کی استری ہیں دیوی؟''
''ہاں مہاراج! میں لالہ جی کو بلاتی ہوں۔'' وہ اندر چلی گئی اور چند منٹ کے بعد ایک پُروقار بوڑھے کے ساتھ واپس آ گئی۔ بوڑھے نے بھی مجھے پرنام کیا اور میں کھڑا ہو گیا۔
''پدھاریئے مہاراج!...... پدھاریئے۔ بھاگوان ہوں کہ آپ آئے۔ بتایئے، کیا سیوا کروں؟...... ارے پشپامتی!...... کچھ جل پانی۔''
''رہنے دیں لالہ جی!...... درگا پور سے آیا ہوں۔''
''اوہ...... اچھا!'' میاں بیوی کے چہرے پر محبت پھیل گئی۔ کیسا انوکھا پیار تھا۔ ممتا کی کیسی حسین شکل تھی ..اس جگہ کے نام سے بھی محبت تھی، جہاں بیٹی بیاہ کر گئی تھی۔
''اور آپ کی دیومتی کے پاس سے۔''
''اچھا......''
''اچھا......'' دونوں آوازوں میں اضطراب تھا۔
''ہاں۔ میں نے اُسے بہن اور اُس نے مجھے بھائی بنایا ہے۔''
''بڑی کرپا مہاراج۔ وہ کیسی ہے؟'' عورت نے پوچھا۔
''بالکل ٹھیک۔ آپ کو نمسکار کہا ہے۔''
''بھگوان سُکھی رکھے اُس کو۔ بھگوان سدا سہاگن رکھے اُس کو۔'' بدری پرشاد نے کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔
میں بغور ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ پشپا دیوی کی آنکھوں میں اضطراب نظر آ رہا تھا۔ عورت تھیں، ضبط نہ کر سکیں، پوچھ بیٹھیں۔ ''وہ وہاں خوش تو ہے؟...... اُسے کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''
''نہیں...... کوئی تکلیف نہیں ہے۔''
''بھگوان کی کرپا ہے۔''

''اس کے خوش نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔
''کوئی نہیں۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' بدری پرشاد جلدی سے بولے۔
''کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ وہ درگا پور کی رانی ہے؟''
میرے اس سوال پر دونوں کی گردنیں جھک گئیں۔ پھر بدری پرشاد ہی نے کہا۔ ''ہماری خوشی اسی میں ہے کہ وہ خوش رہے۔ جو کچھ اس کے بھاگ میں لکھا تھا، وہی ہوا۔''
''آپ نے بڑی اچھی جگہ بیاہا اُسے۔'' میں نے کہا۔
''ہم نے نہیں مہاراج! اُس کے بھاگ نے۔ ورنہ ہم ایسی اونچی اُڑان نہیں رکھتے۔''
''ہوں.....!'' میں نے گہری سانس لی۔ بہر حال یہ بھی دُکھی لوگ تھے۔ اُن پر طنز کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس موضوع پر کوئی مزید بات چیت نہیں کی۔ مقصد صرف ان لوگوں سے ملنا تھا۔ انہوں نے دودھ اور مٹھائی سے میری تواضع کی اور پھر میں ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ رام نرائن کے گھر جانے کے بجائے میں جوالا پور کی سڑکوں اور گلیوں کی سیر کرتا رہا۔ اور پھر شام کو رام نرائن کے گھر پہنچ گیا۔ رام نرائن گھر میں موجود تھا۔ میری اطلاع پاتے ہی ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔
''میں...... میں اُسے لے آیا ہوں مہاراج!''
''کہاں ہے؟''
''اندر لیٹا ہے، خاموش۔'' رام نرائن نے جواب دیا۔
''اُسے میرے پاس پہنچا دیں اور تنہا چھوڑ دیں۔''
''جو آ گیا مہاراج!'' رام نرائن نے کہا اور پھر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت اور دُبلا پتلا نوجوان اندر آ گیا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی نقش تھی۔ آنکھوں سے ذہین معلوم ہوتا تھا، لیکن ناکامی نے اُس کی شخصیت پر دھول ڈال دی تھی۔
''میرا بیٹا ہے مہاراج!...... ست پرکاش! ان سے مل۔ یہ بڑے مہان سادھو ہیں۔'' ست پرکاش نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُس کے چہرے پر بیزاری نظر آ رہی تھی۔
''بیٹھو ست پرکاش!'' میں نے بھاری آواز میں کہا اور وہ بیٹھ گیا۔ لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اُس کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔
''مہاراج سے باتیں کرو ست پرکاش! میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔'' رام نرائن نے کہا اور پھر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ست پرکاش کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لئے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی بات نہ تھی۔ بس خاموش، اپنی دُھن میں مگن!
''کیا سوچ رہے ہو ست پرکاش؟'' بالآخر میں نے اُسے مخاطب کیا اور وہ چونک پڑا۔ مجھے گھورتا رہا اور پھر اُس کے خشک ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
''میرا ابھی کسی پر ادھیکار ہے سادھو جی!'' اس نے بھاری لہجے میں کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں اچانک سوال پر چونک پڑا۔
''پتا جی نے اپنا حق استعمال کیا۔ مجھے آپ سے ملانے لے آئے۔ میں ان کی بات کیسے ٹال سکتا تھا؟...... حالانکہ آپ سے مل کر مجھے کیا ملے گا؟ لیکن پتا جی کو ادھیکار تھا کہ وہ مجھے یہاں لے آئیں۔

اور پھر وہ آپ کے لئے کہہ گئے کہ میں آپ سے باتیں کروں۔ سو اب آپ اپنا حق استعمال کر رہے ہیں۔ حالانکہ میرا من کسی سے باتیں کرنے کو نہیں چاہ رہا۔ مگر آپ کو ادھیکار ہے۔ میرا بھی کسی پر ادھیکار ہے؟''

''ہاں...... کیوں نہیں...... سنسار میں ہر منش کو دوسرے پر ادھیکار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جھوٹ مت بولو مہاراج! یوں کہو کہ سنسار میں کچھ انسانوں کا دوسرے انسانوں پر حق ہے۔ سب کا ایک دوسرے پر نہیں۔'' اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ بات نہیں ست پرکاش!...... کچھ انسان ڈرپوک ہوتے ہیں۔ بزدل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حق کا استعمال نہیں جانتے۔ دوش دوسروں کو دیتے ہیں۔''

''بکواس ہے۔ اس سنسار میں سب یکساں نہیں ہیں۔ سب طاقتور نہیں ہوتے۔ ایک کمزور ہوتا ہے، دوسرا طاقتور۔''

''میں نہیں مانتا۔ کمزور وہی ہے جو اپنا کام نہیں کر سکتا۔ اور دوسروں کو دوش دیتا رہتا ہے۔''

''مجھے غصہ مت دلاؤ مہاراج!...... دیکھو، مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ورنہ.....'' ست پرکاش مجھے گھورتا ہوا بولا۔

''آگے بول ست پرکاش!...... دیکھوں تو تُو کتنا بڑا سورما ہے۔''

''میں سورما نہیں ہوں مہاراج! میں...... میں تو...... میں تو......'' اُس کی آواز رُندھ گئی۔

''بزدل ہے پاپی کہیں کا۔ روتا ہے۔ مرد کی آنکھوں میں جب آنسو آنے لگیں تو اُسے چوڑیاں پہن لینی چاہئیں۔''

''میں بے بس ہوں مہاراج!''

''سمجھتا ہے خود کو بے بس۔ ہے نہیں۔'' میں نے کہا اور ست پرکاش پھر کھول گیا۔ اُس نے میری طرف خونی نگاہوں سے دیکھا اور پھر تلخ لہجے میں بولا۔

''تم سادھو نہیں ہو، بہروپیئے ہو۔ کسی کے من کو نہیں دیکھ سکتے۔ کسی کا درد نہیں جھانک سکتے۔ صرف دُکھ دے سکتے ہو دوسروں کو۔ میرا درد تو دیکھو...... بتاؤ، میرے دل پر کون سا داغ ہے؟''

''تیری بزدلی کا داغ...... اگر تُو بزدل نہ ہوتا تو اپنی پریمیکا کو یوں غیروں کے ہاتھوں میں نہ جانے دیتا۔'' میں نے کہا اور ست پرکاش چونک پڑا۔ مجھے دیکھتا رہا اور پھر اُس نے گردن جھکا کر کہا۔

''اوہ...... تو...... تو پتا جی نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔''

''پتا جی نے نہیں۔'' میں نے آہستہ آہستہ اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''بلکہ خود دیومتی نے۔''

اور میرے ان الفاظ پر ست پرکاش اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''دیومتی نے......؟'' اُس کے حلق سے سرسراتی آواز نکلی۔

''ہاں...... دیومتی نے۔'' میں نے اسی سکون سے جواب دیا۔

''تو کیا...... تو کیا آپ اُس سے ملے تھے مہاراج؟'' اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کب؟''

''میں کل جوالا پور آیا ہوں اور سیدھا اسی کے پاس سے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ست پرکاش بے قرار ہو کر میرے قدموں میں آ گرا۔

''مہاراج!......مہاراج!......آہ مہاراج! آپ اُس کے پاس سے آئے ہیں۔ کیسی ہے وہ؟...... کیا حال ہے اُس کا؟......کیا وہ خوش ہے؟......اُس نے میرے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟......اُس نے میرے لئے کوئی سندیس تو نہیں دیا؟'' ست پرکاش نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ اُس کی آنکھوں میں حسرت تڑپ رہی تھی۔ وہ سخت بے چین تھا۔

''بہت سے سندیس دیئے ہیں ست پرکاش! لیکن تم اتنی بے چینی سے کام نہ لو۔ میں تمہیں ساری باتیں ایک ایک کر کے بتاؤں گا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات یہ کہ دیومتی نے مجھے بھائی بنایا ہے۔''

''اوہ......آپ......اُس نے آپ کو بھائی بنایا ہے۔ آپ میرے بھی بھائی ہیں۔ پران مانگیں گے تو دے دوں گا۔''

''بھائی پران لیتے نہیں پگلے!......دے دیتے ہیں۔ میرے اوپر وشواس کرنا۔ جو کہوں گا، جو کروں گا، تمہارے اور دیومتی کے بھلے کے لئے کروں گا۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ میں بالکل صاف ہوں۔ نہیں...... تمہارے کام سے میرا بھی لالچ ہے۔ میں تم دونوں سے کچھ چاہتا ہوں۔ مگر میں تم سے وہ اس سمے مانگوں گا، جب پہلے تمہارا کام ہو جائے گا۔''

''مہاراج!......مہاراج! بھگوان کی سوگند، تم مجھ سے جو کچھ مانگو گے، دے دوں گا۔ مجھے میری دیومتی کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ مہاراج!......وہ ٹھیک ہے؟......وہ خوش ہے؟''

''تم خوش ہو؟'' میں نے اُس سے سوال کیا۔

''میں......میں......'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''وہ بھی تمہارے بنا خوش نہیں ہے۔''

''مہاراج......'' ست پرکاش تڑپ کر رہ گیا۔

''ہاں ست پرکاش! وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے؟ وہ بھی تم سے اتنا ہی پریم کرتی ہے، جتنا تم اس سے۔ بلکہ وہ عورت ہے۔ اُس کا پریم تم سے بھی زیادہ ہوگا۔''

''مہاراج! میں اس آگ میں بھسم ہو رہا ہوں۔''

''اس کی بھی یہی حالت ہوگی ست پرکاش! لیکن وہ عورت ہے۔ اور عورت زیادہ مجبور ہوتی ہے۔''

''ہم کر بھی کیا سکتے تھے مہاراج!......راجہ گووند اس کپور کی ہوس کے سامنے ہم بے بس پنچھی تھے۔''

''کیا تم اب بھی اُس کے خواہش مند ہو، ست پرکاش؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں مہاراج!......میرا اُس سے آتما کا رشتہ ہے۔ میں تو جنم جنم اُس کی آرزو کروں گا۔''

''ست پرکاش!......بعض اوقات حالات انسان کو اس طرح چکرا دیتے ہیں کہ کسی مشکل سے نکلنے کا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہتا۔ وہ اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن ان حالات میں تبدیلی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاں، انسان کو منزل پانے کے لئے سخت جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔''

''میری تو منزل ہی کھو گئی ہے مہاراج!'' ست پرکاش درد بھرے لہجے میں بولا۔

''بعض اوقات منزل صرف نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے اور ہم اسے کھویا ہوا سمجھ لیتے ہیں۔''

''میرے سامنے تو کوئی کرن نہیں ہے مہاراج!''

''یہ بتاؤ ست پرکاش! اپنے پریم میں اتنے پکے ہو کہ سخت جدوجہد کر سکو؟''

''اسی طرح مہاراج!...... جیسے سمندر میں ڈوبتا انسان جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔''

''تب میں تمہیں کچھ اہم باتیں بتاؤں گا، ست پرکاش!''

''بتائیے مہاراج!''

''میری باتوں پر یقین کرنا۔ تمہارے سامنے جھوٹ بولنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے مہاراج!''

''دیومتی آج بھی کنواری ہے۔''

''جی؟'' ست پرکاش حیرت سے بولا۔

''ہاں۔ عیاش راجہ، عرصۂ دراز سے ناکارہ ہے۔ وہ صرف عورتوں کے سنگ میں خوش رہتا ہے اور خود کو بھی عورت سمجھنے لگا ہے۔ اُس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔''

''ارے...... مگر یہ کیسے؟''

''راج محل میں بڑی سازش کام کر رہی ہے۔ منتری ہرچرن لال اور ایک سادھو پورن لال مل کر گوونداس کپور کو راج گدی سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ہرچرن لال خود راجہ بننا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس نے مہاراج گوونداس کپور کی یہ حالت کی ہے۔''

''اوہ......''

''راجہ درحقیقت اب اس قابل نہیں رہا کہ راج کرے۔''

''ایسی ہی بات ہوگی مہاراج!''

''چنانچہ اس وقت راج سنگھاسن ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہے، جو تھوڑی سی کوشش کرے۔''

''جی......'' ست پرکاش کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں ست پرکاش!''

''مگر کسی عام آدمی کی کیا مجال ہے مہاراج! کہ وہ راج گدی کی طرف دیکھے۔''

''میں عام آدمی کی بات نہیں کر رہا ست پرکاش!''

''پھر؟''

''میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔''

''میری؟'' ست پرکاش اُچھل پڑا۔

''ہاں، تمہاری۔'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور ست پرکاش کافی دیر تک احمقوں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔

''بات میری سمجھ میں نہیں آئی مہاراج!...... کہاں میں اور کہاں راج گدی۔''

''یہ ممکن ہے ست پرکاش!''

''مگر کیسے مہاراج؟''

''میں تمہاری سہائتا کروں گا۔ بشرطیکہ تم ہمت کرو۔''
''میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا مہاراج! منتری ہر چرن لال کے جیون میں یہ کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ہمارے پیچھے تو کوئی شکتی بھی نہیں ہے۔ اگر راج گدی کے حاصل کرنے کی بات ہو تو کون کوشش نہیں کرے گا؟''
''تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ خود مہاراج گوونداس کپور کی کوئی سنتان نہیں ہے۔''
''نہیں۔''
''مگر...... اگر مہاراج اپنے جیون میں ہی کسی کو چاہیں تو گدی دے سکتے ہیں؟''
''ہاں مہاراج!...... دے سکتے ہیں۔''
''بس، تو پھر کام بن جائے گا۔ مہاراج کو تیار کرنا میرا کام ہے۔''
''مگر... مگر...... میں..... میں تو اس قابل نہیں ہوں۔'' ست پرکاش گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔
''اگر نہیں ہو ست پرکاش! تو بننے کی کوشش کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور پھر جب راج گدی مل جائے گی تو راج نیتی خود بخود آ جائے گی۔''
''میں پاگل ہو جاؤں گا مہاراج!...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟...... یہ کیسے ممکن ہے؟''
''میں اسے ممکن بنانے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں ست پرکاش! اور مجھے کم ہمت لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''
''بات بہت بڑی ہے مہاراج! ورنہ میں اتنا کم ہمت نہیں ہوں۔''
''بات صرف بڑی نظر آتی ہے...... ہوتی نہیں۔ ہاں، ہمت اور کم ہمتی کی بات ہے۔''
''میں کم ہمت نہیں ہوں۔''
''تو ہمت کرو۔''
''مگر میں کر کیا سکتا ہوں؟''
''میں تمہاری سہائتا کروں گا۔''
''تب پھر...... تب پھر مہاراج! لائیے اپنا ہاتھ۔ میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں، بزدلی نہیں کروں گا۔ جو آپ کہیں گے، کروں گا۔ آنکھیں بند کر کے کروں گا۔ مجھے راج گدی نہیں چاہئے مہاراج! مجھے...... مجھے صرف میری دیومتی مل جائے۔''
''اوش مل جائے گی، ست پرکاش! بس ذرا ہمت سے کام لینا ہو گا۔ تیاریاں کر لو۔ کل ہم یہاں سے واپس درگا پور پلٹیں گے۔''
''جو آگیا مہاراج!'' ست پرکاش نے کہا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔
دوسرے دن جب روانگی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ست پرکاش نے رام نرائن سے آگیا لی۔
''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے میرے پوت!...... مہاراج بڑے گیانی ہیں۔ جو کریں گے، اچھا ہی کریں گے۔ مگر تم جا کہاں رہے ہو؟''
''مہاراج کے ساتھ۔ جہاں وہ لے جائیں گے۔''
''مہاراج!'' رام نرائن روتے ہوئے بولا۔ ''ست پرکاش میرا اکیلا ہی بیٹا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو

میں بن موت مر جاؤں گا۔"

"بھگوان پر وشواش رکھو، رام نرائن!...... جو کچھ ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔" اور پھر رام نرائن کی آشیرواد کے بعد ہم چل پڑے۔ لاری اڈے آئے اور ایک لاری ہمیں لے کر درگا پور دوڑنے لگی۔

راستے بھر خاموشی رہی تھی۔ ست پرکاش کا ہیجان اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں وہ اور کہاں درگا پور کی حکومت۔ کیسے ممکن ہے؟......اور جب بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ میری شکل دیکھنے لگتا۔ دوسری طرف میں بھی غور وفکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس سے قبل میں نے اپنے طور پر کوئی اتنا بڑا پلان نہیں پھیلایا تھا۔ لیکن طالوت کی گمشدگی سے کچھ جھلاہٹ بھی طاری ہوگئی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکوں۔

اور پھر راجہ گووندا س کپور کو دیکھ کر یہ خیال ذہن میں جڑ پکڑ گیا تھا کہ درگا پور کی حکومت اس وقت لوٹ کا مال ہے۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر اسے لوٹ لے۔ بس ہرچرن لال تھا۔ تو میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کے اس دشمن کو اگر قتل بھی کرنا پڑا تو میں قتل کر دوں گا۔ یوں بھی بہت سی باتیں یکجا ہوگئی تھیں، جن کی وجہ سے میں جان کی بازی لگا کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔

بالآخر ہم درگا پور پہنچ گئے اور لاری سے نیچے اُتر آئے۔
ست پرکاش کا چہرہ بدستور فکرمند تھا۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے ست
کاش! تم ابھی تک پریشان ہو؟''
''پریشان نہیں ہوں مہاراج! بس سوچ رہا ہوں۔''
''ساری سوچ دماغ سے نکال دو۔ شانت ہو جاؤ۔ بھگوان پر وشواش کرو۔ جو ہوگا، اچھا ہوگا۔''
''ہم اب کہاں چل رہے ہیں مہاراج؟''
''راج محل۔''
''اوہ...... مگر ہم وہاں کیسے داخل ہوں گے؟''
''آرام سے۔ بس تمہیں اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑے گی۔''
''مجھے کیا کرنا ہوگا مہاراج؟''
''سادھوؤں کا بھیس بدلنا ہوگا۔''
''اوہ......'' ست پرکاش گردن ہلا کر رہ گیا۔ لالہ جی کی عطا کی ہوئی رقم موجود تھی۔ اور پھر درگا پور
کے بازاروں وغیرہ سے بھی کافی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ چنانچہ ست پرکاش کو سادھو بنانے میں کوئی دقت
یں ہوئی۔ دُبلا پتلا یہ سادھو بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔
تب میں اُسے لے کر راج محل چل پڑا۔ راج محل میں داخلے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔
ارے لوگ مجھے جان گئے تھے۔ البتہ ست پرکاش کو کسی قدر حیرت سے دیکھا گیا تھا۔ بہرحال اُسے
وکنے والا کون تھا؟...... میں اُسے لے کر راج مندر میں پہنچ گیا۔ میں یہاں زبردستی کا مہمان تو تھا ہی۔
وئی پنڈا وغیرہ مجھ سے مخاطب نہیں ہوا۔ پورن لال کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا وہی حال ہے۔ وہ
ستور انڈوں پر بیٹھا تھا۔ اور غمزدہ تھا کہ ابھی تک ان انڈوں سے بچے نہیں نکلے ہیں۔
شام تک ہم راج مندر میں رہے۔ وہیں کھایا پیا اور رات کے جھٹپٹے میں، میں ست پرکاش کو لے کر
یومتی کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔
ست پرکاش کو میں نے نہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی ہم
سادھو تھے۔ چنانچہ میں نے دیومتی کے کمرے کے دوار کھولے ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔
دیومتی حسبِ معمول تنہا تھی۔
ویسے بڑی عجیب زندگی تھی۔ دوسری رانیوں کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ گووندا اس کپور کی

کسر کیسے پوری کرتی ہیں۔ لیکن دیومتی سادتری تھی اور بڑی شرافت سے جوانی کاٹ رہی تھی۔ ورنہ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ پوچھتا ہی کون؟ مہاراج تو خود عورت بن کر عشق کر رہے تھے۔

دیومتی کی نگاہ میرے اوپر ہی پڑی۔ ''ارے بھیا!'' کہہ کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اور تب اُس کی نگاہ ست پرکاش پر پڑی۔ ست پرکاش سادھو بنا ہوا تھا، اور پھر کسی قدر میری آڑ میں تھا۔ اس لئے دیومتی اسے نہ پہچان سکی۔

''یہ...... یہ کون ہیں؟'' اُس نے سوال کیا۔

''قریب جا کر دیکھو۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ست پرکاش کی طرف دیکھنے لگا۔ ست پرکاش پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ تب دیومتی نے بھی اُس کا چہرہ دیکھا اور پہچان لیا۔

''ست...... پر...... کاش......!'' وہ سحر زدہ سے انداز میں بولی۔

ست پرکاش کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ خاموش نگاہوں سے دیومتی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے۔ اور اس وقت کم از کم تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں میری موجودگی کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں ایک طرف کھسکا اور میں نے دوشالہ اوڑھ لیا۔

اب میں ان کی نگاہوں سے روپوش تھا۔

دونوں مجسموں کی طرح ساکت اور خاموش کھڑے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ اور پھر دیومتی ہی چونکی۔

''نہیں...... نہیں...... یہ تم نے کیا کیا بھیا؟'' وہ میری طرف مڑی اور پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ''ارے، بھیا کہاں گئے؟''

''ایں......'' ست پرکاش بھی حیرانی سے بولا۔ اور پھر وہ بھی تعجب سے مجھے تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''شاید باہر نکل گئے۔''

''ہاں!'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''کیسی ہو دیومتی؟'' ست پرکاش بولا۔

''تم کیسے ہو ست پرکاش؟...... اور یہ تمہاری حالت کیا ہو گئی ہے؟'' دیومتی دُکھ سے بولی۔

''بدل گیا ہوں؟'' ست پرکاش مسکرایا۔

''سوکھ گئے ہو بالکل۔''

''نہ بدلتا تو خود کو پاپی سمجھتا، دیومتی!''

''کیوں؟''

''تیرے آنے کے بعد مجھ میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تو میں اپنے پریم کو سچ کب مانتا؟''

''نہیں ست پرکاش!...... نہیں۔ تمہیں اپنی یہ حالت نہیں بنانی چاہئے تھی۔'' دیومتی نے کہا۔

''مجھے خود پر ادھیکار کب تھا، دیومتی؟''

''تمہیں میرے لئے...... میرے لئے خود کو سنبھالنا چاہئے۔''

''تیرے لئے خود کو بگاڑ لیا۔ اس سے اچھی کیا بات ہو گی؟''

''پرکاش......!'' دیومتی دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔ ''میرے پرکاش!...... میرے پرکاش!'' وہ اُس

کے سینے سے چہرہ رگڑ رہی تھی۔ لیکن ست پرکاش نے اس کا بدن نہیں چھوا۔

"پرکاش!" دیومتی گمبھیر آواز میں بولی۔

"خود کو سنبھالو دیومتی!"

"ایں......" دیومتی چونک پڑی۔

"ہاں......خود کو سنبھالو دیومتی!......مہاراج نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ مگر ہمارے پھیرے نہیں ہوئے ہیں۔ ہم من میلا نہیں کریں گے۔"

"ہاں ست......ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ سے بھول ہوگئی۔" دیومتی شرمندگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے دیومتی!" ست پرکاش نے ٹھنڈی سانس لی۔

"پتاجی کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"اور ماتاجی؟"

"وہ بھی......سب ٹھیک ہیں۔"

"کب آئے؟"

"دن میں۔"

"بھیا کیا کہہ کر لائے ہیں؟"

"جو کچھ انہوں نے کہا ہے، وہ میرے لئے عجیب ہے دیومتی!......لیکن افسوس، میں تمہیں نہ بتا سکوں گا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ مہاراج مجھے تمہارے پاس لا رہے ہیں۔"

"مگر بھیا چلے کہاں گئے؟"

"پتہ نہیں۔ ہم نے انہیں دروازے سے نکلتے بھی نہیں دیکھا۔"

"میں دیکھتی ہوں، کہاں گئے وہ۔" دیومتی دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ گو اب اُنہیں تنہائی کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں دروازے کی طرف لپکا اور دیومتی سے پہلے باہر نکل گیا۔ پھر میں نے پھرتی سے دوشالہ اُتار دیا اور واپس دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔

"اوہ......آیئے بھیا!......کہاں چلے گئے تھے؟" دیومتی جھینپتے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں نے سوچا، تم دونوں کو باتیں کرنے کا موقع دوں۔"

"ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں رہی بھیا!......جس میں تنہائی ضروری ہو۔" دیومتی نے کہا۔

"ہاں......میں جانتا ہوں۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ اور پھر میں نے اُنہیں بیٹھنے کے لئے کہا اور ہم سب بیٹھ گئے۔ "یہاں کسی کے آنے کا خطرہ تو نہیں ہے دیومتی؟"

"یہاں کون آئے گا بھیا؟" دیومتی نے کہا۔

"ٹھیک ہے دیومتی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیا میرے بیرا......؟"

"میں چاہتا ہوں، ست پرکاش کو درگاپور کا راجہ بنا دوں۔"

"ایں......؟" دیومتی اُچھل پڑی۔

''اس کے بعد تمہارے پھیرے کرادوں۔''
''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے بھیا؟'' دیومتی حیرت سے بولی۔
''ہاں.... تمہارے لئے حیرت کی بات ضرور ہے دیومتی! لیکن میں کوشش کروں گا۔ درگاپور کی حالت اس وقت ایسی ہی ہے۔ وہ لوٹ کا مال بن چکی ہے۔ جو ہمت کرے، لوٹ لے۔''
''لیکن بھیا! یہ بڑا خطرناک کام ہوگا۔ درگاپور کے لوگ آج بھی مہاراج کو چاہتے ہیں۔'' دیومتی بولی۔ ''اور پھر دیوان ہرچرن بڑا پاپی ہے۔''
''مجھے کوشش کرنے دو دیومتی!...... کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ تم لوگ تو میرا ساتھ دو گے؟'' میں نے پوچھا۔
''تم ساتھ کی بات کر رہے ہو، ہم پران دے دیں گے تمہارے لئے بھیا!'' ستیہ پرکاش نے جذباتی لہجے میں کہا۔
''اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی اگر حالات نے میرا ساتھ دیا۔'' میں نے جواب دیا اور پھر میں نے دیومتی کو مخاطب کیا۔ ''اس دوران ست پرکاش کو اپنے ساتھ رکھنے میں تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہوگی؟''
''تمہیں یہاں کے حالات سے واقفیت ہے بھیا!..... یہاں کیا مشکل پیش آئے گی؟''
''تم بدنام تو نہیں ہو جاؤ گی دیومتی؟'' ست پرکاش نے کہا۔
''اس محل میں کوئی بدنام نہیں ہے ست پرکاش!...... یہاں سب اپنی مرضی کے مالک ہیں۔'' دیومتی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
''تب ٹھیک ہے۔ میرے کام میں آسانی ہو جائے گی۔ میں ست پرکاش کو راج مندر میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں صرف چند روز ست پرکاش کو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ہوگا۔ میرا خیال ہے، میرا کام بہت جلد بن جائے گا۔ اب مجھے اجازت دو۔''
اور میں اُن کے پاس سے چلا آیا۔ محل کے ایک سنسان گوشے میں پہنچ کر میں نے دوشالہ اوڑھ لیا۔ اب میں آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بڑی عجیب سی بات تھی۔ ہرچرن اور پورن لال نے مل کر راج گدی حاصل کرنے کے لئے گووند اس کپور کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ لیکن میں بھی ان کی کوششوں سے ہی فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔
ویسے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ ہرچرن نے گووند اس کپور کو قتل کرنے کے سلسلے میں کوئی فوری قدم کیوں نہیں اُٹھایا تھا۔ دراصل درگاپور کے ہندو، گووند اس کو بہت چاہتے تھے، اس لئے وہ لوگ آہستہ آہستہ کام کر رہے تھے۔ تاکہ گووند اس کپور کی موت کو قدرتی شکل دے سکیں۔ یقیناً ان کے ذہنوں میں کوئی گہرا پروگرام ہوگا۔
بہر حال میرا پروگرام ہی مختلف تھا۔ بشرطیکہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں۔
میں نے کچھ فیصلے کئے اور پھر راج محل کے اُس حصے کی طرف چل پڑا، جہاں راجہ کا قیام تھا۔ سب سے پہلے میں ان عورتوں کے گروہ میں پہنچا، جو راجہ کے گرد رہتی تھیں۔
ساری کی ساری خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر مضحکہ خیز تاثرات تھے۔ بیٹھے بیٹھے ان میں

سے ایک شریری لڑکی ہنس پڑی اور دوسری سب چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔
''او چنڈال...... کیوں تیری موت آئی ہے؟...... ہنسی کی آواز، مہاراج کے کانوں میں پہنچ گئی تو کولہو میں پلوادیں گے۔''
''بڑی مشکل ہے روپا!...... مہاراج کی شکل ویسے ہی دیکھ کر ہنسی آوے ہے۔ اب تو وہ اور بھی عجیب ہو گئے ہیں۔ کوئی کیسے اپنی ہنسی روکے۔''
''اری ماری جائے گی بے موت۔ ہنسی کسے نہیں آوے ہے۔''
''ہنس کر دیکھ لے کسی دن۔''
''اب تو کونڈی پر ہی بس نہیں ہوگی۔ جیون بچانا مشکل ہو جائے گا۔''
''مگر مہاراج کو یہ نئی کیا سوجھی ہے؟''
''رام جانے۔''
''ہر وقت کسی برہا کی ماری کی طرح آہیں بھرتے رہتے ہیں دوہے پڑھتے رہتے ہیں۔'' اور لڑکیاں پھر ہنس پڑیں لیکن سب نے جلدی سے منہ میں کپڑے ٹھونس لئے تھے۔
لیکن ان کی گفتگو سے میرے دل میں اُمید کی شمع روشن ہو گئی۔ میں خاموشی سے آگے بڑھا اور پھر اسی خاموشی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔
''مہاراج کسی اُداس گائے کی مانند ایک چھپر کھٹ پر بیٹھے تھے۔ اس وقت بھی زنانے لباس میں تھے اور حسبِ معمول مضحکہ خیز نظر آرہے تھے۔ درحقیقت اُس کی شکل دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی۔
بہر حال، میں اُس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر میں نے اُسے آواز دی۔ ''گوونداس کپور!''
اور مہاراج اُچھل پڑے۔ انہوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔
''کون ہے؟...... کہاں ہے؟...... کون ہو تم؟''
''بھول گئے گوونداس؟''
''ارے ناتھ...... ناتھ...... تم کہاں ہو ناتھ؟...... بھگوان کے لئے میرے سامنے آجاؤ۔ میری پیاسی آتما کی پیاس بجھادو۔ ہائے ناتھ! بھگوان کے لئے میرے سامنے آجاؤ۔'' وہ جلدی سے چھپر کھٹ سے اُتر گئے۔
اُلّو کا پٹھا...... میں نے دل ہی دل میں اُسے گالی دی اور پھر دوشالہ اُتار دیا۔ گوونداس کپور نے مجھے دیکھا اور پھر وہ میرے پیروں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
''ہائے، تم کہاں چلے گئے ناتھ؟...... میں کرموں جلی تو مر چلی تھی۔ تمہارے بنا اب جیون اندھیارا ہے ناتھ!...... ہائے، مجھے مار دو۔ میرے پران لے لو۔ مگر تمہیں بھگوان کی سوگند، مجھے چھوڑ کر نہ جایا کرو۔ میں تمہارے بنا جی نہ سکوں گی ناتھ!''
ایک لمحے کے لئے میں بوکھلا گیا تھا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ ایک اندازہ ہو گیا تھا۔ گوونداس کپور بالکل ہی آؤٹ ہو چکا تھا اور اب عقل کی کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔
بہر حال مجھے بھی وہی کرنا تھا، جو ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اُسے اُٹھایا۔ ''اُٹھو گوونداس!...... اُٹھو تو سہی۔'' میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور وہ بے غیرت ناک سے شوں شوں کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”مجھے گووندی کہا کرو ناتھ!...... گووند اس مجھے بہت برا لگتا ہے۔“
”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں گووندی!“
”پہلے مجھے بتاؤ، اب تو مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟“
”نہیں...... لیکن اس شرط پر کہ جیسا میں کہوں گا، تم ویسا ہی کرو گے۔“
”کروں گی۔“ میں نے کہا۔
”بیٹھ جاؤ۔ پھر میں تم سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔“
”ہے بھگوان..... ہے بھگوان..... میں مر جاؤں.....“ گووند اس کپور شرماتے ہوئے بولا۔ مجھے بہت مشکل سے خود پر کنٹرول کرنا پڑا تھا۔ ایک ہیجڑے سے اظہارِ عشق میں جو کیفیت ہو سکتی تھی، وہی ہو رہی تھی۔
”اب تم میری بات سنجیدگی سے سنو گی، گووندی؟“
”کہو...... کہو تو سہی۔ تمہارے ایک اشارے پر پران دے دوں گی۔“
”تمہیں اپنا پچھلا جیون یاد ہے؟“
”پچھلا جیون......؟“
”ہاں...... جب تم گووند اس کپور تھے؟“
”ہاں، یاد ہے۔“ اُس نے سر جھکا کر کہا۔
”کیا تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ تم کب سے اپنی رعایا میں نہیں گئے؟...... میرا مطلب ہے گئیں؟“
”راج پاٹ کے کام کرنے کو اب میرا من بالکل نہیں چاہتا ناتھ!“
”کیا تمہاری رعایا کو معلوم ہے کہ اب تم گووند اس کپور نہیں، گووندی ہو؟“
”مجھے نہیں معلوم۔“
”میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تمہاری جنتا تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ ابھی تک تمہیں راجہ مانتی ہے۔ گووندی بن کر تم اپنی رعایا سے کیا کہو گی؟“ میں نے پوچھا۔
”مجھے نہیں معلوم۔“
”تم راج پاٹ چھوڑ دو گی گووندی! تو اسے کون سنبھالے گا؟“
”ہر چرن لال۔“
”لیکن وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اگر تم نے راج پاٹ اُس کے ہاتھ میں رکھا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“
”ناتھ......!“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا اور میں اُچھل پڑا۔ ”ہائے، ایسا نہ کہو ناتھ!...... تم جیسا کہو گے، میں ویسا کروں گی۔ ہائے، تم ہی مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“
”یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں گووندی! میں جسے کہوں گا، اُسے راج دے سکو گی؟“
”چولہے میں جائے یہ راج گدی۔ مجھے تو بس تمہاری ضرورت ہے ناتھ!...... بس تم میرے ہو جاؤ، میں تمہاری بن جاؤں۔ جیون سپھل ہو جائے گا۔ اس کے بعد مجھے کسی چیز کی اِچھا نہ رہے گی۔“
”تب میرے کہنے سے تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا، گووندی!“

''بتاؤ...... مجھے بتاؤ ناتھ! میں دُکھوں کی ماری سب کچھ تیاگنے کو تیار ہوں۔''
''تمہیں مہاراج گووندا اس کپور یاد ہیں؟''
''ایں...... ہاں......وہ تو میں خود تھی۔''
''ایک بار پھر تمہیں مہاراج گووندا اس کپور بننا پڑے گا۔'' میں نے اُس کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہائے میں مر جاؤں۔'' وہ لچک کر بولا۔
''اس کے بعد مر جانا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''بڑی مشکل ہو جائے گی۔''
''تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا گووندی!''
''مگر ناتھ! میں لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں گی؟''
''جیسے بھی ہو۔ اگر تم میرے لئے اتنا بھی نہ کر سکیں گووندی! تو میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔''
''ناتھ!...... ناتھ! ایسے شبد منہ سے نہ نکالا کرو۔ میں مر جاؤں گی۔'' اُس نے پھر میرے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔
''تب تمہیں میرے لئے یہ کام کرنا پڑے گا۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔
''جیسا تم کہو گے ناتھ!'' وہ لاچاری سے بولا۔ ''مگر تم میرے پاس سے نہ جاؤ گے۔''
''پھر کہیں نہ جاؤں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے جس طرح برداشت کر رہا تھا، میرا دل ہی جانتا تھا۔ طبیعت پر اتنے بوجھ آ پڑے تھے کہ نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ طالوت کا خیال آتا تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا۔ ہو گا کہیں...... عیش کر رہا ہو گا۔ میرے اندر یہ قوت نہیں تھی کہ میں اُسے تلاش کر سکوں۔ کوئی انسان ہوتا تو شاید اس کی تلاش میں زمین کا کونہ کونہ چھان مارتا۔ مگر اس ہوا کو کہاں تلاش کروں؟ کہاں مل سکے گا وہ؟...... چنانچہ بہتر یہی تھا کہ اسے بھولنے کی کوشش کروں۔ کبھی واپس آ جائے تو ٹھیک ہے...... ورنہ صبر کیا جائے۔ بعض اوقات تو دل چاہتا کہ خاموشی سے درگا پور چھوڑ دوں اور کسی ایسی جگہ جا چھپوں، جہاں طالوت بھی مجھے تلاش نہ کر سکے۔ کیا فائدہ ایسے انسان کے پیچھے مارے مارے پھرنے کا جو کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ دے۔ وہ مطلق العنان ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ میری کیا حیثیت ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے ساتھ رہ کر میری خود اعتمادی ختم ہو گئی تھی۔ ہر کام کے لئے اس کا سہارا تلاش کرنے لگا تھا۔ اور یہ مناسب بات نہیں تھی۔

بہرحال، آج کل دن رات اس اُلو کے پٹھے کے ساتھ گزر رہے تھے اور میری ساری جمالیاتی حِس کا ستیاناس ہو کر رہ گیا۔ کسی ہیجڑے سے عشق کرنے کی مصیبت آپ کے سر آ پڑے تو آپ کو پتہ چلے۔

لیکن دوسری طرف میں اپنا کام بھی کر رہا تھا۔ اس زنخے کو مشق کرا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور وہ میری ہر بات آنکھیں بند کر کے مانتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں مجھے زبردست احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ اگر ہرچرن کو یہ تفصیلات معلوم ہو جاتیں تو شاید وہ ہم دونوں کو ہی قتل کرا دیتا، خواہ اسے کتنا ہی بڑا خطرہ

مول لینا پڑتا۔

پھر سارے کام مکمل ہو گئے۔ ست پرکاش اور دیومتی کو میں نے ''آپریشن'' کی اطلاع دے دی۔ اور پھر ایک صبح...... ایک صبح جب دیوان ہرچرن لال نے دربار شروع کرنے کا حکم دیا، بڑے بڑے لوگ سب دربار میں پہنچ گئے تو اچانک چوبداروں نے ہیجان خیز لہجے میں مہاراج گوونداس کپور کے دربار میں آنے کی اطلاع دی۔

اور پورا دربار حیران رہ گیا۔

بہت سے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ یہ گوونداس کپور کے چاہنے والے تھے۔ ہرچرن لال کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

''کیا بکتے ہو؟...... مہاراج تو بیمار ہیں۔'' اس نے چوبداروں کے سالار سے کہا۔

''وہ...... دربار کے قریب پہنچ چکے ہیں۔''

''مگر اچانک......؟''

''ہاں...... ہمیں پہلے سے اُن کی اطلاع نہیں تھی۔''

''کہاں ہیں وہ؟...... میں اُن کا سواگت کروں گا۔'' ہرچرن لال نے کہا۔

''رک جاؤ ہرچرن جی!...... ہم سب یہیں مہاراج کا سواگت کریں گے۔'' فوجوں کے سالار نے کہا۔ یہ شخص مہاراج کا بڑا پرستار تھا اور اُن سے بہت پریم کرتا تھا۔ ہرچرن لال رک گیا۔ لیکن اُس کی بری حالت تھی۔

میں دربار میں موجود تھا۔ لیکن شاہ دانہ کا دوشالہ اوڑھے ہوئے اور میں ان میں سے ایک ایک کی کیفیت کا اچھی طرح جائزہ لے رہا تھا۔

تب شیروں کا شیر، راجہ گوونداس کپور دربار میں داخل ہو گیا۔ کمبخت کی چال میں اب بھی لچک تھی اور کبھی کبھی چلنے کا انداز بدل جاتا۔ لیکن میں نے اُسے خوب مشق کرائی تھی، اس لئے کام چل رہا تھا۔

سارے دربار میں مہاراج کی جے...... مہاراج کی جے کے نعرے گونجنے لگے اور گوونداس کو بھی پرانے اہ 'زیاد آ گئے۔

وہ تخت پر آ بیٹھا اور ایک ایک درباری نے آ کر اُس کے پاؤں چھوئے۔ ان میں ہرچرن لال بھی تھا۔ لیکن اُس کی جو کیفیت تھی، قابل دید تھی۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر مہاراج، سنگھاسن پر بیٹھ گئے۔ اور پھر انہوں نے کہا۔ ''دربار کے سارے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ کوئی آنے نہ پائے۔'' یہ جملہ پھر کھینچ دیا گیا تھا۔

ہرچرن لال گہری نگاہوں سے مہاراج کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہمارے مترو!...... تمہیں معلوم ہے، ان دنوں ہماری کیا حالت رہی ہے۔ تم میں سے کسی نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں معلوم کیا۔''

''ہمیں بتایا گیا تھا مہاراج! کہ آپ کسی سے نہیں ملتے۔ ہم نے بہت کوشش کی، لیکن......'' سالار نے کہا۔

''تمہیں میرے پاس آنے سے کس نے روکا تھا؟''

''دیوان...... دیوان ہرچرن لال جی نے۔''

''ہرچرن لال۔'' مہاراج نے غور سے ہرچرن لال کی شکل دیکھی۔ اُس کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ ہر کوئی صاف محسوس کر رہا تھا۔ ''تو سنو میرے مترو! ...... میں جانتا ہوں، تم میرے وفادار ہو۔ تم میرے لئے پران تیاگ سکتے ہو۔ لیکن ایک چالاک شخص نے...... ایک چالاک دشمن نے تمہارے اور میرے درمیان دیوار کھڑی کر دی۔ اُس نے اتنا کاری وار کیا کہ...... اُوئی رام......''

''سنبھل کر...... سنبھل کر گووندی!'' میں نے جلدی سے مہاراج کے کان میں کہا۔

''ہائے میری ماں...... تم میرے ساتھ ہو۔''

''ہاں...... سنبھل کر گووندی!'' میں نے اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے چالاک دشمن کا خیال تھا کہ وہ اس طرح ہمیں بیمار بنا کر آہستہ آہستہ ختم کر دے گا اور پھر راج گدی پر قبضہ کر لے گا۔ اس لئے اس نے تمہیں ہم سے ملنے نہ دیا۔''

''اوہ...... مہاراج! وہ بیری کون ہے؟'' سالار تلوار نکال کر بولا۔

''اب بھی نہیں سمجھے، میرے بھولے ساجن! ...... ہائے، میں مر جاؤں۔'' اور پشت پر میرا ہاتھ محسوس کر کے مہاراج پھر سنبھل گئے۔

''ہرچرن لال جی۔'' سالار خونی آنکھوں سے ہرچرن کو گھورتے ہوئے بولا۔

''نن...... نہیں...... نہیں...... میں مہاراج کا وفادار ہوں۔'' ہرچرن لال گھبرا کر بولا۔

''کیڑے پڑیں زبان میں۔ موئے ہردنگے...... تُو ہی تو ہے، جس نے...... جس نے......'' مہاراج نے پشت پر میرے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے انداز بدل دیا۔ ''ہاں، یہی ہے وہ بیری۔ اس نے ہمیں قتل کرنے کی کوئی ترکیب نہیں چھوڑی۔ لیکن...... لیکن...... ارے لیکن...... لیکن کیا......؟'' مہاراج ڈائیلاگ بھول گئے اور میں جلدی سے ان کے کان میں بولنے لگا۔

''لیکن ہماری جان، ہمارے ایک ایسے متر نے بچائی، جس کا احسان ہم جیون بھر نہیں بھول سکتے۔ آج بھی اگر دیوان ہرچرن لال کو ہمارے آنے کا پتہ چل جاتا تو وہ ہمیں مروا دیتا۔''

''ہمارے جیون میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا، مہاراج!''

''گرفتار کر لو اس پاپی کو...... گردن کاٹ دو موئے ہتھیارے کی..... اس نے ہمیں بڑے دُکھ دیئے ہیں۔'' مہاراج کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

اور سالار نے ہرچرن لال کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہاری دیوان کی حیثیت ختم ہو چکی ہے ہرچرن لال! مہاراج نے تمہارا سارا حق چھین لیا ہے۔ چنانچہ میں تمہیں غداری کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' ہرچرن لال گھبرا کر بولا۔

''گرفتار کر لو اس پاپی کو...... اس نے جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید کیا۔''

''اس کے ساتھ پاپی پورن لال بھی تھا، جو اب پاگل بنا ہوا ہے۔''

''اسے بھی سزا دی جائے گی مہاراج!'' سالار نے کہا۔

''اسے لے جاؤ یہاں سے۔ اس کی صورت دیکھ کر ہمیں پریشانی ہوتی ہے۔'' مہاراج بولے۔

''جو آ گیا مہاراج!'' سالار نے کہا۔ ہرچرن لال کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ سپاہی اُسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اتنی شاندار کامیابی کی خود مجھے توقع نہیں تھی۔ بہرحال، بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ گوونداس کپور کس قدر ہردلعزیز تھا۔

''تو میرے مترو!'' گوونداس کپور نے کہا۔ ''میرے سب سے بڑے دشمن کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ میں آج آخری بار تمہارے سامنے آئی..... آیا ہوں۔ میری حالت اب ایسی نہیں ہے کہ راج پاٹ کے کام کرسکوں۔''

''نہیں مہاراج!..... ایسا نہ کہیں..... ایسا نہ کہیں۔'' سب چیخ پڑے۔

''بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ اور اب میرے من میں..... ہائے، میرے من میں بھگوان آ گئے ہیں۔ میں بن باس لے رہی ہوں۔ میں یہاں سے دُور چلا جاؤں گا۔ اور میرا یہ اٹل فیصلہ ہے۔''

گوونداس کپور میرے رٹائے ہوئے جملے دوہرا رہا تھا۔ درباری رونے لگے۔ ''اُوئی..... میں مر جاؤں..... اب کیا کروں؟'' گوونداس کپور گھبرا کر بولا۔

''انہیں حوصلہ دو گوونڈی! اور جلدی سے ست پرکاش کا ذکر کر کے اُسے بلاؤ۔''

''حوصلہ لو..... حوصلہ لو میرے مترو!..... میری پوری بات سنو..... سنو میری پوری بات۔''

''آپ ہمارے اوپر راج کریں مہاراج!..... آپ کہیں نہ جائیں۔''

''میں..... میں اس قابل نہیں رہی۔ میرے من میں بھگوان سما گئے ہیں..... ہائے، میں تو اُن کی جوگن بن گئی ہوں۔'' گوونداس کپور نے پیار سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کام پورا کرلو گوونڈی!..... اس کے بعد میں من بھر کے تمہیں پیار کروں گا۔''

''ہائے میں مر جاؤں..... ہی ہی ہی.....'' گوونداس کپور شرما کر بولا۔

''کام پورا کرو..... پہلے کام پورا کرو۔'' میں نے مضطربانہ انداز میں کہا اور گدھے کی دُم پھر سنبھل گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہتھوڑے مار مار کر اس کا سر کچل دوں۔

''ہم آپ کے بِنا کیا کریں گے مہاراج!''

''میں تمہارے درمیان ایک راجہ چھوڑ جاؤں گا۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر ست پرکاش کو درگا پور کا راجہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''ست پرکاش؟'' سب حیرت سے بولے۔

''ہاں..... میرا متر..... میرا ساتھی ست پرکاش..... جس نے ہمیشہ میری سہائتا کی۔ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو اب تک پاپی ہرچرن لال میری جان لے چکا ہوتا۔''

''ست پرکاش کون ہے؟'' سالار نے سوال کیا۔

''ست پرکاش کو لاؤ۔'' مہاراج نے ایک طرف منہ کر کے کہا اور پروگرام کے مطابق ست پرکاش ایک اندرونی دروازے سے اندر آ گیا۔ راجاؤں کے لباس میں وہ بہت جچ رہا تھا۔

سب نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ کوئی اُسے نہیں پہچانتا تھا۔

''آؤ..... آؤ میرے متر!..... آؤ، میں راج مکٹ تمہارے سر پر رکھ دوں۔''

سالار اور دوسرے لوگ حیرت سے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے۔ پھر سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دھن باد، ست پرکاش جی!......آپ نے ہمارے مہاراج کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے لئے ہم جیون بھر آپ کے احسان مند رہیں گے۔"

ست پرکاش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس پر سحر کی کیفیت طاری تھی۔ حالانکہ میں نے اسے کافی سمجھایا تھا۔ لیکن وہ ہو رہا تھا، جو کبھی اُس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ اس لئے اُس کی حالت عجیب تھی۔

"میرے مترو! تمہاری آ گیا سے، تمہارے سامنے یہ مکٹ میں ست پرکاش کو دے رہا ہوں۔ میری منو کامنا ہے، میری سب سے بڑی منوکامنا ہے کہ میرے بعد تم ست پرکاش کو راجہ ماننا۔ اس کی سہائتا کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج!......ایسا ہی ہوگا۔" سالار نے جذباتی لہجے میں کہا اور پھر مہاراج گووندا س کپور نے تاج ست پرکاش کے سر پر رکھ دیا۔

"مہاراج ست پرکاش کی جے...... مہاراج ست پرکاش کی جے۔" چاروں طرف سے نعرے گونجے۔ درباریوں نے اپنے راجہ سے عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی بات مان لی تھی اور دل سے ست پرکاش کو راجہ قبول کر لیا تھا۔

ست پرکاش کا پورا بدن ٹھنڈا پڑا تھا۔ خود میری کیفیت اس سے جدا نہ تھی۔ میں دل ہی دل میں اتنا خوش تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے وہ کام کر دکھایا تھا، جس کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہے۔

سالار نے اپنی تلوار ست پرکاش کے چرنوں میں رکھ دی اور پھر بولا۔ "میں تمہارا داس ہوں مہاراج! میں نے من سے تمہیں راجہ مان لیا ہے۔ درگا پور کی پوری فوج تمہارے اشارے پر اس شخص سے جنگ کرے گی، جو تمہارا دشمن ہوگا۔" پھر اس نے درباریوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

"میری منوکامنا مترو!......تم سب بھی مہاراج سے وفاداری کا اعلان کرو۔"

اور اس کے بعد ایک ایک شخص نے آ کر ست پرکاش سے وفاداری کا اعلان کیا اور میرے کہنے پر گووندا س کپور سنگھاسن سے ہٹ گیا اور اس پر ست پرکاش بیٹھ گیا۔

"بس، اب تمہارا کام ختم۔ آؤ، واپس چلیں۔" میں نے گووندا س کے کان میں کہا اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ "ان لوگوں سے اجازت تو لے لو۔"

"ہاں مترو!......میرا کام ختم ہو گیا۔ اب میں تمہارے سامنے نہیں آ ؤں گی.....آ ؤں گا۔" اور درباری غم زدہ ہو گئے۔ ویسے وہ سب حیران تھے۔ لیکن بہر حال یہ حیرانی خطرناک نہیں تھی۔

یوں میں گووندا س کپور کو لے کر واپس اُس کی رہائش گاہ میں آ گیا۔ وہ اپنی راج گدی دوسرے کے حوالے کر کے بھی خوش تھا۔ بہر حال، میری شامت آ گئی تھی۔ اور اب میری دلی خواہش تھی کہ جلد از جلد اس سے نجات مل جائے۔

بمشکل تمام میں نے اس سے چھٹکارا پایا۔ ابھی چند روز اس کی زندگی بھی ضروری تھی۔ ممکن ہے، ست پرکاش کو کوئی ضرورت پیش آ جائے۔

ست پرکاش ابھی درباریوں میں تھا۔ میں نے دیومتی کو یہ خوشخبری سنائی اور اس کامیابی پر وہ بھی

انگشت بدنداں تھی۔ اتنا بڑا واقعہ اس آسانی سے ہو گیا تھا۔ میں بھی سسپنس میں تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ ست پرکاش تو بری طرح مصروف تھا۔ بہر حال، ذہین نوجوان تھا۔ اسے جب یہ کچھ ہونے کا یقین آ گیا تو اس نے اپنی صلاحیتوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

بہر حال، رات کے آخری حصے میں اس نے مجھ سے ملاقات کی اور میرے سینے سے لپٹ گیا۔ ''یہ سب کچھ...... یہ سب ابھی تک میرے لئے ناقابلِ یقین ہے...... یہ سب کیسے ہو گیا بھیا؟''

''ہو گیا ہے ست پرکاش!...... لیکن اسے برقرار رکھنا اب تمہارا کام ہے۔ راج نیتی آسان کام نہیں ہے۔ تمہیں سخت اُلجھنوں سے گزر کر اسے سنبھالنا ہے۔ ابھی تمہارے بے شمار مخالف ہوں گے۔''

''تم نے جو کچھ مجھے دیا ہے بھیا!...... تم بے فکر رہو۔ میں اسے بڑی ہی ہوشیاری سے سنبھالوں گا۔''

''ہاں...... اب تم مطلق العنان ہو۔ دیومتی کو کوئی تم سے نہیں چھین سکتا۔ لیکن پہلے دوسرے مرحلوں سے نمٹ لینا۔ اس کے بعد اپنے پریم کی طرف توجہ دینا۔''

''میں وہی کروں گا بھیا! جو تم کہو گے۔ لیکن مجھے یہ تو بتا دو، یہ سب اتنی آسانی سے کیسے ہو گیا؟''

''آسانی سے نہیں ہوا ست پرکاش! میں نے اس کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ براہِ کرم اس کی تفصیل میں نہ جاؤ۔''

''مگر بھیا!...... میں آپ کے لئے کیا کروں؟ میں آپ کو اس کا صلہ کیسے دوں؟''

''میں تم سے صلہ ضرور وصول کروں گا۔''

''میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں بھیا!''

''ابھی تم صرف یہ کرو کہ اپنی گدی پر مضبوط گرفت حاصل کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں میرے لئے کیا کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ست پرکاش کو راج گدی سنبھالے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس ایک ہفتے میں زبردست ہنگامے ہوئے۔ ہرچرن کے کچھ لوگوں نے اُس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن انہیں گرفتار کر کے سخت سزائیں دی گئیں۔ اور پھر ایک دن ہرچرن لال کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ فوجوں کا سالار پوری طرح ست پرکاش کے حق میں تھا۔ وہ گوونداس کپور سے اندھی عقیدت رکھتا تھا۔ بہر حال، بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا وہ۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ست پرکاش کی حکومت اس کی وجہ سے بہت مضبوط ہو گئی۔

رہ گیا میں...... تو میں ہیجڑے کے عذاب میں گرفتار تھا۔ وہ کمبخت تو خود کو مکمل عورت سمجھ بیٹھا تھ اور اب اُس کی دست درازیاں بڑھ گئی تھیں۔ میرا خیال تھا، اب اس سے چھٹکارا پا لوں۔ چنانچہ مئ نے اس کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ اسی رات میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی داسیوں کا رقص دیکھ چاہتا ہوں۔

''ضرور میری جان!...... میں سب سے کہے دیتی ہوں۔''

''ہم شراب بھی پئیں گے۔''

''ہائے...... اس کے بعد میں سرور میں آ جاؤں گی۔''

''تم کتنی شراب پی سکتی ہو گوو ندی؟''

"جتنی تم کہو گے۔"
"اچھا، پھر دیکھیں گے۔ لیکن میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ تم کسی سے میرا ذکر بھی نہیں کرو گی۔"
"پر تم میرے پاس تو ہو گے؟" اُس نے محبوبانہ بے قراری سے پوچھا۔
"یقیناً...... تمہارے بالکل نزدیک۔" میں نے جواب دیا۔
سو اُس رات گوونداس کپور کے محل میں خاص رقص و سرود کی محفل رچائی گئی۔ رقاصائیں اپنا کمالِ فن دکھانے لگیں۔ کنیزیں جام لنڈھانے لگیں۔ میں دوشالہ اوڑھے ہوئے مہاراج کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور مہاراج جام پر جام پی رہے تھے۔
اتنا بڑا کام ہو جانے کے بعد میں مطمئن و مسرور تھا اور اب میرے اندر خوداعتمادی بھی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنا کام مکمل کر لوں، اس کے بعد درگاپور چھوڑ دوں گا۔ اب مجھے طالوت پر غصہ آنے لگا تھا۔ اپنی پُراسرار طاقتوں پر گھمنڈ کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، اس نے میری زندگی بچائی تھی، مجھے بہت کچھ دیا۔ لیکن میں بھی تو انسان ہوں۔ ہمیشہ اس کی وجہ سے اُلجھنوں میں پھنس جاتا ہوں۔ اس کا احسان سرآنکھوں پر۔ لیکن اب مزید احسان نہیں لوں گا۔ یہ ملک ہی چھوڑ دوں گا اور کسی دوسرے ملک جا کر اپنے طور پر کوئی سنجیدگی کی زندگی بسر کروں گا۔
مہاراج کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ کنیزیں بھی اب اسے جام دیتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔ پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ مہاراج جام پکڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ انہوں نے میرے کندھے پر ٹھوڑی رکھ دی۔
"ناتھ!" وہ آہستہ سے بولے۔
"میری گووندی۔" میں نے پیار سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔
"اب...... غاز سے (کیسے)...... پیئوں؟"
"کنیزوں سے کہو، اپنے ہاتھ سے پلائیں۔" میں نے جواب دیا۔
"غا...... چا...... (اچھا)" وہ بولا اور پھر اس نے داسیوں کو اشارہ کیا۔
"بس کریں مہاراج!...... بس کریں۔ بھگوان نہ کرے۔ آپ کو نقصان پہنچ جائے گا۔" ایک داسی نے کہا۔
"پا...... لاؤ...... (پلاؤ)...... جو میں کہہ...... رغا...... غوں......" مہاراج ناراض ہو کر چلائے اور داسیاں پھر اُنہیں پلانے لگیں۔ اثر ہونے لگا۔ مہاراج کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔
"بس کچھ جام اور......" میں نے اُس کے کان میں کہا۔
"غاں...... غاں...... کچھ اور......" مہاراج جھوم کر بولے۔ اور داسیاں تو حکم کی بندی تھیں۔ اور پھر مہاراج کے منہ سے شراب بہنے لگی اور وہ اوندھے گر گئے۔ اور میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔
میرا اندازہ تھا کہ اب میرا کام ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا اور ایک مناسب جگہ تلاش کر کے لیٹ گیا۔ نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ اور دوسری صبح جب میں اٹھا تو پورے محل میں سرگوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ "مہاراج مر گئے...... مہاراج مر گئے۔"
"ہاں، مہاراج کا دیہانت ہو گیا تھا۔

ست پرکاش بہت عمدہ اداکاری کر رہا تھا۔ وہ اس قدر اُداس تھا کہ جیسے سچ مچ اُس کو بہت رنج ہوا ہو۔ اُس نے مہاراج کی موت کے سلسلے میں بہت سے احکامات جاری کئے تھے۔

سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن طالوت نہیں تھا۔ یہاں میں نے میدان ہی صاف کر دیا تھا۔ کاش طالوت واپس آ جائے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں یہ آواز ضرور تھی۔

لیکن طالوت کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اور اب میں آخری پَچ کے لئے تیار تھا۔ اس کے بعد......اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ درگا پور چھوڑ دوں گا۔ یوں بھی یہاں طویل عرصہ گزار چکا تھا۔

اور طالوت......اس بار شاید اُس نے مجھ سے جان ہی چھڑا لی تھی۔ تلکا کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔ اور پھر مجھے یقین تھا کہ طالوت کبھی کا تلکا کو ٹھکانے لگا چکا ہو گا۔ اس جن زادے سے بچنا مشکل ہی تھا۔ اور پھر جو اُس کی فطرت تھی، مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔

چنانچہ ایک رات میں ست پرکاش اور دیومتی کے پاس پہنچ گیا۔ یہ دونوں بے حد خوش تھے۔ اور ظاہر ہے اُنہیں یہ خوشی میری وجہ سے ملی تھی۔ اس لئے وہ میرے پجاری تھے۔

''آؤ بھیا! ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔''

''کیا باتیں ہو رہی تھیں؟'' میں نے پژمردہ سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''بھیا!......تم نے مجھے وہ کام ابھی تک نہیں بتایا، جو تم مجھ سے لینا چاہتے تھے۔'' ست پرکاش سے کہا۔

''بہت مشکل ہے ست پرکاش!......کر سکو گے؟''

''آپ کے لئے تو میں آگ کے سمندر میں چھلانگ لگانے کو تیار ہوں۔''

''غور کر لو۔''

''غور کر لیا بھیا!......آپ کہیں تو سہی۔'' ست پرکاش نے بھروسے سے کہا۔

''تو سنو ست پرکاش!......کیا دیومتی نے تمہیں میری حقیقت نہیں بتائی ہے؟''

''تمہاری حقیقت؟''

''ہاں۔''

''تمہاری حقیقت کیا ہے بھیا؟''

''کیوں دیومتی؟'' میں نے اسے دیکھا۔

''بہنیں ایسے ہلکے من کی نہیں ہوتیں بھیا!'' دیومتی نے کہا۔

''میں تمہاری اس بات کی قدر کرتا ہوں دیومتی! اور یہ سچ بھی ہے۔ تم عام عورتوں سے مختلف ہو۔ بہر حال، ست پرکاش! میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں یہ جان کر کتنا دُکھ ہو گا کہ میں مسلمان ہوں۔''

''ایں......!'' ست پرکاش حیرت سے اُچھل پڑا۔

''ہاں ست پرکاش!......میں مسلمان ہوں۔''

''مگر......مگر یہ......یہ کیسے ممکن ہے بھیا؟......کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں، میں مسلمان ہوں ست پرکاش!''

''اگر ہیں بھیا! تو اس میں دُکھ کی کیا بات ہے؟......دھرم تو سب کے اچھے ہوتے ہیں۔ ہم نے خود

اُنہیں برا بنا دیا ہے۔''
''ہاں ست پرکاش!......اور تمہارے دیش میں مسلمانوں کے ساتھ بہت برا سلوک ہو رہا ہے۔''
''مجھے نہیں معلوم بھیا!......بھگوان کی سوگند مجھے نہیں معلوم۔''
''اُنہیں اچھوت بنا دیا گیا ہے۔ اُن سے اُن کی مذہبی مراعات چھین لی گئی ہیں۔ اُن کے سارے کاروبار چھین لئے گئے ہیں۔ اُنہیں جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اُن کی لڑکیاں ہندو اُٹھا لاتے ہیں، اُنہیں طرح طرح سے پریشان کیا جاتا ہے۔''
''بھگوان کی سوگند بھیا!...... یہ انیائے ہے۔ میں اس کے ساتھ نیائے کروں گا۔''
''میرا یہی کام ہے ست پرکاش!...... میں چاہتا ہوں، ایک راجہ ہونے کی حیثیت سے تم ان کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ اُنہیں ان کی عزت واپس دلاؤ۔ انہیں بھی انسانوں کی طرح جینے کا حق دو۔''
''یہ تمہارا کام نہیں بھیا!...... میرا کام ہے۔'' ست پرکاش نے جذباتی انداز میں کہا۔ کئی منٹ تک خاموش رہا۔ پھر حیرت سے دیومتی کی طرف دیکھ کر بولا۔
''لیکن تمہیں یہ بات معلوم تھی دیومتی؟''
''ہاں...... بھیا نے مجھے بتا دیا تھا۔''
''تم نے مجھے نہیں بتایا۔ خیر، ٹھیک ہی کیا۔ بھیا کا اعتماد قائم رہا۔ میں کوئی دعویٰ نہیں کروں گا بھیا! لیکن بھگوان کی سوگند، جب تک میں زندہ ہوں، جب تک میرا جیون باقی ہے، میں ان کے ساتھ انیائے نہ ہونے دوں گا۔''
''میرا کام ختم ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ دل میں نہ جانے کیوں اُداسی کی لہر دوڑ گئی تھی اس کے بعد میں اُن کے پاس نہ رُکا اور اُن سے اجازت لے کر نکل آیا۔
اب درگا پور میں ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ دیومتی اور ست پرکاش سے ذکر کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اور اگر ذکر کر دیتا تو وہ لوگ مجھے روکنے کی کوشش کرتے۔
یہ سب کچھ فضول تھا اب یہاں رکنا بیکار ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن کہاں جاؤں؟.... کسی بھی طرف۔ سب سے پہلے درگا پور سے نکلا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔''
میں چلتا رہا۔ اور پھر اسی مندر کے قریب پہنچ گیا، جہاں ہم نے درگا پور میں داخل ہونے کے بعد پہلی بار قیام کیا تھا۔ مندر کو دیکھ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دوشالہ اوڑھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اسے اُتار دیا۔ سرحد پار کرتے وقت دیکھا جائے گا۔ اور پھر میں مندر کے سامنے سے بھی گزر گیا۔
اور پھر درگا پور کی حدود ختم ہی ہوئی تھی کہ اچانک میری نگاہ سامنے اُٹھ گئی۔ دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سامنے سے طالوت آ رہا تھا!
میرے قدم ٹھٹک گئے۔ طالوت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اور پھر وہ تیز قدموں سے میرے قریب پہنچ گیا۔ لیکن مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ اور کسی قدر پریشان سا تھا میں خاموش کھڑا رہا۔ اور وہ میرے قریب پہنچ گیا۔
''تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گیا۔ کہاں چلے گئے تھے؟'' اُس نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''بتاؤ نا، کہاں چلے گئے تھے؟''
''کہیں نہیں طالوت!''
''آؤ میرے ساتھ۔''
''کہاں؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اُس کے سوال پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ لیکن میں نے سردمہری سے کام لیتے ہوئے اس کا اظہار بھی نہیں کیا۔
''کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' اس نے کہا۔
''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''میں درگا پور چھوڑ رہا ہوں۔''
''ارے......ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ آؤ تو سہی۔''
''نہیں طالوت! مجھے اجازت دو۔''
''ایسے اجازت نہیں دوں گا۔ تم آؤ تو سہی۔'' طالوت نے میرا بازو پکڑ لیا۔
''سوری طالوت! زیادہ دُور نہ جا سکوں گا۔ یہیں بتا دو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مجھے اس پر شدید غصہ تھا۔ کمبخت نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ آخر میں نے اس کے ساتھ یہ روّیہ کیوں اختیار کیا ہے۔
''مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ آؤ، سامنے والے پہاڑوں تک چلیں گے۔''
''چلو۔'' میں نے کہا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ ویسے میں اُس کی سنجیدگی پر غور کر رہا تھا۔ وہ اتنا پریشان کیوں ہے؟ کوئی خاص ہی بات ہو گئی ہے کیا؟
بہر حال، ہم نے پہاڑوں تک کا راستہ خاموشی سے طے کیا۔ چنچل طبیعت والے طالوت کی یہ پُراسرار سنجیدگی مجھے بے حد عجیب لگ رہی تھی۔ لیکن میں نے بھی غصے کی وجہ سے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر ہم ایک پہاڑی غار میں داخل ہو گئے۔ غار بے حد کشادہ تھا۔ اس میں کئی سرنگیں پھوٹتی تھیں۔ اس کے علاوہ غار میں عجیب عجیب چیزیں موجود تھیں۔ کئی پتھر کے بت، جن کی شکلیں بے حد بھیانک تھیں۔ ان میں سے بعض کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ انسانی ڈھانچے، کھوپڑیاں، ہڈیاں اور نہ جانے کیا کیا۔
''یہ......یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔
''میں بڑی مشکلات میں گھر گیا ہوں۔ ایسی مشکلات میں، جن کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔'' طالوت سنجیدگی سے بولا۔
''کیا مطلب؟''
''تلکا سے جنگ بڑی مہنگی پڑی ہے۔''
''اوہ......مگر ہوا کیا؟'' اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔
''سنو!......میرے پاس اس وقت کوئی قوت نہیں ہے۔ میں عام آدمی ہوں۔''
''ارے......مگر......''

''پوری بات سن لو۔ تلکا کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں جن ہوں۔ اُس نے مجھے اپنے طلسم کدے میں گرا دیا۔ اور پھر مجھے آگ میں گرا دیا۔ آگ سے ہمارا ایک عہد ہے۔ آگ ہمیں جلاتی نہیں ہے، لیکن ہماری قوتیں چھین لیتی ہے۔ بس میں یہاں دھوکا کھا گیا۔ تلکا بہت طاقتور ہے۔''

صورت حال ایسی عجیب تھی کہ میں بھونچکا رہ گیا۔ اور اس کے بعد میرے دل میں طالوت کے لئے ہمدردی پھوٹ پڑی۔ جب وہ اس قدر مجبور ہو گیا تھا تو پھر میرے پاس کیسے پہنچتا؟ اب وہ بھی میری طرح ایک عام آدمی تھا اور ایسے وقت اُس سے ناراضگی کا اظہار اُسے دُکھ پہنچا سکتا تھا۔

''پھر تلکا کا کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ اُس نے سزا کے طور پر مجھے بے بس کر کے چھوڑ دیا۔ اب میں اُس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟''

''لعنت بھیجو طالوت!..... اچھا ہے۔ دونوں یکساں ہو گئے۔ اب کہیں چل کر آرام سے رہیں گے۔''

''مگر میں بغیر کسی قوت کے زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ پھر یہاں کی سرحد سے نکلنا کس قدر مشکل ہو گا۔ ہم اُن کی نظروں سے چھپ بھی تو نہیں سکتے۔'' طالوت نے اُداسی سے کہا۔

''ایک چیز تم بھول رہے ہو۔'' اچانک میں نے مسکرا کر کہا۔

''کیا؟'' طالوت نے تعجب سے پوچھا۔

''شاہ دانہ کا دوشالہ..... جسے اوڑھ کر ہم سب کی نظروں سے گم ہو سکتے ہیں۔''

''ارے.....'' طالوت اُچھل پڑا۔ ''ہاں..... میں تو بھول ہی گیا۔ اوہ..... میں کیسا احمق ہوں۔ ذرا دو تو سہی۔ دیکھو، وہ میرے اوپر کارآمد بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔''

اور میں نے طالوت کی امانت اُسے لوٹا دی۔ طالوت نے مسکراتے ہوئے دوشالہ لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے دوشالہ اوڑھا اور میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

''کیا میں تمہیں نظر آ رہا ہوں؟''

''نہیں۔''

''خوب چیز ہے یہ بھی۔ اور تو کوئی چیز نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''اس کے علاوہ اور کیا دیا تھا تم نے مجھے؟''

''اچھا..... چلو ٹھیک ہے۔ تو اب میں اسے اُتار رہا ہوں۔'' طالوت بولا اور اُس نے دوشالہ اُتار دیا۔

لیکن اس بار جو میں نے اُس کی شکل دیکھی تو خوف سے اُچھل پڑا۔

میرے سامنے منحوس تلکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''کیسی رہی، سوامی.....؟'' اُس نے اپنے غلیظ دانت نکالتے ہوئے کہا اور میرا بدن لرز اُٹھا۔ یہ کیا ہوا؟..... یہ کیا ہو گیا؟..... ہاں، ایک بات میں نے فوراً سوچی۔ وہ یہ کہ دوشالہ گیا۔

کئی منٹ تک میرے حواس گم رہے۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ ''تم..... یہ تم ہو تلکا؟''

''ہاں سوامی!..... آپ کا داس، تلکا۔ بس آپ کی ضرورت تھی۔''

''طالوت کہاں گیا؟''

''اس کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں کہا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں نے اُس کو چھوڑا نہیں۔ وہ میری قید میں ہے۔''

"میرا دوشالہ واپس کر دو۔"

"رام، رام، رام...... کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو شوامی!...... تمہارا نام مجھے یاد نہیں۔" تلکا نے ہنستے ہوئے کہا اور میں غور کرنے لگا۔ آہ......! میں ہی دھوکا کھا گیا تھا۔ اُس نے ایک بار بھی میرا نام نہیں لیا تھا۔ اور پھر بہت سی باتیں اُس کی بدلی ہوئی تھیں۔ غصے میں، میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

"دوشالہ واپس کر دو تلکا!"

"ارے مجھے اس کی تلاش تھی، سوامی!...... میں جاننا چاہتا تھا کہ شریمان، آنکھوں سے کیسے غائب ہو جاتے ہیں۔"

"ذلیل...... کتے!...... دوشالہ مجھے واپس کر دے۔" میں اُس پر جھپٹ پڑا۔ لیکن تلکا اُچھل کر دُور ہٹ گیا تھا۔ اور پھر اُس نے وہی مخصوص مکروہ قہقہہ لگایا اور ایک پتھر کے بت کو اشارہ کیا۔

"شریمان کو ان کے ساتھی کے پاس پہنچا دو۔" اور بت متحرک ہو گیا۔ "ٹھہرو..... وہاں نہیں.... انہیں الگ کوٹھری میں پہنچا دو۔ یہ انسان ہیں۔ اور انسان بہت چالاک ہوتے ہیں۔ یہ کوئی چکر نہ چلا دیں۔"

بت میری طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی میرے بدن کی قوت سلب کر رہی تھی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی، لیکن اُس نے میری گردن پکڑ لی اور دبانے لگا۔ میرے کمزور ہاتھ اُس کے پتھریلے پنجوں کو گردن سے علیحدہ نہ کر سکے اور میں حواس کھونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کچھ یاد نہ تھا۔

نہ جانے کب تک حواس گم رہے۔ جاگا تو کھوپڑی میں ستارے ناچ رہے تھے۔ منہ کا مزہ خراب تھا۔ ویسے کوٹھری میں روشنی تھی۔ کوٹھری کیا، ایک غار تھا، جس کی دیواریں سنگلاخ تھیں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن سہلائی اور اسی وقت اچانک میرے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

"کوئی مجھے شش..... شش..... کر کے بلا رہا تھا۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ تھوڑی بلندی پر ایک سوراخ تھا۔ اتنا کہ میں کھڑے ہو کر اس میں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن سوراخ اتنا چھوٹا تھا کہ اس سے کسی انسان کے نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کیا اس طرف طالوت ہے؟...... میں نے سوچا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ تب میری نگاہ سوراخ کے دوسری طرف پڑی اور ایک بار پھر میں ششدر رہ گیا۔ وہ شکل ایسی نہ تھی، جسے ایک بار دیکھ کر بھلایا جا سکے۔ وہ تو ذہن پر نقش ہو جانے والوں میں سے تھی۔

"راج ہنس......" میرے منہ سے نکلا۔

"ارے...... تم مجھے جانتے ہو؟" وہ حیرت سے بولی۔ آواز تھی کہ گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"تم راج ہنس ہی ہو نا؟"

"ہاں...... میں اسی منحوس نام سے منسوب ہوں۔"

"کیا مطلب؟...... کیا تمہارا یہ نام نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا نام ہے؟"

''پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ...... کیا تم تلکا کے قیدی ہو؟''
''ہاں۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
''کیوں قید کر لیا ہے اُس نے تمہیں؟''
''لمبی کہانی ہے۔''
''کیا نام ہے تمہارا؟''
''عارف۔''
''ایں......'' وہ چونک پڑی۔ ''عارف...... ایسے نام تو مسلمانوں کے ہوتے ہیں۔''
''الحمدللہ، میں مسلمان ہوں۔''
''سچ......؟'' اُس کے لہجے میں ایک انوکھا انبساط تھا، ایک عجیب سا سرور تھا۔
''خدا کا شکر ہے۔ احسان ہے اُس معبود کا۔'' وہ بولی اور اس بار میری حیرت کی باری تھی۔
''کیا مطلب؟...... کیا مطلب؟''
''میں بھی مسلمان ہوں عارف!...... میرا نام شکیلہ ہے۔ آہ...... عارف! کیسی خوشی ہوئی ہے، عرصہ دراز کے بعد ایک مسلمان کو دیکھ کر۔ تم اس کے چنگل میں کیسے آ پھنسے؟''
''تم...... تم مسلمان ہو۔ تم......'' میں شدتِ حیرت سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔
''ہاں...... بحمدللہ، میں بھی مسلمان ہوں۔''
''لیکن راج ہنس؟''
''یہ منحوس نام ان بدبختوں نے ہی مجھے دیا ہے۔'' شکیلہ دردناک لہجے میں بولی اور نہ جانے، دل کے کون سے اندرونی حصوں سے اس کے لئے محبت پھوٹ پڑی۔ نہ جانے کیوں اُس سے بے پناہ اپنائیت محسوس ہوئی۔ میں شدتِ جذبات سے گنگ اُسے دیکھتا رہا۔ اور وہ بھی مجھے گھورے جا رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لی۔
''لیکن آپ نے حلیہ تو سادھوؤں کا سا بنا رکھا ہے۔''
''مصلحت تھی شکیلہ!...... لیکن یقین کرو، یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ تم مسلمان ہو۔''
''یہی کیفیت میری بھی ہوئی عارف صاحب! لیکن آپ مجھے راج ہنس کے نام سے کیسے جانتے ہیں؟''
''ہم تمہیں آج سے نہیں جانتے شکیلہ! کافی عرصہ قبل ہم نے تمہیں ایک مندر میں دیکھا تھا۔ اور یہ شاید مذہب کی کشش ہی تھی کہ ہم اکثر تمہارے بارے میں سوچتے رہے۔''
''ہم سے آپ کی کیا مراد ہے؟''
''میرا ایک اور دوست...... میرا بھائی۔''
''کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟''
''نہیں۔ وہ بھی منحوس تلکا کے چنگل میں ہے۔''
''خدا غارت کرے اس منحوس کو۔ نہ جانے کیوں اللہ نے اُس کی رسّی دراز کر دی ہے۔'' شکیلہ درد بھرے لہجے میں بولی۔
''اپنے بارے میں کچھ اور نہیں بتاؤ گی شکیلہ!''

”کیا بتاؤں عارف صاحب!......دنیا کی سب سے بدنصیب ہستی ہوں۔“

”مارے گئے۔“

”ہاں......ان ظالموں نے نہ جانے کیسے مجھے تاک لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے۔ ذلیل پجاری پورن لال نے وزیر ہرچرن لال کی مدد سے مجھے اغوا کرایا۔ میرے والد اور دادا نے مدافعت کی تو انہوں نے کلہاڑیوں سے انہیں ہلاک کر دیا۔ ماں بچپن میں مر چکی تھی۔ اس کے بعد میرا کوئی نہیں رہا اور پھر میں ان منحوسوں میں تنازع کی شکل اختیار کر گئی۔ چھ سال سے میں مندروں میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ خبیث صورت تلکا بھی میرا طلب گار ہے۔ عجیب سی چپقلش چل رہی ہے ان کے درمیان۔ شاید قدرت اسی طرح میری عزت کی حفاظت کر رہی ہے اور ان کے درمیان میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔“

”اوہ......!“

”اور اب یہ تلکا مجھے لے آیا ہے۔ اس ذلیل نے بھی میری عزت دو کوڑی کی کر رکھی ہے۔ روزانہ شراب پیتا ہے اور پتھر کے ایک بدشکل مجسمے کے سامنے مجھے رقص کرنا پڑتا ہے۔“ شکیلہ زاروقطار رونے لگی۔

”تمہارا درد اتنا وسیع ہے کہ میں تمہیں دلاسہ بھی نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھو۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

”طویل عرصے کے بعد میں نے ہمدردی کے الفاظ سنے ہیں۔ میں تو اتنی بدنصیب ہوں کہ مجھ سے ہمدردی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“ شکیلہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ طالوت کی جانب سے اب میرے دل کی کدورت نکل گئی تھی۔ وہ غریب خود مصیبت میں گھر گیا تھا۔ کاش میں اُس کی مدد کر سکتا۔ بہرحال، میں ذہن دوڑاتا رہا۔ تلکا سچ مچ شیطان تھا۔ اب اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ دوسری طرف شکیلہ کی دکھ بھری داستان نے دل ہلا دیا تھا۔

اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی چیز دماغ میں چبھ رہی ہے۔ کوئی ایسی بات، جسے میں نے نظرانداز کر دیا تھا۔ کون سی ایسی بات تھی؟......کون سی ایسی بات تھی؟......میرے ذہن میں وہ بات نہ آ سکی۔ شکیلہ کی سسکیاں اب رُک گئی تھیں۔

”بہرحال عارف صاحب!......میں نے آپ کو بھی رنجیدہ کر دیا۔ لیکن یقین کریں، کسی ہمدرد کے سامنے آنسو بہانے سے دل کا درد بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”مجھے سخت افسوس ہے، مس شکیلہ!......لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں اور میرا دوست بھی اس ذلیل سادھو کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ہم آزاد ہوئے تو تینوں ساتھ ہی آزاد ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مس شکیلہ! کہ اگر یہاں سے نکلنے کا موقع مل سکا تو ہم تنہا نہ ہوں گے۔ آپ ہمارے ساتھ ہوں گی۔“

”کاش......کاش!“ وہ حسرت بھرے انداز میں بولی۔

”ایک اور بات ہے شکیلہ! شاید تلکا کو مجھے یہاں قید کرتے ہوئے اس سوراخ کا احساس نہیں ہوا تھا، اس لئے ہم اسے یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔“

"ٹھیک ہے۔" شکیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"بہر حال، خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔" اور پھر میں سوراخ کے پاس سے ہٹ گیا۔

اس تنگ غار میں گھٹن ہو رہی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ خاصی دیر کے بعد پتھر کی دیوار میں ایک چوڑی کھڑکی کھلی اور ایک تھال اندر پہنچا دیا گیا، جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ ان سے پرہیز نہیں کر سکتا تھا۔ بھوکا رہ کر عقل بھی کام نہیں کرتی۔ اس لئے آرام سے کھایا اور پھر غار کے پتھریلے فرش پر لیٹ گیا۔ عجیب غنودگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر سو گیا۔

نہ جانے کس قدر رات گزری تھی کہ میرے کانوں میں شکیلہ کی آواز اُبھری۔

"عارف صاحب!......عارف صاحب!"

وہ سوراخ سے مجھے آواز دے رہی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ کر سوراخ پر پہنچ گیا۔ رات کا وقت تھا، اُس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔

"شکیلہ!" میں نے اُسے آواز دی۔

"اوہ......کیا آپ سو گئے تھے؟"

"ہاں، شاید۔" میں نے کہا۔

"کھانا ملا آپ کو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا

"اسی لئے تکلیف دی تھی۔ میرے پاس کھانے کا کچھ سامان تھا۔" شکیلہ نے کہا۔

"شکریہ شکیلہ!......کیا وقت ہوا ہو گا؟"

"رات کا پہلا پہر ہے۔ میں ابھی اُس منحوس کے پاس سے آئی ہوں۔"

"تلکا کے پاس سے؟"

"ہاں۔"

"اوہ......" اچانک میرے ذہن کی وہ کھڑکی کھل گئی، جس کے بارے میں، میں نے سوچا تھا۔ وہ بات یاد آ گئی، جو بھولی بھولی سی لگ رہی تھی اور میں چونک پڑا۔

"شکیلہ!" میں نے اُسے آواز دی۔

"ہاں......میں موجود ہوں عارف صاحب!"

"ایک بات بتاؤ۔"

"جی؟"

"کیا تم روزانہ تلکا کے سامنے رقص کرتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کسی مخصوص وقت پر؟"

"ہاں!"

"اور وہ شراب پیتا رہتا ہے؟"

"ہاں!"

''اور اس کے بعد کیا ہوتا ہے شکیلہ؟''
''وہ مدہوش ہو کر وہیں اوندھا لیٹ جاتا ہے اور تپوکا مجھے واپس غار میں پہنچا دیتا ہے۔''
''تپوکا کون ہے؟''
''تلکا کا غلام۔''
''تمہیں اندازہ ہے کہ یہاں تلکا کے کتنے غلام ہیں؟''
''وہ منحوس بے حد پُراسرار ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے تپوکا کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں دیکھا۔ ویسے اُس کے اشارے پر پتھر کے بت چل پڑتے ہیں۔''
''تپوکا کی کیا کیفیت ہے؟''
''میں نہیں سمجھی۔''
''میرا مطلب ہے، کس جسامت کا انسان ہے؟''
''دُبلا پتلا، سادھو قسم کا آدمی ہے۔ کریہہ شکل۔ آج تک میں نے اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں سنی۔ شاید گونگا ہے۔'' شکیلہ نے جواب دیا اور میں سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر کئی منٹ کے غور و خوض کے بعد میں نے کہا۔
''شکیلہ......!''
''جی؟''
''کیا یہاں سے نکلنے کے لئے تم تھوڑی سی جدوجہد کر سکتی ہو؟''
''کیسی جدوجہد عارف صاحب؟'' شکیلہ نے متعجبانہ انداز میں کہا۔
''کل جب تم تلکا کے پاس سے واپس آؤ تو کوئی ایسی چیز اپنے لباس میں چھپا لو، جس سے تپوکا کو راستے میں ہلاک یا زخمی کر سکو۔ ایسا زخمی کہ تمہیں میرے اس غار کا دروازہ کھولنے کی مہلت مل جائے۔''
شکیلہ ساکت رہ گئی۔ کئی منٹ تک اُس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''آپ کہیں تو میں کوشش کر سکتی ہوں۔''
''میرا خیال ہے شکیلہ! یہ ہمت کر ہی ڈالو۔ خدا نے آج تک تمہاری عصمت کی حفاظت کی ہے، وہی تمہیں یہ کام کرنے کی ہمت بھی دے گا۔ اور پھر غور کرو، ان ذلیل انسانوں کے ارادے اچھے تو نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی دن تمہاری عزت پر بن آئے گی۔ اور اس کے بعد تم کیا کرو گی؟ کیا تم آسانی سے اپنی عزت لٹ جانے دو گی؟''
''ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں...... خدا نہ کرے۔'' شکیلہ کانپ کر بولی۔
''تب یوں سمجھو شکیلہ!...... کہ اپنی عزت بچانے کے لئے تم کل جدوجہد کرو گی اس وقت کا انتظار کیوں کرو، جب عزت پر بن آئے۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں عارف صاحب!'' شکیلہ نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔
''ہمت اور ہوشیاری شرط ہے۔''
''میں انتہائی کوشش کروں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔''

''ممکن ہے، کل کا دن ہماری کامیابیوں کا دن ہو۔'' میں نے کہا اور شکیلہ خاموش رہی۔ ''بس، آرام کرو شکیلہ!'' میں نے کہا اور شکیلہ سوراخ کے پاس سے ہٹ گئی۔ میں بھی اپنی جگہ آ لیٹا۔

لیکن اب نیند آنکھوں میں کہاں تھی۔ خیالات تھے کہ ذہن پر یلغار کئے ہوئے تھے۔ نہ جانے طالوت کہاں قید ہے۔ شاید انہی غاروں میں۔ کیا کیفیت ہو گی اس کی۔ بہت دُکھی ہو گا...... بہت پریشان ہو گا۔ طالوت کے لئے دل میں بے پناہ ہمدردی اُمڈ آئی۔ کسی طرح سے رہا کرا لوں۔ دل میں یہی خیال تھا۔

ساری رات نہ سو سکا۔ اور پھر دن کی روشنی غار میں داخل ہو گئی۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ تن بہ تقدیر ہو گیا۔ حسبِ معمول صبح کا ناشتہ اور پھر دوپہر کا کھانا بھی ملا۔ کیسی بے چینی سے دن گزرا، میرا دل ہی جانتا ہے۔ شکیلہ سے کئی بار گفتگو ہوئی اور میں اُس کی ہمت بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔

اور پھر رات کو میں نے شکیلہ کو آواز دی۔ لیکن دوسری طرف سے جواب نہ ملا۔ گویا شکیلہ جا چکی ہے۔ دل تھا کہ سینے سے باہر نکلا آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ شاق گزر رہا تھا۔ ہر آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے۔ ایسی بری حالت ہو گئی کہ زمین پر لیٹ گیا۔

کاش! شکیلہ کامیاب ہو جائے...... کاش..... کاش......'' دل سے یہی دعا نکل رہی تھی۔

اور پھر نہ جانے کتنی صدیاں گزر گئیں، تب جا کر غار کے بیرونی حصے میں آہٹ ہوئی۔ اور پھر وہی کھڑکی کھل گئی، جس سے کھانا اندر آتا تھا۔ اور پھر شکیلہ کی آواز اُبھری۔

''عا..... رف..... صاحب!'' میں بجلی کی سرعت سے کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

''شکیلہ!''

''میں نے...... میں نے اُسے......'' شکیلہ کی بری حالت تھی۔

''کام ہو گیا شکیلہ؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''زندہ باد..... تو دروازہ کھول دو۔''

''پتہ...... پتہ نہیں چل رہا، کیسے کھلے گا۔'' شکیلہ روتی آواز میں بولی۔

''اوہ..... رک جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں، شاید میں اس کھڑکی سے گزر سکوں۔'' میں نے کہا۔ اور پھر میں نے سخت جدوجہد شروع کر دی۔ سر با آسانی کھڑکی سے نکل گیا لیکن شانے چوڑے تھے، پھنس گیا تو عبرت ناک موت ہو گی۔ لیکن زندگی کی جدوجہد کے لئے موت سے کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے بدن سکوڑا۔ اور اس چھوٹی سی کھڑکی سے نکلنے کی بھرپور جدوجہد کرنے لگا۔ حواس معطل ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ کھڑکی اتنی کشادہ نہیں تھی۔ میں اپنے بدن کو ایک ایک تل سرکا رہا تھا۔

شکیلہ کی بھی جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور اُس کے پاؤں بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ کئی بار تو ہمت ساتھ چھوڑ گئی۔ میں نے سوچا، شاید مجھ بدنصیب کو یہ انوکھی موت ہی ملنی ہے کہ ایک دیوار کے سوراخ میں پھنس کر جان دے دوں...... اور یہ جدوجہد...... اُف، کیسی خوف ناک تھی۔ بدن کا کون سا حصہ تھا، جو چھل نہ گیا ہو۔ پسلیاں تھیں کہ ایک دوسرے پر چڑھ گئی تھیں۔ بقیہ بدن دوسری

طرف لٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ بے جان ہو رہے تھے، جن کی قوت سے میں تل تل سرک رہا تھا۔
اتنا تھک گیا کہ بے جان ہو گیا۔ شکیلہ دل پکڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی اور اپنے کمزور ہاتھوں سے مجھے کھینچنے لگی۔ ''عارف صاحب!...... عارف صاحب! ہمت کریں۔''
''ہاں، ہاں۔'' میں نے نیم غشی کی حالت میں کہا اور پھر بھرپور قوت صرف کرنے لگا۔ بدن کی کھال جگہ جگہ سے اُتر گئی تھی۔ لیکن اب اُمید بندھ چلی تھی کہ سینہ باہر آیا ہی چاہتا تھا۔
اور خدا خدا کر کے سینہ باہر نکل آیا۔ بقیہ جسم نکلنا مشکل کام نہیں تھا۔ اور پھر میں نیچے آ گرا۔ شکیلہ مجھے بھرپور سہارا دیئے ہوئے تھی۔
''خدا کی پناہ!...... آپ تو سخت زخمی ہو گئے۔'' اُس نے ہمدردی سے میرا سر اپنے زانو میں رکھتے ہوئے کہا اور اپنے لباس سے میرے بدن کا پسینہ خشک کرنے لگی۔ اُس نے میرا چہرہ پونچھا۔
عورت کی آغوش بھی کیا ہوتی ہے۔ عورت کا لمس بھی کیا ہوتا ہے۔ ماں ہوتی ہے تو ممتا سارے دُکھ خود میں سمو لیتی ہے۔ بہن ہوتی ہے تو خون کی مہک دل کو قرار بخشتی ہے۔ بیٹی ہوتی ہے تو باپ کے دل کو سکون دیتی ہے۔ بیوی ہوتی ہے تو جذبات کی حدت کو ٹھنڈک مل جاتی ہے۔
شکیلہ کی آغوش میں بھی بڑا سکون تھا۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن میں نے بڑی اچھی کیفیت محسوس کی تھی اور اس کیفیت نے میرے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالا اور چند ساعت کے بعد ہی میں اُٹھ بیٹھا۔
''معاف کرنا شکیلہ! تمہیں پریشان کیا۔''
''آپ ٹھیک تو ہیں نا عارف صاحب؟''
''ہاں، اب ٹھیک ہوں۔ بہت چھوٹی جگہ تھی۔''
''خدا کا احسان ہے۔''
''آؤ...... وہ کہاں ہے؟''
''تپوکا؟''
''ہاں۔ اُسے دیکھیں۔ ہوش میں نہ آ جائے۔''
''مشکل ہے۔'' شکیلہ نے میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
''اچھا۔''
''میں نے پتھر کی موگری پوری قوت سے اُس کے سر پر ماری تھی۔''
''خوب...... موگری تمہیں کہاں سے مل گئی؟''
''ایک بت کے ہاتھ میں گرز کی طرح پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے اُدھار مانگ لی۔'' شکیلہ نے جواب دیا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں اُس کی ظرافت کو سراہا۔ یہ لڑکی ان حالات میں ظریف رہ سکتی ہے۔ بڑی بات تھی۔
''ہم اس بت کا شکریہ ادا کریں گے۔ تلکا مہاراج کہاں ہیں؟''
''آیئے...... اس طرف......'' اور ہم نے رفتار تیز کر دی۔ چند ساعت کے بعد ہم تپوکا کے پاس پہنچ گئے۔ وہ زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر اُسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ اُس بدبخت کا تو

بھیجہ نکل پڑا تھا۔ زندگی کی کوئی رمق اُس میں موجود نہ تھی۔

''زندہ باد...... تپوکا مہاراج تو پرلوک سدھار گئے۔''

''مم...... مر گیا؟'' شکیلہ نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''مرنا ہی چاہیئے تھا۔ ایک مسلمان لڑکی کے ہاتھوں کا وار تھا۔ میری تو خواہش ہے کہ یہ بار بار زندہ ہو اور تم اسے ہر بار قتل کر دو۔'' میں نے جھک کر وہ موگری اُٹھالی، جس سے شکیلہ نے تپوکا کو قتل کیا تھا۔ اچھی خاصی وزنی موگری تھی۔ بہرحال اُسے لے کر میں شکیلہ کے ساتھ چل پڑا۔ اور پھر ایک سرنگ سے گزر کر ہم دوسرے کشادہ غار کے سوراخ پر پہنچ گئے۔

شکیلہ نے اندر اشارہ کیا۔

اندر روشنی ہو رہی تھی۔ کئی شمع دان روشن تھے۔ پیلی روشنی میں چاروں طرف رکھے بت خوف ناک نظر آ رہے تھے، جو اوتاروں کے نہیں تھے بلکہ یہ بھیانک شکلیں ارواح خبیثہ کی تھیں۔ غار میں کوئی آہٹ نہیں تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر میری نگاہ، تلکا پر پڑی۔

جھڑوس بوڑھا ایک مرگ چھالہ پر کروٹ لئے لیٹا تھا۔ شراب کے برتن اُس کے نزدیک پڑے تھے۔ میں بلی کی طرح اُس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اور پھر میں نے بسم اللہ کہہ کر موگری اُٹھائی اور پوری قوت سے اُس کے سر پر دے ماری...... پڑاق سے آواز ہوئی اور تلکا کا سر پاش پاش ہو گیا۔

اُس کا سوکھا بدن اذیت سے تڑپنے لگا اور اس کے ساتھ پورے غار میں وحشت ناک چیخیں گونجنے لگیں۔ سارے بت حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ شمع دانوں میں سلگتی ہوئی شمعوں کی لوئیں کئی فٹ بلند ہو گئی تھیں۔ روشنیوں کے جھماکے ہو رہے تھے۔ پتھریلے قدموں کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں رونے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

شکیلہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس نے میرے سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔ میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اور میں وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تلکا بدستور تڑپ رہا تھا۔ سوکھا سا انسان تھا، لیکن کمبخت میں بڑی جان تھی۔ سر پاش پاش ہو گیا تھا، لیکن بری طرح اُچھل رہا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ ساکت ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ جوں جوں اُس کا جسم ساکت ہوتا جا رہا ہے، شور کی آوازیں رُکتی جا رہی ہیں۔ اور جب اُس کے جسم کی آخری دھڑکن بھی ساکت ہو گئی تو شور بھی رُک گیا۔

ماحول پر اچانک خوف ناک سکوت مسلّط ہو گیا۔ اور یہ سناٹا بھی بڑا عجیب تھا۔ ہمیں اپنے دلوں کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ شمعوں کی روشنیاں بھی ہموار ہو گئی تھیں۔

تب شکیلہ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا تھا۔ میں نے اُسے سینے سے بھینچ لیا۔

''میرا خیال ہے، تلکا کا طلسم ٹوٹ گیا۔''

''ہاں...... یہاں سے نکل چلیں عارف صاحب!'' شکیلہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''آؤ۔'' میں نے کہا اور پھر ہم دونوں اُس غار سے باہر نکل آئے۔ تب ہم نے کچھ اور مناظر دیکھے۔ بہت سے مجسّمے اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ساکت تھے۔

''شاید یہی دوڑ رہے تھے۔'' شکیلہ خوف سے بولی۔
''ہاں۔ لیکن اب یہ سب بے جان ہیں۔''
''نکل چلیں عارف صاحب!...... خدا کے لئے جلدی ان غاروں سے نکل چلیں۔''
''نہیں شکیلہ!...... ہم ابھی نہیں چلیں گے۔ ابھی یہاں ایک اور ہستی ہے، جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اُسے تلاش کریں گے۔'' میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

(اس سے آگے کے واقعات جاننے کے لئے جلد سوئم کا مطالعہ کریں)

طالوت
3
ایم اے راحت

''اوہ.....معاف کیجئے۔ ہاں، اُن کے بارے میں آپ نے بتایا تھا۔'' شکیلہ نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

اور پھر میں ان غاروں کی خاک چھاننے لگا۔ میں ایک ایک جگہ طالوت کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ ...ے دل میں اُس کی محبت کروٹیں بدل رہی تھی۔ میری آنکھیں اُسے تلاش کر رہی تھیں۔

اور پھر جب میں اُس کا سراغ نہ لگا سکا تو میں نے اُسے آواز دی۔

''طالوت.....طا.....لو.....ت.....'' میری آواز سینکڑوں آوازوں میں بٹ کر غاروں میں گونجنے لگی۔

''طالوت.....؟'' شکیلہ آہستہ سے بولی۔

''طالوت.....!'' میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ آواز دی۔ اور میری آواز ...لی گنا ہو کر گونجنے لگی۔ تب اچانک میرے کانوں میں ایک بھنچی بھنچی سی آواز آئی۔

''عارف.....!''

اور میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ یہ طالوت کی آواز تھی۔ ''سنی.....سنی تم نے یہ آواز؟'' میں نے شکیلہ سے کہا۔

''ہاں۔ مگر سمت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔''

''طالوت.....!'' میں نے اس بار پہلے سے زیادہ زوردار آواز نکالی۔ اور جوں ہی میری آواز کی بازگشت ختم ہوئی، طالوت کی آواز سنائی دی۔

''عارف.....!'' اور اس بار میری پوری توجہ اس آواز پر تھی۔ میں نے شکیلہ کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف ...نے لگا۔ میں نے آواز کا کسی حد تک اندازہ لگا لیا تھا۔ گو وہ بہت ہلکی تھی۔

''عارف.....عارف.....عارف.....'' اب طالوت مجھے مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔

''میں آرہا ہوں طالوت!'' میں نے حلق پھاڑ کر کہا۔

''یہ طالوت کیا نام ہے؟'' شکیلہ نے حیرت سے کہا۔ لیکن میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں ...ا اور آواز کا تعاقب کرتا ہوا اُس غار تک پہنچ گیا، جہاں سے طالوت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہاں ...ھی وہی پوزیشن تھی۔ کھانا دینے کی کھڑکی اور دروازہ.....لیکن دروازہ نامعلوم تھا۔

میں نے کھڑکی باہر سے کھولی اور طالوت جلدی سے کھڑکی پر پہنچ گیا۔

''طالوت.....!''

''اوہ.....عارف!.....سچ سچ تم ہی ہو۔'' طالوت کی آواز میں تھکن نمایاں تھی۔

”ہاں طالوت! یہ میں ہی ہوں۔ ٹھہرو، میں دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر اس دروازے کی کل تلاش کرنے لگا۔

شکیلہ بدحواس تھی۔ اور پھر وہ عورت تھی، اس لئے اُسے اس دروازے کو کھولنے کا طریقہ نہیں آیا تھا اور میری بری حالت ہوگئی تھی۔ لیکن میں نے وہ پتھر تلاش کرلیا، جس کے دبانے سے وزنی چٹان کی کمانیاں کھل جاتی تھیں۔ اور پھر میں نے دروازہ کھول دیا۔

طالوت جلدی سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اُس کی نگاہ شکیلہ پر پڑی۔ تاریکی کی وجہ سے شکیلہ کے خدوخال بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

”یہ...... یہ کون ہیں؟“

”آؤ، یہاں سے نکل چلیں۔ اس کے بعد باتیں کریں گے۔“

”یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔“ طالوت آہستہ سے بولا۔

”آؤ تو سہی۔“

”ابھی یہاں شور کیسا تھا؟...... عجیب آوازیں آرہی تھیں۔“

”ہاں۔“ میں نے مختصراً کہا اور آگے بڑھتا رہا۔

”کیا تلکا اس وقت یہاں موجود نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”کہاں گیا؟“

”جہنم رسید ہوگیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ایں......؟“ طالوت چونک کر رُک گیا۔ ”کیا واقعی؟“

”ہاں طالوت!“

”مگر کیسے؟“

”دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، ہاں..... ضرور۔ کیا تم نے اُسے ہلاک کردیا؟“ طالوت سوال پر سوال کر رہا تھا۔ اُس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔

”آؤ تمہیں دکھاؤں۔“

”وہ سچ مچ ہلاک ہو چکا ہے عارف! یا تم مجھے بہلا رہے ہو؟“

”ابھی دیکھ لوگے۔“

”سنو!...... اگر وہ ہلاک ہی ہوگیا تو اُس کی لاش دیکھنے سے قبل ہم ایک اور کام کرلیں۔“

”کیا؟“

”راج ہنس بھی یہاں قید ہے۔“

”اوہ......“ میں چونک پڑا۔ طالوت کا ذہن ابھی شکیلہ کی طرف نہیں گیا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ اُس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ شکیلہ کے چہرے پر نہ جانے کیسے تاثرات تھے۔

''وہ بھی انہی غاروں میں ہوگی۔''
''تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے کہا۔
''ارے وہ اسی منحوس کی قید میں تھی بے چاری۔'' طالوت ہمدردی سے بولا۔
''رہنے دو طالوت! ہمیں کیا۔ یوں بھی وہ ہندو ہے۔''
''کیسی فضول باتیں کررہے ہو عارف؟ کیا ہو گیا تمہیں؟...... کیا وہ مظلوم نہیں ہے؟ کیا کسی مظلوم کے لئے بھی مذہب کی تخصیص کی جاتی ہے؟'' طالوت نے کہا۔
''ارے تو سارے مظلوموں کا ٹھیکہ ہم نے ہی تھوڑی لے لیا ہے؟''
''عارف......!'' طالوت گرج کر بولا۔ ''تم نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی ہے، تمہارا شکریہ۔ لیکن اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ میں اُسے تلاش کروں گا۔''
''ارے تو تلاش کرلیں گے بھائی!...... آؤ تو سہی۔'' میں نے کہا۔
اور پھر میں طالوت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دھکیلتا ہوا اس غار میں لایا، جہاں تلکا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ عجیب تبدیلیاں ہوئی تھیں اس دوران بھی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے یہاں آگ لگ گئی ہو۔ پتھر کے مجسمے تک راکھ کے ڈھیر میں بدل گئے تھے۔ لیکن تلکا کی لاش جوں کی توں پڑی تھی۔
''اس وقت تم نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم نے اسے......'' طالوت کی نگاہ اچانک شکیلہ پر جا پڑی اور وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ''ارے..... راج...... راج ہنس...... یہ...... یہ تم...... اُفوہ...... تو تم شرارت کررہے تھے عارف؟'' طالوت کے چہرے سے بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی۔
''میں..... میں کس منہ سے آپ دونوں کا شکریہ ادا کروں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی میرا اتنا بڑا ہمدرد موجود ہے۔'' شکیلہ اس محبت پر آنسو نہ روک سکی۔
''اچھا، اچھا...... بس، بیکار باتیں بند۔ آؤ طالوت! چلیں۔ اس ہیبت ناک فضا میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' میں نے کہا اور ہم تینوں باہر نکل آئے۔ مجھے اس جگہ کے بارے میں معلوم تھا۔ میں جانتا تھا کہ تلکا مجھے کہاں سے پکڑ کر لایا ہے۔ چنانچہ غاروں سے باہر نکل کر ہم پہاڑوں میں پہنچ گئے۔
''عارف!'' طالوت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''ہوں؟''
''وہ کہاں ہے؟''
''کون؟''
''تمہارا دوشالہ۔''
''ضائع ہو گیا طالوت!''
''اوہ...... مجھے اندازہ تھا۔'' طالوت آہستہ سے بولا۔ ''وہ اس کی تلاش میں تھا۔''
''کوئی پروا نہیں ہے۔'' میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ چاند آدھی منزل طے کر چکا تھا۔ دھیمی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دیر تک چلتے رہے اور غاروں سے دُور نکل آئے۔
''میرا خیال ہے، اب قیام کیا جائے۔''

''بستی میں ہی چلیں۔اب زیادہ دُور نہیں رہ گئی ہے۔وہ روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
''میرا خیال ہے، بستی نہ ہی چلیں تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔
''کیوں؟''
''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ویسے تمہارے لئے بہت سی خبریں ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ بستی چھوڑ دوں۔''
''کیا حالات بہت خراب ہو گئے ہیں؟''
''نہیں دوست!......درگاپور کے حالات ہی بدل گئے ہیں۔''
''آؤ بیٹھو!'' طالوت نے ایک چٹان کے سائے میں بیٹھتے ہوئے کہا اور ہم تینوں بیٹھ گئے۔
''کیسی گزری اس دوران؟'' طالوت کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
''طویل داستانیں ہیں۔ فرصت سے ہوں گی۔''
''ہوں......بستی چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''
''یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا۔''
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ اب یہاں کیا کریں گے؟''
''ہرچرن لال کا کیا حال ہے؟''
''کتے کی موت مارا گیا۔''
''اوہ......خوب......گویا اس دوران تم حرکت میں رہے ہو؟''
''شاید۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ظالم ہرچرن مارا گیا؟......خدا کا شکر ہے۔'' شکیلہ نے خوشی کے لہجے میں کہا۔
''خدا......؟'' طالوت ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔
''میں نے کہا نا طالوت!......بے شمار خبریں جمع کر لی ہیں۔ ویسے رات کافی گزر چکی ہے۔ کیوں نہ بقیہ رات یہیں گزاری جائے۔ میں تمہیں کہانی سناؤں، اس کے بعد فیصلہ کریں۔''
''ہاں......مجھ سے بھی صبر نہیں ہو رہا۔'' طالوت نے کہا۔ میں اس کے چہرے سے اس کی کیفیات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے دبی دبی افسردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی کیفیات چھپا رکھی تھیں۔ بہرحال، میں نے طالوت کے بعد سے اب تک کے واقعات دہرانا شروع کر دیئے۔ شکیلہ بھی ہماری گفتگو غور سے سن رہی تھی۔

⊛⊛⊛

کہانی تمام ہو گئی۔
میرے خاموش ہونے کے بعد بھی طالوت کافی دیر تک خاموش رہا۔ شکیلہ بھی میری کہانی سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔ ویسے اُس کے چہرے پر اُلجھن کے نقوش بھی تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی کچھ نہ بولا تو میں نے ہی کہا۔
''سو گئے تم لوگ؟''

''نہیں۔'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔
''پھر یہ خاموشی؟''
''میں سوچ رہا تھا عارف! اس بار واقعی تم نے بڑا کام دکھایا ہے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بہر حال، تم باصلاحیت ہو۔ تمہاری صلاحیتوں کا تو میں نے کئی بار اعتراف کیا ہے، لیکن جس عقل مندی سے تم نے اس بار کام کیا ہے، وہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ میں داد کے طور پر صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی قوتوں سے کام لے کر بہت سے کام کر لیتا ہوں۔ لیکن عقل میں تم زیادہ ہو۔''
''بس تو فرض کر لو، میں نے کھڑے ہو کر تمہیں تین فرشی سلام کئے ہیں۔ اتنا تھکا ہوا ہوں کہ ان کا عملی مظاہرہ نہیں کر سکتا۔''
''کوئی بات نہیں ہے۔'' طالوت نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا۔
''میں اُلجھن میں ہوں عارف صاحب!'' شکیلہ نے کہا۔
''اوہ...... خیریت؟'' میں نے اسے دیکھا۔
''آپ کی کچھ باتیں بہت پُراسرار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ دوشالہ کیسا تھا؟ اور...... اور......''
''اوہ، یہ ہمارے کوڈ ورڈز ہیں۔ سمجھ جائیں گی آپ بھی۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں بھی آپ کے بارے میں تھوڑی سی اُلجھن میں ہوں، راج ہنس!'' طالوت نے براہِ راست اُسے مخاطب کیا۔
''جی......؟''
''آپ نے ابھی مسلمانوں کے انداز میں خدا کا شکر ادا کیا تھا؟''
''اللہ کے فضل سے میں مسلمان ہوں۔'' شکیلہ نے کہا۔
''مسلمان......'' طالوت پھر اُچھل پڑا۔
''ہاں...... مسلمان۔''
''مگر...... مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے پہلے آپ کو دیواسی کے روپ میں دیکھا تھا۔''
''ہاں۔ میں اُس منحوس روپ کے لئے مجبور کی گئی تھی۔''
''اوہ، پھر آپ کا نام؟''
''میرا نام شکیلہ ہے۔'' شکیلہ نے جواب دیا اور طالوت پریشانی سے کبھی میری اور کبھی شکیلہ کی شکل دیکھنے لگا۔
''یہ سب کیا ہے عارف؟'' بالآخر اس نے کہا۔
''شکیلہ! میرا دوست پریشان ہے۔ میں اسے اور پریشان نہیں کروں گا۔ اجازت ہو تو تمہاری کہانی سنا دوں؟''
''سنا دیں عارف! اب میری کہانی میں کیا رکھا ہے؟'' شکیلہ نے افسردگی سے کہا۔ طالوت بھی شکیلہ کی کہانی سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر اُس نے بڑے خلوص سے کہا۔
''کوئی بات نہیں ہے شکیلہ خاتون! یہ تو بڑی مسرت کی بات ہے کہ آپ ہماری ہم مذہب ہیں۔ مگر

آپ کا کوئی نہیں ہے تو ہم تو ہیں۔ ہم دو تھے، اب تین ہو گئے۔''

''خدا آپ کو خوش رکھے۔'' شکیلہ نے نم ناک نگاہوں سے طالوت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ پسند کریں تو ہمارے ساتھ ہی رہیں۔ جہاں ہم ہوں گے، وہاں آپ۔''

''اگر آپ کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہ ہو تو خدارا ایسا ہی کریں۔ اس بستی سے مجھے بے خوف آتا ہے۔ گو اب اس کے حالات بدل گئے ہیں۔ لیکن وہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ عورت ہوں، زیادہ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نہ جانے اس کے بعد کن حالات سے دوچار ہونا پڑے۔'' شکیلہ نے درد بھرے انداز میں کہا۔

''ان الفاظ کی کیا ضرورت ہے شکیلہ! بس اب تم ہمارے ساتھ ہو۔'' میں نے کہا اور پھر طالوت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں طالوت! ٹھیک ہے نا؟''

''یقیناً میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔''

شکیلہ نے باری باری ہم دونوں کی شکل دیکھی اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''آپ نے میری تشفی نہیں کی، عارف صاحب؟''

''کس بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ طالوت کیا نام ہے؟''

''یہ شخص شرارت سے مجھے طالوت کہتا ہے، ورنہ میرا نام یوسف ہے۔'' میرے بجائے طالوت بول پڑا۔ اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ طالوت خود کو چھپانا چاہتا تھا۔

''اور آپ دونوں کے ہم شکل ہونے کا کیا راز ہے؟''

''یہ راز تو ہمیں خود بھی نہیں معلوم۔ یوں سمجھو، یہ شباہت ہی ہمیں اتنے قریب لے آئی ہے۔''

''اوہ، گویا آپ کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''مذہب اور دوستی کے رشتے کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''حیرت انگیز شباہت ہے واقعی۔'' شکیلہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر ہم خاموش ہو گئے۔ چاند آہستہ آہستہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ ہم تینوں ہی کے چہروں پر تھکن منجمد تھی۔

''صبح ہونے والی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''ہاں۔ اب پروگرام کیا ہے؟''

''ہماری شکلوں سے نیند ٹپکی ہوئی ہے۔''

''ہاں۔ طبیعت نڈھال تو ہے۔''

''کسی مناسب جگہ آرام کئے بغیر کام نہیں بنے گا۔''

''بستی جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ اب کیا لینا ہے اس بستی سے۔ ایسی شکل میں یہیں کسی غار میں بندوبست کرنا ہوگا۔''

''تو پھر غار تلاش کرو۔''

''او کے۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہاں چاروں طرف چھوٹے بڑے غار پھیلے ہوئے تھے۔ ایک صاف ستھرا اور کشادہ غار تلاش کر۔

میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور ہم تینوں اس غار میں داخل ہو گئے۔

غار کی کھردری زمین بھی اس وقت فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔

''تم اس طرف لیٹ جاؤ شکیلہ!'' میں نے کہا اور شکیلہ گردن ہلا کر اس طرف چلی گئی، جدھر میں نے اشارہ کیا تھا۔ میں اور طالوت اس سے کافی فاصلے پر برابر برابر لیٹ گئے۔ شکیلہ ہم سے کافی دور تھی۔ تب میں نے طالوت سے کہا۔

''اور سناؤ استاد! کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔

''تم افسردہ ہو طالوت؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیوں؟''

''تمہارا یہ سوال حیرت انگیز ہے عارف! میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہوں۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''اُونہہ...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے میری جان! تمہارے ہاتھ بھی موجود ہیں اور پاؤں بھی۔ بلاوجہ اس قدر پریشان ہو۔''

''نہیں عارف!...... تم ذہین ہو، اسی دنیا کے باسی ہو، یہاں بخوبی گزارہ کر سکتے ہو۔ لیکن میں...... میرے لئے اب یہاں گزارہ مشکل ہو گا۔''

''فضول بات ہے۔ آخر میں بھی زندہ ہوں۔ اور اس بات سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ کیا تم اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتے ہو؟''

''نہیں عارف! واپس نہیں جانا چاہتا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''تم خود سوچو، ہم کیسے گزارہ کریں گے؟...... تمہاری دنیا پر طاقت کا راج ہے، اور اب طاقت ہمارے پاس نہیں رہی۔ کیا ہم محکوم بن کر اس دنیا میں رہیں گے؟ تم غور کرو، ہمارے سینوں میں جو جذبات ہیں، وہ سرد تو نہیں ہو جائیں گے۔ لیکن ہم ان جذبات کو کیسے گھونٹیں گے؟ کسی مظلوم کی آہ پر کیسے خاموش رہیں گے؟ اور پھر جب ہم اُس کی مدد کرنے سے قاصر رہیں گے تو وہ بے بسی، موت سے زیادہ اذیت ناک ہو گی۔''

''تم تسلیم کر چکے ہو طالوت! کہ ایک طاقت اور ہوتی ہے۔ عقل کی طاقت...... اب ہم زیادہ محتاط رہیں گے، زیادہ ہوشیاری سے کام کریں گے۔ اس خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ اب ہمارے پاس وہ خفیہ طاقت نہیں ہے۔ اب ہمیں صرف اپنے وسائل سے کام لینا ہے۔''

طالوت خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک خاموش رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''جانے کو کس کافر کا دل چاہتا ہے۔ لیکن...... لیکن......''

''سارے خیالات ذہن سے نکال دو میری جان! جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ ہم نے کب مستقبل کی پروا کی ہے۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ بھی سہی۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس افسردگی کے ساتھ نہیں۔''

''نہیں عارف!.....ٹھیک ہے۔ جب حالات سے سمجھوتہ ہی ٹھہرا تو یہی سہی۔''

''وری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔ اچھا بھائی! اب نیند آ رہی ہے، آرام سے سو جاؤ۔ یہ لڑکی تو شاید سو بھی گئی۔'' اُس نے شکیلہ کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔

وہ ایک دیوار سے پشت لگائے بیٹھی تھی۔

''ارے......'' میں نے کہا اور طالوت بھی چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

''اوہ.....بہرحال وہ لڑکی ہے۔''

''میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ شکیلہ کے چہرے پر عجیب سا خوف اُبھر آیا تھا۔

''شکیلہ!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''جی۔'' وہ بھی آہستہ سے ہی بولی۔

''سوئی کیوں نہیں؟''

''نیند.....نیند نہیں آ رہی عارف صاحب!''

''ہمیں ان لوگوں سے بھی بدتر سمجھتی ہو جن کے درمیان تھیں؟''

''جی......؟'' شکیلہ چونک پڑی۔

''کیا تم اس طویل عرصہ میں جاگتی رہی ہو؟''

''نہیں نہیں......یہ بات نہیں ہے عارف صاحب!.......یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر جو بات ہے، بتا دو۔''

''آپ.....آپ.....'' شکیلہ بوکھلا گئی تھی۔

''تمہارا خوف بجا ہے شکیلہ! میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، سوائے اس کے کہ...... کہ کاش تم ہمارے درمیان خود کو محفوظ سمجھو۔'' میں نے کہا اور شکیلہ میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ کئی منٹ تک وہ اسی طرح دیکھتی رہی، پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے۔

''آپ جائیں عارف صاحب!......آرام کریں۔ وعدہ کرتی ہوں، ابھی سو جاؤں گی۔ سنیے.....میں آپ پہ بھروسہ کرتی ہوں۔ میں آپ دونوں پر پورا بھروسہ کرتی ہوں۔''

''شکریہ شکیلہ!'' میں نے کہا اور اس کے پاس سے واپس آ گیا۔ شکیلہ لیٹ گئی تھی۔ اور پھر میں بھی طالوت کے پاس آ گیا۔ وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے بھی نیند آ گئی۔ اور اب اس وقت نیند آئی تھی تو پھر آنکھ فرصت سے ہی کھلی۔ سورج خوب چڑھ چکا تھا، غار میں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

میں اُٹھ گیا۔ دوسری طرف دیکھا تو شکیلہ گہری نیند سو رہی تھی۔ لیکن طالوت کہاں گیا؟ شاید وہ جاگ گیا ہو اور باہر نکل گیا ہو۔ میں نے سوچا اور میں بھی باہر نکل آیا۔ طالوت باہر موجود تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر گھوما اور مسکرا دیا۔

''گڈ......یہ ہوئی نا بات۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ آئی ہے۔''

''سب فضول باتیں ہیں یار! کیا فائدہ خود پر سوگ طاری کرنے سے۔''

''یقیناً۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بستی گیا تھا۔'' طالوت بولا اور میں چونک پڑا۔

''کب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کافی دیر ہوگئی۔''

''ارے......اور واپس بھی آ گئے؟''

''تمہارے خیال میں کیا وقت ہوگیا؟.....دوپہر ہوگئی ہے جناب!''

''اوہ.....لیکن بستی کیوں گئے تھے طالوت؟''

''بھوک نہیں لگ رہی تھی۔'' طالوت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''ارے.....تو تم......تو تم......لیکن......''

''کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے آیا ہوں۔''

''کمال ہے۔لیکن کہاں سے؟...... پیسے کہاں سے آئے؟''

''پیسے تم لوگوں کی ایجاد ہیں۔ میری نگاہ میں نہ پہلے ان کی کوئی حیثیت تھی، نہ اب ہے۔ بھوک لگ رہی تھی، کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت تھی۔ پیسوں کی تلاش کون کرتا؟ جو کچھ جہاں سے ملا، لے آیا۔ اس حالت میں بھی کم از کم ان لوگوں کے بس کا تو نہیں ہوں۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے باپ رے......ڈاکہ زنی؟''

''مجبوری ہے، اب یہی کرنا ہوگا۔''

''سنو طالوت! کیوں نہ ہم جلال آباد چلیں۔ کچھ عرصہ نواب صاحب کے مہمان رہیں گے۔ اس دوران سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔'' میں نے تجویز پیش کی اور طالوت کسی سوچ میں گم ہوگیا۔

''دل نہیں مانتا یار!'' اس نے چند ساعت کے بعد کہا۔

''کیوں؟''

''گویا جن لوگوں کے ساتھ کچھ کیا تھا، اب اس کا صلہ وصول کرنے چلیں؟''

''ہم ان سے دولت تو نہیں طلب کریں گے۔ سیمیں اور آفتاب یوں بھی تو ہمارے دوست ہیں۔''

''لیکن ضرورت ہی کیا ہے عارف! خاص طور سے ان کے پاس نہیں جائیں گے۔ ہاں، کبھی اُس طرف جا نکلے تو دیکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔صرف ایک تجویز تھی۔ جیسا بھی پسند کرو۔''

پھر ہمیں غار کے دروازے پر شکیلہ نظر آئی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر اُس نے گہری سانس لی اور پھر آگے بڑھ کر سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور وہ بھی مسکرا پڑی۔

''معافی چاہتی ہوں عارف!......معافی چاہتی ہوں یوسف صاحب!''

''ارے، ارے کیوں؟...... کس بات کی؟'' طالوت بولا۔
''برے لوگوں میں رہی ہوں۔ برے خیالات ہی ذہن میں آتے ہیں۔'' شکیلہ نے جواب دیا۔
''کوئی تازہ خیال؟''
''ہاں......اسی کی تو معافی مانگی تھی۔''
''ارشاد......ارشاد۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''جانے دیجئے۔ بتا کر اور شرمندگی ہوگی۔''
''اور نہ بتانے سے ہمیں اُلجھن رہے گی۔''
''معافی مانگ چکی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں، آئندہ کبھی آپ دونوں کے بارے میں کوئی بری بات نہیں سوچوں گی۔''
''چلو ٹھیک ہے۔ کیا بات سوچی تھی؟''
''آنکھ کھلی تو غار میں تنہا تھی۔ سناٹا چھا گیا میرے دل پر۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ نے سوچا، میرا بوجھ کہاں اُٹھائے اُٹھائے پھریں گے۔''
''اس بھول میں نہ رہیں محترمہ! آپ کو ہمارے ساتھ پیدل سفر کرنا ہوگا۔ اگر آپ ہمارے کندھوں پر سواری کا ارادہ کئے بیٹھی ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔'' طالوت نے کہا اور شکیلہ ہنس پڑی۔
''وعدہ کر چکی ہوں۔ آپ بھی معاف کر دیں۔''
''تم ہماری دوست ہو شکیلہ! اور دوستوں سے جان نہیں چھڑائی جاتی، ان کا ساتھ تو زندگی کی علامت ہوتا ہے۔''
''طویل عرصے کے بعد میری قسمت کے ستارے جگمگائے ہیں۔ ان لوگوں میں رہتے رہتے ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے زندگی ایک بدترین عذاب ہے۔ بڑی اُکتاہٹ ہوتی تھی۔ لیکن آپ لوگوں کا ساتھ......خدا کی قسم! روح ایک بوجھ سے آزاد ہوگئی ہے۔''
''پیٹ کا کیا حال ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''جی؟'' وہ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔
''کیا ان لوگوں میں رہ کر تم نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا؟''
''نہیں۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن یہاں کیا کھائیں گے؟''
''حلوہ پوری...... مٹھائی...... پھل وغیرہ۔'' طالوت نے جواب دیا اور شکیلہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ ''کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں عارف؟'' طالوت نے میری طرف دیکھا۔
''ہرگز نہیں۔ ہم روزانہ یہی سب کچھ تو کھاتے ہیں ناشتے میں۔ لیکن افسوس! منہ دھونے کے لئے پانی کا بندوبست نہیں ہے۔''
''ہے۔ لیکن منہ دھویا نہیں جا سکتا، البتہ چہرے پر پانی چھڑکا جا سکتا ہے۔''
''وہی کافی ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت کے لائے ہوئے سامان کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم تینوں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ایک ڈکار لی اور پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"ہاں......تو اب کہاں کا قصد ہے دوستو؟......کون سی سمت اختیار کی جائے؟"

"اسی طرف چلو، جدھر سے آئے تھے۔"

"اوہ، میرا خیال ہے مناسب نہ ہوگا......وہاں ہمارے کچھ شناسا موجود ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ ہم ان کے مقروض ہیں۔" یہ اشارہ درگاپور کی سرحد پر متعین ان سپاہیوں کی طرف تھا، جنہیں ہم نے پریشان کیا تھا۔

"درست فرمایا اے دانشور! بے شک وہ لوگ اپنا قرض واپس مانگ سکتے ہیں۔ لیکن پھر؟"

"تن بہ تقدیر، کوئی دوسری سمت اختیار کی جائے۔"

"آپ پیدل سفر سے گھبراتی تو نہیں ہیں مس شکیلہ؟"

"آپ لوگوں کے ساتھ اب میں کسی چیز سے نہیں گھبراتی۔"

"تب آپ زندہ باد......آیئے۔" طالوت نے کہا اور ایک سمت متعین کر کے ہم چل پڑے۔ کھانے پینے کا مختصر سامان ساتھ تھا۔ پانی بھی تھا۔ بہر حال، ہمیں احساس تھا کہ سفر بہت تکلیف دہ ہوگا۔ حالانکہ درگاپور پہنچ کر ست پرکاش سے مدد لی جاسکتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں، دل نہیں چاہا۔

پیدل سفر جاری رہا۔ سب ہی تازہ دم تھے۔ اس وقت تک چلتے رہے، جب تک گہری رات نہ ہو گئی۔ پہاڑوں کی بھول بھلیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے دامن میں قیام کی ٹھہری۔ کھانے پینے کی چیزیں یہاں ختم ہوگئی تھیں، لیکن بہرحال فکر کون کرتا۔ سب ایک ہی جیسے تھے۔ بے فکر، لاپروا۔

آج کی رات شکیلہ ہم سے زیادہ دُور نہ تھی۔ جگہ بھی ایسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سکون سے سو بھی گئی۔ دوسری صبح حسبِ معمول چاق وچوبند تھے۔ شکیلہ کے چہرے پر مسرت تھی۔

"کیا تم پہاڑی پتھر چبا سکتی ہو؟" طالوت نے اس سے پوچھا۔

"کبھی کوشش نہیں کی۔" شکیلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آج کریں گے۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے کہ ناشتے کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا؟" شکیلہ نے سکون سے کہا۔

"عارف!" طالوت نے ہانک لگائی۔

"کیا ہے؟......کیا بات ہے؟"

"یہ لڑکی ہمیں چیلنج کر رہی ہے۔ یہ ہم سے زیادہ باہمت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر بھوکے رہنے کا مقابلہ ہو جائے۔" میں نے کہا اور طالوت خاموش ہو گیا۔ ہم تینوں پھر چل پڑے۔ راستے میں کئی بار طالوت نے ٹیلوں پر چڑھ کر آبادی تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ نہ جانے کس طرف آ نکلے تھے۔ دُور دُور تک کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ طالوت کی کیفیت کا مجھے احساس تھا۔ وہ دل ہی دل میں تلملا رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ شخص، جس کے ایک اشارے پر ایسے ایسے انہونے کام ہو جاتے تھے کہ لوگ ان کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے۔ اور وہ اس طرح بے دست و پا تھا۔

پھر ایک ٹیلے پر میں نے طالوت کو کوئی چیز اٹھاتے دیکھا۔ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھوں میں پتھر تھے۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اور پھر ایک پتھر پوری قوت سے اُس کے ہاتھ سے نکلا اور پھر وہ اُچھل کر بھاگا۔ نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ لیکن جب وہ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں خرگوش دبا ہوا تھا، جس کا بھیجہ پھٹ گیا تھا۔

''دوسرا بھاگ گیا۔ لیکن یہاں اور بھی خرگوش ملیں گے۔ تم جلدی سے اسے ذبح کرو، مر نہ جائے۔''
اس نے ایک تیز دھار پتھر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور میں نے خرگوش کی گردن دوسرے پتھر پر رکھ کر کلمہ پڑھا اور اس کی گردن الگ کر دی۔ طالوت پھر خرگوش کی تلاش میں نکل گیا۔

میں خرگوش کی کھال وغیرہ الگ کرنے لگا۔ وحشیوں کا سا یہ انداز بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ کیونکہ سارے کام خالی ہاتھوں سے کرنے پڑ رہے تھے۔ طالوت تو خوب شکاری نکلا۔ اس نے تھوڑی دیر میں تین اور خرگوش شکار کر لئے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس دوران شکیلہ وہاں جھاڑ جھنکار جمع کر چکی تھی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے پتھر چن کر ایک چولہا بھی تیار کر لیا تھا، جس پر گوشت بھونا جا سکے۔ اور پھر وہ پتھر رگڑ رگڑ کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کام میں کافی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔

میں اور طالوت دوسرے خرگوشوں کی کھال اُتارتے رہے اور ہم نے گوشت بھُننے کی بُو محسوس کی۔ بالآخر شکیلہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

خرگوش کے گوشت کی جو کیفیت ہو گی، آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس آدھے کچے، آدھے پکے خرگوش نے وہ لطف دیا کہ آج تک اس کا مزہ یاد ہے۔ خاص طور سے شکیلہ گوشت بڑے مزے سے کھا رہی تھی۔

''میں تو اس کا ذائقہ ہی بھول گئی تھی، ان لوگوں میں رہ کر۔''

''اوہ ہاں...... تم نے تو طویل عرصہ کے بعد......''

''درگاپور میں یوں بھی گوشت پر پابندی ہے۔ چوری چھپے کوئی جانور ذبح کر لیا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے، آخری بار کب میں نے گوشت کھایا تھا۔'' شکیلہ نے بتایا۔

''درگاپور کے حالات اب بالکل بدل جائیں گے۔''

''اچھا ہے، اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔'' طالوت نے کہا۔

گوشت کافی بچ گیا تھا، جسے ہم نے احتیاط سے رکھ لیا اور پھر آگے چل پڑے۔ اس بار ہم نے کافی تیز سفر کیا تھا۔ اور پھر دُور سے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے اور ہماری رفتار تیز ہو گئی۔

''جنگل ہے شاید۔'' شکیلہ نے کہا۔

''بہر حال، درخت تو نظر آئے۔'' طالوت بولا اور شام ہوتے ہی ان درختوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ نارنگیوں کے درخت تھے۔ درمیان میں امرود بھی لگے ہوئے تھے۔ طالوت نے تو کوئی غور نہ کیا، لیکن میں خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔

''طالوت!'' میں نے خوشی کے عالم میں کہا۔

''ہوں۔''

''کیا تم نہیں سمجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

''اہے، یہ جنگل نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر کیا ہے؟'' طالوت نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''باغ ہے...... باقاعدہ باغ ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ باقاعدہ باغ کیا ہوتا ہے؟''

''یہ درخت انسانی ہاتھوں نے لگائے ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ آبادی قریب ہے۔ کیوں شکیلہ! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یقیناً پھلوں کے درخت لگائے گئے ہیں۔''

''تب پھر آؤ، اندر چل کر دیکھیں۔ درخت ہیں تو مالی بھی ضرور ہوگا۔'' میں نے کہا اور ہم باغ میں داخل ہو گئے۔ پتوں کے نیچے کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہم درختوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ کافی بڑا باغ تھا۔ نہ صرف سنگترے اور امرود تھے بلکہ دوسرے پھلوں کے درخت بھی تھے۔ سوکھے پتے ہمارے قدموں کے نیچے چُل رہے تھے۔

تب اچانک بائیں سمت سے آواز آئی۔ ''اے.....کون ہے؟''

اور ہم اُچھل پڑے۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر زور سے بولا۔ ''ہم ہیں مالی!......ادھر آؤ۔ ہم مسافر ہیں۔''

اور تھوڑی دیر بعد ادھیڑ عمر کا ایک قوی ہیکل دیہاتی ہمارے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا انڈا تھا۔ اس نے ہم تینوں کو غور سے دیکھا۔

''کہاں سے آئے ہو بابو جی؟''

''مالی بابا! ہم پکنک پر آئے تھے، مگر ہماری گاڑی خراب ہو گئی۔ اسے بہت دُور چھوڑ آئے ہیں۔ پریشان پھر رہے تھے کہ تمہارا باغ نظر آ گیا۔''

''اوہو.......آؤ بھائی! میری کٹیا میں چلو۔ تھک گئے ہو گے۔ تمہارے ساتھ زنانی بھی ہے۔'' مالی نے ہمدردی سے کہا اور ہم نے شکر کی گہری سانس لی۔ ہم مالی کے ساتھ چل پڑے۔ مالی کی کٹیا، باغ کے دوسرے کونے میں تھی۔ ہم اس کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''میں تمہارے لئے کھانے کا انتظام کروں۔ بھوکے ہو گے۔'' مالی نے کہا اور کٹیا میں چلا گیا۔

''یہ یہاں تنہا رہتا ہوگا؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہاں۔ باغ کا رکھوالا ہے۔''

''آپ باغ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے یوسف صاحب؟'' شکیلہ نے تعجب سے کہا۔

''یہ ابھی بہت سی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے شکیلہ! اس سے قبل یہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر رہتے تھے۔ حال ہی میں اُترے ہیں۔'' میں نے کہا اور طالوت ہنسنے لگا۔ شکیلہ غور سے طالوت کو دیکھ رہی تھی۔ مالی اندر نہ جانے کیا کرتا رہا، پھر باہر نکل آیا۔

''ہم نے دال پکانے کو رکھ دی ہے بابو جی! دودھ موجود ہے، جب تک چائے بنا لائیں؟''

''بڑی مہربانی ہوگی بابا! آپ کو تکلیف دی۔''

''ارے کیسی باتیں کرتے ہو بابو!..... مسافر ہو، مہمان ہو۔ جو کچھ ہے، حاضر ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔''

''شکریہ بابا! کیا نام ہے تمہارا؟''

''قاسم خان۔''

''یہ کون سی جگہ ہے بابا؟''

''یہاں سے تین کوس دُور بھنگڈی بستی ہے بابو جی!''

''اوہ..... تین کوس دُور۔ کیا وہاں ریلوے اسٹیشن ہے بابا؟''

''ہاں بابو جی! چھوٹی لین ہے۔ پر روزانہ ریل آوے ہے۔'' قاسم بابا نے بتایا اور میں نے خوشی کی گہری سانس لی۔ ہماری مصیبتیں کسی حد تک ختم ہوگئی تھیں۔ قاسم بابا چائے بنا کر لے آیا۔

اور پھر دال پک گئی۔ قاسم بابا نے موٹی موٹی روٹیاں پکائیں اور ہم نے مزے سے کھائیں۔ پھر طے ہوا کہ شکیلہ کٹیا میں سوئے گی اور ہم تینوں باہر..... مالی شریف آدمی تھا، اس لئے تشویش نہ ہوئی۔ اور یہ رات پچھلی راتوں کی بہ نسبت زیادہ پُرسکون تھی۔

صبح کو مالی نے بہت عمدہ ناشتہ پیش کیا۔ اُس نے امرودوں کی ایک خاص ترکاری بنائی اور روٹیوں کے ساتھ وہ ترکاری لطف دے گئی۔

پھر ہم نے رختِ سفر باندھا۔

''عارف.....!'' طالوت نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

''کیوں..... خیریت؟''

''افسوس، ہم اس نیک دل بوڑھے کو کچھ نہیں دے سکتے۔''

''یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ ہمارا کیا قصور ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

بہرحال ہم نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہم چل پڑے۔ تین کوس کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ بوڑھے مالی نے ہمیں راستہ بتا دیا تھا۔ ہم چلتے رہے۔ شکیلہ واقعی قابل ستائش تھی۔ اس دوران اس نے کہیں بھی نہیں محسوس ہونے دیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ وہ اسی طرح خوش وخرم تھی اور ہنستی بولتی راستہ طے کر رہی تھی۔ یہ لڑکی ایسی تھی کہ آدمی اس سے کبھی نہیں اُکتا سکتا تھا۔

دوپہر تک بھنگڈی بستی پہنچ گئے۔ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ایک بازار، جس میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔

''عارف!'' طالوت نے آہستہ سے کہا اور میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ ''ریل سے سفر کرو گے؟''

''ہاں..... کیوں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ٹکٹ کہاں سے لو گے؟''

''اوہ..... نہیں لیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟''

''بے عزتی نہیں ہوگی؟''

''دیکھا جائے گا یار!'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ میں طالوت کے دل پر زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

''پھر بھی عارف!''

''یار! ذرا سی مصیبت سے گھبرا گئے۔ میری دنیا کے لوگوں کو دیکھو، پوری زندگی انہی حالات میں گزار دیتے ہیں اور ماتھے پر شکن بھی نہیں آتی۔ یہ بزدلی ہے طالوت!''

''بس بڑا احساس ہوتا ہے۔ شکیلہ بھی ساتھ ہے، کیا سوچے گی کہ ایسے کنگال لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔''

''ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اور پھر کسی شہر میں داخل ہو کر سوچیں گے۔ ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں۔ پھر یوں تو دیکھو طالوت! کہ زندگی میں ایک دلچسپ تبدیلی آئی ہے۔ اس سے قبل عیش میں گزارتے گزارتے بھی اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔''

طالوت خاموش ہو گیا۔ راستے میں ایک شخص سے اسٹیشن کا راستہ پوچھا۔ قصبہ ہی کتنا بڑا تھا کہ اسٹیشن تک پہنچنے میں زیادہ وقت لگتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اسٹیشن پر تھے۔

پورا شیڈ خالی پڑا تھا۔ ایک طرف اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ تھا۔ ہم اس کے پاس پہنچ گئے اور بوڑھا اسٹیشن ماسٹر چونک پڑا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھا تھا۔

''کیا حال ہے چاچا؟'' طالوت نے پوچھا۔ بڑے میاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اس سے قبل اس اسٹیشن پر کوئی نہیں آیا؟'' اور بڑے میاں نے سادگی سے گردن ہلا دی۔

''بہت خوب۔ ٹرین یہاں رکتی بھی ہے یا نہیں؟''

''رکتی ہے، رکتی ہے جی۔'' بڑے میاں کے منہ سے پہلی آواز نکلی۔

''بہت خوب۔ کب رکتی ہے؟''

''جب آتی ہے۔'' بڑے میاں بولے۔

''واہ..... بڑے میاں فلاسفر معلوم ہوتے ہیں۔'' طالوت میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آتی بھی ہے چچا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں آتی۔''

''کتنی دیر میں آئے گی؟''

''آتی ہی ہو گی۔''

''اوہ، ویری گڈ..... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' طالوت خوش ہو کر بولا۔

''ٹکٹ دوں؟'' بڑے میاں بولے۔

''کیا؟..... طالوت نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ ٹکٹ بھی لینا پڑے گا؟''

''اوہ..... تم بھی بغیر ٹکٹ سفر کرو گے۔'' بڑے میاں مایوسی سے بولے۔

''اور لوگ بھی سفر کرتے ہیں؟''

''سب ہی کرتے ہیں..... میں نے پچھلے تین سال سے کوئی ٹکٹ نہیں بیچا۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔

''ویری گڈ..... ویسے ایک بات بتائیں چچا! بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی سزا کیا ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔ پولیس لے جاتی ہے یا ٹی ٹی کے گھر جھاڑو لگانی پڑتی ہے، برتن صاف کرنے پڑتے ہیں۔'' بڑے میاں نے بڑی سادگی سے کہا اور طالوت نے آنکھیں بھینچ لیں۔ شکیلہ ہنس پڑی تھی۔

کافی دیر تک ہم بڑے میاں سے ہنسی مذاق کرتے رہے، پھر وہاں سے ہٹ آئے۔

''اب کیا خیال ہے عارف؟'' طالوت نے پوچھا۔

''مستقل مزاج ہوں۔''

''برتن دھونے آتے ہیں؟''

''کیا حرج ہے؟ یہ بھی سہی۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر مجھے کیا اعتراض ہے؟'' طالوت نے شانے جھٹکے۔

اور پھر دُور سے ٹرین آتی نظر آئی اور ہمارے دل دھڑک اُٹھے۔ اب تک تو صرف تفریح کر رہے تھے۔ لیکن اب واقعی سوچنا پڑا۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو اچھا نہ ہوگا۔ لیکن کیا بھی کیا جاسکتا تھا؟ چلنا تو تھا ہی۔

ٹرین آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھی اور پھر پلیٹ فارم کے علاقے میں داخل ہوگئی۔

اسٹیشن ماسٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہاں پر کوئی نہیں اُترا۔ البتہ ہم ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔

''فرسٹ کلاس ہے۔'' شکیلہ آواز بھینچ کر بولی۔

''کمال ہے۔ پھر کیا ہم تھرڈ کلاس میں سفر کریں گے؟ اگر پکڑے بھی گئے تو لوگ کیا سوچیں گے کہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ آؤ......'' میں نے کہا اور ہم کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔

یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ لیکن ہم نے کسی کی شکل پر نگاہ بھی نہیں دوڑائی اور خاموشی سے سامنے کی ایک سیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

''شاید آپ لوگوں نے باہر ریزرویشن کارڈ نہیں دیکھا ہے جناب!'' ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''جی؟'' طالوت نے نگاہیں اُٹھائیں۔ میں بھی چونک کر اس سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو دیکھنے لگا۔

''جی ہاں...... باہر ریزرویشن کارڈ موجود ہے۔'' بھاری بھرکم آدمی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''معاف کیجئے گا، ہم دیکھ نہیں سکے تھے۔'' میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

''ابھی ٹرین رُکی ہوئی ہے اور پھر یہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ ہے۔''

''کوئی بھی کلاس ہو، ہمارے لئے یکساں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' بھاری بھرکم آدمی نے بھنویں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ کسی قدر بھنچی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

''بھائی! ہم نے تو کسی کلاس کا ٹکٹ نہیں خریدا۔''

''ہوں......تو چار سو بیس ہیں آپ۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔ گاڑی پلیٹ فارم سے رینگنے لگی تھی۔

''جلدی کریں، ورنہ میں زنجیر کھینچ لوں گا۔ مصیبت میں پھنس جائیں گے آپ لوگ۔''

''مصیبت میں تو پھنسے ہوئے ہیں جناب! مہمان سمجھ کر ہی برداشت کرلیں۔'' طالوت پھر بولا۔

''میں کہتا ہوں، زیادہ چرب زبان بننے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔''

''شکل سے ہی نظر آتے ہیں۔ اور آپ کی گفتگو نے تصدیق کردی ہے۔'' طالوت بیزاری سے بولا۔

''تو ایسے نہیں اُتریں گے آپ۔''

''ہرگز نہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''بہتر ہے۔'' وہ زنجیر کی طرف بڑھا۔ اُس کی بداخلاقی پر غصہ مجھے بھی آ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے پیروں میں ٹانگ اڑا دی۔ اس بری طرح گرا تھا وہ کہ زوردار دھماکا ہوا۔ اور پھر وہ خود سے نہ اٹھ سکا۔

لیکن اِس دھماکے سے سیٹ پر کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی بوڑھی عورت جاگ اُٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی دولڑکیاں اور ایک نوجوان گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی اسی طرف متوجہ تھے۔

''کیا ہوا؟......کیا ہوا تصدق؟.....کیا حادثہ ہو گیا؟......کیا حادثہ ہو گیا؟'' بوڑھی عورت نے متوحش انداز میں پوچھا۔

''آپ لیٹئے بڑی ماں!......آپ آرام کریں۔ لیٹ جائیے۔''

''حادثہ نہیں ہوا؟'' عورت کی آواز عجیب تھی۔

''نہیں، کوئی حادثہ نہیں ہوا۔''

''پھر میری افشاں کہاں ہے؟.....حادثہ نہیں ہوا تو وہ کہاں چلی گئی؟''

''خدا سمجھے آپ سے۔'' نوجوان ہمیں گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا اور پھر وہ بھاری بھرکم شخص کو اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل تمام وہ اسے اٹھانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

''آپ لیٹ جائیے بڑی ماں!......آپ......''

''ارے، تو مجھے بتاؤ تو سہی۔ یہ آواز کیسی تھی؟''

''تصدق گر پڑے تھے بڑی ماں!'' ایک لڑکی بولی۔

''اُف.....اس سے کہو کہ آہستہ سے گرا کرے۔ ایسی زور کی آواز ہوتی ہے جیسے...... جیسے حادثہ ہو گیا ہو۔''

''آپ لیٹ جائیے بڑی ماں!''

''نہیں، اب میں بیٹھوں گی۔ نیند نہیں آ رہی۔''

بھاری بھرکم آدمی قہر آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ شاید عورت کی وجہ سے وہ خاموش تھا، ورنہ ہاتھاپائی پر اُتر آتا۔ ہم دونوں اطمینان سے بیٹھے تھے۔ شکیلہ نے ہنسی روکنے کے لئے منہ کھڑکی کی طرف کر لیا تھا اور ہل رہی تھی۔

''یہ......ارے یہ کون ہیں؟'' بالآخر بڑی ماں کی نگاہ ہم دونوں پر پڑ ہی گئی اور طالوت جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

''آپ کے بچے ہیں بڑی ماں!'' اس نے جھک کر کہا۔

''میرے بچے......'' بوڑھی کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

''یہ بدمعاش ہیں بڑی ماں! ہمارے کمپارٹمنٹ میں گھس آئے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں زنجیر کھینچ کر انہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔'' موٹے تصدق نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''یہ موٹا جھوٹ بول رہا ہے بڑی ماں! اے عارف!......ادھر آؤ۔'' طالوت نے میری طرف رخ کر کے کہا اور میں بھی جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ تب وہ نہایت بھولپن سے بولا۔ ''بتائیے بڑی ماں! کیا ہم آپ کو صورت سے بدمعاش نظر آتے ہیں؟''

''ارے نہیں، بالکل نہیں۔'' عورت محبت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تمہاری شکلیں تو بہت پیاری ہیں بالکل ایک جیسی۔ کیا تم دونوں بھائی ہو؟''

''ہاں۔ مصیبت کے مارے ہیں بڑی ماں! غلطی سے آپ کے کمپارٹمنٹ میں آ گئے تھے، لیکن یہ موٹا ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کر رہا ہے۔'' طالوت نے تصدق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ موٹا نہیں، تصدق ہے۔''

''اچھا؟'' طالوت نے حیرت سے موٹے کو دیکھا اور عورت کی ساتھی لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''بڑی ماں! کیا حکم ہے ان کے بارے میں؟'' تصدق نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹھا رہنے دو تصدق! بیٹھا رہنے دو۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ اس کی آنکھوں سے نرمی اور ماستا ٹپک رہی تھی۔ بڑا پُر وقار چہرہ تھا، بڑی پاکیزہ شکل تھی۔

''شکریہ بڑی ماں!...... ہم واقعی مظلوم ہیں۔''

''ارے...... وہ کون ہے؟'' بڑی ماں کی نگاہ شکیلہ پر پڑ گئی۔

''ہماری ساتھی ہے بڑی ماں!''

''تو وہ ادھر کیوں منہ کیے بیٹھی ہے؟ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟'' بوڑھی نے پوچھا اور بوڑھی کے الفاظ کچھ عجیب سے لگے۔ وہ حادثے کا ذکر بار بار کرتی تھی۔

''نہیں، وہ ٹھیک ہے۔ شکیلہ! ادھر آؤ۔ بڑی ماں بلا رہی ہیں۔'' میں نے کہا اور شکیلہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں، اب تک ان لوگوں نے شکیلہ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اب جو وہ اس طرف مڑی تو ایک عجیب ہنگامہ ہو گیا۔ عورت کی ساتھی لڑکیاں چیخ پڑی تھیں۔ نوجوان ''ارے!'' کہہ کر اُچھل پڑا تھا۔ اور تصدق...... وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور بوڑھی عورت...... اُس کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

ہم دونوں نے ایک لمحے میں یہ انوکھی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ شکیلہ کئی قدم آگے بڑھ آئی۔ اب وہ ہمارے قریب تھی۔

''افشاں باجی!'' ایک لڑکی پاگلوں کے سے انداز میں بولی۔

اور پھر بوڑھی کی دلخراش چیخ گونجی۔ ''افشاں......!'' وہ تیزی سے اُٹھی، دونوں ہاتھ پھیلائے اور پھر گر پڑی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ سب لوگ اُس پر جھک گئے۔ بڑی مشکل سے اُسے اُٹھا کر سیٹ پر ڈالا گیا۔ میں نے اور طالوت نے بھی مدد کی تھی۔

''تم...... تم مصیبت بن کر آئے ہو۔'' تصدق ہمیں گھونسہ دکھا کر بولا اور پھر چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ''لیکن افشاں بی بی!...... آپ ان لوگوں کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟...... کیا یہی بدمعاش......؟''

''جی......؟'' شکیلہ حیرت سے بولی۔

''ہائے افشاں باجی!...... کہاں چلی گئی تھیں آپ؟...... ہائے، آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' دونوں لڑکیاں روتی ہوئی شکیلہ سے لپٹ گئیں اور شکیلہ بوکھلائے ہوئے انداز میں خود کو ان سے چھڑانے لگی۔

''ارے...... ارے سنیے...... سنیے تو...... آپ کو...... آپ کو......'' وہ خود کو بچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''افشاں باجی! آپ...... آپ...... سنیے...... براہِ کرم بتا دیجیے، یہ آپ کو کہاں سے ملیں؟'' نوجوان

پریشانی سے ہماری طرف دیکھتا ہوا بولا۔
''کیا قصہ ہے شکیلہ؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ کیا شکیلہ درحقیقت افشاں تو نہیں ہے؟..... ممکن ہے، اس نے مصلحتاً اپنی کہانی غلط سنائی ہو۔
''بخدا، مجھے نہیں معلوم۔'' شکیلہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ارے بڑی ماں کو تو دیکھو!......اُف، یہاں تو ڈاکٹر بھی نہیں مل سکتا۔''
''زنجیر کھینچ کر گاڑی روکوں؟'' تصدق بوکھلاہٹ میں ناچتے ہوئے بولا۔
''گاڑی روکنے سے کیا ہوگا؟'' نوجوان نے کہا۔
''سب ان لوگوں کا کیا دھرا ہے۔'' تصدق پھر ہمیں گھورتے ہوئے بولا۔
''آپ فضول باتیں کیوں کر رہے ہیں، تصدق صاحب!.....کام کی بات کریں۔'' نوجوان نے ناگواری سے کہا اور موٹا تصدق چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہوئے۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔
طالوت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں اُس کا اشارہ سمجھ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ شکیلہ کو اُن لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔
''معاملہ دلچسپ ہے عارف!'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔
''ہاں، عجیب وغریب ہے بھئی۔''
''کیا خیال ہے، کیا شکیلہ نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟''
''بظاہر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''
''اس کی بوکھلاہٹ مصنوعی نہیں معلوم ہوتی۔''
''ممکن ہے، کوئی دلچسپ غلط فہمی ہی ہو۔''
''پھر اب؟''
''سوچو۔''
''غلط فہمی بہرحال دلچسپ ہے۔ کیوں نہ......''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن شکیلہ اگر ٹھیک ہے تو پریشان ہوگی۔''
''اسے تیار کرلیں گے۔ وقتی طور پر تھوڑی سی تفریح ہو جائے گی۔''
''او کے۔''
''پھر طے؟''
''بالکل طے۔''
''یہ موٹا کیا چیز ہے؟''
''جو کچھ بھی ہے، دلچسپ ہے۔''
''تب آؤ، معاملے کی بات کی جائے۔'' طالوت نے کہا اور ہم پھر ان لوگوں کے قریب پہنچ گئے۔ لڑکیاں شکیلہ کی جان کھائے ہوئے تھیں۔
''ہائے افشاں باجی! آخر آپ مان کیوں نہیں رہیں؟'' ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔

''کیا آپ ہم لوگوں سے ناراض ہیں؟'' دوسری نے کہا۔
''خدانخواستہ افشاں باجی کی یادداشت تو خراب نہیں ہوگئی؟'' نوجوان نے کہا۔
''ہوسکتا ہے۔'' لڑکیاں بولیں۔
''یوسف صاحب! دیکھئے تو سہی۔ نہ جانے ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔'' شکیلہ گھبرا کر ہماری طرف
لپک آئی۔

''کوئی بات نہیں شکیلہ! کوئی دلچسپ غلط فہمی ہے۔''
''جی ہاں۔ غلط فہمی ہے۔ شکل بھی بدل جائے گی، آواز بھی بدل جائے گی، بولنے کا انداز بھی بدل
جائے گا۔ اندھے ہیں نا ہم سب۔'' ایک لڑکی آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔
''اندھی نظر تو نہیں آتیں لیکن عقل کی اندھی ضرور ہو۔'' طالوت نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔
''اے مسٹر! لڑکیوں سے بدتمیزی اچھی نہیں ہوتی۔''
''اب تم ایک ڈبے میں گھس آئے ہو۔ اوپر سے بکواس بھی کر رہے ہو۔'' تصدق پھر آگے بڑھ آیا۔
''تو سنو!...... اگر اب تم میں سے کسی نے اس لڑکی کو افشاں کہا تو میں اس کے دانت توڑ دوں گا۔ تم
جو ہماری ساتھی سے بکواس کر رہے ہو، وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' طالوت نے موٹے تصدق کو گھورتے
ہوئے کہا۔

''تصدق صاحب! براہِ کرم بڑی ماں کا خیال کریں۔ آپ نے بے مقصد گفتگو شروع کر رکھی ہے
خاتون!...... اگر آپ افشاں ہیں تو براہِ کرم اتنا ہی بتا دیں کہ آپ کو بڑی ماں پر بھی رحم نہیں آتا؟''
نوجوان نے پھر مداخلت کی۔

''اور اگر میں افشاں نہ ہوں، تب بھی افشاں بن جاؤں؟''
''اگر آپ افشاں باجی نہیں ہیں تو پھر ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں کہنے دیں کہ دنیا
میں شاید ہی چہروں میں اتنی مماثلت ملتی ہو۔ آپ دونوں بالکل ہم شکل ہیں، لیکن دونوں کی شخصیتوں میں
فرق محسوس ہو جاتا ہے۔ اگر آپ افشاں باجی کو دیکھ لیتے تو خود بھی دھوکا کھا جاتے۔ ان کی شکل، چال
ڈھال، آواز، انداز یہاں تک کہ فطرت بھی ان جیسی ہی ہے۔''
''بہرحال، یہ افشاں نہیں، شکیلہ ہیں۔''
''تب ہمیں معاف کر دیں خاتون!''
''کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن افشاں ہے کون؟''
''ہماری باجی...... ہماری بہن۔''
''اوہ، کہاں گئیں وہ؟'' شکیلہ نے اب کسی قدر ہمدردی سے پوچھا۔
''بس اچانک کہیں کھو گئیں۔ ایک دن یونیورسٹی گئی تھیں، پھر واپس نہیں آئیں۔ کہاں کہاں نہ تلاش
کیا اُنہیں۔ کہاں کہاں نہ دیکھا۔ لیکن اُن کا نشان نہیں ملا۔ بڑی ماں کا خیال ہے کہ اُنہیں کوئی حادثہ
پیش آگیا۔''

''بڑی ماں کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''افشاں باجی کی ماں۔''

''اور تم لوگ؟''

''ہم بھی ان کے بہن بھائی ہیں۔ میں ان کا پھوپھی زاد بھائی اور یہ دونوں خالہ زاد بہنیں۔'' نوجوان نے بتایا۔

''اور یہ تصدق صاحب؟''

''یہ ہمارے منیجر ہیں۔''

''اسی لئے زیادہ اکڑ رہے ہیں۔ ویسے اب بھروسہ کرو دوست! تم سب لوگ غلط فہمی کا شکار ہو۔ ان کا نام افشاں نہیں، شکیلہ ہے۔''

''آہ، کیسی افسوس ناک بات ہے۔ ہمارے زخم تازہ ہو گئے۔''

''کتنا عرصہ ہو گیا افشاں کو غائب ہوئے؟''

''پورے تین سال۔''

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، افسوس کی بات ہے۔'' شکیلہ نے بھی کہا۔ اسی وقت بڑی ماں کی کراہ سنائی دی۔

''افشاں!......افشاں!......کہاں گئیں بیٹی؟......آہ، تم کہاں کھو گئیں؟''

ہم سب کی نگاہیں بوڑھی عورت کے پُرنور چہرے کی طرف اُٹھ گئیں۔ بڑی حسرت، بڑا درد تھا اس کے چہرے پر۔ ہم کافی متاثر ہوئے تھے۔

شکیلہ آہستہ قدموں سے بڑی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ آخر لڑکی تھی، اُس کے دل میں درد پیدا ہو گیا۔ وہ جھکی اور جھجکتے ہوئے اس نے بوڑھی خاتون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بڑی ماں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ سکتے کے عالم میں شکیلہ کو گھور رہی تھیں۔ اور پھر وہ دلدوز چیخ مار کر اس سے لپٹ گئیں۔ ''آہ......افشاں......افشاں! کہاں چلی گئی تھی، میری لعل......کہاں کھو گئی تھی......افشاں!'' وہ بری طرح شکیلہ کو چومنے لگیں۔ شکیلہ نے خود کو ان کی آغوش میں دے دیا۔ اس نے خود بھی بڑی ماں کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''مسٹر! آپ میری بات سنیں۔'' اچانک تصدق نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آیئے......پلیز آیئے۔'' تصدق نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔ اور میں اُس کے ساتھ وہاں سے الگ آ گیا۔ میرے پیچھے طالوت اور اس کے پیچھے نوجوان بھی آ گئے تھے۔

''جی فرمایئے؟'' میں نے کہا۔

''آپ یقین دلا رہے ہیں کہ یہ خاتون افشاں نہیں ہیں۔'' وہ بولا۔

''پہلے میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم صحیح الدماغ ہو بھی یا نہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''میں آپ سے بات نہیں کر رہا......سمجھے؟'' تصدق گرم ہو گیا۔

''تصدق صاحب!......براہِ کرم موقع کی نزاکت سمجھیں۔'' نوجوان نے ٹوکا۔

''تو یہ درمیان میں کیوں بول رہے ہیں؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی ماں، افشاں بی بی کی گمشدگی سے نیم پاگل ہوگئی ہیں۔ان کی ذہنی کیفیت درست نہیں ہے۔ ہم اُنہیں ایک پہاڑی مقام پر لے گئے تھے،لیکن اُن کے درد کا علاج پہاڑی مقام تو نہیں ہے۔آپ کی ساتھی اتفاق سے ہو بہو افشاں بی بی کی ہم شکل ہیں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔''

''کیا مطلب؟'' طالوت پھر بول پڑا۔

''مطلب یہ کہ آپ کو اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے۔''

''کس سلسلے میں؟''

''اس لڑکی کے عوض۔'' تصدق نے جواب دیا۔

''آپ ذرا نیچے بیٹھ جائیں۔'' طالوت نے کہا۔

''جی......؟'' تصدق حیرت سے بولا۔

''بیٹھیں تو سہی۔ میں آپ کے سر پر دس جوتے لگانا چاہتا ہوں۔کیا لیں گے آپ ان کا؟'' طالوت نے کہا۔

''کیا؟'' تصدق اُچھل پڑا۔

''آپ نے بات ہی ایسی کی ہے تصدق صاحب:..... معاف کیجئے، میرا خیال ہے آپ اس سلسلے میں بات نہ کریں۔'' نوجوان نے کہا۔

''آپ میری توہین کر رہے ہیں، کمال میاں!'' تصدق غرّایا۔

''آپ خود اپنی توہین کر رہے ہیں، فضول گفتگو کر کے۔'' نوجوان تیز ہو کر بولا۔

''بہتر ہے، مجھے اب اس سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔'' تصدق تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

''کچھ لوگ تعلیم یافتہ ہو کر بھی حماقت کی باتوں سے احتراز نہیں کرتے۔ میں ان کے الفاظ کی معافی چاہتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں آپ سے کوئی کام لینا چاہتا ہوں، بلکہ اس لئے کہ تصدق صاحب کے الفاظ واقعی احمقانہ تھے۔''

''خیر......آگے بڑھو۔''

''بڑی ماں کے بارے میں تفصیل آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہے۔ اتفاق سے ان کے زخم کو پھر ہرا کر دیا گیا ہے۔ اگر اس وقت آپ نے ہماری مدد نہیں کی تو ہمیں جانے کیا نقصان اُٹھانا پڑے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟''

''یہ خاتون آپ کی کون ہیں؟''

''دوست سمجھ لیں، عزیز سمجھ لیں۔''

''اگر آپ چند روز ہمارے مہمان بننا پسند کریں تو اس اُلجھن کا حل سوچنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اگر کوئی ضروری کام بھی ہو آپ کو، تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔ وہاں کا ماحول دیکھ لیں۔ آپ کی ساتھی بڑی عزت کے ساتھ چند روز رہ لیں گی۔ بڑی ماں کو کچھ ڈھارس مل جائے گی، پھر کوئی حل سوچ لیں گے۔ اگر ابھی آپ نے ان خاتون کو ان سے جدا کر دیا تو خدانخواستہ بڑی ماں بالکل پاگل بھی ہو

سکتی ہیں۔"
"یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"تو آپ...... آپ تیار ہیں؟"
"صرف انسانی ہمدردی کے طور پر۔"
"بہت بہت شکریہ۔ آپ یقین کریں، ہماری بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔ تصدق تو احمق ہے، عقل کی بات نہیں کرتا۔ یہ میں آپ کو خوش کرنے کی غرض سے نہیں کہہ رہا۔ درحقیقت اس نے حماقت کی بات کہی تھی۔ ورنہ انسانی ہمدردی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ویسے ہم آپ کی ہر مدد کے لئے تیار ہیں۔"
"مسئلہ کچھ اور ہے بھائی! ہم اپنے بارے میں تفصیل تو نہیں بتائیں گے، بس یوں سمجھو، ہم قلاش ہیں۔"
"اوہ...... اس کی تو آپ پروا ہی نہ کریں۔"
"پوری بات سن لو۔ کوئی پیشکش مت کر بیٹھنا۔ ہمیں اس ہمدردی کا کوئی معاوضہ نہیں چاہئے۔ بس دو چار روز تک دو وقت کی روٹی اور ٹرین کا ٹکٹ...... کیا سمجھے؟"
"براہ کرم ذلیل نہ کریں۔ آپ لوگ جو کوئی بھی ہیں، دلچسپ ہیں۔ کیوں نہ ہم دوستی کی فضا میں بات کریں۔"
"کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"میرا نام کمال ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں نادرہ اور شمسہ ہیں۔ بڑی ماں کے بارے میں تفصیل بتا چکا ہوں، میری ممانی ہیں۔ ماموں جان کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ ہم لوگ خاندانی ہیں۔ ابھی تک خاندانی روایات کے قائل۔ گو ذرا جدید ہو گئے ہیں، لیکن گھر کے ماحول میں ابھی تک قدامت ہے۔ افشاں باجی، ماموں جان کی اکیلی اولاد ہیں۔"
"خوب...... میرا نام عارف ہے۔ اور یہ یوسف ہیں۔ وہ لڑکی شکیلہ ہے۔"
"سگے بھائی ہیں آپ دونوں؟"
"سگوں سے زیادہ۔"
"اوہ...... گویا سگے نہیں ہیں۔ لیکن آپ دونوں کی شکلیں تو بالکل ایک جیسی ہیں۔"
"تو پھر یہی سمجھ لو کہ ہم دونوں میں شکلوں کا رشتہ ہے۔"
"اس کے علاوہ نہیں؟"
"نہیں۔"
"کمال ہے۔ لیکن کیسی حیرت انگیز بات ہے۔ آپ کی ساتھی، افشاں باجی سے اس قدر ملتی جلتی ہیں...... اور آپ......"
"ہاں، کھیل دلچسپ ہے۔"
"بہر حال، میں آپ کا بے حد ممنون ہوں عارف بھائی! آپ ہمیں برا نہ پائیں گے۔"
"لیکن یہ حضرت تبرک......" طالوت منہ بنا کر بولا۔
"تصدق ہے ان کا نام۔" کمال ہنس کر بولا۔

''میں انہیں تبرک ہی کہوں گا۔''

''آپ ان کی باتوں کی پروانہ کریں۔ کاروباری نہیں، گھریلو امور کے منیجر ہیں۔ ویسے آدمی برے نہیں ہیں۔ آپ سے دوستی ہو جائے گی تو آپ انہیں کافی دلچسپ پائیں گے۔''

''ہاں۔ ہماری دلچسپی کا سامان تو بہر حال فراہم کریں گے۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

''پھر ہماری نگاہ شکیلہ کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ اسی طرح بڑی ماں کی آغوش میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی پلکیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ شاید اس نے بڑی ماں سے اپنے افشاں ہونے کی تردید نہیں کی تھی۔ دونوں لڑکیوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''بڑی ماں کی یہ غلط فہمی کب تک چل سکے گی کمال صاحب؟''

''ان کی حالت ذرا درست ہو جائے۔ ویسے پلیز، کوٹھی چل کر بھی یہی تاثر برقرار رکھا جائے کہ وہ افشاں باجی ہیں۔ ہوگا وہی جو آپ پسند کریں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے، مقصد یہ نہیں ہے۔'' طالوت نے کہا اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

شکیلہ تو بڑی ماں سے ایسی چمٹی تھی کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یا پھر بڑی ماں اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ ہم لوگ بھی ان کے قریب بیٹھ گئے۔

بیٹی کی ہم شکل کو پا کر بڑی ماں باقی سب کو بھول گئی تھیں۔ وقت گزرتا رہا، رات ہو گئی۔ ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رُکتی اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ رات کو سب نے کھانا کھایا۔ عمدہ قسم کا کھانا ساتھ تھا۔ بڑی ماں نے اپنے ہاتھوں سے شکیلہ کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھاتے ہوئے نہ جانے کیوں شکیلہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بڑی ماں بار بار اُسے کلیجے سے لگا رہی تھی۔ کھانا ختم ہو گیا اور پھر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر بڑی ماں کو نیند آنے لگی اور اُن کے سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔

''سنو کمال، تصدق...... افشاں کو جانے نہ دینا۔ اُس کی نگرانی کرنا۔ اگر یہ چلی گئی تو میں مر جاؤں گی۔ بولو...... اگر تم اسے جانے نہ دو تو میں سو جاؤں۔ ورنہ میں نہیں سوؤں گی۔''

''میں نہیں جاؤں گی امی جان!...... میں نہیں جاؤں گی۔ آپ آرام سے سو جائیں۔'' شکیلہ نے کہا۔

''وعدہ کرتی ہو؟''

''ہاں، میں نہیں جاؤں گی۔ آپ آرام سے سو جائیں۔'' شکیلہ پھر بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بڑی ماں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر سب ان کے نزدیک سے ہٹ گئے۔ دونوں لڑکیاں پھر شکیلہ سے چمٹ گئیں۔ ہم لوگ بھی ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔

''آپ لوگوں کا تعارف نہیں ہوا۔ افشاں باجی سے آپ کی کہاں ملاقات ہوئی؟'' شمسہ نے ہماری طرف رخ کر کے پوچھا۔

''تحت الثریٰ میں۔ یہ تحت الثریٰ میں پنگ پانگ کھیل رہی تھیں۔ ہم نے انہیں چیلنج کیا۔ شرط ہوئی کہ اگر یہ ہم سے ہار گئیں تو تحت الثریٰ سے نکل آئیں گی۔ اور اگر جیت گئیں تو پھر ہم بھی وہاں رہ جائیں گے۔ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ ہار گئیں۔ اور ہم انہیں نکال لائے۔'' طالوت نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور لڑکیاں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

کمال مسکرا رہا تھا۔
''کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔''
''آپ کی عقل پر تبرک صاحب کا سایہ پڑ گیا ہے۔''
''کیا......؟'' شمسہ نے تیز ہو کر کہا۔
''ان کی طرف نہ دیکھا کریں، انہیں دیکھ دیکھ کر عقل موٹی ہوتی ہے۔'' طالوت نے تصدق کی طرف اشارہ کیا۔ تصدق اس وقت دُور نہ تھا، اُس نے طالوت کے جملے سنے تھے۔
''میں بدتمیزی پسند نہیں کرتا، سمجھے؟'' وہ تیز ہو کر بولا۔
''پھر کیا پسند ہے آپ کو، مسٹر تبرک؟''
''تبرک نہیں، تصدق۔'' تصدق غرّاتے ہوئے بولا۔
''آزادی کا دور ہے، ہمیں تبرک ہی پسند ہے۔''
''کمال میاں!...... کیا آپ نے انہیں بدتمیزی کی اجازت دی ہے؟''
''ارے نہیں نہیں...... ہم نے اجازت لی ہی نہیں۔'' طالوت نے کہا اور اس بار سب ہنس پڑے۔
''نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیوں میرا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ بہر حال، آپ لوگوں کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ براہِ راست مجھے نشانہ نہ بنایا جائے ورنہ میں بھی کوئی قدم اُٹھا سکتا ہوں۔''
''آپ درخواست لکھ کر دے دیں مسٹر تبرک! ہم اس پر غور کریں گے۔'' طالوت نے کہا۔ ''اور رہی قدم اُٹھانے کی بات، تو آپ صرف دروازے کی طرف قدم اُٹھائیں تاکہ ہم آپ کے کفن دفن کے جھگڑے سے محفوظ رہیں۔ ریلوے والے خود انتظام کر لیں گے۔''
''اوہ......اوہ...... یہ انتہا ہے۔ کاش بڑی ماں ساتھ نہ ہوتیں، میں تمہیں دیکھ لیتا۔'' تصدق نے کہا اور پھر وہ تیز قدموں سے کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔
''زیادہ زِچ نہ کریں اسے یوسف صاحب!'' کمال ہنستے ہوئے بولا۔
''میرے لئے تو وہ بہر حال تبرک ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' شمسہ پھر بولی۔
''دیا تھا...... آپ نے سنا نہیں ہوگا۔''
''اونہہ، وہ کوئی جواب تھا؟...... آپ بتائیں۔'' شمسہ بولی۔
''شمسہ......!'' کمال نے سنجیدگی سے کہا۔
''جی؟''
''تم جانتی ہو، بڑی ماں کی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے۔ یہ خاتون افشاں باجی نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کی ساتھی ہیں۔ میری درخواست پر یہ چند یوم ہمارے ساتھ گزارنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ شکیلہ خاتون بڑی ماں کی صحت کے لئے چند روز ہمارے ساتھ رہیں گی۔ اور جب بڑی ماں کی حالت نارمل ہو جائے گی تو پھر...... بہر حال...... میں نے تمہیں یہ بات اس لئے بتا دی ہے کہ تم بھی ان کی مدد کرو۔ میں کوٹھی میں کسی کو یہ نہیں بتانا چاہتا کہ یہ افشاں باجی نہیں ہیں۔''

''اوہ۔'' لڑکیاں ششدر رہ گئیں۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے شکیلہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''تو......تو یہ ہماری افشاں باجی نہیں ہیں؟'' نادرہ بولی۔

''تم کسی کو یہ تاثر نہ دو گی۔ سمجھیں؟'' کمال نے کہا۔

لڑکیاں خاموش ہو گئی تھیں۔

''اگر اجازت دیں تو ہم بھی تھوڑی دیر آرام کر لیں۔'' طالوت نے کمال سے کہا۔

''ہاں.....ضرور افشاں باجی! آپ بھی۔'' کمال نے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجئے گا خاتون! میں آپ کو شکیلہ باجی ہی کہہ کر مخاطب کرتا لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو افشاں باجی ہی کہوں۔ آپ محسوس نہ کریں۔''

شکیلہ نے گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے، شکیلہ آرام کر لیں گی۔ ہم ان سے کچھ گفتگو کریں گے۔'' طالوت نے کہا۔

''ضرور، ضرور۔ آؤ شمسہ!......انہیں آرام کرنے دو۔'' کمال نے کہا اور لڑکیاں دُور چلی گئیں۔ شکیلہ ہمارے نزدیک سیٹ پر آ بیٹھی۔

''کیوں شکیلہ؟'' میں نے کہا۔

''جی؟''

''کیسا ڈرامہ ہے یہ؟'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''بڑا دردناک۔ ایک ماں سے اس کی ممتا چھن گئی ہے۔'' شکیلہ افسوس ناک لہجے میں بولی۔

''ہاں، واقعی۔''

''میں بھی چوٹ کھائی ہوئی ہوں عارف صاحب! مجھ سے بھی میرے سارے چھن گئے ہیں۔ میں اس ماں کے دل کا حال جانتی ہوں۔'' شکیلہ کی آنکھوں میں پھر آنسو رینگ آئے۔

''گزری ہوئی باتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے شکیلہ! ویسے اگر تم ان لوگوں کی مدد کرنا چاہو، جس انداز میں بھی کرنا چاہو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو چند دن ان کے ساتھ گزار لوں۔''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے؟ تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جو مناسب سمجھو۔''

''آپ بھی......آپ بھی میرے ساتھ رہیں گے نا یوسف صاحب؟''

''ضروری ہے؟''

''اوہ؟'' شکیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس کے چہرے سے حزن و ملال ہویدا تھا۔ میں نے اُس کے احساسات کو سمجھا اور جلدی سے بول پڑا۔

''غلط فہمی کا شکار نہ ہو شکیلہ! میں جانتا ہوں، یوسف کے اس جملے سے تم کیا سوچنے لگیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے احساس ہے عارف صاحب! اور سچ بھی ہے۔ آپ کہاں کہاں میرے بوجھ کو اُٹھائے پھریں

گے۔"
"اگر تم نے آئندہ ایسی بات کہی تو میں سمجھوں گا، تمہیں ہمارے خلوص پر اعتماد نہیں ہے۔" طالوت نے منہ بنا کر کہا۔
"تو پھر مجھے بتائیے، آپ کے ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟" شکیلہ آنسو بھری آواز میں بولی۔
"اُفوہ...... حماقت کی بات نہیں۔ ہم ان کے ساتھ رہ کر ہی تمہارے احسان کی قیمت وصول کریں گے۔"
"اگر وہ اتنے ہی کم ظرف ہیں تو پھر ان کے لئے کچھ کرنے سے فائدہ؟" شکیلہ نے کہا۔
"اوہ! بات ختم کرو بھئی۔ ٹھیک ہے، ہم بھی ساتھ رہیں گے۔ شکیلہ! بس تم تیار ہو تو سب ٹھیک ہے۔ بس، اب اس موضوع کو ختم کرو۔" میں نے جھگڑا ختم کر دیا۔
پھر ہم کافی دیر تک اس موضوع پر سوچتے رہے اور آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس دوران میں اور طالوت مستقبل کے بارے میں بھی سوچ لیں گے کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے ظاہر ہے، اب حالات وہ نہیں رہے تھے، جو تھے۔ اب تو ہمیں نئے سرے سے زندگی کے راستے منتخب کرنے تھے۔
ہم لوگ بھی آرام سے لیٹ گئے تھے۔ شکیلہ، شمسہ اور نادرہ کے پاس چلی گئی تھی۔ طالوت خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے آواز دی۔ "عارف!"
"ہوں۔" میں آہستہ سے بولا۔
"نیند آ رہی ہے؟"
"نہیں۔"
"کیا سوچ رہے ہو اس وقت؟"
"کوئی خاص بات نہیں۔"
"پھر بھی؟"
"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اتنی گفتگو ہوئی، لیکن ابھی تک مجھے، تمہیں یا شکیلہ کو معلوم نہیں کہ ہم جا کہاں رہے ہیں۔"
"اوہ! یہی سوال اس وقت میرے ذہن میں تھا۔"
"ہم نے اسٹیشن ماسٹر سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ یہ ٹرین کہاں جائے گی۔ اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے معلوم کیا۔"
"ہاں، دلچسپ بات ہے۔"
"بہر حال، ہماری منزل تو یوں بھی کوئی نہیں تھی۔ جہاں چاہیں، چل پڑیں۔ یہ لوگ کہیں بھی جا رہے ہوں، ہمارے اوپر کیا اثر پڑے گا؟"
"ٹھیک ہے۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
اور پھر ہم سونے کی کوشش کرنے لگے۔ ٹرین کے ہلکے ہلکے ہلکوروں سے نیند آ گئی اور پھر صبح کو آنکھ کھلی۔ شکیلہ وغیرہ جاگ اُٹھی تھیں۔ بڑی ماں سو رہی تھیں۔ ہم لوگ بھی باتھ روم چلے گئے۔ تیار ہونے

کے بعد ہم سیٹوں پر آ بیٹھے۔ تصدق ابھی تک ایک برتھ پر دراز تھا۔ البتہ کمال منہ ہاتھ دھو کر مسکراتا ہوا ہمارے پاس آ بیٹھا۔

''سنایئے عارف بھائی!...... نیند آ گئی تھی؟''

''ہاں، سُولی پر بھی آتی ہے۔''

''آپ کے بارے میں بہت سے سوالات ذہن میں مچل رہے ہیں۔''

''مچل مچل کر کہہ کیا رہے ہیں؟'' طالوت بولا۔

''یہی کہ اے اجنبی! تُو کون ہے؟...... تُو کون ہے؟''

''اوہ...... بڑا ٹیڑھا سوال کر رہے ہیں۔ اپنے بارے میں تو خود ہم بھی تفصیل سے نہیں جانتے۔'' میں نے کہا۔

''میں جلدی نہیں کروں گا۔'' کمال مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''پہلے میں آپ کو اپنے خلوص کا یقین دلاؤں گا اور جب آپ میرے خلوص پر اعتماد کرنے لگیں گے تو خود ہی اپنے بارے میں بتا دیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ کیوں یوسف؟''

''کمال اچھا انسان ہے۔ لیکن بہرحال، ہم جلدی اپنے بارے میں تحقیقات کریں گے اور پھر انہیں فوراً بتا دیں گے۔''

''جانے دیجئے اس ذکر کو۔ کوئی اور موضوع۔'' کمال نے کہا۔

''موضوع تلاش کریں۔''

''تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چلئے، ہم آپ سے یہ سوال کر دیتے ہیں مسٹر کمال! کہ ٹرین کہاں جا رہی ہے؟''

''ٹرین تو داور پور تک جائے گی۔ لیکن ہماری منزل بس آنے والی ہے۔''

''اس منزل کا کیا نام ہے؟''

''عظمت آباد۔'' کمال نے جواب دیا اور میں حیران رہ گیا۔ ہم اپنے ہی وطن میں داخل ہو گئے تھے۔ نہ جانے پیدل سفر ہمیں کہاں لے آیا تھا۔ عظمت آباد کے بارے میں، میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ گو کبھی اس طرف آنا نہیں ہوا تھا۔

''جانتے ہو؟'' طالوت نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''ایک عرض کروں۔'' اچانک کمال بول پڑا۔

''ضرور۔''

''ہر انسان کی طبیعت میں تجسس ہوتا ہے اور مجھے آپ انسان تو تسلیم کر ہی لیں گے۔ میں بھی بہت سے معاملات میں بار بار آپ سے سوال کروں گا۔ کیونکہ وہ فطری ہوں گے۔ آپ ان سوالات سے ناراض نہ ہوں بلکہ اگر ان میں سے کوئی جواب دینے کے قابل ہو تو جواب دے دیں، ورنہ صاف کہہ دیں

لہ یہ نا قابلِ جواب ہے۔"

"کوئی سوال تمہارے ذہن میں آیا ہے کمال؟"

"ہاں پلیز، کیا آپ مجھے ایک چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ٹریٹ نہیں کر سکتے؟"

"ٹھیک ہے کمال! لیکن سوال کیا ہے؟"

"آپ لوگ اس ملک کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں!"

"ظاہر ہے، اپنوں میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں بلا مبالغہ کہہ دوں کہ آپ کی شخصیتیں بہت شاندار ہیں، میں ان سے بہت متاثر ہوں۔ ویسے آپ کہاں رہتے تھے؟"

"کٹ!" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ جواب نہ دینے میں کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں!"

"تب ٹھیک ہے۔ اچھا دوسرا سوال۔ شکیلہ باجی سے آپ کا کوئی رشتہ ہے؟"

"نہیں!"

"اوہ!"

"لیکن اپنوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اسی طرح ہم دونوں کا بھی آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن ایک دوسرے کو بھائیوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔"

"مجھے بھی آپ خود میں شامل کر لیں۔" کمال نے کہا۔

"کیا کرو گے کمال؟...... زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"ہو جانے دیجئے۔ میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔"

"کیوں بھئی، گنجائش ہے؟" طالوت نے پوچھا۔

"نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

"بڑی مہربانی ہوگی۔" کمال مسکراتے ہوئے بولا۔

"پڑھتے ہو کمال میاں؟"

"جی!"

"تمہارے ماموں کا نام کیا ہے؟"

"سیّد تنویر جمال۔ مشہور شخصیت ہیں۔"

"بہت خوب۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنے بڑے آدمی کی بیٹی کو تلاش کیوں نہیں کیا گیا؟"

"پولیس آج تک حرکت میں ہے عارف بھائی! سینکڑوں لوگ آج بھی ماموں جان سے تنخواہ لیتے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں وہ افشاں باجی کو تلاش کرتے رہے ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، ماموں جان نے کون سی کوشش نہیں کی۔ درجنوں بردہ فروشوں سے رابطہ قائم کیا، مشرقِ وسطٰی کے بہت سے محلوں میں تلاشی کرائی گئی۔ نہ جانے کیا کیا ہوا ہے۔"

"کمال ہے، کوئی پتہ نہیں چل سکا؟"

"نشان بھی نہیں ملا۔"
"تنویر صاحب کی کسی سے دشمنی تھی؟"
"بہت سے کاروباری حریف ہیں۔"
"انہیں ٹٹولا؟"
"کیا کچھ نہیں کیا۔ پولیس نے ہمارے ساتھ زبردست تعاون کیا تھا۔ افشاں باجی کی تلاش کے خیال سے کون سی جگہ تھی، جو چھوڑی گئی میرے خیال میں لاکھوں روپیہ ان کی تلاش کی کوششوں پر صرف ہوگیا۔"
"ہوں۔" طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔ میں اس وقت اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت وہ اصلی حیثیت میں ہوتا تو ان لوگوں کی مشکل حل کر دیتا۔
"ویسے کمال میاں! ان کی گمشدگی کی تفصیل تو بتائیں۔"
"یونیورسٹی گئی تھیں۔ معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ڈرائیور وقتِ مقررہ پر گاڑی لے کر گیا، لیکن پتہ چلا کہ وہ تھوڑی دیر قبل جا چکی ہیں۔ بس اتنی سی بات۔ کس کے ساتھ گئیں، کہاں گئیں، یہ آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ آپ خود سوچیں کہ کیا کیا نہ کیا ہوگا۔"
"ہوں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔
ناشتے وغیرہ کا بندوبست تھا۔ بڑی ماں جاگ گئی تھیں اور پُر سکون تھیں۔ افشاں اب بھی ان کے پاس موجود تھی۔
"ارے افشاں بیٹے! تم نے کپڑے نہیں بدلے؟" اچانک وہ بولیں۔
"یہاں میرے کپڑے ہیں کہاں امی؟"
"ایں، ہاں...... یہ ٹرین نہ جانے اتنی سست رفتار کیوں ہے؟...... تصدق! ٹرین کب پہنچے گی؟"
"بس ایک گھنٹہ باقی ہے بڑی ماں!" تصدق نے جواب دیا۔
"ڈرائیور سے کہو، تیز چلائے۔" بڑی ماں نے کہا۔
"جی بہتر۔"
"بڑی ماں! اگر آپ انہیں ٹرین سے نیچے اُتار دیں تو یہ خودبخود تیز چلنے لگے گی۔" طالوت نے تصدق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"ایں؟" بڑی ماں چونک پڑیں۔ پھر وہ تصدق کو گھورتے ہوئے بولیں۔ "ہائے تصدق! تُو اتنا موٹا کیوں ہوگیا؟ اب تک تو ہم گھر پہنچ بھی گئے ہوتے۔"
اور پورے کمپارٹمنٹ میں قہقہے گونج اُٹھے۔ تصدق کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ طالوت کی بوٹیاں چبا لے۔
"اگر آپ جلدی پہنچنا چاہتی ہیں بڑی ماں! تو انہیں نیچے اُتار دیں۔"
"آ کے رہ جائے گا بے چارہ۔ چلو، اب رہنے دو۔ آئندہ اسے کہیں ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"
"بڑی ماں!...... بڑی ماں! آپ بھی میری بے عزتی برداشت کر رہی ہیں۔" تصدق پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔
"آئے ہائے...... تُو اتنا موٹا ہو ہی کیوں گیا؟ غلطی تیری ہے۔" بڑی ماں نے کہا اور تصدق دانت

ہاتا ہوا ہماری طرف آیا۔
''میں...... میں تم لوگوں کو...... میں تم لوگوں کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد کرو گے۔ بڑی ماں کی وجہ ے خاموش ہوں...... لیکن یہ سمجھ لو، تصدق کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''
''بڑی ماں! دیکھ لیجئے، یہ تبرک ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے۔''
اور تبرک پر بڑی ماں بھی ہنس پڑیں۔
''بڑی ماں!...... اسے خاموش کر دیں، ورنہ...... ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔'' تصدق دہاڑا۔
''وعدہ لے لیں بڑی ماں!...... جلدی سے وعدہ لے لیں۔ مجھے شبہ ہے، مسٹر تبرک خودکشی نہیں کریں گے۔ اگر یہ خودکشی کرنے کی نیت سے ہی نیچے چھلانگ لگا دیں تو ٹرین کی رفتار تیز ہو جائے گی اور ہم ایک گھنٹے کا سفر آدھے گھنٹے میں طے کر لیں گے۔''
ٹرین میں قہقہے گونج اُٹھے اور تصدق...... پہلے وہ طالوت کی طرف بڑھا، پھر رُخ بدل کر دروازے کی طرف چل دیا۔ وہ گیلری میں نکل گیا تھا۔
''ہائے ہائے! کیا یہ کمبخت سچ مچ خودکشی کرنے گیا؟'' بڑی ماں بولیں۔
''ارے نہیں بڑی ماں! اتنے موٹے آدمی خودکشی نہیں کرتے۔'' طالوت بولا۔
''تم ہو کون بیٹے!...... آگے آؤ'' بڑی ماں نے کہا اور ہم دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''
''عارف اور یوسف۔''
''بھائیوں کی جوڑی ہے۔ خدا سلامت رکھے۔ میری افشاں تمہیں کہاں ملی؟''
''بس یونہی پھر رہی تھیں، حیران و پریشان۔ ہم انہیں لے آئے۔''
''بڑا احسان کیا ہے تم نے میرے لعل!...... مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔'' بڑی ماں بولیں اور سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ بڑی ماں پھر شکیلہ کو پیار کرنے لگی تھیں۔
''ذرا سی دیر میں بڑی ماں میں زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔'' کمال نے بتایا۔
''پہلے کیا کیفیت تھی؟''
''ہوش و حواس کی بات نہیں کرتی تھیں۔ ہر وقت کسی حادثے کا تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔ سو میں سے ایک بات کوئی ہوش کی ہوتی تھی۔ لیکن اب آپ نے خود محسوس کیا ہوگا!''
''ہاں، اب تو کوئی ایسی بات نہیں کر رہیں۔''
''بڑا اثر پڑا ہے۔ ماموں جان دیکھیں گے تو خوشی سے اُچھل پڑیں گے۔''
''تنویر صاحب کس قسم کے آدمی ہیں؟''
''آپ کو پسند آئیں گے۔ گو ان کے دل پر بھی گہرا زخم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ زندہ دل ہیں۔ ہاں، زخم سے پہلے تو ان کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ بچوں میں بچے، بڑوں میں بڑے۔''
''خدا کرے، اصلی افشاں بھی مل جائیں۔'' طالوت نے دل سے کہا اور کمال نے سر جھکا لیا۔
تصدق کافی دیر تک واپس نہ آیا تو کمال کو تشویش ہو گئی۔
''آیئے عارف بھائی!...... تصدق کو دیکھیں۔''

''ضرور دیکھو۔'' میں مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ہم لوگ گیلری میں نکل آئے۔ تصدق صاحب ایک جگہ پشت ٹکائے ہوئے کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور اس وقت میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔
کافی خطرناک چہرہ تھا، جس پر سے معصومیت کی چادر سرک گئی تھی۔ لیکن ہمیں دیکھ کر وہ سنبھل گیا اور پھر اُس کے چہرے پر نفرت کے آثار اُبھر آئے۔
''آپ ناراض ہو گئے تصدق صاحب؟'' کمال نے کہا۔
''نہیں۔ میں نے سوچا، آپ کے ذاتی معاملات میں مداخلت مناسب نہیں ہے۔''
''یہ تو بڑی اچھی بات ہے مسٹر تبرک!'' طالوت بول پڑا۔
''ٹھیک ہے، آپ کو مذاق اُڑانے کا حق دیا گیا ہے، میں کیا بول سکتا ہوں؟ بہر حال، مجھے ملازمت کرنی ہے۔''
''ارے ارے...... آپ تو سنجیدہ ہو گئے تصدق صاحب!...... یوسف! احتیاط کرو۔''
''میں ہر بات نہایت احتیاط سے کر رہا ہوں۔ ان سے کہو، مجھ سے دوستی کر لیں۔''
''آپ مالکان کے منظورِ نظر ہیں جناب! میں آپ کی دوستی کے قابل کہاں؟'' تصدق نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''بہتر ہے مسٹر تبرک! دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ دوستی یا دشمنی۔ اور دوستی آپ ٹھکرا چکے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ پھر وہ کمال کی طرف رُخ کر کے بولا۔
''عظمت آباد قریب آ گیا ہے کمال میاں! ہمیں تیاریاں کرنی ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ زیادہ سامان تو ہے نہیں۔ آپ اندر جائیں۔'' کمال نے کہا اور تصدق اندر چلا گیا۔ ہم تینوں خاموشی سے بھاگتے ہوئے مناظر کا نظارہ کرتے رہے۔
''ابھی چند منٹ کے بعد ماموں جان کے باغات نظر آئیں گے۔''
''زمینداری بھی ہے آپ کی؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں...... ماموں جان کے شوق بہت دلچسپ اور عجیب ہیں۔ آپ دیکھیں گے۔ یہ باغات بھی بس انہوں نے خریدے تھے یونہی۔ ایک دن کسی باغ میں جا نکلے تھے۔ یونہی کہتے رہے کہ اگر کوئی باذوق ہوتا تو اس میں یہ بنواتا، وہ بنواتا۔ پورا باغ دیکھ کر گردن ٹیڑھی کر کے بولے۔ کسی بڑے بدذوق انسان کا باغ ہے۔ اور پھر اپنے بزنس منیجر کو حکم دیا کہ کچھ عمدہ قسم کے باغات خریدے جائیں۔ تعمیل ہونے میں کتنی دیر لگتی؟ اور اب ہمارے باغات میں اعلیٰ درجے کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ ایک باغ میں حسین کاٹیج ہے، ایک سوئمنگ پول ہے جو شہر کا سب سے بڑا اور جدید قسم کا سوئمنگ پول ہے۔ دوسرے باغ میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر ہے، جس میں درندے تک موجود ہیں۔''
''بہت خوب۔''
''اکثر ہم لوگ پکنک منانے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو بھی لے چلیں گے۔''
''میں تبرک بھائی کے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' طالوت ٹھنکتے ہوئے بولا اور کمال ہنس پڑا۔
''مجھے یقین ہے کہ آپ تصدق کو خودکشی پر مجبور کر دیں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔
''مجال ہے جو مر سکے۔'' طالوت بولا۔

"گویا مرنے بھی نہیں دیں گے؟"
"میں دشمن کو مارنے کا قائل نہیں ہوں۔"
"اوہ......تو آپ کی دشمنی کنفرم ہے۔" کمال نے کہا۔
"خود اُس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی۔" طالوت نے جواب دیا۔
"اوہ! دیکھئے، عظمت آباد کے آثار ظاہر ہونے لگے۔" اچانک کمال بول پڑا اور پھر ہم خاموشی سے باہر کے مناظر دیکھنے لگے۔
عظمت آباد ریلوے اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن خاصا خوب صورت تھا۔ یہ شہر کافی سرسبز تھا۔ پلیٹ فارم پر پوری فوج استقبال کے لئے موجود تھی۔ ان میں تنویر صاحب نہیں تھے، لیکن ملازم اور اہلِ خاندان اتنے تھے کہ بس!
"لو بھئی، یہ تو نواب جلال الدین سے بھی اونچی کوئی شے ہے۔" طالوت نے کہا۔
"ہاں، لیکن افسوس ہم یہاں......" میں نے کہا اور اچانک مجھے احساس ہوا، جیسے مجھ سے غلطی ہو گئی ہو۔ میں نے طالوت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن شکر تھا، طالوت پوری طرح میری بات کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ استقبال کرنے والوں کی گرم جوشی دیکھ رہا تھا۔ لمبی لمبی کئی کاریں تھیں۔ ملازم اندر گھس آئے۔ سامان مختصر تھا۔ انہوں نے آپس میں بانٹ لیا اور پھر بڑے احترام سے بڑی ماں کو نیچے اُتار لیا گیا۔
لیکن جب شکیلہ بھی ان کے ساتھ نیچے اُتری تو ایک اودھم مچ گیا۔
"افشاں بی بی!......افشاں بی بی!" چاروں طرف سے پاگلوں کے سے انداز میں لوگ دوڑ پڑے۔
"افشاں بی بی مل گئیں......افشاں بی بی مل گئیں۔"
شکیلہ کسی قدر گھبرا گئی تھی۔ اُس نے بڑی ماں کا سہارا لیا اور پھر بڑی ماں کے ساتھ ہی جلدی سے کار میں گھس گئی۔ ہم لوگ کمال کے ساتھ دوسری کار میں بیٹھے تھے۔ پھر یہ قافلہ چل پڑا۔ کمال ایک کار کی پچھلی سیٹ پر ہمارے ساتھ بیٹھا تھا۔
"آپ نے دیکھا، کوئی ایک ہے جسے ان کے افشاں باجی ہونے پر شک ہو؟"
"ہاں۔ شاید بالکل ہی شکل ملتی ہے۔"
"میں آپ کو ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ آپ خود حیران رہ جائیں گے۔"
"شاید۔" میں نے مختصراً کہا۔
بقیہ راستہ خاموشی سے طے ہوا اور پھر ہم ایک عالیشان کوٹھی میں پہنچ گئے۔ شہر سے کسی قدر باہر ایک پُرفضا علاقے میں بنی ہوئی یہ کوٹھی دُور ہی سے عالیشان نظر آتی تھی۔ عام علاقے سے اُونچی، شاید کسی پہاڑی ٹکڑے پر بنائی گئی تھی۔ اوپر جانے کے لئے ڈھلان راستے تھے، جن پر دورویہ درخت لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دونوں طرف سرخ بجری کی روشیں تھیں۔ پھر کوٹھی کا عظیم الشان پھاٹک تھا۔ راستے چونکہ چاروں طرف سے تھے، اس لئے چار بڑے پھاٹک اور چند ذیلی پھاٹک تھے۔
ہم نے بڑے غور سے یہ ساری چیزیں دیکھیں۔ کوٹھی بھی ایک طویل رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ترتیب بھی ایک خاص انداز کی تھی۔ کوٹھی کے سامنے کے حصے میں ایک عظیم الشان لان بنا ہوا تھا، جس پر جگہ جگہ حسین مجسّمے ایستادہ تھے۔ خوبصورت فوارے، نت نئے انداز میں پانی اُچھال رہے تھے۔ اس کے

علاوہ تین سمتوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت بنگلے ایک ہی ڈیزائن میں بنے ہوئے تھے۔

بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ تنویر صاحب کے عزیزوں کے مکانات تھے۔ تنویر صاحب نے خود یہ اپنے عزیزوں کے لئے تعمیر کرائے تھے۔ بہرحال، تنویر محل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ تنویر صاحب کس قسم کے انسان ہیں۔ گاڑیاں پورٹیکو میں لگ گئیں اور بڑی ماں کو نیچے اُتارا گیا۔ شکیلہ کے سلسلے میں خوب ہنگامے ہوئے۔ ہمیں اس بے چاری کی پریشانی کا احساس تھا، لیکن بہرحال پھنس گئی تھی۔

''افشاں باجی کے سلسلے میں خوب ہنگامے ہوں گے۔ میرا خیال ہے، ہم اور آپ ان ہنگاموں سے دُور رہیں تو بہتر ہے۔'' کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسا مناسب سمجھو۔'' میں نے کہا۔

''میری ایک پیشکش ہے، اگر آپ پسند کریں۔''

''بولو۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے یہ ذیلی بنگلے دیکھے ہیں؟''

''ہاں۔''

''ان میں سے ایک میں، میں اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ پسند کریں تو میرے ساتھ ہی قیام کریں۔'' کمال نے کہا۔

''ہاں۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ جلدی یہاں پذیرائی نہیں ہوگی۔ بہرحال ٹھیک ہے، یہی سہی۔''

''اوہ! یہ بات نہیں ہے۔ آپ کی پذیرائی کے لئے میں کافی ہوں۔'' کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہم کمال کے ساتھ چل پڑے۔

یہ چھوٹے بنگلے بھی اندر سے بہت خوب صورت تھے۔ ایک خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں کمال نے ہمیں بٹھایا اور پھر اندر چلا گیا۔ ایک ملازم چند ہی منٹ کے بعد عمدہ قسم کی کافی اور دوسری چیزیں لے آیا اور پھر لباس تبدیل کر کے کمال بھی آ گیا۔

''میں نے آپ کے لئے بیڈ روم تیار کرا دیا ہے۔ چائے وغیرہ پی لیں۔ اس کے بعد اگر تھک گئے ہوں تو آرام کریں۔''

اور ہم خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ پھر ہم نے بیڈ روم دیکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ بیڈ روم بھی خوب صورت تھا۔ اس میں ہم دونوں کے لئے بستر کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

''باتھ روم موجود ہے۔''

''شکریہ کمال! ویسے ہم تمہیں زیادہ وقت تکلیف نہ دیں گے۔''

''اوہ، پلیز...... آپ سارے خیالات ذہن سے نکال دیں۔ میں ذاتی طور پر آپ سے بہت متاثر ہوں۔ اگر آپ میرے ہاں کچھ عرصہ قیام کریں گے تو مجھے دلی مسرت ہوگی۔''

''شکریہ کمال! اب اجازت ہو تو ہم کچھ دیر آرام کر لیں؟''

''ضرور۔'' کمال نے کہا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

''میں تو غسل کروں گا۔'' طالوت بولا۔

''جاؤ، پھر اس کے بعد میں بھی غسل کروں گا۔'' اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنی مسہریوں پر لیٹے

...ولم

"ے تھے۔ طالوت کسی گہرے خیال میں گم تھا۔
"طالوت!" میں نے اسے آواز دے کر چونکا دیا۔
"ہوں!"
"کیا سوچ رہے ہو؟"
"تم کچھ نہیں سوچ رہے عارف؟"
"مثلاً؟"
"ہم جس انداز میں یہاں آئے ہیں، مناسب ہے؟"
"نہیں۔"
"اگر کمال ہمیں نہ پوچھتا تو پھر ہم کس حیثیت سے یہاں رُکتے؟"
"ٹھیک ہے۔"
"چنانچہ یہاں سے نکل چلو۔ یہاں کے علاوہ کہیں بھی قیام کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہم دونوں اپنی پوزیشن عجیب محسوس کریں گے۔ بلکہ اگر تم برا نہ محسوس کرو تو میں کہوں گا کہ ہم یہاں لڑکی کے عوض روٹی کمائیں گے۔"
"اوہ!...... یہ بات ہے تو پھر اسی وقت یہ جگہ چھوڑ دو۔" میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
"نہیں۔ کچھ دیر تو رُکنا ہی پڑے گا۔ ایک بار شکیلہ سے گفتگو ضرور کریں گے۔ وہ اگر یہاں مستقل قیام کرنے پر تیار ہو تو پھر ہمارے یہاں رُکنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے عارف؟"
"کس بارے میں؟"
"کیا ہمیں ایسی صورت میں یہاں رُکنا چاہئے؟"
"ہرگز نہیں۔ کیا ہم مفلوج ہیں؟"
"رہ گئی شکیلہ کی بات، تو یار! کون بدقسمت ہوگا، جو اس شاندار پوزیشن کو ٹھکرائے گا۔"
"ہاں۔ اور پھر ہمارا اس سے لگاؤ زیادہ پرانا بھی نہیں ہے۔"
"اور خاص طور پر ایسی شکل میں عارف! جبکہ ہم خود قلاش ہیں، ہم اس بے چاری سے یہ عیش کی زندگی کیوں چھینیں گے؟"
"ٹھیک ہے طالوت! پھر کیوں نہ ہم خاموشی سے یہاں سے چلیں۔"
"نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے؟ ایک بار شکیلہ سے ملاقات ضرور کریں گے۔ اس سے کہہ کر جائیں گے۔ تاکہ وہ یہ نہ سوچے کہ ہم نے بلا ٹال دی ہے۔"
"چلو ٹھیک ہے۔"
"افسوس، وہ دوشالہ بھی جل گیا۔ ورنہ کم از کم یہی معلوم ہو جاتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔" طالوت نے افسردہ لہجے میں کہا اور میں بھی خاموش ہو گیا۔ پھر ہم خاموش لیٹے رہے اور رات کو چونکہ بے آرام رہے تھے، اس لئے نیند آ گئی۔ نیند خوب گہری تھی۔

❀

ہم شام چار بجے تک سوئے رہے، پھر جاگے، منہ ہاتھ دھویا۔ سامنے لگی ہوئی گھڑی نے چار کا گھنٹہ بجایا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر ہم تیار ہو گئے اور پھر دروازے پر آئے ہی تھے کہ ایک ملازمہ اندر آ گئی۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ ''کمال میاں نے آپ کو دیکھنے بھیجا تھا۔'' وہ بولی۔

''دیکھ لیا؟'' طالوت برجستہ بولا۔

''ہاں۔'' ملازمہ نے سادگی سے جواب دیا۔

''تو اب جاؤ۔'' طالوت بولا اور وہ بے چاری چلی گئی۔ لیکن پھر پلٹی۔

''انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ جاگ گئے ہوں تو انہیں بتا دوں۔''

''پھر تمہارا کیا خیال ہے، کیا ہم جاگ رہے ہیں؟''

''جاگ تو رہے ہیں۔''

''تو پھر بتا دو انہیں۔'' طالوت بولا اور ملازمہ پھر واپس چلی گئی۔ میں ہنس پڑا تھا۔ طالوت بھی مسکرانے لگا۔

''کمال اچھا لڑکا ہے اور شاید اسے احساس ہے کہ......'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت کمال ہمارے سامنے آ گیا۔

''خوب سوئے آپ لوگ۔ دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں! خوب گہری نیند آئی۔''

''کوٹھی میں تو قیامت مچی ہوئی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''ارے وہی، افشاں باجی کے سلسلے میں۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن یہ ملازم، کم بخت خبریں نشر کرنے کے خصوصی ذرائع رکھتے ہیں۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔''

''خوب!......تنویر صاحب کو بھی اطلاع ہو گئی؟''

''ماموں جان کل رات کو باہر گئے تھے۔ خصوصی طور پر اُنہیں اطلاع دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے، پہنچنے والے ہوں گے۔ ٹیلی فون کیا ہے۔ چار بجے پہنچ جائیں گے۔''

''حقیقت بتا دی گئی اُنہیں...''

''ابھی کہاں؟......ویسے وہ سخت حیران ہیں۔''
''ظاہر ہے، ہوں گے۔''
''اس کے علاوہ ڈی آئی جی پولیس نے بھی فون کیا تھا۔ وہ افشاں باجی سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ لیکن میں نے تصدق سے کہہ کر انہیں ٹال دیا ہے۔ ظاہر ہے، ڈی آئی جی، شکیلہ صاحبہ سے سوالات کر کے مجرموں کو پہچاننے کی کوشش کریں گے اور وہ گھبرا جائیں گی۔ چنانچہ میں نے کہلوا دیا ہے کہ ماموں جان کے آنے کے بعد افشاں باجی ان سے ملاقات کر سکیں گی۔''
''ڈی آئی جی صاحب ان سے ان کے اغوا کنندگان کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے؟''
''ہاں۔''
''اور وہ ظاہر ہے، ہمارے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، مائی ڈیئر کمال؟''
''جی؟'' کمال تعجب سے بولا۔
''میرا خیال ہے، تم ایک بار ہماری ملاقات شکیلہ سے کرادو۔ ہم جھگڑوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں پولیس کے سامنے بھی جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کیا واقعی ہمارا جرم ایسا ہی ہے؟''
''اوہ!...... ہرگز نہیں یوسف بھائی! آپ بس ماموں جان کو آ جانے دیں، پھر دیکھیں۔ براہ کرم اس وقت تک یہاں قیام ضرور کریں۔ اور اب ایک بات بتائیں۔''
''پوچھو!''
''شام کی چائے لان میں پی جائے گی۔ آپ اس میں شریک ہونا پسند کریں گے؟''
''کس حیثیت سے؟'' طالوت نے پوچھا۔
''ایک مہمان کی حیثیت سے۔''
''نہیں کمال! ہم تمہارے مہمان ہیں۔ ہمیں یہیں پلا دو تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔
''تب میرا خیال ہے، میں چھت پر بندوبست کر دوں۔ ویسے مجھے ان کے ساتھ شریک ہونا پڑے گا، یہ اصول ہے۔''
''کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
اور کمال چلا گیا۔ بنگلے کی چھت سے لان کا منظر نظر آتا تھا۔ لان میں رنگین کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔ سفید لباس میں ملبوس ملازم تیزی سے کام کر رہے تھے۔
پھر کوٹھی کے بڑے گیٹ سے ایک لمبی سیاہ سیڈان اندر داخل ہوئی اور پورٹیکو میں لگ گئی۔ اس سے ایک طویل القامت اور وجیہہ شخص نیچے اُترا۔ چہرے سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تنویر ہے۔ عمدہ شخصیت تھی۔ اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس۔ وہ نہایت بے چینی سے اندر چلا گیا تھا۔
''یہی تنویر معلوم ہوتا ہے۔''
''شاید۔'' میں نے جواب دیا۔ اور پھر خاندان بھر کے لوگ لان میں جمع ہونے لگے۔ بے شمار افراد تھے۔ تنویر صاحب اندر نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ نہ جانے کیا تماشا ہو رہا ہوگا اندر۔ ہم دل ہی دل میں تلملاتے رہے۔ لیکن کیا کرتے؟ بے دست و پا تھے، خاموش بیٹھے رہے۔ ملازم نے ہمارے لئے پُرتکلف چائے کا بندوبست کر دیا۔ اس کے ساتھ بہت سے لوازمات بھی تھے۔ ہم خاموشی اور کسی قدر بے

دلی سے چائے پیتے رہے۔ اور پھر طالوت نے مجھے اشارہ کیا۔ میں بھی کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور دیکھتا رہ گیا۔

شکیلہ پہلے ہی کون سی کم حسین تھی۔ لیکن اس وقت......اس وقت تو وہ نہ جانے کیا بن گئی تھی۔ آسمانی رنگ کی حسین اور قیمتی ساڑھی میں وہ قیامت نظر آرہی تھی۔ بڑی ماں اُس کے ساتھ تھیں اور دوسرے بہت سے لوگ۔ تنویر صاحب موجود نہ تھے۔ شکیلہ پُروقار انداز میں چلتی ہوئی لان میں پڑی کرسیوں کے نزدیک پہنچ گئی۔

''اس کے بعد'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد اگر یہ لڑکی ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کردے تو اس کا کیا قصور؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ہم نے تنویر صاحب کو کمال کے ساتھ آتے دیکھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ کرسیوں سے کافی دُور وہ رُک گئے اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد چائے شروع ہوگئی۔

لیکن اس وقت میری نگاہ شکیلہ کی طرف اُٹھ گئی تھی۔ شکیلہ بے چینی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی اور میری چھٹی حس کچھ کہنے لگی۔ لیکن میں نے طالوت سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

شکیلہ نے بڑی ماں سے کچھ کہا اور بڑی ماں بھی چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ پھر ہم نے تصدق کو ان کی طرف لپکتے دیکھا۔ تصدق جھک کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد شاید کمال کو طلب کیا گیا۔

تنویر صاحب بھی کمال کے ساتھ آگے بڑھ آئے تھے۔ پھر نہ جانے کیا اُلجھی اُلجھی گفتگو ہونے لگی اور اس کے بعد ایک گروہ چل پڑا۔ شکیلہ سب سے آگے تھی۔ چائے کی میز پر انتشار پھیل گیا تھا۔ سب پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔

کمال، شکیلہ کے برابر پہنچ گیا۔ اور پھر تنویر صاحب نے دوسرے تمام لوگوں کو روک لیا اور صرف تین آدمی آگے آنے لگے۔ یہ کمال، تنویر صاحب اور شکیلہ تھے۔

''عارف!'' طالوت نے کہا۔

''ہوں۔''

''کچھ گڑبڑ ہوگئی۔''

''دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کمال کے بنگلے میں داخل ہوگئے اور ہم ادھر سے رُخ بدل کر بے نیاز بیٹھ گئے۔ چند ہی ساعت کے بعد تینوں اوپر پہنچ گئے۔ شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ ہمارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور خاموشی سے ہماری شکلیں دیکھنے لگی۔ اس کے اندر طوفان بھرا ہوا تھا۔

''کیا آپ نے نہیں کہا تھا......کیا آپ نے نہیں کہا تھا کہ......کہ ہمیں بڑی ماں کے لئے یہ بات مان جانی چاہیے؟'' اُس نے رُندھی ہوئی لیکن تیز آواز میں کہا۔

''شکیلہ!......شکیلہ! کیا ہوگیا؟'' میں نے کہا۔

''آپ یہاں کیوں ہیں؟'' وہ بولی۔

''کمال صاحب سے پوچھ لو۔ ہم تو جا رہے تھے۔'' میں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔
''کہاں جا رہے تھے۔''
''کسی بھی جگہ۔ بہر حال، اس شہر میں نئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ تنویر اور کمال خاموش کھڑے تھے اور شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''میں..... میں اب یہاں نہیں رُکوں گی۔ مجھے افسوس ہے کمال صاحب!...... میں اتنا بڑا ظرف نہیں رکھتی۔ میری دعا ہے کہ اللہ، بڑی اماں کی مشکل حل کر دے۔ خدا کرے، افشاں بی بی خیریت سے واپس آ جائیں۔ مجھے افسوس ہے، میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رُکوں گی۔ براہِ کرم میرا لباس واپس کر دیں۔''
''تم لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے بیٹے! وہ واقعی ناقابلِ برداشت ہے۔ ٹھیک ہے، جہنم میں جائیں سب۔ میں تمہیں روکنے کی جرأت خود میں نہیں پاتا۔ لیکن اگر کچھ کہنے کی اجازت ہو تو شکر گزار ہوں گا۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''جی فرمائیے محترم!'' میں نے کہا۔
''میرے ساتھ بڑی اُلجھن ہے۔ میری خوشی ہے کہ عمر بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ افشاں کے بچھڑ جانے کا غم جتنا شدید ہو سکتا ہے، شاید تم لوگ اندازہ نہ کر سکو۔ اس کے بعد بیگم کی بیماری نے ذہن کو شدید زخمی کر رکھا تھا۔ اچانک ٹیلی فون ملا کہ افشاں مل گئی ہیں تو شادیٔ مرگ ہوتے ہوتے بچا۔ یہاں نہ جانے کیا کیا آرزوئیں لے کر آیا تو حقیقت معلوم ہوئی۔ سوچا کہ کم از کم ایک اُلجھن سے تو نجات ملے گی۔ یعنی بیگم کی بیماری..... اور پھر یہ بچی، افشاں سے اس قدر ملتی ہے کہ دل کو بہلاوا تو دیا ہی جا سکتا تھا۔ سوچو یارو! انسان ہی تو ہوں۔ کہاں تک ان اُمیدوں کو سہارا دیئے رہوں گا۔''
تنویر صاحب کی آواز میں ہلکی سی بھرّاہٹ آ گئی۔
ہم خاموشی سے اُن کی شکل دیکھنے لگے۔
''میں اس پورے کارخانے کا کرتا دھرتا ہوں، لیکن تنہا۔ کون ہے جو میرا سہارا بن سکے؟...... سنو بچو! ہوں تو بالکل غیر، یہاں تک کہ دشمنوں کے ساتھ بھی میرا یہ سلوک نہیں ہوتا۔ لیکن تمہارے ساتھ ہو گیا۔ غلطی ہو گئی۔ سزا دے لو، میں تیار ہوں۔''
''ارے نہیں تنویر صاحب!...... ہوا کیا؟'' میں نے جلدی سے کہا۔
''یہی تو بدبختی ہے کہ ابھی تک میں بھی اس سے لاعلم ہوں۔ کمال میاں نے مجھے حقیقت بتائی ہے، اسے سن کر جس قدر رنج ہوا، بیان سے باہر ہے۔ یہ کم بات ہے کہ میری بچی مل کر بھی نہیں ملی۔''
''محترم! مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟'' شکیلہ نے کہا۔
''ہاں، ہاں۔ ضرور بیٹے!''
''یہ لوگ، میرے عزیز نہیں ہیں۔ لیکن دنیا میں اب میرا ان سے بڑا عزیز کوئی نہیں ہے۔ میرے والدین مر چکے ہیں۔ جن حالات میں، میں انہیں ملی ہوں، وہ ایسے تھے کہ میری زندگی کسی وقت بھی ختم ہو جاتی۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر، بے لوث میری مدد کی اور میں نے ان سے زندگی بھر کا سہارا مانگ لیا۔ اب پوری دنیا میں میرے لئے ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ بخدا یہ سارے عیش و عشرت ان کے پسینے کے ایک قطرے سے زیادہ قیمتی نہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے اس جاہ کا؟ مجھے اس دولت کی

کیا پروا ہو سکتی ہے جو آپ کے پاس ہے؟...... میری تو دعا ہے کہ آپ کی بچی مل جائے۔ میں خود عیش کر کے ان لوگوں کو نظر انداز کیسے کر سکتی ہوں؟ بھوکی رہوں گی تو ان کے ساتھ۔ فٹ پاتھ پر رہوں گی تو ان کے ساتھ۔ ایسی شکل میں مجھے تو شہزادی بنا لیا گیا اور یہ یہاں لاوارثوں کی طرح پڑے ہیں۔ مجھے معاف کر دیں محترم! اگر یہ مجھ سے نہ کہتے تو میں بیگم صاحبہ کی کوئی مدد نہ کرتی۔ مجھے معاف کر دیں۔ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے کہ میں انہیں نظر انداز کر کے خود عیش کروں اور آپ کے کام آؤں۔''

''ہوں! تو تم تینوں ہی اعلیٰ ظرف ہو۔ ہم بھی ہیں۔ لیکن بیٹے! ابھی تک ہمارا قصور نہیں ظاہر ہوا۔ ہمیں کچھ کہنے کا موقع تو دو۔'' تنویر صاحب بولے۔

''جی فرمائیے۔''

''ہم یہاں موجود نہ تھے۔ ہمیں تحقیقات تو کر لینے دو۔ کمال! میں تم سے بھی جواب طلب کر سکتا ہوں۔''

''جی ماموں جان؟''

''ان کے لئے محل میں بندوبست کیوں نہیں ہوا؟''

''کیا یہ فرض میرا ہے ماموں جان؟...... گستاخی معاف لیکن میں جانتا ہوں، آپ صاف باتیں سننے کے قائل ہیں۔''

''یقیناً۔ کیا تصدق ساتھ نہیں تھا؟''

''تھے۔ لیکن ان کا سلوک، ان لوگوں کے ساتھ شروع سے اچھا نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' تنویر صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

''کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''بلاؤ تصدق کو۔'' تنویر صاحب نے کہا اور کمال نے جلدی سے ایک ملازم کو بھیج دیا۔

''میرے خیال میں ان تمام باتوں کی ضرورت نہیں ہے تنویر صاحب! آپ کا حکم ہے تو ہم دو ایک روز یہاں رک جاتے ہیں۔ اور شکیلہ! تم بہرحال ایک نیک کام کے لئے یہاں تک آئی ہو، ہمارے سلسلے میں جذباتی نہ ہو۔''

''مجھے ذلیل نہ کریں یوسف صاحب! براہِ کرم، آپ جانتے ہیں کہ.... کہ میں نے اپنی مرضی سے....

''افوہ! سب جذباتی ہو رہے ہیں۔''

''میری پوزیشن صاف ہو جانے دو، پھر میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' تنویر صاحب جلدی سے بول پڑے اور میں نے لان میں تتر بتر لوگوں کو دیکھا۔ بڑی شرمندگی ہو رہی تھی ہماری وجہ سے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد تصدق اوپر آ گیا۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ تنویر صاحب اُسے گھورنے لگے۔

''تم بیگم صاحبہ کو لینے گئے تھے؟''

''جی سرکار!''

''ان لوگوں سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے؟''

''جی۔''

''ساری صورتِ حال تمہارے علم میں ہے؟''

''جی ہاں۔''

''تمہاری یہاں کیا حیثیت ہے؟ تمہارے سپرد کیا کام ہے؟''

''جی.....وہ......وہ.......''

''تمہیں علم نہیں ہے کہ تمہیں آنے والے ایک ایک مہمان کے لئے حفظِ مراتب کے مطابق بندوبست کرنا ہوتا ہے؟''

''جی ہاں!''

''ان لوگوں کے لئے تم نے کہاں بندوبست کیا ہے؟''

''ان لوگوں کو یہاں ٹھہرانا مناسب نہیں ہے جناب!'' تصدق نے کہا۔

''اوہ، کیوں؟......کوئی خاص بات ہے۔''

''جی۔''

''بتا دو۔''

''یہ شریف لوگ نہیں ہیں۔ صورت ہی سے......''

''تصدق......!'' تنویر صاحب، سرد آواز میں بولے۔ ''تم واقعی بے حد ذہین ہو گئے ہو۔ میں تمہاری ذات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ دیکھو، مالیوں نے لان کی کیا حالت بنا دی ہے۔ کل سے تم صرف ان مالیوں کی نگرانی کرو گے۔ اپنی نگرانی میں سارے لان کو ٹھیک کراؤ، پھر باغوں پر چلے جاؤ۔ اتنے ذہین آدمی کو میں کوٹھی میں نہیں رکھنا چاہتا۔''

''جی......جی وہ......وہ......''

''گیٹ آؤٹ!'' تنویر صاحب حلق پھاڑ کر چیخے اور تصدق جلدی سے واپس مڑ گیا۔ ''یہ ذمہ داری اس کی تھی اور یارو! اب تم بھی فراخ دلی سے کام لے کر معاف کر دو۔'' وہ ہماری طرف مڑ کر بولے۔

''ارے، ارے تنویر صاحب! شرمندہ نہ کریں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''چلو نہیں کرتا۔ اب چلو، چائے پر چلو۔'' تنویر صاحب بے تکلفی سے بولے اور انہوں نے دونوں طرف سے ہمارے بازو پکڑ لئے۔ اب رُکنے کی کیا گنجائش تھی۔ چنانچہ ہم چل پڑے۔ اچھا خاصا تماشا بن گئے تھے۔ تنویر صاحب کے اہلِ خاندان میں ناشتے کی میز پر بڑی ماں اور شکیلہ، اس کے بعد تنویر صاحب، پھر میں اور طالوت اور ہمارے برابر کمال بیٹھا تھا۔ تمام لوگ بیٹھ گئے اور چائے شروع ہو گئی۔ ہماری یکساں شکلیں سب کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ بہر حال عجیب سی کیفیت رہی، پھر چائے ختم ہو گئی اور لوگ اٹھنے لگے۔

تنویر صاحب ہم دونوں کو لے کر لان کے ایک گوشے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے کمال کو آواز دی اور پھر ہم سے پلٹ کر اُسے ہدایات دینے لگے۔ پھر وہ واپس ہمارے پاس پہنچ گئے۔

''آؤ یہاں کچھ دیر گفتگو ہی رہے۔'' وہ بولے اور پھر ہم دونوں ان کے ساتھ ایک فوارے کے قریب پہنچ گئے۔ فوارے کے نزدیک ایک خوبصورت بینچ پڑی ہوئی تھی۔ تنویر صاحب نے ہمیں اشارہ کیا اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

''تم دونوں میں سے عارف کون ہے اور یوسف کون؟'' انہوں نے پوچھا۔
''یہ یوسف ہیں۔ عارف میں ہوں۔''
''تم دونوں بھائی ہو؟''
''نہیں، دوست۔ اور دوستی کی روایت آپ کے علم میں ہوگی۔''
''ہاں، میں جانتا ہوں۔ بعض اوقات دوستوں کی محبت، بھائیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔''
''ہم اس کی مثال ہیں۔''
''یقیناً۔ اور شاید قدرت نے تم دونوں کو ہم شکل اسی لئے بنایا تھا کہ تم دوستی کی مثال بن جاؤ۔ میری بات کا یقین کرو، میں شکیلہ کو افشاں ہی سمجھتا اگر تم دونوں کی شکلوں کی مثال میرے سامنے نہ آ جاتی۔ لیکن اس کے باوجود ابھی میرے ذہن میں کرید ہے۔ یہاں..... میں بڑا آدمی نہیں ہوں، بلکہ سخت مظلوم ہوں۔ تم قدرت کے کارخانے دیکھو۔ اس نے مجھے جی بھر کر دولت دی ہے، عیش و عشرت دیا ہے لیکن مجھ سے یقیناً کوئی ایسی خطا ہوگئی ہے، جس کی پاداش میں اس نے سب کچھ دے کر میرا سکون چھین لیا ہے۔ اب بتاؤ، کیا اس دولت کے عوض میں سکون خرید سکتا ہوں؟ میری صرف ایک ہی بچی تھی، میں نے اُسے پال پوس کر جوان کیا اور ہماری ساری محنت اچانک گم ہوگئی۔ میرے دل کا حال سمجھ سکتے ہو تو سمجھ لو۔ میرے پاس اس کے اظہار کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔'' تنویر صاحب کی آواز میں لرزش اور آنکھوں میں نمی تھی۔
''ہمیں احساس ہے تنویر صاحب!'' طالوت آہستہ سے بولا۔
''ایسی حالت میں اگر میں کچھ احمقانہ سوالات کرلوں تو قابلِ معافی ہیں یا نہیں؟''
''آپ بے فکر ہو کر بات کریں۔'' طالوت نے کہا۔
''کیا تمہارے خیال میں میری افشاں کی یہ اس قدر ہم شکل لڑکی میرے لئے معمہ نہ ہوگی؟''
''ہونا چاہئے۔''
''کیا میں اُمیدوں کے سہارے نہ لوں؟ میں تم سے اس کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کر کے ہی اپنے دل کو سکون دے سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں بہت سے خیالات ہیں، میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ ممکن ہے وہ میری افشاں ہی ہو اور کسی وجہ سے اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہو۔ کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہو، جس کی وجہ سے وہ ہمیں بھول گئی۔ اب صحیح بات اسی وقت پتہ چل سکے گی، جب تم مجھے اس کے بارے میں تفصیل بتا دو گے۔ مجھے بتاؤ، وہ کب سے تمہارے ساتھ ہے؟ کہاں تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟ کیا تم میری مدد کرو گے؟''
''کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ہمیں کچھ باتیں آپ سے چھپانا پڑیں گی، جن کے لئے آپ اصرار نہیں کریں گے۔''
''وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے افشاں، میرا مطلب ہے شکیلہ کی ذات پوشیدہ نہ رہے۔''
''ہاں، یہ درست ہے۔'' طالوت نے کہا۔ وہ تنویر صاحب کی گفتگو سے بہت متاثر تھا۔ یوں بھی اس شریف انسان کا دُکھ واقعی بہت بڑا تھا۔
''تو پھر مجھے بتاؤ۔''
''عارف! میرا خیال ہے، ہمیں تنویر صاحب سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔
''شکیلہ سے ہماری ملاقات زیادہ عرصہ کی نہیں ہے محترم! صرف ایک ہفتہ قبل ہم ملے ہیں۔ لیکن اس سے قبل ہم اسے دیکھ چکے تھے۔ اس بات کو بھی ایک ڈیڑھ ماہ سے زیادہ نہیں گزرا۔''
''اوہ!......کہاں؟......کیسے؟''
''کچھ عرصہ قبل ہم ایک ہندو ریاست درگاپور میں تھے۔ آپ کو اندازہ ہے، وہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟''
''اوہ.....درگاپور کا فاصلہ اس جگہ سے بہت زیادہ نہیں ہے۔ کیا تم لوگ وہیں کے رہنے والے ہو؟''
''نہیں۔ یونہی آوارہ گردی کرتے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہاں ہم نے اُسے ایک ہندو دیوداسی کے روپ میں دیکھا اور ہم اُس کی تلاش میں لگ گئے۔ اُس کی وجہ سے بڑے ہنگامے ہوئے۔ کیونکہ ریاست کا دیوان اسے اپنانا چاہتا تھا۔ کچھ ہندو سادھو بھی اس کے چکر میں تھے۔ بہر حال، بڑی جدوجہد کے بعد ہم نے اسے ان کے چنگل سے نکالا تو اس نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس نے ہمیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے والدین کو قتل کیا جا چکا ہے اور اب وہ تنہا ہے۔ تب ہم نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ ہماری کوئی نہیں ہے، لیکن اب سب کچھ ہے۔ ہم اُس کی عزت کے نگہبان ہیں۔''
''ہندو ریاست درگاپور......'' تنویر صاحب پریشانی سے بولے۔ اور پھر انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تو کیا اس خیال کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ریاستی ہندوؤں نے اسے اغوا کیا ہو اور اس کی یادداشت کھونے میں بھی ان ہی کا ہاتھ ہو۔ ممکن ہے، کسی مقصد کے تحت، کسی طریقے سے انہوں نے ایسا کیا ہو۔''
''ناممکن نہیں ہے۔'' طالوت نے پُرخیال انداز میں کہا۔
''تب میرے بچو! میرے اوپر احسان کرو۔ میں اس سلسلے میں لاکھوں روپیہ خرچ کروں گا۔ تم اس وقت تک میرے ساتھ یہاں قیام کرو، جب تک میں خصوصی ذرائع سے کام لے کر شکیلہ کی حقیقت معلوم نہ کرا لوں۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ مجھے اپنے دل کی لگی مٹا لینے دو۔ اگر یہ میری افشاں نہ بھی نکلی، تب بھی میں تمہارا اسی قدر شکر گزار رہوں گا۔''
''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے تنویر صاحب!'' طالوت نے جواب دیا۔
''میں تمہارا احسان مند ہوں میرے بچو!.....کاش......'' تنویر صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور ہم دونوں بھی اسی انداز میں سوچنے لگے۔ کیا واقعی.....کیا واقعی شکیلہ، افشاں ہے؟
شکیلہ کی شخصیت بے حد پُراسرار ہو گئی تھی۔ بہر حال ایک بات کا تو مجھے یقین تھا کہ شکیلہ نے اپنے بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہ ہو۔ لیکن حالات پُراسرار تھے۔ اگر ہندو سادھو اس کی یادداشت گم کرنے کے لئے کوئی کارروائی کرتے تو پھر شکیلہ خود کو شکیلہ ہی کیوں سمجھتی؟ وہ اپنے آپ کو راج ہنس ہی کہہ سکتی تھی۔ بہر حال، ابھی ہمارا ذہن بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔
''تو تم نے میری درخواست قبول کر لی ہے؟'' تنویر صاحب نے چند منٹ کے بعد کہا۔
''ہم حاضر ہیں تنویر صاحب! خدا کرے ہم آپ کے کسی کام آ سکیں۔''

''تم میرے کام آ چکے ہو میرے بچو!...... میں خفیہ طور پر چند لوگوں کو درگاپور بھیجوں گا۔ وہ وہاں رہ کر شکیلہ کے بارے میں معلومات کریں گے۔ یقین کرو، میں نے افشاں کی تلاش پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو ملازم رکھا ہے، جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ افشاں کا کھوج لگائیں۔ پولیس کے سارے ذرائع آج تک مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ حالانکہ پولیس کسی کیس میں دو چار ماہ سے زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔''

''یقیناً۔''

''بہر حال، میرے لئے دعا کرنا کہ خدائے قدوس میری یہ مشکل حل کر دے۔ میں سخت پریشان ہو چکا ہوں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''ہمیں آپ کے دکھ کا احساس ہے تنویر صاحب!'' طالوت نے ہمدردی سے کہا۔

''میں تمہارا مکمل تعاون چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر خود کو مجھ سے الگ مت تصور کرنا بیٹے! کسی سلسلے میں میرا انتظار مت کرنا۔ مجھے دلی مسرت ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، آپ بے فکر رہیں۔ ہم بڑے بے تکلف لوگ ہیں۔'' طالوت نے کہا۔ اتنی دیر میں کمال واپس آ گیا۔

''تشریف لے چلئے ماموں جان!'' اس نے کہا۔

''آؤ۔'' تنویر صاحب نے کہا اور پھر وہ ہمیں محل کے اندرونی حصے میں لے گئے، جہاں ہمارے لئے ایک عالیشان کمرہ تیار کر دیا گیا تھا۔ ''یہ تمہارا کمرہ ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو، کسی بھی ملازم کو بلا کر بے تکلفی سے کہہ دینا۔''

''جی۔'' طالوت نے جواب دیا۔ میں خاموش تھا۔ تنویر صاحب ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلے گئے۔ ''کمرہ تو عمدہ ہے عارف! کیا خیال ہے؟''

''درست فرمایا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کیا بات ہے عارف! تم کچھ سنجیدہ ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

''نہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔''

''تمہاری حماقت ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''خوب...... اچھا بیٹھ جاؤ۔'' اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ ''ہاں، اب بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ خود بھی میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''شکیلہ کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔''

''ہاں یار! سنجیدگی سے۔ شکیلہ کا کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟''

''اُلجھا ہوا ضرور ہے۔''

''مگر یہ ممکن ہے۔ ممکن بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی لمبا چکر ہو۔''

''شکیلہ جھوٹ تو نہیں بول سکتی۔''

''ہاں، اس بات کا مجھے بھی یقین ہے۔ ویسے جذباتی لڑکی ہے۔ تم نے اُس کی کیفیت دیکھی تھی؟''

''قابلِ بھروسہ ہے۔ میرا خیال ہے، اب ہم لازمی طور پر تین ہو گئے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔''

''اور اگر وہ افشاں نکل آئی تو؟''

''دیکھا جائے گا۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

''ایسے موقع پر عارف! طبیعت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ اگر میری قوتیں میرے پاس ہوتیں تو کیا ہم تنویر صاحب کی مشکل حل نہیں کر سکتے تھے؟''

''اب بھی کوشش کریں گے۔''

''ہاں۔'' طالوت نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں اپنے اپنے طور پر سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ طالوت نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ میں البتہ شکیلہ میں اُلجھا ہوا تھا۔ بات صرف تین سال کی تھی۔ اگر کوئی طویل معاملہ ہوتا تو کوئی گہری بات سوچی جا سکتی تھی۔ کیا معاملہ ہو سکتا تھا؟ اگر شکیلہ، افشاں نہیں ہے تو پھر یہ مشابہت۔ اور اگر مشابہت بھی اتفاقیہ ہے تو پھر افشاں کہاں گئی؟ کیوں نہ افشاں کے سلسلے میں باقاعدہ جاسوسی کی جائے۔

اب طالوت بھی ناکارہ ہو گیا تھا۔ ایسی شکل میں زیادہ ہی محنت کرنا ہوگی۔ بہرحال کرنا تو کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔

''میں اندر آ سکتا ہوں....؟'' اچانک دروازے سے آواز آئی اور ہم دونوں چونک پڑے۔ آواز کمال کی تھی۔

''آ جاؤ یار!'' میں نے کہا اور کمال اندر آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''سنائیے کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک...... کیوں؟''

''اوہ، کوئی بات نہیں۔ ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' اس نے بے تکلفی سے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ کوئی ضروری بات تو نہیں کر رہے تھے؟''

''نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بس شکیلہ کے مسئلے پر ہی گفتگو کر رہے تھے۔''

''اوہ...... اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو افشاں باجی کا کمرہ دکھا دوں۔''

''ممکن ہے؟''

''کیوں نہیں...... آیئے۔''

''آؤ یوسف!'' میں نے کہا اور طالوت خاموشی سے اُٹھ گیا۔ کمال ہمیں لئے ہوئے ایک دُور دراز کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازے میں تالا تھا۔ کمال نے چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا۔

''اوہ، اس کمرے میں تالا رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، مستقل۔''

''لیکن اس کی چابی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''کوٹھی کے بہت سے معاملات میرے سپرد ہیں۔ ماموں جان میرے اوپر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کچھ ذمہ داریاں میرے سپرد کر دی ہیں۔''

''اوہ!'' میں نے گردن ہلا دی۔

کمال نے کمرے میں روشنی کر دی اور سب سے پہلے ہماری نگاہ ایک قدِ آدم تصویر پر پڑی۔ بلاشبہ شکیلہ تھی۔ سرِ مُو فرق نہیں تھا۔ میں اور طالوت حیرانی سے اُسے دیکھتے رہے۔ انتہائی حسین تصویر تھی۔

''کیا خیال ہے عارف صاحب؟'' کمال کی آواز اُبھری۔

''کمال کی تصویر ہے۔''

''ہم لوگوں کی دیوانگی بجا نہیں ہے؟''

''ہاں، تمہارا شبہ درست ہے۔ لیکن ایک بات اور بتاؤ کمال! تین سال کا وقفہ بہت طویل تو نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں افشاں کی کچھ مخصوص عادات اور اس کی آواز یاد نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ ویسے آپ نے بڑی عمدہ بات بتائی۔ درحقیقت ہم سب ان کی شکل میں اس طرح اُلجھ گئے کہ ان کی آواز پر غور ہی نہیں کیا۔''

''لطف کی بات یہ ہے کہ کسی نے نہیں کیا۔''

''ہاں واقعی۔''

''ایسا تو نہیں ہے کہ لوگ افشاں کی آواز ہی بھول گئے ہوں؟''

''ممکن تو نہیں ہے یوسف صاحب!..... میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد اس کی تصدیق کروں گا۔'' کمال نے جواب دیا۔ تب ہم آگے بڑھے۔ اور میں گہری نگاہوں سے افشاں کے پورے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھا، جس سے افشاں کی پُراسرار گمشدگی پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ لیکن پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

پولیس تو پورے کمرے کو کھنگال چکی ہو گی۔ ظاہر ہے، اگر ایسی کوئی چیز ہو گی تو پولیس نے کہاں چھوڑی ہو گی۔ پھر بھی میں نے کمال سے سوال کر ہی لیا۔

''پولیس نے اس کمرے کی تلاشی بھی لی ہو گی؟''

''درجنوں بار۔ یہاں کی ایک ایک چیز دیکھی جا چکی ہے۔''

''کمال! مجھے افشاں کے بارے میں کچھ وقت پوری تفصیل بتانا۔ ہم لوگ بھی اپنے طور پر کوشش کریں گے کہ تمہاری پریشانیاں دُور ہو سکیں۔ خود تنویر صاحب نے ہم سے یہ بات کہی ہے۔''

''خدا آپ کو ہی کامیابی عطا کرے۔'' کمال نے گہری سانس لے کر کہا۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو..... وہ اپنے تبرک صاحب کہاں ہیں؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمال بھی مسکرانے لگا۔ ہم تینوں واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔

''تصدق خاصے رکھ رکھاؤ کا انسان ہے۔ نہ جانے کیوں آپ دونوں سے خار کھا گیا۔ بہرحال، بے چارے کے ساتھ بہت بری ہوئی ہے۔''

''کیوں؟''

''ارے آپ غور کریں۔ کل سے وہ مالیوں کے ساتھ کام کرے گا۔'' کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟''

''کل خود دیکھ لیں۔ ویسے بڑا تلملائے گا۔ ماموں جان عجیب فطرت کے مالک ہیں۔ اوپر سے نرم،

اندر سے سخت۔ نرم رہیں گے تو پھر بالکل نرم۔ اور اگر ان کی حکم عدولی کر دی جائے تو پھر شامت ہی آ جاتی ہے۔ تصدق کی مجال جوان کے حکم سے انحراف کرے۔''

''ملازمت چھوڑ کر نہ بھاگ جائے بے چارہ۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں۔ تصدق اس مٹی سے نہیں بنا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

''اچھا، اب اجازت دیں۔ رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔'' کمال نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ''اور ہاں سنیں۔ مجھے اپنی مرضی سے یہاں آنے کی اجازت ہے؟ آپ لوگ میری مداخلتِ بے جا سے پریشان تو نہیں ہوں گے؟''

''اجازت ہے۔'' طالوت نے جواب دیا اور کمال مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ہم دونوں واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''تصویر دیکھی تم نے؟'' میں نے طالوت سے کہا۔

''ہاں، حیرت انگیز۔ یہ مشابہت تو ہماری تمہاری طرح کی ہوگی۔''

''بہر حال، ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کریں گے کہ ممکن ہے شکیلہ ہی......''

''ہاں، ہاں۔ مگر میرا دل اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا۔''

''خیر، جو کچھ ہے، سامنے آ جائے گا۔''

''شکیلہ بے چاری عجیب اُلجھن میں گرفتار ہوگئی ہے۔''

''ہاں یار!......اسے کسی طور بلواؤ۔'' طالوت نے کہا۔

''کسی ملازم سے کہلوا دیا جائے۔ ویسے اس کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی ہے۔ مروّت میں ماری جا رہی ہے۔''

''جاؤ، اسے بلواؤ۔'' طالوت بولا اور میں باہر نکل آیا۔ میں نے ایک ملازم کو بلایا اور ملازم ادب سے میرے قریب پہنچ گیا۔ ہمارے بارے میں شاید ہدایات جاری کر دی گئی تھیں۔

''افشاں بی بی کہاں ہیں؟''

''بڑی ماں کے پاس۔''

''کیا کر رہی ہیں؟''

''بیٹھی ہیں صاب!..... بڑی ماں تو انہیں خود سے الگ ہی نہیں ہونے دے رہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''ہوں، بہر حال ان سے کہہ دو، عارف نے بلایا ہے۔''

''جی بہتر۔'' ملازم نے کہا اور واپس چلا گیا۔ میں اندر واپس آ گیا اور چند ہی منٹ کے بعد شکیلہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ وہ ہمیں دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

''کیا حال ہیں افشاں بی بی؟'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''فی الحال تو برے حال ہیں۔ اگر بڑی ماں کی محبت اسی رفتار سے جاری رہی تو میں سخت بور ہو جاؤں گی۔ مجھے ان خاتون سے ہمدردی ضرور ہے، لیکن یوسف صاحب! وہ تو مجھے ایک لمحے کے لئے بھی

ہٹنے نہیں دے رہیں۔ ہاں، تنویر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ان حالات نے ہمارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے شکیلہ! کبھی کبھی تو ہم بھی سنجیدگی سے سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"کہیں تم سچ مچ افشاں ہی نہ ہو۔"

"اس لڑکی سے میری مشابہت شاید بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کا کیا سوال ہے؟ اچھا مذاق ہے۔ شکیلہ نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایک بات بتاؤ شکیلہ؟"

"جی......؟"

"کیا تم دعوے سے کہہ سکتی ہو کہ تم درگاپور کی رہنے والی ہو؟"

"کیا مطلب ہوا اس بات کا؟"

"ممکن ہے، کوئی ایسی بات ہو، جو تمہارے ذہن سے بھی محو کر دی گئی ہو۔ ہندو یوگی بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ تم یاد کرو۔"

"عارف صاحب! یہ بات مذاق میں بھی نہیں سوچی جا سکتی۔ میں نے اپنا بچپن دُرگاپور کی گلیوں میں بتایا ہے۔ مجھے وہاں کے ذرّے ذرّے سے واقفیت ہے۔ میری گلیوں کے سارے لوگ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ آپ کی اُلجھن برحق ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہوں..... پورے وثوق سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔

"ویسے تمہارے لئے گولڈن چانس ہے شکیلہ! افشاں بن کر اپنی زندگی عیش سے گزار سکتی ہو۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دل تو چاہتا ہے کہ آپ کی اس بات پر خودکشی کر لوں۔ لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ سن لیں جناب! اگر یہ گولڈن چانس مل رہا ہے اور آپ مجھ سے جان چھڑانے کے چکر میں ہیں، تب غور سے سن لیں۔ خدا کی قسم! مر جاؤں گی، آپ کو چھوڑوں گی نہیں۔ آپ جب دل چاہے، یہاں سے نکل چلیں۔ یہ سارے عیش و عشرت یہاں کے مکینوں کو مبارک۔"

"ارے، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"نہیں بھائی! یہ سو فیصد شکیلہ ہے۔ ان سب کو چاہئے کہ اپنی لڑکی کو تلاش کریں۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اب اس میں شک و شبے کی بات نہیں ہے۔ بہرحال، معاف کرنا شکیلہ! ہماری باتوں سے تمہیں دکھ ہوا۔ اس کے علاوہ غور سے سن لیں محترمہ! ہم خود آپ جیسی پیاری دوست کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ اب تو ہمارا زندگی موت کا ساتھ ہے۔ کیوں بھائی یوسف؟"

"سنجیدگی سے یقیناً۔" طالوت نے کہا۔

''ویسے شکیلہ!....... طے یہ کیا گیا ہے کہ ہم لوگ بھی افشاں کی تلاش میں ان کی مدد کریں گے۔ اچھا ہے، ہماری وجہ سے ان لوگوں کی مصیبت دُور ہو جائے۔ یوں بھی ہم آوارہ گردوں کی کیا ہے۔''

''نہیں، یہ تو ثواب کی بات ہے۔ اس مظلوم عورت کے لئے میں بھی افسردہ ہوں۔ بیٹی کے غم میں بم دیوانوں کی سی کیفیت ہے۔ اس طرف سے آنکھیں بند کرنے پر تیار نہیں ہے کہ آنکھ کھلے گی تو خواب ٹوٹ جائے گا۔''

''اوہ، واقعی افسوس ناک بات ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔ طالوت کے چہرے پر پھر اپنی بے بسی کی جھلاہٹ اُبھر رہی تھی۔

''بہر حال شکیلہ!...... اسی لئے تمہیں تکلیف دی تھی۔ ہمیں یہاں ہر حالت میں وقت گزارنا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہم بھی تعاون کریں گے۔ تم بھی کرو۔'' میں نے کہا اور شکیلہ نے گردن ہلا دی۔

''بس تم بڑی ماں کے پاس جاؤ۔ ویسے دن میں ایک آدھ بار خود ہی موقع نکال کر ہم سے مل لیا کرنا۔''

''یقیناً۔'' شکیلہ نے جواب دیا اور پھر وہ چلی گئی۔ طالوت خاموش بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ بہر حال میں اسے سمجھاتا بھی تو کیا۔ درحقیقت بات ہی ایسی تھی کہ ایک شخص سے اُس کی شہنشاہیت چھن گئی تھی۔ وہ جس قدر افسردہ ہوتا، کم تھا۔

رات کے کھانے پر بھی وہی کیفیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا، بارات آئی ہے۔ بڑا عمدہ اجتماع تھا۔ ہمیں یہ بات بہت پسند آئی۔ معلوم ہوا کہ شام کی چائے اور رات کا کھانا اہلِ خاندان ساتھ کھاتے ہیں۔ صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے پر کوئی اجتماع نہیں ہوتا۔ بہر حال ڈنر کے بعد خوش گپیاں ہونے لگیں۔ تنویر صاحب نے پھر ہم دونوں کو گھیر لیا تھا۔

''بھئی تم لوگوں کے بارے میں مزید تفصیل نہیں معلوم ہو سکی؟''

''وہ تو خود ہمیں بھی نہیں معلوم تنویر صاحب!'' میں نے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے، درگاپور آنے سے قبل تم لوگ کہاں تھے؟''

''صحیح یاد نہیں۔ ایک طویل القامت آدمی نے ہماری گردنیں پکڑ کر باہر دھکیلتے ہوئے کہا تھا کہ تم دونوں اب ٹھیک معلوم ہوتے ہو۔ یہاں رہ کر سرکاری روٹیاں توڑنا چاہتے ہو۔ اور پھر اسی نے ایک اور شریف آدمی سے ہماری چغلی کھاتے ہوئے کہا تھا۔ ڈاکٹر! ان دونوں کے دماغ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میں انہیں یہاں سے چھٹی دینے کی سفارش کرتا ہوں۔ چنانچہ ہمیں چھٹی دے دی گئی۔''

''کیا مطلب؟'' تنویر صاحب ... دے۔

''کون سی جگہ تھی، یہ یاد نہیں،''

''ارے..... وہ...... وہ پاگل خانہ ہی ہو سکتا ہے۔'' تنویر صاحب حیرت سے بولے۔ اور کمال ہنسی نہ روک سکا۔ ''کیوں...... کیوں...... تم ہنس کیوں رہے ہو؟''

''ماموں جان! یہ لوگ انتہائی بذلہ سنج ہیں۔ باغ و بہار طبیعت کے مالک۔ کیا آپ کو ان کی باتوں پر یقین آ گیا کہ یہ پاگل خانے سے چھوٹے ہیں۔''

''بھئی میں کیا کہوں.....انہوں نے نقشہ ہی ایسا کھینچا ہے۔'' تنویر جمال صاحب بھی ہنستے ہوئے بولے۔ ہم دونوں خوش تھے۔

''بھئی اگر یہ مذاق تھا تو میں بہت محظوظ ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے، تم لوگ اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتانے پر تیار نہیں ہو۔ خیر ٹھیک ہے، میں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے ایک درخواست ہے، یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ اُٹھانا۔ یہ خانہ بے تکلف ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں تنویر صاحب! اب تو ہم یہاں جم ہی گئے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''میں کاروباری امور میں مصروف رہتا ہوں۔ میری غیر حاضری کو بھی محسوس مت کرنا۔''

''بہتر۔''

''ہاں کمال! ان کی ذمے داریاں میں نے تمہیں سونپ دی ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں ماموں جان!''

''اچھا بھئی، مجھے اجازت۔ ویسے بہت دلچسپ ہو تم دونوں۔ واقعی کمال ہے۔'' تنویر جمال صاحب ہم دونوں سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ کمال ہنسنے لگا۔

''آپ نے ماموں جان کو بھی نہیں چھوڑا۔ ویسے آخر آپ اپنے ماضی کو اس قدر چھپانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟''

''یار! ایک بات بتاؤ۔''

''جی؟''

''تمہارا تعلق کسی طور پولیس سے تو نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تب کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے طالوت کو دیکھا۔

''چلو، بتا دو۔'' طالوت نے کہا۔

''دراصل ہم لوگ جرائم پیشہ ہیں، پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ ہم دونوں نے بے شمار قتل کئے ہیں۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں یوسف؟''

''ہرگز نہیں۔'' طالوت نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور کمال ہنستا رہا۔ ظاہر ہے، اُسے یقین نہیں آ سکتا تھا۔

''ایسی صورت میں ہم اپنا ماضی کسی کو نہیں بتا سکتے۔''

''یقیناً، یقیناً۔ بہر حال آپ جو کوئی بھی ہیں، بہت دلچسپ ہیں۔ میں آپ کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ پہلے آزمائیں۔ اگر اچھا ثابت ہوں تو مجھے بھی خود میں شامل کر لیں۔'' کمال نے کہا۔

''اوہ، گویا تم بھی جرائم کی طرف راغب ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہر وہ کام کروں گا، جو آپ کریں گے۔''

''اوہ۔'' میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت بھی مسکرا رہا تھا۔ پھر ہم سنجیدہ ہو گئے اور میں نے کمال سے پوچھا۔ ''تم نے اپنا کام کیا کمال؟''

''آواز والا؟''

''ہاں۔''
''انتہائی غور و خوض سے۔ آپ نے دیکھا ہوگا، میں افشاں باجی کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔''
''ہاں۔ ہم نے غور کیا تھا۔''
''مجھے اپنی یادداشت پر ناز ہے یوسف بھیا! بے شک دوسرے لوگ اس بات پر غور نہیں کر سکے ہوں گے۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ افشاں باجی اور ان خاتون کی آواز میں نمایاں فرق ہے۔''
''ونڈر فل۔ بہرحال، دوسرے لوگ کچھ بھی سوچیں، تم یہ بات نوٹ کر لو کہ شکیلہ، افشاں نہیں ہے۔''
''میں تو تسلیم کرتا ہوں۔''
''اب تم ہمیں افشاں کی عادات و اطوار اور اس کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ تاکہ ہم بھی اس سلسلے پر تمہاری مدد کر سکیں۔'' اور کمال اپنی یادداشت کے سہارے افشاں کے بارے میں بتانے لگا۔ ہم دونوں ہی غور سے سن رہے تھے۔ لیکن درحقیقت کافی غور و خوض کے بعد بھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اور پھر کافی رات گزر گئی تو کمال ہم سے اجازت لے کر اُٹھ گیا۔
دوسری صبح جاگنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہوئے تو ایک ملازمہ اندر آ گئی۔ ''ناشتہ تیار ہے صاحب!...... لے آؤں؟''
''اوہ، یقیناً۔ ویسے صبح کا ناشتہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں کرتے ہیں؟''
''جی۔''
ٹھیک ہے، لے آؤ۔'' میں نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ نے ناشتہ سرو کر دیا۔
ناشتے کے بعد ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ طالوت کسی فکر میں تھا۔ کافی دیر کے بعد اس نے گردن اُٹھا کر کہا۔
''عارف! تم نے ایک بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔''
''کون سی بات؟''
''بھئی ہمیں کچھ روز تو یہاں رہنا ہی ہے۔''
''ہاں، رہنا پڑے گا۔''
''لباس وغیرہ کا کیا ہوگا؟...... کیا اس سلسلے میں بھی ہم ان لوگوں کے محتاج رہیں گے؟''
''نہیں طالوت! یہ تو نہ ہو سکے گا۔''
''اس کے علاوہ جیب میں بھی کچھ ہونا ہی چاہئے۔''
''یقیناً۔''
''تب اس بارے میں کیا سوچا؟''
''ہاں...... دوسروں پر لٹاتے رہے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے؟''
''کس سے لو گے؟''
''جس کے پاس ہوا۔''
''مگر کس طرح؟''
''اُفوہ، بہرحال ہم جرائم پیشہ بھی رہ چکے ہیں۔ چلو باہر نکل کر قسمت آزمائی کریں۔''

"کرو گے کیا؟"

"یہ باہر چل کر ہی سوچیں گے۔" میں نے کہا اور طالوت نے گردن جھکالی۔ میرے ذہن کا چرخہ بھی چل پڑا تھا۔ درحقیقت کام بے حد مشکل تھا۔ ہم نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ مگر جو کچھ اس وقت تھے، اس کے بارے میں سوچنا تھا۔ ڈاکہ زنی بھی آسان کام تو نہیں تھا۔ جبکہ ہماری حفاظت کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ طالوت بدستور فکرمند تھا۔ بہرحال، تیاریاں کر کے ہم لوگ نکل آئے۔

سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ہم آرام سے چلتے ہوئے بیرونی راستے کی طرف بڑھنے لگے۔ تب اچانک ایک مکان کے دروازے پر تصدق نظر آیا اور ہم چونک پڑے۔

"طالوت!" میں نے اچانک طالوت کا شانہ دبوچ لیا۔

"کیوں؟"

"تصدق۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تصدق دروازے کو تالا لگا رہا تھا۔

"ہاں۔" طالوت ہنس پڑا۔

"یہ...... یہ تنہا ہی رہتا ہے۔" میں پُرخیال انداز میں بولا۔

"ہاں۔ تالا لگانے سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔"

"اور اس کا مال بھی جائز ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ارے بھئی، اس نے ہماری بے عزتی کی تھی۔"

"کیا سوچ رہے ہو عارف؟"

"قسمت آزما لینے میں کیا حرج ہے؟"

"میں نہیں سمجھا۔"

"سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ تم اس کا تعاقب کرو۔ جب یہ کسی مناسب جگہ پہنچ جائے تو اسے باتوں میں لگالو۔ خبردار! یہ مکان کی طرف واپس نہ آسکے۔"

"ارے، ارے...... دماغ صحیح ہے؟" طالوت بوکھلا کر بولا۔

"بالکل صحیح ہے۔ تم پروامت کرو۔"

"عارف! بے عزتی نہ ہو جائے۔ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" طالوت نے پریشانی سے کہا۔

"ارے، تو ان لوگوں کو منہ دکھاتے رہنا کیا ضروری ہے؟ اور پھر تم پروامت کرو۔ میں کچا کام نہیں کروں گا۔ بس تم چل پڑو۔"

"لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کے پاس کچھ موجود ہو؟" طالوت نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوہو، قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ تم پروامت کرو۔ شاباش، چلو۔ تم اپنا کام کرو، مجھے اپنا کام کرنے دو۔" میں نے کہا اور طالوت آگے بڑھ گیا۔

میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ بہرحال ان معاملات میں میرا ذہن خوب کام کرتا تھا۔ میں نے اس کمپاؤنڈ میں بنے ہوئے مکانات کا جائزہ لے لیا تھا۔ عقبی کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں۔ ظاہر ہے،

ان کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ہوگی۔ اندر داخل ہونا مشکل کام نہیں تھا۔ ہاں، اگر دیکھ بھی لیا جاتا تو بھی کوئی دقت نہ ہوتی۔ میرے پاس ایک عمدہ بہانہ تیار تھا۔ وہ یہ کہ میں اپنے طور پر افشاں کے سلسلے میں کام کر رہا ہوں۔ اس لئے جو کچھ میں کروں، کرنے دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

تصدق کے مکان کی عقبی سمت پہنچ کر میں رُکا۔ کھڑکی بند تھی، مگر خوش قسمتی سے اس کی چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دھکیلا تو کواڑ کھل گئے اور میں خاموشی سے اندر اُتر گیا۔ اندر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے، اس لئے کھڑکی بند نہیں ہو سکی۔ بہر حال، میرے حق میں بہتر تھا۔ میں پھرتی سے مکان کی تلاشی لینے لگا۔ سامان کی بے ترتیبی سے اندازہ ہوتا تھا کہ تصدق مستقلاً تنہا رہتا ہے۔ ویسے ضروریاتِ زندگی کا سارا سامان موجود تھا۔ کسی چیز کی حفاظت کی کوشش نہیں کی گئی تھی کیونکہ کوئی بیرونی خطرہ تھا ہی نہیں۔ میں نے تصدق کی خواب گاہ کا جائزہ لیا اور پھر خواب گاہ کی الماری کھولنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ الماری میں ایک ایسا خانہ بھی نظر آ گیا، جسے تجوری کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور ایک گہری سانس لی۔ اندر چھوٹے بڑے نوٹوں کی خاصی تعداد تھی۔ اب بار بار کون ان چکروں میں پڑتا۔ جو کچھ ہے، اسی سے کام چلانا تھا۔ میں نے نوٹ اُٹھائے۔ تقریباً پونے چھ ہزار روپے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایک پستول بھی نظر آیا اور میں چونک پڑا۔

تصدق بظاہر ایک بے ضرر انسان ہے، پھر اسے پستول کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ اور میرے ذہن میں ایک کرید سی پیدا ہو گئی۔ بہر حال، نوٹ قبضے میں کرنے کے بعد میں نے الماری بند کر دی۔ حتی الامکان اپنی اُنگلیوں کے نشانات وغیرہ صاف کر دیئے اور پھر دوسرے کمروں کی تلاشی لی۔ لکھنے کی میز اور دوسری چیزیں۔ لیکن اور کوئی ایسی چیز نہیں ملی، جس سے کوئی اندازہ ہو سکتا۔

تب میں اسی راستے سے باہر نکل آیا۔ نوٹ میں نے اپنے لباس میں پوشیدہ کر لئے تھے۔ پھر میں نے طالوت اور تصدق کو تلاش کر لیا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دوستانہ فضا میں بات کرتے۔ دونوں میں خاصی تیزی ہو رہی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟'' وہ غرّایا۔

''تبرک جو ٹھہرے۔ قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔''

''ایسی تیسی تبرک کی۔ آئندہ تم نے مجھے تبرک کہا تو دانت توڑ دوں گا۔''

''دیکھو...... تم ہماری بے عزتی کر رہے ہو۔ جبکہ تنویر صاحب......'' طالوت نے کہا۔

''تنویر صاحب بھی مجھے جائز حد تک دبا سکتے ہیں۔''

''تم نے ناجائز حد تک دباؤ کیا؟'' میں نے طالوت سے پوچھا۔

''قسم لے لو جو میں نے ہاتھ بھی لگایا ہو۔'' طالوت نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''نہایت لوفر ہو تم لوگ۔ کیا تم شریفانہ گفتگو کر رہے ہو؟'' تصدق جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''اگر انہوں نے ناجائز طور سے تمہیں دبا دیا ہو تو اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں مسٹر تصدق!'' میں نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

''اور میں نے جو قسم کھائی ہے، اس کا تمہیں اعتبار نہیں ہے۔'' طالوت نے شکایتی انداز میں کہا۔

''لاحول ولاقوۃ...... میں تم سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔'' تصدق نے کہا اور تیز تیز قدموں سے ایک

طرف چلا گیا۔ طالوت نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔
''کیسا رہا؟''
''کامیابی۔'' میں نے جواب دیا۔
''کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑ آئے؟''
''فضول باتیں مت کرو۔ آؤ چلیں۔'' میں نے کہا اور طالوت میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم لوگ محل سے نکل آئے۔ ویسے ہم نے کوشش کی تھی کہ دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رہیں۔
''یار! تم عجیب انسان ہو۔'' طالوت گہری سانس لے کر بولا۔
''کیوں؟''
''یہی کہ تم نے نہایت دلیری سے تصدق پر ہاتھ صاف کر دیا۔ میں اتنی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔''
''کہیں نہ کہیں ہاتھ صاف کرنا ہی تھا۔ ویسے اس محل میں تصدق کے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں تھا۔ اب تم نے دیکھا نہیں، وہ کتنا فضول آدمی ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....''
''چھوڑو یار! بس بھول جاؤ۔ ہم لوگوں کے لئے آج تک کرتے رہے ہیں، آج ہمارے ساتھ کچھ اُلجھنیں پیدا ہوگئی ہیں تو کون سی ایسی بڑی مصیبت آ گئی۔ آخر لوگوں پر بھی تو ہمارا حق ہے۔''
''خوب حق ہے۔'' طالوت ہنستے ہوئے بولا۔
ہم بازار پہنچ گئے اور پھر ضرورت کی چیزیں خریدنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن دیر کافی لگ گئی تھی۔ جب ہم واپس محل پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ تصدق، مالیوں کے پاس بیٹھا ان سے کام کرا رہا تھا۔ دھوپ میں کام کراتے ہوئے اُس کی بری حالت ہوگئی تھی۔ ہم اُس کی نگاہوں سے بچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ ہمارے پیچھے شاید ہماری تلاش کی گئی ہو لیکن بظاہر لگتا تھا، جیسے کسی کو ہمارے جانے اور آنے کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ بہرحال، ہم نے جلدی جلدی سارا سامان سیٹ کیا اور باتھ روم جا کر منہ ہاتھ دھویا۔
ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ شمسہ آ گئی۔ یہ لڑکی ٹرین میں بڑی ماں کے ساتھ تھی۔ چہرے سے شوخ شریر معلوم ہوتی تھی۔ ابھی تک ہماری اس سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی تھی۔
''اوہ، شمسہ.....'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔
''آپ کو میرا نام کیسے معلوم؟''
''بس یہ ہماری خوبی ہے۔''
''میری شکل بھی یاد ہے نا؟''
''کیوں نہیں۔''
''میں ذاتی طور پر آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''
''کریں۔'' میں نے کہا۔
اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہونٹوں کو زبان سے تر کرتی ہوئی بولی۔ ''میں بیٹھ جاؤں؟''
''بیٹھ جائیں۔'' طالوت اچانک بول پڑا اور اس نے چونک کر طالوت کی شکل دیکھی، پھر جلدی سے

ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ کسی قدر نروس ہو گئی تھی۔ باری باری وہ ہم دونوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔
پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور بولی۔ ''میں آپ لوگوں سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''
''جی فرمائیے۔''
''دیکھئے، یہ ساری گفتگو میں ایک دوست کی حیثیت سے کر رہی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے پوری تفصیل بتا دیں۔''
''جی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''میرا مطلب ہے، افشاں باجی کے سلسلے میں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا راز، راز رکھوں گی۔ بس میں اپنے طور پر آپ کی مدد کروں گی۔ اگر آپ کسی اُلجھن میں ہوں گے، تب بھی میں آپ کے ساتھ تعاون کروں گی۔'' اس نے کہا اور میری رگِ شرارت بھڑک اُٹھی۔
''مس شمسہ!'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
''جی!''
''آپ نے غور کر لیا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''
''اچھی طرح۔'' شمسہ نے کہا۔
''پھر سوچ لیں۔ ہم کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔''
''میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔''
''وعدہ کرتی ہیں؟''
''کیسا وعدہ؟''
''کیا خیال ہے یوسف! کیوں نہ ہم ان خاتون پر اعتبار کر لیں؟''
''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' طالوت میری شرارت سمجھ گیا تھا۔ وہ بھی بالکل سنجیدہ تھا۔
''ٹھیک ہے، کسی نہ کسی کو تو رازدار بنانا پڑے گا۔ اس کے بغیر کام چلنا مشکل ہے۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا اور پھر میں شمسہ کی طرف متوجہ ہو کر سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا مس شمسہ! کہ آپ ہم سے کچھ معلوم کر لیں گی؟''
''مجھے شبہ تھا کہ آپ اپنے سینوں میں کوئی راز چھپائے ہوئے ہیں۔''
''اوہ! بے حد ذہین ہیں آپ۔ آپ کا کیا خیال ہے، مس افشاں ہمارے ہاتھ کیسے لگیں؟''
''میں یہ بات نہیں جان سکی۔''
''مس شمسہ! درحقیقت یہ بہت گہرا راز ہے۔ ہمارا تعلق ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے، جو لڑکیوں کو اغوا کرتا ہے۔'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور شمسہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ ''مس افشاں کو بھی ہمارے گروہ کے کچھ لوگوں نے اغوا کیا تھا۔ ہم لڑکیوں کو اغوا کر کے فروخت کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں، جو جس قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، خود اس کی پیشکش کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ہم ان سے ان کی قیمت وصول کر کے انہیں رہا کر دیتے ہیں۔ مس افشاں نے بھی اپنے بارے میں بتایا کہ وہ بہت بڑے آدمی کی لڑکی ہیں۔ انہوں نے ہمیں پیشکش کی کہ ہم انہیں فروخت نہ کریں۔ وہ اپنے

وطن چلیں گی اور نہ صرف اپنی قیمت ادا کریں گی بلکہ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے بدلے دو اور لڑکیوں کو اغوا کرادیں گی۔"

"کیا؟" شمسہ اُچھل پڑی۔

"ہاں۔ اس طرح ہمیں دوہرا منافع ہوگا۔ رقم کی رقم ملے گی اور لڑکیاں کی لڑکیاں۔ مس افشاں نے پکا وعدہ کیا ہے اور بہت جلد وہ ان دونوں لڑکیوں کو ہمارے حوالے کرنے والی ہیں۔ ہم ان کے اشارے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اوہ، عارف!...... عارف! یہ کیا کر رہے ہو؟" طالوت جلدی سے بول پڑا اور میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔

"کیوں، کیا بات ہے یوسف؟"

"میرا خیال ہے، تم نے جلد بازی سے کام لیا۔ تمہیں یہ راز کسی طور افشا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے، مس شمسہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک ہوں۔ بلکہ تم بھول گئے، ٹرین میں مس افشاں نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کیا اس اشارے کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا شکار یہ دونوں ہی ہوں؟"

"اوہ!" میں اچانک خاموش ہو گیا۔ شمسہ درحقیقت بوکھلا گئی تھی۔ وہ اضطراری طور پر کھڑی ہو گئی۔ ہمارے چہروں کی سنجیدگی ہمارے ان الفاظ کی تصدیق کر رہی تھی۔

"مس شمسہ! آپ نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے راز کو راز رکھیں گی۔ کیا ہم اُمید رکھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں...... لیکن...... لیکن خدا کے واسطے، آپ بتا دیں، کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟" شمسہ نے کہا۔

"ہم سنجیدہ ہیں مس شمسہ! لیکن کان کھول کر سن لیں، آپ ہمارا راز، راز رکھیں گی۔" آخر میں میرا لہجہ سخت ہو گیا اور شمسہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ...... آپ بے فکر رہیں۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں ہاتھ جھاڑ کر طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ضرورت تھی اسے خوف زدہ کرنے کی؟" طالوت نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"ارے وہ ہمارے بارے میں معلومات فراہم کرنے آئی تھی۔ ہم نے اسے ٹھیک بات بتا دی۔"

"یہاں کی پوزیشن ویسے ہی عجیب ہے۔ ویسے اب پروگرام کیا ہے؟ ظاہر ہے، ہم یہاں روٹیاں تو نہیں توڑتے رہیں گے۔" طالوت بولا۔

"افشاں کے سلسلے میں جاسوسی کریں گے۔"

"کہاں جھک مارو گے؟"

"کمال نے جو حالات بتائے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہرحال افشاں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ احمق نہیں تھی۔ اور اگر میرا اندازہ درست ہے تو اسے اغوا کرنے والوں کا مقصد مالی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا۔"

''وہ کیسے؟''

''دیکھو نا۔ طویل عرصہ ہو چکا، اگر کوئی مالی مفاد حاصل کرنا ہوتا تو اب تک مطالبہ ہو سکتا تھا۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ تب پھر؟''

''یا یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ کسی نے......'' میں نے کہا اور اچانک طالوت چونک پڑا۔ طالوت کو میرے چونکنے کا احساس ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''یار! میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔''

''کیا؟''

طالوت! میں نے تصدق کے سامان میں پستول دیکھا تھا۔''

''تو پھر؟''

''تصدق بظاہر بے ضرر انسان ہے۔ لیکن اس کے چہرے کی ایک جھلک مجھے اب تک یاد ہے۔''

''تفصیل بتاؤ۔''

''ٹرین میں وہ کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا اور باہر اس کے چہرے کے تاثرات کافی خوفناک تھے۔''

''غور کیا ہے۔''

''کیا ہم افشاں کے اغوا میں تصدق کی شمولیت پر غور نہیں کر سکتے؟''

''ارے کیوں مروانے پر تلے ہوئے ہو بے چارے کو۔ اگر اس بات کا تذکرہ عام ہو گیا تو اسے اب بھنگیوں کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔''

''تنویر صاحب اس کی کھال کھنچوا کر تمہیں پھر دادیں گے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بہر حال، معلومات تو حاصل کرنا ہی ہیں۔''

''تصدق کے بارے میں؟''

''ہاں۔''

''ضرور کرو۔ اُس بدنصیب کی شامت ہی تو آئی تھی اور اس کا اندازہ اسے پہلے ہی ہو گیا۔ اسی وجہ سے وہ شروع سے ہمارے خلاف ہے۔ مگر کرو گے کیا؟''

''پہلے پستول کا مسئلہ حل کر لیا جائے۔''

''کس طرح؟''

''کمال سے اس کے بارے میں معلوم کریں گے۔''

''ٹھیک ہے بھائی! یہ تمہاری دنیا کی باتیں ہیں۔ ضرور معلوم کرو۔'' طالوت نے بے زاری سے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ طالوت کا بجھا بجھا پن صاف نظر آتا تھا اور بہر حال یہ حقیقت تھی۔ وہ اپنی دنیا کا شہزادہ تھا۔ اس سے اس کی ساری چیزیں چھن گئی تھیں۔ گویا اس کی شخصیت ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس پر وہ افسردہ نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

اور پھر دوسرے دن ہم نے کمال کو پکڑ لیا۔ ''یہ تصدق کب سے ہے تنویر صاحب کے پاس؟''

''طویل عرصہ سے۔ یوں سمجھ لیں، یہیں پرورش پائی ہے۔ تعلیم وغیرہ بھی ماموں جان نے ہی

دلوائی ہے۔"

"آدمی کس قسم کا ہے؟"

"برا نہیں ہے، بس تھوڑا سا کریک ہے۔"

"بعض اوقات شکل سے بے حد خطرناک نظر آتا ہے۔"

"کون تصدق؟" کمال ہنس پڑا۔

"ہاں!"

"وہ سب کچھ ہو سکتا ہے یوسف بھائی! لیکن خطرناک نہیں ہو سکتا۔"

"میں نے محسوس کیا ہے، جیسے اُس کی جیب میں پستول رہتا ہو۔" میں نے کہا۔

"ارے توبہ، وہ پستول کے نام سے ہی بے ہوش ہو جائے گا۔" کمال بدستور ہنستے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں۔ ممکن ہے، تنویر صاحب نے اُسے حفاظت کے لئے پستول دیا ہو۔"

"نہیں جناب! اوّل تو یہاں ایسی حفاظت کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی اور پھر اس کے لئے تصدق کا انتخاب تو بہت بڑا لطیفہ ہے۔" کمال نے جواب دیا اور ہم خاموش ہو گئے۔

کمال کے چلے جانے کے بعد میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"بہر حال، دال میں کالا تو نظر آ گیا۔"

"کیا مطلب؟"

"تصدق اندر سے [illegible] کچھ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی الماری میں پستول دیکھا ہے۔ گویا جو کچھ وہ اوپر سے ہے، یہاں کے لوگوں کو صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ اس نے اپنی دوسری شخصیت دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھی ہے۔"

"تم کیوں اس بے چارے کے لئے مصیبت کھڑی کر رہے ہو؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے پستول دیکھا ہے طالوت! میں اسے کیسے نظر انداز کر دوں؟"

"مت کرو بھائی! مگر اب کرو گے کیا؟" طالوت نے کہا اور میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔"

"کرا دو...... وہ بھی کرا دو۔" طالوت طویل سانس لے کر بولا۔

"تصدق کس خاموشی سے چھ ہزار کی چوری پی گیا ہے۔ کسی کی زبان سے تم نے اس چوری کی کہانی سنی؟"

"اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے؟" طالوت نے پوچھا۔

"ممکن ہے، وہ رقم ایسی ہو، جس کے بارے میں تصدق کسی سے تذکرہ بھی نہ کر سکتا ہو۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے اسے صبر کر لیا۔ کسی سے کہنا بھی پسند نہیں کیا۔"

"ممکن ہے۔" طالوت نے پُر خیال انداز میں جواب دیا اور میں بھی خاموش ہو گیا۔

"بہر حال، تصدق کو کریدنا ضروری ہے۔"

"اب کیا کرید و گے؟"

"بس، اُس پر نگاہ رکھی جائے۔ میرا خیال ہے، ہم دونوں مل کر ایک بار پھر اس کے مکان کی تلاشی

لیں۔"

"یار! ان معاملات میں اس طرح کام کرنے سے مجھے واقعی خوف معلوم ہوتا ہے۔ دراصل ان لوگوں کے ساتھ، جو باعزت ہوں اور عزت کرتے ہوں، رہ کر کوئی گڑبڑ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"خیر، کچھ اور سوچیں گے۔" میں نے گردن ہلا دی۔

کئی دن اور کئی راتیں گزر گئیں۔ بڑا سست وقت گزر رہا تھا۔ ہم لوگ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ تنویر صاحب سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ وہ عموماً کاروباری دوروں پر رہتے تھے۔ ویسے جب آتے تھے تو ضرور ملتے تھے۔ محل میں کئی دلچسپیاں تھیں۔ لڑکیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ہم چاہتے تو ان کے ساتھ تفریح کر سکتے تھے۔ لیکن ابھی تک ایسا کوئی پروگرام نہیں ہو سکا تھا۔ اس دن شمسہ سے جو گفتگو ہوئی تھی، وہ گھومتی ہوئی کمال تک پہنچی اور کمال قہقہے لگاتا ہوا ہم تک آ پہنچا۔

"شمسہ ممکن ہے، گھر چھوڑ کر بھاگ جائے۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"وہ بردہ فروشوں سے بہت خوفزدہ ہے۔" کمال نے کہا۔

"اوہ!"

"بہرحال، میں نے اس کا کافی مذاق اڑایا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک سنجیدہ ہے۔ ویسے معاملہ کیا ہوا تھا عارف صاحب؟"

"وہ جاسوسی کرنے آئی تھی۔ کہنے لگی، ہم اسے افشاں کے بارے میں سب کچھ بتا دیں۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اور میں نے سب کچھ بتا دیا۔" میں نے معصومیت سے کہا اور کمال پھر ہنس پڑا۔ کافی دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا۔

"بڑی سست زندگی گزر رہی ہے یوسف بھائی! کیوں نہ کوئی تفریحی پروگرام بنایا جائے؟"

"بنا لو۔ ویسے بھی تو تمہارے مہمان ہیں۔"

"اوہ!...... آپ نے کبھی فرمائش نہیں کی۔ بہرحال یہ کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن ایک کام آپ کو کرنا پڑے گا۔"

"کیا؟"

"افشاں باجی...... میرا مطلب ہے شکیلہ خاتون کو ساتھ لے جانے کے لئے آپ کو ان سے ہی بات کرنا ہوگی۔ وہ بڑی اماں سے کہیں۔ اگر وہ کہیں گی تو بڑی ماں سب کو اجازت دے دیں گی۔"

"ہاں، کیا حرج ہے؟ میں کہہ دوں گا شکیلہ سے۔"

"بس تو پھر طے۔ کل کا پروگرام رکھ لیا جائے۔ آپ آج ہی یہ کام کر لیں۔ میرا خیال ہے، دوپہر کے کھانے کے بعد مس شکیلہ سے آپ گفتگو کر لیں اور ان سے کہہ دیں کہ شام چار بجے تک آپ کو جواب دے دیا جائے۔ ہم ماموں جان کے ایک باغ میں پکنک کو چلیں گے۔ اس پورے علاقے میں سیر و تفریح کے لئے ماموں جان کے باغوں سے عمدہ جگہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"اوکے۔ میں بات کر لوں گا۔ لیکن ایک وعدہ تمہیں بھی کرنا ہوگا۔"

"کیا؟"

''بھائی تبرک کے بغیر زندگی ہی بے مزہ ہے۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوئے تو کیا خاک لطف آئے گا۔''

''ہاں۔ تصدق کے بغیر تو زندگی واقعی بے مزہ ہے۔ وہ کیوں نہ ہوں گے؟'' کمال ہنستے ہوئے بولا۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ تیاریاں کرلو۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد شکیلہ سے گفتگو کروں گا۔'' میں نے کہا اور پھر کھانے کی میز پر میں نے شکیلہ کو اشارہ کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تو شکیلہ بڑی ماں کے ساتھ اندر چلی گئی لیکن پندرہ منٹ کے بعد ہی وہ واپس ہمارے کمرے میں آ گئی۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا نا یوسف صاحب؟''

''ہاں بیٹھ جاؤ۔'' طالوت نے کہا اور شکیلہ بیٹھ گئی۔ ''کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

''بس وہی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہے۔''

''پکنک کا پروگرام ٹھہرا ہے۔''

''اوہ......!'' شکیلہ نے آہستہ سے کہا۔

''تمہیں بڑی ماں سے اجازت لینا ہے۔''

''میرا خیال ہے، وہ میری بات نہیں ٹالیں گی۔''

''بس تو ان سے بات کرلو۔ کل ہم پکنک پر چلیں گے۔ اجازت لینا ہی ہے۔''

''میں لے لوں گی۔'' شکیلہ نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی اور پھر شکیلہ چل دی۔

تنویر صاحب موجود نہیں تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بہرحال اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن بہت سی گاڑیاں تنویر صاحب کے باغ صوفیہ کی طرف چل پڑیں۔ ان میں تنویر صاحب کے خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ ہماری جیپ میں بھائی تبرک مہمانِ خصوصی تھے۔ باقی شکیلہ تھی، کمال تھا، نادرہ تھی، ہم دونوں تھے۔ شمسہ البتہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھی تھی۔

تصدق کا منہ بدستور پھولا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے اور طالوت کی رگِ شرارت بھڑک رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑے پیار سے انہیں پکارا۔

''بھائی تبرک!'' تصدق چونک پڑا۔

''جی فرمائیے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ناراض ہیں؟''

''آپ سے ناراض ہو سکتا ہوں؟ مالکان کے منہ چڑھے ہیں اور مجھے بہرحال ملازمت کرنی ہے۔'' تصدق نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں......ایسا بھی کیا۔ ہر انسان کو عزت عزیز رکھنا چاہئے۔ ملازمتیں تو بہت مل جاتی ہیں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''اوہ! اب میں سمجھا۔ شاید آپ نے یہاں ملازمت حاصل کرنے کے لئے یہ چکر چلایا ہے۔ لیکن آپ میری جگہ لینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ تنویر صاحب سے کہیں، کچھ اور بندوبست کر دیں گے۔''

''میری بات ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا ہے، کسی طرح تبرک سے جان چھڑا دو، اس کی جگہ دے دوں گا۔ فی الحال اور کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔'' طالوت نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے نہیں یوسف بھائی! آپ کہاں ملازمت کرتے پھریں گے۔ جانے دیں۔'' کمال نے ہنستے ہوئے مداخلت کی۔

''ہاں.....اور کیا؟.......اور پھر آپ کو ملازمت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آپ کی ملازمت تو لگی ہوئی ہے۔'' تصدق نے بھرپور چوٹ کی اور مجھے غصہ آ گیا۔

کمال بھی ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شکیلہ اُلجھن آمیز نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے پھر بدتمیزی کی تصدق صاحب!'' کمال سنجیدگی سے بولا۔

''سوچ سمجھ کر کی ہے۔ براہِ کرم آپ مداخلت نہ کریں۔'' تصدق غرّایا۔

''یعنی.....کیا مطلب؟'' کمال نے بھی بگڑ کر پوچھا۔

''اس سے پہلے وہ بدتمیزی کرتے رہے ہیں۔ آپ اس وقت کچھ نہیں بولے۔ میں بھی کہاں تک برداشت کر سکتا ہوں؟ میں تنویر صاحب کو جواب دے لوں گا۔ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو تو آپ انہیں سمجھا لیں۔'' تصدق نے کہا۔

''بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم لوگ پکنک پر چل رہے ہیں، نہ کہ جھگڑا کرنے۔'' شکیلہ اُلجھ کر بولی۔

''ڈرائیور! گاڑی روکو۔'' کمال نے غصیلے انداز میں کہا اور ڈرائیور نے جیپ روک دی۔ ''آپ نیچے اُتر جائیے مسٹر تصدق!'' کمال نے کہا۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟''

''آپ فوراً نیچے اُتر جائیے۔ آپ چاہیں تو کسی دوسری گاڑی میں آ سکتے ہیں۔ نہ آنا چاہیں تو واپس چلے جائیں۔''

''یہاں سے میں کیسے واپس جاؤں گا؟'' تصدق بھی غرّایا۔

''میں نہیں جانتا۔'' کمال نے کہا اور تصدق دانت پیستا ہوا نیچے اُتر گیا۔ ''چلو!'' کمال نے کہا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔

''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔'' شکیلہ نے پریشانی سے کہا۔

''ٹھیک ہے افشاں باجی! آپ فکر نہ کریں۔'' کمال نے جواب دیا۔ تصدق کسی دوسری گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا۔

تنویر صاحب کا باغ واقعی بے حد حسین تھا۔ اسے ایک اعلیٰ پائے کی تفریح گاہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ سوئمنگ پول، اعلیٰ مکان، خوبصورت روشیں، بعض مقامات کو بے حد حسین شکلیں دی گئی تھیں اور پھر کھانے پینے کا عمدہ بندوبست۔ تصدق کے واقعے سے طبیعت کچھ مکدر ہو گئی تھی۔ لیکن بہرحال دوسرے لوگوں کو کوئی تفصیل نہیں معلوم تھی۔ اور پھر یوں بھی تصدق کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی، اس لئے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ لڑکیوں نے ٹولیاں بنا لیں۔ لڑکوں نے الگ ٹولیاں بنا لیں۔ نہانے کا پروگرام بنایا گیا۔ پھر دوپہر کا عمدہ کھانا۔

طالوت کو سوئمنگ پول بے حد پسند آیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر نہانے کا پروگرام بنایا گیا اور ہم سوئمنگ پول میں اُتر گئے۔ یوں شام کے تقریباً چار بج گئے، تب کمال نے واپسی کی تیاری کی تجویز پیش کی۔

''بالکل۔'' ہم نے تائید کی۔

''چلو، سب کو اطلاع کر دو۔'' کمال نے کچھ ملازموں سے کہا اور ملازم باغ میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے لوگوں کو اطلاع دینے دوڑ گئے۔ ساری ٹولیاں یکجا ہونے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد سبھی واپس آ گئے۔

''شکیلہ کہاں ہے؟'' طالوت نے کہا اور میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''شکیلہ کہاں ہے کمال؟'' میں نے پوچھا۔

''ایں...... ہاں...... افشاں باجی کہاں ہیں؟'' کمال بھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر ہم دوسروں سے شکیلہ کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ اور پھر عجیب سی پوزیشن ہو گئی۔ پتہ چلا کہ شکیلہ کو کافی دیر سے کسی نے نہیں دیکھا۔

نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا اعلان کرنے لگی۔

اور پھر سب ہی پورے باغ میں پھیل گئے۔ ایک ایک گوشہ چھان مارا گیا لیکن کسی جگہ شکیلہ کا پتہ نہیں چل سکا۔ بڑی عجیب پوزیشن تھی۔ آخر شکیلہ کہاں گئی؟

سب ہی خوف زدہ ہو گئے تھے۔ رات ہو گئی لیکن شکیلہ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

''عارف!'' طالوت نے ایک گوشے میں جا کر کہا۔

''کیا شکیلہ کی گمشدگی میں تصدق کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟'' طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔

''تصدق۔'' میں چونک پڑا۔

''ہاں۔ وہ کمینہ فطرت انسان ہے۔ ممکن ہے، اس نے کسی انتقامی جذبے کے تحت ایسی کوئی حرکت کی ہو۔''

''میں نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ ثابت کرنا سخت مشکل ہو گا۔''

''میں اس سے اُگلوالوں گا۔ اگر اس نے انتقاماً یہ حرکت کی ہے تو پھر اسے معاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' طالوت نے غرّاتے ہوئے کہا۔

''لیکن طالوت! اس حرکت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟''

''بس انتقام۔ ہمیں پریشان کرنے کی کوشش۔''

''لیکن یہ تو جرم ہے۔''

''وہ صورت ہی سے جرائم پیشہ معلوم ہوتا ہے۔''

''بات بہت اُلجھی ہوئی ہے۔ اگر مذاق ہی مذاق میں یہ معاملہ اس حد تک سنجیدہ ہو گیا ہے تو......''

''تو پھر اور بتاؤ، شکیلہ کہاں جا سکتی ہے؟''

''ممکن ہے طالوت! اس کی گمشدگی میں دوسروں کا ہاتھ ہو۔''

''دوسرے کون؟''

''وہ، جنہوں نے افشاں کو غائب کیا ہے۔'' میں نے کہا اور طالوت کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے شدید اُلجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ کس قدر کوفت میں مبتلا ہے۔ وہ ایک اشارے میں سارے راز کھول سکتا تھا، لیکن اب اُس کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر

سکتا تھا۔

''ہو سکتا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

اور پھر کمال ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ''اب کیا ہوگا عارف بھائی؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''بڑی پریشانیاں کھڑی ہو گئیں۔ آخر وہ یہاں سے کہاں جا سکتی ہے؟''

''کمال! کیا ہم اس میں تصدق کے ہاتھ پر غور کریں؟'' میں نے کہا اور کمال بھی اُچھل پڑا۔

''تصدق؟...... مگر کیوں؟''

''ہم سے انتقام۔''

''ممکن نہیں ہے۔ لیکن آپ اس بارے میں تحقیقات کر سکتے ہیں۔ تصدق کی فطرت میں گھنا پن بہت ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک جا سکتا ہے۔''

''وہ جہاں تک جا سکتا ہے، ہم اسے واپس بھی لا سکتے ہیں۔''

''اب کیا کِیا جائے؟''

''کوئی ممکنہ جگہ رہ گئی ہے؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

''بس تو واپس چلو۔''

''بڑی ماں کی حالت پھر خراب ہو جائے گی۔''

''بہر حال، انوکھی واردات ہے۔ ہم بھی سخت پریشان ہیں۔'' میں نے کہا اور کمال خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس چل پڑے۔ جتنے لوگ پکنک پر آئے تھے، وہ سخت پریشان تھے۔ اور پھر گھر واپس آئے تو کہرام مچ گیا۔ بہر حال، شکیلہ کی گمشدگی کی اطلاع بڑی ماں کو دینا ہی تھی۔ حسبِ معمول بڑی ماں کے اوپر بہت برا اثر ہوا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ خلاء میں گھورتی رہیں، پھر پلٹ کر سو گئیں اور جاگیں تو ان کی وہی کیفیت تھی۔

''تصدق...... تصدق کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''باہر موجود ہے۔ بلاؤں بڑی ماں؟''

''نہیں۔ اُسے بتا دو، حادثہ ہو گیا۔ پھر حادثہ ہو گیا۔'' بڑی ماں نے درد بھرے لہجے میں کہا اور سب کے دل دُکھ کر رہ گئے۔ ہم دونوں بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ طالوت نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور میں اُٹھ گیا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ طالوت کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اور پھر اس نے ایک ملازم کو روکا۔

''تصدق کہاں ہے؟''

''اپنے مکان میں گئے ہیں جناب!''

''آؤ۔'' طالوت نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

''کیا خیال ہے طالوت؟''

''تصدق سے بات کریں گے۔''

''براہِ راست؟''

''ہاں!''

''مگر کیا یہ مناسب رہے گا؟''

''اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔'' طالوت کے لہجے میں غرّاہٹ تھی۔

''پھر بھی۔''

''آ جاؤ یار!'' طالوت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور میں نے شانے ہلائے۔ طالوت کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ بہر حال، ہم دونوں تصدق کے مکان پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ طالوت اندر داخل ہو گیا۔ تصدق ایک کرسی پر بیٹھ کر جوتے اُتار رہا تھا۔ ہم دونوں کو اس طرح داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

''کھڑے ہو جاؤ!'' طالوت نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیا تنویر صاحب نے تمہیں اس پورے علاقے میں دندناتے پھرنے کی اجازت بھی دے دی ہے؟'' تصدق نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کھڑے ہو جاؤ!'' طالوت اسی انداز میں بولا۔

''میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں۔ نکل جاؤ یہاں......''

تصدق کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ طالوت کی ٹھوکر اُس کی کرسی پر پڑی اور کرسی اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ تصدق اُچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ خونخوار انداز میں ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔

''میں بھی خود کو باز نہیں رکھ سکوں گا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔'' اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

''وہاں سے تم کہاں گئے تھے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''کہاں سے؟'' تصدق بے اختیار بولا۔

''پکنک پر جاتے ہوئے۔ اُس جگہ سے، جہاں سے تمہیں اُتار دیا گیا تھا۔''

''جہنم میں۔ تم سے غرض؟'' تصدق سنبھل گیا۔

''شکیلہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی جہنم میں گئی۔ چلو، تم باہر نکلو۔'' تصدق آگے بڑھا اور اچانک طالوت کا ہاتھ گھوم گیا۔ تصدق کے پھولے ہوئے گال سے ایک زوردار آواز بلند ہوئی تھی اور تصدق آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح جھپٹا اور میں نے اس کے پاؤں میں پاؤں پھنسا دیا۔ تصدق پیٹ کے بل گرا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

طالوت نے اوپر سے اس کے کئی ٹھوکریں رسید کر دیں اور تصدق بلبلانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

''بتاؤ، شکیلہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے کیا معلوم، سوّر کے بچو!'' وہ دھاڑا۔

''جھوٹ بولتے ہو۔ میں تمہاری کھال، تمہارے بدن سے اُتار لوں گا۔''

''میں..... میں کہے دیتا ہوں، میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، سمجھے؟ میں.... میں.....'' تصدق پاگلوں کے سے انداز میں بولا۔

''شکیلہ کے بارے میں بتاؤ۔''

''نہیں بتاؤں گا۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' تصدق نے کہا۔ اور اسی وقت کمال اندر پہنچ گیا۔ اندر کا ماحول دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا تھا۔

''آؤ، آؤ..... تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ آ جاؤ!'' تصدق دھاڑا۔

''کیا..... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کمال بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''مار رہے ہیں مجھے۔ شکیلہ کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ ہاں، میں نے اسے اغوا کیا ہے۔ پوچھ لو مجھ سے اس کا پتہ۔ آؤ، تم بھی شریک ہو جاؤ۔''

کمال احمقوں کے سے انداز میں سر کھجانے لگا۔ پھر اس نے ہماری طرف رخ کر کے کہا۔ ''وہ...... ماموں جان اچانک آ گئے ہیں۔ صورتِ حال ان کے علم میں بھی آ گئی ہے۔ آپ لوگوں کو پوچھ رہے ہیں۔''

''آ گئے..... آ گئے تنویر صاحب..... اب ان کے ساتھ ہی بات ہوگی۔'' تصدق نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہیں بھی بلایا ہے۔ اپنا حلیہ درست کر کے آ جاؤ۔'' کمال نے تصدق سے کہا اور پھر ہم دونوں کے بازو پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔ ہم بھی باہر نکل آئے تھے۔ طالوت کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا اس نے ہاتھا پائی شروع کی تھی؟'' کمال نے پوچھا۔

''نہیں، ہم نے اسے مارا ہے۔'' طالوت بولا۔

''اوہ!'' کمال نے آہستہ سے کہا۔

''اعتراض ہے تمہیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... مم...... میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔''

''شکیلہ کو میں اس کے پاس سے برآمد کر لوں گا۔'' طالوت نے کہا۔

''اگر آپ کو یقین ہے تو ماموں جان سے کہہ دیں۔ وہ اُگلوا لیں گے۔'' کمال نے جواب دیا۔ ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے طالوت کے شدت سے بگڑے ہوئے موڈ کا احساس تھا۔

بالآخر ہم تنویر صاحب کے سامنے پہنچ گئے۔

''سنو!'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔

''جی!''

''تنویر صاحب کو اس واقعے کا علم نہ ہونے پائے۔ صرف تم لاعلمی کا اظہار کرو گے۔''

''پلیز۔'' کمال آہستہ سے بولا۔

''اوہ..... اوہ...... عارف!...... یوسف!...... یہ...... یہ کیا ہوا؟...... یہ کیا ہو گیا ہے؟'' تنویر جمال مضطربانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم لوگ..... تم لوگ بھی ہم بدنصیبوں کے چکر میں آ گئے۔ ہماری نحوست تم تک پہنچ گئی۔'' تنویر صاحب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

''بہر حال، شکیلہ کو برآمد کرنا ہوگا، تنویر صاحب!''

''آہ..... کاش وہ برے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ خدا کرے..... مگر..... کوئی اندازہ نہیں ہوتا، آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟'' تنویر صاحب پریشانی سے بولے۔ ''تم نے کوئی اندازہ لگایا عارف؟''

''بڑی عجیب صورتِ حال ہے تنویر صاحب! پہلے بھی مجھے شک تھا کہ افشاں صاحبہ کی گمشدگی میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ بھی ہے جو یا تو اس خاندان سے کوئی تعلق رکھتا ہے، یا پھر کسی حیثیت سے وہ یہاں موجود ہے۔''

''ایں..... یعنی..... کیا مطلب؟'' تنویر صاحب چونک پڑے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔

''میرا یہی اندازہ ہے۔''

''مگر شکیلہ..... شکیلہ کے اغوا کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

''ہم نہیں جانتے۔''

''بڑی پریشانی کی بات ہے۔ لیکن کیا تمہارے ذہن میں کسی آدمی کا نام ہے؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔ اس سے قبل کہ ہم کوئی جواب دیں، تصدق آندھی وطوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا حلیہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ تنویر صاحب چونک پڑے۔

''کیا بدتمیزی ہے؟'' تنویر صاحب بڑبڑائے۔ ''تم نے اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں لی؟''

''صورتِ حال دوسری ہے۔'' تصدق نے قہر آلود انداز میں ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔

''باہر جاؤ۔ دروازے پر رک کر اجازت طلب کرو، پھر اندر آؤ۔'' تنویر صاحب غرّائے۔

''پانی سر سے گزر چکا ہے۔ آج کچھ نہیں سنوں گا۔'' تصدق نے چیخ کر کہا۔

''بالکل ہی پاگل ہو گیا نا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔''

''میرے ایک سوال کا جواب دیں۔'' تصدق نے کہا۔

''پوچھ بھائی! پوچھ۔'' تنویر صاحب نہ جانے کیوں نرم پڑ گئے۔

''کیا میں نے یہاں پرورش نہیں پائی؟''

''پائی ہے۔''

''میں غدار ہوں۔''

''غور نہیں کیا۔''

''اب غور کریں۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ میں غداری کرنے جا رہا ہوں۔ میں یہاں دو خون کروں گا۔'' تصدق نے پستول نکال لیا۔

''خوب!'' تنویر صاحب اسے غور سے دیکھنے لگے۔

''ان دونوں نے مجھے مارا ہے۔'' اس نے پستول کا رُخ ہماری طرف کر لیا۔

''ایں۔'' تنویر صاحب نے بوکھلا کر ہمیں دیکھا۔ کمال اپنی جگہ سے کھسک رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ

بدل لی تھی اور پستول کی زد سے نکل گیا تھا۔
"کمال ہے۔" طالوت بولا۔
"کیوں مارا تھا؟" تنویر صاحب نے پوچھا۔
"ان سے پوچھو۔" تصدق نفرت سے بولا۔
"کیوں بھئی...... کیا بات ہوئی تھی؟"
"تصدق صاحب کو شاید کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ یہ ہمارے لئے قابلِ احترام ہیں۔" طالوت بولا۔
"کیا مطلب؟...... یعنی کیا مطلب؟" تصدق کھلکھلا کر بولا۔
"میں کیا عرض کروں تنویر صاحب! کیا یہ نشے کے عادی ہیں؟" طالوت نے پھر کہا۔
"نہیں چھوڑوں گا۔ خدا کی قسم، نہیں چھوڑوں گا۔" تصدق نے کہا اور پستول سیدھا کر لیا لیکن دوسرے لمحے کمال نے وہ تپائی اس کے پستول والے ہاتھ پر ماری، جس کے قریب شاید وہ اسی ارادے سے کھڑا ہو گیا تھا۔
اور تصدق کی چیخ نکل گئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا تھا۔ تنویر صاحب نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیا اور پھر وہ خونخوار نگاہوں سے تصدق کو دیکھتے ہوئے بولے۔
"اب...... اب کیا کہتے ہو؟ تم میرے سامنے خون خرابے پر آمادہ تھے۔"
"میرے ساتھ...... میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے مارا ہے۔ سب میرے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں...... میں کس سے فریاد کروں؟" تصدق نے کہا۔
"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" تنویر صاحب پریشانی سے بولے۔ ہم لوگ لاپروائی سے کھڑے ہوئے تھے۔ تنویر صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور پھر تصدق کی طرف۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔
"تصدق! تم واپس جاؤ۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔"
اور تصدق ہاتھ پکڑے باہر نکل گیا۔ اس نے کمال کو بھی قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پھر تنویر صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "آپ لوگ محسوس نہ کریں۔ میں شرمندہ ہوں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، اس کا دماغ کیوں اُلٹ گیا۔"
"آدھا تو پہلے ہی اُلٹا ہوا تھا۔ ویسے تنویر صاحب! شکیلہ کو ضرور مل جانا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی یہ اجازت بھی کہ ہم اپنے طور پر اس کا سراغ لگانے کے لئے آزاد ہیں۔"
"ہاں، ہاں...... یقیناً۔ آپ لوگ بھی میری وجہ سے مصیبت کا شکار ہوئے ہیں۔"
"تب براہِ کرم، آپ فرمائیں گے کہ کیا تصدق کے پاس اس پستول کا لائسنس موجود ہے؟"
"ایں؟" تنویر صاحب اُچھل پڑے۔ "ارے، پستول...... یہ کہاں سے آیا؟"
"تصدق کا ہے۔" میں نے کہا۔
"تصدق کے پاس پستول نہیں تھا؟"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تصدق اور پستول، دو متضاد چیزیں ہیں۔ ارے اس نے پرورش ہی یہاں پائی ہے۔ بڑا بزدل سا انسان ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

''بہر حال تنویر صاحب! آپ اس سے پستول کے بارے میں معلوم کریں گے۔ سنیے، ہم دونوں آپ سے پورے پورے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ لیکن بہر حال، شکیلہ کی تلاش بھی ہمارا فرض ہے۔''

''یقیناً، یقیناً۔ ویسے دوستو! میں واقعی تم سے شرمندہ ہوں۔ میں تو تمہیں مہمان بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا۔ ویسے میں تم سے کچھ اور گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیے؟''

''میں بذاتِ خود درگاپور گیا تھا۔''

''اوہ...... کب تنویر صاحب؟'' ہم دونوں چونک کر بولے۔

''بس دل کو تو لگی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے، صبر کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''یقیناً'' میں نے ہمدردی سے کہا۔

''چنانچہ جس کام سے گیا تھا، وہ مکمل کیا اور پھر اپنے چند ساتھیوں کو لے کر درگاپور پہنچ گیا۔ درگاپور میں تو حال ہی میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وہاں کی حکومت تک بدل گئی ہے، چنانچہ میں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا اور بہت جلد مجھے شکیلہ کی کہانی معلوم ہوگئی۔ وہی کہانی درست ہے جو تم نے سنائی تھی۔''

''آپ نے وہاں مسلمانوں کے علاقے میں قیام کیا تھا؟'' طالوت نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں۔ بڑی پُر اسرار روایات سننے میں آئی ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ آسمان سے ایک فرشتہ اُترا تھا اور وہ درگاپور کے مسلمانوں کی قسمت ہی بدل گیا۔ اس سے قبل وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ان پر مظالم کئے جاتے تھے۔ لیکن سارے ظالم عجیب سی موت مر گئے اور اب نئی حکومت نے تو مسلمانوں کو اتنی آسانیاں، اتنے حقوق دیئے ہیں، جو وہاں کے ہندوؤں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔''

''اوہ!'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری بہن اور میرے دوست قول کے پکے تھے۔ طالوت بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

''بہر حال، شکیلہ کی داستان سنی۔ بلاشبہ وہ میری افشاں نہیں ہے۔ نہ جانے میری افشاں کہاں ہے؟''

''آپ ہم سے باز پرس نہ کریں تنویر صاحب! تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ افشاں کا پتہ ضرور لگا لیں گے۔''

''باز پرس سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''ہم جو کچھ بھی کرتے پھریں، اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ بلکہ اسے مصلحت سمجھا جائے۔ اور اب تو یہ ضروری ہوگا۔ مجھے شبہ ہے کہ افشاں کو غائب کرنے والے ہی شکیلہ کو بھی اغوا کر لے گئے ہیں۔''

''مگر عارف میاں!...... عارف میاں! کیا تمہیں کسی پر شبہ ہے؟''

''ابھی نہیں۔ بہر حال، جس طرح دوسرے لوگ کام کر رہے ہیں، ہمیں بھی کام کرنے دیا جائے۔''

''میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔ میرے لئے جو بھی خدمت ہو، فوراً بتا دیں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''شکریہ! اس بگڑے ہوئے سانڈ کو آپ سمجھا دیں۔ ورنہ شاید ہم بھی خود پر قابو نہ پا سکیں۔''

"میں اسے آج ہی باغ روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ یہاں رہے گا ہی نہیں۔"

"یہی درست ہے۔" میں نے کہا اور طالوت چونک کر میری شکل دیکھنے لگا۔ بہر حال، پھر ہم تنویر صاحب سے اجازت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے میں آ گئے۔ طالوت کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں بھی خاموش تھا۔ پھر ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر طالوت نے کہا۔

"کیا تصدق کا کوٹھی سے چلا جانا مناسب ہو گا؟"

"انتہائی مناسب۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" طالوت چونک کر بولا۔

"اس طرح وہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ ہم اس کا تعاقب کریں گے۔ وہاں وہ غیر محتاط ہو جائے گا اور آسانی سے اس کی شخصیت کھل جائے گی۔"

"ہوں۔" طالوت کسی خیال میں ڈوب گیا۔ پھر چند ساعت کے بعد گردن اٹھا کر بولا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے عارف! کہ ہم بلاوجہ اس پر شک کر رہے ہوں۔ ممکن ہے، ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔"

"ہاں، ممکن تو ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"کوشش کرتے رہیں گے طالوت! باقی جو کچھ خدا کی مرضی ہو گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن عارف! شکیلہ کو ملنا چاہئے۔" طالوت کی آواز میں غرّاہٹ تھی۔ "خواہ اس کے لئے مجھے اپنی سطح سے گرنا پڑے۔ خواہ اس کے لئے مجھے ابا حضور سے فریب کرنا پڑے۔"

"ابا حضور؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں عارف! وہ کرنا پڑے جو میں نہیں چاہتا۔" طالوت پُر خیال انداز میں بولا۔

"مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"ہاں عارف! بعض اوقات میں مختلف انداز میں سوچنے لگتا ہوں۔ تم جانتے ہو، میں عیش و عشرت کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ لوگوں پر فوقیت میری زندگی کا مقصد نہیں ہے، لیکن تمہاری اس دنیا میں مکر و فریب کے اتنے جال بچھے ہوئے ہیں، قدم قدم پر ایسے زہریلے ناگ پھنکار رہے ہیں کہ ان کے درمیان سانس لینے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے۔ طاقت کے بغیر یہاں زندہ رہنا ناممکن ہے۔ جب تک میں اپنی حیثیت میں رہا، میں نے مکر و فریب کے یہ جال توڑے لیکن میری طاقت چھن گئی اور آج میں شکیلہ جیسی مظلوم لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں اپنی طاقتیں دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ کچھ مشکلات ہیں۔"

"کیا طالوت؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا پڑے گا۔ مجھے ابا حضور کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اور پھر ممکن ہے، وہ مجھے دوبارہ اس دنیا میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ ممکن ہے، میرے اوپر کچھ ایسی بندشیں لاد دی جائیں کہ میں یہاں واپس نہ آ سکوں۔"

''نہیں، نہیں طالوت! ہم ایسے ہی گزارہ کرلیں گے۔ میں..... میں تمہیں تمہارے والدین سے دُور تو نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن میں خود بھی تم سے دُور نہیں رہوں گا۔ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا میرے دوست!''

''میں جانتا ہوں۔ اور یقین کرو عارف! میں خود بھی تم سے علیحدہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ بس شکیلہ کے سلسلے میں بے بسی پر میں سوچتا ہوں۔''

''ہم دوسری طرح اسے تلاش کریں گے۔''

''نہ جانے کیوں عارف! اس تصدق کو بھولنے کو دل نہیں چاہتا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے ذہن کی گہرائیوں میں یہ شک ہے کہ شکیلہ کے اغوا میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

''ہم اسے چھوڑیں گے تو نہیں۔'' میں نے کہا اور طالوت خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے، پھر طالوت نے بیزاری سے کہا۔

''اُٹھو یار!...... آوارہ گردی کریں گے۔ یہاں تو نحوست طاری ہوگئی ہے۔ اُٹھو!'' اور میں اُٹھ گیا۔ ہم دونوں کسی سے کچھ کہے بغیر باہر نکل آئے اور پھر آوارہ گردی کرتے ہوئے کہیں سے کہیں نکل گئے۔

اچھا خاصا شہر تھا۔ بہت بڑا نہیں تھا لیکن جدید وقت کی ساری ضروریات سے آراستہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت ریستوران جگہ جگہ موجود تھے۔ رہائشی ہوٹل بھی کئی کئی منزلہ تھے۔ ہم پیدل چلتے رہے اور پھر میں کچھ تھکن محسوس کرنے لگا۔

''طالوت!'' میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے پکارا۔

''ہوں۔''

''کیا ارادے ہیں بھائی! کب تک سفر جاری رہے گا؟''

''تھک گئے؟'' طالوت مسکرایا۔

''اگر تھوڑی دیر اور اسی طرح چلتے رہے تو پہلے بیٹھوں گا، پھر لیٹ جاؤں گا اور تمہیں باقی سفر مجھے کندھے پر لاد کر طے کرنا پڑے گا۔''

''اوہ..... تو پھر آؤ، سامنے چلتے ہیں۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ چار منزلہ ہوٹل کی خوبصورت عمارت میری نگاہوں کے سامنے تھی، جس پر فلاڈلفیا کا نیون سائن نظر آرہا تھا۔

''چلو!'' میں نے کہا اور چند منٹ کے بعد ہم ہوٹل کے شفاف ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کافی خوب صورت ہوٹل تھا۔ ہاں، بالکل گول تھا۔ داخلی دروازے کے دونوں سمت اوپر جانے کے لئے لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔ رہائشی کمروں میں رہنے والے اوپر نیچے آ جا رہے تھے۔ طالوت نے کھانے پینے کی کچھ چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ آرڈر سرو ہو جانے کے بعد ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ طالوت کا موڈ کافی خراب تھا۔ وہ بدستور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں بھی سر جھکائے کھانے میں مشغول رہا۔

اچانک میں نے طالوت کے ہاتھ سے چمچہ گرتے دیکھا اور میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

''نن..... ناممکن۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ ہال کے داخلی دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا، خیریت؟'' میں نے پوچھا۔

"ابھی ......ابھی واپس آتا ہوں۔" طالوت پھرتی سے کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے نیپکن پھینکا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ ایسی کون سی چیز دیکھ لی اس نے۔ بہرحال میں نے وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے ایک لفٹ میں داخل ہوا۔ دوسری لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔

میں اپنے طور پر اندازے لگا رہا تھا۔ طالوت نے ضرور کسی کو اوپر جاتے ہوئے دیکھا ہے مگر کون؟...... کیا تصدق؟...... لیکن وہ اتنا حیران کن تو نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے کون تھا۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور پھر ویٹر کو اشارہ کر کے بل منگوایا۔ بھائی تبرک کی رقم ابھی خاصی موجود تھی۔ میں نے بل ادا کیا اور طالوت کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد طالوت لفٹ سے اُترا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے حیرت چپکی ہوئی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"کمرہ نمبر ایک سو ساٹھ۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ اسی میں داخل ہوئی ہے۔"

"کون؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"شکیلہ!" طالوت کا جواب میرے لئے واقعی دھماکہ خیز تھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تمہیں یقین ہے؟" میں نے کئی منٹ کے بعد پوچھا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" طالوت نے جواب دیا۔

"تنہا تھی؟"

"ہاں۔ لیکن عارف! میری ذہنی کیفیت عجیب ہو رہی ہے۔" طالوت نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں؟"

"وہ بالکل مطمئن اور پُرسکون تھی۔ اُس نے ایک عمدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر ذرا سی اُلجھن یا ذرا بھی تردّد نہیں تھا۔"

"اوہ! تو تمہارا مطلب ہے......"

"ہاں! میرا مطلب کچھ نہیں ہے۔ آؤ، اس سے ملیں۔ صاف صاف بات کریں گے۔ عارف! اگر وہ اپنی مرضی سے آئی ہے، اگر اس نے اپنے اس اقدام کے بارے میں کوئی قابل قبول بات نہ بتائی تو ہم اسی وقت اس سے تعلقات منقطع کر لیں گے اور پھر یہاں سے چل دیں گے اور اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ آئندہ کسی کو دل سے قریب نہیں آنے دیں گے۔ کون سی مجبوری تھی، جس نے اسے اس خاموشی سے چلے آنے پر اُکسایا۔ کوئی بھی مسئلہ تھا، اسے ہمیں بتانا چاہئے تھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے بھی اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"تب اُٹھو!" طالوت نے کہا اور میں اُٹھ گیا۔

"بل تو ادا کر دو۔"

"کر دیا ہے۔"

''خوب.....آؤ!'' طالوت دوبارہ دروازے کی طرف بڑھ گیا اور پھر لفٹ سے ہم تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ تیسری منزل کے کاریڈور میں چلتے ہوئے ہم کمرہ نمبر ایک سو ساٹھ کے سامنے رک گئے۔

طالوت نے بیل بٹن دبایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

''کون ہے؟'' دروازے کے قریب سے شکیلہ کی آواز سنائی دی۔

''ویٹر۔'' میں نے جلدی سے آواز بدل کر کہا اور دروازہ کھل گیا۔ میں آگے ہی تھا، اس لئے شکیلہ کی نگاہ پہلے مجھ پر ہی پڑی۔ تنویر صاحب کے ہاں آنے کے بعد اس نے جدید لباس پہننا شروع کر دیئے تھے اور خاصی فیشن ایبل رہنے لگی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک عمدہ لباس میں تھی اور کافی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک پڑی اور پھر اس کے چہرے پر خشونت پھیل گئی۔

''فرمایئے؟'' اس نے نہایت کھردرے لہجے میں کہا اور ہم دونوں تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔ اس کے لہجے سے بڑی دل شکنی ہوئی تھی اور طالوت کے ہونٹ سکڑ گئے۔

''خوب.....غالباً تم ہمیں پہچان نہیں سکیں؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جی۔ میں نہیں پہچان سکی۔'' اس نے غور سے ہم دونوں کی شکلیں دیکھتے ہوئے کہا اور شاید ہمیں ہم شکل دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔

''اس کے باوجود ہم تمہیں اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اور باقی باتوں کا فیصلہ تنویر صاحب کے مکان پر ہی ہوگا۔'' طالوت نے زہریلے انداز میں کہا اور شکیلہ کے چہرے میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔

''اوہ! آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ویسے اندر تو آیئے۔ غالباً آپ میرے نہ پہچاننے سے ناراض ہو گئے۔ لیکن یقین کریں، میری یادداشت بہت خراب ہو گئی ہے۔ آیئے.....آیئے تو سہی۔'' وہ پیچھے ہٹ کر بولی اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ شکیلہ نے دروازہ بند کر دیا اور پھر مسکراتی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی۔

''وہ کون سی مجبوری ہے جس نے تمہیں ہم سے اظہارِ اجنبیت پر مجبور کر دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ! یقین کرو، میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکی ہوں۔'' شکیلہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم نے پہلے بھی تمہیں پیشکش کی تھی۔ تم اگر بہتر مستقبل چاہتی ہو تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اُفوہ!.....نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے، تم اُٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں تنویر صاحب کے حوالے کر دیں گے۔ اور اس کے بعد تمہاری مرضی۔ ہم نے تو تمہارے اوپر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

''میں.....میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' شکیلہ گھبرا کر بولی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے تنویر صاحب کا پورا گھرانہ پریشان ہے۔ ایک مرتبہ تمہیں ان کے سامنے ضرور جانا پڑے گا، اس کے بعد تم چاہو تو ان سے معذرت کر لینا۔ یہ ہم پر فرض ہے۔''

''یعنی اگر میں نہ جاؤں، تب بھی؟''

''ہاں!''

''تو.....تو تم لوگ زبردستی کرو گے؟''

''مجبوری ہے۔''

''سنو تو سہی، میں وہاں جاؤں گی لیکن...... لیکن کچھ وقت کے بعد۔ مجھے حالات بھی تو درست کر لینے دو۔''

''یہ صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم ہمیں پوری تفصیل بتا دو۔''

''ہوں۔'' شکیلہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اُس نے دیوار میں لگا ہوا کال بیل بٹن دبایا اور ویٹر کا انتظار کرنے لگی۔ چند منٹ کے بعد ویٹر آ گیا۔

''کیا پئیں گے آپ؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ! یہ ممکن نہیں۔ ہم باتیں کریں گے۔ سنو! کافی لے آؤ'' اس نے ویٹر سے کہا اور ویٹر گردن ہلا کر چلا گیا۔ شکیلہ کے چہرے پر سخت اُلجھن نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ ایک الماری کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔ ''چند منٹ کی اجازت دیں۔'' اس نے الماری سے کچھ کپڑے نکالے اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔

طالوت نے گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔

''کچھ جچی نہیں دوست! تمہاری یہ راج ہنس۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اب تو مجھے بھی شبہ ہونے لگا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیسا شبہ؟''

''لڑکی پُر اسرار ہے۔''

''یقیناً۔ نہ جانے اس نے کون سی بات درست کہی ہے اور کون سی غلط؟''

''تنویر صاحب تو درگا پور بھی ہو آئے اور وہاں تحقیقات کر کے آئے ہیں کہ وہ وہیں کی رہنے والی ہے۔''

''اونہہ، جہنم میں جائے۔ میرا تو خیال ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تنویر صاحب کے ہاں بھی واپس ہی نہ جایا جائے۔ بس یہیں سے کہیں اور چلتے ہیں۔'' طالوت نے بیزاری سے کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن کیا ذہن میں خلش نہ رہے گی؟''

''خلش تو اب بھی ہے۔ میں اس کے لئے کس قدر پریشان تھا اور وہ ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کر رہی تھی۔'' طالوت نے بھاری لہجے میں کہا۔ اسی وقت ویٹر کافی کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر آ گیا اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کر شکیلہ بھی نکل آئی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اور اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اتنی بے باک ہو گئی تھی وہ کہ پہلے نہ تھی۔

اس نے تین کپ بنائے اور دو ہمارے سامنے سرو کر دیئے۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر اس نے چونک کر گردن اٹھائی۔

''براہِ کرم..... کافی۔'' اس نے کہا اور ہم دونوں نے پیالیاں اٹھا لیں۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا، میں

آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"دل چاہے سمجھا دو، دل چاہے نہ سمجھاؤ۔ اگر تمہارا کوئی ذاتی معاملہ ہے تو صاف کہہ دو، ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اگر تم ہم سے بیزار ہو تو ہم بھی اتنے مشتاق نہیں ہیں۔"

"جی؟" وہ تعجب سے ہمیں دیکھنے لگی۔

"ہاں! تمہارے لئے ہم جس قدر پریشان تھے، اب وہ حماقت محسوس ہو رہی ہے۔"

"لیکن آپ لوگ.... آپ لوگ....." شکیلہ کے چہرے پر سخت اُلجھن نظر آ رہی تھی۔ ہم خاموشی سے کافی پی رہے تھے۔ اور اچانک مجھے محسوس ہوا، جیسے شکیلہ میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی ہو۔

"ارے......ارے....." میں نے کافی کی پیالی نیچے رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر چھناکا ہوا اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا، کچھ ہوش نہ رہا۔ نہ جانے کب تک۔ ہاں، جب آنکھ کھلی تو طالوت کی گہری گہری سانسیں کان میں گھس رہی تھیں۔ اُس کا سر ڈھلک کر میرے کندھے سے آ ٹکا تھا۔

سر بھاری بھاری لگ رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اس کے سر کو اپنے کندھے سے اٹھایا اور وہ بھی چونک کر جاگ گیا۔ پھر اس نے ایک طویل جماہی لی اور ابھی منہ کھلا ہوا ہی تھا کہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ احمقوں کے سے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اُچھل پڑا۔

"عارف!" اُس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہوں!" میں نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

"کیا یہ طلسم مرغبانہ تازہ ہے؟"

"اوہ!......اتنی ثقیل بکواس مت کرو۔ بھیجہ پگھل جائے گا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"مگر...... یہ ہوا کیا؟ ہم کہاں ہیں؟" طالوت نے کہا اور میں غور کرنے لگا۔ یادداشت واپس آنے میں دیر نہیں لگی۔ ہم ہوٹل ہی میں تھے اور انہی صوفوں پر لڑھکے ہوئے تھے، جن پر بیٹھے تھے۔ اور......اور شکیلہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔

جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد اُس کے موجود ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یقیناً کافی میں نشہ آور دوا دے دی گئی تھی۔ لیکن شکیلہ...... میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ یقیناً وہ ہم سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اُس نے...... اُس نے لباس تبدیل کرنے کے بہانے سے شاید الماری سے نشہ آور دوا نکالی اور پھر لباس تبدیل کر کے آئی اور آخر وہ کام دکھا گئی۔

"لیکن شکیلہ......احسان فراموش۔" میں نے دانت پیسے۔

"عارف!" طالوت کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"ہوں؟"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"چلو، یہاں سے تو واپس چلیں۔ ورنہ ہوٹل والے ہمیں چوروں کی حیثیت سے گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو چلی گئی ہو گی؟"

"ظاہر ہے، اب وہ یہاں کیوں رُکتی۔"

"واپس بھی نہیں آئے گی؟"

''اب کیا آئے گی؟''

''چلو بھائی!'' طالوت ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور ہم دونوں لڑھکتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اعصاب ابھی تک کشیدہ تھے۔ بمشکل تمام باہر آئے اور پھر اسی طرح چلتے ہوئے ہم تنویر محل میں داخل ہو گئے۔ محل کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر غسل کیا اور کسی حد تک دماغ درست ہو گیا۔ شکیلہ کے رویے سے بہت دل برداشتہ تھے۔ ابھی تک سروزنی تھا۔

شام کو چائے پر شریک ہوئے۔ ماحول بے حد اُداس تھا۔ تنویر صاحب موجود نہیں تھے۔ تصدق بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کمال موجود تھا۔

''آپ لوگ کہیں چلے گئے تھے عارف بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ بس ویسے ہی آوارہ گردی کرنے۔''

''شکیلہ کا بھی کوئی پتہ نہیں چل سکا؟''

''نہیں۔''

''ماموں جان نے آپ کو تلاش کیا تھا۔ ایس پی صاحب آئے تھے۔ ماموں جان نے شکیلہ کے بارے میں مختصر تفصیل بتا کر ان کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھوادی ہے۔ وہ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔''

''کون؟'' میں چونک کر بولا۔

''ایس پی صاحب۔''

''کیا ہمیں تھانے جانا پڑے گا؟''

''اوہ، نہیں۔ وہ خود کسی وقت آئیں گے۔''

''ہوں۔'' میں نے گہری سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا۔ وہ کسی حد تک خالی الذہن نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر میں نے کمال سے پوچھا۔

''تصدق نظر نہیں آ رہا؟''

''ماموں جان نے اُسے حکم دیا ہے کہ وہ باغ میں جا کر رہے۔ میرا خیال ہے، چلا گیا۔''

''اوہ!..... تنویر صاحب کہاں ہیں؟ کیا کہیں باہر چلے گئے؟''

''نہیں۔ ایس پی صاحب کے ساتھ ہی باہر نکل گئے تھے۔'' کمال نے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔ لان کی چائے ختم ہو گئی اور ہم دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر چل پڑے تھے۔

ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ طالوت نے کمرے میں داخل ہو کر میری شکل دیکھی۔ ''کس سوچ میں ڈوب گئے عارف؟''

''پولیس کے ان ایس پی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''بہر حال، یہ میرا وطن ہے۔ پولیس کا سامنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے، اب یہاں سے چلو۔ شکیلہ کی وجہ سے یہاں پڑے ہوئے تھے۔ اب اس سے ہمارا کوئی واسطہ بھی نہیں رہ گیا۔ اب یہاں گھسے رہنے سے کیا فائدہ؟ تنویر صاحب شریف آدمی ہیں۔ ہمیں

ان سے ہمدردی ہے۔ خدا کرے ان کی لڑکی مل جائے۔ شکیلہ بھی اپنے بارے میں فیصلہ کر لے گی اور اگر وہ......"

اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی اور طالوت خاموش ہو گیا۔

"کون ہے؟......دروازہ کھلا ہوا ہے۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا اور دروازہ کھل گیا۔ سب سے آگے پولیس کی وردی ہی نظر آئی تھی۔ اور یہ وردی، ایس پی کی تھی۔

ایس پی نے ہم دونوں کو دیکھا اور ہم نے ایس پی کو۔ اور میں ساکت رہ گیا۔

یہ آفتاب تھا۔ انسپکٹر آفتاب۔ جو اب ایس پی بن گیا تھا۔ اس شخص سے تو ہماری کئی جھڑپیں ہوئی تھیں۔ مجھے پہچانتے ہی اس نے پستول نکال لیا اور اُس کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرا اندازہ درست تھا تنویر صاحب!" ایس پی نے میری طرف رخ کئے کئے کہا اور تنویر صاحب بھی اس کے پیچھے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ تصدق بھی موجود تھا اور اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"یعنی کہ......یعنی کہ......" تنویر صاحب بولے۔

"ان میں سے ایک عارف ہے۔"

"جی ہاں......جی ہاں!"

"اندر آ جاؤ۔" ایس پی نے باہر رُخ کر کے کہا اور دو انسپکٹر اندر گھس آئے۔ "دونوں کی تلاشی لو اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔" ایس پی نے حکم دیا۔ ہم نے نہایت خاموشی سے ہتھکڑیاں پہن لی تھیں۔

"لیکن میں......میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا۔" تنویر صاحب پریشانی سے بولے۔

"یہ ایک مسلّم حقیقت ہے تنویر صاحب! مسٹر تصدق نے اس وقت پولیس کی ایسی مدد کی ہے کہ ہم ان کا شکریہ نہیں ادا کر سکتے۔ آئیے، میں آپ کو ان دونوں کی تفصیل بتاتا ہوں۔"

"لیکن میں انہیں اپنے مکان سے گرفتار نہیں ہونے دوں گا۔" تنویر صاحب بولے۔

"براہِ کرم جذباتی نہ ہوں۔ آپ بے حد نیک انسان ہیں اور یہی نیکی آپ کو ایسی جگہ لے ڈوبتی کہ آپ پانی بھی نہیں مانگ سکتے۔ پہلے ان کی حقیقت سن لیں، اس کے بعد فیصلہ کریں۔"

"پھر بھی، ان کی ہتھکڑیاں نکال دیں۔ میرا خیال ہے، یہ مزاحمت نہیں کریں گے۔"

"آپ صرف مزاحمت کی بات کرتے ہیں، مجھے خطرہ ہے، یہ دو چار خون کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"اوہ!" نواب صاحب خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔

اور پھر ہمیں ایک دوسرے بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ میں تو خیر فکر مند اور خوف زدہ تھا، لیکن طالوت کے چہرے سے لاپروائی اور بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

ہال میں سب بیٹھ گئے۔ کمال بھی اندر آ گیا تھا اور اُس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا، جیسے رو دے گا۔

"بات زیادہ پرانی بھی نہیں ہے۔" ایس پی نے کہا۔ "ایک فرم تھی، حشمت برادرز۔ ایک جعلساز نے وہاں بہت بڑا ڈاکہ ڈالا اور فرار ہو گیا۔ بے حد چالاک انسان ہے۔ اس نے بہت سی جگہوں پر جعلسازی کی اور پولیس کو اتنے چکر دیئے کہ اسے پسینہ آ گیا۔ اس نے درجنوں قتل کئے ہیں۔ پولیس کو ہدایت تھی کہ

اسے جہاں دیکھے، گولی مار دے..... بہرحال، اس کمبخت نے کہیں سے اپنا ایک ہم شکل تلاش کر لیا۔ اس کی مدد سے یہ کامیابی سے فراڈ کرتا رہا۔ اور میرا دعویٰ ہے کہ یہ آپ کے ہاں بھی کسی خاص پروگرام سے داخل ہوا تھا۔ اور وہ لڑکی...... ممکن ہے، وہ ان کی تیسری ساتھی ہو۔ اوہ، بات کسی حد تک میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ ممکن ہے، اس نے مس افشاں کی گمشدگی کی خبر سنی ہو۔ وہ آپ کی اکلوتی صاحبزادی ہیں۔ ممکن ہے، یہ اس لڑکی کو اس لئے لایا ہو کہ اسے افشاں بنا کر آپ کی دولت پر قبضہ کر لے۔"

"نہیں، مجھے اس سے اختلاف ہے۔" تنویر صاحب بے ساختہ بولے۔

"کیوں؟"

"اگر یہ لوگ چاہتے تو اس لڑکی کو افشاں کی حیثیت سے پیش کر سکتے تھے، جبکہ انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس لڑکی کی صحیح حیثیت کا میں اندازہ لگا چکا ہوں۔" تنویر صاحب بولے۔

"یقیناً کوئی گہری چال سوچی ہوگی اس نے، آپ نہیں سمجھتے۔ اس نے اس امکان کو بھی مدِنگاہ رکھا ہوگا کہ اصلی افشاں واپس بھی آ سکتی ہے۔ ممکن ہے، انہوں نے سوچا ہو کہ اصلی افشاں کے قتل کے بعد اپنا اصل کام کریں گے۔"

"نہیں، نہیں۔" تنویر صاحب گھبرا کر بولے۔

"اور یہ اصلی افشاں کی تلاش میں ہوں۔"

"نہیں۔"

"یا پھر...... یہ بھی ممکن ہے کہ افشاں کو بھی انہوں نے ہی غائب کیا ہو۔"

"میں نہیں مان سکتا۔"

"بہت جلد سب کچھ سامنے آ جائے گا۔" ایس پی نے کہا۔

"لیکن آپ کو ان پر شبہ کیسے ہوا؟" تنویر صاحب نے پوچھا۔

"تصدق صاحب نے دو ہم شکلوں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ بڑے جعلساز معلوم ہوتے ہیں تو یونہی میرا ذہن ان کی طرف چلا گیا۔ میں نے پرانے فائل تلاش کر کے تصدق کو ان کی تصاویر دکھائیں تو اس نے تصدیق کر دی۔"

"لیکن نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا۔" تنویر صاحب بولے۔

"یہ ان کی خوبی ہے۔ کیوں دوستو!" ایس پی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"ممکن ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں میں عارف کون ہے؟" ایس پی نے کہا۔

"کیوں بھئی۔ ہم دونوں میں سے عارف کون ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں۔" طالوت بیزاری سے بولا۔

"تم لوگ ایس پی کی بات کی تردید کیوں نہیں کرتے؟" تنویر صاحب نے بے چینی سے کہا۔

"ارے اتنے بڑے افسر کی بات کی تردید کیا کریں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"اور پھر اللہ نے ان کی سنی ہے، ہم بے چارے کی ترقی کی راہ میں کیوں آئیں؟" طالوت بولا۔

"ہاں اور کیا۔ اللہ انہیں ڈی آئی جی بنائے۔"

"کیا مسخرہ پن ہے؟" تنویر صاحب پریشان ہو کر بولے۔
"مجھے دعائیں دے رہے ہیں، بے چارے۔ رہنے دیں۔" ایس پی ہنس کر بولا۔
"کیا یہ درست ہے کہ تم یہاں کوئی سازش کرنے آئے تھے؟" تنویر صاحب بولے۔
"صحیح بات میرا بھائی بتائے گا۔" میں نے طالوت کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں۔ ہمیں شرم آتی ہے۔" طالوت نے دانتوں میں اُنگلیاں دبا لیں اور ایس پی نے قہقہہ لگایا۔
دوسرے لوگ البتہ سنجیدہ بلکہ پریشان تھے۔
"ارے اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟" میں بولا۔
"تم ہی بتا دو۔" طالوت بھی موڈ میں آ گیا تھا۔
"نہیں تم۔"
"ہرگز نہیں، تم۔" طالوت شرم سے دوہرا ہو کر بولا اور ایس پی نے پستول کا رخ طالوت کی طرف کر دیا۔
"سیدھے رہو۔ تمہاری کوئی حرکت کامیاب نہیں ہوگی۔"
"کیا مطلب؟" تنویر صاحب بولے۔
"تلاشی اچھی طرح لی ہے؟" ایس پی نے تنویر صاحب کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔
"ج...... جی ہاں...... جی ہاں!"
"پھر یہ جھکنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟"
"او ر دیکھتا ہوں سر!" انسپکٹر نے کہا اور پھر اُس نے طالوت کی اچھی طرح تلاشی لی۔
"کچھ نہیں ہے۔"
"کیا یہ لوگ اتنے ہی خطرناک ہیں؟" تنویر صاحب بولے۔
"میں کسی وقت ان کا فائل لے کر حاضر ہوں گا۔ آپ خود دیکھ لیں۔"
"اچھا۔" تنویر صاحب تعجب سے بولے۔
"تو اجازت؟" ایس پی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"نہ جانے کیوں دل دُکھ رہا ہے۔"
"آپ نیک انسان ہیں لیکن کبھی کبھی نیکیاں لے ڈوبتی ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔ چلئے حضرات!" ایس پی نے کہا اور ہم شرافت سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ معاملہ اب ہمارے بس سے باہر تھا، اس لئے کوئی فضول حرکت بے کار ہی تھی۔
باہر جیپ کھڑی تھی۔ ہمیں جیپ میں سوار کرا دیا گیا۔ تنویر صاحب اور کمال افسردہ تھے۔ تصدق مسکرا رہا تھا۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر باہر نکل آئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔
ہم دونوں کو لاک اپ کر دیا گیا۔ لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ لاک اپ کے چاروں طرف مسلح پولیس تعینات کر دی گئی تھی اور پولیس والے باقاعدہ ہم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔
لاک اپ کی زمین پر بیٹھتے ہوئے میں نے گہری سانس لی اور نیم باز آنکھوں سے طالوت کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا خیال ہے بھائی خربوز؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اچھی جگہ ہے۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔
''ہاں۔ یہاں بڑی مہمان نوازی ہوتی ہے۔''
''خوب۔لیکن ابھی تک انہوں نے چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔''
''پوچھیں گے،ضرور پوچھیں گے۔اچھی طرح پوچھیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تم بار بار کیوں ہنس رہے ہو؟''
''بس یار! یونہی۔ابھی میرا تماشہ ہوگا۔ویسے یہ جگہ ہمیں راس نہیں آئی۔''
''کیا تماشہ ہوگا؟''
''میرا خیال ہے، اُلٹا لٹکا دیں گے اور پھر مار لگائیں گے۔''
''بکواس مت کرو۔'' طالوت غرّایا اور میں مسکرانے لگا۔اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔
رات ہو گئی تھی۔ کسی نے ہماری بات بھی نہیں پوچھی۔ نہ ہی اس دوران ہمارے لئے کھانے پینے کی کوئی چیز آئی تھی۔صبح تک بھوکے رہے،صبح کو معمولی سا ناشتہ ملا، جسے ہم نے خاموشی سے زہر مار کر لیا۔
دوپہر ہو گئی اور پھر تقریباً چار بجے کا وقت تھا کہ پولیس کا پورا دستہ لاک اپ پر آ گیا اور ہمیں نکال کر ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں بہت سے شناسا چہرے موجود تھے۔ان میں بڑے بڑے افسر بھی تھے جو خصوصی طور پر آئے تھے۔
ایس پی نے انہیں رپورٹ پیش کی اور ڈی آئی جی نے گہری نظروں سے ہمیں دیکھا۔
''کیا تم دونوں بھائی ہو؟''
''ہاں!'' ہم دونوں بیک وقت بولے۔
''لیکن حشمت برادرز سے غبن کرنے والے عارف کا تو کوئی بھائی نہیں تھا؟''
''وہ کوئی اور ہوگا۔'' طالوت بولا۔
''بکواس مت کرو۔سنا ہے،تم بہت زندہ دل ہو۔'' ڈی آئی جی غرّایا۔
''ہاں! ہم تو پورے زندہ ہیں۔صرف دل کی بات تو نہیں ہے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''تم میں سے عارف کون ہے؟'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔
''ہم دونوں ہی عارف ہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''مسٹر آفتاب!'' ڈی آئی جی غرّاتے ہوئے بولا۔
''یس سر!''
''ان کا دماغ درست کرو۔''
''یس......یس سر!'' آفتاب نے ایک انسپکٹر کو اشارہ کیا اور انسپکٹر نے طالوت کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔میرے بدن میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔
''عارف کون ہے؟.....جواب دو۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''میں ہوں۔'' طالوت نے سکون سے جواب دیا۔
''سچ کہہ رہے ہو؟''

''جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

''اور اس کا نام کیا ہے؟'' انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کیا۔

''عارف۔''

''پھر حرامی پن۔'' انسپکٹر نے ایک زناٹے دار تھپڑ طالوت کے گال پر رسید کر دیا اور میرے بدن میں بجلیاں دوڑ گئیں۔

''سنو!'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ''میں عارف ہوں۔''

''غلط۔ میں عارف ہوں۔'' طالوت بولا۔

''نہیں، تم خاموش رہو۔ ہاں، تو عارف میں ہوں۔''

''ارے واہ، کیوں خاموش رہوں؟ عارف تو میں ہوں، سمجھے؟ حشمت برادرز سے غبن میں نے کیا تھا اور سارے جرائم......''

''براہِ کرم، جھوٹ مت بولو۔ ڈی آئی جی صاحب! عارف میں ہوں۔''

''میں تم دونوں کو پھانسی دوں گا، سمجھے؟''

''سمجھ گئے۔ یہی ٹھیک رہے گا۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''جہنم میں جاؤ، تم میں سے جو بھی عارف ہے۔ بتاؤ، تم لوگ تنویر صاحب کے یہاں کیوں داخل ہوئے تھے؟''

''تنویر صاحب نے نہیں بتایا؟''

''کیا؟''

''یہی کہ ان کی بیٹی محترمہ خود ہمیں اپنے گھر لائی تھیں۔''

''تم نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ تم جان بوجھ کر ان کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے اور افشاں کی ہم شکل لڑکی تمہارے ساتھ تھی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''تمہارا پروگرام کیا تھا؟''

''میرا خیال ہے، فضول باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ ہمارے خلاف جو کرنا ہے، کیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''خوب..... تم ہمیں احکامات دے رہے ہو۔ تمہارا پورا گروہ ہے یا تنہا ہو؟'' ڈی آئی جی نے کڑک کر کہا۔

''گروہ ہے پورا۔ پچیس ہزار افراد پر مشتمل۔'' طالوت نے جواب دیا اور انسپکٹر نے پھر اس کا گریبان پکڑ کر اس کے ایک تھپڑ مارا۔ طالوت کے منہ سے خون نکل پڑا۔

''کھال کھینچ دو اس کی۔ مار مار کر بولنے کے قابل ہی مت چھوڑو۔ مارو۔'' ڈی آئی جی شاید طالوت سے بہت ناراض ہو گیا تھا۔ انسپکٹر نے طالوت کے منہ پر دو گھونسے مارے اور طالوت کافی زخمی ہو گیا۔

''انسپکٹر!'' میں انسپکٹر کی طرف دوڑا اور میرا گھونسہ انسپکٹر کے منہ پر پڑا۔ انسپکٹر اُچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور وہاں سے نیچے پھسل پڑا۔ تمام لوگوں نے پستول نکال لئے تھے اور مجھے اپنا گھونسہ یاد آ گیا۔

طالوت کا یہ تحفہ ابھی تک میرے پاس موجود تھا۔
''پکڑلو اسے..... پکڑلو'' ڈی آئی جی دہاڑا اور بہت سے لوگوں نے دوڑ کر مجھے پکڑ لیا۔ پھر چاروں طرف سے لاتیں، تھپڑ اور گھونسے برسنے لگے۔ میں نیچے گر گیا تھا۔ دوسری طرف طالوت نے بھی جدوجہد شروع کر دی اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک شروع ہو گیا۔
عجیب ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔
تب اچانک ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دیواریں ہل گئی تھیں۔ سب لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ اور پھر کمرے میں خوف ناک تاریکی پھیل گئی۔ تیز ہواؤں کی آواز اور تاریکی۔ پھر نہ جانے کیسے رنگ پھیل گئے۔ عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور پھر یہ تاریکی میرے حواس پر پھیلتی گئی۔ ذہن عجیب سے انداز میں سو گیا تھا۔
اور پھر آنکھ کھلی تو عجیب سا محسوس ہوا۔ ذہن پر ایک خوشگوار کیفیت طاری تھی۔ بدن پھول کی طرح ہلکا پھلکا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے چند ساعت چھت کو گھورا، ایک حسین فانوس روشن تھا پھر احساسات کچھ اور جاگے اور بدن کے نیچے گداز محسوس ہوا۔ میں نے گردن گھمائی، میرے برابر ہی طالوت سو رہا تھا۔ ایک سلک کے بستر پر، حسین لباس میں ملبوس۔ میرے بدن پر بھی وہی لباس تھا۔
''انہیں ہوش آ گیا ہے مادر ملکہ!'' ایک ترنم سنائی دیا اور میں چونک پڑا۔ میں نے جلدی سے دوسری طرف دیکھا۔ ایک حسین شکل نگاہوں کے سامنے تھی، قدیم طرز کے لباس میں۔ بڑا پُرسحر چہرہ تھا۔
اور اس کے بعد کسی کے لباس کی سرسراہٹ۔ کوئی میرے قریب پہنچ گیا۔ میری پیشانی پر پیار بھرا ایک ہاتھ آ ٹکا۔
''یوسف عبران!'' ایک پیار بھری آواز سنائی دی اور میں نے سرہانے کھڑی معمر عورت کی طرف دیکھا۔ تب میرا دماغ گھوم گیا۔ یہ چہرہ جانا پہچانا تھا۔ یہ شکل..... یہ شکل۔
''عبران بیٹے!'' عورت نے پھر پکارا اور میں اُچھل پڑا۔
ہاں!..... یہ شکل میں نے اس وقت دیکھی تھی، جب میں حشمت برادرز کے یہاں سے لوٹی ہوئی رقم لے کر ٹرین سے سفر کر رہا تھا اور..... اور پھر مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اوہ! یہ تو..... یہ تو طالوت کی والدہ تھیں۔
میرا دماغ گھوم گیا۔
''کیسی طبیعت ہے میرے لعل؟'' عورت کی آواز میں بے پناہ پیار تھا۔
''میں..... میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں ماں!'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''ایں؟'' بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔
''ہاں۔ میں آپ کا عبران نہیں ہوں۔ آپ کا بیٹا وہ ہے۔'' میں نے طالوت کی طرف اشارہ کیا۔
''وہ ہے۔'' عورت آہستہ سے بولی اور پھر اس نے سوتے ہوئے طالوت کا سینہ کھول کر دیکھا اور پھر مسکرانے لگی۔
''تم بھی..... تم بھی میرے بیٹے ہو..... میرے بچے!..... تم بھی میرے عبران کے ہم شکل ہو۔ اتنے ہم شکل کہ ماں بھی دھوکا کھا گئی۔ مگر عبران کو کیا ہوا ہے؟''
اب میں کیا جواب دیتا؟ میرا تو خود دماغ گھوم گیا تھا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں دیوانوں کی طرح منہ پھاڑے مہربان عورت کو دیکھ رہا تھا۔ طالوت ابھی تک یا تو بے ہوش تھا، یا گہری نیند سو رہا تھا۔ مادر ملکہ کی نگاہیں ہم دونوں کو بار بار دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے قریب کھڑی ہوئی کنیز کو مخاطب کیا۔

''شبنمی!...... ذرا دیکھو تو...... اگر سینے کا نشان نہ دیکھو تو کیا تم شناخت کر سکتی ہو کہ ان میں سے یوسف عبران کون ہے؟''

''سخت مشکل ہوگی مادر ملکہ!'' شبنمی نے جواب دیا۔

''ارے لیکن میرا عبران ابھی تک کیوں نہیں جاگا؟...... اسے جگاؤ شبنمی!'' مادر ملکہ نے کہا۔

''آشانہ!...... جاؤ، جلدی سے سمیدانہ لاؤ۔ جلدی جاؤ۔''

''ابھی لائی۔'' ایک دوسری کنیز نے مستعدی سے کہا اور ایک طرف دوڑ گئی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے میرے لعل؟'' ملکہ میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔

''ہاں...... میں اب ٹھیک ہوں مادر مہربان!'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن میرے عبران کے چہرے پر یہ زخم کیسے ہیں؟...... خدارا مجھے ان زخموں کی رُوداد سناؤ۔'' ملکہ نے بے چینی سے کہا۔

''کچھ لوگوں نے آپ کے یوسف عبران کو مارا ہے۔''

''زمین کے انسانوں نے؟'' ملکہ غضب ناک ہو کر بولی۔

''ہاں۔''

''شبنمی......!'' ملکہ نے غصے سے لرزتی آواز میں شبنمی کو پکارا۔

''مادر ملکہ......!'' شبنمی نے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''شمشان کو بلاؤ۔''

''جو حکم......'' شبنمی بھی باہر دوڑ گئی۔ ملکہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں آشانا ایک سفید پَر لے آئی۔ ایسا حسین پَر تھا کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ملکہ نے طالوت کی طرف اشارہ کیا اور آشانا وہ پَر طالوت کے چہرے سے رگڑنے لگی۔ چند ہی لمحات گزرے تھے کہ طالوت کو ایک چھینک آئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

اور آنکھیں کھولتے ہی اُس نے آواز لگائی۔ ''عارف......!''

''میں یہاں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھاگ چلو...... گڑبڑ ہوگئی۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، آ گئے۔'' طالوت بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''کون آ گئے؟''

''بڑے میاں۔''

''ہوش میں آؤ طالوت!...... دیکھو تو سہی، تم کہاں ہو؟'' میں نے کہا اور طالوت خاموش ہو گیا۔ اب پہلی بار اُس نے اردگرد کے ماحول کو دیکھا تھا اور پھر اس نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔

''عارف.....!'' وہ مضحکہ خیز آواز میں بولا۔
''ہاں طالوت؟''
''مارے گئے بیٹے!...... یہ تو اپنا ہی قبیلہ معلوم ہوتا ہے۔''
''یوسف عبران!'' مادر ملکہ نے آواز دی اور طالوت نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ پھر اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور پھر اُچھل پڑا۔
''ماں....!'' دوسرے لمحے اس نے مستعدی سے مسہری سے چھلانگ لگا دی اور مادر ملکہ سے لپٹ گیا۔
''میرے بچے!...... میرے جگر کے ٹکڑے!'' مادر ملکہ نے بھی اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ طالوت بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کئی منٹ کے بعد دونوں علیحدہ ہوئے تھے۔
''تجھے میری یاد کبھی نہیں آئی میرے لعل؟'' ملکہ نے شکایتی انداز میں کہا۔
''بار بار..... مگر تمہاری تصویر میرے دل میں تھی، جب چاہتا، دیکھ لیتا تھا۔'' طالوت نے فوراً جواب دیا۔
''مجھے تجھ سے بڑی شکایت ہے عبران!..... میں تیرے لئے تڑپتی تھی۔''
''کیوں ماں؟''
''میری آنکھیں تیری صورت کو ترستی تھیں۔''
''کیوں؟...... کیا تمہارے دل میں میری تصویر نہیں تھی؟'' طالوت نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''ماں سے چالاکی کی باتیں کرتا ہے عبران!...... کاش تُو ماں کا دل دیکھ سکتا۔''
''مجھے معاف کر دو مادرِ مہربان! لیکن تم نے بھی تو میری خواہش پوری نہیں کی تھی۔''
''تُو جانتا ہے، قصور میرا نہیں۔''
''ابا حضور بہت سخت گیر ہیں۔''
''اور ان کی سخت گیری کی سزا تُو نے مجھے دی۔ کیوں......؟''
''میں معافی مانگ چکا ہوں۔''
''اب تو نہ جائے گا مجھے چھوڑ کر؟'' ماں نے پوچھا۔
''ماں! میں نے نیچے کی دنیا میں رہ کر جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے۔ یہاں مجھ سے کوئی ایسا وعدہ نہ لو کہ جھوٹ بولنا پڑے۔ میرا دل ابھی اس دنیا سے نہیں بھرا ہے۔'' طالوت نے صاف گوئی سے کہا۔
''اوہ......'' ماں نے سر جھکا لیا۔ اتنی دیر میں شبنمی واپس آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک شکل کا دیو قامت شخص تھا۔ ملکہ اسے دیکھتے ہی غضب ناک لہجے میں بولی۔
''شمشان!..... جاؤ زمین پر۔ معلوم کرو، میرے بچے کو کس نے مارا ہے؟ اُس کے خاندان کو نیست و نابود کر دو۔ ایسی سزا دو اُسے کہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے۔ جاؤ۔''
''جو حکم مادر ملکہ!'' شمشان نے سر جھکا دیا۔
''ارے ارے، ٹھہرو شمشان!...... ٹھہرو۔'' طالوت بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا اور شمشان رُک گیا۔
''ماں! ان کاموں کو تم رہنے دو۔ زمین کے حالات بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ براہِ کرم ان معاملات

میں تم دخل نہ دو۔"
"نہیں عبران! میں تمہارے زخم نہیں دیکھ سکتی۔ اُس کی جرأت کیسے ہوئی تھی؟"
"بات کچھ اور تھی ماں!...... خدارا میری بات مانو، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ شمشان! تم جاؤ، آرام کرو۔"
"کیا حکم ہے ملکۂ عالیہ؟" شمشان نے پوچھا۔
مادر ملکہ کچھ دیر تک طالوت کو دیکھتی رہی، پھر اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جب عبران تیار نہیں ہے تو رہنے دو۔"
"جو حکم......" شمشان نے گردن جھکائی اور واپس چلا گیا۔
"بال بال بچ گئے مسٹر عارف!...... خیر، کیا یاد کریں گے۔" طالوت میری طرف دیکھ کر بولا۔
"شبنمی......!" ماں نے پھر آواز دی۔
"جی ملکۂ عالیہ!"
"یوسف عبران کے زخموں پر مرہم لگاؤ۔ تم نقاہت تو نہیں محسوس کر رہے میرے بچے؟" ماں کے لہجے میں بے قراری تھی۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔
"اوہ، بالکل نہیں ماں!...... انسانوں کی زمین پر تو یہ زخم عام ہیں۔ کوئی انسان آپ کو زخموں سے خالی نظر نہیں آئے گا۔" طالوت نے جواب دیا۔
"جہنم میں جائیں سارے کے سارے...... انہوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟"
"وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ یہ ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔"
"انوکھا مشغلہ ہے۔ اور تجھے ایسے لوگوں سے دلچسپی ہے؟"
"دلچسپی اپنی جگہ ہے ماں!...... بہرحال، وہاں ایسے ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہماری دنیا میں نہیں ہوتے۔"
"اور تُو ان کے درمیان رہنا چاہتا ہے۔ دل نہیں اُکتاتا تیرا اُن سے؟"
"وہ دنیا ہی ایسی ہے ماں! کون ہے، جسے دُکھ نہیں ہے۔ لیکن وہ دنیا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ اُس دنیا کی خوبی ہے ماں!"
"نہ جانے تجھے کیا ہو گیا میرے بچے!" مادر ملکہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "یہ وہی بچہ ہے، جسے پہلے تیرے دھوکے میں لے آیا گیا تھا؟"
"ہاں۔" طالوت نے جواب دیا۔
"کیا تجھے بھی یہ دنیا پسند نہیں آئی میرے بچے؟" مادر ملکہ نے مجھ سے پوچھا۔
"یہ سکون کی دنیا عظیم ہے ماں!...... میری دنیا میں یہ سکون کہاں؟" میں نے جواب دیا۔
"اس کے باوجود یہ اس دنیا میں خوش نہیں رہے گا۔ یہ زندگی میں ہنگامے چاہتا ہے۔ اس کا دل اپنی دنیا ہی میں لگے گا۔" طالوت نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔
"کیوں میرے بچے!...... کیا عبران ٹھیک کہہ رہا ہے؟"
"جی ماں!" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''عجیب بات ہے......عجیب ہو تم دونوں۔''
شبنمی آگئی اور طالوت کے زخموں پر مرہم لگا دیا گیا۔
''بابا حضور خیریت سے ہیں ماں؟''
''ہاں ٹھیک ہیں۔ لیکن تیری جدائی سے خوش نہیں تھے۔''
''مجھ سے تو ناراض ہوں گے۔''
''ہاں۔''
''میرے بارے میں اطلاع کس نے دی؟''
''اُسی بے چین راسم نے......نہ جانے کیوں وہ تیرا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔''
''اوہ......آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم؟''
''نہیں......شاید شہنشاہِ اعظم نے راسم کو بھی منع کر دیا تھا۔''
''شبنمی......!'' اس بار طالوت نے کنیز کو آواز دی۔
''شہزادے حضور!'' شبنمی نے آگے آ کر گردن جھکا دی۔
''راسم کو تلاش کر کے لا......جلدی۔''
''ابھی آئی شہزادے حضور!'' شبنمی جلدی سے باہر نکل گئی۔ مادر ملکہ پھر بیٹھ گئی تھیں۔ ایک انتہائی خوش ذائقہ مشروب سے ہماری تواضع کی گئی۔ اس مشروب کو پینے کے بعد بدن میں قوت آ گئی تھی اور طبیعت بڑی ہلکی محسوس ہونے لگی تھی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد راسم آ گیا۔ آتے ہی وہ طالوت کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔
''میرے آقا!......میرے شہزادے!'' وہ طالوت کے پیروں سے منہ رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''چھوڑ یار!......تُو بھی بس یونہی نکلا۔''
''میری مجبوریوں پر نگاہ کریں شہزادے!......میری مجبوریوں کو نظر انداز نہ کریں۔ آپ کو کیا معلوم، راسم پر دن رات کس طرح گزرے ہیں۔ راسم تو کسی لمحے آپ سے دُور نہیں رہا۔''
''ہماری کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا؟''
''شہنشاہ حضور نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں آپ کے معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤں۔'' راسم نے گردن جھکا کر کہا۔
''پھر ہمیں یہاں کیوں لایا گیا؟'' طالوت نے ناگواری سے کہا۔ اس بات کا راسم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''ابا حضور نے ہمارے ساتھ ہمیشہ سختی کا سلوک کیا ہے امی!......آپ زمین کے لوگوں کو سزا دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ کیا میرے بارے میں آپ ابا حضور سے بات نہیں کر سکتی تھیں؟'' طالوت نے کہا۔
مادر ملکہ خاموشی سے سر جھکائے سوچتی رہیں، پھر انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''راسم!......ہمیں حقیقت بتاؤ۔''
''کیا عرض کروں ملکہ حضور!......آپ جانتی ہیں کہ میں اس وقت سے یوسف عبران کا خادم ہوں، جب ان کی اور میری عمر تین سال تھی۔ یوسف عبران نے مجھے کبھی خادم نہیں سمجھا اور ایک دوست کا درجہ

دیا۔ چنانچہ جب وہ زمین پر گئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ اس طرح میں بھی شہنشاہ کی نگاہوں میں معتوب تھا۔ حالات درست چلتے رہے۔ پھر ایک بدمعاش سادھو نے چالاکی سے عبران کو آگ میں گرا دیا اور ان کی ساری قوتیں سلب ہوگئیں۔ یہ عام انسان رہ گئے۔ چنانچہ اب میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

پھر جب یہ مزید پریشانیوں میں پھنسے تو میں مجبوراً شہنشاہ کے حضور حاضر ہوا۔ میں نے درخواست کی کہ شہزادے کی مدد کی جائے تو شہنشاہ حضور نے مجھے قید کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی ان کا نافرمان ہوں۔ طویل عرصے کے بعد یہ قید ختم ہوئی اور مجھے یوسف عبران کے حالات معلوم کرنے کی ہدایت کی گئی۔ سو میں نے زمین پر دیکھا کہ چند لوگ ان کے ساتھ سختی کر رہے ہیں۔ میں نے شہنشاہ کو اطلاع دی تو انہوں نے کچھ لوگوں کو بھیج کر انہیں یہاں بلا لیا۔"

"ہوں۔" ملکہ نے گردن ہلائی، پھر بولیں۔ "تم کیا چاہتے ہو عبران؟"

"کچھ نہیں ماں! میں زمین کی سختیاں برداشت کرنے کو تیار ہوں، لیکن میں وہاں جاؤں گا ضرور۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم کچھ توقف کرو۔"

"نہیں مہربان ماں!"

"آخر کیوں؟"

"زمین کے حالات میں، میں نے وہاں کچھ لوگوں سے رابطہ قائم کیا ہے۔ میری بھی زبان ہے۔"

"تم ان لوگوں کی نشاندہی کرو۔ وہاں ان کی امداد کی جائے گی۔"

"مجھے قبول نہیں۔"

"تم اپنے باپ کی مانند ضدی ہو۔" ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔"

"خیر...... ہم شہنشاہ سے گفتگو کریں گے۔"

"اور وہ گفتگو میرے حق میں ہوگی۔"

"ماں سے غلط توقع رکھتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" طالوت نے جواب دیا۔

کافی دیر تک ملکۂ عالیہ ہم دونوں سے گفتگو کرتی رہیں۔ اور پھر وہ کنیزوں کو ہماری خبر گیری کی ہدایت کر کے چلی گئیں۔ طالوت نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ "جی......" وہ آہستہ سے بولا۔ میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ "فرمانبرداری کے سارے ریکارڈ آپ یہیں نہ توڑیں۔ کیا سمجھے؟"

"کچھ نہیں سمجھا یار!" میں نے بے بسی سے کہا۔

"آپ نے ملکہ کی اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ اس سکون کی دنیا میں بھی رہنے پر آمادہ تھے۔

"یار طالوت! خدا کے واسطے۔ ان معاملات سے مجھے جس قدر دُور رکھ سکو، رکھنا۔ میں نے زندگی میں کبھی ماں نہیں دیکھی۔ ماں کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی ممتا مجھے مفلوج کر دیتی ہے۔ میں ماؤف ہو کر رہ

جاتا ہوں۔ مجھ سے کوئی بات کرائی تو وہ غلط ہی ہوگی۔“
”ٹھیک ہے بھائی! میں اکیلا ہی پھنسا ہوا ہوں۔“
”مگر اب ہوگا کیا؟“
”طوفان آئے گا، گرج چمک ہوگی۔ نتیجہ اس کے بعد ہی ظاہر ہوگا۔“
”خدا محفوظ رکھے۔ حالات غلط رُخ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔“
”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پروا نہ کرو۔ آخر میں وہی ہوگا، جو میں چاہتا ہوں۔ ہاں ایک اُمید بندھ گئی ہے۔“
”کیا؟“
”اگر حالات موافق ہو گئے تو ممکن ہے، میری بادشاہت مجھے مل جائے۔“
”خدا کرے ایسا ہی ہو“ میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ اور پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ ہماری تکلیف ایسی نہیں تھی کہ ہم بستر پر پڑے رہتے۔ لیکن بہرحال، ماں کا حکم تھا، اس لئے ہمیں رات تک بستر پر رہنا پڑا۔
ہاں، رات کو ملکۂ عالیہ بہ نفس نفیس ہمارے پاس آئیں۔
”کیسے ہو بچو؟“ انہوں نے پوچھا۔
”ماں کی دعا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”کھانے کے کمرے میں چل سکو گے؟“
”ہم بالکل ٹھیک ہیں ماں! صرف آپ کے حکم سے بستروں پر رہے ہیں۔“
”شکر ہے خدائے قدوس کا۔“
”ماں!“ طالوت آہستہ سے بولا۔
”ہوں۔“ ملکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
”بابا حضور سے گفتگو ہوئی؟“
”ہاں۔“
”کیسا موسم ہے؟“
”بہت خراب۔“
”اوہ..... پھر میں کھانے کے کمرے میں نہیں جاؤں گا“ طالوت جلدی سے بولا۔
”نہیں..... چلو تو بہتر ہے۔ بہرحال، تمہیں ان کا سامنا کرنا ہے۔ یوں بھی وہ تم سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔“
”عارف!“ طالوت نے مجھے پکارا۔
”جی؟“ میں آہستہ سے بولا۔
”میرے لئے ایک کام کر سکتے ہو؟“
”کر سکتا ہوں۔“ میں نے مستعدی سے کہا۔
”پہلے کام سن لو، پھر فیصلہ کرنا۔ معمولی کام نہیں ہے۔“ طالوت نے مسخرے انداز میں کہا۔

''دل چاہے سنادو۔ بہر حال میں آمادگی کا اظہار کر چکا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''تو میرے بھائی! کام یہ ہے کہ ہم دونوں یکساں لباس پہن کر بابا حضور کے سامنے جائیں گے۔ ابتدا اُن کے غصے سے ہوگی۔ وہ وقت تم اُن کے سامنے گزارنا۔ اور جب اُن کا غصہ اُتر جائے تو بتا دینا کہ تم یوسف عبران نہیں بلکہ عارف ہو۔''
ملکہ ہنس پڑیں۔ ''بڑے خود غرض دوست ہو عبران! دوست کے سر مصیبت ڈالنا چاہتے ہو۔''
''ہم لوگ اپنی مصیبتیں تقسیم کر لیتے ہیں ماں!.... کچھ مصیبتیں برداشت کرنے میں، میں ماہر ہوں.... اور کچھ میں عارف.... اب یہ مصیبتوں کی نوعیت ہوتی ہے کہ کون، کون سی مصیبت آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔''
''اچھا...... شرارت نہیں۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔''
''ماں! خدا کے واسطے مجھے اس منزل سے گزر جانے دو۔ عارف میری مدد پر آمادہ ہے۔ تم اسے نہ روکو۔''
''یہ تو سوچو عبران! کہ وہ ہمارا مہمان ہے۔''
''بعد میں سوچ لیں گے۔'' طالوت شرارت سے بولا۔
''بھئی جیسی تم لوگوں کی مرضی۔ تمہارا دوست ہے، تم جانو۔'' ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور طالوت نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔
''تیار ہو جاؤ استاد!''
''تیار ہوں بھائی!...... ایک بات کا وعدہ کرو۔ قربانی سے پہلے کی دُعا یاد ہے تمہیں؟''
''بالکل..... بالکل..... تمہاری قربانی حلال ہوگی۔ پروا مت کرو۔''
''اچھا، تم لوگ تیار ہو کر آ جاؤ۔ میں کھانے کے کمرے میں تمہاری منتظر ہوں۔'' ملکہ نے کہا اور باہر نکل گئیں۔
''آپ وعدہ کر چکی ہیں ماں! کہ آپ اس معاملے میں خاموش رہیں گی۔'' طالوت چیخ کر بولا۔
اس کے بعد ہم تیاریاں کرنے لگے۔ ہم دونوں نے یکساں لباس پہنا، مشاطاؤں نے ہمیں سنوارا اور پھر ہم دونوں شبنمی کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ طالوت کی نہ جانے کیا کیفیت ہو، حالت میری بھی خراب تھی۔ کھانے کے کمرے میں شہنشاہ موجود تھے۔ قہر و غضب کا پیکر، کشادہ پیشانی پر بل، بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی...... دیکھ کر ہی حالت خراب ہوتی تھی۔
لیکن ہم دونوں کو یکساں دیکھ کر تھوڑی سی اُلجھن صاف محسوس کی گئی۔ اور پھر میری بدبختی کہ مخاطب بھی مجھے ہی کیا گیا۔
''اِدھر آؤ..... بیٹھو!'' بادلوں کی گرج، الفاظ میں ڈھل گئی۔ مجال تھی جو نہ جا بیٹھتا۔ ''نالائق ہو۔ احمق ہو۔ بولو، اعتراف کرو۔''
''جی!'' میں سہمے ہوئے انداز میں بولا۔
''مجھے احمق سمجھتے ہو؟''
''جی نہیں۔'' میں جلدی سے بولا۔

''دشمن ہوں تمہارا؟''
''ہرگز نہیں۔''
''پھر تم نے مجھ سے فریب کیوں کیا؟...... مجھ سے نافرمانی کیوں کی؟...... کیا میں تمہیں سزا نہیں دے سکتا؟'' میں خاموش رہا۔ ''دیکھ لیا اس دنیا کو، جو تمہاری نگاہوں میں بہت خوب صورت تھی۔ کیسا پایا؟...... کیا اب بھی وہ تمہارے لئے دلکش ہے؟''
''میں نے...... میں نے کچھ نہیں کیا۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔
''پھر کس نے کیا؟...... بولو، پھر کس نے کیا؟...... میں نے تم سے کہا تھا کہ تم چلے جاؤ؟'' شہنشاہ پُر جلال انداز میں بولے۔
''جی وہ...... وہ......'' میری حالت واقعی خراب ہو رہی تھی۔
''بس..... بکواس بند کرو۔ تم نہایت نافرمان ہو۔ تم نے حکم عدولی کی ہے۔ تم نے تلاش کرنے والوں کو بیوقوف بنایا ہے۔ تم نے وہ کچھ کیا ہے، جو تمہیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔''
میں خاموش ہو گیا۔ شہنشاہ نے غصے میں بہت کچھ کہا۔ اور پھر اُن کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ وہ نرم ہو گئے۔ اور پھر انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کھانا شروع کرو۔''
اور سب خاموشی سے کھانے میں مشغول ہو گئے۔
کھانا نہایت خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد شہنشاہ بالکل پُرسکون تھے۔
''وہ کون تھا، جس نے تمہاری قوتیں چھین لیں؟''
''جی..... میری.....'' میں نے پھر گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔
''اور وہ کون تھے، جو تمہیں اذیت دے رہے تھے؟.... کیا چاہتے تھے وہ تم سے؟'' شہنشاہ نے پوچھا۔
''کب تک وہ غریب ہدفِ ملامت رہے گا؟'' بالآخر ملکہ سے میری حالت نہ دیکھی گئی۔
''کیا مطلب؟''
''ہمارے یہاں اس سے قبل مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا گیا۔'' ملکہ نے کہا۔
''آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی ملکہ!...... یہ مہمان کہاں سے ہوا؟''
''یہ مہمان ہی ہے۔''
''کیوں...... کیا یہ پھر وہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟''
''یہ بے چارہ تو کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔'' ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''پھر مہمان کیوں؟''
''اس لئے کہ اس کا نام عارف ہے۔''
''کیا مطلب؟'' شہنشاہ چونک پڑے۔
''اپنے بیٹے کو بھی نہیں پہچانتے آپ.... اپنے خون کی بُو بھی نہیں محسوس کر سکتے..... کیسے باپ ہیں؟''
''کیا...... کیا مطلب ہے اس بات کا؟...... کون ہو جی تم؟'' اس بار شہنشاہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔
''عارف۔'' میں ملکہ کی بات نہیں جھٹلا سکتا تھا۔

''اور عبران......وہ......وہ ہے؟'' شہنشاہ حیرت سے بولے۔
''جی......'' میں نے جواب دیا اور شہنشاہ بے ساختہ مسکرا پڑے۔ پھر وہ سنجیدہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔
''اور......اور یہ پاجی خاموش بیٹھا رہا۔''
''بابا حضور......!'' طالوت دوڑ کر شہنشاہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ''اب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ دوبارہ اسے آواز نہ دیں، دوبارہ ناراض نہ ہوں بابا حضور!''
''ارے احمق!......میں اس بچے کو بلاوجہ......''
''کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے اسے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔''
''معاف کرنا بیٹے!......میں نے تمہیں......معاف کرنا۔'' شہنشاہ نرم لہجے میں بولے۔
''جی کوئی بات نہیں۔''
''مگر تم نے بھی تو نہیں بتایا......اُفوہ، تم دونوں اس قدر ہم شکل ہو کہ ہم دھوکا کھا گئے۔'' شہنشاہ مسکراتے ہوئے بولے۔
''کوئی بات نہیں ہے بابا حضور! وہ فراخ دلی سے کہہ رہا تھا۔'' طالوت بولا۔
''تم نہایت نالائق ہو......کیا سمجھے؟'' شہنشاہ اسے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ اور پھر وہ میری طرف رُخ کر کے بولے۔ ''آؤ......تم بھی ہمارے سینے سے لگ جاؤ۔ تم ہمارے ہی بیٹے ہو۔ تمہاری سعادت مندی سے ہم بہت خوش ہوئے ہیں۔ لیکن بیٹے! تم درمیان میں بول کیوں نہیں پڑے کہ تم عبران نہیں ہو؟''
''بول کیسے پڑتا؟......تمہارے شریر بیٹے نے اس سے کہہ دیا تھا۔''
''کیا؟''
''یہی کہ اس کے بدلے ڈانٹ وہی سن لے۔''
''اوہ......اس کا مطلب ہے کہ عبران کا ہم شکل اعلیٰ ظرف کا انسان ہے، اور ایک اچھا دوست ہے۔'' شہنشاہ مسکراتے ہوئے بولے۔
''اور کیا آپ کا بیٹا، زمین کے گندے انسانوں کو دوست بناتا پھرے گا بابا حضور؟'' طالوت جلدی سے بولا۔
''بس تم نہایت نالائق ہو۔''
''راسم کو بلائیں بابا حضور! اور اُس سے معلوم کر لیں کہ میں نے زمین پر کتنی نالائقیاں کی ہیں۔''
''کیا مطلب؟''
''میں دوبارہ زمین پر واپس جانا چاہتا ہوں بابا حضور!'' طالوت نے کہا۔
''میرے غصے کو آواز نہ دو عبران!''
''میرا جانا ازحد ضروری ہے بابا حضور!''
''کیوں؟''
''اس لئے کہ جو کام میں نے وہاں شروع کئے ہیں، وہ ادھورے پڑے ہیں۔''
''کیسے کام؟''

''انسانیت کی فلاح کے کام۔ راسم آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس سے پوچھئے، زمین پر جا کر میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے اپنی قوتوں سے تعمیری کام کئے ہیں۔ میں نے زمین پر سسکتے ہوئے انسانوں کے دکھ دور کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا بابا حضور! اور ابھی بہت سے ایسے ہیں، جنہیں میری ضرورت ہے۔''

''عبران بیٹے! زمین بہت وسیع ہے۔ اس کے رہنے والے عجیب ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے خود مسائل پیدا کئے ہیں۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھو۔ زمین کیا تھی؟ اس کے رہنے والے کس قدر پُرسکون تھے۔ آسمان سے رزق اُترتا تھا۔ انہوں نے وہ رزق کھو دیا۔ اور وہ اپنے لئے گوناگوں دُشواریاں پیدا کرتے رہے۔ تم ان میں کس کس کا دُکھ بانٹو گے؟ دنیا تو دُکھوں کی آبادی ہے۔''

''جس قدر بھی ہو سکے بابا!...... جو بھی سامنے آ جائے۔ آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ انسانوں نے خود اپنی مٹی پلید کی ہے۔ لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جو بے گناہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ہمارا کام نہیں ہے بیٹے!''

''آپ نے مجھے تعلیم تو یہی دی ہے بابا حضور! کہ جس قدر نیکیاں سمیٹ سکتے ہو، سمیٹ لو۔ وہ صرف تمہاری کوشش ہو گی اور تمہارے کام آئے گی۔'' طالوت نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا نیکیاں کی ہیں تم نے زمین پر؟'' شہنشاہ کے انداز میں پھر جھلاہٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ طالوت نے ان کی خوب گرفت کی تھی اور وہ لاجواب ہو گئے تھے۔

''نیکیاں گنائی نہیں جا سکتیں بابا حضور! بس اتنا عرض کروں گا کہ جو سرِ عام رُسوا ہونے والے تھے، میں نے اُنہیں رُسوا نہ ہونے دیا۔ جو سفاک اور ظالم انسان کی قید میں تلملا رہے تھے، میں نے اُنہیں اُن کی قید سے چھڑایا۔ آپ کو اگر اپنے دیئے ہوئے سبق پر اعتماد ہے تو آپ سمجھ لیں کہ میں نے مظلوم کو نظرانداز نہیں کیا۔''

''لیکن عبران بیٹے......''

''اور آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی آنکھیں میری طرف لگی ہوئی ہیں۔ اُن کا رُواں رُواں مجھے پکار رہا ہو گا، میرا انتظار کر رہا ہو گا۔''

''کون ہیں وہ؟''

''وہ، جنہیں میں نے امداد کی آس دلائی ہے۔''

''لیکن یہ دنیا...... میرا مطلب ہے......'' شہنشاہ زیرِ ہوتے جا رہے تھے۔

''آپ کی دنیا، سکون کی دنیا ہے۔ آپ نے اپنی دنیا کو سکون دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ میں اس بے سکون دنیا کے چند لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں تو آپ مجھے روک رہے ہیں۔ بابا حضور! آپ مجھے منع کر رہے ہیں۔''

''میں نے کب منع کیا؟'' شہنشاہ جھلا کر بولے۔

''پھر یہ برہمی کیوں ہے؟...... یہ ناراضگی کیوں ہے؟''

''کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں؟''

''بفضلِ تعالیٰ...... میں ایک اعلیٰ نسب کا بیٹا ہوں۔''

سوئم

''یہ تیری ماں نہیں ہیں؟''

''ہیں بابا حضور!''

''ہمیں تیری ضرورت نہیں ہے۔ ہم تجھے نہیں دیکھنا چاہتے؟''

''آپ کی محبت سر آنکھوں پر...... لیکن کیا آپ کو اس بات پر مسرت نہیں ہوتی کہ آپ کا بیٹا دُکھی انسانیت کی خدمت کر کے اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔''

''دنیا میں جا کر تُو نے اور جو کچھ بھی کیا ہو عبران!...... بہرحال تُو چرب زبان ضرور ہو گیا ہے۔ باتیں بہت اچھی کر لیتا ہے۔'' بالآخر شہنشاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک ہے۔''

''لیکن عبران! ہمارا کیا ہو گا؟''

''اگر آپ بخوشی مجھے اجازت دے دیں تو میں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں ماں!''

''کیسی تجویز؟'' شہنشاہ نے کہا۔

''میں دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں، ہر ماہ کی دو راتیں اپنی دنیا میں گزاروں گا۔''

''اوہ......'' شہنشاہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''کافی چالاک ہو گیا ہے یہ ملکہ!''

''ہاں! میں نے محسوس کیا ہے۔''

''پھر آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' شہنشاہ نے پوچھا۔

''اس کی تجویز مناسب معلوم ہوتی ہے۔''

''تو سنو یوسف عبران! جس روز چاند ڈوبے، تم یہاں پہنچ جاؤ۔ چاند کی ڈوبنے والی رات اور نکلتے چاند کی رات تم یہاں گزارو گے۔ اور سختی سے اس وعدے کی پابندی کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں، آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تب میں تمہیں اس دنیا میں جانے کی اجازت دیتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ بابا حضور!...... براہِ کرم ہم دونوں کو وہیں پہنچوا دیں، جہاں سے اُٹھوایا تھا۔'' طالوت بولا۔

''کیوں؟...... وہ لوگ تو تمہارے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔''

''اگر وہاں نہ پہنچے اور دوبارہ پکڑے گئے تو وہ لوگ اس سے زیادہ زیادتی کریں گے۔ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔''

''مگر پکڑے ہی کیوں جاؤ گے؟''

''اس لئے بابا حضور! کہ اب میں بھی ایک عام انسان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔''

''اوہ...... وہ کون تھا، جس نے تمہیں آگ میں ڈالا تھا؟''

''ایک ہندو سادھو...... تلکا۔''

''کیا وہ زندہ ہے؟''

''نہیں۔ اسے میرے ہم شکل دوست نے قتل کر دیا۔''

''انسان بہرحال انسان ہے، اشرف المخلوقات۔ دیکھ لو، تم سے وہ نہ ہوا جو اس نے کر دکھایا۔

بہر حال، پیرابوزاس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔'' شہنشاہ نے کہا اور طالوت نے اُٹھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ طالوت نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''کیسی رہی استاد؟''

''لاجواب۔ کمال کیا ہے تُو نے بدمعاش انسان!''

''جن کہو، جن۔'' طالوت بولا۔

''یہ پیرابوزاس کون بزرگ ہیں؟''

''بڑے کام کی چیز ہیں۔ بس میں جلدی سے ہو آؤں۔ ویسے تمہیں میرے معاہدے پر اعتراض تو نہیں ہے؟''

''کون سا معاہدہ؟''

''وہ ڈوبتے چاند کی رات والا۔''

''اوہ، نہیں طالوت!...... اعتراض کی کیا بات ہے؟ میں تو بہت خوش ہوں۔ اس طرح تمہارے والدین بھی خوش رہیں گے۔ دو دن کی بات ہی کیا ہوتی ہے۔'' میں نے خلوص سے کہا۔

''سچ پوچھو تو یہ اتنی عمدہ بات ہوئی ہے، جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس سے مجھے بڑی مراعات مل جائیں گی۔''

''یقیناً۔''

''اچھا تو میری جان!...... اجازت۔ ممکن ہے کچھ وقت لگ جائے۔''

''خدا حافظ!'' میں نے کہا اور طالوت چلا گیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اور پھر میں ایک مسہری پر دراز ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اور پھر نہ جانے غنودگی آ گئی یا میں ذہنی طور پر اتنا کھو گیا کہ کوئی احساس ہی نہ رہا۔ پیشانی پر ایک نرم و گداز سی گرماہٹ کا احساس ہوا تو آنکھیں کھل گئیں۔ آنکھیں کھلیں تو ایک رنگین بدن خود پر جھکے ہوئے پایا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جلدی سے اس کے نیچے سے سرک کر اُٹھ گیا۔

''عبران!'' اُس کی مترنم آواز اُبھری اور میں نے گہری سانس لی۔ وہی معاملہ تھا۔ ''میں نے سنا ہے عبران! تم نے واپس جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی ہاں۔''

''میرے دل کی آواز آج تک تمہارے کانوں میں نہیں پہنچی عبران؟'' حسین خدوخال والی لڑکی نے اداس نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تار خراب ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا انسانوں کی آبادی میں کسی سے دل لگا بیٹھے ہو عبران؟''

''سینگ نکل آئے ہیں کیا میرے؟'' میں نے کہا۔

''پھر...... پھر میری محبت کیوں قبول نہیں کر لیتے؟...... کیا تمہیں آج تک احساس نہیں ہوا کہ میں تمہیں کس قدر چاہتی ہوں۔''

''کبھی غور ہی نہیں کیا۔''

''آہ......کیا میں اس قابل نہیں ہوں؟''

''آپ کی قابلیت پر بھی میں نے غور نہیں کیا۔''

''کیوں......آخر کیوں؟''

''اس لئے کہ میں عبران نہیں ہوں۔'' میں نے ڈراپ سین کر دیا اور وہ اُچھل پڑی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر باہر بھاگ گئی۔

''آہم......'' میں نے مصنوعی ڈکار لی اور سر سہلانے لگا۔ ابھی اور نہ جانے کتنے دلچسپ واقعات پیش آئیں گے۔ میں نے سوچا۔ یہاں بھی عشق و محبت کے جراثیم کافی مقدار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خاتون بھی عبران سے عشق کرتی ہیں۔ بہر صورت، کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ تو برہمچاری ہو کر رہ گئے ہیں۔

اور پھر میری ذہنی رو عظمت پور کی طرف بھٹک گئی۔ شکیلہ کا معاملہ بے حد پُراسرار ہو گیا تھا۔ آخر وہ کیا تھی؟ اور اُس نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا تھا؟......اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک دھماکا ہوا اور میں اُچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ افوہ......افوہ......اس انداز میں پہلے کیوں نہیں سوچا تھا۔ کیسی غلطی ہو گئی۔

''طالوت!......طالوت! کہاں ہو یار؟......جلدی آؤ۔'' میں نے کہا۔

''ہم یہاں ہیں ہماری جان!'' کارنس سے طالوت کی آواز آئی اور میں اُچھل پڑا۔ کارنس پر ایک خوبصورت پرندے کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ ''آ جاؤں؟'' پرندے نے چونچ ہلاتے ہوئے کہا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجسّمے کو گھور رہا تھا۔ دوسرے لمحے دھات کے بنے ہوئے مجسّمے نے پَر کھولے اور کارنس سے پرواز کرتا ہوا میری آغوش میں آ بیٹھا۔

میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ابے سیدھا بیٹھ......کیا اُچھل کود مچا رہا ہے؟'' پرندے نے پھر کہا۔

''طالوت......طالوت......'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''اونہہ......لے یار!'' مجسّمے نے کہا اور دوسرے لمحے طالوت میرے سامنے تھا۔ مجسمہ پھر بے جان ہو گیا تھا۔

''ارے باپ رے......یہ......یہ سب کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''سب کچھ ہے میری جان!......نئے ساز و سامان سے آراستہ طالوت آپ کی خدمت میں۔''

''اوہ......تو......تو تمہاری قوتیں واپس مل گئیں۔''

''پیر سائیں زندہ باد۔ بابا حضور نے مخصوص ہدایات کے ساتھ تو بھیجا نہیں تھا۔ چنانچہ جو چاہا، مانگ لیا۔''

''مبارک ہو یار!......دلی مبارکباد۔''

''مجھے کیوں پکار رہے تھے؟''

''بس ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔''

"کیسا خیال؟" طالوت نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ میں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ طالوت کے چہرے کی دمک سے اندازہ ہو رہا تھا، جیسے وہ بہت خوش ہے۔ ظاہر ہے، اس کی کھوئی ہوئی دولت اسے مل گئی تھی۔

"ہوٹل میں ہمیں شکیلہ ملی تھی۔"

"ہاں۔"

"اور اس کے انداز میں اجنبیت تھی۔"

"ہاں، تھی۔"

"کیا وہ حقیقتاً اجنبی نہیں ہو سکتی؟"

"کیا مطلب؟"

"یار! کہیں وہ افشاں تو نہیں تھی؟"

"اوہ......" طالوت بھی ہکا بکا رہ گیا۔ کئی منٹ تک وہ خاموش رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ حقیقت ہے عارف! جب گردش ہوتی ہے تو انسان کا ذہن بھی ماؤف ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہم نے پہلے نہیں سوچی تھی۔"

"ہاں۔"

"ہو سکتا ہے میرے دوست!...... ہو سکتا ہے، یہی بات ہو۔ لیکن وہ افشاں تھی تو اس کا مطلب ہے، کافی چالاک لڑکی ہے اور کسی مصیبت میں نہیں ہے۔ ارے تم نے محسوس نہیں کیا؟"

"ہاں...... یقیناً۔"

"پھر تو وہ جان بوجھ کر گھر سے غائب ہے۔"

"ابھی قیاس آرائی مناسب نہیں ہے۔ وہاں چل کر ہی غور کریں گے۔"

"بس اب یہاں سے بھاگو۔" طالوت نے کہا۔

"یہ تو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ اجازت لے لی؟"

"بس اجازت ہی لینا ہے۔ ویسے یار! تم نے ذہن ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ وہ افشاں ہی ہو۔ ہم بے چاری شکیلہ کی طرف سے یونہی بدگمان ہو گئے تھے۔"

"مگر پھر شکیلہ کہاں گئی؟"

"تبرک...... وہی تبرک...... اوہ، تبرک بیٹے! سنبھلو۔ اب تمہاری شامت آ ہی گئی...... دیکھ لوں گا تمہیں اچھی طرح......" طالوت نے گھونسہ بناتے ہوئے کہا اور میں ہنس پڑا۔ درحقیقت بے چارے تصدق کی تو اب شامت آ ہی گئی تھی۔

"آؤ عارف! اب مادر ملکہ اور شہنشاہ سے اجازت لے لیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے ابھی کچھ دیر قبل ایک خاتون میرے پاس آئی تھیں۔" میں نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"خاتون؟" طالوت نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

''کیا فرماتی تھیں؟''

''عشق۔''

''اللہ اکبر......پھر تم نے معذرت کر لی؟''

''ہاں۔ میں نے تصحیح کر دی کہ میں یوسف عبران نہیں بلکہ عارف ہوں۔ چنانچہ فرار ہو گئیں۔''

''نہایت مناسب۔''

''کون خاتون تھیں؟''

''میں کیا جانوں؟'' طالوت نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی ایک آدھ ہو تو یاد بھی رکھوں۔ نہ جانے کون کون ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا اور میں خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے، وہ شہزادہ تھا۔ اس معاملے میں جھوٹ نہیں بول رہا ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ملکۂ عالیہ اور شہنشاہ کے حضور پہنچ گئے اور طالوت نے ان سے اجازت طلب کی۔

''اتنی جلدی کیا ہے عبران!......ایک آدھ دن اور رُکو۔''

''میں حسبِ وعدہ ضرور حاضر ہو جاؤں گا، مادرِ مہربان! کچھ معاملات ایسے ہیں جن کی مجھے جلدی ہے۔ اجازت دیں، نہایت شکر گزار ہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار پھر تمہارا وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔ چاند ڈوبنے والی رات تم یہاں ہو گے۔ اس وعدے میں کبھی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔'' شہنشاہ نے کہا۔

''آپ مطمئن رہیں بابا حضور!'' طالوت نے جواب دیا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ماں اور باپ کے ہاتھ چومے۔ ملکہ نے میرے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ شہنشاہ نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

''راسم ساتھ نہیں جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' طالوت نے کہا اور پھر آواز دی۔ ''راسم......!''

''حاضر۔'' راسم نے بائیں سمت سے جواب دیا۔

''کیا انتظامات ہوئے؟''

''جو حکم۔'' راسم نے جواب دیا۔

''تب میرا خیال ہے، اہتمام کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا تبرک کہاں ہے؟''

''عظمت پور کے باغات میں۔''

''کیا کر رہا ہے؟''

''سو رہا ہے۔'' راسم نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میرے نزدیک آ جاؤ عارف!'' اس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کیا حرکت کرنے والا ہے۔ اُس نے میرا ہاتھ اونچا کیا اور میں گرنے سے سنبھلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن راسم نے ہاتھ نیچے کر لیا اور میرا سر چکرا گیا۔ پھر میں نے سبز سبز درخت دیکھ کر گہری سانس لی تھی۔

''تکنیک میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے بھائی!......شکار ہوں تمہارا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''غلط......ہمارا شکار تو بھائی تبرک ہیں۔ آؤ ذرا ان کی زیارت کریں۔''

''پروگرام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مرمت کریں گے خبیث کی۔'' طالوت دانت پیس کر بولا۔

''اس میں کیا مزہ آئے گا طالوت؟''

''پھر تم بتاؤ۔''

''میرا خیال ہے، اسے تنگ کیا جائے۔''

''کس طرح؟''

''یار! تم بھی یہی پوچھ رہے ہو۔ تمہارے لئے یہ کوئی مشکل کام ہے؟''

''کیا خیال ہے، اس سے شکیلہ کے بارے میں معلوم کریں؟''

''وہ بھی معلوم کریں گے۔''

''تب پھر آؤ۔'' طالوت نے کہا اور ہم اس عمارت کی طرف چل پڑے، جہاں تصدق کے موجود ہونے کے امکانات تھے۔

ہمارا اندازہ اور راسم کا کہنا درست تھا۔ تصدق ایک کمرے میں سو رہا تھا۔ ہم لوگ اس کے سرہانے پہنچ گئے۔ موٹے آدمی کے موٹے خراٹوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ عجیب مضحکہ خیز خراٹے لے رہا تھا، جیسے دو کتے لڑنے سے قبل ایک دوسرے پر غرّا رہے ہوں۔ خراٹے کی ابتدا کرتے وقت اُس کا منہ پورا کھل جاتا تھا اور پھر بعد میں ہونٹ مضبوطی سے بھینچ جاتے تھے۔

''کیا یہ دم توڑ رہا ہے؟'' طالوت نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں......خراٹے لے رہا ہے۔''

''اس کے حلق سے خرخراہٹ تو ایسی ہی بلند ہو رہی ہے، جیسے کوئی بکرا ذبح کیا جا رہا ہو۔ یار عارف! مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ کیا میں اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دوں؟'' اور پھر وہ اچانک کسی خیال کے تحت اُچھل پڑا۔ میں نے ایک ہاتھ بلند کیا اور مٹھی بند کر لی۔ پھر اس نے تصدق کے منہ کے قریب مٹھی کھول دی۔ سرخ رنگ کی کوئی چیز میں نے بھی تصدق کے ہونٹوں پر دیکھی تھی۔

''آ جاؤ۔'' طالوت نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے کونے میں پہنچ گیا۔

''کیا ,کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ لیکن پھر اپنا سوال خود ہی تشنہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ تصدق نے منہ بند کیا تھا اور اُس کی خوفناک دہاڑ کمرے میں گونج اُٹھی تھی۔

''آغو......او...... پھا...... غو...... غو...... ہا......'' اُس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلیں اور اُس نے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ پھر وہ زمین پر کودنے لگا۔ وہ تھو تھو کرتا جا رہا تھا، لیکن مرچیں ایسے تو پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ تصدق کی بری حالت تھی۔ چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں۔

''مغیا......غائے......مغیا......تھو, تھو......اغے......خیا......'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے ناچ رہا تھا۔ اور پھر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ طالوت پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہا تھا۔

''یار! یہ تو بہت عمدہ رقاص ہے......اس کی یہ صفت تو آج ہی معلوم ہوئی۔'' طالوت ہنستے ہوئے بولا۔ ''پانی بھی اس کا حلق صاف نہیں کر سکے گا۔ مرچیں خالص تھیں۔''

اور یہ حقیقت تھی۔ تصدق کافی دیر تک غسل خانے میں غرارے کرتا رہا۔ پھر جب وہ باہر آیا، تب بھی اُس کی حالت اچھی نہ تھی۔ وہاں سے وہ سیدھا باورچی خانے پہنچا۔ پہلے کوئی چیز کھائی، پھر گھی کی کُلّیاں کیں، تب جا کر شاید اُسے سکون ملا۔ ہم لوگ بھی اُس کے پیچھے باورچی خانے کے دروازے تک پہنچ

گئے تھے۔

اور باورچی خانے سے نکلتے وقت اُس کی نگاہ ہم دونوں پر پڑی۔ وہ بری طرح اُچھل پڑا۔

"تم..... تم......" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اخاہ...... بھائی تبرک! کیسے ہیں آپ؟" طالوت نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"تم...... تم یہاں کیسے آ گئے؟...... تم پولیس کو جُل دے کر نکل گئے تھے۔" تصدق نے بدحواس لہجے میں کہا۔

"کیا آپ اندازہ نہیں لگا سکے بھائی تبرک! کہ ہم وہاں سے کیوں بھاگے تھے؟"

"تم...... تم تو عادی بدمعاش ہو۔"

"درست خیال ہے۔ لیکن ہمیں گرفتار کرانے میں آپ نے پولیس کی پوری پوری مدد کی ہے۔"

"ہاں..... کی ہے..... پھر؟...... یہ میرا فرض تھا۔"

"ہم بھی اپنا فرض ہی پورا کرنے آئے ہیں تبرک بھائی!"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"عادی بدمعاش ہیں۔ اگر چاہیں تو آپ کو قتل کر کے خاموشی سے باغ کے کسی حصے میں دفن کر دیں۔ لیکن ہم اس طرح مارنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم آپ کو ایسی سزا دیں گے تبرک بھائی! جس سے دوسرے بھی محظوظ ہوں گے۔ ویسے میرا خیال ہے، مرچیں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔"

"آخ تھو...... آخ تھو..... تو...... تو یہ سب کچھ تم نے کیا ہے ذلیلو!...... آخ تھو۔"

"یہ تو ابتدا ہے تبرک بھائی! ہم تو قبر میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے ہم دونوں کی جان لے لی ہے، ہم بھی آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ایں..... کیا مطلب؟..... کیا مطلب؟" تصدق چونک پڑا۔

"ہاں تصدق!...... ہماری زندگیاں تمہاری وجہ سے گئیں۔"

"زندگیاں گئیں؟"

"اوہ..... انجان کیوں بن رہے ہو؟ کیا تم ہی نے ہمیں گرفتار نہیں کرایا تھا؟"

"لیکن زندگیوں والی بات......؟"

"پولیس نے ہمارے اوپر اتنا تشدد کیا کہ ہم مر گئے۔"

"مم...... مر گئے؟" تصدق کا منہ بھاڑ کی طرح کھل گیا۔

"اوہو...... کیا تمہارے ہاں کے اخبارات میں ہماری موت کی خبر نہیں چھپی؟"

"نہیں...... ان میں تو تمہارے فرار کی کہانی ہے۔ پولیس رپورٹ تو یہ ہے کہ تم دونوں بڑے پُراسرار انداز میں فرار ہو گئے۔ کچھ پُراسرار لوگوں نے اس فرار میں تمہاری مدد کی ہے۔" تصدق بولا۔

"خوب...... ظاہر ہے، پولیس اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اوپر تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ اور پھر جب ہم مر گئے تو ہماری لاشیں دریا میں ڈلوا دی گئیں۔"

"دریا میں؟" تصدق اُچھل کر بولا۔

"ہاں، دریا میں۔" طالوت الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

"لیکن.....پھر.....تم وہاں سے کیسے نکلے؟"
"روحوں کے لئے کون سی بات مشکل ہے؟"
"رر.....رو.....روح....." تصدق کی چیخ نکل گئی۔ "مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
"ان لوگوں سے انتقام لینے، جو ہماری موت کے ذمہ دار ہیں۔"
"ارے.....ارے.....مم.....مر گیا.....مر گیا....." تصدق نے اپنے بھاری بھرکم بدن کے ساتھ بڑی پھرتی سے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی، لیکن طالوت نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔
"بھاگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔
"جائے گا کہاں۔" طالوت پوری طرح شرارت کے موڈ میں تھا۔ اور پھر وہ میرا ہاتھ پکڑے باہر نکل آیا۔ تصدق بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہم اُسے صاف دیکھ رہے تھے۔ باغ کے ایک گوشے میں پہنچ کر وہ رُکا اور خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔
طالوت نے مجھے اشارہ کیا اور اس بار اس نے مجھے بہلاوا بھی نہیں دیا تھا۔ بس ہلکا سا چکر آیا اور دوسرے لمحے ہم تصدق کی پشت پر تھے۔ تصدق کا رُخ سامنے تھا۔
"تو پیارے تبرک!" طالوت بولا اور تصدق کی دہشت آمیز چیخ نکل گئی۔ اُس نے گردن گھما کر ہمیں دیکھا اور بری طرح چیخنے لگا۔ اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن طالوت نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔
"کہاں تک بھاگو گے میری جان!" طالوت بولا۔ "چلو بھاگ جاؤ۔" اُس نے تصدق کا گریبان چھوڑ دیا اور تصدق کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح دوڑا۔ طالوت نے ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے بھی وہ خوفناک منظر دیکھا، جو بلاشک انسان کو دہلانے کے لئے کافی تھا۔ خود میری بھی نہ جانے کیا حالت ہوتی، اگر میں طالوت سے واقف نہ ہوتا۔
طالوت کا ہاتھ کسی رسّی کی طرح دراز ہو رہا تھا۔ اُس کا پنجہ تصدق کی گردن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور بلاشک تصدق کوئی سو گز دُور گیا ہوگا، تب طالوت نے دوبارہ اُس کی گردن پکڑ لی۔ اور پھر اُس کا پنجہ تصدق کو واپس اس کے پاس کھینچ لایا۔ تصدق اب ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔
"اچھا پیارے تصدق! اب اجازت دو۔ اور ہاں، ہماری طرف سے یہ تحفہ قبول کرو۔ آتے جاتے رہیں گے۔" طالوت نے ایک چیز نکالی اور تصدق کی پشت سے لگا دی۔
میں نے چونک کر اس شے کو دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لمبے لمبے بالوں والی ایک دُم تھی، جو زور زور سے ہل رہی تھی۔ دُم تو ٹھیک تھی، چپکائی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ ہل کس طرح رہی تھی، یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ تصدق نے تو شاید اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔
پھر طالوت نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پیچھے ہٹ آیا۔
تصدق آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔
"ارے، کیا یہ اندھا ہو گیا؟" میں نے طالوت کے کان میں سرگوشی کی۔
"نہیں۔ بس ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔"
"مجھے بھی؟"

''ہاں، تمہیں بھی۔''
''اوہ.....'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے، اس بار تم ضرورت سے زیادہ ہی مسلح ہو کر آئے ہو۔ مگر یہ دُم؟''
''تحفتاً دی ہے، بھائی تبرک کو۔''
''یار! یہ ہل کیسے رہی ہے؟''
''ہمیشہ ہلتی رہے گی۔ اب اس کا پورا نام، تصدق دُم دار ہے صاحب!'' طالوت نے کہا اور میں ہنس پڑا۔
ہم دونوں کچھ فاصلے سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اس بے چارے کے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ اب بھی ذرا سی آہٹ پر چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگتا۔
''ایک بات ہے طالوت!'' میں نے کہا۔
''کیا؟''
''ہم اس سے شکیلہ کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں پوچھ سکے۔''
''پوچھ لیں گے، ذرا دم لے لینے دو اسے۔ اب اسے چھوڑے گا کون؟'' طالوت نے ہنستے ہوئے کہا اور ہماری نگاہ پھر تصدق کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ اپنا لباس درست کر رہا تھا۔ اور پھر وہ ایک طرف چل پڑا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ طالوت نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔
تصدق شاید ہمارے قدموں کی چاپ بھی نہیں سن پا رہا تھا۔ بہر حال، چند منٹ کے بعد وہ درختوں کے درمیان کھڑی ایک لینڈ روور تک پہنچ گیا۔ ہم اس کا مقصد سمجھ گئے تھے۔
پھر بھلا لینڈ روور میں وہ اکیلا کیوں ہوتا، ہم بھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی پشت پر بیٹھ گئے تھے۔ تصدق، لینڈ روور کی سیٹ پر بیٹھا اور پھر اُچھل پڑا۔ اُس نے پشت پر ہاتھ مارا اور بالوں والی دُم اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ تصدق کی بے ساختہ دھاڑ بہت زوردار تھی۔ شاید وہ دُم کو سانپ سمجھا تھا۔ اُس نے سیٹ سے چھلانگ لگائی اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر جا پڑا۔ بری طرح گرا تھا۔ لیکن دُم اس کے ساتھ تھی۔ اسے محسوس کر کے تصدق نے پھر چیخ ماری اور زور سے کھینچ کر خود سے الگ کرنا چاہا۔
لیکن پھر دوسری چیخ بھی فطری تھی۔ ایک بار پھر وہ گر پڑا تھا۔ تب اس نے سنجیدگی سے دُم کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے اچھی طرح دُم ٹٹولی، اسے چہرے کے قریب کر کے دیکھا۔
''ارے، ارے..... یہ..... یہ کیا ہو گیا؟..... ہائے یہ کیا ہو گیا؟'' وہ روتی آواز میں بولا۔ ''ارے باپ رے..... اب کیا کروں؟..... دُم نکل آئی۔'' پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ عجیب مضحکہ خیز انداز میں رو رہا تھا۔ اور پھر چپ بھی اچانک ہی ہوا تھا۔ شاید کوئی خیال آ گیا تھا۔
''ارے باپ رے۔'' ایک بار پھر وہ سہمے ہوئے انداز میں چیخا اور پھر جلدی سے لینڈ روور میں گھس گیا۔ اس نے بمشکل تمام دُم سمیٹ کر کسی طرح ایک طرف رکھی اور لینڈ روور اسٹارٹ کر کے اندھادُھند دوڑا دی اور باغ سے نکل بھاگا۔ ہم دونوں نے سیٹیں مضبوطی سے پکڑ لی تھیں۔ تصدق پاگلوں کے سے انداز سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ باغ سے کافی دُور آ کر وہ کسی حد تک سنبھلا اور اُس نے رفتار تھوڑی سست

کردی۔ دُور سے ایک کار آتی نظر آ رہی تھی۔ تصدق نے لینڈ روور کی رفتار کچھ اور سست کر دی۔
کار لینڈ روور کے قریب سے گزری اور پھر اُس میں سے ایک تیز نسوانی آواز اُبھری۔ ''ہائے...... تصدق!'' اور تصدق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں بریک لگا دیئے۔
دوسری طرف جانے والی کار بھی رُک گئی تھی۔ اور پھر وہ بڑی تیزی سے ریورس ہو کر تصدق کی گاڑی کے برابر پہنچ گئی اور ایک بار پھر ہمارے ذہن کو جھٹکا لگا۔
وہ شکیلہ ہی تھی۔
تصدق ساکت و جامد اُسے دیکھ رہا تھا۔
''ارے تصدق! کیسے ہو تم؟...... کہاں بھاگ رہے ہو؟'' لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔
''افشاں بی بی!'' تصدق نے آہستہ سے کہا۔
''کیوں، کیا مجھے پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے؟'' لڑکی نے کہا۔
''آپ...... آپ آپ گئیں افشاں بی بی؟''
''ہاں۔ میں نے تمہیں اطلاع دی تھی۔''
''اطلاع تو مل گئی تھی افشاں بی بی! لیکن...... لیکن آپ نے مار دیا مجھے۔ میں تو بے موت مارا گیا افشاں بی بی!...... مارا گیا، خدا کی قسم...... میں تو بے موت مارا گیا۔''
''ارے، ارے...... کیا ہوا تصدق؟ اور اب جا کہاں رہے ہو؟...... چلو، واپس چلو۔''
''کہاں؟'' تصدق اُچھل پڑا۔
''باغ میں۔''
''باغ......'' تصدق غیر اختیاری طور پر چیخا اور افشاں گہری سانس لے کر اُسے گھورنے لگی۔
''کچھ اور کھسک گئے ہو شاید۔'' لڑکی اُسے گھورتے ہوئے بولی۔
''میں کیا بتاؤں؟'' تصدق روہانسی آواز میں بولا۔
''اُفوہ! کچھ تو بتاؤ...... کچھ تو بتاؤ تصدق!''
''کیسے بتاؤں؟'' تصدق نے بے چارگی سے کہا۔
''کیوں...... کیا تمہارے حلق میں تکلیف ہے؟'' لڑکی نے کہا اور تصدق نے گردن جھکا لی۔ ویسے ہم دونوں ہی گہری نگاہوں سے لڑکی کا جائزہ لے رہے تھے۔ بلاشبہ وہی تھی، جو ہوٹل میں ملی تھی۔ یہ بات ذہن میں آئی تھی لیکن اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ شکیلہ نہیں، افشاں ہے۔ لیکن افشاں اور تصدق کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔
''کیوں سڑک رو کے کھڑے ہو؟...... میں کہتی ہوں، باغ میں کیوں نہیں چلتے؟ وہاں سکون سے گفتگو ہو گی۔''
''نہیں، نہیں...... باغ میں نہیں۔ خدا کی قسم! باغ کا نام نہ لیں۔ ہارٹ فیل ہو جائے گا۔'' تصدق پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔
''ارے، تو خدا کے بندے! کہیں تو مرو۔ کیا یہیں کھڑے رہو گے؟''
''آپ...... آپ میری گاڑی میں آ جائیں افشاں بی بی!''

''اور اپنی گاڑی کا کیا کروں؟''

''یہیں کنارے کر دیں۔ پھر واپسی میں آپ کو اسی جگہ چھوڑ دوں گا۔''

''اور جاؤ گے کہاں؟''

''کہیں بھی نہیں۔ بس کسی پُرسکون جگہ گاڑی روک کر باتیں کریں گے۔''

''یہاں کیا مصیبت آ رہی ہے؟ یہ جگہ بھی تو پُرسکون ہے۔ گاڑی سائیڈ میں کر کے نیچے اُتر آؤ۔ درخت کے نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔ نہ جانے باغ کے نام سے تم پر کیوں وحشت سوار ہے۔''

''بس میں آپ کو نہیں بتا سکتا، افشاں بی بی!''

''نہ بتاؤ۔ جہنم میں جاؤ۔ اب اُترو تو سہی۔''

''افشاں بی بی...... افشاں بی بی! میں اُتر بھی نہیں سکتا۔'' تصدق نے لجاجت سے کہا۔

''ارے ارے، تم تو واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ میں سوچ رہی ہوں، تمہاری دماغی حالت پر اعتبار بھی کروں یا نہ کروں۔''

''اب جو کچھ بھی چاہیں سمجھ لیں۔ آپ اسی گاڑی میں آ جائیں۔'' تصدق بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور افشاں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا کر سڑک کے کنارے پارک کر دی اور پھر دروازہ کھول کر نیچے اُتری اور لینڈ روور میں آ بیٹھی۔ تصدق اس دوران دُم چھپانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اُس نے حتی الامکان دُم چھپا لی تھی۔

افشاں نے گاڑی میں داخل ہو کر اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''بظاہر تو کوئی تبدیلی نہیں نظر آتی، البتہ کھوپڑی ضرور کھسک گئی ہے۔''

''میں کچھ نہ کہوں گا افشاں بی بی! کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔''

''اچھا۔ اب چلو جہاں چل رہے ہو۔''

''کمپنی پارک چلوں...... یہاں سے زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔''

''اوہ، فضول آدمی! جہاں دل چاہے چلو۔'' لڑکی نے کہا۔

تصدق نے پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم دونوں کی دلچسپی عروج پر تھی۔ اس وقت تو واقعی لطف آ گیا تھا۔ کیسے انوکھے انکشافات ہوئے تھے اچانک۔ اور اب...... اب ان دونوں کی گفتگو سے یقیناً بہت سے رازوں کا انکشاف ہوگا۔ ممکن ہے، شکیلہ کا پتہ بھی چل جائے۔

چنانچہ ہم بھی خاموشی سے کمپنی پارک کا انتظار کرنے لگے۔ افشاں بار بار تصدق کی شکل دیکھنے لگتی تھی۔ لیکن تصدق کی نگاہیں سامنے تھیں اور اس کے چہرے پر شدید ہیجان کے آثار تھے۔

راستے میں خاموشی رہی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد لینڈ روور کمپنی پارک کے سنسان علاقے میں داخل ہو گئی۔ پھر ایک جگہ گاڑی روک کر تصدق گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

افشاں اب بھی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے تصدق؟'' آخر وہ عاجز آ کر بولی۔

''طویل داستان ہے افشاں بی بی!''

''شاید میری طویل جدائی نے تمہارے اندر کافی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔'' افشاں نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

''میں تو پیدا ہی مذاق اُڑائے جانے کے لئے ہوا ہوں، افشاں بی بی!.....آپ کا دل خوش ہو جائے، بس یہی میری خواہش ہے۔''

''بھئی تمہارا انداز ہی ایسا ہے کہ بے اختیار زبان میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔''

''میری بدقسمتی کہ میں آپ کو کبھی متاثر نہ کر سکا۔''

''اچھا اب فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ گھر کے حالات بتاؤ۔''

''بے حد خراب ہیں۔ آپ نے بڑا ظلم کیا ہے افشاں بی بی!''

''کیوں؟''

''بڑی ماں تو کئی بار موت کے منہ سے نکلی ہیں۔ ان کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔''

''ارے......'' افشاں سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

''ایسی ویسی مصیبت آئی ہے یہاں، کیا بتاؤں؟.....تنویر صاحب بے چارے زندہ درگور ہو گئے ہیں۔''

''اوہو، تصدق! مجھے اس حد تک حالات بگڑ جانے کی اُمید نہیں تھی۔''

''لیکن آپ غائب کہاں ہو گئی تھیں افشاں بی بی؟.....آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ اپنے ہر اسٹیشن سے رپورٹ دیں گی۔''

''غلطی ہو گئی تھی تصدق!...... مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم اس قدر ثابت قدم رہو گے۔ میں نے سوچا، اگر میں تمہیں اپنے ٹھکانوں کے بارے میں بتاتی رہی تو ایک روز ڈیڈی آئیں گے اور مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔''

''میں نے تو شدید ترین حالات میں بھی زبان نہیں کھولی۔''

''واقعی، تم نے احسان کیا۔''

''احسان کی بات نہیں افشاں بی بی!...... بارہا میرا دل چاہا کہ آپ کے بارے میں بتا دوں، لیکن اس سے فائدہ؟ سوائے اس کے کہ آپ کا رازدار ہونے کی وجہ سے میری مصیبت آ جاتی۔''

''واقعی میری وجہ سے تم بڑی اُلجھنوں کے شکار رہے ہو تصدق!''

''میں آپ کو کیا کیا بتاؤں افشاں بی بی!......ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات ہوئے ہیں کہ بس۔''

''اب کیا حالت ہے امی کی؟''

''نیم دیوانی ہیں بے چاری۔ بس میں کیا بتاؤں؟''

''افسوس......افسوس.....میں نے اس حد تک حالات بگڑ جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اب کیا کروں تصدق؟''

''صورتِ حال بے حد سنگین ہے افشاں بی بی!''

''میں تفصیل بعد میں سنوں گی تصدق! براہِ کرم مجھے فوری طور پر امی کے پاس لے چلو۔''

''مگر......مگر افشاں بی بی! آپ کس طرح، کس حیثیت سے ان کے سامنے جائیں گی؟''

''تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ تصدق! امی کی حالت سن کر میرا تو ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔''

اور تصدق گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''حالات سے آپ کو آگاہ کرنا بھی ضروری ہے افشاں بی بی!

لیکن میرے خیال میں فوری طور پر اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بعد میں آپ کو تفصیل بتادوں گا۔ ابھی آپ اس سے ناواقف رہیں تو بہتر ہے۔ میری مانیں تو آپ ایک کام کریں۔''

''ہاں، ہاں..... بتاؤ۔''

''آپ واپس محل پہنچ جائیں۔''

''ہاں، پھر کیا کہوں؟''

''آپ ایک کہانی سنا دیں۔ آپ تنویر صاحب کو بتائیں کہ آپ کو چند خطرناک لوگوں نے اغوا کیا۔ آپ کو کوئی احساس نہیں کہ وہ آپ کو کہاں کہاں لے گئے۔ آپ پر ہمیشہ بے ہوشی طاری رہتی تھی۔ پھر جب آپ کو ہوش آیا تو آپ کسی بردہ فروش کے چنگل میں تھیں۔ اُس نے آپ کو فروخت کر دیا اور آپ کسی عیاش آدمی کی خواب گاہ میں پہنچ گئیں۔ اس عیاش انسان نے آپ پر دست درازی کی تو آپ نے اسے قتل کر دیا اور اس کے قتل کے الزام میں آپ کو سزا ہو گئی۔ آپ بتا دیں کہ وہ کوئی چھوٹی سی افریقی ریاست تھی۔ پھر اس کی جیل میں بغاوت ہوئی اور آپ دوسرے قیدیوں کے ساتھ فرار ہو کر یہاں تک پہنچ گئیں۔ انہی میں سے کسی رحم دل قیدی نے آپ کی مدد کی تھی۔''

''ونڈرفل!'' افشاں اُچھل کر بولی۔ ''ویری گڈ تصدق!..... تمہارا ذہن تو اچھی طرح کام کرتا ہے۔''

''آپ کو دیکھنے کے بعد تو ساری ذہنی قوتیں عود کر آئی ہیں۔'' تصدق نے جواب دیا۔

''پھر تھوڑی دیر قبل ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے تھے؟''

''اوہ......وہ......وہ......میں نے کہا نا، کچھ تفصیلات......'' تصدق پر پھر بدحواسی طاری ہو گئی۔

''ارے یہ..... یہ تمہارے نیچے کیا دبا ہوا ہے؟'' افشاں چونک پڑی۔

''ایں.....اوہ......'' تصدق کا سانس پھولنے لگا۔

''ارے، ہٹو تو.....ہٹو تو۔'' افشاں نے تصدق کی دُم پکڑ لی۔

''خدا کے لئے......خدا کے لئے......'' تصدق گھگھیایا۔

''اُٹھو تو پاگل!..... یہ کیا دبا رکھا ہے؟'' افشاں نے اُس کی دُم کو زور سے کھینچا اور تصدق کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پوری دُم پھر اُس کے نیچے سے نکل آئی تھی۔

''آخر یہ ہے کیا؟'' افشاں اُسے کھینچے جا رہی تھی۔ اُس نے پوری قوت سے جھٹکا دیا تو تصدق اوندھا گرا اور اس بار اُس کی چیخ کے ساتھ افشاں بھی چیخی تھی۔

''دُم!''

''افشاں بی بی.....!'' تصدق رو دینے والے انداز میں بولا۔

''تمہاری ہی ہے۔'' افشاں بے ساختہ بولی۔

تصدق نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور افشاں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''خدارا.....خدارا میرا مذاق نہ اُڑائیں افشاں بی بی!''

''مبارک ہو.....مبارک ہو تصدق! اب تم مکمل ہو گئے۔'' افشاں بے اختیار قہقہے لگا رہی تھی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے افشاں بی بی!......آپ میری مصیبت پر ہنس رہی ہیں۔''

''یہ مصیبت نہیں، دُم ہے تصدق!'' افشاں نے پھر قہقہہ لگایا۔

''براہِ کرم خاموش ہو جائیں، ورنہ...... ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔''

''کچھ بھی ہو تصدق! ہے بڑی خوب صورت۔ گھنے اور سیاہ بالوں سے ڈھکی ہوئی۔ اللہ ایسی دُم سب کو دے۔'' افشاں بہت انتہا پسند معلوم ہوتی تھی۔

''افشاں بی بی!'' تصدق غرّایا۔ اُس نے لینڈ روور کا دروازہ کھول لیا تھا۔

''ارے، ارے..... کہاں چلے تصدق؟''

''میں..... میں اب کسی کو منہ نہیں دکھاؤں گا۔ سمجھیں آپ۔ ہمیشہ کے لئے...... ہمیشہ کے لئے کہیں چلا جاؤں گا۔''

''تو کیا ابھی دوسرے لوگ، اس کے دیدار سے محروم ہیں؟''

''اُڑا لیں...... اُڑا لیں آپ میرا مذاق۔ میں..... میں ہمیشہ آپ کا خیر خواہ رہا ہوں اور آپ...... آپ میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہیں۔''

''ارے تو کیا میں نے تمہارے دُم نکال دی ہے؟..... مجھ پر کیوں ناراض ہو رہے ہو؟ ویسے تصدق! یہ نکل کیسے آئی؟'' افشاں بمشکل تمام ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

''کاش..... کاش!'' تصدق بری طرح تلملا رہا تھا۔

''ہاں، ہاں..... بتا دو۔'' افشاں نے اُسے تسلی دی۔

''افشاں بی بی! براہِ کرم میرا مذاق نہ اُڑائیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا؟''

''یعنی دُم نکل آتی میرے؟''

''ہاں۔''

''مزہ آ جاتا۔ خدا کی قسم، مزہ آ جاتا۔ میں اخباری نمائندوں کو طلب کرتی، انہیں اپنی خوب صورت دُم دکھاتی، اس کی تصویریں اخبارات میں چھپتیں اور پھر میں دُم کے سنگھار کا سامان خریدتی۔ بال بال موتی پروتی اس میں۔ ایسی سجاتی کہ جتنے لوگ اسے دیکھتے، خود بھی دُم کی آرزو کرنے لگتے۔ میری حیثیت ہی کچھ اور ہوتی۔''

''اُڑا لیجیے...... اُڑا لیجیے، جتنا دل چاہے مذاق۔ تصدق تو پیدا ہی اسی لئے ہوا ہے۔'' تصدق نے افسردگی سے کہا۔

''اچھا تصدق! اب چلو، تم سے پھر تفصیلی بات چیت ہوگی۔ مجھے میری کار تک چھوڑ دو۔ وہاں سے میں اپنے ہوٹل جاؤں گی۔ میرے ساتھ بھی عجیب واقعات پیش آئے ہیں۔ ہم فرصت سے ان کا تبادلہ کریں گے۔''

اور تصدق نے لینڈ روور اسٹارٹ کر کے واپس موڑ دی۔ افشاں بار بار اُس کی دُم ٹٹولنے لگتی تھی اور تصدق اس طرح بدکنے لگتا تھا جیسے درحقیقت یہ دُم ہمیشہ سے اس کے بدن کا حصہ رہی ہو۔

پھر لینڈ روور اس کار کے پاس پہنچ گئی اور افشاں گاڑی سے اُتر گئی۔

''تم کب پہنچو گے تصدق؟'' اس نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں کہہ سکتا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیوں؟''

''تم نے سنجیدگی سے میری اس مصیبت پر غور ہی نہیں کیا افشاں بی بی!''

''یعنی دُم کی مصیبت؟''

''ہاں۔''

''تو کیا یہ نئی ہے؟''

''میں آج ہی اس مصیبت میں پھنسا ہوں۔''

''ارے۔'' افشاں حیرت سے بولی۔ ''گویا دوسرے ابھی اس کی زیارت سے محروم ہیں۔'' وہ پھر ہنس پڑی اور تصدق نے جھلاہٹ میں لینڈ روور اسٹارٹ کر دی۔

''عارف!'' طالوت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہوں!''

''میرا خیال ہے، اب ہمیں افشاں کے ساتھ سفر کرنا چاہئے۔ تصدق سے پھر ملاقات کرلیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

''نہیں، تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''تو آؤ، افشاں کی گاڑی میں چلیں۔'' طالوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں لینڈ روور سے اُتر گئے۔ پھر ہم افشاں کی گاڑی میں پہنچ گئے۔ افشاں بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور پھر اُس نے بھی کار اسٹارٹ کر کے واپس موڑ دی۔

''انوکھی داستان ہے عارف!'' طالوت نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور میں اُچھل پڑا۔ میں نے افشاں کی طرف دیکھا، لیکن افشاں خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے شاید طالوت کے الفاظ نہیں سنے تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' طالوت پھر بولا۔

''طالوت!'' میں نے آواز بھینچ کر کہا اور طالوت چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''کیوں؟''

''وہ.....وہ سن لے گی۔'' میں نے افشاں کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں سنے گی۔ کیوں.....کیا تم ہماری آواز سن رہی ہو؟'' طالوت حلق پھاڑ کر چیخا۔ لیکن افشاں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ تب میں نے ایک گہری سانس لی۔

''میری بھی نہیں سنے گی؟''

''وہ مکمل طور پر بہری ہے۔''

''کمال ہے۔ بہرحال میں تم سے متفق ہوں۔ حالات واقعی عجیب ہیں۔''

''یہ بات تو طے ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس نے ہمیں ہوٹل میں بے ہوش کیا تھا۔''

''ہاں!''

''پھر شکیلہ کہاں ہے؟''

''مجھے یقین ہے، اس کا جواب تصدق ہی دے سکے گا۔''
''وہ حشر کر دوں گا اُس کا کہ یاد ہی کرے گا۔'' طالوت دانت پیس کر بولا۔ ''اور اُس لومڑی کو بھی کچھ سزا دی جائے۔'' اس نے افشاں کو گھورتے ہوئے کہا۔
''میرا خیال ہے اسے معاف کر دو طالوت! ظاہر ہے، وہ ہمیں نہیں جانتی تھی اور ہم نے اسے پکڑ کر تنویر صاحب کے سامنے لے جانے کی دھمکی دی تھی۔'' میں نے کہا۔
''اس سفارش کے پیچھے کچھ ہے؟'' طالوت نے شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔
''دیوار ہے صرف۔ بکواس مت کرو۔'' میں بگڑ کر بولا۔
''خیر...... خیر یوں بھی بھائی تبرک اس کے عاشقوں میں معلوم ہوتے ہیں۔''
''دلچسپ بات ہے۔'' میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
اور ہم خاموش ہو گئے۔ افشاں کی کار ایک اور ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے دروازے بند کئے اور کار لاک کر کے نیچے اُتر آئی۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔
افشاں کے کمرے میں بھی ہم اُس کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ افشاں نے گھنٹی بجا کر ویٹر کو بلایا اور پھر اس سے ہوٹل کے سپروائزر کو۔ ''سنو! میں ہوٹل چھوڑ رہی ہوں۔ لیکن میرا سامان چند روز یہیں رہے گا۔''
''کمرہ آپ کے نام رہنے دیا جائے گا میڈم! آپ اسے لاک کر دیں۔''
''ٹھیک ہے، ایسا ہی کرو۔ یہ ایڈوانس رکھو اور رسید بنوا لو۔''
''بہتر ہے مادام!'' سپروائزر نے ادب سے جواب دیا اور پھر نوٹ سنبھالتا ہوا چلا گیا۔ افشاں نے اپنے لباس میں سے ایک معمولی سا لباس تلاش کیا اور پھر اپنے کپڑے اُتارنے لگی۔
''بند کرو...... جلدی سے بند کرو!'' طالوت نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ''وہ ہماری موجودگی سے لاعلم ہے، اس لئے ہمیں یہ غیر اخلاقی حرکت نہیں کرنا چاہئے۔''
''ٹھیک ہے یار!'' میں نے رُخ بدل لیا۔
اور پھر افشاں تیار ہو گئی۔ اُس نے اپنا سامان الماری میں بند کیا اور پھر کمرے سے نکل آئی۔ ہم حسبِ معمول اُس کے ساتھ تھے۔ تالا لگا کر وہ نیچے اُتر آئی۔ چابی کاؤنٹر کلرک کو دی اور پھر کار کی چابی اور کچھ نوٹ اُس کے حوالے کرتی ہوئی بولی۔
''مسٹر! براہِ کرم میری کار اس کی کمپنی کو واپس کر دیں۔ یہ آج تک کا کرایہ۔'' اُس نے نوٹ کلرک کی طرف سرکا دیئے اور پھر ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ تمہارا انعام۔''
''شکریہ مادام!'' کلرک نے ادب سے کہا اور افشاں باہر نکل آئی۔ باہر آ کر اُس نے ایک ٹیکسی روکی۔
''اب کیا کرو گے طالوت؟'' میں نے پوچھا۔
''کیوں؟'' طالوت نے میری طرف دیکھا۔
''ٹیکسی میں ہم اس کے ساتھ کیسے بیٹھیں گے؟''
''پیدل بھی کچھ چلو۔'' طالوت عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آؤ!'' اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر قدم آگے

بڑھا دیئے۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ لیکن عجیب بات تھی، ہم قدم مناسب انداز میں اُٹھا رہے تھے، لیکن ٹیکسی ہم سے آگے نہیں نکل پا رہی تھی۔ گو اس کی رفتار تیز تھی، لیکن سڑک ہمارے قدموں کے نیچے مختصر ترین ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ ہم تنویر محل پہنچ گئے۔

میں نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ''اس بار تم ضرورت سے زیادہ ہی لے آئے طالوت!'' میں نے کہا۔ طالوت نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ افشاں کی سب سے پہلی ملاقات، کمال سے ہی ہوئی تھی، جو ٹیکسی دیکھ کر رک گیا تھا۔ اور پھر وہ تیر کی طرح شکیلہ کی طرف لپکا۔

''ارے..... مس شکیلہ! آپ..... آپ آ گئیں؟'' وہ مسرت سے بولا۔

''کمال!'' افشاں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ''کیسے ہو کمال؟''

''ٹھ..... ٹھیک ہوں مس شکیلہ! لل..... لیکن.....''

''کیا بکواس ہے، تم میرا نام کیا لے رہے ہو؟''

''کک..... کیا مطلب؟''

''بھول گئے ہو مجھے، یا پاگل ہو گئے ہو؟'' افشاں اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

''اُف..... افشاں باجی!''

''ہاں، ہاں..... بھول جاؤ۔ نکال پھینکو مجھے ذہن سے، کمینے کہیں کے۔''

''افشاں باجی!'' کمال دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

افشاں نے بھی اسے لپٹا لیا تھا۔ ''آپ..... آپ کہاں چلی گئی تھیں افشاں باجی؟..... اُف، آپ آ گئیں۔ اس گھر کی زندگی لوٹ آئی۔ ہم سب مُردوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ آپ کہاں چلی گئی تھیں افشاں باجی!''

''امی کیسی ہیں کمال؟..... جلدی سے مجھے ان کے پاس لے چلو۔''

''آیئے..... آیئے افشاں باجی!..... آیئے۔'' اور کمال نے شور مچا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ افشاں آ گئی..... افشاں آ گئی۔ تنویر صاحب بھی موجود تھے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ایک بار انہوں نے افشاں سے پوچھا۔

''کیا تم سچ مچ افشاں ہو؟''

''ڈیڈی! یہ سب کیا ہے؟ کمال نے بھی مجھے شکیلہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔''

''بہت کچھ ہے بیٹی! معلوم ہو جائے گا تمہیں۔'' اور پھر افشاں نے تصدق کی بتائی ہوئی کہانی دُہرا دی تھی۔ اُس نے اس چالاکی سے یہ کہانی سنائی تھی کہ یقین نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بہر حال، پھر دن بھر ہنگامے ہوتے رہے۔ تنویر صاحب نے ایس پی آفتاب کو بھی بلایا تھا۔ آفتاب نے افشاں سے اُس کے بیانات لئے اور پھر تنویر صاحب کو بیٹی کی بازیابی پر مبارکباد بھی دی۔

''لیکن ایس پی صاحب! میں اُس بچی کی بازیابی بھی چاہتا ہوں، جو افشاں کی ہم شکل تھی۔ مجھے اُس سے بھی ہمدردی ہے۔''

''میرے خیال میں اب اُس کا ملنا مشکل ہے تنویر صاحب!..... اُس کے ساتھی پولیس کو جُل دے کر

نکل گئے۔ یقیناً وہ بھی اُن کے ساتھ ہوگی۔ ممکن ہے، کبھی تینوں ایک ساتھ ہی ہاتھ لگ جائیں۔"
"نہ جانے کیوں، آج بھی میرا دل اُنہیں مجرم سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔" تنویر صاحب بولے۔
"آپ نیک دل انسان ہیں۔ بعض مجرموں کی شکلیں بے حد معصوم ہوتی ہیں۔ اب اجازت دیں۔"
ایس پی صاحب چلے گئے۔ ہم لوگوں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک سنسان جگہ پر چلے آئے۔
"جی!" طالوت نے گہری سانس لے کر مجھ سے کہا۔
"فرمائیے!"
"ہماری تو کوئی پوچھ گچھ اب یہاں ممکن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، کچن میں چل کر کھانے کا بندوبست کیا جائے۔"
"جیسا مناسب سمجھو۔"
"یا پھر راسم سے منگوا لیتے ہیں۔" طالوت نے کہا اور راسم کو آواز دی۔ دوسرے لمحے راسم موجود تھا۔
"کھانا کچن سے ہی آنا چاہئے۔"
"جو حکم آقا!" راسم نے مسکراتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد کھانے کی ٹرے ہمارے سامنے تھی۔ میں نے اور طالوت نے اطمینان سے کھانا کھایا اور فارغ ہو گئے۔
"آؤ۔ اب ذرا بھائی تبرک کو تلاش کیا جائے۔"
"ارے ہاں...... وہ نظر نہیں آیا۔"
"اُس کے مکان میں دیکھتے ہیں۔" طالوت نے کہا اور ہم دونوں تصدق کے مکان کی طرف چل پڑے۔ لیکن دروازے سے کچھ دُور ہی ہم ٹھٹک گئے۔ افشاں، تصدق کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔
طالوت نے میری طرف دیکھا اور پھر ہم خاموشی سے دروازے کے نزدیک پہنچ گئے۔ افشاں نے پھر دروازے پر دستک دی۔
"کون ہے؟...... بھاگ جاؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اندر سے تصدق کی آواز آئی۔
"دروازہ کھولو تصدق! میں افشاں ہوں۔" افشاں نے کہا اور چند ساعت کے بعد دروازہ کھل گیا۔
تصدق عجیب سے لباس میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں چپکے سے اندر داخل ہو گئے اور پھر تصدق کی کمر پر گٹھری دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ تصدق نے اپنی دُم اس طرح لپیٹ کر باندھ لی تھی کہ وہ گٹھری سی بن گئی تھی۔
"آیئے افشاں بی بی!" اُس نے اُداس آواز میں کہا۔
"کیسے ہو تصدق؟"
"خدا کے واسطے، میرا مذاق نہ اُڑائیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔"
"دُم کہاں گئی؟" افشاں نے جھک کر اسے دیکھا اور تصدق اُچھل پڑا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا تھا اور پھر اُس کے چہرے پر جنون کے آثار نظر آنے لگے۔
"افشاں بی بی! اگر آپ میرا مذاق اُڑانے آئی ہیں تو میں درخواست کرتا ہوں، براہِ کرم یہاں سے چلی جائیں۔ میں اس وقت کسی کو برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔
"اوہو...نہیں تصدق! لیکن براہِ کرم تم مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں بتاؤ تو۔" افشاں نے سنجیدگی

سے کہا۔
''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''
''خیر، تمہاری مرضی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ کچھ ضروری باتیں مجھے بتا دو۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''پوچھیے۔'' تصدق نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن دُم کی وجہ سے وہ بے چین تھا۔
''یہ شکیلہ کون ہے؟...... بہت سوں کی زبان سے اس کا نام سنا ہے۔''
''آپ کی ہم شکل تھی۔ حیرت انگیز طور پر ہم شکل۔ ٹرین میں بڑی ماں کو مل گئی تھی۔ اُس کے ساتھ...... اُس کے ساتھ دو ہم شکل لوگ تھے۔ شیطان صفت۔ سب نے اُسے افشاں سمجھا تھا، لیکن میں حقیقت جانتا تھا۔
''اوہ! کیا وہ مجھ سے بہت ملتی تھی؟''
''اتنی کہ شناخت ناممکن تھی۔''
''کمال ہے۔ مگر وہ گئی کہاں؟''
''نہ جانے کہاں۔'' تصدق کی آواز میں عجیب سی کیفیت تھی۔
''اور اس کے ساتھی؟''
''وہ دونوں جرائم پیشہ تھے۔ میں نے اُنہیں گرفتار کرا دیا۔''
''تو وہ جیل میں ہیں؟''
''نہیں۔''
''چھوٹ گئے؟''
''خدا ہی بہتر جانے۔''
''بہرحال تصدق! تم نے میرے ساتھ جو تعاون کیا ہے، اس کے لئے شکرگزار ہوں۔ میری طرف سے دل میں کوئی خیال نہ لانا۔ لیکن دُم کے مسئلے میں میرا دم اٹکا رہے گا۔''
''بس میرے لئے دعا کریں۔ خدا مجھے موت دیدے۔''
''آمین۔'' افشاں نے بے ساختہ کہا اور پھر جلدی سے بولی۔ ''ارے نہیں نہیں۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے کٹوا بھی سکتے ہو۔''
''چلی جایئے...... خدا کے لئے چلی جایئے۔'' تصدق جھلّا کر کھڑا ہو گیا۔
''ارے، ارے..... میں تو تمہیں تسلی دے رہی ہوں۔ جبکہ تم نے ابھی تک مجھے پوری طرح دکھائی بھی نہیں ہے۔ دکھاؤ تو۔ شاید میں ہی تمہیں کوئی علاج بتا سکوں۔''
''افشاں بی بی!...... افشاں بی بی! میرے اوپر رحم کھایئے۔ خدا کے لئے، اس وقت چلی جایئے۔''
''اچھا خدا حافظ!...... جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔'' افشاں بھی اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
ہم دونوں کمرے میں ہی رہے تھے۔ تصدق نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ طالوت اس دوران کارروائی کر چکا تھا اور اب ہم نگاہوں کے سامنے تھے۔ تصدق پلٹا اور بری طرح اُچھل پڑا۔

"تت......تم!" اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں خونخوار تاثرات اُبھر آئے۔ لیکن پھر ان کی جگہ بے بسی نے لے لی اور پھر وہ رو پڑا۔

"نجات دلا دو......خدا کے لئے مجھے اس سے نجات دلا دو۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میں بے موت مر جاؤں گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ، مجھے اس سے نجات دلا دو۔ میں سخت پریشان ہوں۔"

"اور تم نے جو ہماری زندگیاں خاک میں ملا دیں تصدق!" میں نے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔ میں تم سے دلی طور پر شرمندہ ہوں۔ اگر میں تمہاری زندگیاں واپس دلا سکتا تو ضرور دلا دیتا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"ایک شرط ہوگی تصدق!" بالآخر طالوت نے کہا۔

"بتاؤ......بتا دو۔ میں یہ شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

"افشاں کی کہانی سناؤ۔"

"اوہ!" تصدق نے بے بسی سے ہمیں دیکھا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "سنا دوں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ تم پہلے مجھے اس سے نجات دلا دو۔"

"پہلے کہانی......لیکن سچی۔"

"اب تمہارے سامنے کیا جھوٹ بولوں گا۔"

"تو پھر شروع ہو جاؤ۔"

"دراصل افشاں بی بی غیر ممالک کی سیر کرنا چاہتی تھیں۔"

"اچھا......پھر؟"

"تنویر صاحب نے کسی طور اُنہیں اجازت نہیں دی۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے آلۂ کار بنایا، میرے ذریعے ہی انہوں نے پاسپورٹ وغیرہ بنوایا اور دوسرے ضروری کاغذات تیار کرائے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کا دورہ مختصر ہوگا اور وہ جہاں بھی ہوں گی، مجھے آگاہ رکھیں گی۔ ساری تیاریاں کرنے کے بعد ایک روز وہ یونیورسٹی گئیں اور وہیں سے ایئرپورٹ چلی گئیں۔ اس کے بعد سے ان کا پتہ نہیں چل سکا۔ انہوں نے مجھے بھی جُل دے دیا تھا۔ یہاں کے حالات بے حد بگڑ گئے، لیکن اب میں زبان کیسے کھول سکتا تھا؟ خود میری شامت آ جاتی۔ یہ ہے کُل کہانی۔"

"اوہ....." میں نے طویل سانس لی۔

"ایک سوال اور تصدق؟"

"وہ بھی پوچھ لو۔" تصدق نے عاجزی سے کہا۔

"شکیلہ کہاں ہے؟"

"میرے ایک دوست کے ہاں ہے۔ یقین کرو، اُسے میں نے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی ہے۔"

"تم نے اُسے اغوا کیا تھا؟"

"ہاں۔" تصدق نے سر جھکا لیا۔

"کیوں؟" طالوت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

تصدق گھبرائے ہوئے انداز میں ہماری شکلیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"جواب دو، تم نے اسے کیوں اغوا کیا ہے؟"
"معاف کر دو......خدا کے واسطے معاف کر دو۔" تصدق نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"جواب دو تصدق!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔
"تم لوگوں نے بھی تو میری زندگی ضیق کر دی تھی۔ میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ تم لوگوں نے جتنا بے عزت مجھے کیا، اس سے قبل میں کبھی نہیں ہوا۔ میں تم لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔"
"تو اس کا انتقام تم نے شکیلہ سے لیا؟"
"نہیں۔" تصدق نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔
"پھر؟"
"میں نے اُسے اس لئے اغوا کیا کہ تم یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ تم اُسے تلاش کرتے پھرو اور میری جان چھوٹ جائے۔ یہاں تمہاری پوچھ گچھ صرف اس کی وجہ سے تھی۔ اس کے بعد تمہارے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔"
"لیکن کیا یہ جرم نہیں تصدق؟"
"بس، میں اتنا ہی عاجز آ گیا تھا۔"
"ہوں!......اس کے بعد تم نے پولیس کو ہماری نشاندہی کر دی۔ لیکن ہمارے بارے میں علم کیسے ہو گیا؟"
"اتفاقیہ طور پر۔ میں نے اخبارات دیکھے تھے، ان میں تمہاری تصویر اور تفصیل مل گئی تھی۔"
"خوب!" میں نے طالوت کی شکل دیکھی۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں تصدق؟"
"بس قتل کر دو۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔"
"خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟" طالوت نے بے رحمی سے پوچھا۔
"نہیں کر سکتا۔ کر سکتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"
"دُم دکھانے کے قابل تو ہو۔" طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔ تصدق نے بے بسی سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔
"کیا خیال ہے؟" میں نے اُسے گھورا۔
"میں......میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"
"ہم تمہاری خواہش پوری کئے دیتے ہیں تصدق! اسے قتل کر دو۔" میں نے کہا اور طالوت نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ تصدق نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
"لیکن ٹھہرو، پہلے اس سے شکیلہ کے بارے میں تو معلوم کر لو۔" میں بولا۔
"شکیلہ کہاں ہے؟" طالوت اُسے گھورتے ہوئے بولا۔
"نکل روڈ کے مکان نمبر ۔۔۔ میں، چوہدری اسماعیل نامی ایک شخص ہے، میرا دوست ہے۔ وہ شریف آدمی ہے۔ بس میری دوستی سے مجبور ہو کر اُس نے شکیلہ کو رکھ لیا ہے۔ براہِ کرم اُسے کچھ نہ کہنا۔ تم کسی طرح بھی اسے وہاں سے نکال سکتے ہو۔" تصدق نے جواب دیا اور طالوت نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''آنکھیں کھول دو تصدق!'' وہ بولا اور تصدق نے آنکھیں کھول دیں۔ ''تمہاری ایک شرافت کی وجہ سے ہم نے تمہاری جان بخش دی۔''

''شرافت؟''

''ہاں۔تم نے شکیلہ کا پتہ آسانی سے بتا دیا۔ اگر تم اس پر سودے بازی کرتے تو پھر ہم شاید تمہیں معاف نہ کرتے۔''

''میں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔اس دُم کی موجودگی میں، میں زندہ درگور ہو گیا ہوں۔'' تصدق رو پڑا۔

''کون سی دُم کی بات کر رہے ہو؟'' طالوت نے کہا۔

''یہی.....یہی......'' تصدق نے جھلّائے ہوئے انداز میں پشت پر ہاتھ مارا اور پھر بوکھلائے ہوئے انداز میں دُم ٹٹولنے لگا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، نیچے جھانکا لیکن دُم موجود نہیں تھی۔ اُس نے تھوک نگل کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''تت.....تت......تو کیا.....کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا؟''

''تم نے ٹرین سے ہی ہمارے ساتھ غلط سلوک کیا تھا تصدق! تم نے اسی وقت سے ہماری دشمنی مول لے لی تھی، ورنہ ہم تم سے ہی دشمنی کیوں کرتے؟'' طالوت نے کہا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں میری جان! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔تم نے ہماری دشمنی دیکھ لی، اب دوستی بھی دیکھو۔''

''لل.....لیکن......تم تو......تم تو مر چکے ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' طالوت نے لاپروائی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' تصدق پھر حیران ہو گیا۔

''ارے ہم تو اکثر مرتے رہتے ہیں۔دس بیس بار مرنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

''تت.....تو تم واقعی زندہ ہو۔'' تصدق نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''تمہیں کیسے نظر آ رہے ہیں؟''

''اور وہ دُم؟''

''ارے وہ تو ایک شعبدہ تھا۔ایسا ہی شعبدہ، جیسے ہم تھانے سے نکل بھاگے تھے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔'' تصدق نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''چلو.....اب لباس تبدیل کرو، ہمارے ساتھ چلو اور شکیلہ کو ہمیں واپس کر دو۔'' طالوت نے کہا اور تصدق اُٹھ کھڑا ہوا۔اُس کا ہاتھ بار بار پیچھے چلا جاتا تھا۔

بہر حال ہم اُس کے کمرے سے نکل آئے۔اُس نے لباس تبدیل کیا۔اب اُس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے خلاف کوئی حرکت کرتا۔لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکل آیا۔اُس کے چہرے سے اب خوشی جھلک رہی تھی۔

''دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنا ہے۔ تمہارے بارے میں سب کو اطلاع مل گئی ہے۔''
''ٹھیک ہے، تم اپنی گاڑی میں پہنچو، ہم آ رہے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور تصدق گردن ہلا کر باہر نکل گیا۔ ''آؤ!'' طالوت نے مجھ سے کہا اور پھر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ دوسرے لمحے ہم گاڑی کے نزدیک تھے۔ طالوت نے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے اور پھر دُور سے آتے ہوئے تصدق کی طرف اُنگلی اٹھا دی۔

''کیا کر دیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''کچھ نہیں۔ اب اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''
''اوہ! عمدہ بات ہے طالوت۔ بہرحال پولیس سے دوبارہ مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔''
''ارے تو پروا کیوں کرتے ہو میری جان!...... اب میں بے دست و پا تو نہیں ہوں۔ ایس پی صاحب سے بھی ملاقات کر لیں گے۔''
''نہیں بھائی!...... خدا کے واسطے نہیں۔ میرا خون خشک مت کر۔'' میں نے طالوت سے کہا۔
''بزدلی نہ دکھاؤ عارف!...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' طالوت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں تصدق بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہمیں دیکھ کر اُس کا منہ پھر کھل گیا تھا۔
''ارے...... تم لوگ یہاں پہنچ گئے؟'' اُس نے ہونقوں کے سے انداز میں کہا۔
''دوڑتے ہوئے آئے ہیں۔ دوسروں کی نظروں سے بچ کر۔ چلو گاڑی نکالو، کوئی دیکھ نہ لے۔'' طالوت بولا اور تصدق نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور ہم محل سے نکل آئے۔
تصدق خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''تمہارے لئے تو بڑی مشکلات پیش آ جائیں گی۔''
''کیوں؟''
''پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔''
''تمہاری دوستی کب کام آئے گی، تصدق؟''
''میں کیا کر سکتا ہوں؟''
''ہمیں کہیں چھپانے کا بندوبست نہیں کر دگے؟''
''چھپانے کا۔'' اس نے فکرمند انداز میں کہا اور پھر کئی منٹ تک سوچتا رہا۔ پھر اُس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔
''تنویر صاحب کا باغ عمدہ جگہ ہے۔ میں وہاں تمہارے لئے ساری سہولتیں مہیا کر دوں گا۔ یوں بھی وہاں میری اطلاع کے بغیر کوئی نہیں جاتا۔ مالی سے کہہ دوں گا، میرے عزیز ہیں۔'' تصدق نے کہا۔ خاصا رازدان بن گیا تھا وہ اور انسانوں سے بہرحال ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔
چنانچہ ہم خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی اور تصدق نیچے اُتر گیا۔ ''میں اُسے لے کر آتا ہوں۔ براہِ کرم، اگر ہو سکے تو اس کی نگاہوں میں میری پوزیشن خراب مت ہونے دینا۔ اسے نہیں معلوم کہ اسے کس نے اغوا کیا ہے۔ میں نے اُسے بے ہوش کر کے اُٹھایا تھا۔''
''جاؤ...... لے کر آؤ۔'' طالوت نے کہا اور تصدق اس مکان میں پہنچ گیا۔ ہم دونوں انتظار کرنے

لگے۔ ''بھائی تبرک تو میدان چھوڑ گئے عارف!......اب کیا کیا جائے؟'' طالوت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو بہت سی دلچسپیاں ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ یار!''

''شکیلہ آ جائے، اس کے بعد پروگرام بنائیں گے۔''

''یہاں سے کہاں چلا جائے؟ کیا تصدق کی پیشکش قبول کر لی جائے؟''

''باغ والی؟''

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے، ضروری نہیں ہے۔ ہم کسی ہوٹل میں بھی رہ سکتے ہیں، اس شکل میں کہ صرف شکیلہ منظرِ عام پر رہے اور ہم دونوں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔''

''ویری گڈ......اچھا آئیڈیا ہے۔'' طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''منظور ہے تمہیں؟''

''سو فیصد۔'' اس نے کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد تصدق، شکیلہ کے ساتھ باہر آیا۔ وہ دونوں بڑی تیزی سے قدم اُٹھا رہے تھے۔ اور پھر لینڈ روور میں پہنچ کر شکیلہ ہم دونوں سے لپٹ گئی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

''ارے، ارے شکیلہ! اس کی کیا ضرورت ہے؟......ارے، ارے.....'' طالوت بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے تسلی دینے لگا۔

''میری تقدیر میں یہی سب کچھ رہ گیا ہے یوسف! کیا میں زندگی بھر یونہی کھلونا بنی رہوں گی؟''

''ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں۔ تمہیں غلطی سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ فکر مت کرو، سمجھیں۔ اب تم بالکل فکر مت کرو۔'' بمشکل تمام ہم شکیلہ کو خاموش کرانے میں کامیاب ہو سکے۔ تصدق احمقوں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ''بھائی تصدق!'' میں نے اسے آواز دی اور وہ چونک پڑا۔ ''ہمیں کسی عمدہ سے ہوٹل لے چلو۔''

''ہو......ہوٹل کیوں؟''

''فی الحال یہی پروگرام ہے۔ تمہارے پروگرام پر پھر عمل کریں گے۔''

''لل.....لیکن......'' تصدق ہچکچایا۔

''فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہے۔ ہم پروا نہیں کرتے۔ چلو!'' طالوت نے کہا اور تصدق نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''آپ لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟'' شکیلہ نے سوال کیا۔ اب وہ سنبھل گئی تھی۔

''تصدق صاحب کے ذریعے۔ انہوں نے تمہارا کھوج لگایا تھا۔''

''اوہ! میں تصدق صاحب کی شکرگزار ہوں۔'' شکیلہ نے ممنونیت سے کہا اور تصدق کی گردن شرم سے جھک گئی۔

''ویسے ان لوگوں کی قید میں تمہیں تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''انوکھی قید تھی۔ سب لوگ اس طرح میری خدمت کرتے تھے، جیسے میں شہزادی ہوں۔ میری

ذراسی بات پر سب دوڑ پڑتے تھے، سوائے اس کے مجھے اور کوئی تکلیف نہیں تھی کہ میں ایک کمرے تک محدود تھی۔"

"شکر ہے۔ ہم تمہارے لئے بہت پریشان تھے۔"

ایک خوب صورت سے ہوٹل کے سامنے تصدق نے گاڑی روک دی اور ہماری طرف رُخ کئے بغیر بولا۔ "یہ ہوٹل بہت عمدہ ہے۔"

"شکریہ تصدق! بس اب تم واپس جاؤ۔ ہم پھر ملاقات کریں گے۔"

"میرے لئے کوئی اور خدمت؟"

"عیش کرو پیارے! لیکن ہماری یہاں موجودگی کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"اب آپ بے فکر رہیں۔ تصدق کا رواں رواں آپ کا غلام ہے۔ مجھے پورا پورا احساس ہے کہ میرے روّیے نے ہی آپ کو دشمن بنایا تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔" تصدق نے شرمندگی سے کہا۔

"بس بس میری جان تصدق!...... ہمارا دل صاف ہو گیا۔ آج سے تم دوستوں میں ہو۔" طالوت نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی تصدق سے مصافحہ کیا اور تصدق واپس چلا گیا۔

"شکیلہ!" طالوت نے شکیلہ کو پکارا۔

"جی!" وہ آہستہ سے بولی۔

"اب تم ٹھیک ہو جاؤ۔ ہماری بادشاہت واپس مل گئی ہے۔ اندر چلو۔ ہم کہیں رُک جائیں گے۔ تم یہاں تین افراد کا سوٹ حاصل کرلو، ذرا شان سے۔ کہہ دینا، دو شہزادے قیام کریں گے۔ تم ان کی نگران ہو۔"

"اوہ!......لیکن؟"

"ہاں، ہاں۔ یہ نوٹ کاؤنٹر پر ڈال دینا۔" طالوت نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی شکیلہ کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اوہ.....اتنے سارے۔ لیکن یہ سب؟"

"کاؤنٹر پر جو بھی ہو، اس سے کہہ دینا، نوٹ رکھے۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔"

"اچھا!" شکیلہ نے گہری سانس لی، نوٹ سنبھالے اور اندر چل پڑی۔ ظاہر ہے، معمولی سے علاقے کی لڑکی تھی، جھجک رہی تھی۔ لیکن بہرحال ہم نے اسے جو کچھ سمجھایا تھا، اس نے وہی کیا۔ واپس آئی تو دو پورٹرز اُس کے ساتھ تھے۔

"ارے ارے...... یہ اس نے کیا گڑبڑ کر ڈالی؟" طالوت نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس کے علاوہ وہ بے چاری کیا کر سکتی تھی؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مگر اب؟"

"میں ان کے پاس جاتا ہوں۔ جاؤں؟"

"جاؤ یار! لڑکی ابھی سیدھی ہے۔" طالوت نے ایک ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا اور میں ان دونوں کی طرف خود ہی بڑھ گیا۔

"تم لوگ کمرے کا نمبر بتا دو۔ فی الحال سامان وغیرہ نہیں آیا۔ آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"بہتر جناب!" پورٹرز نے کہا اور پھر وہ کمرے تک ہماری رہنمائی کرنے چل پڑے۔ طالوت بھی

ساتھ ہی آ رہا تھا۔ لیکن بہر حال، وہ پورٹرز کی نگاہ میں نہیں تھا۔ ہوٹل واقعی خوب صورت تھا۔ بڑے کمرے میں تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔ طالوت آنکھیں بند کر کے گردن ہلانے لگا اور شکیلہ اُس کی شکل دیکھنے لگی۔

''کیوں...... کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بیٹھو شکیلہ!...... ظاہر ہے، اس دوران کے واقعات سے تو تم لاعلم رہی ہو گی؟''

''ظاہر ہے۔''

''چنانچہ پہلی اہم اطلاع یہ ہے کہ افشاں واپس آ گئی۔''

''اوہ! شکر ہے۔ مگر وہ کہاں گئی تھی؟''

''سیر کرنے۔''

''کیا مطلب؟'' شکیلہ تعجب سے بولی اور میں نے اُسے مختصراً تفصیل بتا دی۔ ''بڑی عجیب لڑکی ہے۔'' شکیلہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر وہ چونک کر بولی۔ ''لیکن آپ لوگوں نے میرا پتہ کیسے چلا لیا؟''

''بس اسی دن سے تمہاری تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔''

''لیکن یہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا؟''

''جرائم پیشہ۔ تنویر صاحب سے کچھ وصول کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بہت جلد اُن کی غلط فہمی دُور ہو گئی۔'' میں نے جواب دیا اور شکیلہ گردن ہلانے لگی۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''گویا محل سے اب ہماری چھٹی؟''

''بظاہر تو یہی بات ہے۔''

''بظاہر کیوں؟''

''بھئی وہ لوگ بد اخلاق ہو سکتے ہیں، ہم نہیں۔ بہر حال سلام دعا ہے، ملاقات تو ضرور کریں گے۔ ویسے اگر تم ہمت کرو تو ایک دلچسپ کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔''

''کیسا کھیل؟'' شکیلہ نے پوچھا اور ہم اسے کھیل کی تفصیل بتانے لگے۔

''اوہ..... لیکن میں...... خاصا مشکل کام ہے۔''

''اگر کر سکو تو تفریح رہے گی۔ ہم تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔''

''مگر اس سے فائدہ؟''

''صرف تفریح۔ اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''

''مناسب رہے گی یہ تفریح؟'' شکیلہ نے کہا۔

''حرج بھی کیا ہے؟..... پہلے تنویر صاحب صرف ایک افشاں کے لئے سرگرداں تھے، اب انہیں دو دو سے بھگتنا پڑے گا۔ لیکن شرط یہی ہے کہ تم خوبی سے اپنا کردار نبھا دو۔''

''میں کوشش کروں گی۔''

''محل سے واقف ہی ہو۔ جن معاملات میں اُلجھو گی، کسی نہ کسی طرح تمہارے کان میں وہ بات پہنچا دی جائے گی۔''

''دلچسپ سچویشن رہے گی۔'' شکیلہ ہنس پڑی۔

''ہاں! لیکن اسی شکل میں، جب تمہارا کردار کامیاب رہے۔''
''آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری پوری کوشش کروں گی۔''
''بس تو کل صبح یہ ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔'' طالوت نے کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں ہنس پڑا تھا۔ طالوت کو اُس کی زندگی واپس مل گئی تھی اور اُس کی سوئی ہوئی شرارتیں بھی جاگ اُٹھی تھیں۔

بہر حال، یہ پروگرام طے ہو گیا۔ شکیلہ جس انداز سے ہوٹل میں داخل ہوئی تھی، اس نے ہوٹل والوں پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ کئی ویٹروں نے دروازے پر دستک دے کر کسی ضرورت کے بارے میں پوچھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد طے ہوا کہ کھانا کھایا جائے اور میں نے شکیلہ سے ویٹر کو بلانے کے لئے کہا۔ شکیلہ نے بیل بجا دی تھی۔

''کھانا ہم لوگ یہیں کھائیں گے۔'' شکیلہ بولی۔
''اوہ، خاتون! کیا آپ کے ساتھی......؟'' ویٹر نے پوچھا۔
''ہاں، ہاں۔ تین آدمیوں کا کھانا لاؤ۔'' شکیلہ نے کہا۔
''جی بہتر۔'' ویٹر نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔
''یہ بوکھلایا ہوا کیوں تھا؟'' شکیلہ تعجب سے بولی۔
''پتہ نہیں۔'' طالوت نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔ ویٹر کھانے کی ٹرالی لے آیا تھا اور پھر اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ لیکن وہ بار بار چاروں طرف گردن گھما کر ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ ہم دونوں تو اس وقت شکیلہ کے سوا کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ کھانا لگا کر ویٹر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
''بس جاؤ۔ کھانے کے بعد کافی لے آنا۔''
''جی!'' ویٹر نے پھر چاروں طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔
''یار عارف!'' طالوت نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔
''ہوں!''
''شکیلہ سے یہ گڑبڑ زیادہ نہ چل سکے گی۔ اسے اس چکر کے بارے میں کیا بتاؤ گے؟'' میں نے چونک کر شکیلہ کی شکل دیکھی۔ لیکن وہ بے چاری ہماری گفتگو سے لاعلم تھی۔ طالوت کے لئے یہ کون سی مشکل بات تھی۔ جب چاہتا، کسی کی آنکھوں اور کانوں پر ہاتھ پھیر سکتا تھا۔
''ہاں۔ اگر اس لڑکی کو ساتھ رکھنا ہے تو اسے راز دار بنانا ہوگا۔''
''مگر ساری باتیں بتا دو گے؟''
''تمہارا کیا خیال ہے؟''
''نہ بتاؤ تو بہتر ہے۔ کوئی اور ترکیب کرو۔'' طالوت نے کہا اور شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا، جو پلیٹوں میں کھانا سرو کر رہی تھی۔
''میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''شروع کریں۔'' شکیلہ بولی اور ہم کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ''ویٹر بڑا احمق ہے۔ اُس کی بوکھلاہٹ میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' شکیلہ کھانے کے دوران بولی۔
''یہ سب یوسف کی شرارت ہے۔'' میں نے ابتدا کی اور شکیلہ میری شکل دیکھنے لگی۔

''کیوں...... یوسف صاحب کی شرارت کیوں ہے؟''

''عجیب وغریب انسان ہے یہ...... تمہارا کیا خیال ہے، تلکا سے ٹکرانے والا کوئی معمولی انسان ہو سکتا ہے؟''

''مگر اُسے تو آپ نے قتل کیا تھا، عارف صاحب!''

''اس کی مدد کے غیر کیسے ممکن تھا؟''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا عارف صاحب!'' شکیلہ نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی یوں سمجھ لو، اس وقت ہم دونوں میں سے کوئی ویٹر کو نظر نہیں آ رہا۔''

''کیا مطلب؟''

''اونہہ، بتاتے کیوں نہیں یوسف!'' میں نے مصنوعی طور پر جھلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر خود ہی بولا۔ ''دراصل یوسف ایک بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ اسے بہت سے علم آتے ہیں۔ پچھلے دنوں اسے اپنے شعبدوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ بمشکل تمام میں نے اسے تیار کیا کہ وہ پھر سے اس دنیا میں آ جائے۔ اس جہاں میں جو جتنا بڑا شعبدہ گر ہے، اتنا ہی کامیاب ہے۔''

''لیکن ویٹر والی بات؟'' شکیلہ حیرت سے بولی۔

''کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ معمولی بات ہے۔ تم نے یوسف کی شعبدہ گری نہیں دیکھی۔''

''کمال ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' شکیلہ بڑبڑانے لگی۔

''بس تم دیکھو گی۔ لیکن کسی بات پر حیرت کا اظہار نہیں کرو گی۔''

''لیکن یہ معمولی شعبدہ گری نہیں ہے کہ آپ دونوں اسے نظر نہیں آ رہے۔''

''ان معاملات میں یوسف اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گی۔''

''میں واقعی حیران ہوں۔ اگر یوسف صاحب ایسے ہی شعبدہ گر تھے تو اتنے دن تک کیوں خاموش رہے۔''

''وہ خاموشی کا دور تھا۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''ویٹر کی حرکات دیکھ لینا، لیکن کچھ بولو گی نہیں۔''

شکیلہ دلچسپی سے گردن ہلانے لگی۔

پھر ہمارے کھانا ختم کرنے کے بعد اُس نے جلدی سے ویٹر کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ چند منٹ کے بعد ویٹر اندر آ گیا۔ اس نے اندر آتے ہی چاروں طرف دیکھا تھا۔

''برتن اُٹھا لو ویٹر!......اور کافی پلا دو۔''

''جی......'' ویٹر نے گردن ہلائی۔ پھر برتنوں کے پاس پہنچ کر وہ دوبارہ چونک پڑا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''کافی کتنی لاؤں جی؟''

''تین۔'' شکیلہ نے جواب دیا۔

''تین......'' ویٹر نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں......کیوں؟''

"بی بی!......ایک بات پوچھوں؟" ویٹر نے ہمت کر کے کہا۔
"پوچھو۔"
"آپ کے......آپ کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"
شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل رہے تھے۔ تب طالوت نے شکیلہ سے کہا۔
"ٹال دو اسے کچھ کہہ سن کر۔ وہ نہ ہمیں دیکھ سکتا ہے، نہ ہماری آواز سن سکتا ہے۔"
شکیلہ نے پھر ویٹر کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا، جیسے اُس نے طالوت کی آواز بھی نہ سنی ہو۔
"تم جاؤ......کافی لے آؤ۔" شکیلہ نے اس سے کہا اور ویٹر پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ لیکن وہ گھوم گھوم کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" شکیلہ نے کہا۔
"اُلجھنے کی بات نہیں ہے شکیلہ!..... یوسف کا فن ہے۔"
"انتہائی حیرت انگیز ہے۔ اور اس کے ساتھ آپ بھی عارف صاحب!"
"ہاں بھائی! اس نے مجھے بھی رنگ دیا ہے۔"
"میرے لئے سخت حیرت انگیز انکشاف ہے۔ بہر حال......"
"ہاں۔ اس بات پر اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اعصاب پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً تنویر صاحب کے مکان میں ڈرامے کے دوران ہم بھی تمہارے ساتھ موجود ہوں گے، لیکن دوسرے لوگ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ تم پورے طور سے مطمئن ہو کر کام کرنا۔ ہم ہر لمحے تمہاری مدد کو موجود ہوں گے۔"
"بہر حال، مجھے حیرت ہے۔"
اتنی دیر میں ویٹر کافی لے آیا۔ اس گدھے کو بھی حیرت تھی، شکیلہ نے اسے واپسی کی اجازت دے دی۔ اور پھر اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔
پھر اس نے تین پیالیوں میں کافی بنائی اور ہم سب کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ہم تنویر صاحب کے ہاں ڈرامے کا پروگرام ترتیب دیتے رہے تھے۔
آخر کافی بھی ختم ہو گئی۔
"ویسے اس پروگرام کی ابتدا کب ہو؟" شکیلہ نے پوچھا۔
"کل صبح۔ بلکہ علی الصبح......وہی موزوں رہے گا۔" طالوت نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے۔" شکیلہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر مسکرا دی۔ "اس شخص تصدق کا کیا حال ہے؟"
"اب تو دوست بن گیا ہے بے چارہ۔"
"اوہ۔"
"ہاں، غریب کو بہت پریشان کر دیا۔"
"ویسے افشاں کی کہانی عجیب ہے۔"

''ہاں، سیاحت کے شوق نے اسے خراب کیا تھا۔''

''اور تصدق بھی خوب گہرا آدمی نکلا۔''

''ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے، تمہیں دیکھ کر اس کی حالت بھی سب سے زیادہ خراب ہونی چاہئے تھی۔''

''افشاں واقعی میری اس حد تک ہم شکل ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، دلچسپ مشابہت ہے۔ آج تک ہم دونوں ہی خود کو انوکھا سمجھتے تھے۔ لیکن تم دونوں بھی حیرت انگیز طور پر یکساں شکلوں کی مالک ہو۔'' اس کے بعد شکیلہ کافی دیر تک افشاں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرتی رہی۔ وہ دل ہی دل میں اس ڈرامے کے تصور سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

بہرحال، دوسرے دن منہ اندھیرے اُٹھ گئے۔ شکیلہ ابھی سو رہی تھی۔ طالوت نے مجھے جگایا اور میں بھی جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تیار ہو عارف؟''

''ابھی..... ہاں ٹھیک ہے۔''

''شکیلہ کے بارے میں بتاؤ۔''

''کیا؟''

''اسے جگا کر لے چلیں یا ایسے ہی؟''

''جگاؤ گے تو باقاعدہ جانا پڑے گا۔''

''یہی میں سوچ رہا تھا۔''

''ویسے ہی لے چلو......وہاں جگا لیں گے۔''

''حیرانی کی وجہ سے اپنا کردار نہ بھول جائے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''میرا خیال ہے، اس پر کسی حد تک کھل جاؤ۔ جگا لو اسے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

پھر میں نے شکیلہ کو جھنجوڑا اور شکیلہ جاگ گئی۔ وہ جلدی سے بستر سے اُٹھ آئی تھی۔

''چلو گی نہیں شکیلہ؟''

''اتنی صبح؟''

''ہاں۔ ڈرامہ بستر سے ہی شروع کر دیا جائے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ چلیں، میں منہ ہاتھ دھو لوں۔''

''لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں جا کر بھی تو بستر پر لیٹ جانا ہے۔''

''لیکن وہاں تک جائیں گے کیسے؟''

''اس ظالم کے شعبدے کس دن کام آئیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''آنکھیں بند کرو۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''یہ ہوٹل ہے نا؟''

''ہاں پھر.....؟''

''بس تو آنکھیں بند کر لو اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔'' طالوت نے کہا اور شکیلہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ طالوت نے میرا بھی ہاتھ پکڑا۔ اور دوسرے لمحے ایک ہلکی سی سنسناہٹ ہوئی۔ یہ سنسناہٹ بھی صرف میں نے محسوس کی تھی۔ تب طالوت کی آواز اُبھری۔

''بس حضرات! آنکھیں کھول دیں۔ کیا کھڑے کھڑے سونے کا ارادہ ہے؟''

ہم نے آنکھیں کھول دیں۔ تنویر صاحب کے مکان کو ہم صاف پہچان گئے تھے۔ شکیلہ شدتِ حیرت سے گنگ ہوگئی تھی۔

''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں شکیلہ! اب اپنا کردار انجام دینے کو تیار ہو جاؤ۔'' طالوت نے کہا۔

''حیرت انگیز..... کیا ہم اسے صرف شعبدہ کہیں گے؟'' شکیلہ آہستہ سے بولی۔

''جو کہنا ہوگا، بعد میں کہہ لیں گے۔ آؤ۔'' طالوت نے کہا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

''کیا ہمیں دیکھ نہیں لیا جائے گا؟'' شکیلہ نے کہا۔

''نہیں۔''

''اور مجھے؟''

''تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

''میرے خدا!..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''لڑکیوں میں بس یہی خرابی ہوتی ہے۔ جب تک سمجھ نہیں لیتیں، کچھ نہیں کرتیں۔ اب اگر تم اسی طرح سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں تو کام ہو گیا۔ کوئی کام بغیر سوچے سمجھے بھی کر لو تو کیا حرج ہے۔'' طالوت نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہ..... اچھا میں اب ٹھیک ہوں۔ لیکن کیا میری حیرت فطری نہیں ہے؟''

''ہاں، ہاں فطری ہے۔ سو فیصد فطری ہے۔''

''آیئے!'' شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم اندر کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم افشاں کی خواب گاہ کے سامنے تھے۔ طالوت نے اندر جھانکا۔ افشاں سو رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔

''تم رُکو..... میں دروازہ کھولتا ہوں' طالوت نے کہا اور پھر وہ خواب گاہ کے عقب میں چلا گیا۔ ہمیں نہیں معلوم، وہ اندر کہاں سے گھسا۔ لیکن بہرحال چند ساعت کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔

''آؤ!'' اس نے کہا اور میں اور شکیلہ اندر داخل ہو گئے۔ افشاں سامنے ہی ایک خوب صورت مسہری پر سو رہی تھی۔ اُس کے بدن پر شب خوابی کا لباس تھا۔

''میں نے اس پر ہاتھ پھیر دیا ہے۔ کم از کم ڈیڑھ گھنٹے تک نہ اُٹھ سکے گی۔ شکیلہ! تم الماری سے اس کا شب خواب کا لباس نکال کر پہن لو۔ ہم اسے مسہری کے نیچے سُلا دیتے ہیں۔ لباس پہن کر لیٹ جانا اور تھوڑی دیر کے بعد.....''

''پتہ ہے۔''

''لیکن دیکھو...... پوری ہوشیاری سے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' شکیلہ نے کہا اور ہم مطمئن ہو کر افشاں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دونوں نے پکڑ کر خوب صورت لڑکی کو احتیاط سے مسہری کے نیچے سُلا دیا اور پھر باہر نکل آئے۔ شکیلہ نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

''کیسی رہی استاد؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بس تمہاری شرارت...... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''ارے دلچسپی رہے گی۔'' طالوت ہنستے ہوئے بولا۔ ''آؤ، ذرا قرب و جوار کی سیر کریں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مس شکیلہ اپنا کردار کس طرح انجام دیتی ہیں۔''

کافی دیر تک ہم تنویر صاحب کے محل میں آوارہ گردی کرتے رہے۔ پھر خاصا دن نکل آیا۔ یہاں کے معمولات ہمیں معلوم تھے، اس لئے ہم سمجھ گئے کہ اب سب لوگ جاگ چکے ہوں گے۔

ہم نے افشاں کے کمرے کا رُخ کیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گویا شکیلہ جاگ گئی تھی۔ ایک ملازمہ اندر سے نکلی۔ میں نے شکیلہ کے کمرے میں جھانکا۔ شکیلہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ درحقیقت وہ بے حد پُرسکون تھی۔ بڑے اطمینان سے اُس نے بال درست کئے اور پھر باہر نکل آئی۔ ہم دونوں نے خود کو اس پر ظاہر نہیں کیا تھا، خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑے۔ شکیلہ بھی اس کوٹھی سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ ناشتے کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

ناشتے کی میز پر تنویر صاحب، بڑی ماں، کمال اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ شکیلہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ناشتہ شروع ہو گیا۔ ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو بھی جاری تھی۔

''بہت خوب عارف!...... یہ لڑکی تو بہت عمدہ جا رہی ہے۔''

''ہاں یار!...... حیرت انگیز۔'' میں نے بھی اعتراف کیا۔

شکیلہ بے حد پُرسکون تھی اور نہایت اطمینان سے ناشتہ کر رہی تھی۔ لیکن سنسنی خیز مناظر شروع ہونے میں دیر نہیں لگی۔ ابھی ناشتہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے سے افشاں داخل ہوئی۔ اُس نے لباس بدل لیا تھا لیکن بال وغیرہ یونہی بکھرے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے تنویر صاحب کی نگاہ اس پر پڑی اور چائے کی پیالی ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ ان کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

''ہوں......تو ناشتہ شروع ہو گیا؟'' اس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر غصیلے انداز میں کہا۔ اور اس کی آواز پر کمال اور بڑی ماں نے بھی چونک کر ادھر دیکھا۔

دونوں کی حالت بدل گئی تھی۔

''ارے مس شکیلہ!......آپ......آپ......'' کمال ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

شکیلہ نے بھی گھوم کر دیکھا۔ اور پھر افشاں کو دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔ ''ارے، یہ کون ہے؟''

افشاں کمر پر ہاتھ رکھے اسی طرح کھڑی تھی۔ لیکن شکیلہ کو دیکھ کر اس کی حالت بھی بدل گئی۔

''ارے......ارے......'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھ آئی۔

''یہ......یہ......یہ......'' افشاں متحیرانہ انداز میں بولی۔

''آپ کب آئیں مس شکیلہ؟'' کمال نے کہا۔
''کیا بکواس ہے؟'' افشاں غرّائی۔
تنویر صاحب خاموشی سے دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ شکیلہ کے اطمینان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ تیکھی نگاہوں سے افشاں کو دیکھ رہی تھی۔
''اے..... کھڑی ہو جاؤ۔'' افشاں، شکیلہ کے قریب پہنچ کر تحکمانہ لہجے میں بولی۔
''یہ کون بدتمیز ہے؟'' شکیلہ نے بھی منہ بگاڑ کر کہا۔
''وہی لڑکی، جس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔'' تنویر صاحب سنجیدگی سے بولے۔
''آپ کیا کہہ رہے ہیں ابو؟'' افشاں تنک کر بولی۔
''میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' تنویر صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔
''کیا آپ..... آپ سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' افشاں تنک کر بولی۔
''کیا بکتی ہو؟'' شکیلہ غرّا کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر وہ کمال کی طرف رُخ کر کے بولی۔ ''یہ کوئی بھی ہو، اس کے بال پکڑ کر باہر نکال دو۔''
''میں تیری شکل بگاڑ دوں گی۔'' افشاں غرّا کر شکیلہ کی طرف لپکی لیکن شکیلہ بھی اس وقت کمال کر رہی تھی۔ اس نے لپک کر میز سے چھری اُٹھالی۔
''ارے، ارے..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' تنویر صاحب اور دوسرے لوگ بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے۔
''میں کہتی ہوں، اسے باہر نکال دو۔'' شکیلہ چیخ کر بولی۔
''کمال!..... اسے باہر لے جاؤ۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''آپ..... آپ سب میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ..... آپ.....'' افشاں رو پڑی۔
''میں باہر آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔'' تنویر صاحب نے کہا اور کمال بمشکل تمام افشاں کو باہر لے گیا۔ تنویر صاحب تشویش ناک نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''یہ کہنا کیا چاہتی ہے؟'' شکیلہ نے کہا۔
''خدا معلوم۔''
''اور آپ کو ابو کیوں کہہ رہی ہے؟''
''آؤ..... تم بھی آؤ..... لیکن براہِ کرم خود پر قابو رکھنا۔'' تنویر صاحب نے کہا اور پھر سب کمرے سے نکل آئے۔ درحقیقت لطف آ گیا تھا۔ ہم دونوں بھی سب کے پیچھے تھے۔
دوسرے کمرے میں افشاں زاروقطار رو رہی تھی اور کمال اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''یہ ہے نا آپ کی بیٹی..... میں نہیں ہوں۔ مجھے بھول جائیے۔ ہیں نا.....'' وہ سسکتی ہوئی بولی۔
''شکیلہ!'' تنویر صاحب نے اُسے مخاطب کیا۔
''میں کہتی ہوں، میں خودکشی کرلوں گی۔'' افشاں غرّائی۔
''لیکن کیوں؟''
''اس لئے کہ میں افشاں ہوں۔ یہ شکیلہ ہے۔''

''خوب...... ابو! اس سے پوچھئے، یہ کیا چاہتی ہے؟'' شکیلہ نے کہا۔
''ہاں...... تم جانتی ہو، تم افشاں نہیں ہو...... اور اس سے قبل تم یہی کہتی آئی ہو کہ تم افشاں نہیں شکیلہ ہو...... اب اچانک تمہارا ارادہ کیوں بدل گیا؟'' تنویر صاحب نے کہا۔
''میں کہتی ہوں، باز آجائیں آپ لوگ۔'' افشاں دانت پیس کر بولی۔
''تم بھی ہوش میں آجاؤ۔ ہم تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتے ہیں۔'' شکیلہ نے کہا۔
''تُو خاموش ہو جا کمینی ذلیل!'' افشاں دہاڑی۔
''ابو! آپ سن رہے ہیں؟'' شکیلہ بولی۔
''لڑکی! میں اب بھی تمہارے ساتھ نرمی برتنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟'' تنویر صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔
''میں یہاں سے چلی جاؤں...... یہی چاہتے ہیں آپ؟'' افشاں بولی۔
''میرا خیال ہے، جانے کی کوشش کے باوجود تم نہیں جا سکو گی۔'' تنویر صاحب نے اسی سنجیدگی سے کہا۔
''کیوں؟''
''اس لئے کہ تمہارے دونوں ساتھی، پولیس کو جُل دے کر نکل گئے ہیں۔ اور اب تمہارے بارے میں پولیس کو اطلاع دینا میرا فرض ہے۔ مجھے ایس پی نے بھی یہی ہدایت کی تھی۔''
''آپ..... آپ اپنی بیٹی کی تمیز نہیں کر سکتے ابو!'' افشاں بولی۔
''ہاں...... میں تمیز کر چکا ہوں۔ مجھے اس ڈرامے کا مقصد بتاؤ؟''
''امی! آپ بھی......؟'' افشاں، بڑی ماں سے بولی۔
''تم کوئی بھی ہو بیٹی!...... مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن تم یہ سوانگ کیوں رچا رہی ہو؟'' بڑی ماں نے کہا۔
''میرے خدا!..... میں کیا کروں؟'' افشاں سر پیٹ کر بولی۔
''میں تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں۔'' کمال نے، جو اب تک خاموش تھا، دخل دیا۔
''جی فرمائیے...... آپ بھی؟''
''بہتر یہ ہے کہ تم اب حقیقت پر آجاؤ۔ ہمیں بہرحال تم سے ہمدردی ہے۔''
''جہنم میں جاؤ تم سب۔ ٹھیک ہے، وہ تمہاری بیٹی ہے۔ وہی افشاں ہے..... میں جا رہی ہوں۔''
''جا سکو گی لڑکی؟'' تنویر صاحب سرد لہجے میں بولے۔
''پھر یہاں کیا جھک ماروں؟''
''چند باتیں بتا دو...... ورنہ پھر پولیس تم سے پوچھے گی۔ ممکن ہے، تم بے گناہ ہو اور قصور صرف تمہارے ساتھیوں کا ہو۔ ایسی شکل میں تم مجھے صورتِ حال بتا دو، تاکہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔''
''اللہ......'' افشاں ایک کرسی میں گر پڑی۔
''تمہیں کس نے اغوا کیا تھا؟ اور تم ان کے چنگل سے کیسے چھوٹیں؟''
''دیکھئے ابو!...... دیکھئے ابو! اچھا نہ ہوگا۔ دیکھئے، میں کہتی ہوں اچھا نہیں ہوگا۔'' افشاں پھر کھڑی

ہوگئی۔

''میرا خیال ہے، تمہارے ساتھیوں نے ہی تمہیں آزاد کرایا ہوگا۔ اور اب شاید ان ہی کے کسی پروگرام کے تحت تم یہاں آئی ہو۔''

''درست ہے..... بالکل درست ہے۔'' افشاں نے کہا۔

''وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''نہیں بتاؤں گی۔ آپ پولیس کو فون کر دیں۔ بلائیں پولیس..... بلائیں۔''

''تم شاید مجھے احمق سمجھتی ہو۔ اگر تم افشاں ہو تو یہ کون ہے؟''

''مجھے اجازت دے دیں...... خدا کی قسم، مجھے اجازت دے دیں۔ ابھی اس سے پوچھ لوں گی۔''

''اے، میرے منہ مت لگو تم...... تم ان لوگوں کا شوق ہو، میرا نہیں۔ ایسا ٹھیک کروں گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گی۔'' شکیلہ نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''ارے تو آؤ نا...... چور کہیں کی۔ آؤ، ٹھیک کرو۔'' افشاں آستین چڑھا کر آگے بڑھی، لیکن کمال نے اُسے پکڑ لیا۔

''تصدق سے کہو، پولیس کو فون کرے۔ ایس پی آفتاب کو فوراً طلب کرے۔ جاؤ۔'' تنویر صاحب نے کہا اور ملازم دوڑ گیا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔

''اب......؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟''

''پولیس آ رہی ہے محترم!''

''تو پھر...... نہیں میری جان! ایس پی صاحب فیصلہ نہ کر سکیں گے۔'' طالوت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر بھی۔'' شکیلہ گڑبڑا گئی۔

''ایسے ہی گڑبڑا جائے گی، ہم دو دو اس کی مدد کو موجود ہیں۔'' طالوت نے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

تنویر صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ ناشتہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اصلی افشاں کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ لیکن شکیلہ کے انداز بھی خراب تھے۔ نہ جانے کس طرح یہ مندر کی داسی اتنی عمدہ اداکاری کر رہی تھی۔

''آؤ..... تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''میں نہیں آؤں گی۔ میرے ہی گھر میں میری اتنی توہین ہو رہی ہے۔ اس کمینی کو...... آپ لوگوں نے......'' افشاں نے روتے ہوئے کہا۔

''اس سے قبل تم شاید کسی تھیٹر میں اداکاری کرتی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت بھی عمدہ ایکٹنگ کر رہی ہو یہاں کس لئے داخل ہوئی ہو، یہ بتا دو۔'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے یہ تم بتاؤ..... فراڈ کہیں کی۔''

''ابو!...... اب کی بار اگر اس نے زبان سے کوئی بدتمیزی کی تو میں اس کے منہ پر کوئی چیز دے ماروں گی۔ خدا کی قسم، رعایت نہیں کروں گی۔'' شکیلہ نے آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....افشاں بیٹے! تم اپنی امی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ پلیز جاؤ!'' تنویر صاحب نے کہا اور کمال خود شکیلہ کو باہر لے گیا۔

لیکن ہم دونوں کمرے ہی میں رُکے رہے تھے۔

''شکیلہ!'' تنویر صاحب نے بڑی نرمی سے اسے پکارا۔

''میں افشاں ہوں۔ آپ لوگ اس کی باتوں میں کیوں آ گئے؟''

''تم افشاں نہیں ہو......لیکن اس کی ہم شکل ضرور ہو۔ اس کے علاوہ تم نے ایک آڑے وقت میں ہماری مدد کی تھی۔ میں تمہارا احسان مند بھی ہوں شکیلہ! اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ تم ایک نیک طینت لڑکی ہو۔ بیٹی! زندگی گزارنا بہت ہی کٹھن کام ہے لیکن اس کے باوجود انسان اچھے راستے اپنانے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہاری اپنی سازش نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں نے اب کوئی نئی چال چلی ہے۔''

''کن دونوں نے؟'' افشاں بے ساختہ بولی۔

''تمہارے ساتھیوں نے۔''

''ابو!.....ابو! دیکھئے، میں کہتی ہوں ہوش میں آ جایئے۔ میں سب سے نمٹ سکتی ہوں۔ میں ان سب کو ٹھیک کر سکتی ہوں۔ لیکن یہ تو سوچیں، یہ بات میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے کہ خود میرے والدین دھوکا کھا گئے۔''

''اس کے علاوہ......'' تنویر صاحب اُس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے۔ ''اس کے علاوہ میں ان دونوں کو بھی برا نہیں سمجھتا تھا۔ یقین کرو، دلی صدمہ ہوا تھا، دلی قلق ہوا تھا ان کی گرفتاری پر۔ لیکن ان کے بارے میں تفصیلات معلوم کر کے ششدر رہ گیا تھا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ابو.....!'' افشاں سر پکڑ کر بولی۔

''تم لوگوں نے پہلے ہی یہ ڈرامہ کیوں نہیں کیا؟ پہلے تو تم انکار کرتی رہیں کہ تم افشاں نہیں، شکیلہ ہو۔''

''ہوں.....تو آپ کو یقین ہے کہ میں افشاں نہیں ہوں۔'' بالآخر افشاں عاجز آ کر بولی۔

''اب اس کی موجودگی میں تو کچھ نہیں سوچا جا سکتا شکیلہ!'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔

''آپ نے پولیس کو بلایا ہے؟''

''ہاں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔'' افشاں نے کہا۔

''لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔''

''کیوں......آخر کیوں؟ جب میں افشاں نہیں ہوں۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے، پولیس تمہارے اوپر سختی کرے گی۔''

''کیوں سختی کرے گی؟''

''وہ تم سے ان دونوں کے بارے میں پوچھے گی۔''

''کچھ بھی کرے۔ بس میں افشاں نہیں ہوں۔ آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔'' افشاں نے کہا۔

''میں نے ایس پی آفتاب کو بلا لیا ہے۔ بہرحال وہ تم سے معلومات کرے گا۔ ہو سکے تو بیٹی! ان

والوں کے بارے میں بتا دینا۔ بہرحال وہ خطرناک مجرم ہیں۔ میں کوشش کروں گا، پولیس تمہیں تکلیف نہ پہنچائے۔"
"لعنت ہے۔" افشاں دانت پیس کر بولی اور تنویر صاحب کمرے سے نکل گئے۔ لیکن جاتے وقت وہ کمرے کا دروازہ بند کرنا نہیں بھولے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور طالوت کی طرف دیکھا۔
"اب پولیس آئے گی۔" طالوت مسکرایا۔
"ہاں۔"
"اور افشاں کو پکڑ کر لے جائے گی۔"
"لیکن یہ تو اچھا نہیں ہوگا طالوت!" میں نے کہا۔
"کیوں؟"
"اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟"
"ایں..... " طالوت نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اُس کا قصور تو نہیں ہے۔"
"تفریح ہی تفریح میں کوئی المیہ نہ ہو جائے۔"
"خطرہ تو ہے۔" طالوت نے افشاں کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر پتھروں کی سی خاموشی تھی۔ "لڑکی کے چہرے پر خطرناک تاثرات ہیں۔ کوئی غلط قدم نہ اُٹھا بیٹھے۔"
"ہاں، جذباتی ہے۔"
"پھر کچھ کیا جائے؟" طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔
"کیا کرو گے؟"
"اسے افشاں بنائے دیتے ہیں، اور شکیلہ کو واپس۔"
"اوہ، اتنی آسانی سے؟"
"ہاں، کیوں نہیں۔" طالوت نے کہا اور پھر اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی بند کی اور پھر افشاں کی طرف اچھال دی۔ دوسرے لمحے افشاں کے بدن پر ایسا ہی لباس تھا، جیسا شکیلہ کے جسم پر۔ لیکن افشاں کو اس کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ اس کے بعد اُس فتنہ انگیز شخص نے مجھے اشارہ کیا۔ اور جوں ہی میں اُس کے قریب پہنچا، اس نے میرے کندھے پر سے کوئی چیز جھاڑی۔ میں چونک کر اپنے کندھے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن دوسرے لمحے ہم بند دروازے سے باہر تھے۔
"آؤ!" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم شکیلہ کی تلاش میں چل پڑے۔ شکیلہ بڑی ماں کے ساتھ تھی۔ بڑی ماں آنکھیں بند کئے ایک کرسی پر دراز تھیں۔
طالوت ظاہر ہو گیا۔ اور پھر اس نے ہاتھ سے شکیلہ کو اشارہ کیا۔
شکیلہ نے ہمیں دیکھ لیا۔ اور پھر اس نے بڑی ماں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اُٹھ گئی۔ لیکن بڑی ماں چونک پڑیں۔ "کہاں جا رہی ہو افشاں؟"
"ابھی آئی امی جان!"
"اس لڑکی کی طرف نہ جانا..... نہ جانے کس ارادے سے آئی ہے۔"
"نہیں۔ وہاں نہیں جاؤں گی امی!" شکیلہ نے کہا اور باہر نکل آئی۔ اور جوں ہی وہ باہر نکلی، طالوت

نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شکیلہ مسکرانے لگی تھی۔ وہ بے چاری سمجھ بھی نہ سکی کہ طالوت نے کیا کر دیا۔

''جی؟'' شکیلہ نے کہا۔

''آؤ...... کھیل ختم۔'' طالوت نے کہا۔

''اوہ...... اچھا۔'' شکیلہ نے ایک گہری سانس لی۔

''کیوں...... کھیل جاری رکھنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں..... لیکن میں کیسی رہی؟''

''شاندار۔'' طالوت نے کہا۔

''شکریہ۔ اب کیا پروگرام ہے؟''

''ابھی تو ان لوگوں کو دیکھیں گے، کیا تفریح رہتی ہے۔''

''خطرہ نہیں ہے۔ خاص طور سے آپ لوگوں کے لئے۔''

''ارے دیکھا جائے گا۔ تم آؤ...... ابھی پولیس آنے والی ہے۔''

''پولیس کے سامنے میرا کیا ردِ عمل رہنا چاہیے؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

''تمہیں پولیس کے سامنے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''اوہ!'' شکیلہ نے گردن ہلا دی اور پھر وہ ایک دم چونک پڑی۔ ''ارے تنویر صاحب آ رہے ہیں۔ اوہ، شاید انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔''

''اطمینان رکھو!'' ان کی بینائی اتنی تیز نہیں ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''ارے..... وہ...... وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔''

''آنے دو۔'' طالوت نے کہا اور پھر شکیلہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ تنویر صاحب ہمارے نزدیک سے گزرتے چلے گئے۔ شکیلہ منہ پھاڑے اُنہیں دیکھتی رہ گئی۔

''انہیں کیا ہو گیا؟'' تعجب سے بولی۔

''وہ نہ صرف اندھے بلکہ بہرے بھی ہو گئے ہیں۔'' طالوت بولا۔

''ارے نہیں۔'' وہ ایک دم بولی۔

''تنویر صاحب!...... ابے او تنویر صاحب!...... بھائی تنویر صاحب!'' طالوت نے زور زور سے آوازیں لگائیں۔ لیکن تنویر صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

''دیکھ لیا تم نے؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟'' شکیلہ نے پریشانی سے کہا۔

''آؤ.... سمجھائیں تمہیں بھی۔'' طالوت نے کہا اور واپس پلٹ پڑا۔ شکیلہ کے چہرے پر اُلجھن تھی۔ ہم لوگ تنویر صاحب کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

تنویر صاحب ڈرائنگ روم کی طرف جا رہے تھے۔

ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر دو پولیس والے کھڑے تھے۔ شکیلہ کا سانس پھول گیا۔

''پولیس!'' اُس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''چلی آؤ...... ان بے چاروں کو بھی دن میں نظر نہیں آتا۔ آ جاؤ۔'' طالوت نے کہا۔ شکیلہ کے ہاتھ

ہاؤس ہرد ہو گئے تھے۔ بہرحال ہم تینوں بھی تنویر صاحب کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔
ڈرائنگ روم میں تصدق، کمال اور دو انسپکٹروں کے ساتھ ایس پی آفتاب بھی موجود تھے۔

''اوہ، تنویر صاحب!..... خیریت؟'' آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خیریت نہ سمجھیں آفتاب میاں!''

''کیا بات ہے؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''بڑی دلچسپ پچویشن ہے۔''

''یعنی؟''

''اب اس لڑکی نے بھی افشاں ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے، جو افشاں کی ہم شکل تھی۔''

''ارے.....'' ایس پی اُچھل پڑا۔ ''مگر وہ کہاں ہے؟''

''ایک کمرے میں بند کر آیا ہوں۔''

''وہ آئی کب؟''

''ابھی تھوڑی دیر قبل۔ افشاں ہی کے لباس میں ہے اور ایسی اداکاری کر رہی ہے، جیسے افشاں وہی ہو۔ اور اصل افشاں فراڈ ہو۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''ہوں..... لیکن اُسے تو اغوا کر لیا گیا تھا؟''

''خدا معلوم۔''

''اس بارے میں وہ کیا کہتی ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''اپنے اغوا کے سلسلے میں۔''

''بھئی وہ خود کو شکیلہ تسلیم کب کر رہی ہے؟''

''اوہ ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ آپ نے اُسے بند کر دیا ہے؟''

''ہاں۔''

بہت اچھا کیا آپ نے تنویر صاحب! ہم اس سے ان دونوں کا پتہ بھی معلوم کر سکیں گے اُفوہ، میں نے ایسے خطرناک لوگ نہیں دیکھے۔ ممکن ہے، اب وہ اس لڑکی کو افشاں بنا کر یہاں رکھنا چاہتے ہوں۔ اس طرح وہ آپ کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں ہوں۔''

''ایک بات ضرور کہوں گا، آفتاب میاں!'' تنویر صاحب بولے۔

''جی۔''

''میرے خیال میں وہ ایسے لوگ نہیں تھے۔''

''کمال ہے۔ یعنی سب کچھ جانتے کے باوجود؟''

''یقیناً۔ درمیان میں کوئی غلط فہمی ضرور ہے۔''

''یہ لوگ اسی طرح متاثر کر لیتے ہیں، پھر بعد میں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ بہرحال، یہ پولیس کا کام ''

اس کے علاوہ اگر وہ چاہتے تو پہلے ہی شکیلہ کو افشاں کہہ سکتے تھے۔''

''اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔''
''خدا جانے..... بس دل ان بچوں کے لئے گھٹتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟'' تنویر صاحب نے کہا۔
''خیر آؤ..... اس لڑکی سے مل لو۔ لیکن اس کے ساتھ سختی نہ کرو گے۔''
''آپ بے حد نرم دل ہیں۔ خیر..... آیئے، میں اسے زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ آپ آیئے۔'' اور ب اُٹھ گئے۔ ہم بھی حسبِ معمول سب کے پیچھے تھے۔
''عارف صاحب! خدا کے واسطے، کچھ تو بتایئے۔ اس وقت ہماری پوزیشن کیا ہے؟'' شکیلہ میری آستین پکڑتے ہوئے بولی۔
''کیا مطلب؟''
''کیا یہ سب اندھے ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ اور یہ ہماری طرف توجہ ہی نہیں دے رہے۔''
''ہوٹل کے بیرے کی کیا کیفیت تھی؟''
''اوہ..... تو..... تو.....''
''ہاں۔ اس وقت بھی وہی شعبدہ کارفرما ہے۔''
''آپ اسے صرف شعبدہ کہیں گے عارف صاحب!''
''چلو، شعبدے سے کچھ آگے بڑھا لو۔''
''گویا مجھے صحیح بات نہیں بتائی جائے گی؟'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔
''صحیح بات سے تمہاری کیا مراد ہے شکیلہ؟''
''چلیں، کوئی بات نہیں۔ میں اب نہیں پوچھوں گی۔'' شکیلہ نے کہا اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ مجھے تھوڑی سی اُلجھن ضرور ہوئی تھی، لیکن بہرحال میں طالوت کی مرضی کے بغیر شکیلہ کو اس راز میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔

ہم اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے، جہاں افشاں بند تھی۔ تنویر صاحب نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا اور پھر وہ اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے ایس پی اور انسپکٹر بھی تھے۔
''ارے وہ..... وہ.....'' تنویر صاحب، افشاں کا لباس دیکھ کر چونک پڑے۔
افشاں شاید رو رہی تھی۔ اس نے سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر ان سب کو دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔
''آیئے ایس پی صاحب!..... مجھے گرفتار کر لیجئے۔ میں شکیلہ ہوں۔ ہاں..... میں ان دونوں مجرموں کی ساتھی ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیں۔''
''افشاں!..... افشاں بیٹی!'' تنویر صاحب بولے۔
''اوہ، کوئی نیا ڈرامہ..... ابو! کیا آپ کی آنکھوں سے پٹی کھل گئی؟'' افشاں نے طنزیہ کہا۔
''مگر تم یہاں کہاں سے آئیں؟..... تم یہاں کیسے آ گئیں؟..... یقیناً تم نے دروازہ کھولا ہوگا اور وہ تمہیں پھنسا کر نکل گئی۔''
''آپ کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ابو!'' افشاں نے زہرخند سے کہا۔
''وہ کہاں گئی افشاں؟'' تنویر صاحب نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔
''افشاں..... افشاں..... افشاں..... میں کہتی ہوں، میں شکیلہ ہوں۔ آپ بھول کیوں رہے ہیں؟

افشاں کو آپ کے ساتھ ہونا چاہئے۔"

"کیا بکواس ہے افشاں!..... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"چند منٹ پہلے آپ کو کیا ہو گیا تھا ابو!...... اس کا جواب دیں؟"

"کیوں، مجھے کیا ہوا تھا؟"

"آپ تو مجھے افشاں مان ہی نہیں رہے تھے۔"

"تمہیں؟"

"آپ کی اس اداکاری کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اوہ، ایس پی!...... میری سمجھ میں یہ سارا گورکھ دھندا نہیں آ رہا۔"

"مجھے بتائیں، کیا بات ہے؟" آفتاب نے نرم لہجے میں کہا۔

"ارے، ابھی چند منٹ پہلے میں شکیلہ کو یہاں بند کر گیا تھا۔ افشاں اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ اب یہ یہاں ہے اور وہ......"

"ابو! خدا سے ڈریں۔ کیا ہو گیا آپ کو؟"

"کیا تنویر صاحب آپ کو یہاں بند کر گئے تھے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"تو اور کیا؟" افشاں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں تنویر صاحب! کہ یہ افشاں، شکیلہ ہیں؟" ایس پی نے پوچھا۔

"میں اسے کب بند کر کے گیا ہوں۔ یہ تو میرے ساتھ ناشتے پر تھی۔ وہ تو..... وہ تو شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھی اور یہ....." تنویر صاحب نے کہا اور اب پہلی بار افشاں نے اپنے لباس پر توجہ دی اور دوسرے لمحے اس کے منہ سے بھی عجیب آواز نکل گئی۔

"ارے یہ..... یہ..... مم..... میں..... میں ابو!..... ابھی کچھ دیر قبل میں یہ لباس تو پہنے ہوئے نہیں تھی۔ خدا کی قسم ابو!..... خدا کی قسم...... یہ......"

تنویر صاحب، ایس پی اور دوسرے لوگ پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟" ایس پی نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"تو..... تو کیا ہم سب پاگل ہو گئے ہیں؟"

"اچھا ان دوسری خاتون ہی کو کہیں سے بلوا دیں، جو دوسرا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ یا انہیں آپ افشاں تسلیم نہیں کرتے تو پھر انہیں بلوا دیں، جو افشاں ہیں۔"

"کمال!..... افشاں کو بلا کر لاؤ۔" تنویر صاحب نے کہا۔

"جی بہتر۔" کمال دوڑا۔ تنویر صاحب سخت پریشانی کے عالم میں ہاتھ مل رہے تھے۔

"کیسی شرم کی بات ہے میرے لئے، میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئی ہوں...... لیکن یہ لباس...... خدا کی قسم ابو! میں نے لباس نہیں تبدیل کیا۔" افشاں نے کہا۔

"خود بخود تبدیل ہو گیا؟" تنویر صاحب دانت نکال کر بولے۔

"ہاں۔" افشاں نے بے بسی سے کہا۔

ایس پی کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے۔ شاید وہ ہمارے بارے میں کچھ کہنے میں احتیاط

کر رہا تھا۔ ورنہ یہ پُراسرار حالات سو فیصدی ہماری نشاندہی کرتے تھے۔
تھوڑی دیر کے بعد کمال واپس آ گیا۔ اُس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ "پوری کوٹھی میں اُس کا پتہ نہیں ہے۔" اُس نے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"تھوڑی دیر پہلے بڑی ماں سے اجازت لے کر گئی تھی۔"
"اوہ......اوہ......گویا......"
"میرے لئے جو حکم ہو؟" ایس پی نے کسی قدر بور ہوتے ہوئے کہا۔
"جاؤ بھئی، معافی چاہتا ہوں۔ میں تو واقعی پریشانی میں پھنس گیا۔" تنویر صاحب نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔
"صرف ایک درخواست کروں گا۔" آفتاب نے کہا۔
"جی۔"
"اگر دوبارہ ان تینوں میں سے کسی کا پتہ چل جائے تو انتہائی اخلاق سے پیش آئیں اور خاموشی سے مجھے اطلاع دے دیں۔"
"بہتر ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"
"خدا حافظ!......آؤ......" ایس پی نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور پھر وہ وہاں سے چلے گئے۔
"تو سچ بتاؤ!.....میں نے تمہیں ہی بند کیا تھا؟" تنویر صاحب نے افشاں سے کہا۔
"نہیں بولوں گی۔ خدا کی قسم نہیں بولوں گی۔ کیسے باپ ہیں آپ......اپنے خون کی بُو بھی نہیں محسوس کر سکتے۔ اُس کمینی کی بات مان لی تھی آپ نے۔"
"میری ناک خراب ہو گئی ہے بھئی۔ آؤ!" تنویر صاحب نے کہا اور پھر وہ سب بھی باہر نکل گئے۔
شکیلہ سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ سب نکل گئے تو اس نے ایک گہری سانس لی۔
"اور ان میں سے کسی نے ہمیں نہیں دیکھا؟"
"تم وہی مرغے کی ایک ٹانگ لئے کھڑی ہو۔" طالوت نے کہا۔
"نہیں۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔" شکیلہ نے کہا۔
"البتہ بور ضرور کرو گی؟"
"نہیں، اب بور بھی نہیں کروں گی۔" وہ آزردگی سے بولی۔
"پکا وعدہ؟" طالوت مسخرے پن سے بولا۔
"ہاں، پکا وعدہ۔" شکیلہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔
"شکریہ۔ آؤ اب کچھ کھانے پینے کی بات ہو جائے۔" طالوت نے کہا اور وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل دیا۔ "میں نے ڈائننگ روم الگ بنا لیا ہے۔ وہاں کھانا لگ چکا ہو گا۔"
میں اس کی بات کی حقیقت جانتا تھا۔ ہم کوٹھی کے ایک دُور اُفتادہ حصے میں پہنچ گئے۔ اور جب ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے تو آنکھیں کھل گئیں۔ ایک چوڑی میز لگی ہوئی تھی اور وہاں انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔

میں نے شکیلہ کی جانب دیکھا۔ شکیلہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بے نیاز کرلیا تھا۔ کھانے پر وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اور پھر کھانا نہایت خاموشی سے کھایا گیا۔

کھانے کے بعد طالوت نے ہم دونوں کی شکل دیکھی اور بولا۔

''تو دوستو! اب کیا پروگرام ہے؟''

''پروگرام ڈائریکٹر تو تم ہی ہو۔''

''تم لوگ اعتراض تو نہیں کرو گے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تو سنو! میرا خیال ہے، میں تنویر صاحب کے سامنے آ جاؤں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں، اُن سے بات کریں گے۔''

''کیا بات کرو گے؟''

''بس، اُنہیں حقیقت بتا دیں گے اور پھر یہاں سے چلیں گے۔''

''اوہ......تو تم تنہا ہی جاؤ گے؟''

''نہیں۔ تم دونوں بھی چلو۔''

''مگر طالوت!......میرا مطلب ہے یوسف!'' میں نے چور نگاہوں سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ بے اختیاری میں میرے منہ سے طالوت نکل گیا تھا۔ شکیلہ نے ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا اور پھر لاتعلق ہو گئی۔ وہ خود پر جبر کر رہی تھی۔

''ہاں، کیا مطلب ہے تمہارا؟'' طالوت نے اس بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ چلنا ہے تو خاموشی سے ہی نکل چلو، ان باتوں کی کیا ضرورت ہے؟''

''پھر وہی بزدلی کی بات۔''

''بزدلی کی بات نہیں یار!......اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''اچھا ہے، ان لوگوں کا ذہن بھی صاف ہو جائے گا۔ اس کے بغیر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو ہم یہیں آرام کریں گے۔ شام کو تنویر صاحب سے ملاقات کی جائے گی۔'' طالوت نے آخری بات کہی۔

''آرام کہاں کرو گے؟''

''برابر میں بیڈ روم موجود ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر ہم اُٹھ کر برابر والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انتہائی کشادہ کمرہ تھا، اس میں تین نہایت آرام دہ بستر لگے ہوئے تھے۔ میں ان کمروں سے اجنبی نہیں تھا، پہلے انہیں دیکھ چکا تھا۔ کباڑ گودام تھا۔ دنیا بھر کا کاٹھ کباڑ یہاں بھرا پڑا تھا۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور [illegible] سامان۔

لیکن طالوت کے لئے اسے عمدہ بیڈ روم بنا لینا کون سی بڑی بات تھی۔

شکیلہ بھی ایک دُور کے بستر پر جا پڑی۔ میں اور طالوت دو برابر، برابر بستروں پر لیٹ گئے۔

''یہ لڑکی اب بور کرنے لگی ہے۔'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''انسان ہے طالوت!''

''کیا مطلب؟''

''اور پھر عورت ہے۔ تجسّس تو فطری ہے۔ اور پھر وہ لوگ، جن کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے، کیسی انوکھی بات ہے کہ وہ ان کی حقیقت سے بھی ناواقف ہے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''قسم لے لو، مطلب کچھ نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اس سے بور مت ہو۔ اس کی یہ ناراضگی فطری ہے۔''

''تو کیا اسے بتا دیا جائے؟''

''نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا۔''

''یوں بھی تو سوچو عارف! اگر ہم اسے اپنے راز میں شریک کر لیں، تب بھی تو وہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ اب سب تمہاری طرح پتھر تھوڑی ہوتے ہیں۔ اور پھر تمہاری دنیا کے لوگ تو ہمارے نام سے ہی کان پر ہاتھ رکھتے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں اس بات پر اصرار نہیں کر رہا۔''

''اس کے باوجود، اگر تم مناسب سمجھو تو اسے بتا دو۔''

''نہیں، کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کے علاوہ ایک بات اور بتاؤ۔''

''ہوں۔''

''اس کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل ہو۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب میں تمہارا مطلب پوچھوں گا۔''

''میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ مطلب وغیرہ تم خود اخذ کر لینا۔'' طالوت نے کہا۔

''کون سی بات؟''

''راج ہنس، بلاشبہ ایک پُرکشش لڑکی تھی، پھر جب وہ شکیلہ بن گئی تو نہ جانے میرے دل میں اس کے لئے کیسا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میں اس سے ایک خوب صورت لڑکی کی حیثیت سے متاثر نہیں ہوں۔ چنانچہ اگر تم اسے پسند کرتے ہو تو میری طرف سے مکمل آزادی ہے۔''

''تمہارے دماغ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''کیا شکیلہ کی حیثیت ایسی ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی اس کے بارے میں اس انداز سے سوچے؟''

''وہ خود تو سوچ سکتی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یار! میں بڑی بیکار باتیں کر رہا۔ میں بس اس وقت نہ جانے کیوں یہ خیال ذہن میں آ گیا۔''

''اب یہ خیال تمہارے ذہن میں آ ہی گیا ہے طالوت! تو اجازت دو تو ایک بات میں بھی پوچھ لوں؟''

''پوچھو۔''
''اگر شکیلہ تمہارا قرب چاہے؟''
''مشکل ہے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''کیوں؟''
''میرے حالات...... میں کیا کر سکتا ہوں؟''
''اس سے شادی۔''
''ارے توبہ توبہ...... یہ تم مجھ سے دشمنی پر کیوں آمادہ ہو گئے؟''
''کیوں؟''
''بلاوجہ مجھ شریف آدمی کی شادی کرا دینا چاہتے ہو۔'' طالوت ہنس کر بولا۔
''میں آج کی بات نہیں کر رہا طالوت! لیکن زندگی کے کسی حصے میں تو تم اس بارے میں سوچو گے۔''
''ہاں۔ اُس وقت کوئی عمر رسیدہ بڑی بی مل گئیں تو غور کروں گا۔''
''گویا شکیلہ تمہیں پسند نہیں ہے؟''
''یہ میں نے کب کہا؟''
''مجھے معلوم ہے طالوت!..... تمہارے ذہن میں راج ہنس سمائی ہوئی تھی۔''
''ہاں..... لیکن شکیلہ نہیں۔''
''کیا مطلب؟...... پہلے تو تمہیں پسند تھی۔''
''ہاں عارف!..... نہ جانے کیوں، اُس وقت میرے ذہن میں اس کی شکل کچھ اور تھی۔ تم بھروسہ کرو میری بات پر، کہ اس وقت اس کی شکل نے میرے اوپر تاثر ہی کچھ اور چھوڑا تھا۔ بعد میں مجھے اس سے ایک عجیب سی اُنسیت ہوگئی اور یہ تصور میرے ذہن سے نکل گیا۔''
''بہر حال، ابھی تو خود اس کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، وہ کیا چاہتی ہے۔''
''اس مسئلے کو درمیان میں کہاں سے لے آئے؟ فی الحال ہمیں کچھ دوسری باتیں سوچنی ہیں۔''
''مثلاً؟''
''میرے خیال کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''
''ارے بھائی! کون سا خیال؟''
''ہم تنویر صاحب پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔''
''مگر اس سے فائدہ؟''
''بس، دل کی تسکین۔''
''جو مناسب سمجھو، وہی کرو۔ جو سوچو گے، مجھے کیا اعتراض ہے۔''
''تم پروا مت کرو۔''
''ہاں۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''
''بس میں اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا ہوں۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔''
''اوکے، اوکے۔ ضرور صاف کرو۔ مجھے اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا اور

سوئم

طالوت مسکرانے لگا۔
''شکیلہ......!'' میں نے شکیلہ کو آواز دی۔
''جی......؟'' شکیلہ نے جواب دیا۔
''سو رہی ہو؟''
''نہیں۔''
''اوہ، میں سمجھا تم سو گئیں۔''
''نہیں۔''
''تب ادھر ہی آ جاؤ۔''
اور شکیلہ اُٹھ کر ہمارے پاس آ گئی۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔
''تمہاری اُداسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔''
''بتا دوں؟'' شکیلہ نے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا۔
''کتنی نفیس بات ہے۔ خدا کی قسم، بہت پسند آئی۔'' طالوت نے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''اگر یہ، کچھ نہیں، کچھ کوئی بات نہیں ہے، وغیرہ کہتیں تو وہ اپنائیت نہیں رہتی، جواب پیدا ہوئی ہے۔ یار عارف! میں اس سوال پر وجد میں آ گیا ہوں۔''
''مذاق اُڑا رہے ہیں آپ میرا؟'' شکیلہ نے شکایتی انداز میں کہا۔
''نہیں.....خدا کی قسم نہیں......ایسی بات نہیں ہے۔''
''اچھا، اب پوچھنے تو دو۔'' میں نے کہا۔
''ہاں، ہاں پوچھو۔ بتاؤ شکیلہ!'' طالوت نے کہا۔
''آپ دونوں کی شخصیت میرے لئے جو کچھ ہے، اس کے بارے میں الفاظ میں نہیں کہہ سکتی۔ یوں سمجھ لیں، اب آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی بے حد خوف ناک ہے۔ آپ لوگوں کی جدائی کے بعد موت ہی مناسب رہے گی۔ جب آپ نے مجھے یہ اپنائیت، یہ تصور دے دیا ہے تو اس کے بعد کیا وجہ ہے کہ آپ کی شخصیت کا کوئی پہلو میری نگاہوں سے یا میرے علم سے دور رہے۔ یا آپ کہہ دیں کہ میں ابھی زیر امتحان ہوں۔ میں اپنی محبت، اپنی وفا کا مکمل ثبوت نہیں دے سکی۔ مجھے وہ طریقہ بتا دیں۔ جس سے میں اپنے آپ کو آپ کا بنا سکوں۔''
شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''عارف!'' طالوت نے ہانک لگائی۔ ''بتا دو یار!..... بتا دو۔ جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔''
''تب تم خود ہی بتا دو۔'' میں نے کہا۔
''میں بتا دوں......تو سنو شکیلہ! جس طرح تم راج ہنس نہیں تھیں، بلکہ شکیلہ تھیں۔ اسی طرح میں خالی یوسف نہیں ہوں۔ بلکہ میرا پورا نام یوسف عبران ہے۔''
''یوسف عبران۔'' شکیلہ نے زیر لب دہرایا۔
''ہاں۔ اور یہ تمہارے عارف صاحب مجھے طالوت کہتے ہیں۔''

''اوہ.... مگر پھر میرے سامنے.....؟''
''کیا یہ نام عجیب نہیں ہے؟''
''ہے۔'' شکیلہ نے جواب دیا۔
''لیکن میری کنیت یہی ہے۔ زمین پر رہنے والے انسان ایسے نام نہیں رکھتے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسے نام ہوتے ہیں۔''
''زمین پر رہنے والے..... ہمارے ہاں.....'' شکیلہ نے دہرایا۔
''ہاں بھئی۔ میرا تعلق تمہاری دنیا سے نہیں ہے۔''
''یعنی؟'' شکیلہ تعجب سے بولی۔
''میں اس پوشیدہ دنیا کا انسان ہوں، جسے تم لوگ جنات کی دنیا کہتے ہو۔''
''اوہ......'' شکیلہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔
''ہاں، میں جن ہوں۔''
''نہیں......'' شکیلہ ہذیانی انداز میں ہنس پڑی۔
''خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تم لوگوں نے ہماری طرف سے ایک بے بنیاد خوف طاری کر رکھا ہے خود پر۔ اور مسٹر عارف! اب پوری کہانی آپ سنا دیں۔''
اور میں نے سنجیدگی سے شکیلہ کو ساری تفصیل بتا دی۔
''خدا کی قسم، یہ کہانی جھوٹی نہیں ہے۔ اور تم اس میں شک نہ کرنا۔'' میرے خاموش ہونے کے بعد طالوت بولا۔ شکیلہ آنکھیں پھاڑ کر طالوت کو دیکھ رہی تھی۔ تب طالوت نے راسم کو آواز دی اور دوسرے لمحے راسم ظاہر ہو گیا۔
''انہیں مختلف شکلیں بنا کر دکھاؤ...... یہ میرا غلام ہے شکیلہ!'' اور پھر راسم نے وہ وہ تماشے دکھائے کہ کئی بار شکیلہ کی چیخیں نکل گئیں۔ تب طالوت نے راسم کو روک دیا۔
''بس، اب جاؤ'' اس نے راسم سے کہا اور راسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
''اب بتاؤ۔ کیا تم مجھ سے خوف زدہ ہو؟''
''نہیں۔'' شکیلہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
''ونڈرفل..... تب تمہیں اپنے بارے میں بتا کر کوئی افسوس نہیں ہوا۔''
''اس سے قبل تم نے کوئی انگریزی بولنے والا جن دیکھا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور شکیلہ خوف زدہ انداز میں مسکرانے لگی۔
''چنانچہ شکیلہ! تمہیں یہ بھی عارف کی زبانی معلوم ہو گیا کہ اس وقت، جب تم ملیں، میں منحوس تلکا کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اب خدا کا شکر ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسی صورت میں یہ تنویر صاحب وغیرہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب یہ بتاؤ، اب تمہارے ذہن میں کوئی میل ہے؟''
''خدا کی قسم نہیں۔ لیکن میں کافی دنوں تک حیرت زدہ رہوں گی۔''
''اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' طالوت نے مسخرے پن سے کہا۔ ''تو اب میں کہہ رہا ہوں کہ ہم تنویر صاحب پر ظاہر ہو جائیں۔''

''کیا حرج ہے۔'' شکیلہ مسکرا کر بولی۔
''ہاں، سیاں ہوئے کوتوال۔'' میں نے ٹکڑا لگایا اور شکیلہ مسکرانے لگی۔
''جاؤ عارف!...... باہر کی فضا دیکھو۔'' طالوت نے کہا۔
''تم اکیلے میں ڈرو گی تو نہیں اس جن سے؟''
''ہرگز نہیں..... یہ ہمارے اپنے ہیں۔'' شکیلہ نے کہا۔
''اللہ اس اپنائیت کو برقرار رکھے۔'' میں نے مسخرے پن سے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوں۔ اس لئے میں اطمینان سے کوٹھی گردی کرتا رہا۔ کوٹھی کے ایک حصے میں کچھ گہما گہمی تھی۔ بہت سے ملازم ایک حصے کو صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ملازموں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ کچھ مہمان آرہے ہیں۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ طویل چکر لگا کر میں کافی دیر میں واپس آیا۔ طالوت اور شکیلہ باتیں کررہے تھے۔
''کیا پوزیشن ہے؟''
''نارمل۔''
''کوئی خاص بات تو نہیں؟''
''کوئی نہیں، سوائے اس کے کہ کوٹھی میں کچھ مہمان آرہے ہیں اور بڑا اہتمام ہے۔''
''تنویر صاحب موجود ہیں؟''
''شاید نہیں۔''
''خیر جلدی بھی کیا ہے۔ اب آرام کرو۔''
''آرام؟''
''ہاں، تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔ تم لوگ بھی سو جاؤ۔'' طالوت نے کروٹ بدل لی۔ شکیلہ اپنی مسہری پر چلی گئی تھی۔ اور پھر سچ مچ سب سو ہی گئے۔
آنکھ کھلی تو خاصی رات ہو چکی تھی۔ پورے کمرے پر گہری تاریکی مسلط تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ آنکھ کھلنے کے بعد چند ساعت تک تو ماحول کا اندازہ ہی نہ ہو سکا، اور جب سب کچھ یاد آ گیا تو میں نے طالوت کو آواز دی۔
''جاگ گئے عارف!'' طالوت کی آواز سنائی دی۔
''ہاں۔ لیکن یہ اندھیرا؟''
''رات ہو چکی ہے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''روشنی تو کراؤ یار!''
''راسم ......!'' طالوت نے راسم کو آواز دی۔ ''ہلکی روشنی۔'' اُس نے راسم کو ہدایت کی اور کمرے میں ایک شمعدان روشن ہو گیا۔
ہلکی روشنی میں ہم نے شکیلہ کی مسہری کی طرف دیکھا۔ شکیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔
''ان خاتون کو بھی جگایا جائے؟''
''ہاں، آواز دو۔'' طالوت نے کہا اور میں نے شکیلہ کو آوازیں دیں۔ خاصی گہری نیند سو رہی تھی۔ کئی

آوازوں پر جاگی۔ اور پھر گھبرا کر جلدی سے مسہری سے نیچے اُتر آئی۔

''کیا ہوا؟......کیا ہو گیا؟''

''رات۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے کیسے؟'' شکیلہ نے اور پریشان ہو کر پوچھا۔

''بس خود بخود ہو گئی۔'' میں نے جواب دیا اور طالوت ہنسنے لگا۔

''اوہ.....!'' شکیلہ نے گہری سانس لی۔ اب اسے اپنی بدحواسی کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ بھی مسکرانے لگی۔ ''واقعی خوب رات ہو گئی۔ نہ جانے کیا بج گیا ہوگا؟''

''آؤ باہر چل کر دیکھیں۔'' طالوت نے کہا اور ہم تینوں باہر نکل آئے۔ لیکن باہر نکل کر ہم نے گہری سانس لی تھی۔ رات تو توقع سے کہیں زیادہ گزر گئی تھی۔ غالباً ڈھائی بجے تھے۔ پوری کوٹھی سنسان پڑی تھی۔ سب سو چکے ہوں گے۔ کسی کے جاگنے کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔

''کمال ہے یار!.....ہم سب اتنی گہری نیند سو گئے۔''

''کھانا تو نشہ آور نہیں تھا؟'' میں نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جن معنوں میں تم کہہ رہے ہو۔ ویسے تو خوراک کے نشے سے بڑا کوئی نشہ ہی نہیں ہے۔''

''مگر حضرت!......اب کیا کیا جائے؟''

''آؤ......آوارہ گردی کرتے ہیں۔''

''اس وقت.....کہاں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''شہر کی سنسان سڑکوں پر۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''واقعی لطف آ جائے گا۔'' شکیلہ بولی۔

''بہت خوب......بہت خوب۔'' میں نے شرارت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور پھر آمادگی ظاہر کر دی۔ ہم کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ خوب تھی یہ رات کی آوارہ گردی۔ سڑکیں بالکل سنسان پڑی تھیں۔ لیکن شہر کے چند علاقے اب بھی جاگ رہے تھے۔ خاص طور سے بندرگاہ کا علاقہ۔ اس علاقے میں ان رات رونق ہی رہتی تھی۔ یہاں کے ہوٹل بھی کھلے ہوئے تھے۔

''کیا خیال ہے، کھانے کا پروگرام ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''اوہ نہیں......لیکن کافی پی جاسکتی ہے۔''

''آؤ، کسی ہوٹل میں چلیں۔''

''یہاں کے ہوٹل، شریف لوگوں کے نہیں ہوتے۔'' میں نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''تو ہم ہی کون سے شریف ہیں......آؤ!'' طالوت نے کہا۔ اور ہم تینوں ''سی ہاک'' کی طرف بڑھ گئے۔ خاصی بڑی عمارت تھی۔ باہر سے خوب صورت بھی نظر آ رہی تھی۔ ایک چوڑے زینے سے گزر کر ہم ریفرشمنٹ ہال میں پہنچ گئے۔ ہال میں خاصی رونق تھی۔ سگریٹوں کے دھوئیں چکرا رہے تھے۔ ان میں شراب اور سگریٹوں کی بُو بھی شامل تھی۔ گندی ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے چل رہے تھے، لیکن پھر بھی ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ زیادہ تر ملکی اور غیر ملکی ملاح ہی نظر آ رہے تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ لیکن شریف عورتوں کی کہیں

جھلک بھی نہیں تھی۔ یہ سب کی سب شگاری تھیں، جو خاص طور سے غیر ملکیوں کا شکار کرنے آتی ہیں۔
''ماحول اچھا نہیں ہے طالوت!'' میں نے کہا۔
''تو پھر......؟''
''شکیلہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔''
''ہائے اللہ...... میں مر جاؤں۔ یار! تم میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔'' طالوت نے کہا اور اس کونے کی میز کی طرف بڑھنے لگا، جو خالی نظر آ رہی تھی۔
بہرحال، ہم کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ بے شمار نگاہیں ہماری طرف تھیں۔ ان میں زیادہ تر خطرناک چہرے تھے۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ اس بے باک ماحول میں کوئی ہنگامہ ضرور ہوگا۔ میرے دل نے کہا۔ لیکن مجھے حیرت اس شکیلہ کی بچی پر ہو رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ اُسے طالوت پر اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ بے حد مطمئن نظر آ رہی تھی۔
ویٹر ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔
''کافی۔'' طالوت نے بھاری آواز میں کہا۔
''صاحب!'' ویٹر جھک کر بولا۔
''ہوں۔'' طالوت نے چونک کر اسے دیکھا۔
''آپ کسی جہاز سے آئے ہیں؟''
''نہیں...... کیوں؟''
''شہر سے آئے ہیں؟''
''ہاں۔''
''تب میں آپ کے لئے کمرے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ رات بھر رہیں۔ کرایہ صرف بیس روپے ہوگا۔ یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔''
''اچھا...... کیوں؟'' طالوت نے پوچھا۔
''یہاں اچھے لوگ نہیں آتے...... اور پھر اس وقت ہال میں بہت برے برے لوگ موجود ہیں۔''
''تم کافی لاؤ...... اور اس کے ساتھ ساتھ ان برے برے لوگوں کی ایک فہرست بھی لے آؤ۔ میں سب کو ٹھیک کر دوں گا۔''
''آپ کی مرضی صاحب!...... میں نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔'' بیرا چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کافی سرو کر دی۔ گھورنے والے اب بھی شکیلہ کو گھور رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔
اور پھر گڑبڑ شروع ہوگئی۔ کرسی سے اُٹھنے والا شخص بلا مبالغہ پونے سات فٹ قد رکھتا تھا۔ بدن اس لحاظ سے موٹا نہیں تھا لیکن تندرست ضرور تھا۔ سفید قمیض اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ گریبان پیٹ تک کھلا ہوا تھا اور بالوں سے صاف سینہ نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں نشے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دیسے وہ کسی غیر ملک سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ نہ جانے کہاں کا تھا۔
''ہیلو......!'' اس نے ہمارے قریب آ کر دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیئے اور جھک گیا۔ طالوت گرالا

جھکائے کافی پیتا رہا۔ لمبا آدمی براہِ راست شکیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ دونوں تمہارے دوست ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی.....فرمایئے؟" میں نے کہا۔

"اوہ، تم خاموش رہو۔ مجھے بات کرنے دو۔ کیوں ڈارلنگ!"

اب شکیلہ کسی حد تک نروس ہوئی۔ اُس نے دزدیدہ نظروں سے طالوت کو دیکھا۔ وہ بڑی شرافت سے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔

"میرا نام کپن ہے۔ انکارڈو کا ہیڈ خلاصی ہوں۔ یہاں مجھے سب جانتے ہیں۔ کیا تم تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھو گی؟"

اب طالوت نے کافی ختم کر لی تھی۔ پھر اُس نے ہونٹ خشک کرتے ہوئے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ "ہیلو کپن.....!" اُس نے بڑے پیار سے کہا۔

"اوہ، ہیلو......تمہاری ساتھی مجھے بے حد پسند آئی ہے دوستو! صرف آج کی رات، اُسے مجھے دے دو۔ میں تمہارا دوست بن جاؤں گا۔"

"مگر تم جیسے مریل لوگوں کو ہم دوست نہیں بناتے۔ تم بانس کی طرح لمبے اور بے تکے ہو۔ اب تم تو تیز ہوا میں قدم بھی نہ جما پاتے ہو گے۔ جاؤ، بھاگ جاؤ۔"

"اُٹھو لڑکی!......تم بندرگاہ کے شہنشاہ کو نہیں جانتیں۔ میں خوش ہو گیا تو قسمت سنور جائے گی۔" کپن نے شکیلہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر چونک پڑا۔

نہ صرف اس نے، بلکہ میں نے، شکیلہ نے بھی محسوس کیا کہ اچانک اُس کا ایک ہاتھ غائب ہو گیا تھا۔ کپن نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ٹٹولا اور پھر اُس کی چیخ نکل گئی۔

بہت سے لوگ چونک کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"ارے میرا ہاتھ.....میرا ہاتھ......میرا ہاتھ......" کپن چیخ رہا تھا۔ اور پھر اچانک وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اُس کی ایک ٹانگ چھوٹی ہو گئی تھی۔ تب طالوت جھکا اور اُس نے منہ سے پھونک ماری۔

پورے ہال میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ کپن کسی تنکے کی طرح اُچھل کر دُور جا گرا تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ لوگ کپن کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہماری طرف سے کچھ نہیں ہوا۔ ہم تو خاموش بیٹھے تھے۔ نہ جانے کپن کو کیا ہو گیا تھا۔

شکیلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اُس نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ "میرا خیال ہے، اُٹھ ہی جائیں۔ یہاں سے کہیں اور چلیں۔"

"بل کی رقم رکھ دو عارف!" طالوت نے کہا اور میں نے جیب سے چند نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیئے۔ کپن کے گرد تقریباً سارے ہی ہال کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دروازے خالی تھے۔ ہم اطمینان سے دروازے سے نکل آئے۔ ہمیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر ہم اس ہوٹل سے ہی کافی دُور نکل آئے۔ ہمارا رُخ سمندر کے ساحل کی طرف تھا۔

"اب اس کا کیا ہو گا مسٹر یوسف؟" شکیلہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ بس ایک ہاتھ غائب اور ایک ٹانگ چھوٹی۔"

''اوہ، ہمیشہ رہے گی؟''

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے، بہت سخت سزا ہے۔''

''اب دے دی گئی۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔'' طالوت نے جواب دیا۔ ہم چلتے رہے۔ اور پھر چلتے چلتے طالوت نے رفتار سست کر دی اور میرے کندھے کو دبایا۔

''ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یار! تھوڑی سی تنہائی دے دے۔''

''اوہ، ویری گڈ...... واقعی؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں۔'' طالوت نے گردن ہلا دی۔

''او کے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم آگے بڑھتے رہے۔ پھر ہم سمندر کے خالی حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں چاروں طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ریت اور ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔

''طالوت!'' میں نے اسے آواز دی۔

''ہوں۔''

''میں تو اس ٹیلے پر لیٹ کر ماضی کا سفر کروں گا۔ ٹھنڈی ریت مجھے بچپن سے پسند ہے۔''

''اوہ، کیا بچوں والی حرکت ہے۔ آؤ، چہل قدمی کریں گے۔''

''تم لوگ کرو...... مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری مرضی۔ آؤ شکیلہ!'' طالوت نے کہا اور پھر وہ شکیلہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں ریت پر لیٹ کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ سچی بات ہے، شکیلہ بہت خوب صورت تھی۔ میرے دل میں اُس کے لئے جگہ تھی۔ لیکن دل لگانے کا کاروبار تو میں نے عرصۂ دراز سے چھوڑ دیا تھا۔ اب تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

چنانچہ طالوت کو اس کی طرف مائل دیکھ کر مجھے کوئی احساس نہیں ہوا۔ بلکہ اس التفات میں مجھے خود دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ویسے عجیب تھا یہ جن زادہ بھی۔ خود مجھے اس سے عشق کا مشورہ دے رہا تھا۔ اور اب......

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور پھر نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ماضی کی کچھ تصویریں اُبھرنے لگیں۔ کیسی عجیب زندگی ہے میری بھی۔ تردّد سے پاک...... لیکن اضطراب سے بھرپور۔ دونوں خیال ایک دوسرے کی نفی۔ شاید احساس کو سکون نہیں مل سکا ہے۔ یہ خیال ذہن کے گوشوں میں موجود ہے کہ میں وہ زندگی نہیں گزار رہا، جو میرے آباء و اجداد گزارتے آئے ہیں۔ اور وہ زندگی...... سکون کی زندگی مجھ سے کافی دُور ہے۔ میں کسی کے کاندھے کے سہارے چل رہا ہوں۔ اور کسی وقت بھی یہ سہارا ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔

نہ جانے کب تک خیالات میں گم رہا۔ پھر طالوت کی آواز نے ہی خیالات کا طلسم توڑا۔

''میں نے کہا، مولانا!...... پھر سو گئے کیا؟''

''نہیں، جاگ رہا ہوں۔'' میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ طالوت اور شکیلہ بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

"کیا سوچ رہے تھے؟"
"کوئی خاص بات نہیں۔"
"کیا خیال ہے، واپس چلیں؟"
"چلو۔"
"چہل قدمی کا موڈ تو اب نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہوا کی سواری کی جائے۔"
"ٹھیک ہے۔"
"چنانچہ تم دونوں آنکھیں بند کرو۔" طالوت نے کہا اور پھر آنکھیں تنویر محل ہی میں کیوں نہ کھلتیں۔ ہم اسی کمرے میں تھے۔
"یہ کیسا سفر ہے یوسف صاحب!..... ہمیں اپنے جسم تک متحرک نہیں معلوم ہوئے۔" شکیلہ نے کہا۔
"ہوا کے سُبک ذرات ہمارے بدن منتقل کر دیتے ہیں، اس سے زیادہ تفصیل میں خود نہیں جانتا۔ مجھے صرف عمل آتا ہے، تھیوری نہیں۔" طالوت نے جواب دیا اور پھر مجھ سے بولا۔ "آؤ عارف!...... ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لے لیں۔ شکیلہ! تم آرام کرو۔"
"آؤ۔" میں نے کہا اور ہم دونوں کمرے سے نکل آئے۔
"میرا خیال ہے، صبح کو ہم تنویر صاحب سے بات کر لیں، اور پھر یہاں سے نکل چلیں۔ کہیں اور چلیں گے۔"
"جیسی تمہاری مرضی۔"
"یار!..... ایک اور خاص بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔"
"کیا؟"
"میں اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں۔"
"مبارک ہو...... دل سے مبارک ہو۔ لیکن اچانک کیسے؟"
"بس یار! جو کچھ ہوا، اچانک ہی ہوا۔ لیکن تمہیں طالوت کی قسم کھانی پڑے گی۔"
"کس بات پر؟"
"جو کچھ کہو گے، سچ کہو گے۔"
"ہاں، ہاں..... پوچھو، کیا بات ہے؟"
"نہیں، پہلے قسم کھاؤ۔" اور پھر طالوت نے پیچھے پڑ کر مجھے قسم کھلوائی، پھر بولا۔ "اگر میں اس لڑکی سے راہ و رسم بڑھالوں تو تمہیں دُکھ تو نہیں ہوگا؟"
"طالوت کی قسم! نہیں۔"
"اوہ، شکریہ میرے دوست! تمہارے الفاظ میں خلوص اور سچائی ہے۔ مجھے اعتماد ہے۔ سنو، وہ بھی مجھے چاہنے لگی ہے۔"
"اعتراف کیا اس نے؟"
"ہاں۔" طالوت نے بھونڈے انداز میں شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا اور میں نے اُس کی کمر پر ایک دھپ رسید کر دی۔ طالوت ہنسنے لگا تھا۔

''یار عارف! کیوں نہ ہم زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی لائیں۔''
''کیسی تبدیلی؟''
''ہم دونوں شادیاں کرلیں۔''
''سوار ہوگئی عورت ذہن پر؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم، یہ بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی سوچ رہا تھا۔''
''بہرحال، میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔''
''اور تم......؟''
''میری اور بات ہے۔''
''کیوں؟''
''یار! میں شادی نہیں کروں گا۔''
''آخر کیوں؟''
''تم خود سوچ سکتے ہو۔ میری زندگی ہی کیا ہے؟ سُولی پر تو لٹکا رہتا ہوں ہمیشہ۔ تمہاری بات دوسری ہے۔ تمہاری ساتھی عیش کرے گی۔ اور میں..... جس وقت بھی تم مجھ سے جدا ہو گئے، میری حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔''
''کیا کہہ رہے ہو عارف!'' طالوت سنجیدہ ہو گیا۔
''اس میں کون سی بات غلط ہے میرے دوست؟''
''گویا تمہیں طالوت پر اعتماد نہیں ہے؟''
''ہے......لیکن......''
''سن میرے یار!...... طالوت اپنے باپ کی قسم کھاتا ہے، جب تک وہ زندہ ہے، حالات کچھ بھی ہو جائیں، وہ تجھے نظر انداز نہیں کرے گا۔ وہ ہمیشہ تیری بہتری کی تلاش میں رہے گا۔''
''وہ تو ٹھیک ہے طالوت!.....لیکن......''
''اب بھی لیکن کی گنجائش رہ گئی ہے؟'' طالوت نے شکایتی انداز میں کہا۔
''نہیں......میرا مطلب ہے، ابھی تو میری نگاہ میں......''
''میں سمجھ گیا۔ بہرحال، ہم تلاش شروع کر دیں گے۔''
''تمہیں اجازت مل جائے گی؟'' میں نے سوال کیا۔
''بتاؤں گا ہی نہیں وہاں۔''
''میرا خیال ہے، خاصی خطرناک بات رہے گی۔''
''وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہ بھی تو سوچو، میں اپنے ہاں کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ اور پھر اگر میری زندگی میں کوئی عورت بیوی کی حیثیت سے آئی تو اب وہ شکیلہ ہو گی۔ ہم لوگ قول کے سچے ہوتے ہیں۔''
''خدا کامیاب کرے۔'' میں نے خلوصِ دل سے کہا۔
''اچھا، اب ان تنویر صاحب سے نمٹنے کی سوچو۔''
''تم بضد ہی ہو تو آؤ.....انہیں تلاش کریں۔''

''ابھی تو سو رہے ہوں گے۔''
''جگا لیں گے۔'' میں نے کہا۔
''تب پھر آؤ!'' طالوت نے کہا اور ہم تنویر صاحب کی خواب گاہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ سو رہے ہوں گے۔ تنویر صاحب کی خواب گاہ سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دو تین افراد تھے۔
''جلدی جاگ جاتے ہیں یہ لوگ؟'' طالوت بولا۔
''ہاں، مگر دوسری آوازیں؟''
''مسز تنویر کی ہوں گی۔''
''تب کیا خیال ہے؟''
''آخری عمر میں ہیں یار!...... دستک دو۔'' طالوت نے کہا اور میں نے دستک دی۔
''کون ہے؟...... اندر آ جاؤ۔'' تنویر صاحب کی آواز اُبھری اور ہم دونوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر تنویر صاحب، بڑی ماں اور افشاں تینوں موجود تھے۔
ہمیں دیکھ کر تنویر صاحب اور بڑی ماں کی جو حالت ہونی چاہئے تھی، وہی ہوئی۔ البتہ افشاں حیرانی سے ہم دونوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ تنویر صاحب اور بیگم تنویر سکتے کے عالم میں تھے۔ پھر تنویر صاحب کا ہاتھ تکیے کے نیچے رینگ گیا۔ اور ہم نے صاف محسوس کیا کہ اب ان کے ہاتھ میں پستول ہے۔ لیکن پستول چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔
''ہمیں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی؟'' طالوت نے کہا اور تنویر صاحب سنبھلے۔
''بیٹھو!'' انہوں نے بھاری آواز میں کہا اور ہم اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''ہم آپ سے کچھ باتیں کرنے آئے تھے۔'' میں نے کہا۔
''کہو!''
''ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ خاموشی سے چلے جاتے، لیکن دل نہ مانا۔ سوچا، آپ سے آخری گفتگو کر کے ہی جائیں۔''
''یہ گفتگو کا وقت ہے؟''
''ہم جیسے لوگوں کے لئے ایسے ہی اوقات مناسب ہوتے ہیں۔''
''ہوں...... کہو؟'' تنویر صاحب بولے۔
''کیا آپ کے روّیے کی یہ تبدیلی مناسب ہے؟''
''کیا مطلب؟''
''ہماری ذات سے آپ کو دکھ پہنچا ہے کوئی؟''
''نہیں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''پھر آپ کے روّیے کی یہ تبدیلی سمجھ میں نہیں آتی؟''
''معمولی سی بات ہے۔ تم لوگ جرائم پیشہ ہو اور پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ تم نے کئی بار پولیس کو دھوکا دیا ہے۔ اور میں بہر حال ایک شریف شہری ہوں۔''

''تو سنیں تنویر صاحب!...... میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ابتدا سے آج تک پولیس غلط فہمی کا شکار رہی ہے۔ اس شخص کا نام عارف ضرور ہے، لیکن یہ وہ نہیں جو پولیس کا مجرم تھا۔ ہمارا تعلق تو ایک پہاڑی ریاست سے ہے۔ ہم سیر و تفریح کی غرض سے نکلے تھے، لیکن حالات کا شکار ہو گئے۔ آپ کے یہاں کی پولیس نے ہمیں مجرم سمجھا، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم اسے باور کراتے رہے، لیکن شاید وہ شخص بھی ہمارا ہی ہم شکل تھا، جو مجرم تھا۔ ایسی شکل میں ہم کیا کریں؟'' طالوت نے تُرپ ماری۔

''یہ تم پولیس کو باور کرا سکتے ہو۔''

''مصیبت یہ ہے کہ کوئی نہیں مانتا۔''

''اور وہ جعلساز لڑکی؟''

''اُس نے کوئی جعلسازی کی آپ سے؟...... کیا اس نے ابتدا میں خود کو افشاں کہا؟ جب آپ لوگوں نے ہمیں مجرم سمجھ لیا تو پھر ہم نے بھی تھوڑی سی تفریح کی۔''

''بہر حال، یہ فیصلہ کرنا پولیس کا کام ہے۔''

''ہمارے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔ یہ حق کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ آپ کے پاس ہم صرف اس لئے آئے تھے کہ آپ اپنے ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ ہم مجرم ہیں۔''

''میرے ذہن سے نکال دینے سے کیا ہو گا؟''

''صرف دل مطمئن ہو جائے گا۔ اور کچھ نہیں۔''

''ہوں۔'' تنویر صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''یہ وہی دونوں ہیں ابو......؟'' افشاں نے پوچھا۔

''ایں..... ہاں۔'' تنویر صاحب چونک کر بولے۔

''لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر غور بھی تو کیا جا سکتا ہے۔'' افشاں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''آپ کے تعلقات ہیں...... آپ پولیس افسروں سے بات کیوں نہیں کرتے؟ ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے ذہن سے ان کی بات سنیں، تحقیقات کریں۔ وہ لوگ جو مجرم نہیں ہیں، ان کی زندگی کیوں عذاب کی جائے۔'' افشاں بولی۔

''ہوں۔'' تنویر صاحب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ بدستور گہری سوچ میں تھے۔ پھر انہوں نے گردن اُٹھائی اور بولے۔ ''تم لوگ کہاں مقیم ہو؟''

''آپ کی کوٹھی میں۔''

''کیا مطلب؟'' سب اُچھل پڑے۔

''ہاں، ہم نے آپ کا کباڑ گودام خالی کر لیا ہے۔ آج کل وہیں رہتے ہیں۔'' طالوت نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ارے......'' سب اُچھل پڑے۔ افشاں حیرت زدہ انداز میں مسکرانے لگی تھی۔

''سچ کہہ رہے ہو؟'' تنویر صاحب نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''افوہ......بچو! وہ کوئی رہنے کی جگہ ہے؟ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔''

''میری رائے ہے ابو!......اگر یہ لوگ بے گناہ ہیں تو ان کی مدد اخلاقی فرض ہے۔ بہرحال، ان لوگوں نے بھی ہماری مدد کی ہے۔ میں چاہتی ہوں، آپ ان کی مدد کریں۔'' افشاں نے کہا۔

میں نے طالوت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔

''کیا آپ ہمیں اپنی رہائش گاہ دکھائیں گے؟'' افشاں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں......کیوں نہیں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''آیئے ابو!.....دیکھیں۔'' افشاں نے بچوں کی طرح کہا۔ تنویر صاحب تیار ہو گئے۔ بڑی ماں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور پھر سب کباڑ گودام کی طرف چل پڑے۔ میں نے طالوت کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے تھے۔ غالباً راسم کو ہدایات مل رہی تھیں۔

بہرحال، ہم گودام میں داخل ہوئے تو اس کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی مسہری پر شکیلہ لیٹی ہوئی تھی۔ یقیناً راسم نے اُسے بھی حالات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔

''خدا کی پناہ!.....تم اس منحوس جگہ پر کیسے گزر کر رہے تھے؟ پھر کھانے پینے کی کیا رہتی تھی؟'' بڑی ماں نے کہا۔

''قسم لے لیں بڑی ماں! آپ کے کچن سے کبھی کچھ نہیں چرایا۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''چھوڑو، مجھے افسوس ہے، میری چھت کے نیچے تمہیں اتنی تکلیف ہوئی۔'' بڑی ماں نے دُکھ سے کہا۔

''اور مجھے بھی۔'' افشاں نے کہا اور شکیلہ کی طرف بڑھ گئی۔ شکیلہ جلدی سے اُٹھ گئی۔ افشاں مسکرانے لگی۔ ''جی خاتون!.....اب آپ کیا کہتی ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں شکیلہ ہوں۔'' شکیلہ نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے مسہری کے نیچے کس نے ڈالا تھا؟''

''جانے دو ان باتوں کو۔'' شکیلہ نے کہا۔

''ہاں، جانے دو۔ آؤ، باہر آؤ۔'' بڑی ماں نے کہا۔ ''بیٹی کو کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔''

''آپ لوگوں کے ذہن ہماری طرف سے صاف ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں بیٹے!......تم شکلوں سے ایسے نہیں معلوم ہوتے۔ کیسی پیاری پیاری شکلیں ہیں۔ میں تو ان دنوں ہوش میں ہی نہیں تھی، ورنہ میں تمہیں اس طرح نہ جانے دیتی۔''

''ہماری یہی خواہش تھی بڑی ماں!.....بہرحال پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ ہم مزید یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ ورنہ آپ لوگ اُلجھن میں پڑیں گے۔''

''اب میں ایسا فقیر بھی نہیں کہ اُلجھنوں میں پڑتا رہوں۔ تم ابھی ایک آدھ دن یہاں رہو، پھر خاموشی سے جہاں دل چاہے چلے جانا۔ ناشتہ تم ہمارے ساتھ ہی کرو گے۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''ہم اپنی شکیلہ باجی کو ایسے نہیں جانے دیں گے۔'' افشاں نے پیار سے شکیلہ کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''افشاں! تم انہیں ساتھ لے جاؤ۔ لیکن براہِ کرم کسی کو ان کے بارے میں ابھی نہ بتانا۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''آیئے حضرات!'' افشاں نے کہا۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا اور طالوت نے لاپروائی سے گردن ہلا دی۔ ظاہر ہے، طالوت کو کیا پروا ہو سکتی تھی۔ ہوا تو میری کھسک رہی تھی۔

بہرحال، ہم سب افشاں کے ساتھ چل پڑے۔ افشاں ہمیں اپنے کمرے میں لے گئی۔

''تشریف رکھئے حضرات!......آپ لوگ تو بے حد مشہور شخصیتیں ہیں۔ لیکن کیسی دلچسپ بات ہے کہ آپ دونوں ہم شکل ہیں اور ہم دونوں ہم شکل۔ اور ہم شکل بھی ایسے کہ خود سے دھوکا کھا جائیں۔ لیکن یہ بھی کوئی شعبدہ تو نہیں ہے؟''

''یہ قدرتی شعبدے ہیں مس افشاں!'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔

''مگر یہ تو بتائیں، کیا آپ کالے جادو کے ماہر ہیں؟''

''کیوں؟''

''پولیس رپورٹ......اور پھر خود میرے ساتھ جو کچھ ہوا۔'' افشاں نے کہا۔

''اوہ، آپ شعبدہ ہی کہیں اسے۔''

''مگر کمال ہے۔ ہاں، آپ میں سے یوسف کون ہیں؟ اور عارف کون؟''

''میں عارف ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خوب.....مگر پوچھنا ہی بیکار ہے۔ اگر میں ایک لمحے کے لئے پلک جھپک لوں اور آپ لوگ جگہیں بدل لیں، تب بھی نہ پہچان سکوں گی۔ شکیلہ! آپ کو دقت نہیں ہوتی؟''

''اب نہیں ہوتی۔'' شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑی دلچسپ بات ہے۔ کاش! آپ پر سے سارے الزامات ہٹ جائیں اور ہم لوگ ساتھ رہیں۔ جہاں بھی جائیں گے، لوگ بری طرح چکرا جائیں گے۔''

''یہ آپ کی خواہش ہے مس افشاں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''دلی۔''

''لیکن بہرحال، یہ مشکل ہے۔ ویسے شعبدے تو آپ بھی خوب دکھاتی ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''میں؟''

''ہاں۔ ہماری ملاقات ان لوگوں سے ہوئی تھی، جنھوں نے آپ کو اغوا کیا تھا اور پھر ساری دنیا میں گھماتے رہے تھے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن افشاں کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ''آپ.....آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''دوسرا شعبدہ باز تصدق ہے۔''

''اوہ.....اوہ.....تو کیا اُس نے......؟''

''ہرگز نہیں۔''

''پھر براہِ کرم بتا دیں، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''کیا آپ کو ہوٹل کی ملاقات یاد نہیں ہے؟''

''ہے.....اوہ......تو......''

''ہاں، پہلے ہم آپ کو شکیلہ سمجھے تھے۔ مگر جب آپ ہمیں جُل دے کر نکل گئیں اور ہمیں ہوش آیا تو

ہم نے آپ کے بارے میں کافی تحقیقات کیں۔"
"خدا کی پناہ......میرا خیال تھا، آپ مجھے نہیں پہچان سکے ہوں گے۔"
"خیر، پرانی باتیں جانے دیں۔"
"لیکن ایک درخواست ضرور کروں گی۔"
"کیا؟"
"خدا کے واسطے یہ معلومات اپنے تک محدود رکھیں۔ امی جان کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن میری وجہ سے ان کی جو حالت ہوئی، وہ میرے لئے بڑی شرمندگی کا باعث ہے۔"
"آپ مطمئن رہیں۔"
"شکریہ!.....ویسے آپ یہاں آرام سے رہیں۔ میں آپ کو اپنی باجی سے ملواؤں گی۔ ہمارے خالو اور خالہ زاد بہنیں وغیرہ آئی ہوئی ہیں۔"
"افسوس، اس الزام کی وجہ سے ہم سوشل زندگی سے کافی دُور ہو گئے ہیں۔"
"خدا آپ پر سے یہ الزام دُور کرا دے۔" افشاں نے بڑے خلوص سے کہا۔
کافی دیر تک ہم گفتگو کرتے رہے، بہت وقت گزر گیا، تب ایک ملازمہ نے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دی اور افشاں نے کہا۔ "آیئے.....ناشتہ تیار ہے۔"
"آپ کے مہمان بھی ہوں گے، ناشتے کی میز پر؟"
"ہاں.....کیوں؟"
"کیا ہمارا اُن کے سامنے جانا مناسب رہے گا؟"
"اوہ، آیئے......کیا حرج ہے؟" افشاں نے کہا۔
اور ہم اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر اُس کے ساتھ چل پڑے۔ پھر ہم ناشتے کے عظیم الشان کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ہم نے سب کو نہیں دیکھا، لیکن چند آوازوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ ضرور کیا تھا۔
"ارے، ارے، ارے....." اور ہماری نگاہیں بھی سامنے اُٹھ گئیں۔
اور پھر ہماری حیرت کی بھی انتہا نہ رہی۔ یہاں کئی جانی پہچانی شکلیں نظر آئی تھیں۔ اور یہ شکلیں نواب جلال الدین، سیمیں اور احسان کی تھیں۔
"عادل بھائی!......صائم بھائی!" سیمیں اور احسان اس بری طرح اُٹھے کہ کرسیاں اُلٹ گئیں۔ اور پھر وہ اس بری طرح ہم سے لپٹے کہ توبہ۔ سیمیں نے بھی کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔
"ارے، ارے...تم کہاں میرے نورِ نظر!......تم کہاں سے نظر آ گئے؟" نواب جلال الدین بھی بے اختیار ہو گئے۔ وہ بھی ہم سے آ چپٹے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
"بتایئے، کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ؟" سیمیں ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے بولی۔ احسان بھی اس کی طرح رو رہا تھا۔ اور بقیہ لوگ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے۔
تنویر صاحب کی بری حالت تھی۔ بڑی ماں پاگلوں کی طرح کھڑی تھیں۔ اور افشاں عجیب احمقانہ انداز میں منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ سب لوگ ناشتہ واشتہ بھول گئے تھے۔

سوئم

''میرے بچو!......آہ، کتنا تڑپا ہوں میں تمہارے لئے۔ بتاؤ...... بتاؤ کہاں چلے گئے تھے تم لوگ؟''
سچی بات ہے، ان مخلص لوگوں کو دیکھ کر ہم بھی دنگ رہ گئے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ نواب صاحب کے مہمان یہ ہوں گے۔ ہم خود بھی ان لوگوں سے لپٹ گئے تھے۔
نواب جلال الدین سب کچھ بھول گئے تھے۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر کرسیوں پر آ بیٹھے۔ سیمیں اور احسان تو ہم پر ہی لدے پڑ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک کسی نے شکیلہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔
''بتاؤ، تم کہاں چلے گئے تھے؟'' نواب صاحب نے پھر پوچھا۔
''آپ سے جدا تو ہونا ہی تھا نواب صاحب!'' میں نے کہا۔
''ہاں......پھر؟''
''اگر ہم باقاعدہ آتے تو آپ لوگوں کو بہت دُکھ ہوتا...... اور ہمیں بھی...... اسی لئے ہم اس طرح چلے آئے۔''
''بڑا ظلم کیا ہے تم دونوں نے۔ خدا کی قسم! مہینوں تمہارے لئے تڑپتے رہے۔ سینکڑوں آدمی نہ جانے کہاں کہاں تمہاری تلاش میں ہو آئے۔ ابھی تک صبر نہیں آیا تھا۔ خدا کا احسان ہے...... خدا کا احسان ہے کہ اس نے پھر تم سے ملا دیا۔''
''جلال بھائی!'' تنویر صاحب کی گھٹی گھٹی آواز اُبھری۔
''اجی خاموش رہو...... میرے دونوں گوہر تم نے چھپا رکھے تھے، مجھے کیا معلوم۔''
''جلال بھائی! بس...... سنئے تو سہی۔'' تنویر صاحب نے پھر اسی انداز میں کہا۔
''کیا خاک سنوں؟ یہ بتاؤ، یہ کب سے تمہارے ہاں ہیں؟ اور ان کے ساتھ تمہارا سلوک کیسا رہا؟''
''میری بات تو سنیں۔''
''بس، اب کچھ نہیں سنوں گا۔ خدا کی قسم! بھوک اُڑ گئی ہے۔ مگر آؤ بیٹے!...... ناشتہ کرو...... اُفوہ، میری کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔ آؤ، ناشتہ کرو۔ پھر باتیں کریں گے۔'' نواب جلال الدین نے کہا۔
اسی وقت دروازہ کھلا۔ ایس پی آفتاب اور چار انسپکٹر، ہاتھوں میں پستولیں لئے اندر گھس آئے۔ ایس پی آفتاب سب سے آگے تھا۔
''مداخلت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ تم دونوں ہاتھ بلند کر لو۔ کوٹھی کے چپے چپے پر پولیس موجود ہے۔ تم نکل نہ سکو گے۔ اگر تم نے ذرا سی گڑبڑ کی تو یہیں گولی مار دی جائے گی۔''
طالوت نے گہری سانس لی۔ میں بھی ساکت رہ گیا تھا۔ نواب جلال الدین عجیب سی نگاہوں سے ایس پی کو گھور رہے تھے اور تنویر صاحب کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔
''تم کس سے مخاطب ہو آفیسر؟'' بالآخر نواب جلال الدین کی گرجدار آواز اُبھری۔
''معاف کیجئے گا جناب! یہ دونوں جو آپ کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں، بہت بڑے جعلساز ہیں۔ ہم انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔''
''انہیں؟'' نواب صاحب اُچھل پڑے۔
''جی ہاں! آپ ہمیں اجازت دیں۔'' ایس پی آگے بڑھا۔
''کیا بدتمیزی ہے؟'' نواب صاحب کی غراہٹ بلند ہوئی۔ ''پیچھے ہٹو...... گیٹ آؤٹ...... آئی

گیٹ آؤٹ!" نواب صاحب حلق پھاڑ کر دہاڑے۔ اور پھر وہ تنویر صاحب کی طرف مڑے۔ "تنویر! یہ تمہاری کوٹھی ہے یا جوئے کا اڈہ؟ یہاں پولیس اس طرح گھس آتی ہے۔"

تنویر صاحب کے تو حواس ہی جواب دے گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہے تھے۔ اور نواب جلال الدین کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے محترم! یہ دونوں......" آفتاب نے کہنا چاہا۔

"ایس پی!...... تم قانون کے محافظ ہو۔ میں تم سے اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکوں گا کہ ان دونوں کی شان میں گستاخی کا دوسرا لفظ نہ نکلے۔ اور اس کے بعد میں تم سے وارنٹ طلب کرتا ہوں۔"

"ان دونوں کے لئے تو ہدایات ہیں جناب! کہ اگر زندہ گرفتار نہ ہوں تو گولی مار دی جائے۔" آفتاب نے کہا۔

"اور یہ بھی ہدایات ہیں کہ صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر ہر جگہ گھس جاؤ۔" نواب جلال الدین بولے۔

"ان کی تلاش میں تو یہ بھی جائز ہے۔ خواہ بعد میں حکومت کو کتنا ہی بڑا جرمانہ ادا کرنا پڑے۔ لیکن اس وقت میں صاحبِ خانہ کے طلب کرنے سے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" نواب جلال الدین نے اس بار تنویر صاحب کی طرف گھور کر دیکھا۔

"وہ...... وہ دراصل...... یہ حقیقت ہے۔" تنویر صاحب کی آواز مشکل سے نکل سکی تھی۔

"بہت خوب...... ٹھیک ہے ایس پی صاحب! ان دونوں کے جتنے جرائم ہیں، میں ان میں برابر کا شریک ہوں۔ براہ کرم مجھے بھی گرفتار کر لیا جائے۔"

"جلال بھائی!" تنویر صاحب گھبرا کر بولے۔

"اٹھو......!" نواب جلال الدین نے بیگم، احسان وغیرہ سے کہا اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"جلال بھائی! سنئے تو سہی۔" تنویر صاحب پریشانی سے بولے۔

"تنویر!...... بے تکلفی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ دنیا کے بدبخت ترین انسان ہو جو ان فرشتوں سے پرخاش رکھتے ہو۔ میں اس کی وجہ بھی نہیں معلوم کروں گا۔ بہرحال، اگر تم نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اپنی دانست میں، تو بہرحال تمہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ میری موجودگی میں پولیس نہیں آنی چاہئے تھی۔ بہرحال شکریہ...... ان لوگوں کو تم نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ اور جس گھر میں ان کی بے عزتی ہو، وہاں میں ایک پل نہیں رہ سکتا۔"

"بات کچھ...... بات کچھ غلط فہمی کی ہے جلال بھائی! ام...... میں......"

"تم جانتے ہو، میں ضدی آدمی ہوں۔ میں اب یہاں نہ رہ سکوں گا۔ بیگم! واپس چلو۔ وقتی طور پر کوئی ہوٹل مناسب رہے گا۔ پھر ہم کسی مکان کا بندوبست کر لیں گے۔ اور ایس پی!...... تم سنو...... ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنے کا تصور ذہن سے نکال دو۔ میں نواب جلال الدین آف جلال آباد ہوں۔ تمہارا ہوم سیکرٹری، میرا لنگوٹیا دوست ہے۔ آؤ، ٹیلی فون تک چلیں، میں تمہیں اس سے فوری ہدایات دلوا دیتا ہوں، تاکہ تمہاری اُلجھن دُور ہو جائے۔"

"اوہ...... نواب صاحب!...... آپ فرما رہے ہیں، یہی کافی ہے۔ لیکن میں [illegible]

ہے۔" ایس پی آفتاب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"ہاں کہو۔" نواب جلال الدین بولے۔
"براہ کرم تصدیق کرلیں۔ ممکن ہے، آپ غلط فہمی کے شکار ہوں۔"
"تصدیق۔" نواب صاحب اُچھل کر بولے۔ "ارے میاں! تمہیں اگر ان کی حقیقت معلوم ہو جائے، تو معاف کرنا، اپنی ملازمت کے لئے پریشان ہو جاؤ گے۔"
"خیر..... پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟" ایس پی آفتاب نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔
"تم خود فیصلہ کرلو۔ کیا میں ہوم سیکرٹری سے بات کروں؟"
"مناسب رہے گا، اگر آپ مجھے اوپر سے احکامات دلوا دیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی شخصیت ایسی ہے کہ انہیں گرفتار نہ کرنے پر بھی میں ملازمت سے ہاتھ دھو سکتا ہوں۔" آفتاب نے کہا۔
"آفتاب میاں! میری بات سنو۔ میرے ساتھ آؤ۔" تنویر صاحب نے ایس پی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور آفتاب ایک طرف چلا گیا۔ بہرحال، وہ کمرے میں ہی تھے۔ "میری درخواست ہے، اس وقت واپس چلے جاؤ۔ انہیں گرفتار نہ کرو۔ ممکن ہے، جلال بھائی کو غلط فہمی نہ ہو اور..... اور....."
"کیسی باتیں کرتے ہیں تنویر صاحب! بھلا یہ لفنگے اور....."
"ایس پی..... ایس پی....." نواب جلال الدین دہاڑے۔ "میں کہتا ہوں، اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ۔ اگر تم نے ان کے بارے میں کوئی نازیبا جملہ استعمال کیا تو اچھا نہ ہوگا۔"
"تنویر صاحب!..... براہِ کرم باہر آئیے۔" آفتاب نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ دونوں باہر نکل آئے۔ ناشتے کی میز اب بھیک مانگ رہی تھی۔ بھلا ناشتے کا موڈ کس کا رہا۔ نواب جلال الدین سخت غصے میں تھے۔ سیمیں اور احسان بھی سرخ ہو رہے تھے۔ افشاں، کمال اور دوسرے لوگ بھی پریشان تھے۔
"اور یہ تنویر کو کیا ہو گیا ہے؟..... اچھے برے کی ساری تمیز کھو بیٹھا ہے۔" نواب جلال الدین بولے۔
کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ "اس نے خود ہی پولیس کو بلایا تھا۔ حد ہے..... اب وہ اتنا بڑا کاروباری ہو گیا ہے کہ مہمانوں کو ناشتے کی میز سے گرفتار کراتا ہے۔ اس نے میری توہین کی ہے۔"
"خالو جان! براہ کرم....." افشاں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔
"نہیں افشاں بیٹے!..... تمہارا باپ اب مصلحتوں کا قائل ہو گیا ہے، میں یہاں نہ رُک سکوں گا۔ براہ کرم مجھے مجبور نہ کیا جائے۔" نواب صاحب ہتھے سے اُکھڑ گئے تھے۔
تقریباً دس منٹ کے بعد تنویر صاحب حیران و پریشان کمرے میں داخل ہوئے۔ آفتاب اب اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ طالوت کے چہرے سے بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔
"جلال بھائی! کیا آپ ناشتے کے بعد تھوڑی دیر تک مجھ سے گفتگو پسند کریں گے؟" تنویر صاحب نے کہا۔
"معافی چاہتا ہوں تنویر! میں اب یہاں نہ رُک سکوں گا۔" جلال الدین صاحب نے خشک سے انداز میں کہا۔
"میں شرمندہ ہوں۔ لیکن حالات آپ کے علم میں نہیں ہیں۔"

”ٹھیک ہے۔ وہ حالات تمہارے تھے۔ میری بے عزتی کیوں کرائی گئی؟“

”دراصل آپ کو کچھ نہیں معلوم۔ میں خود بھی بے شمار اُلجھنوں سے گزر رہا ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے، میں تمہاری اُلجھنوں میں اضافے کا باعث بنا۔ بہرحال، میں یہاں آیا ہوں تو کچھ عرصہ ضرور رہوں گا۔ لیکن اس کوٹھی میں نہیں، جہاں پولیس دندانہ گھس آتی ہو۔“

”یہ قصور تو میرا ہے جلال بھائی!“ تنویر صاحب بولے۔

نواب جلال الدین حد سے زیادہ بگڑ گئے تھے۔ سب ہی اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ خاص طور سے افشاں اور بڑی ماں۔ اور خدا خدا کر کے نواب صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ناشتہ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

ازسرِ نو ناشتہ لگایا گیا۔ اور نواب صاحب سے ناشتہ کرنے کی درخواست کی گئی۔

”ہم اجازت چاہیں گے۔“ طالوت نے کھڑے ہو کر کہا اور ایک بار پھر سب چونک پڑے۔ میں اور شکیلہ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

”ارے، ارے..... اب.....“ کمال نے کہا۔

نواب جلال الدین خاموشی سے ہماری شکلیں دیکھ رہے تھے۔

”آپ تنویر صاحب کے مہمان ہیں نواب صاحب!..... اور ہم وہ، جنہیں دھوکے میں رکھ کر تنویر صاحب گرفتار کرانے کے چکر میں تھے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم تینوں اس وقت حوالات میں ہوتے۔ ایسی شکل میں اب ہمارے لئے کیا گنجائش ہے۔ کیا ہم ناشتہ اس لئے کریں کہ آپ نے ہماری حمایت کی ہے؟“ طالوت نے کہا۔

”جواب دو تنویر!“ نواب صاحب بولے۔

”میں تم دونوں سے..... تم سب لوگوں سے معافی چاہتا ہوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ خدا کے لئے ناشتہ کر لو۔ مجھے اُلجھنوں میں نہ ڈالو، میں سخت پریشان ہوں۔“

”خدا کے لئے ٹھیک ہے۔“ طالوت نے کہا اور بیٹھ گیا۔ اور پھر خاموشی سے ناشتہ کیا گیا۔ بڑی عجیب سی کیفیت رہی تھی۔ سیمیں اور احسان ہماری ہی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ درحقیقت اُن کے حلق سے نوالے نہیں اُتر رہے تھے۔

بالآخر ناشتہ ختم ہو گیا اور سب لوگ خاموشی سے اُٹھ گئے۔

”آپ میرے ساتھ آئیں گے، جلال بھائی؟“ تنویر صاحب نے عاجزی سے کہا۔

”صرف میں؟“ جلال الدین نے پوچھا۔

”ہاں..... مجھے آپ سے گفتگو کرنی ہے۔“

”مجھے افسوس ہے، میں شہزادہ عادل اور شہزادہ صائم کی موجودگی کے بغیر کوئی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوں۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”لیکن میں؟“ تنویر صاحب نے پریشانی سے کہا۔

”تنویر!..... تم بات سمجھ نہیں رہے۔ میں کسی ایرے غیرے کے لئے اس قدر جذباتی نہیں ہو سکتا۔ کاش! تم ان لوگوں کو جانتے ہوتے۔ یہ ایک ایسی ریاست کے شہزادے ہیں جو اگر چاہے تو ہمیں اور

تمہیں خرید کر کسی یتیم خانے کو وقف کر دے۔ نہ جانے تم نے انہیں کیا سمجھا ہے اور کیوں ان کی بے عزتی پر آمادہ ہوئے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے سخت ہو گیا ہوں۔ لیکن میرا ان سے لگاؤ اتنا قدرتی ہے کہ...... کہ میں اس کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔"

ناشتے کے کمرے میں موجود سارے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ بی شکیلہ کے چہرے پر بھی عجیب تاثرات تھے۔ بہر حال، وہ اب جان گئی تھیں کہ ہم کسی ریاست کے شہزادے تو کیا، کسی بہت بڑی حکومت کے سربراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ بہر حال دوسروں کی طرح حیران نہیں تھیں۔

"تب آیئے۔ لیکن دوسرے لوگوں کی موجودگی تو ضروری نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن ان کے بغیر میں کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔" نواب جلال الدین نے کہا اور میری طرف دیکھ کر بولے۔ "آیئے شہزادہ عادل!..... آیئے شہزادہ صائم!"

"نواب صاحب قبلہ! اب تک جو کچھ ہوا، وہ آپ کی محبت اور تنویر صاحب کی نفرت پر مبنی تھا۔ ہم کچھ نہیں بولے۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ ایس پی آفتاب ہمیں گرفتار ہی کر لیتے۔ اس سے پہلے بھی تنویر صاحب کے ہاں یہ کوشش ہو چکی ہے۔ اپنی دانست میں ان حضرات نے ہمیں پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟..... نواب صاحب! آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ لیکن میرے خیال میں تنویر صاحب کی بہت سی کوششیں ناکام بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو ان سے گفتگو کر لیں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہم دنیا گردی کرنے نکلے ہیں تو اپنی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔"

"آیئے تو سہی۔ تنویر کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ یہ اتنا برا انسان تو نہیں ہے۔ نہ اتنا کم عمر ہے کہ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت نہ رکھے۔ آپ آیئے تو سہی۔" اور ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ تنویر صاحب کے چہرے سے شرمندگی ٹپک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے سخت اُلجھن مترشح تھی۔ ہم چاروں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ نواب صاحب نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تنویر صاحب تھکے تھکے سے انداز میں سب سے پہلے بیٹھ گئے۔

"جلال بھائی! میں سخت پریشان ہوں۔ اتنا بد باطن بھی نہیں ہوں۔ دراصل میری ذہنی کیفیت اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا۔ براہ کرم ناراضگی ذہن سے نکال کر میری اُلجھنوں کو سن لیں۔"

"ہوں۔" نواب جلال الدین نے گردن ہلائی۔ ہم دونوں بھی ان کے ساتھ ہی صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"تب پھر میں تم سے بنیادی سوالات کروں گا میرے بچو!..... مجھے اجازت دو۔"

"ہاں، ہاں۔ ضرور۔" طالوت نے کہا۔

"آپ لوگوں کی ملاقات کہاں ہوئی؟" جلال الدین نے پوچھا۔

"اس کوٹھی میں۔ یہ دونوں بچے اس لڑکی کے ساتھ جو افشاں کی ہم شکل ہے، ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ بیگم کو مل گئے۔ افشاں کی گمشدگی کی تفصیل میں نے تمہیں لکھی تھی۔ بیگم کی ذہنی کیفیت درست نہ تھی۔ تصدق وغیرہ نے ان لوگوں سے ساتھ آنے کی درخواست کی، تاکہ بیگم کی ذہنی کیفیت کچھ سنبھل جائے اور یہ یہاں آ گئے۔ ان سے پوچھو، ان کے ساتھ میرا برا سلوک نہ تھا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دونوں بڑے خطرناک مجرم ہیں، تب میں اُلجھ گیا۔ اور بہر حال، کچھ بھی ہو، میرا شمار شریف شہریوں میں

ہے۔ میں قانون کا احترام کرتا ہوں۔ یہ قانون کو جُل دے کر نکل بھاگے تھے۔ اور جب یہ دوبارہ میرے ہاتھ آئے تو پولیس کو اطلاع دینا میرا فرض تھا۔"

"لیکن تم نے اُن سے بھی کچھ پوچھا؟"

"کیا پوچھتا؟" تنویر صاحب نے کہا۔

"تنویر میاں!..... کیا تصدق وغیرہ کی درخواست پر تمہاری بیگم کے لئے یہ لوگ تمہاری کوٹھی میں نہ آئے تھے؟..... کیا تمہارے اوپر ان کا یہ احسان نہ تھا؟ کیا یہ تمہارا فرض نہ تھا کہ تم ان سے بھی ان کے بارے میں معلوم کر لیتے۔"

"نہیں نواب صاحب!..... شاید آج ہی ہم سے ہمارے بارے میں معلوم کیا گیا تھا۔ ہم نے تھوڑی بہت تفصیل بتا دی۔ اس کے بعد ہی پولیس کو اطلاع دی گئی تھی۔"

"یہ درست ہے۔ لیکن مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔" تنویر صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے..... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" طالوت بولا۔

"شہزادہ عادل! یہ تنویر کچھ احمق بھی ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں کسی حد تک آپ کے بارے میں بتا دوں۔ میرا خیال ہے، آپ اس کی اس حالتِ غیر پر ترس کھائیں گے۔"

"اوہو..... نہیں۔ تنویر صاحب ہمارے لئے بھی قابلِ احترام ہیں۔" طالوت نے گہری سانس لے کر کہا اور میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ گویا اشارہ کر رہا ہو۔ "ٹھیک ہے، ہونے دو۔"

"تو سنو تنویر!..... یہ دونوں ایک پہاڑی ریاست کے شہزادے ہیں۔ سیر و سیاحت کے شوقین۔ ریاست کا خزانہ اتنا عظیم ہے کہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کی شخصیت میں جو عظمت ہے تنویر! تم اس کا ثانی تلاش نہیں کر سکو گے۔ میرے بارے میں تم جانتے ہو، میں کس قسم کا انسان ہوں۔ لیکن سنو میرے دوست! اگر شہزادہ عادل اور شہزادہ صائم میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لیں تو میں اسے اپنی خوش بختی تصور کروں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میری اولاد، میری بیوی..... میرا رواں رواں ان کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں بتا سکوں گا۔"

تنویر صاحب ششدر نگاہوں سے نواب جلال الدین کی شکل دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ اُنہیں احساس تھا کہ نواب جلال الدین جیسا غیور انسان، جو کسی کی بھی تعریف کرنے میں احتیاط کرتا ہے، جو شاید صرف احسان کرنا جانتا ہے، احسان لینا نہیں۔ اس کے منہ سے لوگوں کے لئے یہ الفاظ کوئی حیثیت ہی رکھتے تھے۔

کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر تنویر صاحب آہستہ سے بولے۔ "لیکن ان لوگوں نے تو اپنے نام عارف اور یوسف بتائے تھے؟"

"ہمیں بھی ان کی اصلیت بہت بعد میں معلوم ہوئی۔ ظاہر ہے، یہ اپنی پبلسٹی کے لئے نہیں نکلے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن پولیس کو کیا ہوا؟"

"جو کچھ بھی ہوا ہو..... پولیس جانے، اس کا کام ہے۔ میں ہوم سیکرٹری سے بات کروں گا۔ میرا دوست ہے۔"

"اور میرے لئے کیا سزا تجویز ہوتی ہے؟" تنویر صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" نواب جلال الدین بولے۔

''مجھ سے بڑی گستاخی ہوئی ہے۔ لیکن لاعلمی میں۔ اس سے قبل شہزادہ عادل کو کوئی شکایت نہ ہوئی ہوگی۔''
''بہرحال، کیا چاہتے ہو؟'' جلال الدین بولے۔
''بس معاف کروا دیجئے۔'' تنویر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا خیال ہے شہزادہ صائم؟''
''چلئے ٹھیک ہے۔ تنویر صاحب کی بھی غلطی نہ تھی۔ لیکن بہرحال، پولیس کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کام آسان نہ ہوگا۔''
''میں ابھی جاتا ہوں...... ہوم سیکرٹری سے ملاقات کروں گا اور اس سلسلے میں ساری تفصیلات طے کر لوں گا۔'' نواب جلال الدین نے کہا۔ اور پھر مسکراتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''بھئی میرا غصہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ تم لوگ بھی اپنی کیفیت سے آگاہ کر دو تاکہ گفتگو کا موضوع بدل دیا جائے۔''
''نہیں نہیں...... تنویر صاحب بہرحال برے انسان نہیں ہیں، اس کا اندازہ ہم پہلے سے کر چکے ہیں۔''
''بہت خوب..... تو اب آپ شہزادگانِ عالی یہ فرمائیں کہ ریس کے گھوڑے آپ کو کہاں لے گئے تھے؟'' نواب جلال الدین نے پوچھا اور ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔
''نہ جانے کہاں کہاں نواب صاحب!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''وہ بچی کون ہے جو افشاں بیٹی کی ہم شکل ہے؟''
''تنویر صاحب خود بھی اس کے بارے میں تصدیق فرما چکے ہیں۔'' میں نے تنویر صاحب کی طرف اشارہ کیا۔
''مجھے اور شرمندہ نہ کریں مسٹر صائم! ویسے آپ لوگوں کی شخصیت آج بھی میرے لئے سخت پُراسرار ہے۔ جلال بھائی کے سامنے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن.....''
''لیکن کیا؟''
''میں عرض کر چکا ہوں نا کہ میں خود پریشان ہوں۔ بلاشبہ مجھے آپ کی شخصیتیں جرائم سے بالاتر نظر آئیں، لیکن پولیس...... نہ جانے اسے اتنی شدید غلط فہمی کیوں ہوئی؟''
''ہاں بھئی۔ بعض اوقات عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں۔ بہرحال تنویر! مجھے ان لوگوں پر خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ تم احسان اور سیمیں یا جلال آباد کے کسی بھی فرد سے پوچھ لو۔ ہر ایک تمہیں ان دونوں کی محبت میں ڈوبا نظر آئے گا۔''
''آپ غلط نہ کہتے ہوں گے۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''بہرحال، اب ان دونوں کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہونے پائے۔''
''نہیں ہوگی۔''
''میرے لئے گاڑی تیار کرا دو۔ ہوم سیکرٹری سے میں خود ملوں گا۔ میرا خیال ہے، گھر پر ہی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ تم مجھے ڈائرکٹری دینا ذرا۔''
''میں ابھی بھجواتا ہوں۔'' تنویر صاحب نے کہا اور اُٹھ گئے۔ پھر وہ باہر نکل گئے اور نواب جلال الدین ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

''مجھ سے کوئی شکایت ہوگئی تھی شہزادہ صائم؟''

''اوہ، نہیں...... کیوں؟'' میں نے کہا۔

''پھر مجھے تڑپتا چھوڑ کر کیوں چلے آئے تھے؟''

''آپ خود غور کریں نواب صاحب!''

''کیا مطلب؟''

''ہم لوگوں کے درمیان محبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اگر ہم باقاعدہ وہاں سے آنے کا اعلان کرتے تو شاید لوگ ہفتوں کے لئے کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ اور بہرحال وہاں سے آنا ضروری تھا۔''

''ہاں۔'' نواب جلال الدین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''اور اب تم پھر مل گئے۔ بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا تھا۔ اب کیا کریں گے؟''

''ہم شرمندہ ہیں نواب صاحب! لیکن بہرحال، آپ کو علم ہو گیا ہے، ہم خود یہاں نہیں آئے۔''

''میرے ساتھ واپس چلو گے؟''

''کہاں؟''

''جلال آباد۔'' نواب صاحب نے جواب دیا۔

''مشکل ہے نواب صاحب! براہ کرم ہماری مجبوریوں کو ذہن میں رکھیں۔'' طالوت نے صاف گوئی سے کہا اور نواب جلال الدین نے گردن جھکا لی۔ پھر کئی منٹ کے بعد آہستہ سے بولے۔

''ہاں، ٹھیک ہی ہے..... لیکن تمہاری ریاست کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ اب تو ابا حضور سے رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ ایک طویل عرصہ کے لئے ان سے اجازت لی گئی ہے۔ ریاست سے وفود آتے رہتے ہیں اور ابو حضور کی طرف سے تحائف لاتے رہتے ہیں۔''

''اس لڑکی سے تعارف نہیں ہوا...... کہاں سے ملی؟ اور اس دوران تم کہاں رہے؟''

''بس آوارہ گردی۔ صائم نے ایک فلم کمپنی قائم کی تھی۔ پھر وہاں سے سرحد کی طرف نکل گئے اور وہاں سے ایک ہندو ریاست درگا پور۔ وہاں یہ مظلوم اور بے سہارا لڑکی ملی۔ یہ اس قدر بے بس تھی کہ ہم نے اسے ساتھ ہی رکھ لیا۔''

''اوہ..... ہاں، تم لوگ بے حد رحم دل ہو۔ تمہارا پاؤں آج بھی میری گردن پر ہے۔'' نواب صاحب نے کہا اور طالوت نے جلدی سے اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر دیکھے۔ اور پھر میرے پاؤں دیکھنے لگا۔ نواب صاحب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''برا نہ محسوس کرو تو ایک بات اور پوچھ لوں؟''

''ضرور، ضرور۔'' طالوت فراخ دلی سے بولا۔

''یہ پولیس کا کیا چکر ہے؟''

''تفصیل تو نہیں معلوم۔ بس ایک مذاق تکلیف دہ بن گیا۔'' طالوت ہی نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''شاید ہم دونوں کا ایک تیسرا ہم شکل بھی ہے، جو کوئی جعلساز تھا اور اس کا نام عارف تھا۔ ہمیں حقیقت نہیں معلوم تھی، اسی لئے کسی نے کہا تو ہم نے خود کو عارف تسلیم کر لیا۔ اور پھر پولیس چکر میں

پڑ گئی۔“

”اوہ......“ نواب صاحب نے گہری سانس لی۔ ”بہر حال، میں ہوم سیکرٹری سے بات کر کے سب ٹھیک کر دوں گا۔“

”نہ بھی کریں نواب صاحب! تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”مقصد یہ کہ کچھ دن جیل کی ہوا کھا لیں گے۔“

”میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔“

”تب پھر ابو حضور کو لکھ دیں گے اور ہماری ریاست سے پورا وفد یہاں پہنچ جائے گا۔ حکومت کو جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔“ طالوت نے جواب دیا۔

”اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟...... میں تمہارا کوئی نہیں ہوں؟“ نواب جلال الدین نے اپنائیت سے کہا۔

”بہتر۔“ طالوت نے گہری سانس لی۔ اور پھر تنویر صاحب کی آواز دروازے سے سنائی دی۔

”اندر آ سکتا ہوں؟“

”ہاں، ہاں......آؤ۔“ نواب صاحب بولے۔

”گاڑی تیار ہو گئی۔“

”اب تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔“ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اطلاع کسی ملازم کے ذریعے بھی پہنچ سکتی تھی۔“

”یہ بات نہیں ہے......اصل میں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ کسی نہ کسی طرح شرمندگی تو کم ہو۔“

”اچھا فضول باتیں مت کرو۔ میں چلتا ہوں صائم میاں!“ نواب صاحب اُٹھتے ہوئے بولے اور ہم سب ساتھ ہی باہر نکل آئے۔ نواب صاحب تنویر صاحب کے ساتھ باہر چلے گئے۔ سامنے ہی پورا گروہ ہماری تاک میں تھا۔ ان میں شکیلہ بھی شامل تھی۔ ہمیں تنہا پا کر ہماری طرف لپکا اور سب ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں کمال، تصدق، افشاں، سیمیں، احسان اور دوسری چند لڑکیاں تھیں۔ سب کے سب حیرت اور شرارت کی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پھر افشاں آگے بڑھی۔

”اور یہ بات ہم سے کیوں چھپائی گئی؟“ افشاں نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ صرف خدا بہتر جانتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔“ تصدق نے کھوپڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

”کیوں......کیا آپ کو خالو جان کی باتوں پر یقین نہیں ہے؟“ افشاں نے تیکھی نگاہوں سے تصدق کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ تصدق نے گہری سانس لے کر کہا۔

”آئیے عادل بھائی، صائم بھائی! کہیں بیٹھ کر گفتگو کریں۔ آپ سے بہت سی شکایات ہیں۔“

”سوری سیمیں باجی! آپ میرے مہمانوں سے شکایات وغیرہ نہیں کر سکتیں۔ اس کے لئے آپ کو تحریری اجازت لینا ہو گی۔“

"کس سے؟" سیمیں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"فی الحال میں اور کمال ہی میزبان ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اجازت نامے تیار نہیں ہیں۔ اس کے لئے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔" سیمیں نے کہا اور پھر شکیلہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ "آیئے شکیلہ! کہیں بیٹھ کر کسی مشروب کا دور چلے۔"
اور پھر پورا گروہ عقبی باغ کی طرف چل پڑا۔ باغ کے ایک خوش نما گوشے کو نشست کے لئے منتخب کیا گیا اور سب بیٹھ گئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے احسان کی طرف دیکھا اور احسان بھی مسکرا دیا۔
"کیسی گزر رہی ہے احسان؟"
"میں الفاظ میں نہ بتا سکوں گا عادل بھیا!"
"اوہ..... کسی مناسب وقت لکھ کر دے دینا۔ معلوم ہوتا ہے، سیمیں بھابی بہت سخت ہیں۔"
"نامنظور..... نامنظور..... یہ بھابی وغیرہ کا چکر نہیں چلے گا۔ مجھے بہن کی حیثیت سے ہی ناز کرنے دیں۔" سیمیں نے جلدی سے کہا اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ارے سیمیں! اپنی بوا کا کیا حال ہے؟"
"ٹھیک ہیں۔" سیمیں ہنس پڑی۔ "یقین کریں، نماز پڑھ پڑھ کر آپ کے لئے دعا کرتی تھیں اور ابو جان تو ہفتوں پاگلوں کی طرح ویرانوں کی خاک چھانتے پھرے ہیں۔"
"کیوں؟"
"اُن کا خیال تھا کہ خدانخواستہ گھوڑوں نے آپ کو نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔"
"اوہ....." طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اور ہاں سیمیں!.....وہ اپنے شمشیر الدولہ.....ان کی خیریت بھی معلوم ہو سکی؟"
"شادی ہوگئی ہے اُن کی۔"
"ارے!" طالوت اُچھل پڑا۔ "واقعی؟"
"ہاں.....اور سنا ہے، اپنی ریاست میں بھی نہیں ہیں۔"
"واپس چلے گئے؟"
"نہیں.....واپس کہاں جاتے؟ کوئی کاروبار کر لیا ہے۔" سیمیں نے جواب دیا۔
"بہت خوب۔ گویا کام کا آدمی بن گیا ہے وہ بھی۔ لیکن وہ بے چاری کون ہوگی، جس سے اس نے شادی کی ہے۔ کیا تم لوگ اس شادی میں شریک نہیں ہوئے؟"
"بلایا تھا ہمیں بھی۔ لیکن ابو حضور نے جانا پسند نہیں کیا۔"
"بہت خوب۔" طالوت پُرخیال انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔ "بہرحال عمدہ بات ہے۔"
"اب آپ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے؟"
"ارے ہم کیا بتائیں؟ افشاں کے دیس میں مظالم کا شکار ہوتے رہے ہیں بس۔ غور کرو، اتنی بڑی حویلی میں کتنی گنجائش ہے۔ لیکن ہم نے کباڑ خانے میں چھ روز گزارے ہیں۔"
"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لئے میں شرمندہ بھی نہیں ہوں۔" افشاں نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ہاں واقعی...... یہ تو درست ہے۔ سارا چکر تصدق کا چلایا ہوا ہے۔''
''مجھے اس کی بھرپور سزا مل چکی ہے۔'' تصدق جلدی سے بولا۔
''کیا مطلب؟''
''افسوس! مطلب نہیں بتایا جا سکتا۔ ارے ہاں، افشاں بی بی! وہ مشروب کی کیا رہی؟'' تصدق شاید بات بدلنے کے لئے بولا۔
''ہاں..... سب لوگوں سے معلوم کیا جائے، کیا پسند کریں گے۔''
''میں تو کافی کے حق میں ہوں۔'' سیمیں بولی۔
''لطف دے جائے گی۔''
''اور بقیہ لوگ؟''
''کافی..... کافی.....'' کئی آوازیں اُبھریں۔
''آپ لوگ کیوں خاموش ہیں؟'' افشاں نے ہماری طرف دیکھا۔
''وہ ڈر رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''کیوں؟'' افشاں حیرت سے بولی۔
''وہ..... ہوٹل والی کافی یاد آ گئی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور افشاں بے اختیار مسکرا پڑی۔
''دیکھئے اب مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔''
''اوہو..... اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ کافی ہی خراب ہوگی۔ کیوں عادل بھائی!''
''ہاں، ہاں۔ ہو سکتا ہے۔''
''لیکن یہ آپ لوگوں نے نام کیوں بدل ڈالے تھے؟ اتنے خوب صورت نام ہیں اور آپ نے.....'' کمال بولا۔
''ہم لوگ تو نہ جانے کیا کیا کرتے رہتے ہیں۔ جانے دو۔'' طالوت نے گہری سانس لے کر کہا۔ تصدق کافی کے لئے کہنے چلا گیا اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ ہم سے ہماری ریاست کے بارے میں معلومات حاصل کی جانے لگیں۔ اور ظاہر ہے، اناپ شناپ بکنے کے علاوہ ہم کیا کر سکتے تھے؟ طالوت اس میں پیش پیش تھا۔
تصدق کافی لے کر ہی آیا تھا۔ کافی کا دور چلا۔ سیمیں اور احسان بے حد خوش تھے۔ جلال آباد کی باتیں ہونے لگیں اور سننے والے دنگ رہ گئے۔ یوں دوپہر ہو گئی اور پھر لنچ کے طلبی ہو گئی۔ کھانے کی میز پر نواب جلال الدین اور تنویر صاحب موجود نہیں تھے۔
نہ جانے یہ لوگ کس اُلجھن میں پھنس گئے تھے۔ لنچ پر قہقہے جاری رہے اور پھر آرام کی ٹھہری۔ ہمارے لئے تو کباڑ گودام اور خوب صورت بیڈروم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ شکیلہ ہمارے ساتھ نہ تھی۔ طالوت نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''ہاں بھئی...... اب کیا پروگرام ہے؟''
''پروگرام۔'' میں ہنس پڑا۔
''کیوں..... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''یار! کتنے پروگرام بنتے ہیں اور کتنوں پر عمل ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں اپنی مرضی سے کوئی پروگرام بنانا ہی نہیں چاہئے۔''

''ایسی بات تو نہیں ہے۔ بولو، کیا چاہتے ہو؟''

''میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''افشاں کو بھی نہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے......افشاں، افشاں......'' طالوت شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''بکواس کے موڈ میں ہو۔'' میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

''ہرگز نہیں۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں یار!..... یقین کر، میں نے اُس کی آنکھوں میں میرے لئے پسندیدگی کے جذبات پائے ہیں۔''

''طالوت!'' میں نے اُسے سرزنش کی۔

''تو اس میں ہرج ہی کیا ہے مولانا!.....اب زیادہ اداکاری مت کرو۔ آخر برائی کیا ہے اس میں۔''

''میں نے اس انداز میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے طالوت!''

''کیوں؟..... کسی پہاڑ پر بس جانے کا ارادہ ہے کیا؟''

''نہیں...... یہ بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''بس ایسے ہی۔ اور پھر یہ افشاں تمہارے ذہن میں کیوں گھس آئی ہے؟''

''میرے ذہن میں نہیں آئی۔ بلکہ میں اسے تمہارے ذہن میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''نہیں طالوت! میری زندگی اب ان ہنگاموں کی تابع نہیں رہی۔''

''کیوں..... بڑھاپا محسوس کر رہے ہو؟''

''ہاں۔ ذہنی طور پر بوڑھا ہو گیا ہوں۔''

''بکواس۔'' طالوت نے ہونٹ سکوڑے۔ ''اگر تم نے بوڑھا ہونے کی کوشش کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ میرے خیال میں تو زندگی صرف جوانی کا نام ہے۔ جب انسان کے ذہن میں بڑھاپے کا تصور آ جائے تو اسے خودکشی کر لینی چاہئے۔''

''اچھا اب تم فضول باتیں مت کرو۔''

''نہیں یار!..... فضول باتیں نہیں۔ یہ میری خواہش ہے۔''

''یعنی...... کیا خواہش ہے آپ کی؟''

''دیکھو، ہم اور تم ہم شکل ہیں۔ افشاں اور شکیلہ بھی...... اور تمہیں پتہ ہے شکیلہ..... میرا مطلب ہے کہ...... چنانچہ اب افشاں کو بھی ہم سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔''

''بندۂ خدا! ابھی چند گھنٹوں قبل پولیس کے چکر سے بچے ہو۔ نیکی کام آ گئی کہ نواب جلال الدین یہاں موجود تھے، ورنہ پھر اُلجھنوں میں پھنسنا پڑتا۔ اور پھر ابھی تنویر صاحب کا ذہن بھی ہماری طرف سے صاف نہیں ہے۔ پھر یہ افشاں کہاں سے درمیان میں آ کودی؟..... میرے خیال میں تمہاری یہ سوچ

فضول ہے۔ اور اب ہمیں یہاں زیادہ عرصہ تک رہنا بھی نہیں چاہئے۔"
"کیوں، کیا تکلیف ہے آپ کو یہاں پر؟"
"معلوم ہوتا ہے، تمہارا دل خوب لگ گیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"صرف شکیلہ سے۔" طالوت جلدی سے بولا۔
"وہ تو جہاں ہم ہوں گے، ہمارے ساتھ ہوگی۔"
"بالکل ٹھیک۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ تنہا ہمارے ساتھ نہ ہو۔ افشاں بھی ہوگی تو لطف دوبالا ہو جائے گا۔ ورنہ تمہاری سرد آہیں خوامخواہ موسم خراب کرتی رہیں گی۔"
"وعدہ کرتا ہوں، آہیں نہیں بھروں گا۔"
"میں یہ وعدہ نہیں مانتا۔ بلکہ وعدہ کرو، اگر افشاں کی طرف سے کچھ اظہار ہو تو اسے نظرانداز نہیں کرو گے۔"
"وعدہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہی نظر آتا ہے۔"
"یہ تم براہ راست میری توہین کر رہے ہو؟"
"تمہاری کیوں؟"
"اس لئے کہ میری شکل تم سے الگ نہیں ہے۔"
"سنجیدگی سے سوچو طالوت! واقعی اب کچھ ہونا ہی چاہئے۔ یہاں زیادہ دل نہیں لگ رہا۔"
"افشاں..... افشاں..... افشاں..... کہے دیتا ہوں، ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"
"اور اگر پولیس سے بات نہیں بن سکی؟"
"عارف!" طالوت نے آنکھیں نکالیں۔
"کیا فائدہ ان ہنگاموں سے۔"
"تم واقعی بوڑھے ہو گئے۔ میرا خیال ہے، میں تمہاری گردن دبا کر تمہیں سارے جھگڑوں سے نجات دلا دوں۔"
"مجھے انکار نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ اسی وقت کسی ملازم نے دروازے پر دستک دی۔
"کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔" اور ایک ملازم اندر آ گیا۔
"صاحب نے بھیجا ہے۔ کہا ہے، دیکھ آؤں آپ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔" ملازم احمقانہ انداز میں بولا۔
"سو رہے تھے ہم لوگ۔ تم نے دروازہ کیوں بجایا؟"
"نہ بجاتا تو دیکھتا کیسے جناب؟"
"خیر اب دیکھ لیا؟" میں نے مداخلت کی۔
"جی....." ملازم نے احمقانہ انداز میں گردن ہلا دی اور واپس دروازے کی طرف مڑ گیا۔
"سنو!" میں نے ملازم کو آواز دی۔ ملازم رک گیا۔ "کیا نواب جلال الدین واپس آ گئے؟"
"ہاں، صاحب ابھی ابھی آئے ہیں۔"
"اوہو..... اچھا..... ہمیں بلایا تو نہیں ہے؟"

''نہیں صاحب! بس یہی کہا تھا۔'' ملازم نے جواب دیا۔
''اچھا ٹھیک ہے، جاؤ۔'' میں نے کہا اور ملازم واپس چلا گیا۔ ''طالوت! آؤ، نواب جلال الدین سے مل لیں۔ دیکھیں، کیا کر کے آئے ہیں۔''
''چلو۔'' طالوت نے ایک گہری سانس لی اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نواب جلال الدین کے سامنے تھے۔ تنویر صاحب بھی ان کے پاس ہی موجود تھے۔ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔
''ارے میں خود تم دونوں کے پاس آ رہا تھا۔ بے وقوف ملازم نے کیا کہہ دیا۔''
''کوئی بات نہیں، آپ بزرگ ہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''میں نے ہوم سیکرٹری سے بات کر لی ہے۔ بڑا گہرا سلسلہ ہے۔ مجھے انہوں نے اس کیس کا فائل بھی دکھایا تھا، تصویر بھی لگی ہوئی تھی اس میں۔ حیرت انگیز بات ہے شہزادہ صائم! اس کمبخت کی شکل تم دونوں اس قدر ملتی ہے کہ دو شخصیتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یوں سمجھ لو کہ جیسے عادل اور تم۔ اور وہاں بھی دو ہی کردار ملتے ہیں۔ ایک کا نام عارف ہے، دوسرا گمنام۔ دونوں نے مل کر ایسی خوف ناک وارداتیں کی ہیں کہ پولیس پریشان ہو کر رہ گئی۔ اغوا، قتل و غارت گری، پولیس کو دھوکا دہی اور ایسے بہت سے دوسرے جرائم، جن کی وجہ سے پولیس ان کی سخت دشمن ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں احکامات صادر کئے گئے کہ انہیں جہاں بھی دیکھا جائے، گولی مار دی جائے۔ بھئی مجھے تو شدید حیرت ہے۔ ہم شکلوں کا ایسا عجیب چکر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تم اور عادل سب کے سب عجوبہ بن گئے تھے۔ ہم تمہیں دیکھ کر ہی حیران تھے کہ یہ افشاں اور شکیلہ کا مسئلہ نکل آیا۔ اور اب دو اور دو چار یعنی صائم، عادل اور وہ دونوں بدمعاش۔ کیا اتنے سارے ہم شکلوں کو اکٹھا کر دو تو گھن چکر نہیں بن جاؤ گے؟..... ہوم سیکرٹری نے مجھے تصویریں دکھائیں اور کہا کہ میں فرق تلاش کروں۔ ایمان کی بات ہے کہ میں کوئی فرق نہ نکال سکا۔ بڑی پریشانی رہی۔ بالآخر ایک بات پر فیصلہ ہو گیا۔'' نواب جلال الدین نے گردن ہلائی۔
''کس بات پر؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔
''پولیس کے ریکارڈ میں عارف کے فنگر پرنٹ اور ہتھیلیوں کے نشانات موجود تھے۔ ہوم سیکرٹری نے درخواست کی ہے کہ تمہارے ہاتھوں کے نشانات ان کے پاس بھجوا دیئے جائیں۔ میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کو اس پر تیار کر لوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہوم سیکرٹری سے کہا کہ وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے کسی اعلیٰ آفیسر کو سادہ لباس میں تنویر کی کوٹھی پر بھیج دیں، تاکہ وہ اپنے فنگر پرنٹ لے لے۔ چنانچہ ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ اور ڈی آئی جی پولیس ابھی یہاں آئیں گے اور آپ کے فنگر پرنٹس لے لیں گے۔ شہزادہ صائم اور عادل! میری اس جسارت پر آپ برہم تو نہ ہوں گے؟''
میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں طالوت کی طرف دیکھا۔
''نہیں، نہیں۔ بہرحال، اس جھنجھٹ سے نکلنے کے لئے ہمیں تعاون کرنا ہی ہوگا۔'' طالوت نے جلدی سے جواب دیا اور میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
''بہرحال عجیب معاملات ہیں۔ میرا خیال ہے، ہم شکلوں کا اتنا بڑا ہنگامہ پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ اور مجھے اس سلسلے میں جتنا شرمندہ ہونا پڑا ہے، میں ہی جانتا ہوں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''نہیں، نہیں.....اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟'' طالوت جلدی سے بولا۔
''شہزادہ عادل! جلال بھائی نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال، یہاں آپ کے ساتھ جو گستاخیاں ہوئی ہیں، میرے پاس ان کا ازالہ کرنے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے، سوائے معافی کے۔''
''بس، اب آپ شرمندہ نہ کریں تنویر صاحب! جو بات تھی، ختم ہو گئی۔'' طالوت نے کہا اور تنویر صاحب ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔
''وہ لوگ کس وقت آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔
''شام کی چائے پر۔ بالکل دوستانہ انداز ہو گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' طالوت لاپروائی سے بولا۔
''کھانا کھا لیا آپ لوگوں نے؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔
''ہاں، آرام کر رہے تھے۔ اجازت؟''
''بہت بہت شکریہ.....اب شام کی چائے پر ملاقات ہو گی۔ آپ آرام کریں۔'' نواب جلال الدین نے کہا اور ہم دونوں واپس نکل آئے۔
''میں جانتا ہوں، فنگر پرنٹ کے معاملے میں بھی تم کوئی چکر چلا لو گے۔ لیکن اب یہاں رُکنے سے فائدہ؟''
''یار! کیوں بور کر رہے ہو؟ دل لگ رہا ہے اور کیا؟ اگر زیادہ ہی بور ہو رہے ہو تو پھر چلو۔''
''تمہارا دل بالکل نہیں چاہ رہا؟''
''ہاں میں تو یہاں کچھ روز رہنا چاہتا تھا۔'' طالوت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
''تب ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' میں بستر پر گر گیا۔ طالوت بھی جوتے اُتار کر مسہری پر لیٹ گیا تھا۔ کئی منٹ تک ہم دونوں خاموش رہے، پھر طالوت نے شرارت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''تم نے شکیلہ کے بارے میں مجھے ہدایات دی تھیں اور میں نے تسلیم کر لی تھیں۔ یوں سمجھ لو، تمہاری ہدایت پر میں نے اس سے عشق کیا۔ اور اب تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔''
''کون سی بات؟''
''افشاں۔''
''نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم پر تو ایسی عشق و عاشقی سوار نہ تھی۔ ارے بھائی! کام کے آدمی رہو۔ کیا رکھا ہے شکیلہ اور افشاں میں۔''
''یار عارف! اب تو مشکل ہے۔''
''کیا مشکل ہے؟''
''اب تو ہو گیا۔''
''عشق نا؟''
''بالکل۔''
''چلو، خدا تم پر رحم کرے۔ لیکن مجھے کیوں مریض بنائے دے رہے ہو؟''

''یہ ممکن ہے کہ طالوت کسی مرض میں مبتلا ہو۔ اور عارف اس مرض سے دُور رہے۔'' طالوت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''خدا کی پناہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''چنانچہ مسٹر عارف! آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ شام کی چائے پر آپ افشاں سے نظر بازی شروع کر دیں گے اور پھر رات کے کھانے پر آپ اس کی کرسی کے بالکل سامنے ہو جائیں گے۔ آپ کی آنکھوں میں ایک تجربہ کار عاشق کی طرح محبت کے جذبات ہوں گے۔ کم از کم اس حد تک کہ افشاں انہیں محسوس کر لے۔ گویا آج ہی آپ اپنا کام شروع کر دیں گے اور اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر آپ دونوں کو مکمل طور سے ایک دوسرے پر عاشق ہو جانا ہوگا۔'' طالوت کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔

''کیا یہی احکامات آپ افشاں پر بھی صادر کر سکتے ہیں؟''

''دیکھو، یہ بات مت کرو۔ کیوں اس بے چاری کو بدنام کرانے کی فکر میں ہو؟ ورنہ ابھی پانچ منٹ کے اندر اندر وہ پوری کوٹھی میں ہائے صائم، وائے صائم چلاتی پھرے گی۔''

''ارے نہیں، نہیں۔ ایسا مت کرنا۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ سچی بات یہ ہے کہ طالوت جیسے بدمعاش کے لئے یہ کام مشکل نہ تھا۔

''ویری گڈ..... گویا ثابت ہوا کہ تمہارے دل میں بھی اس کے لئے کچھ ہے۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں ہے۔''

''کیا ہے؟'' طالوت دلچسپی سے بولا۔

''انسانی ہمدردی۔''

''دھت تیرے کی۔ خیر بیٹے! بہر حال تمہیں اڑتالیس گھنٹے کا وقت دیا گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کے تحت ہی سہی، عشق شروع کر دو۔''

مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ عجیب احمق آدمی ہے یہ بھی۔ طالوت کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد کافی دیر تک اس نے بات نہ کی۔ تیز سانسوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ سو گیا ہے۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی اور خیالات کی ریل چھک چھک کرتی چل پڑی۔

ماضی..... زرینہ..... نرگس رحمانی..... تشکیھر کی فراہم کردہ بے شمار لڑکیاں، بھینگی انجیلا۔ طالوت کی دنیا میں ملنے والی حسینہ سیمی اور نہ جانے کون کون۔

لیکن عشق کا تصور تو کب کا ذہن سے زائل ہو چکا تھا۔ شاید زرینہ کے بعد ہی۔ اب کوئی لڑکی دل کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن طالوت کی ضد عجیب تھی۔ خود بھی پھنسا تھا اور مجھے بھی پھنسانے کے درپے تھا۔ اور اس بار ایسا نظر آ رہا تھا، جیسے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ کیا کرنا چاہئے؟..... افشاں لڑکی تو اچھی ہے، لیکن ضروری ہے کہ وہ بھی مجھ سے عشق کرے؟ اور پھر اتنے اعلیٰ گھرانے کی لڑکی۔ طالوت نے مجھے کچھ بھی بنا دیا ہو، لیکن بہر حال تھا میں حشمت برادرز کا ایک کلرک ہی۔ طالوت کی حماقت کے جواب میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ طالوت کے احکامات کی پابندی کرنے آیا تھا، اسی میں میری بہتری تھی۔ لیکن انوکھا حکم..... افشاں میری آنکھوں میں اُبھر آئی۔ لیکن یہ حکم

سوئم

ناگوار تو نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ افشاں حسین ہے..... کیا حرج ہے؟..... اگر..... اگر..... اور میری آنکھوں میں تاریکیاں گہری ہوتی گئیں۔ مجھے نیند آ گئی تھی۔

پھر شام کو پانچ بجے طالوت نے ہی جگایا۔ وہ شاید غسل کر کے نکلا تھا۔

"دن کے خواب اچھے نہیں ہوتے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس اب اٹھ جاؤ۔ افشاں صاحبہ ابھی چند منٹ کے بعد ناشتے کی میز پر نظر آئیں گی۔" میں مسکرانے لگا۔ "تم تو کالج کے نوجوان لڑکوں کی طرح عشق کے ابتدائی طالب علموں کی سی حرکتیں کر رہے ہو۔"

"اور تمہیں بکواس کرنے کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا اور پھر اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"جی نہیں..... ابھی آپ سوتے میں افشاں سے گفتگو فرما رہے تھے اور خاصی رومانی گفتگو تھی۔"

"یار طالوت! تمہارے اوپر تو واقعی مجھے حیرت ہونے لگی ہے۔ اچانک تمہاری شخصیت ہی بدل گئی۔ تمہارے ذہن پر تو صرف رومان ہی رومان سوار نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا، بلکہ اعتراف کر چکا ہوں۔" طالوت نے جواب دیا اور میں گردن جھٹک کر باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ یہ لڑکے لڑکیاں تو جیسے ہر وقت ہی ہماری تاک میں رہتے تھے۔ سامنے ہی موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سب ہمارے قریب پہنچ گئے۔

"کیا آپ نے ہمارے قدموں کی آہٹ سن لی تھی؟" کمال نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ البتہ دل کی آہٹ سن لی تھی۔" طالوت نے افشاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اوہو..... یہ آواز کسی ایک دل کی تھی؟" شکیلہ جلدی سے بولی۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نے سنی تھی؟" شکیلہ شرارت سے بولی۔

"نہیں۔ مجھے عادل نے بتایا تھا۔"

"یہ آواز کس کے دل کی تھی؟"

"خاتون شکیلہ کے دل کی۔" میں نے برجستہ کہا۔ دوسرے لوگوں نے قہقہہ لگایا اور شکیلہ کسی قدر جھینپ گئی۔

"بھئی باقی گفتگو چائے کی میز پر۔" افشاں نے میزبان کی حیثیت سے کہا۔

"اونہہ..... چائے کی میز تو اس وقت تک قید خانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔" ایک لڑکی بولی۔

"کیوں؟"

"انکل تنویر کے کچھ مہمان چائے پر مدعو ہیں۔"

"آ چکے ہیں؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔

"ہاں، تین چار افراد ہیں۔ لیکن کوئی ہرج نہیں ہے۔ ہم جلد ہی چائے کی میز سے اٹھ جائیں گے۔" افشاں نے جواب دیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا اور پھر ان لوگوں سے چند لمحات کی معذرت طلب کی اور طالوت کا بازو پکڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔

''حضرت! چائے کی میز پر رومان کی ابتدا کینسل۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ مہمان کون ہیں؟''
''وہی لوگ۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''یار طالوت! ہاتھوں کے نشانات کا کیا کرو گے؟''
''کیا چاہتے ہو؟''
''میرے فنگر پرنٹ پولیس ہیڈ آفس میں موجود تھے۔'' میں نے جواب دیا۔
''فکر مت کرو، جس کاغذ پر وہ تمہارے ہاتھ کا نشان لیں گے، اس پر گدھے کے کھر کی تصویر آئے گی۔'' طالوت نے بے فکری سے کہا۔
''نہیں یار!..... ایسی کوئی حرکت بھی نقصان دہ ہو گی۔ میرا خیال ہے، کوئی سیدھی سادی بات ہو جائے تاکہ میری جان بچے۔''
''ٹھیک ہے۔ ان کے فرشتے بھی تمہارے ہاتھ کے موجودہ نشانات کو پہلے نشانوں سے نہ ملا سکیں گے۔''
''یہی مناسب ہے۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ویسے میں کسی حد تک مسرور تھا۔ اس معاملے کے بعد میری شخصیت بدل رہی تھی اور اپنے ہی وطن میں اب میری حیثیت ایک مجرم کی نہ رہے گی۔ بہرحال یہ مسرت کی بات تھی۔

ہم واپس دوسرے لوگوں میں پہنچ گئے اور سب ناشتے کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ ناشتے کے کمرے میں جلال الدین، تنویر صاحب اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ سب لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد چائے کا پُرتکلف دور شروع ہو گیا۔ نئے آنے والوں کی نگاہیں گہرے انداز میں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور میں نے اور طالوت نے ایک پولیس افسر کو صاف پہچان لیا تھا۔ ان حضرت کو ہم نے ایک دن پولیس ہیڈ آفس میں کافی پریشان کیا تھا۔

بہرحال ہم سنجیدہ شکلیں بنائے رہے اور چائے کے دوران غیر فطری سی خاموشی طاری رہی۔ بالآخر چائے کا دور ختم ہو گیا اور نواب جلال الدین نے کہا۔
''عادل میاں اور صائم میاں! یہ حضرات آپ سے کچھ خصوصی گفتگو کرنے کے خواہش مند ہیں۔ میرا خیال ہے، ہم ڈرائنگ روم میں چلیں۔''
''جیسا آپ پسند کریں۔'' میں نے جواب دیا۔
''آپ لوگوں سے معذرت۔'' نواب صاحب نے بچوں کی طرف دیکھا اور پھر تنویر صاحب اور نووارد حضرات ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ پولیس آفیسر، نواب صاحب کے احترام میں خاموش تھے، ورنہ میں نے ان کی نگاہوں میں کینہ توزی صاف دیکھی تھی۔ اور پھر وہ حضرت بول ہی اُٹھے، جنہیں ہم نے پولیس ہیڈ آفس میں پریشان کیا تھا۔
''کیا آپ مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں گے مسٹر؟'' ان کے انداز میں طنز تھا، جسے نواب صاحب برداشت نہیں کر سکے۔
''براہِ کرم، آپ صرف وہ کریں جس کی آپ کو ہدایت کی گئی ہے۔'' انہوں نے پولیس افسر کو ٹوک دیا۔
''میں نے پوری زندگی پولیس کے محکمے میں گزاری ہے جناب! میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔

میں ان دونوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔
''تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' نواب جلال الدین ہونٹ بھینچ کر بولے۔
''کچھ نہیں۔ میں صرف آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں، آپ کوئی بڑا نقصان نہ اُٹھا جائیں۔''
''میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ میرے بارے میں فکرمند ہونے کے بجائے صرف اپنا کام کریں۔'' نواب صاحب نے کہا اور پولیس آفیسر تلملا کر خاموش ہو گیا۔
''بہرحال ہمارے ہاتھوں کے اور اُنگلیوں کے نشانات لے لئے گئے۔ میرے دل میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی، لیکن طالوت لاپروا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد مجسٹریٹ اور پولیس آفیسرز چلے گئے۔
نواب صاحب نے گہری سانس لی تھی۔ چند منٹ خاموشی رہی، پھر نواب صاحب بولے۔ ''دراصل قصور ان کا بھی نہیں ہے۔''
''جی......؟'' تنویر صاحب نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''ہاں بھئی یہ روایتی مشابہت ہے۔ تصویر دیکھ کر میں خود دنگ رہ گیا تھا۔''
''بہرحال اب بات صاف ہو جائے گی۔''
''ہاں، چھوڑو۔ اس تذکرے پر ہی لعنت بھیجو۔ ویسے تنویر! اب تم نرے کاروباری بن کر رہ گئے ہو۔'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں نہیں سمجھا بھائی صاحب؟'' تنویر صاحب شریف انسان تھے، سادگی سے بولے۔
''نہ سیر، نہ شکار۔ بچے ہیں، ان کے لئے کوئی بھی پروگرام نہیں بنایا تم نے۔''
''تنہا کیا بناتا؟ آپ تشریف لائے ہیں، ہمارے دن بھی اچھے گزر جائیں گے۔ اور پروگرام آپ سے اچھے کون بنا سکتا ہے۔ آپ بھی ان علاقوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔''
''ہاں بھئی، کچھ سوچو۔ صائم اور عادل میاں کی موجودگی ان پروگراموں میں چار چاند لگا دے گی۔ تم یقین کرو، جلال آباد میں انہوں نے جو دن گزارے، وہ ایک یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ ویسے عادل میاں! آپ نے وہ گھوڑے کہاں چھوڑے؟''
''ریاست واپس بھجوا دیئے تھے۔'' طالوت اب جھوٹ بولنے میں ماہر ہو گیا تھا۔
''اوہو......تو عادل صاحب اور صائم صاحب کو بھی ریس کا شوق ہے؟'' تنویر صاحب دلچسپی سے بولے۔
''تم صرف شوق کی بات کرتے ہو، ان کے گھوڑوں کا ثانی ہی مشکل سے ملے گا۔'' نواب جلال الدین فخر سے بولے۔
''کمال ہے۔''
''ابھی تم نے ان کے کمال دیکھے کہاں ہیں۔ تم تو بس انہیں مجرم بنانے پر تُل گئے تھے۔''
''براہِ کرم بھائی صاحب! یہ کہہ کر میرا دل نہ دُکھایئے۔ میں اتنا برا انسان نہیں ہوں۔ بس حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ آپ اندازہ لگایئے۔''
''خیر، اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ ہاں، تمہارے گھوڑوں کی کیا کیفیت ہے؟''
''افشاں کی گمشدگی نے سارے شوق ختم کر دیئے تھے۔ گھوڑے اصطبل میں موجود ہیں، لیکن عرصے

سے نہیں دوڑے ہیں۔ اب تو دوڑنا بھی بھول گئے ہوں گے۔"

"اوہ..... عمدہ گھوڑے تھے، ناکارہ کردیئے تم نے۔ میرے پاس ہی بھیج دیتے۔"

"بس مجبوریاں۔"

"ہاں..... بعض باتیں اپنے بس سے باہر ہوتی ہیں۔ یہاں ریس وغیرہ کی کیا کیفیت ہے؟"

"باقاعدہ، سالانہ ریس بھی ہونے ہی والی ہے۔"

"اوہو..... وہ تو کافی بڑی ریس ہوتی ہے؟"

"ہاں!"

"کب ہوگی؟..... معلوم کرو۔"

"بہتر۔"

"بہرحال، ایک آدھ دن میں سیر وتفریح کا کوئی پروگرام بنائیں گے۔ اب تو تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا؟"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ سارے معاملات ہموار ہو گئے۔" تنویر صاحب ہمیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آؤ پھر اُٹھیں۔ اور ہاں، ملازموں کو ہدایت کرو کہ ان کے ہاتھ صاف کرادیں۔"

"نہیں۔ ہم خود صاف کرلیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے اجازت دیں۔" میں نے کہا اور پھر میں طالوت کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔

۞

تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے کمرے میں تھے۔ سب سے پہلے ہم نے ہاتھ صاف کئے اور پھر میں تولیے سے ہاتھ خشک کرتا ہوا طالوت کے سامنے آ بیٹھا۔

''جی حضور!.....اب کیا حکم ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی پہلے حکم کی تعمیل کہاں ہوئی ہے؟'' طالوت نے سنجیدہ شکل بناتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کوئی دفترِ عشق کھول رکھا ہے؟''

''یونہی سمجھ لو۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''یار! میری مانو تو بس چلو یہاں سے۔ اب دل نہیں لگ رہا۔''

''دل کی بات کیوں کرتے ہو یار!..... سچی بات کہو۔ دل تو خوب لگ رہا ہے، مگر اس کے ساتھ ڈر بھی لگ رہا ہے۔''

''ڈر کس بات کا؟''

''پولیس کا.....اور کس کا؟''

''چلو یونہی سمجھ لو۔ یہ بے عزتی اچھی لگ رہی ہے۔ ویسے ہاتھوں کی لکیروں کا تم نے کیا کیا؟''

''سب بدل دی ہیں۔''

''ہمارے یہاں کے فنگر پرنٹس ایکسپرٹ بے حد ذہین ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اور میں تو جیسے گدھا ہوں..... کیوں؟'' طالوت آنکھیں نکال کر بولا۔

''یہ بات نہیں۔''

''بس پھر کوئی بات نہیں ہے۔ فضول باتوں سے پرہیز کرو۔'' طالوت ہاتھ اُٹھا کر بولا اور مجھے ہنسی آ گئی۔''

''دانت نکالنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں عشق کرنا ہوگا۔'' طالوت نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

''اب میں کیا جواب دوں؟...... بہرحال کوشش کروں گا۔ لیکن اس کا نتیجہ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نتیجہ جب نکلے گا، تب سمجھ میں آئے گا۔ ابھی سے کیسے آ جائے گا؟''

''لیکن تمہیں آخر اس سے کیا دلچسپی ہے طالوت؟''

''دیکھو عارف!..... طالوت عشق کرے گا تو تم بھی کرو گے۔ طالوت شادی کرے گا تو تم بھی شادی کرو گے۔ بس اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

''اچھی زبردستی ہے۔''
''بس اب زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہاری پارسائی سے واقف ہوں۔ اب وہ ایسی بری بھی نہیں ہے۔''
''پارسا تو میں نے خود کو کبھی نہیں کہا طالوت!''
''سنجیدہ ہونے کی کوشش مت کرو۔ جاؤ، لگن سے کام کرو۔ کامیابی ہوگی۔''
''بہت بہتر پیر و مرشد!''
''یہ شکیلہ کہاں ہے؟ بہت غیر حاضر رہنے لگی ہے۔''
''بلا کر لاؤں؟'' میں نے کہا۔
''نہیں، خود آجائے گی۔ میرا جذبۂ عشق دیکھنا چاہتے ہو؟'' طالوت بولا۔
''ضرور دکھاؤ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''راج ہنس.... میں انتظار کر رہا ہوں۔'' طالوت چھت کی طرف منہ اُٹھا کر بولا اور میں مسکرانے لگا۔
''خوب.... تو گویا آپ اسے پیار سے راج ہنس کہتے ہیں۔''
''اچھا نام ہے۔ مجھے پسند ہے۔'' طالوت نے کہا اور اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر شکیلہ کی آواز سنائی دی۔
''میں اندر آسکتی ہوں؟''
''تشریف لائیے۔'' طالوت نے جواب دیا اور شکیلہ مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔
''میں باہر جا سکتا ہوں؟'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
''ارے، ارے خیریت؟.... یعنی میرے آتے ہی؟'' شکیلہ نے کہا۔
''جی، یہی مناسب بھی ہے۔ کیونکہ آج کل آپ نے ہمارے قریب رہنا چھوڑ دیا ہے۔'' میرے بجائے طالوت نے جواب دیا۔
''لیکن آپ لوگ تو ان کے ساتھ تھے، اس لئے۔ اور پھر یہ افشاں کی بچی، جونک بن گئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے نہیں چھوڑتی۔ اس نے میری شکل سے اپنی سہیلیوں کو دھوکا دینے کے درجنوں منصوبے بنا ڈالے ہیں۔ بس عجیب احمقانہ حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ تو بس دیوانی ہو کر رہ گئی ہے میری۔''
''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ جس طرح ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے، اسی طرح ایک خاتون کے دو دیوانے نہیں ہو سکتے۔'' طالوت نے کہا۔
شکیلہ سرخ ہو گئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ البتہ میں نے مسکراتے ہوئے طالوت سے پوچھا۔
''اوہو.... ان کا دوسرا دیوانہ کون ہے؟''
''اتفاق سے کمرے میں کوئی پتھر نہیں ہے، ورنہ میں اسے اُٹھا کر تمہارے سر پر دے مارتا۔ تب تمہیں اندازہ ہوتا کہ دوسرا دیوانہ کون ہے۔'' طالوت نے کہا۔ ''ویسے میں تمہیں شکل سے دیوانہ نہیں نظر آتا۔''
''ہمیشہ سے نظر آتے ہو۔ کون سی نئی بات ہے۔ لیکن میرا سر کیوں پھوڑا جا رہا ہے؟''

''اس لئے کہ تم ابھی تک باہر نہیں گئے۔'' طالوت نے کہا۔

''جا رہا ہوں..... جا رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ محبت میں انسان بے حد خودغرض ہو جاتا ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ شکیلہ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

بہرحال میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس بار طالوت سنجیدگی سے مرضِ عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن اس بار میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ شکیلہ کوئی بری لڑکی نہیں تھی۔ اور بہرحال، یہ طالوت کا اپنا فعل تھا۔ اگر وہ کسی شریف لڑکی کو پسند کر کے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اسے کیسے روک سکوں گا؟ میں تو اب اسے سمجھا بھی نہیں سکتا، یہ بات میری خودغرضی پر محمول سمجھی جاتی۔ میں اپنی حفاظت کی خاطر اسے روکنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

''خدا کرے، یہ محبت کامیاب ہو۔'' آج تو طالوت نے کھل کر اعلان کر دیا تھا اور شکیلہ کے چہرے کی سرخی اور شرم اس بات کی گواہ تھی۔

لیکن وہ احمق مجھے بھی پھنسا رہا تھا۔ افشاں، شکیلہ کی ہم شکل تھی۔ خوش مزاج تھی، اعلیٰ خاندان کی تھی۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کر لے۔ طالوت نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ چاہے تو افشاں مجنوں کی مانند میرے لئے صحرا گردی کرنے لگے۔ لیکن یہ فضول بات تھی۔ دل کے سودوں میں، میں طالوت کی مدد نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اور بھی بہت سے خیالات تھے۔ میں اپنی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک نہ ایک دن بہرحال، طالوت کا طلسم ٹوٹنا تھا۔ اس کے بعد......اس کے بعد میری کیا حیثیت ہو گی؟...... ممکن ہے، میں طالوت کے چلائے ہوئے چکر کی وجہ سے پولیس کے جھگڑے سے بھی نکل جاؤں۔ لیکن دنیا کو میری حقیقت پتہ چل گئی تو کیا ہو گا؟

لیکن اپنا یہ خیال مجھے خود پھسپھسا لگا۔ طالوت بہرحال ایک مخلص انسان تھا۔ اس نے اجنبی لوگوں کے لئے اتنا کچھ کیا تھا تو میرے لئے وہ کیا کچھ نہ کرے گا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور پھر عقب سے سیمیں کی آواز سن کر چونک پڑا۔ ''ارے صائم بھائی! کہاں گھوم رہے ہیں؟''

اور میں رک گیا۔ سیمیں، احسان اور افشاں آ رہے تھے۔ اور پھر وہ میرے قریب پہنچ گئے۔

''سیمیں باجی!'' افشاں نے سیمیں کو پکارا۔

''ہوں۔''

''آپ کو یقین ہے کہ یہ صائم صاحب ہیں؟''

''ہاں، کیوں؟'' سیمیں مسکراتے ہوئے بولی۔

''براہِ کرم مجھے ان دونوں کی کوئی نمایاں پہچان بتا دیں۔''

''دل کی آنکھیں کھول لو افشاں! مشکل نہ رہے گی۔'' سیمیں نے جواب دیا۔

''یہ جذباتی باتیں ہیں سیمیں باجی!..... خدا کی قسم میں ان دونوں میں تمیز نہیں کر سکتی۔'' افشاں نے کہا۔

''جذبات ہی تو زندگی کا اظہار کرتے ہیں افشاں! خدا کی قسم، میں صرف دل سے انہیں پہچانتی ہوں۔ ورنہ میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''

''لیکن میرا خیال ہے حضرات! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں عادل ہوں۔'' میں نے شرارتاً کہا۔
''صائم بھائی! آپ کی سیمیں دھوکا نہیں کھا سکتی۔''
''اور احسان بھی۔'' احسان نے کہا۔
میں ہنسنے لگا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟'' افشاں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔
''کیا افشاں صاحبہ؟''
''آپ.....آپ صائم صاحب ہی ہیں؟''
''جی۔''
''تب تو سیمیں باجی قابلِ داد ہیں۔''
''میں نے دل کی آنکھوں کی بات کی تھی افشاں!''
''لیکن سیمیں بہن! سب آپ کا سا دل کہاں سے لائیں گے؟ اور پھر آپ سے جو قربت ہے، آپ اسے افشاں صاحبہ پر کیوں مسلط کر رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔
افشاں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیمیں نے مسکراتے ہوئے اس کی شکل دیکھی اور بولی۔ ''ہاں..... میری نگاہ سے اگر کوئی دیکھے تو میں کہوں کہ تم کیا ہو۔ عادل کہاں ہیں؟''
''عبادت کر رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''کیا مطلب؟''
''عبادت، میرا خیال ہے عام فہم لفظ ہیں۔''
''مگر اس وقت؟''
''عبادت کے لئے کوئی وقت متعین تو نہیں ہے۔ جب دل چاہے، جب دل طلب کرے۔'' میں نے جواب دیا۔
''مگر اس سے قبل تو...... ہیں کہاں......؟''
''اپنے کمرے میں۔''
''آؤ، ذرا دیکھیں تو سہی۔''
''آپ چلئے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ سب طالوت کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اور پھر میں نے دُور سے اُنہیں طالوت کے کمرے میں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ پھر سب کے سب دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میرے سینے میں قہقہے مچل اُٹھے۔ اور میں اندازہ لگانے لگا کہ طالوت کو جب میری شرارت کا پتہ چلے گا تو وہ کتنا سیخ پا ہو گا۔ بہر حال، خود میں نے اس وقت وہاں رُکنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پھر میں نے ان سب کو طالوت کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور کان دبا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بات کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گئی تھی!
اور پھر جان بوجھ کر رات کے کھانے تک طالوت کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ نواب جلال الدین گپیں ہانکتا رہا تھا۔ پھر نواب صاحب کا ٹیلی فون آ گیا اور وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ تب تصدق اور کمال ہاتھ لگ گئے۔ ہاں، رات کے کھانے پر سب ساتھ تھے۔ نواب صاحب کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔
''حضرات!'' انہوں نے کھانے کی میز پر سب کو مخاطب کیا۔ ''بمشکل تمام میں نے اب تک صبر کیا

ہے۔لیکن جب تک میرا پیٹ اس اطلاع سے خالی نہیں ہو جائے گا، میں کھانا نہیں کھا سکوں گا۔اس لئے آپ ایک خوشخبری سنیئے!''

''خیریت؟''

''ہوم سیکرٹری صاحب نے بطورِ خاص مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔''

''اوہ......'' تنویر صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ظاہر ہے، انہوں نے میری درخواست پر خصوصی ہدایات جاری کی تھیں۔ چنانچہ کام بھی نہایت پھرتی سے ہوا ہے۔ جس شخص نے ایک فرم حشمت برادرز سے غبن کیا تھا اور پھر جس نے کئی قتل بھی کئے اور پولیس سے فراڈ بھی، اُس کا نام عارف ہے۔ وہ شہزادہ عادل اور شہزادہ صائم کا ہم شکل ضرور ہے، لیکن اس کا کوئی تعلق ان دونوں حضرات سے نہیں ہے۔ فنگر پرنٹس ڈیپارٹمنٹ نے تصدیق کر دی ہے۔ وہ کوئی اور ہی شخص ہے۔ چنانچہ ہوم سیکرٹری نے پیشکش کی ہے کہ پولیس باضابطہ معافی مانگ سکتی ہے، اگر یہ دونوں حضرات چاہیں تو۔ اور سرکاری طور پر ان کی رہائش کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے ان دونوں کی طرف سے کہہ دیا ہے کہ ہمیں کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نواب صاحب کے خاموش ہوتے ہی پُرزور تالیاں بجیں۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''میرے اوپر معافی خاص طور سے فرض ہوگئی ہے۔'' تنویر صاحب شرمندہ لہجے میں بولے۔

''ارے نہیں تنویر! بس بات ختم ہوگئی۔ خدا کی قسم ان کے ظرف سے واقف ہو جاؤ گے تو انہیں کسی اور ہی دنیا کا انسان پاؤ گے۔''

''مجھے اعتراف ہے۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''بس اب کھانا شروع کیا جائے۔'' نواب صاحب بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہو گیا۔ کھانے کے دوران میں نے کنکھیوں سے طالوت کی شکل دیکھی۔ وہ نارمل تھا۔ ایک آدھ بار میں نے اس سے آنکھیں بھی ملائیں لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تب میں نے سکون کی سانس لی۔ گویا وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے۔

''بھئی اب کوئی عمدہ سا پروگرام بن جائے تنویر!'' نواب صاحب کھانے سے فارغ ہو کر بولے۔

''میں حاضر ہوں بھائی صاحب!''

''میں حاضر کیا ہوں۔ پروگرام بناؤ۔''

''میرا خیال ہے، کل کا دن میرے باغ میں گزارا جائے۔ سوئمنگ وغیرہ کی جائے اور پھر وہیں بیٹھ کر کوئی دوسرا پروگرام بنائیں گے۔''

''منظور ہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''اور ہاں، تمہارا وہ اصطبل بھی تو وہیں کہیں ہے۔''

''باغ سے تھوڑی دُور ایک عمارت میں ہے۔ لیکن بھائی صاحب! میرے گھوڑے بس اب نام کے ہیں؟''

''خیر...... خیر تو یہ طے ہے۔''

''جی۔''

''اب رات کا کیا پروگرام ہے؟''

''جو حکم۔''
''بھئی میں تو شطرنج کھیلنا چاہتا ہوں۔ پبلک کی کیا رائے ہے؟''
''کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ ہم سب پائیں باغ کی سیر کریں گے۔'' سیمیں نے کہا۔
''چلو ٹھیک ہے۔'' نواب صاحب نے کہا اور سب کھانے کے کمرے سے نکل آئے۔
''اگر آپ حضرات کو شوق ہو تو میں پائیں باغ میں موسیقی کا بندوبست کروں؟'' افشاں نے پوچھا۔
''واہ..... یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟'' سیمیں اور احسان نے کہا۔
''تب مجھے تھوڑی دیر کی اجازت دیں۔ آؤ تصدق!.....آؤ کمال!'' افشاں نے کہا۔
''ہم بھی لباس وغیرہ تبدیل کر آئیں؟'' طالوت نے کہا۔
''ضرور۔''

اور پھر ہم دونوں واپس چل پڑے۔ میں خاموش تھا۔
''کیا سوچ رہے ہو عارف؟'' طالوت نے حسبِ عادت پوچھا۔
''کوئی خاص بات نہیں۔''
''خوش نہیں ہو؟''
''کیوں نہیں۔''
''ساری زندگی کے لئے جان چھوٹ گئی۔ ویسے یار! تمہارے ہاں کا قانون بھی عجیب ہے۔ جب انسان مجرم ہوتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا۔ اور جب نہیں ہوتا تو سب اس کی جان کو آ جاتے ہیں۔''
''ہاں طالوت!.....بہر حال، اچھا ہی ہوا۔'' میں نے گہری سانس لی۔
ہم نے لباس تبدیل کئے اور پھر باہر ہی نکل رہے تھے کہ افشاں پہنچ گئی۔ ''تیار ہو گئے آپ لوگ؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں.....کچھ خاص تیاریاں کرنی تھیں کیا؟'' طالوت نے پوچھا۔
''ارے نہیں.....بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔''
''دوسرے لوگ پہنچ گئے؟''
''ہاں.....سیمیں باجی اور احسان بھائی کو روانہ کر کے آئی ہوں۔'' افشاں نے جواب دیا اور طالوت نے گردن ہلا دی۔
پھر ہم لوگ پائیں باغ کے اس خوبصورت حصے میں پہنچ گئے، جہاں درختوں کی جڑوں میں روشنیاں چھپی ہوئی تھیں۔ رنگین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ درمیان کی میزوں پر خوش رنگ پھلوں کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ تمام لوگ پہنچ چکے تھے۔ روشنیاں اس قدر مدھم تھیں کہ شکلیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تاہم پتہ چل رہا تھا کہ کون کون ہے۔
''آیئے حضرات.....!'' سیمیں کی آواز سنائی دی۔ ''افشاں! تم نے تو چند منٹ میں ہی بہت کچھ کر ڈالا۔''
''نہیں سیمیں باجی! ہم اکثر یہاں یہ پروگرام رکھتے ہیں۔ میں آپ کو بڑی عمدہ چیزیں سنوا رہی ہوں۔'' افشاں نے کہا۔ اور درحقیقت افشاں بے حد باذوق تھی۔ درختوں ہی میں مائیک چھپے ہوئے تھے۔

ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ انسانی سرگوشیاں اُبھریں۔ کسی نوجوان کی آواز سنائی دی، ایک روح کی مانند۔ سسکتی ہوئی روح کی مانند۔ اور پھر ایک عجیب سا سماں بندھ گیا تھا۔ اور پھر ایک زخمی نغمہ پھڑ پھڑانے لگا۔

سب خاموش تھے اور بہت غور سے سن رہے تھے۔ نغمہ جاری رہا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔ کئی منٹ تک سکتہ سا طاری رہا۔ سب متاثر تھے۔ پھر جب ہوش آیا تو تالیاں گونج اُٹھیں۔

''یہ افشاں اتنا اعلیٰ ذوق رکھتی ہے، معلوم نہیں تھا۔'' احسان نے کہا۔

''واقعی افشاں! کمال کر دیا۔ لیکن آوازیں کس کی تھیں؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''میں نے ایسے بہت سے ریکارڈ تیار کرائے ہیں باجی! ان میں مختلف آرٹسٹوں کی آوازیں ہیں۔ تاریخ کے چند کرداروں کو سنیں گی؟''

''اوہ، ہاں..... ضرور۔''

''تو سنیے..... یہ زیب النساء ہے۔ اور دوسرا اس کا محبوب، نواب عاقل خاں۔'' افشاں نے کہا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مغلیہ دور کی صوتی تصویر اُجاگر ہونے لگی۔ کنیزوں کی چہلیں..... خدام کی دست بستہ آہٹیں اور خواجہ سراؤں کی آوازیں۔ اور پھر زیب النساء کی شیریں آواز۔ فارسی کا ایک شعر..... اور اس کے بعد ایک غزل، جو مشاعرے کے انداز کی تھی۔ واقعی کمال کر دیا تھا۔

طالوت بھی بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔

موسیقی کا یہ پروگرام اس قدر حسین تھا کہ بس داد نہ دی جا رہی تھی۔ المیہ، طربیہ نغموں کے لئے ایک خاص ماحول پیدا کیا جاتا تھا اور اس کے بعد نغمے کا لطف۔ بس دل موہ لیتا تھا۔

''اب بھی تم اس پر عاشق نہیں ہوئے؟'' طالوت نے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''مطلب بھی پوچھو گے؟'' طالوت دانت پیس کر بولا۔

''یار! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تو سر پر پتھر ماروں تاکہ عقل آ جائے۔''

''کیوں مرچیں چبا رہے ہو؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''خدا کی قسم!..... شکیلہ پر عاشق نہ ہوا ہوتا تو اس وقت افشاں کے ذوق پر ضرور عاشق ہو جاتا۔'' طالوت نے کہا۔

''اوہ......'' میں نے طویل سانس لی۔

''میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔'' طالوت غرّایا۔

''لیکن کیوں میرے بھائی؟''

''تم نے ابھی تک اس سے اظہارِ عشق نہیں کیا۔''

''یار طالوت.....!''

''ہاں، ہاں..... بکو۔''

''ہمت نہیں پڑتی۔''

"دیکھو، میرے سامنے فضول باتیں کیں تو اچھا نہ ہوگا۔"
"قسم لے لو۔ ایسے ویسے ماحول کی دوسری بات تھی۔ اس شریف لڑکی سے کچھ کہتے ہوئے ہلکا سا لطف محسوس ہوتا ہے۔"
"اب تو کہہ دو۔ نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔"
"کل ہم پکنک منا رہے ہیں؟"
"ہاں..... پھر......؟"
"وعدہ کرتا ہوں، وہاں....."
"آخری وعدہ؟" طالوت نے پوچھا۔
"ہاں یار! آخری وعدہ۔" میں نے کہا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ رہی تھی۔ طالوت کسی خیال میں گم تھا۔ پھر اس نے چونک کر گردن اٹھائی اور شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔
"بلا دوں؟" میں نے شرارت سے کہا۔
"دل تو چاہ رہا ہے...... مگر رہنے دے یار!..... آج دن میں ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔"
"کیا مطلب؟"
"تم گئے تو یہ غولِ بیابانی آ دھمکا۔" طالوت نے کہا۔
"اوہ، اچھا......" میں نے بڑی سنسنی محسوس کی۔ اس کا مطلب ہے کہ حضرت کو میرے اوپر شبہ نہیں تھا۔ بہرحال، یہ عمدہ بات تھی، ورنہ میری جان کو آ جاتا۔"
"میرا خیال ہے، انہوں نے چھپ کر ہماری باتیں بھی سنی تھیں۔"
"اوہو...... تو کیا......"
"ہاں۔ اور پھر اچانک سب اندر گھس آئے۔ صاف تو نہیں کہا، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ سن لیا تھا۔ ان کی بکواس سے اندازہ ہوتا ہے۔"
"اوہ..... لیکن تمہارے درمیان گفتگو کیا ہو رہی تھی؟"
"بکو مت۔" طالوت ہونٹ بھینچ کر غرایا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ طالوت خونخوار نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ چاہے دوسروں کو سب معلوم ہے۔" میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ طالوت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پُرخیال انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔ یہ نغمہ بھی ختم ہو گیا۔ اور پھر شاید انٹرول ہو گیا۔ افشاں نے سب کو فروٹ اور مشروب کی دعوت دی۔ پھلجھڑیاں پھوٹنے لگیں۔ ویسے اتنی خوب صورت اداکاری پر سب نے افشاں کو مبارکباد دی۔
"آپ کو بھی پسند آیا یہ پروگرام یا نہیں؟" اُس نے ہم دونوں سے پوچھا۔
"دوسرے لوگوں نے جتنی داد دی ہے، ہماری طرف سے اسے دس سے ضرب دے لو۔" طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اور آپ کا کیا خیال ہے صائم صاحب؟" اس نے میری طرف دیکھا۔
"ضرب ہی کی بات ہے تو میری طرف سے آپ پچیس سے ضرب دے دیں۔" میں نے جواب دیا۔

''اوہو، آپ لوگ بڑی فراخ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں، میں مغرور ہو جاؤں گی۔ فروٹ لیجئے نا۔''
وہ ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اور پھر اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''ارے شکیلہ! کہاں ہو؟..... یہاں آؤ بھئی۔'' افشاں کے انداز میں ہلکی سی شرارت تھی۔ طالوت نے سر کھجایا تھا، لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔
''ویسے میں آپ کی غلط فہمی دُور کر دوں محترمہ! آپ عادل کو صائم کہہ کر مخاطب کر رہی ہیں۔'' وہ بولا۔
''ہرگز نہیں۔'' افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیوں؟..... کمال ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''اب کوئی کمال نہیں ہے۔'' افشاں شرارت سے بولی۔
''کیا مطلب؟''
''شکیلہ نے مجھے آپ کی خاص پہچان بتا دی ہے۔'' افشاں نے کہا اور طالوت سچ مچ جھینپ گیا۔
اس دوران شکیلہ وہاں پہنچ گئی تھی۔
''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''بس یونہی، پہچان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ سچ بتانا شکیلہ! کیا تمہیں کبھی ان دونوں کو پہچاننے میں کوئی دقت ہوئی؟''
''ہاں..... ابتدا میں کئی بار۔'' شکیلہ نے سادگی سے کہا۔
''شکر ہے، بات ابتدا کی تھی۔'' افشاں ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
''کیا مطلب؟'' شکیلہ نے پوچھا۔
''اب کیا میں اتنی مطلبی ہوں کہ ہر بات مطلب سے کروں گی؟'' افشاں پوری طرح شرارت پر آمادہ تھی۔
''اوہ.....'' شکیلہ ہنسنے لگی۔
''ویسے واقعی بڑی انوکھی سچویشن ہے۔ فرض کرو، کوئی شخص کسی کو چاہتا ہے اور اس سے اظہارِ عشق کر دیتا ہے اور اس کا جواب اس کے ہم شکل سے مانگتا ہے۔''
''میری ایک درخواست ہے مس افشاں!'' طالوت بولا۔
''فرمایئے، فرمایئے۔'' افشاں ڈھٹائی سے بولی۔
''آپ اپنے گلے میں کوئی نشانی لٹکا لیجئے۔''
''اوہ..... آپ فکر نہ کریں۔ آپ اگر کبھی غلط فہمی کا شکار ہوئے تو میں برا نہ مانوں گی اور جلدی سے اپنا نام بتا دوں گی۔''
''خیر، اب میری آنکھیں اتنی کچی بھی نہیں ہیں۔'' طالوت نے طویل سانس لے کر کہا۔
''یہ نہ کہیں عادل بھائی! ہم آپ کو دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔''
''چیلنج کر دو مجھے۔'' طالوت نے کہا۔
''جانے دیں۔ ہمیں کسی کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ کیوں شکیلہ؟''
''مم..... میں..... مجھے کیا معلوم؟'' شکیلہ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''کیا ہوا بھئی؟ یہ انٹرول کب ختم ہو گا؟'' احسان نے ہانک لگائی۔

''بس احسان بھائی! ابھی دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔'' افشاں نے جواب دیا۔ اور پھر وہ چند لمحات کی معذرت طلب کر کے اُٹھ گئی۔ طالوت شرارت آمیز نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شکیلہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔

''شکیلہ! تمہارا اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کون لڑکی؟'' شکیلہ جیسے کسی خیال سے چونک پڑی۔

''اوہو..... کہاں ہیں آپ؟'' میں بھی چپ نہ رہا۔

''یہیں..... ہاں ہاں یہیں۔'' شکیلہ احمقانہ انداز میں بولی۔

''افسوس، اچھی خاصی لڑکی تھی۔''

''کون؟'' شکیلہ بدستور گھبرائی ہوئی تھی۔

''شکیلہ کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور شکیلہ پھیکے انداز میں مسکرا دی۔

''مس شکیلہ! آپ اس شخص کی باتوں پر توجہ مت دیں۔ میں آپ سے افشاں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' طالوت نے کہا۔

''بلاؤں اُسے؟''

''جی نہیں۔'' طالوت نے گہری سانس لی۔ ''آپ بدحواس نہ ہوں۔''

''میں ابھی حاضر ہوئی۔''

''ہاں، ہاں۔ آپ تشریف رکھئے۔ میں غائب ہوا جاتا ہوں۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور شکیلہ جھینپ گئی۔

''دفع ہو جاؤ۔'' طالوت غرّایا۔ اور میں ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

موسیقی کا پروگرام خاصی رات گئے تک جاری رہا۔ کسی بزرگ نے بچوں کے مشاغل میں دخل نہیں دیا تھا۔ پھر جب سب تھک گئے تو متفقہ طور پر پروگرام بند کر دیا گیا اور سب آرام کرنے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

دوسرا دن حسبِ معمول تھا۔ لیکن تنویر صاحب، باغ کی پکنک کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ صبح کا ناشتہ گھر پر ہی کیا گیا اور ناشتہ کے فوراً بعد سب لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر باغ کی طرف چل پڑے، جہاں تصدق پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

بلاشبہ زندہ دل لوگ تھے۔ تنویر صاحب نے بہترین انتظامات کئے تھے۔ بزرگ ساتھ تھے۔ لیکن اب جلال الدین اور تنویر صاحب ایک گوشہ میں شطرنج کی بازی لگا کر بیٹھ گئے۔ نوجوانوں کے کسی شغل میں انھوں نے دخل نہ دیا۔ کچھ لوگ سوئمنگ کر رہے تھے اور کچھ سیر و تفریح۔ طالوت نہ جانے کہاں تھا؟ شکیلہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سیب کے ایک درخت کے نیچے کھڑا گردن اُٹھائے خوش رنگ سیبوں کو دیکھ رہا تھا کہ افشاں میرے پاس پہنچ گئی۔

''جی.....؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''اوہ..... فرمایئے، مس افشاں!'' اُسے تنہا پا کر میں کسی قدر گڑبڑا گیا۔

''کیا مطلب؟'' افشاں حیرت سے بولی۔

"مطلب بھی آپ ہی بتادیں۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"کیا گڑبڑ ہے بھئی؟" افشاں اُلجھے ہوئے انداز میں مسکرا دی۔
"بخدا مجھے نہیں معلوم۔"
"آپ نے مجھے بلایا نہیں تھا؟"
"یہ پیغام کس نے دیا آپ کو؟"
"عادل بھائی نے۔"
"تب ٹھیک ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"گویا آپ نے نہیں بلایا تھا؟......اور یہ اُن کی شرارت تھی؟"
"بہر حال، مجھے یہ شرارت پسند آئی۔"
"آپ سوئمنگ نہیں کریں گے؟"
"پانی سے ڈر لگتا ہے۔"
"کیوں؟"
"ڈوب جاؤں گا۔"
"ارے نہیں۔ سوئمنگ پول اتنا گہرا نہیں ہے۔" افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو چغد محسوس کر رہا تھا۔ درجنوں لڑکیاں میرے نزدیک آ چکی تھیں لیکن خود کو اتنا نروس پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔
"آئیے صائم صاحب!.....چلیں۔"
"کہاں؟" میری آواز کیسے کہیں دُور سے آئی؟"
"سوئمنگ پول پر۔" افشاں کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"اوہ......اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں کچھ وقت دوسروں سے الگ گزارنا چاہتا ہوں۔"
"اوہو......معاف کیجئے گا۔ گویا عادل بھائی کی شرارت سے آپ کو تکلیف ہوئی؟"
"کیسی تکلیف؟"
"میں نے بلاوجہ آپ کی تنہائی میں مداخلت کی۔"
"اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو تشریف رکھئے مس افشاں! آپ کی مداخلت میرے لئے ناگوار نہیں ہے۔"
افشاں خاموش ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آ گئی تھی، پلکیں جھک گئی تھیں۔ اور وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا بات کروں؟......اچھا خاصا احمق بن گیا تھا۔ اور خاموشی بھی بری لگ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے مس افشاں! ہم لوگوں نے آپ کو خاصا پریشان کیا ہے۔"
"کیوں؟" افشاں بے ساختہ بولی۔
"بھئی ایک طرح سے زبردستی کے مہمان ہیں۔"
"یہ صرف آپ کا احساس ہے صائم صاحب!..... براہِ کرم مجھے بتایئے، کیا آپ نے کسی کے انداز میں ناگواری محسوس کی ہے؟"

''ارے نہیں نہیں افشاں صاحبہ!..... آپ لوگوں کے بارے میں یہ سوچنا بھی گناہ ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تب پھر آپ کے الفاظ؟''

''بس یونہی..... اخلاقی تقاضا بھی ہے کہ زیادہ بار نہ بنا جائے، میں نواب جلال الدین اور تنویر صاحب سے اجازت لینے کی سوچ رہا ہوں۔''

افشاں نے گردن جھکا لی۔ اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

''ہم آپ کو روک بھی کس طرح سکتے ہیں؟...... ہماری آپ کی حیثیت میں بڑا فرق ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس کوئی بھی تو ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم آپ سے رُک جانے کے لئے کہیں۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''اوہو..... اوہو.....افشاں صاحبہ!...... آپ سنجیدہ ہو گئیں۔''

''ہاں۔ اس تصور سے دکھ ہوتا ہے کہ آپ یہ رونقیں سمیٹ کر لے جائیں گے۔''

''جانا تو ہوگا ہی افشاں صاحبہ!''

افشاں چند ساعت خاموش رہی، پھر بولی۔ ''شکیلہ میں اور مجھ میں کتنا بڑا فرق ہے۔ وہ میری ہم شکل ہے، لیکن خوش بخت ہے۔ میں اُس کی شکل حاصل کر کے بھی اس جیسی قسمت نہ پا سکی۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

افشاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''کاش مجھے بھی بچپن میں اغوا کر لیا جاتا۔ میں بے بس ہوتی، مظلوم ہوتی۔ میرے اوپر ترس کھایا جاتا اور پھر مجھے اس قدر اپنائیت دی جاتی کہ میں اس کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی...... کاش میں بھی کوئی راج ہنس ہوتی۔ آیئے صائم صاحب! چلیں۔''

''ابھی نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن افشاں کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے تھے۔

''ارے ارے..... ارے افشاں!..... افشاں صاحبہ!...... یہ...... یہ کیا؟''

''شرمندہ ہوں۔ آپ کے لئے زحمت بنی۔'' وہ اُٹھ گئی۔

''سنیئے تو سہی...... براہِ کرم سنیئے۔''

''جی۔'' وہ رُک گئی۔

''کیا آپ ہمیں جانے نہ دیں گی؟''

''کیسے روک سکتی ہوں؟'' اُس نے ڈبڈبائی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''کہیں تو سہی ایک بار۔''

''رُک جائیں گے آپ؟''

''زندگی بھر کے لئے۔''

''صائم صاحب!'' افشاں کی شرمگیں آواز اُبھری۔

''سچ افشاں!..... آپ کہیئے تو سہی۔''

''تو پھر رُک جایئے۔'' افشاں نے رُخ بدل کر دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔

''ہمیشہ کے لئے؟''

''ہاں.....'' اس نے کہا اور تیزی سے دوڑ گئی۔
میں خاموشی سے کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ میں نے اُسے آواز نہ دی۔ بس ایک عجیب سی کیفیت میرے ذہن پر طاری تھی۔ عمر کے اِس دور میں نہ تھا کہ نوجوانوں کی طرح دوڑ کے اسے پکڑ لیتا، بے قراری سے اسے آوازیں دیتا، محبت کی بے چینی کا اظہار کرتا۔ عورت کی دنیا میں نیا انسان نہ تھا۔ بے شار لڑکیاں قریب آئی تھیں، پیار بھرے جملے بھی سنے تھے..... اظہار عشق کے نت نئے انداز بھی دیکھے تھے۔ لیکن بدن کے اندرونی حصوں میں یہ ہلکی ہلکی کسک اس سے پہلے بیدار نہ ہوئی تھی۔ کسی کی شرمگیں آواز نے رگ و پے میں سرور کی یہ لہریں نہ دوڑائی تھیں..... دُور تک اُسے دیکھتا رہا۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو دل کی ایک تیز دھڑکن نے اسے آواز دی۔ قدم خود بخود آگے بڑھ گئے۔ آنکھیں اُس کی تمنا کرنے لگیں۔
اور جب حواس یکجا ہوئے تو میں سوئمنگ پول کے نزدیک تھا۔
سوئمنگ پول میں عجیب تماشا تھا۔ بھائی خربوز خان، موڈ میں تھے۔ ساکت پانی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور کناروں پر کھڑا مجمع آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔
مجمع میں شکیلہ بھی تھی..... طالوت کی محبوبہ..... اور محبوبہ کی موجودگی میں سرونسٹن چرچل بھی دنیا کے سب سے بڑے احمق نظر آئے تھے۔ چنانچہ اپنا یار پانی پر پالتی مارے بیٹھا تھا تو کون سی بڑی بات تھی۔
میں نے افشاں کو بھی ایک کنارے پر دیکھا اور بے دھڑک اُس کی طرف بڑھ گیا۔ اُس سے اجتناب دوسروں پر اظہار بن جاتا۔ افشاں نے بھی مجھے دیکھا۔ ہلکی سی گھبراہٹ چہرے پر اُبھری، پھر اس نے بھی شاید میرے ہی انداز میں سوچا اور پُرسکون ہوگئی۔
''یہ کیا ہے صائم صاحب؟'' اُس نے سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا۔
''عادل ہی ہے۔''
''مگر یہ پانی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔''
''اس نے پیراکی کا اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کیا ہوا ہے، ہماری ریاست میں۔''
''لیکن یہ پیراکی کی کون سی قسم ہے؟'' افشاں حیرت سے بولی۔
''کچھ بھی نہیں ہے یہ تو۔ اگر آپ کہیں تو وہ پانی پر دوڑ سکتا ہے۔'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔
''میں نہیں مانتی صائم صاحب!''
''کیوں؟''
''مجھے بتائیے، میرا لباس خود بخود کیسے بدل گیا؟ شکیلہ نے میری جگہ کیسے لے لی؟ اور پھر وہ انوکھے واقعات۔'' افشاں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔
''ارے ہم لوگ کالے جادو کے ماہر ہیں۔''
''جی نہیں۔ سفید جادو کے۔'' افشاں ایک پیار بھری مسکراہٹ سے بولی۔
''کیوں.....؟'' میں نے پوچھا۔
''اگر آپ کالے جادو کے ماہر ہوتے تو کالے ہوتے۔''
''اوہ.....'' میں ہنسنے لگا۔ اسی وقت طالوت کی نگاہ ہم دونوں پر پڑ گئی اور وہ اُچھل کر پانی پر کھڑا ہو گیا۔ پھر تیزی سے دوڑتا ہوا اس کنارے تک آیا، جہاں ہم دونوں کھڑے تھے اور اُچھل کر کنارے پر

چڑھ آیا۔

”جی، جی..... میرا نام افشاں ہے۔“ افشاں برجستہ بولی۔

”اوہ..... خدا کا شکر ہے۔“ طالوت نے کہا اور دوبارہ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ افشاں ہنسی نہ روک سکی۔ میں بھی قہقہہ لگا رہا تھا۔ جبکہ دوسرے لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے۔

طالوت اب باقاعدگی سے پانی میں تیر رہا تھا۔ اور پھر وہ دوسرے کنارے پر نکل آیا۔ سب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم دونوں بھی ٹہلتے ہوئے دوسرے لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔

”میں کہتا ہوں خدا کی قسم، یہ جادو ہے۔“ تنویر صاحب کہہ رہے تھے۔ ”پانی پر چلنا انسانی کارنامہ نہیں ہو سکتا۔“

”تعجب ہے تنویر صاحب!..... اس کا مقصد ہے کہ آپ کے یہاں کے تیراک صرف پانی کے نیچے ہی جا سکتے ہیں۔ ارے ہماری ریاست کے تیراک تو پانی پر بانس کھڑے کرتے ہیں اور ان پر کرتب دکھاتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں، میں پانی پر سر کے بل دوڑ سکتا ہوں۔“ طالوت نے کہا۔

”تب پھر تمہاری ریاست جنوں کی ریاست ہی ہو سکتی ہے۔“ تنویر صاحب مسکراتے ہوئے بولے اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ آپ کا خیال کس قدر حقیقی ہے محترم! یہ آپ نہیں جانتے۔ میں نے دل میں سوچا۔

کافی دیر تک وہ لوگ طالوت کی اس تیراکی پر حیرت کا اظہار کرتے رہے۔ بہرحال، اس کے بعد دوسرے پروگرام شروع ہو گئے، جن میں کھانے پینے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ ویسے بدمعاش طالوت بار بار میری اور افشاں کی شکلیں دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی اندازہ لگانے کی فکر میں ہو۔ لیکن ہم دونوں نے اپنے چہرے اتنے نارمل کر لئے تھے کہ کوئی اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ بہرحال، اُسے شبہ ضرور تھا۔ تنہائی ملتے ہی وہ میرے سر پر سوار ہو گیا۔

”رپورٹ.....؟“

”خیریت۔“

”میں کہتا ہوں رپورٹ۔“ طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔

”کس سلسلے میں بندۂ خدا؟“

”عارف! مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔ کیوں مجھے غصہ دلا رہے ہو؟ ابھی تمہاری زبان سب کچھ اُگل دے گی۔“

”عجیب منحوس آدمی ہو۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”کوئی راز، راز نہیں رہنے دیتے۔“

”راز کے بچے!..... میں نے اُسے تیرے پاس بھیجا تھا۔“ طالوت بولا۔

”جی ہاں، مہربانی۔“

”یہ دیکھو.....“ طالوت نے اپنی ایک اُنگلی اُٹھائی اور میری نگاہیں بے ساختہ اُس کی اُنگلی کی طرف اٹھ گئیں۔ تب اچانک میں نے اپنے ذہن میں سناٹا محسوس کیا۔ اور پھر جیسے میرے حلق سے کوئی اجنبی آواز نکلی۔

”وہ میرے پاس آئی تھی تو میں نے اس سے کہا کہ ہم نے اسے خاصا پریشان کیا ہے۔ اس نے

جواب دیا کہ یہ صرف آپ کا احساس ہے، اور پھر وہ رونے لگی۔ اس نے کہا کہ ہم یہاں کی رونقیں لے جائیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ شکیلہ خوش قسمت ہے کہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس نے آرزو کی کہ کاش وہ بھی ہمارے ساتھ رہ سکتی۔ اس نے کہا کہ میں زندگی بھر اس کے ساتھ رہوں۔''

میرے ذہن نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں یہ سب کچھ طالوت کو نہیں بتانا چاہتا تھا، لیکن میری زبان سے بے ساختہ سارے الفاظ نکل رہے تھے۔ اور طالوت حکیمانہ انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔

''بس۔'' اُس نے انگوٹھا اُٹھا دیا اور میری زبان جیسے اُس کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ مجھے احساس تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے اس سے کیا کہا ہے۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' میں جھلا کر بولا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' طالوت نے معصومیت سے کہا۔

''میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''اور یہ اچھی بات تھی کہ تم دوستی کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور اپنی باتیں بھی چھپانا چاہتے ہو؟''

''یار! تم احمق ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہارے معاملات میں مداخلت نہیں کروں گا۔'' طالوت مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

میں خاموش کھڑا رہ گیا تھا۔ اور پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے واقعی طالوت سے زیادتی کی ہے۔ مجھے یہ لہجہ نہیں اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اور پھر اس بے ایمان سے تو کچھ چھپانا بھی حماقت ہے۔ بھلا اس سے کون سی بات چھپی رہ سکتی ہے۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ لیکن طالوت نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ نواب جلال الدین اور تنویر صاحب کھڑے ہوئے گفتگو کر رہے تھے، میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا خیال ہے صائم میاں!...... واپس چلیں؟''

''جیسی آپ کی مرضی۔''

''جلال بھائی کہہ رہے تھے کہ میں انہیں اپنے گھوڑے دکھاؤں۔ آپ لوگ پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں پسند کریں گے؟'' میرے بجائے نواب جلال الدین بولے۔

''ضرور، ضرور۔ عادل کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔''

''تب پھر آیئے۔ باقی لوگ بدذوق ہیں۔ گھوڑوں کو کیا سمجھیں گے؟'' تنویر صاحب نے کہا اور ہم تینوں طالوت کو تلاش کرنے لگے۔ طالوت دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی مل گیا۔

''آیئے عادل میاں! ذرا تنویر کے گھوڑے دیکھنے چل رہے ہیں۔'' نواب صاحب نے اُسے دعوت دے دی۔

''جی بہتر۔'' طالوت سنجیدگی سے بولا۔ پھر تنویر صاحب نے دوسرے لوگوں سے وہیں انتظار کرنے کے لئے کہا اور تصدق کو ساتھ لے کر ایک جیپ کی طرف چل پڑے۔ تصدق نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ہم چاروں پیچھے بیٹھ گئے۔ زیادہ فاصلہ نہ طے کرنا پڑا۔ باغ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک عمارت میں

تنویر صاحب کا اصطبل تھا۔ دس گیارہ گھوڑے تھے۔ خاصے تھے۔ مجھے یا طالوت کو بھلا گھوڑوں کی کیا پہچان۔ ہم اگر چاہتے تو ایک گدھے کو بھی ڈربی کا انعام دلا سکتے تھے۔ طالوت خوامخواہ گھوڑے کے بارے میں بکواس کر رہا تھا۔ گو وہ مجھ سے ناراض تھا لیکن اس خفگی کا اظہار دوسروں پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے اس کا موڈ شرارت کا ہی تھا۔ چنانچہ ایک مریل سے گھوڑے کے سامنے وہ رُک گیا۔

''اوہو ہو..... نواب صاحب!'' اُس نے نواب جلال الدین کو مخاطب کیا۔

''ہاں، ہاں..... خیریت؟'' نواب صاحب بولے۔

''اس گھوڑے کو دیکھا آپ نے؟''

''ہاں۔'' نواب صاحب ہنس پڑے۔ ''میرا خیال ہے، تنویر نے اسے دوسرے گھوڑوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے خریدا ہے۔''

''کیا آپ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں نواب صاحب؟'' طالوت نے تعجب سے کہا۔

''اماں! تو اس خچر کو یہاں باندھنے کی وجہ تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟'' نواب صاحب بولے۔

''اوہو..... بھئی دراصل یہ میرے سائیس کا گھوڑا ہے۔ اکثر وہ اس پر بیٹھ کر کبھی کبھی شہسوار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ جانے بے وقوف کہاں سے خرید لایا۔ میرے گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر ان کا اخلاق بھی تباہ کر رہا ہے۔ ابھی بلاتا ہوں بد بخت کو، اور اسے کھلواتا ہوں یہاں سے۔'' تنویر صاحب جھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''تعجب ہے..... تعجب ہے..... آپ دونوں حضرات کی ایک ہی رائے ہے۔'' طالوت نے منہ پھاڑ کر کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو بھئی؟'' نواب جلال الدین بولے۔

''معاف کیجئے نواب صاحب! آپ اس گھوڑے کو نہیں سمجھ سکے۔'' طالوت مایوسی سے بولا۔

''اوہو..... گویا یہ بھی سمجھنے کی چیز ہے؟''

''جی ہاں۔ شاید اپنی نسل کا یہ آخری گھوڑا ہے۔''

''بہت خوب.....'' نواب صاحب ہنس پڑے۔

''آپ ہنس رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں، معلوم کیجئے سائیس سے کہ یہ اسے کہاں سے مل گیا؟'' طالوت انتہائی سنجیدگی سے یہ تمام باتیں کر رہا تھا۔

''ارے کوئی چھوڑ گیا ہوگا، مصیبت سمجھ کر۔ سو پچاس روپے دے دیئے ہوں گے اس نے۔ کیوں تنویر؟'' نواب جلال الدین بولے۔

''گویا ریس کے لئے اس کی تربیت بھی نہیں ہوئی ہوگی؟''

''یہ ریس میں دوڑے گا؟'' نواب صاحب ہنس پڑے۔

''قبلہ نواب صاحب!'' طالوت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ''صرف ایک ہفتے کے لئے یہ گھوڑا میرے حوالے کر دیں اور اس کے بعد سارے ملک میں چیلنج کر دیں۔ اگر کوئی اسے ہرا سکا تو ہمیشہ کے لئے خود کو گھوڑوں کا ماہر کہنا چھوڑ دوں گا۔'' طالوت نے کہا اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''کیوں بھئی..... کیا خیال ہے؟'' نواب جلال الدین بولے اور تنویر صاحب ہنس پڑے۔

سوئم

''کیا عرض کروں؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''قبلہ، ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اگر کوئی گھوڑا اس گھوڑے کو ہرا سکا تو میں اس کے مالک کی خدمت میں ایک ہزار گھوڑے پیش کروں گا۔'' طالوت انتہائی سنجیدگی سے بولا۔
ہے کوئی اس گھوڑے کو ہرانے والا؟...... اور پھر ریس کورس میں اگر شمشیر الدولہ کے گھوڑے بھی ہوں تو.....؟
طالوت کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی طاری تھی۔ لیکن گھوڑے کی ہیئت دیکھ کر اور اس کے بارے میں ریس کے ایک شاندار گھوڑے کا تصور کرنے سے ہنسی نہ رُک سکتی تھی۔ اور طالوت کے الفاظ کو ایک شرارت آمیز طنز کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے، میں ان الفاظ کو شرارت نہیں سمجھ سکتا تھا۔ طالوت، طالوت تھا۔ وہ چاہتا تو کسی گدھے کو بھی ڈربی جتا سکتا تھا۔ بہر حال دونوں بزرگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس دلچسپ بات کو حقیقت سمجھیں یا مذاق..... لیکن طالوت کی سنجیدگی بھی انہیں اُلجھا رہی تھی۔
''پھر کیا خیال ہے؟ کیا مجھے اس کی تربیت کی اجازت مل جائے گی؟'' چند منٹ کے بعد طالوت نے پوچھا۔
''اوہو..... اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ صرف یہ بلکہ سارے گھوڑے آپ کی نذر عادل میاں!'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔
''نہیں..... مجھے صرف یہ قیمتی گھوڑا درکار ہے۔ ہاں، ذرا اُس شخص کو بلوائیے، جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ اسے لانے والا وہ ہے۔''
''اچھا، اچھا۔'' تنویر صاحب نے کہا اور تصدق کو سائیس کو بلانے بھیج دیا۔
''میں اس نایاب گھوڑے کا شجرہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' طالوت بولا۔
''مجھے یقین ہے، کسی گدھے کی جولانئ طبع کا نتیجہ نکلے گا۔'' تنویر صاحب بولے اور نواب جلال الدین نے زور دار قہقہہ لگایا۔
''نواب صاحب! مجھے آپ پر حیرت ہے۔'' طالوت نے کہا۔ ''آپ گھوڑوں کے سلسلہ میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ بھی اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں؟''
''گھوڑوں کے بارے میں..... صرف گھوڑوں کے بارے میں۔ گدھوں پر میں نے کوئی ریسرچ نہیں کی۔'' نواب صاحب بدستور ہنستے ہوئے بولے۔ ''ویسے تنویر! تم نے کسی کو اتنی سنجیدگی سے مذاق کرتے دیکھا ہے؟''
''بہتر ہے نواب صاحب!...... میں اس گھوڑے کی طرف سے ہر چیلنج قبول کروں گا۔ بس اب میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' طالوت نے غصیلے انداز میں کہا اور سب ہنستے رہے۔
چند منٹ کے بعد سائیس آ گیا۔ اُس نے جھک جھک کر سلام کیا تھا۔ اور پھر وہ ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ طالوت نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ گھوڑا تمہارا ہے؟''
''جی..... جی سرکار!'' سائیس نے جواب دیا۔
''کہاں سے حاصل کیا تھا؟ مجھے اس کے بارے میں تفصیل بتاؤ۔''

''جی سرکار!...... وہ ہمارا ایک واقف کار ہے، رمضانی۔ یکہ چلاتا ہے۔ تین سال سے اس کے پاس تھا اور اس کے دال دلیے کا سہارا تھا۔ پھر ایک دن اس کی ٹانگ میں کتے نے کاٹ لیا اور زخم خراب ہو گیا۔ رمضانی اسے چلاتا رہا۔ اور جب بالکل ہی نہ چل سکا تو وہ مایوس ہو گیا اور ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اس کا جو بھی مل جائے، بکوا دوں۔ لنگڑا گھوڑا کون خریدتا صاحب! میں نے دو چار آدمیوں سے بات کی۔ کوئی پچاس بھی دینے کو تیار نہ ہوا۔ مگر رمضانی کی حالت خراب تھی۔ اُس کے بچے بھوکے مرنے لگے۔ تھوڑے سے پیسے اس کے پاس تھے، لیکن ان سے وہ گھوڑا نہیں خرید سکتا تھا۔ ہم نے اس کی مدد کی سرکار! اور پچھتر روپے اسے دے دیئے۔ یہی ہم کر سکتے تھے۔ اُس کا کام چل گیا اور اس نے زبردستی اسے ہمیں دے دیا۔ اس نے کہا کہ ویسے بھی وہ اسے چھوڑ دے گا۔ کہاں سے کھلائے گا اس بیکار جانور کو۔ تو ہم اسے لے آئے۔ ہم نے سوچا، ہم اس کا علاج کریں گے۔ اور ہماری قسمت سے اس کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب تو یہ خوب چل لیتا ہے سرکار!..... ہمارا گاؤں تھوڑی دُور ہے۔ جب ہم وہاں جاتے ہیں تو اسی پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔'' سائیس نے سادگی سے کہا۔

''اُف...... اُف...... اس نایاب گھوڑے کی یہ بے قدری..... یقیناً اس کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ تین سال تک یکے میں جُتا رہا۔'' طالوت نے کہا۔

نواب صاحب اور تنویر صاحب بے ساختہ قہقہے لگا رہے تھے۔

''تم یہ گھوڑا بیچو گے سائیس؟'' طالوت نے انہیں نظر انداز کر کے پوچھا۔

''اس کی کیا حیثیت ہے سرکار!..... خادم ہیں آپ کے۔''

''کیا قیمت لو گے اس کی؟''

''کچھ نہیں مائی باپ!..... یہ ہے کس قابل؟''

''اوہ، بے وقوف!..... اس عظیم المرتبت گھوڑے کی توہین مت کرو۔ تم کیا جانو اس کے بارے میں۔ غریب رمضانی کو بھی زبردست خسارہ ہوا ہے۔ لیکن کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کی قیمت مقرر کرتا ہوں۔ صائم بھائی! آپ کی جیب میں بیس ہزار روپے ہوں گے؟'' طالوت نے اچانک مجھ سے پوچھا اور میں بوکھلا گیا۔

''کیا......؟'' نواب صاحب اور تنویر صاحب بیک وقت بولے۔

''اوہ، میں..... میں پیسے تو نہیں لایا۔'' میں نے جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنے قلاش کب سے ہو گئے صائم بھائی! کہ آپ کی جیبوں میں دس بیس ہزار بھی نہ نکلیں۔ دیکھئے تو سہی۔'' طالوت کے لہجے میں ایک خاص انداز تھا۔ میں نے طویل سانس لے کر جیبیں ٹٹولیں اور بھلا میری جیبوں میں گڈیاں کیوں نہ ہوتیں۔ میں نے وہ گڈیاں نکال لیں۔ طالوت نے انہیں میرے ہاتھ سے اُچک لیا تھا۔

''یہ دس ہزار روپے رمضانی کو بھجوا دو۔ کسی غریب کی غربت سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہئے۔ اسے اس کے مال کی قیمت ملنی ہی چاہئے۔''

''عادل.....!'' تنویر صاحب بے چین ہو کر بولے۔

''اور یہ دس ہزار تمہارے۔ میرا خیال ہے گھوڑے کی خدمت کر کے، اسے ٹھیک کرنے کا یہ معاوضہ کم

نہیں ہے۔'' طالوت نے تنویر صاحب کے احتجاج پر توجہ دیئے بغیر کہا۔
سائیس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ اُس نے اس انداز میں ایک ایک کی شکل دیکھی، جیسے یہ سب اُس کا مذاق اُڑانے آئے ہوں۔
''کیوں..... کیا یہ رقم کم محسوس ہو رہی ہے؟ پھر تم بتا دو بھئی، کیا لو گے؟'' طالوت، سائیس سے بولا۔
''عادل میاں! یہ غلط ہے۔ نہیں نہیں، یہ غلط ہے۔ گھوڑا آپ کی نذر کیا جا چکا ہے، براہِ کرم پیسے واپس لے لیں۔'' تنویر صاحب نے آگے بڑھ کر مداخلت کی۔
''اوہ، گویا آپ کو یہ سودا منظور نہیں ہے؟'' طالوت بولا۔
''سودے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ رقم.....''
''میں اسے اسی قیمت پر خریدوں گا۔ اگر آپ نے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا تو پھر میں اسے قبول نہیں کر سکوں گا۔ معاف کیجئے، مجھے ہمیشہ یہ احساس رہے گا کہ یہ گھوڑا بے حیثیت ہے۔''
''لیکن سنیں تو سہی۔ اس نے اسے پچھتر روپے میں خریدا ہے۔''
''یہ اس کی حماقت ہے، میری نہیں۔''
''اچھا، آپ کی طرف سے میں اسے ادائیگی کر دوں گا۔''
''ایک ہی بات ہے تنویر صاحب! براہِ کرم اس معاملے میں مداخلت نہ کریں۔''
''لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے۔''
''اوہ، ہاں..... شاید آپ ناراض ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کے اصطبل میں آ کر خرید و فروخت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ خیر سنو!'' اس بار اس نے سائیس کو مخاطب کیا۔ ''اگر تم یہ گھوڑا اس قیمت پر فروخت کرنا چاہو تو یہاں سے باہر آ کر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔''
''تنویر.....!'' نواب جلال الدین نے مداخلت کی۔
''جی بھائی صاحب!''
''جو ہو رہا ہے، ہونے دو۔ اور خوشی سے ہونے دو۔''
''لیکن بھائی صاحب! کیا یہ اس گھوڑے کی قیمت ہے؟''
''صائم بھائی!'' طالوت نے مجھے پکارا۔
''فرمایئے۔''
''ایک گڈی اور ہو گی؟''
''یقیناً۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گڈی اور نکال لی۔
''پندرہ پندرہ ہزار دونوں کے۔ اب تو ٹھیک ہے تنویر صاحب؟''
''تنویر!..... میں کہتا ہوں، مداخلت مت کرو۔'' نواب جلال الدین بولے۔ ''شہزادوں کو جو چیز پسند آتی ہے، وہ اسے شایانِ شان قیمت ادا کر کے ہی خریدتے ہیں..... لے لو میاں! یہ رقم لے لو۔ لیکن رمضانی کو پندرہ ہزار آج ہی پہنچ جانے چاہئیں۔ اس سے معلوم کر لیا جائے گا۔'' نواب جلال الدین بولے۔
اور تنویر صاحب خاموش ہو گئے۔ نوٹ لیتے ہوئے سائیس بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تب طالوت نے کہا۔

''ہاں، آپ سے ایک رعایت ضرور طلب کروں گا، تنویر صاحب!''
''ہاں ہاں، ضرور۔'' تنویر صاحب پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔
''یہ گھوڑا یہاں پر ہی رہے گا۔ میں یہاں آ کر ہی اس کی تربیت کروں گا اور اسے آئندہ ریس کے لئے تیار کروں گا۔''
''ضرور......ضرور......اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟''
''تو بھئی آج سے تم اس کی خصوصی نگرانی کرو گے۔ اور اس کے لئے جو غذا تجویز کروں، اسے قاعدگی سے دو گے۔'' طالوت، سائیس سے بولا۔ سائیس کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔
''آیئے نواب صاحب! چلیں۔'' طالوت نے کہا اور سب واپس چل پڑے۔ تنویر صاحب بے حد نجیدہ ہو گئے تھے۔ راستے میں نواب جلال الدین نے ان کی شکل دیکھی اور ہنس پڑے۔
''کیا ہو گیا تنویر؟'' انہوں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔
''کچھ نہیں بھائی صاحب!''
''میاں! احمق ہو نرے۔'' نواب صاحب بولے۔ ''کیا تم نے سنا نہیں تھا کہ سائیس نے کیا کہا تھا؟''
''کیا؟'' تنویر صاحب چونک کر بولے۔
''اُس نے کہا تھا، رمضانی کے پاس دوسرا گھوڑا خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے اور اس کے بچے وکے مر رہے تھے۔ کیا پندرہ ہزار سے اُس کی زندگی نہیں سدھر جائے گی؟ اور کیا تمہارا سائیس اس رقم سے اپنے سارے دُکھ دُور نہیں کر لے گا؟ کیا تمہارے خیال سے میں احمق ہوں کہ بلاوجہ ان لوگوں کے ن گاتا رہوں؟''
''خدا کی قسم!......خدا کی قسم!...... میں نے ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس پر زندگی بھر رمندہ رہوں گا۔'' تنویر صاحب نے جذباتی لہجے میں کہا۔
''آپ زیادتی کر رہے ہیں نواب صاحب!'' طالوت نے مداخلت کی۔
''کیا عادل میاں؟''
''یہ گفتگو کر کے آپ میرے عظیم المرتبت گھوڑے کی توہین کر رہے ہیں۔''
''اوہو...... معافی چاہتا ہوں...... معافی چاہتا ہوں۔'' نواب صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ تنویر احب بھی تھکی تھکی سی ہنسی ہنس رہے تھے۔
ہم واپس اس جگہ پہنچ گئے، جہاں سے چلے تھے۔ تمام لوگ ہمارے منتظر تھے اور بور ہو رہے تھے۔
رحال، واپسی کا پروگرام بنا اور اس طرح یہ دلچسپ پکنک ختم ہو گئی۔
لیکن ہماری موجودگی اور نواب صاحب کے آ جانے سے ہر وقت قہقہے رہتے تھے۔ پکنک کی جگہ ہو یا م، دلچسپ پروگرام بنتے رہتے۔ خاص طور پر جب سے افشاں سے میری بات ہوئی تھی، نہ جانے کیوں راول بھی یہاں لگنے لگا تھا۔ حالانکہ میری کیفیت سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ دنیا کی ساری دلچسپیاں مل ہو چکی تھیں اور عورت میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ عورت ہی نے تو میری زندگی میں کانٹے لے تھے۔ اور سچ بات یہ ہے کہ عورت ہی میری زندگی میں نت نئے موڑ لائی تھی ورنہ شاید آج تک لست برادرز میں کلرک ہوتا۔

سوئم

لیکن آج پھر عورت مجھے اجنبی اجنبی لگ رہی تھی۔ آج پھر میرے دل میں وہ پاکیزگی اور تقدس لئے جلوہ گر ہو گئی تھی۔ آج پھر میں نے افشاں کی آنکھوں سے لڑھکتے ہوئے موتیوں میں محبت پائی تھی۔ دیکھیں، یہ محبت راس بھی آتی ہے یا نہیں۔ اور یہ بہر حال، طالوت کی بدمعاشی تھی۔ اس نے مجھے زبردستی عشق کروایا تھا۔ اور پھر بدمعاش نے کس چالاکی سے میرے منہ سے سب کچھ اُگلوا لیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، اس کے بعد اچانک یہ دنیا زیادہ حسین لگنے لگی تھی۔

مجھے طالوت کی ناراضگی کا احساس تھا اور بہر حال میں اسے ناراض نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جونہی موقع ملا، میں نے اسے گھیر لیا۔ ''تو آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' طالوت منہ پھلا کر بولا۔

''یار! واقعی ناراض ہو گئے۔'' میں نے اُداس لہجے میں کہا اور طالوت چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''اُلّو بنا رہے ہو؟'' اُس نے کہا۔

''نہیں طالوت! میں تمہاری ناراضگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! دنیا میں تمہارے علاوہ میرا ہے بھی کون؟...... اگر تم ناراض ہو گئے ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ یقین کرو، تمہارے کہنے سے تو میں اس حماقت پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ ورنہ عورت میری زندگی میں جو حیثیت رکھتی ہے، تمہیں معلوم ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو طالوت! عورت نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔ جیل میں سڑ رہا ہوتا یا پھر پھانسی پا چکا ہوتا۔ میری تو پوری زندگی ہی دوسروں کے سہارے گزری ہے۔ اگر تم مجھے نہ سنبھال لیتے تو عورت مجھے کہاں پہنچا چکی ہوتی۔ اسی لئے کسی کے معاملے میں سنجیدہ ہونے کو تیار نہ تھا۔''

''افشاں ایسی نہیں ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''میں اس پر الزام نہیں لگاؤں گا۔ لیکن تم میرے زخموں کا احساس کیوں نہیں کرتے؟''

''مجھے احساس ہے۔''

''بس یہی بات تھی کہ میں کسی کے معاملے میں سنجیدہ ہونا نہیں چاہتا۔''

''جب یوسف عبران سنجیدہ ہو گیا ہے تو تمہیں بھی سنجیدہ ہونا پڑے گا۔''

''میں نے تمہاری بات سے کب انکار کیا ہے طالوت!''

''مگر یار!..... یہ زبردستی کا عشق نہیں چلے گا۔ تمہیں سنجیدہ ہونا پڑے گا۔''

''اور اگر کچھ اور زخم مل گئے طالوت!......تو؟''

''میرا خیال ہے، نہیں ملیں گے۔ خدا کی قسم! وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔''

''ہاں، مجھے احساس ہے۔''

''بس تو پھر توہمات کو ذہن سے نکال دو۔ پوری دلجمعی سے عشق کرو کہ عشق ہی زندگی ہے، عشق اللہ خدا ہے۔ عشق عشق..... صرف عشق۔ باقی دنیا فالتو ہے۔ بیکار..... بالکل بیکار۔''

''کر تو لیا بھائی!.....اب تو ناراض نہیں ہے؟''

''ارے میری جان! میں تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں؟'' طالوت نے مجھے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

اسی وقت کمال نے دروازے پر دستک دی۔

''آ جاؤ......کون ہے؟''

''قاصد۔'' کمال اندر داخل ہوکر مسکراتے ہوئے بولا۔
''کیا پیغام ہے؟..... کس کا پیغام ہے؟''
''کھانے کی میز پر انتظار ہو رہا ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔
''ارے کھانے کا وقت ہوگیا؟'' طالوت چونک کر بولا اور ہم دونوں کمال کے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ ''یہاں کھانے پینے کی مصروفیت کچھ زیادہ ہی رہتی ہے۔'' راستے میں طالوت نے کہا اور کمال ہنسنے لگا۔
کھانے کی میز پر ہمارے علاوہ سب پہنچ چکے تھے۔ نواب صاحب وغیرہ نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سب دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔
''بیٹھو بھئی۔ اس وقت تمہارے گدھے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔'' نواب صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔
''ارے بیٹے! یہ دولت کیوں لٹاتے پھر رہے ہو؟ سنا ہے، تم نے تیس ہزار روپے کا ایک گدھا خریدا ہے۔'' بڑی ماں ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔
''نہیں بڑی ماں!..... وہ ایک مظلوم گھوڑا تھا۔ آپ دیکھیئے نا، بعض اوقات اعلیٰ خاندان کے لوگ اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں اس قدر لاچار ہو جاتے ہیں کہ خود انہیں اپنی اعلیٰ نسبی پر شک ہونے لگتا ہے۔ دوسرے لوگ انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر آپ انہیں پہچان کر انہیں ان کی صحیح جگہ دے دیں تو یہ کیا بری بات ہے؟'' طالوت نے کہا۔
''ہرگز نہیں۔'' بڑی ماں بولیں۔
''بس میں نے اس ستم رسیدہ گھوڑے کے ساتھ یہی کیا ہے۔'' طالوت نے کہا اور ستم رسیدہ گھوڑے پر سب ہنس پڑے۔
''افسوس! آپ اس گھوڑے کی عظمت نہیں پہچان سکے۔ لیکن خیر..... نہ گھوڑا دور ہے، نہ میدان۔'' طالوت سنجیدگی سے بولا اور سب ہنستے رہے۔
''وہ تو ٹھیک ہے بھئی..... لیکن تم نے میرے ہاتھ سے سائیس نکلوا دیا۔'' تنویر صاحب بولے۔
''کیا مطلب؟''
''ارے اس کی جیب میں پندرہ ہزار روپے ہیں۔ اب وہ گھوڑوں کو کیا خاطر میں لائے گا؟''
''یہ رقم اُسے کہیں اور سے بھی مل سکتی تھی۔ کیا آپ تقدیر کے قائل نہیں ہیں؟''
''ہوں بھئی۔ اچھی طرح ہوں۔ اور تم سے بحث بھی نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے، کھانا شروع کیا جائے۔'' تنویر صاحب نے کہا اور کھانا شروع ہوگیا۔
کھاتے کھاتے میری نگاہ، افشاں کی طرف اُٹھ گئی اور میرے ذہن میں سرور کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ افشاں میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سا خمار تھا، جو اس سے قبل نہیں آیا تھا۔ مجھ سے نگاہیں ملتے ہی اُس کے ہونٹ شرمگیں انداز میں کھنچ گئے اور نگاہیں جھک گئیں۔
''ہا.....'' میں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔ خاتون! شاید آپ کی زندگی میں محبت کا کھیل پہلی بار ہی آیا ہو۔ لیکن میں یہ شرم، یہ مسکراہٹ کئی بار دیکھ چکا ہوں اور اس کے بارے میں میرا تجربہ خاصا وسیع ہے۔ کچھ اچھے خیالات نہیں رکھتا۔ خدا کے واسطے آپ میرے ان خیالات کی تجدید نہ کریں بلکہ جب قدم بڑھایا ہے تو کسی منزل تک ہی پہنچا دیں۔ ورنہ اس کے بعد خود کو جینے کے لئے تیار نہ کر سکوں گا۔ ایسا

نہ ہو کہ آپ ہی میری موت کا سبب بن جائیں۔

کھانا جاری رہا۔ اور پھر ختم ہو گیا۔ سب لوگ اُٹھ گئے۔ یہاں کے لوگوں میں یہ عمدہ بات تھی کہ عمر کے تعین کے ساتھ ہی ساتھی متعین کر لیتے تھے۔ حالانکہ تنویر صاحب اور نواب جلال الدین ہم دونوں سے کافی بے تکلف تھے۔ لیکن وقت کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے وہ زبردستی ہم میں گھسنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی نوجوانوں کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اور ہم لوگ ایک گروہ کی شکل میں جمع ہو گئے۔

''ہاں تو خواتین و حضرات! کیا حکم ہے؟'' افشاں نے سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے تمہیں کون حکم دے سکتا ہے؟'' سیمیں مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہیں سیمیں باجی! پلیز بتایئے، کیا موڈ ہے پبلک کا؟''

''کس بارے میں بھئی؟''

''کل کے پروگرام کی تجدید کی جائے یا کوئی اور پروگرام؟''

''پبلک کی رائے تو پبلک ہی سے پوچھنی چاہئے۔''

''بھئی میرا تو خیال ہے، آج ہم لوگوں نے خاصی آوارہ گردی کی ہے۔ تھکن بھی سوار ہے۔ کیوں نہ آج کے اس خوب صورت پروگرام کو ذہن میں بسائے ہوئے بستروں میں پہنچ جائیں اور اسی کے خوابوں میں سو جائیں۔ ویسے یہ اس ناچیز کی ذاتی رائے ہے۔ اور اگر خواتین و حضرات کا اس پر اتفاق نہ ہو سکے تو خادم ہر پروگرام میں شامل ہے۔'' احسان نے کہا۔

''میرا خیال ہے، احسان صاحب کی رائے درست ہے۔'' طالوت فوراً بولا۔

''بس تو پھر طے...... خدا حافظ!'' افشاں نے کہا اور تمام لوگ ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سب کی دلی خواہش یہی ہو۔ اس کی وجہ تھکن ہی ہو سکتی تھی۔

میں اور طالوت اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ لباس تبدیل کئے اور مسہریوں پر پہنچ گئے۔ طالوت کسی خیال میں گم تھا۔ میں بھی خاموش لیٹا رہا۔ کافی دیر کے بعد طالوت نے گردن اُٹھائی۔

''عارف کے بچے!..... باز نہیں آؤ گے؟''

''خیریت.....؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دفع نہیں ہو گے یہاں سے؟''

''ارے ارے، کیا ہو گیا تمہیں؟'' بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ابے تو کیا سونے کے لئے میں نے سب کو بھگایا ہے؟'' طالوت جھلّا کر بولا۔

''اے جن زادے!..... بخدا تیری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو اے آدم زا! تُو بھی غور سے سن لے، میں نے کوئی تربیت گاہِ عشق نہیں کھولی۔ تُو جس اناڑی پن کا مظاہرہ کر رہا ہے، اس سے اظہار ہوتا ہے کہ تُو نے صرف لڑکیوں سے فلرٹ کیا ہے، عشق نہیں۔ اور تیرے ساتھ لڑکیوں نے جو سلوک کیا ہے، اس میں اُن کا قصور نہیں بلکہ تیرا تھا۔''

''جی ہاں..... ٹھیک ہے۔ ممکن ہے، ایسا ہی ہو۔ لیکن اب آپ بکواس کریں کہ کیا مقصد ہے؟''

''یار! خود بھی غور کیا کر..... دن میں شکیلہ سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہو سکی۔ یہ کمبخت لڑکیاں اور لڑکے

بڑی خوفناک نگاہیں رکھتے ہیں۔ کمبخت دن بھر ہمیں ہی تاڑتے رہے۔ چونکہ ان کے منحوس کانوں میں بھنک پڑ چکی ہے، درجنوں بار انہوں نے مجھے اور شکیلہ کو تنہائی کا موقع دیا اور خود تاک میں رہے کہ ہماری گفتگو سن سکیں۔ لیکن بہرحال، تیرا یار اتنا احمق بھی نہیں ہے۔"

"اوہ، تو یوں کہیئے، اس لئے یہ تقریر جھاڑی جا رہی ہے۔"

"نہیں یار!..... سمجھا کرو۔ بات صرف میری نہیں ہے، تیری بھی ہے۔"

"الحمدللہ، میں خیریت سے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا آج ہی فیل ہو جانا چاہتے ہو؟"

"کیوں؟"

"کیا تمہارے خیال میں اُسے آسانی سے نیند آ جائے گی؟"

"کسے؟"

"افشاں کو۔"

"کیوں..... کیا وہ بے خوابی کی مریضہ ہے؟"

"دیکھو عارف! مجھے غصہ مت دلاؤ۔ تمہیں چاہیئے، اس کے کمرے کی عقبی کھڑکی پر جاؤ، دستک دو اور اسے باغ میں چلنے کی پیشکش کرو۔"

"واہ اناڑی اُستاد..... رہے نا جن کے جن۔ پہلے ہی مرحلے پر مروا دو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"صاحبزادے! خوش نصیب ہو کہ ریڈی میڈ عشق مل گیا۔ کچھ کوششیں کرنا پڑتیں تو یقیناً منہ کی کھاتے۔ ارے وہ ایک شریف لڑکی ہے اور یہ حرکت قطعی غیر شریفانہ۔ کیا سوچے گی وہ اپنے دل میں؟" میں نے کہا۔

"بس یہی سوچے گی کہ عجیب عاشق ملا ہے، جو دن بھر اطمینان سے تارے گنتا ہے اور رات کو آرام سے سو جاتا ہے۔"

"کچھ بھی سوچے، میں ایسا نہیں کروں گا۔ ویسے کیا شکیلہ یہاں آئے گی؟"

"کیوں نہیں آئے گی۔ میں کوئی کچا عاشق ہوں؟"

"ٹھیک ہے، تب میں باغ میں چلا جاتا ہوں۔"

"یار! برا تو نہیں مانے گا؟" طالوت جھینپے ہوئے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ پھر میں کمرے سے نکل آیا۔ عشق و محبت کی باتیں تھیں، میں درمیان میں کیوں دخل دیتا؟ ویسے دونوں کے کردار سے میں پوری طرح مطمئن تھا۔ طالوت ایک ٹھوس کردار کا نوجوان تھا اور شکیلہ انتہائی پاکیزہ فطرت۔ ان دونوں کی تنہائی میں شیطان کبھی نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں باغ کی طرف چل پڑا۔

چاند نہیں نکلا تھا۔ لیکن اس کے آثار آسمان کے آخری سرے پر نمودار ہو رہے تھے۔ باغ کی فضا بے حد خوشگوار تھی۔ فرحت بیز ہوا کے جھونکے روح کو معطر کر رہے تھے۔ مجھے اس تنہائی میں بے حد سکون کا احساس ہوا اور ایک خوب صورت تختے کے نزدیک میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بیٹھا رہا، پھر لیٹ گیا۔

نرم گھاس مخمل کے فرش کے مانند تھی۔ سکون..... بے پناہ سکون..... لیکن پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر میں چونک پڑا اور جلدی سے اُٹھ گیا۔

تاروں کی چھاؤں بھی اتنی تھی کہ کسی کو پہچانا جا سکے۔ اور افشاں کو دیکھ کر میرا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ کافی قریب آ چکی تھی اور بے حد گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں..... میں انتہائی شرمندہ ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ارے، ارے..... آیئے افشاں!..... کیوں، آپ شرمندہ کیوں ہیں؟''

''میں نے آپ کے سکون میں مداخلت کی ہے۔'' وہ چوروں کے سے انداز میں بولی۔

''یہ آپ کو کیسے معلوم؟'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

''یہی کہ آپ نے مداخلت کی ہے۔''

''تو پھر؟''

''ممکن ہے، میں اس وقت آپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اور آپ غور کریں، کسی کے بارے میں سوچا جائے اور وہ اچانک آ جائے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔''

افشاں کئی منٹ تک کچھ نہیں بولی تو میں نے ہی کہا۔ ''اور اب آپ اجنبیوں کی طرح کھڑی ہی رہیں گی؟''

''اوہ، معافی چاہتی ہوں۔'' وہ میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس قرب میں بڑا اعتماد، بڑی اپنائیت تھی۔

''آپ خاموش کیوں ہیں؟''

''ویسے ہی۔''

''چاندنی پسند ہے آپ کو؟''

''ہاں۔''

''اور تنہائی؟''

''نہیں۔'' افشاں نے جواب دیا۔ اس کے انداز میں کسی قدر شوخی تھی۔

''اور افشاں صاحبہ! جو قرب آشنا ہی نہ ہو؟'' میں نے نہ جانے کس خیال کے تحت کہا اور افشاں نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''اپنی طرف بڑھنے والوں کی پذیرائی ہی نہیں کی ہوگی آپ نے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''شاید کوتاہی میری ہی ہو۔''

''عادل صاحب کی نسبت آپ سنجیدہ ہیں۔''

''بڑا جو ہوں اس سے۔''

''کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوتا آپ دونوں میں۔''

''اب تو آپ پہچان لیتی ہیں۔''

''ہاں۔'' افشاں نے ایک شرمگیں مسکراہٹ سے کہا۔ میں بھی مسکرانے لگا۔ اس وقت دل سے ساری محرومیاں دُھل گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے دوبارہ پیدا ہوا ہوں۔ دوبارہ جوان ہوا ہوں..... اور افشاں

میری زندگی کی پہلی لڑکی ہے۔ اس سے قبل کبھی اتنی فرحت، ایسا انوکھا پن محسوس نہیں کیا تھا۔
اس کے بعد ہم دونوں کئی منٹ تک خاموش رہے۔ افشاں گردن جھکائے گھاس کرید رہی تھی۔
”کیا آپ نے مجھے دیکھ لیا تھا، مس افشاں؟“
”ہاں۔“
”کہاں سے؟“
”کھڑکی میں کھڑی تھی۔“
”کیوں؟“
”نیند نہیں آ رہی تھی۔“
”یہی کیفیت میری تھی۔“ میں نے جواب دیا۔
”آپ نے اُس وقت کیوں نہ کہا کہ آپ کو نیند نہیں آ رہی۔ کوئی پروگرام ہی رکھتے۔“
”تنہائی کو دل چاہ رہا تھا۔“
”اوہو...... تب تو میری بات درست ہے۔ یعنی میں نے مداخلت کی ہے۔“
”افشاں!..... گستاخ ہونے کو دل چاہ رہا ہے، اگر اجازت دیں۔ آپ کی آمد نے تو وہ خلا پُر کر دیا ہے، جس کے پُر ہونے کی دل نے بارہا آرزو کی تھی۔“ اور افشاں کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ وہ خاموشی سے گھاس کریدتی رہی۔ پھر نہایت صاف ستھرے لہجے میں بولی۔
”صائم صاحب! آپ کے خیال میں میری عمر کیا ہوگی؟“
”کیوں؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔
”میری عمر بائیس سال ہے۔ کسی حادثے کے تحت نہیں بلکہ قدرتی طور پر۔ میرے خیال میں، میں اپنی عمر سے دس سال آگے بڑھ گئی ہوں۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو میں یہ کہوں کہ میری عمر بتیس سال ہے۔“
”ماشاء اللہ!“ میں نے کسی قدر شوخی سے کہا۔
”اور یہ عمر کم نہیں ہوتی صائم صاحب!“
”ظاہر ہے، بڑھاپے کی آمد آمد ہوتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ لیکن افشاں کے چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔
”میں ایک مشرقی لڑکی ہوں اور بے حد خودسر ہوں۔ لیکن اگر آپ یقین کریں تو بتا دوں کہ میں نے بہت سے ممالک کی سیر کی، بہت کچھ دیکھا، لیکن ضمیر پر کوئی داغ نہیں لگنے دیا۔ اور میں آج خود کو فخر سے مشرقی کہہ سکتی ہوں۔ البتہ میں نے کچھ تجربات ضرور کیے ہیں۔ میں نے کچھ حاصل بھی کیا ہے۔“
”اوہ!“ افشاں کی سنجیدہ گفتگو پر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔
”ہاں صائم صاحب! میں نے سیکھا ہے کہ پاکیزگی کی حدود نہیں ہوتیں۔ ضمیر اگر صاف رہے تو زندگی بوجھ نہیں بنتی، جبکہ نگاہ کے راستے بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اور ان کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنی زندگی کو بے مقصد سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، اب کیا کرے۔ اور پھر یہ بوجھل زندگی اُسے عذاب لگنے لگتی ہے اور اس کا نتیجہ بھیانک ہی ہوتا ہے۔ انسان اگر زندہ بھی رہے تو ضمیر کی ہولناک چیخیں اسے مضطرب رکھتی ہیں۔ صائم صاحب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ صاف ہوں تو اس قدر کہ والدین کی

مرضی کے بغیر، ان سے چھپ کر بلکہ مجرمانہ انداز میں سیاحت کا شوق پورا کیا۔ چرب زبانی سے کام نہیں لے رہی، اپنی شخصیت کو عریاں کر رہی ہوں۔ مشرق کی حیا اپنی جگہ، لیکن زندگی گزارنے کی خواہش کے اظہار کو بے حیائی نہیں سمجھتی۔ میں آپ کی شکل وصورت، آپ کے کردار اور آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوں۔ خدا کی قسم! اگر کسی بہت بڑے ملک کے شہزادے بھی ہوتے تو میرے لئے قابل اعتنا نہ تھے۔ لیکن آپ اپنی اسی شخصیت، اسی کردار کے ساتھ کسی دفتر کے معمولی کلرک ہوتے اور کسی طور میری آپ سے ملاقات ہو جاتی تو اپنی پسند کے اظہار سے باز نہ رہتی۔ صائم صاحب! اسے میرا اظہار عشق سمجھ لیں، میری آرزو سمجھ لیں یا میری بے حیائی۔ یہ سب کچھ میں آپ سے صرف ایک بار کہوں گی، اس خوف سے بے نیاز ہو کر کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

بڑی سلجھی ہوئی، بڑی انوکھی اور بڑی جذباتی گفتگو تھی۔ ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہو رہا تھا۔ میں حیرانی سے اس کچی عمر کی جہاندیدہ لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کو پسند کرتی ہوں صائم صاحب! میں آپ سے چھپ چھپ کر نہیں ملوں گی، ہم ایک دوسرے سے گھٹیا طور پر رومان نہیں کریں گے۔ بلکہ اگر..... بلکہ اگر آپ کے حالات اجازت دیں تو ہر پہلو سے سوچ کر، ہر خطرے، ہر اُلجھن کو مدِ نگاہ رکھ کر مجھے بتائیں کہ..... کہ کیا آپ مجھے زندگی بھر کا ساتھی منتخب کر سکتے ہیں؟''

یہ سوال میرے لئے خاصا سنسنی خیز تھا۔ مشورہ کس سے کرتا تھا؟ طالوت بدمعاش ہی میرا سب کچھ تھا، لیکن اسی نے تو مجھے اس کے لئے مجبور کیا تھا۔ اور اب یہ لڑکی میری زندگی کا ایک اہم کردار بن گئی تھی۔ چنانچہ اب اگر طالوت بھی مجھے اس سے شادی کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تو میں اس سے معذرت کر لیتا۔ ہاں، میری زندگی اب ایک ٹھوس حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ضمیر پر جھوٹ کا داغ ہی سہی، لیکن خدا کی مہربانی سے میں بھی زندگی گزارنے کے قابل بن گیا تھا۔ اس لئے اس سلجھی ہوئی لڑکی کو زندگی کا ساتھی نہ بنانے کا تصور بھی محال تھا۔ تاہم میں نے کچھ اور باتیں کرنا مناسب سمجھیں۔

''آپ کے جذبات میری خوش بختی ہیں افشاں لیکن اپنی چند مجبوریوں کو مدِ نگاہ رکھ کر میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔''

''بصد خوشی۔'' افشاں نے کھلے دل سے کہا۔

''فرض کریں، میرے والدین اس کی اجازت نہ دیں؟''

''یہ فیصلہ آپ کریں گے۔'' افشاں نے جواب دیا۔

''فرض کریں، آپ سے شادی کے بعد مجھے قلاش ہونا پڑے؟''

''میرے فیصلے پر اثر نہیں پڑے گا۔ میں آپ کو ہر حیثیت میں قبول کروں گی۔''

''بہت شکریہ۔ لیکن مس افشاں! خود آپ اس سلسلے میں کس قدر ثابت قدم رہیں گی؟''

''میں آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تنویر صاحب؟''

''میرے والدین روشن خیال ہیں۔''

''میری پوزیشن تو خراب نہیں ہو گی؟''

"یہ میری ذمے داری ہے اور میں اسے نبھانے کی کوشش آخری سانس تک جاری رکھوں گی۔"
"تب پھر مس افشاں! آپ ہی بتائیں، مجھے آپ سے اچھا زندگی کا ساتھی دوسرا کون ملے گا؟"
"جی؟"
"افشاں! آپ سن لیں، میں آپ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"
اور افشاں کے چہرے پر افشاں بکھر گئی۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔ "آپ..... آپ سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں صائم صاحب؟"
"ہاں افشاں!"
"آپ کی جانب سے کسی تعرض کی گنجائش؟"
"ہرگز نہیں۔"
"تب مجھے دعا دیں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ جب میں آپ سے درخواست کروں، اس وقت آپ عادل بھائی کے ذریعے یا پھر نواب جلال الدین کے ذریعے ابو سے کہلوا دیں۔"
"تعمیل ہوگی۔"
"صائم صاحب!" افشاں شرمائی سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"ارے ارے، بیٹھو افشاں!"
"اب نہ بیٹھ سکوں گی۔" اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ اور ایک دم چاند نکل آیا۔ چاندنی میں جھکی جھکی، شرمائی شرمائی لڑکی بے حد حسین لگ رہی تھی۔
"کیوں؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔
"صائم صاحب! میں..... میں بہرحال مشرقی بھی ہوں۔ اب مجھے شرم آ رہی ہے۔" افشاں نے کہا اور پھر وہ تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن روح میں بالیدگی اُتر گئی تھی۔ چاندنی ہمیشہ سے زیادہ روشن ہو گئی تھی۔ اور میں جیسے ایک نئی دنیا میں سانس لے رہا تھا۔ یہ دنیا ہمیشہ سے زیادہ حسین ہوتی ہے۔ روح کو سہارا مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا، وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر طالوت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ طالوت نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ چند منٹ کے بعد وہ میرے قریب پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر شرمندگی کے آثار تھے۔
"ارے، تم تنہا ہی بیٹھے ہو؟" اس نے کہا۔
"ہاں۔" میں مسکرا دیا۔
"یار! اس وقت تو زیادتی ہو گئی تمہارے ساتھ۔ میں نے سوچا تھا کہ تم بھی کسی طرح اپنا کام چلا لو گے۔"
"نہیں طالوت!..... زیادتی نہیں ہوئی۔"
"کیا مطلب؟"
"کام چل گیا تھا اور ضرورت سے زیادہ ہی چل گیا۔"

''کیا کہہ رہا ہے یار!.....صاف صاف کہہ۔''

''افشاں ابھی تھوڑی دیر قبل گئی ہے۔''

''اوہ! ویری گڈ۔ تیری استادی پر تو میں نے کبھی شبہ نہیں کیا۔'' طالوت میرے کندھے پر ہاتھ مار کر میرے نزدیک بیٹھ گیا۔

''شکیلہ چلی گئی؟''

''ہاں! بڑی شرمارہی تھی، اس بات پر کہ تم اس کی وجہ سے کمرہ چھوڑ کر فرار ہو گئے ہو۔ مگر اس وقت شکیلہ کے ذکر کو چھوڑو۔ تم سناؤ، کیا افشاں نے اس وقت آنے پر اعتراض نہیں کیا؟''

''میں نے اسے نہیں بلایا تھا۔''

''ونڈرفل۔ پھر؟''

''خود ہی آ گئی۔''

''نیک بچی ہے۔ جلدی جلدی آگے بڑھو۔ پھر کیا ہوا؟''

''بہت کچھ ہو گیا ہے طالوت! بات اتنی آگے بڑھ گئی کہ.....''

''ارے!'' طالوت کا منہ حیرت سے کھل گیا اور میں نے چونک کر اُس کی شکل دیکھی۔ احمق انسان، غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں جلدی سے بولا۔

''منہ بند کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ تمہارا منہ کھل جائے۔''

''اوہ!'' طالوت نے ایک گہری سانس لی۔ ''بات کو ڈرامائی انداز میں مت پیش کیا کرو۔ خوامخواہ منہ کا مزا کرکرا کر دیا تھا۔ ہاں کیا بات ہوئی، بتاؤ؟'' اور میں نے افشاں کی پوری گفتگو، طالوت کو سنا دی۔ طالوت خوشی سے اُچھل پڑا تھا اور پھر اُس نے بے ساختہ اُچھل کر مجھے دبوچ لیا۔ ''ارے زندہ باد میرے شیر! کیا گہرا رنگ مارا ہے۔ پھر اب؟''

''اب کیا طالوت؟''

''کیا فیصلہ کیا؟''

''اگر زندگی کا یہ اہم فیصلہ بھی تمہارے اوپر چھوڑ دوں طالوت؟'' میں نے اسے دیکھا۔

''تو میں فوراً تیرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دوں۔''

''یعنی؟''

''میری تو دلی خواہش ہے عارف!..... بہرحال، ہمیں زندگی کسی منزل تک لے جاتی تو ہے۔ یوں کب تک خوار پھرتے رہیں گے؟ اور عارف! سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ تیرے ہی وطن میں تیرے لئے مکمل آزادی ہو گئی۔ اب تُو یہاں آرام سے رہ سکتا ہے۔''

''بے شک، مجھے احساس ہے، وطن کیا شے ہوتی ہے۔''

''خدا اہلِ وطن کو کسی کا دشمن نہ بنائے۔''

''تو پھر بتایا نہیں عارف؟''

''کہہ تو چکا ہوں۔ میں کیا بتاؤں؟ میرا فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔''

''ہوں۔'' طالوت کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے عارف! اس کا فیصلہ اگلے چاند کریں گے۔''

''مناسب۔'' میں نے جواب دیا۔
''ویسے میں بہت خوش ہوں۔'' طالوت مسکراتے ہوئے بولا اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگا۔''اس کا مطلب ہے یار! کہ یہ افشاں بہت ستھری طبیعت کی لڑکی ہے۔''
''ہاں طالوت! میں اُس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''
''متاثر ہونے کی بات بھی ہے۔ ہم اس سے یہ توقع نہیں رکھتے۔ چل یار! اب سوئیں گے۔ رات کافی گزر چکی ہے۔'' اور ہم دونوں اُٹھ کر کمرے کی طرف چل پڑے۔
''مجھے بھی کچھ پوچھنے کی اجازت ہے؟'' میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے پوچھا۔
''ضرور!''
''تم نہیں بتاؤ گے، تمہارے اور شکیلہ کے معاملات کس حد تک پہنچے؟''
''بس سرحد کے قریب ہیں۔ چاند ڈوبنے پر والدہ صاحبہ کے پاس جاؤں گا اور ان سے بات کروں گا۔ آخری مرحلہ ہوگا، میرے لئے دعا کرنا۔''
''میری دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں میرے دوست!'' میں نے کہا اور طالوت مسکرانے لگا۔
دوسری صبح حسبِ معمول تھی۔ ناشتے کی میز پر گپیں ہوتی رہیں۔ سب کے موڈ خوشگوار تھے۔ افشاں کی گہرائی دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رات کو اس نے مجھ سے ایسی گفتگو کی ہوگی۔ جیسی روزانہ ہوتی تھی، ویسی ہی تھی۔
''ہاں بھئی، اپنے اس زرخرید کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟'' نواب جلال الدین بولے۔
''بس تھوڑی دیر کے بعد جاؤں گا۔''
''اخبار دیکھا آج کا؟''
''نہیں۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''آئندہ ماہ کی چھ تاریخ کو ایک عظیم الشان ریس ہے، جس پر زبردست انعام رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے نامی گرامی گھوڑے دوڑیں گے اس ریس میں۔ پوری تفصیل آئی ہے اخبارات میں۔''
''میرا عظیم المرتبت بھی دوڑے گا۔ کسی سے کم ہے؟'' طالوت نے کہا اور سب ہنس پڑے۔
''گویا تم نے اس کا نام ہی عظیم المرتبت رکھ دیا ہے؟''
''جی۔ وہ اسی قابل ہے۔ براہِ کرم آپ اسے اس ریس میں رجسٹر کرا دیں۔''
''شہزادہ عادل! براہِ کرم بتا دو، کیا تم سنجیدہ ہو؟''
''نواب صاحب! عظیم المرتبت سے مجھے دلی لگاؤ ہے۔ براہِ کرم اس کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات نہ کی جائے۔ اس پر کوئی شبہ نہ کیا جائے۔ اور کیا آپ اسے رجسٹر کرا دیں گے یا پھر میں ہی کوشش کروں؟''
''نہیں بھئی، ہم بھی اس تفریح میں حصہ لیں گے۔'' نواب صاحب ہنستے ہوئے بولے اور طالوت سر ہلا کر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔
ناشتے کے بعد طالوت نے تنویر صاحب سے گاڑی حاصل کی اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔
''تنہا جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔
''جی نہیں۔''

''تب میں تیار ہو جاؤں؟''
''جی نہیں..... ہرگز نہیں۔''
''پھر؟''
''مس شکیلہ کو بازار میں کچھ کام ہے، وہ میرے ساتھ جائیں گی۔''
''اوہ!'' میں مسکرا پڑا۔
''کوئی اعتراض ہے آپ کو؟''
''ہرگز نہیں۔ مس شکیلہ سے بات ہوئی ہے؟''
''کیوں بتاؤں؟''
''گویا اب آپ لوگ علی الاعلان سامنے آ گئے ہیں؟''
''الحمدللہ!'' طالوت نے خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ بہرحال میں نے خوشی سے اُنہیں جانے کی اجازت دے دی اور طالوت چلا گیا۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ نواب جلال الدین بھی کسی کام سے چلے گئے تھے۔ سیمیں اور احسان کسی سے ملنے چلے گئے تھے۔
نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔
''کون؟''
''حاضر ہو سکتی ہوں؟'' افشاں کی آواز تھی اور میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔
''تشریف لائیے۔'' میں نے جواب دیا اور افشاں مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔
''کیا ہو رہا ہے؟''
''بیکاری کا شغل۔'' میں نے جواب دیا اور افشاں مسکراتی ہوئی میرے سامنے بیٹھ گئی۔
''بور ہو رہے ہیں؟''
''ہرگز نہیں۔'' میں جلدی سے بولا۔
''پھر یہ تنہائی پسندی کیسی؟''
''الفاظ غیر معیاری بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''آپ کے سامنے میں ہوں جناب! اور اب ہمارا معیار جدا نہیں ہے۔''
''خدا کی قسم افشاں! یہ اپنائیت دلا رہی ہے۔'' اچانک میری آواز بھرّا گئی۔ بس، نہ جانے کیوں عجیب سا لگا تھا۔
''آپ اسے اپنا حصہ سمجھئے۔'' افشاں نے کہا۔ اس نے لاکھ ضبط کرنے کی، نڈر بننے کی کوشش کی لیکن اُس کی آنکھوں میں حیا آ گئی اور میں بے اختیار اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔
''افشاں!'' میں نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے، جو انسان کی سرشت نہیں ہوتی۔ لیکن جذبات بے پروا ہوتے ہیں، وہ سوچتے ہیں۔''
''ہاں شاید۔ ورنہ..... ورنہ میں اس بے باکی سے یہاں نہ آ جاتی۔'' افشاں نے نہایت خوب صورتی سے کہا اور میں بے اختیار ہو گیا۔

سچ مچ زندگی میں بے شمار پھول کھل گئے تھے۔ چاروں طرف خوشبوئیں بکھر گئی تھیں۔ ہر شے حسین نظر آنے لگی تھی۔ طالوت بھی شگفتہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ روزانہ ناشتے کے بعد وہ گھوڑے کو تربیت دینے نکل جاتے۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ طالوت گھوڑے کو کیا تربیت دے گا۔

بہرحال، ریس قریب آ گئی تھی۔ خود نواب جلال الدین اور تنویر صاحب نے کئی بار گھوڑے کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی، لیکن طالوت نے معذرت کر لی تھی۔

''میں اسے ریس کے میدان میں ہی آپ کے سامنے پیش کروں گا۔''

بہرحال، ہر طرف خوشیاں اور قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ بی افشاں خوب تھیں۔ شرماتی بھی تھیں اور جب اپنے تئیں جدید دور کی ایک فرد ہونے کا خیال آتا تو خاصی بے تکلف بننے کی کوشش کرتیں۔ بہرحال میں اس سے مطمئن ہو گیا تھا۔

اور پھر ریس کا دن آ گیا۔ نواب جلال الدین نے بھی اپنے گھوڑے منگوائے تھے اور ان کے ایما پر تنویر صاحب بھی ریس میں اپنا ایک گھوڑا لے آئے تھے۔

لیکن اس مریل ٹٹو کو میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ریس کورس میں خصوصی نشستوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ طالوت نے خود ہی کسی جیکی کو بھی انگیج کر لیا تھا۔ اور پھر جب ریس کورس میں طالوت کا گھوڑا آیا تو چاروں طرف ہلچل مچ گئی۔ طالوت نے اس کے پورے بدن کے بال صاف کرا دیئے تھے اور اسے کئی رنگوں میں رنگوا دیا تھا۔ انتہائی مضحکہ خیز ہو گیا تھا وہ۔ بال صاف ہو جانے سے اس کی ساری پسلیاں نظر آ رہی تھیں اور شکل کچھ اور بھیک مانگتی نظر آنے لگی تھی۔

چاروں طرف سے اسے دیکھ کر قہقہے اُبل رہے تھے۔ طالوت نے ان دونوں حضرات کو متنبہ کر دیا تھا کہ اپنے گھوڑے اس ریس میں نہ رکھیں، جس میں عظیم المرتبت دوڑ رہا ہو۔ بہرحال ان لوگوں نے اس کی بات مان لی تھی۔ لیکن وہ بمشکل تمام اس گھوڑے کو آج کی سب سے بڑی ریس میں رجسٹر کرا سکے تھے۔
اس ریس میں سارے نامی گرامی گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ ان کی جسامت اور شان دیکھنے کے قابل تھی۔

لیکن جب میں نے جیکی کو دیکھا تو ایک طویل سانس لی۔ جیکی کے لباس میں راسم تھا، جو خود بھی گھوڑے سے کم مضحکہ خیز نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچھا خاصا مزاحیہ پروگرام بن گیا تھا۔ طالوت سارے انتظامات کرانے کے بعد واپس ہم لوگوں میں آ گیا اور نواب جلال الدین اسے دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ طالوت بے حد سنجیدہ تھا۔

''بھئی واہ! کیا گھوڑا ترتیب دیا ہے۔ اور اس کے رنگ، کیا خوب..... کیا خوب!'' نواب صاحب نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

''اور جیکی..... آپ نے جیکی نہیں دیکھا نواب صاحب؟'' تنویر صاحب نے بھی اس مذاق میں حصہ لیا۔ اس سے قبل کہ طالوت کوئی جواب دیتا، اچانک احسان کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

''ارے انکل شمشیر!'' اور سب چونک پڑے۔

''کہاں ہے؟'' نواب جلال الدین بولے۔

''وہ دیکھئے۔'' احسان نے اشارہ کیا اور اسی وقت شمشیر کی نگاہ بھی ہم لوگوں پر پڑی۔ وہ بھی چونک پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا، ٹھٹکا اور پھر رُک گیا۔ طالوت بھی اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''زندہ باد!......آپ لوگوں نے جس قدر موڈ خراب کیا تھا، شمشیر کو دیکھ کر اتنی ہی فرحت ہوئی ہے۔''
''اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہے۔'' نواب جلال الدین بولے۔
''لیکن مخاطب تو نہیں ہوئے ابو!'' سیمیں نے کہا۔
''ارے تو کیا ہم اتنے بد اخلاق ہیں کہ اس سے ملاقات ہونے پر گفتگو بھی نہیں کریں گے؟''
''اوہو! وہ خاتون شاید ان کے ساتھ ہیں۔'' احسان نے کہا۔
''ممکن ہے، اس کی بیوی ہو؟''
''ہائے بے چاری۔ اگر بیوی ہے تو بدنصیب ہے۔ صورت سے تو بڑی پیاری لگ رہی ہے۔'' سیمیں نے کہا۔
''ارے صائم! تم کیا دیکھ رہے ہو؟ بلاؤ اُن نواب شمشیر الدولہ کو۔'' طالوت نے کہا اور میں شمشیر کی طرف بڑھ گیا۔ شمشیر طنزیہ انداز میں مسکرایا تھا۔
''ہیلو شمشیر صاحب! آپ یہاں؟.....بڑی مسرت ہوئی آپ کو دیکھ کر۔''
''خوب! تو گویا تم لوگ ابھی تک اس خاندان سے منسلک ہو؟''
''ہاں! ہم اس قدر بے مروّت نہیں، جیسے آپ۔ گئے تو پلٹ کر خبر نہ لی۔ آیئے، نواب صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔'' میں نے شمشیر کا طنز پی کر کہا۔
شمشیر کی ساتھی خاتون دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو شمشیر نے گردن اکڑا کر کہا۔ ''یہ مسز شمشیر ہیں۔''
''اوہ! بھابی آداب۔'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔
''آداب۔'' خاتون کی آواز بے حد شیریں تھی۔
''آیئے بیگم! نواب جلال الدین سے ملیں۔ غائبانہ آپ کا تعارف ہے؟''
''ہاں ہاں..... کیوں نہیں۔ وہ خوب صورت خواتین انہی کے ساتھ ہیں نا؟'' خاتون اُٹھتی ہوئی بولیں اور نواب شمشیر الدولہ اپنی بیگم کے ساتھ نواب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔
نواب صاحب اور دوسرے لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شمشیر کی بیوی بلاشبہ خوش اخلاق عورت تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ سب ہی کو بھلی لگی۔
''بڑے عرصے کے بعد نیاز حاصل ہوئے۔'' شمشیر الدولہ نے رسماً کہا۔
''ہاں میاں! تم نے تعلقات ہی ختم کر لئے۔ آؤ بیٹھو!'' نواب جلال الدین نے شمشیر کے لئے بھی جگہ بنا دی اور شمشیر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی کو لڑکیوں نے گھیر لیا تھا۔ سب ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے لگے۔
''اور سناؤ، کیا مشاغل ہیں؟''
''بزنس کر رہا ہوں اور اس شہر کا کامیاب ترین تاجر ہوں۔'' شمشیر اکڑ کر بولا۔
''ماشاء اللہ!...... ماشاء اللہ! بڑی مسرت ہوئی۔''
''لندن کا بھوت اُتر گیا؟'' نواب صاحب بولے اور شمشیر تحقیر آمیز انداز میں ہنسنے لگا۔
''بہر حال بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔ اور سناؤ، گھوڑے وغیرہ بھی رکھے ہوئے ہیں کیا؟''

''جی ہاں۔ بڑی ریس میں میرا ہٹلر دوڑ رہا ہے۔''
''ہٹلر...... بہت خوب۔ بڑا خوف ناک گھوڑا ہوگا۔''
''جی ہاں۔ وہ سیاہ گھوڑا آپ نے دیکھا ہوگا، جس کے سینے پر سفید نشان ہے؟''
''بھئی واہ..... بھئی واہ! شاندار گھوڑا ہے۔ کتنے گھوڑے ہیں آج کل؟''
''چار۔ لیکن میں نے صرف بڑی ریس میں حصہ لیا ہے۔'' شمشیر الدولہ نے جواب دیا اور پھر طنزیہ انداز میں بولا۔ ''بک میں آپ کا نام بھی نظر آیا تھا؟''
''ہاں بھئی، لیکن کوئی خاص پروگرام نہیں تھا۔ البتہ شہزادہ عادل نے ایک گھوڑا تیار کیا ہے، جو تمہارے ہٹلر سے مقابلہ کرے گا۔''
''کون سا؟'' شمشیر الدولہ چونک کر بولے۔
''عظیم المرتبت۔'' نواب صاحب نے کہا اور ہنس پڑے۔
''اوہو...... وہ رنگین گھوڑا؟'' شمشیر نے کہا۔
''ہاں!''
''لیکن قبلہ گستاخی معاف! کیا آپ جیسے سنجیدہ لوگوں کو یہ مسخرا پن زیب دیتا ہے؟..... یہ گھوڑا تو کسی تانگے سے نکالا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تمام لوگ ہنس رہے ہیں۔''
''ہٹلر کی دُم تو یہی اُکھاڑے گا، نواب شمشیر الدولہ!'' طالوت نے کہا اور شمشیر زہریلی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔
''تب پھر ہم ایک شرط بدلیں شہزادہ عادل!'' اس نے کہا۔
''ضرور..... ضرور۔'' طالوت جلدی سے بولا۔
''اگر ہٹلر اس ریس میں ہار جائے تو میں اسے گولی مار دوں گا اور آپ سے تو میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اس ٹٹو کو ہلاک کر دیں۔ اس سے فرق بھی کیا پڑے گا۔''
''ہاں، وعدہ کریں کہ اس کے بعد آپ ریس نہیں کھیلیں گے۔''
''منظور۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''ارے بھئی یہ کیا گفتگو شروع ہو گئی؟ شرط ورط نہیں ہو گی۔ پلیز شمشیر! اتنے اچھے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے، کچھ اچھی گفتگو کریں۔'' شمشیر کی بیوی نے درمیان میں مداخلت کی۔ ''گھوڑے دوڑے جائیں جہنم میں۔'' اور شمشیر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔
''آپ نے مجھے اب تک افشاں سے کیوں نہیں ملایا تھا؟''
''اوہو، بس کاروباری مصروفیات۔'' شمشیر کسی قدر رام ہو گیا تھا۔
''بڑے اچھے لوگ ہیں یہ..... اور انہیں تو دیکھو، یہ افشاں اور شکیلہ جڑواں بہنیں نہیں معلوم ہوتیں؟ بھئی عجیب بات ہے، یہ دو ہم شکل لڑکیاں اور دو ہم شکل صاحبزادے۔ سرِ مو فرق نہیں ہے ان میں۔''
''پانچواں ہم شکل گھوڑا نہیں دیکھا آپ نے؟'' شمشیر نے نہ جانے کس طرح یہ خوبصورت جملہ کہہ دیا، جو بہر حال بدتمیزی تھی۔ لیکن اُس کی برجستگی نے ماحول خراب نہ ہونے دیا۔
''ہاں۔ کیسی حیرت کی بات ہے۔ اگر شمشیر کو ایسے ہی رنگوں میں رنگ دیا جائے تو لوگ سوچنے لگیں

گے کہ شاید یہ بھی ریس میں دوڑیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''اچھا بھئی، یہ گفتگو ختم۔ دیکھو، پہلی ریس تیار ہے۔'' اور گفتگو واقعی ختم ہو گئی۔
ریس چھوٹی اور شمشیر الدولہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ ریس کے خاتمے پر وہ خوشی سے ناچنے لگا تھا۔
''میں نے ستارہ پر داؤ لگایا تھا، اسی ہزار جیتا۔'' وہ چیخا اور نواب صاحب اور دوسرے لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن شمشیر جیتنے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔
اس کی بیوی، لڑکیوں سے گفتگو کر رہی تھی۔ کافی خوش اخلاق معلوم ہوتی تھی۔ اور سب سے گھل مل گئی تھی۔ ہم لوگوں سے بھی وہ کبھی کبھی گفتگو کر لیتی تھی۔
دوسری، تیری اور چوتھی ریس بھی ختم ہو گئی۔ شمشیر کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے چاروں ریسیں جیتی تھیں اور مجموعی طور پر اب تک تقریباً پانچ لاکھ روپے جیت لئے تھے۔ اس لئے اس کا موڈ بہت ہی خوشگوار تھا۔ اور اب پانچویں ریس کے انتظامات ہو رہے تھے، جس میں شمشیر اور طالوت کے گھوڑے دوڑنے والے تھے۔ سب لوگ ریس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ گھوڑے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر پہنچ گئے۔
طالوت نے واقعی بڑا مسخرہ پن کیا تھا۔ گھوڑے کے رنگ آنکھوں کو بری طرح چبھ رہے تھے اور وہ شاندار گھوڑوں کے درمیان بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن میں اس خوف ناک گھوڑے سے اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ ایک تو اس پر طالوت کا سایہ تھا اور پھر طالوت ہی کی نسل کا پُراسرار راسم اس پر سواری کر رہا تھا۔ گویا دو آتشہ۔
فائر ہوا اور ریس چھوٹ گئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چھوٹا سا رنگین خچر اس طرح نکلا، جیسے بندوق سے گولی نکلتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کتنی ٹانگیں ہیں۔ اس وقت جب گھوڑے پہلے راؤنڈ پر تھے، وہ دوسرا موڑ کراس کر رہا تھا۔ اور جب گھوڑے دوسرے موڑ پر پہنچے تو عظیم المرتبت ونگ پوسٹ کے نزدیک تھے۔ اور ریس کورس میں ایسی خاموشی ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ کچھ ہذیانی سے قہقہے ضرور سنے گئے تھے۔ لیکن چاروں طرف کی خاموشی حیرت ناک تھی۔ اور حیرت کی بات ہی تھی گھوڑے نے اس طرح یہ ریس جیتی تھی کہ عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔
نواب جلال الدین اور دوسرے سارے لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ کبھی وہ طالوت کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی گھوڑے کی طرف، جسے بے شمار لوگوں نے گھیر رکھا تھا اور اسے حیرت سے چاروں طرف سے ٹٹول رہے تھے جیسے اس کے کل پُرزے تلاش کر رہے ہوں۔
''وہی ہو گیا، جو شہزادہ عادل نے کہا تھا۔'' بالآخر نواب جلال الدین نے کہا۔ شمشیر الدولہ پریشانی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا گھوڑا آٹھویں نمبر پر آیا تھا۔
''بہر حال، میں شہزادہ عادل کو مبارک باد دیتا ہوں۔''
''میں اس گھوڑے کا میڈیکل چیک اپ کراؤں گا۔ میں اسے چیلنج کروں گا۔'' شمشیر الدولہ نے غرّاتے ہوئے کہا۔
''ارے، ارے..... آپ کو کیا ہوا؟''
''اوہ، تم نہیں سمجھتیں زیب! یہ لوگ...... اُٹھو!'' شمشیر نے اپنی بیوی سے کہا۔
''یہ تو بڑی بداخلاقی ہے شمشیر!..... سنو تو....'' اس کی بیوی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن شمشیر الدولہ

نہیں رُکا۔

''تم بیٹھنا چاہتی ہو تو بیٹھو۔'' اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

''میں آپ لوگوں سے معذرت چاہتی ہوں۔ نہ جانے شمشیر کو کیا ہو گیا ہے۔ میں..... میں انکل!..... میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گی۔'' شریف عورت بے حد خجل نظر آ رہی تھی۔ سب کو رنج ہوا۔ بہرحال، طالوت کے گھوڑے کے جیت جانے سے سب حیران تھے۔ لیکن طالوت سنجیدہ تھا۔

''بھئی بڑی ہلچل مچ گئی ہے۔ اب لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے، اخباری رپورٹر تمہارے پاس ضرور آئیں گے۔'' تنویر صاحب ہجوم کی حالت دیکھ کر بولے۔ گھوڑے کی دھڑا دھڑ تصویریں بنائی جا رہی تھیں اور لوگوں نے تنویر صاحب کے منیجر کو گھیر لیا تھا۔

''آپ نے مجھ سے کہا؟'' طالوت بولا۔

''ہاں، دیکھو۔ میرا خیال ہے، منیجر بے وقوف ہماری طرف اشارہ کر رہا ہے۔'' تنویر صاحب گھبرا کر بولے۔

''لیکن اس گھوڑے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ گھوڑا تو سائیس کا ہے۔ میں تو بس آپ کو اس کی شخصیت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ آیئے چلیں۔'' طالوت نے کہا۔ کسی کی سمجھ میں اُس کی بات نہیں آئی تھی۔ بہرحال، لوگوں کے ڈر سے ہم وہاں سے ہٹ گئے۔ لیکن چونکہ بعد کی ریس کی تیاریاں ہونے لگی تھیں، اس لئے لوگ اس حیرت انگیز گھوڑے کے مالکان سے ملنے نہیں آئے اور اپنے طور پر مصروف ہو گئے۔

ہم نے بھی گھر کا رُخ کیا۔ لیکن راستے میں اس حیرت انگیز واقعے پر تبصرہ ہوتا رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھوڑا کیسے جیت گیا۔ میں جانتا تھا یا شکیلہ..... اور بس۔ تنویر صاحب تو اس قدر حیران ہوئے تھے کہ انہوں نے منیجر کو فون کیا کہ گھوڑے کو کوٹھی لے آئے۔

''آخر تم نے اسے ریس میں دوڑنے کے قابل کیسے بنایا؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔

''قابل تو وہ خود تھا۔ بس میں نے ذرا اس کی غذا وغیرہ کا خیال کیا تھا اور تھوڑی سی مٹر گشت کرا دیتا تھا۔''

''لیکن اُس کی جسامت تو وہی تھی۔ خاصا لاغر نظر آ رہا تھا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے اُسے مضبوط کرنے والی غذائیں دی تھیں۔''

''بھئی سچی بات ہے، نہ جانے کیوں، کبھی کبھی تم دونوں مجھے بے حد پُراسرار معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے واقعات اس قدر حیرت انگیز ہوتے ہیں کہ عقل انہیں تسلیم نہیں کرتی۔''

''حالانکہ ان کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

گھوڑا کوٹھی پر آ گیا اور عورتیں تک اس عجوبے کو دیکھنے لگیں، جس میں بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ صرف اُس کی دوڑ حیرت انگیز تھی۔ ورنہ شکل پر اب بھی پھٹکار برس رہی تھی۔ تنویر صاحب نے اسے دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

''خدا کی قسم! مجھے اس میں کوئی بات نظر نہیں آتی۔''

''نگاہ نگاہ کی بات ہے۔ بہرحال، اب اسے سائیس کو واپس کر دیا جائے۔''

''کیوں؟ اب تو یہ تمہاری ملکیت ہے۔''

''میں اس کا کیا کروں گا؟ بس مجھے تو آپ لوگوں پر ثابت کرنا تھا کہ یہ واقعی اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہے۔'' طالوت نے کہا اور تنویر صاحب اس پر بھی حیرت کرنے لگے، کیونکہ بہرحال تیس ہزار معمولی رقم نہیں ہوتی۔ اس ریس کی آمدنی کے بارے میں طالوت نے صاف کہہ دیا کہ یا تو اسے سائیس کو دے دیا جائے یا پھر کسی اور کام میں لگا دیا جائے۔

''بھلے آدمی! خاصی معقول رقم ہوگی۔'' تنویر صاحب بولے۔

''والد صاحب کو معلوم ہو جائے کہ اب میں جوئے کی رقمیں استعمال کرنے لگا ہوں تو عاق کر دیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا اور تنویر صاحب خاموش ہو گئے۔ بہرحال! بمشکل تمام یہ موضوع ختم ہو سکا۔ گھوڑے کو واپس اصطبل بھجوا دیا گیا۔ رات کو مجھے اور طالوت کو فرصت ملی تو میں نے طالوت کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''ایسا لگتا ہے، جیسے اب تم دنیا کو اپنے بارے میں بتا دینا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''تمہاری حرکتیں اب کھلی ہوتی ہیں۔ تنویر صاحب کے گھر والے ویسے بھی تمہاری طرف سے مشکوک تھے۔ وہ پانی کی قلابازیاں، افشاں کے ساتھ تفریح اور اب یہ مریل گھوڑے کا کارنامہ۔ جبکہ اب یہ گھوڑا زندگی بھر کسی ریس میں نہیں دوڑ سکتا۔''

''بس یار! کبھی کبھی تفریح کو دل چاہتا ہے۔ اور پھر میں کسی سے کیوں ڈروں؟ میں اپنے منہ سے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دنیا والے اگر کچھ سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں۔''

''تمہارے لئے تو ٹھیک ہے، لیکن لوگ مجھ سے بھی وہی چیزیں طلب کریں گے۔''

''اوہ، ہاں! اس انداز میں، میں نے نہیں سوچا تھا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔'' طالوت نے جواب دیا اور پھر دلچسپی سے بولا۔ ''خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ آج نوابزادہ شمشیر الدولہ سے مل کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ ہائے، کیسا چاند سا مکھڑا نکل آیا ہے۔ ابے کیا تمہیں اس سے محبت نہیں محسوس ہوئی؟''

اور میں ہنس پڑا۔

''یہ کیسے ممکن ہے، اپنا شمشیر اسی شہر میں ہو اور ہم اس سے ملاقات نہ کریں، بلکہ کرتے رہیں۔''

''اب اس کی زندگی بدل گئی ہے طالوت!''

''لیکن عادت نہیں بدلی میرے یار کی۔''

''اس کی بیوی تو خاصی سلیقے کی عورت معلوم ہوتی تھی؟''

''سیمیں غریب بھی تو سلیقے کی تھی۔ وہ بدنصیب بھی کسی چکر میں ہی پھنسی ہوگی۔''

''ہاں، عین ممکن ہے۔''

''بہرحال مجھے اس کے حالات سے کافی دلچسپی ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''لیکن اس کا پتہ وغیرہ تو معلوم ہی نہیں ہو سکا۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اپنا جیکی کس دن کام آئے گا؟''

''ارے ہاں، یہ راسم کو تم نے جیکی خوب بنایا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہائے، اپنے عظیم المرتبت کی ٹانگوں میں تو جان ہی نہیں تھی۔ راسم اگر ان کی مشین نہ بنتا تو وہ تو اب چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکے ہوتے۔'' طالوت نے کراہتے ہوئے کہا اور میرے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔
''سچ کہہ رہا ہوں عارف! وہ گھوڑا اب دو چار دن سے زیادہ کا مہمان نہیں ہے۔ اور بہرحال اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس طرح اس کا شاندار کارنامہ تو زندہ رہے گا۔ وہ خود زندہ رہا تو اس کے کارنامے پر پانی پھر جائے گا۔''
''یار! تم سے بڑا بدمعاش روئے زمین پر نہیں ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ممکن ہے۔ ویسے میرے قبیلے میں بہت سے مل جائیں گے۔ ہاں یار! چاند ڈوبنے کی رات آ رہی ہے۔''
''میں بھی سوچ رہا تھا۔''
''کیا پروگرام رہے گا؟''
''پروگرام بنالو۔''
''بس پروگرام کیا بنانا ہے۔ دو دن کی ہی تو بات ہے۔ لیکن ہاں یہاں کسی سے نہیں کہیں گے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔''
''کیا مطلب؟''
''اگر اپنی ریاست جانے کی بات کی تو ممکن ہے، کوئی پُرخلوص انسان میرے والد صاحب سے ملاقات کی خواہش ہی کر ڈالے۔''
''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔''
''بہرحال، کوئی بہانہ کر دیں گے۔''
''ہاں۔ وہ مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن شکیلہ؟''
''اس سے میں کہہ دوں گا۔''
''ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟''
''ارے نہیں۔ ابھی نہیں۔ مرواؤ گے کیا؟ ویسے اس بار میں والدہ محترمہ سے گفتگو ضرور کروں گا۔''
''مناسب۔''
''خیر، اب کل کا پروگرام سوچو۔''
''کوئی خاص پروگرام؟''
''یار! اپنے جگری دوست کو بار بار کیوں بھول جاتے ہو؟.... کیا شمشیر الدولہ کی حسین صورت نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہے؟''
''اچھا..... ہاں، تو گویا تم اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔''
''ہائے۔ وہ چیز ہی ایسی ہے۔ ٹھہرو، میں اس کے بارے میں تفصیل معلوم کرتا ہوں۔'' طالوت نے کہا اور پھر اُس نے راسم کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور تھوڑی ہی دیر کے بعد راسم نے شمشیر الدولہ کا کچا چٹھا بیان کر دیا۔
''یہاں کے ایک معروف بازار میں اس کی قالینوں کی بہت بڑی فرم ہے اور شہر کے ایک خوبصورت

علاقے میں اس کی کوٹھی ہے، جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔''
''ہوں۔'' طالوت گہرے خیال میں ڈوب گیا۔ اس نے راسم کو واپسی کا اشارہ کر دیا تھا۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''ہم اس کی فرم ضرور دیکھیں گے۔ اور عارف! کیا تمہیں کسی کاروبار سے دلچسپی نہیں ہے؟''
''کیوں نہیں۔ لیکن تمہارا مطلب کیا ہے؟''
''یار! شمشیر الدولہ کی فرم کے سامنے اگر ہمارا شوروم نہ ہو تو پھر بات ہی کیا بنی۔''
''اوہ! طالوت کسی کی روزی پر......''
''یار! بس تفریح۔ وہ جھک جائے۔ ہمیں کون سا کاروبار کرنا ہے۔''
میں خاموش ہو گیا۔ طالوت جیسے بدمعاش کو کون روک سکتا تھا۔
دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ اجازت لے کر نکل گیا۔ آج وہ شکیلہ کو بھی ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ پھر شام ہی کو واپس آ گیا۔ اس نے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں، شام کی چائے پر اس نے معمولی انداز میں تذکرہ کیا، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ کارروائی کر کے آیا ہے۔ یہ تذکرہ اس نے تنویر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کیا تھا۔
''آپ کا شہر بے حد خوب صورت ہے تنویر صاحب! میں نے والد صاحب سے اجازت منگوائی تھی کہ کیوں نہ یہاں کاروبار کیا جائے۔''
''اوہو..... عمدہ خیال ہے۔ پھر کیا اجازت مل گئی؟''
''ہاں۔ انہوں نے ہمیں مختار کر دیا ہے۔ دراصل ہم ہمیشہ کے آوارہ گرد ہیں۔ حکومت کے کام سب سے بڑے بھائی نے سنبھال رکھے ہیں، اس لئے ہمیں کھلی آزادی ہے۔ بلکہ صائم بھائی نے تو اسی شہر میں رہنے کی اجازت بھی لے لی ہے۔''
''بہت خوب بھئی۔ واقعی دلی مسرت ہوئی یہ سن کر۔'' تنویر صاحب کے علاوہ نواب جلال الدین نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ''اس طرح کم از کم تم لوگوں کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کا خوف تو نہیں رہے گا۔''
''تو پھر آپ لوگوں کی اجازت ہے؟''
''اجازت کا کیا سوال ہے۔ اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہو گی۔ لیکن کسی کاروبار کا ارادہ کر لیا ہے؟''
''ہاں!''
''بہت خوب..... کیا؟''
''غیر ممالک سے قالینوں کی تجارت عمدہ رہتی ہے۔''
''اوہ! کسی سے مشورہ کیا ہے؟''
''ہاں! آج بھی اسی سلسلے میں گیا تھا۔''
''بہت عمدہ۔ بھئی بڑے انسان ہو۔ پھر کیا رہی؟''
''یہاں کے ایک خوب صورت علاقے میں، میں نے آج ایک بلڈنگ کا سودا کیا ہے۔ نہایت حسین بلڈنگ ہے۔ ابھی تعمیر ہوئی ہے۔''

''پوری بلڈنگ خرید لی ہے؟'' تنویر صاحب حیرت سے بولے۔
''ہاں۔ میرا شوروم، ہمارے شایانِ شان ہوگا۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گہری سانس لی۔
''کیا وہ بلڈنگ برائے فروخت تھی؟''
''جی نہیں۔ لیکن میں نے اس کے مالک کو اتنی رقم کی پیشکش کی کہ وہ بدحواس ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا، جو اس میں تھے اور انہیں اتنی دولت کی پیشکش کی کہ تقریباً سبھی تیار ہو گئے۔ اتنی دولت وہ کاروبار میں محنت کر کے دس سال تک بھی نہیں کما سکتے تھے۔''
''بھئی وہ کہاں ہے؟ ہمیں بھی تو اس کے بارے میں بتاؤ۔'' نواب جلال الدین نے کہا۔
''صرف چند روز انتظار کریں۔ میں اس کی اصل شکل آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔'' طالوت نے جواب دیا اور لوگ خاموش ہو گئے۔ لیکن میرے تو پیٹ میں ہانڈی پک رہی تھی۔ چنانچہ ذرا سی تنہائی ملتے ہی میں نے اُسے پکڑ لیا۔
''اور یہ عمارت یقیناً شمشیر الدولہ کی فرم کے سامنے والی ہو گی؟''
''یقیناً!''
''اور تم نے اس کے مالک کو اتنی رقم کی پیشکش کی ہو گی کہ وہ بادلِ نخواستہ تیار ہو گیا؟''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔''
''بہرحال، تمہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اب کیا پروگرام ہے؟''
''کچھ دوسرے انتظامات میں نے راسم کے سپرد کر دیئے ہیں۔ وہ کام کر رہا ہے۔'' طالوت نے جواب دیا اور میں سمجھ گیا کہ طالوت یقیناً بہت لمبا چکر چلا رہا ہے اور شمشیر الدولہ کی شامت ہی آ گئی ہے۔
بہرحال شب و روز گزرتے رہے۔ طالوت بے حد مصروف تھا۔ شکیلہ کبھی اُس کے ساتھ ہوتی، کبھی نہ ہوتی۔ رہ گئی بی افشاں تو ان دنوں انہوں نے ایک خوف ناک کھیل شروع کر رکھا تھا، جس سے میں کسی حد تک بوکھلا گیا تھا۔ یعنی مجھ سے بے پناہ لگاوٹ کا اظہار اور اس انداز میں کہ دوسروں کی نگاہوں میں آ جائے۔ میں اس چالاک لڑکی کا مقصد سمجھ گیا تھا۔
بالآخر طالوت کے گھر جانے کا دن آ گیا۔ اس نے مجھے ہدایات دیں اور چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن بہرحال، بات بنا دی گئی تھی ہاں، دوسری رات کچھ دلچسپ باتیں ہوئیں۔ افشاں بی نے باغ میں محفل لگائی تھی۔ سب شریک تھے۔ یہاں تک کہ بزرگ بھی۔ اور افشاں نے ان کی موجودگی میں میری خاطر مدارات کی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اس رات تو وہ ایسی دیوانی ہوئی کہ بہت سی نگاہیں اس پر اُٹھنے لگیں۔
اور جب رات گئے محفل ختم ہوئی اور سب رخصت ہوئے تو میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور نیند بھی نہیں آئی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور میں چونک پڑا۔ میرے ذہن میں اُلجھن سی پیدا ہو گئی۔ اگر یہ افشاں ہے تو اس وقت اس نے آ کر اچھا نہیں کیا۔ میں نے اس کی نگاہیں دیکھی تھیں۔ اگر اسے یہاں دیکھا گیا تو یہ ٹھیک نہ ہو گا۔
بہرحال، میں نے دروازہ کھول دیا۔ سیمیں اور احسان کو دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی۔ سیمیں مسکرا رہی تھی اور احسان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''صائم بھائی! آپ سو تو نہیں گئے تھے؟''
''نہیں۔''
''حالانکہ خاصی رات ہو چکی ہے۔''
''ہاں، نیند نہیں آئی۔''
''خدا کا شکر ہے۔'' احسان نے شرارت سے کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔
''گویا یہاں بھی نیندیں اُڑی ہوئی ہیں۔'' احسان مسکراتا ہوا بولا۔
''خوب! گویا کسی شرارت کا پروگرام بنا کر آئے ہیں آپ حضرات۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''توبہ، توبہ، توبہ! اس گستاخی کی جرأت ہو سکتی ہے صائم بھائی؟'' سیمیں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔
''پھر کیسے تشریف آوری ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔
''ایک خاص مسئلے پر گفتگو کرنے حاضر ہوئے ہیں اور اس تصور کے ساتھ کہ آپ کے کوئی ہیں اور آپ پر حق رکھتے ہیں۔''
''اوہو، کوئی جذباتی مسئلہ ہے؟''
''ہاں، یونہی سمجھ لیں۔''
''مسئلہ پیش کیا جائے۔''
''پہلے کہیں کہ خدا کی قسم، جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔'' سیمیں شرارت سے بولی۔
''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔''
''آپ کو سیمیں کی قسم صائم بھائی! جھوٹ نہ بولیں۔''
''ارے، ارے احسان! کیا ہو گیا ہے اسے؟'' میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔
''ماشاءاللہ خاصی ذہین ہو گئی ہیں بھائی جان!''
''اچھا ذہین صاحبہ! اب آپ فرما دیں، کیا سلسلہ ہے؟''
''یہ افشاں بیگم کس موڈ میں ہیں آج کل؟'' سیمیں نے کہا۔
''اوہو، آپ ان کے موڈ کے بارے میں پوچھنے آئی ہیں؟''
''جی!''
''لیکن آپ سے کس نے کہا کہ میں ان کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں؟''
''سیکرٹری نہ ہوں بھائی جان! لیکن ''پرائیویٹ'' ضرور ہیں۔'' سیمیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''سیمیں!''
''خدا کی قسم بھائی جان! سیمیں ہی نہیں، سب نے یہ بات محسوس کی ہے۔ نہ جانے افشاں کو کیا ہو گیا ہے۔ حالانکہ خاصی سنجیدہ لڑکی ہے۔''
''یہ بات آپ نے افشاں سے کیوں نہیں پوچھی؟''
''اس سے بھی پوچھیں گے۔''

"جو کچھ معلوم ہو، مجھے بھی بتا دینا۔ اور اب میرے کان نہ کھاؤ۔" میں نے کہا۔
"میری قسم پر بھی نہیں بتائیں گے بھائی جان!" سیمیں نے کہا۔
"سیمیں! فضول باتوں سے پرہیز کرو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور اچانک سیمیں کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اُس نے بے بسی سے احسان کی طرف دیکھا۔ احسان پریشان سا ہو گیا تھا۔
"بھائی جان کی نیند خراب کر دی ہے تم نے سیمیں! میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ سونے کا وقت ہے۔ پھر کبھی سہی۔ آؤ، بھائی جان کو سونے دیں۔" احسان نے سیمیں کا بازو پکڑا اور پھر وہ دونوں مڑ گئے۔
"واقعی، حماقت ہوئی صائم بھائی! ہم دونوں معافی چاہتے ہیں۔" احسان نے مڑ کر کہا۔ اور پھر وہ سیمیں کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کی طرف مڑ گیا۔
مجھے ایک دم اپنے خشک لہجے کا احساس ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا۔ ان دونوں کو غلط فہمی ہو گئی۔ اور اب یہ شرمندگی سے واپس جا رہے تھے۔
میں تیزی سے آگے بڑھا اور چھلانگ لگا کر دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے ان دونوں کا راستہ روک لیا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟"
سیمیں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ احسان نے بے قراری سے اس کے رخسار صاف کر دیئے تھے۔ اس سے اس کی بے پناہ محبت کا احساس ہوتا تھا۔ اور پھر اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا، ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔
"چلو واپس بیٹھو۔" میں نے پھر اسی طرح ڈپٹ کر کہا اور احسان کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی آ گئی۔ اس نے بے بسی سے سیمیں کی طرف دیکھا۔
"بس ہم نہیں بیٹھیں گے۔ آؤ چلو..... ہم نہیں بیٹھیں گے ٹھیک تو ہے، ہم ہیں کون؟ ہمارا رشتہ ہی کیا ہے؟.... صرف زبان سے..... زبان سے بہن یا بھائی کہہ دینے سے خون تو نہیں مل جاتے۔" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی اور جذبات سے میرا سینہ پھٹنے لگا۔
اس دیوانی کو کیا معلوم تھا کہ مجھے نہ بہن کی محبت ملی تھی، نہ بھائی کا پیار، نہ ماں کی ممتا ملی تھی نہ باپ کی شفقت۔ یہ محبت تو میرے لئے انمول تھی۔ میں جذبات میں اندھا ہو کر آگے بڑھا اور میں نے سیمیں کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ اور پھر میں نے اس کی پیشانی پر، رخساروں پر، گردن پر، بازوؤں پر اتنے پیار کئے، اتنے پیار کئے کہ سیمیں بوکھلا کر رونا دھونا بھول گئی۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ احسان بھی بھونچکا ہو کر دیکھ رہا تھا اور میں سیمیں کو زور زور سے بھینچ رہا تھا۔ میرا پورا بدن لرز رہا تھا۔ نہ جانے کیسی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو اُبلنے لگے تھے۔ سیمیں نے میرے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی وہ کسمسائی اور میں اُسے شدتِ جذبات میں چومتا رہا۔ پھر میں نڈھال ہو گیا اور میں نے آہستہ سے سیمیں کو چھوڑ دیا۔
"بھائی جان!..... بھائی جان!" احسان نے رومال سے میرے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "کیا ہو گیا آپ کو بھائی جان؟"
"صائم بھائی!..... صائم بھائی!" سیمیں نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی تھیں سیمیں! لیکن..... لیکن میں نے تم سے اجنبیت نہیں برتی تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ارے کوئی بات نہیں۔ خدا کی قسم! میرا دل صاف ہوگیا۔'' سیمیں جلدی سے بولی۔

''مجھ سے میری اس کیفیت کے بارے میں کچھ مت پوچھنا احسان! میں تمہارا شکرگزار ہوں گا۔ بس صرف اتنا سمجھ لو کہ سیمیں کے خلوص نے، سیمیں کی اپنائیت نے مجھے..... مجھے.....'' میں کوئی الفاظ نہ تلاش کرسکا۔

''جانے دیں بھائی جان! کوئی بات نہیں۔ آپ خوامخواہ سنجیدہ ہو گئے۔ بھئی سیمیں! اس وقت تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ ہم کیا سوچ کر آئے تھے، کیا ہوگیا۔''

''بیٹھو تم لوگ..... بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا اور سیمیں اور احسان بیٹھ گئے۔ اب ان کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ سیمیں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ مسکراہٹیں بکھیرنے والے بھی زندگی کے کسی دور میں اس قدر سنجیدہ ہوسکتے ہیں۔ خدا کی قسم، میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔''

''آئی ایم سوری سیمیں!..... سوری احسان! میں نے تم لوگوں کو بھی کبیدہ کردیا۔''

''صائم بھائی! خدا کے واسطے، شرمندہ نہ کریں۔ ہم ہی کچھ غلط ہوگئے تھے۔''

''بات یہ ہے احسان! کہ میں تم لوگوں کو بہت چاہتا ہوں۔ ہم لوگ بھی مکمل نہیں ہیں۔ ہمیں بھی بہت سی چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور ہمیں تم سے اپنائیت اور محبت ملی ہے۔ ہمارے لئے وہ بےکار شے نہیں ہے۔''

''بےشک بھائی جان! ہم بھی خدا کی قسم، آپ پر جان دیتے ہیں۔''

''مجھے احساس ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب بتاؤ، تم کس پروگرام سے آئے ہو؟''

''جانے دیں بھائی جان! سیمیں کی حماقت تھی۔'' احسان نے کہا۔

''اور خود بےچین نہیں تھے؟'' سیمیں بولی۔

''تھا تو سہی۔'' احسان نے اعتراف کیا۔

''پھر؟''

''مگر اب اس کی کیا گنجائش رہی؟'' احسان نے کہا۔

''ہاں، ماحول کچھ خراب ہوگیا۔'' سیمیں نے میری شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانے دیں بھائی جان! اس موضوع پر پھر گفتگو کریں گے۔''

''تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا اور دونوں ہنس پڑے۔

''لیکن ہمارے تو بہت سے پروگرام تھے؟'' سیمیں بولی۔

''تو پھر اب کیا ہوگیا؟''

''بس ذرا فضا بدل گئی۔ وہ چیز باقی نہیں رہ گئی۔''

''سب کچھ وہی ہے۔ پچھلے کچھ منٹ ذہن سے خارج کردو، جذبات میں حماقت کی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔''

"نہایت مناسب بات ہے۔" احسان نے کہا۔
"لیکن ایک شرط ہے بھائی جان!" سیمیں شرارت سے بولی۔
"چلو وہ بھی بتا دو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔
"وہ لمحات جو ہم نے ذہن سے نکال دیئے ہیں، ان میں سے کچھ کام کے بھی تھے۔ کیا آپ ہمیں ان کے استعمال کی اجازت دیں گے؟"
"بہت شریر ہو۔ اب جلدی سے بک دو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"اللہ شافی، اللہ کافی.....!" سیمیں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اور پھر کسی قدر نیچی آواز سے بولی۔ "جناب قبلہ بھائی جان! یہ افشاں کا کیا سلسلہ ہے؟ احسان! ذرا میرے سامنے آ جانا۔ میری آنکھیں بند ہیں، میں انہیں کھول نہیں سکتی۔ جملہ سخت ہو تو حقوقِ شوہریت استعمال کرنا۔ میرا مطلب ہے، زخمی نہ ہو جاؤں۔"

میں ایک لمحہ کے لئے بوکھلا گیا تھا، لیکن پھر سنبھل گیا۔ افشاں نے اپنے روّیے سے یہ راز دوسروں کی نگاہوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ خود ہی اس کی پردہ پوشی نہیں چاہتی تھی تو پھر میں کہاں تک اسے پوشیدہ رکھتا۔

"احسان! کیا پوزیشن ہے؟" سیمیں نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔
"نارمل!" احسان نے جواب دیا۔
"دشمن غیض وغضب میں تو نہیں ہے؟"
"نہیں، مسکرا رہا ہے۔"
"خدا کا شکر ہے۔" سیمیں نے آنکھیں کھولیں۔ "کیا بندی کو اس گستاخی پر معاف کر دیا گیا ہے؟"
"آخر یہ بکواس کیا ہے؟"
"آپ کو سیمیں کی قسم بھائی جان! اپنی بہن سے کچھ نہ چھپائیں۔"
"افوہ! مگر مسئلہ کیا ہے؟..... کیا ہو گیا اتنی رات گئے تم دونوں کو؟"
"ہمیں افشاں ہو گئی ہے۔" سیمیں بولی۔
"خطرناک مرض ہے۔ علاج کراؤ۔" میں نے کہا۔
"اسی لئے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔"
"سیمیں کی بچی! باز نہیں آؤ گی؟" میں نے مصنوعی طور پر آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔
"ہرگز نہیں بھائی جان! ماری گئی تو شہادت کا درجہ ملے گا۔"
"احسان! یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔
"میں دخل نہیں دے سکتا بھائی جان!"
"گویا تم بھی اس سازش میں شریک ہو؟"
"الحمدللہ!" احسان نے سر جھکا کر کہا۔
"میں مار بیٹھوں گا تم لوگوں کو۔"
"تو آئے کس لئے ہیں؟..... لیکن جب آئے ہیں تو کچھ لے کے ہٹیں گے۔

''انشاءاللہ!'' احسان نے کہا اور دونوں کی اداکاری پر مجھے ہنسی آ گئی۔
''اچھا بھئی، چلو شکست تسلیم۔ اب عقل کی گفتگو کرو۔''
''افشاں..... صرف افشاں۔ خواہ اس کا تعلق عقل سے ہو یا نہ ہو۔''
''آخر کیا ہو گیا افشاں کو؟''
''بھائی جان! وہ عقل کی باتیں نہیں کر رہی۔ براہ کرم، اب سنجیدہ ہو جایئے۔'' سیمیں نے بھی سنجیدہ ہو کر کہا۔
''کیا مطلب؟''
''کیا آپ نے اُس کے روّیے کو محسوس نہیں کیا؟''
''کھل کر بتاؤ!''
''آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟''
''نہیں ہوں گا۔''
''وہ آپ کی طرف بے پناہ ملتفت ہے۔ آپ کو خدا کی قسم، آپ بتایئے، کیا آپ نے محسوس نہیں کیا؟''
''ہاں کیا ہے۔''
''وہ بچپنا کر رہی ہے۔ تمام لوگ اسے غور سے دیکھنے لگے ہیں۔''
''ہاں شاید!''
''لیکن بھائی جان! خدا کے واسطے یہ بتایئے کہ اس کا ہو گا کیا؟''
''سیمیں! یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو؟''
''ہاں، آپ بتا سکتے ہیں۔ صرف آپ۔''
''وہ کس طرح؟''
''افشاں جو کر رہی ہے، وہ حماقت کر رہی ہے۔ ایسا نہ ہو بھائی جان! کہ وہ دنیا کی نگاہوں میں آ جائے۔ اور اس کے بعد اُسے رسوائی کے سوا کچھ نہ ملے۔''
''وہ کس طرح؟''
''اسے احساس ہو جانا چاہئے کہ...... کہ وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔''
''کیوں؟'' میں نے کہا۔
''اس لئے کہ اس کی حیثیت آپ سے کہیں کمتر ہے۔ وہ آخر آپ کو کیسے اپنا سکتی ہے؟''
''سیمیں!..... سیمیں! بولتے وقت عقل کھو بیٹھتی ہو۔ بولے جا رہی ہو کہ غور بھی کر رہی ہو؟'' احسان نے درمیان میں دخل دیا۔
''کیا مطلب؟''
''ارے تم بھائی جان کے جواب بھی سن رہی ہو؟''
''ہاں سن رہی ہوں۔''
''خاک سن رہی ہو۔ للہ کانوں کے ساتھ دماغ بھی استعمال کرو۔ غور کرو، ابھی ابھی بھائی جان نے

کیا کہا ہے؟'' احسان، مسرت سے سرخ ہوتے ہوئے بولا اور اُس کی اس بوکھلاہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی۔

''آخر ہوا کیا احسان؟'' سیمیں نے حیرت سے کہا۔

''تم نے کہا تھا، اسے احساس ہو جانا چاہئے کہ وہ بھائی جان کے قابل نہیں ہے، تو بھائی جان نے کیا سوال کیا تھا؟''

''ایں؟..... اوہ، مجھے یاد نہیں۔''

''یہی تو کہہ رہا ہوں۔ کم بولو، زیادہ سوچو۔''

''ارے تو بتاؤ نا۔'' سیمیں ٹھنک کر بولی۔

''انہوں نے کہا تھا، کیوں؟''

''تو پھر؟''

''خدا کی پناہ! اس کیوں پر غور تو کرو سیمیں!..... اس کا مطلب ہے، بھائی جان سوال کر رہے ہیں کہ آخر وہ میرے قابل کیوں نہیں ہے؟..... گویا ہے۔'' احسان نے کہا اور سیمیں اُچھل پڑی۔

''ارے خدا کی قسم!..... ہاں خدا کی قسم، ٹھیک تو ہے۔ افوہ! میں نے غور نہیں کیا۔ پیارے بھائی جان! آپ کو میری قسم، بتا دیں۔ کیا آپ..... کیا آپ سیمیں کو قبول نہیں کر سکتے؟''

''کیوں..... کوئی خرابی ہے مجھ میں؟''

''آپ میں..... ارے نہیں۔ افوہ..... احسان! یہ..... یہ کیا ہوا؟ ارے احسان! بھائی جان تیار ہیں۔'' سیمیں مسرت سے چیختے ہوئے بولی اور احسان نے جلدی سے اس کا منہ دبا دیا۔ ''چھوڑ دو احسان!..... چھوڑ دو۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ بس چیخنے دو مجھے۔''

''کپڑا ٹھونس دوں گا میں۔ میں نے اپنا راز تمہیں اس لئے بتایا ہے کہ سب کو بتا دو۔''

''للہ، بھائی جان! ایک بار اور کہہ دیں، آپ افشاں کو اپنانے پر تیار ہو جائیں گے؟'' سیمیں فرطِ مسرت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

''ہاں بھئی، میرے زبردستی کے رازدارو!

رازِ ہستی راز ہے، جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

چنانچہ اب سارے معاملات تمہارے سپرد۔ لیکن دیکھو، کوئی ٹریجڈی نہ ہونے دینا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم، جان لڑا دوں گی۔ سمجھا کیا ہے آپ نے۔ اپنے بھیا کے لئے جان نہ دے دوں گی۔ میرے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور پھر تنویر انکل کو ایسا داماد کہاں ملے گا۔ ایں!''

''بڑی بھولی ہو سیمیں! ارے یہ برابر کی آگ ہے۔ لیکن بہرحال ہمارے اوپر بہت سی ذمہ داریاں آ گئی ہیں۔'' احسان نے بوڑھوں کے سے انداز میں کہا۔

''اچھا۔ بس اب بھاگو تم لوگ، مجھے سونے دو۔'' میں نے کہا اور دونوں قہقہے لگاتے چلے گئے۔

❀

احسان اور سیمیں خوش خوش واپس چلے گئے۔ لیکن میری نیند اُڑ گئی تھی۔ حشمت برادرز کا ایک کلرک ایک معمولی سا انسان، اتنی بڑی خوشی سے دوچار ہونے جا رہا تھا۔ کیسی انوکھی بات تھی میرے لئے۔ طالوت کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزرا تھا، ایک انوکھی زندگی گزری تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی، میں نے اس پوری زندگی کو الف لیلیٰ کی ایک رات سمجھا تھا، جس کی صبح ہو گی، آنکھ کھلے گی اور آنکھ کھلنے کے بعد میں قلاش ابوالحسن کے علاوہ کچھ نہیں ہوں گا۔

لیکن میں تو ابوالحسن کی مانند بھی نہ ہوں گا۔ وہ دیوانہ تو آزادی سے سڑکوں پر پھرتا تھا۔ میرے لئے تو سخت کھردری رسّی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، جو میری گردن کو لمبا کر دے گی۔ زبان اور آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ ہاں، الف لیلیٰ کی اس حسین رات کے حسین واقعات کے بعد میری آنکھ کھلے گی تو ہمیشہ کے لئے بند ہونے کے لئے۔ اور یہ خوف ناک تصور میں نے ذہن کے آخری گوشوں میں نہاں رکھا تھا۔ یہ تصور جس دم اُبھرتا، میرے پورے بدن کے مسامات پسینہ اُگل دیتے۔

میں تو کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے اس خوف کو کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیان کرنے کے لئے تھا کون؟ سوائے طالوت کے۔ اور طالوت ان باتوں کو سن کر ناراض ہو جاتا تھا۔ اُسے یہ بے اعتمادی پسند نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جب مجھ سے جدا ہو گا تو دنیا میرے لئے پھولوں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہ ہو گی۔ سچ بات ہے، مجھے یقین نہیں تھا۔ طالوت کی قوتیں مسلّم تھیں، لیکن میری دنیا اس کی دنیا سے بے حد مختلف تھی۔ وہ سب کچھ مشکل تھا، جو طالوت سوچ رہا تھا۔ بھلا کانٹوں کے ڈھیر بھی پھولوں کے بستر میں بدل سکے ہیں، میں کیسے مان لوں!

لیکن حالات بدل گئے تھے اور اس انوکھے انداز میں بدلے تھے کہ شاید طالوت کو بھی اتنی آسانیوں کی اُمید نہیں تھی۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ میری شکل بدل دے۔ لیکن بدلی ہوئی شکل کے ساتھ بھی میں اس طرح خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اور اس انداز میں ٹھیک ہوا تھا کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا تھا۔

اور پھر اس کے بعد کے حالات، میں نے اپنی پوری زندگی گوش گزار کر دی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں فطرتاً برا انسان نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادا کلرک۔ اگر زرینہ مجھ سے بے وفائی نہ کرتی تو شاید آج وہ میری بیوی ہوتی۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا، اب تک دو چار بچے ہوتے۔ زرینہ بھی شاید گھرانے کو خوشحال رکھنے کے لئے ملازمت کر رہی ہوتی۔ نہ جانے کیسی زندگی ہوتی۔ اپنے طور پر میں پورے وثوق

سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک اچھا شوہر، ایک اچھا باپ ہوتا!
لیکن ایک عورت کی بے وفائی نے میری صورت بدل دی تھی۔ اگر قسمت یاور نہ ہوتی تو جیل میں سڑ رہا ہوتا۔ اگر بات صرف غبن تک ہی رہتی اور اگر حالات زیادہ سنگین شکل اختیار کر جاتے تو پھر.....اب تک میں کبھی کا موت کی آغوش میں جا سوتا اور میری زندگی کے زیاں میں میرا کوئی قصور نہ ہوتا۔
کیسی انوکھی بات ہے، انسان سیدھا سچا رہنا چاہتا ہے، دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ مصالحت اور محبت کی زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دنیا والے، اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہنے دیتے۔ اس کا خلوص، اس کی محبت، اس کی سادگی، سچائی سب چھین لیتے ہیں۔
کاش ایجادات کرنے والے، کاش جہاز بنانے والے، راکٹ اُڑانے والے، چاند پر اُترنے والے، چاند سے پہلے اس زمین کے مسائل حل کر سکتے۔ کاش! وہ کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد کر دیتے جو صحیح مجرم کی تشخیص کر سکتا۔ جو بتا سکتا کہ معاشرے کو تباہ کرنے والا وہ نہیں ہے، جس نے کسی کی گردن کاٹ دی ہے۔ اصل مجرم وہ ہے، جس نے اسے اس جرم کی طرف تحریک دلائی ہے، جس نے اسے جرم پر مجبور کیا ہے۔ کاش! لیکن.....لیکن.....میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
خیالات کا ریلا اس طرح آیا تھا کہ وقت کا تعین ہی نہیں ہو سکا۔ دُور کہیں گھڑیال نے دو بجائے۔ میں نے آنکھوں میں نیند تلاش کی، لیکن دُور دُور تک اس کا نشان نہیں ملتا تھا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور پھر افشاں کی حسین شکل میری نگاہوں میں در آئی۔ ہر طرح سے ایک مکمل لڑکی۔ تعلیم یافتہ، خوش مزاج، خوش مذاق، سنجیدگی سے محبت کرنے والی۔ کتنی صاف ستھری گفتگو کی تھی اس نے، حقیقتوں سے نزدیک کی گفتگو، جس میں تلاش کے باوجود فریب نہیں تھا۔ اس کے علاوہ باعزم بھی تھی، ہمت بھی رکھتی تھی۔ بلاشبہ بیوی کی حیثیت سے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔
حالانکہ جو حادثات مجھے پیش آئے تھے، ان میں بہت سی لڑکیوں کا کردار تھا۔ نرگس رحمانی اور دوسری کئی لڑکیوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن اس وقت حالات دوسرے تھے۔ میں نے ان پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس وقت خود میری حیثیت کیا تھی۔ لیکن اب۔ میں نے حسرت بھرے انداز میں سوچا۔ اب تو میں اپنے ہی وطن میں، اسی جگہ جہاں میں ملعون و مطعون ہوا تھا، سرخرو تھا۔ میرے اوپر سے الزامات ہٹ چکے تھے۔ خاص طور سے انگلیوں کے نشانات والے کمال نے سارے اندیشے بے بنیاد ثابت کر دیئے تھے اور بہرحال، یہ طالوت کا ایک ایسا کارنامہ تھا، جس نے مجھے بہت مدد دی تھی۔
تو اب، ویسے تنویر صاحب اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ خاص طور سے نواب جلال الدین کی موجودگی میں۔ اگر انہوں نے ہمارے بزرگوں کو طلب کیا تو نواب جلال الدین موجود ہیں۔ افشاں کے سامنے میں کسی فریب سے کام نہیں لینا چاہتا تھا، لیکن اپنی شخصیت کا جھوٹ تو ساری زندگی نبھانا ہوگا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں اس مخلص لڑکی کے سامنے بھی حقیقت نہیں بیان کر سکتا تھا، مجھے بہت تجربہ ہو چکا تھا۔
ضمیر کا بوجھ ایک مسلّم حقیقت رکھتا ہے، لیکن حالات شاہد رہے ہیں کہ بعض اوقات سچ اور خلوص بھی اس دنیا کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ میری تو پوری زندگی ہی اس تجربے کا نچوڑ تھی، چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ بوجھ ہمیشہ برداشت کروں گا۔ عورت میرے لئے نئی نہیں ہوگی، لیکن افشاں کو میں ہمیشہ اپنی

سوئم

زندگی کی نئی عورت سمجھوں گا۔

اور اس وقت نیند میرے نزدیک آنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے بار بار خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن افشاں کی تصویر نگاہوں میں جمی ہوئی تھی۔

اور جب نیند کی کوئی صورت نہیں رہی تو میں اُٹھ گیا اور اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت میرے علاوہ اس کوٹھی میں کون جاگ رہا ہوگا۔ میں نے سوچ، کون میری مانند دیوانہ ہے۔ چنانچہ کسی سے ملنے یا گفتگو کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر اس وقت باغ کی ٹھنڈی ہوا ہی سکون بخش ہوگی۔ کسی کو شبہ کرنے کا موقع دینا بھی حماقت ہے، چنانچہ میں دبے پاؤں باغ میں نکل آیا۔ درحقیقت باغ کی فضا اس وقت بے حد حسین تھی۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی، چاند کی کمی پوری کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔

میں نے حوض کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھ کر گہری سانس لی اور بینچ پر لیٹ کر رخسار اس پر رکھ دیا۔ ٹھنڈے پتھر نے بے حد سکون بخشا۔ لیکن پھر کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں چونک پڑا۔

یقیناً انسانی قدموں کی چاپ تھی۔ اور میں نے گردن اٹھا کر دیکھا اور پہچان لیا۔ میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا۔ کیونکہ وہ افشاں تھی۔

اس وقت افشاں..... ذہن کے گوشے گوشے سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس تنہائی میں کسی مونس کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ اگر افشاں تھی تو پھر اب باقی کیا رہ گیا تھا۔

میں سکرات کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بدن سے اُٹھنے والی خوشبو مجھے اس کے قرب کا احساس دلا رہی تھی۔ افشاں میرے قریب پہنچ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی خاموش تھی۔ اس کے جذبات بھی اس کی گویائی سلب کر رہے تھے۔ میں نے دوبارہ گال ٹھنڈی بینچ پر رکھ دیا اور تاروں کی چھاؤں میں کھڑی افشاں کو دیکھنے لگا۔

واقعی عجیب سچویشن تھی۔ جذبات پھٹے پڑ رہے تھے۔ لیکن زبانیں اس طرح خاموش ہوگئی تھیں، جیسے بولنا ہی [illegible] جانتی ہوں۔ حالانکہ ہم دونوں عملی دنیا کے انسان تھے۔ حقیقت پسندی کو جذباتیت پر ترجیح دیتے تھے۔ [illegible] کن اس وقت..... اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا تھا، بولنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

افشاں شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے بال اُلجھے اُلجھے نظر آ رہے تھے۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ افشاں کسی سنگتراش کے شاہکار کی مانند خاموش کھڑی تھی اور میں بینچ پر لیٹا تھا۔ پھر شاید ہم دونوں کو ایک ساتھ ہی ہوش آیا۔ ادھر افشاں کے جسم میں حرکت ہوئی، ادھر میں گھبرائے ہوئے انداز میں اُٹھ بیٹھا۔ افشاں ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔ اب وہ سنبھل گئی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا تھا؟“ اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اوہ..... وہ..... وہ..... کہاں؟“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں لیٹے تھے یہاں؟“

”بڑی پُرسکون جگہ ہے افشاں!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”آثار اچھے نہیں ہیں۔“ افشاں مسکراتی ہوئی بولی۔

”کیا مطلب؟“

''جب تنہائیوں میں سکون ملنے لگے، جب انسان راتوں کو جاگنے لگے تو.... تو نہ جانے کیا ہوتا ہے۔''
''بیٹھو افشاں!'' میں نے بڑی اپنائیت سے کہا اور افشاں اور آگے بڑھ آئی۔
''جگہ دو۔'' اس نے کہا اور میرے برابر بینچ پر آ بیٹھی۔ اُس کے حالات بھی زیادہ ٹھیک نہیں تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ بھی دنیا کے ہر خدشے کو فراموش کر بیٹھی ہو۔
''تم بھی نہیں سوئیں افشاں؟'' میں نے پوچھا۔
''بھی، سے کیا مراد ہے؟'' اُس نے شرارت سے پوچھا۔
''میرا مطلب ہے، تم کیوں نہیں سوئیں؟''
''آپ کو نیند کیوں نہیں آئی؟''
''تم شرارت کے موڈ میں ہو۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
''قطعی! لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''
''ایک ایک سوال، ایک ایک جواب۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''منظور!'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''بسم اللہ!'' میں نے کہا۔
''آپ یہاں کس وقت آئے؟''
''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''
''اب آپ سوال کریں گے۔'' افشاں نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔
''اجازت؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''جان کی امان دی جاتی ہے۔''
''آپ کیوں جاگ رہی تھیں، ظلِ سبحانی؟'' میں نے سوال کیا۔
''ہمارے بستر میں کھٹمل ہو گئے تھے۔'' افشاں نے جواب دیا اور ہنس پڑی۔
''غلام جھوٹ کی تشخیص ضرور کر سکتا ہے عالی جاہ!..... اس کی تردید کی جرأت نہیں۔''
''اوہ..... نہایت بزدل غلام ہے۔ خیر، ہم سچ بتائے دے رہے ہیں۔ یوسف و زلیخا کا دور تازہ ہو گیا ہے۔''
''خادم کی عقل بھی موٹی ہے۔''
''عقل کی ڈینٹنگ ہونی چاہئے۔ ہم نے خواب دیکھا تھا۔'' افشاں نے کہا۔
''خواب..... کیا خواب دیکھا تھا؟''
''دیکھئے، نہ تو آپ ہمارے خواب پر مسکرائیں گے، نہ ہمارا مذاق اُڑائیں گے۔ سنجیدگی سے سنیں گے اور اس پر یقین کریں گے۔''
''تعمیلِ ارشاد ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔
''ہم نے خواب میں آپ کو دیکھا تھا۔''
''زہے نصیب۔''
''ہم نے دیکھا، آپ تنہا کھڑے ہیں، اُداس ہیں۔ آپ کی آنکھیں خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش

کر رہی ہیں۔ پھر ہم نے دیکھا، آپ بے چین ہیں، آپ بہت گھبرا رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو آواز دی اور آپ چونک پڑے۔ پھر ہم آپ کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور.....اور آپ ٹھیک ہو گئے۔ خدا کی قسم، ہم نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہماری آنکھ کھل گئی اور پھر ہم بے چین ہو گئے۔ جب ہمیں چین نہیں آیا تو ہم یہاں نکل آئے اور یہاں آپ کو اس انداز میں دیکھ کر ہم سکتے میں رہ گئے تھے۔''

میں خاموشی سے افشاں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی میں کچھ نہیں بول سکا۔ نہ جانے دل کی کیسی کیفیت ہو گئی تھی۔

''اب ہماری باری ہے۔'' افشاں پھر ہنس پڑی۔

''افشاں! میں.....میں کچھ اور نہیں بتا سکوں گا۔''

''دیکھئے جناب! یہ بے ایمانی ہے۔''

''پلیز افشاں! مجھے معاف کر دو۔''

''ہرگز نہیں۔ ہم سے پوچھ لیا اور اب خود..... ہرگز نہیں جناب!...... ہرگز نہیں۔''

افشاں بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔ میں بے بسی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے سچ نہیں بول سکتا تھا۔ میں اپنے اندر سچ بولنے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔ میرا سچ مجھے یقیناً نقصان پہنچا سکتا تھا۔ بلاشبہ افشاں نے عورت کی فطرت سے بغاوت کی تھی، اس نے پورے خلوص سے میرے سامنے وہ سب کچھ سچ سچ کہہ دیا تھا، جو عورت ذہن میں رکھنے کے باوجود کبھی نہیں کہتی۔

لیکن جو کچھ میں کہتا، وہ افشاں کے ذہن کو منجمد کر دینے کے لئے کافی تھا۔ میں اس کی طرح سچ نہیں بول سکتا تھا۔ بھلا میں اس سے کیسے کہتا، افشاں! میری بے چینیاں کچھ اور ہیں۔ بحیثیت عورت تم میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ لیکن میں خود کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے آپ سے اجنبی بن کر خود کو تیار کر رہا ہوں کہ عورت کی دنیا کے پہلے انسان کی مانند تمہیں چاہوں اور اپنا لوں۔

''صائم صاحب!'' افشاں نے پھر مجھے ٹوک دیا۔

''ہوں!'' میں خیالات سے چونک پڑا۔

''آپ کی یہ خاموشی، شرط کی خلاف ورزی ہے۔''

''میں خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا افشاں!''

''میں آپ کو اچھا انسان تسلیم کرتی ہوں۔'' افشاں نے میرے ذہن پر ایک اور تازیانہ لگایا۔ لیکن میں خود کو کسی حد تک تیار کر چکا تھا۔

''شکریہ!'' میں نے کہا۔

''تب پھر بتائیے!''

''کیا بتاؤں؟'' میں نے مسکرا کر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کیوں اپنی خواب گاہ سے نکل بھاگے؟''

''دراصل افشاں! رات کو سیمیں اور احسان میرے کمرے میں آ گئے تھے۔''

''اوہو!'' افشاں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے، اب ہم لوگوں کی نگاہوں تک پہنچ گئے ہیں۔''

''کچھ کہہ رہی تھیں سیمیں باجی؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور پھر سیمیں اور احسان کی پوری گفتگو اسے سنا دی۔ افشاں کے چہرے پر کسی قسم کا تردد یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ وہ دیر تک مسکراتی رہی اور پھر بولی۔

''لیکن اس میں آپ کے لئے پریشانی کی کیا بات تھی؟''

''میں پریشان تو نہیں تھا۔''

''اوہ..... پھر؟''

''بس افشاں! خوشیوں کا ہجوم اتنا وسیع ہو گیا کہ کمرہ تنگ محسوس ہونے لگا اور میں اس کھلی فضا میں نکل آیا۔ اس وقت تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا، جب تمہارے قدموں کی چاپ سنائی دی۔''

''اوہ!'' افشاں کے لہجے میں کسی قدر محجوبیت محسوس ہوئی۔ اُس نے گردن جھکا لی اور میں عجیب سی نگاہوں سے اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ کئی منٹ تک میں اُسے دیکھتا رہا، پھر میں نے اُسے مخاطب کیا۔

''کیوں افشاں! کیا سوچ رہی ہو؟''

''اوں ہوں..... تھوڑا سا تو شرما لینے دیں۔ آخر شرم و حیا، لڑکیوں کا زیور ہے۔'' وہ اسی طرح گردن جھکائے جھکائے مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں ضرور۔'' میں ہنس پڑا۔

''بہر حال، حالات ہماری مدد کر رہے ہیں۔'' چند منٹ کے بعد اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''آہستہ آہستہ یہ بات پھیلتی جا رہی ہے۔''

''تم اس سے خوف زدہ نہیں ہو افشاں؟''

''نہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے حیرت ہے۔''

''کیوں؟..... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''اگر..... میرا مطلب ہے، اگر تمہارے والدین اس انداز میں سوچنے پر تیار نہ ہوئے؟''

''یہ ممکن نہیں صائم صاحب! اگر ایسی کسی بات کا امکان ہوتا تو میں خود محتاط ہو جاتی۔ میں ان راستوں پر قدم بڑھانے کی عادی نہیں ہوں، جو آگے جا کر مسدود ہو جاتے ہوں۔''

''تمہیں اتنا یقین ہے؟''

''آپ کو بھی ہونا چاہئے۔''

''واقعی؟''

''یقیناً صائم صاحب! آپ خود سوچئے، مجھے بھی اپنی عزت پیاری ہے۔ میں لاکھ چاہنے کے باوجود آپ کے پاس اس وقت نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن جب راستے صاف ہوں تو پھر کوئی احتراز میرے نزدیک نہیں ہے۔''

''افشاں! تم عجیب لڑکی ہو۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''اور آپ کے مقابلے میں غریب بھی۔'' افشاں نے کہا اور میں مسکرانے لگا۔ پھر ہنس پڑا۔'' کیوں؟ ہنسی کس بات پر آئی؟''

''میں بھی کچھ احمقانہ انداز میں سوچنے لگا تھا۔''

''یعنی؟''

''بس، یونہی۔ دل چاہا تھا، سوال کروں کہ اگر میں کوئی غریب انسان ہوتا تو کیا تمہاری محبت حاصل کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے، اس میں ایک پہلو احمقانہ بھی ہے۔''

''اوہ، نہیں..... خیر، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی ذات یقیناً محبت کے قابل ہے صائم صاحب! لیکن چند باتیں ضرور ہوتیں۔''

''کیا.....؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اگر آپ کوئی غریب اور غیر معروف انسان ہوتے تو اتنے لوگوں کی توجہ ہی نہ حاصل کر پاتے۔ کون آپ کے بارے میں اس انداز سے سوچتا۔ اگر آپ کی مکمل شخصیت میرے سامنے آ بھی جاتی تو میں یہ ضرور سوچتی کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتی۔ لیکن زندگی گزارنے کا تصور آپ سے وابستہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے معاف کریں، میں آسمان سے نہیں اُتری ہوں۔ ہاں، آپ کی قربت کے بعد، میرا مطلب ہے، آپ سے دائمی طور پر منسلک ہونے کے بعد، اگر آپ اچانک قلاش ہو جائیں، خدانخواستہ آپ کے پاس کچھ نہ رہے اور اس وقت آپ، اپنی فطری خودداری سے کام لے کر کسی کی اعانت نہ قبول کریں تو سن لیں، میری پیشانی پر بل نہیں آئے گا۔ میں اتنی ہی خوشی اور مسرت سے آپ کے ساتھ مل کر مستقبل کے منصوبے بناؤں گی اور اپنے مسائل ٹالنے میں آپ کی معاون بنوں گی۔''

''افشاں!'' میں نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ایمان سے، بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے۔''

''آپ میری اس بات سے ناراض ہو گئے؟''

''خدا کی قسم نہیں۔ تم نے اس قدر حقیقی اور سچی بات کہی ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔''

''آداب..... بندی کس قابل ہے؟''

''تم بے حد ذہین ہو افشاں!''

''لیکن آپ سے کم۔''

''اوہ، نہیں افشاں! میں کچھ بھی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا اور افشاں مسکراتی رہی، پھر بولی۔

''یہ صرف انکساری ہے۔''

''کیوں؟''

''اب دیکھئے، آپ کتنی خوب صورتی سے وہ سوال کر گئے، جو میں مزید آپ سے کرنے والی تھی۔''

''اوہ!..... کچھ اور بھی سوالات رہ گئے ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر کر لیں وہ بھی۔''

''عادل بھائی کہاں گئے ہیں؟'' افشاں نے سوال کیا اور میں ایک لمحے کے لئے بوکھلا گیا۔ خاصا خطرناک سوال تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت میں ایسی جذباتی کیفیت میں تھا کہ افشاں سے جھوٹ بولنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن افشاں نے جو حقیقی گفتگو کی تھی، ایک انداز سے وہ خطرے کی گھنٹی بھی تھی، یعنی سارا کھیل بگڑ سکتا تھا اور اس وقت، جب زندگی کی بہت سی گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ غیر متوقع طور پر کچھ خوشیاں ملنے والی تھیں، میں اپنی کسی جذباتی لغزش سے کھیل خراب نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ فوری طور جھوٹ بولنا تھا اور جھوٹ بھی نہایت سلیقے کا۔ کیونکہ ایک ذہین شخصیت کے سامنے بولا جانے والا تھا۔

''ریاست۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ! کسی خاص پروگرام کے تحت؟'' افشاں نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابو جان سے انہیں کچھ خصوصی مراعات مل گئی ہیں۔ دراصل یہ ایک اُلجھی ہوئی کہانی ہے افشاں! ایسی کہانی، جسے ہم نے ذہنوں سے نکال پھینکا ہے۔''

''اللہ..... ہمیں بھی سنا دیں۔'' افشاں نے کہا۔

''کسی حد تک دردناک بھی۔''

''رولیں گے تھوڑے سے۔'' افشاں مسخرے پن سے بولی اور میں اُس کی شرارت پر مسکرا پڑا۔

''تمہاری مرضی۔ دراصل افشاں! ہم ریاست سے نکالے ہوئے ہیں۔ ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ بلکہ والد صاحب غلطی کر بیٹھے تھے۔ یوں سمجھو، کرتے ہی رہتے تھے۔ عادل میرا سگا بھائی نہیں ہے۔ ماں دوسری تھی۔ ایک ماں سے میں، دوسری سے عادل بھائی۔ لیکن ہم دواوں کی ماؤں کے بعد والد صاحب نے تیسری شادی بھی کر لی اور وہ ماں، ہم دونوں سے بے پناہ نفرت کرنے لگی۔ اتنی نفرت کہ کئی بار اس نے ہم دونوں بھائیوں کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ والد صاحب کے علم میں ساری باتیں تھیں لیکن وہ بیویوں سے ڈرنے کے عادی ہیں۔ اور یہ عادت انہوں نے آج تک ترک نہیں کی۔''

''عادت؟''

''ہاں۔ میری اور عادل کی ماں سے بھی وہ اسی طرح ڈرتے تھے۔''

''اوہ!'' افشاں مسکرا پڑی۔

''چنانچہ وہ نئی ماں سے بھی اتنے ہی خوف زدہ تھے اور اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ پھر جب ہمارے بچ جانے کے بعد ہماری ماں، موت کے دوسرے منصوبے بنانے لگی تو والد صاحب نے ہم سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ جان بچاؤ۔ تجویز یہی طے پائی کہ ہم دنیا گردی کرنے نکل جائیں۔ دولت کی تو کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ریاست کی حکمرانی کے لئے وہ نئی اولاد پیدا کر لیں گے۔ اور اگر یہ تیسری ماں مر گئی اور چوتھی اچھی عادت کی ثابت ہوئی تو وہ ہمیں واپس بلا لیں گے۔ لیکن اگر وہ بھی غلط ہوئی تو انہوں نے ہم سے وعدہ کر لیا کہ ہم اس تیسرے بھائی کو اپنے ساتھ ہی رکھیں گے، جو تیسری ماں سے پیدا ہوگا۔''

افشاں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''تم اس دردناک کہانی پر ہنس رہی ہو؟''

''اللہ..... کیا یہ حقیقت ہے؟'' افشاں ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ ایک دردناک حقیقت۔'' میں نے ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے کہا اور افشاں بھی بمشکل، شاید میری وجہ سے سنجیدہ ہوگئی۔

''اچھا..... پھر کیا ہوا؟''

''چنانچہ ہم چل پڑے۔ طے یہ پایا ہے کہ عادل بھائی ہر ماہ خفیہ طور پر والد صاحب سے ملاقات کرتے رہیں گے۔ چنانچہ وہ ان سے ملنے جاتے ہیں۔''

''اوہ..... تم نہیں جاتے؟''

''نہیں۔ میں سینئر ہوں، اس لئے میری کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''تیسری ماں کا کیا حال ہے؟'' افشاں نے پوچھا۔

''زندہ بھی ہے اور صحت مند بھی۔ اب تو والد صاحب بھی مایوس ہو گئے ہیں۔'' میں نے مسمسی سی صورت بنا کر کہا اور افشاں نے پھر قہقہہ لگایا۔

''گویا اس کا مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور افشاں میری غم زدہ شکل دیکھتی رہی۔ کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور کبھی وہ سنجیدہ بننے کی کوشش کرتی۔ پھر وہ جھنجلا کر بولی۔

''اللہ..... اب بس بھی کریں، یہ اداکاری طویل ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے نہایت خوب صورت طریقے سے بے وقوف بنایا ہے۔ قسم کھا کر بتائیں، جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے۔''

''افشاں! میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ حقیقت ہے، جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس انداز میں کہا گیا ہے کہ موسم اور ماحول خراب نہ ہونے پائے۔ تم ان لوگوں کی داد نہیں دو گی جو اپنا مذاق خود اُڑانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔''

''سوری! اگر یہ بات ہے تو مجھے افسوس ہے۔'' افشاں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کس بات پر؟''

''آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔''

''ہم نے اسے زیادتی سمجھنا چھوڑ دیا ہے افشاں! تم نے دیکھا، ہم دونوں کس قدر خوش ہیں اور ہمیں افسوس کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہمارا باپ ہم سے مخلص ہے۔ اگر اس کی کچھ مجبوریاں ہیں تو ہم ان میں اضافہ کیوں کریں؟ ہمیں دنیا کے کسی بھی خطے میں کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا کے بینکوں میں ہمارے اکاؤنٹ موجود ہیں۔ رہی حکومت کی بات، تو حکومت کرنے میں کیا رکھا ہے افشاں!''

''بے شک، لیکن کیا آپ لوگوں کو یہ بھی اجازت ہے کہ جہاں چاہیں، رہیں؟''

''ہاں، مکمل۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے، یعنی.....'' افشاں جھجکنے لگی۔

''ہاں، مکمل آزادی ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ شرما گئی۔

''واقعی، انوکھی داستان ہے۔ کسی حد تک افسوس ناک بھی۔ لیکن آپ کے سنانے کے انداز نے اس کا تاثر بدل دیا ہے۔''

''لکیریں پیٹنے سے کیا ملتا ہے؟''

''ہاں واقعی، آپ کو خوش رہنا چاہئے۔'' افشاں نے بڑی اپنائیت سے کہا اور پھر بولی۔ ''بس ایک بات اور ذہن میں اُلجھی رہ گئی ہے۔''

''کیا؟ وہ بھی پوچھ لیں۔''

''اُس روز کیا ہوا تھا؟...... میرا مطلب ہے، جس دن شکیلہ نے افشاں ہونے کا دعویٰ کیا تھا؟''

''اوہ، وہ عادل بھائی کی شرارت تھی۔'' میں نے بظاہر اس سوال کو زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو خوف ناک سوال تھا۔ گویا افشاں کے ذہن میں یہ سب کچھ تھا۔

''مگر یہ کیسی شرارت تھی؟''

''ویسی ہی، جیسی اس دن تم نے تیراکی کے سلسلے میں دیکھی تھی۔ کیا پانی پر دوڑنا معمولی بات ہے؟''

''ہرگز نہیں۔ آپ لوگوں کی ان انوکھی قوتوں پر سب حیران ہیں، ورنہ وہ مریل گھوڑا بھلا ریس میں دوڑنے کے قابل تھا؟''

''دراصل ہماری ریاست کے ایک بزرگ، بابا صادق شاہ بچپن سے اس پر مہربان تھے اور بابا صادق شاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ جس پر ان کی نگاہ ہو جائے، وہ بہت کچھ بن جاتا ہے۔''

''اوہ......تو کیا تمہارے خیال میں؟''

''یہ خیال صرف میرا ہی نہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کا ہے کہ بابا صادق شاہ نے عادل کو کچھ دیا ہے۔ لیکن ایسی باتیں اپنے سائے سے بھی چھپائی جاتی ہیں۔ عادل شوخ طبیعت ہے، اس لئے وہ کبھی کبھی ایسی حرکتیں کر جاتا ہے، ورنہ یہ باتیں تو کسی کے علم میں نہیں آنی چاہئیں۔''

''اوہ!'' افشاں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔ ''تو آپ بھی اس بات سے ناواقف ہیں؟''

''نہیں، ناواقف تو نہیں ہوں لیکن تفصیل بھی نہیں جانتا۔''

''آپ نے کبھی پوچھا بھی نہیں؟''

''ہاں، لیکن عادل نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔''

''بہرحال حیرت انگیز بات ہے۔''

''میرے لئے اب نہیں رہی ہے۔''

''ظاہر ہے، آپ تو بے شمار انوکھی باتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا حضور! اب تو کافی باتیں ہو گئیں۔ اب آپ بھی کمرے میں جایئے، آرام سے سویئے اور مجھے بھی اجازت دیجئے۔''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں افشاں! اس وقت تم نے آ کر مجھے روحانی سرور بخشا ہے۔''

''آپ اُداس تھے، میں کیوں نہ آتی۔'' افشاں پیار بھرے انداز میں بولی۔

''تم میری ساری زندگی کی اُداسیاں سمیٹ لو گی افشاں!''

''جی۔ اور ان کی گٹھڑی باندھ کر کسی گہرے کنویں میں پھینک دوں گی۔ پھر آپ ساری زندگی اُداس نہیں ہوں گے۔'' افشاں نے کہا اور میں جذباتی انداز میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے

بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا لوں۔ لیکن وہ عام لڑکی نہیں تھی اور میں کوئی ایسی حرکت کر کے خود کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہم دونوں اُٹھ گئے۔ اور پھر تھوڑی دُور پہنچ کر رک گئے۔ یہاں سے دونوں کو دو مختلف راستوں پر جانا تھا۔

''افشاں!'' میں نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' اس نے محبت پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''اگر اس وقت کوئی ہمیں دیکھ لے؟''

''آپ نے یہ بات اب سوچی ہے؟'' افشاں نے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے اس وقت سوچی تھی، جب آپ نظر آئے تھے۔''

''اوہ! تب تمہیں خوف نہیں محسوس ہوا؟''

''خوف؟..... کس بات سے؟''

''اگر ہمیں کوئی اس وقت اس جگہ دیکھ لے؟''

''تو پھر کیا ہوگا؟''

''لوگ غلط بھی سوچ سکتے ہیں۔''

''نہیں صائم صاحب! اوّل تو کوئی غلط نہیں سوچے گا۔ اور اگر سوچے گا بھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب سے بڑا نگراں میرا ضمیر ہے اور اس نے اس وقت آپ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے، پھر کسی اور کے اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ دوسری بات یہ کہ بہر حال ہمارا آپ کا ذہنی رابطہ ہے۔ آپ کوئی راہ گیر نہیں ہیں۔ وہ ہیں، جن کے ساتھ میں نے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور میں بہر طور اس فیصلے پر عمل درآمد کراؤں گی۔ اس طرح خود آپ کی اپنی ایک شخصیت ہے اور جو مجھے اس وقت، اس جگہ آپ کے ساتھ دیکھ کر اعتراض کرتا ہے، اس کا مطلب ہے وہ آپ کی شخصیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور ایسا شخص بہر حال میرے لئے قابلِ اعتنا نہ ہوگا، خواہ اس کا مجھ سے کوئی بھی رشتہ ہو۔'' افشاں نے انتہائی مضبوط لہجے میں کہا۔

اور میں افشاں کی شکل دیکھنے لگا۔

''اچھا، خدا حافظ۔ شب بخیر!'' افشاں نے کہا اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ عمارت کے دروازے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

میں بھی واپس اپنے کمرے میں آگیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند اس بار بھی آنکھوں سے دُور تھی۔ لیکن اب ذہن میں کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ افشاں کے پیار بھرے انداز نے، اس کے الفاظ نے زندگی میں ایک نیا رنگ بھر دیا تھا۔ بلاشبہ افشاں جیسا ساتھی تو زندگی کی ساری کلفتوں کو اپنی ایک مسکراہٹ میں سمیٹ سکتا ہے، اس پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا دن حسبِ معمول تھا۔ افشاں پورے اعتماد سے میرے سامنے آئی تھی۔ ناشتے کی میز پر بھی اس نے اپنی عنایتوں کی بارش جاری رکھی۔ میں خجل ہو رہا تھا لیکن افشاں کی پیشانی پر کوئی نشان نہیں تھا۔ ہاں،

سیمیں اور احسان زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ لیکن اس طرح کہ ان کی مسکراہٹ کوئی محسوس نہ کر سکے۔
''شہزادہ عادل کی غیر موجودگی بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''میرے منہ کی بات چھین لی۔ صائم میاں اور عادل میاں ہم شکل ہیں لیکن ان دونوں میں ایک فرق نمایاں ہے۔ عادل کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ہمیشہ شرارت مسکراتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس صائم میاں کی آنکھوں میں سنجیدگی اور وقار ہے۔ اور یہ دُور ہی سے بڑے بھائی نظر آ جاتے ہیں۔'' نواب جلال الدین بولے۔
''واقعی، بڑا خوش مزاج بچہ ہے۔'' بڑی ماں بھی بول پڑیں۔
''آپ کو پسند ہے بڑی ماں؟'' سیمیں نے پوچھا۔
''مجھے تو دونوں پیارے لگتے ہیں۔'' بڑی ماں نے جواب دیا۔
''نہیں۔ زیادہ کون اچھا لگتا ہے؟''
''کم زیادہ کی بات مت کرو۔ اب تو یہ بچے بھی کوئی الگ تھوڑی ہیں؟ جیسی افشاں، تم لوگ، ویسے وہ۔ کسی ماں سے یہ سوال مت کرنا کہ اسے اپنا کون سا بچہ زیادہ پیارا لگتا ہے۔ اس کے لئے یہ سوال دنیا کا سب سے مشکل ہوگا، جس کا وہ کبھی جواب نہ دے سکے گی۔'' بڑی ماں نے جواب دیا۔
سیمیں مسکرانے لگیں۔
''اچھا بھئی تو صائم میاں! آج کا کیا پروگرام ہے؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں۔ بس عادل کا انتظار کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ اسی وقت تصدق ایک تار ہاتھ میں لئے اندر آیا اور اس نے لفافہ تنویر صاحب کو پیش کر دیا۔
''کیا ہے؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔
''ٹیلی گرام ہے صاحب!'' تصدق نے احمقانہ جواب دیا اور تنویر صاحب نے لفافہ کھول لیا، پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔
''جمشید آ رہے ہیں۔''
''ارے ارے۔'' بڑی ماں اُچھل پڑیں۔ ''کب؟''
''آج ہی پہنچ جائیں گے۔''
''مگر کس وقت؟''
''ساڑھے گیارہ بجے۔''
''ارے واہ!..... اللہ تعالیٰ اس کی زندگی رکھے، اب تو وہ خوب بڑا ہو گیا ہوگا۔'' بڑی ماں محبت بھرے انداز میں بولیں۔
''ہاں بھئی، افشاں سے پانچ سال بڑے ہیں جمشید میاں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''انکل! یہ وہی جمشید ہیں نا، نسیم پور والے؟'' سیمیں نے پوچھا۔
''ہاں ہاں بیٹی! میرے بھائی کا بچہ ہے۔ بھائی جان تو ولایت جا کر سب کو بھول گئے۔ بھابی جان کا ار بہت تھا ان پر۔ مگر یہ بچہ اللہ رکھے، ہمیشہ سے محبت کر رہا ہے۔ اس کے خط آتے ہی رہتے ہیں مگر اس لے اچانک آنے کا پروگرام کیسے بنا لیا؟'' بڑی ماں کے لہجے سے پیار ٹپک رہا تھا۔ تنویر صاحب کا چہرہ کچھ

سپاٹ سپاٹ سا تھا۔
''چلئے اچھا ہے، ہم لوگ بھی موجود ہیں۔ ملاقات ہو جائے گی۔'' سیمیں نے کہا۔
''ہاں، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''
''ارے تصدق! تیاریاں تو کر۔ ساڑھے گیارہ بجے اسے لینے بھی جانا ہے۔'' بڑی ماں نے کہا۔
''اور ہاں، اس کے لئے ایک کمرہ بھی درست کرنا ہے، بالکل ولایتی طرز پر۔ نہ جانے وہاں ان کا طرز رہائش کیا ہو۔ یہاں اسے کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ پھوپھی کے ہاں، اللہ رکھے بارہ سال بعد آ رہا ہے۔'' بڑی ماں پیار کے عالم میں بولتی رہیں۔ لیکن میں نے تنویر صاحب کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں دیکھے۔ پھر نواب جلال الدین، سیمیں، احسان اور بڑی ماں، جمشید اور اس کے والدین کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں بھی رسمی طور پر اس گفتگو میں شریک تھا۔ تنویر صاحب نے کسی مصروفیت کا ذکر نہیں کیا اور اُٹھ گئے۔ پھر میں نے بھی اجازت مانگی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔
شاید افشاں بھی میرے پیچھے ہی اُٹھ گئی تھی۔ کیونکہ چند ہی منٹ کے بعد وہ بے تکلفی سے میرے کمرے میں آ گئی۔ افشاں کی اس بے تکلفی سے میں کسی حد تک خوف زدہ تھا لیکن اس سے کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جس ٹائپ کی تھی، مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کی خود اعتمادی کو توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔
''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے، کیسی کمبل قسم کی لڑکی ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
''اوہ! ان پُر تکلف جملوں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں، بس ایسے ہی کہا تھا۔ ظاہر ہے، آپ ابھی ناشتے کے کمرے سے اُٹھ کر آئے ہیں اور پھر میں یہاں آ گئی۔ دراصل میرے ذہن میں یہ احساس تھا کہ آپ تنہا ہیں، میرا مطلب ہے، عادل بھائی موجود نہیں ہیں۔''
''ہاں، میں تنہائی تو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن آپ کے قرب سے میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔''
''کیوں؟''
''کوئی بہت ہی عزیز شے ہوتی ہے افشاں! انسان اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کہیں وہ کھو نہ جائے۔ میرے ذہن میں کئی وسوسے جاگنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے، لوگ تمہارے ذہن تک نہ پہنچ سکیں''
''اوہ، آپ یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اس کی پوری ذمہ دار میں ہوں گی۔ آئندہ آپ خوف کے عالم میں نہیں رہیں گے۔ میں اب اس سے زیادہ بے باک نہیں بن سکتی کہ آپ..... آپ اپنی شخصیت پر، اب صرف اپنا حق نہ سمجھیں آپ اپنے لئے کبھی خوف زدہ نہ ہوں۔ کیونکہ یہ ذمہ داریاں میں نے سنبھال لی ہیں۔''
''افشاں! تمہاری اس اپنائیت نے زندگی بھر کی محرومیاں دھو دی ہیں۔''
''دخل در معقولات۔'' دروازے سے شکیلہ کی آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا لیکن افشاں کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا۔
''اب تم یہ نا معقولیت کر ہی بیٹھی ہو تو آ جاؤ!'' افشاں نے کہا۔
''معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اس خیال سے اندر آنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی کہ بہرحال آپ

گفتگو پرائیویٹ نہیں ہوگی۔" شکیلہ نے کہا۔
"خیر..... خیر، اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟..... آؤ۔" افشاں مسکراتے ہوئے بولی اور شکیلہ اندر آ گئی۔
"چونکہ میرا دل صاف ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اس لئے میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی؟" شکیلہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔
"ارے، ارے..... یہ لڑکی تو حد سے آگے بڑھ رہی ہے۔ حالانکہ میری ہم شکل ہونے کے ناطے سے اسے تو بڑا مہذب ہونا چاہئے تھا۔" افشاں آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔
"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم خود ہی کوئی مناسب گفتگو تصور کئے لیتے ہیں۔ ہاں، تو پھر کیا ہوا؟" شکیلہ نے کہا۔
"پھر عادل بھائی کہنے لگے۔ شکیلہ! یقین کرو، میری زندگی میں اس سے قبل کوئی لڑکی نہیں آئی۔ اب تم آ ہی گئی ہو تو اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" افشاں کہنے لگی۔ میں ہنس پڑا اور شکیلہ جھینپ گئی۔
"خوب..... پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔
"ارے، ارے..... آپ بھی اس افشاں کی بچی کی باتوں میں آ گئے۔" شکیلہ نے کہا۔
"اُفوہ، تم ہماری گفتگو میں دخل مت دو۔ تو پھر......" افشاں نے کہا اور شکیلہ جلدی سے واپس مڑی۔ لیکن افشاں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔
"بیٹھو شکیلہ بی بی! تمہارے دل میں تو کوئی چور نہیں ہے؟" افشاں ہنستے ہوئے بولی۔
"ہاں، ہاں..... نہیں ہے۔ لیکن تم بھگانا چاہتی ہو۔" شکیلہ نے کہا۔
"ارے نہیں۔ تم کہو تو میں یہ موضوع بدل دوں؟"
"چلو بدل دو افشاں! کوئی اور بات کرو۔" میں نے کہا۔
"اچھا، چلو مان لیا۔"
"کیوں نہ مانو گی۔" شکیلہ نے آہستہ سے کہا۔
"اچھا، اچھا..... پھر شروع ہوتی ہوں۔"
"یہ جمشید صاحب کون ہیں افشاں! جن کے بارے میں کھانے کی میز پر تذکرہ ہوا تھا؟" میں نے شکیلہ کی مدد کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔
"میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ امریکہ میں رہتے ہیں۔ ماموں جان کا وہیں کاروبار ہے۔"
"اوہ!" میں نے گردن ہلائی۔ "کتنا عرصہ قبل گئے تھے؟"
"طویل عرصہ ہو گیا۔ ماموں جان کافی مغرور ہیں۔ ابو انہیں پسند نہیں کرتے۔"
"میں نے محسوس کیا تھا۔"
"بہر حال، امی جان کے تو بھائی ہیں۔ امی ان سے کافی محبت کرتی ہیں۔"
"کیسے انسان ہیں؟"
"کون، ماموں جان؟"

سوئم

''نہیں، جمشید صاحب۔''

''اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب تو میں شکل بھی بھول گئی ہوں۔ چھوٹے سے تھے جب دیکھا ہے۔ ویسے امریکہ سے خط آتے ہیں، وہ بھی اُردو میں۔ لگتا ہے جیسے تیسری کلاس کے بچے نے لکھے ہوں۔''

''اوہ، ظاہر ہے، وہاں اُردو تو پڑھ نہیں رہے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' افشاں بولی۔

''بہر حال، دیکھیں کس قسم کے آدمی ثابت ہوتے ہیں۔''

''اور ثابت بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔'' افشاں ہنس پڑی۔

''اوہ، تمہارے ماموں زاد بھائی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ماموں جان کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، اس کے تحت میں بھی ابو جان کی ہم خیال ہوں۔'' افشاں نے کہا اور پھر شکیلہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ارے، تم بہت اُداس ہو شکیلہ؟''

''ہائیں، ہائیں..... اچھی خاصی تھیں۔ پٹری سے کیوں اُتر گئیں؟'' شکیلہ نے کہا۔

''خوب!..... تو یہ یہاں کانفرنس ہو رہی ہے۔ موضوع کیا ہے؟ ہم بھی تو سنیں۔'' دروازے سے سیمیں اور احسان اندر داخل ہو گئے اور ہم چونک پڑے۔

''سیمیں باجی! گستاخی تصور نہ کریں تو ایک بات بتائیں۔''

''پوچھو؟''

''دن یا رات کا کوئی لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے، جب آپ دونوں ساتھ نہ ہوں؟''

''ارے..... اوہ..... میں شاید مخل ہوا ہوں۔'' احسان جلدی سے بولا۔

''نہیں احسان بھائی! پلیز۔ میں تو یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ دونوں کون سا سریش استعمال کرتے ہیں؟''

''فکر مت کرو، ہم تمہارے لئے بھی منگوا دیں گے۔'' سیمیں نے جلدی سے کہا۔

''لیکن یہ لگائیں گی کیسے؟'' شکیلہ کو موقع مل گیا۔

''جو بھی سامنے پڑ گیا۔'' سیمیں نے شرارت سے کہا۔ میں افشاں کے بالکل سامنے تھا۔

''اللہ...... باجی! ایک شیشی فوری طور پر شکیلہ کے لئے بھی منگوا دیں۔ دیکھیں نا، بے چاری کتنی اُداس ہے۔ اگر سریش ہوتا تو.....'' افشاں بہت تیز تھی۔ سب ہنس پڑے۔ شکیلہ اور طالوت کی بات اب کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ شکیلہ منہ کھول کر رہ گئی۔

''بس بس افشاں بی!..... میری شکیلہ کو زیادہ تنگ مت کرو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کا کوئی ہمدرد نہیں ہے؟'' سیمیں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

یونہی دلچسپ گفتگو ہوتی رہی اور سب قہقہے لگاتے رہے۔

''صائم بھائی! میں خاص طور سے آپ کو ایک خوشخبری دینے آئی تھی۔''

''اوہو۔ پھر اتنی دیر تک آپ خاموش کیوں رہیں؟''

''بول تو رہی تھی۔ شکیلہ کی حفاظت کے خیال سے سب کچھ بھول گئی تھی۔''

''ہائے! شکیلہ کا محافظ بھی جلد آ جائے گا۔'' افشاں پھر بولی۔

''افشاں! تم خاموش نہیں رہو گی؟..... صائم بھائی! آپ ہی اسے خاموش کرائیں۔'' سیمیں بہت تیز ہو گئی تھی۔

''وہ خوشخبری تو سناؤ سیمیں!''

''آج ماشاء اللہ، مہمانوں کی آمد آمد ہے۔ بوا بھی دس بجے والی ٹرین سے پہنچ رہی ہیں۔ اکیلی گھبرا رہی تھیں بے چاری۔ لیکن ان کا خط دیر سے ملا۔''

''ارے..... ٹرین تو آ بھی چکی ہو گی۔ دس تو بج رہے ہیں۔''

''خط ابھی تھوڑی دیر پہلے ملا۔ تصدق کو روانہ کر دیا گیا ہے۔''

''ویری گڈ۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کوٹھی میں ایک نئی زندگی دوڑنے والی ہے۔''

''یہ بوا کون ہیں؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

''صائم بھائی کی محبوبہ۔'' سیمیں پھٹ سے بولی اور میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ شکیلہ میری طرف دیکھنے لگی تھی۔

''عرصہ ہو گیا انہیں دیکھے ہوئے۔ کیسی ہو گئی ہوں گی وہ؟'' میں نے کہا۔

''پہلے سے زیادہ حسین۔'' سیمیں نے کہا اور ہنس پڑی۔ احسان بھی ہنس رہا تھا۔

''عادل بھائی جلدی سے واپس آ جائیں، لطف ادھورا رہ جائے گا۔'' سیمیں ہنستے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے، کل تک عادل ضرور آ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''چلئے، بوا کے استقبال کے لئے چلیں۔ اب کمرے سے نکلئے۔'' سیمیں نے کہا اور ہم سب کمرے سے نکل آئے۔ بیرونی برآمدے میں نواب جلال الدین، بڑی ماں سے گفتگو کر رہے تھے۔ اس گروہ کو دیکھ کر ہم خوش ہو گئے اور ہم سب ان کے نزدیک پہنچ گئے۔

''ماشاء اللہ! واقعی لطف آ رہا ہے یہاں۔ میں تو اپنا پروگرام کچھ اور طویل کر دوں گا۔''

''تو تمہیں جانے ہی کون دے رہا ہے؟ بس منہ دھو رکھو، تین چار مہینے سے پہلے نہیں جانے دوں گی۔'' بڑی ماں نے کہا۔

''اوہ، تین چار مہینے تو بہت ہوتے ہیں۔ بہرحال، پھر بھی۔'' نواب صاحب ہنستے ہوئے بولے اور اسی وقت تنویر صاحب کی کار، مین گیٹ سے اندر داخل ہوتی نظر آئی۔ اسٹیشن گئی تھی۔ تصدق، بوا کو لے کر آیا تھا۔ اور پھر پورٹیکو میں بوا پچھلے دروازے سے اُتریں۔ وہی شباب تھا۔ آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسی، ہونٹوں پر باتوں کی دھڑی، زیورات سے لدی پھندی، چوڑی دار پائجامہ، باریک ریشمی کُرتہ، جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ تندرستی بھی خوب تھی۔

اور پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکیں۔ ''سلام بہو!...... سلام میاں!'' انہوں نے بڑی ماں اور نواب صاحب کو سلام کرتے ہوئے کہا اور پھر بڑھ کر دونوں کی بلائیں لیں اور انگلیاں چٹخانے لگیں۔

''اچھے تو ہو یہاں۔ مجھ نگوڑ ماری کو وہاں چھوڑ آئے۔ دن رات کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ ایک پل دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہائے، میں تو ادھ موئی ہو گئی۔''

''چلئے، آپ نے اچھا کیا بوا! یہاں آ گئیں۔''

''اللہ خوش رکھے۔ سیمیں بٹیا کہاں ہے؟..... ہائے میری تو آنکھیں ترس رہی ہیں اسے دیکھنے کو۔''

''یہ ہوں بوا!.....سلام۔''

''آئے جیتی رہو۔ پھلو پھولو۔'' بوا، سیمیں کی طرف لپکیں اور پھر احسان اور سیمیں دونوں کو گلے لگا لیا۔

''ہم بھی تو ہیں بوا!'' افشاں آگے بڑھ آئی۔

''آئے جیتی رہو میری بچی!......کون ہے یہ بچی؟'' بوا نے افشاں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ ہی کی بچی ہے بوا!'' بڑی ماں نے کہا۔

''ایں!'' بوا چونک پڑیں۔ پہلے حیرت سے بڑی ماں کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''آئے، مذاق کر رہی ہو۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔'' اوران کی اس بات پر زوردار قہقہہ پڑا۔

''ان کا مطلب ہے، یہ تنویر بھائی کی بیٹی افشاں ہے۔'' نواب صاحب جلدی سے بولے۔ ''کیا یہ آپ کی بچی نہیں ہوئی بوا؟''

''آئے یہ مطلب ہے۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ خدا سلامت رکھے۔ ایں، یہ بھی ہے..... ہائے، جڑواں معلوم ہوویں ہیں دونوں۔'' بوا کی نگاہیں شکیلہ پر پڑ گئی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے بھی دیکھ لیا اوران کا منہ بھاڑ جیسا کھل گیا۔

''سلام بوا!'' میں نے کہا۔ لیکن بوا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں مجھے گھور رہی تھیں۔

نواب جلال الدین بھی خاموشی سے مسکراتے رہے۔ پھر بوا نے آنکھیں ملیں اوران کے منہ سے نکلا۔ ''یا الٰہی! کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟''

''کیا ہوا بوا؟'' سیمیں نے پوچھا۔

''آئے، یہ وہ نہیں ہیں......وہ؟''

''کون ہے؟''

''آئے وہی۔ اے بی بی! ذرا غور سے دیکھو۔''

''میں نے دیکھ لیا بوا!'' سیمیں نے کہا۔

''ان کی شکل نہیں ہیں۔''

''کن کی؟''

''آئے وہی اپنے صائم میاں اور عادل میاں۔''

''وہی ہیں۔'' سیمیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آئے، میرے رب..... یہ کہاں سے آ گئے؟..... ہائے، تم تو سب کو تڑپا گئے بیٹا!'' بوا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ بعد میں ہمارے تعلقات بوا سے بہت اچھے ہو گئے تھے۔ بوا محبت کی ماری رونے لگی تھیں

''بس بوا!.....آپ کی یاد دوبارہ کھینچ لائی۔''

''ہائے، تم تو گھوڑے لے گئے تھے۔'' بوا روتے ہوئے بولیں۔

''ہاں۔ پھر وہ ہمیں یہاں چھوڑ گئے۔''

بوا روتی رہیں اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ ''اور وہ کہاں گئے؟''

''کون بوا؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آئے، میں نہیں پہچان سکی، تم عادل ہو کہ صائم؟'' بوا روتے روتے ہنس پڑیں۔
''وہ بھی آجائیں گے۔''
''آئے، اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ ہائے، ان بچوں کے لئے کیسا کلیجہ کٹتا ہے میرا۔ روشنی بن گئے تھے آنکھوں کی۔ جی خوش ہو گیا ہے تمہیں دیکھ کر میرے بچے!'' بوا کبھی رو رہی تھیں، کبھی ہنس رہی تھیں۔ اور جنہوں نے انہیں نہیں دیکھا تھا، وہ اس عجوبے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ تصدق بھی برابر آکھڑا ہوا تھا۔
کئی منٹ کے بعد بوا سنبھلیں، پیچھے ہٹیں تو تصدق سے ٹکرا گئیں۔ انہوں نے تصدق کی شکل دیکھی اور آگ بگولہ ہو گئیں۔ ''ہاں، ہاں..... آجاؤ..... چڑھ جاؤ میرے اوپر۔ اے میں کہوں، تیرا دماغ ٹھیک ہے؟''
''ارے، ارے بوا! کیا ہوا؟'' نواب صاحب جلدی سے بولے۔
''ارے یہ ہے کون موا؟...... بیلن کا بیلن۔ گاڑی میں بھی میرے پاس ہی آبیٹھا۔ ڈرائیور کے برابر کی سیٹ خالی پڑی تھی، مگر میرے پاس ہی گھس مرا تھا اور بار بار سرک رہا تھا میری طرف۔ ارے یہاں بھی آمرا کم بخت مارے!''
اور تصدق بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔
''ارے ارے...... ان بڑی بی کو نہ جانے مجھ سے کیا دشمنی ہو گئی ہے۔'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔
''تم نے کوئی بدتمیزی کی ہو گی تصدق!'' بڑی ماں بولیں۔
''ارے نہیں بڑی ماں! انہوں نے بڑی زور سے نوچا تھا۔'' تصدق ران سہلاتے ہوئے بولا۔
''آئے ہائے، نوچا تھا..... تو بار بار مجھ سے کیوں چمٹا جا رہا تھا؟'' بوا بولیں۔
''میں چمٹ رہا تھا؟'' تصدق آنکھیں نکال کر بولا۔
''تو کیا میں چمٹ رہی تھی تجھ سے، مٹے صورت حرام۔ ارے ایسی ویسی مت سمجھ لینا، ہاں۔ کچا چبا جاؤں گی۔'' بوا مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئیں۔
''یہ زیادتی ہے بڑی ماں!'' تصدق فریاد کرتے ہوئے بولا۔ لڑکیوں کے پیٹ میں درد ہوا جا رہا تھا، ہنستے ہنستے۔ یہاں تک کہ بڑی ماں بھی ہنس رہی تھیں۔
''ارے تو تُو بیٹھا ہی کیوں تھا پیچھے؟ اب تیار ہو جا جلدی سے، ایئرپورٹ چلنا ہے۔''
''آیئے بوا!..... آپ اندر چلئے۔'' نواب جلال الدین ہنستے ہوئے بولے اور بوا کا شانہ پکڑ کر اندر لے چلے۔ ہم سب بھی ان کے پیچھے ہی چل پڑے تھے۔
''غضب کی چیز ہیں یہ بوا تو۔'' افشاں بولی۔
''تصدق کو نوچ لیا۔'' شکیلہ پھر ہنس پڑی اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔
نواب صاحب، بوا کو لے کر اندر پہنچ گئے۔ اور پھر انہوں نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''بھئی، بوا کے قیام کے لئے بندوبست کرو۔ تھکی ہوئی آئی ہیں۔''
''آیئے بوا!'' افشاں نے کہا اور پھر پورا گروہ، افشاں اور بوا کے پیچھے چل پڑا۔ ''بڑا ہی کم بخت ہے یہ تصدق بھی۔ اب بتایئے، بوا کے پیچھے ہی پڑ گیا۔''
''اسے دیکھنا بیٹی! ٹھیک کر دوں گی مٹے مارے کو۔ مگر یہ ہے کون؟''

"ملازم ہے بوا!" افشاں نے جواب دیا۔

"بڑا سر چڑھا رکھا ہے۔ مگر مجھ سے بھڑا تو ٹھیک نہ ہوگا۔ بھلا بتاؤ، پوری جوانی گزار دی، کسی کو منہ نہ لگایا۔ اب یہ دو ٹکے کے ملازم چپک رہے ہیں۔ ارے ٹھیک کردوں گی۔"

"مگر آپ بوڑھی کہاں ہوئی ہیں بوا!" افشاں بولی۔

"ارے رہنے دو بیٹی! اب کیا رکھا ہے؟ کبھی دیکھتیں۔" بوا نے شرما کر کہا۔

"اب بھی دیکھ رہے ہیں بوا!" افشاں نے کہا اور پھر ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رُک گئی۔ "یہ کمرہ کیسا ہے بوا! دیکھ لیں، آپ کو پسند ہے؟"

"اے بس ٹھیک ہے بٹی! میرا کیا۔ غسل خانہ ہے اس میں؟" بوا نے پوچھا۔

"سنگھار میز بھی رکھی ہے۔" افشاں نے جواب دیا۔

"اللہ خوش رکھے۔ میں ذرا نہاؤں گی۔ اب تم لوگ آرام کرو۔" بوا نے کہا۔

"ہاں، ہاں بالکل۔ تصدق جو قریب بیٹھ گیا تھا۔" افشاں نے کہا اور پھر ہم واپس چل پڑے۔ لڑکیاں ہنستے ہنستے مری جارہی تھیں۔ سیمیں بھی ان میں شریک تھی۔

"ارے خدا کی قسم سیمیں باجی! اب تک تھیں کہاں؟ کہاں چھپا رکھا تھا اس نایاب شے کو؟"

"کمال کی ہیں بوا بھی۔ صائم بھائی! یاد ہے؟" سیمیں ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں بھئی، یاد ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا، کیا.....؟ ہمیں بھی تو بتائیے۔" شکیلہ نے کہا۔

"سب سے پہلی ملاقات ہم لوگوں کی ٹرین میں ہوئی تھی اور بوا......بس بوا کو یقین ہو گیا کہ یہ دونوں بھائی ان پر مرمٹے ہیں۔ اور عادل بھائی، خدا کی پناہ! ان کا تو جواب نہیں۔ ہفتوں بوا کا نام لے کر آہیں بھرتے رہتے تھے اور بوا کی زندگی عذاب ہوگئی تھی۔ اور صائم بھائی! جب عادل بھائی نے بوا کو شادی کا پیغام دیا۔"

"شادی کا پیغام بھی دیا؟" افشاں ہنس پڑی۔

"جوڑا بھی بنوایا تھا دُلہن کا اور پہنوا بھی دیا تھا بوا کو۔ بوا بھی بالآخر نیم راضی ہوگئی تھیں۔" سیمیں نے بتایا اور قہقہوں کا طوفان دیر تک اُمڈتا رہا۔

"خدا کی قسم، آج کل جینے کا لطف آرہا ہے۔ جو کچھ آج اس کوٹھی میں ہو رہا ہے، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔" افشاں نے جھومتے ہوئے کہا۔

"اچھا! اب کچھ دیر کی چھٹی۔ دوپہر کو کھانے پر جمع ہونا ہے۔" سیمیں نے کہا۔

"بھئی بڑا عمدہ وقت کٹا ہے۔" شکیلہ نے کہا۔ اسی وقت ایک ملازمہ افشاں کے پاس آئی۔

"بی بی! بڑی ماں بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، آپ ایئرپورٹ نہیں چل رہیں؟"

"اوہ، میں جا کر کیا کروں گی۔ امی جا رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"ان سے کہہ دیں، وہ چلی جائیں۔ میں جمشید بھیا سے یہیں ملاقات کروں گی۔"

"جی بی بی!" ملازمہ چلی گئی۔

''اچھا بھئی۔'' افشاں نے کہا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''تھوڑی دیر کی اجازت؟'' اور پھر سب منتشر ہو گئے۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ افشاں پھر آ گئی۔

''ایک اجازت لینے آئی ہوں۔'' اُس نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''ارے، خیریت؟''

''امی جان مصر ہیں کہ میں بھی ایئرپورٹ چلوں۔ میں نے بہت ٹالا، لیکن وہ کہہ رہی ہیں کہ جمشید کیا خیال کریں گے۔''

''تو آپ ضرور جائیں افشاں!''

''آپ کی اجازت سے۔'' افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے اتنی عزت بخشی تو میں ہوش میں نہیں رہوں گا، افشاں!'' میں نے وفورِ مسرت سے کہا۔

''ارے، اب کائنات میں آپ کے علاوہ رکھا کیا ہے۔'' افشاں نے ایک ادا سے گردن ٹیڑھی کر کے کہا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں دروازہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس افشاں نے تو ذہن و دل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ اور پھر خیالات کا چکر جاری ہی ہوا تھا کہ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اُچھل پڑا۔ طالوت مسکرا رہا تھا۔

''ارے!'' میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''جیتے رہو بیٹے!..... جیتے رہو۔ استاد کا نام روشن کر رہے ہو۔ کیا جال مارا ہے۔ دشمن چاروں شانے چت۔'' طالوت نے میری کمر کو ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''استاد کے بچے! اس طرح آنے کی کیا تک تھی؟'' میں نے اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''میری مرضی۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا ہونہار شاگرد کیا کر رہا ہے۔''

''دیکھ لیا؟'' میں نے ہونٹ بھینچ کر پوچھا۔

''اچھی طرح۔ مگر خوب ہے بھائی!..... یہ تو اُلٹا چکر چل گیا ہے۔ زندہ باد افشاں بی!..... زندہ باد۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اپنی داسی کی خبر تو لو۔ چہرہ اُتر گیا ہے۔''

''ہائے میں مر جاؤں..... کہاں ہیں؟'' طالوت مسخرے پن سے بولا۔

''اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

''جا رہا ہوں۔'' طالوت مڑتے ہوئے بولا۔ لیکن میں نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

''بڑا بے مروّت انسان ہے۔ ابو حضور اور امی کے بارے میں تو بتاؤ۔''

''ابا حضور کچھ بیمار ہیں۔ امی ٹھیک ہیں۔ تمہارے کہے بغیر تمہارا سلام ان دونوں تک پہنچا دیا ہے۔ دعا کہی ہے انہوں نے۔ اور کچھ؟''

''ہاں۔ شکیلہ کے بارے میں گفتگو ہوئی؟''

''یار! کھل کر تو ہمت نہیں پڑ سکی، گول مول سی باتیں کر لی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''پوچھنے لگیں، آخر کب تک یونہی بھٹکتا پھروں گا؟ شادی وغیرہ بھی کروں گا یا نہیں؟ میں نے جواب دیا، کیوں نہیں۔ خوش ہوگئیں۔ پوچھا کہ کوشش کی جائے؟ تو میں نے کہا، نہیں۔ کہنے لگیں، کیا مطلب؟ تب میں نے کہا، امی حضور! آپ نے میری ساری خوشیاں پوری کر دی ہیں، ایک اور کر دیں۔ کہنے لگیں، کون سی؟ تو میں نے جواب دیا کہ کسی ذہین لڑکی سے ہی شادی کی اجازت دے دیں۔ بس، دیکھتی رہ گئیں۔ اس کے بعد کسی گفتگو کا موقع ہی نہیں مل سکا اور بس..... اب جانے دو۔''

''سنو تو یار!'' میں نے کہا۔

''جھگڑا ہو جائے گا بس، اب جانے دو۔ صبر نہیں ہو رہا۔'' طالوت نے کہا۔

''میں بلا کر لاتا ہوں، یہیں مل لو۔ ممکن ہے، اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو۔''

''جی نہیں، میں بھگا دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' طالوت دانت نکال کر بولا اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے گہری سانس لی تھی۔ بہر حال، طالوت کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی اسے بہت سی باتیں نہیں معلوم ہوئیں لیکن بہر حال دلچسپی رہے گی۔ مجھے حضرت جمشید کی آمد کا بھی شدت سے انتظار تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھے۔ ویسے بڑی ماں کے چہیتے تھے، کسی قسم کی اُلجھن بننے کی کوشش نہ کریں۔

لیکن اس بارے میں زیادہ فکر نہیں تھی۔ اپنا یار موجود ہے، ٹھکانے لگا دے گا اچھی طرح۔ اور پھر افشاں بھی خاصی بولڈ تھی، اسے زیر کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔ مجھے رہ رہ کر شمشیر یاد آ رہا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی سچویشن ہوگئی تھی۔ لیکن آنے والے موصوف بھی اگر شمشیر ہی کی مانند ہوئے تو گویا ایک بار بازی پھر جم جائے گی۔

ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ یقیناً طیارہ آ گیا ہوگا۔ طالوت بھی شکیلہ کے پاس جا گھسا تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ بہر حال، میں باہر نکل آیا اور پھر یونہی آوارہ گردی کرتا رہا۔ شکیلہ کے کمرے کی طرف میں نے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس وقت اتفاق سے بیرونی حصے کی طرف نکل آیا تھا۔ میں نے تنویر صاحب کی شاندار کار گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ دوسرے لوگ سب اندر تھے۔ کسی کو بھی بڑی ماں اور ان کے بھتیجے کے آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ کار پورٹیکو میں رُک گئی اور بڑی ماں جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔ یہی حرکت افشاں نے کی تھی۔ تصدق آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے نیچے اُترا۔ اور پھر اُس نے پچھلے دروازے میں منہ ڈال کر کسی سے کچھ کہا۔

ویسے مجھے کوئی نظر تو آ رہا تھا لیکن صاف نہیں۔ اور پھر گاڑی سے ایک عجوبہ برآمد ہوا۔ سانولا رنگ، سر کے بال خشک اور نیگروز کے مانند گھنگھریالے، ایک خاص تراش کے ساتھ انہیں درمیان سے بلند کیا گیا تھا۔ سفید لمبا کوٹ جس کی آستینیں آگے سے کھلی ہوئی تھیں، کمر میں چاندی کی بیلٹ بندھی ہوئی اور غرارہ نما پتلون، جس کے دونوں سائیڈ بڑا خوب صورت کام ہوا تھا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی اور کانوں میں بڑے بڑے بالے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نرمی لئے وہ نیچے اُتر آیا۔

''بھتیجا!'' میرے ذہن نے نعرہ لگایا اور میں جلدی سے آگے بڑھ آیا۔ افشاں منہ بنائے کھڑی تھی اور بڑی ماں کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

افشاں مجھے دیکھ کر میرے قریب آ گئی۔ ”خدا کی پناہ!“ اس نے کہا۔
”کیا ہوا؟“
”ایسا بدبودار شخص میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ راستہ طے کرنا محال ہو گیا۔“
”یہی ہے نا؟“
”ہاں!“ افشاں ناک سکوڑ کر بولی۔
”سبحان اللہ!..... چلو، اب یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آیئے، بڑی ماں! مہمان کو اندر لے چلیں۔“
”آؤ جمشید میاں!“ بڑی ماں نے کہا۔
”ہیک منٹ..... ہیک منٹ..... مٹوشن میین جلدی ڈکے کھولو..... جلدی کاراؤ۔“ جمشید نے چٹکی بجا کر تھرکتے ہوئے کہا۔ تخاطب تصدق سے کیا۔
”ارے سامان سب حفاظت سے پہنچ جائے گا، تم فکر مت کرو۔“ بڑی ماں نے کہا۔
”اوہ، ناممکن..... ناممکن ہائے۔ گاڑی میں تم نے ہمیں اس سے جدا کر دیا۔ ہم تو پلین میں بھی اسے ساتھ رکھا۔ گٹار سے ہمارا دوستی، جانم جانم کا ہائے۔ اس کے بغیر ہمارا شخصیت ہاف ہائے۔“ جمشید نے جواب دیا۔ اس دوران اس کے پاؤں، ہاتھ اور کولہے ہلتے رہے تھے۔ وہ ہمیشہ رقص کی کیفیت میں رہنے کا عادی تھا۔
”ارے نکالو تصدق! اس کی سارنگی نکال کر اسے دو۔“ بڑی ماں نے کراہنے والے انداز میں کہا اور تصدق نے ڈگی کھول کر ایک لمبا سا گٹار نکال لیا۔ جونہی گٹار، جمشید کو نظر آیا، وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا اور اسے تصدق کے ہاتھوں سے لے لیا۔
”اوہ جانِ من! ہم کو معافی دینا..... ہم سے ناراض مت ہونا۔“ اُس نے گٹار کو چومتے ہوئے کہا۔
”امی جان! اب چلیں بھی۔“ افشاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
”تصدق! تم اسے ساتھ لے کر آؤ۔“ بڑی ماں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئیں۔
”آیئے صائم صاحب!“ افشاں بولی اور میں بھی ان دونوں کے ساتھ چل پڑا۔
”اب کیا ہو گا امی جان!“ افشاں نے مسخرے انداز میں کہا۔
”کیا ہو گا؟“ بڑی ماں نے پوچھا۔
”ان حضرت کو کہاں رکھیں گی؟“
”مذاق مت اُڑاؤ افشاں!..... یہ بھائی جان کی بگڑی ہوئی تقدیر ہے۔ بہرحال، میرا خون ہے۔ آیا ہے تو یہیں رہے گا۔ میں جانتی ہوں، مجھے کیسی کیسی نگاہیں برداشت کرنا پڑیں گی۔“
”اُف اللہ..... بدبو کتنی تھی گاڑی میں۔“
”نہ جانے کم بخت امریکہ میں ایک آدھ بار نہایا بھی ہے یا نہیں۔“
”امی جان! معاف کریں۔ ان حضرت کو اس انداز میں تو ہم کمپنی نہیں دے سکیں گے۔ بتایئے، کیسے برداشت کریں گے؟ لوگ میرا مذاق بھی اُڑائیں گے کہ یہ افشاں کا ماموں زاد بھائی ہے۔“
”اس وقت بات مت کرو افشاں! میرا دماغ خود چکرا رہا ہے۔ اللہ کے واسطے!“ بڑی ماں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا اور میں نے افشاں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

مسٹر جمشید، گٹار گردن میں ڈالے، تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آرہے تھے تاکہ ہم میں شامل ہو جائیں۔ تب بڑی ماں گھبرائے ہوئے انداز میں بولیں۔

''خدا کے لئے افشاں! اسے تم ہی سنبھالو، اس کے کمرے میں پہنچا دو اور کسی طرح اسے نہانے پر تیار کردو۔ میں تو ایک منٹ بھی برداشت نہ کرسکوں گی۔''

''آپ جائیے بڑی ماں!'' افشاں کے بجائے میں بولا اور بڑی ماں نے شکر گزار نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ حالانکہ عام حالات میں وہ اتنی تیز چلنے کی عادی نہیں تھیں۔ مسٹر جمشید مسکراتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر کھلنڈرے پن کے سے آثار تھے لیکن حماقت لئے ہوئے۔ گول گول آنکھوں میں عجیب سی شرارت ناچتی نظر آتی تھی۔

''ہیلو بوائے!'' اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا اور میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ''ہام سے ملو، جم..... جم۔ اور تمہارا نام؟'' اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور میں نے اس کا ہاتھ، ہاتھ میں لے لیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا، جسے بے پناہ طاقت دے دی گئی تھی۔ میں نے زور سے جمشید کا ہاتھ دبایا اور جمشید نے ایسی بھیانک چیخ ماری کہ میں خود ڈر گیا۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''ارے، ارے..... کیا ہو گیا؟''

''ہائے، مارا گیا..... مارا گیا.....'' وہ ہاتھ دبا کر دوہرا ہو گیا۔ اور پھر وہ زمین پر پالتی مار کر بیٹھ گیا اور انتہائی سریلے لہجے میں مارا گیا، مارا گیا کی گردان کرنے لگا۔

شامت کی ماری بوا نہ جانے کہاں سے نکل آئیں اور ہمارے پاس ہی پہنچ گئیں۔ ''آئے ہائے، میراثی ہے یہ۔ دل بہلانے کو بلوایا ہے وہاں سے۔'' وہ دانت نکال کر بولیں اور جمشید ہاتھ کی تکلیف بھول گیا۔

''ہم میراثی کا مطلب سمجھتا ہائے۔ امریکہ میں بہت سا بُک پڑھا ہائے۔ ہم میراثی نہیں، فنکار ہائے۔ بوڑھا عورت تم غلط سمجھا۔ اور دیکھو!'' جمشید اُچھل کر کھڑا ہو گیا، گٹار کھینچا اور پھر گٹار کی تانیں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ رقص بھی کر رہا تھا۔ بوا نے پیچھے کھسکنے کی کوشش کی لیکن جمشید نے انہیں گھیر لیا اور ان کے چاروں طرف ناچ ناچ کر گٹار بجانے لگا۔ بوا بدحواس ہو گئی تھیں۔ وہ خود بھی اُچھل اُچھل کر اُس کے دائرے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن جمشید نے اُنہیں پوری طرح گھیر لیا تھا۔

''اِئے..... اِئے..... اِئے.....'' بوا بدحواسی میں کہہ رہی تھیں اور افشاں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ ''اِئے ہٹے گا کہ نہیں مٹے مارے!..... اماں نہیں ہیں کیا۔ اِئے دیکھو..... اِئے..... اِئے!'' وہ احتجاج کر رہی تھیں۔ کئی بار انہوں نے جمشید کے دو ہتھڑ مارنے کی کوشش کی، لیکن بہرحال وہ پھرتیلا تھا۔

''اِئے، کوئی شرافت ہے۔ جسے دیکھو، پرائی بہو بیٹیوں کے پیچھے لگ گیا ہے۔ عزت محفوظ ہی نہیں ہے۔ اِئے ہٹ جا مونڈی کاٹے۔ تیرا ستیاناس۔''

''تم نے دیکھا بوڑھا عورت! میراثی اور فنکار میں کیا فرق ہوتا ہے۔'' جمشید نے کہا۔

''جھاڑو پھرے تیری شکل پر۔ مجھے جانے دو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔'' بوا نے کہا۔ اور بالآخر وہ جمشید کے نرغے سے نکل ہی گئیں۔ لیکن گٹار کی آواز پر سب ہی نکل آئے تھے، یہاں تک کہ طالوت اور شکیلہ بھی۔ سب دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

جمشید نے گردن جھکائی اور گٹار بند کر دیا۔ بوا بھاگ کر ایک کمرے میں گھس گئی تھیں۔ تب طالوت نے تالیاں بجائیں اور جمشید جیسے انہی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بڑے دلآویز انداز میں مسکراتے ہوئے چاروں طرف گردن جھکائی، لیکن طالوت کو دیکھ کر سیمیں، افشاں وغیرہ اُچھل پڑی تھیں۔

''ارے..... عادل بھائی!..... آپ آ گئے..... آپ آ گئے؟'' سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

''ہاں بھئی۔ لیکن یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟'' طالوت ہنستے ہوئے بولا۔

''ہائے عادل بھیا! بہت کچھ ہو گیا ہے۔'' افشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ بوا تھیں نا؟'' عادل نے سیمیں سے پوچھا۔

''ہاں۔ آج ہی آئی ہیں۔'' سیمیں نے جواب دیا۔

''کیا بوا نے شادی کر لی ہے؟'' طالوت نے پھٹ سے پوچھا۔

''ایں..... کیوں؟'' سیمیں نے ہنسی روک کر پوچھا۔

''پھر یہ کون تھا جو اُن کے ساتھ رقص کر رہا تھا؟''

''آپ کے خیال میں یہ بوا کا شوہر ہے؟'' سیمیں نے قہقہہ لگایا۔

''اوہ! دونوں اسی طرح محبت بھرے انداز میں رقص کر رہے تھے کہ میں یہی سمجھا اور بوا شرما کر بھاگ گئیں۔'' طالوت نے سوکھے منہ سے کہا اور سیمیں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

سب جمشید کے گرد جمع ہو گئے تھے اور وہ یونہی ہونقوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔

''کون ہو بھائی؟'' طالوت نے اس سے پوچھا۔

''جم..... آئی مین، جمی۔ میرا مطلب ہے فنکار۔'' آخر میں جمشید نے گٹار کے تاروں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''عادل بھیا! یہ جمشید ہیں۔ آج ہی امریکہ سے آئے ہیں۔ امی کے بھتیجے ہیں۔'' افشاں نے کہا۔

''آج ہی آئے ہیں؟'' عادل نے مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بلکہ ابھی ابھی۔''

''اوہ، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی جمشید صاحب!'' طالوت نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

''ہائے..... اب نہیں پھنسیں گا۔ بائی گاڈ، اب نہیں پھنسیں گا۔'' جمشید نے ہاتھ کمر کے پیچھے کر لیا۔ اسے میرا مصافحہ یاد آ گیا تھا۔

''پھنس ہی جاؤ یار!'' طالوت بولا۔

''بالکل نائیں۔ پھر ہم گٹار کائے سے بجائیں گا؟..... بالکل نائیں۔''

''تمہاری مرضی۔'' طالوت نے گہری سانس لی۔

''انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ آؤں عادل بھیا! ابھی آئی۔ آیئے جمشید صاحب!''

''جمی بولو..... جمی..... جمی ڈارلنگ۔'' جمشید نے کہا اور افشاں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''بہت خوب..... گویا میرے جانے کے بعد خاصی ترقی ہوئی ہے۔ بہرحال، خواتین و حضرات! آپ کو جمی مبارک۔ واقعی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص ہے۔''

''لیکن آپ اچانک کس طرح آ گئے عادل بھائی؟''

''بس آ گئے۔ آنا ہی تھا۔''
''خدا کی قسم! بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی، آپ کی۔''
''ہائے..... جی..... جی ڈارلنگ!'' طالوت چٹخارے بھرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایک گڑبڑ ہے۔''
''کیا؟''
''بڑی ماں کے جذبات کیا ہیں ان حضرت کے بارے میں، انہیں دیکھنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔'' طالوت نے کہا۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیا منصوبے بن رہے تھے۔
''آپ نے ناشتہ تو نہیں کیا ہوگا؟'' شکیلہ نے طالوت سے پوچھا۔
''ارے ہاں، اور شکریہ شکیلہ! کیا میں ناشتہ لگواؤں عادل بھیا؟'' سیمیں جلدی سے بولی۔
''نہیں، میں ناشتہ کر چکا ہوں۔ ہاں، دو دن کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک نشست ہونی چاہئے، جس میں کافی ضروری ہے۔'' طالوت نے کہا۔
''میں کہتی ہوں، کافی کے لئے آپ لوگ ناشتے کے کمرے میں چلئے۔ میں افشاں کے ساتھ واپس آتی ہوں۔'' سیمیں چلی گئی اور ہم سب ناشتے کے کمرے میں جا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔
سیمیں اور افشاں کے پہنچنے تک خاموشی رہی۔ پھر وہ دونوں بھی آ گئیں۔ اس دوران سب ہنستے رہے تھے۔ ہنسنے کے لئے بہت سے خیالات تھے۔
''کارروائی شروع کی جائے۔ مجھے ان دو دنوں کی رپورٹ چاہئے۔'' طالوت نے کہا۔
''سب آپ کو یاد کرتے رہے عادل بھیا! بڑی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ آج اچانک بہت سے قہقہے برس پڑے۔ جمشید صاحب اور بوا کی آمد کی اطلاع اچانک ملی۔ تصدق، بوا کو لینے گیا تھا۔'' افشاں نے کہا اور سب ہنس پڑے۔
''اس قہقہے کی وجہ؟''
''بوا کا خیال ہے کہ تصدق ان پر ڈورے ڈال رہا ہے۔''
''عمدہ۔'' طالوت ہنس پڑا۔ ''تفصیل؟'' اور افشاں نے بے تکلفی سے تفصیل بتا دی۔ تصدق کے نوچنے والے واقعے پر طالوت بھی دل کھول کر ہنسا۔
''ان جمشید صاحب کی شانِ نزول کیا ہے؟''
''امی کے بھتیجے ہیں۔ بارہ سال کے بعد امریکہ سے آئے ہیں۔ ماموں جان وہیں آباد ہیں۔''
''بہت خوب...... بہت خوب! بہر حال اللہ کی دین ہے۔ آپ لوگوں کو خلوصِ دل سے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔''
''آپ سنائیے بھیا!''
''بس آپ لوگوں کے بغیر میں بھی اُداس تھا۔ میرے والدین بھی بخیریت ہیں۔ جونہی اجازت ملی میں واپس آ گیا۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''لطف آ جائے گا بھئی۔'' احسان نے کہا۔
''آج کل تو ہم مالا مال ہیں۔ شمشیر الدولہ بھی یہیں ہیں، بوا بھی ہیں اور پھر اپنا جمی۔ مگر بڑی ماں کے جذبات کا خیال رکھنا ہے۔''

''امی تو اسے دیکھ کر خود بدحواس ہو گئی ہیں۔'' افشاں نے بتایا۔

''اوہ!......کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''پریشان ہیں بری طرح۔ ابو جان کے تعلقات، ماموں جان سے کبھی اچھے نہیں رہے۔ لیکن امی، بھتیجے کی آمد کی خبر سن کر باغ باغ ہو گئیں۔ اب وہ پریشان ہیں کہ ابو جان اسے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔''

''خوب!'' طالوت نے گردن ہلائی۔

''اللہ!...... بدبودار اتنا ہے کہ توبہ۔ بڑی مشکل سے ہم نے اس کے ساتھ ایئرپورٹ سے یہاں تک کا سفر طے کیا۔ امی کا تو سر چکرا گیا تھا۔'' افشاں نے بتایا۔

طالوت گردن ہلانے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''بہرحال خواتین و حضرات! قدرت نے نعمتوں کے انبار ہمارے سامنے لگا دیئے ہیں۔ اب فیصلہ ہو جائے۔ کیا پروگرام رکھا جائے؟ ویسے تصدق اور بوا کی جوڑی مجھے بہت پسند آئی ہے۔ رہی یہ نایاب شے، تو اس کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں بڑی ماں کے جذبات کا جائزہ لیا جائے گا۔''

''میرا خیال ہے، امی جان کو بڑی مایوسی ہوئی ہے۔'' افشاں نے کہا۔

''پھر بھی، بہرحال خون ہے۔''

''ہاں۔ اندازہ کر لیں گے۔'' افشاں نے کہا۔

''چنانچہ فی الحال یہ نشست برخاست۔ میرا خیال ہے، تھوڑی دیر کے بعد کھانے پر ملاقات ہوگی۔'' طالوت اُٹھ گیا۔ باقی لوگ بھی اُٹھ گئے تھے۔ اور پھر طالوت میرے ساتھ کمرے میں آ گیا۔

''تو یہ عیش ہو رہے ہیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں! اعتراض ہے آپ کو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ارے ہم کوئی جلنے والوں میں ہیں؟..... ویسے کیسی چل رہی ہے؟''

''یار طالوت! قسم سے بہت عمدہ۔''

''یار کو نہ بتاؤ گے؟''

''بس کیا بتاؤں، افشاں بہت ہی شاندار لڑکی ہے۔ انتہائی خود اعتماد قسم کی۔ اور اب وہ بالکل کھل گئی ہے۔''

''پبلک کی نگاہ میں بھی آ گئی ہو گی؟''

''سو فیصدی۔ یوں بھی سب بڑے چالاک ہیں۔'' میں نے سیمیں اور احسان کی گفتگو سنا دی۔

''بس پیارے! حالات تمہارے حق میں ہی ہیں۔ ابھی ہمارا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ یار! امی کے سامنے بھی کھل کر کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اور پھر ابا جان بھی بیمار تھے۔''

''آئندہ ماہ سہی۔ اس وقت تک شہنشاہ حضور بھی ٹھیک ہو چکے ہوں گے۔''

''ویسے میرے وعدے کی پابندی پر سب خوش ہو گئے تھے۔ واپسی کی اجازت بھی خوشی سے مل گئی۔ ''یہ تو سب کچھ ہے۔ مگر یار! ان شمشیر الدولہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا۔''

''کیا پروگرام ہے اس کے بارے میں؟''

''اس نے نواب جلال الدین کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''ہم اس سے کاروباری مقابلہ کریں گے۔''

''اوہ! بس ایک قباحت ہے۔'' میں نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''وہ اب تنہا نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ جو عورت تھی، وہ اس کے برعکس نظر آتی تھی۔ بے چاری یونہی شمشیر الدولہ سے عاجز ہو گی اور پھر سے مالی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے گی۔''

''اگر وہ اچھی ہوئی تو ہم اسے مصیبت میں نہیں پھنسا رہنے دیں گے۔ اگر شمشیر ٹھیک ہو گیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اب بھی اتنا ہی ٹیڑھا ہے۔ بس اسے سیدھا کر لیں اور عارف! میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی ہے۔''

''کیا؟''

''میں چاہتا ہوں، تم کوئی کاروبار جما لو۔ اب حالات دوسرے ہو گئے ہیں۔ تنویر صاحب کی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد ان کے ہم پلّہ بلکہ ان سے کچھ آگے ہونا ضروری ہے۔''

''ارے ہاں طالوت! میں نے افشاں کو ایک کہانی سنائی تھی۔''

''وہ کیا بھائی؟''

''براہ کرم سنجیدگی سے سنو! اس کے سوالات خاصے پریشان کرنے والے تھے، میں نے بڑی ذہانت سے ایک کہانی ترتیب دی ہے۔ تم بھی سن لو، تاکہ اس کی روشنی میں بات کر سکو۔''

''سناؤ!'' طالوت نے کہا اور میں نے اسے سوتیلی ماں کی کہانی کی تفصیل سنا دی۔ طالوت مسکراتے ہوئے گردن ہلانے لگا۔ ''درحقیقت تم نے بڑی ذہانت سے یہ کہانی ترتیب دی ہے۔ سارے تقاضے پورے کر دیتی ہے۔ تم نے مجھے اس سے آگاہ کر دیا، یہ اچھا ہوا۔ ہاں تو کاروبار کے سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''جب تم نے میری شخصیت ہی بدل دی ہے، تو میں اس کے بارے میں کیا تکلف کروں۔ جیسی تمہاری مرضی۔''

''ہم تنویر صاحب سے مدد لیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس عمارت کو بھی دیکھنے چلیں گے۔ تنویر صاحب کچھ کاروباری ضروریات کو پورا کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا اور طالوت خاموش ہو گیا۔

۞

پھر ہم دونوں نے غسل کر کے تیاریاں کیں، عمدہ لباس پہنے اور دوپہر کے کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بلاوا آ گیا۔ کمرے سے نکلے ہی تھے کہ بوا مل گئیں۔ طالوت کو دیکھ کر وہ خوشی سے اُچھل پڑی تھیں۔

''ماشاء اللہ! جوڑی اکٹھی ہو گئی۔ اللہ سلامت رکھے، تم دونوں کو دوبارہ دیکھ کر کتنی خوشی ہے، کیا کہوں۔'' انہوں نے ہم دونوں کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''کیسی ہیں بوا؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں میرے بچو!..... بس تمہیں دعائیں دیتی ہوں۔''

''سنا ہے، آپ کے ساتھ یہاں بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے ہماری بوا کو؟''

''کس کی بات کر رہے ہو میاں؟''

''ارے اُسی تصدق کی، جو آپ کو لینے گیا تھا۔''

''ارے وہ کم بخت، قطب مینار۔ ذرا دیکھو بدنظرے کی باتیں..... گاڑی میں مجھ سے چمٹا جا رہا تھا۔''

''اور اُس جوکر نے آپ کو دیکھتے ہی ناچنا شروع کر دیا تھا!''

''باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں ان بڑے گھرانوں کا۔ سنا ہے، بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔ پر میاں! حلیہ کمبخت نے کیسا بنایا تھا۔ ہم نے تو ایسے بڑے آدمی کا ہے کو دیکھے۔ ہاں، اللہ وسایا کے سرکس میں وہ موٹے لمبانے والے ایسے بھیس بدلتے تھے۔ مجھے تو وہ وہی لگ رہا تھا۔'' بوا نے کہا اور وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔

''بہر حال بوا! آپ کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ اب اطمینان سے بیٹھیں گے تو باتیں کریں گے۔''

''اچھا میاں!'' بوا نے سر ہلایا اور ہم دونوں کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

کمرے میں سبھی موجود تھے۔ حضرت جی شاید ابھی داخل ہوئے تھے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ ان کا گٹار بھی تھا۔

تنویر صاحب بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ماشاء اللہ! تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی جمشید میاں!'' تنویر صاحب نے کہا۔

''میں بھی آپ لوگوں سے ملنے کو بہت تڑپتا تھا انکل! کتنا ونڈرفل ہے آپ لوگ۔ اوہ، مجھے مشرق کا

کلاسک بہت پسند ہائے۔آپ دیکھا، میں آپ لوگوں کو اُردو میں خط لکھتا۔میرا مادری ٹنگ۔ہاؤ سویٹ۔"
"بیٹھو اور اسے ایک طرف رکھ دو۔کھانے کے کمرے میں اسے لانے کی کیا ضرورت تھی؟" تنویر صاحب نرمی سے بولے۔
"اوہ، میوزک سویٹ انکل۔موسیقی میری جان ہائے۔اور یہ گٹار، یہ مجھے سویٹ سیلی نے دیا تھا۔بلی کا مافک چمک دار آنکھوں والا سیلی۔اوہ سیلی ڈارلنگ!"
"کیا تم اسے بھی لنچ کراتے ہو؟" تنویر صاحب نے پوچھا۔
"کسے؟" جمشید نے منہ پھاڑ کر پوچھا۔
"اپنے گٹار کو۔"
"اوہ نہیں...... نہیں انکلو! آپ مذاق بولتا۔مگر یہ آل ٹائم ہمارے ساتھ رہتا۔میوزک ہمارا جان ہائے۔ہم اسے بیڈ پر ساتھ لے کر سوتا۔"
"ماشاءاللہ! مگر کرسی پر کیسے بیٹھو گے؟"
"بیٹھ جائیں گا...... بیٹھ جائیں گا۔ایسا مافک۔" جمشید کرسی پر بیٹھ گیا۔گٹار اُس کی گود میں تھا۔لیکن دونوں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کو کرسی چھوڑ دینی پڑی تھی۔کیونکہ گٹار کی لمبائی متاثر ہو رہی تھی۔
"دوسری کرسیاں ڈلواؤ۔" تنویر صاحب سنجیدگی سے بولے۔بڑی ماں کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔ویسے شکر تھا کہ جمشید نہا لیا تھا اور اب اس کے بدن سے وہ بدبو نہیں اُٹھ رہی تھی۔ورنہ کھانے کی میز پر کسی سے نہ بیٹھا جاتا۔لیکن اس کی کسر اس کے کھانے کے انداز نے پوری کر دی۔
نہایت بدتمیزی سے کھا رہا تھا۔اسے ہندوستانی کھانے، کھانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔اس کی بہت سی حرکتیں مسکراہٹوں کا سبب بنیں۔اوپر سے تنویر صاحب کی سنجیدگی سونے پر سہاگہ تھی۔وہ بغور اس لنگور کا جائزہ لے رہے تھے، جو دونوں ہاتھوں سے کھانا اس طرح سمیٹ رہا تھا، جیسے آندھی آنے والی ہو۔
"بہت مزے کا کھانا ہائے۔ہمیں پسند آیا۔" اس نے سب سے آخر میں کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔
"ہماری خوش بختی ہے۔" تنویر صاحب بولے۔"اور سناؤ، شاداب علی کیسے ہیں؟"
"کاؤن شاڈاب؟...... ام نہیں جانتا۔" جمشید بولا۔
"تمہارے ڈیڈی کا کیا نام ہے؟"
"اوہ، پپ...... پپ ٹھیک ہیں۔مگر آپ اُردو میں اسے شاڈاب بولتا ہائے؟"
"آپ امریکن میں اسے کیا بولتے ہیں؟" تنویر صاحب بھی تفریح کے موڈ میں تھے۔
"اوہ، میں تو پپ بولتا ہائے۔مگر ڈیڈی کا دوست اس کو شیڈوب بولتا ہائے۔مسٹر شیڈوب۔"
"ماشاءاللہ! خاصی ترقی ہوئی ہے۔کاروبار کیسا چل رہا ہے تمہارا؟"
"اوہ، میں نہیں جانتا انکل!...... یہ پپ کا ورک ہے، وہی جانتا۔میں تو بس میوزک جانتا۔آپ بولو تو سنائے۔" جمشید اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔
"ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ابھی کھانا کھایا ہے۔"
"ٹھیک ہائے، ٹھیک ہائے۔پھر سنائیں گا۔جب آپ کا موڈ ہوئیں گا، تب سنائیں گا۔اوہ انکل! آ نہیں جانتا، آپ کا جمی، نیویارک میں ہیرو ہائے۔جدھر نکل جاتا، لڑکی لوگ اسے کِس مارتا۔ایک دم...

سے آتا اور رکس مارتا۔"

"اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔" تنویر صاحب نے کہا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔ "آپ لوگ ذرا احتیاط رکھیں۔" سب کی ہنسی نکل گئی۔ "اور مسٹر جی! آپ بھی ذرا خیال رکھیں، یہ نیویارک نہیں ہے۔"

"نظر آتا ہائے۔ ادھر تو کچھ نہیں ہے۔ ہم ایئر پورٹ سے ادھر تک کا عمارت دیکھا۔"

"اچھا بھئی۔ آیئے جلال بھائی! اور آپ بھی مسٹر عادل و صائم.....!" تنویر صاحب نے کہا اور ہم چاروں باہر نکل آئے۔

"یہ شاداب میاں کی اولاد ہے تنویر!..... کیا ہو گیا شاداب کو؟" باہر نکل کر جلال الدین نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ شاداب میاں کے اعمال کون سے اچھے تھے۔ آپ کو تو معلوم ہے جلال بھائی! اور اللہ تعالیٰ کسی کو چھٹی نہیں دیتا۔ شاداب کے اعمال کی سزا آپ کے سامنے ہے۔ کیا خوب بیٹا ہے۔ باپ کی ریڑھ کی ہڈی۔"

"لیکن کیا کہا جا سکتا ہے تنویر! ممکن ہے، شاداب اپنے اس جدید بیٹے کے جدید حلیے سے خوش ہو؟"

"ٹھیک ہے، اللہ بہتر جانتا ہے۔" تنویر صاحب بولے اور پھر ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگے "آپ لوگ اس چڑیا گھر سے بددل نہ ہوں، شہزادہ صائم اور شہزادہ عادل!"

"اوہ..... نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ارے بھئی یہ عادل میاں تو بڑے ستم ظریف ہیں۔ شمشیر الدولہ جب انگلینڈ سے واپس آیا تھا تو وہ بھی پچھتر فیصد پاگل تھا۔ لیکن عادل میاں نے اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔" جلال الدین نے کہا۔

"اوہو..... لیکن یہ بیگم کے اکلوتے بھائی کی اولاد ہے۔ اس لئے ذرا احتیاط رکھنا ہوگی۔ میں اس مردود کو کھڑے کھانے کے کمرے سے نکال دیتا، جس کا گٹار ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا ہو۔ لیکن بیگم خود ہی شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کی غم انگیز خاموشی نے مجھے بھی خاموش کر دیا۔ نہ جانے بے چاری کیا کیا خیالات باندھے بیٹھی تھیں۔ یہ لنگور تو ان کے تصور میں بھی نہ ہوگا۔"

"خیر چھوڑو۔ آیا کتنے دن کے لئے ہے، چلا جائے گا۔" نواب جلال الدین نے کہا۔

"آؤ بھئی، کہیں بیٹھتے ہیں۔" تنویر صاحب نے کہا اور پھر وہ ہم سب کو لئے ہوئے نشست کے کمرے میں پہنچ گئے۔

"آپ کے والدین کیسے ہیں عادل میاں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"کاروبارِ ریاست کیسا چل رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔" طالوت نے جواب دیا اور پھر بولا۔ "مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے انکل!"

"ہاں، ہاں بیٹے! ضرور۔ کیا بات ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نے ایک عمارت خرید لی ہے۔ میں نے اسے تبدیل بھی کرا دیا ہے۔ دو ایک دن میں کام مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد میرا پروگرام ہے کہ ہم یہاں کاروبار کریں۔"

"نہایت مناسب خیال ہے۔" تنویر صاحب خوش ہو کر بولے۔

''اس سلسلے میں ہمیں آپ سے کچھ مدد چاہئے۔''

''ہر طرح سے حاضر ہوں بیٹے!.....کہو؟''

''کاروباری امور میں گورنمنٹ کے جو کام ہوتے ہیں، وہ آپ کو کرانے ہوں گے۔ میرا مقصد ہے، فرم کا رجسٹریشن وغیرہ، ایکسپورٹ لائسنس اور ایسے ہی دوسرے کام۔''

''سب ہو جائے گا۔ مگر کاروبار کیا کرو گے؟''

''قالینوں کا۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''اوہو۔'' نواب جلال الدین مسکرا اُٹھے۔ ''اور یہ کاروبار یقیناً شمشیر الدولہ کے مقابلے پر ہوگا؟''

طالوت ہنسنے لگا۔

''بہر حال، میری ساری خدمات حاضر ہیں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔ ''میں آج ہی اپنے کاروباری مشیر کو بلاتا ہوں اور اس سے فرم کے کاغذات تیار کرا لیتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ!'' طالوت نے جواب دیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک ہم لوگ گفتگو کرتے رہے۔ پھر نواب جلال الدین نے اجازت چاہی۔

''میں اپنے کچھ دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے، شام کی چائے پر نہ ہوں۔ آپ لوگ خیال نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے، آپ بھی آرام کریں۔'' تنویر صاحب ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے اور ہم دونوں ان دونوں بزرگوں سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ طالوت جوتے اُتار کر بستر پر دراز ہو گیا تھا۔

''تو یہ ہیں حالات۔ ایک بات بتاؤ عارف! اب ہم اس کوٹھی میں کب تک رہیں گے؟''

''کیوں؟''

''بھئی یہاں رہنے کا کیا جواز ہے۔ مہمانداری کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ کیوں تکلیف دی جائے ان لوگوں کو؟ میرا خیال ہے، قرب و جوار میں کوئی خوب صورت سی کوٹھی تلاش کر لی جائے۔ پاس بھی ہوں گے اور الگ بھی۔''

''ہاں، خیال تو برا نہیں ہے۔ رات کو یہ تجویز تنویر صاحب کے سامنے رکھ دیں گے۔''

''یہ مخلص لوگ اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن بہر حال، اب تو ہم کاروبار بھی کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، خاموشی سے کوٹھی خرید لی جائے اور پھر انہیں اطلاع دے دی جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں سے جانے کا فیصلہ کچھ لوگوں کے مشوروں سے کیا جائے گا۔''

''یعنی.....یعنی؟'' طالوت آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

''افشاں سے اجازت لینا ضروری ہے۔''

''اللہ اکبر.....اللہ اکبر!'' طالوت خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''تمہارا کیا ہے استاد! تمہاری راج ہنس تو تمہارے ایک اشارے پر تمہارے ساتھ ہو گی۔ مگر میری بے چاری افشاں، وہ تو ابھی غیروں کے بس میں ہے۔''

''حق اللہ!'' طالوت نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''اب تو تُو پیدائشی عاشق معلوم ہو رہا ہے۔''

"سب تمہاری حرکت ہے۔"

"جی ہاں۔ عشق آپ کر رہے ہیں، شادی آپ کریں گے اور حرکت میری ہے۔ ویسے میرا خیال ہے، کچھ ہو ہی جانا چاہئے۔ کیوں نہ میں براہِ راست نواب جلال الدین سے بات کروں۔"

"چند روز رُک جاؤ یار!..... ذرا کاروبار شروع کر لیں، اس کے بعد کچھ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔" طالوت گہری سانس لے کر بولا۔

تقریباً چار بجے تک ہم لوگ اپنے کمرے میں رہے۔ یہاں کے لوگ دوپہر کو سونے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن بہرحال، ہر وقت تو سب ایک دوسرے میں نہیں گھسے رہتے تھے۔

سوا چار بجے کے قریب کسی نے دروازے پر دستک دی اور میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ شکیلہ، افشاں، سیمیں اور احسان کے علاوہ دو لڑکیاں اور تھیں۔

"سو رہے ہیں آپ لوگ؟" افشاں نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم دن میں کبھی نہیں سوتے۔"

"پھر یہاں کیوں گھسے ہوئے ہیں؟"

"بحالت مجبوری۔" طالوت نے جواب دیا۔

"کیوں، کیا مجبوری ہے؟"

"بھئی آپ لوگ نہ جانے کہاں تھے، کیا کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا، ہر وقت تو آپ کے سر پر سوار رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"تکلف کی باتیں نہ کیا کریں۔ آیئے ذرا بھائی جمشید..... میرا مطلب ہے، جمی عرف جم کی خدمت میں چلیں۔ ان سے تفصیلی تعارف تو ہوا ہی نہیں۔" افشاں نے کہا۔

"جو حکم..... ذرا لباس بدل لیں؟"

"ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شام کی چائے پر دیکھا جائے گا۔" افشاں بولی اور طالوت نے شانے ہلا دیئے۔

پھر ہم دونوں بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے اور یہ شیطانی ٹولی، لارڈ جم کی خواب گاہ کی طرف چل پڑی۔ دبے پاؤں سب لوگ دروازے پر پہنچے اور چابی کے سوراخ سے باری باری اندر جھانکنے لگے۔

"ارے خدا کی پناہ!" سیمیں بولی۔

"کیا ہوا؟..... کیا ہوا؟" افشاں نے سیمیں کے شانے پکڑ کر اسے چابی کے سوراخ سے ہٹایا اور خود آنکھ اس پر لگا دی۔ اور پھر اس نے بمشکل ہنسی روکی۔

"بات کیا ہے؟" شکیلہ نے کہا۔

"اُلٹا کھڑا ہے، احمق کہیں کا۔" افشاں نے کہا۔ "اور صرف زیر جامہ پہنے ہوئے ہے۔" "ہائے، مگر اسے ہوا کیا؟" افشاں کراہی۔

"تمہارا کزن ہے افشاں! کچھ تو خیال کرو۔" سیمیں مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ، ہاں۔ چلو اسے سیدھا کریں۔" افشاں بولی۔

"ارے افشاں! کیوں نہ اچانک اندر گھس جائیں۔ لطف آ جائے گا!" شکیلہ جیسی سنجیدہ لڑکی کے

ذہن میں نہ جانے کہاں سے شرارت گھس آئی۔

''مگر دروازہ تو اندر سے بند ہے۔''

''میں نے پورے چھ ماہ تک ایک نقب زن سے تجوری توڑنے کی تربیت لی ہے۔ دروازہ بے آواز کھل سکتا ہے۔'' طالوت آگے بڑھ کر بولا۔

''تو کھولیے۔'' افشاں نے سرگوشی کی اور طالوت نے دکھاوے کے لئے ایک کیل جیب سے نکالی۔ ورنہ یہ بات تو میں جانتا تھا اور شکیلہ کہ دروازہ ایک اشارے سے کھل سکتا تھا۔

بہرحال، کیل باہر نکل آئی اور دروازہ کھل گیا۔ تب اچانک ہم سب نے اسے زور سے دھکا دیا اور دونوں پٹ کھل گئے۔ جمشید بری طرح اُچھل پڑا۔ لیکن یہ بات صرف میں ہی دیکھ سکا تھا کہ طالوت نے اپنی ایک انگلی اوپر کر دی تھی۔ اب اس کا مقصد کیا تھا، یہ ابھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

جمشید کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ہمیں دیکھ کر بھی سیدھا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس کے پاؤں، خلاء میں سائیکل چلانے والے انداز میں حرکت کر رہے تھے۔

''ویل مسٹر جم! کیا ہو رہا ہے؟'' افشاں نے پوچھا۔ لیکن جمشید کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ البتہ پاؤں کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔

''میں نے کہا جمشید بھائی! آپ غالباً اُلٹے ہو گئے ہیں۔'' افشاں پھر بولی۔

''مم... مم..... مجھے سیدھا کرو۔'' جمشید کی آواز اُبھری۔ اُس کے چہرے پر بہت زیادہ بوکھلاہٹ نظر آ رہی تھی۔

''اُلٹا کیا ہم نے کیا تھا؟''

''میں خود ہوا تھا۔''

''پھر سیدھے بھی خود ہو جائیے۔''

''نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں؟''

''نہیں جانتا، کیا ہو گیا۔ بس سیدھا نہیں ہو سکتا۔''

''اللہ کی مرضی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' افشاں شانے اچکا کر بولی۔ ''مگر یہ آپ کیا کر رہے تھے؟''

''عبادت۔'' جمشید نے جواب دیا۔

''سبحان اللہ!'' طالوت پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بات کسی حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔ جمشید اُلٹا اپنی مرضی سے ہوا تھا، لیکن بدمعاش طالوت کی موجودگی میں اپنی مرضی سے سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔

جمشید نے اب سائیکل چلانا بند کر دی تھی۔ وہ اب ساکت، ہم سب کی شکلیں دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر صبر کے آثار تھے۔ کئی منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح بے تعلق تھا۔

''جمشید بھائی!'' سیمیں نے آواز دی۔

''آئی ایم سوری لیڈیز! میں آپ لوگوں کو اچھا ریسپشن نہیں دے سکتا۔ آئی ایم سوری۔'' وہ بھرّائی

ہوئی آواز میں بولا۔

"مگر آپ سیدھے تو ہوں۔" افشاں نے کہا۔

"نہیں۔ یونہی ٹھیک ہوں۔ آج عبادت میں گڑبڑ ہو گیا ہے۔ اب جب تک گاڈ کا مرضی ہوئیں گا، اُلٹا رہیں گا۔" جمشید نے ایسی بے چارگی سے کہا کہ سب ہنس پڑے۔ میں آہستہ آہستہ طالوت کے قریب پہنچ گیا اور پھر میں نے سرگوشی کی۔

"بس طالوت! کافی ہے۔"

"واقعی؟" طالوت نے میری طرف رُخ کئے بغیر کہا۔

"ہاں۔اس کی بے چارگی پر ترس آگیا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" طالوت نے کہا اور جمشید پٹ سے نیچے آپڑا۔ لیکن اس کا چہرہ اب بھی پُرسکون تھا۔ وہ اسی طرح نیچے پڑا رہا۔لڑکیاں اب بھی ہنس رہی تھیں۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ کو تکلیف تو ہوئیں گا، میرے کو اُٹھا کر کرسی پر رکھ دیں۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہے۔ میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہائے، پلیز!" جمشید لجاجت سے بولا۔

"اُفوہ، جمشید بھائی! کمال ہے۔ آخر آپ ہیں کیا چیز؟" افشاں پیر پٹخ کر بولی۔

"آرام آرام سے پٹخا کرو۔ جلدی مت کرو۔ ہم فنکار ہے۔ دیر سے سمجھ میں آئیں گا۔ مگر تم لوگ ہمارا ہیلپ نہیں کریں گا؟" جمشید مخصوص انداز میں بولا۔

"آؤ بھئی۔" طالوت بولا اور پھر میں نے اور طالوت نے جمشید کو اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔ اُس کی آنکھیں بدستور پتھرائی ہوئی تھیں، بے تاثر آنکھیں۔ پھر اُس نے یاس بھری نگاہوں سے افشاں کو دیکھا۔

"کزن!..... ڈیئر کزن! ہمارا پرسنالٹی خراب ہو گیا ہائے۔ کیا تم وہ چادر ہمیں نہیں دے گا؟" اس نے بستر پر پڑی چادر کی طرف اشارہ کیا اور افشاں نے چادر اس کے بدن پر ڈال دی۔

"مگر یہ کون سی عبادت تھی، مسٹر جمشید؟" سیمیں نے پوچھا۔

"عبادت نمبر ایک سو گیارہ!"

"کیا مطلب؟" سب حیرت سے بولے۔

"سوری لیڈیز! ہم خود کسی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تو آپ کیوں مغز خراب کرتا۔ آپ لوگ بیٹھو۔ ہم کو رنج ہے، ہم آپ کا خاطر نہیں کر سکتا۔"

"آپ ہمیں صرف اس عبادت کے بارے میں بتا دیں۔" شکیلہ بولی۔

"اوہ، سیمیں کزن! ہم کیا بولے۔ ہمارا بات تمہارا سمجھ میں نہیں آئیں گا۔ بس ہم جو کچھ کرتا، خواب دیکھ کر کرتا۔ ایک رات ہم ڈنر میں گیا۔ ادھر چکن فرسٹ کلاس پکا۔ ہم اتنا کھایا کہ پیٹ خراب ہو گیا۔ تب ہم رات کو خواب دیکھا۔ ایک بوڑھا مین بولتا کہ عبادت کرو۔ ہم بولا کیسے؟ تو اس نے ایسا مافک کیا۔ تب ہمارا پیٹ ٹھیک ہو گیا۔ ادھر رات کو ڈنر بہت اچھا تھا، ہم کھایا اور پھر پیٹ خراب ہو گیا۔ تب ہم عبادت کیا، ابھی ٹھیک ہے۔" جمشید نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور لڑکیاں بے اختیار قہقہے لگانے لگیں۔ گویا جمشید پیٹ ٹھیک کرنے کے لئے عبادت کر رہا تھا۔

"زندہ رہو یار! پیارے آدمی ہو۔" طالوت نے بڑے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

کہا اور جمشید شرمائے ہوئے انداز میں مسکرانے لگا۔ پھر چونک کر بولا۔
''لیکن مین! میں تمہارا کیا خدمت کروں؟ ادھر تو کچھ نہیں ہے۔ ویری سوری۔ ابھی تم ہمارا کنٹری آوٗ تو میں تمہارا خدمت کروں گا۔ اس ٹیم میرے کو معافی دو۔''
''دیا..... بخدا دیا۔ بس اب تم تیار ہو جاؤ۔ باہر سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' طالوت نے کہا۔
''اوہ، مگر کیسے تیار ہوں؟ اوہ، گڈ! تم بیٹھو، ہم تیار ہوتا ہائے۔'' جمشید نے کہا اور پھر وہ بدن پر چادر ڈال کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کپڑے نکالے اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکیاں اب بھی ہنس رہی تھیں۔
''آپ نے ایک بات محسوس کی، صائم بھائی؟'' سیمیں نے کہا۔
''کیا؟''
''جمشید کے اندر ایک عجیب بات ہے۔ یہ صورتِ حال پیش آئی لیکن انہوں نے ہمارے اس طرح گھس آنے کا برا نہیں منایا بلکہ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ وہ ہماری خدمت نہیں کر سکتے۔''
''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' طالوت نے بھی اعتراف کیا۔
''ایک شمشیر الدولہ بھی ولایت پلٹ تھے۔''
''غیر ممالک میں سب برے نہیں ہوتے، جو کوئی جس شخصیت کو اپنا لے، بہرحال یہ شخص کافی دلچسپ ہے اور ہمارے شب و روز کو رنگین بنائے گا۔'' میں نے کہا اور ہم سب جمشید کے کمرے کے مختلف حصوں میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ پانچ منٹ..... دس منٹ..... اور پھر پندرہ منٹ گزر گئے، لیکن جمشید باتھ روم سے نہ نکلا۔
''ارے کیا ہو گیا اسے؟'' احسان نے باتھ روم کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اسی وقت اندر سے گٹار کی آواز پھوٹ پڑی۔ سب اُچھل پڑے تھے۔
''کیا مطلب؟'' سیمیں حیرت سے بولی۔
''یہ گٹار باتھ روم میں کہاں سے پہنچ گیا؟'' افشاں حیرانی سے بولی اور ہم سب گٹار سننے لگے۔ اچھا خاصا نغمہ تھا۔ لیکن جس جگہ بجایا جا رہا تھا، وہ بڑی مضحکہ خیز تھی۔
''اب کیا خیال ہے دوستو؟'' طالوت ہنس کر بولا۔
''آواز تو دیں۔ نہ جانے کیا ہو گیا اس پاگل آدمی کو۔'' افشاں نے کہا۔
''چل کر دیکھا جائے اندر۔'' طالوت بولا اور سب ہنس پڑے۔
''نہیں عادل بھائی! نہ جانے کس حال میں ہو۔ کوئی صحیح الدماغ شخص تو ہے نہیں۔'' افشاں نے کہا۔
''تو پھر اسے باہر بلانے کی کوئی ترکیب کرو، ورنہ وہ اندر بیٹھا گٹار بجاتا رہے گا اور ہم سب یہاں احمق بنے بیٹھے رہیں گے۔'' احسان نے کہا۔
لڑکیاں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی تھیں۔ درحقیقت یہ جمشید نایاب چیز تھی۔ اس کی حرکتوں میں ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ظریف نہیں بلکہ ستم ظریف تھا اور اب اس وقت کا ہی معاملہ لے لیا جائے، وہ ہم سب کو یہاں بٹھا کر باتھ روم میں گٹار بجا رہا تھا۔ کوئی اندر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

بالآخر میں، احسان اور شکیلہ آگے بڑھے۔ ہم نے زور زور سے باتھ روم کا دروازہ دھڑ دھڑایا اور گٹار کی آواز بند ہو گئی۔ اُمید افزا بات تھی۔ دوسری اور تیسری بار دروازہ بجانے پر اندر سے جمشید کی بھرّائی ہوئی آواز اُبھری۔

''ارے کون آ گیا صبح ہی صبح؟''

''کیا جمشید صاحب اندر موجود ہیں؟'' طالوت نے آواز لگائی۔

''ہاں، کون صاحب ہیں؟'' اندر سے جمشید کی آواز آئی۔

''دروازہ کھولیے، ایک ضروری کام ہے۔'' طالوت نے کہا اور چند سیکنڈ کے بعد اندر سے دروازہ کھل گیا۔ جمشید لباس پہن چکا تھا۔ گٹار اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں عجیب سا کھویا کھویا پن تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے خاص امریکن لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہو رہا تھا اندر؟''

''ایں!'' جمشید چونک پڑا۔ ''تم کون ہو؟..... یہ میرا گھر ہے۔'' پھر اس نے باقی لوگوں کی شکلیں دیکھیں اور کھڑے کھڑے جھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ لہرا کر گرنے ہی والا تھا کہ سیمیں، احسان اور طالوت نے اُسے جلدی سے سنبھال لیا۔ گٹار جمشید کے ہاتھ سے لے لیا گیا اور ہم سب اسے باہر لائے۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' افشاں کی سرسراتی آواز اُبھری

''ابھی پتہ چل جاتا ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر جمشید کی سفید پتلون پر ایک ننھا سا سرخ دھبّہ اُبھر آیا۔ طالوت نے اُس کی ران میں پن گھسیڑ دی تھی لیکن جمشید کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ طالوت کی آنکھوں میں خجالت کے آثار اُبھر آئے۔ جمشید کو تکلیف دے کر اسے افسوس ہوا تھا۔

بہر حال، ہم سب نے اسے بستر پر لٹا دیا۔

''یہ سب کیا ہے عادل بھائی؟'' افشاں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''کوئی انوکھا کیس۔ یہ بے ہوش ہے۔'' طالوت آہستہ سے بولا۔ سب ہی جمشید کے لئے دل میں ہمدردی محسوس کر رہے تھے۔ اچھا خاصا نوجوان تھا۔ بے چارہ ذہنی طور پر بھی کمتر تھا اور اس وقت کی بے ہوشی بہر حال قابلِ رحم تھی۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور چند منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سہی ہوئی نگاہوں سے ایک ایک کا جائزہ لینے لگا اور پھر بستر سے چھلانگ لگا دی۔ وہ اس طرح اپنا بدن چھپا رہا تھا، جیسے برہنہ ہونے کا احساس ہو رہا ہو۔ لیکن پھر اس نے بدن کے لباس کو دیکھا اور سکون کی گہری سانس لی۔ پھر جھینپی جھینپی نگاہوں سے ایک ایک کی شکل دیکھنے لگا۔

''اب کیا کروں؟'' اس نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''کیسی طبیعت ہے جمشید صاحب؟'' طالوت ہمدردی سے بولا۔

''ٹھیک ہائے، ٹھیک ہائے۔ مگر آپ لوگ کھڑا کیوں ہے؟''

''چلئے، ناشتہ نہیں کریں گے؟''

''اوہ، آئی ایم سوری۔ پلیز میرا گٹار واپس رکھ دیں۔ میں اس کے معاملے میں بہت جذباتی ہوں۔ پلیز آپ لوگ مائنڈ نہیں کریں گا۔'' اس نے گٹار احسان کے ہاتھ سے لے لیا اور بڑے پیار سے اس پر

ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر وہ گٹار سمیت ہی ہمارے ساتھ باہر آیا تھا۔ ناشتے کے کمرے میں بھی وہ مع گٹار کے داخل ہوا تھا اور حسبِ معمول اس کی گٹار کو باقاعدہ جگہ دی گئی لیکن نہ جانے کیوں ہم سب اس کے لئے سنجیدہ ہو گئے تھے۔ بزرگوں سے اس کی پُراسرار بے ہوشی کا تذکرہ نہ کیا گیا، لیکن ناشتے کے بعد سب ہی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ جمشید کو اس کے کمرے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

''کیا خیال ہے، یہ جمشید کیا چیز ہے؟'' احسان نے کہا۔

''خدا ہی بہتر جانے۔ ویسے کیا اس کی بے ہوشی مصنوعی تو.....''

''ہرگز نہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔'' طالوت بولا۔

''آپ کہہ رہے ہیں عادل بھائی! تو پھر ٹھیک ہی ہو گا۔ لیکن آخر یہ ہے کیا کردار؟''

''میرے خیال میں کوئی ذہنی مرض۔'' میں نے کہا۔

''اور پھر امریکہ جیسا ملک، نت نئے امراض وہاں ایجاد کئے جاتے ہیں۔ کچے ذہن کا ایشیائی نوجوان جو اپنی شخصیت ان لوگوں میں کھو بیٹھا۔ شمشیر الدولہ دوسری قسم کا انسان تھا۔ چالاک اور بدفطرت۔ لیکن جمشید اس سے مختلف فطرت کا مالک ہے۔''

''مگر ہے خوب۔'' میں نے گردن ہلائی۔

''میرا خیال ہے، اس کی حماقتوں پر گہرا نوٹس نہ لیا جائے۔''

''اور اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کیا جائے جو اسے تکلیف پہنچائے۔''

''طے رہی۔''

''لیکن وہ بے ہوش کیوں ہو گیا تھا؟''

''یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتا سکے گا۔'' طالوت نے شانے ہلاتے ہوئے کہا اور ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ہاں، جمشید نے ہماری ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ اس کے بعد سب منتشر ہو گئے۔ طالوت، شکیلہ کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ اب وہ تکلفات کا عادی نہیں رہا تھا۔ افشاں، تصدق کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کوئی خیال ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ یونہی بے خیالی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی۔

''اےئے عادل بھیا!.....صائم میاں!.....کوئی ہے؟'' آواز بوا کی تھی۔ میں جلدی سے سنبھل گیا۔

''آیئے بوا!.....آیئے۔'' میں نے کہا اور بوا کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں حیرت کے آثار۔ ''بیٹھیں بوا! کیسی ہیں؟'' میں نے کہا اور بوا بیٹھ گئیں۔

''ٹھیک ہوں بیٹے!.....عادل میاں کہاں گئے؟''

''اوہ، بوا! عادل تو میں ہوں۔ آپ غالباً صائم کی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایں؟'' بوا حیرت سے بولیں، مجھے گھورتی رہیں، پھر کہنے لگیں۔ ''نہ بیٹا! نہ......محبت کے ماروں سے مذاق نہیں کرتے۔ میا باوا کی آنکھیں کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو جائیں، اولاد کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میں تم لوگوں کی سگی نہیں ہوں، لیکن تم دونوں ایسے پیارے بچے ہو کہ بس اپنے ہی لگتے ہو۔ بتا دے بیٹا! میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی؟''

''نہیں بوا! آپ بے حد مہربان ہیں۔ میں صائم ہی ہوں۔''

''اللہ زندہ سلامت رکھے۔'' بوا نے دل سے دعائیں دیں اور پھر میں ان سے دوسری باتیں کرنے لگا۔ باتوں کے دوران بوا بول اٹھیں۔ ''لیکن بیٹا! یہاں کا ماحول میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''کیوں بوا؟''

''بس اچھا نہیں لگے ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں ہر وقت ایک دوسرے میں گھسے، ہی ہی کرتے رہتے ہیں۔ ایک موا میراثی ہے، جو امریکہ سے آیا ہوا ہے۔ نوکر ہیں تو ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔''

''ارے بوا! وہ تصدق بہت کمینہ انسان ہے۔''

''کون تصدق؟''

''وہی جو آپ کو لینے اسٹیشن گیا تھا۔''

''ارے اُس جھاڑو پھرے کی بات مت کرو۔ بڑا ہی کمینہ ہے۔ لوگوں کی بہو بیٹیوں کے تو اسے (رب بھی نہ کھڑا کیا جائے۔''

''واقعی۔ اب دیکھو نا، تمہارے بارے میں ہی کیا کہتا پھر رہا ہے۔ وہ تو مجھے احسان نے روک دیا، ورنہ اُسے مار بیٹھتا۔''

''میرے بارے میں؟'' بڑی بی چونک پڑیں۔

''ہاں بوا!..... جانے دو بے غیرت کو۔''

''ارے نگر کہہ کیا رہا تھا جھاڑو پھرا؟''

''بس بوا! اُلٹی سیدھی باتیں۔ لڑکیاں تو حیران رہ گئیں۔''

''بتا دے بیٹا! تجھے میری قسم، بتا دے۔'' بوا ضد کرنے لگیں۔

''بس یہی، اسٹیشن سے آنے کی باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگا، خود تو بار بار میری ران میں نوچ نوچ کر متوجہ کر رہی تھیں۔ میں نے توجہ نہیں دی تو بگڑنے لگیں۔''

''ہائے میں مر جاؤں۔'' بڑی بی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''کہہ رہا تھا، مجھے دیکھ کر آنکھیں تتلی بنا لیتی ہیں۔ بڑی بی کا دماغ چل گیا ہے۔''

''ارے بھو بھل پڑے منہ پر۔ کوڑھی ہو مرے کالیا۔ ہے کہاں ستیاناسی؟ مار مار کر حلیہ نہ بگاڑ دوں تو ام نہیں۔'' بوا بری طرح بپھر گئی تھیں۔

''ارے ارے اس قدر ناراض نہ ہوں بوا!'' میں نے ٹکڑا لگایا۔

''ارے ناراض نہ ہوں۔ کمبخت، پرائی بہو بیٹیوں کو عیب لگاتا ہے۔ ارے آ تو جائے۔ گیا کہاں؟'' اللہ کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

''بوا!..... بوا! وہ ہے نہیں۔ افشاں بی بی کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ آ جائے تو اپنا غصہ نکال لیجئے۔'' اں نے بوا کو روکتے ہوئے کہا۔ ''آیئے بیٹھیے۔''

''ارے نہیں بیٹا! اب نہیں بیٹھوں گی۔ کمبخت نے دو کوڑی کی عزت کر دی۔ اب کس منہ سے اے سامنے بیٹھوں؟ اب تو جب تک دل ٹھنڈا نہ ہو جائے گا، میں نہیں بیٹھوں گی۔'' بوا کمرے سے نکل گیں اور میرے حلق میں سینکڑوں قہقہے مچل اُٹھے۔ آ گئی شامت بے چارے تصدق کی۔

بہرحال، بوا کے جانے کے بعد میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ کسی کو اس شرارت کے بارے میں بتانا

مناسب نہیں تھا۔ لیکن تقریباً پونے گھنٹے کے بعد کا ہنگامہ ایسا نہیں تھا کہ میں کمرے میں گھسا رہتا۔ بوا کی تیز تیز آوازیں سن کر یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ بھائی تصدق مُردہ باد۔

باہر نکل کر دیکھا تو وہی صورتِ حال تھی، جس کا میں منتظر تھا۔ بوا نے نہ جانے کس طرح تصدق کی ٹائی پکڑ لی تھی اور اب تصدق ناچ رہا تھا اور بوا زری کے کام کی جوتی پٹا پٹ برسا رہی تھیں۔

''مٹ گئے نیچ، ذلیل خاندان! آنکھیں بند ہو گئی ہیں کیا۔ عمر بھی نہیں دیکھتا۔ تیری ماں کے برابر ہوں۔ ہائے، ہائے..... ان بچوں کے سامنے تُو نے میری کیسی مٹی پلید کی ہے۔'' پھٹ پھٹ بوا نے اپنے گیت کے ساتھ جوتیوں کا میوزک دیا اور پھر شروع ہو گئیں۔ ''ارے بول! کیا سمجھتا ہے تُو مجھے؟''

تصدق کی ایسی حالت بگڑی تھی کہ منہ سے آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ اس کے تن و توش کے آگے بوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی، لیکن اس وقت اُس کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ اچانک ٹائی کھینچنے سے گرہ تنگ ہو گئی تھی اور وہ کافی تکلیف میں مبتلا تھا۔

بوا کی جوتیوں کے رُخ پر وہ ناچ رہا تھا۔ صورتِ حال تو کسی کو معلوم نہیں تھی، بس یہ بندر کا ناچ سب کے لئے دلکش تھا اور چاروں طرف سے قہقہے اُبل رہے تھے۔

صورتِ حال اس قدر خطرناک ہو جائے گی، مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بوا کو روکنے اور یہ تماشا ختم کرنے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ پھر تصدق کی مشکل قدرتی طور پر حل ہو گئی۔ نواب جلال الدین کسی طرف سے آ نکلے تھے۔

''ارے ارے بوا!..... ارے بوا! کیا ہو گیا؟ ارے یہ کیا کر رہی ہو؟..... چھوڑو اسے۔'' نواب جلال الدین دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ نواب صاحب کا حکم تھا، اس لئے بوا نے ٹائی چھوڑ دی لیکن منافع کے طور پر دو چار جوتیاں اور برسا دیں۔ اور پھر وہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگیں

''جان دے دوں گی یہاں، عزت نہیں گنواؤں گی۔ ہائے ہائے، ساری عمر تمہاری ڈیوڑھی میں گزار دی۔ آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھا؟.... پہاڑ سی جوانی کاٹ دی، کبھی انگلی نہ اُٹھی۔ اور اب اس بڑھاپے میں۔ ہائے اس بڑھاپے میں.....'' بڑی بی نے جھلاہٹ میں چپل اُٹھائی اور تصدق نے چھلانگ لگا دی۔

''ارے رُک تو سہی مردار! گنجا نہ کر دوں تو نام نہیں۔'' بوا کلکلائیں۔

''میں منع کر رہا ہوں بوا! آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' نواب صاحب غصیلے انداز میں بولے۔

''ٹکڑے کر دو میاں! مگر عزت نہیں گنواؤں گی۔''

''ارے مگر ہوا کیا ہے؟'' نواب صاحب جھلا کر بولے۔

''اسی سے پوچھو..... اسی سے پوچھو میاں!..... ارے دو کوڑی کا کر دیا ہے مجھے۔''

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے بوا!.... تصدق! تم میرے ساتھ آؤ۔'' نواب صاحب، بے چارے تصدق کو بازو سے تھام کر ایک طرف لے گئے اور بوا دوپٹے سے منہ ڈھانپے روتی رہیں۔ ہم سب بوا کو سمجھانے لگے۔ ویسے اصل بات ابھی بوا کے اور میرے درمیان ہی رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے، اُس کا بھانڈا پھوٹنے ہی والا تھا۔

سب لوگ بوا کو پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئے۔ بوا اب بھی زار و قطار رو رہی تھیں۔

''اللہ کے واسطے بوا! اب چپ بھی ہو جائیے۔ بتائیے تو سہی، آخر ہوا کیا؟'' سیمیں نے عاجز آ کر

پوچھا۔
"نہیں بی بی!..... ہرگز نہیں۔ اللہ کے واسطے مجھے یہاں سے واپس بھجوا دو۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اللہ..... مجھے ساتھ خیریت کے گھر بھجوا دو۔ ہائے، اس دنیا کو کیا ہو گیا۔"
"اب آپ تصدق کو چھوڑ کر دنیا کی باتیں کرنے لگیں۔"
"ارے چھوڑوں گی تھوڑی، اس مری کے لئے کو۔ لو اور سنو، کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟"
"اللہ تصدق کی جان پر رحم کرے۔" سیمیں نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"ایں!" بوا چونک پڑیں۔ سیمیں کی شکل دیکھتی رہیں اور پھر جو انہوں نے آسمان سر پر اُٹھایا تو توبہ ہی بھلی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ "سیمیں بٹیا! تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اللہ کی قسم!..... تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ ہائے، گودوں میں پروان کیا ہے، پوتڑے دھوئے ہیں تمہارے۔ اور آج یہ دن ہے، تم میرے دشمنوں کی خیر مانگ رہی ہو۔ ہائے سیمیں بٹیا! تم سے یہ اُمید نہ تھی..... تم سے....."
"بوا!..... بوا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اب میری جان کو آ گئیں۔" سیمیں بوکھلا کر بولی۔
"ارے اب کچھ ہی ہو جائے، جب اپنے ہی بیگانے ہو گئے تو کسی سے کہنے سے کیا فائدہ؟" بوا روتی رہیں۔ پھر سب نے لاکھ پوچھا، لیکن بوا نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ صرف روتی رہیں اور سب تنگ آ گئے۔ پھر کچھ اور لطف آ گیا۔ جمشید صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی تھی، گٹار لے کر آ گیا۔ اُس نے تاروں پر انگلیاں پھیریں اور بوا کی آواز کو بریک لگ گیا۔ وہ روتے روتے ایک دم چپ ہو گئیں۔ اور پھر انہوں نے جلدی سے دوپٹہ سر پر لے لیا۔
ہم سب بھی ایک دم جمشید کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
"اوہ..... سیڈ سین ہے۔ کیا ہوا، پرانا عورٹ!..... کیا ہوا؟" اُس نے بوا سے پوچھا۔ بوا شاید اُس کی اردو نہیں سمجھ سکی تھیں۔
وہ ایک دم واپسی کے لئے مڑیں اور افشاں بول پڑی۔ "ارے، ارے بوا! کہاں چلیں؟"
"اے بٹی! میرا جانا ہی ٹھیک ہے۔ ایسی باتیں دیکھی نہ سنیں۔ ائے ایک سے ایک بدحواس ہے اس گھر میں۔ یہ موا میراثی کیا کسی سے کم ہے۔"
"ٹم پھر اَم کو میراثی بولا، پرانا عورٹ!" جمشید برا مان کر بولا۔
"کیا؟..... کیا کہا تُو نے مجھے؟..... پرانی عورت؟" بوا کو غصہ آ گیا۔
"ٹم میرے کو میراثی بولتا؟" جمشید نے آنکھیں نکالیں۔
"ارے میراثی، بھانڈ اور نہ جانے کیا کیا۔" بوا نے بھی آنکھیں نکال کر کہا۔
"بوا!..... بوا! اب بھی آپ کو کچھ نہ کہوں۔ بڑی ماں سنیں گی تو کیا کہیں گی؟ جمشید صاحب ان کے بھتیجے ہیں۔" سیمیں نے کہا اور بوا کی آنکھیں ایک دم پھیل گئیں۔
"ایں..... بھتیجے؟"
"تو اور کیا۔ آپ سمجھتی تو ہیں نہیں۔ جو دل چاہتا ہے، بولتی چلی جاتی ہیں۔"
"اور لو، مجھے کیا معلوم تھا۔ اے بھین! مگر یہ کیسے بھتیجے ہیں؟" بوا ناک پر اُنگلی رکھ کر بولیں۔
"لیں، جمشید صاحب بہت بڑے فنکار ہیں۔" سیمیں نے کہا۔

''خدا لگتی کہوں بابا! برا مانو چاہے بھلا۔ آنکھیں اس لونڈے کی بھی اچھی نہیں ہیں۔'' بوا نے کہا۔

''افشاں!..... مائی کزن!..... پلیز، میرے کو بتاؤ، یہ بھینڈ کیا ہوتا؟''

''بہت برا ہوتا۔'' طالوت ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''اور پرانا عورت!..... تم میرے کو میراثی بولتا۔ بھینڈ بولتا۔ میں تمہارے کو مرڈر کریں گا۔ میں تمہارے کو ایک ڈم مرڈر کر دیں گا۔'' جمشید نے جیب سے ایک بڑا چاقو نکال لیا اور بوا نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ جمشید ان کی طرف لپکا اور بوا نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ اس عمر میں اتنی پھرتی سے دوڑنا عجوبہ تھا۔ جمشید تو ایک بھبکی دے کر رُک گیا تھا۔

بوا اتنی تیزی سے دوڑی تھیں کہ آن کی آن میں نگاہوں سے غائب ہو گئیں۔ البتہ جب ہم جمشید کی طرف مڑے تو وہ احمقانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''میرے کو بھاگتا ہوا بڈھا عورت بہت اچھا لگتا۔'' وہ شرمائے ہوئے انداز میں بولا۔

''سبحان اللہ!'' احسان نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بائی گوڈ..... معلوم ہوتا، انڈوں پر بیٹھا مرغی بھاگ پڑا۔'' جمشید نے پھر کہا۔

''اور حضور نے یہ چاقو کس خوشی میں نکالا تھا؟'' طالوت نے پوچھا۔

''بس، اس کو بھاگتے دیکھنا مانگتا تھا۔''

''لیکن جناب! یہ امریکہ نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں ہے۔ ہم جانتا ہے۔''

''اور اس سائز کا چاقو رکھنا یہاں جرم ہے۔''

''آئی نو..... آئی نو..... مگر یہ نقلی ہے۔ دیکھو، اصلی کا مافک مگر نقلی۔'' جمشید نے چاقو ہمارے ہاتھ میں دے دیا۔ درحقیقت وہ ٹوائے نائف تھا۔ سب کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی ہنس رہے تھے، کبھی سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

''خوب چڑیا گھر بنایا ہے افشاں صاحبہ!'' احسان ہنستے ہوئے بولا۔

''ایمان سے بتائیے احسان بھائی! مزہ نہیں آ رہا؟'' افشاں کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آ گئے تھے۔

''بے حد۔''

''ارے آئیے، اس بے چارے کی حالت تو دیکھیں''

''تصدق کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' افشاں نے جواب دیا اور ہم تصدق کی تلاش میں چل پڑے۔ تصدق، نواب جلال الدین کے کمرے میں ملا۔ عجیب سی شکل بنائے بیٹھا تھا اور نواب صاحب اُسے سمجھا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ سنبھل گئے۔

''بھئی کیا قصہ تھا؟ تم ہی کچھ بتاؤ۔''

''پتہ نہیں ابو! تصدق صاحب کیا بتاتے ہیں؟'' سیمیں نے کہا۔

''اس بے چارے کو کچھ نہیں معلوم۔ بوا نے اسے کیوں مارا؟'' نواب صاحب بولے۔

''کمال ہے، ادھر بوا کچھ نہیں جانتیں۔''

''بوا کافی ضعیف ہو گئی ہیں۔ مجھے ان کی دماغی صحت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ تم انہیں سمجھا دو سیمیں! ورنہ مجھے ان کے ساتھ سخت سلوک کرنا پڑے گا۔ آئی ایم سوری تصدق! تم اس بات کو ٹال دو۔''

''میں اب یہاں کس منہ سے رہوں گا جناب! میں شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔''

''بس ایک بار تصدق ڈیئر! میری وجہ سے معاف کر دو۔ سیمیں! بوا کو میرے پاس بھیج دو۔ بلکہ اسی وقت بلاؤ۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''میں بلا کر لاتی ہوں۔'' سیمیں نے کہا۔

''نہیں۔ براہ کرم رہنے دیں۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' تصدق نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ نواب صاحب نے اُسے نہیں روکا تھا، پھر وہ آہستہ سے بولے۔

''کوئی گھپلا ضرور ہے۔ تصدق خود بھی بوا کے سامنے نہیں رُکنا چاہتا۔ بہر حال بوا کو اس حد تک نہیں جانا چاہئے تھا۔ بھئی تم میں سے تو کسی نے شرارت نہیں کی ہے؟'' نواب صاحب مسکرا کر بولے لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر سب نواب صاحب کے کمرے سے نکل آئے۔ پورا دن دلچسپ ہنگاموں میں گزرا تھا۔

رات کو میں اور طالوت تنہا ہوئے تو طالوت نے پوچھ ہی ڈالا۔ ''یار! یہ بڑی بی نے تصدق کی اس قدر پٹائی کیوں کر ڈالی، سمجھ میں نہیں آیا؟''

''گڑبڑ ہو گئی تھی طالوت!'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

اور میں نے طالوت کو تفصیل بتا دی۔ طالوت خوب ہنسا تھا۔ ''خیر کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن تم نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا، جو کوئی کارروائی کر لیتا۔ اگر بڑی بی بتا دیتیں تو؟''

''ہاں یار! میری تو روح فنا ہو گئی تھی۔'' میں نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''مگر عارف! یہ جمشید ذہن میں اٹک رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس آدمی کے بارے میں فیصلہ کرو۔''

''میں نہیں سمجھا طالوت؟''

''یہ کیا شے ہے؟''

''کوئی دماغی کیس۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہ جانے کیوں عارف! بعض اوقات یہ شخص مجھے کافی ذہین لگتا ہے۔'' طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔

''ذہین۔'' میں ہنس پڑا۔

''ہنسو نہیں۔ کیا اس کی کیفیت میں ایک انوکھا پن نہیں محسوس ہوتا؟''

''مگر کیسا انوکھا پن میری جان! میں تو نہیں تلاش کر پایا۔''

''بس دل اندر سے کہتا ہے، کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اس کی آنکھوں سے شوخی ٹپکتی ہے اور اس کی

حرکتوں میں ایک باقاعدہ سی شرارت ہوتی ہے۔ اگر وہ بے حد چالاک اور مضبوط اعصاب کا مالک نہیں ہے تو پھر میرے لئے بہت عجیب ہے۔''

''چالاک، مضبوط اعصاب کا مالک؟''

''ہاں۔ وہ اُلٹا کھڑا تھا، میں نے اُسے معلق کر دیا۔ لیکن وہ صرف چند سیکنڈ اضطراب میں مبتلا رہا اور پھر پُرسکون ہو گیا۔ معمولی بات نہیں تھی عارف! اس حیرت انگیز بات پر اُسے پریشان ہو جانا چاہئے تھا۔''

''لیکن طالوت! اس طرح پُرسکون ہو جانا اس کے ذہنی عدم توازن کی دلیل بھی ہو سکتی ہے۔ تم غسل خانے والا واقعہ بھول گئے ہو؟''

''نہیں..... میں نہیں بھولا۔ میں نے اس کے پورا جن اُتار دیا تھا، لیکن وہ بے ہوش ہی تھا اور اسی بات پر میں نے اُسے معصوم قرار دے دیا تھا۔''

''پھر؟.....اور کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں!''

''کیا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''چاقو والی بات۔ تمہاری شرارت سے بڑی بی نے تصدق کی پٹائی کر دی۔ تم یا کوئی اور، جمشید کے سلسلے میں بھی کوئی شرارت کر سکتا تھا لیکن اب بڑی بی کی ہمت نہیں پڑ سکتی کہ وہ جمشید کے ساتھ کوئی برا سلوک کریں۔''

''اوہ! تم بہت گہرائی میں سوچ رہے ہو طالوت!''

''ہاں، میرا خیال تھا۔''

''بظاہر ایسی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بہرحال، ہم سے کہاں چھپ سکے گا وہ۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ لیکن جن والی بات مصنوعی نہیں تھی۔'' طالوت نے کہا۔

''یقیناً۔ اُس کے بدن میں جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''بہرحال چھوڑو۔ ویسے تنویر صاحب کی کوٹھی ایک دم دلچسپ تفریحات کا مرکز بن گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھائی شمشیر کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہو گا۔''

''اوہ ہاں!.....اب کیا پروگرام ہے؟'' میں نے کہا۔

''کاروبار۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ چند روز میں کام شروع ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ عمارت میں کام مکمل ہو گیا؟''

''اس میں کون سی دیر لگے گی۔ میرا خیال ہے، کام مکمل ہو جانا چاہئے۔'' طالوت نے کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔ دیر تک ہم بڑی بی اور تصدق کے معاملے پر ہنستے رہے، پھر طالوت نے موضوع بدل دیا۔ ''اب تم افشاں کی بات سناؤ۔''

''افشاں!'' میں نے گہری سانس لی۔

''ہاں۔ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ بات بہت آگے ہو رہی ہے۔'' طالوت شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں اس سے انکار نہیں کروں گا طالوت! بات واقعی بہت آگے ہو گئی ہے۔ تم یقین کرو، بعض

ات تو میں پریشان ہونے لگتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟..... پریشانی کی کیا بات ہے؟" طالوت نے چونک کر پوچھا۔

"بہت سی باتیں طالوت! گو تم نے حقِ دوستی کی انتہا کر دی ہے، یعنی اپنے ہی شہر میں، میں سرخرو ہو گیا ہوں۔ اب میرے وطن والوں کو مجھ پر شبہ نہیں رہا ہے اور میں باعزت لوگوں میں شمار ہونے لگا ہوں۔ لیکن ضمیر کبھی کبھی حقیقت کا احساس دلاتا ہے۔ اس وقت سوچنے لگتا ہوں کہ اگر کبھی لوگوں کے سامنے حقیقت کھل گئی تو کیا ہو گا؟"

"خودکشی کر لینا، کون سی بڑی بات ہے؟" طالوت نے بڑے سکون سے کہا۔

"ایں!" میرے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی۔

"کیوں، مرنا نہیں ہے کبھی؟..... بات کھل جائے تو کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی مار لینا۔"

"طالوت! تم..... تم مذاق کر رہے ہو لیکن......"

"ابی لعنت ہے مذاق کرنے والے پر۔ عارف! تم درحقیقت ایک بزدل انسان ہو۔ مستقبل کے واہموں میں پھنسے رہنے والے۔ اور ایسے لوگ زیادہ دانشمند نہیں ہوتے۔ مستقبل کی فکر میں ہم اپنا حال خراب کرتے رہتے ہیں۔ احمق انسان! اس وقت تمہارے سر پر کون سوار ہے؟ چاروں طرف سے پُرسکون ہو۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"اوہ، طالوت! میں ضمیر کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھو نا، افشاں نے ہمارے والدین کے بارے میں سوال کر لیا اور لمبے چوڑے جھوٹ بولنے پڑے۔ نہ جانے آئندہ بھی کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔"

"اور جناب بس ولی ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیوں؟" طالوت نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"ولی تو نہیں لیکن....."

"آخری بار مشورہ دے رہا ہوں عارف! خدا کی قسم آئندہ اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم غور نہیں کرتے۔ تمہاری یہ باتیں میری براہِ راست توہین کے مترادف ہوتی ہیں۔ گویا میں ایسا ہی بے وسیلہ انسان ہوں کہ ایک دنیاوی انسان کے لئے کوئی ٹھوس اور مضبوط کام نہیں کر سکتا۔ اور رہی تمہارے ضمیر کی بات، تو تم مجھے بتاؤ، کسی دور میں تم نے کلرکی کرنے کے بارے میں کیوں سوچا تھا؟ کیسی زندگی گزار رہے تھے تم۔ آخر کیوں؟..... تنہا ذات کے مالک تھے۔ زندگی کی ابتدا کسی عمدہ ڈاکے سے کیوں نہ کی؟ دو ہی شکلیں ہوتیں۔ یا تو پکڑے جاتے اور ایک لمبی سزا ہوتی، یا پھر....."

"ٹھیک کہہ رہے ہو طالوت!" میں نے مضمحل سی آواز میں کہا۔

"حالات نے تمہیں اس طرف دھکیلا تھا، اس لئے ضمیر کی تکلیف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"یار طالوت! تم درحقیقت عمدہ دوست ہو۔"

"جی نہیں، احمق ہوں۔ اور اپنی اس بکواس سے اگر آپ افشاں کا ذکر گول کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کامیاب نہیں ہوں گے، بے فکر رہیں۔" طالوت نے کہا اور میں ہنس پڑا۔

"نہیں میری جان! میں اُس کا ذکر گول نہیں کروں گا۔ تم سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا دل کی بات؟"

"تو پھر کہہ ڈالیے نا۔" طالوت نے مسخرے پن سے کہا۔

''یار! یہ لڑکی بڑی پُراسرار قوتوں کی مالک ہے۔''

''ماشاء اللہ! عبرانہ ہے اس کا نام؟''

''نہیں طالوت! مذاق نہیں۔ بے حد باہمت ہے۔ انتہائی ٹھوس کردار کی مالک۔ یقین کرو، ان حالات میں، میں بزدل انسان نہیں ہوں۔ شکر کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی تمہارے علم میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ بہت سی عورتیں میری زندگی میں آ چکی ہیں۔ لیکن افشاں ان میں سب سے الگ ہے۔''

''اے سبحان اللہ! کیوں نہ ہو، میری راج ہنس کی ہم شکل ہے۔'' طالوت نے مسخرے پن سے کہا۔

''وہ کھل کر میدان میں آ گئی ہے۔'' میں نے افشاں کی باغ والی ملاقات اور اس کی گفتگو کی تفصیل، طالوت کو بتائی اور طالوت بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد اس نے کہا۔

''میرا بھی اس لڑکی کے بارے میں یہی خیال تھا۔ وہ صاحبِ کردار ہے۔ بس عارف! کسی مناسب وقت اس کے سلسلے میں کام ہو جانا چاہئے۔ میں اُسے اپنی بھابی بنانے کے لئے بے چین ہوں۔''

''ہمیں مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''ہاں بھئی۔ اور پھر تم اپنے پیروں پر تو کھڑے ہو جاؤ۔ چار پیسے تو کما لو، اس کے بعد ہی سارے کام ہو سکیں گے۔'' طالوت نے بوڑھوں کے سے انداز میں کہا اور میں ہنس پڑا۔ ''ہنسنے کی بات نہیں۔'' طالوت بولا۔ ''ہمیں سنجیدگی سے جلد از جلد اپنا کام شروع کرنا چاہئے۔''

''تو میں نے کب منع کیا ہے؟''

''بس کل ضروری ہدایات جاری کر دیں گے۔''

''کام قالینوں کا ہی ہوگا؟''

''سو فیصد۔ ویسے راسم نے پوری دنیا میں آرڈر دے ڈالے ہیں۔ مال پہنچنے والا ہوگا۔''

''شمشیر الدولہ کی چھٹی؟''

''ہاں۔ مقابلہ تو اسی سے ہے۔''

''بے چارہ۔'' میں نے کہا۔

''بے چارہ؟'' طالوت آنکھیں نکال کر بولا۔ ''ارے اُسے تو ایسی جگہ مارا جائے، جہاں پانی بھی نہ ہو۔ ہاں، ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''کیوں نہ ہم تنویر سے کہہ کر تصدق کو مانگ لیں؟''

''کیا مطلب؟''

''کام کا آدمی ہے یار! اور پھر اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے۔ اس کی تلافی اس کی حیثیت بدل کر کی جا سکتی ہے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کل بات کر لیں گے۔'' طالوت نے کہا اور سونے کے لئے کروٹ بدل لی۔

''اے مسٹر! ایسے نہیں سونے دوں گا۔'' میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"جوابی کارروائی، مجھے شکیلہ کے بارے میں بتاؤ۔"

"ارے اپنی راج ہنس کی کیا بات ہے۔ بس ہم دونوں یک جان دو قالب ہو چکے ہیں۔ ذہنی طور پر ہم نے ایک دوسرے کو پوری طرح قبول کر لیا ہے، مذہبی طور پر بھی یکجا ہو جائیں گے۔ بس ذرا گھر والوں کو ہموار کر لوں۔"

"بڑی خوشی ہوتی ہے طالوت! یہ سب کچھ سوچ کر۔"

"بس اب تم اپنی افشاں کو اور میں اپنی راج ہنس کو آنکھوں میں بسا کر سو جائیں۔ صبح ملاقات ہوگی۔" طالوت نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے بھی مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے اور سو گیا۔

دوسری صبح حسبِ معمول خوشگوار تھی۔ تنویر صاحب کی عظیم الشان کوٹھی، ہنگاموں کا مرکز تھی۔ اتنے سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جس قدر بھی دلچسپیاں ہوتیں، کم تھیں۔ خاص طور سے بوا اور جمشید۔ جمشید آج نہایت سنجیدہ تھا اور لطف کی بات یہ کہ اس کا گٹار بھی آج ناشتے کے کمرے میں اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس بارے میں نواب جلال الدین نے پوچھ ہی لیا۔

"جمشید میاں! تمہارا گٹار کہاں ہے؟"

"کمرے میں چھوڑ آیا ہوں انکل! میں نے محسوس کیا ہائے کہ ادھر میرے گٹار کا کوئی قدردان نہیں ہائے۔ آپ لوگ میرے کو معاف بولو، میوزک سے بہت دُور ہائے۔"

"ہاں، یہ تو حقیقت ہے۔ ہم سُروں میں کھونے کے عادی نہیں ہیں۔" نواب صاحب بولے۔

"اوہ انکل! سُروں کا انسلٹ مت کرو۔ سُر آسمان سے اُترتے ہیں۔ ہم رُوح کے رشتے کو بھول نہیں سکتے۔ تاروں کا رشتہ براہِ راست روح سے ہوتا ہائے۔ مگر آپ چھوڑو۔"

"تم نے کسی دن گٹار سنایا بھی تو نہیں ہے۔" تنویر صاحب بولے۔

"کیا سنائے انکل! جب تک قدردان نہ ہو، کیا فائدہ؟"

"میرا خیال ہے، آج شام کو جمشید بھائی سے گٹار سنا جائے۔" افشاں نے کہا۔

"ہاں بھئی، دیکھیں تو، شاداب نے بیٹے کو کیا فن دیا ہے۔" تنویر صاحب بولے اور بڑی ماں نے ناشتے سے ہاتھ روک لیا۔ انہوں نے خاموش نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور اچانک ہی تنویر صاحب کو احساس ہو گیا۔ وہ بوکھلا گئے۔ لیکن براہِ راست بیگم کو مخاطب کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے طریقے سے معاملہ ہموار کرنا چاہا۔

"جمشید میاں! تم نے پڑھا کہاں تک بیٹے؟"

"جہاں تک پڑھا جا سکا انکل! مگر مجھے میوزک سے عشق تھا۔"

"اچھی بات ہے بیٹے! لیکن عملی زندگی بھی ضروری ہے۔ ابھی تک تم نے عملی زندگی کے لئے کیا کِیا؟ مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" تنویر صاحب گھبرا گئے تھے اور چور نگاہوں سے بیگم کو دیکھ رہے تھے۔

"زندگی کسی کے لئے کیا کرتا ہائے انکل، جو زندگی کے لئے کچھ کیا جائے۔ مجھے اس بے وفا چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہائے۔" جمشید نے جواب دیا اور اس انوکھے جواب پر سب چونک پڑے۔

"اوہ!..... کیا خوب۔ یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟" نواب جلال الدین دلچسپی سے بولے۔

''زندگی کسی کا بات نہیں مانتا۔ زندگی کسی کا تابع نہیں، پھر زندگی کا تابع کیوں ہوا جائے۔ آپ میرا مطلب سمجھو انکل! جب یہ اپنی مرضی سے آتا ہائے، اپنی مرضی سے جاتا ہائے تو پھر ہم اس سے تعاون کیوں کرے؟''

''لیکن اس کے باوجود تم اس کے لئے اہتمام کرتے ہو۔'' تنویر صاحب بولے اور جلدی سے ایک پلیٹ بڑی ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بیگم! آپ نے یہ تو لیا ہی نہیں۔'' اور ان کی گفتگو نے بڑی ماں کو کسی قدر مطمئن کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے انکار نہ کیا۔

''اہتمام نہیں انکل، اس کا بے کدری دیکھو۔ ہم اس کے لئے کچھ نہیں کیا، ہم پیٹ بھرتا ہے، گٹار بجاتا ہے اور مست ہو جاتا ہے۔''

''انوکھی منطق ہے۔ واللہ! ذہن کو اُلجھا دینے والی۔'' نواب جلال الدین بولے۔

''بہر حال بیٹے! تمہارا خیال درست ہے۔ لیکن پھر بھی سانسوں کو خراج دینا ہوتا ہے۔ یورپ بلکہ مغرب زندگی سے بھٹک رہا ہے۔ وہ حقیقتوں کی تلاش میں گمراہی کی طرف جا رہا ہے۔ تم مشرق کے بیٹے ہو، وہاں رہ کر بھی اپنی تہذیب کا خیال رکھو۔'' تنویر صاحب بولے اور جمشید کھاتا رہا۔

ناشتہ ختم ہو گیا اور سب ناشتے کے کمرے سے اُٹھ گئے۔ تب میں نے تنویر صاحب سے کہا۔ ''تنویر صاحب! آج ہم لوگ اپنے شوروم کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ہمارا کام مکمل ہو چکا ہے۔''

''اوہ صائم میاں! واقعی آپ لوگ اس معاملے میں اس قدر سنجیدہ ہیں؟''

''ہاں انکل! ہم کام کر چکے ہیں۔ بہت سے ممالک کو قالینوں کا آرڈر بھی دیا جا چکا ہے۔''

''کمال ہے۔ اور یہ کام تم کس وقت کرتے ہو؟''

''فی الحال تو ہمارے چند کارندے یہ کام کر رہے ہیں۔ اب ہم بھی توجہ دیں گے۔ لیکن آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''ہاں، ہاں کہو۔ میں بھی پورے طور سے تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔ میرے سپرد بھی کوئی خدمت کرو۔''

''بس آپ کی سرپرستی کی ضرورت ہوگی۔ فی الحال اگر پسند کریں تو تصدق ہمیں دے دیں۔''

''تصدق؟'' تنویر صاحب تعجب سے بولے۔

''ہاں۔ ہم اسے انتظامی امور سونپیں گے۔''

''اگر وہ تیار ہو تو ہمیں اعتراض نہیں ہے۔''

''میں بات کر لوں گا۔'' میں نے کہا اور تنویر صاحب نے گردن ہلا دی۔

پھر ہم نے تصدق کو پکڑ لیا۔ بے چارے کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں اور طالوت اُسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ''کیا بات ہے تصدق! کافی ست نظر آ رہے ہو؟''

''پریشان ہوں صائم صاحب!''

''کیوں؟''

''بس یہ احساس ہونے لگا ہے کہ میں پیدا ہی دوسروں کے جوتے کھانے کے لئے ہوا ہوں۔''

''غلط احساسات کو ذہن میں کیوں جگہ دیتے ہو؟''

''اس لئے کہ عمل سامنے آتا رہتا ہے۔''
''بوا یوں بھی بزرگ ہیں۔ چڑچڑی ہیں، تمہاری عزت کم نہیں ہوئی۔''
''صرف بات ان کی نہیں ہے۔''
''پھر؟''
''آپ ہی بتائیں، میرا کیا مستقبل ہے؟''
''بناؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔
''چاہتا تو یہی ہوں۔''
''کاروباری صلاحیتیں رکھتے ہو؟''
''پیدا کر سکتا ہوں۔ آج تک موقع ہی نہیں مل سکا۔''
''ہم ایک فرم کھول رہے ہیں، تم پسند کرو تو اس کے منتظم بن جاؤ۔ ابتدائی تنخواہ تین ہزار روپے ماہوار اور منافع بھی دو فیصد۔ میرا خیال ہے، بھاری رقم بن جائے گی۔'' طالوت نے کہا۔
''للہ، میری حسرتوں کو اجاگر نہ کریں۔'' تصدق درد سے بولا۔
''پانچ سال کا معاہدہ۔ ایک کار اور رہائش مفت۔'' طالوت بولا۔
''عادل صاحب! میں درخواست کرتا ہوں کہ......''
''کمپنی کی طرف سے ڈرائیور بھی۔ شادی کرو گے تو ایک لاکھ روپیہ ملے گا اور تنخواہ میں دو ہزار کا اضافہ کر دیا جائے گا۔'' طالوت پھر بولا اور تصدق ہاتھ مل کر رہ گیا۔
''بولو، منظور ہے؟'' میں نے کہا۔
''صائم بھائی! آپ بھی.....؟'' تصدق نے پھیکی سی ہنسی سے کہا۔
''مسخرہ پن کر رہے ہیں تم سے، کیوں؟'' میں نے آنکھیں نکال کر کہا۔
''کیا یہ حقیقت ہو سکتی ہے؟''
''تم اس کے لئے تیار ہو؟''
''مجھے اور کیا چاہئے؟'' تصدق نے کہا۔
''گویا تم تیار ہو؟''
''جی ہاں!''
''تب تمہیں نئی ملازمت مبارک ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم چلیں گے۔''
''کہاں؟''
''ہمارا شوروم تیار ہو رہا ہے، اس کا جائزہ لیں گے۔ کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ بس کل سے باقاعدہ کام شروع کر دو۔''
تصدق کی آنکھوں میں کشمکش کے آثار تھے۔ بہر حال وہ گردن ہلا کر چلا گیا اور ہم دونوں پُر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔
''کاروبار شروع کرنے کے بعد ہمیں یہاں سے رہائش بھی بدلنا ہوگی، آخر تنویر صاحب کے مہمان کب تک رہیں گے؟'' طالوت بولا۔

''ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''
''کچھ متردّد ہو؟'' طالوت مسکرایا۔
''نہیں۔''
''یاروں سے جھوٹ؟'' طالوت شرارت سے بولا۔
''نہیں طالوت! تم سے جھوٹ کیا بولوں گا؟ افشاں سے دُور ہونے کا دُکھ ہوگا۔''
''دن رات یہیں گزاریں گے یار! اور پھر اس میں بھی زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ ویسے بھی بالآخر افشاں سے شادی سے پہلے تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔''
''ہاں، ظاہر ہے۔''
''ویسے اپن خوش نصیب ہیں۔'' طالت ہنستے ہوئے بولا۔ ''اپنی راج ہنس ساتھ ہی لے جائیں گے اور اس کے بعد.....''
''تم تو ہر لحاظ سے ہی خوش نصیب ہو طالوت!''
''اور تم؟''
''ہاں، تمہارے نصیبوں کے کچھ جراثیم اپنے نصیب میں بھی داخل ہو چکے ہیں۔ اب کیا پروگرام ہے؟''
''بس تصدق آ جائے، چلتے ہیں۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تصدق تیار ہو کر آ گیا۔ اس کی نگاہوں میں اب بھی ایسے ہی تاثرات تھے، جیسے ہم ایک زوردار قہقہہ لگائیں گے اور بات ختم کر دیں گے۔ لیکن ہم نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے باہر نکل آئے۔ اور پھر خاموشی سے ہی ہم نے شوروم تک کا سفر کیا۔
عظیم الشان عمارت تھی۔ ابھی ہم نے فرم کے نام کا بورڈ نہیں لگایا تھا، لیکن عمارت پوری طرح مکمل ہو گئی تھی۔ عظیم الشان آئینے اور ان کے پیچھے ہاتھی دانت کے باریک کام کی دیواریں۔ ڈیکوریشن کی ایسی نایاب چیزیں تھیں کہ دیکھ کر آنکھیں کھل جائیں۔ پوری عمارت ایئرکنڈیشنڈ تھی۔ کام کرنے والوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ٹھیکیدار موجود تھا۔
''کیا کیفیت ہے؟''
''سارا کام مکمل ہے جناب! ابھی ابھی الیکٹریکل ڈیکوریشن والے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کام شروع کر دیں گے۔ صرف شیڈ فٹنگ رہ گئی ہے، وہ شام تک ہو جائے گی۔ میں نے پوری صفائی کرا دی ہے۔''
''آؤ!'' طالوت نے کہا اور ہم ٹھیکیدار کے ساتھ عمارت کے مختلف حصے دیکھنے لگے۔ کیا بات تھی اس عمارت کی۔ ڈائریکٹر کے لئے جو دفتر بنایا گیا تھا، اس میں فرنیچر تک آ گیا تھا۔ بلاشبہ طالوت نے ایسی عمارت بنا دی تھی کہ پورے شہر میں اس کا ثانی ناممکن تھا۔ تصدق کی تو خیر بات ہی کیا تھی، میں بھی ششدر تھا۔
''اس کے بعد جو تبدیلیاں تم پسند کرو۔'' طالوت نے کہا۔
''تبدیلیوں کی کیا گنجائش ہے طالوت!'' میں نے آہستہ سے کہا اور طالوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پھیل گئی۔

''تمہارے شایانِ شان ہے میرے دوست؟'' طالوت نے پیار سے پوچھا۔

''میں روپڑوں گا طالوت!'' میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

''ارے میری جان! تیرے لئے تو میں نہ جانے کیا جذبات رکھتا ہوں۔ یہ تو تیری جوتیوں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے۔ بس تجھے پسند آ گیا، میری محنت وصول ہو گئی۔''

''ٹھیک ہے ٹھیکیدار! تم اپنے حسابات بتاؤ، ہم یہاں موجود ہیں۔ ادائیگی کر کے چلیں گے۔'' طالوت نے کہا اور ہم پہلی بار اپنے شاندار آفس کی کرسیوں پر بیٹھے۔ طالوت نے خصوصی طور پر مجھے پروپرائیٹر کی کرسی پیش کی تھی۔ تصدق ابھی تک حواس میں نہیں آیا تھا۔

تب ہم نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا خیال ہے تصدق! تمہیں جہاں کوئی خامی نظر آئے تو بتاؤ۔''

''میں..... میں کیا عرض کروں جناب؟'' تصدق پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''تم اپنی ذمے داری سمجھ لو تصدق! فرم کے پہلے کارکن کی حیثیت تم ہی رکھتے ہو۔ تمہارے کندھوں پر پوری پوری ذمہ داری ہے۔''

''میں اتنی محنت کروں گا جناب! جو آپ کے تصور میں بھی نہیں ہو گی۔'' تصدق لرزتی آواز میں بولا۔

''انسان کی حیثیت سے جتنا کام کر سکتے ہو، کرو۔ ہمیں اسٹاف کی فہرست بنانا ہے۔ اور اس کے بعد تم اسٹاف بھرتی کرو گے۔''

''جی بہتر۔'' تصدق نے جواب دیا اور پھر اس کے چہرے پر کسی قدر ہچکچاہٹ پھیل گئی۔

''کیوں تصدق! کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی۔''

''کیا بات ہے؟''

''تنویر صاحب اس سلسلے میں اجازت دے دیں گے؟''

''تمہارے بارے میں؟''

''ہاں!''

''ان سے اجازت لے لی جائے گی۔ تم فکر مت کرو۔ کاروبار کی نوعیت سمجھ لو۔ فی الحال ہم دنیا کے بہت سے ممالک سے قالین درآمد کر رہے ہیں۔ لیکن بہت جلد ہم ماہرین کی نگرانی میں اپنے کارخانے لگوائیں گے۔ سامنے ہی شمشیر لمیٹڈ ہے۔ ہمارا مقابلہ اس سے ہے۔ ملک بھر کی کمپنیوں، تجارتی فرموں، بینکوں، سفارت خانوں اور ایسی تمام جگہوں پر ہمارے ڈیزائنوں کی کتابیں پہنچ جانی چاہئیں، جو قالین استعمال کرتی ہیں۔ قیمتیں کم سے کم رکھی جائیں اور ہر قیمت پر سپلائی قبول کر لی جائے۔ شمشیر لمیٹڈ کو بالکل ڈاؤن کرنا ہے۔ نقصان کی فکر نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ فرم کی پبلسٹی کے لئے ملک کی بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی سے رابطہ قائم کرو۔ پبلسٹی کے سارے ذرائع پر اخراجات کئے جائیں۔ تم میرا مقصد سمجھ گئے ہو تصدق؟ کہیں کوئی فیلڈ ایسی نہ چھوڑی جائے، جو اس کے لئے ضروری ہو۔ اور اخراجات کی کوئی پروا نہ کی جائے۔''

''آپ دیکھیں گے جناب! میں نہایت خوش اسلوبی سے یہ سارے کام انجام دوں گا۔'' تصدق نے

خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔
"بس ہم یہی چاہتے ہیں۔ کیا خیال ہے، چلا جائے؟"
"چلو!" طالوت نے کہا اور ہم لوگ عمارت سے نکل آئے۔ تصدق کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جو ہم کہہ رہے ہیں، وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔
"اس کے لئے ابھی بہت ساری چیزوں کی خریداری کرنا ہوگی۔ مثلاً تصدق کے لئے کار، اپنے لئے مکانات وغیرہ وغیرہ۔" راستے میں طالوت نے کہا۔
"میں دفتر کب سے آنا شروع کروں جناب؟" تصدق نے پوچھا۔
"بس تصدق! اب یہ سارے معاملات تمہارے ذمے ہیں۔ بہت جلد ہم افتتاح کریں گے۔ سارے کام جس قدر مکمل کر سکتے ہو، کر لو۔ کل تمہارے نام سے اکاؤنٹ کھل جائے گا، جہاں سے تم اخراجات پورے کر سکتے ہو۔"
"بہت بہتر جناب!" تصدق نے جواب دیا۔
"ویسے اس عمارت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"
"میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب! میں نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔"
"کوئی خامی ہو تصدق! تو تمہیں اسے درست کرنے کا اختیار ہے۔ اور ہاں، ابھی دوسرے لوگوں کو اس بارے میں تفصیلات نہیں معلوم ہونی چاہئیں۔"
"بہت بہتر۔"
تھوڑی دیر کے بعد ہم گھر واپس آ گئے۔ لنچ کا وقت ہو گیا۔ سب موجود تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں اور کوئی دلچسپ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لنچ پر افشاں، شکیلہ، جمشید اور سیمیں وغیرہ موجود تھے۔ بزرگ بھی تھے، اس لئے کسی قدر سنجیدگی برقرار رہی۔ ویسے جمشید کی بے تکی باتیں اور بے تکی حرکتیں بدستور جاری تھیں جس کی وجہ سے مسکراہٹیں جاگتی رہیں۔ لیکن بڑی اماں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔
لنچ کے بعد سب باہر نکل آئے اور سب ہی ایک جگہ جمع ہو گئے۔
"کہئے حضرات! کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے؟" احسان نے کہا۔
"ہاں احسان بھائی!" افشاں نے کہا۔
"کیا بات ہے؟"
"یوں لگتا ہے، جیسے ذہن سنسان ہو گئے ہوں۔ معمولات میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہے۔"
"ہونی چاہئے..... ہونی چاہئے۔" احسان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"لیکن کیا؟" افشاں بولی۔
"یہ فیصلہ سب کریں گے۔"
"میں نے مسئلہ پیش کر دیا ہے۔ اب فیصلہ کیا جائے۔"
"کوئی پکنک ہو جائے۔" شکیلہ بولی۔
"بالکل!" طالوت نے تائید کی۔

''اس کی نہیں ہو رہی عادل بھائی! دوسرے بھی ہیں۔'' افشاں شرارت سے بولی۔
''ارے ہاں صائم بھیا!..... جلدی سے کوئی تجویز پیش کرو۔'' طالوت نے برجستہ کہا اور سب ہنس پڑے۔ افشاں نے جھینپنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال، خاصی گرما گرم بحث کے بعد ایک پکنک طے ہو گئی، جس کے لئے تیسرا دن مقرر کیا گیا تھا۔ آج رات جمشید کے گٹار کا پروگرام رکھا گیا تھا۔
اور پھر سب دوپہر کے آرام کے لئے اپنے کمروں میں چل پڑے۔ ٹھنڈا کمرہ بے حد پُرسکون تھا۔ میں اور طالوت لباس تبدیل کر کے لیٹ گئے۔ دونوں ہی خاموش تھے، اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ لیکن دفعتہً خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ دروازے پر گٹار کی ٹزنگ ٹزنگ سنائی دی تھی۔
''خدا خیر کرے۔'' طالوت دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔
''میں حاضر ہو سکتا ہوں؟'' آواز جمشید کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھول دیا۔
''اوہ، ڈیئر جمشید! شاید تم غلط آ گئے۔'' میں نے کہا۔
''غلط؟'' جمشید نے پہلے زمین اور پھر چھت کی طرف دیکھا۔
''ہاں، کہاں جانا چاہتے تھے؟''
''یہاں!'' جمشید نے میرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
''اوہ! خوش آمدید..... خوش آمدید۔ تشریف لایئے۔'' میں پیچھے ہٹ گیا اور جمشید مع گٹار کے اندر تشریف لے آئے۔
طالوت اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
''سبحان اللہ!..... وہ آئیں ہمارے کمرے میں، خدا کی قدرت۔ کبھی ہم ان کو اور کبھی ان کے گٹار کو دیکھتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
''اوہ، ہاں..... مم..... میں نے سوچا، اکیلا کیا جاؤں۔'' جمشید نے انکساری سے کہا۔
''بڑا اچھا کیا، دونوں آ گئے۔ تشریف رکھئے۔'' طالوت نے اشارہ کیا اور جمشید ہونقوں کی طرح ایک کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے بڑے احترام سے اپنا گٹار کرسی پر رکھ دیا اور خود اس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔
''اوہو..... آپ بھی تشریف رکھئے۔''
''ایں..... اوہ، اچھا..... شوکریہ، شوکریہ!'' وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ہی دلچسپی سے اس کی شکل دیکھ رہے تھے اور جمشید ہماری۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ اپنی آمد کی وجہ بھول گیا ہو۔ کسی طور وہ کوئی چالاک شخص نہیں نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے بس خبط الحواس ہو۔
''اور سنایئے مسٹر جمشید! آپ تو طویل عرصے کے بعد امریکہ سے وطن آئے ہیں۔''
''ہاں۔ بہت طویل عرصے کے بعد۔'' جمشید نے کہا۔
''جب آپ یہاں سے گئے ہوں گے تو چھوٹے سے ہوں گے؟''
''ہی ہی، بہت چھوٹے..... بہت چھوٹے۔'' جمشید نے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔
''خیر اتنے چھوٹے بھی نہیں۔ کچھ بڑا کریں۔'' طالوت نے کہا اور جمشید کا ہاتھ کچھ اوپر اُٹھ گیا۔

''اتنا ٹھیک ہائے؟''
''تھوڑا سا اور۔'' طالوت بولا اور جمشید نے برا سامنہ بنا کر تھوڑا سا ہاتھ اور اوپر اُٹھالیا۔
''جمشید ڈیئر!'' طالوت بڑے پیار سے بولا۔
''بس!''
''تھوڑے سے اور بڑے نہیں ہو سکتے؟''
''آئی ایم سوری۔'' جمشید نے ذرا سا ہاتھ اور اوپر اٹھالیا اور بولا۔''بس مسٹر! اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہائے۔''
''چلے گا؟'' طالوت نے رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا اور مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔''چلئے ٹھیک ہے مسٹر جمشید! آپ کو اتنا بڑا تسلیم کر لیا گیا۔'' طالوت نے مطمئن ہو کر گردن ہلا دی۔
''شوکریہ، شوکریہ!'' جمشید نے خوش ہو کر کہا۔
''یوں کہئے آپ نے امریکہ میں ہوش سنبھالا؟''
''ایک دم.....ایک دم!''
''وہاں کی زندگی تو بڑی رنگین ہوگی؟'' طالوت بولا۔
''اوہ! ہنڈریڈ پرسنٹ کلرفل لائف۔ ادھر لو کلر ڈریس پہنتا ہائے۔ پورا کنٹری میں کلرڈ مکان ہائے۔ اور رات کو چاروں طرف رنگین روشنیاں بکھر جاتا ہائے۔'' جمشید نے پُر جوش لہجے میں کہا۔
''اس کے علاوہ؟''
''علاوہ؟.....علاوہ ادھر بالکل نہیں ہوتا۔'' جمشید نے کہا۔
''آپ نے اُردو کہاں سیکھی؟'' میں نے کہا۔
''اپنا گھر میں۔ ممی ہمیشہ اُردو بولتا۔ ہمیں اپنا مدر لینگوئج بہت اچھا لگتا ہائے۔''
''اور آپ کے والد؟''
''اوہ..... مسٹر شیڈوب ہمیشہ انگلش بولتا۔ گھر میں ممی کے سامنے وہ اُردو بولتا، تب بھی انگلش میں۔ ہم تو بہت اچھا اُردو بولتا ہے۔ اتنا اچھا مسٹر شیڈوب بھی نہیں بولتا۔''
''وہاں تو آپ کی لڑکیوں سے بھی دوستی ہوگی؟'' طالوت نے پوچھ لیا اور جمشید کی حالت غیر ہوگئی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں شرم کے آثار اُبھر آئے۔ اور پھر اس نے نگاہیں نیچی کئے کئے گردن نفی میں ہلا دی۔
''کیا مطلب؟.....امریکہ جیسے ملک میں آپ کی لڑکیوں سے دوستی نہیں تھی؟''
''اُدھر لڑکی لوگ بہوت کھراب ہوتا ہائے۔ لڑکا لوگ کو اپنی کار میں گھسیٹ کر لے جاتا ہائے۔ ممی بولتا، ہم لوگ مشرقی ہائے۔ اور مشرق، شرم و حیا کا گہوارہ ہائے۔ ہمیں اپنا کلچر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ میں نے کسی لڑکی سے اُدھر دوستی نہیں کیا مسٹر!..... ممی کو کبھی شکایت نہیں ہوا۔''
''کمال ہے..... واقعی کمال ہے۔ کبھی نشہ کیا آپ نے؟''
''ہاں۔ جدھر ہم نے گٹار سیکھا، اُدھر لوگ چرس پیتا، افیون پیتا، بھنگ کھاتا، گانجا پیتا اور ایسا ہی دوسرا چیز۔ ہم نے بھی ٹیسٹ کیا۔ مگر ممی بولا یہ ٹھیک نہیں، تب ہم چھوڑ دیا۔''

"ونڈرفل! اگر تم سچ بول رہے ہو میری جان! تو پسند آنے لگے ہو۔" طالوت نے کہا۔ جمشید شاید اس کے الفاظ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ کسی فکر میں مبتلا تھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے مسٹر صائم؟" طالوت نے مجھ سے پوچھا۔

"شاید!" میں نے گردن ہلا دی۔

"ہم تمہاری کیا خدمت کر سکتے ہیں جمشید؟" طالوت نے پوچھا۔

"آپ لوگ..... آپ لوگ..... بس میرے کو اچھا لگتا ہے۔ اُدھر میرے کئی دوست تھے، اِدھر کوئی نہیں ہے۔ میرا ایک پرابلم ہے مگر میں اِدھر کیسے بولوں؟" جمشید نے کہا۔

"اوہ! ہمیں بتاؤ، ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔" طالوت بولا۔

"سچ بولتا ہائے؟" جمشید خوش ہو کر بولا۔

"بالکل سچ۔ بتاؤ، کیا پرابلم ہائے؟"

"میں تمہارے کو اپنا ہارٹ کا بات بتائیں گا۔ پلیز تم ہمارا ہیلپ کرو۔"

"ضرور، ضرور۔ بتاؤ۔"

"مسٹر شیڈوب..... آئی مین مائی فادر، ایک دم جیوٹ ہے۔ پکا والا جیوٹ۔ ادھر امریکہ میں رہ کر بھی وہ رسی والا چار پائی پر سوتا ہائے۔ گھر کا فرنیچر ہمیشہ پرانا خریدتا ہائے۔ اُس کا بس نہیں چلتا، ورنہ وہ کھانے کا واسطے بھی ہوٹلوں کا بچا ہوا کھانا اُٹھا لائے۔ وہ بہت لالچی ہائے۔"

"اوہ!" طالوت نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"ادھر امریکہ میں بھی ہمارے ملک کا لوگ ہائے۔ مگر ان کا فادر سے دوستی نہیں ہائے۔ وہ لوگ بھی اسے جیوٹ بولتا۔ اور پھر ہمارا ممی بولا، ہم ینگ ہو گیا ہائے، ہمارا شادی بناؤ۔ بٹ اُدھر کا لوگ مسٹر شیڈوب کو اچھی طرح جانتا۔ ممی امریکن لڑکی لوگ سے شادی نہیں مانگتا۔ تب مسٹر شیڈوب ہمارے کو بولا کہ اپنا ملک جاؤ۔ ادھر ہمارا آنٹی ہائے، انکل ہائے اور ان کا لڑکی ہائے۔ اس کو "لو" بناؤ اور اگر وہ ہمارے کو "لو" نہیں کرے تو دوسرا کسی لڑکی سے لو بناؤ۔ میرج کرو اور بہت سا دولت لے کر ادھر آ جاؤ۔ ٹھیک ہائے۔"

"اوہ..... تم اس لئے آئے ہو جمشید؟"

"ہاں مسٹر! آپ صائم..... آپ عادل؟" اس نے ہم دونوں سے کہا۔

"ہوں۔" طالوت نے گردن ہلائی۔ "پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں نے کبھی لو نہیں بنایا مسٹر! میرا سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟"

"تم لڑکی کی آنٹی سے عشق کرنا چاہتے ہو؟"

"اوہ! شوکریہ، شوکریہ۔ میرے کو عشک نہیں آ رہا تھا۔ بالکل ٹھیک، مگر مسٹر صائم! ادھر تو کئی لڑکی لوگ ہے۔ میں کس سے عشک بناؤں؟"

"تمہیں کوئی پسند نہیں آئی؟"

"نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں۔ ادھر تو سب پسند ہائے۔"

"ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔"

”مگر کس کا؟“
”یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا چاہئے۔“
”دیکھو مسٹر! ہم کمرشل عشک کرے گا۔ ہمارا پرسنل بات نہیں ہے۔ پلیز! تم ہمارے کو گائیڈ کرو۔“
”ابے، یعنی یہ مشورہ بھی ہم ہی دیں کہ تم کس سے عشق کرو؟“
”پلیز، میرا ہیلپ کرو۔“ جمشید گڑگڑایا۔
”ہوں۔“ طالوت نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر جمشید سے بولا۔ ”یہ شخص چاہتا ہے، اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ تمہارے والد صاحب نے قید تو نہیں لگائی کہ جس سے انہوں نے کہا، اسی سے عشق اور شادی کرو؟“
”ایں..... ایسا بات تو نہیں بولا۔“ جمشید نے کہا۔
”تب پیارے جمشید! میں تمہیں ایک کام کی بات بتاؤں گا۔“
”اوہ! ایک دم شوکریہ۔“ جمشید خوش ہو کر بولا۔
”سیمیں کو دیکھا ہے؟“
”شی می..... ہاں، شی می۔“
”کیسی ہے؟“
”ایک دم بیوٹی فل۔“
”جانتے ہو، اس کا باپ کون ہے؟“
”ہاں، انکل جلال۔“ جمشید نے جواب دیا۔
”خوب!..... کافی سمجھ دار ہو۔ نواب جلال الدین، تنویر صاحب سے کہیں زیادہ مالدار ہیں۔ اگر تم سیمیں پر ٹرائی کرو تو کیا حرج ہے؟“ طالوت نے کہا۔
”شی ی!“ جمشید نے جیسے منہ میں مٹھاس محسوس کی۔ میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً جمشید کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ سیمیں، احسان کی بیوی ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی شادی شدہ نہیں لگتا تھا۔
”کیا خیال ہے پھر؟“
”وہ بھی کافی خوب صورت ہے۔ لیکن یہ دونوں ایک شکل کا لڑکی.....“
”دو ہیں نا۔ یہ مصیبت ہے۔“ طالوت بولا۔
”ہاں، مگر ممی بولا، تنویر انکل کا ایک لڑکی ہے۔“
”پہلے ایک تھی، اب دو ہو گئیں۔“
”اوکے۔ میں تمہارے مشورے پر عمل کریں گا۔“
”آج ہی سے۔“ طالوت نے کہا۔
”تھینک یُو ویری مچ..... تھینک یُو ویری مچ۔“ جمشید نے گٹار اُٹھا لیا۔ اور پھر وہ واپسی کے لئے مڑا۔ ہم دونوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ باہر نکل گیا۔
”کمال ہے یار! جمشید واقعی اونچی چیز ہے۔“

''واقعی بوم ہے۔ مگر یار! مزہ آ گیا۔''
''لیکن تم نے غریب سیمیں کو مصیبت میں کیوں پھنسا دیا؟''
''اوہ عارف! فکر مت کرو۔ تفریح عمدہ رہے گی۔ یہ سیمیں صاحبہ ہم لوگوں سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھیں، اب خود بھی تو کسی جال میں پھنسیں۔'' طالوت نے ہنستے ہوئے کہا اور میں بھی ہنسنے لگا۔
پھر ہم دونوں کسی تفریح کی تلاش میں باہر نکل آئے لیکن سب لوگ اس وقت اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ اس لئے شاید جمشید کی دال بھی نہیں گل سکی تھی اور فی الحال اس نے اپنے کمرے میں ہی چلے جانا مناسب سمجھا تھا۔ ہم بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔
لیکن شام قہقہہ انگیز تھی۔ جمشید مکمل طور پر عاشقانہ موڈ میں تھا۔ اس وقت لباس بھی اُس نے قیامت کا پہنا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی جیکٹ، جس پر ایک انتہائی نفیس مخصوص انداز کی شال پڑی ہوئی تھی۔ سفید فرنچ اسٹائل پینٹ اور گہرے نیلے رنگ کا میکسیکو کے باشندوں کا سا چوڑا ہیٹ، جس کی سفید ڈوریاں گردن میں بندھی ہوئی تھیں۔ عمدہ شکل وصورت کا انسان تھا۔ خاصا متناسب تن وتوش تھا۔ اگر چہرے پر حماقت نہ ہوتی اور حلیہ خراب نہ کیا ہوتا تو خاصا دلکش نوجوان تھا۔ اس وقت وہ واقعی جچ رہا تھا۔ لیکن دوسرے لوگ اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔
''لو بھئی۔'' طالوت نے میرا شانہ دبایا۔ ''مردِ میدان تو تیار ہو کر آیا ہے۔''
میں نے بھی جمشید کو دیکھا اور میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔
''گٹار ساتھ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''بچہ ذہین ہوتا جا رہا ہے۔''
ہم سب لان پر جمع تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سب ہی عمدہ لباس میں تھے۔ نواب جلال الدین، تنویر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔
پھر ہمارے علاوہ دوسروں نے بھی جمشید کو دیکھ لیا اور سب ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور جمشید حسبِ معمول تھرکتا ہوا لان پر پہنچ گیا۔
''ہیلو جم!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔
''ہیلو!'' اس نے خالص امریکن اسٹائل میں کہا اور ٹوسٹ کے انداز میں تھرکتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ پھر اس نے سیمیں کو دیکھا اور ہیٹ سر سے اونچا کر کے گردن جھکا دی۔
''بہت اسمارٹ لگ رہے ہو جم!''
''ہاؤ۔ تھینک یُو..... تھینک یُو۔ آپ کا کیا خیال ہے، مِس شی می؟''
''اللہ.....!'' سیمیں سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
''میں آپ کی رائے سننا چاہتا ہوں۔'' جمشید نے کہا۔
''بہت پیارے لگ رہے ہیں جمشید صاحب!'' سیمیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''یو.... ہا.....'' جمشید نے حلق سے آواز نکالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ ''تھینک یُو۔'' اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے عقب میں کھڑے تنویر صاحب تشویش ناک آواز میں نواب جلال الدین سے کہہ رہے تھے۔

''اس شخص کی وجہ سے میں تھوڑی سی اُلجھن میں پڑ گیا ہوں۔''

''کیوں؟'' نواب جلال الدین نے کہا۔

''یوں تو اس کا وجود ہی قابلِ نفرت ہے۔ امریکی معاشرہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ وہاں کے نوجوان نیم دیوانے ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس معاشرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جبکہ ہماری نسل کے لوگ ان کے معاشرے کو اپنا کر سخت گھناؤنے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے ذہن تنگ ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ سطحی ہوتی ہے۔ وہ گہرائیوں میں تو جا نہیں سکتے اور سطحیت جس قدر تکلیف دہ ہو سکتی ہے، اس کی مثال یہ شخص موجود ہے۔''

''لیکن تنویر! اس کی حیثیت .....''

''اسی وجہ سے خاموش ہوں۔ اسی وجہ سے تو اسے گھر میں جگہ دے رکھی ہے۔ دراصل بیگم کے دوسرے عزیز بھی یہاں نہیں ہیں۔ شاداب نے زندگی میں کبھی کوئی خاص رابطہ نہیں رکھا لیکن اس کے باوجود ان کی بہن انہیں بری طرح چاہتی ہیں اور یہ صاحبزادے، میں نے محسوس کیا ہے جلال بھائی! کہ بیگم اس کے حلیے اور انداز سے خوش نہیں ہیں۔ لیکن خون ہے۔ کر بھی کیا سکتی ہیں؟ اور میں صرف ان کے جذبات کا احترام کرتا ہوں، ورنہ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔''

''اوہ، تنویر! احساس نہ ہونے دینا۔ یوں بھی وہ کون سے طویل عرصہ کے لئے آیا ہے، واپس چلا جائے گا۔ بھگتیں گے تو اس کے والدین، ہمیں کیا۔'' نواب جلال الدین بولیں۔

''ٹھیک ہے۔'' تنویر صاحب گہری سانس لے کر بولے۔

میں اور طالوت ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ دوسری طرف جمشید عشق کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ہماری نگاہ اور کان اس کی طرف بھی تھے اور ہم اس کی لن ترانیاں سن رہے تھے۔

''امریکہ میں لڑکی لوگ آرٹسٹ پر جان دیتا۔ بہت لائیک کرتا وہ لوگ۔ صحیح ریسپیکٹ ملتا ہے اُدھر آرٹسٹ کو۔ اِدھر آرٹسٹ کا کیا پوزیشن ہائے؟''

''تمہارا مطلب ہے، تمہارے جیسے آرٹسٹ کی؟'' احسان نے پوچھا۔

''یس، یس......''

''ان سب کے لئے ایک مناسب عمارت تجویز کر دی گئی ہے، جو کانجی ہاؤس کہلاتی ہے۔'' احسان نے جواب دیا۔

''کان.....جی..... ہاؤس.....ویری گڈ! اُدھر سارا آرٹسٹ ہوتا ہے؟''

''آرٹسٹوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔''

''اوہ! تب پلیز، میرے کو اُدھر کا پتہ بتاؤ۔ میں اُدھر ضرور جاؤں گا۔''

''پتہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی مسٹر جمشید! آپ کسی بھی سڑک پر جا کر گٹار بجانا شروع کر دیں، لوگ خود آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔'' احسان نے جواب دیا اور سب ہنس پڑے۔

''ونڈر فل.....ونڈر فل.....سچ مچ ادھر کا ماحول بہت اچھا ہے۔''

چائے لگ گئی اور سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جمشید کی نگاہ خاص سیمیں پر تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد نوجوانوں میں اسے محسوس کر لیا گیا تھا۔ لیکن سیمیں اب پہلے جیسی سیدھی سادی لڑکی نہیں تھی۔ اب وہ ا

جہاندیدہ اور شادی شدہ عورت تھی۔ اس بات کو محسوس کرنے کے باوجود وہ گھبرائی نہیں تھی۔

پھر چائے کے بعد سب اُٹھ گئے اور پھر اُس گدھے نے براہِ راست پیش کش کر دی۔

''مس شی می! براہِ کرم کیا آپ میرے ساتھ آئیں گا؟''

''کیا مطلب؟'' سیمیں حیرت سے بولی۔

''میرے کو آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہائے۔''

سیمیں نے احسان کی طرف دیکھا اور احسان نے اسے آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ سیمیں نے گردن جھکا دی اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''کہاں چلوں جمشید صاحب؟''

''اوہ!..... باغ کا پچھلا حصہ ٹھیک ہائے۔''

''چلئے۔'' سیمیں نے کہا اور جمشید نے اسے ایک بازو کی پیشکش کی۔ لیکن سیمیں ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اور پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

''یہ اچانک اسے کیا ہو گیا؟'' احسان نے کہا۔

''اللہ سیمیں باجی پر رحم کرے۔'' شکیلہ نے کہا۔

''مگر ہوا کیا ہے؟''

''تم نے سیمیں کو اشارہ کیا تھا نا؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں نے کہا تھا، دیکھئے تو سہی، کیا ہوا ہے اس امریکن بکرے کو'' احسان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے تو آؤ، ہم بھی دیکھیں گے۔'' طالوت بولا اور ہم سب ایک دوسرے راستے سے ان دونوں سے پہلے عقبی باغ میں پہنچ گئے۔

سیمیں اور جمشید، باغ میں داخل ہو رہے تھے۔ اور پھر جمشید نے ایک جگہ منتخب کر لی۔ ہم سب لوگ بھی اسی طرف کھسکنے لگے تھے۔ اور پھر ہم سب نہایت خاموشی سے ان دونوں کی پشت پر پہنچ گئے۔

''جی فرمایئے جمشید صاحب؟'' سیمیں نے کہا۔

''اوہ، مِش شی می! کیا بولے۔ آئی مین ہم کیا بولے۔ پلیز تم خود سمجھو..... سمجھنے کا کوشش کرو۔''

''لیکن کیا سمجھوں جمشید صاحب؟''

''ہم اس ڈریس میں اسمارٹ لگتا؟''

''جی ہاں۔''

''تب ہم پورا لائف یہی ڈریس پہنے گا۔ بائی گاڈ! ہم ہول لائف......''

''کیڑے پڑ جائیں گے اس لباس میں اور آپ کے بدن میں بھی۔'' سیمیں نے جواب دیا اور ہم نے بمشکل ہنسی روکی۔

''اوہ..... تب چینج کرے گا، سوری۔''

''ہاں، یہی مناسب ہے۔ اور کچھ؟'' سیمیں نے کہا۔

''مس شی می! آپ کو بھی ہم سے لو ہو گیا ہائے؟''

''جی؟'' سیمیں نے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

''یُو سی..... آئی مین، تم ہم سے میرج کرے گا؟..... اوہ مائی گاڈ! تمہارے ساتھ لائف کتنا بیوٹی فل

گزریں گا۔'' جمشید نے آنکھیں بند کر کے کہا۔
''تو آپ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں؟'' سیمیں نے گردن ہلائی۔
''ایک دم.....ایک دم۔'' جمشید اُچھل کر بولا۔
''اور آپ مجھ سے شادی کریں گے؟''
''شیور.....آف کورس!''
''لیکن میں تو شادی شدہ ہوں۔'' سیمیں نے کہا۔
''ایں.....کیا مطلب؟.....یُو مین میریڈ؟''
''آپ کو نہیں معلوم؟''
''تمہارا ہزبینڈ کدھر ہائے؟ ہم اس کو نہیں دیکھا۔''
''احسان صاحب کیا آپ کے شوہر ہیں؟'' سیمیں نے کہا اور اس بار واقعی ہنسی روکنا سب سے مشکل ثابت ہوا تھا۔ جمشید منہ پھاڑے سیمیں کو دیکھتا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور بے یقینی، پھر غم......اور تھوڑی دیر کے بعد ان سے عزم جھانکنے لگا تھا۔
سیمیں بھی اس کی کیفیات سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ غور سے جمشید کو دیکھ رہی تھی۔ تب جمشید نے بائیں پاؤں سے تھرکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں شی می! جب ہم دونوں ایک دوسرے کو لو کرتا تو ان باتوں کا کیا اہمیت ہائے۔ تم اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں تم سے شادی کر لیں گا۔''
سیمیں کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے سخت غصے کے آثار نظر آئے لیکن نہ جانے کس طرح اس نے برداشت کیا اور پھر لہجے کو پُرسکون بنا کر بولی۔
''میں آپ کی بات مان سکتی ہوں، مسٹر جمشید! لیکن آپ کو مختلف مراحل میں میری تین شرطیں پوری کرنا ہوں گی۔''
''اوہ، شرطیں۔ شہزادیوں کی طرح۔ ونڈرفل!.....میں نے مشرقی شہزادیوں کی کہانیاں پڑھی ہیں۔''
''یہی سمجھ لیں۔''
''میں تیار ہوں۔'' جمشید نے کہا۔
''تب آپ یہاں اسی جگہ ایک گھنٹے تک اُلٹے کھڑے رہیں۔ کوئی آپ سے کچھ بھی کہے، آپ سیدھے نہ ہوں۔ یہ میری پہلی شرط ہے۔ اگر آپ ایک گھنٹے سے پہلے سیدھے ہوئے تو.....''
''اوہ.....تو مس شی می! میں وعدہ کرتا ہوں، ایک گھنٹے سے پہلے سیدھا نہیں ہوں گا۔'' جمشید نے کہا اور پھر وہ اُلٹا کھڑا ہو گیا۔ تب سیمیں جھک کر بولی۔
''اسی طرح کھڑے رہو جم! میں ابھی آئی۔''
''او کے، او کے.....تم بالکل فکر مت کرو۔'' جمشید نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا اور سیمیں وہاں سے چل پڑی۔ جونہی وہ باغ کے احاطے سے نکلی، ہم لوگوں نے اُسے گھیر لیا۔ احسان بھی ہنس رہا تھا۔ لیکن سیمیں کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
''ارے سیمیں! یہ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' طالوت نے کہا۔
''تو آپ لوگ سن رہے تھے؟''

''ناراض ہو؟''
''کیا میری توہین نہیں ہوئی ہے؟'' سیمیں نے سنجیدگی سے کہا۔
''کیا بے وقوفی ہے سیمیں! ایک اچھی خاصی تفریح پر سنجیدہ ہو رہی ہو۔ یعنی جو کچھ کر کے آئی ہو، اس کی تردید کر رہی ہو۔''
''کاش..... کاش میں اسے کوئی بڑی سزا دے سکتی۔ مجھے معاف کرنا افشاں!''
''دیکھیے محترمہ سیمین باجی! اگر آپ نے میرا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ میری جانب سے اس گدھے کو درخت سے اُلٹا لٹکا دیں۔ جذباتی ہوں گی ان کے معاملے میں تو صرف امی۔ مجھے گدھوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خواہ وہ کوئی ہو۔'' افشاں نے کہا۔
''سیمیں! پلیز، سنجیدہ نہ ہو۔ تم کیوں حمایت کر رہی ہو؟ اب دوسری اور تیسری شرط تم ہمارے مشورے سے پیش کرو گی۔'' بہر حال بڑی مشکل سے سیمیں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آسکی۔
''حضرات! اگر آپ اجازت دیں تو ایک مزاحیہ پروگرام میں پیش کروں؟'' طالوت نے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''اس تفریح میں تھوڑا سا اضافہ۔''
''ضرور عادل بھائی۔'' افشاں نے کہا۔
''تب آپ لوگ خاموشی سے انتظار فرمائیے۔ ہم ابھی حاضر ہوئے۔'' طالوت نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر بولا۔ ''آؤ صائم!'' اور ہم دونوں چل پڑے۔
''کیا سوجھی؟'' میں نے راستے میں کہا۔
''یار جمشید معصوم ضرور ہے لیکن تھوڑی سی تفریح میں کیا حرج ہے۔''
''ارے مارا جائے گا بے چارہ۔'' میں نے ہمدردی سے کہا۔
''نہیں۔ کوئی زیادہ خطرناک بات نہیں ہے۔ آؤ یار! برداشت نہیں ہو رہا۔'' طالوت نے کہا۔
''مگر ارادہ کیا ہے؟''
''بوا کو چڑھائیں گے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''جمشید کے خلاف؟''
''ہاں۔''
''یار! مگر بوا خطرناک خاتون ہیں۔''
''اُفوہ! اب زیادہ گڑبڑ مت کرو۔ اُنہیں تلاش کیا جائے۔''
اور پھر ایک دو ملازموں کے پوچھنے سے بوا کا پتہ چل گیا اور ہم دونوں پریشان سی شکلیں بنا کر بوا کے قریب پہنچ گئے۔ ہم نے ایسا انداز اختیار کر لیا تھا، جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں ہے اور ان کے قریب سے گزرنے لگے۔ تب طالوت نے کہا۔
''بوا بے حد نیک دل خاتون ہیں۔''
''یقیناً۔'' میں نے کہا۔
''کیا انہیں یہ بات نہ بتائی جائے؟''

''بتانا تو چاہئے لیکن کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔''
''اوہ!..... بوا اگر اُس ریچھ کے چنگل میں پھنس گئیں، تب بھی تو ہمیں دُکھ ہوگا۔''
''یہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ہم نے محسوس کیا تھا کہ بوا نے بخوبی ہماری گفتگو سنی ہے اور پھر دوسرے لمحے عقب سے بوا کی آواز سنائی دی۔
''صائم میاں!.....اے عادل میاں!'' اور ہم دونوں ایسے ٹھٹکے جیسے اب تک بوا کو دیکھا ہی نہ ہو۔
''ارے بوا.....!'' طالوت نے کہا۔
''اے لو...... میں تو تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، تمہیں پتہ بھی نہیں چلا۔'' بوا بولیں۔
''اتفاق سے اس وقت ہم آپ کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔''
''میں نے سنی ہیں میاں! مگر سمجھ میں نہیں آئیں۔''
''ہم تو بڑی اُلجھن میں پڑ گئے ہیں بوا!''
''کیا ہوا میاں؟''
''بتا دوں صائم؟'' طالوت نے پوچھا۔
''بتا دو۔''
''ہاں۔ بوا سے چھپانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ آخر ہمارے ان سے اتنے گہرے تعلقات ہیں۔ وہ ہمیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتی ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
''اے جلدی بتاؤ میرے بچو!..... مجھے ہول چڑھ رہا ہے۔''
''میری سمجھ میں نہیں آتا بوا! آخر یہ سب کم بخت آپ کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہیں۔''
''اے کون میاں؟''
''تصدق نے بھی آپ کے ساتھ ہی بدتمیزی کی تھی اور اب یہ.....''
''اب کون؟'' بوا نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔
''اُفوہ بوا! آپ نے کچھ نہ کیا تو کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔''
''اے بتاؤ تو سہی، کیا کروں؟..... کیا ہو گیا ہے؟''
''جمشید۔'' طالوت بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔
''کیا ہوا اُس مٹے میراثی کو؟'' بڑی بی نے پوچھا۔
''ایک ایک کے سامنے آپ کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔ ہائے عشق، وائے عشق کے نعرے لگا رہا ہے۔''
''عشق؟''
''ہاں۔''
''مگر کس سے؟''
''آپ سے بوا!..... اس نے تو صبح سے اودھم مچا رکھا ہے۔ کہتا ہے، رات کو آپ کو خواب میں دیکھا تھا، اس وقت سے عاشق ہو گیا۔ سب نے سمجھایا مگر نہیں مانتا۔ اور اس وقت تو اس نے غضب ہی ڈھا رکھا ہے۔''
''کیا؟'' بوا پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔

''کہتا ہے، کسی بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے ایک وظیفہ بتایا ہے معشوق کو قبضے میں کرنے کا۔ اب وہ باغ میں اُلٹا کھڑا وظیفہ پڑھ رہا ہے اور کہتا ہے، رات تک بوا اُس کے قدموں میں آ گریں گی۔''

''ارے میرے مولا!'' بوا گھبرا کر بولیں۔

''اگر آپ نے اس کا وظیفہ ختم نہ کرایا تو آپ اُس کے چنگل میں پھنس ہی جائیں گی۔ یہ بہت برا ہو گا بوا!..... براہِ کرم کچھ کریں۔''

''وہ باغ میں وظیفہ پڑھ رہا ہے؟''

''وہ بھی اُلٹا کھڑا ہو کر۔'' طالوت نے ٹکڑا لگایا۔

''ہائے مالک!..... میں کیا کروں؟'' بڑی بی پریشانی سے بولیں۔

''دماغ درست کر دیں اس کا۔ اچھی طرح دماغ درست کر دیں، تاکہ آئندہ کسی شریف عورت کو بدنام نہ کرے۔''

''ارے مگر وہ تو غنڈہ ہے موا..... چاقو نکال لیتا ہے۔''

''آپ بھی بہت سیدھی ہیں بوا!..... ارے وہ تو کھلونے کا چاقو تھا۔ آپ نے غور ہی نہیں کیا۔ ورنہ وہ تو بڑا بزدل انسان ہے، مکھی تک نہیں مار سکتا۔ ہونہہ، بوا سے عشق کرے گا۔'' طالوت نے کہا اور نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ بوا شیر ہو گئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

''مگر وہ تو..... وہ تو بڑی بی بی کا بھتیجا ہے۔''

''کوئی بھی ہو بوا! آخر عزت سب کی ہوتی ہے۔''

''جھاڑو پھرے اس کے منہ پر۔ ابھی بتاتی ہوں، مال زادے کو۔'' بوا بالآخر تیار ہو گئیں اور تیزی سے بیرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں اور ان کے باہر نکلتے ہی ہم دونوں بھاگے اور بوا سے پہلے بقیہ لوگوں کے پاس پہنچ گئے، جو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر سب مسکرانے لگے۔

''مورچے سنبھال لیں حضرات جلدی۔ بھائی کس پوزیشن میں ہیں؟'' طالوت نے پوچھا۔

''بے چارہ اسی طرح کھڑا ہے۔'' شکیلہ نے کہا۔

''جی؟'' میں نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔ ''اچھا۔''

''ارے ارے، کیا ہوا صائم بھائی؟'' شکیلہ گھبرا کر بولی۔

''وہ بے چارہ ہے۔ ہمدردی محسوس ہو رہی ہے اس سے۔'' میں نے کہا۔

''تو اور کیا۔ کسی سیدھے سادے انسان کو مصیبت میں پھنسانے سے کیا فائدہ؟'' شکیلہ نے کہا۔ اسی وقت بوا باغ میں داخل ہو گئیں۔ طالوت کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ جمشید صاحب اُلٹے کھڑے تھے اور بوا عزت خطرے میں دیکھ کر سب کچھ بھول گئیں۔ اُتاری پاؤں سے جوتی اور جمشید کے پاس پہنچ گئیں۔

''سیدھا ہو...... میں کہتی ہوں سیدھا کھڑا ہو جا۔ ورنہ جوتیاں مار مار کر دماغ ٹھیک کر دوں گی۔''

''اوہ بوا..... میڈم بوا! پلیز آپ واپس چلا جاؤ۔ میں ضروری کام کرتا ہائے۔'' جمشید نے کہا۔

''ارے میاں باوا کے لئے کرنا یہ ضروری کام۔ سیدھا ہو...... ہو سیدھا۔'' بوا نے سچ مچ ایک جوتی، جمشید کی کمر میں جڑ دی۔

''توبہ عادل بھائی! آپ بڑے ستم ظریف ہیں۔ اب میں سمجھ گئی۔'' افشاں نے کہا۔
''کیا؟'' طالوت نے پوچھا۔
''تصدق کی پٹائی بھی آپ نے ہی کرائی ہوگی۔'' افشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ارے توبہ توبہ!'' طالوت نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف کی سچویشن بہت عمدہ تھی۔ بوا، جمشید کو سیدھا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور جمشید چیخ چلا رہا تھا مگر سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔ بالآخر بوا نے ایک بازو لگایا تو جمشید گر پڑا اور پھر وہ اسی جگہ سر پکڑ کر رہ گیا۔
''شرم نہ آئی تجھے۔ بڑی ماں کے برابر ہوں۔'' بوا نے کہا۔
''میں تمہیں ماں ہی سمجھتا ہائے، پرانا عورت!'' جمشید نے کہا۔
''ایں؟'' بوا اب چونکیں۔ اسی وقت طالوت نے اشارہ کیا اور ہم سب بھاگ کر باغ میں گھس گئے۔ جمشید ہمیں دیکھ کر بھی اسی طرح بیٹھا رہا۔ البتہ بوا چونک پڑی تھیں۔
''کیا ہوا بوا؟'' افشاں نے پوچھا۔
''کچھ نہیں مس افشاں!..... بوا کو میں نے ماں بنا لیا ہائے اور یہ ہیں بھی میری ماں کے برابر۔ بیٹا سمجھ کر ڈانٹ رہی تھیں۔''
''اوہ!'' افشاں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ''آپ بتائیں بوا!''
''ایں..... ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔'' بوا نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''جمشید صاحب!'' سیمیں آہستہ سے بولی۔
''ہوں!''
''آپ میری پہلی شرط پوری نہ کر سکے۔ اب کیا ہوگا؟''
''سوری مس شی می! اب میں تمہارے کو کچھ نہیں بولیں گا۔'' جمشید نے گہری سانس لے کر کہا۔
''تم میرے ساتھ آؤ جمشید!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور میں اسے دوسروں کے نرغے سے نکال لے گیا۔ دوسرے لوگ مجھے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ جمشید نہایت سعادت مندی سے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں اسے سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا اور پھر میں نے بڑے احترام سے اسے بٹھا دیا۔
''بڑے کمینے لوگ ہیں۔ ایک نیک اور سیدھے سادے انسان کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جا رہا ہے۔'' میں بولا لیکن جمشید احمقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
''مگر تم اُلٹے کیوں کھڑے تھے؟''
''شرط پورا کر رہا تھا۔''
''کیسی شرط؟'' میں نے پوچھا اور جمشید نے پوری تفصیل بتا دی۔ میں تو بہرحال اس تفصیل سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے نہایت افسوس کا اظہار کیا اور سیمیں کو برا بھلا کہنے لگا۔ پھر میں نے کہا
''بہرحال اس سے ایک بات معلوم ہوگئی جمشید!''
''کیا؟'' جمشید نے پوچھا۔
''سیمیں، احسان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسی سے محبت کرتی ہے۔''

''تو کیا.....تو کیا اُس کی شادی نہیں ہوئی؟''
''پتہ نہیں۔ ہم میں سے تو کسی نے اس کے بارے میں نہیں سنا۔ تمہاری زبانی معلوم ہوا ہے کہ احسان اس کا شوہر ہے۔ لیکن وہ بے حد چالاک ہے۔ تمہیں اُلٹا کھڑا کر کے سیدھی بوا کے پاس گئی اور انہیں نہ جانے کیا کیا پڑھا کر لائی۔''
''شی می خود گئی تھی؟'' جمشید نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں!''
''اوہ.....تب تو.....تب تو.....'' جمشید گردن ہلانے لگا۔
''یہ لڑکیاں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ لیکن شکیلہ کا چہرہ دیکھا تھا تم نے؟''
''شا کھی لا.....ئیں.....کیوں؟''
''تمہاری اس درگت پر وہ بہت غم زدہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔''
''آنسو!..... بٹ وائی؟..... کیوں؟''
''مجھے یقین ہے جمشید! وہ تمہیں چاہنے لگی ہے۔''
''اوہ! سویٹ شا کھی لا۔ میں نے کبھی اس کی طرف ایسے نہیں دیکھا مسٹر!''
''اس وقت سب خوش تھے، سوائے اس کے۔ تمہارے ساتھ ہونے والے سلوک پر سب سے زیادہ رنج اسے ہوا ہے۔''
''تب تو ہم سے غلطی ہوا مسٹر صائم!''
''کیا ہو گیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''ہم نے اس پر غور نہیں کیا۔ وہ تو بہت سویٹ ہے۔ بے حد چارمنگ۔''
''اور تم سے پیار بھی کرتی ہے۔''
''اوہ مائی گاڈ.....ہم بہت بے وقوف ہے۔ ہم اُس سے ایکسکیوز کرے گا۔'' جمشید افسوس سے بولا۔
''ہم اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے گا۔''
''تمہارے لئے یہی ٹھیک ہے جم! لیکن احتیاط سے۔''
''احتیاط کیا ہوتا ہے؟''
''مطلب یہ کہ تم فوراً اُس سے اظہارِ عشق مت کر لینا۔ وقت اور موقعے کا انتظار کرنا۔ جلد بازی سے کام بگڑ جاتا ہے۔''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' ''آپ ٹھیک بولتا ہائے مسٹر!'' جمشید زور زور سے گردن ہلانے لگا۔ میں نے اُسے پکا کر لیا تھا۔ بہرحال، شکیلہ نے اس کے لئے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔
''اس کے علاوہ جمشید! اگر سیمیں نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے تو تم بھی اس کی پروا مت کرو۔ ایسے بن جاؤ، جیسے اس کے رویے سے تمہیں ذرا بھی دُکھ نہ ہوا ہو۔ تم اس کی پرواہی نہ کرنا۔''
''بالکل ٹھیک۔ میں اس کا کوئی پروا نہیں کرتا۔'' جمشید نے کہا۔
''رات کو پروگرام کرو گے؟''
''کیسا پروگرام؟''

''تم نے گٹار سنانے کا وعدہ کیا ہے نا۔''

''اوہ ہاں!.....ضرور سنائیں گا۔ پکا وعدہ۔'' جمشید نے کہا اور میں نے اسے پکا کر لیا۔ بس جمشید بلاوجہ ہی پھنس گیا تھا۔ ابتدا میں تو ہم نے اسے معاف کر دیا تھا لیکن بس، نہ جانے کیوں اس بے چارے کی شامت آ گئی تھی۔ ویسے میرے ذہن میں ایک خیال اور بھی تھا۔ شکیلہ کے سلسلے میں کہیں طالوت سنجیدہ نہ ہو جائے۔ اگر وہ سنجیدہ ہو گیا تو جمشید اور مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمشید چلا گیا۔ رات ہو گئی تھی، روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ دوسرے لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ طالوت بھی غائب تھا۔ میں اس کی تلاش میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے شکیلہ کے کمرے کا ہی رُخ کیا تھا۔

لیکن راستے میں افشاں مل گئی۔ ''کہاں.....کہاں جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''عادل کی تلاش میں نکلا ہوں۔''

''اوہ.....اور شکیلہ کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں؟''

''وہ اور کہاں مل سکتا ہے۔''

''ہاں! شکیلہ خوش نصیب ہے۔''

''کیوں؟''

''بس، عادل بھائی کو اس کے کمرے میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہمارا کمرہ ہے، بدنصیب کہیں کا۔ کوئی اس کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا ہے۔'' افشاں بولی۔

''شرمندہ کر رہی ہو افشاں؟''

''ارے خدانخواستہ کیوں؟''

''آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کی طرف آنے میں احتیاط کیوں کرتا ہوں۔''

''کاش جانتے۔'' افشاں بولی۔

''مس افشاں! اگر آپ کی اجازت ہو تو.....تو آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔''

''شکایت کون کافر کر رہا ہے۔ ہم تو نصیب کی بات کر رہے تھے۔''

''پلیز افشاں! معاف کر دو۔''

''کر دیا۔'' افشاں بڑے پیار سے گردن ہلا کر بولی۔

''رات کا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کھانا بھی کھائیں گے، سوئیں گے بھی۔''

''اور جمشید سے گٹار نہیں سنیں گے؟''

''سنائے گا وہ؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا اور افشاں ہنس پڑی۔

''اللہ!.....کبھی کبھی تو اُس پر رحم آنے لگتا ہے۔ سچ، بچپن میں اتنا برا نہیں تھا۔ میں نے دیکھا ہے۔''

''افشاں! تمہارے جذبات تو مجروح نہیں ہوتے؟''

''نہیں۔ بس کہہ چکی ہوں کہ رحم آتا ہے۔ اور امی کا خیال رہتا ہے۔ ویسے بوا والی بات عام نہیں ہو

گی، میں نے کہہ دیا ہے۔''
''ہماری باتیں ہم تک ہی رہنا چاہئیں۔ بزرگوں تک پہنچنا مناسب نہیں ہوگا۔''
''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ امی اور ابو کا ذہن خراب نہ ہو۔ ویسے کیا وہ سچ مچ گٹار بجائے گا؟''
''یقیناً بجائے گا۔''

❀❀❀

رات کے کھانے کی فضا پُرسکون تھی۔ جمشید پوری طرح مطمئن تھا۔ اس شخص کا یہ انداز حیرت انگیز تھا۔ کوئی بھی واقعہ ہو جائے، تعلق اسی کی ذات سے ہو لیکن وہ پھر بھی پُرسکون ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد باغ کی محفل جاری ہوگئی۔ جمشید نے رات کے لئے خاص لباس پہنا تھا اور پھر اُس نے گٹار پر کئی ملکوں کی موسیقی سنائی۔ اچھا خاصا بجالیتا تھا۔ لیکن میرا کارنامہ سر اُبھار رہا تھا اور شکیلہ کی طرف جمشید کا التفات زیادہ ہی تھا۔

''عارف!'' طالوت آہستہ سے میرے کان میں غرّایا۔
''ہوں۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟''
''کہاں؟''
''کیا تم اس گدھے کی حرکتیں نہیں دیکھ رہے؟''
''اوہو، کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
''ہوں۔ تو یہ تمہاری شرارت ہے؟'' طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔
''ارے مگر کون سی شرارت؟''
''میں اسے کبڑا کر دوں گا، ورنہ اسے سمجھا دو۔'' طالوت نے غصیلے لہجے میں کہا۔
''یار! تفریح لینے دو۔ اور پھر آپ کی شکیلہ خانم اسے بے چارہ بھی تو کہہ رہی تھیں۔''
''یہ بات ہے۔'' طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''اچھا تو پھر سنبھالو اپنی افشاں بیگم کو۔'' اس نے کہا اور میں چونک کر اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ طالوت کی آنکھوں میں سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ لیکن افشاں والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔
''پسند آیا؟'' جمشید نے شکیلہ کی طرف جھک کر کہا اور بے تکے انداز میں مسکرانے لگا۔ شکیلہ نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر سکون کی سانس لی۔ میں چور نگاہوں سے شکیلہ اور جمشید کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس انداز میں کہ دونوں کو احساس نہ ہو۔
''میں آپ سے بولتا ہوں مس شاکھی لا!'' جمشید نے جواب نہ پا کر پھر کہا۔
''ہاں، ہاں۔ آپ بہت اچھا گٹار بجاتے ہیں۔'' شکیلہ نے کہا اور اپنی جگہ سے کھسک کر بوا کی طرف جانے لگی جو بطورِ خاص یہاں موجود تھیں اور اُنہیں رات کی یہ محفل زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔
''گویا یہ حضرت اب شکیلہ کو تنگ کر رہے ہیں!'' طالوت غرّایا۔
''یار! بس تھوڑی سی.....''
''جی نہیں۔ تم اس کے جذبات سے واقف نہیں ہو۔ وہ بہت نازک خیالات کی مالک ہے، آبگینے کی

طرح۔ٹوٹ گئی تو جوڑنا مشکل ہوگا۔" طالوت پھنکارا۔

"اوہ! تب پھر کیا کیا جائے؟"

"میں کرتا ہوں۔" طالوت نے کہا۔

"یار! کوئی ایسی بات نہیں، جس سے اسے تکلیف ہو۔" میں نے التجا کی۔

"بہت ہمدردی ہے اس سے؟"

"اب وہ غریب کیا کرے۔ اسے یہاں بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ عشق کرے اور شادی کرے۔" میں نے کہا۔

"لیکن اسے سوچ سمجھ کر عشق کرنا چاہئے۔ دیکھو دیکھو، وہ پھر اسی طرف بڑھ رہا ہے۔" طالوت نے کہا اور میں نے جمشید کی طرف دیکھا۔ پھر میں بھی آہستہ سے اس کی طرف چل پڑا۔ طالوت خطرناک آدمی تھا۔ جمشید کا کباڑا ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ جمشید چونک کر ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے شکیلہ کی طرف دیکھا۔

"ایکسکیوز می، مس شاکھی لا! میں ذرا ان شریف لوگوں سے بات کرلوں۔" اس نے معذرت کے انداز میں کہا اور پھر ہم دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "یس پلیز؟"

"آپ سے ضروری کام ہے مسٹر جمشید!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ! اسی وقت؟"

"ہاں!"

"آئی ایم سوری۔ میں اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ آپ لوگ پھر کسی وقت گفتگو کر لیں۔" وہ واپس شکیلہ کی طرف مڑ گیا اور طالوت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اسے کسی کارروائی سے روکنا چاہتا تھا۔

"جمشید!" میں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"اوہ مسٹر صائم!...... میں...... میں......" جمشید نے کسی قدر جھلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن میرا ہاتھ اُس کے شانے پر جم گیا اور اس کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ جمشید ہوش میں آ گیا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں شانہ چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ میرا وہ ہاتھ تھا، جس میں خصوصی قوت تھی۔ جمشید کے فرشتے بھی شانہ نہیں چھڑا سکتے تھے۔ جمشید کو احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بحالتِ مجبوری شکیلہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"معاف کرنا شاکھی لا!...... میں ابھی آیا۔" اُس نے مُردہ آواز میں کہا اور پھر وہ بھاری قدموں سے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ طالوت ہم دونوں کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ تھوڑی دُور چل کر میں رُک گیا۔ جمشید سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم غلط جا رہے ہو جمشید!" میں آہستہ سے بولا۔

"کیدر؟...... کیدر؟...... میں تو اِدھر کھڑا مسٹر!" جمشید نے حیرت سے کہا۔

"میری مراد شکیلہ سے ہے۔"

"شاکھی لا کو کیا ہوا؟" جمشید نے اسی انداز میں کہا۔

''شریف لڑکیوں کے پیچھے اس طرح نہیں پڑتے۔''
''میں نہیں سمجھتا، تم کیا بولتا مسٹر صائم؟''
''میں سمجھاتا ہوں میری جان!'' طالوت قریب پہنچ گیا۔
''اوہ، یس یس..... تھینک یُو..... تھینک یُو۔'' جمشید اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''منہ کھولو۔'' طالوت نے کہا اور جمشید نے متحیرانہ انداز میں منہ کھول دیا۔ ''بس اب بند مت کرنا۔'' طالوت بولا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر واپس چل پڑا۔ جمشید اسی طرح منہ کھولے کھڑا رہ گیا۔
''ارے، ارے..... مر جائے گا بے چارہ!'' میں نے سفارش کی۔
''خاموش رہو۔ میں نے رعایت برتی ہے۔'' طالوت نے غرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
''تماشا بن جائے گا بے چارہ۔''
''بن جانے دو۔ تمہیں معلوم نہیں، وہ کس کی محبوبہ ہے۔ اس سے بدتمیزی کا نتیجہ تو وہ نکلے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ بس یار! تم زیادہ نہ بولو۔ ورنہ میں تم سے بھی ناراض ہو جاؤں گا۔'' طالوت ہتھے سے اُکھڑ گیا تھا۔ اور اب اسے سنبھالنا بے حد مشکل تھا۔ میں بے چارے جمشید کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجے میں، میں واپس آ گیا۔
یہاں کی محفل یونہی شباب پر تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ افشاں اور شکیلہ کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ بوا بھی درمیان میں تھیں۔ ہم دونوں بھی دوسرے لوگوں میں شامل ہو گئے۔
''اللہ..... صائم بھائی! آپ ہی بوا سے سفارش کر دیں۔'' شکیلہ نے کہا۔
''مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہم سب کی دلی خواہش ہے کہ بوا سے گانا سنیں۔'' افشاں بولی۔
''ائے دیوانی ہوئی ہو بی بی! میں بھلا گاؤں گی؟'' بوا شرما کر بولیں۔
''تو سیمیں جھوٹ بول رہی ہے کیا؟'' افشاں نے کہا۔
''مذاق کر رہی ہے۔''
''بوا! آپ مجھے جھوٹا کروا رہی ہیں۔'' سیمیں نے برا مانتے ہوئے کہا۔
''ائے سیمیں بی بی!..... اللہ کے واسطے، میرا مذاق مت بنواؤ۔'' بوا گڑگڑائیں۔
''گویا ہم لوگ آپ کے لئے اس قدر اجنبی ہیں۔ اتنے برے ہیں ہم لوگ، آپ ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتیں۔ ٹھیک ہے بوا!..... ٹھیک ہے۔'' افشاں نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔
''یا الٰہی! کیا کروں؟'' بوا ہلکان ہوتے ہوئے بولیں۔
''سنا بھی دیں بوا!..... کتنے لوگ کہہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ہاں بوا! ہماری بھی خواہش ہے۔'' طالوت نے ٹکڑا لگایا اور بوا سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر خود بخود شرما گئیں۔
''مگر بھیا! مجھے نئے زمانے کے گانے کہاں آوے ہیں۔'' وہ نیم راضی ہو گئی تھیں۔
''لاحول ولاقوۃ! نئے زمانے کے گانے بھی کوئی گانے ہوتے ہیں؟ جو آپ گائیں گی بوا! وہ کلاسک چیز ہو گی۔'' میں نے کہا اور بوا کی ہمت بندھ گئی۔

''جیسی تم سب کی مرضی۔'' بوا نے کہا۔ ان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں، جیسے کوئی گانا یاد کر رہی ہوں۔

''ہُرّا.....'' سب نے نعرہ لگایا اور سب بوا کے گرد جمع ہو گئے۔ ''بلاؤ جمشید بھائی کو۔ وہ گٹار بجائیں گے۔'' افشاں نے کہا۔

''ارے ہاں، جمشید صاحب!..... جمشید صاحب!'' احسان نے آواز لگائی۔

''کیا بجائیں گے؟'' بوا پھر بہک گئیں۔

''اپنا باجا بجائیں گے بوا! مزہ آ جائے گا۔'' سیمیں نے کہا۔

''اسے نہ بلاؤ بھیا! بڑا بدنظرا ہے کم بخت کہیں کا۔ نہ بھیا! وہ آئے گا تو میں نہیں گاؤں گا۔'' بوا نے کہا۔

''مجال ہے کسی کی جو ہماری بوا کی طرف بری نگاہ سے دیکھ جائے۔ آنکھیں نکال دیں گے۔'' کمال نے کہا۔ ''جمشید صاحب!..... جمشید صاحب!'' کمال نے زوردار آواز نکالی اور طالوت نے اور میں نے چور نگاہوں سے جمشید کی طرف دیکھا۔ غریب منہ کھولے چلا آ رہا تھا۔ چند ساعت کے بعد وہ قریب پہنچ گیا۔ کسی نے اس کے کھلے ہوئے منہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

''جمشید بھائی! بوا گائیں گی۔ کیا آپ گٹار بجانا پسند کریں گے؟'' کمال نے کہا اور جمشید نے یونہی منہ کھولے کھولے گردن ہلا دی اور پھر اس نے گٹار اٹھا لیا۔ اب بھی کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

میرے دل میں بے اختیار اس کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ درحقیقت وہ غریب عقل سے پیدل تھا، ورنہ ایسی عجیب و غریب پچویشن پر بھلا کسی کے حواس قائم رہتے ہیں؟ میں جانتا تھا، کھلے منہ سے اسے کس قدر تکلیف ہو گی۔ لیکن وہ اس حالت میں بھی مگن تھا اور گٹار بجانے کے لئے تیار تھا۔

میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت بھی گہری نگاہوں سے جمشید کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اچانک بوا شروع ہو گئیں۔

''..... نارنگی اور ہیرے کی کنی مرا نیا۔'' انتہائی بے سُری اور بے تکی آواز اور نہ سمجھ میں آنے والا گانا۔ اور پھر اوپر سے جمشید کا جھوم جھوم کر گٹار بجانا، جس کی وجہ سے بے چاری بوا کو چیخ چیخ کر گانا پڑ رہا تھا۔ لوگوں کی ہنسی روکتے روکتے بری حالت ہو گئی۔ لیکن بوا نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب شروع کیا ہے تو ختم کر کے ہی دم لیں گی۔

''عارف!'' طالوت نے آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہوں۔''

''دیکھ رہے ہو اس گدھے کو۔ اسے اپنے کھلے منہ کا کوئی احساس نہیں ہے۔''

''رحم کرو طالوت! اس کی اس بات سے ہی اندازہ لگا لو کہ وہ کیا ہے۔''

''بند کر بے۔'' طالوت نے کہا۔ میں نے چونک کر اُس کی شکل دیکھی۔ یہ جملے مجھ سے نہیں کہے گئے تھے۔ اس لئے میں نے جلدی سے جمشید کی طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لی۔ جمشید کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا تھا۔ لیکن درحقیقت یا تو یہ شخص بے پناہ فولادی اعصاب کا مالک تھا یا پھر بالکل ہی پاگل۔ اس لے اب بھی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ گٹار اسی طرح بج رہا تھا اور بوا اب تک گا رہی تھیں۔

''خدا کے لئے بوا! اب بس کریں، ورنہ کوئی نہ کوئی ضرور مر جائے گا۔'' سیمیں نے کہا اور پھوٹ

ہی۔ پھر کیا تھا، چاروں طرف سے ہنسی کا طوفان اُمڈ پڑا۔ سب ہی بری طرح ہنس رہے تھے اور ان کے ساتھ بوا کی بگڑی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اسی لئے انکار کر رہی تھی۔ دیکھا نا، مذاق اُڑا رہے ہو سب مل کر۔ تف ہے۔ میں نے تمہاری خاطر گایا اور تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔''

''اوہ، یہ کلاسک ہمیں سمجھتا پرانا عورت۔ بائی گاڈ، ہمارا روح خوش ہو گیا۔ تم گاتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے آسمان سے شراب برس رہا ہو۔ چاروں طرف مستی پھیل گیا تھا۔'' جمشید نے ہمدردی سے کہا۔

''دیکھ تُو نہ بولیو بس۔ کہے دے رہی ہوں ہاں۔ ورنہ اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گی۔'' بوا آستین چڑھا کر بولیں اور جمشید خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔

''تو پھر کیا ہم بھی ہنستے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہنس لے۔ تُو بھی ہنس لے۔ لو اور سنو! ان لڑکے لڑکیوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ خدا کی مار۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ سب انہیں روکتے رہ گئے لیکن اب وہ کسی کی نہیں سن سکتی تھیں۔

رات خاصی گزر گئی تھی۔ اس لئے تھوڑی دیر کے بعد نشست برخاست ہو گئی اور سب ایک دوسرے سے رخصت ہو کر اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ طالوت، شکیلہ سے گفتگو کرتا ہوا آیا تھا۔ پھر اس نے شکیلہ کو خدا حافظ کہا اور میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس دوران لباس وغیرہ تبدیل کر لیا تھا۔

طالوت نے بھی سونے کی تیاریاں کیں اور ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ طالوت خاموش تھا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

''ویسے اس گدھے نے شکیلہ سے پینگیں بڑھانے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''کوئی خاص بات تو نہیں۔ بس شکیلہ نے محسوس کیا تھا۔''

''بڑا انوکھا انسان ہے۔''

''پاگل ہونے میں تھوڑی ہی کسر باقی ہے۔ لیکن میں اس کا یہ پاگل پن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اسے سمجھا دینا، آئندہ اگر میں نے اسے شکیلہ کے گرد منڈلاتے دیکھا تو اس کے سر پر درخت اُگا دوں گا۔''

''وہ بے چارہ خاموشی سے سر جھکائے جھکائے پھرے گا اور زبان سے اُف بھی نہیں کرے گا۔''

''اب تو کیا شکیلہ ہی رہ گئی ہے؟..... افشاں بھی تو ہے۔''

''اے مسٹر طالوت! عقل کی بات کریں۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔''

''میں تو صرف بات کر رہا ہوں۔ مگر اس احمق کے لئے کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''ہاں۔ بات کی حد تک کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے خطرہ ہو گیا تھا کہ طالوت، افشاں کے سلسلے میں کوئی حرکت نہ کر ڈالے۔ کافی دیر تک ہم اس دلچسپ نشست کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، پھر سو گئے۔

دوسری صبح عام سی تھی۔ ناشتے پر وہی دبی دبی مسکراہٹیں، وہی لگاؤ کا اظہار۔ بزرگوں کے انداز میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد ہم نے افشاں اور شکیلہ سے گفتگو کی اور پھر ہم باہر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ باہر نکلے ہی تھے کہ جمشید صاحب آڑے آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی سلام کیا اور مسمی

شکل بنا کر کھڑے ہو گئے۔

''خیریت بھائی صاحب؟'' طالوت نے پوچھا۔

''ٹھیک ہائے۔ بالکل ٹھیک ہائے۔'' جمشید بھاری آواز میں بولا۔

''ہمارے لائق کوئی خدمت؟''

''شوکریہ، شوکریہ۔'' جمشید نے اسی طرح پھولے ہوئے منہ سے کہا۔

''کوئی خدمت نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر جناب کا نزول کیوں ہوا؟...... راستہ کیوں روک لیا ہے؟''

''میں بھی آپ کے ساتھ جائیں گا۔''

''ارے، خدا کی پناہ..... کہاں؟'' طالوت چونک کر بولا۔

''جہاں آپ لوگ جائیں گا۔''

''مگر میرے بھائی! آخر کیوں؟...... ہم نے کیا غلطی کی ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''یہ راستے میں بتائیں گا۔'' جمشید بچوں کے سے انداز میں ضد کرتے ہوئے بولا۔

''سنبھالو۔'' طالوت نے میری طرف رُخ کر کے کہا۔

''لے چلو یار!..... دیکھیں کیا نیا گل کھلا ہے۔'' میں نے کہا۔ طالوت نے میری طرف دیکھا اور پھر گردن ہلا دی۔ ہم نے جمشید کو ساتھ آنے کی اجازت دے دی اور پھر ہم تینوں چل پڑے۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا۔ طالوت ازراہِ اخلاق جمشید کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ جمشید بے حد رنجیدہ نظر آ رہا تھا

''کیا بات ہے میری جان؟..... کچھ منہ سے تو پھوٹو۔'' طالوت نے جمشید کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اچانک جمشید کی سسکیاں شروع ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ میں اور طالوت بری طرح بوکھلا گئے۔ میں نے جلدی سے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور منہ پھاڑے، جمشید کی طرف دیکھنے لگا۔

''ارے ارے جمشید!..... ارے کیا ہو گیا؟..... افوہ، پاگل انسان!'' طالوت کے لہجے میں ہمدردی آ گئی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے جمشید کو دیکھ رہا تھا۔ جمشید چپ بھی اچانک ہی ہو گیا تھا ہم دونوں ہمدردی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

جمشید نے جیب سے رومال نکال کر آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور پھر اس طرح چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگا، جیسے ہمیں بھول ہی گیا ہو۔ پھر اس نے ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ہم دونوں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر طالوت نے مجھے اشارہ کیا ''چلو عارف!'' اور میں نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کہاں چلوں؟''

''کارپٹ سینٹر۔'' طالوت نے آہستہ سے کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جمشید کے لئے اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ راستے میں اس نے جمشید سے اور کوئی بات نہیں کی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم کارپٹ سینٹر پہنچ گئے۔ دن رات کام ہو رہا تھا۔ اور تصدق درحقیقت ایک عمدہ کارکن ثابت ہو رہا تھا۔ اس

نے نہایت عاجزی سے ہمارا استقبال کیا اور پھر ہمیں اپنی کارکردگی کے بارے میں بتانے لگا۔ جمشید بالکل خاموش ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں نظر آ رہے تھے۔ بس سپاٹ سپاٹ سا چہرہ۔ نہ جانے اس بے چارے کی کھوپڑی کے اندر کیا چیز رکھی ہوئی تھی۔

پھر ہم اپنے شاندار دفتر میں آ بیٹھے۔ تصدق ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کئی بار عجیب سی نگاہوں سے جمشید کی طرف دیکھا تھا لیکن جمشید صاحب تو اس وقت دنیا سے ہی گئے ہوئے تھے۔

''ہاں تصدق! اب سناؤ۔'' طالوت نے کہا۔

''آج دوپہر تک ایک ایک کام ختم ہو جائے گا جناب!'' تصدق نے کہا۔

''اسٹاف کے بارے میں کیا کیا؟''

''ایک فہرست بنا لی ہے۔ اس کے بعد آپ جو حکم دیں۔'' تصدق نے جواب دیا اور پھر اس نے ہمارے سامنے فہرست پیش کر دی۔ کافی لمبا چوڑا اسٹاف تھا۔ تصدق کی اس صلاحیت کا ہم نے دل سے اعتراف کیا۔ درحقیقت اُسے اس معاملے میں خوب تجربہ تھا۔ ایک ایسی فرم کے لئے اس نے جیسے اسٹاف کا انتخاب کیا تھا، اس سے ہم پوری طرح مطمئن تھے۔

''مناسب فہرست ہے۔'' میں نے منظوری دے دی۔ طالوت نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''ان لوگوں کے اپائنٹمنٹ کے سلسلے میں کیا کرو گے تصدق؟''

''جو حکم فرمائیں جناب!''

''میرا خیال ہے، یہ فہرست ایمپلائمنٹ ایکسچینج کو دے دو اور پھر ان لوگوں کے انٹرویو کر لو۔''

''جی..... وہ..... میں..... میں کر لوں؟''

''ہاں تو کیا حرج ہے؟ بھئی تم اس فرم کے منیجر ہو۔'' میں نے کہا اور تصدق نے گردن جھکا لی اور پھر آہستہ سے بولا۔

''آپ نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے صائم صاحب!''

''لیکن تمہاری صلاحیتیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس میں ہماری کوئی مہربانی شامل نہیں ہے۔ تم تو ہمارے لئے بہترین آدمی ہو۔''

''میں دل سے شکرگزار ہوں۔''

''ویسے انٹرویو کے دوران ہم بھی کبھی کبھی آتے رہیں گے۔ تم ایک ہفتے کے اندر اندر یہ پورا اسٹاف رکھ لو۔ اس کے بعد ہم کارپٹ سینٹر کا افتتاح کر دیں گے۔''

''جو حکم۔'' تصدق نے گردن ہلا دی۔

''اور کوئی قابلِ ذکر بات تو نہیں؟''

''جی، کوئی خاص نہیں۔''

''شمشیر لمیٹڈ سے تو کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا؟''

''اوہ..... جی نہیں۔ دراصل کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس عمارت میں کس چیز کی فرم قائم ہو گی۔'' تصدق

نے جواب دیا۔

''ابھی معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں، کچھ کام اور باقی رہ جاتے ہیں۔''

''جی!''

''بورڈ اور نیون سائن۔''

''میں نے یہاں کی تین بڑی پبلسٹی فرموں سے رابطہ قائم کیا ہے۔ ان سے یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ کسی وقت بھی انہیں بورڈ اور نیون سائن کے لئے ارجنٹ آرڈر دیا جا سکتا ہے۔ کمپنی کا نمائندہ عمارت کا جائزہ لے گیا ہے۔''

''بہت خوب۔ کیا خیال ہے عادل؟''

''بالکل ٹھیک!'' طالوت نے تائید کی۔

''ارے ہاں، مسٹر تصدق! ان سے ملو، یہ جمشید عرف جم، عرف جمی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بڑی خوشی ہوئی۔'' تصدق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ خاطر مدارات کرو ان کی۔ تمہارے مہمان ہیں۔''

''ضرور، ضرور۔'' تصدق جلدی سے باہر نکل گیا اور ہم دونوں نے بیک وقت جمشید کی طرف دیکھا۔

''آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں مسٹر جمشید؟''

''ادھر ہی ہائے۔ ادھر ہی ہائے۔'' جمشید جلدی سے بولا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''مسٹر ٹوساڈک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنا لکی آدمی ہائے۔ کتنا رچ مین ہائے۔ میرے کو نئیں معلوم تھا کہ اس کا اتنا بڑا کمپنی ہائے۔'' جمشید نے کہا۔

''اوہ، واقعی جو بات کہی، لاجواب کہی۔'' طالوت نے کہا اور پھر چونک کر بولا۔ ''تم رو کیوں رہے تھے؟''

''کب؟''

''گاڑی میں۔'' طالوت اُسے گھورنے لگا۔

''اوہ..... مجھے یاد نہیں ہائے۔ کوئی بات یاد آ گیا ہوگا۔''

''لاحول ولا قوۃ!'' طالوت نے برا سا منہ بنایا اور میں بھی جمشید کو گھورنے لگا۔

''یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ تمہارا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ، آئی سی۔'' جمشید نے ہونٹ سکوڑے، پھر چونک کر بولا۔ ''ہاں، یاد آ گیا..... یاد آ گیا۔'' اور پھر اُس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔

میرے بدن میں ہلکی سی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ کہیں کم بخت، شکیلہ کے بارے میں میرا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ طالوت غور سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

''اب اُگل بھی دو۔ تم تو پیشہ ورانہ رونے والے معلوم ہوتے ہو۔ سارے گُر آتے ہیں۔''

''مسٹر صائم! مسٹر عادل! پلیز میرے کو بتاؤ، میں کیا کرے؟'' جمشید گلوگیر آواز میں بولا۔

''کیا ہوا میری جان؟'' طالوت نے پوچھا۔

"میرے کو لو کرنا مانگتا۔ مگر ادھر لڑکی لوگ لفٹ نہیں دیتا۔ اب میں کدھر جائے؟"
"تم نے کہاں کہاں کوشش کی؟" طالوت نے پوچھا۔
"پہلے شی می ٹرائی کیا، بٹ اس کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کبھی لوگ بولتا وہ احسان کا وائف ہے۔ میرے کو نہیں معلوم۔"
"دوسرے نمبر پر کون تھا؟"
"شاکھی لا۔ مگر وہ میرے کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتا ہائے۔ میں اس کو بھی ٹرائی نہیں کر سکتا۔ تیسرے نمبر پر میری کزن افشاں ہے، مگر میرے کو لگتا، وہ بھی میرے کو لفٹ نہیں دیں گا۔"
"ٹھیک لگتا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا اور طالوت بے اختیار ہنس پڑا۔
"پھر میں کیا کرے؟" جمشید نے درد بھرے انداز میں کہا۔
"عشق کرنا ضروری ہے؟" طالوت نے پوچھا۔
"ہاں!" وہ بے چارگی سے بولا۔
"ویری گڈ، لیکن آخر کیوں؟"
"مسٹر صائم! ہم آپ کو کیا بولے؟ بس آپ یوں سمجھو، ہمارا پپا مسٹر شیڈ وب بے حد کنجوس آدمی ہائے۔ اس نے اُدھر کوشش کیا کہ کسی رچ لڑکی سے ہمارا میرج ہو جائے۔ مگر اُدھر کسی نے ہمارے ساتھ میرج نہیں بنایا۔ تب اُس نے ایک اسٹیمیٹ بنایا اور ہم کو اِدھر بھیجا۔ اس نے بولا۔ اِدھر کا لڑکی لوگ، لو کرتا ہے۔ اِدھر کسی مالدار لڑکی سے لو کرو، شادی کرو.....اوہ مسٹر عادل! بائی گاڈ، ہم لو کرنا نہیں مانگتا۔ بٹ....."
"تو مسٹر شاداب، دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟" طالوت نے پوچھا۔
"ہاں!"
"خود وہاں اُن کی کیا پوزیشن ہے؟"
"بہت خراب.....ایک دم خراب۔ بہت سا قرض ہائے۔ وہ خود اچھا آدمی نہیں ہائے۔ ہم سب لوگ کو بھی خراب کیا۔ مگر بولا، ادھر ہم کسی کو نہیں بتائیں گا۔"
"اس کے علاوہ دولت حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے؟" طالوت نے پوچھا۔
"ہمارا سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم تو میوزیکل مین ہے۔ ہم یہ سب کچھ نہیں جانتا۔"
"آدمی برے نہیں ہو یار!.....مگر تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" طالوت نے کہا۔
"بس ہم اپنے پپا سے پریشان ہائے، ورنہ کوئی بات نہیں۔"
"ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟" طالوت نے پوچھا۔
"کچھ نہیں.....کچھ نہیں۔ بس آپ لوگ کا دوستی ٹھیک ہائے۔"
"دوست بناؤ گے؟" طالوت نے پوچھا۔
"اگر آپ میرے کو چانس دیں گا تو ضرور بنائیں گا۔" جمشید نے کہا۔
"کیا خیال ہے بھئی؟" طالوت نے پوچھا۔
"ٹھیک ہے۔ آدمی برا نہیں۔"

''لیکن کچھ شرائط ہوں گی مسٹر جمشید!'' طالوت نے کہا۔
''منظور ہائے۔ منظور ہائے۔''
''سنے بغیر؟''
''بالکل، بالکل..... آپ لوگ بہت اچھا ہائے۔ جو بولے گا، اچھا بولے گا۔''
''پھر بھی، سن لو۔ ساری لڑکیاں انگیج ہیں۔ مطلب یہ کہ سیمیں، افشاں اور شکیلہ۔ تم ان میں سے کسی سے عشق لڑانے کی کوشش نہیں کرو گے۔''
''بالکل نہیں کریں گا۔''
''بس پہلی اور آخری شرط یہی ہے۔''
''میرے کو منظور ہائے۔''
''تب ہاتھ ملاؤ۔'' پہلے میں نے جمشید سے ہاتھ ملایا اور پھر طالوت نے۔ جمشید بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ اور ہم بھی اب اس کے لئے مخلص ہو چکے تھے۔
تصدق نے کافی تکلف کیا تھا۔ بہرحال، ہم نے خوب کھایا پیا۔ جمشید بھی ہمارے ساتھ شریک تھا۔ پھر ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ لنچ کوٹھی میں ہی کیا۔ رات کے کھانے پر تنویر صاحب نے ہماری مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔
''کارپٹ سینٹر تکمیل کے مراحل سے گزر چکا ہے۔ بہت جلد ہم اس کا افتتاح کرنے والے ہیں۔'' میں نے کہا اور پھر طالوت بولا۔
''اس کے علاوہ تنویر صاحب! اب آپ ہمیں اجازت بھی دیں گے۔''
''کیا مطلب؟'' سب چونک پڑے۔
''صائم بھائی یہاں مستقل رہائش چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مہمان نوازی ختم کر دی جائے۔''
''تم یہاں مہمان تو نہیں ہو صائم!'' تنویر صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے۔
''یقیناً یہ درست ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں، ہم اپنی کوئی رہائش گاہ بھی بنالیں۔''
''اس میں کوئی حرج نہیں ہے تنویر!'' نواب جلال الدین نے دخل دیا۔
''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کچھ بھی کریں، اگر قیام یہاں رہے تو کیا حرج ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں جو رونقیں سمٹ آئی ہیں، میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔''
''ہم یہاں سے دُور نہیں جائیں گے تنویر صاحب! ہر لمحے آپ کے قریب ہوں گے۔''
''میں تمہیں روکنے کا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ سوائے اپنی محبت کے۔'' تنویر صاحب سنجیدگی سے بولے اور پھر کافی دیر تک اس موضوع پر بحث ہوتی رہی۔ بالآخر تنویر صاحب کو بھی ماننا پڑا تھا۔
لیکن کھانے کے کمرے سے باہر نکلتے ہی افشاں نے میری ٹانگ پکڑ لی۔
''صائم صاحب!'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔
''جی..... کیا بات ہے افشاں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''ذرا تشریف لائیے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ باغ کے ایک سنسان

گوشے میں پہنچ کر وہ رک گئی اور پھر مجھے گھاس پر بیٹھنے کے لئے کہہ کر خود بھی بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے افشاں! اتنی سنجیدگی۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''یہ کیا گفتگو ہو رہی تھی؟''

''اوہ..... یہاں سے جانے کے بارے میں؟''

''جی ہاں!''

''تمہیں پسند نہیں آئی ہوگی۔''

''جی نہیں..... بہت پسند آئی ہے۔ کب تشریف لے جا رہے ہیں آپ؟ اور یہ کہ اس کے بعد بھی آنا جانا رہے گا یا تعلقات بھی ختم کر لیں گے؟'' افشاں نے کہا۔

''بہت خوب! اس ناراضگی میں چھپے پیار کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا ہوں۔''

''اوہ، میں سمجھی شاید آپ کے ذہن سے یہ احساسات مٹ گئے۔'' افشاں اسی سنجیدگی سے بولی۔

''اب خادم کو بھی بولنے کی اجازت ملے گی یا نہیں؟''

''بولئے، بولئے۔''

''کیا حضور مجھے گھر داماد بنا کر رکھیں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''اگر حضور کی یہی خواہش ہے، تب مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ میں تیار ہوں۔ لیکن ہر لڑکی کے دل میں اپنے گھر کی آرزو ہوتی ہے اور میں آپ کے لئے ایک گھر بنانا چاہتا ہوں۔ اب بتایئے۔''

''لیکن ابھی کیا ضرورت ہے؟'' افشاں نرم پڑ گئی۔

''کیوں..... کیا حضور کی خواہش ہے کہ خادم بس تنہا تڑپتا رہے اور دُور دُور سے ہی حضور کی قربت کی آنچ محسوس کرتا رہے۔ افشاں بیگم! کیا یہ ظلم نہیں ہے؟''

اور افشاں مسکرا دی۔ ''آپ..... آپ.....''

''جی، جی فرمایئے۔''

''لیکن مکان کہاں خریدیں گے؟''

''ایک ہزار مکانات خرید لیں لیکن آپ کے قدموں سے دُور جانا کون پسند کرے گا۔ ہاں، کل لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ صاحبزادے کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ تو ہے نہیں......''

''بس خاموش ہو جایئے۔''

''آپ کی فرم شاید اسی ماہ سے کام شروع کر دے۔ اس کا افتتاح بھی آپ ہی فرمائیں گی؟''

''پلیز ایسا نہ کریں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے شرم آئے گی۔ مگر آپ نے ابھی تک ہمیں تو اپنی فرم دکھائی ہی نہیں۔'' افشاں کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئی تھیں۔

''حضور کے شایانِ شان تیار تو ہو جانے دیں، ورنہ پھر ناراضگی کون برداشت کرے گا؟'' میں نے پیار بھرے انداز میں کہا اور افشاں نے گردن جھکا لی۔ پھر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد بولی۔

''بس، آپ مکان خریدیں یا کچھ اور کریں، آپ کو رہنا یہیں ہوگا۔''
''شادی کے بعد بھی؟''
''نہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور میں سحر زدہ نگاہوں سے افشاں کو دیکھنے لگا۔ کیسی اچھی لگ رہی تھی وہ۔ میں نے جو کچھ اب تک کیا تھا، خواب محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے عورت اپنی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ زندگی میں پہلی بار میرے سامنے آئی ہو۔
افشاں منہ چھپائے کھڑی رہی اور میں کافی دیر تک مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر افشاں کو ہی اس پُراسرار خاموشی کا احساس ہوا اور اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔ تب میں بھی سنبھلا اور پھر میں نے ایک طویل سانس لی۔
''بہتر ہے۔ حضور کے حکم کی خلاف ورزی کی مجال کسے ہے۔'' اور پھر افشاں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں۔
شب و روز ہنگاموں سے تنویر صاحب کی کوٹھی میں بہار آ گئی تھی۔ زبردست وسائل کے آدمی تھے۔ سو پچاس مہمان ان پر کیا بھاری پڑتے۔ ہمارا معاملہ عجیب بھی تھا اور تنویر صاحب فطرتاً نیک۔ وہ ہمیں بھی بہت چاہنے لگے تھے۔ دوسری طرف طالوت، کارپٹ سینٹر کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔ اکثر وہ تنہا ہی چلا جاتا۔ مجھے اب اس سر پھرے جن کی کسی بات پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔
''بالآخر ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور ایک رات میں اور طالوت اپنے کمرے میں کارپٹ سینٹر کے افتتاح کا پروگرام بنانے لگے۔
''یہ بات تو طے کہ یہ افتتاح، نواب جلال الدین کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں۔ تمہارے خیال میں ان سے اچھی شخصیت اور کس کی ہے؟'' طالوت بولا۔
''نہیں، ٹھیک ہے۔''
''اس کے علاوہ ہمارے گھر کا افتتاح بھی ہوگا۔'' طالوت نے کہا۔
''گھر؟.....کون سا؟''
''ارے بھئی وہی، جہاں تم رہو گے۔'' طالوت نے مسکرا کر کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔
''اوہو..... یار! معاف کرنا۔ دراصل تصدق کوئی اچھا مکان تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ بہرحال، ہمیں مکان کی ضرورت تھی اس لئے میں نے راسم سے کہہ دیا۔''
''طالوت.....!'' میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔
''ارے کیا غلطی ہو گئی؟'' طالوت نے مسخرے لہجے میں پوچھا۔
''یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں نے افشاں سے ابھی مکان کے بارے میں بات نہیں کی۔''
''کیا مطلب؟''
''دو باتیں ہیں۔ یا تو وہ یہ سمجھے گی کہ میں نے اس سے بات چھپائی، یا پھر مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ میں بے حقیقت انسان ہوں اور معاملات میرے علم میں ایک حد تک ہی رہتے ہیں۔''
''بس بس۔ فضول بکواس سے پرہیز کرو۔ کوئی ترکیب کر لیں گے۔'' طالوت نے منہ بنا کر کہا۔

میں اسے کافی دیر تک خاموشی سے گھورتا رہا۔ تب طالوت مسکرا پڑا۔

''بس یار! خاموشی سے یہ کام کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن تُو تو باقاعدہ ناراض ہو رہا ہے۔''

''ناراض نہیں ہو رہا۔ میں نے ایک بات کہی تھی۔''

''ایک آدمی غلطی معاف بھی کر دیا کر۔ اب تو ہو ہی گیا ہے۔ سنبھال لے۔'' طالوت نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی، پھر طالوت ہی بولا۔ ''تیری خاموشی سے میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔''

''خوش رہو میری جان! ہاں کل ذرا اسٹاف چیک کر لیں گے۔ میں نے ابھی تک اسٹاف سے تعارف نہیں حاصل کیا۔''

''ضرور۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایک شرط پر۔''

''ہاں، ہاں۔ بول جلدی سے۔'' طالوت موڈ میں بولا۔

''افشاں بھی جائے گی۔''

''اور شکیلہ؟'' طالوت نے آنکھیں نکالیں۔

''وہ بھی۔'' میں مسکرا پڑا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا عارف!''

''کیا؟''

''مالک کی حیثیت سے تم سامنے آؤ گے۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب، اسٹاف سے تعارف کے سلسلے میں۔''

''اور تمہاری کیا حیثیت ہو گی؟''

''جو ہے۔''

''یعنی؟''

''مالک کا بھائی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....''

''سمجھنے کی کوشش کیا کر یار! میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور پھر میں تمہاری دنیا کے کاروبار سے واقفیت حاصل کر کے کروں گا بھی کیا۔ تجھے میری قسم میری جان! جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کر لے۔''

''تم نے یہ سب کچھ میرے لئے کیا ہے؟''

''مجھے بنیا بننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''لیکن طالوت!''

''میرے اور تیرے درمیان ''لیکن'' کی گنجائش نہیں ہے عارف!'' طالوت نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ درحقیقت جو شخص کسی سڑک پر پڑے انسان کی ذرا سی بات سے متاثر ہو کر اس کی حیثیت بدل دے، اس سے یہ بات کہہ کر خود شرمندہ ہونا تھا۔ مجھ سے تو بہرحال اس کا ایک واسطہ تھا۔

کئی منٹ تک خاموشی رہی، پھر میں نے کہا۔ ''تو میں افشاں کو تیار کر لوں؟''

"ہاں!"
"ٹھیک ہے۔" میں نے طویل سانس لی۔
"ارے ہاں۔ یہ آج کل اپنا جمشید بھائی گھر سے غائب رہنے لگا ہے۔"
"ہاں۔ عام طور سے نظر نہیں آتا۔"
"ویسے اس نے معاہدے کی پابندی کی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"میرا خیال ہے، اب اس نے گھر کی ساری لڑکیوں کو ماں بہن سمجھنا شروع کر دیا ہے۔"
"اوہ ہاں...... آج کل وہ کسی کے پاس نہیں منڈلا رہا۔"
"یا پھر کچھ کرنے کی ہمت اس میں ہے نہیں۔"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"
"ویسے عارف! اس نے اپنے بارے میں تفصیل بھی تو بتا دی ہے۔ یعنی وہ خود عشق وغیرہ کا قائل نہیں ہے۔ بقول اس کے مسٹر شیڈ وب اُس کی جان کو آئے ہوئے ہیں۔"
"اگر وہ سچ بول رہا ہے.....؟"
"میرا خیال ہے، اس میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"
"ممکن ہے۔"
"بہرحال! انوکھی شے ہے۔ ویسے اپنے جیسے دوسرے آوارہ گردوں کی مانند وہ نشے کا عادی نہیں معلوم ہوتا۔"
"ایں، ہاں..... یہ بات بھی نہیں سوچی جا سکتی کہ نشے نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا ہے۔"
"بہرحال، وہ بے چارہ قابلِ رحم ہے۔ سوچیں گے کچھ اس کے بارے میں بھی۔" طالوت نے لاپروائی سے کہا اور پھر سونے کے لئے کروٹ بدل لی۔
دوسری صبح بے حد خوشگوار تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گو بارش کا موسم نہیں تھا، لیکن لگ ایسا ہی رہا تھا، جیسے بارش ہو گی۔ ناشتے کے بعد ہی سب کے ذہن موسم میں کھو گئے۔ جمشید بھائی بھی ناشتے پر موجود تھے۔ ویسے بے چارہ اپنی شخصیت کی وجہ سے کوئی نمایاں حیثیت نہیں اختیار کر سکا تھا۔ اس لئے کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔
ناشتے کے کمرے سے سب ساتھ ہی نکلے تھے۔ تب سیمیں نے سب کو روک لیا۔
"کیا بات ہے، آج کل موسم کافی سرد ہے۔" وہ بولی۔
"اے لو۔ ابھی تو سردی کا نام بھی نہیں ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" بوا نے جلدی سے سیمیں کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"خدا کے واسطے، مجھے بخار نہ بتا دیں۔" سیمیں جلدی سے بولی۔
"اے بچی! ماتھا تو گرم ہے۔" بوا تشویش سے بولیں۔
"اللہ کے واسطے بوا! آپ خاموش رہیں۔ اگر ابو کے سامنے کہہ دیا تو خوامخواہ دواؤں کے چکر میں پھنس جاؤں گی۔" سیمیں دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''دواؤں کی تو تم ہمیشہ سے چور ہو بی بی! مگر.....''

''ٹھیک ہے بوا! آپ اپنا فرض ضرور پورا کریں۔ یعنی کمال ہے۔ ذرا بھی سردی نہیں ہے اور انہیں سردی لگ رہی ہے۔'' طالوت نے لقمہ دیا۔

''اللہ..... عادل بھائی! بوا اتنی ہی دیوانی ہیں۔ پلیز آپ.....''

''نمک حلال ہیں۔ محبت کرتی ہیں تم سے۔ ایسی کیا بات ہے؟'' طالوت بولا اور سب ہنس پڑے۔

''جائیے بوا! آپ نواب صاحب سے بات کریں۔''

''کمال!'' سیمیں پیر پٹخ کر بولی۔

''جی سیمیں باجی!'' کمال آگے بڑھ آیا۔

''تم ان بوا کو زبردستی لے جاؤ اور کوٹھی کے ویران حصے کے کسی کمرے میں بند کر دو۔ یہ اتنے اچھے موسم کا بیڑا غرق کرائیں گی۔'' سیمیں غرّائی۔

''بہت بہتر۔'' کمال آگے بڑھ آیا۔

''جمشید بھائی! آپ بھی کمال کی مدد کریں۔'' سیمیں جلدی سے بولی۔

''اوہ..... ضرور، ضرور۔''

''ارے، ارے..... لو اور سنو۔ نیکی برباد، گناہ لازم۔ اے بی بی! تمہاری مرضی ہے، علاج کرو نہ کرو۔ بستر پر پڑ جاؤ گی تو ٹھیک ہے۔'' بوا بوکھلائے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گئیں۔

سب قہقہے لگا رہے تھے۔ کمال تو رُک گیا، لیکن جمشید صاحب کے لئے یہی کافی تھا کہ کسی نے کوئی کام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر بوا کو پکڑنے کی کوشش کی۔

''پیچھے ہٹ..... پیچھے ہٹ۔ خبردار جو میرے پنڈے کو چھوا۔'' بوا غرّائیں اور جمشید احمقانہ انداز میں سیمیں کی شکل دیکھنے لگا۔

سیمیں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''جمشید بہت طاقتور ہے۔'' طالوت جلدی سے بولا۔ ''اگر وہ چاہے تو بوا کو اُٹھا کر بھی لے جا سکتا ہے۔''

''اُٹھا کر تو دیکھے۔ ہڈیاں توڑ دوں گی۔'' بوا نے آنکھیں نکالیں۔

''اب یہ جمشید جانے۔'' طالوت بولا اور جمشید کے لئے کافی تھا۔ دوسرے لمحے وہ جھکا اور بوا کو اُٹھا کر لے دوڑا۔ بوا بھونچکی رہ گئی تھیں۔

اور لوگوں کے پیٹوں میں ہنستے ہنستے درد ہو گیا تھا۔

''ارے، ارے..... یہ بوا کو لے کہاں جا رہا ہے؟'' طالوت سنجیدگی سے بولا۔

''اللہ..... عادل بھائی! بس۔'' سیمیں نے پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔ افشاں اور شکیلہ کی آنکھوں میں ہنسنے کی وجہ سے آنسو نکل آئے تھے۔

''ہائے، اب تو بوا قیامت کر دیں گی۔ ان کے ساتھ اتنی بری تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔''

''آیئے، دیکھیں تو سہی۔ دیکھنے کے قابل منظر ہو گا۔'' افشاں نے کہا۔

''توبہ توبہ..... کیسی ہو گئی ہیں یہ لڑکیاں۔ تمہیں شرم نہیں آئے گی ان دونوں کی خلوت میں جاتے ہوئے؟'' طالوت نے شرارت سے کہا اور سیمیں نے شرم سے دوپٹہ منہ میں دبا لیا۔

"خدا کی پناہ! کیا بات کا بتنگڑ بنا ہے۔" احسان نے ہنستے ہوئے کہا۔
"مگر بات ہوئی کیا تھی؟"
"بس، میری شامت۔ میں نے موسم کی سردی کی بات کر دی۔ میرا مطلب سچ مچ کے موسم سے تو نہیں تھا۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ بہت دن سے کوئی تفریح نہیں ہوئی۔ سب لوگ سرد سرد سے ہیں، تفریحی معاملات میں کوئی پُر جوش نہیں ہے۔" سیمیں بولی۔
"اوہ! یہ بات تھی۔"
"شامت کی ماری بوا کی محبت جوش مارنے لگی۔ وہ سمجھیں کہ میں سردی کا شکار ہو گئی ہوں۔"
"ہاں۔ یہ بات سوچنے کی ہے۔" طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"کیا؟"
"یہی کہ پچھلے کچھ عرصے سے موسم کافی سرد چل رہا ہے۔"
"اور پھر آج تو بادلوں نے اور ہلچل مچا دی ہے۔"
"کیا کہا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"کیا مطلب؟"
مطلب یہ کہ ہم گھر سے نکلیں اور دُھوپ نکل آئے۔"
"آثار تو نہیں ہیں۔ بادل گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔" سیمیں نے کہا۔
"ہمیں مشکل پیش آئے گی۔" طالوت بولا۔
"کیسی مشکل؟"
"آپ سمجھتی نہیں ہیں سیمیں! انسان کو اتنا بے حس نہیں ہونا چاہئے۔" طالوت منہ بنا کر بولا۔
"ارے ارے، کیا شکایت پیدا ہو گئی میرے بھیا کو؟" سیمیں نے پیار سے کہا۔
"احسان اگر سیر کرنے نکلیں گے تو تم ان کے ساتھ ہو گی۔ باقی لوگ؟"
"خدا کی قسم! حسرت میں نہ مبتلا کیا کریں عادل بھائی!" سیمیں جلدی سے بولی۔
"کیا مطلب؟"
"کتنی خواہش ہے اپنے بھیا کا سہرا دیکھنے کی۔"
"ارے باپ رے!" طالوت اُچھل پڑا۔ "سچ مانو سیمیں! تو شادی کرنے میں جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ مانع ہے، وہ سہرا ہے۔ اگر سہرا نہ باندھنا پڑے تو میں دس شادیاں کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میرے برادر محترم کو سہرا باندھنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
طالوت کا اشارہ میری طرف تھا۔
"ایک کر دوں گی۔ جیتا نہیں چھوڑوں گی۔ ہائے، اب یہ بھی لکھا تھا تقدیر میں۔" بوا کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑی تیزی سے آ رہی تھیں۔ ہم سب الرٹ ہو گئے۔
"اور تم دیکھتے رہے۔ اے سیمیں بیٹی! ہائے، اب کس پر ناز کروں گی۔ تجھے بھی خیال نہ آیا۔"
"ارے اس جمشید کی ایسی تیسی۔ گیا کہاں وہ؟...... راسم! جمشید کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ آ! میرے ساتھ۔ غضب خدا کا، اُس سے مذاق میں یہ بات کہی تھی لیکن اس نے سچ مچ یہ حرکت کر ڈالی۔

آؤ!" طالوت نے میرا بازو پکڑا اور تیزی سے چل پڑا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ طالوت اس وقت وہاں سے پھوٹ جانا چاہتا ہے۔

ہم دونوں سیدھے اپنے کمرے میں آ گئے اور طالوت مسکرانے لگا۔

"بدمعاشی کی انتہا کر ڈالی ہے تم نے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور طالوت چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ "اس وقت وہاں سے بھاگے کیوں؟"

"بات غلط رُخ اختیار کر رہی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دماغ میں خرابی ہوئی ہے کچھ۔" طالوت نے آنکھیں نکالیں۔ "آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ سیمیں صاحبہ کے ذہن میں کیڑے کلبلا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا پروگرام کچھ اور ہے۔"

"اوہو..... تو..... تمہارا مطلب ہے......"

"جی ہاں۔ اگر سیمیں کا موڈ سب پر سوار ہو جاتا تو؟"

"لیکن اب کیا کرو گے؟"

"اپنی اپنی۔"

"کیا مطلب؟"

"بوژم داس! تم افشاں کو لے کر وہاں پہنچو اور میں شکیلہ کو لے کر۔"

"ہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "یار! اس معاملے میں بھی تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو۔"

"کس معاملے میں؟"

"شکیلہ کو ساتھ لے جانے میں تمہیں قباحت نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں سوچ رہا ہوں کہ افشاں نہ جانے کیا کہے۔ ممکن ہے، دقت پیش آئے۔"

"اب یہ تیری اور افشاں کی صلاحیت کی بات ہے۔ بہرحال زیادہ دیر نہیں ہونی چاہئے۔ یہاں کی پبلک کو بادلوں کا بخار چڑھتا جا رہا ہے۔ اگر زور دار ہو گیا تو سارا پروگرام خاک میں مل جائے گا۔"

میں نے فکرمندی کی گہری سانس لی۔ افشاں کو لے جانا خاصا مشکل کام تھا۔ بہرحال، کوشش کرنے میں حرج نہیں تھا۔ طالوت میری شکل دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچا؟"

"ٹھیک ہے یار! میں کوشش کروں گا۔"

"تب پھر جلدی سے ایک کام کرو۔" طالوت بولا۔

"ہوں..... کہو۔" میں نے کہا۔

"خاموشی سے شکیلہ کے پاس جاؤ اور اسے میرے پاس بھیج دو۔" طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ میں باہر نکل آیا۔ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ بچھڑا ہوا گروہ مل گیا۔ مجھے دیکھ لیا گیا اور سب میرے پاس پہنچ گئے۔

"یہ آپ لوگ کیوں فرار ہو گئے؟" سیمیں نے کہا۔

سوئم

''اوہ، راستے میں ہم نے پروگرام کینسل کر دیا۔''

''اوہ، کیوں؟''

''دراصل ہمیں آج ایک مصروف دن گزارنا ہے۔'' مجھ سے کوئی بہانہ نہیں بن پا رہا تھا۔

''گویا آج کے موسم سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔'' سیمیں نے مایوسی سے کہا۔

''ہاں، کچھ ایسی ہی مجبوری ہے۔''

''اور یہ جمشید صاحب کیا گھر چھوڑ کر بھاگ گئے؟''

''کیوں؟''

''سب جگہ اُنہیں تلاش کیا گیا لیکن اُن کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔''

''ممکن ہے، غریب باہر ہی چلا گیا ہو۔ ارے ہاں شکیلہ! ذرا بات سنو۔'' میں نے کہا اور دوسرے لوگوں سے معذرت کر کے ذرا دُور چلا گیا۔ شکیلہ میرے پاس آ گئی تھی۔ ''جہاں پناہ یاد فرما رہے ہیں۔''

''عادل صاحب؟''

''جی۔''

''اپنے کمرے میں ہیں؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا اور شکیلہ میری شکل دیکھ کر جھینپ گئی۔

''لیکن..... لیکن یہ لوگ؟''

''کانوں کان خبر نہ ہو ان لوگوں کو؟''

''اتنا آسان تو نہیں ہے۔ پلیز صائم بھائی! آپ ان لوگوں کو کسی طرح.....'' شکیلہ نے درخواست کی۔

''شیطانی ٹولی ہے۔ بہرحال میں کوشش کرتا ہوں۔ تم پہلے اپنے کمرے کی طرف جاؤ، پھر پچھلے راستے سے.....''

''جاؤں؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور شکیلہ دوسرے لوگوں کی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی!!! میں واپس ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔

''کیوں؟..... یہ مس شکیلہ کہاں چلی گئیں؟''

''آتی ہیں ابھی۔ ذرا کام سے گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویسے آج کا موسم جس طرح پٹ ہوا ہے، اس کا افسوس رہے گا۔''

''بوا کہاں گئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی غائب ہو گئیں۔ نہ جانے کہاں چلی گئیں؟''

''چلو سیمیں! پھر ہم اپنے طور پر ہی کوئی پروگرام بنائیں۔ یہ قوم آج نہ جانے کس موڈ میں ہے'' احسان نے کہا۔

''پروگرام کیا خاک بنائیں؟'' سیمیں بوریت سے بولی۔

''آؤ..... یہاں میرے کچھ دوست ہیں، ان سے ملیں گے۔'' احسان نے کہا۔

''آپ کیا کریں گی مس افشاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک سوچا نہیں۔'' افشاں نے کہا۔
''اچھا بھئی۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا اور سب منتشر ہو گئے۔ میں نے افشاں کو اشارہ کر دیا تھا اور چند منٹ کے بعد میں اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ افشاں میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔
''میں نہیں سمجھ سکی، یہ کیا ہو رہا ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولی۔''ارے، اندر آیئے۔ دروازے پر کیوں کھڑے ہیں؟'' اور میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔
''تشریف رکھئے۔'' افشاں بولی۔
''میرا خیال ہے، ہمیں یہاں نہیں بیٹھنا چاہئے۔''
''کیوں؟'' افشاں نے آنکھیں نکالیں۔
''اوہو، کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ پروگرام ہے۔''
''کیا؟''
''آپ کو بتانا ضروری ہے؟'' میں نے اُسے دیکھا۔
''کیا میں بھی اس پروگرام میں شریک ہوں؟'' افشاں نے پوچھا۔
''شریک کیا، پروگرام ہی آپ کے لئے ہے۔''
''تب پھر میرے لئے کوئی حکم تو ہو گا۔'' افشاں پیار بھرے لہجے میں بولی۔
''بس آپ تیار ہو جائیں۔'' میں نے کہا اور افشاں کھڑی ہو گئی۔
''لباس بدلنے کا حکم ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''بدل لیں۔''
''بہتر۔'' افشاں نے گردن ہلائی اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اُس نے ایک خوبصورت لباس نکالا اور ملحقہ باتھ روم کی طرف چل پڑی اس کے انداز اپنائیت پر میری روح خوشی سے جھوم گئی تھی۔ درحقیقت افشاں جیسی لڑکیاں زندگی میں روشنیاں بکھیر دیتی ہیں۔ میں مستقبل کی روشنیوں میں جھانکنے لگا اور پھر روشنی کمرے میں در آئی۔
''ٹھیک ہے۔'' روشنی کی آواز اُبھری اور میں چونک گیا۔ افشاں بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ میں نے تعریفی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور یہی اُس کے حُسن کو خراج تھا۔ الفاظ میں یہ تاثر کہاں، جس کا اظہار چہرے سے ہو۔
''چلیں؟''
''چلئے۔'' افشاں نے سکون سے کہا اور میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ طالوت یا تو ابھی نکلا نہیں تھا، یا پھر نکلا تھا تو اس نے کار ہمارے لئے چھوڑ دی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ طالوت خود کار لے جانا چاہتا ہو۔ میں کار لے جاؤں تو یہ خود غرضی نہ ہو۔ لیکن چوکیدار نے میری یہ مشکل حل کر دی۔ وہ قریب سے ہی گزر رہا تھا۔
''سنو!'' میں نے کہا اور وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا۔''عادل صاحب باہر گئے ہیں یا اندر ہی ہیں؟''
''ابھی تو باہر گئے ہیں صاحب!.....ان کے ساتھ بی بی بھی تھیں۔''

"اوہ!" میں نے گردن ہلائی اور پھر میں اطمینان سے کار میں آ بیٹھا۔ افشاں میرے برابر آ کر بیٹھ گئی اور میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔ افشاں نہ جانے کس خیال سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اسے مسکراتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"خیریت..... کون سا خیال ذہن میں رقصاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ صاحب کون سی بی بی کے ساتھ باہر گئے ہیں؟" افشاں نے پوچھا۔

"شکیلہ بی بی کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ آج پروگرام کیا بن گیا؟"

"بس، میں نے سوچا، کارپٹ سینٹر کے افتتاح کی منظوری لے لی جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ..... کس سے؟"

"اس کی اصل مالکہ سے۔"

"یعنی؟" افشاں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"افشاں خاتون سے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو صرف ایک کارکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مالکہ اپنے کاروبار کا جائزہ لے لیں۔ اگر وہ انتظامات سے، آرائش سے مطمئن ہوں تو پھر اس کے افتتاح کی تاریخ مقرر فرما دیں۔ اس کے علاوہ مکان کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ ممکن ہے، افشاں خاتون کو پسند نہ آئے۔"

"اوہو..... تو مکان بھی خرید لیا؟" افشاں نے پوچھا۔

"جی، یہ گستاخی بھی ہو گئی ہے۔"

"لیکن اپنا وعدہ یاد رہے گا نا؟"

"مجال ہے جو سرتابی ہو جائے۔"

"لیکن صائم صاحب! یہ سب کچھ آپ لوگ کس وقت کرتے ہیں؟ خاصے مشکل کام ہیں، لیکن....."

"بس ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تصدق بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا ہے۔ خوب کام کر رہا ہے۔"

"ہاں، انتظامی امور میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔" افشاں نے کہا۔ خوشی سے اُس کے چہرے پر چمک آ گئی تھی۔ وہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔ پھر کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔ "تو آپ نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا؟"

"حضور کے لئے تو بہت کچھ کرنا ہے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔ یوں تو..... یوں تو....." وہ جھجک گئی۔

"ہوں ہوں، کہہ دیں..... تکلف کیوں؟"

"یوں تو جہاں آپ ہوتے، مجھے وہاں جانے پر اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن یہ دوہری خوشی کی بات ہے کہ میں کہیں اور نہیں جاؤں گی۔"

"تمہاری یہ خوشی میری روح کو منور کر دیتی ہے افشاں!" میں نے کسی قدر جذباتی لہجے میں کہا۔

"میری خوش بختی ہے۔" افشاں نے کہا اور اس کے بعد ہم دونوں کافی دیر تک ان جملوں کے سرور میں کھوئے رہے۔ پھر افشاں بولی۔ "عادل بھائی کے لئے شکیلہ بہت مناسب ہے۔ میں بہت مسرور ہوں۔"

''ہاں۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔''
''وہ حضرات کہاں گئے ہیں؟''
''کارپٹ سینٹر۔'' میں نے جواب دیا۔
''ارے تو باقاعدہ پروگرام ہے؟''
''ہاں، صرف ہمارا۔ دوسرے لوگوں کو اس وقت ساتھ لانا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات
ں۔ سب کو اس وقت بلائیں گے، جب افتتاح کریں گے۔''
''بالکل ٹھیک ہے۔''
''ایک بات پوچھوں افشاں؟''
''ہوں، ضرور۔'' افشاں نے کہا۔
''میری یہ بے تکلفی ذہن پر بار تو نہیں بنی؟''
''کیسی باتیں کرتے ہو صائم!'' افشاں نے احتجاج کیا۔
''کوئی دوسرا تو اس بارے میں نہیں سوچے گا؟''
''میرا خیال ہے، جسے سوچنا ہوگا، سوچ چکا ہوگا۔ آپ نے کسی کے اندر کوئی تبدیلی محسوس کی؟''
''قطعی نہیں۔''
''سوچ سکتے ہیں تو صرف ابو یا امی جان۔ دونوں ٹھیک ہیں، سب کچھ ٹھیک ہے۔ ویسے ایک بات
ں؟''
''بتاؤ۔'' میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
''خطرہ اگر ہوسکتا تھا تو صرف جمشید بھائی سے۔ کیونکہ امی جان اپنے بھائی کو بہت چاہتی ہیں۔ ابو
ں ہمیشہ سے ناپسند کرتے ہیں لیکن وہ کسی معاملے میں امی جان کا دل نہیں توڑ سکتے۔ لیکن خدا بھلا
ے جمشید بھائی کا، کہ وہ قاعدے کے نہیں نکلے۔ ورنہ کچھ دُشواریاں پیش آسکتی تھیں۔''
''ہوں۔'' میں نے کہا ''ان حالات میں تو بڑی ماں سوچ بھی نہیں سکتیں۔''
''ہرگز نہیں۔ وہ تو جمشید بھائی کی آمد سے شرمندہ ہیں۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے۔''
''خیر، اُنہیں شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ خود ان کے والدین شرمندہ نہیں ہیں۔ جانتی ہیں،
ر جمشید یہاں کیوں آئے ہیں؟''
''اوہو، کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے آپ کو؟''
''جی۔'' میں نے کہا اور جمشید کے بارے میں پوری تفصیل بتا دی۔ افشاں کبھی ہنس پڑتی، کبھی سنجیدہ
جاتی۔ پوری کہانی سننے کے بعد وہ افسوس بھرے لہجے میں بولی۔
''افسوس ہے ماموں جان پر۔ ابو اُن سے نفرت کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اُن کی ذہنیت ہی خراب
ے۔'' افشاں نے کہا۔
''لیکن افشاں!.....اس لحاظ سے جمشید قابلِ نفرت نہیں ہے۔''
''ان بے چارے کا خود کوئی کردار ہی نہیں ہے، اور بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ شاداب ماموں
ہ اس ناکارہ بیٹے کے ذریعے اپنی گندی خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔''

''چھوڑو افشاں!..... بہر حال، وہ بزرگ ہیں۔ خدا انہیں عقل دے۔'' میں نے کہا۔
کار منزل پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے خوب صورت عمارت کے گیٹ سے اندر داخل کر دیا۔ چوکیدار جلدی سے آیا اور اس نے ادب سے سلام کر کے کار کا دروازہ کھول دیا۔
''عادل صاحب آ گئے؟''
''جی صاحب! اندر موجود ہیں۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔ اور میں اور افشاں آگے بڑھ گئے۔ افشاں بڑی متاثر نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔
''بہت خوب۔'' وہ شو ہال کی چوڑی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بولی۔ وسیع ہال میں چاروں طرف قالینوں کے شعبے بنے ہوئے تھے، جن میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ حسین ترین ڈرائنگ رُوم ترتیب دیئے گئے تھے، جن میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ دراصل یہ جدید ترین شوروم تھا، جس کا جواب پورے ملک میں ناممکن تھا۔
افشاں نے رُک رُک کر انہیں قریب سے دیکھا اور پھر تعریفی انداز میں گردن ہلائی۔
''کوئی ارشاد؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''صرف اتنا کہ میں نے بہت سے ممالک دیکھے ہیں، بڑے بڑے ملکوں کے تجارتی مراکز دیکھے ہیں۔ اب تک جو کچھ دیکھا ہے، وہ انتہائی معیاری ہے اور ہم اس شوروم کو بڑے سے بڑے غیر ملکی شوروم کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔''
''شکریہ نہیں ادا کروں گا، کیونکہ بس یہ معمولی سی کاوش ہے۔''
''آیئے، اوپر چلیں۔'' افشاں نے مسرت بھرے انداز میں کہا۔ اوپر کی منزل اسٹاک ہال تھی۔ چاروں طرف قالینوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ افشاں نے کافی دیر تک وہاں رُک کر قالینوں کی کوالٹی دیکھی، اور پھر ہم اوپری منزل کی طرف چل پڑے۔ یہ اسٹاف ہال تھا۔
اسٹاف نے باقاعدہ کام شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی کام ہو رہے تھے۔ کئی ممالک سے قالین درآمد کئے گئے تھے۔ ملکی طور پر بھی کافی اسٹاک خریدا گیا تھا۔ یہ سارے کام ہو رہے تھے۔ اسی ہال میں طالوت اور شکیلہ ملے۔ ہمیں دیکھتے ہی سارا اسٹاف کرسیاں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ تقریباً دس بارہ لڑکیاں تھیں اور ساٹھ کے قریب نوجوان اور درمیانی عمر کے لوگ۔ تصدق بھی تھا، لیکن سب سے زیادہ حیرت جمشید کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ جمشید صاحب بھی موجود تھے۔
بہر حال، طالوت نے پہلے آ کر یہاں کافی تیاریاں کر لی تھیں۔ اہم عہدوں کے لوگوں سے افشاں کا تعارف کرایا گیا اور پھر ہم اپنے آفس میں داخل ہو گئے۔ جمشید، تصدق وغیرہ ساتھ تھے۔
''خوب، جمشید صاحب! آپ کس وقت کھسک آئے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''اوہ مسٹر صائم! اُدھر پرانا عورت بہت خراب ہو گیا تھا، وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑتا۔ مسٹر ٹاساڈک بہت اچھا انسان ہے۔ ہم اکثر ان کے پاس آ جاتا ہے۔''
''بہت خوب۔ تو جب آپ گھر سے غائب ہوتے ہیں تو یہاں ہوتے ہیں؟''
''بالکل، بالکل۔ بٹ پلیز! آپ پرانا عورت کو یہ بات نہ بتا دیں۔''
''جمشید صاحب بے حد دلچسپ انسان ہیں جناب! بعض معاملات میں نہایت سلیقے کی اور مفید بات

کہہ جاتے ہیں۔'' تصدق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے۔ بہر حال کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آپ جب تک یہاں ہیں، جب دل چاہے، یہاں آ سکتے ہیں جمشید صاحب!'' طالوت نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ! ادھر آنٹی کا کوٹھی میں زیادہ اچھا نہیں لگتا۔'' جمشید نے کہا اور پھر سہمے ہوئے انداز میں افشاں کی طرف دیکھنے لگا۔

''اوہ، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی جمشید بھائی! آپ بے فکر رہیں۔'' افشاں جلدی سے بولی۔

سب لوگ بیٹھ گئے تھے۔ تصدق نے خاطر مدارات شروع کر دی۔ طویل و عریض آفس سے ملحقہ آرام کا کمرہ بھی تھا۔ وہیں پر ایک خوب صورت ڈائننگ ٹیبل بھی موجود تھی، دفتر میں لنچ وغیرہ کے لئے۔ بہر حال، میز بھر دی گئی اور ہم سب کافی پینے لگے۔ جمشید تو بے تکلفی سے شریک ہو گیا تھا، لیکن تصدق کو بھی خصوصی طور سے شریک کیا گیا۔ کھانے کے دوران قہقہے لگائے جاتے رہے۔ پھر تصدق سے گفتگو شروع ہو گئی۔ میں نے اس سے معلومات حاصل کی تھیں۔ پھر ہم اس کمرے سے نکل آئے۔

''اچھا مسٹر تصدق! اجازت دیں۔ اور ہاں، ٹیلی فونوں کے بورڈ مکمل ہو گئے؟''

''جی ہاں..... کل شام ہی کنکشن مل گئے تھے۔''

''ویری گڈ..... تب پھر شام تک تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ اطلاع ملتے ہی نیون سائن والوں کو اجازت دے دینا۔ کام نہایت پھرتی سے ہو۔''

''ایسا ہی ہو گا جناب!'' تصدق نے جواب دیا۔

''ہاں بھئی عادل صاحب! دوسرے پروگرام کی کیا رہی؟''

''چلئے صائم بھائی!'' طالوت نہایت شرافت سے بولا۔

''میں..... میں بھی چلوں؟'' جمشید نے کہا اور سب ہنس پڑے بھلا اب اُسے کون منع کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے اُسے ساتھ لے لیا۔ طالوت ٹیکسی سے یہاں تک آیا تھا۔ کار اُس نے ازراہِ اخلاق میرے لئے چھوڑ دی تھی، لیکن اس وقت ہم پانچوں ساتھ تھے۔

افشاں اور شکیلہ غیر معمولی طور پر خاموش تھیں اور ان کی خاموشی کو جلد ہی محسوس کر لیا گیا۔ ڈرائیونگ اس وقت طالوت کر رہا تھا۔

''ارے، یہ خواتین مراقبے میں کیوں ہیں؟'' میں نے کہا اور دونوں لڑکیاں چونک پڑیں۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور پھر شکیلہ بولی۔

''کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔''

''عام بات کیا ہے؟'' طالوت نے کہا۔

''عام بات بھی نہیں ہے۔'' شکیلہ ہنس پڑی۔

''تیسری قسم کون سی ہوتی ہے؟'' طالوت نے جھک کر رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا اور دونوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔

بھائی جمشید، اُردو کے مذاق کو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے وہ صرف متعجبانہ انداز میں ہم لوگوں کو ہنستا ہوا دیکھتے رہے۔ خود انہوں نے اخلاقاً بھی ہنسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''کیا بات ہے افشاں! یہ خاموشی کیوں ہے؟.....کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' اس بار میں نے افشاں کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شکیلہ باجی کے بارے میں تو میں کہہ نہیں سکتی، لیکن میں آپ کی اس فرم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''کیا؟'' طالوت نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جتنی خوب صورت، جتنی شاندار فرم آپ نے بنائی ہے، ملک میں شاذ ہی ہوگی۔ یوں تو یہاں بے شمار بڑی بڑی فرمیں ہیں، لیکن یہ اپنی طرز کی انوکھی فرم ہے۔ میں اسے دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی ہوں۔'' افشاں نے کہا۔

''شکریہ ادا کریں صائم صاحب!'' طالوت نے مسخرے پن سے کہا۔

''بہت بہت شکریہ افشاں!......اور شکیلہ خاتون! آپ بھی کچھ گل افشانی فرمائیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''تعریف سننا چاہتے ہیں صائم صاحب؟'' شکیلہ نے کہا۔

''جو کچھ آپ سنا دیں۔''

''میں اس فرم کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔''

''خوب.....پھر؟''

''بلکہ آپ دونوں پر غور کر رہی تھی۔ آپ کو جاننے کے بعد ایسی چیزوں پر حیرت نہیں ہوتی۔ مجھے معاف کرنا افشاں! میرے ساتھ جو حالات پیش آئے ہیں، وہ ایسے ہی تھے کہ ان دونوں کو میں جو کچھ بھی سمجھوں، کم ہے۔''

''مجھے احساس ہے شکیلہ!'' افشاں نے کہا۔

''بس یوں کہنا چاہئے، بعض اوقات محرومیوں کے سمندر میں، طوفان میں گھرے ہوئے انسان کو ایسا سہارا مل جاتا ہے، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر پاتا۔ اور جوں جوں اسے سہارے کی مضبوطی کا احساس ہوتا ہے، اس کی کیفیت انوکھی ہوتی جاتی ہے۔ اسے اپنے خواب میں کھوئے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور پھر یہ خوف اس کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔'' شکیلہ نے کہا۔

طالوت نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر رُخ بدل لیا۔ جمشید بھائی بدستور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پلّے ہی کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

کار کافی دُور نکل آئی تھی۔ اس وقت جس جگہ ہم جا رہے تھے، اس کے بارے میں صرف طالوت ہی کو معلوم تھا۔ باقی لوگ بے خبر تھے۔ جن میں، میں بھی شامل تھا۔ بہرحال ہم ایک نہایت ہی پُر فضا علاقے میں نکل آئے۔ اور پھر دُور سے ایک انتہائی خوش نما محل نظر آیا۔ دُور ہی سے عمارت کے حُسن کا اندازہ ہوتا تھا اور میں نے سمجھ لیا کہ یہی ہماری نئی رہائش گاہ ہے۔

کار طویل و عریض پھاٹک کے سامنے رُک گئی اور پھاٹک خود بخود اس طرح سمٹ گیا، جیسے ہمیں پہچان گیا ہو۔ کسی خاص ٹیکنیک کا پھاٹک تھا۔ طالوت کار اندر لے گیا۔ دو رویہ درخت لگائے گئے تھے فرش ہفت رنگ ٹائل کا تھا۔ تا حدِ نگاہ رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ میں خود بھی دنگ رہ گیا تھا۔ طالوت لے

یہاں کچھ زیادہ ہی رنگ دکھایا تھا۔ کوٹھی کی تعمیر میں راسم کا ہاتھ تھا اور راسم نے پرستان سے کوئی مکان لا کر یہاں نصب کر دیا تھا۔ اتنی حسین عمارت تھی کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ اور پھر جدید طرزِ تعمیر کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ایک ایک کونہ اعلیٰ فرنیچر اور ضرورت کی نہایت قیمتی اشیاء سے پُر تھا۔ دیکھ کر آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔

طالوت نے جلال آباد میں احسان کے لئے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی۔ نہایت حسین عمارت تھی۔ لیکن اس عمارت کے سامنے وہ کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ ہر کونہ اپنی جگہ ایسا مکمل تھا کہ بس تعریف کے لئے الفاظ کم ہو جاتے تھے۔ ہم سب سحر زدہ سے اس عمارت کو دیکھتے پھر رہے تھے۔

یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔

''صائم بھائی!'' طالوت نے مجھے آواز دی۔

''ہوں۔'' میں اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''لنچ نہیں کرائیں گے؟''

''یہیں کیا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اب کیا آپ اپنے مہمانوں کو باہر لے جائیں گے؟..... میرا خیال ہے، اب ہمارا کچن اتنا مفلس بھی نہیں ہے۔''

''تب پھر تم ہی تکلیف کرو۔'' میں نے کہا۔

''جو حکم۔'' طالوت بولا اور میں دونوں لڑکیوں اور جمشید کو لے کر ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ طالوت کچن کی طرف چلا گیا تھا۔ دونوں لڑکیوں پر سحر طاری تھا۔

''بھئی، یہ خاموشی کچھ جچ نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔ افشاں اور شکیلہ صوفوں پر بیٹھ گئی تھیں، جمشید دوسرے صوفے پر اور میں اُن کے برابر بیٹھ گیا۔

''کیا بولا جائے؟'' شکیلہ نے کہا۔

''کچھ تو بولیں۔''

''بس ہم خود کو اس مکان کی تعریف میں بے مایہ سمجھ رہے ہیں۔ الفاظ میں اس کی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے پیار بھری نگاہوں سے افشاں کو دیکھا۔

''میں کچھ معلوم کرنا چاہوں گی۔''

''ضرور، ضرور...... ارشاد؟''

''مکان کی آرائش کے لئے یہ سامان کہاں سے حاصل کیا گیا؟'' افشاں نے پوچھا۔

''یہ شعبہ عادل کا ہے۔ ویسے اتنا میں بتا سکتا ہوں کہ جو چیز جہاں سے مل سکی، امپورٹ کر لی گئی۔''

''غیر ملکی سامان ہے نا؟''

''تقریباً۔''

''چند روز میں تو یہ سب کچھ نہ کیا ہو گا؟''

''ظاہر ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، کافی دن سے اس شہر پر قبضہ جمانے کی کوششیں جاری تھیں۔'' افشاں نے کہا

اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میری جان میں جان آئی۔ افشاں کے ٹیڑھے سوالات نے مجھے کافی اُلجھا دیا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی شک پیدا ہو گیا ہے۔ ان سوالات کے مناسب جوابات میرے لئے خاصے مشکل تھے۔ لیکن شکر ہے، افشاں کے دل میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔

''ہاں، یہ تو درست ہے۔''

''بہر حال، میری طرف سے اس خوب صورت محل کی مبارکباد قبول فرمائیے۔'' افشاں نے کہا اور میں نے ایسی نگاہوں سے اُسے دیکھا کہ وہ جھینپ گئی۔ شکیلہ نے میری یہ شرارت دیکھ لی تھی اور وہ بھی زیر لب مسکرانے لگی۔

کھانے کا انتظام راسم نے کیا تھا، اس لئے حیرت کی گنجائش نہیں تھی۔ عظیم الشان ڈائننگ ہال کی لمبی میز انواع واقسام کے لوازمات سے بھری پڑی تھی۔

''توبہ ہے..... یہاں پوری بارات آرہی ہے کیا؟..... کیا یہ کھانا ضائع نہیں ہوگا؟'' شکیلہ نے کہا۔

''جب آپ خود یہ سارے انتظامات سنبھالیں تو جو کچھ خرابی ہے، ٹھیک کر لیں۔ ہم مردوں کو اس بارے میں کیا معلوم؟'' میں نے شکیلہ سے مسکرانے کا بدلہ لیا اور شکیلہ خاموش ہو گئی۔

کھانا گنجائش سے زیادہ ہی کھا لیا گیا اور پھر تھوڑی دیر آرام کی ٹھہری۔ جمشید صاحب، کباب میں ہڈی بن گئے تھے۔ چنانچہ ان کو ٹالنے کی ترکیب کی جانے لگی۔

''سنائیے مسٹر جمشید! اس دوران آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔''

''ہم یہ سب دیکھ رہا ہے..... ونڈرفل ہے۔'' جمشید نے کہا۔

''شکریہ۔''

''آپ سب ونڈرفل ہے۔''

''اس کا بھی شکریہ۔ ویسے آپ نے کیا سوچا؟''

''ہمارا لائف بھی ونڈرفل ہے۔ ہم کیا سوچے؟'' جمشید بولا۔

''اس کا بھی شکریہ۔'' طالوت نے کہا اور سب ہنس پڑے۔ ''ویسے تصدق سے آپ کی کیسی چھن رہی ہے؟''

''اوہ، وہ اچھا آدمی ہے۔''

''کیا اُس کی لائف بھی ونڈرفل ہے؟''

''میں نے اس کا لائف کے بارے میں نہیں پوچھا۔''

''اب آپ کا کیا خیال ہے؟''

''بس تھوڑے دن ادھر اور گزاریں گا اور پھر واپس چلا جائیں گا۔''

''مسٹر شیڈوب سے کیا بولیں گا؟'' طالوت نے پوچھا۔

''بولیں گا، اب وہ خود ٹرائی کرے۔'' جمشید نے برا سا منہ بنا کر کہا اور سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''ویسے تصدق کو آپ سے کچھ کام تھا جمشید صاحب!''

''اوہ، کیا کام تھا؟'' جمشید چونک کر بولا۔
''پتہ نہیں۔ جب ہم وہاں سے چلے تھے تو اس نے درخواست کی تھی کہ جمشید کو بھیج دیا جائے۔''
''اوہ، تب ہم جائے گا مسٹر صائم!''
''گاڑی اگر آپ چاہیں تو لیتے جائیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
''اوہ، نو.....نو..... اِدھر گاڑی چلانا آسان کام نہیں ہائے۔''
''اچھا..... کیوں؟''
''بس..... ادھر کا ٹریفک کا اصول ہمارا سمجھ میں نہیں آیا۔ جس کا جدھر دل چاہتا ہے، چلتا ہے۔ میں ٹیکسی سے چلا جائیں گا۔'' جمشید نے کہا۔ وہ اس قدر آسانی سے ٹل جائے گا، ہمیں یقین نہیں تھا۔ چنانچہ ہم اُسے بڑے خلوص سے باہر تک چھوڑنے آئے۔ اور جمشید کو ٹیکسی بھی مل گئی۔
''میں ذرا شکیلہ کے ساتھ عقبی پارک میں جا رہا ہوں۔ اُمید ہے تم محسوس نہ کرو گے صائم!'' طالوت نے کہا۔
''ٹھیک ہے، آؤ افشاں! ہم بیرونی پارک کا نظارہ کریں۔'' میں نے کہا اور طالوت مسکراتا ہوا شکیلہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔
میں افشاں کو لے کر خوب صورت کوٹھی کے ایک حصے کی طرف بڑھ گیا اور پھر اُسے بیڈ روم میں لے آیا۔ افشاں کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ بیڈ روم کی فضا انتہائی رومانی تھی۔ دیواروں پر حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ کچھ خوب صورت مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ سارے کے سارے نوادرات میں شمار ہوتے تھے۔
میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور افشاں کی طرف دیکھا۔ لیکن افشاں پُرسکون تھی۔ اور یہ اُس کے اعتماد کی اعلیٰ مثال تھی۔ میں مسکرانے لگا۔
''بیٹھو افشاں!'' میں نے کہا۔
''کہیں عادل ہمیں تلاش نہ کریں۔'' وہ شرمگیں انداز میں بولی۔
''نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔
''کیوں..... آپ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں؟''
''بھئی، وہ اپنے بیڈ روم میں ہوں گے اور شکیلہ اُن سے یہی بات کہہ رہی ہوگی۔''
''اوہ!'' افشاں ہنس پڑی۔ ''بڑے شریر ہیں آپ لوگ۔''
''واقعی؟''
''ہاں..... اور قابلِ رشک بھی۔''
''خوب۔ وہ کس لحاظ سے؟''
''میں نے دو بھائیوں میں ایسی بے تکلفی اور ایسی محبت نہیں دیکھی۔''
''اوہ، عادل بہت پیارا انسان ہے۔''
''اور آپ؟'' افشاں مسکرا کر بولی۔
''اپنے بارے میں فیصلہ کرنے والا میں کون ہوں۔''
''کیوں؟'' افشاں شرارت سے بولی۔

''میرے جملہ حقوق آپ کے نام محفوظ ہیں۔ کوئی برا کہے گا تو آپ کا مسئلہ ہے اور اچھا کہے گا تو آپ کو خوش کرے گا۔'' میں نے جواب دیا اور افشاں کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ ان الفاظ کے تاثر میں ڈوبی رہی اور اس کے چہرے کا رنگ گلابی سے گلابی تر ہوتا گیا۔

''افشاں!'' میں نے اُسے مخاطب کیا۔

''جی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟''

''آپ نے.....آپ نے اس حد تک خود کو میرے سپرد کر دیا ہے صائم صاحب!''

''شک ہے؟''

''نہیں۔''

''میں نے خود تو کچھ نہیں کیا۔ بس اچانک محسوس کیا کہ اب، اپنی زندگی کے کسی لمحے پر میرا اختیار نہیں ہے، میری سانسوں کا مالک کوئی اور بن گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے صائم صاحب؟'' افشاں کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

''عمل کی دنیا بے شک تلخ ہے افشاں! لیکن ہم انسان کمزور سے، نازک سے، مانندِ حباب، خود پر قید و بند کی لاکھوں پوششیں چڑھا لیتے ہیں۔ جب چہرہ کھول کر دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ خود کو چھپانے سے دنیا کا رنگ نہیں بدلتا۔ ہمارے سانس اتنے ہی نازک ہوتے ہیں، اتنی ہی آزادی کے طالب ہوتے ہیں جو ان کے لئے ضروری ہو۔ میرا مقصد ہے، ہم متاثر ہونے کے لئے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ یہی ہماری زندگی ہے اور یہی ہمارے لئے ضروری بھی ہے۔ ہاں، ہم زبان کو تابع کر لیں تو دوسری بات ہے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' افشاں نے آہستہ سے کہا۔

''تم مجھے چاہتی ہو افشاں؟''

''ہاں۔'' افشاں نے سادگی سے کہا۔

''کتنا؟''

''یوں سمجھیں کہ میں نے زندگی کے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ آپ کو میری بات پر اعتبار کرنا ہوگا۔ میں خود کو زندگی کی ضرورتوں سے الگ کا انسان ثابت نہیں کروں گی۔ ننھے ننھے جانوروں کو، یا کسی محبت کرنے والے جوڑے کو دیکھ کر کبھی کبھی میرے ذہن میں بھی محبت کا تصور اُبھرا۔ میری خواہش بھی ہوئی کہ میں اس رمز کو جانوں۔ میں تعلیم یافتہ ہوں، میں نے زندگی کے ان لمحات کے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ وہ افسانے ہی سہی، لیکن میں نے ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا، نہ ہی اُلجھے ہوئے لوگوں کی مانند خود کو ان سے مبرا سمجھا۔ لیکن میرے جذبات، میرے یہ احساسات کبھی شدید طلب نہ بن سکے۔ یوں سمجھیں کہ میں نے جب بھی ان کے بارے میں سوچا تو اپنی پسند کی تلاش میں بھٹکنے کا تصور میرے ذہن میں نہیں آیا۔ بس ایک آرزو دل کے نہاں خانے میں پوشیدہ رہی کہ کوئی ہو، کم ہو۔ اور صائم صاحب! آپ بھروسہ کریں، جب آپ پہلی بار نظر آئے تو میرے ذہن میں قطعی یہ تصور نہیں اُبھرا کہ آپ وہ ہیں، جو میری چاہت بن سکتے ہیں۔ بہت سی بار آپ کو دیکھا۔ جھوٹ نہیں بولوں گی، بہت سی بار آپ کے بارے میں سوچا۔ کبھی ہمدردی محسوس ہوئی اور کبھی بہت سا تلذذ آپ کے احساس سے

ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اور..... اور نہیں کہہ سکتی کہ کب ذہن کے گوشوں میں آپ جا چھپے۔ ہاں، جب آپ کی طرف سے اظہار ہوا تو اندر سے آواز اُبھری کہ میں بھی تو آپ کو چاہتی ہوں۔ اور پھر میں نے سوچا کہ اب اس چاہت کے درمیان ہوا کی دیوار بھی نہ رہے۔ تھوڑی سی اجنبیت کا تصور ذہن میں تھا، اس لئے اپنے جذبات کو عیاں نہ کر سکی۔ اور میرے خیال میں یہ موزوں بھی نہ تھا۔"

افشاں کی اس گفتگو پر میں دنگ رہ گیا۔ وہ اتنے صاف ذہن کی مالک ہوگی یا اس انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکے گی، میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

کافی دیر تک الفاظ کے سرور میں ڈوبا رہا۔ افشاں بھی گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ کچھ لمحات کے بعد اس نے گردن اٹھائی۔

"کیا سوچنے لگے؟"

"خوش بختی پر نازاں ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب بنائیں گے۔" وہ شرگیں انداز میں بولی۔

"نہیں افشاں! حقیقت کہہ رہا ہوں۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"ایک بات بتاؤ۔"

"جی۔"

"تمہارے ذہن میں کوئی تردّد نہیں ہے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"میرا مطلب ہے، گھر سے اس طرح چلے آنے پر۔"

"اور جب میں مستقل یہاں آ جاؤں گی تب؟"

"اوہ ہاں..... لیکن اس وقت تو سب کے علم میں ہوگا۔"

"ابھی سے ابتدا ہو جانی چاہئے۔" افشاں نے لاپروائی سے کہا۔

"سچ افشاں! کبھی کبھی تو ایک خوف کا سا احساس ذہن میں اُبھر آتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ اگر کبھی کوئی بات ہم دونوں کی راہ میں رکاوٹ بن گئی؟"

"سنو، تمہیں اپنی ذات کی مضبوطی پر اعتماد نہیں؟"

"ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کو کیسے دُکھاؤں گا جن کا سلوک میرے ساتھ اس قدر اچھا رہا ہو۔"

"صائم! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ نہ ہم کچے ذہنوں کے لوگ ہیں۔ اوّل تو کوئی ایسا موقع ہی نہیں آئے گا۔ آیا بھی تو میرا خیال ہے ہم اسے با آسانی ہینڈل کر سکتے ہیں۔ ان خیالات کو تم ذہن میں جگہ نہ دیا کرو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتائیے؟"

"جی۔"

''عادل بھائی کو ہمارے معاملات کا علم ہے؟''
''اگر ہو تو.....؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں۔ بس شرم آتی ہے۔'' افشاں نے کہا۔
''اور عادل بھائی کے معاملات کا جو آپ کو علم ہے تو.....؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
افشاں آہستہ سے ہنس پڑی پھر بولی۔ ''عادل بھائی، شکیلہ ہی سے شادی کریں گے؟''
''ظاہر ہے۔''
''آپ لوگوں کو اپنے والدین سے اجازت نہیں لینا ہوگی؟''
''میں تمہیں کسی حد تک حالات سے آگاہ کر چکا ہوں افشاں!..... والد صاحب، والدہ صاحبہ کے چکر میں ایسے اُلجھے ہیں کہ ہم سب کو بھول چکے ہیں۔ ریاست کے معاملات، عادل بھائی سنبھالیں گے، میرے لئے مکمل آزادی ہے۔ اس لئے میں مطمئن ہوں۔ یہ سارے معاملات، میرا مقصد کاروبار وغیرہ سے ہے، میرے لئے کئے گئے ہیں۔''
''آپ دونوں بھائی واقعی قابل رشک ہیں۔'' افشاں خاموش ہوگئی۔
آج کی یہ تنہائی درحقیقت یادگار تھی۔ جس سکون سے ہم دونوں نے بات چیت کی تھی، اس سے پہلے میسر نہیں ہوا تھا۔ افشاں بھی خوش تھی اور میں بھی مسرور تھا۔ یوں شام ہوگئی۔ اس دوران ایک بار بھی افشاں نے چلنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ تب میں نے ہی گھڑی دیکھی اور چونک پڑا۔
''ارے، چار بج گئے۔''
''ہاں..... کیوں؟'' افشاں مسکرائی۔
''چلیں گے۔''
''چلئے..... عادل! امی کو آواز دیں گے۔''
''ٹیلی فون کئے دیتے ہیں۔'' میں نے ریسیور اُٹھایا اور دوسرے کمرے میں عادل کو رنگ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس چل پڑے۔ طالوت بھی بہت خوش تھا۔ شاید یہ لمحات اس کے لئے بھی بڑے پُرسکون تھے۔ سیمیں اور احسان اگر کہیں گئے تھے تو واپس آ چکے تھے۔ اور گھر میں داخل ہوتے ہی ہم پکڑے گئے۔
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... اب یہ نوبت آ گئی ہے۔'' سیمیں نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا احسان! اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کہیں زیادہ قیام نہ کرو۔ ارے اگر ہمیں بھی ساتھ لے لیا جاتا تو کیا ہم تنہائی میں مخل ہوتے؟''
''چلو سیمیں! اب معاف بھی کر دو۔ نئے نئے جوڑے ہیں۔ ہمارا کیا ہے، ہم لوگ تو پرانے ہو گئے۔'' سیمیں اور احسان ہماری خوب کھنچائی کرتے لیکن اسی وقت بڑی ماں نکل آئیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہماری طرف ہی بڑھ آئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر رچی ہوئی پُرخلوص مسکراہٹ باعثِ سکون تھی۔
''کیا اجتماع ہے بھئی۔'' وہ مسکراتی ہوئی بولیں اور پھر چونک کر کہنے لگیں۔ ''ارے ہاں، آج تم دوپہر کے کھانے پر غائب تھے۔ جلال بھائی بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ بڑی بدمزگی رہی۔ سیمیں اور احسان بھی موجود نہیں تھے۔''
''اوہ، امی!..... بس اچانک پروگرام بن گیا۔ ابو کہاں ہیں؟'' افشاں نے پوچھا۔

''ٹیلی فون آیا تھا کہ پانچ بجے تک واپس پہنچ جائیں گے۔'' بڑی ماں نے کہا اور پھر بولیں۔ ''ارے جمشید تمہارے ساتھ نہیں ہے؟''

''وہ بھی آتے ہوں گے امی!'' افشاں نے کہا اور بڑی ماں نے گردن ہلائی۔

''شام کی چائے کا وقت ہونے والا ہے، تیار ہو کر پہنچ جاؤ۔'' بڑی ماں آگے بڑھ گئیں۔

''جی، اب بتایئے؟'' سیمیں نے کہا۔

''اونہوں، سیمیں! کپڑے تو تبدیل کر لو۔ جلدی کرو۔ شام کی چائے کا وقت ہو رہا ہے۔'' طالوت نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف مڑ گیا۔

''میں کہہ چکی ہوں، چھوڑوں گی نہیں۔'' سیمیں نے ہانک لگائی۔ لیکن ہم سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے میں آ گئے۔

''لطف آ گیا، خدا کی قسم! آج تو جی بھر کے باتیں ہوئیں۔'' طالوت مسرور لہجے میں بولا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر شرارت سے کہنے لگا۔ ''تمہارے چہرے پر بھی بے شمار چراغ جل رہے ہیں۔''

''جی ہاں، فانوس بنا ہوا ہوں۔''

''بی افشاں کو سسرال پسند آئی؟''

''یار طالوت! تم نے بہت کچھ کر ڈالا ہے، میں تم سے کیا کہوں؟''

''بس فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ آج رات بیٹھ کر یہ طے کرنا ہے کہ اب کارپٹ سینٹر کا افتتاح کب کرنا ہے۔ اور ہاں، اس سلسلے میں خوب صورت سے کارڈ بھی چھپوانا ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔

اس شام کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ سب لوگ نارمل تھے، سوائے سیمیں کے۔ جو بار بار ہم لوگوں کو گھورنے لگتی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں پیار بھری خفگی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

رات کو طالوت سے افتتاح کے سلسلے میں ضروری گفتگو ہوئی اور پھر ہم سب سو گئے۔

⊛

دوسرا دن چھٹی کا تھا۔ حالانکہ اس کوٹھی میں ملازم پیشہ کوئی بھی نہ تھا، لیکن چھٹی کا دن باقاعدہ منایا جاتا تھا۔ تنویر صاحب، نواب جلال الدین اور دوسرے تمام لوگ ناشتے کے بعد اُٹھ کر ایک کمرے میں آ بیٹھے اور دلچسپ گفتگو ہونے لگی۔ لیکن آج کے لئے کوئی دلچسپ پروگرام نہیں بن سکا۔ ہاں، جب ہم لوگ بزرگوں کو چھوڑ کر باہر آئے تو ایک عجیب وغریب منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

بوا اور جمشید کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ تقریباً سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''انہونی.....خدا کی قسم! انہونی۔'' احسان منہ پھاڑ کر بولا۔

''ارے مگر دیکھیں تو سہی، یہ آگ اور پانی یکجا کیسے ہو گئے؟'' طالوت نے کہا اور ہم سب بڑی بی اور جمشید کے گرد جمع ہو گئے۔

سب کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ بوا ہمیں دیکھ کر جھینپے ہوئے انداز میں مسکرانے لگیں۔

''ہائے کیا ہوا تم سب کو؟.....آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟'' بوا جھینپے ہوئے انداز میں بولیں۔

''بوا! انہیں پہچانتی ہیں؟ یہ جمشید ہیں۔''

''ہاں، ہاں سب پہچانتی ہوں۔ تم سب ہی ایک جیسے ہو۔ مجھ بڑھیا کو تماشا بناتے ہو۔ مجھے بہکا کر اسے پٹوا دیا۔ میری شکل تو اس کی دادی سے ملے ہیں۔'' بوا کہنے لگیں۔

''ارے واہ.....تو گویا آپ جمشید کی دادی بن گئیں؟''

''اے ہاں، ہاں.....تو کیا حرج ہے۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اب میں ایسی پتھر دل تھوڑی ہوں؟'' بوا ہمدردی سے بولیں اور ہم لوگوں نے گردن ہلائی۔ تو یہ بات تھی۔ لیکن جمشید، اس نے پھر ایک ایسی حرکت کر ڈالی تھی، جو اس کی اصلیت مشکوک کر دیتی تھی۔ ورنہ بڑی بی کو رام کرنے کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں تھا۔ بہرحال اس وقت اس پر تبصرہ نہیں ہوا۔ بس یونہی تفریحی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا گیا۔

رات کے پروگرام کے مطابق دوسری صبح ناشتے کی میز پر میں نے تنویر صاحب اور نواب جلال الدین سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ ظاہر ہے، طالوت تو اس معاملے میں نل (NIL) تھا۔

''میں چاہتا ہوں نواب صاحب! کہ اب اپنی فرم کا افتتاح کر دوں۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔''

''واقعی؟'' نواب صاحب کے بجائے تنویر صاحب اُچھل پڑے۔ انہوں نے اس انداز میں میری شکل دیکھی تھی، جیسے یہ بات بھی مذاق رہی ہو۔

''ہاں تنویر صاحب!......آپ لوگوں کی دعاؤں سے اور آپ لوگوں کی اجازت سے میں نے یہ

کاروبار پھیلایا ہے۔ جیسا کہ ہمارا پروگرام تھا، میں مستقلاً اس شہر میں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے چھوٹا موٹا کاروبار بھی کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ عادل کے تعاون سے میں نے یہ ادارہ قائم کر لیا اور اب مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ارے میاں! دعائیں ہی دعائیں، خدا کی قسم! بھرپور مبارکباد قبول کرو۔ میں تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا۔"

"خوش قسمت ہو تنویر! کہ تمہیں ان لوگوں کا قرب حاصل رہے گا۔ اور خوش نصیب ہے تمہارا شہر، جس نے ان کا دل موہ لیا۔ ورنہ اگر شہزادہ صائم قبول کرتے، یا شہزادہ عادل قبول کریں تو میں آج بھی پورا جلال آباد ان کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ اور تم جانتے ہو تنویر! میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"ہاں صائم بھائی! بہرصورت، واقعی مسرت کی بات ہے۔"

"ہم نے یہاں ایک مکان بھی تیار کرایا ہے۔" میں نے کہا۔

"تیار ہو گیا؟" تنویر صاحب مسرت سے بولے۔

"جی...... بالکل مکمل۔"

"بھئی میرا خیال ہے، اس سلسلے میں زیادتی ہوئی ہے۔"

"جی...... کیوں؟"

"بھئی مجھے تعمیرات وغیرہ کا بڑا تجربہ ہے۔ لیکن خیر اب تو ہو ہی گیا۔ تم اس کا معائنہ کب کرا رہے ہو؟"

"آج۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے..... واقعی؟"

"جی..... آج آپ سے بہت سے مشورے درکار ہیں۔ افتتاح کے لئے کارڈ چھپوا لئے گئے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ انہیں اپنے دوستوں میں تقسیم کرائیں گے، کیونکہ ہمارا یہاں آپ کے سوا کون ہے۔"

"یقیناً یقیناً..... یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں مہمانوں کا انتخاب کروں گا۔ جلال بھائی کے بھی کچھ دوست یہاں موجود ہیں۔ ارے واہ، عرصۂ دراز کے بعد ایک عمدہ تقریب ہو رہی ہے، لطف آئے گا۔ مگر صاحبزادے! کب تک کا پروگرام ہے؟"

"ہمارے ساتھ کام مکمل ہو چکے ہیں۔ بس کارڈز پر تاریخ درج کرنا ہے اور اس کا مشورہ آپ دیں گے۔"

"زیادہ سے زیادہ تین دن کا وقفہ رکھ لو۔" تنویر صاحب نے کہا۔

"مناسب۔" میں نے جواب دیا اور پھر ضروری امور طے ہو گئے۔

شام کو تنویر صاحب سر ہو گئے کہ کم از کم مکان دکھا دیا جائے۔ اور بالآخر ہمیں مجبور ہونا پڑا۔ گھر کے سارے لوگ گاڑی میں بھر کر چل پڑے۔ یہاں تک کہ بوا بھی ساتھ تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کوٹھی پر پہنچ گئے۔ خودکار دروازے سے اندر داخل ہوئے اور سب لوگوں کے چہروں سے وہی آثار ہویدا ہو گئے، جن کی توقع تھی۔

"خدا کی پناہ!...... خدا کی پناہ!" تنویر صاحب کے منہ سے نکلا۔ "یہ کوٹھی ہے۔" اور پھر تو سب کی

حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بڑی ماں بھی دنگ رہ گئیں۔ ایک ایک گوشے کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ ساری کوٹھی دیکھنے کے بعد سب ہال میں جمع ہو گئے۔ سب سے زیادہ مسرت نواب جلال الدین کے چہرے سے عیاں تھی۔

''کیا خیال ہے تنویر؟''

''بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں جل گیا۔'' تنویر صاحب بولے۔

''ہاہا...... بڑا خود کو ماہر تعمیرات سمجھتے تھے۔'' نواب صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں، اب ان جملوں پر شرمندہ ہوں۔''

''اوہ نہیں تنویر صاحب! خدا کی قسم، میں اب بھی آپ کے مشوروں کا طالب ہوں۔''

''میاں! تم نے ہمارے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ اب اپنی فرم بھی دکھا دو۔ نہ جانے تم نے وہاں کیا گل کھلائے ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے، آج کا دن اسی کوٹھی کو رونق بخشیں۔ وہاں تو چلنا ہی ہے۔''

''لیکن یہاں ملازمین وغیرہ کا تو بندوبست ہے ہی نہیں۔''

''ابھی اس کو استعمال کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔ اس لئے ابھی ملازمین کا بندوبست نہیں کیا۔''

''ارے تو یہ لڑکیاں کس کام آئیں گی؟..... چلو لڑکیو! کچن سنبھالو۔'' بڑی ماں نے کہا اور افشاں، شکیلہ اور سیمیں تیار ہو گئیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ کچن میں لایا تھا۔ موقع پاتے ہی میں نے افشاں سے کہا۔

''مبارک...... آپ تو وقت سے پہلے ہی......'' اور افشاں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا، جسے میں نے آہستہ سے چوم لیا اور باورچی خانے سے نکل آیا۔

شام تک گوناگوں دلچسپیوں میں وقت گزرا۔ سب بے حد خوش تھے۔ ہر ایک کوٹھی میں آزادانہ گھوم رہا تھا اور اس کی ایک ایک چیز کی تعریف کر رہا تھا اور پھر واپسی کی ٹھہری۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب ان دونوں سے صحیح معنوں میں مرعوب ہوا ہوں۔'' تنویر صاحب نے کوٹھی کے اندرونی دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' نواب جلال الدین تمسخرانہ انداز میں بولے۔ ''یعنی اس سے قبل ہماری باتیں بکواس تھیں؟''

''یہ بات نہیں جلال بھائی! ان کی شخصیت تو واقعی مرعوب کن تھی، جس کا میں نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان نوجوانوں کے سلیقے نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ کوٹھی بے پناہ قیمتی، بے اندازہ خوب صورت ہے لیکن اسے جس انداز سے آراستہ کیا گیا ہے، وہ مکینوں کی اعلیٰ صلاحیت اور اچھے ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ دولت تو بہت سے لوگوں کے پاس ہوتی ہے لیکن سلیقہ، اس کا دولت مندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے، مجھے تعمیرات سے کس قدر دلچسپی ہے لیکن ان لوگوں کے ذوق کے سامنے میں خاموش ہو گیا ہوں۔ بلاشک اس معاملے میں یہ مجھ سے زیادہ باصلاحیت ہیں۔''

''شکریہ، شکریہ!'' نواب جلال الدین خوش ہو کر بولے۔

ہم یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ ان لوگوں کو احساس نہیں تھا، لیکن ان کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ تنویر صاحب نے ابتدا میں ہمارے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ لیکن اس

معاملے میں ہم انہیں روزِ اوّل ہی سے بے گناہ سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے، ان حالات میں جو کچھ ہو سکتا تھا، وہی ہوا تھا۔ لیکن بات نواب جلال الدین کی تھی۔ اس شخص کے ساتھ طالوت نے بے شک بہت کچھ کیا تھا، لیکن جس انداز میں وہ احسان مند ہوئے تھے، یہ ظرف کی بات تھی۔ ورنہ اپنا کام نکل جانے کے بعد بہت کم لوگ یاد رکھتے ہیں۔ تنویر صاحب کی بات پر انہوں نے جس انداز میں ان کا شکریہ ادا کیا تھا، اس میں بناوٹ نہیں تھی اور یہ نواب جلال الدین کی بے پناہ اپنائیت کا ثبوت تھا۔ طالوت نے بھی اس تاثر کو دل سے قبول کیا تھا۔

''عارف!'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہوں!''

''سنا تم نے؟''

''نواب جلال الدین کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں!''

''بے حد نفیس انسان ہے طالوت! خدا کا شکر ہے، ہم نے ایسے اعلیٰ ظرف انسان کو بروقت ڈوبنے سے بچا لیا۔''

''ہاں۔ میں بھی بہت خوش ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کے لئے کچھ کر کے خوشی ہوتی ہے۔'' طالوت نے کہا۔ باہر آ کر ہم کاروں میں بیٹھ گئے اور کاریں چل پڑیں۔ راستے میں کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور ہم کوٹھی پہنچ گئے۔

سب لوگ بے حد خوش تھے۔ خاص طور سے بیگمات یعنی شکیلہ بیگم اور افشاں خانم۔ ان کے چہرے کھلے پڑ رہے تھے۔ افشاں نے پورا دن کوٹھی میں عجیب رنگ دکھایا تھا۔ وہ اس طرح ہر کام میں گھسی رہی تھی، جیسے گھر کی مالکہ ہو اور دوسرے سارے لوگ اس کے ہاں مہمان آئے ہوں۔ سب نے یہ بات محسوس کی تھی، لیکن افشاں دوسروں کی نگاہوں سے جان بوجھ کر انجان بنی رہی تھی۔

آج رات کے لئے کوئی پروگرام نہیں بنا اور سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ طالوت نے اور میں نے بھی اپنے کمرے کا رُخ کیا تھا۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے اور دونوں کو ایک ساتھ ہی اس خاموشی کا احساس ہوا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیئے۔

''کیا سوچ رہے ہو بھئی؟'' طالوت نے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو آج کے دن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ درحقیقت بہت اچھا دن گزرا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔''

''اور تمہاری افشاں بیگم نے تو اس گھر کو ابھی سے اپنا لیا ہے۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! وہ لڑکی ضرورت سے زیادہ ہی دلیر ہے۔ بعض اوقات تو میں اس کی دلیری سے گھبرا جاتا ہوں۔''

''مستقبل کے تصور سے؟''

''اوہ، نہیں۔ میرے لئے تو وہ کبھی بری نہیں رہے گی۔''

''اس قدر اعتماد ہے؟''

''ہاں طالوت! یوں تو میں تمہاری محبت کو ذہن کے گوشے گوشے میں محسوس کرتا ہوں۔ میری اس زندگی میں تمہاری موجودگی سے جو پھول کھلے ہیں، ان کی مہک نے میری زندگی بڑھا دی ہے۔ احسان اور شکریے کے الفاظ درحقیقت مجھے خود شرمندہ کر دیتے ہیں۔ لیکن افشاں کے بارے میں تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے لئے تو میں تمہارا حد سے زیادہ ہی ممنون ہوں۔''

''میاں! ہمارے ساتھ رہو گے تو یہی مزے رہیں گے۔ آئندہ بھی ہمارے مشورے پر عشق کرتے رہنا۔''

''نہیں طالوت! افشاں میری زندگی کی انتہا ہے۔''

''بہت خوب...... ماشاء اللہ!'' طالوت نے مسخرے پن سے کہا۔

''مذاق مت اُڑاؤ یار!'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''تم خوف زدہ کون سی دلیری سے ہو؟''

''بس یہی، وہ جس انداز میں دوسروں سے بے پروا ہو جاتی ہے، بعض اوقات وہ بے حد خوف ناک ہو جاتا ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا تھا کہ بہت سی نگاہیں اس کی نگرانی کر رہی تھیں۔''

''واقعی؟'' طالوت کسی خیال سے چونک پڑا۔

''ہاں۔ کیوں؟''

''تو اس میں برا کیا ہے؟'' طالوت نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''بس خوف محسوس ہوتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ جانا کسی طور مناسب نہیں ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ان لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری تو بڑی مشکل پیش آ سکتی ہے۔''

''میرا خیال ہے، یہ ناممکن ہے۔'' طالوت بولا۔

''کیوں...... ناممکن کیوں؟''

''بھئی تنویر صاحب تم سے بہت مرعوب ہیں اور پھر یہ حقیقت بھی ہے، انہیں تم سے بہتر داماد اور کون مل سکے گا؟''

''نہیں طالوت! بعض اوقات انسان معمولی بات کو بڑا مسئلہ بنا لیتا ہے۔''

''ارے تو طالوت مر تو نہیں گیا۔ بنا کر دیکھیں مسئلہ۔ ابھی انہوں نے صرف ہمارا پیار دیکھا ہے۔ اور پھر یار! تمہاری افشاں بیگم اتنی بدھو بھی نہیں ہیں۔''

''وہ بے حد خودسر ہے۔ لیکن بہرحال، ان کی اولاد ہے۔ وہ اسے مجبور بھی کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''انتہائی احمقانہ گفتگو فرما رہے ہیں آپ۔ اب یہ بتائیے کہ فی الحال میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ یا پھر سنو!'' اچانک طالوت چونک پڑا۔

''ہوں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''افشاں سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟''

''اس وقت کیوں؟''

''یا پھر تم دوسرے لوگوں کے خیالات بھی معلوم کر سکتے ہو۔''

''کس طرح طالوت؟''
''ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر۔''
''اوہ.....مگر؟''
''تمہارے لئے اس وقت یہی بہتر ہے۔'' طالوت نے کہا اور پھر اس نے راسم کو آواز دی اور راسم اس کے سامنے حاضر ہو گیا۔ ''راسم! ذرا اپنی انگوٹھی دے دو۔ تمہیں واپس کر دی جائے گی۔'' طالوت نے کہا اور راسم نے تعمیل کی۔ طالوت نے انگوٹھی میری طرف بڑھا دی۔ ''لے بھائی! جا عیش کر۔''
''اوہ.....تو کیا؟''
''ہاں۔ اسے پہننے کے بعد تمہارا کوئی وجود نہیں رہے گا۔ خود کو صرف ایک ہوا سمجھنا۔ جس سوراخ سے چاہو گے، اندر داخل ہو سکو گے۔ باہر نکلنے میں بھی کوئی دقت نہ ہوگی۔ لیکن اسے صرف ایک رات کا اُدھار سمجھو۔''
''بہت بہت شکریہ طالوت!'' میں نے کہا اور انگوٹھی پہن لی اور اس کے بعد میں نے طالوت کی بات کا عملی تجربہ بھی کر لیا۔ میں دروازے سے باہر نہیں نکلا تھا، بلکہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں روشندان سے باہر نکل کر دیکھوں۔ اور اچانک مجھے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ میں باریک ذرّات کے مانند ہوا میں منتشر ہو گیا اور دوسرے لمحے میں نے خود کو روشندان سے باہر پایا۔ دوسرے لمحے میں اسی طرح زمین پر اُتر گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ سب سے پہلے میں نے تنویر صاحب کے کمرے کا رُخ کیا تھا۔
تنویر صاحب، خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ یوں ان کی خواب گاہ میں داخل ہونا بداخلاقی تھی۔ لیکن اس وقت.....اس وقت میں ہر بداخلاقی کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روشندان کے ذریعے ہی میں اندر داخل ہوا۔ بڑی ماں اور تنویر صاحب جاگ رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔
''ایک بات کہوں تنویر؟'' بڑی ماں اچانک بولیں۔
''ہوں!''
''کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
''پھر بھی؟''
''کہا نا، کوئی خاص نہیں۔''
''مجھ سے چھپاؤ گے؟'' بڑی ماں پیار بھرے انداز میں بولیں۔
''کوئی چھپانے کی بات تو نہیں ہے۔''
''پھر کہہ کیوں نہیں دیتے؟''
''بس میں ان لوگوں کے مکان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''
''اوہ! میں بھی اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔'' بڑی ماں جلدی سے بولیں۔
''لیکن تمہاری اور میری سوچ میں فرق ہے۔'' تنویر صاحب عجیب سے انداز میں بولے اور میرا دل دھڑک اُٹھا۔ میں اس اتفاق پر متحیر رہ گیا کہ میرے سامنے ہی یہ گفتگو شروع ہوئی۔

''کیا فرق ہے؟..... تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''تم کیا سوچ رہی تھیں؟'' تنویر صاحب نے پوچھا۔

''نہایت خوب صورت حویلی ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماشاءاللہ! میرا خیال ہے، پورے شہر میں اپنی مثال آپ ہوگی۔''

''خیر، مالی حالت کے بارے میں تو کچھ نہ کہو۔ جلال بھائی ان لوگوں سے اتنے متاثر ہیں کہ پورا جلال آباد ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ اور بیگم صاحبہ! اس دور کے حالات آپ خوب سمجھتی ہیں۔ خدانخواستہ میں جلال بھائی کو لالچی یا خوشامد پسند انسان نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ جو بات منہ سے نکالتے ہیں، اسے پورا بھی ضرور کرتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ کل اگر صائم یا عادل ان سے جلال آباد طلب کریں تو وہ بلا چوں و چرا اسے ان کے حوالے کر دیں گے۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں لیکن بیگم! یہ جذبہ بلاوجہ تو نہیں پیدا ہوتا۔''

''ہاں..... یقیناً۔''

''انہوں نے جلال بھائی کے لئے کوئی ایسا ہی کام کیا ہے کہ جلال بھائی اس حد تک آمادہ ہیں۔ ورنہ کوئی غریب آدمی کو تو کچھ دے دے۔ یقیناً ایسی پیشکش اپنے سے بڑے انسان کو کی جاسکتی ہے، جس کی نگاہ میں ایسے چھوٹے چھوٹے جلال آبادوں کی کوئی وقعت نہ ہو۔ اور پھر بہرحال، انہیں کسی ریاست کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ مان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ شہزادے وغیرہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو تنویر؟'' بڑی ماں نے اُلجھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ یہ تو تمہاری بات کا جواب تھا۔ بے شک وہ بے پناہ دولت کے مالک ہیں اور نہ جانے کیا کچھ حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاستیں یونہی نہیں ہوتیں۔''

''اُفوہ! بات پھر وہیں آگئی۔ میں کہہ رہی ہوں، تم کیا سوچ رہے تھے؟''

''بڑی نازک بات ہے بیگم! کہیں تم عورت پن کا ثبوت نہ دے جاؤ۔''

''ارے، یہ تم میری طرف سے اتنے بدظن کیسے ہو گئے؟'' بڑی ماں نے چونک کر پوچھا۔

''تم جانتی ہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہارے اوپر مکمل اعتماد کیا ہے لیکن تم بھی تو جہاندیدہ ہو۔ تم نے خود کو اس طرح بے نیاز کیوں کر لیا ہے۔ کیا تم نے کچھ نہیں محسوس کیا؟''

''آخر کیا؟''

''مجھے بولنا ہی پڑے گا۔ میں ان لوگوں کی شرافت اور جنابت پر یقین رکھتا ہوں لیکن چند باتوں کا اعتراف بھی کرتا ہوں۔ وہ بے حد حسین اور پُرکشش ہیں۔ ہر لحاظ سے انتہائی شریف، ہنس مکھ، دولت مند۔ کیا ان میں سے کوئی بھائی کسی لڑکی کی آنکھوں کا خواب نہیں بن سکتا؟''

''خدا کے واسطے، جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟''

''تم ایک ایسی بات میرے منہ سے کہلوانا چاہتی ہو، جو ایک باپ کی زبان سے زیب نہیں دیتا۔ لیکن کیا تم نے افشاں کا جھکاؤ صائم کی طرف نہیں دیکھا؟'' تنویر صاحب نے کہا اور پھر بیگم صاحبہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''کیا مطلب؟..... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''صائم بھی اس کی طرف مائل ہے۔'' تنویر صاحب نے کہا اور میرا دل جیسے بند ہونے لگا۔ بیگم صاحبہ متحیرانہ نگاہوں سے تنویر صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ بالکل خاموش رہیں اور پھر بولیں۔

''تم نے کیسے اندازہ لگایا تنویر؟''

''اس سے قبل کئی بار محسوس کیا تھا، لیکن آج میں نے افشاں کے چہرے پر بہت سے رنگ دیکھے ہیں۔''

''مثلاً؟''

''اُس مکان میں وہ اس قدر خوش رہی کہ سب کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی تھے، لیکن افشاں جس طرح ہر معاملے میں پیش پیش تھی، اسے تم نے محسوس نہیں کیا بیگم؟''

''خوش تو خیر سب ہی تھے، کیا تم نہیں تھے؟''

''ہاں، لیکن.....''

''دونوں بچے اس قدر مخلص اور ہنس مکھ ہیں کہ سبھی ان سے محبت کرنے لگے ہیں۔ افشاں اندر باہر سے یکساں ہے، ایسا تو نہیں ہے، یہ صرف اس کا خلوص ہو اور کوئی بات نہ ہو؟''

''ہم اپنی عمر اور اپنے تجربے کو نظرانداز نہیں کر سکتے بیگم!'' تنویر صاحب بولے اور بیگم پھر سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر کافی دیر کے بعد جیسے کسی گہری فکر سے آزاد ہو گئیں۔

''سنو تنویر!.....ارے سنو! ہم نے اس سے پہلے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔''

''کس انداز میں؟'' تنویر صاحب بولے۔

''افشاں کو پوری زندگی تو بٹھا نہیں رکھو گے۔ ٹھیک ہے، وہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے لیکن بہرحال اس کے لئے کوئی نہ کوئی انتخاب تو کرنا ہی ہوگا۔''

''پھر؟'' تنویر صاحب کے لہجے میں کھردراپن آ گیا۔

''صائم برا لڑکا ہے کیا؟''

''سوچنے لگیں نا عورتوں کے سے انداز میں۔'' تنویر صاحب ناک سکوڑ کر بولے۔

''کیوں، غلط سوچ ہے کیا؟''

''ہاں، غلط ہے۔'' تنویر صاحب کا لہجہ پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا۔

''کیوں؟.....آخر کیوں؟''

''کیا ہو گیا ہے بیگم! یہ کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔''

''میں پوچھتی ہوں، آخر کیوں؟......کیا خرابی ہے صائم میں؟''

''کون نالائق کہتا ہے کہ وہ خراب ہے۔ لیکن وہ لوگ کتنے عرصے سے ہمارے ساتھ رہ رہے ہیں۔''

''تو پھر اس سے کیا؟''

''کیا ہم نے ان دولت مند نوجوانوں کو اسی لئے گھر میں رکھا تھا کہ بالآخر ان میں سے کسی کو داماد بنا لیں اور اس طرح مزید دولت مند بن جائیں۔ کیا افشاں ایک ایسے باپ کی اولاد ہے جو مجبور، لاچار اور بے کس ہے۔ وہ اپنی اولاد کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اپنے لئے کسی دولت مند شوہر کا بندوبست کرے۔ کیا تنویر اتنا ہی بے غیرت ہے۔ سنو بیگم! اگر صائم ایک غریب اور مفلوج الحال نوجوان ہوتا اور اتنا ہی

شریف اور سعادت مند ہوتا، جتنا وہ ہے تو میں اسے بخوشی اپنا داماد بنا کر اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا، اس وقت مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ لیکن شہزادہ صائم مجھے اس لئے قبول نہیں ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ صاحبِ حیثیت ہے۔ میں دنیا کے سامنے سر اُٹھا کر رہنا چاہتا ہوں۔''

''سوچ لو تنویر!...... افشاں خود سر ہے۔'' بیگم صاحبہ تشویش سے بولیں۔

''کتنی ہی خود سر کیوں نہ ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں بہت کم معاملات میں بولتا ہوں۔ لیکن اپنی آواز کی اہمیت سمجھتا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں۔ کل سے آپ افشاں پر کچھ پابندیاں عائد کریں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں کو احساس ہو سکے۔ لیکن اپنے طور پر آپ افشاں کو اس طرف بڑھنے سے روکیں۔''

''میں کوشش کروں گی۔'' بیگم صاحبہ نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا اور دونوں خاموش ہو گئے۔

میرا دل خون ہو گیا تھا۔ جو خدشہ تھا، وہ سامنے آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے تھے، سر چکرا رہا تھا، آنکھوں کے نیچے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ بمشکل تمام میں نے خود کو سنبھالا اور وہاں سے نکل آیا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے، زبان خشک ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا، جیسے افشاں مجھ سے چھن گئی۔ ایک بار پھر میں ویرانے میں جا کھڑا ہوا تھا۔

اسی حالت میں، میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ طالوت آرام سے لیٹا تھا۔ میں نے انگوٹھی اُتاری اور مسہری پر گر پڑا۔ طالوت جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے میری طرف آیا تھا اور پھر میری شکل دیکھ کر وہ اُچھل پڑا۔

''ارے، ارے.... کیا ہوا عارف؟..... کیا ہو گیا؟'' اس نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہوا طالوت!..... بہت برا ہو گیا طالوت!'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ابے کیا ہوا احمق بھائی! منہ سے تو پھوٹ۔''

''وہی، جس کا خدشہ تھا۔'' میں گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''عارف!'' طالوت غرّایا۔ ''کیا میں اس پورے مکان کو آگ لگا دوں؟ اگر تم نے مجھے ایک منٹ میں سب کچھ نہ بتایا تو ابھی یہ پورا گھر شعلوں کی لپیٹ میں ہو گا۔ ایک ایک چیز خاکستر کر دوں گا۔ تنویر صاحب، فقیروں کی صف میں کھڑے ہوں گے۔'' طالوت کا لہجہ بے حد خوف ناک تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، مجھے اس لہجے سے بڑی تقویت ملی۔ ہاں! میرا ایک بہت بڑا ہمدرد موجود تھا، جو حالات بدلنے کی قوت رکھتا تھا۔ بہرحال، میں نے رُندھی ہوئی آواز میں اسے پوری تفصیل بتا دی۔

''لعنت ہے تم پر۔'' طالوت غرّایا۔

''کیوں؟'' میں نے احمقوں کی طرح منہ کھول دیا۔

''یہ اس قدر گھبرانے کی بات ہے؟''

''مگر تنویر صاحب کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ کل سے وہ اُلوؤں کی طرح کوکتے پھریں گے اور درختوں پر رہنے کی کوشش کریں گے۔'' طالوت نے سفاک لہجے میں کہا اور مجھے تصدق کی دُم یاد آ گئی۔ میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔ ''ط...

ہوگا، جو میں کہہ رہا ہوں۔"
"نہیں طالوت! ہم کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے۔"
"اوّل نمبر کے گدھے ہیں آپ۔" طالوت برا سا منہ بنا کر بولا۔
"تم سنجیدگی سے سوچو طالوت!"
"فضول بکواس مت کرو، عارف!.....دل چاہ رہا ہے، یہ گلدان اُٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں۔ ارے تم نے مجھے اتنا بے حیثیت اور مجبور سمجھا ہے کہ ایک بے وقوف انسان کو سیدھا نہ کرسکوں؟"
"مگر ہمارا ضمیر اس کی اجازت دے گا؟"
"میں بے بس نہیں ہوں۔ بے شمار طریقے ہو سکتے ہیں۔ مجھے تو تمہاری حالت پر غصہ آرہا ہے۔"
"اوہ!" میں نے طالوت کی طرف دیکھا۔ طالوت کی باتوں نے مجھے کافی ڈھارس دی تھی۔ بہر حال اس وقت میں ایک زخمی فاختہ کے مانند تھا، جسے باز کا خطرہ ہو۔
"ہاں۔ کہہ چکا ہوں، وہی ہوگا، جو ہم چاہیں گے۔ سینکڑوں طریقے ہیں۔"
"مگر میں اب کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔
"تم......" طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔ چند ساعت خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔ "ابھی اور اسی وقت افشاں کے پاس جاؤ۔"
"اوہ.....اس وقت؟" میں نے گھبرا کر کہا۔
"ہاں۔ اسی وقت۔ ڈرتے کیوں ہو؟ وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوگی۔"
"لیکن....."
"ابھی اور اسی وقت جاؤ گے تم اور افشاں سے یہ پوری گفتگو دہراؤ گے۔" طالوت نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"مگر اس سے فائدہ؟"
"اس سے پوچھو کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے اور وہ اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہے؟"
"وہ بھی پریشان ہو جائے گی؟"
"آج نہیں تو کل ہوگی۔ اسے بے خبر کیوں رکھتے ہو؟ اور پھر یہ ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ اسے اپنے والدین کے خیالات سے بے خبر نہیں رہنا چاہئے۔" طالوت کی دلیل وزن دار تھی۔ میں افشاں کی خواب گاہ میں پوشیدہ رہ کر بھی جا سکتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے افشاں بھی کیا سوچے۔ بہر حال، طالوت کا مشورہ بھی بے وزن نہیں تھا۔ چنانچہ میں تیار ہو گیا اور پھر میں دوبارہ انگوٹھی پہن کر باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں افشاں کے کمرے کے دروازے پر تھا۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری اور پھر تیسری دستک دینے پر اندر روشنی ہوگئی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر افشاں کی آواز آئی۔
"کون؟"
"دروازہ کھولو افشاں! میں ہوں۔" میں نے سرگوشی کی اور افشاں نے میری سرگوشی پہچان لی۔ دوسرے لمحے دروازے کی چابی گھ ے ں آواز سنائی دی اور میں نے جلدی سے انگوٹھی اُتار لی۔ دروازہ

کھل گیا۔ میری آواز پہنچ گئی تھی۔ افشاں شب خوابی کے لباس میں تھی۔
''روشنی بجھاؤ افشاں!.....پلیز، روشنی بجھا دو۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔
''اندر آجایئے۔ کیا بات ہے؟'' افشاں نے حیرت سے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ افشاں نے تیز روشنی گل کر دی تھی۔ البتہ اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔
''افشاں! اس وقت اس طرح آنے پر میں سخت شرمندہ ہوں۔ درحقیقت یہ بڑی غیر شریفانہ حرکت ہے۔ براہِ کرم، تم.....تم میری نیت پر کوئی شک نہ کرنا۔'' میں نے لرزتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''ارے، ارے.....آپ مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔'' افشاں نے شرمندہ لہجے میں کہا اور پھر دوبارہ روشنی کر دی۔ ''آپ آرام سے بیٹھیے۔ ہم چوروں کی طرح باتیں نہیں کریں گے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''
''خدا کے لئے افشاں!.....خدا کے لئے۔'' میں گھگھیایا۔
''آپ خود کو اس انداز میں پیش کر کے براہِ کرم مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بیٹھیے تو سہی۔ میرا، آپ کا رشتہ وقتی نہیں ہے اور نہ میں کسی سے خوف زدہ ہوں۔''
''قیامت آجائے گی افشاں! بہت برا ہو جائے گا، اگر.....''
''نہیں آئے گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کے لئے کافی بنواتی ہوں۔'' افشاں دیوار کی طرف بڑھی۔ شاید وہ گھنٹی بجا کر ملازمہ کو بلانا چاہتی تھی لیکن میں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔
''افشاں پلیز! اس وقت کافی نہیں پیوں گا۔'' میں درحقیقت خود کو احمق محسوس کر رہا تھا۔ میں مرد ہو کر اتنا خوف زدہ تھا، لیکن افشاں کو کوئی پروا نہیں تھی۔
''آپ کی مرضی۔ مگر پانی ضرور پئیں اور مجھے بتائیں، اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟'' افشاں نے مجھے کولر سے پانی بھر کر دیا اور میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ ''کمال ہے۔ میں نے آپ کو اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا۔'' افشاں نے اپنے رومال سے میری پیشانی کا پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے بالکل نزدیک کھڑی تھی۔ اور پھر اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''براہِ کرم اپنے ذہن سے سارے خدشے نکال دیں۔''
''افشاں!'' میں نے گہری سانس لی۔
''آپ اپنا انداز بدل دیں، ورنہ میں رو پڑوں گی۔ کس کی مجال ہے، جو آپ کی یہ حالت بنا سکے میں اُسے شوٹ کر دوں گی اور خودکشی کر لوں گی۔'' افشاں جذباتی لہجے میں بولی اور میں دیوانوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔
''دراصل افشاں! مجھ سے کئی غیر اخلاقی حرکتیں سرزد ہو گئی ہیں۔''
''میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور اگر کچھ ہوا بھی ہے تو غلطی ہر انسان سے ہو سکتی ہے۔ مجھے آپ پر ہر طرح اعتماد ہے۔''
''خدا کی قسم افشاں! تم بے حد عظیم ہو۔''
''اب وہ بات بتایئے جناب! جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں۔'' افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آج کوٹھی میں تمہاری بے تکلفی سے مجھے خطرہ تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کے چہروں پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ کسی اور کی تو مجھے پروا نہیں تھی، لیکن تنویر صاحب اور بڑی ماں کی طرف سے میں فکرمند تھا اور میں نے چھپ کر ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔''

''اوہ! اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ پھر کیا ہوا؟''

''وہ لوگ ہمارے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔''

''شریف لوگ ہیں۔ کیا کہہ رہے تھے؟'' افشاں کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں پیدا ہوا۔ اور میں نے اُسے پوری گفتگو سنا دی۔ افشاں نہایت سکون سے سن رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا تو اس نے میری طرف دیکھا۔ ''جی..... پھر کیا ہوا؟''

''بس، اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا..... پھر کیا ہوا؟'' افشاں شرارت آمیز لہجے میں بولی اور میں خجل نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا اور افشاں ہنس پڑی اور پہلی بار مجھے ہلکا سا غصہ آ گیا۔

''گویا آپ کی نگاہ میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا؟'' میں نے اوپری ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''میرے خیال میں تو نہیں۔'' افشاں شانے ہلا کر بولی۔

''افشاں! براہِ کرم سنجیدہ ہو جاؤ۔ تم میری حالت دیکھو۔ میں تو..... میں تو....'' میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

''آپ کہہ رہے ہیں تو سنجیدہ ہو جاتی ہوں۔ ورنہ اس میں سنجیدہ ہونے کی کوئی بات تو نہیں ہے۔'' افشاں نے درحقیقت سنجیدگی سے کہا۔

''گویا...... گویا تمہاری نگاہوں میں تنویر صاحب اور بڑی ماں کی اس گفتگو کی کوئی وقعت نہیں ہے؟''

''ان دونوں کی تو بے انتہا وقعت ہے۔ آخر وہ میرے والدین ہیں۔ لیکن ہر انسان غلط سوچ سکتا ہے۔ اگر اس بارے میں وہ غلط سوچنے لگے تو انہیں معاف بھی کیا جا سکتا ہے، سمجھایا بھی جا سکتا ہے یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''افشاں!..... افشاں! تم بے حد مضبوط اعصاب کی مالک ہو۔'' میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''پلیز صائم! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔'' اور میں نے سر اُٹھا کر افشاں کو دیکھا۔ ''میرے اوپر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا؟'' اُس نے گردن جھکا لی۔

''نہیں افشاں! یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''اب تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں تنویر صاحب اور بڑی ماں کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ اگر ان کی نگاہوں سے گر گیا تو..... تو بے حد دُکھ رہے گا۔'' میں نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ خود ہی نادانی کریں تو کسی کا کیا قصور؟'' افشاں سنجیدگی سے بولی۔

''شکریہ افشاں! اب مجھے اجازت دو۔''

''سکون سے سو جائیں۔ خوب گہری اور آرام کی نیند۔ دیکھیں تو آنکھیں کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔'' افشاں نے جرأت کر کے میری آنکھوں کے پپوٹوں پر اُنگلیاں پھیریں۔ اُس کی ہتھیلی میرے ہونٹوں سے ٹکرائی۔ شاید اسی لمس کی تلاش میں، جو ہماری نئی کوٹھی کے کچن میں اُسے ملا تھا۔

لیکن اس وقت میری پوزیشن ٹھیک نہیں تھی۔ میں مکمل حواس میں بھی نہیں تھا، اس لئے میرے سرد ہونٹ، اس ہتھیلی کو بوسہ نہ دے سکے۔

''خدا حافظ!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''خدا حافظ!......وعدہ کریں، سکون سے سوئیں گے۔'' افشاں مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

''ہاں وعدہ۔ لیکن.....''

''صبح کو چند ایکٹ کا ایک ڈرامہ ہوگا۔ ناشتے پر میں نظر نہ آؤں تو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میرا خیال ہے، امی اور ابو کے لئے ایک ہلکا سا ڈوز ضروری ہے۔''

''اوہ!'' میں نے گردن ہلائی اور پھر دوبارہ خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ تیز روشنی، افشاں کے دروازے سے نکل رہی تھی اور دیکھ لئے جانے کا خطرہ زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بہرحال، فوری طور پر ایک ستون کی آڑ میں ہوکر میں نے انگوٹھی دوبارہ پہن لی اور خدا خدا کر کے اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔

طالوت ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کے تاثرات تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''خدا کا شکر ہے، چہرے پر نحوست نہیں برس رہی۔ ملاقات ہوئی؟''

''ہاں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا حالت ہے موصوفہ کی؟''

''یار! لگتا ہے، میں ہی کچھ سنک گیا ہوں۔ باقی سب تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''ایسے ویسے سنک گئے ہو۔ احمق ہونرے۔'' طالوت منہ بنا کر بولا۔

''مگر مجھے حیرت ہے طالوت!''

''کس بات پر؟''

''بہرحال، تنویر صاحب اور بڑی ماں اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں۔ لیکن کوئی انہیں گردانتا ہی نہیں۔ افشاں سے کہا، اس نے اس بات کا تم سے بھی زیادہ مذاق اُڑایا۔''

''خوب! وہ فکرمند نہیں ہوئی؟''

''بالکل نہیں۔ اُلٹا میرا مذاق اُڑاتی رہی۔''

''تم ہو ہی اس قابل۔''

''فضول بکواس مت کرو۔ نہ جانے.....نہ جانے کیوں، افشاں اُنہیں گردانتی ہی نہیں۔''

''ہاں، اب یہ بات تمہارے لئے باعثِ پریشانی ہوگی۔''

''کون سی بات؟'' میں چونک پڑا۔

''یہی کہ افشاں اپنے والدین کو زیادہ اہمیت کیوں نہیں دیتی۔''

''بس کرو یار!......خدا کے لئے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ابے جوتے اُتارو اور سو جاؤ، اُلّو کہیں کے۔'' طالوت نے کہا اور خود بستر میں چھلانگ لگا دی مجھے بھی ہنسی آنے لگی تھی۔ لیکن بستر میں گھسنے کے بعد بھی کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ حالات کا تجزیہ درست

نہیں تھا۔ تنویر صاحب اور بڑی ماں کی بات بہر حال وزن رکھتی تھی۔ سوائے اس کے کہ افشاں بے حد خود سر تھی اور طالوت چکر چلا کر حالات سنبھال سکتا تھا۔
اور جب ذہن تھک گیا تو نیند آ گئی۔ دوسری صبح طالوت نے ہی جگایا تھا۔
''پیشہ ور عاشقوں کے سے انداز اختیار مت کرو۔'' اس نے کہا۔
''کیا ہو گیا؟''
''رات کو جاگنا، تارے گننا اور دن بھر سونا۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔ غسل وغیرہ کر لو۔ ناشتے کے لئے طلب کیا ہی جانے والا ہے۔'' طالوت سپاٹ لہجے میں بولا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے بستر سے نکل آیا۔
''جگا کیوں نہ دیا یار!'' میں نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''اب میں کیا ٹھیکیدار ہوں تمہارے عشق کا؟..... راتوں کو ستارہ گردی کرو اور دن میں منت سماجت کر کے جگایا جائے۔'' طالوت برا سا منہ بنا کر بولا اور میں باتھ روم میں داخل ہوتے ہوتے رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ طالوت کو بھی اس کا احساس ہو گیا اور اُس نے غصیلے انداز میں میری طرف دیکھا۔
''ناراض ہو طالوت؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔
''جی نہیں۔ آپ کی بزدلی سے بے حد خوش ہوں۔ تالیاں بجانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اب نہاؤ جلدی سے، پھر باہر آ کر بکواس کرو۔'' اُس نے ڈانٹتے ہوئے کہا اور میں خاموشی سے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ذہن میں اس ڈرامے کا تصور تھا، جو ناشتے پر ہو گا اور جس کے بارے میں افشاں نے بتایا تھا۔ لیکن رات کی سی کیفیت نہیں تھی۔ افشاں اور طالوت نے میرا کافی مذاق اُڑایا تھا، حالانکہ جو بات تھی، اس پر غور کرنے کے باوجود مجھے اپنی حماقت نظر نہ آئی۔ بات اپنی جگہ وزن دار تھی۔
بہر حال، نہا دھو کر نکل آیا۔ لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔ اور بیٹھے ہی تھے کہ ملازمہ آ گئی۔ ''ناشتہ تیار ہے۔'' اُس نے آ کر اطلاع دی اور ہم اُٹھ گئے۔
ناشتے کے کمرے میں زیادہ تر لوگ پہنچ گئے تھے۔ تنویر صاحب، بڑی ماں، نواب صاحب، سیمیں اور احسان۔ شکیلہ ابھی تک نہیں آئی تھی، نہ ہی افشاں۔ ان کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ انتہائی غور سے دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ تنویر صاحب اور بڑی ماں کے چہروں پر کچھ نئی شکنیں نمودار ہو گئی ہیں۔ لیکن ممکن ہے، یہ بھی صرف میرا احساس ہو۔
ہمارے بیٹھنے کے بعد شکیلہ بھی آ گئی اور افشاں کے بارے میں نواب صاحب نے کہا۔ ''کیا بات ہے، افشاں بیٹی نہیں پہنچی؟''
''جاؤ دیکھو۔'' بڑی ماں نے کہا۔ ''آپ شروع کریں بھائی صاحب!''
''واہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ آ جانے دو۔'' نواب صاحب بولے۔ لیکن ملازمہ چند ساعت کے بعد واپس آ گئی۔
''بی بی نے کہا ہے، آپ لوگ ناشتہ کریں۔ انہیں ابھی کافی دیر لگ جائے گی۔''
''ارے کیوں..... ٹھیک تو ہے وہ؟''
''جی۔ کوئی کتاب پڑھ رہی ہیں۔''

''ممکن ہے، ہاضمہ خراب ہو گیا ہو۔ چلیں ناشتہ کریں۔'' تنویر صاحب نے کہا اور سب نے ناشتہ شروع کر دیا۔ میں بھی خاموشی سے ناشتہ کر رہا تھا لیکن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ حضرات، ہاضمہ تو اب آپ سب کا خراب ہونے والا ہے۔ عام طور سے ناشتے پر خاموشی ہی رہتی تھی، بشرطیکہ کوئی خاص گفتگو نہ چھڑ جائے۔ لیکن آج کی خاموشی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ صرف میری یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک بات نوٹ کر رہا تھا۔ ورنہ باقی لوگ تو نارمل تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر نواب صاحب بولے۔ ''ہاں بھئی، آج کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔

''پرسوں تمہاری فرم کا افتتاح ہے صائم میاں؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تنویر! ایک دن میں کارڈ تقسیم ہو جائیں گے؟''

''جی بھائی صاحب! کچھ خاص لوگوں کو میں کارڈ پہنچا دوں گا، باقی کام تصدق اور کمال وغیرہ کر لیں گے۔''

''مناسب۔ مگر عادل میاں! ذرا ہمیں کارپٹ سینٹر کی زیارت تو کرا دو۔''

''ضرور۔ لیکن مناسب یہی ہوتا کہ افتتاح کے وقت ہی اس کی نقاب کشائی کی جاتی۔''

''ہاں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ بس کوٹھی دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا ہے کہ وہ بھی دیکھنے کی چیز ہو گی۔ سچ، تمہاری کوٹھی بے حد خوب صورت ہے۔ یوں سمجھ لو، اسے دیکھنے کے بعد، ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔''

''آپ کی ہے نواب صاحب! ہمارے وہاں جانے کے بعد آپ چند روز ہمارے ہاں قیام کریں گے۔'' طالوت نے کہا۔

''ضرور، ضرور۔ اب تو انتظار رہے گا کہ تم کب وہاں جاتے ہو۔''

''تنویر صاحب اور بڑی ماں سے اجازت دلا دیں۔ جب یہ دونوں بزرگ اجازت دے دیں گے، ہم چلے جائیں گے۔'' طالوت نے کہا اور تنویر صاحب رسمی طور پر ہنسنے لگے۔

یہ نمایاں تبدیلی تھی۔ ورنہ ایسے موقعوں پر تنویر صاحب عموماً ناراض ہو جاتے تھے۔ بڑی ماں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت میں نے اجازت طلب کر لی۔ طالوت بھی میرے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا۔

''خیریت؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ محسوس کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''واقعی۔ میرا خیال تھا، تم نے غور نہیں کیا ہو گا؟''

''کیا تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ لوگ بہر حال اتنا جانتے ہی ہیں کہ ہم کسی طور بے بس نہیں ہیں۔''

''یار! راسم کی انگوٹھی تھوڑی دیر اور استعمال کر لوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ کیا کرو گے؟''
''میرا خیال ہے، افشاں کی خبر گیری ضرور کی جائے گی۔''
''اوہ! اور تم اس وقت وہاں ہو گے؟''
''ہاں یار! سنو تو۔ دیکھونا، باخبر رہنا ضروری ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں ہے۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''میں چلتا ہوں۔ سیمیں اور احسان بھی آنے والے ہوں گے۔ سیدھے اس طرف آئیں گے اور ان جنجالیوں سے جان چھڑانا خاصا مشکل کام ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اب میرا رُخ افشاں کے کمرے کی طرف تھا۔ لیکن تھوڑی دُور جا کر میں نے انگوٹھی پہن لی۔ میں اس وقت افشاں پر بھی اپنی موجودگی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

افشاں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اس لئے میں اطمینان سے اندر داخل ہو گیا۔ افشاں سکون سے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ میں اس سے کافی فاصلے پر کونے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ افشاں خود بھی کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ اُس کی نگاہیں گاہے گاہے دروازے کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

اور اُسے بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بڑی ماں، ناشتے کے کمرے سے اُٹھ کر شاید سیدھی اسی طرف آئی تھیں۔ کمرے کے کھلے دروازے سے انہوں نے اندر جھانکا، پھر آواز دی۔ ''افشاں!''
''جی اماں جی!..... آئیے۔'' افشاں نے کتاب رکھتے ہوئے کہا اور بڑی ماں اندر آ گئیں۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔
''کیا بات ہے افشاں! طبیعت تو ٹھیک ہے؟''
''جی اماں جی!..... ٹھیک ہوں۔''
''ناشتے پر کیوں نہیں آئیں؟'' بڑی ماں اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔
''میرا ذہن ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ سے یہیں کچھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔''
''کیا بات ہے؟'' بڑی ماں کی آنکھوں میں سینکڑوں وسوسے جاگ اُٹھے۔
''اتفاق سے رات کو میں نے آپ کی اور ابو جان کی گفتگو سن لی تھی۔'' افشاں نے کہا اور بڑی ماں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ سناٹے میں آ گئی تھیں۔ کئی منٹ تک وہ کچھ نہیں بول سکیں۔ پھر کافی دیر کے بعد بمشکل بولیں۔
''کیسے؟''
''معذرت خواہ ہوں۔ نہیں بتا سکوں گی۔''
''تو بیٹی! کیا ہمارا خیال غلط ہے؟'' بڑی ماں نے کہا۔
''کون سا خیال؟''
''عادل اور صائم کی کوٹھی میں، تم جس دلچسپی سے پیش پیش تھیں، وہ صرف ایک اخلاقی جذبہ ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور ذہنی جذبات وابستہ ہیں؟'' بڑی ماں نے پوچھا۔
''آپ جہاندیدہ ہیں اماں جی! آپ خود غور فرمائیں۔'' افشاں نے کہا۔

''کیا تمہارے ابو کا خیال غلط ہے؟''

''براہِ کرم صاف گفتگو کریں۔ آپ جس بات کو کہتے ہوئے جھجک رہی ہیں، وہ انسان کی زندگی میں سب سے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ میں اس بارے میں آپ سے صاف گفتگو کروں گی۔''

''تم ان دونوں میں سے کسی سے..... کسی سے پوشیدہ دلچسپی رکھتی ہو؟''

''آپ نے غلط لفظ استعمال کیا ہے۔ میں اسے پوشیدہ تو نہیں کہوں گی۔ اگر یہ دلچسپی پوشیدہ ہوتی تو آپ لوگوں کو ساری زندگی احساس نہیں ہوتا۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کو یہ احساس دلایا ہے۔'' افشاں نے کہا اور بڑی ماں کسی حد تک نروس ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ چوری پکڑے جانے پر افشاں شرمندہ ہو گی، آنکھیں چرائے گی۔ لیکن یہاں تو معاملہ اُلٹا ہو رہا تھا۔ کئی منٹ تک وہ سُن بیٹھی رہیں، پھر اپنے رُتبے کا احساس جاگا اور اُن کی آواز بھی کرخت ہو گئی۔

''گویا تم ہمارے شبے کی تصدیق کر رہی ہو؟''

''آپ صرف شبے میں کیوں مبتلا ہیں ابھی تک؟ یقین کی منزل تک کیوں نہیں پہنچ رہیں؟'' افشاں تیکھے انداز میں بولی۔

''کیا تمہاری گفتگو مناسب ہے؟''

''ہاں۔ میں خود کو اس انداز میں پیش کرنے میں حق بجانب ہوں۔ کیونکہ عرض کر چکی ہوں، یہ میری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ میں اس میں تکلّف نہیں کروں گی۔''

''گویا تم ان میں سے کسی کو پسند کرتی ہو؟''

''ہاں!'' افشاں نے جواب دیا۔

''کسے؟'' بڑی ماں کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

''ان دونوں میں سے کون آپ کے لئے ناپسندیدہ حیثیت رکھتا ہے؟''

''افشاں! تمہاری پوری گفتگو گستاخی پر مشتمل ہے۔''

''ساری زندگی آپ سے ناک رگڑ کر معافی مانگتی رہوں گی اماں جی! لیکن اس وقت جو گفتگو ہو رہی ہے، وہ مجھے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔'' افشاں لاجواب جا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں اس پر نثار ہو رہا تھا۔ درحقیقت میرے ذہن سے ساری گھٹن نکل چکی تھی۔ یہ لڑکی جس قدر مجھے چاہتی ہے، اس کے عوض تو زمانے بھر کی مخالفت مول لی جا سکتی ہے۔ میں بلاوجہ خوف زدہ ہوں۔

''اگر تم نے ہماری گفتگو سن لی ہے تو پھر اپنے ابو کے خیالات سے بھی واقف ہو چکی ہو گی؟'' بڑی ماں نے کہا۔

''ہاں..... اچھی طرح۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''ابو غلطی پر ہیں، جھوٹی انا برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی سوچ بدل دینی چاہئے۔''

''تم ان کے لئے اپنے خیالات نہیں بدل سکتیں؟''

''یہ تصور بھی ذہن سے نکال دیں۔'' افشاں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم گھر والوں کی مخالفت مول لو گی؟''

''ایک انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔'' افشاں زہریلے لہجے میں بولی اور بڑی ماں چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔ اُن کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا تھا۔

''کیا؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولیں۔

''میں غیر ممالک کی سیر کو جانا چاہتی تھی، آپ لوگ نہ مانے لیکن.....''

''اوہ، افشاں! تمہاری وہ ضد پوری کر دی جائے گی۔ میں وعدہ.....''

''پوری بات سن لیں اماں جی!..... میں اپنی ضدیں خود پوری کر لیتی ہوں۔ اغوا کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا تھا، غلط کہا تھا۔ میں پاسپورٹ بنوا کر بہت سے ملکوں کی سیر کو گئی تھی۔ یقین نہ آئے تو سینکڑوں ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔ تصدق بھی اس بات کا گواہ ہے۔''

''کیا..... کیا؟'' بیگم صاحبہ حیران رہ گئیں۔

''بتانا صرف یہ تھا کہ آپ لوگ خود ہی اپنے فیصلوں میں تبدیلیاں کر لیں۔ ورنہ مجھے میدانِ عمل میں آنا ہوگا۔ آپ کا احترام اپنی جگہ، لیکن جو کچھ عرض کر رہی ہوں، اس کے بارے میں کہہ چکی ہوں کہ اس کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔''

اماں بی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے گھورتی رہیں اور پھر اُٹھ گئیں۔ ''کیا میں تمہارے ابو کو تمہاری گفتگو کے بارے میں بتا دوں؟''

''اگر آپ نے اس میں ایک لفظ کی بھی تحریف کی تو ساری ذمے داری آپ کی ہوگی۔ میں اس میں سے کوئی ذمے داری قبول نہیں کروں گی۔'' افشاں نے جواب دیا۔

بڑی ماں خاموشی سے اُٹھ کر باہر نکل گئیں۔ افشاں نے دوبارہ کتاب اُٹھا لی تھی۔ میرا بھی اس وقت وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا اس لئے میں خاموشی سے باہر نکل آیا اور اب میں بڑی ماں کے پیچھے جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا، بڑی ماں سیدھی تنویر صاحب کے پاس جائیں گی۔ لیکن وہ اپنے کمرے کی طرف گئیں اور انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ تنویر صاحب سے کوئی گفتگو نہیں کریں گی۔ بہر حال، میں وہاں سے چلا آیا۔

طبیعت پر ایک بوجھ سا طاری تھا۔ تنویر صاحب کو دیکھا، وہ تیار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی اور واپس طالوت کے پاس پہنچ گیا۔

طالوت ایک آرام کرسی پر دراز مسکرا رہا تھا۔ میں نے انگوٹھی اُتار دی اور وہ شرارت آمیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''مذاق اُڑا رہے ہو یار؟'' میں نے تھکے ہوئے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور ایک آرام کرسی میں گر پڑا۔

''مذاق اُڑا سکتا ہوں!'' طالوت بولا۔

''بڑی گرما گرم گفتگو رہی۔''

''سن چکا ہوں۔'' طالوت ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں اُچھل پڑا۔

''ہاں یار! اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ دراصل میں بھی حالات سے واقف ہونا چاہتا تھا۔''

”تو تم وہاں موجود تھے؟“
”ہاں!“
”اوہ......!“ میں نے گہری سانس لی۔ ”پھر اب کیا خیال ہے؟“
”دلیری میں تم اُس کے عشرِ عشیر بھی نہیں ہو۔“
”مجھے اعتراف ہے۔“ میں نے کہا۔
”اور مجھے یقین ہے کہ وہ حالات سنبھال لے گی۔“
”بڑی مضبوط لڑکی ہے۔“
”ہاں۔ خدا کی قسم! اُس سے عقیدت ہوگئی۔“ طالوت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”مگر حضرت! اب پروگرام کیا ہے؟“
”تنویر صاحب کی بے رُخی کا یہ ہلکا سا انداز قابلِ قبول نہیں ہے۔“
”کیا مطلب؟“
”کیا اب بھی یہاں رہو گے؟“
”میں نہیں چاہتا۔ لیکن افشاں؟“
”اُس سے بات کر لینا۔ بہر حال، وہ کمزور لڑکی نہیں ہے۔ ہم اُس کی طرف سے مطمئن ہیں۔“
”اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“
”موقع ملتے ہی اس سے گفتگو کر لو اور اس سے کہہ دو کہ ایسی صورت میں ہمارا اپنی کوٹھی میں چلے جانا ہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے، ہم کسی طور اس سے دُور نہیں رہیں گے۔ لیکن یہاں رہنے سے کچھ تلخیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں اور وہ خطرناک ہوسکتی ہیں۔“
”بالکل ٹھیک!“
”بس تو طے ہے، پرسوں ہم اچانک افتتاح کے بعد اعلان کر دیں گے اور سیدھے اپنی کوٹھی پر جائیں گے۔ ہاں، کل تک کاروں کی خریداری اور کر لی جائے۔“
”او کے باس!.....لیکن یار! اگر افشاں نے اجازت نہ دی؟“
”اس بات کا امکان تو ہے۔ لیکن وہ سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس موقع پر منع نہیں کرے گی۔ اور ہاں، نواب جلال الدین کو ضرور ساتھ لے چلو، کام آئیں گے۔“ طالوت نے کہا اور میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔
کافی دیر تک ہم دونوں کمرے میں بیٹھے گفتگو کرتے رہے اور پھر سیمیں اور احسان کی مداخلت پر ہی چونکے۔ دونوں اندر گھس آئے تھے۔ ان کے پیچھے افشاں اور شکیلہ تھیں۔
”یہ ہو کیا رہا ہے آخر؟ آج جواب مل جانا چاہئے۔“ سیمیں نے ہتھیلی پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ وہ مصنوعی غصے کا اظہار کر رہی تھی۔
”ارے، ارے خیریت؟.....ناشتے میں گرم اشیاء کا استعمال کچھ زیادہ کر لیا تھا کیا؟“ طالوت نے مسکرا کر سنبھلتے ہوئے کہا۔ میں نے احسان کی شکل دیکھی، اس کا چہرہ بالکل نارمل تھا۔ کوئی تردّد یا کوئی شکن نہیں تھی اس پر۔

''ہرگز نہیں۔ میں پوچھ کر رہوں گی۔'' سیمیں نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا۔
''لیکن آخر کیا سیمیں بیگم؟'' میں نے پوچھا۔
''ہم لوگوں کو نظر انداز کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ اچانک بے رونقی سی کیوں پھیل گئی ہے؟''
''ارے توبہ توبہ۔ یہ نظر انداز کرنے کی بات کیا کہی سیمیں بیگم! کسی کی مجال ہے؟'' طالوت جلدی سے بولا۔
''خدا کی قسم! برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ بس اب میں واپسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' سیمیں نے کہا۔
''کہاں؟'' طالوت نے آنکھیں نکالیں۔
''جلال آباد۔''
''ناممکن۔ ابھی تو آپ تنویر صاحب کی مہمان ہیں۔ وہ کوٹھی جو خریدی ہے، اس کا کیا ہوگا؟'' طالوت نے کہا۔
''یہی طور رہے تو میں کیوں جاؤں گی آپ کی کوٹھی میں۔''
''حضور، سرکار! ہمارا قصور؟'' طالوت نے گڑگڑا کر کہا۔
''اُس دن بھی آپ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''
''ہاں۔ اُس دن تو غلطی ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ؟''
''اور آج کل آپ لوگ اپنے کمرے میں گھسے بیٹھے رہتے ہیں۔''
''دراصل سیمیں! صرف چند روز کے لئے معاف کر دو۔ پرسوں کاربٹ سینٹر کا افتتاح ہو جائے گا، اس کے بعد فرصت ہی فرصت ہے۔''
''تو یہ اس وقت کمرے میں گھس کر افتتاح ہو رہا تھا؟''
''ہاں۔ یقین کرو، ہم پلاننگ کر رہے تھے۔''
''آپ لوگوں پر یہ بات عجیب محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال، اگر یہ بات ہے تو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں افشاں!..... کیوں شکیلہ؟'' سیمیں نے کہا اور دونوں ہنستے ہوئے گردن ہلانے لگیں۔
''آپ کو تو کوئی شکایت نہیں ہے احسان صاحب؟''
''جی میں کیا، میری حیثیت کیا۔'' احسان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اوہ، حیثیت کیوں نہیں ہے؟'' سیمیں تڑپ کر بولی۔
''دراصل احسان بہت چالاک ہے۔ جانتا ہے کہ اس کے بدلے آپ ہی نمٹ لیں گی، اس لئے خود برا کیوں بنے۔'' طالوت بولا۔
''گویا میں بری بن گئی ہوں۔'' سیمیں نے آنکھیں نکالیں۔
''ائے، میں سارے میں تلاش کر کر کے مر گئی، یہاں گھسے بیٹھے ہیں میرے بچے۔'' بوا کی آواز دروازے سے سنائی دی اور ہم سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔
''آیئے بوا!..... آیئے۔ آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے ہم لوگ۔'' طالوت نے کہا اور بوا مسکراتی ہوئی اندر آ گئیں۔

''کیا مسکوٹ ہو رہی ہے، سب کے سب جمع ہیں ماشاء اللہ۔'' بوا نے اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے کہا اور اچانک طالوت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے۔

''صائم!'' اس نے میری طرف جھک کر کہا۔

''ہوں!''

''یار! اچانک میرے ذہن میں بڑا خوب صورت پروگرام آیا ہے۔''

''کیا؟''

''کیوں نہ کارپٹ سینٹر کا افتتاح بوا سے کرایا جائے؟''

''پاس۔ بس خاموش ہو جاؤ۔ ابھی ہم دوسروں کو ہوا نہیں لگنے دیں گے۔'' میں نے کہا اور طالوت گردن ہلا کر خاموش ہو گیا۔

''میرا کیا ذکر ہو رہا تھا؟..... اور ہاں، یہ جمشید کہاں گیا؟ نگوڑ مارا نظر ہی نہیں آتا آج کل؟''

''کیا بات ہے بوا! آج کل جمشید کے ستارے بہت اچھے جا رہے ہیں؟'' سیمیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اے، سیمیں بٹیا! بڑا اچھا لونڈا ہے۔ دل کا برا نہیں ہے۔ تم لوگوں نے کیا دُرگت بنوائی ہے بے چارے کی میرے ہاتھوں، مجھے بڑا ہی افسوس ہے۔''

''واقعی؟'' طالوت دلچسپی سے بولا۔

''تو اور کیا۔ میری شکل اُس کی دادی اماں سے ملتی ہے۔ ماتا کا ترسا ہوا ہے بے چارہ۔'' بوا کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا۔ درحقیقت بڑی سادہ لوح خاتون تھیں۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔

''اور تصدق کے بارے میں کیا خیال ہے بوا؟''

''اُس کی بات چھوڑو، وہ بد نظرا ہے، بیٹا!..... اُس میں اور جمشید میں بڑا فرق ہے۔ مگر آج کل تو وہ بھی نظر میں آ رہا۔''

''ا رے بھی خوب ہیں بوا!..... ناراض بھی رہتی ہیں اور یاد بھی کرتی ہیں۔'' سیمیں بولی۔

''اے، اب دل سے کسی سے تھوڑی ناراض رہوں ہوں۔ میرے بڑھاپے میں کالک لگاوے ہیں تو دل جل جاوے ہے۔ اب بتاؤ، تم میری اولادوں کے برابر، مجھ پر بری نگاہ رکھو تو ٹھیک ہے؟''

اور بوا کی اس ''بری نگاہ'' پر ہم سب ہنس پڑے۔

''اور بوا! کسی کی نگاہ ہی خراب ہو تو؟'' طالوت ہنس کر بولا۔

''ارے رہنے دو عادل میاں! تم تو بڑے ہی شریر ہو۔''

''سچ بوا؟..... تصدق کی آنکھیں خراب ہیں۔ وہ آپ کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتا، بلکہ آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے آپ کو ایسا محسوس ہوا ہوگا۔''

''چلو ہٹو، بس رہنے دو۔ اور ہاں، جمشید کے لئے نہیں بتایا، صبح بھی نہیں ملا۔''

''مصروف ہے بے چارہ۔'' طالوت نے کہا اور پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''ارے صائم میاں! چلیں گے نہیں؟''

''وقت ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ساڑھے دس بج رہے ہیں۔''
''تب پھر خواتین و حضرات! اجازت دیجئے اور یہ بداخلاقی صرف کل تک کے لئے۔ اور اس کے بعد اِنشاء اللہ، تفریحی پروگرام رہیں گے۔''
''کوئی خاص کام ہے، صائم بھائی؟''
''ہاں۔ بس افتتاح کے پروگرام کو فائنل کر رہے ہیں۔ پرسوں اِنشاء اللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور سب کمرے سے نکل آئے۔ افشاں کے ہونٹوں کی پُر سکون مسکراہٹ نے مجھے بھی سکون بخشا تھا۔ جب وہ مطمئن تھی تو میں تردّد کیوں کروں۔ تمام لوگوں سے اجازت لے کر ہم باہر نکل آئے اور پھر کار لے کر چل پڑے۔
کارپٹ سینٹر میں باقاعدہ کام ہو رہا تھا۔ تصدق اور جمشید کسی گفتگو میں اُلجھے ہوئے تھے، ہمیں دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئے اور اپنی کرسیوں سے اُٹھ گئے۔ کیونکہ ہم اچانک ہی پہنچے تھے
''اوہو، آیئے!'' تصدق نے مجوب انداز میں کہا۔
''کوئی بات نہیں۔ تم کام کرو تصدق!''
''جی کوئی خاص کام نہیں تھا۔ ہم لوگ ایک فائل دیکھ رہے تھے۔''
''کیسی فائل؟''
''ایک لڑکی ملازمت کے لئے آئی ہے۔ حالانکہ جگہیں تقریباً سب پُر ہو گئی ہیں، لیکن جمشید صاحب کی خواہش ہے کہ اسے ملازم رکھ لیا جائے۔''
''جمشید صاحب کی خواہش ہے؟'' طالوت نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔
''لیس مسٹر عادل! لڑکی بہت سیڈ ہائے۔ اُس کا آنکھ سے آنسو نکلتا۔ میں اُس کو بولا، میں سفارش کریں گا۔'' جمشید نے کہا۔
''جمشید صاحب جس کی سفارش کریں، اُسے تو ضرور رکھنا چاہیے مسٹر تصدق!''
''ضرور جناب! میں نے جمشید صاحب سے اختلاف نہیں کیا۔ صرف جگہوں کی فائل ان کے سامنے رکھ دی ہے کہ اس میں سے جو چاہیں، انتخاب کر لیں۔'' تصدق نے کہا۔
''بٹ ہمارا سمجھ میں کچھ نئیں آتا۔''
''لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''باہر ویٹنگ رُوم میں بیٹھا ہائے۔''
''بلاؤ!'' میں نے تصدق سے کہا اور جمشید جلدی سے اُٹھ گیا۔
''ارے ارے، جمشید! تم کہاں؟ بیٹھو۔ تصدق بیل بجا کر چپڑاسی کو بلا لے گا اور وہ اس لڑکی کو۔'' طالوت نے کہا اور جمشید گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔
تصدق نے بیل بجائی اور چپڑاسی اندر آ گیا۔ ''ویٹنگ ہال میں مِس عذرا بیٹھی ہیں، اُنہیں اندر بلا لو۔'' تصدق نے کہا اور چپڑاسی ادب سے گردن جھکا کر چلا گیا۔
اور پھر چند ساعت کے بعد اُس نے وزنی دروازہ کھولا اور دُبلی پتلی، سہمی ہوئی لڑکی اندر آ گئی۔ رنگ پیلا پڑا ہوا تھا، آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات دبے ہوئے تھے۔ اندر

داخل ہوئی تو کاغذات قالین پر گر پڑے اور اُس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا۔ اُس نے ہراساں نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔

اُس کی یہ حالت دل لرزا دینے والی تھی۔ میں اور طالوت لرز اُٹھے۔ بھلا ایسی بے بسی کا انداز ہم دیکھ سکتے تھے؟ اور پھر ہم دونوں ہی تیزی سے اُس کی طرف لپکے۔

''آیئے عذرا بی بی!.....آپ فکر نہ کریں، یہ کاغذات چپڑاسی اُٹھا لے گا۔'' طالوت نے محبت بھرے انداز میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عذرا کا بدن اب بھی کانپ رہا تھا۔

''آؤ عذرا بہن! تم تکلّف کر رہی ہو۔'' میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اُس نے ایسی نگاہوں سے ہمیں دیکھا، جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ ہم کتنی سنجیدگی سے اُس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے چہروں پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ جمشید نے اُس کے لئے کرسی کا انتخاب کیا اور میں نے عذرا کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے بٹھا دیا۔ وہ بیٹھنے کے بعد گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

''ارے تصدق! بڑے بداخلاق ہو گئے ہو۔ کچھ کھلاؤ پلاؤ گے نہیں؟'' طالوت بولا۔

''ہاں جناب! ابھی پیش کرتا ہوں۔'' تصدق جلدی سے اُٹھ گیا۔

''عذرا بی بی! آپ چائے پئیں گی یا کافی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میں..... میں نے بی اے کیا ہے..... میں..... میں دراصل ملازمت کے لئے آئی تھی۔'' اُس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہو، بھئی ملازمت تو طے ہو گئی۔ یہ جو اپنے جمشید صاحب ہیں نا، بس یہ جسے چاہیں، جو جگہ دے سکتے ہیں۔ ہم ان کے معاملے میں مداخلت کرنے والے کون۔ آپ کی ملازمت کا تو فیصلہ کر لیا گیا۔ اب ذرا کچھ کھانے پینے کی باتیں بھی تو ہو جائیں۔ ہاں تو آپ چائے پئیں گی یا کافی؟''

لڑکی نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن آواز نہ نکل سکی۔

''چلو بھئی تصدق! سب کے لئے چائے ہی منگوا دو۔'' اتنی دیر میں تصدق، چپڑاسی کو بلا چکا تھا۔ اور پھر اُسے ہدایات کر کے واپسی پر وہ لڑکی کے کاغذات بھی اُٹھا تا لایا۔

لڑکی نے جلدی سے کاغذات لپک لئے تھے۔ ''یہ میرے سرٹیفکیٹس وغیرہ ہیں۔''

''بھئی عذرا! ان بور باتوں کو چھوڑو، کچھ اور باتیں کرو۔ سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہیں؟ اب تو تم ہماری اس چھوٹی سی فرم کی اہم کارکن ہو۔ یہ فائل بند کر لو۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بی بی!''

''تو.....تو آپ نے مجھے ملازمت دے دی؟'' اُس کے چہرے پر پہلی بار خوشی کے ہلکے سے تاثرات نظر آئے۔

''بھئی اس میں کیا شک ہے؟..... ہماری مجال ہے کہ نہ دیں؟''

''مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟''

''ابھی شروع ہی کہاں ہوا ہے بی بی! آپ تو بلاوجہ ابھی سے فکر مند ہو گئیں۔ وہی کام ہوگا، جو آپ آرام سے کر سکیں گی۔ البتہ یقین کریں، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' طالوت نے کہا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں جناب! کہ جو کوئی خدمت میرے سپرد کی گئی، میں پوری جانفشانی سے اسے

انجام دوں گی۔'' عذرا نے کہا۔

''چلو یہ بات بھی طے ہو گئی۔ اب تو اس موضوع کو چھوڑ دو۔'' طالوت بولا اور وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن اُس کی نگاہوں میں شدید حیرت تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم لوگوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اور اُس کی یہ حیرت درحقیقت بجا تھی۔ اب فرشتے تو زمین پر آتے نہیں ہیں، وہ ہمارے بارے میں جو کچھ بھی سوچتی، ٹھیک تھا۔

''اور عذرا بی بی! آپ اپنا مکمل تعارف نہیں کرائیں گی؟''

''جی بس، میں نے بی اے کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی کے چھوٹے سے مکان میں رہتی ہوں۔''

''والدین ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اور دوسرے، بہن بھائی؟''

''دو بہنیں اور ہیں۔''

''بھائی؟''

''جی بھائی نہیں ہے۔''

''ہوں!'' میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''اچھا عذرا بیگم! ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھے بھائی بنانے کو تیار نہیں ہیں تو میں بھی آپ سے ضد نہیں کروں گا۔ حالانکہ ابھی ابھی میں نے آپ کو عذرا بہن کہا تھا۔''

عذرا نے آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا، دیکھتی رہی اور پھر اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اُس نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔

''اب بتائیے، بھائی کتنے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو۔'' طالوت غرّایا۔ ''اگر تم نے صرف اسے بھائی کہا تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں اس سے بڑا ہوں۔ دیکھ لو، ہم دونوں کی مورت ایک جیسی ہے۔'' اور عذرا نے نگاہیں اُٹھا کر ہم دونوں کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت سی نمودار ہو گئی۔

''ٹھیک ہے نا...... دو بھائی ہیں نا؟'' طالوت نے پھر پوچھا اور عذرا رو پڑی۔ اُس نے سسکتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔

''واہ!..... ابے یار تصدق! یہ تمہارا چپڑاسی کہاں مر گیا؟ چائے پلاؤ نا۔ دیکھو، ہماری بہن آئی ہے۔'' اور تصدق بے چارہ بار بار بیل بجانے لگا۔

جمشید صاحب بدستور خاموش بیٹھے اُلوؤں کی مانند پلکیں جھپکا رہے تھے، جیسے اب سب کچھ اُن کے ذہن سے نکل گیا ہو۔

چپڑاسی چائے لے آیا اور ہم نے عذرا کو کچھ کھانے اور چائے پینے کے لئے مجبور کر دیا۔ عجیب دُکانداری ہو رہی تھی۔ عذرا کے ذہن میں یہ ساری باتیں فٹ نہیں ہو رہی تھیں۔ جو کچھ ہوا تھا، بے حد انوکھا تھا۔ بہرحال اس نے ہمارے ساتھ چائے پی اور خاصی حد تک پُرسکون نظر آنے لگی۔

''بھئی تصدق! تم عذرا کا اپائنٹمنٹ لیٹر بنوا دو اور حسبِ روایت ایک ماہ کی تنخواہ بھی انہیں دے دی جائے۔ دراصل عذرا! ہماری فرم نے ابھی کام شروع نہیں کیا۔ نیا نیا سلسلہ ہے، اس لئے فرم کے افتتاح

کی خوشی میں طے کیا گیا ہے کہ سارے ملازموں کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی جائے۔ اس طرح یہ فرم کی طرف سے انعام سمجھا جائے۔"

عذرا خاموشی سے گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ تصدق باہر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور اُس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ اپائنمنٹ کا لیٹر تھا۔ اس میں تنخواہ کا خانہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ طالوت نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا اور پھر اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ عذرا خاموشی سے چائے پیتی رہی اور پھر اُس نے پیالی رکھی اور سوالیہ انداز میں ہماری طرف دیکھنے لگی۔

"مس عذرا! آپ نے اپنا لیٹر دیکھ لیا۔ اس میں آپ صائم بھائی کی سیکرٹری ہیں۔ اپائنمنٹ لیٹر میں آپ کی تنخواہ دو ہزار روپے مقرر کی گئی ہے۔ فی الحال آپ اسے قبول کر لیں، بعد میں ہم اور بڑھا دیں گے۔" طالوت نے کہا۔

"جی؟" عذرا پھر چونک پڑی۔ اُس نے متحیرانہ نگاہوں سے ہماری شکلیں دیکھیں۔ اُس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں مس عذرا! اس فرم کو آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ ابتدا میں یہ تنخواہ قبول کریں، ہم ایک ماہ آپ کا کام دیکھ کر مزید بڑھا دیں گے۔ فی الحال آپ اس کے کم ہونے کا خیال نہ کریں۔"

عذرا کے حواس ایک بار پھر جواب دینے لگے تھے۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروانہ تقرری کو دیکھا۔ یہ مذاق نہیں ہو سکتا تھا۔ خوب صورت لیٹر پیڈ پر باقاعدہ ٹائپ شدہ تحریر تھی، جس پر میرے دستخط بھی تھے۔ لیکن اتنی تنخواہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اُس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ وہ کن سر پھروں میں آ پھنسی ہے۔

"اب میں جاؤں؟" اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"ضرور...... خدا حافظ! ہاں تصدق! براہِ کرم تم مس عذرا کو کیشئر کے پاس لے جاؤ اور انہیں کمپنی کے اصول کے مطابق ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دلا دو۔"

"میں بھی ان کا ساتھ چلا جائے؟" جمشید نے پوچھا۔

"ضرور چلا جائے۔" طالوت بھی اسی کے مانند منہ ٹیڑھا کر کے بولا اور جمشید بھی اُٹھ گیا۔ عذرا نے ہمیں سلام کیا اور پھر وہ جمشید اور تصدق کے ساتھ باہر نکل گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"یہ جمشید بھائی کو کیا ہوا؟" طالوت متحیرانہ انداز میں بولا۔

"ہاں۔ یہ لڑکی تو ان کے پروگرام میں کسی طور شامل نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے، اسے دیکھ کر صرف ہمدردی جاگ اُٹھی ہو۔"

"ہاں، ممکن ہے۔"

"ویسے لڑکی کی حالت قابلِ رحم ہے۔"

"لیکن تقدیر کی سکندر ہے۔"

"کیوں؟"

"ظاہر ہے، یہاں آ گئی اور ایسے وقت، جب جہاں پناہ موجود تھے۔"

"اوہ، عارف! ایسی بات مت کہو۔ میں کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ صرف اللہ کا کرم ہے۔ اس کے

بندوں کی خدمت تو سب پر فرض ہے، جو جس حد تک یہ فرض پورا کر دے۔"

میں نے طالوت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تصدق واپس آ گیا اور ہم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ "جی ادائیگی کر دی گئی ہے۔"

"وہ چلی گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" تصدق نے جواب دیا۔

"جمشید بھائی کہاں ہیں؟"

"اُسے بس میں بٹھانے گئے ہیں۔" تصدق نے جواب دیا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر ہم سنجیدہ ہو گئے۔

"دعوت نامے تقسیم کر دیئے گئے تصدق؟"

"جی ہاں۔ جو فہرست آپ نے عنایت کی تھی، اس کے مطابق۔"

"ویری گڈ۔ شمشیر کو کارڈ بھجوایا؟"

"جی ہاں۔"

"کون لے گیا تھا؟"

"میں نے اپنے اسسٹنٹ شوکت کو بھیجا تھا۔"

"اس نے کچھ بتایا؟"

"جی ہاں۔ شمشیر نے کافی کرید کی۔ لیکن میں نے اُسے ہدایت کر دی تھی۔ اُس نے سارے جواب گول مول دیئے۔" تصدق نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

صرف شمشیر کی وجہ سے کارڈ ایسے چھپوائے گئے تھے کہ ان سے ہم لوگوں کی حقیقت نہ کھل سکے۔ اور جب شمشیر آ جائے، تب اُسے پتہ چل سکے۔ بہر حال، خوب عمدہ تفریح شروع ہونے والی تھی۔ بہت سی ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم واپس چل پڑے۔ افتتاح کی تیاریاں مکمل تھیں اور اب کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

راستے میں، میں نے طالوت سے اپنے مطلب کی باتیں شروع کر دیں۔ "بہر حال، افشاں کے معاملے میں جو کچھ ہوا، میں اس سے خوش نہیں ہوں طالوت!"

"خوش تو میں بھی نہیں ہوں۔ لیکن ہمیں تنویر صاحب کو ایک چانس دینا چاہئے۔ ممکن ہے وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ ورنہ اس کے بعد ان کی ساری سابقہ حرکتوں کا بدلہ لے لیا جائے گا۔"

"ویسے وہ ہمارے چلے آنے کو محسوس تو کریں گے؟"

"ممکن ہے۔ ویسے اس وقت ان کی خاموشی مجرمانہ تھی۔"

"ابھی تو رات باقی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بیگم صاحبہ، افشاں کی گفتگو کے بارے میں اُنہیں ضرور بتائیں گی۔"

"ہاں۔ چھپانا تو خطرناک ہوگا!"

"اس کے بعد دیکھنا ہے کہ اُن کا رویہ کیا ہوتا ہے۔"

''دیکھ لیں گے یار!'' طالوت لاپروائی سے بولا اور پھر چونک کر بولا۔ ''ارے سنو۔''
''ہوں؟'' میں نے پوچھا۔
''دوپہر کا کھانا کھا کر چلیں گے۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا بھی گول کریں گے۔''
''اوہ!..... دوپہر کا کھانا گول کر دیں گے طالوت! لیکن.....''
''ہاں، لیکن کیا؟'' طالوت نے پوچھا۔
''کل تو ہم وہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ کوئی ایسا اظہار کرنے سے کیا فائدہ، جس سے تعلقات میں براہِ راست تلخی پیدا ہو۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' طالوت نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تب پھر چھوڑو یار! کوئی خاص اظہار نہ کرو۔ بس کل ہم کسی قیمت پر نہیں رُکیں گے۔'' اور ہم دونوں متفق ہو گئے۔
کوٹھی پہنچے اور دوپہر کے کھانے میں شریک ہوئے۔ تنویر صاحب تو اس وقت بھی موجود نہیں تھے، نہ ہی ان سے شام کی چائے پر ملاقات ہوئی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ چائے کے بعد ہم باغ میں کھیلنے لگے۔ سب لوگ ساتھ تھے اور خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ دُور سے جمشید آتا نظر آیا اور سب خوش ہو گئے۔
''یہ جمشید بھائی، آج کل مستقل غائب رہنے لگے ہیں۔'' سیمیں نے کہا۔
''کوئی پوچھتا بھی تو نہیں ہے بے چارے کو۔'' افشاں نے کہا۔
''نہیں، یہ بات نہیں۔ بڑی ماں نے دوپہر کے کھانے پر بھی تشویش ظاہر کی تھی اور شام کی چائے پر بھی اسے خاص طور سے پوچھا تھا۔''
''بس وہی پوچھ لیتی ہیں۔''
''اتنا برا آدمی بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''حلیے سے آدمی لگتے ہی کہاں ہیں؟'' افشاں ناک سکوڑ کر بولی اور جمشید قریب آ گیا۔ وہ حسبِ عادت احمقانہ انداز میں ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا اور سب خاموشی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اور پھر جمشید احمقانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ اُس کی اس جھینپی جھینپی ہنسی پر سب کو ہنسی آ گئی۔ اور جمشید ایک دم اس انداز میں سنجیدہ ہو گیا، جیسے اُسے کسی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔
''کیا حال ہیں جمشید بھائی؟'' افشاں نے پوچھا۔
''بالکل ٹھیک ہائے۔ بٹ تم لوگ..... اتنا سیڈ کیوں ہائے؟'' جمشید نے پوچھا۔
''بس ہائے۔'' سیمیں نے کہا۔
''کیوں ہائے؟''
''ہائے۔'' سیمیں اسی مسخرے پن سے بولی اور پھر ہنسی چھوٹ گئی۔
''آپ غائب کہاں رہنے لگے ہیں جمشید بھائی؟'' شکیلہ نے پوچھا۔
''ہائے بے چارے جمشید بھائی کو کچھ ہو گیا ہے۔'' سیمیں نے کہا۔
''ارے کیا ہو گیا ہے؟'' افشاں تشویش سے بولی۔
''سُر کھو گئے ہیں۔'' کمال نے لقمہ دیا۔
''کہاں کھو گئے ہیں؟'' احسان بھی خاموش نہ رہ سکا۔

''گر پڑے ہوں گے کہیں۔ یہ لاپرواجو ہیں۔'' شکیلہ نے کہا۔
''سنبھال کر رکھنے چاہئے تھے۔ سُروں کے علاوہ اور تھا کیا ان کے پاس۔'' افشاں نے کہا۔
''دیکھئے نا، آج کل یہ آدھے رہ گئے ہیں۔ کبھی مکمل ہی نظر نہیں آتے۔ جمشید بھائی! آپ نے گٹار کہاں بیچ کھایا؟'' کمال بولا اور جمشید کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بے چارہ خاموشی سے ہدف بنا ہوا تھا۔ پھر اُس نے اسی پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔
''آپ سب لوگ اپنا اپنا بولی بولا، مگر افشاں نے جو بات کیا، وہ سب سے ٹاپ تھا۔'' وہ بولا۔ ''سنبھال کر رکھنا چاہئے تھا۔ سُروں کے علاوہ اور کیا تھا ہمارے پاس۔ آل رائٹ۔'' اور پھر وہ مُڑ کر واپس چلا گیا۔
''ارے ارے، جمشید بھائی!'' سیمیں اور افشاں چیخیں۔ لیکن جمشید رُکے بغیر اندر چلا گیا۔ ہم لوگ بھی ششدر رہ گئے تھے۔ جمشید کی تھوڑی بہت کہانی معلوم تھی۔ بڑی عمدہ بات ہو گئی تھی۔ لیکن اس احمق کے دل پر چوٹ لگی۔ کچھ بھی ہو، بہرحال انسان تھا۔
''حضرات! میں اعلان کرتا ہوں، جمشید بھائی کو کچھ ہو گیا۔'' کمال نے کہا۔
''واقعی، حیرت ناک بات ہے۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ آ سکتا ہے۔'' افشاں بولی۔
''لیکن انہیں ہو کیا سکتا ہے، عشق؟'' سیمیں نے پوچھا۔
''ممکن ہے۔''
''لیکن اب ان کے عشق کا ٹٹو کس طرف دوڑا ہے؟..... کس کی شامت آئی ہے؟''
''آئی ہو گی کسی نصیبوں ماری کی۔'' شکیلہ نے کہا اور ہم اُس نصیبوں ماری کے بارے میں سوچنے لگے، جس کی سفارش جمشید نے کی تھی۔ پیاری سی، معصوم سی لڑکی!
کافی دیر تک باغ میں چہل قدمی ہوتی رہی، پھر موقع پاتے ہی افشاں نے کہا۔ ''صائم صاحب!''
''ہوں۔''
''رات کے کھانے کے بعد آئیں گے؟''
''تمہارے پاس؟''
''ہاں۔''
''آ جاؤں گا۔ یا پھر کیوں نہ باغ میں آ جائیں؟''
''باغ میں آ جایئے۔ اس فوارے کے پاس۔''
''او کے!'' میں نے کہا اور افشاں مطمئن ہو گئی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے کچھ وقت سب کے ساتھ گزارا۔ اور پھر جب سب اپنے اپنے کمروں کی طرف گئے تو میں طالوت کو پوزیشن بتا کر باغ کی طرف چل پڑا۔ میرے پہنچنے کے چند ہی منٹ کے بعد افشاں پہنچ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ تھی۔
''آپ کو انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟''
''نہیں۔ صرف چند منٹ گزرے ہیں۔''
''ایک بات کہوں۔ کیا اچانک ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی تڑپ بڑھ نہیں گئی ہے؟ آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں تو یہی محسوس کرتی ہوں۔ یوں کہئے، اماں جی اور ابو کی اس ہلکی سی مخالفت

نے ہماری محبت اور بڑھا دی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ محبت سے سوچنے لگے ہیں۔“ افشاں شرمگیں انداز میں بولی۔

میں خاموشی سے اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

”غلط کہا ہے میں نے؟“ وہ مجھے خاموش پا کر بولی۔

”نہیں افشاں! شاید یہ بھی محبت کی کوئی اہم طلب ہے۔“ میں آہستہ سے بولا۔

”اب آپ کا کیا حال ہے؟“ افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انتہائی پُرسکون اور مطمئن ہوں۔“ میں نے پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خدا آپ کو ہمیشہ مطمئن اور مسرور رکھے۔“ افشاں نے جواب دیا۔

”ہاں۔ مجھے خدا پر..... افشاں پر پورا پورا بھروسہ ہے۔“

”میں کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔“

”مجھے یقین ہے افشاں!“

”صبح کو امی سے بات ہوئی تھی۔“

”اوہ!“ میں نے اس بات سے اجنبیت ہی مناسب سمجھی۔

”ہاں! میں نے ان سے کافی کھل کر بات کی ہے۔ میرا خیال ہے، اُنہیں صورتِ حال کا اندازہ تو ہو چکا ہے۔ اب یہ بات ان پر منحصر ہے کہ وہ کتنی سمجھ داری سے کام لیتے ہیں۔“

”خدا کرے، وہ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہ کھڑی کریں۔“

”اونہہ۔ ساری دیواریں گر جاتی ہیں صائم صاحب! آپ پروا نہ کریں۔“

”خدا کی قسم، اب کوئی پروا نہیں ہے۔ لیکن افشاں! اگر آپ اجازت دیں تو ایک درخواست کروں؟“

”ضرور!“

”آپ محسوس تو نہیں کریں گی؟“

”نہیں۔ آپ کہیں۔“ افشاں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ فرم کے افتتاح کے بعد ہم اپنے مکان میں منتقل ہو جائیں۔“

”اوہ! دوبارہ یہ خیال کیوں آیا؟..... اس کا جواز کیا ہے؟“

”صبح کو آپ ناشتے پر موجود نہیں تھیں۔ نواب جلال الدین کے سامنے یونہی تذکرہ ہوا۔ تنویر صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ گویا ایک طرح سے وہ راضی تھے۔ جبکہ اس سے قبل وہ اس بات کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ خدانخواستہ اس بات سے تنویر صاحب کی کوئی شکایت مقصود نہیں ہے بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ یوں بھی اب ہمارے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور پھر ان دونوں حضرات کے روّیے میں کوئی تبدیلی ہوئی تو خوامخواہ رنج ہو گا۔“

افشاں سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی، پھر اُس نے گردن اُٹھا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے صائم صاحب! لیکن اپنے اس روّیے پر انہیں خود ہی شرمندگی ہو گی۔“ اس کے لہجے میں ترشی آ گئی۔

”نہیں افشاں! اس موضوع پر آپ کوئی سختی نہیں کریں گی۔ یہ ضروری بھی ہے۔ بعد کے معاملات کے لئے ہمارا کچھ فاصلہ ضروری ہے۔ اور پھر میرا خیال ہے، یہ مخالفت کسی عداوت کی مظہر نہیں ہے۔ تنویر

صاحب بھی اسی رسمی دنیا کے انسان ہیں، جو جھوٹی انا کی خاطر غلط فیصلوں کو ضروری سمجھتی ہے۔"
"میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں کو اس بات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔"
"تو تمہاری طرف سے اجازت ہے؟"
"ہاں اجازت کیا، بلکہ اب تو میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" افشاں کی آنکھوں سے کوئی خیال جھلک رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔ بہرحال، کافی دیر تک ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ افشاں کے انداز میں ذرا بھی تشویش نہیں تھی۔ وہ پورے یقین سے کہہ رہی تھی کہ وہی ہوگا جو ہم دونوں چاہتے ہیں۔ پھر ہم واپس چل پڑے۔
کمرے میں طالوت میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے افشاں سے گفتگو کی تفصیل بتائی اور اُس نے بھی مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ "ٹھیک ہے عارف! یہی مناسب ہے۔ ویسے اچھا ہے، معمولات میں کچھ تبدیلیاں ہی آئیں۔" اور میں ہنسنے لگا۔ پھر ہم سو گئے۔
دوسرا دن بھی حسبِ معمول تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ہم کوٹھی میں رہے اور پھر اجازت لے کر نکل آئے۔ کارپٹ سینٹر پہنچے تو جمشید صاحب موجود تھے۔
"میری مانیں جمشید بھائی! تو آپ امریکہ کی سکونت ترک کر کے واپس اپنے وطن آ جائیں۔ یہاں ہم کاروبار میں آپ کی مدد کریں گے۔ اور وقتی طور پر تو یہ فرم حاضر ہی ہے۔"
"میرا دلی خواہش یہی ہے۔ بٹ، ان لوگوں کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں ہائے، ورنہ....."
"اور سنائیں کیا حال ہے؟"
"ٹھیک ہائے۔"
"کل آپ نے افشاں کی بات کا برا مانا تھا؟"
"اوہ نہیں۔ افشاں ٹھیک بولا تھا۔ ہم ایک دم قلاش انسان ہائے۔ کیا ہائے ہمارے پاس۔ امریکن لوگ ہمیں بلیک انڈین بولتا ہائے اور ہمارے ملک کا لوگ ہمیں امریکن اُلو۔ نہ ہمارا وطن وہ ہے نہ یہ۔ ایسا قلاش لوگ کون ہوگا، جو اپنے وطن میں گھر اور عزت حاصل کرنے کی بجائے اپنا وطن ہی کھو بیٹھے۔ بس ایک گٹار ہائے، جس کے سُر بے سُرے ہو گئے تھے۔ ہم نے اُسے رات کو توڑ دیا۔"
"ارے۔" ہم دونوں چونک پڑے۔
"ہاں۔ اب ہم گٹار نہیں بجائے گا۔" جمشید نے کہا۔ اس کی آواز سپاٹ تھی لیکن چہرے کے تاثرات بکھر تھے۔ ہمیں اُس کی کیفیت سے بہت دُکھ ہوا تھا۔
"ان لوگوں نے واقعی بدتمیزی کی تھی جمشید بھائی! ہم اُنہیں ڈانٹیں گے۔"
"ارے نہیں نہیں، ٹھیک بات پر کسی کو ڈانٹنا مناسب نہیں ہائے۔ پلیز آپ ان لوگوں کو کچھ نہیں بولیں گا۔" جمشید نے کہا۔
"تصدق!" میں نے تصدق کو آواز دی۔
"جناب!"
"وہ عذرا آئی ہے؟"

''جی۔ وقت پر آ گئیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''کاؤنٹر آفس میں بیٹھی ہیں جناب! میں نے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کی سیٹ لگوا دی ہے اور ان کے طلب کرنے پر کچھ کام ان کے سپرد کر دیا ہے۔''

''ویری گڈ۔ اسے احساس نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نے اُسے خصوصی مراعات دی ہیں۔ ویسے جمشید بھائی! کل آپ اُس کے ساتھ کہاں گئے تھے؟''

''بس اسٹاپ پر۔ اُسے بس پر چھوڑنے۔''

''اُس لڑکی سے آپ کی جان پہچان کہاں ہو گئی؟''

''ویٹنگ ہال میں۔ وہ خود ہم سے بولا کہ اُسے نوکری کا ضرورت ہائے۔ ہمیں اُس پر ترس آ گیا۔''

''ترس، یا کچھ اور؟''

''اوہ سوری! کیا ہم غلط بول گیا؟ اسے ترس نہیں بولتا؟'' جمشید نے کہا۔

''بولتا تو ہے لیکن بہر حال آپ اتنے اچھے انسان ہیں کہ آپ پر شک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا اور جمشید خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے تصدق سے کہا۔ ''تصدق! تم جمشید صاحب سے ضروری امور میں مشورے لیتے رہا کرو۔ بہر حال ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ایک جدید ترین ملک سے۔ بعض امور میں یہ مفید مشورے دیتے رہیں گے۔ اور جمشید بھائی! براہِ کرم آپ جب تک یہاں ہیں، ہماری مدد کریں۔ آپ باقاعدہ دفتر آیا کریں۔ ہم آپ کو حقیر سا نذرانہ بھی پیش کر دیا کریں گے۔''

جمشید نے احسان مندی سے گردن جھکا دی تھی۔

''بعض اوقات تم ایسی پیاری باتیں کرتے ہو کہ روح خوش ہو جاتی ہے۔'' دوپہر کو اپنی نئی کوٹھی جاتے ہوئے طالوت نے کہا۔

''مثلاً؟''

''اب جمشید کے بارے میں میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ اُس بے چارے کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ یہاں تک کہ بڑی ماں بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتیں۔ نہ جانے اس کے پاس کچھ رقم بھی ہے یا نہیں۔ بظاہر تو اس کا کوئی خرچ نہیں ہے، لیکن پھر بھی۔''

''ہاں یار! بہر حال، وہ بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے جو ہمارے پسندیدہ ہیں اور جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔''

''بے شک!'' طالوت نے جواب دیا۔ ان معاملات میں وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتا تھا۔

کوٹھی کے گیٹ پر نئے چوکیدار نے ہمیں سلام کیا۔ گو دروازہ خود کار تھا، لیکن بہر حال چوکیدار کی ضرورت تو تھی۔ اس کے علاوہ تصدق کو دفترِ ملازمت روانہ کر دیا گیا تھا، جہاں سے اُسے کوٹھی کے لئے ملازموں کا بندوبست کرنا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے اور عمارت کا آخری جائزہ لینے لگے۔ ہر طرح سے مکمل عمارت تھی، بس ملازموں کی کمی تھی۔

لیکن یہ کمی ٹھیک تین بجے پوری ہو گئی۔ تصدق ملازموں کی پوری فوج لے آیا تھا۔ ان میں خانساماں بھی تھے، بیرے بھی، گھر کی صفائی کرنے والی خادمائیں تھیں اور مالی بھی۔ تقریباً اکیس افراد تھے۔ طالوت

کے سامنے ضرورت مند آ جائیں اور وہ کسی کو مایوس کر دے، ناممکن بات تھی۔ چنانچہ سارے ملازم رکھ لئے گئے۔ اس کے علاوہ دو خوب صورت کاریں بھی آج ہی خرید لی گئیں جن کے لئے ڈرائیوروں کا بندوبست بھی دفترِ روزگار سے ہی کیا گیا۔ یوں آج سارے مکمل ہو گئے۔ ملازموں کے لباس کے لئے طالوت نے خصوصی ہدایات جاری کر دی تھیں۔

اور میں دولت کے اس کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ جو کام منہ سے نکلتا، چٹکی بجاتے پورا ہو جاتا۔ کہاں ایسی زندگی گزاری تھی، کہاں ایسا کھیل دیکھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اور خود کو اس کھیل میں شامل پا کر عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کے سارے کاموں سے فراغت پا کر ہم واپس چل پڑے اور تنویر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔

کوٹھی میں چہل پہل تھی اور اس کی روحِ رواں افشاں تھی۔ اُس نے کل کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ لباسوں کا انتخاب ہو رہا تھا اور نہ جانے کیا کیا۔ ہمیں روحانی مسرت ہو رہی تھی۔ طالوت بھی خوش تھا۔ رات کے کھانے پر تنویر صاحب نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کو بھی مدعو کیا ہے۔

”اگر آپ نہ کرتے تو مجھے دُکھ ہوتا۔“ طالوت نے کہا۔

”کارڈ کم تو نہیں پڑے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بھئی۔ وہ تو ضرورت سے بھی زیادہ چھپ گئے تھے۔“ تنویر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب کل کا کیا پروگرام ہے بھئی؟ یقین کرو، بڑی بے چینی سے وقت گزر رہا ہے۔ بڑے بڑے خیالی بُت بنائے ہیں تمہاری اس فرم کے۔“ نواب جلال الدین نے کہا۔

”ساری تیاریاں مکمل ہیں نواب صاحب! کوئی کام باقی نہیں رہ گیا ہے۔ درحقیقت تنویر صاحب نے ہمیں تصدق کی شکل میں ایک زبردست تحفہ دے دیا ہے۔ چراغ کے جن کی طرح ہر کام چٹکی بجاتے میں کر دیتا ہے۔“

”آدمی کچھ خوبیوں کا ضرور تھا۔ لیکن میں نے اُس کی اس صلاحیت کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا تھا۔ بہرحال، مجھے خوشی ہے کہ وہ تمہارے کام آسکا۔“

”کل کے پروگراموں کے بارے میں چند اہم باتوں کی اجازت چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں، اجازت اجازت۔“ نواب جلال الدین جلدی سے بولے۔

”جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ کل ہی ہم اپنے مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ فرم کے افتتاح سے فراغت کے بعد ہم سیدھے وہیں چلیں گے اور میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ نواب جلال الدین اور تنویر صاحب چند روز ہم غریب الوطنوں کے ساتھ گزاریں۔ آپ کو علم ہے کہ ہمارا یہاں آپ لوگوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس مکان میں جا کر ہم خود کو تنہا محسوس کریں گے۔ لیکن ہمارے بزرگ ہمیں وہاں کی عادت ڈال دیں گے تو ہم ممنونِ کرم ہوں گے۔“

تنویر صاحب کے چہرے پر اُلجھن نظر آئی۔ وہ کسی کش مکش کا شکار ہو گئے تھے۔ نہ جانے اُن کی جذباتی کیفیت کیا تھی۔ لیکن نواب صاحب سادہ لوحی سے بول پڑے۔

”اماں یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟..... حد ہو گئی۔ چند روز نہیں صاحبزادے! چند ہفتے کہو۔ بھئی

میں تو اب باقی وقت تمہارے گھر پر ہی گزاروں گا۔ اور یہ تنویر..... اس کی مجال ہے کہ.....''

''لیکن سوال یہ ہے جلال بھائی! کہ انہیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' تنویر صاحب اُلجھے ہوئے انداز میں بولے۔

''کیا مطلب؟ یعنی اپنے گھر نہ جائیں؟..... ساری زندگی تمہارے در پر پڑے رہیں؟''

''یہ کوئی غیر جگہ تو ہے نہیں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن بھئی، بچوں نے گھر بنایا ہے، اسے آباد کرنا بھی ضروری ہے۔ آج تنہا ہیں، کل تنہا نہ ہوں گے۔ اسے آباد کرنے کے لئے تمہیں پوری پوری مدد کرنا ہوگی۔''

''زندگی میں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ گھر آتے ہوئے ان لوگوں کا تصور آتا تھا تو ایک دلچسپی، ایک خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں..... نہ جانے کیوں....'' تنویر صاحب کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ پھر گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''حالانکہ یہ سب کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہاں ان کے ساتھ برا سلوک بھی ہوا ہے۔ لیکن غلط فہمیاں بعض اوقات نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی ہیں۔''

''اوہ!..... وہ ہماری زندگی کا ایڈونچر تھا تنویر صاحب! براہِ کرم اسے بالکل بھول جائیں۔'' طالوت جلدی سے بولا۔

''لیکن..... لیکن تمہیں ابھی مکان کی کیا ضرورت تھی؟ قصور تمہارا تو نہیں ہے۔'' تنویر صاحب نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قصور...... کیسا قصور؟'' نواب جلال الدین بولے اور تنویر صاحب چونک پڑے۔

''ہاں، میں یہی کہہ رہا تھا۔'' وہ گھبرا گئے۔ ''بہر حال، خدا تمہیں مبارک کرے۔ مجھے جو حکم دو گے، اس سے انکار نہیں ہوگا۔'' تنویر صاحب بولے۔ ان کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی تھی۔

اور رات کو طالوت نے اس بارے میں خاص طور سے تذکرہ کیا۔ ''تم نے تنویر صاحب کی کیفیت دیکھی؟''

''ہاں۔ دل کا برا انسان نہیں ہے۔''

''غور کیا، اس کے منہ سے کیا نکل گیا تھا؟''

''قصور والی بات کر رہے ہو؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں۔''

''ویسے یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''جی ہاں۔ کسی کے گھر میں زبردستی آ گھسے، اُس کی بیٹی کو شیشے میں اُتار لیا اور اب کہہ رہے ہو، قصور تمہارا نہیں ہے۔''

''اس میں بھی تمہاری حرکتیں مددگار تھیں۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''اچھا بس، اب سو جاؤ۔ کل کا دن مصروف ترین دن ہے۔'' طالوت نے کروٹ بدل کر کہا اور میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میری آنکھوں میں مستقبل کے خواب جگ اُٹھے۔ وہ حسین مستقبل، جس میں افشاں جیسی شریکِ حیات، قدم قدم کی ہم سفر ہوگی۔ گو وہ منزل دُور تھی اور اس کی راہ میں کچھ دیواریں تھیں۔ لیکن افشاں کی ثابت قدمی نے اور طالوت کی دوستی نے یہ یقین دلا دیا کہ دیواریں کتنی بھی ہوں،

کیسی بھی ہوں، گر ضرور جائیں گی۔

دوسرے دن خاصی چہل پہل تھی۔ میرے ذہن میں ایک کھلبلی تھی، بڑی ماں نے تنویر صاحب کو افشاں سے ہونے والی گفتگو بتائی یا نہیں؟ اور اگر بتا دی ہے تو تنویر صاحب کا ردِعمل کیا ہے۔ لیکن ناشتے پر تنویر صاحب اور دوسرے سبھی لوگ نارمل تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ راسم کی انگوٹھی ابھی تک میرے پاس تھی۔ مجھے ایک رات اور بڑی ماں اور تنویر صاحب کے کمرے میں گزارنی تھی۔ پوزیشن تو معلوم ہو جاتی۔ بہرحال اب تو وقت گزر گیا تھا۔ ممکن ہے، افشاں کوئی انکشاف کرے۔

ناشتے کے وقت تنویر صاحب کچھ اُداس ہو گئے۔ اس بات کو سب نے ہی محسوس کر لیا۔

''کیا بات ہے تنویر! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' نواب جلال الدین نے پوچھا۔

''ہاں بھائی صاحب! کیوں؟''

''بس یونہی کچھ تھکے تھکے سے محسوس ہو رہے ہو۔''

''ان لوگوں کے جانے کے تصور سے اُداس ہو گیا ہوں۔ درحقیقت ان سے بڑی چہل پہل تھی۔''

''اوہ، تنویر! اس کی بات مت کرو۔ جس وقت یہ جلال آباد میں تھے، اس وقت ہماری حالت اس سے زیادہ خراب تھی۔ شکر کرو، یہ اس شہر سے نہیں جا رہے۔ بھئی تم واقعی خوش نصیب ہو۔ چند میل کے فاصلے پر رہو گے۔ میں تو جلال آباد جا کر یہاں کی تفریحات کو زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ عین ممکن ہے، مجھے بھی یہاں ہی بندوبست کرنا پڑے۔''

''سچ ابا جان!..... یہاں ایک مکان خرید لیں۔ جلال آباد، کارندوں کے حوالے کر دیں۔ بس کبھی کبھی جا کر دیکھ بھال کر لی جائے گی۔ کبھی آپ، کبھی احسان۔ ہم سب یہیں رہیں گے۔ یہاں زندگی ہے۔'' شمیں نے کہا اور نواب صاحب پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے۔

''پھر جب یہ اچانک چلے آئے تو ہفتوں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا کسی نے۔ ایمان سے پورے جلال آباد پر سوگ طاری تھا۔'' شمیں نے کہا۔

''اچانک چلے آئے تھے یہ لوگ؟''

''ارے بس، نہ پوچھو۔ تڑپتا چھوڑ آئے تھے سب کو۔ میں نے سینکڑوں میل کھنگال ڈالے۔'' نواب صاحب نے کہا۔ اور پھر دوسرے لوگوں کو ہمارے گھوڑوں پر فرار ہو جانے کا قصہ سنانے لگے۔

''اللہ!..... مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟'' بڑی ماں بولی۔

''کوئی بری نیت نہیں تھی۔ بس نہیں چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کا رونا دھونا دیکھیں۔'' نواب صاحب نے کہا اور پھر بولے۔ ''ہاں تو حضرات! ہمارے لائق کوئی خدمت ہے؟''

''بس دعاؤں کی ضرورت ہے۔ کارکن سارے کام مکمل کر لیں گے۔ ہم یہاں سے چار بجے چلیں گے۔''

''اوہ، گویا مدعی سست اور گواہ چست والی بات ہے۔ تمہاری مرضی بھئی۔''

''یہ بات نہیں ہے جناب! سارے معاملات اطمینان بخش ہیں۔ دراصل عین وقت پر چل کر ہم آپ سے اپنے انتظام کی داد وصول کرنا چاہتے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''بھئی تم لوگ کیا کر سکتے ہو، اس کا فیصلہ تو کوٹھی دیکھ کر ہی ہو گیا۔'' تنویر صاحب مسکراتے ہوئے

بولے اور نواب صاحب کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ دوپہر کا کھانا الوداعی تھا، اس لئے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد رات کو تو ہماری کوٹھی میں دعوت تھی۔ یوں بھی ایک اُداس کیفیت تھی۔ ہاں، دوپہر کے کھانے کے بعد افشاں ہمارے کمرے میں آ گئی۔

وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور ہم دونوں نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ ''ارے عادل بھائی! وہ بے چاری شکیلہ آپ کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔'' افشاں نے کہا۔

''ارے کل کی لڑکی! سیدھی بات کر۔ درخواست کر تو چلے جائیں گے۔'' طالوت اکڑ کر بولا اور افشاں ہنس پڑی۔

''حضور!..... سرکار..... مائی باپ!..... بندی التجا کرتی ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''ہوں، اچھا..... کیا یاد کرو گی۔'' طالوت نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اور افشاں ہنس پڑے تھے۔ اور پھر افشاں پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

''حضور! کنیز کے لئے بھی تو کوئی کام تجویز کیا ہوتا۔''

''کیا ہے۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''حکم؟''

''میرے لئے لباس کا انتخاب کریں۔'' میں نے کہا اور افشاں کھو سی گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ ''کیوں، زیادہ مشکل کام ہے؟''

''ایسی بات نہ کہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے باہر جائیں گے تو میں آپ کا لباس نکال دوں گی۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا دی۔

''اور کوئی کام بتائیں؟''

''بتاؤں؟'' میں نے اُسے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، ضرور۔''

''دوسرا کام افتتاح کے بعد۔ جس وقت بھی موقع ملے، آپ انجام دیں گی۔''

''ہاں ہاں، حکم دیں۔'' افشاں نے کہا۔

''آپ میری دونوں آنکھوں کو بوسہ دیں گی۔ میری ساری کاوشوں کا ماحصل ہوگا۔'' میں نے دوسری طرف رُخ کر کے کہا۔ افشاں کا چہرہ میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اس لئے اس کے تاثرات نہ پڑھ سکا لیکن اُس کی خاموشی بہت سی کہانیاں سنا رہی تھی۔

''اور بتایئے۔'' بالآخر اُس کی آواز اُبھری لیکن اس میں ایک شرگیں کپکپاہٹ تھی۔

''اوہ، باقی یہ کہ آپ آج کے انتظامات کے بارے میں صحیح رائے سے نوازیں گی۔''

''مجھے یقین ہے، آپ نے سب کچھ ٹھیک ہی کیا ہوگا۔'' افشاں پیار بھرے انداز میں بولی۔

''نوازش۔ مہربانی۔ ارے ہاں، اس بارے میں اور کوئی خاص بات؟''

''کس بارے میں؟''

''آپ نے بڑی ماں سے جو کچھ کہا تھا، انہوں نے تنویر صاحب سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا یا نہیں؟''

''آپ ابھی تک اسی معاملے میں اُلجھے ہوئے ہیں؟''

''ہاں افشاں! پلیز، مجھے بتاؤ۔''
''میرا خیال ہے کہ اماں جی گول کر گئیں۔ ان کی ہمت نہیں پڑی ہوگی۔'' افشاں نے کہا۔
''ہاں، تنویر صاحب کے رویّے میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔''
''ہوگی بھی نہیں۔ ویسے میں عرض کروں، گھر میں سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ جو بات ہوئی ہے، صرف ایک ایسے تصور سے ہوئی ہے، جو پرانے والدین کے ذہنوں میں ہوتا ہے۔ صرف دنیا کا خوف۔ لیکن کوئی بات نہیں، بچے ہیں، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' افشاں نے آخر میں مسخرے انداز میں کہا۔
''جی ہاں، جی ہاں۔'' میں نے پُرزور تائید کی اور افشاں ہنس پڑی اور پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔
''ارے ہاں، افتتاح کون کرے گا؟''
''آپ تیار تو نہیں ہیں؟''
''نہیں پلیز، تماشا نہ بنوائیں۔'' افشاں نے عاجزی سے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ پھر آپ فیصلہ فرما دیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں۔ اس بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی تصور تو ہوگا؟''
''ہاں ہے تو سہی۔ لیکن اگر آپ متفق نہ ہوئیں؟''
''تو آپ کو منع کر دوں گی۔'' افشاں نے کہا۔
''واقعی؟''
''کیوں، کیا میں منع نہیں کر سکتی؟''
''یہ بات آپ بخوبی جانتی ہیں۔'' میں نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''تبھی تو کہہ رہی ہوں۔'' افشاں نے جواب دیا۔
''تب سنیئے، ابھی یہ بات میرے، عادل اور تصدق کے درمیان ہے۔ ہم بوا سے افتتاح کرائیں گے۔''
''بوا سے؟'' افشاں ہنس پڑی۔
''ہاں۔ اور اس کے بعد اُنہیں تحائف پیش کیے جائیں گے۔''
''ایمان سے، بہت شریر ہیں آپ دونوں۔'' افشاں ہنستی ہوئی بولی۔
''آپ کی منظوری چاہیے۔''
''خوشی سے منظور۔ دل سے منظور۔ بلکہ بہت عمدہ۔'' افشاں نے کہا۔
''خدا کا شکر ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
''اب چلتی ہوں۔ ممکن ہے، عادل بھائی موجود ہوں اور دروازے کے پاس سے ہماری باتیں سن رہے ہوں۔'' افشاں ہنستی ہوئی بولی اور میں نے اُسے خدا حافظ کہہ کر رخصت کر دیا۔
شام کو ٹھیک پونے چار بجے ہماری تمام کاریں تنویر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئیں۔ ان میں دو قیمتی کاریں ہمارے استعمال کی تھیں، باقی اسٹاف وین، اسٹاف کاریں تھیں جن پر کارپٹ سینٹر کے مونوگرام تھے۔ باوردی ڈرائیور گاڑیوں کو قطار میں کھڑا کر کے ان کے نزدیک مؤدب ہو گئے۔ ملازموں نے اندر آ کر اطلاع دی تھی۔ سب تیار تھے اور ہال میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

''چلئے حضرات!'' میں نے کھڑے ہو کر درخواست کی اور سب کھڑے ہو گئے۔ لیکن کوٹھی کے بیرونی دروازے کے باہر کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لئے سب ٹھٹک گئے۔

''ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ!'' نواب جلال الدین کے منہ سے نکلا۔ ڈرائیوروں نے جھک کر گاڑیوں کے دروازے کھول دیئے۔ میں نے پیار بھری نگاہوں سے افشاں کی طرف دیکھا۔

''حضور کے لئے سفید رنگ کی کار ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''نوازش!'' افشاں کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر گاڑیوں کی ترتیب یوں رہی۔ سفید رنگ کی عظیم الشان کار میں نواب جلال للدین، افشاں، سیمیں اور کمال تھے۔ سرمئی رنگ کی کار طالوت کی تھی۔ اس میں تنویر صاحب، بڑی ماں، شکیلہ، طالوت اور احسان تھے۔ دوسرے لوگ بھی تھے جیسے بوا اور کچھ دوسرے افراد۔ بہر حال گاڑیاں کافی تھیں۔ میں چور نگاہوں سے افشاں کو دیکھ لیتا تھا۔ اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ آنکھیں مسرت سے جھکی جا رہی تھیں۔

راستے میں مکمل خاموشی رہی۔ اس شان و شوکت کی نواب جلال الدین کو بھی اُمید نہیں تھی۔ حالانکہ ہمارے بارے میں وہ بہت کچھ جانتے تھے، لیکن پھر بھی، کوئی حد ضرور ہوتی ہے۔ کوئی کھیل کہیں جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہم نے جلال آباد خرید کر نواب جلال الدین کو دے دیا تھا، معمولی بات نہیں تھی۔ اور یہ سب کچھ.....کوٹھی دیکھ کر ہی ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور ابھی تو ایک معمولی سی جھلک دیکھی تھی انہوں نے، ابھی تو بہت کچھ باقی تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کارپٹ سینٹر کی شاندار عمارت میں داخل ہوئے۔ بینڈ بج رہے تھے۔ تصدق نے خوب ہنگامے کئے تھے۔ بے شمار مہمان آ چکے تھے۔ دلچسپ بات جو ہم نے دیکھی، وہ یہ تھی کہ شمشیر، تصدق کے پاس کھڑا تھا۔ عقب میں جمشید بھائی موجود تھے۔

تصدق نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ یہ انوکھی بات تھی۔ حالانکہ ہمیں مہمانوں کا استقبال کرنا چا۔ ئے تھا، لیکن مہمان ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ ویسے روحِ رواں تصدق تھا اور اس وقت وہ ایک قیمتی سوٹ ۔ ں خوب جچ رہا تھا۔ بے شمار لوگوں نے ہم سب کو پھولوں میں لاد دیا۔ عظیم الشان ہال میں ایک اسٹیج بنایا گیا تھا، جس پر مائیک وغیرہ لگے ہوئے تھے۔

نواب جلال الدین بھی اس وقت کھوئے ہوئے تھے۔ ایک ایک چیز دیکھ رہے تھے۔ ہال کی ڈیکوریشن اور دوسرے کام۔ پھر مہمانوں سے تعارف ہوا۔ بڑے بڑے لوگ تھے۔ شہر کے سربرآوردہ، جن کا تعلق ہر محکمے سے تھا۔ یہ تنویر صاحب کی کارروائی تھی۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو مدعو کیا تھا، جن سے مستقبل میں ہمارا واسطہ پڑ سکتا تھا۔

بہر حال، اس کے بعد کارروائی شروع ہو گئی۔ عمارت اتنی بڑی تھی کہ بے شمار مہمان ایک ہال میں ہی سما گئے تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات کا ٹھیکہ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کو دے دیا گیا تھا۔ سرخ سفید وردی میں ملبوس بیرے ٹرالیاں لئے پھر رہے تھے، جن میں شراب کے علاوہ ہر چیز موجود تھی۔

اس کے بعد افتتاح کا وقت آیا۔ شوروم کے دروازے پر فیتہ لگا ہوا تھا، جس کو کاٹنے والے کے نام کا ابھی اعلان نہیں ہوا تھا۔ بالآخر اس کا اعلان بھی تصدق نے کیا۔ بوا اس وقت اس کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ تصدق نے کہا۔

''معزز مہمانوں سے درخواست ہے کہ متوجہ ہوں۔ آج کا مہمانِ خصوصی جس ہستی کو منتخب کیا گیا ہے، اس سے ہمارے کچھ جذبات وابستہ ہیں۔ بزرگ ہی ہمارے رہنما اور راہبر ہوتے ہیں۔ پہلے وہ ہماری پرورش کرتے ہیں، اس کے بعد ہمیں زندگی کے راستوں پر گامزن کرتے ہیں۔ ابتدا میں ان کا عمل ہمارے جسم اور ذہن کی نشوونما کرتا ہے اور بعد میں ان کی دعائیں راہبر ہوتی ہیں۔ چنانچہ کارپٹ سینٹر کے افتتاح کے لئے جناب عادل و جناب صائم نے بوا کو منتخب کیا ہے۔''

تصدق نے بوا کا ہاتھ اونچا کر دیا۔

''اے ہٹ، یہاں بھی باز نہیں آتا، کم بخت۔'' بوا نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دانت پیس کر بولیں۔ کچھ مہمانوں نے قہقہے لگائے تھے اور تصدق گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گیا، بوا تو وہاں بھی دو چار جڑ سکتی تھیں۔ نواب صاحب اور تنویر صاحب نے پُرجوش تالیاں بجائی تھیں۔ تب میں آگے بڑھا۔

''تشریف لے چلیں بوا!''

''اۓ کہاں بھیا! ہائے اتنے سارے مردوں میں میری جان تو ویسے ہی ہلکان ہوئی جا رہی ہے۔''

''ہمارے اس چھوٹے سے کاروبار کا افتتاح آپ کریں گی۔''

''مجھے کرنا نہ آوے ہے بھیا! کسی اور سے کرا لو۔'' بوا لجاجت سے بولیں۔

''اوہ، بوا! ہم آپ کو بتا دیں گے۔ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم آپ کے ہاتھوں کی برکت چاہتے ہیں۔''

''اے میرے مولا! میں کیا کروں؟'' بوا بری طرح گھبرا رہی تھیں۔

''مری کیوں جا رہی ہیں بوا! سب کے سامنے مذاق بنوا رہی ہیں۔ کوئی ہل تو نہیں چلانا پڑے گا آپ کو۔'' سیمیں نے کہا۔ افشاں اور شکیلہ ہنس رہی تھیں۔

''چلو، اللہ تمہیں سلامت رکھے۔'' بوا آگے بڑھیں۔ مہمان پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ''اۓ یہ اۓ کیوں پیچھے لگ گئے ہیں؟ دیکھو تو، سب کے سب چلے آ رہے ہیں۔''

''ارے ارے بوا! یہ ہمارے مہمان ہیں۔'' افشاں آواز دبا کر بولی۔

''تو یہ بھی آئیں گے؟'' بوا بولیں۔

''ہاں، ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں بلایا ہے۔''

''اے لو..... قسم لے لو، ایک سے بھی کہا ہو۔ کیوں بلاتی ان مٹ گیوں کو؟'' بوا اپنی پوزیشن صاف کرنے لگیں۔

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ چلتی رہیں۔''

''اب یہ سب میرا تماشا دیکھیں گے۔'' بوا ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ اُنہیں گمان بھی نہیں تھا کہ ان پر ایسی بیتے گی۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

''اۓ جمشید!'' بوا نے رازدارانہ انداز میں جمشید سے کہا۔

''یس یس، کیا بولتا پڑا بوا؟'' جمشید جھک گیا۔

''کیا ہو گیا بیٹا!..... اور کیا کریں گے اب یہ سب؟''

''اوہ! اب یہ قینچی لائیں گا اور سب کے سامنے تمہارا چوٹی کاٹیں گا۔'' جمشید نے آہستہ سے کہا لیکن

میں نے سن لیا۔ بلاشبہ اُس نے بدمعاشی کی تھی۔ بوا سہم کر رُک گئیں۔ دوسرے لوگوں نے جمشید کی بات نہیں سنی تھی۔ سب بوا کو پیچھے سے دھکیل رہے تھے اور بوا کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ان کی کوئی سن تو رہا نہیں تھا، بس اُنہیں سُولی پر لٹکانے لے جایا جا رہا تھا۔ اتنے لوگوں کے سامنے زیادہ بول بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ اچھی تقریب میں آئی تھیں۔ بالآخر اُنہیں فیتے کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ پھر ایک ملازم ہاتھوں میں چوڑی کشتی لے کر قریب پہنچ گیا، جس میں قینچی رکھی ہوئی تھی۔

بوا نے قینچی دیکھی تو ان کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے، چکر آ گیا، گرنے لگیں اور سنبھلنے کے لئے تنویر صاحب کا سہارا لیا۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''ائے بچے! اس آخری عمر میں مجھے بے عزت ہونے سے بچا لو۔ ہائے، چوٹی کٹ گئی تو لوگ کیا کہیں گے، کہاں منہ کالا کیا تھا۔''

''چوٹی کٹ گئی؟'' تنویر صاحب حیرت سے بولے۔

''ارے تو اور کیا کر رہے ہو تم سب مل کر۔ کیا مجھے صرف ذلیل کرنے کے لئے یہ دھوم دھام نہیں کی گئی تھی؟''

''براہِ کرم بوا! کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں۔ اس وقت تمام لوگوں کی نگاہیں آپ پر ہیں۔ آپ کو صرف اتنا کام کرنا ہے کہ اس قینچی سے یہ فیتہ کاٹ دیں۔''

''کیا کاٹ دیں؟'' بوا چونک کر بولیں۔

''یہ رنگین فیتہ۔'' تنویر صاحب نے فیتے کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے کاٹنے سے کیا ہو جائے گا؟''

''بس صرف یہی کام ہے آپ کا۔''

''اے لو، کہاں گیا یہ جمشید۔ کہہ رہا تھا، میری چوٹی کٹے گی۔'' بوا کے چہرے کی رونق واپس آ گئی ''اے بھیا! تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو گے۔ ائے کہاں گیا یہ جمشید؟'' لیکن جمشید اب لوگوں کے ہجوم میں گھس گیا تھا۔

ضروری کارروائیاں ہو چکی تھیں اور اب فیتہ کٹنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ چنانچہ بوا سے درخواست کی گئی۔ طالوت نے جھک کر ان سے فیتہ کاٹنے کے لئے کہا۔

''ائے کیوں کٹوا رہے ہو؟ اتنا خوب صورت تو ہے۔ میں گانٹھ کھول دوں گی۔ اسے کٹواؤ مت۔'' بوا نے کہا۔

''اوہو بوا! یہ ضروری ہے۔'' طالوت بولا۔

''تمہاری مرضی۔ تمہاری چیز ہے، مجھے کیا۔'' بوا نے قینچی اُٹھائی اور پھر فیتہ کاٹ دیا۔ چاروں طرف سے تالیاں گونج اُٹھی تھیں اور پھر مبارکبادیں برسنے لگیں۔ پھر تمام معزز مہمانوں کو فرم کے مختلف شعبے دکھائے جانے لگے۔ شوروم دکھایا گیا۔ پوری عمارت کی سیر کرائی گئی۔ لوگوں کی آنکھوں میں تحسین کے آثار تھے۔ اور پھر سب واپس ہال میں آ گئے، جہاں چند دعائیہ تقریریں ہوئیں۔ جن میں نواب جلال الدین اور تنویر صاحب کی تقریر بھی شامل تھی۔ انہوں نے اپنے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا تھا۔ پھر اخباری نمائندوں نے ہمارے کاروبار کے بارے میں کچھ سوالات کئے اور میں نے انہیں بتایا کہ فی الحال ہم دنیا کے مختلف ممالک کو قالین ایکسپورٹ کریں گے اور پھر اپنی فیکٹری بھی لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بہر حال انتہائی شاندار رہی تھی یہ تقریب۔ پھر اس کا اختتام ہو گیا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ بے شمار لوگ چلے گئے اور جو باقی بچے تھے، جا رہے تھے۔ شمشیر اور اس کی بیوی رقیہ بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ شریک رہے تھے۔ بالکل الگ تھلگ، اجنبی اجنبی سے۔ اور پھر اس وقت وہ بھی دوسروں کے ساتھ جانے لگا تو میں نے طالوت کو اشارہ کیا۔ طالوت نے شمشیر کو لپک لیا۔ نواب صاحب، تنویر صاحب اور دوسرے افراد بھی یہاں موجود تھے۔

''ارے ارے شمشیر صاحب! یعنی آپ مسلسل زیادتی پر آمادہ ہیں۔'' طالوت نے اُسے روکتے ہوئے کہا اور وہ چونک کر رُک گیا۔ اُس نے عجیب سی نگاہوں سے ہم سب کو دیکھا۔ اُس کی بیوی کے چہرے کے تاثرات اب بھی مخلصانہ تھے اور وہ مسکرا رہی تھی۔

''خیریت؟ کیا زیادتی ہو گئی میری جانب سے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی یوں لگتا ہے جیسے آپ سے کوئی قرابت داری ہی نہیں ہے۔ عام مہمانوں کی طرح آئے ہیں اور عام مہمانوں کے سے انداز میں واپس جا رہے ہیں۔'' طالوت نے کہا۔

''اوہ! مجھے کوئی فوقیت حاصل ہے؟''

''یقیناً۔ نواب صاحب سے آپ کے جو بھی تعلقات ہوں، تھوڑی سی قربت تو ہم سے بھی ہے۔''

''تھی نہیں، ہو گئی ہے۔ ویسے میں آپ کی اس کاوش کی داد ضرور دوں گا، جو آپ نے خود کو چھپانے کے لئے کی۔''

''اوہ شکریہ۔ لیکن میں سمجھا نہیں؟'' طالوت نے کہا۔

''مجھے آخر وقت تک ہوا نہیں لگنے دی کہ سامنے کی عمارت کس کی ہے اور اس میں کیا ہو رہا ہے۔''

''اوہ! ہم نے کئی بار سوچا کہ آپ سے اس بارے میں مشورہ کریں لیکن فرصت ہی نہیں مل سکی۔''

''خیر، کچھ نہ کچھ تو آپ کو کہنا ہی ہے۔'' شمشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہر حال، اب تو ہم لوگ ہم پیشہ بھی ہو گئے اور پھر دیرینہ تعلقات۔ مجھے مسرت ہو گی، اگر آپ دونوں یعنی خاتون اور آپ، رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھائیں۔''

''معاف کیجئے گا جناب! ویسے میں یہ نہیں پہچان سکا کہ آپ عادل ہیں یا صائم؟''

''عادل۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''جی عادل صاحب! تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی مناسب۔ ہم ایک دوسرے کے کاروباری حریف ہوں گے اور مستقبل میں بڑے بڑے معرکے بھی ہوں گے، اس لئے ہمیں ابھی سے تیاری کر لینا چاہئے۔ یہ دوستانہ فضا ہم میں سے کسی کو راس نہیں آئے گی۔'' شمشیر نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور پھر دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اجازت حضرات؟''

''آپ کی مرضی شمشیر صاحب! ویسے آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے گھوڑے، ہمارے معمولی سے ٹٹو کے مقابلے میں بھی پٹ جاتے ہیں۔'' طالوت بھی کم نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اس ریس کورس میں بھی قسمت آزمائی کر لیں گے۔ ممکن ہے، اس بار آپ کا ٹٹو نہ دوڑ سکے۔'' شمشیر نے کہا اور اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھ گیا۔

طالوت نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''شمشیر تو ٹٹو بن کر رہ گیا ہے نواب صاحب!''

''کمینے باپ کا کمینہ بیٹا۔اس کی فطرت ہی خراب ہے۔'' نواب صاحب ہونٹ چبا کر بولے۔
''لیکن یہ شمشیر کو عادل اور صائم سے کیا پُرخاش ہے؟ میں نے ریس کورس میں بھی محسوس کیا تھا۔''
''بس یہ خدا واسطے کے بیریوں میں سے ہے۔جہنم میں جائے۔'' نواب صاحب بولے۔مہمان رخصت ہوتے رہے اور پھر سارے مہمان چلے گئے۔تصدق، جمشید اور کمال ایک جگہ کھڑے تھے۔سارا اسٹاف دست بستہ تھا۔تب طالوت نے سب کو اشارہ کیا اور واپس ہال میں آ گیا۔پھر اُس نے تصدق سے کہا کہ پورے اسٹاف کا تعارف کرایا جائے اور سب کی حیثیت بتا دی جائے۔چنانچہ فرم کے یکہ وتنہا مالک کی حیثیت سے میرا نام بتایا گیا۔تصدق کو منیجر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔خود طالوت نے کوئی حیثیت قبول نہیں کی تھی۔تمام لوگوں نے مجھے مخلصانہ مبارکباد دی۔اور پھر ایک مختصر سی تقریر میں نواب جلال الدین اور تنویر صاحب نے اپنے خلوص کا اظہار کیا اور ملازموں سے کہا کہ وہ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیں۔

اس کے بعد میں نے بھی کچھ جملے کہے اور طالوت کی ہدایت کے مطابق اعلان کیا کہ افتتاح کی خوشی میں مزید ایک ایک ماہ کی تنخواہ ملازموں کو بطورِ انعام ادا کی جائے گی۔اس کے علاوہ میں نے اپنے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کریں اور یہ تصور لے کر یہاں آئیں کہ اپنی زندگی میں ایک اہم ذمے داری پوری کرنے آئے ہیں۔یہ ان کا کام ہوگا اور میرا کام یہ ہوگا کہ اس کاروبار میں جان ڈالنے کے علاوہ اپنے ایک ایک کارکن کا خیال رکھوں۔آپ میں سے کوئی شخص خواہ وہ کسی عہدے پر فائز ہو، ہر وقت میرے پاس آ کر کاروباری اور ذاتی گفتگو کر سکتا ہے۔اپنی کسی تکلیف، اپنے کسی مسئلے کو فوراً میرے سامنے پیش کر سکتا ہے۔

کارکنوں نے اس تقریر کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔اس کے بعد بوا کو تحائف پیش کئے گئے اور پھر کارکنوں کو رخصت کی اجازت دے دی گئی۔پھر ہم کوٹھی چل پڑے۔کہیں بھی، کسی بھی انتظام میں جھول نہیں تھا۔صرف ان شاندار انتظامات پر ہی تصدق کی تنخواہ دُگنی کر دی گئی۔

کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔اسے دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔میرا دل مسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔اس وقت ذہن و دل پر کوئی بار نہیں تھا۔بہرحال دوسرے تکلفات شروع ہو گئے۔رات کی پہلی دعوت کھائی گئی، جس کے بارے میں کوئی تذکرہ فضول ہے۔بس وہ سب کچھ تھا، جو ہو سکتا تھا۔نواب جلال الدین اور تنویر صاحب کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

پھر لان کی نشست میں انہوں نے یہ سوال کر ہی ڈالا۔''میرا تو خیال ہے صائم میاں! تم نے یہاں بھی اپنی ریاست کی چھوٹی سی برانچ ہی بنا ڈالی۔''

''اوہ جناب! یہ ممکن نہیں تھا۔میری ریاست تو خوابوں کی ایک دنیا ہے۔وہاں جو کچھ ہے، اس کا تصور بھی یہاں نہیں کیا جا سکتا۔''

''بھئی ہم تو احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے ہیں۔'' تنویر صاحب بولے۔

''آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔آپ بزرگوں کی محبت ان ساری چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''خدا تمہیں خوش رکھے۔'' نواب جلال الدین بولے۔

''ہاں بھائی، یہ احمق انسان کیا بکواس کر رہا تھا؟'' تنویر صاحب بولے۔
''کون؟'' نواب صاحب نے چونک کر کہا۔
''یہی شمشیر۔''
''اوہ، کچھ نہیں۔ حشمت بذاتِ خود بھی اچھا انسان نہیں تھا۔ اُس کی اولاد بھی اُس جیسی ہے۔''
''لیکن یہ کہہ کیا رہا تھا؟''
''ظاہر ہے، ان دونوں کا ایک ہی کاروبار ہے۔''
''میرا تو خیال ہے، عادل اور صائم میاں نے یہ کاروبار اسی کے لئے کیا ہے؟'' تنویر صاحب بولے۔
''ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ کیوں صائم میاں! چھپاؤ گے؟''
''نہیں جناب! آپ سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ شمشیر کی فرم کے سامنے یہ جگہ صرف اسی خیال سے خریدی گئی تھی۔ ہم اس شخص کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور بن جائے گا۔ مشکل نہیں ہو گی۔'' طالوت نے جواب دیا۔
''اور اس چھوٹی سی بات کے لئے تم نے یہ سب کچھ کر ڈالا؟''
''نہیں۔ یہ بات نہیں نواب صاحب! دراصل صائم میاں کو یہ علاقہ، یہ لوگ پسند آ گئے۔ انہوں نے یہاں قیام کا فیصلہ کر ڈالا۔ اب یہاں ان کے لئے کوئی مشغلہ بھی ضروری تھا۔ چنانچہ کچھ کرنا ہی تھا، سو کر ڈالا تاکہ تھوڑی سی تفریح بھی رہے۔''
''خوب تفریح ہے بھائی! لیکن اس احمق نے تمہیں چیلنج کیا ہے؟''
''پہلے بھی کیا تھا ایک بار۔'' نواب صاحب نے حقارت سے کہا۔
''ہم اسے جواب دیں گے۔''
''زندگی خراب کر بیٹھا ہے احمق کہیں کا۔ کیا مقابلہ کرے گا۔'' نواب صاحب منہ بنا کر بولے۔
''لطف رہے گا نواب صاحب! میں تو ایک اور درخواست کروں گا۔'' میں نے کہا۔
''کیا؟'' نواب جلال الدین بولے۔
''آپ واقعی جلال آباد سے یہاں آ جائیں۔ اس عمارت میں تنہا زندگی تو مشکل سے گزر سکے گی۔ جلال آباد آپ کارندوں کے حوالے کر دیں اور یہاں ہی کوئی کاروبار کر ڈالیں۔''
''بھئی میں تو سادہ دل انسان ہوں۔ درحقیقت یہی کر بیٹھوں گا۔'' نواب جلال الدین بولے۔
''اور آپ جانتے ہیں نواب صاحب! ہم بھی مصلحت آمیز گفتگو کے قائل نہیں ہیں۔'' طالوت نے کہا۔
''ہاں، جانتا ہوں۔''
''بس تو یہ مبارک فیصلہ آج ہی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔
''مشورے کے لئے وقت نہیں ملے گا؟''
''ابھی ووٹنگ ہو جاتی ہے۔'' طالوت بولا۔
''میں اس قرارداد کی پُرزور حمایت کرتا ہوں۔''
''ہم بھی...... ہم بھی...... ہم بھی......'' چاروں طرف سے آوازیں اُبھریں اور سب نے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ ان میں سیمیں اور احسان بھی تھے۔

''میں بھی اپنے بچوں ہی میں خوش رہ سکوں گا۔ میری زندگی ہی کتنی ہے۔ لیکن صائم میاں! میری کچھ شرائط ہوں گی۔''

''سب منظور۔'' میں نے کہا۔

''بس تو اپنی کوٹھی کے قریب ہی میرے لئے بھی ایک عمارت تعمیر کراؤ اور کاروبار کا انتخاب کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''بس پھر میرے یہاں آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' نواب صاحب نے کہا اور پُرجوش تالیاں بجا بجا کر اُن کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا۔ سب بے حد خوش وخرم نظر آرہے تھے۔ پھر فرم کے بارے میں گفتگو شروع ہوگئی۔ اس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا کہ پورے ملک میں اس کی ٹکر کی کوئی فرم نہیں ہوگی۔ غرض خاصی رات گئے تک ہنگامے جاری رہے اور پھر سونے کی ٹھہری۔ ملازموں نے سارے کمرے تیار کر دیئے تھے۔ مہمانوں کو ان کے کمروں میں پہنچا دیا گیا۔ میں اور طالوت بھی اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔

''آج سے ہم تم علیحدہ ہوگئے۔'' طالوت نے کہا۔

''خدا نہ کرے۔ کیوں؟''

''میرا مطلب ہے، رات کو۔ ظاہر ہے، اپنے اپنے کمروں میں سوئیں گے۔''

''جی ہاں۔ آپ تو خدا سے چاہتے ہوں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''میں دیکھ چکا ہوں، آپ کی راج ہنس کا کمرہ، آپ کے کمرے سے کتنی دُور ہے۔''

''تیرا بھی فیصلہ جلد ہو جائے گا یار!'' طالوت ہنستے ہوئے بولا۔ پھر چونک کر کہنے لگا۔ ''ایک بات تو بتا عارف!''

''ہوں!''

''ہم دونوں کے تعلقات کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟''

''ہم دونوں سے مراد؟''

''شکیلہ اور میں۔''

''کسی خیال کی گنجائش ہے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں۔ صرف ایک خیال کی۔''

''وہ کیا؟''

''ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اکثر رات کو بھی یکجا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا، ہم دونوں پاکیزگی کی حدود میں ہیں اور اس وقت تک پاکیزگی کی حدود میں رہیں گے، جب تک اخلاقی اور مذہبی طور پر ایک دوسرے کے نہ ہو جائیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا اور کبھی غلط نہ سوچنا۔''

''احمق ہو پورے۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی غلط تصور نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ!'' طالوت نے کہا اور مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ مسرت وشادمانی بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی تھی۔ بہت ہی خوش تھا۔ لیکن کمرے کی

تنہائی پسند نہیں آئی۔ دل میں آواز اُبھری، کاش، افشاں یہاں ہوتی۔ کاش، اس کمرے میں تنہائی نہ ہوتی۔
لیکن انتظار کرنا تھا۔ انتظار..... ابھی کچھ وقت لگے گا۔ میں نے مسہری پر لیٹ کر سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ورنہ خیالات کے ہجوم میں سونے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ کروٹ بدل لینے سے نیند تھوڑی آ جاتی ہے۔ یہ جو سب کچھ ہوا تھا، یہ جو کچھ تھا، سونے کہاں دیتا تھا؟ خیالات چپکے سے ذہن کے گوشوں میں در آتے اور نہ جانے کہاں کہاں بھٹکانے لگتے۔
رات گزرتی رہی۔ اور پھر آہستہ سے کمرے کے دروازے پر دھکا لگا۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ کھل گیا اور افشاں مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔
میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ افشاں مسکرا رہی تھی۔
''کیا اجازت لینی چاہئے تھی؟'' اس نے پوچھا۔
''شرمندہ کر رہی ہیں افشاں!''
''ہرگز نہیں۔ اور پلیز آپ یہ بالکل نہ کہیں کہ مجھے اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔''
''نہیں کہوں گا۔ بیٹھیں۔''
''شکریہ۔ دراصل ذاتی مبارکباد دینا تھی نا۔''
''ہاں۔ میں اسے وصول کرنے کے لئے بے چین تھا۔''
''جانتی تھی، آپ جاگ رہے ہوں گے۔''
''واقعی؟'' میں نے مسرور نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''کیوں..... یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟'' افشاں نے مسکرا کر کہا اور میں بے اختیار ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور افشاں آہستہ آہستہ میرے قریب پہنچ گئی۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اور ہرا سینہ فرطِ مسرت سے پھٹنے لگا۔ ہم دونوں پہلی بار بے قابو ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ افشاں سے لپٹ گئے تھے۔ افشاں کے ہاتھوں کی لرزش بھی نمایاں تھی۔ اس نے میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ کئی منٹ تک ہم اسی طرح رہے۔ ہم ساری دنیا کو بھول گئے تھے۔
پھر میں نے آہستہ سے افشاں کو علیحدہ کر دیا۔ افشاں کی پلکیں بوجھل تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک رنگیں مسکراہٹ تھی۔
''میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔'' بالآخر اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔
''آپ بھی افشاں بیگم!..... ظاہر ہے، میں تو آپ کے غلام کی حیثیت رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور شاں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
''ایسا نہ کہیں۔ کنیز تو میں ہوں، ہمیشہ کے لئے۔'' اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
''آنے والا وقت بتائے گا افشاں! کہ آپ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا اور افشاں بیٹھ گئی۔ پھر کئی منٹ تک خاموش زبان بنی رہی۔ اور پھر اس نے کہا۔
''واقعی آپ نے بڑا طلسمی ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یہ سب جادوگری کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی خوبصورت کوٹھی اور ایسا عظیم الشان شوروم بنایا ہے آپ نے کہ بس۔''
''مہربانی، نوازش!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ شمشیر کیا لاف وگزاف کر رہا تھا؟''
''احمق ہے بے چارہ۔ بہر حال، دلچسپی رہے گی۔''
''اس کی بیوی اس سے مختلف ہے۔ آج بھی اس نے ہم سے گھلنے ملنے کی کوشش کی، لیکن میرا خیال ہے، شمشیر نے اس کو تاکید کر دی ہے کہ ایسا نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی چھاپہ مار دیا اور اسے ساتھ لے گیا۔''
''ٹھیک ہے۔ اس کا خیال رکھا جائے گا۔''
افشاں کافی دیر تک مجھ سے بات چیت کرتی رہی اور پھر اجازت لے کر اُٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بڑی پُرسکون نیند آئی اور صبح کو ہی آنکھ کھلی۔ میں سب سے بعد میں جاگا تھا۔ تمام لوگ نشست کے ہال میں موجود تھے۔ ایک ملازم نے اطلاع دی۔ چنانچہ سارے کام نہایت پھرتی سے کیے اور تیار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔

سب اخبارات دیکھ رہے تھے۔ بہت سے اخبارات نے ہماری فرم کے بارے میں تفصیلات چھاپی تھیں۔ بے شمار تصاویر موجود تھیں۔ لیکن شمشیر نے انتہائی جلد بازی میں ایک دلچسپ حرکت کی تھی۔ تقریباً سارے ہی اخبارات میں اس کی فرم کے بڑے بڑے اشتہارات تھے۔ اسے شاید گمان بھی نہ ہوگا کہ اخبارات ہمارے بارے میں اس قدر دلچسپی لیں گے۔ اُس نے تو بڑی رقم خرچ کی تھی، لیکن اُس کے اشتہارات ہماری فرم کی خبروں میں دب گئے تھے۔
اسی بات پر دلچسپ تبصرے ہو رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔
''بھئی کاروباری مقابلہ تو بری چیز نہیں ہے۔ ہاں، اس میں جنون کا انداز احمقانہ ضرور ہو جاتا ہے۔'' تنویر صاحب نے کہا۔
''شمشیر کے ارادے ان اشتہارات سے پتہ چلتے ہیں۔ اُس نے معمولی تگ و دو نہ کی ہوگی۔'' نواب جلال الدین بولے۔
''ہاں، یہ حقیقت ہے۔''
''بہر حال، اب کیا پروگرام ہے؟''
''کس بارے میں نواب صاحب؟'' میں نے پوچھا۔
''فرم کے بارے میں۔''
''بس فرم آج سے کام شروع کر دے گی۔ ویسے سارے شعبے تصدق کے پاس ہیں اور اسے اجازت مل گئی ہے کہ جو مناسب سمجھے، کرے۔ اور تصدق کی انتظامی صلاحیتیں آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔''
''ہوں۔'' نواب صاحب گردن ہلانے لگے۔ اس کے بعد ناشتے کا وقت ہو گیا اور ہم سب ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ ناشتہ ہوا اور پھر ہم نے دفتر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ پھر ہم نے سب لوگوں سے اجازت لی اور اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر چل پڑے۔ جمشید ہمارے ساتھ تھا۔ یہ شخص بھی خوب تھا، ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔
دفتر کا پہلا دن کافی دلچسپ تھا۔ طالوت تو پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے کسی معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ میرے کمرے میں صرف میری سیکرٹری عذرا تھی اور میں۔ عذرا ایک مستعد لڑکی تھی۔ دوپہر کا

کھانا ہم نے آفس میں ہی کھایا اور اس کے بعد تصدق فرم کے پبلسٹی منیجر کے ساتھ حاضر ہو گیا۔ وہ پبلسٹی کے پروگرام کی منظوری لینے آیا تھا۔ میں نے اُسے بھرپور پبلسٹی کی اجازت دے دی۔ پھر مارکیٹنگ منیجر سے میٹنگ ہوئی اور بہت سے امور طے کئے گئے۔ مثلاً چند ایجنٹ اس سلسلے میں منتخب کئے گئے کہ وہ بڑی بڑی کمپنیوں، بینکوں اور دوسری فرموں سے رابطہ قائم کریں اور ان سے مستقل ٹھیکے لیں۔ ایسے ہی بہت سے امور۔

خواب کے دن، خواب کی راتیں گزرنے لگیں۔ تنویر صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔ پورے ایک ہفتے وہ ہمارے ساتھ رہے اور پھر اجازت لے کر چلے گئے۔ البتہ نواب جلال الدین ایک طویل عرصے کے لئے آئے تھے۔ چنانچہ گھر کے امور نواب صاحب نے سنبھال لئے۔ سیمیں، احسان اور شکیلہ گھر میں رہتے تھے۔

شمشیر سے معرکہ آرائی شروع ہو چکی تھی، جس کی ابتدا پبلسٹی سے ہوئی۔ اخبارات بھی پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔ شمشیر برابر مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا اشتہار ہمارے اشتہار سے چھوٹا نہیں ہوتا تھا، لیکن احمق ہمیشہ کا تھا۔ صرف اخباری اشتہارات پر اکتفا کر رہا تھا۔ جبکہ ہمارے ایجنٹوں نے چھ سفارت خانوں، تین بینکوں اور بیس بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں سے ٹھیکے لے لئے تھے اور چند روز کے اندر اندر سپلائی شروع ہونے والی تھی۔ تصدق اس کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بھیا جمشید کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ صبح کو بڑی باقاعدگی سے آفس آتے، تھوڑی دیر میرے کمرے میں بیٹھتے اور پھر نہ جانے کہاں مارے مارے پھرتے۔ کبھی ہمارے ساتھ ہمارے ہاں رہتے اور کبھی تنویر صاحب کے ہاں چلے جاتے۔ تصدق نے انہیں اچھی خاصی رقم دی تھی، جسے تھوڑی سی رد و کد کے بعد انہوں نے قبول کر لیا تھا۔ اور پھر ایک دن انہوں نے ایک ایسی تجویز پیش کی کہ ہم دنگ رہ گئے۔

شمشیر کے مسئلے سے وہ بھی دلچسپی لے رہے تھے اور اپنی احمقانہ باتوں سے نوازتے رہتے تھے۔ اس وقت طالوت بھی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر عذرا بیٹھی کچھ کاغذات درست کر رہی تھی۔

''میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے صائم بھائی!'' جمشید کی بات پر ہم چونک پڑے۔

''ارشاد، ارشاد!'' طالوت بولا۔

''ہماری سپلائی شروع ہونے والی ہے۔ کیوں نہ ہم نقلی گاہک کے ذریعے شمشیر کا سارا اسٹاک بھی خرید لیں۔ ذریعہ اشتہار ہی بنائیں گے اور پھر اس کی ورائٹی ہم سپلائی کریں۔ شمشیر کی تو دُکان ہی خالی ہو جائے گی۔ وہ فوری طور پر کہیں سے مال بھی نہ حاصل کر سکے گا۔ پھر خالی اشتہار دینے سے فائدہ۔'' اور اس تجویز پر ہم دنگ رہ گئے۔ نہایت ہی عمدہ تجویز تھی۔

جمشید نے جو تجویز پیش کی، وہ اتنی شاندار تھی کہ ہم متحیر رہ گئے تھے۔ کم از کم سادہ لوح جمشید سے اس عمدہ تجویز کی توقع نہیں تھی۔ کئی منٹ تک خاموشی چھائی رہی اور جمشید ہمارے اچانک اس طرح خاموش رہ جانے سے کچھ بوکھلا گیا تھا۔ وہ احمقانہ انداز میں ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔

جب کوئی کچھ نہ بولا تو خود اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''میرے سے کوئی غلطی ہو گیا کیا؟''

''اوہ، نہیں جمشید صاحب! فیصلہ کر رہے ہیں کہ اس تجویز پر آپ کے لئے کون سا پرائز مقرر کیا جائے۔ آپ نے اتنی لاجواب بات کہی ہے کہ ہم حیران رہ گئے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ جمشید صاحب کی تجویز پر عملی کارروائی فوراً شروع ہو جانی چاہئے۔'' طالوت نے کہا۔

''یقیناً''

''اور اسے نہایت خفیہ رکھا جائے۔ صائم! تصدق کو طلب کریں۔'' طالوت بولا اور چند منٹ کے بعد تصدق موجود تھا۔ طالوت نے جمشید کی تجویز تصدق کے سامنے پیش کر دی اور تصدق بھی خوش ہو گیا تھا۔

''نہایت عمدہ خیال ہے جناب! ہم بروکرز کے ذریعے بات چیت کر سکتے ہیں۔'' تصدق نے کہا۔

''اوہ، نہیں مسٹر ٹاساڈوک! بروکر لوگ کسی کا نہیں ہوتا۔ بات ان سے آؤٹ بھی ہو سکتا ہے۔'' جمشید نے پھر دخل دیا۔

''پھر آپ کے ذہن میں کوئی اور تجویز ہے؟''

''ہاں۔ آسانی سے کام ہو سکتا ہے۔ ہم کسی بھی آدمی کو اس پر تیار کر سکتا ہائے۔ وہ مڈل ایسٹ کے کسی شیخ کا نمائندہ بن کر جائے اور ایک بڑا ڈیمانڈ کرے۔ یہیں کیش پر خریدنے کا پیش کش کرے۔ مال اگر شمشیر کے اسٹاک سے بھی زیادہ مانگا جائے اور قیمت اچھا لگایا جائے تو شمشیر اپنا سارا کوشش کرے گا اور جہاں کہاں سے مال لے سکتا ہے، لے لے گا اور پھر اس کے بعد اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔''

''یار جمشید! خدا کی قسم اب ہم مرغے کی بولی بولنا شروع کر دیں گے۔ بھائی! صبح ہی صبح کوئی غلط چیز کھالی تھی...... میرا مطلب ہے، عقل آور۔ کیا غضب کی چل رہی ہے تمہاری کھوپڑی۔'' میں سچ مچ متحیر ہو گیا تھا۔

''صائم بھائی!'' طالوت چیخا۔

''کیوں؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جمشید کی تنخواہ میں دو ہزار روپے کا اضافہ۔''

''منظور۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تصدق کو پوری تجویز سمجھا دی گئی۔ کسی مقامی آدمی کو کچھ لے دے کر عرب بنا دینا مشکل کام نہیں تھا۔ اس تجویز کے تیسرے دن ہی ہمارا نمائندہ، شمشیر کے ہاں پہنچ گیا اور شام کو اُس نے اطلاع دی کہ شمشیر دل و جان سے تیار ہو گیا ہے۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر آرڈر کی تعمیل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اسے ایک بڑا ایڈوانس دے دیا گیا ہے۔ اور جس شخص کو معاوضے پر ہم نے اپنا نمائندہ بنایا تھا، اس کے عیش ہو گئے۔ شمشیر نے اسے اپنی کوٹھی میں قیام کی پیش کش کی تھی لیکن ہماری ہدایت پر اُس سے معذرت کر لی گئی۔ پھر بھی شمشیر اُس کی خدمت میں لگا رہا۔ اس کے سارے نمائندے کام کر رہے تھے اور وہ چاروں طرف سے مال اکٹھا کر رہے تھے۔

پھر ایک دن جمشید نے تصدق سے گفتگو کر کے ایک بڑا اسٹاک طلب کیا اور تصدق نے اس کی ڈیمانڈ میرے سامنے پیش کر دی۔

''اوہ، جمشید! ٹھیک ہے۔ لیکن یہ آرڈر تم کہاں سپلائی کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ، میں اپنے طور پر بھی کام کرتا، مسٹر صائم! اگر آپ اجازت دیں تو۔ ویسے میں نے ریٹ بہت اچھا دیا ہے، آپ دیکھو۔''

''ہاں، ریٹ بہت عمدہ ہے۔ ٹھیک ہے تصدق! جمشید کو مال سپلائی کر دو۔''

''بہت بہتر جناب!'' تصدق نے جواب دیا اور جمشید نے فوراً ایڈوانس پیش کر دیا۔ مال کی ڈلیوری ملتے ہی اُس نے پوری قیمت بھی ادا کر دی۔ درحقیقت یہ جمشید بہت عمدہ جا رہا تھا۔ طالوت بھی اُس سے

ہت خوش تھا۔

''میرا خیال ہے صائم! ہمیں جمشید کے مہیا کیے ہوئے آرڈر سے تقریباً دو لاکھ کا فائدہ ہوا ہے۔''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

''اس کا کمیشن ہونا چاہئے۔''

''ضرور۔ ظاہر ہے، دوسرے لوگ بھی یہی کام کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ منافع سے پانچ فیصد اسے دے دو۔''

''شمشیر کا مسئلہ نمٹ جائے، اس کے بعد اسے ادائیگی کر دیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' طالوت نے میری بات سے اتفاق کیا۔

بہر حال ٹھیک ایک ہفتے کے بعد شمشیر نے آرڈر کی تعمیل کر دی اور اُس کے سارے گودام خالی ہو لئے۔ عظیم الشان اسٹاک ہمارے گوداموں میں آ گیا۔ لیکن اس اسٹاک میں وہ مال دیکھ کر ہم حیران رہ گئے، ،جمشید نے سپلائی کیا تھا۔ فوری طور پر جمشید سے رابطہ قائم کیا گیا اور وہ مسکراتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا۔

''تم سے وہ مال کس نے خریدا تھا جمشید! جو تم نے سپلائی کیا تھا؟''

''شمشیر نے۔'' جمشید شرماتا ہوا بولا۔

''کیا مطلب؟''

''ہم نے بروکر کے ذریعے اپنے آدمی کو وہ مال بھی دکھایا اور اس نے ہمارے پروگرام کا مالک اسے ہت پسند کیا اور کہا کہ جتنا مال ہو، شامل کر دیا جائے۔ شمشیر دوسرے مال کی ساکھ کے لئے اسے خریدنے پر جبور ہو گیا۔ بڑے آرڈر کو سرو کرنے کے لئے اُسے یہ نقصان اُٹھانا پڑا اور اُس نے بروکر سے اسٹاک مانگ یا۔ اس طرح ہمیں تھوڑا فائدہ اور ہو گیا۔'' جمشید نے شرماتے ہوئے بتایا اور ہمارے منہ حیرت سے کھل لئے۔ یہ ایسی زبردست کاروباری چال تھی، جسے ایک خطرناک کاروباری ذہن ہی سوچ سکتا تھا۔ لیکن یہ کام ں احمق جمشید نے کیا تھا۔ ہم سناٹے میں رہ گئے تھے اور ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جمشید کیا چیز ہے۔

''کیا یہ بات تصدق کے علم میں تھی؟''

''نہیں مسٹر صائم! یہ کام ہم پر تلی کیا۔ اس سے نقصان میں تھوڑا کمی ہو گیا اور شمشیر کا منافع تقسیم ہو کر لم ہو گیا۔'' جمشید نے جواب دیا۔

''اب تم ہمیں پاگل کر دو گے جمشید!''

''اوہ..... کیا غلطی ہو گیا؟'' جمشید بوکھلا کر بولا۔

''یار جمشید!..... خدا کی قسم، کھل جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔'' طالوت نے کہا۔

''کیسے کھل جائے؟'' جمشید نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''صائم! اس شخص سے کہو، اپنی اصلیت اُگل دے۔ ورنہ خدا کی قسم، مجھے غصہ آ جائے گا۔'' طالوت پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ میں نے جمشید کی طرف دیکھا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے بیٹھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے کھولوں۔ وہ تو کھلا بیٹھا تھا۔

''اس کے علاوہ ہم ایک کام اور کیا۔'' جمشید نے کہا۔

''وہ کیا؟ وہ بھی فرما دیجئے۔'' طالوت نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہم نے شمشیر کے ان ٹھکانوں کا پتہ لگایا، جدھر سے وہ مال لیتا ہے۔ ان دنوں وہ مال حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے تھا۔'' جمشید نے کہا۔

''سبحان اللہ۔ دیکھا آپ نے؟'' طالوت نے میری طرف اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے، عادل! جمشید کو آج پکڑ کر لے چلیں گے، بند کر لیں گے اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک یہ حضرت اپنی اصلیت نہیں اُگل دیں گے۔''

''کیا خیال ہے جمشید؟'' میں نے پوچھا اور جمشید چونک پڑا۔

''کیا ہوا صائم بھائی؟''

''کہاں کھو گئے تھے؟''

''ایک اور آئیڈیا کھوپڑی میں اُتر رہا تھا۔'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دن شمشیر کو آرام کرنے دیا جائے، اس کے بعد اسے دوسرا ڈوز دیا جائے۔''

''وہ کیا پیارے جمشید؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمارے جس نمائندے نے شمشیر سے اتنا بڑا ذخیرہ خریدا ہے، وہ دوبارہ بھی گاہک بن کر اُس کے سامنے جا سکتا ہے اور اس بار وہ پہلے سے بھی بڑی سپلائی مانگ لے گا۔''

''اچھا...... پھر؟''

''وہ ریٹ اتنا ہائی مان لے گا کہ شمشیر، مال حاصل کرنے کے لئے پاگل ہو جائے گا۔ اور پھر ہمارا بروکر، شمشیر سے بات کر کے ہمارا مال اسے سپلائی کر دے گا۔ ہماری منہ مانگی قیمت پر، جو بہر حال اس قیمت سے کافی کام ہوگی، جس پر شمشیر کا گاہک اُس سے مال طلب کرے گا۔ شمشیر کا گاہک وہ مال پسند کرلے گا، جو ہمارے لئے ناکارہ ہو چکا ہوگا۔ اس طرح ہمارے پاس اعلیٰ ورائٹی رہ جائے گی اور خراب مال اچھی قیمت پر فروخت ہو جائے گا۔ اور اس بار جو ہم نے گھاٹا اُٹھایا ہے، وہ پورا ہو جائے گا۔ گاہک پھر آئندہ کبھی شمشیر کے پاس نہیں جائے گا۔ اس طرح شمشیر کے پاس جو مال اسٹاک ہوگا، وہ کسی قیمت نہیں بکے گا۔ کیونکہ اس سے اچھی ورائٹی ہمارے پاس اس سے کم قیمت پر موجود ہوگی۔ اور ہماری پبلسٹی......''

دفعتہً طالوت اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے آفس کا دروازہ اندر سے بند کر کے اسے لاک کر دیا۔ میرے چہرے پر بھی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ جمشید نے جو کچھ بتایا تھا، وہ کسی معمولی دماغ کا کارنامہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی خوف ناک بات تھی۔ درحقیقت شمشیر کی موت کا پورا پورا سامان تھا اور اس سے عمدہ کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی تھی۔

طالوت، جمشید کے پاس پہنچ گیا۔ وہ غور سے جمشید کی شکل دیکھ رہا تھا اور جمشید بوکھلائے ہوئے انداز میں پہلو بدل رہا تھا۔ طالوت چاروں طرف سے گھوم گھوم کر جمشید کو دیکھ رہا تھا اور جمشید اب اُس کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر اُس کے منہ سے بوکھلائی ہوئی آواز نکلی۔

''کک...... کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے عادل بھائی؟''

''ہونے والی ہے۔'' طالوت ہونٹ بھینچ کر بولا۔

''کک..... کیا مطلب؟'' جمشید نے اسی انداز میں کہا۔

''کھل جاؤ جمشید! ورنہ خدا کی قسم، اچھا نہیں ہو گا۔ بس بہت ہو گئی۔ کیا تم ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو؟'' طالوت نے کہا۔

''کک..... کیسے کھل جاؤں؟''

''صائم......!'' طالوت نے میری طرف دیکھا۔ ''جمشید ہمارے دوستوں میں شامل ہونا ہی نہیں چاہتا۔ میں چاہوں تو اس کی زبان اس کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ لیکن اس کے بارے میں معلوم کرنے کا شوق، اس کی دوستی کی بنا پر ہے۔ اگر دوسرے ذرائع اختیار کیئے گئے تو دوستی کیا رہے گی۔''

اور اچانک جمشید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کسی قدر بدلے ہوئے انداز میں بولا۔

''نہیں نہیں عادل بھائی! کوئی ایسا کام نہ کریں۔ مجھے یاد ہے، جب میں اُلٹا کھڑا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔'' اس بدلی ہوئی آواز اور بدلے ہوئے لہجے پر ہم چونک پڑے۔

''تب پھر تم......'' طالوت نے کہا۔

''خدا کی قسم! اس ملک کے بارے میں اچھے تاثرات لے کر نہیں آیا تھا۔ صرف اس لئے کہ میرے والدین نے مجھے یہاں کمانے کے لئے بھیجا تھا۔ آپ لوگوں کو دیکھ کر رائے بدل گئی۔''

''ارے، تمہاری اُردو تو بالکل صاف ہو گئی۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''اب تو سب کچھ صاف ہو گیا صائم بھائی! کل یہ جھاڑ جھنکار بھی صاف کرا دوں گا۔ اب اس کا فائدہ۔'' جمشید نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''بس اب جمشید نہیں، آپ کا دوست آپ کی خدمت میں ہو گا۔''

''مگر یہ روپ کیوں دھارا گیا تھا؟''

''مختصراً بتا چکا ہوں۔ تفصیل یوں عرض ہے کہ والدین بے حد لالچی ہیں۔ پہلے انہوں نے ایک جرمن بیوہ سے شادی کا مشورہ دیا جو کافی دولت مند تھی۔ نہ جانے کس طرح اُس سے جان بچائی۔ جو کاروبار وہ یہاں کر رہے ہیں، اس سے مجھے قطعی اتفاق نہیں ہے۔ وہ مجھے دولت بنانے کی مشین بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ لیکن انہیں خدا نے بہت بڑا دماغ دیا ہے۔ ان کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی۔ تنویر پھوپھا کی امارت ان کے علم میں تھی۔ ان کی بچی افشاں بھی انہیں یاد تھی۔ اکلوتی لڑکی کی بے پناہ دولت ان کے لئے بہت پُرکشش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کو اس طرح بڑھایا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا وجیہہ بیٹا جاتے ہی اس لڑکی کو اپنے عشق کے جال میں پھانس لے گا اور پھر یہ بے پناہ دولت ان کی ہو جائے گی۔ بہرحال، میں انکار کی جرأت نہیں کر سکا۔ ہاں، میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ابا جان کی ایسی کوئی چال قیامت تک کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ چنانچہ ان سے جدا ہو کر میں نے یہ حلیہ بنا لیا۔ صرف اس لئے کہ خدانخواستہ کسی طور افشاں مجھ سے متاثر نہ ہو جائے۔ میں اپنی شخصیت کو اس قدر مضحکہ خیز بنا لینا چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی میرے قریب کھڑی ہونا بھی پسند نہ کرے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا۔''

ہم دونوں آنکھیں پھاڑے جمشید کی گفتگو سن رہے تھے۔

''تمہیں خطرہ تھا کہ کہیں افشاں تم سے متاثر نہ ہو جائے؟''

''پھوپھی جان اپنے بھائی پر بہت جان دیتی تھیں، ان کی ذات سے بھی خطرہ تھا۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ مجھے دیکھ کر اُن کی محبت جوش نہ مارے اور......''

''اور وہ تمہارے اور افشاں کے گٹھ جوڑ کے بارے میں سوچنے لگیں۔'' طالوت مسکرا کر بولا۔

''ہمارے اس مشرقی ماحول میں یہ بات ناممکن نہیں ہے جناب!''

''ہاں۔ میرے خیال میں جمشید! ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے تائید کی اور طالوت گردن ہلانے لگا۔

''تو یہ سب کچھ صرف اس لئے تھا؟''

''ہاں جناب! میں اپنے باپ کی ہوس پوری کرنے میں ان کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔''

''عمدہ انسان ہو جمشید! بے حد ذہین اور بہت ہی بدمعاش۔'' طالوت مسکراتا ہوا بولا اور پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ ''ہے اس شخص کا جواب، صائم! اس کا کوئی جواب ہے، اس نے کس طرح سب کو احمق بنایا ہے۔''

''آپ کو نہیں بنا سکا جناب!'' جمشید مسکرایا۔

''ارے بس جاؤ۔ کسر چھوڑی تھی تم نے؟'' طالوت نے کہا۔

''معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت تک آپ کی اس حسین شخصیت سے متعارف نہ تھا۔''

''مذاق اُڑا رہے ہو۔'' طالوت نے کہا۔

''خدا کی قسم نہیں۔ خود ہی دل چاہا تھا کہ آپ پر کھل جاؤں، آپ کے سامنے بنتے ہوئے شرم آتی تھی۔ آپ لوگ جس قدر نیک دل انسان ہیں، میں آپ سے بے حد متاثر ہوں۔''

''خیر جمشید! اچھا ہوا، تم نے حالِ دل ہمیں بتا دیا۔ ہم بھی شروع سے ہی تمہیں ناپسند نہیں کرتے۔ اب بتاؤ، تمہارا پروگرام کیا ہے؟''

''کچھ عرصہ یہاں گزاروں گا، اس کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔''

''ناکام و نامراد؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ ان کے لئے مایوسی کا پیغام لے کر۔''

''اور عذرا کا کیا ہوگا؟'' طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا لیکن جمشید کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ چند منٹ وہ سوچتا رہا، پھر بولا۔

''وہ معصوم لڑکی خود اپنے مصائب کا شکار ہے۔ آپ نے اس کی زندگی بدل دی ہے۔ وہ خود کو خواب کی سی کیفیت میں محسوس کر رہی ہے۔ اسے لگ رہا ہے، جیسے اسے جو کچھ مل گیا ہے، آنکھ کھلنے پر چھن جائے گا۔ پہلے کچھ نہیں تھا تو اُسے اپنے گھر کا احساس تھا۔ اپنی بہنوں کے مستقبل کا خیال تھا۔ پہلے وہ اس لئے پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھاتی تھی کہ ہوتی نہیں تھی۔ اب وہ پیٹ بھر کر روٹی اس لئے نہیں کھاتی کہ جب آنکھ کھلے گی تو اس سے مایوسیاں برداشت نہ ہوں گی۔ مایوسی کا وقت آنے سے پہلے وہ اپنی بہنوں کے مستقبل کو محفوظ کر لینا چاہتی ہے۔''

''ارے!'' طالوت چونک پڑا۔ ''اس نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اُس سے چھن جائے گا۔''

''میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آپ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے صائم بھائی! وہ سحر زدہ ہے، خوفزدہ ہے۔ اور یہ خوف بڑی مشکل سے اس کے ذہن سے نکلے گا۔''

''نکل جائے گا۔'' طالوت نے کہا اور پھر چونک کر بولا۔ ''لیکن اپنی کہو۔''

''اپنی کیا کہوں۔'' جمشید نے گردن جھکا لی۔
''یار جمشید! آج اپنی شخصیت پر کوئی خول نہ رکھو، سب کچھ عریاں کر دو۔''
''اب کچھ نہیں رہا ہے عادل بھائی!'' جمشید نے افسردگی سے کہا۔
''عذرا کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟''
''اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' جمشید نے جواب دیا۔
''اسے اپنا کیوں نہیں لیتے؟''
''نہ خود اس قابل ہوں، نہ اسے اس قابل پاتا ہوں۔''
''کیا وہ بھی تم سے متاثر ہے؟''
''ہاں۔ اعتراف کر چکی ہے۔''
''ابے جمشید بھائی! تم تو بہت استاد نکلے۔ مگر فکرمند کیوں ہوتے ہو میری جان! ہم نے تو پورے ملک کے عاشقوں کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ عنقریب ہم اعلان کرنے والے ہیں کہ پورے ملک کے عاشقان ہم سے رجوع کریں۔ ہم ان کے مسائل حل کرنے میں ان کی بھرپور مدد کریں گے۔'' طالوت نے کہا۔
جمشید اسی طرح گردن جھکائے رہا تھا۔
''تم نے تھوڑی دیر کے لئے شمشیر کو بھی بھلا دیا جمشید! بہرحال اس وقت تک شمشیر کا مسئلہ ملتوی، جب تک تمہارے مسئلے کا حل نہ نکل آئے۔''
''میں نے آپ لوگوں کے ذہن پر بوجھ ڈال دیا عادل بھائی!''
''ہمیں ایسے بوجھ سے سرور آتا ہے، اس کی پروا مت کرو۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے؟''
''مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں عادل بھائی!''
''ہیں بھائی! ہم مستقبل میں لے جا کر چھوڑتے ہیں۔ اب تم ان باتوں کو چھوڑو۔ اپنے اور عذرا کے مستقبل کے بارے میں ہمیں مشورہ دو۔''
''آپ لوگ..... آپ لوگ بے حد نیک طینت انسان ہیں۔'' جمشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''شمشیر سے لکھوا کر لا دو تو مان لیں گے۔'' میں نے کہا اور سب ہنس پڑے۔ کافی حد تک ماحول بدل گیا۔ ہم نے دل کھول کر جمشید کو اُس کی تجاویز کی داد دی۔
''یار جمشید! تمہارا ذہن بزنس کے معاملے میں بہت شاندار ہے۔ تم نے وہاں کوئی بزنس کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' تھوڑی دیر کے بعد طالوت نے پوچھا۔
''اس کی وجہ عرض کر چکا ہوں۔''
''کیا؟''
''کوئی بھی بزنس کرتا، اس پر والد صاحب کا اثر ہوتا اور وہ اسے میرے طور پر نہ کرنے دیتے۔ بس میں کیا عرض کروں عادل بھائی! مجھے اپنے ماحول سے چڑ ہے۔ میرا وطن سکون کی سرزمین ہے۔ مسائل یہاں بھی ہیں لیکن..... لیکن نہ جانے کیوں، بے چینی نہیں ہے۔''
''امریکہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''بس، اس طرح بھٹک گیا ہوں کہ اپنی شخصیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔''

''کون سا مشکل کام ہے جمشید یار! ارے ہم ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ان معاملات کو چھوڑو اور شمشیر کی فکر کرو۔''

''میری تجویز مناسب نہیں ہے؟''

''مناسب کہہ رہے ہو، بے حد شاندار ہے۔ بس تم اس پروگرام کے انچارج ہو۔ اور تصدق کو ہدایت کر دی جائے گی کہ تمہارے احکامات کی تعمیل کرے۔''

''بہت بہتر۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھنے کی گستاخی کر لوں؟''

''چلو کر لو۔''

''شمشیر بذاتِ خود گھٹیا آدمی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس پر عتاب کیوں ہے؟''

''صائم! تمہیں شمشیر کی مختصر کہانی سنائیں گے۔'' طالوت نے کہا اور میں نے مختصراً شمشیر سے اختلاف کی بنیاد بتائی۔

''بہت خوب!'' جمشید گہری سانس لے کر بولا۔ ''بہر حال، اب میں اور زیادہ دلجمعی سے اس کے ساتھ کام کر سکوں گا۔''

دن رات ہنگاموں میں گزر رہے تھے۔ لیکن ان ہنگاموں میں بھی سکون تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی، جو ذہن کو پریشان کرتی۔ جمشید نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

پھر ایک دن تقریباً گیارہ بجے جب میں اور طالوت کارپٹ سینٹر پہنچے تو اپنے آفس میں ایک خوبصورت نوجوان کو بیٹھے دیکھ کر ہم چونک پڑے۔ نوجوان جس بے تکلفی سے بیٹھا تھا، وہ تعجب خیز تھی۔ اس کے بدن پر خوبصورت سوٹ تھا، جسے نہایت سلیقے سے پہنا گیا تھا۔ بال گھنگھریالے اور سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر ایک جانی پہچانی سی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ غالباً اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کی بناوٹ شناسا لگتی تھی۔

ہمیں دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''جی فرمایئے؟'' طالوت نے کہا اور نوجوان مسکرا پڑا اور اُس کی یہ مسکراہٹ..... یہ مسکراہٹ..... ہم دونوں ہی چونک پڑے۔

''میں نے چہرے کا جنگل صاف کرا دیا ہے۔'' اس نے کہا اور اس کی آواز سن کر ہم دونوں اُچھل پڑے۔ وہ تو..... وہ تو جمشید تھا۔

''جمشید! یہ تم ہو؟''

''جی۔ میں نے عرض کیا تھا نا کہ اب یہ جھاڑیاں بھی کٹوا دوں گا۔ مقصد پورا ہو گیا۔''

''یار! تیری تو شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ دیکھو صائم! خاصا خوب صورت بچہ ہے۔'' طالوت خوش ہوتے ہوئے بولا۔ جمشید ہنسنے لگا تھا۔

''تصدق نے تمہیں پہچان لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی مشکل سے یقین دلا سکا ہوں۔'' جمشید مسکرا دیا۔

''اور عذرا نے؟''

''جی نہیں۔ اُس نے سرسری نگاہ سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔''
''ہم خود نہیں پہچانے تھے۔ بہر حال مزہ آ گیا۔ اب تنویر صاحب کے ہاں بھی چلیں گے۔ وہاں بھی لطف آ جائے گا۔ ارے ہاں، عذرا کو بلاؤ۔'' طالوت نے کہا اور میں نے ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ پھر عذرا کو طلب کر لیا اور عذرا مسکراتی اندر آ گئی۔ اس نے ہم لوگوں کو سلام کیا اور ہم نے جواب دیا۔
''بیٹھو عذرا! ان سے ملو۔ یہ ہمارے نئے بزنس منیجر ہیں۔''
''جی!'' عذرا نے جمشید کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی۔
''یوں سمجھو، داڑھی کٹوا کر اسٹاف میں شامل ہو گئے ہیں۔ ویسے ان کا نام جمشید ہے۔'' طالوت نے کہا اور عذرا کے چہرے پر حیرت پھیل گئی، پھر تعجب اور پھر وہ ہنس پڑی۔ پہلی بار وہ اس قدر کھل کر ہنسی تھی۔
''ارے واقعی..... ارے..... یہ تو واقعی جمشید صاحب ہیں۔ کمال ہے۔'' وہ بے ساختہ بولی اور پھر جیسے خود پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر وہ زبردستی سنجیدہ ہو گئی۔
''اوہو، جمشید! دیکھو شاید عذرا کو تمہاری داڑھی کا افسوس ہو رہا ہے۔ وہ کس قدر سنجیدہ ہو گئی ہے۔''
''نن..... نہیں..... ہرگز نہیں۔'' عذرا جلدی سے بولی۔
''بغیر داڑھی کے یہ زیادہ اچھے لگ رہے ہیں نا؟'' طالوت جلدی سے بولا۔
''ہاں۔ یقیناً!'' عذرا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔
''جمشید! عذرا کا شکریہ ادا کرو۔''
''شکریہ مس عذرا!'' جمشید نے مسکرا کر کہا اور عذرا کسی حد تک نروس ہو گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ لیکن ہم لوگ رہ رہ کر جمشید کی شکل دیکھ رہے تھے۔ جمشید نے یہ سوٹ بھی شاید نیا سلوایا تھا۔ عمدہ لباس اُس پر خوب بج رہا تھا اور درحقیقت اُس کی شخصیت شاندار نظر آ رہی تھی۔
''بہر حال، خوب رہے جمشید! لیکن بھئی، آج عذرا سے کچھ گفتگو کرنا تھی۔ عذرا! کچھ نجی قسم کی گفتگو کرنے کی اجازت دو گی؟'' طالوت نے کہا۔
''جی..... نن..... نجی؟''
''ہاں، معاف کرنا، ہم نے تمہیں بہن کہا تھا۔ لیکن شاید تم نے ہمیں بحیثیت بھائی قبول نہیں کیا، اس کا افسوس رہے گا۔ کیوں صائم؟'' طالوت نے میری طرف دیکھا۔
''ہو سکتا ہے، ہم اس قابل ہی نہ ہوں۔'' میں نے کہا۔
''صائم صاحب!'' عذرا تڑپ کر بولی۔
''دیکھا..... دیکھا، صائم صاحب کہاں ہے، صائم بھائی نہیں۔ سن لیا تم نے صائم!..... اب کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا۔ ہونہہ، آئینہ بھی دیکھتے نہیں اور ہر لڑکی کو بہن بنانے پر تُل جاتے ہیں۔''
''عادل بھائی! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم غریبوں کے دل چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ خوشیاں سماتی ہیں نہ غم۔ پھٹ جاتے ہیں کبھی کبھی اور ہم مر جاتے ہیں۔'' عذرا نے آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں کہا۔
''سنا بھئی۔ امیر بھائیوں کی بہنیں بھی غریب ہوتی ہیں۔ مگر وہ انہیں بھائی سمجھیں، تب نا!''
''چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔'' عذرا نے کہا۔

''ہاں، ہاں..... بالکل، بالکل۔ اسی طرح نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔''
طالوت شرارت سے بولا اور عذرا زِچ ہوگئی۔

''اللہ...... میں کیا کروں؟''

''مجبوری ہے بی عذرا!..... شرافت سے بھائی بنالو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''آپ لوگ...... آپ لوگ میرے بھائی ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ اگر بہن ہو تو ایک اچھی سی دعوت بھی کرو۔''

''جی؟''

''جی ہاں، دعوت۔ اپنے گھر پر۔'' طالوت بولا۔ ''کیوں صائم؟''

''بالکل۔ اور پہلے سے تعین کر لو کہ کھانے کو کیا ملے گا۔'' میں نے کہا اور عجیب سی کیفیت کے باوجود عذرا مسکرا پڑی۔

''مجھے کوئی عذر نہیں ہے بھیا!''

''تو پھر دن طے کرو۔''

''جب آپ حکم کریں۔''

''کیا خوب..... دعوت کے لئے مہمان حکم کریں؟''

''مہمان نہیں بھیا!'' عذرا تھوڑی سی کھل گئی۔ آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں میں مسکراہٹ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''ہاں، یہ مسئلہ تو ٹھیک۔ تو صائم! پھر کون سا دن ٹھیک ہے؟''

''جتنی جلدی ممکن ہو۔''

''کل شام عذرا بی!..... اور آپ اہتمام میں مصروف رہیں گی، اس لئے کل کی چھٹی۔''

''ٹھیک ہے بھیا!..... اب آپ نے اتنا کہا ہے تو میں اس میں عار نہیں سمجھتی کہ آپ کو اپنے گھر بلاؤں۔ جیسا بھی ہے، آپ کی بہن کا گھر ہے۔''

''اس میں کہنے کی کیا بات ہے۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ کل میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''کس وقت؟'' طالوت بے تابی سے بولا۔

''خدا کی قسم، صبح ہی آجائیں۔ لیکن جناب! کھانا شام کو ملے گا۔''

''ٹھیک ہے، شام کو آئیں گے۔'' طالوت نے کہا اور پھر جمشید کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''ہائے بے چارہ جمشید، جنگل نہ صاف کراتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔''

''کیسی نوبت؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے اس بے چارے کو بھی دعوت مل جاتی۔'' طالوت نے کہا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ جمشید صاحب تو کل میری مدد کریں گے۔ میرے والد صاحب بے حد ضعیف ہیں۔ چھوٹی بہنیں ہی گھر کا سامان لے آتی ہیں۔ کل جمشید صاحب کو تکلیف دوں گی۔''

''ہاں۔ اسے بھی بہت سے کھانے پکانے آتے ہیں۔ ایک دن بتا رہا تھا۔'' طالوت نے کہا۔ جمشید

مسکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عذرا چلی گئی اور میں نے طویل سانس لی۔ جمشید، نیازمندی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں مسٹر جمشید؟''

''بس آپ لوگوں کے بارے میں۔''

''خوب۔ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''یہی کہ قدرت نے آپ کو اس قدر دولت اور عزت بخشی ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہے۔ آپ بے حد نیک دل انسان ہیں۔''

''بس بس مولانا۔ جب داڑھی تھی تو وعظ نہیں فرماتے تھے آپ۔ اب بغیر داڑھی کے وعظ کرتے اچھے نہیں لگتے۔ چھوڑیئے ان باتوں کو، شمشیر کی رپورٹ دو۔''

''میں نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔'' جمشید مسکرایا۔

''یعنی؟''

''مال فروخت کرنے والا نمائندہ میں خود ہی بن گیا ہوں۔ شمشیر سے کل رات ملا تھا۔ اس کے فرشتے بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔''

''اوہ..... ویری گڈ۔ یعنی کام شروع ہو چکا ہے؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ختم ہونے والا ہے جناب!''

''کیا مطلب؟''

''کل اسٹاک نکلوانا ہے اور کل ہی اس کی ادائیگی بھی ہو جائے گی۔ میں نے کیش کی بات کی ہے۔''

''کتنے کی سپلائی ہے؟''

''تقریباً ساٹھ لاکھ کی۔''

''ہوں!'' میں نے ایک طویل سانس لے کر طالوت کی طرف دیکھا۔

''رقم کیش ملے گی یا چیک؟''

''چیک تو آج بھی مل سکتا تھا جناب! لیکن میں بھی ایک سنکی آدمی ہوں، جوان ہوں تو کیا ہوا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ کیش سودا کرتا ہوں۔ ویسے ہمارے نمائندے نے یعنی خریدار نے پورا ایک لاکھ ایڈوانس دیا ہے۔''

''اوہ، جو مال سپلائی ہو رہا ہے، میرا خیال ہے، اس میں ہمیں پچیس لاکھ کا تو نقد منافع ہے۔''

''اس سے کچھ زیادہ۔'' جمشید نے کہا۔

''تب ایک دو لاکھ اور بھی خرچ ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال، شمشیر کو قبر میں اُتارنے کا پورا پورا بندوبست ہو چکا ہے؟''

''مکمل!'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر ایک گڑبڑ ہو جائے گی۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''کیا؟''

''کل تو تمہیں عذرا کے ساتھ کھانا پکانا ہے۔''

''اوہ، جی ہاں..... دوپہر کے بعد یہ کام بھی ہو جائے گا۔'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ طالوت بھی مسکرا رہا تھا۔

''اور ہاں جمشید! مہمانوں میں صرف ہم نہیں ہوں گے۔ تمہیں انتظامات کرنے میں خیال رکھنا ہوگا۔''

''کون کون آئے گا؟''

''افشاں اور شکیلہ بھی ساتھ ہوں گی۔'' طالوت نے کہا۔

''بہتر ہے۔'' جمشید نے کہا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ شام کو پہلے ہم نے تنویر صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا تھا۔ جمشید ہمارے ساتھ تھا۔ کوٹھی میں داخل ہوئے تو چائے کا وقت تھا اور ہم نے سیدھے لان کا رُخ کیا، جہاں چائے کے لئے اجتماع ہو چکا تھا۔ ہماری کاریں دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔

ہمارے علم میں نہیں تھا لیکن تنویر صاحب کے ہاں نواب جلال الدین اور سیمیں وغیرہ بھی آ گئے تھے۔ یہ اور دلچسپ بات ہوئی تھی۔ نواب جلال الدین، تنویر صاحب اور دیگر تمام لوگوں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔

''خدا کی قسم، تمہاری عمریں بے حد دراز ہیں۔ جلال بھائی سے میں یہی کہہ رہا تھا کہ اگر تم دونوں کو بھی فون کر دیا جاتا کہ چائے یہیں پئیں تو اچھا تھا۔ چائے اسی لئے رُکوا دی گئی تھی کہ احسان تمہیں فون کر دیں۔ وہ فون کرنے اندر گئے ہیں۔'' تنویر صاحب نے کہا۔

''چلئے، آپ نے یاد کیا، ہم حاضر ہو گئے۔'' میں نے کہا۔

''خوش آمدید۔ اور..... آپ کی تعریف؟'' تنویر صاحب نے کہا۔

''ہمارے بزنس منیجر۔ اور آئندہ غیر ممالک میں ہمارے نمائندے مسٹر.....'' طالوت رُک گیا۔ نواب جلال الدین بڑے غور سے شمشیر کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''کیوں، نام نہیں بتایا ان کا؟'' تنویر صاحب نے کہا۔

''میں نے سوچا، نام آپ میں سے کوئی بتا دے گا۔'' طالوت مسکرا کر بولا۔

''اوہ..... میں بتاؤں؟'' نواب جلال الدین عجیب سے لہجے میں بولے۔

''جی؟'' میں نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''غالباً..... جمشید۔'' نواب صاحب بولے۔

''جی نہیں، صرف جمشید۔'' میں نے کہا اور بڑی ماں آگے بڑھ آئیں۔

''اپنا جمشید؟''

''جی بڑی ماں! آپ کا جمشید۔'' اور بڑی ماں، جمشید کو غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے جمشید کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب تو انسان لگ رہا ہے۔''

اور پھر خوب ہنگامہ ہوا۔ جمشید دیکھنے کی چیز تھا، جسے بار بار دیکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بوا نے بھی خوب فقرے کسے۔ کہنے لگیں۔ ''اے لگتا ہے، جیسے مولی، پتوں کی آڑ سے نکل آئی ہو۔ کیسی چندا کی سی شکل ہے۔ موئی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔'' خوب قہقہے لگے، خوب تبصرے ہوئے۔ پُرخلوص تبصرہ نواب صاحب نے کیا۔ انہوں نے تنویر صاحب سے کہا۔

''تنویر! شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو، لیکن جب میں نے جمشید کو ان لوگوں کی توجہ کا مرکز پایا تھا

وچ رہا تھا کہ اس کی تقدیر بہت اچھی ہے اور بالآخر اسے فیض ملے گا۔ خدا کی قسم، یہ میرے خیال کی
یق ہے۔ تم سوچو، صحبتِ صالح بھی تقدیر سے ملتی ہے۔"
"واقعی، اس کی شخصیت تو قطعی بدل گئی۔" تنویر صاحب نے کہا۔
"ذہن بھی بدل گیا ہوگا۔ اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ پوری ہو جائے گی۔" بہر حال، جمشید پر
ب تبصرے ہوئے۔ پھر چائے کے بعد ہم نے واپسی کی اجازت چاہی تو بہ اصرار روک لیا گیا اور رات
ھانے کے بعد جانے کے لئے کہا گیا۔ کوئی خاص مصروفیت تو تھی نہیں، رُک گئے اور تفریحات میں
ت گزرنے لگا۔
بالآخر موقع پا کر میں نے افشاں کو تنہائی میں جالیا۔
"کیسے مزاج ہیں؟"
"نوازش۔ دعائیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"ہاں۔ ہماری دعائیں سب تمہیں لگتی ہیں، ہمیں نہیں۔"
"کیوں؟"
"بس زبان گھس گئی ہے تمہیں مانگتے ہوئے۔ نہ جانے کیوں دعا قبول نہیں ہو رہی۔"
"دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے۔" افشاں نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر اس کے
ء کچھ نہ بول سکی۔ میں نے بہت سی باتیں کیں لیکن اس سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔
"اچھا افشاں! ایک ضروری اطلاع ہے۔"
"جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔
"کل آپ دفتر تشریف لے آئیں۔"
"حاضر ہو جاؤں گی۔"
"کس وقت؟"
"جب آپ حکم دیں۔"
"تو آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ کل ٹھیک چار بجے دفتر پہنچ جائیں۔ اور اگر گھر میں کہنا ہو تو رات کے
یں۔ رات کے نو بجے تک۔ آپ کو یقیناً واپس پہنچا دیا جائے گا۔"
"تعمیل ہوگی۔" افشاں نے کہا۔
"شکریہ۔ لیکن تم نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں، کیا کرنا ہے، کہاں جانا ہے؟"
"ہرگز نہیں پوچھوں گی۔" افشاں نے کہا۔
"کیوں؟"
"بس نہیں پوچھوں گی۔ خود شرمندہ نہیں ہو جاؤں گی۔ آپ حکم دے رہے ہیں، اس کے بعد پوچھنے
گنجائش ہے۔ بس ٹھیک ہے، جو آپ کا حکم۔"
"میں تمہارے خلوص، تمہارے یقین کا تمہیں کوئی صلہ نہیں دے سکتا افشاں!" میں نے اچانک
ہو کر کہا۔ درحقیقت اُس کے اس بے پناہ اعتماد پر میرا دل بھر آیا تھا۔
"دے سکتے ہیں۔" افشاں کے انداز میں شرافت اُبھر آئی۔

''کس طرح؟''

''اپنا بھرپور اعتماد دے کر۔'' اس نے جواب دیا۔

''خدا کی قسم افشاں!...... میں...... میں...... '' مجھ سے جملہ پورا نہ ہو سکا۔

''مجھے یقین ہے صائم صاحب!'' افشاں نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آیئے بیٹھیں۔'' اور ہم باغ کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ''آپ ایسے کیوں ہو گئے؟'' افشاں نے پوچھا۔

''بس اب ٹھیک ہوں۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' افشاں نے کہا۔ میں تھوڑی دیر تک خود کو سنبھالتا رہا، پھر بولا۔

''تم نے عذرا کو دیکھا ہے افشاں؟''

''عذرا کون؟''

''میرا خیال ہے، میں نے اس کے بارے میں بتایا تھا، ملاقات بھی کرائی تھی۔ وہ لڑکی جو میری پرسنل اسسٹنٹ ہے۔''

''ہاں، یاد آ گئی۔ پیاری لڑکی ہے۔''

''اس کی سفارش جمشید نے کی تھی۔''

''اوہ...... یہ نئی اطلاع ہے۔''

''ایک اور بھی اطلاع ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جمشید وہ نہیں ہے جو خود کو ظاہر کرتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ ایک ذہین ترین نوجوان ہے۔ مجھے معاف کرنا، دراصل تمہارے ماموں غلط آدمی ہیں۔ وہ اسے ہمیشہ غلط لائنوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے رہے اور ضد میں جمشید وہ بن گیا، جو نظر آتا تھا۔''

''خدا کی پناہ! تو کیا وہ اس قدر احمق نہیں ہیں، جتنا خود کو ظاہر کرتے تھے؟''

''بالکل احمق نہیں ہے، بلکہ ایک اعلیٰ ذہانت کا مالک نوجوان ہے۔''

''ان کی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی ہوں۔''

''اسے یہاں اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ بی افشاں کو شیشے میں اُتار کر ان سے شادی کرے اور اس طرح تنویر صاحب کی بے پناہ دولت کا مالک بن جائے۔ اسے افشاں سے کوئی کد نہیں تھی، لیکن وہ اپنے باپ کی ہوس پوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ممکن ہے، پھوپھی جان کی محبت عود کر آئے، اس لئے اُس نے ایسا حلیہ بنایا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اسے کسی شریف آدمی کو قبول کرنا ناممکن ہو جائے۔ اور وہی ہوا۔''

''اوہ!'' افشاں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ساری باتیں آپ کو جمشید بھائی نے بتائی ہیں؟''

''خود سے نہیں بتائیں، پوچھی گئی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تب تو وہ اچھے انسان ہیں۔ میرے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی۔'' افشاں نے کہا۔

''ہاں افشاں! واقعی وہ عمدہ انسان ہے۔ خیر، تو بات ان عذرا بی کی ہو رہی تھی۔''

''ہاں!''
''جمشید میں اوران میں کچھ گڑ بڑ پائی جاتی ہے۔''
''ایمان سے؟'' افشاں بڑے پیارے انداز میں بولی۔
''ہاں۔ مجھے یقین ہے۔''
''اوہ! میں نے غور سے اُس بے چاری لڑکی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب دیکھوں گی۔ لیکن صائم صاحب! ـرایسی کوئی بات ہے بھی تو..... میرا خیال ہے، یہ بیل مشکل سے منڈھے چڑھے گی۔''
''کیوں؟''
''ماموں جان کا لالچ۔ وہ بے چاری ملازم پیشہ لڑکی ہے۔''
''تھی، اب نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''اب وہ دو بھائیوں کی بہن ہے۔ ایک کا نام صائم ہے اور دوسرے کا عادل۔ اور یہ دونوں کافی ـدار ہیں۔'' میں نے کہا اور افشاں عقیدت سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر متاثر لہجے میں بولی۔
''ہاں۔ خدا کا احسان ہے۔ وہ بے حد مالدار ہیں۔ قدرت نے انہیں وسیع دلوں کی دولت سے نوازا ـہے۔ سچ، مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔ دوہری خوشی سمجھ لیں۔ اوّل تو یہ کہ جمشید بھائی بہرحال میرے ـموں زاد بھائی ہیں۔ تھوڑی سی محبت تو مجھے ان سے اس حیثیت سے تھی۔ ان کی شخصیت میں کوئی دلکشی ـیں تھی، اس لئے زیادہ نہ چاہ سکی۔ لیکن اب ان کی شخصیت بھی بدل گئی ہے اور ان کی ذہنی کیفیت بھی ـامنے آگئی ہے۔''
''بہرحال آخری بات یہ کہ کل میں نے تمہیں جس کے لئے بلایا ہے، وہ سن لو۔ عذرا کے یہاں ـری دعوت ہے۔ چنانچہ میں، عادل، شکیلہ اور تم چلیں گے۔''
''اوہ، ضرور۔ اور جمشید بھائی؟''
''سمجھا کرو۔ وہ تو میزبانوں میں شمار ہوتے ہیں۔''
''ارے..... اوہ!'' افشاں ہنس پڑی۔ ''تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔''
''ابھی تو بہت آگے پہنچے گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
بہرحال دوسرے دن مقررہ وقت پر ہم چل پڑے۔ جمشید نے عذرا کے گھر کا پتہ بخوبی سمجھا دیا تھا۔ ـاقہ غریب لوگوں کا تھا۔ ہماری کاریں، عذرا کے مکان کے سامنے پہنچ گئیں۔ جمشید دروازے پر استقبال ـکے لئے موجود تھا اور اندر عذرا، اس کی بہنیں اور اس کی ماں موجود تھیں۔ ان سب کے چہروں سے مسرت ـوٹی پڑ رہی تھی۔
چھوٹا سا صاف ستھرا گھر تھا، جہاں ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔ کھانے نہایت لذیذ تھے اور اس سے ـی اچھی عذرا کی امی کی باتیں تھیں۔ محبت کے شہد میں ڈوبی ہوئی، سوندھی سوندھی۔ بہرحال نہ صرف ـیں، بلکہ افشاں اور شکیلہ کو بھی بہت لطف آیا۔ عذرا سے ان کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی اور انہوں نے ـسے دعوت دے دی کہ وہ اکثر ان سے ملتی رہا کرے۔ عذرا کے انبساط کی انتہا نہیں تھی۔ اسے اتنے اچھے ـاتھی مل گئے تھے، ایسے کرم فرما مل گئے تھے، جن کی محکوم ہونے کے باوجود وہ ان کی محکوم نہیں بلکہ دوست

تھی۔ خاصی دیر سے واپسی ہوئی۔ افشاں کو اس کے گھر چھوڑ کر ہم واپس آ گئے۔ گھر آ کر ہم کافی دیر تک عذرا کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہمیں وہ بہت پسند آئی تھی۔ طالوت نے کہا۔
''بہن کو جہیز میں گھر تو دینا ہی پڑے گا۔ اس لئے تصدق سے کہا جائے کہ وہ ایک عمدہ سے مکان کا بندوبست کرے۔''
''یقیناً۔'' میں نے کہا۔
''لیکن ہم پہلے سے اسے مکان پیش تو نہیں کر سکتے۔''
''ہاں۔ بہر حال سوچیں گے اس بارے میں۔''
''ایک اور خیال میرے ذہن میں کاٹ رہا ہے۔''
''کیا؟''
''چاند کی آخری رات قریب آتی جا رہی ہے۔''
''اوہ!'' میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔
''باقی پروگرام واپسی پر رہیں گے۔''
''ہاں، ہاں تو ٹھیک ہے۔ جلدی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔
دوسرے دن جمشید نے شمشیر والے کام کے مکمل ہو جانے کی اطلاع دی۔ خریدار نمائندے کا کام ختم ہو گیا تھا۔ شمشیر کو اسٹاک اُٹھوا کر رقم وصول کر لی گئی۔ حساب سے چھ لاکھ روپے جمشید کے نام مخصوص کر دیئے گئے، جس کی اسے کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔
معاملات چلتے رہے۔ اور پھر نواب جلال الدین نے واپسی کے بارے میں تذکرہ کیا۔ ''بھئی اب جب مجھے یہاں آنا ہی ہے تو کچھ انتظامات کرنے کے لئے جلد جانا چاہئے۔''
''آپ کی یہاں رہائش گاہ کے لئے انتظامات ہو رہے ہیں نواب صاحب!''
''ہاں بھئی، یہ تمہاری ذمے داری ہے۔'' نواب صاحب اپنائیت سے بولے۔
''ایک اور بات کرنی تھی، نواب صاحب!'' طالوت نے کہا۔
''ہاں ہاں، ضرور۔ کیا بات ہے؟''
''صائم! تم باہر جاؤ۔'' طالوت نے کہا اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ''جاؤ!'' طالوت نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا اور میں ہنس پڑا۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ لیکن بھلا میں ٹلنے والا تھا۔ راسم کی انگوٹھی پر میں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ چنانچہ دوسرے لمحے میں نے انگوٹھی پہنی اور اُلٹے قدموں اندر چلا گیا۔ طالوت نے دروازہ بند کر لیا تھا۔
''خیریت..... بڑی رازداری برتی جا رہی ہے؟'' نواب صاحب مسکرا کر بولے۔
''بات ہی ایسی ہے۔''
''کہو!''
''نواب صاحب! میں چاہتا ہوں، افشاں کی شادی صائم سے ہو جائے۔''
''اوہ!'' نواب صاحب سنجیدگی سے بولے۔
''کیا آپ نے کبھی اس سلسلے میں سوچا ہے؟'' طالوت نے پوچھا۔

''جو کچھ کہوں گا، اس پر سنجیدگی سے یقین کر لو گے؟'' نواب صاحب بولے۔
''یقیناً!''
''خود میرے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا لیکن ہمت نہیں پڑ سکی۔ بہرحال تمہاری حیثیت تنویر سے بہت بڑی ہے۔''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے نواب صاحب!'' طالوت نے کہا۔ ''بہرحال اب آپ اس بارے میں کوشش کریں۔ میں صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں، یہ کام ضرور ہونا چاہئے۔''
''اوہ، میرا خیال ہے، مشکل تو نہیں ہوگا۔ تنویر کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کون سی ہو سکتی ہے؟''
''تو پھر کب ابتدا کر رہے ہیں؟''
''میرا خیال ہے، اس میں دیر مناسب نہیں ہے۔''
''یقیناً۔''
''پھر کل شام کو میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ یوں تو تنویر کو بھی طلب کیا جا سکتا تھا، لیکن میرا خیال ہے، یہ بات اس کے گھر پر ہی مناسب رہے گی۔''
''بالکل ٹھیک۔'' طالوت نے جواب دیا اور وہ دوسری گفتگو کرنے لگے۔ میں نے خاموشی سے کھسک آنے میں عافیت سمجھی۔ طالوت کو شبہ بھی ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد طالوت میرے کمرے میں آ گیا۔ میں ایک آرام کرسی پر دراز تھا۔
''بات ہو گئی شریف آدمی!''
''کیا ہوئی؟'' میں نے دبے دبے اشتیاق کا اظہار کیا۔
''بس کل تنویر صاحب سے گفتگو ہو گی۔''
''اوہ..... خود نواب صاحب کا کیا خیال ہے؟''
''بس وہی۔ چاہتے تو وہ بھی یہی تھے، لیکن ہمت نہیں پڑ سکی۔''
''ہوں۔ شکریہ طالوت! میرے خیال میں یہ مناسب قدم ہے۔''
''خوش ہو؟''
''ہاں۔ لیکن ایک درخواست ہے۔''
''عرض کرو۔'' طالوت شاعرانہ انداز میں بولا۔
''کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میرا مطلب ہے، راسم کی انگوٹھی پہن کر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا حرج ہے؟'' طالوت شریفانہ انداز میں بولا اور میں نے اُسے بھینچ لیا۔
دوسرا دن کئی دلچسپیوں کا حامل تھا۔ ہم دفتر پہنچے تو تصدق نے بتایا کہ دو بار شمشیر کا فون آ چکا ہے۔ اس نے دونوں بار آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔
''ویری گڈ! اُسے احساس ہو گیا؟''
''ایسا ہی لگتا ہے۔''
''اور کچھ کہا تھا؟''

''بس آخر میں کہا تھا کہ جب آپ آ جائیں تو اسے اطلاع کر دی جائے۔ اُس نے اپنا فون نمبر دے دیا ہے۔''
طالوت نے میری طرف رُخ کر کے آنکھ دبا دی۔''اب گفتگو کرو جنگل کے شیر سے۔''
''واقعی خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر میں نے تصدق سے کہا۔
''ٹھیک ہے تصدق! شمشیر کو اطلاع دو کہ ہم آ گئے ہیں۔''
''بہتر جناب!'' تصدق نے کہا اور چلا گیا۔ تقریباً تین چار منٹ کے بعد اس نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔ انٹرکام پر اس نے کہا۔''میں نے شمشیر کو رِنگ کر کے اطلاع دے دی ہے جناب!''
''ہوں۔ کیا کہا؟''
''کچھ نہیں۔ فون رکھ دیا۔''
''اوہ، ٹھیک ہے تصدق! وہ آ جائے تو اُسے احترام سے ہمارے پاس لے آیا جائے۔'' میں نے کہا اور انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔ طالوت دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
''کیا اُس کے آنے کے امکانات ہیں؟''
''بہت جلد۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اور میرا خیال بہرحال غلط نہیں تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد شمشیر کی آمد کی اطلاع ملی اور ہم نے اسے اندر بلا لیا۔ شمشیر ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی، ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔
''ہیلو شمشیر!..... آؤ بھئی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئی بلکہ آنکھوں میں ایک خونخوار چمک پیدا ہو گئی۔
''میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ضرور..... بیٹھو۔ ویسے تم نے مصافحے کی کوشش نہیں کی۔ اور یہ اس بات کا اظہار ہے کہ تم دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنے نہیں آئے ہو۔''
''دوستانہ.....؟'' وہ زہرخند سے بولا۔''حالات دوستانہ ہی تو ہیں۔''
''خیر، پھر بھی بیٹھو۔ ہمارے دروازے پر آئے ہو۔'' میں نے بھی حقارت سے کہا۔
''شکریہ!'' شمشیر بیٹھ گیا۔
''ہاں، شروع ہو جاؤ۔ کیا بات ہے؟'' میں نے بھنویں اُٹھا کر پوچھا اور شمشیر تلملا کر رہ گیا۔ طالوت کے چہرے پر البتہ بڑی پُرسکون کیفیت طاری ہو گئی، جیسے میرے انداز سے وہ مطمئن ہو۔
''یہ اب کیا ہو رہا ہے؟'' شمشیر غرّایا۔
''کہاں؟''
''کارپٹ سینٹر کیا ہے؟''
''تمہاری عقل میں کچھ نہیں آتا؟''
''کیا مطلب؟''
''یہ قالینوں کا بڑا مرکز ہے اور بین الاقوامی پیمانے پر قالینوں کی تجارت کرتا ہے۔ آگے بڑھو۔''
''لیکن میں سمجھتا ہوں، یہ سب..... یہ سب میرے مقابلے پر کیا گیا ہے۔'' شمشیر نے کہا۔

''تمہارے مقابلے پر؟'' میں ہنس پڑا۔ ''خوب! بہر حال، خوش فہمیاں زندہ رکھتی ہیں۔ ورنہ تمہاری ننھی سی دکان کا کارپٹ سینٹر سے کیا مقابلہ؟ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو تو مقابلہ کرو۔ مردوں کو ہمت نہیں چھوڑنی چاہئے۔''

''جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اور اب جو ہو گا، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہو گی۔'' شمشیر نے اسی انداز میں کہا۔

''اس کی وضاحت بھی کر دو۔ دراصل تمہاری گفتگو ارتھمیٹک میں ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس میں یہی اطلاع دینے آیا تھا۔'' شمشیر نے کرسی سرکائی۔

''اوہ، بیٹھو میری جان!...... میرا خیال ہے، تم سادہ پانی پینا پسند کرو گے۔ ویسے اطلاع کا شکریہ۔ اور اس کے عوض ایک ہمدردانہ مشورہ نوٹ کرتے جاؤ۔''

''وہ کیا؟'' شمشیر نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بیوی بچوں اور دنیا سے اُکتا گئے ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنی معمولی سی ریاست فروخت کر کے کوئی چھوٹی موٹی پرچون کی دکان کھول لو۔ پیٹ بھرتا رہے گا۔ کارپٹ سینٹر سے مقابلے کا اور ہمارے خلاف کچھ کرنے کا فتور ذہن سے نکال دو۔ اور کوئی ایسی کوشش کی تو جوابی کارروائی جیسی ہو گی، اسے دیکھ لینا۔''

''تم بھی لکھ لو۔ تمہیں کتوں کی طرح سڑکوں پر بھونکنے پر مجبور نہ کر دیا تو شمشیر نام نہیں۔'' شمشیر نے خوفناک انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''نام تو اب بھی تمہارا غلط ہے میری جان! ایک مشورہ میرا بھی ہے۔ تم اپنا نام شمشیر سے بدل کر گل اندام رکھ لو اور کہیں گانے بجانے کا کاروبار کرو۔ شمشیر جیسا نام تمہارے ساتھ ایسا ہی لگتا ہے، جیسے کسی مداری نے بندر کے ہاتھ میں بندوق دے کر اسے سیدھا کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا ہو..... لیکن..... لیکن دُم لٹکتی رہتی ہے۔ ارے ہاں..... دُم تو لٹکتی ہی رہتی ہے۔'' طالوت قہقہے لگانے لگا اور شمشیر جھلاہٹ میں پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ ہم کافی دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔

پھر جمشید کی آمد پر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ جمشید مسکراتا ہوا اندر آیا۔

''آؤ بھئی جی ڈارلنگ! کیا حال ہے تمہارے کشتۂ ستم کا؟''

''جی.....؟'' جمشید بوکھلا کر بولا۔

''میری مراد شمشیر سے ہے۔''

''اوہ، آج ابھی تک اس کے بارے میں رپورٹ نہیں موصول ہوئی۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے اس کی روزانہ رپورٹ ملتی ہے۔ میرا ایک آدمی اس کے بالکل قریب ہے۔''

''ارے......؟'' ہم دونوں چونک پڑے۔

''ہاں، یہ ضروری تھا۔''

''یار! تُو قیامت کا انسان ہے جمشید! کون ہے وہ؟''

''للی ہارفش..... اُس کی پرسنل سیکرٹری۔ موسیقی کی رسیا۔ لیکن اب اُس کا جم کھو گیا۔ وہ میری داڑھی

سے پیار کرتی تھی جناب! آج کل صرف فون سے کام چلا رہا ہوں۔''
''خدا کی پناہ۔ دیکھا، ہمارے اس امریکن بدمعاش کو؟ کیا چکر چلائے ہوئے ہیں اس نے ہمارے شمشیر کے خلاف۔ اب تو اُس بے چارے پر ترس آنے لگا ہے۔''
جمشید ہنستا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''بہر حال اسے یہ اطلاع تو مل چکی ہے کہ اس کا سودا کینسل ہو گیا ہے۔''
''جبھی آیا تھا۔''
''آیا تھا؟'' جمشید چونک کر بولا۔
''ہاں، ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔''
''ویری گڈ!..... کیا کہہ رہا تھا؟'' جمشید نے دلچسپی سے پوچھا اور ہم نے اُسے تفصیل بتا دی۔ جمشید بھی اُس کی گفتگو سے کافی محظوظ ہوا۔ کافی دیر تک ہم اس پر تبصرہ کرتے رہے اور پھر جمشید اجازت لے کر چلا گیا۔ ہم لوگ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ مجھے شام ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔
بالآخر خدا خدا کر کے وقت گزرا۔ واپسی میں ہم ایک ہی کار میں آئے تھے۔ ''میرا خیال ہے، نواب جلال الدین کو بھی اندازہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم ساتھ ہو۔''
''ارے انہیں کیسے ہوگا؟ ظاہر ہے۔''
''گھر چل کر پہلے تنویر صاحب کو فون کریں گے۔''
''میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' میں نے کہا اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ہم کوٹھی پہنچ گئے۔ نواب جلال الدین سنجیدہ انسان تھے۔ حالات نارمل تھے لیکن وہ چلنے کے لئے تیار تھے۔ اور پھر انہوں نے تنویر صاحب کو فون کر کے ان کی موجودگی کے بارے میں معلوم کیا اور ان سے کہہ دیا کہ انتظار کریں، وہ آ رہے ہیں۔
اور پھر وہ اور طالوت چل پڑے۔ ڈرائیونگ خود طالوت کر رہا تھا۔ اور نواب صاحب اس کے برابر بیٹھے تھے۔ چنانچہ پچھلی سیٹ میرے لئے خالی تھی اور میں اس پر اپنا سانس روکے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم تنویر صاحب کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ تنویر صاحب باہر ہی ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے پورچ میں ہی ہمارا استقبال کیا۔
''ارے خیریت، باہر کیسے ٹہل رہے ہو؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔
''نہ جانے کیوں، آپ کے فون کے بعد میں خلجان میں مبتلا ہو گیا۔''
''کیوں، ایسی کیا خاص بات تھی میرے فون میں؟''
''بس کچھ اجنبیت تھی، کچھ انوکھا پن تھا۔''
''بہت خوب!'' نواب صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بہر حال انوکھا پن ضرور ہے۔ مگر ناخوشگوار نہیں۔ آؤ، بیٹھیں گے۔ لیکن ایسی جگہ جہاں دوسرے مداخلت نہ کریں۔''
''اوہ، ہے نا خاص بات۔'' تنویر صاحب پھیکے انداز میں مسکرائے۔
''ہاں، خاص بات تو ضرور ہے۔'' نواب صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور ہم ایک طرف چل پڑے۔ میں خود کو اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ میں ان لوگوں سے دُور نہیں تھا۔ اور بے آواز ان کے پیچھے

پیچھے چل رہا تھا۔ بالآخر تنویر صاحب ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ ان کی مخصوص نشست کا کمرہ تھا۔ بصورت کرسیوں پر سب بیٹھ گئے۔ میں ان کے نزدیک بیٹھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔

''کیا پئیں گے جلال بھائی؟''

''ابھی کچھ نہیں۔ کیوں عادل؟'' نواب صاحب نے کہا۔

''ہاں، ابھی تو ضرورت نہیں محسوس ہو رہی۔'' طالوت نے جواب دیا۔

''للہ، اب جلدی بول پڑیں، جلال بھائی! ایسی کیا بات ہے؟ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔'' تنویر صاحب بولے۔

''اوہ، تنویر! میں کہہ چکا ہوں، کوئی پریشان کُن بات نہیں بلکہ مسرت خیز ہے۔ رسمی سا سوال ہے لیکن بہرحال جواب ضروری ہے۔ ان بچوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کن بچوں کے بارے میں؟''

''میری مراد صائم اور عادل سے ہے۔''

''میرے خیال سے کیا مراد ہے؟''

''کیسے ہیں یہ دونوں؟''

''مثالی۔ قابلِ فخر۔'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔

''سنو تنویر! اگر ان میں سے کسی کو خواہش ہوتی، اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو میں سیمیں کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں بخوشی دے دیتا۔ خدا کا احسان ہے کہ وہ احسان کے ساتھ خوش ہے۔ میں ایک بیٹی کا باپ ہو کر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری مراد ہے کہ میں انہیں اتنا عزیز رکھتا ہوں۔ اب عادل کی رائے ہے بلکہ عادل کی خواہش ہے کہ صائم کو تم اپنی فرزندی میں قبول کر لو اور افشاں کا عقد صائم سے کر دو۔ اگر تمہارے ذہن میں دوسرا کوئی احساس ہو تو یوں سمجھو، میں صائم کے باپ کی حیثیت سے تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

تنویر صاحب کا چہرہ خشک ہو گیا۔ وہ بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگے۔ کئی منٹ تک وہ خاموش اور پریشان بیٹھے رہے، پھر بولے۔ ''جلال بھائی! خدا کی قسم، جو کچھ کہہ رہا ہوں، دل کی گہرائیوں اور خلوص سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کو خدا کی قسم، اس میں کوئی فریب تلاش نہ کریں، نہ کوئی تجاہلِ عارفانہ۔ میرے لئے بھی یہ دونوں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو آپ کے لئے۔ بس ایک پیچ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''کاش! یہ ان حالات میں یہ بات کہہ دیتے، جب یہ کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔ اب دنیا سوچے گی کہ تنویر ان کی حیثیت پر ریجھ گیا۔''

''احمقانہ خیال ہے۔ ہم اپنی افشاں کو کسی فقیر سے کیسے بیاہ سکتے ہیں؟ ہمیں ہم پلّہ داماد کی ضرورت تو ہوتی ہی، سو ہمیں مل گیا۔''

''لیکن ان لوگوں کی حیثیت گھر کے افراد کی سی رہی ہے اور......''

''یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ گھر کا لڑکا ہی اچھا ہو تو باہر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے؟'' نواب جلال الدین نے تنویر صاحب کی ایک نہ چلنے دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔میرا خیال ہے، آپ میری ذہنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔'' تنویر صاحب بے بسی سے بولے۔

''دیکھو تنویر! کوئی اور معاملہ ہوتا تو شاید میں تم پر اتنا حق رکھتا ہوں کہ تم سے پوچھے بغیر بھی کوئی بات کر سکتا ہوں۔ لیکن اس بارے میں تمہیں پورا پورا حق ہے، جو فیصلہ بھی کرو۔ لیکن ایسی بات کا سہارا مت لو، جس کی کوئی حیثیت، کوئی حقیقت نہ ہو۔ ہاں، تم صائم کو افشاں کے لئے ناموزوں قرار دے سکتے ہو۔ اس کی ذات، اس کی شخصیت پر تنقید کر کے اس رشتے کو نامنظور کر سکتے ہو۔ یہ تمہارا حق ہے۔'' نواب صاحب سنجیدگی سے بولے۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ بلاشبہ نواب جلال الدین اس کام کے لئے موزوں ترین انسان تھے۔

''خدا کی قسم....... یہ دونوں نوجوان میری نگاہ میں عظیم ہیں۔ نیک طینت، عالی نسب۔ لیکن آپ مجھے مشورہ دیں جلال بھائی! میں ان سے کمتر ہوں۔ اس احساس کو کہاں لے جاؤں؟''

''مجھے کچھ بولنے کی اجازت ملے گی نواب صاحب؟'' طالوت نے مداخلت کی۔

''ہاں ضرور۔''

''مجھے تنویر صاحب کے ان الفاظ سے اختلاف ہے۔ ایک شخص کی اولاد اگر ترقی کر کے کچھ سے کچھ بن جائے تو کیا باپ اس کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے؟ ہاں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی اجنبی کو اپنی اولاد سمجھنے میں خاصی مشکلات پیش آتی ہیں۔''

''اوہو، اوہو..... یہ بات نہیں ہے عادل میاں!'' تنویر صاحب تڑپ کر بولے۔

''تنویر صاحب کو میرے بھائی کے رشتے پر اعتراض ہے، وہ اسے قبول نہیں کر سکتے۔ ٹھیک ہے نواب صاحب! ہم انہیں احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دیں گے۔ آپ لوگوں کی محبت کے سہارے ہم لوگوں ـ یہاں ایک گھر بنا لیا تھا۔ ہم نے آپ ہی کے پیار کے سہارے یہاں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جب'' یہ پیار کی اس روشنی میں کچھ تاریک دھبے نظر آ رہے ہیں تو پھر یہ شہر ہی ہمارے لئے اجنبی ہو گیا۔ ہم ایک ہفتے کے اندر اندر شہر چھوڑ دیں گے نواب صاحب!'' طالوت اُٹھ کھڑا ہوا۔

نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تنویر صاحب تڑپ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''عادل!..... عادل بیٹے! شاید مجھ سے حماقت ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ بخدا اب تمہارے بغیر اس شہر میں دل بھی نہیں لگے گا۔ خود کو ہم سے اس قدر دُور کیوں سمجھ رہے ہو؟''

''اس دُوری کا احساس دلایا جا رہا ہے۔'' طالوت نے کہا۔

''اور عادل کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔''

''میں افشاں کو ان کی کنیز بنانے کو تیار ہوں۔ اس کے بعد انہیں اختیار ہو گا۔''

''وہ میری بہن ہے۔ اور بہنیں، بھائیوں کی کنیزیں نہیں ہوتیں۔ میں اس سے ایک اور رشتہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکے تو اس میں میری مدد کریں۔''

''پھر بیٹے! تمہیں اختیار ہے۔'' تنویر صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے اور نواب صاحب خوشی سے کھڑے ہو گئے۔

''تو تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟''

''نامنظور تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بس میں اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔''
''تو اب اس اُلجھن کو ذہن سے نکال دو۔'' نواب صاحب خوشی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔
''نکال دی۔'' تنویر صاحب پھیکے انداز میں بولے۔
''چلو بھئی عاصم، مبارک۔'' نواب صاحب نے کہا اور میں خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ اور پھر میں وہاں رُکنے والا کہاں تھا۔ افشاں کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ میں نے انگوٹھی اُتار کر جیب میں ڈال لی اور اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
''آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہی ہے۔'' افشاں کی آواز سنائی دی اور میں اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر افشاں اُچھل پڑی۔ اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ ''ارے آپ......اچانک؟''
''جی ہاں۔''
''آیئے!'' افشاں کھڑی ہو گئی۔ اُس نے میرے لئے کرسی کھسکائی اور میں بیٹھ گیا۔
''تنہا ہیں؟'' افشاں نے پوچھا۔
''ہرگز نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم میرے ساتھ ہو۔''
''یقیناً! مگر کیا عادل بھائی نہیں آئے؟''
''نواب صاحب بھی آئے ہیں۔''
''کہاں ہیں؟''
''تنویر صاحب کے کمرے میں۔''
''اوہو، اچانک آئے آپ لوگ۔ فون ہی کر لیا ہوتا۔''
''کیا کرتیں آپ؟''
''انتظار۔'' افشاں دل آویز انداز میں مسکرائی۔
''دونوں حضرات ہمارے درمیان سے یہی اُلجھن دُور کرنے آئے ہیں؟''
''کیا مطلب؟'' افشاں کے چہرے پر سنسنی پھیل گئی۔
''اور میرا خیال ہے، اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''صائم پلیز! میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ پلیز!'' افشاں نڈھال سی ہو گئی۔ اُس کی کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ان لوگوں کی آمد کا مقصد اور تنویر صاحب سے گفتگو کی تفصیل بتا دی۔ افشاں کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ اُس کی گردن جھک گئی تھی اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔
''کیا بات ہے افشاں؟'' میں اس کے قریب پہنچ گیا۔
''کچھ نہیں، کچھ نہیں صائم!''
''خوش ہو؟''
''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' افشاں آہستہ سے بولی۔
''پھر کس سے پوچھوں؟''
''خود سے۔'' افشاں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کافی دیر تک ہم تاثر میں ڈوبے رہے۔ پھر افشاں

چونکی اور حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں؟'' میں نے اس کے بدلے ہوئے انداز پر چونک کر پوچھا۔

''آپ اس گفتگو میں کہاں سے شریک ہو گئے؟''

''چھپ کر سنی تھی کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو.....تو پھر.....تو پھراب آپ جائیں۔ دیکھئے، برا نہ مانیں۔ پہلے دوسری بات تھی۔ پہلے میں دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ آپ کے بارے میں سوچ لیں، میرے لئے آپ کی حیثیت سمجھ لیں۔ اب انہوں نے سمجھ لیا ہے۔ اب.....اب مجھے شرم آئے گی۔''

''یہ گڑبڑ ٹھیک نہیں ہے افشاں! میں تم سے ملوں گا ضرور۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہاں۔ اس کے لئے کون منع کر رہا ہے؟ لیکن.....اب.....چھپ کر۔'' افشاں نے شرگیں انداز میں کہا۔

''پھر کل کب؟.....کس وقت؟''

''دفتر آؤں گی۔'' افشاں نے جواب دیا۔

''کس وقت؟''

''دو بجے۔ بہانہ کر کے۔ پلیز! اب جائیے۔'' افشاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر اُس نے میری اُنگلیاں چوم لیں اور میں خوش و خرم باہر نکل آیا۔ لیکن باہر آتے ہی میں نے انگوٹھی پہن لی تھی۔

جمشید نے اپنی کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ تصدق اور وہ مل کر قیامت ڈھا رہے تھے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں قالین درآمد کئے جا رہے تھے اور دنیا کے بہت سے ممالک کو برآمد کئے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں خریداروں کا جال پھیلا دیا گیا تھا، جو ہر اس جگہ سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے، جہاں قالین تیار ہو رہے تھے اور عمدہ قیمت پر فوراً مال خرید لیتے۔ شمشیر کی طرف سے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی، لیکن جمشید کا جاسوس کام کر رہا تھا اور صرف یہ اطلاع تھی کہ شمشیر ذہنی طور پر دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے۔

طالوت وقتِ مقررہ پر چلا گیا تھا لیکن واپس آیا تو کسی قدر پریشان تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھ کر اُس سے خیریت سے پوچھی۔

''خیریت نہیں ہے یار!'' اس نے کہا۔

''کیا بات ہے طالوت! مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''نہ بتانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے پھر اوپر سے رابطہ توڑنا پڑے گا۔''

''کیوں؟''

''آج کل والد صاحب پر میری شادی کی فکر سوار ہے۔ اس بار ان سے خاصی گرما گرمی ہوئی ہے۔ کسی زمینی لڑکی کے بارے میں وہ غور کرنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''اوہ!'' میں نے بھی فکرمندی سے کہا۔ ''پھر کیا کرو گے؟''

''اسی سوچ میں ہوں۔''

''اگر تم.....اگر تم ان کی مرضی کے بغیر یہاں شادی کر لو طالوت! تو اس کے بعد کیا ردِعمل ہو گا؟''

میں نے پوچھا۔
''ایں!'' طالوت چونک پڑا۔ وہ پُر خیال انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ آنکھوں میں کسی قدر مسکراہٹ نظر آئی اور پھر وہ بولا۔ ''یار! میرا خیال ہے، پوری زندگی میں تم نے ایک نہایت قیمتی بات کہی ہے، وہ بھی اتفاقاً۔''
''یعنی؟''
''دراصل میں اس بات سے فکر مند تھا کہ اب ان کی نگاہوں سے چھپنا مشکل تھا۔ پہلے تو ہم جگہیں بدلتے رہتے تھے، اب یہاں سے کہیں جانا مشکل ہے۔''
''یقیناً! پھر اب؟''
''تمہارے اس خیال نے میرے ذہن میں ایک اور خیال پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ خیال نہایت شاندار ہے۔ یہیں شکیلہ کو اپنا لوں اور آئندہ ماہ جاؤں تو شکیلہ کو بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اگر اس حیثیت سے وہ لوگ اسے قبول کر لیں تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر ان سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔''
''اوہ! یہ خیال آیا ہے تمہارے ذہن میں؟''
''ہاں!''
''سوچ لو طالوت! اگر ان کا ردِعمل سخت ہوا تو؟''
''جو کچھ بھی ہو یار! راج ہنس کو چھوڑنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔''
''ٹھیک ہے میری جان! پھر بسم اللہ کرو۔''
''کیوں نہ ہماری اور تمہاری شادیاں ساتھ ہی ہوں۔'' طالوت نے کہا۔
''اب تم نہیں شرما رہے تو میں کیا شرماؤں۔ ٹھیک ہے۔''
''تب پھر یار! اس سلسلے میں نواب صاحب سے ہی بات کرو۔'' طالوت نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ لیکن میں نے نواب صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ اور بھی کارنامے انجام دیئے۔ ایک رات میں نے انہیں ان کے کمرے میں جا لیا۔
''آج پھر آپ کو زحمت دینے جا رہا ہوں۔''
''ہاں ہاں بیٹے! کیا بات ہے، کہو؟ ویسے میں بھی تم لوگوں سے گفتگو کرنے والا تھا۔''
''جی پہلے آپ فرما دیں۔''
''بس کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تمہاری شادی سے پہلے فارغ ہو کر آ جاؤں تا کہ یہاں اپنا گھر بنا کر دلجمعی سے تمہاری خوشی میں حصہ لے سکوں۔''
''یہ تو کسی طور ممکن نہیں نواب صاحب!''
''اوہو...... کیوں؟''
''ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ اور سرپرست کا یہاں ہونا ضروری ہے۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں کہیں بھی رہوں، ہر جگہ تمہارا سرپرست ہوں۔''
''میری یہی خواہش تھی۔'' میں نے کہا۔
''سر آنکھوں پر۔ میں کب انکار کر سکتا ہوں۔'' نواب صاحب شفقت سے بولے۔

''میں آپ کی شفقت پر ناز کرتا ہوں نواب صاحب! ایک اور مسئلہ درپیش ہے۔''
''ہاں ناار، کہو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''
''یہ، عادل کی پسند ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''
''اوہ، خدا کی قسم! کتنی خوشیاں سمیٹوں۔ بے حد دلچسپ، نہایت حیرت انگیز۔ دو بیویاں ہم شکل، دو شوہر ہم شکل۔ ایک عجوبہ نہیں ہے لوگوں کے لئے؟'' نواب صاحب مسرت سے بولے۔
''یہ بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔''
''تو میاں! کوئی کہنے کی بات ہے یہ۔ بلکہ میرا خیال ہے، دونوں شادیاں ایک وقت ہوں اور تنویر کے ہاں سے ہوں۔''
''دو نہیں..... تین۔'' میں نے اضافہ کیا۔
''واللہ...... یہ تیسرا جوڑا کون ہے؟''
''جمشید اور عذرا۔''
''ارے!'' نواب صاحب اُچھل پڑے۔
''جی۔''
''مگر یہ عذرا کون ہے؟'' انہوں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا اور میں نے پوری تفصیل سے عذرا کے بارے میں نواب صاحب کو بتا دیا۔ نواب صاحب حیرت اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولے۔
''لیکن جمشید کا مسئلہ اُلجھا ہوا ہے، اس کا باپ اسے کس طرح قبول کرے گا۔ تنویر بھی رشتے داری کی وجہ سے یہ ذمہ داری شاید قبول نہ کرے۔''
''وہ دیگر بات ہے، لیکن آپ ان سے گفتگو تو ضرور کریں۔ باقی ذمہ داری ہم خود قبول کر لیں گے۔''
''ٹھیک ہے، میں بات کرلوں گا۔''
''تو آج آپ کے لئے یہی دردِ سر لایا تھا۔''
''اسے دردِ سر کہتے ہو بیٹے! میری زندگی تو تم لوگوں میں شامل ہو کر اور خوشگوار ہو گئی ہے۔ تم جتنے نیک دل انسان ہو، اس کی مثال جمشید اور عذرا کے سلسلے میں بھی ملتی ہے۔ تھوڑی سی نیکی مجھے بھی کرنے دو۔ وہ یہ کہ عذرا کو میں اپنی بیٹی کی حیثیت سے بیاہوں گا۔''
''ہم آپ کو نہیں روکیں گے نواب صاحب! ویسے ہم بھی اس کے لئے کچھ طے کر چکے ہیں۔ شادی کے بعد جمشید امریکہ ضرور جائے گا لیکن واپس یہیں آ جائے گا۔''
''بہت خوب۔ یقیناً تم نے کوئی گہری بات سوچی ہو گی۔ اب ایک بات اور بتا دو، اس سلسلہ میں کب تک خیال ہے؟''
''براہِ کرم اسے صرف ضرورت خیال فرمائیں۔ میں اس لئے شرمندہ ہوں کہ اس میں میرا معاملہ بھی شامل ہے۔ یہ کام دس پندرہ دن میں ہو جانا چاہئے۔''
''ہوں..... ٹھیک ہے میاں! عذرا کے معاملے میں تھوڑی سی اُلجھن ہے۔ بہرحال اس کے گھر چل کر اس کے والدین کو راضی کریں گے۔ بلکہ ایک تبدیلی کیوں نہ کی جائے۔''

''جی؟''

''تمہارے مشورے سے۔ اس طرح تھوڑی سی تفریح بھی بڑھ جائے گی۔ دو شادیاں یوں ہوں کہ لڑکوں کی بارات تنویر کے مکان پر جائے اور دوسرے دن جمشید کی بارات تنویر کے مکان سے یہاں آ جائے۔ اور ہم یہاں سے عذرا کو رخصت کریں۔ جمشید بہر حال تنویر کا عزیز ہے، اس کا حق بھی ہے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے، یہ بات آپ تنویر صاحب سے کر لیں۔''

''تم لوگ بھی ساتھ ہو گے؟'' نواب جلال الدین بولے اور میں نے گردن ہلا دی۔

دوسرے دن میں اور طالوت، نواب جلال الدین کے ساتھ تنویر صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ تنویر صاحب نے بڑا پُر جوش استقبال کیا ان کے چہرے کی ساری شکنیں مٹ گئی تھیں اور وہ بہت بشاش نظر آ رہے تھے۔

''بھئی مجھے یہ بات بہت پسند آئی۔ کوئی بھی روایتی انداز اختیار کیا جائے۔ جب تک شادی نہ ہو جائے، صائم میاں اسی بے تکلفی سے آتے جاتے رہیں۔''

''تو تمہارا خیال تھا، کوئی تکلف کیا جائے گا؟'' نواب صاحب بولے۔

''ہرگز نہیں۔ کیا جاتا تو مجھے افسوس ہوتا۔'' تنویر صاحب بولے۔

''کچھ ضروری امور تھے۔'' نواب صاحب بولے۔

''ارشاد؟''

''شادی کی تاریخ طے کرنی ہے۔''

''یہ آپ پر منحصر ہے۔'' تنویر صاحب بولے۔

''بات تین تین شادیوں کی ہے، سوچ لو...... اگر میں پندرہ دن کا وقت رکھ دوں تو......؟''

''پندرہ دن میں تو پندرہ شادیاں ہو سکتی ہیں جلال بھائی! مگر یہ تین شادیاں؟''

''ہاں بھئی..... تو کیا تمہاری دوسری بیٹی شکیلہ یونہی بیٹھی رہے گی؟''

''ہرگز نہیں۔'' تنویر صاحب خلوص سے بولے۔

''میں بھی اپنے دونوں بچوں صائم اور عادل کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک بچی بھی ہے، اس کی شادی بھی تم سے طے کرنا ہے۔''

''بچی......؟'' تنویر صاحب حیرانی سے بولے۔

''ہاں..... تم اس کے لئے جمشید کا رشتہ لے کر آ جاؤ۔ اب باپ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ لیکن خیر..... تم بھی کیا یاد کرو گے؟''

''جلال بھائی! واللہ..... کیا کہہ رہے ہیں؟''

''جمشید تمہاری بیوی کا بھتیجا ہے، اس کے بارے میں کون سوچے گا؟''

''لیکن لڑکی؟''

''میری بیٹی ہے، رشتہ لے کر آؤ تو دیکھ بھی لینا۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''میری تو عقل چکرا کر رہ گئی ہے۔''

''تب پھر اپنی بیوی سے رجوع کرو...... بلکہ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ بلاؤ بھابی جان کو۔''

سوئم

نواب صاحب نے کہا اور تنویر صاحب جلدی سے اُٹھ گئے۔
تھوڑی دیر کے بعد بڑی ماں کمرے میں پہنچ گئیں اور نواب صاحب نے بغیر کسی تمہید کے سلسلہ شروع کر دیا۔ "بات یہ ہے بھابی جان! کہ جمشید کی بدلی ہوئی شخصیت کے تحت اس کی حیثیت ہی بدل گئی ہے۔ میں کچھ ناگوار باتوں کا انکشاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ گو اس کے لئے میں نے اجازت نہیں لی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر بات آگے بڑھانا ناممکن ہوگا۔ آپ کے بھائی صاحب نے جمشید کو امریکہ سے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ آپ کی بچی کو شیشہ میں اُتارے، اس سے شادی کرے اور اس طرح آپ کی دولت کا مالک بن جائے۔ لیکن جمشید خصلت میں باپ سے مختلف نکلا اور ایسی شکل بنا کر یہاں آیا کہ آپ اسے قبول نہ کریں اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ لیکن یہ صرف اس کی نیک دلی تھی۔ وہ اس طرح اپنے باپ کی ہوس پوری کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس وقت تک، جب تک اسے اچھا ساتھ نہ ملا، وہ اپنی کوششوں میں مصروف رہا۔"
نواب صاحب طویل سانس لے کر رُکے اور پھر بولے۔ "عادل اور صائم نے اُس کی ذہنی اُلجھنوں کو دُور کرنے میں مدد دی اور وہ پھر انسان بن گیا۔ اور اب اس بدلی ہوئی شکل کے تحت اس نے اپنے کچھ حقوق بھی پیدا کر لئے ہیں۔ ہم نے اس کے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کیا ہے اور اب میری خواہش ہے کہ آپ پھوپھی ہونے کے ناطے سے اس کی سرپرست بن کر اس کی شادی کر دیں۔"
بڑی ماں حیرت سے منہ پھاڑے یہ سب کچھ سن رہی تھیں، کئی منٹ تک وہ سکتہ کے عالم میں رہیں پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "لیکن آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم بھائی صاحب؟"
"جمشید کی زبانی۔"
"اوہ!" بڑی ماں افسردگی سے بولیں۔ "بھائی جان نے کبھی میرا اچھا نہ سوچا۔ کاش میرا کوئی بھائی نہیں ہوتا، حسرت تو نہ ہوتی۔ میں اس جمشید کے لئے ہی کچھ کیوں کروں؟ میرا اس سے کیا رشتہ؟"
"نہیں بھابی جان! اس انداز میں نہ سوچئے۔ بہر حال وہ آپ کا بھتیجا ہے۔"
"ارے تو بھائی جان کیوں خوش ہوں گے اس بات سے؟"
"ہم یہ ان کے لئے نہیں کر رہے ہیں، یہ صرف جمشید کے لئے کیا جا رہا ہے اور وہ اسی قابل ہے۔ وہ خود بھی اپنے باپ کی حرکتوں سے نالاں ہے۔"
"سوچ لیں بھائی صاحب! میری جان، میری جان کو نہ آ جائیں۔"
"یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اُن سے بھی نمٹ لیں گے۔"
"جیسی آپ سب کی مرضی۔ لڑکی کون ہے؟"
"میری بیٹی۔"
"آپ کی؟"
"ہاں۔"
"مگر کون سی؟"
"یہ تو آپ رشتہ لے کر آئیں گی، تب پتہ چلے گا۔"
"کہاں آؤں گی؟" بڑی ماں تعجب سے بولیں۔

''بھئی میرے بچوں کے گھر، میرے گھر۔''

''اوہ، آپ شکیلہ کی بات کر رہے ہیں؟''

''ارے توبہ توبہ...... وہ میری کہاں، وہ تو آپ کی بیٹی ہے۔ اور اس کی شادی تو عادل میاں کے ساتھ ہوگی۔ آپ نے دراصل میری دوسری بیٹی کو دیکھا ہی نہیں ہے۔''

''ایمان سے، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔''

''آپ کو تو اللہ سمجھائے گا، یا پھر تنویر۔ بہرحال، آپ کل رشتہ لے کر آ رہی ہیں؟''

''جو حکم بھائی صاحب!'' بڑی ماں نے کہا۔ وہ نواب جلال الدین کا بے حد احترام کرتی تھیں۔

''چلو بھئی، یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔ تو کل شام چار بجے آپ ہمارے ہاں آ رہی ہیں، مٹھائی کے ساتھ؟''

''جی، حاضر ہو جاؤں گی۔'' بڑی ماں نے کہا۔

''چلیں بھئی، یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔'' نواب جلال الدین نے کہا اور پھر انہوں نے تنویر صاحب سے اجازت طلب کر لی۔

''ایسی کیا جلدی ہے بھائی صاحب!..... بیٹھیں بھی۔''

''جلدی تو ہے بھئی۔ تم نہیں سمجھو گے۔ اجازت دو۔'' نواب صاحب نے کہا اور پھر وہ تنویر صاحب سے اجازت لے کر ہم دونوں کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔

''جلد بازی تو نہیں ہو گئی؟'' انہوں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' طالوت بولا۔

''میں نے کل انہیں بلا لیا ہے۔ جبکہ لڑکی کو ابھی تک میں نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے، عذرا کی والدہ وغیرہ تیار ہو جائیں گی؟''

''میں نے پوری طرح نوٹ کیا ہے جناب!'' طالوت نے کہا۔ ''آپ کی دنیا کے غریب لوگ عموماً خود دار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول میں ہی زندگی سے جنگ کرتے ہیں۔ جبکہ بعض دولت مند مزید دولت مند بننے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ لوگ بھی مشکل ہی سے راضی ہوں گے۔''

''تمہارا خیال درست ہے بیٹے!'' نواب جلال الدین نے کہا۔ ''لیکن یہ آپ کی دنیا کیا معنی رکھتی ہے؟''

''دراصل ہماری ریاست میں دوسرے اصول ہیں۔ ہمارے ہاں غریب اور امیر نہیں ہوتے۔''

''تمہاری ریاست..... نہ جانے اسے دیکھنے کی خواہش بھی کبھی پوری ہوگی یا نہیں۔''

''میرا خیال ہے، نہیں نواب صاحب!''

''ہاں شاید۔''

''اور اس کی وجہ آپ سمجھتے ہیں۔ وہاں کے بعض اصول بے حد احمقانہ ہیں۔ میں اس کے بارے میں آپ کو تفصیلات بتا چکا ہوں۔'' طالوت نے بات بنائی۔

''خیر اب یہ بتاؤ، کیا کیا جائے؟''

''میرا خیال ہے، عذرا کے گھر چلیں۔''

''کیوں نہ سیمیں اور شکیلہ کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔''

''مناسب خیال ہے۔'' طالوت جھٹ سے بول پڑا اور نواب صاحب مسکرانے لگے۔ بہر حال ہم گھر واپس گئے۔ سیمیں، احسان اور شکیلہ کو تیار کرایا گیا اور پھر ہم عذرا کے گھر پہنچ گئے۔

''دن میں عذرا سے ملاقات ہوئی تھی، ہم نے اس کے گھر آنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہمیں اچانک دیکھ کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ اور پھر خوشی سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ گھر کے بچے بچے نے مسرت بھرے انداز میں استقبال کیا تھا۔ عذرا کی والدہ بھی بے حد خوش تھیں۔

''کیا نام ہے عذرا بیٹی! آپ کی امی کا؟''

''جی..... شاہدہ۔'' عذرا نے جواب دیا۔

''شاہدہ بہن! میں ان بچوں کا بزرگ ہوں۔ میری ایک چھوٹی سی ریاست ہے جلال آباد۔ اور میرا نام جلال الدین ہے۔ بات یہ ہے بہن! کہ ان لڑکوں نے جگہ جگہ مجھے چوٹ دی ہے۔ یعنی انہوں نے عذرا جیسی پیاری بیٹی کو بہن بنا لیا ہے اور میں بوڑھا ہو گیا، لیکن آج تک میری کوئی بہن نہیں بن سکی۔'' نواب صاحب نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

''میں تو حیران ہوں بھائی صاحب! اور یقین کریں، اکثر سوچنے لگتی ہوں کہ فرشتے صرف آسمان پر نہیں رہتے۔ کبھی کبھی وہ زمین کی سیر کرنے بھی آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کی زندگی اور بلندی میں ترقی فرمائے۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے انہوں نے ہم ناچیزوں پر توجہ دی۔ انہوں نے تو ہماری تقدیر ہی بدل دی۔''

''نہیں، نہیں..... خدا سے توبہ کریں۔ تقدیر بدلنا صرف اُس کا کام ہے۔ خوش بختی تو ہماری ہے کہ اُس نے ہم گنہگاروں کو اس کا ذریعہ بنایا۔''

''درست فرمایا بھائی صاحب!'' شاہدہ نے کہا۔

''دیکھئے، آپ بار بار مجھے بھائی صاحب کہہ کر میرے محرومی کے زخم کو تازہ کر رہی ہیں۔ یہ لوگ میرے اوپر مسکرائیں گے۔'' نواب صاحب بولے۔

''میں نہیں سمجھی، بھائی صاحب!''

''بھئی، میں ان کا چیلنج قبول کر کے ہی یہاں آیا ہوں۔ اگر یہ لوگ عذرا بیٹی کو بہن بنا سکتے ہیں تو کیا شاہدہ میری بہن نہیں ہو سکتی؟''

اور اندر خاموشی چھا گئی۔ شاہدہ، نواب صاحب کے سامنے نہیں آئی تھیں اور پردے کے پیچھے سے گفتگو کر رہی تھیں۔ کئی منٹ خاموشی چھائی رہی، پھر شاہدہ کی سسکیاں سنائی دیں۔

''آپ غالباً رو رہی ہیں بہن! اور میں آپ کے سر پر ہاتھ بھی نہیں پھیر سکتا۔ آپ کو اپنے بوڑھے سینے سے بھی نہیں لگا سکتا۔''

''بھائی جان!'' شاہدہ پردے کے پیچھے سے نکل آئیں اور نواب صاحب ایک قدم آگے بڑھے، پھر جھجک کر رک گئے۔

''میں ابھی آپ کے سر پر ہاتھ نہیں رکھوں گا بہن! اگر آپ خلوصِ دل سے مجھے بھائی تسلیم کر کے خدا کو حاضر ناظر جان کر اس کا اعلان کریں، تب ہی میرے دل کی پیاس بجھے گی۔''

''اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ آپ نے ہم غریبوں کے سر پر ہاتھ رکھا ہے، رب العزت آپ کے سر

پر رحمت کا سایہ رکھے۔''
''آپ نے مجھے بھائی کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے؟''
''نہیں بھائی جان!..... خدا کی قسم، میرا دل کئی ہاتھ بڑھ گیا۔ میں خدا کے حضور پیش ہو کر آپ کو خلوصِ دل سے بھائی تسلیم کرتی ہوں۔'' شاہدہ بولیں۔
''ارے تو بھائی کے سینے سے کیوں نہیں لگ جاتیں، پگلی کہیں کی۔'' نواب صاحب دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے اور عذرا کی والدہ، نواب صاحب کے سینے سے لگ گئیں۔
''سمجھے لڑکو!.....اب میں بھی بہن والا ہوں۔'' نواب صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔ اُن کی آواز بھرّا گئی تھی۔ بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ سیمیں، پھوپھی جان کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔
''یہ تمہاری بھتیجی ہے شاہدہ!......اور یہ اس کا دولہا، یہ شکیلہ ہے اور یہ.....''
''ان بچوں سے تو میں مل چکی ہوں۔'' شاہدہ نے کہا۔
''ارے عذرا بیٹے! چلو بھئی، چائے بنواؤ۔ ہم اندر بیٹھتے ہیں۔ آؤ شاہدہ!'' اور نواب صاحب نہایت اپنائیت سے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے عذرا کی ساری بہنوں کو سینے سے لگایا تھا۔ ''پھول سی بچیاں ہیں میری، شاہدہ بہن! اب کسی سلسلے میں بھائی کا دل تو نہ توڑ دو گی؟''
''میں آپ کی خادمہ ہوں، بھائی جان!''
''جو کہوں گا، مان لو گی؟''
''حکم دیں بھائی جان!''
''میں نے تمہیں دل و جان سے بہن کہا ہے شاہدہ! میرے پیار میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ ایک بھائی ہونے کے رشتے سے میں یہ کیسے برداشت کروں کہ تم یہاں رہو اور میں کہیں اور۔''
''میں نہیں سمجھی بھائی جان!'' شاہدہ حیرت سے بولیں۔
''میں تمہیں آج اور ابھی یہاں سے لے جاؤں گا۔''
''کہاں؟''
''جہاں میں چاہوں۔ حق رکھتا ہوں۔''
''سر آنکھوں پر بھائی جان! لیکن......لیکن.....''
''لیکن کی گنجائش ہے؟''
''ہرگز نہیں۔ بس دنیا والے......آپ کی عنایت۔ کیا کہوں، میں کیا کروں؟'' شاہدہ بھی پریشانی سے بولیں۔
''زندگی میں پہلی بار کسی کو دل سے بہن بنایا ہے۔ دل نہ توڑو شاہدہ! خدا کی قسم! دل نہ توڑو۔'' اور پھر اس کے بعد خوب ڈرامہ ہوا۔ نواب صاحب بھی بے حد کائیاں تھے۔ ہمارے ساتھ مل کر خوب استاد ہو گئے تھے۔ شاہدہ بھی بادلِ نخواستہ تیار ہو گئیں۔ اور پھر انتظامات ہونے میں دیر کتنی لگتی۔ راسم جیسا منتظم موجود تھا۔ چنانچہ رات تک عذرا اور اس کی فیملی ہماری کوٹھی میں منتقل ہو گئی۔ سب کی سب حیران اور پریشان تھیں۔ خدا نے ایک دم وقت بدل دیا تھا۔ عذرا کے تو آنسو نہیں تھمتے تھے۔ چھوٹی بچیاں سراسیمہ تھیں۔ ایک ایک چیز سے سہمی سہمی خوف زدہ، کہیں خراب نہ ہو جائے۔ گندی گلیوں سے اُٹھ کر جنت میں آ گئی

سوئم

تھیں۔ لیکن سب ان کی دلجوئی میں مصروف تھے۔ نواب صاحب بچے بن گئے تھے، خوش خوش چاروں طرف پھر رہے تھے۔ بڑی گہما گہمی ہوگئی تھی۔ اور تو اور، احسان ان لوگوں سے بہت خوش تھا۔ کہہ رہا تھا، میں نے اتنی ساری سالیوں کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کوٹھی کی رونق دوبالا ہوگئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ہال میں محفل جمی۔ اس میں صرف بڑے بڑے شریک تھے۔ عذرا، سیمیں یا شکیلہ وغیرہ نہیں تھیں۔ ہاں احسان شامل تھا۔ تب نواب صاحب نے شادیوں کے ذکر چھیڑ دیئے، کہنے لگے۔

''میں بڑا پریشان تھا۔ اتنی اہم ذمے داریوں میں کوئی بزرگ خاتون نہیں تھیں۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ میری بہن یہاں آگئی۔''

''کیسی ذمے داریاں بھائی جان؟'' شاہدہ بولی۔

''آپ دیکھ رہی ہیں بہن! دو دو بیٹے ہیں، ن کی شادیاں کرنی ہیں، رشتے طے ہو چکے ہیں۔ اب بھلا میں تنہا کیا کر سکتا تھا؟''

''اوہ، خدا مبارک کرے۔'' شاہدہ بیگم نے کہا۔

''صرف مبارکباد سے کام نہیں چلے گا۔ آپ سے تو بہت ضروری گفتگو کرنی ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ ماشاء اللہ! عذرا بھی شادی کے قابل ہے۔''

''ہاں بھائی صاحب! احساس تو سارے زندہ ہیں، لیکن جو حالات تھے، آپ کے علم میں ہیں۔''

''اجی پرانی باتیں چھوڑو، آج کی بات کرو۔''

''ہاں، اللہ نے آپ کا سہارا دلا دیا ہے۔''

''چنانچہ اب عذرا کی شادی پندرہ دن کے اندر اندر ہو جانی چاہئے۔''

''جی.....؟'' شاہدہ بیگم حیرت سے بولیں۔

''پندرہ دن کے اندر اندر...... سمجھیں آپ؟''

''بھائی جان کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ آپ ہی بتائیں۔''

''ارے ناممکن ہوتا تو بتاتے ہی کیوں؟ بس اتنا ہی وقت لگے گا۔ ان دونوں، یعنی صائم اور عادل کی شادیوں میں۔ یوں سمجھ لیں آپ، پہلے دو باراتیں جائیں گی اور دو دلہنیں یہاں آئیں گی۔ پھر ایک بارات آئے گی اور بیٹی رخصت ہو جائے گی۔''

''میری خود بھی یہی آرزو ہے بھائی صاحب!...... بن باپ کی بچیوں کو اللہ تعالیٰ عزت سے اپنے گھر پہنچا دے تو اُس کا بڑا احسان ہوگا۔ لیکن اتنی جلدی...... لڑکے کے بارے میں بھی تو نہیں سوچا۔''

''دیکھو بھئی شاہدہ بیگم! ہم تو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ تم صرف ایک بات کہو۔ ہمارے اوپر اعتماد ہے؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی صاحب! اب تو خدا کے بعد آپ پر ہی سب سے زیادہ اعتبار ہے۔''

''بس تو بات ختم ہوئی۔ ہم جانیں اور ہمارا کام۔ آپ صرف دیکھتی رہیں۔''

''جو آپ کا حکم بھائی صاحب!'' شاہدہ بیگم نے کہا اور ہم نے سکون کی سانس لی۔ نواب صاحب نے واقعی ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر بھی، ناشتے کے بعد محفل جمی۔ نواب صاحب نے شاہدہ بیگم کو بقیہ

کوائف بھی بتا دیئے۔ انہوں نے اس مسئلے پر پوری تفصیل شاہدہ بیگم کو بتا دی تھی کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ انہوں نے جمشید کے بارے میں بھی تفصیل بتائی اور کہا۔

''دوپہر کے کھانے پر میں اُسے بلا رہا ہوں۔ آپ اپنی رائے سے نواز دیں، اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا۔ اگر لڑکا آپ کو پسند آ جائے تو مجھ سے کہہ دیں۔ شام کو اس کے ماموں ممانی آ جائیں گے۔''

''بس مجھے تو اب صرف حکم دیا کریں بھائی صاحب! باقی آپ جو کچھ کریں، وہ ٹھیک ہے۔'' شاہدہ بیگم آبدیدہ ہو کر بولیں۔ ''میری کیفیت تو کسی ویرانے میں تنہا کھڑے اس درخت کی مانند ہے جو صدیوں سے تیز آندھیوں کی زد میں اکیلا کھڑا تھا۔ ہوا کے جھکڑ اسے جھنجوڑتے تو وہ امداد طلب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا، لیکن دُور دُور تک کسی کو نہ پا کر سر جھکا لیتا اور ہواؤں کے زخم سہتا رہتا۔ اس کی آنکھیں بے خوابی کا شکار تھیں۔ رفتہ رفتہ اس نے مصائب کو بھی زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ پھر اسے آندھیوں میں بھی نیند آنے لگی۔ وہ ان آندھیوں کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک رات وہ سو گیا اور خوب گہری نیند سویا..... جب آنکھ کھلی تو اُسے پتہ چلا کہ آندھیاں آئی تھیں لیکن اب اس کے گرد مضبوط اور تناور درختوں کا ایک جنگل موجود ہے۔ ان سب نے ہواؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔ درخت کو اب تو گہری نیند سونے کی آرزو ہے بھائی صاحب! تاکہ زندگی بھر کی تھکن دُور ہو جائے۔'' شاہدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

نواب صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔ ''تھکن سونے سے دُور نہیں ہوگی شاہدہ بہن! اب تو یوں سمجھو، اس درخت کے اردگرد غنچے کھل رہے ہیں، بہار آ رہی ہے، تنہائی دُور ہو رہی ہے۔ جاگو..... جاگتی رہو۔ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو۔ نیند بھاگ جائے گی۔ جاگنے کی آرزو پیدا ہو گی۔'' کافی دیر تک یہ ماحول اُداس رہا۔

عذرا بی کو بھی آج دفتر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ میں اور طالوت البتہ تھوڑی دیر کے لئے گئے۔ جمشید بھی موجود تھا۔ وہ اور تصدق کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے دونوں کو طلب کر لیا۔

''خیریت بھئی؟''

''گرما گرم خبریں ہیں۔'' جمشید مسکراتا ہوا بولا۔

''خیریت؟''

''میرے جاسوس نے بتایا ہے کہ آج رات، چند افراد، کارپٹ سینٹر کے گوداموں میں آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔ ان کا باقاعدہ تقرر کیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے دلچسپی سے کہا۔ ''تو شمشیر اب یہ کر رہا ہے۔''

''اُس کی ایسی تیسی۔'' طالوت بولا۔

''ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے، پولیس کو خاموشی سے گوداموں پر تعینات کر دیا جائے اور رنگے ہاتھوں ان کو پکڑوا دیا جائے۔ شمشیر خود بخود روشنی میں آ جائے گا۔''

''ابھی نہیں۔ ہم مشورہ کر لیں۔'' میں نے کہا۔ اور پھر میں اور طالوت اس بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

''میرا خیال ہے، شمشیر کو بالکل تباہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ اس کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ لوگ جو آگ لگانے آئیں گے، کل سے گانے بجانے کا کاروبار کریں گے اور شمشیر

کے دفتر کے سامنے ڈیرہ ڈال دیں گے۔ وہ گا گا کر اسے اس کے کرتوت بتائیں گے اور کسی طور وہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ کیوں راسم! کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ہرگز نہیں..... یوسف عبران!" راسم نے نمودار ہو کر کہا۔

"بس تم پوری ہوشیاری سے شمشیر کے معاملات کی نگرانی کرو۔ ہم اسے کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونی چاہئے۔"

"جو حکم آقا!" راسم نے کہا اور غائب ہو گیا۔

"یہی ٹھیک ہے، مجھے تم سے اتفاق ہے۔" طالوت نے کہا۔

دوپہر کے کھانے پر ہم نے جمشید کو تیار کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔ بلاشبہ اعلیٰ تراش کے سوٹ میں ملبوس جمشید بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ شاہدہ بیگم اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں اور پھر وہ پیار سے بولیں۔ "ارے اپنا جمی..... یہ تو......" اور پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ جمشید کے باہر چلے جانے کے بعد انہوں نے متاثر لہجے میں کہا۔ "آپ نے تو زمانے بھر کی خوشیاں میری جھولی میں ڈال دیں بھائی صاحب!..... یقین کریں، میں نے کئی بار اس بچے کے بارے میں سوچا تھا۔ میں..... مجھے یہ اپنی عذرا کے لئے بہت پسند تھا۔"

"بس، اب آپ ان لوگوں کے استقبال کی تیاریاں کریں۔" نواب صاحب نے کہا۔

وقتِ مقررہ پر تنویر صاحب، بڑی ماں، کمال اور افشاں کے ساتھ آ گئے۔ شاہدہ بیگم بہرحال کسی حد تک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انہوں نے نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا اور پھر نہایت سلیقے کی گفتگو ہوئی اور معاملات طے ہو گئے۔ گہما گہمی کے اس وقت میں شمشیر ذہن سے نکل گیا تھا لیکن دوسرے دن اُس کی فرم کے سامنے مجمع لگا ہوا تھا۔ چار خطرناک قسم کے ہیجڑے اُس کے آفس کی عمارت کے سامنے تحرک رہے تھے۔ وہ بے تکے انداز میں اُلٹے سیدھے گانے گا رہے تھے۔ شمشیر کے آدمیوں نے انہیں بھگانے کی کافی کوشش کی، مگر وہ بے تکے انداز میں گاتے رہے۔ وہ اپنا بقیہ معاوضہ مانگ رہے تھے جو آگ لگانے کے سلسلے میں ان سے طے کیا گیا تھا۔

"اوہ!" طالوت نے گردن ہلائی اور ہم لوگ دیکھتے ہوئے اندر چلے گئے۔

اور پھر بڑے زبردست دن گزرے۔ تینوں شادیوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شکیلہ بھی اب تنویر صاحب کی کوٹھی میں چلی گئی تھی اور طالوت کسی قدر اُداس ہو گیا تھا۔ میں اکثر اُس کا مذاق اُڑاتا رہتا تھا اور وہ پھیکے انداز میں مسکرا دیتا تھا۔

ویسے ہم نے سارے پروگرام طے کر لئے تھے۔ افشاں سے بھی کم ملاقات ہوتی تھی۔ ہماری کوٹھی میں اب سیمیں، بوا، شاہدہ بیگم، عذرا اور اس کی بہنیں قیام پذیر تھیں اور دن رات انتظامات میں مصروف رہتی تھیں۔ باقی سب لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔

اور یہ شادی سے صرف چھ دن قبل کی بات ہے، میں اور طالوت کسی کام سے باہر گئے تھے اور ابھی واپس آئے تھے کہ تصدق اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"ہیلو تصدق!"

"مبارک ہو جناب!" تصدق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیریت؟"

''شمشیر کے دفتر میں تالا پڑ گیا۔ اس نے کاروبار بند کر دیا۔'' تصدق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن نہ جانے کیوں، ہمارے دلوں پر گھونسے سے پڑے۔ ہمارے چہرے اُتر گئے۔ ہم نے عجیب سی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں نے تصدق سے کہا۔

''ٹھیک ہے تصدق!..... جاؤ۔ ہمیں ذرا بات کرنی ہے۔'' اور تصدق چلا گیا۔ اب ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ طالوت کے چہرے پر بھی تاسف تھا۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''ہاں یار! اس وقت عجیب لگ رہا ہے۔ حالانکہ یہی ہونا تھا۔''

''یہ صورتِ حال تو پسند نہیں آئی۔'' طالوت پشیمان لہجے میں بولا۔

''پھر اب کیا کِیا جائے؟''

''سوچو۔'' طالوت نے کہا۔ اسی وقت انٹر کام پر تصدق کی آواز سنائی دی۔

''ایک خاتون ملاقات کرنا چاہتی ہیں جناب! برقعہ پوش ہیں۔ انہوں نے اور کچھ نہیں بتایا۔ بس ملنے کے لئے اصرار کر رہی ہیں۔''

''کون ہو سکتا ہے؟'' طالوت پُرخیال انداز میں بولا۔ ''بھیج دو تصدق!'' اس نے کہا اور ہم انتظار کرنے لگے۔ برقعہ پوش خاتون اندر آ گئیں اور پھر اُس نے نقاب اُٹھایا تو ہم ششدر رہ گئے۔ اُسے پہچاننے میں وقت نہیں پیش آئی۔ شمشیر کی بیوی کو افتتاح کے موقع پر بھی دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت...... سوجی ہوئی آنکھیں۔ اُترا ہوا چہرہ، بکھرے بال...... ہمارے دل لرز گئے۔

''صرف ایک بات پوچھنے آئی ہوں بھیا!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بھائی اگر بہنوں سے اس طرح ناراض ہو جایا کریں تو بہنیں کہاں فریاد کریں؟ بھائی ناراض ضرور ہوتے ہیں، مگر بہنوں کے گھر تو نہیں اُجاڑتے۔''

''بیٹھو بہن!'' طالوت نے کہا۔

''میں اس قابل نہیں ہوں بھیا! کہ اب اس قیمتی کرسی پر بیٹھ سکوں۔''

''بیٹھو۔'' طالوت نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔

''میرا شوہر سخت بیمار ہے۔ ہم مصائب میں گھر چکے ہیں۔ بہر حال، بہن کی طرف سے کامیابی کی مبارکباد قبول کریں۔ ہم اب اُس گھر میں بھی نہیں رہ سکیں گے۔ ہمارا بال بال قرض میں بندھ گیا ہے۔''

وہ واپس مڑ گئی۔ ہم اُسے روک بھی نہیں سکے تھے۔ پھر جونہی اُس نے دروازے کے باہر قدم رکھا، طالوت چیخ پڑا۔

''ابے عارف!..... کچھ کرو یار!..... چوٹ ہو گئی۔''

''کیا کروں؟''

''بلاؤ اُس قلابازکو..... موجود ہے یا شادی کے سرور میں غرق پڑا ہے۔''

''جمشید؟''

''ہاں۔'' طالوت بولا اور میں نے انٹر کام پر تصدق سے جمشید کے بارے میں پوچھا۔

''ابھی ابھی آئے ہیں جناب!''

سوئم

''بھیجو جلدی۔'' میں نے کہا اور چند لمحات کے بعد جمشید ہمارے سامنے موجود تھا۔ اُسے ساری صورتِ حال بتائی گئی اور جمشید بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

''اب سوچو بوجھ بجھکڑ جی!.....کیا ہونا چاہیے؟''

''وہ اسٹاک اُس نے نہ جانے کیا کیا، جو ہم نے اُسے فروخت کیا تھا''

''کیوں، اُس کا کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہو......وہ تو بڑی نایاب چیز ہے۔ ہم اُسے منہ مانگی قیمت پر خرید سکتے ہیں اور نئے سال کے لئے اُس سے آرڈر بُک کر کے اُسے ایک سال کی پوری رقم ایڈوانس دے سکتے ہیں۔'' جمشید نے کہا اور میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

''خدا کی قسم!.....یہ کاروباری شیطان ہے۔ جا بھائی! کہیں اپنا یار چل نہ بسے۔ یہ کام تجھے کرنا ہے۔ جلدی کر۔''

''کل پرسوں تک ہو جائے گا جناب!'' جمشید نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور پھر وہ چلا گیا۔

''دماغ گھما کر رکھ دیا ہے اس شخص نے، جو کمبخت گٹار بجاتا آیا تھا۔'' طالوت بولا اور میں ہنسنے لگا۔ اور در حقیقت جمشید کا اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں تھا۔

دوسرے ہی دن ہم نے شمشیر کی فرم کھلتے دیکھی۔ پرانے اور آؤٹ آف فیشن اسٹاک نکل رہے تھے اور ٹرکوں پر بار ہو رہے تھے۔ تیسرے دن شمشیر بھی نظر آیا۔ کافی لاغر ہو گیا تھا۔ بہر حال، کسی حد تک سکون کی سانس لی گئی، ور پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب صرف تین دن باقی رہ گئے تھے اور سخت بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا، جب ہم دونوں احمق، پھولوں سے لدے تنویر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ قاضی صاحب نے مقدس آیات پڑھ کر ہماری زندگی کو دائمی سکون بخش دیا۔ افشاں اور شکیلہ ہماری کوٹھی میں آ گئیں۔ اور پھر وہ راتیں..... چھپانے کی راتیں ہیں۔ ہم آپ کو حجلۂ عروسی میں کیوں لے جائیں؟ ساری باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں..... بس ہو گا کچھ..... خوب لطف اُٹھا چکے ہیں ہماری حرکتوں سے آپ۔

ہاں، دوسرے دن جمشید بھائی کی شادی تھی۔ قہقہے برس رہے تھے، خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔ اپنی شادی میں شمشیر کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ لیکن دوسرے دن جمشید کی بارات آنے کے بعد آیا۔ اُس کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ اور جب اُس نے نواب صاحب اور تنویر صاحب سے سلام کر کے ہاتھ ملایا تو ہم حیران رہ گئے۔ ایک بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ ہماری طرف بھی آیا۔

''ایک ہارے ہوئے انسان کا سلام قبول کریں شہزادگان!'' اس نے کہا۔

ہم نے بڑے تپاک سے اُس سے مصافحہ کیا تھا۔ ''شرمندہ ہوں۔ کل حاضر نہ ہو سکا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔''

''بہت بہت شکریہ شمشیر!.....لیکن ہمیں تمہارے پہلے الفاظ پر اعتراض ہے۔''

''جس بات پر بھی اعتراض ہے، اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ سہا ہوا ہوں۔'' شمشیر بولا۔

''ایسے معاف نہیں کیا جائے گا۔'' طالوت بولا۔

''پھر حکم دیں۔''

''حکم نہیں، التجا..... ایک بازو میں مجھے لے لیں، دوسرے میں عارف کو۔ اور بڑے بھائی کی حیثیت سے پیشانی چوم کر مبارکباد دیں، تب قبول کی جاسکتی ہے۔'' طالوت بولا اور شمشیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ایک شرط پر۔'' اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارشاد۔''

''اسے ایک ناکام کاروباری کی خوشامد نہیں سمجھا جائے گا۔ بلکہ ایک ایسے انسان کا خلوص سمجھا جائے گا، جسے ماضی کی حماقتوں کا احساس ہو گیا ہو۔''

''بڑے بھائی، چھوٹے بھائیوں کے لئے ہمیشہ فراخ دل ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کیا جائے۔'' اور شمشیر ہم دونوں سے لپٹ گیا۔

''خدا کی قسم..... خدا کی قسم! مجھے اپنی حماقتوں کا احساس ہے۔ بس اور کچھ نہ کہوں گا۔''

''ہماری طرف سے جو گستاخیاں ہوئی ہیں، انہیں معاف کر دیں شمشیر بھائی!''

''نہیں۔ قصور وار میں ہی ہوں۔'' شمشیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تبھی قاضی صاحب آ گئے اور جمشید کی ناک میں رسّی ڈال دی گئی۔

شمشیر اور اُس کی بیوی کو کسی طور جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس سے نواب صاحب نے درخواست کی تھی کہ تین دن تک یہیں رہے۔ یوں یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

اور پھر دن عید تھے اور راتیں بغیر پٹاخوں والی شبِ برات۔ ایسے حسین دن اور راتوں کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ ہو گیا تھا، لیکن بڑی ماں کس قدر پریشان تھیں، اُنہیں اپنے بھائی کا خیال تھا۔ ظاہر ہے، وہ بے حد ناراض ہوں گے۔

پروگرام طے ہونے لگے اور پھر ایک بات پر اتفاق ہو گیا۔ طے کیا گیا کہ جمشید ہماری فرم کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ جائے۔ اس کے ساتھ اُس کی 'غریب' بیوی عذرا بھی ہو۔ وہ بالکل قلاش انسان کی حیثیت سے جائے اور اس کے بعد اپنے والدین کا ردِعمل دیکھے۔

یہ بات طے ہو گئی اور شادی کے ٹھیک دس دن کے بعد جمشید اور عذرا امریکہ روانہ ہو گئے۔ نواب صاحب بھی جانے کے لئے پَر تول رہے تھے۔ چنانچہ انہیں بھی اجازت مل گئی۔ شمشیر نے دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا لیکن اب اسے ہماری فرم کا پورا تعاون حاصل تھا۔ ہم نے کئی بڑے بڑے ٹھیکے اُس کے سپرد کر دیئے اور اُسے مال بھی سپلائی کیا۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز میں کیا گیا کہ اسے ہمارے احسان کا احساس نہ ہو۔

طالوت بھی بہت خوش تھا۔ بس کبھی کبھی وہ آنے والے چاند کی باتیں کرتا تھا۔ اس بار وہ شکیلہ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نواب صاحب بھی چلے گئے۔ البتہ بیگم یہیں رہ گئی تھی۔ نواب صاحب کے ساتھ صرف احسان گیا تھا۔ لیکن کوٹھی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ افشاں اور شکیلہ، ان دونوں نے اسے نہ جانے کیا بنا دیا تھا۔

اور پھر چاند ڈوبنے کی رات آ گئی۔ سرسری طور پر ذکر کر دیا گیا تھا کہ عادل بھائی اپنی دُلہن کو لے کر اپنے گھر جائیں گے لیکن اسے رخصت کرنے کے لئے کسی اہتمام کو منع کر دیا گیا۔

''اچھا دوست! میری کامیابی کی دُعا کرنا۔'' طالوت نے مجھ سے کہا اور میں نے بڑے خلوص سے

اُسے رخصت کیا۔ اب کوٹھی میں افشاں تھی اور میں۔ سیمیں بھی یہاں بہت خوش تھی۔ عذرا کی بہنیں بھی کوٹھی کی رونق تھیں۔ شاہدہ بیگم ایک بزرگ کی حیثیت سے کوٹھی کا پورا نظام سنبھالے ہوئے تھیں اور دن رات ہمیں دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

یوں حشمت برادرز کا ایک کلرک، نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ زرینہ کی بے وفائی نے اس کی تقدیر بدل دی تھی۔ آج بھی جب میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو خود کو ایک افسانہ نظر آتا ہوں۔ طالوت کی واپسی کا وقت آ رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ نہ جانے اس بے چارے کے ساتھ کیا بیتی۔ اور پھر چاند نکل آیا لیکن طالوت واپس نہ آیا۔

اپنی بے چینی کو افشاں پر بھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ افشاں کو میں نے دل کا ہر راز سونپ دیا تھا، لیکن طالوت کے بارے میں کچھ بتانا ناممکن تھا۔ اس کے لئے میں نے خود کو معاف کر دیا تھا اور اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ طالوت کو گئے ہوئے پانچواں دن تھا اور اب کہیں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ یہاں تک کہ افشاں کی گود میں بھی اکثر طالوت کے بارے میں سوچنے لگتا تھا، لیکن کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سی پریشانیاں منہ کھول کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

چھٹا، ساتواں اور آٹھواں دن بھی گزر گیا۔ افشاں بھی اب میری پریشانیاں بھانپ رہی تھی۔ بہر حال وہ خود بھی طالوت کے لئے فکر مند تھی۔

اور نویں دن میں آفس میں تھا کہ اچانک طالوت دروازے سے اندر داخل ہوا۔ میں دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا تھا۔ طالوت میری پشت تھپکنے لگا لیکن اُس کے چہرے پر پھیکا پن نظر آ رہا تھا۔

''خوب ہنی مون منایا، بے ایمان! یہاں میں پاگل ہو گیا تھا۔''

''نہیں یار! گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' طالوت سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا طالوت؟..... شکیلہ کہاں ہے؟''

''اُسے وہیں چھوڑ آیا ہوں۔''

''ارے، خیریت؟''

''والد صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔'' طالوت نے بتایا اور میں سکتے میں رہ گیا۔ کئی منٹ تک میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ بمشکل حواس قائم ہوئے اور میں نے تاسف سے پوچھا۔

''کب؟...... کیسے؟''

''بیمار تو پہلے بھی تھے، لیکن اس حد تک احساس نہیں تھا۔ جس دن میں وہاں پہنچا، اسی دن صبح کو انتقال ہوا تھا۔''

''میں تمہارے دُکھ میں برابر کا شریک ہوں طالوت!......اور کیا کہوں؟''

''یار! بڑی اُلجھنیں پیش آ گئیں۔ یوں تو ہر زندگی کی انتہا موت ہے، لیکن بہر حال وہ میرے باپ تھے اور ان کی موجودگی میں، میں نے کوئی ذمے داری کبھی نہیں محسوس کی۔''

''یقیناً طالوت! میں مانتا ہوں۔''

''اب میرے قبیلے کے لوگ مجھے بادشاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی بات نہیں مانوں گا تو بڑی دُشواریاں پیش آئیں گی۔''

''اوہ!'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''سنجیدگی سے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے عارف! یہ حالات کبھی پیش نہیں آئے تھے، جو اس وقت ہیں۔ اور تمہارا مشورہ ہی میرے لئے راستے کا تعین کرے گا۔''

''ایک بات بتاؤ طالوت! اگر تم وہاں جا کر ذمے داریاں سنبھال لو گے تو کیا تمہارا رابطہ ہم سے بالکل ختم ہو جائے گا؟''

''نہیں میرے دوست! ہرگز نہیں۔ میں نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ سوچا ہے۔ میں وہاں ایک ایسا علاقہ تعمیر کروں گا، جو ہماری بیان کردہ پہاڑی ریاست کا نمونہ ہوگا اور وہاں پر میں تم لوگوں کو بھی دعوت دیا کروں گا۔''

''ہمارے بغیر وہاں تمہارا دل لگ جائے گا؟''

''یہی تو سب سے مشکل کام ہوگا۔''

''لیکن ذمے داریاں، طالوت؟''

''ہاں!'' طالوت نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ان کا احساس ضروری ہے۔''

''تب طالوت! تمہیں خود میں تھوڑی سی تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے خاندان، اپنے قبیلے کی ذمے داریاں ضرور پوری کرو۔''

''یہی مناسب ہے عارف!''

''میں خود کو یہاں تنہا محسوس کروں گا طالوت!''

''میں خود بھی۔ لیکن یہ کیسی انوکھی بات ہے کہ اس وقت ہم بھٹکنے والوں میں نہیں ہیں، بلکہ یوں لگتا ہے، جیسے ایک جانے بوجھے پروگرام کے تحت یہ سب کچھ ہوا ہو۔ اب تم بھی سیٹ ہو اور میں بھی اور ہمارے ساتھی بھی موجود ہیں۔''

''ہاں!''

''ویسے جب بھی مجھے طلب کرو گے، چشم زدن میں موجود ہوں گا۔''

''یہی اچھی بات ہے۔''

''اس کے علاوہ میں چند لوگوں کو تمہاری خدمت کے لئے مامور کر دوں گا۔ وہ میرے لوگ ہوں گے اور وہ سب کچھ ہو جائے گا، جو تم چاہو گے۔''

''میں تمہاری محبت سے سرشار ہوں طالوت!''

''تو پھر یہ بات طے ہو گئی؟''

''ہاں!''

''اب مسئلہ دوسرے لوگوں کا ہے۔''

''وہ بھی مشکل نہیں ہوگا۔''

''یعنی؟''

''ہم انہیں حقیقت بتا دیں گے۔''

''اوہ! لیکن......؟''

''سیدھی بات ہے طالوت! اب تم اپنی ریاست کا نظام سنبھالو گے، میں یہیں رہوں گا۔''
''ہاں۔ باقی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔''
''جا بھی نہیں سکتے۔''
''پھر یار! بلاوجہ فکرمند تھے ہم لوگ۔ سوائے اس کے کہ تھوڑی سی جدائی برداشت کرنا پڑے گی، اور کیا تبدیلی ہوگی۔''
''کچھ نہیں۔''
''بس اب میں مطمئن ہو گیا۔'' طالوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔
سب سے پہلی اطلاع تنویر صاحب کو دی گئی تھی اور تھوڑی دیر میں سب کوٹھی پہنچ گئے۔ ہم بھی کوٹھی ہی چلے گئے۔ تنویر صاحب نے تعزیت کی اور اس بات پر مجبوری ظاہر کی کہ وہ نہ پہنچ سکیں گے۔
''ایک اور بری اطلاع بھی ہے تنویر صاحب!'' میں نے کہا۔
''اوہ! خدا کے لئے ساری بری اطلاعات ایک ساتھ نہ دو۔''
''سننا ضروری ہے۔ عادل اب ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔''
''کیا مطلب؟''
''ریاست کے امور اب انہیں سنبھالنا ہوں گے۔''
''ارے۔'' تنویر صاحب افسوس ناک انداز میں بولے۔
''مجبوری ہے۔ لیکن بہرحال، مقررہ دن عادل ہمارے ساتھ گزارا کریں گے۔'' میں نے کہا اور تنویر صاحب ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔
''انتظامات سنبھالنے کے بعد میں بہت جلد آپ لوگوں کو ریاست کی سیر کی دعوت دوں گا۔ بہرحال ان دلچسپیوں کو، آپ کی عنایات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔'' طالوت نے کہا۔
شام تک وہ ہمارے ساتھ رہا اور پھر اس نے واپسی کی اجازت مانگی۔ میرے دل میں خلا سا محسوس ہو رہا تھا لیکن بہرحال طالوت کی علیحدگی کسی شدید انداز میں نہیں ہوئی تھی۔ میں اُس سے دُور رہ کر بھی دُور نہیں تھا۔ طالوت چلا گیا۔ اور پھر وہ ہر جمعرات کی رات کو آنے لگا۔ کبھی کبھی وہ دن میں بھی آ جاتا اور شکیلہ اُس کے ساتھ ہوتی۔ وہ ہمارے لئے بے شمار انوکھے تحائف لاتا، جن کا دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔
تین ماہ کے اندر کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ مثلاً جمشید بھیا واپس آ گئے تھے۔ ان کے والد نے انہیں اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اپنی قلاش بیوی کو لے کر وہ سیدھے گھر واپس آ گئے تھے، لیکن امریکہ سے ایک بہت بڑا بزنس لائے تھے۔
اس کے علاوہ نواب جلال الدین کی کوٹھی اب ہماری کوٹھی کے بالکل برابر ہے اور رات کا کھانا اُنہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم سب شدت سے جمعرات کا انتظار کرتے رہتے ہیں، جب طالوت آتا ہے اور ہمارے اس گلکدے میں قہقہے بکھر جاتے ہیں۔

(تمت بالخیر)